زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

افسانہ نمبر

انتخاب ۱۸۰۱ئہ سے ۱۹۵۵ئہ تک

مرتب

محمد طفیل

قیمت ڈی لکس ایڈیشن ۸۰۰/- روپے

نقوش ○ اُردو بازار، لاہور
فون : 7226516-7311291-7353828 فیکس : 92-42-7229389
ای میل : nuqoosh@wol.net.pk

ترتیب

افسانوی مضامین کا دور

اُردو افسانہ

پہلا دور

دُوسرا دور

تیسرا دور

(انگارے کے افسانے)

چوتھا دور

پانچواں دور

مضامین

جاوید [illegible] نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو لاہور سے شائع کیا۔

طلوع

کھاتے پیتے گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ جو بے حد ذہین' موٹا تازہ اور ساتھ ہی بڑا باتونی تھا۔ وہ اپنی توتلی زبان میں جب باتیں کرنے پر آتا تو چپ ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ اس کی وہ تمام اکھڑی اکھڑی اور سلسلہ در سلسلہ باتیں آج بھی سب کو یاد آتی ہیں۔

مگر ٹریجڈی یہ کہ شروع ہی سے اس بچے کو اپنی ماں کا دودھ نصیب نہ ہوا۔

جب یہ بچہ کچھ بڑا ہوا اور اس کا شعور بھی کچھ کچھ پختہ ہونے لگا تو اسے اپنے تمدن اور اپنی معاشرت سے بے حد اُنسیت پیدا ہوئی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اُس نے قدرے سنبھل کر اپنے مسائل کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ اب اس کی باتوں میں وہ پہلی سی یاوہ گوئی نہ رہی' قدرے اختصار کے ساتھ ایک ٹھہراؤ تھا' ایک تسلسل تھا اور ایک نقطہ نظر تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود وہ مطمئن نہ تھا۔

اِسی بے منزلی میں اس نے اپنے ملک سے دور' مغرب کے بچوں سے یارانہ گانٹھا۔ کیونکہ وہ اس سے زندگی میں کئی قدم آگے تھے۔ یہاں بیٹھے ہی بیٹھے اس نے انھیں اپنا ذہنی امام تصور کر لیا اور ان کی باتوں کو اپنے الفاظ میں دہرا دہرا کر بہت کچھ سیکھا۔

مغربی بچوں کی دیکھا دیکھی جب اس نے اسی انداز میں یہاں زندہ رہنا چاہا۔ تو اپنی چال بھی بھول گیا۔ نہ ان بچوں والی کوئی بات پیدا ہو سکی اور نہ اپنی ہی انفرادیت باقی رہی۔ یہی وجہ ہوئی کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا' کہہ نہ سکا۔ کچھ بوکھلا سا گیا۔ بعضوں کو اس کی یہی بوکھلاہٹ بڑی عزیز ہے۔

تذبذب کی یہ کیفیت اس پہ زیادہ عرصہ طاری نہ رہی۔ وہ بچے جن سے وہ بہت زیادہ مرعوب تھا اور جن سے واقعی اس نے بہت کچھ سیکھا تھا' ان سے بھی اسے آنکھیں چار کرنے کی ہمت پیدا ہوئی۔ اور اس کا یہ گھمنڈ کچھ زیادہ غلط بھی نہ تھا۔

آپ کو سن کر حیرت ہوگی کہ وہ بچہ جو بعد میں بالغ ہو کر جوان بھی ہوا آج نڈھال پڑا زندگی کے دن گزار رہا ہے۔

یہ کہانی اُردو افسانے کی تھی۔

محمد طفیل

پرچے کی ترتیب اور افسانوں کے چناؤ میں کرشن چندر، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، وقار عظیم، احتشام حسین، عبادت بریلوی اور محمد حسن عسکری کے مشورے بھی شامل ہیں۔

اس پرچے کی ترتیب کے بارے میں مختصراً یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جن جن راہوں سے گذر کر اُردو افسانے نے موجودہ شکل پائی اس کا دور بہ دور یہ ایک تفصیلی ڈھانچہ ہے۔

نظریاتی اختلاف کے باوجود میں نے کسی بھی افسانہ نگار کو نظر انداز کرنے کی کوشش نہیں کی ہے (نہ ہی کسی کے فنی اعتبار سے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ اپنے ذمہ لیا ہے) ہو سکتا ہے کہ پڑھے لکھوں کا ایک طبقہ میری اس قدر فراخ دلی کو عیب کا درجہ دے دے۔ لیکن میں اپنی جگہ مطمئن ہوں۔ اس لئے کہ کسی صنف ادب کے انتخاب میں جو مرتب کے فرائض ہونے چاہئیں، ان سے (شاید) پوری طرح عہدہ برآ ہوا ہوں۔

رہا افسانوں کے انتخاب کا قصہ، وہ تو ہے ہی اپنی اپنی پسند کا معاملہ، لیکن میری پسند میں مشہور افسانہ نگاروں اور نامور نقادوں کی پسند بھی شامل ہے۔

افسانہ نگاروں اور نقادان کرام کے تعاون کے ساتھ پبلشر دوستوں میں خصوصیت کے ساتھ مکتبہ اُردو، مکتبہ جدید، نیا ادارہ کا بھی شکر گذار ہوں، ورنہ یہ نمبر اتنی جامعیت کے ساتھ پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔

نقوش کے ٹائٹل ایشیا کے نامور مصور عبدالرحمٰن چغتائی کی اعجاز کاریوں کے شاہکار ہیں۔ ادارہ نقوش کو ان کی اشاعت پر فخر ہے۔

(مرتب)

موجودہ ایڈیشن کے بارے میں

چند وضاحتیں

-- افسانہ نمبر پہلے دو جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ اب حصہ اول و دوم کو اکٹھا کر دیا گیا ہے۔

-- افسانہ نمبر کے پہلے ایڈیشن میں صفحہ نمبر کی ترتیب میں غلطی تھی۔ اب ان صفحہ نمبروں کی تصحیح کر دی گئی ہے۔

-- اشاریہ سازی میں بھی اس غلطی کا احتمال ہے۔ حوالے کے لئے نئے اور پرانے صفحہ نمبر درج کر دیئے ہیں۔

-- "انگارے" کے افسانے شامل نہیں کیئے گئے۔

رانی کیتکی

سید انشاء اللہ خاں انشاء

(۱۸۰۳ء)

سر جھکا کر ناک رگڑتا ہوں اوس اپنے بنانے والے کے سامنے جس نے ہم سب کو بنایا اور بات کی بات میں وہ سب کر دکھایا جس کا بھید کسی نے نہ پایا۔

آتیاں جاتیاں جو سانسیں ہیں
اوس کے بن دھیان سب یہ پھانسیں ہیں

یہ کل کا پتلا جو اپنے اوس کھلاڑی کی سدھ رکھے تو کھٹائی میں کیوں پڑے؟ اور کڑوا کسیلا کیوں ہو؟ اوس پھل کی مٹھائی چکھے جو بڑوں سے بڑے اگلوں نے چکھی ہے۔

دیکھنے کو آنکھ دی اور سننے کو یہ کان دیئے۔ ناک بھی اونچی سب میں کر دی مورتوں کو جی دان دیئے۔ مٹی کے باسن کو اتنی سکت کہاں، جو اپنے کمہار کے کرتب کچھ بتا سکے؟ سچ ہے، جو بنایا ہوا ہو، سو اپنے بنانے والے کو کیا سراہے؟ اور کیا کہے؟ یوں جس کا جی چاہے پڑا بکے۔ سر سے لگا پاؤں تک جتنے رونگٹے ہیں جو سب کے سب بول اٹھیں اور سراہا کریں اور اتنے برسوں[1] اسی دھیان میں رہیں جتنی ساری ندیوں میں ریت اور پھول پھلیاں کھیت میں ہیں تو بھی کچھ نہ ہو سکے۔

اس سر جھکانے کے ساتھ دن رات جپتا ہوں اوس داتا کے پہونچے ہوئے پیارے کو جس کے لئے یوں کہا ہے "جو تو نہ ہوتا میں کچھ نہ بناتا" اور اوس کا چچیرا بھائی جس کا بیاہ اوسی کے گھر ہوا اوس کی سرت[2] مجھے لگتی رہتی ہے میں پھولا اپنے آپ میں نہیں سماتا اور جتنے اون کے لڑکے بالے ہیں انھیں کے یہاں پر چاو[3] ہے اور کوئی ہو، کچھ میرے جی کو نہیں بھاتا۔ مجھے اس گھرانے کے چھوٹ[4] کسی سے بھاگ اوچک، چور ٹھگ سے کیا پڑی؟ جیتے مرتے اور نہیں سبھوں کا آسرا اور اون کے گھرانے کا رکھتا ہوں تیسوں گھڑی۔

ڈول ڈال ایک انوکھی بات کا

۱۔ (ن) برس، ۲۔ [illegible] ۳۔ چھت، ۴۔ سوا۔

ایک دن بیٹھے بیٹھے یہ بات اپنے دھیان میں چڑھ آئی کہ کوئی کہانی ایسی کہیے جس میں ہندوی چھٹ اور کسی بولی کی پٹ نہ ملے تب جا کے میرا جی پھول کی کلی کے روپ سے کھلے۔ باہر کی بولی اور گنواری کچھ اوس کے بیچ نہ ہو۔ اپنے ملنے والوں میں سے ایک کوئی بڑے پڑھے لکھے پرانے دھرانے بوڑھے گھاگ یہ کھڑاگ لائے سر ہلا کر منہ [2] بنا کر ناک بھوں چڑھا کر آنکھیں پھرا کر لگے کہنے "یہ بات ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ ہندوی پن بھی نہ نکلے اور بھاکھا پن نہ ٹھوس [3] جائے۔ جیسے بھلے لوگ اچھوں سے اچھے آپس میں بولتے چالتے ہیں جوں کا توں وہی ڈول رہے اور چھانہہ کسی کی نہ پڑے' یہ نہیں ہونے کا۔ میں نے اون کی ٹھنڈی سانس کی پھانس کا ٹہوکا کھا کر جھنجھلا کر کہا۔ میں کچھ ایسا انوکھا [4] بولا نہیں' جو رائی کو پربت کر دکھاؤں اور جھوٹ سچ بول کے اونگلیاں نچاؤں اور بے سری بے ٹھکانے کی اوجھی سلجھی باتیں سمجھاؤں [5]۔ جو مجھ سے نہ ہو سکتا' تو بھلا یہ بات منہ سے کیوں نکالتا؟ جس ڈھب سے ہوتا اس بکھیڑے کو ٹالتا —

اب اس کہانی کا کہنے والا یہاں آپ کو جتاتا ہے اور جیسا کچھ لوگ اوسے پکارتے ہیں کہہ سناتا ہے۔ دہنا ہاتھ منہ پر پھیر کر آپ کو جتاتا ہوں۔ جو میرے داتا نے چاہا تو وہ تاؤ بھاؤ اور آؤ جاؤ اور کود پھاند اور لپٹ جھپٹ دکھاؤں جو دیکھتے ہی آپ کے دھیان کا گھوڑا' جو بجلی سے بھی بہت چنچل اچپلاہٹ میں ہرنوں کے روپ میں ہے اپنی چوکڑی بھول جائے۔

گھوڑے پر اپنے چڑھ کے آتا ہوں میں — کرتب جو ہیں سو سب دکھاتا ہوں میں
اوس چاہنے والے نے جو چاہا تو ابھی — کہتا جو کچھ ہوں کر دکھاتا ہوں میں

اب آپ کان رکھ کے سنکھ [6] ہو کے ٹک ادھر دیکھئے کس ڈھب سے بڑھ چلتا ہوں اور اپنے ان پھول کی پنکھڑی جیسے ہونٹوں سے کس کس روپ سے پھول اگلتا ہوں۔

(کہانی او بھار اور بول چال کی دولہن کا سنگار)

کسی دیس میں کسی راجہ کے گھر ایک بیٹا تھا اُسے اُس کے ماں باپ اور سب گھر کے لوگ کنور اودے بھان کہہ کر پکارتے تھے۔ سچ مچ اوس کے جوبن کی جوت میں سورج کی ایک سوت آ ملی تھی۔ اوس کا اچھا پن اور بھلا لگنا کچھ ایسا نہ تھا جو کسی کے لکھنے اور کہنے میں آ سکے۔ پندرہ برس بھر کے سولھے میں پانو رکھا تھا۔ کچھ یوہیں سی اوس کی مسیں بھیگتی چلی تھیں۔ اکڑ تکڑ اوس میں بہت سی سما رہی تھی کسی کو کچھ نہ سمجھتا تھا۔ پر کسی بات کے سوچ کا گھر گھاٹ پایا نہ تھا اور چاؤ کی ندی کا پاٹ اون نے دیکھا نہ تھا۔ ایک دن ہریالی دیکھنے کو [illegible] گھوڑے پر چڑھ کے انکھیل پنے اور لڑکپن [7] کے ساتھ دیکھتا بھالتا چلا جاتا تھا۔ اتنے میں ایک ہرنی جو اس کے سامنے آئی' تو اس [illegible] پٹ ہوا۔ اس ہرنی کے پیچھے سب کو چھوڑ چھاڑ کر گھوڑا پھینکا۔ بھلا کوئی گھوڑا اوس کو پا سکتا تھا؟ جب سورج چھپ گیا اور [illegible] سے او جھل ہوئی' تب تو یہ کنور اودے بھان بھوکا پیاسا اور اوداسا جمائیاں اور انگڑائیاں لیتا ہکا بکا ہو کے لگا آسرا ڈھونڈنے [illegible] کچھ امریاں دھیان چڑھیں' اودھر چل نکلا۔ تو کیا دیکھتا ہے؟ چالیس پچاس رنڈیاں [8] ایک سے ایک جوبن میں اگلی [illegible] پڑی جھول رہی ہیں اور ساون گاتیاں ہیں۔ جو انھوں نے اوس کو دیکھا' تو کون؟ تو کون؟ کی چنگھاڑ سی پڑ گئی (اون [illegible] کے ساتھ اس کی آنکھ لڑ گئی۔

دوہا۔ کوئی کہتی تھی یہ اوچکا ہے — کوئی کہتی تھی ایک پکا ہے

۱۔ بالکل۔ ۲۔ (ن) [illegible] ۳۔ (ن) [illegible] ۴۔ (ن) جتلاؤ۔ ۵۔ (ن) سجاؤں۔ ۶۔ روبرو، سامنے۔ ۷۔ (ن) الھڑپن۔
۸۔ عورتیں۔ [illegible]

والی جھولنے والی لال جوڑا پہنے ہوئے جس کو سب رانی کیتکی کہتے تھے اوس کے بھی جی میں اس کی چاہت نے گھر کیا۔ پر کہنے سننے کو اس نے بہت سے ناں نوں کی۔ اس لگ چلنے کو بھلا کیا کہتے ہیں؟ یک نہ یک[1] جو تم جھٹ سے ٹپک پڑے یہ نہ جانا جو یہاں رنڈیاں اپنی جھول رہی ہیں۔ اجی تم جو اس روپ سے ساتھ بے دھڑک چلے آئے ہو' ٹھنڈی ٹھنڈی چھانہہ چلے جاؤ۔ تب انھوں نے مسوس[2] کے ملوا[3] کھا کے کہا کہ اتنی رکھائیں نہ دیجئے۔ میں سارے دن کا تھکا ہوا ایک پیڑ کی چھانہہ میں اوس کا بچھڑ کر کے پڑ رہوں گا جیسے تڑکے ڈھونڈتے اوٹھ کر جدھر کو منہ پڑے گا چلا جاؤں گا۔ کسی کا لیتا دیتا نہیں۔ ایک ہرنی کے پیچھے سب لوگوں کو چھوڑ کر گھوڑا پھینکا تھا' جب تلک اوجالا رہا' آدمی کے دھیان میں تھا۔ جب اندھیرا چھا گیا اور جی بہت گھبرا گیا ان امریوں کا آسرا ڈھونڈھ کر یہاں چلا آیا ہوں۔ کچھ روک ٹوک تو نہ تھی جو ماتھا ٹھنک جاتا اور رک جاتا' سر اوٹھائے ہانپتا ہوا چلا آیا۔ کیا جانتا تھا پدمنیاں یہاں پڑی جھولتی پینگیں چڑھا رہی ہیں۔ پر یوں ہی بدی تھی' برسوں میں بھی جھولا کروں گا۔ یہ بات سن کر جو لال جوڑے والی سب کی سر دھری تھی اوس نے کہا۔ ہاں جی بولیاں ٹھولیاں نہ مارو۔ ان کو کہہ دو جہاں جی چاہے اپنے پڑ رہیں اور جو کچھ کھانے پینے کو مانگیں سو انہیں پہنچا دو۔ گھر آئے کو کسی نے آج تک مارا نہیں ڈالا۔ ان منہ کا ڈول گال تمتمائے اور ہونٹھ پپڑائے اور گھوڑے کا ہانپنا اور جی کا کانپنا اور گھبراہٹ اور تھرتھراہٹ اور ٹھنڈی سانسیں بھرنا اور نڈھال ہو کر گرے پڑنا ان کو سچا کرتا ہے۔ بات بنائی اور[4] چتوئی کی کوئی چھپتی ہے؟ پر ہمارے اور ان کے بیچ میں کچھ اوٹ سی کپڑے لتے کی کر دو۔ اتنا آسرا پا کر سب سے پرے کونے میں جو پانچ سات چھوٹے چھوٹے پودے سے تھے اون کی چھانہہ میں کنور اودے بھان نے اپنا بچھونا کیا۔ سرہانے ہاتھ دھر کے چاہتا تھا سو رہے' پر نیند[5] کوئی چاہت کی لگاوٹ میں آتی تھی؟ پڑا پڑا اپنے جی سے باتیں کر رہا تھا۔ اتنے میں کیا ہوتا ہے؟ جو رات سائیں سائیں بولنے لگتی ہے اور ساتھ والیاں سب سو رہتی ہیں' رانی کیتکی اپنی سہیلی مدن بان کو جگا کر یوں کہتی ہے۔ اری تو نے کچھ سنا ہے؟ میرا جی اس پر آگیا اور کسی ڈول سے نہیں تھم سکتا۔ تو سب میرے بھیدوں کو جانتی ہے اب جو ہونی ہو سو ہو۔ سر رہتا ہے جاتا جائے' میں اوس کے پاس جاتی ہوں۔ تو میرے ساتھ چل' پر تیرے پاؤں پڑتی ہوں کوئی سننے نہ پاوے۔ اری یہ میرا جوڑا میرے اوڑاس کے بنانے والے نے ملا دیا۔ میں اسی لئے ان امریوں میں آئی تھی۔ کیتکی مدن بان کا ہاتھ پکڑے وہاں آن پہنچتی ہے جہاں کنور اودے بھان لیٹے ہوئے کچھ سو میں پڑے پڑے بڑبڑا رہے تھے۔ مدن بان آگے بڑھ کر کہنے لگی۔ تمہیں اکیلا جان کے رانی آپ آئی ہیں۔ کنور اودے بھان یہ سن کر اوٹھ بیٹھے اور یہ کہا کیوں نہ ہو۔ جی سے جی کو ملاپ ہے۔ کنور اور رانی دونوں چپ چاپ بیٹھے تھے' پر مدن بان دونوں کے بدن گدگدا رہی تھی۔ ہوتے ہوتے اپنے اپنے پتے سب نے کھولے۔ رانی کا پتہ یہ کھلا۔ راجہ جگت پرکاس کی بیٹی ہیں اور ان کی مہارانی کام لتا کہلاتی ہیں۔ ان کو ماباپ نے ان کے کہہ دیا ہے ایک مہینے پیچھے امریوں میں جا کے جھول آیا کرو۔ آج وہی دن تھا سو تم سے مٹ بھیڑ ہو گئی۔ بہت مہاراجوں کے کنوروں کی باتیں آییاں پر کسی پر ان کا دھیان نہ چڑھا۔ تمہارے دھیان ہی لاگ' جو تمہارے پاس سب سے چھپ کے میں جوان کی لڑکپن کی گوئیاں[6] ہوں مجھے ساتھ اپنے لے کے آئیں ہیں۔ اب تم اپنی کہانی کہو کہ تم کس دیس کے کون ہو۔ انھوں نے کہا میرا باپ راجہ سورج بھان اور مہارانی لچھمی باس ہے' آپس میں جو گٹھ جوڑ ہو جائے تو کچھ اچرج اور اچنبھے کی بات نہیں۔ یوہیں آگے سے ہوتا چلا آیا ہے[7]۔ جیسا منہ ویسی تھپڑ[8]' جوڑ توڑ ٹٹول لیتے ہیں۔ دونوں مہاراجوں کو یہ چت[9] چاہی بات اچھی لگے گی۔ پر ہم تم دونوں کے جی کا گٹھ جوڑا چاہے۔ اس میں مدن بان بول اوٹھی۔ سو تو ہوا' اپنی اپنی انگوٹھیاں ہیر پھیر کر لو اور آپس میں لکھوٹی[10] بھی لکھ دو۔ پھر کچھ ہچر مچر نہ رہے۔ کنور اودے بھان

ا۔ یکایک، ۲۔ ... ۳۔ رنج و غم، افسوس، ۴۔ جو سچ نہ ہو، ۵۔ (ن) کہیں، ۶۔ سہیلی، ۷۔ (ن) ہوتی چلی آئی،
۸۔ (ن) تھپیڑہ ۹۔ ... حسب مراد، ۱۰۔ تحریر۔

نے اپنی انگوٹھی رانی کیتکی کو پہنا دی اور رانی کیتکی نے انگوٹھی کنور کی انگلی میں ڈال دی[1] اور ایک دھیمی سی چٹکی بھی لے لی۔ اس میں مدن بان بول اوٹھی جو سچ پوچھو تو اتنی بھی بہت ہوئی اتنا بڑھ چلنا اچھا نہیں میرے سر چوٹ ہے۔ اب اوٹھ چلو اور ان کو سونے دو اور روئیں پڑے رونے دو۔ بات چیت تو ٹھیک ٹھاک ہو چکی تھی، پچھلے پہر سے رانی تو اپنی سہیلیوں کو لے کے جدھر سے آئی تھی ادھر چلی گئی اور کنور اودے بھان اپنے گھوڑے کی پیٹھ لگ کر اپنے لوگوں سے مل کر اپنے گھر پہنچے۔ کنور جی کا انوپ روپ کیا کہوں کچھ کہنے میں نہیں آتا۔ کھانا نہ پینا، لگ چلنا، کسی سے کچھ نہ کہنا نہ سننا۔ جس دھیان میں تھے اوسی میں گھونے رہنا اور گھڑی گھڑی کچھ سوچ سوچ سر دھننا۔ ہوتے ہوتے اس بات کا لوگوں میں چرچا پھیل گیا۔ کسی کسی نے مہاراج اور مہارانی سے بھی کہا، کچھ دال میں کالا ہے۔ وہ کنور اودے بھان جن سے تمہارے گھر کا اوجالا ہے ان دنوں کچھ اس کے برے تیو۔ بے ڈول آنکھیں دکھائی دیتی ہیں۔ گھر سے باہر پانوں نہیں دھرتا۔ گھر والیاں جو کسی ڈول سے بہلاتیاں ہیں تو اور کچھ نہیں کرتا ایک اونچی سانس لیتا ہے بہت کسی نے چھیڑا تو چھپر کھٹ پر جا کے اپنا منہ لپیٹ کے آٹھ آٹھ آنسو پڑا روتا ہے۔ یہ سنتے ہی ماں باپ کنور کے پاس دوڑے آئے۔ گلے لگایا منہ چوما پانوں پر بیٹے کے گر پڑے، ہاتھ جوڑے اور کہا۔ جی کی بات ہے سو کہتے کیوں نہیں؟ کیا دکھ پڑا[2] جو پڑے پڑے کراہتے ہو؟ راج پاٹ جس کو چاہو دے ڈالو۔ کہو تو تم کیا چاہتے ہو۔ تمہارا جی کیوں نہیں لگتا؟ بھلا وہ ہے کیا، جو ہو نہیں سکتا منہ سے بولو، جی کھولو جو کہنے میں کچھ سوچتے[3] ہو تو ابھی لکھ بھیجو۔ جو کچھ لکھو گے جوں کی توں وہی کر تمہیں دے جاویں گے۔ جو تم کہو کنویں میں گر پڑو تو ہم دونوں ابھی گر پڑتے ہیں۔ جو کہو سر کاٹ ڈالو تو ابھی سر کاٹ ڈالتے ہیں۔ کنور اودے بھان وہ جو بولتے ہی نہ تھے انھوں نے لکھ بھیجنے کا آسرا پا کے اتنا بولے۔ "اچھا آپ سدھارئے[4] میں لکھ بھیجتا ہوں۔ پر میرے اوس لکھ بھیجنے کو میرے منہ پر کسی ڈھب سے نہ لانا، نہیں تو میں شرماؤں گا۔ اسی لئے لکھ[5] بات ہو کے میں نے کچھ نہ کہا" اور یہ لکھ بھیجا۔ "اب جو میرا جی ناک میں آگیا اور کسی ڈھب نہ رہا گیا اور آپ نے مجھے سو سو روپ سے کھولا اور بہت سا ٹٹولا تب تو لاج چھوڑ کے ہاتھ جوڑ کے منہ کو پھوڑ کے گھگیا کے یہ لکھتا ہوں۔ جگ میں جا کے ہاتھوں کسی کو سکھ نہیں ہے۔ بھلا وہ کون ہے جس کو دکھ نہیں۔ وہ اس دن جو میں ہریالی دیکھنے کو گیا تھا وہاں جو میرے سامنے ایک ہرنی کنوتیاں اوٹھائے ہوئے ہولی تھی اس کے پیچھے میں نے گھوڑا بگ چھوٹ پھینکا، جب تک اوجالا رہا اسی کے دھن میں میں چلا کیا۔ جب اندھیرا ہو گیا اور سورج ڈوبا تب جی میرا بہت اوداس ہوا۔ امریاں تاک کے میں اون میں گیا، تو اون امریوں کا پتا پتا میرے جی کا گاہک ہوا، وہاں کا یہ سمل[6] ہے، کچھ رنڈیاں جھولا جھول رہی تھیں۔ اون سب کی سر دھری کوئی رانی کیتکی مہاراجہ جگت پرکاس کی بیٹیا ہیں اونھوں نے یہ انگوٹھی اپنی مجھے دی اور میری انگوٹھی انھوں نے لے لی اور لکھاوٹ[7] بھی لکھ دی۔ سو یہ انگوٹھی اون کی لکھاوٹ سمیت میرے لکھے ہوئے کے ساتھ پہنچتی ہے۔ آپ دیکھ لیجئے اور جس میں بیٹے کا جی رہ جائے وہ کیجئے۔ مہاراج اور مہارانی اپنے بیٹے کے لکھے ہوئے پر سونے کے پانی سے یوں لکھتے ہیں۔ ہم دونوں نے اوس انگوٹھی اور لکھاوٹ کو اپنے آنکھوں سے ملا۔ اب تم اپنے جی میں کچھ کڑھو مت۔ جو رانی کیتکی کے ماباپ تمہاری بات مانتے ہیں تو ہمارے سمدھی اور سمدھن ہیں، دونوں راج ایک جا کہہ ہو جاویں گے اور جو کچھ ناؤ کی ٹھیرے گی تو جس ڈول سے بن آویگا ڈھال تلوار کے بل تمہاری دلہن ہم تم سے ملاویں گے، آج سے [illegible] کھیلو کودو بولو چالو آنندیں[8] کرو۔ ہم اچھی گھڑی سبھ مہورت سوچ کر تمہاری سسرال میں کسی بامھن کو بھیجتے ہیں جو بات [illegible] پکی کر لاوے۔ بامھن جو سبھ گھڑی دیکھ کر ہڑبڑی سے گیا تھا اوس پر بڑی کڑی پڑی۔ سنتے ہی رانی کیتکی کے باپ نے کہا اون کے [illegible] ہونے کا، اون کے باپ دادے ہمارے باپ دادوں کے آگے سدا ہاتھ جوڑ کے باتیں کرتے تھے اور جو تک

۱۔ (ن) [illegible] بھان کی انگلی میں ڈال دیا۔ ۲۔ (ن) دکھڑا ہے، ۳۔ گھبراتا،
۴۔ جاؤ، ۵۔ [illegible] ۶۔ [illegible] ۷۔ (ن) لکھت، ۸۔ خوش رہو، مزے کرو۔

[illegible] دیکھتے تو بہت ڈرتے تھے' کیا ہوا اب سے [illegible] اونچے پر چڑھ گئے۔ جس کے ہاتھ ہم [illegible] پہاڑ کے [illegible] سے [illegible] دو مہاراجوں کا راجہ ہو جائے' کس کا منہ جو یہ بات [illegible] منہ پر لائے۔ بامھن نے جل بھن کے کہا کہ ہمی اسی [illegible] میں تھا اور بھری سبھا میں یہی کہتے تھے۔ ہم میں اون میں کچھ گوت کا تو میل نہیں ہے۔ پھر کنور کی ہٹ سے کچھ ہماری نہیں چلتی' نہیں تو ایسی اوچھی بات کب ہمارے منہ سے نکلتی؟ یہ سنتے ہی مہاراج نے بامھن کے سر پہ پھولوں کی چھڑی [illegible] دی اور کہا جو بامھن کے بدیا کا گھمنڈ نہ ہوتا تو تجھ کو ابھی چکی میں دلوا ڈالتا۔ اس کو لے جاؤ اور ایک اندھیری کوٹھری میں مونڈ رکھو۔ جو اس بامھن پر بیتی سو سب کنور اودے بھان کے ماباپ نے سنتے ہی لڑن کی ٹھان اپنے ٹھاٹھ باندھ کر دل بادل جیسے گھر آتے ہیں چڑھ آئے۔ جب دونوں مہاراجوں میں لڑائی ہونے لگی رانی کیتکی ساون بھادوں کے روپ سے رونے لگی اور دونوں کے جی پر یہ آگئی۔ یہ کیسی چاہت ہے جس میں لہو برسنے لگا اور اچھی باتوں کو ترسنے لگا۔ کنور نے چپکے سے یہ لکھ بھیجا۔ "اب میرا کلیجا ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے دونوں مہاراجوں کو آپس میں لڑنے دو۔ کسی ڈول سے جو ہو سکے تو تم مجھے اپنے پاس بلا لو' ہم تم دونوں مل کے کسی اور دیس کو نکل چلیں' جو ہونی ہو سو ہو۔ سر رہتا رہے جاتا جائے۔" ایک مالن جس کو پھول کلی کہہ کر سب پکارتے تھے اون نے اوس کنور کی چٹھی کسی پھول کی پنکھڑی میں لپیٹ سمیٹ کے رانی کیتکی تک پہنچا دی۔ رانی نے اوس چٹھی سے آنکھیں اپنی ملیں اور مالن کو ایک تھال بھر کے موتی دیے اور چٹھی کی پیٹھ پر اپنے منہ کی پیک سے یہ لکھا "اے میرے جی کے گاہک جو تو مجھے بوٹی بوٹی کر چیل کوے کو دے ڈالے تو بھی میری آنکھیں کو چین کلیجہ میں سکھ ہووے' پر یہ بات بھاگ چلنے کی اچھی نہیں' ڈول سے بیٹا بیٹی کے باہر ہے۔ جی تجھ سے پیارا نہیں ایک تو کیا جو کروڑ جی جاتے رہیں پر بھاگنے کی کوئی بات ہمیں رہتی نہیں!۔" یہ چٹھی پیک بھری جو کنور تک جا پہنچتی ہے وہ کئی ایک سونے کے ہیرے موتی پکھراج کے کچا کچ بھرے ہوئے تھال نچھاور کر کے لٹا دیتا ہے[1] اور چٹھی سے اس کی بیکل چوگنی پچگنی ہو جاتی ہے اور اس چٹھی کو اپنے گورے ڈنڈ پر باندھ لیتا ہے۔

(آنا جوگی مہندر گر کا کیلاس پہاڑ سے اور ہرن ہرنی کر ڈالنا کنور اودے بھان اور اس کے ماباپ کا)

جگت پرکاس اپنے گرو کو جو کیلاس پہاڑ پر رہتا تھا' لکھ بھیجتا ہے' کچھ ہماری سہائے[3] کیجئے مہا کشٹ ہم چیلاوں کو پڑی ہے' راجہ سورج بھان کو اب یہاں تک باو بھک نے لیا ہے جو انھوں نے ہم سے مہاراجوں سے ناتے کا ڈول کیا ہے۔ کیلاس پہاڑ اک ڈال چاندی کا ہے' اوس پر راجہ جگت پرکاس کا گرو جس کو اندر لوک کے لوگ سب مہندر گر کہتے تھے' دھیان گیان میں کوئی نو کے لاکھ اتیتوں[4] کے ساتھ ٹھاکر کے بھجن میں دن رات رہا کرتا تھا۔ سونا روپا تانبے رانگے کا بنانا تو کیا اور گٹکا منہ میں لے کے اڑ جانا دور رہے اس کی اور باتیں جو اس ڈھب کی دھیان میں تھیں جو کچھ کہنے سننے سے باہر ہیں۔ مینہ سونے روپے کا برسا دینا اور جس روپ میں چاہنا ہو جانا سب کچھ اس کے آگے ایک کھیل تھا اور گانے میں مہادیو جی چھٹ سب اوس کے آگے کان پکڑتے تھے۔ سرسوتی جس کو ہندو کہتے ہیں آدھ شکتی' اون نے بھی اسی سے کچھ گنگنانا سیکھا تھا۔ اس کے سامنے چھ راگ چھتیس راگنیاں آٹھ پہر روپ بندھوں کا سا دھر کے اس کی سیوا میں ہاتھ جوڑے کھڑی رہتی ہیں۔ وہاں اتیتوں کو یہ کہہ کر پکارتے تھے بھیرو گر بیبھاس گر ہنڈول گر' میگھ ناتھ کیدار ناتھ دیپک داس' جوتی سروپ' سارنگ روپ اور اتیتیاں[5] اس ڈھب سے کہلاتی تھیں گوجری' ٹوڑی' اساوری' گوری' مالسری' بلاول' [illegible] مرگ چھالا پر بیٹھ اوڑائے پھرتا تھا اور نوے لاکھ اتیت گٹکے اپنے اپنے منہ لئے ہوئے گیروے بستر[6] پہنے

۱۔ (ن) تو اچھی [illegible] بھی جھکی تھی، ۳۔ مدد، ۴۔ فقیروں، درویشوں، ۵۔ (ن) اتیتنیں، ۶۔ لباس۔

جتنا بھبھوت اس کے ساتھ ہوتے تھے۔ جس گھڑی راجہ جگت پرکاس کی چٹھی ایک بگولے[1] نے کر پہنچائی ہے جوگی مہندر گر ایک [illegible] کرول بادلوں کو جھنکا دیتا ہے۔ باگھمبر پر بھبھوت اپنے منہ کو مل کچھ کچھ پڑھنت کرتا ہوا باد کے گھوڑے کی پیٹھ پر [illegible] اور سب [illegible] مرگ چھالوں پر بیٹھے ہوئے گٹکے منہ میں لئے ہوئے بول اٹھے "گورکھ جاگا" ایک آنکھ کی جھپک میں وہاں آن پہنچتا ہے جہاں دونوں مہاراجوں میں لڑائی ہو رہی تھی۔ پہلے تو ایک کالی آندھی آئی پھر اولے برسے پھر ایک بڑی آندھی آئی کسی کو اپنی سدھ بدھ نہ رہی ہاتھی گھوڑے اور جتنے لوگ اور بھیڑ بھاڑ راجہ سورج بھان کی تھی کچھ نہ سمجھا گیا کدھر گئی اور انہیں کون اٹھا لے گیا اور راجہ جگت پرکاس کے لوگوں پر اور رانی کیتکی جی کے لوگوں پر کیوڑے کی بوندوں کی ننھی ننھی پھوار سی پڑنے لگی۔ جب یہ سب کچھ ہو چکا تو گروجی نے اپنے اتیتوں سے کہہ دیا اودے بھان سورج بھان، لچھمی باس ان تینوں کو ہرن ہرنی بنا کر کسی بن میں چھوڑ دو اور جو ان کے ساتھی ہوں ان سبھوں کو توڑ پھوڑ دو۔ جیسا کچھ گروجی نے کہا جھٹ پٹ وہی کیا۔ بپت کا مارا کنور اودے بھان جی اور اس کا باپ مہاراجہ سورج بھان اور اس کی مہارانی لچھمی باس ہرن ہرنی بن بن کی ہری ہری گھاس کئی برس تک چگتے رہے اور اس بھیڑ بھڑکے کا تو کچھ ٹھل بیڑا نہ ملا جو کدھر گئی اور کہاں تھی۔ یہاں کی یہاں ہی رہنے دو۔ آگے سنو اب رانی کیتکی کی بات۔ اور مہاراجہ جگت پرکاس کی سنتی[2] ان کے گھر کا گھر گروجی کے پاؤں پر گرا اور سب نے سر جھکا کر مہاراج یہ آپ نے بڑا کام کیا ہم سب کو رکھ لیا جو آپ آج نہ پہنچتے تو کیا رہا تھا سب نے مر مٹنے کی ٹھان لی تھی، ان پاپیوں سے کچھ نہ چلے گی یہ جان لی تھی۔ راج پاٹ سب ہمارا اب نچھاور کر کے جس کو چاہیے دے ڈالئے ہم سب کو اتیت بنا کے اپنے ساتھ لیجیے۔ راج ہم سے نہیں تھمتا، سورج بھان کے ہاتھ سے آپ نے بچایا اب کوئی ان کا چچا چندر بھان چڑھ آویگا تو کیونکر بچنا ہوگا، اپنے آپ میں تو سکت نہیں پھر ایسی راجہ کا پھٹے منہ، ہم کہاں تک آپ کو ستایا کریں گے۔ یہ سن کے جوگی مہندر گر نے کہا تم سب ہمارے بیٹا بیٹی ہو، انندیں کرو دندناؤ سکھ چین سے رہو، ایسا وہ کون ہے جو تمہیں آنکھ بھر اور ڈھب سے دیکھ سکے۔ یہ بگھمبر[3] اور یہ بھبھوت ہم سے تمہیں دیا آ ہے جو کچھ ایسی گاڑ[4] پڑے تو اس بگھمبر میں سے ایک رونگٹا توڑ کر آگ دھر کے پھونک دیجو، رونگٹا پھونکنے نہ پاویگا جو ہم آن پہنچیں گے۔ رہا بھبھوت سو اس لئے ہے جو کوئی چاہے جب اسے انجن [illegible] سب کچھ دیکھ لے اور اسے کوئی نہ دیکھے، جو چاہے کر لے۔ گرو مہندر گر جن کے پانوں پوجئے اور دھن مہاراج کہئے ان سے [illegible] نہیں، مہاراجہ جگت پرکاس ان کو مورچھل کرتے ہوئے رانیوں کے پاس لے گئے۔ سونے روپے کے پھول ہیرے موتی [illegible] سب نے نچھاور کئے اور ماتھے رگڑے۔ انہوں نے سب کی پیٹھیں ٹھونکیں۔ رانی کیتکی نے بھی ڈنڈوت کی پر جی ہی جی میں [illegible] گروجی کو گالیاں دیں گروجی سات دن سات راتیں یہاں رہ کے راجہ جگت پرکاس کو سنگاسن میں بٹھا کر اپنے اس بگھمبر پر اسی [illegible] پر آ دھمکے۔ راجہ جگت پرکاس اپنے اگلے ڈھب سے راج کرنے لگے۔

([illegible] کیتکی کا دن [illegible] کے آگے رونا پچھلی باتوں کا دھیان کر کے ہاتھ جی سے دھو نا اپنی بولی ٹھٹھن میں)

[illegible] ہے کلی تھی ———— کب سوچتی[5] وہ بری[6] بھلی تھی

[illegible] کراہتی تھی ———— جینا اپنا نہ چاہتی تھی

[illegible] بان ———— ہے آٹھ پہر مجھے وہی دھیان

۱۔ بھاگا ہوا [illegible] ۲۔ [illegible] ۳۔ (ن) باگھمبر، شیر کی کھال، ۴۔ سختی، مشکل، ۵۔ (ن) سوجھتی، ۶۔ (ن) کچھ۔

جل پیاس کے بھلا کے ناؤ کہ / " دیکھوں ہوں وہی ہرے ہرے روکھ
بچھ کا ڈر ہے اب یہ کبھی / چاہت کا گھر ہے اب یہ کبھی
امریوں میں ان کا وہ اترنا / وہ رات کا سائیں سائیں کرنا
اور چپکے سے اٹھ کے میرا جانا / اور تیری[1] وہ چاہ کا جتانا
ان کی وہ اتار انگوٹھی لینی / اور اپنی انگوٹھی ان کو دینی
آنکھوں میں میری وہ پھر رہی ہے / جی کا جو روپ تھا وہی ہے
کیوں کر انھیں بھولوں کیا کروں میں / ماں باپ سے کب تلک ڈروں میں
اب میں نے سنا ہے اے مدن بان / بن بن کے ہرن ہوئے اودے بھان
چرتے ہوں گے ہری ہری دوب / کچھ تو بھی پسیج سوچ میں ڈوب
میں اپنی گئی ہوں چوکڑی بھول / مت مجھ کو سونگھا یہ ڈھڈے[2] پھول
پھولوں کو اٹھا کے یہاں سے لے جا / سو ٹکڑے ہوا میرا کلیجا
بکھرے جی کو نہ کر اکٹھا / ایک گھاس کالا کے رکھ دے گٹھا
ہریالی اسی کی دیکھ لوں میں / کچھ اور تو تجھ کو کیا کہوں میں
ان آنکھوں میں ہے بھڑک ہرن کی / پلکیں ہوئیں جیسی گھاس بن کی
جب دیکھیے ڈبڈبا رہی ہیں / اوسیں آنسو کی چھا رہی ہیں

یہ بات جو جی میں گڑ گئی ہے
ایک اوس سی مجھ پہ پڑ گئی ہے

اسی ڈول سے جب اکیلی ہوتی تھی تب مدن بان کے ساتھ ایسے ہی موتی پروتی تھی۔

(بھبوت مانگنا رانی کیتکی کا اپنی ماں رانی کام لتا سے آنکھ مچول کھیلنے کے لئے اور روٹھ رہنا اور راجہ جگت پرکاس کا بلانا اور پیار سے کچھ کچھ کہنا اور وہ بھبوت دینا)

ایک رات رانی کیتکی نے اپنی ماں کام لتا سے بھلاوے میں ڈال کر یہ پوچھا گرو گسائیں مہندر گر نے جو بھبوت باپ کو دیا تھا وہ کہاں رکھا ہوا ہے اور اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس کی ماں نے کہا میں تیری واری تو کیوں پوچھتی ہے۔ رانی کیتکی کہنے لگی آنکھ مچول کھیلنے کے لئے چاہتی ہوں، جب اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیلوں اور چور بنوں تو کوئی مجھ کو پکڑ نہ سکے۔ رانی کام لتا نے کہا وہ کھیلنے کے لئے نہیں ہے ایسے لٹکے کسی برے دن کے سنبھال لینے کو ڈالے رکھتے ہیں۔ کیا جانے کوئی گھڑی کیسی ہے، کیسی نہیں۔ رانی کیتکی اپنی ماں کی اس بات سے اپنا منہ تھتھا کے اٹھ گئی اور دن بھر بن کھائے پیے پڑی رہی مہاراج نے جو بلایا تو کہا مجھے رچ[3] نہیں۔ تب رانی کام لتا بول اٹھی اجی تم نے سنا بھی بیٹی تمھاری آنکھ مچول کھیلنے کے لئے اور بھبوت گرو جی کا دیا ہوا مانگتی تھی، میں نے نہ دیا اور کہا لڑکی یہ لڑکپن کی باتیں اچھی نہیں، کسی برے دن کے لئے گرو جی دے گئے ہیں۔ اسی پر مجھ سے روٹھی ہے، بہتیرا بہلاتی

۱۔ (ن) تیرا۔ ۲۔ شوخ رنگ کے پھول۔ ۳۔ اشتہا

کے ہاتھ کی یہ چٹھی لائی ہوں آپ پڑھ لیجئے آگے سو چاہے سو کیجئے۔ مہاراج نے اسی ملمبر میں سے ایک رونکلا توڑ کر آگ پر دھر دیا۔ بات کی بات میں گسائیں مہندر گر آ پہنچے اور جو کچھ یہ نیا سانگ جوگی اور جوگن کا آیا تھا آنکھوں میں دیکھا۔ سب کو چھاتی سے لگایا اور کہا ملمبر اسی لئے میں سونپ گیا تھا جو تم پر کچھ ہووے تو اس کا ایک رونکلا پھونک دیجو۔ تمہارے گھر کی یہ گت ہو گئی اب تم کیا کر رہے تھے اور کن نیندوں سو رہے تھے۔ یہ تم کیا کرو وہ کھلاڑی جو روپ چاہے سو دیکھاوے، جو ناچ چاہے سو نچاوے، بھبوت لڑکی کو کیا دینا تھا۔ ہرن ہرنی اودے بھان اور سورج بھان اس کے باپ کو اور کچھی باس کو میں نے کیا تھا، میرے آگے تینوں کو ویسے کا تیسا کرنا کچھ بڑی بات نہ تھی۔ اچھا، ہوئی سو ہوئی، اب چلو اٹھو، اپنے راج پر براجو اور بیاہ کا ٹھاٹھ کرو۔ اب تم اپنی بیٹی کو سمیٹو، کنور اودے بھان کو میں نے اپنا بیٹا کیا اور اس کو لے کے میں بیاہنے چڑھوں گا۔ مہاراج یہ سنتے ہی اپنے راج کی گدی پر آ بیٹھے اور اسی گھڑی کہہ دیا سارے چھتوں کو اور کوٹھوں کو گوٹے سے منڈھ لو اور سونے روپے کے روپہلے سنہرے سب جھاڑ اور پہاڑوں پر باندھ دو اور پیڑوں میں موتی کی لڑیاں گوندھو اور کہہ دو چالیس دن چالیس رت تک جس گھر ناچ آٹھ پہر نہ رہے گا اس گھر والے سے میں روٹھ رہوں گا اور جانوں گا یہ میرے دکھ سکھ کا ساتھی نہیں۔ چھ مہینے جد[1] کوئی چلنے والا کہیں نہ ٹھہرے اور رات دن چلا جائے اس ہیر پھیر میں وہ راج سب کہیں تھا، بھی ڈول ہو گیا۔

(جانا مہاراج اور مہارانی اور گسائیں مہندر گر کا رانی کیتکی کے لینے کے لئے۔)

پھر گروجی اور مہاراج اور مہارانی، مدن بان کے ساتھ وہاں آ پہنچے جہاں رانی کیتکی چپ چاپ سن کھینچی بیٹھی تھی۔ گروجی نے رانی کیتکی کو اپنے گود میں لے کر کنور اودے بھان کا چڑھاوا چڑھا دیا اور کہا تم اپنے ماں باپ کے ساتھ اپنے گھر سدھارو اب میں اپنے بیٹے کنور اودے بھان کو لئے آتا ہوں۔ گروجی گسائیں جن کو ڈنڈوت ہے سو تو یوں سدھارتے ہیں آگے جو ہوگی سو کہنے میں آوے گی، یہاں کی یہ دھوم دھام اور پھیلاوا دھیان کیجئے۔ مہاراجہ جگت پرکاس نے اپنے سارے دیس میں کہا یہ پکار دیں جو یہ نہ کرے گا اس کی بری گت ہو گی۔ گانوں میں آمنے سامنے ترپولئے بنا کے سوہے[2] کپڑے ان پر لگا دو اور گوٹ دھنک کی اور گوکھرو روپہلی سنہری اور کرنیں اور ڈانک ٹانک رکھو اور جتنے بڑھ پیپل کے پرانے پیڑ جہاں جہاں ہوں ان پر گوٹوں کے پھولوں کے سہرے ہرے بھرے ایسے جس میں سر سے لگا جڑ تک ان کی ٹھلک اور جھلک پہنچے باندھ دو۔ پودوں نے رنگا کے سوہے جوڑے پہنے، سوہانوں ڈالیوں نے توڑے پہنے۔ بوٹی بوٹی نے پھول پھل کے گہنے، جو بہت نہ تھے تو تھوڑے تھوڑے پہنے، جتنے ڈھڈے ہے اور ہریاول میں لہلہے پات تھے اپنے اپنے ہاتھ میں چھچی مہندی کی چاوٹ سجاوٹ کے ساتھ جتنی سماوٹ میں سما سکی کرلی اور جہاں تک نول[3] بیاہی دلہن ننھی ننھی پھلیوں کے اور سہاگنیں نئی نئی کلیوں کے جوڑے پنکھڑیوں کے پہنے ہوئے تھیں، سب نے اپنی اپنی گود سہاگ پیار کے پھول اور پھلوں سے بھر لی اور تین برس کا پیسا جو لوگ دیا کرتے تھے اس راجہ کے راج بھر میں جس جس ڈھب سے ہو اکھیتی باڑی کر کے، ہل جوت کے اور کپڑا لتا بیچ کھوچ کے، سو سب ان کو چھوڑ دیا۔ اپنے گھروں میں بناؤ کے ٹھاٹھ کریں اور جتنے راج بھر میں کوئیں تھے کھنڈ سالوں کی کھنڈ سالیں لے جا ان میں اونڈیلیں گئیں اور سارے بنوں میں اور پہاڑ تلیوں میں لالٹینوں کی بہار جھم جھماہٹ راتوں کو دکھائی دینے لگی اور جتنی جھیلیں تھیں ان سب میں کسم اور ٹیسو اور ہار سنگار تیر گیا۔ اور کیسری بھی تھوڑی تھوڑی گھولنے میں آ گئی اور پھننگ سے لگا جڑ تک جتنے جھاڑ جھنکاڑوں میں پتے اور پتوں کے بندھے چھوٹے تھے ان میں روپہلے سنہرے ڈانک گوند لگا کر چپکا دیئے اور کہہ دیا گیا جو سوہی پگڑی اور سوہے باگے بن کوئی کسی ڈول روپ سے نہ پھرے چلے اور جتنے گوئیے نچوئیے[4] بھانڈ بھگتیے ڈھاڑی رام جن دھاڑی اور سنگیت ناچتے ہوئے ہوں سب کو کہہ دیا، جن جن گانوں میں جہاں جہاں ہوں اپنے اپنے ٹھکانوں سے نکل

۱ جب۔ ۲ لال۔ ۳ نئی۔ ۴ (ن) نچنے۔

[illegible] سے پھر آکر گاتے بجاتے دھوم میں چہتے چہتے گھر آتے ہیں۔

(ڈھونڈھنا گوسائیں مہندر گر کو کنور اودے بھان اور اس کے ماں باپ کو اور نہ پانا اور بہت سا تلملانا اور راجہ اندر کا اس کی [illegible] کے آنا)

یہاں کی بات اور چہلیں جو کچھ ہیں سو یہیں رہنے دو اب آگے یہ سنو جو گی مہندر گر اور اس کے نو لاکھ اتتوں نے سارے بن کے بن چھان مارے کہیں کنور اودے بھان اور اس کے ماں باپ کا ٹھکانا نہ لگا تب انھوں نے راجہ اندر کو چٹھی لکھ بھیجی۔ اس چٹھی میں یہ لکھا ہوا تھا۔ ان تینوں جنوں کو میں نے ہرن اور ہرنی کر ڈالا تھا اب ان کو ڈھونڈھتا پھرتا ہوں کہیں نہیں ملتے اور میری جتنی سکت تھی اپنے سی کر چکا ہوں اور اب میرے منہ سے نکلا کنور اودے بھان میرا بیٹا اور میں اس کا باپ۔ سسرال میں سب بیاہ کے ٹھاٹھ ہو رہے ہیں اب مجھ پر نپٹ گاڑھ[1] ہے جو تم سے ہو سکے سو کرو۔ راجہ اندر گرو مہندر گر کے دیکھنے کو سب اندر راسن[2] سمیت آپ آن پہنچا ہے اور کہتا ہے جیسا آپ کا بیٹا ویسا[3] میرا بیٹا۔ آپ کے ساتھ میں۔ سارے اندر لوک کو سمیٹ کے کنور اودے بھان کو بیاہنے چڑھوں گا۔ گسائیں مہندر گر نے راجہ اندر سے کہا ہماری آپ کی ایک ہی بات ہے پر کچھ ایسی سو جھائیے جس میں وہ اودے بھان ہاتھ آویں یہاں جتنے گویے اور گائنیں ہیں اب کو سب کو ساتھ لے کے ہم اور آپ سارے بنوں میں پھریں کہیں نہ کہیں ٹھکانا لگ جائے گا۔

(ہرن اور ہرنیوں کے کھیل کا بگڑنا اور نئے سر سے کنور اودے بھان کا روپ پکڑنا)

ایک رات راجہ اندر اور گسائیں مہندر گر نکھری ہوئی چاندنی میں بیٹھے راگ سن رہے تھے کروڑوں ہرن آس پاس[4] ان کے راگ کے دھیان میں چوکڑی بھولے سر جھکائے کھڑے تھے۔ اس میں راجہ اندر نے کہا سب ہرنوں پر پڑھ کے میری سنگت کے بھگت بھر و منتر ایسری[5] باچا' ایک ایک چھینٹا پانی کا دو۔ کیا جانے وہ پانی کیا تھا پانی کے چھینٹے کے ساتھ ہی کنور اودے بھان اور ان کے ماں باپ تینوں جنے ہرنوں کا روپ چھوڑ کر جیسے تھے ویسے ہو جاتے ہیں۔ مہندر گر اور راجہ اندر ان تینوں کو گلے لگاتے ہیں اور پاس اپنے بڑی آؤ بھگت سے بٹھاتے ہیں اور وہی پانی کا گھڑا اپنے لوگوں کو دے کر وہاں پہنچوا[6] دیتے ہیں جہاں سر منڈواتے ہی اولے پڑے تھے۔ راجہ اندر کے لوگ جو پانی کے چھینٹے وہی ایسری باچ پڑھ کے دیتے ہیں جو جو مر گئے تھے سب اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور جو جو ادھ موئے ہو کے بھاگ بچے تھے سب سمٹ آتے ہیں۔ راجہ اندر اور مہندر گر کنور اودے بھان اور راجہ سورج بھان اور رانی لچھمی باس کو لے کر ایک اڑن کھٹولے پر بیٹھ کر بڑی دھوم دھام سے ان کے[7] اپنے راج پر بیٹھا کر بیاہ کے ٹھاٹھ کرتے ہیں' پنسیریوں ہیرے موتی ان سب پر نچھاور ہوتے ہیں۔ راجہ سورج بھان اور اودے بھان اور ان کی ماں رانی لچھمی باس چت چاہی آس پا کر پھولے اپنے آپ میں نہیں سماتے اور سارے اپنے راج کو یہی کہتے جاتے ہیں جو نرے[8] بھونرے کے منہ کھول دو اور جس جس کو جو جو اکت[9] سوجھے بول دو۔ آج کے دن [illegible] اور کون سا دن ہو گا ہماری آنکھوں کی پتلیوں کا جس سے چین ہے۔ اس لاڈلے اکلوتے کا بیاہ اور ہم تینوں کا ہرنوں کے روپ سے نکل کر پھر راج پر بیٹھنا۔ پہلے تو یہ چاہیے جن جن کی بیٹیاں بن بیاہیاں کنواریاں بالیاں ہوں ان سب کو اتنا کر دو کہ جو اپنی جس جس چاؤ [illegible] اپنی اپنی گڑیاں سنوار کے اٹھاویں اور جب تک جیتی رہیں ہمارے یہاں سے کھلیا پیا کیا رہیں دعا کریں اور

۱۔ مشکل ۲۔ اندر کا تخت [illegible] ۳۔ (ن) ویسا ۴۔ (ن) آن ۵۔ (ن) ایسر باچ
۶۔ (ن) [illegible] ۷۔ (ن) [illegible] ۸۔ [illegible] ۹۔ مشکل

سب راج بھر کی بیٹیاں سدا سہاگنیں بنی رہیں اور سوہے بالے جھٹ کبھی کوئی کچھ نہ پہنا کریں اور سونے روپے کے کواڑ کنگا جتنی سب گھروں میں لگ جائیں۔ سب کوٹھوں کے ماتھوں پر کیسر اور چندن کے ٹیکے لگے ہوں اور جتنے پہاڑ ہمارے دیس میں ہوں اتنے اتنے ہی روپے سونے کے پہاڑ آمنے سامنے کھڑے ہو جائیں اور سب ڈالکوں کی چوٹیاں موتیوں کی مالک سے بن مانگے بھر جائیں اور پھولوں کے گہنے اور بندن واروں سے سب جھاڑ پہاڑ لدے پھندے رہیں اور اس راج سے لگا اس راج تک ادھر میں چھت سے باندھ دو چپا چپا کہیں نہ رہے جہاں بھیڑ بھیڑ کا دھوم دھڑکا نہ ہونا چاہیے۔ پھول اتنے بہت سارے کھنڈ جائیں جو ندیاں جیسی بیچ بیچ پھول کی کتیاں ہیں یہ سمجھا جائے۔ اور یہ دول کر دو جدھر سے دولھا کو بیاہنے چڑھیں سب لاڑی اور ہیرے اور پکھراج ادھر ادھر کنول کی نٹیاں بن جائیں اور کیاریاں سی ہو جائیں، جن کے بیچوں بیچ سے ہو نکلیں اور کوئی ڈانگ اور پہاڑ تلی کا اتار چڑھاؤ ایسا دکھائی نہ دے جس کی گود پکھروٹوں اور پھول پھلوں سے بھری بھتولی نہ ہو۔

(راجہ اندر کا ٹھاٹھ کرنا اودے بھان کے بیاہنے کیلئے)

راجہ اندر نے کہہ دیا وہ رنڈیاں چلبلیاں جو اپنے مدھ میں چڑچلیاں ہیں ان سے کہہ دو سولہ سنگار بال بال گج موتی پرو دو، اپنے اپنے اچرج اور اچنبھے کے اڑن کھٹولوں کے اس راج سے اس راج تک ادھر میں چھت سی باندھ دو، پر کچھ ایسے روپ سے اڑو چلو جو اڑن کھٹولوں کی کیاریاں اور پھلواریاں سی سیکڑوں کوس تک ہو جائیں اور اوپر ہی اوپر مرونگ، بین جلترنگ، منہ چنگ، گھونگھروت، تبلے کٹ مال اور سیکڑوں اس ڈھب کے انوکھے باجے بجتے آئیں اور ان کیاریوں کے بیچ میں ہیرے پکھراج ان بندھے موتیوں کے جھاڑ اور لال ٹینوں کی بھیڑ بھاڑ کی جھم جھماہٹ دکھائی دے اور انھیں لال ٹینوں میں سے ہتھول، پھلجھڑیاں جاہی، جوہیاں، کدم، گیندا، چنبیلی اس ڈھب سے چھوٹے کہ دیکھتوں کی چھاتیوں کے کواڑ کھل جائیں اور پٹاخے جو اچھل اچھل کے پھوٹیں ان میں سے ہنسی سپاری اور بولتے پکھروٹے ڈھل ڈھل پڑیں اور جب تم سب کو ہنسی آوے تو چاہیے اس ہنسی کے ساتھ موتی کی لڑیاں جھڑیں جو سب کے سب ان کو چن چن کے راج رلے ہو جاویں چاؤ دکھاؤ۔ ٹھڈیاں کپکپاؤ اور ناک بھویں تان تان بھاؤ بتاؤ، کوئی پھوٹ کر رہنہ جاؤ۔ ایسا بھاؤ جو لاکھوں برس میں ہوتا ہے، جو جو راجہ اندر نے اپنے منہ سے نکالا تھا آنکھ کے جھپک کے ساتھ وہی ہونے لگا اور جو کچھ ان دونوں مہاراجوں نے ادھر ادھر کہہ دیا تھا سب کچھ اسی روپ سے ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔ جس بیاہنے کی یہ کچھ پھیلاوٹ اور جماوٹ اور رچاوٹ اوپر تلے اس جمگھٹے کے ساتھ ہو کہ اس کا اور کچھ پھیلاوا کیا کچھ ہوگا یہ دھیان کر لو۔

(ٹھاٹھ گسائیں مہندر گر کا)

جب کنور اودے بھان اس روپ سے بیاہنے چڑھے اور وہ بامھن جو اندھیری کوٹھری میں موندا ہوا تھا اس کو بھی ساتھ لے لیا اور بہت سے ہاتھ جوڑے اور کہا بامھن دیوتا ہمارے کہنے سننے پر نہ جاؤ، تمھاری جو ریت ہوتی چلی آئے ہے بتاتے چلو۔ ایک اڑن کھٹولے پر وہ بھی ریت بتانے کو ساتھ ہوا۔ راجہ اندر اور گسائیں مہندر گر ایراوت [3] ہاتھی پر جھومتے جھامتے دیکھتے بھالتے سارا اکھاڑا لئے چلے جاتے تھے۔ راجہ سورج بھان دولھے کے گھوڑے کے ساتھ مالا جپتا ہوا پیدل تھا۔ اتنے میں ایک سناٹا ہوا سب گھبرا گئے۔ اس سناٹے میں ... جو مرگ چھالوں اور ... پر آ پہنچے، انھوں [4] کے جیوں میں جتنی امنگیں چھا رہی تھیں وہ چوگنی پچگنی ہو گئیں۔ سکھپال ... پر اور رتھوں پر جتنی رانیاں مہارانی بھی باس کے پیچھے چلی جاتی تھیں سب کو گدگدیاں سی ہونے لگیں۔

---

۱ صبر۔ ۲ [illegible] ۳ اندر کے ہاتھی کا نام۔ ۴ (ان) لوگوں۔

اس میں کہیں بھرتری کا سانگ آیا' کہیں رُج وگی بے پل آ کھڑے ہوئے' کہیں مہادیو جی اور پاربتی جی دکھائی پڑے' کہیں گورکھ جاگے' کہیں مچھندر ناتھ بھاگے' کہیں مچھ' کہیں کچھ' کہیں براہ' سنکھ ہوئے' کہیں پرسرام کہیں باون روپ کہیں ہرناکس اور نرسنگھ' کہیں رام لچھمن سیتا سامنے آئے' کہیں راون اور لنکا کا بکھیڑا سارے کا سارا دکھائی دینے لگا' کہیں کنہیا جی کا جنم اشٹمی ہونا اور باسدیو کا گوکل لے جانا اور ان کا اس روپ سے بڑھ چلنا اور گائیں چرانی اور مورلی بجانی اور گوپیوں سے دھومیں مچانی اور رادھکا اور اس کہانی کا بس کر لینا' جمنی بٹ' چیر گھاٹ' بندرابن' کریل کی کنج' بندرابن سیوا کنج برسانے اور اس کنہیا سے جو جو کچھ ہوا تھا' سب کا سب جیوں کا تیوں آنکھوں میں آنا اور دوارکا میں جانا اور وہیں سونے کے گھر بنانا اور پھر برج کو نہ آنا اور سولہ سو گوپیوں کا تلملانا سامنے آگیا۔ ان گوپیوں میں سے اودھو کا ہاتھ پکڑ کر ایک گوپی کے اس کہنے نے سب کو رلا دیا جو اس ڈھب سے بول کے روندھے ہوئے جی کو کھولتی تھی۔

کبت

جب چھانڑ کریل کی کنجن کون ہری دوارکا جیوماں جائے بسے

کلدھوت[1] کے دھام بنائے گھنے مہراجن کے مہاراج بھئے

تج مور مکٹ اور کامریا[2] کچھو اور ہی ناتے جور لئے

دھرے روپ نئے کئے نیہہ نئے اور گیاں چرائیو بھول گئے

اچھا پنا گھاٹوں کا

جتنے گھاٹ دونوں راج کی ندیوں میں تھے پکی چاندی کے تھکے سے ہو کر لوگوں کو ہکا بکا کر رہے تھے۔ نواڑے' بھولئے' بجرے' لچکے' مور پنکھی' سونا مکھی' سیام سندر' رام سندر اور جتنی ڈھب کی ناویں تھیں ستھرے روپ سے سجی سجائی' کسی کسائی سو سو لچکیں کھاتیاں آتیاں جاتیاں لہراتیاں پڑی پھرتیاں تھیں۔ ان سب پر یہی گویئے کنچنیاں' رام جنیاں' ڈومنیاں' کھچا کھچ بھری اپنے اپنے کرتب میں ناچتی' گاتی' بجاتی' کودتی پھاندتی' دھومیں مچاتیاں' انگڑائیاں جمائیاں' انگلیاں نچاتیاں اور ڈھلی پھرتیاں تھیں اور کوئی ناؤ ایسی نہ تھی جو سونے روپے کے پتروں سے منڈی ہوئی اور اساوری[3] سے ڈھکی ہوئی نہ ہو اور بہت سی ناؤں پر ہنڈولے بھی اسی ڈھب کے' ان پر گائنیں بیٹھی جھولتی ہوئی سوہلے' کدارے اور باگیری کا نبھڑے میں گا رہیں تھیں۔ دل بادل ایسے نواڑوں کے سب جھیلوں میں بھی چھا رہے تھے۔

(آ پہنچنا کنور اودے بھان کا بیاہنے کے ٹھاٹھ کے ساتھ دلہن کی ڈیوڑھی پر)

اس دھوم دھام کے ساتھ کنور اودے بھان سہرا باندھے جب دلہن کے گھر آن پہنچا اور جو ریتیں ان کے گھرانے میں ہوتی چلی آتیاں تھیں ہونے لگیاں' مدن بان رانی کیتکی سے ٹھٹھولی کر کے بولی "اب سکھ سمیٹئے بھر بھر جھولی' سر نہوڑائے کیا بیٹھی ہو۔ آؤنہ ٹک ہم تم مل کے جھروکوں سے انھیں جھانکیں۔" رانی کیتکی نے کہا "ایسی نچلی باتیں ہم سے نہ کر' ایسی ہمیں کیا پڑی جو اس گھڑی ایسی کڑی جھیل کر ریل پیل میں انھیں" اور تیل پھلیل میں بھری ہوئی ان کے جھانکنے کو جا کھڑی ہوں۔ مدن بان اس رکھائی کو اوڑن گھائی کے اٹھیوں میں کر بولی۔ دوہے اپنی بولی میں۔

---

[1] (ن) کل دھوت۔ [2] (ن) کمبلی) [3] ریشمی کپڑا۔ [4] (ن) اس اٹھن (سر اٹھانا رانی کیتکی کے جوبن کا)۔

دوہا

یوں تو دیکھو واچھڑے جی واچھڑے
ہم سے اب آنے لگی ہیں آپ یوں مہرے کڑے
چھان مارے بن کے بن تھے آپ نے جن کے لئے
وہ ہرن جو بن کے مدہ میں ہیں بنے دودلہ کھڑے
تم نہ جاؤ دیکھنے کو جو انھیں' کچھ بات ہے
جھانکتے اس دھیان میں ہیں ان کو سب چھوٹے بڑے
ہے کہاوت "جی کو بھاوے یوں ہی پر منڈیا ہلائے"
لے چلیں گے آپ کو ہم ہیں اسی دھن پر اڑے
سانس ٹھنڈی بھر کے رانی کیتکی بولی کہ سچ
سب تو اچھا کچھ ہوا پر اب بکھیڑے میں پڑے

(واری پھیری ہونا مدن بان کا رانی کیتکی پر اور اس کی باس کا سونگھنا اور اینڈے پن سے اونگھنا)

اس گھڑی کچھ مدن بان کو رانی کیتکی کے مانجھے کا جوڑا اور بھینا بھینا پن اور انگھڑیوں کا لجانا اور بکھرا بکھرا جانا بھلا لگ گیا تو رانی کیتکی کی باس سونگھنے لگی اور اپنی آنکھوں کو ایسا کر لیا جیسے کوئی انگھنی لگتی ہے سر سے لگا پانوں تک واری پھیری ہو کے تلوے سہلانے لگی' رانی کیتکی جھٹ سے دھیمے سے ہنس کے لپکے کے ساتھ اٹھی۔ مدن بولی میرے ہاتھ کے ٹھوکے سے وہ ہی پانوں کا چھالا ٹھ گیا ہوگا جو ہرنوں کی ڈھونڈ ڈھونڈھ میں پڑ گیا تھا۔ ایسی دکھتی چٹکی کی چوٹ سے مسوس کہ رانی کیتکی نے کہا کانٹا اڑا تو اڑا اور چھالا پڑا تو پڑا پر نگوڑی تو کیوں میرا اینچھالا ہوئی۔

(سراہنا رانی کیتکی کے جوبن کا)

رانی کیتکی کا بھلا لگنا پڑھنے سے باہر ہے۔ وہ دونوں بھوؤں کی کھچاوٹ اور پتلیوں میں لاج کی سماوٹ اور نکیلی پلکوں کے لوشاہٹ اور ہنسی کی لگاوٹ 'دنتڑیوں میں مسیوں کے اوراہٹ اور اتنی سی رکاوٹ سے ناک اور تیوری چڑھا لینا اور سہیلیوں کو گالیاں دینا اور چل نکلنا اور ہرنیوں[1] کے روپ سے کرچھالیں[2] مار پرے او چھلنا کچھ کہنے میں نہیں آتا۔

(سراھنا کنور جی کے جوبن کا)

[3]کنور اودے بھان کے اوتھے پن میں کچھ چل نکلنا کسی سے ہو نہ سکے۔ ہائے رے! ان کی اوبھار کے دنوں کا سہانا پن اور چال [illegible] کا پھبن پھبن اٹھتی ہوئی کونپل کی پھبن اور مکھڑے کا گدر لیا ہوا جوبن جیسے بڑے تڑکے ہرے بھرے پہاڑوں کی گود سورج کی کرنیں [illegible] روپ تھا ان کی بھیگتی مسوں سے رس کا ٹپکا پڑنا اور اپنی پرچھائیں دیکھ کر اکڑنا' جہاں تہاں چھانہہ اس کا ڈول ٹھیک [illegible] پانوں تلے جیسے دھوپ تھی۔

---

[1] (ن) [illegible] کہنا [illegible] حسن ،

(دولہا اودے بھان کا سنگھاسن پر بیٹھنا)

دولہا اودے بھان سنگھاسن پر بیٹھا اِدھر اُدھر راجہ اندر اور جوگی مہندر گر جم گئے۔ دولہ کا باپ اپنے بیٹے کے پیچھے مالا لئے کچھ کچھ گنگنانے لگا اور ناچ لگا ہونے اور ادھر میں جو اوڑن کھٹولے اندر کے اکھاڑے کے تھے سب کے سب اس روپ سے چھت باندھے ہوئے تھرکا کئے۔ مہارانیاں دونوں سمدھنیں آپس میں ملیاں جلیاں اور دیکھنے والے کو کوٹھوں پر چندن کے کواڑوں کے تڑکوں میں آ لگیاں۔ سانگ سنگیت بھنڈ تال رہس[1] ہونے لگا۔ جتنے راگ اور راگنیاں تھیں یمن کلیان، جھنجھوٹی، کانڑا، کھماچ، سوہنی، بہاگ، سوہرٹ، کالنگڑا، بھیرویں، کھٹ للت، بھیروں روپ پکڑے ہوئے سچ مچ کے جیسے گانے والے ہوتے ہیں اسی روپ سے اپنے اپنے سمے پر گانے لگے اور گانے لگیاں۔ اس ناچ کا جو بھاؤ تاؤ رچاوٹ کے ساتھ ہو اکس کا منہ جو کہہ سکے، جتنے وہاں کے سکھ چین کے گھر تھے مادھو بلاس، رس دھام، کشن نواس، مچھی بھون، چندر بھون سب کے سب لپے سے لپٹی[2] اور سچے موتیوں کے جھالریں اپنی اپنی گانٹھ میں سمیٹے ہوئے ایک پھبن کے ساتھ متوالوں کے روپ سے جھوم جھوم[3] بیٹھنے والوں کے منہ چوم رہے تھے۔ بیچوں بیچ ان سب گھروں کے ایک آرسی[4] دھام بنایا تھا۔ جس کی چھت اور لواڑ اور آنگن میں آرسی چھت لکڑی اینٹ پتھر کے پٹ، ایک انگلی کے پور ے بھر نہ تھی۔ جالی[5] کا جوڑا پہنے ہوئے چودھویں رات جب گھڑی چھ ایک رہ گئی، تب رانی کیتکی سی دولہن کو اس آرسی بھون میں بیٹھا کر دولہ کو بلا بھیجا۔ کنور اودے بھان کنہیا بنا ہوا سر پر مکٹ دھرے سہرا باندھے اسی تڑاوے[6] اور جمگھٹ کے ساتھ چاند سا مکھڑا لئے جا پہنچا۔ جس جس ڈھب سے باہمن اور پنڈت کہتے گئے اور جو مہاراجوں میں ریتیں چلی آتیاں تھیں اسی ڈول سے اسی روپ سے بھونری گٹھ جوڑا سب کچھ ہو لیا۔

دوہے اپنی بولی کے

اب اودے بھان اور رانی کیتکی دونوں ملے
آس کے جو پھول کملائے ہوئے تھے پھر کھلے
چین ہوتا ہی نہ تھا جس ایک کو اس ایک بن
رہنے سہنے سو لگے آپس میں اپنے رات دن
اے کھلاڑی یہ بہت تھا کچھ نہیں تھوڑا ہوا
آن کر آپس میں جو دونوں کا گٹھ جوڑا ہوا
چاہ کے ڈوبے ہوئے اے میرے داتا سب تریں
دن پھرے جیسے انھوں کے ایسے اپنے دن پھریں

وے اوڑن کھٹولے والیاں جو ادھر میں چھت باندھے تھرک رہی تھیں بھر بھر جھولیاں اور مٹھیاں ہیرے اور موتیوں سے نچھاور کرنے کے لئے اوتر آئیاں اور اوڑن کھٹولے جوں کے توں ادھر میں چھت باندھے ہوئے کھڑے رہے۔ دولہ دولہن پر سے ساتھ ساتھ واری پھیرے ہوتے ہیں پس پس گیان اور ان سبھوں کو ایک ہنسی سی لگ گئی۔ راجہ اندر نے دلہن کی منہ دیکھائی میں ایک ہیرے کا اکڈال چھپر کھٹ اور ایک پیڑھی پکھراج کی دی اور ایک پارجات کا پودھا جس سے جو مانگئے سو ہی ملے، دلھن کے سامنے لگا دیا اور ایک کام دھینو گائے کی پٹھیا بھی اس کے نیچے باندھ دی اور اکیس لونڈیاں انھیں اوڑن کھٹولے والیوں سے چن کے اچھی سے اچھی ستھری گاتی بجاتیاں، [illegible] پرو چتیاں، سگھڑے سگھڑے سونپیں اور انھیں کہہ دیا "رانی کیتکی چھٹ ان کے دولہ سے کچھ بات

۱ ملسی ڈل گئی۔ [illegible] [illegible](ن) جام۔ ۴ آئینہ خانہ۔ ۵ (ن) چاندنی۔ ۶ مورو نمائش۔

چھٹ سندر کیو، تمھارے کان پہلے سے مروڑے دیتا ہوں، تمھیں تو سب کی سب پتھر کی مورتیں بن جاؤ گی اور اپنا کیا آپ پاؤ گی۔ اور گسائیں مہندر گر جی نے باون تولے پاؤ رتی جو سنتے ہیں اس کے ایکس ٹکے آگے رکھ کے کہا یہ بھی ایک کھیل ہے جب چاہیے تو بہت سا تانبا گلا کے ایک اتنی سی اس کی چھوڑ دیجے گا کنچن ہو جائے گا۔ اور جوگی نے یہ سبھوں سے کہہ دیا جو لوگ ان کے بیاہ میں جاگے ہیں ان کے گھروں میں چالیس دن رات سونے کی ٹڑیوں کے روپ میں ہن برسیں اور جب تک جئیں کسی بات کو پھر نہ ترسیں۔ نو لاکھ ننانوے گائیں سونے روپے کی سنگوتیوں کی، جڑاؤ گہنا پہنے ہوئے، گھنگرو، جھنجھناتیاں، باہمنوں کو دان ہوئیں اور سات برس کا پیسا سارے راج کو چھوڑ دیا۔ بائیس سے ہاتھی اور چھتیس سے اونٹ لدے ہوئے روپوں کے لٹا دیے۔ کوئی اس بھیڑ بھاڑ میں دونوں راج کا رہنے والا ایسا نہ رہا جس کو گھوڑا جوڑا، روپوں کا توڑا، سونے کی جڑاؤ کڑوں کی جوڑی نہ ملی ہو اور مدن بان چھٹ دولہ دلہن پاس کسی کا ہیاؤ نہ تھا جو بن بلائے چلی جائے، بن بلائے دوڑی آئے تو وہی آئے اور ہنسا دے تو وہی ہنسا دے۔ رانی کیتکی کے چھیڑنے کو ان کے کنور اودے بھان کو کنور کنور جی کہہ کے پکارتی تھی اور اسی بات کو سو سو روپ سے سنوارتی تھی۔

دوہے اپنی بولی کے

گھر بسا جس رات انھوں نے کا تب مدن بان اس گھڑی
کہہ گئی دولہ دلہن کو ایسی سو باتیں کڑی
باس پا کر کیوڑے کی کیتکی کا جی کھلا
سچ ہے ان دونوں جنوں کو اب کسی کی کیا پڑی
کیا نہ آئی لاج کچھ اپنے پرائے کی اجی
تھی ابھی اس بات کی ایسی ابھی کیا ہڑبڑی

(دلہن نے اپنے گھونگھٹ سے کہا)

جی میں آتا ہے تیرے ہونٹوں کو مل ڈالوں ابھی
مل بے اے رنڈی ترے دانتوں کی مسی کی دھڑی

طوطا کہانی

حیدر بخش حیدری

۱۸۰۱ء

سینتیسویں داستان۔ عاشق ہونا ایک بادشاہ کا روم کی شہزادی پر اور
حکم قتل دینا اس کے لڑکے کا

ایک بادشاہ روم کی بادشاہت کے قریب رہتا تھا۔ اتفاقاً ایک دن اُس کے وزیر نے کہا۔ "اے جہاں پناہ! روم کا بادشاہ ایک خوبصورت لڑکی رکھتا ہے کہ،

عجب طرح کا نور ہے جاں فزا
کہ مہ جس کے ہو روبرو تھک رہا

اگر وہ بیٹی اپنی جناب عالم پناہ کو بیاہ دے تو کیا خوب۔" بادشاہ نے اس سخن وزیر کو نہایت پسند کیا اور ایک ایلچی کے ساتھ مع سوغات اس لڑکی کی طلب کا پیغام روم کے بادشاہ کو بھیجا۔ جس وقت نامہ بر نے یہ پیغام اس بادشاہ سے کہا تو بادشاہ سن کر ایلچی پر خفا ہوا اور کہنے لگا۔ "اے نامہ بر! تیرے بادشاہ نے مجھ کو کیا سمجھا جو اس ڈھب کا پیغام بھیجا۔ اگر میں اپنی بات پر آتا ہوں تو اس کی سلطنت خاک میں ملاتا ہوں۔ تجھے کیا کہوں۔ [illegible] سامنے سے۔ بہتر یہی ہے کہ پھر ادھر منہ نہ کرنا خبردار۔ خیر اسی میں ہے۔" وہ بیچارا اس کی خفگی سے تھرا گیا اور وہاں سے نا امید [illegible]

اسے غصہ میں دیکھ وہ ڈر گیا
کہے تو کہ جیتے ہی جی مر گیا

[illegible] کر [illegible] بادشاہ کے پاس آیا اور وہاں کی واردات بیان کی یہ بات بادشاہ کو نہایت ناگوار معلوم ہوئی۔ اسی گھڑی فوج [illegible] کے ملک کو آن کی آن میں تاخت و تاراج کیا۔ جب وہ تنگ آیا۔ ناچار اپنی لڑکی بیاہ دی۔

غرض [illegible] کر اپنے شہر کو گیا اور اس سے عیش و عشرت کرنے لگا۔ بعد کئی دنوں کے شہزادی اپنے بیٹے کی جدائی سے [illegible] آتی تھی۔ سبب قرار ہوئی اور روئی۔

آخر اس کے بعد یہ بات اپنے جی میں ٹھیرائی کہ کسی بہانہ سے اس کو اپنے پاس بلوائیے۔ اس خیال میں رہتی تھی کہ اتنے میں بادشاہ نے اپنا ایک نہایت بیش قیمت ڈبہ کہ جواہر سے بھرا ہوا تھا دیا۔ تب بادشاہ سے کہنے لگی کہ آپ نے سنا ہوگا کہ میرے باپ کے پاس ایک ایسا غلام حقند ہے کہ جواہر کی خوب شناخت کرتا ہے اور اچھا برا بتلا دیتا ہے۔ بادشاہ نے کہا "اگر اس غلام کو تیرے باپ سے مانگوں تو وہ مجھے دے یا نہ دے؟"

اس نے کہا کہ بابا جان نے اس کو بچپن سے فرزند کی طرح پرورش کیا ہے۔ اگر تم اس کی تمنا رکھتے ہو اور اسے بلوانا منظور ہے تو ایک سوداگر میں اپنی طرف سے بھیجوں اور کچھ اپنی نشانی بھی دوں اور بہتری کا امیدوار اس لڑکے کو کر دوں۔ تو شاید وہ انکار نہ کریں۔ بادشاہ نے ایک سوداگر کو اس سبب سے تجارت کے لئے روم کی طرف بھیجا۔ جس وقت وہ تاجر بموجب بادشاہ کے فرمان کے اپنا مال واسباب لے کر روم کی طرف چلا۔ اس وقت شاہزادی بادشاہ سے چھپ کر سوداگر سے بولی "اے سوداگر وہ لڑکا غلام نہیں۔ بلکہ میرا بیٹا ہے۔ اور ایک خط میرا دینا اور بادشاہ روم سے یہ پیغام کہو کہ وہ لڑکے کی جدائی سے نہایت مغموم ہے۔ یہاں سے غلام کے نام کے ساتھ اس کو بھیج دیجئے۔ جب وہ تیرے ساتھ آوے۔ بخوبی لے آئیو۔ مگر یہ پردہ نہ کھولیو۔"

آخر کار وہ سوداگر گیا۔ اور کتنے دنوں کے بعد اس لڑکے کو لے آیا۔ اور بادشاہ کے حوالہ کیا۔ بادشاہ نے جو اس لڑکے کو خوبصورت اور ہنرمند پایا۔ تو نہایت خوش ہوا اور اس تاجر کو ایک خلعت عمدہ بخشا۔ اور اس غلام کو اپنے پاس رکھا۔ اور ماں اس کو روبرو سے دیکھ لیتی۔ اور سلام و پیام کے ساتھ اپنا جی خوش کرتی۔

اتفاقاً ایک دن بادشاہ شکار کھیلنے گیا۔ شہزادی نے فرصت پا کر اس لڑکے کو محل میں بلوایا اور اپنے گلے لگایا۔ اور اس کا سر منہ چوما۔ اور گذشتہ جدائی کا غم اس سے کہا۔

یہ خبر پہرہ داروں نے اسی گھڑی بادشاہ کو پہنچائی کہ آج شہزادی نے جہاں پناہ کے پیچھے اس غلام کو محل میں طلب کیا۔ اور اپنے برابر بٹھایا ہے۔ یہ خبر وحشت اثر سنتے ہی بادشاہ نہایت آزردہ ہوا۔ اور کہنے لگا۔ ایسی عورت سے ڈریئے۔ کہ یہ ڈیوڑھی پر دیوار بناتی ہے۔ کیسا مکر کر کے اپنے یار کو روم سے بلایا ہے۔ اللہ رے۔ کلیجہ! پھر آپ جلد شکار گاہ سے محل میں داخل ہوا۔ اور کرسی جواہر نگار پر متفکر ہو کر بیٹھ گیا۔ اس حالت میں شاہزادی نے بادشاہ کو دیکھا تو دریافت کیا۔ کہ آج مزاج مبارک ناساز معلوم ہوتا ہے۔ کیا سبب ہے؟

تب بادشاہ نے کہا "کیا خوب تم اپنے معشوق کو روم سے بلوا کر ہم بستر ہو اور مجھ سے بیوفائی کرو۔ کیا شوخی اور بے شرمی ہے" چاہتا تھا کہ اسے ہلاک کرے تا پر عاشق معشوق کو کب مار سکے۔ پھر اپنے جی میں کہنے لگا کہ بی بی کے بدلے غلام کو مارے۔

یہ ٹھیرا کر ایک جلاد کو اشارہ کیا۔ اور کہا کہ اسی گھڑی اس کے سر کو جدا کیا جائے۔ یہ سنتے ہی اس لڑکے کو جلاد نے پکڑا اور قتل گاہ میں بٹھا کر پوچھا کہ اے اجل گرفتہ تو یہ نہ جانتا تھا کہ یہ بادشاہ کی بیگم ہے۔ اس سے دوستی کرونگا تو کیونکر بچوں گا۔ اور تیر اقدم کیونکر بڑھا جو تو محل شاہی میں گیا۔ اس نے کہا کہ تو ایسی بات نہ کر۔ وہ میری سگی ماں ہے۔ جب میرا باپ مرا تو اس نے اسے اپنا شوہر کیا۔ اور مارے شرم کے احوال اس سے نہ کہا۔ میں جھوٹ نہ کہوں گا۔ مار دیا چھوڑ دو۔ بیت۔

قابو میں ہوں میں تیرے گو اب بچا تو پھر کیا
خنجر تلے کسی نے اک دم لیا تو پھر کیا

اس بات کو سنتے ہی جلاد کو رحم آیا اور اس کے قتل کا ارادہ فسخ کیا۔ اور اپنے جی میں کہنے لگا کہ اگر یہ بات بادشاہ پر کھلی کہ یہ اس کا بیٹا ہے۔ اور شہزادی کی خاطر اس نے اس لڑکے کو مجھ سے طلب کیا۔ اور میں اس کو اس کے پاس جیتا نہ پہنچاؤں گا۔ تو میں بھی اسی طرح دوسرے کے ہاتھ سے مارا جاؤں گا۔ اس اندیشہ کو دل میں جگہ دے کر بادشاہ سے عرض کی۔ "جہاں پناہ اس کشتنی کو وہاں جا کر ماروں گا۔ جہاں پرندے کا نام بھی نہ ہو۔"

غرض اس بہانے سے وہ اس کو بادشاہ سے لے کر اپنے گھر گیا۔ اور چھپا رکھا۔ اور بعد دو دن کے بادشاہ کی جناب میں آکر عرض کی۔ "عالم پناہ سلامت اس کا سر قدم مبارک پر نثار ہوا۔" بارے اس بات کے سنتے ہی تھوڑی سی آتش غضب بادشاہ کی ٹھنڈی ہوئی مگر شہزادی کا کلیجہ اٹھ گیا۔ اور اس کی کوکھ میں اور بھی محبت کی آگ بھڑک اٹھی۔ میر حسن۔

کلیجہ تڑپ وہ تو بس رہ گئی
کلی کی طرح سے کس رہ گئی

بے اختیار وہ رو کر اپنے جی میں کہنے لگی کہ یہ کیا ہوا۔ ادھر بیٹا جدا ہوا ادھر خاوند چھوٹا۔ قضائے کار ایک دن ایک بڑھیا نے جو اس کے محل میں رہتی تھی اس سے پوچھا کہ اے بی بی اس جوانی پر یہ غم کس کا کھاتی ہے جو اس طرح سے آٹھ آٹھ آنسو روتی ہے اور منہ ڈھانکے آٹھوں پہر مسند پر پڑی رہتی ہے؟" تب شاہزادی نے سارا احوال اس سے کہا کہ یہ ماجرا مجھ پر گزرا ہے۔ یہ سن کر اس نے عرض کی۔ "اے شہزادی تو خاطر جمع رکھ۔ میں ایک بہانہ سے تیرے بادشاہ کو تجھ پر مہربان کروں گی۔ اور محل میں لے آؤں گی۔" شہزادی نے کہا۔ "اے مادر مہربان! اگر اس درد کی دوا کرے گی۔ تو میں تیرے دامن اور جیب کو جواہرات سے بھر دوں گی۔"

آخر کار ایک دن اس پیر زال نے بادشاہ کو تنہا دیکھ کر پوچھا۔ "اے شہنشاہ! میں تجھے اور دنوں سے کچھ آجکل متفکر دیکھتی ہوں۔ میں واری جاؤں خیر تو ہے۔" بیت

تجھے خوش رکھے میرا پروردگار
تیری اس جوانی پہ بڑھیا نثار

بادشاہ نے کہا۔ کہ اے اماں نیک بخت میں وہ درد بے درماں رکھتا ہوں۔ کہ جس کا بیان نہیں کر سکتا۔ چنانچہ وہ درد یہ ہے کہ شاہزادی نے روم سے اس غلام کو بلایا کہ جس پر وہ عاشق تھی۔ اور میں نے اسے قتل کیا۔ پر شاہزادی کو مار نہیں سکتا۔ کیونکہ خدا جانے یہ بات جھوٹ ہے یا سچ ہے۔ اور وہ میری معشوقہ ہے۔ اگر بے تقصیر مار ڈالوں۔ اور پھر جھوٹ نکلے۔ تو بدنامی ہو۔ اور جی کی بے قراری اس کے علاوہ ہو۔ یہ عقدہ باعث دل تنگی کا ہے۔

یہ بات سنتے ہی وہ پیر زال کہنے لگی۔ کہ بادشاہ سلامت! تم اس بات کا کچھ فکر مت کرو۔ میرے پاس ایک تعویذ ہے۔ کہ اس کو جس کسی کی چھاتی پر رکھ دے۔ وہ اپنے دل کا سب احوال خود بخود کہہ دے سو وہ نقش میں تمہیں لکھ دیتی ہوں۔ تم اس کے سینہ پر دھر دیکھو۔ اس کے جی میں جو ہو گا۔ سو سب حال آپ سے کہہ دے گی۔

بادشاہ نے کہا۔ "وہ تعویذ جلد لا۔" بڑھیا نے اسی وقت وہ تعویذ بادشاہ کو لا دیا۔ اور آپ شہزادی کے پاس جا کہا۔ آج تو سر شام سے جھوٹ موٹ سو رہیو۔ جب بادشاہ تیری چھاتی پر تعویذ رکھے۔ تو اس وقت سوتوں کی طرح سے جو تیرا احوال ٹھیک ٹھیک ہو سو وہ بخوبی کہہ

دیا۔ حاصل کلام جب پہر رات گزر گئی۔ بادشاہ نے اس وقت نقش کو شہزادی کے سینے پر جو رکھا وہیں اس نے اپنے پہلے خاوند کا حال اور اس کے لڑکے کا احوال یک بیک کہہ دیا۔ بادشاہ نے جو یہ بات سنی اسے جگا کر نہایت مہربانی کی۔ اور سینے سے لگا کر شہزادی سے کہا کہ جانی! کس واسطے یہ راز مجھ سے پہلے ہی نہ کہا۔ وہ گھبرا کر بولی "میں نے کونسی بات چھپائی ہے۔ بادشاہ نے کہا۔ وہ تیرا سگا بیٹا تو نے غلام کیوں بنایا" تب اس نے آنکھیں نیچی کر کے عرض کی۔ کہ مجھ کو شرم معلوم ہوتی تھی۔ کیونکر کہتی یہ سنتے ہی بادشاہ نے اسی گھڑی جلاد کو بلا کر کہا کہ بہت جلد اس لڑکے کو میرے پاس لے آؤ۔ اور اگر مار ڈالا ہے تو اس کی قبر کہاں ہے۔ بتلا"؟ اس نے کہا کہ جہاں پناہ! میں نے اسے تاحال نہیں مارا ہے۔ وہ خدا کے فضل سے جیتا جاگتا ہے۔ اور موجود ہے۔ یہ سنتے ہی بادشاہ نہایت خوش ہوا۔ اور اسی وقت لڑکے کو بلوا کر اس کی والدہ کے حوالہ کیا۔ اور اس ناامید نے لڑکے کو گود میں لے کر درگاہ الٰہی میں سجدہ شکر ادا کیا۔

آرائش محفل

حیدر بخش حیدری

(۱۸۰۱ء)

(حاتم کا کوہِ ندا کی خبر لانا)

صبح کو حاتم نے حمام کیا' کپڑے پہنے حسن بانو کی ڈیوڑھی پر آیا چوبداروں نے خبر کی کہ حاتم آیا ہے۔ اس نے پردہ کے اندر بلایا اور ایک کرسی پر بٹھا کر کہا۔ اے حاتم سننے میں یوں آیا ہے کہ ایک پہاڑ سے ندا' آتی ہے اس لئے اس کا نام کوہِ ندا رکھا ہے اب خبر لا کہ وہاں آواز کرنے والا کون ہے اور پہاڑ کے اوپر کیا اسرار ہے۔ حاتم یہ سن کر وہاں سے رخصت ہوا اور کاروان سرا میں منیر شامی سے کہا کہ اب میں کوہِ ندا کی خبر لینے جاتا ہوں۔ اگر زندگی نے وفا کی تو اس بات کی تحقیق کر کے پھر تجھ سے ملتا ہوں۔ ورنہ مرضی خدا کی۔ تم کسی بات کا خطرہ نہ کرنا۔ غرض حاتم نے دو چار باتیں نصیحت آمیز منیر شامی سے کہہ کر جنگل کی راہ لی۔ جس بستی میں جاتا ان سے پوچھتا کہ اے عزیزو اگر تم میں سے کوئی کوہِ ندا کی راہ سے واقف ہے تو مجھے بتا دے۔ یہ بات سن کر لوگ حیران ہوتے اور کہتے کہ اتنی عمر ہوئی ہم نے نام بھی نہیں سنا۔ جوانمرد بن دیکھے راہ طے کرتا چلا جاتا تھا۔ ایک مہینے کے بعد کسی شہر کے نواح میں جا پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ مزدور اس شہر کے صحرا میں جمع ہوئے ہیں۔ یہ انہیں کی طرف چلا۔ انہوں نے جو دیکھا کہ ایک شخص چلا آتا ہے وہ سب کے سب اس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے۔ مرحبا خوب آیا تو کہاں تھا۔ ہم تیرے منتظر ہیں۔ حاتم آگے گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک دستر خوان پر طرح طرح کے کھانے چنے ہیں اور ایک جنازے کے گرد بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔ حیران ہو کر پوچھنے لگا کہ اس مردے کو کیوں نہیں گاڑتے اور اس قدر کیوں روتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہماری قوم کی یہ رسم ہے کہ کوئی شخص کیا امیر کیا غریب' مر جاوے تو ہم اس کے جنازے کو جنگل میں لے آتے ہیں اور کھانے بہت سے ستھرے پکا کر ایک دستر خوان پر چن کے مسافر کی راہ دیکھتے ہیں۔ اگر کوئی مسافر اس عرصے میں آیا مردے کو گاڑ دیتے ہیں اور کھانا مسافر کو کھلا دیتے ہیں۔ سات روز ہوئے یہ مردہ اسی طرح پڑا ہے کوئی اب تک نہیں آیا۔ ہم عجیب مصیبت میں گرفتار تھے کہ ہر روز کھانا شام کے وقت عورتوں کو بھیج دیتے تھے اور آپ یوں ہی پڑے رہتے تھے۔ الحمد للہ سات روز کے بعد تیری صورت دیکھی اب دفن کر لیں گے۔ حاتم نے کہا اگر مہینہ بھر تک کوئی مسافر یہاں نہ آوے تو اس مردے کا کیا حال ہو اور تم کس صورت سے جیو۔ انہوں نے کہا ساتویں روز مسافر بالضرور آتا ہے۔ اگر پندرہ روز تک نہ آئے تو تمام دن روزہ رکھ کر شام کے وقت پانی پئیں اور ایک مردہ ایک ماہ تک نہیں سڑتا۔ حاتم نے کہا اگر اس سے زیادہ مدت گذرے اس وقت کیا کرو گے۔ وہ بولے ایسا ہو تو مردے کو دفن کریں اور تمام مرد و زن چھ ماہ تک روزہ رکھیں۔ شام کو توبہ کریں اور روزہ افطار کریں اور بہت سی خیرات کریں۔ تب اپنے کام میں مشغول ہوں۔ یہ سن کر حاتم حیران ہوا اور انہوں نے اس مردے کو تہ خانہ اتار کر فرش بچھا کر اس پر رکھا اور طرح طرح کے کھانے اور خوشبو کی بتیاں روشن کر کے سات پیالے اس کے گرد پھر کر قد معکوس ہو کر باہر نکل آئے اور دستر خوان پر جا بیٹھے۔ پھر حاتم سے کہا کہ اے مسافر پہلے کھانے میں تو ہاتھ ڈال اور پیٹ بھر کر کھا۔ یہ قبول ہو اور تیری توجہ سے ہم بھی روزہ کھولیں۔" یہ سن کر حاتم کھانے لگا اور سب بھی شریک

طعام ہوئے۔ اس کے بعد جو بچا ہر ایک نے اپنے اپنے گھر بھجوا دیا اور ان کی عورتوں نے کھالیا۔ پھر وہ نہائے اور کپڑے پاکیزہ پہن کر چلے اور حاتم سے کہا "اے جوان اگر تیرا جی چاہے تو چند روز اور ہمارے گھر مہمان رہ۔" حاتم نے کہا "بہت بہتر۔ تمہاری خاطر اور دو چار روز رہ سکتا ہوں۔"

غرض وہ اس کو شہر میں لے گئے اور ایک مکان ستھرا سا اس کے رہنے کو خالی کر دیا اور خورد و نوش کے لوازم خوبصورت لونڈیوں سمیت بھجوا دیئے۔ حاتم نے اپنے دل میں کہا کہ یہاں کی عجیب رسم ہے۔ اگر میں ان کاموں سے فراغت پاؤں اور خدا میرا مطلب پورا کرے تو میں بھی اپنے شہر میں جا کر اسی طرح مہمانداری کروں اور وہ عورتیں آرزومند تھیں کہ اس جوان کا جی ہم میں سے جس کو چاہے اس سے بشوق تمام ملے اور شراب وصل خوب پئے۔ لیکن حاتم نے کسی طرف خواہش کی نظر سے بھی نہیں دیکھا۔ جب سات روز گذر گئے تب ان عورتوں نے اپنے سرداروں سے حاتم کی نیک ذاتی اور نیک نیتی کی خبر دی۔ حاکم شہر نے اس کو روبرو بلوایا اور عزت و حرمت سے مسند پر بٹھایا اور کہا کہ اگر شہر میں بود و باش اختیار کرو تو عین مہربانی ہے اور میں بھی اپنی بیٹی تیری خدمت میں دوں۔ حاتم نے کہا کہ مجھ کو ایک ضروری کام درپیش ہے اس سبب سے ناچار ہوں نہیں تو رہتا۔ یہ سن کر اس نے کہا کہ اگر ہم بھی اس کام سے مطلع ہوں تو تیری رفاقت کریں۔

حاتم نے التماس کیا کہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی میرے ساتھ تکلیف کھینچے۔ وہ بولا کہ اے جوان اگر ساتھ نہیں لیتا تو اتنا کہہ دے کہ وہ ایسا کام کیا ہے؟ حاتم نے کہا کہ "ایک عورت حسن بانو نامی سات سوال رکھتی ہے جو کوئی اس کا بخوبی جواب دے وہ اپنا نکاح اس کے ساتھ کرے۔ حاصل یہ کہ شہزادہ منیر شامی اس پر عاشق ہوا ہے' نہ جدائی کی طاقت رکھتا ہے نہ وصال کی قدرت' اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اس کے سوال پورے کرے مگر اس کے فراق میں جنگل میں روتا پھرتا ہے۔ اتفاقاً ایک دن مجھ سے ملاقات ہوئی میں نے جو اس کو بحال تباہ آہیں بھرتا دیکھا نہایت غمگین ہوا بلکہ رو دیا۔ آخر کار میں تاب نہ لا سکا برائے خدا اس کے لئے مسافرت اختیار کی۔ خدا کے فضل سے اس کے چار سوال پورے کر چکا ہوں۔ اب پانچویں سوال کی باری ہے اور وہ یہ ہے کہ کوہ ندا کی خبر لانا چاہئے اس تلاش میں چھ ماہ گذر گئے۔ جس سے پوچھتا ہوں کوئی نہیں بتاتا۔ اگر تجھ کو خبر ہو تو بتا۔"

یہ بات سن کر اس دیرینہ سال سے نے کہا "میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ دکھن کی طرف طلسمات ہے اور بائیں طرف شہر عالیشان آباد ہے وہاں آج تک کسی نے مردہ نہیں دیکھا نہ قبر دیکھی اور نہ کوئی کسی کو روتا ہے۔" یہ ماجرا سن کر حاتم نے کہا "مجھے اس سمت جانا ہے۔" وہ بولا "اے عزیز سنی ہوئی راہ کیسے طے کر سکتا ہے؟" حاتم نے کہا جو مجھے یہاں لایا ہے وہ وہاں بھی پہنچائے گا۔ اس سخن کو سن کر اس دیرینہ سال نے بہت سا زر و جواہر اس کے سامنے رکھ دیا۔ حاتم نے اس میں سے خرچ راہ کے موافق لیا اور باقی فقیروں کو دے کر اسی طرف کا راستہ لیا۔ ایک مدت کے بعد ایک شہر کے قریب جا پہنچا اور اس کے گرد و پیش کوئی قبر نہ دیکھی' جانا کہ وہ شہر یہی ہے۔ اندر گیا وہاں کے رہنے والوں نے پوچھا کہ اے جوان تو کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا۔ حاتم نے کہا شاہ آباد سے آیا ہوں اور کوہ ندا کو جاؤں گا۔ انہوں نے کہا کوہ ندا کا راستہ یہاں سے بہت دور ہے تو نہ جا سکے گا۔ اس نے جواب دیا کہ جو مجھ کو یہاں لایا ہے وہ کریم کارساز وہاں بھی پہنچائے گا۔ پھر انہوں نے کہا کہ تو آج کی رات یہیں رہ جا' ہمارا قول دلیا قبول کر۔ حاتم یہ بات سن کر ٹھہر گیا۔ وہاں ایک آدمی کئی دنوں سے بیمار تھا اس کے وارثوں نے لوگ جمع کر کے اسے ذبح کر کے آپس میں گوشت بانٹ لیا اور یہ شخص جس نے حاتم کو مہمان رکھا تھا اپنا حصہ پکا کر پانی کا ایک کوزہ دو چار روٹیاں حاتم کے پاس شام کے وقت لے آیا اور کہنے لگا کہ اے مسافر اس کو کھا۔ حاتم کھاتے ہی کہنے لگا کہ میں نے کبھی ایسا گوشت نہیں کھایا۔ اس نے کہا البتہ تو نے جانوروں کا گوشت کھایا ہوگا۔ لیکن یہ آدمی کا ہے ایسا نہ کھایا ہوگا۔ حاتم نے کہا کہ تم آدم خور ہو تم سے ڈرنا چاہیے۔ شاید کسی مسافر کو تم نے مارا ہو گا اس کا گوشت کھا رہے ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہارا یہی قاعدہ ہے کہ جو مسافر بھولا بھٹکا یہاں آ نکلتا ہے تم اس کو ذبح کر کے گوشت بانٹ کر کھا لیتے ہو۔ وہ بولا "اے مسافر توبہ کر خدا سے ڈر مسافروں کو مار کر ہم نہیں کھاتے۔" حاتم نے کہا "یہ تو طرفہ ماجرا ہے کہ آپ ہی تو کہتا ہے کہ گوشت آدمی کا ہے پھر کوئی ہم جنس کو ذبح کر کے نہیں کھاتا مگر غیر کو۔" اس شخص نے جواب دیا "تو غلط سمجھا ہے ہمارے ملک یہ رسم ہے کہ جو کوئی بیمار پڑتا ہے اس کے قبیلے کے لوگ اس کو ذبح کر کے آپس میں گوشت کے حصے کر لیتے ہیں۔ چنانچہ اس سبب سے سارے شہر میں اپنی

موت سے کوئی نہیں مرتا اور نہ قبر بنتی ہے۔" اس ماجرے کو سن کر حاتم نے کہا "لعنت خدا کی تمہاری ایسی رسم پر اور تمہارے شہر پر۔ خدائے کریم اکثر بیماروں کو اچھا کرتا ہے اور اچھوں کو مار ڈالتا ہے۔ پس جو بیمار ہو تم اس کو ذبح کر کے کھا جاؤ۔ یہ فعل کس قوم میں درست ہے۔ یہ کیا ظلم ہے۔ اس حرکت سے سب کے سب گنہگار ہوتے ہیں اور ہزاروں خون تمہاری گردن پر ہوتے ہیں۔ تمہارا کچھ علاج نہیں۔" یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا اور جنگل کی راہ لی۔ دور جا کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک شیر مارے بھوک کے زمین پر تڑپ رہا ہے۔ یہ حالت دریافت کر کے اس نے ہرن کو شکار کیا اور شیر کے آگے ڈال دیا۔ اس نے بخوبی تمام پیٹ بھر کر کھایا اور سجدہ شکر ادا کر کے جنگل کی راہ لی اور حاتم نے بھی کچھ کباب کر کے کھائے۔ ایک پرانے تالاب پر جا کر پانی پیا اور درگاہ الٰہی میں سجدہ شکر ادا کر کے آگے راستہ لیا۔ جب کسی جنگل میں میوہ و دانہ پاتا اسی طرح شکار کر کے گوشت کھاتا۔

چند روز کے بعد ایک آبادی نظر آئی اس کی طرف چلا۔ جب قریب پہنچا کیا دیکھتا ہے کہ بہت سے لوگ میدان میں آگ جلا کر اس کے گرد کھڑے ہیں۔ اس نے بڑھ کر پوچھا کہ اے یارو یہ کون سا ملک ہے اور تم کون ہو۔ اس جگہ اتنی لکڑی جمع کر کے آگ کیوں جلائی ہے؟ انہوں نے کہا اے فقیر تو اپنی راہ لے۔ تجھے اس کے دریافت کرنے سے کیا حاصل۔ یہاں کچھ رسوائی نہیں ہوتی جو ہم تجھے کہہ دیں ہماری قوم سے جو ایک شخص مر گیا ہے اس کی جورو اس کے ساتھ جلتی ہے۔ حاتم نے کہا اے یارو تم اس مردے کو زمین میں کیوں نہیں گاڑ دیتے اور اس عورت کو جیتے جی کیوں جلاتے ہو۔ انہوں نے کہا اے عزیز معلوم ہوا کہ تو یہاں کا رہنے والا نہیں۔ یہ ملک ہندوستان ہے یہاں کی یہی رسم ہے۔ حاتم نے کہا یہ رسم نہایت بد ہے۔ یہ کہہ کر وہاں سے رخصت ہوا اور کسی گاؤں میں جا پہنچا۔ ایک شخص سے پانی مانگا۔ وہ ایک کٹورہ دودھ کا اور ایک میٹھے پانی کا لایا اور کہا ان دونوں میں سے جسے جی چاہے اسے پی لے۔ حاتم نے دونوں پیالے پئے۔ پھر کہا اے مسافر اس وقت میرے گھر میں اچھے خوشبودار باس متی کے چاول پکے ہیں بلکہ تیار دھرے ہیں۔ اگر تو کہے تو وہ بھی لے آؤں' اس کے ساتھ کھانا نہایت مزہ پائے گا۔ حاتم بولا کہ نیکی کا پوچھنا کیا ہے۔ دل میں اس کی ہمت پر آفرین کرنے لگا۔

غرض وہ ہندو ایک تھالی میں مٹھائی اور ایک میں چاول لے آیا۔ حاتم نے بخوبی کھایا اور رات کی رات اسی گاؤں میں بسر کی۔ صبح ہوتے ہی اس ہندو کی جورو نے آکر رسوئی کی تیاری کی اور کہا کچھ اس میں سے کھاؤ اور دو چار دن یہیں رہو تا کہ راہ ماندگی دور ہو۔ یہ بات سن کر حاتم نے ان سے کہا کہ ہمت آفرین ہے۔ یہ بات سن کر انہوں نے نہایت عجز و نیاز سے کہا۔ "ہم سے تمہاری خدمت کب ہوئی یہ کھانا معمولی لڑکوں کا موجود تھا وہی ہم بے تکلف لے آئے ہیں۔ اگر دو تین روز یہاں رہو تو البتہ ہم اپنے مقدور کے موافق کچھ خدمت بجا لائیں گے۔" حاتم کے واسطے ایک پلنگ تکلف سے بچھایا اور اس کے آگے فرش بھی صاف ستھرا کر دیا۔ پھر اقسام اقسام کے کھانے پکوا کر اس کے سامنے رکھ دئے اور کہا اس میں سے کچھ نوش جان فرمایئے تو عین احسان و مہربانی ہے۔ حاتم نے تو ایسے کھانے کبھی نہ کھائے تھے ان کو کھا کر بہت محظوظ ہوا اور بہت تحسین و آفرین کر کے کہنے لگا کہ یہ ہندوستان عجب گلستان ہے مگر یہاں کی رسم بد ہے کہ زندہ عورتوں کو موئے خصم کے ساتھ جلاتے ہیں۔ اس کو سن کر انہوں نے کہا چونکہ زن و شوہر باہم الفت رکھتے ہیں۔ تب کہ آپس میں عاشق و معشوق ہوتے ہیں۔ اس لئے حیف ہے کہ خاوند مرے اور جورو جیتی رہے۔ ہم بزور نہیں جلاتے وہ اپنی خوشی سے آپ جلتی ہے۔

اتفاقاً وہاں کا رئیس بیمار ہو کر دو چار ہی دن میں مر گیا۔ اس کی چار جورو تھیں اور پہلی بیوی سے ایک لڑکا بھی تھا۔ جب اس کی ارتھی بنا کر چلے تب وہ چاروں کمخواب کے لہنگے پہن کر لال تاش کی ساریاں باندھ کر گہنے پاتے سے آراستہ ہو کر پھولوں کے ہار گلے میں ڈال کر بالوں کو بکھیر کر ساتھ ہو لیں۔ قبیلے والے لوگ ان کے پاؤں پر گر پڑے کہ تم بھری پری ہو۔ تم کو جلنا مناسب نہیں۔ انہوں نے کسی کا کہنا نہ مانا۔ تب حاتم ان کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ اے بیبیو تمہیں شرم نہیں آتی جو اپنے گھر سے نکل کر نامحرموں میں آتی ہو اور ایک مردے کے ساتھ جلا چاہتی ہو۔ وہ ہنس کر کہنے لگیں کہ اے جوان تجھے ہمیں دیکھنے سے حیا نہیں آتی۔ ہم تو مردے ہیں ہم کو تیرے پردے کی خبر نہیں۔ کیونکہ وہ کونسا دن تھا جو ہم نے اس مردے کے ساتھ عیش و آرام کیا تھا۔ اب جو وہ مر گیا ہے تو ہم اس سے جدا ہوں اور جیتی رہیں۔ یہ محبت سے اور مروت سے

دور ہے۔ اس کے سوا تمام عمر آتش غم میں جلنا پڑے گا۔ اس سے بہتر ہے کہ ہم اس کے ساتھ ہی جل بجھیں جو تمام عمر کے غم سے چھوٹیں گے۔ پر میشور جانے کیونکر اس بات سے جی ڈرتا ہے کہ کہیں شیطان اپنے مکر سے وسوسہ نہ ڈالے کہ جن کے سبب اپنے سوامی کو بھول کر کسی طرف بد نظر رکھیں اور اس نے اپنی رنڈ گی پر لعنت کی ہے۔ غرض انہوں نے حاتم کا کہنا نہ مانا اور دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر دیکھتی بھالتی وہاں تک پہنچیں۔ پھر اس مردے کو چتا میں رکھ کر اور آپ ہنستی ہوئی آئیں کسی نے اس کا سر زانو پر رکھا اور کسی نے پاؤں گود میں لیے۔ یکایک چتا کو آگ لگا دی۔ تب حاتم نے جانا کہ یہ س آگ سے ڈر کر بھاگ اٹھیں گی۔ گمان غلط ہوا اور ہنسی خوشی اس کے ساتھ جل کر راکھ ہو گئیں۔ حاتم یہ احوال دیکھ کر گھبرایا اور افسوس کرنے لگا جب وہ اپنے اپنے گھروں کو چلے تب حاتم بھی ہندوؤں کے ساتھ آیا۔ اس نے کہا یہ عورتیں اپنی خوشی سے جلتی ہیں۔ کوئی ان پر زبردستی نہیں کرتا اور محبت کی شرط یہی ہے۔ حاتم نے کہا یہ سچ ہے اور وفاداری کا بھی یہی طریقہ ہے۔

غرضیکہ کئی روز کے بعد حاتم نے پھر کہا کہ اے یارو مجھے کوہ ندا کی طرف جانا ہے رخصت کرو۔ یہ بات سن کر ہندوؤں نے کہا کہ اے جوان کوہ ندا یہاں سے بہت دور ہے تو نہ پہنچ سکے گا۔ حاتم نے پھر کہا اے عزیز مجھے رخصت کرو۔ یہ کہہ کر گاؤں گاؤں ملک ملک کی سیر کرتا ہوا اتر کی طرف پہنچا۔ ایک شہر دکھائی دیا جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ بہت سے لوگ جمع ہیں اور شور و غل کرتے ہیں۔ اس نے جا کر پوچھا اے یارو شور و غل کا کیا سبب ہے۔ کسی نے کہا۔ "یہاں کے رئیس کی بیٹی مر گئی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اس کے خاوند کو اس کے ساتھ جیتا گاڑ دیں۔ وہ اس بات کو قبول نہیں کرتا اسی واسطے یہ شور و غل ہے۔"

حاتم نے کہا۔ "تمہارا رئیس کہاں ہے؟ مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں اس سے کچھ کہوں گا۔" یہ بات سن کر وہ اس کو اپنے سردار کے پاس لے گئے۔

حاتم نے ان کو دیکھتے ہی کہا کہ "اے بزرگ تمہاری کیا رسم ہے جو جیتے کو مردے کے ساتھ گاڑتے ہو اور اس پر یہ غضب کہ وہ غریب راضی نہیں۔ اس پر زبردستی کرتے ہو اور خدا سے نہیں ڈرتے ہو۔"

سردار نے کہا۔ "اے عزیز یہ جوان بھی تیری طرح مسافر اس شہر میں وارد ہوا تھا چند روز یہاں رہ کر میری بیٹی کو چاہنے لگا اور فوراً ہم لوگوں میں مل گیا۔ اس شہر کا دستور ہے کہ جب تک لڑکا یا لڑکی اپنی جوانی پر نہیں آتا تب تک ہم لوگ اپنی رغبت سے نہیں بیاہتے۔ جب تک کہ آپس میں عشق و محبت کی حد سے گذر جائے۔ یہاں تک کہ ہر ایک اپنی خوشی سے اقرار کرے کہ جو کوئی ہم میں سے مر جاوے تو اس کے ساتھ دوسرا گڑے گا۔ تب ہم دونوں کو بیاہ دیتے ہیں۔ چنانچہ یہ جوان بھی رسم سے آگاہ ہو کر اس لڑکی پر عاشق ہوا تھا جب محبت کامل دیکھی تب اس کے ساتھ دفن کرتے ہیں یہ کیا نا انصاف امر ہے کہ ایک مدت تک چاچن کرتا رہا اور اس کے باغ جوانی سے گل مراد لوٹتا رہا۔ اب جو مر گئی تو یہ اپنی خوشی سے اس کے ساتھ نہیں گڑتا اور اپنے اقرار پر ثابت قدم نہیں رہتا تمہی بتاؤ کس کا قصور ہے ہم زبردستی کسی کو نہیں گاڑتے۔ اگر اس کو باندھ کر قبر میں رکھ دیں تو البتہ ظلم ہے۔ تو ہی پوچھ کہ اپنے قول سے یہ کیوں پھرتا ہے۔"

یہ بات سن کر حاتم اس کے پاس گیا اور کہنے لگا۔ "اے جوان! تو کس لئے اپنے کہنے پر عمل نہیں کرتا۔ کب تک جئے گا آخر مرنا ہے۔ بہتر ہے کہ جو کچھ کہا اس پر ثابت قدم رہ۔"

اس نے کہا "اے جوان تو بھی انہیں میں مل گیا۔ اپنے شہر کا دستور کیوں نہیں بیان کرتا؟"

حاتم نے کہا۔ "میں کیا کہوں تو آپ ہی اقرار کر چکا ہے اب پھرنے سے تجھے شرم نہیں آتی؟"

اس نے کہا "یہ مجھ سے کبھی نہ ہو گا جو میں ان کا کہا مانوں اور جیتے جی مردے کے ساتھ گڑوں۔"

حاتم نے معلوم کیا کہ یہ سب کے سب بے گاڑے نہ رہیں گے اور یہ بھی اپنی خوشی سے نہ گڑے گا۔ اس بات کا لحاظ کر کے اپنی بولی میں کہا "تو خاطر جمع رکھ میں تجھے رات کو نکال لوں گا پر اب ان کے سامنے گڑ۔"

اس نے کہا "میں تیرے نکالنے تک کیونکر زندہ ہوں گا؟"

حاتم نے تسلی کر کے لوگوں سے کہا کہ "یارو! یہ اجل گرفتہ اپنی بولی میں کہتا ہے کہ ہمارے شہر کا یہ دستور ہے کہ قبر حجرے کے طور پر بناتے ہیں۔ اگر تم بھی اسی طرح سے بناؤ گے تو میں اپنی خوشی سے گڑوں گا۔" اس سخن کو سن کر وہ کہنے لگے کہ یہ بات حاکم سے تعلق رکھتی ہے ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ جو وہ کہے گا وہی کریں گے۔

حاتم ان سبھوں کو ان کے حاکم کے پاس لے گیا اور کہنے لگا "خداوند یہ شخص گڑنے پر راضی نہیں اور کہتا ہے کہ جس طرح میرے ملک میں قبر بنتی ہے اگر اس ڈھب کی قبر بناؤ گے تو میں قبول کروں گا۔"

حاکم نے کہا "کس طرح کی بنتی ہے؟"

حاتم نے کہا "حضرت سلامت! کوٹھڑی کی طرح بہت بڑی کہ جس میں دس بیس آدمی اچھی طرح لیٹ جائیں۔"

یہ بات حاتم کی زبان سے سنتے ہی حاکم نے کہا "جس طرح یہ کہے، موجب اس کے کہنے کے کرو۔"

یہ سن کر وہ لوگ پھر آئے اور ایک قبر ایسی ہی بنوائی تب حاتم نے لوگوں کی آنکھ بچا کر اس سے کہا کہ اندیشہ نہ کر وقت شب تجھے نکال لوں گا۔ وہ اس کلمہ سے راضی ہوا اور لوگوں سے کہنے لگا "اے یارو اب دیر نہ کرو کہ جو تم چاہتے ہو مجھے قبول ہے۔"

آخر انہوں نے ان دونوں کو گاڑ دیا اور ایک پتھر سے اس کے منہ کو بند کر کے مع حاتم شہر کو گئے۔ پھر اس کی مہمانداری کی اور ایک مکان ستھرا اسے رہنے کو دیا۔ حاتم پھر رات ہونے کا منتظر تھا کہ کسی طرح اس شخص کو قبر سے باہر نکالے۔ جب رات ہوئی اور گھر والے سو رہے حاتم اپنے بچھونے پر سے اٹھا اور اس گور کی طرف چلا۔ اس ملک کا یہ دستور تھا کہ تین روز تک مردہ کی قبر پر ان کے وارث تمام رات جا کر جاگا کرتے تھے اور گھر نہ آتے تھے...... چنانچہ اسی سبب سے حاتم کو قابو نہ چلا چوتھے روز حاتم اس گور پر گیا اور وہ شخص جو اس میں دفن تھا حاتم کو بہت سخت سست کہہ رہا تھا۔ الغرض حاتم نے پکارا وہ نہ بولا۔ جانا کہ شاید مر گیا۔ پھر پکارا کہ اے جوان میں تجھے نکالنے آیا ہوں۔ اس نے جواب نہ دیا۔ حاتم نے پھر پکارا۔ پھر بھی نہ بولا حاتم کو یقین ہو گیا کہ بے شک مر گیا۔ کمال افسوس ہوا اور بے اختیار رونے لگا۔ چوتھی بار آواز بلند پکارا۔ "اے جوان اگر جیتا ہے تو جواب دے ورنہ میں اپنا وعدہ وفا کر چکا۔ تو قیامت تک یہیں رہے گا۔"

وہ یکایک چونک پڑا اور نابدان کے پاس آکر کہنے لگا "اے شخص تو کون ہے؟"

حاتم نے جو اس کی آواز سنی سجدہ شکر بجا لایا اور کہا کہ "میں وہی ہوں جو تجھ سے وعدہ کر گیا تھا۔" یہ کہہ کر خنجر سے قبر کھود کر نکالا اور بعد ایک ساعت کے کھانا کھلا کر کہا کہ اب جدھر تیرا منہ اٹھے چلا جا۔ اس نے کہا کہ میرے پاس خرچ نہیں۔ حاتم نے کئی درہم دے کر رخصت کیا اور اس قبر کو درست کر کے اپنی جگہ پر آ کر سو رہا۔

صبح کو اٹھ کر لوگوں سے کہا کہ کوہ ندا کا راستہ بتاؤ میں جاؤں انہوں نے کہا جاؤ یہاں سے قریب ہے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک دوراہا ملے گا اگر داہنی طرف جائے گا تو منزل مقصود کو پہنچے گا۔ حاتم ان سے رخصت ہوا اور دس روز تک رات دن چلا کیا۔ بعد طے منازل گیارھویں اسی دوراہے پر جا پہنچا اور ان کی نصیحت کو بھول کر بائیں طرف جا نکلا حیف ہے کہ جس راہ کو انہوں نے منع کیا تھا اسی پر جا پہنچا اور دو دن کے بعد کیا دیکھتا ہے کہ تمام جانور درندے کیا گزندے بھاگے ہوئے چلے آتے ہیں۔ یہ ایک کونے میں کھڑا ہو کر دیکھنے لگا کہ شاید کوئی درندہ پیچھے پڑا ہے جو اپنا جی چھوڑے گرتے پڑتے چلے آتے ہیں۔ یہ سمجھ کر درخت پر چڑھ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ بڑے بڑے ہاتھی اور گینڈے بھی گھبرائے ہوئے بے اختیار دوڑے چلے آتے ہیں اور ان کے پیچھے ایک چھوٹا سا جانور مہیب صورت چراغ سی آنکھیں سر پر دم چھتر کئے ہوئے چلا آتا ہے۔ حاتم ڈرا کہ کوئی بلائے عظیم ہے کہ جس کے ڈر سے اتنے بڑے جانور درندے بھاگے چلے آتے ہیں میں غریب کس شمار میں ہوں۔ مستعد ہو کر خنجر نکال لیا۔ اتفاقاً وہ جانور اسی درخت کے نیچے آیا اور آدمی کی بو پاتے ہی غرا غرا کر اچھلا۔ حاتم نے ایک خنجر ایسا مارا کہ دونوں ہاتھ قلم ہو گئے۔ گر پڑا اور پھر سنبھل کر نہایت غضب سے لپکا۔ حاتم نے پھر اس کے پیٹ میں ایک خنجر مارا کہ انتڑیاں نکل پڑیں۔ زمین پر گر پڑا اور گرتے ہی پیشاب کر

کے دم کو اس میں بھگو کر ہلانے لگا۔ جہاں جہاں اس کی بوندیں پڑیں وہاں آگ لگ گئی۔ جب اس درخت کے پاس پہنچی حاتم جست کر کے ایک چشمہ میں جا پڑا اور وہ جانور مر گیا۔ جب وہ آگ بجھ گئی تب حاتم اس پانی سے نکل کر اس درخت کے نیچے آیا اور اس جانور کے دانت جو خنجر کے برابر تیز تھے اکھاڑ لئے اور دم کانوں سمیت کاٹ کر ترکش میں ڈال لئے اور چل نکلا۔

کئی دن کے بعد ایک قلعہ دکھائی دیا اسی طرف متوجہ ہوا۔ جب نزدیک پہنچا تو اس کے کنگورے آسمان سے لگے دیکھے اور بڑی بڑی عمارتیں آئینہ دار اس میں چمک رہی تھیں۔ وہ چوپڑ کا بازار نہایت ستھرا اور صاف آراستہ ہو رہا تھا۔ اور ہر شے دکانوں میں موجود تھی۔ مگر آدمی کا پتہ مفقود یہ دیکھ کر حاتم حیران ہوا اور دل میں کہنے لگا کہ کوئی دیو اس شہر میں آتا ہے کہ جس کے ذریعہ سے یہاں کے لوگ دکانیں چھوڑ کر بھاگ گئے۔ یہ سوچ کر آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ خاص قلعہ شاہی میں پہنچا۔

یہاں بادشاہ اپنے اہل و عیال اور اجناس سمیت رہتا تھا۔ دو چار نوکر بھی باہر دروازے کے دریچوں میں بیٹھے تھے۔ حاتم کو دیکھ کر بولے کہ مدت کے بعد ایک مسافر شہر میں آیا ہے۔ دوسرے نے کہا اس کو پکارو کہ ادھر آئے۔ یہ بات سن کر ایک شخص نے پکارا۔ حاتم ایک دریچہ کے پاس جا کھڑا ہوا۔ بادشاہ نے کھڑکی میں سے سر نکال کر کہا کہ "اے جوان تو کہاں سے آیا ہے اور کہاں جائے گا؟"

حاتم نے کہا کہ یمن کے رہنے والوں میں سے ہوں۔ شاہ آباد سے آیا ہوں۔ کوہ ندا کو جاؤں گا۔

یہ بات سن کر بادشاہ نے کہا۔ "اے جوان تو راہ بھول گیا جو دائیں طرف سے آیا۔ شاید تیری موت تجھ کو یہاں لائی ہے۔"

حاتم نے کہا۔ "مرضی حق پر راضی ہوں۔ لیکن اے شخص تو اپنا ماجرا کہہ۔"

اس نے کہا۔ "میں یہاں کا بادشاہ ہوں اور اس ملک میں چند روز سے ایک بلائے عظیم آتی ہے اس کے سبب سے کیا رعیت کیا سپاہ سب شہر چھوڑ کر چلے گئے اور شہر ویران ہو گیا۔ لیکن وہ بھی بے قصور ہیں کیا کریں کیونکہ شیر کی طاقت نہیں جو عہدہ برآ ہو سکے اور میں اپنی شرم و حیا سے اہل و عیال سمیت قلعہ میں بند ہو گیا۔ طاقت نہیں رکھتا کہ اسے ماروں ناچار ہو کر گوشہ گیری توکل بخدا کی۔" حاتم نے کہا۔ "اے بادشاہ وہ بلائے ناگہانی کیا کوئی دیو ہے یا کوئی درندہ عظیم ہے کہ کوئی اس کی تاب ہی نہیں۔"

بادشاہ نے فرمایا کہ "اس کا مسکن کوہ قاف ہے مگر تھوڑے دنوں سے یہاں اس کا گذر ہونے لگا ہے۔ اسی کے باعث تمام ملک ویران ہو گیا۔ ہر روز اس کا ایک وقت آنا اور دو چار آدمیوں کو کھا کر چلے جانا۔ آج تک قدم قلعہ میں نہیں آیا۔ اس واسطے ایک خندق عظیم اس کے گرد پانی سے مدام بھری رہتی ہے۔ معلوم نہیں وہ کیا ہے۔"

یہ سن کر حاتم بولا۔ "اے بادشاہ تجھے مبارک ہو۔ میں نے فلاں جنگل میں اس کو مارا ہے۔ خدا مسبب الاسباب ہے کہ میں کوہ ندا کی راہ بھول کر بائیں طرف آنکلا۔" حاتم نے پھر تمام ماجرا اس جانور کا اور اپنا بیان کیا۔ اس بات کو سنتے ہی بادشاہ اپنے قلعہ سے اترا اور حاتم کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ اندر لے گیا۔ بہ عزت تمام مسند پر بٹھا کر اقسام اقسام کے کھانے منگوا کر اس کے سامنے چنوائے۔ حاتم نے بخوبی تناول فرمایا اور بادشاہ بھی اس کا شریک طعام رہا۔ پھر آپ خاصہ منگوا کر نوش جان کیا اور اس کو بھی کھلایا۔

اس کے بعد بادشاہ نے کہا۔ "میں کیونکر باور کروں کہ وہ بلا ماری گئی؟"

حاتم نے اس کے دانت اور دم ترکش سے نکال کر دکھلائے بادشاہ ان کے دیکھتے ہی حاتم کے پاؤں پر گر پڑا اور بہت شکر گذاری کی۔ پھر ہر طرف لوگوں کو شقے پہنچانے بھیجے کہ وہ بلا دفع ہوئی۔ تم بے دھڑک آ کر اپنے ملک میں بسو اور بخوبی اوقات بسر کرو۔

چند روز کے بعد حاتم نے رخصت چاہی اور عرض کی کہ ایک رہبر میرے ساتھ کر دو کہ کوہ ندا کا راستہ بتا دے۔ بادشاہ نے فرمایا۔ "اے جوان یہ شہر خدا کے فضل سے آباد ہو جائے گا اسے اپنا ہی سمجھو۔ یہیں بود و باش اختیار کرو۔ میں اپنی بیٹی تمہاری خدمت میں دیتا ہوں۔ اس کو قبول کرو۔"

حاتم نے کہا۔ "جب تک میں بندگان خدا کے کاموں سے فراغت نہیں پاتا عیش کو حرام جانتا ہوں۔"

بادشاہ نے یہ کلام سن کر کہا۔ "آفرین تیری ہمت پر۔" ایک رہبر دے کر رخصت کیا۔ حاتم اس کے ساتھ ہوا۔

تھوڑی دور جا کر وہ کہنے لگا۔ "اے حاتم! کوہ ندا کی یہی سیدھی راہ ہے۔" حاتم ادھر متوجہ ہوا۔ پھر ایک شہر میں پہنچا وہاں کے لوگ اس کو حاکم کے پاس لے گئے۔ اس نے اٹھ کر تعظیم کی اور پوچھا کہ "اے مسافر تو کہاں سے آیا ہے اور اس شہر سکندر آباد میں کیونکر تشریف لایا ہے۔ اب آنکھوں دیکھا حال سچ کہہ۔"

حاتم نے کہا۔ "مجھ کو حسن بانو برزخ سوداگر کی بیٹی نے بھیجا ہے تو جا کر کوہ ندا کی ٹھیک ٹھاک خبر لا۔ حق تو یہ ہے کہ میں نے بہت رنج اٹھائے۔ اب امیدوار اس بات کا ہوں کہ اگر تم اس بھید سے واقف ہو تو عند اللہ کہہ دو یہی بندہ نوازی ہے اور مسافر پروری۔ کیونکہ میرے نصیب راست سے مبدل ہو جائیں۔"

رئیس شہر نے کہا۔ "کوہ ندا کا ایسا راز نہیں جو سرسری بیان ہو سکے۔ اگر تو چند روز یہاں رہے گا تو معلوم ہو جائے گا۔" حاتم نے کہا بہت اچھا۔ حاکم نے اس کے رہنے کو مکان عالیشان دیا۔ اکثر آپ بھی شریک صحبت رہتا۔ ایک روز حاتم بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا کہ اتنے میں کوہ ندا کا ذکر آگیا تو بیان کرنے لگے۔ جس کے قلعہ کی ہر ایک دیوار آسمان سے باتیں کر رہی ہے اور اس سے خود بخود ایک آواز پیدا ہوتی ہے۔

یہ اسی گفتگو میں تھے کہ ایک آواز پہاڑ کی طرف سے آئی۔ "یا اخی! یا اخی!" اس مجلس میں سے ایک جوان خوش رو دوڑا۔ لوگوں نے اس کے وارثوں سے جا کر کہا۔ "فلاں شخص کو کوہ ندا سے طلب ہوئی ہے۔" وہ اس بات کے سنتے ہی دوڑے دیکھا کہ اس کا تمام منہ سرخ ہو رہا ہے۔ لوگ اس کے گرد ہیں۔ وہ بے اختیار کوہ ندا کی طرف چلا جاتا تھا۔ یہ حال دیکھ کر حاتم حیران ہو کر پوچھنے لگا اے یارو اس جوان کو کیا ہوا ہے کہ دوڑا جاتا ہے۔ نہ کچھ کہتا ہے۔ نہ سنتا ہے۔ لوگوں نے کہا اس کو کوہ ندا سے آواز آئی ہے شتابی آ۔ حاتم نے معلوم کیا کہ کس نے بلایا ہے جو دوڑا جاتا ہے اس بات کو سوچ کر اس کو پکڑ لیا اور کہا کہ اے بھائی یہ مروت سے بعید ہے جو تو نہیں بتاتا۔ برائے خدا کہہ دے کہ کس کے بلانے پر ہم سب کو چھوڑے جاتا ہے۔ غرضیکہ حاتم نے ہر ممکن کوشش کی اور سر پٹکا اس نے کچھ جواب نہ دیا اور ہاتھ جھٹک کر بھاگا اور پہاڑ کے نیچے جا پہنچا۔ حاتم بھی جا لپکا۔ وہ نظروں سے پہاڑ پر غائب ہو گیا۔ اس نے ہر چند نظر کو دوڑا کر دیکھا پر کچھ پتہ نہ چلا صرف پتھر ہی پتھر نظر آئے۔ بہت حیران ہوا۔ آخر سب کے ساتھ شہر میں آیا۔

حاصل یہ ہے کہ ہر شخص اپنے گھر کو آیا پر کوئی اس کے واسطے نہ رویا بلکہ بہت سا کھانا وغیرہ دیا۔ حاتم نے پوچھا تم میں سے کسی کو معلوم ہے کہ اس پر کیا گذری۔ انہوں نے جواب دیا تو بھی موجود تھا جو تو نے دیکھا۔ یہ سن کر حاتم چپ ہو رہا اور اس جوان کے واسطے آبدیدہ ہو کر کہنے لگا کہ افسوس دنیا ہیچ ہے۔ انہوں نے کہا اے جوان ہمارے ملک کی یہی رسم ہے۔ اگر ایسا کرے گا تو نکالا جائے گا۔ حاتم کہنے لگا کہ حسن بانو کو کیا جواب دوں گا۔ غرض چھ مہینے حاتم کو اور گذر گئے اور اس عرصہ میں اسی طرح سے پندرہ آدمی پہاڑ کی طرف گئے۔ اتفاقاً ایک شخص حاتم نامی وہاں بھی موجود تھا۔ حاتم میں اور اس میں نہایت دوستی تھی کہ ناگاہ کوہ ندا کے قلعہ سے آواز آئی۔ "یا اخی! یا اخی۔" اس بات کے سنتے ہی وہ بے چارہ متوجہ ہوا اور اس کے خویش و اقارب کو خبر پہنچی کہ حاتم بلایا گیا۔ وہاں سب آ کر جمع ہوئے اور اسے گھیر لیا۔ تب حاتم کہنے لگا کہ یہ بھی اسی طرح جائے گا افسوس ہے کہ مجھ کو اس کے ساتھ محبت ہو گئی تھی۔ یہ بھی جدا ہوتا ہے۔ میں اس کو ہرگز نہ چھوڑوں گا اس کا ساتھ دینا مجھ کو ضروری ہے جو ہونی ہو سو ہو۔ کیونکہ یہاں کے لوگوں سے کوہ ندا کا مفصل حال معلوم نہ ہوا۔ یہ بات ٹھہرا کر کمر کس باندھی اور اس کا ہاتھ پکڑ کے پہاڑ کی طرف دوڑا۔ ہر چند [illegible] کیا ہوا ہے؟ تجھے کون کھینچے لئے جاتا ہے۔ وہ کچھ جواب نہ دیتا تھا۔ آخرکار جھنجھلا کر بولا اے بے مروت یہ کیسی دوستی تھی۔ آخر [illegible] تیری زبان کیوں بند ہو گئی۔ سچ کہہ تجھے کون لئے جاتا ہے۔ وہ کچھ جواب نہ دیتا تھا بلکہ حاتم کے ہاتھ سے اپنے [illegible] کیا کہ اس کے ہاتھ چھوٹ گئے اور حاتم زمین پر گر چلا۔ تب وہ چلا اور حاتم اس کے پیچھے چلا گیا

اور دونوں آگے پیچھے پہاڑ کے نیچے جا پہنچے۔ حاتم نے اچھل کر زور سے اس کی کمر پکڑی۔ ہر چند اس نے چاہا کہ اس کو جدا کرے لیکن جدا نہ ہو سکا۔ اسی طرح دونوں گرتے پڑتے پہاڑ کے اوپر جا پہنچے۔

جونہی قلعہ کے نزدیک گئے ایک کھڑکی دکھائی دی۔ دونوں لپٹے لپٹائے اس کے اندر چلے گئے۔ لوگوں کی نظروں سے غائب ہو گئے۔ وہ نا چار وہاں سے حاتم کا افسوس کرتے ہوئے شہر میں آئے اور حاکم کو خبر پہنچائی کہ مسافر بھی حاتم کے ساتھ اسی پہاڑ پر چلا گیا۔ اس بات کے سنتے ہی حاکم غصہ میں آ کر کہنے لگا کہ نادان آج تک کوئی بے بلائے اس پہاڑ پر نہیں گیا تم نے اس کو کیوں چھوڑا؟ اور کس واسطے جانے دیا؟ یہ پاپ اس غریب کا تمہاری گردن پر ہے۔ انہوں نے عرض کی خداوند ہم نے اس کو بہت سمجھایا کہ وہاں نہ جا مگر ہمارا کہنا نہ مانا اور کہا کہ میرا یار جانی ہے۔ میں ہرگز اس کو تنہا نہ چھوڑوں گا۔ بلکہ جو مصیبت اس پر پڑے گی میں بھی اس میں شریک ہوں گا۔

غرض حاتم اور وہ جوان ایک میدان وسیع میں پہنچے۔ وہاں ایک سبزہ زار نظر آیا کہ نظر کام نہ کرتی تھی گویا فرش زمردین چاروں طرف بچھا ہے۔ تھوڑی سی زمین اس میں سے خالی تھی۔ وہ جوان اس پر پاؤں رکھنے لگا۔ پاؤں رکھتے ہی چت گر پڑا۔ حاتم نے چاہا کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھائے اتنے میں اس کا منہ زرد ہو گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ ہاتھ پاؤں سخت ہو گئے۔ اس کا یہ حال دیکھ کر حاتم نے اپنے دل میں کہا یہ مر گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ بے اختیار رونے لگا۔ اس عرصہ میں وہ زمین حرکت میں آئی وہ جوان اس میں سما گیا اور وہ جگہ برابر ہو گئی۔

اس ماجرے کو دیکھ کر حاتم نے سجدہ شکر ادا کیا اور کہا کہ دنیا فانی ہے سب کو مرنا ہے۔ واقعی اب کو ندا کا حال کما حقہ معلوم ہو گیا۔ بس اب یہاں سے چلئے۔ یہ دھن باندھ کر روانہ ہوا اور تمام دن پھرا مگر اس کھڑکی اور قلعہ کا کھوج نہ پایا۔ خدا جانے کھڑکی کیا ہوئی اور قلعہ کدھر گیا۔ سات روز تک حیران و سرگرداں بے آب و دانہ رہا۔ غرض جینے سے مایوس ہو کر دل میں کہنے لگا کہ اے حاتم تیری یہاں موت آئی ہے جو تو بے بلائے آیا۔ کیونکہ نہ وہ قلعہ نظر آتا ہے نہ وہ پہاڑ نہ وہ شہر۔ اتنے میں ایک دریا کے پاس جا پہنچا۔

کیا دیکھتا ہے کہ وہ بڑے زور شور سے بہ رہا ہے' اور چھور نہیں ملتا۔ یہ نہایت متفکر ہوا اور کہنے لگا کہ الٰہی اب اس سے کیونکر پار ہوں۔ تیرے سوا کون ہے جو بیڑا پار کرے۔ اتنے میں ایک ناؤ نظر آئی کہ ادھر ہی چلی آتی ہے۔ اس نے جانا کہ کوئی ملاح لئے چلا آتا ہے۔ جب کنارے آ لگی تو اس کو دیکھا کہ کوئی ملاح نہیں۔ متعجب ہو کر شکر خدا کا بجا لایا۔ سوار ہوا کیا دیکھتا ہے کہ ایک دستر خوان میں کچھ لپٹا ہوا دھرا ہے۔ بھوکا تو تھا ہی جھٹ ہاتھ بڑھا کر کھولا تو دو روٹیاں اور مچھلی کے کباب گرم گرم تھے۔ چاہا کہ کھائے' ساتھ ہی دھیان آیا کہ شاید ملاح نے اپنے واسطے رکھا ہو۔ اتنے میں ایک مچھلی نے دریا سے سر نکال کر کہا اے حاتم یہ تیرا حق ہے بے اندیشہ کھا۔ یہ کہہ کر غوطہ مار گئی۔ حاتم نے کھا کر پانی پیا اور شکر کیا۔

وہیں ایک آندھی ایسی چلی کہ تین دن میں کشتی کنارے پر جا لگی۔ حاتم اترا اور متوجہ شہر کا ہوا۔ حاتم نے چاہا کہ اگر شہر ملے تو ان کی [illegible] لوگوں سے بیان کرے۔ حتیٰ کہ سات شبانہ روز چلتے چلتے گذر گئے کہیں سراغ نہ ملا۔ سرگرداں چلا جاتا تھا کہ پہاڑ نظر آیا۔ تین دن کے [illegible] کے نیچے جا پہنچا جس پتھر کو اٹھا کر دیکھتا ہے اس کے نیچے لہو بہتا ہوا پایا۔ فکر کرنے لگا کہ کس سے پوچھوں کیا ماجرا ہے۔ ناچار پہاڑ پر چڑھ [illegible] کے بعد اس پر جا پہنچا تو ایک میدان کف دست دکھائی دیا کہ وہاں کی خاک اور جانور چرندے اور پرندے بیر بہوٹی کی طرح لال [illegible] بھوک پیاس بھول گیا اور قدم بڑھائے جائے چھ کوس تک چلا ہی گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ لہو کا ایک دریا لہریں مار رہا ہے اور اس میں [illegible] سرخ ہو رہے ہیں گویا لہو سے بنے ہیں۔ گھبرایا کہ اس دریا سے کیونکر پار ہوں گا۔ ناچار کنارے کنارے چلا۔ کہیں سے تو [illegible] بھوک لگی تو [illegible] کر کے کھاتا جب پیاس لگی تو مہرہ منہ میں رکھ لیتا۔ ایک مہینہ اسی طرح گذر گیا۔ یکایک اس جگہ پہنچا جہاں [illegible] کے سوا کچھ نہ تھا نہ درخت نہ چرندے نہ پرندے تھے۔ دل میں کہنے لگا اے حاتم ایک مہینہ تک تو نے یہ رنج سہے کہ پاؤں [illegible] نظر نہ آیا۔ اگر دس برس تک یونہی پھرے گا دریائے خون کے سوا کچھ نہ دیکھے گا۔ خدا کے کارخانہ میں [illegible] کو اس نے چھپایا ہے ان کا کھولنا آسان نہیں۔ اگر وہ فضل کرے تو یہاں سے صحیح سلامت [illegible] ہو سکتی۔

اسی فکر میں کوئی چیز دریا میں سے نمودار ہوئی حاتم اس کی طرف بغور دیکھنے لگا۔ اتنے میں وہ نزدیک آئی۔ دیکھا کہ ایک کشتی ہے۔ حاتم بسم اللہ کر کے سوار ہوا۔ پھر ویسی ہی روٹیاں اور کباب بدستور پائے۔ بے تامل انہیں کھا گیا اور خدا کا شکر و حمد بجالایا۔ جب کشتی منجدھار میں پہنچی زور سے ہوا چلنے لگی اور لہریں مانند شعاع کے بلند ہونے لگیں۔ حاتم ڈرا اور خدا کو یاد کرنے لگا۔ آنکھیں بند کر کے ناؤ میں لیٹ رہا۔ قریب تھا کہ بے حواس ہو جائے اور خوف سے ڈوب جائے۔ غرض سات روز تک اس طرح گذرے آٹھویں روز کشتی کنارے پر لگی۔ حاتم اترا اور کشتی الٹی پھر گئی۔ یہ کنارے کنارے چلنے لگا اور افسوس کرتا تھا کہ یہ راز نہ کھلا کہ یہ کشتی کون لایا اور کباب روٹی کون دھر گیا۔ کئی روز تک اٹھتے بیٹھتے چلا گیا کہ دور سے ایک چیز نمودار ہوئی۔ حاتم حیران ہوا کہ یہ کیا چیز ہے۔ آگے بڑھ کر کیا دیکھتا ہے کہ ایک دریا نہایت شفاف لہریں مار رہا ہے اور ایسا چمکتا ہے کہ کسی نے چاندی گلا کر بہادی ہے۔ حاتم تشنگی سے جاں بلب تھا کنارہ پر آبیٹھا اور اس میں بایاں ہاتھ ڈالا۔ جس وقت پانی نکالا تو پانی نہ پایا مگر ہاتھ چاندی کا ہو گیا۔ ہر چند اس کو داہنے ہاتھ سے صاف کیا۔ لیکن وہ اسی طرح رہ گیا بلکہ بوجھ ہو گیا۔ حاتم نے کہا یہ عجب دریا ہے اگر غوطہ ماروں تو چاندی کا ہو جاؤں پھر چلنا مشکل ہو جائے۔

حالت اضطراب میں چاروں طرف دیکھا کہ ناگہاں اسی طرح ایک کشتی آئی۔ یہ بسم اللہ کہہ کر چڑھ گیا۔ پھر ایک طباق گرما گرم حلوے کا نظر آیا۔ اس نے ہاتھ سے اپنی طرف کھینچ لیا اور خوب کھایا۔ پھر پاؤں پھیلا کر بآرام سو رہا۔ کئی دن کے بعد کشتی کنارے پر جا پہنچی۔ حاتم اتر کے آگے بڑھا۔ ہر وقت اپنا ہاتھ دیکھا کرتا تھا۔ چار دن کے بعد ایک پہاڑ نمودار ہوا۔ اس نے جانا کہ یہ نزدیک ہے حالانکہ وہ ایک مہینہ کی راہ پر تھا۔ غرض شکار کرتا ہوا اور کھاتا ہوا چلا جاتا تھا۔ جب وہ تین دن کی راہ پر پہنچا تو سنگریزے رنگ برنگ کے اور طرح طرح کے جواہرات نظر پڑے۔ طمع دامن گیر ہوئی۔ تھوڑے سے جواہرات جیب میں ڈال لئے، تھوڑی دور چل کر اس سے زیادہ بیش بہا دیکھا۔ اس کو پھینک کر اس کو جیب میں ڈال لیا۔ تھوڑی دور جا کر خیال آیا کہ اگر یہ جواہر شہروں میں پہنچے تو ان کی قیمت کوئی نہ دے سکے گا۔ اسی خیال میں چلتا گیا۔ آخر ان کے بوجھ سے تھک کر کسی جگہ بیٹھ گیا اور کئی لعل اور زمرد الماس بیش قیمت جو سب سے بڑے تھے چن لئے باقی وہیں پھینک دیئے اور پھر راہی ہوا ایک چشمہ پر جا پہنچا۔ اس کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ اپنے ہاتھ پاؤں دھوئے۔ اتنے میں ایک دم بائیں ہاتھ پر جو نظر پڑی اس کو جیسا تھا ویسا ہی پایا مگر ناخن چاندی کے رہے۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ اس دریا میں ہاتھ چاندی کا ہو گیا تھا اس چشمہ میں حالت اصلی پر آگیا اس میں کیا بھید ہے۔ اتنے میں رات ہو گئی۔ اسی جگہ پڑا رہا۔

یکایک دو شخص اس چشمہ پر آنکلے کہ ان کے سر آدمی کے تھے اور پاؤں ہاتھی کے اور ناخن شیر کے۔ رنگ نہایت سیاہ۔ حاتم دیکھ کر ڈرا اور اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ یہ کیا بلا ہے۔ اگر میں بھاگوں تو شرم دامن گیر ہے اور ٹھہروں تو ٹھہر نہیں سکتا۔ دیکھئے کہ تقدیر میں کیا ہے۔ یکایک حاتم نے تیر و کمان اٹھا کر ایک تیر مارا۔ ایک نے ان میں سے پکڑ لیا۔ چاہتا تھا کہ وہ دوسرا تیر مارے انہوں نے فریاد کی اے حاتم طائی تو اپنی جان کے ڈر سے ہمیں مارتا ہے۔ ہم خدا کے بندے ہیں کچھ تجھے ایذا دینے نہیں آئے۔ حاتم تیر و کمان ڈال کر بیٹھ گیا اور دل میں سوچنے لگا کہ ان کو مجھ سے کیا کام ہے جو ادھر آتے ہیں۔ تیر تو انہوں نے درمیان میں ہی پکڑ لیا۔ اگر دوسرا ماروں گا تو کاہے کو کارگر ہوگا۔ اتنے میں وہ نزدیک آکر کہنے لگے۔ "اے حاتم تجھ کو شرم نہیں آتی جواہر کی طمع کی؟"

وہ بولا۔ "میں نے کس کا جواہر لیا؟"

انہوں نے کہا۔ "تو فلانے جنگل سے جواہر لایا ہے۔ اب تک تیرے پاس موجود ہیں۔"

یہ سن کر حاتم نے جواب دیا کہ "تیرا تو نہیں لایا۔"

وہ بولے کہ "یہ اور خلقت کے واسطے اللہ نے رکھا ہے کہ وہ اپنے کام میں لائیں۔"

حاتم نے کہا۔ "میں خدا کی صنعت دکھانے کو اٹھا لایا ہوں۔"

یہ سن کر دونوں نے کہا۔ "اگر سلامت جانا چاہتا ہے تو اس جواہر سے ہاتھ اٹھا۔"

یہ سنتے ہی حاتم نے سب پھینک دیا اور کہا۔ "تم لے جاؤ۔ حیف ہے کہ میں اس کو بہت دور سے لایا ہوں۔ تم نے بڑا ظلم کیا کہ اس کو مجھ سے لے لیا۔ میں کوئی چرا کر نہیں لایا۔"

انہوں نے کہا۔ "یہ کیا چلن ہے کہ بے کہے اس قدر مال اٹھا کر روانہ ہوا اپنے پاس رکھنا۔ یہ کب روا ہے بلکہ محنت کی کمائی لوینی پڑتی ہے۔" حاتم یہ سن کر سر جھکا کر چپکا ہو رہا۔ وہ ایک الماس اور ایک زمرد اپنی اپنی سم میں سے جو بیش بہا تھا اس کو دینے لگے اور کہا تجھے یہ ہی بہت ہے۔ اس نے لے لیا اور کہا اے بندگان خدا مجھ کو راہ بتادو جو میں کسی طرح ملک میں پہنچوں۔ وہ بولے "اے جوان غنیمت سمجھ جو تو صحیح و سلامت آیا اور جیتا و جاگتا چلا کیونکہ اس حد سے آج تک کوئی جان سلامت نہیں لے گیا۔ اس قدر اندیشہ نہ کر کہ عمر بڑی ہے۔ اس کے آگے ایک جواہر کا دریا ملے گا اس کے بعد دریائے آتش آئے گا اگر اس سے صحیح و سالم اتر گیا تو مقرر اپنے ملک میں پہنچے گا۔ مگر کسی چیز کا لالچ نہ کیجو اسی میں تیری سلامتی ہے۔ خدا نخواستہ اگر کسی چیز پر دل دوڑائے گا تو اپنے کیے کی سزا پائے گا۔" یہ کہہ کر وہ پانی میں اتر پڑے اور اس کی نظر سے چھپ گئے۔

حاتم اسی مقام پر تمام رات بیٹھا رہا۔ صبح کو تھوڑی دور چلا تھا کہ ایک دریا دکھائی دیا۔ اس کو دیکھ کر بہت شاد ہوا۔ اس واسطے کہ بہت پیاسا تھا۔ جب اس کے پاس پہنچا اور نگاہ کی تو ہزاروں موتی بیش قیمت پڑے ہیں۔ لیکن ہر ایک انڈے کے برابر تھا۔ ان کی چمک سے آنکھیں جھپکی جاتی تھیں۔ اور قیمت کا تو کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ حاتم نے لالچ میں آکر چاہا کہ دس بیس اٹھائے کہ اتنے میں ان دونوں کی نصیحت یاد آئی۔ ڈر گیا اور اس حرکت سے باز رہا۔ اور اس کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ کیا دیکھتا ہے کہ اس کا پانی دودھ اور شہد کی مانند ہے۔ پیاسا تو تھا ہی خوب پیٹ بھر کر پیا۔ غرض اس میں بخوبی اتر گیا اور آگے بڑھا کہ دور سے ایک روشنی نظر آئی گویا سونے کا ایک تختہ ہوا میں چمک رہا ہے۔ اسی طرف چلا۔

ایک مہینے کے بعد جا پہنچا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک پہاڑ آسمان سے لگا ہوا ہے اور جگمگا رہا ہے یہ اس پر چڑھ گیا وہاں ایک درخت سونے کا پھلا پھولا دیکھا۔ متعجب ہوا۔ تین روز تک اسی پہاڑ پر چلتا رہا۔ ایک میدان نظر پڑا اور اس کی زمین پر ہزاروں درخت سونے کے چمک رہے تھے۔ حاتم دیکھ کر حیران ہوا اور صانع کی صنعت دیکھنے لگا اور خدا کا شکر کرنے لگا۔ پھر تھوڑا میوہ توڑ کر کھایا۔ پھر آگے چل کر ایک حوض نظر پڑا۔ اس کا پانی مثل بلور کے صاف تھا۔ اس کے کنارے پر بیٹھا اور دل میں فکر کرنے لگا یہ باغ کس کا ہے۔ کس سے پوچھے۔ اتنے میں کئی پریاں پوشاک اور زیور سے آراستہ جلوہ گر ہوئیں اور حاتم کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوئیں۔ ادھر حاتم ان کو دیکھ کر حیرت میں آیا کہ الٰہی یہ کیا حسن ہے۔ اس وقت ملکہ زرین پوش یاد آئیں اور دل میں کہا خدا اسے ملائے۔

القصہ ان سے کہا کہ تم کون ہو اور یہاں کا بادشاہ کون ہے؟ انہوں نے کہا یہ محل پری نوش لب کا ہے۔ اتنے میں وہ آپہنچی۔ حاتم اس کو دیکھتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا اور وہ اس کے سرہانے آکر کھڑی ہوئی۔ کہنے لگی۔ "ارے کوئی ہے۔ جلد آکر اس کے منہ پر گلاب چھڑک دو۔" تو ہیں ایک نازنین دوڑی گئی اور گلاب پاش لے کر اس کے منہ پر چھڑکنے لگی۔ حاتم ہوش میں آیا۔ پھر پری نوش لب ایک تخت مرصع پر جا بیٹھی اور اس کو کرسی جواہر نگار پر بٹھا کر پوچھنے لگی۔ "اے جوان سچ کہہ کہاں سے آیا ہے اور کس کام کے ارادہ سے یہاں تک پہنچا ہے اور کدھر جائے گا۔" حاتم نے اپنا تمام احوال ابتدا سے انتہا تک اس کے سامنے بیان کر کے پوچھا اس مکان کا مالک کون ہے اور اس پہاڑ کا کیا نام ہے۔ پری نوش لب نے کہا کہ "اس پہاڑ کو کوہ زریں کہتے ہیں اور اس مکان کا مالک شاہپال شاہ ہے اور اس کی بیٹی کا آسیا نام ہے۔ میں اس لڑکی کی ایک خواص ہوں چنانچہ ساتواں روز میری باری کا ہے۔ اس روز میں حاضر ہوتی ہوں اور اس مکان کا کوہ قاف سے تعلق ہے۔ اگرچہ دنیا کی حد میں ہے اور یہ جو دور سے دکھائی دیتا ہے اسی قلعہ کا حصہ ہے۔" غرض چار روز تک حاتم وہاں رہا اور اطعام ہائے خوش گوار سے ملذذ ہوا۔ پانچویں روز کہا کہ یہ جگہ تمہارے رہنے کے قابل نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ یہاں سے تشریف لے جا۔

حاتم اس پری سے رخصت ہو کر پہاڑی پر چلا اور دس روز کے بعد پہاڑی سے اتر کر کسی جنگل میں جا پہنچا۔ وہاں سونے کا سا ایک دریا دکھائی

دیکھا کہ اس کا پانی گلے ہوئے سونے کی طرح لہریں لے رہا ہے اور اس کی موجیں آسمان سے ٹکر کھا رہی ہیں۔ یہ دریائے فکر میں غرق ہو کر اس کے کنارے پر بیٹھ گیا کہ اس سے کیونکر پار اترے۔ اتنے میں ایک ناؤ طلائی دور سے نظر آئی اور فوراً کنارے پر پہنچی۔ حاتم شکر کر کے اس پر بیٹھ گیا اور وہیں طباق حلوے سے ملبب نظر آیا۔ بھوکا تو تھا ہی کمال رغبت سے کھایا۔ چاہتا تھا کہ دریا میں ہاتھ ڈال کر پانی پیئے ڈرا کہ یہاں ہاتھ سونے کا نہ ہو جائے' کھینچ لیا۔ پھر ایک کٹورا بغل سے نکال کر بھرا اور تھوڑا سا حلق میں ٹپکایا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ کٹورا اور چار دانت سونے کے ہو گئے۔ غرض چوتھے دن ایک کنارے پر پہنچا حاتم نے اتر کر دوگانہ شکریہ ادا کیا اور آگے بڑھا۔ سات روز تک چلتا گیا وہ عجائبات دیکھے کہ جو نہ سنے تھے۔

آٹھویں روز پتھروں کے میدان میں پہنچا اور ہر ایک پتھر ایسا گرم تھا گویا آگ سے ابھی نکلا ہے۔ مشکل سے چند قدم چلا۔ طاقت نہ رہی بیٹھ گیا۔ گرمی کے سبب سے لب خشک ہو کر بدن جل اٹھا۔ بیقرار ہو کر مہرہ منہ میں رکھ لیا مگر کچھ فائدہ نہ دیکھا۔ نکال کر پھینک دیا۔ مثل ماہی بے آب بیتاب ہو کر بیہوش ہو گیا۔ زبان باہر نکل پڑی۔ قریب مرگ پہنچا اتنے میں وہ دونوں شخص نظر آئے۔ بولا اے یارو آفرین ہے کہ وقت پر پہنچے اور بڑی مدد کی۔ کہو اب کس طرف جاؤں' یہ گرمی کس وجہ سے ہے؟ انہوں نے کہا اس سے آگے دریائے آتش ہے یہ گرمی اس کے سبب سے ہے اور راستہ یہ ہی ہے۔ چلا جا۔ خدا کی قدرت سے اپنے ملک کو پہنچ جائے گا۔ راہ بتانا ہمارا کام ہے وہاں یہ ممکن ہے کہ تمہاری آگ ہلکی ہو جائے گی۔ اس نے کہا جو ہو سکے وہ بہتر ہے۔ احسان سے خالی نہیں۔ تب انہوں نے ایک مہرہ نکال کر حاتم کو دیا اور کہا آگے دریائے آتشیں ہے۔ اگر اس کو منہ میں رکھے گا تو آگ تجھ پر کارگر نہ ہو گی۔ آرام سے چلا جائے گا۔ پر یہ یاد رہے کہ دریا کے پار ہوتے ہی یہ مہرہ پھینک دینا۔ یہ کہہ کر حاتم کی نظر سے غائب ہو گئے۔ وہ رات کی رات وہیں رہا۔ صبح کو اپنے منہ میں مہرہ رکھ کر آگے چلا۔ تین دن کے بعد سامنے سے آگ کے شعلے دکھائی دینے لگے۔ یہ ڈرا اور عظمتہ اللہ کہہ کر آگے بڑھا۔ جب کنارے پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ شعلے کی لہریں آسمان تک جاتی ہیں۔ اتنے میں ایک کشتی بھی کنارے پر آ لگی وہ دل میں خدا کی حمد کرنے لگا۔ اور کہا کہ دیدہ و دانستہ آپ کو آگ میں ڈالتا ہے پر کیا کروں راہ یہ ہی ہے۔ خدا آسان کرے گا۔ جو اس کی رضا ہے اس پر راضی رہنا چاہیے۔ تن بہ تقدیر کشتی پر جا بیٹھا اور منہ میں مہرہ رکھ لیا۔ اتنے میں ایک طباق کباب سے بھرا ہوا دیکھا۔ اس کو بے اختیار کھینچا اور پیٹ بھر کر کھایا۔ غرض ناؤ چلی جاتی تھی یہ ڈر کے مارے کبھی آنکھیں نہ کھولتا جو کبھی آنکھیں کھل جاتی تھیں تو جان نکلنے لگتی تھی۔ وہیں آنکھیں بند کر لیتا تھا۔

قصہ کوتاہ ناؤ منجدھار میں پہنچی اور چکر کھانے لگی۔ حاتم کو یقین ہوا کہ اب ڈوبتی ہے۔ خدا کی یاد میں مشغول ہوا اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر سر بہ زانو ہو گیا کہ اب نہیں بچتا۔ بارے فضل الٰہی سے تین دن کے بعد کشتی کنارے پر جا لگی۔ اتر پڑا۔ آنکھیں جو کھول کر دیکھتا ہے تو نہ وہ دریا ہے نہ وہ کشتی ہے ایک سہانا جنگل نظر آتا ہے۔ مہرہ منہ سے نکال لیا اور آگے چلا۔ تھوڑی راہ طے کی تھی کہ سواد یمن سے کسی گاؤں کی طرف جا نکلا اور کھیت پر کھڑا ہو کر کسان سے کہنے لگا کہ نواح کس شہر کا ہے؟ اس نے کچھ جواب نہ دیا اور ٹکٹکی باندھ کر اسے تکنے لگا۔

حاتم بولا کہ اے عزیز تو بہرا ہے کہ نہیں سنتا؟ اس نے عرض کی کہ تیری صورت میں اپنے بادشاہ کی سی جانتا ہوں۔ حاتم یہ سن کر کہنے لگا کہ تو کون ہے اور کہاں جاتا ہے۔ وہ بولا اے جوان یہ ملک یمن ہے اور حاتم شہزادہ ہے کہ اس کا باپ طے نام یہاں کا بادشاہ ہے۔ لیکن شہزادہ کو سات برس ہوئے کہ اس ملک سے نکل گیا ہے۔ ایک مرتبہ اس کی خبر ملکہ زریں پوش سے پہنچی تھی۔ اس سے ہر شخص کو تسکین ہوئی تھی۔ اب تو اس کے ماں باپ اور اقربا کا برا حال ہے کہ ہر ایک پر اپنی زندگی وبال ہے۔ خصوصاً ملکہ زریں پوش کی تو جان پر آ بنی ہے۔ دیکھیے اس کی ملاقات ہونے تک جیتے یا نہ جیتے۔ حاتم نے کہا چند روز ہوئے تمہارا شہزادہ مجھے راہ میں ملا تھا۔ وہ خیر و عافیت سے ہے۔ تو یمن میں جا کر سب کی خدمت میں دعا و سلام پہنچانا اور کہنا کہ حاتم شاہ آباد کی طرف گیا تھا۔ پھر کہا اے دہقان میں بہت پیاسا ہوں تھوڑا سا پانی پلا دے۔ وہ جلدی سے ایک پیالہ دودھ کا اور ایک چھاچھ کا لے آیا۔ حاتم نے نہایت مزے سے پیا اور کہا کہ ہزار شکر ہے کہ مدت کے

بعد میں نے اپنے ملک کو دیکھا اور یہ نعمت کھائی۔

پھر اٹھ کر روانہ ہوا اور شاہ آباد کو چلا۔ تھوڑے دنوں میں وہاں جا پہنچا اور حسن بانو کو اپنے آنے کی خبر دی۔ اس نے پردہ کے اندر بلا لیا اور ایک سونے کی کرسی پر بٹھلا کہا، اے جوان صد آفرین ہے جو تو آیا۔ بارے کوہ ندا کی خبر کہو اور وہاں کے بھید سے مجھے آگاہ کرو۔ حاتم نے سر سے قصہ شروع کیا اور آخر تک کہہ سنایا۔ حسن بانو نے کہا سچ کہتا ہے، کچھ نشان دکھلا۔ حاتم نے اپنے بائیں ہاتھ کے ناخن دکھلائے اور کہا ایک روز کسی چشمہ آب زلال پر پہنچا اور اس کو دھویا، یہ اصلی صورت پر آگیا اور دوسری نشانی یہ ہے کہ چار دانت دریائے زرین کے پانی سے سونے کے ہوگئے ہیں۔ اور وہ تینوں، قیمیں جواہر کی بھی دکھادیں۔ تب حسن بانو نے بہت سی آؤ بھگت کی اور کھانا، پر تکلف منگا کر کہا کہ کھاؤ۔ حاتم نے کہا اس کو میرے ساتھ کر دو میں کاروان سرا میں جا کر منیر شامی کے ساتھ کھاؤں گا۔ وہاں سے اٹھ کر کاروان سرا میں آیا اور منیر شامی کے ہمراہ کھانا کھایا اور اپنی سرگذشت مفصل سنائی۔

باغ و بہار

میر امن

(۱۸۰۳ء)

سیر پہلے درویش کی

اے یاران! میری پیدائش اور وطن بزرگوں کا ملک یمن ہے۔ والد اس عاجز کا ملک التجار خواجہ احمد نام بڑا سوداگر تھا۔ اس وقت میں کوئی مہاجن یا بیپاری ان کے برابر نہ تھا۔ اکثر شہروں میں کوٹھیاں اور گماشتے خرید و فروخت کے واسطے مقرر تھے اور لاکھوں روپے نقد اور جنس ملک ملک کے گھر میں موجود تھے۔ ان کے یہاں دو بچے پیدا ہوئے' ایک تو یہی فقیر جو کفنی سیلی پہنے ہوئے مرشدوں کے حضور میں حاضر اور بولتا ہے اور دوسرے ایک بہن جس کو قبلہ گاہ نے اپنے جیتے جی ایک شہر کے سوداگر بچے سے بیاہ دیا تھا' وہ اپنے سسرال میں رہتی تھی۔ غرض اتنی دولت اور ایک لڑکا ہو اس کے لاڈ پیار کا کیا ٹھکانا ہے۔ مجھ فقیر نے بڑے چاؤ چور سے ماں باپ کے سایہ میں پرورش پائی اور پڑھنا لکھنا' سپاہ گری کا کسب و فن' سوداگری کا بہی کھاتا روزنامہ سیکھنے لگا۔ چودہ برس تک نہایت خوشی اور بے فکری میں گذری کچھ دنیا کا اندیشہ دل میں نہ آیا۔ یک بیک ایک ہی سال میں والدین قضائے الٰہی سے مر گئے عجب طرح کا غم ہوا جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ یک بارگی یتیم ہو گیا۔ کوئی سر پر بڑا بوڑھا نہ رہا۔ اس مصیبت ناگہانی سے رات دن رویا کرتا۔ کھانا پینا سب چھوٹ گیا۔ چالیس دن جوں توں کر کے گذرے۔ چہلم میں اپنے بیگانے چھوٹے بڑے جمع ہوئے۔ جب فاتحہ سے فراغت ہوئی سب نے فقیر کو باپ کی پگڑی بندھوائی اور سمجھایا دنیا میں سب کے ماں باپ مرتے آئے ہیں اور اپنے تئیں بھی ایک روز مرنا ہے پس صبر کرو اپنے گھر کو دیکھو اب باپ کی جگہ تم سردار ہوئے اپنے کاروبار لین دین سے ہوشیار رہو۔ تسلی دے کر وہ رخصت ہوئے' گماشتے کاروباری نوکر چاکر جتنے تھے آن کر حاضر ہوئے۔ نذریں دیں اور بولے کوٹھے نقد و جنس کے اپنی نظر مبارک سے دیکھ لیجیے۔

ایک بارگی جو اس دولت بے انتہا پر نگاہ پڑی آنکھیں کھل گئیں۔ دیوان خانے کی طیاری کا حکم کیا۔ فراشوں نے فرش فروش بچھا کر چھت پردے چلمنیں تکلف کی لگا دیں اور اچھے اچھے خدمتگار دیدار و نوکر رکھے سرکار سے زرق برق کی پوشاکیں بنوا دیں۔ فقیر مسند پر تکیہ لگا بیٹھا۔ ویسے ہی آدمی غنڈے بھانڈے مفت بر کھانے پینے والے جھوٹے خوشامدی آکر آشنا ہوئے اور مصاحب بنے ان سے آٹھ پہر صحبت ہونے لگی۔ ہر طرح کی باتیں اور زٹلیں واہی تباہی ادھر ادھر کی کرتے اور کہتے اس جوانی کے عالم میں کیفیتی شراب یا گل گلاب کھنچوا لیجئے نازنین معشوقوں کو بلوا کر ان کے ساتھ پیجیے اور عیش کیجیے۔

غرض آدمی کا شیطان آدمی ہے۔ ہر دم کے کہنے سننے سے اپنا بھی مزاج بہک گیا۔ شراب' ناچ اور جوئے کا چرچا شروع ہوا آخر تو یہ نوبت پہنچی کہ سوداگری بھول کر تماش بینی کا اور دینے لینے کا سودا ہوا۔ اپنے نوکر اور رفیقوں نے جب یہ غفلت دیکھی جو جس کے ہاتھ میں پڑا الگ کیا گویا لوٹ مچا دی۔ کچھ خبر نہ تھی کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے کہاں سے آتا ہے اور کدھر جاتا ہے۔ مال مفت دل بے رحم اس ورخرچی کے آگے اگر گنج

قارون ہوتا تو بھی وفانہ کرتا کئی برس کے عرصے میں ایک بارگی یہ حالت ہوئی کہ فقط ٹوپی اور لنگوٹی باقی رہی ' دوست آشنا جو وقت کالی دال کھاتے تھے اور چچہ بھر خون اپنا ہر بات میں زبان سے نثار کرتے تھے کافور ہو گئے بلکہ راہ باٹ میں اگر کہیں بھینٹ ملاقات ہو جاتی تو آنکھیں چرا کر منہ پھیر لیتے اور نوکر چاکر خدمتگار جھیلے ڈھلیت خاص بردار تا بتخانے سب چھوڑ کر کنارے لگے کوئی بات کا پوچھنے والا نہ رہا جو کہے یہ کیا تمہارا حال ہوا سوائے غم و افسوس کے کوئی رفیق نہ ٹھہرا۔ اب دمڑی کی ٹھنڈیاں میسر نہیں جو چبا کر پانی پیوں۔ دو تین فاقے کڑاکے کے کھینچے تاب بھوک کی نہ لاسکا۔ ناچار بے حیائی کا برقعہ منہ پر ڈال کر یہ قصد کیا کہ بہن کے پاس چلئے لیکن یہ شرم دل میں آئی تھی کہ قبلہ گاہ کی وفات کے بعد نہ بہن سے کچھ سلوک کیا نہ خالی خط لکھا بلکہ اس نے دو ایک خط خطوط ماتم پرسی اور اشتیاق کے جو لکھے ان کا جواب بھی اس خواب خرگوش میں نہ بھیجا اس شرمندگی سے ہی تو نہ چاہتا تھا پر سوائے اس گھر کے اور کوئی ٹھکانا نظر میں نہ ٹھہرا جوں توں پا پیادہ خالی ہاتھ گرتا پڑتا ہزار محنت سے کئی منزل کاٹ کر ہمشیرہ کے شہر میں جا کر اس کے مکان پر پہنچا۔

وہاں جائی میرا یہ حال دیکھ کر بلائیں لے اور گلے مل کر بہت روئی۔ تیل' کالے ماش' ٹکے مجھ پر سے صدقے کئے' کہنے لگی "اگرچہ ملاقات سے دل بہت خوش ہوا لیکن بھیا تیری یہ کیا صورت بنی؟"

اس کا جواب میں کچھ نہ دے سکا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا کر چپکا ہو رہا۔ بہن نے جلدی خاصی پوشاک سلوا کر حمام میں بھیجا۔ نہا دھو کر وے کپڑے پہنے۔ ایک مکان اپنے پاس بہت اچھا تکلف کا میرے رہنے کو مقرر کیا۔ صبح کو شربت اور لوازمات حلوا سوہن پستہ مغزی ناشتے کو اور تیسرے پہر میوے خشک و تر پھل پھلاری اور رات دن دونوں وقت پلاؤ نان قلیے کباب تحفہ تحفہ مزے دار منگوا کر اپنے روبرو کھلا کر جاتی۔ سب طرح خاطر داری کرتی۔ میں نے ویسی تصدیع کے بعد جو یہ آرام پایا خدا کی درگاہ میں ہزار شکر بجا لایا۔ کئی مہینے اس فراغت سے گذرے کہ پاؤں اس خلوت سے باہر نہ رکھا۔

ایک دن وہ بہن جو بجائے والدہ کے میری خاطر رکھتی تھی کہنے لگی۔ "اے بیرن! تو میری آنکھوں کی پتلی اور ماں باپ کی موئی مٹی کی نشانی ہے۔ تیرے آنے سے میرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا جب تجھے دیکھتی ہوں باغ باغ ہوتی ہوں' تو نے مجھے نہال کیا لیکن مردوں کو خدا نے کمانے کے لئے بنایا ہے گھر میں بیٹھا رہنا ان کو لازم نہیں۔ جو مرد نکھٹو ہو کر گھر بیٹھتا۔ اس کو دنیا کے لوگ طعنہ مہنا دیتے ہیں: خصوص اس شہر کے آدمی چھوٹے بڑے بے سبب تمہارے رہنے پر کہیں گے اپنے باپ کی دولت دنیا کھو کھا کر بہنوئی کے ٹکڑوں پر آ پڑا۔ یہ نہایت بے غیرتی اور میری تمہاری ہنسائی اور ماں باپ کے نام کو سبب لاج لگنے کا ہے نہیں تو میں اپنے چمڑے کی جوتیاں بنا کر تجھے پہناؤں اور کلیجے میں ڈال رکھوں۔ اب یہ صلاح ہے کہ قصد سفر کا کرو۔ خدا چاہے تو دن پھریں اور اس حیرانی اور مفلسی کے بدلے خاطر جمعی اور خوشی حاصل ہو۔"

یہ بات سن کر مجھے بھی غیرت آئی اس کی نصیحت پسند کی۔ جواب دیا۔ "اچھا اب تم ماں کی جگہ ہو جو کہو سو کروں۔"

میری مرضی پا کر گھر میں جا کر پچاس توڑے اشرفی کے اصیل اور لونڈیوں کے ہاتھوں میں پوا کر میرے آگے لا رکھے اور بولی۔ "ایک قافلہ سوداگروں کا دمشق کو جاتا ہے تم ان روپوں سے جنس تجارت کی خرید کرو اور ایک تاجر ایماندار کے حوالے کر کے دستاویز پکی لکھواؤ اور آپ بھی قصد دمشق کا کرو۔ وہاں جب خیریت سے جا پہنچو اپنا مال جمع منافع سمجھ بوجھ سے لیجو یا آپ بیچیو۔"

میں وہ نقد لے کر بازار میں گیا۔ اسباب سوداگری خرید کر کے ایک بڑے سوداگر کے سپرد کیا۔ نوشت خواند سے خاطر جمع کر لی۔ وہ تاجر دریا کی راہ سے جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہوا اور فقیر نے خشکی کی راہ چلنے کی طیاری کی۔

جب رخصت ہونے لگا بہن نے ایک سرا پا بھاری جوڑا اور ایک گھوڑا جڑاؤ ساز سے تواضع کیا اور مٹھائی پکوان ایک خاصدان میں بھر کر ہرنے سے لٹکا دیا اور چھاگل پانی کی شکار بند میں بندھوا دی۔ امام ضامن کا روپیہ میرے بازو پر باندھا' دہی کا ٹیکا ماتھے پر لگا کر آنسو پی کر بولی۔ "سدھارو تمہیں خدا کو سونپا پیٹھ دکھائے جاتے ہو اسی طرح جلد اپنا منہ دکھائیو۔"

میں نے فاتحہ پڑھ کر کہا۔ "تمہارا بھی اللہ حافظ ہے۔ میں نے قبول کیا۔"

وہاں سے نکل کر گھوڑے پر سوار ہوا اور خدا کے توکل پر بھروسہ کر کے دو منزل کی ایک منزل کرتا ہوا دمشق کے پاس جا پہنچا۔ غرض جب شہر کے دروازے پر گیا بہت رات جا چکی تھی دربان اور نگہبانوں نے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے بہت منت کی کہ مسافر ہوں دور سے دھاوا مارے آتا ہوں اگر کواڑ کھول دو تو شہر میں جا کر دانے گھاس کا آرام پاؤں۔ وہ اندر سے گھڑک کر بولے "اس وقت دروازہ کھولنے کا حکم نہیں کیوں اتنی رات گئے تم آئے؟" جب میں نے جواب صاف ان سے سنا شہر پناہ کی دیوار کے تلے گھوڑے پر سے اتر زین پوش بچھا کر بیٹھا جاگنے کی خاطر ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔

جس وقت آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر ہوئی سنسان ہو گیا دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صندوق قلعے کی دیوار پر سے نیچے چلا آتا ہے۔ یہ دیکھ کر میں اچنبھے میں ہوا کہ یہ کیا طلسم ہے۔ شاید خدا نے میری حیرانی اور سرگردانی پر رحم کھا کر خزانہ غیب سے عنایت کیا۔ جب وہ صندوق زمین پر ٹھہرا ڈرتے ڈرتے میں پاس گیا۔ دیکھا کہ کاٹھ کا صندوق ہے' لالچ سے اسے کھولا۔ ایک معشوق خوبصورت کامنی سی صورت جس کے دیکھنے سے ہوش جاتا رہے گھائل لہو میں تربتر آنکھیں بند کئے کلبلاتی ہے آہستہ آہستہ ہونٹ ہلتے ہیں اور یہ آواز منہ سے نکلتی ہے۔ "اے کم بخت بے وفا! اے ظالم پر جفا! بدلا اس بھلائی اور محبت کا یہی تھا جو تو نے کیا' بھلا ایک زخم اور بھی لگا میں نے اپنا تیرا انصاف خدا کو سونپا۔" یہ کہہ کر اسی بیہوشی کے عالم میں دوپٹے کا آنچل منہ پر لے لیا میری طرف دھیان نہ کیا۔

فقیر اس کو دیکھ کر اور یہ بات سن کر سن ہو گیا۔ جی میں آیا کس ظالم بے حیا نے کیوں ایسے نازنین صنم کو زخمی کیا۔ کیا اس کے دل میں آیا اور ہاتھ اس پر کیوں چلایا۔ اس کے دل میں تو اب تلک محبت باقی ہے جو اس جان کنی کی حالت میں اس کو یاد کرتی ہے۔ آپ ہی آپ یہ کہہ رہا تھا کہ آواز اس کے کان میں گئی۔ ایک مرتبہ کپڑا منہ سے سرکا مجھ کو دیکھا۔ جس وقت اس کی نگاہیں میری نظروں سے لڑیں مجھے غش آنے لگا اور جی سنسانے لگا۔ بزور اپنے تئیں تھانبا۔ جرات کر کے پوچھا "سچ کہو تم کون ہو اور یہ کیا ماجرا ہے؟ اگر بیان کرو تو میرے دل کو تسلی ہو۔" یہ سن کر اگرچہ طاقت بولنے کی نہ تھی لیکن آہستہ سے کہا "شکر ہے' میری حالت زخموں کے مارے یہ کچھ ہو رہی ہے کیا خاک بولوں کوئی دم کی مہمان ہوں۔ جب میری جان نکل جائے تو خدا کے واسطے جوانمردی کر کے مجھ بد بخت کو اسی صندوق میں کسی جگہ گاڑ دیجیو تو میں بھلے برے کی زبان سے نجات پاؤں اور تو داخل ثواب ہو۔" اتنا بول کر وہ چپ ہو رہی۔ رات کو مجھ سے کچھ تدبیر نہ ہو سکی وہ صندوق اپنے پاس اٹھا لایا اور گھڑیاں گننے لگا کہ کب اتنی رات تمام ہو تو فجر کو شہر میں جا کر جو کچھ علاج اس کا ہو سکے بمقدور اپنے کروں وہ تھوڑی رات ایسی پہاڑ ہو گئی کہ دل گھبرا گیا۔

بارے' خدا خدا کر کے صبح جب نزدیک ہوئی مرغ بولا آدمیوں کی آوازیں آنے لگیں میں نے فجر کی نماز پڑھ کر صندوق کو خورجی میں کسا۔ جوں ہی دروازہ شہر کا کھلا میں شہر میں داخل ہوا ہر ایک آدمی دوکاندار سے حویلی کرائے کی تلاش کرنے لگا۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک مکان خوش قطع نیا فراغت کا بھاڑے لے کر جا اترا۔ پہلے اس معشوق کو صندوق سے نکال کر روئی کے پھاہوں پر ملائم بچھونا کر کے ایک گوشے میں لٹایا اور آدمی اعتباری وہاں چھوڑ کر فقیر جراح کی تلاش میں نکلا۔ ہر ایک سے پوچھتا پھرتا تھا کہ اس شہر میں جراح کاریگر کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ ایک شخص نے کہا "ایک حجام جراحی کے کسب اور حکیمی کے فن میں یکتا ہے اور اس کام میں نپٹ پکا ہے اگر مردے کو اس پاس لے جاؤ خدا کے حکم سے ایسی تدبیر کرے کہ ایک بار وہ بھی جی اٹھے وہ اس محلے میں رہتا ہے اور عیسیٰ نام ہے۔"

میں یہ خبر وہ سن کر بے اختیار چلا۔ تلاش کرتے کرتے پتے سے اس کے دروازے پر پہنچا ایک مرد سفید ریش کو دہلیز پر بیٹھے دیکھا اور کئی آدمی مرہم کی تیاری کے لئے کچھ چیزیں پیس رہے تھے۔ فقیر نے مارے خوشامد کے ادب سے سلام کیا اور کہا "میں تمہارا نام اور خوبیاں سن کر آیا ہوں ماجرا یہ ہے کہ میں اپنے ملک سے تجارت کے لئے چلا۔ قبیلہ کو بسب محبت کے ساتھ لیا جب نزدیک اس شہر کے آیا تھوڑی سی دور رہا تھا شام ہو گئی اَن دیکھے ملک میں رات کو چلنا مناسب نہ جانا۔ میدان میں ایک درخت کے تلے اتر پڑا۔ پچھلے پہر ڈاکہ آیا جو کچھ مال و اسباب پایا لوٹ لیا گہنے کے لالچ سے اس بی بی کو بھی گھائل کیا مجھ سے کچھ نہ ہو سکا۔ رات جو باقی تھی جوں توں کاٹی فجر ہی شہر میں آن کر ایک مکان کرائے پر لیا ان کو وہاں رکھ کر میں تمہارے پاس دوڑا آیا ہوں۔ خدا نے تمہیں یہ کمال دیا ہے اس مسافر پر مہربانی کر غریب خانہ پر تشریف لے چلو اس کو دیکھو اگر اس کی زندگی ہوئی تو تمہیں بڑا جس ہوگا اور میں ساری عمر غلامی کروں گا۔"

عیسیٰ جراح بہت رحم دل اور خدا پرست تھا۔ میری غریبی کی باتوں پر ترس کھا کر میرے ساتھ اس حویلی تک آیا۔ زخموں کو دیکھتے ہی میری تسلی کی۔ بولا کہ خدا کے کرم سے اس بی بی کے زخم چالیس دن میں بھر آویں گے۔ غسل شفا کا کرواوں گا۔ غرض اس مرد خدا نے سب زخموں کو نیم کے پانی سے دھو کر صاف کیا۔ جو لائق ٹانکوں کے پائے انہیں سیا اور باقی گھاوؤں پر اپنے کھیسے سے ایک ڈبیا نکال کر کتنوں میں بتی رکھی اور کتنوں پر پھاہے چڑھا کر پٹی سے باندھ دیا اور نہایت شفقت سے کہا "میں دونوں وقت آیا کروں گا تو خبردار رہیو ایسی حرکت نہ کرے جو ٹانکے ٹوٹ جائیں۔ مرغ کا شوربا بجائے غذا اس کے حلق میں چوائیو اور اکثر عرق بید مشک گلاب کے ساتھ دیا کیجو جو قوت رہے۔" یہ کہہ کر رخصت چاہی۔ میں نے بہت منت کی اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "تمہارے تشفی دینے سے میری بھی زندگی ہوئی۔ نہیں تو سوائے مرنے کے کچھ سو جھتا نہ تھا۔ خدا تمہیں سلامت رکھے۔" عطر و پان دے کر رخصت کیا۔

میں رات دن خدمت میں اس پری کی حاضر رہتا آرام اپنے اوپر حرام کیا خدا کی درگاہ میں روز روز اس کے چنگے ہونے کی دعا مانگتا۔ اتفاقاً سوداگر آ پہنچا اور میرا لعل امانت میرے حوالے کیا۔ میں نے اسے اونے پونے بیچ ڈالا اور دارو درمن میں خرچ کرنے لگا۔ وہ مرد جراح ہمیشہ آتا جاتا تھوڑے عرصے میں پری کو مکلف فرش بچھا کر مسند پر بٹھایا۔ فقیر غریبوں کو بہت سی خیر خیرات کی اس دن گویا بادشاہت ہفت اقلیم کی اس فقیر کے ہاتھ آئی۔ اور اس پری کا شفا پانے سے ایسا رنگ نکھرا کہ مکھڑا سورج کے مانند چمکنے لگا اور لندن کی طرح دمکنے لگا۔ نظر کی مجال نہ تھی کہ اس کے جمال پر ٹھہرے۔ فقیر بسر و چشم اس کے حکم کا منتظر رہتا۔ جو فرماتی سو بجا لاتا وہ اپنے حسن کے غرور سے سرداری کے دماغ میں جو میری طرف کبھی دیکھتی تو فرماتی۔ "خبردار اگر تجھے ہماری خاطر منظور ہے تو ہرگز ہماری بات میں دخل نہ ماریو۔ جو ہم کہیں سو بلا عذر کیے جائیو اپنا کسی بات میں دخل نہ کریو نہیں تو پچھتاوے گا۔"

اس کی وضع سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ حق میری خدمت گذاری اور فرمانبرداری کا اسے البتہ منظور ہے۔ فقیر بھی اس کی بے مرضی ایک کام نہ کرتا۔ اس کا فرمانا بسر و چشم بجا لاتا ایک مدت اسی راز و نیاز میں کٹی جو اس نے فرمائش کی وہیں میں نے لا کر حاضر کی۔ اس فقیر کے پاس جو کچھ نقد و جنس اصل نفع کا تھا سب صرف ہوا۔ اس بیگانے ملک میں کون اعتبار کرے جو قرض دام سے کام چلے آخر تکلیف روز مرے کے خرچ کی ہونے لگی۔ اس سے دل بہت گھبرایا فکر سے دبلا ہوتا گیا۔ چہرے کا رنگ کلجھواں ہو گیا لیکن کس سے کہوں جو کچھ دل پر گزرتی سو گزرتی قہر درویش بر جان درویش۔ ایک دن اس پری نے اپنے شعور سے دریافت کر کے کہا۔ "اے فلانے تیری خدمتوں کا حق ہمارے جی میں نقش کالحجر ہے پر اس کا عوض بالفعل ہم سے نہیں ہو سکتا۔ اگر واسطے خرچ ضروری کے کچھ درکار ہو تو اپنے دل میں اندیشہ نہ کر ایک ٹکڑا کاغذ اور دوات قلم حاضر کر۔"

میں نے تب معلوم کیا کہ یہ کسی ملک کی بادشاہزادی ہے جو اس دل و دماغ سے گفتگو کرتی ہے۔ فی الفور آگے قلمدان رکھ دیا۔ اس نازنین نے ایک شقہ دستخط خاص سے لکھ کر میرے حوالے کیا اور کہا "قلعے کے پاس ترپولیا ہے وہاں اس کوچے میں ایک حویلی بڑی سی ہے اس کے مالک کا نام شیدی بہار ہے تو جا کر اس رقعہ کو اس تلک پہنچا دے۔" فقیر موافق اس کے فرمانے کے اسی نام و نشان پر منزل مقصود تک جا پہنچا دربان کی زبانی کیفیت خط کی کہلا بھیجی، وہیں سنتے ہی ایک حبشی جوان خوبصورت ایک پھینٹا طرحدار سجے ہوئے باہر نکل آیا اگرچہ رنگ سانولا تھا پر گویا نمک بھرا ہوا میرے ہاتھ سے خط لے لیا نہ بولا نہ کچھ پوچھا انہیں قدموں پھر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں گیارہ کشتیاں سر بمہر زربفت کے توڑہ پوش پڑے ہوئے غلاموں کے سر پر دھرے باہر آیا۔ کہا اس جوان کے ساتھ جا کر جو گوشے پہنچا دو۔ میں بھی سلام کر کر رخصت ہوا۔ اپنے مکان میں لایا آدمیوں کو دروازے کے باہر سے رخصت کیا وہ کشتیاں امانت حضور میں اس پری کے گذرانیاں۔ دیکھ کر فرمایا۔ "یہ گیارہ بدری اشرفیوں کی لے اور خرچ میں لا۔ خدا رزاق ہے۔"

فقیر اس نقد کو لے کر ضروریات میں خرچ کرنے لگا۔ اگرچہ خاطر جمع ہوئی دل میں خلش رہی یا الٰہی یہ کیا صورت ہے۔ بغیر پوچھے کچھے اتنا مال نا آشنا صورت اجنبی نے ایک پرزے کاغذ پر میرے حوالے کیا اگر اس پری سے یہ بھید پوچھوں تو اس نے پہلے ہی منع کر رکھا تھا اس سے ڈر کے

[illegible] دن کے وہ معشوق مجھ سے مخاطب ہوا کہ "حق تعالیٰ نے آدمی کو خلیفہ کہا ہے [illegible] کیا ہے کہ وہ [illegible] [illegible] اس کی آدمیت میں فرق نہیں آتا پر ظاہر میں خلق اللہ کی نظروں میں اعتبار نہیں [illegible] کے ساتھ لے کر [illegible] سوداگر کی دکان میں جا اور کہو رقعہ جوہری کا بیش قیمت اور دو خلعتیں زرق برق کی مول لے آ۔"

[illegible] سوار ہو کر اس کی دکان پر گیا دیکھا تو ایک جوان شکیل ذو معرفت ہوا پہنے گدی پر بیٹھا ہے اور اس کا یہ عالم ہے کہ ایک عالم دیکھنے کے لئے دکان سے بازار تک کھڑا ہے۔ فقیر کمال شوق سے نزدیک جا کر سلام علیک کر کے بیٹھا اور جو چیز مطلوب تھی طلب کی۔ میری بات چیت اس شہر کے باشندوں کی سی نہ تھی اس جوان نے گرم جوشی سے کہا "جو صاحب کو چاہیے سب موجود ہے لیکن یہ فرمائیے کس ملک سے آنا ہوا اور اس [illegible] شہر میں رہنے کا کیا باعث ہے اگر اس حقیقت سے مطلع کیجئے تو مہربانی سے بعید نہیں۔"

میرے تئیں اپنا احوال ظاہر کرنا منظور نہ تھا کچھ بات بنا کر اور جواہر پوشاک اور قیمت اس کی دے کر رخصت چاہی اس جوان نے رو کھے پھیکے ہو کر کہا "اے صاحب اگر تم کو ایسی ہی نا آشنائی کرنی تھی تو پہلے دوستی اتنی گرمی سے کرنی کیا ضروری تھی۔ بھلے آدمیوں میں صاحب سلامت کا بڑا پاس ہوتا ہے" یہ بات اس مزے اور انداز سے کہی کہ بے اختیار دل کو بھائی۔ بے مروت ہو کر وہاں سے اٹھنا انسانیت کے مناسب نہ جانا اس کی خاطر پھر بیٹھا اور بولا "تمہارا فرمانا سر آنکھوں پر میں حاضر ہوں" اتنے کہنے سے وہ بہت خوش ہوا ہنس کر کہنے لگا "آج کے دن غریب خانے میں کرم کیجئے تو تمہاری بدولت مجلس خوشی کی سجا کر دو چار گھڑی دل بہلاویں اور کچھ کھانے پینے کا شغل باہم بیٹھ کر کریں۔"

فقیر نے اس پری کو کبھی اکیلا نہ چھوڑا تھا اس کی تنہائی یاد کر کے چند در چند عذر کئے پر اس جوان نے ہرگز نہ مانا۔ آخر وعدہ ان چیزوں کو پہنچا کر میرے پھر آنے کا لے کر اور قسم کھلا کر رخصت دی میں دکان سے اٹھ کر جواہر اور خلعتیں اس پری کی خدمت میں لایا اس نے قیمت جواہر کی اور حقیقت جوہری کی پوچھی۔ میں نے احوال مول تول کا اور مہمانی کے لئے بضد ہونے کا کہہ سنایا۔ فرمانے لگی۔ "آدمی کو اپنا قول و قرار پورا کرنا واجب ہے۔ ہمیں خدا کی نگہبانی میں چھوڑ کر اپنے وعدہ کو وفا کر۔ ضیافت قبول کرنی سنت رسول اللہ کی ہے۔"

تب میں نے کہا "میرا دل چاہتا نہیں کہ تمہیں اکیلا چھوڑ کر جاؤں اور حکم یوں ہوتا ہے ناچار جاتا ہوں جب تک آؤں گا دل تمہیں میں لگا رہے گا" یہ کہہ کر پھر اس جوہری کی دکان پر گیا۔ وہ مونڈھے پر بیٹھا میرا انتظار کھینچ رہا تھا۔ دیکھتے ہی بولا۔ "آؤ مہربان بڑی راہ دکھلائی۔" وہیں اٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور چلا چلتے چلتے ایک باغ میں لے گیا۔ وہ بڑی بہار کا باغ تھا۔ حوض اور نہروں میں فوارے چھوٹتے تھے۔ میوے طرح طرح کے پک رہے تھے۔ ہر ایک درخت مارے بوجھ کے جھوم رہے تھے۔ رنگ برنگ کے جانور ان پر بیٹھے چہچہے کر رہے تھے اور ہر مکان عالیشان میں فرش ستھرا بچھا تھا۔ وہاں لب نہر ایک بنگلے میں جا کر بیٹھا۔ ایک دم کے بعد آپ اٹھ کر چلا گیا۔ پھر دوسری پوشاک معقول پہن کر آیا۔ میں نے [illegible] سبحان اللہ چشم بد دور۔ سن کر مسکرایا اور بولا "مناسب یہ ہے کہ صاحب بھی اپنا لباس بدل ڈالیں۔" اس کی خاطر میں نے بھی [illegible]

[illegible] سے تیاری ضیافت کی کی اور سامان خوشی کا جیسا چاہیے تھا موجود کیا اور فقیر سے صحبت بہت گرم کر مزے [illegible] میں ساقی صراحی و پیالہ بلور کا لے کر حاضر ہوا اور گزک کئی قسم کی لا کر رکھی۔ نمکدان چن دئے دور شراب کا [illegible] بچے لڑکے امرد صاحب جمال زلفیں کھولے ہوئے مجلس میں گانے بجانے لگے۔ یہ عالم ہوا ایسا سماں [illegible] تو اپنی جان بھول جاتا اور بیمار اس کر دیکھا ہو جاتا اس مزے میں یکبار گی وہ جوان آنکھوں میں آنسو بھر لایا دو چار قطرے [illegible] فقیر نے بولا۔ "اب ہمارے تمہارے دوستی جانی ہوئی پس دل کا بھید دوستوں سے چھپانا کسی مذہب میں درست نہیں [illegible] کے بھروسے پر کہتا ہوں اگر حکم ہو تو اپنی معشوقہ کو بلوا کر اس مجلس میں تسلی اپنے دل کی کروں۔ اس کی جدائی سے [illegible] فقیر دیکھے بھالے فقیر کا دل بھی مشتاق ہوا میں نے کہا "مجھے تمہاری خوشی درکار ہے اس سے [illegible]"

اس جوان نے چلون کی طرف اشارت کی وہیں ایک عورت کالی کلوٹی بھتنی سی جس کے دیکھنے سے انسان بے اجل مر جائے نکل کے پاس آ بیٹھی فقیر اس کے دیکھنے سے ڈر گیا۔ دل میں کہا یہی بلا محبوبہ ایسے جوان پری زاد کی ہے جس کی اتنی تعریف اور اشتیاق ظاہر کیا۔ لاحول پڑھ کر چپ ہو رہا۔ اسی عالم میں تین دن رات مجلس شراب اور راگ رنگ کی جمی رہی چوتھی شب کو غلبہ نشہ اور نیند کا ہوا میں خواب غفلت میں بے اختیار رہو گیا۔ جب صبح ہوئی اس جوان نے جگایا۔ کئی پیالے خمار شکنی کے پلا کر اپنی معشوقہ سے کہا اب زیادہ تکلیف مہمان کو دینی خوب نہیں۔ دونوں ہاتھ پکڑ کر اٹھے میں نے رخصت مانگی خوشی بخوشی اجازت دی۔"

تب میں نے جلد اپنے قدیمی کپڑے پہن لئے اپنے گھر کی راہ لی اور اس پری کی خدمت میں جا حاضر ہوا مگر ایسا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا کہ اسے تنہا چھوڑ کر شب باش کہیں اور ہوا ہوں۔ اس تین دن کی غیر حاضری سے نہایت خجل ہو کر عذر کیا اور قصہ ضیافت کا اور اس کے نہ رخصت کرنے کا سارا عرض کیا۔ وہ ایک دانا زمانے کی تھی تبسم کر کے بولی۔ "کیا مضائقہ اگر دوست کی خاطر رہتا ہوا ہم نے معاف کیا تیری کیا تقصیر ہے جب آدمی کسی کے گھر جاتا ہے تب اس کی مرضی سے پھر آتا ہے لیکن یہ مفت کی مہمانیاں کھا پی کر چپکے ہو رہو گے یا اس کا بدلا بھی اتارو گے۔ اب یہ لازم ہے کہ جا کر اس سوداگر بچے کو اپنے ساتھ لے آ اور اس سے دوچند ضیافت کر اور اس بات کا کچھ اندیشہ نہیں۔ خدا کے کرم سے ایک دم میں سب لوازمہ تیار ہو جائے گا اور بخوبی مجلس ضیافت کی رونق پائے گی۔"

فقیر موافق حکم کے جوہری کے پاس گیا اور کہا۔ "تمہارا فرمانا میں تو سر آنکھوں سے بجالایا اب تم بھی مہربانی کی راہ سے میری عرض قبول کرو۔" اس نے کہا "جان و دل سے حاضر ہوں۔" تب میں نے کہا۔ "اگر اس بندے کے گھر تشریف لے چلو عین غریب نوازی ہے۔"

اس جوان نے بہت عذر و حیلے کئے پر میں نے پنڈ نہ چھوڑا جب تک وہ راضی نہ ہوا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کو اپنے مکان پر لے چلا۔ راہ میں یہی فکر کرتا آتا تھا کہ اگر آج اپنے تئیں مقدور ہوتا تو ایسی تواضع کرتا کہ یہ بھی خوش ہوتا اور اب اسے لئے جاتا ہوں دیکھئے کیا اتفاق ہوتا ہے۔ اسی حیص بیص میں گھر کے نزدیک پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دروازے پر دھوم دھام ہو رہی ہے گلیارے میں جھاڑو دے کر چھڑکاؤ کیا ہے۔ یساول اور عصابردار کھڑے ہیں۔ میں حیران ہوا لیکن اپنا گھر جان کر قدم اندر رکھا دیکھا تو تمام حویلی میں فرش مکلف لائق ہر مکان کے جابجا بچھا ہے اور مسندیں لگی ہیں، پاندان گلاب پاش، عطردان، پیکدان، چنگیریں نرگس دان قرینے سے دھری ہیں۔ طاقوں پر رنگترے، کنولے، نارنگیاں گلابیاں رنگ برنگ کی چنی ہیں۔ ایک طرف رنگ آمیز ابرک کی ٹٹیوں میں چراغاں کی بہار ہے۔ ایک طرف جھاڑ اور سرد کنول کے روشن ہیں اور تمام دالان اور شہ نشینوں میں طلائی شمعدانوں پر کافوری شمعیں چڑھی ہیں اور جڑاؤ فانوسیں اوپر دھری ہیں سب آدمی اپنے عہدوں پر مستعد ہیں اور باورچی خانے میں دیگیں کھٹکھنا رہی ہیں۔ آبدار خانے کی ویسی ہی تیاری ہے کوری کوری ٹھلیاں روپے کی گھڑونچیوں پر صافیوں سے بندھی اور بجروں سے ڈھکی رکھی ہیں آگے چوکی پر ڈو تلے کٹورے مع تھالی سرپوش دھرے برف کے آبخورے لگ رہے ہیں اور شورے کی صراحیاں ہل رہی ہیں۔ غرض سب اسباب بادشاہانہ موجود ہے اور کنچنیاں بھانڈ بھگتیے کلاونت قوال اچھی پوشاک پہنے ساز کے سر ملائے حاضر ہیں۔ فقیر نے اس جوان کو لے جا کر مسند پر بٹھایا اور دل میں حیران تھا کہ یاالٰہی اتنے عرصے میں یہ سب تیاری کیونکر ہوئی۔ ہر طرف دیکھتا پھرا لیکن اس پری کا نشان نہ پایا۔ اسی جستجو میں ایک مرتبہ باورچی خانے کی طرف جا نکلا دیکھتا ہوں کہ وہ نازنین ایک مکان میں گلے میں کرتی پاؤں میں تہ پوشی سر پر رومال سفید اوڑھے ہوئے سادی خوزادی بن گہنے پاتے بنی ہوئی۔

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی کہ جیسے خوشنما لگتا ہے دیکھو چاند بن گہنے

خبر گیری میں ضیافت کی لگ رہی ہے اور تاکید ہر ایک کھانے کی کر رہی ہے کہ خبردار بامزہ ہو اور آب و نمک بوباس درست رہے اس محنت سے وہ گلاب سا بدن پسینہ پسینہ ہو رہا ہے۔ میں پاس جا کر تصدق ہوا اور اس شعور و لیاقت کو سراہ کر دعائیں دینے لگا۔ وہ یہ خوشامد سن کر تیوری چڑھا کر

[illegible] سے ایسے ایسے کام ہوتے ہیں کہ فرشتے کی مجال نہیں۔ میں نے ایسا کیا کیا ہے جو اتنا حیران ہو رہا ہے۔ بس بہتر یہ ہے کہ [illegible] آئیں بھلا کہہ تو یہ کون آدمیت ہے کہ مہمان کو اکیلا بٹھلا کر ادھر ادھر پڑے پھرتے ہو۔ وہ اپنے جی میں کیا کہتا ہوگا جلد جا مجلس میں بیٹھ کر [illegible] خاطر داری کر اور اس کی معشوقہ کو بھی بلوا کر اپنے پاس بٹھلا۔"

فقیر وہیں اس جوان کے پاس گیا اور گرمجوشی کرنے لگا۔ اتنے میں دو غلام صاحب جمال صراحی اور جام جڑاؤ ہاتھ میں لئے موجود آئے شراب پلانے لگے۔ اس وقت میں نے اس جوان سے کہا "میں سب طرح مخلص اور خادم ہوں بہتر یہ ہے کہ وہ صاحب جمال کہ جس کی طرف دل صاحب کا مائل ہے تشریف لائے تو بڑی بات ہے۔ اگر فرماؤ تو آدمی بلانے کی خاطر جائے۔"

یہ سنتے ہی وہ خوش ہو کر بولا۔ "بہت اچھا اس وقت تم نے میرے دل کی بات کہی۔"

میں نے ایک خوجے کو بھیجا جب آدھی رات گئی وہ چڑیل خاصے چنڈول پر سوار ہو کر بلائے ناگہانی سی آ پہنچی۔ فقیر نے بنابر خاطر سے مہمان کا استقبال کر کے نہایت تپاک سے برابر اس جوان کے لا بٹھلایا۔ جوان اسے دیکھتے ہی ایسا خوش ہوا جیسے دنیا کی نعمت ملی وہ بھتنی بھی اس جوان پری زاد کے گلے لپٹ گئی۔ سچ سچ یہ تماشا ہوا جیسے چودھویں رات کے چاند کو گہن لگتا ہے جتنے مجلس میں آدمی تھے اپنی اپنی انگلیاں دانتوں میں داب کر رہ گئے کہ کیا کوئی بلا اس جوان پر مسلط ہوئی۔ جس کی نگاہ تھی اسی طرف تھی تماشا مجلس کا بھول کر اس کا تماشا دیکھنے لگے۔

ایک شخص کنارے سے بولا۔ "یارو عشق اور عقل میں ضد ہے جو کچھ عقل میں نہ آئے یہ کافر عشق کر دکھائے۔ لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھوں سے دیکھئے۔"

سبھوں نے کہا "آمنا یہی بات ہے۔"

یہ فقیر بموجب حکم کے مہمانداری میں حاضر تھا ہر چند جوان ہم نوالہ و ہم پیالہ ہونے کو مجوز ہوتا تھا پر میں ہرگز اس پری کے خوف کے مارے اپنا دل کھانے پینے یا سیر تماشے کی طرح رجوع نہ کرتا تھا اور عذر مہمانداری کا کر کے اس میں شامل نہ ہوتا اسی کیفیت سے تین شبانہ روز گزرے چوتھی رات وہ جوان نہایت جوش سے مجھے بلا کر کہنے لگا کہ اب ہم بھی رخصت ہوں گے تمہاری خاطر اپنا سب کاروبار چھوڑ چھاڑ کر تین دن سے تمہاری خدمت میں حاضر ہیں تم بھی تو ہمارے پاس ایک دم بیٹھ کر ہمارا دل خوش کرو۔ میں نے اپنے جی میں کہا کہ اگر اس وقت کہنا اس کا نہیں مانتا تو آزردہ ہوگا۔ پس نئے دوست اور مہمان کی خاطر رکھنی ضرور ہے۔"

تب میں نے کہا "صاحب کا حکم بجالانا منظور ہے کہ الامر فوق الادب۔"

سنتے ہی اس جوان نے پیالہ تواضع کیا اور میں نے پی لیا۔ پھر تو ایسا پیہم دور چلا کہ تھوڑی دیر میں سب آدمی مجلس کے کیفی ہو کر بے خبر ہو گئے اور میں بھی بے ہوش ہو گیا۔ جب صبح ہوئی آفتاب دو نیزے بلند ہوا تب میری آنکھ کھلی تو دیکھا میں نے نہ وہ طیاری ہے نہ وہ مجلس نہ وہ پری فقط حویلی خالی پڑی ہے مگر ایک کونے میں کمبل لپٹا ہوا دھرا ہے اس کو جو کھول کر دیکھا تو وہ جوان اور اس کی رنڈی دونوں کے سر کٹے پڑے ہیں۔ یہ حالت دیکھتے ہی حواس جاتے رہے۔ عقل کچھ کام نہیں کرتی تھی کہ یہ کیا تھا اور کیا ہو گیا حیرانی سے ہر طرف تک رہا تھا اتنے میں ایک خواجہ سرا جسے ضیافت کے کام کاج میں دیکھا تھا نظر پڑا فقیر کو اس کے دیکھنے سے کچھ تسلی ہوئی احوال اس واردات کا پوچھا۔

اس نے جواب دیا "تجھے اس بات کی تحقیق کرنے سے کیا حاصل جو تو پوچھتا ہے؟"

میں نے بھی اپنے دل میں غور کیا سچ تو کہتا ہے' پھر ایک ذرا تامل کر کے میں بولا۔ "خیر نہ کہو بھلا یہ تو بتاؤ وہ معشوقہ کس مکان میں ہے؟"

تب اس نے کہا "جہاں تک میں جانتا ہوں سو کہہ دوں گا لیکن تجھ سا آدمی عقلمند بے مرضی حضور کے دو دن کی دوستی پر بے محابا بے تکلف

ہو کر محبت سے نوشی کی باہم کرے یہ کیا معنی رکھتا ہے؟"

فقیر اپنی حرکت اور اس کی نصیحت سے بہت نادم ہوا سوائے اس بات کے زبان سے کچھ نہ نکلا کہ "فی الحقیقت اب تو تقصیر ہوئی معاف کیجئے۔"

بارے محلی نے مہربان ہو کر اس پری کے مکان کا نشان بتایا اور مجھے رخصت کیا۔ آپ ان دونوں زخمیوں کے گاڑنے دابنے کی فکر میں رہا میں تہمت سے اس فساد کی الگ ہوا اور اشتیاق میں اس پری کے ملنے کے لئے گھبراتا ہوا گرتا پڑتا ڈھونڈھتا شام کے وقت اس کوچے میں اسی پتے پر جا پہنچا اور نزدیک دروازے کے ایک گوشے میں ساری رات تلپھتے کٹی۔ کسی کی آمد و رفت کی آہٹ نہ ملی اور کوئی احوال پرساں میرا نہ ہوا اسی بےکسی کی حالت میں صبح ہو گئی جب سورج نکلا اس مکان کے بالاخانے کی ایک کھڑکی سے وہ ماہرو میری طرف دیکھنے لگی۔ اس وقت عالم خوشی کا جو مجھ پر گذرا دل ہی جانتا ہے۔ شکر خدا کا کیا۔

اتنے میں ایک خوجے نے میرے پاس آکر کہا "اسی مسجد میں تو جا کر بیٹھ شاید تیرا مطلب اس جگہ بر آئے اور اپنے دل کی مراد پائے۔"

فقیر اس کے فرمانے سے وہاں سے اٹھ کر اسی مسجد میں جا کر جا رہا لیکن آنکھیں دروازے کی طرف لگ رہی تھیں کہ دیکھئے پردہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے تمام دن جیسے روزہ دار شام ہونے کا انتظار کھینچتا ہے میں نے بھی وہ روز ویسے ہی بیقراری میں کاٹا بارے جس تس طرح سے شام ہوئی اور دن پہاڑ سا چھاتی پر سے ٹلا ایک بارگی وہی خواجہ سرا آیا اس شفیق نے کہ سب راز و نیاز کا محرم تھا نہایت تسلی دی۔ ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے ساتھ لے چلا رفتہ رفتہ ایک باغیچے میں مجھے بٹھا کر کہا یہاں رہو جب تک تمہاری آرزو بر نہ آئے اور آپ رخصت ہو کر شاید میری حقیقت حضور میں کہنے گیا۔ میں اس باغ کے پھولوں کی بہار اور چاندنی کا عالم اور حوض نہروں میں فوارے ساون بھادوں کے اچھلنے کا تماشا دیکھ رہا تھا لیکن جب پھولوں کو دیکھتا تب اس گلبدن کا خیال آتا۔ جب چاند پر نظر پڑتی تب اس ماہ رو کا مکھڑا یاد کرتا۔ یہ سب بہار اس کے بغیر میری آنکھوں میں خار تھی۔

بارے خدا نے اس کے دل کو مہربان کیا ایک دم کے بعد وہ پری دروازے سے جیسے چودھویں رات کا چاند بناؤ کئے گلے میں پیشواز بادلے کی سنجاب کی موتیوں کا دردامن لگا اور سر پر اوڑھنی جس میں آنچل پلو لہر گوکھرو لگا ہوا سر سے پاؤں تک موتیوں میں جڑی روش پر آکر کھڑی ہوئی اس کے آنے سے تروتازگی نئے سرے سے اس باغ کو اور اس فقیر کے دل کو ہو گئی ایک دم ادھر ادھر سیر کر کے شہ نشین میں مغرق مسند پر تکیہ لگا کر بیٹھی۔ میں دوڑ کر پروانے کی طرح جیسے شمع کے گرد پھرتا ہے تصدق ہوا اور غلام کے مانند دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوا اتنے میں وہ خواجہ سرا میری خاطر بطور سفارش کے عرض کرنے لگا۔ میں نے اس محلی سے کہا "بندہ گنہگار تقصیر وار ہے جو کچھ سزا میرے لائق ٹھہرے سو ہو۔"

وہ پری ازبسکہ ناخوش تھی بددماغی سے بولی کہ اب اس کے حق میں یہی بھلا ہے کہ سو توڑے اشرفی کے لیوے اپنا اسباب درست کر کے وطن کو سدھارے میں یہ بات سنتے ہی کاٹھ کا ہو گیا اور سوکھ گیا کہ اگر کوئی میرے بدن کو کاٹے تو ایک بوند لہو کی نہ نکلے اور تمام دنیا آنکھوں کے آگے اندھیری لگنے لگی اور ایک آہ نامرادی کی بے اختیار جگر سے نکلی آنسو بھی ٹپکنے لگے۔ سوائے خدا کے اس وقت کسی کی توقع نہ رہی مایوس محض ہو کر اتنا بولا۔ "بھلا ٹک اپنے دل میں غور فرمایئے اگر مجھ کم نصیب کو دنیا کا لالچ ہوتا تو اپنا جان و مال حضور میں نہ کھوتا کیا ایک بارگی حق خدمت گذاری اور جاں نثاری کا عالم سے اٹھ گیا جو مجھ کم بخت پر اتنی بے مہری فرمائی خیر اب میرے تئیں بھی زندگی سے کچھ کام نہیں معشوقوں کی بے وفائی سے بیچارے عاشق نیم جاں کا نباہ نہیں ہوتا۔"

یہ سن کر تیکھی تیوری چڑھا کر خفگی سے بولی۔ "چہ خوش آپ ہمارے عاشق ہیں مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ اے بے وقوف اپنے حوصلے سے زیادہ باتیں نہ بنا یہ خیال خام ہے چھوٹا منہ بڑی بات بس چپ رہ یہ گلی بات چیت مت کر اگر کسی اور نے یہ حرکت بے معنی کی ہوتی پروردگار قسم

میں کیونکر اس کے حکم کے خلاف کروں تجھ پر کیا کروں تیری خدمت یاد آتی ہے۔ مطلب اس میں بھلائی ہے کہ اپنی راہ لے۔ تیری قسمت کا دانہ پانی ہماری سرکار میں اتنا ہی تھا۔"

پھر میں نے رو رو کے کہا۔ "اگر میری تقدیر میں یہی لکھا ہے کہ اپنے دل کے مقصد کو نہ پہنچوں اور جنگل پہاڑ میں سر ٹکراتا پھروں تو لاچار ہوں۔"

اس بات سے بھی دق ہو کر کہنے لگی۔ "میرے تئیں یہ بسا ہنے چوچلے اور رمز کی باتیں پسند نہیں آتیں۔ اس اشارے کی گفتگو کے جو لائق ہو اس سے جا کر کہو۔" پھر اس خفگی کے عالم میں اٹھ کر اپنے دولت خانے کو چلی۔ میں نے بہتیرا سر پٹکا متوجہ نہ ہوئی۔ ناچار میں بھی اس مکان سے مایوس اور ناامید ہو کر نکلا۔

غرض چالیس دن تک یہی نوبت رہی جب شہر کی کوچہ گردی سے اکتا جاتا جنگل میں نکل جاتا جب وہاں سے گھبراتا تو شہر کی گلیوں میں دیوانہ سا آتا نہ دن کو کھاتا نہ رات کو سوتا جیسے دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا زندگی انسان کی کھانے پینے سے ہے 'آدمی اناج کا کیڑا ہے' طاقت بدن میں مطلق نہ رہی اپاہج ہو کر اسی مسجد کی دیوار کے تلے جا پڑا کہ ایک روز وہی خواجہ سرا جمعے کی نماز پڑھنے آیا میرے پاس سے ہو کر چلا میں یہ شعر ناطاقتی سے پڑھ رہا تھا۔

اس درد دل سے موت ہو یا دل کو تاب ہو　　　قسمت میں جو لکھا ہے الٰہی شتاب ہو

اگرچہ ظاہر میں صورت میری بالکل تبدیل ہو گئی تھی چہرے کی یہ شکل بنی تھی کہ جس نے مجھے پہلے دیکھا تھا وہ بھی نہ پہچان سکتا کہ یہ وہی آدمی ہے لیکن وہ محلی آواز دور کی سن کر متوجہ ہوا میرے تئیں بغور دیکھ کر افسوس کیا اور شفقت سے مخاطب ہوا کہ آخر یہ حالت اپنی پہنچائی۔

میں نے کہا۔ "اب تو جو ہوا سو ہوا مال سے بھی حاضر تھا جان بھی تصدق کی اس کی خوشی یوں ہوئی تو کیا کروں۔"

یہ سن کر ایک خدمتگار میرے چھوڑ کر مسجد میں گیا نماز اور خطبے سے فراغت کر کے جب باہر نکلا فقیر کو ایک میانے میں ڈال کر اپنے ساتھ خدمت میں اس پری بے پروا کے جا کر چق کے باہر بٹھلایا اگرچہ میری رو دہت کچھ باقی نہ رہی تھی پر مدت تک شب و روز اس پری کے پاس اتفاق سے رہتا ہوا تھا جان بوجھ کر بیگانی ہو کر خوجے سے پوچھنے لگی۔ "یہ کون ہے؟"

اس مرد آدمی نے کہا۔ "یہ وہی کم بخت بد نصیب ہے جو حضور کی خفگی اور عتاب میں پڑا تھا اسی سبب سے اس کی یہ صورت بنی ہے عشق کی آگ سے جلا جاتا ہے ہر چند آنسوؤں کے پانی سے بجھاتا ہے پر وہ دونی بھڑکتی ہے کچھ فائدہ نہیں ہوتا علاوہ اپنی تقصیر خجالت سے مرا جاتا ہے۔"

پری نے ٹھٹھولی سے فرمایا۔ "کیوں جھوٹ بکتا ہے بہت دن ہوئے اس کی خبر وطن پہنچنے کی مجھے خبرداروں نے دی ہے واللہ اعلم یہ کون ہے اور تو کس کا ذکر کرتا ہے۔"

اس دم خواجہ سرا نے ہاتھ جوڑ کر التماس کیا۔ "اگر جان کی امان پاؤں تو عرض کروں۔"

فرمایا کہ "تیری جان تجھے بخشی۔"

خواجہ بولا۔ "آپ کی ذات قدردان ہے واسطے خدا کے چلون درمیان سے اٹھا پہچان لیجئے اور اس کی بے کسی کی حالت پر رحم کیجئے ناحق شناسی خوب نہیں اب اس کے احوال پر جو کچھ ترس کھائیے بجا ہے اور جائے ثواب ہے آگے حد ادب ہے جو مزاج مبارک میں آوے سوئی بہتر ہے۔"

اتنا کہنے پر مسکرا کر فرمایا۔ "بھلا کوئی ہووے اسے دارالشفا میں رکھو جب بھلا چنگا ہو گا تب اس کے احوال کی پرسش کی جائے گی۔"

خوجے نے کہا۔ "اگر اپنے دست خاص سے گلاب اس پر چھڑکئے اور زبان سے کچھ فرمایئے تو اس کو اپنے جینے کا بھروسہ [illegible] بری چیز ہے دنیا بہ امید قائم ہے۔"

اس پر بھی اس پری نے کچھ نہ کہا۔ یہ سوال و جواب سن کر میں بھی اپنے جی سے اکتا رہا تھا۔ نڈر ہو کر بول اٹھا کہ "اب اس طور کی زندگی کو دل نہیں چاہتا۔ پاؤں تو گور میں لٹکا چکا ہوں۔ ایک روز مرنا ہے اور علاج میرا شاہزادی کے ہاتھ میں ہے کریں یا نہ کریں وہ جانیں۔"

بارے پھر مقلب القلوب نے اس سنگدل کے دل کو نرم کیا۔ مہربان ہو کر فرمایا۔ "جلد بادشاہی حکیموں کو حاضر کرو۔"

وہیں طبیب آ کر جمع ہوئے۔ نبض و قارورہ دیکھ کر بہت غور کیا۔ آخر تشخیص میں ٹھہرا کر یہ شخص کہیں عاشق ہوا ہے۔ سوائے وصل معشوق کے اس کا کچھ علاج نہیں جس وقت وہ ملے یہ صحت پاوے۔ حسب حکیموں کی زبانی بھی یہی مرض ٹھہرا۔ حکم کیا۔ "اس جوان کو حمام میں لے جاؤ، نہلا کر خاصی پوشاک پہنا کر حضور میں لے آؤ۔" وہیں مجھے باہر لے گئے۔ حمام کروا کر اچھی پوشاک پہنا خدمت میں پری کے حاضر کیا۔ تب وہ نازنین تپاک سے بولی۔ "تو نے مجھے بیٹھے بٹھائے ناحق بدنام اور رسوا کیا۔ اب اور کیا چاہتا ہے جو تیرے دل میں ہے صاف صاف بیان کر۔"

فقیر کا اس وقت یہ عالم ہوا کہ شادی مرگ ہو جائے۔ خوشی کے مارے ایسا پھولا کہ جامے میں نہ سماتا تھا اور صورت شکل بدل گئی۔ شکر خدا کا کیا اور اس سے کہا۔ "اس دم ساری حکیمی آپ پر ختم ہوئی کہ مجھ سے مردے کو ایک بات میں زندہ کیا۔ دیکھو تو اس وقت سے اس وقت تک میرے احوال میں کیا فرق ہو گیا۔" یہ کہہ کر تین بار گرد پھرا اور سامنے آ کر کھڑا ہوا۔ کہا "حضور سے یوں حکم ہوتا ہے کہ جو تیرے جی میں ہو سو کہہ۔"

میں نے کہا کہ بندے کو ہفت اقلیم کی سلطنت سے زیادہ ہے کہ غریب نوازی کر کے اس عاجز کو قبول کیجئے اور اپنی قدم بوسی سے سرفرازی دیجئے۔ "ایک لحظہ تو سن کر غوطے میں گئی پھر کن انکھیوں سے دیکھ کر کہا۔ "بیٹھو تم نے خدمت اور وفاداری ایسی ہی کی ہے جو کچھ کہو سو پھبتی ہے اور اپنے دل پر بھی نقش ہے، خیر ہم نے قبول کیا۔" اسی دن اچھی ساعت اور سبھ لگن میں چپکے چپکے قاضی نے نکاح پڑھ دیا۔ بعد اتنی محنت اور آفت کے خدا نے یہ دن دکھلایا کہ میں نے اپنے دل کا مدعا پایا لیکن جیسی دل میں آرزو اس پری سے ہم بہتر ہونے کی تھی ویسی ہی جی میں بے کلی اس واردات عجیب کے معلوم کرنے کی تھی کہ آج تک میں کچھ نہ سمجھا کہ یہ پری کون اور وہ حبشی سانولا سجیلا جس نے ایک پرزے کاغذ پر اتنی اشرفیوں کی بدری میرے حوالے کی کون تھا اور طیاری ضیافت کی بادشاہوں کے لائق ایک پہر میں کیونکر ہوئی اور وے دونوں بے گناہ اس مجلس میں کے لئے مارے گئے اور سبب خفگی اور بے مروتی کا باوجود خدمت گزاری اور ناز برداری کے مجھ پر کیا ہوا اور پھر ایک بارگی اس عاجز کو یوں سر بلند کیا۔ غرض اسی واسطے بعد رسم رسومات عقد کے آٹھ دن تک باوصف اس اشتیاق کے قصد مباشرت نہ کیا۔ رات کو ساتھ سوتا دن کو یوں ہی اٹھ کھڑا ہوتا۔

ایک دن غسل کے لئے میں نے خواص کو کہا کہ تھوڑا پانی گرم کر دے تو نہاؤں۔

ملکہ مسکرا کر بولی۔ "کس برتے پر تتا پانی؟" میں خاموش ہو رہا لیکن وہ پری میری حرکت سے حیران ہوئی بلکہ چہرے پہ آثار خفگی کے نمودار ہوئے۔ یہاں تلک کہ ایک روز بولی۔ "تم بھی عجیب آدمی ہو یا اتنے گرم یا ایسے ٹھنڈے اس کو کیا کہتے ہیں۔ اگر تم میں قوت نہ تھی کیوں ایسی کچی ہوس پکائی؟"

تب تو اس وقت میں نے بے دھڑک ہو کر کہا "اے جانی منصفی شرط ہے آدمی کو چاہیے کہ انصاف سے نہ چوکے۔"

بولی۔ "اب کیا انصاف رہ گیا ہے جو کچھ ہونا تھا سو ہو چکا۔"

تمہیں نے کہا: واقعی بڑی آرزو اور مراد میری یہی تھی سو مجھے مل گئی لیکن دل میرا وسوسے میں ہے اور معقول آدمی کی خاطر پریشان رکھتی ہے اس سے کچھ اور کچھ سمجھ نہیں سکتا انسانیت سے خارج ہو جاتا ہے میں نے اپنے دل میں یہ قول کیا تھا کہ بعد اس نکاح کے جو دل کی شادی ہے کئی باتیں جو خیال میں نہیں آئیں اور نہیں کھلتیں حضور سے پوچھوں گا کہ زبان مبارک سے اس کا بیان سنوں تو جی کو تسکین ہو۔"

اس پری نے خفا ہو کر کہا: "کیا خوب ابھی سے بھول گئے یاد کرو بارہا ہم نے کہا کہ ہمارے کام میں ہرگز دخل نہ کرو اور کسی بات کے معترض نہ ہو خلافِ معمول یہ بے ادبی کرنا کیا لازم ہے؟"

میں نے ہنس کر کہا: "جیسے اور بے ادبیاں معاف کرنے کا حکم ہے ایک یہ بھی سہی" وہ پری نظریں بدل کر غصے میں آ کر آگ بگولا بن گئی اور بولی "تم تو بہت سر پر چڑھے اپنا کام کر ان باتوں سے تجھے کیا فائدہ ہوگا؟"

میں نے کہا: "دنیا میں اپنے بدن کی شرم سب سے زیادہ ہوتی ہے لیکن ایک دوسرے کا واقف کار ہوتا ہے جب ایسی چیز دل پر روا رکھی تو اور کونسا بھید چھپانے کے لائق ہے؟"

میرے اس دھڑ کو وہ پری ہو قوف سے دریافت کر کے کہنے لگی: "یہ بات سچ ہے پر جی میں یہ سوچ آتا ہے کہ اگر بھید کھولوں کار راز فاش ہو تو بڑی قیامت مچے۔"

میں بولا: "یہ کیا ذکر ہے بندے کی طرف سے یہ خیال دل میں نہ لاؤ اور خوشی سے ساری کیفیت جو بیتی ہے فرماؤ ہرگز ہرگز میں دل سے زبان تک نہ لاؤں گا کسو کے کان پڑنا کیا امکان ہے؟"

جب اس نے دیکھا کہ اب سوا کہنے کے اس عزیز سے چھٹکارا نہیں ناچار ہو کر بولی: "ان باتوں کے کہنے میں بہت سی خرابیاں ہیں تو خواہ مخواہ در پے ہوا آخر تیری خاطر عزیز ہے اس لئے اپنی سرگزشت بیان کرتی ہوں تجھے اس کا پوشیدہ رکھنا ضرور ہے۔"

غرض بہت سی تاکید کر کے کہنے لگی کہ میں بدبخت ملک دمشق کے سلطان کی بیٹی ہوں اور وہ سلاطینوں سے بڑا بادشاہ ہے سوائے میرے کوئی لڑکا بالا اس کے یہاں نہیں ہوا۔ جس دن سے میں پیدا ہوئی ماں باپ کے سایہ میں ناز و نعمت اور خوشی خرمی سے پلی جب ہوش آیا تب اپنے دل کو خوبصورت اور نازنینوں کے ساتھ لگایا چنانچہ ستھری ستھری پری زاد ہمجولی امرا زادیاں مصاحبت میں اور اچھی اچھی قبول صورت ہم عمر خواصیں سہیلیاں خدمت میں رہتی تھیں تماشا ناچ اور رنگ کا ہمیشہ دیکھا کرتی دنیا کے واسطے بھلے برے سے کچھ کام نہ تھا اپنی بے فکری کے عالم کو دیکھ کر سوائے خدا کے شکر کے کچھ منہ سے نہ نکلتا تھا اتفاقاً طبیعت خود بخود ایسی بے مزہ ہوئی کہ نہ مصاحبت کسو کی بھاوے نہ مجلس خوشی کی خوش آوے سودائی سا مزاج ہو گیا دل اداس اور حیران نہ کسو کی صورت اچھی لگے نہ بات کہنے سننے کو جی چاہے میری یہ حالت دیکھ کر دائی دوا چھوچھو سب کی سب متفکر ہوئیں اور قدموں پر گرنے لگیں یہی خواجہ سرا نمک حلال قدیم سے میرا محرم و ہم راز ہے اس سے کوئی بات مخفی نہیں میری وحشت دیکھ کر بولا۔ "اگر بادشاہزادی تھوڑا سا شربت ورق الخیال کا نوش جان فرمائیں تو اغلب ہے کہ طبیعت بحال ہو جائے اور فرحت مزاج میں آوے۔" اس کے اس طرح کہنے سے مجھے بھی شوق ہوا تب میں نے فرمایا جلد حاضر کر۔ محلی باہر گیا ایک صراحی اسی شربت کی تکلف سے بنا کر برف میں لگا کر لڑکے کے ہاتھ نوکر آیا میں نے پیا جو کچھ اس کا فائدہ بیان کیا تھا ویسا ہی دیکھا اس وقت اس خدمت کے انعام میں ایک بھاری خلعت خوجے کو عنایت کیا اور حکم کیا کہ ایک صراحی ہمیشہ بلاناغہ اسی وقت حاضر کیا کر اس دن سے یہ مقرر ہوا کہ خواجہ سرا صراحی اسی چھوکرے کے ہاتھ لوا دے اور بندی پیتی جب اس کا نشہ طلوع ہوتا تو اس کی لہر میں اس لڑکے سے ٹھٹھا مزاح کر کے دل بہلاتی وہ بھی جب ڈھیٹھ ہوا تب اچھی اچھی میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگا صاحب کی نقلیں لانے بلکہ آہ بھرنے اور سسکیاں لینے لگا صورت تو اس کی طرح دار لائق دیکھنے

کے تھی بے اختیار جی چاہنے لگا میں دل کے شوق اور اٹھکیلیوں کے ذوق سے ہر روز انعام بخش دیتے گی پر وہ کم بخت ویسے کپڑوں سے جو ہمیشہ پہنے رہتا تھا حضور میں آتا بلکہ وہ لباس بھی میلا کچیلا ہو جاتا۔ ایک دن میں نے پوچھا "تجھے سرکار سے اتنا کچھ ملا پر تو نے اپنی صورت ویسی ہی پریشان رکھی۔ کیا سبب ہے تو نے روپے کہاں خرچ کئے یا جمع کر رکھے؟"

لڑکے نے یہ خاطر داری کی باتیں جو سنیں اور مجھے اپنا احوال پرساں پایا آنسو ڈبڈبا کر کہنے لگا "جو کچھ آپ نے اس غلام کو عنایت کیا سب استاد نے لیا مجھے ایک پیسہ نہیں دیا کہاں سے دوسرے کپڑے بناؤں جو پہن کر حضور میں آؤں۔ اس میں میری تقصیر نہیں میں لاچار ہوں۔"

اس غریبی کے کہنے پر اس کے مجھے ترس آیا۔ وہیں خواجہ سرا کو فرمایا آج سے اس لڑکے کو اپنی صحبت میں تربیت کر اور لباس اچھا تیار کرا کر پہنا اور لونڈوں میں بے فائدہ کھیلنے کودنے نہ دے بلکہ اپنی خوشی یہ ہے کہ آداب لائق حضور کی خدمت کے سیکھے اور حاضر رہے خواجہ سرا موافق فرمانے کے بجا لایا اور میری مرضی جو ادھر دیکھی نہایت اس کی خبر گیری کرنے لگا تھوڑے دنوں میں فراغت اور خوش خرمی کے سبب اس کا رنگ و روغن کچھ کا کچھ ہو گیا اور کینچلی سی ڈال دی۔ میں اپنے دل کو ہر چند سنبھالتی پر اس کافر کی صورت جی میں ایسی کھب گئی تھی یہی جی چاہتا تھا کہ مارے پیار کے اسے کلیجے میں ڈال رکھوں اور اپنی آنکھوں سے ایک پل جدا نہ کروں۔ آخر اس کو مصاحبت میں داخل کیا اور خلعتیں طرح طرح کی اور جواہر رنگ برنگ کے پہنا کر دیکھا کرتی۔ بارے اس کے نزدیک رہنے سے آنکھوں کو سکھ کلیجے کو ٹھنڈک ہوتی۔ ہر دم اس کی خاطر داری کرتی۔ آخر کو میری یہ حالت پہنچی کہ اگر وہ ایک دم کچھ ضروری کام کو میرے سامنے سے جاتا تو چین نہ آتا۔

بعد کئی برس کے وہ بالغ ہوا مسیں بھیگنے لگیں چھب تختی درست ہوئی تب اس کا چرچا باہر درباریوں میں ہونے لگا دربان اور روپے میوڑے بار یدار بساول چوبدار اس کو محل کے اندر آنے جانے سے منع کرنے لگے۔ آخر اس کا آنا موقوف ہوا مجھے تو اس بغیر کل نہ آتی تھی ایک دم پہاڑ تھا۔ جب یہ احوال نا امیدی کا سنا ایسی بد حواس ہو گئی گویا مجھ پر قیامت ٹوٹی اور یہ حالت ہوئی کہ نہ کچھ کہہ سکتی ہوں اور نہ اس بن رہ سکتی ہوں۔ کچھ بس نہیں چل سکتا الٰہی کیا کروں عجب طرح کا قلق ہوا۔ مارے بے قراری کے اس محلی کو جو میرا ابھیدی تھا بلا کر کہا مجھے خور اور پرداخت اس لڑکے کی منظور ہے بالفعل صلاح وقت یہ ہے کہ ہزار اشرفی پونجی دے کر چوک کے چوراہے میں دکان جوہری کی کروا دو تجارت کر کے اس کے نفع سے اپنی گذران فراغت سے کیا کرے اور میرے محل کے قریب ایک حویلی اچھے نقشے کی رہنے کے لئے دلوا دو لونڈی غلام نوکر چاکر جو ضروری ہوں مول لے کر اور درماہہ مقرر کر کے اس پاس رکھوا دو کہ کسی طرح بے آرام نہ ہو خواجہ سرا نے اس کی بود و باش کی اور جوہری کا اپنے تجارت کی سب طیاری کر دی۔ تھوڑے عرصے میں اس کی دکان ایسی چمکی اور نمود ہوئی کہ جو خلعتیں فاخرہ اور جواہر بیش قیمت سرکار میں بادشاہ کی اور امیروں کی درکار یا مطلوب ہوتے اسی کے یہاں بہم پہنچتے آہستہ آہستہ دکان جمی کہ جو تحفہ ہر ایک ملک کا چاہیے وہیں ملے۔ سب جوہریوں کا روزگار اس کے آگے مندا ہو گیا۔ غرض اس شہر میں کوئی برابری اس کی نہ کر سکتا بلکہ کسی ملک میں ویسا کوئی نہ تھا۔ اس نے کاروبار میں تو لاکھوں روپے کمائے پر جدائی اس کی روز بروز نقصان میرے تن بدن کا کرنے لگی کوئی تدبیر ایسی نہ بن آئی کہ اس کو دیکھ کر اپنے دل کی تسلی کروں۔

ایک دن صلاح کی خاطر اسی واقف کار محلی کو بلایا اور کہا کوئی ایسی صورت بن نہیں آتی کہ ذرا اس کی صورت میں دیکھوں اور اپنی جان کو صبر دوں مگر یہ طرح ہے کہ ایک سرنگ اس کی حویلی سے کھدوا کر محل میں ملا دو۔ حکم کرتے ہی کئی دنوں میں نقب طیار ہوئی کہ جب سے سانجھ ہوتی چپکے ہی وہ خواجہ سرا اس جوان کو اسی راہ سے لے آتا۔ تمام شب شراب کباب عیش و عشرت میں کٹتی میں اس کے ملنے سے آرام پاتی وہ میرے دیکھنے سے خوش ہوتا جب فجر کا تارا نکلتا اور موذن اذان دیتا محلی اسی راہ سے اس جوان کو اس کے گھر پہنچا دیتا۔ ان باتوں سے سوائے اس خوجے کے اور دو دائیوں کے جنہوں نے مجھے دودھ پلایا تھا چوتھا آدمی کوئی واقف نہ تھا۔ ایک مدت اسی طرح سے گذری۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ موافق معمول کے خواجہ سرا اس کو بلانے گیا دیکھا تو وہ جوان فکر مند سا چپکا بیٹھا ہے۔ کسی نے پوچھا "آج خیر ہے؟ کیوں ایسے دلگیر ہو رہے ہو؟ چلو حضور نے یاد فرمایا ہے۔" اس نے ہر گز کچھ جواب نہ دیا زبان نہ ہلائی۔ خواجہ سرا اپنا سا منہ لے کر الٹا پھر آیا احوال اس کا عرض کیا۔ میرے تئیں شیطان جو خراب کرے اس پر بھی محبت اس کی دل سے نہ بھولی اگرچہ جانتی کہ یہ عشق اور چاہت نیک حرام ہے۔ آخر کو بدنامی اور رسوا کرے گی اور ننگ و ناموس سب لٹانے لگے گا تو اسی دم اس کام سے باز آتی اور توبہ کرتی پھر اس کام میں نہ لگتی۔ اپنا دل اس بے حیا پر گذشت سے بغیر دیکھے بھالے تو بھی واقف ہو، نہیں تو میں کہاں اور تو کہاں خیر جو ہوا سو ہوا اس خرمائی پر اس گدھے کی خیال نہ کر۔ وہ خوجے کے ہاتھ پیغام بھیجا کہ اگر تو اس وقت نہیں آوے گا تو میں کسی ڈھب سے وہیں آتی ہوں لیکن میرے آنے میں بڑی قباحت ہے۔ اگر یہ راز فاش ہوا تو تیرے حق میں بہت برا ہے ایسا کام نہ کر جس میں سوائے رسوائی کے اور کچھ پھل نہ ملے۔ بہتر یہی ہے جلدی چلا آ نہیں تو مجھے وہیں پہنچا جان۔ جب یہ سندیسا گیا اور اشتیاق میرا انپٹ دیکھا شنڈی سی صورت بنائے ہوئے ناز نخرے سے آیا جب میرے پاس بیٹھا تب میں نے اس سے پوچھا کہ آج رکاوٹ اور خفگی کا کیا باعث ہے؟ اتنی شوخی اور گستاخی تو نے کبھو نہ کی تھی ہمیشہ بلا عذر حاضر ہوتا تھا۔ تب اس نے کہا کہ میں گمنام غریب حضور کی توجہ سے اور دامن دولت کے باعث اس مقدور کو پہنچا بہت آرام سے زندگی کٹتی ہے آپ کی جان و مال کو دعا کرتا ہوں۔ یہ تقصیر بادشاہزادی کے معاف کرنے کے بھروسے اس گنہگار سے سرزد ہوئی امیدوار عفو کا ہوں۔

میں تو جان و دل سے اسے چاہتی تھی اس کی بناوٹ کی باتوں کو مان لیا اور شرارت پر نظر نہ کی بلکہ پھر دلداری سے پوچھا کیا تجھ کو ایسی مشکل کٹھن پیش آئی جو ایسا متفکر ہو رہا ہے اس کو عرض کر اس کی بھی تدبیر ہو جائے گی۔ غرض اس نے اپنی خاکساری کی راہ سے یہی کہا کہ مجھ کو سب مشکل ہے اور آپ کے روبرو سب آسان ہے۔ آخر اس کے فحوائے کلام اور بت کہوے سے یہ کھلا کہ ایک باغ نہایت سرسبز اور عمارت عالی خاص و تالاب کنویں پختہ سمیت غلام کی حویلی کے نزدیک ناف شہر میں بکاؤ ہے اور اس باغ کے ساتھ ایک لونڈی بھی گائن کہ علم موسیقی میں خوب سلیقہ رکھتی ہے لیکن یہ دونوں باہم بکتے ہیں نہ اکیلا باغ جیسے اونٹ کے گلے میں بلی جو کوئی وہ باغ لیوے اس کنیز کی بھی قیمت دیوے اور تماشہ یہ ہے باغ کا مول لاکھ روپے اس باندی کا مول پانچ لاکھ فدوی سے اتنے روپے بالفعل سرانجام نہیں ہو سکتے۔

میں نے اس کا دل بہت بے اختیار شوق میں اس کی خریداری کے پایا کہ اسی واسطے دل حیران اور خاطر پریشان تھا باوجودیکہ روبرو میرے بیٹھا تھا تب بھی اس کا چہرہ غمگین اور جی اداس تھا مجھے تو خاطرداری اس کی ہر گھڑی اور ہر پل منظور تھی اسی وقت خواجہ سرا کو حکم کیا کہ کل صبح کو قیمت اس باغ کی لونڈی سمیت چکا کر قبالہ باغ کا اور خط کنیز کا لکھوا کر اس شخص کے حوالے کر دو اور مالک کو زر قیمت خزانہ عامرہ سے دلوا دو۔ اس بے وفا گی کے سنتے ہی وہ آداب بجا لایا اور منہ پر رونق آئی۔ ساری رات اسی قاعدے سے جیسے ہمیشہ گذرتی تھی ہنسی خوشی سے رہے فجر ہوتے ہی وہ رخصت ہوا خوجے نے موافق فرمانے کے اس باغ کو اور لونڈی کو خرید کر دیا۔ پھر وہ جوان ہمیشہ رات کو موافق معمول کے آیا جایا کرتا۔

ایک روز بہار کے موسم میں کہ مکان بھی دلچسپ تھا بدلی گھمنڈ رہی تھی بوندیاں پڑ رہی تھیں بجلی بھی کوند رہی تھی اور ہوا نرم نرم بہتی تھی غرض عجب کیفیت اس دم تھی جو ہیں رنگ برنگ کے حباب اور گلابیاں طاقوں پر چنی ہوئی نظر پڑیں دل للچایا کہ ایک گھونٹ پی لوں جب دو تین پیالوں کی نوبت پہنچی وہیں خیال اس باغ نو خرید کا گذرا کمال شوق ہوا کہ ایک دم اس عالم میں وہاں کی سیر کرنی چاہیے۔ کم بختی جو آوے اونٹ چڑھے کتا کاٹے اچھی طرح بیٹھے بٹھائے ایک دائی کو ساتھ لے کر سرنگ کی راہ سے اس جوان کے مکان میں گئی وہاں سے باغ کی طرف چلی دیکھا تو ٹھیک اس باغ کی بہار بہشت کی برابری کر رہی ہے۔ قطرے مینہ کے درختوں کے سر سبز پتوں پر جو پڑے ہیں گویا زمرد کی پٹریوں پر موتی جڑے ہیں اور سرخی پھولوں کی اس ابر میں ایسی بھلی ہے جیسے شفق پھولی ہے اور نہریں لبالب مانند فرش آئینے کے نظر آتی ہیں اور موجیں لہراتی ہیں غرض اس باغ میں ہر طرف سیر کرتی پھرتی تھی کہ دن ہو چکا سیاہی شام کی نمود ہوئی اتنے میں وہ جوان ایک روش پر نظر آیا اور مجھے دیکھ بہت ادب

اور گرمجوشی سے آگے بڑھ کر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ پر دھر کر بارہ دری کی طرف لے چلا جب میں وہاں گئی تو وہاں کے عالم نے سارے باغ کی کیفیت کو دل سے بھلا دیا۔ یہ روشنی کا ٹھاٹھ تھا۔ جا بجا قمقمے سرو چراغاں کنول اور فانوس خیال شمع مجلس حیران اور فانوسیں روشن تھیں کہ شب برات باوجود چاندنی اور چراغاں کے اس کے آگے اندھیری لگتی۔ ایک طرف آتشبازی پھلجڑی انار دلاؤدی مہتاب سرو دار چرخی ہوائی چرخی ہتھ پھول جاہی جوہی پٹاخے بتاشے چھٹتے تھے اس عرصے میں بادل پھٹ گیا اور چاند نکل آیا جیسے نافرمانی جوڑا پہنے ہوئے کوئی معشوق نظر آجاتا ہے بڑی کیفیت ہوئی۔

چاندنی چھٹکتے ہی جوان نے کہا اب چل کر باغ کے بالا خانے پر بیٹھیے میں ایسی احمق ہو گئی تھی کہ جو وہ کمبخت کہتا سو میں مان لیتی تب یہ حکم نہایا کہ مجھ کو اوپر لے گیا وہ کوٹھا ایسا بلند تھا کہ تمام شہر کے مکان اور بازار کے چراغاں گویا اس کے پائیں باغ تھے میں جو اس جوان کے گلے میں ہاتھ ڈالے ہوئے خوشی کے عالم میں بیٹھی تھی اتنے میں ایک رنڈی نہایت بھونڈی سی صورت نہ شکل چولہے میں سے نکل شراب کا شیشہ ہاتھ میں لئے آ پہنچی۔ مجھے اس وقت اس کا آنا نپٹ برا لگا اور اس کی صورت دیکھنے سے دل میں ہول اٹھی۔ تب میں نے گھبرا کر جوان سے پوچھا "یہ طرفہ علت کون ہے تو نے کہاں سے پیدا کی" وہ جوان ہاتھ باندھ کر کہنے لگا "یہ وہی لونڈی ہے جو اس باغ کے ساتھ حضور کی عنایت سے خرید ہوئی۔" میں نے معلوم کیا کہ اس احمق نے بڑی خواہش سے اس کو قبول کیا شاید اس کا دل اس پر مائل ہے اسی خاطر سے پیچ و تاب کھا کر میں چپکی ہو رہی۔ لیکن دل اسی وقت سے مکدر ہوا اور ناخوشی مزاج پر چھا گئی تس پر قیامت اس ایسے تیسے نے یہ کی کہ ساقی اسی چھنال کو بنایا۔ اس وقت میں لہو پیتی تھی اور جیسے طوطی کوئی کوے کے ساتھ ایک پنجرے میں بند کرتا ہے نہ جانے کی فرصت پاتی تھی اور نہ بیٹھنے کو جی چاہتا تھا قصہ مختصر وہ شراب بوند کی بوند تھی جس کے پینے سے آدمی حیوان ہو جاوے۔ دو چار جام پے در پے اسی تیزاب کے جوان کو دئے اور آدھا پیالہ جوان کی منت سے میں نے بھی زہر مار کیا آخر وہ کسبی بے حیا بھی بدمست ہو کر اس مردود سے بیہودہ ادائیں کرنے لگی اور وہ چبلہ بھی نشے میں بے لحاظ ہو چلا اور نامعقول حرکتیں کرنے لگا۔ مجھے یہ غیرت آئی کہ اگر اس وقت زمین پھٹے تو میں سما جاؤں لیکن اس کی دوستی کے باعث میں بکلی اس پر بھی چپ ہو رہی وہ اصل کا پاجی تھا۔ میرے اس درگذر کرنے کو نہ سمجھا نشے کی لہر میں اور بھی دو پیالے چڑھا گیا کہ رہتا سہتا ہوش جو تھا وہ بھی کم ہوا اور میری طرف سے مطلق دھڑکا جی سے اٹھا دیا......... دونوں میں چوما چاٹی ہونے لگی نہ اس بے وفا میں وفا نہ اس بے حیا میں حیا' جیسی روح ویسے فرشتے۔

میری اس وقت یہ حالت تھی جیسے اوسر چوکی ڈومنی گاوے تال بے تال اپنے اوپر لعنت کرتی تھی کہ کیوں تو یہاں آئی جس کی یہ سزا پائی۔ آخر کہاں تک سہوں میرے سر سے پاؤں تک آگ لگ گئی اور انگاروں پر لوٹنے لگی۔ اس غصے اور طیش میں یہ کہاوت کہی 'جنگل نہ کودا کودے کون یہ تماشا دیکھے کون' کہتی ہوئی وہاں سے اٹھی وہ شرابی اپنی خرابی دل میں سوچا کہ اگر بادشاہزادی اس وقت ناخوش ہوئی تو کل میرا کیا حال ہوگا اور صبح کو کیا قیامت مچے گی اب بنے تو اس کا کام تمام کر ڈالوں یہ ارادہ اس غیبانی کی صلاح سے جی میں ٹھہرا کر گلے میں پٹکا ڈال میرے پاؤں آکر گر پڑا اور پگڑی سر سے اتار کر منت وزاری کرنے لگا میرا دل تو اس پر لٹو ہو ہی رہا تھا جدھر لئے پھرتا تھا پھرتی تھی اور چکی کی طرح میں اس کے اختیار میں تھی جو کہتا تھا سو کرتی تھی جوں توں مجھے بہلا پھسلا کر پھر بٹھایا اور اسی شراب دو آتشہ کے دو چار پیالے بھر بھر آپ بھی پئے اور مجھے بھی دئے ایک تو غصے کے مارے جل بھن کر کباب ہو ہی رہی تھی دوسرے ایسی شراب پی جلد بیہوش ہو گئی کچھ حواس باقی نہ رہے۔ تب اس بے رحم نمک حرام کٹر سنگدل نے تلوار سے مجھے گھائل کیا بلکہ اپنی دانست میں مار چکا۔ اس دم میری آنکھ کھلی تو منہ سے یہی نکلا خیر جیسا ہم نے کیا ویسا پایا لیکن تو اپنے تئیں اس خون ناحق سے بچائیو

مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر

مرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

کسی سے سبب ظاہر نہ کیجو اور ہم نے تجھ سے جان تک بھی در گذر نہ کی۔ پھر اس کو خدا کے حوالے کر کے میر لنگر اب کیا تھا اپنی سعادت مندی بچہ بند اوپر اس بد شگالی نے مجھے مردہ خیال کر کے اس صندوق میں ڈال کر قلعے کی دیوار کے تلے لٹکایا سو تو نے دیکھا۔ کسو کا کیا مقدور تھا لیکن یہ خرابیاں قسمت میں لکھی تھیں مفت نہیں کرم کی ریکھا آنکھوں نے سب یہ کچھ دیکھا اگر خوبصورتوں کے دیکھنے کا دل میں شوق نہ ہوتا تو وہ بدبخت میرے گلے کا طوق نہ ہوتا۔ اللہ یہ کام کیا کہ تجھ کو وہاں پہنچایا اور تو سبب میرے زندگی کا ہوا۔ اب حیا جی میں آتی ہے کہ یہ رسوائیاں کھینچ کر اپنے تئیں جیتا نہ رکھوں یا کسی کو منہ نہ دکھاؤں پر کیا کروں مرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں نہیں۔ خدا نے مار کر پھر جلایا آگے دیکھئے کیا قسمت میں بدا ہے۔ ظاہر میں تو تیری دوڑ دھوپ اور خدمت کام آئی جو ویسے زخموں سے شفا پائی۔ تو نے جان و مال سے میری خاطر کی اور جو کچھ اپنی بساط تھی حاضر کی۔ ان دنوں تجھے خرچ سے دو دلا دیکھ کر وہ شقہ شیدی بہار کو جو میرا اخراجی ہے لکھا اس میں یہی مضمون تھا کہ میں خیر و عافیت سے اب فلانے مکان میں ہوں۔ مجھ بد طالع کی خبر والدہ شریفہ کی خدمت میں پہنچائیو۔ اس نے تیرے ساتھ وہ کشتیاں نقد کی خرچ کی خاطر بھیج دیں اور جب تجھے خلعت اور جواہر خرید کرنے کو یوسف سوداگر بچے کی دکان پر بھیجا تو مجھے یہ بھروسہ تھا کہ وہ کم حوصلہ ہر ایک سے جلد آشنا ہو بیٹھتا ہے تجھے بھی اجنبی جان کر اغلب ہے کہ دوستی کرنے کے لئے اترا کر دعوت اور ضیافت تیری کرے گا۔ سو میرا منصوبہ ٹھیک بیٹھا جو کچھ میرے دل میں آیا تھا اس نے ویسا ہی کیا۔ تو جب اس سے قول و قرار پھر آنے کا کر کے میرے پاس آیا اور مہمانی کی حقیقت اور اس کا بضد ہونا مجھ سے کہا میں دل میں خوش ہوئی کہ جب تو اس کے گھر میں جا کر کھاوے پیوے گا تب اگر تو بھی اس کو مہمانی کی خاطر بلاوے گا تو وہ دوڑا چلا آوے گا۔ اس لئے تجھے جلد رخصت کیا۔

تین دن کے پیچھے جب تو وہاں سے فراغت کر کے آیا اور میرے روبرو عذر غیر حاضری کا شرمندگی سے لایا میں نے تیری تسلی کے لئے فرمایا کہ کچھ مضائقہ نہیں جب اس نے رضا دی تب تو آیا۔ لیکن بے شرمی خوب نہیں کہ دوسرے کا احسان اپنے سر رکھئے اور اس کا بدلہ نہ کیجئے اب تو بھی جا کر اس کی استدعا کر اور اپنے ساتھ ہی ساتھ لے آ۔ جب تو اس کے گھر گیا تب میں نے دیکھا کہ یہاں کچھ اسباب مہمانداری کا تیار نہیں اگر وہ آجاوے تو کیا کروں لیکن یہ فرصت پائی کہ اس ملک میں قدیم سے بادشاہوں کا یہ معمول ہے کہ آٹھ مہینے کاروبار ملکی و مالی کے واسطے ملک گیری میں باہر رہتے ہیں دو چار مہینے موسم برسات کے قلعہ مبارک میں جلوس فرماتے ہیں۔

ان دنوں دو چار مہینے سے بادشاہ یعنی ولی نعمت مجھ بدبخت کے بندوبست کی خاطر ملک گیری کو تشریف لے گئے تھے۔ جب تک تو اس جوان کو ساتھ لے کر آوے شیدی بہار نے میرا احوال خدمت میں بادشاہ بیگم کے کہ والدہ مجھ ناپاک کی ہیں عرض کیا۔ پھر میں اپنی تقصیر اور گناہ سے خجل ہو کر ان کے روبرو جا کھڑی ہوئی اور جو سرگذشت تھی سب بیان کی۔ ہر چند انہوں نے میرے غائب ہونے کی کیفیت دور اندیشی اور مہر مادری سے چھپا رکھی تھی کہ خدا جانے اس کا کیا انجام ہو۔ ابھی یہ رسوائی ظاہر کرنی خوب نہیں۔ میرے بدلے میرے عیبوں کو اپنے پیٹ میں رکھ چھوڑا تھا لیکن میری تلاش میں تھیں۔ جب مجھے اس حالت میں دیکھا اور سب ماجرا سنا آنسو بھر لائیں اور فرمایا:

"اے کم بخت شہزادی! تو نے جان بوجھ کر نام و نشان بادشاہت کا سارا کھویا۔ ہزار افسوس اور اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھویا۔ کاش کہ تیری عوض میں پتھر جنتی تو صبر آتا۔ اب بھی توبہ کر۔ جو قسمت میں تھا سو ہوا۔ اب آگے کیا کرے گی جیوے گی یا مرے گی؟"

میں نے نہایت شرمندگی سے کہا: "مجھ بے حیا کے نصیبوں میں یہی لکھا تھا جو اس بدنامی اور خرابی میں ایسی ایسی آفتوں سے بچ کر جیتی رہوں۔ اس سے مرنا ہی بھلا تھا اگرچہ کلنک کا ٹیکا میرے ماتھے پر لگا پر ایسا کام نہیں کیا جس میں ماں باپ کے نام کو عیب لگے۔ اب یہ بڑا دکھ ہے کہ وے دونوں بے حیا میرے ہاتھ سے بچ جاویں اور آپس میں رنگ رلیاں مناویں اور میں ان کے ہاتھوں سے یہ کچھ دکھ دیکھوں۔ حیف ہے کہ مجھ سے کچھ نہ ہو سکے۔ امیدوار ہوں کہ [illegible] ہو تو اسباب ضیافت کا بخوبی تمام اس کم بخت کے مکان میں طیار کرے تو میں دعوت کے

بہانے سے ان دونوں بدبختوں کو بلوا کر ان کے عملوں کی سزا دوں اور اپنا عوض لوں جس طرح اس نے مجھ پر ہاتھ چھوڑا اور گھائل کیا میں بھی دونوں کو پرزے پرزے کروں تب میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو نہیں تو اس غصے کی آگ میں پھنک رہی ہوں۔ آخر جل بل کر بھوبھل ہو جاؤں گی۔"

یہ سن کر انہوں نے ماستا کے درد سے مہربان ہو کر میری عیب پوشی کی اور ساز و لوازمہ ضیافت کا اسی خواجہ سرا کے ساتھ جو میرا محرم تھا کر دیا سب اپنے اپنے کارخانے میں آکر حاضر ہوئے۔ شام کے وقت تو اس موئے کو لے کر آیا۔ مجھے اس قحبہ باندی کا بھی آنا منظور تھا۔ چنانچہ فقیر تجھ کو تاکید کر کے اسے بھی بلوایا۔ جب وہ آئی اور مجلس جمی شراب پی پی کر سب بدمست اور بیہوش ہوئے اور ان کے ساتھ تو بھی کنی ہو کر مردہ سا پڑا میں نے قلماقنی کو حکم کیا کہ ان دونوں کا سر تلوار سے کاٹ ڈال۔ اس نے وہیں ایک دم میں شمشیر نکال دونوں کے سر کاٹ بدن لال کر دیئے اور تجھ پر غصے کا یہ باعث تھا کہ میں نے اجازت ضیافت کی دی تھی تو دو دن کی دوستی پر اعتماد کر کے شریک مئے خواری کا ہوا البتہ یہ تیری حماقت اپنے تئیں پسند نہ آئی اس واسطے کہ جب تو پی پا کر بیہوش ہوا اب توقع رفاقت کی تجھ سے کیا رہی۔ پر تیری خدمت کے حق ایسے میری گردن پر ہیں کہ جو تجھ سے ایسی حرکت ہوئی ہے تو معاف کرتی ہوں ____ لے میں نے اپنی حقیقت ابتدا سے انتہا تک کہہ سنائی اب بھی دل میں کچھ اور ہوس باقی ہے؟ جیسے میں نے تیری خاطر کر کے تیرے کہنے کو سب طرح قبول کیا تو بھی میرا فرمانا اسی صورت سے عمل میں لا۔ صلاح وقت یہ ہے کہ اب اس شہر میں رہنا میرے اور تیرے حق میں بھلا نہیں آگے تو مختار ہے۔"

یا معبود اللہ شہزادی اتنا فرما کر چپ ہو رہی فقیر تو دل و جان سے اس کے حکم کو سب چیز پر مقدم جانتا تھا اور اس کی محبت کے جال میں پھنسا تھا بولا جو مرضی مبارک میں آوے سو بہتر ہے یہ فدوی بے عذر بجا لائے گا جب شہزادی نے میرے تئیں فرمانبردار و خدمتگار اپنا پورا سمجھا فرمایا دو گھوڑے چالاک اور جانباز کہ چلنے میں ہوا سے باتیں کریں بادشاہ کے خاص اصطبل سے منگوا کر طیار رکھ۔ میں نے ویسے ہی پری زاد چار گرہے کے گھوڑے چن کر زین بند هوا کر منگوائے جب تھوڑی رات باقی رہی بادشاہزادی مردانہ لباس پہن کر اور پانچوں ہتھیار باندھ کر ایک گھوڑے پر سوار ہوئی اور دوسرے مرکب پر میں بھی مسلح ہو کر چڑھ بیٹھا اور ایک طرف کی راہ لی جب شام ہوئی اور چرچا ہونے لگا تب ایک پوکھر کے کنارے پہنچے اتر کے منہ ہاتھ دھو جلدی سے کچھ ناشتہ کر کے پھر سوار ہو کر چلے۔

کبھو ملکہ کچھ کچھ باتیں کرتی اور یوں کہتی کہ "ہم نے تیری خاطر شرم و حیا ملک و مال ماں باپ سب چھوڑا ایسا نہ ہو کہ تو بھی اس ظالم بے وفا کی طرح سلوک کرے۔"

کبھو میں کچھ احوال ادھر ادھر کا راہ کٹنے کے لئے کہتا اور اس کا جواب دیتا کہ "بادشاہزادی سب آدمی ایک سے نہیں ہوتے اس پاجی کے نطفے میں کچھ خلل ہو گا جو اس سے ایسی حرکت واقع ہوئی اور میں نے جان و مال تم پر تصدق کیا اور تم نے مجھے ہر طرح سرفرازی بخشی اب میں بندہ بغیر داموں کا ہوں میرے چمڑے کی اگر جوتیاں بنوا کر پہنو تو میں آہ نہ کروں' ایسی ایسی باتیں باہم ہوتی تھیں اور رات دن چلنے سے کام تھا۔ کبھو جو ماندگی کے سبب کہیں اترتے تو جنگل کے چرند و پرند شکار کرتے اور حلال کر کے نمکدان سے نون نکال چقماق سے آگ جھاڑ بھون بھان کر کھا لیتے گھوڑوں کو چھوڑ دیتے وے اپنے منہ سے گھاس پات چر چگ کر اپنا پیٹ بھر لیتے۔

ایک روز ایسے لق و دق میدان میں جا نکلے کہ جہاں بستی کا نام نہ تھا اور آدمی کی صورت نہ نظر آتی تھی۔ اس پر بھی بادشاہزادی کی رفاقت کے سبب سے دن عید اور رات شب برات معلوم ہوتی تھی جاتے جاتے اچپٹ ایک دریا کہ جس کے دیکھنے سے کلیجا پانی ہو راہ میں ملا۔ کنارے پر کھڑے ہو کر جو دیکھا تو جہاں تلک نگاہ نے کام کیا پانی ہی پانی تھا کچھ تھل بیڑ نہ پایا الٰہی اس سمندر سے کیونکر پار اتریں ایک دم اسی سوچ میں کھڑے رہے آخر یہ دل میں لہر آئی کہ ملکہ کو یہیں بٹھا کر میں تلاش میں ناؤ تواڑی کے جاؤں جب تلک اسباب گذارے کا ہاتھ آوے تب تلک وہ نازنین بھی آرام پاوے تب میں نے کہا "اے ملکہ اگر حکم ہو تو گھاٹ باٹ اس دریا کا دیکھوں" فرمانے لگی "میں بہت تھک گئی ہوں اور بھوکی پیاسی ہو رہی ہوں ذرا دم لے لوں جب تئیں تم پار چلنے کی کچھ تدبیر کرو۔"

اس جگہ ایک درخت پیپل کا تھا، بیٹھا ہم کہتے رہے کہ اگر بیڑا رہ گیا ہو آئی تو میں سب اس کے تلے آرام کیا ہیں وہاں اس کو شکار میں چاروں طرف دیکھتا تھا کہ کہیں بھی زمین پر وہ پریزاد نشان اٹھانے کا پاؤں نظر آئے سر مارا کہیں پتا نہ لگا آخر یہ کہ وہاں سے مار آیا تو اس پری کو بڑے کے پیچھے دیکھنے لگا اس وقت کی حالت کیا کہوں کہ سرت جاتی رہی دیوانہ ہو گیا۔ کبھی درخت پر چڑھ جاتا وہاں سے نیچے گر پڑتا کبھی گرد زمین میں گرتا اور اس درخت کی جڑ کے آس پاس تصدق ہوتا۔ کبھی چیخ مار کر اپنی بے بسی پر روتا اور کبھی دکھ سے پورب کو دوڑا جاتا کبھی پچھم کو پھر آتا غرض بجیری خاک چھانی لیکن اس گوہر نایاب کی نشانی نہ پائی جب میرا کچھ بس نہ چلا تب روتا اور خاک سر پر اڑاتا پھر کہیں کرتا ہوا دل میں یہ خیال آیا کہ شاید جن اس پری کو اٹھا کر لے گیا اور مجھے یہ داغ دے گیا اس کے ملک سے کوئی اس کے آتا تھا اس وقت کیا پا کر مار ڈالا کر پھر شام کی طرف لے پھرا۔

ایسے خیالوں میں گھبرا کر کپڑے وپڑے پھینک پھانک دیئے ننگ منگا فقیر بن کر شام کے ملک میں صبح سے شام تک ڈھونڈتا پھرتا اور رات کو کہیں پڑ رہتا سارا جہان روندا مارا پر اپنی بادشاہزادی کا نام و نشان کسی سے نہ سنا نہ سبب غائب ہونے کا معلوم ہوا تب دل میں آیا کہ جب اس جانی کا کچھ پتہ نہ پایا تو اب جینا بھی حیف ہے۔ کسی جنگل میں ایک پہاڑ نظر آیا تب اس پر چڑھ گیا اور یہ ارادہ کیا کہ اپنے تئیں گرا دوں کہ ایک دم میں سر منہ پتھروں سے ٹکراتے ٹکراتے پھوٹ جاوے گا تو ایسی مصیبت سے جی چھوٹ جاوے گا۔ یہ دل میں کہہ کر چاہتا تھا کہ اپنے تئیں گرا دوں پاؤں بھی اٹھا چکے تھے کہ کسی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اتنے میں ہوش آیا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک سوار سبز پوش منہ پر نقاب ڈالے مجھ سے فرماتا ہے کہ کیوں تو اپنے مرنے کا قصد کرتا ہے خدا کے فضل سے ناامید ہونا کفر ہے جب تک سانس ہے تب تک آس ہے اب تھوڑے دنوں میں روم کے ملک میں تین درویش تجھ سے دیکھے ایسی ہی مصیبت میں پھنسے ہوئے اور ایسے ہی تماشے دیکھے ہوئے تجھ سے ملاقات کریں گے اور وہاں کے بادشاہ کا آزاد بخت نام ہے اس کو بھی ایک بڑی مشکل در پیش ہے جب وہ بھی تم چاروں فقیروں کے ساتھ ملے گا تو ہر ایک کے دل کا مطلب اور مراد جو ہے بخوبی حاصل ہو گی۔

پس اس فقیر نے اپنے مولیٰ مشکل کشا کی بشارت سے خاطر جمع ہو قسطنطنیہ کا ارادہ کیا۔ راہ میں جو کچھ مصیبتیں قسمت میں لکھی تھیں کھینچتا ہوا اس بادشاہزادی کی ملاقات کے بھروسے خدا کے فضل سے یہاں تک آ پہنچا۔

بیتال پچیسی

مظہر علی ولا و للو لال

(۱۸۰۴ء)

چھٹی کہانی

دھرم پیار نام ایک نگر ہے وہاں کا راجہ دھرم سیل اوس کے منتری کا نام اندک اوس نے ایک دن راجہ سے کہا "مہاراج ایک مندر بناؤ اوس میں دیبی کو بٹھا نت پوجا کیجئے کہ اس کا شاستر میں بڑا پن لکھا ہے تب راجہ ایک مندر بنوا' دیبی دہرا شاستر کی بدھ سے پرچار کرنے لگا اور بن پوجا کے جل بھی نہ پیتا تھا اسی طرح سے جب کتنی ایک مدت گزری تو ایک روز دیوان نے کہا۔ مہاراج مثل مشہور ہے کہ نپوتے کا گھر سونا مورکھ کا ہردے سونا اور دالدری کا سب کچھ سونا ہے یہ بات سن راجہ دیبی کے مندر میں جا ہاتھ جوڑ استت کرنے لگا ہے کہ دیبی تجھے برھما بشنو اور اندر اٹھ پہر سیوتے ہیں اور تو نے منی کا سر چند منڈ کھینچ نے دیتون کو مار پر تھوی کا بھار او تارا ہے اور جہاں تیرے بھگت نیر پیٹ پڑے تھان تھاں جا تو سہاے ہوئے اور یہی اس تک تیرے دوارے پر آیا ہوں اب میرے ہی من کی اچھیا پوری کرا تنی استت جب راجہ کر چکا تب دیبی کے مندر سے آواز آئی کہ راجہ میں تجھ سے خوش ہوئی' راجہ نے کہا "مجھ کو پتر دے" دیبی نے کہا راجہ تیرے پتر ہوگا مہابلی اور بڑا ویر تاپی" تب تو راجہ نے چندن گشت پھول دھوید یپ بتوید دے کر پوجا کی اور اسی طرح سے ہر روز پوجا کرتا تھا۔ غرض کتنے دنوں کے پیچھے راجہ کے ایک لڑکا پیدا ہوا راجہ نے باجے گاجے ست کلب سمیت جا کے دیبی کی پوجا کی اس عرصہ میں ایک دن کا اتفاق ہے کہ کسی نگر سے ایک دھوبی اپنے دوست کو ساتھ لئے اس شہر کی طرف آتا تھا کہ دیبی کا مندر لسے نظر آیا اوس نے ڈنڈوت کرنے کا ارادہ کیا اس میں ایک دھوبی کی لڑکی ات سندری آتے سامنے سے اس نے دیکھی اوسے دیکھ موہت ہوا اور دیبی کے درشن کو گیا ڈنڈوت کو ہاتھ جوڑ اس نے اپنے من میں کہا" ہے دیبی! جو اس سندری سے میرا بیاہ تیرے کرپا سے ہو تو میں اپنا سر تجھے چڑھاؤں۔" یہ مانتا مان ڈنڈوت کر دوست کو ساتھ لے اپنے نگر کو گیا جب وہاں پہنچا تو اوس کے بروہ نے یہ ستایا

کہ وہ لوگ سے پاس سے گزر گئی آنکھ پھر اوس کے درمیان میں رہنے لگی یہ بڑی بات اوس کے دوست نے دیکھ لی اوس کے باپ سے جا کر بیان کیا اوس کا باپ بھی یہ سن کے بیکل ہوا اور اپنے جی میں پچتا کر کہنے لگا کہ اوس لڑکی کو اوس نے دیکھ لیا معلوم ہوتا ہے اوس کا اس کی شادی نہ ہو گی تو یہ اپنا پران تیاگ کرے گا اس سے بہتر یہ ہے کہ اوس لڑکی سے اوس کا بیاہ کر دیجئے کہ جس سے یہ بچے یہ سوچ کر لڑکے کے متر کو ساتھ لے اوس گاؤں میں پہنچ لڑکی کے پتا سے جا کر کہا کہ میں تیرے پاس کچھ جانچنے آیا ہوں جو تو دیوے تو میں کہوں اس نے کہا کہ میرے پاس جو پدارتھ ہو گا جو میں دوں گا کہا "تو اپنی لڑکی میرے پتر کو دے" یہ سن کر اوس نے بھی اوس کی بات پہچان کر برہمن کو بلوا دن لگن مہورت ٹھیرا کر کہا "تم لڑکے کو لے آؤ میں بھی اپنی لڑکی کے ہاتھ پیلے کر دوں گا" وہ وہاں سے اوٹھ اپنے گھر آ سامان شادی کا تیار کر بیاہنے کو گیا اور وہاں جا بیاہ کر بیٹے بہو کو لے اپنے گھر پھر آیا اور دونوں آنند سے باہم رہنے لگے پھر کتنے دنوں کے بعد اوس لڑکی کے پتا کے یہاں کچھ سبھ کرم تھا وہاں سے نیوتہ یہاں بھی آیا یہ استری پرش بھی تیار ہو اپنے متر کو ساتھ لے اوس گھر کو چلے جب گھر کے نکٹ پہنچے تو دیبی کا مندر نظر آیا تو اوسے منتا یاد آئی تب اون نے یہ بات جی میں بچار کر کہا کہ بڑا مت پاپی اوجھڑ ہوں کہ دیبی سے جھوٹ بولا اتنی بات اپنے من میں کہ اوس دوست سے کہا کہ تم یہاں کھڑے رہو۔ میں دیبی کا درشن کر آؤں اور استری سے کہا تو بھی یہاں ٹھیر یہ کہ مندر پاس پہنچ کر کنڈ میں اشنان کر دیبی کے سنمکھ جا کر ہاتھ جوڑ نمسکار کر کھڑگ اوٹھا کر گردن پہ مارا کہ سر تن سے جدا ہوا بھوم میں گر پڑا غرض کتنی ایک دیر کے پیچھے اوس کے متر نے بچارا کہ گئے بڑی دیر ہوئی ہے اب تک پھر کے نہیں چل کر دیکھا چاہیے اور اوس کی استری کو کہا "تو یہاں کھڑی رہو میں اسے شتابی سے ڈھونڈ کر لے آتا ہوں" یہ کہہ کر دیبی کے مندر میں گیا دیکھتا کیا ہے کہ دھڑ سے اوس کا سر جدا پڑا ہے یہ حالت وہاں کی دیکھ اپنے من میں کہنے لگا کہ سنسار بہت کٹھن جگہ ہے کوئی یہ نہ سمجھے گا کہ اس نے اپنے ہاتھ سے سر دیبی کو چڑھایا ہے بلکہ یہ کہیں گے کہ اوس کی ناری جو ات سندری ہے اوس کے لینے کے لیے مار کر یہ مکر کرتا ہے اس سے یہاں مرنا اوچت ہے پر سنسار میں بدنامی لینی خوب نہیں یہ کہہ تالاب میں نہا دیبی کے سامنے آ ہاتھ جوڑ پرنام کر کھانڈا اوٹھا لیا گلے میں مارا کہ رنڈ سے منڈ جدا ہو گیا اور وہ استری یہاں اکیلی کھڑی کھڑی اوکتا کر رہ دیکھ دیکھ نراس ہو ڈھونڈتی ہوئی دیبی کے مندر میں گئی وہاں جا کر دیکھتی کیا ہے کہ دونوں موے پڑے ہیں پھر ان دونوں کو موا دیکھ اون نے اپنے جی میں بچارا کہ لوگ تو نہ جانیں گے کہ یہ آپ سے دیبی کو بل چڑھے ہیں سب کہیں گے کہ رانڈ نشٹ تھی بدکاری کرنے کے لئے دونوں کو مار آئی ہے اس بدنامی سے مرنا اوچت ہے۔ یہ سوچ کنڈ میں غوطہ مار دیبی کے سنمکھ آ سر نوا ڈنڈوت کر تلوار اوٹھا چاہی کہ گردن پہ مارے کہ دیبی نے سنگھاسن سے اوتر اوس کا ہاتھ آن پکڑا اور کہا "پتری بر مانگ میں تجھ سے پرسن ہوئی" تب اون نے کہا "ماتا جو مجھ سے خوش ہوئی ہے تو ان دونوں کو جی دان دے۔" پھر دیبی نے کہا کہ ان کے دھڑوں سے سر لگا دے ان نے مارے خوشی کے گھبراہٹ میں سر بدل کر لگا دیے اور دیبی نے امرت لا چھڑکا یہ دونوں جی کر اوٹھ کھڑے ہوئے اور آپس میں جھگڑنے لگے یہ کہے استری میری ہے وہ کہے استری میری ہے تب بیتال بولا کہ ہے راجہ بکرماجیت ان دونوں میں وہ استری کس کی ہوئی؟ راجہ نے کہا "سن شاستر میں اس کا بیان لکھا ہے کہ ندیوں میں گنگا اوتم ہے اور پربتوں میں سمیر پربت اور پرکھوں میں کلپ برکش انگوں میں مستک اوتم ہے اس نیاؤ سے جس کا اوتم انگ سیس ہو اوسی کی استری ہوئی۔"

سنگھاسن بتیسی

کاظم علی جوان وللو لال

(۱۸۰۴ء)

(اکیسویں داستان۔ انرودھوتی پتلی کی زبانی)

مادھونام ایک برہمن تھا بڑا گنی اس کی تعریف نہیں ہوسکتی جو میں کروں جوگی ہو کر وہ تمام پرتھی میں پھر آیا کہیں ٹھہر کر رہنے نہ پایا۔ مادھو کام کا اوتار تھا استری اسے دیکھتے ہی موہت ہو جاتی تھی وہ سب بدیا پڑھا تھا اتی چتر تھا ویسا مرت لوک میں منش کم پیدا ہوتا ہے جس راجہ کی سیوا کرنے جاتا وہاں دس دن اس کا آدر ہوتا اور جب وہ اپنا گن پرکاش کرتا تب وہ راجہ اس کو دیس نکالا دیتا اس طرح سے دیس دیس بھٹکتا ہوا وہ کھ پاتا کاماگری میں آن پہنچا۔ کام سین وہاں کا راجہ تھا اس کے یہاں کام کندلا ایک پاتر تھی وہ گویا ربس اتار گندھرب بدیا[1] میں اتی چتر تھی وہ راجہ کی سبھا میں نرت[2] کہہ رہی تھی مادھو بھی اسی راجہ کے دوار پر جا پہنچا۔ دوارپالوں سے کہا کہ راجہ کو ہمارا سماچار کہو کہ آپ کے درشن کو ایک برہمن آیا ہے ڈیوڑھی دار اس کی بات سنی ان سنی کر گئے وہ ہار لاماندہ وہیں بیٹھ گیا جوں جوں وہاں مردنگ کی آواز اور گانے کے شبد آتی تھی توں توں یہ سر دھنکر کہتا تھا کہ راجہ بھی مورکھ ہے اور اس کی سبھا میں کوڑھ[3] ہے جو بچار نہیں کرتا یہی پانچ سات دفعہ کہی دوارپال خفا ہو کر برہمن کو دیکھ راجہ کے ڈر سے کچھ تو کہہ نہ سکے پر راجہ کے سنمکھ جا ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوئے مہاراج نے جوان کی طرف دیکھا انھوں نے بنتی کر کہا کہ ایک برہمن بدیسی اور مل دوار پر آبیٹھا ہے۔ سر ہلا کر کہتا ہے کہ راجہ کی سبھا کے لوگ اتی مورکھ ہیں جو گن بچار نہیں کرتے۔ تب راجہ نے ان دوارپالوں سے کہا "جا کر اس سے پوچھو کہ ان کو مورکھ تو نے کس لئے کہا؟" انھوں نے راجہ کی آگیا پائی پور پرائے برہمن سے پوچھا کہ مہاراج نے آگیا کی ہے ان کی گن میں کیا دوش ہے وہ تم بتاؤ تو ہم تمھاری بات سچ جانیں اس نے کہا کہ بارہ آدمی چار چار تین طرف میں کھڑے ہوئے مردنگیں بجاتے ہیں۔ تن میں پورب مکھ والے ہیں ایک مردنگی کا انگوٹھا نہیں ہے اس سے سم پر تھاپ ہلکی پڑتی ہے اس سے میں نے سبھا کو کوڑھ کہا ہے نہ مانو تو تم جا کر دیکھ لو وے دوڑے ہوئے راجہ کے پاس آئے سب باتیں سنائیں راجہ نے پورب مکھ کے چاروں مردنگیوں کو بلایا۔ ایک ایک کا ہاتھ دیکھا تو ان میں ایک کا انگوٹھا موم کا بنا ہوا تھا۔ یہ تماشا راجہ دیکھ پرسن ہوا۔ اور اس برہمن کو بلایا وہ جا کر سنمکھ ہوا راجہ نے ڈنڈوت کی اور اس سے اسیس دی پھر سنگھا چار کر گدی پر بٹھلایا جیسے بستر[4] بھوشن

---

[1] گانے کا فن۔ [2] ناچ۔ [3] بے وقوف۔ [4] لباس

آپ بہت سے دھن دیے ہی مگر برہمن کو پہنانے اور کام کندلا کو بلا کر آگیا کی کہ یہ مہا گنی ہے اس کے آگے تم اپنا گن پرکاش کرو جس میں یہ پرسن ہووے۔

کام کندلا راجہ کی آگیا پا اپنا گن ظاہر کرنے کو سنگیت نرت کا آرنبھ کیا شیشے رنگ کے بھرے ہوئے سر پر رکھ منہ سے موتی پروتی انکھوں سے بھاؤ بتاتی ہوئی ناچنے لگی سب ساز سر ملائے ہوئے ناچتی تھی اس میں پھولوں اور عطر کی خوشبو پا کر ایک بھونرا اڑتا ہوا اس کی چولی کی کسنی پر بیٹھا اور ڈنک مارا اوس کے بدن میں پیڑ ہوئی تب اس نے بچارا کہ جو کچھ بھی حرکت کرتی ہوں تال بھنگ ہو گا اور میرے گن کی ہنسی ہووے گی اتنا سوچ چھند اور بیاد کر سانس روک کچ کی راہ نکالی پون لگتے ہی وہ بھونرا اڑ گیا مادھو اس گن کو دیکھتے ہی موہت ہوا جو من سے تھے اور ہیرے گر تب کو "یہ کہہ پرسن ہو کر بستر بھوشن جو راجہ نے دیئے تھے سب اتار دیئے یہ دیکھ راجہ اور منتری آپس میں کہنے لگے کہ دیکھو اس برہمن نے کیا مورکھتائی کی ہے کہ بدیا کو کپڑے اور تمام جواہر ایک دن میں خشد یا ذات کا بھکاری ہمارے آگے سخاوت دکھاتا ہے راجہ نے خفا ہو برہمن سے پوچھا کہ اس کے کس گن پر ریجھا وہ میرے آگے بیان کر۔ برہمن نے کہا سن راجہ کوٹھ تو بھی ہے تری سبھا میں کوڑھ ہے۔ تیری سبھا میں ایسا گن پرکاش کرے اور کوئی گن کا بچار نہ کرے اس کی کچ پر بھونرا آن بیٹھا تھا سو اس نے اپنی سانس روک کچ کی راہ نکال اسے اڑا دیا یہ کام دیکھ میں نے سب کچھ خشد یا"

مادھو نے جب یہ بات کہی تب راجہ لجت ہو رہ گیا اور کچھ راجہ سے بن نہ آیا کہ اسی وقت میرے گھر سے نکل جا جو سنوں گا کہ تو اس گھر میں ہے تو بندھوا کر دریا میں ڈلوا دوں گا تب مادھو نے کہا کہ مہاراج مجھ سے ایسا کیا اپرادھ ہوا ہے جو آپ مجھے دیس نکالا دیتے ہیں؟ راجہ نے کہا کہ میں نے جو کچھ تجھے دیا تھا سو تو نے میرے ہی آگے دان کر دیا کیا میرے پاس دینے کو کچھ نہ تھا جو تو نے دیا؟" یہ سن کر مادھو ملین ہو راج سبھا سے نکل باہر جا ایک درخت کے نیچے بیاکل کھڑا ہوا اپنے جی میں کہنے لگا کہ ماتا بیٹے کو بکھ دے اور پتا پتر کو بیچے اور راجہ سر لیں لے تو کوئی سرن کس کی لے پھر کہنے لگا کہ راجہ نے تو مجھے نکالا اب میں کہاں رہوں۔ انیک انیک بھانت کی چنتا کر کام کندلا نام لے لے روتا تھا۔

ادھر کام کندلا بھی راجہ سے بہانہ کر بدا ہوئی اور ایک آدمی دوڑایا کہ یہ برہمن جانے نہ پاوے اسے لے جا کر میرے مکان میں بٹھا دو وہ آدمی گیا اور برہمن کو لے جا کر اس کے مندر میں بٹھا دیا ادھر سے یہ بھی ترت جا پہنچی دونوں آپس میں بیٹھ کر پریم کی باتیں کرنے لگے جب اس برہمن نے کہا کہ مجھے راجہ نے دیس نکالا دیا ہے اور تو نے اپنے گھر میں بلا بٹھلایا جو یہ بات راجہ سنے گا تو میرا پران جائیگا تو میں دکھ سے چھوٹوں گا پر تجھے بھی راجہ دکھ دے گا اس سے ایسی باتیں کرنی اچت نہیں ہے کہ اپنی جان جائے اور جگ ہنسائی ہو پریم جو ہے سو دکھ کی کھان ہے۔ جس نے پریم کے پھندے میں پڑ کر دیا اس نے کبھی سکھ نہ پایا۔ یہ باتیں مادھو کی سن کر کام کندلا نے کہا کہ اب تو میں اس پھندے میں آئی جو کچھ کرے سو [illegible] ساز منگوا اپنی بدیا ظاہر کرنے لگی جتنی بدیا اسے یاد تھی۔ اتنی جب پرکاش کر چکی تب مادھو نے انھیں جنتروں کے ساتھ اپنا بھی گن سب کچھ دکھلایا جب رات تھوڑی سی رہ گئی۔ تب کام کندلا نے کہا کہ تم نے سرم بہت کیا چل کر آرام کیجئے یہ کہہ کر مادھو کو رنگ محل میں لے گئی [illegible] کی باتیں تھیں سب کیں جب گجر بجا دونوں کے جی میں رات کی بات یاد آئی سدھ بدھ جاتی رہی۔ گھبرا کر مادھو نے کہا۔ ہمن سے [illegible] ساتھ رہو گا تو دونوں کے پران جائیں گے۔ اس لئے کچھ جتن کیجئے جس میں نردوند آنند سے رہیں۔ میں نے [illegible] میں بچاری ہے۔ کہ اب میں یہاں سے جاؤں اور کچھ اپائے کر آ تجھے بھی یہاں سے لے جاؤں۔ تو اپنا جی مضبوط رکھ میں ضرور آکر [illegible] جن میں تجھے دے کر جاتا ہوں۔ اتنی بات سنتے ہی وہ تو مورچھا کھا کر گر پڑی۔ اور مادھو نے اپنی راہ لی وہاں سے نکل کر بن میں [illegible] کام کندلا کرنے لگی ادھر اسے بھی سکھیوں نے گلاب کا نیر چھڑک کر اٹھایا جب کچھ ہوش آیا یہ بھی

مادھو مادھو پکارنے لگی۔ کھانا پینا بھی تیاگ کیا۔ بہت سکھیاں سمجھاتی تھیں۔ اس کے جی میں ایک نہ آتی تھی۔ جوں جوں گلاب چھڑ کتیں کپور چندن لالا کر لگاتی تھیں توں توں جو گنی وہ بڑھتی تھی۔ کسی طرح سے سنبھل نہ ہوتی تھی۔ جب کوئی مادھو کا نام اور گن سناتا تھا تب ا سے ذرا آرام آجاتا۔

ادھر مادھو بھی بھٹک بھٹک اپنے من میں بچارنے لگا کہ اب سنسار میں کون ہے جس کے نکٹ[1] جائیے جو ہمارا دکھ دور کرے۔ سے یاد آیا کہ سنتے ہیں۔ راجہ بیر بکرماجیت پردکھ نوارن ہے بھلا اس کے پاس جایئے اور دیکھئے کہ لوگ سچ کہتے ہیں یا جھوٹ یہ بچار کر اجین نگری کا رستہ لیا وہاں لوگوں سے پوچھا کہ یہاں راجہ سے بھینٹ کیونکر ہوتی ہے۔ تب اس نگری کا ایک باسی بولا۔ کہ داوری ندی کے کنارے ایک شیو کا مندر ہے اس مندر میں راجہ شیو کے درشن کو نت آتا ہے وہاں تو جا جو تیرا اندر تھ ہے سو تو کہہ تیری کامنا پوری ہوگی۔ یہ سن کر وہاں گیا اور اس مٹھ کے دروازے کی چوکھٹ پہ لکھا کہ میں بدیسی ات دکھی برہ سے بیاکل تمھارے نگر میں آیا ہوں یہ سن کر راجہ پردکھ نوارن ہے۔ اور جو یہ دکھ میرا جائے گا تو میں اپنے پران رکھونگا۔ نہیں تو تیسرے دن گوداوری ندی میں پران تیاگ کرونگا۔ یہ مقرر اپنے جی میں ٹھہرائی ہے۔ اس میں تم راجہ ہو۔ اور سدا گو اور برہمن کی رکشا کرتے[2] آئے ہو۔ اور اب بھی کروگے۔ میں نے اپنے من کی بات سب پرکاش کردی ہے...... راجہ بیر بکرماجیت کا یہ نیم تھا۔ کہ ان دکھی ادم دکھی برہ دکھی درب دکھی اور کسی طرح کا دکھی نگر میں آتا۔ راجہ سنکر جب اس کا دکھ نہ مٹاتا تب تک ان جل کا کیا ذکر ہے داتن بھی چیرتا نہ تھا۔

سویرے راجہ جب مہادیو کے درشن کو گیا درشن کر، پرنام کرنے لگا۔ راجہ اونچی درشٹ کے دیکھے تو کوئی اپنے دکھ کی اوستھا لکھ گیا ہے۔ راجہ مہادیو کو پانچ ڈنڈوت کر مندر میں آیا سب کو آگیا کی مادھو نام برہمن ہمارے نگر میں آیا ہے۔ جو کوئی اسے ڈھونڈلادے تو منہ مانگا درب پاوے یہ بات سن کر لوگ نگر میں ڈھونڈنے نکلے گھاٹ، باٹ، نوزہ محلہ، باغ، باغیچہ سب نگر ڈھونڈھ پھرے اور کہیں ٹھکانا اس کا نہ پایا۔ تب راجہ نے ایک دوتی کو بلا کر کہا کہ جو تو اسے ڈھونڈلادے تو منہ مانگا دھن پاوے۔ اس نے کہا مہاراج یہ کیا کٹھن بات ہے میں ابھی جاکر ڈھونڈ لاتی ہوں یہ کہہ اس نے وہاں سے سیدھی راہ مندر کی لی جہاں اس نے لکھا تھا جا کر مندر کے پاس بیٹھ رہی۔ شام کے وقت مادھو بھی بھٹکتا آن پہنچا۔ اس نے اسے دیکھا من میں بچارا کہ ہو نہ ہو وہ برہی یہی ہے۔ اس لئے کہ منہ پیلا آنسو جاری تن چنچل میں من ملین ہورہا ہے یہ ابچار کر رہی تھی کہ وہ برہمن وہاں آبیٹھا تب اس نے جا اس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ میں تیرے ڈھونڈنے کے لئے راجہ کی آگیا پاکر آئی ہوں تو اٹھ میرے ساتھ جلدی چل تیرا منورتھ پورا ہوگا۔ تیرے دکھ سے راجہ نپٹ دکھی ہے یہ سنتے ہی وہ اس کے ساتھ ہولیا۔

اسے لئے ہوئے راجہ کے سنمکھ پہنچ کر کہنے لگی مہاراجہ یہ وہی بیوگی ہے۔ جس کے لیے آپ نے یہ دکھ پایا ہے۔ تب راجہ نے اس برہمن سے پوچھا۔ کہ تو کس کے بیوگ سے ایسا بیاکل ہورہا ہے میرے آگے کہہ۔ تب اس نے ایک آہ بھر کر کہا "مہاراج کام کندلا کے بیوگ میں میری یہ گت ہوئی ہے وہ راجہ کام سین کے پاس ہے۔ تو دھرم آتما ہے اور میں تیرے پاس آیا ہوں۔ تو مجھے اس کو دلادے تو جی دان ہوے۔ یہ سنتے ہی راجہ ہنس کر بولا کہ سن بیر وہ بیسوا ہے۔ تو نے اس کے پریم میں سب کرم دھرم چھوڑا یہ تجھے اچت نہیں۔ مادھو نے کہا مہاراج پریم کا پنتھ نرالا ہے۔ جو پریم کرتے ہیں سو اپنا تن من دھن دھرم کرم سب پن کرتے ہیں پریم کی اکت کہانی ہے۔ مجھ سے کہی نہیں جاتی۔" راجہ یہ باتیں سن کر اور اسے اپنے ساتھ لے مندر میں گیا اور سب رانیوں کو آگیا کی کہ تم سب بناؤ سنگھار کر کے آؤ رانیاں سب سنگار کر آئیں اور اس بیر سے راجہ نے کہا کہ جسے تمھاری اچھا ہو ان میں سے لو اپنے من کا دکھ بسار دو اور سکھ چین کرو۔ اس نے جواب دیا کہ مہاراج

---

[1] نزدیک، [2] حفاظت

تپسیہ کے آگے ست کیوں کہ میری آنکھوں میں وہ بس رہی ہے اس لئے میری دو رشٹ میں ہکو نہیں آتی۔ اچار تو تھا سونے کے بدھ سے کچھ ہے اور جل پر اسے روچ نہیں ہوتی۔ ایسے پریم کی ذرا ساہیر کی دیکھ راجہ اپنے من میں بچارا کہ اسے ساتھ لے جا کر کام کندلا وہاں اس کے ملا اس کے تپر تھتہ ہوگی یہ بات راجہ نے بچار بیر سے کہا یہ تاتم اشنان پہ جا کر کچھ کہا تب تک میں بھی اپنے لوگوں کو تھوڑی سا ساتھ لے جاؤں اور اسے دلا دوں تم اپنے جی میں کسی بات کی چنتا نہ کرو میں نے تم سے یہ بچن کیا۔

بیر اپنے کھانے پینے میں لگا راجہ نے پردھان کو آگیا کی۔ کہ میرے ڈیرے گھر کے باہر نکلیں چار گھڑی کے بعد کاماگری کی طرف میرا کوچ ہے سب لوگوں کو خبر دو اس میں کتنی ایک دیر کے پیچھے راجہ تیار ہو کر بیر کو ساتھ لے کر جھگڑ ڈیروں میں داخل ہوا اور جتنے راجہ کے نوکر تھے سب رکاب میں حاضر تھے راجہ وہاں سے کوچ در کوچ جاتا تھا۔ کتنی ایک منزلوں کے بعد کاماگری سے دس کوس ادھر ڈیرا کیا اور اس راجہ کو پتر لکھا کہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ تمھارے یہاں جو کام کندلا پاتر ہے اسے بھیج دو نہیں تو جدھ [2] کرنے کا ہم سے سامان کرو یہ پتر لکھ ایک دوست کے ہاتھ راجہ کے پاس بھیج دیا۔ راجہ کو خبر ہوئی کہ ایک دوست راجہ بیر بکرماجیت کا خط لے کر آیا ہے۔ یہ سنتے ہی راجہ نے اس کو بلایا۔ اس نے جوہار کر خط راجہ کے ہاتھ دیا راجہ نے اس چٹھی کو بانچ کر کہا "اچھا کہو اپنے راجہ سے چلے آویں ہم جدھ کرنے کو تیار ہیں دوست نے راجہ سے کہا "مہاراج وہ لڑنے کو تیار ہے "راجہ نے بھی اپنے لوگوں پر حکم دیا کہ ہمارا بھی دل تیار ہو۔

پھر راجہ کے جی میں آیا کہ جس کے واسطے ہم آئے ہیں اس کی بھی پریت کی پرکھشا [3] لینی چاہیے اس طرح جی میں ٹھہرا بید کا سوانگ بن راجہ کاماگری میں گیا لوگوں سے کام کندلا کا مکان پوچھ دوارے پر جا بید حکیم کر تا پکارا آواز سنتے ہی ایک داسی باہر نکل آئی پوچھا کہ تم بید ہو تو ہماری نائکہ کا علاج کرو۔ جو وہ اچھی ہو گی تو تمھیں بہت سے روپے ملیں گے یہ باتیں کر داسی اسے اپنے ساتھ لے کر کام کندلا کے پاس گئی، راجہ نے دیکھا کہ نرجیو پڑی ہے راجہ نے اس کی ناڑی دیکھ کر کہا۔ کہ اس کو اور کچھ روگ نہیں پریم کا بیوگ ہے جس سے یہ گت بنی ہے۔ یہ بات سن کندلا نے آنکھیں کھول اس کی طرف دیکھا اور کہا "اس کا علاج تمارے پاس ہو تو کرو تب اس نے کہا علاج تو تھا پر اس وقت کچھ کہنے میں نہیں آتی تب وہ بولی کہ تمہارے پاس کیا علاج تھا وہ بتاؤ۔ راجہ نے کہا "مادھو نام ایک برہمن تھا اسے ہم نے اجین نگری میں برہ بیوگ سوگی دیکھا سو وہ کہا ہے مر گیا۔ یہ سنتے ہی اس نے بھی ہائے کر اپنا پران چھوڑ دیا جتنے داس داسی اس کے گھر کے تھے یہ دسا دیکھ کر سر پیٹ پیٹ کر رونے لگے تب راجہ نے کہا تم کچھ چنتا اپنے من میں مت کرو اسے مورچھا آگئی ہے۔ کتنی ایک دیر کے بعد سدھ آوے گی تم اس کی چوکسی کرتے رہو۔ میں اپنے گھر سے جا کر اوکھد [4] لاؤں راجہ الٹا پھر اپنے دل میں آیا اور مادھو کے آگے اس کے مرنے کی خبر کہی سنتے ہی ایک ہائے کے ساتھ اس کی بھی جان نکل گئی یہ دیکھ کر راجہ اپنے جی میں پچھتا کر بچار کرنے لگا کہ جس کے واسطے اتنا سماج کر کے پربھوم میں آیا اور اسے اس طرح کھو دیا یہ دو ہتیا میرے اوپر ہوئیں۔ اب اپنا بھی پران رکھنا اُچت نہیں یہ بات اپنے جی میں ٹھہرا دیوان بہت سا سنگوا چتا بنوا راجہ جیتا جلنے کو تیار ہوا۔ دیوان پردھان نے جتنا منع کیا نہ مانا جو چاہا کہ چتا میں بیٹھ آگ لگاوے کہ بیتال نے آ ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ راجہ تو اپنا جی کیوں دیتا ہے تب اس نے کہا کہ دو آدمی کی جان میں نے کھوئی اب میرا بھی جینا سنسار میں اس بدنامی کے پیچھے سے مرنا تم ہے۔ بیتال نے کہا راجہ میں امرت لاتا ہوں تو دونوں کو جلائے یہ کہہ دیکھ کر جلد بیتال پاتال سے امرت لے آیا اس برہمن پر چھڑک کر سی اٹھا پھر لے جا کر کام کندلا پر چھڑکا وہ بھی جی اٹھی اور مادھو پکارنے لگی راجہ کی صورت دیکھ کر کہا کہ تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو مجھ سے کہو تب راجہ نے کہا ہم بیر بکرماجیت ہیں مادھو کا برہ دور کرنے کے لئے اجین نگری سے یہاں آئے ہیں تو خاطر جمع رکھو

اچت نہیں ایپاس۔ ۲ [illegible]۔ ۳ امتحان۔ ۴ سودا۔

تجھے ہم مادھو سے ملا دیں گے۔ یہ سنتے ہی وہ اٹھ راجہ کے پاؤں پر گر پڑی اور کہا کہ یہ تم جی دان دو ئے اور جیسا تمہارا پرتاپ سنی تھی سو درست میں آیا اتنی بات سن کر راجہ پھر لشکر میں آیا۔ دوسرے دن اتنی فوج لے کانگری پر چڑھ دیا وہاں کے راجہ سے جدھ کیا اس راجہ نے بہادری اور تحمل کیا کہ ہم کام کندلا کو بھیج دیں گے اور یہ جو ہم نے جدھ کیا سو آپ کے درشن کے واسطے اور اس لئے کہ کسی طرح ہمارے گھر میں آپ کا چرن پڑے۔ آ کے راجہ سے ملاقات کر کے وہ راجہ اپنے مندر میں لے گیا بہت بھینٹ آئے ھر کام کندلا کو بلا راجہ کے آگے کھڑی کی اور اس نے بھی مادھو کو بلا کام کندلا کا ہاتھ پکڑ سوا لے کیا پھر وہاں سے کوچ کر اپنے نگر میں آئے مادھو کو بہت دھن، دولت دے بدا کیا۔

———

نورتن

محمد بخش مہجور

(۱۸۱۴ء)

چہ تر چار عورتیں ایک عورت کے لاشہ بے سر پر اوس نے چشم و دندان و لب کا بیان کرتی تھیں اون میں سے تین عورتوں نے اپنے کہے کا بادشاہ کو نشان دیا اور اپنا رستہ لیا اور چوتھی عورت بادشاہ کی قید میں رہی اور ایک سال کے بعد جو کہا تھا وہ کر دکھلایا اور دانائی سے بھاگ کر بادشاہ کو خجلت دی۔

دانایان جہان اور عاقلان زماں بالائے کاغذ فطرت یہ حکایت پر فراست یوں رقم کرتے ہیں کہ ایک عورت بد خصلت کا سر کسی سر دار باحیا نے کٹوا کے کہیں پوشیدہ دفن کیا اور اوس کے دھڑ کو چار سو بازار شہر غدار میں پھکوا دیا یہ خبر وحشت اثر جو بادشاہ عالم پناہ کو پہنچی تو کوتوال بد خصال کو ابلاغ حکم کیا کہ اس لاشہ بے سر کے پاس جو اشخاص آ کر تیغ زبان سے کل کتریں او سکی خبر بہر روش ہمارے قریب خبرداران صبا رفتار کے ہاتھ جلد پہنچے۔

الحاصل ایک تجار عالی وقار کی چار بیٹیاں غیرت گلزار ایک رتھ پر سوار چار سوے بازار میں ہو کر نکلیں ایک اژدحام خاص و عام کا وہاں دیکھ کر وہ سبھی ملاحظہ کناں ہوئیں یہ ماجرا حیرت افزا وحشت انجام دیکھ کر ایک جادو چشم اون میں سے بول اوٹھی کہ یہ عورت بد خصنت معلوم ہوتی ہے کہ سرمہ خوب لگاتی ہو گی۔ یہ کلام حیرت التیام دوسری رشک پری سن کر کہنے لگی "واقعی لیکن لالہ رو بد خوپان بھی انوپان سے افزوں کھاتی ہو گی" یہ بات عجائب نہایت سنکر تیسری خجلت دہ کبک دری جواب دہ ہوئی کہ یہ تیرہ بخت مسی بھی نہایت اچھی لگاتی ہو گی یہ سخن پر فن اوس کا گوش زد کر کے چوتھی یوں حرف زن ہوئی کہ "اس کمبخت بد بخت نے کیا اور کر نجانا" اشعار

جو ہوتی اسے عقل تو برملا ... نہ ہوتی گرفتار رنج و بلا

دیا ہے خدا نے جنہیں کچھ شعور ... نہیں اون سے ہوتا ہے ایسا قصور

یہ باتیں وہ نیک ذاتیں کہہ کر تو اپنے گھر کو روانہ ہوئیں اور یہ خبر وحشت اثر مخبران صادق اور محرران واثق کی زبانی بادشاہ کو پہنچی کہ فلانے سوداگر پری پیکر کی چار بیٹیاں ' غیرت مہر درخشاں ' رشک ماہ تاباں اس طرح کا کلام حیرت التیام کر گئی ہیں۔

المطلب بادشاہ عالی جاہ نے اون چاروں کو طلب فرما کر کہا کہ تم اپنے اپنے سخن کا جواب باصواب دو یعنی بے سر عورت کو تم نے کیونکر جانا کہ

یہ مسی اور سرمہ خوب لگائی ہوئی اور پان بہت کھاتی ہوگی یہ کلام بادشاہ عالی مقام کا گوش زد کر کے ایک جادو نگاہ سحر بیان جوابدہ ہوئی کہ اس کمتر ناچیز کے شعور بے قصور نے اوس تیرہ بخت کے گوشہ چادر میں سرمے کی سیاہی دیکھ کر دریافت کیا تھا اور دوسری رشک پری سے پوچھا کہ تجھ سرخ فام گل اندام سے کیونکر جانا تھا کہ وہ لالہ رو بہت پان کھاتی ہوگی وہ شعلہ خو جوابدہ ہوئی کہ پیر و مرشد اکثر جا بجا اوس کے دوپٹے میں پیک کی افشاں نمایاں تھی اور تیسری خجلت دہ کبک دری سے بادشاہ جمجاہ نے پوچھا کہ تو نے کس طرح دریافت کیا کہ وہ سیاہ بخت مسی خوب لگاتی ہوگی سے جواب دہ ہوئی کہ حضرت سلامت اوس کے ڈوپٹے کے آنچل میں جو دھری پوچھنے کا نشان بیگمان تھا اوس نے میرے گوش ہوش میں خبر دی تھی اور چوتھی فتنی سے پوچھا کہ تو جو کہتی تھی کہ کیا اور کر نجانا اوس کے کیا معنی ہیں سچ کہہ نہیں تو تیرا کہا تیرے آگے آئے گا وہ زبان چالاک سفاک جوابدہ ہوئی کہ خداوند نعمت اگر اوس کو شعور و قوف ہوتا تو اس بلا میں کیوں گرفتار ہوتی اور عقلمندی اور دانائی کے تو یہ معنی ہیں کہ کر کے اور کر دکھائے یہ سخن پر فن بادشاہ نے اوس کا سنکر اون تینوں کو بصد بشاشت رخصت کیا اور اسے ایک پختہ کوٹھری میں جید مقید کر کے یوں کہا کہ اے فتنی دیکھیں تو تو کیونکر کر دکھاتی ہے۔ نظم

اگر تجھ میں ہے کچھ فراست کا زور تو پیدا یہاں کر کوئی اپنا زور
نہیں تو اسی قید میں تیری جان کروں گا میں برباد اے بدزبان

القصہ اوس زن پر فن کو مقید کر کے ایک کوزہ آب دیا و پارچہ نان اپنے ہاتھ سے دینا مقرر کیا اور گاہے یہ سخن بھی پوچھتا کہ کیوں ری فتنی جہان میں کون چیز لذیذ ہے تو وہ جگر کباب چشم پر آب جوابدہ ہوتی کہ خداوند نعمت جہاں بے نشان میں رنڈیوں کو مرد نہایت عزیز اور لذیذ ہیں تو بادشاہ جوابدہ ہوتے کہ اے فتنی سب رنڈیوں کو میسر ہوگا لیکن تجھ ناکام تلخ کام کو نہ بہم پہنچے گا وہ کشتہ یاس بلا و سواس کہتی کہ آپ سچ فرماتے ہیں لیکن اللہ کو سب قدرت ہے چنانچہ کہتے ہیں۔ میر حسن۔ شعر

نہ لاؤ کبھی یاس کی گفتگو
کہ آیا ہے قرآں میں لا تقنطوا

الغرض اوس زن پر فن نے بہر صورت اپنے دوست نیک سیرت کو یہ پیغام بھیج کہ اے یار جانی وائے مایہ زندگانی یہ خانہ خراب جگر کباب اس عذاب منجلاب میں ہے کہ خدا دشمن کو بھی نصیب نہ کرے لیکن میری رہائی اس دانائی سے ہوتی ہے کہ ایک سرنگ بہر رنگ حسب دلخواہ اے رشک ماہ میرے قید خانے سے اور اپنے مکان دلستان تک طیار کر آگے میں سمجھ لوں گی۔ المطلب اوس سوداگر خوش منظر نے ایک سرنگ بید رنگ خاطر خواہ بخوبی غرض ایک روز وہ غم اندوز اوس سرنگ کی راہ اوس رشک ماہ کے قریب جا کر یہ گفتگو درمیان لائی کہ اے یار دمساز دلنواز بھر راز بالفعل تو کچھ جواہر زواہر تحفہ و نادر بادشاہ عالی جاہ کو نذر گذران اور بصد صفائی آشنائی پیدا کر کے اپنے گھر میں بطریق ضیافت طلب کر جو کچھ ہونا ہوگا ظہور میں آئے گا الغرض وہ سوداگر پری پیکر یوں ہی عمل میں لایا مگر بادشاہ جمجاہ کو اوس سوداگر خوش منظر سے اس قدر محبت بہم پہنچی کہ اگر اوس کے متاع حسن کو دیدہ میزان میں ایک روز نہ وزن کرتا تو جنس بے قراری کا نرخ بڑھ جاتا۔ بلکہ سودا پورا ہو جاتا اور آٹھ پہر ہنگامہ بازار عشق عاشقی کا گرم رہتا۔ نظم

غرض ایسی بڑھی دونوں میں الفت کہ رہتے تھے ہمیشہ بے کدورت
کبھی اوس پاس وہ شہ آپ جاتا کبھی اپنے بھی گھر اوس کو بلاتا

الحاصل اس عرصے میں اوس زن پر فن نے اس سوداگر خوش منظر سے خفیہ خفیہ نکاح کر لیا بعد انقضائے چند ایام نیک انجام اوس زہرہ جبین المعبت مکین کے ایک طفل رشک مہر درخشاں غیرت ماہ تاباں متولد ہوا لیکن وہ زن اوس طفل کو دائیوں کی آغوش میں دے کر آپ اپنے

قید خانے میں آ بیٹھی اور جس وقت بادشاہ دیوان خاص میں رونق افروز ہوتے وہ سرنگ کی راہ گھر لوٹ کر اپنے خانہ مطلب میں جا کر زینت بخش ہوتی اس عرصے میں جب نو مہینے کا وقت عشرت اندوز جلوہ گر ہوا تو وہ ماہ پیکر اوس سوداگر سے کہنے لگی کہ آج تو بادشاہ عالی جاہ کو مہمان خانے میں بجائے ضیافت طلب کر اور میرے ہاتھ سے لڑکے پیدا ہونے کی نذر دلوا دیکھ تو بطن فطرت سے کیا ثمر حرفت پیدا ہوتا ہے۔ الغرض اوس سوداگر خوش منظر نے بادشاہ عالی جاہ کو اپنے گھر میں بلوا کے اوس زن پرفن کے ہاتھ سے نذر حرفت دلوائی اوس عقل کو بھی آخوش بادشاہ میں بٹھا ورد یہ سخن زبان پر لایا کہ خداوند نعمت اس کنیز ناچیز کی نذر قبول بے عدول ہو لیکن بادشاہ اس عورت پر فطرت کو دیکھ کر نہایت متعجب ہو کر گرداب حیرت وسکوت میں مستغرق ہو گیا بعد شناوری بحر حیرانی ساحل گفتگو سے ہمکنار ہو کے یہ دل میں کہنے لگا کہ یہ تو وہی عورت پر فطرت صاف صاف معلوم ہوتی ہے کہ جس کو میں نے جید مقید کیا ہے۔ شعر

یہ نہیں معلوم کیا اسرار ہے
یا مری ہی عقل کج رفتار ہے

پھر سوچ کر کہنے لگا کہ میں نے تو اوس کو ایسی جا مقید کیا ہے کہ وہاں فرشتے کو بھی دخل نہیں اور اس کے سوا میں وہیں قید خانے میں اس کو مقید چھوڑ آیا ہوں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت ماہ طلعت کی صورت اس کی صورت سے نہایت ہم شباہت ہے لیکن یہ بات عجائبات بادشاہ کے دل میں گرہ ہوئی اس خیال کثیر الاختلال میں بادشاہ وہاں سے اٹھ کر اپنے مکان دلستان میں رونق افروز ہوا اور وہ زن پرفن بھی سرنگ کی راہ سے جھٹ پٹ اپنے قید خانے میں آ بیٹھی اور بادشاہ نے اس کو جو اسی قید خانے میں دیکھا تو وہیں بیٹھا لیا الغرض وہ زن پرفن بھی فن کرتی رہی کہ جب بادشاہ سوداگر کے پاس جاتا تو آپ بھی سرنگ کی راہ گھر راہ سے جا کر مقابلہ کرتی اور جب گھر میں تشریف فرماتا تو اپنے قید خانے میں آ بیٹھتی لیکن بادشاہ اس احوال پر ملال پر نہایت حیران و ششدر رہتا پر سوداگر آئینہ رو کی آشنائی بصفائی نبھی جاتی تھی کبھی دل پر غبار نہ آتا تھا۔

الغرض ایک روز اس زن پرفن نے اپنے سوداگر سے کہا "اے عزیز باتمیز آج تو بادشاہ عجلاہ کے پاس بلا وسواس جا کر یہ بات کہنا کہ میری ہمشیرزادی کی شادی کدخدائی کل کی تاریخ مقرر ہے لیکن وہ مکان رشک گلستان اس شہر مینو چہر سے دس منزل کامل ہے اور میری طلب کو وہاں سے قاصد مہینے کے قریب ہوا ہے کہ روانہ ہوا مگر ناساعدی وقت سے اس کمبخت کو ناگاہ راہ میں اس قدر بیماری ہوئی کہ وہ یہاں تک آنے کو وق رہا بارے اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے جو شفا پائی تو وہ بے ہر اس آج میرے پاس آیا ہے سو میں اب اس بات سے نہایت حیران و پریشان ہوں کہ کل کا روز دل افروز کا شادی کا معین ہے اور مجھ کو خبر فرحت اثر آج پہنچی۔ شعر

کیا کروں آہ سخت پریشان ہوں
گر نہ واں جاؤں تو پشیمان ہوں

سوائے خداوند نعمت نیر حشمت میری عروس تجویز کو حنائے اجابت سے یوں رنگین کیجئے کہ حضور پرنور میں وہ جو سانڈنی سو کوس کے دھاوے کی ہے عنایت و کرامت فرمایئے تو میں وہاں ایک روز میں پہنچ کر مہمانوں کے ہم پہلو ہوں اور اگر خدانخواستہ میرا وہاں جانا نہ ہوگا تو مہاریکا گی ہاتھ سے چھوٹ جائے گی اے عزیز باتمیز اگر تجھ کو وہ سانڈنی دیگا تو پھر میں اپنے توسن طبع کی چالاکی تجھ کو دکھادوں گی۔"

المطلب وہ سوداگر حسب ایمائے زن پرفن بادشاہ کے پاس جا کر وہ قصہ پر فریب افسانہ عجیب بیان کرنے لگا بادشاہ نے اس کی گفتگو پریاس و حسرت استماع کر کے داروغہ اشتر خانہ کو طلب فرما کے ارشاد کیا کہ ہماری وہ سانڈنی لیلیٰ نژاد کہ جو سو کوس تک جانے میں پہلو تہی نہیں کرتی اسکی مہار سوداگر مجنوں شعار کے ہاتھ میں حوالہ کردے بموجب ارشاد عالی وہ داروغہ ذہن سے خالی وہی سانڈنی جو اس سوداگر فتنہ گر کو دینے لگا تو اس کا سارباں پیر ناتوان بصد آہ و فغان کہنے لگا کہ اے داروغہ اگر یہ سانڈنی صبا رفتار رشک بہار کچھ حادثے میں گرفتار ہو جائے گی تو پھر تجھ کو خار حسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا کیونکہ ایسی سانڈنی رشک پری باغ جہان میں دوسری کوئی نہیں ہے غرض وہ داروغہ یہ مصلحت نیک دل میں سمجھ کر

کہنے لگا سچ ہے سخن بزرگان راست ست الغرض داروغہ شتر خانہ سے اسی کوس کی منزل کی سانڈنی اس سوداگر بے خبر کو دی اس سانڈنی قبلت وہ کبک دری پر وہ سوداگر مع زن فتنہ گر اور پسر رشک قمر سوار ہو کر فرار ہو گیا اس عرصے میں بادشاہ عالی جاہ کو دریافت ہوا کہ وہ سوداگر فتنہ گر زن فتنہ افروز سے شطرنج دغا کھیل کر کرامات عیاری سے میری بازی مات کر گیا اور مہرہ ہوش کو چار خانہ ششدر میں زچ کر گیا۔ مثنوی۔

کوئی ایسی نہیں اب سوجھتی چال　　　جو اوس کا توڑوں فرزین بند فی الحال
نہ کوئی گھوڑا ایسا ہے فیل　　　جو اوس کو مار لوں جا کر بہ تعجیل
پیارہ ہے نہ ایسا کوئی چالاک　　　کہ اوس تک رخ کرے اپنے وہ سفاک

الغرض وہ شہ شاطر زمان اوس آن داروغہ شتر خانہ کو طلب فرما کر کہنے لگا کہ کوئی اور بھی سانڈنی رشک پری ہمارے شتر خانہ میں سو کوس کے دھارے کی ہو تو جلد لا ہم تجھ کو انعام بے بہا دینگے یہ کلام بادشاہ عالی مقام کا سنکر وہ کہنے لگا کہ سچ ہے بڑے بوڑھوں کا کہنا ماننا مصلحت نیک ہے وقت پر کام آرہتا ہے آخر اوس کی بات کام آئی اگر آج یہ سانڈنی اوس کے حوالے کر دی ہوتی تو نہایت پشیمانی کھینچنی پڑتی۔

المدعا وہ سانڈنی چالاک بادشاہ غمناک کے قریب لا کر حاضر کی وہ بادشاہ جمجاہ اوس پر سوار ہو کر مثل صبا فر روانہ ہوا اس عرصے میں جب بادشاہ عالی جاہ کی سانڈنی سوداگر اور زن پر فریب کے قریب پہنچی تو ایک بار بادشاہ عالی مقدار نے للکار کر کہا کہ اے زن پر فن اب تو میرے ہاتھ سے جانبر کہاں ہو سکتی ہے یہ سخن دلشکن وہ زن پر فن سن کر کہنے لگی خدا خیر کرے ہماری سانڈنی پر دغا ہے مگر کیا مضائقہ ہم اپنے طعام فطرت کا بادشاہ کو مزا چکھادیں گے الغرض جب اوس سوداگر اور زن فتنہ گر کی سانڈنی اسی کوس کی منزل پر پہنچی تو یکایک اوس کی طاقت نے پہلو تہی کر کے اوس صحرائے ہولناک میں مقام کیا وہ زن مکار اور سوداگر عیار مع پسر رشک قمر اوس سانڈنی کی پشت پر سے اوتر کے سامنے ایک باغ پر فراغ تھا مثل نسیم سبک رو اوس کی طرف روانہ ہو کر دونوں اوس باغ کے دروازے کے ایک ایک پٹ کی اوٹ میں بزور بازوے دانائی جھٹ پٹ روپوش ہو گئے اس میں بادشاہ جمجاہ نے جو آ کر ملاحظہ فرمایا کہ وہ دونوں ناپاک بیباک اوس باغ میں پوشیدہ ہیں اپنی سانڈنی پر سے اوتر کر باغ کے اندر بے تحاشا یہ کہتا چلا۔ شعر

اب کہاں ہاتھ سے جاتی ہے مرے وہ ناپاک　　　ایک ہی ہاتھ میں تلوار کے کرتا ہوں ہلاک

یہ کہتے کہتے وہ بادشاہ تو باغ کے اندر مکانات عجائبات میں ڈھونڈھنے لگا اور یہ دونوں پر فن پٹوں کی اوٹ سے جھٹ پٹ نکل کر بادشاہ کی سانڈنی پر سوار ہو کر وہ زن مکار پکار پکار کر یوں کہنے لگی کہ اے بادشاہ غفلت پناہ "کیا اور کر دکھایا" اسے کہتے ہیں۔ مثنوی۔

یہ کہہ کر وہاں سے وہ زن نابکار　　　بہ شکل ہوا ہو گئی جب فرار
تو دست الم مل کے وہ بادشاہ　　　لگا کہنے میں بے اجل ہو گیا
مرے پاؤں میں اب یہ طاقت کہاں　　　جو گھر تک پہنچ جاؤں بیخوف جاں
غرض بادشہ تو روتا رہا　　　مگر ہو گئی وہ وہ سے ہوا
جو مجبور ہوتی نہ وہ باشعور　　　تو اوس وقت میں قتل ہوتی ضرور

فسانہ عجائب

رجب علی بیگ سرورؔ

(۱۸۲۴ء)

حکایت پسر جگستن بیٹے کا پیدا ہونا سفر کی کیفیت جہاز کی تباہی شہزادی

کا ملنا، پھر مفارقت، جگستن کا ساتھ جانا۔

ایک شخص تھا جگستن نام نہایت اہل دول، مرفہ حال، علم و فضل، جامع ہر کمال طبیب اور ادیب بے بدل۔ سخن سنج، لطیفہ گو، بر محل کمالات میں یگانہ روزگار تجارت میں نامور ہر دیار۔ سو سو جہاز ایک بار تجارت کو جاتا تھا۔ نصیب ایسا تھا مٹی کو چھوتا سونا ہاتھ آتا تھا۔ کسی طرح کا حاجت مند بجز فرزند ارجمند تھا شب و روز اسی کا خیال تھا۔ مدام فرحت میں یہ ملال تھا۔ خوش قسمتوں کی دعا جلد قبول ہوتی ہے، تمنائے دل حصول ہوتی ہے۔ پچھتر برس کے سن میں اللہ نے بیٹا عنایت کیا حسب دلخواہ۔ صورت میں غیرت ماہ۔ بہت شاد اس سرگرم پرورش تھا۔ جب بارہ برس کا ہوا بسبب طبع رسا و تعلیم استادان باذکا جمیع علوم اور فنون میں کامل ہوا اور درس دینے لگا۔ مطب کرنے لگا۔ چودھویں سال باپ سے سفر کی اجازت چاہی کہ تجارت میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہ جائے۔ جگستن نے کہا اپنا بھی یہی قصد تھا مگر چندے توقف شرط ہے اس نے عرض کی حضور عمر طبعی کو پہنچے۔ مسن ہیں۔ فدوی کے سیاحت کے دن ہیں۔ چاہتا ہوں کہ آپ کے بقید حیات سفر کو جاؤں، جودت طبع دکھاؤں۔ آخر جگستن نے دس بارہ جہاز پر متاع و مال چندرہ میں رفیق قدیم دیانت دار امانت شعار ہمراہ کو رخصت کیا۔ جہاز ایک سمت روانہ ہوئے دو مہینے کے بعد ہوا لے جوا گردوں سے جہاز جاہ ہو گئے۔ جگستن کے بیٹے کا بھی جہاز ڈوبا یاران ہمراہی عالم بقا کو راہی ہوئے۔ یہ ایک تختے پر ڈوبتا چھلتا بہہ چلا۔ حیات مستعار باقی تھی ساتویں دن تختہ کنارے پر لگا۔ اس کو غش سے جو افاقہ ہوا تختے سے اترا اور گھانس کی رسی بنا وہ تختہ پتھر سے اٹکا دیا۔ پھر آپ بتلاش آب و دانہ روانہ ہوا۔ چند قدم بڑھا تھا کہ شہر نمودار ہوا آہستہ آہستہ بیٹھتا اٹھتا شہر میں داخل ہوا۔ وہاں عجب سانحہ طرفہ ماجرا نظر آیا۔ دکان ہر ایک کھلی اشرفی روپیہ کا ڈھیر اسباب سب طرح کا موجود، مگر آدمی کا پتہ مفقود اس قرینے سے ثابت ہوا کہ عرصے سے یہ بازار جنس بشر سے خالی ہے۔ شہر کا وارث بے سر و الی ہے۔ پھرتا پھراتا قلعہ میں آیا دیکھا باغ سرسبز پر میوہ، بیچ میں بنگلہ، زربفت کے نفیس پردے پڑے۔ پردہ اٹھا بنگلے میں آیا۔ پلنگ جواہر نگار گستردہ، اس پر کوئی بشکل مردہ، دوپٹہ تانے، نہ کوئی پاس نہ کوئی سرہانے پڑا ہے۔ اس نے دوپٹہ سرکایا۔ عورت نے چونک کر سر اٹھایا اس کی صورت دیکھ کر کہا اے عزیز اپنی جوانی پر رحم کر یہ مکان نہیں سیل فنا ہے، تو نا آشنا ہے۔ اس لئے در گذر و گرنہ آفت کا جلا ہو گا۔ خدا جانے ایک دم میں کیا ہو گا اس نے کہا ایسا ماجرا کیا ہے۔ بیان تو کر عورت نے کہا تو پہلے اپنے آنے کا حال سنا کیونکر آپھنسا ہے۔ اس نے کہا سات دن سے

بھوکا پیاسا ہوں جو کچھ کھاؤں تو داستان پریشان سناؤں۔ عورت بولی مدت کے بعد کھانے کا نام تیرے منہ سے سنا ہے۔ سو کھانا یہاں کہاں بجز غم کھانے اور پانی سوا اشک بہانے کے 'آنسو پینے کا نام ہے۔ اس سے نہیں پیتی ہوں۔ اور کھانے کی قسم ہے قسم تک نہیں کھاتی ہوں۔ متحیر ہوں کیونکر جیتی ہوں۔ مگر تنہائی میں ہاں خوف کھائے روز دن بھر روتی ہوں۔ ہر شب کہ شب اولین گور ہے جاگتی رہتی ہے۔ سخت جانی کی بدولت نہیں مرتی ہوں۔

تو اس باغ میں جا اور جس میوے پر رغبت ہو کھا۔ مجستن کے بیٹے نے جا کے میوہ کھایا۔ نہر سے پانی پیا گونہ رنج فاقہ کشی سے افاقہ ہوا۔ پھر عورت کے پاس آکر حسب و نسب اپنا اور باعث سفر اور جہاز کی تباہی مفصل سرگذشت سنائی۔ پھر اس کا ماجرا پوچھا وہ بولی اے شخص اس شہر بے چراغ کی میں شہزادی ہوں۔ باپ میرا والئی ملک تھا مجھ کو سوائے سیر و شکار کے کسی امر سے سروکار نہ تھا۔ ایک روز لب دریا معروف تماشا بیٹھی تھی دفعتہً ایک سانپ نمودار ہوا اور میری طرف بڑھا۔ میں نے تیر مارا معلوم نہیں لگایا خطا کر گیا۔ پھر جو دیکھا تو اژدہائے مہیب شکل عجیب جھپٹتا آتا ہے۔ میں تو گھوڑے پر چڑھ کر بھاگی۔ جو جو ہمراہ رکاب تھے وہ طعمہ دہن مار خونخوار ہوئے۔ کہاں تک بیان کروں۔ ساکنان شہر مع بادشاہ انسان سے تا حیوان کوئی نہ بچا۔ فقط میں سخت جان باقی ہوں اور یہ صحبت ہے کہ قریب شام وہ مار خون آشام آکر اس بنگلے کے نیچے بیٹھتا ہے دو گھڑی کے بعد غائب ہو جاتا ہے۔ مجھ پر جب بھوک پیاس کا غلبہ ہوتا ہے اسی باغ سے میوہ کھا پانی پی لیتی ہوں۔ اس خرابی سے جیتی ہوں کوئی غمخوار بجز ذات پروردگار نہ تھا۔ آج تجھے دیکھا خوف خدا آیا مطلع کر دیا پسر مجستن نے کہا خاطر پریشان جمع رکھ۔ اگر فضل الٰہی شریک حال ہے تو اس آفت سے جلد نجات ہو جائے گی۔ یہ کہہ کر جہاں سانپ کے بیٹھنے کا نشان تھا' وہاں گڑھا کھودا۔ قلعے سے بارود لا کر اس میں بچھائی اور دور تک نقب سی بنائی۔ پھر گھانس ہری اس پر جمائی۔ شہزادی نے کہا اب وہ آتا ہی ہوگا۔ یہ سن کر سر نقب جا پوشیدہ ہو کر بیٹھ رہا دفعتہً وہ افعی پر زہر خدا کا قہر آیا اور اپنی جگہ پر اس سبز قدم نے فرش زمردین پایا۔ بہت خوش ہو کر بیٹھا۔ یہ تو تاک میں تھا پتھر سے آگ نکال اس نقب میں ڈال دی۔ فوراً ایک دھماکا پیدا ہوا۔ وہ ٹکڑا زمین کا مع سانپ آسمان پر پہنچا۔ دونوں نے شکر کا سجدہ بدرگاہ دافع البلیات کیا باہم بے اندیشہ و غم رہنے لگے سات برس تک دونوں سات رہے اس عرصے میں دو لڑکے بھی پیدا ہوئے ایک دن رنج تنہائی کی شہزادی نے شکایت کی کہ اکیلے طبیعت نہیں لگتی۔

کوئی ترکیب ایسی نکالو کہ پھر یہ شہر آباد ہو خاطر غمگین شاد ہو وہ بولا کہ اگر وطن جاؤں اور مجستن کو یہاں لاؤں تو یہ بستی سے عورت نے کہا اکیلی میں کیونکر بسر کروں گی میں بھی ساتھ چلوں گی آخرش ایک ایک لڑکا دونوں گود میں لے کے چل نکلے قضارا وہاں پہنچے جہاں تختہ بندھا تھا ذہن میں آیا اسی پر سوار ہو کھولدو کہیں تو جا نکلو گے یہ سوچکر دونوں سوار ہوئے وہ تختہ کھولنے لگا شہزادی بولی مال و اسباب تو اس قدر ہے کہ بیان قاصر ہے مگر ایک ناریل اکسیر سے بھرا ہے دولت لا انتہا ہے جو تو اجازت دے تو اسے لے آؤں۔ مصرع

بدوزد طمع دیدہ ہوشمند

مجستن کے بیٹے نے کہا "اچھا" وہ تختہ کچھ کھلا کچھ بندھا یونہی رہا شہزادی لڑکا لیے اتری اس کے اترتے ہی ایسی تند ہوا چلی کہ رسی ٹکان سے ٹوٹ گئی تختہ بہہ چلا ہر چند اس نے ہاتھ پاؤں مارے وہ ساحل مطلب سے کنارے ہوا کنارے پر شہزادی بحال خراب دریا میں وہ بادل کباب بہہ نکلا دل سے کہتا تھا دیکھیے مرضی ناخدا نے کشتی بادبان شکستہ کیا ہے یہ جھونکا ہوائے قوم عاد کا ہے اس سوچ میں تھا کہ ایک جہاز نمودار ہوا اہل جہاز نے دیکھا تختے پر کوئی جوان گود میں لڑکا نادان لئے بہا جاتا ہے رحم کھا بچاؤ کو دوڑا جہاز پر لیا اتفاق زمانہ مالک جہاز مجستن کا دوست دمساز تھا اس کو پہچانا بہت تعظیم و تکریم سے پیش آیا۔ کئی روز میں جہاز کلکتے میں داخل ہوا جہاز کا حاکم مجستن کی ملاقات کو آیا بچھڑے بیٹے کو باپ سے ملایا یہاں جس دن سے جہاز کی تباہی مجستن نے سنی تھی غریق لجہ غم تھا پیارے بیٹے کو دیکھ کر سجدہ بدرگاہ باری کیا پوتا گھاتے میں ملا اور کلمات شکر یہ اس سے کرنے لگا

اس [illegible] خبر سے دنیا ہی کا کام ہے جس کا کام جس سے تقلب قرد و صنعت ہے کہ اس چند روز بجستن سے بیچے ہے دو ماہ سفر ہو گئی اس [illegible] سرگزشت سب بیان کی یہ عکر سمجھا [illegible] چاکر کہاں [illegible] [illegible] خبر سے اس میں تھی [illegible] مصرعہ

بر سر فرزند آدم ہرچہ بگذرد

[illegible] نے کہا مناسب یہ ہے کہ اب جلد چلئے ایسا ملک مالا مال یہ دولت لازوال ہاتھ سے نہ جانے دیجئے بجستن نے کہا خیر ہے یہ بھی ایک [illegible] میں نے سنا اور خواب تھا جو تو نے دیکھا۔ اااعلم

ایام وصال و صحبت سیم تناں

در عالم خواب حتلام شد درفت

اس نے کہا آپ سا عقلمند ایسا کلمہ فرمائے تو نہایت بعید ہے دنیا میں تین معرکے ہیں زر زمین زن یہ سب سامان بیچ ہیں اگر آپ نہ جائیں گے فدوی تنہا جائے گا۔ بجستن نے کہا افسوس ہم تجھے دانا جانتے تھے الا ہماری نادانی تھی حمق کی مقتضی تمہاری جوانی تھی اے بھائی کوئی نادان سے بدتر [illegible] کی بات کا دھیان نہیں کرتا یہ باتیں جب تک تھیں جو تم اور وہ باہم تھے وہ مونس تھی تم ہمدم تھے اب خیر یت ہے۔ سعدی نے

زن دوست بود و لے زمانے ۔۔۔۔ تا جز تو نیافت مہربانے

چوں در بر دیگرے نشیند خواہد کہ ترا دگر نہ بیند

مصرعہ

اسپ و زن و شمشیر وفادار کہ دید

ہر چند اس نے مغز خالی کیا یہ مقدمہ اس پر حالی کیا وہ بے مغز نہ سمجھا۔

مصحفی

مصحفی سود نصیحت کا نہیں عاشق کو میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے

[illegible] بجستن نے کہا تم جب تک ذلت نہ اٹھاؤ گے اور ہمیں خراب نہ کرو گے اس حرکت بیجا سے باز نہ آؤ گے نہ چین لو گے اسی دن سامان سفر [illegible] کیا [illegible] سے جہاز مع اسباب اور چند مشیر خوش تدبیر ہمراہ لے روانہ ہوا چند روز میں وہ جزیرہ ملا جہازوں کو لنگر ہوا بجستن کا بیٹا اترا اگر جہاں ویران [illegible] کا آشیانہ تھا وہاں بستی دیکھی اور جس جگہ بیڑ تھا سے ہموار پایا بلند نظر آئی نہ پستی دیکھی آدمی ہر سمت سرگرم کار و شہر پناہ تیار ہے تعجب ہوا سمجھا کہ میں بھول گیا کسی سے پوچھا اس شہر کا نام کیا ہے والی ملک کون سا ہے وہ بولا مدت سے یہ ملک بسبب آفت آسمانی اجاڑ ہوا کیا تھا [illegible] برباد [illegible] بھی نہ بچا تھا [illegible] بادشاہ کی بیٹی باقی تھی اب برس دن سے اس نے شوہر کیا ہے شہر از سر نو آباد ہوا نیا طرز ایجاد ہوا یہاں [illegible] ہے [illegible] کا شوہر وہی منڈی ہے بجستن نے یہ ماجرا سن کر بیٹے سے کہا خوش بہت ہوئے ہو گے لو سیدھے پھر چلو اس نے کہا تھی صعوبت سفر کی [illegible] کی صورت بھی نظر نہ آئی وہ باتیں کر لوں تو پھر چلوں بجستن نے کہا یہ معصیت کچھ نہ تھی جو بات کرنے میں ایذا

اٹھے گی۔ وہ کب مانتا تھا انھیں لوگوں سے پھر پوچھا شہزادی کبھی سوار بھی ہوتی ہے وہ بولے روز۔ غرضیکہ سواری کا وقت دریافت کر لڑکے کا ہاتھ پکڑ کے سر راہ کھڑا ہوا کہ شہزادی شبدیز کو مہمیز کرتی آ پہنچی یہ پکارا ہم نے ایفائے وعدہ کیا حاضر ہوئے اور لڑکا بھی فضل الٰہی سے سلامت موجود ہے کیا ارشاد ہوتا ہے اس نے بیگانہ وار جیسے کسی اجنبی کو کوئی دیکھتا ہے ملاحظہ کیا جواب کچھ نہ دیا چلی گئی یہ خفیف گھر پھرا مجسٹن نے حال پوچھا لا ملاقات نہ ہوئی کل پھر جاؤں گا اس نے کہا صبح کا جانا روز الم شام غم دکھائے گا بہت پچھتائے گا اس نے دوسرے روز بیٹے کو سکھلایا کہ جب سواری قریب آئے گھوڑے سے لپٹ جانا اور یہ زبان پر لانا کہ دنیا کا لہو سفید ہو گیا مہر مادری سے محبت پدری میں لطف زیادہ ملا کہ ہمیں ساتھ بار ہا تمام لئے پھرتا ہے تم بات بھی نہیں کرتی ہو بلکہ پہچانتی نہیں جب سواری قریب آئی یہ تو بہت جلا تھا اور سمجھ چکا تھا کہ کھیل تو بگڑ گیا کہا شہزادی باگ کو روکو وہ خود تور کی تھی باگ بھی رک گئی پسر مجسٹن بولا۔

مولف

یاد ایام کہ نفرت تھی زمانے سے تجھے
ہوتی وحشت تھی بہت غیر کے آنے سے تجھے

خوف آتا تھا کہیں آنے سے جانے سے تجھے
مکر تھا یاد خبر تھی نہ بہانے سے تجھے

بے دھڑک غیر سے باتوں کا کبھی طور نہ تھا
ہمیں ہم تھے تری صحبت میں کوئی اور نہ تھا

کبھی چوٹی کی خبر تھی نہ تھا کنگھی کا خیال
بارہا الجھے سے رہتے تھے ترے سر کے بال

پان کے لاکھے سے اور مسی سے ہوتا تھا ملال
مجھ کو افسوس یہ آتا ہے کہ گذرا نہیں سال

ایسی کیا بات ترے دل میں سمائی ظالم
دفعتہ سب وہ رہ و رسم بھلائی ظالم

تھی لگاوٹ ہی تجھے یاد نہ خلطا سب سے
گرمجوشی کا بھلا کب تھا یہ لپکا سب سے

بیٹھنا کونے میں ہر دم تجھے تنہا سب سے
تجھ کو لگ چلتے کبھی ہم نے دیکھا سب سے

اب تو ٹٹی میں کیا چھید غضب تو نے کیا
کھل گیا سب پہ ترا بھید غضب تو نے کیا

شکر صد شکر ہوئی جلد رہائی تجھ سے
ابتو تا حشر مکدر ہے صفائی تجھ سے

وضع اپنی نہیں کیا کیجئے برائی تجھ سے
نہ ملیں پر جو کہے ساری خدائی تجھ سے

بخدا ملنے سے ہم ہاتھ ترے دھو بیٹھے
خوش رہو تم کہ تمہیں کھول کے دل رو بیٹھے

اب قسم کھاتا ہوں لو دل نہ لگاؤں گا کبھی
ذلت و رنج نہ اس طرح اٹھاؤں گا کبھی

گر طرحدار بھی اس دہر میں پاؤں گا کبھی
ربط تو کیا ہے نہ میں پاس بٹھاؤں گا کبھی

موسم اب دل کے لگانے ہی کا جاتا نہ رہا
ربط کیا خاک کریں ہم وہ زمانہ نہ رہا

[illegible] دل کے یہ ذکر رہے گا ہر بار
گو کہ عاشق تھا مگر تھا یہ بڑا غیرت دار

دیکھ بد وضع کیا دیکھئے ایسا اللہ — سر پٹک مر گئے سب پر نہ ملا وہ ذہد

کرے معشوق کسی سے تو وفا ایسی کرے

گر کرے بات کی عاشق تو بلا ایسی کرے

یہ سن کر وہ شرمندہ ہوئی پھر لڑکا گھوڑے سے لپٹا بیچارہ نادان باتوں کا سود و زیاں کچھ نہ سمجھا جو کچھ باپ نے سکھلایا تھا کہنے لگا جب کہہ چکا شہزادی نے تیغ تلوار سے کھینچ لڑکے پر جھونک دیا وہ دم سے گر پڑا وا ئے ! اس نے کنار عاطفت میں اٹھا لیا اٹل تلوار سے ملا دیا پھر پاک اٹھا تل گلی جگسٹن نے بیٹے کی بہت خاک اڑائی بیٹے کی لاش باپ کو دکھائی اس نے کہا کیوں جو ہم نے کہا تھا وہی آگے آیا وہ بدنصیب بولا سچ تقسیم ہے جو ہونا ہے ہو جائے گا جگسٹن نے کہا تو اپنا بھی حال ایسا ہی بنائے گا دم سحر جب وہ جلا جگسٹن کا جی نہ رہ سکا ساتھ ہوا جس دم شہزادی کی سواری پاس آئی باگ پکڑی ہنوز زبان نہ ہلائی تھی شہزادی نے کہا اے جگسٹن ہم نے سنا تھا کہ مرد جہاندیدہ و سرد و گرم روزگار چشیدہ تجربہ رسیدہ ہے مگر افسوس یہ ایں ریش فش تو نے سنا نہیں۔ لااعلم

زحادثات جہاں نی ہمیں پسند آمد

کہ خوب وزشت و بد و نیک در گذر دیدم

اس پیرانہ سالی میں تجھ پر ہزار سانحے گذرے ہوں گے کچھ الم و رنج کا مزا لیا فرحت و خوشی کا نشہ باقی ہے اے نادان دنیا میں کس بات کو یاد کیجئے کس کا غم کس سے خاطر شاد کیجئے اگر عقل رسا کچھ فہم و ذکا ہو تو دنیا میں کافی ہے یہ بات گزشتہ را صلوات۔

مصحفی

اے مصحفی میں رووں کیا پچھلی صحبتوں کو

بن بن کے کھیل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

یہ سن کر گھوڑا پھیر کر اکہ پھر سلسلہ جنبائی اس امر بے معنی کی موجب مضرت جانا جگسٹن نے بیٹے کو سلام کیا اور نہ کچھ کلام کیا وہ بھی نطفہ [illegible] ایسے باپ کا بیٹا تھا تجربہ وطن پھر ا جیتے جی باپ سے آنکھ چار نہ کی۔

الف لیلیٰ

رجب علی بیگ سرورؔ

(سوتے جاگتے کی حکایت)

الف لیلہ کی داستانیں کئی زبانوں میں ترجمہ ہوئیں اور کئی بار اردو میں بھی' مختلف اہل قلم نے' زبان کے ردوبدل سے پیش کیں۔

پیش نظر داستان کی زبان ۱۸۴۴ء کی نہیں' بعد کی معلوم ہوتی ہے۔ ۱۸۴۴ء میں اسے حسن علی خاں کشمیری' جعفر علی' شدیدالدین خاں نے پیش کیا تھا۔

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں ایک سوداگر نہایت امیر و کبیر تھا۔ اور اس کے ہاں ایک ہی لڑکا تھا جس کا نام ابوالحسن تھا۔ اس سوداگر کے مرنے کے بعد ابوالحسن اس کی تمام املاک کا وارث ہوا مال و دولت بے انتہا تھی۔ جس کو اس نے نہایت بیدردی سے صرف کیا اور اپنے دوستوں کو بھی اس قدر دیا کہ وہ سب مال دار ہو گئے۔ پھر اس تمام روپیہ کو اس نے دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ سے اس قدر جائیداد خریدی کہ جس کی آمدنی اس کے تمام اخراجات کے لئے کفالت کرتی تھی۔ اور دوسرے نقد حصہ میں سے خرچ کیا کرتا بہت سے دوستوں کا مجمع اس کے اردگرد رہتا۔ دن رات ناچ رنگ مجرے اور شراب خوری اور دیگر عیش و عشرت میں گذارتا یہاں تک کہ وہ تمام روپیہ صرف ہو گیا۔ اور ابوالحسن مفلس ہو گیا۔ اس کی مفلسی دیکھ کر اس کے دوستوں نے بھی اس کے گھر آنا جانا بند کر دیا یہاں تک کہ اگر وہ راہ میں مل جاتا۔ تو وہ اس سے آنکھ چرا کر نکل جاتے ابوالحسن دوستوں کی یہ بے مروتی اور بے حمیتی دیکھ کر سخت حیران ہوتا اور اپنے دل میں افسوس کرتا کہ جن لوگوں کے پیچھے میں مفلس و قلاش ہو گیا' ان کے اخلاق و سلوک کا یہ عالم ہے۔

ایک دن ابوالحسن اسی فکر میں تھا کہ اس کی والدہ نے اسے پریشان خاطر دیکھ کر پوچھا کہ بیٹا ابوالحسن آج پریشان کیوں ہو۔ مجھے تو تمہاری بے اعتدالیاں دیکھ کر پہلے ہی یقین تھا۔ کہ تم جلد مفلس ہو جاؤ گے۔ افسوس تم نے اپنا تمام زر و مال نالائق دوستوں کو کھلا دیا۔ جو آج تم سے صاحب سلامت کے بھی روادار نہیں ابوالحسن والدہ کی یہ بات سن کر رو پڑا اور اپنے ان دوستوں کے پاس گیا جن پر اسے کمال اعتبار اور حسن ظن تھا اور ان سے کچھ مدد کا بصورت قرض طلبگار ہوا لیکن ان سب نے صاف انکار کر دیا غرضیکہ ابوالحسن والدہ کے پاس واپس آیا اور کہا کہ والدہ جو تم نے کہا تھا بجا تھا۔ اب میں عہد کرتا ہوں کہ کسی بغدادی سے دوستی نہ کرونگا۔ پھر کچھ مال و اسباب فروخت

کر کے کچھ تھوڑا سا سرمایہ اکٹھا کیا اور نہایت احتیاط سے گھر رکھا۔ اور اپنا یہ دستور ٹھہرا لیا کہ ہر روز ایک نووارد مسافر کو اپنے ساتھ گھر لے جاتا اس کو کھانا کھلاتا۔ اور آدھی رات تک اس سے باتیں کرتا اور فجر ہوتے ہی اس کو رخصت کر دیتا۔ اور اس سے کہہ دیتا کہ پھر کبھی میرے گھر نہ آنا غرضیکہ زیادہ ملاقات سے گھبراتا اور یہ دستور بھی اس نے اپنی طبیعت سے مجبور ہونے کی وجہ سے بنا رکھا تھا۔ کیونکہ وہ عرصہ سے دوسروں کے ساتھ مل کر کھانا کھانے کا عادی تھا۔ اور بلا اس کے نہیں رہ سکتا تھا۔

ایک دن کا ذکر ہے کہ ابوالحسن کسی نووارد کی تلاش میں بغداد کے پل پر بیٹھا ہوا تھا کہ خلیفہ ہارون الرشید سے ملا۔ خلیفہ نے اپنی ہیئت اور لباس کو بدلا ہوا تھا۔ اور کوئی شخص بھی اس کو پہچان نہ سکتا تھا۔ کیونکہ خلیفہ کی عادت تھی کہ وہ ہر رات اپنا لباس تبدیل کر کے نکلتا تھا۔ تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ رعایا کس حال میں ہے اور حکام شہر اپنے فرائض کی ادائیگی میں تو قاصر نہیں ہیں۔ غرضیکہ اس دن خلیفہ موصل کے ایک سوداگر کے لباس میں تھا۔ اور اس کے ہمراہ ایک غلام تھا۔ ابوالحسن نے جھٹ سلام علیک کر کے کہا۔ "بندہ پرور ایک رات غریب خانہ پر تشریف لا کر تناول ماحضر سے مشکور کریں۔"

ہارون الرشید نے اس کی دعوت کو قبول کر لیا اور ابوالحسن کے ساتھ اس کے گھر کی جانب چلا اثنائے راہ میں ابوالحسن نے اپنا دستور ہارون الرشید سے کہا۔ ابوالحسن اس کی بھولی بھالی باتوں پر حیران تھا۔ اور کہتا تھا کہ ضرور اس میں کوئی نہ کوئی راز ہے اسے دریافت کرنا چاہیے۔ ابوالحسن خلیفہ کو لے کر اپنے مکان پر پہنچا۔ اور نہایت پر تکلف کمرے میں بٹھایا۔ جو ہر طرح کے شیشہ و آلات وغیرہ سے آراستہ تھا۔ پھر خود اپنے ہاتھوں سے دستر خوان بچھایا اور اس پر نہایت پر تکلف کھانا چن دیا۔ دستور عرب کے مطابق دونوں کھانے کو بیٹھے اور کھانے کے دوران میں کسی قسم کی کوئی بات نہ کی ابوالحسن اچھی اچھی چیزیں اٹھا کر اپنے مہمان عزیز کے سامنے رکھتا۔ جب دونوں کھانے سے فارغ ہو چکے تو خلیفہ کے غلام نے دونوں کے ہاتھ دھلائے۔ جب کھانا وغیرہ اٹھا لیا گیا۔ تو ابوالحسن کی والدہ نے نہایت اعلیٰ قسم کے میوہ جات سنہری طشتریوں میں لا کر ان کے سامنے رکھے شام ہونے پر ابوالحسن نے تمام شمعیں روشن کیں اور شیشہ و ساغرہ صراحی اور مے ناب وغیرہ لا کر سامنے رکھ دیئے۔ پھر خلیفہ اور ابوالحسن دونوں شراب نوشی کرتے رہے۔

ابوالحسن نے اپنی والدہ سے کہہ دیا تھا کہ غلام کو خوب اچھی طرح کھانا کھلانا جب ابوالحسن اور خلیفہ دونوں سرور میں آ گئے تو خلیفہ ابوالحسن کی بذلہ سنجیوں سے نہایت خوش ہوا اور اس کا حسب و نسب دریافت کیا ابوالحسن نے اپنی تمام کیفیت مع دوستوں کی بے وفائی کے بیان کی اور کہا۔

"میں نے عہد کر لیا ہے کہ میں آئندہ اہل بغداد سے کبھی دوستی نہ کروں گا اور نہ ان سے ملوں گا۔ کیونکہ یہ لوگ سخت بے وفا ہیں بلکہ ان کی بجائے ایک نووارد آدمی کو لا کر اس سے دل بہلاؤں گا۔ اور صبح ہی صبح اسے رخصت کر دیا کرونگا۔ جیسا میں نے راستہ میں تم سے ذکر کیا تھا۔"

خلیفہ نے کہا "بیشک ایسے دوستوں سے نہ ملنا چاہیے۔ اب تمہارا وقت اچھا گذرتا ہے کہ روز ایک نئے دوست سے دل بہلاتے ہو۔ اور فجر ہونے سے پیشتر اسے رخصت کر دیتے ہو تم بڑے اچھے مزاج کے آدمی ہو۔ مجھے تو تمہاری اس خوش اخلاقی پر رشک آتا ہے۔"

پھر دونوں دیر تک شراب نوشی اور نہایت خوش کن باتیں کرتے رہے جب رات کچھ زیادہ گذر گئی تو خلیفہ نے کہا۔

"بھائی اب تم بھی آرام کرو اور میں بھی آرام کرتا ہوں کیونکہ صبح منزل پر چلنا ہے اور میری خواہش ہے کہ میں تمہارے اس حسن سلوک کا عوض [illegible] ادا کروں۔ میں بغدادی دوستوں کی طرح نہیں ہوں۔"

ابوالحسن نے [illegible] کچھ تم نے کہا میں تمہاری اس جوانمردی پر تمہاری تعریف کرتا ہوں اور تمہارا مشکور

ہوں مجھے کسی چیز کی حاجت نہیں جو میں تم سے بیان کروں خدا گواہ ہے مجھے کسی قسم کی ہوس نہیں اور جو تم میرے احسان کے عوض کوئی خدمت کرنا چاہتے ہو تو تمہاری طرف سے یہ کافی بدلہ ہے کہ تم نے میری دعوت قبول کی اور ماحضر تناول کر کے مجھے مشکور کیا۔ اور میں تو تمہارے غلاموں کی حیثیت بھی نہ رکھتا تھا۔ محض تمہاری بندہ نوازی تھی کہ تم میرے غریب خانہ میں تشریف لائے۔ البتہ ایک امر ایسا ہے۔ جسے میں اپنے لئے تکلیف محسوس کرتا ہوں۔ مگر تم مسافر پردیسی ہو اس لئے تمھارا اس معاملہ سے کوئی دخل نہیں۔ تم جانتے ہو کہ بغداد میں ہزاروں محلے اور گلی کوچہ میں اور ہر محلہ میں ایک مسجد ہے جس میں ایک موذن رہتا ہے جو پانچوں وقت لوگوں کو نماز کے لئے بلاتا ہے اس محلّہ کا موذن جس میں مَیں رہتا ہوں نہایت شریر بدباطن اور ریاپسند ہے اور لوگ اس کی مردم آزاری سے نہایت تنگ ہیں اس کے چار دوست یا مشیر ہیں وہ اسی کی طرح مردم آزار ہیں۔ تمام محلّہ کے لوگ ان سے نالاں ہیں۔ سب ان سے ڈرتے ہیں اور خاص کر مجھے ان سے شکایت اور تکلیف ہے۔"

خلیفہ نے کہا "تم نے ان کی نسبت کیا علاج تجویز کیا ہے؟"

ابوالحسن نے کہا "علاج کیا؟ خدا سے ڈرتا ہوں کہ فقط ایک دن کے لئے مجھے خلیفہ ہارون الرشید بنا دے۔"

خلیفہ نے کہا "اگر تم ایک دن کے لئے خلیفہ بن جاؤ تو کیا کرو؟"

"جو چار اس کے مشیر ہیں۔ سو سو درے ان کی پیٹھ پر لگواؤں اور چار سو درے صرف اس موذن کی پیٹھ پر بطور سزا کے لگوا دوں پھر میرے دل کی حسرت نکلے اور آئندہ دوسروں کو عبرت ہو کہ جو لوگ اپنے ہمسایوں کو تنگ کرتے ہیں ان کی یہی سزا ہے۔" ابوالحسن نے کہا۔

خلیفہ ابوالحسن کی اس خواہش سے نہایت خوش ہوا اور دل میں ارادہ کیا کہ اس فعل کو اس کے ہاتھوں سے پورا کرا دے پھر ابوالحسن سے مخاطب ہوا اور کہا۔

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ خدا تمہیں تمھاری خواہش میں کامیاب کرے خدا کی قدرت سے بعید نہیں کہ وہ ایک دن کے لئے تمہیں خلیفہ بنا دے۔ اور یہ بھی بعید نہیں کہ خلیفہ تمھاری لیاقت سے آگاہ ہو کر ایک دن کے لئے تمہیں اپنا قائم مقام بنا دے اور تم اس صورت میں ان مفسدوں کو سزا دے سکو۔ میں تو ایک اجنبی سوداگر ہوں ورنہ جو سزا تم نے تجویز کی ہے میں ضرور انہیں دیتا۔"

ابوالحسن نے کہا "تم میری اس بات پر تمسخر کرتے ہو اگر خلیفہ بھی ان باتوں کو سن لے تو یقیناً تمھاری طرح مجھ پر تمسخر کرے۔"

خلیفہ نے کہا "کیا مجال کہ میں تم جیسے محسن پر جس نے مجھے نہایت مزیدار کھانا کھلایا۔ شراب پلائی۔ افسوس یا اسے تمسخر کروں اور یہ بھی یاد رکھو کہ خلیفہ ایسا بیوقوف نہیں کہ تمھارے اس مقصد میں حائل ہو یا اس پر ہنسے یا تمسخر اڑائے اب آدھی شب گذر گئی ہے سونا چاہیے۔" ابوالحسن نے کہا "یہ جو تھوڑی سی شراب باقی رہ گئی ہے اسے تم پی کر سو رہو اور ہاں ایک بات کا خیال رہے اور وہ یہ ہے کہ تم صبح جس وقت یہاں سے چلو تو دیوان خانہ کا دروازہ بند کر کے جانا۔"

خلیفہ نے کہا "ہاں اسی طرح کیا جائے گا۔"

پھر ایک گلاس شراب کا پہلے خلیفہ نے آپ پیا اور دوسرا بھر کر اس میں کچھ سفوف بیہوشی ملا ابوالحسن کو دیا اور کہا کہ یہ آخری جام میرے ہاتھ سے پی لو۔ ابوالحسن نے فوراً آداب بجا لا کے شراب پی لیا اور پیتے ہی اس پر آثار بے ہوشی طاری ہو گئے۔ اور پھر وہ غافل ہو گیا۔ پھر خلیفہ نے غلام کو بلایا۔ جو غلام گردش میں کھڑا تھا اور کہا "اس آدمی کو اپنے کندھے پر اٹھا۔ اور اس کے گھر کو اچھی طرح پہچان لے کیونکہ جب میں کہوں گا تو اسے پھر یہیں لا کر چھوڑنا ہو گا۔" غلام نے کہا "بہتر حضور" اور ابوالحسن کو اپنے کندھے پر اٹھا لیا۔ اور خلیفہ کے

ہمراہ قصر اسے شاہی کو چلا۔ خلیفہ اس غلام کو لئے ہوئے اپنی خوابگاہ میں گیا۔ وہاں سب خواجہ سرائے اور لونڈیاں وغیرہ جن کی ڈیوٹی تھی خلیفہ کے تشریف لانے کے انتظار میں تھے۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ اس شخص کو میرے شب خوابی کے کپڑے پہناؤ۔ اور میرے پلنگ پر لٹاؤ۔ اور صبح جس وقت یہ بیدار ہو تو جس طرح مجھے مخاطب کیا کرتے ہو اسی طرح امیر المومنین کے نام سے اسے مخاطب کرو اور اسے میرا قائم مقام جانو۔ پھر خلیفہ نے وزیر جعفر کو بلا کر کہا۔

"صبح ایک اور آدمی ہماری جگہ تخت پر جلوس کریگا اس کو ہمارا قائم مقام سمجھنا۔ اور ہر طرح سے اس کے لئے آداب شاہی جو میرے لئے مخصوص ہیں بجالانا اور جس کسی کو وہ سزا دے اسے سزا دینا اور جسے وہ انعام دلوائے۔ فوراً اسے انعام دینا۔"

پھر مسرور خواجہ سرائے کو بلا کر کہا۔

"جس طرح تو مجھ کو صبح کے وقت نماز کے لئے جگایا کرتا ہے اس شخص کو بھی ایسے ہی جگانا۔"

غرضیکہ خلیفہ تمام ہدایات جاری کرنے کے بعد دوسرے مکان میں جا کر سو رہا۔ اور صبح ایک ایسی جگہ پر چھپ کر بیٹھا جہاں سے ابوالحسن کی تمام حرکات دیکھ سکے۔ اور اس کو کوئی نہ دیکھے۔ صبح ہو گئی۔ تمام خواصیں، کنیزیں، لونڈیاں اپنی اپنی جگہ پر مودبانہ طریق سے کھڑی ہو گئیں۔ اتنے میں مسرور خواجہ سرا نے اسفنج کا ایک ٹکڑا سرکہ میں تر کر کے ابوالحسن کی ناک کے پاس لے جا کر سونگھایا۔ ابوالحسن کو سرکہ کی تیزی سے چھینک آ گئی۔ اور اس نے چاہا۔ کہ بلغم کو تھوکے کہ ایک کنیز نے بڑھ کر سونے کا اگالدان آگے کر دیا تاکہ قالین پر نہ گرے کیونکہ خلیفہ کو اس سرکہ کے اسفنج سے اٹھاتے تھے۔ ابوالحسن نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنے آپ کو ایک نہایت سجے ہوئے کمرہ میں پایا جس میں کئی قسم کی شمعیں روشن تھیں۔ اور جس کی چھت نہایت خوبصورت تھی پھر اس نے سامنے نہایت ہی حسین و جمیل کنیزوں کو صف بستہ دیکھا۔ بعض کے ہاتھوں میں مور چھل تھے اور بعض سونے کے اگالدان لئے ہوئے تھیں اور بعض کے ہاتھوں میں گانے بجانے کے آلات تھے اور کئی ایک خواجہ سرا لباس زرنگار میں نہایت مودبانہ طریق سے کھڑے ہوئے تھے۔ لحاف اور پلنگ پوش پر نگاہ کی تو انہیں بھاری کمخواب کا بنا ہوا پایا جن کے گرد موتیوں کی جھالریں لٹک رہی تھیں۔

ابوالحسن یہ تمام ساز و سامان دیکھ کر نہایت حیران ہوا۔ اور دل میں خیال کیا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں۔ اگر بیداری ہے تو کیا میں واقعی خلیفہ ہوں؟ رات کو اس مہمان سے باتوں باتوں میں خلیفہ ہونے کا ذکر کیا تھا۔ شاید کہیں وہی خیال میرے دماغ میں نہ سمایا ہوا ہو اور اصلیت کچھ بھی نہ ہو اسی خیال میں پھر آنکھیں بند کر کے سونے کا ارادہ کیا کہ ایک خواجہ سرا نے بڑھ کر کہا۔

"یا امیر المومنین۔ یہ سونے کا وقت نہیں ہے۔ نماز کا وقت ہو چکا ہے آفتاب طلوع ہوا چاہتا ہے۔"

ابوالحسن نے یہ سن کر خیال کیا کہ میں سوتا نہیں بلکہ بیدار ہوں سویا ہوا آدمی کسی کی بات کو نہیں سنتا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول دیں [illegible] شمعوں کی روشنی میں نظر آتی تھیں انہیں دن کی روشنی میں دیکھا تو دل میں نہایت خوش ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اور اسے یقین ہو گیا کہ واقعی خدا نے مجھے خلیفہ بنا دیا ہے۔

خلیفہ ہارون الرشید یہ تمام حرکات دیکھ دیکھ کر نہایت خوش ہو رہا تھا اتنے میں ایک نہایت حسین و کمسن کنیز آگے بڑھی اور زمین بوس ہوئی اور گانے والیوں نے بانسلی بجا کر چھوٹے سر میں سلامی دی شہنائی اور دیگر سازوں کی آوازوں نے ابوالحسن کو اس قدر حیران کر دیا کہ وہ اپنے آپ کو بھول گیا ایک پھر اس کو خیال آیا کہ میں خواب دیکھ رہا ہوں یا بیداری ہے۔ اس نے پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں پھر جب اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو مسرور خواجہ سرا آگے بڑھا اور عرض کیا۔

"یا امیر المومنین [illegible] ہے کہ حضور نے نماز صبح ادا نہیں کی کیا کچھ خداوند کی طبیعت خراب ہے۔ یا یونہی سست تھی۔ اب بستر

سے اٹھئے۔اور دربار عام کو تشریف لے جائیے اور حکم احکام جاری فرمائیے۔ تمام اراکین دربار حضور کی تشریف آوری کے منتظر ہیں۔"

یہ سن کر تو ابوالحسن کو پختہ یقین ہو گیا کہ میں خلیفہ ہوں۔ اور یہ جو کچھ ہے خواب نہیں۔ بلکہ عین حقیقت ہے۔ پھر ابوالحسن نے خیال کیا کہ مجھے یہ مرتبہ کیسے نصیب ہوا؟ اور اسی خیال سے مسرور سے کہا" تو یہ باتیں کس سے کر رہا ہے اور کس کو امیر المومنین کے نام سے مخاطب کرتا ہے کسی اور کے دھوکہ میں تو مجھے امیر المومنین نہیں کہہ رہا۔" مسرور نے جواب دیا۔ "خداوند! آپ کیا کہہ رہے ہیں شاید غلام کی آزمائش کرتے ہیں۔ خداوند! کیا امیر المومنین نہیں اور کیا حضور نائب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہیں؟ مسرور خانہ زاد ہو مدتوں سے حضور کی خدمت کا شرف حاصل کر رہا ہے کس طرح اپنے آقائے نعمت کو بھول سکتا ہے۔ خداوندا غریب پرور اوہی نظر عنایت رکھیں جو مدت سے غلام پر چلی آتی ہے۔ کیا خداوند نے رات کوئی خواب پریشان دیکھا ہے جس کے اثر سے اس قسم کی گفتگو فرمارہے ہیں۔"

ابوالحسن مسرور کی اس بات پر بہت ہنسا خلیفہ بھی چاہتا تھا کہ ٹھٹھا مار کے ہنسے۔ لیکن ضبط سے کام لیا۔ تاکہ کہیں ابوالحسن آواز نہ سن لے غرضیکہ ابوالحسن ان حالات کو دیکھ کر دیر تک ہنستا رہا۔ اور پلنگ پر ذرا درست ہو کر اٹھ بیٹھا۔ اور پھر ایک نوردسال حبشی بچے کو لے کر کہا۔

"سچ بتا کہ میں کون ہوں؟" اس نے کہا" حضور خلیفہ امیر المومنین ہیں۔ اور نائب سید المرسلینؐ ہیں۔"

ابوالحسن نے کہا تو سخت جھوٹا ہے اور اسی وجہ سے تیری صورت ایسی منحوس ہو گئی ہے۔"

پھر ابوالحسن ایک نہایت ہی حسین و جمیل کنیز کی طرف متوجہ ہوا۔ اور کہا" ادھر آ۔ اور اپنے دانتوں سے ذرا میری انگلی کو کاٹ تاکہ میں دیکھوں کہ میں بیدار ہوں۔" اس خواص نے سمجھ لیا کہ خلیفہ بھی کہیں پوشیدگی سے اس کو دیکھ رہا ہو گا۔ اس لئے ذرا زور سے ابوالحسن کی انگلی کو کاٹا ابوالحسن درد سے تلملا اٹھا اور کہا میں واقعی خلیفہ بن گیا ہوں اور یہ امر نہایت حیرت انگیز ہے پھر اس کنیز سے پوچھا' خدا کے لئے سچ سچ بتاؤ۔ کہ میں واقعی امیر المومنین ہوں اور تمہارا مالک ہوں۔" اس نے جواب دیا۔" واقعی ہمارے مالک و صاحب ہیں۔ اور ہم آپ کے غلام ہیں پھر جب ابوالحسن نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو ایک خواجہ سرا نے بڑھ کر ہاتھ تھام لیا۔ اور تمام محل میں آداب و سلام کا شور مچ گیا۔ تمام خواجہ سراؤں اور خواصوں اور کنیزوں نے دعا دی کہ خدا امیر المومنین کے اس دن کو بخیریت گذارے۔

ابوالحسن حیران تھا اور دل میں کہتا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ کل تک تو میں ابوالحسن تھا۔ اور آج خلیفۃ المومنین بن گیا ہوں میرے وہم و فکر میں یہ معاملہ نہیں بیٹھتا تھا کہ میں کس طرح اس عالی رتبہ پر فائز ہوا۔

پھر خواجہ سراؤں نے ابوالحسن کو خلیفہ کی پوشاک پہنائی اور دونوں طرف قطاریں باندھ کر کھڑے ہو گئے اور مسرور آگے بڑھا۔ اور ابوالحسن کو دربار عام کی طرف لے گیا۔ ابوالحسن دربار میں پہنچ کر تخت کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ تاکہ کوئی بازو تھام کر اسے تخت پر بٹھا دے۔ اتنے میں دو امیر آگے بڑھے اور انھوں نے ابوالحسن کے بازوؤں میں ہاتھ دے کر تخت پر بٹھایا بمجرد تخت پر بیٹھنے کے چاروں طرف سے ملازموں کی آوازیں آداب و سلام کی بلند ہونے لگیں جسے سن کر وہ نہایت مسرور ہوا پھر ابوالحسن نے جب اپنے دائیں بائیں نظر کی تو بڑے بڑے سرداروں کو صف بستہ ایستادہ دیکھا پھر تمام لوگوں کے مقدمات سننے کی طرف متوجہ ہوا۔ وزیراعظم جعفر بھی سامنے حاضر ہوا اور پائے تخت کو بوسہ دے کر دعا دی کہ "امیر المومنین پر ہمیشہ خدا کا سایہ رہے۔ اور آپ لاکھوں برس سلامت رہیں۔ اور دین و دنیا میں مرتبہ بلند ہو۔ دوستوں کو مسرت نصیب اور دشمن ذلیل ہوں۔" یہ تمام باتیں دیکھ کر ابوالحسن کو یقین ہو گیا۔ کہ میں واقعی خلیفہ ہوں اور جاگتا ہوں۔ یہ عالم خواب نہیں ہے۔ بلا کسی محنت کے خدا نے مجھے بادشاہ بنا دیا ہے۔ پھر امور سلطنت کی سرانجام دہی میں مصروف ہوا۔ اور وزیراعظم سے کہا۔

"تمہیں کچھ عرض کرنا ہے؟"

اس نے کہا "امیر اور عہدہ داران افواج وغیرہ حضور کے سلام کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔ اور باریابی چاہتے ہیں" ابوالحسن نے کہا "دروازہ دربار عام کا کھول دیا جائے اور ان سب کو پیش کیا جائے۔"

غرضیکہ وہ سب حاضر ہوئے اور نہایت مودبانہ طریق سے آداب شاہی بجالائے اور پھر اپنی اپنی جگہ پر خاموش کھڑے ہو گئے پھر وزیراعظم نے لوگوں کی درخواستیں پیش کیں اور ہر ایک کے مقدمہ کے متعلقہ حالات عرض کرنے لگا اس سے پہلے کہ وزیر ان مقدمات کو پیش کرے۔ ابوالحسن نے حکم دیا کہ کوتوال شہر کو پیش کیا جائے۔ کوتوال شہر حاضر ہوا ابوالحسن نے کہا کہ فلانے محلّہ کے امام مسجد اور اس کے مشیروں کو درے لگائیں جائیں اور پھر انہیں اونٹ پر الٹا سوار کر کے تمام شہر میں تشہیر کیا جائے اور آگے آگے ان کے منادی کرائی جائے کہ یہ سزا ان لوگوں کی ہے جو اپنے اہل محلّہ کو ناحق تنگ کریں اور ان پر جھوٹی تہمتیں لگائیں۔

غرضیکہ کوتوال شہر نے ابوالحسن کے اس حکم کی تعمیل کی کیونکہ خلیفہ نے بھی کوتوال کو اس پر عمل کرنے کے لئے اشارہ کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ امام مسجد اور اس کے مشیر درحقیقت نہایت شریر تھے اور لوگوں کو ان سے سخت تکلیف تھی۔ جب کوتوال شہر نے عرض کیا کہ حضور اس پر عمل کیا گیا۔ تب ابوالحسن نے وزیراعظم سے کہا کہ فلانے محلے میں ابوالحسن نامی ایک شخص رہتا تھا اس کی والدہ کو ایک ہزار اشرفیاں پہنچا دی جائیں اور کہا جائے کہ یہ خلیفہ نے تیرے لیے بھیجا ہے۔

وزیر جعفر نے ایک غلام کے ہاتھ ایک تھیلی ایک ہزار اشرفی کی ابوالحسن کی ماں کو پہنچا دی۔ وہ دیکھ کر نہایت خوش ہوئی اور حیران تھی کہ خلیفہ نے ہمارے حال پر کیوں اس قدر مہربانی کی۔ درحقیقت وہ اصلی معاملہ سے بے خبر تھی۔ کہ اس وقت خود اس کا لڑکا خلیفہ بنا ہوا ہے۔

جب تمام امور سے فراغت ہو چکی۔ تو ابوالحسن نے دربار برخاست کر دیا۔ تمام اراکین دربار رخصت ہو گئے اور صرف وزیراعظم جعفر اور خواجہ سرائے مسرور اور خود ابوالحسن رہ گئے۔ اس وقت ابوالحسن وزیر اور مسرور کی مدد سے تخت سے نیچے اترا اور محل کی جانب چلا اسی اثناء میں اسے جائے ضرور کی حاجت ہوئی۔ مہتر نے پاخانہ شاہی کے دروازے کھول دیئے۔ جس میں سفید سنگ مرمر کے فرش بچھے ہوئے تھے اور ایرانی قالین اور نہایت اعلیٰ درجہ کے زربفت وغیرہ بھی بچھے ہوئے تھے۔ داروغہ جائے ضرور نے ایک سنہری جوتی کا جوڑا ابوالحسن کے سامنے رکھا۔ کیونکہ خلیفہ اسی جوڑہ کو پہن کر جائے ضرور میں جایا کرتا تھا۔ ابوالحسن اس بات سے بے خبر تھا اس نے اس جوڑے کو اٹھا کر اپنی کشادہ آستینوں میں رکھ لیا۔ وزیر اور مسرور اس کی اس حرکت پر ہنسے لیکن انہوں نے ضبط سے کام لیا اور کہا کہ حضور اس جوتی کو پہن کر پاخانہ میں جایا کرتے ہیں۔ غرضیکہ ابوالحسن اس جوتی کو پہن کر پاخانہ میں گیا جب وہ اس سے فارغ ہو چکا تو مسرور اسے کھانا کھانے والے کمرہ میں لے گیا۔ وہاں دستر خوان بچھایا گیا طرح طرح کے لذیذ کھانے چنے گئے اور ساتھ گانے کے طائفے [illegible] ابوالحسن کے کھانے پر بیٹھتے ہی انہوں نے گانا بجانا شروع کر دیا۔

[illegible] خیال کرنے لگا کہ میں تمام ان باتوں کو خواب میں دیکھ رہا ہوں یا بیداری میں پھر خیال کیا کہ یہ بیداری میں ہی ہے۔ [illegible] میں واقعی خلیفہ بن گیا ہوں ابوالحسن وہاں کی ہر چیز کو دیکھ کر نہایت حیرت زدہ تھا۔ سات عدد نہایت حسین و جمیل لونڈیاں [illegible] سامنے گا رہی اور ساز بجا رہی تھیں اور نہایت اعلیٰ درجہ کے جھاڑ فروزاں تھے اور سونے کی انگیٹھیوں میں عود سلگایا جا رہا تھا۔ [illegible] حسین و جمیل خواصیں جو نہایت نفیس پوشاک پہنے ہوئے تھیں مورچھل ہلا رہی تھیں اور ابوالحسن تمام اشیاء کو دیکھ دیکھ کر [illegible] بے حد خوش ہو رہا تھا اور ان سب کو کہتا تھا۔ کہ ایک ایک باری باری مورچھل ہلائے۔ اور باقی میرے ساتھ دستر خوان [illegible] دستر خوان پر اچھی اچھی چیزیں دیکھ نہایت خوش ہو رہا تھا مگر وہ لحاظ سے کھانے میں ہاتھ نہیں ڈالتی

تھیں۔ ابوالحسن نے ان کو کھانے میں شریک کیا اور ہر ایک سے ان کا نام دریافت کیا۔ ایک نے کہا میرا نام مرمرجان ہے دوسری نے کہا مرجان لب تیسری نے کہ میرا نام مہتاب ہے چوتھی نے کہا میرا نام خورشید ہے' پانچویں نے کہا میرا نام نزہت ہے' چھٹی نے کہا میرا نام فرحت ہے ساتویں نے کہا میرا نام مصری ہے پھر وہ ہر ایک کے نام پر مذاق کرتا رہا اور خلیفہ بھی ایک ساتھ کے مکان میں چھپا ہوا یہ حال دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ جب کنیزوں نے دیکھا کہ ابوالحسن کھانے سے فارغ ہو چکا ہے تو خواجہ سراؤں سے کہا کہ ہاتھ دھلانے کے لئے آفتابہ وغیرہ لایا جائے۔ پھر وہاں سے اٹھ کر دوسرے کمرہ کو گیا۔ اس کے جاتے ہوئے تمام کمرہ نغمہ وسرود کی آواز سے گونج اٹھا۔ وہاں جواہر نگار قندیلیں روشن تھیں اور زریں دستر خوان پر طرح طرح کے میوے چنے تھے اور سات عدد نہایت ہی حسین خواصیں ایستادہ تھیں۔ ابوالحسن دستر خوان پر بیٹھا اور ان کو بھی اپنے ساتھ شامل ہونے کا کہا اور ان سے بھی ان کے نام دریافت کئے جو انھوں نے پہلی خواصوں کی طرح بتلائے پھر ہر ایک کو میوے اٹھا اٹھا کر دینے لگا۔ اور کھلاتا گیا۔ پھر اس کمرہ سے اٹھ کر بارہ دری میں گیا۔ وہاں بھی محفل رقص وسرود آراستہ تھی اور سات عدد نہایت ہی خوبصورت وکمسن کنیزیں اپنے ہاتھوں میں طرح طرح کے پیالے جن میں قسم قسم کے شربت تھے' لئے کھڑی تھیں ابوالحسن کے شربت پیتے ہی انھوں نے گانا بجانا شروع کیا۔ ابوالحسن نے ان کے نام بھی دریافت کئے انھوں نے بھی سابقہ خواصوں کی طرح اپنے نام بتائے ابوالحسن نہایت خوش ہوا۔ اور ہر ایک سے بے تکلفانہ گفتگو کرتا۔ خلیفہ اس کی حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر نہایت خوش ہوتا۔

اب ابوالحسن یہاں سے ایک چوتھے کمرہ میں گیا۔ وہ بھی سابقہ کمروں کی طرح ہر ایک شے سے آراستہ وپیراستہ تھا۔ وہاں کافوری شمعیں بلوریں فانوسوں میں جل رہی تھیں اور جو نظارہ اس کمرہ میں تھا۔ وہ کسی دوسرے کمرہ میں نہ دیکھا گیا تھا۔ یہاں بھی کئی ایک طائفے گانے بجانے کے لئے تیار تھے۔ اور ان کی دلفریب ادائیں اور آوازیں بہشت بریں کا نمونہ پیش کر رہی تھیں۔ وہاں سات عدد لونڈیاں اور بھی تھیں جو اپنے ہاتھوں میں طلائی طشتریاں لئے کھڑی تھیں جن میں شراب کے بعد کھانے کا سامان نہایت قرینہ سے لگا ہوا تھا۔ اور اسی کمرہ میں ایک جانب ساتھ طلائی صراحیاں شراب سے بھری رکھی تھیں اور ان کے گرد جام بلورین معہ طلائی دستوں کے موجود تھے۔ ابوالحسن نے ان تینوں کمروں میں سوائے پانی کے کچھ نہ پیا۔ کیونکہ شہر بغداد کی رسم تھی۔ کہ تمام بڑے بڑے لوگ رات کو مخفی طور پر شراب نوشی کرتے تھے اور دن کو اس سے نہایت پرہیز کرتے تھے۔ جب ابوالحسن چوتھے مکان میں داخل ہوا۔ تو وہاں بھی سات عدد نہایت خوش رو خواصیں موجود تھیں جن کو دیکھ کر ابوالحسن حیران رہ گیا۔ اور جس قدر وہ پہلے کنیزوں کو دیکھ چکا تھا یہ ان سب سے زیادہ خوبصورت تھیں۔ ابوالحسن انھیں دیکھ کر فریفتہ ہو گیا۔ اور چاہا کہ ان سے گفتگو کرے۔ لیکن سازوں کی آوازیں اس قدر بلند تھیں کہ اسے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ ابوالحسن نے گانا بجانا بند کرنے کا حکم دیا۔ اور ایک نہایت ہی کمسن اور حسین وجمیل کنیز کو آگے بڑھنے کا حکم دیا جب وہ قریب آئی تو اس سے پوچھا۔

"تیرا نام کیا ہے" اس نے کہا "یا امیر المومنین میرا نام سلک مروارید ہے۔"

ابوالحسن نے کہا "تیرے دانت تو موتیوں سے بھی زیادہ آب وتاب رکھتے ہیں جس نے تیرا یہ نام رکھا ہے اس نے سخت غلطی کی ہے۔ تیرا نام تو اس سے بہتر ہونا چاہیے تھا۔ بھلا ایک جام تو شراب کا دے۔"

اس نے ابوالحسن کو ایک گلاس میں شراب ڈال کر دی وہ پی گیا پھر اس کنیز نے ایک گلاس ابوالحسن کے حکم سے خود پیا اور پینے سے قبل ایک نہایت دلفریب گیت گایا جس کو سن کر ابوالحسن نہایت خوش ہوا۔

پھر ایک دوسری خواص کو بلایا اس سے پوچھا "تیرا نام کیا ہے" اس نے کہا "میرا نام کوکب الصبح ہے۔" ابوالحسن نے کہا "تیری

آنکھیں ستاروں سے بھی زیادہ روشن ہیں۔ یہ جام درست کہیں لعل سے بہتر ہو چکا ہے تھا۔"

۔ پھر ایک جام اس کے ہاتھ سے بھی پیا۔ پھر ایک تیسری خواص جس کا نام شمس النہار تھا۔ اس کی طرف مخاطب ہوا اور اس کے ہاتھ سے بھی ایک جام پیا۔ ابوالحسن نے جب پے در پے کئی جام شرابوں کے پیئے۔ تو خلیفہ نے سلک مروارید کنیز کو اشارہ کیا کہ ایک جام میں سفوف بیہوشی ملا دے۔ اس نے بموجب حکم خلیفہ کے ایسا ہی کیا اور جام سفوف بیہوشی آمیز ابوالحسن کو دیا۔ وہ اس کو بھی نہایت خوشی خوشی نوش کر گیا۔ پھر اس کنیز نے ایک گیت بانسلی کے ساتھ گایا۔ اور ابوالحسن سے کہا کہ یہ گیت میں نے آج صبح بنایا ہے۔ ابوالحسن اسے سن کر نہایت خوش ہوا اور حالت نشہ میں وجد کرنے لگا۔ جب اس خواص نے گیت ختم کر دیا۔ تو ابوالحسن نے چاہا کہ اس کی داد دے اور تعریف کرے لیکن سفوف بیہوشی اپنا اثر کر چکا تھا۔ تعریف کرنے کی غرض سے نصف منہ اس نے کھولا ہی تھا کہ بیہوش ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں ڈھیلے ہو گئے۔ اور وہی روز اوّل والی کیفیت ہو گئی۔ خلیفہ نے غلام کو حکم دیا کہ اس کے شاہی کپڑے اتار ڈالو اور اس کے اصلی کپڑے اس کو پہنا دو غلام نے حکم کی تعمیل کی۔

پھر خلیفہ نے کہا "اس کو لے جا کر اس کے مکان کے دیوان خانہ میں لٹا دو اور باہر نکلتے وقت دروازہ کھلا چھوڑ دینا" غلام حسب الحکم اس کو اس کے گھر لے گیا۔ اور اس کے بستر پر لٹا دیا اور خود محل کو واپس چلا آیا۔ تاکہ خلیفہ کو اہتمام کار کی اطلاع دے پھر خلیفہ نے اپنے مصاحبوں سے کہا کہ ابوالحسن یہ دعا مانگتا تھا کہ خدا اسے ایک دن کے لئے خلیفہ بنا دے۔ تو وہ اپنے محلّہ کے موذن مسجد اور اس کے چار مشیروں کو سزا دے کیونکہ ان کے ہاتھوں اہل محلّہ سب کے سب تکلیف میں تھے۔ سو میں نے اسے ایک دن کے لئے خلیفہ بنا کر اس کے ارمان کو پورا کر دیا تو اس نے بموجب اپنی خواہش کے ان کو سزا دی۔

اب ابوالحسن کی سنو کہ جب غلام اس کو اس کے گھر چھوڑ آیا تو وہ تمام رات بیہوش رہا۔ صبح ہونے پر اس نے آنکھ کھولی۔ اور اپنے گھر کو دیکھ کر سخت حیران ہوا۔ سلک مروارید، کوکب الصبح وغیرہ کنیزوں اور خواجہ سراؤں کے نام لے لے کر آوازیں دیں اور کہا کہ تم کدھر ہو یہاں کیوں نہیں آتے۔ ابوالحسن کی ماں اس کی آواز سن کر دوڑی ہوئی آئی اور کہا۔

"بیٹا خیر تو ہے کیوں اس طرح کی باتیں کرتے ہو۔"

ابوالحسن نے اپنی ماں کی طرف نہایت غرور سے دیکھا اور کہا "اے اچھی بی بی تو کسے اپنا بیٹا کہتی ہے؟"

اس نے کہا "کیا تو میرا بیٹا نہیں ہے۔ میں حیران ہوں کہ تم مجھے بھول کیوں گئے۔"

ابوالحسن نے کہا "اے نالائق عورت کچھ ہوش سے بات کر میں ہرگز ہرگز تیرا بیٹا نہیں ہوں۔ تو نہایت جھوٹی ہے۔ ادب سے بات کر میں امیر المومنین ہوں۔"

اس کی ماں نے کہا "خاموش رہ ایسی بیہودہ گفتگو نہ کر ورنہ لوگ تجھے ابھی پکڑ کر لے جائیں گے۔"

ابوالحسن نے کہا "میں پاگل نہیں ہوں میرے ہوش و حواس درست ہیں۔ میں فی الحقیقت امیر المومنین ہوں۔ اور نائب رسولؐ ہوں جو دونوں جہان کا مالک ہے۔"

۔ اس کی ماں نے جواب دیا "معلوم ہوتا ہے کہ تجھ پر کسی جن کا سایہ ہو گیا ہے یا کوئی شیطانی چیز تیرے جسم میں حلول کر گئی ہے" اور کہا "میں در حقیقت تیری ماں ہوں۔ اور تو میرا بیٹا ابوالحسن ہے" اور وہ تمام علامتیں جو ابوالحسن کے ابوالحسن ہونے میں ہو سکتی تھیں بتائیں۔ اور اس کی [illegible] کیا اور کہا دیکھ یہ گھر تیرا ہے۔ یا خلیفہ کا محل ہے اور کیا میں ہمیشہ سے تیرے ساتھ نہیں رہی اور جو کچھ میں نے تجھ سے کہا ہے [illegible] واہیات گفتگو کو چھوڑ دے۔ یہ مرتبہ نہ تجھے حاصل ہے اور نہ کبھی حاصل ہو گا اور کبھی بھی اس قسم

کا نام زبان پر نہ لانا۔"

ابوالحسن یہ سن کر کچھ سوچنے لگا اور تھوڑی دیر ٹھہر کر آنکھیں کھولیں اور کہا "ماں جو کچھ تو نے کہا ہے یہ سب سچ ہے۔ اور میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ یہ میرا مکان ہے۔ اور میں ابوالحسن ہوں۔ لیکن میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ باتیں میرے دماغ میں کیونکر پیدا ہو گئیں۔

اس کی ماں نے خیال کیا کہ اس کو شاید کوئی دماغی بیماری ہو گئی ہے۔ جس کے سبب سے اس قسم کی گفتگو کرتا ہے یہ خیال کر کے کچھ مسکرائی اور کہا "شاید بیٹا تو نے کوئی خواب دیکھا ہے۔"

ابوالحسن نے ذرا پھر کچھ سوچ کے کہا "او نالائق عورت سوچ سمجھ کر بات کر میں ہرگز تیرا بیٹا نہیں ہوں اور نہ تو میری ماں ہے۔ یہ تیری بے ادبانہ باتیں جو ہیں جو تو مجھے اپنا بیٹا بناتی ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں۔ کہ میں امیر المومنین ہوں۔ اور تمام مسلمانوں کا سردار ہوں۔"

اس کی ماں نے کہا بیٹا خدا کے لئے اپنی زبان بند کر۔ کیا تو نے اس محلہ کے موذن اور اس کے چار مشیروں کا نہیں سنا۔ جو اس محلہ کے رہنے والوں کو تکلیف دیتے ہیں۔ کل کوتوال شہر نے ان پانچوں کو گرفتار کر لیا۔ اور سزائے تازیانہ دی۔ اور پھر تشہیر کر کے شہر بدر کر دیا مجھے ڈر ہے کہ کہیں تیرا بھی ایسا ہی حال نہ ہو۔"

ابوالحسن کی ماں کو یہ خبر نہ تھی۔ کہ موذن وغیرہ کی سزا ابوالحسن ہی کے حکم سے ہوئی تھی۔ اس نے تو محض ابوالحسن کو ڈرانے کے لئے یہ واقعہ بیان کیا تھا۔ ابوالحسن نے اس قصہ کو سن کر کہا "اے مکار بڑھیا۔ غور سے سن کہ نہ تو میں تیرا بیٹا ہوں۔ اور نہ ابوالحسن ہوں بلکہ امیر المومنین بادشاہ بحر و بر ہوں۔ اور تجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے ہی کوتوال کو ان لوگوں کو سزا کے لئے حکم دیا تھا۔ اور اس نے میرے حکم کی تعمیل کی تھی۔ اب تو تیری بات سے بھی میرا امیر المومنین ہونا ثابت ہوتا ہے۔"

ابوالحسن کی ماں یہ نہ سمجھ سکی کہ ابوالحسن امام مسجد کی سزا وغیرہ کا سن کر اپنے دعوے میں اور مستقل کیوں ہو گیا ہے۔ مگر اس نے پھر کہا "بیٹا خدا کے لئے عقل کو کام میں لاؤ۔ اور ایسی فضول باتیں نہ کرو۔"

ابوالحسن نے کہا "اے بے حیا خاموش رہ ورنہ ایسی سخت سزا دوں گا کہ قیامت تک یاد رہے گی میں نے تجھے ایک دفعہ کہہ دیا کہ میں امیر المومنین ہوں بھلا تجھے اس بات کے ماننے میں کیوں پس و پیش ہے۔"

ابوالحسن کی ماں نے سمجھ لیا۔ کہ یہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ اور اپنی محبت کی وجہ سے جو اپنے بیٹے ابوالحسن کے ساتھ تھی۔ اس کی حالت پر رونے لگی۔ لیکن ابوالحسن اس کے رونے پر اور غصہ میں آ گیا۔ اور کہا۔

"اے ملعونہ سچ بتا کہ میں کون ہوں۔"

اس نے نہایت محبت کے لہجہ میں کہا۔

"تو میرا پیارا بیٹا ابوالحسن ہے۔ جس کو میں نے جنا ہے۔ اور پرورش کیا ہے اور دودھ پلایا ہے۔ تو نے غلطی کی کہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ امیر المومنین کہتا ہے۔ بلکہ امیر المومنین کا لفظ تو خاص ہمارے مہربان بادشاہ خلیفہ ہارون الرشید کے لئے ہے۔ جس کے ہم سب لوگ فرمانبردار ہیں وہ ہمارا خداوند نعمت ہے۔ اس نے کل ہی ایک غلام کے ہاتھ ایک ہزار اشرفی کی تھیلی بھیجی ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ایسے امیر المومنین کے لئے دعائے سلامتی مانگیں۔"

ابوالحسن کو یہ سن کر اپنے امیر المومنین ہونے کا اور زیادہ یقین ہو گیا۔ پھر اپنی ماں کو مخاطب کر کے کہنے لگا "او مکار اب تجھے میرے امیر المومنین ہونے [illegible] یہ کہہ کر ابوالحسن نے ایک لاٹھی اٹھالی۔ اور اپنی ماں کو زور زور سے مارنے لگا۔ وہ غریب ضعیفہ اس کی اس

یہ سن کر اس نے گلی کے گرد کے تمام لوگ جو اس کے ہمسائے تھے شور سن کر اکٹھے ہو گئے اور ابوالحسن کے ہاتھ سے لاٹھی چھین لی اور کہا "تم کیا دیوانے ہو گئے ہو۔ کہ اپنی ماں پر ہاتھ اٹھاتے ہو۔ سعادت مند بیٹوں کا یہ کام نہیں کہ وہ اپنی ماؤں سے ایسا شرمناک سلوک روا رکھیں۔"

ابوالحسن یہ سن کر اور غصہ میں آ گیا اور کہنے لگا "ابوالحسن کون گدھا ہے جس کا یہ نام تم نے مقرر کیا ہے۔"

ابوالحسن کی یہ باتیں سن کر سب حیران ہو گئے۔ اور کہا "کیا یہ تیری ماں نہیں ہے۔ اور کیا یہ تیرا گھر نہیں ہے۔ جس میں تو اس وقت کھڑا ہے۔"

ابوالحسن اس کے جواب میں کہنے لگا "میں ہرگز ہرگز اس ذلیل اور بے حرمت عورت کو نہیں جانتا۔ اور نہ تمہیں پہچانتا ہوں۔ کہ تم کون ہو اور نہ میں ابوالحسن ہوں۔ بلکہ امیرالمومنین ہوں۔ اگر تم اس بات سے واقف ہو تو تم سب کو بتا دو نگا کہ میں خلیفہ ہوں۔"

سب ہمسایوں نے اس کو دیوانہ سمجھا۔ اور خیال کیا کہ جس طرح اس نے اپنی ماں کو مارا ہے ہم کو بھی مار یگا۔ اس خیال سے ایک شخص نے دوڑ کر داروغہ پولیس کو خبر کی۔ اور پھر سب آدمیوں نے مل کر ابوالحسن کو پکڑ لیا۔ ابوالحسن نے کوشش کی کہ وہ ان لوگوں کے ہاتھ سے بھاگ جائے مگر نہ بھاگ سکا۔ داروغہ پولیس نے یہ حال دیکھ کر دو ایک ایسے اس زور سے کوڑے لگائے کہ وہ تلملا اٹھا۔ پھر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پاؤں میں بیڑی ڈال دی اور جیل خانہ کی طرف لے چلا اب تو ابوالحسن کی آنکھیں کھلیں لوگ راستہ میں اسے گھونسے مارتے تھے۔ کئی آدمیوں نے طمانچے لگائے۔ اور بہت سے لوگوں نے گالیاں دیں۔ گویا کہ ہر وہ فعل اس کے ساتھ کیا جو دیوانوں کے لئے مخصوص ہے۔ جب اس نے اس طرح ذلت اٹھائی۔ اور مار کھائی۔ تو اسے معلوم ہوا کہ لوگوں نے مجھے دیوانہ خیال کر کے میرے ساتھ ایسا سلوک کیا ہے حالانکہ میں ہوش میں ہوں۔ پھر داروغہ اسے جیل خانہ میں لے گیا۔ اور ایک لوہے کے پنجرہ میں بند کیا۔ اور ہر روز اسے باہر نکال کر پچاس کوڑے لگاتا۔ اور پوچھتا کہ اب بھی تو اپنے ہوش و حواس میں آیا ہے۔ یا بدستور اپنے آپ کو امیرالمومنین تصور کرتا ہے۔ دو ہفتہ تک ابوالحسن اسی مصیبت میں گرفتار رہا۔ اور ایک دن داروغہ سے کہا۔ "یہ میری بدقسمتی تھی۔ کہ میں نے اس قدر ذلت اٹھائی۔ اور رسوا ہوا۔"

ابوالحسن کی ماں ہر روز جیل خانہ میں جاتی۔ اور ابوالحسن کو اس حال میں دیکھ کر روتی۔ پھر جب اس نے دیکھا کہ یہ دن بہ دن دبلا ہو رہا ہے۔ اور تمام جسم اس کا مجروح ہو رہا ہے۔ تو یہ دیکھنے کے لئے کہ اب بھی اس کے ہوش و حواس درست ہوئے ہیں یا نہیں۔ امتحاناً اس سے گفتگو کرنے لگی۔ ابوالحسن بھی اب ان تمام واقعات کو جو اس نے خلیفہ کے محل میں دیکھے تھے۔ بھول گیا تھا۔ اور اس نے سمجھ لیا کہ سب خواب و خیال تھا۔ اور یہ سوچا کہ اگر یہ خواب نہ ہوتا تو میں بعد بیدار ہونے کے کس طرح اپنے گھر میں ہوتا۔ لیکن حیران تھا کہ مؤذن وغیرہ کو جو سزا ہوئی۔ اور میری والدہ کو ایک تھیلی اشرفیاں جو ملیں سب کس طرح ظہور پذیر ہوا۔ یہی باتیں ہیں جو میرے شک کا باعث ہیں کہ میں خلیفہ ہوں۔ اب حیران ہوں۔ کہ کس کو خواب سمجھوں اور کس کو نہ سمجھوں۔

ابوالحسن ایک دن انہیں باتوں پر غور کر رہا تھا کہ اس کی ماں اس سے ملنے کے لئے آئی۔ اور دبلا اور کمزور دیکھ کر رونے لگی۔ ابوالحسن نے ماں کو اسی طریق سے سلام کیا جیسے وہ ہمیشہ کرتا تھا۔ ماں نے پوچھا۔

"بیٹا اب تو تیرے دماغ میں وہ خیال نہیں۔ جس کی وجہ سے تو اس حال کو پہنچا۔"

ابوالحسن نے کہا۔ "اماں میرا قصور معاف کرو۔ میں واقعی ایک غلط خیال میں مبتلا تھا۔ میں خلیفہ نہیں ہوں۔ ابوالحسن ہوں۔ اور تمہارا بیٹا ہوں۔"

ابوالحسن کی ماں اس کی ایسی باتیں سن کر نہایت خوش ہوئی۔ اور کہا کہ اب میرا بیٹا اچھا ہو گیا ہے۔ پھر وہ ابوالحسن سے مخاطب ہوئی

اور کہا "وہ مسافر جو سوداگر تھا۔ اور جو صبح کو دیوان خانے کے دروازے کھلے چھوڑ کر چلا گیا۔ مگر شیطان تھا۔ جس نے تمہیں اس قدر دکھ دیا۔" ابوالحسن نے کہا "واقعی وہ موصلی سوداگر ایک شیطان تھا۔ جس نے مجھے خراب کیا۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ اب میں اچھا ہو گیا ہوں۔ مجھ کو یہاں سے گھر لے چلئے۔"

پھر ابوالحسن نے دارونہ کے کہا اس کی والدہ کے کہنے پر اسے چھوڑ دیا۔ ابوالحسن اپنے گھر آ گیا۔ اور کتنے روز کے بعد اس کے بدن میں طاقت آئی۔ پھر وہ حسب دستور سابق ایک نیا مہمان ہر روز اپنے گھر لے آتا۔ اور صبح اس کو رخصت کر دیتا ایک دن وہ پھر کسی مہمان کی تلاش میں حسب بغداد کے پل کے قریب گیا۔ تو اتفاقاً اس دن بھی خلیفہ ایک موصلی سوداگر کے بھیس میں گذر رہا تھا۔ ابوالحسن نے اسے دور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ یہی وہ سوداگر ہے جس کی وجہ سے میں نے اس قدر مصیبت اٹھائی۔ اگر یہ میرا مہمان نہ ہوتا۔ تو مجھے اس قدر مصیبت برداشت نہ کرنی پڑتی۔ یہ خیال کر کے وہ ڈرا۔ اور کہا کہ خدا مجھے ایسے منحوس آدمی سے بچائے۔ جب وہ قریب پہنچا۔ تو اس کی طرف سے منہ پھیر کر دریا کو دیکھنے میں مشغول ہو گیا۔ اور اپنی طرز سے یوں ظاہر کیا کہ جیسے اس نے اس کو دیکھا ہی نہیں۔ مگر خلیفہ ابوالحسن کی تلاش میں تھا۔ کہ اگر پھر وہ مل جائے تو اسے محل میں لے جا کر اس کی تمام تکلیف کی تلافی کر دے اور عمر بھر کے لیے مستغنی بنا دے۔ غرضیکہ خلیفہ نے بھی اسے پہچان لیا۔ اور قصداً اس کے نزدیک جا کر کھڑا ہو گیا اور چاہا کہ ابوالحسن سے صاحب سلامت کرے لیکن ابوالحسن نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور کہا۔

"مجھے نہ تمہارے سلام اور نہ آداب کی ضرورت ہے۔ اپنی راہ لو۔" خلیفہ نے کہا "کیا تمہیں یاد نہیں۔ کہ میں تمہارا واقف ہوں اور تم نے ہی مجھے ایک مہینہ گذرا ہے۔ اس جگہ سے اپنے گھر لے جا کر نہایت پر تکلف کھانا کھلایا تھا۔" ابوالحسن نے کہا۔ "مجھے یاد نہیں کہ میں نے تمہیں پہلے کبھی دیکھا بھی تھا جاؤ اور اپنا کام کرو۔"

خلیفہ نے خیال کیا کہ شاید یہ اپنے اس عہد کی وجہ سے جو اس نے کیا ہوا ہے کہ سوائے ایک بار کھانا کھلانے کے پھر اس سے بات نہ کرونگا۔ یہ مجھ سے متنفر ہے پھر خلیفہ نے کہا "افسوس کہ تم نے مجھے فراموش کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں اس عرصہ میں کوئی نہایت زبردست صدمہ پہنچا ہے جس کی وجہ سے تم اس قسم کی باتیں کر رہے ہو بخدا اگر تم مجھ سے اپنی تکلیف بیان کرو۔ تو میں حسب دلخواہ تمہاری مدد کروں۔"

ابوالحسن نے کہا۔ "مجھے تم سے کسی مدد کی ضرورت نہیں مجھے تو یہ یاد ہے کہ محض تمہاری وجہ سے میں دیوانہ بنا ہوں۔ خدا کے لئے مجھ سے بات نہ کرو۔ اور اپنی راہ لو۔ میرے پاس سے ہٹ جاؤ۔ اور مجھے نہ ستاؤ۔"

خلیفہ جھٹ ابوالحسن کے گلے لگ گیا اور کہا "یہ ناممکن ہے کہ میں اب تمہیں چھوڑ کر پھر دوسری جگہ جاؤں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے تمہیں دیکھا اب پھر مجھے اپنے گھر لے جاؤ اور پہلے کی طرح میری دعوت کرو۔ یہ میری تمنا ہے کہ میں پھر ایک دفعہ تمہارے ساتھ سے خوشی کروں۔"

ابوالحسن نے کہا "مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں پھر ایسے شخص سے ملوں جس کی وجہ سے مجھے اس قدر تکلیف پہنچی ہو۔"

خلیفہ ابوالحسن کے گلے لگ گیا اور کہا "میرے پیارے دوست خدا کے لئے مجھے بتاؤ۔ کہ وہ کونسی تکلیف ہے جو تمہیں میری وجہ سے پہنچی کیونکہ میری خواہش ہے کہ میں تمہارے دکھ درد میں ہاتھ بٹاؤں اور تمہاری مدد کروں اور اگر مجھ سے کچھ قصور ہوا ہو تو اس کی تلافی کروں۔"

ابوالحسن نے خلیفہ کو اپنے پاس بٹھا لیا اور شروع سے آخر تک تمام رام کہانی جو اس پر گذری تھی کہہ سنائی خلیفہ پہلے بھی ان تمام

خلیفہ ابوالحسن کی زبانی سن کر خوب ہنسا اور قہقہہ لگایا ابوالحسن نے کہا۔

"میں سمجھتا تھا کہ تو میری داستان غم سن کر مجھ سے اظہار ہمدردی کرے گا اور اپنے قصور پر نادم ہو کر مجھ سے اس کی معافی چاہے گا۔ لیکن افسوس ان تمام باتوں کے خلاف تو میری باتوں پر ہنستا ہے اور مجھے بیوقوف بناتا ہے اگر تجھے میری باتوں پر اعتبار نہیں آتا۔ تو میری پیٹھ کو دیکھ کہ اس قدر ضربات سے اس پر نشان ہیں۔"

خلیفہ نے اس کے بدن پر داغ دیکھ کر اظہار افسوس کیا۔ اور اس کو پھر گلے سے لگایا اور کہا "بھائی مجھے تمہارے داغ دیکھ کر نہایت افسوس ہوا ہے لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب کیا ہو سکتا ہے خدا کے لئے میرا قصور معاف کر دو۔ اور مجھے اپنے ہمراہ گھر لے چلو۔ اور مجھے کھانا کھلاؤ۔ صبح کو میں دیوان خانہ کا دروازہ بند کر کے چلا جاؤں گا۔"

ابوالحسن اب خلیفہ کو اپنے گھر لے جانے کے لئے مجبور ہو گیا۔ اور آخر الامر دونوں شہر کی جانب چلے اثنائے راہ میں خلیفہ نے ابوالحسن کو اپنی طرف متوجہ کر کے کہا۔

"دوست تم میرے جیسے ہمدرد اور یک رنگ دوست سے بدگمان نہ ہو جو ہر حال میں تمہاری بہتری اور بھلائی کا خواستگار ہے اور میں اقرار کرتا ہوں۔ کہ ہرگز ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہ کروں گا۔"

ابوالحسن نے کہا "جو تم کہتے ہو سب درست ہے لیکن آئندہ پھر کبھی میری دعوت کی امید نہ رکھنا۔ یہ جتنی تکلیفیں مجھے پہنچیں۔ سب تمہاری وجہ سے تھیں۔"

خلیفہ نے مسکرا کر کہا "بھائی تم بڑے بدگمان ہو باوجود اس قدر معذرت کرنے کے بھی تم مجھ پر بدگمانی کرتے ہو۔"

الغرض اسی طرح باتیں کرتے شام ہونے پر ابوالحسن کے گھر پہنچے ابوالحسن نے اپنی ماں سے طرح طرح کے کھانے پکوائے اور خلیفہ کے آگے رکھے پھر دسترخوان بچھایا۔ اور اس پر میوے وغیرہ رکھے۔ کھانا کھانے کے بعد دونوں شراب نوشی میں مشغول ہوئے خلیفہ اور ابوالحسن نے متواتر کئی گلاس پئے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور ابوالحسن جب خوب نشہ میں آیا۔ تو خلیفہ نے پوچھا

تم کبھی کسی پر عاشق بھی ہوئے ہو یا نہیں؟"

ابوالحسن نے کہا "میں کبھی کسی پر عاشق نہیں ہوا۔"

پھر خلیفہ نے پوچھا "تمہیں کس چیز سے زیادہ رغبت ہے؟"

ابوالحسن نے کہا "مجھے اچھی شراب پینے اور دوستوں سے خوش گپیاں اڑانے کی بڑی خواہش ہے اور ہاں یہ بھی چاہتا ہوں کہ میری شادی اس حسینہ کے ساتھ ہو۔ جو عالم خواب میں میرے ساتھ شراب پیتی تھی اور بانسلی بجاتی تھی۔ اور خوب مزے مزے کی باتیں کرتی تھی اور میں جانتا تھا کہ اس خوبی و تعریف کی عورت سوائے شاہی محل کے اور کسی جگہ نہ ملے گی۔"

پھر ابوالحسن نے ایک جام بھر کر خلیفہ کو دیا۔ اور کہا "لو پیو۔ یہ آخری جام ہے۔"

خلیفہ نے کر پی لیا۔ پھر خلیفہ نے ایک جام بھر کر اس میں سفوف بے ہوشی ملا کر ابوالحسن کو دیا۔ اور کہا "یہ جام اس بی بی کی یاد میں ہے جسے تم نے خواب میں بانسلی بجاتے ہوئے دیکھا تھا۔"

ابوالحسن نے وہ جام بے ہوشی لے کر پی لیا۔ اور کچھ دیر کے بعد غافل ہو گیا۔ خلیفہ نے غلام کو اشارہ کیا کہ اس کو اٹھا لے اور باحتیاط محل کو لے جا اور خلیفہ ابوالحسن کے مکان کا دروازہ بند کر کے خود بھی ساتھ ہو لیا۔

پھر خلیفہ نے حکم دیا۔ کہ اس کو چوتھی بارہ دری میں لے جاکر میرے پلنگ پر لٹادو۔ پھر خواجہ سراؤں سے کہا۔ اسے میری پوشاک پہنادو۔ انھوں نے حکم کی تعمیل کی اور خلیفہ کی شب باشی والی پوشاک اسے پہنادی۔

خلیفہ صبح ہوتے ہی ابوالحسن کی خوابگاہ کی جانب گیا۔ تاکہ وہاں چھپ کر تمام باتوں کو دیکھے غرضیکہ جب ابوالحسن صبح کو بیدار ہوا تو اس نے سونے کے اگالدان اور سب ساز و سامان کو دیکھا کہ گانے بجانے والی کنیزیں باقاعدہ کھڑی ہیں اور اپنے سازوں کو ہلا کر گا رہی ہیں ابوالحسن یہ حال دیکھ کر نہایت حیران ہوا اور اپنے ارگرد خواجہ سراؤں اور خواصوں کو دیکھ کر نہایت متعجب ہوا اور گذشتہ تمام کیفیت اس کی آنکھوں کے سامنے پھر آگئی اور کمرہ کو بھی دیکھ کر پہچان لیا کہ یہ وہی کمرہ ہے جس میں ایک دفعہ پہلے بیدار ہوا تھا اور یہ سب ساز و سامان وہی ہے جو پہلے بھی تھا۔

خلیفہ نے گانے بجانے کو موقوف کرادیا تاکہ وہ اپنے مہمان کی حرکات کو دیکھے اور اس کی باتوں کو سنے سب لوگ قرینہ سے اپنے اپنے مقام پر کھڑے تھے ابوالحسن نے کہا۔

"آج میں پھر اسی خوفناک خواب کو دیکھ رہا ہوں۔ جو میں نے پہلے دیکھا تھا اور اب پھر مثل سابق لوہے کے قفس میں قید ہونے کا وقت آگیا ہے۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالی جائیں گی اور میرے پاؤں میں بیڑیاں پہنائی جائیں گی۔ اور پھر کئی دن تک مجھ کو مار پڑے گی۔ بے شک وہ شخص جو کل شام میرے گھر آیا تھا نہایت بدمعاش ہے باوجود اس کے کہ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں دیوان خانہ دروازہ بند کر جاؤں گا۔ لیکن اس نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا اور دیوان خانہ کا دروازہ کھلا چھوڑ کر چلا گیا۔ شیطان کو موقع مل گیا اور وہ اندر آگیا اور اس نے یقیناً میرے دماغ میں حلول کر لیا ہے جو اسی قسم کے خیالات میرے دماغ میں پیدا ہونے شروع ہوئے ہیں جن کی وجہ سے میں اپنے آپ کو خلیفہ خیال کرنے لگا ہوں اللہ مجھے ایسے خیالات فاسدہ سے محفوظ رکھے۔"

یہ کہہ کر ابوالحسن نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دیر تک غور کرتا رہا تھوڑی دیر کے بعد پھر آنکھیں کھولیں اور وہ سب ساز و سامان دیکھا اور حیران رہ گیا۔ اور دعا مانگی کہ "خداتعالیٰ مجھے شیطان کے مکر و فریب سے بچا۔" پھر اپنے دل میں ارادہ کیا۔ کہ بالکل خاموش نہ پڑا رہے شیطان دو پہر تک خود بخود تھک کر چلا جائے گا لیکن محل کے لوگوں نے اسے اس طرح نہ رہنے دیا۔ راحت جان نامی ایک خواص ابوالحسن کے نزدیک آکر بیٹھ گئی اور کہنے لگی۔

"یاامیرالمومنین اب آرام کرنے کا وقت نہیں ہے۔ صبح ہو گئی پھر دن نکل آیا ہے اٹھیے۔ سب لوگ حضور کا انتظار کر رہے ہیں۔"

ابوالحسن نے کہا "اے شیطان مردود اٹھ میرے پاس سے دفع ہو جا کیوں مجھے خواہ مخواہ امیرالمومنین بناتی ہے۔"

راحت جان نے کہا "آپ درحقیقت امیرالمومنین ہیں اور تمام مسلمانوں کے حاکم ہیں اور میں حضور کی ایک ادنیٰ کنیز ہوں شاید آپ نے کوئی خواب بد دیکھا جو اس طرح کی باتیں کرتے ہیں اگر آپ اچھی طرح دیکھیں' تو ضرور آپ کا شک رفع ہو جائے۔ آپ کے [illegible] کی وجہ نہیں۔"

غرضیکہ راحت جان کے اس طرح باتیں بنانے پر ابوالحسن اٹھ بیٹھا۔ اور آنکھیں کھول کر سنگ مروارید اور دیگر کنیزوں کو پہچانا۔ وہ سب پاس آکر کھڑی ہو گئیں۔ اور کہنا شروع کیا۔

"یاامیرالمومنین [illegible] دن ہو گیا ہے۔"

ابوالحسن نے آنکھیں کھول کر کہا "میں تو عاجز ابوالحسن ہوں اور اپنے آپ کو خوب جانتا ہوں۔ مجھے امیرالمومنین کیوں کہتے ہو۔"

انھوں نے کہا "یا امیر المومنین! ہم تو ابوالحسن کو نہیں جانتے کہ وہ کون ہے آپ کیوں اس کا نام لے رہے ہیں اب پھر خدا کے لئے بیدار ہوجائیے کہ آپ ہی امیر المومنین ہیں۔"

ابوالحسن نے کہا کہ یہ عجب طلسم بازی ہے کہ میں اپنے آپ کو اس بارہ دری میں دیکھتا ہوں جس میں پہلے تھا وہی خواب دیکھ رہا ہوں جو پہلے دیکھا تھا۔ پھر ابوالحسن کے دل میں سزا و قید سے ڈر پیدا ہوگیا۔ اور آنکھیں بند کرکے چپکے سے لیٹ گیا۔ راحت نے کہا۔

"یا امیر المومنین آپ بیدار ہو جائیے۔ تمام درباری سلام کی خاطر دردولت پر حاضر ہیں۔"

پھر دونوں خواصوں نے ابوالحسن کے بازو تھام کے اٹھایا اور بارہ دری کی درمیانی مسند پر بٹھا دیا۔ اور تمام خواصیں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر رقص کرنے لگیں اور تمام ساز بجنے لگے جب چاروں طرف سے گانے بجانے کا شور اٹھا تو ابوالحسن دل میں خیال کرنے لگا کہ میں واقعی امیر المومنین ہوں اس نے چاہا کہ کچھ باتیں کرے لیکن شور و غل میں کچھ سنائی نہ دیا۔ پھر اس نے کوکب الصبح کو اشارہ سے بلایا اور کہا۔

"تو سچ بتا کہ میں کون ہوں۔"

اس نے جواب دیا "یا امیر المومنین! آپ امیر المومنین ہیں اور بھلا آپ ہی بتائیں کہ آپ امیر المومنین نہیں ہیں تو کون ہیں آپ نے کیوں اتنی جلدی اپنے آپ کو بھلا دیا اگر آپ اجازت دیں۔ تو ہم وہ سب باتیں آپ کے سامنے بیان کریں جو آپ نے کی تھیں۔"

کوکب الصبح کی اس تقریر کی تمام خواجہ سراؤں اور خواصوں نے تائید کی اور کہا "حضور آپ اٹھیں اور نماز فجر ادا کریں۔"

ابوالحسن نے کہا "اے شعبدہ سازو۔ اگرچہ تم سب حسین ہو لیکن عقل و فکر سے خالی ہو پہلے میں نے اس خواب کو دیکھ کر نہایت تکلیف اٹھائی تھی۔ قید خانہ میں قید کیا گیا تھا اور پچاس تازیانے روز میری پیٹھ پر پڑتے تھے جن کی وجہ سے میرے بدن کی کھال تک اتر گئی اور تمام بدن پر سیاہ داغ پڑ گئے۔"

کوکب الصبح نے کہا "یا امیر المومنین یہ سب باتیں آپ نے خواب میں دیکھی ہوں گی حضور تو کل سے یہیں ہیں کہیں نہیں گئے تمام رات اسی بارہ دری میں موجود تھے۔" ابوالحسن نے کہا "بے شک تم سچ کہتی ہو اور دل میں خیال کیا کہ میں جب سے محل میں آیا ہوں۔ کہیں بھی باہر نہیں گیا اور اس امر پر متعجب ہوا کہ آیا میں اس قید خانہ اور مار کی حالت کو سچ جانوں یا اس کو۔ اور ان دونوں میں سے خواب کس کو تصور کروں پھر کہنے لگا "اے خدا میں امیر المومنین ہوں یا ابوالحسن ہوں جو کچھ ہے مجھ پر روشن ہو جائے۔"

پھر ابوالحسن نے اپنا تمام بدن کھول کر دکھایا۔ اور کہا کہ دیکھو کہ ان داغوں میں آج تک درد ہوتا ہے اور یہ ایک روشن دلیل ہے کہ میں ابوالحسن ہوں امیر المومنین نہیں ہوں۔ پھر ایک خواص کو اپنے پاس بلایا۔ اور اس سے کہا "تو میرے کان کو کاٹ تاکہ میں تمیز کروں کہ میں سو رہا ہوں یا جاگتا ہوں۔"

خواص نے اس زور سے کاٹا کہ ابوالحسن تلملا اٹھا اور درد سے چلا کر شور و غل مچایا۔ اس کے یکبارگی شور کرنے پر خواصوں نے تمام ساز بجانے شروع کر دیئے۔ اور خواجہ سرا بھی ناچنے لگے۔ ابوالحسن یہ دیکھ کر خود بھی ناچنے لگا اور کودنے لگا اور حالت جوش میں اپنے تمام کپڑے اتار ڈالے اور صرف ایک پاجامہ رہنے دیا۔ اور خود ناچتا ناچتا دوہرا ہو جاتا کہ زمین کے ساتھ اس کا سر لگتا غرضیکہ مسخرہ پن کی کوئی حرکت باقی نہ چھوڑی۔ خلیفہ اس حال کو دیکھ کر بے قرار ہو گیا۔ اور ہنستے ہنستے لوٹ گیا۔ اور بے ساختہ کہنے لگا۔

"اے ابوالحسن خدا کے لئے ان حرکات کو موقوف کر کیا مجھے ہنساتے ہنساتے مار ڈالے گا۔" خلیفہ کی یہ بات سن کر تمام ساز بجانے والوں نے ساز بند کر دیئے اور ابوالحسن بھی اس وقت اس طرف دیکھنے لگا۔ جہاں سے یہ آواز آتی معلوم ہوئی تھی ابوالحسن نے خلیفہ کو دیکھ

کر پہچان لیا اور کہا" آنجناب ہی سوداگر موصل بنے ہوئے تھے اور پھر سمجھ گیا کہ یہ بیداری ہے خواب نہیں ہے۔" اور بادشاہ نے یہ جو کچھ کیا ہے محض خوش طبعی اور مذاق کے طور پر کیا ہے۔ پھر خلیفہ سے کہا "سبحان اللہ کہ حضرت ہی سوداگر موصل کے لباس میں تھے اور میری تمام مصیبتوں اور تکلیفوں کا باعث ہوئے۔"

خلیفہ نے کہا "اے ابوالحسن بے شک تو سچا ہے اور میں انشاء اللہ تیری تمام تکالیف کی تلافی کردونگا اور تیرے ساتھ وہ سلوک کرونگا جو آج تک کسی کے ساتھ نہ کیا ہو۔ پھر خلیفہ نے مسرور سے کہا۔

کہ ابوالحسن کو ایک نہایت عمدہ جوڑا پہناؤ۔ جب ابوالحسن کو پوشاک پہنادی گئی۔ تو خلیفہ نے اسے گلے لگالیا اور کہا" میں تجھے اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔ اب جو تو کہے گا وہی کیا جائے گا۔"

ابوالحسن نے کہا" خداوندا! میرے ساتھ اس طرح مذاق کرنے میں حضور کو کیا فائدہ تھا؟"

خلیفہ نے اسے تسلی کے لئے سب حال اول سے آخر تک کہہ سنایا۔ اور کہا" اب تو خاطر جمع رکھ انشاءاللہ سب باتوں کی تلافی ہو جائیگی۔"

ابوالحسن نے کہا" خداوندا! جو تکلیف جناب کے اس مذاق میں مجھ پر گزری ہے۔ وہ مجھے تمام عمر یاد رہے گی۔... میری ایک آرزو ہے اور وہ یہ ہے کہ مجھے یہاں آنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔"

خلیفہ نے کہا" میں تیری اس ایک تمنا کو پورا کرتا ہوں اور تجھے ہر وقت یہاں آنے کی اجازت دیتا ہوں۔"

پھر خلیفہ نے ابوالحسن کو ایک مکان عطا کیا اور ایک ہزار اشرفی نقد دیں اور اس کا ماہانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ پھر جب خلیفہ دربار عام کو تشریف لے گئے۔ ابوالحسن اپنے گھر پر آیا اور اپنی ماں سے تمام واقعہ بلا کم وکاست بیان کیا اور کہا کہ جو واقعہ مجھ پر تھا۔ وہ سب صحیح اور درست تھا۔ اور عین بیداری کی حالت میں تھا۔ خلیفہ نے فی الواقعی مجھے اپنا مصاحب مقرر کیا ہے۔

ابوالحسن اور خلیفہ کا یہ قصہ تمام بغداد میں مشہور ہو گیا اور پھر وہاں سے دوسرے ملکوں تک پہنچ گیا پھر ابوالحسن ہر روز خلیفہ کے پاس رہتا اور اسے اپنی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی سے خوش رکھتا ایک دن خلیفہ ابوالحسن کو اپنے ہمراہ زبیدہ خاتون کے محل میں لے گیا۔ اور اس کے تمام قصہ کو بیان کیا جسے وہ سن کر نہایت محظوظ ہوئی۔ پھر ابوالحسن خلیفہ کے ہمراہ زبیدہ کی خدمت میں جایا کرتا اور ایک دن اثنائے گفتگو میں زبیدہ نے خلیفہ سے کہا۔

"میں چاہتی ہوں کہ نزہت کی شادی ابوالحسن سے کر دی جائے کیونکہ وہ اکثر اس کو دیکھتا رہتا ہے اور نزہت بھی اس امر میں راضی ہے۔

خلیفہ نے کہا" تو نے یہ بات تو میرے دل کی کہی ہے کیونکہ میں نے بھی ابوالحسن سے وعدہ کیا تھا کہ تجھے ایک نہایت خوبصورت بی بی دونگا۔ اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے آج ہی دونوں کی شادی کر دینی چاہیے تاکہ وعدہ وفائی ہو جائے۔"

جس قدر خلیفہ ابوالحسن کو چاہتا تھا اسی قدر زبیدہ نزہت سے پیار رکھتی تھی۔ خلیفہ نے ابوالحسن کی شادی نہایت دھوم دھام سے کی اور زبیدہ نے بھی نزہت کو نہایت بیش بہا جہیز دیا۔ اور خلیفہ نے بہت سا سونا موتی نزہت کو عنایت کیا اور ابوالحسن نزہت کو اس مکان میں لے گیا جو خلیفہ نے اسے پہلے دے رکھا تھا پھر تمام اہل محلہ کی نہایت پر تکلف دعوت بطور ولیمہ کے کی اور کئی روز تک راگ ورنگ کی محفل رہی نزہت اور ابوالحسن دونوں آپس میں نہایت پیار و محبت سے رہنے لگے اور آپس میں کبھی جدا نہ ہوئے سوائے ان اوقات کے جس وقت ابوالحسن خلیفہ کی خدمت میں جاتا اور نزہت زبیدہ کی خدمت میں جاتی نزہت نہایت پسندیدہ خصلت والی عورت تھی اور ابوالحسن جان و دل سے [illegible] ابوالحسن اور نزہت فطرتاً سخی تھے اس لئے کھانا اچھا کھاتے کپڑے اچھے پہنتے شراب بھی نفیس پیتے اس

کے بجائے کوئی محل کا خواجہ سرا یا کنیز وغیرہ ملنے کے لیے آتے تو انھیں بغیر کھانا کھلائے نہ جانے دیتے اور حسب استطاعت بعض کو خلعت انعام وغیرہ بھی دیتے علاوہ اس کے گانے بجانے کا بھی شوق رکھتے اور سوائے معمولی کھانوں کے مٹھائیاں وغیرہ بھی کھاتے اور خوب سیر کرتے ایک مدت انھیں اشغال میں گذر گئی اور جس قدر روپیہ پیسہ تھا سب صرف ہو گیا ابوالحسن نے خلیفہ سے عہد کر لیا تھا کہ اب کوئی رقم نہ مانگے گا اور نزہت کا زبیدہ سے یہی اقرار تھا۔ اب دونوں بموجب اپنے وعدوں کے کچھ نہ مانگ سکتے تھے۔ ایک دن باورچی نے بھی اپنا حساب وغیرہ دکھلایا اور توشہ خانہ والے نے بھی نفیس پوشاکوں کی قیمت طلب کی اور کئی ایک سوداگروں کی رقم بھی واجب الادا تھی جو کچھ ابوالحسن اور نزہت کے پاس تھا وہ سب انھیں کو دے ڈالا۔ لیکن پھر بھی کئی ایک رقوم واجب الادا رہ گئیں اور بسر اوقات میں بھی تنگی در پیش ہوئی۔ اب ابوالحسن نے نزہت سے کہا۔

"اب سوائے مکاری اور فریب کے گذارہ نہیں میں نے ایک تجویز سوچی ہے جس کے باعث ہم دونوں کچھ نہ کچھ روپیہ خلیفہ اور زبیدہ سے لے کر رہیں گے۔"

نزہت نے ابوالحسن سے پوچھا "وہ کونسا حیلہ ہے جو تم نے تجویز کیا ہے؟"

ابوالحسن نے کہا "یہ ہے کہ ہم تم دونوں مریں۔"

نزہت نے کہا "میاں تم مرتے ہو تو مرو میں تو نہ مروں گی۔" ابوالحسن نے کہا "آخر تم عورت ہو نا کہ مرنے کا نام سن کر گھبرا گئیں۔ لیکن ابھی مرنے کی کیفیت نہیں سنی کہ وہ مرنا کس قسم کا ہوگا میری مراد مرنے سے درحقیقت مرنا نہیں بلکہ ایک جھوٹ موٹ کا فریب ہوگا۔"

نزہت نے کہا "اگر یہ بات ہے تو بتاؤ میں اس کے لئے تیار ہوں۔"

ابوالحسن نے کہا...... "میں سیدھا لیٹ جاؤنگا اور اپنے آپ کو مردہ بنالونگا تم مجھے ایک سفید چادر سے کفنا دینا جیسے کہ میں درحقیقت مر گیا ہوں پھر ایک پگڑی میرے سر پا باندھ دینا اور میرے مرنے کی خبر مشہور کر دینا اور اپنے سر کے بال نوچتی ہوئی کپڑے وغیرہ پھاڑ کر زبیدہ کے پاس جانا اور میرے مرنے کا حال بیان کرنا وہ میری تجہیز و تکفین کے لئے تمہیں بہت کچھ دے گی وہ لے کر چلی آنا جب تم آ جاؤ گی تو میں اٹھ کھڑا ہوں گا۔ پھر تم اپنے آپ کو مردہ بنا لینا اور میں تمہیں کفن وغیرہ پہنا کر خلیفہ کے پاس جاؤنگا اور تمہیں مردہ بیان کر کے کچھ نہ کچھ وصول کر لوں گا۔"

نزہت نے یہ سن کر کہا "یہ حیلہ اور فریب تو نہایت مزے کا ہے۔ اس صورت میں واقعی بہت کچھ ہمارے ہاتھ لگ جائیگا۔"

پھر ابوالحسن ایک کمرہ میں لیٹ گیا اور نزہت نے اس کو کفنا دیا اور وہاں سے روتی پیٹتی محل میں گئی۔ اور زبیدہ سے جا کر ابوالحسن کے مرنے کا حال بیان کیا زبیدہ سن کر بہت روئی اور محل کے تمام خواصوں نے افسوس کیا رونے دھونے کے بعد نزہت سے زبیدہ نے کہا۔

"وہ بے چارہ تمہاری وجہ سے مر گیا۔ تمہاری ہر روز کی فرمائشوں نے اسے تنگ کر ڈالا تھا۔"

نزہت نے کہا "میں تو اسے دل سے پیار کرتی ہوں۔ میں نے کبھی بھی اس کو تنگ نہ کیا تھا۔"

پھر زبیدہ نے ایک ہزار اشرفی نقد اور ایک جوڑا کمخواب کا نزہت کو دیا اور کہا "اسے اچھی طرح فاتحہ درود میں صرف کرنا۔" نزہت یہ رقم وغیرہ وہاں سے [illegible] اشرفیاں وغیرہ ابوالحسن کو لا کر دیں ابوالحسن دیکھ کر نہایت خوش ہوا اور پھر اس نے نزہت سے کہا:
"اب تم جلد [illegible] دیکھو کہ میں پھر کیا کام کرتا ہوں۔ اور خلیفہ سے کس طرح رقم وصول کرتا ہوں۔" غرضیکہ

نزہت نے اپنے آپ کو مردہ بنالیا اور ابوالحسن وہاں سے روتا پیٹتا عین دوپہر کے وقت خلیفہ کے سامنے پہنچا۔ خلیفہ نے اسے اس حالت میں دیکھ کر تمام توجہ اس کی طرف پھیر لی۔ اور پوچھا۔ "ابوالحسن تو کیوں روتا ہے۔"

ابوالحسن نے کہا "خداوند! میری عورت نزہت مر گئی ہے۔"

خلیفہ نے یہ سن کر بہت افسوس کیا اور خود بھی رویا۔ جعفر اور دیگر اراکین بھی ابوالحسن کو اس حالت میں دیکھ کر رو دیے۔ خصوصاً خلیفہ کو نزہت کی نوحہ گی سے، بہت رنج ہوا۔ اور پھر یک ہزار اشرفی اور کمخواب کا تھان دے کر کہا "جاؤ نزہت کی تجہیز و تکفین نہایت اچھی طرح کرو۔"

ابوالحسن وہاں سے اشرفیاں وغیرہ لے کر سیدھا گھر آیا۔ اور آکر نزہت کو دکھلائیں۔ نزہت خوش ہو کر اٹھ بیٹھی۔ اب ادوہر کی سنئے خلیفہ کو نزہت کے مرنے کا نہایت رنج تھا اور زبیدہ کو ابوالحسن کے مرنے کا داغ تھا۔ خلیفہ نزہت کے مرنے کا افسوس کرنے کے لئے زبیدہ کے محل میں گیا اسے نہایت مغموم دیکھ کر اس کی تسلی وغیرہ کی اور کہا۔

"اگرچہ تمہاری کنیز نہایت اچھی ور وفادار تھی لیکن قضاالٰہی کے آگے کچھ پیش نہیں چلتی۔"

زبیدہ یہ سن کر حیران ہوئی۔ اور خیال کیا کہ شاید خلیفہ کو کچھ دھوکا ہو گیا ہے جو بجائے ابوالحسن کے مرنے کے نزہت کے مرنے کا نام لیتے ہیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔

"خداوند! میری کنیز نزہت تو زندہ ہے۔ حضور کا مصاحب ابوالحسن چل بسا ہے۔" خلیفہ حیران ہو کر مسرور سے مخاطب ہوا کہ زبیدہ نے جو کہا ہے۔ تم نے سنا؟"

مسرور نے کہا "مجھے شاہزادی کی عقل پر تعجب ہے۔ کہ ایسا خلاف واقعہ قصہ بیان کیا۔"

خلیفہ نے کہا "تم میرے مصاحب ابوالحسن کے لئے آنسو نہ بہاؤ۔ وہ تو تندرست ہے۔ اپنی کنیز نزہت کا غم کرو۔ جو مر گئی ہے۔ ابوالحسن بھی تھوڑی دیر ہوئی ہے میرے پاس روتا ہوا آیا تھا۔ اور اس نے نزہت کے مرنے کا حال بیان کیا تھا۔ میں نے اس کی تجہیز و تکفین کے لئے ایک ہزار اشرفی اور ایک تھان کمخواب کا دے دیا تھا۔ مسرور اس وقت موجود تھا۔ اس نے ابوالحسن کو خود اپنی آنکھ سے دیکھا تھا۔ اگر تمہیں کچھ شبہ ہو تو اس سے پوچھ لو۔"

زبیدہ نے کہا "تم کو ہر وقت مذاق ہی سوجھتا ہے۔ مرا تو ابوالحسن ہے تم تعزیت میری لونڈی کی کرتے ہو۔ ہمارا تمہارا فرض ہے کہ ابوالحسن کا غم کریں۔"

خلیفہ نے کہا "میں سچ کہتا ہوں۔ مذاق نہیں کرتا میرا مصاحب ابوالحسن جیتا ہے۔"

زبیدہ نے کہا "تم جھوٹ کہتے ہو۔ بلکہ میری بیوہ کنیز زندہ ہے ابھی تھوڑا ہی وقفہ گذرا ہے کہ وہ بے چاری میرے پاس روتی ہوئی آئی تھی۔ اور اس کی حالت دیکھ کر میں بھی روئی۔ اور دیگر خواصیں بھی روئیں۔ پھر میں نے اسے ایک ہزار اشرفی اور ایک تھان کمخواب کا دیا۔ تاکہ وہ ابوالحسن کی تجہیز و تکفین اچھی طرح کرے اور میں بھی اس خیال میں تھی۔ تم کو تمہارے مصاحب کے مرنے کی اطلاع کرتی کہ اتنے میں تم خود آگئے۔"

غرضیکہ اس جھگڑے نے بہت طول کھینچا۔ خلیفہ کہتا۔ کہ ابوالحسن زندہ ہے اور نزہت مر گئی ہے۔ زبیدہ کہتی کہ نہیں۔ نزہت زندہ ہے اور تمہارا ابوالحسن مصاحب مر گیا ہے۔ آخر اس حیص بیص میں خلیفہ کو غصہ آگیا۔ اور اس نے مسرور سے کہا کہ جلد جلد جا کر دیکھ کہ دونوں میں سے کون مرا ہے اور کون زندہ ہے۔ تاکہ اس جھگڑے کا فیصلہ ہو جائے۔ جب مسرور گیا تو خلیفہ نے کہا "ابھی پتہ چل جاتا ہے۔

کہ کون سچ کہتا ہے اور کون جھوٹ کہتا ہے۔ مگر زبیدہ نے کہا "دیکھنا میں سچی ہوں گی۔" آخر دونوں کی شرط لگ گئی۔ کیونکہ دونوں کو اپنے سچے ہونے کا یقین تھا۔ خلیفہ نے کہا "اگر میں جھوٹا ہوا تو تمہیں فلاں باغ دے دوں گا۔ اگر تم جھوٹی ہوئیں تو میں تمہارا فلاں محل لے لوں گا۔" زبیدہ بھی اس شرط پر راضی ہو گئی۔ اور دونوں مسرور کا انتظار کرنے لگے۔ ادھر ابوالحسن بھی سمجھتا تھا کہ اس معاملہ میں زبیدہ اور خلیفہ کی ضرور تکرار ہو گی۔ اس لئے اس نے بھی آگے کا انتظام سوچ رکھا تھا۔ اور اپنی بی بی نزہت سے اسی بارے میں مشورہ کر رہا تھا۔ اتنے میں کھڑکی سے جو جھانک کر دیکھا تو مسرور کو آتے ہوئے پایا اور اپنی بیوی نزہت سے کہا "تم جلد پھر اپنے کو مردہ بنالو۔"

ابوالحسن کے کہنے پر کفن پہن کر لیٹ گئی اتنے میں مسرور مکان میں داخل ہوا۔ اور دیکھا کہ نزہت کی لاش کمرہ میں کفنائی ہوئی رکھی ہے۔ اور ابوالحسن اس کے پاس بیٹھا رو رہا ہے۔ مسرور بھی اس کے ساتھ رو دیا اور دل میں خوش ہوا کہ شکر ہے بادشاہ کی بات سچی ہوئی۔ پھر مسرور نے کپڑا اٹھا اس کا چہرہ دیکھا اور کہا "بہن نزہت بڑی اچھی تھی۔ لیکن کیا کیا جائے قضاو قدر سے کچھ چارہ نہیں۔ ہم سب کے لئے یہی راستہ ہے اچھا اللہ اس پر رحم کرے اور تم کو صبر بخشے۔" پھر ابوالحسن سے کہا۔

"بھائی عورتیں بھی عجب ناقص العقل ہیں خواہ مخواہ بات پر تکرار کر بیٹھتی ہیں اور دوسرے کی بات کو سنتی ہی نہیں۔ باوجود عقلمند ہونے کے زبیدہ بھی کہے جاتی ہے کہ ابوالحسن مر گیا ہے۔ اور نزہت زندہ ہے۔ اور خلیفہ کے ساتھ اس بات پر تکرار ہو رہی ہے۔"

ابوالحسن نے کہا "خدا خلیفہ کو ہمیشہ ہمارے سر پر سلامت رکھے۔ انھوں نے میری اس مصیبت میں کمال ہمدردی فرمائی ہے میں خود حاضر ہو کر تمام شک وشبہ کو دور کر دیتا۔ مگر کیا کروں۔ لاش اکیلی نہیں چھوڑ سکتا۔"

مسرور نے کہا "اگر مجھے واپس جانا نہ ہوتا تو میں تمہارے ساتھ تمہارے اس حال میں شریک رہتا۔ لیکن کیا کروں۔ مجھے جلد واپس جانے کا حکم ہے۔"

یہ کہہ کر مسرور واپس چلا گیا۔ نزہت اٹھ بیٹھی۔ اب ابوالحسن نے کہا "دیکھنا کہ ابھی کوئی نہ کوئی زبیدہ کی طرف سے آیا چاہتا ہے" نزہت نے اپنا لباس پہن لیا۔ اور پھر دونوں میاں بیوی دروازہ میں بیٹھ کر کسی نئے آنے والے کا انتظار کرنے لگے مسرور جب محل میں داخل ہوا۔ تو نہایت خوش خوش تھا اور اپنے ہاتھوں سے تالیاں بجاتا تھا۔ جس کا یہ مطلب تھا کہ خلیفہ سچا ہے۔ اور شرط جیت گیا ہے۔ زبیدہ نے خفا ہو کر پوچھا۔

"او شریر سیاہ حبشی۔ سچ بتا کون زندہ ہے اور کون مرا ہے؟"

اس نے کہا "خداوند نزہت الارواح مر گئی ہے۔ اور ابوالحسن اس کے غم میں رو رہا ہے۔"

خلیفہ یہ سن کر اچھلا اور ہنسا اور زبیدہ سے کہا کہ اب میں نے فلاں محل جیت لیا ہے۔ پھر مسرور سے کہا کہ وہاں کا تمام واقعہ جو کچھ تو نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے تفصیل وار بیان کر۔ مسرور نے تمام واقعہ مفصل بیان کیا پھر خلیفہ نے زبیدہ سے کہا۔

"اب بھی تم کو یقین آیا ہے یا نہیں۔" زبیدہ نے کہا یہ غلام کاذب اور مفتری ہے میں ہرگز اس کی بات پر یقین نہ کروں گی۔"

مسرور نے عاجزی سے کہا کہ بی بی تمہاری قسم اور خلیفہ کی عمر کی قسم ابوالحسن زندہ ہے اور نزہت الارواح مر گئی ہے زبیدہ لال پیلی ہو کر یہی کہتی رہی۔ "[illegible] تم سے سچی ہوں۔"

پھر اس نے اپنی [illegible] کو [illegible] سب آگئیں۔ ان سے پوچھا کہ خلیفہ کے تشریف لانے سے پیشتر کون میرے پاس روتا ہوا آیا تھا۔ کنیزوں نے [illegible] آئی تھی"۔ پھر زبیدہ نے اپنی خزانچی خواص سے کہا کہ تو بھی بتلا کہ میں نے کس کو تجھ سے تھان اور اشرفیاں دلوائی [illegible] نزہت کو۔" پھر زبیدہ نے غصہ میں آکر کہا۔ "او مسرور شریر! تجھے جھوٹ بولنے میں

کیا فائدہ ہے۔"

مسرور تو خاموش ہو گیا۔ خلیفہ نے زبیدہ کی طرف دیکھ کر کہا "جس نے عورت کی نسبت ناقص العقل کہا ہے بالکل درست ہے۔"

زبیدہ نے کہا "بے ادبی معاف مسرور کی آپ سے سازش ہے۔ مجھے بھی اجازت دیں کہ میں کسی اپنے آدمی کو بھیج کر اصل معاملہ کی تحقیق کروں۔" خلیفہ نے اجازت دی زبیدہ نے اپنی دایہ کو بلایا۔ جو نہایت ضعیف تھی اور اس سے کہا کہ "والدہ تو جا کر تحقیق کر کہ نزہت الارواح مری ہے یا ابوالحسن۔ اگر تو آکر سچ بتائے گی تو میں تجھے انعام دوں گی۔"

دایہ وہاں سے رخصت ہو کر ابوالحسن کے گھر کی جانب چلی ابوالحسن نے جب اسے آتے دیکھا تو سمجھ لیا کہ یہ ضرور زبیدہ کی طرف سے آئی ہے فوراً اپنے آپ کو مردہ سا لیا۔ اور کفن پہن کر لیٹ گیا۔ نزہت نے اس پر کپڑا ڈال دیا۔ وہ اپنے بال نوچ نوچ کر رونے لگی۔ جب دائی اندر داخل ہوئی تو اس نے نزہت الارواح کو روتے ہوئے دیکھا۔ کہ وہ کہہ رہی ہے کہ "پیارے ابوالحسن میں تمہارے بعد اس دنیا میں رہ کر کیا کروں گی۔ خدا نے مجھے کس مصیبت میں مبتلا کیا دایہ نے دیکھا کہ یہاں تو مسرور کے خلاف واقعہ ہے۔ لعنت ہو اس پر اس نے خواہ مخواہ کا گھر میں ایک جھگڑا پیدا کر دیا ہے نزہت الارواح نے کہا "اماں جو مسرور نے کہا۔ کاش وہی سچ ہوتا۔ تو میں آج اس دکھ میں نہ پڑتی اور بیوگی کی مصیبت نہ دیکھتی۔" یہ کہہ کر رونے لگی۔ اور دائی کو بھی اس کی حالت دیکھ کر رونا آگیا پھر اس نے ابوالحسن کے منہ سے کپڑا اٹھا کر دیکھا۔ اور کہا "اے ابوالحسن خدا تجھ پر رحم کرے۔" اور نزہت الارواح سے کہا "بیٹی اگرچہ میں چاہتی ہوں۔ کہ تیرے رنج میں شریک رہوں۔ لیکن کیا کروں۔ مجھے جلد واپس جانا ہے زبیدہ خاتون میری منتظر ہو گی اس نمک حرام مسرور نے اپنی دروغ گوئی سے انھیں آپس میں ناخوش کر رکھا ہے۔" یہ کہہ کر دایہ محل کو واپس لوٹ گئی۔

اس کے جانے کے بعد ابوالحسن بھی اٹھ بیٹھا۔ اب دونوں میاں بیوی دروازہ میں بیٹھ کر دیکھنے لگے۔ کہ دیکھئے اب کیا نیا شگوفہ پھوٹتا ہے اس بڑھیا نے جو کچھ دیکھا تھا محل میں جا کر زبیدہ سے بیان کیا۔ زبیدہ نے بڑھیا سے کہا۔ کہ تو یہی سب کچھ خلیفہ کے پاس جا کر بیان کر' اس دایہ نے مسرور سے مخاطب ہو کر بیان کیا۔ "کہ تو نہایت دروغگو ہے۔ جو اپنے آقاؤں کے سامنے جھوٹ بولتا ہے۔ نزہت الارواح تو زندہ ہے۔ اور ابوالحسن مر گیا ہے۔ میں نے اس کی لاش کو بچشم خود دیکھا ہے اور نزہت اس کے سرہانے بیٹھی رو رہی ہے۔"

مسرور نے کہا۔ "او چھنالہ تو بڑی مکارہ ہے کہ دن دہاڑے ہماری آنکھوں میں خاک جھونکتی ہے۔ میں ابھی دیکھ کر چلا آرہا ہوں۔ کہ نزہت مر گئی ہے اور ابوالحسن اس کے سرہانے اس کی ماتم داری کر رہا ہے۔"

بڑھیا نے کہا "مسرور تو بڑا بے حیا ہے اور کس دیدہ دلیری سے جھوٹ بولتا ہے۔ میں خود ابوالحسن کو مرا ہوا دیکھ کر آئی ہوں۔"

مسرور نے کہا کیا تو مجھے فریب دینا چاہتی ہے۔"

زبیدہ نے خلیفہ سے کہا "تم اپنے غلام کی باتیں سن رہے ہو کہ یہ کیسی بک بک کر رہا ہے۔ اور میری دایہ سے گستاخی کلام کر رہا ہے لیکن تم اسے ذرا بھی منع نہیں کرتے۔" یہ کہہ کر زبیدہ کھسیانی ہو کر رونے لگی۔

خلیفہ یہ تمام تماشہ دیکھ کر خاموش ہو رہا۔ ادھر مسرور' دائی اور دیگر خواصیں سب حیرت زدہ ہو کر چپ ہو گئے کچھ دیر ٹھہر کر خلیفہ نے زبیدہ سے کہا "بی بی اس معاملہ میں ہم سب ایک دوسرے کے سامنے جھوٹے ہیں۔ اور اس طرح اس امر کا فیصلہ ہونا ناممکن ہے۔ بہتر یہ ہو گا کہ ہم سب ابوالحسن کے مکان پر چلیں اور وہاں جا کر اس امر کی تحقیق کریں کہ کون مرا ہے۔ اور کون زندہ ہے۔" سب نے خلیفہ کی اس رائے پر اتفاق کیا اور خلیفہ مع زبیدہ' مسرور' دائی اور دیگر خواصوں کے ابوالحسن کے مکان کی جانب چلا۔ ابوالحسن کا مکان خلیفہ کے محل کے متقابل واقع تھا۔ راستہ میں بھی مسرور اور دائی ایک دوسرے سے برا بھلا کہتے رہے۔ حتے کہ ابوالحسن کے مکان کے قریب پہنچ

گئے۔ جب ابوالحسن نے ان سب کو آتے دیکھا تو نزہت سے کہا۔

"لو اب سب کے سب آ رہے ہیں۔" نزہت یہ دیکھ کر گھبرا گئی۔ کہ اب ہمارا راز فاش ہو جائے گا۔ لیکن ابوالحسن نے تسلی دی اور کہا "بالکل نہ گھبراؤ۔" پھر ابوالحسن اور نزہت دونوں اپنا اپنا کفن پہن کر اور تھان سے منہ ڈھانپ کر کمرہ میں مردوں کی طرح لیٹ گئے۔ جب یہ سب پارٹی مکان میں داخل ہوئی تو انہوں نے ابوالحسن اور نزہت دونوں کو مردہ پایا۔ سب حیران ہو گئے۔ کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ زبیدہ نے کہا "کیا غضب ہے کہ دونوں ہی چل دیئے پھر خلیفہ اور مسرور وغیرہ سے مخاطب ہو کر کہا "تو دیکھو تمہاری تکرار اور بار بار آدمی بھیجنے سے میری پیاری کنیز نزہت بھی فوت ہو گئی۔ ایک تو وہ اپنے خاوند کے مر جانے سے غم میں تھی دوسرے تمہارے تجسس نے اسے ہلاک کر دیا۔"

خلیفہ نے زبیدہ سے کہا کہ یہ معاملہ اس طرح پر نہیں بلکہ ابوالحسن نزہت پر عاشق تھا۔ اس کی موت سے یقیناً اس کو صدمہ پہنچا۔ اور وہ بھی مر گیا۔ اب میں شرط جیت گیا۔ اور تم لازمی طور پر ہار گئیں۔ لہٰذا تمہارا محل میرا ہوا۔ زبیدہ نے کہا نہیں تم ہار گئے۔ اور وہ تمہارا باغ میرا ہو گیا۔ کیونکہ ابوالحسن پہلے مرا ہے۔ پھر ان باتوں میں خلیفہ اور زبیدہ کے درمیان تکرار ہونے لگی۔ اور ادھر دائی اور مسرور بھی آپس میں جھگڑنے لگے۔ خلیفہ کچھ سوچنے کے بعد ان دونوں جنازوں کے درمیان میں بیٹھ گیا۔ اور کہنے لگا۔

"میں اقرار کرتا ہوں کہ اسے بھی ایک ہزار اشرفی دوں گا۔ جو مجھے یہ بتا دے گا کہ پہلے کون مرا ہے۔"

ابوالحسن نے اپنے تابوت سے آواز دی۔

"پہلے میری موت ہوئی۔ مجھے ہزار اشرفی دیجئے۔" پھر ابوالحسن اٹھ بیٹھا اور خلیفہ کے قدموں پر گر پڑا۔ اُدھر نزہت اٹھ بیٹھی۔ اور اپنی مالکہ کے قدموں پر گر گئی زبیدہ ڈر گئی۔ کہ مردے جی کر مجھے اور خلیفہ کو چمٹ گئے ہیں۔ جب زبیدہ کا وہم اور خوف کچھ دور ہوا تو کہنے لگی کہ اے کمبخت تجھے کیا ہو گیا تھا۔ تیری اس حرکت کی بدولت ہمارا تمام دن لڑنے جھگڑنے میں گذرا آخر میں نے تیرا قصور معاف کر دیا۔ یہی غنیمت ہے۔ کہ تجھے زندہ و سلامت پایا۔ اسی طرح خلیفہ بھی ابوالحسن کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگا۔ اور خوش ہوا۔ اور ابوالحسن سے کہا نالائق تجھے یہ کیا سوجھی تھی۔ کہ تو نے اس فریب سے مجھے تمام دن جھگڑے میں رکھا۔ اور کئی آدمیوں کو پریشان کیا۔"

ابوالحسن نے کہا "خداوندا اب میرا حال بھی سنئے میں جب مجرد تھا۔ نہایت آرام سے رہتا تھا۔ جب سے میری شادی ہوئی ہے کئی ایک قسم کے مصارف کی وجہ سے مقروض و زیر بار ہو گیا ہوں۔ آپ نے اور زبیدہ خاتون نے جو کچھ دیا تھا وہ سب خرچ ہو گیا قرضخواہوں نے تنگ کیا جب تقاضا کیا تو ہم نے جو کچھ باقیماندہ رہ گیا تھا دے ڈالا جب ہمارے پاس کچھ بھی نہ رہا۔ تو ہم نے بہت سی تدبیریں سوچیں سوائے اس حیلہ و فریب کے جو آپ نے ملاحظہ فرمایا۔ اور کچھ دماغ میں نہ آیا۔

خلیفہ ابوالحسن کی صاف بیانی پر نہایت خوش ہوا۔ اور اس کا قصور معاف کر دیا۔ اور پھر ابوالحسن اور اس کی بیوی کو ایک ہزار اشرفی اور عنایت کیں۔ اور پھر ابوالحسن اور نزہت خلیفہ کی مہربانی سے اپنی تمام عمر نہایت اچھی طرح بسر کرتے رہے اور ہمیشہ شاد و خرم رہے۔

بھروسا

مولوی نذیر احمد

کلیم شیخ چلی کے سے منصوبے سوچتا۔ اپنے دوست مرزا کے مکان پر پہنچا ہر چند ابھی کچھ ایسی بہت رات نہیں گئی تھی۔ لیکن مرزا جیسے نکھے بے فکرے کبھی کے لمبی تان کر سو چکے تھے۔ کلیم نے جو دروازے پر دستک دی۔ تو جواب ندارد۔ اس مقام پر مرزا کا تھوڑا سا حال لکھ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اس شخص کی کیفیت یہ تھی۔ کہ شاید اس کا نانا (وہ بھی حقیقی نہیں) ابتدائے عملداری سرکار میں صاحب ریزیڈنٹ کی اردلی کا جمعدار تھا۔ اول تو ایسی عالی جاہ سرکار' دوسرے اعتبار منصب' اردلی کا جمعدار' تیسرے ان دنوں کی بے عنوانی۔ اس پر خود اس کی رشوت ستانی۔ بہت کچھ کمایا' یہاں تک کہ اس کا اعتداد دہلی کے روداروں میں ہو گیا۔ مرزا کی ماں اوائل عمر میں بیوہ ہو گئی۔ جمعدار نے (باوجودیکہ دور کی قرابت تھی) حسبۃً للہ اس کا تکفل اپنے ذمے لیا' جمعدار اپنی حیات میں تو اتنا سلوک کرتا رہا کہ مرزا کو یتیمی اور اس کی ماں کی بیوگی بھول کر بھی یاد نہ آئی ہو گی۔ لیکن جمعدار کے مرنے پر اس کے بیٹے۔ پوتے۔ نواسے کثرت سے تھے انھوں نے اعتنا نہ کی۔ اور اگرچہ جمعدار بہت کچھ وصیت کر مرے تھے۔ مگر ان کے ورثا نے بہزار دقت محلسرا کے پہلو میں ایک چھوٹا سا قطعہ رہنے کو دیا۔ اور سات روپیہ مہینے کے کرایہ کی دو دکانیں مرزا کے نام کر دیں۔ یہ تو حال تھا کہ مرزا۔ مرزا کی ماں۔ مرزا کی بیوی تین آدمی اور سات روپیہ کی کل کائنات۔ اس پر مرزا کی شیخی اور نمود۔ یہ مسخرہ چاہتا تھا کہ جمعدار کے بیٹوں کی برابری کرے۔ جن کو صدہا روپیہ کی مستقل آمدنی تھی۔ اگرچہ جمعدار والے اس کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ مگر یہ بے غیرت زبردستی ان میں گھستا تھا۔ یہ کسی کو بھائی جان۔ کسی کو ماموں جان کسی کو خالو جان بناتا۔ اور وہ لوگ اس کے اِدّعائی رشتے ناتوں سے جلتے اور دق ہوتے۔ اونچی حیثیت کے لوگوں میں بیٹھنا اس کے حق میں اور بھی زہر ہوا تھا۔ ان کی دیکھا دیکھی اس نے تمام عادتیں امیر زادوں کی سی اختیار کر رکھی تھیں۔ مگر امیر زادگی نبھے تو کیسے نبھے۔ دو کانیں گروی ہوتی جاتی تھیں۔ ماں بے چاری بہت بکی' مگر کون سنتا تھا۔

مرزا کی جب دیکھو۔ پاؤں میں ڈیڑھ حاشیہ کی جوتی۔ سر پر دہری بیل کی بھاری کامدار ٹوپی۔ بدن میں ایک چھوڑ دو انگرکھے۔ اوپر شبنم یا ململ تو نیچے کوئی طرحدار ساڈھاکے کا نینو۔ جاڑا ہوا تو بانات مگر سات روپیہ گز سے کم نہیں۔ خیر یہ تو صبح و شام۔ اور تیسرے پہر کا شالی مخمل کی آصف خانی۔ جس میں حریر کی سجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل ٹکی ہوئی۔ سرخ نیفہ کا پائجامہ۔ اگر ڈھیلے پائنچوں کا ہوا تو گز بھر۔ اور اس قدر نیچا کہ ٹھوکر کے اشارے سے دو قدم آگے۔ اور اگر تنگ موہری کا ہوا تو نصف ساق تک چوڑیاں۔ اور اوپر جلد بدن کی طرح منڈھا ہوا ریشمی۔ ازاربند گھٹنوں میں لٹکتا ہوا۔ اور اس میں بے قفل کی کنجیوں کا گچھا۔ غرض دیکھو۔ تو مرزا صاحب اس

[illegible] سے [illegible] مرزا [illegible] جم جم کرتے چلے جاتے ہیں۔ کلیم [illegible] مرزا سے [illegible] ہوا [illegible] مرزا صاحب کلیم کے مکان پر تشریف لانے لگے یہاں تک کہ اب [illegible] دونوں میں [illegible] کی [illegible] طالب تھے۔ کلیم کو مرزا کے مکان پر جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا مگر مرزا [illegible] کبھی کبھی۔ [illegible] کلیم کے پاس [illegible]۔ مرزا نے اپنا حال اصلی کلیم پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کلیم بھی جانتا تھا کہ جمعدار کا سب [illegible] مرزا [illegible] اور جمعدار کی محلسرا کو مرزا کی محلسرا اور جمعدار کے دیوان خانہ کو مرزا کا دیوان خانہ اور جمعدار کے بیٹے پوتوں کے نوکروں کو مرزا کے نوکر [illegible] تھی۔ [illegible] کر سے [illegible]۔ تو سیدھا جمعدار کی محلسرا کی ڈیوڑھی پر جا موجود ہوا۔ بار بار کے پکارنے اور کنڈی کے کھڑکھڑانے سے دو لونڈیاں چراغ لئے ہوئے اندر سے نکلیں۔ اور ان میں سے ایک نے پوچھا کہ "کون صاحب ہیں؟ کون صاحب ہیں؟ [illegible] کیا کام ہے؟"

کلیم۔ جاؤ مرزا کو بھیج دو۔

لونڈی۔ کون مرزا؟

کلیم۔ مرزا ظاہر دار بیگ، جن کا یہ مکان ہے اور کون مرزا۔

لونڈی۔ یہاں کوئی مرزا ظاہر دار بیگ نہیں ہے۔

اتنا کہہ کر قریب تھا کہ لونڈی کواڑ بند کر لے۔

کلیم۔ کیوں جی کیا یہ جمعدار صاحب کی محلسرائے نہیں ہے؟

لونڈی۔ ہے کیوں نہیں۔

کلیم۔ پھر تم نے یہ کیا کہا کہ یہاں کوئی ظاہر دار بیگ نہیں ہے؟ کیا ظاہر دار بیگ جمعدار کے وارث اور جانشین نہیں ہیں؟

لونڈی۔ جمعدار کے وارثوں کو خدا سلامت رکھے۔ مرزا ظاہر دار بیگ جمعدار کا وارث بننے والا کون ہے؟

دوسری لونڈی۔ اری کمبخت! یہ کہیں مرزا بانکے کے بیٹے کو نہ پوچھتے ہوں۔ وہ ہر جگہ اپنے تئیں جمعدار کا بیٹا بتایا کرتا ہے۔ (کلیم کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں میاں وہی ظاہر دار بیگ نہ جن کی رنگت زرد زرد ہے؟ آنکھیں کرنجی۔ چھوٹا قد۔ دبلا ڈیل۔ اپنے [illegible] سنوارے رہا کرتے ہیں۔

کلیم۔ [illegible] وہی ظاہر دار بیگ۔

لونڈی۔ [illegible] کے پچھواڑے اپلوں کی ٹال کے برابر ایک چھوٹا سا کچا مکان ہے۔ وہ اس میں رہتے ہیں۔

[illegible] تھوڑی دیر بعد مرزا صاحب۔ ننگ دھڑنگ جانگیہ پہنے ہوئے باہر تشریف لائے اور کلیم کو دیکھ کر شرمائے [illegible] میں سمجھا کوئی اور صاحب ہیں۔ بندہ کو کپڑا پہن کر سونے کی عادت نہیں۔ میں ذرا کپڑے [illegible]

کلیم۔ چلئے [illegible] آ رہا۔

مرزا۔ پھر اگر [illegible] کرتا ہوں۔

کلیم۔ میں آج شب کو آپ ہی کے یہاں رہنے کی نیت سے آیا ہوں۔

مرزا۔ بسم اللہ تو چلئے! اسی مسجد میں تشریف رکھئے۔ بڑی فضا کی جگہ ہے' میں ابھی آیا۔

کلیم نے جو مسجد میں آکر دیکھا' تو معلوم ہوا کہ ایک نہایت چھوٹی سی مسجد ہے' وہ بھی ویران' وحشت ناک۔ نہ کوئی حافظ ہے' نہ ملا' نہ طالب علم' نہ مسافر۔ ہزار ہا چمگادڑیں اس میں رہتی ہیں کہ ان کی تسبیح بے ہنگام سے کان کے پردے پھٹے جاتے ہیں۔ فرش پر اس قدر بیٹ پڑی ہے کہ بجائے خود کھرنجے کا فرش بن گیا ہے۔ مرزا کے انتظار میں کلیم کو چار و ناچار اسی مسجد میں ٹھہرنا پڑا۔ مرزا آئے بھی تو اتنی دیر کر کے کہ جب کلیم مایوس ہو چکا تھا۔ قبل اس کے کہ کلیم شکایت کرے۔ مرزا صاحب بطور دفع دخل مقدر فرمانے لگے۔ "کہ بندہ کے گھر میں کئی دن سے طبیعت علیل ہے' خفقان کا عارضہ' اختلاج قلب کا روگ ہے۔ اب جو میں آپ کے پاس سے گیا۔ تو ان کو غشی میں پایا۔ اس وجہ سے دیر ہوئی۔" پہلے تو یہ فرمایئے کہ اس وقت بندہ نوازی فرمانے کی کیا وجہ ہے؟

کلیم نے باپ کی طلب' اپنا انکار' بھائی کی التجا۔ ماں کا اصرار۔ تمام ماجرا کہہ سنایا۔

مرزا۔ پھر اب کیا ارادہ ہے؟

کلیم۔ سوائے اس کے کہ اب گھر لوٹ کر جانے کا تو ارادہ نہیں ہے۔ اور جو آپ کی صلاح ہو۔

مرزا۔ خیر نیت شب حرام صبح تو ہو۔ آپ بے تکلف استراحت فرمایئے' میں جا کر بچھونا وغیرہ بھیجے دیتا ہوں' اور مجھ کو مریضہ کی تیمارداری کے لئے اجازت دیجئے کہ آج اس کی علالت میں اشتداد ہے۔

کلیم۔ یہ ماجرا کیا ہے؟ تم تو کہا کرتے تھے کہ ہمارے پاس دہری محلسرائیں۔ متعدد دیوان خانے' کئی پائین باغ ہیں۔ حوض اور حمام اور کٹرے اور گنج اور دوکانیں اور سرائیں ہیں۔ میں جانتا ہوں عمارت کی قسم سے کوئی چیز ایسی نہ ہو گی جس کو تم نے اپنی ملک نہ بتایا ہو۔ یا یہ حال ہے کہ ایک تنفس کے واسطے ایک شب کے لئے تم کو جگہ میسر نہیں۔ جو جو حالات تم نے اپنی زبان سے بیان کئے ہیں۔ ان سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ تم جمعدار کے تمام ترکہ پر قابض اور متصرف ہو۔ لیکن میں اس تمام جاہ و حشمت کا ایک شمہ بھی نہیں دیکھتا۔

مرزا۔ آپ کو میری نسبت سخن سازی کا احتمال ہونا سخت تعجب کی بات ہے۔ اتنی مدت مجھ سے آپ سے محبت رہی۔ مگر افسوس ہے آپ نے میری طبیعت اور عادت کو نہ پہچانا۔ یہ اختلاف حالت جو آپ دیکھتے ہیں اس کی ایک وجہ ہے۔ بندہ کو جمعدار صاحب مرحوم و مغفور نے متبنٰی کیا تھا۔ اور اپنا جانشین کر مرے تھے۔ شہر کے کل روٴسا اس سے واقف و آگاہ ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد لوگوں نے اس میں رخنہ اندازیاں کیں۔ بندہ کو آپ جانتے ہیں کہ بکھیڑے سے کوسوں بھاگتا ہے۔ صحبت ناملائم دیکھ کر کنارہ کش ہو گیا۔ لیکن کسی کو انتظام کا سلیقہ۔ بندوبست کا حوصلہ نہیں۔ اسی روز سے واویلا مچی ہوئی ہے۔ اور اس بات کے مشورے ہو رہے ہیں کہ بندے کو منا لے جائیں۔

کلیم۔ لیکن آپ نے اس کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔

مرزا۔ اگر میں آپ سے یا کسی سے تذکرہ کرتا۔ تو استقلال مزاج سے بے بہرہ اور غیرت و حمیت سے بے نصیب ٹھہرتا۔ اب آپ کو کھڑے کھڑے میں تکلیف ہوتی ہے اجازت دیجئے کہ میں جا کر بچھونا بھجوا دوں اور مریضہ کی تیمارداری کروں۔

کلیم۔ خیر مقام مجبوری ہے۔ لیکن پہلے ایک چراغ تو منگوا بیٹھئے۔ تاریکی کی وجہ سے طبیعت اور بھی گھبراتی ہے۔

مرزا۔ چراغ کیا؟ میں نے تو لیمپ روشن کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ لیکن گرمی کے دن ہیں۔ پروانے بہت جمع ہو جائیں گے۔ اور آپ زیادہ پریشان ہو جیئے گا۔ اور اس مکان میں ابابیلوں کی کثرت ہے۔ روشنی دیکھ کر گرنی شروع ہوں گی۔ اور آپ کا جشن نا خوار کر دیں گی۔ تھوڑی دیر صبر کیجئے کہ ماہتاب نکلا آتا ہے۔

کلیم جب گھر سے نکلا تو کھانا تیار تھا۔ لیکن وہ اس قدر طیش میں تھا کہ اس نے کھانے کی مطلق پروا نہ کی اور بے کھائے نکل کھڑا ہوا۔ مرزا سے ملنے کے بعد وہ منتظر تھا کہ آخر مرزا خود پوچھیں گے تو کہہ دوں گا۔ مرزا کو ہر چند کھانے کی نسبت پوچھنا ضرور تھا۔ کیونکہ اول تو کچھ ایسی رات زیادہ نہیں گئی تھی۔ دوسرے یہ نہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کلیم گھر سے نکلا ہے۔ تیسرے دونوں میں بے تکلفی غایت درجہ کی تھی۔ لیکن مرزا قصداً اس بات سے متعرض نہ ہوا۔ کلیم بیچارے کا بھوک کے مارے یہ حال کہ مسجد میں آنے سے پہلے اس کی انتڑیوں نے قل ھو اللہ پڑھنی شروع کر دی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ مرزا کسی طرح اس پہلو پر نہیں آتا اور عنقریب تمام شب کے واسطے رخصت ہونا چاہتا ہے۔ تو بے چارے نے بے غیرت بن کر خود کہا کہ "سنو یار! میں نے کھانا بھی نہیں کھایا۔"

مرزا۔ سچ کہتے ہو؟ نہیں۔ جھوٹ بہکاتے ہو۔

کلیم۔ تمہارے سر کی قسم میں بھوکا ہوں۔

مرزا۔ مرد خدا تو آتے ہی کیوں نہیں کہا۔ اب اتنی رات گئے کیا ہو سکتا ہے۔ دوکانیں سب بند ہو گئیں اور جو ایک دو کھلی بھی ہیں۔ تو باسی چیزیں رہ گئی ہوں گی۔ جن کے کھانے سے فاقہ بہتر ہے۔ دیواشتہا کو زیر کرنا بڑی ہمت والوں کا کام ہے۔ ایک تدبیر سمجھ میں آتی ہے۔ کہ جاؤں چھدامی بھڑ بھونجے کے یہاں سے گرم گرم خستہ چنے بھنوالاؤں۔ بس ایک دھیلے کے بھی کو تم کو دونوں کو کافی ہوں گے۔ رات کا وقت ہے۔

ابھی کلیم کچھ کہنے بھی نہیں پایا تھا کہ مرزا جلدی سے اٹھ باہر گئے۔ اور چشم زدن میں چنے بھنوالائے۔ مگر دھیلے کے کہہ کر گئے تھے۔ یا تو کم کے لائے۔ یا راہ میں دو چار پھنکے لگا آئے۔ اس واسطے کہ کلیم کے روبرو تین مٹھی چنے سے زیادہ نہ تھے۔

مرزا۔ یار! ہو تم بڑے خوش قسمت کہ اس وقت بھاڑ مل گیا ذرا واللہ ہاتھ تو لگاؤ۔ دیکھو تو کیسے بھلس رہے ہیں! اور سوندھی سوندھی خوشبو بھی عجیب ہی دلفریب ہے کہ بس بیان نہیں ہو سکتا۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے خس و مٹی کا عطر نکالا۔ مگر بھنے ہوئے چنوں کی طرف کسی کا ذہن منتقل نہ ہوا۔ کوئی فن ہو۔ کمال بھی کیا چیز ہے! دیکھئے اتنی تو رات ہو گئی ہے۔ مگر چھدامی کی دکان پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ بندے نے تحقیق سنا ہے کہ حضور والا کے خاصے میں چھدامی کی دوکان کا چنا بلا ناغہ لگ کر جاتا ہے۔ اور واقع میں ذرا آپ غور سے دیکھئے۔ کیا کمال کرتا ہے کہ بھوننے میں چنوں کو سڈول بنا دیتا ہے۔ بھئی تمہیں میرے سر کی قسم! سچ کہنا ایسے خوبصورت خوش قطع سڈول چنے تم نے پہلے بھی کبھی دیکھے تھے۔ دال بنانے میں اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ کسی دانہ پر خراش تک نہیں۔ ٹوٹنے پھوٹنے کا کیا ذکر ہے۔ اور دانوں کی رنگت دیکھئے کوئی بسنتی ہے۔ کوئی پستی۔ غرض دونوں رنگ خوشنما۔ یوں صدہا قسم کے غلے اور پھل زمین سے اگتے ہیں۔ لیکن چنے کی لذت کو کوئی نہیں پاتا۔ آپ نے وہ ایک ظریف کی حکایت سنی ہے۔

کلیم۔ چنا ایک مرتبہ حضرت میکائیل کی خدمت میں۔ جن کو ارزاق عباد کا اہتمام سپرد ہے۔ فریاد لے کر گیا۔ کہ یا حضرت میں نے ایسا کیا قصور کیا ہے؟ کہ جوں میں نے زمین سے سر نکالا ہتر ستم چلنے لگا۔ ماکولات اور بھی ہیں۔ مگر جیسے جیسے ظلم مجھ پر ہوتے ہیں۔ کسی پر نہیں ہوتے نشو و نما کے ساتھ تو میری قطع و برید ہونے لگتی ہے۔ میری کونپلوں کو توڑ کر آدمی ساگ بناتے ہیں۔ اور مجھے کچے کو کھا جاتے ہیں۔ جب بارور ہوا۔ تو خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ آدمی بکری بن کر لاکھوں من بوٹ چر جاتے ہیں۔ اس سے نجات ملی۔ تو ہولے کرنے شروع کئے۔ پکا تو شاخ' برگ۔ بھس بن کر بیلوں اور بھینسوں کے دوزخ شکم کا ایندھن ہوا۔ رہا دانہ۔ اس کو چکی میں دبیں۔ گھوڑوں کو کھلائیں۔ بھاڑ میں بھونیں۔ بیسن بنائیں۔ کھولتے ہوئے پانی میں ابالیں۔ گھنگنیاں پکائیں۔ غرض شروع سے آخر تک مجھ پر طرح طرح کی آفتیں نازل رہتی ہیں۔ چنے کا حضرت میکائیلؑ کے دربار میں اس طرح پر بے باکانہ چٹر پٹر بولنا سن کر حاضرین دربار اس قدر ناخوش ہوئے کہ ہر شخص اسے کھانے کو دوڑا۔ چنانچہ یہ ماجرا دیکھ کر چنا بے انتظار حکم اخیر رخصت ہوا۔ سو حضرت! یہ چنے ایسے لذت کے بنے ہیں۔ کہ فرشتوں کے دندان آز بھی ان پر تیز ہیں۔ افسوس ہے کہ اس وقت نمک مرچ بہم نہیں پہنچ سکتا' ورنہ میر مدو کے کبابوں میں یہ خستگی اور یہ سوندھا پن کہاں!

غرض مرزا نے اپنی چرب زبانی سے چنوں کو گھی کی تلی دال بنا کر اپنے دوست کلیم کو کھلایا۔ کلیم بھوکا تو تھا ہی۔ اس کو بھی ہمیشہ سے کچھ زیادہ مزے دار معلوم ہوئے۔

مرزا نے گھر جا کر ایک میلی دری اور کثیف سا تکیہ بھیجدیا۔ دو ہی گھڑی میں کلیم کی حالت کا متغیر ہو جانا عبرت کا مقام ہے۔ یا خلوت خانہ اور عشرت منزل میں تھا۔ اب ایک مسجد میں آکر پڑا اور مسجد بھی ایسی جس کا حال تھوڑا سا ہم نے اوپر بیان کیا۔ گھر کے الوان نعمت کو لات مار کر نکلا تھا۔ تو پہلے ہی وقت چنے چبانے پڑے۔ نہ چراغ نہ چارپائی' نہ بہن نہ بھائی' نہ مونس' نہ غم خوار۔ نہ نوکر' نہ خدمت گار' مسجد میں اکیلا ایسا بیٹھا تھا' جیسے قید خانہ میں حاکم کا گنہگار۔ یا قفس میں مرغ نو گرفتار' اور کوئی ہوتا تو اس حالت پر نظر کر کے تنبیہہ پکڑتا۔ اپنی حرکت سے توبہ اور اپنے افعال سے استغفار کرتا۔ اور اسی وقت نہیں تو سویرے گجردم باپ کے ساتھ نماز صبح میں جا شریک ہوتا۔ لیکن کلیم کو اور بہت سے مضمون سوجھتے تھے۔ اس نے رات بھر میں ایک قصیدہ مسجد کی ہجو میں تیار کیا۔ اور ایک مثنوی مرزا کی شان میں۔ صبح ہوتے ہی آنکھ لگ گئی۔ تو نہیں معلوم مرزا یا محلہ کا کوئی عیار۔ ٹوپی۔ جوتی۔ رومال۔ چھڑی۔ تکیہ۔ دری۔ یعنی جو چیز کلیم کے بدن سے منفک اور اس کے جسم سے جدا تھی لے کر چمپت ہوا۔ یوں ہی کلیم بہت دیر کو سو کر اٹھتا تھا اور آج تو ایک خاص وجہ تھی۔ کوئی پہر سوا پہر دن چڑھے جاگا تو دیکھتا کیا ہے کہ فرش مسجد پر پڑا ہے اور نیند کی حالت میں جو کروٹیں لی ہیں تو سیروں گرد کا بھبوت اور چمگادڑوں کی بیٹ کا ضماد بدن پر تھپا ہوا ہے۔ حیران ہوا کہ قلب ماہیت ہو کر میں بھتنا تو نہیں بن گیا۔ مرزا کو ادھر دیکھا ادھر دیکھا کہیں پتہ نہیں۔ مسجد تھی ویران اس میں پانی کہاں! صبر کر کے بیٹھ رہا کہ کوئی اللہ کا بندہ ادھر کو آ نکلے۔ تو اس کے ہاتھ مرزا کو بلواؤں اور یا منہ ہاتھ دھو کر خود مرزا تک جاؤں۔ اس میں دوپہر ہونے آئی۔ بارے! ایک لڑکا کھیلتا ہوا آیا۔ جونہی زینہ پر چڑھا کہ کلیم عرض مطلب کے لئے لپکا وہ لڑکا اس کی ہیئت کذائی دیکھ دوڑ کر بھاگا۔ خدا جانے اس نے اس کو بھوت سمجھا۔ یا سڑی خیال کیا۔ کلیم نے بہتیرا پکارا۔ اس لڑکے نے پیٹھ پھیر کر نہ دیکھا۔ ناچار کلیم نے بہزار مصیبت دوسرے فاقے سے شام پکڑی۔ اور جب اندھیرا ہوا۔ تو الو کی طرح اپنے نشیمن سے نکلا۔ سید حامر زا کے مکان پر گیا۔ آواز دی۔ تو یہ جواب ملا کہ وہ بڑے سویرے کے قطب صاحب سدھارے ہیں۔ کلیم نے چاہا کہ اپنا تعارف ظاہر کر کے ممکن ہو تو منہ دھونے کو پانی مانگے۔ اور مرزا کی پھٹی پرانی جوتی اور ٹوپی۔ تاکہ کسی طرح گلی کوچے میں چلنے کے قابل ہو جائے۔ یہ سوچ کر اس نے کہا "کیوں حضرت! آپ مجھ سے بھی واقف ہیں۔" اندر سے آواز آئی کہ "ہم تمھاری آواز تو نہیں پہچانتے۔ اپنا نام و نشان بتاؤ تو معلوم ہو۔

کلیم۔ میرا نام کلیم ہے۔اور مجھ سے اور مرزا ظاہر دار بیگ سے بہت دوستی ہے۔کل میں شب کو مرزا صاحب ہی کی وجہ سے مسجد میں تھا۔

گھروالے۔ وہ دری اور تکیہ کہاں ہے۔جو رات تمھارے سونے کے لئے بھیجا گیا تھا۔

تکیہ اور دری کا نام سن کر تو کلیم بہت چکرایا اور ابھی جواب دینے میں متامل تھا۔ کہ اندر سے آواز آئی۔"مرزا زبردست بیگ دیکھنا یہ مردوا کہیں چل نہ دے۔دوڑ کر تکیہ اور دری تو اس سے لو۔ کلیم یہ بات سن کر بھاگا۔ابھی گلی کے نکڑ تک نہیں پہنچا تھا کہ زبردست نے چور چور کر کے جالیا۔ہر چند کلیم نے مرزا ظاہر دار بیگ کے ساتھ اپنے حقوق معرفت ظاہر کئے۔ مگر زبردست کا ٹھیکا سر پہ۔اس نے ایک نہ مانی اور پکڑ کر کوتوالی لے گیا۔

کوتوال نے سرسری طور پر دونوں کا بیان سنا۔اور کلیم سے اس کا حسب اور نسب پوچھا۔ ہر چند کلیم اپنا پتہ بتانے میں جھینپتا تھا مگر چارو ناچار اس کو بتانا پڑا۔ لیکن اس کی حالت ظاہری ایسی ابتر ہو رہی تھی کہ اس کا سچ بھی جھوٹ معلوم ہو تا تھا۔ کوتوال نے سن کر یہی کہا کہ میاں نصوح جن کو تم اپنا والد بتاتے ہو۔ میں ان کو خوب جانتا ہوں اور یہ بھی مجھ کو معلوم ہے کہ ان کے بڑے بیٹے کا یہی نام ہے۔ جو تم نے اپنا بیان کیا۔ محلہ کا پتا گھر کا نشان جو تم نے کہا سب ٹھیک ہے۔ مگر کلیم تو ایک مشہور و معروف آدمی ہے۔ آج شہر میں اس کی شاعری کی دھوم ہے۔ تمھاری یہ حیثیت کہ ننگے سر ننگے پاؤں۔ بدن پر کیچڑ تھپی ہوئی۔ مجھ کو باور نہیں ہوتا۔ اچھا اب رات کو کیا ہو سکتا ہے۔ جرم سنگین ہے ان کو حوالات میں رکھو۔ صبح میں ان کے والد کو بلواؤں تو ان کے بیان کی تصدیق ہو۔

کلیم یہ سن کر رو دیا۔اور کہا میں وہی بد نصیب ہوں جس کی شعر گوئی کا شہرہ آپ نے سنا ہے اور آپ کو یقین نہ ہو۔ تو میں اپنے افکار تازہ آپ کو سناؤں۔ چنانچہ کل شب کو جو کچھ مسجد اور مرزا کی شان میں کہا تھا سنایا۔ اس پر کوتوال نے اتنی رعایت کی کہ دو سپاہی کلیم کے ساتھ کیے۔اور ان کو حکم دیا کہ ان کو میاں نصوح کے پاس لے جاؤ۔ اگر وہ ان کو اپنا فرزند بتائیں تو چھوڑ دینا۔ ورنہ واپس لا کر حوالات میں قید رکھنا۔

کلیم پر اس کیفیت سے باپ کے روبرو آنا جیسا کہ شاق گزرا ہوگا۔ مگر کیا کر سکتا تھا۔ سپاہی اس کو کشاں کشاں لے ہی گئے۔ محلہ کی مسجد جس میں نصوح نماز پڑھا کرتا تھا۔ اس کے گھر سے بہت قریب تھی۔ صحن میں ایک شاداب چمن تھا۔ اور چمن کے بیچوں بیچ ایک مربع چبوترہ عجیب تفریح کا مقام تھا۔ نصوح بیشتر نماز عشا کے بعد خصوصاً چاندنی راتوں میں اس چبوترہ پر بیٹھ کر پھول بوٹوں میں خداوند تعالیٰ کی صنعت کا ملاحظہ کیا کرتا تھا۔ اس کو بیٹھا دیکھ کر دوسرے نمازی بھی جمع ہو جاتے تھے۔ اور نصوح کو وعظ و پند کے طور پر ان کے ساتھ گفتگو کرنے کا موقع ملتا تھا۔

نصوح اور اس کے مستعین مسجد کے چبوترہ پر جمع ہو چلے تھے کہ کوتوالی چبوترے کے سپاہی کلیم کو لئے ہوئے آپہنچے۔ یہ اتفاق منجانب اللہ شاید اس وجہ سے پیش آیا کہ جو لوگ کلیم کی نظر میں صرف اس وجہ سے ذلیل تھے کہ وہ اپنے خالق کی پرستش کرتے تھے۔ ان کے سامنے اس کی گردن نخوت نیچی ہو۔اب وہ انھیں قلاوَذیوں اور مردہ شویوں اور بھک منگوں اور ٹکڑ گداؤں کے روبرو اس حیثیت سے کھڑا تھا کہ منکر نکیر کی طرح دو سپاہی اس کی گردن پر سوار تھے۔ نہ سر پر ٹوپی۔ نہ پاؤں میں جوتی۔ دو وقت کے فاقے سے منہ سوکھ ذری سا نکل آیا تھا۔ آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی تھیں۔ کپڑوں کا وہ حال تھا کہ ایسے لباس سے ننگا ہوتا تو بہتر تھا۔ جوں نصوح کی نظر بیٹے پر پڑی۔ گویا اک تیر سا کلیجے میں لگ گیا۔ اگر پہلا سا نصوح ہوتا۔ تو معلوم نہیں عورتوں کی طرح دھاڑیں مار کر روتا یا سر پیٹنے لگتا۔ یا دوڑ کر بیٹے کو لپٹ جاتا۔ یا سپاہیوں سے بے پوچھے کچھے دست و گریبان ہو پڑتا۔ خدا جانے اضطراب جاہلانہ میں کیا

کرتا۔ مگر اب اس کی جملہ حرکات و سکنات معلم دینداری کی مطیع اور مودب خدا پرستی کی تابع تھی۔ اس نے ایک دم سرد بھر انا للہ وانا الیہ راجعون تو کہا اور اف بھی نہ کی۔ سپاہیوں نے اس سے کلیم کی نسبت پوچھا تو اس نے آنکھیں نیچی کر کے کہا کہ "جب حضرت نوح کا بیٹا کو ڈوبتے دم تک بیٹا بیٹا پکارے گئے تو میں اس کے فرزند ہونے سے کیونکر انکار کر سکتا ہوں۔" سپاہی تو اتنا سن کر رخصت ہوئے اور کلیم کو رفقائے نصوح میں ــ ن نے ہاتھ پکڑ کر اپنے پہلو میں بٹھایا۔

نصوح بیٹے کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ کیوں کلیم! میں نے ایسا کونسا قصور کیا تھا۔ کہ تم کو میری طلعت منحوس تک دیکھنی گوارا نہ ہوئی۔ تم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ شفقت اولاد ماں باپ کی طینت میں مضمر اور ان کی جبلت میں داخل ہے۔ وہ شفقت جو اس وقت مجھ کو اس بات کی محرک ہوتی کہ میں سپاہیوں کے پنجے سے تمھاری نجات کا باعث ہوا۔ وہی شفقت مجھ کو اس بات پر بھی مجبور کرتی تھی اور کرتی ہے اور کرے گی کہ میں تم کو ایسی راہ نہ چلنے دوں جو تمھاری ابدی ہلاکت کا باعث اور دائمی تباہی کا موجب ہو۔ میں نے تم سے نہیں کہا۔ کہ میرے لئے کمائی کرو۔ میری آسائش کے واسطے اپنے اوپر تکلیف اٹھاؤ۔ اگر میں ایسا کہتا بھی تو مجھ کو اس کا منصب اور حق تھا۔ میں نے جس کمائی کو کہا۔ وہ تمھارے ہی کام آوے گی اور جس محنت کی تم کو تکلیف دی وہ تمہیں کو آرام دے گی۔ اگر کسی بیمار کا طبیب مہربان سے پرہیز کرنا۔ کسی سیاح کا مدرقہ خیر خواہ سے گریز کرنا روا ہے۔ تو بیشک تم بھی مجھ سے نفرت رکھ سکتے ہو۔ کیوں کلیم؟ کیا ہمیشہ تمھاری خوشی مجھ کو منظور تمھاری رضا جوئی مجھ کو ملحوظ نہیں رہی ہے جو تم نے مجھ کو اپنا دشمن قرار دیا۔ اپنا مدو ٹھہرایا۔ تو دشمنی کا سبب؟ عداوت کا موجب؟

میں نے سنا ہے کہ تم مجھ کو دیوانہ اور مجنوں اور مختل الحواس تجویز کرتے ہو۔ سو میں اس تشخیص صحیح اور تجویز درست اور اس فراست صائب پر جرح نہیں کرتا۔ میں باؤلا اور سڑی اور پاگل سہی۔ لیکن اگر کوئی باؤلا تمھاری راہ میں کانٹے پڑے دیکھ کر تم کو آگاہ کرے تو کیا اس کی بات نہ سننا۔ اس کی نصیحت کو نہ ماننا۔ اس کی فریاد کی طرف ملتفت نہ ہونا، شیوہ دانشمندی ہے؟ پھر تم کو یہ بھی سوچنا چاہیے تھا اور چاہیے کہ آیا میں اکیلا اس جنون میں مبتلا ہوں۔ یا اور بندگان خدا بھی میری ہی سی رائے، میرے ہی سے خیالات رکھتے ہیں۔ کلیم! میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ کہ جتنے بزرگان دین ہو گزرے ہیں (خدا ان کی پاکیزہ اور مطہر روحوں پر رحمت کاملہ نازل کرے) اور جتنے نیک بندے اب موجود ہیں (خدا ان کی حیات میں برکت دے) کوئی اس جنون سے خالی نہیں۔ بلکہ جس کو جتنا یہ جنون زیادہ۔ اسی قدر برگزیدہ اور خدا رسیدہ زیادہ۔ کیا اس بات کا اقرار کرنا جنون ہے کہ ہم بندے ہیں اور اس کا بھی ہم پر کچھ حق ہے۔ جس نے ہم کو پیدا کیا جو ہم کو روزی دیتا ہے۔ جس نے ہماری جانوں کی شادابی اور تازگی کے لئے آب شیریں وخوشگوار کی سوتیں زمین میں جاری کر رکھی ہیں۔ اور ہماری روحوں کے انبساط کے لئے ہوا کا ذخیرہ کافی مہیا فرما دیا ہے جس کے حکم سے چاند سورج اپنے معمول سے نکلتے اور غروب ہوتے ہیں۔ تاکہ کام کرنے کے لئے دن ہو اور آرام لینے کے لئے رات۔ جس نے دنیا کے قوی ہیکل اور زبردست جانوروں کو ہمارا مطیع و منقاد بنا دیا ہے کہ ان سے ہم سواری لیتے ان پر ہم اپنا بوجھ لادتے ان کے گوشت اور پوست اور دودھ سے مستفید ہوتے ہیں۔ جس نے انسان کو گویائی اور بیان کی قوت عطا کی ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنا مافی الضمیر اپنے ابنائے جنس پر ظاہر کر سکتا ہے جس نے انسان ضعیف البنیان کو عقل کی قوت اور دانش کی طاقت دے کر روئے زمین کا بادشاہ اور مخلوقات کا حاکم بنایا ہے۔ جس نے کائنات میں سے ہر موجود کو اس کی مناسب حالت میں خلق کیا ہے۔ اگر دنیا کے سارے درخت قلموں میں صرف کر دیئے جائیں اور ساتوں سمندر کا پانی سیاہی کی جگہ میں کام لایا جائے اور پڑھے لکھے لوگ جتنے ابتدائے آفرینش سے اب تک ہو چکے اور اب موجود ہیں اور آیندہ پیدا ہونے والے ہیں۔ سب کے سب مل کر اس کی تعریف اس کے احسانات۔ اس کے انعامات روز قیامت تک بیٹھے لکھا کریں۔ گو گھستے گھستے درخت ختم ہو چکیں۔ سمندر سوکھ جائیں۔ لکھنے والے تھک کر بیٹھ رہیں۔ مگر اس کے حق واجب کا ایک عشر عشیر بھی ادا نہ ہو۔ کلیم! کیا ایک ایسی بدیہی بات

ہے۔ کہ دنیا میں کوئی اس کا منکر نہیں۔ اور نہ اس سے انکار ممکن ہے۔ ہیضہ کی وبا پھیلے ہوئے برس نہیں گزرے۔ تمہارے دیکھتے دیکھتے کیسے کیسے لوگ لے گئے۔ توانا۔ اچھے بھلے۔ چلتے پھرتے۔ امیر و غریب۔ عالم و جاہل۔ بچے بڑے۔ کس طرح کے صدہا ہزارہا۔ چوٹ تیر قضا ہو گئے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔ دنیا پر کیا منحصر ہے۔ وعدے سے دم زیادہ نہ کم۔ مرنا برحق۔ اچھا پھر مرے پیچھے کیا ہوگا۔ وہی عقل ہے۔ وہی فہیم۔ وہی زیرک۔ دانشمند جو اس سوال کا جواب معقول دے۔ جو اس معمے کو حل کرے۔ جو یہ پہیلی بوجھے۔ کلیم! انسان کی خاص طرح کی خلقت۔ یعنی اس کا وجود عاقل ہونا اس بات کا مقتاضی ہے کہ ضرور اس سے کوئی بڑی خدمت متعلق اور اس کے ذمے زیادہ جواب دہی ہے۔ اگر اس کا صرف یہی کام ہوتا کہ پیٹ بھر لے اور سو رہے اور گرمی سردی سے اپنے تئیں بچائے تو اس کے لئے زیادہ عقل کی ضرورت نہ تھی۔ جانور اپنے بڑے بڑے دھندوں کی پرداخت پر بخوبی قادر ہیں۔ حالانکہ عقل سے بے بہرہ اور دانش سے بے نصیب ہیں۔ پس اس خدمت اور ذمہ داری کو دریافت کرنا شرط انسانیت ہے۔

نصوح کا وعظ سن کر اس کے ہمراہیوں کے دلوں میں دینداری کے ولولے اور خداپرستی کے جوش تازہ ہو گئے۔ حاضرین میں کلیم کے سوائے کوئی متنفس نہ تھا۔ کہ جس پر تھوڑی یا بہت رقت طاری نہ ہوئی ہو۔

جام سرشار

رتن ناتھ سرشارؔ

شام کے وقت رئیس زادہ گردوں مدار مع مصاحبین بد کردار ولایتی بیش بہا فٹن پر سوار ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں کھاتے گپیں اڑاتے، قہقہے لگاتے تھے اور سمند خوش خرام و تیز گام نوخیز معشوقوں کے مزاج کی طرح بل کرتے جاتے تھے، بجلی بھی ان کے مقابل میں گرد تھی، چھل بل میں ہرن کی گرمئی بازار سرد تھی۔

جھمن نے کہا "حضور! خدا چشم زخم حوادث سے بچائے، اس وقت تو واللہ ریل گاڑی کے بھی انجر پنجر ڈھیلے ہو جائیں۔ دونوں گھوڑیاں چوکڑیاں بھرتی جاتی ہیں۔ اوہو ہو ہو۔ اے صل علیٰ ابھی پرسوں ہی کا ذکر ہے۔ بڑے حضور کی خواصی میں بندہ بھی بیٹھا تھا۔ پلٹن کے جو جنڈیل ہیں۔ کوئی تیس ہزار روپے مہینہ طلب پاتے ہیں بس بس حضور ان کی مشکی جوڑی اور دونوں دبلا۔ کوئی پانچ پانچ ہزار کے گھوڑے سامنے سے جوڑی آئی اور ہماری گاڑی کے آگے نکال لے گیا۔ اے حضور یقین مانئے بس پھر تو گھوڑیاں آگ بھبوکا ہو گئیں۔ اور ذقن بھر کر اس طرح چھٹیں کہ میری مندیل گرتے ہی دو گولی کے ٹپے پر ہو رہی۔ اور کوچ مین کے حواس بلا اجازت غفرد۔ راس کو لاکھ کڑا کرتا ہے مگر توبہ ہی بھلی۔ کروڑوں جتن کئے ایک نہ چلی، جنڈیل کی گاڑی تو منزلوں دور رہ گئی۔ اور انھوں نے جا کے جھٹ پر دم لیا۔ سو وہ بھی بہزار خرابی۔ خداوندا اس وقت کنوتیاں دیکھنے کے قابل تھیں۔ اللہ ہی جانتا ہے۔۔ کھائی کا باپ بھی اس وقت سامنے آتا تو یہ پھاند جاتیں۔ اور ہماری کھوپڑی کے بھی ماتھے جاتی۔ مگر حضور اس وقت میاں گھسیٹے نے بھی وہ کام کیا کہ لاٹھ صاحب کے کوچوان سے بھی نہ ہو سکتا۔ اور اینلا تو منہ کے بل زمین پر آ رہتا۔ قسم بس یہ کیفیت تھی کہ جیسے ریل کا انجن ڈبل چال جائے۔

رئیس۔ کیوں جی گھسیٹے تم نے ہم سے یہ واردات بیان ہی نہ کی۔ وہ کون فرنگی تھا۔

گھسیٹے۔ (کوچ مین) حضور کوئی پلٹن کا تھا۔ کل مجھے دکھائے۔ وہ جو چشمہ لگاتا ہے۔

رئیس۔ پھر تم گاڑی نکال لے گئے تھے۔

گھسیٹے۔ اے حضور نکال لینا کیسا خدا نے جان بچائی اس دن۔ نہیں تو ہم اپنے حساب کوچ ہی کر چکے تھے۔ جوں جوں روکتا ہوں دوں دوں وہ اور بھی تیزی کرتی ہیں۔ فیض آباد کی سڑک تک ناکوں دم آ گیا۔ ایک بڑھیا کچلتے کچلتے بچی۔

مبتلا۔ ہاں اوہ؟ ارے تو یہ خدا نے بڑی خیر کی ورنہ برے پھنسے تھے۔

چھمن۔ (جھلا کر) برے کیا خاک پھنسے تھے' ہماری سرکار سے صاحب لوگوں سے تپاک بڑھا ہوا ہے۔ واللہ جو حیا مرد ہار کے جاتے ہم سیدھے پھانسی لا جاتے۔ مگر حضور کے نوکروں پر آنچ نہ آنے پاتی۔

رفیق۔ خدا خدا کر کے بندے۔ ہونہ۔ اے تیری قدرت۔ آپ اور ہم کو سکھائیں۔ میں نے تو یہ بات کہی کہ بوڑھی عورت ہماری صفت میں کمال کی ہوتی۔

رئیس زادے نے کوچ مین سے کہا کہ میاں گھسیٹے جب جانیں کہ اسی دن کی طرح جوڑی کو تیز کر دو گھوڑیاں ہوا ہو جائیں اور بات کرتے وہاں پہنچ جائیں۔ کوچ مین نے انعام کی طمع سے جوڑی کو تیز کیا تو ہوا سے باتیں کرتی چلیں۔ راستے میں جو دیکھتا ہے کہتا ہے بگھی کیا بھونچال ہے۔ آندھی روگ ہے۔ جوڑی زوروں پر تھی۔ چلتے چلتے موڑ پر ایک کمہار برتنوں کی کھانچی لیے ملا۔ کوچ مین نے للکارا۔ سائسوں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر چلایا۔ ہائیں ہائیں آئی یہ جانے والا۔ موڑ پر سے ہٹ جانا آئی یہ کمہار ارے موڑ پر سے ہٹ۔"

کمہار قوت سامعہ سے بے بہرہ اور مارے بوجھ کے پسا جاتا تھا۔ قدم اٹھانا دوبھر اور گھوڑیاں بگٹٹ چلی جاتی تھیں۔ موڑ پر پہنچتے ہی کمہار جھپٹ میں آگیا۔ برتنوں کی کھانچی سر سے گری۔ ازار ادھوں سب برتن چکنا چور ہو گئے۔ چو طرفہ تماشائیوں کا ہجوم۔ کسی نے کہا ہائے ہائے کمہار بے چارہ مر گیا۔ دوسرا بولا ٹانگ پاش پاش ہو گئی۔ تیسرے نے کہا۔ بید حاتھا پکارتے تو جاتے تھے۔ ہٹا کیوں نہیں۔ دو کوس سے تو بگھی کے گھڑ گھڑانے کی آواز آتی تھی۔

کمہار کا گھٹنے کا گھٹنے اٹھا تو ٹانگ میں خفیف سی چوٹ بتائی۔ ادھر کوچ مین نے کہا کمہار کے گرتے ہی راس جو اٹھائی تو منڈیاؤں ہو رہا۔ رئیس زادہ باوقار اور مصاحبین حماقت شعار پیچھے پھر پھر کے دیکھتے جاتے کہ کوئی گرفتار کرنے والا تو نہیں آتا۔ رئیس زادے کا چہرہ زرد اور رنگ فق ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں پھولے یاد بتان طناز بھولے۔ میاں چھمن کانپتے ہیں۔ رفیق کا کلیجہ دھک دھک کر رہا ہے۔ اور کوچ مین کی بس یہ کیفیت تھی کہ ع

کاٹو تو لہو نہیں بدن میں

جب منڈیاؤں پہنچے تو فٹن کو روک کر کوچ مین نے پوچھا۔ حضور کیا حکم ہوتا ہے۔

رئیس۔ یہاں ہوش کس نامعقول کے ٹھکانے ہیں جو تم کو حکم دے۔ اف بس اب مارے پڑے۔ غضب ہی ہو گیا۔ اس کمہار کی تو خبر لاؤ۔

چھمن۔ حضور بھلا اس وقت تازی تازی واردات ہوئی ہے۔ کس کو جان بھاری ہے جو سانپ کے منہ میں انگلی دے۔

رفیق۔ جو جائے وہی عزت گنوائے۔

رئیس۔ گھسیٹے تم جا کے دیکھ آؤ۔

گھسیٹے۔ اور حضور جوڑی کو یہاں کون سنبھالے گا' اس وقت گھوڑیاں بدی پر ہیں۔

رئیس۔ کھول ڈالو اور جاؤ مگر کتے کی چال جاؤ اور بلی کی چال آؤ۔

گھسیٹے۔ وہ کہئے بلی کی تو حضور نے ٹھیک کہی مگر ناتے تو غلام کے جائے گی۔ راس تو میرے ہاتھ میں تھی۔ میں جاؤں تو اسی دم دھر اجاؤں۔

رئیس۔ اچھا کسی چاکر کو بھیجو۔

ایک چاکر۔ نا صاحب [illegible] روپے کی نوکریاں بہت مل رہیں۔

دوسرا اچاکر۔ ہاں مجور چاکری تو پہالتو ہیں۔

رئیس۔ پھر اب ہوتا کیا ہے۔ چودہ چودہ برس کو سب جائیں گے۔ ہم تو قانون وانون جانتے نہیں۔

جھمن نے کہا" حضور ایک تدبیر غلام کو سوجھی ہے قربان جاؤں جو کبھی پٹ پڑے۔ پوچھا۔ "وہ کیا۔ "کہا" حضور تو یہاں اسی جگہ بستر جمادیں۔ اور غلام تراب علی تو لے کر لپکتا ہوا جائے۔ کسی فرنگی کونسلی کے ہاں اور جو رائے وہ دے اس کے بموجب کارروائی ہو۔ فرمایا واللہ خوب دجھی دیکھو جیسی بات ہوگی اتنی کہیں گے۔ لگی لپٹی سے یہاں نفرت ہے۔ لے بس اب تم جاؤ۔ تراب علی تم بھی ان کے ساتھ جاؤ۔ تراب علی بولا حضور اسی دم توپ کے مہرے پر کہیئے چلا جاؤں۔ میں تو نمک پروردہ قدیم ہوں۔ غلام کو عذر کیا چلو بھئی جھمن۔

رئیس زادے نے کہا۔ "دیکھو راستے میں کہیں لڑ نہ بیٹھنا دونوں۔ کہیں باہم گلخپ تکرار جوتی پزار ہو تو اصل مطلب ہی غت ربود ہو جائے "کہا" اے حضور کیا طاقت اس طرح رہیں گے جس طرح شیر وشکر۔ اس وقت جاں نثاری کا موقع ہے یا گلخپ کا۔ لاحول ولا قوۃ چاہے جان جاتی رہے۔ مگر معاملہ ٹھیک ٹھاک کئے بغیر ملک الموت کو بھی بتے بتائیں گے۔

میاں جھمن اور تراب علی پو قدے چلے تو راستہ میں یوں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

جھمن۔ گہرے ہیں استاد گہرے۔

تراب علی۔ اجی ہماری پانچوں گھی میں اور تمھارا سر کڑھائی میں۔

جھمن۔ ایک جگہ بیٹھ کر معاملہ کی باتیں تو کرو۔

تراب علی۔ اجی تو واہی ہو۔ کون بڑا لمبا چوڑا معاملہ ہے۔ چلو چل کے امین آباد والی ساقن کی دوکان پر دم لگاؤ۔ پھر ہم سب ٹھیک کر دیں گے۔

جھمن۔ واللہ کیا کہی ہے۔ ارے یار آؤ آج تاڑی پئیں۔

تراب علی۔ بس اسی کو وحشت کہتے ہیں۔ تاڑی واڑی نہیں۔ چلو کسی وکیل کے ہاں چلیں کوئی حقیقت کا اعلیٰ مقدمہ تو ہے نہیں۔ لاکھ دو لاکھ کی جائداد کا مقدمہ ہے نہیں۔ نہ خون کیا نہ قتل کر کے آئے ہیں۔ ہم تو جانتے ہیں کہ دس پانچ روپے جرمانہ ہو جائیں گے۔

تراب علی نے کہا۔ بس اور کیا۔ بلکن (بلکہ) اس سے کم۔ بہت جرمانہ ہوا آٹھ آنے ایک روپیہ۔ تدبیر وہ کرو جس سے یاروں کے ہاتھ گرمائیں۔ اور خوب وارے نیارے ہوں۔

تراب علی۔ ہم جا کے اس کمہار کی خبر تو لائیں۔

جھمن۔ خدا کرے ضرب شدید آئی ہو۔

تراب علی۔ ہاں مزہ تو جب ہی ہے ورنہ کیا۔ مگر ہم اس کو خوب بھرے دیں گے۔ کہ ابے کچھ تو لے مر یہی موقع ہے۔

جھمن۔ تم الگ بہکاؤ میں الگ پٹی پڑھاؤں۔

تراب علی۔ اجی ہم جانتے ہیں کہ اگر اس مقدمے میں سال سال بھر کے کھانے کو بھی نہ ملا تو کیا۔

جھمن نے کہا ملے اور پھر ملے۔ کیونکہ میاں کی سٹی بھولی ہوئی ہے۔ بہت گھبرائے ہوئے ہیں۔

تراب علی اور میاں جھمن باتیں کرتے آہستہ آہستہ قدم دھرتے امین آباد میں دن سے داخل ہوئے۔ اور سیدھے ساقن کی دوکان

جھمن [illegible] موں کی خبر۔ اس نے کہا" ابے جانے ہوئے ہیں سارے بتو لے۔ ایک ذری سی بات نہ ہو سکی نکھٹو۔ "جھمن

نے کہا "اللہ جانتا ہے اگر اپنے پر آتا تو یہی دوکان کو ٹھی ہو جاتی۔ وہ بولی او بھئی اونہہ۔ جو میری بکری کر جائے شیر کو پچھاڑ دے۔" کہا "اچھا اب جس دن بھئی نے حضور خوش ہوں گے اس دن ہم بٹیر ضرور لڑائیں گے۔" اس نے تنگ کر جواب دیا۔ "بس بس بھئی دور۔ جب بادامی گے تو قل چلیں گے۔ لے اب تو دم لگواؤ۔ وہ بولی کوڑی نہ پیسہ گئے والے ہاٹ۔

تراب علی مسکرائے۔ "کوڑی نہ پیسا؟" "اے بیوی اشرفیاں موجود ہیں۔ ساقن نے کہا منہ دھو آؤ۔ باپ دادا نے بھی کبھی اشرفیاں دیکھی تھیں آنکھوں سے سوائے ڈینگ کے اور کوئی بات نہیں۔

الغرض میاں چھمن اور تراب علی دونوں نے چرس کے دم لگائے۔ وہ دھواں دھار کہ سو آسمان کی خبر لائے۔ کر وہ ظہر یہ کو کرہ ہار بنائے جب دونوں گرمائے تو دور کی سوجھنے لگی۔

چھمن۔ کیوں یار چلو اب کدھر کی سیدھیاں ہیں۔

تراب علی۔ بس اب رہا نے بھر کے کونسلی کے ہاں چلتے ہیں۔

چھمن۔ پیدل۔

تراب علی۔ پیدل نہیں تو کیا تمہارے لئے کسی دھوبی کے ہاں سے گدھا منگواؤں۔

چھمن۔ تم بھی وہ باتیں کرتے ہو بے تکی کہ گدھوں کو بھی ہنسی آئے۔ ارے میاں ایسے موقعے روز روز تھوڑی ملتے ہیں۔ چلو چل کے بگھی کرایہ کریں مزے سے بیٹھے ہوئے چلیں۔ کہہ دینا جلدی کی غرض سے بگھی کر لی تھی۔ کچھ گرہ سے تھوڑی جائے گا۔ ہے کہ نہیں؟

تراب علی۔ اچھا پھر بگھی کرایہ کرو۔

چھمن۔ وہ کیا اڑ گڑا ہے ارے میاں کوئی بگھی ہے۔ کونسلی تک جائیں گے۔

گاڑی والا۔ چلئے فل بہشت کلاس ہے۔ پہلے گھنٹے کے بارہ آنے۔ پھر چھ آنے گھنٹہ۔

چھمن۔ جو حساب ہو گا دے دیں گے۔

تراب علی۔ جان کیوں کھسکی جاتی ہے۔ یہ لو پیشگی۔ ایک روپیہ لے لو۔ کھوٹا۔ پرکھ لو۔ ہاں نئے گمن کا ہے۔ دودھ کا دھویا۔

گاڑی تیار ہوئی اور میاں چھمن اور تراب علی کونسلی کے ہاں چلے۔

تراب علی۔ اجی کیا کہار اپنی ایسی تیسی میں۔ چلو کونسلی کے ہاں چلیں۔

چھمن۔ وہ بھی اپنے دل میں ہنسے گا کہ عجیب قطع کے آدمی ہیں۔ کہار کا پاؤں ذرا اچھل گیا۔ اور چلے وکیل کے پاس۔

تراب علی۔ اب کونسلی سے تو آپ کچھ کہیے گا نہیں۔ میں بھگت لوں گا۔

چھمن۔ بہتر ہے۔

تراب علی۔ ذرا تم سنتے رہنا کس ترکیب سے گفتگو کرتا ہوں۔ واللہ وہ داؤں پیچ یاد ہیں کہ ماروں چاروں شانے چت۔ ہٹ تو پڑتا ہی نہیں۔ اجی یہ یاروں کے ہتھکنڈے ہیں' بائیں ہاتھ کے کرتب۔

چھمن۔ فرنگی ہیں نہ وہ کونسلی۔

تراب علی۔ وہ اصل فرنگی۔ ولایت زاد خاص الخاص لندن کے۔

چھمن۔ رہتے کہاں ہیں؟

تراب علی۔ سلیمان باغ کے سامنے لال جھیل کے پاس کوٹھی ہے۔

جھمن۔ چھوٹے حضور اس وقت بڑے بیاکل ہوں گے۔ نہ ہم ہیں نہ تم ہو نہ مصاحب الدولہ ہیں۔ بالکل سناٹا اور ہو کا عالم۔ لے بھلا منڈیاؤں کی چھاؤنی میں اس وقت کون ہو گا۔ پرندہ تو پر مارتا نہیں اور ہوا سن سن چل رہی ہو گی۔ معاذاللہ۔

تراب علی۔ واللہ بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ سر منڈاتے اولے پڑے۔

جھمن۔ اب دیکھئے بھرے میں آتے ہیں یا نہیں۔ چلتے ہی پر ٹوک دیئے گئے ورنہ پوبارہ تھے۔

تراب علی۔ اب کی یہ پلہ پار ہو جائے تو سمجھئے کہ بیڑا پار ہے۔ ورنہ وہی ملا پن۔ ..

الغرض گاڑی صاحب کی کوٹھی میں داخل ہوئی۔ اور تراب علی نے بیرا کو بلایا۔

صاحب کو اطلاع ہوئی بلائے گئے اور سلام کیا۔

تراب علی۔ حضور آج فٹن پر ہمارے مالک جاتے تھے چنانچہ ایک کمہار روپے لینے کے لئے بہانہ کر کے لیٹ رہا۔ اور غل مچایا کہ کچلا کچلا۔ حضور کچلا نہیں۔ کچھ جھوٹ موٹ غل مچادیا۔ گھوڑیاں جو اس کے غل سے دوڑیں تو ہوا ہو گئیں بس زمین پر قدم ہی نہیں رکھتی تھیں۔ لاکھ لاکھ سمجھایا۔ غل مچایا۔ للکارا۔ ہائیٹ ہائیٹ کرتے رہے مگر سنتا کون ہے۔ وہاں آخر کار گر پڑا۔

صاحب۔ کیا مر گیا..... ہاتھ پاؤں کچھ ٹوٹ گیا تھا۔ کچھ چوٹ آیا۔

تراب علی۔ سچ تو یوں ہے کہ ہم لوگ گاڑی تیز بڑھا کر چل دیئے تھے۔ خدا جانے اس کی کیا کیفیت ہوئی۔

صاحب۔ ول تم سب پر سو سو روپے جرمانہ۔

تراب علی۔ (مسکرا کر) واہ حضور اچھا فیصلہ کر دیا۔

جھمن۔ (تراب علی کے کان میں) اجی صاحب فقط ہنسی میں کہتے ہیں۔

تراب علی۔ ہاں واللہ! اجی نہیں۔ عجب نامعقول آدمی ہو۔ بھئی یہاں اتنا بڑھے ہوئے۔ صدہا مقدمے لڑائے۔ آپ ہم سے مشخت کی لیتے ہیں۔ یہ کونسلی ہیں۔ پیروکاران کو جرمانے اور سزا سے کیا سروکار۔

تراب علی۔ گاڑی کو گھر پر لے جائیں یا نہیں۔

صاحب۔ برابر کے جاؤ۔ پولیس اگر کوچ مین کو مانگے بھیجدو چالان ہو گا اور روپا دو روپا جرمانہ بس۔

جھمن اور تراب علی نے زمین دوز ہو کر فرشی سلام کیا اور چلے۔ تراب علی اور جھمن ایسے لنگوٹیے یار بن گئے گویا دانت کاٹی روٹی تھی۔ یہ ان پر جان نثار کریں۔ وہ ان کا دم بھریں۔ مگر دونوں گون کے یار دونوں پرلے سرے کے کائیاں۔ دنیا بھر کے نیاریئے' چکمہ بازی میں طاق۔ جعل سازی میں شہرہ آفاق۔ سب گنوں پورے۔ انھیں کون کہے لنڈورے۔ الغرض دونوں کونسلی سے رخصت ہو کر چلے تو راستے میں بگھی پر:

جھمن۔ سالا تمھارا استاد تو بھی اپنے فن میں استاد کامل ہے۔

تراب علی۔ میاں ابھی دیکھتے تو جاؤ۔ رقم چیرنی ہے۔

جھمن۔ یار چنگ پر تو چڑھ گیا۔ مگر یہ بڑی افتاد پڑی۔

تراب علی۔ بس ہم میں تم میں یہی فرق ہے' یہاں سہنا تو جانتے ہی نہیں استاد نے یہ سبق ہی نہیں پڑھایا۔ ع

ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

اور اتفاقاً سمجھ یار عزیز کہ وہ بات ہی کیا ہے۔ جس سے ہم بھنے لگیں۔ ابھی بھی نہ کہ گاڑی کے پہیے کے تلے ایک شخص کا پاؤں آگیا۔ پھر خوف کا کون سا مقام ہے۔ اگر پاؤں کچل بھی جاتا تو کون بات تھی۔ دو روپے نہیں دس جرمانہ ہوتے۔ دس نہیں بفرض محال سو جرمانہ ہوتے تو کیا یہ بھی کوئی رقم ہے۔

چھمن۔ ارے یار تیرا بہت بڑا پیٹ ہے۔

تراب علی۔ میاں اپنا تو یہ مقولہ ہے کہ ع

خاک از تودۂ کلاں بردار

جب مارے روپے والے کو۔ غریب کے پلے کیا ہے۔ جو دیگا امیر ہے البتہ اینٹھنے کا موقعہ ملتا ہے۔ ہزار دو ہزار کی رقم یکمشت چیرے تو البتہ بات ہے۔ ورنہ سو دو سو روپے کے لئے جعلسازی کرنا اپنے مذہب کے تو خلاف ہے۔ درخت کا ایک پھل رکھوالے کی چوری سے کھایا۔ تو کیا یہاں جڑ سے پھننگی تک چٹ کر جائے تو ڈکار تک نہ لے تب تو آدمی ورنہ جانور ..... دیکھئے تو حضرت سے کیا کیا جا کے کہتا ہوں واللہ وہ سبز باغ دکھاؤں کہ میاں کی آنکھیں کھل جائیں اور ان لونڈوں کو الو بناتا تو بائیں ہاتھ کا کرتب ہے ...... تمہارے ایسے لونڈے میری جیب میں پڑے ہیں۔ اب ایک بات کا خیال ضرور ہے استاد کہ چھوٹے حضور کو ہتھا ڈرلیا جائے اتفاقاً اگر آن بان کے ساتھ یہ نہیں کہ باتوں ہی سے وہ بھڑک جائیں......

چھمن۔ وہ تو اپنے نزدیک پھانسی پر چڑھ چکے۔ .... مگر میں جاتے ہی وہ بھرے دونگا کہ بخدا اندیشہ تھلی ہو جائیں۔ یہ بھی اتنا صاف صاف بتادو کہ ہمارے ہتھے کیا چڑھے گا۔ یہاں تو اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہے۔ مردہ چاہے دوزخ میں جائے چاہے بہشت میں۔ ارے یار ایک مکان گروی رکھ دیا ہے۔ کچھ ایسا کرو کہ اس کو چھڑا سکوں....

القصہ میاں چھمن اور تراب علی اپنے اپنے اڑھائی چاول پکاتے باتیں بناتے منڈیاؤں پہنچے .... اتنے میں تراب علی نے پکارا "ہرما گھسیٹے۔" رئیس نے خوش ہو کر کہا۔ "آگئے۔" "آؤ آؤ" گھسیٹے بولا۔ لپک آیئے۔ تراب علی اور چھمن جا پہنچے۔ تراب علی نے کہا "حضور فتح ہے"۔ چھمن بولا۔ "خداوند مبارک ہو۔" رئیس نے پوچھا خوف تو نہیں ہے۔ یہ بتادو مختصر طور پر کیا کہا۔ "ایک کونسلی کو کہہ دیا ہے۔ حضور خاطر جمع رکھیں۔ خداوند چلتے چلتے کا مچھیاں درد کرنے لگیں...... رئیس زادے نے پوچھا۔ "اس کہار کا کیا حال ہے۔ کہا "پتلا دھڑی میں چوٹ آگئی ہے۔ پڑا سسک رہا ہے"..... اے خداوند چودہ روپے پیر بخش نیچے والے سے قرض لے کر جراح کو دے آیا ہوں اور اس کے پلے کیا ہے دو جوتیاں اور وہ تو چاہتا ہی ہے کہ ٹانگ زخمی رہے۔ جس میں سرکار سے آپ کے نام ڈگری ہو جائے کہ عمر بھر اس کو روٹیاں دیئے جاؤ' ہم کونسلی کے ہاں گئے۔ حضور اللہ رے دماغ۔ خدا جانے فقفوز چین میں اپنے کو سمجھتے ہیں یا شہنشاہ روس کا سمجھتے ہیں۔ اف رے تیرے دماغ سیدھی بات ہی نہیں کرتے۔ تب تو میں جلا کر چلا گیا۔ لالہ ہیرا لال اور گھسیٹی مل کی کوٹھی۔ ان کے منیب جی ایک جھنجھا لئے پہلے تو کہا کہ نواب صاحب یا چھوٹے حضور کے نام سے روپیہ قرض لو تو دیں۔ پھر جب میں نے ڈانٹ بتائی تو دو سو روپیہ دے دیا...... چھمن کو کونسلی کے پاس بٹھا آیا تھا۔ جاتے ہی روپیہ میز پر ڈال دیا اور نوٹ ہاتھ میں دیئے۔ بس پھر کیا تھا۔ روپے کی بھی کیا بڑی چوٹ ہے۔ حضور کل باتیں سنیں۔ پہلے تو کہا مقدمہ ذرا پیچیدہ ہے۔ شاید کوئی کہہ دے کہ راس نواب صاحب ہی کے ہاتھ میں تھی۔ مگر سوچ ساچ کر بولے۔ "اچھا ہم سمجھ لیں گے جاندار تو ہے مقدمہ اور جو ہار گئے تو اپیل میں دیکھ لیں گے۔ حضور کو سلام کہلا بھیجا ہے۔ اور کہا تشفی کر دینا۔ کہ اس میں کچھ ہونا نہیں ہے۔ خفیف مقدمہ ہے' ہزار دو ہزار پر تو البتہ پانی پھر جائے گا۔

رئیس زادہ۔ واقعی عزت بڑی بیش قیمت ہے۔ ہزار دو ہزار روپیہ گیا چولہے کی جڑ میں اب تو آبرو پر بن آئی ہے۔

گھسیٹے۔ بھلا میاں تراب علی۔ ہم پر تو آنچ نہ آئے گی؟

تراب علی۔ کیوں گھبرائے جاتے ہو۔ خواہ مخواہ کے لئے۔

گھسیٹے۔ ارے صاحب ہم غریب آدمی پانچ چھ روپے کی اوقات کہیں گھن کی طرح پس نہ جائیں۔

تراب علی۔ قربان جاؤں پیر و مرشد جہاں حضور کا پسینہ گرے وہاں غلام کا خون گرے۔ اور کیا۔

چھمن۔ حضور کونسلی سے انھوں نے وہ تقریر کی ہے کہ ہوش اڑا دیئے۔ جو خداوند وہاں ہوتے تو انعام ضرور دیتے۔

.....تراب علی نے کہا: . . "خداوند حضور کی بدولت بہت کچھ پیدا کیا۔ برسوں سے نمک کھا رہے ہیں۔ اسی سرکار کے ساختہ پرداختہ ہیں خانہ زاد۔ رگ و پیشہ میں اسی سرکار کا نمک پیوست ہے۔ خدا کرے جاہ و حشم روز بروز ترقی پائے۔ ہر صبح کو دولت آستاں بوسی کو آئے۔ اقبال قدم قدم پر ساتھ ہو۔ رحمت خدا کے ہاتھ میں ہاتھ ہو۔ عزت بڑھے رتبہ بڑھے اور اسی سرکار کی بدولت تراب علی فیل نشین ہو ہاتھی پر چڑھے۔

اب چلئے حضور۔

رئیس زادہ۔ اسی فٹن پر؟

تراب علی۔ ہاں ہاں حضور اسی فٹن پر۔

رئیس زادہ۔ اب تو اس فٹن پر بندہ سوار نہ ہونے کا۔

تراب علی۔ فٹن سڑک پر لاؤ میاں گھسیٹے۔ حضور سوار ہوں۔ غلام کا ذمہ ہے۔ ایسی بات ہے۔ بھلا۔

الغرض بعد خرابی بسیار فٹن پر سوار ہو کر۔

آہستہ خرام بلکہ مخرام   کہ زیر قدمت ہزار جانست

گھسیٹے۔ حضور کلیجہ دھڑ دھڑ کر رہا ہے۔

تراب علی۔ اور کیوں جی اگر وہ مر جاتا۔

گھسیٹے۔ واہ چھوڑ چھاڑ کر فٹن گنگا پار ہو رہتا۔

تراب علی۔ کیا خوب ان کو بھی شاہی کی باتیں یاد ہیں۔ نادان ہو کون؟ ارے گنگا پار کیا ہے پاگل۔ وہاں بھی سرکار کمپنی بہادر کی عملداری ہے۔

فٹن ذرا تیز چلی اور رئیس زادے نے غل مچایا۔ "آہستہ آہستہ تیز نہ چلو۔" گھوڑیوں نے ذرا کنوتی بدلی اور ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اب چاکروں کو للکار رہے ہیں کہ اتر پڑو۔ اتر پڑو۔ ساتھ ساتھ چلو۔ کئی مقام پر خود اتر پڑے لوگوں کی ناک میں دم۔ تراب علی نے [illegible] سمجھایا۔ میاں چھمن نے دلاسا دیا مگر بے سود۔ ہزار خرابی کہیں فٹن در دولت پر پہنچی اور دروازہ پر ایک دفعہ ہی غل مچا کہ آگئے آگئے [illegible] بڑے حضور کو اندر اطلاع کر دیئے کہ سرکار آگئے آگئے۔

فوراً [illegible] نے کہا "یہاں کنوؤں میں بانس پڑ گئے۔ بڑے حضور گھبرا اُٹھے تھے آج خلاف معمول اتنی دیر کہاں ہوئی۔ چو طرفہ آدمی [illegible] گل بھر میں کہرام مچ گیا۔ بارے شکر ہے کہ حضور آگئے۔ بسم اللہ۔" رئیس زادہ اتر پڑا۔ دو فرخندہ اندر سے

دوڑی آئیں۔ چٹ چٹ بلائیں لے کر کہا کہ حضور بس جلدی اندر چلئے۔ بیگم صاحب کی آنکھیں رو رو کے لال بیر بہوٹی ہو گئی ہیں۔ اور بڑے حضور بھی بیدم ہیں نصیب اعدا، اتنی دیر آپ رہے کہاں۔ یہاں گھر بھر میں دشمنوں کے کان بہرے کہرام سا مچ گیا۔ ہوش اڑے ہوئے تھے سب کے۔ رئیس زادے نے جیسے ہی دہلیز پر قدم رکھا گھر بھر کی ماما اصیلیں مغلانیاں خوش خوش ہشاش بشاش لپکیں چھوٹے حضور آئے چھوٹے حضور آئے مبارک سلامت کی صدا چرخ ہفتم تک پہنچی۔ بڑی بیگم رئیس زادے کی مادر مہربان کی جان میں جان آئی اور فرط محبت سے لڑکے پر خفا ہوئیں۔

بڑی بیگم۔ اے غضب خدا کا اتنا بھی خیال نہ رہا کہ بڑھیا کڑھ کڑھ کے اتنی دیر میں مر تو نہ جائے گی۔ بوڑھے باپ کی خدا نہ کرے جان پر تو نہیں بن جائیگی۔ آخر تھی یہ اتنی دیر جو غائب غلہ رہے تو دل میں سمجھے کیا تھے۔ ایک آدھ کی لاش گھر سے نکلوانے کا مقصد تھا شاید۔ چلو اوپر باپ کے پاس۔

بڑے نواب۔ بیٹا اب تک تم کہاں تھے۔

رئیس زادہ۔ قبلہ کہیں نہیں ہوا کھانے گیا ہوا تھا۔

بڑے نواب۔ اے تو اتنی دیر۔ اتنی دیر میں تو ادنیٰ جھنٹ کے تین چار پھیرے کر آئے۔

رئیس زادہ۔ گرمی کے سبب سے منڈیاؤں نکل گیا تھا۔

بڑے نواب۔ معقول۔ بے انگریزی پڑھے ہی وحشت کی لینے لگے۔ تو ہماری تشفی کے لئے ایک آدمی یہاں دوڑا دیا ہوتا بس پھر چاہے آدھی رات تک نہ آتے۔ ہمارے قلب کی اس وقت عجیب کیفیت تھی۔

رئیس زادہ۔ بہت خوب۔ مگر قبلہ و کعبہ یہ تو بڑی مصیبت ہوئی کہ جہاں کسی دن ذرا دیر ہو گئی اور گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ کنوؤں میں بانس پڑنے لگے۔ اصیلیں مغلانیاں گھر میں، نوکر چاکر مصاحب باہر، غل مچانے لگے۔ اتفاق سے کسی روز ہوا کھانے صدر نکل گئے۔..........

ادھر جمن اور امام الدین خاں مصاحبوں میں یوں چپکے چپکے گفتگو ہونے لگی۔

امام الدین۔ دونوں ہاتھوں سے لوٹو مگر ہماری بھی فکر رکھنا۔

جمن۔ تم تو شریک حال ہوئے پہلے۔ پھر اور کوئی۔

امام الدین۔ ہاں صاحب تو منڈیاؤں میں ٹھہرے پھر سیدھے گھر چلے آئے یا کہیں اور گئے تھے۔

جمن۔ وہاں نواب کو چھوڑا فٹن پر ہم اور تراب علی چلے کونسلی کے ہاں۔

امام الدین۔ (چٹکی لیکر) ارے ستم! یہ تو کہیے بالکل الو کی دم فاختہ ہی ہے۔ بھلا اس میں کونسلی کا کون سا کام تھا۔ اچھے رہے۔ کونسلی کے ہاں گئے بھی تھے۔ یا یوں ہی فقرہ چست کر دیا۔ ساقن کے ہاں دم لگایا ہو گا۔ اور چھوٹے حضور سے آکے کہہ دیا ہو گا کہ ہو آئے۔ یہ کہا اور وہ کہا۔ خوب سبز باغ دکھایا ہو گا۔

کہا "تیرے سر کی قسم ساقن کے وہاں بھی گئے تھے۔ مگر وہاں سے پلٹ کر پہنچے کونسلی کے ہاں اس سے تراب علی کی بات چیت ہوئی۔ اس نے کہا ہم ایسے چھوٹے مقدمے میں وکالت نہیں کرنا چاہتے۔ مگر اتنا کہے دیتے ہیں کہ کوچ مین کو جب کوئی تلنگا برق انداز بلانے آئے تو سمجھ لینا۔ دو ایک روپیہ جرمانہ کی سزا ہو جائے گی۔ بس یہاں آکر تراب علی نے وہ اڑن گھائیاں بتائیں کہ کچھ نہ پوچھئے کہا کہ پیر و مرشد کمہار کا حال دیکھا تو تانگ میں انتہا کا درد پایا اس نے تو آسمان سر پر اٹھایا ہوا ہے نالش کروں گا اور لندن تک لڑوں گا۔ اور بڑے صاحب کے ہاں عرضی دونگا۔ آخر میں نے ایک دوکاندار سے چودہ روپے قرض لے کر اس کے حوالے کر

دیئے.........پھر میں کونسلی کے پاس گیا۔ وہ اچھی طرح مخاطب نہ ہوا۔ مگر ایک مہاجن کی کوٹھی سے دو سو روپے قرض لئے جب جاکے کونسلی کو دیئے۔ اور اس کی رائے لی اور خدا جانے کیا کیا جھوٹ بولے۔ بس یہ سمجھئے کہ جھوٹ کے چھپر اُڑا دیئے۔

امام الدین نے کہا پلو راوی چین لکھتا ہے۔ ایک تو یہ بیہودہ والا مقدمہ تھا ہی۔ دوسرا اس پر طرہ ہوا۔ اس میں بھی کچھ نہ کچھ لے ہی مریں گے۔

جھمن۔ دو سو چودہ تو دودھ پی رہے ہیں۔

اب رات بھیگی تو چھٹ میٹ کے تراب علی اور میاں جھمن اور امام الدین خاں اور نواب صاحب اور ایک امیی مصائب الدولہ بہادر رہ گئے۔

رئیس زادے نے کہا میاں خاں صاحب ہم تو بڑی مصیبت میں پڑ گئے۔ ایک آدمی دب کے مر گیا۔ اب دیکھئے کیا ہوتا ہے۔ خاں صاحب نے تشفی دی۔ "پیرو مرشد کچھ نہ ہو گا۔" نہیں خاں صاحب بڑی بلا سے مقابلہ کرنا ہے۔"

تراب علی۔ لاحول ولا قوۃ۔ بلا سے حضور کے دشمنوں کا مقابلہ ہو۔ حضور کا اس مقدمے سے کیا واسطہ۔ غلام تو اپنا اور گھسیٹے کا نام لکھوا آیا۔

رئیس زادہ۔ واللہ؟

تراب علی۔ حضور کے قدموں کی قسم۔

امام الدین۔ اے وہ بات ہی کیا ہے۔ چار پانچ سو روپے کا تو خرچ ہے۔

رئیس زادہ۔ اجی خرچ ہونے کو چاہے ہزار بارہ سو خرچ ہو جائیں۔ مگر عزت پر حرف نہ آئے۔

امام الدین نے کہا کیا مجال۔ جھمن بولا کیا حقیقت ہے کسی کی" رئیس زادے نے کہا۔ ابھی دیکھو تو اونٹ کس پہلو بیٹھتا ہے۔ ابھی تو مقدمہ ہی در پیش ہے۔ پھر سمجھا جائے گا۔ ابھی ہم نہ جانے کے" جھمن بولا۔ "خداوندا! رئیس لوگ عالی ہمت ہوا کرتے ہیں۔ اور حضور تو پوتڑوں کے رئیس ہیں۔ سارے شہر میں ڈگی پھر جائے گی کہ مقدمہ کر کے پھر تشریف نہ لے گئے۔ چلئے اور ضرور چلئے۔ ایسے ایسے خفیف معاملوں سے تو آپ کو واسطہ ہی نہ رکھنا چاہیے' چھوٹے نواب پر نئی نئی مصیبت پڑی تھی۔ ایسی افتاد کبھی کاہے کو پڑی تھی۔ مگر مصاحبوں نے بھڑک مٹانا شروع کیا۔ ایک نے کہا حضور اب تو مقدمہ تراب علی اور گھسیٹے کے سر پڑا۔ حضور تو لوہ بچ گئے۔ اب حضور سے واسطہ ہی کیا رہا۔ وہ اپنے سمجھ لیں گے۔ حضور پر ذرا آنچ نہ آنے پائے گی۔ بلا کو تو ہم لوگوں نے اپنے سر لے لیا۔

نواب۔ ....کس قدر روپیہ چاہیے۔

تراب علی۔ حضور کوئی بیس بائیس سو۔ کیوں جی جھمن؟

جھمن۔ سب ملا کر تین ہزار رکھ لو۔

نواب۔ (جھمن سے) تین ہزار روپیہ لالہ سے لے کر الگ رکھو اور جب تراب علی مانگیں بے دریغ دو۔ اب رات بھی زیادہ آئی ہے۔ اور لوگوں کو نقصان بھی بہت ہوا ہے۔ اب برخاست کل ملاقات ہو گی۔ شب بخیر۔

دربان نے آکر دست بستہ ایک وحشت ناک خبر سنائی شامت کی صورت مجسم نظر آئی۔ یعنی ایک برق انداز جوان طناز خاکی وردی والے 'سرخ سرخ پگڑی باندھے ایک رومال ہاتھ میں لئے ہوئے آن کھڑا ہوا۔ اور نواب نامدار کو جھک کر سلام کیا۔ نواب صاحب کے حواس غائب ہوش پراں' مصاحب فرحاں وخنداں۔ کوئی وظیفہ خواں سوا کسی کو ناد علی یا سورہ جن ورد زبان

ہوں

نواب۔ اللھم احفظنا من کل البلیات۔

تراب علی۔ کہاں سے آنا ہوا بھئی جوان۔

برق انداز۔ چوکی پر سے آیا ہوں۔

تراب علی۔ کیوں۔

برق انداز۔ وہی جو گاڑی سے کہار کچل گیا تھا نہ اسی لئے...... کو جوان کا چالان ہوگا۔ اس کے تئیں ساتھ کر دیں۔

میاں گھسیٹے سے جو چوبدار نے جا کر کہا چلئے سپاہی آیا ہے اور آپ کے چالان کا پیغام لایا ہے تو ہوش فقرہ ہو گئے۔ چہرے پر مردنی چھائی۔ سمجھے کہ بس قیامت ہی آئی۔ چوبدار کے ہاتھ جوڑے کہ کسی للہ سپاہی سے اتنا کہہ دے کہ گھسیٹے یہاں نہیں ہے۔ میں اسی وقت کی ریل پر سوار ہو کر کانپور چل دوں گا۔ گنگا اس پار۔ چوبدار نے سمجھایا کہ کیسے نادان ہو بھلا بھاگ کے جاؤ گے کہاں۔ اور کیا کہیں توپ لگی ہے۔ گولہ چلتا ہے۔ مور چے پر لوئی بھیجتا ہے۔ قضا کے منہ میں جاتے ہو۔ آخر ماجرا کیا ہے یہ تو بتاؤ یہی نہ کہ کچھ جرمانہ ہوگا؟ پھر حضور دے دیں گے۔ تم کو کیا فکر ہے۔

گھسیٹے۔ بھئی برا سامنا ہے آج.....

چوبدار۔ اے ہے بس جاتے ہی پھانسی کا حکم سنایا جائے گا۔

گھسیٹے۔ اف بری ہو گی۔

چوبدار۔ کیا گلا گھونٹ کے کوئی مار ڈالے گا۔

گھسیٹے۔ دیکھئے کیسی گذرتی ہے۔

چوبدار۔ خدا ہی مالک ہے۔ کام تو پھانسی ہی کا کیا ہے۔ چور بے ایمان۔

گھسیٹے۔ ذرا سا ٹھنڈا پانی پلاؤ۔

چوبدار۔ (خدمتگار سے برف کا پانی منگوا کر) لو پیو۔

گھسیٹے۔ خدا سلامت رکھے۔ اُف۔

چوبدار۔ یار کہنا مانو۔ اُٹھو۔ خدا گواہ ہے۔ جو کچھ بھی ہو۔

گھسیٹے۔ خیر کیا جانے کیا حال ہوگا۔

چوبدار۔ الٹے ٹانگے جاؤ گے۔ عدالت کے دروازے پر۔ گور کھا کہیں کا۔

گھسیٹے۔ ہاں بھئی گرے کا کوئی دوست نہیں۔

چوبدار۔ اب چلتے ہو یا پٹتے ہو؟

گھسیٹے۔ ہم تو نہ جائیں گے چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہو جائے۔

چوبدار۔ تو پھر ہم زبردستی لے چلیں گے۔

ادھر نواب صاحب نے تراب علی کو حکم دیا کہ بھئی دیکھو سپاہی کھڑا ہے۔ کوچ مین کو بلا دو۔ چوبدار بھی مر گیا جا کے۔ تراب علی لپکے ہوئے میاں گھسیٹے کے پاس گئے۔ ارے میاں گھسیٹے ہوت۔ چلو سپاہی آیا ہے بیٹھے کیا کرتے ہو۔" چوبدار نے کہا۔ ابھی وہ تو

.........اس وقت جانے کیا واہی تباہی بک رہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بس اب پھانسی ہوئی۔ بچوں کی طرح مچل رہے ہیں........

گھسیٹے اقبال وخیزاں چوبدار اور تراب علی کے ساتھ ڈرتے ڈرتے بہزار خرابی چلے۔ جب نواب زادہ نامدار کے حضور میں پیش کیے گئے تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

نواب۔ تم بالکل نادان ہو۔

گھسیٹے۔ آپ کے دربار میں جو دانا ہو اسی کو حضور میری عوض بھیج دیں۔

نواب۔ واہ۔ بڑے بزدل ہو۔

گھسیٹے۔ حضور یہ چھمن توڑ تند پیل ہیں۔ انھیں کو بھیج دیجئے۔

چھمن۔ میں کہوں گا کہ مجھے تو بگھی بھی نہیں ہانکنا آتی۔

گھسیٹے۔ اور میں کہوں گا کہ اسی لئے تو آدمی مچل گیا۔

چھمن۔ گنوار پن کی نہ لو۔ اب چلے جاؤ۔

گھسیٹے۔ آپ تو شہر کے ہیں پھر آپ ہی میری جگہ پر تشریف لے جائیں۔

نواب۔ ہم برق انداز سے کہہ دیں گے وہ ایک دورول جما کر کشاں کشاں لے جائے گا۔

گھسیٹے نے کہا حضور میرا استیفا (استعفا)۔ تراب علی بولا کہ پھر اس سے کیا بچ جاؤ گے۔ برق انداز نے قہقہہ لگایا' جانو توپ لگی ہے۔ "گھسیٹے بولا۔ ہاں بھئی ہنسو ہنسو تم۔ وقت تو ہم پر ایسا آن پڑا ہے۔ اس فقرے کو کوچ مین نے ایسی بے کسی سے کہا کہ حاضرین و مصاحبین سب نے زور سے قہقہہ لگایا اور گھسیٹے کو خوب ہی بنایا۔

برق انداز نے دق ہو کر پوچھا اب چلو گے یا میں چوکی پر رپٹ بولوں۔ تھوڑی دیر میں صاحب اجلاس پر آجائیں گے ہم پر خفگی ہو گی۔ نو بج گئے ہیں۔"

گھسیٹے نے پوچھا۔ بھلا نہ چلنے کی بھی کوئی تدبیر ہے۔

برق انداز نے کہا بس تدبیر و دبیر یہی ہے کہ تم کو کھدیرتا لے چلے۔ (نواب صاحب سے) غریب پرور اب ہمیں کیا حکم ہوتا ہے۔ انھیں زبردستی پکڑ لے جائیں گے ہم۔

نواب صاحب نے حکم دیا۔ تراب علی' گھسیٹے کو زبردستی لے جاؤ۔ گھسیٹے نے کہا "سپاہی بھیا! یہاں سے کوس بھر پر میرا گاؤں ہے میں جا کے جورو اور لڑکوں سے تو مل آؤں۔ ان سے تو کہوں کہ میں اب جاتا ہوں (رو کر) ابھی آجاؤں گا۔

برق انداز نے پھر قہقہہ لگایا۔ اخاہ یہ تو جیسے جانے مرے جاتے ہیں۔

میاں گھسیٹے کو تراب علی نے گھسیٹ گھساٹ کر بہزار دقت ایک ڈولی پر لادا اور باندھ کر لے چلے......

گھسیٹے۔ دہائی بڑے صاحب کی۔ دہائی بڑے صاحب کی۔

برق انداز۔ کیا بید پڑ رہے ہیں۔

گھسیٹے۔ یہ سارا افسانہ تراب علی اور چھمن کمبخت کا ہے۔

چھمن۔ بس صاف صاف کہہ دینا کہ حضور ہم نے قل مچایا مگر کہار نے ایک نہ سنی۔

گھسیٹے۔ ذرا دیکھئے تو کیسا صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ آپ بھی یاد کریں۔

چھمن۔ گیا۔ آواز تو نکلے گی نہیں۔ کہنے لگے یاد کرو گے۔ ہو نہہ۔

میاں گھسیٹے گھسٹتے ہوئے عدالت کے دروازے تک پہنچے۔ تراب علی نے ایک درخت کے سایہ میں لے جاکر ان کو بٹھایا اور سمجھایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کونسل بڑا خرانٹ ہے۔ تم کو تلوے سہلانا کوئی بڑی کرامات نہیں۔ دو چار روپے جرمانہ ہو جائیگے بس نرے سے بتائیں گے۔

گھسیٹے کا دم خفا تھا۔ مبتلائے رنج وبلا تھے۔ لب پر آہ و فغاں قضا کا نوحہ خواں۔

چھمن۔ میاں گھسیٹے کس سوچ پر ہو۔

میاں کیا بتائیں کس سوچ میں ہیں...... بھئی ایسا نہ ہو کہ صاحب ہم پر جرمانہ کردیں۔ اور تم لوگ دل لگی باز تو ہو ہی۔ اپنے اپنے گھر چل دو اور ہمارا امکان گانسا جائے۔ ہم کو نقد روپیہ دے دو کہ صاحب ادھر جرمانہ بولے۔ ادھر تڑ سے چہرہ شاہی گن دیئے۔

تراب علی نے دس روپے گھسیٹے کو دے دیئے۔ گھسیٹے کے ہوش پراں کہ خدا خانے آج کس بلا میں مبتلا ہوں۔ کیا معلوم کہار کمبخت کی ٹانگ ٹوٹی۔ ہاتھ ٹوٹا سر پھوٹا۔ کیا آفت نازل ہوئی۔ حاکم کیا حکم سنائے۔ کبھی تراب علی سے باصرار کہتے تھے کہ بھائی جان ہم کو ذرا گھر تو ہو آنے دو۔ مقتول اکو یا کالے پانی جاتے تھے۔ کبھی درخت کے سائے میں بیٹھ کر سوچتے تھے کہ بھاگ جاؤں یا دیوانہ بن جاؤں۔ کروں تو کیا کروں۔

چھمن۔ (مسکرا کر) سنا وہ کہار مر گیا۔

تراب علی۔ نہ جی تم اور ڈرائے دیتے ہو۔

گھسیٹے۔ ارے میاں ادھر مرے کو کیا مارتے ہو۔

اتنے میں ایک بگھی گاڑی آئی اور صاحب مجسٹریٹ بہادر اس میں سے بر آمد ہوئے۔

چھمن۔ انھیں کے اجلاس پر مقدمہ ہے۔

گھسیٹے۔ (اٹھ کر) ہاں بھلا یہ پلٹن کے صاحب تو نہیں ہیں۔

چھمن۔ یہ کیوں۔ اس کے کیا معنی۔

تراب علی۔ ایسی انصاف کریں گے۔ ضروری صاحب لوگوں کے مزاج میں انصاف ہوتا ہے۔

گھسیٹے۔ ارے بھئی یہ سب تقدیر کے کھیل ہیں۔ بچنے والا بچ ہی جاتا ہے......

اتنے میں چپڑاسی نے پکارا۔ گھسیٹے کوچبان حاجر ہے۔

تراب علی۔ حاضر ہے۔

چھمن۔ چلو میاں۔

گھسیٹے۔ یا خدایا میرے اللہ مالک میرے بچائیو۔ میرے مولا۔

تراب علی۔ اب چپکے چپکے چلو۔ اور جو کچھ دعا مانگنی ہو تو دل ہی میں دل میں مانگو۔ ہلڑ مچاتے نہ چلو۔ گھسیٹے آبدیدہ ہو گیا۔ اگر کوئی ذرا سا ٹھوکا دیتا تو رو دیتا۔ چلا تو قدم اٹھانا دوبھر ہو گیا۔ پاؤں ڈگمگانے لگے۔ رنگ فق۔ چہرے سے وحشت برسنے لگی۔ چلتے چلتے صاف مجسٹریٹ کی بگھی کی طرف گیا۔ اور کوچ مین سے یوں پوچھنے لگا۔

گھسیٹے۔ بھائی مالیکم سلام۔

کوچ مین۔ سلام بھیا۔

گھسیٹے۔ ہم کو پہچانا۔

کوچ مین۔ ہاں وہاں نواب صاحب کے یہاں سو۔ سمند جوڑی کی فٹن پر۔

گھسیٹے۔ ہاں بھئی۔ ایک مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ پہیے کے تلے ایک کہار کا ہاتھ دب گیا۔

راوی۔ اس وحشت کے صدقے کہار کا کہار اور پاؤں کا ہاتھ بتالیا۔

کوچ مین۔ میاں یہ کار بڑا نازک (نازک) ہے۔ جری (ذری) چوکا اور تلوار کی دھار پر دم آٹھوں گانٹھ کیت رہے۔ جب جائے بنے۔

گھسیٹے۔ تمھارے صاحب کا مجاز کڑوا تو نہیں ہے۔

کوچ مین۔ نہیں کسو سے بولتے چالتے نہیں۔ سیدھے انگریز ہیں۔ بچارے میم صاحب کبھی کبھی کچھ کہتی بھی ہیں۔ یہ بجڑ و تو بولتے تک نہیں۔

گھسیٹے۔ دیکھئے ہمیں کیا حکم ہوتا ہے۔

کوچ مین۔ اونہہ ہونا کیا ہے۔ روپیہ دو روپیہ جرمانہ اور کیا۔

کانسٹیبل نے للکارا کہ چلو جھٹ پٹ صاحب خفا ہو رہے ہیں۔

تراب علی نے بھی ڈانٹ بتائی۔ کہ اب چلتے ہو یا دکھڑا لے کے بیٹھے ہو۔ خفگی کا لفظ جو سناؤ تو میاں گھسیٹے کی رہی سہی عقل بھی جاتی رہی۔ بارے بہزار خرابی اجلاس پر پہنچے تو دونوں ہاتھ باندھ کر چور کی طرح کھڑے ہوئے۔ مگر بدن بھر تھر تھر کانپ رہا ہے اور پھوٹ پھوٹ کے رونا آتا ہے۔

صاحب۔ تمھارا نام۔

گھسیٹے۔ حضور بال بچوں والا ہوں۔ دو ننھے ننھے لڑکے ہیں ایک بٹیا پائی ہے۔ اور قبیلہ ہے حضور اور دو مسیاں ہیں۔

صاحب۔ اوہ۔ ول۔ یہ مجرم ہے۔ گھسیٹے۔ باپ کا نام؟

گھسیٹے۔ حضور میرا نام کاغذ پر چڑھا لیں۔ مگر باپ کا نام نہ لکھیں۔ مرے ہوئے مردے کیوں اکھیڑیئے۔

سررشتہ دار۔ (شاعر آدمی) مرے ہوئے مردے نہیں گڑے ہوئے مردے۔

تراب علی۔ یہ کوچوانی ہی خوب جانتا ہے۔ منطق نہیں پڑھا ہے۔

صاحب۔ باپ کا نام گھسیٹے۔

راوی۔ صاحب مجسٹریٹ کا قاعدہ تھا کہ جو کچھ لکھتے تھے اس کو زبان سے بھی ادا کرتے جاتے تھے۔ حضرت نے جو میاں گھسیٹے کے باپ کا نام گز بھر وہ لکھا تو اجلاس پر حاضرین کو بے اختیار ہنسی آگئی۔

سر رشتہ دار۔ حضور۔ ابھی اس نے باپ کا نام نہیں بتایا۔

صاحب۔ ول تمھارے باپ کا نام کیا ہے۔

گھسیٹے۔ حضور میرے بال بچے بھوکوں مر جائیں گے۔ (ہاتھ جوڑ کر) حضور میں مر مٹوں گا۔

صاحب۔ یہ پاگل ہے۔ کون ہے تم کون ہے۔

گھسیٹے۔ حضور پاگل ہوں۔

صاحب۔ اچھا کانسٹیبل اس کو پاگل خانے لے جاؤ۔ (مسکرا کر) جاؤ پاگل خانے تم۔

گھسیٹے۔ حضور دن بھر گاڑی چلاؤں گا۔ نوکری بجاؤں گا رات کو پاگل خانے میں سو رہا کروں گا۔

صاحب۔ (ہنس کر) باپ کا نام۔

سر رشتہ دار۔ بتاتا نہیں۔ نامعقول۔ گنوار۔

گھسیٹے۔ ہائے گجب۔ (غضب)

صاحب۔ باپ کا نام ہائے گجب۔

سر رشتہ دار۔ نہیں خداوند۔

صاحب۔ چپ رہو۔ باپ کا نام ہائے گجب۔ دادا کا نام۔

گھسیٹے۔ وہ تو عمر بھر مرغ لڑایا کئے۔

صاحب۔ دادا کا نام مرغ۔ ول عمر کتنا۔

گھسیٹے۔ نصیر الدین حیدر جب گدی پر بیٹھے تو میں پاؤں پاؤں چلتا تھا۔

صاحب۔ سر رشتہ دار۔ اس کا عمر کتنا۔

سر رشتہ دار۔ خداوند ہماری طرح یہ پچپن کے پیٹے میں آگیا۔

صاحب۔ عمر ۵۵ سال۔ رہنے والا کہاں کا ہے۔

گھسیٹے۔ ابھی کس پیری کا ہے۔

صاحب۔ سب سچے والا کری کا۔ تم نے گاڑی بے کابو (قابو) چلایا۔

گھسیٹے۔ حضور راس جھمن کے ہاتھ میں تھی۔

صاحب۔ (سر رشتہ دار کو) کیا

سر رشتہ دار۔ ارے مرزا صاحب ہوا ہو بتادے۔ کوئی کھا نہیں جائے گا۔

جھمن۔ بتادو۔ بتادو۔

تراب علی۔ کہہ دو صاف صاف ڈرتے کیوں ہو۔

گھسیٹے۔ تمہیں بڑے باپ کے بیٹے ہو تو کہہ دو کہ راس ہمارے ہاتھ میں تھی۔

صاحب۔ مجرم نے اقبال لیا کہ اس ہمارے ہاتھ میں تھی۔

گھسیٹے۔ حضور گلا پھاڑ پھاڑ کر چلایا کہ ہیٹ ہیٹ۔ (بہت زور سے) موڑ پر سے بھاگ کر چل ہٹ۔ بچ ہٹ۔ دور ہٹ۔ ایک نہ سنی اور ہم کو پھانسی دلوائی۔

کمہار۔ گوسیاں جب گلے پر گاڑی آگئی تب پکارے کہ چل ہٹ حرامجادے۔ جب پاؤں کچیل گیا تب کہس' ہمار گوڑ کاٹ ڈارس۔

گھسیٹے۔ حضور اس سے مجھے لاگ ڈانٹ ہے۔ یہ لئے مرتا ہے۔ حضور میرے بال بچے ننھے ننھے ہیں۔ کمہارن تو بھولے بھالے کھلونے بنا کے بیچ بھی لے گی۔ میری جورو، تو سینا پرونا بھی نہیں جانتی۔

صاحب۔ ہم کو تمہاری جورو سے کچھ مطلب نہیں۔

گھسیٹے۔ تو خدا حضور کو سلامت رکھے۔ مجھ کو تو اس سے مطلب ہے اس بوڑھوتی وقت میں جورو اور اماں سب کچھ وہی ہے۔

صاحب۔ (ہنس کر) تم مسکھری (مسخراپن) کرتا ہے۔

گھسیٹے۔ مسکھری؟ اے حضور جان پر بن آئی۔ مسکھری کس کی جورو ہے۔

کمہار۔ گوسیاں ہمارا گوڑ کچل ڈالس ہے۔

صاحب۔ بولو۔ ول تم نے گاڑی تیز کیوں دوڑایا۔

گھسیٹے۔ حضور جھمن نے کہا تھا۔

جھمن۔ ارے چپ بیوقوف بڑا اشریر ہے بھئی۔

گھسیٹے۔ حضور۔ میں حضور کی صورت دیکھے ڈرتا ہوں۔

صاحب۔ ول تم ہم کو وولف سمجھتا۔ کیا سمجھتا۔ ہم کو وولف جانتا۔

گھسیٹے۔ میں نہیں سمجھا لوف کیا۔

سر رشتہ دار۔ صاحب بہادر فرماتے ہیں کہ کیا تم ہم کو بھیڑیا سمجھتے ہو۔

گھسیٹے۔ اللہ کرے اس کمہار کو بھیڑیا لے جائے۔

صاحب۔ گھسیٹے پر دو روپے جرمانہ۔

الغرض بڑی دیر تک روبکاری رہی۔ اور آخر کار دو روپے میاں گھسیٹے پر جرمانہ ہوئے۔ حضرت نے دو روپے چپکے سے میز پر رکھے اور مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے چلے۔

تراب علی۔ کہو پھانسی تو نہیں دی گئی۔

جھمن۔ جی چاہتا ہے کہ ایک گدا دوں پاجی کو۔ ہر سٹے ہمارا ہی نام لیتا تھا۔ راس بھی جھمن ہی کے ہاتھ میں تھی۔ اور گاڑی بھی جھمن ہی کے کہنے سے دوڑائی۔ اور کمہار بھی کچلا تو جھمن ہی کے سبب سے۔ اس مردود کی شیطنت تو دیکھئے۔

تراب علی۔ اس [illegible] مطلب کی دو باتیں سن لو...... گھسیٹے۔ جو کچھ مل رہے تو کیسا۔

گھسیٹے۔ کیوں رے؟ حال کیا رہا؟

تراب علی۔ جی، دو روپیہ مل رہے تو کیسا۔

گھسیٹے۔ ہم سمجھے ہی نہیں۔ روپیہ کیا چھت پھاڑ کے دے گا۔ کہیں [illegible] لنگڑے کی بیت تو نہیں ہے۔ اے ہاں کہ پھر کچہری آنا پڑے اور سب کی بڑا گھری ہو دیکھیں بھیا۔ اب خدا ایمان نہ لائے۔ باپ کا نام [illegible] حلف اٹھاؤ.....

تراب علی۔ کتنا کوڑھ مغز آدمی ہے۔ ارے میاں اگر نواب سے جھوٹ بول کے روپیہ لے تو لوگے کہ نہیں۔

جھمن۔ ہم کہتا کہ ایک انگریز کونسلی ہماری طرف سے تھا۔ اس نے خوب خوب تقریر کی۔

تراب علی۔ اور کہا کہ کمہار نے بھی ایک ڈبلو کیا تھا۔

گھسیٹے۔ اجی ہم کہہ دیں گے۔ کہ راتون صاحب اس کی طرف سے تھے۔

تراب علی۔ ارے کہیں ایسا غضب بھی نہ کرنا۔ راتون تو ولایت گئے ہیں۔

جھمن۔ مروا ہی دیا تھا۔

تراب علی۔ نہیں جی۔ وہاں کس کو یہ فکر ہے۔ کہ راتون کون ہے اور لیا۔

گھسیٹے۔ تو پھر ہم کو کیا لواؤ گے۔ ہم پندرہ سے کم نہ لیں گے۔

تراب علی۔ (جھمن کے کان میں) اچھا گو کھا پھنسا۔

جھمن۔ بھئی پندرہ دیں گے مگر اس شرط سے کہ ایک روپیہ کے یار لوگ دم لگائیں۔

دل دینا

مولانا عبد الحلیم شررؔ

عشاق ہر صورت زیبا کو دل دے دیتے ہیں۔ شعرا کا دل ہمیشہ کسی کی زلف گرہ گیر میں رہا کرتا ہے۔ داستان گو دل دینے اور دل لینے کے افسانے بڑے ذوق و شوق سے سنایا کرتے ہیں۔ ناول نویسوں کا سارا زور قلم اس کوشش میں صرف ہوا کہ کیسے کوئی دل دیتا اور کوئی لیتا ہے؟ خلاصہ یہ کہ دل دینا ایک نہایت ہی آسان مشغلہ سمجھ لیا گیا اور ہمارے عاشق مزاج نوجوان دل ہاتھوں میں لئے پھرنے لگے کہ کوئی اچھی صورت دیکھیں اور حوالے کر دیں۔

مگر افسوس صحیح طور پر نہ آج تک کسی نے دل دیا، نہ کسی نے لیا اور نہ کوئی سمجھا کہ دل دینا کیا چیز ہے اور کیسے دل دیتے ہیں۔ صدہا عاشقوں اور معشوقوں کی داستانیں دلدہی اور دلبری کے دلچسپ نمونے سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن غور کرو تو نہ کسی نے دل دیا نہ کسی نے لیا۔ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ سچے اور صحیح معنوں میں دل دینے کا کہیں پتہ نہیں۔

لیکن ہاں یورپ کا ایک واقعہ جو قرون وسطیٰ میں پیش آیا تھا وہ البتہ دل دینے اور لینے کا سچا معاملہ ہے چونکہ ہمارے عاشقوں اور شاعروں کے کان اس سے ناآشنا ہیں۔ اس لئے ہم اس واقعے کو ان کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں کہ لوگ دیکھیں اور سمجھیں کہ دل دینا کیا چیز ہے؟

جن دنوں صلیبی لڑائیوں کے معرکے در پیش تھے اور بیت المقدس کو مسلمانوں سے چھیننے کے لئے سارا یورپ امڈا چلا آتا تھا۔ فرانس میں نواب شانپین کے دربار میں ایک بڑا معزز سردار تھا لارڈ کوسی، جو خوبصورت اور قابل ہونے کے ساتھ اپنے وقت کا بڑا بانکا بھی تصور کیا جاتا تھا۔ اسی زمانے میں وہاں ایک اور بڑے معزز رئیس تھے لارڈ فائل۔ لارڈ فائل کی نازنین و زہرہ جبین بیوی لیڈی فائل اپنے حسن و جمال اور ناز و انداز کے لحاظ سے سارے ملک میں منتخب تھی اور فرانس کی ساری مہ جبینوں کے حسن کی شمعیں لیڈی فائل کے آفتاب رخسار کے سامنے ماند تھیں۔ دونوں کی خوبیوں نے یہ شرمناک کرشمہ کیا کہ لارڈ

کوسی اور لیڈی فائل ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے اور ناجائز الفت نے دونوں کے دلوں میں عشق کی شمعیں روشن کر دیں۔ لارڈ فائل بیوی کے اس شرمناک عشق سے ناواقف نہ تھا۔ ہر طرح کی روک تھام کی۔ تاہم کچھ زور نہ چلتا۔

اسی اثناء میں نواب شانپین تیار ہوا کہ ارض مقدس میں جا کر مسلمانوں کے مقابلے میں جہاد کرے۔ جو مجاہدین فرانس اس کے ہمراہ روانہ ہونے والے تھے ان کے زمرے میں لارڈ کوسی نے بھی اپنا نام لکھوا دیا۔ اپنے اس ارادہ کی اطلاع جب اس نے لیڈی فائل کو کی تو معشوقہ دل نواز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ روئی اور رلایا۔ مگر آخر ضبط سے کام لیا۔ دل میں کہا۔ "اچھا ہے۔ لارڈ کوسی کے چند روز باہر رہنے سے لارڈ فائل کی آتش رقابت ٹھنڈی پڑ جائے گی اور شاید ان کی بدگمانیاں دور ہو جائیں۔"

اس کے بعد ہنسی خوشی عاشق دلدادہ کو گلے لگا کے رخصت کیا اور کہا لو یہ ہماری الفت و محبت کی یادگاریں ساتھ لیتے جاؤ اور ان کو ہمیشہ اپنے دل سے لگائے رکھنا۔ یہ یادگاریں چند انگوٹھیاں تھیں کچھ جواہرات تھے اور سب سے زیادہ قیمتی ایک نازک ڈوری تھی جس کو لیڈی فائل نے اپنی سنہری زلفوں کے بالوں کو ریشم کے دھاگے میں گوندھ کے بنایا تھا اور اس کے دونوں سروں پر دو بڑے بڑے موتی گھنڈیوں کی وضع میں لگے ہوئے تھے۔ ان دنوں یورپ کے بانکوں اور فرنگی سرداروں کی دھج تھی کہ اپنے فرغل کو ایک خوبصورت ڈوری سے خود میں اٹکایا کرتے' اور اسی مقصد کے لئے لیڈی فائل نے یہ ڈوری خود اپنے ہاتھ سے بنا کے اپنے عاشق کو دی۔ الغرض بصد حسرت واندوہ عاشق و معشوق جدا ہوئے اور لارڈ کوسی نے شانپین کے نواب کے ہمراہ ارض مقدس فلسطین کی راہ لی۔

یہ ۵۸۵ھ کا زمانہ تھا جبکہ فلسطین کے مشہور ساحلی شہر عکہ کا مشہور محاصرہ قائم تھا۔ شہر کے اندر مسلمان تھے۔ لاکھوں فرنگیوں کی خلقت عظیم چاروں طرف سے یورشیں کر رہی تھی اور ان محاصرہ کرنے والوں کو سلطان صلاح الدین اعظم خشکی کی طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ خوں ریزیوں کا سلسلہ جاری تھا اور مسیحی کسی طرح شہر پر قابو نہ پا سکتے تھے۔

لارڈ کوسی نے نئے مجاہدین فرنگ کے ساتھ ساحل فلسطین پر قدم رکھا تو وہ بھی زور شور سے دھاوے کرنے لگا اور ایک دن ایسے جوش و خروش سے دھاوا کیا کہ تیروں' پتھروں اور آتشبازی کے قمقموں کو ڈھال پر لیتا ہوا عکہ کی شہر پناہ کے نیچے جا پہنچا اور سیڑھی لگا کے اوپر چڑھنے لگا۔ فصیل کے اوپر سر نکالا ہی تھا کہ کسی مسلمان نے تلوار کا ایسا زبردست ہاتھ مارا کہ کاری زخم کھا کے نیچے آ رہا اور لوگ فوراً خیمے میں اٹھا لے گئے۔

خیمے میں لیٹ کر لارڈ کوسی نے خیال کیا کہ اب میری زندگی کے چند ہی لمحے باقی ہیں۔ ساتھ ہی محبوبہ جاں نواز یاد آئی اور ارادہ کیا کہ زندگی کے ان باقی ماندہ لمحوں کو اسی کی یاد میں صرف کرے۔ چنانچہ لیڈی فائل کے نام ایک عاشقانہ خط لکھا اور اپنے ایک قدیم وفادار و جاں نثار ملازم کو دے کر کہا۔ "میرے مرنے کے بعد تم فرانس میں جانا اور اس خط کو میری دلدار مہ جبین کے ہاتھ میں دے دینا۔ اس کے ساتھ یہ تمام چیزیں بھی جو اس نے مجھے یادگار محبت کے طریقے سے دی تھیں اسے واپس کر دینا۔ اس کے علاوہ جب میں مر چکوں تو سینہ چاک کر کے میرا دل نکالنا اور اس کو تیل میں ڈال دینا کہ سڑنے نہ پائے' اور اس کو بھی لے جا کر اسی آفت جان کی نظر کر دینا۔"

یہ وصیتیں کر کے لارڈ کوسی مر گیا اور وفادار ملازم نے ان پر پورا عمل کیا۔ سفر کر کے فرانس میں پہنچا اور لارڈ فائل کے

قصر کے قریب جاکر پھاٹک کے سامنے جنگل میں چھپ رہا کہ لارڈ فائل کہیں باہر جائے تو قلعہ میں داخل ہو کر اپنے آنجہانی آقا کی امانتیں اس کی محبوبہ کے حوالے کرے۔ اسی انتظار میں کھڑا تھا کہ لارڈ فائل کی نظر پڑ گئی۔ دیکھتے ہی پہچان گیا کہ لارڈ کوسی کا ملازم ہے۔ اور اپنے آقا کا کوئی پیام لے کر میری بیوی کے پاس آیا ہے۔ غیظ و غضب کے ساتھ اس کے سر پر جا پہنچا اور کہا سچ سچ بتا یہاں کس لئے آیا ہے ' ورنہ تیری جان کی خیر نہیں۔ ملازم نے قسمیں کھا کر کہا۔ "میرے مالک تو ارض مقدس میں مسلمانوں کے ہاتھ سے مارے گئے۔ اب پیام دینے والا کون ہے؟" لارڈ فائل کو اس کا یقین نہ آیا۔ سمجھا کہ فضول باتیں بنا رہا ہے۔ تلوار میان سے کھینچ کر اس کے سر پر بلند کی اور ڈپٹ کے کہا۔ "بتا ورنہ سر زمین پر پڑا لوٹتا ہو گا۔" خادم سہم گیا ' ہوش و حواس جاتے رہے اور جان کے خوف سے ساری باتیں قبول دیں۔ جو چیزیں ساتھ لایا تھا اس کے سامنے رکھ دیں اور لارڈ کوسی کا خط بھی اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

خط پڑھ کر لارڈ فائل کے غصے کی انتہا نہ تھی اور جوش غضب میں ارادہ کیا کہ بیوی سے ایک نئے طریقے کا انتقام لے۔ فوراً قصر میں آکر اپنے باد کو بلایا اور وہ لارڈ کوسی کا دل اس کے ہاتھ میں دے کر کہا اس کو اور گوشت میں ملا کر بہت اچھے نفیس کباب پکاؤ۔ کباب لیڈی فائل کی نہایت ہی مرغوب غذا تھی۔ جیسے ہی پک کر آئے لارڈ فائل نے میز پر بیٹھ کر ان کو بیوی کے سامنے پیش کیا اور کہا۔ "تمہارے شوق کے مطابق ان کو بڑے اہتمام سے پکوایا ہے۔" بیوی نے ان کبابوں کو بڑے شوق سے لیا ' مزے لے لے کر کھایا اور جب کھا چکی تو میاں نے ایک زہر خند کے ساتھ پوچھا۔ "کیسے پکے ہیں؟" جواب ملا کہ بہت اچھے پکے ہیں اور مجھے بہت مزا آیا۔ کہا "ہاں مزا آنے کی چیز ہی تھی۔ تمہارے مرغوب ہونے ہی کے خیال سے میں نے اس کو بڑی کوشش سے تیار کرایا۔ اور تمہیں پسند کیوں نہ آتا؟ یہ خاص لارڈ کوسی کا دل تھا جس کی قدر تم سے زیادہ کون کرے گا؟" لیڈی فائل کو اسپر یقین نہ آیا مگر جب میاں نے ساری سرگذشت من و عن بیان کر دی اور بیوی کے دیئے ہوئے یادگار محبت کے تحفوں کے ساتھ لارڈ کوسی کا خط بھی نکال کر سامنے رکھ دیا تو کانپ گئی اور یقین آیا کہ شوہر نے جو کچھ کہا سچ ہے۔

اس کے خون شدہ دکھے دل پر یاس و نامرادی کا ہجوم ہوا مگر ضبط کیا اور استقلال کے تیوروں سے بولی۔ "ہاں سچ کہتے ہو۔ یہ دل میرا محبوب تھا۔ کیونکہ یہ محبت کرنے کے قابل دل تھا اور کبھی اس سے زیادہ شریف دل نہیں دیکھا گیا تھا اور میں نے چونکہ ایسا اچھا اور شریف گوشت کھایا ہے اور میرا معدہ ایک ایسے بہترین اور قیمتی دل کا مقبرہ بن گیا ہے لہذا اب میں کوئی اس سے کم درجے کی چیز نہ کھاؤں گی نہ اس اچھے دل کو کسی ذلیل چیز سے آلودہ کر کے ناپاک کروں گی۔" یہ کہتے کہتے پر حسرت زبان رک گئی۔ اٹھ کر اپنے کمرے میں گئی اور اندر سے دروازہ بند کر کے بیٹھ رہی۔ دوستوں ' عزیزوں ' ملازموں اور خود شوہر نے لاکھ کہا اور قسمیں دلائیں مگر دروازہ نہ کھولا۔ یہاں تک کہ اس رنج میں فاقے کرتے کرتے چوتھے روز ملک عدم کی راہی۔

شریف زادہ

مرزا محمد ہادی رسواؔ

مرزا عابد حسین جب اودھ کے ایک ضلع میں پہلے پہل ملازم ہو کے گئے، سرائے میں اترے۔ صاحب کی ملاقات کی۔ کار سرکاری سپرد ہوا۔ اس عرصے میں اس بستی کے بہت سے لوگ ان کو پہچاننے لگے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ چھوٹی بستیوں میں بہ نسبت بڑے شہروں کے بہت جلد شہرت ہو جاتی ہے۔ دو ایک صاحب شریف صورت اس بستی کے رہنے والے جو اپنے ذاتی منافع کے باب میں بڑے خوش فکر اور دور اندیش ہوتے ہیں۔ ان سے سرا میں آ کے ملے۔ ایسے لوگوں کو خواہ مخواہ فکریں رہتی ہیں کہ فلاں عہدے پر کون شخص مقرر ہوا۔ کس کی تبدیلی ہوئی۔ کس کی ترقی ہوئی۔ کس کا تنزل ہوا۔ غرضیکہ یہ لوگ زندہ گزٹ ہوتے ہیں اور لطف یہ کہ نہ کہیں نوکر نہ چاکر۔ نہ کوئی ذاتی معاملہ نہ مقدمہ مگر ان باتوں سے بڑے بڑے مطلب نکال لیتے ہیں۔ حکام رسی۔ اہل عملہ سے حسب حیثیت رسم و راہ یہ خاص اوصاف ہیں جو منجملہ فضائل سمجھے جاتے ہیں۔

مرزا صاحب سے جو لوگ آ کے ملے ان میں سے ایک صاحب فدوی میاں خاندانی رئیس اس بستی کے تھے۔ مگر یہ شرف انقلاب روزگار یا موروثی غفلت اور اسراف یا خود ان کی اولوالعزمی یا شرکاء کے تنازع قانونی یا کارندوں کی چالاکی کی وجہ سے اب صرف اضافی رہ گیا تھا۔ اگرچہ زمانہ سابق میں ان کے بزرگ زمیندار تھے۔ مگر اب صرف برائے نام ایک موضع کا نمبر آپ کے نام سے رہ گیا تھا۔ اگرچہ اس پر بھی تصرف مالکانہ ان کے ایک کارندہ مسمی شیو رتن کا تھا۔ جو کہ در حقیقت اسی گھر کا ساختہ پرداختہ تھا مگر اب خود ان سے بدرجہا متمول اور ان کی کل موروثی جائداد کا اصلی مالک تھا۔ مگر بلحاظ اخلاق ظاہری جو کہ اکثر کسی مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ ابھی تک ان سے بمراعات پیش آتا تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ موضع بجن پور جہاں کا وہ اصلی باشندہ تھا۔ اسی کے یہ برائے نام نمبردار تھے۔ تحصیل وصول شیو رتن کے پاس تھی۔ مگر رعایا ابھی تک انھیں کا رعب وداب مانتی تھی۔ آسامیوں سے دبا کے کبھی کبھی کچھ انہیں بھی وصول ہو جایا کرتا تھا۔ ایک اور وجہ شیو رتن کی ان سے دبنے کی یہ تھی کہ شیو رتن ایک چھوٹے درجہ کا آدمی تھا اور بستی کے لوگ بسبب ان کی قدیمی ریاست کے ان کو مانتے تھے اور اسی خصوصیت کے لحاظ سے حکام اور اہل عملہ تک انکی رسائی بسہولت ہو سکتی تھی۔ شیو رتن کو ان سے بہت مدد ملتی تھی۔ اس لئے کہ اکثر مقدمات میں سعی۔ سفارش۔ کہنا ۔ سننا جو کچھ ہوتا تھا وہ انھیں کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ یہ دوادوش اور تملق و چاپلوسی جو اکثر موقعوں پر کرنا پڑتی تھی اس کا تمام فائدہ شیو رتن کو حاصل ہوتا تھا۔ آپ کا منشا صرف اس قدر تھا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ فدوی علاقہ دار ہے اور فدوی کے قبضے میں ابھی کل مواضع ہیں اور شیو رتن صرف ایک کارندہ ہے۔ صرف استقرار شان کے تحفظ کے واسطے آپ ہر طرح کی مشقتیں اور صعوبتیں گوارا کرتے تھے۔ بستی میں جس قدر مکانات آپ کے بزرگوں کے تھے سب شیو رتن کے قبضے میں تھے اور ان میں اکثر اہل عملہ رہا کرتے تھے۔ اس کا کرایہ شیو رتن ماہ بماہ وصول کر لیتا تھا۔ چونکہ کرایہ لینا آپ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ لہٰذا اگر کبھی اس کا ذکر کسی موقع پر آیا تو آپ اس سے تحاشی فرماتے

تھے اور شیوہ رتن کو غائبانہ کلمات ناملائم سے یاد فرماتے۔

اسم مبارک آپ کا فدا علی تھا۔ مگر اس نام سے لوگ بہت کم واقف تھے۔ لوگ آپ کو اکثر فدوی میاں کے نام سے جانتے تھے۔ آپ کا خود یہ بیان تھا کہ فدوی تخلص ہے۔ مگر اصل وجہ یہ تھی کہ ابتدائے سال میں آپ اس لفظ کو اپنی نسبت بہت استعمال فرماتے تھے۔ مثلاً "فدوی حاضر ہوا تھا۔" "اور فدوی غائب ہوا۔ اور عرض فدوی کی یہ ہے۔" "اور "فدوی آپ کا قدیمی نیاز مند ہے۔" "اس لفظ کے کثرت استعمال کی وجہ سے لوگوں نے آپ کا نام فدوی میاں رکھ لیا۔ پہلے غائبانہ اور پھر بالمشافہ اسی اسم سے موسوم ہو گئے۔ آپ نے مصلحتاً یہی تخلص اپنا قرار دے لیا۔ کیونکہ آپ کے تخلص کی (جواب کسی کو یاد بھی نہ تھا) شہرت نہ ہونے پائی کہ یہ لقب مشہور ہو گیا۔ ایسی حالت میں اس تخلص کو بٹہ کھاتے میں ڈال کر دم نقد یہ تخلص اختیار کر لینا عین مصلحت تھی۔

مرزا عابد حسین کے تقرر کی خبر ضلع میں ان کے آنے سے پہلے آپ کو مل گئی تھی۔ جس دن آپ تشریف لائے اس کے دوسرے ہی دن آپ سرائیں پہنچ گئے۔ پھر ملاقات کر لینا کتنی بڑی بات تھی۔

مرزا صاحب چار بجے کے بعد سرائیں آ کے ابھی بیٹھے ہی تھے کہ آپ نازل ہوئے اور بھٹیاری سے دریافت کر کے بے تکلف مرزا صاحب کے پاس چلے آئے۔

فدوی:۔ فدوی آداب عرض کرتا ہے۔

مرزا صاحب:۔ تسلیم۔

مرزا صاحب بہت دیر آشنا تھے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وضع تہذیب کے پابند نہ ہوں۔ جب ایک شریف صورت اس طرح تعارف کرے تو اس سے بے رخی کریں۔

آیئے تشریف لایئے۔

اس وقت اتفاق سے بھٹیارہ اس طرف کسی ضرورت سے آنکلا۔ اس نے کہا "فدوی میاں سلام" اسی طرح کئی شخصوں نے آپ کو سلام کیا۔ چلئے نام بتانے کی ضرورت بھی نہ ہوئی۔ مرزا صاحب کو معلوم ہو گیا کہ آپ اس لقب سے ملقب ہیں۔ اس پر بھی مرزا صاحب نے ازرہ احتیاط اسم مبارک دریافت کیا۔

فدوی میاں:۔ بس یہی "فدوی"

مرزا صاحب:۔ (کسی قدر تعجب سے) درست!

فدوی میاں:۔ جی ہاں۔ وہ اصل حقیقت یہ ہے کہ نام تو میر فدا علی ہے مگر فدوی تخلص ہے۔ یہی زبان زد ہر خاص و عام ہو گیا۔

مرزا صاحب:۔ بہت مبارک!

فدوی میاں:۔ آپ کی تشریف آوری کی خبر سن کر میں بہت مشتاق تھا کہ آپ سے ملوں اس لئے کہ یہاں حکام اور اہل عملہ میں کوئی صاحب ایسے نہیں ہیں جو فدوی کو نہ جانتے ہوں۔

مرزا صاحب:۔ میں جانتا ہوں کہ اکثر صاحبوں کو اس قسم کا شوق ہوتا ہے۔

فدوی میاں:۔ جی ہاں شوق کیا۔ ایک لت سی ہے۔ آپ جانئے یار باشی میں تو وہ مزا ہے کہ جہاں اس کا چسکا پڑا پھر نہیں چھوٹتا۔

مرزا صاحب:۔ سچ ہے کہ جس کو جس بات کا شوق ہو جائے اگر اس میں تضیع اوقات بھی ہو۔ مگر انسان سے بمشکل ترک ہو سکتا ہے۔

مرزا صاحب کے ان بلیغ فقروں کا مطلب یا تو فدوی میاں سمجھے ہی نہیں یا سوجھ بوجھ کے تجاہل عارفانہ فرمایا۔ اس لئے کہ مرزا

صاحب تو کچھ ایسے کھرے تھے بھی نہیں۔ آپ تو ایسے ویسے حکام اور اہلکاروں سے مل چکے تھے جو دو کمشنری میں خود متعلق تھے۔ اور فدوی کو اس بات کا فخر تھا۔ مرزا صاحب کیا چیز تھے۔ جیکسن صاحب جو بے حد ملاقاتوں سے اس قدر گھبراتے تھے کہ جو کوئی ان کی ملاقات کو جاتا تھا اڑا لے کے پیچھے دوڑتے تھے۔ ان سے بھی فدوی میاں مل چکے تھے اور جب تک وہاں ضلع میں رہے ہر ہفتہ کو سلام کے لئے جایا کرتے۔ علی ہذا القیاس ڈپٹی تہور حسین خاں صاحب جنہوں نے اپنے بنگلے پر تختی لکھ کے لگا دی تھی کہ کوئی میری ملاقات کو نہ آئے۔ وہاں بھی فدوی پہنچ گئے اور آخر اس قدر رسم بہم پہنچایا کہ ان کا پان پیا۔ ان کے خاصدان سے پان کھایا۔

فدوی میاں۔ (مرزا عابد حسین سے) یہاں سرائیں تو آپ کو تکلیف ہوگی۔

مرزا صاحب۔ جی ہاں۔ ابھی کل تو آیا ہوں۔ مکان تلاش کر کے اٹھ جاؤں گا۔

فدوی میاں۔ فدوی کے مکانات لاتعداد ولا تحصی ہیں۔ خالی پڑے ہیں۔ جو پسند آئے اس میں اٹھ چلئے۔

مرزا صاحب۔ (کسی قدر تامل کے بعد) کس کرائے کے مکانات ہوں گے۔

فدوی میاں۔ (مسکرا کے) آپ کو معلوم نہیں دیہات میں اس بات کا عیب ہے۔

مرزا صاحب۔ مگر میں اس کو معیوب سمجھتا ہوں کہ بلا کرایہ کسی کے مکان میں رہوں۔

فدوی میاں۔ مگر جب کسی غیر کا مکان ہو نہ۔ مرزا صاحب اس کا جواب دینے ہی کو تھے کہ میرے آپ کے کب کی شناسائی ہے مگر اسی اثنا میں ان سے ایک اور صاحب ملنے کو آ گئے۔

پنڈت جانکی پرشاد صاحب ان کے ہم مکتب دوست جو اس ضلع میں تھانہ دار تھے مرزا صاحب ان سے مخاطب ہو گئے۔ فدوی میاں سے ان سے حسب معمول بے تکلفی کی ملاقات تھی۔ بلکہ کچھ مذاق بھی فیما بین ہوتا تھا۔ مکان کا تذکرہ پنڈت صاحب کے سامنے بھی ہوا۔ پنڈت صاحب نے بھی یہی کہا کہ فدوی کے کئی مکان خالی ہیں کوئی ان میں سے پسند کر کے اٹھ جایئے۔ ایک عہدہ دار پولیس کے کہنے سے مرزا عابد حسین کو یہ تو اطمینان ہوا کہ فدوی میاں قابل اعتماد شخص ہیں۔ مگر

مرزا صاحب۔ مگر آپ فرماتے ہیں کہ میں کرایہ نہ لوں گا۔

پنڈت صاحب۔ اچھا اٹھ جایئے۔ حساب دوستاں در دل والا معاملہ ہو جائے گا۔

مرزا صاحب اس معمے کو نہ سمجھے۔ مگر چپ ہو رہے۔ اس اثنا میں فدوی میاں کسی ضرورت سے اٹھ گئے۔

پنڈت صاحب نے اصل حقیقت مرزا صاحب کے ذہن نشین کر دی۔ معلوم ہوا کہ مکان کا اصل مالک شیو رتن ہے وہ آپ کے گھر کا کارندہ تھا۔ اس لئے آپ اس کو مال مملوک سمجھ کے اپنا مال سمجھتے ہیں۔

مرزا عابد حسین۔ مگر یہ تو کہیے۔ یہ حضرت میرے اوقات میں تو ہارج نہ ہوں گے کیونکہ آپ جانتے ہیں میں اس قسم کی ملاقاتوں سے گھبراتا ہوں۔

پنڈت صاحب۔ کچھ ایسے ہارج نہ ہوں گے۔ مکان میرے دیکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بڑا مکان جو آج کل خالی ہے اس میں پہلے تحصیلدار صاحب رہتے تھے۔ آپ کی قسمت سے ان کی تبدیلی ہو گئی۔ فوراً لے لیجئے نہیں تو کوئی نہ کوئی لے لے گا اور آپ کو افسوس ہوگا۔ ان کے ہارج ہونے کی یہ صورت ہے کہ اس قسم کے لوگ جو بہت لوگوں سے ملتے رہتے ہیں وہ کسی قدر مزاج شناس ہو جاتے ہیں۔ وہ آئیں گے ضرور خواہ ان کے مکان میں رہئے خواہ نہ رہئے۔ مگر جب آپ منہ نہ لگائیں گے دو چار منٹ ٹھہر کے چلے جایا کریں گے۔ آپ کا ہرج ہی کیا ہوگا۔ دوسرے ایک فائدہ بھی ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جس چیز کی ضرورت ہو (مسکرا کے) خواہ کیسی ہی ضرورت کیوں نہ ہو یہ مہیا کر دینگے اور لطف یہ کہ بہ کفایت۔ مرزا صاحب پنڈت جی کے اس موقع پر مسکرانے سے کسی قدر بدظن ہو گئے تھے۔ مگر پنڈت جی نے اپنی تقریر کو اس طرح جاری کیا۔

پنڈت جی:۔ مثلاً اب فی الحال تو آپ کو گھوڑے کی ضرورت ہو گی۔وہ آپ کی معرفت بہت جلد اور کفایت سے مل سکے گا۔ ہواری غلہ اگر بھی زراب جس شے کی ضرورت ہو گی۔ان کی معرفت مل جایا کرے گا۔اسباب ضروری مثل پلنگ۔ میز۔ کرسیاں۔ دریاں۔ برتن۔ باسن یہ سب انھیں سے منگوایئے گا۔

مرزا صاحب:۔ مگر ان سب کا معاوضہ کیا دینا ہو گا۔

پنڈت صاحب:۔ کوئی معاوضہ نہیں صرف وہی چند منٹ ہرج اوقات جو ان کے آنے سے ہو گا یا اگر کچھ کمیشن وغیرہ لیتے ہوں تو اس کا علم نہیں۔

مرزا صاحب:۔ اچھا اگر کمیشن لے کے عمدہ شے بہم پہنچا دیتے ہیں تو یہ کچھ ایسا معیوب نہیں۔

پنڈت صاحب:۔ ہاں بس یہی سمجھ لیجئے۔ میرا جہاں تک خیال ہے آپ کو ان کی ذات سے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ ممکن ہے کہ کچھ فائدہ ہو جائے۔

مرزا صاحب:۔ باہم فائدہ رسانی تمدن کا اصل اصول ہے۔ اس کا میں منکر نہیں ہوں۔ مگر وہ معاملات جن میں طرفین سے غیر کافی معاوضہ پر کوئی شے ایک سے دوسرے کی طرف منتقل کی جائے یا کوئی کام کیا جائے میں اس کا ناجائز سمجھتا ہوں۔

پنڈت جی:۔ یہ دقیق منطق تو میری فہم سے باہر ہے۔ میرے کہنے کا خلاصہ یہ ہے کہ مکان لے لیجئے پھر جس طرح چاہیے ان سے معاملات رکھیے گا۔

مرزا عابد حسین:۔ پنڈت صاحب اصل امر تو یہ ہے کہ ایسے شخص کی معرفت مکان لینا بھی کسی قدر مسلک احتیاط سے دور ہے۔ مگر آپ فرماتے ہیں کہ اور کوئی مکان نہیں مل سکتا اور اصل معاملہ ایک شخص ثالث سے ہے کہ جس کا نام آپ نے لیا تھا۔

پنڈت جی:۔ شیو رتن۔

مرزا صاحب:۔ شیو رتن سے۔ لہذا مکان لئے لیتا ہوں۔ مگر ان کے اس عجیب اخلاق کی وجہ سے مجھے خواہ مخواہ ایک قسم کا تعلق خاطر ہو گیا۔ لکھنؤ جو کہ میرا اصل وطن ہے۔ وہاں کے عامیانہ اطوار و اوضاع سے مجھے نفرت ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ باہر جا کے ایسے لوگوں سے دور رہوں گا۔ مگر یہاں بھی وہی سامنا ہوا۔

پنڈت جی:۔ جی ہاں کیا کیا جائے۔ "باہمیں مرداں ببابد ساخت۔" اس کے بعد پنڈت جی رخصت ہونے کو تھے کہ فدوی میاں پھر نازل ہو گئے اور آتے ہی کہا۔

فدوی میاں:۔ پھر مکان دیکھ لیجئے۔ مرزا صاحب نے پھر ذرا تامل کیا۔ مگر پنڈت جی بھی فدوی کے ہم زبان ہو گئے۔ لہذا مرزا صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

پنڈت جی کی ٹمٹم سرا میں موجود تھی۔ مرزا صاحب اور پنڈت جی داہنے بائیں اور عقب میں فدوی میاں اور ایک حوالدار جو پنڈت جی کے ساتھ تھا بیٹھ لئے۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ راستہ میں فدوی میاں اور حوالدار میں بڑے تپاک سے باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ جس قدر حوالدار پنڈت جی کی ہمراہی کی وجہ سے لحاظ کرتا تھا اسی قدر فدوی میاں بیباک تھے۔

اثنائے راہ میں بلا مبالغہ سو دو سو آدمیوں نے فدوی میاں کو سلام کیا ہو گا۔

فدوی میاں سلام! فدوی میاں سلام! یہ صدائیں دس دس بارہ قدم کے فاصلے سے سنائی دیتی تھیں۔

سلام میں کچھ ترتیب بھی تھی کہ جو ملا اس نے پہلے تھانہ دار صاحب کو سلام کیا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ کے اور بہت مودبانہ جھک کے۔ یہ اول درجے کا سلام تھا۔ دوسرے درجے کا سلام مرزا صاحب کو کیا مگر وہ بھی بلا صوت و صدا۔ تیسرا اسلام ان لفظوں کے ساتھ

تھانہ دار صاحب سلام کرتے رہ گئے۔ تھانہ دار صاحب سلام کرتے رہ گئے لیکن فدوی میاں سلام کرتے رہتا تھا جو ابھی تک رہتا تھا جو سلام آداب کے ساتھ فدوی میاں سلام

فدوی میاں کا جواب بھی خصوصیت کے ساتھ ہو تا تھا۔ جیسا سلام ویسا سلام

اس کے بعد میدان میں کئی دیہاتی رنڈیوں نے بھی سلام کیا۔ فدوی میاں ہر ایک کا نام لے کر جواب دیتے تھے جیسا سلام ویسا جواب۔ ہر سلام کے بعد فدوی میاں مزاج پرسی کو بھی واجب سمجھتے تھے۔ اور ہر شخص کے ساتھ طرز پرسش میں جدت ہوتی تھی۔

گاڑی اس مکان تک پہنچی جسے دیکھنا منظور تھا۔ واقعی مکان قابل رہنے کے تھا۔ زنانہ مکان پختہ دو منزلہ باہر بیٹھنے کا مکان جسے قصباتی زبان میں بیٹھکہ (بہ تشدید قاف) کہتے ہیں۔ نہایت ہی معقول۔ اور اس کے سامنے بڑا سا احاطہ تھا۔ اس میں ایک طرف کچی کھپریلیں تھیں۔ گاڑی گھوڑے اور سائیس۔ خدمت گار وغیرہ کے رہنے کے لئے جابجا کچھ درخت مختلف قسم کے لگے ہوئے تھے۔ مگر بہت ہی بے تکے پن سے۔ کچھ بیلا۔ چنبیلی کے جھنڈ۔ کچھ مہندی کی روشیں۔ بانس کا پھاٹک لگا ہوا تھا۔ غرضیکہ مکان مرزا صاحب کے پسند آیا۔ شیو رتن بھی اس موقع پر پہنچ گیا تھا۔ ایک سیاہ فام سا آدمی۔ دھوتی بندھی ہوئی۔ اودی چھینٹ کی مرزئی پہنے۔ اسی چھینٹ کی دوہری ٹوپی۔ پاؤں میں چمڑودھا جوتا۔ گلے میں ایک بٹوا پڑا ہوا۔ یہ آپکا درباری لباس تھا کیونکہ اس وقت آپ براہ راست کچہری سے تشریف لائے تھے۔ تھانہ دار صاحب اور مرزا صاحب کے آنے کی خبر سن کے دوڑے چلے آئے۔ شیو رتن سے کرائے کے بارے میں گفتگو ہوئی اس موقع پر فدوی میاں ذرا ٹل گئے۔

سات روپے ماہوار پر وہ مکان لے لیا گیا اور اسی شب کو مرزا صاحب کا اسباب سفر وہاں آ گیا۔

دو پلنگ۔ تین کرسیاں۔ فدوی میاں کی سرکار سے بلا طلب بھیج دی گئیں۔ اور طوعاً و کرہاً مرزا صاحب کو رکھنا پڑیں۔

دریاں اور قالین مرزا صاحب کے ہمراہ تھے۔ کھانا پکانے کے برتن بھی کافی موجود تھے۔ مکان کی صفائی اور مختصر سامان کی آراستگی میں فدوی میاں کی دخل در معقولات ہوتی رہی۔ ایسے لوگ جو ہر کسی کام میں خواہ مخواہ دخیل ہو جاتے ہیں۔ ان میں ایک خاص وصف ہوتا ہے جسے کسر نفس کے سوا اور کیا کہا جائے۔ یعنی اس قسم کے لوگوں کو دوسروں کی اختلاف رائے سے چنداں ملال بھی نہیں۔ اگرچہ وہ اختلاف برے تیوروں سے کیا جائے مثلاً۔ اگر ان کی یہ رائے ہوئی کہ دری اس طرح بچھانا چاہیے اور پلنگ یوں لگانا چاہیے۔ اور میز کا رخ یوں رہے اور دیوار گیریوں کا وہ موقع ہے اور دوسرے شخص کی آسائش کا یہ اہتمام کر رہے ہیں۔ ان میں سے ہر تجویز کو بلا دلیل یا یہ الفاظ کہہ کے "صاحب آپ نہیں جانتے" مسترد کر دیا۔ یا ہر ایک میں ترمیم کر دی۔ تو ان کو نہ کچھ خفت ہوگی نہ ملال۔ ایسے ہی ہمارے سادہ دل رئیس موضع بجن پور۔ فدوی میاں صاحب تھے۔

جب گھر کی صفائی اور آراستگی سے فراغت ہوئی اور ہر چیز اپنے اپنے موقع سے لگا دی گئی۔ فدوی میاں نے یہ فرمایا۔

لیجئے لوور سیئر صاحب آپ کا مکان سج سجا گیا۔ اب اور جس چیز کی ضرورت ہو۔ وہ بھی حاضر کر دی جائے۔ کیونکہ خدا کے فضل سے سب کچھ ممکن ہے۔ فقط آپ کے اشارے کی دیر ہے......

مرزا صاحب۔ آپ کی عنایت کافی ہے۔ یہ سامان بھی میری ضرورتوں سے زیادہ ہے اور جو کچھ ضرورت ہوگی عرض کر دیا جائے گا یہ آخری جملہ مرزا صاحب نے اس خیال سے کہا تھا کہ تھانہ دار صاحب نے پہلے ہی کہا تھا کہ گھوڑا فدوی میاں کی کوشش سے بہت جلد اور کفایت سے مل جائیگا مگر فدوی میاں کو سلسلہ کلام کو طول دینے کا شوق تھا۔

فدوی میاں۔ لے تو فرما دیجئے نہ تاکہ اس کی ابھی سے فکر کی جائے۔ مرزا کے پاس اتفاق سے روپیہ نہ تھا۔ ان کو یہ خیال ہوا کہ ابھی کہنا کیا ضرور ہے پہلے روپے کی فکر ہو جائے تو دیکھا جائے گا۔

مرزا صاحب۔ عرض کروں گا۔

فدوی میاں:۔ تو آپ فرماتے کیوں نہیں اور چارپائیوں کی ضرورت ہو تو بھجوا دی جائیں۔ چینی کے برتن۔ پتیلیاں۔ لوٹے۔ گھڑے۔ مٹکے غرضیکہ جس طرح لڑکے پہیلی بجھواتے ہیں۔ یہ ایک ایک چیز کا نام لئے جاتے تھے اور مرزا نہیں نہیں کہتے جاتے تھے۔ ان کی حماقت اور سفاہت پر اگر کوئی اور ہوتا تو کھل کھلا کے ہنس دیتا۔ مگر مرزا صاحب ہی مہذب اور متین آدمی تھے اس پر بھی متبسم ہو گئے۔ مرزا صاحب کے تبسم سے فدوی میاں سمجھ گئے

ع۔ فکر ہر کس بہ قدر ہمت اوست

کچھ اور ہی سمجھتے تھے۔ مزاج کے سادے، بے تکلف فرمانے لگے۔

فدوی میاں:۔ اچھا تو پھر اس میں تکلف کیا ہے۔ کوئی پتریا بلا دیجائے کیونکہ اس میں ہرج کیا ہے۔ آپ نوجوان آدمی ہیں اور پھر لکھنو کے رہنے والے مرزا کے کان اس قسم کی گفتگو سے آشنا نہ تھے۔ یہ ایک خشک آدمی تھے۔

مرزا صاحب:۔ جناب آپ نے میرے اخلاق کا غلط اندازہ کیا۔ میں اس قسم کے مذاق کا آدمی نہیں۔ آپ کی خواہ مخواہ عنایتوں کا میں مجبوراً ممنون ہوں۔ آئندہ مجھ کو ایسے مذاق سے معاف رکھئے گا۔

فدوی میاں:۔ (بظاہر جھینپ کے اور خجلت زدہ صورت بنا کے دو تین طمانچے زور زور سے اپنے گالوں پر لگا کے اور دونوں کان مروڑ کے) توبہ! توبہ! خطا ہوئی۔ معاف کیجئے گا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ آپ مولوی آدمی ہیں۔

مرزا صاحب:۔ نہیں آپ کو کا کچھ قصور نہیں۔ یہ اس زمانے کی تہذیب کا قصور ہے۔ شاید آپ کو اسی طرح کے لوگوں سے زیادہ ملنے کا اتفاق ہوا ہو گا جو بیہودہ دل لگی مذاق یا چوسر۔ گنجفہ وغیرہ میں اپنے اوقات کو ضائع کیا کرتے ہیں۔ اگرچہ میں مولوی نہیں۔ مگر طالب علم ضرور ہوں۔

مرزا اپنی نیک نفسی سے فدوی میاں کی اس بات کو دل لگی سمجھے تھے۔ حالانکہ فدوی میاں کا مافی الضمیر حقیقت کا مشعر تھا نہ مجاز کا۔ کیونکہ آپکی ذات والا صفات سے یہ فیض اکثر ملازم پیشہ لوگوں کو پہنچتا رہتا تھا۔ تاہم اپنی نیک نیتی سے کہہ سکتے ہیں۔ کہ اس میں کوئی منفعت ذاتی از قسم زر فدوی کو نہ تھی بلکہ ان کا مذاق طبیعت اسی قسم کا واقع ہوا تھا۔ ضلع کی کون سی پتریا ایسی تھی جو آپ کی ممنون منت اور مطیع فرمان نہ ہو۔ ایک تو اس لئے کہ زمانہ ثروت میں آپ نے بالتخصیص اس فرقے کے ساتھ بہت سلوک کیا تھا۔ اکثر باغات اور اراضی آپ کی عطیہ رنڈیوں کے قبضے میں موجود تھیں۔ چار ہی دن کا ذکر ہے چھوٹے صاحبزادے چھٹن میاں کی تقریب ختنہ میں دس بیگہ زمین بی وفاتن کو۔ بیس درخت آم کے مع اراضی بی رسولن کو دیئے تھے۔ اسی تقریب میں موضع کھجن پور رہن ہوا تھا۔ یہ سب اوصاف فدوی میاں کے مرزا صاحب کو معلوم ہوتے رہے اور اسی قدر تنفر ان کے اخلاق سے بڑھتا گیا۔

اگرچہ گھوڑے کی خرید میں فدوی میاں کی رائے شریک رہی۔ اور اسی طرح اور معاملات میں خواہی نہ خواہی ان کا دخل رہا۔ لیکن مرزا ہر امر میں حتی الامکان ان سے دور بھاگتے تھے۔ لیکن فدوی میاں خی وضع داری سے بعید تھا کہ آپ مرزا صاحب کے پاس جانا ترک کرتے۔ بلکہ ان کو ایک طرح کی محبت مرزا سے ہو گئی تھی اور کچھ ایسا اخلاقی دباؤ پڑ گیا تھا کہ ان سے کسی قدر ڈرتے تھے۔

فدوی میاں کو کئی مرتبہ مرزا کے سامنے اپنے منہ پر طمانچے مارنے اور کان مروڑنے کا اتفاق ہوا۔ اس لئے کہ یہ موقع بے موقع بول اٹھتے تھے۔ جو امر مرزا کی شان کے خلاف ہوتا تھا۔ اس پر ان کو دانٹتے رہتے تھے۔ مثلاً۔

فدوی میاں کو یہ مسئلہ مرزا کی ذات سے تحقیق ہوا کہ وہ چیز جو عموماً بالائی آمدنی کہلاتی ہے اس کا لینا بالکل حرام ہے۔

فدوی میاں صوم صلوۃ کی پابندی اور ناجائز کے کھانے پینے کی چیزوں سے اجتناب کرنے کو مولویت اور زہد و ورع خیال کرتے تھے۔ ناجائز طریقوں سے اکتساب منفعت کرنے کو یہ گناہ ہی نہ جانتے تھے بلکہ حرام سمجھتے تھے۔

مرزا عابد حسین سے ان کو یہ بھی معلوم ہوا کہ شادی ہونے کا ... ہو گیا ہے۔ مگر عمید عمر ہو گیا ... حق کی امام دیا گیا ہے۔ فدوی میاں کو مرزا عابد حسین کی صحبت سے اکثر ایسے امور معلوم ہوئے جن کو یہ نہیں سمجھتے تھے کہ در حقیقت وہ بری تھے۔ رفتہ رفتہ فدوی میاں کو مرزا صاحب سے وہ اعتقاد ہو گیا جو معتقد کو اپنے مجتہد سے یا مرید کو اپنے پیر سے ہونا چاہیے۔ مگر فدوی میاں کی عادتیں اس حد تک خراب ہو چکی تھیں کہ ان کی اصلاح محال تھی۔ اہل محلہ کی خوشامد بے جا سخی و سیدھا پن۔ جھوٹ بولنا جھوٹی قسمیں کھانا۔ فحش اور بے تکا مذاق۔ راتوں کو رنڈیوں کا دربار۔ جھوٹے مقدموں کی اطاعت۔ بدمعاشوں کی حمایت اور اسی قسم کے لاکھوں معائب ان میں موجود تھے۔ مگر ان سب معائب کے ساتھ ایک وصف بھی تھا وہ یہ کہ خاندانی شرافت نفس کی وجہ سے طمع ان میں نہ تھی۔ اگرچہ اس وصف کے ساتھ ایک عیب بھی تھا یعنی اسراف جس کو لوگ جہالت سے اولوالعزمی کہتے ہیں۔ مرزا صاحب ان کے اس وصف کو پہچان گئے تھے۔ مرزا کا خیال تھا کہ ان کی یہ عادتیں کسی حد تک ترک ہو سکتی ہیں۔ بشرطیکہ کسی خاص اخلاقی قوت سے ان کے نفس پر اثر ڈالا جائے۔ مرزا نے تجویز کیا کہ مذہبی جوش اگر آپ کی طبیعت میں پیدا کر دیا جائے تو ممکن ہے کہ ان کی اولوالعزمی ان کو اس طرف متوجہ کر دے۔

فدوی میاں کے دو لڑکے تھے۔ ایک نثار علی جس کا سن چودہ برس کا تھا۔ دوسرا احمد حسن جس کا سن سات آٹھ برس کا تھا۔

نثار علی آوارگی کی حد تک پہنچ گیا۔ مگر ایک خاص صفت جو قصبات اور دیہات کے لڑکوں میں پائی جاتی ہے۔ یعنی شرم۔ اگرچہ وہ حد اعتدال سے کسی قدر زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن وہی ان کی درستی کا باعث ہوئی۔

فدوی میاں اپنے لڑکوں کی تعلیم سے غافل نہ تھے۔ ایک مولوی صاحب برسوں سے دروازے پر نوکر تھے۔ مگر لڑکا گلستان کا باب اول پڑھتا تھا۔ کئی سال ہو چکے تھے مگر اس کے ختم ہونے کی نوبت نہ آتی تھی۔ اور چھوٹا بغدادی قاعدہ سامنے لئے بیٹھا رہتا تھا۔ مرزا صاحب نے رفتہ رفتہ فدوی میاں کے معاملات خانگی میں دخل دینا شروع کیا۔ اور جس قدر مرزا صاحب ان کے معاملات میں دخیل ہوتے جاتے تھے۔ فدوی میاں اپنی ذمہ داریاں مرزا کے سپرد کرتے جاتے تھے۔ نوبت بہ اینجا رسید کہ فدوی میاں کا ہر کام مرزا نے اپنے ذمہ لے لیا۔ فدوی میاں کی وہ اس طرح محافظت اور نگرانی کرتے تھے جو نابالغ یا مجنون کے ولی کو کرنا چاہیے۔ اور فدوی میاں روز اول سے کچھ ایسا یا دو مرزا صاحب کا مان گئے تھے کہ بغیر ان کی صوابدید کے کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ جس قدر مرزا صاحب فدوی میاں پر توجہ کرتے جاتے تھے۔ شیور تن کو مرزا صاحب سے خوف پیدا ہوتا جاتا تھا۔ مرزا صاحب کو فدوی میاں اور شیور تن کے معاملات میں کچھ گھپلا اور غبن معلوم ہوئی اور در حقیقت ایسا ہی تھا۔ مرزا صاحب خود فرماتے ہیں کہ یہ راز مجھ پر شیور تن کی چشم ابرو سے ظاہر ہو گیا تھا۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ مجھے شیور تن کی نگاہیں فدوی میاں کے سامنے جھینپتی سی معلوم ہوتی تھیں۔ اس سے مجھے معلوم ہو گیا۔ کہ اس نے کسی قسم کی چالاکی ان کے معاملات میں ضرور کی ہے۔ اور وہ فدوی میاں سے کسی قدر دبتا بھی تھا۔ اس سے اور بھی یقین ہو گیا تھا کہ ابھی تک اس کی چالاکی کا تدارک فدوی میاں کے اختیار میں ہے۔

فدوی میاں کا اہل عملہ کے پاس دوڑ دوڑ کے جانا اس سے بھی مجھے ایک قسم کا شبہ سا پیدا ہوتا تھا کہ شاید فدوی میاں ان معاملات کے تدارک کی فکر میں ہیں۔ مگر ان کی بے پروائی نے اس شبہ کو رفع کر دیا تھا۔

مرزا صاحب فدوی میاں کو خفیف العقل سمجھتے تھے۔ اس لئے اپنے خیالات کو ان سے ظاہر کرنے میں انہیں تامل تھا۔ اس لئے کہ شاید وہ اس راز کو ظاہر کر دیں کہ مرزا کو ان کے معاملات کی درستی کی غیر معمولی فکر ہے۔ ان امور پر نظر کر کے مرزا نے خفیہ تحقیقات کرنا شروع کی۔ شیور تن ایک بڈھا آدمی تھا۔ وہ فدوی میاں کے والد کے زمانے میں ان کے کسی موضع کا ضلعدار تھا۔ جس زمانے میں فدوی میاں کے والد شیخ قربان محمد صاحب نے انتقال کیا۔ فدوی میاں جن کا اصلی نام شیخ فدا علی تھا، بہت ہی کم سن تھے۔ تولیت جائداد کی ان کے ماموں شیخ احمد کے سپرد ہوئی تھی۔ شیخ احمد ایک مشہور جعلیہ تھا۔ شیخ احمد کی تولیت کے زمانے میں بھی شیور تن کارکن رہا۔ بعد تحقیقات کے معلوم ہوا کہ شیخ احمد اور شیور تن کی سازش سے اس معاملے میں کوئی جعل ہوا ہے۔ مگر یہ پتہ لگتا تھا کہ

کیونکر اور کیا جعل ہوا ہے۔ مرزا کا خود بیان ہے کہ اس مقدمے کی تحقیقات کا مجھے ایسا شوق ہو گیا تھا کہ راتوں کو نیند نہ آتی تھی۔ ذرا ذرا سی باتوں کا علمی مشاہدات کے طور پر جانچتا اور پرتالتا تھا۔ شیو رتن کے تمام حرکات و سکنات پر شب و روز میری نظر رہتی تھی۔ اگرچہ اس سے مہینہ میں شاید ہی دو ایک مرتبہ میرے ان کے ملاقات ہوتی تھی۔ وہ بھی چند منٹ کے لئے، مگر میرا خیال ہر وقت اس کے ساتھ رہتا تھا۔ فدوی میاں اگرچہ بہت ہی سفیہ اور خفیف الحرکات آدمی تھے۔ مگر اپنی آبائی جائداد کو اپنے والد کے ایک ادنیٰ ملازم کے قبضے میں دیکھ کر ایک قسم کی حسرت جو اس کے بشرے پر ظاہر ہوتی تھی اس پر مجھے کمال تاسف ہوتا تھا اور جب سے میں یہ سمجھ گیا تھا کہ اس مقدمے میں شیو رتن نے یقیناً جعل کیا ہے اس وقت سے میرا بس نہ تھا کہ اس کو علاقے سے بیدخل کر کے فدوی میاں کو اس کی جگہ قابض کرا دوں۔ مگر میرا کوئی اختیار نہ تھا۔ ظاہراً یہ امر محال معلوم ہوتا تھا اور سب سے زیادہ اہم ان خیالات کی رازداری تھی۔ اس لئے کہ افشائے راز میں ناکامیابی کا اندیشہ ایک طرف۔ شماتت کا خیال دوسری طرف دامن گیر حال تھا۔ آخر بڑی مشکل سے بعض واقعات کا پتہ لگا۔ پھر تو پیچ در پیچ مشکلیں آسان ہونے لگیں۔ اور برسوں کی الجھی ہوئی گتھیاں سلجھ گئیں۔

معلوم ہوا کہ شیخ قربان علی فدوی میاں کے والد نے لکھنو میں وفات پائی تھی۔ سبب وفات مرض وبائی مشہور تھا۔ شیخ فدا علی کی والدہ اپنے شوہر کے سامنے مر چکی تھیں۔ شیخ احمد ان کا سوتیلا بھائی تھا۔

شیخ قربان علی کے لکھنو جانے کا سبب ایک مقدمہ اپیل تھا۔ مقدمہ کی روئداد یہ تھی کہ کسی راجپوت مسمی ماندھاتا نے بندوبست کے زمانے میں شیخ قربان علی کے علاقے پر دعویٰ کیا تھا۔ سرسری مقدمہ حاکم بندوبست نے خارج کر دیا۔ اس نے نمبری نالش کی۔ وہ بھی خارج ہوئی۔ پھر اس نے اپیل کی۔ اپیل بھی خارج ہوئی۔ پھر اس نے اپیل ثانی کی۔ یہاں وہ تمام لوگوں کے خلاف امید جیت گیا۔ جس دن عدالت العالیہ سے مقدمہ اس کے حق میں فیصلہ ہوا۔ وہی دن شیخ قربان علی کی وفات کا تھا۔ بلکہ اکثر لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ شیخ خودکشی کر کے مر گئے۔ اپیل سے جیتنے کے بعد چاہیے تھا کہ قابض جائداد ماندھاتا یا اس کے وارث ہوتے مگر بخلاف اس کے قابض جائداد شیخ احمد اور شیو رتن ہوئے۔ شیخ احمد لاوارث مر گیا۔ اس کے بعد شیو رتن بلامزاحمت احدے اور بے مشارکت غیرے تمام علاقے پر قابض اور متصرف رہا۔ فدوی میاں کے ساتھ اس کا سلوک اس طرح کا ہے جیسے کسی نمک حلال قدیم نوکر کو جو کسی وقت میں ملازم تھا اپنے آقازادہ کے ساتھ ہونا چاہیے جواب مفلس ہو۔ مگر اس سلوک میں ظاہرداری کسی طرح کھل جاتی تھی۔ جائداد پدری سے ایک بسوہ زمین شیخ فدا علی کو نہیں ملی موضع نجن پور جس کا نمبر اب تک اس کے پاس ہے اور جو شیو رتن کے پاس کئی سال پیشتر رہن ہو چکا ہے وہ موضع ان کی والدہ کا تھا۔ کل جائداد کا مالک بالفعل شیو رتن تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ حتیٰ کہ مکانات بھی اس کے نام رہن ہیں۔ مگر وہ بطور مایحتاج شیخ فدا علی کو گذارہ دیتا ہے۔ اور موضع نجن پور کے آسامیوں سے جو کچھ چھین جھپٹ کے وصول ہو جاتا ہے وہ گویا بالائی آمدنی ہمارے عنایت فرما شیخ فدا علی صاحب کی ہے۔ مرزا کو یہ واقعات جو اوپر بیان کئے کئی برس کی تحقیق کے بعد معلوم ہوئے یہ تو ان پر ظاہر ہو گیا تھا کہ اس معاملے میں کسی قسم کی چالاکی ہوئی ہے۔ رہا یہ امر کہ وہ قابل تدارک ہے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ تفصیلی حالات کے معلوم ہونے کے بعد ہو سکتا ہے۔ منہ سے کوئی بات نکالنا............ ایک تو اس مقدمے کے لئے مضر تھا۔ جس کا سبب اوپر بیان ہوا اور مرزا کا استقلال بھی اسی کا متقاضی تھا کہ جب تک کوئی صورت یقینی کامیابی کی نہ پیدا ہو ایسی باتوں کا منہ سے نکالنا سفاہت پر محمول کیا جائے گا۔ ان کا یہ منصوبہ تھا۔ کیا خوب ہو۔ اگر میں اس معاملے کا پورا پتہ لگا کے اور تدارک کی کافی تدبیر کر کے اس کو زبان سے نکالوں۔ پانچ برس تک اس معاملے سے مرزا کو تعلق خاطر رہا۔ فدوی میاں تو روز ہی مرزا کے پاس موجود رہتے تھے اور شیو رتن بھی کبھی کبھی آ نکلتا تھا۔ مگر دونوں کو ان کے کسی اشارے کنائے سے یہ نہ ثابت ہوا کہ وہ ان کے حق میں کیا کرنے والے ہیں۔ اس اثنا میں کئی بار ان کو لکھنو آنے کا اتفاق ہوا جوڈیشل کے محافظ خانے میں دن دن بھر گذر گیا کل مقدمہ کی روداد سے انھوں نے واقفیت حاصل کر لی۔

جب تحقیقات کماحقہ کر چکے تو اس راز کو ایک خاص مطلب کے لئے راقم الحروف (مرزا رسوا) پر ظاہر کیا۔ اور بعض امور مجھ کو تعلیم کئے جس کا حال ناظرین کو آئندہ بیان سے معلوم ہو جائے گا۔ اس مطلب کے لئے مجھ کو مرزا کے پاس ضلع....... جانا پڑا۔ اتوار کا

دن تھا۔ مرزا دیوان خانہ (بیٹھک) میں تشریف رکھتے تھے۔ فدوی میاں اور مجھ سے مذاق کی باتیں ہو رہی ہیں کہ مرزا نے فلسفہ علی کے چپراسی کو بلا کے کہا۔ شیور تن کو بلا لاؤ۔ شاید اس سے پہلے مرزا نے کسی موقع پر شیور تن کو یاد نہ کیا ہوگا۔ میں تو اس معاملے سے واقف تھا۔ مگر فدوی میاں کو البتہ تعجب ہوا ہوگا کہ آج شیور تن خلاف معمول کیوں بلایا جاتا ہے۔

شیور تن حسب المطلب سامنے آ کے کھڑا ہوا۔ مرزا نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گیا۔ مرزا نے اس سے چند معمولی غیر ضروری باتیں کر کے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

مرزا۔ ہاں تو ولایت علی خاں مر گیا۔

میں نہیں بیان کر سکتا کہ اس نام کے سننے کے بعد شیور تن کے دل پر کیا گذری اور اس کے چشم و ابرو سے کس قسم کے آثار پائے گئے۔

میں۔ جی ہاں مر گیا۔ اس کو مرے ہوئے دو مہینے ہوئے ہوں گے۔

مرزا۔ آپ جانتے ہیں یہ کون شخص تھا؟

رسوا۔ میں خوب جانتا ہوں۔ کٹاری ٹولہ کے متصل وہ گلی جو کالکوں کی طرف جاتی ہے۔ نیم کے درخت کے سامنے۔

مرزا۔ آپ خوب جانتے ہیں۔ مگر آپ نے سنا ہوگا کہ کس بری گت سے مرا ہے۔

رسوا۔ جی ہاں بندگان خدا کی حق تلفی کا یہی انجام ہوتا ہے۔

مرزا۔ سنتے ہیں لاوارث تھا۔ مرنے کے بعد کل اسباب پولیس میں اٹھ گیا ہوگا اور یقین ہے کہ پولیس ہی نے اسے دفن کیا ہو۔

رسوا۔ جی ہاں یہی ہوا۔ اور ہو نا ہی کیا تھا۔

مرزا۔ اور وہ تکیہ جو اس کے سرہانے رہتا تھا۔

رسوا۔ اس کا حال پھر عرض کرونگا۔

اس گفتگو کے بعد ہم اور مرزا ادھر ادھر کا ذکر کرنے لگے۔ شیور تن کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ وہ ابھی اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ مرزا نے گاڑی کسوانے کا حکم دیا۔ مرزا صاحب اور میں دونوں اٹھ کھڑے ہوئے ____ ____ مرزا صاحب نے فدوی میاں کا ہاتھ پکڑ لیا۔ گاڑی پر سوار ہوئے راستہ میں سوائے اس چٹکلہ کے جو مجھ سے مخاطب ہو کے کہا تھا'

"کیوں دیکھا آپ نے ہم نہ کہتے تھے۔" جس کا میں نے یہ جواب عرض کیا تھا۔ جی ہاں آپ کا خیال بہت صحیح تھا' اور کوئی گفتگو اس مقدمہ کی نہیں ہوئی۔ دوسرے دن معلوم ہوا کہ شیور تن رات ہی کو لکھنو گیا۔

اس واقعے سے ہمارے خیالات اور پختہ ہو گئے۔ کئی دن کے بعد لکھنو سے واپس آیا۔

مرزا کا موکل شکرم میں شیور تن کے ساتھ ساتھ تھا۔ شکرم لکھنو پہنچی۔ موکل ساتھ تھا' شیور تن امین آباد کی سرا میں اترا۔ وہاں تھوڑی دیر ٹھہر کے چوک کی طرف روانہ ہوا۔ گول دروازے کے قریب پان والی گلی کی طرف سے ولایت علی خاں کے مکان پر پہنچا۔ (جس مکان میں ولایت علی خاں رہتا تھا۔ وہاں اب شوالہ بن گیا ہے۔ شیور تن وہاں کے دکانداروں سے کچھ پتہ دریافت کر کے اس سمت کی طرف چلا۔ جہاں تیرہ و تاریک گلیاں بہت دور تک چلی گئی ہیں۔ اس کے بعد ایک نالہ ملتا ہے پھر ایک فقیر اسا ملا۔ اس پر گیا۔ وہاں ایک شخص کو آواز دی وہ گھر سے نکلا۔ دونوں میں کچھ باتیں ہوئیں۔ ولایت علی خاں کو مرے ہوئے دوسرا مہینہ تھا۔ یہ ٹھیک پولیس کی معرفت دفن ہوا تھا مگر تکیہ کا پتہ نہ ملا۔ اس کے بعد موکل اور شیور تن دونوں امین آباد کی سرا میں آئے۔ اس نے حلوائی کی دکان سے پوریاں لے کے کھائیں۔ موکل نے بھی اسی حلوائی سے پوریاں لیں۔ اس کے بعد شیور تن نظیر آباد کی طرف چلا۔ اس کے

بعد اس نے دو دن تک کچہریوں کی خاک چھانی۔ آخر مایوس ہو کر واپس چلا۔ موکل اس سے ایک دن پہلے ہمارے پاس پہنچ گیا تھا۔

وہ تکیہ جس میں شیور تن کی جان تھی ہمارے قبضے میں کئی مہینے پیشتر آ چکا تھا۔ اس میں چند کاغذات تھے اور وہ کاغذات سب فدوی میاں کے علاقے کے متعلق تھے۔

اب ہم اس جعلسازی کو کھولے دیتے ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہوا کہ ماندھاتا عدالت العالیہ سے مقدمہ ہار گیا تھا۔ جیسی کہ توقع تھی۔ مگر اسی کے دوسرے یا تیسرے دن شیخ قربان علی نے بعارضہ "نقص" بخار انتقال کیا جیسا کہ ظاہراً ثابت ہوتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شیور تن اور شیخ احمد جو شیخ مرحوم کے ہمراہ تھے ان دونوں نے سازش کر کے شیخ کو کچھ کھلا پلا دیا ہو۔ مگر اس قدر عرصے کی بات تھی۔ اس کا ثبوت دشوار بلکہ محال ہے۔ علاقے کے باب میں یہ چالاکی کی گئی کہ اصلی فیصلہ محافظ خانہ سے اڑوا کے اور بجائے اس کے ایک فیصلہ بحق ماندھاتا ولایت علی خاں کی معرفت بنوالا گیا۔ پھر ماندھاتا اور شیخ احمد اور شیور تن میں کچھ ایسا من سمجھوتا ہو گیا کہ ماندھاتا کچھ رقم معتدبہ لے کے علیحدہ ہو گیا۔ اور اس سے ایک رہن نامہ بنام شیور تن ہو گیا۔ شیخ احمد کے نام رہن نامہ ہوتا مگر اس کی حیثیت اس لائق نہ تھی۔ اور شیور تن شیخ قربان احمد کے زمانہ ہی میں لین دین کرتا تھا اور بڑا روپیہ والا مشہور تھا۔ اصل فیصلہ عدالت جو ولایت علی خاں کو بطور نمونہ کے دیا گیا تھا وہ اس نے دبا رکھا۔ اور اس کے ذریعے سے وہ شیور تن کو وقتاً فوقتاً دبا کر کچھ لے لیا کرتا تھا۔

آخر میں ولایت علی خاں نابینا ہو گیا تھا۔ جب وہ خرچ سے تنگ ہوتا تو ایک خط دباؤ ڈالنے کے لئے شیور تن کو لکھ بھیجتا۔ وہ کچھ نہ کچھ بھیج دیا کرتا تھا۔ مگر قلیل مقدار۔ اس لئے کہ شیور تن خوب جانتا تھا کہ ولایت علی وہ کاغذات پولیس یا عدالت میں داخل نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ وہ خود مجرم ہے مگر پھر بھی احتیاطاً کچھ دے نکلتا تھا۔ جب مرزا اس مقدمے کی تحقیقات میں مصروف ہوئے۔ ایک دن شیور تن کے نام کا ایک پوسٹ کارڈ مرزا کی ڈاک کے ساتھ چلا آیا۔ اس پوسٹ کارڈ میں اگرچہ کوئی امر تفصیلی طور سے نہ لکھا تھا مگر ولایت علی خاں کو مرزا اچھی طرح جانتے تھے ولایت علی خاں کا نام پوسٹ کارڈ پر دیکھتے ہی گویا تمام مقدمہ کا پتہ چل گیا۔

پوسٹ کارڈ کا مضمون یہ تھا کہ شیور تن کو معلوم ہو کہ ہمارا آخری وقت ہے۔ کچھ ہماری مدد کرنا چاہیے۔ کاغذات ہم سے لے لو۔ اور جو کچھ تم سے ہو سکے ہم کو دے دینا۔ ورنہ مرتا کیا نہ کرتا۔

اس پوسٹ کارڈ کو مرزا نے دبا رکھا۔ اور ایک موکل شیور تن کی طرف سے ولایت علی خاں کے پاس گیا۔ اور پچاس روپے دے کے وہ کاغذات اس سے حاصل کر لئے۔ اس کے چند ہی روز بعد ولایت علی واصل جہنم ہوا۔ واقعی بہت بری طرح سے مرا۔ ایسے بے ایمانوں کا ایسا ہی انجام ہونا چاہیے۔

ان واقعات کے مفصل ذکر کے بعد اب اس کے کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ شیور تن کس قدر سہولت کے ساتھ تمام جائداد سے دست بردار ہونے پر راضی ہو گیا ہو گا۔ باہمی فیصلہ کر لینا مناسب وقت تھا۔ اس لئے کہ اگرچہ جعل کا ثبوت قطعی ہاتھ آ گیا تھا اور شیور تن واقعی مجرم تھا۔ اس لئے وہ بہت ہی خائف تھا۔ مگر بہت عرصے کی بات ہے۔ اس لئے مرزا کی احتیاط اسی کی مقتضی ہوئی کہ یہ مقدمہ عدالت تک نہ جائے اور شیور تن بھی یہی چاہتا تھا۔ ________ لہذا شیور تن نے کل جائداد کا بیعنامہ فدوی میاں کے نام کر کے صرف ایک موضع اپنے نا چھڑوا لیا اور اس فیصلے کے چند ہی روز کے بعد تیرتھ کو چلا گیا جہاں سے اس وقت تک واپس نہیں آیا۔

اب فدوی میاں کا حال نہ پوچھئے پورے رئیس بن گئے۔ مگر مرزا کو ابھی تک اسی طرح مانے جاتے ہیں۔ اور کوئی کام بغیر ان کی صلاح مشورے کے نہیں کرتے۔

بھنور کی دلہن

راشد الخیری

بادشاہی باغ جس نے صاحبقران ثانی جیسے جلیل القدر شہنشاہ سے لے کر بیچارے بہادر شاہ تک کے جلوس اپنی آنکھ سے دیکھے تھے۔ خواتین مغلیہ کے قدم اپنے سر آنکھوں پر رکھے۔ دلی سے چار میل شاہدرہ اسٹیشن کے قریب واقع ہے متواتر پانچ ساڑھے پانچ صدی تک بادشاہی باغ نے جو عیش کیے ہیں اس کی نظیر پردہ دنیا پر مشکل سے ملے گی برسات کے موسم میں باغ کا اندھیری حصہ ایک طلسم کدہ تھا آم اور جامن کے گنجان درخت زمین میں اس طرح جھول رہے تھے کہ مالی اور باغبان تو در کنار بہتر سے بہتر صناع دنگ رہتے تھے ڈھائی تین فرسنگ درختوں کی یہ دورویہ قطار اس طور پر چھائی ہوئی تھی کہ چھاجوں پانی پڑ جائے مگر ایک قطرہ زمین تک نہ پہنچے۔ اندھیری حصہ کی مشرقی سمت پر جمنا لہریں لیتی تھی ساون بھادوں کی اکثر راتیں اور بیشتر دن مغل بادشاہوں نے اس باغ میں بسر کئے۔ جب اودی اور سیاہ گھٹائیں آسمان پر چھا جاتی تھیں بجلی کوندتی تھی بادل گرجتا تھا تو یہ سیر کے رسیا جھولوں کا لطف اٹھاتے تھے۔ گنگا جمنی ڈوریوں میں روپہلی سنہری پڑیاں پڑ جاتی تھیں۔ قلعہ معلیٰ کی پریاں لال سبز جوڑے پہن پینگیں چڑھاتی تھیں اور جھولنے والیوں کی بھنبیری آوازیں زمین سے اٹھ کر کوئل کی کوک اور پپیہے کی صدا سے ٹکراتی تھیں۔

آج کل باغ کی کل کائنات چند درخت ایک ٹوٹی ہوئی محلسرا اور شکستہ دیواریں ہیں۔ بیگم پسند کنواں تو زندہ ہے مگر کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا جہاں آدمیوں کی کثرت سے تل دھرنے کو جگہ نہ تھی وہاں اب دن دہاڑے گیدڑ پھرتے ہیں۔ وسط باغ میں فیروز خاں تاتاری ملازم کی جھونپڑی ہے جو ان درختوں کی رکھوالی کرتا ہے اور اپنی جوان لڑکی فیروزہ کو لئے ہوئے زندگی کے دن پورے کر رہا ہے۔

۲

شمع آفتاب جھلملا جھلملا کر دم توڑ رہی تھی روز روشن کا جنازہ دفن کے قریب تھا اور بادشاہی باغ کے درخت جو قبروں میں پاؤں لٹکائے کھڑے تھے اپنے دور شباب کا مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ پتوں کی موسیقی اور پرندوں کا نغمہ شام کا گجر بجا رہا تھا کہ فیروزہ اپنے میلے دوپٹے کے بائیں آنچل کو کندھے پر ڈالتی ہوئی جھونپڑی سے باہر نکلی اس کی کٹیا مصنوعی دنیا کے جھوٹے تکلفات اور ان سامانوں سے جو امیر زندگی کا جزو ہو گئے ہیں پاک تھی مگر اطمینان کی ایک خاموش مسرت گھاس پھونس کے اس ڈھیر پر برس رہی تھی۔ شباب کا یہ مجسمہ جس پر حسن قربان ہو رہا تھا۔ زندگی کے تمام آلام و افکار سے صاف تھا وہ جوانی کے جذبات سے قطعی ناآشنا تھی۔ مگر ایک نامعلوم طاقت اس کے دل میں کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ کیا؟

۳

حسین علی زمیندار کا لڑکا احسن صبح سے جمنا کے کنارے شکار کھیل رہا تھا۔ قازوں اور مرغابیوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ نوکر چاکر دوست احباب آٹھ دس آدمی اور پانچ چھ بندوقیں ہمراہ تھیں احسن اپنی کامیابی پر خوش اور مصاحب نشانہ کی داد دینے میں سرگرم تھے وہ دولت کے نشہ میں جھوم رہا تھا اور کتاب عمر کا ہر ورق بتا رہا تھا کہ ناکامی کا وجود اس دنیا میں صرف مفلسوں کے واسطے ہے دوپہر کا دستر خوان انواع و اقسام کی نعمتوں سے لبریز تھا کچھ بہشتی کچھ بھنگنیں کچھ چمار ہجور ہجور کہہ کر پیٹ بھر رہے تھے ان کلیوں کی طرح جن سے شگفتہ ہوتے ہی شہد کی مکھیاں اور بھنورے ہر وقت بھنبھناتے رہتے ہوں۔ جنہوں نے کبھی بھول کر بھی گلچیں کی صورت نہ دیکھی ہو احسن کے دولتمند کان خوشامد سے بھرے ہوئے تھے جوانی کی رعونت رگ رگ میں موجود تھی اس پر دولت کی افراط ان عید تھارات شب برات۔ زمیندار گاؤں کا خدا ہوتا ہے آسامیاں رعیت نہیں بندے ہوتے ہیں ان کی دولت ان کا گھر ان کی عزت ان کا مال و متاع ملکیت ہوتا ہے زمیندار کی۔

احسن نے اسی ماحول میں آنکھ کھولی اور ان ہی خیالات میں پرورش پائی۔ سچ پوچھو تو باپ کی زندگی ہی میں گاؤں کا بادشاہ بن چکا تھا۔ اکلوتا بچہ تھا۔ کس کی مجال تھی کہ اس کا حکم ٹالے۔ ابھی پندرہ دن بھی نہ ہوئے تھے کہ اس نے محض اپنے حکم سے ایک دھوبی کا مکان اپنے دار وغہ کو دلوا دیا۔

۴

شام ہونے لگی تو احسن نے منہ ہاتھ دھویا۔ شکاری لباس تبدیل کیا۔ چائے پی اور ایک مصاحب سے کہا۔ "میر صاحب، جینٹ صاحب شکار کو گئے اور خاک نہ ملا۔ منجھلے میاں تین دن حیران رہے اور چڑیا کا بچہ نہ لائے۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ یہ لوگ خالی ہاتھ کس طرح آتے ہیں۔ ہم کو تو ہمیشہ اتنا ملتا ہے کہ ڈھویا نہ جائے۔ یہ دیکھئے۔ پرے کے پرے لگے ہوئے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ میرا فیر آج تک خالی ہی نہیں گیا۔"

میر صاحب:۔ سرکار آپ کی بات آپ کے ساتھ ہے حضور کا تو ارادہ ہی شکار کے واسطے ملک الموت ہے ساری دنیا کہہ رہی ہے کہ اس وقت ہندوستان میں دو شخص ہیں ایک نواب حیدر آباد اور ایک حضور جن کا نشانہ خطا ہی نہیں ہو سکتا۔

احسن:۔ مجھے تو انگریزوں پر تعجب ہے کہ وہ بھی میرے نشانہ کی تعریف کرتے ہیں۔

میر صاحب:۔ جی ہاں کلکٹر صاحب کے خانساماں نے مجھ سے خود کہا کہ صاحب تعریف کرتے تھے۔

احسن:۔ یہ لوگ اصل میں پیترے کے قدر دان ہیں۔ پچھلے موقعہ پر صاحب کے ساتھ میں نے بھی کئی فیر کئے یہ اتفاق تھا کہ سب خالی گئے مگر صاحب نے پیترا بہت پسند کیا۔

میر صاحب:۔ حضور یہ تو حکومت ہی پیترے کی کرتے ہیں۔ یہ جو دن رات قواعد اور پریڈ ہوتی ہے یہ ہے کیا؟ بس پیترا۔

احسن:۔ میر صاحب ہاں وہ دھوبی کا کیا ہوا۔

میر صاحب:۔ بھلا حضور کے حکم کو کوئی ٹال سکتا ہے۔ رعیت کی کیا مجال ہے کہ اف کر سکے۔

احسن:۔ یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ مکان دھوبی ہی کا تھا۔ مگر اس کے اکڑنے پر مجھے غصہ آ گیا۔

میر صاحب:۔ حضور نے اس کو بہت اچھی سزا دی اب ایک درخت کے نیچے بال بچوں کو لے کر پڑتا ہے بس عمر بھر کو ٹھیک ہو گیا۔

احسن۔ ان کمینوں کو اسی طرح درست کرنا چاہیے۔

میر صاحب۔ آؤ ذرا بادشاہی باغ کی سیر کریں۔

۵

آسمان کی بساط اور زمین کا دامن دونوں آفتاب و ماہتاب کے ظاہری اثرات سے پاک تھے۔ درختوں کے قہقہے فضائے آسمانی میں گونج رہے تھے۔ جھٹ پٹا وقت تھا۔ ہلکی ہوا۔ سرسبز پتیوں کو گدگدا رہی تھی۔ جامن کی خاموش پھننگ پر بیٹھا ہوا ایک طائر شاہی باغ کے انقلاب کا مرثیہ پڑھ رہا تھا۔ رات چودھویں تھی اور کائنات کی آنکھیں قمر چہاردہم کے واسطے آسمان پر لگی ہوئی تھیں کہ شاہی باغ کی کنیا سے زمینی چاند بر آمد ہوا۔ حسن کی مجسم تصویر فیروزہ اپنی جھونپڑی سے باہر نکلی چاروں طرف دیکھا۔ بادشاہ پسند کنویں پر آ کر پانی بھرا اور پانی کے دو گھڑے لے کر کیاری میں آئی۔ رنگ برنگ کے پھول کھل رہے تھے اور ہوا نے باغ کو معطر کر رکھا تھا چمبیلی کے درختوں میں پانی دیا جوئی اور موتیا کو ٹھیک کیا۔ گلاب کے پاس پہنچی تو دیکھا کہ ایک شاخ کے دو پھول ہوا میں جھوم جھوم کر گلے مل رہے ہیں۔ فیروزہ ابھی اس جذبہ سے جو اس سلسلے میں کام کر رہا تھا قطعاً نا آشنا تھی مگر فطرت نے پھولوں کی اس حرکت پر اس کے قلب میں ایک آگ لگا دی۔ وہ جھک گئی ہوا کا جھونکا زور سے آیا پھولوں نے ایک دوسرے کے منہ چومے اور اس کے ساتھ ہی ان دونوں کو آنکھ سے لگانے میں باغ کا ایک تیسرا پھول فیروزہ شریک ہوئی وہ یہ سب کچھ کر رہی تھی مگر بے خبر تھی کہ کیوں اور ناواقف تھی کہ کیا؟

فیروزہ کی خاموش انگلیاں پھولوں سے کھیل رہی تھیں وہ کبھی پھولوں کو ہونٹوں سے لگاتی تھی کبھی سر پر رکھتی اور پھر چھوڑ دیتی۔ پھول ہوا کے دریا میں تیرتے اور وہ ان سے لپٹ جاتی اس کا حسن تصنع سے پاک تھا۔ اس کی آنکھیں سرمہ اور کاجل سے صاف تھیں اس کا چہرہ پاؤڈر سے اس کا لباس لونڈر سے اس کے ہاتھ چوڑیوں سے اس کا سینہ زیور سے ہزاروں کوس دور تھا۔ لیکن وہ اس پر بھی ایک مجموعہ تھی ان خوبیوں کا جن پر قدرت خود فخر کر رہی تھی سیاہ اور گھن دار بال حسین چہرہ کی کروٹوں میں آ پڑے تھے اور اس کو مطلق خبر نہ تھی کہ وہ کہاں ہے۔ اور کیا کر رہی ہے۔ پھولوں کی نازک پنکھڑیاں اپنی کامیابی پر نہال تھیں۔ آم کا درخت سر پر چھایا ہوا تھا کہ بلبل کے نالۂ رقابت نے اس کو چونکا دیا۔ پریشان بال درست کئے سامنے دیکھتی ہے تو ایک نوجوان گم سم ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا ہے۔ تاتاری خون رنگ لایا غیر نظریں دیکھتے ہی آنکھیں غصہ سے سرخ ہو گئیں مگر خون کا یہ دورہ طیش و غضب میں بجھا ہوا ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ ایک متضاد جذبہ نے یہ بھڑکتی ہوئی آگ ٹھنڈی کی۔ بلند آنکھیں نیچی ہوئیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ شوق نے نیچی نگاہیں پھر بلند کیں اور آناً فاناً یہ تین مختلف کیفیتیں فیروزہ کے قلب پر گذر گئیں۔ جذبہ غیظ جل بجھ کر تلاش سے بدلا۔ تلاش نے شوق کی صورت اختیار کی اور آخری طاقت جس نے دوبارہ آنکھیں جھکوا دیں نسوانیت تھی۔ یہ سب کچھ ہوا اور ہو چکا مگر فیروزہ اب تک یہ نہ سمجھ سکی کہ کیا ہوا!

۶

مہتم لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ میں تین روز سے مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہوں یہ تمام عمر میں پہلا اتفاق ہے کہ مجھ کو اس قسم کی تکلیف ہوئی تم سب فضول باتیں کر رہے ہو اور اتنا نہیں ہو تا کہ اس کو یہاں تک لاؤ۔ وہ عورت نہیں حور ہے جو بادشاہی باغ کی جنت میں رہتی ہے ایک ہیرا ہے جو گلاب کی کیاری میں چمک رہا تھا۔ ایک چاند ہے جو باغ میں اتر آیا تھا تم لوگ نمک حرام ہو اور باتیں بنانے کے سوا کچھ نہیں جانتے۔ "(احسن)

"غریب پرور اس بد نصیب فیروز خاں کے سر پر تو قضا سوار ہے کہ نمک حرام نے بل بھرا آخر اجڈ گنوار ہے۔ اکڑ گیا اس نے یہ نہ سوچا کہ کجا وہ اور کجا سرکار۔ اس کے سر پر موت کھیل رہی ہے۔ اس کی ہستی کیا ہے کہ دم مار سکے اپنی اصلیت کو نہیں دیکھتا حضور کے حکم کی دیر ہے ہم تو فیروز کو جان سے مار ڈالیں۔" (ایک مصاحب)

"مگر وہ لڑکی بہت خوبصورت ہے، مغلانی کہہ رہی تھیں کہ مجھ کو دیکھ کر باغ باغ ہو گئی پٹھان تو بگڑتا رہا اور وہ ہنستی رہی۔" (دوسرا مصاحب)

بھئی بہت ٹھیک۔ (۱)

بے شک۔ (۲)

بے شک بے شک (۳)

بس پتہ چل گیا۔ (۴)

"ہاں یہ کون کہہ رہا تھا کہ بڑے سرکار حکم دیں تو اسی وقت کام ہو جائے۔" (پہلا)

"اور اس میں کلام ہی کیا ہے۔" (دوسرا)

"سرکار نے بلوایا تھا اس نے انکار کر دیا" (تیسرا)

"یہ تو حد ہو گئی" (چوتھا)

۷

احسن اور اس کے مصاحبوں نے ہر ممکن کوشش سے کام لیا منت خوشامد کی زبردستی کی ڈرایا دھمکایا سمجھایا بجھایا مگر فیروزہ کا دل نہ پگھلا سکے۔ بلوچ تھا تو ایک ٹانگ کا آدمی لیکن غیرتمند قوم کا جری فرد، وہ کھری کھری سنائیں کہ سب منہ تکتے رہ گئے فیروزہ صبح کے وقت ایک ہندو رئیس کے جمنا پار روزانہ ڈالی لیکر جاتی تھی اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ گھنٹوں پہلے کنارہ دریا پر آ بیٹھتا۔ اور فیروزہ کی صورت دیکھ لیتا اس نامعلوم کیفیت سے جو اندر ہی اندر فیروزہ کو زیروزبر کر رہی تھی اب پردہ اٹھنے لگا۔ اور وہ اتنا سمجھ گئی کہ جس بے باکی سے میری آنکھیں آج کائنات کی ہر شے کا مطالعہ کرتی تھیں احسن کی طرف جانے میں اس بے باکی کے ساتھ کوئی اور چیز بھی شامل ہے جو وقتاً فوقتاً رنگ بدل رہی ہے۔ کبھی حیا انگیز ہوتی ہے کبھی شوق کبھی تعجب اور کبھی تلاش ایک مہینہ سے زیادہ اسی طرح گزر گیا اور اب فیروزہ کا معصوم قلب محبت کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا کہ وہ جب علی الصبح اٹھتے ہی رائے صاحب کے ہاں جانے کی تیاری کرتی تو ادائیگی فرض کے ساتھ ہی احسن کو دیکھنے کی بھی ایک مسرت پاتی جون کا دوسرا ہفتہ تھا گرمی شدت سے پڑ رہی تھی جمنا پایاب ہو گئی تھی اور پاٹ بہت مختصر ایک روز جب فیروزہ بیچ دریا میں تھی اس کا پاؤں اٹھا اور گر گیا۔ رنگ برنگ کے پھول اور پودینہ کی سبز پتیاں پانی میں تیرنے لگیں۔ شلجم۔ چقندر اور بینگن ڈوب گئے احسن ایک چٹان پر بیٹھا یہ دیکھ رہا تھا فیروزہ کے گرتے ہی وہ بیتاب ہو گیا مدد کو دوڑا اور ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

صبح کا وقت تھا جنگل اور دریا سنسان اور چند آبی پرندوں یا آبی جانوروں کے سوا ان چار آنکھوں کا تماشہ کسی اور آنکھ نے نہ دیکھا۔ احسن بہتے ہوئے پھول پکڑ پکڑ کر لایا ڈوبی ہوئی ترکاریاں ٹٹول ٹٹول کر نکالیں اور وہیں کھڑے کھڑے ڈالی سجائی۔ فیروزہ کا دل چاہتا تھا کہ وہ محسن کا شکریہ ادا کرے۔ مگر بہت سی طاقتیں ایسی غالب تھیں کہ وہ کہہ تو کچھ نہ سکی مگر کرا اتنا ضرور سکی کہ چلتے وقت اس کی آنکھوں نے مسکرا کر احسن کو دیکھا اور اس مسکراہٹ میں بہت کچھ پنہاں تھا۔

٨

دریا کی لہریں جنھوں نے فیروزہ کے گرنے پر قہقہے لگائے خاموش تھیں اس صبح کو جب درد دل سے نا آشنا حسینہ خاموش کھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی اور احسن کی صورت نظر نہ آتی تھی آج اس کو معلوم ہو گیا کہ دل جن گتھیوں کو سلجھا رہا تھا جذبات جن ساتھیوں سے کھیل رہے تھے اور خواہشیں جس تخیل میں ڈوب رہی تھیں اس کی کیا حقیقت ہے اور احسن کا انتظار اور ناکامی یہ معنی رکھتا ہے کہ۔

"اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی"

اسی حالت میں پار گئی اور بار بار واپس آئی تو پھر سناٹا تھا۔ دیر تک کھڑی رہی مایوس ہوئی تو باغ پہنچی دن تڑپ تڑپ کر اور رات رو رو کے لے کر ختم کی ابھی آفتاب طلوع ہی ہوا تھا کہ باہر نکلی پھول توڑے ترکاری اکٹھی کی اور ڈالی سجا کر دریا پر آئی۔

٩

پرندوں کا نغمہ فضائے آسمانی میں گونج رہا تھا۔ جمنا رات کی نیند ختم کر چکی تھی اور لہریں چاندی میں دھلی ہوئی بہہ رہی تھیں۔ کہ فیروزہ کی منتظر آنکھوں نے احسن کی صورت دیکھی مگر انتظار و اشتیاق نفرت سے بدلا اس کی رسیلی آنکھوں میں بلوچی حرارت پیدا ہو گئی۔ تیوری پر بل پڑ گئے اور اس نے نفرت کے ساتھ منہ پھیر لیا۔

آج پہلا روز تھا کہ احسن اس کے قریب پہنچا۔ ہر چند ہمت کی کہ اس کے قدموں کو ہاتھ لگائے اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے ملے، مگر یہ تمام جذبات جو رفتار کے ساتھ ترقی کر رہے تھے قریب پہنچتے ہی فنا ہو گئے۔ اور اتنی ہمت بھی نہ رہی کہ اس کے سوا کچھ کہہ سکتا۔

"کل پاؤں کا درد زنجیر بن کر پاؤں میں پڑ گیا"

فیروزہ نے یہ الفاظ خاموشی سے سنے اور اتنا کہہ کر پانی میں اتر گئی۔

"میں تو اس باپ کی بیٹی ہوں جو صرف ایک پاؤں سے دنیا کا مقابلہ کر رہا ہے۔"

١٠

اس سے پہلے کہ میں آپ کی درخواست کا جواب دوں میں آپ کی اس جھونپڑی میں تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتا ہوں، افسوس ہے کہ اس گھاس پھوس کے سوا یہاں آپ کے بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں۔ میں نے آپ کا ارشاد سنا اس کے جواب میں عرض ہے کہ آپ مجھ کو اس خیال سے نہ دیکھیے جو جھوٹی شرافت فانی دولت اور لغو امارت نے آپ کے دماغ میں پیدا کیا۔ میں بہادر و جری قوم بلوچ کا ایک فرد ہوں مفلسی میں ہندوستان میں بھیک مانگنے نہیں آیا میں گھوڑوں کی تجارت کے واسطے آیا۔ میری بیوی میرے ساتھ تھی گھوڑے سے گر کر میری ٹانگ ٹوٹی لیکن وطن کی واپسی میں یہ حارج نہ تھی فیروزہ میری پیاری بچی یہیں پیدا ہوئی۔ مگر میری واپسی وطن میں [illegible] بھی تو خود اندازہ نہ ہو سکتا تھا۔ مجھے جس چیز نے ہندوستان میں روکا وہ اس فیروزہ کی ماں اور میری عزیز بیوی کی یہ سامنے والی قبر ہے جس کی میں پرستش کر رہا ہوں میں اس باغ اور باغیچہ کا رکھوالا نہیں میں ان ہڈیوں کی نگہبانی کر رہا ہوں جن کی عصمت کا میں مالک [illegible] ہم بہادر جنگجو ہیں لیکن دغا باز نہیں تم دولت مند لوگ، تم ہندوستان کے مسلمان تم رئیس اور امیر ہمارے مقابلے میں کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ تم نے عورت کی مٹی پلید کی اور اس کے ساتھ وہ سلوک کیا جس کے خیال سے انسانیت لرزتی ہے تمہارا ایمان یہ ہے [illegible] اور غلط امیدوں سے ایک معصوم عورت کو نکاح میں لاؤ اور جب تمہاری بدولت تمہارے

مظالم کے طفیل وہ تمہارے بچہ بچوں کو دودھ پلا کر پالا کیا اور افکار میں گھل گھلا کر صورت سے بے صورت ہو جائے تو تم اس کو ادھر میں چھوڑ کر دوسری عصمت کو تاکو اور اسلام کی آڑ میں مزے اڑاؤ مجھے معلوم ہے کہ خود آنجناب کی تین بیویاں موجود ہیں آپ کو حق نہیں کہ کسی معقول آدمی سے اس قسم کی درخواست کریں، مجھے معاف کیجئے۔ میری رائے میں آپ سے زیادہ جفاشعار مشکل سے ہوگا افسوس یہ ہے کہ آپ کے ان افعال پر آپ کی سوسائٹی یا برادری آپ کا کنبہ یا قوم خوش ہے اور اس لئے وہ بھی آپ سے کم سنگ دل نہیں ضرورت تھی کہ مسلمان آپ کو دونوں ہاتھوں سے سلام کرتے۔ اور اگر ان میں ایمان ہوتا تو آپ کی صورت نہ دیکھتے آپ سڑکوں کے قریب جنگل کے وسط میں باغوں کے مابین نہروں کے کنارے ہماری خانہ بدوش قوم کی ہم فقیروں کی ٹوٹی ہوئی جھونپڑیوں میں جہاں عصمت کے جواہرات جگمگاتے ہیں اس صنف نازک سے وہ قدر دان دیکھیں گے جن پر آسمانی فرشتے مرحبا کہتے ہیں ہم نے اس پھول کی جو عورت کی حیثیت میں قدرت نے ہم کو عطا کیا بچی قدر کی اور سر آنکھوں پر رکھا۔ ہمارے پھٹے ہوئے کپڑوں اور ٹوٹی راوٹیوں میں مسرت کے وہ خزانے دمک رہے ہیں جن کا عشر عشیر بھی تمہارے قالینوں اور غالیچوں، محلوں اور دو محلوں میں موجود نہیں۔

کثرت ازدواج کے مسئلہ کو ہم تم سے بہتر سمجھتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ گو میں حافظ نہیں مگر آپ سے اور اس تمام جماعت سے جو آپ کے ہمراہ ہے بہتر اور زیادہ قرآن اور حدیث مجھے یاد ہے لیکن آپ نے تو اس سلسلہ میں اسلام کو الٹی چھری سے ذبح کیا۔ نص کے خلاف میں کیا کوئی مسلمان نہیں جا سکتا مگر فردعات میں ہم کو یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہر ضرورت خواہ وہ کسی عنوان کے تحت میں ہو حالات کے اعتبار سے مکمل ہونی چاہیے۔ شکم پری جس کی ضد خودکشی ہوگی انسان کی بہترین عبادت ہے اس کی تکمیل کسی وقت جنگلی پھلوں، پہاڑی جانوروں سے ہو رہی تھی مگر آج گو مقصود وہی ہے لیکن حالات نے سامان بدل دیا اور غذا بالکل مختلف ہو گئی میں پھر کہتا ہوں کہ نص کی مخالفت کفر ہے لیکن نص کو دھوکا دینا کفر سے بھی زیادہ، ہے قرون اولے کی ضرورتیں اور تھیں اس وقت کے حالات اور تھے۔ میں نے آپ حضرات کو اور بالخصوص آنجناب کو کبھی سر منڈاتے ہوئے تہبند باندھتے ہوئے کھجوروں سے پیٹ بھرتے ہوئے اور پتھر ڈھوتے ہوئے نہیں دیکھا ہاں آپ کے نکاحوں کی خبریں میرے کانوں میں برابر پہنچتی رہیں۔ آپ ہم کو اقوام جرائم پیشہ میں شمار کرتے ہیں مگر گریبان میں منہ ڈالئے اور فرمایئے آپ سے زیادہ عادی مجرم کون ہو سکتا ہے۔ کہ شب و روز آپ بدبخت عورت پر سوکنیں لا رہے ہیں۔ آپ خوش ہیں۔ آپ کی ستم گر سوسائٹی آپ کی ہاں میں ہاں ملا رہی ہے! اس باغ میں میری حیثیت محافظ کی ہے کہ میں ان پھلوں کو اور میووں کو پرندوں اور جانوروں سے محفوظ رکھوں یہ ہی میرا رزق اور میری زندگی کا سہارا ہے یہ سامنے دیکھئے میری غلیل اور گوپیا اسی مرض کی دوا ہیں مگر شام کے وقت جب اندھیرے کی چادر اس چار دیواری پر پھیلتی ہے اور قدرت آفتاب جہانتاب کی رونق فنا کرتی ہے اس وقت طوطے کا ایک جوڑا اس اونچی ٹہنی پر آکر بیٹھتا ہے میری کیریوں کے گرنے کی آواز ان کی آمد کا غلغلہ بلند کرتی ہے میرے ہاتھ گوپیا اٹھاتے ہیں۔ لیکن میری آنکھیں جب یہ دیکھتی ہیں کہ فضائے آزادی میں مٹھی بھر پروں کا یہ جوڑا زندگی کا لطف اٹھا رہا ہے۔ اور ہوا کے جھونکے اس کی بچی محبت پر قربان ہو رہے ہیں تو میرے ہاتھ رک جاتے ہیں میرا دل کانپ جاتا ہے اور اب مجھے ایک دوسرا سماں دکھائی دیتا ہے میں دیکھتا ہوں کہ محبت کے انتہائی جذبہ سے مغلوب ہو کر نر مادہ سے لپٹ گیا اس نے اپنا روشن چہرہ چمکدار منہ مادہ کے پروں میں رکھ دیا، مادہ اس کے پاکیزہ جذبے کے استقبال کو آگے بڑھی منہ سے منہ ملایا اور ان کے گلوں سے موسیقی کی وہ صدائیں بلند ہوئیں۔ جن پر کائنات نثار ہو تو میرا گوپیا گر پڑتا ہے غلیل ہاتھ سے چھوٹ جاتی ہے اور میں از سر تاپا ان کی محبت میں محو ہو جاتا ہوں۔ مجھ کو دنیا و مافیہا سے بے خبر کر دینے والا سماں آپ کے ایک اشارے میں ختم ہوتا ہے۔ اور آپ کے ایک فیر میں وہ دونوں دم توڑتے ہوئے نیچے آپڑتے ہیں۔

دور ہو جایئے آپ میرے سامنے سے اس لئے کہ آپ کافر کہیں گے، چلے جایئے یہاں سے اس واسطے کہ مشرک فرمائیں گے، مگر آپ مجبور ہیں [illegible] بدولت سے جس سے میرا دل مالامال ہے۔

میری زندگی اور زندگی کا نصب العین یہ ہے۔"

اتنا کہہ کر بلوچ کھڑا ہوا بیوی کی قبر پر سجدہ میں گرا اس کی خاک آنکھوں پر ملی اور کہا "تو آپ کے واسطے بڑی خوشی ہے بہتر سے بہتر اور امیر سے امیر اور حسین سے حسین لڑکیاں موجود ہیں۔ مجھے معاف فرمائیے اور آئندہ عمر کا ذکر نہ کیجئے گا۔"

وہی جمنا کا کنارہ ہے اور صبح صادق کا سہانا وقت۔ فیروزہ اپنی ڈالی ہاتھ میں لئے خاموش کھڑی ہے۔ احسن کچھ کہہ رہا ہے۔ اور آنکھ سے زار و قطار آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی ہیں وہ اپنی داستان غم ختم کر چکا تو فیروزہ مسکرائی اور کہا "میرے باپ نے جو کچھ کہا وہ تم لوگوں کو کتنا ہی ناگوار ہو لیکن اس کا حرف حرف صحیح تھا میں ان کی مرضی یا اجازت کے خلاف ہرگز نکاح کے واسطے تیار نہیں اس لئے تم کو اس سے قطعاً مایوس ہو جانا چاہیے۔

تم نے اپنی محبت میرے سامنے پیش کی یہ میرا فرض انسانیت ہے کہ میں اس کا جواب محبت سے دوں اس لئے جس زبان سے یہ لفظ ادا ہو رہے ہیں کہ میں اپنے باپ کی مرضی کے خلاف یا اجازت کے بغیر نکاح نہ کروں گی اسی سے یہ وعدہ بھی کرتی ہوں کہ اگر تمہارا دل محبت کے اسی مرکز پر قائم رہا تو میں کسی دوسرے شخص سے بھی نکاح نہ کروں گی۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔ میں نے باپ کے ارشاد کی بھی تعمیل کر دی اور محبت کا بھی جواب دے دیا۔" اتنا کہہ کر فیروزہ اپنی ڈالی لئے آگے بڑھی اور احسن منہ تکتا رہ گیا۔

۱۲

آج صبح کے وقت بادشاہی باغ جہاں دو آدمیوں کے سوا کوئی نہ ہوتا تھا بیسیوں آدمیوں سے بھرا ہوا ہے۔ کچھ پولیس کے لوگ ہیں کچھ ہسپتال کے اور زخمی فیروز ایک چارپائی پر اس طرح پڑا ہے کہ اس.. ... . . .کے کپڑے خون میں تر بتر ہیں۔ کوتوال اور تھانہ دار اس کے اظہار لکھ رہے تھے کہ اس کی حالت بگڑی اور اس نے طیش میں آکر کوتوال سے کہا۔

"سوتے آدمی پر حملہ کرنا بہادر کا کام نہیں ہمت تھی تو میرے سامنے آکر مقابلہ کیا ہوتا' چھری کا قریب قریب تمام حصہ میرے پیٹ میں گھسا اور رات تک خون بند نہیں ہوا مگر مجھے اپنی موت کی مطلق پروا نہیں۔ قلق یہ کہ اس وقت میری قوم کا کوئی بچہ تک موجود نہیں جس کو وصیت کرتا۔"

فیروز نے یہ کہہ کر اپنی بچی کو پاس بلایا اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا! میں دنیا سے رخصت ہوتا ہوں اور تجھ کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ دعا کرتا ہوں کہ خدا تجھ کو ہندوستان کے مسلمانوں کے فریب سے محفوظ رکھے۔ افسوس ہے کہ بلوچ قوم کا کوئی متنفس اس واقعہ سے باخبر نہیں جو ان سیدوں کو کافی سزا دیتا۔ میں قدرت کے قانون اور فطرت نسوانی کو اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ دنیا بہت جلد بے گناہ باپ کے قتل کو تیرے دل سے محو کر دے گی مگر تجھ کو وصیت کرتا ہوں کہ لباس عروسی تیرے جسم پر اس وقت تک حرام ہے جب تک تو میرے خون کا بدلہ احسن سے نہ لے لے۔"

یہ کہہ کر فیروز نے کلمہ طیبہ پڑھا اور دنیا سے رخصت ہوا۔

۱۳

باپ کے دفن کے بعد فیروزہ باغ سے اٹھ کر برابر کے گاؤں میں چلی گئی۔ آٹھ دن میں گاڑھے کا تھان تیار کرتی اور ہر منگل کو شام کے وقت شہر میں جا کر بیچ آتی۔ شہر اور گاؤں میں دریا حائل تھا برسات کا موسم تھا دو پیسہ دے کر ناؤ میں بیٹھتی اور پار چلی جاتی اور دو پیسہ دے کر لوٹ آتی۔

احسن کی حالت روز بروز ردی ہو رہی تھی اس نے اس کے عزیزوں اور مصاحبوں نے ہر ممکن کوشش سے کام لیا ہر قسم کا علاج کیا مگر سب بیسود تھا اب احسن کے واسطے صرف یہ ایک صورت تھی کہ وہ تڑپ تڑپ کر ہفتہ گذار دے اور منگل کو کنارے پر آجائے۔ کچھ روز اسی طرح گذرے۔ مگر اب بڑی مصیبت یہ ہوئی کہ فیروزہ نے اس سے بات چیت ترک کر دی وہ ہر چند سب کچھ کہتا مگر وہ جواب نہ دیتی مجبوراً احسن نے ایک ناؤ تیار کی اور اس امید پر ہر منگل کو دریا پر موجود رہا کہ شاید وہ وقت بھی آجائے جب فیروزہ کو پار پہنچانے میں میری خدمات کام آئیں لیکن اس میں بھی کامیابی نہ ہوئی۔ بارش نے شاہدرے کے قرب وجوار میں قیامت بپا کر رکھی تھی جمنا پوری طغیانی پر تھی اور بیسیوں گاؤں اس کی بھینٹ چڑھ چکے تھے ریلوے لائن اکثر جگہ سے بیکار ہو گئی۔ پل نصف سے زیادہ پانی میں ڈوب گیا اور ہر طرف سے الاماں والحفیظ کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں خدا معلوم کتنے آدمی اور جانور دریا میں بہہ گئے۔ گائیں بھینسیں بھیڑ بکریاں تنکوں کی طرح بہاؤ میں جا رہی تھیں۔ ستمبر کی چھٹی مارچ کی شام کو وہ بارش ہو رہی تھی جس کے خوف سے ہزارہا بندگان خدا ابھر سے گھر چھوڑ چھاڑ کر جنگلوں میں بھاگ گئے جمنا کے دونوں پاٹ ایک ہو گئے تھے اور پانی پل کے اوپر بہہ رہا تھا۔

بادل گرج رہا تھا بجلی چمک رہی تھی اور بارش لحہ بہ لحہ تیز ہو رہی تھی۔ احسن ایک درخت کے نیچے خاموش بیٹھا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ کہ اس کے کان میں آواز پہنچی۔

"احسن کیا تم مجھ کو پار پہنچا سکتے ہو؟"

اس آواز نے احسن کو چونکا دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو فیروزہ بناؤ سنگار کئے سامنے کھڑی ہے۔ یہ پہلا روز تھا کہ احسن نے فیروزہ کو آراستہ دیکھا وہ قریب پہنچا اور کہا۔

"مجھے تعمیل میں عذر نہیں ناؤ موجود ہے مگر اس وقت دریا میں قدم رکھنا موت کے منہ میں جانا ہے۔"

"ہاں میں بھی جانتی ہوں مگر میں نے تھان کا وعدہ آج ہی کا کیا ہے۔"

احسن:۔ ایک تھان کے بدلے ہزار اور لاکھ تھانوں کی قیمت قربان کرنے کو حاضر ہوں مگر اس وقت پار جانا مصلحت نہیں۔

فیروزہ:۔ مجھے آپ سے قیمت لینے کا کوئی حق نہیں میں وعدہ کر چکی ہوں اور پورا کروں گی۔

احسن:۔ اگر یہ حالت ہے تو میں قربان ہونے کو اور تعمیل کرنے کو تیار ہوں۔

فیروزہ:۔ "بسم اللہ"

فیروزہ ناؤ میں بیٹھ گئی۔ احسن نے رسے کھولے۔ ناؤ کھینی شروع کی۔ پانی غضب ڈھا رہا تھا آناً فاناً ناؤ بھنور میں پہنچ کر ہچکولے کھانے لگی۔ احسن کے ہاتھ سے بلیاں چھوٹ گئیں وہ فیروزہ کے قریب آیا اور کہا "بس ناؤ ڈوب رہی ہے۔" فیروزہ مسکرائی۔ اس نے گلاب کا ایک پھول احسن کے سر پر رکھا "یہ وہ رسم ہے جو بلوچوں میں نکاح کے وقت دلہن کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ تمہاری محبت کے جواب میں میں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور اب موت سر پر ہے۔ میں نے باپ کی وصیت بھی پوری کر دی۔ احسن اس بھنور میں ہمارا نکاح ہے!"

یہ کہہ کر فیروزہ نے اپنے ہاتھ احسن کے گلے میں ڈال دیئے اور ناؤ جمنا میں ڈوب گئی۔

---

(۳)

ترجموں کا دور

تولہ بھر ریڈیم

مولانا ظفر علی خان

کچھ دن ہوئے لندن کے چند بے فکروں نے ایک جگہ جمع ہو کر یہ سوچنا شروع کیا کہ تفریح و دلچسپی کا ایسا کون سا شغلہ ہو سکتا ہے کہ وقت بھی بڑے مزے میں گذرے اور گرہ سے بھی خرچ نہ ہو۔ یہ لوگ انگریزی سوسائٹی کا خلاصہ اور انگلستان کی شرافت کا عطر تھے۔ ان میں سے کوئی ڈیوک تھا' کوئی بیرن۔ کوئی پارلیمنٹ کا ممبر تھا اور کوئی فوجی افسر۔ سب کے سب مجرد تھے اور اس آزادی کے صدقے میں جس کے لحاظ سے انگلستان کے مرد و عورت زبان زد خاص و عام ہیں۔ سبھی طرح کے گلچھرے اڑا چکے تھے۔ کوئی ایسی ہوس نہ تھی جو انہوں نے پوری نہ کی ہو اور کوئی ایسا پاپڑ نہ تھا جو انہوں نے بیلا نہ ہو۔ زندگی کا لطف خاص طور پر حاصل کرنے کے لئے اب انہیں کسی ایسے مشغلہ کی ضرورت تھی جو بڑا ہی انوکھا ہو۔

سوچتے سوچتے آخر ایک کی طبیعت لڑ گئی اور اس نے یہ تجویز پیش کی کہ ہم لوگ ایک انجمن نقب زنی قائم کریں جس کی رکنیت کی فیس یہ ہو کہ ہر رکن سال میں ایک دفعہ لندن کا کوئی گھر جسے صدر انجمن صاحب تجویز کریں پھوڑا کرے' اس تجویز پر سب نے بہ اشتیاق تمام صاد کیا اور ایک باقاعدہ انجمن نقب زنی قائم ہو گئی جس کے ارکان کی تعداد ایک رکن کی تحریک کی بنا پر الف لیلہ کے مشہور علی بابا اور چالیس چوروں والے قصہ کی مناسبت سے چالیس تھی۔

ایک دن جب بعض ضروری امور پر غور کرنے کے لئے اس انجمن کا باقاعدہ اجلاس ہوا تو صدر انجمن نے پہلے تو بلا کسی تمہید کے حاضرین سے یہ کہا کہ ریڈیم جیسی نایاب چیز بہ مقدار کثیر موجود ہو گئی۔ اور اس کے بعد جیب میں سے ایک اخبار نکال کر حسب ذیل عبارت پڑھنی شروع کی۔

"کچھ عرصہ ہوا کہ آدھ سیر ریڈیم کی قیمت آٹھ لاکھ چھیانوے ہزار پاؤنڈ (ایک کروڑ چوبیس لاکھ چالیس ہزار روپیہ) بتائی گئی تھی۔ جن لوگوں کے پاس اس نادر الوجود عنصر کی کوئی مقدار بہ غرض فروخت موجود ہو انہیں ہم مشورہ دیتے ہیں کہ جہاں تک جلد ہو اسے علیحدہ کر ڈالیں کیونکہ پروفیسر بلتھ نے اس عنصر کے بمقدار کثیر بہم پہنچانے کا ایک حیرت انگیز طریقہ دریافت کر لیا ہے۔ چنانچہ اس طریقہ کے مطابق پروفیسر موصوف نے تولہ بھر ریڈیم جس کی قیمت بازار کے بھاؤ سے تین لاکھ چونسٹھ ہزار روپے ہوتی ہے تیار کر لی ہے اور چند خاص خاص ماہرین علم کیمیا نے پروفیسر بلتھ کے کارخانہ میں جا کر اس کی اصلیت کے متعلق اپنی تشفی کر لی ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمانہ جلد آنے والا ہے جب ریڈیم نظری دنیا سے عملی دنیا میں آ جائے گی اور اس کا شمار تمدن کی بڑی قوتوں میں ہونے لگے گا۔ اس عجیب و غریب عنصر کے چھوٹے سے ٹکڑے میں اتنی تاثیر موجود ہے کہ ایک متوسط الحال شخص کے

آتش دان کو دو ہزار سال تک کوئلہ کی احتیاج سے مستغنی رکھ سکے۔ لہذا ظاہر ہے شہروں میں دھوئیں کی وجہ سے آج کل جو تکلیف ہوتی ہے وہ بالکل جاتی رہے گی۔ دخانی جہازوں کو کوئلہ کی کانوں کے بیکار ہونے کی وجہ سے کوئی دس لاکھ مزدوروں کو معاش کی کوئی دوسری شکل نکالنی پڑے گی۔"

ایک رکن: ہوگا تو بڑے مزے کا زمانہ۔

دوسرا رکن: لیکن اس کا ہماری آج کی کارروائی سے کیا تعلق؟

صدر انجمن: مجھے بات پوری تو کر لینے دی ہوتی۔ اس کے بعد ٹوکا ہوتا۔

دوسرا رکن: ارشاد ہو۔ ہم ہمہ تن گوش ہیں۔

صدر انجمن: ہمارے سیکرٹری صاحب نے جو سالانہ رپورٹ پیش کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میجر جیرلڈ براؤن کا چندہ بابت سال گذشتہ ابھی تک وصول نہیں ہوا۔ لہذا میں یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ میجر براؤن یہ تولہ بھر ریڈیم مالیتی تین لاکھ چونسٹھ ہزار روپیہ پروفیسر بلتھ کے مکان سے لاکر انجمن کے اجلاس آئندہ میں پیش کریں۔ اگرچہ ساتھ ہی میں یہ کہے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اس معزز انجمن کی رکنیت کی شان اس سے بہت اونچی ہے کہ تین لاکھ چونسٹھ ہزار روپیہ جیسی ہیچ میرز رقم اس کے برقرار رکھنے کا کافی معاوضہ ہو سکے۔

اس فیصلہ کی تعمیل کے خیال سے گذشتہ ماہ اپریل کی پہلی تاریخ کو آدھ رات کے وقت میجر جیرلڈ براؤن پروفیسر بلتھ کے مکان واقع لڈگیٹ سرکس کے پچھواڑے کی دیوار پھاند کر مکان کے اندر داخل ہوئے۔ میجر صاحب کا طرز عمل وہی تھا جو ایک معمولی چور کا ہوتا ہے۔ آپ کھڑکی توڑ کر کمرہ میں گھسے۔ یہ کمرہ پروفیسر کا معمل یا لابارٹری تھا۔ چونکہ چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لہذا میجر براؤن نے جیب میں سے ایک چھوٹی سی برقی لالٹین نکال کر روشنی کی اور ہر طرف نگاہ ڈالی۔ سامنے ایک دروازہ نظر آیا۔ ایک چٹخنی کھول کر وہ آگے بڑھا کچھ دور جا کے داہنے ہاتھ کی طرف ایک دروازہ اور دیکھا جس کے پٹ بالکل کھلے تھے۔ دروازہ میں سے اسے جو کچھ نظر آیا وہ اسے محو حیرت واستعجاب کرنے کے لئے کافی تھا۔ کمرہ کے وسط میں میز پر ایک چمکدار چیز رکھی ہوئی تھی۔ مقابل والی دیوار پر کوئی ایک فٹ مربع جگہ اس چمکدار چیز کے عکس کی وجہ سے نورانی ہو رہی تھی۔ یہ ریڈیم تھا۔ میجر کو تعجب ہوا کہ پروفیسر نے ایسی بیش بہا چیز کو کیوں اس طرح سے کھلا چھوڑ دیا۔ یہ ظاہر تھا کہ پروفیسر نے سائنس دانوں کے دکھانے کے لئے اسے یہاں رکھا تھا۔ لیکن تین لاکھ چونسٹھ ہزار کا مال کھلے کمرہ میں میز پر رکھ دینا ایسی لغویت تھی جس کا ارتکاب پروفیسر کے سوا کوئی دوسرا کرتا تو اول درجہ کا پاگل سمجھا جاتا۔ لیکن یہ ایسا وقت نہ تھا کہ میجر براؤن پروفیسر کے قوائے ذہنی کی صحت وعدم صحت پر کھڑا ہوا غور کیا کرتا۔ چنانچہ وہ میز کی طرف بڑھا۔ لیکن دہلیز کے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ دروازے کے پٹ بڑے زور سے بند ہوئے۔ میجر حیران ہوا کہ دروازہ کیسے بند ہوا۔ کیونکہ نہ ہوا تھی نہ کوئی شخص موجود تھا جس نے دروازہ بند کیا ہو۔ کچھ دیر تک محو حیرت رہنے کے بعد وہ دروازہ کی طرف بڑھا کہ پٹ پھر کھول دے اور گھنڈی گھما کر کھینچا۔ لیکن معلوم ہوا کہ دروازہ مقفل ہے۔ اس نے گھنڈی کو ہر طرف گھمانا دبانا شروع کیا مگر بے سود۔ چٹخنیوں کو ٹٹولا کہ بند ہونے کے دھماکے سے پیچھے والی چٹخنی تو کہیں گر نہ گئی ہو لیکن چٹخنی چڑھی ہوئی تھی۔ اس نے دروازہ کو پھر اچھی طرح سے دیکھنا شروع کیا۔ سوا اس گھنڈی کے جسے وہ ہر طرف گھما چکا تھا اور اس چٹخنی کے جسے وہ دیکھ چکا تھا کہ چڑھی ہوئی ہے اور کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے دروازہ بند ہو سکتا۔ نہ کنجی کا سوراخ تھا نہ حلقے تھے جن سے معلوم ہو کہ دروازہ مقفل ہے۔ میجر نے خیال کیا کہ ضرور ہے کہ کمرہ سے نکلنے کا کوئی دوسرا راستہ ہو۔ اس خیال سے اس نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ مگر کوئی کھڑکی یا دروازہ یا روشندان نظر نہ آیا۔

تب تو میجر بہت شپٹایا اور دل میں کہنے لگا "برے پھنسے! خدا ہی ہے جو یہاں سے رہائی دے اور یہ سب میری بے وقوفی ہے۔

مجھے چاہیے تھا کہ دروازے کی طرف سے اطمینان کر لیتا تب اندر گھستا۔ افسوس کہ مجھ جیسا آدمی جو شاہی گارد کا میجر ہو اور پارلیمنٹ کا ممبر ہو وہ معمولی چوروں کی طرح اقدامِ نقب زنی میں چالان کیا جائے۔

اس خیال سے اس کا دماغ چکرانے لگا اور بدن میں رعشہ پڑ گیا۔ اس پر اسے اور غصہ آیا اور دل میں سوچنے لگا کہ میں اس سے زیادہ خطروں میں مبتلا ہو چکا ہوں لیکن کبھی مجھے ایسی گھبراہٹ نہ ہوئی جیسی اس وقت ہے۔ وہ انہی خیالات میں مستغرق تھا کہ دفعتہً گھنٹی بجی جسے سنتے ہی وہ چونک پڑا پیچھے پھر کے دیکھا تو کمرے کے کونے میں ٹیلیفون لگا ہوا پایا جس کی گھنٹی بج رہی تھی اس سے اس کے رہے سہے اوسان اور جاتے رہے۔ جب گھنٹی کی موقوف ہی نہ ہوئی تو بہ مجبوری ٹیلیفون کے پاس گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ آواز آئی۔ "کون ہو؟" میجر نے کچھ جواب نہ دیا۔ دوبارہ آواز آئی۔ "کون ہے؟" میجر پھر چپ ہی رہا۔

آواز: اگر جواب نہ دو گے تو ابھی پولیس کے سپاہی کو بلا کر تمہیں گرفتار کرا دیا جائے گا۔

میجر: (یہ دیکھ کر کہ اگر جواب نہ دیا تو پولیس کا سپاہی آ کر حقیقت میں ہتھکڑی ڈالے گا) کہو کیا کہتے ہو؟

آواز: خوب! کہو کیسے ہو؟

میجر: بڑے مزے میں ہوں۔ کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟

آواز: تمہارا نام کیا ہے؟

میجر: (یہ خیال کر کے کہ صحیح نام بتانا ٹھیک نہیں) رچرڈ مارسم۔

آواز: آپ کی عمر کتنی ہے؟

میجر: (یہ یقین کر کے کہ یہ ضرور کوئی بیمہ کمپنی کا ڈاکٹر ہے جو اسے پروفیسر بلتھ کا نائب سمجھ کر یہ باتیں پوچھ رہا ہے) میری عمر تو جو کچھ ہے وہ ہے مگر یہ تو فرمائیے کہ یہ آدھی رات کے وقت آپ کو اپنی معلومات میں اس اضافہ کی کیا ضرورت ہے؟

آواز: (میجر کے سوال پر مطلق التفات نہ کر کے) آپ کی عمر؟ جلدی کیجیے۔

میجر: پینتیس سال۔ (اپنے دل میں ایسے آڑے وقت میں سچ کے سوا چارہ نہیں۔

آواز: رچرڈ مارسم۔ عمر پینتیس سال۔ پیشہ؟

میجر: سپہ گری۔

آواز: بہت ٹھیک۔ رچرڈ مارسم۔ عمر پینتیس سال۔ پیشہ سپہ گری۔ ابھی تک ملازمت میں ہیں یا پنشن ملتی ہے؟

میجر: پنشن پاتا ہوں۔

آواز: اچھا تو سنئے۔ رچرڈ مارسم عمر پینتیس سال۔ پیشہ سپہ گری۔ حال پنشن یاب مگر آپ کس درجہ بے وقوف ہیں کہ ریڈیم کے ایک ٹکڑے کی خاطر اپنے پیشہ کو دھبہ لگاتے ہیں اور پنشن سے ہاتھ دھوتے ہیں۔

میجر: (شرمندہ اور متحیر ہو کر) کیا کہا؟

آواز: میں نے یہ عرض کیا کہ ریڈیم کے ایک ٹکڑے کی خاطر آپ اپنی پنشن کے پیچھے کیوں پڑے ہیں؟

میجر: میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم بک کیا رہے ہو؟

آواز: بہت اچھا۔ میں کوشش کروں گا کہ زیادہ وضاحت سے کام لوں۔ جناب والا آپ چور ہیں۔ آیا خیال شریف میں؟ آپ ریڈیم چرانے آئے تھے لیکن پروفیسر بلتھ کے مکان میں بند ہو گئے۔

میجر: (گھبرا کر) اب تو ہے کون؟

آواز: پروفیسر بلتھ!

میجر: لعنت بہ [illegible]

پروفیسر: نہیں جناب بہ کار پروفیسر کہئے۔

میجر: آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں؟

پروفیسر: میں بر آمدہ کے پہلو والے کمرہ میں ہوں۔ میں جس جگہ کھڑا ہوں وہاں سے آپ کے کمرہ کا دروازہ نظر آتا ہے اور میرے ہاتھ میں بھرا ہوا پستول ہے۔

میجر: آپ چاہتے کیا ہیں؟

پروفیسر: میری منشا کا انحصار آپ کے طرز عمل پر ہے۔

میجر: وہ کیسے؟

پروفیسر: وہ ایسے کہ آپ چاہیں تو آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا جائے اور چاہیں تو مجھے سائنس کے اکتشافات میں مدد دیں۔ کہئے کیا صلاح ہے؟

میجر: یہ سائنس کے اکتشافات کیا بلا ہوتے ہیں؟

پروفیسر: آپ ایک بارہ فٹ مربع کمرہ میں مقید ہیں جس میں ایک تولہ بھر ریڈیم رکھا ہوا ہے۔

میجر: اچھا پھر؟

پروفیسر۔ پھر یہ کہ آپ دنیا میں پہلے آدمی ہیں جو اتنی قلیل الحجم جگہ میں اتنے کثیر المقدار ریڈیم کے ساتھ بند ہوئے اس لئے آپ کے محسوسات سائنٹیفک دنیا میں بہت گراں بہا سمجھے جائیں گے اس لئے اگر آپ اس وقت تک جب تک آپ کے ہوش و حواس بجا رہیں اپنے محسوساست سے مجھے بذریعہ ٹیلیفون اطلاع دیتے رہنے کا وعدہ کریں تو خیر ورنہ ابھی پولیس کو بلاتا ہوں۔ ان دونوں میں سے آپ کون سی بات پسند کرتے ہیں؟

میجر: آپ کی توجہات کہ آپ نے یہ معاملہ میری رائے پر چھوڑا' میں چاہتا ہوں کہ اپنے محسوسات بیان کر کے آپ کے علم میں اضافہ کروں۔

پروفیسر: جناب رچرڈ مارکھم صاحب میں آپ کا نہایت ہی شکر گزار ہوں لیکن آپ کو پہلے سے متنبہ کئے دیتا ہوں کہ آپ کو جسمانی تکلیف بہت کچھ برداشت کرنی پڑے گی۔ میرا تجربہ کئی گھنٹے سے پہلے ختم نہ ہوگا اور چاہے آپ کو کتنی ہی تکلیف محسوس کیوں نہ ہو نا ممکن ہے کہ دوران تجربہ میں کمرہ کھول کر آپ کو نکل جانے دوں۔ کہئے آپ راضی ہیں یا پولیس........

میجر: (جلدی سے بات کاٹ کر) میں تو کہہ چکا کہ پولیس کے مقابلہ میں مجھے آپ کی سائنس زیادہ عزیز ہے۔

پروفیسر: نہایت مہربانی۔ ہاں یہ تو فرمایئے آپ کا قلب کیسا ہے؟

میجر: نہایت زبردست۔ گھنٹہ کی طرح آواز دیتا ہے۔

پروفیسر: نہایت ہی خوب۔ اس قسم کے تجربہ کے لئے دل چاہیے بھی ایسا ہی۔

میجر: (دل میں) یا اللہ! برے پھنسے۔ (پروفیسر سے مخاطب ہو کر) آپ کو مجھ سے کچھ اور پوچھنا ہے؟

پروفیسر: بہت کچھ۔ گھڑی ہے؟

میجر: ہاں ہے۔

پروفیسر: آپ ضربات نبض بتا سکتے ہیں؟

میجر: بے شک!

پروفیسر: جناب والا! آپ تو موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں۔ میں نہایت ہی ممنون ہوں کہ آپ نے آدھی رات کو غریب خانہ میں قدم رنجہ فرمایا۔ اس کمرہ میں آپ کو بند ہوئے ۱۵ منٹ ۳۰ سیکنڈ ہو چکے ہیں۔ اب بتائیے آپ کی نبض کی رفتار کیا ہے؟

میجر: تہتر!

پروفیسر: نہایت مہربانی۔ کیا آپ مقیاس الحرارت کا استعمال جانتے ہیں؟

میجر: بیشک!

پروفیسر: بہت خوب ٹیلیفون کے ڈھکنے پر کاغذ کے پاس ایک نلکی رکھی ہے اس میں سے مقیاس الحرارت نکال لیجئے اور نہایت احتیاط سے بتائیے کہ پارہ کس درجہ پر ہے؟

میجر: ستانوے۔

پروفیسر: نہایت مہربانی۔ بہت بہت شکریہ مجھے خیال نہیں تھا کہ فوج میں ایسے سمجھدار لوگ بھی ہوتے ہیں۔ اخبار بھی لوگوں کو کس قدر دھوکا دیتے ہیں کہ اس کے خلاف ظاہر کرتے ہیں۔ اب آپ مقیاس الحرارت کو دو منٹ تک اپنی زبان کے نیچے رکھئے اور اس کے بعد مجھے بتائیے کہ پارہ کتنے درجہ اوپر چڑھا۔

میجر: (دو منٹ کے بعد) ننانوے۔

پروفیسر: بہت بہت مہربانی۔ آپ رسالہ میں تھے یا پیدلوں میں؟

میجر: رسالہ میں۔

پروفیسر: رسالہ میں؟ بہت بہت مہربانی۔ آپ کی شادی ہو چکی ہے؟

میجر: نہیں۔

پروفیسر: تب تو کیا ہی کہنے ہیں۔ آپ کو دردسر کی شکایت تو نہیں؟

میجر: ابھی تک تو نہ تھی لیکن آپ کے مسلسل سوالات کی عنایت سے تھوڑی دیر میں ضرور ہو جائے گی۔

پروفیسر: آپ مہربانی فرما کر صرف علامات ہی بتائے جایئے۔ تشخیص کا کام اس خاکسار کے سپرد کر دیجئے۔ آپ کے قلب کی حرکت کی کیا کیفیت ہے؟

میجر: خوب زور سے دھڑک رہا ہے۔

پروفیسر: ابھی کیا آگے چل کر دیکھئے گا کہ کیسا دھڑکتا ہے۔ تنفس کیسا ہے؟

میجر: دم گھٹا جاتا ہے اگر آپ مجھے تازہ ہوا کھانے کے لئے ایک منٹ کو باہر آنے دیں تو بڑی عنایت ہو گی۔

پروفیسر: نہ حضرت تازہ ہوا کو ابھی اپنے تنفس سے زیربار فرمانے کا خیال دل میں نہ لایئے۔ تجربہ ختم ہونے سے پہلے آپ کا باہر تشریف لانا ناممکنات میں سے ہے۔ فوج والوں کے ذی ہوش ہونے کے متعلق جو رائے میں نے قائم کی تھی عجب نہیں کہ آگے چل کر وہ غلط ثابت ہو۔ کوئی عقلمند شخص دوران تجربہ میں اس قسم کی خواہش کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اچھا بالفعل کچھ دیر کے لئے میں اپنے سوالات ملتوی کرتا ہوں۔ تھوڑی دیر میں میں پھر گھنٹی بجاؤں گا۔ اگر آپ کو مجھ سے کچھ ارشاد کرنا ہو تو میں یہیں حاضر ہوں۔ اس عرصہ میں آپ تھوڑی سی چہل قدمی کر کے تازہ دم ہو جائیں گے۔

میجر ٹیلیفون کے پاس سے ہٹ گیا۔ کمرہ کی ہوا بہت ہلکی ہو گئی تھی۔ ریڈیم کی شعاعیں زیادہ تیز اور چمکدار ہو چلی تھیں۔ جب وہ

اس کی طرف بڑھا تو اسے ایک فوری بے چینی محسوس ہوئی۔ جس طرح جلتی ہوئی آگ کے سامنے جسم کو بڑھانے سے جلن معلوم ہوتی ہے اسی طرح اسے ریڈیم کی طرف بڑھتے وقت یہ معلوم ہوا کہ اس کے جسم کے سامنے کا حصہ آگ میں جھلس گیا ہے۔ سانس بھی رک رک کر آنے لگی۔ دور دوسرے بھی معلوم ہونے لگا۔ خوفزدہ پیچھے ہٹ کر وہ کمرے کے ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ پیچھے ہٹ جانے سے ان علامتوں کی سختی کم ہو گئی۔ اتنے میں گھنٹی پھر بجی اور پروفیسر کی آواز آئی:

"مناسب ہو گا کہ میں آپ کو متنبہ کر دوں کہ اگر آپ ریڈیم کو ضائع کرنے کی کوشش کریں گے تو اس سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ اگر آپ نے ریڈیم کے ٹکڑے کو توڑ دیا یا پگھلا ڈالا تو اور بھی مضر ہو گا۔ کیونکہ اس حالت میں اس کے ذرات منتشر ہو کر آپ کے جسم میں نفوذ کر جائیں گے۔ اس وقت جو کیفیت آپ کو محسوس ہو گی وہ نہایت ہی دلچسپ ہو گی۔ بشرطیکہ آپ اس کا تجربہ کرنا چاہیں۔ لیکن نتیجہ کا ذمہ دار میں نہ ہوں گا۔ بہرحال اتنا میں آپ کو سمجھائے دیتا ہوں کہ آپ اس نئے زبردست عنصر سے اس حالت میں کسی طرح بچ نہیں سکتے جبکہ آپ اس کے ساتھ ایک کمرہ میں بند ہیں۔ خصوصاً جبکہ وہ کمرہ صرف بارہ فٹ مربع ہے۔"

بیچارے مجرم نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ ٹیلیفون کے تار کے دوسرے سرے پر پروفیسر رابرٹ بلیتھو فیلو آف دی رائل سوسائٹی' ڈاکٹر آف سائنس کھڑے تھے جن کی تحقیقات واکتشافات نے علمی دنیا میں ہلچل ڈال دی تھی۔ عام طور پر پروفیسر نہایت متین اور سنجیدہ شخص تھا اور اپنے اندرونی جذبات کو کبھی شکل سے ظاہر نہ ہونے دیتا تھا۔ اس کے دوست کہا کرتے تھے کہ پروفیسر کے چہرہ پر سوائے اس حالت کے جبکہ وہ کوئی تجربہ کامیابی کے ساتھ کر رہا ہو خوشی کے آثار اور کبھی نہیں پائے جاتے۔ یہ قول بالکل صحیح تھا کیونکہ اس وقت وہ رچرڈ ڈار کھم سابق ملازم رسالہ شاہی وحال مقید کمرہ' پروفیسر موصوف کے بیان کردہ تجربوں کو (جسے انہوں نے قلم بند کر لیا تھا) پڑھ پڑھ کر باغ باغ ہوئے جاتے تھے۔ پڑھتے تھے اور خوش ہوتے تھے کہ سائنس کی دنیا میں کس قدر اضافہ ہوا اور جوش مسرت میں پھر پڑھتے تھے۔

"نبض کی رفتار ۷۳ حرارت عزیزی ۹۹۔ قلب کی حرکت بے قاعدہ۔ نہایت ہی عمدہ نتائج ہیں: سانس رک رک کر آتی ہے۔ یہ بھی قرین قیاس ہے۔ کیونکہ اسے مقید ہوئے ۳۱ منٹ گذر چکے ہیں۔ جسم مضبوط ہے اسی لئے ابھی تک کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن اب تھوڑی دیر میں دیکھنا کیا ہوتا ہے۔ جناب رچرڈ ڈار کھم۔ آج تو آپ بے طرح پھنسے۔ اگر آپ مجرم نہ ہوتے تو میں آپ کو اس بلا میں پھنساتے ہوئے جھجکتا لیکن بحالت موجودہ تو آپ کو اس سائنس کی راہ میں ضرور ہی یہ مصیبت جھیلنی چاہیے۔ اگر آج تجربہ آپ کے ذہن عالی سے اتر نہ گیا تو عمر بھر پھر چوری نہ کیجئے گا۔

"حقیقت میں یہ بات عجائبات قدرت سے ہے کہ عقل ہمیشہ مادہ پر غالب آتی ہے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں کہ رچرڈ ڈار کھم جیسا قوی ہیکل اور زبردست آدمی مجھ جیسے ضعیف ونحیف شخص کے ایک اشارہ سے برابر والے کمرہ میں اس طرح بند ہو جائے جس طرح چوہا چوہے دان میں بند ہو جاتا ہے میں نے اپنی تحقیقات کا اشتہار اخباروں میں دے کر اپنی کمال دانشمندی کا ثبوت دیا۔ آج کل بچے بوڑھے سب لوگ ہیں سب اخبار پڑھتے ہیں۔ میرا یہ خیال صحیح تھا کہ اس اشتہار پر ضرور کسی چور کی نظر پڑے گی۔ اس کے بعد میں نے ریڈیم کو کمرے کے وسط میں رکھ دیا اور مقابل والی دیوار پر سلفائڈ آف زنک مل دیا تاکہ چور کو ریڈیم ڈھونڈنے میں ذرا بھی دقت نہ ہو۔ ایک ایسا دروازہ بنا دیا جس میں سے گذرتے ہی دروازہ کھٹ سے بند ہو جائے' میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ بس اب اس کا انتظار تھا کہ چور آئے اور جال میں پھنسے جو ہو گیا۔"

اس وقت گھنٹی بجی۔ پروفیسر فوراً آرام کرسی پر سے اٹھا اور ٹیلیفون کے پاس جا کر کہنے لگا:

"رچرڈ ڈار کھم صاحب! کیا آپ کی بے چینی بڑھنے لگی؟ فرمائیے کیا ارشاد ہے؟"

مجرم: کیا تم خدا [illegible] سمجھتے ہو؟

پروفیسر: کہتے تو ایسا ہی ہیں۔ مگر اس سوال سے آپ کا مطلب؟

میجر: جو شخص مسیح پر ایمان رکھتا ہو اور بہشت میں جانے کا آرزومند ہو کیا وہ ایسی حرکات کا مرتکب ہو سکتا ہے کہ مجھے اس کمرہ میں بند کر کے دوزخ کی آگ کا ایک ٹکڑا میرے سامنے رکھ دے کیا تم نہیں جانتے کہ میں اس آگ میں کباب ہوا جا رہا ہوں اس کے زہر میرے جسم میں پھیل رہا ہے۔ اس کے انجرے میرا دم گھونٹ رہے ہیں۔ اس کا اثر میرے دماغ پر چھایا جا رہا ہے۔ اگر تم عیسائی ہو تو کمرہ کھول دو اور مجھے باہر نکلنے دو۔

پروفیسر: یہ آپ اپنے دماغ کو بے فائدہ تکلیف کیوں دے رہے ہیں۔ آپ کا کوئی حق نہیں ہے کہ تجربہ ختم ہونے سے پہلے باہر نکلنے کا نام لیں۔ چونکہ آپ چور ہیں اس لئے آپ کو قرار واقعی سزا بھگتنی چاہیے' اور آپ تو فوج میں ملازم رہ چکے ہیں۔ بیسیوں لڑائیاں لڑی ہوں گی۔ خون کے نالے بہتے گولوں کے مینہ برستے دیکھے ہوں گے۔ تھوڑی دیر کے لئے سمجھ لیجئے کہ وہی ہنگامہ بپا ہے۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کی تھوڑی دیر کی تکلیف سے بنی نوع انسان کو کس قدر فائدہ پہنچے گا۔ میں آپ کی اس تکلیف کا حال نمک مرچ لگا کر برٹش میڈیکل جرنل میں شائع کر دوں گا اور مجھے یقین کامل ہے کہ آپ کے خویش و اقارب جب اسے پڑھیں گے تو آپ کی ذات پر فخر کریں گے۔

میجر: میں خویش و اقارب سب کو پانی دے چکا ہوں اور اگر کوئی ہو تا بھی تو تیری اس بکواس کو نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا۔ دروازہ کھولتا ہے تو کھول نہیں تو میں کوئی ایسی بات کر گذروں گا کہ تو عمر بھر پچھتائے گا۔

پروفیسر: حضرت اس کی طرف سے اطمینان رکھئے۔ کمرہ میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کی طرف سے خدشہ ہو۔ ریڈیم ہے سو اس کے توڑنے سے آپ کی جان پر ہی بن جائے گی۔ رہا ٹیلیفون' اس کے ضائع کرنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بیرونی دنیا سے جو رہا سہا تعلق آپ کا ہے وہ بھی منقطع ہو جائے گا۔ آپ ہمت کیوں ہارے جاتے ہیں۔ کلکتہ کے بلیک ہول والے واقعہ کا ذکر تو آپ نے پڑھا ہی ہو گا۔ ان بے چاروں کی حالت آپ سے زیادہ خراب تھی۔

میجر: تیری اور تیرے بلیک ہول کی ایسی تیسی۔ رہ تو جا ملعون۔ خبیث۔ پاجی۔ اگر جیتا بچا تو تیری ہڈیاں چور چور نہ کر دی ہوں تو نام نہیں۔"

پروفیسر: جناب عالی! آپ اس قدر گرم کیوں ہوتے ہیں۔ مزاج درست رکھئے۔ کمرہ میں چہل قدمی کیجئے۔ انشاءاللہ طبیعت جلد بحال ہو جائے گی۔ ہاں تھرمامیٹر پھر زبان کے نیچے رکھ کر مجھے بتایئے کہ پارہ کتنے درجہ پر ہے۔ سائنس کی کچھ نہ کچھ خدمت بجالاتے رہیے۔ بیکار رہنا ٹھیک نہیں (دل میں) بچا لو اب تو چھٹی کا دودھ یاد آگیا ہو گا۔ اگر پانچ ملی گرام کلورائڈ سے ۸ چوہے تین دن میں مر جاتے ہیں تو ایک تولہ ریڈیم برومائڈ ایک مضبوط آدمی کو کتنی دیر میں بیہوش کر سکے گا۔ اربعہ متناسبہ کا یہ سوال کئی دن سے حل طلب تھا۔ اب وہ وقت آگیا کہ کوئی شخص اس کو حل کرے اور وہ شخص پروفیسر بلتھ ہو گا۔

کچھ دیر میں گھنٹی بجی اور آواز آئی:

میجر: حرارت غریزی ۱۰۲۔ نبض ۱۰۰۔ اے او پاجی پروفیسر خدا کے لئے اب تو مجھ پر رحم کر۔ اگر مسیح کی خاطر نہیں تو کم از کم اس خیال سے چھوڑ دے کہ تو بھی بال بچوں والا ہے۔

پروفیسر: (میجر کی بات سنی ان سنی کر کے) نبض ۱۰۰ اغالباً ناہموار ہو گی۔

میجر: ابے پاجی کہے جاتا ہے میری ایک نہیں سنتا۔

پروفیسر: رحمدلانہ تھم صاحب للہ برائے خدا انصاف کیجئے کہ جو قرار داد مجھ میں آپ میں ہوا تھا اس کے لحاظ سے آیا یہ مناسب ہے کہ

ایسی حالت میں جبکہ تجربہ سے خاطر خواہ نتائج مستنبط ہو رہے ہیں آپ اپنی رہائی کے لئے زور دیں اور تجربہ کو آخر تک پہنچانے سے پہلو تہی کریں۔ اگر علمی دنیا پر احسان نہیں کرنا چاہتے تو کم از کم ایفائے عہد ہی کے خیال سے اپنی بات پر قائم رہیے۔ ہاں تو کیا آپ کی نبض ناہموار ہے؟

میجر: ہاں ہے تو لیکن میرے ہاتھ بھی کھجلا رہے ہیں کہ تیری چاند گنجی کر دیں۔ پروفیسر بلتھ یاد رکھ اگر آج میرا دم نکل گیا تو خبیث بن کر تجھے اور تیرے گھر بھر کو پانچویں پشت تک کھا جاؤں گا۔ دیکھ لینا تو پاگل ہو کر بھونک بھونک کر کتے کی موت مرے گا۔

گالیاں سن کر پروفیسر ٹیلیفون سے ہٹ گیا اور اپنی مختصر سی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگا۔

"ادنے درجہ کے اراذل و انفاز کی خاص خصوصیت ہے کہ سختی کے وقت گندہ دہان ہو جاتے ہیں۔ مجھ پر خواہ کیسا ہی وقت کیوں نہ آپڑے ممکن کیا کہ پایہ تہذیب اور درجہ ثقاہت سے گرا ہوا کوئی لفظ میری زبان سے ادا ہو۔ شرافت خاندانی اور اعلیٰ تعلیم کے یہی تو جوہر ہیں۔ لیکن رچرڈ مارکھم نے میرے استفسارات کا جواب جس تشفی بخش طریقہ سے دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم اچھی پائی ہے۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ آخر میں شرافت خاندانی بازی لے جاتی ہے۔"

یہ کہہ کر پروفیسر نے بڑے فخر سے پھر اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ کچھ دیر گذرنے کے بعد پروفیسر نے اس خیال سے کہ اس کے قیدی کی حالت ضرور متغیر ہونی شروع ہوئی ہوگی۔ گھنٹی بجائی لیکن کچھ جواب نہ ملا۔ پروفیسر نے دل میں کہا کہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک ۳۵ سال کا جوان سپاہی ایسی جلدی میں بے ہوش ہو گیا ہو۔ ضرور ہے کہ وہ کمرہ میں چہل قدمی کر رہا ہو۔ یہ سوچ کر اس نے پھر گھنٹی بجائی۔ اس دفعہ آہستہ سے جواب آیا جسے سن کر پروفیسر نے کہا:

"جناب آپ نے جواب کیوں نہ دیا؟"

میجر: جیسے میں تیرے باپ کا نوکر ہوں۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر تو میرے ہاتھ آ جائے تو تجھے کن عذابوں سے ماروں۔ ابے سنتا ہے کہ نہیں؟ اس آگ کو دیکھتے دیکھتے میری آنکھیں پھوٹ چلیں۔ اب تو میری روح کی تحلیل ہوئی جاتی ہے۔ اب مجھے پولیس وولیس کی کوئی پروا نہیں۔ تیرا جی چاہے تو گرفتار کرا دے۔

پروفیسر: جناب عالی آپ کی گفتگو پایہ ثقاہت اور درجہ تہذیب سے گری ہوئی ہے مجھے آپ کے اس اشتعال طبع پر رہ رہ کر تعجب ہوتا ہے۔ آپ جیسا جوان اور بچوں کی طرح بگڑے اور بوڑھوں کی طرح چڑے۔ اب تو میں پولیس کو بلانے سے رہا۔ آپ نے وعدہ کیا تھا کہ یہ تجربہ ختم تک پہنچا دیں گے اور ایفائے وعدہ آپ کا فرض ہے۔ اب کہئے نبض کی رفتار کیا ہے؟

میجر: ایک سو بیس ہے۔ گھڑی کی طرح ٹک ٹک چل رہی ہے اور کوئی تعجب نہیں اگر آگے چل کر گھنٹے کی طرح ٹن ٹن کرنے لگے۔

پروفیسر: بہت منہاسئے۔ آپ کے ہاتھوں کی رنگت نیلی ہے؟

میجر: نیلی تو نہیں سبز ہے۔

پروفیسر: سبز نا ممکن ہے۔

میجر: ممکن ہے کہ حقیقت میں نیلی ہو کیونکہ میری نگاہ خراب ہے رنگوں میں امتیاز نہیں کر سکتا۔

پروفیسر: سپاہی ہو کر آپ کی بصارت ایسی ضعیف ہو! سخت تعجب ہے۔ شاید آپ کے ہاتھ میلے ہوں گے۔ اس وجہ سے نیلاہٹ میں ہریالی معلوم ہوتی ہو گی۔ آپ کی انگلیوں میں درد تو نہیں ہوتا؟

میجر: صرف ہاتھ بلکہ پاؤں کی انگلیوں میں ٹیسیں اٹھ رہی ہیں۔

پروفیسر: مرحبا اور حرارت غریزی؟

میجر: ۱۰۴ ارے میں گرمی کے مارے بھنا جاتا ہوں۔ کیا تو نے مجھے مار ہی ڈالنے کی ٹھانی ہے؟

پروفیسر: ابھی کلیم سوا گھنٹہ ہوا ہے اس پر یہ شور بپا کر دیا کہ الامان ابھی تو تجربہ کی ابتدا ہی ہے۔ یہ کہہ کر پروفیسر بر آمدہ میں ٹہلنے اور اپنے دل سے باتیں کرنے لگا:

"کاش ڈاکٹر پ یہاں موجود ہوتا۔ میں ثابت کر کے اس سے منوا لیتا کہ اس کی یہ رائے بالکل غلط ہے کہ ریڈیم کے اثر سے خون کے کار پسل آکسیجن سے خالی ہو کر بیہوشی کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں۔ میں علمی دنیا کے سامنے اب یہ اصول پیش کر سکوں گا کہ ریڈیم کے فعل سے اعصاب متاثر ہوتے ہیں اور معمولی فالج ہو جاتا ہے۔ کرٹپ بیوقوف ہے اپنی بات پر اڑا رہا۔ اب اسے میری بات ماننی پڑے گی۔"

"پروفیسر بلتھ اچھی طرح سن اگر تو نے فوراً دروازہ نہ کھول دیا تو میں یہ ریڈیم نگل جاؤں گا اور تو ٹاپتا رہ جائے گا۔ ریڈیم نگل لینے سے میری حالت اس سے تو خراب ہونے سے رہی جیسی اس وقت ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ جس قدر جلد میرا دم نکل جائے اچھا ہے۔"

پروفیسر: آپ احمق نہ بنئے جو تکلیف آپ کو اس وقت ہو رہی ہے اس میں بہت زیادتی ہو جائے گی۔

میجر: کچھ پروا نہیں میں ......

پروفیسر ٹیلیفون بند کر کے ادھر ادھر ٹہلنے لگا اور دل میں کہنے لگا:

"اس شخص نے تو مجھے مایوس کر دیا۔ خدا ہی ہے جو تجربہ حسب مراد ختم ہو۔ یہ شخص تو جلدی ہمت ہار گیا۔ آخر رذیل ہے۔ محض گوشت و خون کا تودہ کیا کر سکتا ہے جب تک شرافت و علم نہ ہو۔"

کچھ دیر کے بعد پروفیسر نے پھر گھنٹی بجائی لیکن اس دفعہ جو جوابات اسے ملے ان سے معلوم ہوا کہ قیدی کا دماغ چل گیا۔ جو آوازیں پروفیسر کے کان میں رک رک کر آئیں وہ یہ تھیں:

"بلتھ کے سر پر بلی ناچی۔ او سوار گھوڑا دوڑائے کدھر جاتا ہے۔ برف گر رہی ہے۔ بلتھ پیپا بنا ہوا سڑک پر لڑھک رہا ہے۔"

پروفیسر: مارکھم صاحب! خدا کے واسطے حواس بجا رکھئے مجھے ابھی بہت دیر تک تجربہ کرنا ہے۔ آپ کے اختلاط حواس سے میرا بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔

میجر: اہا ہا ہا اوہو ہو ہو۔ سوار و تلواریں کھینچ کر بڑھو اور دشمن کو کاٹ دو۔ بور جاپانی اور روسی گلے مل رہے ہیں۔ شاباش میرے بہادرو۔ گھر کو پلٹ چلو........ واہ رے میں! تلوار سے ایک سارجنٹ میجر کے دو ٹکڑے کر دیئے۔

اس کے بعد ٹیلیفون میں قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں جنہیں سن کر پروفیسر نہایت افسردہ ہوا۔ تجربہ کے اس طرح رک جانے سے اس کی خوشی خاک میں مل گئی۔ کچھ دیر کے بعد اس نے گھنٹی بجائی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے تھوڑی دیر بعد پھر گھنٹی بجائی لیکن جواب نہ ملا۔ آخر پروفیسر نے غمزدہ آواز میں کہا:

"اب تو دروازہ کھولنا ہی چاہیے۔ یہ شخص بیہوش پڑا ہوا ہے اور اس حالت میں اگر دیر تک ریڈیم کی شعاعوں کے سامنے رہا تو ممکن ہے کہ نتیجہ اچھا نہ ہو۔"

یہ کہہ کر اس نے دروازہ کھولا۔ کمرہ میں اندھیرا تھا۔ پروفیسر سخت متعجب ہوا اور دل میں کہنے لگا:

"یہ ریڈیم کہاں غائب ہو گیا؟ کہیں حقیقت میں نگل ہی تو نہیں گیا؟" آگے بڑھ کر اس نے چاہا کہ بٹن دبائے تاکہ کمرہ میں بجلی

کی روشنی ہو جائے اس نے قدم اندر رکھا ہی تھا کہ دروازہ بڑے زور سے بند ہو گیا۔ پروفیسر نے کمرہ روشن کر کے چاروں طرف نظر ڈالی مگر نہ قیدی تھا نہ ریڈیم۔ اس وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور آواز آئی:

"کیا جناب اندر تشریف رکھتے ہیں؟"

پروفیسر: (محو استعجاب ہو کر) مارکھم تم ہو؟

میجر: جناب والا! یہاں خاکسار حاضر ہے۔ آپ کی عمر کیا ہے؟

پروفیسر: تمہارا سر ہے۔

میجر: جناب پروفیسر صاحب برہم نہ ہو جیئے۔ آپ کی حرارت غریزی کتنے درجہ ہے؟ مقیاس الحرارت ٹیلیفون کے پاس ہے۔ براہ کرم زبان کے نیچے لگائیے اور جیب سے گھڑی نکال کر نبض کی رفتار بھی بتائیے۔

پروفیسر: نابکار۔ ملعون۔ چور۔ بد معاش! تو ہمارا مذاق اڑاتا ہے؟

میجر: جناب عالی! آپ کی گفتگو پایہ ثقاہت اور درجہ تہذیب سے گری ہوئی ہے۔

پروفیسر: ابے او پاجی سنتا ہے کہ نہیں اگر تو نے فوراً دروازہ کھول دیا تو میں تجھے پولیس کے حوالہ کر دوں گا۔

میجر: جناب عالی پولیس یہاں کہاں۔ سوائے اس خاکسار کے اور یہاں کوئی بھی نہیں ہے۔

پروفیسر: ابے تو نے میرا ریڈیم کیا کیا؟

میجر: جناب والا! ریڈیم نہایت حفاظت سے میری جیب میں رکھا ہوا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے اس کے حالات خوب اچھی طرح پڑھ لئے تھے۔ ایک سیسہ کی چھوٹی سی ڈبیا جس کے اندر سیسہ ہی کی ایک اور ڈبیا بند تھی اور دونوں فصل میں پارہ بھرا ہوا تھا میں اپنے ساتھ لیتا آیا تھا ___ جب آپ نے مجھے مقید فرمایا ہے تو اس کے کچھ دیر بعد میں نے ریڈیم کو اس ڈبیا میں بند کر لیا تھا۔ اس ڈبیا کے باہر نہ اس کی شعاعیں نکل سکتی ہیں نہ حرارت اثر کر سکتی ہے۔ میرا وقت آپ سے باتیں کرنے میں نہایت عمدہ طور پر صرف ہوا۔ میں جناب کو یقین دلاتا ہوں کہ جناب کی خوشگوار باتیں مجھے عمر بھر نہ بھولیں گی۔

پروفیسر: مارکھم تو اول درجہ کا چھٹا ہوا بد معاش' بے ایمان اور گستاخ ہے۔ مجھے جلد حراست سے نکال ورنہ......

میجر: جناب عالی ناراض نہ ہو جیئے۔ آپ نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کی تھوڑی دیر کی تکلیف سے بنی نوع انسان کو کس قدر فائدہ پہنچے گا۔ برٹش میڈیکل جرنل میں آپ کا مضمون طبع ہو گا میں اسے ضرور پڑھوں گا اور اس کی تردید میں ایک حرف بھی زبان سے نہ نکالوں گا۔ اگرچہ میری نبض کی رفتار ۷۳ سے نہیں بڑھنے پائی اور حرارت غریزی ننانوے درجہ سے زیادہ نہ ہوئی۔ اگر میں آپ سے شرف مکالمت حاصل کرنے کی بجائے ریڈیم کو فوراً ڈبیا میں بند کر لیتا تو اتنا بھی نہ ہوتا۔ لیکن جناب سے ایک فروگذاشت ضرور ہوئی کہ دروازہ کھولتے وقت جناب نے یہ خیال نہ فرمایا کہ جس بوتل کا آپ کاگ کھول رہے ہیں اس میں اڑ جانے والا جوہر بند ہے۔ براہ کرم کلکتے کے بلیک ہول کا تصور اپنے ذہن عالی میں رکھئے اور مجھے الوداع کہنے کی اجازت دیجئے۔ خدا حافظ!

(ترجمہ)

نجم السحر

مولوی عنایت اللہ دہلوی

شہزادہ کوش اور سردار رعمیس کی لڑائی

آج کل طیبی کے شہر میں دور دور کے نوجوان رئیس اور امیر زادے بڑی بڑی ریاستوں کے مالک فرعون کے مہمان ہیں۔ ان میں ہر ایک بادشاہ کی بیٹی نیطر طیبہ سے عقد کی امید میں آیا ہے۔ یہ شہزادی وہی ہے جو نجم السحر 'قرص خورشید' جمال حاسر 'دخت عمون کے خطبوں سے مشہور ہے۔ جلسوں اور ضیافتوں کا سلسلہ ایک مہینے سے جاری ہے۔ ہر ضیافت میں ان معزز مہمانوں میں سے صرف ایک مہمان خصوصیت کے ساتھ مدعو کیا جاتا ہے اور نیطر طیبہ ملکہ مصر وہاں موجود ہوتی ہے۔

ہر ضیافت کے ختم ہونے پر فرعون اور اس کے مشیران سلطنت ملکہ کے پاس آتے ہیں اور دریافت کرتے ہیں کہ جس مہمان کو آج خاص طور پر مدعو کیا گیا تھا اس سے آپ اپنا عقد کرنا پسند کرتی ہیں یا نہیں۔ نیطر طیبہ ہوشیار ہے۔ کسی کی نسبت صاف جواب نہیں دیتی اور اس طرح امیدواروں کی فہرست سے نام کٹتے چلے جاتے ہیں۔

نیطر طیبہ حکم دیتی ہے کہ وہ تحریر جس میں اس کی والدہ احورہ کا خواب درج ہے ہیکل عمون سے طلب کر کے اس کے سامنے پڑھی جائے۔ جس وقت یہ تحریر پڑھی جاتی ہے تو اس جملہ پر کہ 'اس کا عقد صرف ایسے شخص سے ہو سکتا ہے جو شاہی خاندان سے ہو' سب کو توجہ دلاتی ہے اور کہتی ہے کہ اب تک جس قدر امیدوار ضیافتوں میں اس کے سامنے پیش ہوئے چونکہ ان میں کوئی کسی شاہی خاندان کی یادگار نہ تھا اس لئے وہ رب عمون کے حکم کے خلاف کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔

مہمانوں میں بعض بڑے بڑے بادشاہوں کے ایلچی تھے۔ یہ بادشاہ اپنی سلطنتیں چھوڑ کر مصر میں نہ آ سکتے تھے اس لئے انہوں نے اپنے سفیر شادی کا پیغام لے کے بھیجے تھے۔ ان کی نسبت نیطر طیبہ نے جواب دیا کہ جب میں نے ان میں سے کسی کو دیکھا ہی نہیں ہے تو کیسے کسی کو قبول کر لوں۔ جب تک وہ دربار مصر میں حاضر نہ ہوں' میں ان کے پیغام کا کوئی جواب نہیں دے سکتی۔

آخر کار کم ہوتے ہوتے صرف ایک مہمان رہ گیا جس سے ملکہ واقف تھی۔ خود بادشاہ مصر اور اس کے ندیموں کی مرضی تھی کہ اس مہمان سے نیطر طیبہ کی شادی ہو جائے۔ یہ مہمان ولایت کوش کا شہزادہ اماثل نامی تھا۔ اس کے پیرانہ سال باپ کا تخت گاہ نباطہ کا شہر تھا جو طیبی سے جنوب میں واقع تھا۔ جس ملک میں یہ شہر تھا اس کی شکل ایک جزیرہ کی سی ہو گئی تھی۔ کیونکہ دریائے نیل نے اس کو تین

[illegible] مشہور تھا کہ مصر کے [illegible] شاب [illegible] اس
[illegible] اور [illegible] بھی [illegible] کی بہت [illegible] تھیں اور [illegible]

[illegible] میں فراعنہ کا ایک خاندان جس کی اصل [illegible] تھی مصر کا [illegible] تھا لیکن ایک مدت گذرنے [illegible] مصر کے لوگوں نے اس خاندان کو اس بناء پر کہ اس کی اصل [illegible] کی [illegible] جاری کرتا [illegible] سلطنت مصر سے معزول کردیا اور ایک فرمان بھی اس مضمون کا [illegible] کہ اس [illegible] خاندان کے کسی شخص کے سر پر بھی [illegible] نہ رکھا جائے۔ اسی معزول فرعونی خاندان کا سب سے آخری اور [illegible] رکن نیطر طیبہ کے ساتھ بچپن کا کھیلا ہوا [illegible]

مصر کے لوگوں نے گو اس خاندان کو معزول کردیا تھا لیکن دل میں ہمیشہ افسوس ہی کرتے رہے کیونکہ اس معزولی کے بعد نباطہ کا [illegible] سلطنت مصر کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ جب مصر سے یہ خاندان معزول ہوا تو نباطہ کے لوگوں نے مصر کی [illegible] سے اپنے تئیں آزاد کرالیا اور اس پرانے شاہی خاندان نے بھی بے تعلق ہو کر ایک نئے خاندان کو نباطہ کی سلطنت سپرد کردی۔ اس نئے خاندان کا وارث اب لائل شہزادہ کوش تھا جس کا ذکر اوپر ہوا۔

اہل مصر کو اس کھوئی ہوئی دولت کا پھر خیال آیا اور انہوں نے سوچا کہ اگر ملکہ نیطر طیبہ کا عقد شہزادہ لائل سے ہو جائے تو نباطہ کا [illegible] سلطنت مصر کے قبضہ میں آسکتا ہے۔ چنانچہ جب سے نیطر طیبہ پیدا ہوئی تھی اس وقت سے تمام وزراء اور ہوا خواہان دولت [illegible] کہ خود فرعون بھی اسی فکر میں رہا کرتا تھا۔ فرعون کو اس کا افسوس تھا کہ صرف لڑکی رکھتا ہے اگر لڑکا بھی ہوتا تو مصر قدیم [illegible] کے مطابق بھائی بہن کا عقد کر کے سلطنت کو اپنے ہی خاندان میں قائم کر دیتا۔ بہر کیف جس وقت نیطر طیبہ کا جشن تاجپوشی [illegible] خط و کتابت کر کے شہزادہ لائل کو اس موقع پر مدعو کیا گیا اور اس سے کہا گیا کہ اگر طیبی میں مستقل طور پر سکونت رکھنے کی [illegible] ہے تو نیطر طیبہ کا اس سے عقد کردیا جائے گا۔ یہ سچ ہے کہ اور لوگ بھی ملکہ سے شادی کا پیغام دے کر فرعون کے ہاں مہمان [illegible] لیکن وہ خوب جانتے تھے کہ ہم سب بساط شطرنج پر پیادے ہیں' بادشاہ اور فرزین کوئی اور ہی ہے۔

غرض جس شہزادہ کی نسبت تصفیہ ہو چکا تھا کہ ملکہ نیطر طیبہ کو اپنے دام محبت میں اسیر کرے وہ لائل تھا۔ نیطر طیبہ کو اس کا علم [illegible] آشتی اس کو پہلے سب باتوں سے آگاہ کرچکی تھی اور یہی وجہ ہوئی تھی کہ لائل کے اندیشہ اور رعمیس کے عشق سے مجبور ہو کر [illegible] عمون کو آسمان سے بلوا کر اپنی قسمت کا حال پوچھنا چاہا تھا اور اس طرح حالت بے قراری میں عمون کی جناب میں بے ادبی کی [illegible] تھی۔ لیکن فرعون نے لائل کا ذکر ابھی تک نیطر طیبہ سے نہیں کیا تھا اور نہ نیطر طیبہ نے ابھی تک اس شہزادے سے [illegible]

[illegible] کہتے ہیں کہ ملکہ کے جشن تاجپوشی کے وقت لائل بھیس بدل کر اسے دیکھنے آیا تھا کیونکہ اس کا قول تھا کہ ایک ملکہ [illegible] میری پسند کی چیز نہ نکلی تو میں ہرگز شادی نہیں کروں گا۔ بہر کیف اس موقعہ پر ضروری ہوا کہ وہ شادی سے [illegible] کرے

[illegible] کی پوری جوانی اور حسن کی شان میں دیکھا تو لائل نے اپنا اطمینان ظاہر کیا۔ کہنے کو فقط اطمینان تھا۔ لیکن [illegible] کا آدمی تھا' ملکہ کے حسن نے اس کے خون میں ایک آگ لگادی اور اب سوائے اس کے کوئی آرزو نہ رہی کہ [illegible]

[illegible] لائل اپنی آئندہ عروس نیطر طیبہ سے ملاقات کرے۔ چنانچہ شب کو ایک ضیافت غیر معمولی

ساز و سامان کے ساتھ ایک بڑے عالیشان اور پر فضا باغ میں قرار پائی۔ اس باغ میں ہزار ہا مشعلیں روشن کی گئیں اور ہر طرف میزیں بچھا کر نہایت پر تکلف اور خوش ذائقہ کھانے چنے گئے۔ نیطر طیہ آئی مگر اپنے بشرہ سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ اس ضیافت کی غرض اسے معلوم ہے۔ ہر طرف تکلفات دیکھ کر فرعون سے پوچھنے لگی۔ "باباجان! وہ کون سا مہمان ہے جس کے لئے اس درجہ اہتمام ہوا ہے انسان ہے یا کوئی دیوتا؟"

فرعون نے جواب دیا۔ "بیٹی! یہ مہمان کوش کا شہزادہ ہے۔ اس کی رعایا بھی اسے اسی طرح خدا مانتی ہے جیسے ہماری رعایا ہم کو خدا سمجھتی ہے۔ یہ شہزادہ اس وقت اپنے ملک کا ولی عہد ہے لیکن جب وہ تخت پر بیٹھے گا تو دنیا کے سب سے بڑے بادشاہوں میں اس کا شمار ہو گا۔"

نیطر طیہ نے کہا۔ "باباجان! آپ نے کوش کا نام لیا۔ اس ملک پر تو اس زمانے میں ہم بادشاہی کرتے تھے۔"

فرعون نے ایک آہ سرد بھر کر کہا۔ "بیٹی! ایک زمانہ میں یہ ملک ہمارا تھا۔ یا یہ کہو کہ کوش کے بادشاہ مصر پر بھی بادشاہی کرتے تھے لیکن میرے پردادا کے باپ کو جس وقت مصر کا ملک ملا تو اس وقت جو خاندان کوش پر مسلط تھا اس کو زوال ہو گیا۔ اور اب اس خاندان میں صرف تین آدمی باقی ہیں۔ ایک مریس ہیکل عمون کی فوج کا سردار' دوسرے اس کی بیوی آشتی جو ساحرہ ہونے کے علاوہ اب عمون کی کاہنہ بھی ہے اور تیسرا نوجوان رعمیس تمہارا دودھ شریک بھائی' جو ہماری فوج میں ملازم ہے اور جو کسی زمانے میں تمہارے ساتھ کھیلا کرتا تھا اور تمہیں یاد ہو گا کہ تالاب والے مگرمچھ سے اس نے تمہاری جان بچائی تھی۔"

نیطر طیہ نے کہا۔ "باباجان خوب یاد ہے لیکن اگر یہی بات تھی تو پھر آج مریس کوش کا بادشاہ کیوں نہیں ہے؟"

فرعون نے جواب دیا۔ "اس لئے نہیں ہے کہ نباطہ کے لوگوں نے ایک دوسرے خاندان کو کوش کا بادشاہ بنا لیا تھا اور اس خاندان کا وارث اب لماثل ہے۔"

نیطر طیہ نے کہا۔ "تو پھر یہ فرمایئے کہ اگر خون اور نسل کوئی چیز ہے تو یہ لماثل ایک غیر مستحق اور غاصب خاندان کا آدمی ہوا۔"

فرعون نے کہا۔ "اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر آج مریس ہماری جگہ مصر میں فرعون ہوتا۔ بیٹی یہ باتیں منہ سے نکالنے کی نہیں ہیں۔"

نیطر طیہ نے اس کا کچھ جواب نہ دیا اور جب باغ میں باپ کے قریب تخت پر بیٹھنے لگی تو بہت بے پروائی سے پوچھا۔ "کیا یہ کوش کا شہزادہ بھی ان لوگوں میں سے ہے جو مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

فرعون نے کہا۔ "ظاہر ہے اس کے سوا اور کیا خواہش رکھ سکتا ہے۔ کیا تمہیں اس کا علم نہیں؟ دیکھ ان کے ساتھ مہربانی اور تپاک سے پیش آنا۔ کیونکہ یہ طے پا چکا ہے کہ تمہاری شادی اس سے کی جائے گی۔ بس خاموش رہو۔ جواب کی ضرورت نہیں' شہزادہ آتا ہے۔"

فرعون کے اتنا کہتے ہی باجے اور تاشوں کی آواز باغ کے دوسرے سرے سے آنی شروع ہوئی اور آدمیوں کا ایک گروہ زرق برق [illegible] کیلسان میں کوئی ہاتھی دانت کا قرنا اور کوئی پیتل کے بڑے بڑے جھانج اور کوئی ڈھول جن پر منقش کے غلاف چڑھے [illegible] یہ سب قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور اپنے باجے اور طبل بدستور بجاتے رہے۔ ان کے پیچھے بیس حبشی جوانوں کا [illegible] چوڑے پھلوں کے برچھے اور کندھوں پر گینڈے کی کھال کی ڈھالیں جن پر طرح طرح کا کام بنا ہوا تھا [illegible] پہنے تھے اور سروں پر چیتے کی کھال کی ٹوپیاں تھیں۔

ان سب کے [illegible] کوش کا شہزادہ آیا۔ یہ ایک بہت مضبوط' پستہ قد' چوڑے چکلے سینے کا جوان آدمی تھا۔ چہرے کا نقشہ موٹا اور بھدا تھا اور آنکھیں [illegible] جن میں چتلیاں ہر وقت پھرتی تھیں۔ لباس بہت پر تکلف تھا اور خالص سونے کے توڑے اور [illegible] جواہرات کے تھے۔ بہت سے گلے میں پڑے تھے اور سر کی اونچی ٹوپی میں سیمرغ کا ایک بہت بڑا سفید پر لگا تھا۔ [illegible] غلام تھے جو مور چھل جھلتے تھے اور عبا کے لمبے لمبے دامن دو نہایت کریہہ منظر سیاہ قوم کے

[illegible] ہوئے تھے یہ پوری عمر کے آدمی تھے مگر [illegible] آلودہ ان کے چہرے [illegible] زیادہ تھا۔

ابھی کچھ فاصلہ پر تھا نطر طیبہ نے ایک نظر دیکھتے ہی [illegible] کا اندازہ کر لیا اس درجہ اسے نفرت پیدا ہوئی کہ کبھی [illegible] نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد شہزادی کی [illegible] جہاں تخت پر بیٹھی جلوس کرتی تھی شہزادہ اماثل کے سر کے [illegible] کنورتی ہوئی ایک جگہ پر جمی اور یہاں اماثل کے پیچھے مصری سپاہ کا ایک [illegible] نوجوان افسر کھڑا تھا نہایت سادے لباس پر [illegible] پہنے تھا کمر میں سنہرے قبضہ والی تلوار جو فرعون نے دی تھی [illegible] ظاہر ہے کہ یہ رعمیس کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ رعمیس جو نیطر طیبہ کا دودھ شریک بھائی اور بچپن میں ساتھ کھیلا ہوا لڑکا تھا اور جس سے اب جوانی میں ملکہ کو عشق تھا۔ اس شریف و دراز قامت جوان کا سیاہ فام شہزادہ کوش سے مقابلہ کرتے نیطر طیبہ کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح سرخ ہو گیا۔ فرعون نے نیطر طیبہ کی یہ کیفیت دیکھی مگر اور درباریوں کی طرح وہ بھی یہ سمجھا کہ چہرہ پر رنگ کا تغیر محض اس وجہ سے ہے کہ نیطر طیبہ نے آج پہلی مرتبہ شہزادہ اماثل کو دیکھا ہے جو اس کا نوشہ بننے والا ہے۔

نیطر طیبہ کو اس وقت یہ حیرت تھی کہ رعمیس شہزادہ اماثل کے پیچھے ایک خدمتگار کی طرح کیوں کھڑا ہے۔ وہ کون بشر ہے جس نے رعمیس کو بھرے دربار میں ایک خادم کی حیثیت سے حاضر رہنے کا حکم دیا ہے۔ سمجھ گئی کہ بادشاہ کے حکم سے ایسا نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ بادشاہ کو ان باتوں کی کیا خبر ہو سکتی تھی۔ یہ کارروائی کسی وزیر یا دربار کے ملازم کی ہے جس نے رشوت لے کر شہزادہ کوش کو خوش کرنے کے لئے یہ حرکت کی ہے۔ رعمیس ایک قدیم تر خاندان شاہی کا رکن ہے اور انصاف سے دیکھا جائے تو اس وقت اس کو نہ صرف کوش کا بلکہ مصر کا بھی بادشاہ ہونا چاہیے تھا۔ پس رعمیس کو ذلیل کرنے کے لئے اس موقع پر اس کو اماثل کا خدمتگار بنایا گیا ہے۔

علاوہ اس کے لوگوں کو یہ بات معلوم تھی کہ ملکہ اس رعمیس پر نظر الفت رکھتی ہے اور اس کی ماں کا دودھ بھی اس نے پیا ہے اس لئے ملکہ کی نگاہ میں رعمیس کو ذلیل کرنے کے لئے یہ حکم ہوا ہے کہ اماثل کے جلو میں رعمیس ایک معمولی سپاہی کی طرح اس کی جان کا [illegible] ملازم بن کر ساتھ رہے۔

نیطر طیبہ نے یہ معمہ ایک آن میں حل کر لیا اور فوراً دل ہی دل میں خدائے عمون کے سامنے اس کی قسم کھائی کہ جن لوگوں نے رعمیس کو ذلیل و خوار کرنے کے لئے یہ حرکت کی ہے ان سے کبھی نہ کبھی سخت بدلہ لوں گی۔ نیطر طیبہ اپنی اس قسم کو کبھی نہ بھولی۔

اب شہزادہ اماثل نے شہ نشین پر پہنچ کر فرعون اور ملکہ کو تعظیم دی اور دونوں کے جواب کا متوقع ہوا۔ فرعون نے چند منتخب اور [illegible] اماثل کے خیر مقدم میں کہے اور جس قدر القاب و آداب وہ رکھتا تھا ان سب کو بیان کر کے اس سے خطاب کیا اور تقریر [illegible] کی طرف بھی اشارہ کیا جنہوں نے سلطنت مصر اور کوش کو قدیم زمانہ میں متحد و وابستہ کر رکھا تھا اور امید ظاہر کی کہ [illegible] ان دونوں سلطنتوں میں اب اور بھی زیادہ قرابت پیدا کر دیں گے۔

[illegible] نے اپنی گفتگو ختم کرتے ہی نیطر طیبہ کی طرف دیکھا۔ ملکہ مصر ہونے کی وجہ سے اس کو بھی اس موقع پر کچھ کہنا ضروری تھا۔ چنانچہ [illegible] سے لکھ کر شہزادی کو پیش کر دی گئی تھی اور اس وقت وہ کاغذ اس کے سامنے تھا۔ ملکہ کو یہ بھی یاد تھا کہ اس کو پڑھ کر [illegible] نے نہ اس کاغذ کو اٹھایا اور نہ اس کو پڑھا بلکہ منہ پھیر کر ایک خواص کو حکم دیا۔ "ہماری الماس کی پنکھیا حاضر کرو۔"

اماثل [illegible] ملکہ کچھ کہے گی لیکن جب اس کو خاموش اور بے توجہ پایا تو اپنا جواب شروع کر دیا جسے از بر کر رکھا تھا۔ پہلا ہی فقرہ [illegible] جس طرح باران رحمت صحرا میں پھول کھلا دیتا ہے اسی طرح ملکہ نیطر طیبہ کے شیریں الفاظ نے اس کے دل کو [illegible] لیکن واقعہ یہ تھا کہ نیطر طیبہ کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا تھا۔ اب جو ملکہ نے اپنی پنکھیا کی اوٹ سے [illegible] ایک تبسم دیکھا اور دربار کے چند معززین بھی اماثل کے بے محل فقرے پر بے اختیار ہنس پڑے۔ لیکن [illegible]

[illegible] کوئی جملہ غصہ کا منہ ہی منہ میں کہہ کر اپنے ملازموں کی طرف متوجہ ہوا اور حکم دیا کہ جو تحائف ہم ساتھ لائے ہیں [illegible] [illegible] جائیں۔ ملازموں نے فوراً تحائف حاضر کیے ان میں نہایت نادر صنعت کے خوبصورت سونے کے ظروف شیر دان اور [illegible] بہت وزنی خالص سونے کی مورتیں، گودنہ وشن کرنے کے مرصع برتن تھے۔ شہزادے نے یہ نادر چیزیں اپنی طرف سے [illegible] کوش کی طرف سے پیش کیں اور بہت ہی غرور اور نخوت کے لہجہ میں کہا کہ "ان چیزوں کا شمار ہمارے ملک میں بہت معمولی چیزوں میں ہے۔ ایسے ہی اور بہت سے تحائف میں اپنے ساتھ لانے والا تھا مگر خواہ مخواہ وزن بڑھانے کے خیال سے نہیں لایا۔"

فرعون نے لائل کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ مصر بھی مفلس ملک نہیں ہے۔ چنانچہ کل آپ کو اس کا ثبوت مل جائے گا۔ اس کے بعد شہزادہ نے ملکہ نیطر طیہ کو خاص طور پر چند تحائف اپنی طرف سے پیش کیے۔ ان میں مرصع گلوبند، جس میں الماس، یاقوت اور زمرد جڑے ہوئے تھے اور قیمتی موتیوں کے ہار تھے اور ان کے علاوہ ایک بے نظیر صنعت کا خوبصورت چنگ تھا جس پر سونے کے تار کھچے ہوئے تھے اور جس کی مجموعی شکل ایک نہایت خوش رو عورت کی سی بنائی تھی۔ یہ تحفہ شہزادے نے نیطر طیہ کو اس خیال سے نذر میں پیش کیا کہ موسیقی کے ساز بجانے اور خوش نوائی میں ملکہ مصر کا ہمسر کوئی نہ تھا۔ اور یہ کمال رب عمون کے خاص عطیات میں سے تھا جو اس حسین ملکہ کو ملے تھے۔ اس عجیب و غریب چنگ کے ساتھ شہزادے نے دو حبشی لونڈیاں بھی پیش کیں۔ یہ نہایت قیمتی زیور پہنے تھیں اور مشہور تھا کہ نباطہ کے ملک میں ان سے بہتر گانے والا نہ تھا۔

فرعون نے ان تحفوں کو ملاحظہ کر کے بیٹی سے کہا کہ موتیوں کے ہاروں میں سے کوئی اچھا سا ہار اپنے گلے میں ڈال لو۔ نیطر طیہ نے عذر کیا کہ میں اس وقت سپید لباس پر کاسنی رنگ کے پھول پہنے ہوں۔ ان ہاروں کا رنگ اس لباس پر نہیں کھلے گا۔ غرض نیطر طیہ نے کوئی ہار اپنے گلے میں نہ ڈالا اور بجائے اس کے شہزادہ کوش کا شکریہ بہت پر تکلف الفاظ میں جن میں سرد مہری شامل تھی ادا کیا اور تمام تحفوں پر ایک نظر ڈال کر آہستگی سے کہا کہ ان سب چیزوں کو ہٹا کر ایک طرف رکھ دیا جائے۔ کیونکہ خوشبوئیں جو ان چیزوں پر چھڑکی گئی ہیں ان سے دماغ پریشان ہو جاتا ہے۔ جب تحفے وہاں سے ہٹائے جانے لگے تو ملکہ نے بہت بے اعتنائی سے کہا کہ وہ چنگ البتہ جہاں رکھا ہے وہیں رہنے دیا جائے۔ ضیافت جو بہت ہی نامبارک ساعت میں شروع ہوئی تھی، جاری رہی اور لائل نے قبرص کی شیریں شراب کثرت سے پینی شروع کر دی۔ رعمیس کو جو اس کی کرسی کے پیچھے کھڑا تھا، بار بار حکم ہوتا تھا کہ جام شراب خالی نہ رہنے پائے۔ معلوم نہیں یہ فرمائش محض اس وجہ سے تھی کہ رعمیس اس کے پاس کھڑا تھا یا نیت یہ تھی کہ اسے حکم دے کر اس مجمع میں اسے ذلیل کیا جائے۔ نیطر طیہ کو اس کا مطلق علم نہ تھا کہ لائل رعمیس سے کیا خدمت لے رہا ہے۔ مگر رعمیس کو سوائے حکم برداری کے کوئی چارہ نہ تھا۔ گو بھرے دربار میں شراب کے پیالے بھر بھر کر دوسرے کو دینے ایسے شخص کا کام نہ تھا جو مصر میں قوس اور نواب کا خطاب رکھتا ہو اور فرعون کی محافظ فوج کا افسر و سردار ہو۔

جس وقت غلامیں زرق برق لباس اور سونے کے چوڑے ہاتھوں میں پہنے، دستر خوان اٹھانے کو آئیں تو بڑے بڑے بھان متی [illegible] میں حاضر ہوئے اور انہوں نے عجیب و غریب تماشے دکھائے۔ ایک تماشہ دکھایا کہ ایک بڑے خوبصورت اونچے ظرف کے منہ [illegible] طیہ کی تصویر برآمد ہوئی جس کی پیشانی پر ایک چمکتا ستارہ اور سر پر تاج شاہی رکھا تھا۔

[illegible] نے جس طرح ملکہ نیطر طیہ کی تصویر ظرف سے نکالی تھی اسی طرح شہزادہ کوش کی تصویر بھی نکالنی چاہی [illegible] جو [illegible] ان کی بھی استاد تھی ملکہ کی کرسی کے پیچھے کھڑی یہ تماشا دیکھ رہی تھی اس نے فوراً اپنے جادو کے زور سے [illegible] ڈال دیا۔

[illegible] بجائے شہزادہ کی تصویر کے جس کا نام لے کر یہ بازیگر زور زور سے کہتے تھے کہ "اے تصویر [illegible] جس کے سر پر تاج رکھا تھا اور تاج میں سیمرغ کا ایک بہت بڑا پر لگا تھا۔ بندر کی صورت بھی ایسی [illegible] بندر کی شکل مٹکے کے منہ پر بیٹھی گھگھیاں باندھ باندھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ کچھ دیر

تک یہی کیفیت رہی۔ پھر دفعتاً مٹکے کے منہ سے نیچے گر کر غائب ہو گئی۔ اس تماشے کو دیکھ کر بعض لوگ ہنسے اور بعض چپ رہے لیکن فرعون کی پیشانی پر بل آ گئے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آیا یہ حرکت کسی انسان کی پیش بندی کا نتیجہ ہے یا خداؤں کی طرف سے کوئی نحس علامت ظاہر ہوئی ہے۔ چنانچہ پریشان ہو کر لائل کی طرف دیکھنے لگا لیکن لائل کثرت سے شراب پی کر نیطر طیبہ کی صورت دیکھنے میں ایسا مصروف تھا کہ اس کو کسی بات کا بھی ہوش نہ تھا۔ لائل کی نظر نیطر طیبہ کی طرف تھی اور نیطر طیبہ اس طرح نگاہ جمائے ہوئے تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھ رہی ہے۔ بازیگروں نے جب دیکھا کہ ان کا کام بگڑ گیا تو وہ جان کے خوف سے بھاگے اور حیرت میں تھے کہ وہ کون ساجن یا دیو تھا جس نے آ کر ان کے تماشے کی صورت بدل دی۔

جب بھان متی اور بازیگر اٹھ کر بھاگے تو ناچنے والیوں کا طائفہ آیا۔ لائل کوش کا شہزادہ نیطر طیبہ کی طرف اسی طرح نظر جمائے دیکھ رہا تھا کہ ملکہ گھبرائی جاتی تھی۔ آخر کار اس نے ہاتھ کے اشارے سے حکم دیا کہ حبش کی جو گانے والیاں تحفہ میں پیش ہوئی ہیں ان کو بلایا جائے۔ سنا ہے کہ وہ بہت ہی خوش آواز ہیں۔ عورتیں فوراً ہی اپنے اپنے ساز لے کر حاضر ہوئیں اور بہت خوبی سے گانے بجانے لگیں۔ جب ان کا گانا ختم ہوا تو نیطر طیبہ نے کہا۔ "ہم تمہارا گانا سن کر بہت خوش ہوئے۔ اور اس کا انعام یہ دیا جاتا ہے کہ آج سے تم دونوں آزاد ہو۔ اگر ہمارے پائے تخت طیبی میں تم لوگ سکونت اختیار کرو تو کبھی کبھی دربار میں حاضر ہو کر گانا سنانے کی خدمت پر تم کو مامور کرتے ہیں۔"

اتنا سن کر وہ دونوں گانے والیاں پیشانی زمین پر رکھ کر ملکہ کو ہزاروں دعائیں دینے لگیں۔ کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ غلامی سے نجات پا کر وہ اپنے فن سے بہت دھن دولت کمائیں گی۔ حاضرین دربار نے جب ان کے گانے کی تعریف ملکہ کے منہ سے سنی تو اپنے گلوں سے قیمتی ہار اور ہاتھوں سے جواہرات کی انگوٹھیاں اتار اتار کر ان گانے والیوں کی طرف پھینکیں اور تھوڑی سی دیر میں ان عورتوں نے جو اب تک لونڈیوں کی حیثیت رکھتی تھیں، اتنی دولت پیدا کر لی کہ اس سے پہلے ان کے خواب و خیال میں بھی نہ آ سکتی تھی لیکن لائل کو نیطر طیبہ کی اس بات پر کہ ان لونڈیوں کو آزاد کر دیا، غصہ آیا اور وہ کہنے لگا:

"کوئی اور ہوتا تو اس نادر تحفے کو کہ دنیا کی بہترین گانے والیاں پیش کی گئی ہیں، کبھی اپنے سے جدا نہ کرتا۔"

یہ فقرہ سن کر نیطر طیبہ نے پہلی مرتبہ لائل سے مخاطب ہو کر کہا۔ "کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان خوش آواز عورتوں سے بہتر گانے والیاں دنیا میں نہیں ہیں؟ آپ کے اس خیال سے جرات ہوتی ہے کہ جو کچھ تھوڑا بہت مجھے آتا ہے، سناؤں تاکہ مجھے معلوم ہو کہ دنیا کی بہترین گانے والیوں سے میں کس بات میں کم ہوں۔" اتنا کہتے ہی نیطر طیبہ نے چنگ اٹھالیا۔ تاروں کو الماس کی مضراب سے چھیڑا پکھراج کی کھونٹیوں کو مروڑ کر سر ملائے اور اس مصروفیت میں اپنی نگاہیں شہزادے کی طرف متوجہ رکھیں۔ یہ نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ "ہماری مثل کوئی دوسرا صاحب کمال ہو تو بتایئے۔"

فرعون نے یہ کیفیت دیکھ کر کہا۔ "نور چشم! یہ نہایت سبک حرکت ہو گی کہ تم ملکہ مصر ہو کر مجمع عام میں گانا سنانے بیٹھو۔"

نیطر طیبہ نے جواب دیا۔ "بابا جان! اس میں کوئی بات خفیف ہونے کی نہیں ہے۔ آج ہم بادشاہ کوش کے فرزند اور ولی عہد کی تعظیم و تکریم کے لئے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ فرعون اس کی خاطر و مدارات میں مصروف ہے۔ فرعون کی بیٹی اس کے تحائف قبول کر چکی ہے۔ جملہ اعیان دولت اس کی خدمت میں گردو پیش حاضر ہیں۔" اتنا کہہ کر نیطر طیبہ کچھ رکی مگر پھر بہت صاف آواز میں کہا۔ "اور ایک شخص جو شرافت نسب کے اعتبار سے شہزادہ لائل سے بھی قدیم تر خاندان شاہی کا رکن ہے، اس کو بادہ بردار بنا کر شہزادہ کے پیچھے ایک خدمتگار کی طرح کھڑا کیا گیا ہے اس کے بزرگوں نے ایک زمانے میں وہ سلطنت قائم کی تھی جس پر شہزادہ کوش کا باپ آج مسلط ہے۔" یہ کہہ کر اس نے رحمیس کی طرف اشارہ کیا جو لائل کے قریب جام شراب لئے ایک ادنیٰ نوکر کی طرح حاضر تھا۔ ملکہ نے پھر کہنا شروع کیا۔ "جب یہ کیفیت ہو تو پھر ملکہ مصر ایسے مہمان کو خوش کرنے کے لئے جو تکلیف بھی گوارا کرے وہ محل اعتراض نہیں، میرے پاس تو کوئی اور تحفہ بھی سوائے اپنی خوش گلوئی کے پیش کرنے کو نہیں ہے۔"

اس دلیرانہ اور صاف تقریر پر سب دم بخود رہ گئے۔ ہر شخص اس گفتگو کا مطلب سمجھ گیا اور ملکہ نیطر طیبہ، نجم السحر، اپنے تخت

سے اٹھی اور چنگ کو اپنے نوخیز سینے سے لگا کر اس پر جھکی۔ سر پر مصر کا تاج تھا جس میں سونے کا سانپ اس طرح پھن اٹھائے تھا کہ اب کسی کو ڈسا۔ ملکہ نے چنگ بجانا شروع کیا۔ انگلیوں میں اس غضب کا جادو بھرا تھا کہ ایک آن میں حاضرین کو سوائے چنگ کی آواز کے اور کسی چیز کا ہوش نہ رہا۔ شروع میں آواز ہلکی اور کمزور تھی پھر بتدریج اس کی گمک اور گرج بڑھتی گئی یہاں تک کہ سریلی صدائیں تمام فضا میں گونجنے لگیں۔ جب راگ پوری قوت پر آیا تو آواز ملائی۔ کبھی لحن لطیف و شیریں اور کبھی نوائے مستانہ و ژالہ بار میں اس طرح محو ترنم ہوئی کہ آسمان کے ستارے بھی متوجہ معلوم ہونے لگے اور زمین سے نغمے بلند ہو کر ماہ وانجم کے دلوں پر نشتر کا کام کرنے لگے۔

ملکہ نے جو کچھ گایا تھا، وہ عشق و محبت کی ایک داستان تھی جس کا مضمون صرف اتنا تھا کہ ربہ حاسر کے بت خانے کی ایک بڑی عالی مرتبہ نوجوان کاہنہ کو ایک غریب خطاط سے عشق ہو گیا ہے اور یہ مرد بھی اس کی محبت میں دیوانہ ہے ——— لیکن دونوں کی حالت میں ایسا تفاوت ہے کہ وہ شادی نہیں کر سکتے۔ رفتہ رفتہ عاشق پر محبت کا ایسا جنون سوار ہوتا ہے کہ رات کے وقت ٹھوکریں کھاتا ہوا معشوقہ کی تلاش میں بت خانے کے حرم میں داخل ہوتا ہے کہ کسی طرح اس کی صورت دیکھنی نصیب ہو جائے۔ ربہ حاسر اس کی یہ جسارت دیکھ کر اس قدر برہم ہوتی ہے کہ فوراً اسے ہلاک کر دیتی ہے۔ اتفاق سے اسی وقت وہ نوجوان کاہنہ بھی حرم میں یہ دعا مانگنے آتی ہے کہ کسی طرح ضبط عشق کی قوت اس میں پیدا ہو جائے۔ چلتے چلتے یکایک عاشق بے جان کی لاش سے ٹھوکر کھا کر فوراً اس کی صورت پہچان لیتی ہے اور عاشق کو مردہ دیکھ کر خود بھی وہیں جان دے دیتی ہے۔ ربہ حاسر جو عشق کی دیوی تھی اس منظر حسرتناک کو نہ دیکھ سکی، دل میں رحم آیا۔ مردہ عاشق و معشوق کو دوبارہ زندگی بخشی مگر یہ منظور نہ کیا کہ وہ اس دنیا میں رہیں، فوراً ان کو تخت الثریٰ میں بھیج دیا جہاں یہ دونوں موت کی نیند سے بیدار ہو کر بغل گیر ہوتے ہیں اور اب تک نہایت خوش و خرم دوسرے عالم میں زندہ ہیں۔

اس پرانے قصے کو سب لوگ بار بار سن چکے تھے مگر گانے میں، وہ بھی اس خوش الحانی کے ساتھ کسی نے نہ سنا تھا۔ جس وقت ملکہ کی صاف ستھری پیاری آواز ہلکی موجوں کی طرح ہوا میں حرکت کرتی ہوئی سامعین کے سروں پر سے گذری تو ان کو صاف نظر آنے لگا کہ عاشق زار خوف سے لرزاں مگر امید کی دستگیری سے بت خانے کے حرم میں قدم رکھتا ہے اور ربہ حاسر عاشق کی اس بے ادبی پر غضبناک ہو کر کس طرح اس کو چشم زدن میں ہلاک کر کے سرد کر دیتی ہے۔ اس نور کے گلے نے تصویر کھینچ دی کہ کس طرح خوبصورت کاہنہ ہاتھ میں چراغ لئے عاشق بے جان کو دیکھتے ہی کر کر اس کے ماتم میں اپنی جان کھو دیتی ہے اور اب چنگ کی نوائے روح پرور کو سنتے سنتے سامعین کی آنکھوں میں یہ نقشہ بندھتا ہے کہ فرشتے آسمان سے اتر کر عاشق و معشوق کی لاشوں کو کندھوں پر اٹھائے دنیا کی سرحدوں سے گذر رہے ہیں۔

چنگ کی دلآویز صدائیں نہایت تیزی سے یکایک بلند ہوئیں، سننے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ عشق و محبت کے مضمون نے ان کی آنکھوں کے سامنے بہشت بریں کے دروازے کھول دئے ہیں۔ سب کی نگاہیں آسمان کی طرف اٹھیں اور چشم تصور نے دیکھا کہ عاشق و معشوق موت کی نیند سے جاگے ہیں اور ایک فوری تحیر کے مٹتے ہی فرط مسرت سے ایک دوسرے کو لپٹ گئے ہیں کہ اتنے میں نور کی ایک شعاع گلگوں نے ان دونوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ اور اس پردہ نور سے اب عشق کی مائی کاہنہ نے خدا کی تعریف شروع کی ہے۔
اس نوائے جانفزا نے سب پر ایک محویت طاری کر دی۔ اس حالت میں کچھ دیر کے بعد ملکہ کی آواز رفتہ رفتہ نحیف و ناتواں ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ اس روحانی عالم کی فضائے ساکت میں اس کی آخری صدائے بازگشت بھی معدوم ہو گئی۔ نیطرطیہ نے نغمہ بلند کیا۔ چنگ جس کے تار ابھی تک لرز رہے تھے ایک طرف رکھ دیا اور خود خستہ حال ہو کر ہاتھ پاؤں پر لرزہ تخت زرنگار کی پشت سے سہارا لے کر آرام کرنے لگی۔ زرد مہتاب سے چہرہ پر نیلگوں آنکھیں ستاروں کی طرح روشن تھیں۔ کل دربار سکوت کے عالم میں تھا۔ نغمہ کا اثر سننے والوں کے دلوں پر ابھی تک باقی تھا۔ نہ کوئی لب ہلا سکتا تھا نہ کسی میں تاب جنبش تھی۔ سب جانتے تھے کہ نیطرطیہ رب عمون کی لخت جگر ہے جو اس وقت سنا وہ ملکہ کا نہیں ہے بلکہ عرش کی کوئی دیوی آ کر اپنا نغمہ سنا گئی ہے۔

اہل دربار اس طرح بیٹھے تھے کہ گویا عالم خواب ان پر طاری ہے۔ لیکن ان کی نگاہیں ملکہ کے زرد چہرے اور روشن آنکھوں کی طرف جمی تھیں۔ فانی بھی ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے ٹکٹکی باندھے اسی طرف دیکھ رہا ہے۔ شراب اور عشق دونوں کے نشے میں چور ہے۔

لیکن جن خوبصورت آنکھوں کی طرف دیکھ رہا ہے وہ کسی اور طرف متوجہ ہیں اور لاثل سے ایسی بے پرواہیں گویا انسان نہیں پتھروں کا ایک ڈھیر ہے۔ ملکہ کی شعاعِ نظر نے اس سے گذر کر کسی اور ہی کو اپنا ہدف بنا رکھا تھا۔

لاثل نے یہ معلوم کرنے کے لئے کہ ملکہ کی نظر کس طرف ہے گردن پھیری فوراً معلوم ہو گیا کہ جو نوجوان افسر اس کی بادہ برداری کی خدمت پر حاضر ہے ملکہ کی نظر اسی کی طرف ہے اور یہ افسر وہی ہے جس کی نسبت ملکہ کہہ چکی ہے کہ نسل و خاندان کے اعتبار سے وہ لاثل سے زیادہ شریف اور قدیم ہے اور اس کے بزرگ ایک زمانے میں اس سلطنت کے مالک تھے جس پر آج لاثل کا باپ حکمران ہے۔ لاثل کو یہ بھی معلوم ہوا کہ رعمیس بھی ملکہ کی طرف اسی طرح دیکھ رہا ہے کہ گویا کسی سحر اور افسوں نے اس بات پر مجبور کر رکھا ہے رعمیس کے چہرے پر جو کیفیت اس وقت تھی وہ ایسی تھی کہ لاثل جیسے شرابی اور خونخوار حبشی نے بھی اسے پہچان لیا۔

رعمیس سونے کا ساغر بادہ سے سرلبریز ہاتھ میں لئے لاثل کے قریب کھڑا تھا۔ لاثل نے اپنی کرسی دفعتاً اس طرح کھسکائی کہ اس کی پشت ساغر میں لگی۔ ساغر رعمیس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس طرح چھوٹا کہ سرخ شراب شہزادے کے لباس پر گری اور وہ سر سے پاؤں تک خون میں رنگا ہوا معلوم ہونے لگا۔ یہ دیکھتے ہی لاثل جھلا کر کرسی پر سے اٹھا اور کہنے لگا:

"اے کتوں کی نسل کے غلام زادے! مادہ خنزیر کے خوبصورت بھائی! کیا بادشاہوں کی خدمت میں حاضر رہنے کا یہی طریقہ ہے؟" یہ کہہ کر رعمیس کے منہ پر ایک طمانچہ مارا اور اس کو قتل کرنے کے لئے تلوار سونت لی۔

رعمیس بھی کمر میں تلوار باندھے تھا اور یہ تلوار وہی سونے کے قبضہ والی تھی جس پر مگرمچھ کی شکل بنی ہوئی تھی اور جو فرعون نے اسے انعام میں دی تھی۔ اور جسے دیکھ کر ساحرہ آشتی نے کہا تھا کہ اس پر کسی بادشاہ کے خون کی بوندیں نظر آتی ہیں۔ اس توہین پر رعمیس دیوانہ ہو گیا اور اس نے بھی فوراً تلوار کھینچ لی۔ لاثل نے وار کیا۔ رعمیس اس سے پہلے ہی شہ نشین سے کود کر نیچے کھلی جگہ میں آ گیا جو ناچ کے لئے مخصوص کی گئی تھی۔ لاثل اس کو نامرد اور بزدل کہتا ہوا خود بھی نیچے آیا اور اب دربار کے اس عالیشان کمرے میں نغمہ و سرود کی جگہ فولاد سے فولاد ٹکرانے کی آوازیں گونجنے لگیں۔

حاضرین دربار خوف و حیرت سے فرعون کی طرف دیکھنے لگے اور منتظر ہوئے کہ دیکھئے بادشاہ کیا حکم دیتا ہے۔ لیکن فرعون اس خوفناک منظر کو دیکھ کر یا تو غش کھا گیا یا تخت کی پشت سے کمر کو سہارا دے کر آنکھیں بند کئے اس طرح بیٹھا کہ گویا سو گیا۔ جب بادشاہ کی یہ کیفیت سب نے دیکھی تو لوگ ملکہ کی طرف متوجہ ہوئے کہ شاید وہ کوئی حکم دے لیکن وہ بھی خاموش رہی۔ لب سے لب جدا تھا اور حیرت میں تھی کہ دیکھئے کیا انجام ہوتا ہے۔

رعمیس کو اس وقت کسی بات کا ہوش نہ تھا' بجز اس کے کہ اہل سیف اور شاہانِ سلف کی یادگار ہو کر وہ ایک بدخو سیاہ رو حبشی کے ہاتھ سے طمانچہ کھاتا کیونکر گوارا کر سکتا ہے۔ رعمیس کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی اور اب اس کی آنکھوں جن میں خون اتر آیا تھا ایک بار خونی رنگ میں سے نیفرطیہ کی خوبصورت آنکھوں کو دیکھا کہ فتح و فیروز مندی کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ ملکہ کی نگاہ دیکھتے ہی رعمیس نے لاثل کی گردن پر جھپٹ کر ایسا وار کیا جیسے جنگل کا شیر جست کر کے شکار پر اپنا چنگل چلائے۔ لیکن ہاتھ گردن سے اونچا پڑا اور لاثل کے تاج کا ایک پر کٹ کر اڑتا ہوا زمین پر گرا۔ لاثل بھی تلوار کا دھنی تھا اور اس وقت طاقت بھی اس میں حالت جنون کی سی پیدا ہو گئی تھی اور تلوار بھی اس کی رعمیس کی تلوار سے زیادہ لمبی تھی۔ لاثل کا وار رعمیس کی زرہ نے روکا اور وہ پیچھے ہٹا۔ لاثل کی دوسری ضرب رعمیس کے شانہ پر پڑی اور شانہ سے اچٹ کر گھٹنے پر آئی۔ لاثل نے تیسرا وار کیا جس نے رعمیس کی ران پر زخم پہنچایا اور خون بہنے لگا۔ یہ دیکھ کر رعمیس کے دستہ فوج کا ایک سپاہی للکارا تا کہ اپنے افسر کی ہمت بڑھائے۔ اس پر لاثل سے اس کے حبشی سردار چیخ چیخ کر کہنے لگے کہ اس دشمن سور کا گلا کاٹ دیجئے۔

رعمیس زخم کھا کر ہوشیار ہوا۔ جھک کر ایک دفعہ دشمن پر جھپٹا۔ تلوار کا ایک ہاتھ لگایا۔ وار ٹھیک پڑا تھا لیکن لاثل کی زرہ نے اسے بے کار ثابت کیا۔ رعمیس نے پھر طیش میں آ کر ایک ہاتھ مارا اور اب لاثل کا خون بہتے ہوئے سب نے دیکھا۔ لاثل نے بھی وار کیا۔ رعمیس جھک گیا اور وار خالی گیا اور اسی حالت میں یک لخت اچھل کر پوری طاقت سے دشمن کے سینے میں اپنی تلوار بھونک دی اس

طرح کہ اس کی نوک پشت سے باہر نکل آئی۔ ایک لمحہ کے لئے لاش کھڑا رہا۔ پھر دفعتہً زمین پر گرا اور گرتے ہی ٹھنڈا ہو گیا۔

اتنا دیکھتے ہی حبش کے فوجی سردار ہاتھوں میں برچھے تول تول کر اپنے شہزادے کے خون کا بدلہ لینے رعمیس کی طرف بڑھے۔ رعمیس مجبور ہوا' دوڑ کر اپنے دستہ فوج میں چلا گیا۔ حبشی فوراً اس دستہ پر ٹوٹ پڑے اور اب شدت سے ہنگامہ قتل برپا ہوا۔ حبش کے سپاہیوں اور فرعون کے فوجیوں میں باپ دادا کے وقت سے جانی دشمنی چلی آتی تھی۔ فریقین میں کوئی بیچ بچاؤ کرانے والا نہ تھا۔ فوج محافظ کے سرداروں کے سوا باقی اہل دربار میں کوئی مسلح نہ تھا۔ خون ریزی سخت ہوئی۔ حبش والوں کا اب کوئی سردار نہ تھا اور رعمیس کے ساتھ اس وقت طیبی کے مشہور جنگ آزما موجود تھے۔

آخر کار حبشیوں میں کوئی کاری زخم کھا کر یہاں گرا کوئی وہاں' آخر میں صرف تین آدمی زندہ بچے اور انہوں نے ہتھیار پھینک کر امان طلب کی۔ اب رعمیس کی سمجھ میں آیا کہ اس نے کیا کیا۔ سر جھکائے خون آلودہ تلوار ہاتھ میں لئے شہ نشین کی سیڑھیوں پر چڑھا اور تخت فرعون کے سامنے زمین بوس ہو کر عرض کیا:

"شاہا! میں نے اپنی بے عزتی اور دولت مصر کی توہین کا انتقام لیا۔ اب میرے قتل کا حکم ہو۔"

لیکن بادشاہ نے کچھ جواب نہ دیا۔ کیونکہ اس پر ابھی تک غشی کی حالت طاری تھی۔ یہ دیکھ کر رعمیس ملکہ نیطر طیبہ سے مخاطب ہو کر عرض کرنے لگا۔ "ملکہ عالم! میرے قتل کا حکم صادر فرمائیں۔"

نیطر طیبہ اس وقت تک پتھر کی مورت بنی یہ کل حالات دیکھتی رہی تھی۔ رعمیس کی درخواست سن کر قالب بے جان میں کچھ جان آئی۔ شروع سے جس بات کا خوف تھا وہ دور ہوا اب کون اس کو اس کالے حبشی سے شادی کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ رعمیس نے تو اس کا کام ہی تمام کر دیا' سامنے شاہی لباس میں اس کا مردہ جسم پڑا تھا اور گرد اس کے حبشی سرداروں کی لاشیں جیسے جنگل میں درخت کٹے پڑے ہوں' پھیلی تھیں۔ مقتضائے بشریت یہی تھا کہ نیطر طیبہ ایک مصیبت سے نجات پانے پر رعمیس کو دل میں دعائیں دینے لگی۔

(ترجمہ)

شاعر کی وصیت

عبدالرزاق ملیح آبادی

مولانا کا کوئی ترجمہ ہمیں بروقت نہ مل سکا۔ اس مجبوری کی بنا پر اسے یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ فہرست میں مولانا کو اپنے مرتبے کے اعتبار سے جگہ دی گئی ہے۔

(مرتب)

اوگسٹ لیلیبوٹ نام کا ایک نوجوان روسی شاعر پیرس میں مقیم تھا۔ بیوی اور بچے بھی رکھتا تھا۔ موجودہ عالمگیر تنگ دستی نے اس پر بھی رزق کے دروازے بند کر دیئے تھے۔ سب ہی جتن کیے۔ سب ہی سے دعا مانگی مگر کسی نے کوئی مدد نہ کی۔ آخر ناامید ہو کر اور مصائب سے گھبرا کر اس نے خود کشی کر لی۔ اس کی لاش کے پاس ذیل کا وصیت نامہ ملا۔ جس کے شائع ہوتے ہی فرانس میں ایک تہلکہ پڑ گئی۔ اب دنیا کو معلوم ہوا کہ یہ مرنے والا کتنا بڑا شاعر تھا۔ مگر اس وقت جبکہ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

میں اپنی کہانی دل کی گہرائیوں سے لکھ رہا ہوں۔ اس لئے میری کہانی بالکل سچی ہے۔ کیونکہ دل کی گہرائیوں میں نیکی اور پاکی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح شروع کروں؟ زندگی کا جامہ جن رنگ برنگ تاروں سے بنا گیا ہے۔ ان میں کس تار کو پہلے چھوؤں؟ میرے سامنے سفید تار بھی ہیں، سرخ بھی، نیلے بھی، سیاہ بھی۔ اور ایسے تار بھی ہیں جن کا کوئی رنگ نہیں۔ گویا کسی جادو کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ مضبوط تار بھی ہیں۔ اور کمزور بھی۔ ایسے کمزور کہ چھوتے ہی ہاتھ میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ ان تمام بوقلموں تاروں سے زندگی نے اپنا جامہ تیار کیا ہے۔

میرے دل میں ایسی خوشیاں ہیں جن کی کوئی حد نہیں۔ بہار کی خوشیوں جیسی جبکہ ہر چیز نباتات، حیوان، انسان سب تر و تازہ ہو جاتے ہیں۔ بلکہ میری خوشیاں محبت کی خوشیوں سے بھی زیادہ بڑی اور مالا مال ہیں۔ میری خوشیاں موسیقی کے ساحرانہ نغموں سے لبریز اور مست ہیں۔ میں ان کا رقص اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔ وہ اس درجے محسوس ہیں، کہ میں انہیں اپنے ہاتھ سے چھو سکتا ہوں۔

اور میرے دل میں غم کے طوفان امنڈتے ہیں۔ ایسے غم جو جوانوں، بہادروں اور عروس نو کی موت کے غم سے بھی زیادہ وزنی

ہیں۔ ان کی آگ کبھی نہیں بجھتی۔ آنسوؤں کا سیلاب کبھی نہیں رک سکتا۔ حتیٰ کہ آنکھیں روتے روتے سفید ہو جاتی ہیں۔

میرے دل میں آرزوئیں ہیں بے حد و حساب۔ ایسی آرزوئیں جن کی انتہا نہ آنکھ دیکھ سکتی ہے، نہ عقل سمجھ سکتی ہے۔ خیال نے انہیں پیدا کیا ہے۔ مگر اب خود خیال بھی ان کے سامنے حیران و درماندہ ہے۔ دماغ انہیں دیکھ کر سناٹے میں آ جاتا ہے۔ وہ سوچنے لگتا ہے کیا یہ ممکن ہے۔ پھر تھک کر اور عاجز ہو کر کہہ دیتا ہے۔ نہیں۔ ناممکن بالکل ناممکن۔

میرے دل میں ناامیدیاں ہیں۔ سیاہ اور کڑوی ناامیدیاں۔ وہ اس طرح باہم لپٹی ہوئی بل کھایا کرتی ہیں۔ گویا ہندوستانی اژدہے جو ہاتھی پر جھپٹتا اور جیتے آدمی نگل جاتا ہے۔ گھٹاٹوپ اندھیری رات میں اندھے ہو جانے والے کی ناامیدی اور تپتے ہوئے بیابان میں گم ہو جانے والے گونگے بہرے کی ناامیدی سے بھی زیادہ تاریک اور الم ناک ناامیدیاں میرے سینے میں اپنے ہیبت ناک پھن اٹھائے بیٹھی ہیں۔

میرے دل میں خوف ہیں۔ زندگی سے خوف اور موت سے خوف، تندرستی سے خوف اور بیماری سے خوف۔ مفلسی سے خوف اور تونگری سے خوف۔ جو جانتا ہوں اس سے خوف۔ اور جو نہیں دیکھتا اس سے خوف۔ محبت سے خوف اور عداوت سے خوف۔ دوست سے خوف اور دشمن سے خوف، وفاداری سے خوف اور بے وفائی سے خوف۔ اپنے ہوش و بیداری سے خوف۔ اور اپنی مدہوشی اور نیند سے خوف۔

میرے دل میں نیکی ہے۔ بغیر کسی دلیل کے نیکی۔ عقل و منطق کو اس میں ذرا دخل نہیں۔ گویا آسمان سے یہ نیکی اتر کر میرے دل میں سما گئی ہے۔ لیکن میں اسے محسوس کرتا ہوں۔ پوری طرح محسوس کرتا ہوں۔ وہ مجھ میں شجاعت و ہمت پیدا کرتی اور ایک بہت ہی پرانے اجاڑ پیڑ کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کی جڑیں زمین نے اگل دی ہیں اور جس کی شاخیں تری سے خالی ہو چکی ہیں۔ تمام پتے پیلے پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں سبزی دکھائی دیتی ہے۔ وہ عجیب و کمیاب سبزی جو خزاں کے آخر میں بوڑھے درختوں ہی کا حصہ ہے۔ باغبان نے جس کی پوری عمر اس پیڑ کے چھانٹنے میں بیت چکی ہے۔ جو اپنی قدامت و بوسیدگی میں کسی دیوتا کا اجڑا ہوا مندر معلوم ہوتا ہے۔ ایسے دیوتا کا جو اپنے پجاریوں کی دعائیں نہ قبول کر سکنے کی وجہ سے بھاگ چکا ہو۔ ہاں اسی ڈراؤنے درخت کا نام خرانٹ۔ مالی نے اپنے مرتعش ہاتھ سے بھدے حرفوں میں لکھ دیا ہے۔ "صبر"

یہ سب بوجھ میں اپنے دل میں اٹھائے ہوں۔ اور شہر میں پھرتا ہوں۔ دوست دشمن سب سے ملتا ہوں۔ ہنستا بولتا ہوں۔ شادی غمی میں شریک ہوتا ہوں۔ ہر سوال کا جواب دیتا ہوں۔ ہر شخص کا خندہ پیشانی سے استقبال کرتا ہوں۔ ان کی ہنسی پر ہنستا اور ان کے غم پر کڑھتا ہوں۔ گویا انہیں میں سے ایک ہوں!

لیکن ان سب کے باوجود میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ بہت زور سے دھڑکن اٹھتی ہے۔ مجھے شبہ ہونے لگتا ہے کہ یہ میرا دل نہیں بلکہ بجلی کا پنکھا ہے جسے پوری قوت کے ساتھ کھول دیا گیا ہے۔ تب میں اسے اس طرح بغور دیکھنے لگتا ہوں۔ گویا وہ میرے سینے میں نہیں، کسی اور کے سینے میں ہے۔ پھر تعجب سے چلا اٹھتا ہوں۔ اس عجیب آلے کی اتنی تیز گردش۔ کتنی مدت تک جاری رہ سکتی ہے؟ صانع ازل نے بے شک اس کے بنانے میں کمال کر دکھایا ہے۔ مگر وہ کب اتنی سخت حرکت کو برداشت کر سکے گا۔ کیا وہ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ نہیں ہو جائے گا۔ ہر مشین کو کچھ دیر ستانے کو چھوڑ دیتے ہیں لیکن یہ کیا ہے۔ اس مشین کے لئے ایک لحظہ بھی آرام کا نہیں؟ اس کے لئے وہ روغن کہاں ہے جو فولاد کو فولاد سے ملنے پر نرم کر دیتا ہے۔ زہر کے تمام انبار کہاں چلے جاتے ہیں۔ غموں اور مصیبتوں کا وہ زہر جو آنکھ ناک کان زبان اور دماغ کے راستے میں اندر ہر وقت اترتا رہتا ہے۔ یہ چھوٹی سی مشین جو میرے سینے میں اتنی مدت سے چل

رہی ہے۔ کیونکر اس تمام زہر کو خارج کرتی ہو گی؟ وہ کون ہوشیار انجینئر ہے جو اس بے حساب زہر کے موریچے سے مشین کو صاف کرتا ہو گا؟

میری کہانی! کیا میں اسے شروع سے لکھ دوں۔ اس وقت سے لکھوں جب پہلی مرتبہ میں نے زندگی کے معنی سمجھے اور یہ بوجھ اپنے کاندھے پر اٹھا لیا۔ یا اس آخری گھڑی سے شروع کروں جب میں زندگی کو سلام کے ساتھ رخصت کرتا اور اس کا بوجھ اتار پھینکنا چاہتا ہوں۔ اپنے اس کاندھے سے اتار پھینکنا چاہتا ہوں جو بوجھل گاڑی میں جتے ہوئے گھوڑے کے کاندھے کی طرح بن چکا ہے۔ جسے قسموں نے زخمی کر ڈالا ہے۔ اور جب وہ گاڑی میں زور لگاتا ہے۔ زخم گہرا ہوتا جاتا ہے۔ مگر کوئی آنکھ اسے دیکھتی نہیں۔ کیونکہ انہیں قسموں کے اندر وہ چھپا ہوتا ہے۔ جنہوں نے اسے پیدا کیا اور اتنا گہرا کر دیا ہے۔

میرا قصہ انسانیت کو بدنام کرنے والا۔ بے نقاب کرنے والا۔ اس کی تمام آلائشیں کھول دینے والا۔ اور اسے خود اس کی نظر میں ذلیل کر ڈالنے والا قصہ ہے۔ انسانیت ان عورتوں کی طرح ہے۔ جو عالیشان محلوں اور مسرت آمیز نعروں کی گونج میں بچوں کو دودھ پلانے کے لئے ان کی ماؤں سے لیتی ہیں۔ اور تاریک کمین گاہوں میں بیٹھ کر انہیں مار ڈالتی ہیں۔ یہ مجرم عورتیں پاگل ہوتی ہیں۔ مگر معصوم بچوں کے قتل کا شوق انہیں صرف اتنی دیر کے لئے بہت ذہین بنا دیتا ہے۔ جتنی دیر بچے حاصل کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ وہ بڑی ہوشیاری سے اچھے کپڑے پہن کر جاتی ہیں۔ اور میٹھی میٹھی باتیں بنا کر ماؤں کی گودیں خالی کر لیتی ہیں۔ ٹھیک یہی حال مکار دغاباز' جھوٹی' بدبخت' پاگل انسانیت کا بھی ہے۔ وہ اپنی خواہشوں کی کنیز اور نفس کی پجاری ہوتی ہے۔ انسانیت دراصل بدصورت' بد اخلاق چڑیل ہے۔ جو اپنی مدہوشی کی وجہ سے اپنے افعال سے بے خبر اور جنون و جہالت کی وجہ سے اپنی زندگی کے معنی سے ناواقف ہے۔ بدترین ماں ہے۔ یہ ہماری دنیا جس کے دل میں ممتا نام کو نہیں۔

میں اس دنیا اور انسانیت کے کس جھوٹ سے اپنا قصہ شروع کروں؟ کیونکہ میں اس کے تمام جھوٹوں کا شکار بن چکا ہوں۔ یہ دیکھو میرے تمام بچے بیمار پڑے ہیں۔ اور تکلیف کی شدت سے کراہ رہے ہیں۔ کسی کی آنکھیں دکھ رہی ہیں۔ کوئی گلہڑے کے ورم میں مبتلا ہے۔ کوئی پیدائشی لنجا ہے۔ نہ کوئی غذا اسے قوت دیتی ہے۔ نہ کوئی دوا فائدہ پہنچاتی ہے۔

میری بیوی اس طرح روتی پیٹتی پھرتی ہے گویا اسے پھانسی کا حکم مل چکا ہے اور جلاد سامنے کھڑے ہیں۔ اسے روپے کی "آرام کی' کھلی ہوا کی' لمبے سفر کی ضرورت ہے۔ خدا سے رحم کی طالب ہے۔ حالانکہ نہ کبھی رحم سے آشنا ہوئی نہ کسی پر رحم کھا سکی ہے۔ میرے لئے سب سے زیادہ ناقابل برداشت مصیبت یہ ہے کہ وہ بکتی رہتی ہے۔ اور میری کوئی بات سننا نہیں چاہتی۔ عقل کل ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔ حالانکہ کچھ بھی نہیں سمجھتی۔ ان مصیبتوں سے روتی اور فریاد کرتی ہے' جو اس نے اپنی بے وقوفی' نیک نیتی سے خود ہی پیدا کر دی ہیں۔ نیک نیتی کا ذکر یہاں خوب موقع سے آیا۔ کیونکہ انگریزوں کی مثل ہے۔ جہنم کا راستہ نیک نیتی نے تیار کیا ہے؟"

اے شخص انصاف کر' اس سے بڑھ کر تیرے لئے سوہان روح اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایسی مشکل سامنے آ جائے جس کا کوئی حل تجھ سے ممکن نہیں ہے۔ ایسی خرابی جس کی درستگی اختیار سے باہر ہے۔ ایسی بیماری جس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ ایسی تنگی جسے دور کرنا تیرے بس میں نہیں۔ خصوصاً جب کہ یہ مشکل' خرابی' بیماری' تنگی اس وجہ سے پیدا ہوئی ہو کہ تیرا لڑکا جسے بیماری نے ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا دیا ہے۔ جس کی آواز بھوک سے تھرا گئی ہے وہ گھسٹ کر تیری طرف بڑھنا چاہتا ہے۔ اپنے ننھے ننھے لاغر ہاتھ پھیلاتا ہے۔ اپنی کملائی آنکھوں سے تجھے ہزاروں امیدوں کے ساتھ دیکھتا ہے اور اپنی غمناک آواز میں روٹی کا ٹکڑا بس ایک ٹکڑا مانگتا ہے۔ مگر تو اسے یہ

ٹکڑا بھی نہیں دے سکتا۔ تو اس معصوم کے سامنے بے حس و حرکت اس طرح بیٹھا ہے جیسے کوئی بت کسی مندر میں رکھا ہو۔ ٹکر ٹکر اپنے لخت جگر کو دیکھتا ہے۔ بولنے کا ارادہ بھی کرتا ہے۔ بڑھ کر اسے سینے سے بھی لگا لینا چاہتا ہے۔ مگر تیرا تمام جسم اس طرح ہو جاتا ہے جیسے سن ہے یا فالج کا مارا ہوا۔

یہ دیکھو دنوں پر دن اور ہفتوں پر ہفتے ایک ہی حالت اور ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ کون رنگ گہرا مٹیالا رنگ غم و حسرت کا رنگ۔ گویا یہ زندگی جس کا ہم شکار ہوئے ہیں موسیقی رکھتی ہے۔ وہ موسیقی جو صرف قبروں کے درمیان مترنم ہوتی ہے۔ جس کے راگ غم لاتے اور مایوسی پیدا کرتے ہیں۔ گویا شوپنہار نے اپنی قاتل ناامیدی میں۔ بہتوں نے اپنے مہلک غم میں۔ چیکووسکی نے اپنی درد انگیز حیرانی میں ایک ہی سر الاپا تھا۔ ایسا سر جو ہر مرتبہ دل کی ایک رگ کو کاٹتا اور روح کے ایک تار کو توڑ ڈالتا ہے۔

یہ دیکھو۔ قرضخواہ ابدی حقوق کے مالک دروازے پر کھڑے ہیں اور اپنے حق مانگ رہے ہیں۔ گویا انہوں نے باہم مشورہ کر کے طے کر لیا ہے کہ ایک ساتھ اور ایک ہی جگہ مطالبہ کریں گے۔ قرض دیتے وقت یہ لوگ جتنے ہنس مکھ ملنسار خوش اخلاق تھے۔ اب قرض واپس لیتے وقت اتنے ہی کرخت بے مروت بداخلاق بن گئے ہیں۔

انہوں نے گویا فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنی دکانوں پر میری آؤ بھگت بھول جائیں گے اور خود میرے دروازے پر میری توہین میں باہم بازی لے جائیں گے۔ میں ان کی نگاہ میں ایسا مقروض ہوں جو وعدہ خلاف ہے۔ نہ وہ مقروض جس سے زمانے نے بے وفائی کی ہے۔ ان میں کسی ایک آدمی کو بھی میں نے ایسا نہیں دیکھا جو اس اندیشے سے ڈرتا ہو کہ کل شاید اس کی حالت بھی میرے جیسی ہو جائے۔ معلوم ہوتا ہے عارضی دولت انسان کو زمانے کی گردش سے بے خبر کر دیتی اور تونگری ظلم و تکبر کا مادہ پیدا کر دیتی ہے۔ شاید اپنی قوت اور دولت پر بھروسہ آدمی کو اس وہم میں مبتلا کر دیتا ہے۔ کہ فقر و فاقہ کی مصیبت اس کے لئے بنی ہی نہیں۔ میں اپنی غربت و مصیبت پر بھی ان لوگوں کے لئے عذر تلاش کرتا ہوں۔ مگر وہ اپنی تونگری و بے فکری پر بھی میرا کوئی عذر قبول نہیں کرتے۔ بلکہ شب و روز ہر لحظہ اپنے قرض کا مطالبہ جاری رکھتے ہیں۔ اب ان قرضخواہوں کی وجہ سے میری حالت جنرل ولنگٹن کی سی ہو گئی ہے۔ جو "واٹر لو" کے معرکے سے ذرا پہلے بار بار چلا اٹھتا تھا۔ رات یا بلوچر۔ اسی طرح میں بھی بار بار اپنے دل میں پکارتا ہوں۔ الٰہی رات یا دولت۔"

لیکن بعض قرض خواہ چمگادڑوں کی طرح رات کو بھی میرے گھر پر منڈلایا کرتے اور بار بار دستک دیا کرتے ہیں۔

جب رات بھیگ جاتی ہے اور ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے تو میں کسی ایسے آنے والے کا انتظار شروع کرتا ہوں۔ جو پرانے زمانے میں ناگہاں نمودار ہو کر دولت و مسرت سے مالا مال کر دیا کرتا تھا۔ ہر لحہ مجھے گمان گزرتا ہے جیسے کسی پکارنے والے کی آواز یا دستک سن رہا ہوں۔ فوراً اپنی سانس روک کر اور کان کھڑے کر کے آہٹ لیتا ہوں۔ مگر وائے افسوس! دروازے پر سناٹے کے سوا کچھ نہیں سنتا۔ میری رات اسی طرح بیت جاتی ہے جس طرح تمہارے لازوال شاعر الفرڈ دی موسیہ نے کہا ہے:۔

Jui Sonne ? Peronne :
O ! Solitude ! O ! Pauvrete

کون دستک دے رہا ہے! کوئی نہیں! اف تنہائی! اف غربت۔"

(ترجمہ)

بپتا

خواجہ منظور حسین

شام کا جھٹپٹا، گیلی برف کے بڑے بڑے گالے بازار کے لیمپوں کے جو ابھی جلائے گئے ہیں، اردگرد دھیمی رفتار سے گھوم رہے ہیں، چھتوں پر، گھوڑوں کی پیٹھ پر، بازوؤں پر، ٹوپیوں پر برف کی نرم تہ جمی ہوئی ہے۔ گاڑی بان ایونا، بھوت کی طرح سفید براق، کوچ بکس پر بے حس و حرکت گٹھڑی بنا بیٹھا ہے۔ اس سے زیادہ جھکنا انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر برف کے تودے اس پر آ پڑیں تب بھی انہیں جھٹکنا ضروری نہیں سمجھے گا۔ اس کی سوکھی سہمی گھوڑی بھی سفید و ساکت ہے۔ اس کے مسکوت جسم کے پیچ و خم اور بانس کی سی سیدھی ٹانگوں کو دیکھ کر اس پر ٹکے کی مٹھائی کے گھوڑے کا شبہ ہوتا ہے۔ شاید کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی ہے۔ جس غریب کو ہل بکھرے ان مٹیالے مناظر سے جو اس کی آنکھوں میں بسے ہوئے ہیں، زبردستی چھڑا کر اس جنجال میں پھنسا دیا جائے جہاں ڈراؤنی روشنیاں، غل غپاڑہ، لوگوں کی لگاتار تھک دوڑ دھوپ ہو، وہ سوچ میں کیسے نہ پڑے۔

ایونا اور اس کی گھوڑی کو ایک جگہ سے ہلے بہت دیر ہو گئی تھی۔ دوپہر سے پہلے نکلے تھے اور اب تک ایک سواری نہیں ملی۔ شہر پر شام کی تاریکی چھا رہی ہے، بازار کے لیمپوں کی دھندلی روشنی تیز ہو رہی ہے اور سڑک کا شور و شغب بڑھ رہا ہے۔

"وائی برگ اسکایا کے لئے گاڑی!" ایونا کے کان میں آواز آتی ہے۔ "گاڑی!"

ایونا چونک پڑتا ہے اور اپنی برف سے ڈھکی ہوئی پلکوں میں سے ایک افسر کو دیکھتا ہے جو بڑا فوجی کوٹ پہنے کھڑا ہے "وائی برگ اسکولیا کو۔" افسر پھر کہتا ہے۔ "سو رہے ہو؟ وائی برگ اسکایا کو۔"

افسر کی بات سمجھ کر ایونا باگ کو جھٹکا دیتا ہے۔ برف کے ٹکڑے گھوڑی کی پیٹھ اور پٹھوں پر سے ہوا میں اڑتے ہیں۔ افسر گاڑی میں بیٹھ جاتا ہے۔ گاڑی بان گھوڑے کو للکارتا ہے، بط کی طرح گردن آگے کو نکالتا ہے، اپنی جگہ پر اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے حالانکہ اس کی ضرورت نہیں مگر عادت کے مطابق چابک چٹخاتا ہے۔ گھوڑی گردن آگے کو نکالتی ہے، اپنی بانس کی سی ٹانگیں سکیڑتی ہے اور بادل ناخواستہ چلنے لگتی ہے۔

تاریکی کے انبار میں جو اس کے سامنے ادھر سے ادھر گردش کر رہا ہے۔ ایونا کے کان میں چیخوں کی آواز آتی ہے۔ "شیطان کہاں گھسا چلا جاتا ہے، کدھر چلا پڑتا ہے ___ دائیں کو چل۔"

"تمہیں چلانا نہیں آتا۔ دائیں کو چلاؤ۔" افسر بگڑ کر کہتا ہے۔

ایک نوجوان جو کسی کی ذاتی گاڑی چلا رہا ہے اُسے جھڑکتا ہے۔ سڑک پار کرتے ہوئے ایک راہ گیر کے شانے گھوڑی کی ناک سے ٹکرا جاتے ہیں وہ اس کی طرف غصہ کی نظروں سے دیکھتا ہے اور اپنی آستین جھٹکتا ہے۔ ایونا بکس پر اس طرح پہلو بدلتا ہے جیسے کانٹوں پر ہے۔ کہنیاں ہلاتا ہے اور چاروں طرف مبہوت ہو کر کھوئی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے کہ کہاں ہوں اور جہاں ہوں کیوں ہوں۔

"یہ سب لوگ کتنے بد معاش ہیں۔" افسر ازراہ تمسخر کہتا ہے۔ "پوری کوشش کرتے ہیں کہ تمہارے راستے میں حائل ہوں یا گھوڑی کے پاؤں سے کچلے جائیں۔ ضرور جان بوجھ کر یہ شرارت کرتے ہیں۔"

ایونا اپنی سواری کی طرف دیکھتا ہے اور اپنے ہونٹ ہلاتا ہے۔ بظاہر کچھ کہنا چاہتا ہے مگر سوائے سوں سوں کے منہ سے کچھ نہیں نکلتا۔

"کیا کہا؟" افسر پوچھتا ہے۔

ایونا کھسیانا ہو کر مسکراتا ہے اور گلے پر زور ڈال کر روکھی آواز سے بمشکل یہ لفظ ادا کرتا ہے۔ "میر الڑکا میر الڑکا اس ہفتے گذر گیا حضور"

"ہوں! کیا شکایت تھی؟"

ایونا پوری طرح سواری کی طرف پلٹ کر کہتا ہے:

"خدا جانے بخار ہو گا۔ تین دن ہسپتال میں پڑا رہا اس کے بعد گذر گیا۔ جو خدا کی مرضی۔"

"شیطان مڑ کر دیکھ!" اندھیرے سے آواز آتی ہے۔ "کتے باؤلا ہو گیا ہے؟ آنکھیں کھول کر دیکھ کدھر چلا جا رہا ہے؟"

"چلے چلو' چلے چلو۔" افسر کہتا ہے۔ "اس رفتار سے کل تک بھی نہیں پہنچ سکتے' تیز چلو۔"

گاڑی بان پھر گردن آگے کو نکالتا ہے۔ اپنی جگہ اٹھ کھڑا ہو جاتا ہے۔ چابک گھماتا ہے' کئی بار پھر کر افسر کی طرف دیکھتا ہے۔ افسر نے آنکھیں میچ لی ہیں اور بات چیت کرنا نہیں چاہتا۔

والئی برگ اسکایا پر سواری کو اتار کر ایونا ایک قہوہ خانے کے پاس گاڑی کھڑی کرتا ہے اور پھر سکڑ کر بکس پر بیٹھ جاتا ہے۔ ایک گھنٹہ گذرتا ہے' پھر دوسرا۔ ..

تین نوجوان دو کشیدہ قامت اور دبلے پتلے' ایک پستہ قد اور کبڑا' ایک دوسرے پر فقرے کستے' اپنے برساتی جوتے پہلے کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اس طرف آتے ہیں۔

"گاڑی بان! الولس کے پُل کو چلو۔" کبڑا جھوجری آواز میں چلاتا ہے۔ "تینوں کے بیس کوپک۔" ایونا باگ کھینچتا ہے اور گھوڑی کو للکارتا ہے۔ اصل کرایہ بیس کوپک سے زیادہ ہوتا ہے مگر اسے اس کا خیال نہیں' ایک روبل ہو یا پانچ کوپک' اس کی پروا نہیں' بس سواری مل جائے۔

تینوں نوجوان ایک دوسرے کو دھکیلتے' بدزبانی کرتے گاڑی کی طرف آتے ہیں اور تینوں یہ کوشش کرتے ہیں کہ ایک ساتھ بیٹھ جائیں۔ تصفیہ طلب سوال یہ ہے کہ کون سے دو بیٹھیں اور کون کھڑا رہے۔ لمبے چوڑے بحث مباحثے' تو تو میں میں گالی گلوچ کے بعد یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ کبڑا کھڑا رہے۔ کیونکہ وہ سب سے مختصر ہے۔

"چلاؤ" کبڑا کھڑا ہو کر کہتا ہے۔ ایونا کی پیٹھ پر اس کا سانس محسوس ہوتا ہے۔ "منحوس ہو چاند دوست! تمہاری ٹوپی عجیب و غریب ہے۔ اس سے ردی ٹوپی سارے پیٹرز برگ میں ڈھونڈے نہیں ملے گی۔"

"ہی ہی ہی ہی!" ایونا ہنستا ہے۔ "بس گذارے کے لائق ہے۔"

"خیر جناب گذارے کے لائق ذرا تیز چلئے۔ تمام راستے اسی چال سے چلو گے۔ کیوں؟ ادھر تان کر ایک چانٹا"

"میرا سر پھٹا جاتا ہے۔" کشیدہ قامت نوجوانوں میں سے ایک کہتا ہے۔ "دو کماسوف کے ہاں کل واسکا اور میں مل کر برانڈی کی چار بوتلیں اڑا گئے۔"

"سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اتنی بکواس کیوں کرتے ہو؟" دوسرا کشیدہ قامت نوجوان خفا ہو کر کہتا ہے۔ "وحشیوں کی طرح جھوٹ بکتے ہو۔"

"اپنی جان کی قسم سچ کہتا ہوں۔"

"یہ ایسا ہی ہے جیسے یہ کہنا کہ جوں کھانستی ہے۔"

"ہی ہی ہی۔" ایونا ہنستا ہے۔ "صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں۔"

"مردود!" کبڑا غصے میں آکر چیختا ہے چلاتا ہے 'ملعون' نہیں گاڑی یوں چلائی جاتی ہے؟ چلانے کا یہ طریقہ ہے؟ لگا ایک چابک 'کم بخت کی چابک سے خبر لے۔"

ایونا کو اپنے پیچھے کبڑے کے ہلنے جلنے اور کانپتی ہوئی آواز کا احساس ہوتا ہے۔ وہ سنتا ہے کہ مجھے گالیاں دی جارہی ہیں۔ لوگوں کو دیکھتا ہے اور تنہائی کا بوجھ اس کے دل پر سے ہلکا ہو جاتا ہے۔ کبڑا اسے برا بھلا کہتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنے لچھے دار گرم گرم فقروں سے اس کے گلے میں پھندا پڑ جاتا ہے اور کھانسی اس کی زبان بند کر دیتی ہے۔ اس کے کشیدہ قامت رفیق ندا ہنر وا پتر دوا ایک عورت کا ذکر چھیڑتے ہیں۔ ایونا ایک طرف دیکھتا ہے تھوڑی دیر انتظار کر کے جب وہ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتے ہیں تو پھر مڑ کر دیکھتا ہے اور کہتا ہے:

"اس ہفتے میرا لڑکا گذر گیا۔"

"سب کو ایک نہ ایک دن مرنا ہے۔" کبڑا ٹھنڈا سانس کھینچتا ہے اور کھانس کر ہونٹ پونچھتا ہے۔ "خیر تیز چلاؤ' تیز' یارو مجھ سے یہ چیونٹی کی چال نہیں دیکھی جاتی' نہ معلوم کب پہنچائے گا۔"

"ذرا اس کی ہمت بڑھاؤ...... لگاؤ گردن پر ایک ہاتھ۔"

"ملعون! سنتا ہے 'مزا چکھا دوں گا۔ تم لوگوں کا لحاظ کرنے سے پیدل چلنا اچھا۔ بھتنے سنتا ہے' یا جو کچھ ہم لوگ کہہ رہے ہیں تیری جوتی کی نوک سے؟"

ایونا کی پیٹھ پر تھپیڑ پڑتا ہے جس کا تڑاخا سے چوٹ سے زیادہ سنائی دیتا ہے۔

"ہی ہی!" وہ ہنستا ہے۔ "صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں خدا آپ صاحبان کو سلامت رکھے۔"

"گاڑی بان تمہاری شادی ہو چکی ہے؟" ایک کشیدہ قامت نوجوان پوچھتا ہے۔

"میری؟ ہی ہی ہی! صاحب لوگ مذاق کرتے ہیں۔ سب گیلی مٹی ہی میری دلہن بنے گی..... ہو ہو یعنی قبر..... ذرا سوچو میرا بیٹا قبرستان میں جا کتا موجود ہوں۔ عجیب معاملہ ہے۔ موت انگل پکڑ زنجیر کھٹکھٹاتی ہے۔ میرے پاس آنے کے بجائے میرے لڑکے کو لے گئی۔"

ایونا مڑ کر انہیں اپنے بیٹے کی موت کا حال سناتا ہے۔ مگر یہاں پہنچ کر کبڑا ہلکی سی آہ بھر کر کہتا ہے۔ "شکر ہے منزل مقصود پر آ پہنچے۔" اپنے بیں کوپک لے کر ایونا دیر تک ان اوباشوں کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ وہ ایک اندھیرے پھاٹک میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ایونا کے لئے پھر وہی تنہائی' وہی ہو کا عالم چھا جاتا ہے۔ جو صدمہ گھڑی بھر کو ہلکا ہو گیا تھا' وہ پھر ابھر آتا ہے اور اس کے دل پر انتہائی شدت سے ٹوٹتا ہے۔ اس کی نظروں سے غم و اندوہ ٹپکتا ہے۔ وہ بے چین نگاہوں سے سڑک کے دونوں طرف لوگوں کی ریل پیل پر نظریں ڈالتا ہے۔ کیا اس ہزاروں کے مجمع میں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہیں' جو اس کی دکھ بھری کتھا سنے؟ لوگ اس سے' اس کے غم سے غافل گذرتے چلے جاتے ہیں..... اس کا غم بے انتہا سخت' اندازے سے باہر ہے۔ اگر اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے اور اس کا غم اس میں سے پھوٹ پڑے تو وہ تمام دنیا میں سیلاب کی طرح پھیل جائے۔ پھر بھی وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔ اس نے ایک ایسے حقیر خول میں چھپنے کو جگہ نکالی ہے کہ دن کے وقت چراغ لے کر ڈھونڈو تب بھی نہ دکھائی دے۔

ایونا کی نظر ایک دربان پر پڑتی ہے جس کے ہاتھ میں ایک پلندہ ہے۔ وہ اس سے بات چیت کرنے کی ٹھانتا ہے۔

"بھئی کیا وقت ہو گا؟"

"دس بجا چاہتے ہیں..... یہاں کیوں کھڑے ہو آگے بڑھو۔"

ایونا چند قدم آگے بڑھ جاتا ہے' اتنا جھکتا ہے کہ دوہرا ہو جاتا ہے اور اپنے غم میں ڈوب جاتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ لوگوں سے کسی قسم کی امید رکھنا بے فائدہ ہے۔ پانچ منٹ نہیں گذرتے کہ وہ سیدھا ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ سر اس طرح ہلاتا ہے جیسے سخت درد میں مبتلا ہے اور باگ کھینچتا ہے۔ اب اس سے تکلیف نہیں سہی جاتی۔

"واپس اصطبل کو" اپنے دل میں کہتا ہے۔ "اصطبل کو۔"

گھوڑی اس کے خیالات کو تاڑ کر دلکی چلنے لگتی ہے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد ایونا ایک غلیظ بڑے آتشدان کے پاس بیٹھا ہے۔ آتشدان پر' فرش پر' بنچوں پر لوگ پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ ہوا' بو میں بسی ہوئی اور کثیف ہے۔ ایونا سونے والوں کی طرف آتا ہے۔ اپنا بدن کھجاتا ہے اور افسوس کرتا ہے کہ ناحق اتنے سویرے گھر واپس آیا۔ مزدوری سے دانے کے دام بھی نہیں نکلیں گے۔ "سوچتا ہے۔" یہی وجہ ہے کہ اتنا غمگین ہوں' جو اپنا کام ٹھکانے سے کرتا ہے' جسے پیٹ بھر کر کھانے کو میسر ہے' جس کے گھوڑے کو پیٹ بھر دانا ملتا ہے وہ ہمیشہ خوش رہتا ہے۔"

ایک کونے میں سے ایک نوعمر لڑکا گاڑی بان اٹھتا ہے' کچھ سوتے کچھ جاگتے کھنکھارتا ہے اور پانی کی بالٹی کا رخ کرتا ہے۔

"پیاس لگی ہے؟" ایونا پوچھتا ہے۔

"معلوم تو یہی ہوتا ہے۔"

"خدا راس لائے' بھئی دیکھو میرا بیٹا گذر گیا..... سنتے ہو؟ اس ہفتے ہسپتال میں..... عجیب معاملہ ہے۔"

ایونا دیکھتا ہے کہ ان کے لفظوں کا اثر کیا ہوا۔ مگر کچھ نظر نہیں آتا۔ نوجوان اپنا منہ لپیٹ کر سو جاتا ہے۔ بڈھا آہ بھرتا ہے اور اپنا

جان کھپاتا ہے.... جس طرح نوجوان کو پانی کی پیاس تھی اسی طرح ایونا بات چیت کا پیاسا ہے۔ اس کے لڑکے کو مرے عنقریب ہفتہ بھر ہو جائے گا۔ اور اب تک اسے کسی سے کھل کر باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا۔ وہ اس بارے میں ٹھکانے سے جی بھر کر باتیں کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ میرا بیٹا کس طرح بیمار پڑا۔ اس نے کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں، مرتے دم کیا کہا، کیونکر مرا..... وہ چاہتا ہے کہ جنازے کا حال سنائے اور بتائے کہ کیونکر اپنے لڑکے کے کپڑے لینے ہسپتال گیا۔ اس کی لڑکی انیسیا دیہات میں رہتی ہے...... وہ چاہتا ہے کہ اس کا بھی ذکر کرے ..ہاں اب اسے بہت کچھ کہنا سننا ہے۔ جس سے وہ باتیں کرے اسے چاہیے کہ ٹھنڈی آہیں بھرے، تعجب کا اظہار کرے اور اس کے سوگ میں شریک ہو.... اگر عورتیں بات کرنے کو مل جائیں اور بھی اچھا ہو۔ گو وہ بے وقوف ہوتی ہیں اور بات شروع نہیں ہوتی کہ بسورنے لگتی ہیں___ "چلیں، گھوڑی کو ایک نظر دیکھ آئیں۔" ایونا سوچتا ہے "سونے کے لئے بہت وقت پڑا ہے نیند کہیں نہیں گئی۔"

کوٹ پہن کر گھوڑی کے تھان میں داخل ہوتا ہے، اسے دانے، چارے، موسم کا خیال آتا ہے .... تنہائی میں وہ اپنے لڑکے کا خیال نہیں کر سکتا ہے.... کسی اور سے اس کا ذکر کر سکتا ہے. . . مگر اس کا خیال کرنا اور تصور باندھنا، یہ اذیت اس کی برداشت سے باہر ہے.....

"دانہ چبا رہی ہو۔" اپنی گھوڑی کی روشن آنکھیں دیکھ کر پوچھتا ہے۔ "اچھا جگالی کئے جاؤ... کئے جاؤ....دانے کیلئے کافی مزدوری نہیں ملی تو نہ سہی، گھا کر گزارہ کرلیں گے ......ہاں میری عمر اب گاڑی چلانے کی نہیں رہی، اب میرا نہیں میرے لڑکے کا کام سنبھالنے کا وقت تھا.....وہ پورا گاڑی بان تھا....اسے کچھ دن اور جینا تھا۔"..ایونا تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو جاتا ہے پھر کہتا ہے ۔"بیٹی بات یہ ہے..... کزما ایونچ چل بسا..... مجھ سے رخصت ہو گیا۔ بلاوجہ، اچانک جان دے دی.....اچھا یوں سمجھو کہ تمہارا ایک بچھیرا ہے اور تم اس ننھے سے بچھیرے کی ماں ہو.... اور یکایک وہ بچھیرا مر جائے.... تو تمہیں اس کا رنج ہو گا کہ نہیں؟"

گھوڑی منہ چلاتی ہے، ہنستی ہے اور اپنے مالک کے ہاتھوں پر سانس لیتی ہے، ایونا کا دل بھر آتا ہے اور وہ اس کے سامنے اپنا دل چیر کر رکھ دیتا ہے۔

(ترجمہ)

کیڈور کا مصور

منصور احمد

لڑکے کی آنکھیں ان پھولوں کے قلوب کی طرح سیاہ تھیں جن کا ایک انبار وہ اٹھائے ہوئے تھا اور وہ مشتاقانہ اس سوار پر جمی ہوئی تھیں جو اپنے گھوڑے کو شاہراہ پر اڑائے لئے جا رہا تھا۔

اس نے کہا۔ "کیٹرینا ذرا دیکھنا! یہ شخص شہر کو جا رہا ہے 'حیرت انگیز شہر کو۔"

کیٹرینا نے اپنے بھائی کی طرف اس طرح دیکھا جیسے وہ اس کی بات نہیں سمجھی۔ اس سڑک پر جو ان کے گاؤں سے جنوب کی طرف جاتی تھی' بہت سے قصبے آباد تھے جنہیں یہ پہاڑی لڑکی کافی بڑا سمجھتی تھی۔ لیکن اس نے اپنے بھائی کی طرح انہیں حیرت انگیز کبھی خیال نہ کیا تھا۔

لڑکی نے کہا۔ "حیرت انگیز شہر؟ ٹیزیانو! حیرت انگیز شہر کہاں ہے؟"

اس نے متعجب ہو کر کہا۔ "کیوں تمہیں معلوم نہیں؟ اور کیا سینٹ مارک کے عظیم الشان شہر وینس کے علاوہ بھی کسی شہر کو حیرت انگیز کہا جا سکتا ہے؟"

مگر وینس کے نام نے سیاہ چشم کیٹرینا پر کچھ زیادہ اثر نہ کیا۔ وہ عمر میں اپنے بھائی سے بڑی تھی اور اس کی طرح موہوم باتوں کے خواب نہ دیکھا کرتی تھی۔ اس نے سنا تھا شہر میں اکثر خوفناک واقعات رونما ہو جایا کرتے ہیں اور بعض اوقات لوگوں کو وہاں فاقے بھی کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے برعکس اس پہاڑی علاقہ میں کھانے پینے کا سامان کافی سے زیادہ تھا اور اگرچہ کوئی بھی یہاں اتنا امیر نہ تھا جس کے قبضے میں خوبصورت محلات اور پر تکلف ساز و سامان ہو' لیکن بہت غریب بھی کوئی نہ تھا۔ اس نے اپنے کندھوں کو ذرا سا سکیٹر کر جواب دیا۔ "وینس! میں نہیں جانتی تم کیوں اسے حیرت انگیز کہتے ہو۔ گریزپا جولاہا بہت دفعہ وہاں گیا ہے مگر وہ کہتا ہے کہ اس میں ہمارے کیڈور سے آدھا حسن بھی نہیں ہے۔ نہ وہاں پہاڑ ہیں اور نہ مرغزار جہاں پھول کھلتے ہیں نہ [illegible] تو! کیا تم یہاں سے تنگ آ گئے ہو؟"

"[illegible] نہیں ایسے نہیں! لیکن شہر میں مصور رہتے ہیں اور اگر میں وہاں جا سکوں تو ان کے فن کا مطالعہ کروں اور بعض ایسی تصویریں [illegible] کی آرزو میرے دل میں ہے۔"

کیٹرینا ایک عملی دیہاتی لڑکی تھی جس کا خیال تھا کہ اگر کسی کے پاس کھانے اور پینے کے لئے کافی ہو تو اسے مطمئن ہو جانا چاہیے۔ اسی لئے جب وہ بولی تو اس کا لہجہ ملامت آمیز تھا اور دلچسپ بھی۔

"یہ جو تم ہر وقت مصوری کی باتیں کرتے رہتے ہو اور ان چیزوں کو دیکھنے کے لئے بیتاب رہتے ہو جنہیں اور کوئی بھی نہیں دیکھتا تو لوگ کہتے ہیں کہ جب تک تم یہ دن دہاڑے خواب دیکھنے نہ چھوڑو گے تم کوئی کام نہیں کر سکو گے۔ اسی لئے والد تمہیں لوگی موچی کے پاس شاگرد کرانے کا دھیان کر رہے ہیں۔ کم از کم وہ تمہیں اپنے فن میں ماہر تو بنا سکتا ہے اور یہ تمہارے لئے ہر وقت وینس کے متعلق سوچتے رہنے سے بدرجہا بہتر ہو گا۔"

ٹیزیانو نے اپنے سر کو جنبش دی لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔ اسے اپنے مقصد کے سامنے کسی دوسری بات کی ذرا بھی پروا نہ تھی۔ اکثر راتوں کو جب گھر کے سب لوگ سو جاتے اور وہ اپنے بستر میں جاگ جاگ کر سوچا کرتا کہ کس طرح وہ اپنے باپ کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اسے مصوری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے شہر جانے کی اجازت دے دے۔ گاؤں میں سب جانتے تھے کہ وہ گھنٹوں 'پتھروں اور ہر اس چیز پر جو اس کے سامنے آجاتی' تصویریں بنانے میں گھنٹوں صرف کر دیا کرتا ہے' اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ گاؤں کا نیک دل پادری اس کے کام کی تعریف کیا کرتا ہے۔ لیکن اس کی ان کے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہ تھی۔ کیڈور کے دوسرے لڑکے بھی اسی طرح تصویریں بناتے تھے اور انہیں کوئی پوچھتا نہ تھا۔ آخر اسے کیوں شہر بھیجا جائے؟ صرف اس لئے کہ وہ ایک پہاڑ کا نقشہ خیال سے اتار سکتا ہے' یا جنگل کی تصویر کسی حد تک بنا لیتا ہے؟ ان کی اس بے توجہی کی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی طرح بھی انہیں یہ سمجھانے میں کامیاب نہ ہوتا تھا کہ رنگ وہی چیز ہے جس نے اس کی روح میں ایک آگ لگا رکھی ہے اور سرے کے قلم سے اس کا اظہار ناممکن ہے۔

نیچے سڑک پر ایک سیٹی کی آواز سنائی دی اور کیٹرینا نے دیکھا کہ اس کا بھائی فرانسسکو انہیں جلد اپنے پاس بلا رہا ہے۔

کیٹرینا نے کہا "وہ شاید ہار گوندھنے کے لئے تیار ہو چکے ہیں۔"

اس کے بعد دونوں گاؤں کی سرائے کی طرف دوڑ پڑے۔

کوہستان اطالیہ میں یہ جون کا روشن اور عطر بار مہینہ تھا۔ جب ڈولومی کی زرخیز وادی کے ٹیلے اور میدان رنگا رنگ پھولوں کا ایک گلدستہ بن جاتے ہیں کل پھولوں کا میلہ آرہا تھا۔ اسی لئے آج انہوں نے پھول چننے میں کئی گھنٹے گذار دیئے تھے اور اب کہ غروب ہوتا ہوا آفتاب چوٹیوں کو ارغوانی رنگ دے رہا تھا وہ اپنی تاخت و تاراج کو لے کر واپس جا رہے تھے تاکہ اس سے اپنے عیش و مسرت کی تیاری میں مدد لیں۔

ذرا سی دیر میں وہ اپنے نوخیز ساتھیوں سے جا ملے۔ سب نے ہار بنانے شروع کر دیئے اور کل کے کھیلوں کے متعلق تجویزیں سوچنے لگے۔ کیڈور کا گاؤں ان دونوں ذرائع آمد و رفت کی کمی کے باعث دنیا سے بہت دور تھا اور جب کوئی تیوہار آتا تھا تو وہاں کے باشندے اپنے سیدھے سادھے کھیلوں میں اتنے نہ خوش ہوتے تھے جتنے کہ وینس کے رہنے والے اپنے نئے نئے تماشوں کو دیکھ کر لطف اندوز ہوں' ہر طرف سے گیتوں اور قہقہوں کی آوازیں آتیں تھیں اور مشتاق سامعین کے لئے چھوٹی بچی دلچسپ باتیں کہی جاتی تھیں۔

ایک لڑکی نے جس کی زبان اس کی چالاک انگلیوں سے بھی تیز چلتی تھی کہا "کچھ تم نے سنا' چکی والے کا لڑکا سالو تیر سنگ

فن سیکھنے کے لئے وینس جا رہا ہے۔ جب سے اس کا باپ امیر ہو گیا ہے' اس نے اس سے اپنا کاروبار کرانے کا خیال [illegible] ہے۔ پہلے تو سالویٹر نے اس طرف دھیان ہی نہ کیا لیکن جب اسے بتایا گیا کہ ایک سنگتراش کسی بہت بڑے نواب کا مقرب بھی ہو سکتا ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ اگر وہ ایک بڑا آدمی بن گیا اور ایک نفیس مکان میں رہنے لگا تو یہ کیسی شاندار بات ہو گی۔ پھر ہم کہا کریں گے 'ہاں ہاں وہ ہمارے ہی گاؤں کا آدمی ہے۔"

سیزیانو جس کا چچا بریگیو میں کسی وکیل کا منشی تھا' اور جو شہر کی باتوں سے دوسرے بچوں کی نسبت زیادہ واقف تھا' بولا۔ "میں تو نہیں سمجھتا کہ اسے سنگتراشی کا کچھ شوق ہو۔ میرے خیال میں صناع بننے کے لئے امیر باپ کے علاوہ کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے۔"

باتونی لڑکی نے اپنے سر کو ہلایا۔ پھر بولی۔ "یہ سچ ہے! مگر روپیہ بھی نہ ہو اور استاد بھی نہ ملے تو بتاؤ کوئی کیسے کچھ کر سکتا ہے؟"

کیٹرینا نے کہا۔ "سو اب اگر ٹیزیانو نے مصوری سیکھنے کے لئے شہر جانے کا نام لیا تو میں اس سے کہہ دوں گی کہ والد اتنے امیر نہیں ہیں کہ تمہارا خرچ برداشت کر سکیں اس لئے بہتر یہی ہو گا کہ تم لونگی سے موچی کا کام سیکھنے کا خیال نہ کرو۔"

اس پر سب کھلکھلا کر ہنس پڑے اور کسی نے کہا۔ "ٹیزیانو! اس نے تو کبھی کسی سے ایک دفعہ اصلاح نہیں لی۔ وہ تو بنیاد اٹھائے بغیر قلعے کے برج بنانے شروع کر دیتا ہے۔"

ٹیزیانو کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ یہ سچ تھا کہ اسے کبھی استاد میسر نہ آیا لیکن اسے یقین تھا کہ اگر اسے موقع دیا جائے تو وہ اپنے آپ کو اس قابل ثابت کر دے گا کہ اس کے لئے ایک استاد کی خدمات حاصل کی جائیں۔

اس نے دل میں سوچا۔ "کاش مجھے کچھ رنگ مل جائیں! ممکن ہے پھر یہ لوگ مجھے وہمی نہ سمجھیں' کیونکہ مجھے یقین ہے کہ میں ان سے ایک اعلیٰ درجہ کی تصویر بنا سکوں گا اور پھر شاید میں اپنے مقصد کے حصول کے لئے وینس جا سکوں۔"

لیکن رنگ کمیاب اور بیش قیمت تھے اور گو اس کا باپ ایک آسودہ حال شخص تھا' تاہم وہ ایک ایسے لڑکے کے لئے رنگ خرید کر اپنا روپیہ ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا جسے کبھی ان کا استعمال نہ سکھایا گیا ہو۔

دوسرے دن نوخیز مصور کو راستے کے پتھروں پر کچھ داغ نظر آئے جو پھولوں کے روندے جانے سے وہاں پڑ گئے تھے۔ یہ داغ ایسے صاف اور روشن تھے جیسے کسی مصور نے انہیں بڑی احتیاط سے بنایا ہو۔ ان کو دیکھ کر اسے ایک خیال سوجھا۔ اس نے یہ خیال کسی پر ظاہر نہ کیا۔ وہ اس میں اتنا محو تھا کہ سبزہ زار پر رنگ برنگ کے لباس پہن کر رقص کرنے والے دیہاتی بھی اسے اپنی طرف متوجہ نہ کر سکے اور جیسے ہی اسے موقع ملا وہ چپکے سے ان میں سے نکل کر پھولوں کے کھیتوں کی طرف چل دیا۔

کیٹرینا نے اسے جاتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ حیران تھی کہ اس مسرت و انبساط کے مجمع میں سے کون سی چیز اسے لے جا رہی ہے۔ جب اس کی حیرت تفریح کی خواہش حد سے بڑھ گئی تو وہ بھی اس کے پیچھے روانہ ہو گئی۔ جب وہ اس کے پاس پہنچی تو وہ ایک ایسی پہاڑی پر کھڑا تھا جسے پھولوں نے روشن کر رکھا تھا۔

وہ بولی۔ "ٹیزیانو! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

لڑکے نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شک جھلک رہا تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ گو میری بہن کو میری بلند پروازیوں پر اعتراض ہے پھر بھی وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور میرے راز کو فاش نہیں کرے گی۔

اس نے جواب دیا۔ "میں ایک رنگین تصویر بنانا چاہتا ہوں۔"

ایک لمحے کے لئے وہ کھڑی اسے دیکھتی رہی۔ پھر یہ سوچ کر کہ وہ مذاق کر رہا ہے کہنے لگی "ہاں کیوں نہیں رنگوں کے بغیر!"

لیکن اس کا متین چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مذاق نہیں کر رہا ہے۔

اس کی آنکھیں ایک عجیب روشنی سے چمک رہی تھیں۔ جب اس نے کہا "میں رنگوں کی جگہ پھولوں کا استعمال کروں گا۔ دیکھو ان میں سب رنگ موجود ہیں اور مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ کام میں لائے جا سکتے ہیں میں نے ان کے نشان راستے کے پتھروں پر دیکھے ہیں۔"

کیٹرینا اپنے بھائی کی طرح موہوم خیالات میں کھو نہیں جایا کرتی تھی اور کہیں رنگ کے ایک دھبے کو دیکھ کر اسے تصویریں نظر نہیں آیا کرتی تھیں۔ لیکن اس نے سمجھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے ناممکن نہیں ہے۔ کیونکہ اس نے خود بھی پتھروں پر رنگ کے نشانات دیکھے تھے۔ اب اسے یہ بھی خیال تھا کہ اس کا بھائی ضرور ایک ہشیار اور زیرک لڑکا ہے۔ کیونکہ عام لوگوں کو یہ بات ذرا بھی نہیں سوجھی اور اس نے سوچا کہ شاید اس کی وینس جانے کی خواہش کوئی بے سروپا خیال نہیں ہے۔ اگر چکی والے کے بیٹے کے لئے سنگتراش بن جانا ایک شاندار بات ہو سکتی ہے تو کیا ٹیزیانو کا ایک مصور بن جانا شاندار تر نہیں؟ اور کیا کیڈور اور اس پر فخر نہیں کر سکتا؟ پادری کو اس نے اکثر سنا تھا کہ کوئی کام ایسا نہیں جس کی دھن انسان کو لگی ہو اور پھر اسے صبر، حوصلے اور استقلال سے کیا جائے اور ناکامی ہو۔ اور یہ کہ مدد ہمیشہ ان کو ملتی ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں چنانچہ اس نے ٹیزیانو کو مدد دینے کا فیصلہ کر لیا خواہ وہ اسی قدر کیوں نہ ہو کہ اس کے راز کی حفاظت کی جائے اور اس کے کام کے لئے ضروریات مہیا کی جائیں۔ سو کھتے ہوئے کھلوں میں سے وہ رنگ رنگ کے پھول اکٹھے کرتے پھرے۔ سرخ، گلابی، نیلے، ارغوانی جیسے کوہستان کی شفق کا رنگ ہوتا ہے اور پیلے اور سنہری جیسے وہ اپنے تصور میں دیکھا کرتے تھے۔ پھر وہ اس پرانے پتھر کے بنے ہوئے مکان کی طرف اٹھ بھاگے جو ان کے باپ کی ملکیت تھا۔ یہ بالکل خالی رہتا تھا۔ ان کے اپنے گھر والے لوگ بھی یہاں شاذ و نادر ہی آیا کرتے تھے اور گاؤں کے رہنے والے تو اس میں کبھی داخل ہی نہ ہوتے تھے ___ اور یہیں ہر دست اندازی سے محفوظ ہو کر اسے وہ تصویر بنانی تھی جس کے متعلق دونوں بہن بھائیوں کو امید تھی کہ وہ اسے وینس لے جانے کا ایک ذریعہ ثابت ہو گی۔

کیٹرینا پاس رہ کر تصویر کو بنتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن ٹیزیانو کو اس پر اعتراض تھا۔ اس نے کہا۔ "جب تک یہ ختم نہ ہو لے میں نہیں چاہتا کہ تم بھی اسے دیکھو۔ کیونکہ اول اول اس کی شکل تصویر جیسی نہیں ہو گی۔"

چنانچہ وہ اسے کوئلے کے ایک ٹکڑے سے خاکہ بناتے ہوئے چھوڑ کر چلی گئی۔

کئی دن تک لوگوں سے چھپ چھپا کر وہ اس مکان میں جاتا رہا اور پھولوں کے رنگوں سے تصویریں بناتا رہا۔ کیٹرینا تو پرندوں کی طرح اڑتی ہوئی کھنڈروں میں جاتی اور پھر ادھر ادھر نگاہ ڈال کر کوئی دیکھ تو نہیں رہا، اس کھڑکی میں سے پھول اپنے بھائی کے حوالے کر دیتی جس کے قریب بیٹھ کر وہ کام کر رہا تھا اور اگرچہ پھول کی ہر پتی تصویر پر صرف ایک ننھا سا دھبہ بنا کر خشک ہو جاتی اور اگرچہ ٹیزیانو ایک ملہم نبی کی سی تیزی کے ساتھ تصویر پر رنگوں کو پھیلاتا جاتا لیکن اسے ایک مرتبہ بھی

کے انتظار میں ہاتھ روکنا نہ پڑا۔

تصویر اس کے سحر آشنا قلم کے نیچے بتدریج نمایاں ہوتی گئی اور اس نے اور کیٹریانو نے اپنے راز کی خوب پاسداری کی۔ صرف تصوروں کے گلے مہکتی ہوئی چراگاہوں میں چرتے ہوئے کبھی کبھی اس سنسان مکان تک جا پہنچتے۔ چنانچہ کسی کو بھی علم نہ تھا کہ یہاں وہ لڑکا مصرف کار ہے جو اٹلی کے نام کو چار چاند لگا دے گا۔ گاؤں کے لوگوں کو خواب و خیال بھی نہ تھا کہ یہ پھول جو کیٹرینا چن رہی ہے' ایک غیر فانی کام میں استعمال ہو رہے ہیں۔

ایک شام جب سورج پہاڑ کی چوٹیوں کے پیچھے غائب ہو رہا تھا اور گھروں کو واپس جاتے ہوئے گڈریوں کی خوشی سے لبریز آوازیں بلندیوں سے نیچے گونج رہی تھیں' ٹیزیانو نے اس مکان کے دروازے سے باہر قدم رکھا اور بہن کو اپنے پاس بلا کر کہا۔

"کیٹرینا! تصویر ختم ہو گئی اور یہ میری بہترین تصویر ہے۔"

وہ خوشی سے اچھلتی ہوئی اندر گئی۔ لیکن جب وہ تصویر کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی تو مسرت اس کے چہرے سے رخصت ہو گئی اور وہ احترام آمیز لہجے میں بولی۔ "اوہ ٹیزیانو! یہ تو مقدس مریم کی تصویر ہے۔"

اس نے کہا۔ "ہاں مریم اور بچے کی۔ اور ایک میری طرح کا لڑکا تحفہ پیش کر رہا ہے۔ کیٹرینا یہی تصویر میرے دل میں تھی۔"

چند لمحوں کے لئے وہ تصویر کے حسن میں ایسی محو ہوئی کہ اسے اور کوئی بات یاد نہ رہی۔ پھر یہ خیال کر کے کہ گاؤں والوں کے لئے اس حیرت انگیز کارنامے کا علم اس کے بھائی کے حق میں کیسے کیسے شاندار نتائج پیدا کرے گا۔ وہ اس خبر کو پھیلانے کی خاطر باہر نکلی۔

اور جب وہ لونگی کے گھر کے پاس سے جلد جلد گذر رہی تھی اس نے کہا۔ "آؤ دیکھو! ٹیزیانو نے ہمارے پرانے مکان کی دیوار پر مقدس مریم کی تصویر رنگوں سے بنائی ہے۔"

کوئی خبر جب دیہاتیوں کی زبانوں پر چڑھ جاتی ہے تو بہت جلد مشہور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ تھوڑی دیر میں لوگوں کا ایک مجمع اس مکان کے دروازے پر پہنچ گیا جہاں ٹیزیانو ان کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا باپ جو تمام دن پہاڑوں میں شکار کرتا پھرا تھا' اب گھر واپس آ رہا تھا۔ جب اس نے لوگوں کو اس جگہ جمع ہوتے دیکھا تو حیران ہو کر وہ بھی اسی طرف چل کھڑا ہوا مگر اس کے پہنچنے تک ہجوم اس قدر بڑھ چکا تھا کہ تصویر اس کو نظر نہ آئی۔

ہر طرف سے یہی آوازیں آ رہی تھیں "___ اس نے یہ تصویر کیسے بنائی؟___ اس نے یہ رنگ کہاں سے لئے؟" اور ہر شخص میں اتنا جوش بھرا ہوا تھا کہ اس کے باپ کو یہ بھی معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ وہ کیوں یہاں جمع ہو رہے ہیں۔ پھر اس نے ٹیزیانو کی آواز سنی۔ "میں نے اس تصویر کو پھولوں کے رس سے بنایا ہے۔ کیٹرینا ان کو جمع کرتی رہی اور میں کام کرتا رہا۔"

ہر طرف سے تعریف کا اظہار ہونے لگا اور گاؤں کے پیشوا نیک دل پادری نے پر احترام انداز سے کہا۔ "پھولوں کے رس سے! مقدس ٹیزیانو کو دیکھو۔"

انٹونیو ویسلی سکتے کے عالم میں کھڑا دیکھ رہا تھا کیونکہ جو کچھ وہ سن رہا تھا اس پر اسے یقین نہ آتا تھا۔ ایک دیہاتی سے جو پاس ہی کھڑا تھا اس نے پوچھا۔ "کیا میں پاگل ہو گیا ہوں یا پادری نے سچ مچ میرے بیٹے کو مقدس کہا ہے؟"

اس نے جواب دیا۔ "نہیں تم پاگل نہیں ہو۔"

اور جب انہوں نے سارا ماجرا اس سے کہہ سنایا اور ہجوم نے اسے راستہ دیا کہ وہ بھی تصویر کو دیکھ سکے تو وہ حیران رہ گیا۔

چکی والے کا لڑکا سالویٹر سنگ تراشی سیکھنے گیا یا نہیں یہ کوئی نہیں جانتا لیکن ٹیزیانو گیا اور کیڈور کا یہ لڑکا بعد میں وینس کا مصور بنا۔ وہاں بیلینی کی استادانہ اصلاح نے اس کی رہنمائی کی اور ان سو قلموں کو جو اس سے قبل تقریباً اسی سال تک مصروف کار رہتے تھے اس نے خوب چلایا اور ان سے وہ تصویریں بنائیں جن کے شگفتہ رنگوں کی نظیر پھر کبھی نہ مل سکی۔ اس نے اپنے وطن کے لوگوں پر ثابت کر دیا کہ خیال پرستی کچھ بری چیز نہیں۔ کیونکہ خیال پرستی کے ساتھ جب محنت مل جاتی ہے تو اس سے حیرت انگیز باتیں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔

جب گاؤں کے لوگ اس عالی پایہ مجسمہ کے پاس آکر کھڑے ہوتے ہیں جس کا رخ پھولوں کے ان کھیتوں کی طرف ہے جن میں کیٹرینا اپنے بھائی کے لئے رنگ رنگ کے پھول توڑ کر لاتی تھی، تو وہ اس کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں۔ "دیکھو! مقدس ٹیزیانو کو دیکھو!"

(ترجمہ)

بلی کے بچے

جلیل قدوائی

صبح سورج کی کرنیں خواب گاہ کی شیشہ دار کھڑکیوں سے چھن کر کمرے کے اندر اور بستر پر آ رہی ہیں۔ دانیا ایک چھ سال کا لڑکا جس کے بال برابر سے ترشے ہوئے ہیں، اور بٹن کی سی ناک ہے اور اس کی بہن نینا ایک چھوٹی، پھولے گالوں والی، گھونگھریالے بالوں والی، چار سال کی لڑکی، سو کر اٹھے ہیں اور بستر پر پڑے پڑے چارپائی کی جالی سے ایک دوسرے کو گھورتے ہیں۔

"اٹھو۔ او۔ او۔ لڑکو۔ ان کی انا انہیں دیکھ کر کہتی ہے۔ اچھے لڑکے کب کے ناشتہ کر چکے اور تمہاری آنکھ نہیں کھلنے آتی۔"

سورج کی کرنیں کمبلوں، دیواروں اور انا کے سایہ کے دامنوں پر کھیلتی اور تھرکتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بچوں کو اپنے کھیل میں شریک کرنے کی دعوت دے رہی ہیں۔ مگر بچے اس دعوت کو رد کر رہے ہیں۔ وہ سو کے اٹھے ہیں تو ان کا مزاج بگڑا ہے اور تیوریاں چڑھی ہیں۔ نینا انگڑائی لیتی ہے اور انا سے کہتی ہے۔

"نا... آشتہ.......بوا' ناشتہ!"

دانیا اپنی آنکھیں چرا جاتا ہے اور شور کرنے کے لئے کوئی بہانہ ڈھونڈتا ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں تلملانا اور منہ کھولنا شروع کر دیا ہے لیکن اسی وقت ماں کی آواز ڈرائنگ روم سے سنائی دیتی ہے۔ بلی کو دودھ دینا نہ بھول جانا اس نے بچے دیئے ہیں۔

لڑکوں کے بگڑے ہوئے چہرے پھر اصلی حالت پر آ جاتے ہیں۔ اور وہ ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے ہیں۔ پھر دونوں ایکدم چلانا شروع کر دیتے ہیں۔ اپنے بستر سے باہر نکل آتے ہیں۔ اور اپنے شور و بکا سے فضا میں جھنکار پیدا کرتے، ننگے پیر دوڑتے، رات کا لبادہ پہنے باورچی خانہ پہنچتے ہیں۔

باورچی خانہ میں ایک تپائی کے نیچے ایک چھوٹا ڈبہ رکھا ہے۔ جس میں اسٹفن آگ جلانے کے لئے کوئلے لاتا تھا۔ بلی اس ڈبے میں سے جھانک رہی ہے۔ اس کے اترے ہوئے چہرے پر ناتوانی ہے۔ اس کی سبز آنکھوں سے جن کے گرد تنگ و تاریک حلقے ہیں۔ کمزور شفقت میں ڈوبی ہوئی نظریں نکل رہی ہیں......

"وہ میاؤں کرنا چاہتی ہے اور اپنا منہ کھولتی ہے لیکن اس کے حلق سے صرف ایک ناتواں، ہلکی بے صدا سانس نکلتی ہے۔ بلی کے بچے کل بل کل بل کر رہے ہیں۔ ان کے کلبلانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

دونوں لڑکے ڈبے کے سامنے اینڈی کے بل کودتے ہیں اور اپنی سانس روکے بالکل بے حرکت بلی کو دیکھتے ہیں.......وہ متحیر اور خوش ہیں اور انا کے بکنے ڈانٹنے کی آوازوں کو نہیں سنتے۔ دونوں کی آنکھیں بے اختیاری خوشی سے چمک رہی ہیں۔

بچوں کی تعلیم اور زندگی سدھارنے میں پالتو جانوروں کا بھی کتنا زیادہ حصہ ہے۔ اس کو مشکل سے محسوس کیا جاتا ہے۔ ہم میں سے کون طاقتور اور بھاری کتوں' ست ادھ مری بلیوں' پنجرے میں محبوس چڑیوں' کم عقل مگر جوشیلی مرغیوں' حلیم' نیک دل۔ بڈھی بلیوں کو نہیں یاد کرتا۔ جنہوں نے اگر ہم نے کھیل میں ان کی دم پر پیر رکھ دیئے ہیں اور انہیں تکلیف پہنچائی ہے۔ ہمیں معاف کر دیا! بلکہ میں تو بعض وقت فی الواقع یہ سمجھتا ہوں کہ وہ صبر' رحم' شفقت' وفاداری اور اخلاص جو ان پالتو جانوروں میں ہوتا ہے' بچوں کے ذہن پر کسی بڈھے فلسفی یا باؤں اور استادوں کی تربیت اور تعلیم سے کہیں زیادہ مفید دور پا اثر ڈالتا ہے۔

"کیسے ننھے ننھے ہیں۔" نینا اپنی آنکھیں اچنبھے میں خوب کھول کر ہنستی ہوئی کہتی ہے۔ جیسے چوہے ہوں۔"

ایک دو تین۔" دانیا گنتا ہے۔ تین بچے ہیں۔ اچھا تو ایک تمہارا' ایک میرا! اور ایک ننی کے لئے بھی۔

"ہائیں ہائیں۔ ماں کہتی ہے ہائیں......

بلی کے بچوں کو خوب اچھی طرح دیکھ کے دونوں لڑکے انہیں بلی کے نیچے سے اٹھا لیتے ہیں۔ اور اپنے ہاتھوں میں انہیں ملنا شروع کرتے ہیں۔ اور پھر اس سے بھی نہ مطمئن ہو کر انہیں اپنے فراک کے لبادہ کے دامنوں میں رکھ لیتے ہیں۔ اور دوسرے کمروں میں دوڑ کر جاتے ہیں۔

"امی! بلی نے بچے دیئے۔" وہ چلاتے ہیں۔

امی ڈرائنگ روم میں کسی اجنبی سے باتیں کر رہی ہیں۔ لڑکوں کے بغیر منہ دھوئے' بغیر صاف کپڑے پہنے رات کے لبادے کے دامن اٹھائے دیکھ کر وہ گھبراتی ہے۔ اور انہیں خفگی کی نظروں سے دیکھتی ہے۔

"دامن گراؤ' بد تمیز کہیں کے۔" وہ کہتی ہے۔ کمرے سے باہر جاؤ۔ نہیں تو پیٹے جاؤ گے۔" لیکن لڑکے نہ ماں کی خفگی کی پروا کرتے ہیں' نہ اجنبی کی موجودگی کی۔ وہ بلی کے بچوں کو چٹائی پر رکھ دیتے ہیں۔ اور اپنے شور سے کان پھاڑ ڈالتے ہیں۔ بلی ان کے چاروں طرف رحم کی طالب نظروں سے میاؤں کرتی ہے۔ جب تھوڑی دیر بعد لڑکے کپڑے بدلنے کے لئے۔ منہ دھونے کے لئے یا ناشتہ کرنے کے لئے بلائے جاتے ہیں' انکی خواہش ہوتی ہے کہ کسی طرح یہ غیر دلچسپ فرائض جلد ختم ہوں کہ وہ بلی کے بچوں کے پاس پھر بھاگ کر جائیں۔

ان کے روزانہ کے کھیل اور دلچسپیوں کا پروگرام بالکل بالائے طاق ہے۔ بلی کے بچوں نے دنیا میں آکر ہر کام کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اور ان کی سب سے بڑی دلچسپی کا باعث ہوئے ہیں۔ اگر نینا یا دانیا کو چالیس پونڈ مٹھائی یا دس ہزار کا چیک فی بچہ دیا جاتا تو وہ بغیر پس و پیش کے ایسے سودے کو رد کر دیتے۔ باوجود انا اور باورچن کی سخت تاکید کے لڑکے مصر ہیں کہ باورچی خانہ میں کھانا کھانے کے وقت بلی کے ڈبے کے پاس بیٹھے رہیں۔ ان کے چہروں سے شوق اور جستجو اور انہماک ظاہر ہوتا ہے۔ وہ بچوں کے حال کے لئے اتنے فکر مند نہیں' جتنا ان کے مستقبل کے لئے۔ وہ طے کرتے ہیں کہ ان میں سے ایک بچہ تو گھر میں اپنی بڈھی ماں کی خبر گیری کے لئے رہے گا اور دوسرا ان کے گرمی کے مکان میں بھیجدیا جائے گا۔ اور تیسرا اسودی خانہ میں رہے گا۔ جہاں چوہے اتنی کثرت سے ہیں۔

"مگر وہ ہماری طرف دیکھتے کیوں نہیں ہیں۔" نینا کو تعجب ہوتا ہے۔ "ان کی آنکھیں بھکاریوں کی طرح اندھی ہیں۔"

دانیا کو بھی یہی تشویش ہے۔ وہ ایک بچہ کی آنکھ کھولنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور دیر تک اس کے پپوٹوں کو پھونکتا اور ہوا دیتا ہے لیکن اس کی کوشش بے کار جاتی ہے۔ اور اس پر بھی دونوں بہت متحیر ہوتے ہیں کہ بچے جو گوشت یا دودھ انہیں دیا جاتا ہے اُسے لینے سے انکار کرتے ہیں ان کے سامنے جو چیز رکھی جاتی ہے وہ ان کی ماں کھا لیتی ہے۔

"اچھا ان کے لئے گھر بنائیں۔" دانیا رائے دیتا ہے 'یہ تینوں علیحدہ علیحدہ گھر میں رہیں گے۔ اور بلی ان سے ملنے آیا کرے گی۔ ..."

دفتی کی ٹوپی کے ڈبے باورچی خانے کے مختلف کونوں میں رکھ دیے جاتے ہیں۔ اور بچے ان میں بٹھائے جاتے ہیں۔ لیکن یہ تقسیم ناکام ثابت ہوتی ہے۔ بلی اب بھی رحم کی طالب اور محبت بھری نظریں لئے سب ڈبوں کے گرد جاتی ہے۔ اور اپنے بچوں کو پہلی جگہ لے آتی ہے۔

"بلی ان کی ماں ہے۔" دانیا نے کہا "لیکن ان کا باپ کون ہے؟"

"ہاں ان کا باپ کون ہے؟" نینا دہرانی ہے۔

"کوئی ان کا باپ ضرور ہونا چاہیے۔"

دانیا اور نینا دیر تک سوچتے رہتے ہیں۔ کہ ان کا باپ کسے ہونا چاہیے۔ اور آخر میں ان کی نظر انتخاب ایک گہرے رنگ کے گھوڑے پر پڑتی ہے۔ جس کے دم نہیں ہے۔ اور جو زینہ کے نیچے کباڑ خانے میں دوسرے ٹوٹے پھوٹے کھلونوں کے ڈھیر میں پڑا ہے۔ وہ وہاں سے اسے باورچی خانہ میں گھسیٹ کر لاتے ہیں۔ اور اسے ڈبے کے پاس کھڑا کرتے ہیں۔

"سنتے ہو۔" وہ اس سے تاکید کرتے ہیں۔ "یہاں کھڑے رہو اور دیکھو کہ بچے کوئی بد تمیزی تو نہیں کرتے۔"

یہ سب بڑی سنجیدگی سے کیا جاتا ہے۔ دانیا اور نینا سوا بچوں کے ڈبوں کے کسی اور دنیا کے وجود سے انکار کرتے ہیں۔ ان کی خوشی کی کوئی حد نہیں ہے۔ لیکن انہیں تکلیف دہ اور رنجیدہ لمحوں سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔

کھانے سے پہلے دانیا اپنے باپ کے مطالعہ کے کمرے میں خواب آلودہ نظروں سے میز کو دیکھ رہا ہے۔ لیمپ کے نزدیک چھپے ہوئے نوٹ پیپر پر ایک بلی کا بچہ رینگ رہا ہے۔ دانیا اس کی حرکات کو خوب غور سے دیکھ رہا ہے۔ اور اس کے منہ میں پہلے ایک پنسل پھر دیاسلائی دے رہا ہے۔ ایک دم جیسے زمین کو پھاڑ کے نہ معلوم کہاں سے اس کا باپ میز کے پاس نمودار ہوتا ہے۔

"یہ کیا ہے؟" دانیا ایک غصہ کی آواز میں سنتا ہے۔

".....یہ ابا جان بلی کا بچہ ہے........"

"مار تو نہیں کھاؤ گے۔ دیکھو۔ تم نے کیا کیا۔ میرا تمام کاغذ خراب کر ڈالا!"

دانیا کے استعجاب کی حد نہیں رہتی جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کا باپ اس شوق میں کوئی حصہ نہیں لیتا جو دانیا کو بچے کے ساتھ ہے اور بجائے خوش ہونے کے وہ دانیا کے کان کھینچتا ہے اور چلاتا ہے۔

"سلطان اس شریر کو یہاں سے لے جاؤ۔"

کھانے پر دوسرا منظر پیش ہوتا ہے.....دوسرے دور کے درمیان ایک تیز میاؤں کی آواز دفعتہً سنائی دیتی ہے۔ وہ اس آواز کا مخرج تلاش کرتے ہیں۔ اور نینا کے کپڑوں میں ایک بلی کا بچہ چھپا لیتے ہیں۔

"نینا" بس میز پر سے اٹھ جاؤ۔" اس کا باپ خفا ہو کر کہتا ہے۔ بچوں کو موری میں پھکوا دو۔ میں ان گندی چیزوں کو گھر میں نہیں رکھونگا"۔

دانیا اور نینا خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ موری میں پڑے پڑے بچوں کی موت علاوہ بے رحمی کے بلی اور گھونسے کو جانکاہ صدمہ پہنچائے گی بچوں کے ڈبوں کو سونا کر جائے گی۔ ان کے مستقبل کے ارادوں پر پانی پھیر دے گی۔ وہ روشن مستقبل جب کہ ایک بچہ ماں کے آرام کے لئے اس کے پاس رہے گا' دوسرا دیہات پر رہے گا۔ اور تیسرا کوٹھڑی میں چوہے پکڑے گا۔ لڑکے رونے لگتے ہیں اور خوشامد کرتے ہیں۔ کہ بچوں کی جانیں بخش دی جائیں۔ ان کا باپ مان لیتا ہے۔ مگر اس شرط پر کہ وہ دونوں باورچی خانہ میں نہ جائیں۔ اور بچوں کو نہ چھوئیں۔

کھانے کے بعد دانیا اور نینا کمرے کمرے ایک بے کلی اور اداسی کے ساتھ پھرتے ہیں۔ باورچی خانہ جانے کی ممانعت نے انہیں بے دل کر دیا ہے۔ وہ مٹھائی نہیں لیتے۔ منہ پھیلائے ہوئے ہیں۔ اور ماں سے بگڑے ہوئے ہیں۔ جب ان کا چچا پڑوشا شام کو آتا ہے' وہ اسے علیحدہ لے جا کر اس سے اپنے باپ کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ بچوں کو نالی میں پھنکوائے دیتے ہیں۔

"چچا جان امی سے کہہ دو کہ بلی کے بچوں کو ہمارے کمرے میں منگا دیں۔" لڑکے چچا سے خوشامد کرتے ہیں۔ "کہہ دو۔ کہہ دو۔"

"ہاں ہاں اچھا" چچا جان انہیں چمکار کر کہتے ہیں' "اچھا۔"

چچا پڑوشا کبھی اکیلے نہیں آتے۔ ان کے ساتھ ان کا نیرو ایک بڑا سیاہ کتا بھی جس کے کان جھکے ہوئے ہیں اور جس کی لکڑی کی طرح سخت دم ہے' آتا ہے۔ کتا خاموش' غمگین اور اپنے وقار کو لئے رہتا ہے۔ وہ لڑکوں کو آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ بلکہ جب ان کی طرف سے گذرتا ہے تو ان کے دم مار جاتا ہے۔ جیسے وہ کاٹھ کی کرسیاں ہوں۔ لڑکے اس سے بڑی نفرت کرتے ہیں۔ لیکن وقتی ضرورتیں جذبات پر غالب آتی ہیں۔

"سنو نینا" دانیا اپنی آنکھیں خوب پھیلا کر کہتا ہے۔ نیرو کو ان کا باپ بناؤ۔ گھوڑے کو نہیں۔ گھوڑا بے جان ہے۔ اور یہ جاندار ہیں۔ سمجھے۔"

پوری شام وہ اس وقت کا انتظار کرتے ہیں جب ابا جان تاش کھیلنے بیٹھیں گے اور نیرو کو بغیر کسی کے دیکھے ہوئے باورچی خانے لیجانا ممکن ہوگا..... آخر کار ابا جان تاش کھیلنے بیٹھ جاتے ہیں۔ امی سماوار گرم کرتی ہے۔ اور لڑکوں کو نہیں دیکھ رہی ہے۔

وہ مبارک وقت آجاتا ہے۔

"آؤ" دانیا چپکے سے نینا کے کان میں کہتا ہے۔

لیکن اس وقت اسٹفن اندر آتا ہے اور خبر سناتا ہے۔

"بیگم صاحبہ۔ نیرو نے بچے کھا لئے۔"

"سچ کہتا ہوں اس نے کھا لئے..... نوکر ہنستا ہے۔ "وہ ڈبوں کے پاس گیا اور ہڑپ کر گیا۔"

لڑکے منتظر ہیں کہ گھر بھر بدحواس ہو جائیگا۔ اور بدمعاش نیرو کو سزا ملے گی۔ لیکن سب اطمینان سے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہتے ہیں۔ اور اس بدذات کتے کی بھوک پر صرف حیرت ظاہر کرتے ہیں۔ امی اور ابا جان ہنستے ہیں۔ نیرو میز کے پاس چکر لگاتا ہے۔ دم ہلاتا ہے اور

اپنے ہونٹ مزے سے چاٹتا ہے ....بلی ہی ایک ہے جسے چین نہیں ہے۔ اپنی دم ہوا میں اٹھائے وہ کمرے کمرے بھٹکتی ہے۔ اور لوگوں کو شبہ کی نظر سے دیکھتی ہے اور درد سے کراہتی ہے۔

"لڑکو! نو بج چکے۔ امی کہتی ہے اب سونے کا وقت ہے۔"

دانیا اور نینا بستر پر جاتے ہیں۔ آنسو گراتے ہیں۔ اور بڑی دیر تک بیمار اور نڈھال بلی اور بے رحم و بدتمیز نیرو کے حال پر جسے کوئی سزا نہیں دی گئی۔ کف افسوس ملتے ہیں۔

(ترجمہ)

مصور کا راز

حامد علی خان

چند سال گذرے میں نے چارلسٹن سے نیویارک جانے کے لئے ڈاک کے ایک جہاز میں اپنے لئے جگہ محفوظ کرائی۔ جہاز کے کپتان کا نام ہارڈی تھا۔ موسم کی مساعدت کی صورت میں جہاز پندرھویں جون کو روانہ ہونے والا تھا۔ تاریخ روانگی سے ایک دن قبل میں اپنے سفر کے متعلق بعض انتظامات کے لئے جہاز پر گیا۔

مجھے معلوم ہوا کہ جہاز پر کثیر التعداد مسافر جانے والے تھے جس میں خواتین کی تعداد معمول سے خاصی زیادہ تھی۔ مسافروں کی فہرست پر نظر ڈالی تو میں نے دیکھا کہ ان میں سے کئی میرے شناسا تھے۔ دوسرے ناموں میں مجھے کارنیلس کا نام بھی نظر پڑا جسے دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ یہ ایک نوجوان مصور تھا جس سے میری بہت پر خلوص دوستی تھی۔ کالج میں ہم دونوں نے ایک ساتھ تعلیم پائی تھی اور ایک دوسرے کی صحبت میں گھڑیاں گذار چکے تھے۔ وہ غیر معمولی دل و دماغ کا مالک تھا۔ اس قسم کے لوگ بالعموم انسانی صحبت سے متنفر' ذکی الحس اور جوشیلے ہوتے ہیں۔ یہی حالت کارنیلس وائٹ کی تھی لیکن ان صفات کے ساتھ ہی اس کے سینے میں ایک انتہادرجہ کا وفاشعار اور محبت بھرا دل تھا۔

میں نے دیکھا کہ جہاز کے تین کمروں پر اس کے نام کی تختی آویزاں تھی۔ مسافروں کی فہرست پر دوبارہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی اور دو بہنیں بھی اس کے ساتھ جارہی تھیں۔ جہاز کے کمرے زیادہ تنگ نہ تھے اور ہر کمرے میں سونے کے لئے اوپر تلے دو دو خواب گاہیں تھیں جن میں سے ہر ایک پر بمشکل صرف ایک آدمی سو سکتا تھا۔ لیکن میں یہ نہ سمجھ سکا کہ ان چار نفوس کے لئے تین کمرے کیوں مخصوص کئے گئے تھے۔ اس وقت میری دماغی کیفیت کچھ اس قسم کی ہو رہی تھی جس میں انسان غیر متعلق باتیں معلوم کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ متجسس بن جاتا ہے اور میں بہ ندامت اقرار کرتا ہوں کہ اس وقت میں زائد کمرے کے متعلق طرح طرح کے لغو اور احمقانہ قیاسات دوڑانے میں مصروف ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس معاملہ سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا مگر اس کے باوجود میں اس معمے کو حل کرنے میں نہایت سرگرمی سے منہمک ہو گیا۔ آخر میں ایک نتیجہ پر پہنچا اور مجھے حیرت ہونے لگی کہ میں نے یہ بات پہلے کیوں نہ سمجھ لی تیسرا کمرہ غالباً کسی ملازم کے لئے تھا۔ میں نے دل میں کہا میں بھی عجیب احمق ہوں کہ اتنی کھلی ہوئی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ اس کے بعد میں نے پھر ناموں کی فہرست پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ کوئی ملازم ان کے ساتھ نہ جارہا تھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ پہلے وہ کسی ملازم کو ساتھ لے جانے کا ارادہ

رکھتے تھے۔ کیونکہ فہرست میں "بہ معیت ملازم" کے الفاظ پہلے لکھے گئے تھے۔ پھر میں نے دل میں کہا غالباً یہ کمرہ زائد سامان رکھنے کے لئے محفوظ رکھا گیا ہے۔ کوئی ایسی چیز ہوگی جسے بغرض حفاظت وہ اپنی تحویل میں رکھنا چاہتا ہے۔ ہاں میں سمجھ گیا۔ یہ کوئی تصویر ہوگی اور غالباً وہی جس کی فروخت کے متعلق وہ اطالوی یہودی نکولینو سے بات چیت کر تارہا تھا۔ اس خیال نے میرا اطمینان کرادیا اور اس وقت کے لئے میں اپنے تجسس سے کنارہ کش ہو گیا۔

وائٹ کی دونوں بہنوں کو تو میں جانتا تھا وہ دونوں بہت ذہین اور زندہ دل لڑکیاں تھیں۔ البتہ اس کی بیوی سے مجھے واقفیت نہ تھی جس سے ان دنوں وہ نیا نیا بیاہا گیا تھا۔ میرے سامنے بھی وہ اپنی بیوی کا ذکر کئی مرتبہ اپنے مخصوص پرجوش انداز میں کرچکا تھا۔ وہ اس کے حیرت انگیز حسن' اس کی فراست' اور اس کی شائستگی کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملادیتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں اس کا تعارف حاصل کرنے کے لئے بیتابی سے منتظر تھا۔

جس دن میں جہاز پر گیا (چودہ جون کو) اسی دن وائٹ اور اس کے ہمراہی بھی جہاز پر آنے والے تھے' یہ بات مجھے کپتان سے معلوم ہوئی اور میں نے دلہن سے متعارف ہونے کی امید میں اپنے مجوزہ وقت سے ایک گھنٹہ زائد جہاز پر گذار دیا۔ آخر معذرت کا ایک رقعہ پہنچا کہ مسز وائٹ کی طبیعت کچھ ناساز ہے اور وہ کل روانگی کے وقت سے پہلے جہاز پر نہ آسکیں گی۔

دوسرے دن صبح اپنے ہوٹل سے نکل کر میں بندرگاہ کی طرف جارہا تھا کہ راستے میں کپتان ہارڈی سے میری مڈبھیڑ ہوگئی اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ "بعض وجوہ کی بناپر (ایک مہمل لیکن آسان بہانہ) میں نے جہاز کی روانگی ایک دودن کے لئے ملتوی کردی ہے۔ تیاری مکمل ہونے پر میں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔" یہ بات مجھے عجیب معلوم ہوئی۔ اس لئے کہ اس دن تیز جنوبی ہوا چل رہی تھی جو ہمارے سفر کے لئے ہر طرح سازگار تھی۔ لیکن چونکہ میرے متواتر اصرار کے باوجود "بعض وجوہ" کے چہرے سے نقاب نہ اٹھ سکا اس لئے میں مجبوراً واپس چلا آیا اور صبر کے ساتھ جہاز کی روانگی کی اطلاع کا انتظار کرنے لگا۔

پورا ایک ہفتہ گذر گیا لیکن مجھے کوئی خبر نہ ملی۔ آخر سخت انتظار کے بعد اطلاع آئی اور میں فوراً جہاز پر پہنچا۔ جہاز مسافروں سے لدا ہوا تھا۔ ہر طرف اس گہما گہمی اور چہل پہل کے آثار نمایاں تھے جو جہاز کے روانہ ہونے کے وقت نظر آیا کرتی ہے۔ وائٹ اور اس کے ہمراہی میرے پہنچنے کے دس منٹ بعد آئے۔ میں نے دونوں بہنوں' دلہن اور مصور پر نظر ڈالی۔ آخر الذکر کے چہرے سے اس وقت سخت بیزاری اور بے دلی کی کیفیت نمایاں ہو رہی تھی۔ یہ اس کی فطرت کا خاصہ تھا اس لئے میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ اس نے اپنی بیوی سے میرا تعارف بھی خود نہ کرایا بلکہ یہ فرض مجبوراً اس کی بہن میرین کو ادا کرنا پڑا جو ایک بہت خوش اخلاق اور ذہین لڑکی ہے۔ مسز وائٹ کے چہرے پر گہرا نقاب پڑا ہوا تھا اور جب اس نے میرا آداب قبول کرتے ہوئے اخلاقاً اپنا نقاب اٹھایا تو مجھے سخت تعجب ہوا۔ یہ تعجب اور بھی زیادہ ہوتا اگر مجھے تجربہ سے یہ بات معلوم نہ ہو چکی ہوتی کہ میرے مصور دوست کے پرجوش بیانات اس وقت بہت زیادہ قابل اعتماد نہیں ہوتے جب وہ عورت کے حسن کی تعریف کررہا ہو۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ جب کبھی گفتگو کا موضوع حسن ہو تو میرے دوست کا دماغ خالص مثالی حسن کی جنتوں میں پہنچ جایا کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مسز وائٹ کو میں نے شکل و صورت کے لحاظ سے بالکل سیدھی سادھی عورت پایا' بلکہ شاید بدصورت کا لفظ بھی اس پر صادق آسکتا تھا۔ ہاں اس کے لباس سے بلاشبہ غیر معمولی سلیقہ نمایاں ہو رہا تھا۔ پھر میں نے خیال کیا کہ میرے

دوست کو غالباً دل ودماغ کی مقابلتہً زیادہ پائیدار خوبیوں نے مسحور کیا ہے۔ مختصر گفتگو کے بعد مسز وائٹ اپنے شوہر کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

میرا پرانا تجسس پھر مجھ پر غلبہ پانے لگا۔ کسی ملازم کی ہم سفری کا تو شائبہ تک نہ رہا تھا اس لئے میں زائد سامان کا انتظار کرنے لگا۔ آخر کچھ عرصہ کے بعد بندرگاہ پر ایک گاڑی آکر رکی جس میں صنوبر کا ایک مستطیل صندوق رکھا تھا۔ اسی کا انتظار تھا' اس کے پہنچتے ہی جہاز نے فوراً لنگر اٹھالیا اور تھوڑی ہی دیر میں ہم بندرگاہ سے نکل کر سمندر میں پہنچ گئے۔

یہ مستطیل صندوق جس کا میں نے ذکر کیا ہے طول میں چھ فٹ اور عرض میں ڈھائی فٹ تھا۔ میں نے اسے بہت غور سے دیکھا اس لئے میں اس کی ٹھیک ٹھیک پیمائش بتا سکتا ہوں۔ بلاشبہ اس صندوق کی ہیئت انوکھی تھی اور اس کو دیکھتے ہی مجھے اپنے قیاس کی صحت پر فخر ہوا۔ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ مصور کا زائد سامان ضرور ایک یا زیادہ تصاویر پر مشتمل ہوگا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ تصویر کے متعلق ہفتوں نکولینی سے گفتگو کرتا رہا ہے۔ صندوق کی صورت دیکھ کر میرا یہ گمان غالب تھا کہ اس میں لیونارڈو کی مشہور تصویر "عشائے ربانی"[1] کی نقل ہے۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ اسی تصویر (عشائے ربانی) کی ایک اور نقل فلارنس کے ایک مشہور مصور کے ہاتھ کی بنی ہوئی نکولینو کے پاس پہلے بھی موجود ہے۔ بس مجھے اپنے موجودہ قیاس کی صحت میں بھی کوئی شبہ نہ رہا اور میں اپنی دقیقہ رسی کا خیال کرکے بہ طمانیت زیرلب متبسم ہوا۔ وائٹ نے غالباً اب تک اپنی تصویروں کے متعلق کوئی راز مجھ سے نہ چھپایا تھا لیکن اب وہ مجھ سے کنیا رہا تھا اور میری آنکھوں میں دھول جھونک کر ایک نفیس تصویر کو مجھ سے بالا بالا نیویارک پہنچانے کا ارادہ رکھتا تھا۔ چنانچہ میں نے بھی چپکے چپکے اسے جی بھر کر ستانے اور دق کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

ایک بات اب بھی میرے لئے بہت پریشانی کا باعث بن رہی تھی۔ وہ یہ کہ مستطیل صندوق زائد کمرے میں نہ رکھا گیا بلکہ وائٹ نے اسے اپنے کمرے میں رکھوالیا۔ صندوق کمرے کی تقریباً تمام سطح پر چھا گیا اور مجھے یقین تھا کہ مصور اور اس کی بیوی کے لئے بہت کچھ باعث تکلیف بن رہا ہوگا۔ بالخصوص اس لئے کہ قیر یا جس روغن سے اس صندوق پر بڑے بڑے حروف لکھے گئے تھے اس سے نہایت تیز اور ناگوار بلکہ میرے نزدیک ایک حد تک کریہہ بو پیدا ہو رہی تھی۔ ڈھکنے پر یہ الفاظ لکھے گئے تھے۔ "مسز ایڈیلیڈ کرٹس 'البنی' نیویارک۔ بہ تحویل مسٹر کرنیلیس وائٹ۔ بہ جانب اوپر' بہ احتیاط اٹھایا جائے۔"

مجھے یہ معلوم تھا کہ مسز ایڈیلیڈ کرٹس مصور کی بیوی کی والدہ ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ پتہ وغیرہ محض ایک فریب تھا جو خاص طور پر میرے لئے کھیلا گیا تھا۔ اس لئے مجھے پورا یقین تھا کہ اس صندوق اور اس کی اشیا کا آخری ٹھکانا نیویارک میں میرے دوست کے تصویر خانے کے سوا اور کوئی نہیں۔

اگرچہ ہوا جہاز کی روانگی کے بعد ہی مخالف سمت اختیار کر چکی تھی مگر پہلے دو چار دن تک موسم اچھا رہا۔ تمام مسافر خوش تھے اور اپنے وقت کا بہت سا حصہ ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور باتیں کرنے میں گزارتے تھے۔ البتہ وائٹ اور اس کی بہنوں کا طرز عمل بالکل مختلف تھا۔ وائٹ کی حالت تو تعجب کے قابل نہ تھی اگرچہ وہ بھی معمول سے زیادہ خاموش بلکہ اندوہ گیں نظر آتا تھا۔ لیکن اس کی بہنوں کی روش بہت تعجب انگیز تھی کیونکہ باوجود میرے اصرار کے وہ دوسرے مسافروں سے دلچسپی نہ لیتی

۱۔ ایک مشہور تصویر جس میں مسیح آخری مرتبہ اپنے حواریوں کے ساتھ ایک لمبی میز پر مصروف طعام نظر آتے ہیں۔

تھیں اور انہوں نے بھی سفر کا زیادہ حصہ اپنے کمروں کی تنہائی میں گذارا۔

مسز وائٹ کا طرز عمل بالکل مختلف تھا۔ وہ خوب باتیں کرتی تھی اور جہاز کی خواتین سے بہت جلد کھل گئی۔ بلکہ میں یہ دیکھ کر سخت متعجب ہوا کہ اسے مردوں سے لگاوٹ کرنے میں بھی کسی قسم کا باک نہ تھا۔ اس نے ہم سب کو بہت محظوظ کیا۔ میں نے "محظوظ کیا" کہا ہے' اس لئے کہ اس سے زیادہ موزوں لفظ مجھے نہیں ملتا۔ مجھے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ مسز وائٹ دوسروں سے مل کر ہنسنے کے بجائے ان کو اپنے آپ پر ہنساتی تھی۔ مرد اس کے متعلق کچھ نہ کہتے تھے لیکن عورتوں نے فیصلہ کر دیا کہ وہ ایک سیدھی سادھی' نیک دل' تربیت یافتہ اور بے انتہا گنوار عورت ہے۔ مجھے حیرت یہ تھی کہ وائٹ کس بات پہ گرا ہے۔ اس عقدے کا عام حل دولت ہو سکتا تھا لیکن یہ بھی صحیح نہ تھا کیونکہ وائٹ نے مجھ سے خود کہا تھا کہ "مجھے اس شادی سے کسی قسم کا مالی فائدہ نہیں پہنچا' نہ اس کی توقع ہے۔ میں نے خاص محبت کے لئے شادی کی ہے اور میری بیوی کی غیر معمولی خوبیوں کے مقابلہ میں میری محبت ایک بالکل حقیر معاوضہ ہے۔" یہ الفاظ یاد کر کے میری عقل چکرا گئی۔ مجھے خیال آیا کہ شاید میرے دوست کے ہوش و حواس معطل ہو چکے ہیں۔ بھلا مجھے اور کیا خیال آتا؟ اس جیسا نفیس مزاج' اس جیسا ذکی الفہم' اس جیسا بلند خیال جس کی نگاہیں عیب کو بھانپنے اور حسن کو پہچاننے میں مہارت تامہ رکھتی تھیں' اس عورت کو اپنی زندگی کا مالک بنا چکا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اس کی بہت گرویدہ معلوم ہوتی تھی بالخصوص اس کی غیر موجودگی میں وہ اپنی محبت کا اظہار اور بھی زیادہ کرتی تھی۔ وہ بار بار اس قسم کی باتیں کہہ کر دوسروں کی تضحیک کا ہدف بنتی کہ "میرے شوہر وائٹ نے فلاں موقع پر چناں کہا اور فلاں موقع پر چنیں۔" لفظ شوہر اسی کے انداز بیان کے مطابق اسے ہر وقت نوک زبان رہتا تھا۔ اسی اثنا میں اہل جہاز نے یہ محسوس کیا کہ وائٹ اپنی بیوی کی صحبت سے عمداً گریزاں رہتا تھا۔ وہ زیادہ اپنے کمرے میں تنہا رہتا تھا بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنے کمرے ہی میں رہتا تھا اور اس کی بیوی کو پوری آزادی حاصل تھی کہ حسب منشا جہاز کے مسافروں کی مجالس میں اپنا دل بہلاتی رہے۔

جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ بیچارہ مصور قسمت کے کسی ان بوجھے پھیر میں آ کر یا فریب انگیز جذبات کی کسی جنونی کیفیت کا شکار ہو کر اپنے سے ہر طرح ادنیٰ درجہ کی عورت سے نادانستہ طور پر وابستہ ہو گیا ہے اور اس قسم کی وابستگی کا قدرتی نتیجہ صریح اور قطعی نفرت کی صورت میں ظاہر ہو چکا ہے۔ مجھے اس کی حالت سخت قابل رحم معلوم ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں "عشائے ربانی" کے معاملہ میں اس کی خاموشی کو پوری طرح قابل معافی نہ سمجھ سکتا تھا اور اس کے لئے میں اس سے بدلہ لینے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ ایک دن وہ جہاز کے عرشے پر آیا۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق اس کا بازو تھام کر ادھر ادھر چکر لگانے شروع کئے۔ اس کی افسردہ دلی (جسے میں ان حالات میں بالکل بجا سمجھتا تھا) ذرا بھی کم نہ ہوتی تھی۔ اس نے بہت سخت کوشش سے ایک آدھ بات کی۔ وہ اپنے خیالات میں کھویا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اس سے ہنسی مذاق کی کچھ باتیں کیں اور اس نے بے دلی سے مسکرانے کی کوشش بھی کی۔ لیکن جب میں نے اس کی بیوی کا خیال کیا تو اس بے چارے پر سخت رحم آیا اور مجھے تعجب ہوا کہ وہ مسکراہٹ کے یہ موہوم آثار بھی کیونکر اپنے چہرے سے ظاہر کر سکا ہے۔ لیکن پھر بھی میں نے آخر کار چھوٹے کو گھر تک پہنچانے کا ارادہ کیا اور فیصلہ کیا کہ مستطیل صندوق کے متعلق مرموز اشارات و کنایات کا ایک سلسلہ شروع کر دوں گا تاکہ وہ سمجھ جائے کہ میں بالکل اس کی پر لطف فریب کاری کا شکار ہی نہیں ہو گیا۔ پہلے میں نے پردے پردے میں اس پر وار کرنے شروع کئے۔ چنانچہ میں نے "اس صندوق کی عجیب و غریب ہیئت" کا ذکر کیا۔ اس کے ساتھ ہی میں عیارانہ ہنسی ہنسا اور پھر شرارت سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میں نے داہنے ہاتھ کی انگلی سے اس کی پسلی کو چھوا گویا

مجھے سب کچھ معلوم ہے۔

میرے اس بے ضرر سادہ مذاق پر وائٹ کی جو کیفیت ہوئی وہ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ بالکل پاگل ہو چکا ہے۔ پہلے وہ اس طرح ٹکٹکی لگا کر میری طرف دیکھنے لگا گویا وہ میرے مذاق کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس کے بعد بظاہر میرے مذاق کا صحیح مفہوم بتدریج اس کے دماغ پر روشن ہونے لگا اور اسی نسبت سے اس کی آنکھوں کے ڈھیلے کٹوریوں میں سے نکل کر باہر آنے لگے۔ اس کے بعد اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور پھر خوفناک طور پر زرد۔ پھر اس نے ایک زور کا قہقہہ مارا۔ گویا میرے مذاق سے وہ بہت خوش ہوا ہے۔ لیکن یہ قہقہہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا اور غالباً دس منٹ تک قہقہوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر وہ جہاز کے فرش پر زور سے چت گر گیا۔ جب میں اسے اٹھانے کے لئے دوڑ کر پہنچا تو وہ بظاہر بالکل مردہ ہو چکا تھا۔

میں مدد کے لئے چلایا اور سخت جدوجہد کے بعد ہم اسے آپے میں لائے۔ ہوش آنے پر بھی وہ کچھ دیر تک خفقانی باتیں کرتا رہا۔ آخر فصد کھول کر ہم نے اس کا لہو لیا اور اسے بستر پر ڈال دیا۔ دوسرے دن اس کی جسمانی صحت اچھی نظر آتی تھی۔ البتہ اس کی دماغی کیفیت کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کپتان کے حسب ہدایت میں اس کے بعد اس سے بالکل الگ تھلگ رہا۔ اس کے ہوش و حواس کے تعطل کے متعلق کپتان مجھ سے پوری طرح متفق تھا لیکن اس نے مجھے جہاز کے دوسرے مسافروں کے سامنے اس قسم کا ذکر کرنے سے محترز رہنے کی تاکید کر دی۔

اس واقعہ کے بعد جلد جلد متعدد ایسے حالات پیش آئے جنہوں نے میرے تجسس کو اور بھی بڑھا دیا۔ بات یہ ہے کہ مجھے زیادہ مقدار میں سبز چائے پینے سے بے خوابی کی شکایت ہو گئی اور دو راتیں تو میں نے تقریباً آنکھوں میں گذار دیں۔ میرے کمرے کا ایک دروازہ کھانے کے بڑے کمرے میں کھلتا تھا۔ وائٹ کے تینوں کمرے اس بڑے کمرے کے پیچھے تھے جنہیں ایک ہلکا پھلکا دروازہ بڑے کمرے سے جدا کرتا تھا۔ یہ دروازہ رات کو بھی کبھی مقفل نہ کیا جاتا تھا۔ چونکہ ہوا مسلسل جہاز کے مخالف ہی رہی اور تھی بھی خوب تیز اس لئے جہاز کا ایک پہلو ہوا کی سمت مخالف میں خاصا دبا رہتا۔ چنانچہ جب کبھی جہاز کا سیدھا پہلو ہوا کے بہاؤ کے مقابل ہوتا وہ ہلکا پھلکا دروازہ خود بخود کھل جاتا اور اسی طرح کھلا رہتا کیونکہ کوئی شخص اٹھ کر اسے بند کرنے کی تکلیف گوارا نہ کرتا تھا۔ اب میرا کمرہ ایسے مقام پر تھا کہ جب اس طرف کا دروازہ کھلا ہوتا (اور یہ گرمی کی وجہ سے میں ہمیشہ کھلا رکھتا تھا) تو ہلکے پھلکے کھلے دروازے میں سے مجھے جہاز کے اس حصے کی بھی جھلک نظر آ جاتی تھی جہاں وائٹ کے کمرے واقع تھے۔ جو دو راتیں میں نے بیداری کی حالت میں گذاریں ان میں میری توجہ ایک نئی بات کی طرف منعطف ہوئی۔ وہ یہ کہ رات کے تقریباً گیارہ بجے مسز وائٹ اپنے شوہر کے کمرے سے نکل کر باحتیاط زائد الگ کمرے میں چلی جاتی جہاں رات کا باقی حصہ گذارتی اور علی الصباح وائٹ کے بلانے پر وہ پھر اس کمرے میں چلی آتی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ دونوں فی الحقیقت جدا ہو چکے ہیں اور یہ علیحدہ کمرے ان کی مستقل علیحدگی اور طلاق کا پیش خیمہ ہیں۔ اس طرح آخر کار زائد کمرے کا راز بھی کھل گیا۔

ایک اور واقعے نے بھی مجھے متوجہ کیا۔ میرے مذکورہ دو رتجگوں میں مسز وائٹ کے الگ کمرے میں جانے کے بعد اس کے شوہر کے کمرے سے مجھے دھیمی دھیمی دبی دبی سی آہٹ سنائی دیتی۔ کچھ دیر تک اس آہٹ کو بغور سننے کے بعد میں اس کی اصلیت سمجھ گیا۔ یہ [illegible] کی چوری چوری مستطیل صندوق کھولنے کی آواز تھی جو اس کے ہتھوڑے وغیرہ سے پیدا ہوتی تھی۔ ہتھوڑے کا سر اس نے آواز [illegible] کے لئے غالباً کسی نرم اونی یا سوتی چیز میں لپیٹ رکھا تھا۔

اس طرح مجھے [illegible] ہو گیا گویا میں ٹھیک ٹھیک بتا سکتا ہوں کہ کس وقت وہ صندوق کا ڈھکنا علیحدہ کر چکا

کس وقت اسے اٹھاتا ہے اور کس وقت پلنگ پر رکھتا ہے' آخری بات مجھے اس طرح معلوم ہوتی کہ جب لکڑی کا ڈھکنا پلنگ کے چوبی کناروں سے مس کرتا تو خفیف سی آواز نکلتی۔ فرش پر صندوق کا ڈھکنا رکھنے کے لئے بالکل گنجائش نہ تھی اس لئے وہ بہ احتیاط تمام اسے پلنگ ہی پر رکھتا تھا۔ اس کے بعد اس کے کمرے میں سکوت مزار چھا جاتا اور گجر تک یہی حالت رہتی۔ البتہ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ بعض وقت مجھے دھوکا سا ہوتا کہ میرے کان سسکیوں کی آواز سن رہے ہیں لیکن یہ بھی اتنی دبی ہوئی ہوتی کہ میں اسے محض اپنے واہمہ خلاق کا کرشمہ قرار دے سکتا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ آواز سسکیوں اور آہوں سے مشابہ تھی۔ لیکن دراصل یہ اتنی موہوم تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ میرے کان بج کر مجھے دھوکے میں ڈالتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ وائٹ کو اس کا مصورانہ ذوق اشتیاق مالا یطاق بن کر صندوق کھولنے اور بیش بہا تصویر کے نظارے سے بھوکی نگاہوں کی تسکین کا سامان فراہم کرنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ پھر بھلا اس میں رونے دھونے کی کیا بات تھی؟ پس میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کپتان ہارڈی کی سبز چائے کے صدقے میں یہ فریب سماعت 'میری اپنی ہی پریشان دماغی کا نتیجہ ہے۔ مذکورہ بالا ہر دو راتوں میں میں نے آہٹ ہی سے واضح طور پر معلوم کر لیا کہ وائٹ صبح کے قریب صندوق پر ڈھکنا رکھ کر اپنے بے آواز ہتھوڑے سے پہلے ہی سوراخوں میں دوبارہ کیلیں لگا دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے دن کے لباس میں کمرے سے باہر نکلتا اور جا کر مسز وائٹ کو اس کے کمرے سے بلا لاتا۔

جہاز کے سفر کا ساتواں دن تھا کہ جنوب مغرب سے تند ہوا کا ایک خوفناک طوفان اٹھا۔ ہم ایک حد تک اس کے لئے تیار تھے۔ کیونکہ عناصر ہمیں پہلے ہی دھمکیاں دے رہے تھے۔ ہر چیز اپنے ٹھکانے لگا دی گئی اور جب ہوا رفتہ رفتہ زیادہ تیز ہوئی تو ہم نے بادبان لپیٹ کے نیچے کر دیئے۔ ۴۸ گھنٹے تک ہم اسی طرح بہ حفاظت جاتے رہے لیکن اس کے بعد غضب کا طوفانی جھکڑ چلنے لگا جس نے پچھلے بادبان کے پرخچے اڑا دیئے۔ اب جہاز میں پے بہ پے پانی کی کئی موجیں آنی شروع ہوئیں جن کی وجہ سے جہاز کا مطبخ اور عرشے کے کٹہرے کا بایاں حصہ سارا گر گیا اس کے ساتھ ہی تین آدمیوں کی جانیں بھی ضائع ہو گئیں۔ ابھی ہم اس صدمے سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ سامنے کے بادبان کی بھی دھجیاں اڑ گئیں۔ اس کے بعد ہم نے ایک چھوٹا سا مضبوط طوفانی بادبان لگایا جس نے چند گھنٹوں تک بہت اچھا کام دیا۔

ہوا کا وہی زور شور تھا اور اس کے تھمنے کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ جہاز کے مستول وغیرہ زیادہ پائدار ثابت نہ ہوئے اور ان پر ہوا کی شدت کا بہت اثر پڑا۔ طوفان کے تیسرے دن پچھلا مستول ہوا کے ایک زوردار ریلے کے ساتھ جہاز کے ایک پہلو پر آ رہا اور جہاز بری طرح ڈگمگانے لگا۔ متواتر ایک گھنٹے کی جدوجہد کے بعد ہم اس مستول سے خلاصی پانے میں کامیاب ہوئے لیکن اس وقت نجار و نبالہ جہاز کی طرف آیا جس نے اطلاع دی کہ جہاز کے زیریں حصے میں چار بالشت پانی جمع ہو چکا ہے۔ مصیبت پر مصیبت یہ پڑی کہ جہاز کے آب کش درست حالت میں نہ تھے بلکہ تقریباً بے کار ہو چکے تھے۔

اب ہر طرف سخت بدحواسی اور ناامیدی پھیل گئی۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے جہاز کا بار ہلکا کرنے کے لئے سامان سمندر میں پھینکنا شروع کیا اور باقیماندہ دو مستول بھی کاٹ کاٹ کر پھینک دیئے۔ آب کش اب بھی کوئی کام نہ دے سکے۔ بلکہ اس اثنا میں پانی اور بھی سرعت کے ساتھ رسنا شروع ہو گیا۔

غروب آفتاب کے وقت طوفان کی شدت کچھ کم ہوئی اور ہمیں کچھ موہوم سی امید تھی کہ شاید ہم کشتیوں کی مدد سے اپنی جانیں بچا سکیں گے۔ رات کے آٹھ بجے بادل کھل گئے اور چودھویں رات کا چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنے لگا۔ یہ ہمیں اپنے لئے ایک اچھا شگون معلوم ہوا۔ چنانچہ ہمارے پژمردہ دلوں میں نامعلوم طور پر مسرت جھلکنے لگی۔

غرض جدوجہد کے بعد ہم نے کوئی حادثہ پیش آئے بغیر بڑی کشتی سمندر میں اتاری جس میں تمام ملاح اور اکثر مسافر سوار ہو گئے۔ یہ لوگ فوراً روانہ ہو گئے اور تین دن کی جانکاہ تگ و دو کے بعد ایک محفوظ مقام پر پہنچ گئے۔

اب کپتان کے علاوہ چودہ مسافر جہاز میں تھے جو دنبالے والی چھوٹی کشتی کے بھروسے پر زندگی کی بازی لگائے بیٹھے تھے۔ اس کو ہم نے بآسانی سمندر میں اتار لیا۔ اس میں کپتان اور اس کی بیوی، وائٹ اور اس کے متعلقین، ایک فوجی افسر کی بیوی اور چار بچے اور میں مع ایک حبشی ملازم کے سوار ہوا۔ کشتی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ چند ضروری اوزار اور کھانے پینے کا کچھ سامان رکھنے کے بعد اس میں تل دھرنے کی جگہ نہ بچی تھی اور کوئی دوسری چیز بچانے کا کسی کے دل میں بھی خیال نہ آسکتا تھا۔ پھر آپ جانتے ہم سب کی حیرت کی کیا انتہا رہی ہوگی جب کشتی جہاز سے دس بیس ہاتھ کے فاصلہ پر پہنچی اور وائٹ نے دنبالہ کشتی میں کھڑے ہو کر نہایت اطمینان سے کپتان سے مطالبہ کیا کہ میرا مستطیل صندوق لانے کے لئے کشتی واپس لے جائی جائے۔

کپتان نے ذرا ترش لہجے میں جواب دیا۔ "مسٹر وائٹ بیٹھ جایئے اگر آپ بالکل بے حرکت اور خاموش نہ بیٹھے رہیں گے تو کشتی کو الٹ کر ہم سب کو ڈبو دیں گے۔ کیونکہ کشتی بوجھ سے پہلے ہی دب رہی ہے اور پانی اس کے کناروں تک پہنچ رہا ہے۔"

وائٹ نے اسی طرح کھڑے کھڑے بلند آواز سے کہا۔ "صندوق! مسٹر ہارڈی' میرا صندوق! آپ میری درخواست کو کس طرح رد کر سکتے ہیں۔ مجھے آپ سے یہ توقع نہیں اسکا بوجھ تو بالکل برائے نام ہے۔ وہ تو بالکل ہلکا پھلکا ہے۔ آپ کو اپنی والدہ مرحومہ کی قسم' آپ کو خدا کی محبت کا واسطہ' اپنی نجات کی امید کے صدقے میں میری درخواست کو نہ ٹھکرایئے اور صندوق لانے کے لئے واپس چلئے۔"

اس کی یہ درد بھری التجائیں سن کر کپتان کا دل بظاہر کچھ دیر کے لئے پسیج گیا۔ لیکن جلد ہی اس نے پھر وہی ترش روئی اختیار کر کے جواب دیا "مسٹر وائٹ آپ دیوانے ہیں۔ میں آپ کی درخواست پر کوئی توجہ نہیں کر سکتا۔ بیٹھ جایئے میں کہتا ہوں۔ آپ کشتی کو الٹ کر سب کو ڈبو دیں گے ___ ٹھہریئے ___ پکڑو اسے روکو ___ وہ چھلانگ لگا رہا ہے' وہ! مجھے یہی اندیشہ تھا ___ بس گیا۔"

ابھی یہ الفاظ کپتان کے لبوں ہی پر تھے کہ وائٹ نے فی الحقیقت چھلانگ لگا دی اور چونکہ شکستہ جہاز کی اوٹ میں ہوا کا زور کم تھا وہ فوق الانسانی ہمت کے ساتھ جہاز سے لٹکے ہوئے ایک رسے کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ طرفۃ العین میں وہ عرشہ جہاز پر نظر آیا اور پھر دیوانہ وار نیچے اپنے کمرے کی طرف اتر گیا۔

اس اثنا میں موجیں ہماری کشتی کو جہاز کی اوٹ سے نکال کر دور لے گئی تھیں اور اب ہم ہیبت ناک سمندر کی طوفان خیز موجوں کا بازیچہ بنے ہوئے تھے ہم نے واپس جانے کی پوری کوشش کی لیکن دہشت ناک طوفانی ہوا کے سامنے ہماری کشتی ایک تنکے سے زیادہ وقعت نہ رکھتی تھی۔ ہم کو یقین ہو گیا کہ قضا نے بدانجام مصور کی موت کے پروانے پر مہر لگا دی ہے۔

ہم بہ سرعت تمام دور دور ہو رہے تھے مگر ہم نے دیکھا کہ جہاز کے بغلی زینہ میں دیوانہ شخص (یہی اسے ہم کہہ سکتے تھے) نمودار ہوا۔ وہ ایک دیوزاد کی قوت کے ساتھ پورا صندوق کا صندوق گھسیٹتا ہوا زینے پر چڑھ رہا تھا۔ ہم اس کی طرف فرط حیرت سے بغور دیکھ رہے تھے کہ اس نے تین انچ موٹا ایک رسہ پہلے جلدی سے صندوق کے گرد لپیٹا اور پھر جلد جلد اس کو کئی چکر اپنی کمر کے گرد دیئے۔ اس کے بعد دفعتہً صندوق اور اس سے بندھا ہوا آدمی دونوں سمندر میں تھے اور چشم زدن میں دونوں ہمیشہ کے لئے سمندر کی تہ میں غائب ہو گئے۔

فرط تاسف سے کچھ دیر کے لئے ہمارے چپو رک گئے اور ہماری آنکھیں اس جگہ پر جم گئیں۔ اس کے بعد ہم روانہ ہو گئے۔

ایک گھنٹے تک ہم بالکل چپ چاپ رہے۔ اس کے بعد میں نے خاموشی کا سلسلہ توڑنے کی جرات کی۔ "کپتان صاحب! آپ نے دیکھا دونوں کس طرح دفعتاً ڈوب گئے۔ کیا آپ کے خیال میں یہ عجیب بات نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ جب وہ اپنا جسم صندوق سے باندھ کر سمندر میں کودا تو مجھے اس کی زندگی کی خفیف سی امید ہو گئی تھی۔"

کپتان نے کہا۔ "یقیناً وہ گولی کی طرح تہ کی طرف گئے ہیں مگر نمک کے گھل جانے کے بعد وہ پھر ابھریں گے۔"

میں نے حیران ہو کر کہا۔ "نمک کیا معنی؟"

کپتان نے متوفی۔ کے پس ماندہ عزیزوں کی طرف دیکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کہا کہ کسی مناسب موقع پر پھر یہ باتیں ہوں گی۔

ہزار قسم کی صعوبتیں جھیل کر چار دن کے بعد آخر ہم بمشکل اپنی جانیں بچانے میں کامیاب ہوئے اور ایک مشہور جزیرے تک پہنچے۔ لیکن ہم سب نیم جان ہو رہے تھے۔ جزیرے کے باشندے ہم سے ہمدردانہ طور پر پیش آئے اور وہاں پورا ایک ہفتہ گذارنے کے بعد ہم ایک جہاز میں نیویارک کو روانہ ہو گئے۔

جہاز کو غرقاب ہوئے ایک مہینہ گذر چکا تھا۔ ایک دن اتفاقاً ایک تفریح گاہ میں کپتان ہارڈی سے میری ملاقات ہو گئی۔ جہاز کی تباہی اور بالخصوص بیچارے وائٹ کا المناک انجام قدرتاً ہمارا موضوع گفتگو بنا اور اس سلسلے میں مجھے حسب ذیل واقعات معلوم ہوئے:

مصور نے اپنے لئے اپنی بیوی کے لئے، دو بہنوں کے لئے اور ایک ملازم کے لئے جگہ محفوظ کرائی تھی۔ اس کی بیوی جیسا کہ وہ خود کہتا تھا، بے انتہا حسین، بے انتہا سلیقہ مند اور بے انتہا مہذب تھی۔ جون کی چودھویں کی صبح کو (جس دن میں جہاز پر گیا) یہ خاتون دفعتاً علیل ہو کر جاں بحق ہو گئی۔ نوجوان شوہر غم سے دیوانہ ہو گیا۔ لیکن ناگوار وجوہ سے نیویارک کے سفر کا التوا اس کے لئے کسی طرح ممکن نہ تھا۔ وہ اپنی محبوب بیوی کی لاش اس کی ماں کے پاس پہنچانا ضروری سمجھتا تھا۔ لیکن ایک مشہور عام وہم جہاز میں لاش کو علانیہ طور پر لے جانے سے مانع آتا تھا۔ کیونکہ غالباً نوے فی صدی مسافر ایک لاش کو ہم سفری پر ترک سفر کو ترجیح دیتے۔

اس مشکل کا حل کپتان ہارڈی نے یہ تجویز کیا کہ لاش کو خوشبودار مسالہ لگا کر کثیر المقدار نمک کے ساتھ ایک بڑے صندوق میں بند کر کے تجارتی سامان کی طرح جہاز پر پہنچایا جائے۔ مسز وائٹ کی وفات کو پردہ راز میں رکھا گیا اور چونکہ مصور اپنی بیوی کے لئے جہاز میں جگہ محفوظ کرا چکا تھا اس لئے ضروری ہوا کہ کوئی دوسری عورت اس کے نام سے جہاز میں سفر کرنے کے لئے آمادہ کی جائے۔ متوفی خاتون کی خادمہ بلا دقت اس فرض کی بجا آوری پر رضامند کر لی گئی۔ زائد کمرہ جو مصور کی بیوی کی زندگی میں اس ملازمہ کے لئے مخصوص کیا گیا تھا، بحال رہا۔ بناوٹی بیوی ہر شب اس کمرے میں سوتی تھی۔ دن بھر وہ لوگوں کو دکھانے کے لئے اپنے مقدور کے مطابق بہ تصنع اپنی مرحوم مخدومہ بنی رہتی جس سے جہاز کے مسافروں میں سے کوئی بھی روشناس نہ تھا۔ اس بات کے متعلق کپتان اور مصور پوری طرح اطمینان کر چکے تھے۔ میری اپنی غلط فہمیوں کا ماخذ قدرتاً میری بے حد غیر محتاط، بے حد متجسس اور بے حد ذکی الحس طبیعت تھی۔ لیکن اب ایک مدت سے رات کی نیند میں کبھی آرام سے نہیں سویا۔ ایک آفت زدہ چہرے کا ہولناک تصور ہر وقت میری آنکھوں میں پھرتا رہتا ہے اور ایک جنونی قہقہے کی وحشت ناک آواز ہر وقت میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے۔

(ترجمہ)

دلہن کی پوشاک

فضل حق قریشی

میں نے اپنی زندگی میں بہت سے مکان دیکھے ہیں۔ چھوٹے بڑے، جدید و قدیم، سنگین اور چوبی...... لیکن ایک مکان کی یاد بہت واضح طور پر میرے دل میں باقی ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ مکان نہیں بلکہ ایک جھونپڑا تھا۔ وہ تین کھڑکیوں والی ایک منزلہ عمارت تھی اور ایک ضعیف کوزپشت کے مانند جس کی کمر پر ایک ٹوپی رکھی ہو ____ عجیب و غریب معلوم ہوتی تھی۔ اس کی استرکاری کی دیواریں، ٹائل کی چھتیں اور خستہ حال دُودکش پر سرسبز بیلیں اس طرح چھائی ہوئی تھیں گویا مکان کاہی کے سمندر میں ڈوب گیا ہے۔

شہتوت، کیکر اور چنار کے درخت جو گھر والوں کے آباؤ اجداد نے لگائے تھے، اس قدر گھنے ہوگئے تھے۔ کہ مکان بالکل روپوش ہوگیا تھا۔ وسیع صحن دوسر سبز چمنوں کی قطار میں تھا۔ وہ دراصل ایک سڑک کا حصہ تھا۔ لیکن اس راستے پر کوئی گاڑی وغیرہ نہیں چلتی تھی۔ اور شاذونادر ہی کوئی شخص اس راہ سے گزرتا دکھائی دیتا تھا۔

اس مختصر مکان کے دروازے ہمیشہ بند رہتے۔ اس کے اندر رہنے والے دھوپ کی مطلق پروا نہ کرتے۔ اور نہ صاف روشنی سے مستفید ہوتے۔ کھڑکیاں بھی کبھی نہ کھلتیں۔ کیونکہ وہ تازہ ہوا حاصل کرنے کے متمنی نہیں تھے۔

ان لوگوں میں قدرت پرستی کے جذبات مطلق نہیں ہوتے جو عموماً کیکر، چنار اور شہتوت کے درختوں کے درمیان زندگی بسر کرتے ہیں صرف موسم سرما میں سفر کرنے والے سیاحوں کو خدا نے وہ آنکھیں عطا کی ہیں جو شاطر قدرت کی دلچسپیوں سے کامل طور پر لطف اندوز ہو سکتی ہیں۔ باقی نوع انسان ان حسین نظاروں کے وجود سے غافل رہ کر قعر مذلت میں پڑی رہتی ہے۔

لوگ عموماً اس چیز کی قدر نہیں کرتے جو نہایت افراط سے پائی جاتی ہے۔ مثل مشہور ہے "جو چیز ہم آسانی سے حاصل کر سکیں اسے جمع کرنے کی ضرورت نہیں۔" اور نہ صرف یہ بلکہ ہم اس کی طرف راغب بھی نہیں ہوتے۔ یہ چھوٹا سا مکان سبز درختوں کی فردوس میں واقع ہے جس کے اندر چہچہانے والے پرندوں نے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ لیکن مکان کا اندرونی نقشہ ناقابل بیان ہے۔

موسم گرما میں بند رہنے کے باعث اندرونی حصہ مثل تنور اور سرما میں ٹرکش حمام کی طرح گرم۔ جس میں نہ ہوا کی رمق ہوتی ہے نہ روشنی کا شائبہ۔

عرصہ دراز ہوا کہ میں کاروباری سلسلہ میں اس چھوٹے مکان کے اندر پہلی مرتبہ داخل ہوا۔ میں کرنل کا جو مالک مکان تھا ......ایک پیغام لے کر اس کے بیوی بچوں کے پاس گیا تھا۔ مجھے وہ پہلی ملاقات بہت واضح طور پر یاد ہے اس کو فراموش کر دینا میرے لئے ناممکن ہے۔

ذرا اپنے تصورات سے کام لے کر غور کیجئے کہ ایک کمزور اور پستہ قدرت عورت...... جس نے اپنی زندگی کی چالیس منزلیں طے کرلی ہیں۔ خوف واضطراب کی حالت میں آپ پر نظر جمائے ہوئے ہے۔ جب کہ آپ ملاقاتی کمرے میں داخل ہو چکے ہیں۔ آپ ایک اجنبی ہیں۔ ایک ملاقاتی اور سب سے زیادہ یہ کہ ایک نوجوان مرد۔ بس یہ احساس اس غریب عورت کو خوف زدہ اور پریشان حال کر دینے کے لئے کافی ہے خواہ آپ کے ہاتھ میں کوئی خنجر کلہاڑی یا پستول وغیرہ نہ ہو۔ اور آپ نہایت خندہ پیشانی سے ملیں۔ پھر بھی آپ کو مخدوش سمجھا جائے گا۔

"مجھے کس شخص سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہے؟"

پستہ قد خاتون نے کپکپاتی ہوئی آواز میں دریافت کیا۔ میں نے خود ہی اپنی تعارف کرا دیا اور اپنے جانے کی غرض وغایت بھی بیان کر دی اس کا خوف واضطراب فوراً ایک خوشی کی چیخ میں تبدیل ہو گیا۔ اور اس نے اپنی نظر اٹھا کر چھت کی طرف دیکھا۔ اس کی آواز تمام کمرے میں گونج گئی۔ اور صدائے بازگشت کی طرح صدر دالان سے ملاقاتی کمرے اور ملاقاتی کمرے سے باورچی خانے میں اور باورچی خانے سے گودام میں گونجتی ہوئی سنائی دی۔ غرض تھوڑی دیر میں وہ آواز مختلف سروں میں تمام مکان کے اندر پھیل گئی۔

پانچ منٹ بعد میں بیٹھک کے اندر ایک بڑی اور نرم آرام کرسی پر لیٹا ہوا اس آواز کو سن رہا تھا جو اس وقت تمام سڑک پر گونج رہی تھی۔

فضا میں مچھر مارنے کے سفوف اور تازہ چمڑے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اور اسی کھال کا بنا ہوا ایک جوتا رومال میں لپٹا قریب کی کرسی پر رکھا تھا۔ کھڑکیوں میں گلدستے سجے تھے۔ اور ململ کے پردے آویزاں تھے۔ جن پر بے حد مکھیاں چمٹی ہوئی تھیں۔ دیواروں پر پادریوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں جن کو وارنش اور تیل وغیرہ سے بنایا گیا تھا۔ ان میں سے بعض کے شیشے کناروں کے قریب سے شکستہ ہو گئے تھے۔

پادریوں کے بعد چوکھٹوں میں خاندان کے بزرگوں کی قطار تھی۔ جن کے چہرے بادیہ گرد قبائل کے طرز پر زرد رنگ ہو گئے تھے۔ میز پر ایک انگشتانہ پیچک اور ایک نصف بنی ہوئی جراب رکھی تھی۔ نیز کاغذ کے کترے ہوئے چند خاکے کالی نیم آستینوں کے ساتھ لپٹے فرش پر پڑے تھے۔ ملحقہ کمرے میں دو گھبرائی ہوئی پریشان ضعیف عورتیں جلدی جلدی اسی جیسے کاغذ کے خاکے اور درزیوں کے استعمال میں آنے والی کھریا مٹی کے ٹکڑے فرش سے اٹھا رہی تھیں۔

"جناب آپ ہمیں معاف فرمائیں" پستہ قد خاتون نے کہا۔ ہمارے مکان میں بہت زیادہ بد نظمی رہتی ہے۔ دوران گفتگو میں خاتون نے اپنی نگاہیں ایک حالت کشمکش و پیچ میں دوسرے کمرے کی طرف ڈالیں جہاں اس وقت تک کاغذ کے خاکے میز پر سے چنے جا رہے تھے۔ دروازے کے کواڑ بھی کسی قدر پریشان معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ ایک یا دو انچ کے قریب کھلے اور پھر فوراً بند ہو گئے۔

دوسرے کمرے میں سے ایک دل کش نسوانی لہجے میں کسی نے جواب دیا۔ لیکن میں اس زبان کو سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ آیا تو جرمنی تھی یا فرانسیسی۔

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا۔ ایک دراز قد چھریرے بدن کی خوبصورت لڑکی جس کی عمر تقریباً پچیس سال ہو گی میری نظر کے سامنے تھی۔ وہ باریک ململ میں ملبوس گلٹ کی ایک پیٹی اپنی کمرے میں باندھے ہوئے تھی۔ جس کے اندر کچھ اچھی طرح بنایا ہوا سیپ کا ایک نازک سا پنکھا لٹک رہا تھا۔

اس نے اندر داخل ہو کر خوش اخلاقی سے سلام کیا۔ اور اس احساس کے ساتھ ہی کہ ایک غیر مرد کمرے میں موجود ہے اس کا چہرہ موسم بہار کی شفق کی مانند سرخ ہو گیا۔ سب سے پہلے اس کی لمبی ناک جس پر چیچک کے ننھے ننھے داغ تھے سرخی میں تبدیل ہوئی اس کے بعد اس کی آنکھوں اور پیشانی میں چمک کی ایک لہر دوڑ گئی۔

"یہ میری لڑکی ہے۔" خاتون نے تعارف کراتے ہوئے کہا___ "اور مریم یہ نوجوان اس غرض سے آئے ہیں...... وغیرہ وغیرہ۔

میرا بھی تعارف ہو گیا۔ میری نظر کاغذی خاکوں کے انبار پر دوبارہ پڑی۔ اور یہ دیکھ کر دونوں ماں بیٹیوں نے اپنی نگاہیں نیچی کر لیں۔

"ہمارے مکان کے قریب ایک میلہ ہوتا ہے۔" خاتون نے کہا۔ "ہم اپنی ضروریات کی چیزیں میلے میں سے خرید لیتے ہیں۔ ہمارا تمام سال سینے پرونے میں گزر جاتا ہے۔ اور یہاں تک کہ میلے کا دور ثانی سر پر آ جاتا ہے۔ ہمارے پاس کبھی کوئی غیر تیار شدہ چیز باقی نہیں بچتی۔ میرے خاوند کی تنخواہ کافی نہیں ہے۔ اس لئے ہم کو فضول خرچی سے احتراز کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اپنی تمام چیزیں خود تیار کر لیتے ہیں۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ اتنی ساری چیزیں کون استعمال کرے گا؟ کیا آپ دونوں کے علاوہ اس مکان میں کوئی اور بھی رہتا ہے؟

"خوب! کیا آپ کا خیال ہے کہ ہم ان کو پہن لیتے ہیں۔ ہم ان چیزوں کو استعمال نہیں کرتے کیونکہ یہ جہیز کی چیزیں ہیں۔"

"نہیں___ امی جان آپ کیا فرما رہی ہیں۔" حسین لڑکی نے محجوب ہو کر کہا۔ اور شرم سے اس کا چہرہ دوبارہ سرخ ہو گیا۔ "ہمارے ملاقاتی کو یقین ہو جائے گا کہ آپ سچ کہہ رہی ہیں۔ حالانکہ میں شادی کے لئے رضامند نہیں ہوں۔ اور نہ کبھی ہو سکتی ہوں۔"

اس نے یہ جملہ ادا کیا۔ لیکن لفظ شادی پر اس کی آنکھوں میں ایک برقی لہر دوڑ گئی۔

چائے بسکٹ مکھن اور مربہ وغیرہ منگایا گیا۔ رس بھری اور بالائی بھی ان کے ساتھ تھی۔ سات بجے رات کو ہم نے کھانا کھایا۔ جو چند مختلف قسم کا تھا۔ میں نے دوران طعام میں جمائی لینے کی ایک اونچی آواز سنی جو دوسرے کمرے سے آ رہی تھی۔ میں نے حیرت سے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ ایسی جمائی کی آواز تھی جو ایک انسان کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔

"یہ میرا بھائی یوسف مسیح ہے۔" خاتون نے میرے تعجب کو رفع کرنے کی غرض سے کہا۔ "وہ گذشتہ سال سے ہمارے ساتھ مقیم ہے۔ جناب معاف فرمائیں وہ............ عموماً ہر اجنبی کے سامنے آتا ہوا شرماتا ہے۔ اس کا ارادہ کسی خانقاہ میں داخل ہو جانے کا ہے۔ ملازمت کے زمانے میں افسروں نے غیر منصفانہ طور پر اس کے ساتھ برتاؤ کیا تھا اس وجہ سے اس کے دماغ میں فتور آ گیا ہے۔"

کھانے سے فارغ ہو کر خاتون نے ایک خلعت دکھایا جس کو یوسف مسیح نے گرجا میں پیش کرنے کے لئے اپنے ہاتھ سے تیار کیا تھا۔ مریم نے تھوڑی دیر کے لئے حیا کو خیر باد کہہ دیا۔ اور مجھے ایک تمباکو دانی دکھائی جس پر وہ اپنے باپ کے لئے نقش و نگار بنا رہی

تھی۔جب میں نے کسی قدر چرب زبانی سے کام لیتے ہوئے اس کی کاریگری کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور خوب تعریف کی تو اس کا پیارا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا۔اس نے اپنی ماں کے کان میں کچھ کہا۔ فوراً اس کا رنگ بھی سرخ ہو گیا۔اور مجھ سے سامان رکھنے کے کمرے میں چلنے کی درخواست کی میں نے دیکھا کہ وہاں پانچ عدد بڑے اور بہت سارے چھوٹے ٹرنک رکھے ہوئے ہیں۔

"یہ میری بیٹی کا جہیز ہے ۔۔۔۔۔۔" اس کی ماں نے میرے کان میں کہا۔"یہ سب ہم نے خود تیار کیا ہے۔"

اس سامان کو اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد اپنے مہمان نواز میزبانوں سے رخصت کی اجازت طلب کی انہوں نے مجھ سے وعدہ لے لیا کہ ان سے پھر کسی روز آکر ملوں گا۔اور اکثر ملاقات کرتا رہوں گا۔

اتفاق کی بات ہے کہ میں اپنا وعدہ وفا کرنے میں کامیاب رہا۔

اپنی پہلی ملاقات کے سات سال بعد میں دوبارہ اس چھوٹے سے قصبہ میں گیا۔کیونکہ مجھے ایک مقدمے میں گواہی دینی تھی۔ جس کی کارروائی اسی جگہ ہو رہی تھی۔

جونہی میں اندر داخل ہوا۔ وہی سابقہ آواز..... جو پہلی ملاقات کے وقت تمام کمروں میں گونجی تھی ...... دوبارہ سنائی دی انہوں نے فوراً مجھ کو پہچان لیا۔ میری پہلی ملاقات ان کی زندگی میں ایک حادثہ کی حیثیت رکھتی تھی۔اور جب حوادث تعداد میں بہت کم ہوں تو ان کو عرصہ دراز تک یاد رکھا جا سکتا ہے۔میں ملاقاتی کمرے میں گیا۔خاتون فرش پر بیٹھی ہوئی ایک نیلے کپڑے کو تراش رہی تھی۔اس عرصہ میں وہ کسی قدر طاقتور ہو گئی تھی۔ لیکن پیرانہ سالی کے باعث اس کا سر بگلے کے پروں کی طرح سفید ہو گیا تھا۔اس کی بیٹی ایک پلنگ پر بیٹھی ہوئی کوئی چیز کاٹ رہی تھی۔ فضا میں اسی سفوف کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے دیکھا کہ پچھلی دفعہ کی طرح کاغذی خاکے زمین پر پھیلے ہوئے تھے۔اور ٹوٹے شیشوں کی تصویریں دیوار پر لٹک رہی تھیں لیکن پھر بھی میں نے ایک تبدیلی محسوس کی۔پادری کی شبیہہ کے قریب کرنل کی تصویر آویزاں تھی۔اور گھر کی تمام عورتیں ماتمی لباس میں تھیں کرنل کو انتقال کئے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔اور حال ہی میں وہ ترقی کر کے جرنیل کے اعلیٰ عہدے پر مامور ہوا تھا۔

ایام رفتہ کی یاد دلوں میں تازہ ہو گئی۔

بیوہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا تار جاری تھا۔""ہمیں ایک انقلاب عظیم برداشت کرنا پڑا ہے۔"اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "اور تم کو معلوم ہو گا کہ میرا خاوند مر چکا ہے۔اب اس دنیا میں ہم تنہا رہ گئے ہیں۔اور کوئی یار و مددگار بھی نہیں ہے۔یوسف سمیع زندہ ہے لیکن میں اس کے متعلق کچھ اچھی خبر نہیں سنا سکتی۔اس کو بادہ نوشی کے باعث خانقاہ میں داخل ہونے کی بھی اجازت نہیں ملی۔وہ ناکامیابی کے غم کو دور کرنے کے لئے اب اور بھی زیادہ پیتا ہے.....میں عدالت میں ایک دعویٰ دائر کرنا چاہتی ہوں۔کیونکہ وہ کئی دفعہ میرے ٹرنک کا قفل توڑ کر مریم کا جہیز لے گیا۔اور فقیروں میں کپڑے وغیرہ تقسیم کر دیئے۔اس نے یہ حرکت کئی بار کی ہے۔اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو میری مریم کے جہیز میں ایک چیز بھی باقی نہ رہے گی۔"

"اماں جان آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔"مریم نے کسی قدر شرماتے ہوئے کہا۔"ہمارے ملاقاتی کو یقین ہو جائے گا کہ میری شادی ہونے والی ہے۔حالانکہ میں کوئی رشتہ قائم کرنا نہیں چاہتی۔"

مریم نے اپنی نظر چھت کی طرف اٹھائی اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو گیا۔

ایک گنجے سر والی مردانہ شکل' بھورا کوٹ اور جوتوں کی جگہ جرابیں پہنے ہوئے دکھائی دی۔ جو چھپے کی طرف سے پر کودتی ہوئی سامنے آئی اور غائب ہو گئی۔ میں نے کہا۔

"میرے خیال میں یہ یوسف مسیح ہے۔"

میں نے ماں بیٹی پر نظر ڈالی وہ دونوں کافی ضعیف العمر معلوم ہوتی تھیں۔ اور ان کے چہروں میں غیر معمولی تبدیلی ہو گئی تھی۔ ماں کے بال . . . سفید ہو گئے تھے۔ لیکن لڑکی اس قدر زرد اور پژمردہ معلوم ہوتی تھی گویا وہ اپنی ماں کی چھوٹی بہن ہے۔ اور ان کی عمر میں پانچ سال سے زیادہ فرق نہیں۔

"میں نے عدالت میں دعویٰ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔" خاتون نے وہی بات دوبارہ کہی۔ گویا ابھی تک اس امر کا تذکرہ مجھ سے نہیں کیا گیا تھا۔ "میرا مطلب دعویٰ دائر کرنے سے ہے۔ ہم جو چیز تیار کرتے ہیں۔ یوسف مسیح اس پر ہاتھ صاف کر دیتا ہے۔ اور اپنی روح کو ثواب پہنچانے کی غرض سے غربا میں تقسیم کر دیتا ہے۔ میری مریم جہیز سے محروم ہوتی جا رہی ہے۔"

مریم کے چہرے پر بدستور سرخی کی لہر نمودار ہوئی۔ لیکن اس دفعہ اس نے کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالا۔

"ہم کو نئے سرے سے اس کی تیاری کرنی ہے۔ کیونکہ اب اس دنیا میں ہم تنہا رہ گئی ہیں۔"

"اب اس دنیا میں ہم تنہا رہ گئے ہیں۔" مریم نے بھی انہی الفاظ کو دہرایا۔

ایک سال کا عرصہ ہوا کہ قسمت تیسری بار مجھے پھر وہاں لے گئی اس مختصر ملاقات کے کمرے میں جاتے ہوئے میں نے بڑھیا خاتون کو دیکھا جو سیاہ ماتمی کپڑوں میں ملبوس ایک پلنگ پر بیٹھی سینے پرونے میں مشغول تھی۔ اس کے قریب ہی ایک ٹھگنا معمر آدمی بیٹھا تھا۔ وہ بھورا کوٹ اور جوتوں کی جگہ چمڑے کی جرابیں پہنے ہوئے تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اچھلا اور کمرے کے باہر بھاگ گیا۔

میرا استقبال کرنے کی غرض سے بڑھیا خاتون مسکرائی۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دریافت کیا "آپ کیا بنا رہی ہیں؟"

"یہ دلھن کی پوشاک ہے۔ اس کو تیار کرنے کے بعد میں گرجا کے پادری کو دے آؤں گی تاکہ حفاظت سے رہے۔ ورنہ یوسف مسیح اس کو بھی چرا لے گا۔ اب میں ہر چیز تیار کر کے پادری کے سپرد کر دیتی ہوں۔" اس نے آخری فقرہ نہایت آہستہ سے کہا۔

پھر اس نے اپنی بیٹی کی تصویر پر نگاہ ڈالی جو چوکھٹے میں لگی ہوئی سامنے کی میز پر رکھی تھی۔ اور ایک آہ سرد کھینچ کر کہا۔

"اب میں اس دنیا میں تنہا رہ گئی ہوں۔"

مریم کہاں ہے؟ میں نے دریافت کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ اس غم نصیب ماں سے ایسا سوال کروں۔ جبکہ میں دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے ماتم میں سیاہ لباس پہنے بیٹھی ہے اور اس کی شادی کی پوشاک تیار کر رہی ہے۔

میں کافی دیر تک کمرے میں رہا اور تصورات کی دنیا میں مریم کے حسین نقوش اپنی لوح قلب پر اجاگر کرتا رہا۔ مجھے نہ تو اس کی نغمہ زا آواز سنائی دی اور نہ طاؤس صفت رفتار کی چاپ۔

میں اصل بات کو اچھی طرح سمجھ سکا تھا۔ میں نے اپنے دل کی گہرائی میں ایک شدید قسم کا درد محسوس کیا...... اس درد کی لذت ابھی تک باقی ہے۔ اور نگاہوں میں "دلھن کی پوشاک" پھر رہی ہے۔ جس کو ماں اس وقت سی رہی تھی جب کہ بیٹی کا کفن بھی میلا ہو چکا ہو گا۔

ہڈیوں کا پنجر

تیرتھ رام فیروز پوری

(۱)

جب میں درسی کتابیں پڑھ چکا تو میرے باپ نے مجھ کو فن طبابت سکھانا چاہا اور اس کام کے لئے ایک عالم بید کو استاد مقرر کیا۔ میرا اپنا استاد صرف دیسی طبابت ہی میں ماہر نہ تھا۔ بلکہ ڈاکٹری بھی جانتا تھا۔ اور اس نے انسانی جسم کی بناوٹ سمجھانے کی غرض سے میرے لئے ایک انسان کا ڈھانچہ یعنی ہڈیوں کا پنجر منگا دیا تھا۔ جو اس کمرہ میں جہاں میں پڑھتا تھا رکھا گیا۔ عام لوگ جانتے ہیں کہ مردہ خصوصاً ہڈیوں کے ڈھانچہ سے کمسن بچوں کو جب وہ اکیلے ہوں کس قدر خوف آتا ہے۔ قدرتاً مجھ کو بھی ڈر لگتا تھا۔ اور شروع شروع میں میں کبھی اس کمرہ میں تنہا نہ جاتا تھا۔ اور اگر کسی ضرورت کی وجہ سے جانا بھی پڑتا تو اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتا تھا ایک اور طالب علم بھی سبق میں میرا شریک تھا۔ جو بہت نڈر تھا۔ وہ کبھی اس ڈھانچہ سے خوف نہ کھاتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ اس مشت استخوان کی بساط ہی کیا ہے۔ جس سے کسی زندہ آدمی کو تکلیف پہنچ سکے؟ ابھی ہڈیاں ہیں۔ چند روز بعد خاک ہو جائیں گی۔ مگر میں نے اس بارہ میں کبھی اس سے اتفاق نہ کیا اور ہمیشہ کہتا رہا کہ گو روح ان ہڈیوں سے جدا ہو گئی ہے۔ تاہم جب تک یہ موجود ہیں وہ وقتاً فوقتاً آ کر اپنے پرانے مکان کو دیکھا کرتی ہے۔ میرا یہ خیال بظاہر عجیب اور ناممکن معلوم ہوتا ہے اور کبھی کسی نے یہ دیکھا نہیں ہوگا۔ کہ روح پھر اپنی ہڈیوں میں واپس آ گئی ہو لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ میرا خیال درست تھا اور درست نکلا۔

(۲)

چند دن کا ذکر ہے کہ ایک رات خانگی ضروریات کی وجہ سے مجھے اس کمرہ میں سونا پڑا۔ چونکہ میرے لئے یہ نئی جگہ تھی۔ اس لئے نیند نہ آئی اور میں بڑی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ یہاں تک کہ پاس کے گرجا نے بارہ بجا دیئے۔ لیمپ جو میرے کمرہ میں روشن تھا۔ مدھم ہونا شروع ہوا اور پھر آہستہ آہستہ گل ہو گیا۔ اس وقت مجھے اس روشنی کی نسبت خیال آیا کہ ایک لحظہ پیشتر وہ روشنی تھی۔ مگر اب ہمیشہ کے لئے تاریکی میں بدل گئی ہے دنیا میں انسانی زندگی کا بھی یہی حال ہے۔ جو کبھی رات کو کبھی دن کو ابدی زندگی میں جا ملتی ہے۔

رفتہ رفتہ میرا خیال ہڈیوں کے ڈھانچہ کی طرف منتقل ہونا شروع ہوا۔ میں دل میں سوچ رہا تھا کہ خدا جانے یہ ہڈیاں اپنی زندگی میں کیا کچھ نہ ہوں گی۔ یکایک مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کوئی متحرک چیز میرے پلنگ کے ادھر ادھر تاریکی میں پھر رہی ہے۔ پھر لمبی سانسوں کی آواز جیسے کوئی غمزدہ شخص سانس لیتا ہے۔ میرے کانوں میں پڑی اور پیروں کی آہٹ بھی آئی مگر میں

نے خیال کیا یہ میرا وہم ہے اور بدخوابی کی وجہ سے خیالی آوازیں آرہی ہیں۔ مگر پاؤں کی آواز پھر آئی۔ اس پر میں نے رفع شک کی خاطر زور سے کہا۔ "کون ہے؟"

یہ سن کر وہ نامعلوم شکل میرے پلنگ کے نزدیک آئی اور بولی۔ "میں ہوں۔ میں اپنی ہڈیوں کو دیکھنے آئی ہوں۔"

میں نے خیال کیا میرا کوئی واقف مجھ سے ہنسی کر رہا ہے۔ اس لئے کہا۔ "یہ کونسا موقعہ ہے ہڈیوں کے دیکھنے کا ہے۔ اصل مدعا کہو۔"

آواز آئی۔ "مجھے وقت بے وقت سے کیا غرض۔ میری چیز ہے۔ میں جس وقت چاہوں اسے دیکھ سکتی ہوں۔ آہ! کیا تم نہیں دیکھتے۔ وہ میری پسلیاں ہیں۔ جن میں مدتوں میرا دل رہا ہے۔ میں پورے ۲۶ سال اس آشیانہ میں مقیم رہی ہوں۔ جس کو اب تم ہڈیوں کا ڈھانچہ کہتے ہو۔ اگر میں اپنے پرانے گھر کو دیکھنے چلی آئی۔ تو اس میں تمہارا کیا ہرج ہوا؟"

میں ڈر گیا۔ اور روح کو ٹالنے کے لئے کہا۔ "اچھا تم جا کر اپنی ہڈیاں دیکھ لو۔ مجھے نیند آتی ہے۔ میں سوتا ہوں۔"

میں نے دل میں ارادہ کر لیا کہ جس وقت وہ یہاں سے ہٹی۔ میں فوراً بھاگ کر باہر چلا جاؤں گا۔ لیکن وہ ٹلنے والی آسامی نہ تھی اور کہنے لگی۔ "کیا تم یہاں تنہا سوتے ہو؟ اچھا آؤ کچھ باتیں کریں۔"

اس کا اصرار میرے لئے آفت ناگہانی سے کم نہ تھا۔ موت کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا۔ مگر چار و ناچار جواب دیا۔ "اچھا تو بیٹھ جاؤ اور کوئی مزے دار بات سناؤ۔"

آواز آئی۔ "لو سنو۔ ۲۵ سال گزرے ہیں کہ میں بھی تمہاری طرح انسان تھی اور انسانوں میں بیٹھ کر گفتگو کیا کرتی تھی۔ لیکن اب مرگھٹ کے ویرانہ میں پھرتی رہتی ہوں۔ آج میری خواہش ہے کہ میں پھر اس قدر عرصہ دراز کے بعد انسانوں سے باتیں کروں۔ میں خوش ہوں کہ تم نے بھی میری باتیں سننے پر رضامندی ظاہر کی ہے۔ کیوں تم باتیں سننا چاہتے ہو یا نہیں؟"

یہ کہہ کر وہ اور آگے کی طرف آئی اور مجھے معلوم ہوا کہ کوئی شخص میری پائنتی پر بیٹھ گیا ہے اور اس سے پہلے کہ میں کوئی لفظ زبان سے نکالوں۔ اس نے اپنا قصہ سنانا شروع کیا۔

اب کوئی چارہ نہ تھا۔ میں نے حوصلہ کر کے کہا۔ "اچھا کوئی عمدہ کہانی سناؤ۔"

(۳)

وہ بولی۔ "اے صاحب۔ جب میں انسانی جامہ میں تھی۔ تو صرف ایک شخص سے ڈرا کرتی تھی۔ اور وہ شخص میرے حق میں گویا موت کا فرشتہ تھا وہ میرا خاوند تھا۔ جس طرح ایک شخص مچھلی کو کانٹا لگا کر پانی سے باہر نکال لایا ہو۔ یہ شخص مجھ کو میرے والدین کے گھر سے لے آیا تھا۔ اور وہاں مجھ کو جانے نہیں دیتا تھا۔ شکر ہے کہ اس کا کام جلد تمام ہو گیا۔ یعنی شادی کے دوسرے مہینہ ہی وہ دنیا سے چل بسا میں نے لوگوں کی دیکھا دیکھی نالہ و شیون کیا۔ لیکن دل میں بہت خوش تھی۔ کہ کانٹا نکل گیا۔ اب مجھ کو اپنے والدین سے ملنے کی اجازت مل جائے گی۔ اور میں اپنی پرانی سہیلیوں سے جن کے ساتھ میں کھیلا کرتی تھی۔ ملوں گی۔ لیکن ابھی مجھ کو میکے جانے کی اجازت نہ ہوئی تھی کہ ایک دن میرا خسر گھر میں آیا اور میرا چہرہ غور سے دیکھ کر اپنی اہلیہ سے کہنے لگا۔ مجھ کو تو قیافہ سے یہ لڑکی ڈائن معلوم ہوتی ہے۔ اپنے خسر کے الفاظ اب تک مجھ کو یاد ہیں۔ اور میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اس کے چند روز بعد مجھ کو اپنے باپ کے گھر چلے جانے کی اجازت مل گئی باپ کے گھر پہنچ جانے پر مجھ کو جو

خوشی حاصل ہوئی وہ احاطہ بیان سے باہر ہے۔ میں وہاں بھی خوش گوار رہنے اور اپنی جوانی کے دن گذارنے لگی۔ میں نے ان دنوں اپنا اپنی نسبت لوگوں سے سنا کہ میں خوبصورت نازنین ہوں مگر تم کہو تمہاری کیا رائے ہے؟"

میں نے کہا۔ "میں نے تمہیں زندگی کی حالت میں دیکھا نہیں۔ میں کیسے رائے دے سکتا ہوں۔ جو کچھ تم نے کہا۔ درست ہوگا۔"

وہ بولی۔ "میں کس طرح یقین دلاؤں کہ ان دو خانوں میں دو سرنگیں آنکھیں دیکھنے والوں پر بجلیاں گراتی تھیں! افسوس تم میرے اصلی تبسم کا اندازہ ان ہڈیوں کے کھلے منہ سے نہیں لگا سکتے۔ ان ہڈیوں کے گرد جو خوبصورتی تھی۔ اب اس کا نام تک نہیں ہے۔ میری زندگی کے ایام میں کوئی لائق سے لائق ڈاکٹر بھی گمان نہ کر سکتا تھا کہ میری ہڈیاں تشریح جسم انسانی کے کام آئیں گی۔ مجھے وہ دن یاد ہیں۔ جب میں چلا کرتی تھی۔ تو نور کی شعاعیں میرے بال بال سے نکل کر ہر سمت کو منور کیا کرتی تھیں۔ میں اپنے بازوؤں کو گھنٹوں دیکھا کرتی تھی۔ آہ! یہ وہ بازو تھے۔ کہ جس کو میں نے دکھائے اپنا فریفتہ کیا۔ شاید سہدرا کو بھی ایسے گول اور سڈول بازو نصیب نہ ہوئے ہوں گے۔ میری چھوٹی نازک انگلیاں پنجہ مرجان کو شرماتی تھیں۔ افسوس۔ میرے اس برہنہ ڈھانچہ نے تمہیں میرے حسن و جمال کی نسبت غلط رائے قائم کرنے کا موقعہ دیا۔ تم مجھ کو ایام شباب میں دیکھتے۔ تو آنکھوں سے نیند اڑ جاتی اور علم تشریح کا سودا دماغ سے حرف غلط کی طرح محو ہو جاتا۔"

میں نے جواب دیا۔ "یقین جانو تمہاری اس گفتگو سے بھی طب کے سارے معلومات میرے دماغ سے خارج ہو گئے ہیں۔ اور تمہاری دلکش خوبصورتی میرے دل میں نقش ہو گئی۔ اچھا آگے کہو۔"

اس نے سلسلہ کلام جاری رکھ کر کہا۔ "میرے بھائی نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ شادی نہ کروں گا۔ اس لئے گھر میں صرف میں ہی ایک عورت تھی۔ میں شام کو اپنے باغ میں سایہ دار درختوں کے نیچے بیٹھتی۔ تو ستارے مجھ کو گھورا کرتے۔ اور ٹھنڈی ہوا جب میرے پاس سے گذرتی تو میرے ساتھ اٹھکھیلیاں کرتی تھی۔ میں اپنے حسن کے غرور میں بارہا سوچا کرتی کہ جس زمین پر میرا قدم پڑتا ہے۔ اگر اس میں محسوس کرنے کی قوت ہوتی۔ تو خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ کبھی کہتی کہ دنیا کے سارے عاشق مزاج نوجوان گھاس کے بھیس میں میرے قدموں پر غلطاں پڑے ہیں۔ اب یہ تمام خیالات بار بار مجھ کو پریشان کرتے ہیں کہ آہ! کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ میرے بھائی کا ایک دوست ستیش کمار تھا۔ جس نے میڈیکل کالج سے ڈاکٹری کی سند حاصل کی تھی۔ وہ ہمارا بھی خانگی ڈاکٹر تھا۔ گو اس نے مجھ کو نہیں دیکھا۔ مگر میں نے ایک روز اس کو دیکھا۔ اور مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اس کی خوبصورتی نے مجھ پر خاص اثر کیا۔ میرا بھائی عجیب قسم کا شخص تھا۔ وہ زمانہ کے سرد و گرم سے بالکل ناآشنا تھا۔ اور کبھی گھر کے کاموں میں دخل نہ دیتا تھا۔ وہ زیادہ تر خاموشی پسند تھا اور تنہائی میں رہتا تھا۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ دنیا سے کنارہ کش ہو کر گوشہ نشین بن گیا اور عارفانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ ہاں تو وہ نوجوان ستیش کمار اکثر ہمارے گھر آتا تھا۔ اور یہی ایک نوجوان تھا جس کو اپنے گھر کے مردوں کے سوا مجھے دیکھنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ جب میں باغ میں تنہا ہوتی۔ اور پھولوں سے لدے ہوئے درختوں کے نیچے ملکہ کی طرح بیٹھتی تو ستیش کمار کا خیال اور بھی میرے دل میں چٹکیاں لیتا۔ لیکن تم کس فکر میں ہو۔ تمہارے دل میں کیا گزر رہا ہے؟"

میں نے آہ سرد بھر کر جواب دیا۔ "میں یہ خیال کر رہا ہوں کہ کاش میں ہی ستیش کمار ہوتا۔"

وہ ہنس کر بولی۔ "اچھا پہلے میری کہانی سن لو۔ پھر عشق بازی کر لینا۔ ایک دن بارش ہو رہی تھی۔ مجھے قدرے بخار تھا کہ

ڈاکٹر یعنی میرا پیارا ستیش کمار مجھے دیکھنے آیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بالمقابل دیکھا۔ اور دیکھتے ہی ڈاکٹر کو سکتہ سا ہو گیا اگرچہ میرے بھائی کی موجودگی نے اس کو ہوش سنبھالنے پر مجبور کر دیا۔ وہ میری طرف اشارہ کر کے بولا۔ میں ان کی نبض دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے آہستہ سے اپنا بازو دوشالہ سے باہر نکالا۔ ڈاکٹر نے میری نبض پر ہاتھ رکھا۔ میں نے کبھی نہ دیکھا تھا کہ کسی ڈاکٹر نے معمولی بخار کی تشخیص میں اس قدر تامل کیا ہو۔ اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں سخت جدوجہد کے بعد اس نے میرے بخار کا اندازہ لگایا۔ لیکن میرا بخار دیکھتے دیکھتے ہی بذات خود بیمار ہو گئے۔ کیوں تم اس بات کو مانتے ہو یا نہیں؟

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "ہاں بالکل مانتا ہوں۔ آدمی کی حالت میں تغیر پیدا ہونا کیا مشکل ہے۔"

وہ بولی۔ "چند روز امتحان کرنے سے معلوم ہوا۔ کہ میرے دل میں ڈاکٹر کے سوا اور کسی نوجوان کا خیال تک نہیں۔ میرا معمول تھا۔ کہ شام کے وقت سلیٹی رنگ کی ساری پہن کر اپنے بالوں میں کنگھی کر کے پھولوں کا ہار گلے میں ڈال کر شیشہ ہاتھ میں لے باغ میں چلی جاتی اور پہروں دیکھا کرتی۔ کیا شیشہ دیکھنا معیوب ہے؟"

میں نے گھبرا کر جواب دیا۔ "نہیں تو۔"

اس نے سلسلہ حکایت کو جاری رکھ کر کہا۔ "شیشہ دیکھ کر میں محسوس کرتی تھی۔ گویا میری دو زندگیاں ہو گئی ہیں۔ یعنی میں خود ہی ستیش کمار بن جاتی اور خود ہی اپنے عکس کو معشوق سمجھ کر اس پر نقد دل نثار کیا کرتی۔ یہ میری بڑی مرغوب تفریح تھی۔ اور میں گھنٹوں اس میں گزار دیا کرتی تھی۔ بارہا ایسا ہوا کہ دوپہر کو پلنگ پر بستر بچھا کر سوئی۔ اور ایک بازو کو بستر پر لاپروائی سے پھینک دیا۔ ذرا آنکھ جھپکی۔ تو خواب میں دیکھا۔ کہ ستیش کمار آیا اور میرے ہاتھ کو بوسہ دے کر چلا گیا ...... بس اب میں کہانی ختم کرتی ہوں۔ تمہیں تو نیند آ رہی ہے۔"

میری دلچسپی بہت بڑھ چکی تھی۔ اس لئے میں نے منت کے لہجہ میں کہا۔ "نہیں تم کہے جاؤ۔ میرا شوق بڑھتا جاتا ہے۔"

وہ کہنے لگی۔ "اچھا تو سنو۔ تھوڑے دنوں میں ستیش کمار کا کاروبار بہت بڑھ گیا۔ اور اس نے ہمارے مکان کے نچلے حصہ میں اپنا مطب کھول لیا۔ جب اس کو مریضوں سے فرصت ہوتی تو میں اس کے پاس جا بیٹھتی۔ اور ہنسی ٹھٹھے میں مختلف دواؤں کے نام پوچھتی رہتی۔ اس طرح مجھے کئی ایسی دوائیں بھی معلوم ہو گئیں۔ جو زہر قاتل تھیں۔ ستیش کمار جو کچھ میں اس سے دریافت کرتی۔ بڑی محبت اور متانت سے بتایا کرتا۔ اس طرح ایک طویل عرصہ گذر گیا۔ اور میں نے محسوس کرنا شروع کیا۔ کہ ڈاکٹر مفکر و اداس رہتا ہے۔ اور جب کبھی میں اس کے سامنے جاتی ہوں۔ تو اس کے چہرہ پر مردنی چھا جاتی ہے لیکن ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کی وجہ معلوم نہ ہوئی۔ ایک دن ڈاکٹر نے میرے بھائی سے گاڑی مانگی۔ میں پاس بیٹھی تھی۔ میں نے بھائی سے پوچھا۔ ڈاکٹر اس وقت رات میں کہاں جائیگا؟ میرے بھائی نے جواب دیا۔ تباہ ہونے کو۔ میں نے اصرار کیا کہ مجھ کو ضرور بتاؤ وہ کہاں جا رہا ہے۔ بھائی نے کہا وہ شادی کرنے جاتا ہے۔ یہ سن کر مجھ پر غشی سی طاری ہو گئی۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور بھائی سے پھر پوچھا کیا سچ مچ وہ شادی کرنے جاتا ہے۔ یا مذاق کرتے ہو؟ اس نے جواب دیا درست ہے۔ آج ڈاکٹر دلہن لائے گا۔

میں نہیں بتا سکتی کہ مجھے یہ بات کس قدر شاق گزری۔ میں نے اپنے دل سے بار بار پوچھا۔ کہ ڈاکٹر نے کیوں مجھ سے یہ بات پوشیدہ رکھی؟ کیا میں اس کو روک دیتی۔ کہ شادی مت کرو۔ ان مردوں کی بات کا کچھ اعتبار نہیں۔

"سہ پہر کو ڈاکٹر مریضوں کو دیکھ کر مطب میں آیا۔ اور میں نے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب کیا یہ درست ہے کہ آج آپ کی

ہے؟ یہ کہہ کر میں بہت ہنسی۔ اور ڈاکٹر یہ دیکھ کر کہ میں اس کو ہنسی میں اڑا رہی ہوں نہ صرف شرمندہ ہوا بلکہ کچھ متفکر سا ہو گیا۔ پھر میں نے یکایک پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب جب آپ کی شادی ہو جائے گی تو کیا آپ پھر بھی لوگوں کی نبض دیکھا کریں گے؟ آپ تو ڈاکٹر ہیں۔ اور ڈاکٹروں کی نسبت مشہور ہے وہ جسم کے تمام اعضا کا حال جانتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آپ ڈاکٹر ہو کر کسی کے دل کا پتہ نہیں لگا سکتے۔ کہ وہ کس حالت میں ہے۔ حالانکہ دل بھی جسم کا ایک حصہ ہے۔

میرے الفاظ ڈاکٹر کے دل میں تیر کی طرح لگے۔ مگر وہ خاموش رہا۔"

(۴)

لگن کی مہورت بڑی رات گئے مقرر ہوئی تھی۔ اور برات کو دیر سے جانا تھا اس لئے ڈاکٹر اور میرا بھائی حسب معمول شراب پینے بیٹھ گئے اس شغل میں ان کو بہت دیر ہو گئی۔ گیارہ بجنے کو تھے کہ میں ان کے پاس گئی۔ اور کہا۔ ڈاکٹر صاحب گیارہ بجنے والے ہیں۔ آپ کو شادی کے لئے تیار ہونا چاہیے۔ وہ کسی قدر سرور میں ہو گیا تھا۔ بولا۔ ابھی جاتا ہوں۔ پھر وہ میرے بھائی کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گیا اور میں نے موقعہ پا کر زہر کی پڑیا جو میں نے دوپہر کو ڈاکٹر کی غیر حاضری میں اس کے صندوق سے نکالی تھی شراب کے گلاس میں جو ڈاکٹر کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ ڈال دی۔ چند منٹ بعد ڈاکٹر نے اپنا گلاس ختم کیا اور دولہا بننے کو چلا گیا۔ میرا بھائی بھی اس کے ہمراہ روانہ ہوا۔

میں بالائی کمرہ میں گئی۔ اور اپنا نیا بنارسی دوپٹہ اوڑھا۔ ماتھے پر سیندور لگایا اور پوری سہاگن بن کر باغ میں نکلی۔ جہاں روز شام کو بیٹھا کرتی تھی۔ اس وقت چاندنی چٹکی ہوئی تھی ہوا میں خنکی تھی اور چنبیلی کی خوشبو نے باغ کو مہکا دیا تھا۔ اب میں نے پڑیا کی باقیماندہ دوا نکالی اور منہ میں ڈال کر چلو بھر پانی پی لیا۔ تھوڑی دیر میں میرے سر میں چکر آنے لگا اور آنکھوں میں غنودگی چھا گئی چاند کی چاندنی مدھم ہونے لگی اور زمین و آسمان' بیل بوٹے میرا گھر جہاں میں نے اس قدر عمر گذار دی تھی' رفتہ رفتہ غائب ہوتے معلوم ہوئے۔ اور میں میٹھی نیند سو گئی۔

ڈیڑھ سال کے بعد خواب راحت سے چونکی تو میں نے دیکھا کہ تین لڑکے میری ہڈیوں سے علم تشریح سیکھ رہے ہیں اور ایک استاد میری چھاتی کی طرف بید سے اشارہ کر کے لڑکوں کو مختلف ہڈیوں کے نام بتا رہا ہے اور کہتا ہے۔ یہاں دل رہتا ہے جو شادی و غم کے وقت دھڑکا کرتا ہے اور یہ وہ جگہ ہے جہاں اٹھتی جوانی کے وقت شگوفے نکلتے ہیں۔

"اچھا اب میری کہانی ختم ہے اور رخصت ہوتی ہوں۔"

(ترجمہ)

شہزادے کا بازار میں گھسٹنا

خواجہ حسن نظامی

(۱)

غدر سے ایک برس پہلے کا ذکر ہے دہلی سے باہر جنگل میں چند شہزادے شکار کھیلتے پھرتے تھے اور بے پرواہی سے چھوٹی چھوٹی چڑیوں' فاختاؤں کو جو دوپہر کی دھوپ سے بچنے کے لئے درختوں کی ہری بھری ٹہنیوں پر بیٹھی خدا کی یاد کی تسبیحیاں پڑھ رہی تھیں' غلے مار رہے تھے کہ سامنے سے ایک گدڑی پوش فقیر آن نکلا اور اس نے نہایت ادب سے شہزادوں کو سلام کیا "میاں صاحبزادو! ان بے زبان جانوروں کو کیوں ستاتے ہو' انہوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔ ان کے بھی جان ہے۔ یہ بھی تمہاری طرح دکھ اور تکلیف کی خبر رکھتے ہیں۔ مگر بے بس ہیں اور منہ سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ تم بادشاہ کی اولاد ہو۔ بادشاہوں کو اپنے ملک کے رہنے والوں سے محبت اور مہربانی برتنی چاہیے۔ یہ جانور بھی ملک میں رہتے ہیں ان کے ساتھ بھی رحم اور انصاف برتا جائے تو شان بادشاہی سے دور نہیں۔" بڑے شہزادے نے جس کی عمر ۱۸ برس کی تھی شرما کر غلیل ہاتھ سے رکھ دی۔ مگر چھوٹے مرزا نصیر الملک بگڑ کر بولے "جا رے جا' دو ٹکے کا آدمی ہم کو نصیحت کرنے نکلا ہے۔ تو کون ہوتا ہے ہم کو سمجھانے والا' سیر و شکار کرتے ہیں ہم سے کون سا گناہ ہو گیا۔" فقیر بولا "صاحب عالم ناراض نہ ہوں' شکار ایسے جانور کا کرنا چاہیے کہ ایک جان جائے تو دس پانچ جانوں کا پیٹ تو بھرے' ان ننھی ننھی چڑیوں کے مارنے سے کیا نتیجہ؟ بیس بھی مارو گے تو بھی ایک آدمی شکم سیر نہ ہو سکے گا۔" نصیر مرزا فقیر کے دوبارہ بولنے سے آگ بگولا ہو گئے اور ایک غلہ غلیل میں رکھ کر فقیر کے گھٹنے میں اس زور سے مارا کہ بے چارہ منہ کے بل گر پڑا اور بے اختیار اس کی زبان سے نکلا کہ "ہائے ٹانگ توڑ ڈالی" فقیر کے گرتے ہی شہزادے گھوڑوں پر سوار ہو کر قلعے کی طرف چلے گئے اور فقیر گھسٹتا ہوا سامنے کے قبرستان کی طرف چلنے لگا۔ گھسٹتا جاتا تھا اور کہتا جاتا تھا "وہ تخت کیونکر آباد رہے گا جس کے وارث ایسے سفاک ظالم ہیں۔ لڑکے تو نے میری ٹانگ توڑی خدا تیری ٹانگیں توڑے اور تجھ کو بھی اسی طرح گھسٹنا نصیب ہو۔"

(۲)

توپیں گرج رہی تھیں' گولے برس رہے تھے۔ زمین پر چاروں طرف لاشوں کے ڈھیر نظر آتے تھے' شہر دہلی ویران اور

... ہو تا جاتا تھا کہ لال قلعے سے بھروہی چند شہزادے، گھوڑوں پر سوار ہو کر بد حواسی کے عالم میں بھاگتے ہوئے نظر آئے اور پہاڑ گنج کی طرف جانے لگے۔ دوسری طرف بیس پچیس گورے سپاہی دھاوے کرتے چلے آتے تھے انہوں نے ان نو عمر سواروں پر یک لخت بندوقوں کی باڑھ ماری۔ گولیوں نے گھوڑوں اور سواروں کو چھلنی کر دیا اور یہ سب شہزادے فرش خاک پر گر کر خون میں تڑپنے لگے۔ گورے جب قریب آئے تو دیکھا کہ دو شہزادے جاں بحق ہو چکے ہیں۔ مگر ایک سانس لے رہا ہے۔ ایک سپاہی نے اس زندہ شہزادے کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو معلوم ہوا کہ اس کے کہیں زخم نہیں آیا گھوڑے کے گرنے سے معمولی کھرونچیں آگئی تھیں اور وحشت کے سبب غشی طاری ہو گئی تھی۔ صحیح سالم دیکھ کر گھوڑے کی باگ ڈور سے شہزادے کے ہاتھ باندھ دیے گئے اور حراست میں کر کے دو سپاہیوں کے ساتھ کیمپ میں بھجوا دیا گیا۔ کیمپ پہاڑی پر تھا جہاں گوروں کے علاوہ کالوں کی فوج بھی تھی۔ جب بڑے صاحب کو معلوم ہوا کہ یہ بادشاہ کا پوتا نصیر الملک ہے تو وہ بہت خوش ہوئے اور حکم دیا کہ اس کو حفاظت سے رکھا جائے۔

(۳)

باغیوں کی فوجیں شکست کھا کر بھاگنے لگیں۔ اور انگریزی لشکر یلغار کرتا ہوا شہر میں گھسنے لگا۔ بہادر شاہ ہمایوں کے مقبرے سے گرفتار ہو گئے۔ تیموری بزم کا چراغ جھلملا کر گل ہو گیا اور جنگل شریف زادیوں کے برہنہ سروں اور کھلے چہروں سے آباد ہو گیا۔ باپ بچوں کے سامنے ذبح ہونے لگے۔ اور مائیں اپنے جوان بیٹوں کو خاک و خون میں لوٹتا دیکھ کر چیخیں مارنے لگیں۔

اس دارو گیر میں پہاڑی کے کیمپ میں میرزا نصیر الملک رسی سے بندھے بیٹھے تھے کہ ایک پٹھان سپاہی دوڑا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ جائیے میں نے آپ کی رہائی کی اجازت صاحب سے حاصل کر لی۔ جلدی بھاگ جاؤ ایسا نہ ہو کسی دوسری بلا میں پھنس جاؤ۔

مرزا بے چارے پیدل چلنا کیا جانیں' حیران تھے کہ کیا کریں۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ پٹھان کا شکریہ ادا کر کے نکلے اور جنگل کی طرف ہو لئے۔ چل رہے تھے مگر یہ خبر نہ تھی کہ کہاں جاتے ہیں۔ ایک میل چلے ہوں گے کہ پیروں میں چھالے پڑ گئے' زبان خشک ہو گئی' حلق میں کانٹے پڑنے لگے۔ تھک کر ایک درخت کے سایہ میں گر پڑے اور آنکھوں میں آنسو بھر کر آسمان کی طرف دیکھا کہ الٰہی یہ کیا غضب ہم پر ٹوٹا۔ ہم کہاں جائیں کدھر ہمارا ٹھکانا ہے۔ اوپر نگاہ اٹھانے سے درخت پر نظر گئی۔ دیکھا فاختہ کا ایک گھونسلا بنا ہوا ہے اور وہ آرام سے اپنے انڈوں پر بیٹھی ہے۔ اس کی آزادی و آسائش پر شہزادے کو بڑا رشک آیا اور کہنے لگے کہ فاختہ! مجھ سے تو لاکھ درجے بہتر ہے کہ آرام سے اپنے گھونسلے میں بے فکر بیٹھی ہے۔ میرے لئے تو آج زمین و آسمان میں کہیں جگہ نہیں۔

تھوڑی دور ایک بستی نظر آتی تھی۔ ہمت کر کے وہاں جانے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ پاؤں کے چھالے چلنے نہ دیتے تھے۔ مگر افتاں و خیزاں گرتے پڑتے وہاں پہنچے تو عجیب سماں نظر آیا۔

ایک درخت کے نیچے سینکڑوں گنوار جمع تھے۔ اور چبوترہ پر ایک تیرہ سال کی معصوم لڑکی بیٹھی تھی جس کے چہرہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کان لہو لہان ہو رہے تھے۔ اور دیہاتی اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ جونہی مرزا کی نگاہ اس بچی پر پڑی اور اس بے چاری نے مرزا کو دیکھا دونوں کی چیخیں نکل گئیں۔ بھائی بہن کو اور بہن بھائی کو چمٹ کر رونے لگے۔ میرزا نصیر الملک کی یہ چھوٹی بہن اپنی والدہ کے ساتھ رتھ میں سوار ہو کر قلعہ سے قطب صاحب چلی گئی تھیں۔ میرزا کو گمان بھی نہ تھا کہ وہ اس آفت میں مبتلا ہو گی۔ پوچھا "ملکہ تم یہاں کہاں؟" رو کر بولی "آغا جی گوجروں نے ہم کو لوٹ لیا۔ نوکروں کو مار ڈالا۔ اماں جان کو

دوسرے گاؤں والے لے گئے اور مجھ کو یہ یہاں لے آئے۔ میری بالیاں انہوں نے نوچ لیں۔ اور دیکھو انہوں نے میرے لباس کی یہ حالت کر دی ہے۔ اتنا کہہ کر لڑکی کی گھگی بندھ گئی۔ اور پھر کوئی لفظ اس کی زبان سے نہ نکلا۔

یہ سن کر شہزادے نے اپنی غریب بہن کو دلاسا دیا اور ان گنواروں سے عاجزی کرنے لگا کہ اس کو چھوڑ دو۔ گو جر بگڑ کر بولے ارے جا آیا بڑا بے چارہ۔ ایک گنڈاسا ایسا ماریں گے کہ گردن کٹ جائے گی۔ اس کو ہم دوسرے گاؤں سے لائے ہیں۔ انعام دے جا اور لے جا۔ مرزا نے کہا کہ چودھریو! میں دام کہاں سے دوں۔ میں تو خود تم سے روٹی کا ٹکڑا مانگنے کے قابل ہوں۔ دیکھو ذرا رحم کرو۔ کل تم ہماری رعیت تھے اور ہم بادشاہ کہلاتے تھے۔ آج آنکھیں نہ پھیرو۔ خدا کسی کا وقت نہ بگاڑے۔ اگر ہمارے دن پھر گئے تو مالا مال کر دیں گے۔ یہ سن کر گنوار بہت ہنسے اور کہنے لگے اوہو آپ بادشاہ سلامت ہیں، تب تو ہم تم کو فرنگیوں کے ہاتھ بیچیں گے۔ اور یہ چھوکری تو اب ہمارے گاؤں کی ٹہل کیا کرے گی۔ جھاڑو دے گی ڈھوروں کے آگے چارہ ڈالے گی۔ گوبر اٹھائے گی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سامنے سے انگریزی فوج آ گئی اور گاؤں والوں کو گھیر لیا۔ اور چودھریوں کو اور ان دونوں شہزادے شہزادی کو پکڑ کر دہلی لے گئے۔

(۴)

چاندنی چوک کے بازار میں پھانسیاں گڑی ہوئی تھیں۔ اور جس کو انگریز کہہ دیتے کہ یہ قابل دار ہے اس کو پھانسی مل جاتی تھی۔ ہر روز سینکڑوں آدمی دار پر لٹکائے جاتے۔ گولیوں سے اڑائے جاتے اور تلوار سے ذبح ہوتے تھے۔ ہر طرف اس خونریزی سے تہلکہ تھا۔ میرزا نظام الملک اور ان کی بڑی بہن بھی بڑے صاحب کے سامنے پیش ہوئے۔ اور صاحب نے ان دونوں کو خرد سال دیکھ کر بے قصور سمجھا اور چھوڑ دیا۔ دونوں نجات پا کر ایک سوداگر کے ہاں نوکر ہو گئے۔ لڑکی سوداگر کے بچے کو کھلاتی تھی۔ اور نصیر الملک بازار کا سودا سلف کرتے تھے۔ چند روز کے بعد لڑکی تو ہیضہ میں مبتلا ہو کر مر گئی۔ اور میرزا کچھ دن ادھر ادھر نوکریاں چاکریاں کرتے رہے۔ آخر سرکار نے ان کی پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی اور نوکری کے وبال سے سبکدوشی ہو گئی۔

(۵)

ایک برس کا ذکر ہے۔ دہلی کے بازار چتلی قبر۔ کٹرہ بنگش وغیرہ میں ایک پیر مرد جن کا چہرہ چنگیزی نسل کا پتہ دیتا تھا کولہوں کے بل گھسٹتے پھرا کرتے تھے۔ ان کے پاؤں شاید فالج سے بے کار ہو گئے تھے اس لئے ہاتھوں کو ٹیک کر کولہوں کو گھسیٹتے ہوئے راستہ چلتے تھے۔ ان کے گلے میں ایک جھولی ہوتی تھی دو دو قدم چلتے اور راہ گیروں کو حیرت سے دیکھتے۔ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی محتاجی ظاہر کر کے بھیک مانگتے تھے۔ جن لوگوں کو ان کا حال معلوم تھا ترس کھا کر جھولی میں کچھ ڈال دیتے تھے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ ان کا نام میرزا نصیر الملک ہے اور یہ بہادر شاہ کے پوتے ہیں۔ سرکاری پنشن قرضہ میں برباد کر دی اور اب خاموش گداگری پر گزارہ ہے۔ مجھ کو ان کے حال سے بڑی عبرت ہوتی تھی۔ اور جب ان کا ابتدائی قصہ جو کچھ خود ان کی زبانی اور کچھ دوسرے شہزادوں کی زبانی سنا تھا یاد آتا تو دل ہل جاتا تھا کہ اس قیصر کا کمرہ پورا ہوا۔ جس کی ٹانگ میں انہوں نے غلہ مارا تھا۔ شہزادہ صاحب کا بازار میں گھسٹتے پھرنا سخت سے سخت دل کو موم کرتا تھا۔ اور ملک کے خوف سے جی کانپ جاتا تھا۔ اب ان شہزادہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔

اوکھلے کی سیر

آغا حیدر حسن دہلوی

اللہ محمدؐ کے چہیتے' صاحب عالم نے محلسرائے میں آنا شروع کر دیا۔ کیا ایک برایک ہے۔ مقلب القلوب کی تسبیح۔ اب اس کی سند نہیں کہ ساون سوکھے جائیں۔ سیل ہونی چاہیے اور وہ بھی اوکھلے کی۔ باغ تو اپنے ہی ہیں۔ جب چاہا چلیں گے اور آج کل تھمڑاں ناشپاتیاں ہی ہوں گی یا امرود اور نیبو قطب صاحب پھر کبھی سہی۔ شرف النساء یہ تمہارا درس سن کون رہا ہے کہ داغ اپنی جمائے جاتا ہے۔ تم اپنا سن دیکھو اور یہ چونپ۔ بہو بیگم یہ خوب رہی کہ بڑھیا حال سے گئی احوال سے گئی کیا اب دل کے خیال سے بھی جائے۔ رابعہ خانم نے کہا۔ دلہن بیگم اللہ جانے رت تو ایسی ہی ہو رہی ہے۔ بھلا اس چار دیواری میں کیا مزا۔ یہ قہقہہ دیواریں اور یہ دریا انگنائی اس پہ اس کالی گھٹا کی چھت نے تو پورا محل بھونرا بنا دیا ہے' اللہ جانے وحشت ہونے لگی۔ آپ ذرا سا بڑی سرکار کے سامنے ذکر چھیڑ دیں۔ وہ کبھی انکار نہ کریں گی ____ آبادی خانم سارا انتظام کر لیں گی اور انتظام کیا آخر اللہ رکھو سیر سوا سیر کا پکنا ہی ہے یہاں نہ پکا وہیں سہی۔ یہاں نہ کھایا وہاں کھا لیا۔ جو وہاں کی بھیڑ میں پکنا ریند ھنا دوبھر ہو جائے گا تو سب یہاں سے ہی پکا پکایا ساتھ لے لیا جائے گا۔ کوئلوں کی بوریاں اور انگیٹھیاں رکھ لیں گے۔ بیسن' مصالحہ' گھی' کڑھیاں لے لیں گے تو اب رہا کیا۔ یوں چٹکی بجاتے میں سب ہو جائے گا۔ پرسوں جمعہ ہے۔ مرد سب نماز کو جائیں گے وہاں کوئی جمی جم ہو گا۔ صاحب عالم ساتھ ہوئے تو کوئی کھٹکا نہیں دو چوبدار کافی ہیں۔ دونوں بڈھوں کو لے لیں گے۔ لال خان اور محب اللہ خان ہیں بھی خوش دل۔ اس موئے عبداللہ خان کو نہ لیجئے گا۔ نگوڑا بڑا زشت رو ہے۔ اور ولایت بیگ بھی نرا جانگلو ہے۔ اجبک کھیوں کے ہمیشہ تیوری پر تین بل رہتے ہیں۔ صبح ہی صبح صورت دیکھ لو تو سارے دن کھانے کو خیر سلا۔ ہاں فرمائیے تو جا کے عرض کر آؤں بڑی سرکار سے۔ انکار تو کسی تریوں کریں گی ہی نہیں۔ اللہ انہیں سوا سو سال سلامت رکھے وہ بھی اداس اداس سی رہتی ہیں۔ جب سے منجھلی بیگم اصل خیر سے سدھاری ہیں۔ جی بہل جائے گا اچھا بی' جاؤ' توبہ ہے تم لوگوں نے میرا دماغ چاٹ لیا۔ خوب دل ہیں (چٹ چٹ بلائیں لے کر) صدقہ گئی زندہ دلی اسی کا نام ہے۔ مردہ دلوں کا کیا خاک جینا اور اللہ ہماری مزے کرانے والی سرکار کو قیامت تو ڑی رکھے یہ کہہ۔ جھپ جھپ جا' صدر دالان میں بیگم صاحبہ کو بہو کا پیغام سنا دیا۔ وہ کہنے لگیں کہ سچ سچ دلہن بیگم کا سیر کو جی چاہا۔ اس پر کچھ جان نے کہا کہ یہ سر سفید ہوپ میں نہیں ہوا۔ انہیں لڑ چیتوں کا اشغلا اٹھایا معلوم ہوتا ہے۔ دلہن

بولی نے کدھی منہ کہا ہوگا۔ دلہن بیگم یہ انہیں لنگلیریوں کی پٹی پڑھائی ہے۔ ہاں روانگی کیا ہے' بچے ہیں کوئی بوڑھے تھوڑی ہیں۔ تمہ دو گلیں کے جمعہ کو۔ مگر اتنا کرنا کہ ایک آنکھ انتظام ہو دیکھ لینا۔ میں ابھی آتون جی سے کہہ دیتی ہوں وہ باہر داروغہ جی کو کہلوا دیں گی اور بڑی ہوروغن کو میں حکم دے دیتی ہوں وہ سب سامان مہیا کردیں گی۔ چلے گی ساری گلشر ائے محمد کے طائفے کو بلوالو۔ پھپھاس کی نقل ضرور آئے اور کہنا نقلیں بھی ہوں گی ہواخوری کو جارہے ہیں۔ فرنگی کی نقل ضرور کرے ڈرے نہیں باہر نقلیں کھلی ہوں گی کالے صاحب سے بنگلے کی اجازت منگوالی ہے۔ جاؤ سب تیاریاں کرو۔ مجھے نفل پڑھ لینے دو ابھی تسبیاں بھی باقی ہیں۔ سارے محل میں ایک اودھم مچ گئی سب نے مہندیاں لگائیں جن کی مہندیاں پھیکی ہو گئی تھیں انہوں نے اور رچائیں۔ سرخ سبز جوڑے پہنے لال سبزے ڈلنک کے لاکھی جوڑے پہنے سب بن سنور گئیں کل سامان لیس ہو گیا۔ اندھیرے منہ سب اٹھ کے تیار ہو گئے۔ بیڑے کے دربان پھاٹک کے باہر ہوئے' زنانہ پہرہ بیڑے میں آگیا۔ عنابی روغن کا گھٹا ٹوپ انگریز کی ولایت کا بنا۔ دروازوں کی مٹھیاں گنگا جمنی ولایتی چار تیلیا۔ کیت گھوڑے جتے۔ ہاتھی کے بچے' اونچائی میں ٹوپ اوڑھے فرنگی سے بھی دو مٹھی نکلتے۔ ان کا ساز و یراق گنگا جمنی' کلغی میں سارس کے گپھے دار پر سبز رنگے تکے۔ بڑی سرکار بہو بیگم' صاحب عالم اور بچے اس میں بیٹھے۔ پانوں کی ڈبیا کا کستا' چھاگل اور تھالی جوڑ کٹورا ساتھ رہا۔ کجاجان بھی اسی میں تھیں' بیج گاڑیاں اور پالکی گاڑیوں میں خاندان والیاں اور معزز مصاحبیں بیٹھیں۔ رتھوں میں منہ چڑھی مغلانیاں اور اصیلیں' بہلیوں' منجھولیوں میں خوگیری کی بھرتی۔ ٹھیلوں چھکڑوں پر سامان لد کر پہلے ہی روانہ ہو گیا تھا۔ کوچبانوں نے مجرا عرض کرایا۔ روانگی کا حکم چاہا۔ ادھر کہاں' ہوں' اور ادھر انہوں نے بسم اللہ مجریہا و مرساہا کہا اور کچھ پڑھ دائیں بائیں دم کر ذرا باگ تان کے ڈھیلی کی کہ لگے گھوڑے پون منہ لینے اور ہوا سے باتیں کرنے۔ سائیسوں کی کرتیاں لال بانات کی اور اس کے گھٹنے لال سبز بلیوڑے کی مندیلیں سروں پر سفید چونریاں۔ ہاتھوں میں ہٹو بچو کا شور مچاتے۔ کوچوانوں کی لال بانات کے گول پردے کی وردیاں کلابتونی ساز لگے' سفید سیدھے پاجامے' سفید پگڑیاں کالی گرگابیاں روپہلی موٹے بکل لگے' ایک خاص دھج سے بیٹھے' سفید دستمال سے باگوں کو پکڑے۔ ایک ہاتھ سے کبھی کبھی چابک کا تڑاخا ہوا میں اڑاتے گھوڑے طرارے بھرتے آناً فاناً میں چھ سات کوس کی منزل ایک سانس میں آکر پہنچے۔ ابھی عملہ والیاں سلطان جی میں آدھے رستے میں ستا رہی تھیں۔ غنیمت یہ کہ پیش خدمتوں کو رات کو ہی روانہ کر دیا تھا ورنہ کیسی کام کی تکلیف ہوتی۔ بنگلہ کی اجازت صاحب کلاں سے مل گئی تھی۔ فراشوں نے دریاں بچھا' چاندنیوں کا فرش مسند تکیہ لگا دیئے اشراق کی نماز پڑھ کے خاصے کی سواریاں نکلی تھیں۔ او کھلے پہنچ کر چاشت کی نماز پڑھی بچے چمنوں میں کھیلتے کودتے پھر رہے تھے مگر حکم تھا نگاہ کے روبرو رہیں' آنکھ سے اوجھل نہ ہونے پائیں کہ اتنے میں بیج گاڑیاں اور پالکی گاڑیاں آپہنچیں اور چرخ چوں چرخ چوں کرتی بہلیاں اور رہلو جلو کرتی رتھیں بھی آگئیں۔ ماما اصیلیں لونڈیاں' باندیاں اپنی پنڈلیاں سہلاتی اور پاؤں جھٹکتی اتریں کہ اتنی دیر میں ٹھس کے بیٹھنے سے آدھے دھڑ سن ہو گئے تھے۔ بعض بچاریوں کو تو سواریوں میں جگہ نہ ملی تو منہ بولی خالہ ممانیوں کی گودوں میں چڑھ بیٹھیں۔ پرانے شیشموں اور پیپل' بڑوں کے موٹے موٹے مضبوط گدوں میں اور کہیں آموں کے موٹے ٹہنوں میں جھولے پڑ گئے تھے۔ دس بارہ جھولے تھے۔ جمنا کا کنارا او کھلا پرانا گاؤں بڑے موسیٰ خان نواب محب الدولہ غلام رسول خان کی جاگیر میں۔ خانپور سنگیڑہ کنڈا کے گاؤں بھی اسی جاگیر میں شامل تھے ان کے بیٹے نواب دلاور الملک دلیر الدولہ محمد علی خان' فیروز جنگ کا زمانہ تھا کہ ۱۸۲۴ء میں کمپنی بہادر نے جاگیروں کی ضبطی کے احکام صادر کئے اور یہ علاقہ ضبط ہو گیا۔ بڑی سرکار ان کی پوتی اور نواب نصیر الملک احتشام الدولہ علی محمد خان رفعت

تھیں۔ سن ستاون میں ان کے باوا اور خاندان کے سترہ مردوں کو پرانی عیدگاہ میں باڑھ مار کر کھتے میں ڈال دیا۔ ... کے کا نمبردار تھا۔ سن کر دوڑا آیا' مجرا عرض کر لیا اور روپیہ نذر گذار اور دعوت دی۔ بیگم صاحبہ وسیع الاخلاق اور قدیم ... کی قدر دان قبول کیا اور آنے کا وعدہ کیا۔ وہ خوشی خوشی چلا گیا اور وہاں سے کچھ کمیرے کام کاج کو بھجوائے۔ ہرے ... بڑھیا بیٹے ایک کوری ہنڈیا میں گاڑھی گاڑھی چھاچھ' مٹکے میں میزان شکر اور مکھن سے چپڑی ٹھیکرے کی پکی مکئی اور ... کی روٹیاں بھجوائیں۔ چولائی کی بھجیا بھی آئی۔ یہ سب چیزیں خاصے پر چنی گئیں۔ من سکھیا اس کی جورو لکڑی ٹیکتی' بہوؤں بیٹیوں کو ساتھ لئے آئی۔ جمروی کے لہنگے باندھنو کی چندریاں' بہوؤں کے گھونگھٹ' شاہ عالمی روپوں کے چاندی کے گہنے میں کونتی کی طرح لدی۔ بڑھیا کے ہاتھ میں 'شاہی میں' مچھلیاں تھیں تو اب بھی خولی کڑے تھے گلے میں جگنی پڑی جوے کی چمپا کلیاں۔ ٹھوڑی کے کھونسڑے جن پر سوت کی مکڑیاں اور چڑی پنجے پڑے' دور اتار ننگے پاؤں سامنے آئی۔ پالاگن کی بہوؤں بیٹیوں کو پاؤں پڑا دیا۔ اپنی پرانی مالکانی کو دیکھ دھارم دھار رونے لگی اور اگلے پچھلے زمانوں کے ذکر کرنے لگی۔ لونڈیاں باندیاں آئیں ان کے برساتی رنگین جوڑے خواص پورے کی دروغن نے بڑے سلیقہ سے پہنوائے تھے جو رنگ جس کے چہرے اور دھج پر کھلتا تھا وہی پہنچایا اندر۔ سہاکا رنگ خوب گھٹا ہوا تھا اور نقشہ تھا کھڑا کھڑا' اس کو گلناری جوڑا پہنایا۔ نرگس ہمیشہ کی روگن تھی' رنگ تھا ملتانی مٹی' نقشہ پھڈا پھڈا' اس کو شوخ فیروزی پہنایا۔ صورت میں بے بدل ہو گئی۔ اچھی طرح دار معلوم ہونے لگی۔ اکی پیا پھری ناک میں فیروزے کی کیل جو پہنائی تو خاصی اونچی اونچی معلوم ہونے لگی۔ شام برن کا سانولا رنگ' تیکھا نقشہ' شفقی جوڑا پہن اور دونا نظر آنے لگی۔ مبارک قدم کا سیپی رنگ تھا' اس پر نافرمانی جوڑا خوب پھبا۔ نجمی سرخ سفید تھی' سبز دوپٹہ کھائے جاتا تھا۔ کلچہ گلگلو تھا سی' رنگ گیہواں' اس پر شنگرفی خوب کھلا۔ غرض دروغن کو خوب شاباش ملی عمدہ اور اس کی بیٹی پریا اور پورا طائفہ خوب بن سنور کر آیا تھا۔ جھولے کی اجازت ملی سب نے جھولنا اور لہک لہک کے گانا شروع کیا مولسری کی چھتر گھنیری چھاؤں میں تین کٹل کے پتھر رکھ کر چولھا بنایا۔ کڑھاؤ چڑھا اور چھوکریوں کے لئے خرچی کا پکوان تلا جانا شروع ہوا۔ انگیٹھیوں پر کڑھائیاں چڑھیں۔ خاصے کا پکوان تلنا شروع ہوا۔ گرم گرم اترتا جاتا ہے اور بھجواتے جاتے ہیں۔ عمدہ اور پریا نے کیا پنچم کے سروں میں ملہار گایا ہے کہ کوئل کوکتے کوکتے چپ ہو گئی اور پپیہا سناٹے میں آگیا۔ ٹیڑی کی رٹ رکی جھونٹے وہ لمبے لمبے لئے کہ درختوں کے ٹہنے چڑ چڑ کرنے لگے۔ شہر کی طرف سے وہ کالی گھٹا اندھیری دے کر اٹھی کہ جمعہ مسجد کے مینار اور سفید گنبد اس ... بھی برق سے نظر آنے لگے۔ چمر بگلے جو پیپل کے ٹھنٹ پر بیٹھے تھے قطار میں اڑے' پر جو کھلے تو رام بگلے معلوم ہونے لگے اور اس گھٹا ٹوپ اندھیری میں ان کی ہوا میں قطار تھی یا کپٹی راون کی گود سے مچلتی ستونتی سیتا نے اپنی موتی مالا پھینکی تھی جو کسی راجہنس کے بل سے بیچ ادھر ہی میں رہ گئی تھی موروں نے وہ مست ہو کے جھنکارا ہے کہ میگھ راگ مجسم آگئے۔ ایسا معلوم ہونے لگا جمنا جی پر تختوں کا بند باندھا ہے کوئی کوس بھر کا پاٹ ہوگا۔ تختوں پر سے پانی کی چادر چھٹتی۔ جگہ جگہ قرینے سلیقے سے چمن بندی مرغزار' جو یہاں سے نہریں نکالی گئی ہیں ان کے پھاٹک فولادی سرخ روغن چڑھے' ان کی درزوں میں سے پانی ایک خاص قسم کی آوازیں نکالتا کرتا چلا جاتا چھوٹے چھوٹے پل مختلف چمن بند حصوں کو ملائے' نہروں کے دونوں کناروں پر بڑے بڑے سایہ دار درخت ایک سے ایک ملا۔ ٹھنڈی گھما کا تا۔ صاحب عالم اور دلہن بیگم چرخی دار چھتریں لے کر نوکروں سے ذرا اوٹ میں بیٹھے جھلی کا انتظار کر رہے ہیں۔ دلہن بیگم پہ ساس کا تقیہ ہے کہ ماما اصیلوں لونڈیوں میں خلا ملا کرنے سے خفت بھی ہوتی ہے اور سرکار کی موجودگی ان کی بے تکلفی اور مزے میں کھنڈت ڈال دے گی اس لئے ایک رسمی طرح دے دی گئی ہے اور

وہ سب آسمان سر پر اٹھائے ہیں۔ بہو بیگم کا دل چاہتا تھا کہ ہم بن سہیلیوں کو دعوت دے کے بلائے اور ساتھ لاسکے۔ بڑے افسروں کی لڑکیاں۔ ان کے رقعوں پہ صاحبزادی لکھا جانا سرکار کو پسند نہ آیا۔ کہا کہ اگر ملازم پیشوں کی لڑکیاں صاحبزادی ہو گئیں تو جو صاحبزادیاں ہیں وہ کیا شہزادیاں ہو جائیں گی؟ اور پھر جو شہزادیاں ہیں ان کو کیا لکھا جائے؟ ان کے لئے دفتر لکھنا کافی ہے۔ بہو بیگم ان میل جول کی نزاکت کے الجھاؤں سے گھبراتی تھیں۔ خاندان کی مرجادا کے خلاف کیا نہ جاتا۔ ان قدیم روایات کا پابندی رکھنا جزو ایمان۔ اس لئے نہ کسی سے ملنا نہ جلنا۔ آپ بھلے اپنا گھر بھلا۔ آج کل کی بیبیاں شاید تحقیر اً گھر گھسنی کہیں' لیکن وہ تو اس استہزاء کو سمجھ بھی نہ سکتی' کیونکہ گھر ہوتا ہی ہے گھسے رہنے کے لئے۔ موٹی موٹی بوندیں جمنا کے پانی میں پڑیں اور پڑ کر اچھلیں۔ سفید سفید بلبلے بنے اور پھوٹے۔ جلدی سے چرخی پر ڈور دونوں میاں بیوی چڑھا' چرخیں سنبھالتے بنگلے کی طرف بھاگے۔ لونڈیاں باندیاں' ساری محل والیاں اسی طرح جھولوں پر ٹنگی رہیں وہ موسلادھار بارش ہوئی کہ تو چل میں آیا۔ جن کے جوڑے پڑیا کے رنگ کے تھے وہ تھے کچے۔ بھیگ کے رنگ چھوٹ کے عجیب ان کی بھگل بن گئی اور جن کے کسوم کی زمین پہ تھے وہ ایسے پکے کہ پانی کا کچھ اثر نہ ہوا آخر مغرب کی نماز کے بعد گھر لوٹے۔ لوٹنے میں دوسرے رستے سے چلے۔ سلطان جی اور پرانے قلعہ کی دیواریں بن رہی تھی۔ گاڑیاں اور روڑیوں اور بجھوا پتھروں میں نہ چل سکیں۔ گھوڑے اڑے گھبرا کے سب اتر پڑے اور کوئی پاؤ کوس پیدل چلنا پڑا۔ مگر وہ پاؤ کوس کیا تھا ستم کے ہفت خواں تھے۔ لچو' پکڑیو' جانے نہ پائے' وہ چلا کی آوازیں بھی آنے لگیں اور بڑے بڑے منڈاسے باندھے گنوار لٹھ لئے لوٹتے آتے بھی دکھائی دینے لگے ____ بہو بیگم جو گھبرائیں' سازا زیور محل میں بڑھا کر آئی تھیں' بے خیالی میں ہیرا تراش کے توڑے پاؤں میں پڑے رہ گئے جلدی سے اتار وہیں سڑک پر گھبراہٹ میں ڈال دیئے۔ توشہ خانے کی داروغن کو خیال آیا وہ اسفندیار بن کر بیس گز پیچھے اکیلی گئیں اور اٹھا کر لے آئیں' برسوں ان کی جرات کے فسانے ہوتے رہے۔ اس گھبراہٹ اور افراتفری میں جو جو باتیں اور خفیف حرکتیں ہوئیں وہ آج تک اس محفل میں نقل محفل ہیں۔ اللہ حافظ!

جہان آباد

سید ناصر نذیر فراق دہلوی

جواب کاہے کو تھا لاجواب تھی دہلی
مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دہلی

ایک روز امیر تیمور صاحب قران اپنے مرکب پر سوار دارالسلطنت بخارا کی گلی کوچوں میں چکر لگا رہا تھا۔ جمعدار رکاب تھامے ساتھ تھا اور امیر پوچھتا جاتا تھا کہ اس گلی کا کیا نام ہے' اس کوچہ کو کیا کہتے ہیں؟ یہ کون سا محلہ ہے۔ جمعدار جواب دیتا تھا۔ یہ پستہ شکن محلہ ہے۔ یہ گلی سراجوں کی کہلاتی ہے۔ یہ کوچہ روشن آباد ہے' جو چلتے چلتے ایک تنگ کوچہ میں پہنچا اور اس نے یہ دیکھا کہ بانسوں کے پھاٹک کے آگے چند نوجوان ایک دری کے فرش کو چاروں طرف سے پکڑے جھاڑ رہے ہیں اور دھول اڑ رہی ہے۔ امیر نے پوچھا۔ "جمعدار یہ کیا جگہ ہے؟" جمعدار نے کہا "حضور یہ کوچہ حضرت سید خواجہ بہاؤالدین نقشبند کا ہے۔ یہ بانسوں کے پھاٹک والی آپ کی خانقاہ ہے۔ اس میں آپ تشریف فرما ہیں۔ مرید خانقاہ کی شطرنجی کو جھاڑ رہے ہیں۔" امیر کو دیکھ کر نوجوانوں نے شطرنجی جھاڑنے سے اپنے ہاتھ روک لئے تھے اور امیر ان لوگوں کے پاس پہنچ گیا تھا۔

امیر: (نوجوانوں سے) تم ہمارا اصلاً لحاظ نہ کرو۔ شطرنجی بدستور جھاڑے جاؤ۔

آپ جانتے ہیں مرید اور طالب علم الھڑ ہوتے ہیں۔ نوجوانوں نے دری کو اس زور سے پٹخارا کہ دھول کے مارے امیر کا سازو یراق اور امیر کا چہرہ' تاج' گھوڑا وغیرہ سب اٹ گئے۔ امیر نے اڑتی ہوئی دھول کو دونوں ہاتھوں سے اپنے منہ پر مل کر کہا۔ "غبار الحمد ہند خانقاہ" اور گھوڑے کو مہمیز کیا اور یہ جاوہ جا۔

مریدوں نے خانقاہ میں آکر امیر کا سارا حال حضرت کی خدمت میں عرض کیا۔ حضرت خواجہ سید بہاؤالدین نقشبندی نے کہا۔ لڑکو! کیا کہتے ہو امیر تیمور ہماری درگاہ کی خاک منہ پر مل گیا۔ یہ کیوں نہیں کہتے کہ امیر اپنی عاقبت سنوار گیا۔ الٰہی اس ترک بچہ نے جس طرح تیرے رسولؐ کی ذریت کا ادب کیا ہے اسی طرح اس کے بدلے میں اس کا نام شرق سے غرب تک شمال سے جنوب تک روشن کر دے۔ اس کی اولاد در اولاد کو پشتوں تک سلطنت بخش دے۔ چنانچہ امیر تیمور سے میران شاہ' سلطان ابوسعید میرزا۔ سلطان محمد میرزا۔ عمر شیخ میرزا۔ ہمایوں۔ اکبر۔ جہانگیر۔ شاہجہان تک گیارھویں سلطنت تھی۔

شاہجہاں کو تعمیر کا دلی شوق تھا۔ نئی دلی بسانے کی تعمیر شروع کی۔ لال قلعہ اور اس کی اندرونی عمارتوں اور جامع مسجد اور نئے شہر کے نقشے ہوا کرتے تھے شہنشاہ نقشوں میں بذات خاص اصلاح دیتے تھے۔ میر عمارت نے ہر مکان ہر محل کی لاگت کا تخمینہ تیار کیا اور جگہ جگہوں سے سنگ مرمر، سنگ سرخ، سنگ سیاہ، سنگ باسی اور ہزار ہزار قسم کا مصالحہ اور سامان آنے لگا۔ میر عمارت نے چونا اینٹ کا ٹھیکہ ایک ٹھیکیدار کو دے کر کہا ایسی اینٹ تیار کرو مگر اینٹ کی نذر ہے لاکھوں ہی ہو۔ بادشاہی کام ہے، دھیان سے کرنا۔ ٹھیکیدار نے کہا تھوڑی نقد دلوا دیجئے۔ میر عمارت نے لاکھ روپے کی چٹھی لکھ دی۔ خزانہ سے فوراً روپیہ بٹ گیا اور ٹھیکیدار کام میں مشغول ہو گیا۔ اینٹوں کا پزاوہ چڑھ گیا۔ کچھ مدت بعد میر عمارت کے پاس ٹھیکیدار بسورتا ہوا آیا اور کہنے لگا "میں تو برباد ہو گیا۔ پزاووں کی آنچ تیز ہو گئی اینٹوں کا کھنگر بن کر رہ گیا۔ بادشاہ اس بندہ کا زن بچہ کولھو میں پلوا دے گا۔ اس لئے میں بھاگتا ہوں۔ دیکھئے یہ کھنگر ہے۔"

میر عمارت: "گھبرانے کی کیا بات ہے؟"

اور قلم اٹھا کر اس نے ایک عرضی لکھ دی کہ بادشاہ کے حضور میں بھیجی کہ لال قلعہ اور جو شاہی عمارتیں دریا کے کنارے بنائی جائیں گی ان کی بنیادوں میں بجائے سنگ خارہ کے کھنگر بھرا جائے گا کیونکہ کھنگر پانی کو خوب جذب کرتا ہے اور بنیاد مضبوط رہتی ہے اور بنیاد کی مضبوطی کے ساتھ اوپر کی عمارت کا مضبوط ہونا شرط ہے۔ کھنگر کا نمونہ ملاحظہ کے لئے بھیجتا ہوں۔ لاگت اس پر دوگنی آتی ہے منظوری دی جائے۔

جواب آیا کہ کھنگر کا ہونا مناسب ہے۔ دوگنی لاگت منظور بادولت ہے۔

میر عمارت نے ٹھیکیدار سے کہا۔ "ایک لاکھ پہلے کھنگر کے نقصان کا لو اور اب لاکھ کے بدلے دو لاکھ لیتے رہو اور نرا کھنگر پکاتے رہو۔"

میر عمارت کی یہ عنایت اور بادشاہ کی یہ پرورش دیکھ کر ٹھیکیدار خوش ہو گیا اور دل سے کام کرنے لگا۔ جب لال قلعہ کی نیو رکھنے لگے تو بڑے بڑے لوہے کے کڑھاؤ اور تانبہ کی ناندوں میں چربی کھولائی جاتی تھی اور پھلکیوں کی طرح اس میں کوری اینٹیں ڈالی جاتی تھیں اور اینٹیں جب خوب چربی پی لیتی تھیں تو نکال کر ٹھنڈی کی جاتی تھیں اور گچ کے ساتھ بنیاد میں رکھی جاتی تھیں۔ گچ میں سفیدی نارنول کے پتھر کی، ماش کا آٹا، مردار سنگ، گوڑ، السی کا تیل، سن مقرض ڈال کر بیل گری کا پانی چھان کر دیا جاتا تھا۔ یہ ادنیٰ قسم کا مصالحہ تھا اور بڑھیا مصالحوں کی تفصیل کے لئے دفتر درکار ہیں۔ سفیدی جو در و دیوار پر لگا کر مہرہ کی جاتی تھی وہ احمد آباد۔ گجرات کے ایڈر نام پہاڑ کی کان سے آتی تھی۔ اس سفیدی کا یہ خاصا تھا کہ جب اس کی گھوٹائی کی جاتی تھی تو بلا مبالغہ چمک دمک میں جلی آئینہ بن جاتی تھی اور اس کے اندر آنکھوں کا سرمہ دکھائی دیتا تھا۔ دو سو برس تک آبدار رہتی تھی۔ لال قلعہ اور اس کے اندرونی مکان، قصر دیوان بن رہے تھے۔ تخت طاؤسی کے لئے جواہر تراشے جاتے تھے۔ جنگل میں منگل تھا۔ ہزاروں مزدور معمار کاریگر خیموں میں، چھولداریوں میں، جھونپڑیوں میں پڑے تھے۔ دور دور کے پہاڑوں سے چھکڑوں میں پتھر لدے چلے آتے تھے۔ ایک چھکڑے میں سو سو پچاس بیل جوتے جاتے تھے۔ کھنگر اینٹوں کی بھٹیوں اور ٹانکیوں کی دھڑادھڑ سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ہر سو قدم کے فاصلہ پر ایک خیمہ خزانہ کا ہوتا تھا۔ ایک خزانچی اور تین محرر۔ دس سپاہی روپیہ کی حفاظت کے لئے حاضر رہتے تھے۔ روپیہ، اٹھنیاں، چونیاں، دونیاں، پیسے اور کوڑیاں رکھی رہتی تھیں۔ کام لاگت میں زیادہ اور ٹھیکہ میں کم ہوتا تھا۔ شام کے چار بجے روزانہ چٹھہ بٹ جاتا تھا۔ غریبوں کا پیسہ واجب الادا مل جاتا تھا۔ لال قلعہ کے لاہوری دروازہ سے شہر کے فرضی لاہوری دروازہ تک اردو بازار ہٹیوں اور جھونپڑیوں کی دوکانوں میں لگا دیا گیا تھا جس میں [illegible] باجرہ کے آٹے سے لے کر قسم قسم کی جنس، کپڑا، ترکاری، کابل و کشمیر کے میوے تک ملتے تھے۔

[illegible] سے حکم پر حکم چلا آتا تھا کہ اردو بازار میں ہر شے کی دوکانیں اضافہ ہوتی رہیں تاکہ غیر ملکوں کے کاریگر جو اپنا دیس چھوڑ کر یہاں [illegible] تکلیف نہ پائیں اور اپنے وطن کی اشیاء اور غذا انہیں میسر ہو۔ شہر کا نقشہ بنا کر اس کے حصہ حصہ کر دیئے گئے اور شاہجہان نے [illegible] حصوں کو اپنی اولاد پر بانٹ دیا تھا اور فرمایا تھا کہ لاگت سب خزانہ سے ملے گی۔ اپنے اپنے حصہ میں عمدہ عمدہ مکانات اور محل [illegible] تاکہ [illegible] شہر اچھی اچھی عمارتوں سے آراستہ ہو کر آبادی کی صورت پکڑے۔ چنانچہ دکن کا حصہ اورنگ زیب کے اہتمام سے زیب [illegible] پایا۔ کشمیری دروازہ کے قطعہ کو دارا شکوہ نے فلک شکوہ قصر دیوان سے سنوارا۔ چاندنی چوک کے ٹکڑے کو جہاں آرا بیگم کے غلام نے جو ناتواں تخلص کرتا تھا' باغ اور گلشن اور حماموں سے رشک فردوس بنایا۔ نئوں کا کوچہ اسی ناتواں کی یادگار ہے۔ جامع مسجد کی تعمیر نواب سعد اللہ خان وزیر کو سپرد تھی اور اس کی نیویں بھری گئی تھیں۔ وہ انجینئر جس کی سپردگی میں جامع مسجد کا نقشہ تھا یکایک مع نقشہ کے غائب ہو گیا اور مسجد کی تعمیر کا کام اینڈ ہو کر رہ گیا۔ اس امر کی خبر پا کر شہنشاہ ناخوش ہوئے' حکم صادر ہوا کہ جو شخص اس کافر منش مسلمان کو جس نے خانہ خدا کی تیاری میں روڑا اٹکایا ہے پکڑ کر لائے گا تو اسے اس قدر انعام دیا جائے گا۔ مگر وہ خدا کا بندہ ایسا روپ ہوا کہ تین برس تک کسی نے اس کی جھلک بھی نہ پائی۔ تین سال بعد وہ یکایک دربار شاہی میں حاضر ہو گیا۔ حضور والا نے فرمایا۔ "کم بخت یہ حرکت کیا تھی؟" اس نے ہاتھ باندھ کر کہا۔ "جامع مسجد کی عمارت بہت بھاری ہو گی۔ نئی بنیاد پر ایسی اونچی عمارت کا لیجانا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ برسات کا پانی نیو میں پڑتا اور اس کے در و دیوار نیچے کھسکتے اور ڈاٹیں' کمانیں' محرابیں جھک جاتیں۔ سرکار کے لاکھوں روپے پر پانی پھر جاتا اور میری آبرو کے ساتھ ساتھ جان بھی جاتی۔ نیک نیتی اور مصلحت سے فدوی روپوش ہو گیا تھا۔ تین برس تک کھا کر نیو لوہا لاٹ ہو گئی ہے۔ اب جو کچھ عمارت کھڑی ہو گی۔ صدیوں تک کھڑی رہے گی۔ حضور کو اختیار ہے کہ فدوی کی جاں بخشی ہو یا سزا دی جائے۔"

بادشاہ نے انجینئر کے عذر کو غور سے سن کر اس کی خطا معاف فرمائی اور خلعت سے سرفراز کیا اور جامع مسجد نواب سعد اللہ خاں صاحب کے اہتمام سے تیار ہونے لگی۔ جو نواب صاحب کو قولنج ہوا اور وہ جنت کو سدھارے۔ بہر حال جامع مسجد اور لال قلعہ اور شہر بن گیا۔ حضور والا نے دیوان خاص میں تخت طاؤسی پر جلوہ افروز ہو کر جشن ماہتابی منایا اور ایک فرمان جاری فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ [illegible] جہان آباد عرف شاہجہان آباد میں جو رعایا آباد کی گئی ہے۔ اس میں خوش حال کم اور اہل حاجت زیادہ ہیں۔ پھر ان میں کاروباری ہیں' مزدور ہیں' بیمار ہیں' عورتیں ہیں' پردہ نشین جو برقعہ اوڑھ کر بھی باہر نہیں نکلتی ہیں اور بغیر سودے سلف کے کام نہیں چلتا ہے۔ اس واسطے میں حکم دیتا ہوں کہ ترکاری فروش' گوشت فروش' میوہ فروش' پارچہ فروش' کسیرہ' گندمی' تانبے کے برتن فروش' موچی' مٹی کے مٹکے' ٹھلیاں' صراحیاں بیچنے والے' اوپلہ ایندھن بیچنے والے' سادہ کار' چاندی سونے کے زیور بیچنے والے' حلوائی' بساطی اپنا اپنا سامان خوانچوں میں لگا کر گٹھڑیوں میں کندھے پر رکھ کر بہنگیوں میں کہاروں کے کندھے پر لاد کر گلی گلی' کوچہ کوچہ' محلہ محلہ پھریں اور اپنی اپنی جنس کا نام لے کر آواز لگائیں۔ بزاز کہے۔ "ننیو' لٹھا' ڈوریہ' ململ۔" "مچھلی والا" "مچھلی دریاؤ کی لو مچھ۔" "کھٹ بنے' بڑھئی' لوہار گلی گلی چل [illegible] کام لے کر پکاریں۔ یہاں تک کہ موری دھانے والے پکار کر کہیں۔ "موری دھلوا لیجئے۔" تاکہ گھر بیٹھے اہل حاجت کی ضرورت رفع ہو [illegible] چونکہ اس حکم بندہ کی تعمیل مشکل سے پیشہ ور کریں گے اس لئے کوتوالی کے برق انداز لوگوں کے ساتھ رہیں اور شہر میں [illegible] تاکہ [illegible] اور سودا بیچنے والے اس طور کے لین دین کے عادی ہو جائیں اور بیچنے والوں کو نفع ہو اور مول لینے والوں کو [illegible] گھر کی چیز اپنے دروازہ پر لے لیں۔ جیسی نیت ویسی برکت۔ شاہجہان بادشاہ کی یہ تدبیر ایسی راست آئی کہ [illegible] اپنے گھر کے دروازہ پر کواڑ کی آڑ میں کھڑی ہو کر مول لے لیتی ہے۔

شاہجہان کے بعد سلطنت درجہ بدرجہ ختم ہوتی ہوئی محمد شاہ تک پہنچی اور لال قلعہ کا دیوان خاص عیش و عشرت کے سامانوں سے فردوس بریں بن گیا۔ معتمد الملک سید ہاشم علوی خاں حکیم جو شمس الدولہ کے مددگار تھے۔ ان کے حکم سے شتر خانہ بادشاہی میں کئی جوڑا [illegible] بدمست رکھے جاتے تھے اور ان کے کانوں کے پیچھے کی مستی دوا کے کام میں آتی تھی۔ میر شاہ جنگلی کبوتروں کے [illegible] اور بارہ انڈے چھپا کے پیش کرتا تھا۔ کیونکہ دونوں چیزیں مقوی ہیں۔ شراب پانی کی طرح لنڈھائی جاتی تھی۔ ایک دفعہ محمد شاہ نشہ کے سرور میں اس درگاہ کے اندر مع جوتیوں کے گھس گئے جس میں حضور رسالت پناہ اور بزرگوں کے تبرکات امیر تیمور کے عہد سے جمع کئے گئے تھے۔ یہ درگاہ لال قلعہ میں ہی تھی۔ اس بے ادبی اور گستاخی کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت کا زوال شروع ہوا۔ نادر شاہ آیا اور لال قلعہ کو اور شاہجہان آباد کو اجاڑ کر چل دیا اور بقول مومن۔

حسن روز افزوں پہ غرہ کس لئے اے ماہ رو
یونہی گھٹتا جائے گا جتنا۔ بڑھتا جائے گا

مغلیہ سلطنت گھٹتے گھٹتے اور سکڑتے سکڑتے لال قلعہ کی چار دیواری میں منحصر رہ گئی۔ والیان فرنگ کی تدبیر و شمشیر سے کوئی راجہ کوئی حاکم کوئی رئیس کوئی نواب عہدہ بر آنہ ہو سکا۔ شاہ عالم بادشاہ نے فرنگیوں کو بیٹا بنایا۔ ان کی دی ہوئی پنشن کو اللہ آمین کر کے قبول کر لیا۔ کیونکہ مرتا کیا نہ کرتا؟ جان بچی لاکھوں پائے۔ ایک شاہ عالم بادشاہ کے دل میں فرنگیوں نے گھر نہیں کر لیا تھا۔ بلکہ ہندوستانی عموماً نہیں اچھا جاننے لگے تھے اور ان کی سپاہ اور شاہراہ اور تنخواہ کی بچہ بچہ کی زبان پر تعریف تھی۔ یعنی فرنگیوں کی فوج جرار ہوتی ہے۔ دس ہزار پر ایک ہزار بھاری ہوتی ہے۔ شاہراہ یعنی کلکتہ سے جہاں تک ان کی حکومت پہنچتی ہے پکی سڑک اور سڑک کے ساتھ ساتھ ریل اور ڈاک بھی اڑی چلی جاتی ہے اور تین تین دن میں خط پتر ملک کے اس سرے سے اس سرے تک پہنچا دیتی ہے۔ تنخواہ کی تعریف یہ ہے کہ جسے نوکر رکھتے ہیں اس کا درمایہ یا طلب وظیفہ بے قیل و قال بے چون و چرا پہلی کی پہلی کر دیتے ہیں۔ راجہ مہاراجہ نوابوں اور بادشاہوں کی سرکار سے نوکر کی تنخواہ تین تین برس نہیں ملتی تھی اور نوکر کا گھرانہ کا گھرانہ فاقہ کر کے برباد ہو جاتا تھا۔

(۲)

ابو نصر معین الدین اکبر ثانی جب بیٹے کی منت پوری کرنے اور پھول والوں کی سیر منانے مہر دلی حاضر ہوئے تھے تو عجب سماں تھا۔ برکھا رت ساون کا مہینہ بادشاہی خیمے مخملی باناتی اطلسی سبز سرخ زرد ریشمی کلابتونی سوتی طنابوں سے جکڑے ہوئے کھڑے تھے۔ ان کے سنہری کلس اور شمسے سورج میں چمک رہے تھے اوپر نیلا آسمان نیچے زمین پر سبزہ کا فرش اور خیموں کا سلسلہ اور جا بجا پانی میں ان کا عکس طلسمات کا عالم پیدا کر رہا تھا۔ بادشاہی خیمہ سے لے کر حضرت قطب صاحب بندہ نوازؒ کی درگاہ شریف تک جہاں مستورات جا سکتی ہیں۔ دو رویہ قنات کھڑی تھی کیونکہ ملکہ دوراں میرزا جہانگیر کو لے کر منت ادا کرنے کے لئے درگاہ میں حاضر ہوں گی۔ تیاری تو صبح سے ہو رہی تھی مگر دن کے تین بجے ظل سبحانی نے کہا پنکھا چڑھانے کا وقت آ گیا۔ بس ملکہ دوراں نے پچاس خوان اندر سے اندرسہ کی گولیوں اور مٹھیوں کے آراستہ کئے ایک چاندی کی کشتی میں سونے کا پنکھا جس میں پنہ، پکھراج، نیلم، یاقوت اور سچے موتی جڑے تھے جس کی بالشت بھر بچی جھالر کو بیگم نے جوہی کی کلیوں سے خود گوندھا تھا۔ مرزا جہانگیر کو دولہا بنا کر سہرا پھولوں کا بدھی طرہ عطر میں بسا کر ان کے سر پر بند ھوا کر وہ کشتی صاحب عالم کے سر پر بسم اللہ کہہ کر بیگم نے رکھی اور بادشاہزادہ کی بلائیں لے کر کہا۔ مماں میرا منشا تھا کہ تو فرنگیوں کے چنگل سے نکل کر شاہجہان آباد آئے اور میں تجھے دیکھوں یہ سب حضرت کا صدقہ ہے۔ جان

... کی کشتی سنبھال کر اور سر ادب نیاز سے جھکا کر درگاہ کو چلے۔ آگے غلاف شریف کی سینی بادشاہ نے اپنے سر پر اور صندل ... بیگم نے اپنے سر پر اور مٹھائی کے خوان بادشاہزادوں نے اپنے سروں پر رکھ کر سب نے مل جل کر آستانہ پاک کی راہ لی۔ ... میں بادشاہزادیاں نکواں جوڑے پہنے تھیں۔ گوکھرو کے جال کے سلمہ ستارہ کلابتون کے تمامی زری بوٹی تُو رمضت کمخواب زری ... اطلس والدائی بابا رنیسٹ بنارس گجرات سورت احمد آباد شریف لاہور کے شاہی کارخانوں ریشمی اور زرین کپڑوں کے لباس پہن کر ... ہو رہی تھیں۔ لاکھوں روپیہ کا جڑاؤ گہنا ہاتھ گلے میں تھا۔ پور پور تار نول کی مہندی رچی ہوئی تھی ڈھیلے پائچوں کو دو لونڈیاں ... چلتی تھیں تو دو باندیاں پیچھے دوپٹہ کو سنبھالے چلتی تھیں۔ آگے آگے روشن چوکی اور نفیری بجانے والیاں سب عورتیں تھیں۔ بیگموں کے جھانجھن چوڑیوں اور پازیب کی جھنکار سے زندہ اور مردوں کے دل کانپتے تھے۔ قنات در قنات یہ سب درگاہ شریف میں پہنچے۔ باجے گاجے سب آستانے کے باہر ہی تھما دیئے گئے۔ ملکہ جہاں اور سب عورتیں فرخ سیر والی جالیوں تک پہنچ کر رک گئیں۔ اگرچہ ساری درگاہ کا زنانہ ہو رہا تھا مگر عورتوں کے لئے ہمیشہ سے یہی حد ادب ہے۔ بادشاہ اور مرزا صاحب اور سب مرد مزار شریف پر گئے اور پہلے غلاف پھر صندل چڑھایا اور اوپر سے عطر لگایا۔ پنج آیت پڑھی گئی۔ شیرینی تقسیم ہوئی۔ نقد نذرانہ جھولی میں بھر دیا گیا۔ بادشاہزادوں کو قدم بوس کرایا اور سب حاجتی دعا کر کے قنات کے اندر پلٹ کر سراپردہ شاہی میں داخل ہوئے۔ رات کے کھانے کے بعد محلسرا میں ناچ گانا ہونے لگا۔ صحن میں کھم گڑے تھے۔ نوعمر بادشاہزادیاں جھولے میں بیٹھیں اور گائنیں انہیں جھلانے اور یہ غزل گانے لگیں:

میری دل کی کنجی میری جان جھولا   میری آرزو میرا ارمان جھولا

پھول والوں کی سیر سے فارغ ہو کر بادشاہ شاہجہان آباد تشریف لائے اور جشن کا حکم دیا اور فرمایا کہ جشن سے پندرہ دن پہلے تورہ بندی کی جائے۔ یہ رسم دلی سے مٹ گئی اور نئی تانتی نے تورہ کا نام بھی کم سنا ہے اس لئے فقیر (فراق) تورہ کے معنی عرض کرتا ہے۔ تورہ ترکی کی زبان میں قانون یا آئین کو کہتے ہیں۔ اس واسطے دہلی میں محاورہ بنا "شرع تورہ" یعنی شریعت اور قانون دونوں ایک باگ۔ مگر عورتیں اپنی بول چال میں طنز کے طور پر تورہ غرور اور غصے کے معنے میں استعمال کرتی ہیں مثلاً "اللہ رے عورت ترا تورہ" "بوا یہ اپنا تورہ کسی اور کو دکھانا۔ تورہ پٹی۔

دوسرے ترکی زبان میں تورہ کے معنی کھانے کے خوان کے ہیں اور توران میں اس کھانے کے خوانوں کو کہتے ہیں جو شادی بیاہ سے کچھ دن پہلے بطور حصہ بخرہ کے بھائی بندوں عزیزوں دوستوں کے گھر بھجوائے جاتے ہیں۔ مغل بادشاہ ہندوستان میں فرمانروا ہوئے توان کے ساتھ تورہ چنگیزی بھی آیا۔ بیاہ شادی سے دو ہفتہ پہلے تورہ بن گئے نام بنام تاکہ عین تاریخ پر تقریب میں الجھنہ ہو اور عزیزوں کو شکایت کا موقع نہ ملے کہ ہم بھوکے رہے یا دستر خوان پر نہ بٹھایا ہم دستر خوان پر بیٹھے تو تھے مگر فلاں کھانا فلاں شے ہمارے آگے نہ تھی ہماری توہین کی گئی۔ اس لئے تورہ کے کھانوں کی فہرست لکھ کر کنبہ خاندان میں بھیج دی جاتی تھی۔ اس کے مطابق لینے والے تورہ لے لیں۔ ایک گھر کے دس تورہ ہیں تو دسوں تورہ ایک دن میں لے سکتے ہیں اور دل چاہے تو دس دن میں لے لیں۔ پھر تورہ کی قیمت بھی تشخیص کر دی جاتی تھی۔ چاہے لینے والے نقد لے لیں۔ ایک منشی مع دوات قلم کے اور پانچ خادموں کے توروں کے ساتھ ہولیتا۔ ایک تھیلی روپیہ کی بھی اس کے ہمراہ ہوتی تھی اس کے ذمہ پچاس تورہ ایک دن میں تقسیم کے لئے ہوتے۔ رسید لے لیتا تھا اور تورہ دے دیتا تھا۔ جو نقد لینا چاہتا اسے نقد دیتا تھا۔ ہر تورہ ایک کہاری کی بہنگی میں ہوتا تھا۔ تورہ جو اونی قسم کا ہوتا اس کی قیمت پانچ روپیہ ہوتی تھی۔ تورہ کا کھانا مٹی کے برتنوں میں عموماً ہوتا تھا۔ تورہ کے

کھانوں کی تفصیل یہ تھی۔ ایک لکڑی کے خوان میں سب سے نیچے:

(۱) باقر خانیاں ڈھائی سیر پختہ کی دو عدد (۲) قورمہ کے دو پیالے ہر پیالہ میں کم سے کم آدھ سیر قورمہ (۳) کباب شاہی پانچ عدد (۴) بریانی دو طباق (۵) متنجن دو طباق (۶) فیرنی دو پیالہ۔ ہر پیالہ میں آدھ سیر (۷) مربہ آم وغیرہ کا ایک پیالی میں (۸) اچار کسی قسم کا ایک پیالی (۹) دہی آدھ سیر ایک پیالہ میں (۱۰) گاؤزبان دو عدد (۱۱) گاؤدیدہ دو عدد (۱۲) نان تنور یعنی آبی روٹی دو سیر کی چار عدد۔

یہ سب کھانے ساندوں سے ڈھکے ہوتے تھے۔ ساندہ اس باریک اور روغنی چپاتی کا نام ہے جو شب برات کو پکتی ہیں۔

ایک مثل بھی ساندوں کے متعلق مشہور ہے۔ مردہ دوزخ میں جائے یا بہشت میں انہیں اپنے حلوے ساندے سے کام ہے۔

یہ معمولی تورہ ہے ورنہ بادشاہوں کے تورہ ہزار نعمتوں کے، سونے چاندی اور چینی کے برتنوں میں بھی ہوتے تھے۔ اس رسم کو بادشاہوں سے دلی والوں نے بھی سیکھ لیا تھا اور شہر میں تورہ بندی ہوتی تھی۔ مگر غدر ۱۸۵۷ء کے کچھ دن بعد سے موقوف ہے۔ اب تو پارٹی کی گرماگرمی ہے۔

دربارِ دھلی کی کنکوابازی

عشرت لکھنوی

لکھنؤ میں یہ خبر گرم ہوئی کہ دہلی میں بادشاہ کا دربار ہوگا۔ بادشاہ سلامت تخت پر جلوس فرمائیں گے۔ تمام ہندوستان کے راجہ مہاراجہ پیشوائی کو آنے لگے۔ تمام ہندوستان میں اس بات کی خوشی تھی کہ شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم دہلی میں رونق افروز ہوں گے۔

لوگ اس تماشہ کو دیکھنے کے واسطے دور دور سے آرہے تھے۔ ہر فن کے اہل کمال جمع ہو رہے تھے۔ فوجیں جنگ کا نمونہ دکھانے کے واسطے بلائی گئیں۔ مرغ باز نامی گرامی، بٹیر باز سر تام بلائے گئے۔ نیولاک صاحب ڈپٹی کمشنر نے لکھنؤ میں سید آغا حسین صاحب کو لکھنؤ کے کنکوابازوں میں انتخاب کیا اور بلا کر کہا کہ کچھ آپ نے سنا بھی ہے، دہلی میں دربار ہونے والا ہے۔ تمام دنیا کے لوگ جمع ہو رہے ہیں۔ تمام بازیوں کے کھلاڑی شاہی مہمان ہوں گے۔ آپ اپنے فن میں یکتا ہیں۔ ہم آپ کو چھٹی دیں گے آپ شاہی خیمے میں شاہی مہمان ہوں گے۔ اس سے بڑھ کر آپ کی عزت نہیں ہو سکتی۔

آغا صاحب سوچنے لگے کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ دوست احباب سے مشورہ لیا سب نے یک زبان ہو کر کہا کہ آغا صاحب ایسا اچھا موقع آپ کو عمر بھر نصیب نہیں ہو سکتا ایک تو ہندوستان بھر میں عزت دوسرے امید بہبودی یعنی اگر بادشاہ کو آپ کی کنکوابازی پسند آگئی تو کچھ جاندار گورنمنٹ سے انعام میں مل جائے گا۔ عمر بھر چین کیجئے گا۔ یا کم سے کم تنخواہ بیش بہا تاحیات مقرر ہو جائے گی۔ سب سے عزت کی بات یہ ہے کہ خود ڈپٹی کمشنر آپ کو اپنی طرف سے بھیجتے ہیں۔ شاہی خیموں میں آپ فروکش ہوں گے اور شاہی مہمان تصور کیے جائیں گے اور پھر سیر بھی ایسی دیکھنے میں آئے گی جس کے واسطے لوگ ہزاروں روپے خرچ کر کے تمنا رکھتے ہیں کہ دہلی میں قدم رکھنے کی جگہ مل جائے۔ لوگ تو اسی حسرت میں رہتے ہیں۔ یہ دن کس کو نصیب ہوتا ہے۔ نواب بنّے صاحب نے فرمایا "ہم آپ کے ساتھ چلیں گے۔ آپ کو کسی بات کی تکلیف نہ ہوگی۔ لاٹ صاحب سے انگریزی میں گفتگو کر کے ایک خیمہ ڈلوالیں گے۔ اسی میں ہم آپ سب رہیں گے۔" منجھو صاحب سوز خوان نے کہا۔ "آپ کچھ اندیشہ نہ کیجئے ہم آپ کے ساتھ چلیں گے" آپ ڈپٹی کمشنر سے جا کر چٹھی تو لکھوا لائیے۔"

آخر بے چارے آغا صاحب سب کی اشتعالک سے ڈپٹی کمشنر کے پاس گئے۔ چٹھی لکھوا کر لائے۔ اچھے کاریگروں سے عمدہ کنکوے بنوائے۔ ماجھا ستولیا ایک ڈیڑھ تاوے پر "ویلکم" بنوا کر کہا یہ بادشاہ کے خیمہ میں گرادیں گے۔ کنکووں کو کسا' کنّے باندھے'

چھتیوں پر ساوی اور ماتھا چڑھا کر ان پر غلاف اطلس کے چڑھائے۔ پوشاکیں نفیس بنوا کر بکسوں میں رکھیں اور بہت سی امیدیں بہت سے ارمان لے کر ہمراہ نواب بنے صاحب، منجھو صاحب سوز خواں دہلی کا ٹکٹ لے کر سوار ہوئے۔ دیکھا تو پرانی دہلی کھچا کھچ آدمیوں سے بھری ہے اور نئی دہلی میں جہاں شاہی خیموں کا جنگل ہے، فوجی پہرے موجود ہیں۔ آدمیوں کو راستہ نہیں ملتا۔ میدان حشر معلوم ہوتا ہے کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ بہت مشکل سے بنے صاحب اور ہم خیموں تک پہنچے۔ وہاں کمیٹی کو ڈپٹی کمشنر کا خط دکھلایا انہوں نے بہت عزت کی۔ ایک خیمہ آغا حسن صاحب کو دیا اور اس پر گوروں کا پہرہ مقرر کر دیا۔ یہ مقام شہر سے بہت دور تھا۔ اب آغا صاحب کو کھانے کی فکر ہوئی۔ یہ سمجھے تھے شاہی مہمان ہیں، کھانے کے خوان آتے ہوں گے مگر جب کھانے کو کسی نے نہ پوچھا تو یہ خیال ہوا کہ کسی ہوٹل سے کھانا منگوا لیا جائے مگر یہاں سرکاری خیموں میں ہوٹلوں کا ذکر کیا۔ کھانے کی بو باس پر گوروں کا پہرہ تھا اور کارونیشن ہوٹل شہر سے دو کوس کے فاصلے پر تھا۔ آخر ہم سب لوگ خیمہ چھوڑ کر ہوٹل میں مقیم ہوئے مگر دن بھر خیموں میں رہتے ہیں۔ سرکاری کمیٹی نے حکم دیا کہ آغا صاحب آج کنکوا لڑائیں۔ دہلی کے نامی کنکوا باز ان سے کنکوا لڑائیں گے۔ آغا صاحب نے چاہا کہ پہلا کنکوا بڑھا کر بادشاہی محل میں ڈھا دیں تاکہ بادشاہ کے ملاحظہ سے گذرے کیونکہ اس پر 'ویلکم' لکھا ہوا تھا۔ مگر ہوا مخالف تھی، مجبور ہو کر خاموش رہے اور اس ناکامی پر سخت تعجب کیا۔

سہ پہر کو آغا صاحب نے کنکوا اڑایا۔ دہلی والوں نے بھی کنکوا اڑایا۔ شام تک کنکوا اڑایا کئے اور بارہ پیچ زائد ہوئے۔ شام کو کمیٹی میں بلائے گئے۔ وہاں مسٹر واس صاحب سیکرٹری کمیٹی نے کہا کہ آج آپ کے بارہ پیچ زیادہ ہوئے مگر دہلی کے لوگوں نے ہم سے کہا یہ دہلی کے اچھے کنکوا باز پنشن تھے، اور انہوں نے درخواست کی ہے کہ پھر ایک دن ہم کو دیا جائے تاکہ ہم اچھے اچھے لوگوں کو پیش کریں جو کنکوا بازی میں اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ اس لئے آپ کل پھر کنکوا لڑائیے۔

دوسرے دن پھر دہلی والوں سے لڑے، ۲۰ پیچ زائد ہوئے۔ شام کو پھر کمیٹی میں گئے تو سیکرٹری صاحب نے کہا "آج تو آپ کے بیس پیچ زائد رہے۔ اور سب لوگوں نے آغا صاحب کی تعریف کی اور کہا کل آپ میرٹھ والوں سے کنکوا لڑائیے۔

تیسرے روز آغا صاحب نے ——— میرٹھ والوں سے کنکوا لڑایا اور ان سے بھی ۵۲ پیچ زائد رہے۔ کمیٹی نے شام کو آغا صاحب کو بلا کر کہا کہ سار اور بار آپ کی تعریف کرتا ہے کہ آپ سے بہتر کنکوا لڑانے والا کسی شہر میں نہیں ہے۔ آج آپ کے ۵۲ پیچ زائد رہے۔

آغا صاحب کی خوشی کو کچھ نہ پوچھئے۔ ہاتھوں دل بڑھ گیا اور کہنے لگے اب تو ضرور کوئی علاقہ سرکار سے ملے گا اور زندگی بھر عیش کریں گے۔

چوتھے روز دہلی والوں نے کنکوا لڑایا اور وہاں بھی آغا صاحب کو کامیابی ہوئی اور شام تک ۲۲ پیچ کاٹے۔

پانچویں کنکوا بڑھایا اور برابر کاٹتے رہے۔ بتیس پیچ کاٹے۔ شام کو پھر دربار میں بلائے گئے اور لاٹ صاحب کی میم صاحبہ نے اور بڑے جلیل القدر انگریزوں نے آغا صاحب کی تعریف کی اور کہا تمام ہندوستان میں آپ سے بڑھ کر کوئی کنکوا نہیں لڑا سکتا۔ ہر طرف سے تعریف ہو رہی تھی اور آغا صاحب دل میں خوش تھے کہ آج بادشاہ کی طرف سے کسی بڑے انعام کا اعلان لاٹ صاحب کریں گے۔ سب انگریزوں نے ان سے ہاتھ ملایا۔ اتنے میں میم صاحبہ نے آغا صاحب کو ایک کرسی پر کھڑا کیا اور ایک روپے سے بڑا نکل کا بنا ہوا ایک تمغہ سینہ پر آویزاں کیا اور سب لوگوں نے چیر زدیئے اور سرکاری فرمان بھی نہایت خوشی سے پیش کیا۔

یہ دیکھ کر آغا صاحب تو جیتے جی مر گئے ضبط نہ ہو سکا آخر بے اختیار ہو کر بول اٹھے۔

"میم صاحب ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ ہم بادشاہ کے دربار میں آئے ہیں اور پانچ سو روپیہ ہمارا صرف ہو چکا۔ خیال تھا کہ بادشاہ کی طرف سے ہماری پنشن مقرر کی جائے گی یا کوئی علاقہ انعام میں عطا ہو گا کہ بقیہ عمر عیش و آرام سے کٹے گی۔ آپ نے اس سب خدمت کے بدلے ایک روپیہ ہمارے سینے سے لٹکا دیا اور ایک کاغذ ہم کو دیا۔ اسے ہم لے کر کیا کریں گے؟ ہمارے کس کام کا؟ یہ تو ہمارے درد کا علاج نہیں ہے۔"

میم صاحبہ نے کہا۔ "آغا صاحب یہ آپ کیا فرماتے ہیں۔ یہ تو بڑی عزت کی چیز آپ کو دی جاتی ہے جو فوجی افسروں کو جنگ کی کامیابی پر بادشاہ دیتے ہیں اس کے سبب سے آپ ہر ایک دربار میں جا سکتے ہیں اور ہر سرکاری جلسہ میں آپ کو جگہ دی جا سکتی ہے۔ ہر فوجی افسر کے پاس یہی تمغہ ہوتا ہے جس سے اس کی عزت کی جاتی ہے۔ یہ بہت عزت کی چیز ہے آپ کو بادشاہ کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ آپ کو اتنی بڑی عزت عطا ہوئی اور شاہی فرمان کے کاغذ میں آپ کو کامیابی کی مبارک دی گئی ہے۔ حقیقت حال یہ ہے کہ بادشاہ نے آپ کی بہت قدر کی۔"

آغا صاحب کا چہرہ اتر گیا اور بادل ناخواستہ اپنے اوپر ہزاروں نفرین کرتے ہوئے گھر واپس آئے اور کہنے لگے:

تہی دستانِ قسمت راچہ سود از رہبر کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

کہنے لگے کہ کنکوا تو ہزاروں جگہ لڑانے گئے مگر یہ سوختی کبھی نہیں ہوئی۔ اور اس کے بعد کنکوا بازی سے توبہ کر لی۔

زُود پشیمان

چودھری افضل حق

ریاض شاداب پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھا تھا۔ بہار خوشی کے جھولے میں جھول رہی تھی۔ اس خوشگوار موسم میں شگفتہ رو نوجوان سوچ میں پڑا فضا کو یوں تاکتا ہے؟

"میری زندگی کا مصرف کیا ہے؟" ریاض نے آہستہ سے کہا "عیش، آرام، شہرت، جاہ طلبی، دنیا کا سیم و زر ان سب چیزوں کی کمی نہیں۔ باوجود اس کے چند دن سے طبیعت میں بے اطمینانی بڑھ رہی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ ان چیزوں سے اب مجھے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ کیا مجھے خوشی کے اور ذریعہ کی تلاش میں نکلنا چاہیے۔ یہ خوشی بھی کیا ہے جس کے لئے میں مارا مارا پھروں۔ میں نے اپنی خوشیوں کے لئے بیسیوں کا آرام حرام کر دیا۔ شہرت اور جاہ طلبی کی بھاگ دوڑ میں کئی ایک سے بازی لے گیا۔ اور انہیں ناکامیوں کی حسرت ناک زندگی بسر کرنے کے لئے چھوڑ گیا۔ کیا گوشہ تنہائی اختیار کروں۔ کیونکہ وہ بھی خوشی اور اطمینان حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اگر گوشہ تنہائی میں بیٹھوں اطمینان تو نصیب ہو جائے گا۔ مگر زندگی کی افادیت گھٹ جائے گی۔ پس میری عقل کا فتویٰ تو یہی ہے کہ ایسی فائدہ بخش زندگی بسر کروں جس میں میری ذات کو دوروٹی سے زیادہ دخل نہ ہو۔"

وہ اٹھ کر محل میں آ گیا۔ ڈیوڑھی پر ملازمین نے جھک کر سلام کیا۔ وہ اندر داخل ہو گیا۔

خوبصورت نسیمہ راحت بخش اور آرام دہ مخملیں کاؤچ پر بیٹھی تھی۔ گویا مخمل پر رنگین ریشم کا ڈھیر پڑا تھا۔ وہ زندگی کے حسین تصورات میں کھوئی ہوئی تھی۔ ریاض نے شادی کے بعد نسیمہ کی ناز برداری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ ان کی متاہل زندگی میں دن عید رات شب برات ہو کر گزرتی تھی۔ ریاض حسب معمول مسکراتا گھر میں داخل ہوا۔ نسیمہ کے لئے گھر بھر میں گلزار کھل گیا۔ ریاض نسیمہ کے قریب کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ گل و بلبل محبت کی سرگوشیوں میں معروف ہو گئے۔ نسیمہ نے تین سال کی بچی کی طرف جو پاس ہی لیٹی ہوئی تھی۔ آنکھوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اب ہم پر خدا نے زندگی کی بھاری ذمہ داری ڈال دی ہے۔ ابھی سے اس کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا چاہیے۔ اور ساتھ ہی ساتھ آج ہی ہونہار بر وا پر نظر رکھنا ہو گی۔ اللہ کرے کوئی اچھا بر مل جائے۔

ریاض نے کہا "اس کی کیا تشویش ہے۔ ہماری ڈیوڑھی کے دربان کے سات سالہ لڑکے کو علم و دولت سے مالامال کیا جائے وہ اس بچی کے لئے ہر طرح موزوں ہو سکتا ہے۔"

نسیمہ اس طرح تڑپ اٹھی گویا ہزار بچھوؤں نے کاٹ کھایا ہو۔ قریب تھا کہ وہ ریاض کو کچھ الٹی سیدھی سناتی اس کی طبعی شرافت بروئے کار آئی۔ اور اس نے ضبط سے کام لیا۔ پھر خیال آیا کہ میں نے شاید بات سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ اس لئے دوبارہ پوچھا کہ "میں

آپ کی بات کو نہیں سمجھ سکی۔"

ریاض نے کہا۔ "بات تو تم نے ٹھیک سنی ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ مزاج کو گراں گزری ہے۔"

نسیمہ۔ تو کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ اپنی بچی کو دروازے کے دربان کی کنیز بنانے پر آمادہ ہیں؟

ریاض۔ اگر تم میری کنیز ہو تو تمہاری بچی کو بھی کسی کی کنیز بننے کے سوائے چارہ نہیں۔ مگر پیاری نسیمہ یہ تو بتاؤ کہ طبیعت میں اعتراض کیا ہے؟"

نسیمہ۔ موری کی اینٹ چوبارہ کو کیسے لگی۔ رذیل شریف کا ناطہ کیا؟

ریاض۔ رذیل شریف کا معیار کیا ہے۔ اگر میں کسی وجہ سے دولت دنیا کھو بیٹھوں۔ کیا رذیل ہو جاؤں گا

نسیمہ۔ آج آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ ماں باپ اولاد کی ترقی اور آرام کی سبیلیں سوچتے ہیں یا انہیں جہنم میں جھونکنے کی تدبیر کرتے ہیں۔ کیا میری بچی کا خاوند دوسروں کے دلی دربانی کرے گا۔ اور میری بچی غیروں کے برتن صاف کر کے اپنا پیٹ پالے گی؟

ریاض۔ اگر ہم' جو بزعم خود بڑے بنے بیٹھے ہیں دولت سے محروم ہو جائیں' ہمیں بھی ہاتھ ہلا کر گزر اوقات کرنی پڑے گی۔ لیکن چھوڑ دو اس بحث کو میں تو یہ کہتا ہوں' دولت تمہارے ہاتھ میں ہے۔ تم اس امر پر قادر ہو کہ دربان کے لڑکے کو زیور علم و اخلاق سے آراستہ کرو۔ تمہارا داماد تمہاری لڑکی کا غلام بن کر رہے گا۔

نسیمہ۔ تو میں کفو اور خاندان کا خیال چھوڑ دوں؟

ریاض۔ ہم سب اولاد آدم ہیں۔ رشتہ انسانوں میں کرو حیوانوں میں نہ کرو۔

نسیمہ خاموش ہو گئی مگر ماتھے کے تیور نہ اترے۔

ریاض نے رات کے کھانے پر سب ملازمین کو دعوت دی کہ میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔ شاگرد پیشہ لوگوں کو بے حد پریشانی تھی۔ امراء کے آداب غربا کی معاشرت سے جدا تھے۔ ڈر تھا کہ کوئی حرکت رئیس کے ناگوار خاطر نہ ہو۔ بہر حال رات کو لجاتے شرماتے' سمٹتے سمٹاتے سب آئے۔ کوئی نتھو کو کہے تو چل۔ کوئی فتو کو کہے تو آگے ہو۔ رئیس کی دعوت کیا تھی۔ داور محشر کا سامنا تھا۔ غریب مہمان ہر چند نئے کپڑے بدل کر آئے۔ لیکن وہ خود اپنی نگاہ میں حقیر تھے۔ اس وقت کپڑے ان پر تنگ تھے وہ کپڑوں سے تنگ تھے۔

ریاض خود اٹھا۔ ایک ایک کو اخلاق سے ہمراہ لایا اور زمین پر بچھے مکلف دستر خوان پر سب کو بٹھایا۔ رئیس سامنے بیٹھا تھا۔ غریب مہمانوں کی حرکات عروس نو کی طرح محجوب تھی۔ وہ لقمہ اٹھاتے اور ساتھ ساتھ آنکھ چرا چرا کر رئیس کی طرف بھی دیکھتے جاتے تھے کہ کہیں وہ تو ان کو نہیں دیکھتا۔ مبادا اس کو ان کے خورد و نوش کے طور طریقے ناپسند ہوں۔ اور وہ بے ہودہ اور بے عقل تصور کئے جائیں۔

ریاض ان کی کیفیت قلب اور بے چینی کو سمجھتا تھا۔ انسان اور انسان میں مغائرت کا ذمہ دار وہ اپنے آپ کو خیال کرتا تھا' اور ساتھ ہی اعلیٰ سوسائٹی کو مطعون کرنے سے اسے دریغ نہ تھا۔ جس نے غریب امیر میں آداب معاشرت کی خلیج حائل کر دی۔ جب تک اخوت و مساوات کی بنیاد پر تہذیب و سیاست کی تعمیر نہ ہو گی۔ تب تک انسان مختلف درجوں میں بٹے رہیں گے۔ نسیمہ نے جب سنا کہ ریاض شاگرد پیشہ لوگوں کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھا ہے تو وہ غصہ کی دیوی بن کر اندر آنگن میں پھرنے لگی۔ اس کا چہرہ لال اور

آنکھیں غصہ سے سرخ تھیں۔ اس نے رات کو سونا چاہا مگر غصہ سے نیند نہ آئی۔ ریاض نے ادنیٰ لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھالیا۔ نسیمہ کی نظر میں وہ خود اچھوت ہو گیا۔ صبح کامنی اور لڑکی کو لے کر چپکے سے موٹر میں بیٹھ میکے چلی گئی۔

ریاض کو محبوب بیوی کی مفارقت شاق گزری۔ لیکن اس کے چپکے سے چلے جانے کا بھی صدمہ تھا۔ پھر اس نے سوچا کہ نسیمہ عورت ہے۔ میرا عمل اگر اس کے خلاف مزاج ہو تو اس کو احتجاج کرنے کا حق ہے۔ اس لئے چند دن اور صبر کروں۔

نسیمہ کے بغیر گھر کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ چند دن میں ریاض کا چہرہ اتر گیا۔ مفارقت کی بیماری نے غلبہ پالیا۔ ایک ہفتہ تو جوں توں کرکے کاٹا۔ ہفتہ کے بعد سسرال میں گیا کہ نسیمہ کو منالائے۔ کسی شیطان نے نسیمہ کو ورغلایا کہ اکڑی رہنا جب تک دو چار بار لینے نہ آئیں نہ جانا۔ ورنہ امور خانہ داری میں وہ اسی طرح خود رائی کریں گے۔ بدی کے سرچشمہ کو ابھی بند کرلو ورنہ سیل حوادث میں خود بہنا پڑے گا۔ ریاض نے ہر چند منایا کہ گھر چلو۔ نسیمہ نے سو کی ایک کہہ دی کہ میں نہیں جاسکتی۔ مرد کا آخری کارگر ہتھیار بھی اس نے آزما دیکھا۔ یعنی ریاض نے یہ بھی کہا کہ میں کئی روز سے بیمار ہوں۔ باوجود اس کے نسیمہ نے کہا میں چھ ماہ سے پہلے نہیں آسکتی۔ بیمار خاوند درماندہ مسافر کی طرح شکستہ خاطر ہو کر چلا آیا۔ نسیمہ کو اپنے حسن کی تاثیر پر اعتماد تھا کہ وہ ہزار بار آئے گا اور لاکھ بار مجھے منائے گا۔ ریاض کے خیالات میں پہلے ہی انقلاب آچکا تھا محبت کا بندھن اب کمزور ہو گیا۔ نسیمہ کے خلاف توقع فیصلہ نے اس کا دل توڑ دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب انسان زندگی کے بہت سے خوشگوار اور ناخوشگوار فیصلے کر بیٹھتا ہے۔ ریاض نے تازہ رجحانات کی روشنی میں اپنے کمزور عزم کو پختہ کرلیا۔ دو روٹی کے سوا مجھے دنیا میں اور کیا چاہیے۔ پندرہ گاؤں کا پرگنہ میرے کس کام کا۔ خدا کی زمین پر لوگ ہل جوتتے ہیں اور گاڑھے پسینے کی کمائی مجھے دیتے ہیں۔ خود بعض اوقات نان و نفقہ سے بھی محروم رہتے ہیں لیکن میری تن پروری اور عیش کے لئے سامان مہیا کرتے ہیں۔ آخر کسان کا خون کب تک چوسوں!

اب اس کے چہرے پر متانت بڑھ رہی تھی۔ اپنے ملازموں اور کسانوں سے اس کا سلوک ہمدردانہ ہی نہ تھا بلکہ مساویانہ تھا۔ وہ خود بڑھ کر سب کو سلام کہتا تھا۔ باورچی خانہ کے تکلفات ختم ہو گئے تھے۔ وہ ملازموں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا تھا۔ وہ پہلے شاہانہ ٹھاٹھ سے اپنے تعلقہ داری کے گاؤں میں جاتا تھا۔ اب اکیلا موٹر پر گھومتا ہے۔ اور ان کی فلاکت کو دیکھ کر کانپ اٹھتا ہے۔

فصل نکلنے کا موسم آگیا۔ ریاض کے مختار بڑے سرگرم ہیں۔ رئیس کے حسن سلوک نے ان میں کام کی طاقت بڑھا دی ہے۔ وہ اب کسی کسان پر رحم کرنا نہیں چاہتے۔ قرضے کی ساری رقوم کو اسی فصل پر وصول کرکے ریاض کے قدموں میں ڈھیر کرنا چاہتے ہیں۔ اچانک ریاض نے حکم دے دیا کہ زر قرضہ صرف اسی کسان سے وصول کیا جائے جس کے گھر میں سال کا غلہ اور چھ جوڑے کے حساب سے ہر ایک کے پاس کپڑے ہوں۔ ایک ہل کے پیچھے پانچ روپیہ کا ماہانہ خرچ۔ ایک بچے کے لئے تعلیم کے اخراجات ماہوار نکال کر جو بچ رہے وہ قرضہ میں وصول کرو۔

سب مختار اس انوکھے حکم پر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور کہا "سرکار! اس طرح تو کچی کوڑی وصول ہونے کی نہیں۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ ریاست کے تمام حقوق ضائع ہو جائیں گے۔ آپ کے خزانہ میں کوئی دمڑی داخل نہ ہو گی۔"

ریاض نے کہا "میں بھی اسی کشمکش میں مبتلا ہوں کہ ریاست کے حقوق سے دست بردار ہو جاؤں یا انسانیت کے حقوق سے۔ مجھے اگر فکر ہے تو لڑکی کی تعلیم کی۔"

سب نے کہا "بے شک حضور! اس پر لاکھوں اٹھیں گے۔ تعلیم کے بعد شادی کا سامان بھی آج ہی ہونا چاہیے۔ اس کے لئے

بھی لاکھوں لٹیں گے۔"

ریاض نے مسکرا کر کہا "جب ایک لڑکی کی تعلیم اور شادی پر لاکھوں اٹھیں گے تو جن کسانوں کے ہاں دو دو چار چار بچے ہیں ان کا اس دنیا میں کوئی حق ہے یا نہیں۔ اس لئے جاؤ میرے حکم کے مطابق دیکھ بھال کر آؤ کہ ان کم از کم اخراجات کے بعد کسی کے پاس کچھ بچتا بھی ہے یا نہیں۔"

سب نے کہا "جانے کی کیا ضرورت ہے ایسا کوئی کسان نہیں ہے جو رات دن جان مار کر بھی یہ سامان مہیا کرے۔ پھر بچانے کا سوال ہی کہاں رہا۔ بس ہماری نوکری ختم ہوئی۔ رئیس جانے یا کسان!"

ریاض۔ "اگر تم ان حالات میں یہاں رہنا پسند کرو تو خیر ورنہ تمہارے سپرد دوسرا کام کروں گا۔ تم اپنے تجربہ کی بنا پر کسانوں کو بہترین مشورے دو۔ کوئی جھگڑا اٹھے تو نپٹاؤ' کسی کا جانور بیمار ہو تو سلوتری کو دکھاؤ۔ بچوں کی تعلیم کی نگرانی کرو۔ غرض تم کسانوں کی تکلیفوں کے دور کرنے کا عہد باندھو تو تمہاری مقدور بھر خدمت کروں گا۔ تمہیں عمر بھی نظم و نسق کا تجربہ ہے۔ میں پانچ لاکھ روپیہ تمہارے سپرد کروں گا اور پانچ برس تجربہ کر کے دیکھوں گا کہ تم نے ریاست میں کیا ترقی دکھائی ہے۔ تمہیں ہمت اور تدبیر سے کام کرنے کا موقع ہے۔ اس روپیہ کو کسانوں کی اقتصادی اور تعلیمی ترقی کے لئے خرچ کرو۔ پانچ برس کی محنت سے اس پرگنہ کو ریاستوں کے لئے قابل رشک بنا دو۔"

ریاست کے دہقانوں نے جب رئیس کے ان پاکیزہ خیالات کو سنا تو لٹو ہو گئے۔ ان کی اپنی ہمت میں اضافہ ہو گیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان بازوؤں میں اور بل آ گیا ہے۔ مختاروں نے گاؤں اور اہل دیہہ کی ترقی کی راہیں سوچنا شروع کیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ ریاست میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی ہے۔

ریاض نے روپیہ مختاروں کے سپرد کر دیا اور کہا کہ میں بھی پانچ سال کے لئے مختلف مقامات کی سیر کو جا رہا ہوں۔ امید ہے کہ میری واپسی پر تمہاری محنت اور تدبیر نے پرگنے کو رشک جنت بنا دیا ہو گا۔

نسیمہ کو اس انتظام اور ریاض کے جانے کی خبر ہوئی تو دل مسوس کر رہ گئی۔ ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ رنگ متغیر ہوا۔ سوچا یہ تھا کہ وہ آئیں گے۔ آج نہیں تو کل ساتھ چلی جاؤں گی۔ ان کا کیا قصور؟ مجھ نصیبوں جلی نے کیا قیامت ڈھائی۔ وہ بیمار تھے اور منت پذیر تھے۔ میں نے کس دیدہ دلیری سے ان کو جواب دیا۔ اور وہ کس طرح اپنا سا منہ لے کر چلے گئے تو مجھے شکوہ کیا۔ مجھے بھی کہیں ڈوب مرنا چاہیے۔ اس غم میں نڈھال سی ہو کر پڑ رہی۔ نسیمہ کے والدین کو علم ہوا تو انہوں نے ڈھارس بندھائی کہ اس گھر میں کیا کمی ہے جو تمہیں کسی بات کا غم ہو۔ یہاں رزق و دولت کی کمی ہو تو کوئی غم کھائے۔

نسیمہ کو باوجود ڈھارس بندھانے کے غم کھا رہا تھا۔ ایسے کم گو اور نیک طبیعت خاوند کے ساتھ کسی رذیل عورت نے بھی وہ غیر شریفانہ سلوک نہ کیا ہو گا جس سلوک کی میں مرتکب ہو چکی ہوں۔ مگر اب پچھتائے سے کیا ہوتا ہے۔

ریاض ریاست سے جا کر شہر میں آباد ہوا۔ وہ مزدور کی حیثیت سے بسر اوقات کرنے لگا۔ مزدور شہر کے جس متعفن حصہ میں رہتے تھے وہی ریاض کا مسکن تھا۔ غریبوں کے گلی کوچے نسیم صبح اور سورج کی کرنوں کی مداخلت سے محروم تھے اور مزدوروں کے بچے بچیاں دنیا کی آسائشوں اور خوشیوں سے نا آشنا تھیں۔ اس نے ایک دن ایک بوڑھی عورت کو گرمی میں سر پر بوجھ اٹھائے دیکھا۔ عورت بوجھ کے نیچے دبی جا رہی تھی۔ اس نے عورت کا بوجھ سر پر اٹھا لیا۔ منزل مقصود دور تھی۔ بوجھ اس کی برداشت سے بھی زیادہ

تھا۔ تیکی ٹھنگی پڑنے لگی۔ وہ ہانپتا جا رہا تھا۔ کپڑے پسینے سے شرابور ہو گئے تھے۔ وہ بوجھ سر سے گرا دینا چاہتا تھا۔ مگر خودی نے ہٹ جانے پر زور دیا۔ کچھ اور دور چل کر آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آنے لگا۔ زبان تالو سے لگ گئی۔ لب خشک ہو گئے۔ اس وقت کو ملامت کرنے لگا جس وقت رحم کے تقاضے سے اس نے بڑھیا کا بوجھ اپنے سر پر اٹھا لیا تھا۔

بوڑھی عورت نے کہا "بس اب گھر آ گیا ہے۔" ریاض اس نوید جانفزا سے گویا تازہ ہو گیا۔ اس کے ڈگمگاتے ہوئے قدم سنبھل گئے۔ اور ایک اطمینان کی سانس لی۔ کہ اچھا ہوا خدا نے اس عورت کے سامنے ذلیل نہ کیا۔ ورنہ کہتی کہ اچھے جوان بچے ہو کہ مجھ بوڑھی کے برابر بھی بوجھ نہ اٹھایا گیا۔

وہ عورت ایک تاریک کوٹھڑی کی زنجیر کھول کر داخل ہوئی اور کہا "لے آ میرے بچے!" ریاض نے بوجھ سر سے گرا دیا۔ خود بھی کھڑے ہونے کی تاب نہ رہی۔ وہیں فرش زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کا بند بند دکھتا تھا۔ کائی جمے ہوئے کچے گھڑے سے مٹی کے آبخورے میں پانی پیا اور خدا کا شکر کیا۔ اسے مزدور کی زندگی کا احساس ہو گیا۔ عورت نے بتایا "بیٹا! تم نے میرے دو پیسے بچا دیئے۔ کسی مزدور سے اٹھواتی تو دو دھنی دینا پڑتی۔ جیتے رہو۔"

آدھ آنے کے لئے مزدور کو یہ مصیبت کا پہاڑ اٹھانا پڑتا ہے۔ ریاض نے عالم تصور میں اپنی گزشتہ زندگی پر نفرین کی کہ کس بے دردی سے وہ روپیہ لٹاتا رہا۔ حالانکہ پائی پائی ملک کے مزدور کا حق تھا۔ دو دھنی کے لئے ایک طرف انسان یہ مصیبت اٹھاتا ہے، دوسری طرف ایک شخص روپے کو پانی کی طرح بہاتا ہے۔ لیکن ریاض نے دل میں کہا افلاس کا سمندر ہر طرف ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ انسانیت اس میں غوطے کھا رہی ہے اس میں میں بے کس تنکا ہوں۔ میرے سہارے پر انسانیت ڈوبنے سے نہیں بچ سکتی۔

دنیا کا کوئی ایسا مذہب نہیں جس نے غریب اور مزدور کی امداد کو ذریعہ نجات قرار نہ دیا ہو۔ مذہب اور اہل مذہب موجود ہیں۔ لیکن غریب اور مزدور مصیبت کے اتھاہ سمندر میں ڈبکیاں لے رہے ہیں۔ اسی لئے تو شاید سوویٹ روس مذہب کے دعویٰ اور غریب نوازی کا قائل نہیں۔ اور وہ غریب کو امیر کے خلاف صف آراء دیکھنا چاہتا ہے۔ امیر اور غریب میں اس اقتصادی بعد کا لازمی نتیجہ جماعتی جنگ ہے۔ بیشتر مذاہب کا اخوت اور مساوات کا دعویٰ ہے۔ لیکن اس مذہب کے پیرو بھی اپنی صداقت کی مناسب مثال قائم نہ کر سکے۔

ریاض اپنے بے مثل ایثار سے مطمئن تھا۔ اس نے دل میں فیصلہ کیا کہ میں بقیہ عمر امراء کی تربیت میں گزاروں گا تاکہ وہ غرباء کی دستگیری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں، اور اپنے اخراجات کو کم کر کے کسانوں اور مزدوروں کی ترقی اور فلاح کے لئے روپیہ صرف کریں۔ اس نے مسجد میں جا کر بھی وعظ کیا جو بہت موثر ثابت ہوا۔ ملک بھر میں گھوما۔ امراء کے پاس پہنچا۔ کون کہے کہ غریب کی مدد نہ ہونی چاہیے۔ وہ اپنی سعی سے بہت مطمئن تھا۔ اسے امید تھی کہ میں اپنی عمر میں ملک میں وہ نتائج پیدا کر سکوں گا جو چودہ سو سال قبل سردار عرب نے کئے جانے کا حکم دیا تھا اور جس پر اب سوویٹ روس کا مختار مطلق لینن عمل کر رہا ہے۔

پانچ برس گزر گئے۔ ریاض نے مناسب سمجھا کہ وہ ریاست کی ترقی کا جائزہ لے۔ چنانچہ وہ ریاست میں اچانک واپس آ گیا۔ پرگنے میں عجیب انقلاب تھا۔ کسانوں کی حالت بالکل بدل چکی تھی۔ ان کی صحت اور صفائی قابل دید تھی۔ آئے دن کی مالی پریشانیوں سے انہیں نجات مل چکی تھی۔ بچے مدرسے میں شوق سے جاتے تھے۔ انسان اور حیوان کے لئے ہسپتال تھے۔ صبح اور شام کے لئے سامان تفریح موجود تھا۔ ہر گاؤں میں ایک چھوٹا سا سینما گھر۔ بھاگ دوڑ کے لئے کھلا صاف میدان۔ نہانے دھونے کے لئے صاف ستھرے

خوشحال پرگنہ نمونہ جنت بن گیا تھا۔ سب ریاض کے سر کو دعائیں دیتے تھے۔ ریاض نے یہ نقشہ دیکھ کر سجدہ شکر ادا کیا۔ عثمان کی قسمت کی داد دی اور کہا۔ "میں یہاں ٹھہر کر تمہارے کام میں مداخلت کرنا نہیں چاہتا۔ میں تم سے بڑھ کر اور کیا کرتا۔"

ریاض اطمینان بخش انتظام سے خوش ہی نہ تھا بلکہ اس کو اپنا حیرت انگیز ایثار سمجھتا تھا۔ یکایک اس کے اطمینان قلب پر لڑکی کی ایک بیماری اور آنا فانا موت نے بجلی گرا دی۔ وہ سر پر پاؤں رکھ کر سسرال کے گھر گیا۔ وہاں کہرام مچا ہوا تھا۔ ہر ایک لڑکی کی لاپروائی کا شاکی تھا۔ بعض اسے ننگ اسلاف کہتے تھے۔ جو اولاد اور جائداد سے لاپرواتھا۔ ریاض "ہرچہ مرضی مولا از ہمہ اولیٰ" کہہ کر خاموش تھا۔ لڑکی کے صدمہ نے گو طبیعت پر گہرا اثر کیا۔ تاہم اپنی زندگی کے کارنامہ پر اسے فخر تھا۔ ریاست کے کسانوں میں خوشگوار انقلاب کے خیال نے اسے پھر اطمینان کی دولت بخش دی اور بدستور زیردستوں کی امداد میں منہمک ہو گیا۔

ریاض نے سنا "سکلات والا" مشہور سوشلسٹ ممبر پارلیمنٹ آیا ہے۔ جی چاہا کہ اسے اپنے پرگنہ کا ملاحظہ کرائے۔ اس نے جا کر ممبر موصوف کو مل کر ریاست کے حالات بتا کر اس امر پر آمادہ کر لیا کہ حالات کو بچشم خود دیکھے۔

مسٹر سکلات والا مزدوروں کے حال میں ایک رئیس کو دیکھ کر خوش ہو گیا اور کہا کہ ہندوستان میں سوشلسٹوں کا ایک نیا گروہ پیدا ہوا ہے۔ جو آٹھ آنے کے کھدر کے کپڑوں میں بسر اوقات کرتا ہے۔ دو پیسے کی گاندھی ٹوپی' آگرے کے الٹے کھرل کی طرح سر پر رکھ کر پانچ ہزار کی موٹر میں چڑھا ہوتا ہے۔ وہ دس روپے کا روزانہ پٹرول جلاتا ہے۔ شاہانہ کوٹھیوں میں رہتا ہے۔ دوستوں کو ٹھاٹھ سے دعوتیں دیتا ہے۔ لیکن ملازموں کی تنخواہ دباتا ہے۔ بہت سے نکمے کارکن اسے سچ مچ کا لینن سمجھ کر یا تہذیب مغربی کا حامل جان کر اس کے پیچھے لگے پھرتے ہیں۔ یہ ریاکار سرمایہ داروں کا نیا بہروپ ہے۔ میں ان بہروپیوں سے سخت متنفر ہوں۔ انہوں نے ظاہر میں تبدیلی کر لی ہے لیکن ان کا دل تبدیل نہیں ہوا۔ وہ اندر سے اب بھی سرمایہ دار ہیں۔ صرف لوگوں کی نگاہ میں معزز بننے کے لئے انہوں نے یہ روپ دھار لیا ہے۔"

"مسٹر ریاض!" سکلات والا نے بیان کو جاری رکھتے ہوئے کہا "میں تم سے خوش ہوں۔ تم سچے سوشلسٹ ہو۔ تم نے اپنے ملک کے ادنیٰ مزدور کی آمدنی کے مطابق اپنا خرچ گھٹا لیا ہے۔ تم ہی سچے مسلمان ہو۔ عرب کے اولوالعزم پیغمبرؐ نے پیٹ بھر کر کھانا نہ کھایا۔ کیوں؟ کیا انہیں میسر نہ تھا؟ اگر تن آسانی اور شکم پروری مد نظر ہوتی تو یثرب و بطحا کا رئیس اور مسلمانوں کے دل کا حکمران جو آرام چاہتا کرتا۔ لیکن سچا سردار فوج کا ادنیٰ سپاہی ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کو راحت پہنچانے کے لئے خود تکلیف اٹھاتا ہے۔ اس لئے مسٹر ریاض میں تمہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ کیونکہ تم نے سچے انقلاب کو قبول کر لیا ہے۔"

ریاض نے اپنی بیوی سے ان بن کی داستان بھی کہہ سنائی کہ کس طرح ڈیوڑھی کے دربان کے لڑکے کے رشتے کے ذکر سے ناراض ہو کر میکے چلی گئی۔ مسٹر سکلات والا نے ریاض کو گلے لگا لیا اور کہا "خاندانی تعصب' نسل اور خون کا امتیاز بھی بنی نوع انسان کو مختلف حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ یہ انسانیت کے لئے بدترین فتنہ ہے۔ سرمایہ اور کفو کا امتیاز ہی سامان غرور ہے۔ اور انسانیت تب ہی آسودہ ہو گی جب دونوں کا نشان دنیا سے اٹھ جائے گا۔ رسول عربیؐ نے اپنے غلام زید سے بہن کا نکاح کر کے آدمی دنیا میں نسلی تعصبات کا خاتمہ کر دیا۔ پھر زیدؓ کو سرداران قریش کی سرداری دے کر دشمن کے مقابلہ میں بھیجا' تاکہ اخوت و مساوات کا اصول زبانوں پر نہ رہے عمل میں بھی سما جائے۔ عرب کے بعض لوگوں نے ناک بھوں چڑھائی۔ عالی ظرف زیدؓ کی شہادت کے بعد اس کے بیٹے اسامہؓ کو دنیا کی تسخیر کرنے والے سرداروں کا سردار اسی لئے بنایا گیا تاکہ نسلی تعصب کا ذلیل جذبہ اگر کسی کے دل میں

موجود ہے تو وہ بھی کچلا جائے۔"

سکلات والا نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا "ریاض! مجھے اسلامی تاریخ کا وہ واقعہ پہلی خلافت کا وہ زریں زمانہ رہ رہ کر یاد آتا ہے۔ جب غلام زید کا بیٹا اسامہ معصوم اور ناتجربہ کار دنیا کو فتح کرنے والے جرنیلوں کا سردار بنا کر بھیجا گیا۔ اور خود خلیفہ اول نوجوان اسامہؓ کی رکاب تھامے شہر سے نکلا۔ علیؓ خالدؓ اور وقاصؓ جیسے جرنیل اسامہؓ کے احترام میں گردنیں جھکائے ساتھ ہو لئے۔

اسامہؓ نے خلافت پناہ کو کہا کہ یا مجھے پیدل چلنے دیجئے یا آپ بھی سوار ہو جایئے۔ یاد ہے باعظمت حضرت ابو بکر صدیقؓ نے کیا کہا۔ کہا تو یہ کہ "میرے آقاؐ کے نامزد کئے ہوئے سردار! میں تیری برابری کیسے کر سکتا ہوں۔ نہ میں سوار ہو سکتا ہوں نہ تو پیدل ہو سکتا ہے۔ اس کے حکم سے تو اور میں دونوں مجبور ہیں۔" ریاض! مجھے تو اس واقعہ کی یاد تڑپا دیتی ہے۔ جب تم نے اپنی بیوی کو یہ مشورہ دیا۔ اس وقت تیرے اندر سچے مسلمان کی روح موجود تھی۔"

ریاض ——— مسٹر سکلات والا کی حوصلہ افزائی سے مسرور تھا۔ آنکھوں میں بٹھا کر اسے پرگنہ میں لے گیا۔ حالات کو دیکھ کر سکلات والا کی بھی آنکھیں کھل گئیں۔ ریاض کو داد دیتے دیتے اس کے ہونٹ خشک ہو گئے۔ ریاض بھی خوشی سے پھولا نہ سماتا تھا۔ یک بہ یک سکلات والا نے دریافت کیا کہ "آپ نے اراضیات کا حق مالکانہ کسانوں کو دے دیا ہے؟" ریاض نے جواب دیا کہ "نہیں۔"

سکلات والا نے ریاض کی طرف دیکھا اور بے تکلف ہو کر کہا کہ "تمہاری روح میں بدترین شیطان گھسا بیٹھا ہے۔ نفس تمہیں دھوکا دے رہا ہے۔ اور تم دنیا کو دھوکا دے رہے ہو۔ بہت سے ریاکار اپنی شہرت کے لئے دنیا کی بدترین سختیاں جھیلتے ہیں مگر ان کی ریاضت نیکی نہیں۔ تمہاری یہ غریب نوازی ایک دن کسانوں کے لئے بدترین لعنت ثابت ہو گی۔ جب تم مر جاؤ گے۔ تمہارا وارث ان کسانوں کی ساری خوشیاں بدستور اپنی ذات پر قربان کرے گا۔ اور یہ لوگ پہلے سے زیادہ بدحال ہو جائیں گے۔ تمہارا عارضی کرم ان پر مستقل ظلم بن جائے گا۔ کیا تم مالکانہ حقوق سے دست بردار ہو کر اس جائیداد کو وقف نہیں کرا سکتے تاکہ کسانوں کو بلاوجہ بے دخل نہ کیا جا سکے؟"

ریاض نے کچھ دیر سوچا۔ اس کا رنگ زرد ہونا شروع ہو گیا۔ سکلات والا نے سمجھ لیا کہ وہ زمین کی وراثت سے محروم ہونا نہیں چاہتا۔

سکلات والا نے کہا "ریاض! تم اپنی بیوی کو گھر لاؤ جو نہ نسلی مفاد ترک کرنے پر آمادہ ہے نہ اقتصادی حقوق سے دست بردار ہونا چاہتی ہے۔ معاف کرنا۔ تم اور تمہاری بیوی میں ایک روح جاری و ساری ہے۔ میرا لہجہ کرخت ضرور ہے مگر میرا دل و دماغ بہت صاف ہے۔ تم اور تمہاری بیوی دونوں مفاد عامہ کے خلاف امتیازی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔ لیکن تمہاری بیوی زیادہ نیک ہے۔ کیونکہ اس نے تمہاری طرح ریاکاری کا جامہ نہیں پہنا۔ لو مسٹر ریاض رخصت! بھلائی اور دنیائے دولت دونوں کی طلب نہ کرو۔"

سکلات والا یہ کہہ کر بلا ہاتھ ملائے چلا گیا۔ ریاض دم بخود رہ گیا۔ اس کا دماغ سکلات والا کے کلام کی صحت کو قبول کرتا تھا۔ مگر دل میں اس پر عمل کرنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ دماغ اور دل کے عدم تعاون سے طبیعت عجب کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ رات دن کسی فیصلہ پر پہنچنے کی کوشش اور ناکامی سے اسے کم خوابی کا دورہ شروع ہو گیا۔ دل کڑا کر کے آنکھیں بند کرتا تھا۔ سکلات والا کے الفاظ کانوں میں گونجتے تھے کہ "تم اور تمہاری بیوی دونوں مفاد عامہ کے خلاف امتیازی زندگی بسر کرنا چاہتے ہو۔ وہ نیکی کا عزم کر کے سونا چاہتا تھا' تو دل پکار اٹھتا تھا کہ عارضی طور سے حکومت سے دست بردار ہونا اور حقیقی طاقت کا مالک رہنا شہرت کو چار چاند لگاتا ہے۔ لیکن ریاست کے حقوق مستقل طور پر ضائع کر کے عام آدمیوں میں شمار ہونا ناقابل قبول امر ہے۔ دماغ خیالات کے تصادم سے پراگندہ اور دل مضمحل

تھا۔ ہر وقت وہ اپنے دل سے باتیں کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ کبھی وہ کہتا کہ میں مفاد عامہ کے خلاف امتیازی زندگی بسر کرنے کو حرام سمجھتا ہوں۔ پھر پکار اٹھتا کہ نہیں میں امتیازی زندگی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ میں کس طرح حقوق ریاست سے ہمیشہ کے لئے دست بردار ہو جاؤں۔ علاوہ ازیں لڑکی کی موت کا صدمہ بھی دل سے نہ گیا تھا۔ دل اور دماغ کی اس کیفیت نے وہم کی صورت اختیار کی۔ خیالات کے ایک مرکز پر نہ رہنے سے وہ رات دن پریشان اور حیران رہنے لگا۔ کم خوابی بے خوابی میں بدل گئی۔ پریشانی اور حیرانی نے چہرے پر وحشت کے آثار نمایاں کر دیئے۔ بڑا عزم لے کر اٹھنا اور پھر قوت فیصلہ کا جواب دے دینا ناقابل برداشت اذیت ہے۔ بالآخر وہم نے بڑھ کر دیوانگی تک نوبت پہنچادی۔ ہم عصر رئیس اسی تاک میں تھے۔ انہوں نے سرکار دربار تک نوبت پہنچائی کہ ریاض کا انتظام ریاست دیوانگی پر مبنی ہے۔ اس سے سب رئیسوں کا انتظام ریاست بگڑتا ہے۔ رعایا دلیر ہو گئی ہے۔ غریب امراء کے منہ آنے لگے ہیں۔ اس شکایتی ٹولہ میں اس کا خسر پیش پیش تھا۔ حکام بالادست کو بھی ریاض کی غریب نوازی کی ادا ناپسند تھی۔ اس شکایت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاض کی ریاست کا انتظام براہ راست حکومت کی نگرانی میں آ گیا۔ اور ایک افسر ریاست کے انتظام کے لئے مقرر ہوا۔

سرکار کے مقرر کردہ افسر نے آکر دیکھا کہ خزانہ خالی ہے۔ سب مختاروں کو بلا کر لتاڑا کہ تم نے رئیس اور ریاست دونوں کو برباد کر دیا۔ غضب خدا کا ایسی زرخیز ریاست اور خزانہ خالی۔ کسانوں کے گھروں میں ہن برستا ہے اور رئیس کے ایوان میں خاک اڑتی ہے۔ سابقہ بقائے اور قرضے وصول کرو اور آئندہ حسب سابق ریاست کا حصہ کسانوں سے حاصل کر کے داخل کرو۔"

جب کسانوں نے اس حکم کو سنا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ ایک تو کھایا ہوا اگلنا پڑا۔ علاوہ ازیں افلاس بھیانک صورت میں سامنے آ گیا۔ غریبوں کے دلوں سے ہوک اٹھی۔ کچھ "قہر درویش برجان درویش۔" کے مصداق آہ بھر کر بیٹھ گئے۔ کچھ ناقابل برداشت حالات کے پیش نظر مرنے مارنے پر تیار ہو گئے۔ پشت پر طاقت ہو تو مخالفت کو مرعوب کیا جا سکتا ہے۔ بے زور کسان کا اللہ والی تھا۔ جس نے سر اٹھایا پولیس کا زار شاہی ڈنڈا سر پر پڑا۔ محکوم در محکوم کسان میں قوت برداشت باقی نہ رہی۔ بعض پرجوش لوگ ریاست سے ہجرت کر گئے۔ باقی مثل سابق خون جگر پی کر کھیتوں میں کام کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ دنیا جو ان کے لئے بہشت بن گئی تھی۔ اب وہ دوزخ میں تبدیل ہو گئی۔ ریاست کے خزانہ میں پندرہ لاکھ روپیہ وصول ہو کر داخل ہوا۔ کسان کے بیوی بچے پھر چیتھڑوں میں دکھائی دینے لگے۔ البتہ سرکار کا سرکردہ ایک کامیاب منتظم سمجھا جانے لگا۔ جس کا عہدہ اور تنخواہ بڑھا دی گئی۔ کسانوں کی ساری خوشحالی سمٹ کر دیوانے رئیس کے خزانہ میں آ گئی۔

ریاض کا معالجہ برابر جاری تھا۔ طبیعت تین سال کے بعد آہستہ آہستہ بحال ہونا شروع ہو گئی۔ دو سال تک علاج اور جاری رہا۔ خدا نے شفائے کلی دی۔ ریاض نے صحت یاب ہو کر پہلا کام یہ کیا کہ بیوی کے پاس جا کر معذرت طلب کی اور کہا "نیکی، اخوت اور مساوات کا وہم بھی اب دور ہو گیا ہے۔ گھر چلو تاکہ آرام چین کی زندگی بسر کریں۔" نسیمہ جسے ریاض سے سچی محبت تو تھی مگر اس کی اخوت اور مساوات کی نئی اپج سے نفرت تھی باغ باغ ہو گئی۔

نسیمہ نے کہا "نیکی کرو مگر نہ اتنی کہ اپنے خاندانی مفاد پر ضرب لگے۔ امیر و غریب خدا نے بنائے ہیں۔ اگر وہ چاہتا تو سب کو برابر بناتا۔"

ریاض نے ہنس کر کہا "تو عقلانہ کہو بیوی! نہ میں اتنی نیکی کروں گا نہ اتنی۔ میرا تو سرے سے اعتقاد ہی بدل گیا ہے۔ روسا کو نیکی راس نہیں آ سکتی۔ جو عیسا غریب کا درد دل میں رکھ کر خدا سے اپنی عافیت کا چاہتا ہو ہم ہے۔ نیکی کے عزم کے ساتھ ابتلا اور امتحان کا

سلسلہ شروع ہونا لازمی ہے۔ امراء اور روٴسا کا اس میں پورا اترنا ممکن نہیں۔

"پیاری نسیمہ! اگر کوئی امیر اور رئیس نیکی کا عزم کرے۔ پہلے تو اس کی بیوی ناراض ہو کر میکے چلی جاتی ہے۔ پھر اولاد سے محروم ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی بیوی بچوں کا صدمہ برداشت بھی کر لے تو بھی ایثار کی وہ صورت اختیار نہیں کر سکتا جو نیکی کی تکمیل کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے میں نے نیکی کے خیال سے توبہ کر لی ہے۔ یہ سر دردی بھی غربا کو بھلی لگتی ہے۔ آؤ ہم تم چین سے بسر کریں اور مسیح کے اس قول کو بھول جائیں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزرنا ممکن ہے لیکن امرا کا بہشت میں داخل ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے نسیمہ کیوں نہ جہنم کے وہم کو چھوڑ کر اسی دنیا میں جنت کے مزے لوٹیں۔"

ریاض نے پختہ کار سرمایہ دار کی طرح بسر اوقات شروع کر دی۔ اب ریاض اور نسیمہ کی زندگی ان دل کش نغموں کی طرح آسودہ تھی۔ جو صبح بہار کی خوشبو سے بسی ہوئی ہواؤں میں پھیلے ہوئے ہوں۔ ریاست کے کسانوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سامان عیش و راحت میں صرف ہوتی تھی۔ ساز و سرور اور سنہرے ساغروں نے محل کی ساری فضا کو رنگین کر دیا تھا۔ لیکن مسرت نا آشنا کسان اور ان کے بچے افلاس کی دردناک مصیبت میں پڑے کراہ رہے تھے۔ ریاض نے ان کی چیخوں کو نہ سننے کے لئے عیش و نشاط کی روئی کان میں دے رکھی تھی۔ اور ان کا حال نہ دیکھنے کے لئے غفلت کی پٹی آنکھوں پر باندھ لی تھی۔

ریا کار

فلک پیما

ریاکار کو موٹے موٹے دل 'جگر' جلا دینے والے لفظوں میں برا بھلا کہہ دینا آسان ہے۔ ظہیر فاریابی نے لکھا ہے کہ جس زاہد سے ریا کی بو آئے اسے اس کو بوریے کا کفن پہنا کر آگ میں ڈال دو۔

آج کل پاکیزہ زندگی کے زبانی شیدائی پاکستان میں بکثرت ہیں اس لئے ہر محفل میں ریاکار کی مٹی پلید ہوتی رہتی ہے۔ جس طرح مسجدوں کی رونق ریاکاروں کے طفیل سے ہے اسی طرح مجلسوں میں ریاکار کے ذکر خیر سے چہل پہل رہتی ہے۔ ریاکار کے اس احسان کا اعتراف نہ کرنا انصاف کا خون کرنا ہے۔

بزرگان دین انسانی مجبوریوں اور کمزوریوں سے آگاہ تھے۔ ریا کے معاملے میں اولیاؤں نے ہمیشہ قابل تعریف تحمل اور فراخدلی کو مد نظر رکھا ہے۔ ایک صوفی نے تو انتہا کر دی۔ لکھا ہے کہ اللہ میاں نے ایک بزرگ سے کہا کہ اگر تمھارا پردہ فاش کر دیا جائے تو تم بتاؤ کہ تمھارا دنیا میں کیا حال ہو؟ اس بزرگ نے بلا تامل جواب دیا کہ اللہ میاں اگر تمھاری بخشش و عفو گناہ کا صحیح حال ظاہر کر دوں تو آپ فرمایئے پھر عبادت کون کریگا؟ اس پر بارگاہ الٰہی سے ارشاد ہوا کہ ہم بھی خاموش رہیں گے تم بھی خاموش رہو۔

یہ اس لئے گوش گذار ہے کہ پاکیزگی کے مدعی خلوص کی حمایت میں شور جتنا چاہے مچالیں مگر یہ شور بھی اشتہاری ہے اور ریا سے خالی نہیں۔

ریاکار کے متعلق یہ تو ہر ایک کو معلوم ہے کہ ریاکار کے سجدے سے زمین چلا اٹھتی ہے کہ مجھے خراب کر دیا۔ یہ بھی سب کو علم ہے کہ حافظ شیرازی میٹھے میٹھے لفظوں میں ہدایت کر گئے کہ شراب پیو' رندی کرو مگر ریاکار کی طرح قرآن کو دام تزویر نہ بناؤ۔ ملا عراقی اور حافظ شیرازی کا مطلب یہ تھا کہ دکھلاوے کی عبادت کی مذمت کریں مگر صوفیائے کرام ہمیشہ یہی تلقین فرماتے رہے کہ چشم پوشی اختیار کرو۔ عیب جوئی کے کنوئیں میں مت گرو۔ مگر دنیا ہے کہ عیب جوئی سے باز نہیں آتی اور ریاکار ہے کہ دکھلاوے کے سجدوں سے نہیں چوکتا۔ صرف سجدے نہیں بلکہ جبہ و عمامہ کی ترتیب سے اپنے آپ کو پارسائی کا سالار اعظم ظاہر کرتا ہے۔ اس سج دھج کے شوق کی وجہ یہ ہے کہ زاہد ریاکار کو علم ہے کہ عوام ظاہر پرست ہیں۔ یہ جانتے ہوئے کہ اصلی عبادت صرف خدمت خلق ہے۔ وہ

خصلت اپنی خدمت کروانا چاہتا ہے۔ کیونکہ اس کی زندگی ذاتی منفعت کے لئے وقف ہے۔

ریاکار یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کے گردو پیش والے مر کر تو اس کے کام ہر گز نہ آئیں گے اسی زندگی میں پارسائی کا جال پھیلا کر پیدا کرتا ہے۔ اس زندگی میں عزت' آرام' آسائش کا خواہاں ہے اور اس کا ہر فعل اس امر کا گواہ ہے کہ

عاقبت کی خبر خدا جانے   اب تو آرام سے گذرتی ہے

کیا یہ کہنا غلط ہے کہ اگر لوگ دھوکا کھاتے ہیں تو قصور لوگوں کا ہے؟ کیوں؟ ان میں اتنی عقل نہیں اتنی تمیز نہیں کہ نمود کی نمائشی ز ہی عبادتوں سے متاثر ہو کر ریاکار کو پیش پیش نہ ہونے دیں۔ اگر کسی کا خیال ہے کہ ریاکار بھولے پن سے ریاکاری کرتا ہے تو یہ خیال غلط ہے۔

شروع شروع میں ریاکار دانستہ ریاکاری کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ خود احمق نہیں ہوتا لوگوں کو احمق بناتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ جوں جوں ریاکاری کامیاب ہوتی ہے یہ خصلت عادت بن جاتی ہے۔ اور اگر عوام بھانپ جائیں ریاکار اپنی چالوں سے باز نہیں آتا۔ اور کیوں باز آئے؟ نفع کا سودا اور وہ بھی عبادت کے روپ میں۔ چپڑی اور دو دو۔ ریاکار انتاریاں کار نہیں کہ آرام' عزت' دولت کو ٹھکرا دے۔

ایک ریاکار حضرت کسی موقع پر بے تکلف صاف گو دوستوں کے قابو چڑھ گئے۔ دوستوں نے صلواتیں سنائیں۔ ریا کی کمائی میں سے حصہ بخرا طلب کیا۔ پتے کی باتیں کہیں۔ افغانستان سے نذر قم آئی اس کا ذکر چھیڑا۔ ریاستوں سے امداد کی تفصیل اور وجہ پوچھی۔ ریاکار صاحب کب دبنے والے تھے۔ جواب میں فرمانے لگے تم بے وقوف سب حاسد ہو مجھے مولا کریم اپنے خزانہ غیب سے وظیفے عطا کرتا ہے۔ میرا روزانہ ورد ہے۔

اے کریمے کہ از خزانہ غیب   گبرو ترسا وظیفہ خور داری

دوستاں را کجا کنی محروم   تو کہ بادشمناں نظر داری

یہ ورد کرتا ہوں۔ دعا کی برکت سے دعوت نامے آتے ہیں' دولت آتی ہے' عزت میں ترقی ہوتی ہے۔ تم یونہی جلتے ہو۔ میری طرح ورد کرو' تعریفی خط لکھو' مناسب موقع پر بڑے آدمیوں کی کامیابی کی دعا بعد نماز جمعہ ہزاروں آدمیوں سے کراؤ اور اس دعا کرانے سے پہلے اور بعد میں اپنے ممدوح کو باخبر رکھو۔ دیکھو پھر کس طرح شہرت اور دولت کی بارش ہوتی ہے۔ ریاکار حضرت اپنے فن کی کچھ اور باریکیاں بیان کرنے کو تھے کہ ایک منہ پھٹ بولا "اے ابلہ فریب! لوگوں کو دھوکا دے کر موٹا ہو جائے گا تو خدا کو کیا جواب دے گا؟"

اس پر ریاکار حضرت بہت بگڑے۔ جوش میں آ کر کہنے لگے کہ "تم سب کے سب ملحد ہو۔ نامسلمان ہو۔ تمہارا خدا پر ایمان نہیں ہے۔ کیا تمہاری یہ مرضی ہے کہ میں اس جل شانہ' کے ایک فرشتے کو معطل کر دوں۔ کارساز حقیقی نے میرے دونوں کندھوں پر ایک ایک فرشتہ معین کر رکھا ہے۔ دائیں کندھے والا نیکیاں لکھتا ہے۔ بائیں کندھے والا لغو حرکتوں کا محرر ہے۔ اگر میں لغو حرکتیں ابلہ فریبی اور نمائشی عبادت نہ کروں تو بائیں کندھے والا فرشتہ بے کار ہو جائے۔ تم میرے عیب دیکھتے ہو۔ یہ نہیں دیکھتے کہ جو کچھ کماتا ہوں اس سے دس غریب کنبے پالتا ہوں۔ تم تو بتاؤ کہ تمہارے ہاں کتنے غریب نوکر ہیں؟ تم جیسے مسلمانوں نے زکوٰۃ جیسے فریضے کو متروک کر رکھا ہے۔ میں محنت سے زکوٰۃ اور صدقہ عیدالفطر جمع کرتا ہوں' جو جمع کرتا ہوں اس سے آدھی رقم یتیم خانوں میں بھجواتا ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ یتیم خانے کے انتظام میں اپنے آدمی رکھوانے کی کوشش کرتا ہوں۔ مگر تم بتاؤ کہ تم نے عملی کام کیا کیا؟ نہ

کسی یتیم خانے میں تم مددو ونہ کسی دینی کتاب کے چھپوانے اور فروخت میں دلچسپی لو تم مجھ سے کہیں زیادہ ملعون ہو۔ میں تو صرف ریاکار ہوں۔ تم بےکار ہو اور بے کار ریاکار سے کہیں بدتر ہے!"

اب آپ ایک اور منکسر مزاج ریاکار کی داستان سنیئے! یہ حضرت اپنے آپ کو عاجز گنہگار کمترین خلائق بیان کرنے میں بڑے حاتم تھے۔ بات پیچھے ہوتی تھی اور یہ پہلے فرمادیتے تھے کہ مجھ نالائق سے کیا ہوگا۔ جب ان کی بہت خوشامد کی جاتی تو فرماتے اچھا آپ کا ارشاد ہے تو بسر و چشم حاضر ہوں۔ چنانچہ یہ جملے دہراتے ہوئے وہ بصد شوق ہر ایسے کام میں شامل ہو جاتے جس میں چندے کی ضرورت ہو۔ ہوتے ہوتے کچھ متمول ہو گئے مگر انکسار پہلے سے دگنا تگنا۔ عام چرچا ہوا کہ یہ شخص اپنے کام میں محنت کرتا ہے۔ قومی کاموں میں دن رات ایک کر دیتا ہے۔ نہایت ہمدرد مفید انسان ہے۔ ان حضرت کے بود و ایک راز دان تھے انھوں نے ایک دن ذرا سخت گوشمالی کی اور کہہ دیا کہ اب تو اس فریب سے توبہ کرو۔ فرمانے لگے کہ مجھے تم ریاکار کہتے ہو۔ مجھ سا بد کار دنیا میں کوئی نہیں مگر تم لوگ بے سمجھ ہو۔ یہ دنیا میں نے نہیں بنائی۔ اس کے طریقے میرے ایجاد کردہ نہیں۔ مجھے صرف یہ علم ہے اور صحیح علم ہے جیسا کہ حضرت امیر خسروؒ فرما گئے کہ:

"عشق، افلاس اور مسلمانی کافری سے سو درجہ بدتر ہیں۔ اس کافری سے ڈرتا ہوا افلاس سے بچنا چاہتا تھا۔ سو خدائے بزرگ کی بخشش سے افلاس دور ہوا، عشق حاصل ہوا۔ ایک مسکین خاتون کی دلجوئی کرتا ہوں۔ اب جو تمھارا جی چاہے کہو اور کرو۔ مجھ عاجز کا خدا والی ہے!"

زہد فروشی کی ان دو مثالوں سے سننے والوں کو ریاکار کا نقطۂ نگاہ واضح ہو گیا ہوگا۔ مگر جو اصحاب اپنے خصوصی حلقوں میں اقبال کر لیتے ہیں کہ وہ ریا کی کمائی کھاتے ہیں وہ دو باتوں کا جواب چاہتے ہیں۔ اول یہ کہ وہ کونسا خدائی فوجدار ہے جسے علم ہے کہ ہمارے سب سجدے، سب نمازیں، سب دعائیں ہمیشہ محض ریا ہیں؟ کیا ہم بھولے سے بعض دفعہ خلوص کے سجدے نہیں کرتے۔ وہ کون ہے جس کی ہر نماز میں حضورِ قلب کا نور ہے؟ ایک خلوص کا سجدہ، ایک سچے دل کی توبہ ہفت سالہ گناہوں کو دور کرنے پر قادر ہے۔ سوائے ذات باری کے کسے معلوم ہے کہ ہم مردود ہیں۔ ہم برے سہی مگر ہر ایک کو تو علم نہیں کہ ہم ہر وقت ریاکار ہیں۔ بہت لوگ ہیں جو ہماری مثال سے نیک تو ہو جاتے ہیں ریاکار نہیں بن سکتے! کیا اس مثال کا قائم کرنا قابل قدر نہیں؟ زاہد ریاکار کو اسفل السافلین شوق سے کہیے مگر ریاکار اور دنیادار میں فرق کیا ہے؟ صرف یہی کہ دنیادار دکانوں، بنکوں، کارخانوں کے ذریعے سے لوٹتا ہے اور ہم زہد کو ذریعہ تجارت بناتے ہیں۔ ان کا راس المال روپیہ ہے ہمارا راس المال عبادت۔ ہر دنیادار کامیاب نہیں ہوتا، ہر ریاکار کی دکان بھی نہیں چلتی۔ ہم میں اور ان میں فرق کیوں کیا جاتا ہے؟ روپیہ کی سیڑھی کو عبادت کے زینہ پر کیوں ترجیح دی جاتی ہے؟ کیوں لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ ریاکاری معاشی پیداوار ہے؟ شخصی تخلیق نہیں۔ اگر ریاکار مردود ہے تو وہ جماعت جس کے وہ جزو ہیں مردود تر ہے۔

ریاکار کا دوسرا سوال بہت ٹیڑھا ہے۔ پوچھتا ہے۔ ایمان سے کہو

"کون ہے جو ریاکار نہیں؟"

غیب کا علم تو خدا کو ہے مگر جہاں تک دیکھنے میں آیا ہے شہروں میں ایک سے ایک بڑھ کر ریاکار ہے!

———

پربت کی بیٹی

چراغ حسن حسرت

ستی جس کا چہرہ چاند کا سا تھا۔ شوجی[1] کی استری اور دکش[2] جی کی بیٹی تھی وہ اپنے پتی کے ساتھ کیلاش[3] پربت پر رہتی تھی۔ جہاں سورج کی کرنیں دیودار کے پیڑوں تلے جھولا جھولتی ہیں اور سپید بادل ننھے بچوں کی طرح کھیلتے پھرتے ہیں۔ پر یہ دکھ اسے گھلائے ڈالتا تھا کہ اس کے پتا دکش جی رات دن شیوجی کی نندیا کرتے رہتے تھے۔ کبھی انھیں بھکاری اور کنگال کہتے۔ کبھی بیٹی کو بھکارن کہہ کے اس بچاری کا جی دکھاتے۔ ایک دن انھوں نے ستی کو ایسے ایسے طعنے دیئے کہ اس جانہار نے آگ میں کود کے جان دے دی۔

ستی اپنے جی سے گئی۔ پر اس کی یاد شوجی کے جی سے نہ جا سکی۔ انھیں آٹھوں پہر اسی کا دھیان لگا رہتا۔ اور جدھر نظر اٹھتی ستی کی سندر موت کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیتا۔

ہاتھ کی امٹ لکیروں میں جو کچھ لکھا ہے وہ ضرور ہو کے رہتا ہے ستی کے فیصلے میں یہی لکھا تھا کہ وہ پربتوں کے راجہ ہماچل کے ہاں جنم لے کر پھر شیوجی کی استری بنے اور کیلاش کی اندھیری گپھاؤں میں اجالا کرے اور یہ بات پوری ہو کے رہی۔

---

1. شوجی ہندوؤں کے تین بڑے دیوتاؤں میں ایک ہیں۔ ویدوں میں ان کا نام رودر ہے۔ اپنشدوں اور پرانوں میں انھیں شوشنکر۔ مہیشور اور مہادیو کہا گیا ہے۔ عام طور پر انھیں فنا اور ہلاکت کی قوت سمجھا جاتا ہے۔ پر ہندو فلسفیوں کے نزدیک شوجی کی ذات زندگی اور موت حیات اور فنا دونوں کا سرچشمہ ہے پرانوں میں ان کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پانچ چہرے اور چار بازو اور تین آنکھیں ہیں اور تیسری آنکھ ماتھے کے درمیان ہے۔
2. دکش جی برہما کے بیٹے ہیں دیوتاؤں میں بڑے اونچے سمجھے جاتے ہیں مہابھارت میں لکھا ہے کہ برہما کے داہنے انگوٹھے سے پیدا ہوئے اور ان کی استری نے بائیں انگوٹھے سے جنم لیا۔ دکش جی کی تیرہ بیٹیاں کیشپ رشی کو بیاہی گئی تھیں۔ بہت سے دیوتا انسان اور حیوان انھیں سے پیدا ہوئے۔
3. کیلاش جو شوجی کا استھان ہے۔ ہمالیہ کے اس حصے کا نام ہے جو مان سرور سے اتر کی طرف ہے۔

اس جنم میں اس کا نام اماتھا۔ اور لوگ اسے پاربتی[2] یعنی پربت کی بیٹی بھی کہتے تھے۔ اس کا چمپئی بدن ہماچل کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کی طرح چمکتا تھا۔ جن پر پیلی پیلی دھوپ اپنا سنہری رنگ پھیر دیتی ہے۔ اس کی کمر انگور کی طرح پتلی اور لچکیلی تھی اور آنکھیں مان سرور[1] سی نیلی اور گہری۔ جب وہ کیلاش کی برف بھری چوٹیوں پر نظر ڈالتی۔ تو اس کے ہونٹوں سے جو شہد شہتہ کی طرح لال تھے۔ ایک سرد آہ نکل جاتی۔ اس وقت اس کی آنکھیں لمبی اور گھنی پلکوں کی چھاؤں میں اس طرح بے چین معلوم ہوتیں جیسے مان سرور کا پانی گھنے پیڑوں کے سائے تلے تیز ہوا میں جھکولے کھا رہا ہو۔

وہ پربت کی بیٹی تھی اور پربت کی گود میں کھیل کے پلی تھی۔ پیڑوں سے ڈھکی ہوئی گھاٹی۔ پہاڑ کا ڈھلوان ہمر اکھنڈ اور اونچی نگر اس کے لئے گھر آنگن تھے۔ اور سارس اور تیتر بگلے اور مرغابیاں پتھریلی چٹانوں میں گھونسلا بنانے والے باز اور سہمی ہوئی آنکھوں والی ہرنیاں اس کے بچپن کے ساتھی۔ گرمیوں کی رت میں جب برف پگھلتی۔ خوبانی کی کلیاں کھلتیں اور اجلی اجلی پن چادریں سپید سپید پتھروں پر سر پٹکنے لگتیں۔ تو وہ اونچے سروں میں شوجی کی مہما کے گیت گاتی اور لہراتی ہوئی ندیاں گنگناتے ہوئے چشمے سنگت کرتے۔ کبھی اسے کوئی ہرن کسی پیڑ تلے چوکڑیاں بھرتا نظر آ جاتا۔ تو وہ اس کے پیچھے دوڑ پڑتی۔ راستے میں اسے کوئی چشمہ مل جاتا تو وہ ہرن کو بھول کے اس میں اپنا روپ دیکھنے لگتی۔ پھر وہ ایکا ایکی مسکرا اٹھتی۔ اور اس کی مسکراہٹ پھولوں کی مسکراہٹ میں یوں گھل مل جاتی کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

پھر جب تیز اور سرد ہوا سوکھے پتوں میں سے سرسراتی ہوئی گزرتی اور اس کا ایک جھونکا اما کے گالوں کو تھپ تھپاتا۔ اس کے بالوں کو کندھے پر بکھیر دیتا۔ تو وہ جان لیتی کہ جاڑا آ گیا۔ پر وہ برف اور آندھی کہر کا ور دھند سے ڈرتی نہیں تھی۔ کیونکہ وہ پربت کی بیٹی تھی اور پربت کی بیٹی کو کون ڈرا سکتا ہے۔ وہ چاہتی تو اپنی گرم گرم سانس سے برف کو پگھلا دیتی۔ بادلوں کو ہوا میں یوں اچھال دیتی کہ ان کا کوئی اتا پتہ نہ ملتا۔ اور جاڑے کی تیز ہوا تو اسے اپنی سانس کی طرح جانی پہچانی معلوم ہوتی تھی۔ کیونکہ وہ کیلاش کی چوٹیوں کو چھو کے آئی تھی۔

کھلی ہوا اور پیلی دھوپ میں نیلے آسمان کے سائے تلے اس کے جوبن کی جوت یونہی بڑھتی گئی۔ پر جوں جوں اس کا روپ نکھرتا جاتا تھا۔ اس کے دل میں چاہت کی آگ زیادہ تیز ہوتی جاتی تھی۔ اب اس میں اگلی سی اچپلاہٹ نام کو نہ رہی تھی۔ وہ کچھ کھوئی کھوئی اور اداس نظر آتی تھی۔ اور کبھی کبھی تو اسے ایسی چپ لگ جاتی کہ جنگل کے پکھیرو جنھوں نے اسے مسکراتے، قہقہے لگاتے اور سورج کی کرن کی طرح سرد اور اندھیری گپھاؤں کو جگمگاتے دیکھا تھا۔ حیران ہو ہو کر ایک دوسرے سے پوچھتے۔ "پربت کی بیٹی کو کیا ہو گیا ہے؟"

اس کے جی کو شیو بھگوان نے کچھ ایسی چینک لگا دی تھی کہ وہ رات دن انہی کے نام کی سمرن کرتی رہتی۔ وہ لمبے لمبے برت رکھتی۔ پیاس کے دکھ سہتی۔ بھگوان کے سامنے بیل کے پتوں۔ جنگلی بیروں اور آنسوؤں کی لڑیوں کے چڑھاوے چڑھاتی۔ پر شوجی کے من میں تو مستی بسی ہوئی تھی۔ انھوں نے اما کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا وہ کبھی کبھی اس کے پاؤں کی چاپ سے اتنا جان لیتے تھے کہ ہماچل کی بیٹی پوجا کرنے آئی ہے۔ پر انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ پربتوں کے راجہ کی بیٹی کیسی ہے؟

1۔ ہمالیہ کی ایک مشہور جھیل جس کا ذکر سنسکرت کی کتابوں میں بکثرت آیا ہے۔ اس جھیل سے کوئی دریا نہیں نکلتا۔ ہاں دریائے ستلج کا منبع مانسرور کے قریب ہے۔

2۔ پاربتی یا پربت کی بیٹی کوئی عام انسان نہیں۔ بلکہ شوجی کی شکتی ہے۔ اس کے دو روپ ہیں۔ اپنے پہلے روپ میں وہ گوری۔ ستی۔ اما، پاربتی اور ہماوتی ہے اور دوسرے روپ میں کالی درگا اور چنڈکا۔ پہلے روپ میں وہ حسن کی مورت ہے اور دوسرے میں جنگ کی دیوی۔ اسے مہادیوی۔ مہامایا۔ بھیروی اور بھوانی بھی کہتے ہیں۔

یہ دیکھ کر دیوتا سناٹے میں آگئے۔ ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ کوئی ایسی تدبیر ہونی چاہیے کہ مہادیو ستی کو بھول کے اُما کو چاہنے لگیں۔ کیونکہ برہما [1] جی کہہ چکے ہیں کہ جب شو جی پاربتی سے بیاہ کریں گے۔ ان کے ہاں ایک لڑکا [2] پیدا ہوگا جو سنسار کو راکشسوں [3] کے ظلم سے چھڑائے گا۔ اس لئے جب تک لاسے مہادیو کا بیاہ نہیں ہوتا دھرتی پر یونہی پاپ کا اندھیرا چھایا رہے گا۔

آخر دیوتاؤں کے راجہ اندر [4] نے لکشمی [5] کے بیٹے مدن [6] کو بلا بھیجا جو پریم کا دیوتا ہے۔ اور جس کے زہریلے بانوں سے انسان تو انسان دیوتا بھی نہیں بچ سکتے۔ اور کہنے لگے ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ مہادیو کسی ڈھب اُما کو چاہنے لگیں۔ اگر تم سے اتنا بھی نہ ہو سکے تو تمھارے بان جو پریم کے بس میں بجھے ہوئے ہیں اور کس کام آئیں گے۔

شو کا نام سن کر مدن کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ اور اس کی استری رتی ایسے کانپنے لگی۔ جیسے مینہ کی بوچھاڑ میں چمپا کی پنکھڑی کانپ رہی ہو مدن کو مہادیو پر تیر چلانے کا ہواؤ تو نہیں پڑتا تھا پر جب اندر نے کہا۔ "گھبراتے کیوں ہو۔ رتوں کا راجہ بسنت [7] جس کی سانس میں کلیوں کی باس ہے۔ تمھارے ساتھ ہوگا۔" تو مدن کی ٹوٹی ہوئی ہمت بندھ گئی۔ اور وہ کمان کو کندھے پر ڈال۔ رتی کو ساتھ لے کیلاش کی طرف چلا۔ آگے آگے بسنت پھول بکھیرتا جارہا تھا اور پیچھے پیچھے یہ دونوں جنے چلے آرہے تھے۔

اس سمے سارے جنگل اور بن سنسان تھے۔ پربت کچھ اس ڈول سناٹے میں تھا۔ جیسے اُما کا دکھ اس سے دیکھا نہیں جاتا۔ کالی۔ نیلی۔ ملگجی' اور سپید چٹانیں اس طرح سو رہی تھیں۔ جیسے ان کے دل پر کوئی بڑا بوجھ ہو۔ ہوا رکی ہوئی تھی۔ پن چادروں کا شور مدھم پڑ گیا تھا۔ پکھیرو گھونسلوں میں دبکے ہوئے تھے۔ چشمے اور تال آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے پہلو میں کسک دبائے سر نہوڑائے کھڑے تھے ہاں کبھی کبھی ہوا سسکیاں بھرنے لگتی۔ تو یہ خیال ہوتا کہ اب یہ آنسو پربت کے گالوں پر پھوٹ بہیں گے۔

---

1. برہما دنیا کا خالق ہے۔ اسے پرجاپتی بھی کہتے ہیں۔ رامائن میں لکھا ہے کہ پہلے ہر طرف پانی پھیلا ہوا تھا۔ اس میں سے دھرتی ابھری اور برہما جی نمودار ہوئے۔
2. شو اور پاربتی کے لڑکے کا نام رکیہ ہے۔ اسے سکندر اور کمار بھی کہتے ہیں۔ وہ دیوتاؤں کا سنیاسی (سپہ سالار) اور جنگ کا دیوتا ہے۔
3. ایک مخلوق کا نام ہے۔ راون جو رام چندر جی کے ہاتھوں مارا گیا۔ راکششوں کا ہی سردار تھا۔ رامائن میں لکھا ہے کہ جب ہنومان جی لنکا گئے تو انھوں نے وہاں ہر قسم کے راکشش دیکھے۔ ان میں سے کچھ خوبصورت تھے۔ کچھ بدصورت۔ کچھ موٹے کچھ دبلے پتلے۔ کچھ لمبے کچھ بونے۔ بعض کے سر ہاتھیوں جیسے تھے۔ بعض کے سانپوں کے مانند۔ اس زمانے کے عالموں کا خیال ہے کہ راکشش وہ لوگ تھے جو آریاؤں کے آنے سے پہلے ہندوستان آباد تھے۔ آریاؤں نے انھیں دکن کی طرف دھکیل کے ملک پر قبضہ کر لیا۔
4. اندر آکاش کا دیوتا اور دیوتاؤں کا راجہ ہے' وہ مینہ برساتا اور فصلیں اگاتا ہے۔ بجلی کا کڑکا (رعد) اور دھنک (قوس قزح) اس کے ہتھیار ہیں۔ سورگ کا راج بھی اسی کے قبضے میں ہے۔ ایراوت اس کے ہاتھی کا نام ہے اور اندرانی اس کی بیوی ہے۔ اندر آریوں کا پرانا دیوتا ہے۔ ویدوں میں اس کا ذکر جگہ جگہ آیا ہے۔
5. لکشمی دولت کی دیوی ہے اسے شری بھی کہتے ہیں۔ پرانوں میں لکھا ہے کہ جب دیوتاؤں نے سمندر کو بلو کے اس میں سے امرت نکالا تو لکشمی ہاتھ میں کنول کا پھول لیے سمندر کے جھاگ سے نمودار ہوئی۔ ہری بنس جو سنسکرت کی ایک مشہور نظم ہے۔ کام دیو کو لکشمی کا بیٹا بھی کہا گیا ہے۔
6. بسنت بہار کا دیوتا ہے' جو مدن کا دوست سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ اکثر خواہشیں اسی موسم میں بیدار ہوتی ہیں۔
7. مدن کے بہت سے نام ہیں۔ وہ آم کی پتلی ٹہنیوں سے اپنی کمان بناتا ہے مدھ مکھیاں کمان کی تانت کا کام دیتی ہیں۔ یونانی دیومالا میں ایروس یعنی کیوپڈ محبت کا دیوتا ہے۔ [illegible] کمان سے دلوں کا شکار کرتا پھرتا ہے۔ لیکن اس کی آنکھیں نہیں۔

پر جب پانچ تیروں والا دیوتا مدن اپنی استری رتی کو لے کے کیلاش کے بنوں میں پہنچا تو ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ چنچل کرنیں پربت کی گود میں مچل رہی ہیں۔ جن کی جوت سے اندھیرے جنگلوں میں اجالا سا ہو گیا ہے۔ چنانچہ اس طرح دمک اٹھیں جیسے ان کے سینوں میں آگ دہک رہی ہے۔ پچھوا بہکی چشموں کا پانی ہلکورے لینے لگا ندیاں شور مچانے اور لال اور سپید پتھروں پر سر پٹخنے لگیں۔ ہری ہری دوب کے فرش پر پھولوں اور کلیوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اور ہوا ان کی خوشبو سے مہک اٹھی۔ شفتالو کی ٹہنیاں خوبانی کے پیڑ میں پھنسیں۔ انار کی کلیاں انگور کے پتوں میں کھچڑی ہو گئیں۔ چنبیلی کی ڈالیاں لچکے کے ساتھ اٹھیں اور آپس میں مل گئیں۔ عشق پیچہ بادام کی ٹہنیوں سے لپٹ گیا۔ اور انگور نے اپنی نازک باہیں چنار کے گلے میں ڈال دیں۔ کنول کی سپید کلیاں ندی کے پانی میں اپنا روپ دیکھنے لگیں۔ بھونروں کے جھنڈ گونجنے لگے۔ پکھیرو سرک کے ایک دوسرے کے پاس آ گئے۔ اور ان کی کوک سے دلوں میں ہوک سی اٹھنے لگی۔

مدن نے دور سے دیکھا کہ درختوں کے جھرمٹ میں دیودار کا ایک پرانا پیڑ ہے جس کی ٹھنڈی چھاؤں سے دل میں ٹھنڈک پڑتی ہے۔ پیڑ تلے مرگ چھالا ہے اور مرگ چھالا کچھ دور ہٹ کے کیشپ[1] کا بیٹا نندی سنتری کی طرح پہرہ دے رہا ہے۔

مدن نے کندھے سے کمان اتاری۔ پرندے چہکارے بھرنے لگے کیلاش کی گپھاؤں میں جو تپسوی مدتوں سے بیٹھے تپسیا کر رہے تھے ان کا بھی من ڈول گیا۔ ایکا ایکی نندی نے کہا "چپ" اور بن پر سناٹا چھا گیا۔ پرندوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ہوا نے سانس روک لیا۔ مدھ مکھیاں گاتے گاتے ٹھٹھک گئیں۔ پھر مدن کو دیودار کے پیڑ تلے شو کی جھلک سی نظر آئی۔ گورا رنگ اور اس پر بھبھوت کا بانا۔ جیسے راکھ میں آگ چمک رہی ہو۔ گلے میں کھوپڑیوں کی مالا بازوؤں سے ناگ لپٹے ہوئے۔ گورے ماتھے پر ہلکی ہلکی لکیر جیسے کسی پنچھی کے پنکھ چشمے کے تھمے ہوئے پانی سے چھو کر اس پر سلوٹ سی ڈال گئے ہوں۔

مدن سمجھ گیا۔ یہ مہادیو کی تیسری آنکھ ہے۔ جس میں سارے سنسار کو بھسم کر ڈالنے کی شکتی ہے۔ یہ اگر کھل گئی تو اس سے کوئی نہ بچ سکے گا۔ یہ سوچ کر اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ مڑا اور بسنت اور رتی کو پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے جھاڑیوں میں دبک گیا۔

وہ پریم پتی ۔ جگت جیت مدن۔ جس نے نہ جانے کتنے مردوں اور عورتوں کو پریم کے بندھنوں میں جکڑ دیا تھا۔ وہ کام کا دیوتا جو بھگوان کے من میں سب سے پہلے پیدا ہوا۔ وہ دلوں کا شکاری جس کے بانوں سے ان گنت سینوں کو چھید ڈالا تھا۔ آج سہما ہوا تھا اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں موتیوں کی طرح ڈھلک رہی تھیں۔ اور سانس پچھوا کی طرح چل رہا تھا۔

بسنت نے کہا۔ کوئی آ رہا ہے۔ رتی کہنے لگی سچ مچ کوئی آ رہا ہے۔ پر یہ کون ہے جو مہادیو کے استھان میں یوں بے دھڑک چلا آ رہا ہے۔ یہ کوئی دیوتا ہے یا کوئی تپسوی جس نے تپسیا کے بل سے تینوں لوکوں[2] کو جیت لیا ہے۔ نہیں یہ تو ایک سندر استری ہے جس کے روپ میں سورج کی جوت اور جس کے جوبن میں کونپل کی پھبن ہے۔ یہ کسی گندھرو[3] کی کنیا ہے جو بادلوں پر پاؤں رکھتی دھنک کے چنچل رنگوں کو روندتی ہوئی ابھی ابھی آکاش سے اتری ہے یا سورگ کی اپسرا[4] ہے۔ جس کے گورے گورے پاؤں تلے پربت کا

---

1. کیشپ رشی سات مشہور رشیوں میں ایک ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ برہما کے پوتے تھے۔ وایو پران میں لکھا ہے کہ شوجی کا بیل نندی ان کا بیٹا ہے۔ لیکن صرف ایک نندی ہی پر موقوف نہیں۔ بہت سے دیوتا ان کی اولاد میں سے ہیں۔ کیشپ رشی دکش جی کی تیرہ بیٹیوں سے بیاہے گئے تھے۔ جن میں سب سے بڑی کا نام ادیتی تھا۔ ادیتی سے کئی دوسرے دیوتا پیدا ہوئے اور باقی سے دوسری مخلوق نے جنم لیا۔
2. تین دنیائیں۔ دھرتی سورگ (بہشت) اور پاتال۔ مگر ہندوؤں کی بعض کتابوں میں سات اور بعض میں آٹھ لوکوں کا ذکر آیا ہے۔
3. گندھرو ایک آسمانی مخلوق کا نام ہے جو دیوتاؤں کو گا بجا کے رجھاتی ہے۔ اسی لئے موسیقی کو گندھرو بدیا بھی کہتے ہیں۔
4. گندھرو کی استری۔ سورگ کی ایک حسین مخلوق۔ حور۔

دل مارے خوشی کے دھڑک رہا ہے۔ نہیں یہ نہ تو کسی گندھرو کی کنیا ہے نہ سورگ کی اپسرا۔ یہ پربتوں کے راجہ ہماچل کی بیٹی اما ہے جو شردھا کے بل اور بھگتی کی شکتی سے وہاں آ پہنچی ہے۔ جہاں دیوتا بھی پاؤں نہیں رکھ سکتے۔

اما مہادیو کے سامنے پہنچ کر ڈنڈوت کو جھکی۔ تو اس کے بالوں کی ایک لٹ کھل کے اس کے تمتماتے ہوئے گالوں پر آ رہی۔ مدن نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے کمان میں تیر جوڑا۔ شوجی نے مسکرا کے آنکھیں کھول دیں۔

کتنے لال ہیں۔ اس کنیا کے ہونٹ۔ لال اور رس بھرے۔

یہ خیال شوجی کے من میں لو کی طرح لپک اٹھا۔ انہوں نے پہلی بار پربت کی بیٹی کو آنکھ بھر کے دیکھا تھا۔

پھر وہ ننھی سی لو کانپی اور کانپ کے بجھ گئی۔ "میرے جی میں یہ بات کہاں سے آئی۔ کیسے آئی۔ میرے من نے اسے جنم نہیں دیا یہ تو کہیں باہر سے آئی ہے۔ چپکے چپکے 'دبے پاؤں چوروں کی طرح لال اور رس بھرے ہونٹ' یہ بات میرے من میں کس نے ڈال دی ــــ کون ایسا ہے ــــ؟"

یہ سوچتے سوچتے ان کی بھویں تن گئیں اور پھر ایکا ایکی انھوں نے اپنی تیسری آنکھ کھول دی۔ وہی آنکھ جس میں تمام سنسار کو جلا کر راکھ کر ڈالنے کی طاقت ہے۔

لال لال شعلے نکیلی زبانیں نکالے ہوئے بڑھے۔ اور دلوں کے شکاری کو جو جھاڑیوں کی اوٹ میں کمان کا چلہ چڑھائے گھات لگائے بیٹھا تھا۔ جلا کر راکھ کر ڈالا۔ رتی نے اپنی آنسو بھری آنکھیں اٹھائیں۔ مرگ چھالا سونا پڑا تھا۔ شوجی کہیں نہیں تھے۔ ہاں اما پھولوں بھری ڈالی کی طرح سر نہوڑائے کھڑی تھی۔ اس کا جوڑا اب پوری طرح کھل گیا تھا۔ اور لمبے لمبے بال اس کے پاؤں میں لوٹ رہے تھے۔

(۲)

جب اما نے دیکھا کہ اس کا روپ اور جوبن شوجی کے من سے ستی کی یاد کو نہیں مٹا سکا۔ تو اس نے سارا گہنا اتار ڈالا۔ ست لڑے ہار کو یوں نوچ کے پھینک دیا کہ اس کی رگڑ سے چندن کا لیپ آپ ہی آپ اتر گیا۔ کان کے بندوں کو غصہ میں یوں نوچا کہ کان لہولہان ہو گئے۔ پھولوں کے جھومروں کو پاؤں تلے روند ڈالا اور ریشم کا سوہا جوڑا جس میں سونے کے تار گندھے ہوئے تھے اتار کے درختوں کی بھوری چھال سے اپنا بدن ڈھانک لیا۔ اور گھر بار چھوڑ ایک سنسان جنگل میں جو آبادی سے دور راہ باٹ سے کٹا ہوا تھا کٹیا بنا کے رہنے لگی۔

پر اس برن میں بھی اس کے روپ کی چمک دمک کم نہیں ہوئی تھی۔ اور بھوری چھال کے جوڑے میں اس کا نکھرا ہوا جوبن یوں جھلک دکھائی دیتا تھا۔ جیسے پچھلے پہر کے دھندلکے میں پو پھٹ رہی ہو کیونکہ کنول کا پھول کائی میں گھرا ہوا بھلا معلوم ہوتا ہے اور بھونرا اس کے ہونٹوں کا رس پینے کے لئے اس کے گرد منڈلاتا رہتا ہے۔

پچھلے پہر وہ ندی پر جا کے اشنان کرتی۔ اور لوٹتے وقت پودوں کو پانی دینے کے لئے گگری بھر لاتی۔ جب بھوک بہت ستاتی۔ تو پھل پھلاری اور پیڑوں کی جڑیں کھا کے گزارہ کر لیتی۔ اور رات کے سمے اپنی نازک بانہہ کو تکیہ بنا کے پتھریلی زمین پر پڑ رہتی۔ جنگل کے پنچھی پکھیرو اسے اچھی طرح جانتے تھے۔ اور ہرن ہرنیاں اس سے یوں ہل گئی تھیں۔ جیسے وہ بھی کوئی ہرنی ہے جو راستہ بھول کے اس طرف آ نکلی ہے۔

آہستہ آہستہ اسے بھوک پیاس بھی بسر گئی۔ پہاڑ سی راتیں آنکھوں میں کٹنے لگیں اور نیند اس کی آنکھوں کو یوں چھوڑ کے چلی گئی کہ پھر اس کا کوئی اتا پتہ نہ ملا۔ جب تو اس کا یہ حال ہوا کہ جو تھوڑا بہت وقت ان دھندوں میں خرچ ہو جاتا وہ بھی تپسیا میں کٹنے لگا۔ اس کا جسم جو

نئی کھلی ہوئی کلی کی طرح نرم اور تازہ تھا۔ کملا گیا۔ مالا پھیرتے پھیرتے انگلیوں پر گٹے پڑ گئے۔ پر اس کے جپ تپ میں کوئی فرق نہ آیا۔

لاکو یونہی تپسیا کرتے مدتیں بیت گئیں۔ ایک دن وہ کٹیا کے ورانڈے پر کھڑی تھی۔ کہ ایک برہمن جو شاید راستہ بھول کے ادھر آ نکلا تھا۔ کٹیا کے پاس سے گزرا۔ اور لاکو دیکھ کے رک گیا۔

لانے برہمن دیوتا کے پاؤں دھلائے۔ ان کی پوجا کی۔ اور پھل پھلاری ان کے سامنے رکھ کے چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔

برہمن پہلے تو ٹکٹکی لگائے اس کے منہ کو تکتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔ اے کنول کے سے نینوں والی میں دیکھتا ہوں۔ کہ ہرن تجھ سے بہت ہلے ہوئے ہیں۔ وہ کش[1] گھاس کے تنکے تیرے ہاتھوں سے چھینے لئے جاتے ہیں۔ اور تو بھی ان ہرنوں اور ہرنیوں میں بہت خوش معلوم ہوتی ہے۔ پر سندری ایک بات پوچھوں۔ برا تو نہ مانے گی۔ تو اس سنسان بن میں کیوں اپنی جوانی گنوا رہی ہے۔ تجھے تو چاند ایسے چہرے سے کسی راجہ کے نواس کو جالنا چاہیے تھا۔ کیونکہ یہ چھال کے کپڑے بڑھاپے کا سنگار ہیں۔ ایسی تپسیا تو ہم ایسے بوڑھوں کا کام ہے جو زندگی سے نراش ہو چکے ہوں۔ میری سنے تو اس جنگل کو چھوڑ کے اپنے گھر چلی جا۔ یہاں تیری رسیلی جوانی کی بہار دیکھنے والا کون ہے؟ اچھا میں سمجھ گیا۔ تیری ٹھنڈی سانس نے تیرے دل کا بھید کھول دیا۔ تو نے کسی کی چاہت میں یہ دھج بنا رکھی ہے۔ پر دھرتی پر کون ایسا ہے۔ جسے تو چاہے اور وہ تیرے قدموں پر نہ آ گرے۔ اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر کی سل ہو گی۔ کہ وہ تیرے اداس چہرے، بکھرے بکھرے بالوں اور آنسو بھری آنکھوں کو دیکھتا ہے اور اس کا جی نہیں پسیجتا۔ نہ تیرے ہاتھوں میں مہندی ہے نہ تیری آنکھوں میں کاجل۔ تیرے کان بندوں سے خالی ہیں۔ اور تیرے سینے کو جسے ہاروں سے ڈھکا ہونا چاہیے تھا۔ سورج کی تیز کرنیں جھلس رہی ہیں۔ وہ کون ہے جو یہ سب کچھ دیکھتا ہے اور اسے تیری حالت پر ترس نہیں آتا۔

مجھے تو کوئی ایسا برہمن سمجھتی ہے۔ جو صرف باتیں کرنا جانتا ہے پر اے پتلی کمر والی کنیا۔ میں نے بھی تپسیا کی ہے۔ مجھ میں بھی اتنی شکتی ہے کہ اگر چاہوں تو تیرے پریتم کو تجھ سے ملا دوں۔ اس لئے مجھ سے اپنا بھید مت چھپا۔ اور صاف صاف بتا دے کہ کس کی چاہت تیرے جی کی گاہک ہوئی ہے۔

لا بولی "برہمن دیوتا۔ میں شو بھگوان کے سوا اور کسی کو نہیں چاہتی۔

برہمن ٹھٹھا مار کے ہنسا۔ اس کی ہنسی میں بادل کی گڑگڑاہٹ تھی اور اس کے اجلے اجلے دانت بجلی کی طرح چمک رہے تھے۔ شو! میں شو کو جانتا ہوں۔ پر اس کے پاس کیا رکھا ہے کہ تجھ ایسی دیوی اس کی چاہ میں اپنا جوبن گنوائے۔ شو تو بھکاری[2] ہے بھکاری۔ اسے تو پہننے کو کپڑا بھی نہیں جڑتا اور میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ وہ گیت جوڑنے والے شاعروں کی طرح سپنے دیکھتا رہتا ہے۔

لا ٹھنڈی سانس بھر کے کہنے لگی۔ دیوتاؤں کے ڈھنگ نیارے ہیں ان کی باتوں کو ہم تم نہیں سمجھ سکتے۔ تم شو کو بھکاری کہتے ہو پر دیوتاؤں کا راجہ اندر اسے ڈنڈوت کرتا ہے۔ اور برہما جس نے سارے سنسار کو پیدا کیا۔ اس کی مہما کے گیت گاتا ہے۔

برہمن بولا "میری سنو تو ____"

لا کی بھنویں تن گئیں اور وہ کڑک کے بولی۔ "چپ! میں اور کچھ سننا نہیں چاہتی۔"

---

1. ایک قسم کی گھاس جو پوجا کے کام آتی ہے۔

2. شو کا حلیہ اس طرح بتایا گیا ہے کہ ان کے سر پر بالوں کا جوڑا ہے جو سنکھ کی طرح کا معلوم ہوتا ہے۔ گلے میں کھوپڑیوں کی مالا ہے اور بازوؤں سے سانپ لپٹے ہوئے ہیں۔

پر ایکا ایکی اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اور وہ یوں رک گئی جیسے پتھریلی چٹان کا ایک ٹکڑا کسی چنچل ندی میں ٹوٹ کے آپڑے اور اس کا راستہ روک لے۔ کیونکہ برہمن کی جگہ مہا دیو کھڑے مسکرا رہے تھے۔

اُما اپنے روپ اور جوانی سے تو شو کے من کو بھا نہ سکی۔ پر اس کا تپ وشوا نا تھ[1] کو اس کے دوارے لے آیا۔

پھر وہ پانچ تیروں والا دیوتا بھی جی اٹھا۔ جو مردوں اور عورتوں کو پریم کے بندھنوں میں جکڑتا ہے۔ اور جس نے اپنے زہریلے بانوں سے ان گنت سینے چھید ڈالے ہیں۔

جب آموں پہ مور آتا ہے اور اس پر بھنوروں کے جھنڈ گونجنے لگتے ہیں۔ تو مدن بے کھٹکے دلوں کا شکار کرتا پھرتا ہے۔ پر جب سے اس نے شوجی پر تیر چلانے کا ہواؤ کیا ہے' وہ کسی کو نظر نہیں آتا۔

ا۔ وشوا ناتھ بھی شوجی کا نام ہے۔ جس کے معنی سب کا مالک ہیں۔

حاجی بغلول لاہور میں

اشرف صبوحی

کیانام کہ بسم اللہ الرحیم۔ معاف فرمایئے گا حضرات اور حاضرات الرحمٰن کہنا تو ہم بھول ہی گئے۔ کیا کریں سب سے پہلے ہمارے جدامجد نے گیہوں کھا کر چوک کھائی تھی، ہم بھی اگر بھول چوک نہ کھائیں تو ان کی اولاد ہونے کا دعویٰ کس منہ سے کریں۔ دوسری بات یہ بھی بھول جایئے کہ ہم مولوی نہیں تو حاجی ہیں حاجی۔ ہمارا نام نامی اس طرح ہے۔ حاجی بلیغ العلی ابن حاجی بدر الدجیٰ مکی مدنی ثم لکھنوی ثم بدایونی ثم دہلوی۔ یہ ثم ہمارے عرب کی بول چال ہے۔ آپ حضرات کو اس ترکیب کے استعمال کا کوئی حق نہیں۔ البتہ اس کے بالمقابل آپ سرمہ لکھ سکتے ہیں۔ جیسے سید محمد بدایونی، سرمہ بریلوی۔ یاایہاالناس! کیانام کہ آپ میں سے جو حضرات سو کے پیٹے میں ہیں۔ وہ تو جانتے ہیں کہ ہم سید سجاد حسین ایڈیٹر "اودھ پنچ" کے دست راست و دست چپ تھے۔ جس طرح ایک مخلص مومن کی تعریف میں یہ حدیث قدسی ہے کہ میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم بھی اس سیدزادے کا دماغ بن گئے تھے جس سے وہ سوچتا تھا۔ ہاتھ بن گئے تھے جس وہ لکھتا تھا۔ الغرض سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے ہمارا ہی تخیل اس پر سوار تھا۔ کیانام کہ وہ غریب جلدی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ ہم نے بھی اس کے ماتم میں قیصر باغ کے جلسے یک قلم موقوف کر دیئے۔ نخاس کا پھیرا لگانا چھوڑ دیا۔ امام باڑہ سے منہ موڑ کر گومتی کے کنارے دھونی رما کر بیٹھ گئے۔ کیانام کہ بارہ اور بارہ چوبیس برس کے بعد ایک اور سیدزادے میاں محفوظ علی بدایونی ہمیں زبردستی بدایوں لے آئے۔ وہاں لا کر بے چارے نے زور تو بہت لگایا کہ ہماری طبیعت کی جولانیاں بڑھیں۔ مگر جناب توبہ کیجئے

لکھنو بھی چھٹ گیا وہ عشق بھی باقی نماند
آں قدح بشکست وآں ساقی نماند

آخر مجبور ہو کر بدایونی ہمیں دلی لے آئے اور اجمل خاں کے مطب میں لے جانے کی بجائے "ہمدرد" کے دفتر میں بند کر دیا۔ یہاں علی برادران سے ہمارا تعارف کرا دیا گیا۔ انھوں نے ہر طرح ہماری خاطر مدارات کی۔ طبیعت سنبھلتے سنبھلتے سنبھل گئی اور پھر وہی ہنسی دل لگی، چہل، تفریح، پھکڑبازی جو ہماری عادت ثانیہ تھی، عود کر آئی۔ اور ہم دوبارہ دنیا کے چار کھونٹ مشہور ہو گئے۔ چند سال بعد "ہمدرد" بند اور علی برادران جیل میں نظر بند۔ کیانام کہ اس قید و بند کے زمانے میں یہی مناسب معلوم ہوا کہ ہم بھی اپنی آنکھوں

تک شام و سحر بند کر لیں اور حبس دم سے کام لیں۔ یاد نہیں کتنے سال سوتے رہے اور جب اصحاب کہف کی طرح بیدار ہوئے تو دنیا کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔

صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک دور ‌‌‌ ‌ ‌ نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

دفعتاً "لے کے رہیں گے پاکستان" کے نعرے ہر چھوٹے بڑے کی زبان سے سننے میں آئے۔ وہ جو کہتے ہیں زبان خلق نقارہ خدا۔ بس خدا نے پاکستان بنوا دیا۔ ہمارا پاکستان دیکھنے کا شوق جب حد سے بڑھ گیا تو کیا نام ہم آنکھوں میں سرمہ سلیمانی لگا کر بغیر پاسپورٹ کے لاہور میں آوارد ہوئے۔ قیام کی فکر دامن گیر تھی اور ہم سڑک کے درمیان کے وسط میں چل رہے تھے۔ سامنے ایک چوک آیا اور پیچھے سے تانگے والے نے آواز دی "بچ موڑ توں۔ "خیر صاحب ہم ایک طرف کو ہو گئے۔ آگے بڑھے تو بڑے ہسپتال کے قریب کئی فوٹو گرافر بیٹھے تھے۔ ایک صاحب نے جھٹ کیمرہ سنبھالا۔ ہم نے کڑک کر کہا "تصویر نہیں اترواتے ہے" وہ بولا "مجھے تو اتارنی ہے۔ قسم ہے ہزاروں کاپیاں ہاتھوں ہاتھ بک جائیں گی۔" اس پر ایک اور صاحب نے جیب سے فیتہ نکال کر سر ناپتے ہوئے فرمایا۔ بھائیو! جس کے سر کا دور چودہ انچ ہو اس پر پچیس گز کا عمامہ بھی بندھا ہو اور ابرو اس طرح آگے کو جھکے ہوں جیسے خس پوش سائبان۔ ناک کا بانسہ حرف غلط کی طرح مٹ گیا ہو اور نتھنے ایسے ہوں جیسے تہ خانے کے روشندان۔ اوپر کا لب چھوٹا نیچے کا جبڑا مع زنخداں آگے کو ابھرا ہو۔ ٹانگیں چھوٹی اور موٹی۔ اس پر ایک ٹانگ میں لنگ بھی ہو' منہ پر چھتر شاہی داڑھی۔ ایک عدد جریب زیتونی ہاتھ میں لے کر جب ایسا شخص پر قدمی چال چلے تو کون ایسا بے ذوق ہو گا جو ایسی تصویر کا گاہک نہ ہو۔ ایک اور صاحب ہنس کر فرمانے لگے اس تصویر کے نیچے یہ بھی لکھ دیا جائے "ڈارون کی تحقیق کا نچوڑ۔ یعنی افریقہ کا بندر۔" اس پر کیا نام کہ ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔ جن صاحب نے یہ پھبتی کسی تھی وہ نزلہ بخار کا شکار تھے۔ ان کی آنکھ' ناک اور منہ سے پانی جاری تھا۔ کیا نام کہ ہم نے کہا صاحب زادے راوی' چناب' جہلم کی روانی تو دکھا چکے اب ستلج اور بیاس کے دہانے بھی کھول دو۔ اور اگر یوں نہ کھلیں تو شورہ قلمی کی مدد سے کھل جائیں گے۔ اور ساتھ ہی تمہاری آنکھیں بھی کھلیں گی اور پہچان لو گے کہ افریقہ کا بندر تمہارا بزرگ حاجی بغلول ہے۔ کیا نام ہے کہ یہ سنتے ہی وہ جھینپ گئے اور یہ صدا لگاتے ہوئے ایک طرف کو چل دیئے۔

عزیز و حق تعالیٰ کبریا ہے ‌ ‌ شرف بغلول کو جس نے دیا ہے

پھر ہم نے فوٹو گرافر سے کہا ہم حاجی ہیں' ہماری تصویر کھینچ کر شیطان کا آدھا عذاب تمہیں اٹھانا پڑے گا۔ مسافروں سے ٹھٹھا مخول نہ کرو اور کسی سرائے کا راستہ بتا دو۔ وہ بولا یہ رہی سامنے رتن چند کی سرائے۔ ہم نے وہاں جا کر ایک شخص سے پوچھا یہاں ٹھہرنے کا کیا لیا جاتا ہے؟ اس نے جواب دیا بڑے میاں! اس سرائے میں بسیں ٹھہرتی ہیں۔ آدمیوں کے لئے بازاروں میں ہوٹل ہیں۔ یکایک ایک چھاپے والے نے آواز دی گوکوشے لو۔ ہم خود گوشہ عافیت کی تلاش میں تھے۔ گوکوشے والے کے پاس کھڑے ہو گئے۔ خوش قسمتی سے اس وقت ایک واقف کار نظر پڑ گئے۔ "اور حاجی صاحب ابھی زندہ ہو۔" یہ کہہ کر بغل گیر ہو گئے اور اپنے مکان میں لے آئے۔ اور ان ہی کی وساطت سے کچھ ادبی انجمنوں اور مخصوص مشاغل کی صحبتوں میں شریک ہونے کا موقع ملا۔

کیا نام کہ ایک روز انجمن اخوان الادب کے مشاعرے میں شریک ہوئے۔ حاضرین نے پرجوش طریقے پر ہمارا خیر مقدم کیا اور اصرار کیا کہ ہم مختصر سی تقریر بھی کریں اور اپنا کلام بھی سنائیں۔ چنانچہ ہم نے کھڑے ہو کر کہا بھائیو! آپ کی بغلول نوازی کا شکریہ۔ اور دو دو عیدیں منانے پر مبارک باد۔ کیا نام کہ چپڑی اور دو دو۔ ایسا تو اتر تو ہم نے اپنی صد سالہ عمر میں کہیں نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے کہ

آگے چل کر کسی کو ے گا۔ تاریخ کے بعد ہی سے چاند نظر آنے لگے اور ایک دو کی بجائے آپ تین تین عیدیں منانے لگیں۔ اے پاکستانی بھائیو! کیانام کہ نماز عیدین سے مقصد اجتماع ملت ہے۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ عموماً ہر مسجد اور ہر میدان میں یہاں نماز عید ہوتی ہے دس بیس آدمی اکٹھے ہوئے اور کسی سبزہ زار پر کھڑے ہو کر نماز عید ادا کر لی چاہیے: بڑا اجتماع اس سے چند قدم کے فاصلے پر ہی کیوں نہ ہو۔ پھر صفوں کی ترتیب بھی نہیں۔ صف سے ہٹ کر جہاں سایہ دیکھا وہیں کھڑے ہوگئے۔ کیانام کہ آپ ہمارے کہنے کا برانہ مانیں۔ ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ آپ کا ملک بہت غریب ہے لیکن یہاں کاروں اور کوٹھیوں کی کثرت دیکھ کر یقین تو نہیں آتا۔ اگر واقعی ملک غریب ہے تو اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کے ملک میں کوئی احمق نہیں بستا۔ کیا یہ کہاوت آپ نے نہیں سنی:۔ چوں احمق در جہاں باقیست مفلس در نمی ماند۔

لیجئے حضرات ہمیں اتنا ہی کہنا تھا۔ عقلمند را اشارہ کافیست۔ اب خاص رنگ میں چند شعر ملاحظہ فرمائیے۔ عرض کیا ہے:۔

ہوئے ریچ کے ہم جو رسوا ہوئے نیوں نہ در گز عیا — وہیں رہتے مثل مینڈک وہیں غائیں غائیں کرتے
ہمیں کیا سمجھ کے تو نے دھتکارا اپنے در سے — کوئی کوے تھے کہ چھت پر تری کائیں کائیں کرتے
تری بات کا ستمگر نہ جواب بن پڑا کچھ — یونہی وقت ہم نے ٹالا فقط آئیں بائیں کرتے
یہ جریب اپنی موٹی کوئی تجھی ہوتی یارب! — تو اسے گھما گھما کر ابھی شائیں شائیں کرتے

سامعین کو یہ اشعار بہت پسند آئے اور تحسین و آفرین کا وہ شور بلند ہوا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ ہم نے یہ رنگ دیکھا تو اپنی جریب زیتونی سنبھالے ہوئے ڈائس سے اترے اور گھر روانہ ہوئے۔

اس مشاعرے کو ابھی دو روز بھی نہیں گزرے تھے کہ پاکستان کے رسائل و جرائد کے مدیران کی جو کانفرنس ہو رہی تھی اس کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا کہ مقبرہ جہانگیر میں چار بجے تشریف لائیے۔ آپ فرمائیں گے کہ آپ کا کیا علاقہ؟ تو کیانام ہم کسی زمانے میں "ہمیر الاخبار" کے ایڈیٹر رہ چکے تھے اس لئے یہ تقریب عمل میں آئی۔ چنانچہ ہم وقت مقررہ پر مقبرہ پہنچ گئے۔ یہاں ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ اور چاندی کی تھالی میں ایک ایڈریس بھی پیش کیا گیا۔ اس کا مضمون آپ بھی سن لیجئے:۔

بخدمت عالی متعالی حضرت حاجی بلغ العلیٰ ابن حاجی بدرالدجیٰ مکی مدنی ثم لکھنوی دام فیضہ۔ زندہ باد و پائندہ باد! ہم سب آپ کی تشریف آوری پر ہدیہ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں اس وقت اس برادری میں آپ کی شخصیت بابا آدم سے کم نہیں۔ آپ نے ہمیر الاخبار اس وقت نکالا تھا جب صرف ہینڈ پریس تھے۔ کاغذ اور دیگر سامان طباعت بھی کمیاب تھا اور ذوق اخبار بینی بھی اتنا عام نہ تھا جتنا آج کل ہے۔ آپ کی ہمت کو آفرین ہے کہ سخت مشکلات کے باوجود آپ نے اپنا مشن جاری رکھا خدا ہمیں بھی آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

ہم نے اس کا جواب دیا:۔

"ایہا الحاضرین والحاضرات! (آوازیں "یہاں کوئی مستورات نہیں") ہم نے کہا کیانام کہ "آپ کا یہ دخل در معقول و نامعقول ہمیں پسند نہیں۔ حاضرات تو آپ کی بائیں پسلی میں پھڑک رہی ہیں ذرا کو ٹھا ٹکانے کی دیر ہے اس طرح گرنے لگیں کہ جس طرح موسم خزاں میں پتے درختوں سے گرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم عمل حاضرات کے ماہر بھی تو ہیں۔ دیکھئے شروع کرتے ہیں "یا قاضی الحاجات۔ حاضرین کو بنا دے حاضرات یا قوی قادر حاضرات کو کر حاضر۔"

اتنا کہنا تھا کہ چند خواتین جو تفریح کے لئے آئی تھیں ہماری تقریر سننے کے لئے وہاں کھڑی ہو گئیں۔ لوگوں کے دلوں میں ہماری ولایت کا سکہ بیٹھ گیا۔ سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے ہم نے کہا۔

"کیانام کہ آپ نے جن خلوص و محبت، بزرگانہ اور مخلصانہ قسم کے جذبات کا اظہار فرمایا ہے وہ میرے لئے مایہ شترا عرابی ہے۔ لاحول ولا، بھولا صاحب وہ میرے لئے مایۂ فخر ہے۔ اور مرحوم بعیر الاخبار کا ذکر کر کے تو ع

اک تیر میرے دل پہ مارا کہ ہائے ہائے

کیانام کہ بعیر عربی میں اونٹ کو کہتے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی تو اس اونٹ اخبار کی بھی کوئی کل سیدھی نہ تھی۔ جب پرچہ چھاپنے کا وقت آتا تو پریس مین ندارد، کبھی کاتب غائب، نکلتے تو کبھی سنگ ساز فقیر ولی اللہ۔ غرض پریس کے عملے نے "البعیر" کی چولیں تک ہلا دیں۔ ہمارا کاتب بڑا تیز رقم تھا۔ اس نے زود نویسی میں نامہ اعمال لکھنے والے فرشتوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ جب جلی لکھتا تو یہ معلوم ہوتا گویا ہاتھی دوڑ رہے ہیں اور خفی لکھتا تو دال اور چاول پر قرآنی سورتیں لکھنے والوں کو بھی پرے بٹھا دیتا۔ غلطیاں درست کرتا تو یہ معلوم ہوتا کہ لاکھوں جوؤں کا خون بہہ رہا ہے۔ اگر چیپیاں لگاتا تو ساری کاپی سانپ کی کینچلی معلوم ہوتی۔ بس کیانام کہ ہمارا ہی جامہ تھا کہ یہ بار امانت جسے پہاڑ اور جنگل نہ اٹھا سکے ہم نے اپنی اکیلی لنگڑی ٹانگ پر اٹھا لیا۔

تجھ ہی سے اٹھیں میر یہ خواریاں   نہ بھائی ہماری تو طاقت نہیں

آپ نے ایڈریس میں کہا ہے کہ اب پہلے کی نسبت طباعت و کتابت میں آسانیاں ہیں خدا کرے ایسا ہی ہو۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔"

اتنا کہہ کر ہم بیٹھ گئے اور چائے کا دور شروع ہو گیا۔ پھر ہمارا تعارف مختلف اشخاص سے کرا لیا گیا۔ آپ "شہنائی" کے ایڈیٹر ہیں۔ آپ کی نغمہ نوازی پر سارا پاکستان جھوم اٹھتا ہے۔ آپ "سنگ و خشت" کے ایڈیٹر ہیں۔ بڑی سنگین قسم کی اردو لکھتے ہیں۔

پھر اخباری رپورٹر ہمارے گرد جمع ہو گئے اور سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ "کیا آپ ہندوستان واپس جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟" ہم نے جواب دیا کیانام کہ جب کوئی پھل آخر ہونے لگتا ہے۔ اور بازار میں کم کم دکھائی دیتا ہے تو پھل والے آواز لگاتے ہیں کہ خرید لو امیوہ چلا وطن کو۔ "تو میری بہار بھی ختم ہو رہی ہے۔ میرا وطن عرب ہے۔ لہٰذا براہ کراچی عرب جا رہا ہوں۔

"چھیڑ چھاڑ" کے نمائندہ نے سوال کیا "آپ نے اپنی عمر میں رومان بھی لڑایا ہے؟" ہم نے کہا "میاں صاحبزادے رومان لڑانا بیسویں صدی کی پیداوار معلوم ہوتا ہے۔ میں نے تو بیٹریں لڑائی ہیں۔ ہاں خوب یاد آیا ایک مرتبہ ذرا تعلق خاطر ہو گیا تھا، وہ بھی ایک دوشیزہ سے جس کا نام مراوتی تھا۔ مگر افسوس کہ نامراوی پلے بندھی۔" نبی صاحب نے فرمائش کی کہ مراوتی کے متعلق جو اشعار یاد ہوں وہ سنائیں۔ میں نے یہ کہہ کر لاکھ ٹالنا چاہا کہ میرے نجی معاملات سے آپ کو کیا غرض۔ مگر وہ نہیں مانے۔ مجبوراً دو شعر سنانے پڑے۔ آپ بھی سن لیجئے۔

یاروں کو کیوں یہ واقعہ اک کھیل ہو گیا   کیا امتحان عشق میں فیل ہو گیا
تن ہو گیا ہے سوکھ کے کانٹا ببول کا   اپنے تو حق میں عشق امر بیل ہو گیا

ساری مجلس قہقہوں سے گونج رہی تھی۔ اور یہ صحبت جو ہمیشہ یاد رہے گی۔ ختم ہو گئی۔ اللہ بس باقی ہوس۔

(۵)

اُردو افسانہ

پہلا دور

خارستان وگلستان

سجاد حیدر یلدرم

گلستان

آج سے دس ہزار برس قبل کا ماجرا ہے۔ بحر ہند میں ایک جزیرہ تھا جو اب ناپید ہے۔ چاندنی رات تھی' سطح آب پر سکون مطلق طاری تھا' اور اس سکون پر چاند اپنی شعاعیں ڈال رہا تھا۔ فضا میں خاموشی' بے پایاں سمندر' ڈراؤنی تنہائی' وحشت انگیز سکوت' کوئی صدا نہیں' کوئی اثر حیات نہیں۔ ایک غیر محدود مگر روشن تنہائی' ایک محشر سکون! یہ عالم ہے۔ چاند خاموشی کے ساتھ گویا سوچ رہا ہے' موجیں بھی سوچ رہی ہیں' چاند کی کرنوں کے سیلان سے بچا ہوا سایہ سوچ رہا ہے' بادلوں کے منتشر ٹکڑے سوچ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا اس خاموشی کا بھید چپکے چپکے سمندر کے کان میں کہنا چاہتی ہے اور نہیں کہہ سکتی' سمندر کا سینہ سانس لینے کی کوشش کرنا چاہتا ہے' تمام موجودات میں گویا ایک کروٹ لینے کی خواہش معلوم ہوتی ہے' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس بے پایاں سستی اور سکوت میں اگر کہیں سے ذرا سی صدا بھی آجائے تو دنیا ہنس پڑے گی' اچھل پڑے گی۔

نسرین نوش جزیرے کے دامن میں' سمندر کے ریت پر ایک سرو زریں کی طرح جو زمین پر گر پڑا ہو لیٹی ہوئی تھی کہ موجوں میں کچھ حرکت پیدا ہوئی' اور وہ نسرین نوش کے عریاں جسم' چاند جیسے عریاں جسم پر' گردن پر' بالوں میں سے گذرنے لگیں۔ ادھر سلسبیل قمر اس کے بدن پر پڑ رہی تھی' ادھر چھوٹی چھوٹی موجیں ایک دوسرے کو ہٹاتی آتی تھیں اور اس سیمیں تن کے کبھی بالوں میں سے گزرتی تھیں' کبھی اس کے گورے بازوؤں سے لپٹتی تھیں' کبھی اس کے بلوریں سینہ سے ملابست کرتی تھیں' کبھی اس کے ارغوانی پاؤں کو سہلاتی تھیں' اور اس کے بوسے لے لے کے آگے چلی جاتی تھیں' اور پھر لوٹ کر آتی تھیں اور قعر بحر سے موتی لا لا کر اس کے پاؤں پر نثار کر کے نہایت تعظیم اور احترام کے ساتھ واپس جاتی تھیں۔

نسرین نوش ایک پر لطف تھکن سے' ایک بے ہوش نشے سے آہستہ آہستہ بیدار ہوئی' اس کے چاروں طرف جو پریاں ایک ہالہ بنائے کھڑی تھیں۔ ان پر نظر ڈالی' اور اپنے لعل' لبوں سے برق تبسم گرا کے کہا۔ "میری پیٹھ ملو" اس پر چند خدامہ تعمیل حکم میں مصروف ہوئیں' اور اس کے بعد چند اور پریاں جو ریشمی تولیا' چادر وغیرہ لئے کھڑی تھیں' انھوں نے اس کے بازوؤں' سینے' اور پاؤں کو پونچھنا اور بالوں کو سکھانا شروع کیا۔ نسرین نوش اس شاہد لعل زریں کو جو چاند نے اس تک بنا رکھی تھی دیکھنے اور موجوں کی ارگن کو سننے لگی۔

اتنے میں ایک قسم کی چھوٹی پریاں، صدف البحر کی بنی ہوئی نفیریاں، اور دف اور سارنگی اور ستار غرضیکہ پورا ساز لئے ہوئے نسرین نوش کے گرد اڑنے اور ستار بجانے لگیں۔ نسرین نوش اٹھ کھڑی ہوئی اور ماہتاب کی طرف ہاتھ بڑھا کے، اس رات کے لئے اسے "خدا حافظ" کہا اور اپنی سہیلیوں کے کبھی کندھوں پر ہاتھ رکھ کے، کبھی ہاتھ میں ہاتھ ڈال کے پھولوں سے چھپے ہوئے راستے پر نسیم کی طرح خرام ناز سے چلنا شروع کیا۔

اس وقت پھول جھک جھک کے اسے سلام کرتے تھے، اور ایک دوسرے سے مل کر گویا تالیاں بجاتے، بنفشہ اس کے پاؤں چومنے اور روندے جانے کی تمنا سے راستہ میں آ پڑتا تھا۔ نسرین نوش پانچ منٹ تک چلی ہوگی کہ ایک کاشانہ بلور میں داخل ہوئی۔

چاند کا عکس اس محل کی کن دیواروں اور صحن کے فوارے پر پڑتا تھا، اور اس فوارہ نور سے ایک زمزمہ روح نواز پیدا ہو رہا تھا۔ حوض کے کنارے نیبو، نارنگی، ترنج کے پودے پھولوں سے لدے ہوئے دماغ کو فرحت دے رہے تھے۔ یہ سب ایک دستر خوان پر بیٹھ گئیں، زبرجد کے طباقوں میں طرح طرح کے کھانے اور میوے لائے گئے، خرمے، انار، انگور، سیب، شکار کے گوشت، مچھلیاں، لائی گئیں۔ لالے کے پیالوں میں، شراب، شربت گلاب پئے گئے۔

حوض کے دوسری طرف، ناچنے والیوں گانے والیوں نے ایک حلقہ باندھا اور رباب، مزمار، بربط استاد پر نسرین نوش کی حسن و ادا کی تعریف میں قصیدے، غزلیں، ٹھمریاں گانی شروع کیں گانا بھی وہ گانا جو ایک جوئے رواں کی طرح مسلسل تھا۔

ادھر سہیلیوں نے چھیڑ خانی شروع کی، رفتہ رفتہ لالوں اور پھولوں کو پھینک کے لڑائی شروع ہوئی، اور تھوڑی دیر میں پھولوں سے زخم کھا کھا کے پریاں گرنے لگیں۔

لذیذ شراب کے نشہ سے، نسرین نوش ہنستی ہوئی ایک سہیلی کی گود میں گر پڑی اور اپنے ہونٹ چوس چوس کر نظر اس طرح دور دور ڈالنے لگی۔ گویا عالم خیال میں ہے۔ سہیلیاں، اپنی مالکہ کے ہاتھ چوم چوم کے، اس کی بالوں کی خوشبو سے دماغ معطر کر کر، شراب کا ایک ایک گھونٹ پیتی تھیں۔

نشہ کا خمار چڑھنا شروع ہوا تھا کہ ناچنے والیوں کو پھر حکم ہوا۔

ساز پر پریوں کا ایک خاص ناچ، ایک رقیق، نازک، نورانی ناچ ناچا گیا۔

وہ گلابی، چمپئی، دھانی ریشمی ساڑھیاں جو پریوں کے سڈول جسموں سے لپٹی ہوئی تھیں، وہ اس ناچ کے چکروں میں مل کر طرح طرح کے نئے رنگ پیدا کرتی تھیں، پریاں تیتری کی ہلکی پرواز کی طرح ادھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر ٹھمک ٹھمک کے آتی جاتی تھیں، کبھی وہ ایک دوسرے سے ملیں کبھی علیحدہ ہو جائیں۔ کبھی دو کے درمیان میں سے تیسری گذر جائے کبھی حلقہ بندھ جائے کبھی ٹوٹ جائے۔ اس ملنے، جدا ہونے چکر کھانے سے رنگ اور نور کا انحلال اور اجتماع ایسا مختلف ہوتا جیسے ہشت پہلو شیشے میں سے آفتاب کی کرنیں گذر رہی ہوں۔ ان پریوں کا تھرک تھرک کے ملنا، پھر تتر بتر ہو جانا، شانوں کا ہلنا، بالوں کا بحر سنبل کی طرح لہرانا، نازک کمر [illegible] کھانا، جھک جھک کے دہرا ہو جانا، یہ سب باتیں سلیس و بلیغ گتوں سے (جو سازندے پریاں بجا رہی تھیں) مل کر ایک ایسا نشہ [illegible] پیش کرتی تھیں کہ کان موسیقی اور رقص میں تمیز نہیں کر سکتے تھے اور آنکھ نہیں بتا سکتی تھی کہ آیا موسیقی رقص کر رہی ہے [illegible] رقص نغمہ ساز ہے، کیا ہو رہا ہے۔

نسرین نوش [illegible] محو جلسہ رقص و آہنگ کو، ایک سہیلی، صبح خنداں کے زانو پر سر رکھے ہوئے ایک بے پروا، لاابالیانہ نگاہ

سے دیکھ رہی تھی اور ایسا نظر آتا تھا کہ ان چیزوں کی طرف زیادہ ملتفت نہیں، کیونکہ اس کی نگاہ کسی اور نقطہ پر گڑی ہوئی تھی۔

یہ نیم ماہتاب، یہ چاند کا ٹکڑا، وہ رات دن دیکھتی تھی اس لئے اس کی روح خفتہ کو جگانے یا اس کی دل میں حرکت پیدا کرنے کے لئے یہ کافی نہ تھے۔

اس وقت محل میں داخل ہونے کو اس کا دل نہ چاہا۔ اس کی طبیعت میں چاند کو دیکھ دیکھ کر یہ امنگ پیدا ہوتی تھی کہ اس کے عریاں جسم سے جا کر لپٹ جائے۔ وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ سہیلیوں نے اس کی طبیعت بہلانے کے لئے لطیفے کہانیاں، پہیلیاں کہنی شروع کیں کہ چاند اور سورج میں کیسی دوستی ہے، شہد کی مکھیاں پھولوں سے کیا کہا کرتی ہیں، بھونرا چنبیلی کے کان میں کیا بھنبھنایا کرتا ہے یہاں تک کہ آہستہ آہستہ اس نورانی آنکھوں میں نیند آنی شروع ہوئی، اس کے نرم جسم کو سہلا سہلا کے اس کے دماغ کو تھپکا تھپکا کر، ہلکے بادلوں کے پیچھے بھاگتے ہوئے چاند کو پیش نظر کر کے غرضیکہ عجب عجب دھوکے دے دے کے نیند اس کی آنکھوں میں چپکے سے آ گئی اور ان گھنی پلکوں کو ملا دیا۔

نسرین نوش کا نیند میں جانا تھا کہ ناچ بند کر دیا گیا لطیفے پہیلیاں ختم ہو گئیں۔ نہ صرف یہ بلکہ فوارے بند ہو گئے، وہ عندلیب جو پنجرے میں بند بیٹھی گا رہی تھی، چپ ہو گئی، ہوا کی سنسناہٹ بند ہو گئی، تاکہ نسرین نوش آرام سے سوئے۔ تمام رامشگر پریاں، سہیلیاں دبے پاؤں علیحدہ ہو گئیں، گھونگرو آہستہ آہستہ اتار ڈالے گئے۔ اتنے میں سفید بازوؤں والی چھوٹی چھوٹی پریاں حلقہ باندھ کے آئیں اور نسرین نوش کے گرد اڑنے لگیں، ان کے پروں سے کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ یہ پریاں نسرین نوش کی نگہبان تھیں۔

دو تین منٹ کے بعد ایک بڑھیا درختوں میں سے نکل کے جریب ٹیکتی ہوئی آہستہ آہستہ نسرین نوش کے پاس آئی اور نسرین نوش کے بدن پر جو چادر ڈال دی گئی تھی، اسے چہرے پر سے ہٹا کر، غور سے دیکھنے لگی۔ اس کے سوکھے چہرے پر آثار اطمینان ظاہر ہوئے۔ اور "الحمد للہ" کہہ کے جیسی آئی تھی ویسی ہی غائب ہو گئی۔

یہ نسرین نوش کی ماں تھی۔ اپنی لڑکی کو نہایت احتیاط اور بدگمانی سے رکھتی تھی، اور اس طرح ہر شام کو آ کر تحقیقات کرتی تھی۔

یہ معمر عورت سوچا کرتی تھی کہ میرے بالوں کو سفید کرنے والے، میرے دانتوں کو گرانے والے، میرے چہرے کو خراب کرنے والے یہ مرد ہی تو ہیں، ان کے ظلم ہی تو ہیں، اپنی اولاد کو میں ان مصیبتوں سے بچاؤں گی۔ اسی لئے میں اس لڑکی کو اس جزیرے میں لائی ہوں۔ اسے کھیل تماشے، دل بہلاوے، ہنسی دل لگی، آرائش و نمائش سب کچھ دوں گی، لیکن مرد کیا شے ہے، یہ نہ جاننے دوں گی۔ وہ فلاکت جس کا نام مرد ہے، اسے اس کے قریب نہ آنے دوں گی، لیکن اگر ڈر ہے تو اتنا کہ مجھے اطلاع ہوئے بغیر اس جزیرے میں کوئی مرد آ جائے، بہر حال اس وقت تو میری کل تدبیریں مکمل ہیں اور میرے دل کو اطمینان ہے۔

ماہتاب، دھیما ہو ہو کے، غائب ہو گیا۔ مگر نسرین نوش کے جسم نازک کو طلوع آفتاب کے سپرد کر تا گیا۔ سفید بازوؤں والی نگہبان پریاں ہٹ گئیں اور ان کی بجائے سہیلیاں گانے والیاں آ گئیں، جنہوں نے نرم و نازک آواز سے اسے جگانے کے لئے پیاری پیاری راگنیاں گانا شروع کیں۔ تھوڑی دیر میں، نسرین نوش نے اپنی مخمور آنکھیں کھول دیں، اور انگڑائیاں لیتی ہوئی اور اپنے پریشان بالوں کو سنوارتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ پھر ایک صاف شفاف نہر کے کنارے، نیلوفر کے پھولوں کی ایک چوکی پر جا کر بیٹھ گئی، پریاں بھی آ کر اس کے گرد جمع ہو گئیں۔

مشاطہ پریوں نے نسرین نوش کا سنگار کیا۔ نسرین نوش نہر کے صاف پانی میں اپنے عکس جمال کو دیکھ رہی تھی۔ تیتریاں ایک

دوسرے کا پیچھا کرتی ہوئی اڑ رہی تھیں، نہر کی روانی سے نرم صدا پیدا ہو رہی تھی، سہیلیوں نے پھر ہنسی کی باتیں شروع کیں، جن کو سن سن کر وہ پیارے باریک ہونٹ تبسم میں کھل کھل جاتے تھے۔

سہیلیوں اور خادمہ پریوں کے نام، گل چکاں، زہرہ جبیں، ناز آفریں، موج نور، بعضوں کے نام پھولوں پر مثلاً نیلوفر، سوسن وغیرہ بعضوں کے پرندوں کے اوپر، مثلاً طاؤس خرام، کبک ادا وغیرہ وغیرہ تھے، اور ان سب کے نام اور عنوان کے مناسب ان کا لباس تھا۔

سنگار کے بعد، اس صبح کے لئے ایک خاص رنگ کا لباس پہن کر، نسرین نوش نیلوفر کے پتوں کی کشتی میں بیٹھ کر سہیلیوں کے ساتھ تھوڑی دور تک نہر میں گئی، پھر یہ سب کنارے پر پہنچیں، جہاں بلور اور پھولوں کی ایک بگھی تیار کھڑی تھی، اس بگھی میں دو مادہ سیمرغ جتی ہوئی تھیں، اور اس انتظار میں کہ ان کی مالکہ بگھی پر سوار ہو گی، آمادہ روانگی کھڑی تھیں، جوئے رواں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نسرین نوش گاڑی میں سوار ہوئی، اور جوئے رواں کو اپنے پاس بٹھا کر "دیار گل" کو چلنے کا حکم دیا۔ اس حکم کے سنتے ہی، چند چھوٹی چھوٹی پریوں نے، جو چھوٹے چھوٹے بگل لئے کھڑی تھیں، کوچ کا بگل بجایا، اور اس تزک واحتشام کے ساتھ سواری روانہ ہوئی۔ سامنے طاؤس، کبوتر، قمریاں، طوطی، ناچتے، ہوا میں اڑان بھرتے، گاتے چہچہاتے اور طرح طرح کے تماشے کرتے جاتے تھے۔

سڑک پر پھول کی پتیاں، گلال، اور چاندی کے ذرے بکھرے ہوئے تھے، جو پہیوں کے چلنے سے اڑ اڑ کر گاڑی کے بلوریں پہیوں میں، پرندوں کے پروں میں جم جاتے تھے، اور اس سارے قافلے پر قوس قزح کا رنگ پیدا ہو جاتا تھا۔

آفتاب، افق سے اپنے نورانی بالوں کو سنوارتا ہوا، کچھ اونچا ہوا تھا کہ یہ قافلہ اس بلدہ شعر و خیال میں جسے نسرین نوش نے "دیار گل" کہا تھا پہنچا۔ یہاں کی وادی حقیقتاً وادی گل تھی۔ نسرین نوش کی تشریف آوری کی خوشی میں، تمام غنچے ایک دم کھل گئے، اور ان کی خوشبو نکل نکل کے اس کے جسم کو، کندھوں کو، چہرے کو احاطہ کر کے چومنے لگی، نسرین نوش گاڑی سے اتری، اتنے میں سہیلیاں، نوکرانیاں اور سازندے وغیرہ بھی پہنچ گئے۔

اب نسرین نوش نے اس زمان و مکان لطافت میں آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ سہیلیاں، تعظیم اور احترام کے انداز سے اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ اونچے درخت بھی اس ملکہ ملاحت کے سامنے جھک جھک کر اس کی خدمت میں پھول پیش کرتے تھے اور نسرین نوش ان پھولوں کو اپنے ان پیارے ہاتھوں سے (جن میں اور پھولوں میں صرف اس قدر فرق تھا، کہ یہ پھولوں سے زیادہ خوبصورت تھے) چھو چھو کر سہیلیوں کو ایک عظمت آمیز نیم غمزہ سے حکم کرتی تھی کہ "انھیں توڑو۔" زہرہ جبیں، گل چکاں کی گود ان پھولوں سے بھر گئی۔ ان پھولوں کا ایک تاج بنایا گیا جسے نسرین نوش نے پہنا، غرضیکہ اس طرح، نسیم صبح کے ساتھ، اور نسیم صبح کی مانند سب آہستہ آہستہ چل کے ایک اونچے موقع پر پہنچیں، جو مطلع آفتاب کے مقابل تھا، نسرین نوش کھڑی ہو کر آفتاب کی طرف جھکی اور پھر سیدھی ہو گئی، زاں بعد اپنے ہاتھ کو چوم کر گویا سورج کو ایک بوسہ بھیجا۔ یہ ایک آئین آفتاب پرستی تھا۔ اس بوسہ کے بھیجتے ہی، سہیلیاں ہنس ہنس کے، دوڑ دوڑ کے ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کے، بالوں میں پھول لگا لگا کے، ہاتھوں میں پھولوں کے پنکھے ہلا ہلا کے، نازک کمروں کو بل دے دے کر، آنکھوں کو شرارت سے پھرا پھرا کے، نسرین نوش کے گرد چکر لگانے لگیں۔ پھر کھڑی ہو کر آفتاب کی شان میں گانے گانے لگیں۔ پھر ان سب نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر، کبھی ہوا میں اڑ کر، کبھی زمین پر پاؤں مار کے آفتاب کے لئے ایک مستانہ ناچ ناچا، اور ایک دلربا گانا گایا۔ اس کلبانگ رقص و آہنگ کی لطافت میں درخت بھی جھوم جھوم کے، نسیم آہستہ

آہستہ گل کے شریک ہوئی۔ پھول ورخت' ہوا' سب سامنے وجد میں آگئے۔

نسرین نوش اس نشہ شعر کی کیفیت سے لذت یاب معلوم ہوتی تھی اور اس آئین آفتاب پرستی میں دل سے شریک تھی۔ آخر گل اس کو ختم کیا گیا لیکن پھر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ختم کرنے پر پریاں دل سے راضی نہیں تھیں کیونکہ آئین ختم ہوتے ہی وہ شجر کی شاخوں میں پھولوں کے بنے ہوئے جھولے ڈالے اور اڑ اڑ کے ایک جھولے سے دوسرے جھولے پر جانا جھولنا' ہنسنا اور کودنا پھاندنا شروع کیا' ایک مدت تک اس طریقے سے وقت گزرا۔

آخر کار نسرین نوش پھر گاڑی پر سوار ہوئی اور اسی انتظام کے ساتھ واپس ہو کر کاشانہ بلور میں جو دستر خوان کھانوں سے حاضر تھا اس پر مع سہیلیوں کے بیٹھی۔

غرضیکہ دن اس طرح گزرتے تھے۔ اکثر نسرین نوش صبح کے کھانے کے بعد قیلولہ کرتی تھی اور تیسرے پہر کو شکار کے لئے نکلتی تھی۔ نازک پیارے ہاتھوں میں تیر کمان لے کر کبھی کبھی مشق تیر اندازی کرتی تھی۔ کبھی غروب آفتاب کے قریب ساحل بحر پر غسل کے لئے جاتی تھی اور تیر اندازی کے بعد تھکن اتارنے کے لئے گلاب یا بنفشہ کا ابٹنا مل کے سمندر میں نہاتی تھی' رات کو سہیلیوں کو بلا کے گانا' پہیلیاں کہانی وغیرہ سے دل بہلاتی تھی۔ کبھی کوئی بحث شروع ہو جاتی اور یہ زمزمہ مکالمہ کبھی پر حدت ہو جاتا' گویا ایک منبع شفاف سے پانی گر رہا ہے' کبھی تیز اور بلند قہقہہ کی آواز آتی گویا ساز زور سے بجا' کبھی آہستہ آہستہ باتیں ہوتے ہوتے خاموشی طاری ہو جاتی گویا باد نسیم پھولوں میں ہلکے ہلکے چل کے رک گئی۔ چاندنی رات ہوتی تو ایک دو سہیلیاں ساتھ لے کر سیر کو نکل جاتی اس وقت نسرین نوش کا چلنا اس نہر کے پانی کی مانند ہوتا تھا جو بلور کی زمین پر بہہ رہی ہو۔ اور جس کے پانی کو معطر نسیم جنبش دے رہی ہو جس کے کنارے پھول کھلے ہوں اور بلبلیں اڑ رہی ہوں۔

نسرین نوش پانچ برس کی تھی جب اس جزیرہ میں پہلے پہل آئی۔ تیرہ برس سے اسی طرح خوشبوؤں میں' آرام میں' ناز و نعم میں' بے فکریوں میں' لاڈ اور پیار میں زندگی بسر کر رہی ہے' اور مجہول غیر مجسم خیالات میں مستغرق رہ کر دن ہنسی کے ساتھ اور رات متبسم خواب میں گزرتی ہے۔

لیکن ایک صبح خلاف معمول اس کے دل میں ایک جلن محسوس ہوئی۔ اٹھی' کاشانہ بلور کے قریب جو نہر بہتی تھی اس تک گئی اور نہر کے اندر جا کر لیٹ گئی اور دیر تک اس میں بے حرکت پڑی رہی۔ پھر نکل کے اور بدن کو سکھا کے' سفید ریشمی بستر پر جا لیٹی۔

نسرین نوش پر ایک سخت نیند غالب ہوئی' اور وہ شام تک سوتی رہی یہاں تک کہ سورج ڈھلا' سورج کی شعاعیں اس پر آکر پڑیں اور وہ جاگی۔ اس وقت اس کی طبیعت ایک ایسی شے چاہتی تھی' ایک ایسے مبہم وجود کی آرزو کر رہی تھی جو اس کے بازوؤں کو پکڑے' کمر کو سنبھالے' اس کے جسم کو اٹھا لے۔ ایک غیر معنی تمنا اس کے دل میں پیدا ہو رہی تھی' اور اس کا دل چاہتا تھا کہ ایک ذات' ایک وجود آئے' جو اس پر قادر ہو' جو اس پر حاوی ہو۔

اس نے دیکھا کہ اس کے پاس ایک سفید براق ہنس پھر رہا ہے۔ اسے ہی اس نے گود میں لے لیا' اور اس کے سفید سینے کو اپنے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا لیا۔ اور اس کی گردن کو اپنی گردن سے ملا دیا۔ اور اپنی تمام قوت سے اسے بھینچنا شروع کیا۔ اور اس طرح پرند کے نرم پروں میں' اپنی آنکھوں کو کچھ کھولے' کچھ بند کئے' بدن کو جھکائے دیر تک بے حرکت پڑی رہی۔

نسرین نوش انہی خوشبوؤں سے ان رنگوں سے ان پھولوں سے ان کھیل تماشوں سے اکتا گئی تھی اور ان سے چھٹکارا چاہتی تھی۔

اب پھولوں کا اس پر نثار ہونا اس کی روح کو مشغول نہ کرتا تھا۔ ناچنے والیوں کے ناچ اور عشوے اور غمزے اس کے دل کو نہ بہلاتے تھے سہیلیوں کا اس کے بدن کو ملنا اسے آرام نہ دیتا تھا۔ وہ ایک شے تلاش کرتی تھی جسے وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا ہوگی کیا نہ ہوگی، ایک مبہم چیز چاہتی تھی جو اسے دکھ دے، اس کے دل میں درد پیدا کرے، احساس پیدا کرے، اسے مسل ڈالے۔ ایک ملکی پر قوت، پر جرات شے کہ باوجود اس کے حسن و جمال کے باوجود اس کے کہ وہ جزیرے کی ملکہ تھی، اس سے نہ دبے، اس کے رعب میں نہ آئے، بلکہ اسے پکڑے، اسے مارے، ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

خارستان

تاڑ، برگد، سال، بیڑ اور ببول وغیرہ درختوں کے ایک اصلی اور قدیم جنگل میں سوکھے پتوں پر درندوں کے چلنے کی آواز، بیچ جنگل سے اٹھنے والی آندھی کے شور سے مل کر سمندر کے خروش سے باتیں کر رہی تھی، ہر زندہ شے اس فریاد کار ظلمت میں تدارک غذا، و گذران زمان کے لئے کبھی شیر انہ جرات سے کام لیتی تھی، اور کبھی ایک بودی جھجک سے کانپ اٹھتی تھی۔

ساحل کے قریب جہاں جنگل ختم ہوتا ہے، ایک تنہا موقع پر، ایک چٹان کے کنارے ایک مرد، غمگین، بے حرکت، حالت میں شام کے وقت شام کے ستارہ پر نظر گاڑے ہوئے ہے۔ چہرہ کی سرخی اس بات کا ثبوت دے رہی ہے کہ رگوں میں صحت مند خون دوڑ رہا ہے۔ کندھوں تک لٹکے ہوئے بال گھنے اور چمکدار ہیں اور بتا رہے ہیں کہ جسم کا نشو و نما جوش پر ہے۔

اس مرد نے انگڑائی لی، اور دور سے ایک شیر کی گرج کو مسکرا کے سننا شروع کیا۔ ....

آریاؤں اور ہندوستان کے قدیمی باشندوں سے بھی پہلے ایک قبیلہ ہندوستان سے ہجرت کر کے لنکا کے جزیرے میں جا بسا تھا۔ اس قبیلہ کی بے تاب طبیعت نے ایک خاندان کو مجبور کیا کہ جزیرہ سراندیپ سے نقل مکان کر کے اللہ توکل کسی نئے مقام کی تلاش میں نکل پڑے۔ کچھ لنکا میں زندگی کی دشواریاں کچھ قدیم انسان کی سیماب وار طبیعت، غرضیکہ یہ سراندیپ میں بھی نہ ٹھہرے، چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں سوار ہو کر اپنے تئیں بحر ناپیدا کنار کے سپرد کر دیا۔ سمندر کے طوفانوں نے بہت سی کشتیوں کو غرق کر ڈالا صرف ایک کشتی جس میں رئیس قافلہ کا بیٹا خارا، اور سات آدمی اور تھے، جزیرۃ العرب کے جنوب غرب میں ایک خالی جزیرہ کے کنارے آ لگی۔ عورتیں کچھ تو سمندر میں ڈوب چکی تھیں، دو ایک جو بچی تھیں وہ مصائب سفر سے جانبر نہ ہوئیں۔ خارا کی عمر اس وقت چار برس کی تھی۔ ان سات آدمیوں نے جو اس جزیرہ تک پہنچے تھے، اس قسمت کی ضد پر جس نے انھیں اس جزیرے میں لا پھنسایا تھا اور گذشتہ پر لطف زندگی کی یادگار کے طور پر اس بچے کو نہایت چاؤ اور پیار سے پالا، کشتی میں جس قدر آلات و اسلحہ تھے، یہ لوگ انھیں لے کر نکلے تھے، اور سب سے پہلا کام جو انھوں نے کیا وہ یہ تھا کہ خارا کی حفاظت کے لئے زیر زمیں غار نما ایک گھر بنایا، اور ایسا انتظام کیا کہ اس میں بھیڑیا، چیتا وغیرہ کوئی درندہ نہ گھس سکے۔ ان سات آدمیوں میں سے ایک آدمی ہر وقت خارا کی حفاظت کے لئے رہتا تھا، باقی صید و شکار کو نکل جاتے، شکار کا گوشت، اور بکریوں کا دودھ لا کر، اس بچے کو پالتے تھے۔ خارا نے پہلی بات جو سیکھی وہ اپنے تئیں درندہ حیوانوں سے بچانے کے لئے ان کا مقابلہ کرنا تھا۔ ابھی جزیرہ میں آئے چھ ہی مہینے ہوئے تھے کہ ایک دن خارا کے محافظ کو بڑی مسرت کا دن نصیب ہوا یعنی غار کے سامنے سے ایک چڑیا اڑ کر جا رہی تھی، خارا نے ایک پتھر کھینچ کر مارا، جس سے چڑیا زخمی ہو کر زمین پر آ پڑی۔ اس واقعہ پر بڑا جنگل میں منگل کیا گیا، اور ان ساتوں آدمیوں

نے مل کر اپنے رئیس زادے کی شان میں گانے گائے۔

اب خاؔرا ہر شے کو جس پر اس کا بس چلتا' توڑتا' پھوڑتا' بند کرتا کھڑ تا تھا' کسی چڑیا کا گھونسلا ہاتھ لگ جاتا تو اسے توڑتا انڈوں کو پھوڑتا' بچوں کا گلا مروڑتا تھا۔

ایک دن (کئی سال کے بعد) خاؔرا نے پہلی دفعہ ایک بارہ سنگھا شکار کیا ایک بڑا پتھر اس کے سر پر مارا جس کی ضرب سے بارہ سنگھا گر پڑا خاؔرا اسے کھینچ کھینچ کر غار تک لایا' اور اپنے ساتھیوں کو فخر کی ادا سے دکھایا۔ اس دن ساتھیوں نے پھر عید منائی اور خوشیاں کیں۔ اس بارہ سنگھے کے سر کو غار کے منہ پر لٹکایا۔ خاؔرا نے اس کی کھال سے جسے اس نے خود صاف کیا' اور سکھایا تھا' اپنے لئے ایک لباس بنایا۔ یہاں ہر طرف کانٹے' ہر طرف پتھر تھے اور پتھریلی زمین' اونچی چٹانیں' خوفناک گھاٹیاں' اس جزیرے کی اجزائے مرکبہ تھیں۔ جب کبھی آندھی اٹھتی تو جزیرے کے اونچے اور تناور درختوں میں سائیں سائیں کر کے شور مچاتی۔ کسی دن آندھی کی شدت سے درخت ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کے پتھر اڑ اڑ کر طغیانی انگیز سمندر میں گرتے تھے' اور جزیرے کے درندوں کا شور سمندر کے پرندوں کی چیخوں سے مل کر ایک محشر ہیجان پیدا کرتا تھا۔ اس وقت اس گوشہ عافیت یعنی خاؔرا کے غار میں ایک عمیق خوف طاری ہوتا تھا۔ خاؔرا اور اس کے ساتھی' ایک دوسرے سے ملے ہوئے' ناامیدی' نفرین' اور ڈر کے ساتھ اس وحشی غلغلہ کو سنتے تھے اور کانپتے تھے۔

کسی رات موسلادھار مینہ پڑتا' اور پانی ریلا کرتا ہوا اس غار تک آتا' بجلی چمک چمک کے' تڑپ تڑپ کے' بادل گرج گرج کے اس جزیرے کو گھیر لیتے' قدرت کے اس شور و شغب میں شیر کی ڈکار' ہاتھی کی چنگھاڑ' اور درندوں کی چیخ پکار قیامت برپا کر دیتی تھی' کبھی جزیرہ کی ایک طرف کوہ آتش فشاں آگ اگلتا اور اپنے چاروں طرف ہر زندہ شے کو جھلسا دیتا تھا۔

ہر طرف کانٹے' ہر طرف پتھر تھے۔ یہ سات آدمی تدارک معیشت کے لئے صبح نکلتے تھے اور شام کو واپس آتے تھے' مگر اس طرح کہ کانٹوں سے پاؤں زخم کھائے ہوئے' ہاتھ چھدے ہوئے' چہرے چھلے ہوئے' غار میں بیٹھ کر ان زخموں کو دھوتے' لیکن اس وقت ان زخموں کو دھونے اور چہرے اور ہاتھوں کو روغن ملنے کے لئے' عورت کے ہاتھ کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ اس ضرورت کو محسوس کر کے ان میں ایک بڈھا آدمی' غار کے سامنے کے ایک پتھر پر بیٹھ جاتا اور سفید لٹوں کو ہلا ہلا کے' اور زخمی سینہ کو کھول کے' سمندر کی پر عناد اور ظالم موجوں کی طرف گھونسا تانتا' اور قسمت پر لعنت بھیجتا۔

خاؔرا اس آفتاب کے تلے اس کیلی پتھریلی زمین پر' ان درندے حیوانوں میں پلا تھا' اس کے ہاتھ سینکڑوں مرتبہ چھل چکے تھے' سینہ پر ہزاروں مرتبہ کھرچیں لگی تھیں' چہرہ تمتما کے تانبہ ہو گیا تھا۔

غرضیکہ ہر طرف کانٹے' ہر طرف پتھر تھے' کبھی اس کے خون کا جوش اسے آدھی رات کو خواب سے بیدار کر کے باہر لے جاتا' اور ایک سائرفی المنام شاعر کی طرح جو فضائے نامتناہی کی سیر کر رہا ہو' خاؔرا بھی ایک چٹان پر بیٹھ کر خیالات میں غرق ہو جاتا' یہ ظاہر ہے کہ خیالات اس جزیرے اور خاؔرا کی کل زندگی کی مناسبت سے پر حدت ہوتے تھے' لیکن یہ عجیب بات تھی کہ کبھی کبھی نرم ونازک خیالات ایک سفید چھوٹی چڑیا کی طرح اس کے دماغ کے سامنے اڑتے نظر آتے تھے' اور کبھی اس کی سیاہ آنکھوں کے سامنے اس طرح مجسم ہوتے تھے جیسے ہوا چل رہی ہو اور درختوں کا متحرک سایہ کانپ رہا ہو۔

خاؔرا کی عمر اس وقت بیس برس کی تھی' حسیات کا ہجوم تھا اور اکثر راتیں وہ کسی پہاڑی پر درختوں میں گزارتا۔

ایک شام کو غار میں آیا اور بستر پر جا پڑا' تین دن تک بخار میں بیہوش پڑا رہا۔ اس بخار کی حالت میں اس کی پیاس بجھانے کے لئے اور سوکھے ہونٹوں کو تر کرنے کے لئے اُس کے ساتھی اسے جگا کر پانی دینا چاہتے تھے مگر وہ نہیں جاگتا تھا۔ اس وقت وہ بڈھا اپنے سوکھے ہاتھوں کو جس میں رگیں ابھری ہوئی نظر آتی تھیں اٹھا اٹھا کے کہتا! "آہ! ایک عورت! ایک عورت" اور پھر خارا کی تیمارداری کرتا۔ آخر خارا نے آنکھیں کھولیں اور اس کی حالت بہتر ہونی شروع ہوئی' تاہم نقاہت باقی تھی ایک شام' یہ ہمراہی خارا کے بستر کے گرد بیٹھے ہوئے تھے کہ بڈھے نے ایک پرانا راگ جسے وہ بھول نہیں گیا تھا' گنگنانا شروع کیا۔

"جینا تو ایک نیند ہے پیارے پریم ہے اس کا سپنا"

خارا نے پوچھا۔

"جینا کیا چیز ہے؟"

بڈھے نے جواب دیا" پریم"

"پریم کیا ہے؟"

"عورت"۔

اس طرح خارا سوال' اور بڈھا توضیح کرتا تھا۔ غرضیکہ نوجوان کو معلوم ہوا کہ زندگی میں کانٹے اور پتھر ہی نہیں ہیں' بلکہ پھول اور خوشبوئیں بھی ہیں' چیرنا پھاڑنا ہی نہیں' بلکہ ملنا اور گلے لگانا بھی ہے۔

اس کے بعد یہ نوجوان اپنے ہمراہیوں سے اکثر علیحدہ رہتا' اور اکثر سوچا کرتا' دن میں اسے اکثر کوئی نہ دیکھ سکتا تھا۔ کسی تنہا جگہ پر نکل جاتا' اور وہاں ایک مرمر کے ٹکڑے کو لے کر' بڈھے کی بیان کی ہوئی تصویر کے موافق ایک مورت بنانا شروع کرتا' جس کی پوری شکل اس کے خیال خانہ دماغ میں پھرتی ہوتی تھی۔ پہلے سر بنایا' پھر سینہ تراشا' پھر ہاتھ نکالے۔ اس جزیرے کی' چٹانوں میں اور سمندر کے کنارے' زمرد' الماس' لعل' یاقوت وغیرہ چمکدار اور رنگین پتھروں کی بہت کثرت تھی۔ خارا نے انھیں جمع کر کے' اس کی مورت کی آنکھ سفید اور سیاہ الماس سے' دانت موتی سے ہونٹ لعل و یاقوت سے بنائے۔ ایک برس کامل اس شغل میں بڑی حرص اور بڑے شوق سے مشغول رہا۔ ایک دن' ہمراہیوں نے آ کر اسے دیکھا اور بہت تعجب کیا' لیکن بڈھا ہنسا اور کہنے لگا۔ "اچھی ہے مگر حقیقت سے بہت دور ہے" تاہم خارا کے لیے یہ مورت ایک بدیہہ خیال تھی۔ اس نوجوان نے اپنے حسیات کی تمام قوت اس مرمر میں صرف کی تھی۔ صبح سے شام تک نظر اس مورت پر گاڑے رہتا اور اس درجہ مستغرق ہو تا کہ ہمراہی کھانے کے وقت آ کر اسے جبراً وہاں لے جاتے' اور اس وقت بھی خارا مورت کی طرف ہاتھ بڑھاتا اور پر شوق نظریں اس پر ڈالتا۔

اس طرح مہینے گزر گئے۔ خارا پتھر اور سلیں جمع کرتا تھا' اور اپنے خواب' اور خیالوں کی تصویریں ان پتھروں سے بنانا چاہتا تھا۔ لیکن اُسے خوف تھا تو صرف اس بات کا کہ بڈھے کے اعتراض اور استہزا سے یہ بچیں گی یا نہیں' کبھی کبھی ایک مورت بناتا' وہ ٹھیک نہ ہوتی اُسے توڑ دیتا' دوسری شروع کرتا۔ کبھی دوڑا دوڑا بڈھے کے پاس آتا اور اس سے سوال کرتا۔ "پھر بتانا' عورت کیا ہوتی ہے' کیسی ہوتی ہے؟" بڈھا دوان بادلوں پر اپنی نظر گاڑ کر' اس کے سوال کا جواب دیتا' اور کہتا" عورت! عورت آدھا میوہ' آدھا پھول ہے" پھر چپ ہو جاتا اور رونے لگتا' خارا گھنٹوں اس بڈھے کی آنکھوں پر سوال کی نظر ڈالے ہوئے' اس کی باتوں کو سنتا تھا اور سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ بڈھا اٹھ کر خارا کو لے کر' جنگل میں ایک طرف جاتا اور کسی تاڑ کے نیچے دو جرانے' اپنی گردن' ایک دوسرے سے ملائے

کھڑے ہوتے تھا نھیں دکھاتا اور کہتا۔ "دیکھتے ہو، سمجھتے ہو؟ کیسی ہے؟"

خارا کچھ نہ سمجھتا اور پھر سوال آمیز نظروں سے بڑے بڑے تکتے پھر نہیں کہتا۔ خارا نے کئی مورتیں تراشیں، اس میں وہ بغیر استاد کے محض اپنی طبیعت کے زور سے ماہر ہو گیا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس نے خود ہی یہ فن ایجاد کیا۔ اس کی حاصل عمر یہ مورتیں تھیں اور ان سے بے حد محبت کرتا تھا، محبت ہی نہیں پرستش کرتا تھا۔ یہ مقام گویا اس کا معبد تھا۔ مبارزۂ حیات سے تھک کر یہاں آتا اور گھنٹوں مبہوت نظروں سے ان مورتوں کو دیکھا کرتا، اور سوچا کرتا کاش یہ مورتیں سمندر پار کی حقیقت سے خبردار کریں، اور بتائیں کہ اس طوفان سمندر کے اس طرف، ان مورتوں جیسی زندہ مخلوق ہے کہ نہیں۔ کبھی اپنے خیالات کے تکمیل کرنے سے عاجز ہو جاتا، تو غصہ میں آکے ایک سیاحانہ وحشت سے کسی مورت کو توڑ ڈالتا پھر رنج کرتا اور نکل کھڑا ہوتا اور جو جانور ملتا، اسے بعنوان انتقام مار ڈالتا۔

رات کا وقت تھا، گھنے درختوں میں خارا چیتے کی کھال بچھائے بیٹھا کہ اتنے میں پاؤں کی خفیف آہٹ سنائی دی، تھوڑی دیر میں آہٹ زیادہ واضح ہوئی۔ اس نے سر پھرایا تو دیکھا کہ ایک بارہ سنگھا آرہا ہے، اتنے میں ایک لومڑی نکلی۔ بارہ سنگھے نے اپنے سینگوں پر لومڑی کو اٹھا کے پھینک دیا۔ یہ بارہ سنگھے کی شوخی اور کلیل تھی۔ لیکن یہ شوخی اور کلیل بہت دیر تک نہ رہی کیونکہ ایک تیندوا بارہ سنگھے پر لپکا، بارہ سنگھے نے اپنی جان بچانے کے لئے بھاگنا شروع کیا۔ خارا نہایت شوق سے اس گیر و دار اور بھاگ دوڑ کو دیکھ رہا تھا۔ بارہ سنگھا اپنی تمام قوت سے دوڑ رہا تھا، یہاں تک کہ تھک کر اس کی رفتار میں سستی معلوم ہوئی، پسینہ میں شرابور ہو گیا اور ہانپنے لگا، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود اسے اپنی جان کی سلامتی کی امید نہ رہی تھی۔ پندرہ منٹ کے اندر، تیندوا بارہ سنگھے تک پہنچ گیا اور اسے دبوچ لیا۔ خارا تعجب کر رہا تھا کہ بارہ سنگھا بہت جلد مغلوب ہو گیا، اور اس کا دل چاہتا تھا کہ بارہ سنگھے کو کسی طرح مدد پہنچائے کہ اتنے میں ایک گرج سنائی دی اور ایک بڑا سایہ جھپٹتا نظر آیا، سر پھرایا تو کیا دیکھتا ہے کہ یکہ تاز میدان شجاعت، بادشاہ بیابان وحشت یعنی شیر چلا آرہا ہے۔

شیر نے، تیندوے اور بارہ سنگھے پر ایک پر غیظ و غضب نظر ڈالی، اور پھر ایک پرہول ڈکار کے ساتھ پھلانگ مارتا نظر آیا، تیندوہ پہلے تو باوجود اپنی تھکن اور ضعف کے، ہرچہ باداباد آمادہ مقاومت معلوم ہوتا تھا، لیکن شیر کی زہرہ ریز گرج نے جو اس نے اپنی تمام قوت سے کی تھی، تیندوے کے حواس باختہ کر دیئے، اور وہ محجوب اور منفعل کانپتا ہوا، اپنا شکار اور اپنی نخوت شیر کے لئے چھوڑ گیا۔ تھوڑی دیر تو تیندوے نے آثار غصہ ظاہر کئے تھے اور اس کی طرف گھور کے دیکھا تھا، لیکن شیر کی آتش ریز آنکھوں سے کون آنکھیں ملا سکتا تھا۔ ان آنکھوں کا دوچار ہونا تھا اور گرج کا نکلنا تھا کہ تیندوے نے ہار مان لی۔ شیر نے، بارہ سنگھے کے جسم پر اپنے پنجے گاڑ کر اس کے ٹکڑے کرنا شروع کئے۔ خارا جو اس سے پہلے بارہ سنگھے اور تیندوے کی کشمکش بے پروائی اور بغیر خوف کے دیکھ رہا تھا اب ذرا سنبھل بیٹھا۔ اس کے دل میں خوف اب بھی نہ تھا، لیکن ذرا احتیاط سے بیٹھا ہوا تھا۔

اب شیر لپ لپ کر کے خون پی رہا ہے، ہڈیوں کو چبا رہا ہے۔ اور جھوم رہا ہے۔ غلبہ اور کامیابی کے نشہ میں، اپنی دم دائیں اور بائیں مار رہا ہے اور اس پر لطف ضیافت کو کھاتے وقت، مزے میں آ آکر کبھی اپنا سر اٹھا کے اوپر کو دیکھتا ہے۔

ایک دفعہ اس نے اپنی دم اٹھا کے، اور اپنے اگلے پاؤں، بارہ سنگھے کے مردہ جسم سے ہٹا کے نظر تفتیش سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اس کے سر اور ان ہڈیوں کو جن پر ابھی گوشت باقی تھا، چبانے کے لئے وہاں سے گھسیٹ کے لے جانا شروع کیا، اتنے میں شیر کی نظر

خارا پر پڑی' اور اس زرد خونخوار طاقتور مخلوق کی آنکھیں' اس جزیرے کے جوان انسان سے دو چار ہوئیں۔ آدھ گھنٹہ پہلے 'خارا اس افتخار مجسم یعنی شیر کو اس کی ہیبت اور طاقت سے متاثر ہو کر دیکھ رہا تھا اور اس غالب مغرور کی دل میں عزت کر رہا تھا۔ لیکن اس وقت جبکہ شیر اس کے سامنے تھا اس وقت ایک قدرتی جوش مقابلہ سے وہ اس کی طرف بڑھا' شیر بھی جاتے جاتے رک گیا اور شاخوں اور پتوں کو اپنے پاؤں کے نیچے دباتا' توڑتا اور کھڑبڑ کرتا ہوا خارا کی طرف چلا۔ غرضیکہ لڑائی کی ٹھن گئی' اور خارا نے شیر کے بائیں طرف سے اس پر حملہ کرنے کی ٹھہرائی۔

شیر نے سر اٹھا کر پھر اسے دیکھا اور اس پر کودنے والا ہی تھا کہ خارا نے ایک سیکنڈ رائیگاں نہ کر کے کمان کو پوری طاقت سے کھینچ تیر چھوڑا۔ تیر ایک ہوا چاک سرسراہٹ سے اس کی طرف گیا اور گردن میں گھس گیا۔ اس کے ساتھ ہی خارا نے اپنی ڈھال سنبھال کے اور ایک ہولناک "ہاؤ" کا نعرہ مار کے بائیں طرف پھرتی سے پھر کر' اپنا گرز شیر کی گدی میں (جو چھلانگ مار کر اس پر چھا گیا تھا) مارا۔ پھرتی اور طاقت خارا کے جسم میں بچپن سے ایسے مشاغل میں رہنے کی وجہ سے ہم جیسے آدمیوں کی نہ تھی' پس اس نے ادھر اپنی تمام قوت بازو سے گرز مارا' اور ادھر' اپنی کمر سے برچھی نکال کے' اب مارے غصے کے دیوانہ شیر کے پیٹ میں پوری گھونپ دی' اس دفعہ اس درندہ جانور نے پیچ کھا کے 'خارا کے بائیں بازو کو پکڑنا چاہا' لیکن اس کے منہ میں خارا کی ڈھال جو وہ بائیں ہاتھ میں لئے ہوئے تھا آگئی' اور شیر نے شدت غضب اور درد میں اسی کو چبانا شروع کیا' لیکن اس عرصہ میں بے حد خون شیر کے جسم سے نکل چکا تھا' اور اس پر ضعف طاری ہونا شروع ہو گیا تھا۔ خارا نے ایک دفعہ پھر پہلے کی طرح نعرہ مار کے' اور پہلی جیسی قوت سے برچھی کو گھسا دیا' آخر کار' شیر اپنے غرور جنسی کے باوجود' زمین پر آرہا۔ لیکن نوجوان نے اس گرنے کو اور اس مغلوبیت کو حیلہ تصور کیا' اور برچھیوں پر برچھیوں کے وار کرتا رہا۔

مگر اب شیر کی زرد' بے نور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں' پنجے پھیلے تھے' منہ بغیر نفس کے کشادہ تھا' جس میں سے اس کے بڑے دانت باہر نکلے ہوئے تھے' جو خون سے سرخ ہو رہے تھے۔ یہ وہی شیر تھا جس کی مہیب آواز اندھیری راتوں میں ہر جاندار کو کنپا رہی تھی' وہی شیر اب اس کے پاؤں کے تلے مسکین حالت میں پڑا ہوا تھا۔ یہ خیال خارا کے دل میں گذرا' تو اس کا سینہ ایک شیریں غرور جلاوت سے ابھرا اور وہ ایک خود کام نمائش کے ساتھ' اپنی تیر و کمان' ڈھال' برچھی اور گرز کو ایک جگہ رکھ کے نہایت فخر کی ادا سے شیر پر بیٹھ گیا' اور متخیل اور متفکر نظروں سے مشرق میں آہستہ آہستہ ابھرتے ہوئے نور پاش ماہتاب کو دیکھنے لگا۔

رات کی سیاہ پلکیں کھلنے کے بعد' صبح کا رنگین نور' آسمان میں ادھر ادھر سنہری تیر پھینک رہا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ تیر' تیز اور پر حدت ہونے شروع ہوئے۔ اور نوجوان کی آنکھیں صبح کے وقت' اور موقع اور گذشتہ واقع کی یاد سے پر نور' اور اس کا دل' دور سے دکھائی دینے والے سمندر کے شور کو سن سن کر' ذوق حیات سے محلذذ ہو رہا تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہے کہ نہایت پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ' رنگوں میں لپٹی ہوئی ایک شے صبح کے ایک مجسم ٹکڑے کی طرح' ہوا میں تیرتی ہوئی' خارا سے کچھ دور زمین پر آرہی۔ تھوڑی دیر میں' وہاں پہلے تو مشکوک اور مبہم اور پھر عیاں اور واضح ایک شکل لطیف پیدا ہوئی۔

خارا کا شیخ بڈھا' جب کبھی نہایت تھک جاتا' یا کسی اضطراب میں ہوتا' یا اور کسی تکلیف سے بیتاب ہو کر "عورت...... عورت' عورت" کہہ کہہ کے آہیں بھرا کرتا تھا اور خارا پوچھتا تو بیان کرتا کہ وہ کیا شے ہے۔ غرضیکہ یہ نازک شے' اس بڈھے کی بیان کی ہوئی چیز سے بہت ملتی تھی اور اس عورت سے' (جسے اس نے بڈھے کی تعریف کے مطابق' پتھر سے تراش کے بنائی تھی) بہت مشابہ

تھی۔ اس کو دیکھ کر نوجوان کا دل ایک عجیب پرشوق رقت سے کانپنے لگا۔ اور اس نے اس کی طرف اپنے ہاتھ بڑھا دیئے۔ اور سوچنے لگا کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں؟ اس کا دل چاہتا تھا کہ دوڑ کے اس سے چمٹ جائے۔ لیکن اس سے شیر کی طرح لڑائی نہیں لڑنا چاہتا تھا' بلکہ یہ چاہتا تھا کہ یہ شکار جو اس قدر رنگوں میں اس قدر رعب آمیز احتشام اور ایسی نزاکت کے ساتھ زمین پر آیا ہے اس شکار کو آہستہ آہستہ جا کے نہایت ہلکے سے چھوئے' اور اسے خوف نہ دلائے' بلکہ پھسلا پھسلا کے' چمکار چمکار کے پکڑے۔ سوچا کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟ اور یہ سوچ کے' سب آلات حرب ایک طرف رکھ دیئے' اور دبے پاؤں اس کی طرف چلنا شروع کیا۔ وہ قدم بڑھا رکھے گا وہ ایسے لگے کہ جیسے نسیم کسی چھوٹے پودے کو ہلاتی ہے' یہ خیال دفعتاً بھی جنبش کھا کے بادلوں کی طرف بڑھنے اور خلا سے دور ہونے لگا اور ایک منٹ کے بعد زمین پر چٹان کے ٹکڑوں اور پتھر کے روڑوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

عمر میں یہ پہلی دفعہ تھا کہ خدارا ویلا۔ غار کو نہایت رنجیدہ حالت میں واپس آیا اور اپنے ساتھیوں کو ساری سرگزشت سنائی۔ ساتھیوں میں سے بعض کہنے لگے "یہ خیال تھا" اور بعضوں نے کہا "نہیں تم نے خواب دیکھا ہے۔"

شیرازہ

ہر طرف کانٹے' ہر طرف پتھر تھے۔ اب خدارا سوچا کرتا تھا کہ کیا ان پتھروں اور کانٹوں سے رہائی ممکن ہے کہ نہیں کیا اس زخم کا جو اس کے دل میں ہے کوئی علاج ہے کہ نہیں۔ دوسرے افقوں کو کشف کرنے' نئے شکار' شکار کرنے' اس کے قعر جان میں جو خالی خالی ایک کونا محسوس ہوتا تھا اسے بھرنے اس کے دل میں جو ایک نامعلوم کمی تھی اسے پورا کرنے کی آرزو اسے پاگل کئے ہوئے تھی۔

وہ بیمار نہ تھا۔ کھاتا پہلے کی طرح کھاتا ہے' بھوک کھل کے لگتی ہے' درندوں کا شکار پہلی طاقت و قوت سے کرتا ہے' زندہ رہنے کی خواہش قائم ہے' ہر لڑائی اور مقابلہ میں جیتنے کی خواہش باقی ہے۔ پھر یہ ہر جگہ اور ہر وقت جو کمی اسے محسوس ہوتی ہے' یہ کیوں؟ یہ کس لئے؟ یہ اس کی سمجھ میں نہیں آتا اسے سمجھنا چاہتا ہے؟ لیکن اپنے ساتھیوں سے اس کا ذکر نہیں کرتا۔

جب یہ لوگ جزیرہ میں آئے تھے اس وقت سے اس وقت تک یہاں سے چھٹکارا پانے کے خواب تو بہت دیکھے لیکن سمندر میں پہلی دفعہ مصیبت اٹھانے کے بعد کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ پھر اس طوفان خیز' بے رحم' کس ناشناس موجوں کو اپنی جان سپرد کر دے' پس سوائے اس کے کہ اس شکستہ کشتی کی تقلید میں جو انہیں اس جزیرے تک لے آئی تھی ایک کشتی بنائیں اس خانہ ویران قافلے نے اور کچھ نہ کیا۔ ہاں کبھی کبھی ساحل کے قریب خدارا کو لے کر وہ ایک کشتی چلا کے مچھلیاں پکڑ لایا کرتے تھے۔

ایک رات جبکہ چاندنی کھلی ہوئی تھی' اور جزیرے میں خاموشی طاری تھی' خدارا آلات حرب' اور بہت سا خورد و نوش کا سامان لے کے جزیرہ خارستان کو "خدا حافظ" کہہ' کشتی میں بیٹھ سمندر سے مقابلہ کے لئے چپکے سے نکل کھڑا ہوا۔

اور اپنے دل میں کہنے لگا "موت؟ آخر کیوں؟ کس لئے؟ کوئی وجہ نہیں' ہرچہ باد اباد اس یکساں زندگی سے تو نجات ملے گی" یہ کہہ کہہ کے کبھی کشتی کھیتا' کبھی چھوڑ دیتا کہ کشتی اپنے آپ چلے۔ پو پھٹتے ہی اس کی آنکھوں کو جو رات کی بے خوابی سے بے تاب اور مخمور تھیں غنودگی خوشی کشتی کو اس کی طرف لے جانا شروع کیا اور شام تلک اپنی پوری کوشش اس میں صرف کرتا رہا' وہ اس قدر محو تھا کہ اسے نہ معلوم ہوا کہ تھکن کیا چیز ہے' نیند کیا شے ہے' بلکہ اپنے آپ اس کی طبیعت نے ایک گانا بنا لیا جسے وہ شوق سے گاتا رہا۔

منجدھار گہری نیکی ہے اور سندر ہے سنسار ناؤ تو چلیو پار' نیا تو لگیو پار

رات آدھی گذر چکی ہوگی کہ یکایک ایک بلبل کی نرم و نازک و شیریں آواز جسے عمر بھر میں اس نے کبھی نہ سنا تھا اس کے کانوں میں آئی۔ اس آواز کے نشہ سے مست ہو کر اس نے کشتی چلانی بند کر دی اور بے حس و حرکت بیٹھ کر اسے سننا شروع کیا۔ زمردیں ٹیلوں سے بوئے گل اور نوائے بلبل' نسیم کے جھونکوں کے ساتھ ساحل تک آ رہی تھی اور مستی اور خوشی پھیلا رہی تھی۔

اگرچہ چاندنی رات تھی' لیکن آسمان پر بادل ہونے کی وجہ سے' چاروں طرف کی چیزیں صاف نظر نہ آتی تھیں۔ خارا اس خفیف تاریکی میں' اس غیر معمولی حالت میں' اس راحت روح نغمہ و خوشبو کو بچوں کی طرح ہمک کے لینا چاہتا تھا' لیکن ان سب سے مست ہو کر۔ آنکھیں اور ہونٹ کھولے' سر پیچھے کو ڈالے کشتی میں پڑا تھا۔ اس کے کان جو درندے حیوان کی پر ہول آوازوں سے آشنا تھے' اب بلبل کا ترانہ سن رہے تھے' اس کا جسم جو کانٹوں اور پتھروں سے چھدا' اور چھلا کرتا تھا' پھولوں کی خوشبوئیں اس جسم کو آ آ کر لپٹ رہی تھیں۔ اور اس پر ایک پر لطف اور اشتیاق انگیز سستی طاری ہو رہی تھی۔ خارا اس قدر دلشاد تھا اور ایسا لطف اٹھا رہا تھا کہ اس خوف سے کہ اس میں خلل نہ پڑ جائے' کشتی میں ذرا نہ ہلتا تھا۔

جس وقت صبح ہوئی' اور گردونہ گلگونہ آفتاب' اپنے مطلع احتشام سے نکل کر آہستہ آہستہ اوپر کو بڑھا' اس وقت درختوں کے سبز پتے اور رنگ رنگ کے پھول چمکنے اٹھے' اور پتوں پر قطرات شبنم موتی بن گئے۔ خارا اس سے بے خبر کہ کہاں آیا ہوں' اور اس سے غافل کہ کیا دیکھ رہا ہوں' متحیر نظریں چاروں طرف ڈال رہا تھا۔ اتنے میں درختوں کے پیچھے سے ایک گرد باد اٹھتی اور قہقہہ اور زمزمہ کے ساتھ خارا کی طرف بڑھتی نظر آئی۔

نوجوان خارا جو اب تک نہیں جانتا تھا کہ ڈر کیا چیز ہے' اس وقت خلجان اور گھبراہٹ سے کانپنے لگا' اور ہر احتمال کے مقابلہ کے لئے تیاری کرنے لگا۔

یہ صرصر رنگ و سحاب' آہستہ آہستہ خارا جہاں کھڑا تھا' اس سے کچھ فاصلہ پر سمندر کے کنارے آکر رک گئی' اور جب خاک چھٹی تو اس میں سے ایک جسم منور ظاہر ہوا۔ خارا پہلی نظر میں نہ سمجھ سکا کہ آیا آفتاب زمین پر اتر آیا ہے' یا میں آسمان پر ہوں۔ یہ سوچے بغیر کہ کیا کرنا چاہیے' وہ اپنی کشتی سے نکلا' اور حسب معمول' اسی "ہاؤ" کے ساتھ اس نے اس پر حملہ کیا کہ یکایک ایک تیر نے سامنے سے آکر خارا کو زخمی کر دیا۔

نسرین نوش اپنا دل بہلانے کے لئے اکثر اپنی ماں سے اجازت لے کر شکار کو نکلا کرتی تھی' اس صبح کو' اپنی سہیلیاں پیچھے چھوڑ کر وہ بہت آگے نکل گئی تھی اور آخر کار تھک کر ساحل تک شکار اور غسل کے لئے آئی تھی۔

خارا مجہول اور غیر معلوم شکار کو دیکھ کر' اس نے فوراً اس پر تیر چھوڑا تھا جس سے یہ شکار زخمی تو ہوا' لیکن نسرین نوش نے دیکھا کہ زخم کھا کے وہ اس کی طرف جھپٹا اور قبل اس کے کہ دوسرا تیر چھوڑے' اس نے اپنے تئیں شکار کی آغوش میں پایا۔ اور شکار کرنے والی کی نظریں' ایک آتش ریز حرارت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملیں۔ نسرین نوش سمجھتی تھی کہ خارا کوئی نیا شکار ہے' خارا سمجھتا تھا کہ نسرین نوش کوئی شکار کرنے والی چڑیا ہے۔ مگر نہ معلوم کیا بات تھی اور کیا سبب تھا' ان کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ کیوں ان کی نظروں میں ایک دوسرے کے لئے کشش تھی۔ دونوں کے دلوں میں گھبراہٹ تھی' جانے کیسے' خارا کی فریاد سے نسرین نوش' اور نسرین نوش کی پر [illegible] مسکراہٹ سے خارا نے سمجھ لیا کہ ہم ہم جنس ہیں۔ نسرین نوش کا نرم ریشمیں لباس بارہ سنگھے کی کھال کے کپڑوں میں جسے خارا پہنے ہوئے تھا پھنس گیا' دونوں نے اسے چھڑانا چاہا مگر دیکھتے کیا ہیں کہ ایک کا ہاتھ' دوسرے کے ہاتھ میں ہے' او

مانیکسا ہاتھ دوسرے ہاتھ کو محبت سے دبا رہا ہے۔

خاؔرا نے اپنے پہلو پر جو نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ تیر کے زخم سے خون نکل رہا ہے، بجھے اس تردد سے کچھ نہ معلوم کیوں خاؔرا نے اپنے کل ہتھیار زمین پر ڈال دیئے۔ نسرینؔ نوش کے ہاتھ سے بھی حیرت کی وجہ سے تیر گر پڑے۔ اب ان دونوں میں اپنے آپ کو ایک بے تکلیف سے مراسم، مگر اسرار انگیز آمیزش نہانی پیدا ہو گئی۔ نسرینؔ نوش اس سے پوچھ رہی تھی "تو کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟" مگر خاؔرا اشاروں سے سمجھا رہا تھا "دور سے آیا ہوں کانٹوں سے، پتھروں سے آ رہا ہوں۔" ہاتھوں کے ملنے سے تو جوان خاؔرا کے جسم میں ایک عجیب برقی حرارت سرایت کر گئی تھی، جس کی وجہ سے وہ کانپ رہا تھا۔ ادھر خون نکلنے کی وجہ سے اس کے چہرے کا رنگ اڑا جا رہا تھا۔

نسرینؔ نوش نے آہستہ آہستہ تیر خاؔرا کے پہلو سے نکالا۔ خون کو اپنے کپڑے سے پونچھا اور زخم دھویا، پھر جا کے قریب سے چند پتے لا کے زخم پر باندھے۔ انھیں باندھتے وقت نسرینؔ نوش جو خارا پر جھکی تو ایک مرتبہ پھر ان دونوں کی نظریں، نظریں کیا ان دونوں کی روحیں ایک مبہم شوق کے ساتھ ایک دوسرے سے ملیں، اور اس دفعہ دونوں کی آنکھوں میں سے ایک جاں فروز چمک، ایک دل سوز چنگاری نکلی، موجیں ساحل کی طرف کیسے آتی ہیں؟ آفتاب کائنات پر کس طرح روشنی ڈالتا ہے؟ شہد کی مکھی کس طرح پھولوں کی طرف جاتی ہے۔ بس بالکل اسی طرح، ان دو بیگانہ روح آشنائے ہونٹ، ایک قدرتی کشش، ایک قدرتی شوق کے ساتھ ایک دوسرے سے ملے۔

یہ جزیرہ گو، بے انتہا خوبصورت تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک گراں خواب میں سو رہا ہے اور ہمیشہ سے کسی چیز کا انتظار ہے۔ ان دونوں کا ایک دوسرے کا بوسہ لینا تھا کہ جزیرے کے پرند، چہچہا کے اڑنے لگے، تمام کلیاں ایک دم کھل گئیں۔ ایک گرد آہنگ و رنگ، ایک زمزمہ جوش و خروش نے کل جزیرے کو گھیر لیا۔ اس وقت دونوں (خاؔرا اور نسرینؔ نوش) مدہوش و بے خبر پڑے ہوئے تھے۔ خاؔرا کو ایک ایسی خوشی حاصل ہو رہی تھی، جو اس نے تمام عمر میں اب تک محسوس نہیں کی تھی۔ اور اس نشہ کی لذت سے اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل رہی تھیں، آغوش کھلی ہوئی تھی، سینہ سانس کی وجہ سے ابھر رہا تھا اور دل ایک ننھی چڑیا کی اڑان کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔

پہلے نسرینؔ نوش ہوش میں آئی تو دیکھا کہ اس کے ہونٹوں پر، جہاں خاؔرا نے بوسہ لیا تھا ایک پھول کھلا ہوا تھا، یہ کیا؟ اس نے سوچا تو یاد آیا کہ ایک مرتبہ، جب وہ سو نہیں رہی تھی، بلکہ آنکھیں بند کئے تھی اور اس کی ماں حسب معمول اسے دیکھنے آئی تھی تو اس نے کہا تھا "خدا نہ کرے، مجھے خبر ہوئے بغیر، یہاں کوئی مرد آئے، لیکن اگر آیا تو مجھے معلوم ہو جائے گا، کیونکہ اگر اس نے میری بیٹی کا بوسہ لیا تو بوسہ کی جگہ پھول کھلیں گے اور اس سے مجھے پتہ لگ جائے گا۔" ماں کی یہ تقریر جب نسرینؔ نوش کو یاد آئی تو وہ گھبرائی ایں یہ تو مرد ہے! یہ وہ چیز ہے جس سے میری ماں مجھے بچانا چاہتی تھی، اب کیا کروں؟ یہ تو بڑا غضب ہو گیا۔ بڑی برائی ہوئی، مگر برائی کہتے وقت دل کہتا تھا "اگر برائی ہے تو شیریں اور پر لطف برائی ہے۔"

اب نسرینؔ نوش ہزار طرح سے خاؔرا کو سمجھانا چاہتی ہے کہ ماں آئے گی تو تجھ پر بہت خفا ہو گی، جا، جہاں سے آیا ہے وہاں بھاگ جا۔ لیکن خاؔرا نہ سمجھتا تھا نہ سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ آخر عاجز ہو کر نسرینؔ نوش رونے لگی، اور آنسو اس کے سرخ رخساروں سے ڈھلک کے زمین پر گرنے لگے۔ یہ آنسو گرتے ہی، موتی بن جاتے تھے۔

خاؔرا اس رونے سے بھی کچھ نہ سمجھا، بلکہ پہلی لذت کا جو اثر دماغ میں بسا ہوا تھا، اس سے متاثر ہو کر، پہلے جوش و اشتیاق کے

ساتھ نسرین نوش کو آغوش میں لے کر اُن رونے والی آنسوؤں سے تر آنکھوں کو چومنے لگا۔ اور جب نسرین نوش نے اپنے ہاتھ سے اسے اپنے پاس سے ہٹانا چاہا ہے' تو خارا نے' ہاتھوں ہی کو پکڑ کے چومنا شروع کر دیا۔

نسرین نوش اس وحشی مگر فسوں کار نسو دازدہ مرد کی آغوش سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہی تھی کہ دور سے اُس کی ماں آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ ماں' جو مرد کو سب سے بڑی مصیبت خیال کرتی تھی' وہ ماں' جو رات دن اسی دھن میں رہتی تھی کہ مرد کا گذر اس جزیرے میں نہ ہو' اب مرد کے روبرو تھی' اس کشمکش میں' اور نیز اپنی ماں کو آتا دیکھ کر' نسرین نوش' گھبراہٹ اور خوف کی وجہ سے بے ہوش ہو گئی۔ خارا نہیں جانتا تھا کہ بیہوش ہونا کیا چیز ہے' اس لئے اس نے اس بے ہوشی کو ایک ادائے تسلیمیت خیال کیا' اور نسرین نوش کے پریشان اور بکھرے ہوئے بالوں سے لے کر' پاؤں تک لگاتار بوسے لینے شروع کر دیئے اور سر سے پاؤں تک جہاں جہاں بوسے لئے تھے' وہاں پھول کھل گئے' یہاں تک کہ نسرین نوش کے جسم پر کوئی جگہ خالی باقی نہ تھی جہاں پھول نہ کھلے ہوں۔ (نسرین نوش کی ماں کے خارا تک پہنچتے پہنچتے نسرین نوش ایک گلدستہ لطیف بن گئی۔

بڑھیا' اپنی بھویں اٹھا اٹھا کے خارا سے' اس جزیرے میں آنے کا سبب پوچھتی تھی' مگر خارا نہ سمجھتا تھا' نہ سمجھنا چاہتا تھا' بس اپنے ہاتھوں کے گلدستے کو دکھاتا تھا' اور اپنی آغوش میں لے لے کر بھینچتا تھا' بڑھیا نے خیال کیا کہ "بہتر یہی ہے کہ اسے جزیرے سے نکال دوں' کیونکہ میں اس کا مقابلہ تو کر نہیں سکتی' "یہ سوچ کے اس نے اپنی جریب سے اشارہ کیا" جا اس جزیرے سے نکل جا۔"

خارا فوراً گلدستے کو اپنی گود میں اٹھا کر کشتی میں جا بیٹھا۔ نسرین نوش اب تک بے ہوش تھی۔ اس دفعہ ہوا اور موجوں نے خارا کی کشتی کی مدد کی۔ اور وہ بہت جلد جزیرہ خارستان کو پہنچ گیا' جزیرے کے کنارے اس کے تمام ساتھی' پریشان' مضطرب منتظر بیٹھے تھے۔ خارا اپنے مال غنیمت یعنی اس گلدستہ روح و راحت کو لے کر کنارہ پر آیا' تو اس کے تمام ساتھیوں نے جو مدت سے ان پھولوں کی خوشبو سے محروم تھے بہ کمال احترام' اس گلدستہ کی خوشبو سے اپنی مشام جان معطر کرنا شروع کیا۔ جب خارا نے اپنی سرگزشت سنائی' تو ساتھیوں نے تحسین اور حیرت بھری نگاہیں اس پر ڈالیں' اور سب سوچنے لگے کہ زندگی کی بڑی کمی کو پورا کرنے والی' یہ چیز' یہ لازمہ عمر یعنی یہ عورت کس طرح ہوش میں لائی جائے۔

آخر سب نے کہا کہ بڈھے کے پاس (جو غار میں تھا' ساحل تک نہیں آیا تھا) لے چلنا چاہیے' وہ کوئی ترکیب بتائے گا۔ بڈھے نے تمام حال کو سنا' اور خوشی خوشی' اپنے تمام تجربوں سے جو ہندوستان و سرندیپ میں سے حاصل ہوئے تھے نسرین نوش کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ دوائیں دیں' منتر پڑھے' پانی چھڑکا' یہاں تک کہ صبح ہوئی اور آفتاب عالمتاب' دنیا کو حرارت اور زندگی دیتا ہوا نمودار ہوا۔ اور اس وقت نسرین نوش کے جسم کے پھول' ایک ایک کر کے زمین پر گر پڑے اور یہ عورت اپنے تمام عورت پن' اپنی تمام نسوانیت' اپنی تمام شفقت' اپنی تمام شعریت کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اب نسرین نوش اپنے تئیں خارا کے قوی بازوؤں پر جوش سینے کو پانے سے خوش تھی' اور ایک نسوانی غرور کی ادا سے' چاروں طرف دیکھتی تھی' اور ہنستی تھی۔ اس کے ہنستے ہی' اس خشک جزیرے کے پہاڑ اور گھاٹیاں سبز ہو گئیں۔ یاوہ و غمناک کانٹے' پھول اور سنبل بن گئے' اور عورت کی جادو بھری نظر' اور نیم خندہ سحر نے' اس مصیبت زدہ طائفہ کو جو مدت سے شفقت کے لئے ترس رہا تھا' جان تازہ بخش دی' اور یہ لوگ ان عذابوں کو جو انھوں نے اٹھائے تھے آن کی آن میں بھول گئے۔

انھوں نے' موتی' زمرد' لعل' یاقوت' فیروزے وغیرہ جو اس جزیرے میں پڑے ہوئے تھے' اور کوئی ان کی بات نہ پوچھتا تھا' اب جمع

کر کے لائے گئے اور نسرین نوش کے قدموں پر ڈال دیے گئے۔ اس حسن و آن کو دیکھ کے بڈھا لے پہ خوشی کا دورہ سا ہوتا تھا اور سر ہلا ہلا کے کہتا تھا۔

"تمہاری محبت پاش سودا ریز بانہیں نہ ہوں، جن میں ہیرے لگائے جائیں تو ہیروں کی کیا قدر رہ سکتی ہے اور اگر حنائی انگلیاں نہ ہوں، تو انگوٹھیوں سے زمردوں سے اور پیاری گوری گردنیں نہ ہوں تو موتیوں کے وجود سے کیا فائدہ؟"

بڈھا لے خوشی کے متوالا سا ہو گیا تھا، کچھ چپ ہو جاتا، لیکن ترنگ میں آ کر پھر کہنا شروع کرتا۔

"عورت! عورت ایک بیل ہے جو خشک درخت کے گرد لپٹ کے، اسے تازگی، اسے زینت بخش دیتی ہے۔ وہ ایک دھونی ہے کہ محبت کی لپیٹ سے مرد کو گھیر لیتی ہے۔ بغیر عورت کے مرد سخت دل ہو جاتا ہے، اکل کھرا بن جاتا ہے، یہ عورت کی شفقت و نوازش، یہ اس کی مسکراہٹ کا ہی اثر ہے کہ مردوں کا سینہ حال اور رنقِ حیات سے منور ہو جاتا ہے۔"

اب نسرین نوش کو ایک دست قوت مل گیا تھا جو اسے آغوش میں لے اور خدا کو ایک دست شفقت ہاتھ لگ گیا تھا جو مبارزہ حیات کی تلخیوں کو بھلا دے۔

بڈھا اس جوڑے کو دیکھ کر، وفور مسرت سے چپ نہ رہ سکتا، ناچنے لگتا، پھر کہتا۔

"عورت میں حسن نہ ہوتا تو، تو مرد میں جرات اور عالی حوصلگی نہ ہوتی، مرد میں عالی حوصلگی نہ ہوتی، تو عورت کی خوبصورتی و دلبری رائیگاں جاتی"۔

الحمد لمن قدر خیراً و خیالاً واشکر لمن صور حسناً و جمالاً

طوقِ آدم

سلطان حیدر جوش

آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں رسالہ یا اخبار کے ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے "ضرورت ہے" والے کالم کو کیوں پڑھتا ہوں اور اس میں اس قدر دلچسپی کیوں لیتا ہوں۔ میں اس کا جواب صرف یہ دے سکتا ہوں کہ اگر آپ میری جگہ پر ہوتے اور آپ کو بھی ایسا ہی تجربہ ہوتا تو آپ بھی ایسا ہی کرتے۔

مجھے اس کے بیان کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ میری کالج کی زندگی ایک عجب آزادی کے ساتھ گذری ہے میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کسی امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیاب نہیں ہوا۔ کبھی امتحان دینے کے بعد مجھے اپنی کامیابی کا یقین نتیجہ آنے سے پیشتر نہیں ہوا مجھے کتاب کے نام سے بلا کسی استثنا کے نفرت تھی۔ اگر کبھی اخبار وغیرہ کے دیکھنے کی خطا مجھ سے سرزد ہوتی تھی تو محض اس خیال سے کہ کسی نئے اشتہار کو معلوم کر سکوں۔ ریاضی سے مجھے اسی قدر لگاؤ تھا جس قدر ایک مسلمان کو ہو سکتا ہے۔ لاجک سے مجھے ایک ناقابل بیان الجھن ہوتی تھی اور فلاسفی سے مجھے للہی بغض تھا۔ میں خود تعجب کرتا ہوں جب میں یہ سوچتا ہوں کہ میں نے بی۔ اے کا ڈپلوما کس طرح پالیا۔

مستقل مزاجی مجھ سے اس طرح کوسوں بھاگتی تھی جس طرح لاحول سے شیطان۔ ہمیشہ ایک ہی چیز کو اچھا کہنا میری رائے میں اول درجہ کی جہالت تھی۔ میں کبھی فٹ بال ٹیم کے ساتھ ٹور پر جاتا تھا اور کبھی روزانہ سب کی استدعا پر بھی روزانہ کھیل میں شریک ہونے سے گھبراتا تھا۔ کالج کی زندگی نے مجھے "سیماب" کا خطاب دلوا دیا تھا۔ اور میں اسی خطاب سے عام طور پر مشہور تھا۔ ایسی طبیعت اور ایسا دل لئے ہوئے میں نے ڈگری لینے کے بعد پیارے کالج کو خدا حافظ کہا۔ ایک بھری دنیا میری اپنی بے شمار دلچسپیوں کے ساتھ میرے سامنے موجزن تھی۔ اور میں ناتجربہ کار ناواقف حیران۔ اس کے ساحل پر کھڑا سوچتا تھا کہ آنکھیں بند کر کے کود پڑوں یا نہیں۔

یہ اور سن لیجئے کہ میں اپنے فرسٹ ایئر کے زمانے میں اپنے جونیئر کم عمر دوست کے بار بار کہنے پر اس کے ساتھ بمبئی گیا تھا۔ میں کالج میں اسی سال پاس ہو کر شامل ہوا تھا اور وہ یعنی چرائسٹ انٹرنس میں تھا۔ آپ کو چرائسٹ کے سمجھنے میں دقت ہوگی۔ مگر یہ بھی ایک خطاب سمجھ لیجئے۔ جو اس کو تیسری جماعت کے زمانے میں ملا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ایک روز اپنی ریڈر کے یاد کرنے میں بآواز بلند مشغول تھا اور "سی۔ ایچ۔ آر۔ آئی۔ ایس۔ ٹی چرائسٹ معنی عیسیٰ" کی رٹ لگا رہا تھا کہ کسی بڑے طالب علم نے سن پایا اور بس اسی روز سے چرائسٹ مشہور ہو گیا۔ اس کے ساتھ مجھے اپنی عمر میں سب سے پہلے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ میں اسی کے

یہاں مہمان ہوا۔ اور یہ بھی سمجھنا مشکل نہیں کہ اس کی والدہ اور اس کی نو عمر چھوٹی بہن نے مجھ سے پردہ نہیں کیا۔ بمبئی سے پردہ گدھے کے سر سے سینگ سے زیادہ مفقود ہے۔ اور سچ یہ ہے کہ وہاں کے لوگ نہایت ترقی یافتہ اور آزاد خیال ہیں۔ میری رائے میں پردہ کیسی سے کیسی معتدل شکل میں بھی ایک نہایت وحشیانہ حرکت ہے ... . ممکن ہے کہ آپ اس معاملہ میں میرے ہم خیال نہ ہوں مگر آپ کی کمزوری کا جواب وہ سوائے آپ کے اور کوئی نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ مختصر یہ کہ اس گھر میں جو راحت مجھے اس قلیل زمانے میں ملی میں اس کو کبھی نہ بھول سکا۔ اور اس گھر والوں کا بے حد خلق اور مہمان نوازی میرے دل و دماغ پر ہمیشہ نقش رہی۔ دماغ پر تو اس وجہ سے کہ اس کے بعد سے چراغسٹ کے والدین کو ہمیشہ خط لکھتا رہا اور وہ انتہائے انسانیت کے ساتھ برابر جواب دیتے رہے اور دل پر اس وجہ سے کہ... ... خیر اس کی نسبت آگے چل کر معلوم ہو گا۔

ہاں اس جملہ معترضہ کو چھوڑیئے۔ میں نے جب کالج چھوڑا تو اپنا سامان وغیرہ ڈھونے سے فراغت حاصل کرتے ہی مجھے بمبئی کی لو لگی۔ میں نہیں کہہ سکتا کیوں مگر کوئی چیز تھی جو مجھے زبردستی لے گئی۔ میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ دن کو گشت لگاتا تھا شام کو سمندر کے کنارے دل دماغ کو تازہ کرنے جاتا تھا۔ مگر پھر یہ سوچتا تھا کہ آخر میں اس بحر ناپیدا کنار میں کود پڑوں یا نہیں!

چراغسٹ کے والدین مجھے قریب قریب روز ملتے تھے اور قریب قریب روز مجھے اپنے مکان میں اٹھا لے جانے پر مجبور کرتے تھے مگر میں خدا جانے کس کش مکش میں مبتلا تھا۔ میرے دل کو ایک گونہ تسلی بلاناغہ ہوتی رہتی تھی اور میری آنکھیں اپنا مشغلہ روز کم از کم ایک مرتبہ ضرور پا لیتی تھیں۔ مگر میں پھر بھی یہی سوچتا تھا کہ آخر میں اس تموج جادو فریب میں کود پڑوں یا نہیں۔

ایک ایک معمولی واقعہ بیان کرنا گویا داستان کہنا ہے اور سلسلہ وار گھاگانا ایک دقیانوسی طریقہ ہے۔ میں بلا تفریق ہر پرانی حرکت سے متنفر' لہٰذا اس قدر سن لیجئے کہ میں بھی آخر کار اس دل فریب بحر ذخار میں کودا' کودا اور آنکھیں بند کر کے کودا۔ دوسرے سال کے جاڑے میں میں اپنے ڈرائنگ روم میں چراغسٹ کی نو عمر بہن حمیدہ سے یا فی زمانہ اپنی بیوی سے یہ کہہ رہا تھا۔ "کیوں پیاری! آج تو غضب کی سردی ہے۔ بدن کانپا جاتا ہے۔"

(۲)

میں غالباً کہہ چکا ہوں اور میری ہیئت بھی ہر دیکھنے والے کو بتا سکتی ہے کہ میں مستقل مزاج نہیں ہوں اور نہ خدانخواستہ کسی حالت میں کولہو کا بیل بننے کے لئے تیار ہوں۔ کیونکہ مستقل مزاج اور کولھو کا بیل میری نظر میں ہر لحاظ سے مرادف نظر آتے ہیں۔ جس چیز کو میں آج پسند کرتا ہوں کوئی وجہ نہیں کہ کل بھی اسی کو پسند کروں۔ مجھے اس منطق کے صغریٰ و کبریٰ میں حصہ مشترک ہی مفقود نظر آتا ہے' جو شخص مستقل مزاجی کا حامی ہو' وہ بشرط فرصت مجھ سے تبادلہ خیالات کر سکتا ہے۔ خدا جانے یہ بوسیدگی دماغ کا نتیجہ ہے۔ ترقی کے معنی ہی یہ ہیں کہ زمانے کے ساتھ برابر بڑھتے رہنا اور مستقل مزاجی کے معنی یہ ہیں کہ معاف فرمایئے گا۔ تھکے اونٹ کی طرح ایک جگہ ٹھہر جانا۔

دراصل میرا مزاج اور میری طبیعت انگلینڈ کا موسم تھی! کوئی نہیں بتا سکتا کہ کل میری حالت کیا ہو گی۔ میں کس بات میں دلچسپی لوں گا اور کس بات سے نفرت کروں گا۔ میں اس زندگی کا عادی تھا اور میرے لئے اس کو چھوڑنا ایسا ہی تھا جیسا مچھلی کا پانی کو چھوڑنا۔

میں کبھی کسی ایک چیز کا مداح برابر نہیں رہا۔ اور خدا کا شکر ہے کہ تقلید کی غلطی مجھ سے کبھی سرزد نہیں ہوئی۔ مگر یہ سچ ہے کہ حمیدہ نے میری اس عادت کو اچھی طرح پہچان لیا تھا۔ وہ میری گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی طبیعت کو تاڑ گئی تھی۔ اور میں نہیں کہہ سکتا کیونکر وہ مجھے روز نئے نئے رنگ میں، جلوہ گر نظر آتی تھی۔ یہ ایک فیکٹ ہے کہ وہی ایک پہلی چیز تھی جس سے میں کبھی نہیں اکتایا۔ وہی پہلی صورت تھی جس سے میرا دل کبھی سیر نہیں ہوا۔ وہ میری طبیعت کے ساتھ ساتھ روزانہ پلٹ جاتی ہو یا کسی اور طرح میں قطعی نہیں بتا سکتا۔ کہ وہ مجھے چھ مہینے خوش اور مطمئن رکھنے میں کیونکر کامیاب ہوئی۔

اس کی حقیقت اگر میں بلاکم وکاست بیان کروں تو غالباً آپ سمجھیں گے کہ میں اپنی بیوی کو رشک پروین بنانا چاہتا ہوں یا میں خود اس کے پیچھے رشک قیس بن گیا ہوں۔ مگر پھر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ قیس عامری اور فرہاد ایرانی دونوں میری نظر میں اول درجہ کے مخبوط الحواس تھے۔ میں ایسے عشق کو جہالت سمجھتا ہوں اور سچ یہ ہے کہ ایسے آندھی اندھیر۔ جذبہ عشق میں سوائے حیوانیت کے اور کچھ نہیں۔ شاعروں نے اس کو چار چاند لگانے میں بہت کچھ ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگایا ہے مگر سرے سے شاعروں ہی کی حقیقت میری نگاہ میں کچھ نہیں۔ میں نفس شاعری میں ہی کوئی بات قابل ستائش نہیں پاتا۔ شاعری اور دنیا کی اور بہت سی فضولیات سب ایک قطار میں ہیں۔ تضیع اوقات کے لئے اب دنیا نے شاعری سے زیادہ دلچسپ مشغلے ایجاد کر لئے ہیں۔ اگر آپ کی رائے اس کے خلاف ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ میں دنیا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھوں۔ آپ کی یا اور کسی کی آنکھوں سے دیکھوں آپ یقین کیجئے موسیقی اور شاعری میں اگر کچھ اثر مانا جاتا ہے تو میں "واٹر پروف" کی طرح "میوزک پروف" یا "پوئٹری پروف" ہوں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں کسی بات میں شاعری کرنی نہیں چاہتا۔ اس لئے میرا یہ کہنا کہ حمیدہ نقطہ خیال سے تمام خوبیوں اور حسن دلفریب سے آراستہ نظر آتی تھی۔ کافی سے بھی زیادہ ہے۔ وہ میرے مزاج اور طبیعت کے لئے نہایت موزوں تھی۔ البتہ اس میں صرف ایک عادت تھی جو آخر کار میرے مزاج کے خلاف ثابت ہوئی۔

وہ میرا ہی دل لبھانے کے لئے سجی روز نت نئی صورت ولباس میں جلوہ گر ہوتی تھی۔ یہاں تک تو نہایت اچھا تھا۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی چاہتی تھی کہ میں روزانہ اس کی دلفریبی اور حسن کا اعتراف بھی کروں۔ اور یہی غضب تھا۔ میں بار بار اس سے کہہ چکا تھا اس کے سامنے شاعری کر چکا تھا کیونکہ میں ایسے الفاظ کو نظم ہی سمجھتا ہوں کہ وہ سب سے زیادہ حسین سب سے زیادہ دلکش سب سے زیادہ دلفریب، نیچر کی انتہائی صنعت، تہذیب اور ترقی کی نقش آفریں وغیرہ وغیرہ تھی اور ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ میں ہمیشہ ان الفاظ کو طوطے کی طرح دہرا لیا کرتا۔ جب کبھی وہ خلوت میں ہوتی ایک شعلہ خود ستائی اس میں بھڑک اٹھتا۔ اس وقت تک فرو نہ ہوتا جب تک میں عملاً نہیں بلکہ قولاً الفاظ میں اس کی مدح سرائی نہ کرتا۔ اس کو نہایت عزیز رکھتا تھا۔ لیکن پھر بھی آپ جانتے ہیں کہ میرا نام ——— کالج کا نام ——— سیماب تھا۔

اس کے علاوہ حمیدہ کو ایک بات سے نفرت بھی تھی۔ وہ کسی عورت کو میری زبان سے خوبصورت سننا برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ کسی اپنی دلفریبی کی تعریف اور دوسرے کے اپنے ہمسر نہ ہونے کا اقرار۔ یہ دونوں ایسی عادتیں تھیں جو مستقل طور پر اس کی طبیعت ثانیہ بن گئی تھیں۔ اور میں کسی عادت کے پابند ہونے سے اسی قدر دور تھا جس قدر قطب شمالی، قطب جنوبی سے ہے۔ وہ کسی اور کے حسن کی تعریف سننا نہیں چاہتی تھی۔ اور مجھے بعض اوقات بلا کسی وجہ کے اس کی دھن لگ جاتی تھی۔ تاہم ایسے لمحے جو ہماری خاموش اور مسرت انگیز زندگی میں باد صرصر کا طوفان کہے جا سکتے ہیں اکثر واقع ہوتے تھے، لیکن یہ آندھیاں بلا کسی ظاہری نقصان کے اوپر ہی اوپر اتر جایا کرتی تھیں۔ اور بہت جلد مطلع صاف ہو جاتا تھا۔

ایک روز میں اس وقت جبکہ وہ اپنے تاملات سے یا بالفاظ دیگر کنگھی چوٹی سے فارغ ہو چکی تھی اور میرے پیچھے کھڑی ہوئی اپنی دلفریبیوں اور حسن بے مثال کا اندازہ بڑے آئینہ میں کر رہی تھی۔ میں ایک تصویر انگریزی میگزین میں دیکھ رہا تھا اور ایک ایکٹرس کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ غالباً وہی شعلہ خود نمائی اس کے اندر بھڑک اٹھا تھا۔ اور اس نے میرے پاس آ کر دیکھا تو مجھے ایک دوسری صورت کے نظارہ میں مشغول پایا۔ ممکن ہے کہ اس سے وہ شعلہ خود نمائی زیادہ مشتعل ہو گیا ہو۔ لیکن مجھے اس کا مطلق علم نہیں تھا۔ میرے اوپر اس تصویر کی تعریف کرنے کی خواہش آندھی کی طرح مسلط ہوتی جاتی تھی اور میں نے آخر کار کہا۔

"پیاری حمیدہ! دیکھنا یہ ایکٹرس کس قدر خوبصورت ہے؟"

"کیا خاک خوبصورت ہے مجھے تو اس میں کوئی خوبصورتی معلوم نہیں ہوتی۔" اس نے کہا۔

وہ یہ چاہتی تھی کہ کم از کم ایک مرتبہ غور کے ساتھ اس کو سر تا پا دیکھ تو لوں اور مجھ پر یہ جن سوار تھا کہ اسے میری ہاں میں ہاں ملانی چاہیے۔ میں نے تصویر پر نظر جمائے ہوئے پھر کہا۔ "بھلا کیا کہتی ہو؟ اس کی آنکھیں تو دیکھو۔ اس کے بال تو دیکھو؟"

"ہزار حسینوں کی ایک حسین سہی۔ مجھے کیا؟ میں نہیں سمجھ سکتی۔ تم ایسی فضول باتوں میں کیوں اپنا اور میرا دونوں کا سر پھرایا کرتے ہو۔"

"سچ یہ ہے کہ دن کو دن کہنا کوئی گناہ نہیں ہے۔ میں صرف اپنی رائے ظاہر کر رہا تھا۔ اگر تم اس کے خلاف ہو تو یہ تمہاری ذاتی رائے ہے۔ جس میں ممکن ہے کوئی اور وجہ بھی پوشیدہ ہو۔ مگر اختلاف رائے کی وجہ سے ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی آزاد رائے ظاہر نہ کر سکوں۔ اور سینکڑوں سوالات کو محض تمہاری ناپسندیدگی کی وجہ سے ایک کاک لگی ہوئی بوتل کی طرح اپنے میں بند رکھوں۔"

یہ بحث برابر بڑھتی چلی گئی۔ مجھ پر اور اس پر دونوں پر اپنی محبت کے موافق ایک جن سوار تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس مرتبہ یہ آندھی بلا نقصان عظیم کے نہیں اتری۔ حمیدہ نے بات بڑھ جانے پر اپنی ریشمی نقاب اٹھائی اور وہ خدا حافظ کہتی ہوئی چلی گئی۔ چند منٹ کے بعد میں نے گاڑی کے باہر جانے کی آواز سنی اور اس وقت مجھے اپنے ایک پرانے کلاس فیلو کا فقرہ جو وہ تمسخر کے طور پر ہمیشہ کہا کرتا تھا یاد آیا کہ شادی کر اور بربادی لے۔

(۳)

پہلے روز تو میں اپنے اسی خیال میں مستغرق رہا میری نگاہ میں حمیدہ کی یہ دیدہ دلیری ناقابل عفو جرم نظر آتی تھی۔ مجھے اپنی حالت پر افسوس بھی تھا۔ افسوس اور بے حد افسوس۔ صرف اس بات کا افسوس کہ میں نے اپنی بیش بہا آزادی کو محض وہ فتنہ زا آنکھوں، وہ دلکش رخساروں اور چند ایسی ہی دلفریب چیزوں کے عوض کیوں غارت کر دیا۔ میری رائے میں اس وقت شادی "زر دادن و درد سر خریدن" سے زیادہ قبیح چیز نظر نہیں آتی تھی۔ میں مرحوم غالب کی رباعی کو لفظ بہ لفظ صحیح سمجھ رہا تھا۔

بہ آدم زن بہ شیطان طوق لعنت	سپردند از رہ تکریم و تذلیل
ولیکن در اسیری طوق آدم	گراں تر آمد از طوق عزازیل

دوسرے دن میرے خیالات [illegible] نہیں تھے۔ طبیعت کا غبار رات کے ساتھ ہوا ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی وجہ نہیں تھی کہ

جس کو میں کل پسند کر رہا تھا آج اسی کے لئے بے قرار نہ ہو تا۔ سچ ہے کہ تنہائی کا رفتہ رفتہ پڑنے والا اثر مجھے بے چین کئے دیتا تھا۔ نوکر کا تقاضا تھا کہ فرنیچر خراب ہو رہا ہے۔ مرمت کی ضرورت ہے۔ خادمہ کی ضد تھی کہ پہلے برتن دیکھ لئے جائیں وہ بھی ٹوٹ گئے ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ محض ایک حمیدہ کے نہ ہونے سے میں اپنے آپ کو کیسی مصیبت میں پاتا تھا۔ میں اور ایسی فضولیات کا حساب و کتاب نا ممکن! قطعی ناممکن۔ میں کبھی ان واہیات باتوں کی طرف مشغول نہیں ہوا تھا۔ حمیدہ خدا جانے کس طرح ان سے برابر آتی ہو گی۔ مجھے تعجب تھا۔ تاہم اب کیا کیا جائے۔ حمیدہ کو اب واپس آنا چاہیے۔

مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی۔ کیونکہ کوچوان سے صرف اس قدر پتہ چل سکا تھا کہ وہ فلاں کے اسٹیشن پر اتری تھی۔ بفرض محال اگر مجھے معلوم بھی ہو تا تو بھی اس کے پیچھے وارنٹ گرفتاری کی طرح ہر جگہ پہنچنا میرے دل و دماغ کے قطعی خلاف تھا۔ خود جاکر خوشامد کرنا یا دو ایک کو درمیان میں ڈال کر اور زیادہ تشہیر کرنا۔ مجھ سے قطعی ناممکن تھا۔ پھر کیا کیا جائے۔ کچھ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ حمیدہ کے بغیر اب مجھے زندگی ایک کالا پانی معلوم ہوتی تھی۔

میں سوچتا رہا اور سوچتا رہا۔ مجھے اس سے پہلے سوچنے کا اتفاق بہت کم ہوا تھا۔ کیونکہ سوچنا میرے خیال میں ایک بہت نازیبا بات ہے۔ اس سے انسان کی پیشانی پر جھریاں پڑتی ہیں۔ اس سے طبیعت پر ایک بار معلوم ہوتا ہے۔ اس سے عمر زیادہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اس سے آدمی بڈھا ہو جاتا ہے اور؟ اور کیا نہیں۔ اس سے تمام نقصانات ہی نقصانات ہوتے ہیں۔ بہر حال بندہ مجبور و لاچار۔ سوچنا ہی پڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نئی چیز دماغ میں بجلی کی روشنی کی طرح پر تو افگن ہوئی۔ میں فوراً اٹھا اور ٹوپی سر پر رکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

جس قدر عرصہ میں گھڑی کی بڑی سوئی نے ۲۰ منٹ کا فاصلہ طے کیا اسی قدر عرصہ میں میں نے اپنا راستہ ختم کر لیا۔ ۲۰ منٹ کے اختتام پر میں ....روزانہ اخبار کے آفس میں مینجر سے نہایت تعجیل کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ "اچھا تو آپ الفاظ کے حساب سے چارج کریں گے۔ خیر جس طرح آپ چاہیں۔ میں جو عبارت شائع کرانا چاہتا ہوں۔ وہ ابھی لکھے دیتا ہوں آپ ملاحظہ کر لیں۔"

مینجر نے میری عجلت کو تعجب کے ساتھ دیکھتے ہوئے ایک سادہ کاغذ اور قلم دوات میری طرف بڑھایا اور میں نے کھڑے ہی کھڑے میز پر ایک ہاتھ ٹیک کر جھکے ہوئے لکھنا شروع کیا۔

"ضرورت ہے"

ایک چھ مہینے کے شادی شدہ شوہر کو اپنی حسین بیوی کی جو دو روز سے تبدیلی مزاج کی غرض سے کہیں چلی گئی ہے۔ آنکھیں سیاہ۔ رنگ سرخ و سفید۔ بال گھونگھر والے، قد میانہ، عمر ۱۸ سال۔ نام حمیدہ۔ جو شخص مذکورہ بالا کو کسی طرح نمبر ۱۴۰ منزل نمبر ۱ بائیکلا میں اپنے ساتھ لے آئے گا۔ اس کو دو اشرفیاں بطور معاوضہ محنت نذر کی جائیں گی۔ خط و کتابت کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ مزید حالات بتائے جا سکتے ہیں۔"

بے چین شوہر۔ عبدالحی سیماب

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ منیجر نے اس اعلان کو پڑھنے کے بعد میری طرف دیکھا اور مسکراہٹ جو غالباً کوشش خودداری کی زنجیروں میں جکڑے جانے کی وجہ سے مسکراہٹ ہی بن کر رہ گئی تھی ورنہ قہقہہ بننے کے لئے تیار تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بلکہ تمام چہرے پر ظاہر ہوئی۔ میں نے اجرت بلا حجت نقد ادا کی اور خدا حافظ کہتا ہوا باہر تھا۔ میرے باہر نکلتے ہی دو چار کلرکوں اور منیجر کے دل کھول کر ہنسنے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

میں جانتا تھا کہ حمیدہ روزانہ اخبار کو دیکھتی ہے۔ مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ کل کے پرچے میں وہ اعلان شائع ہو گیا ہے۔ مجھے اس کا بھی یقین تھا کہ حمیدہ ہر جدت پسند بات کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے ایسا اعلان ایک روزنامہ اخبار میں کیا۔ کیا اور محض اس خیال سے کیا کہ حمیدہ اس کو پڑھے 'میری حالت سے آگاہ ہو' جدت آمیز خیال کو پسند کرے اور چلی آئے۔ آج دوسرا دن تھا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس نے اخبار پڑھا ہی نہ ہو۔ میں تو یہ سمجھا تھا کہ اس نے کل ہی پڑھا ہو گا۔ اگر اس نے بالفرض کل بھی نہ پڑھا ہو تو آج میں تو کوئی شک ہی نہیں۔ اب دوپہر ڈھل چکی تھی۔ نصف سے زیادہ دن گذر چکا تھا اور میری تشویش بڑھتی جاتی تھی۔

میں اپنے ڈرائنگ روم میں اسی خیال میں غلطاں پیچاں تھا۔ ڈرا ہوا تھا کہ میرا نوکر کواڑ کھول کر اندر گھسا اور کہنے لگا۔ "حضور ایک شخص اور ایک نقاب پوش عورت آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔" میں فوراً سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ عزیز حمیدہ کا چچا زاد بھائی ہو گا۔ حمیدہ کو لایا ہو گا یا ممکن ہے کسی کو حمیدہ اپنے ساتھ لائی ہو۔ میں نے فوراً اندر آنے کی اجازت دی اور کرسی پر سے کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے کے اندر نہایت سرعت کے ساتھ مجھے خیال آیا کہ آخر میں کہوں گا کیا۔ دروازہ کھلا اور جاہل شخص جو صورت سے کوئی دکاندار معلوم ہوتا تھا۔ اندر گھسا اور یہ کہتا ہوا اندر گھسا "حمیدہ حمیدہ! اندر آؤ" اس کے پیچھے پیچھے ایک نوجوان عورت جس نے نقاب اتار ڈالی تھی اندر آئی۔ اس کا چہرہ اس کی بے باکی اس کی وضع 'غرض اس کی ایک ایک بات بتا رہی تھی کہ وہ نہایت چلتی ہوئی عورت تھی۔ جہاں تک میرا حافظہ اور قیاس کا کام کرتی ہے 'میرے خیال میں وہ کوئی بازاری آوارہ گرد عورت تھی۔ لانے والے نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیجئے یہ اب یہاں موجود ہیں 'یہ ہم کو ایک ہوٹل میں ملیں۔ ہم کل سے اخبار پڑھ کر تمام بمبئی ڈھونڈھ ڈالا۔ آج ہم کو ملی تو ہم نے فوراً پکڑ لیا۔ اس نے بہت کچھ شکایت کیا۔ تمھارا برائی کرتا ہے۔ خیر تم جانے یہ جانے۔ یہ خود کہے گا تم سنے گا اب ہمارا معاوضہ۔ بس ہم خلاص!"

مجھے تعجب تھا 'حیرت تھی پریشانی تھی۔ میری زبان سے نکلا۔ "تم کہتے کیا ہو؟ یہ عورت کون ہے؟"

وہ "ہم کہتا ہے کہ تم نے اخبار میں لکھا کہ جو کوئی اس کو لائے گا' وہ دو گنی پائے گا۔ ہم کل بارہ گھنٹے تلاش کیا۔ رات بھر اسی خیال میں رہا۔ آج برابر صبح سے ڈھونڈھ رہا ہے۔ اس کی آنکھیں سیاہ ہیں 'رنگ گورا ہے سرخی نہیں ہے تو وہ اس چار دن کی پریشانی میں جاتا رہا۔ بال گھونگھر والا ہے۔ قد بیچ کا ہے۔ عمر کون اس کا ۱۸ سال سے زیادہ بتا سکتا ہے؟ نام اس کا حمیدہ ہے۔ (اس کی طرف) کیوں ہے نا؟"

اس میں شک نہیں کہ اس میں یہ سب باتیں تھیں 'مگر آخر اس جہالت کے معنی کیا؟ وہ میری پیاری حمیدہ نہیں تھی۔ نہیں خدا نہ کرے۔ میں نے جواب دیا۔ "مگر یہ میری بیوی نہیں ہے۔"

وہ (عورت کی طرف) "کیوں یہ کیا بات ہے۔"

عورت "کیا پیارے سیماب پیارے سیماب۔ اب تم ایسے خفا ہو کہ پہچانتے تک نہیں۔ میں تمھاری بیوی نہیں ہوں؟"

میں۔ "حمیدہ میری طرف تو دیکھو؟"

اب مجھے استعجاب تھا۔ مگر اس جواب پر وہ استعجاب غصہ سے بدل گیا۔ یہ نالائق عورت اور میری بیوی۔ اس گستاخی کے معنی کیا؟ یہ بد معاشی کی دغابازی۔ جعلسازی۔ غصہ بڑھ چلا اور میرے منہ سے نکلا۔ گستاخ عورت اس بد تمیزی کے کیا معنی۔ ... ؟"

میں فقرہ بھی ختم نہ کرنے پایا تھا کہ وہی لانے والا شخص بولا "دیکھو سیٹھ۔ بد تمیزی وغیرہ کا وجہ تنہائی میں پوچھو۔ وہ چلا گیا تھا۔ اس کا قصور ہے۔ سب کے سامنے ایسامت کہو۔ آخر وہ تمہاری بیوی ہے۔"

میں۔ (نہایت غصہ کے ساتھ) "بد معاش! یہ پاجی عورت میری بیوی کیوں ہونے لگی......"

وہ۔ دیکھو سیٹھ۔ ہم پر زبان مت چلاؤ۔ تم جانو تمھارا بیوی جانے۔ ہم سے کچھ مطلب نہیں چاہے تم اسے رکھو چاہے نکالو۔ مگر ہمارا دو گنی ہم کو دو۔ بس۔

مجھے غصہ تھا پریشانی تھی الجھن تھی۔ سب کچھ تھا۔ قطعی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر لڑوں کیا کروں۔ اتنے ہی میں دروازہ پھر کھلا۔ ایک اور گنوار جاہل ایک عورت کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا اندر گھسا۔ اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ "یہ لو۔ حمیدہ موجود ہے۔ میں دو دن سے مارا مارا پھرتا تھا۔ آخر میں نے ایک دکان پر دیکھ پایا اور کھینچتا ہوا لایا۔ آنکھ۔ رنگ۔ بال۔ قد۔ عمر۔ سارا دیکھ لو۔ یہ تمھاری بی بی حمیدہ ہے کہ نہیں۔ اور میرا انعام؟"

اب میرے غصے نے بھی مجھ سے بھاگنا شروع کیا۔ میں ساکت تھا۔ خاموش تھا۔ مبہوت تھا۔

دوسری عورت۔ "پیارے سیماب! کیا اب بھی تم اپنی پیاری حمیدہ سے نہیں بولو گے۔"

پہلی عورت۔ "تو کون چڑیل ہے جو میرے شوہر کو اپنا شوہر بتاتی ہے۔؟"

دوسری عورت۔ "چل چنے۔ تجھ جیسی مکار میں نے ہزاروں دیکھ ڈالیں۔ سیماب میرا شوہر ہے یا تیرا؟"

دونوں لانے والے۔ (تقریباً ساتھ ہی ساتھ) "بتائیے سیٹھ آپ کا بیوی کون ہے۔"

"بولو صاحب بولو۔ ہاتھ پکڑ لو ایک کا۔"

گورنمنٹ کا قانون کہیے۔ اپنی پوزیشن کا لحاظ سمجھئے۔ یکایک حیرت زدہ ہو جانا اس کی وجہ ٹھہرائیے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس خیال نے اس وقت مجھے دست درازی سے روک لیا۔ میری حالت عجیب تھی۔ میں حیرت زدہ بھی تھا۔ اور پریشان بھی۔ خائف بھی تھا اور غصہ سے لرزاں بھی۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ ملازم فوراً اندر تھا' میں یہ کہتا ہوا کہ "دیکھو پولیس کو بلاؤ اور ان سب بد معاشوں کو ان کے حوالے کر دو" ڈرائنگ روم سے نکل کر سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ میرا خیال ہے کہ میں جاتے ہی پلنگ پر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

برابر والے کمرے میں سے سب کے سب باہر جانے کی آواز میرے کان میں آئی۔ پھر کچھ تکرار نہ ہوا اور تھوڑی دیر میں سناٹا۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اب میں ڈرائنگ روم میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے ڈر تھا کہ اسی طرح دس پانچ زبردستی بیوی بننے والیاں .... میرا سلسلہ خیال کواڑ کھلنے سے ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو پیاری حمیدہ ریشمیں نقاب ڈالے ہوئے ایک عجیب شان دلربائی کے ساتھ میرے سامنے تھی.......!

تھوڑی دیر کے بعد جس میں معمولی شکوہ شکایت کا دفتر ختم ہو چکا تھا' وہ میری آغوش میں تھی۔ اس کا شعلہ خود ستائی پھر بھی

لڑکی کا گھر میں اس کے بجھانے کے لئے کئی روز سے تیار تھا۔ اس وقت اور صرف اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ دونوں بازاری عورتیں اور اوباش آدمی حمیدہ ہی کے اشارہ پر آئے تھے اور عزیز نے اس کا انتظام کیا تھا۔ میری دو اشرفیاں تو بچ گئیں۔ لیکن حمیدہ کو اس پلاٹ کے تیار کرنے میں دو گنیاں نذر کرنی پڑیں۔ آہ شریر شوخ...... پیاری حمیدہ۔

اس دن اور آج کا دن دو باتوں میں پورا پورا اعتقاد رکھتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ اخبار کا مضمون درست ہے "[illegible]" کالم قابل فروگذاشت چیز نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ مرحوم مرزا نے سچ کہا۔

ولیکن در اسیری طوق آدم
گراں تر آمد از طوقِ عزازیل

کیوپڈ و سائکی

نیاز فتحپوری

یوں تو یونان کے عہد زریں کا ذرہ ذرہ بجائے خود اک حسن آباد تھا لیکن سائکی کے شباب نے جس رعنائی جمال کا نمونہ پیش کیا وہ حقیقتاً "عورت کی دنیا" میں ایک سحر تھا اک اعجاز تھا۔

حسن کی نسبت بہترین شاعرانہ تخیلات کے زیر اثر اک ماہر کوئی ایسی تصویر نہیں پیش کر سکتا تھا' جسے سائکی کے حسن عالم افروز سے کوئی نسبت دی جا سکتی' پھر یہ خدا کی شان ہے کہ علاوہ سائکی کے رئیس یونان کی دو بیٹیاں اور بھی تھیں' لیکن جب رات کو شاہی باغ کے صحن اور اس کے کنجوں میں گھڑی گھڑی بجلی کی سی چمک نمودار ہو کر غائب ہو جاتی' تو سارے شہر کو معلوم ہو جاتا کہ آج سائکی باغ میں نقاب الٹ الٹ کر پھول توڑ رہی ہے۔

اگلارس و کیوپڈس بھی غیر معمولی حسین تھیں' اور اگر قدرت کے پاس اک آخری نقش حسن و شباب (سائکی) اور نہ ہوتا تو اس میں کلام نہیں کہ یہ دونوں بہنیں بھی وہ چیز تھیں' کہ دنیا انھیں کے لئے ترستی انھیں کے لئے تڑپتی' اس لئے وہ اگر اپنی چھوٹی بہن سے کچھ خوش نہ تھیں' تو جائے عجب نہیں تاہم چونکہ ان کی شادی ہونے والی تھی' اس لئے وہ اپنی تسلی اپنے انتقام کی تسکین اس خیال سے کر لیتی تھیں کہ ہر چند سائکی زیادہ حسین سہی' مگر کم از کم وہ ان لذات سے تو ابھی آشنا نہیں ہو سکتی جن سے ہماری راتیں بہت جلد لبریز ہونے والی ہیں" کیا واقعی سائکی کی زندگی میں کوئی رات نہ تھی؟" اب رئیس یونان کے پیش نظر صرف یہی اک فکر تھی' جس میں وہ شب و روز مستغرق رہتا' دنیا کے ہر گوشہ سے شادی کے پیغام آئے' خدا جانے کتنے شاہزادوں کی تصویریں مختلف سلطنتوں سے آئیں' اور اگر ہم اس میں ان لوگوں کا بھی شمار کر لیں جو سائکی کی مواصلت کی صرف آرزو اپنے دلوں میں لئے ہوئے تھے اور زبان تک نہیں لا سکتے تھے تو اس میں پیدا و پنہاں پروانوں کے ہجوم کا کوئی شمار ہو ہی نہیں سکتا لیکن یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہ آئی کہ سائکی کے لئے کوئی بر کس طرح منتخب کیا جائے۔

اب سائکی کوئی بچہ تو تھی نہیں کہ اس کو برے بھلے یا اپنی طبیعت کے میلان کی تمیز نہ ہوتی وہ تو اب پوری جوان تھی اور اس لئے

انتخاب شوہر کی حس جو عورت کی جوانی کی تمام حس ہے اس میں بدرجہ اتم موجود تھی اول تو بہت سی تصویریں اس کے سامنے پیش ہی نہ کی جاتی تھیں اور جو اسے دکھائی بھی جاتی تھیں' تو سوائے اس کے اور کیا نتیجہ ہوتا تھا کہ وہ ایک دفعہ تصویر پر نگاہ ڈالتے ہی لانے والے کو نہایت غرور سے لاسر تاپا دیکھ لیتی۔ ہاں اسے غرور تھا اپنے حسن پر تو ایک بار ایسا ہوا کہ اس نے تصویر کی پشت پر لکھوا دیا کہ "اگر یہ انسان ہے تو مجھے انسان کی ضرورت نہیں" مگر اسے کیا خبر تھی کہ وہ اس فقرے سے اپنی آئندہ زندگی کے لئے ایک ہی پیشین گوئی کر رہی تھی۔

وہ خوب جانتی تھی کہ اس کے باپ کو کیا فکر لاحق ہے اور جب اسے معلوم ہو گیا کہ دنیا کے ہر گوشہ میں اس کے حسن کے پرستار موجود ہیں تو اس کی زندگی میں بڑا پیارا انقلاب پیدا ہو گیا۔

وہ کسی شاعر کی بہترین تصویر اٹھا لیتی اور جذبات حسن و عشق میں یہاں تک مستغرق ہو جاتی کہ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتی' بارہا ایسا ہوتا کہ جب کتاب دیکھتے دیکھتے اسی حالت انہماک میں اس کی نگاہ کسی پھول پر پڑ جاتی' تو وہ خدا جانے کیوں شرما جاتی اور پھر اٹھ کر ٹہلنے لگتی۔ غرض کہ اس کی تنہائی کی کوئی ایسی گھڑی نہ تھی۔ خلوت کی کوئی ساعت ایسی نہ تھی جسے وہ اپنے حسن سے معمور نہ پاتی ہو اور اس کا کوئی تخیل اور ایسا نہ تھا جو شرم و حجاب پر ختم نہ ہوتا ہو اور چونکہ قریب قریب نصف حصہ اس کے اوقات کا اسی تخیل میں گزرتا تھا پھر ایسے کھیلوں میں' جن میں وہ خود کسی کو ڈھونڈنا' یا اپنے تئیں ڈھونڈا جانا پسند کرتی (یہاں تک کہ بعض دفعہ جب وہ اکیلی ہوتی تو مہندی کی بھول بھلیوں میں گھس جاتی اور آپ اپنی تلاش کرنے لگتی) اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ساگی نصف عورت تھی اور نصف انفعال و جستجو۔

دن گزر گئے' یہاں تک کہ ساگی کا شباب' سرور سے سکر' اور سکر سے سرشاریت کی حد تک پہنچ گیا' لیکن اس وقت تک کوئی فیصلہ انتخاب شوہر کے متعلق نہ ہو سکا۔

چاندنی رات تھی اور چاندنی بھی موسم بہار کی اور موسم بہار بھی یونان کا' جس کی زمین کی نسبت فرش گل کا تخیل ادنیٰ ترین تخیل ہے۔ ساگی اپنے باغ کے ایک کنج میں جو نسبتاً زیادہ تاریک تھا بیٹھی ہوئی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی سے جسے وہ صرف ایک طویل دن کہہ سکتی تھی' یہاں تک سیر ہو گئی تھی کہ اکثر تاریک مقامات میں وقت صرف کرنا پسند کرتی تھی' مگر وہ یہ دیکھ کر کیسی گھبراتی کہ ہر جگہ اس کے لئے روشنی ہے۔ اور اس کی ہر رات چاندنی' وہ کنج میں فرش سبزہ پر بیٹھی ہوئی پنکھڑیوں کے ڈھیر کو ایک ہاتھ سے منتشر کرتی جاتی تھی' اور پتیوں اور نازک شاخوں سے چھن چھن کر آنے والی کمزور شعاعوں کو دیکھ دیکھ کر گردن اٹھائے ہوئے اپنے ہی تصنیف کئے ہوئے شعر آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی اپنا درد کہہ رہی تھی' شکایتیں کر رہی تھی کہ'

اے چاندنی تو تو آسمان کی ساگی ہے' آسمان ہی میں رہ' دنیا کو تیری ضرورت نہیں کہ وہ پہلے ہی ایک ساگی سے بیزار ہے' زمین جس میں اب مرد کی جنس پیدا ہونی بند ہو گئی ہے سنسان ہے۔ لیکن۔ نہیں تو مجھے بتا کہ تو روز یہاں آ کے ڈھونڈ جاتی ہے۔ میں بھی تیرا ملک دیکھوں گی۔ شاید میری راتیں وہیں چھپی ہوں۔ جو رات کی طرف چھکا بیتابانہ آتا ہے' میں اسے پکڑ لیتی ہوں اور گھنٹوں دیکھا کرتی ہوں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ کلی پر بیٹھنے سے پہلے بھونرے کو آ کر گرفتار کر لوں۔ تو ہنسے گی کہ میں نے اپنے مکان سے [illegible] باغ سے کلیاں نکلوا دیں کہ جب شمع نہ ہو گی تو پتنگے کیا کریں گے کلیاں نہ

ہوں گی تو بھونرے کہاں جائیں گے' لیکن تجھے یقین دلاتی ہوں کہ اگر رات کو میری انگلیوں کے سرے چراغ کی لو ہیں تو دن کو وہ چمپا کی کلیاں ہیں۔ میری گردن جس پر ہرنوں کی گردنیں فدا ہیں ڈھلی جاتی ہے' میری وہ آنکھ جس پر جنگلی گایوں کی آنکھیں قربان ہیں' رونا چاہتی ہے' میرا وہ چہرہ' جس پر اے چاندنی' ہر نقاب تیرا ہی ایک ٹکڑا نظر آتا ہے' افسردہ ہے کیونکہ دنیا میں کوئی مصور ایسا نہیں ہے جو میرے بعد میرا یادگار حسن باقی رکھے' کوئی شاعر ایسا نہیں جو میری تمناؤں کو لکھ سکے' اور کوئی مغنی ایسا نہیں' جس کے بربط کے تار میری تعریف میں کانپ سکیں' پھر اے آسمان کی ساگی' تو ہی بتا کہ ایسا شخص جو نور کی تصویر بنا سکے جو سمندر کو لکھ سکے جو نکہت کو گا سکے کہاں ملے گا۔"

ساگی جیسی حسین و جمیل تھی' ویسی ہی لطیف الخیال شاعرہ اور نازک دست مصورہ بھی تھی' اور اس لئے وہ قدرتاً اس بات کی خواہشمند تھی کہ ویسا ہی حسین' اسی درجہ کا شاعرانہ مزاج رکھنے والا اور ویسا ہی بے مثل نقاش اس کی زندگی کا ہمدم ہو۔ وہ دیر تک اپنے بنائے گیت گاتی رہی اور بربط بجایا کی' یہاں تک کہ وہ خستہ سی ہو گئی اور اس نے آخری ضرب کے ساتھ جس سے تار کچھ دیر گونجا کئے۔ بربط کو پھینک دیا گویا وہ اس سے بیزار ہو گئی تھی اس نے چاندنی میں ایک جمائی لی' اور پھر انگڑائی لیتی ہوئی وہیں لیٹ گئی وہ اب سونا چاہتی تھی' یعنی اس کی شرابی آنکھیں جو یوں بھی ہمیشہ نیم خواب رہتی تھیں' اب بالکل سو جانا چاہتی تھیں ....۔ ساری فضا سو رہی تھی' آسمان و زمین سو رہے تھے' وہ شاہراہ زریں جس پر چاند کی شعاعیں ایک مستقل خاموشی کے ساتھ چڑھ اتر رہی تھیں' سو رہی تھی' مگر سکوت خواب تو اس خوش نصیب کنج کا تھا جو بیہوش ساگی کو اپنے آغوش میں لئے ہوئے سو رہا تھا۔

آہ' اس حالت کو نیچر گھنٹوں تک دیکھتا رہا!

بیابان کار چڑیوں کی شیریں نغمہ سنجی شروع ہو گئی۔ یعنی صبح جاگی' ہر شاخ پھول ہی پھول ہو گئی۔ یعنی کلیاں جاگ اٹھیں۔ ساگی اٹھی اور کنج بھی اپنے تبسم آباد میں جاگ اٹھا' وہ یہاں حقیقتاً سونے نہیں آئی تھی۔ اور نہ اس کو یہ گمان تھا کہ وہ اس قدر جلد اور دیر تک یہاں سوتی رہے گی لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ اس کی نزاکت موسیقی کا بار نہ اٹھا سکی' جس کے ہر اتار چڑھاؤ کے ساتھ اس کا شباب صرف ہو تا تھا۔ گیت کے بول جن میں اس کے سارے حسیات لطیفہ کی قوت گھٹتی جاتی تھی اس کو بہت جلد خستہ کر دینے والے ثابت ہوئے چنانچہ وہ سو گئی اور انہیں تمناؤں' شکایتوں اور بیزاریوں کو اپنے دماغ میں لئے ہوئے سو گئی' جن میں اس کے اجزائے روح گھل گھل کر رل رہے تھے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس کی پیاری پیاری آنکھوں نے بند ہونے پر کیا کیا دیکھا مگر ہاں جب وہ اٹھی' تو اس کے اعضا ہو کہ رہے تھے' اس کا سارا بدن خستگی سے چور ہو رہا تھا' اس نے ہاتھ الٹ کر اپنی پیشانی کو چھوا اور پھر اپنے بازوؤں کو اپنے ہاتھ سے پکڑ کر ایک آدھ دفعہ بل دیا اور اپنے منتشر بالوں کو سمیٹتی ہوئی کھڑی ہو گئی اور آہستہ آہستہ کنج سے نکل کر روش پر ہو لی۔

چھریرا بدن ہو اور نازک کمر' تو رفتار میں لوچ کا پیدا ہونا ضروری ہے' لیکن اگر رفتار کی لچک کوئی مستقل چیز ہے اگر سبک خرامی صرف کشیدہ قامتی کی صفت لازم نہیں' بلکہ ایک جدا حسن ہے' تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ حسن صرف ساگی کی رفتار کو دیکھ کر سمجھ میں آسکتا تھا۔ نغمہ کا کوئی نقش نہیں' مگر ہوا اس سے معمور ہے' بھنبیری اڑ کر نکل گئی' مگر اس کی لچک اور سبک پروازی اب بھی نگاہ میں تھر تھرا رہی ہے۔ ساگی کنجوں میں غائب ہو گئی' لیکن اس کی رفتار کا ارتعاش اب بھی روح میں ملا ہوا ہے۔ وہ دبے پاؤں اپنی خوابگاہ میں پہنچی اور اپنی سیج پر گر پڑی' اس نے سمجھا کہ بدن کا درد' اعضا کی دکھن عدم آسودگی خواب کی وجہ سے ہے' اور اس نے چاہا کہ پھر سو جاؤں'

لیکن وہ ابھی کروٹیں ہی لے رہی تھی کہ نسرین جو ساتھی کی محبوب مطربہ تھی ہاتھ میں اپنا زریں بربط لئے ہوئے آئی اور پائیں کی طرف فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے بربط کے تار اپنی نازک انگلیوں سے درست کئے اور یہ دیکھ کر کہ شاہزادی کی رات شاید کرب میں گزری ہے اور وہ ابھی سونا چاہتی ہے اس نے افسون خواب نہایت ہی نرم ہوشیریں لہجہ میں گانا شروع کیا۔

"اے نیند آ" اور تھکی پلکوں کو پھر ملا دے کہ ابھی ان میں کچھ نشہ باقی ہے اے نیند آ اور انکھڑیوں کو پھر بند کر دے کہ ابھی ان میں کچھ خمار ہے۔ اسے یونان کی بیٹی لوافشرہ انگور کی ضرورت نہیں۔ اس کا شباب خود شراب ہے میں نے چاندنی راتوں میں صحن باغ کے اندر اسے ٹہلتے دیکھا ہے۔ اور اس کی رات وہ مجھ سے جھجک کر چلی گئی ہے تو صبح کو میں نے روشوں پر سے اس کے نشانات قدم اپنے ہاتھ سے مٹائے ہیں کہ کوئی اس کی لغزش رفتار نہ پہچان لے اے نیند آ جا کہ ابھی سورج کی کرنیں ارغوانی بھی نہیں ہوئیں۔ ساتھی کروٹیں لے رہی ہے اس کا بدن شاید دکھ رہا ہے رات کی شراب ابھی اچھی طرح آسودہ "

——— "نسرین خاموش۔ افسوں خواب کو ختم کر کہ یہ ابھی گھبراتا ہے۔"

اب ساتھی اٹھ بیٹھی تھی اور پیشانی پر ایک نازک شکن ایک ننھی سی موج بلوریں ڈالے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔ آخر کار اس نے چونک کر نسرین کے ہاتھ سے بربط لے لیا اور یوں ہی بغیر کسی نظام و اصول کے اپنی انگلیاں تاروں پر آہستہ آہستہ چلانے لگی۔ نسرین خاموش مودب کھڑی ہوئی ساتھی کی اس خلاف معمول بدمزگی سے ڈر رہی تھی۔ یہ حالت اتنی دیر تک قائم رہی کہ آفتاب اچھی طرح نکل آیا اور تمام کنیزیں تعمیل احکام اور ضروریات صبح کے متعلق اپنے اپنے فرائض ادا کرنے حاضر ہو گئیں۔ لیکن ساتھی نے ان کو فوراً رخصت کر دیا اور نسرین کو قریب بلا کر اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

اے نسرین آج تو ایسی بات منہ سے نہ نکال۔ جس پر کل تجھے افسوس کرنا پڑے تیرے نغموں نے ہمیشہ میری روح کو مسرت پہنچائی، لیکن اس وقت سے ڈر جب مجھے ان سے تکلیف پیدا ہونے لگے۔ کچھ ایسی باتیں کر کہ میرے بھولے ہوئے دن میرے سامنے آ جائیں، تو مجھے سلانا چاہتی ہے تو میری ان راتوں کا ذکر نہ کر جن میں دیوانہ وار پھرتی رہتی ہوں، تو تو مجھے لوریاں سنا کہ میں اپنی اس زندگی کو بھول جاؤں جس کا بار میرے لئے ناقابل برداشت ہے اور پھر ایک دفعہ بچہ بن جاؤں۔

اگر میری پلکیں نشہ آلود اور میری آنکھیں خمار آگیں ہیں تو کیا؟ اگر یونان کی بیٹی کا شباب عروج صہبا ہے تو کیا؟ کیونکہ اسے خود نہیں معلوم کہ اس میں کیا لذت پنہاں ہے میری زندگی تو اک ایسی صدا ہے، جو صحرا کی وسعت میں گم ہو جائے۔ پھول اگر اپنی نکہت سے آپ فائدہ اٹھا سکتا ہے اگر کلی اپنی رعنائی پر خود فریفتہ ہو سکتی ہے تو تو ہزار دفعہ وہی گا جو ابھی گائی، ورنہ اپنے بربط کے تار توڑ ڈال، طربیں اتار دے، نغموں کو بھول جا اور اپنا ساز کسی کونہ میں پھینک کر آ اور میرے ساتھ کرلے"

قبل اس کے کہ ساتھی اپنی گفتگو ختم کرتی، وہی دونوں کنیزیں جن کو سب سے پہلے حکم دیا گیا تھا آئیں اور ساتھی نسرین کو مبہوت و متحیر چھوڑ کر ان کے ساتھ چل دی۔

ساتھی غسل سے فارغ ہو کر حمام سے نکلی اور نگاہ کی طرح فوراً آئینہ خانہ میں داخل ہو گئی۔ آج اس کی سترھویں سالگرہ تھی

اور اسے حسب رواج دربار میں شریک ہونا تھا۔ ملک کے تمام شعراء' شاہزادے' سفیر' مغنی' سبھی موجود تھے۔ اور دربار میں سانگی کی آمد کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ شام کو سانگی کتاں کی آسمانی رنگ کی چادر میں اپنا بدن چھپائے اور اسی رنگ کا ہلکا نقاب اپنے چہرہ پر ڈالے ہوئے برآمد ہوئی۔

سب گردنیں جھکا کر کھڑے ہو گئے اور سانگی اپنی جگہ پر' جو بہت مرتفع تھی' کنیزوں کے حلقہ میں بیٹھ گئی۔

اس کے بعد رسم نذر شروع ہوئی۔ ہر شخص جو بڑھتا تھا اس کے ایک ہاتھ میں ہار ہوتے تھے اور دوسرے میں وہ چیز جو نذر کے لئے مخصوص تھی۔ پہلے اس کے قدموں پر پھولوں کو ڈال دیتا تھا اور پھر نذر پیش کرتا تھا' چنانچہ تھوڑی دیر میں سانگی کے پیروں پر موسم بہار کی بہترین پیداوار اور صناعت انسانی کے نازک و لطیف ترین ہدایا کا انبار لگ گیا۔ شعراء نے اپنے قصائد شروع کئے مغنیوں نے اپنے ساز درست کئے یہاں تک کہ اختتام دربار کا وقت قریب آ گیا۔ جس کے لئے ہر دل تڑپ رہا تھا۔ اور جس ایک لمحہ کے لئے یہ سارے تکلفات تمہیدی برداشت کئے گئے تھے۔

یہ دستور تھا کہ جب دربار سالگرہ ختم ہو جاتا' تو ان ہدایا کی پذیرائی میں سانگی کو ایک لمحہ کے لئے اپنے چہرہ سے نقاب الٹ دینا پڑتی تھی۔ اور غالباً اسی برق پاش رسم کا یہ اثر تھا کہ تمام عالم میں سانگی کی غائبانہ پرستش ہو رہی تھی اور ساری دنیا اس جلوہ عریاں کے لئے بے تاب نظر آتی تھی۔

سنا ہے کہ جس وقت سانگی پورے بارہ برس کی ہو گئی اور اول اول دربار میں نقاب پوش ہو کر آئی تو اس قدر ہجوم نہ تھا لیکن اس کے بعد جب اس کے بے نقاب ہونے کی خبر منتشر ہوئی تو ہر سال لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا' یہاں تک کہ جب پانزدہ سالہ سانگی کی سالگرہ ہوئی تو تمام اقطاع عالم میں اس کے حسن کی آگ مشتعل ہو چکی تھی اور اس سال جبکہ اس کا شباب پورے سترہ سال کا تھا اتنا کثیر ہجوم ہوا کہ شاید سرزمین یونان نے اس سے قبل اتنے پروانوں کا ہجوم کبھی نہ دیکھا ہو گا' غرضیکہ وہ ساعت آئی' جب سانگی کو بے نقاب ہونا تھا' یوں تو جب تک وہ وقت نہیں آیا تھا ہر شخص ایک مستقل اضطرار ایک نمایاں بے چینی بنا ہوا تھا' لیکن جب وہ وقت آیا اور نقیبوں نے اس ساعت کا اعلان کیا تو اتنے بڑے مجمع میں کوئی حرکت' کوئی صدا' اثر حیات کا پتہ دینے والی نہ تھی' لب باہم وصل ہو کر رہ گئے تھے اور آنکھوں نے جھپکنا ترک کر دیا تھا۔

آخر کار سانگی اٹھی اور اپنی بلوریں نازک انگلیوں سے نقاب کے دونوں سرے ایک جھٹکے سے سر کے اوپر کر لئے اور اپنے سحر حسن سے سب کو کم از کم ایک گھنٹہ کے لئے پتھر کا بنا کے چل دی۔

(۲)

اگر وینس (زہرہ) کو اپنے حسن و جمال پر ناز تھا' تو بے جا ناز نہ تھا کیونکہ سارا آسمان اور تمام آسمان والے اس بات کو مان چکے تھے کہ وینس سا حسین ہونا گویا خدا ہونا ہے اور معلوم نہیں یونان والوں کو یہ آسمانی عقیدہ کس طرح معلوم ہو گیا کہ انھوں نے بھی وینس کو دیوی مان کر اس کی پرستش شروع کر دی' بت تراشوں نے اس کے مجسمے تیار کئے مصوروں نے اس کی تصویریں بنائیں شعراء نے اس کے حسن کی تعریف میں قصائد کہے اور مغنیوں نے اس کے ترانہ ہائے جمال سے دنیا کو مبہوت و متحیر کرنا چاہا۔ مگر یہ پرستاران حسن (خدا یونان والوں کی روحوں کو خوش رکھے) کچھ اس سے بھی زیادہ وسیع جذبات رکھتے تھے اور اس لئے آخر کار انھیں منہ کے بل اس

کے سامنے گر کر کہا تھا کہ "اے ملکہ حسن تیرے جیسے باوصف اس کے کہ ملک کے بہترین نقاشوں کے دماغوں نے اپنی بہت سی راتیں تیری تیاری میں جاگ کر کاٹ دی ہیں نادرست ہیں، ہمارے قصائد جن میں حسن کی نسبت لطیف ترین تخیلات کو پیش نظر رکھ کر تیری تعریف کی گئی ہے ناکمل ہیں اور ہمارے راگ جن کو ہم اپنے بہترین سازوں کے ذریعہ سے اک ترانہ عبودیت کی صورت میں تجھ سے آستانہ جلال تک پہنچانا چاہتے ہیں کمزور و ناقص ہیں۔ پھر اے تو کہ حسن سے بھی بلند کوئی چیز ہے اے تو وہ کہ ہمارے خیال کی پرواز تیرے سامنے ایک مرغ پر شکستہ سے زیادہ نہیں ہمیں یہ نہ بتا کہ تو کیا ہے۔ بلکہ ہمیں یہ بتا کہ تو کیا ہے"___ یہ تھے دنیا کے خیالات وینس کے حسن کی نسبت اور یہ تھا عالم بے چینی ... کا حال۔

زہرہ جو آج سے ہزاروں سال پیشتر یونانیوں کے سامنے جو سامنے چمکتی تھی آج بھی شاید اسی انداز سے درخشاں ہے۔ البتہ فرق یہ ہے کہ وہ اسے حسن کی دیوی سمجھتے تھے اور ہم ایک کرہ غیر آباد یقین کرتے ہیں سو یہ ہو سکتا ہے کہ کسی زمانہ میں وہ آباد رہا ہو اور وینس وہاں کی ملکہ ہو اور اگر نہیں ہو سکتا تو بھی ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ اس وقت اس ملک کی حکمران ایک حسین و جمیل عورت تھی جو ہر چند طبقہ انسان سے نہ تھی مگر طبقہ انسان میں اس کا ذکر ضرور تھا اور اس نے آسمان میں وہی زمانہ پایا تھا جو سافو نے زمین میں۔

اسی زمانہ میں ایک دن کا واقعہ ہے (ہم دن کہتے ہیں مگر ہمیں نہیں معلوم کہ اس ملک میں دن رات کا کوئی مفہوم تھا بھی یا نہیں) بہر حال ایک جزو زمانہ کا واقعہ ہے وینس اپنے کاشانہ بلور میں بیٹھی ہوئی کنیزوں کا تماشہ غسل دیکھ رہی تھی اور نہایت مسرور تھی ایک بلوریں حوض جس کی تہہ اور دیواریں صیقل کئے ہوئے آئینہ کی تھیں نہایت شفاف پانی سے لبریز تھا اور ان میں کنیز پریاں برہنہ نہا رہی اور آپس میں کھیل رہی تھیں چونکہ وینس خود سمندر کے کف سے پیدا ہوئی تھی اس لئے وہ فطرتاً عریانی پسند تھی اور اس کے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک مشغلہ یہ بھی تھا۔ غرضیکہ وہ اپنی نوجوان کنیزوں کی اس جدوجہد کا تماشہ نہایت انہماک سے دیکھ رہی تھی کہ ایک کنیز نے باہر سے آکر کسی کے آنے کی اطلاع دی اور وہ اٹھ کر چلی گئی۔

اروتس، وینس کے ملک کی مشہور سیاحہ اور شہرت کی دیوی، جو اس سے قبل کئی بار کرہ ارض کا سفر کر چکی تھی اور وینس کے بہت مقرب درباریوں میں تھی، وینس سے ملنے آئی تھی، وینس پہنچی اور نہایت تپاک سے پذیرائی کر کے اس کی نئی سیاحت دنیا کے متعلق پوچھنے لگی لیکن اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "اے وینس، میرے حالات سیاحت کے تمام جزئیات سے آگاہ ہونے کی خواہش نہ کر کیونکہ ممکن ہے کوئی بات اس میں تیرے لئے اضمحلال اور افسردگی کا باعث ہو۔"

وینس نے نہایت متحیر ہو کر پوچھا "اے اروتس آخر تو وہ کونسی بات اب کے دیکھ آئی ہے جو مجھے تکلیف پہنچانے والی ہو گی، مجھے یقین ہے کہ تو نے کرہ ارض کے ان ذلیل باشندوں میں، جن کو ہوا نہ سنبھالے تو منہ کے بل زمین پر گر پڑیں، کوئی بات ایسی نہ پائی ہو گی، جس کو سن کر وینس جلے، کیا تو نے اس سے قبل وہاں کے حالات مجھ سے نہیں کہے اور کیا میں یہ سنکر ہنستے ہنستے بیتاب نہیں ہو گئی کہ انسان اپنے جسم کو جانوروں کی طرح ناخن سے کھجاتا ہے تو اس کے جسم پر مٹی کی لکیریں بن جاتی ہیں۔ اے اروتس کہہ اور نہایت آزادی سے کہہ، جو کچھ تو نے دیکھا ہے، میں دیکھتی ہوں کہ آج تو اپنی ملکہ سے خلاف معمول کچھ مذاق کرنا چاہتی ہے۔"

اروتس جو تمام دیویوں میں نہایت سنجیدہ و متین دیوی تھی یہ سن کر کچھ چیں بہ جبیں ہوئی اور بولی "اے وینس مانا کہ کرہ ارض کثیف ہے اور اس کے بسنے والے، جن کی ساخت مٹی سے ہوئی ہے ذلیل ہیں، لیکن اسے کیا کیا جائے کہ اسی کرہ میں ایک جگہ یونان بھی ہے، جس کا ذکر میں تجھ سے نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن جب تو نہیں مانتی اور سمجھتی ہے کہ میں مذاق کر رہی ہوں تو سن میں بتاتی

ہوں بلکہ والیٔ یونان کی چھوٹی بیٹی جس کا نام سائکی ہے ایسی حسین ہے کہ اگر اس کی خاکِ پا مل جائے تو وینس کو چاہیے کہ اس کا غازہ بنائے اور فخر کرے' کل اس کی سالگرہ کا دن تھا اور میں اس تقریب میں اتفاق سے پہنچ گئی تھی' لیکن اے وینس یقین کر کہ میں جو اس وقت اتنی دیر سے وینس کو بے نقاب دیکھ رہی ہوں' اور اس سے قبل ہزاروں بار دیکھ چکی ہوں' اس ایک لمحہ کی تاب نہیں لا سکی' جب سائکی نے اپنا نقاب چہرہ سے جدا کیا۔ اے وینس میں افسوس کرتی ہوں اور رشک کرتی ہوں کہ کیوں نہ انسان ہوئی کہ اس کی معیت کی آرزو تو اپنے دل میں پیدا کر سکتی۔"

وینس' جس کے نزدیک اس سے قبل کبھی اس امر کا امکان بھی نہ تھا کہ کوئی اس کے برابر حسین ہو سکتا ہے' یہ سن کر کہ ایک عورت اور وہ بھی کرہ ارض کی' اس سے زیادہ حسین ہے' چونک پڑی اور اس کے غرورِ حسن کو اس بیان سے ایسا صدمہ پہنچا کہ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا اور وہ سخت فکر مند ہو کر خاموش ہو گئی' لیکن کچھ سوچ کر بولی۔

"اے اروٹس ٹھہر' میں ابھی طلسمی آئینہ منگا کر سائکی کی تصویر دیکھتی ہوں اور اگر وہ ایسی نہ ہوئی جیسی تو ظاہر کرتی ہے' تو یہ سمجھ رکھ کہ وینس جس طرح حسن خدمات پر انعامات کی بارش کر سکتی ہے' اسی طرح وہ یہ بھی جانتی ہے کہ گستاخی اور جھوٹ کی بدترین سزا کیا ہے۔"

اس نے اروٹس کو رخصت کیا' اور کنیزوں سے طلسم بند آئینہ منگوا کر اپنے سامنے ایک بلوریں میز پر رکھوایا۔ اور سب کو علیحدہ کر کے تنہا اس کے روبرو آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئی' یہ آئینہ دیکھنے کا طریقہ تھا کوئی پندرہ منٹ تک وہ اسی طرح سر جھکائے اور آنکھیں بند کئے بیٹھی رہی۔ لیکن اس کے حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ تھی جب اس نے آنکھیں کھول کر آئینہ کو ایک ایسی تصویر پیش کرتے ہوئے دیکھا' جو حقیقتاً وینس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اس کی نگاہیں کانپ کر گر پڑیں آئینہ ہاتھ سے چھوٹ پڑا اور عجیب مضطربانہ انداز سے اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

کامل دو گھنٹے ہو چکے تھے۔ اور وینس کا اضطراب کسی طرح کم ہونے میں نہ آتا تھا کہ دفعتاً ایک تدبیر اس کے ذہن میں آئی۔ اور نسبتاً بیتابی میں کچھ کمی پیدا ہوئی۔ "بیشک میں سائکی کے حسن کا قیام نہیں دیکھ سکتی' پھر مجھے وہ چیز تلاش کرنی چاہیے جو اس کے حسن کو جلد از جلد زائل کر دے اور اس کی رعنائیوں کو تباہ و برباد۔ اس کو جلد سے جلد درسِ عشق دینا چاہیے۔ اور عشق بھی نہایت شدید' سخت ناکام و مایوس" یہ کہتی ہوئی وہ اٹھی اور اپنے باغ کی طرف نہایت تیزی سے چل دی۔

کیوپڈ' وینس کا بیٹا شانہ پر کمان اور ترکش میں تیر لئے' اپنے پردار بازوؤں کو سمیٹے' روشوں پر ٹہل رہا تھا اور پھول توڑ توڑ کر ڈھیر لگا رہا تھا کہ ان پر مشق تیر اندازی کرے (ہر چند اس وقت بھی ہمیں اس کی صورت ایک پردار معصوم بچہ ہی کی شکل میں دکھائی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا' اس کا عنفوانِ شباب تھا اور اس لئے اس کی نازک اندازیوں کی کوئی انتہا نہ تھی) وینس آہستہ آہستہ اس کے پاس پہنچی اور بیٹے کا منہ چوم کر کہنے لگی "اے کیوپڈ میں نے سنا ہے کہ جب تو تیر کمان لے کر باہر نکلتا ہے تو ملک کی جوان لڑکیاں تیرے ہاتھ جوڑتی ہیں کہ اچھے کیوپڈ' جی چاہے ہمارے دلوں کو اپنے تیروں سے چھلنی کر دے' لیکن خدا کے لئے پیروں میں زنجیرِ محبت نہ ڈال' کیا واقعی تیرے تیروں کے زخم زنجیرِ محبت سے زیادہ آسان ہیں' کیا میں دیکھ سکتی ہوں کہ تو ان تیروں سے کچھ کر سکتا ہے یا زنجیر ہی پر فخر کرتا ہے' کرۂ زمین میں رئیس یونان کی چھوٹی بیٹی سائکی تیری قائل نہیں' جا اور اس کو بتا کہ وینس کا بیٹا کیسا تیر انداز اور وہ مغرور حسن ہے۔"

یہ سن کر ہڑک گیا۔ نے شکار کا سال معلوم کر کے ... سب بے بس ہو گئیں۔ کمان شانے سے اتر کر ہاتھ میں آگئی اور ... ترکش سے نکل کر کمان میں۔ اس کے پروں کی شکنیں کھلیں اور ... غائب ہو گیا۔

(۳)

ساگی کی رسم سالگرہ جس نے اس کے شباب میں ایک سال کا اور اضافہ کیا۔ قیامت کیا۔ ختم ہو گئی اور سارا عالم پھر ایک سال تک اس پھر عریاں کے انتظار میں تڑپنے کے لئے چھوڑ دیا گیا جس کو دیکھنے کی تمنائیں اس درجہ شدید تھیں کہ اگر ساری دنیا سے اس وحشت کا کوئی عوض چاہا جاتا اور واقعی وہ عوض مان بھی لیا جاتا تو ساگی کے بے نقاب چہرہ اور نگاہ بے محابا کے سامنے خاکستر حیات کا ایک ڈھیر ہوتا اور پھر وہ تمام عمر کے لئے اپنے نقاب سے بے نیاز ہو جاتی۔ لیکن اس کا حسن معلوم ہوتا ہے کہ حیات کو رفتہ رفتہ دنیا سے اٹھاتا جاتا تھا۔ اور روحوں کو بتدریج گھلا گھلا کر فنا کرنے کا خواہشمند تھا۔ دنیا سے اب یہ خیال اٹھتا جاتا تھا کہ ساگی واقعی نوع انسان سے ہے اور یہ خواہش کہ کم از کم ایک ہی رات۔ ایک ہی ساعت، ایک ہی لمحہ اس کے حسن و شباب میں فنا ہونے کے لئے میسر آجائے" تو یہ خواہش تو ایسی خواہش تھی جو اب کفر میں داخل تھی کیونکہ اس کا حسن لوگوں کے دلوں میں ایک عجیب و غریب عظمت کی صورت اختیار کر چکا تھا اور اس سے محبت کرنے کا مفہوم سوائے اس کے اور کچھ نہ رہ گیا تھا کہ دنیا اس کی پرستش کرنے لگے عالم اسے پوجنے لگے "ساگی کا نام لیا جائے" تو لوگ سجدوں میں گر پڑیں اور جب اس کا واسطہ دلایا جائے تو ظالم سے ظالم قزاق اپنا ہاتھ روک لے اور خونخوار سے خونخوار قاتل کی تلوار جہاں تک اٹھ چکی ہے وہیں تک اٹھ کر رہ جائے اور دنیا میں صرف وہی عہد و پیمان قابل اعتبار سمجھا جائے جو ساگی کی قسم سے شروع کیا گیا ہو۔ غرضیکہ رئیس یونان کو پورا یقین تھا کہ اب ساگی کی شادی کسی طرح نہیں ہو سکتی کیونکہ اگر کوئی شخص منتخب بھی کیا جاتا تو یہ خبر اس کو کیونکر پہنچائی جاتی کہ وہ ساگی کا شوہر ہونے والا ہے۔ اول تو کوئی شخص ایسا نظر ہی نہ آتا تھا جو حقیقتاً اس بات کا اہل ہوتا کہ ساگی اس کے آغوش میں سپرد کر دی جائے اور اگر کوئی ہوتا بھی تو یہ بالکل یقینی امر تھا کہ ساگی کے حسن کی برداشت اس کے امکان سے باہر ہے، بہرحال اس سترھویں سالگرہ کی تقریب میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ شاید کوئی انتخاب ہو سکے گا لیکن افسوس ہے کہ اس میں بھی کوئی کامیابی کی صورت نظر نہ آئی۔

سالگرہ کے ٹھیک دوسرے دن شام کو ساگی اپنے باغ میں حوض پر بیٹھی ہوئی رنگین مچھلیوں کی بے قراری کا تماشہ دیکھ رہی تھی وہ شاید چند لمحوں کے لئے اس بات کو بھول گئی تھی کہ وہ وہی ساگی ہے جس کی ناکامیاب رسم سالگرہ ابھی دو دن ہوئے ختم ہوئی ہے اور اس سال بھی اپنے شباب کو خلوت و مجبوری میں کاٹنے کے لئے مجبور ہے، ورنہ دربار سے واپس آنے کے بعد ایک دن تک اس کی افسردگی کا یہ عالم رہا کہ دنیا کی تمام تفریحیں اسے بے معنی نظر آتی تھیں اور مسرت کا وجود بالکل مفقود۔ وہ سمجھتی تھی کہ عورت ہونا اور ذرا حسین ہونا ایک ایسا قہر ہے جس کا علاج اس دنیا میں ممکن نہیں اس نے کھانا نہیں کھایا۔ کیونکہ غذا بقائے حیات کے لیے ہے اور وہ سمجھتی تھی کہ شاید عورت کا شباب عورت کی حیات سے جدا کوئی چیز ہے، بالوں میں شانہ کرتے کرتے جی الجھا تو اٹھ بیٹھی کہ آخر کیوں؟ آئینہ دیکھا تو منہ پھیر لیا کہ وہ ساگی جہاں کہیں بھی ہے مغموم و نامراد ہے، پھولوں کے ہاریوں ہی رکھے رکھے سوکھ گئے اور اس نے نہیں پہنے کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ شاید گجروں کو کوئی اپنے لئے نہیں پہنتا۔ ہار اس لئے گردن میں نہیں ہوتے کہ ان کی نکہت کو صرف ہوا اڑا لے جائے پھر نہ ان سے یہ مقصود نہیں کہ وہ ایک افسردہ سینے پر پڑے پڑے سوکھ جائیں۔ بلکہ شاید ان سے یہ مدعا ہے کہ کوئی دوسرا ان کی نکہت سے بے قرار ہونے والا ہو اور ان کی جنبش ایک دھڑکتے ہوئے دل کی جانب سے اسے بے قراری کا جواب

دیے ہیں یوں تو ناکام سینہ ایک مزار ہے اور مزار پر چڑھائے ہوئے پھول کیا اس نے گانے میں بھی دلچسپی نہ لی' کیونکہ وہ لحن میں کچھ خامی محسوس کرتی تھی سازوں کی نسبت اسے یہ گمان تھا کہ شاید ان کے تاروں میں کسی خاص تار کی کمی ہو گئی ہے اور پھر سب سے زیادہ یہ کہ اگر موسیقی لذت ہے تو خدایا یہ کیسی لذت ہے کہ سینہ پھٹا جاتا ہے اگر گانا سکون ہے' تو یارب یہ کیسا سکون ہے جو دل کو بے قرار کئے دیتا ہے۔

غرضیکہ اس نے اپنے سارے محبوب مشاغل ترک کر دیئے کیونکہ ان میں سے کوئی اس کے حسیات شباب کا جواب دینے والا نہ تھا' وہ راحتوں اور عشرتوں سے بیزار ہو گئی تھی' وہ اپنی گوری گوری کلائیاں دیکھتی تھی اور چاہتی تھی کہ کوئی مضبوط ہاتھ انھیں پکڑے اور پھر نہ چھوڑے' وہ اپنی نازک کمر' وہ ایک مٹھی میں بھر کے آجانے والی پتلی کمر چاہتی تھی کہ کوئی اس کو دکھائے اور دکھائے جائے' وہ خواہشمند تھی کہ اس کی نزاکت دوشیزگی کا کوئی دشمن مل جائے اور اسے تکلیفیں پہنچائے۔ اب اس کا وہ غرور حسن باقی نہ رہا تھا کہ شاہزادوں کی تصویریں دیکھ کر منہ پھیر لیتی تھی' اب تو وہ باغ میں طاؤس کو بھی مستی کے عالم میں رقص کرتے' دیکھتی تھی تو بے اختیار اس سے لپٹ جانا چاہتی تھی' اور ہنس کو بھی گردن اٹھائے' ابھرا ہوا سینہ نکالے پانی میں دیکھتی تھی' تو وہ چاہتی تھی کہ یہی بازو کھول کر اپنی آغوش میں لے لے اور اس کی نڈھال گردن پر اپنی زبردست گردن ڈال دے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اس کی اول تمکنت نے معاملہ کی صورت کو اس قدر ہم بنا دیا تھا کہ اب چارہ کار اس کے سوا اور کوئی نہ تھا کہ وہ ایک دیوی کی سی زندگی بسر کرے۔ لیکن، آہ کون جانتا ہے کہ ایک دیوی' جس کو دنیا معصوم جانتی ہے اس وقت کن کن گناہوں کی آرزو اپنے دل میں لئے ہوئے تھی۔

بہرحال وہ اس وقت حوض پر بیٹھی ہوئی تھی' اور نسبتاً کچھ مسرور نظر آتی تھی' کنیزیں پھولوں کے پنکھے لئے اسے ہوا پہنچا رہی تھیں' اور سامنے دوسرے کنارے پر نسرین حسب معمول اپنا سرود لئے ہوئے کچھ گنگنا رہی تھی کہ ساگی یکبارگی چونک پڑی اور نسرین کی طرف خطاب کر کے بولی کہ "نسرین' یہ تو کیا گنگنائی' پھر کہہ ذرا آواز سے کہہ' ساز لے اور گا کہ مجھے کچھ لطف آیا" نسرین جو ساگی کی افسردگی سے بہت فکرمند تھی' خوش ہو گئی اور اس نے نہایت ہی شیریں لہجہ میں گانا شروع کیا۔

وہ دن جب میں ایک مغموم خلوت خانہ میں منہ لپیٹے پڑی رہتی تھی' گئے' وہ راتیں جب سنسان کنجوں میں تنہا پڑی کراہا کرتی تھی گذر گئیں' اب تو جی چاہتا ہے کہ نقاب میرے چہرہ سے جدا ہو اور پھر چاروں طرف کی چاندنی سمٹ کر ایک ہالہ نظر آئے' شمعیں آزردہ تھیں کہ میرا آفتاب سا چہرہ انھیں دیکھنا نصیب نہ ہوتا تھا' شاید میں افسردہ تھی کہ میری زلفوں کی بھینی بھینی خوشبو سے وہ عرصہ سے محروم تھیں' راتیں کبیدہ تھیں کہ میرے نغموں نے انھیں عرصہ سے روشن نہیں کیا تھا' لیکن اب اے صبح' اپنا دامن پھیلا اور کرنوں کو جمع کر لے کہ میں آج پھر بے نقاب پھر رہی ہوں' اے شام اپنے تئیں خوب سجا لے کہ آج میرے بال پھر تیرے اندر کھلے ہوئے ہیں' اور اے رات بیدار ہو جا کہ آج میری نازک انگلیوں میں پھر تاروں کی لرزش سے گدگدی سی پیدا ہو رہی ہے' میری آنکھیں اگر جادو ہیں تو وہ جادو ہی رہیں گی' انھیں مسحور ہونا نہیں آتا' میرا حسن اگر دیوتا ہے تو ہمیشہ اس کی پرستش ہی کی جائے گی' وہ خود کسی کا پرستار کیوں ہو۔ دنیا اگر میرے لئے تڑپ رہی ہے تو تڑپے' میں کسی کے لئے کیوں تڑپوں' میرا دل ایک مستقل استغنا ہے اور سارے عالم کی حیات اس کے ایک جلوہ گریزپا کا ادنیٰ خراج۔"

سائکی یہ سن کر جوش میں آ گئی اور ایک شاہانہ انداز سے کھڑی ہو کر ٹہلنے لگی' سیاہ ریشمی چادر جو اس کی رانوں سے لپٹی ہوئی کمر کی نزاکت کو اور بھی نمایاں کرتی ہوئی سر تک پہنچ گئی تھی ڈھلک گئی' شانے کھل گئے بیاض گردن سینہ کی عریاں سپیدی سے مل گئی' سیاہ ریشمی بال پیٹھ پر گھوم گھوم کر چھلے بن گئے ابروئیں تن گئیں' مست آنکھیں اور متوالی بن گئیں' ٹھیک یہی وقت تھا اور یہی عالم کہ کیوپڈ اپنا تیر کمان سنبھالے کنجوں میں سے نکلا اور اس ارادہ سے نکلا کہ آج اپنا ترکش سائکی پر خالی کر دیگا' لیکن نشانہ کو پیش نظر رکھنے کے لئے کیوپڈ نے سائکی کو نگاہ بھر کے دیکھا ہی تھا کہ تیر چٹکی سے چھوٹ گیا' کمان ہاتھ سے گر پڑی' چلہ اتر گیا اور کیوپڈ غش کھا کر زمین پر گر پڑا۔

آہ کاش کوئی۔ سائکی سے اس وقت جا کر کہہ دیتا کہ جس محبت کی اس کو جستجو تھی وہ خود اس کی آرزومند ہے' جس عشق کی اس کو تمنا تھی وہ اب خود اس کا تمنائی ہے' صیاد خود اس کا مجروح ہے۔ عشق خود اس کا دیوانہ اور تیر آپ اس کی نگاہ کا زخمی۔

اے کیوپڈ تو نے لاکھوں دلوں پر تیر چلائے ہوں گے' خدا معلوم کتنے سینے تو نے مجروح کئے ہوں گے' لیکن وہ تیر جو حسن کے ترکش میں پنہاں ہیں وہ پیکاں' جنہیں صرف اک حسین دوشیزہ ہی کی نیم آنکھیں چلا سکتی ہیں تیری ناوک اندازیوں سے کہیں زیادہ تباہ کن ہیں۔

جا' تیرا تیر' اب صرف شہپر ہے بازو سے جدا' تیری کمان صرف اک خمیازہ ہے بے مزہ جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ فرشتوں نے صحائف میں لکھ لیا' حوروں نے اپنے کاشانوں میں سن لیا کہ وینس کا بیٹا آج سائکی کے باغ میں بیہوش پڑا ہے۔

وینس کو یقین تھا اور وینس کیا جو بھی کیوپڈ کی بے پناہ ناوک اندازیوں کا حال سن چکا ہے وہ یہی یقین کرے گا کہ ایک سائکی کیا اگر اس جیسی ہزار ہوں تو وہ چٹکی کی صرف ایک جنبش سے سب کے دلوں کو چھلنی کر سکتا ہے' مگر فطرت کے پاس اک تیر اور تھا' اک ناوک اور تھا جو کیوپڈ کے تیروں کی طرح بدنام تو نہ تھا' مگر ان سے زیادہ کارگر تھا اور جس وقت سائکی اس عالم میں آئی تو وہ ناوک اس کی نیلی آنکھوں میں نگاہ بنا کر رکھ دیا گیا' کیوپڈ کو تو جراحت پہنچانے کے لئے قصد و ارادہ کی ضرورت تھی اہتمام و انصرام درکار تھا کہ کمان میں تیر رکھے پھر چلہ کھینچ کر چٹکی ڈھیلی کرے' لیکن سائکی کی مست آنکھوں کو یہ ہوش کہاں' نہ وہ کسی قصد کو جانتی تھی اور نہ کسی اہتمام کو' وہ نہ کسی ارادہ سے واقف تھیں اور نہ کسی انصرام سے' ایک بار پلک سے پلک جدا ہوئی اور تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔

غرضیکہ کیوپڈ' سائکی کے باغ سے زخمی ہو کر پھرا اور ایسا زخمی کہ اگر ہم چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کا دل پاش پاش تھا اور اس کی روح یکسر جراحت کدہ۔

وہ باغ میں ٹہل رہا تھا اور نہایت انہماک کی حالت میں اضطراب و بے قراری کا لطف اٹھا رہا تھا کہ وینس آئی اور خلاف معمول اس کو اس درجہ مغموم و افسردہ دیکھ کر متحیر رہ گئی۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ کیوپڈ کسی مہم سے ناکام و نامراد واپس آسکتا ہے۔ چہ جائیکہ اس کا مضمحل ہو کر لوٹنا' وہ کچھ سمجھی اور سمجھ کر ٹھٹکی اور پھر آگے بڑھی' بڑھی اور ایک خاص انداز میں بولی "اے کیوپڈ مجھے اپنا ترکش دکھا کہ میں اسے خالی دیکھ کر خوش ہوں اور مجھ سے شکایت کر کہ آج تو تیر چلاتے چلاتے چٹکیاں دکھ گئیں' ہاں ہاں' سمجھتی ہوں شاید اب تو افسوس کرتا ہو گا کہ کیوں سائکی کو زخمی کیا' وہ ایسی حسین ہے اور اے کیوپڈ یہی وجہ تھی جس نے اس کی تباہی و بربادی کو لازم کر دیا تھا۔ اے کیوپڈ بول جلدی کہہ کہ وہ دیوانہ وار ویرانوں سے سر ٹکرا رہی ہے' بیابانوں میں کہیں خراب و خستہ پھر رہی ہے۔"

کیوپڈ' سائکی کی نسبت تباہی و خستگی کا ذکر نہ سن سکا اور بے قرار ہو کر بول اٹھا۔

"ہاں میرا ترکش بھی خالی ہے اور چٹکیاں بھی دکھتی ہیں۔ کیا تیرے فرمان سے قاصر رہنے کے لئے یہ عذر کافی نہیں ہیں میں سائکی کے مجروح ہونے پر افسوس نہیں کرتا کیونکہ وہ مجروح نہیں ہے اور اگر کہیں وادیوں میں پریشان پھر رہی ہے یا وادیوں سے سر ٹکرا رہی ہے تو وہ تنہا نہیں ہو گی"۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنی کمان توڑ ڈالی تیروں کو پھینک دیا اور اب اس کی زندگی صرف یہی ہے کہ وہ سائکی کے درد و مصیبت میں اپنے تئیں مٹا دے اے وینس مجھے ملامت نہ کر کیونکہ وہ فن تیر اندازی میں مجھ سے زیادہ مشاق نکلی اور مجھ پر تاسف بھی نہ کر کیونکہ ساری عمر میں آج ہی تو یہ معلوم ہوا ہے کہ تیر چلانے سے تیر کھانے میں زیادہ مزہ ہے' آہ اگر مجھے یہ رشک نہ ہوتا کہ زمانہ اس تیر کو دیکھ لے گا تو میں اس کو اس حال میں کہ وہ میرے خون کے بہترین قطرات سے رنگین ہوتا' اولمپس و اٹیلس کی چوٹیوں پر نصب کر دیتا اور زمین کی اس بے مثل یادگار کی پرستش سارے آسمان والوں سے کراتا مگر نہیں وہ پہلو میں ہے اور وہیں رہے گا خواہ اس کے نکالنے کی کوشش میں جیوپیٹر میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ کر ڈالے۔"

غالباً اس کے اظہار کی ضرورت نہیں کہ وینس پر کیوپڈ کی اس تقریر کا کیا اثر ہوا وہ انتہائی غیظ و غضب کی حالت میں وہاں سے چلی گئی اور سب سے پہلا حکم جو اس نے واپس آ کر دیا یہ تھا کہ "سامان سفر درست کیا جائے۔"

پریاں نہایت عجلت کے ساتھ اہتمام و تیاری میں مصروف ہو گئیں اور دربار کی کنواریاں وینس کے جلو میں چلنے کے لیے آمادہ۔ پردار گھوڑے جن کا ساز و براق جواہرات کا تھا اور جن کی دم وایال میں نہایت آبدار موتی گندھے ہوئے تھے' وینس کے زریں رتھ میں لگائے گئے اور معہ اپنی اپنی کنیزوں' کنواریوں اور پریوں کے دفعتہً بادلوں کی طرح جو سما پر چھا گئیں اور پھر تھوڑی دیر بعد آفتاب کی روشنی میں تحلیل ہو کر غائب۔

(۴)

سارا یونان آج چراغاں ہو رہا تھا۔ اور یونان کا ہر ہر گھر بزم رقص و سرود ــــ ایک سیلاب مسرت تھا کہ ہر پیشانی اس میں غرق نظر آتی تھی۔ ایک طوفان نشاط تھا کہ ہر دل اس میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا تھا' ہر گلی کوچہ میں زر و سیم کی بارش ہو رہی تھی' شاہی انعامات کا سلسلہ برابر جاری تھا اور نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا کے کسی جشن میں ایک بادشاہ کے دست کرم نے اس سے زیادہ وسیع حصہ لیا ہو۔ آگسٹس والی یونان کا عہد سلطنت نہ صرف اس وجہ سے عہد زریں سمجھا جاتا ہے کہ وہ بے انتہا سیر چشم و فیاض تھا' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ رعایا کا خیر خواہ بادشاہ یونان کی تاریخ میں نہیں اور کوئی دوسرا نظر نہیں آتا' وہ بہانہ تلاش کیا کرتا تھا کہ میں کس طرح رعایا کو زیر بار احسان کروں اور اس سے بہتر موقع اس کے لئے اپنا حوصلہ نکالنے کا اور کیا ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی دو حسین بیٹیوں کی شادیاں کر رہا تھا' سارا دربار زرا ندوز تھا اور دربار کی ہر ہر چیز جواہر کار۔

یونان کے تمام امراء جمع تھے اور پایہ تخت کی ہر حسین لڑکی شاہی مہمان تھی' اگلارس و کیوپڈس' سائکی کی دونوں بہنیں سر سے پاؤں تک جواہرات میں غرق دولہن بنی بیٹھی تھیں اور ان کے خوش نصیب شوہران کے پہلوؤں میں مست و سرشار۔ ملک کی بہترین موسیقی سازوں سے نکل رہی تھی اور یونان کی لطیف ترین شراب بلوری و الماسی گلاسوں میں چھلک رہی تھی۔

ٹھیک یہی وقت تھا اور جشن طرب کا یہی عالم کہ دربار کے مکان کا ایک دروازہ کھلا اور کوئی چیز اندر آ کر روشنی میں مل گئی اور بادشاہ چیخ مار کر تخت سے نیچے گر پڑا۔

نیلے ہرن ہو گئے' مسرتیں منغض ہو گئیں' سکون کی جگہ اضطراب نے لے لی' اطمینان پر سراسیمگی نے قبضہ کر لیا۔ ہر شخص بادشاہ کی طرف دوڑ پڑا۔ وہ بری طرح تڑپ رہا تھا' آنکھیں شدت درد سے ابل پڑی تھیں اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا بات ہے' ملکہ چیخ کر بادشاہ سے لپٹ گئی کہ "خدایا یہ کیا ہوا؟" اس کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا مگر ہاں ایک وینس جو لوگوں کی نگاہ سے غائب ہو گیا یہ کہتی ہوئی چل دی کہ "یہ ابتدا ہے انتقام کی۔ سائکی وینس نے بیٹے کو بے قرار کر کے زندہ رہے ناممکن ہے۔"

آن واحد میں سارے یونان کو معلوم ہو گیا کہ بادشاہ کسی سخت مرض میں مبتلا ہے لوگ دوڑ پڑے' ماہرین طب نے اپنی ساری تدبیریں ختم کر دیں' شیوخ معابد دعا مانگتے مانگتے تھک گئے لیکن درد میں کسی قسم کی تخفیف نہ ہوئی اور اس لئے بپایان کار تمام اراکین و عقلائے سلطنت کی یہ رائے ہوئی کہ سنگ مقدس سے چارہ جوئی کی جائے۔ جو ہدایات اس کی ہوں ان پر عمل کیا جائے۔

جس عہد کا یہ واقعہ ہے اس وقت یہ دستور تھا کہ جب کوئی سخت مصیبت پیش آتی تھی اور کوئی انسان تدبیر کارگر نہ ہوتی تھی تو دیوتاؤں کی روحوں سے التجا کی جاتی تھی' اور اس عرض و التجا کے لئے ایک خاص مقام مقرر تھا' یہاں ایک پتھر نصب تھا جسے سنگ مقدس کہتے تھے' اس عرض کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پتھر پر ایک تحریر نظر آ جاتی تھی' جو نہ صرف اس مصیبت کی حقیقت سے آگاہ کرتی بلکہ دفع بلا کی تدبیر بھی ظاہر کرتی تھی' چنانچہ اس وقت صعب میں' جبکہ بادشاہ کی تکلیف ہر لمحہ بڑھ رہی تھی اور کسی طرح اسے آرام ہوتا نظر نہ آتا تھا' سوائے اس کے اور کیا چارہ تھا کہ سنگ مقدس سے مدد چاہی جائے۔ چنانچہ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے ملکہ امرائے دربار' اراکین سلطنت اور اپنی دونوں دلہن بیٹیوں کے ساتھ روانہ ہو گئی' اور سائکی کو بادشاہ کی تیمارداری کے لئے چھوڑ دیا۔

سب وہاں پہنچے اور جلدی جلدی وہ تمام مراسم عبودیت ادا کئے گئے' جن کا ادا کرنا ضروری تھا' مگر آہ کسے خبر تھی کہ وینس کے ہاتھ نے اس سنگ مقدس پر ایسا سخت فیصلہ لکھ دیا ہے' جس کے دیکھنے اور سننے کے لئے نہایت سنگین دل کی ضرورت ہے۔

جب دعائیں اور التجائیں ختم ہو گئیں تو ملکہ دھڑکتا ہوا دل لیکر بڑھی اور اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس پردہ کو ہٹایا' جو سنگ مقدس پر پڑا ہوا تھا۔ اس تحریر کا مفہوم یہ تھا۔

> "رئیس یونان بیمار ہے' لیکن اس کی بیماری کا علاج انسانی قوت سے باہر ہے' سارے عالم کے طبیبوں کو بلاؤ' لیکن وہ نہ بتلا سکیں گے کہ یہ بیماری کیا ہے' ساری دنیا کے اختر شناس جمع کرو' لیکن وہ نہ کہہ سکیں گے کہ یہ کیا بلا ہے کیونکہ وہ کوئی مرض نہیں جسے طبیب پہچان سکے' وہ کسی ستارہ کا اثر نہیں جسے نجومی دور کر سکے۔ وہ ایک قہر ہے جو بہشت کے مالک اور دیوتاؤں کے سردار جیوپیٹر نے اس پر نازل کیا ہے' یہ اس کا غصہ ہے کہ اگر اس سے جلد پناہ نہ مانگی گئی' تو سارا یونان بہت جلد تباہ ہو جائے گا' اگر یونان کی ملکہ' یونان کے امراء' یونان کی رعایا اپنے بادشاہ کی صحت اور آئندہ امن و سکون کے آرزومند ہیں تو ان کو چاہیے کہ شاہزادی سائکی کو کوہ الونڈ کی سب سے اونچی چوٹی پر لے جائیں اور شاہ بلوط میں باندھ کر چلے آئیں۔ جیوپٹر اس قربانی کو کسی عفریت کے ذریعہ سے قبول کرے گا' اور بادشاہ فوراً صحیح و تندرست ہو جائے گا' اور اگر یہ قربانی دو دن کے اندر نہ کی گئی تو پھر ہزار سائکی کی قربانیاں بھی اس مصیبت کو دور نہ کر سکیں گی۔"

ملکہ غش کھا کر گر پڑی' امراء متحیر رہ گئے' کنیزوں نے اپنا سر پیٹ لیا مگر اس غمگین جماعت میں' اس حلقہ ماتم میں دو روحیں ایسی بھی تھیں جن کی حقیقی مسرت کا یہ آج پہلا دن تھا' اور جن کے لئے اس ظالم پتھر کی یہ ظالم تحریر اک شعر سے زیادہ پر لطف ایک نغمہ

حیاتی سے زیادہ مسرت بخش تھی۔

اکلارس وکیوپڈس نے اپنی ماں کو اٹھایا اور ہوش میں لا کر جلد واپس چلنے پر اصرار کرتی ہوئی بولیں "اے ماں اٹھ' خدا جانے بادشاہ کا کیا حال ہوگا۔ ہر چند جیوپٹر کا فیصلہ نہایت شدید و ظالم ہے' لیکن اس کا غصہ اس سے زیادہ بے پناہ و بے رحم ثابت ہوگا۔ اگر سنگ مقدس کی تحریر پر عمل نہ کیا گیا۔"

بہر حال ملکہ کسی نہ کسی طرح واپس آئی' لیکن اک ایسے روح فرسا غم کا بوجھ اپنے دل میں لئے ہوئے کہ اگر خود اسے اپنی جان کی قربانی کرنی پڑتی' تو وہ نہایت خوشی سے اس کے مقابلہ میں برداشت کر لیتی' مگر نہیں فطرت اس وقت اس کے نسوانی فرائض کا امتحان لے رہی تھی' سخت المناک آزمائش میں ڈالنا چاہتی تھی' شوہر اس کا دل تھا اور بیٹی اس کی جان اور اس لئے کوئی قوت اس امر کے فیصلہ میں مدد نہیں دے سکتی تھی کہ وہ دل کو جان پر قربان کرے' یا جان کو دل پر۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو ہاتھ سے دینا ناگزیر ہے' مگر کس کو دے اور کس کو دل سے لگائے رکھے' یہ ایک ایسی کشاکش تھی جس سے نکلنا آسان نہ تھا۔

وہ محل واپس آئی تو بادشاہ کے کرب میں اس نے اضافہ پایا' لیکن جب اس نے سائکی کو باپ کے پاس سخت حالت فسردگی میں بیٹھا پایا۔ تو وہ۔ "ہائے سائکی" کہہ کر زمین پر گر پڑی۔ اور بیہوش ہو گئی' ہمیں خبر نہیں کہ وہ کب تک اس عالم میں رہی' اور کن کن شدائد کا مقابلہ اس نے کیا' مگر ہاں جس وقت صبح کو اس کی آنکھ کھلی تو چہرہ کا رنگ بالکل اڑا ہوا تھا' آنکھوں میں حلقے پڑے ہوئے تھے اور ضعف و نقاہت کا وہ عالم تھا کہ کسی کے سہارے سے اٹھنا بھی دشوار تھا۔ اس نے آنکھ کھولتے ہی چاروں طرف دیکھا اور یہ یقین کرنا چاہا کہ جو کچھ گزرا یہ سب خواب تھا' مگر جب اس نے کئی بار اپنی آنکھوں کو کھولا اور بند کیا تو اسے سمجھنا پڑا کہ یہ سب حقیقت و واقعہ ہے اور ویسا ہی جگر خراش ہے جیسا اس نے اپنے پندار میں بحالت خواب و بے ہوشی پایا تھا۔

نہ صرف امراء و درباروارکین سلطنت' بلکہ سارا یونان سراسیمہ تھا کہ دیکھئے ملکہ کس نتیجہ پر پہنچتی ہے' بعض کا خیال تھا کہ ایسا عادل بادشاہ' ایسا سخی و رحیم حکمران پھر یونان کو نصیب نہ ہوگا' اس لئے جس قدر گراں قیمت پر بھی اس کی زندگی واپس مل سکے ارزاں ہے' لیکن بعض کی تمنا یہ تھی کہ جو کچھ ہو سائکی زندہ رہے' کیونکہ بادشاہ تو ضعیف ہے اور بہر حال یونان کو ایک نہ ایک دن اس کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا ہے لیکن سائکی جس نے ابھی اپنی زندگی کی صرف سترہ بہاریں دیکھی ہیں اور جو ساری زمین کے لئے مایہ ناز ہے' روز روز پیدا ہونے کی چیز نہیں۔

اسی حالت میں منتظرہ دفعتاً بادشاہ کی خواب گاہ سے سخت چیخ کی آواز آئی اور معلوم ہوا کہ بادشاہ دم توڑ رہا ہے۔ ملکہ نے دفعتہً آنکھیں کھول دیں۔ اور اس سکوت کے دور کرنے کے لئے جو اس وقت سارے دربار پر چھایا ہوا تھا' اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے جس کے سننے کے واسطے یونان کا ہر شخص ہمہ تن گوش بنا ہوا تھا وہ اٹھی اس عزم کو اپنے خط و خال میں لئے ہوئے' اس عجیب و غریب استقلال سے اپنے اندرونی اضطراب کو چھپائے ہوئے' جس سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید وہ اپنے تاثرات سے جنگ کر کے کوئی فتح حاصل کر چکی ہے' گویا اب جو کچھ وہ کرنا چاہتی ہے اس پر افسوس کرنے کے لئے تیار نہیں۔

اس نے سمجھ لیا تھا کہ سائکی بھی مثل میرے بادشاہ کی مملوکہ ہے اور اس لیے مجھے کوئی حق نہیں کہ ایک مالک کو اپنی مملوکہ سے [illegible]۔ اگر سائکی کو ہاتھ سے دے دینے کے بعد بادشاہ اپنی زندگی حاصل کر لے گا تو اس کی مثال بالکل ایسے ہی ہو گی جیسے کوئی شخص [illegible] جوہر دے کر کسی مصیبت سے نجات حاصل کرے۔

جب وہ اس تاویل سے اپنی تسلی کر چکی تو اپنے مریض شوہر کے بستر علالت پر گئی اور سب کے سامنے سائنگی کو مخاطب کر کے کہا کہ:۔

"تم بیٹی تیار ہو جاؤ میں تجھے اجازت دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہوتی ہوں اور اس کی تعمیل کر کے اپنے فرض کو ادا کر اے سائنگی ہر چند مجھے یقین ہے کہ تیرے بعد میں زیادہ نہ جی سکوں گی۔ لیکن اگر مجھے اپنی ہی جان دینی پڑتی تو کیا مجھے پس و پیش کرنا چاہیے تھا پھر تیرا چلا جانا بھی تو میرا اپنی ہی جان کا چلا جانا ہے اے میرے جگر کے ٹکڑے دیکھ اپنی کمزوری سے اس وقت میرے ارادوں کو کمزور نہ کر دینا۔ تو زیادہ پریشان نہ ہو کیونکہ تیری ماں بھی بہت جلد تجھ سے آ ملے گی اور پھر کبھی جدا نہ کرنے کے لیے تجھے اپنی آغوش میں لے لیگی۔"

لب ملکہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ امڈ کر آنے لگے اور اس کی آواز کانپنے لگی۔ یہاں تک کہ اس کی ہچکی بندھ گئی اور مجبوراً آنکھ پر رومال رکھ کر اسے بات کا اشارہ کرنا پڑا کہ "بس اب سائنگی کو لے جاؤ اور دیر نہ کرو۔"

ہم نہیں کہہ سکتے کہ سائنگی نے اول اول اس خبر کو کہ وہ قربان گاہ پر چڑھائی جائے گی کس طرح سنا اور اس حالت انتظار کو جب تک ملکہ نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا کیونکر کاٹا مگر ہاں یہ ایک واقعہ ہے کہ جب اس کی نسبت ایک قطعی رائے قائم کر لی گئی اور اسے پہاڑ پر لے جانے کی تیاریاں ہونے لگیں تو وہ بالکل مردہ سی تھی اور اس کے قویٰ نے بالکل جواب دے دیا تھا۔

موت سے ڈرنا بالکل فطری امر ہے اس لئے سائنگی کیونکر مستثنیٰ ہو سکتی تھی لیکن اس میں کلام نہیں کہ جس غم نے اسے گونگا بنایا جس صدمہ نے اس کی آنکھوں سے آنسو جذب کر لیے وہ صرف یہ تھا کہ "میری جدائی کو ماں کیونکر برداشت کر سکے گی۔" اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈال دیئے۔ بدن ڈھیلا کر دیا اور اس طرح گویا اس نے اجازت دے دی کہ اس جسم کو جہاں جی چاہے لے جاؤ۔

اگلارس و کیو پڈس نے جلدی جلدی سارا انتظام روانگی کا کیا اور غریب سائنگی کا زندہ جنازہ ایک گاڑی پر ڈال کر کوہ الوند کی طرف چل دیئے۔

سوگوار ماں جس کی حالت دیکھ دیکھ کر لوگوں کے کلیجے پھٹے جاتے تھے ساتھ ساتھ تھی اور اک ہجوم تھا جو پروانہ وار اس شمع مردہ کو گھیرے ہوئے تھا سارے شہر میں ایک کہرام برپا تھا اور ہر گھر میں نالہ و ماتم۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو خونبار نہ ہو اور کوئی دل نہ تھا جو بے قرار نہ ہو۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت ساری کائنات پلٹ دی جانے کو ہے اور آسمان ٹوٹ پڑنے کو۔

ایک گھنٹہ میں یہ جماعت اس چوٹی پر پہنچ گئی جہاں سائنگی کی قربانی پیش کی جانے والی تھی اور جلدی جلدی اسے شاہ بلوط کے اس درخت سے باندھ دیا جو سب سے زیادہ نمایاں وہاں کے درختوں میں تھا۔

اب اس کی نازک کلائیاں جو ایک ایک چوڑی کا بار بھی برداشت نہ کر سکتی تھیں پس پشت رسی سے باندھ دی گئی تھیں اور کمر جس کی نزاکت کی پیمائش کے لئے ڈیڑھ بالشت فیتہ بھی زائد تھا درخت کے زبردست تنے سے کس دی گئی تھی اس کی وہی ریشمی چادر جسے وہ نصف باندھتی اور نصف اوڑھ لیتی تھی اس کے جسم پر تھی لیکن وہ نقاب جو ۵ سال سے اس کے چاند سے مکھڑے کو اپنی آغوش میں چھپائے ہوئے تھا اب جدا تھا کیونکہ یہ بھی رسم تھی کہ جس کی قربانی کی جائے اس کا سر و چہرہ برہنہ کر دیا جائے۔

سائنگی کا یہاں تک لایا جانا اس کی کمر اور کلائیوں کو باندھ کر درخت سے کس دیا جانا یہ سب عالم بیہوشی میں ہوا لیکن جس وقت اس کی ماں نے بیتابانہ اک آخری بوسہ اس کی پیشانی کا لیا تو سائنگی کی آنکھیں کھل گئیں اور چونکہ اب وہ ہاتھ نہ جوڑ سکتی تھی (کیونکہ وہ

بندھے ہوئے تھے وہ قدموں پر نہ گر سکتی تھی' (کیونکہ وہ درخت سے کس دی گئی تھی) وہ کچھ کہہ نہ سکتی تھی (کیونکہ اس کے حلق و زبان خشک تھے) اس لئے اس نے وہ ساری التجائیں' وہ ساری لجاجتیں جو دیگر اعضا سے کی جا سکتی تھیں اب صرف اس کی آنکھوں میں کھینچ کر آ گئی تھیں' اور اس لئے عالم یاس میں اس کی آنکھوں کا ماں سے رحم طلب کرنا' حقیقتاً ایک ایسا دل ہلا دینے والا منظر تھا جس کی تاب بھلا غریب ماں کیا لا سکتی تھی' وہ بیہوش ہو کر گر پڑی لوگوں نے اسے اٹھایا اور سائکی کو یوں تنہا پہاڑ کی چوٹی پر چھوڑ کر چل دیئے۔

مگر آہ' وہ سائکی کا کسمسا کسمسا کر اک آخری نگاہ مایوس کے ساتھ دیکھنا اور اس وقت تک اپنی نڈھال گردن موڑ موڑ کر دیکھتے رہنا' جب تک سب لوگ نظروں سے او جھل نہیں ہو گئے (کہ شاید اب بھی کوئی رحم کرے) ایسا دردناک نظارہ تھا کہ شاید اگر وینس خود موجود ہوتی تو وہ بھی آنسو بہاتی' مگر آہ' نہ وینس وہاں تھی کہ اسی کو کچھ رحم آتا۔ اور نہ ماں وہاں موجود تھی کہ پھر ایک بار بھینچ کر اپنی بیٹی کو کلیجے سے لگا لیتی۔ صرف ایک سنسان پہاڑ کی چوٹی تھی اور وحشت ناک جنگل کی خاموشی جس کی ساکن و وسیع فضا میں سائکی کی نگاہ اور وا پسیں گم اور وہ خود ایک طرف گردن ڈال کر بے ہوش۔

(۵)

"اے خواب کی ملکہ' اے نیند کی دیوی جا اور اس کی آنکھوں کو اک شیریں سکون بھر دے' اور تو بھی اے نسیم کی دیوی اٹھ اور اس کی کمر اور کلائی کے بند جدا کر دے' کیونکہ فانی نوع انسان میں ایسا سحر دلدوز حسن میں نے کبھی نہیں دیکھا جلدی کرو کیونکہ میرا دل اس کی محبت میں پھنک رہا ہے۔" کیوپڈ کی اس التجا کو ان دیویوں نے سنا اور دفعتاً کوہ الوند کی اس خوفناک چوٹی پر پہنچ گئیں' جہاں اک شاہ بلوط کے تنے سے یہ چاند طلوع ہو رہا تھا۔

شاخوں میں جنبش شروع ہوئی۔ پتیاں ہلنے لگیں اور رفتہ رفتہ ایک لطیف و نکہت بیز ہوا نے سارے پہاڑ کو معطر کر دیا۔ سائکی کے دماغ کا اس تعطر سے متاثر ہونا تھا کہ اس کی آنکھیں جھپک گئیں اور اس کا سونا تھا کہ باد نسیم نے درخت سے جدا کر کے' اپنے ہاتھوں پر سنبھال کر فرش پر لٹا دیا۔

سائکی بے خبر پڑی سو رہی تھی' چادر اس کے سر و سینہ سے جدا تھی اور اسے یہ ہوش نہ تھا کہ ایک حریص آنکھ اسے دیکھ رہی ہے۔ اس لئے اپنا عریاں حصہ جسم چھپا کر اسے سمٹ جانا چاہیے' اس کے بال ہوا سے اڑاڑ کر اس کی پیشانی اور چہرہ پر آ رہے تھے اور اسے کچھ خبر نہ تھی کہ ایک غیر شخص اس منظر سے لطف اٹھا رہا ہے' اس لئے اپنے بال درست کر کے چہرہ پر نقاب ڈال لینا چاہیے۔

کیوپڈ نے اس سے قبل جب سائکی کو باغ میں دیکھا تو وہ بے نقاب ضرور تھی' مگر محو خواب نہ تھی' لیکن اسے کیا خبر تھی کہ جب حسن سو جاتا ہے تو کیا ہو جاتا ہے اور جب لباس بے ترتیب اور بال برہم ہو جاتے ہیں تو ایک عورت کیا قیامت ہو جاتی ہے۔

کیوپڈ خاموش و متحیر کھڑا دیکھ رہا تھا اور تباہ ہو رہا تھا' اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سائکی کی کھلی ہوئی بلوریں گردن کو دیکھا کرے یا صرف اس کے عریاں سیمیں سینہ کو' اس کے یاقوتی ہونٹوں پر جان دے یا اس کی کشادہ پیشانی پر۔ اس کی فہم اس امر کا ضبط کرنے سے قاصر تھی کہ سائکی کی سیاہ خمدار ابروؤں سے محبت کرے یا اس کی متوالی آنکھ سے' وہ متحیر تھا کہ اس کی نازک کمر پر اپنے تئیں تباہ کرے یا اس کی کشیدہ قامتی کے انتہائی تناسب پر۔ وہ دیر تک اسی عالم حیرت و استعجاب میں کھڑا رہا' اور آخر کار یہ فیصلہ کر کے کہ سائکی کا رتبہ اس سے بہت زیادہ بلند ہے کہ کوئی شخص اپنے تئیں اس سے محبت کرنے کا اہل سمجھے وہ اس کے قدموں پر گر پڑا اس کے رنگین

گالوں پر ایک طویل بوسہ دے کر یہ کہتا ہوا اٹھ بیٹھا کہ:

> اے ساکی میں تجھ سے محبت نہیں کروں گا' تجھ سے پیار نہیں کروں گا' تجھ سے عشق نہیں کروں گا' کیونکہ یہ بھی ایک ناقص طریقہ اظہار جذبات کا ہے' میں تیری عظمت کروں گا' تجھے پوجوں گا' تجھ سے ڈروں گا' ایک ایسا ڈر اپنے دل میں لئے ہوئے جو کبھی جیوپیٹر کی طرف سے بھی مجھے پیدا نہیں ہوا' تجھے دیکھوں گا اور کانپا کروں گا' بدن کی اس کپکپی کے ساتھ جو کبھی میرے اوپر طاری نہیں ہوئی ہیں تجھے ایک ملکہ' نہیں' ایک دیوی آہ' یہ بھی نہیں بلکہ خدا جانے کیا سمجھوں گا اور اگر تو نے اجازت دی تو اپنے تئیں تیرا ایک خادم' ایک ادنیٰ پرستار' آہ یہ بھی نہیں بلکہ ایک غریب' فقیر' اک ذلیل گدا' ایک خوار بھکاری' اور اس سے زیادہ حقیر وہ کچھ سمجھوں گا' جسے میں الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا۔"

مارفیس وزفر نے ساکی کو اٹھالیا اور اپنے پروں پر رکھ کر شاداب کوہ اولمپس کی اس کنج میں لے گئیں جہاں کیوپڈ نے خاص طور پر ایک قصر ساکی کے لئے تیار کر لیا تھا' وہ اک برج میں جو اس قصر کا بہترین حصہ تھا لٹا دی گئی اور مارفیس نیند اس کی آنکھوں سے لے کر زفر کے ساتھ غائب ہو گئی۔

ساکی اپنی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور سخت متحیر ہوئی جب اس نے اپنے تئیں اک طلائی برج میں جواہر کار فرش پر پایا' اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں کہ شاید یہ کوئی دلکش خواب ہے اور پھر کھول دیں کہ کاش خواب نہ ہو' مگر بے صبر کیوپڈ سے زیادہ ضبط نہ ہو سکا اور اک شیریں آواز ساکی کے کانوں میں آئی کہ "یہ خواب نہیں حقیقت ہے" اور اسی کے ساتھ چہرہ پر نقاب ڈالے ہوئے' سونے کی بوچھاروں میں حسین کیوپڈ یہ کہتا ہوا نکل آیا کہ "متعجب نہ ہو' تیرا غلام تیرے سامنے حاضر ہے' اسے کوئی حکم دے شاہانہ لب ولہجہ کے ساتھ کچھ کرنے کو کہہ' کیونکہ تیری خدمت اس کی زندگی ہے' اگر تو نفرت نہ کرے تو میں کہوں کہ وہ عفریت میں ہی ہوں۔ جس کے لئے تیری قربانی چڑھائی گئی تھی' اور اگر تو خفا نہ ہو تو وہ عفریت تیری تمام خواہشات قلب مہیا کر دے۔"

ساکی کو سمجھایا گیا تھا کہ جب اس کی قربانی پیش کی جائے گی تو ایک بدصورت' مردم خوار عفریت اس کا شوہر بنے گا' لیکن وہ تو اپنے سامنے ایک حسین نوجوان کو دیکھ رہی تھی اور ہر چند وہ نقاب پوش تھا لیکن اعضا کا تناسب' اس کا کندنی رنگ جو نقاب سے چھنا پڑتا تھا' کہے دیتا تھا کہ اس نقاب کے نیچے ایک نہایت ہی خوبصورت اور پرشباب چہرہ چھپا ہوا ہے۔

اس کے وہ تمام حسیات جو یونان میں مردہ ہو چکے تھے' دفعتاً زندہ ہو کر پھر اس کے خون میں دوڑنے لگے' اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا' انفعال سے بھیگ گیا یعنی گلاب پر پھر وہی شبنم آ گئی جس سے اس کا حسن اور چمکنے لگتا تھا۔ وہ آخر کار اپنی تمنا سے مغلوب ہو کر اٹھ بیٹھی اور کیوپڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی کہ "اگر تو ہی میرا شوہر ہے تو پھر یہ حجاب کیوں؟ یہ نقاب کیسا؟ تجھے کیا حق حاصل ہے کہ ان آنکھوں کو مجھ سے چھپائے رکھے۔ جن میں مجھے اپنے جذبات' اپنی تمناؤں کی وسعت کو پڑھنا ہے' وہ جیسی بھی ہیں میری ہیں' میں ان سے محبت کرنا سیکھوں گی گو انھیں مجھ سے محبت نہ ہو' میں اپنے بہترین ہدایائے عشق ان کے سامنے پیش کروں گی' خواہ وہ کتنی ہی مجھ سے چرائی رہیں" یہ کہتے ہوئے ساکی نے اس کا نقاب نوچنے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ کیوپڈ نے اس کی کلائیاں پکڑ لیں اور نہایت ہی نرم و پرلجاجت لہجہ میں بولا کہ:

"اے ساکی میں تیرا ادنیٰ غلام ہوں تو مجھے جو چاہے سمجھ لیکن مجھے اس بات پر مجبور نہ کر' جس کو میں اگر کر ڈالوں تو پھر تجھی کو

افسوس کرنا پڑے اگر تو مجھ پر صرف اس لئے رحم کر سکتی ہے کہ صرف نقاب کا جدا کرنا ہی اک ایسا کام ہے جس کے متعلق وہ تیرا فرمان ماننے کے لیے تیار نہیں' تو تو رحم کر' ورنہ اے سائکی پھر میں تجھ سے چمٹ جاؤں گا اور مر جاؤں گا۔"

سائکی کچھ تو اس تقریر سے متاثر ہو کر کچھ اس کے مردانہ گرم ہاتھوں میں اپنی نازک کلائیوں کو پا کر رک گئی۔ ٹھہر گئی اور ایسا محسوس کرنے لگی گویا اس کے ہاتھ ڈھیلے ہیں' اس کے بدن میں سکت نہیں ہے اور وہ بے اختیار اس کی طرف کھنچی جا رہی ہے۔ آخر کار اس نے سارے بدن کا بوجھ کیوپڈ پر ڈال دیا' اپنے تئیں اس کی آغوش میں سونپ دیا اور اس نامعلوم لذت سے مست و سرشار ہو کر جو اس سے قبل اسے کبھی نصیب نہ ہوئی تھی اور جس کے لیے وہ اک جستجوئے مبہم بنی ہوئی تھی' آنکھیں پلٹ کر کیوپڈ کی گود میں بے حس ہو کر گر پڑی۔

ہر چند' ملک' وطن' ماں باپ کو اس طرح یکایک چھوڑنے کا رنج' ایسا معمولی رنج نہیں جسے ایک عورت اور عورت بھی ایسی حساس' اور ایسی لطیف الخیال اور ایسی نازک طبع جلد فراموش کر سکے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک عورت اپنے شباب کے عالم میں اگر کوئی حقیقی اور سچی حس رکھتی ہے تو وہ وہی ہے جس کا تعلق صرف اس کے شباب سے ہے' یہ ممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں وہ دیگر مشاغل حیات میں بھی منہمک ہو' مختلف اسباب تفریح سے بھی گہری دلچسپی کا اظہار کرے' یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی ذات سے وابستہ ہونے والے اور تمام تعلقات کے ساتھ یکسر محویت واستغراق ہو جائے' لیکن اس کے سامنے اس کے حسن کا ذکر کرو۔ جس سے اس کا شباب براہ راست متاثر ہو' پھر یہ ممکن نہیں کہ وہ دنیا بھر کی تمام باتیں چھوڑ کر اس طرف متوجہ ہو جائے' یہ عورت کی فطرت ہے کہ وہ اپنے حسن و شباب کے متعلق جس قدر دوسروں کی رائے زنی سے خوش ہوتی ہے' اتنی وہ خود آئینہ دیکھ کر بھی کبھی مسرور نہیں ہوتی' حالانکہ وہ گھنٹوں اس کے سامنے گیسو سنوار سنوار کر مزے لیا کرتی ہے' وہ چاہتی ہے کہ اس کی جوانی میں جوانی ہی کا ذکر ہو' اور کوئی گفتگو اس کے سامنے نہ ہو۔

ہم نے مانا کہ سائکی کو اپنی ماں سے بہت زیادہ الفت تھی' اپنے باپ پر جان دیتی تھی (اور اس نے دے ہی دی) اپنے وطن کی شیدا تھی' لیکن یہ الفت' یہ جاں نثاری یہ قربانی اسی وقت تک تھی جب تک کوئی اس کا چاہنے والا نہ تھا' لیکن جب اس نے اپنے سامنے کیوپڈ ایسا حسین نوجوان دیکھا اور اس کی وارفتگی' اس کی افتادگی اور اس کی پرستاری اپنی آنکھوں سے دیکھ لی' کانوں سے سن لی اور ہاتھوں سے چھو لی' تو وہ اپنے سارے افکار بھول گئی' سارے غم طے کر گئی' کیونکہ اب کوہ اولمپس کی وسیع خلوت میں سوائے اک حیات معاشقہ کے اسے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی اور وہ کچھ نہ سمجھ سکی تھی مگر یہ کہ وہ اپنے بار شباب سے خستہ ہو کر جس کی خستگی کو وہ کم از کم تین چار سال سے برداشت کرتی چلی آتی تھی' آنکھ بند کر کے کیوپڈ کی محبت بھری آغوش میں گر پڑی' اس نے سمجھ لیا کہ وہ نوجوان ہے' حسین ہے' اس لئے اس اس نے مطلق پروا نہیں کی' اگر کیوپڈ کا چہرہ بے نقاب نہ تھا' اس نے جان لیا کہ وہ اس سے محبت کرنے کے لیے آمادہ ہے' اس لئے کون اور کیا کے جھگڑوں میں اپنے لطف کو خراب کرنا حماقت ہے۔

کیوپڈ کی خود کیا حالت تھی' وہ سائکی کے نرم و نازک جسم کو اپنے جسم سے متصل پا کر کیا سوچ رہا تھا؟ غالباً یہ سوال جواب طلب نہیں۔ کبھی وہ سائکی کی آنکھیں چومتا تھا اور کبھی لب' کبھی اس کے سینے سے آنکھیں ملتا تھا اور کبھی گردن سے۔ غرضیکہ وہ بالکل دیوانہ سا تھا' مجنوں تھا' اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیونکر وہ سائکی سے سیر و آسودہ ہو سکتا ہے یہاں تک کہ اس نے سائکی کے پر نم ہونٹوں پر اپنے لب رکھ دیئے' اور وہ بھی مست ہو کر اپنے تئیں بھول گیا اور اس کی آغوش میں بیہوش ہو کر گر پڑا۔

(۲)

غرضیکہ آفرینش سے لے کر اس وقت تک کیوپڈ لمپس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے کسی آبادی کو اپنے دامن میں جگہ دی تھی کیونکہ اس کی بلند چوٹیاں نہ صرف اس وجہ سے کہ خداوند جیوپیٹر کی تجلی گاہ تھیں، بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ان کو آباد کرنا ایک انسانی قوت سے باہر تھا ہمیشہ سنسان اور ویران رہیں۔ ناقابل پیمائش عمیق غاروں کی تاریک وسعت نہایت ہولناک سیلابی کے عمیق چشموں کی اس وسعت میں روانی بڑے بڑے درختوں سے پیدا ہونے والا ہولناک مہیب سناٹا خوفناک درندوں کی گرج کی آواز بازگشت، بڑے بڑے کانٹوں والی جھاڑیوں کا ایک غیر متناہی سلسلہ، ہر اسی طرح کی اور بہت سی ڈراونی چیزوں اور جسم میں لرزہ پیدا کر دینے والے مناظر کا مجموعہ! یہ تھا کوہ اولمپس جہاں کیوپڈ نے سائکی کے ساتھ رہنا پسند کیا اور یہ انتخاب اس نے اپنی کمسنی اور ناتجربہ کاری ہی کے لحاظ سے کیا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب وینس کو خبر ہو جائے گی تو وہ کوئی تدبیر سائکی کی ہلاکت کی نہ اٹھا رکھے گی پھر وہ کہاں جاتا؟ کوہ اولمپس ایسی جگہ تھی جہاں کسی کی رسائی نہ تھی اور وہ اپنی زندگی سائکی کے ساتھ امن و سکون کی حالت میں بسر کر سکتا تھا کیونکہ جب جیوپیٹر کو کوئی عذاب نازل کرنا ہوتا تھا تو وہ اسی پہاڑ کی چوٹی پر اتر آتا تھا اور عذاب نازل کرتا تھا چنانچہ اس سے قبل بارہا کوہ اولمپس کی چوٹیوں سے جیوپیٹر کا غصہ آگ بن کر نکلا اور دور دور آبادیوں کو تباہ و برباد کر گیا، پھر ایسی جگہ جو آسمان کے دیوتاؤں میں سب سے بڑے دیوتا کے غصہ کرنے کی جگہ ہو کون جا سکتا تھا مگر چونکہ کیوپڈ، جیوپیٹر کا محبوب ترین بیٹا تھا اور اپنے فرائض کے لحاظ سے نہایت اہم مانا جاتا تھا اس لئے وہ وہاں پہنچ سکا اور اپنے ساتھ رہنے والی مخصوص دیویوں، مارفیس اور زفر کو بھی اپنے ساتھ لا سکا۔

اس زریں قصر کا ذکر پہلے ہو چکا ہے، جو اس نے سائکی کے خوش کرنے کے لئے تیار کیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کیوپڈ سے مواصلت کی مسرت ایک ایسی مسرت سائکی کے لئے تھی کہ ایک ہفتہ تک تو اسے یہ ہوش بھی نہ ہوا کہ وہ ہے کہاں۔ مگر پورے ایک ہفتہ تک اس برج طلائی کی خلوت میں بند رہنے کے بعد وہ وقت آیا کہ سائکی کو اپنی نئی زندگی پر کچھ غور کرنا پڑا اور اسے معلوم ہوا کہ اب کیوپڈ اس سے زیادہ مسلسل وقت نہیں دے سکتا، کیونکہ انھیں آٹھ دس دن میں کیوپڈ کے معطل بیٹھ جانے سے کرۂ ارض میں کج خلقی، بے رحمی اور درندگی بہت پھیل گئی تھی اور اس لئے ضرورت تھی کہ وہ اپنا تیر و کمان سنبھال کر نہایت سرگرمی کے ساتھ اس کمی کو پورا کرے لیکن سوال یہ تھا کہ جب تک وہ نہ آئے گا سائکی کیونکر اپنا وقت بسر کرے گی، کن مشاغل میں اپنے تئیں الجھائے رکھے گی؟ اس کا جواب ذرا دشوار تھا مگر آخر سائکی نے کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کیوپڈ سے التجا کی کہ وہ حوالی قصر میں ان تمام اسباب تفریح کو مہیا کر دے جن کی وہ اپنے زمانہ دوشیزگی میں عادی تھی۔

کیوپڈ نے دو گلدستے اٹھا کر زمین پر دے مارے جو خود تو غائب ہو گئے، لیکن بجائے ان کے دو حسین فرشتے جن کے پروں میں الماس ٹکے ہوئے تھے اور جن کی عمریں ۱۴۔ ۱۴ سال سے زائد نہ تھیں نکل کر سائکی کے سامنے کھڑے ہو گئے، کیوپڈ نے ان سے کہا کہ "جاؤ اور قبل اس کے کہ ملکہ سائکی دروازہ تک پہنچے، تمام حوالی قصر کو ان مناظر سے آباد کر دو جو والی یونان کے محل سے متعلق ہیں۔" ان کو رخصت کر کے کیوپڈ نے جتنے گلدستے وہاں رکھے تھے سب کو فرش پر ٹپکنا شروع کیا، یہاں تک کہ چشم زدن میں سارا قصر حسین پریوں سے بھر گیا اور سائکی ان پر دار پیش خدمتوں سے گھر گئی ان کے ہاتھوں میں مختلف قسم کے ساز تھے، جن کے تاروں سے ارتعاش کے وقت عجیب دلکش خوشبو پیدا ہوتی تھی، سائکی اس زمانہ قیام میں اس نوع کے عجائب و غرائب سے اس درجہ آشنا ہو گئی تھی کہ اسے زیادہ حیرت نہیں ہوئی اور کیوپڈ کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر پریوں کے حلقہ میں قصر سے باہر نکلی لیکن اس کی نگاہ، واقعی باہر

[illegible] کر ایلی ہی تھی کہ وہ ششدر و متحیر ہو گئی کہ شاہ یونان کا باغ مع اپنی تمام روشوں، نہروں، کنجوں، فواروں، درختوں اور حوضوں کے [illegible] یہاں منتقل ہو سکا، وہ اپنے باغ اور اس باغ میں کچھ فرق نہ پاتی تھی، سوائے اس کے کہ وہاں بلور کے ٹکڑے روشوں پر پڑے ہوئے تھے اور یہاں ذرہ ہائے الماس تھے، وہاں حوض سنگ مرمر و بلور کے تھے اور یہاں شفاف طلا اور صیقل کی ہوئی چاندی کے، وہاں اپنی دوشیزگی کی بے مزہ زندگی بسر کرنی تھی اور یہاں وہ کیوپڈ کے ساتھ مست و سرشار تھی۔

سائیکی خوش خوش اس باغ میں داخل ہوئی اور ٹہلتے ٹہلتے ہر چیز کو دیکھتی ہوئی پھولوں کو سونگھتی ہوئی کیوپڈ کو لے کر ایک کنج کے اندر چلی گئی اور ساری پریاں باہر مودب کھڑی رہیں۔

شام ہو گئی تھی، چاند نکل آیا تھا۔ اس لئے پھر سائیکی وہاں سے نہیں نکلی اور وہ رات قصداً اس نے کیوپڈ کے ساتھ اس کنج میں بسر کرنا چاہی کیونکہ جب وہ یونان میں تھی تو یہی کنج تھا جہاں اس نے پوری ایک طویل رات نہایت کرب میں گزاری تھی۔

(۷)

کچھ زمانہ اسی انداز سے گزرا کہ کیوپڈ دو چار دن کے لئے باہر چلا جاتا اور پھر اک نیا شوق نیا جوش لے کر واپس آتا اور سائیکی کے پاس رہتا۔ ہر چند سائیکی بھی اس کی عادی بننا چاہتی تھی اور کیوپڈ کی غیبت میں انتظار کی گھڑیاں، مختلف مشاغل تفریح میں کاٹتی تھی۔ لیکن وہ کیوپڈ کی اس گھڑی گھڑی کی مفارقت سے بعض اوقات بہت دل گرفتہ و مضمحل ہو جاتی، اور وہ اپنے کنجوں، پھولوں اور پریوں سے بیزار، اب وہ چاہتی تھی کہ کوئی اسی کا ہم جنس مل جائے اور اس سے اپنی موجودہ کامرانی کی داد لے۔ وہ ان پریوں سے صرف اشارہ سے کام لیتی تھی، کیونکہ کام کرنے والی پریاں بات نہیں کر سکتیں اور شاید کیوپڈ نے کسی مصلحت کی بنا پر ایسی کنیزیں مہیا نہیں کی، جن سے سائیکی گفتگو کر سکتی۔ غرضیکہ جب کیوپڈ چلا جاتا تھا تو وہ سخت متوحش ہو جاتی اور باوصف اس کے کہ کنیزوں کی ایک کثیر تعداد اس کی جلو میں ہوتی، وہ ان بے زبان متحرک تصویروں سے گھبرا کر یہی سمجھتی کہ۔ "میں تو اب ویسی ہی اکیلی اور تنہا ہوں۔"

جس وقت عورت اپنی محبت میں کامیاب نہیں ہوتی، اس وقت تک تو اس کی زندگی ایک کلی سی خلوت آرمیدہ زندگی ہے، وہ نہ کہیں جانا پسند کرتی ہے اور نہ کسی سے بات کرنا۔ لیکن جب وہ اپنی محبت میں کامیاب ہو جاتی ہے، جب اس کی حیات معاشقہ اک عملی صورت اختیار کر لیتی ہے تو وہ پھر اگر تنہا بھی ہے تو بجائے خود اک انجمن ہے اور خلوت سے سخت بیزار، جب تک اس کی محبت کا کوئی جواب دینے والا نہیں، لیکن جب کوئی ایسا شخص اسے مل جاتا ہے اور اس کی جوانی کی لذتوں کو اس کے لئے قابل فہم بنا دیتا ہے، تو پھر عورت اپنی مسرت کے بار کو برداشت نہیں کر سکتی اور اپنی ہی جنس کا کوئی فرد اپنے پاس چاہتی ہے۔ جس سے وہ اپنی لذتوں کا اظہار کرے، یعنی جس طرح وہ اپنی ناکام زندگی میں دوسروں پر رشک کیا کرتی تھی اسی طرح اپنے مسرور و شادکام زمانہ میں یہ چاہتی ہے کہ کوئی دوسرا بھی اس پر رشک کرے، اس لئے سائیکی بعض وقت گھبرا اٹھتی کہ کوئی اور نہیں تو کم از کم اس کی بہنیں، اگلارس و کیوپڈس ہی آ کے دیکھیں اور اس کی خوش قسمتی پر رشک کریں۔

ایک دن جبکہ کیوپڈ خلاف معمول کئی دن کے بعد آیا، تو سائیکی مچل گئی کہ میں تو اپنی بہنوں کو دیکھوں گی، اور اگر میں وہاں نہیں جا سکتی تو انھیں کو یہاں بلاؤں گی، یا تو وہ اس کے پاس سے ہٹانہ کرے یا پھر کیوپڈس و اگلارس ہی کو بلوا دے کہ چند دن انھیں کے ساتھ بسر ہو لے۔

کیوپڈ خاموشی سے سائکی کی ضدوں کو دیکھتا اور سنتا رہا اور جب وہ کہہ چکی تو اس نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا کہ "اے سائکی میرے لئے اس سے زیادہ مسرت بخش امر اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ تیرے احکام کی تعمیل میں اپنی ساری قوتوں کو صرف کر دوں، لیکن میں ڈرتا ہوں کہ ان کا آنا میری مسرتوں کو منغص نہ کر دے، یہ بالکل ممکن ہے کہ ان کے آنے سے تیری بعض ضدیں پھر از سر نو زندہ ہو جائیں اور وہی خدشات سامنے آ جائیں جن کے خیال سے میں کانپنے لگتا ہوں، شاید وہ تیرے دل میں کوئی جستجو پیدا کر دیں اور یہی ایک چیز ہے جو میں تیرے دل میں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اے سائکی اب بھی سوچ اور مجھے ان کے بلانے پر مجبور نہ کر۔"

مگر سائکی جسے اپنی محبت پر پورا اعتماد تھا اور جو کیوپڈ کے خلاف مزاج کسی بات کا کرنا اپنے لئے بالکل ناممکن خیال کرتی تھی، اپنی ضد پر قائم رہی اور کیوپڈ کو بادل نخواستہ ماننا پڑا۔

اس نے مارفیس وزفر کو بلایا اور اگارس و کیوپڈس کے بلانے کا حکم دیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی تاکید کر دی کہ ان کو کسی طرح یہ نہ معلوم ہو کہ کس کے اشارہ اور حکم سے وہ طلب کی جاتی ہیں۔

"میں ان راتوں پر رشک نہیں کرتی جو تیری معیت میں مجھ پر گزر جاتی ہیں، کیونکہ جب تک تو میرے پہلو میں ہے صرف میرا ہے، لیکن ہاں میں ان راتوں سے ضرور جلتی ہوں جو ادھر مجھ پر اور ادھر تجھ پر تنہا گزریں، کیونکہ اس وقت میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ تیری معیت صرف انہیں کے ساتھ ہے، لیکن جب تو مجھ سے دور ہو تو یہ نہ سمجھ کہ میں تجھ سے جدا ہوں، کیونکہ میں تو صرف ایک آرزو ہوں اور آرزو بھی صرف تجھے چاہنے کی، تجھ سے محبت کرنے کی۔ پھر اگر تو علیحدہ ہو کر میری یاد اس طرح کرتا ہے جیسے کسی دور کی چیز کا خیال کیا جاتا ہے تو غلطی ہے کیونکہ وہ آرزو تو تیرے ساتھ ہے۔ پھر یہ تخیل کیسا؟ دیکھ تو اپنے مشاغل کے دوران میں ایک دفعہ چونک کر کچھ سوچنے لگتا ہے، خاموش ہو جاتا ہے، وہ سکوت وہ فکر میں ہی تو ہوں جو تیری نگاہوں کو تیرے کام سے تیرے دل کو تیرے فرائض سے ہٹا لیتی ہوں، تو رات کو کسی دور دراز زمین میں سوتے سوتے چونک پڑتا ہے، گھنٹوں جاگ کر کروٹیں لیا کرتا ہے، یاد رکھ کہ وہ بیداری اور کروٹ خود سائکی ہے جو تیری آنکھوں میں آ جاتی ہے اور تیرے پہلو سے لپٹ جاتی ہے لوگ کہتے ہیں محبت بری ہے، مگر میں دیکھتی ہوں کہ میرے زخمی کرنے کے لئے کوئی خاص تیر تھا جو کیوپڈ نے چلایا۔"

کیوپڈ کے جسم میں اس فقرہ سے ایک لرزش پیدا ہوئی لیکن اپنا اضطراب چھپانے کے لئے بول اٹھا کہ "اے سائکی، کیوپڈ نے کیا چلایا یہ کہو کہ میں نے چلایا؟"

سائکی بولی ہاں سچ ہے، "تمہیں نے چلایا، تو کیا تم کیوپڈ ہو؟ نہیں تم کیوپڈ نہیں ہو سکتے کیونکہ میں نے سنا ہے وہ خود کسی سے محبت نہیں کرتا، اس کے دل میں ذرا رحم نہیں ہے، اس کا سینہ گداز عشق سے خالی ہے، وہ سفاک ہے اور تم تو مجھ سے محبت کرتے ہو، مجھے چاہتے ہو۔"

کیوپڈ "ہاں میں کیوپڈ نہیں ہوں، مگر یہ خیال کہ کیوپڈ کو کسی سے محبت نہیں ہو سکتی، شاید درست نہ ہو، کیونکہ بہت سی باتیں غلط مشہور ہو جاتی ہیں۔"

یہاں یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ مارفیس اور زفر سائکی کی بہنوں کو ہاتھوں پر لئے ہوئے آئیں اور جگا کر غائب ہو گئیں۔ سائکی اپنی

بہنوں کو لے کر قصر میں گئی اور ایک ایک چیز وہاں کی دکھائی پھر وہاں سے باغ میں لائی اور فخر کے ساتھ ہر ہر کنج کی سیر کرائی دل میں تو وہ اور جلیں کہ سائکی ابھی تک نہ صرف زندہ ہے بلکہ ایسی شاہانہ زندگی بسر کر رہی ہیں لیکن ظاہر میں انھوں نے سائکی کو مبارکباد دی اور پوچھا کہ "یہ زر و جواہر یہ سامان نشاط کہاں سے آیا؟"

سائکی نے جواب دیا کہ "مجھے یہ نہیں معلوم کہ کہاں سے آیا اور وہ کون ہے جس نے مہیا کیا؟" انھوں نے نہایت حیرت سے کہا "تو کیا اس وقت تک تیرے شوہر نے اپنا نام بھی تجھے نہیں بتایا؟"

"آہ میں اس کا نام نہیں جان سکتی اس کی ممانعت ہے۔"

"مگر اے بہن تو نے اس کا چہرہ تو ضرور دیکھا ہوگا کیا بہت خوبصورت ہے۔"

"نہیں میں نے اس کی صورت تو نہیں دیکھی کیونکہ وہ ہمیشہ نقاب ڈالے رہتا ہے۔"

"ہاں ہاں جب میں سو جاتی ہوں تو خواب اور میری نیندیں اس کے حسین چہرہ سے جگمگا اٹھتی ہیں۔"

بہنیں بولیں "اے لڑکی تجھے فریب دیا گیا کیونکہ یہ وہی عفریت ہے جو کسی دن تجھے کھا لے گا۔" سائکی نے کہا "نہیں وہ عفریت تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔" مگر دونوں بہنوں نے پھر یہی کہا اور اس قدر اصرار کے ساتھ اس کے عفریت ہونے کا یقین دلایا کہ سائکی بھی کچھ متفکر سی ہو گئی۔ اس تفکر سے انھوں نے اور فائدہ اٹھایا اور آخر کار اسے مجبور کر دیا کہ ابھی جائے اور نقاب الٹ کر اس کا چہرہ دیکھے۔

رات ہو گئی تھی کیوپڈ اپنی خوابگاہ میں بیہوش پڑا سو رہا تھا سائکی آہستہ آہستہ گئی اور ڈرتے ڈرتے اس کے چہرے سے نقاب الٹ دیا مگر بجائے اس کے کہ وہ عفریت کی ڈراونی شکل دیکھتی اس نے ایک نہایت ہی حسین و جمیل شکل دیکھی اور اسی ایک لمحہ میں سائکی کی محبت نے خدا جانے کتنے مدارج اور طے کر لئے۔

کیوپڈ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور برہم ہو کر بولا کہ "اے بیوقوف سائکی یہ تو نے کیا کیا کیا تو یہ نہ جانتی تھی کہ میں اک قوت غیر فانی ہوں اور کیا میں نے تجھ سے یہ بات بارہا نہیں کہی کہ کوئی انسان میرے چہرہ کو دیکھ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔" یہ کہہ کر اس نے باہر نکل جانا چاہا لیکن بدقسمت سائکی نے اپنی ملتجی نگاہوں سے کیوپڈ کو دیکھ کر اپنے ہاتھ بڑھائے کہ کسی طرح وہ لوٹ آئے اور اس کی خطا کو معاف کر دے۔ ہر چند کیوپڈ سائکی کی اس ادا سے بے انتہا متاثر ہوا اور بے اختیار اس کا جی چاہا کہ اس سے لپٹ جائے لیکن وہ رک گیا کیونکہ اب ایسا کرنے سے اس کی غیر فانی روح اس سے چھین لی جاتی۔ اس لئے کیوپڈ فوراً ایک ہاول اور سائکی کے درمیان حائل کر کے غائب ہو گیا اور سائکی بیہوش ہو کر گر پڑی۔

کیا خبر وہ کتنے عرصہ تک بیہوش رہی لیکن ہاں جب اس کی آنکھ کھلی تو نہ وہ قصر تھا نہ وہ اس کی مکلف خوابگاہ نہ وہاں باغ تھا نہ کوئی کنیز وہی وحشت ناک کوہ الوند کی چوٹی تھی جہاں وہ پہلی دفعہ قربانی کے لئے لائی گئی تھی اور وہی شاہ بلوط سامنے تھا جس کے تنے سے وہ کبھی کس کے باندھ دی گئی تھی پہلے تو وہ یہ سمجھی کہ کوئی وحشت ناک خواب دیکھ رہی ہوں لیکن تھوڑی دیر کے بعد اسے یقین کر لینا پڑا کہ خواب نہیں ہے بلکہ خواب تو وہی تھا جس میں اس نے پرلطف زندگی بسر کی مگر ایسا خواب ایسا طویل خواب نہیں ہو سکتا مگر پھر کیا تھا!

آہ وہ اس حقیقت پر زیادہ غور کرنے کی طاقت اپنے میں نہ پاتی تھی وہ بالکل مبہوت تھی دیوانہ پن اس کے چہرہ سے برس رہا تھا اور وہ فوراً مر جانا چاہتی تھی۔

(۸)

سائکی دیوانہ وار پہاڑ پر پھر رہی تھی، پاؤں کانٹوں سے مجروح تھے اور سارا بدن چوٹوں سے داغدار، کراہتی تھی اور روتی تھی، چیختی تھی اور گر گر پڑتی تھی، لیکن وینس کی برہمی کا وہی عالم تھا اس نے آدمیوں کو حکم دیا کہ سائکی کو پکڑ کے سامنے لائیں اور خود یہ حکم دے کر جیوپیٹر کے پاس چلی گئی۔ جیوپٹر اس کا شوہر اولین تھا اور یہ کسی زمانہ میں اس کی محبوب ترین بیوی رہ چکی تھی اس لئے اس نے بعض خاص تدابیر پر عمل کیا اور اپنے پندار میں ایسی حسین بن کر بیٹھ گئی کہ سائکی کا حسن اس سے شرما جائے گا مگر جس وقت سائکی لائی گئی تو وینس یہ دیکھ کر کہ اس حالت خستگی میں بھی سائکی کے حسن کا وہ عالم ہے کہ وہ باوجود تمام تدابیر حسن افروز کے بھی مقابلہ نہیں کر سکتی عرق عرق ہو گئی اور یہ عزم کر لیا کہ سائکی کو مار ڈالنا چاہیے لیکن جیوپیٹر نے رات کو وینس کے خواب میں آکر اس کا خیال بدل دیا اور سائکی کی جان بخشی کی یہ شرط قرار دی گئی کہ وہ دیوی پراسرپائن کا طلسمی صندوق لے آئے جس میں طلائے حسن بند ہے۔

سائکی اپنی قسمت کا فیصلہ سن کر کانپ اٹھی کیونکہ اس لئے بہت مشہور تھا کہ وہ کوہ پیرس کے سب کے نیچے اور عمیق غار میں محفوظ ہے اور کسی کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی، لیکن ایک آواز اس کے کانوں میں آئی جسے سوائے اس کے اور کسی نے نہیں سنا کہ "گھبرا نہیں، تیرا محافظ تیرے ساتھ ہے۔" یہ محبت بھری آواز اسے کچھ آشنا سی معلوم ہوئی اور وہ اس شرط کے پورا کرنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گئی۔ نہ اس نے دشوار گذار پہاڑی راستوں کی پروائی اور نہ درندوں کی، نہ اس نے کانٹوں کا خیال کیا اور نہ مہیب غاروں کا، کیونکہ ایک روشنی تھی، اک محبت پاش جھلک تھی جو اس کے آگے آگے تھی، اور اسے ان مصائب میں تسکین دیتی جاتی تھی، راستے میں درندے اسے ملے، مگر وہ اس کے حسن سے مسحور ہو گئے، متلاطم دریا راہ میں آئے، لیکن وہ بھی خشک ہو گئے، غرضیکہ وہ کسی نہ کسی طرح پراسرپائن کے دربار تک پہنچی اور طلسمی صندوق اس سے حاصل کیا، سائکی خوش خوش واپس آئی اور وہ صندوق وینس کے سامنے لا کر ڈال دیا، اس امید پر کہ شاید وہ زمانہ پھر واپس آ جائے جس کے لئے وہ تڑپ رہی تھی، لیکن وینس، سائکی کے اس عزم و استقلال سے اور زیادہ جلی اور بد عہدی پر آمادہ ہو گئی۔ جیوپیٹر اس پر راضی نہ ہوا اور وینس کو حکم دیا کہ سائکی کو چھوڑ دے کیونکہ جب اس کے پاس طلسمی صندوق آ گیا ہے تو اسے کسی کے حسن سے شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، آخر کار اسے راضی ہونا پڑا اور سائکی کو جیوپیٹر نے خاص اپنی شراب اور الوہیت منگا کر پلا دی جس سے وہ بھی غیر فانی ہو کر آسمانی مخلوق میں مل گئی۔

(۹)

کیوپڈ و سائکی پھر اسی کوہ اولمپس پر چلے گئے اور سائکی کی پھر وہی زندگی شروع ہو گئی۔ جس زندگی کا خواب وہ ایک دفعہ دیکھ چکی تھی، اس کے بعد کیوپڈ نے اپنے چہرہ پر نقاب نہیں ڈالا۔ مگر ہاں اس وقت جب اسے انسانوں کی نگاہ سے چھپ کر ان پر تیر عشق چلانا مقصود ہوتا تھا۔

سمن پوش

مجنوں گورکھپوری

"شہید زخم شمشیر تغافل اجر ہا دارد"

ناہید سے میرا تعارف لکھنو میں ہوا جب کہ میں نے پہلی بار اس کی تصویر اپنے ایک عزیز دوست ناصری کے کمرے میں دیکھی تھی' ناصری کو فن نقاشی سے خاص شغف تھا جو جنون کی حد تک پہنچا ہوا تھا۔ کوئی دلکش تصویر اس کی نظر سے گزر جاتی پھر ناممکن تھا کہ وہ اس کو کسی نہ کسی ذریعہ سے حاصل کر کے اس کی نقل نہ اتارتا۔ اس کو اس فن میں کافی مہارت ہو گئی تھی' اور مبصرین کی نگاہ میں وہ ایک ممتاز حیثیت کا مالک تھا۔ میں نے یہ جاننا چاہا کہ یہ کس کی تصویر ہے۔ اور اس کا نام کیا ہے۔ مگر خود ناصری کو اس کا کوئی علم نہ تھا۔ وہ ایک مشہور دکان سے خرید کر لایا تھا۔ اس سے مجھ کو معلوم ہوا کہ وہ ہندوستان کے ایک ماہر فن کی صنعت تھی۔ مصور کے نام کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا' میں اس پیکر جمال میں محو ہو گیا جو صفحہ قرطاس سے مجھ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک خاموش مگر بلیغ تبسم تھا۔ چنبیلی کا ایک ہار اس کے سینے پر لٹک رہا تھا۔ انداز سے وہ ایکٹرس معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ اس کو میں پہلے سے جانتا ہوں۔ اس کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی کشش تھی۔ جس نے میری آنکھوں کو مبہوت کر لیا' گویا وہ کہہ رہی تھی۔ "ٹھہرو' اور آغاز سے انجام تک میری داستان سن لو۔" اس کے رخسار گلابی تھے' بکھرے ہوئے بال اس کے نیم برہنہ سینے سے کھیل رہے تھے' اور میں خواب میں تھا یا واقعی ہوا میں چنبیلی کی مہک پھیلی ہوئی تھی؟ میں اپنے عالم محویت سے چونکا۔ ایک لرزش خفی میرے تمام اعصاب میں دوڑ گئی۔ میں وہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا۔ کہ ناصری جو اپنا سامان نقاشی لینے دوسرے کمرہ میں چلا گیا تھا۔ واپس آ گیا اور ناہید کی تصویر سامنے رکھ کر اس کا خاکہ کھینچنے لگا۔ میں رک گیا۔ ناصری کا قلم اپنی قدرت دکھا رہا تھا۔ میں غور سے مطالعہ کر رہا تھا۔ مجھے یقین تھا۔ کہ تصویر میں ایک ناقابل بیان چیز ہے۔ جس کو کاغذ پر بجنسہ ظاہر کر دینا ناصری کا حصہ نہیں۔ البتہ جس صناع کا نام مجھے بتایا گیا تھا۔ وہ اس باب میں کامیاب ہوا تھا۔ اگر یہ واقعی اس کی صنعت تھی جس کا نہ مجھ کو اس وقت یقین تھا۔ نہ اب ہے میں ناصری کے مکان سے خاموش روانہ ہو گیا۔ باہر برآمدہ میں پہنچ کر پیچھے دیکھا تو وہی دلفریب اور جاذب نظر صورت سامنے تھی۔ جو مجھ کو پکارتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مسکراہٹ جس میں تاثرات کی ایک دنیا پوشیدہ تھی' میرے حواس میں خلل پیدا ہو رہا تھا۔ عجیب عجیب خیالات ذہن میں آ رہے تھے۔ آخر کار خود اپنے توہمات سے خائف ہو کر برآمدہ سے نیچے اتر آیا۔ اور اپنی اقامت گاہ کی طرف چلا۔ میں قیصر باغ کی طرف سے جا رہا تھا' یکایک میرے قلب کی حرکت خوفناک طریقہ پر تیز ہو گئی' میں حیران ہو کر جہاں تھا وہیں رک گیا' مجسمہ کے پاس

[illegible] ہوا اس پنجرہ سا تھا وہی سفید پوش عورت بیٹھی [illegible] سر نگوں بیٹھی تھی [illegible] کے [illegible] قد [illegible] کے [illegible] گزر رہی تھی۔ رعشہ براندام [illegible] کی [illegible] اس کی نیلی آنکھوں نے ایک المناک تبسم کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ [illegible] کے بیچ نے اس قدر جائزہ لے لیا۔ کہ اس کا چہرہ زرد تھا' جسم کی ساخت نازک تھی' رنگ میں صباحت تھی۔ دو شانے تک وہ عریاں تھی' اس کی بلوری گردن دیکھنے والے کی آنکھوں میں تازگی پیدا کر رہی تھی۔ ہوا کے ہلکے جھونکے اس کی شبنمی ساری میں شکن پر شکن ڈال رہے تھے اور وہ ان کو برابر کرتی جا رہی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا' راستہ چلنے والوں میں سے کوئی اور بھی اس زہرہ جبیں کو دیکھ رہا تھا یا نہیں؟ لیکن کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہوئی' اس لئے ہوئی کہ یہ کوئی ایسی صورت نہ تھی جو بغیر اپنا خراج لئے ہوئے کسی کو گزر جانے دیتی۔ میں کانپنے لگا' کیا اس کو میرے علاوہ کوئی اور نہیں دیکھ رہا تھا؟ کیا میرے مرکزی نظام عصبی میں کوئی اختلال رونما ہو چلا تھا؟ کہتے ہوئے شرم آتی ہے کہ میں نے نفسیات' عضویات اور دیگر علوم جدیدہ کا غائر مطالعہ کیا ہے۔ جس نے مجھ کو متشکک بنا کر چھوڑ دیا ہے۔

اس منظر سے مجھ پر وہ ہیبت طاری ہوئی کہ میں بے ساختہ چلا اٹھا۔ پھر دیکھا تو نشست خالی تھی۔ وہ عجیب الخلقت عورت وہاں سے جا چکی تھی۔ اور چنبیلی کی شامہ نواز مہک بھی اپنے ساتھ لیتی گئی تھی۔ میں رگ رگ میں تکان محسوس کر رہا تھا۔ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا قیصر باغ سے باہر نکلا۔ اور ایک تانگہ پر بیٹھ کر فرنچ ہوٹل میں کسی نہ کسی صورت سے پہنچ گیا۔ جہاں میں چند اپنے احباب کے ساتھ مقیم تھا۔ اپنی داستان اگر بیان کرتا مضحکہ کا نشانہ بنتا' لہٰذا میں نے اس تصویر کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ جس کو ناصری کے "نگار خانہ" میں دیکھ آیا تھا۔ اور جس کی اثر آفرینیوں نے اس حد تک مجھ کو بے قابو کر دیا تھا۔ میرے احباب کی لغت میں زندگی نام تھا۔ صرف شاد کیشی کا' ہمارے بیشتر اوقات خوش باشیوں میں گزر جاتے۔ سیر و تفریح کی لذتوں اور مختلف دلچسپیوں نے "سن پوش نازنین" کا تصور میرے ذہن سے مٹا دیا۔ اور اگر کبھی اس کی یاد تازہ ہو جاتی تو میں اس سے پہلو بچا جاتا۔ اس طرح دس بارہ روز گزر گئے۔

ایک روز ہم سب کو معلوم ہوا کہ الفریڈ تھیٹر آیا ہے۔ بالاتفاق یہ طے پایا کہ پہلی رات کا کھیل ضرور دیکھنا چاہیے' چنانچہ اس کا انتظام کیا گیا۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں تھیٹر دیکھ رہا تھا۔ مگر نہ تو تماشہ کی غایت کی طرف دھیان تھا' نہ اس پر تنقید کرنے کا ہوش' میں بس ایک چیز دیکھ رہا تھا' یعنی وہی عورت چنبیلی کا ہار زیب گلو کئے ہوئے۔ ارچسٹرا میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اور محویت کے ساتھ مجھے دیکھ رہی تھی' وہ تنہا تھی' اس کے لباس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اپنے دوست کو مخاطب کر کے کہا "اس کو دیکھتے ہو جو سامنے شبنمی ساری زیب تن کئے ہوئے بیٹھی ہے؟" وہی جس کے گلے میں ہار ہے۔"

میرے دوست نے نگاہ اٹھائی۔ اور سر ہلا کر جواب دیا "نہیں تو کہاں بیٹھی ہے؟"

"بالکل سامنے۔" میں نے کسی قدر متحیر ہو کر پھر کہا۔ "آرچسٹرا میں دیکھو وہ ہم کو دیکھ رہی ہے۔"

میرا مخاطب تعجب سے مجھ کو دیکھنے لگا۔ "خواب تو نہیں دیکھ رہے ہو؟ آرچسٹرا میں کوئی عورت نہیں ہے۔" اس نے مجھ سے کہا۔

"کوئی عورت نہیں؟" اب مجھے ہوش آیا میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "شاید مجھ کو مغالطہ ہوا" اور فوراً

مجھے بدل دیا۔ جب تک میں تھیٹر ہال میں تھا میرے احباب سمجھ رہے تھے کہ تماشہ دیکھنے میں مصروف ہے' مگر واقعہ یہ ہے کہ میں اپنی نظر اس جگہ سے ہٹا ہی نہیں سکتا تھا۔ جہاں وہ اس متانت اور خاموشی کے ساتھ بیٹھی درد مند نگاہوں سے میری قوتوں کو سلب کر رہی تھی' آج اس کے سامان آرائش میں ایک چیز کا اضافہ نظر آرہا تھا۔ یعنی ایک خوب صورت پنکھا جس کو کبھی کبھی جنبش دے دیتی تھی۔ رہ رہ کر اسی پر حسرت انداز سے مسکراتی جس میں پوشیدہ تو بہت کچھ تھا لیکن جو اپنے راز کو افشانہ ہونے دیتا تھا۔ جب تماشہ ختم ہوا۔ اور سب چلنے کے لئے کھڑے ہوئے۔ تو وہ بھی اٹھی۔ اور ساری کا آنچل ایک معصومانہ ادا سے سنبھالتی ہوئی ہجوم میں غائب ہو گئی۔ چند لمحوں کے بعد میں نے شاہراہ پر پھر اس کی جھلک دیکھی' اس کا جسم اس قدر نازک تھا' وہ اس قدر کم عمر اور ناآزمودہ کار معلوم ہوتی تھی کہ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں ڈر رہا تھا کہ لوگوں کے اس طوفان میں کہیں اس کو کوئی صدمہ نہ پہنچ جائے۔ "کیا یہ کوئی روح ہے جس کو کسی خاص غرض سے از سر نو اس دنیا کا قالب عطا کیا گیا ہے یا محض میرا واہمہ ہے جو مجھے پریشان کر رہا ہے۔" "میں اپنے دل سے سوال کر رہا تھا۔ "لیکن اس کی صورت اس قدر غمگین اور آزردہ ہے کہ میرا دل اس کے لئے دکھ رہا ہے۔ خواہ وہ خواب ہی کی مخلوق کیوں نہ ہو۔"

اس کشمکش میں مبتلا اپنے دوستوں کے ساتھ مجمع کو پھاڑتا ہوا جا رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے چھو کر مجھے چونکا دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک نازک ہاتھ میرے شانہ پر تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔ آج میرے ذہن میں ایک تغیر رونما ہوا۔ یعنی میری دہشت دور ہو گئی اور مجھے خیال ہو گیا کہ یہ دلکش ہستی خیالی ہو یا مادی' عالم ارواح سے تعلق رکھتی ہو یا عالم اجسام سے' کسی نہ کسی غرض سے میرا تعاقب کر رہی ہے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ اب اس کو دیکھ کر ڈروں گا نہیں بلکہ ہمت کے ساتھ واقعات کا ترتیب وار مطالعہ کروں گا اور مجھے اطمینان تھا کہ اگر استقلال سے کام لیا تو حقیقت کو ضرور بے نقاب کر سکوں گا۔

لکھنو میں پندرہ روز اور قیام رہا لیکن "سمن پوش" اس دوران میں پھر نظر نہ آئی۔ البتہ ناصری کے ساتھ جا کر میں نے اسکی تصویر کی ایک کاپی خرید لی جو میرے لئے ایک خاص اہمیت رکھنے لگی تھی۔ مجھے معلوم ہوا کہ تصویر کو اصل سے کوئی مناسبت نہیں اور اس سے ناہید کی رعنائیوں اور دلربائیوں کا صحیح اندازہ کرنا محال تھا۔ اس کے بعد میں بارہ بنکی چلا آیا اور اپنی روزانہ مصروفیتوں میں ناہید کو پھر بھول گیا۔ میں نے اسی سال بی۔ اے کیا تھا اور اس دور تعطیل سے گذر رہا تھا جس سے سکول اور کالج کا زمانہ ختم کر کے کم و بیش ہر شخص کو گذرنا ہوتا ہے۔ یعنی ابھی یہ فیصلہ نہ کر سکا تھا کہ مجھے کرنا کیا ہے۔

میرے ایک چچا کی لڑکی سائرہ ضلع سیتاپور کے ایک باوقار رئیس عبدالعلی کے لڑکے شمیم سے بیاہی ہوئی تھی۔ شمیم نے بھی اسی سال ایم۔ ایس۔ سی کیا تھا اور چونکہ سرمایہ دار تھے اور کسب معاش کی فکر سے بے نیاز اس لئے ان کا ارادہ تھا کہ اپنی زمینداری کا انتظام کریں گے۔

ایک دن میری ماں کے نام سائرہ کی تحریر آئی جس سے معلوم ہوا کہ عبدالعلی صاحب نے حال ہی میں ایک نیا گاؤں مع ایک عالی شان عمارت کے خریدا ہے اور ان لوگوں کی خواہش ہے کہ ہم سب ان کی مسرتوں میں شرکت کریں۔ سائرہ کا اصرار تھا کہ کم از کم میں ضرور اپنی کیفیتوں سے اس کے لطف میں اضافہ کروں ورنہ وہ مجھے کبھی نہ معاف کرے گی۔ میں کہہ نہیں سکتا سائرہ کو میری مصاحبت میں کیا لطف ہو سکتا تھا۔ جبکہ اکثر احباب کا خیال ہے کہ میری ہنسی مصنوعی ہوا کرتی ہے اور فی الحقیقت میرا خمیر الم ناک گِل سے ہوا ہے یہ اور بات ہے کہ میں ہر قسم کی صحبت میں شریک ہو جایا کرتا ہوں' بہر حال سائرہ کو میری طرف

سے حسن ظن تھا جو غلو کی حد تک پہنچا ہوا تھا اور وہ چاہتی تھی کہ زندگی کے بیشتر فرحت ناک لمحے میری معیت میں گزریں۔ مجھے عذر ہی کیا ہو سکتا تھا' وقت کاٹنے کے لئے کوئی بہانہ تلاش کر رہا تھا میں نے فوراً سامان درست کر لیا' میری ماں البتہ چند اسباب کی بنا پر نہ جا سکیں۔

"جمال منزل" واقعی نہایت خوبصورت اور شاندار عمارت تھی جو ایک احاطہ سے گھری ہوئی تھی۔ شمیم کی گاڑی نے جس وقت مجھے پیش گاہ میں لا کر اتارا تو میں اس کی شوکت سے مرعوب ہو گیا جس نے ایسے دیہات میں اس "فردوسِ ارضی" کو اپنے لئے تعمیر کرایا ہو گا۔ اس میں ذوق سلیم اور حسن لطیف کہاں تک رچا ہو گا۔ اس کے علاوہ "جمال منزل" سے اس کے اصل مالک کی مالی استطاعات کا بھی بخوبی اندازہ ہو تا تھا۔ چونکہ میں شام کو پہنچا تھا اس لئے احاطہ اور باغ کی سیر صبح تک ملتوی رکھی گئی۔

عبدالعلی اور ان کی بیوی نے نہایت خلوص سے میرا خیر مقدم کیا۔ شمیم ضرورت سے زیادہ ہنس رہا تھا اور پھر بھی ان کو سیری نظر نہیں آتی تھی۔ سائرہ نے سنجیدگی اور متانت سے اپنی خوشی کا اظہار کیا جیسا کہ اس کا دستور تھا۔ الغرض میرے آنے سے ہر شخص اپنی اپنی جگہ کافی مسرور تھا۔

جب ہم رات کے کھانے پر بیٹھے تو ہماری گفتگو کا موضوع وہی گاؤں اور مکان تھا اور اس میں شک نہیں کہ موضوع دلچسپ ثابت ہوا ___ شمیم نے کہا۔ "تم اس مکان پر اس حیثیت سے غور کرو کہ جس بد نصیب نے اس کو حوصلوں کے ساتھ تعمیر کرایا تھا وہ مصنف تھا' شاعر تھا' نقاش تھا' اور آج بیس برس سے زیادہ عرصہ گذرا ہے کہ اس نے خودکشی کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ تم اس کا نام جاننے کے لیے بے تاب ہو گے' اس کا نام "جمال الدین" تھا۔"

"جمال الدین"! میں چونک پڑا۔ میں نے اس کے کچھ منتشر اشعار کا مطالعہ کیا تھا اور اس کا ایک ڈراما "ہذیان محبت" بھی پڑھا تھا جس کا مجھ پر گہرا اثر ہوا تھا' مگر یہ نہ جانتا تھا کہ وہ نقاش بھی ہے اور نہ یہ خبر تھی کہ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جان دی۔

سائرہ غور سے مجھے دیکھ رہی تھی' اور خوب واقف تھی کہ میرے اعصاب کتنے سریع الحس اور اثر پذیر ہیں۔ اس نے شمیم سے ناپسندیدگی کے لہجہ میں کہا۔ "آپ نے برا کیا۔ سہیل بھائی کے لئے تمام رات کروٹیں بدلتے رہنے اور سر دھننے کا سامان فراہم کر دیا۔ ابھی وہ سفر سے ماندہ و خستہ چلے آ رہے ہیں۔ آپ نے ان کو راحت شب سے بھی محروم کر دیا۔"

میں نے مسکرا کر کہا "نہیں! نہیں! قصہ سننے کے لائق ہے۔ ہاں تو شمیم! یہ نہیں معلوم کہ ہمارا شاعر نقاش اپنی زندگی سے بیزار کیوں ہو گیا؟"

"میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا' سنا ہے کہ اس کو اپنی بیوی سے بے انتہا محبت تھی جس کو کسی نے واللہ علم کیوں قتل کر دیا۔ جمال الدین اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکا اور غالباً ڈیڑھ سال کے بعد اس نے بھی اپنا عنصری جامہ اتار پھینکا۔ شاعریوں بھی خفقانی اور اپنے دل کے غلام ہوتے ہیں اور ان کا کسی رو میں خودکشی کر لینا کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔"

شروع سے آخر تک شمیم کے لہجہ سے تمسخر و استہزاء پایا جاتا تھا' میں یہ سوچ رہا تھا کہ انسان اس قدر بے حس ہو تا ہے۔ میں نے جواب دیا: "شمیم! تمہاری گفتگو نے تو مجھے بہت دکھ پہنچایا لیکن تم سے اس کے سوا امید ہی کیا ہو سکتی تھی' یہ کوئی تمہارا اپنا خیال نہیں' یہ مرض عالمگیر ہے' جو ساری دنیا میں وباء کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ جو انسانیت اور الوہیت دونوں کو کائنات سے مفقود کر رہا ہے۔ لیکن تمہارے ذہن میں تو شاید ان الفاظ کے کوئی معنی بھی نہ ہوں۔ تم جو دل کو ایک پارہ گوشت سمجھتے ہو جو

پمپ کا کام دیتا ہے' تم جو انسان کو ایک آلہ سمجھتے ہو' بتاؤ تم نے اتنی عمر ضائع کر کے کون سی نئی بات حاصل کی؟

انیکہ دل نام کردہ بہ مجاز
روبہ پیش سگاں کو انداز

شاید ہر شخص جو انسانوں اور حیوانوں کو متواتر چیرتا رہے اور کچھ دنوں تک برابر مشاہدہ کرتا رہے۔ اس قدر جان سکتا ہے کہ دل صنوبری شکل کا ایک ٹکڑا ہے جو غلاف قلب (Pericardium) میں لمفوف ہے اور جس کا کام خون کو اندر کھینچنا اور باہر پھینکنا ہے' مگر تم کو کیا کہوں' بڑے سے بڑا فلسفی اور بڑے سے بڑا حکیم انہی خود فریبیوں میں مبتلا ہے۔ وہ عقل کی رہنمائی میں چلتا ہے اور وجدانیت وبداہت کو پیچھے چھوڑتا جاتا ہے۔ کارلائل نے اسی لئے ایسے لوگوں کا نام "منطق تراش" (Logic Choppees) رکھا ہے۔ اسی نیے کسی چیز کی بابت کوئی قطعی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ عقل کی افراط نے اس کی ربوبیت چھین لی اور اس کے ارتقاء کا سدباب ہو گیا۔ وہ اپنا نصب العین بھول گیا بلکہ اپنی اصلیت بھی اس کو یاد نہ رہی۔ بیدل نے ہم کو بہت صائب رائے اس بارے میں دی ہے:

ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباش

خیریت یہ ہے کہ دنیا میں چند ایسے نفوس ہمیشہ رہے جو کبھی کبھی حقیقت کی جھلک دیکھ لیا کرتے تھے اور ہم کو اپنے آغاز و انجام سے آگاہ کرتے رہتے ہیں' ورنہ آج میمتھ کی طرح یہ مخلوق بھی صفحہ ہستی سے مٹ جاتی جو "انسان" کہلاتی ہے۔

میرے ہیجان کا دور شروع ہو گیا۔ میں انسان کا "جہل مرکب" نہیں برداشت کر سکتا۔ یہ بیماری شاید انسان کے علاوہ کسی دوسرے جانور میں نہیں پائی جاتی کہ وہ اپنی جہالت کو علم سمجھنے کی کوشش کرنا چاہتا ہے اور اپنی اس دانستہ فریب کاری پر ناز کرتا ہے۔

شمیم بے کیف ہونے لگا تھا۔ میرا مباحثہ اکثر تلخ ہوا کرتا ہے اس لئے جہاں سوئی سے کام لینا چاہیے وہاں میں نیزوں اور بھالوں کے کرنے لگتا ہوں۔ سننے والے میری صحبت سے لطف اٹھاتے ہیں مگر میرا مقابل ہمیشہ مجھ سے متنفر ہو جایا کرتا ہے' چنانچہ میرے چاہنے والوں سے وہ لوگ تعداد میں زیادہ ہیں جو میری طرف سے اپنے دلوں میں غبار لئے ہوئے ہیں۔ شمیم نے میری رگوں میں چنگاریاں بھر دی تھیں اور میں آگ برسانے لگا تھا جس کا سلسلہ نہ جانے کہاں ختم ہوتا اگر ان کی والدہ درمیان میں نہ بول دی ہوتیں کہ۔ "اچھا! اب بے کار بحث کو جانے دو' ایک لطیفہ اور سنو گانے والوں میں مشہور ہے کہ "جمال منزل" روحوں کا مسکن ہے اور میرا خیال ہے کہ بیچنے والوں نے اسی وہم سے اس کو جدا بھی کیا تھا' مگر ہم لوگوں پر اس قسم کے جاہلانہ معتقدات کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔"

میں نے اپنے دل میں کہا۔ "نہ جانے گانے والے جاہل ہیں یا آپ۔" شمیم سے پھر نہ رہا گیا اور مجھ پر حملہ کر ہی بیٹھے' انہوں نے کہا۔ "مگر اب مجھے اطمینان ہے کہ میرے گھر میں ایک ایسا محقق موجود ہے جو ہم کو اصلیت سے خبردار کر سکے گا۔"

"غلط خیال ہے" میں نے جواب دیا۔ "میری تحقیق و تدقیق سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت تم میں نہیں ہے' اگر کوئی راز مجھ پر منکشف بھی ہو گا تو میں اس کو تم سے مخفی رکھوں گا۔"

رات زیادہ ہو گئی تھی ہم ایک دوسرے کو "شب بخیر" کہہ کر اپنی اپنی خواب گاہ کو رخصت ہوئے۔ چلتے ہوئے سائرہ نے

کہا۔ "آپ کا چہرہ اترا ہوا ہے' دیکھئے سونا نصیب ہوتا ہے یا نہیں' خدا کے لئے آج کے بحث پر زیادہ تبصرہ نہ کیجئے گا۔"

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ "سائرہ! بچوں کی سی باتیں نہ کرو۔" اور آکر اپنے بستر پر لیٹ رہا' نیند کی کوئی علامت میری آنکھوں میں نہ تھی۔ میں دو بجے رات تک پڑھتا رہا گرمی کی سہانی رت تھی' پچھلے پہر ہوا میں ایک سکون بخش خنکی پیدا ہوئی تو میری آنکھ لگ گئی۔ لیکن پانچ ہی بجے کسی کے قدموں کی آہٹ سے جاگ گیا۔ دیکھا تو شمیم تھے' میں اٹھ بیٹھا۔ شمیم نے کہا۔ "ہوا خوشگوار ہے چلو باغ میں تفریح کر آئیں' یا رات کی کبیدگی ابھی باقی ہے؟"

"کہیں سائرہ نے رات بھر تمہارے کان تو گرم نہیں کئے؟" میں نے پوچھا۔

شمیم ہنس دیئے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے۔ "تم شاید رات بھر سوئے نہیں؟ اچھا چلو ہوا کسل دور کر دے گی۔"

"ہاں! اس وقت کی سیر ضرور روح میں بالیدگی پیدا کرے گی۔" یہ کہہ کر میں شمیم کے ساتھ ہو لیا۔

باغ کو میں نے امیدوں سے زیادہ دلکش اور فرحت ناک پایا۔ احاطہ کے وسط میں ایک خوبصورت تالاب تھا' قسم قسم کے درخت اور مختلف رنگ و بو کے پھول روشوں کے کنارے علوئے تخیل کا نمونہ بنے ہوئے تھے۔ ہر چند کہ قرائن سے ظاہر ہوتا تھا کہ مدت سے ان کی پرداخت کرنے والا کوئی نہیں' تالاب کے چاروں طرف چنبیلی کی کیاریاں تھیں جن سے فضا مہک رہی تھی۔ مجھے بے اختیار اپنی "سمن پوش" یاد آگئی۔ تھوڑی دیر کے لئے میں پھر عالم خیال میں گم ہو گیا۔ شمیم نے یہ دیکھ کر پوچھا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

شمیم نے کہا۔ "اب آؤ میں تم کو جمال الدین کی بیوی کی قبر دکھاؤں" میں سراپا اشتیاق بن کر شمیم کے ساتھ آگے بڑھا۔ چنبیلی کی ایک کیاری میں ایک پختہ قبر تھی جس کی شکستگی کہہ رہی تھی کہ اب ایسا بھی کوئی نہیں جو اس کی مرمت کرانے کی زحمت گوارا کرے' لوح ٹوٹ کر علیحدہ زمین میں پیوست تھی۔ اس پر گھاس اگ آئی تھی۔ اس سے پیشتر شمیم یا کسی اور کی نگاہ بھی اس پر نہیں پڑی تھی' میں نے بیٹھ کر اس کو صاف کیا تو اس پر ناہید لکھا ہوا پایا۔ شمیم نے میرا ایماء پا کر ایک خدمت گار کو بلایا جس نے لوح کو زمین سے باہر نکالا' دوسری طرف بھی کچھ کتبہ نظر آیا۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ کوئی فارسی شعر ہے' مگر باوجود سعی بسیار کے صحیح پڑھا نہ جا سکا۔ اس لئے کہ وہ حصہ تقریباً ایک بالشت زمین کے اندر تھا' اور زمانہ کی رگڑ نے نقوش کو کافی مٹا رکھا تھا۔ میری رگ رگ بے چین ہو رہی تھی کہ کسی طور سے اس کتبہ کو پڑھ لوں' لیکن کچھ بس نہ چلا۔ شعر بھی کوئی ایسا نہ تھا جو عام طور پر مشہور ہوتا' تاکہ قیاس سے پڑھ لیا جاتا' آخر کار مایوس لوٹنا پڑا۔

یہاں عبدالعلی صاحب سائرہ وغیرہ کے ساتھ چائے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ آج کی گفتگو کا مرکز "ناہید کا مزار" رہا۔ مجھے رہ رہ کر اسی کتبہ کا خیال آتا تھا جس نے مجھے تاریکی میں رکھ چھوڑا تھا۔ سارا دن ہارمونیم' فونوگراف' تاش اور دیگر مشاغل میں ضائع ہوا۔ میں چاہتا تھا کچھ لکھوں' مگر یہاں اس کی کوشش کرنا "بت پرستوں کے شہر میں' نماز" کے لئے جہاد کرنے سے کم نہ تھا۔ شام کو شمیم نے گاڑی تیار کرائی اور مجھے لے کر ہوا کھانے نکل گئے مختصر یہ کہ مجھے اس قدر موقع نہ ملا کہ ایک بار پھر ناہید کی قبر پر جاتا اور لوح کے کتبہ پر نظر ثانی کرتا۔ جب کھانے کے بعد اپنے بستر پر گیا تو کسی قدر سکون میسر ہوا۔ دل بہلانے کی غرض سے گھنٹوں مثنوی مولانا روم دیکھتا رہا۔

نیند کے آثار اس دن بھی غائب تھے' رات کا سناٹا بڑھ رہا تھا۔ میرا مطالعہ بدستور جاری تھا' کبھی کبھی کتاب بند کر کے کچھ سوچنے لگتا تھا۔ تقریباً ایک بجے بستر سے اٹھا اور سامنے کے کمرہ سے سگریٹ لے کر واپس ہو رہا تھا کہ مجھے چار پانچ گز کے فاصلے پر ایک عورت کی شکل دکھائی دی جو دیکھتے دیکھتے میرے مقابل تھی۔ یہ کون؟ وہی "سمن پوش!" اس وقت میں نے حیرت کو اعصاب پر قابو پانے دیا کہ ہراس کو۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ میں اپنے حواس قائم رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ میری نگاہیں اس کی نگاہوں سے جس وقت ملیں تو اس نے ہاتھ سے کچھ اشارہ کیا گویا مجھ سے کسی بات کی التجا کر رہی ہے۔

"تم یہاں کس لئے آئی ہو؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔ "اور میرا تعاقب کیوں کر رہی ہو؟"

اسی طرح اس نے پھر اپنے ہاتھ کو حرکت دی اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اس لئے کہ آپ کو مجھ سے ہمدردی ہے۔"

"کیا تم سکون سے محروم ہو؟"

"یک قلم۔" یہ کہتے کہتے اس کا دم پھولنے لگا جیسے تشنج کا دورہ پڑ رہا ہو۔ میں گھبرا سا گیا تاہم سلسلے کو منقطع نہ ہونے دیا۔

"اچھا تو بتاؤ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" میں اپنے بستر پر بیٹھ گیا۔

اس نے اپنی ہیجانی آنکھیں اوپر اٹھادیں جو نم آلود تھیں۔ "میرے لئے دعا کیجئے' جب سے میں مری ہوں کسی نے میرے لیے دعا نہیں کی بیس برس سے کسی نے مجھ پر ترس نہیں کھایا۔" اس نے کچھ ایسے لہجہ میں کہا کہ میرا جی بھر آیا۔

"تمہاری موت کا سبب کیا ہوا تھا؟" میں نے سوال کیا۔

"اب سمن پوش' قریب کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی' اس نے ایک غمگین انداز سے مسکراتے ہوئے اپنے سینہ سے ہار ہٹایا اور میں نے دیکھا کہ اس جگہ اس کے کپڑے پر خون کے گہرے دھبے تھے۔ اس نے دھبوں کی طرف اشارہ کیا اور پھر ان کو اپنے ہار سے چھپا لیا۔ میں سمجھ گیا۔

"قتل؟" میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

"کسی کو اس کا صحیح علم نہیں۔" اس نے کہا۔ "آپ میرا پورا افسانہ حیات سننا چاہتے ہیں تو سنئے! میں وہی ناہید ہوں جس کا مدفن آپ نے اس احاطہ میں دیکھا ہے۔"

"ہاں!..........."

"تم کو کس نے قتل کیا اور کیوں؟" میں نے بات کاٹ کر پھر پوچھا۔ میرے اعصاب پھر بے قابو ہو چلے تھے' میں سب کچھ اسی ایک منٹ میں جان لینا چاہتا تھا۔ خود ناہید کے بشرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک اندرونی کرب سے بے بس ہو رہی ہے گویا اپنی داستان کو دہرانا اس کے لئے بڑی آزمائش کا کام تھا۔

"ذرا صبر کیجئے تو میں کوشش کر کے اپنی زندگی کے واقعات آپ سے بیان کر دوں۔" اس نے کہا۔ "میرا قاتل میرا شوہر ہے لیکن اس سے یہ حرکت ایک زبردست غلط فہمی میں سرزد ہوئی تھی۔ اس کو دھوکا ہوا جس کا مرتے دم تک اس کو علم نہ ہو سکا۔ وہ مجھ سے محبت کرتا تھا۔ ایسی محبت جس کی مثال اس دور مادیات میں کم ملے گی۔ مبالغہ نہ سمجھئے' وہ مجھ کو پوجتا تھا..........

" آپ خاموش سنتے جایئے۔ میرے لئے وہ اپنے عزیزوں سے کنارہ کش ہو گیا اور اس ویرانہ کو آباد کر کے بیٹھ گیا۔ وہ کہا

کہتا تھا "میرے دونوں جہان تیری آنکھوں میں ہیں۔" جمالی معمول "اس نے میرے لئے بنوائی تھی اور میں! میں تو یہ سمجھتی تھی کہ زمین' آسمان' چاند' سورج' دن رات سب اس کی تجلیاں ہیں مجھے یقین تھا اور اب بھی ہے کہ مجھے زندگی اس کے طفیل ملی ہے۔ اگر انسانی دنیا کی تمام زبانیں میرے جذبات کو معرض اظہار میں لانے کی متفقہ کوشش کریں تو عہدہ برآ نہیں ہو سکتیں۔"

ناہید کی زبان میں کانٹے پڑ گئے تھے' وہ دم لینے کے واسطے رک گئی' میں بے خودی کی حالت میں اس کو دیکھ رہا تھا۔

"میں پارسی تھی یعنی "آتش پرست۔" اس نے آخری الفاظ پر زور دیتے ہوئے پھر بیان کرنا شروع کر دیا۔ "اور ایکٹنگ میرا ذریعہ معاش۔ لیکن اگرچہ مردوں کا ساتھ شب و روز رہتا تھا' مجھے کسی سے بھی انس نہ ہوا تھا۔ جمال نے مجھے ایک نئی لذت سے آشنا کیا۔ اس کو مجھ سے محبت پیدا ہو گئی۔ اس کے ایک ایک لفظ اس کی ایک ایک ادا سے خلوص و صداقت کی بو آتی تھی۔ میں بھی اس کو دیوانوں کی طرح چاہنے لگی۔ اس کی ہستی مجھ کو دنیا سے نرالی نظر آئی۔ اس کی ہنسی میں ہمیشہ دکھ بھرا ہوتا تھا۔ اس کی آواز میں چھپے کی سی دلدوز تاثیر تھی' سوز و گداز اس کے تمبسم میں تھا۔ وہ سراپا تصویر درد تھا۔ یہ امیلیان نرتجیذ ہی کی طرف تھا اس لئے جمال نے مجھے آسانی سے جیت لیا۔"

وہ پھر ایک مرتبہ زبان تر کرنے کو رکی' میں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ ترتیب وار اپنا سارا قصہ بیان کر جائے لہذا خاموش منتظر رہا۔

"میں آپ کے آرام میں مخل تو نہیں ہوں؟" اس نے نہ جانے کس خیال سے پوچھا' اس کا چہرہ اس کے واردات قلب کا آئینہ بن رہا تھا۔

"بالکل نہیں! میں اس گھڑی کا مشتاق تھا" میں نے جواب دیا۔

"میں سمجھتی تھی کہ آپ میری غم خواری کریں گے۔" اس نے مسترحمانہ لہجہ میں کہا۔ "ورنہ آپ کا تعاقب نہ کرتی۔"

"ہاں تو ہماری محبت خوش آئند ثابت ہوئی۔ جمال نے مخالفتوں اور انگشت نمائیوں سے بے پروا ہو کر مجھ سے شادی کر لی اور ہم دونوں نے ہنگاموں سے دور اس جنگل میں ایک جنت بسائی۔ دونوں کی زندگی ایک مسلسل لمحہ مسرت تھی۔ جمال نے اپنی ساری دولت میرے لیے وقف کر دی۔ وہ متمول آدمی تھا۔ ادبیات اور مصوری سے اس کو انہماک تھا۔ مصوری کا وہ ماہر ہو چلا تھا۔ اس نے میری تصویریں کھینچیں اور ان میں سے اکثر کی پبلک میں نمائش بھی کی جن سے اس کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ چنبیلی کی کیاریاں میری محنتوں کا نتیجہ ہیں۔ شام کو جب ہم باغ میں گلگشت کرتے ہوتے تو وہ پھول توڑ توڑ کر مجھے دیتا۔ میں ہار گوندھ کر خود پہنتی اور اس کو پہناتی' اسی طرح دو سال گذر گئے۔ یکایک زمانے نے ایسی گردش کی کہ بات ہی بات میں ہمارے خواب کا طلسم ٹوٹ گیا۔ جمال مجھ کو بے نقاب رکھتا تھا۔ میں نہ صرف اس کے رشتہ داروں اور دوستوں کے سامنے' بلکہ عام مجمع میں بھی اس کے ساتھ بے پردہ رہتی تھی۔ جمال نے اگرچہ تنہائی اختیار کر لی تھی' تاہم کبھی کبھی اس کے احباب اس سے ملنے آجایا کرتے تھے۔ اور وہ ان سے مل کر خوش ہوتا تھا۔ اس کے رشتہ داروں میں فیروز جو اس کا شیدا مشہور تھا' ہم کو دیکھنے اکثر آتا تھا اور ہفتوں آ کر رہا کرتا تھا۔ فیروز کی طبیعت مبتذل اور عامیانہ تھی' اس کی نفسانیت کی داستانیں اکثر سنی گئی تھیں مگر جمال اس کی ہولناکیوں سے واقف نہ تھا۔ وہ معلوم نہیں کیوں فیروز کی قدر کرتا تھا' شاعر یا صناع انسان کو بحیثیت مجموعی کتنا ہی صحیح کیوں نہ سمجھ لے لیکن جہاں افراد سے سابقہ پڑتا ہے وہ اکثر دھوکا کھا جاتا ہے۔ فیروز کی نگاہیں مجھے گراں گذرتی تھیں' اس کی مسکراہٹ

مجھے ناگوار ہوتی تھی۔ میں نے متعدد بار چاہا کہ جمال کو ہوشیار کردوں مگر پھر یہ خیال ہوا کہ بیکار بدمزگی پیدا کرنا غلطی ہے۔ مجھے اپنی اخلاقی قوت پر اس درجہ غرور تھا کہ میں سمجھتی تھی کہ فیروز مجھ سے مذاق کرنے کی بھی ہمت نہ کرے گا' اور چونکہ وہ ہمیشہ میرے سامنے مہذب اور شائستہ رہا کرتا تھا اس لئے اور بھی مطمئن تھی اور جمال کو بھی مجھ پر اعتماد تھا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فیروز ہمارا مہمان تھا۔ جمال کو کسی اشد ضرورت سے سیتاپور جانا پڑا' رات کو آٹھ بجے جبکہ اس کی واپسی کا وقت تھا۔ میں اس کمرے میں جو آپ کے کمرے کے متصل ہے' بیٹھی کچھ دھیمی آواز میں گا رہی تھی' دفعتہً مجھ کو کمرہ تاریک ہوتا معلوم ہوا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو فیروز تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "یہ روشنی کم کیوں کر دی؟" میں سوال ختم کرنے نہ پائی تھی کہ میرا بازو اس کی آہنی گرفت میں تھا اور وہ مجھے اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ بعض ساعتیں ہوتی ہیں جو کمزور سے کمزور دل میں خوفناک مجرمانہ جسارت پیدا کر دیتی ہے۔ میں نے اپنے تمام جسم کی قوت صرف کر کے ایک بار اس کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا مگر کم بخت پر بہیمیت کا دیو مسلط تھا۔ دوسرے منٹ میں میں اس کی تنگ آغوش میں تھی۔ میں نے ابھی تک کسی نوکر کو اس لئے نہیں بلایا تھا کہ ان میں اس واقعہ کے متعلق خواہ مخواہ سرگوشیاں ہوں گی۔ اب میں نے ایک بار پھر فیروز کے مہلک پنجوں سے آزاد ہو کر خادمہ کو آواز دی اس کے آنے میں تاخیر ہوئی فیروز پھر میری سمت بڑھا' لیکن اتنے میں جمال نے مجھے پکارا۔ فیروز کمرے سے باہر نکل گیا اور میں جمال کے پاس دوڑی میرا ارادہ تھا کہ اس سے بے کم وکاست سب ماجرا کہہ کر فیروز کو اسی وقت نکلوا دوں گی۔ مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے مجھے فیروز کی آغوش میں دیکھ لیا تھا اور اپنی رائے قائم کر چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت اس نے یہ دیکھا اسی وقت میں نے اپنے کو فیروز کی گرفت سے چھڑایا تھا۔ جمال اف! اف!! کرتا ہوا اپنے سٹوڈیو میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے اس کو کبھی غضبناک نہیں دیکھا تھا اس کی آنکھیں خون کی مانند سرخ ہو رہی تھیں۔ صورت جوش غضب میں مسخ ہو گئی تھی۔ میں کمرے میں داخل بھی نہ ہونے پائی تھی کہ اس نے مجروح شیر کی طرح میری کلائی پکڑ لی اور کہا "دغا باز! تیری زندگی کا! ایک ایک پل اب میری روح کو ناپاک کر رہا ہے۔" مجھ میں پندار ایسا تھا کہ "دغا باز" خطاب پا جانے کے بعد میں نے اپنی بریت کے لئے ایک حرف بھی نہ کہا اور وہ کچھ ایسے عالم میں تھا کہ اگر میں کچھ کہتی بھی تو وہ مجھے جھوٹا سمجھتا۔ جمال بے انتہا مغلوب الجذبات اور ذکی الحس واقع ہوا تھا۔ اس کے عضلات پھڑک رہے تھے' اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس نے ایک نگاہ میری اس نامکمل تصویر پر ڈالی جس کے لئے وہ ان دنوں بڑی محنت کر رہا تھا اور میز کی دراز سے پیش قبض نکال کر میرے سینے میں اتار دیا۔ یہ سب ایسی غیر متوقع سرعت کے ساتھ ہوا کہ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ "تباہی کا شیطان" فیروز پانچ منٹ کے اندر مجھ کو میری جنت سے محروم کر گیا۔ اس کے بعد ہر چند کہ جمال پر کوئی الزام نہ آیا اور مشہور یہ ہو گیا کہ مجھے کسی دشمن نے قتل کر دیا ہے۔ لیکن اس کی زندگی اس قدر المناک ہو گئی کہ چھ مہینے کے بعد اگر اس نے خودکشی نہ کر لی ہوتی تو وہ جا کر قتل کا اقبال کر لیتا۔"

ناہید کے آنسو گرنے لگے۔ میں تڑپ گیا' چاہتا تھا کہ اس کے آنسو پونچھوں لیکن اس نے ہاتھ کے اشارہ سے منع کر دیا اور پھر سلسلہ یوں شروع کیا:

"آپ جمال کو خونخوار اور وحشی کہیں گے۔ مگر میرا ایمان یہ ہے کہ اس کو میرے ساتھ شدید قسم کی محبت تھی۔ یہ محبت کی انتہا تھی کہ اس نے محبت کے فنا ہو جانے کے ڈر سے مجھے ہمیشہ کے لئے کھو دیا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ اس نے شیکسپیئر کے مشہور ڈرامہ "اتھیلو" کا ترجمہ کر کے سنایا تھا۔ میں گھنٹوں "ڈسڈیمونا" پر رشک کرتی رہی۔ میں نے جمال سے کہا تھا کہ "کاش! مجھے

اس کا پارٹ ہی کرنا نصیب ہوتا۔ اس پر اس نے مجھے بہت پیار کیا تھا۔ آہ!"

ناہید تھک گئی تھی لیکن اب اس کے چہرے سے آسودگی ٹپک رہی تھی۔ صبح کی سپیدی نمودار ہو چلی تھی۔ وہ رخصت ہونے کے لئے اٹھی۔ چلتے چلتے اس نے کہا۔ "ہاں! ایک بات بھول گئی۔ جمال نے ایک ظلم مجھ پر کیا ہے' مجھے مار کر اسے تسکین نہ ہوئی تو اس نے میرے مزار کی لوح پر یہ شعر کندہ کرا دیا۔

وفا آموختی از ما بکار دیگراں کردی ربودی گوہرے از ما نثار دیگراں کردی

اس کو آخر وقت تک مغالطہ رہا۔ اب آپ اس شعر کو مٹا کر یہ شعر کندہ کرا دیجئے۔

من کہ جز با تو نہ پرداختہ ام گر بجوئی ساختہ ام ساختہ ام

بس مجھے اطمینان کلی میسر ہو جائے گا اور میں سکون کی سانس لے سکوں گی۔ آپ کو پھر کبھی تکلیف نہ دوں گی۔ ہاں! اگر آپ کا جی چاہے تو جا کر اس پیش قبض کو بھی دیکھ لیجئے جس نے دو ہستیوں کو ہمیشہ کے لئے جدا کر دیا اور جو "اسٹوڈیو" میں ابھی تک ایک بوسیدہ صندوق میں پڑا ہوا ہے۔" یہ کہہ کر ناہید نے الوداع کہا۔ میں نے صحن مزار تک اس کو جاتے دیکھا جہاں وہ نگاہ سے غائب ہو گئی۔

میں ہاتھ منہ دھو کے چائے کے وقت سے پہلے ہی سائرہ سے تنہائی میں ملا۔ اس کو لے کر سیدھا اس کمرے میں گیا جو جمال کا "اسٹوڈیو" رہ چکا تھا۔ سب سے پہلے میری نگاہ جس چیز پر ٹھہری وہ ایک شکستہ صندوق تھا۔ اس میں کرم خوردہ کاغذات کا ایک انبار تھا جس کے درمیان مجھے وہ پیش قبض ملا جو باوجود زنگ آلود ہونے کے اپنی خون آشامی کا اقرار آپ کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سائرہ سے کہا "اس گھر میں جتنے افراد ہیں ان میں ایک تم ایسی ہو جس کے سامنے میں اپنے مشاہدات بیان کر سکتا ہوں۔ اس لئے کہ تم مجھ کو کبھی دیوانہ یا فاتر العقل نہیں سمجھو گی۔"

میں نے سائرہ کو حقیقت سے آگاہ کیا تو وہ حیرت سے میرا منہ تکنے لگی۔ وہ مجھ کو جھوٹا تو سمجھ نہیں سکتی تھی اور ایسی باتوں کو آسانی سے صحیح مان لینا بھی کوئی معمولی کام نہیں۔ سائرہ نے عبدالعلی اور شمیم وغیرہ سے اس کا تذکرہ کیا اور بہت اصرار کے ساتھ کہا کہ مزار کی لوح پر وہ دوسرا شعر کندہ کرایا جائے جو ناہید مجھے بتا گئی تھی۔ لیکن اس کا جواب وہی ملا جس کی مجھے امید تھی۔ یعنی میرے ساتھ ساتھ اس کا بھی خوب مضحکہ اڑایا گیا۔

مجھ کو افسوس ضرور ہے کہ ناہید کی آخری خواہش پوری نہ کر سکا مگر میرے امکان میں جو کچھ تھا وہ کیا اور اب بھی اس سے غافل نہیں ہوں۔ میں اس کے لئے برابر دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ کیونکہ میرا دعائی اعتقاد یہ ہے کہ روحوں کے تعلقات اس دنیا سے کبھی منقطع نہیں ہوتے۔

یہ واقعہ مدتوں میرے غور و فکر کا موضوع رہا ہے۔ میں سوچتا ہوں اور کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا۔ محبت بھی کیا معمہ ہے کوئی ایسا دماغ آج تک پیدا نہ ہوا جو اس طلسم کو توڑ سکتا۔ منطقی اپنے اصول' موضوع اور علوم متعارفہ لئے ہوئے بیٹھا رہ جاتا تھا اور ہم دیکھ لیتے تھے کہ "ضدین" کا اجتماع اور "نقیضین" کا تطابق نہ صرف ممکن ہے بلکہ ہستی کا اصل راز ہے۔ ہم اس گتھی کو ہیگل' اسپنسر یا سینا اور فارابی کی مدد سے نہیں سلجھا سکتے۔ اب آخر میں علمائے نفسیات اور ماہرین عصبیات کو بھی اصل واقعہ کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کامل یقین ہے کہ وہ اس کو خواب یا التباس نظر بتا کر غیر ذمہ دارانہ طور پر اپنے فرض سے سبکدوشی حاصل

کریں گے لیکن دوسری طرف مجھے یہ بھی اطمینان ہے کہ خود ان کو اپنی اس رائے پر بھروسہ کرنا ہوگا۔ وہ خود فریبیوں کے ذریعے سے اپنے اس کرب واضطراب کو دور کرنا چاہتے ہیں جو تشکیک کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ کیسی مسرت کی بات ہے کہ علم انسانی کی تنگ مائیگی کا پردہ اب فاش ہو رہا ہے۔

افسانہ کو ختم کرتے ہوئے میں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ ناہیدؔ کی جو تصویر ناصرؔ کے پاس تھی وہ اس مشہور مصور کی صناعی نہیں ہے جس کا نام تب بتایا گیا۔ بلکہ جمالؔ کی سحر طرازی ہے جس کا علم میرے سوا کسی کو نہیں۔

بھینٹ

ل۔ احمد

"بھائی آگ تو ترت ٹھنڈی ہووے نا ہے۔ اور آج بنئے نے کھوراکی روک دی ہے۔ اب جتن کیا؟"

بوڑھے مزدور نے بات شروع کی۔

"بابا! کھان تو بھینٹ لے گی جبھی ٹھنڈی پڑے گی!" ایک مزدور بولا۔

"ہاں، کھان مجور کا پالن بھی کرے ہے اور واکا کال بھی ہے۔ ندی کے سماں ان داتا بھی ہے اور نگل جانے والا اجگر بھی!" ایک گیانی مزدور نے سمجھایا۔

"دس دنا کی تنکھا بھسم گئی" ایک ضرورت کا مارا بولا۔

"بیتی سو بیت گئی، آگے کی کہو!" بوڑھے نے توجہ دلائی۔

"بابا کہن سن کائے کی۔ باہر بھی مرن بھیتر بھی مرن ____ مجوری کائے چھوڑیں!" کان مالک کا ایک کرگا بولا۔

"یا بنیا اتی جانوں کو موت کے جبڑے میں دے دیوے ہے ____ دو چار دنا اور صبر کتا!" ایک صلح پسند نے رائے ظاہر کی۔

"کیوں بھائی آگ مہینا لگی ہے تو وہ کیسے کھلائے جائے۔ اور پھر پاوے کس سے؟" ایک معاملہ فہم مزدور نے کہا۔

"ایسے سمے کھان مالک کو کھوراکی دے چہیئے۔ کھطرے میں کھان چالو رکھنے کی مناہی ہے ____ مالک منیجر اپنے سوارتھ کے لئے دکھاویں ہیں۔ کہ کھطرہ نا ہے۔" ایک اشتراکی خیال والے مزدور نے اپنی معلومات کا ثبوت دیا۔

"سمجھ کی بات کہو بھائی۔ مالکوں پر مجوروں کیا جور؟" ایک مایوس تقدیر کے مارے نے دخل دیا۔

"جور کوں نا ہے؟ آندولن کرو تو سرکار بھی چیتے۔" وہ اشتراکی بولا۔

"اور کمیٹی کونسلوں کے ممبر کون دنا کام آویں گے؟" ایک جان کار نے اپنی عقلمندی کا اظہار کیا۔

"ممبر بچارے تو گھنی بھوں بھوں کرلیں ہیں، پر ان کا بس کیا ہے؟" ایک دوسرے جان کار نے حقیقت سے پردہ ہٹایا۔

"بھتا تو ماریں ہیں نا" اس مایوس نے غصے کے لہجے میں کہا۔

اس پنچایت میں ہر پہلو سے نظر ڈال کر صورت حال کو سمجھا گیا۔ مزدور آگ سے ڈرتے ہیں تو بھو کا مرنا ہی پڑیگا۔ بنیا تھل

چانول بند کر کے اتنے مزدوروں کو موت کے منہ میں دھکیل رہا ہے تو اس سے جواب طلب کون کرے؟ مزدوروں کی بھوک اور فاقے کی فکر مالکوں کی جوتی کرے گورنمنٹ دباؤ سے ہی جیت سکتی ہے۔ وہ ہندوستانیوں کو روٹی دینے تھوڑے ہی آئی ہے! پھر ہتاپاتے ہیں، تو گلا پھاڑ پھاڑ کر اسے حلال بھی کر لیتے ہیں! یہ ساری باتیں ہوئیں مگر بات جہاں تھی وہیں رہی! مزدور اگر جلتی کان میں نہ اتریں تو کھائیں کہاں سے؟

"تو بھائیو اب ہد کیسے بیٹھے؟" بوڑھے نے پنچائیت سے پوچھا۔

"بس سویرے کھان میں اتر جلو۔ بچے بوڑھے بھات بناتر پھینگ تو نا!" کان مالک کا ایجنٹ پھر بولا۔

"بولو بھائیو؟ یائی جتن ہے نا!" بوڑھے نے پنچائیت کی رائے لی۔

"ہاں!" "اور کیا!" "ہاں!" مختلف آوازیں اٹھیں۔

چھوٹے ناگپور کا پہاڑی علاقہ کوئلے کی سرزمین ہے۔ جہاں سینکڑوں کانیں چل رہی اور ہندوستان بھر کے مل 'فیکٹریاں' انجن اور ملیں چلا رہی ہیں۔ راجہ 'نوابوں کے محلوں کو روشن اور ٹھنڈا کرنے کے لئے' پیسے والوں کی دولت بڑھانے کے لئے ان کانوں کے اندر ہزارہا مزدور کالیا سابنے کدال پھاوڑا لیے چلاتے رہتے ہیں ———— سینکڑوں فٹ زمین کے تلے دن رات پسینہ بہاتے رہتے ہیں۔ کانوں کے قریب ہی چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں ہوتی ہیں۔ جن کے اندر نہ تو آدمی سیدھا کھڑا ہو سکتا ہے اور نہ اس میں ایک چارپائی بچھ سکتی ہے۔ مگر مزدور کا ایک کنبہ اس میں زندگی بسر کرتا ہے۔

کان میں آگ لگ اٹھی تھی اور مزدوروں نے جان کے خوف سے کام بند کر دیا تھا۔ منیجر نے بہت کوشش کی اور یقین دلانا چاہا کہ آگ بڑھنے کا خطرہ نہیں' مگر مزدور راضی نہ ہوئے۔ دس روز گذر گئے مگر آگ ٹھنڈی نہ ہوئی۔ کان کے مالکوں کا ہزاروں لاکھوں کا نقصان ہو رہا تھا۔ اور منیجر کی بدنامی تھی۔ مگر مزدور جلتی کان میں کام کرنا نہ چاہتے تھے۔ منیجر نے بقال کو بلا کر حکم دے دیا۔ کہ مزدوروں کو ادھار خوراکی نہ دے۔ چنانچہ مزدور جب مودی کے پاس سودا لینے گئے تو اس نے نٹھلوے آدمیوں کو آٹا دال دینے سے انکار کر دیا۔ اس سے تمام مزدوروں میں ہلچل پڑ گئی اور پنچایت بیٹھی کہ اب کیا ہو؟

پنچایت کے سامنے سوال کی دو ہی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ جان کے خوف سے کام چھوڑا' اب کام بند کر دینا جان پر بنا دینا چاہتا ہے! دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ جان بچانا ہے تو جان کو خطرے میں ڈالو!

یہ صورت حال غریبوں ہی کے سامنے آسکتی ہے' جن کی فریاد نہ انسان سنتا ہے اور نہ خدا کے ہاں سے داد ملتی ہے! اب چونکہ جان دونوں طرح خطرے میں تھی۔ اس لئے ان مزدوروں کے سامنے یہ مصلحت آنا ہی تھی کہ بچوں اور اندھے دھندوں کو مٹھی بھر بھات اس وقت تک پہنچتے رہنا چاہیے جب تک کان کسی کو نگل نہ لے!

ان مزدوروں میں ایک جھونرا بھی تھا۔ جس نے کام بند ہونے سے چند ہی دن پہلے بدری سے بیاہ کیا تھا۔ بدری کو جھونرا کی جان کا ڈر تھا۔ اس لئے وہ اس کے ساتھ پنچایت میں بھی آئی تھی کہ فیصلہ سنے۔ پنچایت کا یہ فیصلہ کہ مزدوروں کو کان میں اترنا ہے جھونرا کی ان آنکھوں میں جو جوانی کے ولولوں کا گھر اور پریم مدھ کا ٹھکانا تھیں ایک ایسی نظر پیدا ہو گئی جسے "تن بہ تقدیر" کی نظر کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اسے بدری سے پیار پریم تھا اور اسے فاقہ کرانا گوارا نہ ہو سکتا تھا۔ مگر پنچایت کا فیصلہ سن کر

بدری کا دل سیسے کا ہو گیا۔

بدری کو کان سے دلی نفرت تھی۔ کان اس کے باپ کو کھا چکی تھی' بھائی کو نگل گئی تھی۔ اور اب پتی کو بھی بھسم کرنا چاہتی تھی!! اس لئے بدری کی نفرت کوئی اچنبھے کی بات بھی نہ تھی۔ بلکہ اچنبھا اس پر ہو سکتا تھا کہ اس کی یہ نفرت کوئی عملی صورت کیوں نہ اختیار کر سکی۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ بدری اپنی نفرت کو عملی صورت دیتی تو ساتھ ہی فاقے کو بلاوا بھی دیتی۔

بدری کی عمر کا تو سترھواں ہی برس تھا اور شادی ہوئے چند ہی روز گزرے تھے' مگر اچانک شوہر کی جان جوکھوں میں پڑ جانا ایک ایسی تحریک تھی' جس نے اس کی روایتی شرم اور ناتجربہ کاری کی کم عقلی کے باوجود اس کے اندر تحفظ کی جبلت کو پوری طرح جگا دیا تھا ___ عورت کی جرات کو ابھار دیا تھا! اس کے اندر سوچنے سمجھنے کی چیٹک پیدا کر دی تھی!

پنچایت میں پہنچ کر یہ دونوں کنارے ہی بیٹھ گئے۔ بدری کو اچانک محسوس ہوا کہ اس کے پیچھے کوئی آ کر بیٹھا ہے۔ اس نے مڑ کر نہیں دیکھا' مگر بدری کی چھٹی حس نے بتا دیا کہ وہ کرما ہے۔

کرما آس پاس کے علاقے میں بڑا جیالا اور سب سے منچلا جوان مشہور تھا۔ وہ آزاد تھا اور نڈر۔ دنیا جن باتوں پر ایمان رکھتی ہے' یہ نیم وحشی مزدور ان باتوں کا مذاق اڑاتا تھا۔ دنیا جن چیزوں سے ڈرتی ہے' یہ بھوکا مزدور ان کو انگوٹھا دکھاتا تھا ___ غرض وہ کسی کھلی یا ڈھکی طاقت اور بل کو دھیان میں نہ لاتا تھا۔ اس کا یہ نامتکی ڈھنگ لوگوں کو ناپسند تھا۔ لیکن لوگ اس پر بھروسہ کر لیتے تھے! دلوں میں اس کی عزت کرتے تھے!

کرما نے دس برس کی عمر سے کان میں کام کرنا شروع کیا۔ اور پورے پندرہ برس لوگوں کو یہ دیکھتے ہو گئے تھے کہ بیسیوں حادثے پیش آئے۔ مگر کرما ہمیشہ بال بال بچ گیا۔ ہر موقعے پر اس نے پرماتما کا منہ چڑایا اور کبھی بال بیکا نہ ہوا! لوگوں کو اس پر اچنبھا بھی بڑا تھا۔

پنچایت میں کرما چپ بیٹھ رہا۔ وہ بات کرتا ہی بہت کم تھا۔ بنئے کی طرف سے اس کے دل میں بڑا غصہ تھا۔ یہ لالچی بنیا اتی جانوں کو موت کے گڑھے میں دھکیل رہا ہے ___ کان بھینٹ ضرور لے گی! کرما بنئے کو قتل کر دینا چاہتا تھا ___ لیکن یہ مزدور تو کان میں اترنے کا فیصلہ کر رہے ہیں! یہ اگر کام پر گئے تو وہ سب سے پہلے جائے گا۔!

بدری کو جب فاقوں سے سابقہ پڑا' تب سے اسے اس شکتی پر جسے پرماتما کہا جاتا ہے خود بھی شک ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ اپنے اس شک کو پاپ سمجھتی تھی۔ اور اس وجہ سے دل میں ڈر بھی تھا۔

اس شکتی پر کرما کو بھی اعتراض تھا' مگر وہ اس کا اظہار کھلے بندوں کرتا تھا۔ اور اس کے دل میں ڈر بالکل نہ تھا۔ بدری جب کرما کے منہ سے ایسی باتیں سنتی تو ایک طرح کی شانتی تو محسوس کرتی' مگر کرما پر کسی آفت آ جانے کا یقین بھی رکھتی تھی۔ جب بھی کرما اس کے سامنے آتا' وہ خیال کرتی کہ اب کرما پر بجلی گرنے ہی والی ہے! وہ جس طرح اپنے خیالوں کو پاپ سمجھتی تھی' اس طرح کرما کی باتوں کو بھی پاپ کہہ لیتی تھی۔ کرما کی باتوں کو پاپ کہہ کر شاید وہ اپنے وچاروں کے پاپ کو دھونا چاہتی تھی! دنیا میں ایسے لوگ بہت ہیں جو اپنے گناہوں کو دوسروں کے وضو کی دھوون میں بہا دیتے ہیں۔

پنچایت سے اٹھتے اٹھتے بدری نے منہ ہی منہ میں پرارتھنا کی۔

"بھگوان! کھان میں سے جھونرا جیتا نکل آئے!"

کرما نے اس کی بہت دھیمی آواز کی کھنک سن لی اور زور کا ٹھٹھا مارا۔ اس کا یہ ٹھٹھا بدری کو نرم ہنسی کی طرح محسوس ہوا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ کرما کا یہ ٹھٹھا اور کسی نے نہیں سنا۔ وہ صرف اسی کے سننے کے لئے تھا!

جھونرا نے پوچھا۔ "کیا کہہ رہی ہے؟"

"کچھ نا ____ آگ بھڑکتی ہو' تو کھان میں مت اتریو۔" بدری نے جھونرا کی آستین پکڑ کر کہا۔

"کام پہ نہ جاؤں تو نئی دلھنیا بھات کیسے پائے؟"

"ہم اور کہیں رم جائیں گے۔" بدری نے جواب دیا۔

"پردیس؟" جھونرا نے سوال کیا۔

"ہاں محنت مجوری ہر جگہ ملے ہے!" بدری بولی۔

اپنی پیاری بیوی کے منہ سے امیدوں کے خلاف' جگوں کے چلن کے مخالف بات سن کر جھونرا کو ایک دھکا سا لگا۔ جھونرا نے بتایا:۔

"بدری' ہمارے مات پتا تو کہیں نا رہے تھے!"

"ہاں' وہ تو کہیں نا گئے!" بدری نے شرمندہ ہو کر اقرار کیا۔

درخت کی آڑ میں سے پھر وہی قہقہہ سنائی دیا' جو پہاڑی علاقے کے سناٹے پر چھا گیا۔ کرما پھر سامنے کھڑا تھا۔ مگر بجلی نہ پہلے کبھی گری تھی نہ اس وقت گری۔ مگر یہ ڈر بدری کے دل میں اس وقت بھی تھا۔

کان کے منیجر کو منٹ منٹ کی خبر پہنچتی تھی۔ پیسے والے کی دور بلا! پنچایت کے فیصلے کی خبر اسی وقت پہنچ گئی۔ اس کے انتظار میں اسے نیند نہ آ رہی تھی۔ اب وہ پاؤں پھیلا کر سوئیگا۔ مزدور موت کے منہ میں جائیں گے۔ اور اس کی نیک نامی ہو گی!

بہت سویرے کام پر پہنچنے کی سیٹی بجنے لگی اور جھونپڑوں سے لے کر کان کے دہانے تک مزدوروں کی لنگار لگ گئی۔ لیکن دہانے پر پہنچ کر سارے مزدور اکٹھا ہوتے گئے۔ حالانکہ بجلی کا جھولا انھیں کان میں لے جانے کے لئے تیار تھا۔ لیکن کوئی مزدور اس پر سوار نہیں ہوا۔ پیٹ کی مار موت کے گڑھے میں لئے جا رہی ہے۔ مگر بچاؤ کی جبلت پاؤں پکڑے ہوئے ہے۔!

جھونرا کے ساتھ ساتھ بدری بھی موجود تھی۔ جھونرا کا دامن پکڑے کھڑی تھی۔ بدری کی آنکھیں چاروں طرف کسی کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔

دور سے کرما آتا دکھائی دیا تو بدری کی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ وہ سب سے پیچھا پہنچا اور بھیڑ کو چیرتا ہوا جھولے پر جا چڑھا۔ اس کے پیچھے بدری نے جھونرا کو بھی سوار کرا دیا۔ پھر تو سب جانے لگے۔

جھولا جب نیچے اترنے لگا تو کرما نے بدری کے چکنے گالوں پر آنسو ڈھلکتے دیکھے۔ کرما شاید ان آنسوؤں کی زبان سمجھتا تھا:۔

"پریم ہے تو میرے پتی کا دھیان رکھنا!"

دن بھر میں بدری نے کان کے دہانے تک کئی چکر کاٹ ڈالے۔ ڈرتی ڈرتی جاتی اور جب وہاں کسی ہلچل کے آثار نہ دیکھتی تو مطمئن ہو کر پلٹ آتی۔ شام کو چھٹی کی سیٹی بجی تو بدری دہانے پر پہنچ چکی تھی۔ کرما اور جھونرا پہلے ہی جھولے سے اترے۔

بدری کا چہرہ کلی کی طرح کھل گیا۔ کرما نے اپنا مستقل ٹھٹھا بھر لگایا۔ بدری بھی اس کے ٹھٹھے کا مطلب سمجھتی تھی۔

"تجھے پریم شکتی پر بھروسا نہیں ____ سنبھال اپنے تِنی کو!"

جھولے سے اتر اتر کر مزدور مودی کی دکان پر پہنچے۔ تیل' چاول لے کر خوشی خوشی گھر جانے لگے۔ بدری نے بھی سودا لیا اور جھونرا کے ساتھ جھونپڑی میں پہنچی۔ کھایا پکایا اور پھر ٹاٹ بچھا کر دونوں سو گئے۔ بدری کو فوراً نیند آ گئی۔ مگر جھونرا کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ بدری کے کرما کے' اور کان کے دھیان میں جاگتا رہا۔ ایکا ایکی بدری چونک پڑی۔

"کیا ہوا؟" جھونرا نے پوچھا۔

"ڈراؤنا سپنا دیکھا۔" بدری نے جواب میں بتایا۔

"کیا سپنا؟"

"کچھ نا!"

"اچھا سو جا ____ تنکھا ئے دنا بجار ساتھ چلیو۔ تجھے وہ نیلا کنٹھا لا دوں گا۔ جو وا دن کرما کے ہاتھ میں دیکھا تھا۔ نیلے موتیوں پر تیرا من بڑا للچایا تھا۔"

"وہ کنٹھا بڑا سندر تھا!" بدری نے اٹھلاتی ہوئی آواز میں کہا۔

دونوں سو گئے اور حسب معمول منہ اندھیرے سیٹی بجی۔ مزدور کان میں پھر اتر گئے۔

کرما سب سے پہلے پہنچ گیا تھا' مگر جھولے کے پاس کھڑا رہا۔ بدری اور جھونرا سب سے پیچھے پہنچے۔ جھونرا نے جھولے کی طرف بڑھتے ہوئے کرما سے پوچھا۔

"آج کام نہ کریو گا؟"

"آج تو جرور کرنے!" کرما نے جواب دیا اور سوچتا ہوا جھولے پر چڑھ گیا۔

بدری کھڑی دیکھتی رہی۔ اس وقت کرما نے کوئی ٹھٹھا نہ لگایا۔ بدری کی طرف دیکھتا ہوا کان میں اتر گیا۔ بدری گھر کو پلٹ گئی۔

رات میں کام کرنے والے واپس آ چکے تھے۔ بدری وہاں سے گذری تو ان مزدوروں کی باتیں سنیں جو جھونپڑوں کے سامنے درختوں کی چھاؤں میں لیٹے بیٹھے بیڑی پی پلا رہے تھے۔

"بھائی رات آگ کا بڑا جور رہا۔ کہاں بھینٹ جرور لے گی!" ایک بولا۔

"میں نے کرما کو جتا تو دیا ہے ____"

"اونہہ نہہ! کرما سب جانے ہے ____ کرما اور کہاں تو منتر ہیں!"

یہ سن کر بدری دل میں خوش ہوئی۔ کرما کے متعلق اس کا بھی خیال کچھ ایسا ہی تھا۔

دوپہر نہ ہونے پائی تھی۔ کہ خطرے کی سیٹی بجنے لگی۔ مزدوروں کی بستی میں ہلچل پڑ گئی۔ بوڑھے' بچے' عورت' مرد

نکل نکل کر کان کے دہانے پر جمع ہونے لگے۔ ہائے وائے کا شور مچ گیا۔ سخت افراتفری پڑی ہوئی تھی۔

سیٹی کی آواز کے ساتھ بدری کی جان سی نکل گئی۔ وہ جہاں تھی، بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ ایک سناٹا تھا اور دنیا تیزی سے گھومے جارہی تھی۔ سب طرف بھگدڑ اور ہنگامہ تھا۔ لیکن بدری کے دل میں سناٹا اور بے صبری تھی۔

اس حالت میں وہ نہ معلوم کتنی دیر بیٹھی رہی۔ اچانک جھونپڑی کے باہر کسی کی چاپ سنائی دی اور اس چاپ کی آواز نے بدری کو ایک دنیا سے دوسری دنیا میں پہنچادیا۔ بدری کے منہ سے بے ارادہ نکلا:۔

"کرما!"

اس کے جواب میں جھونرا جھونپڑی میں داخل ہوا:۔

"کرما نہیں، میں ہوں!"

"کرما کاں ہے؟"

"کرما؟ وہ تو مر گیا!"

"مر گیا؟ نہیں، کرما نہیں مریگا!"

"جلتے جلتے سرنگ پھٹ گئی اور آگ پھیلی تو سارے میں دھواں بھر گیا۔ میں بھاگا ____ کھمر ناکدھر سے کرما میرے پیچھے پیچھے تھا۔ دھوئیں سے مجھے مرچھا آگیا تو کرما اٹھا کر دوسری سرنگ میں لے گیا۔ واں دھواں نا تھا۔ پر وہ بھی بہت دھوآں کھا گیا تھا۔ بے ہوس ہو گیا۔ ڈاکٹر آیا تو دا دارو سے میں تو اچھا ہو گیا۔ پر کرما ____ کرما مر گیا!"

"نہیں، کرما نہیں مریگا!" بدری نے چیخ کر کہا۔

"کرما کے کھیسے سے یا کنٹھا نکلا تھا۔ تیرے کارن لایا ہوگا ____ کرما کو تیرے ساتھ پریم تھا۔!"

بدری نے جھپٹ کر وہ کنٹھا جھونرا کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور کنٹھے سے باتیں کرنے لگی:۔

"پریم کی مالا! کرما مر گیا؟ نہیں، کرما نہیں مریگا!"

میرے ایک عزیز ریلوے میں ڈاکٹر ہیں۔ میں ان سے ملنے بکارو گیا تھا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ریلوے کی کوئلے کی کانیں ہیں۔ وہ ہسپتال گئے تھے۔ اور میں بنگلے کے برآمدے میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا کہ ایک آواز نے مجھے متوجہ کر لیا:۔

"کرما مر گیا؟ کرما نہیں مریگا!"

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ایک خستہ حال جوان عورت بار بار یہی کہہ رہی تھی۔ پھر ڈاکٹر صاحب کے چوکیدار نے خموش محبت کی خموش قربانی کی یہ عجیب و غریب داستان سنائی۔

تیسری جنس

چودھری محمد علی ردولوی

مدی کا اصلی نام احمدی خانم ہے۔ تحصیلدار صاحب پیار سے مدی مدی کہتے تھے۔ وہی مشہور ہو گیا۔ مدی کا رنگ بنگال میں سو دو سو میں اور ہمارے صوبہ میں ہزار دو ہزار میں ایک تھا۔ جس طرح فیروزے کا رنگ مختلف روشنیوں میں بدلا کرتا ہے اسی طرح مدی کا رنگ تھا۔

تھی تو کھلتی ہوئی سانولی رنگت جس کو سبزہ کہتے ہیں۔ مگر مختلف رنگ کے دوپٹوں یا ساڑھیوں کے ساتھ مختلف رنگ پیدا ہوتا تھا۔ کسی رنگ کے ساتھ دمک اٹھتا تھا۔ کسی رنگ کے ساتھ تمتماہٹ پیدا کرتا تھا۔ بعض اوقات جلد کی زردی میں سبزی ایسی جھلکتی تھی کہ دل چاہتا تھا۔ دیکھا ہی کرے شمع کی روشنی میں مدی کی رنگت غضب ہی ڈھاتی تھی۔ کبھی آپ نے دوسرے درجے کے مدقوق کو دیکھا ہے۔ اگر بیماری سے قطع نظر کیجئے تو رنگت کی نزاکت ویسے ہی تھی۔ آنکھیں بڑی نہ تھیں۔ مگر جب نگاہ نیچے سے اوپر کرتی تھی تو واہ واہ۔ معلوم ہوتا تھا مندر کا دروازہ کھل گیا۔ دیبی جی کے درشن ہو گئے۔ مسکراہٹ میں نہ شوخی نہ شرارت نہ بناوٹ کی شرم نہ لبھاوٹ کی کوشش۔ لکڑی۔ لوہے کے قلم کو کیسے موقلم کر دوں کہ آپ کے سامنے وہ مسکراہٹ آجائے۔

بس یہ سمجھ لیجئے کہ خدا نے جیسی مسکراہٹ اس کے لئے تجویز کی تھی وہی تھی۔ مدی اپنی طرف سے اس میں کوئی اضافہ نہیں کرتی تھی۔ اس کے کسی انداز میں بناوٹ نہ تھی۔ ہاتھ پاؤں 'قد' چہرے کے اعضا سب چھوٹے چھوٹے مگر واہ رے تناسب۔ آواز ہنسی 'چال ڈھال ہر چیز ویسی ہی۔ میں مدی سے بہت بے تکلف تھا۔ مگر عشاق میں کبھی نہ تھا۔ اور جہاں تک میں جانتا ہوں کوئی اور بھی نہیں سنا گیا۔ ایسی خوبصورت عورت بلا مرد کی حفاظت کے زندگی بسر کرے اور عشاق نہ ہوں۔ بڑے تعجب کی بات ہے۔ مگر واقعہ ہے۔ ایک میں نے کہا مدی اگر ہم جادوگر ہوتے تو جادو کے زور سے تم کو تتلی بنا کر ایک چھوٹی سی ڈبیہ میں بند کر کے اپنی پگڑی میں رکھ لیتے اس فن شریف سے واقف کار حضرات جانتے ہیں کہ جو حربہ میں نے استعمال کیا تھا وہ کم خالی جانے والا تھا۔ مگر اس کے بھی جواب میں وہی بے تکلف مسکراہٹ کی ڈھال جو تلوار کا منہ توڑ دے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

اکثر خیال گذرتا ہے کہ یہ استغنا تحصیلدار مرحوم کی سفید داڑھی کے سایہ میں پرورش پانے کا اثر ہے۔ مگر پھر عقل کہتی تھی کہ جوشِ حیات نے نہ معلوم کتنی سفید داڑھیوں میں پھونکا ڈالا ہے۔ وہ سفید داڑھی قبر میں بھی پہنچ گئی اس کا اثر کہاں سے آیا۔ بہر حال قصہ سنتے جایئے اور رفتہ رفتہ رائے قائم کرتے جایئے۔ مدی کے ہر انداز میں نسوانیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ایک بات البتہ تھی۔ جو کو عورتوں میں بھی ہوتی ہے۔ مگر ہم ایسے بوڑھے لوگ اُس کو مردہی سے منسوب کرتے ہیں۔ یعنی اپنے ہم طبقہ عورتوں میں اور اسی طبقے کے مردوں میں مدی حکومت خوب کر لیتی تھیں۔ ہر شخص عورت ہو کہ مردان کا تابع فرمان رہتا تھا۔ اور ان کے اشارے پر چلنے کو تیار۔ اب شروع سے قصہ سنئے۔ تحصیلدار صاحب کا نام کیا کیجئے گا جان کر مرحوم بڑے اچھے آدمی تھے۔ مگر بے عیب خدا کی ذات۔ کچھ خاص خاص کمزوریاں کہی جاتی تھیں۔ پرانی وضع کے لوگ تھے۔ بڑی شان سے تحصیلداری کی۔ لاکھوں کمائے اور ہزاروں اڑائے مگر اولاد نہ ہونے کی وجہ سے ان کی زندگی کچھ بے مرکزی سی ہو گئی تھی۔ بی بی بہت دن ہوئے مر چکی تھی۔ کوئی قریب کا عزیز بھی نہ تھا۔ صرف ایک نوکر تھا وہی سیہ سپید کا مالک تھا۔ تنخواہ اسی کے ہاتھ میں آتی تھی اور جب پنشن ہوئی تو پنشن کا بھی وہی حق دار ٹھہرا۔ میاں کے کپڑے اور کھانا بھی میاں حسن علی ہی پسند کرتے تھے۔ حسن علی کسی کام کو بازار گئے۔ دو تھان رادھا نگری ڈوریئے کے لئے چلے آتے ہیں۔ میاں کے کرتے بنیں گے مگر میاں کو اس وقت خبر ہوئی کہ جب درزی قطع کرنے لگا۔

"ارے میاں حسن علی یہ ڈوریہ کیسا لائے ہو؟"

حسن علی:۔ آپ کے کرتوں کے لئے۔ ڈوریہ وضعدار ہے۔ سلنے پر اور کھلے گا۔"

"کھلے گا تو مگر کرتے تو میرے پاس تھے۔ ابھی اس دن شربتی لے آئے۔ آج ڈوریہ لئے چلے آتے ہیں آخر پوچھ تو لیا ہوتا۔"

"پوچھ کے کیا کرتا۔ آپ یہی تو کہتے کہ رہنے دو گھر میں ایک چیز ہو گئی۔ برسات کا زمانہ ہے۔ دھوبی دیر میں آیا کرے گا۔ دو جوڑے فاضل اچھے ہوتے ہیں۔"

خیر بھئی!"

تحصیلدار کھانے پر بیٹھے ہیں۔ "میاں حسن علی آج کل بازار میں مچھلی نہیں آتی۔"

"آتی تو ہے مگر گرمیوں کی وجہ سے میں نے نہیں منگوائی۔ اس فصل میں مچھلی نقصان کرتی ہے صبح کو مرغ پک جائے گا۔" تحصیلدار صاحب پر حسن علی کی شخصیت ایسی غالب آئی تھی کہ جو بات وہ پسند کرتے تھے۔ تحصیلدار سمجھتے تھے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ اسی وجہ سے غیر ذمہ دار لوگ دونوں کا ذکر کر کے مسکراتے تھے۔ اور آپس میں آنکھیں مارتے تھے۔ میاں حسن علی کا استرے سے صفاچٹ چہرہ اور تحصیلدار صاحب کی بھبو داڑھی پر چہ میگوئیاں ہوتی تھیں۔ داڑھی مونچھوں کا صفایا صرف انگریزی داں حضرات کا حق ہے۔ اگر حسن علی ایسے اپنی چال چھوڑ کر ہنس کی چال چلیں گے۔ تو اللہ ہی نے کہا ہے۔ لوگ کوئی نہ کوئی نئی نکالیں گے۔

بہر حال اصلیت کی خبر خدا کو ہے۔ ہم تو جو کچھ بھی دیکھتے تھے۔ وہ یہ تھا۔ کہ تحصیلدار کا ہمدرد دنیا جہان میں حسن علی کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ حسن علی کو بھی اس سے اچھا آقا گر چراغ لے کے ڈھونڈتے تو نہ ملتا۔

اللہ میاں نے دو جنسیں بنائی تھیں۔ عورت اور مرد۔ یورپ کے ڈاکٹروں نے تحقیقات کر کے ایک اور جنس ایجاد کی ہے جو اپنی ہی جنس کی طرف راغب ہو۔ اس جنس میں عورتیں بھی شامل ہیں اور مرد بھی۔ اب نہ معلوم تحصیلدار اور حسن علی اس تیسری جنس میں سے تھے یا ویسے ہی تھے جیسے ہم آپ یا بعد کو کچھ اول بدل ہوئی۔ اس کو نہ ہم جانتے ہیں نہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ جانیں اور ان کا کام۔ بظاہر ان دونوں کے افعال سے دوسروں کی سماجی زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لئے ہم کو کھوج کی کوئی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی۔ تحصیلدار صاحب بھاری بھرکم آدمی تھے۔ اولاد نہ ہونے کا دکھڑا کیا روتے مگر اولاد کی تمنا اس بات سے ظاہر ہوتی تھی کہ جب کھانا کھاتے۔ تو حسن علی احمدی کو بلوا بھیجتے تھے کہ دستر خوان پر بیٹھ جائے۔ اسی وجہ سے کھانا تنہائی میں کھانے لگتے تھے۔ نوکر کی لڑکی کو دستر خوان پر کھلاتے کچھ اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے علاوہ اگر سب کے سامنے کھلاتے تو صاحب اولاد نہ ہونے کا رنج اور بچوں کی تمناؤں پر کھل جاتی۔ بی احمدی خانم عرف مدی بیگم کا سن چار برس کا رہا ہو گا۔ دستر خوان پر شور با گراتا۔ لقمہ ڈبونے میں دال کا پو۔ ایسا نہ مشغول دینا بچوں کا شیوہ ہے۔ اور نفیس لوگ اسی وجہ سے بچوں کو الگ کھلاتے ہیں۔ گو کہتے ہیں کہ جوانوں والا کھانا بچوں کو نقصان کرتا ہے۔ مگر تحصیلدار صاحب کو اس میں لطف آتا تھا۔ ادھر دستر خوان پر بیٹھے اور ادھر بی مدی کی طلب ہوئی۔ رفتہ رفتہ مدی خود وقت پہچان گئیں۔ تھوڑے دنوں میں مدی تحصیلدار صاحب ہی کے یہاں رہنے لگیں۔ یا تو گھر میں ایک طرف چھوٹا بھیا اور بیچ میں حسن علی کی بی بی تھیں یا ان کی پلنگڑی الگ بنی۔ صاف صاف چادر لگائی گئی۔ چھوٹے چھوٹے تکیے بنوائے گئے۔ تحصیلدار صاحب کے پاس ان کی بھی پلنگڑی بچھنے لگی۔ جوتے پہنے رہنے کی تقید ہوئی کہ بچھونا میلا نہ ہو۔ لڑکی تھی پیدائشی سلیقہ مند۔ ایک بار سے دوسری بار بتانے کی ضرورت نہیں ہوئی تھی۔ پانچ چھ ہی برس کے سن میں ایسا سلیقہ آگیا کہ آدھی بی بی معلوم ہوتی تھیں۔ تحصیلدار صاحب کے پان خود بناتی تھی۔ دس گیارہ برس کے سن میں جنس تلواتا۔ کھانا پکواتا۔ سب کچھ مدی کے ہاتھ میں ہو گیا تھا۔ دن جاتے کچھ دیر نہیں لگتی۔ چودھویں برس مدی کا شباب دمک اٹھا۔ دیکھنے والوں کا دل چاہتا کہ دیکھا ہی کریں۔ مدی بھی جب بال بنانے کھڑی ہوتی تھیں تو آئینہ کے ساتھ خود بھی متحیر رہ جاتی تھیں۔ اب ماں کو شادی کی فکر ہوئی۔ تحصیلدار صاحب کو کہا گیا۔ انہوں نے کہا جلدی کیا ہے ہو جائے گی۔ مگر لڑکی حسن علی کے بھتیجے کو بچپن ہی سے مانگی تھی۔ ادھر سے بھی اصرار ہوا کہ جوان لڑکی کا امیروں کے گھر میں رہنا اچھا نہیں۔ لیجئے صاحب شادی ہو گئی۔ تحصیلدار صاحب نے خود تو اپنے گھر سے شادی نہیں کی۔ مگر جہیز وغیرہ خوب سا دیا۔ چوتھی چالے کے بعد پھر وہی تحصیلدار صاحب کے یہاں کا رہنا۔ مدی کے دولھا بھی تحصیلدار صاحب ہی کے یہاں آتے تھے۔ مدی سسرال کم جاتی تھی۔ گئیں بھی تو کھڑی سواری۔ بہت رہیں تو ایک رات نہیں تو اسی دن واپس آ گئیں۔ سسرال والے جاہل، شوہر بھی الف کے نام لٹھا نہیں جانتے۔ گو مدی بھی بغدادی قاعدہ اور عم کے سیپارے کے آگے نہیں پڑھی تھیں۔ مگر پھر بھی پڑھے لکھے ہوئے کی پالی ہوئی تھی۔ عمر بھر امیری کارخانہ دیکھا تھا مدی کا دل سسرال میں کم لگتا تھا۔ کمسنی میں بیاہ کا تجربہ کچھ الجھنے میں ڈالے تھا۔ شادی کے بعد اگر عورت پر کنوارپنے کی آب نہیں رہ جاتی تو سہاگ کی رونق چہرہ چمکا دیتی ہے۔ مگر احمدی کے چہرہ پر اسی بات کا پتہ چلتا تھا نہ اسی کا۔ میاں بیوی کے برتاؤ کا حال دو چار دن میں کیا کھلتا۔ مگر کسی خاص خوشی یا اطمینان کا اندازہ اس میں بھی نہیں دکھائی دیتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں یہ بھی نہ رہ گیا اور کھلم کھلا ناخوشی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ شوہر صاحب کچھ دبے دبے سے تھے۔ تحصیلدار صاحب کے یہاں اگر وہ بھی اپنی شوہریت کا برتر درجہ برت نہیں سکتے تھے۔ خود اپنی بیچ میرزئی اور پالی کی بلندی ان کی نظر میں کھٹکتی تھی۔ ضرورتیں مجبور کرتی تھیں۔ نئی نئی بی بی کچھ روپیہ پیسہ

بھی ہاتھ آجاتا تھا۔ اس لئے چپ تھے' ایک دن ایسا اتفاق ہوا کہ مدی جو سو کر اٹھیں تو ایک چھڑا غائب۔ بستر پر ادھر ادھر دیکھا۔ دلائی جھاڑی۔ پائنتی جھک کے دیکھا۔ گھر میں اِدھر اُدھر تلاش کیا مگر کہیں نہ ملا۔ نہ معلوم کیا سمجھ کر چپ ہو گئی۔ دوپہر کے قریب ماں سے ذکر کیا۔ ماں نے شور مچادیا۔ تحصیلدار صاحب تک خبر ہوئی۔ انھوں نے سنتے ہی کہہ دیا کہ یہ حرکت سوائے مدی کے دولھا کے اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی کہا کہ اس کے جوا کھیلنے کی خبر بھی مجھ تک پہنچ چکی ہے۔ لیجئے صاحب شوہر بھی روٹھ گئے۔ دو چار دن کے بعد رخصتی کا اصرار ہوا۔ مگر چھڑے والی بات پکڑ کر مدی کے ماں باپ نے انکار کر دیا۔ ایک روز مدی کے شوہر نے حسن علی کے گھر آکر بہت سخت سست سنایا۔ اور غصہ میں یہ بھی کہا کہ حرام زادی کو جھونٹے پکڑ کر گھسیٹتا نہ لے جاؤں تب ہی کہنا۔ اس وقت تک مدی نے کسی کی جنبہ داری نہیں کی تھی۔ لیکن اب وہ بھی فرنٹ ہو گئی۔ اور ایسی فرنٹ ہوئی کہ مرتے دم تک پھر منہ نہ دیکھا۔ حسن علی نے بھی خیال کیا۔ داماد ممکن ہے کچھ شہدہ پن ہی کر بیٹھے اس لئے مدی کا پورے طور سے تحصیلدار صاحب ہی کے یہاں رہنا ٹھہا۔ شوہر صاحب ہمیشہ کے لئے معطل کر دیئے گئے۔

جب سے مدی کی شادی ہو گئی تھی۔ تحصیلدار صاحب کچھ چپ سے رہتے تھے۔ اس واقعہ کے بعد وہ بھی بحال ہو گئے۔ مدی کے شوہر نے اپنی سفاہت سے یہ بھی کہا کہ تحصیلدار صاحب نے اس سے آشنائی کر رکھی ہے۔ مگر اس کو کون باور کرتا۔ حسن علی والی بات پر تو لوگ ہنسی مذاق بھی کرتے تھے۔ مگر اس بات کو کسی نے جھوٹوں بھی یقین نہ کیا۔ البتہ تحصیلدار صاحب تجربہ کار آدمی تھے۔ انھوں نے موت زندگی کا خیال کر کے مدی کے لئے علیحدہ گھر اور کچھ بود گی کا انتظام کرنا شروع کیا۔ اس واقعہ کے دوسرے سال کے اندر تحصیلدار صاحب کا انتقال ہو گیا۔ تحصیلدار صاحب مرحوم کے یا تو کوئی نہیں تھا یا یکبارگی نہ معلوم کتنے وارث پیدا ہو گئے۔ اور آپس میں مقدمہ بازی شروع ہو گئی۔ بی مدی نے بھاری پتھر چوم کے چھوڑا۔ اٹھ کر اپنے گھر چلی آئیں۔ تخت' چارپائیوں' الماریوں پر نہ ان کا حق تھا نہ انہوں نے دعویٰ کیا۔ نقد جو کچھ تحصیلدار صاحب ان کو دے گئے ہوں وہ کون لے سکتا تھا۔ ہاتھ ناک' گلے میں جو کچھ تھا وہ ان کا تھا ہی۔ مدی نے حسن علی کی صلاح سے یہ طریق اختیار کیا کہ اپنے طبقے سے اونچی ہو کر رہنا پسند نہ کیا بلکہ جس حیثیت کے لوگ ان کے ماں باپ تھے اسی برادری میں رہیں۔ البتہ روپیہ پیسہ اور سلیقہ ہونے کی وجہ سے اپنے طبقے میں یوں رہیں جیسے مالی کی نگاہ میں سب پھولوں میں گلاب کا پھول ہوتا ہے۔

تحصیلدار صاحب کے سال ہی بھر بعد طاعون بڑے زوروں کا پڑا۔ اس میں میاں حسن علی اور ان کی بی بی چل بسیں اور اب صرف بی مدی اور ان کا چھوٹا بھائی رہ گئے۔

اس وقت تک مدی نے جو کچھ اچھا برا کیا ہوگا اس کی ذمہ داری صرف ان کے اوپر نہ تھی۔ کیونکہ ہر معاملہ میں تحصیلدار مرحوم اور اس سے کم درجے تک ان کے باپ کی رائے شامل رہتی تھی۔ اس کے بعد جو کچھ پیش آیا۔ وہ البتہ ان کے دل و دماغ کا نتیجہ تھا۔ مدی کا برتاؤ ہر شخص سے عمدہ تھا۔ کوئی شاکی نہ تھا بلکہ اڑوس پڑوس کی عورتیں ہر وقت ان کے گھر میں موجود رہتی تھیں۔ ان سے بھی جو ہو سکتا تھا آنے جانے والیوں کے ساتھ سلوک کرتی تھیں۔ گھر میں کپڑا سینے کی مشین تھی۔ دن بھر لوگوں کے کپڑے مفت سیا کرتی تھی۔ کسی کو اگر روپے دو روپے کی ضرورت ہوتی وہ بھی قرض کے نام سے دے دیئے۔ جس کسی کا کہیں ٹھکانہ نہ لگے وہ مدی کے یہاں چلا آئے۔ روٹی اپنی پکائے دال بی مدی سے لے لے۔ پان پتا بھی بی مدی کے پاندان سے کھائے۔ اسی زمانہ میں ایک عورت نہ معلوم کہاں کی باہر سے آئی۔ اس کو بھی مدی نے رکھ لیا عورت سلیقہ مند تھی۔ اپنا بار بھی ان پر نہیں ڈالتی تھی۔ بلکہ پیسے دو پیسے کا سلوک خود ہی کر دیتی تھی۔ کچھ انگوٹھیاں' کچھ کیلیں لیس' صابون وغیرہ بیچتی تھیں۔

صبح مدی اور برقع اوڑھ کر نکل گئیں۔ دوپہر کو آئیں۔ کھانا کھایا آرام کیا اس کے بعد پھر نکل گئیں۔ شام کو لوٹیں۔ یہ مسماۃ آئی تھیں تو یہ کہہ کر کہ دو چار دن میں سودا کر کے دوسری جگہ چلی جائیں گی۔ مگر مدی سے کچھ ایسی پر گت ملی کہ گھر کی طرح رہنے لگیں۔ محبت دیوانگی کی وہ پینگیں بڑھیں۔ کہ سگی بہنیں مات تھیں۔ صورت شکل کی تو معمولی تھیں مگر قد کشیدہ تھا۔ جب برقع اوڑھ کر راستہ چلتی تھی تو معلوم ہوتا تھا کہ مرد بھیس بدلے ہوئے چلا آتا ہے۔ چال ڈھال قد کے علاوہ بھی کچھ اور باتیں مردوں کی ایسی تھیں۔ مثلاً ہاتھ پاؤں کے دیکھتے سینہ کم تھا۔ کمر کولھے پاؤں کی چوڑی چوڑی ایڑیاں بھی عورتوں کی ایسی نہ تھیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ ہو گیا کہ دن کو ویسا ہی مجمع رہتا تھا مگر رات کو دوسری عورتیں کم رہنے لگیں۔ جب منہ انھیں پایا تو پرائے گھر میں کیسے ٹھہرتیں۔ پہلے تو عورتوں میں سرگوشیاں ہوئیں پھر محلے میں ہر شخص اسی کا ذکر کرنے لگا۔ مگر مدی اور اس عورت نے بجائے تردید کرنے کے ایک آزادانہ بے پروائی کا انداز اختیار کر لیا۔ اس عورت نے کہا ہم لوگ کسی کی بہو بیٹی ہیں یا کسی سے نکاح کرنا ہے جو ہر شخص کے آگے قسمیں کھاتے قرآن اٹھاتے پھریں۔ دنیا اپنی راہ ہم اپنی راہ۔ مدی نے کہا اگر ہمارے کوئی والی وارث ہوتا تو کسی کی مجال پڑی تھی کہ ایسی بات کہتا۔ زمانہ گذرتا گیا اور لوگوں کا شک یقین سے بدلتا گیا۔ قاعدہ ہے کہ پنچ برادری سے اگر دب جاؤ تو وہ اور دباتے ہیں۔ اگر مقابلہ پر تیار ہو جاؤ تو لوگ اپنی نیکی کی وجہ سے اکثر معاف بھی کر دیتے ہیں۔ یہی حال ان دونوں کا ہوا کہ نہ کسی نے پوچھ گچھ کی نہ انھوں نے انکار کی زحمت اٹھائی۔

لکھنے والے کو اغلام مساحقے کے ذکر میں کوئی مزا نہیں آتا۔ مگر اسی کے ساتھ ان چیزوں کا ذکر کرنے سے ڈرتا بھی نہیں۔ اگر یہ چیزیں دنیا میں ہوتی ہیں تو چپ رہنے سے ان میں اصلاح نہ ہو گی۔ نہ یہ طے ہو سکے گا کہ کہاں تک یہ چیزیں فطری ہیں۔ اور کہاں تک اسباب زمانہ سے پیش آتی ہیں۔ کسی جولاہے کے پاؤں میں تیر لگا تھا۔ خون بہتا جاتا تھا۔ مگر دعائیں مانگ رہا تھا کہ اللہ کرے جھوٹ ہو۔

ہمارے قصبے کے لوگ دراصل ہیولاک ایلس اور فرائڈ نہیں پڑھے ہیں۔ اس وجہ سے مجبوراً ہمیں ان مسائل پر بحث کرنا پڑی۔

ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ عورت میں کچھ جزو مرد کا ہوتا ہے اور ہر مرد میں کچھ جزو عورت کا۔ جو جزو غالب ہوتا ہے۔ اسی طرح کے خیالات اور افعال ہوتے ہیں۔ مردانہ قسم کی عورتیں اور زنانہ قسم کے مرد ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ ممکن ہے بعض ان میں ایسے ہوں جن کو فطرتاً اپنے ہی جنس سے تعلقات اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر اس میں بھی کلام نہیں کہ اسباب زمانہ سے بھی لوگ اس راہ لگ جاتے ہیں۔ بجائے اصلاح کی کوشش کے ہر معاملے میں یہی رائے قائم کرنا کہ یہ قدرتی تقاضا سے ہے اور اس لئے اصلاح کی ضرورت نہیں ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ البتہ ایسے فعل کی جس میں سماج کا کوئی نقصان نہ ہوتا ہو تو قانونی سزا ہونی چاہیے یا نہیں یہ دوسرا مسئلہ ہے۔

اچھا اب قصہ سنئے۔ مدی اور اس عورت سے دو سال دوستی رہی۔ اس کے بعد لڑائی ہو گئی۔ کس بات پر بگاڑ ہو گیا یہ کسی کو معلوم نہیں وہ عورت جس راہ آئی تھی۔ اسی راہ چلی گئی۔ بی مدی اجڑی بجڑی رنڈاپا کھینے لگیں۔ جو ئندہ یابندہ۔ تھوڑے دنوں کے بعد ایک اور ہم جنس مل گئیں۔ اس کے بعد اور بھی ملا کیں مگر۔

نہ بے وفائی کا ڈر تھا نہ غم جدائی کا
مزا میں کیا کہوں آغاز آشنائی کا

وہ پہلی سی بات پھر نہ نصیب ہوئی۔ اب روپیہ پیسہ بھی کم رہ گیا تھا اسی لئے آمدنی بڑھانے کی بھی فکر دامن گیر ہوئی۔ بی مدی نے تحصیلدار کے آگے ہاتھ بڑھایا نہ پھر سے شادی کی ہوس کی۔ بلکہ خود کام کرنے پر تیار ہو گئیں۔ پراٹھے کباب بیچنا شروع کئے 'جاڑوں' کی فصل میں انڈے اور گاجر کا حلوا بنانے لگیں۔ کچھ عورتوں کی ضروریات کا بساط خانہ بھی منگوالیا۔ چکن کروشیا کا بھی ڈھیر ڈالا بیچنے والوں کی کمی نہ تھی۔ اردگرد کی لڑکیاں اور عورتیں سودا بیچ لاتی تھیں۔ اور حق المحنت سے زیادہ حصہ پاتی تھیں۔ بی مدی کو سوداگری کا سب سے بڑا گر نہیں یاد تھا۔ یعنی جو آدمی بہت سے کام ساتھ ہی کرتا ہے وہ کوئی کام نہیں کر سکتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خرچ آمدنی سے زیادہ ہی رہا۔ یہاں تک کہ مکان بھی گروی رکھنا پڑا۔

روپیہ جانے کے بعد توقیر میں بھی فرق آجاتا ہے۔ مگر اس کی شائستگی اور رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ پھر بھی لوگوں کی نظر میں ہلکی نہ ہوئی۔ کپڑے اب بھی سلیقہ سے پہنتی تھی۔ گاڑھا پر وہ کبھی نہیں تھا۔ آج بھی سڑک پر ماری ماری نہیں پھرتی تھی۔ تنخواہ والے نوکر کبھی نہیں تھے۔ آج بھی دام کاج کرنے والے آسانی سے مل جاتے تھے۔ مگر اقبال مندی میں گھن بہت دنوں سے لگ چکا تھا۔ اس سے چہرے کی آب رخصت ہو چکی تھی۔ زمانہ بدل جانے سے مزاج میں بھی فرق آگیا تھا۔ ایک دن ان کے گھر میں کئی عورتیں جمع تھیں۔ کسی نے کہا "بن مرد کی عورت کس گنتی شمار میں ہے بی مدی بول اٹھیں۔ سچ کہتی ہو بہن" ایسی بات ان کے منہ سے کبھی نہیں سنی گئی تھی۔ یہ سن کر بعض نے دوسروں کو اشارہ کیا۔ بعض نے اتفاق کیا۔ دو ایک ایسی بھی تھیں جو مدی کا منہ تعجب سے دیکھنے لگیں۔ یہ وہ تھیں جنہوں نے مدی کے منہ سے مرد کا نام بلاناک بھوں چڑھائے عمر میں نہیں سنا تھا۔

زمانہ گذرتا گیا۔ مگر بی مدی کے دن نہ پھرنا تھے نہ پھرے۔ کچھ دنوں بعد ایک شاہ صاحب آئے۔ بہت مرجع خلائق تھے۔ عقیدتمندوں کا ہجوم ہر وقت لگا رہتا تھا۔ بی مدی بھی دو تین بار کباب پراٹھے کی نذر نیاز پیش کر چکی تھیں۔ اتنے میں خبر اڑی کہ شاہ صاحب حج کو جائیں گے۔ ہمیشہ مرغ پلاؤ توکل پر کھایا کئے۔ اب حج بھی توکل پر کریں گے۔ جس دن شاہ صاحب چلے لوگوں نے دیکھا مدی بھی دامن سے لگی چلی جارہی ہیں۔ اور لوگوں سے کہا سنا معاف کرا رہی ہیں۔ جو کچھ بچی کھچی پونجی تھی وہ بیچ کر نقد کر لیا۔ باقی کے لئے شاہ صاحب کی ذات اور توکل کا توشہ کافی ٹھیرا۔ حج سے واپسی پر وطن نہیں آئیں۔ بلکہ شاہ صاحب ہی کے قدموں سے لگی رہیں۔ شاہ صاحب اپنے وقت کے بلعم باعور تھے۔ جی چاہے الگنی پر ڈال دیجئے۔ چاہے چادر کی طرح کاندھے پر لٹکا لیجئے۔ مدی میں جوانی کی کنی گلنے میں اب بھی دیر تھی۔ مگر شاہ صاحب کو دیکھ کر خواب میں بھی آشنائی کا خیال نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اگر غور کیجئے۔ تو پیر بھی ایک طرح کا شوہر ہی ہوتا ہے۔ جس پر مرید اسی طرح تکیہ کرتا ہے جیسے عورت مرد پر۔

---

(٦)

اُردو افسانہ

دوسرا دور

کفن

پریم چند

(۱)

جھونپڑے کے دروازے پر باپ اور بیٹا دونوں ایک بجھے ہوئے الاؤ کے سامنے خاموش بیٹھے ہوئے تھے اور اندر بیٹے کی نوجوان بیوی بدھیا دردِ زہ سے پچھاڑیں کھا رہی تھی اور رہ رہ کر اس کے منہ سے ایسی دل خراش صدا نکلتی تھی کہ دونوں کلیجہ تھام لیتے تھے۔ جاڑوں کی رات تھی، فضا سناٹے میں غرق، سارا گاؤں تاریکی میں جذب ہو گیا تھا۔

گھیسو نے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے بچے گی نہیں۔ سارا دن تڑپتے ہو گیا۔ جا دیکھ تو آ۔"

مادھو دردناک لہجے میں بولا۔ "مرنا ہے تو جلدی مر کیوں نہیں جاتی۔ دیکھ کر کیا آؤں؟"

"تو بڑا بے درد ہے بے! سال بھر جس کے ساتھ جندگانی کا دکھ بھوگا اسی کے ساتھ اتنی بے وپھائی؟"

"تو مجھ سے تو اس کا تڑپنا اور ہاتھ پاؤں پٹکنا نہیں دیکھا جاتا۔"

چماروں کا کنبہ تھا اور سارے گاؤں میں بدنام۔ گھیسو ایک دن کام کرتا تو تین دن آرام۔ مادھو اتنا کام چور تھا کہ گھنٹہ بھر کام کرتا تو گھنٹہ بھر چلم پیتا۔ اس لئے انہیں کوئی رکھتا ہی نہ تھا۔ گھر میں مٹھی بھر اناج موجود ہو تو ان کے لئے کام کرنے کی قسم تھی۔ جب دو ایک فاقے ہو جاتے تو گھیسو درختوں پر چڑھ کر لکڑیاں توڑ لاتا اور مادھو بازار میں بیچ آتا اور جب تک دو پیسے رہتے دونوں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے۔ جب فاقے کی نوبت آجاتی تو پھر لکڑیاں توڑتے یا کوئی مزدوری تلاش کرتے۔ گاؤں میں کام کی کمی نہ تھی۔ کاشتکاروں کا گاؤں تھا۔ محنتی آدمی کے لئے پچاس کام تھے۔ مگر ان دونوں کو لوگ اسی وقت بلاتے جب دو آدمیوں سے ایک کام پا کر بھی قناعت کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہ ہوتا۔ کاش دونوں سادھو ہوتے تو انہیں قناعت اور توکل کے لئے ضبطِ نفس کی مطلق ضرورت نہ ہوتی۔ یہ ان کی خلقی صفت تھی۔ عجب زندگی تھی ان کی، گھر میں مٹی کے دو چار برتنوں کے سوا کوئی اثاثہ نہیں۔ پھٹے چیتھڑوں سے اپنی عریانی کو ڈھانکے ہوئے، دنیا کی فکروں سے آزاد، قرض سے لدے ہوئے۔ گالیاں بھی کھاتے تھے مگر کوئی غم نہیں۔ مسکین اتنے کہ وصول کی مطلق امید نہ ہونے پر بھی لوگ انہیں کچھ نہ کچھ قرض دے

بستے تھے۔ مٹر یا آلو کی فصل میں کھیتوں سے مٹر یا آلو اکھاڑ لاتے اور بھون بھون کر کھاتے یا دس پانچ اوکھ توڑ لاتے اور راتوں کو چوستے۔ گھیسو نے اسی زاہدانہ انداز سے ساٹھ سال کی عمر کاٹ دی اور مادھو بھی سعادت مند بیٹے کی طرح باپ کے نقش قدم پر چل رہا تھا بلکہ اس کا نام اور بھی روشن کر رہا تھا۔ اس وقت بھی دونوں الاؤ کے سامنے بیٹھے آلو بھون رہے تھے جو کسی کے کھیت سے کھود لائے تھے۔ گھیسو کی بیوی کا تو مدت ہوئی انتقال ہو گیا تھا' مادھو کی شادی پچھلے سال ہوئی تھی۔ جب سے یہ عورت آئی تھی اس نے اس خاندان میں تمدن کی بنیاد ڈالی تھی۔ پسائی کر کے گھاس چھیل کر وہ سیر بھر آٹے کا انتظام بھی کر لیتی تھی اور ان دونوں بے غیرتوں کا دوزخ بھرتی رہتی تھی۔ جب سے وہ آئی یہ دونوں اور بھی آرام طلب اور آلسی ہو گئے تھے بلکہ کچھ اکڑنے بھی لگے تھے۔ کوئی کام کرنے کو بلاتا تو بے نیازی کی شان سے دوگنی مزدوری مانگتے۔ وہی عورت آج صبح سے دروزہ سے مر رہی تھی اور یہ دونوں شاید اسی انتظار میں تھے کہ یہ مر جائے تو آرام سے سوئیں۔

گھیسو نے آلو نکال کر چھیلتے ہوئے کہا۔ "جا کر دیکھ تو کیا حالت ہے اس کی۔ چڑیل کا پھساد ہو گا اور کیا یہاں تو اوجھا بھی ایک روپیہ مانگتا ہے' کس کے گھر سے آئے؟"

مادھو کو اندیشہ تھا کہ وہ کوٹھڑی میں گیا تو گھیسو آلوؤں کا بڑا حصہ صاف کر دے گا' بولا۔ "مجھے وہاں ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر کس بات کا ہے' میں تو یہاں ہوں ہی۔"

"تو تم ہی جا کر دیکھو نا۔"

"میری عورت جب مری تھی تو میں تین دن اس کے پاس سے ہلا بھی نہیں اور پھر مجھ سے لجائے گی کہ نہیں۔ کبھی اس کا منہ نہیں دیکھا' آج اس کا اُگھرا ہوا بدن دیکھوں۔ اسے تن کی سدھ بھی تو نہ ہو گی۔ مجھے دیکھ لے گی تو کھل کر ہاتھ پاؤں بھی نہ پٹک سکے گی۔"

"میں سوچتا ہوں کوئی بال بچہ ہو گیا تو کیا ہو گا۔ سونٹھ' گڑ' تیل کچھ بھی تو نہیں ہے گھر میں۔"

"سب کچھ آ جائے گا۔ بھگوان بچہ دیں تو___ جو لوگ ابھی ایک پیسہ نہیں دے رہے ہیں وہی تب بلا کر دیں گے۔ میرے نو لڑکے ہوئے' گھر میں کبھی کچھ نہ تھا مگر اسی طرح ہر بار کام چل گیا۔"

جس سماج میں رات دن کام کرنے والوں کی حالت ان کی حالت سے کچھ بہت اچھی نہ تھی اور کسانوں کے مقابلے میں وہ لوگ جو کسانوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا جانتے تھے کہیں زیادہ فارغ البال تھے۔ وہاں اس قسم کی ذہنیت کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہ تھی۔ ہم تو کہیں گے گھیسو کسانوں کے مقابلے میں زیادہ باریک بیں تھا اور کسانوں کی تہی دماغ جمعیت میں شامل ہونے کے بدلے شاطروں کی فتنہ پرداز جماعت میں شامل ہو گیا تھا۔ ہاں اس میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ شاطروں کے آئین و ادب کی پابندی بھی کرتا۔ اس لئے جہاں اس کی جماعت کے اور لوگ گاؤں کے سرغنہ اور مکھیا بنے ہوئے تھے۔ اس پر سارا گاؤں انگشت نمائی کرتا تھا۔ پھر بھی اسے یہ تسکین تو تھی ہی کہ اگر وہ خستہ حال ہے تو کم از کم اسے کسانوں کی سی جگر توڑ محنت تو نہیں کرنی پڑتی اور اس کی سادگی اور بے زبانی سے دوسرے بے جا فائدہ تو نہیں اٹھاتے۔

دونوں آلو نکال نکال کر جلتے جلتے کھانے لگے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اتنا صبر نہ تھا کہ انہیں ٹھنڈا ہو جانے دیں۔ کئی بار دونوں کی زبانیں جل گئیں۔ چھل جانے پر آلو کا بیرونی حصہ تو بہت زیادہ گرم نہ معلوم ہوتا لیکن دانتوں کے تلے پڑتے ہی

اندر کا حصہ زبان اور حلق اور تالو کو جلا دیتا تھا اور اس انگارے کو منہ میں رکھنے سے زیادہ خیریت اسی میں تھی کہ وہ اندر پہنچ جائے۔ وہاں اسے ٹھنڈا کرنے کے لئے کافی سامان تھا اس لئے دونوں جلد جلد نگل جاتے۔ حالانکہ اس کوشش میں ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔

گھیسو کو اس وقت ٹھاکر کی برات یاد آئی جس میں بیس سال پہلے وہ گیا تھا۔ اس دعوت میں اسے جو سیری نصیب ہوئی تھی وہ اس کی زندگی میں ایک یادگار واقعہ تھی اور آج بھی اس کی یاد تازہ تھی۔ بولا۔ "وہ بھوج نہیں بھولتا۔ تب سے پھر اس طرح کا کھانا اور بھر پیٹ نہیں ملا۔ لڑکی والوں نے سب کو پوڑیاں کھلائی تھیں۔ سب کو ___ چھوٹے بڑے سب نے پوڑیاں کھائیں اور اصلی گھی کی چٹنی، رائتہ، تین طرح کے سوکھے ساگ، ایک رسے دار ترکاری۔ دہی، چٹنی، مٹھائی۔ اب کیا بتاؤں کہ اس بھوج میں کتنا سواد ملا۔ کوئی روک نہیں تھی۔ جو چیز چاہو مانگو اور جتنا چاہو کھاؤ۔ لوگوں نے تو ایسا کھایا، ایسا کھایا کہ کسی سے پانی نہ پیا گیا۔ مگر پروسنے والے ہیں کہ سامنے گرم گرم گول گول مہکتی کچوڑیاں ڈالے دیتے ہیں۔ منع کرتے ہیں کہ نہیں چاہیے، پتّل کو ہاتھ سے روکے ہوئے ہیں مگر وہ ہیں کہ دیئے جاتے ہیں اور جب سب نے منہ دھو لیا تو ایک ایک بیڑا پان بھی ملا۔ مگر مجھے پان لینے کی کہاں سدھ تھی، کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ چٹ پٹ کر جا کر اپنے کمبل پر لیٹ گیا۔ ایسا دریا دل تھا وہ ٹھاکر۔"

مادھو نے ان تکلفات کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اب ہمیں کوئی ایسا بھوج کھلاتا۔"

"اب کوئی کیا کھلائے گا۔ وہ جمانا دوسرا تھا۔ اب تو سب کو کپھایت سوجھتی ہے۔ سادی بیاہ میں مت کھرچ کرو، کریا کرم میں مت کھرچ کرو۔ پوچھو گریبوں کا مال بٹور بٹور کر کہاں رکھو گے! مگر بٹورنے میں تو کمی نہیں ہے، ہاں کھرچ میں کپھایت سوجھتی ہے۔"

"تم نے ایک بیس پوڑیاں کھائی ہوں گی۔"

"بیس سے جیادہ کھائی تھیں۔"

"میں پچاس کھا جاتا۔"

"پچاس سے کم میں نے بھی نہ کھائی ہوں گی۔ اچھا پٹھا تھا اب تو اس کا آدھا بھی نہیں ہے۔"

آلو کھا کر دونوں نے پانی پیا اور وہیں الاؤ کے سامنے اپنی دھوتیاں اوڑھ کر پاؤں پیٹ میں ڈالے سو رہے جیسے دو بڑے اژدر کنڈلیاں مارے پڑے ہوں۔ اور بدھیا ابھی تک کراہ رہی تھی۔

(۲)

صبح کو مادھو نے کوٹھڑی میں جا کر دیکھا تو اس کی بیوی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس کے منہ پر مکھیاں بھنک رہی تھیں، پتھرائی ہوئی آنکھیں اوپر ٹنگی ہوئی تھیں۔ سارا جسم خاک میں لت پت ہو رہا تھا۔ اس کے پیٹ میں بچہ مر گیا تھا۔

مادھو بھاگا ہوا گھیسو کے پاس آیا۔ پھر دونوں زور زور سے ہائے ہائے کرنے اور چھاتی پیٹنے لگے۔ پڑوس والوں نے یہ آہ و زاری سنی تو دوڑے ہوئے آئے اور رسم قدیم کے مطابق غم زدوں کی تشفی کرنے لگے۔

مگر زیادہ رونے دھونے کا موقع نہ تھا۔ کفن کی اور لکڑی کی فکر کرنی تھی۔ گھر میں تو پیسہ اس طرح غائب تھا جیسے چیل کے

گھسیٹتے میں دراس۔

باپ بیٹے روتے ہوئے گاؤں کے زمیندار کے پاس گئے۔ وہاں دونوں کی صورت سے نفرت کرتے تھے۔ کئی بار انہیں اپنے ہاتھوں پیٹ چکے تھے، چوری کی علت میں، وعدہ پر کام نہ آنے کی علت میں۔ پوچھا "کیا ہے بے گھیسو! روتا کیوں ہے؟ اب تو تیری صورت ہی نظر نہیں آتی۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ تم اس گاؤں میں رہنا نہیں چاہتے۔"

گھیسو نے زمین پر سر رکھ کر آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ "سرکار بڑی بپت میں ہوں، مادھو کی گھر والی گزر گئی۔ دن بھر تڑپتی رہی سرکار آدھی رات تک ہم دونوں اس کے سرہانے بیٹھے رہے۔ دوا دارو جو کچھ ہو سکا سب کیا۔ مگر وہ ہمیں دغا دے گئی۔ اب کوئی ایک روٹی دینے والا نہیں رہا مالک، تباہ ہو گئے، گھر اجڑ گیا۔ آپ کا غلام ہوں، اب آپ کے سوا اس کی مٹی کون پار لگائے گا۔ ہمارے ہاتھ میں تو جو کچھ تھا وہ سب دوا دارو میں اٹھ گیا۔ سرکار ہی کی دیا ہو گی تو اس کی مٹی اٹھے گی۔ آپ کے سوا اور کس کے دوار پر جاؤں؟"

زمیندار صاحب رحم دل آدمی تھے مگر گھیسو پر رحم کرنا کالے کمبل پر رنگ چڑھانا تھا۔ جی میں تو آیا کہ دیں۔ "چل دور ہو یہاں سے لاش گھر میں رکھ سڑیوں تو بلانے سے بھی نہیں آتا۔ آج جب غرض پڑی تو آ کر خوشامد کر رہا ہے۔ حرام خور کہیں کا بدمعاش۔" مگر یہ غصہ یا انتقام کا موقع نہیں تھا، طوعاً و کرہاً دو روپے نکال کر پھینک دیئے مگر تشفی کا ایک کلمہ بھی منہ سے نہ نکالا۔ اس کی طرف تاکا تک نہیں گویا سر کا بوجھ اتارا ہو۔

جب زمیندار صاحب نے دو روپے دیئے تو گاؤں کے بنئے مہاجنوں کو انکار کی جرأت کیونکر ہوتی۔ گھیسو زمیندار کے نام کا ڈھنڈورا پیٹنا جانتا تھا۔ کسی نے دو آنے دیئے، کسی نے چار آنے، ایک گھنٹے میں گھیسو کے پاس پانچ روپے کی معقول رقم جمع ہو گئی۔ کسی نے غلہ دے دیا اور کسی نے لکڑی، اور دوپہر کو گھیسو اور مادھو بازار سے کفن لانے چلے ادھر لوگ بانس وانس کاٹنے لگے۔

گاؤں کی رقیق القلب عورتیں لاش کو آ آ کر دیکھتی تھیں اور اس کی بے بسی پر دو بوند آنسو گرا کر چلی جاتی تھیں۔

(۳)

بازار میں پہنچ کر گھیسو بولا۔ "لکڑی تو اسے جلانے بھر کو مل گئی ہے، کیوں مادھو!"

مادھو بولا۔ "ہاں لکڑی تو بہت ہے اب کفن چاہیے۔"

"تو کوئی ہلکا سا کفن لے لیں۔"

"ہاں اور کیا۔ لاش اٹھتے اٹھتے رات ہو جائے گی، رات کو کفن کون دیکھتا ہے؟"

"کفن لاش کے ساتھ جل ہی تو جاتا ہے۔"

"کون کیا رکھا ہے۔ یہی پانچ روپے ملتے تو کچھ دوا دارو کرتے۔"

دونوں ایک دوسرے کے دل کا ماجرا معنوی طور پر سمجھ رہے تھے۔ بازار میں ادھر ادھر گھومتے رہے۔ یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ دونوں اتفاق سے یا عمداً ایک شراب خانے کے سامنے آ پہنچے اور گویا کسی طے شدہ فیصلے کے مطابق اندر گئے۔ وہاں ذرا دیر تک دونوں تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے، پھر گھیسو نے ایک بوتل شراب لی، کچھ گزک لی اور دونوں برآمدہ میں بیٹھ کر پینے لگے۔

کئی کپیاں پیہم پینے کے بعد دونوں سرور میں آگئے۔

گھیسو بولا۔ "کپھن لگانے سے کیا ملتا۔ آخر جل ہی تو جاتا۔ کچھ بہو کے ساتھ تو نہ جاتا۔"

مادھو آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ گویا فرشتوں کو اپنی معصومیت کا یقین دلا رہا ہو۔ "دنیا کا دستور ہے۔ نہیں لوگ بامنوں کو ہجاروں روپے کیوں دے دیتے ہیں؟ کون دیکھتا ہے پرلوک میں ملتا ہے یا نہیں۔"

"بڑے آدمیوں کے پاس دھن ہے پھونکیں۔ ہمارے پاس پھونکنے کو کیا ہے؟"

"لیکن لوگوں کو جواب کیا دو گے؟ لوگ پوچھیں گے نہیں کپھن کہاں ہے؟"

گھیسو ہنسا۔ "کہہ دیں گے روپے کمر سے کھسک گئے۔ بہت ڈھونڈا ملے نہیں۔"

مادھو بھی ہنسا اس غیر متوقع خوش نصیبی پر، قدرت کو اس طرح شکست دینے پر، بولا۔ "بڑی اچھی تھی بیچاری۔ مری بھی تو خوب کھلا پلا کر۔"

آدھی بوتل سے زیادہ ختم ہو گئی۔ گھیسو نے دو سیر پوڑیاں منگوائیں۔ گوشت اور سالن اور چٹ پٹی کلیجیاں اور تلی ہوئی مچھلیاں۔ شراب خانے کے سامنے ہی دوکان تھی۔ مادھو لپک کر دو پتلوں میں ساری چیزیں لے آیا۔ پورے ڈیڑھ روپے خرچ ہو گئے۔ صرف تھوڑے سے پیسے بچ رہے۔

دونوں اس وقت اس شان سے بیٹھے ہوئے پوریاں کھا رہے تھے جیسے جنگل میں کوئی شیر اپنا شکار اڑا رہا ہو۔ نہ جواب دہی کا خوف تھا نہ بدنامی کی فکر۔ ضعف کے ان مراحل کو انہوں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا۔ گھیسو فلسفیانہ انداز سے بولا۔ "ہماری آتما پرسن ہو رہی ہے تو کیا اسے پن نہ ہو گا؟"

مادھو نے فرق عقیدت جھکا کر تصدیق کی۔ "جرور سے جرور ہو گا۔ بھگوان تم انتر جامی (علیم) ہو۔ اسے بیکنٹھ لے جانا۔ ہم دونوں ہردے سے اسے دعا دے رہے ہیں۔ آج جو بھوجن ملا وہ کبھی عمر بھر نہ ملا تھا۔"

ایک لمحہ کے بعد مادھو کے دل میں ایک تشویش پیدا ہوئی۔ "کیوں دادا ہم لوگ بھی تو ایک نہ ایک دن وہاں جائیں گے ہی۔"

گھیسو نے اس طفلانہ سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ مادھو کی طرف پر ملامت انداز سے دیکھا۔

"جو وہاں ہم لوگوں سے وہ پوچھے گی کہ تم نے ہمیں کپھن کیوں نہیں دیا تو کیا کہو گے؟"

"کہیں گے تمہارا سر۔"

"پوچھے گی تو جرور۔"

"تو کیسے جانتا ہے اسے کپھن نہ ملے گا۔ تو مجھے ایسا گدھا سمجھتا ہے۔ میں ساٹھ سال دنیا میں کیا گھاس کھودتا رہا ہوں۔ اس کو کپھن ملے گا اور اس سے بہت اچھا ملے گا جو ہم دیتے۔"

مادھو کو یقین نہ آیا، بولا۔ "کون دے گا؟ روپے تو تم نے چٹ کر دیئے۔"

گھیسو تیز ہو گیا۔ "میں کہتا ہوں اسے کپھن ملے گا تو مانتا کیوں نہیں؟"

"کون دے گا، بتاتے کیوں نہیں؟"

"وہی لوگ دیں گے جنہوں نے اب کی دیا۔ ہاں وہ روپے ہمارے ہاتھ نہ آئیں گے اور اگر کسی طرح آجائیں تو پھر ہم اسی طرح یہاں بیٹھے پئیں گے اور کفن تیسری بار ملے گا۔"

جوں جوں اندھیرا بڑھتا تھا اور ستاروں کی چمک تیز ہوتی تھی مے خانے کی رونق بھی بڑھتی جاتی تھی۔ کوئی گاتا تھا، کوئی بہکتا تھا، کوئی اپنے رفیق کے گلے لپٹا جاتا تھا، کوئی اپنے دوست کے منہ میں ساغر لگائے دیتا تھا۔ وہاں کی فضا میں سرور تھا، ہوا میں نشہ۔ کتنے تو چلو میں الو ہو جاتے ہیں۔ یہاں آتے تھے صرف خود فراموشی کا مزہ لینے کے لئے۔ شراب سے زیادہ یہاں کی ہوا سے مسرور ہوتے تھے۔ زیست کی بلا یہاں کھینچ لاتی تھی اور کچھ دیر کے لئے وہ بھول جاتے تھے کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ہیں، یا زندہ در گور ہیں۔

اور یہ دونوں باپ بیٹے اب بھی مزے لے لے کے چسکیاں لے رہے تھے۔ سب کی نگاہیں ان کی طرف جمی ہوئی تھیں۔ کتنے خوش نصیب ہیں دونوں۔ پوری بوتل بیچ میں ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر مادھو نے بچی ہوئی پوریوں کا پتل اٹھا کر ایک بھکاری کو دے دیا جو کھڑا ان کی طرف گرسنہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور "دینے" کے غرور، ولولہ اور مسرت کا اپنی زندگی میں پہلی بار احساس کیا۔

گھیسو نے کہا۔ "لے جا۔ کھوب کھا اور اسیر باد دے۔ جس کی کمائی ہے وہ تو مر گئی، مگر تیرا اسیر باد اسے جرور پہنچ جائے گا۔ روئیں روئیں سے اسیر باد دے۔ بڑی گاڑھی کمائی کے پیسے ہیں۔"

مادھو نے پھر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بیکنٹھ میں جائے گی دادا۔ بیکنٹھ کی رانی بنے گی۔"

گھیسو کھڑا ہو گیا اور جیسے مسرت کی لہروں میں تیرتا ہوا بولا۔ "ہاں بیٹا بیکنٹھ میں جائے گی۔ کسی کو ستایا نہیں، کسی کو دبایا نہیں، مرتے وقت ہماری جندگی کی سب سے بڑی لالسا پوری کر گئی۔ وہ نہ بیکنٹھ جائے گی تو کیا یہ موٹے موٹے لوگ جائیں گے جو گریبوں کو دونوں ہاتھ سے لوٹتے ہیں اور اپنے پاپ کو دھونے کے لئے گنگا میں جاتے ہیں اور مندر میں جل چڑھاتے ہیں۔"

یہ خوش اعتقادی کا رنگ بھی بدلا۔ تلون نشہ کی خاصیت ہے۔ یاس اور غم کا دورہ ہوا، مادھو بولا۔ "مگر دادا بیچاری نے جندگی میں بڑا دکھ بھوگا۔ مری بھی کتنا دکھ جھیل کر۔" وہ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگا۔

گھیسو نے سمجھایا۔ "کیوں روتا ہے بیٹا۔ کھس ہو کہ وہ مایا جال سے مکت ہو گئی، جنجال سے چھوٹ گئی۔ بڑی بھاگوان تھی جو اتنی جلدی مایا موہ کے بندھن توڑ دیئے۔"

اور دونوں وہیں کھڑے ہو کر گانے لگے:

ٹھگنی کیوں نیناں جھمکاوے ٹھگنی

سارا مے خانہ محو تماشا تھا اور یہ دونوں میکش محویت کے عالم میں گائے جاتے تھے۔ پھر دونوں ناچنے لگے۔ اچھلے بھی، کودے بھی، گرے بھی، مٹکے بھی، بھاؤ بھی بتائے اور آخر نشہ سے بدمست ہو کر وہیں گر پڑے۔

جاں نثار

سدرشن

دیوالی کی رات تھی زمین آسمان بنی ہوئی تھی۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی۔ چراغوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ جیسے آسمان کے تاروں کا شمار نہیں مگر بھی چاندنی (؟) رات ہے۔ جب ہزاروں حریص ہاتھ خیالی ثروت کی آرزو میں اپنا اثاثہ لٹا بیٹھتے ہیں۔ اور پھر اپنی حماقت پر بیٹھے روتے ہیں انسان محنت نہیں کرنا چاہتا مگر اس کے شیریں پھل کھانا چاہتا ہے۔ امید عقل کو دھوکا دے جاتی ہے۔ پورن چند بھی اسی امید سے مسحور ہو چکا ہے وہ دن رات جوا کھیلا کرتا تھا۔ اور دیوالی کے قریب آکر تو اسے کھانے پینے کی سدھ نہ رہتی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ کسی نہ کسی دن نصیبہ چمک اٹھے گا۔ امید ہر بار یاس کی صورت اختیار کرتی تھی۔ مگر پورن چند حوصلہ نہ ہارتا تھا۔ اور قسمت کے بساط پر برابر پانسہ پھینکتا جاتا تھا۔ وہ ایک دفتر میں خزانچی تھا۔ دیوالی قریب آئی۔ تو دفتر سے غیر حاضر رہنے لگا مگر مہینے کے آخری دنوں میں دفتر جانا ضروری ہو گیا۔ عملہ کی تنخواہوں کا بل تیار کرنا تھا۔ حسن اتفاق سے دیوالی یکم نومبر کی تھی۔ ۳۱ اکتوبر کو تنخواہوں کا روپیہ آیا۔ مگر پورے چار بجے کلرک گھر جا چکے تھے۔ تنخواہ اس دن تقسیم نہ ہو سکی۔ لیکن پورن چند نے تنخواہ اسی وقت لے لی اور خوش خوش گھر چلا۔ دیوالی کی رات کا سامان مہیا ہو گیا تھا۔ رات کو جب لکشمی پوجا ہو چکی تو وہ دیپ مالا دیکھنے کے بہانے گھر سے چلا اور جوئے خانہ میں جا پہنچا۔ بدقسمتی پہلے ہی انتظار کر رہی تھی جاتے ہی سب کچھ ہار گیا۔ اب اس کی حالت اس پرندے سے مشابہ تھی جو مصروف پرواز ہونے سے پہلے ہی قینچ ہو چکا ہو۔ اس وقت اس کی بے بسی کیسی دلخراش ہوتی ہے۔ وہ اڑنا چاہتا ہے۔ مگر اپنے کترے ہوئے پروں کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھرتا ہے۔ اور تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ پورن چند کو ایسا معلوم ہوا گویا دیوالی کی رات کے ساتھ ہی اس کی خوش نصیبی بھی رخصت ہو رہی ہے۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر کہیں سے روپیہ ملنے کی صورت نظر نہ آئی۔ یکایک اس کے دل میں ایک خیال نے سر اٹھایا امید سامنے کھڑی دکھائی دی............. عملہ کی تنخواہوں کے روپے دفتر میں موجود تھے اور وہ خزانچی تھا۔

پورن چند پر نشہ سا چھا گیا۔ وہ بدحواسی کے عالم میں دفتر کی طرف روانہ ہوا۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ چراغوں کی بہار میں خزاں کے پہلو نمودار ہو رہے تھے۔ بازاروں کی رونق کم ہو رہی تھی۔ مگر پورن چند کی آنکھیں اس طرف سے بند تھیں۔ وہ اس طرح بھاگتا ہوا جا رہا تھا جیسے کسی عزیز بیمار کے لئے کوئی ڈاکٹر کو بلانے جا رہا ہو۔ دفتر میں پہنچا تو چوکیدار دکھائی دیا۔ پورن چند کا ارادہ متزلزل ہو گیا۔ چوکیدار [illegible]

[illegible]

گنگادین نے آواز سے فوراً پہچان لیا اور آگے بڑھ کر بولا "آیئے بابو صاحب بہار میں تو کھوب رونق رہی ہے۔ آپ یہاں کیسے آگئے؟"

پورن چند کا دل دھڑک رہا تھا۔ مگر زبان پر پورا پورا قابو تھا۔ بولا "کچھ کاغذ بھول گیا ہوں۔ دروازہ کھول دو۔"

گنگادین نے فوراً تعمیل کی۔ اگر کوئی اور ہوتا۔ تو شاید وہ انکار کر دیتا۔ مگر پورن چند خزانچی تھا۔ اس سے کچھ عذر نہیں کیا۔ بعض وقت غلطی کی ضرورت آ پڑتی تھی۔ پورن چند کمرے میں پہنچا۔ اور روشنی کر کے میز کے سامنے ہو بیٹھا۔ اس وقت اس کی عقل اس طرح چاپ تھی۔ جیسے کبوتر شکرے کے پنجے میں پھنس گیا ہو۔ بار بار خیال آتا تھا کہ یہ قدم تباہی کی طرف لے جانے والا ہے مگر اس تاریکی میں امید کا فریب چہرہ بھی کبھی کبھی نظر آ جاتا تھا آخر پورن چند پر امید کا جادو چل گیا۔ اس نے تجوری کھول کر چار سو کے نوٹ جیب میں ڈال لئے۔ اور کمرہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ اس وقت اسے ایسا معلوم ہوا کہ کامیابی کا ایک مرحلہ طے کر چکا ہے۔ حالانکہ اس کا ہر قدم اسے سرزمین کامرانی سے دور لئے جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر اسی جوئے خانہ میں تھا۔ جہاں قسمتیں برباد ہوتی ہیں اور تباہی ہنستی ہے۔ امید اسے راستہ دکھا رہی تھی۔ مگر بدقسمتی اوٹ میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ پورن چند نے پھر داؤ لگائے اور پھر سب کچھ ہار گیا۔ اب چاروں طرف تاریکی تھی۔ لیکن اس تاریکی سے زیادہ خوفناک وہ سپیدی سحر تھی۔ جو آہستہ آہستہ نزدیک سرک رہی تھی۔ اس سپیدی سے پورن چند اتنا خائف تھا کہ اس کے تصور سے ہی اس کی روح کانپ جاتی تھی سوچتا تھا۔ کیا کوئی ایسی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ کل صبح کا سورج ہی طلوع نہ ہو۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ پورن چند گھر پہنچا اس وقت اس کے پاؤں ایسے لڑکھڑا رہے تھے جیسے شراب پی رکھی ہو۔ اس کا باپ رائے صاحب سرجن مل امیر آدمی تھا۔ مگر اس کی امارت سے زیادہ مشہور اس کے بخل کے قصے تھے۔ پورن چند کو کئی بار خیال آیا کہ چل کر ان کے سامنے ساری بات ظاہر کر دوں تو یقیناً وہ مجھے چار سو روپیہ دینے سے انکار نہ کریں گے۔ مگر پھر سوچا کہ یہ نہیں ہو گا۔ اگر ایسے نصیب ہوتے تو وہ مجھے کوئی کارخانہ نہ کھول دیتے۔ ناحق ذلیل ہونے سے کیا حاصل؟ کوئی اور طریقہ سوچنا چاہیے اب اسے عقل آ گئی تھی امید کوئی دھوکا نہ دے سکی۔ اس نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ مگر صبح ہوئی تو اس کا چہرہ قدرے بحال ہو چکا تھا ایک گناہ پر پردہ ڈالنے کے لئے نئے گناہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس وقت اس کا خیال اپنے نوکر رونقی کی طرف تھا۔

(۲)

رائے صاحب کے تین نوکر تھے۔ ان میں رونقی سب سے پرانا تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا بہت سا حصہ رائے صاحب ہی کی خدمت گزاری میں صرف کیا تھا۔ اس لئے رائے صاحب اسے سخت سست نہ کہتے تھے۔ رونقی کو بات چیت کرنے کا سلیقہ نہ تھا۔ بولتا تو ایسا معلوم ہوتا گویا لڑ رہا ہے۔ کام کرنے سے بھی جہاں تک ہو سکتا کترا جاتا تھا۔ ہاں دوسرے ملازموں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے میں بہت ہوشیار تھا۔ اور اس کام کو ایسی مستعدی سے سرانجام دیتا کہ ملازم بلبلا اٹھتے تھے۔ رونقی کی اس مستعدی کے خلاف رائے صاحب کے پاس اکثر شکایتیں پہنچتی رہتی تھیں مگر رائے صاحب رونقی کے فیصلوں کو اکثر بحال ہی رکھتے تھے۔ اس سے رونقی کا چہرہ شگفتہ ہو جاتا تھا۔ اکثر کہتا "منشی کا امیر اتم نے کیا بگاڑ لیا؟"

مگر رونقی میں کوئی بات ہو نہ ہو۔ یہ بات ضرور تھی کہ وہ مالک کے لئے جان تک نثار کرنے کو تیار رہتا تھا رائے صاحب کو اس پر روپے پیسے کے معاملات میں کامل طور پر اعتماد تھا۔ ان کو اس امر کا یقین ہو گیا تھا کہ رونقی مر تا مر جائیگا۔

بھی ایک پائی کی بے ایمانی نہیں کرے گا۔ کئی مواقع ایسے آئے' جب رونقی چاہتا تو سینکڑوں روپے بالا بالا اڑا سکتا تھا تو غیب نے سنہری جال بچھائے مگر رونقی نے اپنی طبیعت کو ڈانواڈول نہیں ہونے دیا۔ وہ پرائے روپے کو مٹی کے برابر سمجھتا تھا۔ رونقی کی اس خوبی نے اس کے تمام عیوب پر پردہ ڈال دیا تھا۔

(۳)

دیوالی کے دوسرے دن صبح کے وقت رونقی اپنے کمرے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور آنکھیں بند کیے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اتنے میں پورن چند بھاگا بھاگا اندر آیا اور بولا "رونقی مجھے بچالو۔"

آواز میں حسرت تھی' الفاظ میں گھبراہٹ' رونقی کے ہاتھ سے حقہ چھوٹ گیا۔ اسے پورن چند سے انتہا درجہ کی الفت تھی۔ اس نے اسے گودیوں میں کھلایا تھا۔ وہ رات کے وقت عموماً بے سدھ پڑا سوتا رہتا تھا۔ مگر جب کبھی پورن چند بیمار ہو جاتا تو ساری ساری رات اس کے سرہانے بیٹھ کر کاٹ دیتا تھا۔ کئی آدمیوں نے اسے زیادہ تنخواہ پر اپنے ہاں لے جانا چاہا مگر پورن چند کے خیال سے اس نے سب جگہ انکار کر دیا اور اسی جگہ پڑا رہا۔ اس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ مگر وہ پورن چند سے پدرانہ شفقت رکھتا تھا۔ جس طرح جنگل کے درخت کو پانی دینے والا اس درخت کی شاخوں اور ٹہنیوں سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح رونقی پورن چند اور اس کے مستقبل سے محبت کرنے لگا تھا۔ جب اسے عمر میں بڑا ہوتے دیکھتا تو اس پر روحانی سرور سا چھا جاتا تھا۔ گویا وہ اس کا نوکر نہیں بلکہ باپ تھا۔ جب وہ کبھی تنہائی میں بیٹھتا۔ تو پورن چند ہی کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ وہ اس وقت بھی اسی کے خیال میں محو تھا۔ سوچتا یہ تھا کہ رائے صاحب جلد اس کا بیاہ کیوں نہیں کر دیتے۔ رائے صاحب کی دوراندیشیاں اس کے لئے بخل سے کم نہ تھیں۔ اچانک پورن چند کو کمرے میں آتے دیکھ کر اس کا دل دہل گیا۔ گھبرا کر بولا "کیوں سرکار! معاملہ کیا ہے؟"

(۴)

یہ کہتے کہتے اس نے کونے میں پڑی ہوئی لاٹھی اٹھالی اور اس طرح تیار ہو گیا۔ جیسے پورن چند کے تعاقب میں کوئی خوفناک ڈاکو آرہا ہو۔ پورن چند کے غمگین چہرے پر ایک لحہ کے لئے ہنسی نمودار ہوئی۔ جیسے رات کو آسمان میں جگنو چمک جاتا ہے۔ اس نے آہ سرد بھری اور کہا۔ "رونقی لاٹھی رکھ دو اس کی ضرورت نہیں۔"

رونقی کے سینہ سے بوجھ اتر گیا۔ لاٹھی رکھتے ہوئے بولا۔ "تو سرکار ایسی کیا آفت آئی ہے۔ جو موں سوکھ گئیو ہے۔"

پورن چند نے چاروں طرف اس طرح دیکھا جیسے چور چوری کرنے سے پہلے دیکھتا ہے۔ انتہائے فکر نے اس کے ہوش و حواس باختہ کر دیئے تھے۔ اس کو اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی مجھے دیکھ نہ لے۔ آہستہ سے بولا۔ "میرے سر پر سچ مچ آفت ہی آگئی ہے تم چاہو تو مجھے بچا سکتے ہو کہو۔ میرا ایک کام کرو گے؟"

رونقی نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔ "ہجور حکم دیں تو مکھی (میں) بھاڑ میں کود پڑے۔"

پورن چند کا چہرہ منور ہو گیا۔ تاریکی یاس میں شعاع امید چمک گئی تھی۔ اس نے جیب سے ایک ہار نکالا۔ اور رونقی کے ہاتھ میں دے کر کہا۔ "یہ ہار لے جاؤ اور بیچ آؤ۔ مجھے ابھی روپے کی ضرورت ہے۔"

رونقی پر گویا بجلی سی گر پڑی۔ ہار دیکھ کر وہ اس طرح سہم گیا۔ جیسے کسی سانپ نے سونگھ لیا ہو۔ اس کی زبان بند ہو گئی دماغ میں ہزاروں خیالات سر اٹھانے لگے۔ سوچتا تھا کہ پورن چند کو ایسی کیا ضرورت آپڑی ہے۔ جو ہار بیچنے کی نوبت آئی ہے۔ اور پھر وہ غریب

لاٹ گنگ رائے صاحب چاہیں تو آدھا شہر خرید سکتے ہیں۔ ان کو زیور فروخت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ رونقی سمجھ گیا کہ پورن چند یہ کام رائے صاحب سے چھپا کر کر رہا ہے۔ اس کی وجہ نہ سمجھ سکا مگر خیالات میں بہت دیر تک غوطے کھانے کے باوجود اسے سوال حل نہ کر سکا۔ اس نے عجیب انداز سے پورن چند کی طرف دیکھا۔ نگاہوں نگاہوں میں دل رکھا ہوا تھا۔ پورن چند اسے تذبذب میں پڑے ہوئے دیکھ کر ہار گھبرا گیا۔ شعلہ امید آنکھوں سے او جھل ہو گئی تھی۔

رونقی نے پوچھا۔ "سرکار معاملہ کا ہے اتی جرورت کیا بن گئی۔ جو ہار بیچو ہو؟"

پورن چند کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور ہار جیب میں ڈال کر واپس چلنے لگا۔ اس وقت اس کا چہرہ حسرت و یاس کی زندہ تصویر تھا۔ رونقی کے کلیجے پر سانپ لوٹ گیا۔ پیچھے دوڑ کر بولا "سرکار تم کو کتے روپے کی جرورت ہے؟"

سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ پورن چند نے پھر امید کے لہجہ میں جواب دیا "چار سو کی۔"

"روپیا کب چہیئے؟"

"ابھی"

رونقی کے پاس چھ سو کے قریب روپیہ موجود تھا۔ یہ روپیہ اس نے کئی سالوں میں جمع کیا تھا۔ وہ ساری تنخواہ گھر نہیں بھیج دیا کرتا تھا۔ تین چار روپے ماہوار بچا رکھتا تھا۔ یہ روپے اس نے اپنی کوٹھڑی کے ایک کونے میں دبا رکھے تھے۔ رونقی نے سوچا کہ ہار لے کر بازار میں کہاں بیچتا پھروں گا۔ اپنے پاس سے روپے دے دوں تو کیا حرج ہے۔ پورن چند کوئی اس طرح ہمیشہ تھوڑے ہی تنگدست رہے گا۔ جب اس کے ہاتھ چار پیسے آئیں گے تو اس سے اپنا روپیہ واپس لے کر ہار لوٹا دوں گا۔ اس وقت اس کا کام چل جائیگا۔ یہ سوچ کر اس نے پورن چند کے ہاتھ سے ہار لے لیا اور کہا۔ "اچھا سرکار! تمرا کام کر دیں گے۔"

پورن چند کی جان میں جان آگئی۔ اس کو ایسا معلوم ہوا۔ گویا رونقی اس کا نوکر نہیں فرشتہ رحمت ہے۔

(۵)

تھوڑی دیر کے بعد رونقی نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور زمین کھودنے لگا۔ اس وقت اس کا دل سینہ میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے چوری نہیں کی تھی۔ بدنیتی نہیں کی تھی۔ مگر پھر بھی اس کا کلیجہ کانپ رہا تھا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ پورن چند کا کام ہو جائے اور اسکو رائے صاحب کے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف نہ کرنا پڑے۔ وہ ہر چند کہ جاہل ان پڑھ تھا۔ تاہم اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ اگر پورن چند کا یہ قصور جس کے بارے میں وہ تاحال تاریکی میں تھا رائے صاحب کے سامنے ظاہر ہو گیا۔ تو پورن چند کا مستقبل خراب ہو جائے گا اس خیال سے اس کا خون خشک ہوا جاتا تھا۔ .... .اس نے جلدی جلدی زمین کھودی، روپیہ گن کر نکالا اور زمین پھر سے ہموار کر دی۔ اس وقت اس کے چہرے پر پھر وہی بے فکری و اطمینان کا رنگ ہویدا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پورن چند امید و بیم کی صورت بنا آیا اور ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "رونقی۔"

رونقی حقہ پی رہا تھا۔ اس نے زبان سے کوئی جواب نہ دیا مگر ہاتھ سے اپنے سرہانے کی طرف اشارہ کر دیا۔ پورن چند نے روپیہ دیکھا تو تن مردہ میں جان آگئی۔ رونقی کی طرف احسانمندی کے انداز سے دیکھتے ہوئے چلا گیا۔

یکایک رونقی چونک پڑا جیسے کسی کی کوئی قیمتی شے گم ہو جاتی ہے۔ وہ زمین کھودتے وقت ہار دبانا بھول گیا تھا۔ وہ تیر کی طرح تیزی سے اپنی چارپائی [illegible] ہار وہیں پڑا تھا۔ سوچنے لگا اب اسے رات کو دبانا چاہیے۔ دن میں کسی کو شبہ

بھی ہو گیا۔ تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے اس نے ہار کمر کے گرد لپیٹ لیا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ مگر طبیعت میں سارے دن انتشار رہا۔

رات ہو گئی تھی رونقی نے دروازہ بند کیا اور زمین کھودنے لگا۔ مگر ہاتھوں میں سکت نہ تھی دل اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے کوئی سپاہی گرفتار کرنے کو آ رہا ہو۔ ؟م برسوں کے مریض کے مانند شل ہو رہا تھا۔ یہ ہونے والے واقعات کا پیش خیمہ تھا۔ رونقی اس سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں نہ چلتے تھے۔ مگر وہ زمین کھود رہا تھا۔ یکایک کسی نے دروازے پر ہاتھ مارا۔ رونقی کے وسوسے پورے ہو گئے گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور سننے لگا کہ کیا یہ میرا وہم ہی تو نہیں دروازے پر پھر کسی نے ہاتھ مارا۔ رونقی کے چہرے پر پسینہ کے قطرے نمودار ہوئے۔ سردی کے دن تھے، مگر اس کا دم گھٹا جا رہا تھا تاہم اس نے حوصلے سے پوچھا۔ "اس وقت کون ہے؟"

"دروازہ کھول دے۔"

رونقی کا چہرہ فق ہو گیا یہ رائے صاحب کی آواز تھی۔ جو حالت بکری کی شیر دھاڑ سن کر ہوتی ہے۔ وہی حالت اس آواز کو سن کر رونقی کی ہوئی اسے اپنی رسوائی آنکھوں کے سامنے ناچتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے بولنا چاہا۔ مگر گلے سے آواز نہ نکل سکی۔ رائے صاحب نے کڑک کر کہا۔ "دروازہ کھول دے۔"

رونقی نے لپک کر ہار بستر کے نیچے چھپا دیا۔ ٹمٹماتا ہوا دیا بجھا دیا۔ اور دروازہ کھول دیا۔ اس وقت اس کے پاؤں من من کے بھاری ہو رہے تھے۔ رائے صاحب نے اندر آتے ہی کہا۔ "دیا کیا ہوا؟"

رونقی نے جواب دیا۔ "سرکار بجھائے دیو۔"

"ابھی تو جل رہا تھا۔ بجھائے کیسے دیو؟ فوراً روشن کرو۔"

رونقی کے اندیشے مادی صورت اختیار کر رہے تھے۔ حیل و حجت کرنے لگا وہ چاہتا تھا کہ یہ وقت ٹل جائے۔ تو بعد میں سینکڑوں بہانے تراشے جا سکتے ہیں۔ وقت اخفائے جرم کے لئے بہترین امداد ہے۔ مگر رائے صاحب نے اس کی مہلت نہ دی۔ جیب سے دیا سلائی نکال کر خود چراغ جلایا۔ اور زمین کی طرف دیکھ کر بولے۔ "یہ تو کیا کر رہا تھا؟"

رونقی نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا۔ "سرکار جو مہینہ ملتا ہے۔ اس سے بچائے کر کسی بکت کے لئے مکھی یہاں کچھ داب دیا کرتا ہوں۔

"مگر آج کیا داب نے لگا تھا۔ ابھی تو تنخواہ بھی نہیں ملی۔"

[illegible] زبان بند ہو گئی۔ رونقی رائے صاحب کا منہ دیکھنے لگا۔ رائے صاحب نے آگے بڑھ کر زمین سے مٹی ہٹائی اور روپوں کی پوٹلی [illegible] بستر ہلایا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید رونقی نے جوا کھیلا ہے کیونکہ اس سے اور کسی بے ایمانی کی انہیں مطلق توقع نہ تھی۔ مگر انہیں [illegible] کر کیسی حیرت ہوئی کہ رونقی کے بستر کے نیچے ہار پڑا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر سر سے پاؤں تک کانپ اٹھے۔ اگر کوئی دوسرا شخص یہ [illegible] رائے صاحب ممکن ہے درگذر کر جاتے۔ مگر رونقی کو اس حالت میں دیکھ کر ان کا خون جوش مارنے لگا۔ انہوں نے نہایت [illegible] سے بھی خوفناک ہوتی ہے پوچھا "یہ ہار کیسے اڑا لیا؟ یہ تو ابھی چند ہی دن ہوئے خرید اتھا۔"

رونقی میں خواہ لاکھوں عیب تھے۔ مگر وہ چور نہ تھا اس صفت کے لئے رائے صاحب اکثر اس کی تعریف کیا کرتے تھے۔ اس وقت اس کی وہ تمام نیک نامی خاک میں ملنے کو تھی۔ رونقی نے سوچا اب تمام واقعہ صاف صاف کہہ دینا چاہیے۔ پورن چند آخر رائے صاحب کا بیٹا ہے۔ اسے کھا تو نہ جائیں گے۔ یہ سوچ کر اس نے حوصلہ مندی کے انداز سے سر اٹھایا اور ہاتھ باندھ کر جواب دیا سرکار! معاملہ یوں ہے کہ..... اتنے میں اس کی نگاہ پورن چند پر پڑی۔ وہ اس طرح کانپ رہا تھا۔ جیسے کسی کو بخار چڑھ رہا ہو۔ اس نے ایک عجیب انداز سے رونقی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ رونقی کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے پورن چند نے اسے کہا ہے۔ آخر تم کمینے نکلے۔ میں نے تم پر اعتبار کیا تھا۔ مگر تم اس کے ناقابل ثابت ہوئے۔ کاش میں یہ پہلے سے سوچتا اس وقت رسوا نہ ہوتا۔

جس طرح ہوا کا رخ بدلنے سے پتنگ کا رخ بدل جاتا ہے۔ اسی طرح اس نگاہ سے رونقی کا ارادہ تبدیل ہو گیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ خود بدنام ہو گا مگر پورن چند پر حرف نہ آنے دونگا۔ یہ سوچ کر اس نے رائے صاحب سے کہا۔ "سرکار معاملہ یوں ہے کہ منشی نے چوری کری ہے۔"

رائے صاحب اس کی چارپائی پر بیٹھ گئے اس وقت اس کو ایسا افسوس ہوا گویا ہزاروں کا نقصان ہو گیا ہے مگر پورن چند دل ہی دل میں اس پر عش عش کر رہا تھا۔ دنیا میں ایسے آدمیوں کی کمی نہیں جو اپنی غرض کے لئے دن رات جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ مگر دوسروں کے لئے جھوٹ بولنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

رائے صاحب نے تھوڑی دیر سکوت کیا اور پھر کہا۔ "تم صبح ہونے سے پہلے پہلے میرے مکان سے نکل جاؤ۔ بس یہی تمہاری سزا ہے۔" رونقی اور پورن چند دونوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

(۲)

اس کے ایک سال بعد رائے صاحب سر جن مل کا انتقال ہو گیا۔ اب سارے روپے پیسے کا پورن چند ہی مالک تھا۔ اس نے کریا کرم سے فارغ ہو کر رونقی کے نام چار سو روپیہ کا منی آرڈر بھجوایا۔ اور ساتھ ہی خط لکھا کہ تم فوراً میرے پاس آ جاؤ۔ مگر ایک ہفتہ کے بعد منی آرڈر واپس آ گیا۔ ساتھ اس کے بھائی کا خط آیا۔ جس میں لکھا تھا۔ کہ اسے مرے ہوئے ایک سال گزر گیا ہے۔ وہ جب آپ کے یہاں سے آیا تو ہمیشہ اداس رہا۔ یہی اداسی اس کے چہرے سے دم واپسیں تک نہیں گئی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اسے کوئی روگ ہے۔ مگر کیا روگ ہے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں ہو سکا۔

پورن چند پر اس خط کا ایسا اثر ہوا کہ کئی دن تک روتا رہا۔ اب اس نے جوا کھیلنا ترک کر دیا ہے۔ اور رونقی کے نام پر ایک دھرم سالہ بنوا دی ہے اور اس میں اس کی قد آدم تصویر رکھی ہے۔ لوگ اس کی حماقت پر ہنستے ہیں مگر وہ سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ رونقی کی جان نثاری کے مقابلے میں اتنی وقعت بھی نہیں رکھتی۔ جتنی ذرہ آفتاب کے مقابلہ میں۔

———

چینی کی انگوٹھی

عظیم بیگ چغتائی

(۱)

انگوٹھیاں طرح طرح کی ہوتی ہیں۔ ان سب میں سونے اور چاندی کی زیادہ مشہور ہیں۔ پھر بعض انگوٹھیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کا انگلی میں ڈالنا وبال جان ہو کر "انگوٹھی کی مصیبت" ہو جاتا ہے۔ مگر یہاں میرا مطلب ایک عجیب و غریب "چینی کی انگوٹھی" سے ہے۔

ایک بڑے ضروری کام سے میں لکھنو سے بھی آگے جا رہا تھا۔ ایک دن لکھنو ٹھہرنا تھا۔ گویا یہ کہیے کہ فی الحال لکھنو جا رہا تھا۔ ٹونڈلہ کے اسٹیشن پر اپنا اسباب کانپور والی گاڑی میں رکھ کر اسٹیشن پر ٹہلنے لگا۔ کیونکہ ابھی گاڑی میں کافی وقت تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے ریفرشمنٹ روم کو سونگھنے لگا' جالی میں سے اندر جھانکا۔ کچھ شبہ سا ہوا۔ غور سے جو جھانک کر دیکھا تو بھائی شنذری! واللہ کس شان سے پتلون کی جیب میں ایک ہاتھ ڈالے کھڑے تھے۔ سامنے میز پر "لبالب" نہیں بلکہ "لدالد" بھری ہوئی ایک کشتی رکھی تھی۔ جس میں کیک' پیسٹریاں' چاکلیٹ' توس' مکھن' انڈے وغیرہ اور نہ معلوم کیا کیا بلائیں درج تھیں۔ علاوہ چائے کے۔ بس کھانے کو بیٹھنا ہی چاہتے تھے کہ بیٹھتے بیٹھتے کچھ پیروی سنت رسولؐ کا پاس یا پھر یہ کہ ابھی ابھی اپنی ناک مروڑی تھی' کچھ بھی ہو لپک کر ہاتھ دھونے کے لئے برابر والے کمرے میں نل پر پہنچے۔ اور ادھر لپک کر میں ان کی جگہ...... بھائی شنذری کے آنے کی آہٹ سن کر میں نے گردن نیچی کر لی۔ میں نے کیک کھانا شروع کیا تھا۔ اور لحہ بھر میں ہی آدھے پر پہنچ گیا تھا۔ ویسے گو "شارٹ ہینڈ" تو میں نے نہیں سیکھا لیکن کھانے میں بحمد اللہ کافی سے زیادہ "زود نویس" ہوں۔ بھائی شنذری ادھر سے بھوک پہ دھار رکھے ہوئے آئے اور مجھے گردن جھکائے "محو خدمت" دیکھ کر بولے۔ "ارے تم کہاں!"

میں منہ چلا رہا تھا تیزی سے اور چونکہ بہ نسبت پلیٹ میں کیک رکھا رہنے کے ضروری خیال کرتا تھا کہ میرے پیٹ میں رہے۔ لہذا اپنے رخساروں کے لحاظ سے کچھ کچھ حضرت ڈارون کے مسئلہ ارتقا کی جیتی جاگتی تصویر ورنہ تفسیر بنا بیٹھا تھا۔ لہذا بولتا کیا خاک۔

"کہاں جا رہے ہو؟" کہہ کر بھائی شنذری بھی کھانے پر پل پڑے۔ کیونکہ یہ موقع علیک سلیک کا بالکل نہ تھا۔ اور پھر علاوہ اس

کے بھائی شنذری ویسے بھی ایک قلفی کی برف والے کا مال لوٹنے میں نمایاں حصہ کالج میں لے چکے تھے۔ جس نے شکایت کرنے کے لئے ادھر ادھر بھاگنے یا غل مچانے کی بجائے کہ ہائے مجھے لڑکوں نے لوٹ لیا' یہ کیا تھا کہ خود بھی اپنی ہی قلفیاں لوٹنے لگ۔ وہ جیتا اور لڑکے ہارے۔ کیوں کہ اس نے اپنے ماہر ہاتھوں سے قلفیاں کھول کھول کر چابک دستی سے ہتھیلیوں میں پلٹ پلٹ کر تیزی سے برف کھانا شروع کر دی تھی کہ جو کچھ بھی اپنے پیٹ میں پہنچ جائے بہتر ہے۔

جب کیک اور عمدہ قسم کی مٹھائیاں ختم ہو چکیں اور گویا گھوڑ دوڑ ختم ہوئی اور محض روکھی سوکھی چیزیں رہ گئیں تب کہیں جاکر بات خیال ممکن ہوا۔ اب مجھے بھی اطمینان تھا اور انھیں بھی۔

"کہاں جا رہے ہو یار؟" بھائی شنذری نے پوچھا۔

"اور تم کہاں جا رہے ہو؟" میں نے جواب دیا۔

"پہلے تم بتاؤ!" بھائی شنذری نے چائے کی پیالی سے کھیلتے ہوئے کہا۔

میں نے بھائی شنذری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوکھے منہ سے کہا۔

"ڈراٹونڈلے تک آیا تھا۔"

"جھوٹے ہو" بھائی شنذری نے چائے کی پیالی کو منہ پر سے ہٹا کر کہا "میں خود ٹونڈلہ تک آیا تھا۔" پھر اپنا منہ چائے کی پیالی سے ڈھک لیا ہم دونوں جھوٹ بولے۔ کیوں؟ شاید۔ اس لئے کہ دوسرا کہے کہ میں کرایہ دوں گا۔ میرے ساتھ چلو۔ پھر لطف یہ کہ دونوں کو معلوم تھا کہ جھوٹ بولا جاتا ہے۔

"کہاں بیٹھے ہو؟" میں نے برجستگی سے پوچھا۔

"سیکنڈ کلاس میں۔" بھائی شنذری کے منہ سے نکل گیا۔ اور پھر اپنی غلطی محسوس کر کے اسی چائے کی پیالی سے جس سے کھیل رہے تھے جھنک کر کہا "بے ایمان کہیں کا۔"

یہ کہہ کر اپنی حماقت پر ہنسنے ہی والے تھے کہ زور سے سیٹی بجی۔ گاڑی چھوٹنے کی اس نامعقول سیٹی کو سنکر ہم دونوں گویا ایک دم سے بھاگ اٹھے اور بھاگے ہم دونوں۔ مگر بھائی شنذری مع چائے کی پیالی کے جس کا کنڈہ کھیلتے کھیلتے اب انھیں پتہ چلا کہ انگلی میں پھنسا ہوا ہے۔ ادھر ہوٹل والے نے دیکھا کہ مسافر پیالی پار کئے جاتا ہے تو الگ لپکا کہ "لینا۔"

ایک وقت میں بھائی شنذری کے ذمے اب دو کام تھے۔ ایک تو اپنی انگلی دیکھ کر چائے کی پیالی کا پھنسا ہوا کنڈا نکالنا اور دوسرے بے تحاشا سر پر پیر رکھ کر بھاگنا کہ گاڑی نہ چھوٹ جائے۔ نتیجہ اس کا ناظرین خود معلوم کر سکتے ہیں سوائے اس کے اور کیا ممکن تھا کہ کسی عجیب و غریب طریقے سے انگلی میں چائے کی پیالی کا صرف کنڈہ ہی کنڈہ رہ جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ قبل اس کے کہ میں عرض کروں کہ کس طرح ایسا ہوا۔ ضروری ہے کہ یہ بھی عرض کر دوں کہ نہ تو کوئی ریلوے ریگولیشن ایسا ہے کہ دو بدحواس بیک وقت پلیٹ فارم پر جمع نہ ہونے پائیں اور نہ پھر یہ کسی قاعدے یا بائی لاز کی رو سے ممنوع ہے کہ ریلوے پلیٹ فارم پر کوئی بدحواس خوانچہ پھاندنے کی کامیاب یا ناکام کوشش نہ کرے۔ پھر ویسے بھی بدحواسی جرم تو نہیں۔ چنانچہ ادھر سے میرا شیر بیشہ حماقت شنذری چلا ہے اور ادھر سے ایک اور صاحب زور شور سے ایک خوانچہ پھاند کر ریل چھوٹنے کی گھبراہٹ میں چلے۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے ان دونوں کا

ریلوے کی اصطلاح میں "میل" ہوا جیسے دو گاڑیوں کا ہوتا ہے۔ اور وہ بھی اس طرح کہ تحقیق کے ساتھ نہیں عرض کر سکتا کہ انہوں نے ناک کرا اپنی ناک بھائی شنذری کے ہاتھ میں پھنسی ہوئی پیالی پر ماری تھی یا پھر بھائی شنذری ہی نے ایک انداز قادرانہ کے ساتھ خود ان کی ناک پر پیالی کا وار کیا تھا۔ کچھ بھی ہو دونوں گر کر اٹھے۔ "اندھا ہے بے۔" بھائی شنذری کے منہ سے نکلا۔ چشم زدن میں دونوں اٹھ کر سامنے والے ہی انٹر کلاس میں چلتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میں ان دونوں حضرات سے دو سیکنڈ پہلے پہنچا تھا اور مجھے دیکھ کر ہی بھائی شنذری اپنا سیکنڈ کلاس چھوڑ کر جلدی میں اوپر آگئے تھے۔ ہوٹل کے خانساماں کو مبلغ ایک روپیہ کلدار چائے کی پیالی کی قیمت یا جرمانہ پیش کیا۔ اب بھائی شنذری نے اپنے کلمہ کی انگلی کو دیکھا۔ جس میں چائے کی پیالی کا کنڈہ ہی کنڈہ پھنسا رہ گیا تھا۔ کھڑکی میں ہاتھ مار کر وہ توڑنے لگے کہ میں نے یونہی بغیر کسی وجہ کے ہاتھ روک کر کہا۔ "یار اسے مت توڑو ایک روپے کا ہے مجھے نکال دو۔"

(۲)

قبل اس کے کہ میں اپنا قصہ بیان کروں، ضروری ہے کہ کچھ "چانٹے" یا "تھپڑ" کی اقسام و ماہیت پر بحث کروں۔ پنجاب سے لیکر دکن تک اگر ہاتھ کو کسی کے گال پر مارا جائے یا گال کسی کے ہاتھ پر مارا جائے تو کہا جاتا ہے۔ کہ چانٹا مارا یا چانٹا پڑا۔ لفظ "چانٹا" بہت عام ہے۔ تھپڑ بھی عام ہے لیکن ان دو الفاظ کے ہم معنی جتنے لفظ یو۔ پی اور نیز دوسرے مقامات پر رائج ہیں ان کی "تلفظی" "سائیکالوجی" پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں چانٹے کے لاتعداد اقسام ہو سکتے ہیں۔ وہاں عوام نے مناسبت سے علیحدہ علیحدہ نام بھی رکھ لئے ہیں۔ چانٹا وہ ہے جو غصہ میں کسی کے گال پر "عرض" کیا جائے۔ اس کے تلفظ ہی میں انگریزی اصطلاح آٹو مونوپیا مضمر ہے۔ یعنی لازمی ہے کہ چانٹا آواز کے ساتھ سرزد ہو۔ ایک پٹاخے کی آواز کا مفہوم لئے ہوئے ہے تھپڑ اس کا ہم معنی اور ہم مطلب لفظ کسی طرح نہیں۔ کیونکہ تھپڑ میں لازمی طور پر چٹاخے کی آواز مفقود ہے، وہ آواز جس کا تعلق محض انگلیوں ہی سے ممکن ہے۔ تھپڑ میں بدقسمت گال پر علاوہ ہاتھ کی انگلیوں کے کچھ حصہ ہتھیلی کا بھی پڑتا ہے اور جو آواز کی لطافت کھو دیتا ہے۔ مگر ضرب البتہ بھاری پڑتی ہے۔ انگلیوں کے نشان گال پر ایک تھپڑ میں پڑنا لازمی نہیں۔ لہٰذا آپ نے دیکھا کہ تھپڑ اور چانٹے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ چانٹے کا ہم معنی لفظ طمانچہ ہے۔ مگر اس میں بھی وہ تیزی نہیں جو چانٹے میں ہے۔ پھر طمانچہ برابر والوں میں استعمال نہیں ہوتا۔ عموماً بڑوں کی طرف سے چھوٹوں کے لئے مخصوص ہے۔ تھپڑ کو بعض لوگوں نے لپڑ بھی کہا ہے۔ یہ لفظ غیر فصیح ہے۔ مگر کیا کیا جائے جہاں مجبوری یہ ہو کہ ایک طرف گال کسی موٹے آدمی کا ہو تو ہاتھ بھی مولانا شوکت علی کا۔ چربی کے وجود نے اس میں سستی پیدا کر دی ہے۔ غرض اس قسم کے اور بہت سے الفاظ ہیں۔ چنانچہ انہی الفاظ میں سے ایک نہایت عامیانہ لفظ "زپاٹہ" ہے۔ یو۔ پی سے اتر کر شاید بھوپال کی طرف بولا جاتا ہے۔ اس بھوپالی زپاٹے میں برق رفتاری اور انتہائی تیزی و تندی اس قدر زیادہ موجود ہے کہ بیان سے باہر۔ دراصل یہ چانٹا ہے۔ ایک بے حد تیز قسم کا۔ بوجہ اپنی رفتار کی تیزی اور زناٹے کے 'چانٹے اور طمانچے کی مخصوص چٹخدار آواز پر اس کی تیزی کا زناٹا غالب آجاتا ہے۔ گو ویسے چانٹا ہونے کی وجہ سے اس میں چانٹے کی مخصوص آواز ضرور موجود ہے اور وہ بھی بدرجہ اتم۔ لہٰذا "زپاٹا" وہ چانٹا ہے۔ جس میں ایک چانٹے کی تمام خطرناک طاقتیں موجود ہیں اور برق رفتاری اس کے علاوہ۔ اس مختصر تمہید کے بعد میں اپنا قصہ شروع کرتا ہوں۔

عموماً مسافروں کا قاعدہ ہے کہ سفر کی گڑبڑ سڑبڑ میں ضروری چیزیں ساتھ لینا بھول جاتے ہیں۔ جیسے ناشتہ دان 'لوٹا' عقل' اخلاق تہذیب وغیرہ وغیرہ۔ بعض لوگ قصداً بھی اسباب کے بکھیڑوں کی وجہ سے سامان ضروریات لے کر ہی نہیں چلتے۔ چنانچہ یہی

بھائی شنذری کا اصول ہے۔ کہ عموماً عقل 'اخلاق' اور تہذیب وغیرہ قسم کی تمام چیزیں قصداً سفر کی طوالت کی وجہ سے گھر پر ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ اس سفر میں بھی یہی معاملہ تھا۔

وہ مضبوط الاعضاء حضرت جن سے بھائی شنذری کی ٹکر ہوئی تھی' ایک پوری کی پوری سیٹ پر دراز تھے۔ اور منہ پر اخبار تھا۔ چھوٹا ڈبہ تھا۔ جگہ بالکل نہ تھی۔ اور دوسرے مسافروں کے آرام سے یہ بے نیازی اور غفلت بھائی شنذری کو بے حد ناگوار گزری۔ چنانچہ بھائی شنذری نے کہا۔

"اخبار پھر پڑھیے گا ذرا اٹھ کر بیٹھیے۔"

انھوں نے اخبار کو منہ سے ہٹایا اور جواب میں اپنی ٹانگیں سکیڑ لیں تاکہ ہم لوگ وہاں بیٹھ جائیں۔ اور پھر اخبار منہ پر' بھائی شنذری کو بھلا یہ رعونت کب گوارا۔ ان کے ہاتھ سے جھٹ اخبار چھین کر ڈانٹا۔

"آپ آدمی ہیں...... ."

وہ تڑپ کر اٹھے۔ اخبار کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "یہ کیا بدتمیزی!" اور بھائی شنذری نے اخبار اونچا کر کے کہا۔ "یا وحشت!"

"ادھر لاؤ اخبار۔" بڑھ کر انھوں نے ڈپٹ کر کہا۔ "بدتمیز کہیں کے۔" غضب ناک ہو کر انھوں نے پھر کہا۔ اس کے جواب میں بھائی شنذری نے ان کا چھ آنے کا ٹائمز آف انڈیا ریل کے باہر پھینک دیا۔

ادھر بھائی شنذری نے اخبار پھینکا اور ادھر انھوں نے جل بھن کر کباب ہو کر ایک اسی نمبر کا زناٹا اس زور سے بھائی شنذری کے گال پر عرض کیا ہے کہ باوجود ریل کی گھڑ گھڑاہٹ اور زنزناہٹ کے زناٹے کے زناٹے اور تڑاخے سے ڈبہ گونج گیا۔ بھائی شنذری کا منہ چرخے کی طرح گھوم گیا اور ہانکا فیلٹ ہیٹ دہ گر۔ بھائی شنذری نے سنبھلتے ہی ایک دو تین ہاتھ تابڑ توڑ ان کے دیئے۔ انھوں نے حملہ کو روک کر بقول کسے "اجھادے" سے ہاتھ نکال کر ایک زناٹا بھائی شنذری کے اور دیا۔ کوئی پچھتر نمبر کا۔ مگر اب میں بھی اپنے عزیز دوست کی امداد پر آچکا تھا۔ مگر تین گھونسوں میں سے ایک تو اوپر والی بنچ پر پڑا تھا۔ دو غنیم کے لگے تھے۔ اس دوران میں علاوہ ان دو زناٹوں کے طرفین سے دس بیس ہاتھ چل چکے تھے۔ یہ سب کچھ چشم زدن میں ہو گیا۔ اور ہم دونوں قطعی دشمن پر بھاری پڑتے کہ "ہیں ہیں" کر کے دو تین مسافروں نے قابو میں کیا۔ اس کے بعد سخت کلامی کے مدارج طے ہونے لگے۔ اور کس مشکل سے لوگوں نے شیروں کو قابو میں کیا ہے کہ بیان سے باہر۔ ہم دونوں دشمن کا کچھ نہ بگاڑ سکے تھے۔ کیونکہ دراصل میں ایسے موقع پر تھا کہ جدل میں اچھی طرح شرکت ہی نہ کر سکا تھا۔ اب اس جنگ کے نتیجہ پر غور کیجئے۔ چائے کی پیالی کے کنڈے کی دھار دار گر سے دشمن کے بائیں ہاتھ کی پشت پر زخم کاری لگا تھا۔ علاوہ اس زخم کے دشمن پر کوئی وار ہی سالم نہ اترا۔ یا تو کلائی پر رک گئے یا اوچھے پڑے۔ مگر ادھر بھائی شنذری کے گال پر زناٹوں کے نشان کس صفائی سے موجود تھے کہ کان تک گواہی دے رہا تھا۔ اصطلاحاً یہ مار پیٹ تھی۔ مگر دراصل "پیٹ" کیونکہ غور جو کیا تو اس نتیجہ پر پہنچنا پڑا کہ بھائی شنذری پٹے ہیں۔ کیا میرے شیر نے بھائی شنذری کے چانٹے دیئے ہیں کہ ہنسی کو روکنا مشکل تھا۔ ہم دونوں اب دوسری بنچ پر بیٹھ گئے اور باتیں کرنا شروع کیں۔ اس شان سے بھائی شنذری نے سگار نکال کر سلگایا ہے کہ جیسے ان کو پٹنے سے نہ کبھی علاقہ رہا اور نہ ہے۔ "اس کو آگے چل کر ٹھونکیں گے۔" بھائی شنذری نے مجھ سے رازدارانہ لہجے میں چپکے سے کہا۔

"قطعی" میں نے کہا اور غور کرنے لگا کہ اس کو آگے چل کر ٹھونکیں گے۔ اس جملہ کا مفہوم کہیں یہ تو نہیں ہے کہ وہ آگے چل کر بھی پٹیں گے کیونکہ یہ نالائق شخص نہ صرف گز تھا بلکہ قطعی طور پر ہم دونوں سے اچھی طرح نپٹ لینے کی طاقت رکھتا تھا۔ مگر چاہتا میں بھی یہی تھا کہ اس موذی کو کسی طرح آگے چل کر موقع دیکھ کر ماریں۔

اب ہم دونوں میں باتیں شروع ہوئیں۔ بھائی شنذری کو میں ان کے سیکنڈ کلاس میں بھلا کیوں جانے دیتا۔ اور پھر شاید خود بھی نہ گئے غرض اب باتیں شروع ہوئیں اور سچ سچ حال ایک دوسرے کو بتانا پڑا۔ بھائی شنذری لکھنو جا رہے تھے۔ اور وہاں سے ایک دوسری جگہ اپنے ایک "بڑے گہرے دوست سے ملنے۔

"یہ کون دوست ہیں تمہارے۔"

"ایک ہیں۔" بھائی شنذری نے جواب دیا۔

"کون ہیں آخر؟ کیا نام ہے ان کا کچھ تو بتاؤ۔"

"دوست تو کیا ہیں" بھائی شنذری بولے۔ "ایک الو تو پھنسا ہے عجیب احمق ہے۔"

"کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"محض ذرا سی ملاقات پر یا تعارف پر خط پہ خط 'ملاقات کا شوق' تقاضے پہ تقاضا 'ناک میں دم کر دیا ہے یار میرے نے' مجبور اُوعدہ کرنا پڑا کہ بھئی لکھنو آئے تو تم سے بھی ملیں گے۔ چلو نا یار تم بھی چلو" مجھ سے بھائی شنذری نے زور دے کر کہا۔ "چلو نا تم بھی۔"

(وہ حضرت جن کی ہم سے جنگ ہوئی تھی غور سے ہماری باتیں سن رہے تھے۔ اور گھورتے ہوئے پاخانہ گئے)۔

میں نے کہا "یار پہلے یہ بتاؤ کہ ہے وہ کون 'کیا نام ہے' کیا کرتے ہیں' تم سے کب ملاقات ہوئی۔"

بھائی شنذری نے سارا حال بتایا' نام بتایا' زمیندار ہیں۔ شکار کے بے حد شوقین ہیں' ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ غائبانہ تعارف ہے۔ اور وہ بھی ایک بندوق کی خرید و فروخت کے سلسلہ میں۔ اور پھر ایک دوسرے کے بڑے گہرے دوست ہیں۔"

"پھر تم نے اس کو بیوقوف اور احمق کیوں کہا؟" میں نے بھائی شنذری سے پوچھا۔ اور ادھر وہ حضرت پاخانہ سے واپس آکر بھائی شنذری کے مضروب گال پر اپنی انگلیوں کے نشان غور سے دیکھنے لگے۔ مجھ سے آنکھیں چار ہوئیں اور اپنی کارگزاری کو دیکھ کر مسکرائے۔ واقعی بھائی شنذری کے سخت تھپڑ انھوں نے رسید کئے تھے۔ شنذری بھائی نے ان کی مسکراہٹ اور وجہ مسکراہٹ کو معلوم کر لیا اور جل بھن کر کباب ہی تو ہو گئے۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ ان کی طرف دیکھ کر کہا جیسے کہ کھا جائیں گے ان کو۔ پھر ہم دونوں باتیں کرنے لگے اور بھائی شنذری نے اس سلسلہ میں کہا۔

"مجھے دراصل ایسے لوگوں سے سخت نفرت ہے کہ خواہ مخواہ دوستی کار شتہ ٹھاٹے جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یار پہلی مرتبہ ملے گا تو خاطر بے حد کرے گا۔"

"جب ہی تو کہہ رہا ہوں کہ چلو تم بھی۔ ایسا الو کم پھنستا ہے۔ خوب بلیلا کر کھائیں گے۔ کہ یاد ہی کرے کہ آیا تھا کوئی۔"

"کر لیا قائل کیا" میں نے کہا۔

بھائی شنذری [illegible] اور ہم دونوں نے طے کر لیا کہ ساتھ چلیں گے۔ اور اس احمق کے یہاں نہایت بے تکلفی سے ڈٹ

اٹ کر کھائیں گے۔

(۳)

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض کاریگر ایک چھوٹی سی ہتھوڑی اور کیل لئے اسٹیشنوں پر گھومتے پھرتے ہیں۔ اور دو آنے کے پیسے لیکر آپ کا نام وہیں کا وہیں برتن پر کھود دیتے ہیں۔ ایسا ہی ایک کاریگر ہمارے ڈبے میں آیا۔ ریل رکنے پر ایک اسٹیشن پر لگا ایک صاحب کے لوٹے پر نام کھودنے یہاں بھیڑ لگ گئی۔ کس صفائی سے خط نستعلیق میں نام کھودتا تھا۔ بیحد پسند آیا۔ خصوصاً بھائی شذری کو۔ ان کے پاس لوٹا نہ تھا۔ میرا لوٹا لے کر کہنے لگے اس پر نام کھدوائیں گے۔ میں اس بدذاقی کا سخت مخالف مگر بھائی شذری نہ مانے اور نام کھدوانے گئے۔ نام کھدوا کر لوٹا تو ایک کنارے رکھا اور لگے ہم دونوں اسٹیشن پر ٹہلنے۔

قبل اس کے کہ میں بیان کروں کہ پھر کیا ہوا۔ ضروری خیال کرتا ہوں کہ اپنے اور بھائی شذری کے بارے میں ایک بات عرض کردوں۔ ہم دونوں علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ' بھائی شذری تعلیم ختم کر چکے تھے۔ اور مجھے ابھی ایک سال اور پڑھنا تھا۔ ہم دونوں کے خیالات صنف نازک کے بارے میں بے حد بلند واقع ہوئے تھے' اور ہیں۔ چنانچہ کس بے کلی سے ہم دونوں نے دیکھا ہے کہ تیسرے درجہ کے زنانہ ڈبے سے ایک نوعمر خاتون نے اپنی گردن ایک طرف کو نکال کر جھکا رکھی ہے۔ اور ایک ہاتھ میں لوٹا لئے پانی والے کو پکار رہی ہے۔ ہم کو تسلیم ہے کہ ہم اس کو دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے۔ نہ کسی اور وجہ سے بلکہ شاید اس کے معصوم اور بھولے چہرے پر مظلومیت اور افسردگی دیکھ کر' وہ پانی مانگ رہی تھی اور کوئی نہ سنتا تھا۔ ہم دونوں چونکہ بالکل قریب سے گذرے اور بھائی شذری تو بالکل ہی قریب سے لہذا اس نے اپنا ہاتھ اور سر سب کچھ ڈبے کے اندر کر لیا۔ واپس تیزی سے لوٹنے میں ہم دونوں نے ایک دبی ہوئی آواز میں سنا "چینی کی انگوٹھی" مڑ کر دیکھا تو وہی لڑکی تھی۔ ایک اور چھوٹی سی لڑکی سے اس نے یہ الفاظ کہے تھے جو بھائی شذری کی طرف انگلی اٹھائے ہوئے تھی۔ شاید اس کے جواب میں یہ کہا ہوگا۔ "یہ چینی کی انگوٹھی" یا چائے کی پیالی کا کنڈہ بدستور بھائی شذری کے داہنے ہاتھ کی کلمہ کی انگلی میں پڑا ہوا تھا۔ جس سے وہ برابر باتیں کرتے میں کھیلتے جاتے تھے۔

گرمی کی تپش سے ہر جاندار کو پانی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور خصوصاً سفر میں۔ متواتر تین اسٹیشنوں پر ہم دونوں نے اس غریب لڑکی کو پانی کے لئے لوٹے کو جھنڈی کی طرح ہلاتے دیکھا۔ اور اگر اس ہندوستان میں بدچلنی کا دائرہ اتنا وسیع نہ ہو تا کہ کسی غیر جنس کی طرف دیکھنا بھی مذہباً کفر ہو تو ہم کبھی کا اس کو پانی دے چکے ہوتے دو ایک اسٹیشن بعد ہمیں اس کا خیال بھی نہ رہا کہ ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔

بھائی شذری سیکنڈ کلاس کے مسافر کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور لیمن سوڈا برف پینا چاہتے تھے' مگر لطف تو دیکھئے میرے خرچ پر' میں نے تجویز کی کہ برف خرید کر شربت بنا لیا جائے' چنانچہ گاڑی میں سے برف لیا۔ اور پانی لوٹے میں لے کر واپس آ ہی رہا تھا کہ پھر اسی اداس اور غمگین مگر خوبصورت چہرے والی لڑکی کو اسی طرح لوٹا لٹکائے پانی کے لئے پکارتے سنا۔ میں بالکل ہی قریب آ گیا تھا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ ریل نے سیٹی دی اور حرکت کی ہی تھی کہ میں نے لڑکی کے ہاتھ سے اس کا لوٹا لیکر اس پر جستگی سے اپنا لوٹا دے دیا کہ اسے لیتے ہی بن پڑا۔ قبل اس کے کہ وہ ہوشیار ہو اور معلوم کر سکے کہ کیا ہو گیا۔ دوڑ کر خالی لوٹا لئے میں اپنے ڈبے میں چڑھ گیا۔ بھائی شذری نے مجھے یہ کرتے دیکھ ہی لیا تھا۔ میری اخلاقی جرات کی تعریف ہی نہیں کی بلکہ میرے پیچھے پڑ گئے اور مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں مجھے بھی تو یہ کسی موذی سے نہیں پٹوائیں گے۔

میں نے غلطی کی جو اگلے اسٹیشن پر ہی اپنا لوٹا واپس نہ لے لیا۔ کیونکہ اس کے بعد کے اسٹیشن پر گاڑی بہت دیر نہ رکی اور تیسرے اسٹیشن پر زنانے ڈبے کی طرف جانے کی ہمت نہ پڑی۔ اس کے بعد جو دیکھا تو زنانہ درجے میں لڑکی نظر نہ آئی۔ نہ معلوم کون تھی۔ کہاں کب اور کدھر اتر گئی۔ مگر میرا لوٹا اس کے پاس تھا اور اس کا لوٹا میرے پاس۔

(۴)

کانپور کے اسٹیشن پر ہم لوگوں کو اس کی فکر ہوئی کہ اپنے دشمن کو کس طرح ماریں۔ مگر کوئی صورت ممکن نہ ہو سکی۔ وہ بھی لکھنو جا رہا تھا۔ لہٰذا طے کر لیا کہ لکھنو پر ماریں گے۔

لکھنو بھی دور نہ تھا۔ زیادہ حصہ سفر بھائی شنذری نے میرے ہی ساتھ طے کیا تھا۔ ویسے میں بھی کبھی کبھی ان کے ساتھ سیکنڈ کلاس میں جا بیٹھتا تھا۔ لکھنو کا اسٹیشن جب قریب آیا تو بھائی شنذری نے مشورہ کیا کہ اسے مارو۔ چنانچہ موقع مل گیا۔ میں اسباب وغیرہ لیکر لکھنو کے اسٹیشن پر تیزی سے آگے نکل گیا۔ اور بھائی شنذری ادھر دشمن کی طرف اسی لوٹے سے مسلح ہو کر پہنچے۔ موقع بھی خوب ملا۔ وہ لگا اپنے ٹرنک کا کنڈہ پکڑ کر قلی کے سر پر ٹرنک لدوانے اور پیچھے سے اس کے کولھے پر بھائی شنذری نے لوٹے کی ٹونٹی پکڑ کر دیا کس کر لوٹا' بالکل "گرز لندھور" کی طرح اور پھر جو سرپٹ بھاگے ہیں تو تیزی تو دیکھئے کہ میرے پاس سے نکل گئے اور مجھے بدحواسی میں دیکھا تک نہیں۔ جب میں نے آواز دی تو گھبرا کر کہا کہ "چلو جلدی بھاگو۔" کیونکہ خوب جانتے تھے کہ اگر کہیں پکڑ لیا اس نے بے طرح کندی کرے گا۔ مگر پھر اس موذی کا پتہ نہ چلا۔

لکھنو میں ہم دونوں دو دن ساتھ رہے۔ پھر بھائی شنذری اور ہم دونوں بارہ بنکی چلے۔ ان دوست سے ملنے۔ گاڑی جو بارہ بنکی کے پلیٹ فارم پر داخل ہوئی ہے تو ہم دونوں سر نکالے ہی ہوئے تھے۔ وہ موذی کھڑا نظر پڑا۔ اور ہم دونوں سے آنکھیں چار ہوئیں۔ بھائی شنذری نے غڑاپ سے گردن نیچی کر لی اور میں نے بھی۔ "اب یہ تمہیں قطعی ٹھونکے گا۔" میں نے بھائی شنذری سے کہا۔

"اس کی ایسی تیسی۔" بھائی شنذری نے کہا۔ اور کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

ادھر میں نے کہا "قلی" اور ادھر وہ موذی آ پہنچا۔ بھائی شنذری نے لوٹے کا گرز بنا کر اپنے کو مسلح دکھایا......

"سر پھوڑ دوں گا" بھائی شنذری نے لوٹا چمکا کر کہا۔

مگر وہ نا معلوم کس گڑبڑ میں تھا۔ گھونسہ دکھا کر تیزی سے چلتا بنا۔ اسباب اتروا کر ہم دونوں ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ کیونکہ بھائی شنذری نے اپنی آمد کا تار دے دیا تھا۔ اور امید پختہ تھی کہ ان کے دوست لینے آئیں گے۔ انتظار کر رہے تھے کہ پھر آیا وہ موذی۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟" اس نے اب گویا بھائی شنذری کو ٹھونکنے کی تمہید اٹھائی۔

"جہنم سے" بھائی شنذری نے لوٹا تان کر کہا۔ "سر پھوڑ دوں گا۔"

"جانتے ہو کہاں ہو۔" اس نے کہا "ریل کے دھوکے میں نہ رہنا۔ یہ بارہ بنکی ہے۔ ساری صاحب بہادری نکال دوں گا۔"

یہ کہہ کر شکر ہے کہ وہ چلتا بنا۔ اور اس سے کہیں زیادہ خطرناک الفاظ ہم دونوں نے اس کے لئے استعمال کئے تھے۔

"تار ملا نہ ہوگا" بھائی شنذری نے کہا۔ قلی سے اسباب اٹھوا کر باہر نکلے تانگہ کیا۔ اپنے دوست کا نام اور مفصل پتہ بتایا کہ لے چلو وہاں۔ تانگہ ایک گلی کے کنارے پر آ کر رکا اور ہم دونوں اس خیال سے کہ مکان کا پتہ لگا لیں تو تانگہ ادھر لائیں۔ اتر کر اندازے سے

ایک مکان پر پہنچے وہاں کھٹکھٹایا ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ مکان چھوڑ کر تیسرے پر دریافت کیجئے وہاں پہنچے ایک بڑا سا عالی شان پھاٹک تھا اندر پہنچے ملازم سے پوچھا معلوم ہوا کہ اندر ہیں۔ ملازم نے بلایا اور کہا بیٹھئے

آپ یقین جانیے کہ اندر وہی موذی چلا آتا ہے۔ اور نکلتے ہی وہ سامنے والے کمرے میں چلا گیا۔

وہ روشنی میں تھا اور ہم اندھیرے میں تھے۔

"یہ تو وہی ہے" گھبرا کر بھائی شنذری نے کہا اور نوکر سے اتنا پوچھا "کیا یہی ہیں"۔ اور جیسے ہی اس نے کہا "ہاں" بھائی شنذری نے کہا "یار بھاگو۔"

ہم دونوں سر پر پیر دھر کے جو بھاگے تو تانگہ پر آ کر دم لیا اور سیدھے وہاں سے اسٹیشن۔ ساڑھے نو بجے کی گاڑی سے واپس لکھنو اور قبل اس کے گھر واپس پہنچیں بھائی شنذری نے لکھنو ہی سے معذرت کا خط لکھ دیا کہ افسوس میں حسب وعدہ حاضر نہیں ہو سکا۔

الحمد اللہ: کہ اب تک ان نادیدہ دوست سے بھائی شنذری کے تعلقات دوستی اسی طرح قائم ہیں۔ اور واقعی بڑی گہری دوستی دونوں میں چلی آ رہی ہے۔

پریم کی چوڑیاں

اعظم کریوی

(۱)

نور پور گنگا جی کے کنارے الہ آباد کے ضلع میں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ پنڈت گردھاری لال اس گاؤں کے زمیندار تھے۔ رما شنکر ان کا اکلوتا لڑکا تھا۔ کھیتی باڑی میں بڑی برکت تھی۔ گھر میں غلہ کا انبار لگا رہتا تھا۔ کسی بات کی کمی نہ تھی۔ پنڈت رام لال کا لڑکا رام جیاون ذات کا برہمن تھا۔ کسی زمانہ میں اس کے خاندان میں بھی لکشمی دیوی کا راج تھا۔ لیکن غدر میں اس کا خاندان تباہ ہو گیا۔ جب اس نے ہوش سنبھالا تو وہ یتیم تھا۔ پنڈت گردھاری لال نے اس کی پرورش کی اور بڑے ہوتے ہی اپنے یہاں پیادوں میں نوکر رکھ لیا۔ رام جیاون بڑا کسرتی پہلوان تھا۔ گو اس کی عمر ۴۰ سال سے کچھ زیادہ ہو گئی تھی پھر بھی نور پور کا تو کیا ذکر آس پاس کے گاؤں میں بھی اس کی جوڑ کا کوئی دوسرا پہلوان نہ تھا۔ پنڈت گردھاری لال کے یہاں چار روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی' ہر فصل پر دس بارہ من اناج مل جاتا تھا۔ گھر میں ایک اچھی ذات کی گائے تھی اس کے لئے بھوسہ آسامیوں سے مل جاتا تھا۔ جب پنڈت رام جیاون اکھاڑے میں ڈنڈ پیل کر صبح کو اپنی گائے کا تازہ دودھ پی کر لمبی پگڑی باندھے ہوئے اور الہ آبادی موٹی لاٹھی کندھے پر رکھ کر گاؤں میں آسامیوں سے لگان وصول کرنے چلتے تو رعب چھا جاتا۔ جو کام کسی اور پیادہ سے نہ ہوتا تو اسے رام جیاون مہراج کے سپرد کیا جاتا۔ گھر میں ان کی بیوی درگا اور ایک لڑکی پریم پیاری کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

رما شنکر اور پریم پیاری میں ایک سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ رما شنکر کی پیدائش کے ایک سال کے بعد رام جیاون مہراج کے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی تو رما شنکر کی ماں تلسی نے لڑکی کا نام پریم پیاری رکھا۔ گاؤں میں ایسے نام کم رکھے جاتے ہیں لیکن زمینداروں کا نام رکھا ہوا کیسے بدلتا۔ پھر بھی پریم پیاری کو لوگ پیار سے پریما کہنے لگے۔

رما شنکر اور پریما بچپن ہی سے ایک جگہ اٹھے بیٹھے' کھیلے کودے اور گرو جی کے یہاں ایک ساتھ پڑھے۔ بھلا ان میں محبت کیوں نہ ہوتی صبح کے وقت خاک دھول میں لت پت ہو کر گھروندے بنانا دونوں کا ایک نہایت پر لطف کھیل تھا۔ نور پور کے پر فضا میدان میں گنگا جی کے کنارے گڑیوں کا میلہ لگتا تو گڑیاں اپنے سسرال جاتیں۔ پریما ہاتھ پاؤں میں مہندی رچاتی' اپنی گڑیوں کو گہنے کپڑے سے سجا کر بدا کرتی۔ گنگا جی کے کنارے جاتی تو رما بھی ساتھ جاتا۔ اور جب پریما اپنی خوبصورت گڑیوں کو پانی میں پھینکتی تو رما اپنی خوش

رنگ برنگی چنری سے پریما کی گڑیوں کو سجاتا اور خوب خوش ہوتا۔ بارہا ایسا ہوا کہ کھیل ہی کھیل میں دونوں میں لڑائی ہوئی۔ کوسا کاٹا، مارا پیٹا اور تھوڑی دیر میں ملاپ ہو گیا۔ پریما کے روٹھنے پر رملا اس کی دلجوئی کرتا اور جب رملا بگڑ جاتا تو پریما اس کو مناتی۔ اسی طرح ہنسی خوشی ہنستے کھیلتے بچپن کا کھیل ختم ہو گیا اور دونوں نے بہار عمر کے سہانے سبزہ زار میں قدم رکھا۔ پنڈت گردھاری لال کے ایک چچیرے بھائی گنگا دھری لال الہ آباد میں وکیل تھے۔ انہیں کے پاس رملا کو انگریزی پڑھنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ الہ آباد جانے سے پہلے جب رملا پریما سے ملا تو پریما نے کہا "رملا تم الہ آباد جا کر مجھے بھول نہ جانا۔"

"پریما تیرا کدھر خیال ہے۔ بھلا میں تجھے بھول سکتا ہوں۔ میں جب الہ آباد سے آؤں گا تو تیرے لئے بڑی اچھی اچھی چیزیں لاؤں گا۔"

"الہ آباد سے کب آؤ گے؟"

"مہینہ میں ایک مرتبہ ضرور آؤں گا۔"

جب رملا رخصت ہونے لگا تو اس نے دیکھا کہ پریما کی کنول کی سی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں۔ اس نے کہا پریما تو روتی کیوں ہے؟ پریما نے اس کا کوئی جواب نہ دیا اس نے جلدی سے اپنے آنچل سے آنسو پونچھ ڈالے اور بغیر کچھ کہے سنے اپنے گھر کے اندر بھاگ گئی۔

(۲)

رملا جب نور پور ایسے چھوٹے گاؤں سے نکل کر الہ آباد ایسے بڑے شہر میں پہنچا تو اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ اپنے چچا کی عالی شان کوٹھی دیکھ کر رملا کی نظر میں اپنے نور پور والے کچے مکان کی کوئی وقعت نہ رہ گئی۔ اس کا الہ آباد میں اتنا جی لگا کہ وہ عرصہ تک نور پور نہ گیا۔ اپنے نئے دوستوں سے مل کر وہ پریما کو بھول گیا۔ اس کے چچا نے اس کے لئے کوٹ پتلون اور انگریزی جوتا بنوا دیا۔ وہ فٹن پر سوار ہو کر شام کو خسرو باغ کی سیر کرتا۔ ادھر تو رملا شہر کی دلچسپیوں میں اپنی دیہاتی زندگی محو کئے تھا اور ادھر نور پور میں پریما اس کی یاد میں تڑپتی رہتی تھی۔ وہ روز شام کی ڈھلتی چھاؤں میں اپنے گھر کے سامنے چبوترہ پر بیٹھ کر رملا کی راہ دیکھا کرتی۔ بھنگ اور دھنی کے کھیتوں سے جو قدرتی راگ پیدا ہوتا وہ ایک لمحہ بھر کے لئے بھی اس کو مسرور نہ کر سکتا۔ برسات کے موسم میں جب کالی کالی راتیں سر پر ہوتیں بجلی چمکتی، بادل گرجتا۔ مور چنگھاڑتے، جھینگر الاپتے تو رملا کی یاد میں پریما کی آنکھیں ساون بھادوں کی طرح جھڑیاں لگاتیں۔

خدا خدا کر کے گرمیوں کی چھٹیوں میں پورے ایک سال کے بعد رملا الہ آباد سے واپس ہوا۔ جس وقت وہ گاؤں میں پہنچا دن ڈوب رہا تھا اور بھینسیں چراگاہ سے واپس ہو رہی تھیں، سورج دیوتا کی سنہری شعاعوں میں گائیں رنگی ہوئی ایسی معلوم ہوتی تھیں جیسے گنگا جی میں چمکتے ہوئے تارے گوالے "برہا" گاتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ کہیں کہیں پر چھوٹے چھوٹے بچے مٹی میں کھیل رہے تھے۔ گاؤں کی بہوویں گھڑے لئے گنگا جی سے پانی بھرنے جا رہی تھیں، ان میں سے ایک شوخ اور چنچل عورت نے گھونگھٹ کی اوٹ سے رملا کو دیکھ کر اپنی ایک سہیلی سے کہا "ری ادھر دیکھ تو یہ کون کرسٹان کا بچہ آگیا ہے۔" اس کی سہیلی نے غور سے رملا کو دیکھ کر کہا۔ "یہ تو رملا ہے کیا تو نہیں جانتی یہ ہمارے زمیندار کا لڑکا ہے۔" "ارے یہ وہی رملا ہے جو دھوتی کرتہ پہنے گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ کھیلتا پھرتا تھا۔ میں نے بالکل نہیں پہچانا تھا۔ اور پہچانتی کیسے "آج تو یہ انگریزی کپڑے پہن کر آیا ہے۔"

دیہاتی زندگی میں ایک برادرانہ انس ہوتا ہے جو شہری زندگی میں نہیں پایا جاتا۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے امیر و غریب سب اسی رشتہ میں بندھے رہتے ہیں۔ چنانچہ رملا کے آنے کی خبر پا کر جگدیو لوہار، بچھلی بٹ، رمضان جولاہا۔ جگرو دھوبی۔ کالکا ماچھی۔ لوھین اہیر۔ رام جیاون مہراج وغیرہ رملا کو دیکھنے آئے اور دعا دے کر چلے گئے۔

گاڑی میں بیٹھ کر رلا کو پریما یاد آئی رات تو کسی طرح سے اس نے بسر کی لیکن صبح اٹھتے ہی وہ اس کے مکان پر پہنچا۔ رام جیا دان کرنے گئے ہوئے تھے۔ درگا دھان کوٹ رہی تھی۔ رلا نے کہا "موسی! پرنام۔"

"کون؟ رلا! جیتے رہو بھیا' بھگوان تمہیں بنائے رکھیں' آؤ آؤ اچھے تو رہے۔" یہ کہتی ہوئی درگا نے آواز دی پریما ارے او پریما دیکھ تیرے رلا بابو آئے ہیں۔ ان کو بیٹھنے کے لئے کچھ آسن تو دے۔" پریما چوکے میں دودھ گرم کر رہی تھی ماں کی آواز سن کر وہ جلدی سے اٹھی اور ایک کھٹولہ لا کر بچھا دیا۔ رلا کو خیال تھا کہ پریما سامنے آتے ہی خوب گھل مل کر باتیں کرے گی اس سے الہ آباد کا سال پوچھے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پریما بدن چرائے آنکھیں نیچے کئے ہوئے آئی اور کھٹولہ بچھا کر پھر چوکے میں واپس چلی گئی۔ رلا نے درگا سے کہا "موسی! پریما بھاگ کیوں گئی مجھ سے باتیں کیوں نہیں کرتی۔"

درگا نے چلا کر کہا "پریما کہاں چلی گئی' ذرا! ایک گلاس دودھ اور ملائی تو ڈال کر بھیا کو کھلا دے (ہنس کر) پریما بڑی پگلی ہے تم کو جو سال بھر کے بعد دیکھا تو سامنے آتے ہوئے شرماتی ہے دیہاتی لڑکیاں بڑی نا سمجھ ہوتی ہیں رلا۔"

"موسی میں بھی تو دیہاتی ہوں۔"

"بھیا تمہاری اور بات ہے۔ تمہارا اور پریما کا مقابلہ ہی کیا' تم پڑھے لکھے ہو لیکن پریما تو بالکل گنوار ہے بس وہی تمہارے ساتھ گروجی سے کچھ ہندی کتابیں پڑھی تھیں کیا اتنے ہی سے وہ سمجھ دار ہو گئی۔ نہیں بھیا نہیں وہ بڑی جاہل ہے۔ دیکھو نہ کئی مرتبہ پکار چکی ہوں لیکن ابھی تک دودھ لے کر نہیں آئی۔"

رلا نے اٹھ کر کہا "اچھا موسی میں خود ہی اس کے پاس جاتا ہوں' دیکھوں تو وہ مجھ سے کیوں نہیں بولتی ہے۔" یہ کہتا ہوا رلا چوکے میں گھسا اور درگا ہنس ہنس کر لوٹ گئی "ہاں بھیا ہاں ضرور پریما کو ٹھیک بنائے گا۔" یہ کہتے ہوئے درگا نے پھر اپنا موسل اٹھایا اور دھان کوٹنے لگی۔"

جب رلا چوکے میں پہنچا تو دیکھا پریما ایک گلاس میں دودھ لئے ہوئے سر جھکائے چپ چاپ کھڑی ہے۔ رلا نے ہنس کر کہا "ہو ہو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا مجھے پہچانتی نہیں' کہو اچھی تو رہیں۔" پریما نے دودھ سے بھرا ہوا گلاس اور ایک لٹیا میں جل بھر کر رلا کے سامنے رکھ دیا اور پھر دیوار کا سہارا لے کر ایک طرف کو چپ چاپ کھڑی ہو گئی لیکن کن انکھیوں سے رلا کو دیکھتی جاتی تھی۔ رلا نے کہا "دیکھو نہ پریما اس طرح سے کام نہیں چلے گا۔ جب تک تم نہ بولو گی میں تمہارے یہاں کوئی چیز نہ کھاؤں گا۔" تھوڑی دیر انتظار کر کے جب رلا نے دیکھا کہ اس کا بھی کوئی جواب پریما نے نہیں دیا تو اس نے اداس ہو کر کہا "اچھا پریما نہ بولو جب تم میری بات کا جواب نہیں دیتیں تو میں اب جاتا ہوں۔" یہ کہتا ہوا رلا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت لجاتی ہوئی پریما نے ایک عجیب انداز سے کسمسا کر دھیمی آواز میں کہا "ہائے رلا تم تو نہ جانے کیا کہتے ہو۔"

رلا کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ پریما کی آواز نے اس کا غنچہ دل کھلا دیا۔ اب اس نے دودھ پی لیا اور ہنستا ہوا چوکے سے باہر نکل کر کہنے لگا موسی آخر کار میں نے پریما سے بات چیت کر لی۔ اس کی ضد میں نے توڑ دی۔" درگا نے خوش ہو کر کہا۔ "وہ تمہارے ساتھ بچپن سے کھیلتی آئی ہے کہاں تک شرما سکتی ہے۔"

گھر سے [illegible] رلا نے کہا "ہو ہو میں ایک بات بھول ہی گیا۔ موسی یہ دیکھو پریما کے لئے ایک جوڑہ چوڑیوں کا لایا ہوں' پریما کو دے [illegible]

چوڑیوں [illegible] چوڑیاں تمہیں تو کانچ کی لیکن اس قسم کی قیمتی اور خوبصورت چوڑیاں اس وقت تک گاؤں

میں کسی کو نصیب نہ ہوئی تھیں۔

درگا کے جانے پر پریما چوکے سے باہر نکلی "دیکھ رلا تیرے لئے کتنی خوبصورت چوڑیاں لایا ہے۔" یہ کہتے ہوئے درگا نے چوڑیاں پریما کی طرف بڑھائیں۔ پریما نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ان کو لیا اور دزدیدہ نگاہوں سے رلا کی طرف دیکھا۔ زبان سے تو اس نے کچھ نہ کہا لیکن شرمیلی آنکھوں سے سوال کیا "کیوں جی ایسی چوڑیاں کانچ کی ہیں یا پریم کی؟" رلا نے بھی اس کا مطلب سمجھ لیا اور اشاروں میں جواب دیا "یہ پریم کی چوڑیاں ہیں۔"

(۳)

آسمان نے کروٹ لی' زمین نے موسم بدلے اور دیکھتے ہی دیکھتے پانچ برس گزر گئے۔ اس دوران میں پنڈت گردھاری لال اور مہاراج جیاون بیکنٹھ سدھارے۔ رلا اب ایک وجیہہ کیم شحیم جوان تھا۔ اس کی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور اس نے اپنی زمینداری کا کام سنبھالا۔ لین دین بہی کھاتہ اس کے ہاتھ میں آیا تو اس کے مزاج میں رعونت پیدا ہو گئی۔ سب نشوں سے زیادہ تیز زیادہ قاتل ثروت کا نشہ ہے۔ رلا اس نشہ میں بے خود ہو گیا۔ اور اپنے کاروبار میں اتنا منہمک ہوا کہ وہ لڑکپن کی محبت کو' پریما کے پریم کو رام جیاون مہاراج کی وفاداری کو بالکل بھول گیا اس نے ایک دن بھی بھولے سے بھی خبر نہ لی کہ یتیم پریما اور دکھیا درگا کی کیسی گزر رہی ہے۔

رام جیاون مہاراج کے کوئی جائیداد تو تھی نہیں جس سے درگا کی چین سے بسر ہوتی' مہاراج کے مرنے پر دس بیس روپے گھر میں تھے وہ بھی انہیں کی کریا کرم میں ختم ہو گئے صرف ایک گائے گھر میں تھی۔ ماں بیٹی کی زندگی کا اب ایک یہی سہارا تھا اس کا دودھ بیچ کر ان کی بسر اوقات ہوتی' کبھی کبھی فاقے بھی کرنا پڑتے اسی حالت میں ایک دن درگا نے پریما سے کہا "جی میں آتا ہے کہ اپنی مصیبت کا حال رلا بابو سے جا کر کہوں' کیا وہ ایسی حالت میں ہماری مدد نہ کریں گے۔"

پریما نے اداس ہو کر جواب دیا "نہیں اماں ان کے پاس جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ——— کیوں؟ جب ان کو خود خیال نہیں ہے تو ہمارے کہنے سے کیا ہو گا۔" "ایک دن کہہ کر تو دیکھوں مجھے تو پوری امید ہے کہ وہ ہماری غریبی پر رحم کریں گے' کیا تیرے باپ کا بھی ان کو کچھ خیال نہ ہو گا۔" مہاراج کا ذکر کرتے ہوئے دونوں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ تھوڑی دیر تک دونوں خوب جی بھر کے روئیں۔ جب کچھ جی ہلکا ہوا تو درگا نے کہا "بیٹی تو سچ کہتی ہے میں کسی کے پاس نہ جاؤں گی۔ جب ان کے جیتے جی میں نے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلائے تو اب ان کے مرنے پر بھیک مانگ کر ان کی آتما کو دکھ نہ پہنچاؤں گی۔" اس کے بعد پھر دونوں میں اس قسم کی باتیں کبھی نہیں ہوئیں۔ ایک مرتبہ رلا کی ماں تلسی نے درگا کو اناج بھیجا بھی لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

سال بھر تک جس طرح بھی ہو سکا درگا نے دن کاٹے۔ پھٹے پرانے کپڑوں کو سی کر کسی طرح کام چلایا۔ لیکن برسات میں ایک نئی مصیبت آئی۔ ان کا گھر چھلنی ہو گیا تھا۔ برسات میں کئی دن تک موسلا دھار پانی برسا تو اس کے مکان کا ایک حصہ گر پڑا۔ گائے وہاں بندھی ہوئی تھی دب کر مر گئی۔ اس نئی مصیبت نے ان پریشانیوں میں اور اضافہ کر دیا۔ گھر میں دو چار چاندی کے جو زیور تھے وہ بھی بک گئے' پریما نے رلا کی دی ہوئی چوڑیاں ایک کپڑے میں باندھ کر پٹاری میں رکھ دی تھیں۔ رلا کی یہی ایک یادگار تھی۔ پریما نے سوچا کہ اگر وہ ان کو پہنے رہے گی تو ٹوٹ جائیں گی۔ فکر معاش بڑی بری بلا ہے۔ درگا اب کھیتوں اور چراگاہوں سے گوبر اٹھا لاتی پریما اُپلے تھاپتی اور درگا گاؤں میں بیچ آتی۔ کبھی کوئی نہ ملتا تو اور مصیبت ہوتی۔ کبھی کوئی اُپلے چرا لے جاتا تو فاقے کرنے پڑتے۔ دنیا کا بھی عجیب حال ہے۔ کوئی ہنس رہا ہے کوئی مصیبت [illegible] کھانے والے نہیں کوئی درد کر زندگی کاٹتا ہے لیکن کوئی اس کا پرسان حال نہیں۔

(۴)

رلا کی بیسویں سالگرہ کا دن تھا' دروازہ پر مردوں کا اور گھر میں عورتوں کا ہجوم تھا۔ ایک طرف گھی کی اور دوسری طرف تیل کی پوریاں پک رہی تھیں۔ گھی کی معزز موٹے برہمنوں کے لئے تیل کی فاقہ کش نیچوں کے لئے۔ رلا کا گھر سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ عورتیں سہانے گیت گا رہی تھیں' بچے خوش ہو ہو کر دوڑتے پھر رہے تھے۔ مالن پھولوں کا گجرا کیلے کی شاخیں لائی' کمہار تے نئے چراغ لائے اور ہانڈیاں دے گئے۔ باری سر سبز ڈھاک کے پتل اور دونے دے گئے۔ کمہار نے آکر کلسہ میں پانی بھرا ہوا جی نے رلا کے لئے نئی پیڑھی بنائی۔ نائن نے آنگن لیپا اور چوک بنائی۔ رلا جب نہا دھو کر اپنے نئے کپڑے پہن کر تیار ہو گیا تو ایک پنڈت جی کھڑاؤیں کھٹ پٹ کرتے براجمان ہوئے۔ رلا کو پیڑھی پر کھڑا کر کے اشلوک پڑھا' ایک کچا دھاگا سر سے پاؤں تک ناپ کر بیسویں گرہ لگائی۔ تل ملا ہوا کچھ دودھ پلایا ماتھے پر تلک لگا کر گلے میں پھولوں کا ہار ڈال کر آشیرباد دی۔ پنڈت جی بھلا چوکی سے خالی ہاتھ کیسے اٹھتے۔ ان کا پیٹ بہت بڑا اور خوب پھولا ہوا تھا۔ تلسی نے بھی اس موقع پر پنڈت جی کو خوب "دچھنا" دی اور پنڈت جی ہنسی خوشی گھر سے رخصت ہوئے۔ ان کے بعد نائی' دھوبی' بھاٹ' کہار' مالی وغیرہ کی باری آئی اور ان کو بھی انعام سے خوش کر دیا گیا۔ غرض اس دن نورپور میں سوائے درگا اور پریما کے کوئی اور رلا کی چشم عنایت سے محروم نہ رہا۔

ادھر تو جشن کا یہ سامان تھا اور ادھر غریب درگا کے یہاں فاقہ تھا۔ کیونکہ ثروت کے نشہ میں سرشار زمیندار اس غریب آسامی کو نیوتہ دینا بھول گیا تھا۔ شام کو جب سب لوگ کھا پی کر چلے گئے تو اتفاقاً پریما کی یاد آئی اور اس نے اپنی ماں سے جا کر پوچھا "ماں جی کیا رام جیاون مہاراج کے یہاں سے کوئی نہیں آیا تھا؟"

"نہیں تو۔ کیا تم نے ان کو نیوتہ نہیں دیا تھا؟"

"کیا وہ بغیر نیوتہ کے نہیں آسکتی تھیں۔ وہ ہمارے آسامی ہیں۔"

"آسامی ہونے سے کیا ہوتا ہے۔ مہاراج کے گھر کی اکڑ تو سارے گاؤں میں مشہور ہے۔ ابھی تھوڑے دن ہوئے میں نے دو من اناج بھیجا تھا لیکن درگا نے واپس کر دیا۔ وہ عورت اپنے کو نہ جانے کیا سمجھتی ہے۔ جب تک مہاراج زندہ رہے ان کا آنا جانا رہا۔ اس کے مرتے ہی اس نے میرے یہاں آنا چھوڑ دیا۔ بھلا بغیر نیوتہ وہ ہمارے یہاں کیوں آنے لگی۔"

رلا چپ چاپ اپنی ماں کی باتیں سنتا رہا۔ اس کے بعد بولا "خیر درگا نہیں آئی تو اس سے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا مجھے ایک تھالی میں کچھ سیدھا دے دو میں اس کو جا کر دے آؤں۔"

تلسی نے کہا "جب تمہاری یہی مرضی ہے تو میں کل سیدھا کسی کے ہاتھ بھجوا دوں گی۔ تمہارے جانے کی وہاں کیا ضرورت ہے۔ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے تم خود سیدھا لے کر جاؤ گے تو درگا کے اور مزاج بڑھ جائیں گے۔"

لیکن رلا نے ماں کا کہنا نہ مانا اس وقت اس کے سامنے اس کا گزرا ہوا زمانہ تھا۔ پریما کی بچپن کی بے لوث محبت اس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی۔ اس نے تلسی سے سیدھے کی تھالی منگوائی اور اسی وقت درگا کے دروازہ پر پہنچ کر آواز دی۔ درگا نے دروازہ کھول کر کہا "کون؟"

رلا نے جواب دیا "میں ہوں رلا"——

"ہمارے دھن بھاگ آیئے اندر آیئے۔ کہئے آج اس طرف مالک کیسے بھول کر آگئے۔"

رلا کے دل پر چوٹ سی لگی اس نے شرمندہ ہو کر کہا "ایشور جانتا ہے کہ گھر کے کاروبار میں ایسا پھنسا رہتا ہوں کہ کسی وقت

فرصت ہی نہیں ملتی۔"

اس کا کچھ جواب نہ دے کر درگا نے پریما کو آواز دی "بیٹی ذرا دیا جلا دے مالک اندھیرے میں کھڑے ہیں۔" پریما ایک طرف کونے میں میلی کچیلی دھوتی اوڑھے پڑی تھی۔ آج اس کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ ماں کی آواز سن کر وہ اٹھی اور آہستہ سے کہا "ماں جی دیئے میں تیل نہیں ہے۔"

اس کی آواز میں حسرت بھری تھی۔ گو پریما کو رلمانے نہ دیکھا لیکن اس کی آواز سن لی اور کہا "دیا جلانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں اب جا رہا ہوں۔ ماں جی نے تمہارے لئے اس تھالی میں کچھ بھیجا ہے۔" یہ کہہ کر رلمانے تھالی بڑھائی لیکن درگا پیچھے ہٹ گئی اس نے اپنے آپ کو سنبھال کر کہا ___

"مالک ہم اس کے بھوکے نہیں ہیں۔"

یہ سوکھا جواب سن کر رلما سناٹے میں آ گیا' غریبوں میں بھی خودداری کا مادہ ہوتا ہے یہ اس کو معلوم نہ تھا۔

ایک غریب برہمنی نے اس کو ذلیل کیا اس کا اس کو سخت صدمہ ہوا اور وہ سیدھے کی تھالی لے کر درگا کے گھر سے نکل کر اپنے گھر واپس آ گیا۔ رلما کے جانے کے بعد پریما نے اپنی ماں سے کہا "معلوم ہوتا ہے بابو جی ناراض ہو گئے ہیں۔" درگا نے جواب دیا "بھگوان راضی رہیں کسی کی ناراضگی کی کچھ پروا نہیں۔"

(۵)

پریما اب انیسویں سال میں تھی اس کی جوانی کا چاند بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ حسن و رعنائی کی تمام خوبیاں قدرت نے فیاضی سے پریما کو عطا کی تھیں۔ اس کے انداز میں بھولا پن آواز میں نغمہ کی دل فریبی' آنکھوں میں حیا اور خیالات میں پاکیزگی تھی۔ لیکن ان سب خوبیوں کے ہوتے ہوئے بھی اب تک اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ غریب کی جوانی جاڑوں کی چاندنی تھی۔ کوئی قدردان نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک غریب برہمن کی لڑکی تھی۔ دان "دہیز" دینے کے لئے درگا کے پاس کچھ نہ تھا۔ جوان جہان لڑکی کو دیکھ دیکھ کر اسکے گلے میں پانی نہ اترتا تھا۔ دو چار جگہ اس نے نسبت کا پیام بھی دیا لیکن کوئی دو سو سے کم دان لینے پر راضی نہ ہوا۔ دو سو روپیہ تو بہت ہوتے ہیں' گھر میں اتنے کھپریل بھی نہ رہے ہوں گے۔ درگا گاؤں میں جس طرف نکلتی لوگ اس کو سنا سنا کر کہتے جوان لڑکی گھر میں بٹھار کھی ہے بیاہ نہیں کرتی نہ جانے کیا ارادہ ہے۔ درگا لوگوں کے طعنے سن کر شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتی۔ اس لئے گاؤں میں اپلے بیچنا بند کر دیئے۔ ایک دوسرے گاؤں میں اپلے جا کر بیچنے لگی وہاں بھی کچھ دنوں بعد لوگوں نے درگا کو دق کرنا شروع کر دیا۔ بے چاری کی جان بڑی مصیبت میں تھی۔ کبھی سوچتی گنگا جی میں ڈوب کر اپنی جان دے دے لیکن جب پریما کا خیال آتا تو اپنے ارادہ سے باز آ جاتی۔ اب درگا دن رات اسی فکر میں رنجیدہ رہنے لگی۔ بسا اوقات وہ پریما پر بھی خواہ مخواہ خفا ہو جاتی۔ ذرا سی بات پر جھڑک دیتی۔ اس پر اگر پریما رونے لگتی تو خود بھی اس کے ساتھ روتی ایک دوسرے کے دل کا حال جانتی تھی لیکن زبان پر نہ لا سکی تھی۔ اس طرح دن گزر رہے تھے' ایک دن درگا کی ایک سہیلی گورا اس سے ملنے آئی تو اس نے کہا "جیجی پریما کا بیاہ کب کرو گی؟ لڑکی بہت سیانی ہو گئی ہے اس کو کنواری بٹھار کھنا بڑی شرم کی بات ہے۔ گاؤں بھر میں تمہاری بڑی بدنامی ہو رہی ہے۔"

درگا نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "بہن کیا بتاؤں، بہت تلاش کرنے پر بھی اب تک کوئی بر ہی نہیں ملا۔"

گورا۔ یہ تو مجھے معلوم ہے لیکن خاموش رہنے سے تو کام نہ چلے گے میرے خیال میں تم کو اب دیری نہیں کرنی چاہیے۔

درگا۔ بہن تمہیں پریما کو کہیں ٹھکانے لگا دو بڑی کرپا ہو گی۔

گورا نے کہا "اچھا میں دیکھوں گی۔" یہ کہہ کر گورا چلی گئی۔ دو چار دن بعد وہ پھر آئی اس نے آتے ہی درگا سے کہا "جیجی مٹھائی کھلاؤ میں نے پریما کے لئے بر ڈھونڈھ لیا ہے۔" درگا نے خوش ہو کر کہا "کہاں؟"

گورا۔ مہاراج بنسی دھر کو تو جانتی ہو۔

درگا۔ وہی جو امر چھ میں رہتے ہیں۔

گورا۔ ہاں ہاں وہی وہی۔

درگا۔ ان کی تو عمر بہت زیادہ ہے اور وہ اب شادی کیوں کر رہے ہیں؟

گورا۔ عمر ضرور زیادہ ہے لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ مرد ہیں ان کی عمر کا کون خیال کرتا ہے۔ ان کی جتنی عمر ہے اس عمر میں تو بہت سے لوگ بیاہ کرتے ہیں۔ اور جیجی برا نہ مانو تو کہوں تمہاری لڑکی بھی بہت سیانی ہے۔ بر بالکل چھوکرا ہونے سے بھی تو کام نہیں چلے گا۔ میرا کہنا مانو تم اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ بڑے امیر ہیں۔ بیس پچیس بیگھے موروثی کاشتکاری ہے۔ تالاب' باغ سب ہی کچھ تو ہے۔ اور سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ وہ کچھ دان "دہیز" بھی نہ لیں گے۔ کہو منظور ہے کہ نہیں۔"

درگا بنسی دھر کے ساتھ پریما کا بیاہ کرنے کے لئے کبھی راضی نہ ہوتی لیکن جب اس نے سنا کہ دان "دہیز" بھی نہ دینا پڑے گا تو وہ مجبوراً راضی ہو گئی۔

گورا۔ ایک بات اور ہے وہ یہ کہ کل کچھ عورتیں مہاراج بنسی دھر کے یہاں سے پریما کو دیکھنے آئیں گی۔

درگا۔ بہن ایسا تو میرے یہاں کبھی نہیں ہوا۔ میرا میکہ کھاگا میں ہے۔ وہاں جب تک بیاہ نہیں ہو لیتا سسرال والے لڑکی کو نہیں دیکھ سکتے۔

گورا۔ خیر تم ایک کام کرو کل سویرے پریما کو نہلا کر صاف کپڑے پہنا دینا امر چھ سے جب عورتیں میرے یہاں آئیں گی میں کسی بہانے سے پریما کو اپنے گھر بلا لے جاؤں گی اس طرح وہ پریما کو دیکھ لیں گی۔ اس میں کوئی ہرج نہ ہو گا۔" درگا نے خوش ہو کر کہا "ہاں یہ ترکیب تو ٹھیک ہے۔"

"اچھا تو اب میں جاتی ہوں۔" یہ کہہ کر گورا اپنے گھر چلی گئی۔ درگا آج بہت خوش تھی اس نے اپنی پٹاری کھول کر ایک پھٹی پرانی دھوتی اور شلوکا نکال کر دھویا اور اس کی مرمت کر دی۔ صبح گورا سے یہ سب باتیں ہوئیں اور شام تک گاؤں بھر میں اس کی خبر ہو گئی۔ جس کسی نے بھی سنا کہ درگا اپنی پھول سی لڑکی کا بیاہ بوڑھے کھوسٹ بنسی دھر سے کرنے والی ہے۔ اس نے افسوس کیا لیکن درگا نے کسی کے کہنے کی کچھ پروا نہ کی۔ اس کو اس کے سوائے کچھ خیال ہی نہ تھا کہ جس طرح بھی ہو پریما کا بیاہ ہو جائے اور دان "دہیز" نہ دینا پڑے۔ بدنامی ہو گی تو کیا اپنے فرض سے سبکدوش تو ہو جائے گی۔ پریما سے بھی کوئی بات چھپی نہ رہی۔ سب کچھ جان بوجھ کر بھی وہ کہہ ہی کیا سکتی تھی' وہ درد سر کا بہانہ کر کے شام سے لیٹ رہی اور چپکے چپکے ساری رات آنسو بہاتی رہی۔

(۶)

صبح کاذب کا وقت تھا چاند دھندلی دھندلی روشنی ڈال رہا تھا۔ درگا نے پریما کو بلا کر کہا "بٹیا جلدی سے اٹھ اور گنگا مائی میں اشنان کر آ۔ لے یہ شلوکا اور دھوتی اس کو نہا کر پہن لینا۔ ہاں خوب یاد آیا ذرا ٹھہر جاؤ۔" درگا نے اپنی پٹاری کھولی اور اس میں سے رلما کی دی ہوئی کانچ کی چوڑیاں نکالیں اور بولی "تیرے بدن پر کوئی زیور نہیں ہے میں اب تجھے بنوا دوں گی۔ آج تو یہ چوڑیاں پہن لے یہ بھی بہت خوبصورت اور قیمتی ہیں۔" پریما اب تک خاموش سر جھکائے بیٹھی تھی۔ چوڑیوں کو دیکھ کر یکبارگی چلا اٹھی "نہیں ماں نہیں' میں

تمہارے پاؤں پڑتی ہوں میں ان چوڑیوں کو نہیں پہنوں گی۔ درگا نے ڈانٹ کر کہا" پہنے گی کیسے نہیں بس تجھ میں یہی تو ایک بڑا عیب ہے کہ کہنا نہیں مانتی۔" یہ کہہ کر درگا نے زبردستی چوڑیاں پہنا دیں۔ پریما کو نہانے کے لئے بھیج کر آپ کسی دوسرے کام میں لگ گئی۔ آج ہی پاس پڑوس سے عورتیں پریما کو دیکھنے آئیں گی۔ درگا کو جلدی تھی۔ جس قدر جلد ممکن ہو پریما نہا دھو کر فارغ ہو جائے۔ پریما جب گھر سے نکلی تو اس وقت بھی اندھیرا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کچھ سوچتی ہوئی دریا کے کنارے پہنچی۔ ستاروں کی مدھم روشنی کے عکس سے دریا کا بعض بعض حصہ سانپ کی کینچلی کی طرف جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ تمام دنیا سنسان تھی۔ دریا کے کنارے پریما نے دھوتی اور شلوکا ایک طرف پھینک دیا گنگا مائی کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بولی "ماتا میں نے کون سا پاپ کیا ہے جو سب کی آنکھوں میں کانٹا بن رہی ہوں کیا میرے لئے دنیا میں کہیں ٹھکانا نہیں ہے جو میری ماں مجھے آگ میں جھونکنے کے لئے تیار ہو گئی۔ ماتا! میرے دل میں جس کی محبت بچپن سے تھی وہی میرا نہ ہوا تو اب دنیا میں مجھے کسی سے کچھ امید نہیں ہے۔

ماتا! کیا تم بتا سکتی ہو کہ رلا نے مجھے کیوں بھلا دیا۔ ماتا! تم جواب کیوں نہیں دیتی ہو۔ اچھا میں سمجھ گئی۔ تم کہتی ہو کہ ان کا نام جپو لیکن میں تو ان کا نام آج سے نہیں بلکہ بالے پن سے جپتی رہی ہوں پھر بھی وہ میرے نہیں ہوئے۔ ماں! میں دھرتی ماتا کی پیٹھ کا بوجھ ہو رہی ہوں تم اس دکھیا کو اپنی گود میں چھپا لو میں تمہارے سرن میں آتی ہوں۔" پریما کی فریاد سن کر چاندی کی تھرکتی ہوئی کرنیں بالو پر لوٹنے لگیں اور گنگا مائی کی لہریں اپنا سر پٹکنے لگیں۔ پریما آگے بڑھی پھر کچھ سوچ کر رکی اور اپنے ہاتھوں سے چوڑیاں اتار ڈالیں اور یہ کہہ کر کہ "میں تو پریم کی چوڑیاں پہنے ہوئے ہوں ان کانچ کی چوڑیوں کی ضرورت نہیں۔" ان کو توڑ کر ایک طرف زمین پر پھینک دیا۔ جن چوڑیوں کو وہ کبھی اپنی جان و دل سے بھی زیادہ عزیز سمجھتی تھی انہیں چوڑیوں کو آج اس نے خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالا اور پانی میں ایک قدم بڑھایا ٹھیک اسی وقت کسی کی آواز سنائی دی ___

"پریما! پریما! ٹھہرو۔ مجھ سے غلطی ہوئی' مجھ سے بھول ہوئی تم مجھے معاف کر دو۔ تم میری غلطی کی سزا تمہارا جو جی چاہے دے سکتی ہو۔ لیکن جو کچھ تم کرنے جا رہی ہو یہ سزا میرے لئے ناقابل برداشت ہو گی۔ پریما زور اور طاقت سے کانچ کی چوڑیاں توڑی جا سکتی ہیں لیکن پریم کا بندھن پریم کی چوڑیوں کا تعلق کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ اس کے توڑنے کی طاقت نہ تم میں ہے اور نہ مجھ میں ہے۔ پریما جو میں نہیں کر سکا اس کو تم بھی نہیں کر سکتیں۔" یہ رلا کی آواز تھی جو اتفاقاً اس وقت گنگا اشنان کرنے کے لئے وہاں آ گیا تھا۔ اس نے پریما کی فریاد سنی۔ پریما کا خوبصورت چہرہ دیکھا' پریم کی چوڑیاں توڑتے اور ان کو پھینکتے دیکھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کو اٹھا لیا۔ ثابت رہنے پر بھی جن کی اس نے کبھی قدر نہ کی تھی معمولی کانچ کی چوڑیاں آج ٹکڑے ٹکڑے ہو کر اس کے دل پر تیر و نشتر کا کام کر گئیں۔ دل کی گہرائیوں میں خوابیدہ محبت نے ایک کروٹ لی۔ بچپن کی محبت نے زور مارا اور قبل اس کے کہ پریما اپنی چاند سی صورت کو گنگا مائی کی لہروں میں چھپا لے رلا نے پھرتی کے ساتھ آگے بڑھ کر پریما کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر پانی سے باہر نکال لیا۔ جس طرح ہوا کے جھونکے سے درخت کا ایک ایک پتہ کانپنے لگتا ہے اسی طرح رلا نے جب پریما کی بانہہ پکڑی تو جوش محبت سے پریما کا ایک ایک عضو کانپ اٹھا اور وہ رلا کے قدموں میں جھک گئی۔ محبت کے آنسو دونوں کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ اس وقت باد سحر مستی سے جھومنے لگی۔ تارے غائب ہو گئے اور صبح ہو گئی۔ رنج و غم کا کہیں نشان بھی نہ رہا۔

کچھ دنوں کے بعد اچھی ساعت میں رلا نے پریما کے ساتھ بڑی دھوم دھام کے ساتھ بیاہ کیا۔ درگا اس مبارک شادی کے بعد بھی کئی سال تک زندہ رہی لیکن اس وضع دار اور آن پر مرنے والی عورت نے اپنی جھونپڑی چھوڑ کر داماد کے یہاں رہنا کبھی گوارا نہ کیا۔

اندھا دیوتا

حکیم احمد شجاع

(۱)

اسلم دہلی کے ایک مشہور اور دولت مند سوداگر کا بیٹا تھا۔ اس کے باپ نے اپنے بزرگوں سے کوئی دولت ورثے میں نہیں پائی تھی۔ جو کچھ کمایا اپنے دست و بازو کی ہمت اور دماغ کی ذہانت کی بدولت۔ جو کچھ بچایا اپنی ان تھک کوششوں اور کفایت شعاریوں کے باعث۔ اسلم کی ماں جوان عمر ہی میں داغ مفارقت دے گئی تھی۔ اس وقت اسلم بچہ تھا۔ اس کے باپ نے اپنی نیک دل اور حسرت نصیب بیوی کی یاد نہ بھلانے اور اسلم کو سوتیلی ماں کی زیادتیوں سے بچانے کی غرض سے پھر شادی نہ کی۔

اسلم ایم۔اے کے امتحان میں کامیاب ہونے کے بعد قانون پڑھنے کے لئے لاہور کے لاء کالج میں داخل ہو گیا۔ وہ پہلے امتحان میں کامیاب ہوا ہی تھا کہ اس کے والد یک لخت بیمار ہو گئے اور اس مہلک مرض سے جانبر نہ ہو سکے۔ اسلم کو اپنے باپ کی ناگہاں موت کا بے انتہا صدمہ ہوا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اسے بے سر و سامان چھوڑ کر چل بسے تھے۔ حساب کتاب کی جانچ پڑتال کے بعد اس پر اپنے باپ کی کفایت شعار زندگی کی حقیقت روشن ہوئی۔ منیم کے پاس پچھتر ہزار روپیہ کے نقد پونڈ تھے۔ ساڑھے تین لاکھ روپے مختلف بنکوں میں جمع تھے اور قریب قریب دو لاکھ روپے کی مالیت کا سامان اس کے تجارت خانوں میں موجود تھا۔ شہر میں دس عظیم الشان مکان اور انگریزی آبادی میں بارہ بنگلے تھے۔ جہاں تک زندگی کی آسائشوں کا تعلق تھا۔ ان میں کوئی کمی نہ تھی۔ روپیہ پیسہ ضرورت سے زیادہ تھا۔ اور وسائل آمد مستقل۔ اسلم کو باپ کی موت کا صدمہ اس لئے ہوا کہ اس دنیا میں ان کے سوا اس کا کوئی اور رشتہ دار نہ تھا۔ اس کی ماں ایک غریب گھرانے کی یتیم اور لاوارث لڑکی تھی اور اس کے باپ کے تمام قریبی رشتہ یکے بعد دیگرے راہی عالم بقا ہو چکے تھے۔ اب اس بھری دنیا میں وہ اپنی دولت اور لیاقت کے باوجود بالکل اکیلا تھا۔ شکل و صورت، وضع قطع، عادات اور خیالات کے لحاظ سے اسلم ایک قابل رشک انسان تھا۔ جس طرف جاتا لوگوں کی انگلیاں اٹھ جاتیں۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے انگریزی وضع کے کپڑے۔ اس کے لمبے لمبے بال اس کی مستانہ چال میں ایک حسین ادا پیدا کر دیتے تھے۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر اس کی بڑی بڑی روشن آنکھیں اور چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھیں بہت زیب دیتی تھیں۔ اگرچہ اس کے لبوں پر ایک غیر فانی مسکراہٹ ہمیشہ کے ایک کھلے ہوئے چمن کی بہار کا پیغام دیتی تھی۔ مگر اس کے کشادہ سینے کی تہوں کے نیچے ایک یاس انگیز اور حسرت مند دل تھا۔ اسلم دولت اور عزت کی موجودگی میں بھی افسردہ رہتا تھا۔ اس کے دوست اس سے ملنے آتے۔ وہ ان کی خاطر تواضع میں کوئی بخل نہ روا رکھتا ______ مگر اس کا ہر دوست یہی محسوس کیا کرتا تھا کہ اسلم خوش نہیں۔ آخر اس کے دوستوں میں خصوصاً اور واقفوں میں عموماً اس بات کا چرچا ہونے

لگا کہ اسلم کا دل کسی غیر معمولی غم کے بار گراں سے دبا رہتا ہے۔

باپ کی موجودگی اسلم کے لئے ایک طلسم تھا۔ جوان کی وفات کے ساتھ ہی ٹوٹ گیا۔ تھوڑے دنوں بعد ہی اس نے اپنی زندگی میں کچھ کمی محسوس کی اور اس کو اپنا گھر کچھ خالی خالی سا نظر آنے لگا۔ نوکر، چاکر، منیم، منشی سب ہی موجود تھے، مگر ان میں ایسا کوئی نہ تھا جس کو وہ اپنے دل کی بات بتاتا۔ جس کا خیال اس کو کام کرنے کے وقت یا آرام کی ساعتوں میں بے چین کر دیتا۔

اسلم فطری طور پر فلسفی مزاج تھا۔ اس پر چار پانچ سال کی فلسفے کی تعلیم اور دن رات کی محنت نے اس فلسفیت کو ایک خاص روش عملی بخش دی تھی۔ اور وہ بڑی کامیابی سے ہر عقدے کا حل سوچ لیتا تھا۔ اس نے اس اضطراب اور زندگی کی نعمتوں کے باوجود اس خلا کے احساس کا تجزیہ کیا اور پھر اس عقدے کو حل کر لیا۔

اس نے محسوس کیا کہ اس کو ایک رفیق حیات کی ضرورت ہے جو اس کی خوشی سے خوش ہو اور اس کے غم سے مغموم۔ جو اس کی خوابیدہ طاقتوں کو بیدار کرے۔ اس کے منجمد دل کو محبت کی آگ سے گداز کرے۔ اور خود اس محبت کا آئینہ بن کر اس کی زندگی کو ایک نئے لطف سے مسرور کر دے۔ ظاہر تھا کہ ایک عورت کے سوا اس کے دل کو ان کیف آور مسرتوں سے کوئی چیز سرشار نہیں کر سکتی تھی..... مگر..... آہ یہ ایک بہت ٹیڑھا سوال تھا۔ کیا اسلم چار برس سے اس سوال کے بلاخیز گرداب میں چکر نہیں کھا رہا تھا۔ اس نے کتنی شادیوں کا عبرتناک انجام دیکھا۔ اور ان سے سبق حاصل کیا۔ کتنی کتابیں فلسفہ ازدواج کے متعلق پڑھیں۔ اور ان کو آہ سرد بھر بھر کر ختم کیا۔ یہی سوال اسلم کے لئے زندگی اور موت کا سوال تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی دولت، اس کا حسن، اس کی وجاہت، حسین سے حسین صورت خرید سکتی ہے۔ مگر اسے یہ بھی علم تھا کہ یہ تمام دولت محبت کی ایک جھلک بھی نہیں خرید سکتی۔ وہ حسن صورت اور شرافت طبعی کو صرف محبت کے زیور سمجھتا تھا اس کے نزدیک حقیقی حسن محبت میں تھا۔ صورت اور سیرت کی خوبیاں محبت کے بغیر ایسی تھیں، جیسے ایک پتھر کے حسین بت کو آراستہ کر دیا جائے۔ یا ایک خوبصورت اور نیک سیرت عورت کے جسم سے اس کا دل نکال لیا جائے۔

چار برس سے وہ اسی تلاش میں تھا۔ ایک بار بمبئی گیا۔ اور وہاں مختلف عورتوں کے چہروں میں اس محبت کو تلاش کرنا چاہا۔ ہاں محبت کے متعلق اسلم کا نظریہ یہ بھی تھا کہ یہ جذبہ بالکل فوری اضطراری اور بے اختیاری ہے۔ اور ایک ہی نظر میں پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ محبت کہ جو آہستہ آہستہ ترقی کے مدارج طے کرے۔ یا جو صرف اس لئے معرض وجود میں آئے کہ ایک انسان کسی دوسرے انسان کی زندگی کے لئے ضروری اور مفید ہے۔ محبت نہیں، پسند ہے۔ لوگ محبت اور پسند میں اسی طرح تمیز نہیں کرتے۔ جس طرح دوستی اور رفاقت میں، یا پرستش اور عزت میں۔

اسی طرح وہ جہاں جہاں جا سکا گیا۔ جس جس چہرے تک اس کی رسائی ہو سکتی تھی، وہ پہنچا۔ کیونکہ صحبت یا گفتگو میں سے کسی چیز سے اسے واسطہ نہیں تھا۔ وہ محبت کو پہلی نظر کی تیز شعاعوں میں ڈھونڈتا تھا۔ مگر وہ ہمیشہ اپنے دل کو اسی کیفیت بارد میں دیکھ کر سر جھکا لیتا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آتیں۔ اور پھر ایک گہری اور ٹھنڈی آہ بھر کر سگریٹ پینے لگ جاتا۔

سگریٹ اس نے اسی دن سے پینا شروع کیا تھا۔ جس دن سے یہ امنگ اس کے دل میں پیدا ہوئی تھی۔ آرزوئے ناکام اپنی

حسرت کسی اور داغ ناتمام سے مٹانا چاہتی تھی۔ سگریٹ اس مصروفیت کے لئے بہت اچھا بہانہ تھا۔ اس لئے اب جب کہ اس کے دل کی حسرت پوری ہوتی دکھائی نہ دیتی تھی اس کو اپنا دل بہلانے کے لئے سگریٹ ہی ایک دل کش کھلونا نظر آتا تھا۔ وہ اب اپنا بہت سا وقت سگریٹ پینے ہی میں صرف کرتا تھا۔ کسی خاص نشے کی مجبوری یا عادت کے تقاضے سے نہیں۔ بلکہ محض اس طرح جس طرح ایک معصوم بچہ کسی دل کش کھلونے سے کھیلتا رہتا ہے۔

اب اس آرزو کے شعلے اسے دن بھر بے قرار رکھتے تھے۔ وہ رات بھر اپنی آئندہ صبح کا دستور العمل تیار کرتا رہتا تھا۔ مگر ہر صبح، اس کی ناکامی کی قبر پر آنسو بہا کر پردہ عدم میں چھپ جاتی تھی۔

اس کے دوست، جن سے اسے کبھی محبت نہ تھی۔ اب اسے برے معلوم ہوتے تھے۔ عیش و آرام ایک شریک کی شرکت کے بغیر ڈراونا نظر آتا تھا۔ زندگی بے معنی معلوم ہوتی تھی۔ آئینہ شاید اس کا سب سے زیادہ مہلک دشمن تھا۔ جب وہ اپنی صورت آئینے میں دیکھتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ خود ہی اپنا منہ چڑا رہا ہے۔

ایک شب اس کا دل سیاہ رات کی طرح بے چراغ تھا۔ امید کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہر روز کی مایوسیوں نے بجھا دیا تھا۔ اور وہ اپنی آئندہ زندگی کے لئے ایک دستور العمل سوچ رہا تھا۔ مگر ہر دستور العمل تاریک تھا۔ بیکار تھا............ آخر اس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ اپنی زندگی کے جہاز کو ڈوبنے سے قبل بچانے کی کوشش کرے گا۔ اس سے پیشتر کہ محبت کے امکان کی امید کو وہ ہمیشہ کے لئے دل سے مٹا دے اس کے لئے ایک دفعہ سب سے بڑا موقع تلاش کرے گا۔ اس کے دل کی وہی کیفیت تھی۔ جو ایک ایسے بوڑھے دولت مند کے دل کی ہوتی ہے جو اپنی عمر بھر کی کمائی کے لئے ایک جائز وارث کی نہ پوری ہونے والی تمنا سے زندگی کو حرارت دیتا رہتا ہے۔

اسلم نے تہیہ کر لیا کہ وہ یورپ کا ایک دورہ کرے گا۔ کسی تعلیمی یا تجارتی غرض سے نہیں۔ بلکہ صرف محبت کی تلاش میں اس زندہ متحرک بت کی تلاش میں، جو اس سے محبت کر سکے اور اس کی پرستش کے قابل ہو۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے وطن میں حسن اور محبت کے نظارے منظر عام پر میسر نہیں آسکتے۔ اس ملک کی بہترین دولت مقفل گھروں اور تہ در تہ پردوں میں چھپی ہوئی ہے۔

یورپ میں شاید، حسن اپنی بیباک کیفیت بے حجابی میں اس کے منجمد دل کو پگھلا دے۔ اس کی بے قرار آنکھیں، شاید وہاں اس خیالی آرزو کی چلتی پھرتی تصویر دیکھ پائیں.....

وہ یورپ گیا اور اس نے تین برس تک یورپ کے کونے کونے کی خاک چھان ماری۔ لیکن شاید آرزو، کسی سراب خیالی کے نظر فریب دھوکوں کی طرح اور دور ہوتا چلا گیا۔ اسلم کی پیاس بھی اس تعاقب اور گرم روی سے اس شوق اور حسرت کی تلخ کامی اور تپش سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔

وہ واپس آیا۔ مگر اب اسلم وہ اسلم نہ تھا۔ وفور درد کے اس احساس کش اثر کی طرح جو کسی بیمار کو آرام اور درد دونوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس ناکامی تمنا نے اس کو آرام اور تکلیف، محبت اور نفرت، زندگی اور موت کے خطروں سے آزاد کر دیا تھا۔

اب وہ اس دنیا کی مادیت کا قائل تھا۔ اور اپنے آپ کی اپنی ذات میں فنا کر دینا چاہتا تھا۔ اس نے اب شہر سے دور ایک خوش نما بنگلہ

بنیادوں سے بہترین سامانِ آرائش سے سجایا۔ مگر زیادہ تر اس کا وقت کتب خانے میں گزرتا تھا، جسے اس نے ہر نایاب اور قابلِ دید کتاب سے آراستہ کر رکھا تھا۔ہاں اس کے بنگلے میں کوئی تصویر نہ تھی۔ وہ تصویروں سے ڈرتا تھا کیونکہ وہ زندہ انسانوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ خوبصورت عورتوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ ان عورتوں کی جن میں سے کوئی بھی...نہ...اس کے لئے....نہ تھی...

(۲)

ایک دن شام کو اسلم اپنے کتب خانے میں آرام کرسی پر بیٹھا غور کر رہا تھا کہ شاید کسی چیز کو کبھی نہ بھولنے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسے بھلا دینے کی کوشش کی جائے۔ کیونکہ وہ خیال جس کو بھلانے کے لئے وہ اس قدر محنت، دولت اور وقت صرف کر رہا تھا۔ روز بروز، ساعت بساعت زیادہ تیزی کے ساتھ اس کے دل نشین ہو رہا تھا۔

وہ آج صبح ہی سے اپنے کتب خانے میں تھا اور ایک ایسے قمار باز کی طرح، جو روز روز کی ہار سے مایوس ہو کر اپنی تمام باقیماندہ دولت ایک ہی بازی پر لگانے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس نے آج یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ آج شام سے پہلے پہلے دریافت کرے گا کہ محبت کی کوئی ہستی بھی ہے کہ نہیں۔

کتابیں جو مضمون، زبان اور طرزِ نگارش کے اعتبار سے ایک دوسری سے مختلف تھیں، چاروں طرف کھلی پڑی تھیں۔ وہ کبھی ایک کے ورق الٹتا، کبھی دوسری کو اٹھا کر دیکھتا۔ کبھی ان سے باتیں کرتا اور پھر خود ہی ہنس دیتا۔ یہ معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ وہ اپنی نادانی پر ہنس رہا ہے، یا ان کتابوں کی ناکامی پر، وہ گویا ایک شرابی تھا، جو اردگرد کی تمام چیزوں کو مدہوش سمجھتا ہے، اور ان سے بے حجابانہ دست درازی کرنے لگتا ہے۔

اب اس کی شفاف پیشانی پر غصے کی جھلک دکھائی دی۔ اس کی آنکھوں میں کسی اندرونی صدمے سے آنسو بھر آئے۔ اس نے زور سے وہ کتاب جو اس کے ہاتھ میں تھی، زمین پر پٹک دی۔ اور چلا اٹھا۔ "سب جھوٹ، سب دھوکا ہے۔ یہ صرف انسان کو بیوقوف بنانے کی تدبیریں ہیں۔"

اس کے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں ایک سگریٹ جل رہا تھا اور وہ اس کی سوزش کے اثرات سے بالکل بے خبر تھا۔ وہ اٹھا اس کے چہرے سے تھکن، اس کی آنکھوں سے مایوسی، اور اس کی حرکات سے بے چینی ظاہر تھی۔ اب اس نے کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ معلوم ہوتا تھا، اس کا دماغ بھی اس کے جسم کی طرح متحرک اور مصروف ہے۔

اس نے ایک اور سگریٹ جلایا، اور دیا سلائی کی جگہ سگریٹ پھینک کر دیا سلائی منہ سے لگالی، پھر اس نے خود ہی حرکت کو سمجھنے کی کوشش کی، پھر وہ ہنسا اب وہ بڑی متانت اور سنجیدگی سے دیوار میں نظریں گاڑے کچھ سوچ رہا تھا، اور اپنے خیالات کو خود ہی سننے کے لئے الفاظ میں منتقل کر رہا تھا۔

"بس اس طرح جس طرح میں نے یہ جلتا ہوا سگریٹ پھینک کر ایک بجھی ہوئی بیکار دیا سلائی اپنے منہ سے لگالی تھی لوگ اس مفید اور کار آمد دنیا کے مشاغل چھوڑ کر ایک بے معنی خیال، ایک بے حقیقت ہستی کی فکر میں مستغرق رہتے ہیں.......... محبت نہ صرف ایک بے معنی لفظ ہے بلکہ جھوٹ ہے۔ جسے انسان عادتاً بولتا ہے۔ ایک فریب ہے۔ جس میں بے کار لوگ اپنے آپ کو مبتلا کر لیتے ہیں۔ ایک مرض ہے، جو وقتاً فوقتاً کمزور دماغوں کو لاحق ہو جاتا ہے..."

آہ غریب اسلم! شاید تجھے معلوم نہیں کہ محبت کی مخالفت ہی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اور شاید اس وقت جب تو اس قدر شدومد سے اس کی ہستی کا انکار کرنا چاہتا ہے۔ محبت کا تیر انداز دیوتا تیرے دل کو للچائی ہوئی نگاہوں سے تاک رہا ہے۔

وہ بھٹکی بھٹکی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ دماغ کو کسی اور خیال میں مصروف کرنا چاہتا تھا' مگر اس کوشش کی ناکامی اس کی آنکھوں کے اضطرار سے ظاہر تھی۔ یک لخت اس نے ایک جست بھری۔ میز کے قریب آیا۔ اور گھنٹی پر زور سے ہاتھ مارا.......اس کے چہرے پر اب تسکین تھی' گویا اُس نے کوئی بڑا عقدہ حل کر لیا تھا۔

ایک معتبر صورت ملازم داخل ہوا اور "سرکار" کہہ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا' اسلم نے کچھ نہ سنا۔ اور پھر بہت زور سے گھنٹی پر ہاتھ مارا۔ وہ ایک بچے کی طرح اپنے خیال سے کھیل رہا تھا۔ ملازم نے ذرا آگے بڑھ کر اور ذرا بلند آواز سے یاد دلایا۔

"میں حاضر ہوں سرکار!"

اسلم نے اس کی طرف دیکھے بغیر گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ اور ابھی ملازم دو قدم ہی چلا ہو گا کہ وہ زور سے چلایا۔ "جلدی' بہت جلدی۔"

اب وہ ایک لمحے کے لئے بھی اس کمرے میں نہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ اس آواز نے ملازم کے اعصاب پر ایک برقی اثر پیدا کیا' اور وہ بھاگا.... ابھی دو منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ اسلم بالکل بے قرار ہو گیا___ وہ حیران تھا کہ کیا گاڑی تیار کرنے کے لئے دو مکمل دنوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے___ وہ وقت کا ناقابل برداشت بوجھ محسوس کر رہا۔ اسے آج وقت آہستہ آہستہ رینگتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ وہ بے صبری سے باہر نکلا اور گاڑی کو اپنے دروازے کے سامنے نہ دیکھ کر آج پہلی مرتبہ سائیس کو اس کے کام کی اہمیت اور اپنے وقت کی قیمت بتانے کے لئے اصطبل کی طرف چلا___ وہ صرف وقت کو صرف کرنا چاہتا تھا۔ طبل کے دروازے پر پہنچ کر اسے بڑی حیرت ہوئی' اس کو توقع تھی کہ وہ سائیس کو حقہ پیتے ہوئے' ملازم کو باتیں کرتے ہوئے اور گھوڑے کو ابھی تھان پر بندھے ہوئے پائے گا۔ مگر وہاں معاملہ بالکل برعکس تھا___

سب ملازم غیر معمولی دلچسپی اور تیزی سے گاڑی تیار کرنے میں مصروف تھے___ سائیس کی لڑکی دھنیا بھی ایک جھاڑن سے گاڑی صاف کر رہی تھی___ وہ اپنے حکم کی تعمیل کو ایک عملی شکل میں دیکھ کر خوش ہوا' اسے اپنے لفظ کی اہمیت کا احساس ہوا۔ خدا کے اتنے بندے اس کا حکم ماننے کے لئے اپنی تمام قوتیں صرف کر رہے تھے' وہ دو چار قدم آگے بڑھ گیا' اب اس کی آنکھیں صرف ایک حرکت کو اپنی آنکھوں کے محدود حلقوں میں جذب کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس کا دماغ صرف ایک حرکت کو سمجھنے میں مستغرق تھا' یہ حرکت ایک نازک' سانولے' چاندی کے کنگن والے ہاتھ کی تھی___ جو گاڑی کو صاف کرنے میں مصروف تھا' دھنیا' کی پشت اسلم کی طرف تھی'___ وہ صرف ایک بلند' سڈول' اور صحت مند جسم کے حسن کو دیکھ رہا تھا اور صرف اس سانولے ہاتھ کو جو برابر ادھر اُدھر حرکت کر رہا تھا...

اسلم کا پاؤں ایک اینٹ سے جو راستہ میں پڑی تھی رکا۔ ایک آہٹ پیدا ہوئی' اور وہ سب لوگ جو گاڑی تیار کر رہے تھے۔ ادھر متوجہ ہو گئے...

مگر اسلم کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس کی آنکھوں نے پہلے کسی دور دراز پہاڑ پر چمکنے والی بجلی کی چمک دیکھی۔ پھر ایک برسات کی چڑھی ہوئی ندی کی روانی دیکھی [illegible] دنیا تاریک ہو گئی۔

دھنیا نے آقا کو دیکھتے ہی شرما چکی تھی اور جھانن پھینک کر تیزی سے اپنی کوٹھڑی کی طرف دوڑ کر غائب ہو چکی تھی۔

اسلم کچھ نہ سمجھ سکا' سائیس گاڑی دروازے پر لایا۔ اسلم چپ چاپ سوار ہو گیا' سائیس حکم کا منتظر تھا۔ اسلم ذرا گھبرا کر چونکا اور سنبھلا مگر پھر خاموش ہو گیا۔ گاڑی چلی' اسلم نے ایک جذبہ بے اختیار سے مڑ کر اصطبل کی طرف دیکھا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ وہ کوئی قیمتی چیز کھو بیٹھا ہے۔ یا اس کل میں جس کا نام اسلم ہے۔ کسی اہم جزو کی کمی واقع ہو گئی ہے۔ وہ اس تصویر کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتا تھا۔ جو اس کے ذہن میں موجود تھی۔ مگر اس کی آنکھوں کے سامنے نہ تھی۔

ابھی گاڑی نے مشکل سے کوئی دس گز کا فاصلہ طے کیا ہو گا۔ کہ اسلم نے سائیس کو واپس ہونے کا حکم دیا۔ شریر' چالاک اور تندرست گھوڑا اس قدر جلدی مڑنے پر بھڑکا' بوڑھے سائیس نے اپنے کمزور ہاتھوں کی طاقت کے اظہار کے لئے گھوڑے کو ایک چابک رسید کیا۔ گھوڑا ایک ایسے غیور اور باحمیت شخص کی طرح جو اپنی بے بسی کی حالت میں ذرا سی سبکی کو اپنی انتہائی ذلت سمجھ کر بگڑ جاتا ہے' بگڑا اور اس نے تین چار ایسی چوکڑیاں بھریں کہ گاڑی اصطبل کے دروازے کے سامنے آ کر الٹ گئی۔ سائیس نے گرتے ہی ایک چیخ ماری۔ گاڑی کے الٹنے کی آواز' گھوڑے کی تڑپ کا شور اور سائیس کی چیخ سن کر نوکر چاکر اصطبل اور کوٹھی سے بھاگے اور ان میں دھنیا بھی تھی۔

سائیس کو کوئی چوٹ نہ آئی۔ مگر اسلم گاڑی سے کوئی سات آٹھ قدم پرے گر کر بے ہوش ہو چکا تھا۔ ہمدردی اور غمگساری کے اس فطری تقاضے سے مجبور ہو کر جو عورت کو مرد کے لئے ایک لازوال نعمت بنا دیتا ہے۔ دھنیا اسلم کی طرف دوڑی اور پھر کچھ سمجھ کر پلٹی' وہ ساتھ ہی کے نل سے پانی کا ایک چلو بھر کر لائی اور اس سے پیشتر کہ مرد نوکروں کا وہ متحیر اور ششدر جم غفیر کچھ کر سکتا۔ ایک عورت نے اپنے انہیں نازک' سانولے اور چاندی کے کنگنوں والے ہاتھوں سے اسلم کے چہرے پر پانی کے دو چھینٹے دیئے۔

اسلم نے ذرا تڑپ کر آنکھیں جھپکیں اور پھر وہ ٹکٹکی لگا کر اس عورت کو جو اب اپنی پوری شان بے حجابی سے اس کے سامنے تھی' دیکھنے لگا۔ دھنیا نے پانی کے بے شمار قطروں کو جو موتیوں کی طرح اسلم کے چہرے پر ڈھلک رہے تھے اپنی آنچل سے صاف کر دیا۔

دھنیا سائیس کی بیٹی تھی' مگر عورت تھی' عورت اپنے فرض کی ادائیگی میں وقت' موقع اور محل کی تلاش نہیں کرتی' جس طرح محض قدرت کی طرف سے کسی خاص جڑی بوٹی میں اکسیر کا اثر ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح عورت کے ہاتھ میں مسیحائی اثر ہے۔ اس کا ذرا سا اشارہ' اس کا ہلکا سا سہارا برسوں کی تکلیف اور مدتوں کے آلام کو زائل کر دینے کے لئے کافی ہے۔ دکھے ہوئے دلوں کی تسکین' برباد گھروں کی آبادی' قدرتی بیماریوں کا قدرتی علاج صرف عورت ہے۔

وہ اپنا فرض ادا کر چکنے کے بعد چلی' اسلم کی پرنم نگاہیں' جن میں احسان مندی اور شکر گزاری موجزن تھی' ایک کمزور اور تھکے ہوئے مگر ارادت مند بھکاری کی طرح اس کے پیچھے پیچھے جا رہی تھیں...

اور اسلم کی آنکھوں سے دور اس کی عظمت و منزلت سے بے پروا ایک اندھا دیوتا اس کے دل پر تیر اندازی کی مشق کر رہا تھا۔

(۳)

آج اسلم اپنی کوٹھی کے ہشت پہلو کمرے میں ایک خوبصورت اور آرام دہ صوفے پر رنگین اور ریشمیں تکیوں کے سہارے بیٹھا

تھا۔اس کے چہرے پر سکون تھا' وہ سکون جو کسی لمبی اور خوفناک بیماری کے بعد چہرے پر ظاہر ہوتا ہے۔وہ سکون 'جو ایک خوفناک طوفان کے بعد سمندر کی سطح پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا ہر عضو آرام اور اطمینان کے مزے لے رہا ہے۔
یہ ہشت پہلو کمرہ کوٹھی کا سب سے زیادہ شان دار اور آراستہ کمرہ تھا۔ مگر اسلم آج دوسری ہی مرتبہ اس کمرے میں آیا تھا۔ہاں اس کمرے کی ایک ہی کمی 'جو ہر قسم کی تصویروں کی غیر موجودگی سے 'ہر دیکھنے والے کو محسوس ہوا کرتی تھی 'پوری کر دی گئی تھی۔اب تصویریں ایک انتقامی ولولے کے ساتھ ہر دوسری آرائش کو پس پشت ڈال رہی تھیں۔ان تصویروں کو اسلم نے پچھلے ہفتے اس ذوق شوق سے خریدا تھا' کہ شاید یہی ایک کام اس کی زندگی کا منشا و مقصد ہے۔ آج وہ اس مقصد کی تکمیل پر خوش ہو رہا تھا۔ان تصویروں کو دیکھ کر اپنے حسن مذاق کی خود ہی داد دے رہا تھا۔

اس کے سامنے دیوار پر ایک بہت بڑی رنگین تصویر آویزاں تھی۔ یہ انسانی دستکاری کا بہترین نمونہ تھی 'اس کے نیچے روشن حروف میں "فتح حسن" لکھا تھا۔ یہ تصویر ایک حسین عورت کی تھی 'جو متکبرانہ انداز سے ایک خوش نما درخت کی ڈال کے ساتھ جھکی ہوئی کھڑی تھی۔درخت کے ارد گرد خوبصورت پرندے تھے۔جو بظاہر اس حسین عورت کے قدموں پر تڑپ تڑپ کر جان دینے ہی کو مآل زندگی تصور کیے ہوئے تھے۔ادھر اُدھر کے گھنے جنگلوں سے وحشی درندے پرستارانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔سامنے کے روشن دان سے کبھی کبھی ایک عجیب پراسرار روشنی اس تصویر پر منعکس ہو جاتی تھی۔جس سے اس بے جان تصویر میں زندگی کی حرارت پیدا ہو ہو کر رہ جاتی تھی۔

کمرے کے دائیں کونے میں ایک ہاتھی دانت کی مرصع اور خوش وضع تپائی پر ایک نوجوان لڑکی کا مجسمہ رکھا تھا' جو ابھی ابھی خواب نوشیں سے بیدار ہو کر انگڑائی لے رہی تھی' دونوں باہیں ایک ذرا پیچھے کی طرف جھکے ہوئے سر کے اوپر اس خوبصورت بت کا محراب بن گئی تھیں۔کھلے ہوئے سیاہ اور لمبے بالوں نے اس کے چہرے کے ایک حصے کو چھپا رکھا تھا' اس کے حاشیے پر اسی طرح روشن حروف میں "فتنہ بیدار" لکھا تھا۔

اسلم کے بائیں پہلو کے قریب ایک آبنوس کے خوب صورت مگر بڑے پشتیبان کے سہارے ایک اور تصویر رکھی تھی جو "بارگاہ عشق" کے نام سے موسوم تھی۔اس میں عشق کا دیوتا' حور پیکر پری جمالوں کے عقد ثریا میں گھرا ہوا تھا' ایک خوبصورت مگر سرکش حسین لڑکی کو زنجیروں میں مقید کر کے اس کے حضور لا رہے تھے۔جسے دیکھ کر وہ اپنے پھولوں کے ترکش سے ایک تیر نکال کر ایک چھوٹی سی پھولوں کی کمان میں جوڑ رہا تھا۔

اسلم ان سب تصویروں کو ایسے دیکھ رہا تھا' گویا وہ کسی بیہوش کرنے والی شراب کے دریا میں' اور اس کی پیاسی آنکھیں تہیہ کر چکی ہیں کہ آج ان دریاؤں کو سکھا دیا جائے گا۔ مگر وہ کبھی کبھی گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگ جاتا۔ کیونکہ جس تصویر کو بھی وہ دیکھتا تھا' اس کی شکل و صورت میں آہستہ آہستہ تغیر رونما ہونا شروع ہو جاتا تھا' اور کچھ وقفے کے بعد اس کی آنکھوں کو اس تصویر کے پس منظر پر دھنیا' کے سوا اور کسی کی صورت نظر نہ آتی تھی۔

کئی روز سے اس کی یہی حالت تھی یعنی اس وقت سے جب اس نے دھنیا' کو پہلی دفعہ دیکھا تھا' اس وقت کا ایک ایک دن اور اس دن کی ایک ایک ساعت اس کے لئے ایک مسرت مجسم' ایک سرور لازوال بن گئی تھی۔ جس چیز کی تلاش میں وہ مارا مارا پھرتا تھا اسے

مل گئی تھی اب ہر ایک شے اس کے لئے معنی رکھتی تھی اب اس کی زندگی ایک مقصد کے لئے وقف ہو گئی تھی اب اس نے عورت کی پیدائش کا راز معلوم کر لیا تھا۔

پچھلے ہفتے کے سات دن اس کے لئے سات برس ہو گئے تھے ان سات دنوں میں دھنیا کے متعلق کوئی سات ہزار تجویزیں اس کے ذہن میں آئیں' سب سے پہلے اس کے دماغ میں وہی خیال آیا' جو ہر معمولی مرد کے دماغ میں ایک خوبصورت عورت کو دیکھ کر آتا ہے۔ اس نے اس پر ایک بے زبان حیوان کی طرح ملکیت کا قبضہ حاصل کرنے کی تجویز کی' اس کی قیمت لگائی' مگر ہر قیمت اس کا حسن خریدنے کے لئے کم نظر آتی تھی۔ پھر اس نے اس خیال کو ناپاک' نازیبا اور بالکل عامیانہ خیال سمجھ کر ترک کر دیا۔ پھر اس نے شادی کرنے کی تجویز کی' مگر آہ ___

دھنیا کے مذہب کا تعصب' دھنیا کی قوم کی عصبیت' دھنیا کی ذات کی دیوار اس کے ارادے اور اس ارادے کی تکمیل کے درمیان حائل تھی' وہ جانتا تھا کہ دھنیا کی غریب اور محنت کش برادری کسی قسم کے بیرونی دخل کی اپنی انتہائی ذلت تصور کرتی ہے۔ وہ اپنے مقدمات کو عدالت کے دروازوں تک لے جانے سے احتراز کرتی ہے۔ اس وقت اسے محسوس ہوا کہ انسان نے انسانی حقوق کو پامال کرنے کے لئے کس قدر حیوانیت سے کام لیا ہے۔ وہ گھبرا گیا' مگر اس نے ایک پوری رات کی نہ ختم ہونے والی گھڑیوں میں ٹہل ٹہل کر یہ مسئلہ بھی حل کر لیا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ عام انسانوں اور ان کے قاعدوں سے ایک بہتر روش اختیار کرے گا۔ اس کی روح تکلیفیں برداشت کر کر کے جسمانی آلائشوں سے پاک ہو چکی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا اور اپنے کمرے کی ساکن اور خاموش دیوار کو سمجھا رہا تھا۔ "جس چیز سے محبت کی جائے۔ وہ یقیناً خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ ہر خوبصورت چیز کو مقدس سمجھنا چاہیے' مقدس بتوں کی عزت کی جاتی ہے' پرستش کی جاتی ہے۔ مقدس چیزوں کو لوگ ہاتھ نہیں لگاتے دور سے دیکھتے ہیں.. شاید ان کو آنکھوں سے دیکھنا بھی خلاف ادب ہے' عاشق و معشوق میں بعد مکانی ضروری ہے تاکہ وہ روحانی ارتباط' وہ برقی تسلسل جو اجسام کے وصال میں ناممکن ہے۔ قائم ہو سکے' چھونے سے مقدس اشیاء کی پاکیزگی فنا ہو جاتی ہے.... ان کے اسرار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ محبت مقام پرستش کی ایک منزل ہے۔ مقدس اشیاء سے مادی مفاد کی امید درست نہیں۔ کیا ایک مفید اور کار آمد چیز سے بھی کوئی شریف اور خوش مذاق انسان محبت کر سکتا ہے؟.... تعجب ہے۔ لوگ ان عورتوں کو جن سے وہ محبت کرتے ہیں' اپنی بیویاں بنانا چاہتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ بڑے زور سے ہنسا' لوگوں کی جہالت پر' اس عام خیال کی بے ہودگی پر' اور پھر اپنی کامیابی پر خوش ہوا' وہ اپنی بند آنکھوں میں ایک نئی دنیا کی وسعتیں دیکھ رہا تھا۔

اس واقعے کے بعد دو تین روز اور گزر گئے۔ آج وہ اتنا خوش تھا کہ اسے اپنی مسرت پر خود حیرت ہو رہی تھی' اور اس لئے وہ آج ارادتاً اس کمرے میں اپنی خوشی کو خود محسوس کرنے کے لئے بیٹھا تھا۔

اس نے خلاف معمول ملازم کو آواز دی' وہ زبان سے ہمیشہ بہت کم کام لیا کرتا تھا۔ ملازم حاضر ہوا' تو اس نے دھنیا کے باپ کو بلانے کا حکم دیا۔ ملازم حیران ہوا' کہ آج سائیس کو اس کے اپنے نام کی بجائے اس رشتے سے کیوں یاد کیا گیا ہے۔ لیکن وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔ وہ ایک شریف گھرانے کا مودب ملازم تھا۔

دھنیا کا باپ آیا' اسلم نے اپنی جھکی ہوئی گردن اٹھائی' اس کی آنکھوں میں دو بڑے بڑے آنسو روشن تھے۔ اس کے زرد اور

پر اطمینان چہرے پر سرخی کی ایک رو دوڑ رہی تھی ہو، وہ اپنے گالوں کی گرمی اپنے ذہن میں محسوس کر رہا تھا۔

اس نے کچھ رک رک کر، کچھ سوچ سوچ کر آخر کار کہا۔

"تم نے..... دھنیائی.... (ا... ہم).. شادی اب تک کیوں نہیں کی"۔ .

سائیس اس خلاف توقع تفتیش سے گھبرا گیا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی۔ "حضور کوئی دو چار پیسے ہوتے ہیں، تو شادی بھی کر دی جائے گی۔ منگنی تو ہو چکی ہے۔"

اسلم کے دل میں ایک غیر محدود مسرت کا طوفان اٹھا، وہ دھنیا کے اس عظیم الشان احسان کا بدلہ اتار سکتا تھا۔ ایک لڑکی کو ایک کامیاب اور بامراد عورت بنانے کے رستے میں صرف سوے چاندی کے چند سکے حائل تھے __ اس نے ذرا جلدی جلدی کہنا شروع کیا۔

"دیکھو رام بلی، تمہاری بیٹی نے ہماری جان بچائی ہے۔" وہ صرف اس کام کو کرنے کے لئے جسے وہ کرنا چاہتا تھا، ایک بہانے کی تلاش میں تھا، وہ خوب جانتا تھا کہ پانی کے دو چھینٹے دینے کے سوا دھنیا نے اور کچھ بھی نہیں کیا تھا __

"اس احسان کا بدلہ ادا کرنا ممکن نہیں۔"

بے چارا سائیس کچھ نہ سمجھا، اس نے صرف اتنا ہی کہا۔

"وہ آپ کی لونڈی ہے۔"

اسلم یہ جواب سننے کے لئے تیار نہ تھا، وہ جلدی میں خدا جانے کیا کیا کہہ گیا۔

"وہ لونڈی نہیں ہے ملکہ ہے، وہ عورت ہے۔ وہ مرد کی قسمت ہے۔ وہ نیکی کی دیوی ہے۔ وہ احسان کی مجسم تصویر ہے __

تم نے کیا کہا لونڈی ہے... تم نے گناہ کیا ہے۔ توبہ کرو، وہ عورت ہے۔ وہ ماں ہو سکتی ہے۔ وہ بہن ہو سکتی ہے، وہ بیٹی ہو سکتی ہے۔ وہ بیوی ہو سکتی ہے۔ مگر لونڈی کبھی نہیں ہو سکتی..... تم اس کے باپ ہو، اس لئے میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔"

اسلم کے دل کی حرارت کو کون سمجھ سکتا تھا۔ جس چیز کو محسوس کرنے کے لئے اس نے اپنی عمر کی بہترین ساعتیں بیکار صرف کی تھیں، جس جذبے کی زندہ تصویر دیکھنے کے لئے اس کے دن کا آرام اور رات کی نیند حرام ہو گئی تھی، اسے اس نے دھنیا کے ہاتھ کی ایک حرکت میں دیکھ لیا تھا، اس کی ایک نظر میں محسوس کر لیا تھا۔

دھنیا اس کے لئے صرف ایک پرستش کے قابل چیز تھی۔ وہ اپنے دل ہی دل میں کچھ فیصلہ کر چکا تھا، اور جس کام کے لئے وہ اپنے آپ کو تیار کر چکا تھا، اب اسے کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا، اور ایک لفافہ نکالا، اس میں بینک کی ایک کتاب اور ایک مکان کا قبالہ تھا۔ اس نے ایک ایسے عقیدت مند پجاری کی طرح جو پھولوں کا ایک حقیر ہار اپنے دیوتا کے قدموں پر نچھاور کرتا ہے، کانپتے ہوئے ہاتھوں سے یہ لفافہ بوڑھے سائیس کی طرف بڑھایا، اور کہا۔ "لو، یہ میری طرف سے دھنیا کو دے دو، یاد رکھو، یہ اس کے احسان کا عوض نہیں، وہ کبھی ادا نہیں ہو سکتا، اسے میں ادا کرنا نہیں چاہتا، اس کے نام پچاس ہزار روپے بینک میں جمع کرا دیئے گئے ہیں، یہ اس کے حساب کی کتاب ہے اور یہ اس سامنے والی کوٹھی کا قبالہ ہے۔ آج سے وہ کوٹھی میری نہیں، دھنیا کی ہے۔"

سائیس مبہوت تھا اس کے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے' وہ گرنا چاہتا تھا اس کا دماغ اس کے کانوں کے خلاف بغاوت کر رہا تھا۔ اس نے سنبھل کر کچھ کہنے کی کوشش کی۔ مگر اس سے پیشتر کہ وہ منہ سے کوئی لفظ نکال سکتا' اسلم نے ذرا زور سے چلا کر کہا۔ "ایک لفظ نہیں' ایک حرف نہیں' میں شکریہ نہیں چاہتا' جاؤ۔"

سائیس ایک بے جان مگر متحرک بت کی طرح دروازے کی طرف حرکت کر رہا تھا' وہ نظروں سے غائب ہو گیا۔ اسلم ایک پر کیف انداز سے اٹھا' اس کے چہرے پر آسمانی نور کی ایک جھلک تھی' اس کے لبوں پر تبسم تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں' اور اس کو وہ اطمینان قلب' وہ روحانی تسکین' وہ جسمانی آرام میسر تھا' جو صرف ایک نیک دل انسان کو ایک نیک کام کی تکمیل کے بعد ہی میسر آ سکتا ہے۔"

تین پیسے کی چھوکری

قاضی عبد الغفار

(۱)

آج سے پندرہ سو برس پہلے!

بائی زنطہ کے شاہی سرکس میں، بادشاہ کے وحشی جانوروں کا داروغہ ایک بوڑھا شخص تھا، بہت بوڑھا، مگر اپنے کام میں بہت ہوشیار، اس نے اپنے بڑھاپے کا سہارا ایک بارہ سالہ چھوکری کو بنالیا تھا۔ جس کو نہ معلوم وہ کہاں سے لایا تھا۔ وہ نہ اس کی بیٹی تھی نہ پوتی نہ رشتہ دار، نہ اس کی ہموطن، لیکن اس نے منہ بولی بیٹی بنالیا تھا، اور بیٹی ہی کی طرح چاہتا تھا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اس چھوکری کی قوم کیا ہے۔ اس کا مذہب کیا ہے اور وہ کس طرح بڈھے کے پاس پہنچی۔

بائی زنطہ کے عظیم الشان دارالسلطنت میں شہنشاہ جسٹینین کا پرچم اقبال بلند تھا۔ اس زمانہ کی تہذیب اور بائی زنطی مخلوق کا تمدن، خصوصاً امراء اور عمائدین کی معاشرت یونان و روما کی قدیم تہذیب سے بھی دس پانچ قدم آگے تھی۔

شہنشاہ اور اس کے امراء و اراکین سلطنت کے اسباب تفریح و تعیش میں سے ایک یہ سرکس بھی تھا۔ جس میں ہزاروں قسم کے وحشی اور جنگلی جانور پالے جاتے تھے۔ ۱۲ برس کی چھوکری کو دنیا میں کوئی کام نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ سرکس کے درندوں میں صبح سے شام تک کھیلتی رہتی۔ وہ حسین بھی تھی اور شوخ بھی۔ اور دل اس کا ایسا ہی بے خوف تھا جیسا کہ وحشی درندوں کا، اسے معلوم ہی نہ تھا کہ خوف کس چیز کا نام ہے۔ وہ شیروں کی ایال پکڑ کر لٹک جاتی تھی اور دوپہر کو کھیلتے کھیلتے اکثر ہاتھی کے پیٹ کے نیچے لیٹ کر سو جاتی تھی۔ اس کی دنیا میں اس کے رفیق اور دوست ہاتھی اور ریچھ ہی تھے۔

دن بھر بڈھا سرکس کے جانوروں کی خدمت میں مصروف رہتا اور چھوکری اپنے کھیل میں، شام کو چھوکری سرکس سے تو چلی گئی۔ لیکن گھر نہ پہنچی۔ رات بھر بڈھا اس کا انتظار کرتا رہا۔ رات بھر وہ غائب رہی صبح کو وہ ہنستی ہوئی گھر آئی اور بڈھے کے ہاتھ پر تین چمکتی ہوئی اشرفیاں رکھ دیں! یہ اس کے حسن کا پہلا سودا تھا! یہ اس کی جوانی کا پہلا منافع تھا! گزری ہوئی شام اور موجودہ صبح کے درمیان، گذشتہ شب کی تاریکی میں بڈھے کی چھوکری عورت بن گئی!

راتوں کو غائب رہنے کا سلسلہ جاری رہا اور سرکس کے درندوں کے ساتھ جو کھیل کود ہوا کرتا تھا۔ وہ اب دوسری قسم کے

حیوانوں کے ساتھ کھیلا جانے لگا! یہ آغاز تھا ملکہ بازنطہ کی حکومت کا!

تھوڈورا کی جوانی اب ہر طرف سے آنکھوں' نظروں اور دلوں کو کھینچ رہی تھی۔ وہ شاہی سر کس میں ناچا کرتی تھی اور بائی زنطہ کے ہزاروں نظر باز شام کو اس کے حسن کی خاطر سر کس میں جمع ہو آکر تے تھے۔ شاہی دربار کے رکن رکین بشپ وجیلس نے تو ایک دن تھوڈورا کو ناچتے ہوئے دیکھ کر بے اختیار کہہ دیا۔"

"گھانس کا یہ پھد کتا ہوا کیڑا کسی دن سارے بائی زنطہ میں اچھلیگا ________ دیکھنا!"

لیکن اس وقت بشپ کو بھی خبر نہ تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے! ستم ظریف قدرت اس ناچنے والی کو نہ معلوم کہاں سے کہاں تک اچھالنے والی تھی!

تھوڈورا سر کس کے نظر بازوں سے تھک گئی۔ ایک ہی کھیل کا بار بار کھیلنا اس کو کبھی نہ بھاتا تھا۔ اب وہ منظر عام پر تھر کنے کی بجائے مخصوص خلوتوں میں ایک بلند نشین حسن فروش بن بیٹھی۔ حسن فروشی اس عہد کی تہذیب میں کوئی ایسی معیوب بات نہ تھی بلکہ حسن وہوس کے یہ کھیل تماشے تو بائی زنطی تہذیب کے جزو لازمی تھے۔ امراء طوائفوں کی نگہ التفات کو سرمایہ افتخار سمجھتے تھے اور عوام کی زندگی ان رنگین تتلیوں کے بغیر بے رنگ ہو جاتی تھی۔ حسین تھوڈورا اپنی دوکان حسن کھولتے ہی' دلوں کی مالک' آنکھوں کا تارا کلیجوں کی ٹھنڈک اور گھروں کا چراغ بن گئی۔ امراء اس کے اشارہ ابرو کا انتظار کرتے۔ ان کی خوں آشام تلواریں اس کے قدموں میں پڑی ٹھوکریں کھایا کرتیں! اہل علم اور اہل مذہب بھی اس دیوی کے استھان پر سر جھکاتے تھے اور سر کس کی ناچنے والی چھوکری بائی زنطہ کی حسن پرست دنیا میں ایک "ملکہ عالم" تھی کہ اس کا سکہ ہر طرف جاری تھا!

نوجوان شہنشاہ جیسٹینین بارہا اس کو تھیٹر میں ناچتے' باغوں میں اٹھکھیلیاں کرتے اور باسفورس کے ساحل پر ایک ہجوم عاشقاں کے ساتھ چہل پہل کرتے دیکھ چکا تھا۔ اس کے دل میں خلش تھی۔ تیر اپنے نشانہ پر بیٹھ چکا تھا۔

ایک شب شہنشاہ نے اپنے محافظ دستہ کے کپتان کو موتیوں کا ایک بیش قیمت ہار دے کر تھوڈورا کے گھر بھیجا اور پیام دیا کہ وہ شاہی خلوت میں آئے۔ آدھی رات کے قریب شاہی کپتان تھوڈورا کے دروازے پر آیا۔ اس وقت تھوڈورا کی خلوت میں اس کا کوئی چاہنے والا موجود تھا۔ اس نے کپتان کو گھر کے اندر نہ بلایا۔ بلکہ خود دروازے پر آگئی۔ شہنشاہ کا پیام سن کر اس نے کہا۔

"شہنشاہ کی یاد فرمائی کا بہت بہت شکریہ' مگر یہ ہار واپس لے جایئے۔ میں بکاؤ نہیں ہوں' شہنشاہ سے کہہ دیجئے کہ اس ہار سے کسی دوسری حسین چھوکری کا حسن خرید لیں ______ میری قیمت اس ہار سے بہت زیادہ ہے!

اب وہ سر کس کی بجائے ایک عظیم الشان سلطنت کے شیر اور ہاتھی سے بے خوف ہو کر کھیل رہی تھی!!

اسی شب پھر ایک شاہی مصاحب' شہنشاہ کا پیام' بہت سے تحائف اور اکرام والطاف کے بہت سے وعدے لے کر آیا۔ تھوڈورا نے دوسرا پانسہ پھینکا۔

"شہنشاہ سے کہہ دیجئے کہ وہ اس کنیز کے طالب ہیں تو اس کے سیہ خانہ پر تکلیف فرمائیں"

بائی زنطہ کے شہنشاہ سے' جس کی خاک پا بادشاہوں اور گردن کشوں کی سجدہ گاہ تھی۔ یہ گستاخانہ سوال وجواب' موت سے کھیلنا تھا مگر تھوڈورا نے بہت بڑی بازی لگائی تھی ______

شب کی آخری ساعتوں میں بالآخر شہنشاہ خود اس کے دروازے پر آیا۔ جس وقت وہ اندر داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ تھوڈورا ایک صلیب کے سامنے جھکی ہوئی عبادت میں مشغول ہے! بہت دیر بعد اس نے اس طرح کہ وہ گویا کسی دوسرے عالم میں ہے۔ نظر اٹھا کر شہنشاہ کی طرف دیکھا۔

"تم ہی تھوڈورا ہو؟" شہنشاہ نے سوال کیا۔

"ہاں حضور! میرا نام تھوڈورا ہے۔ میں شہنشاہ کے سرکس میں ناچا کرتی تھی۔"

"تم وہی ہو۔ جس کو ہر ملاح تین پیسے میں خرید لیا کرتا ہے؟" شہنشاہ کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔"

تھوڈورا نے کہا:۔

"جی ہاں! میں وہی ہوں!"

"پھر تم شہنشاہ کی خلوت میں آنے سے کیوں انکار کرتی ہو؟" اب جسٹینین کا غصہ تیز ہوتا جاتا تھا۔"

"حضور!" تھوڈورا نے دست بستہ عرض کیا۔ "ملاح کے پاس اس لئے جاتی ہوں کہ اس کی جیب میں تین ہی پیسے ہوتے ہیں اور وہ سب میں لے لیتی ہوں۔ وہ تین پیسہ دے کر اپنا سارا سرمایہ مجھے دے ڈالتا ہے۔"

"تو کیا تم اپنے چاہنے والوں سے۔ جو کچھ ان کے پاس ہو۔ سب ہی لے لیتی ہو؟"

"ہاں حضور! میں یہی کرتی ہوں اور یہی میری قیمت ہے!"

"تو پھر تم مجھ سے کیا مانگتی ہو۔"

"آپ کا تاج و تخت! اے بائی زنطہ کے شہنشاہ!"

اس طرح چند روز بعد یہ "تین پیسے کی چھوکری" شہنشاہ بائی زنطہ کی مشہور عالم ملکہ تھوڈورا بن کر اس زمانہ کی سب سے بڑی اور عظیم الشان سلطنت کے سیاہ و سفید کی مالک بنی!

وہ اپنا حسن بیچتے بیچتے ملکہ عالم بنی اور ملکہ عالم بن کر جب اس کو حسن فروشی کی ضرورت نہ رہی تو اس نے بائی زنطہ کے خوبرو نوجوانوں کی جوانی خریدنا شروع کر دی اس کی ہوس پرستی کی داستانیں اسی قدر مشہور ہیں جس قدر اس کا حسن!

(۲)

مسیحؑ کی پیدائش کے پانچ سو برس بعد!

بائی زنطہ کے دارالسلطنت میں

شہنشاہ جسٹینین اور اس کی عیش پرست ملکہ تھوڈورا کا زمانہ

بائی زنطہ کی شاہراہ پر تماشائیوں کا ہجوم ہے۔ شہنشاہ اور ملکہ عالم کی رعایا سڑک کے دونوں طرف ہزاروں کی تعداد میں جمع ہے۔ یہ وہ سڑک ہے جو شاہی محل سے ایا صوفیہ کو جاتی ہے۔ دو رویہ سپاہی کھڑے ہیں۔ سپاہیوں کے عقب میں اہل شہر' اور امراء و رؤساء سب ملکہ عالم کی سواری کے منتظر ہیں۔

ہفتہ میں ایک دفعہ ملکہ تھوڑورا۔ اباصوفیہ میں عبادت کرنے جایا کرتی ہیں۔ یہ جلوس قابل دید ہوتا ہے۔ ملکہ عالم کے شاندار جلوس کو دیکھنے والے گھنٹوں پہلے سے سڑکوں پر جمع ہوتے ہیں۔ اور دارالسلطنت میں ہفتہ کا یہ ایک دن گویا ایک عام یوم تعطیل ہوتا ہے ــــــ وہ ملکہ عالم کی عبادت کا دن ہے!!

دیکھیا کے محافظ دستہ کا ہراول سرخ وردیاں پہنے شاندار گھوڑوں پر سوار آہستہ آہستہ چلا آتا ہے۔ سواروں کی وردیاں اور ان کے چمکتے ہوئے اسلحہ دھوپ میں اس قدر چمک رہے ہیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں ــــــ اس دستہ کے پیچھے ایک مرصع تخت رواں ہے اور اس تخت رواں پر ایک مطلا شامیانہ کے نیچے ملکہ عالم تشریف رکھتی ہیں۔ تخت رواں کے سامنے امراء اور ارا کین سلطنت کی نوجوان اور حسین لڑکیاں ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے لئے ہوئے اور آٹھ چھوکریاں ہاتھوں میں چاندی کی گھنٹیاں لئے ہوئے چل رہی ہیں۔ چاندی کی گھنٹیاں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد بجائی جاتی ہیں۔ تخت رواں کے سامنے شاہی منصب دار قرمزی رنگ کا لمبا کپڑا بچھائے ہوئے آتے ہیں اور ملکہ کی سواری جب اس کپڑے پر گزر جاتی ہے تو اس کو لپیٹ لیتے ہیں۔ منصبداروں کی جماعتیں یہ خدمت انجام دیتی آتی ہیں تاکہ ملکہ عالم کے تخت رواں کا سایہ ناپاک زمین پر نہ پڑنے پائے!

تخت رواں جواہر اور سونے چاندی کی ضیاکاری کا ایک عجیب و غریب نمونہ ہے۔ اس کی چمک میں سورج کی شعاعوں نے گویا آگ لگادی ہے ــــ اس طرح بائی زنطہ کی ملکہ 'دورویہ خلائق کے سلاموں کا جواب سر کے اشارے سے دیتی ہوئی مسیح کی درگاہ میں جارہی ہے۔

سلطنت کے دیہاتی علاقہ کا رہنے والا ایک خوبصورت نوجوان استیف جو چند روز ہوئے دارالسلطنت کی سیر کرنے آیا تھا۔ اس وقت ایک کنوئیں کی دیوار پر کھڑا ہوا شاہی جلوس کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ اس کے قریب اس کا ایک شہری دوست کھڑا ہے۔ سواری قریب آگئی۔ دفعتہ ملکہ عالم کی نظر اس دیہاتی نوجوان پر پڑی مگر وہ نہ سمجھا سکا۔ وہ سمجھا کہ یہ غلط انداز نظر برسرراہ تھی۔ مگر وہ خوش تھا کہ آج اس نے ملکہ عالم کو اچھی طرح دیکھ لیا۔ بادشاہوں کا دیدار عقیدت مند رعایا کے دلوں کو پھول کی طرح کھلا دیتا ہے!

استیف بیچارے نے اپنی عمر میں پہلے کبھی شاہانہ طنطنہ کا یہ مظاہرہ کب دیکھا تھا! وہ اس نظارہ میں محو تھا کہ ملکہ کی سواری بالکل اس کے سامنے آگئی ــــ ایک لحہ کے ہزارویں حصہ میں اس نے یہ محسوس کیا کہ گویا اس کی نظر ملکہ عالم کی نظر سے ملی۔ گھبرا کر اس نے نظریں نیچی کرلیں ــــــ اتنی ہی دیر میں سواری آگے نکل گئی۔ استیف کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کو پسینہ آگیا تھا۔

شاہی سواری کے پیچھے پیچھے ایک منصب دار چاندی کے پھول لٹاتا ہوا جارہا تھا غریب اور امیر بڑھ بڑھ کر ان پھولوں کو لوٹ رہے تھے۔ جس کے ہاتھ ایک پھول آگیا۔ اس کو گویا بڑی سعادت نصیب ہوئی۔ منصبدار جب بڑھتے بڑھتے استیف کے قریب پہنچا تو اس نے اپنا ہاتھ لوگوں کے اوپر سے استیف کی طرف بڑھایا۔ اس کے ہاتھ میں چاندی کے پھول اور ایک تازہ گلاب تھا۔ استیف نے ــــ جیسے کوئی مخمور ہو یا عالم خواب میں ــــ ہاتھ بڑھا کر گلاب لے لیا' وہ چاہتا تھا کہ کچھ کہے 'شکریہ ادا کرے ــــــ لیکن اتنی دیر میں منصب دار بہت آگے نکل چکا تھا!

سواری باد بہاری گزر گئی۔ مجمع منتشر ہو رہا ہے۔ استیف گلاب کا سرخ پھول ہاتھ میں لئے جارہا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر شاہی منصبدار خاص طور پر اس کی طرف کیوں مائل ہوا۔ ہزارہا آدمیوں کے مجمع میں گلاب کا پھول تنہا اسی کو کیوں دیا گیا ــــ؟

گلاب بہت بڑا اور بہت خوبصورت تھا۔ وہ اس قسم کا پھول تھا۔ جس کے چند ہی درخت شاہی باغیچے میں تھے اور شاہی باغیچہ کے علاوہ کہیں نہ تھے۔ یہ گلاب بائی زنطہ میں شاہی محل کے علاوہ کہیں میسر نہ آسکتا تھا۔ مجمع سے باہر نکل کر استیف نے بغور اس پھول کو

دیکھا۔اس کی پتیوں کے نیچے ایک پرزہ بندھا ہوا تھا۔اس پرزہ پر سرخ رنگ سے یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے:۔

"شاہی محل کے جنوبی دروازے پر——— آج دس بجے——— یہ پھول لیکر آؤ——— اس پھول سے تمہاری قسمت کا دروازہ کھلے گا۔"

استیف ششدر رہ گیا۔وہ کچھ بھی نہ جانتا تھا۔کچھ نہ سمجھ سکتا تھا کہ اس واقعہ کے معنی کیا ہیں وہ کیوں محل کے دروازے پر جائے۔اس کی قسمت کا دروازہ کیونکر کھل سکے گا۔اس کا دل کہتا تھا:۔

"جانا چاہیے' اگر یہ شاہی اکرام والطاف کا اشارہ ہے تو تیری قسمت جاگ جائے گی۔کیا معلوم تو شاہی دربار میں منصبدار بنادیا جائے۔کیا معلوم تو کیا ہو جائے——— جانا چاہیے۔"

عقل کہتی تھی:۔

"کوئی دھوکا' کوئی فریب تو نہیں' بھلا کہاں ملکہ عالم' کہاں تو غریب دہقانی' منصبدار نے تیرے گنوارپن کا مذاق نہ اڑایا ہو کسی دشمن نے تجھے دھوکہ دے کر نہ بلایا ہو۔"

عقل اور دل کا جھگڑا ختم نہ ہوتا تھا۔لیکن قدم دل کے فرمانبردار تھے۔عقل کا زور ان پر نہ چل سکا۔وقت مقررہ سے کچھ پہلے استیف کے قدم بلا ارادہ شاہی محل کی طرف بڑھنے لگے۔کبھی اپنے دل سے' کبھی اپنی عقل سے الجھتا ہوا وہ چلا جارہا تھا———

دل کہتا:۔

"تیرا انتظار کیا جارہا ہے' قدم بڑھا۔"

عقل کہتی:۔

"تو بیوقوف ہے' تیرا انتظار! دیوانے! سپاہیوں اور دربانوں کی ٹھوکریں کھائے گا۔"

جوانی کا خون گرم تھا۔دل کی حرکت تیز تھی۔چہرہ پر سرخی جھلک رہی تھی۔پیشانی پر پسینہ کے قطرات تھے۔اس طرح استیف شاہی محل کے دروازہ پر پہنچا اس کو یہ خبر نہ تھی کہ دروازہ مغربی ہے یا مشرقی! وہ بڑھا چلا گیا!

شاہی محافظ فوج کا ایک دستہ بڑے دروازہ میں داخل ہو رہا تھا۔اس کے قدموں کی آواز اور تلواروں کی چمک استیف کو اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے اندر لے گئی۔وہ محل کے پہلے برآمدہ میں داخل ہوا۔جہاں شاہی دربان مسلح کھڑے تھے۔ایک قوی الجثہ حبشی بارگاہ کے پردے کے پاس ایک برہنہ تیغہ ہاتھ میں لئے کھڑا ہوا تھا۔استیف نے آگے بڑھ کر سرخ گلاب اس کے سامنے پیش کیا——— اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہے کیا؟

دربان مسکرایا۔"بیوقوف آدمی! مجھے کوئی حسین چھوکری سمجھا ہے تو نے؟ گدھا!"

استیف کے بدن میں ان تحقیر آمیز الفاظ نے آگ لگادی۔وہ بے اختیار ہو گیا۔اسے خبر نہ تھی کہ کس طرح اس نے دربان کے سیاہ تاب گال پر ایک چانٹا مارا——— سارے برآمدہ میں شور مچ گیا۔محافظ دستہ کے سپاہیوں نے اپنی تلواروں کے قبضوں سے مار مار کر استیف کو فرش پر گرادیا۔چند منٹ میں اس کا خاتمہ ہو جاتا۔مگر ہنگامہ کی آواز سن کر دربانوں کا داروغہ کمرہ سے نکل آیا۔اس کو دیکھ کر سپاہیوں نے ہاتھ روکا۔

"ارے تو کون ہے دہقانی؟" داروغہ نے کہا

استیف جھنجھلایا ہوا اٹھا۔اس کا گلاب زمین پر گر گیا تھا۔اس کی چند پتیاں منتشر ہو چکی تھیں جھک کر اس نے گلاب کو زمین سے

اٹھایا اور اٹھا کر داروغہ کے سامنے پیش کر دیا۔

"ہاں! اس سرخ گلاب کو دیکھ کر داروغہ مسکرایا۔ "بے وقوف آدمی! اس پھول کو لے کر یہاں کیوں آئے؟"

پھر اس نے مجمع کی طرف دیکھ کر سپاہیوں کو جھڑکا۔

"جاؤ اپنا کام کرو کیا کچھ تماشہ بنایا ہے؟" جب سپاہی ہٹ گئے تو اس نے استیف کے کاندھے پہ ہاتھ رکھ کر دبی زبان سے کہا۔

"یہ حماقت کی تم نے! اس پھول کو لے کر یہاں گھس پڑے۔ تمہیں جہاں یہ پھول لے کر جانا چاہیے۔ یہ وہ جگہ نہیں۔"

"یہ کہہ کر استیف کو وہ اپنے ساتھ ایک دوسرے دروازہ پہ لے گیا اور وہاں کے چوبدار کو آواز دے کر کہا

"لو یہ ایک بے وقوف پھول والا آیا ہے۔ اس کو اندر پہنچاؤ۔ یہ آدمی ہماری طرف کا نہیں ہے۔ تمہاری طرف کا ہے۔"

ملکہ کے چوبدار نے پھول پہ نظر کی اور استیف کو پیچھے آنے کا اشارہ کر کے ملکہ کے محل کے دروازے میں داخل ہو گیا۔

آراستہ اور خوبصورت برآمدوں اور کمروں سے گزر کر ــــ آگے آگے چوبدار اور اس کے پیچھے استیف ــــ دونوں ایک پر فضا باغیچہ میں داخل ہوئے۔ جس کے وسط میں ایک فوارہ جاری تھا۔ اس کے پانی کی سطح پر سینکڑوں رنگین پھول تیر رہے تھے۔ باغیچہ سے گزر کر ملکہ عالم کی خاص محلسرا تھی۔ محلسرا کے برآمدوں میں نو عمر اور خوبصورت لڑکے 'زرق برق لباس پہنے ہوئے' حسین ملائیں اور باندیاں 'خوفناک شکل کے خواجہ سرا اور حبشی غلام جن کے سروں پر زردار پگڑیاں بندھی ہوئی تھیں 'کچھ بیٹھے' کچھ لیٹے' کچھ ٹہل رہے تھے۔ کچھ چھوکریاں قدم بڑھائے ادھر سے ادھر جا رہی تھیں۔ استیف کی دہقانی وضع اور پھر اس کے ہاتھ میں سرخ گلاب کے پھول کو جس نے دیکھا۔ وہ منہ پھیر کر مسکرا دیا۔ شاہی خواصیں اپنے ہاتھ کے پنکھوں کی آڑ میں ایکدوسرے کو اشارے کر رہی تھیں اور کم عمر لڑکے منہ پہ ہاتھ رکھ کر اپنی ہنسی روک رہے تھے۔

استیف کو اپنے گردو پیش ان حرکات کی کچھ خبر نہ تھی۔ وہ چوبدار کے پیچھے پیچھے پردہ اٹھا کر شاہی محلسرا کے خاص کمروں میں داخل ہوا۔

ایک مزین کمرہ کے گوشے میں ریشم کے قرمزی پردوں کی آڑ میں 'بڑے بڑے گدوں اور تکیوں پر ملکہ تھوڈورا آرام فرما رہی تھیں۔ ایک رنگین فوارہ کمرے کے وسط میں جاری تھا چھوٹی میزوں پر تازہ پھولوں کی ڈھیریاں رکھی ہوئی تھیں۔ جن کی مہک سے تمام کمرہ معطر تھا۔

کچھ ایسی ہلکی روشنی 'ریشمیں' پردوں میں سے چھن چھن کر کمرہ میں آ رہی تھی جیسی کہ رات کے ختم ہونے اور دن کے شروع ہونے کے وقت ہوتی ہے ــــ وہ سب جنت کا ایک تخیل تھا۔ جس کو استیف نے آج اپنی عمر میں پہلی دفعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ــــ ریشم کے پردوں کی آڑ سے اس دھندلی روشنی میں ملکہ نے اشارہ کیا' کمرہ کے سکون کامل میں 'رومی قالینوں پر استیف کے قدموں کی آواز گم تھی۔ وہ ادب کے ساتھ آگے بڑھا اور اس نے ملکہ تھوڈورا کو آغوش محبت اپنے لئے کھلا ہوا لیا!

"تمہارے جانے کا وقت آ گیا" نظریں نیچی کئے ہوئے ملکہ نے فرمایا۔

استیف کے جسم میں ایک عجیب لرزش ایک عجیب سنسناہٹ تھی جو آج سے پہلے اس نے کبھی محسوس نہ کی تھی۔

وہ ابھی تک ملکہ کے آغوش کی مستیوں سے مخمور تھا! ــــ اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ جب اس نے کہا۔

"کیا پھر کبھی ملاقات نصیب ہو گی؟"

ملکہ مسکرائی! استیف اپنے سوال کے جواب کا منتظر تھا کہ یکایک وہی خواجہ سرا جو اس کو اندر لایا تھا۔ کمرہ میں داخل ہوا۔ استیف

چونکہ اس کو محبت کی خلوت میں خواجہ سرا کی یہ دراندازی ناگوار گزری۔ گویا یہ سیاہ فام حبشی اس کی اس نئی محبت کے راز کو فاش کئے دیتا ہے لیکن ملکہ سے اپنے سوال کا جواب نہ پا کر وہ یک گونہ مایوس ہوا اور سر جھکائے دروازے کی طرف ہٹنے لگا۔ ملکہ کے ہونٹ ہلتے دیکھ کر وہ پھر ذرا رکا۔

"استیف کل پھر آؤ؟"

ملکہ کے شیریں لبوں سے یہ شیریں پیام الفت کس قدر روح پرور اور دلنواز معلوم ہوا۔

اس دھندلی روشنی میں ملکہ ____ نہ جانے کس طرح ____ اس کمرے سے جا چکی تھی۔ استیف نے اس کو جاتے نہ دیکھا۔ لیکن اس کی جگہ خالی تھی اور استیف "وعدہ فردا" کی مسرتوں سے جھومتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

اس کے اور دروازے کے درمیان چند قدم باقی تھے کہ ایک حبشی غلام کی نوکدار چھری اس کی پشت پر چمکی اور چشم زدن میں اس کی پشت کی طرف سے سینہ کے پار ہو گئی۔ وہ صرف ایک ہچکی لے کر دروازے کے سامنے فرش پر اوندھا گر گیا۔

غلام نے چند لمحے اپنی چھری کو اس کے گرم جسم میں آرام لینے دیا۔ اس کے بعد اس کے خون آلود پھل کو باہر کھینچ لیا۔ استیف کے سر کے لمبے بالوں سے اس حبشی نے اپنی چھری کا خون صاف کیا۔ پھر لاش کی ٹانگ پکڑ کر اس کو کھینچتا ہوا کمرہ کے باہر لے گیا۔

اس کمرے کے فرش پر، جہاں استیف کی جوانی کے گرم خون کا صرف ایک قطرہ جما ہوا رہ گیا۔

اسی شام کو جب چند ملاح اپنی کشتیاں ساحل کی طرف لا رہے تھے۔ شاہی محل کے چور دروازے سے باسفورس کے پانی میں ایک سربند تھیلا جو خون آلود بھی تھا پھینکا گیا۔ ملاحوں نے دیکھا اور اپنے پتوار تیزی سے چلانے لگے۔ ان کے لئے اس قسم کے تھیلے کوئی نئی چیز نہ تھے۔ ہر روز صبح و شام وہ دیکھا کرتے تھے کہ شاہی محل سے باسفورس کی بھوکی مچھلیوں کی یہ مخصوص غذا پانی میں پھینکی جاتی ہے۔ انکو یہ بھی معلوم تھا اور بائی زنطہ میں کس کو معلوم نہ تھا کہ رحمدل ملکہ عالم حسن کی دعوت کے بعد باسفورس کی مچھلیوں کے لئے اپنے حسن کے دستر خوان سے تازہ غذائیں پہنچایا کرتی ہیں۔

میلہ گھومنی

علی عباس حسینی

کانوں کی سنی نہیں کہتا' آنکھوں کی دیکھی کہتا ہوں۔ کسی بدیسی واقعہ کا بیان نہیں' اپنے ہی دیس کی داستان ہے۔ گاؤں گھر کی بات ہے' جھوٹ سچ کا الزام جس کے سر پر جی چاہے رکھئے۔ مجھے کہانی کہنا ہے اور آپ کو سننا:

دو بھائی تھے چنو منو نام' کہلاتے تھے پٹھان۔ مگر ننہال جولاہے ٹولی میں تھا اور ددیہال سید واڑے میں۔ ماں پرجا کی طرح میر صاحب کے ہاں کام کرنے آئی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی صاحب نے اس سے کچھ اور کام بھی لئے اور نتیجے میں ہاتھ آئے چنو منو۔ وہ تو یادگاریں چھوڑ کر جنت سدھارے اور خمیازہ بھگتا بڑے میر صاحب نے۔ انہوں نے بی جولاہن کو ایک کچا مکان عطا کیا اور چنو منو کی پرورش کے لئے کچھ روپے دیئے۔ وہ دونوں پلے اور بڑھے' اچھے ہاتھ پاؤں نکالے' چنو ذرا سنجیدہ تھا' ہوش سنبھالتے ہی میر صاحب کے کارندوں میں ملازم ہوا اور ہمسن میر صاحب کا مصاحب بنا۔ منو لاابالی تھا' اہیروں کے ساتھ اکھاڑوں میں کشتی لڑا اور نام کے لئے کھیتی باڑی کرنے لگا۔

لیکن دونوں جوان ہوتے ہی اعصاب کا شکار ہوئے۔ خون کی گرمیاں وراثت اور ماحول سے ملتی تھیں۔ دونوں جنسیات کے میدان میں بڑے بڑے معرکے سر کرنے لگے۔ شدہ شدہ میر صاحب کے کانوں تک ان کارناموں کی داستانیں پہنچیں۔ انہوں نے چنو کو اسی طرح کی ایک لڑکی سے بیاہ کر باندھ دیا۔ مگر منو چھٹے سانڈ کی طرح مختلف کھیت چرتا رہا۔ اس کی ہنگامہ آرائیوں کا غلغلہ دور تک پہنچا۔ بالآخر میر صاحب کے پاس اہیر ٹولی' چمار ٹولی' جولاہے ٹولی ہر سمت اور ہر محلے سے فریاد کی صدائیں پہنچنے لگیں۔ انہوں نے عاجز آکر ایک دن اس کی ماں کو بلوا بھیجا۔ وہ جب گھونگھٹ لگائے' لجاتی' سہمتی ان کی بیوی کے پلنگ کے پاس زمین پر آکر بیٹھی تو میر صاحب نے منو کی شکایت کی اور کہا۔ اس لونڈے کو روکو ورنہ ہاتھ پاؤں ٹوٹیں گے۔

اس نے آہستہ سے کہا:

"تو میں کیا کرسکتی ہوں۔ آپ ہی چنو کی طرح اسے بھی کسی تاند سے لگا دیجئے۔"

میر صاحب بڑی سوچ میں پڑ گئے۔ یہ نئی قوم کا قلمی پودا کسی مناسب ہی تھالے میں لگایا جاسکتا تھا۔ ہر زمین تو اس کو قبول نہیں کر

نکلی اور وہاں اس کے کارناموں کی شہرت نے ہر جگہ شوریت پیدا کر دی تھی۔ وہ زنان خانے سے سوچتے ہوئے باہر چلے آئے اور بڑا بڑ سوچتے ہی رہے۔

اتفاق سے انہی دونوں دوری کے میلے سے واپس ہونے والوں کے ساتھ ایک نامعلوم قبیلے کی عورت گاؤں میں آئی اور ایک دن میر صاحب کے ہاں نوکری کی تلاش کے بہانے پہنچی۔ سیدانی بی نے شکل و صورت دیکھتے ہی سمجھ لیا کہ وہ ان کے گھر میں ملازمہ کی حیثیت سے رہنے والی عورت نہیں۔ پوچھنے کچھنے سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ گاؤں کے درزی کے ساتھ میلے سے آئی ہے اور اس کے ہاں ٹکی بھی ہے سیدانی بی ان درزی کی حرکات سن چکی تھیں۔ جب سے اس کی درزن سدھاری تھی اس نے میلوں سے نئی نئی عورتوں کا لانا اور گاؤں کی نسوانی آبادی میں اضافہ کرنا اپنا وطیرہ بنا لیا تھا۔ پھر بھی سیدانی بی کے رئیسانہ مزاج نے صاف صاف انکار کی اجازت نہ دی۔ انہوں نے کہا:

"اچھا! گھر میں رہو اور کام کرو۔ دو چار دن میں تمہارے لئے کوئی بندوبست کروں گی۔"

ادھر مردانے میں میر صاحب کو ان کے ہم جلیسوں نے نووارد کی خبر دی۔ ایک صاحب نے جو ذرا ظریف بھی تھے ان کی تاریخ یوں بیان کی:

"راویان صادق کا قول ہے کہ اصل اس کی بنجارن ہے۔ وہ بنجارن سے ٹھکرائن بنی، ٹھکرائن سے پٹھانی، پٹھانی سے کبڑن، کبڑن سے درزن اور اب درزن سے سیدانی بننے کے ارادے رکھتی ہے۔"

ایک صاحب نے پوچھا۔ "اور اس کے بعد؟"

وہ دونوں شانے اٹھا کر اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بولے۔ "خدا ہی جانے! شاید اس کے بعد فرشتوں سے آنکھ لڑائے گی۔"

میر صاحب جب گھر آئے تو بیوی نے ان محترمہ کے آنے کی خبر دی۔ بہت جز بز ہوگئے۔ اس سیرت کی عورت اور شرفاء کے گھر میں۔ وہ نیک قدم خود بھی کسی کام کے سلسلہ میں سامنے آئیں۔ میر صاحب بل کھانے لگے۔ نوکری کرنے آئی تھی۔ اگر انکار کرتے ہیں اور گھر سے نکال دیتے ہیں تو اسے معصیت کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔ پیٹ کے لئے انسان کیا کچھ نہیں کرتے ہیں۔ اگر اپنے ہاں بار دیتے ہیں تو گھر میں ماشاءاللہ کئی چھوٹے میر صاحبان ہیں۔ کہیں چنو منو کی نسل اور نہ بڑھے۔ ان ناموں کی یاد سے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا اور وہ مسکرا مسکرا کر بیوی سے سرگوشی کرنے لگے۔ پھر منو کی ماں کو بلوا کر انہوں نے اسے نادر شاہی حکم دے دیا کہ "ہم نے منو کی نسبت طے کر دی۔ اس سے کہہ دو کل اس کا عقد ہوگا۔"

بیچاری جولاہن کو چون وچرا کی مجال نہ تھی۔ وہ "بہت اچھا" کہہ کے ہونے والی بہو پر ایک نظر ڈالنے چلی گئی۔ وہ بھی رشتے سے بالکل بے خبر تھی اس لئے بہت کھل کے باتیں ہوئیں۔ جولاہن اس کے طور طریقے سے زیادہ مطمئن تو نہ ہوئی لیکن جانتی تھی میر صاحب کی خوشنودی اسی میں ہے۔ اختلاف کا یارا انہیں۔ رہنے کا ٹھکانا انہی کا دیا ہے، چنو کی نوکری انہی کی عطا کردہ ہے اور منو کی جوت میں کھیت بھی انہی کے ہیں۔ پھر لالچ بھی تھا۔ اپنی خوشی سے شادی کریں گے تو سارا خرچ بھی خود ہی اٹھائیں گے۔ غرض گھر آئی اور اس نے رات کو منو کو میر صاحب کا فیصلہ سنا دیا۔ وہ اسے درزی ہی کے گھر بھاوج کی حیثیت سے دیکھ کر پسند کر چکا تھا، جلدی سے راضی ہو گیا۔

دوسرے دن مولوی صاحب بلائے گئے۔ منو کو نئی دھوتی، نیا کرتا میر صاحب نے پہنو لیا۔ دلہن کو شاہانہ جوڑا اور چند چاندی کے

زیورات ان کی بیوی نے پہنائے اور عقد ہو گیا۔ پھر میر صاحب اور ان کی بیوی نے رونمائی کے نام سے دس روپے منو کی ماں کو دیے اور دلہن کو اس کے ہاں رخصت کر دیا۔

دن بیتتے گئے' دن بیتتے گئے' مہینے ہوئے' ایک سال ہونے کو آیا مگر منو اور اس کی دلہن کی کوئی شکایت سننے میں نہ آئی۔ میر صاحب کو اطمینان سا ہو چلا کہ نسخہ کارگر ہوا اور اعصاب کے دو بیمار ایک ہی چٹکے میں اچھے ہو گئے ____ کہ دفعتہً ایک دن بی جولاہن روتی بسورتی پہنچیں۔ معلوم ہوا منو نے مارا ہے۔ پوچھ گچھ سے کھلا کہ چھ مہینے سے اسے نشے کا شوق ہے اور جس طرح وہ نشہ بیوی پر اتر تا ہے اسی طرح غصہ ماں پر۔ کل رات میں تو اس نے مارا ہی نہیں بلکہ اسے ایک کوٹھڑی میں بے آب و دانہ بند رکھا۔ اب چھوٹی ہے تو فریاد لے کر آئی ہے۔ میر صاحب کے اس سوال پر کہ پہلے ہی کیوں نہ بتایا کہ فوری تدارک سے شاید بری عادت نہ پڑنے پاتی' جولاہن سوائے "ماسٹا" کے اور کیا جواب دے سکتی تھی۔ انہوں نے حکم دے دیا۔ "آج سے یہیں رہو۔ گھر جانے کی ضرورت نہیں۔"

مگر میر صاحب کو منو کی فکر ہو گئی۔ خون گندی نالی میں بہہ کر نہ تو بدل جاتا ہے اور نہ پھٹ کر سپید ہو جاتا ہے۔ اس لئے اسے بلا بھیجا اور حد سے زیادہ خفا ہوئے اور یہاں تک کہہ دیا کہ "اگر پھر سنا کہ تو نے تاڑی پی تو درخت سے بندھوا کر اتنا پٹواؤں گا کہ چمڑا ادھڑ جائے گا۔" ساتھ ہی پاسی کے مخصوص کارندہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ "اب اگر منو کو ایک قطرہ بھی پینے کو ملا تو تاڑی خانہ پھنکوا دوں گا۔" غرض منو کی پورے طور پر بندش کر دی گئی ____ اور تاڑی بند ہو گئی ____ نشے کا انجکشن ممنوع قرار دے دیا گیا ____

مگر جونک اپنا کام کرتی رہی ____ اور تاڑی بند ہونے کے چھ ماہ بعد وہ آنکھیں مانگنے لگا۔ بالکل زرد' سوکھا ہوا آم بن گیا اور کھانسی بخار کا شکار ہوا۔ جب میر صاحب کو خبر ملی کہ عیادت کے بہانے یاروں کی نشستیں ہونے لگیں ____ اور منو کی بہو نے نینوں کے بان چلانا شروع کر دیئے تو انہوں نے بی جولاہن کو کچھ روپے دے کر گھر بھیجا اور بیٹے کے علاج اور بہو کی نگرانی کی تاکید کی۔

لیکن یہ نگرانی وہاں اسی طرح ناگوار گذری جس طرح چوروں کو پولیس کی نگرانی کھٹکتی ہے۔ دو چار ہی دن انگیز کرنے کے بعد زبان کی چھری تیز ہونے لگی۔ ساس بھلا کس سے کم تھیں' انہوں نے کلہ بہ کلہ جواب دینا شروع کر دیا۔ ایک دن تو نوبت ہاتھاپائی تک پہنچی۔ جوانی اور بڑھاپے کا مقابلہ کیا تھا۔ بہو ساس کے سینے پر سوار ہو گئی۔ منو پلنگ سے جھپٹ کے اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ماں کو بچانے پہنچا۔ بیوی نے سینے پر وہ لات ماری کہ وہ ہائے کر کے وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دونوں لڑنا بھول کر اس کی تیمار داری میں مشغول رہیں۔ لیکن بلغم کے ساتھ تھوڑا تھوڑا خون بھی آنے لگا اور وہ ایک ہفتہ بعد گھر سے اٹھ کر قبر میں چلا گیا۔

اب رونا دھونا شروع ہوا۔ بین ہونے لگے اور ساس بہو میں اسی پر مقابلہ ٹھنا کہ دیکھیں سوگ کون زیادہ مناتا ہے۔ پانچ روز تو اس طوفان میں وہ طغیانی رہی کہ میر صاحب کو خود آکر سمجھانا پڑا۔ لیکن آہستہ آہستہ سیلاب غم گھٹنا شروع ہوا اور ساس بہو کو ایک دوسرے سے چھٹکارا پانے اور رشتہ قرابت ٹوٹ جانے کی غیر شعوری طور پر خوشی ہونے لگی کہ دفعتہً چنو کی بیوی قبل از وقت مرا ہوا بچہ جن کر دیور کے پاس چلی گئی۔ بی جولاہن کو چار چھوٹے چھوٹے پوتے پوتیوں کو سنبھالنا پڑا اور منو کی بیوہ کو عدت کے احکام بھول جانے کے مواقع ملنے لگے۔

ایسے ہی ایک موقع سے چنو غم بھلانے اور جی بہلانے دیورانی کے پاس آ بیٹھا۔ خاطر تواضع ہوئی اور باتوں کا سلسلہ چھڑ گیا۔ درد دل بیان ہوئے' تنہائیوں کا ذکر چھڑا اور اس کے دور کرنے کے ذرائع پر غور ہوا۔ بالآخر ایک شب امتحان کی قرار پائی۔ جب اس کی

صبح سحر خیزی سے ہوئی تو چنو نے ماں سے اصرار کیا کہ اس رشتے کو عقد کے ذریعے مستحکم بنائے۔

وہ بیٹے کو لے کر مولوی صاحب کے پاس پہنچی۔ وہ دیہات میں رہنے کی وجہ سے شرع کی کتابیں اب تک نہ بھولے تھے۔ انہوں نے امتحان اور اس کے نتائج سے واقف ہوتے ہی کان پر ہاتھ رکھا اور نکاح کے ممنوع ہونے کا فتویٰ فوراً صادر فرمادیا۔ بڑی بی دیر تک ایک وکیل کی طرح بحث کرتی رہیں۔ پر جب مولوی صاحب اپنے فیصلے سے نہ ٹلے تو جل کر بیٹے سے بولیں۔ "چل اے گھر چل۔ مانگ میں میرے سامنے سیندور بھر دینا۔ وہ اب تیری بیوی ہے 'میں خوش' میرا خدا خوش!"____ چنو نے ماں کا کہنا کیا۔ مانگ میں سیندور کی چٹکی ڈال دی اور اپنے چار دن بچوں سمیت اسی گھر میں منتقل ہو گیا۔

ایک مہینہ بیتا 'دو بیتے' تین مہینے بیتے مگر چوتھے مہینے چنو کی کمر میں اچک آگئی۔ اکڑنا 'برتنا' تن کے چلنا چھوٹ گیا۔ وہ اب ذرا جھک کے چلنے لگا۔ ہمسن میر صاحبان میں سے ایک صاحب طبیب تھے 'ان کو دکھایا۔ انہوں نے معجونیں اور گولیاں کھلانا شروع کیں۔ دواؤں کے زور پر کچھ دن اور چلا۔ بد قسمتی سے حکیم صاحب ایک ریاست میں ملازم ہو کر چلے گئے۔ بس چنو کی کمر کچی لکڑی کی طرح بوجھ پڑنے سے جھک گئی۔ ساتھیوں نے افیون کی صلاح دی۔ شروع میں تو کافی سرور آیا مگر افیون کی خشکی نے دبوچا اور بی چنیا بیگم مانگتی ہیں دودھ 'گھی' مکھن 'ملائی اور یہ چیزیں چار روپے کی ملائی میں کہاں نصیب 'وہ لگا کھیسے نکال کے ہاتھ پھیلانے اور چٹنیں کھانے۔ مگر اس پر بھی جو کچھ ملتا بھاویں نہ ساتا اور افیون کی لت پڑ ہی چکی تھی وہ چھوٹتی نہیں۔ اس نے آہستہ آہستہ دل و جگر کو چھلنی کیا اور چنو خان کو اختلاج کے دورے پڑنے لگے اور سوکھی کھانسی آنے لگی۔

ایک دن جنوری کے مہینے میں جب بوندا باندی ہو رہی تھی اور اولے پڑنے ہی والے تھے کہ چنو کو اختلاج شروع ہو گیا۔ ڈیوڑھی پر کسی کام کے سلسلہ میں حاضر تھا۔ دلیا برتن چھوڑ چھاڑ گھر کی طرف بھاگا۔ راستے ہی میں کوندا لپکا اور جان پڑا اسی کے سر پر بجلی گری۔ منہ کے بل زمین پر آرہا۔ سنبھل کر اٹھا مگر دل کا یہ حال تھا کہ منہ سے نکلا پڑتا تھا۔ بے ساختہ "ارے ماں! ارے ماں!" چیختا ہوا دوڑا۔ راستہ سجھائی نہ دیتا تھا۔ دم گھٹتا جارہا تھا مگر پاؤں پہیے کی طرح لڑھک رہے تھے۔ گھر کی دہلیز میں قدم رکھا ہی تھا کہ دوسرا اکڑا کا ہوا۔ وہ ٹھوکر کھاتا' سنبھلتا' پھسلتا' لڑکھڑاتا دالان والے پلنگ پر جا کر بکری کے نیچے سے چھوٹے ہوئے کبوتر کی طرح بھد سے گر پڑا اور اسی طرح اس کا ہر عضو پھڑکنے لگا۔ بیوی "ارے کیا ہو گیا لوگو!" کہتی ہوئی دوڑی۔ چنو نے بایاں پہلو دونوں ہاتھوں سے دباتے ہوئے کہا:

"اب میرے بعد تم کو کون خوش رکھے گا؟" اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

چنو کی فاتحہ کے تیسرے دن اس کی خوش نہ ہونے والی بیوہ گاؤں کے ایک جوان کسان کے ساتھ کمبھ کا میلہ گھومنے الہ آباد چلی گئی۔

ڈالی کا جوگ

حامد اللہ افسرؔ

گنگا کے کنارے موضع ارتشی کے مشرقی حصہ میں جامن اور فالسے کے درختوں میں چھپا ہوا ڈالی کا غریب گھر تھا۔ سفید مٹی سے پتی ہوئی کچی اینٹوں کی چھوٹی چھوٹی دیواریں عافیت، سکون، اطمینان کے ساتھ پھونس کے چھپر کو اپنے سروں پر خاموش لئے کھڑی تھیں، صاف و شفاف چھوٹے سے صحن کو محصور کر لینے والی نیچی اور خوشنما دیواروں نے ڈالی کی پرورش گاہ کو تمام بستی سے علیحدہ کر دیا تھا صحن کے مغربی پہلو میں کمرنی کا گنجان درخت تھا جس کے پتے ہوا کے توسل سے تالیاں بجا بجا کر ڈالی کے ننھے دل کو ہمیشہ بہلاتے رہے ہیں گھر کے چاروں طرف سرسبز و شاداب کھیت تھے جن کی گود میں ڈالی نے پرورش پائی تھی۔

شام کا وقت تھا اور تمام دن کی مسافت طے کرنے کے بعد آفتاب اپنی سنہری خوابگاہ میں آرام کرنے کے لئے جا رہا تھا۔

زمین اور آسمان تاریکی کی گہرائیوں میں غرق تھے، پہاڑوں کی بلندیاں اور میدانوں کی پستیاں ایک سطح میں ہو گئی تھیں اور نیلی کملی والا آج کالی کملی اوڑھے ہوئے تھا اندھیری رات سکون و خاموشی کا جامہ پہنے ہوئے تھی۔ مٹی کا چھوٹا سا ٹمٹماتا ہوا چراغ اپنی دھندلی اور افسردہ روشنی میں ڈالی کے غمزدہ چہرہ کو تک رہا تھا نمبردار کیلاش کی پراسرار گم گشتگی نے ایک معصوم اور بھولی بیٹی کو اس کے عزیز ترین باپ سے جدا کر دیا تھا۔

کاش وہ اس سنسان اور ڈراؤنی رات کے پہلے حصہ میں اپنے ہرے بھرے کھیتوں کی رکھوالی کو نہ جاتا کہتے ہیں کہ لٹیروں کا گروہ مسلح تھا اور "کولی" جس وقت کھیت کی ڈول پر سے کود کر بھاگا ہے تو بدنصیب نمبردار ان کے قبضہ میں آ چکا تھا۔

نعش کا پتہ نہیں ملتا صدہا دل اسے اپنے سینوں سے لگانے کے لئے بے چین ہیں۔ کاش انھیں اتنا موقع مل جاتا کہ اپنے عزیز اور بے گناہ کیلاش پر کسی قسم کی مصیبت آنے سے پہلے وہ اپنی جانیں قربان کر دیتے خون کے چھینٹے بھی کہیں نظر نہیں آتے۔ ہاں کھیت کے قریب والی زمین کی مٹی ضرور ادھر ادھر کو ہٹی ہوئی ہے جس سے زور آزمائی اور دست و گریبان ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

تمام گاؤں میں کہرام مچا ہوا تھا لیکن ڈالی اپنے گم گشتہ باپ کو صبر و تحمل کے دشوار گذار راستوں میں تلاش کر رہی تھی۔

(۲)

اس غم انگیز سانحہ کے بعد زمین مع اپنے غیر محدود تغیرات کے چھ مرتبہ آفتاب کے گرد چکر کاٹ چکی ہے کاتک کا مہینہ شروع ہونے والا ہے صبح کا وقت ہے نسیم ادھر ادھر کھیلتی پھرتی ہے۔ اس کے خوشگوار اور دل لبھانے والے جھونکے موسم سرما کے ابتدائی زمانہ کا عکس لئے ہوئے ہیں۔

ہر تشی سے چند میل کے فاصلے پر ہمالہ کی فلک بوس چوٹیوں سے آنے والی گنگا کے اس پار پھونس کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی زاہدانہ انداز سے خاموش کھڑی ہے ہلکی سرمئی ساری پہنے ہوئے ایک دوشیزہ جوگن اٹھکھیلیاں کرنے والے چھوٹے چھوٹے پودوں میں پانی دے رہی ہے۔ بیلے اور چنبیلی کی خوشنما کلیاں اس کے مقدس اور سنجیدہ چہرہ کو دیکھ دیکھ کر مسکرائے دیتی ہیں سورج جو کچھ دیر پہلے سے صنف نازک کے اس پاکباز سنیاسی کو خاموشی کے ساتھ مشرقی پردوں سے منہ نکال کر جھانک رہا تھا اب آہستگی سے اوپر اٹھ آیا ہے کیونکہ اس نے اندازہ کر لیا ہے کہ ماہتاب کی للچائی ہوئی آنکھیں کھلنے سے پہلے وہ بلا شرکت غیرے اس متبرک اور دلچسپ نظارے سے لطف اندوز ہو سکے گا۔

جوگن اپنی پھونس کی کٹی میں بیٹھی ہے جسے اس نے خود اپنے ننھے اور نازک ہاتھوں سے آٹھ شبانہ روز کی محنت میں بنا کر کھڑا کیا ہے۔ دو تصویریں اس کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں کے سامنے ہیں۔ وہ زاہدانہ صبر واستقلال کے ساتھ تخیل کی وسیع گہرائیوں سے نکلنا چاہتی ہے مگر مجبور ہے۔

(۳)

"ڈولی آخر میرے بچپن کے خواب کی تعبیر نکل آئی۔ مجھے مقدس دیویوں نے پسند کر لیا۔ پاک خدا تجھ پر مہربان ہے۔ تو گناہوں سے بری ہے اور تیرے زہد واتقا کی قسم کھائی جاتی ہے۔

تو جوگن کے بھیس میں کیسی پیاری معلوم ہوتی ہے گویا خدائے بزرگ و برتر خود تیرے جسمانی مندر میں جلوہ افروز ہے۔ تو شبنم سے دھلے ہوئے اس پھول کی مانند پاکیزہ اور دلفریب ہے جو دیویوں پر چڑھانے کے لئے لایا جاتا ہے۔

اٹھ پیاری ڈولی اٹھ اور اپنے ہاتھ سے مجھے برکت دے میں اب بھی وہی دانی ہوں جو اب سے چند سال پیشتر تھا۔

اس وقت تو میرے لئے ایک حسن کی دیوی تھی مگر اب"......

"دانی۔ بس بس۔ جسے میں نے بھلا دیا اسے اب پھر یاد نہ دلاؤ۔ میں دنیا کو چھوڑ چکی۔ وہ غم واندوہ کا مسکن ہے۔ میں یہاں آزاد ہوں تم مجھے آزاد رہنے دو۔"

"تو محبت کا وہ عالیشان محل جس کی تعمیر دونوں نے مل کر کی ہے اور جو روح افزا وعدوں سے مزین کیا گیا ہے کیا آج بے گناہ دانی کے سر پر گرا دیا جائے گا۔"

"نہیں دانی نہیں۔ میں تمہاری محبت کی قدر کرتی ہوں۔ میں تمہیں بھولی نہیں ہوں۔ مگر ہاں اب میں مجاز کے شور وشر سے نکل کر حقیقت کے سکون واطمینان میں آگئی ہوں۔"

"ایک سچے پرستار کے محبت بھرے پہلو میں تقدس اور پاکیزگی پر دھبہ آنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔"

"لیکن دلاری جو خدا کی ہو چکی ہے وہ پھر کیسے اور کسی کی ہو سکتی ہے۔"

"ڈالی۔ شاید تم بھول گئیں۔ تمھارے پتاجی مجھ پر مہربانی کی نظر رکھتے تھے۔ کیا تم ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرنا پسند کرو گی؟"

"پتاجی کی مرضی ہرگز نہ تھی کہ تمھارے ساتھ میری شادی ہو انھوں نے مجھے ہدایت کی تھی کہ تمہاری طرف اس نظر سے نہ دیکھوں۔ دلاری۔ کیا تمھیں وہ دن یاد نہیں جب میں کئی ہفتہ متواتر مغموم اور افسردہ خاطر رہی ہوں تم مجھ سے میرے تفکرات کا سبب پوچھتے تھے اور میں ٹال جاتی تھی۔"

"ڈالی مجھ پر رحم کرو!"

"میں اپنے پیارے پتا کی مرضی کے خلاف کچھ نہ کروں گی۔"

"ڈالی۔ میں تیرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایسی پاکیزہ زندگی بسر کرتے ہوئے ایک بے گناہ کا خون اپنی گردن پر نہ لے' دونوں وقت ملتے ہیں۔ مبارک فال ہے' دیکھ ایسے سہانے اور متبرک وقت میری درخواست رد نہ کر۔"

"دلاری۔ میں مجبور ہوں۔"

سورج اپنے طلائی زیور کو دنیا کی آنکھوں سے چھپانے کی کوشش میں تھا اُفق پر بادل منڈلا رہے تھے اور مالن محبت کے جذبات کو اپنے سینہ میں دبا رہی تھی۔

دلاری اب بہت دور نکل گیا ہے' یاس اس کی ساتھی ہے' مایوسی اس کی غمخوار ہے اور موت اس کی رہنما۔

(۴)

ایک روز صبح کی ابتدائی دھندلی روشنی میں جوگن مقدس گنگا کے پانی میں کھڑی ہوئی ستارہ سحری کی طرف نظر جمائے ہوئے اپنے پاکیزہ سروں میں بھجن گا رہی تھی' گنگا کے مشرقی پہلو پر آسمان میں ارغوانی رنگ کی شگفتگی ظاہر ہوئی' تاریکی کھلتی ہوئی کلی کے بالائی نقاب کی طرح ہٹ گئی اور صبح ایک ہلکے پھول کی مانند آسمانی جھیل میں شگفتہ ہوئی' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جوگن کے ہر حرف پر صبح کا جادو ٹوٹ رہا ہے' چاند اور ستارے مغرب میں غرق ہو رہے ہیں' سورج مشرق میں طلوع ہو رہا ہے اور اس طرح دنیا کا منظر اس کی سحر افگنی سے تغیرات کے زیر اثر ہے۔

اشنان کے بعد وہ خوبصورت اور پاکباز ہستی دریا کے باہر آئی اس کے ریشمی بالوں کی جٹا سے پانی ٹپک رہا تھا اور نوزائیدہ سورج کی ہلکی ہلکی شعاعیں اس کے جسم پر منعکس تھیں'

ایک غصہ سے بھری ہوئی آواز اس کے کانوں میں آئی ڈالی صاف نہ سمجھی' پھر وہی آواز سنائی دی "ٹھہر او مکار جوگن ٹھہر۔"

ایک قوی ہیکل انسان ہاتھ میں ننگی تلوار لئے نمودار ہوا ڈالی کے دماغ میں غصہ اور حیرت کا طوفان جوش زن تھا' آواز دینے والا

قریب ہوا۔ ڈالی نے اس شکل اور جسم کو ضرور کہیں دیکھا ہے اس کے کان بھی اس آواز سے مانوس ہیں ڈالی کے دل میں عجیب طرح کے جذبات کا ہجوم تھا۔ انتہائی ضبط اور تحمل کے بعد اس نے بولنے کی جرأت کی۔ "میں........"

"ہاں تو تو ڈاکوؤں اور لٹیروں کو پناہ دیتی ہے، میں نے اس خطہ کو ان تباہ کن ہستیوں سے پاک کر دیا ہے، ایک دانی باقی ہے، سو وہ تیری پناہ میں دیکھا گیا ہے۔ مجھے اس کا پتہ دے ورنہ اپنی جان سے ہاتھ دھو لے۔"

ڈالی ایک بار پھر خیال کی وسیع اور غیر محدود گہرائیوں میں غرق ہو گئی۔

بالکل میرے عزیز پتاجی کی آواز ہے، وہی چہرہ ہے، وہی قد ہے۔ مگر ان کی داڑھی نہ تھی، تصور مجھے دھوکا نہ دے، میں خواب میں ہوں، تخیل نے ایک پیاری شبیہ بنا کر میرے سامنے کھڑی کر دی ہے۔ آہ ظالم لٹیرے، مگر دانی اور لٹیرا!! او خدایا!...... .

"جو گن بول، مجھے اس نامراد دانی کا پتہ دے۔ جس نے میرے قتل کی سازش کی تھی اور اس طرح میری عزیز بیٹی اور میرے مال و متاع پر قبضہ کرنا چاہا تھا، میں اس کے خون سے اپنی پیاری ڈالی کے بیاہ کا جوڑا........"

"پتاجی! پتاجی! تمھاری بیٹی۔"

"کون! ڈالی!.. ....ڈالی!.........جو گن!...... ..."

دریا کا پانی جوش میں اچھل اچھل کر کنارے والی زمین کو بوسہ دے رہا تھا، سرو اور کیلے کے درخت خاموش کھڑے دیکھ رہے تھے اور ایک مدت کا چھوٹا ہوا باپ اپنی پیاری اور پاکباز بیٹی کو اپنے قدموں سے اٹھا کر سینہ سے لگا رہا تھا۔

زندگی

عاشق بٹالوی

صبح چند مہمان آجانے کی وجہ سے تمام دن اُن کی خاطر مدارات میں صرف ہو گیا۔ عصر کے قریب میں بمشکل مطالعہ کے لئے وقت نکال سکا اور شام تک پڑھتا رہا۔ اسی ضمن میں سہ پہری کی ہواخوری بھی ضائع ہو گئی۔ جب چراغ روشن ہوئے تو کتابوں سے دل برداشتہ ہو کر صحیفہ فطرت کا مطالعہ یا یونہی چہل قدمی کے لئے میں مکان کی چار دیواری سے باہر نکلا۔ ابھی دس قدم بھی نہ گیا ہوں گا کہ کسی نے آہستہ سے میرے پیچھے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ مڑ کے دیکھا تو ایک دبلا پتلا چھریرے قد کا آدمی میلی سی اچکن پہنے کھڑا تھا۔ گہری شام کے غلیظ دھندلکے میں اسے پہچاننے میں مجھے کچھ دقت ہوئی۔ لیکن جب اس نے مانوس اور شیریں آواز میں 'اور یقیناً وہ آواز دنیا میں صرف ایک ہی شخص کی ہو سکتی تھی' میرا نام لے کر پکارا تو میں حیرت سے "اصغر" کہہ کر بے تحاشا اس سے لپٹ گیا۔ معانقہ ختم ہوا۔ تو سب سے پہلے میں نے اس کی ظاہری وضع قطع پر لب کشائی کی' جس کی وجہ سے وہ بالکل اجنبی ہو رہا تھا۔ پرانے بے تکلفانہ انداز میں اس کی کمر پر زور سے تھپکی دیتے ہوئے میں نے کہا۔ "خیریت تو ہے؟ تم نے یہ حالت کیا بنا رکھی ہے؟ اگر تم نہ بولتے تو شاید میں تمہیں پہچان بھی نہ سکتا۔"

اُس نے رکتے رکتے کہا۔ "میں ملتان سے آرہا ہوں' راستے میں میرا کپڑوں کا بکس چوری ہو گیا۔"

ہمدردی کی بجائے میرے منہ سے بے اختیار قہقہہ نکل گیا' پھر ہنسی کو ضبط کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "واللہ قدرت بھی ستم ظریف واقع ہوئی ہے تمہارے کپڑوں کے بکس کا گم ہو جانا اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایسا ہی افسوسناک سانحہ ہے بلکہ اس سے بھی شدید' جیسا کسی مصور' نقاش یا سنگتراش کی اختراعات فائقہ اور عمر بھر کی عرق ریزی سے جمع کئے ہوئے نوادر کا کھویا جانا۔ یقیناً اس حادثے سے صنعت اور فنون لطیفہ کی دنیا کو بہت نقصان پہنچے گے۔ کہو یہ واقعہ کیونکر پیش آیا؟"

اس نے کہا۔ "بندہ خدا مذاق پھر کر لینا۔ پہلے یہ تو پوچھو کہ میں آیا کیوں ہوں۔ میرے قیام و طعام کا بندوبست کرو۔ میں تمہارے یہاں ٹھہروں گا۔"

"بسم اللہ۔ آیئے۔"

میں سیدھا اسے اپنے مکان میں لے گیا۔ جب ہم اطمینان سے آرام کرسیوں پر دراز ہو گئے۔ اور لمپ کی روشنی اس کے چہرے

پہنچی تو میں نے دیکھا کہ اصغر بہت زرد اور نحیف ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس نے مخصوص انداز میں اپنی ترکی ٹوپی کو نہایت لاابالیانہ طریق سے اتار کر میز پر پھینک دیا۔ اور زیر لب گنگنانے لگا۔ لیکن اس کی ہیئت مجموعی سے صاف پتہ چل رہا تھا۔ کہ وہ بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ دراصل آج کا اصغر اس اصغر سے جسے میں جانتا تھا۔ کوئی نسبت نہ رکھتا تھا۔ اداس، منحنی سا چہرہ، معمولی اور نے درجے کے لباس میں ملبوس آنکھوں میں کھویا پن اور کہاں وہ چاق، چوبند، خوش طبع انگریزی معاشرت کا دلدادہ اصغر جو اپنی سحر کار شخصیت اور ندرت کلام سے حاضرین کو مبہوت کر دینے کے علاوہ لطیف بذلہ سنجیوں اور فلک شگاف قہقہوں سے بزم کو کشت زعفران بنا دیتا تھا۔ اس کا حسن مذاق، مسلم اور اس کی رائے خصوصاً پوشاک اور آرائش کے معاملات میں ہمیشہ ہمارے حلقہ احباب میں سند کے طور پر پیش کی جاتی تھی۔

چند لمحے خاموشی میں گذر گئے۔ تو میں نے کہا۔ "ہاں، تو تم نے بتایا نہیں کہ وہ بکس کیسے گم ہو گیا؟"

"ارے بھائی کوئی بات ہو تو کہوں۔ سراسر میری ہی غلطی تھی۔ میں ملتان سے چلا تو بہت سراسیمگی اور ذہنی انتشار کے عالم میں تھا۔ یہ اچکن کھونٹی پر لٹک رہی تھی۔ اسی پریشانی میں جلدی سے اتار کر پہن لی، اور باقی تمام کپڑے اور چند کتابیں ٹرنک میں بند کر لیں۔ ریل میں بیٹھا تو بھی وہ ادھیڑ بن طاری رہی اور میں اس ڈبے کے باقی مسافروں کا بخوبی جائزہ بھی نہ لے سکا۔ بعد ازاں میں نے محسوس کیا کہ وہاں دو شخص ایسے موجود تھے۔ جو اپنی حرکات سے بہت مشکوک چلن کے معلوم ہوتے تھے۔ راستے میں اتفاق سے میری آنکھ لگ گئی۔ اور خانیوال اسٹیشن پر جاگا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ٹرنک غائب۔ کمرے میں میرے سوا اور کوئی مسافر نہ تھا۔ میں نے گارڈ اسٹیشن ماسٹر اور پولیس کے افسر کو فوراً اطلاع کی وہ کہنے لگے کہ اپنا سفر منقطع کر کے وہیں ٹھہر جاؤں تاکہ ان کو تلاش و تفتیش میں سہولت ہو۔ مگر میں نے سوچا مقضی ما مضی قسمت اچھی ہوئی تو بکس بھی مل جائے گا۔ ورنہ جان تو باقی ہے۔ ان کو ضروری ہدایات دے کر میں چلا آیا۔ اگر یہ نقصان بعض اور حالات کے ماتحت ہوتا تو شاید میں بالکل ہی محسوس نہ کرتا مگر جیسا مبہم پروگرام اب میرے پیش نظر ہے اور جس قسم کی غیر مستقل زندگی سے میں دوچار ہونے والا ہوں۔ وہاں لباس ایسی اہم چیز کی عدم موجودگی سے ضرور رنج ہو گا۔"

مئیں نے ایک لمبا سانس لیا اور کہا۔ "اصغر ہم ہندوستان میں کتنی جلدی بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ میری مراد جذباتی بڑھاپے سے ہے۔ تم اور ذہنی انتشار کے عالم میں گھر سے چلو اور پھر تمام سفر ایک ادھیڑ بن میں گزار دو۔ خدا کی قسم میں باور نہیں کر سکتا۔ مگر جب دیکھتا ہوں کہ یہ بڑھاپا ہر لحظہ ہم پر شدت سے وار کر رہا ہے اور بہت کم لوگ ہیں جو اپنے اندر قوت مدافعت رکھتے ہیں تو میرے لئے حیرت کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ اور تمہاری گذشتہ زندگی سراسر ایک تعلّی معلوم ہوتی ہے۔"

"تعلّی؟" اصغر چمک کر اٹھ بیٹھا۔ "تم دیکھو گے کہ میں اصول سے سر مو انحراف نہیں کرتا۔ باقی رہا یہ کہ میں خاص احوال میں کیوں سراسیمہ ہوا تو عرض ہے کہ میں نے اس بات کا تو کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ میرے اعصاب فولاد اور قلب و دماغ پتھر کے ہیں۔ ہر ذی حیات شعوری یا غیر شعوری طور پر زندگی کی ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ اور منجملہ ان بالا از شمار نفوس کے ایک میں بھی ہوں جسے اسرار حیات کو سمجھ لینے کا دعویٰ تو نہیں ہاں جس نے بزعم خود ایک ایسا راز جان لیا ہے۔ جس سے زندگی کی غایت پر روشنی پڑتی ہے۔ اسی روشنی میں میں نے اپنے لئے چند اصول وضع کر لئے ہیں۔ جو میری رہبری کر رہے ہیں۔ تم ان باتوں پر ہنستے ہو۔ لیکن ایسی ہنسی میں پہلے کئی مرتبہ دیکھ چکا ہوں تم مجھے نور کو تاریکی اور تاریکی کو نور کہنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ لاریب مجھ میں بہت سی خامیاں ہیں جن کو رفع کرنے کے لئے میں ہمیشہ جدوجہد میں مصروف رہتا ہوں۔ آخر انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں کہ گردش مدام سے

گھبرانہ جاؤں۔ ہر چند کہ جانتا ہوں یہ گھبراہٹ سراسر بے سود اور تکمیل حیات میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ لیکن میرے عمل کو کوتاہی سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ زریں اصول جس کی حقانیت اور صداقت پر مجھے دو اور دو چار والا اعتقاد ہے اپنے اندر کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ تم اسے وہم کہتے ہو۔ لیکن خدارا مجھے بتاؤ ہماری زندگی میں کوئی ایسی چیز مادی یا غیر مادی' بھی ہے جس کی بنیاد وہم نہ ہو؟ عزیز دوست انسان کے تمام اعمال و معیار اعتباری ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو کامیابی پر آپے سے باہر ہو جانے اور ناکامی پر گریہ وزاری کرنے کے کیا معنی؟ تم میرے ہی کہنے سے اس اصول کو جسے میں صداقت اور تم، وہم سے تعبیر کرتے ہو' ایک مرتبہ تو اپنی زندگی میں جاری و ساری ہو جانے کا موقع دو۔ پھر دیکھو کہ حجابات یک قلم اٹھ جاتے ہیں یا نہیں؟ علت و معلول کی اس دنیا میں جہاں جاندار اور بے جان سبھی ایک غیر مختتم سلسلے میں منسلک ہیں۔ اسباب و نتائج کی طبعی کڑی سے کیونکر آزاد ہو سکتا ہوں۔ باقی انسانوں کی طرح میں بھی حسب منشا نتائج اخذ کرنے کے لئے اسباب پر قدرت حاصل کرنے کا متمنی ہوں مگر بسا اوقات ناکامی سے واسطہ پڑتا ہے۔ ناکامی ہماری طبائع پر کیونکر اثر انداز ہوتی ہے۔ بس یہیں سے میرے تمہارے راستے الگ الگ ہو جاتے ہیں۔"

ابھی خدا معلوم وہ اس لے میں کیا کچھ کہہ جاتا کہ میں نے دفعتاً ایک قہقہہ لگا کر اسے خاموش کر دیا۔

میں نے کہا۔ "سبحان اللہ کیا کہنے ہیں آپ کی لسانی کے۔ آئینہ لاؤں حضور کے سامنے کہ آپ کو اپنے اصول کی حقانیت پر ایمان آجائے۔ ذرا اس چہرے کو دیکھو جس میں خون زندگی کا قطرہ تک نہیں آتا۔ اپنی جھریوں سے اٹی ہوئی پیشانی دیکھو۔ رخساروں سے زردی اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دیکھو۔ اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کی ہڈیاں گن لو۔ ایک جھجکتی ہوئی نگاہ اپنے لباس پر بھی ڈال لو کہ یہ اس شخص کا لباس ہے جو زیادہ عرصہ نہیں گزرا ذوق جمال و آرائش لباس کے معاملہ میں مجتہد کا درجہ رکھتا تھا۔ اور پھر مجھے بتاؤ کہ اگر غیر فانی شباب اسی کا نام ہے تو ننگ شباب کی اصطلاح کس پر عائد ہوتی ہے؟"

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اصغر کے متعلق قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کروں تاکہ یہ گفتگو پس منظر کی روشنی میں زیادہ دلچسپ اور واضح ہو سکے۔ یہ کہنا کہ اصغر میرا دوست تھا چنداں قابل التفات بات نہیں کیونکہ طالب علمی کا زمانہ تو ہر شخص پر دوستی کا ملمع چڑھا دیتا ہے اور اصغر اور میں چار سال ایک ہی کالج اور ایک ہی ہوسٹل میں رہے۔ جن میں سے ایک سال کے لئے میں اور وہ "ہم کمرہ" بھی تھے۔ اصغر کے حقیقی بہن بھائی کوئی نہ تھا۔ اور والد کے ساتھ بھی اس کے تعلقات کشیدہ نہ تھے۔ تو بہت زیادہ خوشگوار بھی نہ تھے طوعاً و کرہاً وہ اس کے تعلیمی اخراجات کے کفیل ہو رہے تھے۔ ان ہی وجوہ سے اصغر کی صرف اپنی زندگی اس کی تمام تر توجہات اور دلچسپیوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ چھٹیوں میں بھی وہ بہت کم مکان پر جاتا تھا۔ کبھی میرے ہاں کبھی آپ کے یونہی فرصت کا وقت گزار لیتا یا اگر جیب گرم ہوتی تو ہندوستان کے مختلف شہروں کا چکر لگانا اس کا محبوب مشغلہ تھا حالات کی اس نامساعد روش نے جو یقیناً مجھ ایسے ذکی الحس انسان کے لئے بے حد تکلیف دہ اور ضرر رساں ثابت ہوتی اصغر کی طبیعت میں ایک خاص قسم کی بے نیازی اور قوت ارادی پیدا کر دی۔

سماج میں فرد کی حیثیت سے انسان پر بہت سے ایسے فرائض بھی عائد ہوتے ہیں جن کو اس کے طبعی رجحان اور حقیقی ذوق کے ساتھ چنداں تعلق نہیں ہوتا۔ والدین کی خدمت' دوستوں کی مروت' بیوی بچوں کی الجھن' بھائی بہنوں کی محبت' تعلقات کی ایسی سینکڑوں زنجیروں نے ہمیں سماج کے مختلف شعبوں سے اس طرح باندھ کر رکھا ہے کہ انفرادی زندگی کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہا۔ دراصل انسانی زندگی ایسے ہی خونی رشتوں اور جذباتی تعلقات کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان بندھنوں سے جیتے جی آزاد ہونا محالات سے ہے

لیکن ہم ایسی زندگی کا تصور ضرور کر سکتے ہیں۔ اور اس کا قیام بھی ممکن ہے۔ جہاں انسان محض اپنے لئے زندہ رہتا تھا۔ ایسا قائم بالذات شخص جو طعن و تشنیع کے وفدغے سے بے نیاز اپنی ہر ممکن بالحصول خواہش کی تکمیل کے لئے آمادۂ کار ہو جائے۔ جس کے لئے کل کائنات سمٹ سمٹا کر اس کی اپنی زندگی میں محدود ہو گئی ہو' جس کی آرزوئیں رسمیات عہد کے دباؤ اور جس کے ارادے خندہ استہزاء کے خوف سے یکسر آزاد ہوں' بلا شبہ اپنی زندگی میں ایک خاص لذت رکھتا ہے۔ بعض دنیادار شاید اس حالت کو آوارگی سے تعبیر کریں۔ لیکن سچ پوچھئے تو ہر جذبہ اپنی آخری منزل میں بے عنان ہو کر آوارگی ہی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ آج سے کئی سال قبل جب میں اول اول اصغر سے ملا تو اس کی اسی قسم کی آزادی و بے عنانی نے مجھے بھونچکا سا کر دیا۔ کہاں کالج کا ایک مبتدی اور کہاں یہ باغیانہ طبیعت۔ ذہانت کے لحاظ سے وہ اپنے ہم جماعت طلبہ میں بہت کم حریف رکھتا تھا۔ لیکن چونکہ اس نے اوقات بہت بے ڈھنگے طریق سے تقسیم کر رکھے تھے۔ اس لئے بعض دفعہ وہ کئی کئی ہفتے کسی کتاب کو نہ چھوتا۔ پڑھنے پر آتا تو زاہد شب زندہ دار کی طرح رات کو آنکھ جھپکنا بھی حرام سمجھتا تھا۔ میں کبھی اس کے لاأبالی پن پر لب کشا ہوتا تو وہ یہی جواب دیتا تھا کہ "میں طالب علمانہ شہرت حاصل کرنے کا خواہاں نہیں ہوں۔ کہ کتابوں میں سر کھپانا مقصود زندگی قرار دے لوں۔ کتب بینی جو مشاہدے کی صلاحیت سلب کر لے ایک ذہنی بیماری ہے۔ میرے لئے تو اسی قدر مطالعہ کافی ہے۔ جس سے امتحان میں کامیابی حاصل ہو سکے۔" اور پھر عالم سرخوشی میں یہ شعر پڑھ دیتا۔

مومنؔ بہشت و عشق حقیقی تمہیں نصیب

ہم کو تو رنج ہو جو غم جاوداں نہ ہو!

دو سال کے بعد جب اتفاق سے میری اور اُس کی رہائش ایک ہی کمرے میں ہو گئی تو اُس کے حالات و اطوار زیادہ وضاحت کے ساتھ مجھ پر عیاں ہونے لگے۔ اُس کا معمول تھا۔ کہ سر شام کھانا کھا کے نکل جاتا اور رات کے گیارہ بجے واپس آتا۔ حالانکہ قواعد کی رو سے کوئی طالب علم نو بجے کے بعد اپنے کمرے سے باہر نہیں رہ سکتا تھا۔ خوبی قسمت سے دارالاقامہ کے مہتمم بہت بامذاق اور زندہ دل تھے۔ انہوں نے جب بھی سرزنش کی۔ اصغر نے ہنس کر جواب دیا۔ "حضرت! نوع انسان پر ایک ہی قسم کے قوانین عائد کرنا دانشمندی نہیں۔ بعض کو قدرت مستثنیات کے لئے پیدا کرتی ہے۔ بندہ بھی انہیں میں سے ہے۔"

اُس کی صحبت یقیناً افزائش مسرت کا موجب تھی مگر جب وہ آدھی رات کو آ کر سوتوں کو جگاتا اور دروازہ کھٹکھٹا کر میرے آرام میں بے طرح مخل ہوتا تو طبیعت جھنجھلا اُٹھتی تھی' اور پھر ایک روز کی بات ہو تو مضائقہ نہیں' اُس کا تو مہینے میں تیس دن وطیرہ ہی یہی تھا۔ ایک رات وہ خلاف معمول بہت دیر سے آیا۔ شاید دو بجے ہوں گے۔ صبح ہوئی تو میں نے سامان باندھنا شروع کر دیا۔ بڑی بیتابی سے پوچھنے لگا۔ "خیر ہے۔ کہاں کا ارادہ ہے؟"

میں چلانے لگا۔ "تمہارے ساتھ رہ کر میں اپنی صحت خراب کرنا نہیں چاہتا۔ غضب خدا کا دن بھر تو کالج کی بک بک میں صرف ہو جاتا ہے۔ رات کو آرام کا وقت تم یوں برباد کر دیتے ہو۔ اگر ایسی ہی آوارگی دماغ میں سمائی ہے تو کالج کو خیرباد کہہ دو۔ تم ایسے جہاں گردوں کے لئے خدا کی زمین تنگ نہیں ہے۔"

وہ بستر سے اُچھل کے مجھ سے آلپٹا۔ "دوست خفا ہو گئے؟ سچ پوچھو تو تمہارے ہی بھروسے پر یوں بے فکری سے گزر رہی ہے۔

ورنہ مجھ ایسے سیلانی کو ہوسٹل کی قید و بند میں رہنے کا سلیقہ کب تھا۔ یار تم بھی کسی کٹھ ملا سے کم نہیں۔ کئی بار میں نے کہا کہ کتابی کیڑا بننا ہی طالب علمی کی غایت نہیں ہے۔ انسان تو عمر بھر طالب علم رہتا ہے اور حصول علم کی سینکڑوں راہیں دنیا میں کھلی ہیں۔ لیکن تم ہو کہ کالج کے کمرے اور درسی کتابوں کے گنبد سے نکلنا ہی نہیں چاہتے۔ خدا کے لئے کنوئیں کا مینڈک نہ بنو۔ ذرا چلو پھرو۔ دنیا جہان کی سیر کرو۔ زندگی کا مختلف پہلوؤں سے نظارہ کرو۔ حواس کو آزاد چھوڑ دو۔ پھر دیکھو کہ نفسیات کا علم کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوتا ہے یا ذاتی تجربات سے۔"

اصغر سخت کثیر الاحباب تھا۔ لیکن دوستی کے متعلق اس کا نظریہ بھی عجب تھا۔ وہ کہتا تھا "مجھے ان لوگوں پر ہنسی آتی ہے جو دوستی کو لازمہ حیات تصور کرتے ہیں۔ چودھویں صدی کی شعلہ آشام دوستیاں پانی کے بلبلے اور آنکھ کے اشارے سے جلد فنا ہو جاتی ہیں' پھر ایسی ناپائیدار چیز کو ہم کیونکر روح کی غذا بنا سکتے ہیں۔ وہ لوگ جو دوستوں کی صحبت کے بغیر زندگی گزارنے کی اہلیت نہیں رکھتے خطرناک فریب نفس میں مبتلا ہیں۔ تم نے بہت سے فریب خوردہ اشخاص کو دیکھا ہوگا۔ جو گزشتہ صحبتوں کی یاد میں آٹھ آٹھ آنسو رونے اور ایام رفتہ کو یاد کر کر کے آہیں بھرنے کے عادی ہیں۔ یہ بے چارے اسی قماش کے بزرگ ہیں جو بسر اوقات کے لئے دوستی کو دو وقت کی روٹی کی طرح ضروری سمجھتے ہیں۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ اپنی وفا کیشیوں اور جاں سپاریوں کے عوض میں دوسروں سے بھی تسلیم و وفا کی توقع رکھتے ہیں۔

نادان نہیں سمجھتے کہ اس تغیر پذیر عالم ارضی میں اکثریت ان کی ہے جو نہیں جانتے وفا کیا ہے۔ بھائی اپچ جانو میں تو شطرنج کی طرح دوستی کو بھی وقت فرصت گزارنے کا ایک کھیل سمجھتا ہوں۔ جب کام سے طبیعت اکتائی دو گھڑی کے لئے کسی دوست کو جا پکڑا۔ جس طرح شطرنج نہ کھیلنے کے باوجود تمام عمر خوش رہ سکتا ہوں۔ اسی طرح دوستوں سے قطع تعلق کر لینے پر بھی میری زندگی میں ملال پیدا نہیں ہو سکتا۔"

اصغر صرف لباس کے معاملے میں محتاط تھا۔ کچھ تو مزاج طبعاً خوش پوشی کی طرف راغب تھا اور کچھ اس کا خیال تھا کہ دنیا کو صرف لباس کے ذریعے سے دھوکا دیا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا تھا کہ "میں بڑے بڑے جہاں دیدہ لوگوں سے ملا ہوں جو بزعم خود علم و فضل کے مجسمے بنے بیٹھے ہیں۔ اور جن کا خیال ہے کہ انہیں زندگی کے نشیب و فراز اور حیات انسانی کی باریکیوں سے کامل آگاہی حاصل ہے۔ لیکن کوئی ملاقات ایسی نہ تھی جس کے اختتام پر میں نے اُن کی سادہ لوحی پر قہقہے نہ لگائے ہوں۔ تمدن جدید کے مطابق شاندار لباس زیب تن ہو اور واقعات عالم پر فصاحت کے ساتھ گفتگو کرنے کا ڈھنگ تمہیں آتا ہو تو دنیا کو الو بنا لینا بڑی بات نہیں۔"

ایک دفعہ تو اس نے غضب ہی کر دیا۔ بڑے دن کی تعطیلات سے قبل کالج کا سالانہ ڈنر تھا۔ جس میں شرکت کے لئے اس نے بڑے ٹھاٹھ کا سوٹ سلوا لیا تھا۔ ڈنر کے روز جب اس نے اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ نئے سوٹ کے ساتھ پہننے کو کوئی حسب پسند نکٹائی نہ تھی۔ ادھر مہینے کا اخیر تھا۔ اور اس کی جیب خالی ہو چکی تھی اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ فلسفے کی درسی کتاب (جسے اس نے ابھی چند روز ہوئے بازار سے خریدا تھا) ایک کتب فروش کے ہاں نصف قیمت پر فروخت کر دی۔ اور بازار سے نئی نکٹائی خرید لایا۔

اپنی خصوصیات کی بوقلمونی کے لحاظ سے اصغر ایک اچنبا تھا۔ ہمیشہ مقروض رہتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر کارکنان قضا و قدر نے کبھی حکومت پنجاب کی کرسی وزارت مجھے بخشی تو پانچ ہزار روپیہ مشاہرہ پانے کے باوجود میں تھوڑا بہت مقروض رہوں گا۔" جن لوگوں کو اس سے زیادہ واقفیت نہ تھی وہ اسے ایک سطحی نگاہ رکھنے والا شخص تصور کرتے تھے۔ جسے حالات دنیا کا بغور مطالعہ کرنے کا

موقع نہیں ملا۔ وہ چونکہ کسی شے کو اہمیت دینے کا عادی نہ تھا۔ اس لئے بعض سنجیدہ مزاج لوگوں کو بھی اس سے شکایت تھی۔ لیکن دراصل اصغر کو دنیا والوں کی کمزوریاں اور تعلیاں دیکھ دیکھ کر زہر خند ہونے کی عادت ہو گئی تھی۔ عیب و صواب کی کوئی راہ نہ تھی جس پر وہ گامزن نہ رہ چکا تھا اور نیکی بدی کا شاید ہی کوئی کوچہ ہو گا جس کو اس نے پامال نہ کیا ہو۔ میں اس کی دقت نظر کا ہمیشہ معترف رہا ہوں۔ بے خبری اور جہالت کو مسرت کا ضامن قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن وہ ان چند در چند نفوس میں سے تھا جو سوچتے ہیں اور پھر مسرور رہتے ہیں۔ اصغر یقیناً ایک رجائی تھا۔ لیکن اس کی رجائیت جہالت پر مبنی نہ تھی۔ اس نے زمانے کا سرد و گرم چکھا۔ خار دار جھاڑیوں میں الجھ کر دامن کو تار تار کر دیا۔ بھونوں کے تختوں میں سے نسیم سحری بن بن کر گزرا اور پھر اس نتیجے پر پہنچا کہ اپنی نگاہ میں رنگینی داخل کر لو اور کل کائنات قوس قزح کی طرح نظر فریب ہو جائے گی۔ طبیعت میں استغنا پیدا کر لو تو جھونپڑوں میں محلوں کے عیش اٹھاؤ گے۔

ایک روز ہم سب بیٹھے تھے ہمارا دوست وحید بھی تھا۔ وحید تھا تو بہت ذہین لیکن اس کی ذہانت اس کے لئے وبال بن گئی تھی۔ اس کا تخیل طوفان زدہ جہاز کی طرح ہمیشہ پریشان و مضطرب رہتا تھا۔ کچھ شاعر، کچھ وہمی، قدرے مریض اور اس پر طرہ یہ کہ محبت کا زخم خوردہ۔ وہ اکثر عزلت نشینی کو پسند کرتا اور عہد ماضی کی نوحہ خوانی میں مصروف رہتا تھا۔ یا پھر مستقبل کے خواب دیکھ دیکھ کر حال کو اور زیادہ افسردہ بنا دیتا تھا۔ وہ اصغر کو ہری چگ کے نام سے پکارتا تھا۔ اور اصغر صاحب تھے کہ اس نام کی موزونیت پر لوٹ پوٹ ہوئے جاتے تھے۔ اصغر نے اس روز وحید کو مخاطب کر کے دیر تک سلسلہ کلام جاری رکھا تھا اور سچ پوچھئے تو ہماری معلومات میں دل خوش کن اضافہ کیا۔ وہ کہنے لگا "دیکھو بھائی وحید اگر چندے تمہاری یہی حالت رہی تو قیس کی دیوانگی اور فرہاد کی کوہ کنی کو دنیا یقیناً فراموش کر دے گی۔ اور تم اُن کے جانشین کی حیثیت سے مسند تاریخ پر رونق افروز نظر آؤ گے۔ اگر بقائے دوام کے خواہشمند ہو یا شہیدان عشق کی فہرست میں نام لکھانا چاہتے ہو تو تمہارا یہ طریق عمل بہت موزوں ہے لیکن اگر زندہ رہنا اور زندگی کی حلاوتوں سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہو تو خدا کے لئے اس نیک بخت کو بھلا دو۔ زندہ قوموں کا عشق بھی حیات افروز ہوتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں عشق اور تپ دق ہم معنی الفاظ ہیں۔ اور پھر اس ملک میں رہ کر عاشق بننا تو فطرت کے خلاف جنگ کرنا ہے میں سنتا ہوں کہ تمہاری محبوبہ ہندوستان کے جذبات کش طرز انتخاب کے ماتحت کسی اور کے حوالے کر دی گئی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو تم کیوں ہمالیہ سے ٹکرا کر سر کو لہولہان کر رہے ہو۔ محبت تو جذبات کی انتہائی کمزوری کا نام ہے۔ اور ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہر دعوے دار اپنی محبت کو بے لوث ظاہر کرتا ہے۔ جہاں خون کا جوش زیادہ ہوا۔ محبت کے جراثیم پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ میں حیران ہوں کہ اس "غلام آباد" میں اور مصائب کیا کم ہیں کہ عشق کا روگ ایزاد کر دیا جائے سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم میں زندگی بسر کرنے کی صلاحیت نہیں۔ بات بات پر آنکھوں کو آنسوؤں سے ڈبڈبا لینا ہر وقت ٹھنڈی آہیں بھرنا دنیا کو دھوکے کی ٹٹی کہنا ہر ہنسنے والے کو خدا سے باغی اور قہقہہ لگانے والے کو گنہگار خیال کرنا یہاں دینداری میں داخل ہے تم گردن جھکا کر، آنکھیں بند کر کے چپ چاپ گزر رہے ہو۔ درحالیکہ چھوٹی چھوٹی چیزیں، معمولی معمولی واقعات جن کے اندر مسرت و شادمانی کے لازوال خزانے موجود ہیں، تمہیں زبان حال سے پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔ کوئی بستر علالت پر کراہ رہا ہے اور کوئی فکر فردا و غم ماضی میں جان گھلا رہا ہے۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ ہم ابھی تک بحر حیات کی موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہیں۔ کوئی نہیں چاہتا کہ سطح کے نیچے جا کر دیکھے کہ کیسے کیسے گراں قدر دفینے اور زر و جواہر کے عظیم الشان انبار مدفون ہیں۔ کامیاب زندگی کا راز یہی ہے کہ زندگی کو اہمیت نہ دو۔ زندگی تو مسرور معطر ہوا کا جھونکا ہے جو سن سے گزر جاتا ہے اور تم اس جانفزا شمیم کو مقید کرنے کی فکر میں ہو۔ یہ جھونکے اسی طرح آتے اور گزرتے جائیں گے۔ تمہارا فرض بس اتنا ہے کہ ان کی عطر بیزی سے اپنے دل و دماغ کو مسرور بناؤ اور چلتے جاؤ۔ کائنات کی وسعت بے پایاں کو دیکھو جس میں اس دنیا جیسی ہزاروں

دنیائیں آباد ہیں۔ اور پھر اُن دنیاؤں میں جاندار مخلوق بھری پڑی ہے۔ اس بے شمار جاندار آبادی کا نقشہ چشم تخیل کے سامنے لاؤ۔ اور سوچو کہ ارض و سما کے درمیان اور اس پہنائے عظیم کے اندر ایک تمہاری ہستی بھی ہے جو فنا کے غار عمیق کے کنارے کھڑی باد مخالف کی تندیوں سے ہر گھڑی کپکپا رہی ہے۔ تمہاری تو حقیقت ہی کچھ نہیں۔ اجل کا ادنےٰ سا اشارہ تمہیں ملیامیٹ کر سکتا ہے۔ سر روزہ زندگی کی ناپائیداری پر غور کرو کہ کل صبح تمہیں اپنے بستر پر سے صحیح و سالم اٹھنے کا یقین بھی نہیں اور پھر آلام و تفکرات کے اس لا متناہی سلسلہ پر غور کرو۔ جس نے تم پر خواب و خور حرام کر کے رات کی نیند اور دن کا چین چھین رکھا ہے کیا اوہام و تردوات تمہاری کم فہمی کی دلیل نہیں؟ دماغ کو برتو اور سوچو کہ تمہاری کل پریشانیاں کیا اس نقطہ نظر پر نہیں آ ٹھہرتیں کہ تمہیں پیٹ بھر کر کھانا اور تن ڈھانکنے کو کپڑا درکار ہے؟ اور پھر خدارا مجھے بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی کسی کو فاقوں مرتے یا شارع عام پر برہنہ جسم پھرتے دیکھا ہے؟ یقین جانو کہ ہر شخص قوت لایموت کے مطابق کھا رہا ہے اور منظر عام پر برہنہ پھرنے والے کو خود حکومت لباس مہیا کر دیتی ہے۔ پھر تم کیوں خیالی ہموم و غموم سے مرے جا رہے ہو؟ اگر ریشم کی قمیص نہیں تو نہ سہی گاڑھے کا کرتہ پہن لیں گے۔ ولایتی ساخت کا پمپ میسر نہیں تو بلا سے دیسی جوتا اس سے زیادہ مضبوط اور آرام دہ ہے۔ عزیز دوست دنیا کو ایک اسٹیج تصور کرو اور ہر مرد و زن کو ایکٹر۔ تفریح و تفنن اور رنج و حرماں کے کل مظاہر در حقیقت کامیڈی اور ٹریجیڈی کے کھیل ہیں۔ جن سے متاثر ہونا قرین قیاس نہیں۔ ہر واقعہ کو ایک بے غرض اور غیر جانبدار تماشائی کی حیثیت سے ملاحظہ کرو۔ لیکن اس دوران میں اپنے احساس کو واقعہ کی نوعیت سے آلودہ نہ ہونے دو۔ اس عالم متغیر میں جس کی کسی شے کو ثبات نہیں اور جہاں ہر گذرنے والا لمحہ ایک نئی زندگی کی آفرینش کا پیغام دے جاتا ہے زمانے کی نیرنگیوں اور انقلابات دہر سے اثر پذیر ہونا اس امر کی دلیل ہے کہ تمہیں اپنے دل و دماغ پر قابو نہیں۔ واقعات عالم کا تماشا کرتے وقت ایک سائنسدان کی طرح اپنے حسیات کو بالکل علیحدہ رکھو ورنہ یہاں گریہ وزاری کی تو بے حد ارزانی ہے۔

مَیں اکثر سوچتا ہوں کہ ہندوستان میں ہم اس قدر جلد بوڑھے کیوں ہو جاتے ہیں۔ میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم زندگی کو غیر معمولی اہمیت دینے کے علاوہ اس میں کوئی جدت پیدا نہیں کرتے۔ پیدائش سے موت تک ہم ایک ہی ماحول میں رہتے ہیں۔ وہیں پرورش پائی، وہیں بڑھے اور وہیں مر گئے۔ کسی چیز سے پوری طرح بہجت اندوز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے مختلف پہلوؤں سے تمام امکانی حظ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ طالب علم اگر صبح سے شام تک کتابوں میں سر کھپائے اور کھیل کود حرام کر لے تو مطالعہ کا مقصد فوت ہو گیا۔ وکیل اگر گھر سے کچہری اور کچہری سے گھر تک ہی زندگی محدود کر لے یا ایک طبیب اگر دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر کے امراض کی تشخیص اور مریضوں کے معائنے تک ہی اپنے آپ کو وقف کر دے تو اس نے زندگی کا صرف ایک پہلو دیکھا ہے اور باقی پہلوؤں کے لئے وہ اندھا ہے۔ ایک ہی قسم کے ذائقہ سے طبیعت جلد سیر ہو جاتی ہے۔ مصروفیتوں میں ردو بدل کرتے رہو گے۔ تو دنیا کی چیزیں زیادہ خوبصورت اور جاذب توجہ ثابت ہوں گی۔ کبھی "فقیروں کا بھیس" بنا کر "تماشائے اہل کرم" دیکھو تو کبھی اہل کرم بن کر فقیروں کا تماشا دیکھو۔"

بی اے تک ہم اکٹھے رہے اس کے بعد میں ایم۔ اے میں آ گیا اور اصغر گھر بے کار بیٹھا رہا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ زندگی کا بے کاری کے نقطہ نگاہ سے مطالعہ کرے گا۔ لیکن بعد ازاں معلوم ہوا کہ اس کے والد اسے تعلیم دینے کے حامی نہ تھے۔ اس لئے اصغر کو مجبوراً لاہور کی جاں بخش درس گاہوں سے محروم رہنا پڑا۔ ایک سال گزر گیا اور اگلے برس اصغر نے لاء کالج میں داخل ہو کر سب دوستوں کو حیران کر دیا۔ کہاں اصغر اور کہاں قانون کی کٹھن منزل لیکن شاید اس نے اپنی آبلہ پائی کا یہی علاج سوچا تھا کہ وکالت کی وادی

پر خار کے کانٹوں کی پیاس بجھائی جائے۔ ہم جانتے تھے کہ اس بیل کا منڈھے چڑھنا مشکل ہے۔ سال بھر اصغر قانون کی ضخیم اور خشک کتابوں کا پلندا اٹھائے دو میل کا فاصلہ طے کر کے ہر روز صبح آٹھ بجے کالج پہنچتا رہا۔ اس کی باقی زندگی انہی دیرینہ خصوصیات کی حامل تھی۔ جدت کا وہ اب بھی متلاشی تھا اور شاید لاء کالج میں داخل ہونا بھی حصول جدت کی ایک سعی تھی۔ مگر اس کی ذہانت قانون کی حریف نہ ہو سکی۔ یہاں تو وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو دنیا کو صرف دو اور دو چار سے تعبیر کریں۔ امتحان میں ناکامی کی خبر اس کو ایک انگریزی روزنامہ کے ذریعہ سے ملتان میں ملی۔ اس کے والد جو پہلے ہی اسے ایک ناگوار فرض اور غیر ضروری بار سمجھے بیٹھے تھے۔ یہ خبر سنتے ہی برس پڑے اور لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف انہوں نے کہہ دیا کہ۔ "میرے مکان سے نکل جاؤ۔ میں عمر بھر کا اندوختہ تمہاری فضول خرچیوں اور تماش بینیوں پر لٹانا نہیں چاہتا۔"

یہ حالت تھی جب اصغر صاحب نیچے دروں و نیچے بروں کی صورت بنائے افسردہ و مضمحل میرے پاس آئے۔ جب ہم کھانا کھا چکے تو میں نے پوچھا۔ "اب کہاں کا ارادہ ہے؟"

"میں بمبئی جا رہا ہوں۔"

"بمبئی؟ وہاں کیا کرو گے؟"

وہ کہنے لگا "تم حیران کس بات پر ہوتے ہو؟ میں تمہاری طرح آئی۔ سی۔ ایس کے خواب تو دیکھ ہی نہیں رہا کہ اس سے کم کسی چیز پر میری تسلی نہ ہو گی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ذاتی وجاہت و حشمت کے قائم کردہ معیار میں میں تمہارا ہم خیال نہیں ہوں۔ میں تو صرف جان و جسم کا رشتہ بر قرار رکھنے کے لئے روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا اور ایک انسان کے لئے ضروری سمجھتا ہوں اور یہ چیزیں میں ہر حال اور ہر جگہ اپنے لئے بآسانی پیدا کر سکتا ہوں۔ اس لئے میرے لئے لاہور، کراچی، لکھنو، بمبئی یا لندن سب برابر ہیں۔"

چند روپے اس کے پاس تھے کچھ اس نے مجھ سے لئے اور حضرت دوسرے روز بمبئی روانہ ہو گئے۔ اس واقعہ کو اڑھائی سال گذر گئے۔ ہم بظاہر ایک دوسرے کے لئے مر چکے تھے۔ کیونکہ نہ اس نے مجھے کبھی خط لکھا اور نہ مجھے اس کا پتہ معلوم تھا۔ اس دوران میں میرے پرانے ہم مکتب دوست 'آدم اسمٰعیل کی شادی کی تقریب آئی۔ آدم اسمٰعیل بمبئی کے رہنے والے تھے۔ اور وہیں اُن کا کاروبار تھا۔ ان کے سخت اصرار پر مجھے بھی اس تقریب سعید میں شریک ہونے کے لئے بمبئی جانا پڑا۔ جب شادی کی گہما گہمی سے فراغت ہو چکی تو آدم صاحب نے اپنے خاص دوستوں کو ایک شام تاج محل ہوٹل میں دعوت دینے کا اہتمام کیا۔ تاج محل کی وسیع اور شاندار عمارت کے ایک پر تکلف کمرے بیٹھے ہم سامان اکل و شرب کا انتظار کر رہے تھے کہ ہوٹل کا ملازم رکابیاں اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے دہلیز کے اس طرف قدم رکھا ہی تھا کہ میری اس کی نظریں چار ہوئیں۔ مجھے اپنی آنکھوں پر شک ہونے لگا۔ میں سمجھا کہ عالم خواب ہے اور جو کچھ دیکھ رہا ہوں اس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ آنے والے شخص نے بھی میری طرف دیکھا اور سوائے ایک خفیف تبسم کے اس کے چہرے پر حیرت و استعجاب کی کوئی علامت نہ تھی۔ یہ اصغر تھا جو ہوٹل کے ملازم کی مخصوص وردی پہنے ہمارے لئے میز پر کھانا چن رہا تھا۔ جب وہ دوسری مرتبہ کمرے میں داخل ہوا تو میں نے بے اختیار اُس کا بازو پکڑ لیا اور چلایا "اصغر تم کہاں؟"

اُس نے تحمل سے جواب دیا۔ "یہ مصروفیت کا وقت ہے۔ پہلے کھانے سے فارغ ہو لیجئے۔ پھر باتیں کرینگے۔"

میرے ساتھی حیران تھے کہ کیا معاملہ ہے۔ میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ کھانے کے بعد مفصل گفتگو ہو گی۔ جب ہم ہوٹل

سے رخصت ہونے لگے تو اصغر چند منٹ کے لئے میرے پاس آیا اور کہنے لگا "ابھی کام ختم نہیں ہوا ورنہ میں آپ کے ہمراہ چلتا۔ یہ بتاؤ ٹھہرے کہاں ہو؟ میں کل صبح آؤنگا۔" میں نے اپنی قیام گاہ کا پتہ دیا اور بمنت درخواست کی کہ خدا کے لئے اپنی اولین فرصت میں ضرور پہنچنا۔

دوسرے روز میں ابھی ناشتے سے فارغ نہ ہوا تھا کہ اصغر کے آنے کی اطلاع ہوئی۔ ہلکے فاختی رنگ کا سوٹ بیش قیمت انگریزی ٹوپی اور نہایت اعلیٰ بوٹ پہنے اصغر کمرے میں داخل ہوئے۔ میرے میزبان جواب تک اصغر کے حالات و اطوار سے بے خبر تھے۔ اس قلب ماہیت کو دیکھ کر حیران ہو گئے۔ اصغر نے اندر قدم رکھتے ہی ایک بلند بانگ قہقہہ لگایا اور آداب مجلس کو بالائے طاق رکھ کر وحشیوں کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ میں بار بار اُس کے کپڑوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور سخت متعجب تھا کہ اس طرفہ معجون شخص کا خمیر کس مٹی سے بنا ہے۔ رات ایک ہوٹل کا خدمت گار تھا اور اب ہائیکورٹ کے وکیل سے کم شان کا مالک نہیں۔ میں نے پوچھا "تم نے بہروپ بھرنے کا پیشہ کب سے اختیار کیا ہے۔ کیا بمبئی میں شروع سے یہی کام کر رہے ہو؟ کیسی شرمناک بات ہے کہ یونیورسٹی کا فارغ التحصیل اور تم سا زیرک و خوش فہم شخص یوں ذلیل و خوار ہو۔"

اس نے کہا "اگر تم نے زجر و توبیخ کی پرانی عادت ترک نہیں کی تو الحمد للہ میں بھی اپنی دیرینہ خصوصیات پر بدستور کاربند ہوں۔ میں تم سے ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب ایکٹر۔ تم میرے قول کو متانت کے خلاف سمجھ کر نا قابل عمل خیال کرتے تھے۔ اب تو اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو نہ میں کس انداز سے اس اصول سے اپنی عملی زندگی میں جاری و ساری کر چکا ہوں۔ بھائی سچ جانو میں تم سے زیادہ مسرور و مطمئن ہوں۔ غم دنیا و فکر عاقبت سے آزاد ہوں۔ اچھا کھانا' اچھا پہننا' بمبئی ایسے شہر میں فطرت انسانی کا مطالعہ اور مجھے کیا چاہیے؟ آزادی کا یہ عالم ہے کہ ڈھائی سال کی مدت میں بیسیوں پاپڑ بیل چکا ہو۔ مدرسی اور اخبار نویسی میں نے کی۔ سنگر مشین کا ایجنٹ میں رہا۔ سینما اور تھیٹر کی ملازمت کا مزا میں نے چکھا۔ ٹرام میں نوکری میں نے کی۔ غرض کہ جہاں طبیعت ذرا اکتائی اور حواس پر بڑھاپے کے آثار نمودار ہوئے میں فوراً اپنی مصروفیت کی نوعیت میں تبدیلی پیدا کر لیتا ہوں اور زندگی پھر تر و تازہ ہو جاتی ہے۔ میری صحت دیکھو' قابل رشک ہے یا نہیں۔"

اصغر کی صحت واقعی بے نظیر تھی۔ گوشت اور خون کی کثرت اس پر اس کا ورزشی جسم' پہلوان معلوم ہو رہا تھا۔

آج کل یہ کام ہے کہ دن کو یہاں کے ایک رئیس کے خورد سال بچے کو پڑھاتا ہوں۔ معقول مشاہرہ لینے کے علاوہ رہتا بھی انہی کے مکان پر ہوں۔ اور شام کو تاج محل ہوٹل۔ پچھلے دنوں جرمنی کی ایک مشہور تجارتی کمپنی کے گماشتے سے میری ملاقات ہو گئی تھی وہ اپنے کاروبار کے سلسلہ میں مجھے جرمنی لے جانے پر رضامند ہے۔ شرائط ابھی طے نہیں ہوئیں۔ ممکن ہے چند ماہ تک جرمنی چلا جاؤں اور یوں یورپ جانے کی پرانی آرزو بر آئے۔"

مجھے بمبئی سے واپس آئے سال بھر سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے۔ آدم اسمٰعیل اور اصغر کی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ چنانچہ آدم کے خط سے معلوم ہوا کہ اصغر جرمنی روانہ ہو گیا ہے۔

لاری میں

سید فیاض محمود

منور ایک سادہ سا آدمی ہے۔ میرا اس کا تعارف تین سال ہوئے ایک دوست کے ہاں چائے کے موقع پر ہوا تھا۔ اس کے بعد اتفاق ایسا ہوا کہ کسی نہ کسی جگہ ہماری ملاقات ہوتی رہی اور اب دو سال سے کچھ زیادہ ہی عرصہ ہوا کہ میری اس کی خاصی اچھی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ اکثر میرے ہاں آجاتا اور ہماری لمبی چوڑی گفتگوؤں کا سلسلہ جاری ہو جاتا۔ دیکھنے میں منور میانہ قد اور سانولی رنگت کا نوجوان ہے۔ اس کی عمر غالباً ۲۳۔ ۲۴ سال کے درمیان ہوگی۔ کچھ عرصہ ہوا وہ "جنگلات" میں ملازم ہو گیا ہے۔ وہ خوش پوش ہے اور چونکہ اس کا جسم سیدھا اور ورزشی ہے۔ اس لئے وہ جامہ زیب بھی ہے۔ چلتے ہوئے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کپڑے مانگے کے ہیں۔ شکل و شباہت میں اگرچہ کوئی خاص نقش قابل ذکر نہیں۔ مگر بحیثیت مجموعی خوش شکل ہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر دو ایک چیزیں اس کی البتہ ضرور جاذب نظر ہیں۔ ایک تو اس کے بال اور دوسرا تبسم۔ بال اس کے گھنگھریالے نہیں مگر دو ایک خم ان میں قدرتی طور پر اس طرح قائم ہو جاتے ہیں کہ دیکھنے والے پر اچھا اثر ڈالتے ہیں۔ پھر اس کی آنکھیں اتنی شرمیلی ہیں، جیسے کسی لڑکی کی ہوں۔ ان سے فقط یہی اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی میں اس کے تجربات علمی اور تخیلی ہی ہیں۔ یوں اچھا پڑھا لکھا شخص ہے۔ اور خصوصیت سے اقتصادی اور سیاسی مسئلے سے اسے بہت انہماک ہے۔ اکثر انہی مضامین کی کتابیں پڑھتا ہے اور اس کی گفتگو ان ہی مسائل کے مختلف پہلوؤں کے متعلق ہوتی ہے۔

ہماری باتوں میں اگرچہ سماجی زندگی کے کئے ایک پہلو موضوع بنے ہیں مگر نسوانی موضوع پر ہم نے بہت کم تبادلہ خیالات کیا ہوگا۔ کیونکہ منور اگرچہ اپنے خیالات میں کافی حد تک جدید بلکہ انقلاب پسند ہے۔ مگر عورتوں کے معاملہ میں وہ شرمیلا ضرور ہے اُس لئے اس نے اگرچہ معاشرتی اور متعلقہ امور پر کئی دفعہ بحث کی ہوگی۔ لیکن اپنے ذاتی خیالات یا محسوسات یا تجربات کی بابت اس نے مجھے بہت کم بتایا ہے۔ کبھی کبھی بر سبیل تذکرہ اگر ذاتی معاملات پر ذکر چھڑ جاتا تو وہ رک رک کر شرما شرما کے تھوڑا بہت اپنی بابت اور کسی واقعہ کے متعلق کچھ بتاتا۔ جس سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ اسے کسی سے کبھی محبت ہوئی بھی ہوگی تو بے زبان گہری قلبی بلا اظہار اور اس لئے پر حسرت یعنی بے اثر۔ اور چونکہ میری عادت نہیں کہ دوسروں کے راز کرید تا رہوں۔ اور اس کی شخصیت باوجود اس حجاب کے بھی کافی دلچسپ ہے۔ اور چونکہ دور حاضرہ کے عمرانی اور سیاسی معاملات میں اس کی رائے قابل وقعت اور اس کی معلومات وسیع ہیں۔ اور اس کے خیالات اور تجاویز بہت دلچسپ ہوتی ہیں۔ اور چونکہ ذاتی طور پر بھی وہ ایک دل پسند طبیعت کا مالک ہے۔ اس لئے ہمارے تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔ یہ کہانی اس کے متعلق ہے۔ مگر نہ اتنی کہ اس کے جان پہچان والے اسے پڑھ کر مذاق کرتے

بھر یں۔ اور پھر اس واقع کو اب ایک سال ہونے کو ہے۔ اور یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ خود منور اسے بھول گیا ہے۔ مگر چونکہ میں نے اس سے بھی کہہ دیا تھا کہ میں ....اسے کبھی نہ کبھی دن لکھ دوں گا۔ اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ وہ اب اس واقعہ کے اعادے سے ناراض نہیں ہوگا۔

ایک دن غالباً فروری کے مہینے میں منور شام کے وقت مجھ سے ملنے آیا۔ ہمیں ملے دو ہفتے سے زیادہ ہو گئے تھے اس لئے اس کا آنا باعث مسرت تھا۔ اور میں نے بہت اشتیاق سے اس کا خیر مقدم کیا۔ مگر میں نے دیکھا کہ اس کا انداز کچھ بشاش نہیں ہے۔ بلکہ اگر پژمردہ نہیں تو خاموش اور غیر معمولی طور پر متین ضرور ہے۔ میں نے کہا خیر تو ہے؟ کہنے لگا نہیں بات تو کوئی نہیں ہونی چاہیے۔ مگر طبیعت پریشان ضرور ہے۔ چونکہ عادتاً وہ قدرے راست گو واقع ہوا ہے۔ میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی وجہ ہے۔ چنانچہ میں نے کہا اتنے دن کہاں رہے؟ بیس ایک دن ہو گئے تمہیں دیکھا نہیں۔ کہنے لگا یہیں تھا۔ کچھ دنوں کے لئے گوجرنوالہ ایک کام کو گیا تھا۔ میں نے یہ تو نہ پوچھا کہ کام کیا تھا۔ مگر مجھے محسوس ہوا کہ گوجرنوالہ کا لفظ ادا کرنے میں اس کا لہجہ عجیب سا تھا۔ کم از کم فرق ضرور تھا۔ جیسے کوئی بات اس لفظ کے ادا کرنے میں مانع ہو۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میرا شک درست تھا یا نہیں مگر اس کی آواز میں ارتعاش کے علاوہ کچھ تلخی کی آمیزش بھی تھی۔ بہر حال میں نے اس سے گوجرانوالہ کے متعلق مطلقاً کچھ نہ پوچھا۔ محض ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ مگر وہ معمول کے خلاف کچھ باتیں کر کے چپ ہو جاتا۔ دو ایک دفعہ جب وہ میرے سلسلہ کلام کو جاری کرنے پر بھی چپ رہا تو میں نے اس سے بہت زور سے پوچھا کہ بھئی کیا ہو گیا ہے۔ کوئی وجہ ضرور ہے جو اتنے ملول ہو کوئی واقعہ پیش آیا ہے؟ تو مجھے بتاؤ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔ اور اگر میں کچھ نہیں بھی کر سکتا تو کہہ ڈالو شاید تمہارا دل ہی ہلکا ہو جائے۔ اس پر اس نے مجھے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا مگر میں جان گیا کہ اس کی آنکھیں تھکی ہوئی ہیں اور اس کی نگاہ لاابالی ہے۔ آخر کار تھک کر میں نے ذرا سختی سے پوچھا کہ بھئی کیوں گھلے جا رہے ہو ذرا ہمیں بھی بتاؤ۔ جب بہت اصرار کیا تو اس نے یہ واقعہ سنایا۔

"تمہیں یاد ہو گا ابھی کچھ منٹ ہوئے میں نے تجھ سے گوجرانوالہ کا ذکر کیا تھا۔ مجھے وہاں ایک کام تھا' واپسی پر گاڑی واڑی کا تو مجھے وقت یاد نہیں تھا میں لاریوں کے اڈے پر چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ کسی بس سروس کی لاری بس دو منٹ میں چلنے والی ہے۔ مگر شاید جانتے ہو بس سروسوں کی لاریاں دور دور مقاموں کے درمیان چلتی ہیں۔ یہ لاری لاہور اور سیالکوٹ کے درمیان چلتی تھی۔ چنانچہ جب میں ٹکٹ لے کر بیٹھنے لگا تو دیکھا کہ اگلی نشست تو رکی ہوئی تھی ہی' درمیانی درجہ یا حصہ بھی کسی ہندو خاندان سے اٹا پڑا تھا۔ غالباً کسی برات پر جانے والی مستورات تھیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ سب نشستیں پر ہوں گی چنانچہ میں جو اندر داخل ہونے لگا تو ایک لڑکا جو انہیں میں سے تھا بولا "صاحب یہاں سب مستورات بیٹھیں ہیں۔ اگر آپ پیچھے بیٹھ جائیں تو نوازش ہو گی۔" میں نے خیال کیا کہ شاید سارا درجہ ہی محفوظ کرا رکھا ہو گا۔ مگر میں لاری میں اب تک کبھی پچھلے حصہ میں نہیں بیٹھا۔ کچھ مجھے تامل ہوا مگر ڈرائیور کہنے لگا "صاحب بیٹھنا ہے تو بیٹھیے گاڑی چلنے والی ہے۔" چنانچہ طوعاً و کرہاً میں پچھلے حصہ میں داخل ہو گیا۔ ٹکٹ بھی لے چکا تھا۔ یہ بھی خیال تھا کہ جانے دوسری لاری کب چلے اور پھر پچھلے حصہ کی دائیں جانب کی وہ نشست جو بالکل درمیانی حصہ کے ساتھ لگتی تھی خالی تھی۔ یا کم از کم وہاں ایک مسافر بیٹھ سکتا تھا۔ چنانچہ میں اسی نشست کی طرف لپکا اور بیٹھ گیا۔ اب جو اطمینان سے نظر اٹھا کر ارد گرد دیکھا تو معلوم ہوا کہ نشست بھی کوئی بری نہ تھی۔ میرے دائیں طرف برات والیاں بیٹھی تھیں اور خوش قسمتی سے ان میں سے جن کی پشت میری طرف تھی ان میں ایک وہ لڑکا تھا' ایک اس کے ساتھ پانچ ایک برس کی پیاری سی چھوٹی بچی تھی اور ایک بوڑھی عورت اور ایک اور لڑکی جس کی عمر کوئی سات ایک برس کی ہو گی۔ البتہ جو نشستیں اب میرے مقابل تھیں ____ مقابل ہی سمجھو نا کیونکہ میں

[illegible] انہیں کی طرف رخ کر کے بیٹھا تھا یعنی بیٹھا تو آڑا تھا مگر میں انہیں بآسانی دیکھ سکتا تھا اور وہ سب میری طرف دیکھ سکتی تھیں نہ [illegible] یعنی کہ۔

میں پہلے شاید کہہ چکا ہوں کہ یہ خواتین کسی برات میں جا رہی تھیں۔ اور جب اس پر اس امر کا خیال کیا جائے کہ وہ عورتیں تھیں تو تم اندازہ کر سکتے ہو کہ لباس کے لحاظ سے تو وہ سب کی سب جگمگا رہی ہوں گی اور خصوصیت سے ایک تو شاید تازہ شادی شدہ تھی یا کم از کم اسے ایک سال سے زیادہ تو ہرگز نہیں ہوا ہو گا۔ کیونکہ ایک تو اس کے کپڑے ہی سب سے اچھے تھے اور پھر زیور کے لحاظ سے بھی وہ سب سے ممتاز تھی۔ اور یوں تو گویا تم جانو میرے لئے تو اس کے سوا وہاں گویا اور کوئی تھا ہی نہیں۔ میں نے دو ایک نظر میں سب کو دیکھ لیا۔ اور پھر ان کو بھی جن کی پشت میری طرف تھی۔ لڑکے کی پشت میری طرف تھی اس لئے اس طرف سے تو تسلی تھی۔ اس کے ساتھ کی سواری وہ ننھی منی سی لڑکی تھی۔ جانتے ہو اتنی عمر کا بچہ کبھی نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ چنانچہ سب سے پہلے جس نے میری توجہ اپنی طرف منعطف کرائی وہ یہی لڑکی تھی جسے بار بار وہ جو سامنے کی نشست پر کونے میں بیٹھی تھی یہ کہہ کے چپ کراتی تھی "ارے چاند تو آرام سے تو بیٹھ۔" چاند رانی معلوم ہوا اس چھوٹی سی سرخ گالوں والی شوخ لڑکی کا نام تھا کرتی وہ کیا تھی؟ یہ پوچھو وہ کرتی کیا نہ تھی! کبھی اٹھتی کبھی بیٹھتی اور ہر وقت اپنی چھوٹی سی ریشمی اوڑھنی کو اپنے سر کے گرد لپیٹنے میں مشغول رہتی۔ پھر ایک جیب میں سے جو کافی پھولی ہوئی تھی ایک بڑا سا ریشمی رومال نکال کر چوسنے والی مٹھائی کی ایک گولی نکالتی۔ رومال کو پھر جیب میں ٹھونستی اور مٹھائی کو منہ میں ڈال کر اپنے دوپٹہ کو جو اس اثنا میں ضرور سر پر سے اتر گیا ہوتا تھا سنبھالنے لگ جاتی۔ یا اپنی جگہ کھڑے ہو کر پچھلے حصہ کی طرف منہ کر کے ہم سب کی طرف ایک ایک نظر غور سے دیکھ کر پیچھے کی کھڑکی سے سڑک اور ہٹتے ہوئے درختوں کو دیکھتی رہتی۔ مگر ایک منٹ سے زیادہ نہیں۔ اس کا دہن چھوٹا سا تھا اور جب وہ پیچھے دیکھتی تو منہ میں گولی ہونے کے باعث اس کے ہونٹ ضرور ملے ہوئے ہوتے۔ منہ بس ایک ننھی سی گلاب کی کلی معلوم ہوتا اور چونکہ توجہ اس کی یا سڑک کی طرف یا کسی اور چیز کی طرف مرکوز رہتی۔ اس لئے چہرہ جو عام طور پر جب اس کا رخ اپنی ماں یا ممانی یا ماموں کی طرف ہوتا شوخی اور شرارت اور ہنسی اور خوشی سے چمکتا ہوتا۔ اس قدر متین نظر آتا کہ میں نے موٹر کے چلنے کے پانچ منٹ کے اندر اندر اس سے واقفیت پیدا کر لی اور وہ اس طرح کہ جب وہ ہماری طرف دیکھ رہی تھی تو میں نے آہستہ سے ایک انگلی سے اس کے بائیں گال کو سہلا دیا۔ پہلے تو ایسا کرنے پر دو ایک دفعہ شرما کر اور تھوڑا بہت غصہ کر کے فوراً ہی منہ دوسری طرف کر لیتی مگر اس کے ایسا کرنے پر بھی اسے دوپٹہ درست کرنے کی ضرورت پیش آتی تو میں موقعہ پا کر اس کے دائیں گال کو جواب میرے نزدیک تر ہوتا سہلا دیتا۔ اس پر وہ اتنا الجھ جاتی کہ دوہری ہو کر گول مول ہو جاتی، مگر نچلا بیٹھنا اس کے لئے ناممکن تھا۔ وہ مجھے بھول کر اور میرے چھکانے اور گدگدانے کو بھول کر اپنی ماں سے یا اپنی ممانی سے جو بالکل اس کے سامنے بیٹھی تھی سوال و جواب میں مشغول ہو جاتی۔

میں نے چاند کے متعلق اتنی لمبی تمہید اس لئے دی ہے کہ دراصل میرے اس واقعہ یا سانحہ کی روح اگر چاند نہ تھی تو وسیلہ ضرور تھی۔ اس کے بائیں طرف جو بوڑھی عورت بیٹھی تھی وہ اتنی کم سخن تھی کہ مجھے یاد نہیں اس نے ایک دفعہ بھی کچھ کہا ہو۔ اگرچہ کچھ نہ کچھ تو وہ بولی ہو گی۔ چاند کے سامنے والی نشست پر جو تین فرد تھے ان میں سے معلوم ہوا کہ جو عورت لڑکے کے سامنے بیٹھی تھی وہ چاند کی نانی تھی۔ پھر چاند کے سامنے اس کی ممانی اور پھر اس کی ماں جس کی گود میں دودھ پیتا بچہ تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ وہ برات سے واپس جا رہی تھیں [illegible] جا رہی تھیں۔ غالباً کسی شادی سے واپس آ رہی تھیں۔

چاند سے مجھ [illegible] سے پہلے ہی میں نے اس کے سامنے بیٹھنے والی کو نظر بھر کر دیکھ لیا تھا۔ اور جو میں نے دیکھ لیا تھا

عمر یہ کہ اس کی عمر بیس اکیس سے بمشکل زیادہ ہو گی۔ گول چہرہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں۔ گلابی ہونٹ چھوٹی سی خوش قطع ناک اور چھوٹے چھوٹے مگر خوب بڑے ہوئے سفید دانت جو اکثر جھلکتے ہی رہتے تھے۔ باقی رہے کپڑے سو ان کا یہ عالم تھا کہ گلابی رنگ کا دھاری دار دوپٹہ تھا اور آتشی گلابی کمخواب کا سوٹ اور کامدانی گرگابی۔ قمیص پر ہلکے زرد رنگ کا اونی سویٹر کوٹ اور زیور ہر زیور کا ٹھکانا ہی نہیں تھا۔ کڑے بھی تھے اور چوڑیاں بھی اور گھڑی پہنچی بھی جس میں اوم بنا ہوا تھا۔ اور جسے شاید نفیسیاں بھی کہتے ہیں۔ اور گلے میں ہار اور نیکلس۔ ہاتھوں میں انگوٹھیاں کانوں میں لمبے لمبے بندے۔ دوپٹے کے اوپر جوگیا رنگ کی چادر۔ لباس سے ہی ظاہر ہوتا تھا کہ شادی کو بہت عرصہ نہیں ہوا۔ اور یہ بھی کہ کسی امیر گھرانے کی بہو ہے۔

جو چیز اس کی ہر وقت سامنے رہتی ہے وہ اس کی مسکراہٹ ہے۔ ہر وقت اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم کھیلتا رہتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہونٹ بنے ہی مسکراہٹ کے لئے ہیں۔ اور پھر اسی کی مسکراہٹ کے لئے۔ تم نے بہت سی خوبصورت لڑکیوں کو مسکراتے ہوئے دیکھا ہو گا۔ اچھا بہت سی کو نہیں تو کچھ تو ضرور دیکھی ہوں گی۔ اور شاید ہر لڑکی ہی جوان ہو کر مسکراتی ہے یا کم از کم عام طور پر یہی خیال کیا جاتا ہے۔ مگر دراصل یہ خیال غلط ہے ۔ اور لوگوں کی بے وقوفی نہیں تو ناتجربہ کاری پر مبنی ہے۔ ورنہ میری بھی چوبیس سال کی عمر ہے‘ میں بھی تو ایسی مسکراہٹ کبھی دیکھتا! تبسم کیا تھا حسن کا رقص تھا‘ نشہ تھا نشہ.. ...... یقین جانو جب اس مسکراہٹ سے اس نے مجھے دیکھا تو میں دو تین سیکنڈ سے زیادہ اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ سکا اور اس کی آنکھیں ! اللہ! .... آنکھیں! وہ اتھاہ گہرائیاں! ان میں جھجک بالکل نہ تھی۔ ان میں اطمینان‘ سکون‘ غرور‘ احساس حسن تھا اور ظاہر تھا کہ وہ جانتی تھی کہ ان میں جاذبیت ہے اور میرا ان کے سامنے جھک جانا یا مجھے اس کے حسن کا اعتراف کرنا لازمی تھا۔ بے باکی‘ خود اعتمادی‘ میں تمہیں کیا بتاؤں! میں تو نہ دیکھ سکا‘ یقین جانو میں تو شرما گیا۔

پہلے تو میں نے سرسری طور پر محسوس کیا تھا کہ وہ خوبصورت ہے مگر چونکہ لاری ابھی چلی ہی تھی میں نے زیادہ عجلت نہ کی اور اس کے درجے کی باقی عورتوں کو اچھی طرح دیکھا کیا اور ان کی باتیں سنتا گیا مگر اس کو اچھی طرح دیکھنے کا موقع نہ آیا تھا۔ دوسرے چاند رانی ہی مجھے اپنی طرف مشغول رکھنے میں کافی تھی۔ ایسی پیاری اور سرخ و سپید اور شوخ کہ پہلے پانچ منٹ تو جیسا میں نے کہا ہے میں اسی میں مشغول رہا۔ ایک دفعہ جو وہ گول مول بنی سمٹی سمٹائی اپنے آپ کو دوپٹہ میں لپیٹتی جا رہی تھی اور میں کبھی یہاں کبھی وہاں انگلی سے گدگدا رہا تھا تو میری نظر اٹھ کر اس کی ممانی پر جا پڑی۔ اتفاق سے وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اور مسکرا بھی رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں سے جو میری نظر اٹھ کر اس کی آنکھوں میں گڑ گئی تو میں کچھ دیر کے لئے چاند رانی اور لاری اور برات اور سب کچھ بھول گیا۔ معلوم نہیں میں ایک منٹ دیکھتا رہتا تو کیا ہو جاتا۔ میں تو پانچ سیکنڈ سے زیادہ نہیں دیکھ سکا ہوں گا۔ مگر تمہیں کیا بتاؤں کہ ان آنکھوں میں کیا دیکھا۔ شاعر تو پیٹتے رہتے ہیں۔ شرمائی ہوئی باحیا کنواری نظر کو۔ میں کہتا ہوں ان آنکھوں کو کیا دیکھنا آئے جو شرم و حیا سے آپ ہی بند ہوئی جاتی ہوں۔ آنکھیں تو وہ تھیں! میں کبھی نہیں بتا سکتا کہ ان آنکھوں کا یقین‘ ان کی بے حجابی! ان کی گویا معلومیت۔ "جیسے کہ مرد عورت کا فرق اجنبی اور غیر محرم کی غیریت‘ سب پردے فضول ہیں۔ اور دیکھنے والی آنکھ کے سامنے سب پردے عیاں ہیں۔ یقین کر لو مجھے تو اپنی نظر سے شرم آ گئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ گویا اسے معلوم ہے کہ میری نظر کیا کہہ رہی ہے؟ کس چیز کی خواہش کر سکتی ہے کون سی چیز اسے مل سکتی ہے‘ مرد عورتوں کو کس نظر سے اور کس لئے دیکھتے ہیں اور ان سے کس چیز کے طالب ہوتے ہیں...... اور ستم یہ تھا کہ اس جاننے والی نظر کے باوجود ابھی اس کی آنکھیں ایک جوان لڑکی کی آنکھیں تھیں۔ اور اس کو مسکراہٹ میں شباب کا تمام نشہ موجود تھا۔"

یہ کہہ کر بے چارہ منور اٹھ کھڑا ہوا اور بے چینی سے دو قدم ادھر اور دو قدم ادھر پھرا۔ پھر جیسے یک دم چونک کر بیٹھ گیا اور ایک کمزور سی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں خوب غور سے اس کی کہانی سن رہا تھا۔ میں جانتا تھا جتنا حساس وہ ہے۔ اور مجھے اس کے احساسات کے ساتھ ہمدردی بھی تھی۔ اگرچہ چونکہ اس سے قبل اس نے کبھی اپنی جذباتی زندگی سے مجھے اچھی طرح روشناس نہیں کیا تھا۔ میں حیران ضرور ہوا کہ یہ خاموش سا شرمیلی آنکھوں والا نوجوان جس چیز سے اتنا متاثر ہو گیا ہے وہ اتنی جاذب تھی بھی یا نہیں؟ مگر منور پھر شروع ہو گیا تھا۔

میں نے تو اپنی آنکھیں نیچی کر لیں مگر نہ جانے وہ مجھے کتنا عرصہ دیکھتی رہی۔ یا شاید اس نے دوبارہ دیکھنا شروع کر دیا ہو کیونکہ جب کچھ دیر بعد میں نے پھر اس کی طرف دیکھا تو وہ پھر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اب کی دفعہ میں نے اس کی آنکھوں میں نہ دیکھا بلکہ میں اس کے ہونٹوں اس کے چہرے اس کے ہاتھوں کی طرف جن میں سے ایک میں رومال پکڑا ہوا تھا دیکھتا رہا۔ کلائیوں پر اس نے نفیسیاں پہن رکھی تھیں۔ نفیسیوں کی طرف میں اس لئے بھی غور سے دیکھتا رہا کہ میں اول اول نہ معلوم کر سکا کہ ان کے درمیان سرخ سے جو نقوش بنے ہوئے ہیں وہ کیا ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ اوم ہے۔ مگر اس کے بعد پھر جو میں نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں پھر میری جانب دیکھ رہی تھیں۔ میں نے قدرے بے چینی سے اپنے بائیں طرف دیکھا کہ شاید وہ کسی اور کی طرف دیکھ رہی ہو۔ مگر نہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ پلکوں سے آدھی آدھی ڈھکی ہوئی آنکھیں، جن کی چمک اور نظر اور عمق اور وثوق پلکوں سے چھن چھن کر مجھ تک پہنچ رہا تھا میری طرف ہی جھکی ہوئی ہیں اور وہ نگاہیں میرے جسم دماغ اور دل سے گزر کر میری تمام حیسات کو بے نقاب کر کے کمال آسانی اور اطمینان اور لطف سے ایک کتاب کی طرح پڑھ رہی ہیں۔ شاید یہ سب کچھ اس ترتیب سے مجھے اسی وقت نہ سوجھا ہو مگر یہ احساس اسی وقت کا ہے۔ شاید بعد میں میں نے سوچ اور فکر میں ان احساسات کو ترتیب دے دیا ہو۔ کیونکہ اب تو مجھے یاد یہی آتا ہے کہ وہ نظریں گویا بہت ہی حلیم تھیں۔

اس کے کافی عرصہ بعد یعنی تقریباً دس منٹ تک اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ مطلقاً نہیں۔ مگر اس اثنا میں میں چاند رانی سے بہت بے تکلف ہو گیا تھا۔ اب وہ میرے گدگدانے یا ہاتھ لگانے سے اتنی سمٹتی نہ تھی۔ بلکہ اگرچہ بظاہر میری توجہ اور چھیڑ چھاڑ سے اب تک ناپسندیدگی یا حجاب کا اظہار کرتی تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ اس نے گویا مجھے قبول کر لیا ہے۔ اور وہ بھی نہایت غیر جانب داری سے اپنی توجہ اپنے سامنے بیٹھے ہوئے افراد کی طرف رکھتی تھی اور آدھی یا میری طرف یا ان اطراف اور اشیا کی طرف جن سے میں اس تک نہ پہنچ سکوں۔ لطف یہ تھا جیسا کہ میں کہہ رہا ہوں جب کبھی میں اسے چھیڑتا یا گدگداتا یا اس کے گال یا بالوں کو سہلاتا تو وہ منہ ایسا ہی بناتی تھی۔ جیسے کہ میرا ایسا کرنا اسے ناپسند ہے۔ اور اگر میں دو منٹ تک بھی اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹا لیتا تو وہ اس اجتناب کو محسوس کر لیتی اور کنکھیوں سے میری طرف دیکھ لیتی اور یا لاری کے پچھلے حصہ کی طرف منہ کر کے اپنی نشست پر کھڑی ہو جاتی اور بغیر ادھر ادھر دیکھنے کے سیدھی پیچھے ہٹتی ہوئی سڑک یا اس پر گزرتے ہوئے لوگوں یا چھکڑوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہتی۔ مگر دراصل مجھے معلوم ہوتا کہ اسے انتظار اس بات کا تھا کہ کب میں اس سے پھر کھیلوں۔

ان دو کے علاوہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں چاند کی والدہ بھی اس کی ممانی کے دائیں طرف بیٹھی تھی۔ اور جب میں چاند کی طرف نہ دیکھتا اور جب [illegible] اس کی ممانی کی طرف نہ دیکھ سکتا تو چاند کی ماں کی طرف دیکھتا رہتا۔ مجھے یاد ہے کہ اس ڈیڑھ یا پونے دو گھنٹوں کے سفر میں ایک گھنٹہ [illegible] چاند کی والدہ کی طرف دیکھتا رہا ہوں یا اس کی باتوں کو سنتا رہا ہوں۔ مگر میں مانتا ہوں کہ بعض عورتوں میں نہ دیکھتے ہوئے [illegible] طور پر موجود ہوتا ہے۔ کیونکہ اس عورت کو اچھی طرح معلوم ہو گا کہ میں اس کی طرف دیکھ

رہا ہوں اور اس کی باتوں کو غور سے سن رہا ہوں۔ مگر اس نے ایک مرتبہ بھی دانستہ طور پر میری طرف نہیں دیکھا۔ اب شاید تمہیں یہ خیال ہو کہ اتنی مدت تک ایک عورت کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہنا بدتمیزی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ واقعی یہ آداب کے خلاف ہے۔ اور شاید تم جانتے ہو کہ میں ایسی حرکت عام طور پر کرنے کے ناقابل ہوں۔ بلکہ اگر کہیں میرا گزر ایسے گلی کوچے سے ہو جائے جہاں عورتیں بیٹھی ہوں یا موجود ہوں تو میرے لئے وہ بیس پچیس قدم مصیبت بن جاتے ہیں۔ اور میں نے آج تک کبھی اچھی طرح نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ مگر یہاں بات جو میری بہت معاون تھی وہ یہ تھی کہ اس عورت نے گویا میری طرف نہ دیکھنے کا عہد کر رکھا تھا۔ شاید بھٹکتی ہوئی نظر مجھ پر سے پڑ کر گزر گئی ہو گی کیونکہ آخر میں تو چاند رانی کے عین پیچھے اور اسی سمت میں بیٹھا تھا اور وہ کونے میں ترچھی تقریباً میری طرف رخ کئے بیٹھی تھی اور اس لئے بھی کہ وہ تمام وقت ہی چاند کی ممانی اور نانی اور جو تھی عورت جو چاند کے ساتھ بیٹھی تھی اس سے تیز تیز لہجہ میں باتیں کرتی رہی۔ پہلی باتیں جن سے رفتہ رفتہ ان سب کا رشتہ آپس میں معلوم ہوا وہ یہ تھیں:۔

دوسروں سے وہ کہہ رہی تھی "ہائے ہائے یہ کیا طریقہ ہوا، پورن کی ماں نے شام دیوی کے بیاہ پر مجھے دو لڈو اور تھوڑے سے مرمرے بھیجے تو کس کے ہاتھ؟ اپنی چھوٹی کانتی کے ہاتھ۔ میں نے کہا میں تو لیتی نہیں۔ میں تو نہیں لیتی۔ بھیجا تو دوسرے دن اور آپ تو نہ آسکی۔ بھیجا تو بالشت بھر کی لڑکی کے ہاتھ۔ میں نے کہا میں کیوں لوں، برابر کی شریک ہے میں کیوں نیچی ہوں۔ دو لڈو اور مٹھی مٹھائی اور کانتی کے ہاتھ میں نے تو کہہ ہی دیا تھا کہ نے جا اور اپنی ماتا کے سر پر کہ چاند کے پتاجی بیٹھے تھے۔ کہنے لگے تم تو ناحق ناراض ہوتی ہو تمہیں وہ خود دینے نہیں آئی تو تمہارے ہاں کچھ ہو گا تو تم بھی نہ جانا تم بھی چاند کے ہاتھ بھیج دینا۔ میں نے کہا کہ اچھا میں بھی چاند کے ہاتھ ہی بھیجوں گی (اور وہ دودھ پیتے بچے کو ہاتھ لگا کے) میں بھی کاکاجی کے ہاتھ ہی بھیجوں گی۔ میں نے کہا چاند کے پتاجی سے میں چاند کے ہاتھ بھی کیوں بھیجوں گی، میں بھی نوکر کے ہاتھ بھیجوں گی۔ یہ بھی کیا طریقہ ہوا پورن کی ماں کو تو لین دین اور بھاجی کا کوئی طریقہ آتا ہی نہیں۔ مٹھائی بھیجی تو چٹکی سی اور کانتی کے ہاتھ۔ میں بھی نوکر کے ہاتھ ہی بھیجوں گی۔"

جس تیزی سے اور اشاروں اور اعضاء اور نقوش کی حرکت کی مدد سے اس نے یہ سب کچھ کہا وہ میرے لئے اتنا دلچسپ تھا کہ میں تو مبہوت ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس لئے بھی کہ زیادہ دفعہ چاند کی ممانی کی طرف دیکھنا بھی مخدوش تھا۔

اب چاند کی ماں اپنی ماں یعنی چاند کی نانی سے کہہ رہی تھی "آپ سے میں نے کئی دفعہ کہا آپ لاہور آئیں تو میں آپ کو قلعہ دکھاؤں۔ میں چڑیا گھر دکھاؤں میں انارکلی دکھاؤں۔ میں سینما دکھاؤں۔ آپ تو آتی ہی نہیں۔ آپ چلی ہیں تو ہم سب کل چلیں گے۔ تین تانگے لیں گے، تین۔ دو میں تو ہم سب نہ آسکیں گے۔ سویرے کھانا کھا کر دس بجے گھر سے نکلیں۔ سارا دن سیر کریں گے۔ شام کو آپ کو نہر بھی دکھائیں گے۔ اب تو سردیوں میں وہاں رونق نہیں ہوتی۔ گرمیوں میں تو شام کو وہاں میلہ لگا رہتا ہے۔" ابھی وہ یہیں تک تھی کہ وہ لڑکا بولا "تو بہن جی ماتاجی نے تو کبھی شالامار بھی نہیں دیکھا ہو گا اور سینما بھی، تو آج کل "مہاتما" جیسی فلم آئی ہوئی ہے۔ ماتاجی نے تو کبھی سینما دیکھا ہی نہیں۔ افسوس ہے میرا تو امتحان قریب ہے ورنہ میں بھی ساتھ رہتا۔ مگر آپ تو ساتھ ہوں گی۔ انہیں سینما تو دکھائیے اور بھائی جی بھی تو شام کو دفتر سے آجائیں گے۔" اس پر ان کی والدہ نے کہا "میں تو لاہور آتی اس لئے نہیں آئی کہ ٹھہروں کہاں۔ اب منوہر کی بدلی ہو گئی ہے اب آجایا کروں گی۔"

معلوم ہوا کہ منوہر چاند کی ممانی کا خاوند ہے۔ تم جانتے ہو نا یہ ہندو لوگ اپنی لڑکیوں کے ہاں نہیں رہتے۔ اور نہ ان کے ہاں کا کھاتے ہیں۔ شاید پانی بھی نہیں پیتے۔ اسی لئے غالباً اس لڑکے اور یہاں معلوم ہوا اس لڑکے کے نام مراری تھا اسی لئے اس مراری کی

ملی چاند کی ماں کے ہاں نہیں اترتی۔ خیر اس دفعہ معلوم ہوا کہ وہ منوہر کے ہاں جارہی تھی۔

ایسی ویسی ہی باتیں ہوتی رہیں مگر مجھے ابھی خود اس کا نام نہ معلوم ہوا اور نہ یہ کہ وہ کہاں رہتے ہیں۔ اس سے یہ مطلب نہ لے لینا کہ ان کا پتہ معلوم کرنے سے میرا کوئی مدعا تھا۔ مگر جانتے ہو مجھے لحظہ بہ لحظہ یہ امر شاق گزر رہا تھا کہ اب لاہور آجائے گا اور یہ اتر کر چلے جائیں گے۔ اور میں خود بھی لاری چھوڑ دوں گا۔ اور پھر شاید ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔ مگر باوجود اس کے اس کا نام جاننے کے لئے میرے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ میں بار بار اس کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ اور چونکہ میں نے اس اثنا میں پانچ چھ مرتبہ گھڑی کو بھی دیکھا۔ شاید وہ سمجھ گئی ہوگی کیونکہ اب کی بار جو اس نے مجھے دیکھا تو اس کی مسکراہٹ میں شوخی کے علاوہ میرے اضطراب کا علم ضرور تھا۔ یہ میں نہیں بتا سکتا کہ یہ مجھے کیسے معلوم ہوگیا۔ اگر تم میری جگہ ہوتے تو تم بھی اس کی آنکھوں اور اس کے تبسم کو سمجھ لیتے اس کا ہر احساس تو شاید تم نہ سمجھ سکتے (اس پر میں مسکرایا) مگر ایسا صاف جذبہ تو اس کا ذکی الحس بشرہ صاف ظاہر کررہا تھا۔ کم از کم اس کی پر معنی نگاہ سے مجھے یہ معلوم ہورہا تھا کہ وہ ضروری میری بے چینی کی وجہ کو پہچان رہی ہے۔ اب لاہور غالباً بیس میل رہ گیا تھا۔ اور مجھے ہر منٹ یہی خیال ہورہا تھا کہ ہم اب لاہور پہنچے کہ اب۔ حالانکہ لاری کم از کم پینتالیس منٹ لیتی۔ مگر میں سوچتا کہ پون گھنٹہ کیا ہوتا ہے۔ یہ تو ابھی ختم ہو جائے گا۔ اور پھر اس کی پتلی پتلی گلابی موتیا رنگ کی انگلیاں، اور ان میں سبز اور نیلے نگوں کی انگوٹھیاں اور اس کی کلائیوں کی نفیسیاں کہاں چلی جائیں گی۔ مجھے زیور اس سے پہلے لگتا ہی برا تھا۔ اور جب کبھی بھی ان عورتوں کو دیکھتا جو زیوروں سے لدی ہوئی ہوتیں تو مجھے سخت نفرت ہوتی۔ اور اب مجھے یہ خیال ہی نہ تھا کہ اس نے زیور بھی پہن رکھے ہیں کہ نہیں۔ البتہ اس کی کلائیوں پر وہ گھڑی پہنچیاں اس قدر اچھی معلوم ہوتی تھیں کہ جب میں اس کے چہرے کی طرف نہ دیکھ رہا ہوتا تو اس کے ہاتھوں یا کلائیوں یا ان پہنچیوں کی طرف دیکھتا ہوتا، اور خوش قسمتی سے اسے کسی طرح معلوم ہوگیا کہ اس کے ہاتھ اور اس کی کلائیاں مجھے اچھی لگتی ہیں۔ کیونکہ یا تو عام طور پر اس کے ہاتھ اس کی چادر کے اندر ہوتے کیونکہ ہوا میں سردی ضرور تھی اور یا اب شاید ہی وہ ایک آدھ بار چھپائے گئے ہوں گے بلکہ عام طور پر وہ دونوں یا کم از کم ایک تو کہنی کے سہارے گھٹنوں پر ٹیکے ہوئے چہرہ تھامنے میں مصروف رہتے۔ شاید اس کے پاؤں کے نیچے کوئی سوٹ کیس ہوگا۔ کیونکہ اس کے گھٹنے اٹھے ہوئے تھے اس لئے اسکی کہنیوں کے ٹیکنے کے لئے جگہ موجود تھی۔ یوں بیٹھی پتلی پتلی گلابی ناخنوں والی انگلیاں دونوں گالوں کو حمائل کئے ہوئے وہ چاند رانی سے منٹوں تک باتوں میں مصروف رہتی اور کیا باتیں ہوتیں ــــ

اس پر منور نے ایک ٹھنڈا سانس لیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ "بھئی یہ تو میں سمجھ گیا کہ وہ ماہ طلعت ضرور ہی تمہارے جذبات سے متاثر ہورہی ہوگی، اور ہوگی بھی اسی قابل کہ تم والہانہ طور پر اسے دیکھتے رہتے، اور کاش کہ تمہارا سفر لمبا ہوتا، یا تمہاری لاری ہی راستہ میں بیکل ہو جاتی تاکہ تمہیں ایک آدھ گھنٹہ اور مل جاتا۔ مگر ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ خاندان تو ہندو عورتوں کا تھا۔ اور جانتے ہو اپنے اعمال کی پاداش میں مسلمان لڑکیوں کو ہم پردہ کی وجہ سے نہیں دیکھ سکتے۔ اور ہندو لڑکیاں ہمیں مسلمان سمجھ کر نہیں دیکھتیں۔ تمہیں وہ کس طرح دیکھتی رہی اور تمہارے دیکھنے کو وہ کیسے برداشت کرتی رہی۔ نہ بے پروائی کی تیوری چڑھائی نہ آنکھوں سے شعلہ باری کی اور نہ تمہاری طرف سے منہ ہی پھیرا اور نہ نشست ہی تبدیل کی؟ یہ میں نہیں سمجھ سکا۔"

منور نے کہا "ٹھیک کہتے ہو۔ ہماری ملعون زندگی سے بدتر اور کیا زندگی ہوسکتی ہے۔ ہندوستان میں تو لڑکیوں کا مردوں کی طرف دیکھنا بھی گناہ ہے۔ زندگی کا لطف خاک آئے۔ اس سے تو افریقہ ہی میں پیدا ہوتے! ہم سے تو حبشی ہی اچھی زندگی بسر کرتے ہوں گے۔ اتنی قیدیں، اتنی رکاوٹیں۔ احساس کو بیدار کرنے کے لئے ہزاروں لاکھوں چیزیں موجود ہیں اور دل کی تسلی کے لئے ایک بھی

نہیں! مگر کیا کریں؟......اور ہاں تم پوچھ رہے تھے کہ میری طرف اس نے دیکھا کیوں؟ میں تو یہ کہہ سکتا ہوں کہ کچھ لمحوں کے لئے میرا ستارہ کسی منحوس برج سے نکل کر اکیلا گشت لگا رہا ہو گا۔ اور کیا بتاؤں؟ اور ہندو مسلمان کے متعلق تو جواب آسان ہے۔ کہ میں سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اور میرے سر پر ہیٹ تھا۔ شکل سے نہ ہندو لگتا ہوں نہ مسلمان 'یا دونوں ہی۔ اور شاید اسے یہ خیال ہی نہ آیا ہو۔ کیونکہ آخر اسے بھی تو معلوم ہو گا کہ یہ ڈیڑھ دو گھنٹہ کا سفر ہے پھر وہ کہاں اور میں کہاں اور اگر اسے نہ بھی آیا ہو تو مجھے ہر لمحہ یہی خیال آ آ کر گھبرا رہا تھا۔"

مگر میرے لئے سوائے اس کے کہ چاند رانی سے چھیڑ چھاڑ یا پیار میں مشغول رہوں اور اس کی ممانی کی طرف دیکھ لوں اور کیا تھا۔ چنانچہ اب چاند رانی نے بھی میرے قرب کو تسلیم کر لیا تھا اور اپنے گدگدانے کو میرا حق مان لیا تھا۔ مگر اس وقت چاند رانی میرے بہت کام آئی۔ خدا اسے جوان ہونے پر بھی اتنی کامنی اور من موہنی رکھے جتنی پیاری وہ پانچ برس کی عمر میں تھی۔ میری خوش قسمتی کہ اس کی ممانی اب اس سے یہ باتیں کر رہی تھی "چاند جی اپنے ماموں کے گھر چلو گی۔ تمہیں پتہ ہے اپنے ماموں کے گھر کا؟" چاند جی چپ تھی اور تکن تکر موٹی موٹی آنکھوں سے اپنی ممانی کو نہایت عبادت مندانہ انداز سے حد درجہ کے پیار سے دیکھنا اگر جواب ہو سکتا ہے تو چاند جی اپنی ممانی سے خوب باتیں کر رہی تھی۔ ظاہر تھا کہ چاند رانی کو اگر کسی سے پیار تھا تو اپنی ممانی سے اور ممانی کے منہ پر جو مسکراہٹ تھی اس میں اتنا پیار اور اتنی ملائمت تھی کہ مجھے تو چاند رانی ہی سے ایک لمحہ کے لئے حسد ہو گیا۔ مگر چاند رانی سے جو باتیں ہو رہی تھیں وہ میرے لئے اس قدر دلچسپ تھیں کہ مجھے اور کسی چیز کا دھیان ایک سیکنڈ سے زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتا تھا۔ چاند رانی سے پوچھا جا رہا تھا "چاند جی تم اپنے ماموں جان کے گھر آؤ گی نا؟ کہاں ہے تمہارے ماموں جان کا گھر؟ پنج محل روڈ پر۔ جانتی ہو کہاں ہے پنج محل روڈ؟ تم تو لاہور کی رہنے والی ہو۔ تم نے تو لاہور کی خوب سیر کی ہو گی۔ چاند جی ہمارے ہاں آؤ گی نا۔ ہم اور تم سیر کو چلیں گے۔ ہم اور تم چڑیا گھر چلیں گے' لارنس باغ چلیں گے اور خوب سیر کریں گے۔ تم پنج محل روڈ پر آنا۔ تمہارے گھر سے دور تو نہیں۔ اپنی ماتا جی کو لے کے آنا۔ ہم سب سیر کو چلیں گے۔ ہم تو لارنس باغ میں شام کو سیر کیا کرتے ہیں تم نہیں کیا کرتیں۔ ہائے سیر نہیں جایا کرتیں۔ چاند جی تم ہمارے پاس آ جاؤ۔ ہم تمہیں ماتا جی سے لے لیں گے۔ ہم تمہیں اپنے پاس رکھیں گے۔ ہم روز شام کو سیر کو جایا کریں گے۔ ہم موٹر پر جایا کریں گے۔ موٹر پر سیر کرو گی نا۔ ہم تمہیں موٹر پر سیر کرائیں گے۔ ہم گرمیوں میں نہر پر جایا کریں گے تم بھی آؤ گی نا؟ چاند رانی تو کھل کھل کر ہنس رہی تھی۔ اور اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنی ممانی سے لپٹی جا رہی تھی۔ مگر ایک منٹ کے بعد ممانی جان نے آنکھ اٹھا کر پھر میری طرف دیکھا اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر! کیا نظر تھی! ایسا محسوس ہوا کہ میرا دل اس نگاہ کی گرمی محسوس کر رہا ہے۔ اور اب بھی اس کی آنکھوں میں وہی پر معنی چمک تھی۔"

"میں نے سوچا کہ یہ تو پتہ چل گیا کہ وہ رہتی کہاں ہے مگر اس سے فائدہ؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں پھر اسے دیکھ سکوں اور وہ بیاہی بھی ہوئی ہے اس کا تو خاوند بھی ہے۔ اور خاوند سے اسے ضرور پیار ہو گا۔ ابھی تو شادی کو زیادہ عرصہ ہوئے نہیں معلوم ہوتا۔ ایک نہیں تو ڈیڑھ سال ہوا ہو گا۔ اور میں مسافر' اجنبی اور ڈیڑھ گھنٹے کا سفر۔ اور میں کون اور میرے لئے کس کی دلچسپی' کس کا شوق' مگر اس ادھیڑ بن میں میرا چہرہ اداس ہو گیا ہو گا' اور میں نے چاند رانی کو چھیڑنا چھوڑ کر اس کی طرف پانچ منٹ تک دیکھا بھی نہیں تھا۔ پھر چاند جی نے اپنی جگہ کھڑے ہو کر میری طرف منہ کر کے دوپٹہ لیتے لیتے دوپٹے کو اس طرح جھٹکا دیا کہ میرے ہیٹ پر آ لگا۔ ہیٹ ٹیڑھا ہو گیا۔ میں نے ہیٹ اتار کر اپنے گھٹنوں پر رکھ لیا اور اس وقت سوچا کہ اور سب کچھ تو نظر کا دھوکا ہو گا' مگر چاند رانی تو واقعی ایک پیاری سی لڑکی تھی اور وہ تو کم از کم سچائی سے آرزومند تھی کہ میں اس سے کھیلوں۔ مان لیا کہ وہ مجھے لاہور پہنچنے پر پانچ منٹ کے

اندر اندر بھول جائے گی مگر اس وقت تو وہ حقیقی طور پر مجھ سے کھیلنے کے لئے مشتاق تھی۔ اور پھر وہ تھی اتنی پیاری سی۔ چنانچہ میں نے اس کی ممانی کی طرف پانچ منٹ تک نہ دیکھا۔

اب اپنے آپ پر لعنت بھیجتا ہوں کہ وہ پانچ منٹ بھی کیوں ضائع کئے۔ دیکھتا رہتا تو کیا تھا اُسے کیا پروا کہ میں کیوں اداس ہوں یا میرا جی کیا چاہتا ہے۔ مگر خیر دو تین میل تک میں نے اسے نہ دیکھا۔ پھر جو دیکھتا ہوں تو ایسا محسوس ہوا کہ وہ مجھے متجسس نظروں سے دیکھ رہی ہے۔ معلوم نہیں کہ وہ کیا جاننا چاہتی تھی۔ مگر اس کی نگاہ بالکل غیر مضطرب اور پرسکون تھی‘ جیسے کوئی حادثہ اسے گھبرا نہیں سکتا۔ واللہ مجھے معلوم نہ تھا کہ دنیا میں ایسی آنکھیں بھی ہو سکتی ہیں۔ کیا صاف اور بے ہراس نگاہ تھی‘ یہ تو کبھی میرے قیاس میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اسے میرے ساتھ کچھ دلچسپی پیدا ہونے کا امکان بھی ہے۔ اور آخر تم جانتے ہو لاری میں ڈیڑھ گھنٹہ کا سفر فقط ایک سو منٹ ہوں گے اور کیا ہے۔ اس سے کچھ توقع کرنا حماقت تھی۔ مگر میرا دل چاہتا تھا کہ ایسی نظر اتنی تیز اور پرمعنی لاابالی نہ ہو۔ مجھے شک پڑتا تھا کہ اسے میری گھبراہٹ اور میرے اشتیاق سے لطف آرہا ہے۔ مگر پھر اس کی مسکراہٹ کو دیکھتا تھا تو اس میں کوئی ترشی نہ تھی‘ اور وہ ایسی ملائم اور میٹھی اور رحیم تھی......شاید"

یہ کہہ کر منور پھر ایک دو منٹ کے لئے چپ ہو گیا‘ میں نے بھی اس "شاید" کی تشریح اس سے نہ پوچھنی چاہی۔ پھر وہ ذرا مدھم آواز میں بولنے لگا

"اس کے بعد میں کسی خیال میں مستغرق تھا کہ مجھے اس کی آواز نے چونکا دیا‘ اور میں نے دیکھا کہ وہ چاند کی ماں سے کہہ رہی تھی۔ "آپ نے ہی تو اس دن مجھ سے کہا تھا کہ شانتی تو یہیں بیٹھ میں کھانا کھلا کے تجھے اندر بلاتی ہوں اور جب میں تھک کر آپ کا انتظار کر کے اندر چلی گئی تو آپ ناراض ہو گئیں اور اب تک آپ نہیں بھولیں۔"

"تم تو پہلے ہی چاہتی تھیں کہ باہر نہ بیٹھو۔" یہ چاند کی ماں نے کہا مگر ترش لہجہ میں۔ "اور میں نے تو تمہیں باہر بھی کھلے منہ بیٹھے دیکھا تھا۔ میرے دیور جیٹھ سارے ہی گزر رہے تھے۔ وہ بھی کیا کہتے ہوں گے کہ کل کی دلہن اور ننگے منہ۔ میری سسرال تھی‘ میرا خیال کیا ہوتا۔ مگر وہ تو آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیاں ہوتی ہی ایسی ہیں۔"

"مگر میں کہاں اندر جاتی تھی‘ آپ ہی نے کہا تھا شانتی یہاں بیٹھ میں وہیں بیٹھی رہی۔ اور بھی میرے پاس بہتیری تھیں۔ کسی نے بھی برا نہیں مانا اور گھونگھٹ نکالنے سے تو مجھے بہت گھبراہٹ ہوتی ہے۔ اور نکالتی تو باقی سب مجھے کھانے لیتیں‘ شانتی یہ کیا؟ اور شانتی یہ کیوں؟! اندر بیٹھی تھی تو کسی نے کہا شانتی باہر آ کے بیٹھ۔ تو ابھی دلہن ہے۔ باہر نکل کے مہمانوں میں بیٹھ‘ صحن میں رونق ہو‘ تو شانتی باہر جا بیٹھی پر سب ایک ایک کر کے شانتی کے پاس سے اٹھ بھی گئیں تو شانتی وہاں کیا کرتی؟ اور گھونگھٹ تو میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ مجھ سے نکالا نہیں جاتا۔"

"بہن تم تو آزاد ہو‘ تمہاری مرضی ہے۔ میں نے تو یہی کہا تھا کہ اندر میرے دیور جیٹھ بیٹھے ہیں اُٹھ جائیں تو تم آجانا۔"

"تو بہن جی وہ تو میرے پاس ہی کوئی نہ بیٹھا رہا اور آپ بھی نہ آئیں۔ پرایا گھر‘ میں گٹھڑی بن کے کیا کرتی اور مجھے خیال تھا کہ سب اٹھ گئے ہوں گے۔"

"یہی تو میں کہتی ہوں میری سسرال کی بات تھی‘ سب کہتے ہوں گے کہ ان کی دلہن سال ابھی ہوا نہیں سب کے سامنے منہ کھلے پھرتی تھی۔ اندر بیٹھا تو کوئی نہ تھا۔"

"تو بہن جی مجھے کیا پتہ تھا کہ ابھی تک اندر کوئی بیٹھا ہے یا پھر باہر ہی آپ کسی کو میرے پاس بھیج دیتیں۔ آپ کرتی ہی زبردستی

ہیں۔ اور آپ نے یہ بات ایک دفعہ نہیں کی 'کئی دفعہ کی ہے۔ ہم تو کبھی اتنی دور تک بات کو نہیں کھینچتے۔ آپ کی عادت ہی کچھ ایسی ہے۔"

"تو بہن تو کون سی کم ہے۔ تو بھی تو ایسی نہیں کہ......."

یہاں چاند کی نانی بیچ میں آ گئی اور اس نے کہا "اچھا اچھا جانے دو' شانتی تو ہی جانے دے' ساوتری (یہ چاند کی ماں) چھوڑا بھی کر بات کو 'کیا بری عادت ہے تیری! اب لاہور آنے کو ہو گا 'شام ہو چلی ہے۔ یہ موٹر ہمیں گھر تک پہنچا آئے گی یا کہیں اور چھوڑ دے گی؟" مراری نے کہا "ماتا جی یہ تو چنگی خانے کے اڈہ کی لاری ہے۔ یہ ہمیں سٹیشن پر ہی چھوڑ دے گی۔ وہاں سے ہمیں تانگہ لینا پڑے گا۔" اس پر ساوتری نے جو اتنے میں شانتی سے اپنی چپقلش شاید بھول بھی چکی تھی کہا "یہ ہمیں شاہ عالمی کے اڈے پر پہنچا دے تو اچھا ہے۔ وہاں تانگے ہمیں کرشن نگر تک مل جائیں گے۔ نہیں تو یہ لاری ہی ہمیں کرشن نگر تک پہنچا دے۔"

میں نے کہا "یہ کرشن نگر کہاں ہے؟"

منور نے کہا "معلوم نہیں یہیں کہیں ہو گا عجیب عجیب سے نام لوگوں نے رکھ لئے ہیں۔ اچھرے وچھرے کی طرف ہو گا یا کسی اور طرف۔ ہماری بلا جانے میں تو تمہیں بتاتا ہوں جو میں نے سنا۔ اب شاید لاہور پانچ چھ میل رہ گیا تھا۔ اگرچہ شاہدرہ ابھی نہیں آیا تھا۔ شام پڑ رہی تھی۔ میں لاہور کی نزدیکی سے بہت گھبرایا۔ مگر جانتے ہو کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ نام تو اس نے مجھے اپنا بتا یا تھا۔ مگر شاید اس کا یہ مطلب نہ ہو۔ پھر سوائے اس کے کہ میں اس کے چہرے یا آنکھوں یا ہونٹوں یا اس کے ہاتھوں کو دیکھتا رہوں۔ اور کیا کر سکتا تھا۔ روشنی ابھی اتنی تھی کہ میں سب کچھ با آسانی دیکھ سکوں۔ ہاتھوں کا اس کے رنگ تھا کہ غضب۔ ہاتھ کیا تھے موتیا کے پھول تھے۔ ایسا لطیف رنگ' ایسی نرم جلد! محسوس ہوتا تھا کہ ہاتھ لگانے سے ان پر داغ پڑ جائے گا۔ میں نے کہا اس کی نند یا ساس یا کوئی دیکھتا ہے تو دیکھے۔ باقی پندرہ منٹ تو میں سوائے اس کے دیکھنے کے اور کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ مگر دیکھنے سے کیا سیری ہو سکتی ہے۔ اور آنکھوں کی بھوک کا احساس دوسرے کو ہو بھی جائے تو اس سے کیا ہوتا ہے! مگر میں دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی چاند رانی پر بھی نظر ڈال دیتا۔ مگر اس سے کھیلنے کو زیادہ جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو اب منتظر رہتی کہ کب میں گد گداؤں مگر میں کئی کئی منٹ اس کی طرف دیکھ بھی نہ سکتا۔"

اب مجھے اس کا نام بھی معلوم تھا۔ اور یہ بھی کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ مگر یہ کہ میں پھر کبھی اسے دیکھ سکوں گا۔ یہ خیال مجھے بہت بے چین کر دیتا۔ مگر میرا خیال ہے کہ میں اس کے چہرے میں اتنا منہمک تھا۔ اور لاہور پہنچنے کے ڈر سے اتنا مضطرب ہو رہا تھا کہ میں یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ یہ تمام باتیں یعنی اسے پھر نہ دیکھنے کا ڈر .... اور اسے دیکھنے کا گمان اور ایسے ویسے اندیشے مجھے سوجھ بھی رہے تھے کہ نہیں۔ مجھے یہ بھی وثوق سے یاد نہیں کہ کیا میرا اس وقت واقعی خیال تھا کہ اس نے اپنا نام اور پتہ دانستہ طور پر بتایا ہے؟ شاید یہ محض میرے دماغ کی آفرینش تھی۔ یا شاید اس کی نگاہوں کا کچھ مطلب تھا! یا وہ مجھے اب ہر دو یا تین منٹ کے بعد ٹکٹکی باندھ کر کیوں دیکھ لیتی تھی۔ یا اب آنکھوں میں وہ بے پروائی اور غرور کیوں نہیں تھا۔ یا کیا واقعی اس کی نظر میں کچھ بے چینی موجود تھی یا اس کی مسکراہٹ اب کیوں غائب ہو گئی تھی۔ یا اب اس کے ہاتھ کیوں رومال کو لپیٹنے 'مروڑنے' کسنے اور کھولنے میں مشغول تھے یا اب وہ کیوں نظریں ملا کر آنکھ جھکا لیتی تھی؟ افسوس ہے ان سوالوں کا جواب شاید مجھے تاحشر نہیں مل سکے گا۔"

"مجھے اب اس بات کا افسوس بھی ہے کہ چاند رانی سے بھی کیوں کھیلتا رہا۔ میں ساری راہ اسے ہی کیوں نہ دیکھتا رہا۔ آخر میں اس کے ہونٹ نہ مسکرا رہے تھے نہ بولنے کے لئے کھلے ہوئے تھے۔ مگر ان کے ایک ایک خط سے ان کے خفیف سے جھکاؤ سے کتنی ملائمت کا اظہار ہو رہا تھا۔

"لاہور آگیا۔ ہم اڈے پر پہنچ گئے۔ اور لاری کھڑی ہو گئی۔ اس وقت سب مسافر اترنے میں مشغول۔ ان کے حصے میں دونوں طرف کی کھڑکیاں کھلی تھیں۔ وہ چونکہ بیچ میں بیٹھی تھی۔ شاید اس لئے وہ سب سے آخر میں اتری۔ میں بھی اپنی کھڑکی سے دور تھا۔ میں بھی بیٹھا رہا۔ اترتی دفعہ بھی اس نے مجھے خاص اپنی نظر سے دیکھا۔ کاش وہ اترتی دفعہ ہی مجھے اس نظر سے نہ دیکھتی! پھر بھی میں شاید اسے کبھی بھول جاتا۔"

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا وہ کبھی بیچ محل روڈ پر نہیں گیا۔ یا کیا وہ اسے کبھی لارنس باغ میں نہیں دکھائی دی۔ مگر اس کی نظر کی افسردگی کو دیکھ کر مجھے یہ پوچھنا بے سود ہی معلوم ہوا۔

"___ کہ عالم دوبارہ نیست"

امتیاز علی تاج

فراعنہ مصر کے محل کا دستور تھا کہ ضیافتوں کے بعد جب مہمانوں کی میکساری اور بیباکی اعتدال کی حدود سے تجاوز کرنے لگتی تو معبد قصر کا پروہت ممی کی وضع پر تراشی ہوئی دیوتا آسیرس کی لکڑی کی مورت خدام کے کندھوں پر اٹھوا کر ایوان نشاط میں داخل ہوتا اور اس وقت جب کہ خدام مورت کو اٹھائے مخمور فرعون کے بدمست مہمانوں میں تھم تھم کر گھوم رہے ہوتے 'تو پکار پکار کر کہتا "انجام ہستی کو دیکھو۔ اور ان ترغیبات سے احتراز کرو۔ جو تمھارے حواس کو فریب میں لا کر تمھیں بھلا دیتی ہیں۔ کہ موت کا سرد ہاتھ ایک روز حیات ناپائیدار کی آنکھیں بند کر دیگا۔"

موت کی چیرہ دستی کا بھیانک نتیجہ آنکھوں کے سامنے آجانے سے منادی کی آواز مقسوم کے گھڑیال کی گونج معلوم ہوتی۔ جسے سن کر دست درازوں کے بازو ڈھیلے پڑ جاتے اور مے آشاموں کے ہاتھ پیالوں کو نہ سنبھال سکتے اور ایک لمحہ کے اندر اندر محفل پر مدہوشی اور خود فراموشی کے بجائے عبرت کا خیال آفریں سکوت طاری ہو جاتا۔

لیکن یہ صدیوں کا پرانا دستور جسے زمانہ قدیم کے کسی معلم اخلاق نے وضع کیا تھا۔ اور جس سے اخلاق عام کے محافظ 'پروہت اور پجاری اعتدال و احتیاط کی درس آموزی کیا کرتے تھے۔ ایک ہی رات کے اندر ایک نوجوان فرعون کے ہاتھوں اپنے معانی کی تعبیر میں یوں منقلب ہوا کہ مورخ اور فطرت انسانی کے طالب کے لئے یکساں طور پر استعجاب انگیز ہے۔

وہ رات بلار سروپ دیوی بسط کے تہوار کی آخری ہنگامہ خیز رات تھی۔

مصر کی وسیع مملکت سے ستر ہزار زائر خشکی کی راہ اور کشتیوں میں سوار ہو کر کھڑتالیں اور مرلیاں بجاتے اور گیت گاتے کئی روز پیشتر بوبسطس کے شہر میں پہنچ چکے تھے۔ جواں سال فرعون اور اس کے پروہتوں نے پوجا کی تمام خفی و جلی رسمیں ادا کر لی تھیں۔ دیوی کا چولا اور اس کا منڈل جس پر ایک سنپولیا تھا' بدلا جا چکا تھا۔ فرعون نے معطر لیپ دائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے دیوی کی کانسی کی مورت پر مل دیا تھا۔ قربان گاہ پر سیاہ و سفید رنگ کے ہزاروں بیلوں کی قربانیاں چڑھ چکی تھیں۔ اور ان کے سر ان دعاؤں کے بعد کہ فرد اور قوم اور شہر اور مملکت کی بلائیں ان پر سے ٹل جائیں' نیل میں غرق کئے جا چکے تھے۔ دیوی کے حضور میں شہد اور شراب اور

کشمش اور کیسر کے چڑھاوے چڑھ چکے تھے۔ پو لیطس کے ایک ایک بازار میں عوام کا جو مواج جلا جل اور مجیرے، بجا بجا کر سارے دن بھجن گاتا اور دیوی کی جے کے نعرے لگاتار ہاتھا۔ اور اب تمام رسوم ادا کر چکنے کے بعد مرد اور عورتیں اور بوڑھے اور بچے ادائے فرض کی فراغت کے ساتھ اپنے آپ کو طرب و نشاط کے اس عام میلان کے سپرد کر چکے تھے۔ جس کے تند و پر شور سیلاب کے ریلے سارے اژدحام کو بہائے لئے جارہے تھے۔ اور بہار کی اس جذبات انگیز رت میں تاباں و فروزاں مقدر اکی منقش دیواروں کے باہر جا بجا مشعلیں ٹمٹماتے اور جھانجیں اور الغوزے بجاتے عریاں گیتوں اور ولولہ انگیز ناچوں میں کھوئے ہوئے تھے۔

بلار سروپ دیوی بسط کے تہوار کی آخری ہنگامہ خیز رات میں ضیافت کے بعد نوجوان فرعون کا ایوان نشاط مملکت مصر کے تمام قابل ذکر لوگوں سے پٹا پڑا تھا۔ اور اگر چہ اژدحام کے ہنگاموں سے علیحدہ اور جدا تھا لیکن نہ اتنی دور کہ بیرونی وارفتگیاں محسوس ہوئے بغیر رہ سکیں۔

نوجوان فرعون کا ایوان نشاط عشرت و تجمل کا ایک نادر و یگانہ خواب تھا جسے معمار اور نجار اور مصور اور سنگتراش کی متفقہ مجنونانہ کاوشوں نے زندگی بخش دی تھی۔ عظمت و نزہت میں اہرام کھڑے کرنے والوں کی اولاد کے شایان شان طول و عرض میں اس قدر وافر کہ ایک اژدہام کی معصیت اس میں ناچیز نظر آتی تھی۔ اس کی وسعت اپنے اندر ایک شور قیامت کو گم کر سکتی تھی۔ مجلّے و مصفّٰی فرش پر منقش اور رنگین دیواروں کے ساتھ ساتھ استر کاری کے ستونوں کی ایک دنیا آباد۔ جن کے پائے' اور سر قدیم صناعی' رنگ آمیزی کا ایک فردوس تھے۔ اور ان کے درمیان جا بجا دیوی بسط کے عظیم الجثہ مجسمے وقار اور تمکنت میں ترشے ہوئے کھڑے تھے۔ ایوان کی وسعت کے برابر نیچی نیچی اور چوڑی چکلی بے شمار سیڑھیاں دوایسے ہی دوسرے وسیع تختوں کو رہنمائی کرتی تھیں۔ گرانڈیل صد شاخوں کی مختلف الالون روشنیوں میں انسانی صناعی کا یہ حیرتناک مظہر جس میں رنگ و آہنگ کی موجوں پر خوشبوئیں ہلکورے لے رہی تھیں اپنی تابانی و درخشانی سے ہوش ربائی کر رہا تھا۔

رنگدار پایوں کے ہزاروں گدیلے اور تخت اور کرسیاں بچھی تھیں۔ جن پر نوجوان فرعون کے مہمان ضیافت کے بعد رنگ رلیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے بیٹھے تھے۔ نیل کی مچھلیوں اور بطوں اور جنوبی جنگلوں کے غزالوں اور گایوں کے کبابوں کے ساتھ مہمانوں کو کرنب کھلایا گیا تھا کہ ان کی پیاس بھڑک اٹھے اور وہ اسے وادی نیل کے انگوروں کی لال اور سفید شراب سے بجھا سکیں۔

تنومند ہاتھوں نے قدم بڑھا رکھے تھے۔ اور گوری ساقنیں زمرد کا مینا لئے فراخ حوصلگی سے انھیں لبالب بھر رہی اور خالی مینا ساتھ کی سیہ فام کنیزوں کے سپرد کرتی جارہی تھیں۔ جام ہونٹوں پر سرنگوں تھے اور منہ پونچھنے والے خادموں کے رومال ہٹا ہٹا کر ہل من مزید کی صدائیں بلند کی جارہی تھیں۔

ایوان کے مختلف حصوں میں مختلف تفریحیں جاری تھیں۔ نچلے تختے میں مزامیر کے غل کے ساتھ نٹ اور بازی گر اور شعبدہ باز اور مسخرے اپنے اپنے کمال فن کو نظارہ افروز کر رہے تھے۔ کئی کئی چرمی گیندیں آگے پیچھے اچھال کر واپسی میں باری باری لپکی اور پھر اچھالی جارہی تھیں۔ رنگین دائروں والی لکڑی کے اندرونی دائرے میں خنجروں سے نشانہ لگایا جارہا تھا۔ دو دو مرد اور عورتیں زمین پر ٹانگیں پھیلا کر برابر برابر بیٹھے تھے۔ اور ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر بغیر زمین کا سہارا لئے کھڑے ہورہے تھے' مسخرے اور بونے اپنی چست پھبتیوں اور مضحکہ خیز حرکتوں پر قہقہے وصول کر رہے تھے۔

دوسرا تختہ خوش آواز سازوں اور نامور مغنیوں کے راگوں سے سماعت کے لئے ایک خوش آہنگ اور ہم آہنگی کا سامان مہیا کر رہا تھا۔ طنبور اور سر و دوالے بجانے والی جماعتیں فضا کو کیف و مستی کی جنت بنا رہی تھیں اور مغنیوں کی گلے بازیاں متاع ہوش کی غارت گری میں مصروف تھیں۔ نازنینیں اپنے سبک بربط سینے سے لگائے اور کندھوں پر اٹھائے اپنی نازک انگلیوں سے ان کے تاروں کو ہلاتی اور اپنے گیتوں اور تبسموں سے بجلیاں گراتی مہمانوں کے درمیان سے گذر رہی تھیں جن کے ذہن عشرت کی مدہوشی میں جیسے سن تھے۔

تیسرے تختے کے پرلے کنارے ایک جڑاؤ تخت پر جس کے پایوں کو شیروں کے بڑے سر بنا کر مزین کیا گیا تھا نوجوان فرعون وقار آمیز تجمل میں بیٹھا تھا۔ شباب کے اولین مراحل میں اور نا کتخدا۔ اس کی مسیں بھیگ چکی تھیں۔ اور خط بننا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے نفیس ترین کتان کی ایک لمبی اور دودھ سی سفید عبا پہن رکھی تھی۔ جس کی آستینیں چست تھیں۔ اور جس کے دامن پر سنہری زری کی زرتار قطار سے مصر کا شاہی نشان بنا رکھا تھا۔ زری کے ایک کمر بند سے جس نے عبا کو خوش مذاقی سے چنٹیں دے رکھی تھیں، سامنے کی طرف باریک شگفتہ پھولوں کا سبک سا تاج رکھا تھا۔ گردن میں ہیروں کا ایک ہار دھک رہا تھا۔ اور بازوؤں، کلائیوں اور انگلیوں میں سونے کے موٹے موٹے بازوبند، پہنچیاں اور انگشتریاں جن پر نایاب پتھروں سے مگرمچھ اور بچھو اور تصویری خط کے حروف بنے ہوئے تھے۔

قد آدم بربط جن کے سروں پر ارواح خبیثہ کے انوکھے چہرے ترشے ہوئے تھے، ایک مناسب فاصلہ پر کھڑے تھے اور مزاج شناس سازندوں کی مشاق انگلیاں انھیں ایسے سلیقہ سے ہولے ہولے بجا رہی تھیں کہ رقاصہ لڑکیوں کے لطیف رقص کے ساتھ مل کر وہ تھکے ہوئے دماغ پر خوش آیند غنودگی طاری کر سکیں۔ خوشبوؤں اور روشنیوں میں کھوئے ہوئے نشاط پر اس تیسرے تختے میں ہیبت سے رنگا ہوا ایک سکون مسلط تھا۔ جس نے ہر قسم کے تجاوز و توافر کو عناں گیر۔ اور تمام حرکات اور آوازوں کو منضبط کر رکھا تھا۔ پروہت کے نزدیک عشرت کا یہی تصور تھا جو تہوار کی رات میں ایک نیک فرعون کے شایان شان قرار دیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی ضعیف پیشانی پر اطمینان و تشفی لئے اس اہتمام آمیز طرب میں دل جمعی سے بیٹھا تھا۔

لیکن نوجوان فرعون بے قرار نظر آ رہا تھا۔

اس کی آنکھوں میں ایک تکان تھی۔ ایک بے کلی۔ جسے تکلیف کی یہ محتاط فضا گھٹانے کے بجائے بڑھاتی چلی جا رہی تھی۔ حرکات میں ایک اکتاہٹ، ایک دل برداشتگی، ماحول کی نوعیت سے سیری۔ اس سارے ماحول میں جو تال مضمر تھی۔ اس سے بے آہنگی۔ وہ بیٹھا ہوا تھا جیسے ایک تلخی کے امتلا میں۔ صرف ادائے فرض کی تسکین کے سہارے۔ اس لئے کہ پروہت وہاں موجود تھا۔ جس نے اس کی طبع آزاد کو ہمیشہ آئین پرستی کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی تھی۔ جس کے نزدیک تربیت کا لب لباب ناجائز خدمات کا انسداد تھا۔ اور جس کی خشک دماغی کے لئے وہ تمام جذبات ناجائز تھے جو فرعون کی مقررہ مذہبی و معاشرتی فرائض سے تعلق نہ رکھتے تھے یا جن پر اس کے فرعونی جلال و جبروت میں کوئی عام انسانی خصوصیت جھلک رکھنے کا احتمال کیا جا سکتا تھا۔

وہ بیٹھا ہوا تھا [illegible] کی چبھن سینے میں دبائے۔ ان منضبط عشرت کا صدر بنے اور اپنے کشیدہ دل میں پروہت اور رواج کی طرف سے ایک دود آخرین [illegible] کے تہوار کی یہ آخری ہنگامہ پرور رات جس کی ریل پیل کا شور باہر اور ایوان نشاط کے نچلے تختوں سے ایک مدھم گونج [illegible] سے عجیب طرح متاثر کر رہی تھی۔ ایک انوکھی تشنگی تھی جس نے دل سے زبان تک

اس کے سینے اور حلق کو خشک کر رکھا تھا۔ شراب میں اس پیاس کے لئے تسکین نہ تھی۔ وہ اتنی گاڑھی معلوم ہوتی تھی کہ حلق جبر سے اس کے لئے کھلتا تھا۔ اس کے بے قرار خون کی بڑھی ہوئی حرارت کسی اور تسکین کی تشنہ تھی۔ اس تسکین سے بہت مختلف جو بربط کے ہلکے ہلکے بلتے ہوئے تاروں اور رقاصوں کے لطافت سے اٹھتے ہوئے قدموں میں تھی اور جو اس شبستان کے ضبط اور ترتیب اور تہذیب و شائستگی کی جلا میں نظر آ رہی تھی۔ کچھ زیادہ تند 'وحشیانہ' خلاف معمول۔ اپنی نوع میں اس سب سے مختلف جس نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ کچھ اس سے 'سوا جو ازدہام کے شور و غل کی مدھم گونج میں تھا۔ لیکن زیادہ بلند 'زیادہ شدید 'زیادہ بے تکلف' حواس کی لطف اندوزی کے لئے زیادہ واضح جو وہاں نہ تھا۔ جو گلیوں میں تھا۔ اژدہام کے ان وارفتہ مخلوط ناچوں میں جہاں لباس جذبہ کی فراوانی میں حائل ہونے سے معذور تھا۔ جہاں کی فضا میں صرف بدن سے نکلے ہوئے پسینے کی بو تھی۔ جہاں جسموں کا باہمی مس تھا۔ جہاں شانے بھڑ سکتے تھے۔ جہاں سینہ ہر طرف سے گوشت پوست کے گرم دباؤ میں دب سکتا تھا۔

دیوی بسط کے تہوار کی اس آخری ہنگامہ خیز رات کا رنگ رس جو اپنی فراوانی اور بے عنانی میں بے خودی و مستی کا ایک ابلتا ہوا سمندر تھا' اس کے نوجوان خون پر اپنا افسوں پھونک کر اس کو پکار رہا تھا۔ لیکن اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اپنی روح میں سے اٹھتی ہوئی لبیک کو دبائے چپ چاپ بیٹھا رہا۔ شفقت پدری سے بچپن میں محروم ہو جانے کے بعد پروہت نے اسے یوں ہی تربیت دی تھی۔ خیال سے اپنے آپ کو بچانے کی تربیت۔ نفس کی ہر پیداوار کو دیکھے یا پرکھے بغیر خود کچل ڈالنے کی تربیت۔ اور اس نے ہمیشہ پروہت کے کہے پر عمل کرنے اور اپنے نفس کو اپنا سب سے عیار دشمن سمجھنے کی مخلصانہ کوشش کی تھی لیکن آج کی رات میں۔ تہوار کی اس ولولہ انگیز رات میں جب ہر طرف نفس ہی کی برات چڑھی ہوئی نظر آ رہی تھی 'وہ پروہت کے سکون اور برگشتگی اور اپنے نفس سے ساز باز کرتی ہوئی اس پر چھائی چلی جا رہی تھی۔ اور جس کے وزدیدہ تموج کی سرکشی سے اور اپنے ایک دوسرے آپ کی مغلوبیت سے اس کی فطرت کا زیادہ گہرا عمق پوشیدہ مسرت حاصل کر رہا تھا۔

اور جذبات کی اس درہمی برہمی میں ایک نیا اور قوی ارمان اس کے اندر جنم لے رہا تھا۔ جو شاید انہی نوازئیدگی کی وجہ سے 'شاید اجنبیت کے باعث اسے بے حد محبوب معلوم ہو رہا تھا۔ جس کی قوت کا اصرار جس کی سرکشی کا دعویٰ باوجود درد آمیز ہونے کے ایک عجیب طرح سرور انگیز تھا۔ جس کی سنسناہٹ وہ چاہتا تھا۔ اس کے خون میں فروزاں تر ہوتی چلی جائے۔ اور جس کی پھریریاں اسے کسی زیادہ موافق ماحول میں چھوڑ آئیں۔

وہ آنکھیں بند کئے اپنے آپ سے خود مغلوب ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ کہ بربطوں کے یک لخت تھم جانے سے وہ چونک پڑا۔ اس نے اپنی گرم گرم آنکھوں سے پلکیں ذرا سی اٹھائیں۔ پچھلا رقص ختم ہو چکا تھا۔ اور ایک نئی رقاصہ اکیلی رقص کرنے کو محفل میں آنکلی تھی۔ خاموشی کی علت نے آہستہ سے اس کے شعور سے مس کیا۔ اور اس نے آنکھیں پھر بند کیں۔ لیکن اس میں ایک دامنگیری اس کے ارمان کی حرکت کی تال ایک دعوت تھی۔ اس کی پلکیں رفتہ رفتہ زیادہ اٹھتی چلی گئیں۔

روشنی سے دہکتے ہوئے فرش پر ایک نئی رقاصہ جو لبنان کے تپتے ہوئے صحراؤں سے لائی گئی تھی' ایک باریک سفید نقاب میں سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی ساکت کھڑی تھی۔ یوں جیسے کہ سنگ تراش کی گری جنوں ایک سفید جسامت میں حسن متناسب کا خواب جمیل دیکھ رہی ہو۔ تفصیل کھوئی ہوئی۔ لیکن خاکہ کی سہانی اور محتاط اور احتیاط میں کامل گولائیاں عشرت نظر اپنے جمود میں بھی بجلی حرکات کا تصور بھڑکاتی ہوئی۔ پیر کا انگوٹھا زمین پر گھٹنے میں خم ایک بازو بدن سے چمٹا ہوا۔ دوسرا جدا جس کے فاصلے پر اور انگلیوں کے خم

میں ایک حرکت سی ہوئی۔ گردن میں آکاش۔ بدن کے تناؤ میں ایک تال جیسے اپنی بے تکلفی میں شباب کی للکار منجمد ہو گئی ہو۔

ایک غلام نے جھک کر لمبے نقاب کا دامن زمین پر سے اٹھانا شروع کیا۔ ساقوں کے لمبے لمبے تار دھڑکنے لگے۔ ان کی دھڑکن میں خیال کی تخلیق نے حواس کی دنیا میں جنم لینا شروع کر دیا۔ صحرا کے آفتاب میں پلا ہوا گداز سانولا جسم' تکمیل کے سانچے میں ڈھلے ہوئے اعصاب' جن میں سے زندگی کی گرمی پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی' سرخ اور سبز منکوں کی ایک مختصر جھالر کے مس سے لرزشیں کھاتی ہوئی گدرایا ہوا بدن خدوخال پر ایک بے تکلفی۔ ایک نا تراشیدگی۔ غیر واضح ٹھوڑی۔ ہونٹ موٹے نچلا ہونٹ درمیان سے کسی قدر دبا ہوا۔ اور اوپر کا ہونٹ ابھرا ہوا۔ سرخ خون سے پر اور نمناک۔ ناک چھوٹی اور کسی قدر پھیلی ہوئی۔ نتھنے نازک جو کچھ سونگھتے اور کھنچتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ آنکھیں لمبی اور سیاہ جن میں ایک سحر رقیق ہو کر کبھی پلکوں کی چلمن میں چھپتا اور کبھی باہر جھانکتا تھا۔ تنگ پیشانی اور سر پر پھولے ہوئے گھنگھریالے بال۔

فرعون اسے تک رہا تھا۔ اور اپنی پلکیں پھر گرانا نہ چاہتا تھا۔ وہ اسے عجیب طرح ایک نئی اور تازہ شے معلوم ہو رہی تھی۔ اپنے نوزائیدہ ارمان کی طرح نئی۔ اور تازہ اور اسرار سے بھری ہوئی اس ماحول میں جہاں سب کچھ جچا تلا اور جانچا پرکھا ہوا تھا ایک مختلف شے اس کے ارمان کی طرح مختلف جو باوجود تخالف کے بے محل نہ تھی۔ جس کا تضاد منظر کو ایک انوکھی طرح نبا بنا رہا تھا۔ جس میں اس وسیع اور رنگین چمکتی ہوئی چار دیواری سے باہر کا پیغام تھا۔ وہاں کا پیغام جہاں سے نعروں اور چیخوں اور قہقہوں اور گیتوں کی گونج آ رہی تھی۔ جہاں اجڈ پنڈلیاں اور زندگی سے بھری ہوئی رانیں تھرک رہی تھیں۔

فرعون کانوں میں سنسناہٹ لئے اس کا ناچ دیکھنے لگا۔ جو اس کے بھرے بھرے اور لچکتے ہوئے بازوؤں کی بیباک حرکات سے شروع ہوا تھا۔ اور جس کا زہر اندر ہی اندر اس کے دھڑ میں لہریں مارتا ہوا رانوں نیچے کو بڑھ رہا اور اس کے تندرست و توانا اعضاء میں تند اور البیلی حرکات پیدا کرتا جا رہا تھا۔ حرکات جس میں نہ فرعون کا پاس ادب تھا اور نہ پروہت کا حجاب۔ حرکات جن کا منبع شباب کا جوش مارتا ہوا اور کف اڑاتا ہوا چشمہ تھا۔

فرعون کا انہماک بڑھ رہا تھا۔ رقص جیسے اس پر کوئی افسوں پھونکتا جاتا۔ اور اس پر ایک سنسناتی ہوئی معطر غفلت طاری کر رہا تھا ایک غفلت جو اندر سے بیدار اور حیات افروز تھی۔ جس میں وہ سب خیالات کروٹیں لے لے کر آنکھیں کھول رہے تھے۔ جنہیں اچانک پیدا ہونے پر پروہت کی ہدایت کے مطابق اس نے ہمیشہ کچل ڈالا۔ اور مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ وہ سینے کی گہرائیوں سے زندہ ہو کر ابھر رہے اور اس کے نوزائیدہ ارمان کے اندر سما سما کر اس ناچ پر جھوم جھوم کر وجد کر رہے تھے۔ اور ان کے وجد میں رقاصہ مانوس معلوم ہوتی جا رہی تھی۔ اگر گریزاں لطافت جو ہمیشہ ٹکڑوں میں اس کے پاس آئی تھی۔ جب وہ دیوی کا چولا بدل رہا تھا۔ تو اسی کی پنڈلی کی ایک جھلک [illegible] سے سراسیمہ کر دیا تھا۔ جب وہ دیوی کی برہنہ مورت پر لیپ مل رہا تھا تو اس کی چھنگلی اسی کے مس سے لرز کر تھم گئی تھی۔ جب [illegible] میں سے گزر رہا تھا تو یہی تھی جس نے بالوں میں سے کہیں اپنا شانہ اور کہیں اپنی پیٹھ کا وقار ننگا کر رکھا تھا۔ جس کی آنکھیں [illegible] کے بعد منڈیر کے پیچھے چھپ گئی تھیں۔ جس کی آواز نے اس ہجوم کے شور میں سے اس تک پہنچنے کا راستہ بنا لیا تھا۔ جو کہیں [illegible] کے آگے آگے بھاگ کر نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اور کہیں اس کے گزر چکنے کے بعد پیچھے سے اسے پکارتی رہ گئی تھی۔

اب وہ اکٹھی ہو کر [illegible] ایک ناچ جس کا خروش لمحہ لمحہ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ جو جسم میں رچ چکنے کے بعد اسے چالاں

بھی متحرک کرنے لگا تھا۔ لمبے لمبے قدموں کی البیلی چال میں جس کا تعلق گھٹنوں سے زیادہ کولھوں سے تھا۔ جس میں خلوت کی بیباکی تھی اور جلوت کا احتراز جس میں رزم کی یورش تھی اور بزم کا پس و پیش جس میں سرور آشام قوت کے اچانک دھاوے تھے اور رعنا ضعف کی پسپائیاں۔ نفس کے دروازوں پر بیباک دستک بھی اور دبی ہوئی آہیں بھی۔

فرعون جلتی ہوئی آنکھوں سے اس گدرائے ہوئے جسم کی حرکات کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے مانوس اعضا اس وقت یکجا ہو کر ایک یقینی اور ناقابل فہم ہستی بن گئے تھے۔ اور اپنی تکمیل سے ایک تسکین پیدا کرنے کی بجائے ایک نئے اور پراسرار طریق پر اسے نبرد آزما ہونے کو للکار رہے تھے۔ اس نے رتھ پر کھڑے ہو کر کسی حریف کے سامنے اپنی قوت کی سیاست کو ایسا متامل محسوس نہ کیا تھا۔ کسی مدمقابل کے اسلحہ اور فن نبرد آزمائی کو سمجھنے میں اتنا عاجز نہ رہا تھا لیکن عجز اور تامل کا یہ احساس اسے زیادہ اکسا رہا تھا۔ اس میں سنسنیوں کے نئے ریلے پیدا کر رہا تھا۔ غلبہ کا منہ زور ارمان اس کی ساری ہستی میں ایک زلزلہ سالا رہا تھا اور پکار پکار کر اسے کہہ رہا تھا کہ اس حصول میں وہ سب کچھ ہے، جس سے محرومی مرد کی زندگی کو ماتمی بنا سکتی ہے۔ زندگی کا وہ کامل سرور جو ہمیشہ اس کے ہاتھوں سے پھسلتا رہا ہے، جو اس کے بے پناہ ارمان میں دھڑک رہا ہے۔ اس سرکش جسم کو مغلوب کرنے میں ہے۔ اس میں اپنی سخت انگلیوں کے فشار سے نیل ڈال دینے میں۔ اسے اپنے آغوش کی حدت سے بے سدھ کر دینے میں اور اس کے بھرے بھرے سانولے بازوؤں میں اپنے سفید دانت گاڑ دینے میں۔

پروہت چیں جبیں سے اس کی بے کلی کو دیکھ رہا تھا لیکن اپنے میں جرات نہ پاتا تھا کہ اس رقص کے طغیان کو روک کر فرعون کی سرخ جلتی ہوئی آنکھوں سے آنکھیں چار کر سکے وہ اٹھا اور اپنے سلگتے ہوئے غصے کے شعلوں کو دبائے پروہتوں سمیت خاموشی سے رخصت ہو گیا۔

اور رقاصہ کا رقص اپنی تندی اور تفصیل اور وحشیانہ خود فراموشی میں ترقی کرتا چلا گیا۔ صحرا کہ وہ ارواح خبیثہ جن کی ترغیبات کی روایتیں بھدے مجسمہ میں محفوظ تھیں، اس کے رقص میں انگڑائیاں لے لے کر جاگ رہی تھیں اور اس کے اندازوں میں اپنا شیطانی افسوں پوری پوری وضاحت سے پھونک رہی تھیں اس کی آنکھوں میں اس کی خناسی نظریں دہک رہی تھیں۔ اور اس کے نتھنوں سے اس کی سانس کی گرم بھاپ نکل رہی تھی۔

فرعون کے اندر خواہشوں کی موجیں عظمت اور بلندی اور غضب ناکی میں بے پناہ بن گئی تھیں۔ اس کی کمر اور اس کی رانوں میں سوئیوں کی طرح چبھتی ہوئی گرم لہریں دوڑ رہی تھیں۔ اس کی تمام ہستی غلبہ کے ایک پھونک ڈالنے والے ارمان سے بھڑک رہی تھی۔ اس کا فرعونانہ جلال نرم گوشت اور لچکتی ہڈیوں کی اس کمزور ہستی کو جو اپنی نویلی حرکات اور البیلے اندازوں میں اجیت بن بن کر تھرک رہی تھی اس سے زیادہ سرکش نہ دیکھ سکتا تھا۔ اس کے اعضا نے چیتے کی گھات کا انداز اختیار کر لیا تھا، یکلخت وہ ایک شیر کی سرعت سے لپکا۔ اس کے بازوؤں نے اژدھے کا بل ڈال دیا اور ایک زہریلا ناگ بن کر انتقام کی پوری خونخواری میں رقاصہ کو ہونٹوں پر ڈسنے لگا۔ قد آدم ستاروں کے تار شدید دھڑاکوں کے ساتھ ٹوٹ کر رہ گئے۔ اور ذرا دیر کو ایک کانپتا ہوا سکوت طاری ہو گیا۔

اور پھر ایوان نشاط کا تیسرا تختہ بلند ہو کے ایک فلک شگاف غل سے گونج اٹھا جس میں خموں کے منہ کھل گئے۔ قدحوں میں سے شراب ابل ابل کر گرنے لگی۔ مینا فرش پر لڑھکتے ہوئے دکھائی دینے لگے، رقاصہ لڑکیوں کی کلائیوں پر پنچے گڑ گئے اور ساقنوں کے دامن تار تار ہو گئے۔

لیکن یہ رنگ رس ابھی پورے طور پر بے قابو نہ ہونے پایا تھا کہ یکلخت کانسے کا ایک گھڑیال بجنا شروع ہوا۔ اور فرعون کے تخت کے پیچھے ایک منقش دروازہ رسم کے تکلف و اہتمام سے کھول دیا گیا۔ چونکی ہوئی نگاہیں اس سمت کو اٹھیں تو دیکھا کہ غضب آلود پروہت ممی کی وضع پر تراشی ہوئی دیوتا آسیرس کی لکڑی کی مورتی خدام کے کندھوں پر اٹھوا کر ایوان نشاط میں داخل ہو رہا ہے۔

غل گھٹنے لگا اور گھٹتے گھٹتے نابود ہو کر رہ گیا۔ تامل آمیز سکوت میں جب خدام ممی کو اٹھائے اٹھائے نوجوان فرعون کے مہمانوں کے سامنے چپ چاپ تھم تھم کر گھومنے لگے تو پروہت پکار پکار کر کہنے لگا۔ "انجام ہستی کو دیکھو اور ان ترغیبات سے احتراز کرو جو تمہارے حواس کو فریب لا کر تمہیں بھلا دیتی ہیں کہ موت کا سر دہاتھ ایک روز حیات ناپائیدار کی آنکھیں بند کر دے گا۔

پروہت کی آواز جیسے اہرام کے اندر سے گونج گونج کر نکل رہی اور ہڈیوں میں نفوذ کرتی چلی جا رہی تھی۔ مورتی کے سامنے آتے ہی لرزہ براندام مہمانوں کے رنگ پیلے پڑ گئے اور حلق سوکھ کر رہ گئے۔ ہیبت نے دلوں کو دہلا دیا اور عبرت آفریں خاموشی میں نظروں کے اندر سے استغفار کی بو پھٹنے لگی۔

فرعون اپنی بوجھل اور عطرپاش خود فراموشی سے چونک اٹھا تھا۔ رقاصہ اس کے بازو پر بے سدھ پڑی تھی۔ وہ اپنے تمام جسم میں ایک پیاسا اور معتبر درد لئے ساکت تھا۔ پروہت کے الفاظ کی گونج اس کے کانوں میں شائیں شائیں کر رہی تھی۔ اور اس گونج میں ایک ہیبت کا سایہ اس کے دل پر اترتا آ رہا اور گہرا ہوتا جا رہا تھا۔

اس کی نظر مورتی پر پڑی۔ جسے خدام کے کندھے احترام کی آہستگی اور خاموشی میں اٹھائے لئے آ رہے تھے۔ اس نے خوف آلود پس و پیش سے نظریں اٹھائیں۔ اور آسیرس کی مورتی کو دیکھنے لگا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ آسیرس کے ساکت و جامد چہرے میں اس کے اپنے خط و خال ابھرتے چلے آ رہے ہیں زندگی کی روانی سے منقطع۔ موت کی چیرہ دستی سے مغلوب۔ انجام ہستی کے شدید احساس نے ایک لخت اس کے دل کو مٹھی میں لے کر بھینچ ڈالا۔ ایسے چہرے اور اس بے بسی کے ساتھ زندگی کی رنگینیوں اور دلآویزیوں کو الوداع! مقبرے کے دروازے کا خاموش اور مہیب اور دردانگیز راستہ! وہ راستہ جو صرف جاتا ہے اور واپس نہیں آتا۔

اچانک اس کے بازوؤں میں پڑی ہوئی رقاصہ اپنی مدہوش غفلت میں کراہی اور فرعون کی متامل نگاہیں اس کے چہرے پر مچل گئیں۔ اس کے نمناک ہونٹ ایک شیریں آرزو میں کھلے ہوئے تھے۔ اس کے نازک نتھنوں سے ارمانوں کے لمبے لمبے اور رکتے ہوئے سانس نکل رہے تھے۔ اس کی پھیلی ہوئی پتلیوں میں تشنہ تمنائیں گم تھیں۔ وہ سب کچھ تھا جو یہ مختصر اور عارضی اور اپنی جگمگاہٹوں میں بھاگتی ہوئی دنیا اپنے اندر رکھتی ہے۔ اور اس کا خون بجلیوں کی طرح اس کے دماغ میں تڑپ تڑپ کر پوچھنے لگا۔ اس کو تیاگ نا! اس سے منہ موڑ لینا! اس سربستہ مسرت کے دروازے پر سے ترستی ہوئی روح لے کر لوٹ جانا! کیوں؟ آخر کیوں؟ اس لئے کہ اس زندگی کے آگے آخرت کا سفر درپیش ہے کسی روز شاید کل۔ شاید اسی وقت۔ اس لئے کہ جب روح اس سفر میں ہو گی تو یہ جسم اس ممی سے مشابہ ہو جائے گا خشک اور سرد اور بے رنگ اور بے حس۔ ان تمام شیریں ارمانوں سے محروم جو رگوں کے تاروں سے نغمے نکالتے اور اس کے ساتھ لپک لپک کر گاتے ہیں۔ صرف ایک تودہ۔ ایک لوتھ۔ ایک ڈھیر۔ جس کی رعنائیاں اور رونقیں۔ جس کی گرمیاں اور بجلیاں جس کے میلان اور [illegible] عالم کا تمام حاصل۔ اس حسین دنیا کی ساری متاع عزیز یہیں فنا ہو کر رہ جائے گی۔

اس نے بے قرار ہو کر پروہت پر نظر ڈالی۔ جس کی ملامت سے ابلتی ہوئی نظریں اپنے اقتدار کی جراحت اور اپنی بے بسی کے

ضعف میں گلا پھاڑ پھاڑ کر اسے فریبی اور دغا باز اور ملعون و مردود قرار دے رہی تھیں۔ مایوسی اور برافروختگی کے شدید اعلان میں وہ نوجوان فرعون کو اپنے تمام وقار اور جلال سے عجیب طرح خالی نظر آرہا تھا۔ اپنے زہد واتقا میں خشک اور کم ظرف' اپنی ناتجربہ کاری میں ادنیٰ و جاہل۔ جذبات کی بلند آہنگ نمائش بے تکلف و تقدس کی عبا اس کے شانوں پر سے گرادی تھی اور وہ اپنی عریانی میں ایک بازاری انسان بن کر نظر آرہا تھا۔ جس کی گردن کی رگیں پھول سکتی اور جس کا منہ غیظ و غضب سے کف آلود ہو سکتا تھا۔ جس میں نہ زندگی کی پیچیدگی کی سمجھ تھی اور نہ موت کے اسرار کی فہم۔ جو محض ایک پیشہ ور تھا اور اپنے پیشہ کے فروغ کے لئے دلوں میں اوہام و وساوس بیدار کر رہا تھا۔

نوجوان فرعون پروہت کا چہرہ دیکھ رہا تھا اور اپنے سرکش اور باغی نفس کو اس کی گرفت سے آزاد محسوس کر رہا تھا۔ اس باغی نفس کو جور قاصہ کے نرم جسم سے حرارت اور اس کے کانپتے ہوئے تنفس سے نشہ پارہا ہے اور اپنے طغیان میں مقسوم سے بھی نبرد آزما ہونے کا بل حاصل کرتا جارہا تھا۔

ایک نئی سنسنی نے اسے بے خود کر دیا۔ اس نے یکلخت اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور نفس کی سرور انگیز فیروز مندی میں پکار کر بولا۔ "دیوتا آسیرس کی مورتی کو دیکھو اور اس کے پیغام کو سمجھو کہ ہستی انسان کا انجام کیا ہے' موت بھاگی آرہی ہے کہ تمہیں مغلوب کرلے۔ اس مورتی کی طرح تمہیں بے حس بنادے۔ تمھارے حواس اور بیرونی رعنائیوں کے رشتے کاٹ ڈالے۔ اس سنجوگ سے تمھاری روح میں جو سہانی لرزشیں پیدا ہوتی ہیں' انھیں ہمیشہ کو تھمادے۔ عالم دوبارہ نہیں۔ زندگی مختصر ہے اور اگلا پل غیر یقینی۔ اس لئے ان تمام لذتوں سے اپنے سینے بھرلو۔ جو اس حیات ناپائیدار کا حاصل ہیں۔ اور جو حواس کے دروازے بند ہو جانے پر پھر تمہیں نصیب نہ ہو سکیں گی۔

اور اس کے بعد فراعنہ مصر کے محل کا دستور بن گیا کہ ضیافتوں کے بعد جب مہمان میگساری کی رنگ رلیوں سے لطف اندوز ہونے لگتے تو ایوان نشاط کا مہتمم انھیں عشرت کے انوکھے اور نت نئے احساسات سے لطف اندوزی کی دعوت دینے کو ممی کی وضع پر تراشی ہوئی دیوتا آسیرس کی لکڑی کی مورت خدام کے کندھوں پر اٹھوا کر ایوان نشاط میں داخل ہوتا اور اس وقت جبکہ خدام ممی کو اٹھائے مخمور فرعون اور اس کے بدمست مہمانوں میں گھم گھم کر گھوم رہے ہوتے تو پکار پکار کر کہتا "انجام ہستی کو سمجھو اور ان تمام لذتوں سے اپنے سینے بھرلو جو اس حیات ناپائیدار کا حاصل ہیں۔ اور جو حواس کے دروازے بند ہونے کے بعد پھر نصیب نہ ہو سکیں گی۔

۱

لیلیٰ

عابد علی عابدؔ

ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخ روشنی خیموں کے اس وسیع سلسلہ کو جو ریگستان کے چمکتے ہوئے ذروں پر دور تک پھیلا ہوا تھا۔ قرمزی رنگ میں رنگتی ہوئی دو تنومند نوجوانوں کے صحت مند چہروں پر پڑ رہی تھی' جو اپنی بندوقوں پر سہارا لئے باتوں میں مصروف تھے۔

ان میں سے ایک جس کا لباس اس کے جسم پر نہایت ناموزوں اور بھدا معلوم ہوتا تھا' اپنی داڑھی کے چند بالوں پر ہاتھ پھیر کر بولا۔ "یہ غیر معنی احتیاط کچھ معنی رکھتی ہے۔" پھر گویا اپنی منطقی کارروائی کے اس محیر العقول نتیجہ پر پہنچنے کی خوشی میں اپنی تنگ چھاتی کو ابھار کر جس سے اس کے کوٹ کے دو تین بٹن ٹوٹ جانے کا اندیشہ لاحق ہوتا تھا' اپنے فقرے کو اہمیت دیتے ہوئے کہنے لگا۔ "ہاں ضرور کچھ معنی رکھتی ہے۔"

دوسرے نے جس کی لانبی لانبی گھنی مونچھیں اور مستقل مزاجی کا ایک خاص انداز اس کی بیوقوفانہ شجاعت کے ثبوت دینے میں ایک نمایاں حصہ لے رہا تھا کچھ جواب نہیں دیا۔ پہلا شخص اس کی طرف داد طلب نگاہوں سے دیکھتا رہا' مگر اس نے زیر لب صرف اس فقرے کے کہنے پر اکتفا کیا۔ "ہاں کچھ نہ کچھ بات تو ضرور ہو گی۔"

پھر ارادتاً ذرا آواز بلند کر کے اپنی خودداری کی شکست پر منفعل سا ہو کر دوسرے شخص سے مخاطب ہوا۔ "حیات خاں تم تو کچھ جانتے ہی ہو گے۔" مخاطب نے جو اسی بات کا خواہش مند تھا' اپنی معلومات کی وسعت پر یہ خراج تحسین وصول کر کے اپنی آنکھوں میں رازداری کی ایک مبہم سی چمک مشتعل کی۔ پھر ایک تفاخرانہ لہجہ میں جواب دیا۔ "میں کیا نہیں جانتا۔"

سوال کرنے والے نے حیات خاں کے چہرے کی طرف جس پر کئی گہرے زخموں کے نشان پتہ دیتے تھے کہ وہ جنگ کے ہیبتناک مناظر کے درمیان اپنی عمر کا ایک معتدبہ حصہ گزار چکا ہے۔ اور جس کے کرخت نقش و نگار تکالیف کی برداشت کا ایک متحرک ثبوت تھے غور سے دیکھا۔

"پھر کچھ کہو تو۔"

"مرتضےٰ خاں بڑوں کے معاملے میں چھوٹے دخل نہیں دیا کرتے۔"

یہ فقرہ احساس برتری کی اس مخصوص حالت میں کہا گیا تھا۔ گویا مرتضےٰ خاں جیسے صادق دوست کے ذرا سے اکسانے پر وہ اپنے راز کو فاش کر دیگا۔

مرتضےٰ خاں نے مصنوعی اشتیاق سے لبریز آواز میں سوال کیا۔ "کچھ اتا پتا تو دو۔"

حیات خاں نے اپنی ظاہری معلومات کو ایک معنی خیز مسکراہٹ میں تبدیل کر کے دبی آواز سے پوچھا۔ "تم کیا اندازہ لگاتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔" "یہی تو وجہ ہے کہ تم ابھی تک سپاہی کے درجہ سے نہیں بڑھے مرد خدا فوج میں ترقی کرنے کے لئے مضبوط بازوؤں کے علاوہ عقل کی بھی ضرورت ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے دائیں بازوؤں کے بلوں کی طرف شادماں غور سے دیکھا اور اس کا چہرہ خوشی کے ایک ناگہاں سیلاب سے تمتما اٹھا۔ اسے اس قدر خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ جتنی ایک جرنیل کو گھمسان لڑائی جیتنے پر بھی نہیں ہو سکتی۔ مرتضےٰ خاں نے ایک ادائے تسلیم سے ان نشانوں کو تو فق کا ایک اعلیٰ ترین ثبوت سمجھتے ہوئے ان کی طرف رقابت کی ایسی حریص نگاہوں سے دیکھا کہ حیات خاں کے سمند غرور کو مہمیز ہو گئی۔ اس نے اپنی کارروائی کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے تہیہ کر لیا۔ کہ اپنے بچپن کے اس رفیق کو جس سے وہ بلند رتبہ ہونے کے باوجود برابر کا برتاؤ کرتا تھا اپنی معلومات سے فائدہ پہنچا کر رہے گا اس نے اپنی آواز کو اور زیادہ دبا کے اور اپنی آنکھوں میں ایک مبہم اور تاریک جذبہ مشتعل کر کے مرتضےٰ خاں کے کان میں کہا۔ "دیکھتے نہیں ہمارا بہادر سردار کتنا سہما ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ کسی موقعہ پر کبھی نہیں گھبرایا۔ مگر ان دنوں اس کے انداز سے بھی پریشانی برستی ہے۔ وہ ذرا سی آہٹ پر چونکتا ہو جاتا ہے اور اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ رات کو خاص طور پر دو سپاہی اس کے خیمے کے آگے متعین کئے جاتے ہیں اور اس وقت دن کو بھی ہم دو گھنٹہ سے اس کے خیمے کے آگے کھڑے گپیں ہانک رہے ہیں۔ ان باتوں سے صرف ایک نتیجہ نکلتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ گویا زیادہ کہنا خلاف مصلحت سمجھتا تھا۔

"کیا نتیجہ نکلتا ہے۔"

حیات خاں نے چاروں طرف دیکھا اور دل کو پورا پورا اطمینان دلا کر کہ آس پاس کوئی نہیں ہے۔ اپنے رفیق کی حماقت پر دل ہی دل میں لعنتیں بھیجتے ہوئے ناراضگی سے کہا۔ "کہ چپ رہو کہیں کوئی سن لے گا تو کھال ادھڑوا دی جائے گی۔"

مرتضےٰ خاں نے ایک فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اور حیات خاں کی سپاہی منش خصلتوں کو بھڑکانے کے لئے کہا۔ "تم کسی بات سے ڈرتے ہو۔"

حیات خاں نے تیز ہو کر جواب دیا "اچھا تو سنو۔ ہمارے سردار کو جان کا خطرہ ہے۔

جان کا خطرہ مرتضےٰ خاں کو اس بات کی امید نہ تھی اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اس کے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں آنے لگیں اس کی اپنی جان کی نسبت ایسی پیشینگوئی کی جاتی تو وہ پروا بھی نہ کرتا مگر ان کا سردار ہر دلعزیز سردار جس کے لئے وہ اپنے خون کا آخری قطرہ بہانے کے لئے تیار تھا اس کی نسبت ایسی خبر سن کر وہ بھونچکا سا ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے دل میں ایک خوفناک مگر مستقل ارادے کے خاکے کو محسوس کیا۔ اور اسی جذبہ کو نشوونما پاتے دیکھ کر اس کا ذہن خوشی سے معمور ہو گیا۔ اس نے اپنے سپاہیانہ انداز میں ایسے سکون سے جس کے بین السطور میں خوفناک جذبات کی شورش متحرک تھی۔ پوچھا "اسے کس طرف سے خطرہ ہے؟"

"ایک عورت کی طرف سے"

مرتضےٰ خاں نے صورت حال کو سمجھنے کے لئے اپنے دماغ کو صرف کاوش کرکے ایک نتیجہ پر پہنچ کر چھوٹے چھوٹے جملوں میں حقیقت کے سمجھنے کا اظہار کیا۔

"جبھی ہر آنے جانے والی عورت کی تلاشی لی جاتی تھی۔ ہر ایک طوائف کی نسبت اطمینان کیا جاتا تھا۔"

"ہاں"

مرتضےٰ خاں نے اپنے سردار کے خیمہ کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھا' اندر سے بلند قہقہوں کی آواز آرہی تھی کبھی کبھی آوارہ ہوا اپنے دوش پر شراب کی ناخوشگوار اور تیز بو کو بھی لے آتی۔ جس سے ثابت ہوتا تھا کہ اندر محفل نشاط گرم ہے۔ اب شام ہو چکی تھی۔ پہاڑی ریگستان کی خوش نما اور شاعرانہ شام جو ہر ایک شے پر کسی مہیب اور مافوق الفطرت پرند کے سیاہ آبنوسی پروں کی طرح چھا جاتی ہے۔ "تاریکی لحہ بہ لحہ گہری ہو رہی تھی' خیموں میں چراغ روشن ہونے لگے۔ سپاہی جو گرمی کے مارے خیموں میں ایک عارضی اور غیر مطمئن پناہ تلاش کر رہے تھے۔ اب باہر نکل آئے۔ جنگل میں منگل ہو گیا۔ مرتضےٰ خاں اپنے خیالات میں مستغرق تھا کہ اسے اپنے قریب کئی قدموں کی چاپ سنائی دی اس نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا تو چند آدمی ایک خوشنما فینس کو اٹھائے آرہے تھے۔ جس کا وجود وہاں حیرت انگیز تھا۔ فینس کے آگے چند کم عمر چھوکرے شمعیں ہاتھوں میں لئے ہوئے سبک خرامی سے چلے آرہے تھے۔

دونوں نے پر اشتیاق نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ فینس خیمے کے قریب آکر ٹھہر گئی۔ ایک چھوکرے نے بڑھ کر حیات خاں کو صحیح طور پر افسر سمجھتے ہوئے نہایت سلیس لہجہ میں خطاب کرتے ہوئے کہا "کیا سردار شیر علی کا خیمہ یہی ہے۔"

"یہی ہے مگر تم کیا چاہتے ہو۔"

چھوکرے نے فینس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ یہاں کی مشہور طوائف لیلےٰ ہیں' انہیں آج سردار صاحب نے پورے آٹھ بجے طلب فرمایا ہے۔"

"اچھا ٹھہرو۔ میں سردار صاحب کو خبر کرتا ہوں۔"

حیات خاں خیمہ کے اندر گیا۔ اور واپس آکر سیدھا فینس کے قریب جا کر بولا۔ "بی صاحبہ آپ کو تکلیف تو ضرور ہو گی۔ مگر کم از کم رسماً میرا فرض ہے کہ میں آپ کی تلاشی لے لوں۔"

پردوں سے ایک سریلی آواز آئی۔ "کیا وجہ؟

"سردار صاحب کا حکم۔"

"اچھا میں حاضر ہوں۔"

حیات خاں نے پردے اٹھائے۔ وہ حقیقت میں ایک خوبصورت عورت تھی۔ بلند و بالا شاہانہ انداز اور رعب رکھنے والی ایک ہلکے سے لباس میں ملبوس تھی۔ اس نے ایسی مسحور کن نگاہوں سے حیات خاں کی طرف دیکھا۔ جس طرح صرف ایک عورت ہی مرد کی طرف دیکھ سکتی ہے۔

"اچھا اپنا کام شروع کیجئے۔"

"میں آپ سے پھر معافی مانگتا ہوں۔ مگر اس کے بغیر چارہ نہیں۔"

اُس نے اپنے مرمریں ہاتھ اپنی گردن پر رکھ کر حیات خاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اور کہا۔ "معافی مانگنے کی

ضرورت نہیں یہ تو آپ کا فرض ہے۔"

حیات خاں کو ڈر تھا کہ وہ اس کی مدافعت کرے گی۔ اس مغلوبیت کی ادا نے اس کی تمام بدظنی کو دور کرنے کے علاوہ اسے مسحور کر لیا۔ اس نے اپنے تجربہ کار ہاتھوں کی چار پانچ جنبشوں سے اس کے لباس کے تمام سلوٹوں کو ٹٹول کر اطمینان کر کے کہا۔ "جائیے مگر مجھے بھول کرنہ جائیے گا۔"

"آپ نے مجھے بڑی تکلیف سے بچایا ہے۔ میں کبھی آپ کو بھول سکتی ہوں۔"

فینس بالکل خیمہ کے قریب پہنچ گئی تھی۔ کہ لیلےٰ نے اپنا سر پردوں میں سے نکال کر حیات خاں کی طرف دیکھا جس کی حریص نگاہوں سے اس کے چہرے پر ذلت کی سرخی دوڑ گئی۔ اور خوشامدانہ لہجہ میں کہا۔ "حوالدار صاحب میری ایک پیش خدمت پیچھے آرہی ہے اسے بے روک ٹوک اندر آنے دینا اس کے پاس میری چند ضروری چیزیں ہیں۔"

حوالدار صاحب نے مسکرا کر جواب دیا۔ "مطمئن رہئے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا جائیگا۔"

"شکریہ"

لیلےٰ کے رسیلے لبوں پر ایک لمحہ کے لئے فتحمندی کا ایک زہریلا تبسم کھیلنے لگا۔ مگر فوراً ہی اس کا سر مخمل اور ریشم کے خوش نما زرتار پردوں میں چھپ گیا۔ فینس خیمہ میں داخل ہو گئی۔ مگر حیات خاں اسی طرح مخمور نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

(۲)

نفیس و لطیف پیچوانوں کے دھوئیں نے خیمہ کی محدود ہوا میں ایک تیز و تند خوشبو کا اضافہ کر دیا تھا۔ بیش قیمت ایرانی فرش پر جس کی ہر سلوٹ عیش کی دراز دستیوں کا پتہ دیتی تھی۔ شراب کے تازہ داغ موجود تھے۔ جا بجا ارباب نشاط اپنے اپنے سازندوں کو ساتھ لئے بیٹھی تھیں۔ کوئی اپنی شمعی انگلیوں سے پاندان کھولنے میں مصروف تھی۔ کوئی کسی خوشگوار لطیفہ پر اپنی آواز کے سریلے پن کو ایک جھوٹے قہقہہ کے لوچ میں ظاہر کرنا چاہتی تھی۔

لیلےٰ بظاہر دوپٹے کے ایک شکن کو درست کرتے ہوئے مگر حقیقت میں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔

سب نے سر اٹھا کر نووارد کی طرف ایک خاص نگاہ ڈالی اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔ لیلیٰ نے تھوڑا عرصہ بیٹھ کر اپنے پیش خدمت کو ایسے انداز تحکمانہ اور شان رعونت سے آواز دی اور ایسی دھیمی اور سریلی آواز میں پانی لانے کے لئے حکم دیا۔ کہ طوائفوں نے حقارت آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن اب لیلیٰ کا بے پناہ اور سحر ساز حسن ایک ایشائی لمپ کی لطیف روشنی میں اپنی پوری خیرہ کن عریانی میں ظاہر ہو رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں رقابت کی چمک اور چہروں پر انفعال کی سرخی دوڑ گئی' لیلیٰ نے اپنی اس بے باک فتح کو دیکھ کر دل میں طمانیت کی ایک گہری سانس لی' مگر ظاہر میں ایک بے پروائی کے انداز میں آنکھیں جھکا لیں' وہ مسرور تھی کہ وہ اپنے حسن سے اپنی ہم جنسوں تک کو مرعوب کر رہی ہے۔ اور اس کے لیے ایک کام باقی تھا۔ سردار کو بھی اپنے حسن سے مغلوب کرنا۔

یہ تمام محفل گرم تھی۔ لیکن سردار شیر علی کا دل سرد تھا۔ وہ خیمہ کے آخری سرے پر دو مخملی گاؤ تکیوں کے سہارے خاموش اس منظر کو دیکھ رہا تھا ایسی گہری سوچ میں کہ اس کی آنکھیں بغیر کسی شے کا جائزہ لئے ہوئے گویا خیمہ کے پردوں میں سے نکل کر دور کسی اور منظر میں مصروف تھیں۔ وہ ایک کریہہ المنظر شخص تھا ہر ایک سپاہی منش خصلت سے ممیز۔ جس کے بازو اور طبیعت کئی

لڑائیوں میں کام آ آ کر فولاد کی طرح سخت ہو گئے تھے۔ وہ اسی حالت میں تھا کہ ایک تین چار سال کا بچہ خیمہ کا پچھلا پردہ اٹھا کر داخل ہوا۔ لیکن وہ اس شیطانی ہجوم سے کچھ گھبرا گیا۔ کیونکہ اس نے شیر علی کے دائیں بازو کو اپنی ننھی انگلیوں سے پکڑتے ہوئے توتلی زبان میں کہا۔ "ابا!" شیر علی اس آواز کو سن کر اس طرح چونکا جس طرح اچانک کسی شخص کا پاؤں ایک زہریلے سانپ پر جا پڑے اس نے مڑ کر دیکھا اور اس کی آنکھیں دفعتاً پر آب ہو گئیں بچے کو گود میں اٹھا کر وہ اسے پیار کرنے لگا۔ بچے نے اپنی معصوم نگاہوں سے شیر علی کی طرف پیار سے دیکھنا شروع کیا۔

لیلےٰ جس کا رنگ سرخ سے زرد اور زرد سے سفید ہو گیا تھا۔ دزدیدہ نگاہوں سے اس منظر کی طرف دیکھ رہی تھی اور دیکھتی رہی۔ جب تک بچہ شیر علی کی گود سے اتر کر پھر دوسرے خیمہ میں نہ چلا گیا۔

حیات خاں اور مرتضےٰ خاں باتوں میں مشغول تھے کہ ایک عورت جو اپنی تراش خراش سے پیش خدمت معلوم ہوتی تھی۔ لپکی ہوئی آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک نقرئی پاندان تھا جسے طرح طرح کے نقوش سے مزین کیا گیا تھا وہ خیمہ میں جانا چاہتی تھی۔ مگر حیات خاں نے بڑھ کر روکا۔

حیات خاں کے کرخت ہاتھوں کی گرفت کو محسوس کر کے اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی ایک دیوانہ وار کوشش کی۔ اور اپنی کمزوری سے مایوس ہو کر ایک دلدوز چیخ ماری۔

حیات خاں نے گھبرا کر کہا "کون ہے تو چڑیل۔"

عورت نے جس کا رنگ لحہ بہ لحہ اڑتا چلا جاتا تھا گلو گیر آواز میں جواب دیا "میں لیلےٰ کی پیش خدمت ہوں۔" اس کی سرمگیں آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

حیات خاں ہنس پڑا۔ اور اس کا بازو چھوڑ دیا۔ "جاؤ تم نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔"

پیش خدمت نے نیم تبسم سے حیات خاں کی طرف دیکھا اور خیمہ کے اندر چلی گئی۔ مرتضےٰ خاں بھی جس کے دماغ میں ایک نئی تجویز کا خاکہ گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا اس کے پیچھے دبے پاؤں چل پڑا۔

لیلےٰ ناچ رہی تھی اس کے مشاق پاؤں کے ساتھ بندھے ہوئے گھونگھرو دلوں کے گہراؤ میں موسیقی کی جھنکار پیدا کر رہے تھے۔ طوائفوں کا گروہ اس کی طرف دیکھ کر اپنی کم مائیگی کو ایک حاسدانہ ہنسی میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ اپنی نگاہوں میں غرور کی تمام تمکنت حسن کی تمام کشش جوانی کی تمام مستی کو لے کر ایک بہتے ہوئے سیل کی طرح آگے بڑھی۔ اپنے مرمریں جسم کو جس کی صباحت ململ کے کپڑوں سے پھوٹ نکلی تھی۔ موسیقی کے ہر ایک تال پر سبز شاخ کی طرح لچکاتے ہوئے آگے بڑھی اس نے تمام خیمہ کا تیزی سے چکر لگایا اور چشم زدن میں وہ شیر علی کے سامنے تھی۔

شیر علی کی آنکھیں لیلےٰ سے ملیں اور اس نے اس ناچتے ہوئے رنگ و بو کے پیکر میں کسی بھولے ہوئے زمانہ کی یاد کو منعکس دیکھا وہ بھی آنکھیں پھاڑے ہوئے سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھا کہ لیلےٰ کی پیش خدمت داخل ہوئی۔ اور لیلےٰ فوراً اپنے گھونگھروؤں کی جھنکار کو کانوں میں چھوڑتی ہوئی پھر اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گئی۔

شیر علی غور سے لیلےٰ کی طرف دیکھ رہا تھا مگر آخر کار اس نے چونک کر آواز دی "سہیل خاں" "حضور حاضر"

جواب دینے والا خود بھی آ پہنچا۔ وہ ایک مکاری کا پتلا معلوم ہوتا تھا۔ دبلا پتلا کوتاہ قد کوتاہ گردن' تنگ پیشانی چھوٹی آنکھیں وہ مسکرانے لگا۔

شیر علی نے سرگوشی سے پوچھا۔ "سب انتظام مکمل ہے نا۔"

"پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔"

تلاشی کوئی معتمد آدمی لیتا ہے؟" یہ سوال ذرا گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا گیا۔

تلاشی حیات خاں لیتا ہے۔ جو فوج میں سب سے زیادہ بیوقوف اور آپ کا سب سے زیادہ خیر خواہ نوجوان ہے۔"

شیر علی کے لب ایک مسکراہٹ سے آشنا ہوئے۔ اور اس نے گویا کسی نو پیدا شدہ شبہ کو ذہن سے بالکل دور کر دیا۔ کیونکہ اس نے مطمئن لہجے میں کہا۔ "اچھا تم جا سکتے ہو۔"

سہیل خاں تین دفعہ تسلیم بجالایا۔ اور الٹے قدموں واپس گیا۔

لیلےٰ پھر اٹھی گویا فتنہ خوابیدہ پیدا ہوا۔ اب اس کے ہاتھ میں ایک ہلال نما لکڑی کا نیام تھا۔ جو پیش خدمت نے اسی وقت ایک نقرئی پاندان سے نکال کر دیا تھا۔ ناچتے ہوئے لیلےٰ نے اسے اپنی باہوں پر اچھالا۔ اور پھر ایک رنگین تیتری کی طرح نہایت تیزی سے ایک چکر لے کر ہاتھوں پر سنبھال لیا۔ فن رقص کے اس کمال سے وہ ہر ایک کو متحیر کرتے ہوئے شیر علی کی طرف تیزی سے بڑھتی گئی۔ دس دس قدم کے بعد وہ ناچ کے دوران میں کورنش کے لئے جھک جاتی دائیں ہاتھ سے نیام کو ہوا میں اچھالتی۔ اور وہی ہاتھ چھاتی پر رکھتی اور پھر جھک کر بائیں ہاتھ سے گرتے ہوئے نیام کو روکتی۔

وہ تیزی سے بڑھتی گئی۔ حتیٰ کہ شیر علی کے عین مقابل میں آ پہنچی۔ شیر علی دنگ ہو کر لیلےٰ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یکایک لیلےٰ نے نیام ہوا میں اچھالا اور اپنے ہاتھوں کو اس طرح حرکت دی کہ ہوا سے نیچے آتے وقت نیام کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ لیلےٰ پھر کورنش کے لئے جھک گئی۔ اور اب دونوں ٹکڑوں کی جگہ لیلےٰ کے بائیں ہاتھ میں ایک چمکتا ہوا آبدار خنجر تھا۔ خنجر ایک لحہ میں شیر علی کے دل میں اتر جاتا کہ یکایک خیمہ کا ایک حصہ جو لیلےٰ سے بالکل قریب تھا۔ تلوار کی تیز دھار سے چاک کیا گیا۔ اور مرتضےٰ کی زبردست گرفت نے لیلےٰ کا ہاتھ ہوا ہی میں روک دیا۔

شیر علی گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ لیلیٰ بیہوش ہو کر گر پڑی۔

(۳)

دوسرے دن لیلےٰ کا کورٹ مارشل ہوا۔ ایک خیمہ ضروری سامان سے آراستہ کر دیا گیا۔ صدر میں شیر علی دائیں طرف مرتضےٰ خاں لیلےٰ کی طرف خوفناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بے وقوفانہ وقار سے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

سامنے سپاہیوں کے ایک دستے کی حراست میں لیلےٰ کھڑی تھی' اس کا رنگ سفید ہو گیا تھا۔ مگر وہ مدافعانہ آنکھوں سے شیر علی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

شیر علی نے ہر ایک قسم کے جذبہ سے خالی آواز میں کہا۔ "صاحبان کیا مجرم کے بیان شروع ہوں۔"

مرتضےٰ خاں اور حیات خاں نے کہا۔ "ہاں۔"

لیلئے کو فرد جرم پڑھ کر سنائی گئی اور پھر شیر علی نے جو اس وقت اپنے نافذ کردہ اصول کے مطابق خود ہی منصف اور خود ہی مدعی تھا۔ لیلئے کی طرف دیکھ کر کہا کہ:۔

"کیا وجہ ہے کہ تمہیں موت کی سزا نہ دیجائے۔"

"وجہ تم جانتے ہو۔ مگر میں اس کی آگاہی کے لئے گذشتہ سال کے واقعات کی اجازت طلب کرتی ہوں۔"

شیر علی نے پھر پوچھا "صاحبان آپ کو کوئی اعتراض ہے۔"

پھر مرتضےٰ خاں اور حیات خاں کے منہ سے نکلا۔ "کوئی نہیں کوئی نہیں" اور خاموشی چھا گئی۔

"دو سال کا عرصہ ہوتا ہے جب میں ایک دوشیزہ تھی۔ میری پرورش عشرت اور گناہ کے درمیان ہوئی۔ لیکن میرا دل تمام خارجی تاثرات سے آزاد رہا۔ میری بوڑھی ماں جو اپنے زمانے کی ایک جہاں دیدہ طوائف تھی' اپنی محنتوں کو اس طرح اکارت جاتے ہوئے دیکھ کر گھبرا اٹھی مگر سب بیسود ثابت ہوا۔ گناہ کے اس مہیب عشرت کدہ میں جہاں میری ماں بڑے سے بڑے داؤں لگانے والوں کے ہاتھ حسن کو بیچ دیا کرتی' میں ہر اثر سے بے نیاز رہی۔ بڑے بڑے رئیس زادے جو ہزاروں روپے میرے ایک تبسم کی قیمت دینے کے لئے تیار تھے واپس جاتے تو میری ماں کا دل بہت کڑھتا۔

وہ مجھے سمجھاتی۔ "بیٹا اوپر کے دل سے ان کی خاطر داری کیا کرو۔ یہ تو ہمارا پیشہ ہے۔" لیکن اس بات پر میں بگڑ کھڑی ہوتی۔ اور وہ یہ سمجھ کر چپ ہو جاتی کہ شاید کسی دن مجھے عقل آ جائے۔ بہت عرصہ یہی حالت رہی اور ہمارے دلوں کے درمیان جو خلیج تھی۔ وہ گہری ہوتی چلی گئی۔ ماں بیٹی کی قدرتی محبت بھی اس خلیج کو عبور نہ کر سکی۔ آخر کار ہمارے دلوں میں ایک خفیہ لڑائی چھڑ گئی۔ ظاہر میں ہم نہایت میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگے' مگر نفرت کا کڑوا بیج پرورش پا رہا تھا۔ وہ غالباً اس کوشش میں تھی کہ مجھے کسی رئیس زادے کے پاس اونے پونے بیچ ڈالے مگر ظاہراً اب اس نے ایسی باتوں کا تذکرہ ہی چھوڑ دیا۔

میں بھی بیکار نہیں تھی' ہمارے یہاں آنے جانے والوں میں ایک غریب نوجوان بھی تھا۔ جس کی شرافت اور محبت افلاس کے بادلوں میں ستارے کی طرح چمکتی تھی۔ اس کی شریفانہ گفتگو اس کے مہذب اطوار رفتہ رفتہ مجھے ایک نامعلوم کشش سے کھینچنے لگے۔ رفتہ رفتہ میں بالکل بے بس ہو گئی۔ اس کی سیاہ آنکھوں اور خوبصورت چہرے نے مجھے مسحور کر لیا۔ آخر ایک دن مجھے احساس ہوا کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔

دیر کرنا خطرناک ثابت ہوتا۔ ہم نے بہت جلد خفیہ نکاح پڑھوا لیا اور میں اپنی ماں کی دوربین نظروں سے بچ کر بھاگ نکلنے کا موقعہ تلاش کرنے لگی۔ اس کی آنکھیں بلی کی طرح میری ہر حرکت کے ساتھ لگی رہتی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی مکاری کو چکمہ دے کر نکل جانا آسان نہیں۔ میری چھوٹی سے چھوٹی بات اس کے زیر نظر تھی۔ اس طرح کافی وقت گزر گیا۔ اسی اثناء میں میرے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ میری ماں نے اس پر بہت واویلا مچایا مگر کیا ہو سکتا تھا لڑکا میرے خاوند اسمٰعیل کے سپرد کر دیا گیا۔

عید کی ایک سہانی صبح تھی' اور میں ایک دھانی جوڑا پہنے ہوئے کھڑکی میں بیٹھی تھی' ہمارے دروازہ پر ایک ساندار فٹن آ کر رکی۔ اصیل گھوڑے باگوں کی ایک غیر معمولی سختی سے سر کو بلند کئے ہوئے نتھنے پھلائے زمین پر پاؤں مار رہے تھے گاڑی سے ایک پستہ قد دبلا پتلا آدمی اترا اور ہمارے کمرے میں چلا آیا۔ میری ماں کچھ عرصہ تک اس کے ساتھ سرگوشیوں میں مصروف رہی پھر میرے قریب آ کر پر تبسم نگاہوں سے بولی۔ "لیلئے تمہارے لئے ایک جگہ سے پیام آیا ہے تم ذرا دوسرے کمرے میں چلی جاؤ۔"

میں چپ چاپ دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ آنے کو تو میں آگئی۔ لیکن میرے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ میں نے دیوار سے کان لگا دیئے۔ لیکن وہ بہت آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے، کبھی کبھی کوئی لفظ سنائی دیتا تھا۔ کئی دفعہ مجھے یہ لفظ سنائی دیئے۔ "بیشمار دولت" "بہت دور" لیکن میں ان الفاظ میں کسی قسم کا تعلق پیدا کرنے سے قاصر رہی۔ شاید وہ کسی خزانے کا ذکر کر رہا تھا۔ جو بہت دور تھا یا کسی ناچ مجرے کا ذکر تھا' جس میں بے شمار دولت ہاتھ آنے والی تھی' اسی اوھیڑ بن میں کھڑے کھڑے میرے گھٹنے تھک گئے۔ پنڈلیوں میں درد ہونے لگا۔ میں واپس آنے کو تھی کہ یکایک میں نے اپنی ماں کو غصہ سے بھری ہوئی آواز میں کچھ کہتے ہوئے سنا۔ میں نے دیوار سے کان لگا دیئے۔ مجھے ایک آواز سنائی دی۔ جو بظاہر میری ماں کی معلوم ہوتی تھی۔

"مجھے منظور نہیں "

میں نے اتنے ہی لفظ سنے پھر یوں معلوم ہوا گویا کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کیونکہ وہ ایک بار چپ ہو گئی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا نووارد اسے سمجھا سمجھا کر دھیمی سنجیدہ آواز میں گفتگو کر رہا ہے۔

مجھے پھر اپنی والدہ کی آواز سنائی دی۔ "میں جو ایک دفعہ کہہ چکی ہوں کہ مجھے منظور نہیں۔"

اس کے بعد تھوڑی دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ پھر ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ "بہت اچھا۔"

میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا' نووارد آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے اترا اور گاڑی پر جا کر بیٹھ گیا۔ ایک لحہ میں کوچوان نے سڑاک سے ہنٹر مارا۔ اور اصیل گھوڑے دھاک دھاک کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ میں بہت عرصہ تک نظر سے غائب ہو جانے والی گاڑی کی طرف دیکھتی رہی۔ میرے دماغ میں بے شمار دولت 'بہت دور' کے فقرے نوک نشتر کی طرح چبھ رہے تھے' آخر کار میں نے منہ موڑا تو اپنی ماں کو پشت پر پایا۔

میں نے اشتیاق سے پوچھا۔ "اماں کیا بات تھی؟"

اس نے جواب دیا۔ "کچھ نہیں تمہارے لئے ایک رئیس زادے کا پیغام لے کر آیا تھا۔ مگر میں نے رخصت کر دیا۔"

زیادہ کرید کر پوچھنے کا کوئی فائدہ بھی نہ تھا۔ میں خاموش رہی۔ عید کی چہل پہل میں یہ بات میرے ذہن سے بالکل نکل گئی۔ اور گھنٹہ دو گھنٹہ کے بعد جب گرم گرم سوئیوں کی پلیٹ میرے سامنے آئی۔ میں نے فکر سے آزاد ہو کر خوب جی بھر کے کھائیں۔ لیکن سوئیاں کھاتے ہی میرا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا سا چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ مجھے فوراً دھوکے کا شبہ ہوا۔

میں نے اپنی ماں کی طرف خوفناک نگاہوں سے دیکھ کر پوچھا۔ "اماں تم نے مجھے کیا کھلایا۔"

اس نے جواب نہ دیا۔ خاموش بیٹھی رہی۔ میں اسے مارنے کے لئے اٹھی مگر مجھے ایک چکر آیا' اور میں بے ہوش ہو کر کمرے میں گر پڑی۔

جب مجھے ہوش آیا۔ میرے بند بند میں درد ہو رہا تھا۔ کمر شدت سے دکھ رہی تھی۔ آنکھوں کے پپوٹے بھاری معلوم ہوتے تھے۔ میرے چاروں طرف تاریکی مسلط تھی۔ میں نے چاروں طرف سہارے کے لئے ہاتھ مارے مگر مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں کسی گہرے کنوئیں میں گری جا رہی ہوں۔ رفتہ رفتہ میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئیں۔ میرے چاروں طرف سیاہ ریشمی پردے تھے۔ میں نے آہستہ سے ایک پردہ اٹھا کر دیکھا اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ میں ایک اونٹ پر کجاوے میں سوار ہوں اور اس

کے ہچکولوں سے میرا بدن چور چور ہو رہا ہے۔ میں پھر لیٹ گئی۔ میرے ارد گرد گھوڑوں کے سموں کی آواز آرہی تھی۔ میں نے تعجب سے پھر پردے اٹھا کر دیکھے۔ ایک طرف وہی دبلا پتلا شخص تھا۔ دوسری طرف ایک نہایت تنومند نوجوان آدمی تھا۔ جو ایک مشکی گھوڑے پر سوار تھا۔"

شیر علی نے جواب دیا۔ "ہاں جس تنومند نوجوان کا تم ذکر کر رہی ہو وہ میں تھا۔ اور ابھی وہ دبلا پتلا شخص بھی آجاتا ہے۔" یہ کہہ کر شیر علی نے آواز دی "سہیل خاں۔"

سہیل خاں کمرے میں داخل ہوا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

لیلیٰ نے اس کی طرف شعلہ بار نگاہوں سے دیکھ کر کہا۔ "ہاں یہی ہے" پھر اس نے اپنا بیان شروع کیا۔

"ایک نہایت لق ودق بیابان سے ہوتے ہوئے ہم آخر کار منزل مقصود تک پہنچ گئے۔ اور مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔"

لیلیٰ نے مرتضیٰ خاں اور حیات خاں کو جو اس تمام بیان سے متاثر ہو کر دل ہی دل میں لیلیٰ کے طرفدار ہو گئے تھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "اسی رات آپ کا سردار میرے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے منہ سے شراب کی بو آرہی تھی۔ اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوا اور میری مسہری پر بیٹھ گیا۔ میں نے نفرت اور حقارت سے منہ پھیر لیا۔ مگر اس نے میرے منہ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اپنی طرف پھیر لیا اور پر زور آواز میں کہا۔ "میری جان محبت انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔"

میں نے سہم کر گردن جھکالی۔

اس نے پھر کہا۔ "دیکھو میں تمہارے عشق میں دیوانہ ہو رہا ہوں۔ مر رہا ہوں۔ میں نے تمہیں تیس ہزار روپیہ دے کر خریدا ہے۔ سمجھیں میں نے تیس ہزار! مجھ پر رحم کرو۔ اُف اُف میری طرف ان آنکھوں سے نہ دیکھو۔ ان سے آگ برستی ہے۔"

وہ پھر میری طرف بڑھا۔ مگر میں نے اس کو روک کر کہا۔ "خاموش! تم نہیں جانتے کہ تم ایک بیاہی ہوئی عورت سے گفتگو کر رہے ہو۔"

اس کا رنگ فق ہو گیا اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "بیاہی ہوئی۔ بیاہی ہوئی یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"ہاں بیاہی ہوئی، تمہیں دھوکا دیا گیا۔ تم مسلمان ہو۔ اس پاک رشتہ کی عزت کرو۔"

تھوڑا عرصہ وہ خاموش بیٹھا میری طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر یکایک بڑھ کر میری طرف آیا اور میری گردن کو دبا کر بولا۔ "بتاؤ وہ کون شخص ہے میں اسے قتل کر کے تمہیں اس پاک رشتے سے آزاد کر دوں گا۔"

میرا گلا بند ہو گیا۔ میری آنکھیں باہر نکل آئیں میرے منہ سے ایک چیخ نکلی وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ اور نرم آواز میں بولا۔ "اُف پیاری میں نے تم پر بہت ظلم کیا۔ اچھا آئندہ سے میں تمہیں کبھی تنگ نہیں کروں گا۔ مگر تمہیں رہنا یہیں پڑے گا۔ جب تک تم یہ نہ بتاؤ گی کہ تمہارا خاوند کون ہے اور کہاں رہتا ہے۔ تمہیں چھٹکارا نصیب نہ ہو گا۔"

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے بعد وہ روز رات کو میرے پاس آتا رہا۔ وہ مجھے سمجھاتا۔ اس کی آواز جذبات کے وفور سے بھرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ وہ مجھے کہتا "لیلیٰ لیلیٰ تم کسی مجہول الاسم خاوند کے لئے موزوں نہیں آؤ تم ایک فوج کی تمام عظمت تمام شوکت تمام سرداری کو اپنے

قدموں میں دیکھنا چاہتی ہو لو دیکھو۔" یہ کہہ کر وہ میرے قدموں پر گر جاتا۔

لیکن میں اسے ٹھکرا دیتی۔ ہاں اس طرح ٹھکرا دیتی۔ جس طرح ایک شہزادی اپنے ذلیل سے ذلیل نوکر کو اپنے حنائی پاؤں کی ایک رنگین ٹھوکر سے ٹھکرا دیتی ہے۔ مگر اب اس کی سفاکی اور خونخواری جاتی رہی۔ وہ ایک وفادار کتے کی طرح میری ٹھوکریں کھا کر میرے پاؤں میں پڑا رہتا۔

لیکن رفتہ رفتہ اس کی سفاک۔ پاسبانہ اور گہری محبت مجھے متاثر کرنے لگی مگر میں نے اس گنہگار خیال کو کبھی اپنے دل میں جگہ نہ پکڑنے دی۔ میری دلی کوفت۔ ن بدن ترقی پر تھی۔ میں حیران تھی۔ کہ اسمٰعیل ابھی تک میرا پتہ کیوں نہیں لگا سکا۔ محبت میں تو وہ طاقت ہے کہ پہاڑوں کو پانی کی طرح بہادے کیا۔ سمٰعیل تھک کر بیٹھ رہا ہے۔ کیا اس کی محبت عارضی اور جھوٹی تھی۔ میں نے تو اس کے لئے بہت بڑی قربانی کی تھی۔ مگر آہ مرد عورتوں کی قربانیوں کو اپنی مردانگی کا خراج سمجھتے ہیں۔ ایسے ہی خیالات میں ایک رات میں اپنے وسیع اور شاندار کمرے میں بیٹھی تھی' ہاں اسی طرح بیٹھی تھی' جس طرح کوئی آزاد اور وحشی پرندہ سونے کے ایک خوشنما قفس میں بیٹھا ہو۔ کمرے کی کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ہوا کسی مجروح انسان کی طرح کراہتی ہوئی ریت کے ذروں کو اپنے دوش پر لئے ہوئے سائیں سائیں کرتی ہوئی گزر رہی تھی۔ ایک لمپ کی مدھم روشنی فضا کی تاریکی کو ڈراؤنا اور بھیانک بنا رہی تھی۔ میرے دل کا چراغ بھی بجھ چکا تھا۔ اسماعیل کے آنے سے مایوس ہو کر میں اضطراب کی گھڑیاں کاٹ رہی تھی۔

یکایک داہنی طرف سے مجھے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ گویا کوئی لوہے پر ریتی رگڑ رہا ہو۔ دھڑکتے ہوئے دل سے میں نے داہنی کھڑکی کی طرف دیکھا مجھے ایک مبہم سی سیاہ شکل دکھائی دی۔ جو کھڑکی کی سلاخ کو ایک ہاتھ سے مضبوط تھامے دوسرے ہاتھ سے سوہان کی مدد سے سلاخ کو کاٹ رہی تھی۔ میں ایک چیخ مار کر پیچھے ہٹ گئی۔

اس شخص نے لب پر انگلی رکھ کر کہا۔ "چپ چپ" آواز کچھ شناسا سی معلوم ہوئی۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لمپ اٹھا کر سامنے کیا۔ اور روشنی کی ایک چمکتی ہوئی شعاع اسمٰعیل کے مسخ شدہ اور مکروہ چہرے پر پڑی۔ انتہائی کرب سے بے قرار ہو کر میں نے دوسری چیخ ماری اور لمپ میرے ہاتھ سے گر کر چکنا چور ہو گیا۔ مگر مدھم سی روشنی میں میں نے اسمٰعیل کو کمرے میں کودتے ہوئے دیکھا اس کے ہاتھوں میں ایک چوروں کا لمپ تھا اس نے وہ لمپ میرے چہرے کی طرف پھرلیا اور دانت پیس کر کہا "مردار شور مچا کر آدمیوں کو اٹھا دینا چاہتی تھی۔"

یہ کہہ کر اس نے لمپ میز پر رکھ دیا۔ حیرت انگیز واقعات اس تیزی اور شدت سے عمل میں آرہے تھے کہ میری زبان بند ہو گئی تھی' رات کا خوفناک وقت اسماعیل کا چوروں کی طرح آنا پھر اس کی یہ حیرت انگیز گفتگو خواب کے سے واقعات معلوم ہوتے تھے۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر اب گہری جھریوں کے نشان تھے۔ کپڑے پھٹے ہوئے اور میلے کچیلے وہ ابھی تک میری طرف قہر کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن عورت کی محبت جلدی فنا نہیں ہوتی۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ "اسمٰعیل"

وہ دیوانوں کی طرح ہنسا۔ ہاہاہا.......... اسماعیل ہا اسمٰعیل تمہارا پہلا خاوند۔"

میں ڈر گئی۔ میں نے منت کہا۔ "اسمٰعیل تمہیں کیا ہو گیا۔ دیوانے تو نہیں ہو گئے؟"

اُس نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ "دیوانہ! ہاں تم سچ کہتی ہو۔ مجھے ایک عورت کی بیوفائی نے دیوانہ کر دیا۔"

میں نے چلا کر جواب دیا "بیوفائی! تم کسے بیوفائی کا الزام دیتے ہو۔"

اس نے میری طرف انگلی اٹھا کر کہا "تم کو۔"

میں نے گردن جھکالی۔ یہ تھا میری مصیبتوں کا انجام میری کلفتوں کا خاتمہ جس کے لئے میں نے سب کچھ گوارا کیا وہ یوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے بیوفائی کا الزام دے رہا تھا اس ناگن کی طرح جس کے بچوں کو کسی نے کچل دیا ہو۔ میں نے سر اٹھا کر اس سے کہا "پھر تم یہاں کیوں آئے ہو۔"

"مجھے عادت کبھی نصیب نہ تھی تم ہمیشہ سے امیر تھیں۔ اب بھی ہو۔ جس سے تم نے اب بیاہ کیا ہے۔ اس کے پاس دولت ہے شہرت ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم ہو۔"

اب اسے سمجھانا بیکار تھا۔ خدا جانے وہ کن صحبتوں میں پڑ کر اس حالت تک آ پہنچا تھا کہ اپنی تمام مردانہ غیرت کو چھوڑ کر مجھ سے روپیہ مانگنے آیا تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ میں کسی اور کی بیوی ہو چکی ہوں۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کے یقین کو نہ بدل سکتی تھی یہ سوچ کر میں خاموش ہو رہی

اس نے پھر کہا "میں جوا کھیل کر آ رہا ہوں ہار کر آ رہا ہوں۔ تمہیں پانچ ہزار روپیہ دینا ہوگا۔"

میں نے جل کر کہا "میرے پاس ایک پیسہ نہیں ہے۔"

اس نے میری طرف تیز نگاہوں سے دیکھا۔ "یعنی تم کچھ نہ دو گی۔"

"کچھ نہیں۔"

وہ خاموشی سے کھڑکی کی طرف بڑھا اور نیچے "گل محمد" کہہ کر آواز دی۔ میں نے تعجب سے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ جہاں اب ایک سیڑھی لگی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ ایک شخص اس سیڑھی سے کھڑکی تک آیا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک چھپنے ہوئے لبادے میں لپٹی ہوئی کوئی شے تھی۔ جو اس نے اسمٰعیل کے ہاتھ میں دے دی۔ وہ اسے اپنے ہاتھوں پر لئے ہوئے میری طرف آیا اور اس کا منہ کھول دیا۔

"پہچانتی ہو۔ یہ کون ہے؟ تمہارے چہروں کی شباہت بیوقوف سے بیوقوف آدمی کو بھی یقین دلا دے گی کہ یہ تمہارا ہی بچہ ہے' مگر تم اپنی ہٹ پر قائم رہیں تو میں اسے شیر علی کے پاس لے جاؤں گا۔ اور پھر اس کی اور تمہاری زندگی کا خدا حافظ۔"

میرے سینے میں دودھ بہنے لگا۔ "میرا بچہ" کہہ کر میں نے اس کے ہاتھوں سے اپنے دل کے ٹکڑے کو چھیننا چاہا۔ مگر اس نے مجھے روک دیا اور کہا۔ "بس اب یہ بچہ صرف میرے کام آئے گا۔ بولو کیا جواب دیتی ہو۔"

میرا غرور خاک میں مل گیا۔ میں اس کے سامنے دوزانو ہو کر زار زار رونے لگی۔ میں نے منت کہا۔ "اسمٰعیل! اسمٰعیل! رحم کرو۔ میں ابھی تک تمہاری بیوی ہوں۔"

وہ دروازے کی طرف مڑا اور کھڑکی کی راہ سے نیچے اتر گیا۔ میں نے اسے بہت روکنا چاہا۔ مگر وہ مجھے دھکیل کر نکل گیا۔ میں نے باہر کے دروازے سے کان لگا دیئے۔ دس پندرہ منٹ کے بعد مجھے شیر علی اور اسمٰعیل کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے دروازے کو کھولنا چاہا مگر وہ مقفل تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگرچہ شیر علی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ مگر اس کی محبت رقابت کے اس زندہ ثبوت کو کبھی

برداشت نہ کر سکے گی۔ وہ ضرور اسمٰعیل اور میرے معصوم بچے کو قتل کرڈالے گا۔ میں نے کمرے میں ایک مقید شیرنی کی طرح چکر لگانا شروع کر دیئے۔ اور یکایک میں نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ اسمٰعیل اور اس کا ساتھی مکان سے نکلے اور بھاگتے ہوئے صحرا کا رخ کیا۔ ان کے پیچھے سہیل خاں اور دو ایک نوکر مشعلیں لئے ہوئے نکلے۔ مگر یہ دیکھ کر کہ مفرورین بہت دور نکل گئے ہیں۔ واپس مکان میں داخل ہو گئے۔

تھوڑے عرصے بعد جب مکان میں خاموشی چھا گئی۔ میں خدا کا نام لیکر کھڑکی سے نیچے کود پڑی اور اُٹھ کر اس طرح بھاگی جس طرح کوئی ہرن شکاری کی بندوق کی آواز سن کر بھاگتا ہے۔

(۴)

یہ کہہ کر لیلےٰ نے شیر علی کی طرف دیکھا۔ اور بولی "میں اسی امید پر زندہ تھی کہ ایک دن تم سے اپنے معصوم بچے کا انتقام لوں' میں ناکام رہی مگر میری روح کو یہ تسلی ہے کہ میں نے اپنی طرف سے کوئی بات اٹھا نہیں رکھی۔"

شیر علی نے اُٹھ کر کہا۔ "صاحبان مجھے اس قصے کو اختتام تک پہنچانا ہے.......... سہیل خاں۔"

سہیل خاں آگے بڑھا۔

"جمیل کو لاؤ۔"

سہیل خاں گیا اور چند لمحوں میں ایک معصوم بچے کو لے کر آیا۔ شیر علی نے بچے کو جو اس مجمع سے خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اپنے ہاتھوں پر لیکر کہا۔ "لیلےٰ یہ ہے تمہارا بچہ۔ اس رات جس کا تم ذکر کرتی ہو۔ میں نے تمہاری تمام گفتگو سن لی تھی۔ اور میں نے اسمٰعیل کو مار کر باہر نکال دیا تھا۔ کیونکہ وہ کسی صورت سے تمہارے لائق نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ دوسری صبح تمہیں تمام واقعے کی خبر دوں۔ مگر تم غائب ہو چکی تھیں۔ اب تک میں نے اسے اپنا بچہ سمجھ کر پالا ہے۔ لو آج تمہاری امانت تمہاری نذر ہے۔"

یہ کہہ کر اُس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ لیلےٰ کے بازو کھولدیئے گئے۔ وہ بیتاب ہو کر اپنے بچے کی طرف بڑھی جو مہر مادری کی کشش سے خود بھی اس طرف کھنچا جاتا تھا' لیلےٰ نے اسے گود میں اُٹھا کر اس کی پیشانی چوم لی۔ جمیل بے اختیار لیلےٰ کے سینے سے لپٹ گیا اور کہا۔ "اماں۔"

خیمے سے تمام لوگ دبے پاؤں رخصت ہونے لگے وہ محسوس کرتے رہے کہ انہیں اس مقدس اور آسمانی خوشی میں حارج ہونے کا کوئی حق نہیں۔

کیمیاگر

محمد مجیب

یہ قصہ اس زمانہ کا ہے جب مسلمان ہندوستان میں نئے نئے آئے تھے۔ دہلی اور دہلی سے افغانستان کی سرحد تک ان کی حکومت کسی قدر مستحکم ہو گئی تھی۔ مگر دہلی سے مشرق کی طرف انہوں نے چند حملے کئے تھے۔ ہندو تصور نے عام طور پر مسلمانوں کی فتح تسلیم نہیں کی تھی اور نہ ہندوؤں کو یقین تھا کہ مسلمان ہمیشہ کے لئے ہندوستان میں بسنے والے ہیں۔ ابھی تک شیخ اور برہمن نے ایک دوسرے پر لعنت نہیں بھیجی تھی اور اس بے چینی کو دور کرنے کے واسطے جو ایک بدیسی قوم کے ملک پر حاوی ہو جانے سے پھیل گئی تھی اسلام کا یہ مژدہ کافی تھا کہ خدا کے تمام بندے برابر ہیں۔ اس کا گھر سب کا گھر ہے۔ اس کا نیا دین دنیا میں نئی جان پیدا کرنے آیا ہے۔

حکیم مسیح ترکستان سے اپنی بوڑھی ماں کو ساتھ لے کر ہندوستان آئے تھے۔ دہلی پہنچتے ہی انہیں حکم ملا کہ جونپور کی طرف کچھ اور نووارد ترکی خاندانوں کے ساتھ ایک بڑے گاؤں میں جس کا نام خالد پور رکھا گیا تھا مسلمان آبادی کی بنیادیں ڈالیں۔ حکیم مسیح نے حکم کی تعمیل کی اور خالد پور میں جا بسے۔ رفتہ رفتہ دوسرے خاندان بھی آ گئے اور مسلمانوں کی ایک مستقل آبادی ہو گئی۔ حکیم مسیح نے اسلامی دنیا کے تقریباً تمام مشہور طبیبوں کی شاگردی کی تھی اور اپنے فن میں ماہر تھے اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ وہ تھوڑے دنوں میں آس پاس مشہور ہو گئے اور ترکستان میں ان کے خاندان نے جو کچھ کھویا تھا وہ ہندوستان میں انہیں واپس ملنے لگا۔ ان کی ماں نے ایک ترکی رئیس کی بیٹی سے ان کی شادی بھی کرا دی جس سے انہیں شرافت اور سرمایہ داری کا تمغہ مل گیا۔

حکیم مسیح نہایت حسین، خوش مزاج اور شائستہ آدمی تھے۔ دنیا کی مصیبتیں ان کی طبیعت میں ذرا بھی ترشی یا تلخی نہیں پیدا کر سکی تھیں۔ وہ دنیا کو دیکھ چکے تھے، خود ہمدردی کی تلاش میں رہ چکے تھے اور اب ہر ایک سے اچھا سلوک کرنے پر تیار تھے۔ تجربہ نے انہیں انسان کی فطرت کے بھید بتا دیے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ محبت سے بات کرنے کا کیا اثر ہو سکتا ہے۔ مریض کو دوا سے کتنا فائدہ پہنچتا ہے اور طبیب کے اخلاق سے کتنا۔ ان کا برتاؤ بیماروں اور تیمارداروں کے ساتھ ایسا تھا کہ لوگ محض ان کی توجہ کو کافی سمجھتے تھے لیکن وہ مرض کی تشخیص بھی بہت سمجھ کر کرتے تھے اور دوائیں نہایت احتیاط سے اکثر اپنے سامنے تیار کراتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کی ناموری کی وجہ [illegible] کے اور کوئی نہیں سمجھی جاتی تھی۔

لیکن حکیم [illegible] اور ہر دلعزیزی اور شہرت کے اپنی زندگی سے مطمئن نہ تھے۔ کچھ اپنے وطن کی یاد بے چین کرتی

تھی کچھ ہندوستان کی فضا۔ مگر سب سے زیادہ انہیں یہ خیال ستاتا تھا کہ اب وہ یہیں دفن ہوں گے۔ ان کا دل ہر قسم کے تعصب سے پاک تھا لیکن پھر بھی وہ ہندوؤں کو اپنے جیسا آدمی سمجھتے تھے نہ ہندوستان کو اپنے جیسا ملک۔ ان پر کچھ اثر ان کی بیوی اور ان کی سسرال کا تھا۔ یہ لوگ کسی مجلس کو بغیر اپنے ملک کی یاد میں نوحہ خوانی کئے نہیں برخاست کرتے تھے اور بغیر ہندو قوم اور ہندو مذہب پر لعنت بھیجے کسی مسئلہ پر گفتگو نہیں کر سکتے تھے۔ حکیم مسیح کو ہندوؤں سے اس قدر سابقہ پڑتا تھا اور ہندو ان کی اس قدر عزت اُن سے اتنی محبت کرتے تھے کہ ان کا اپنی سسرال والوں کا ہم خیال ہونا ناممکن تھا۔ لیکن ان لوگوں کے تعصب کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ حکیم مسیح نہ ہندوؤں میں اس طرح گھل مل سکے جیسے کہ ان کی فطرت کا تقاضا تھا اور نہ ہندوستان کے زمین آسمان کو اپنا وطن بنا سکے۔ عزت اور شہرت حاصل کرنے پر بھی ان کو اس کا ارمان رہ گیا کہ ایک دم بھر کے لئے طبیعت میں وہ سکون پیدا کر سکیں، اپنی زندگی کو مستقل یا اپنے گھر کو گھر سمجھ سکیں۔

یوں ہی دن گذرتے گئے حکیم مسیح کی ماں کا انتقال ہو گیا اور وہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوئیں جو آبادی کے ساتھ رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا۔ لیکن حکیم مسیح کو کسی طرح سے یقین نہ آسکا کہ ہندوستان میں ان کی نسل نے جڑ پکڑ لی ہے اور ان کی روحانی بے چینی انہیں پریشان کرتی رہی۔

"کاش! مجھے ایک ایسا کیمیا گر ملتا" انہوں نے اپنی بیوی سے ایک دن کہا "جو میری فطرت میں اس سرزمین سے مناسبت پیدا کر دیتا۔ آخر میں کب تک اپنے آپ کو مسافر یا مہمان سمجھتا رہوں گا۔"

اس کے جواب میں ان کی بیوی نے آنکھیں نکالیں اور طنز سے کہا:

"جب جوانی تھی تو ہمت ہارے بیٹھے رہے۔ اب بڑھاپے میں کیمیا گر کی تلاش ہے۔ جو ارادہ کا کمزور ہو اس کی مدد کرنا قادر مطلق کے امکان سے بھی باہر ہے۔"

حکیم مسیح مسکرائے، ایک ٹھنڈی سانس بھری اور خاموش ہو گئے۔

اس گفتگو کے کچھ دن ہی بعد ان کے مطب میں ایک طاعون کا مریض لایا گیا۔ حکیم صاحب نے اس کے لئے تو نسخہ لکھ دیا لیکن اپنے گھر کہلا بھیجا کہ خالد پور میں طاعون کا اندیشہ ہے اور سب کو فوراً سفر کی تیاری کرنا چاہیے۔ ان کے گھر سے دوسرے مسلمان گھرانوں میں خبر پہنچائی گئی اور ساری بستی میں کھلبلی مچ گئی۔ جب حکیم مسیح کے پاس شام تک اور مریض بھی پہنچے تو انہوں نے یہ اطلاع دی کہ طاعون کا حملہ غالباً شدید ہونے والا ہے۔ تو سب نے اسی رات بستی چھوڑ دینے کا تہیہ کر لیا۔ حکیم مسیح خود خالد پور میں ٹھہرنے کا ارادہ کر چکے تھے اور انہوں نے اپنی بیوی کو اس کی مصلحت سمجھانے کی بہت سی دلیلیں بھی سوچ لی تھیں۔ مگر ان کی بیوی ان سے زیادہ دور اندیش ثابت ہوئیں اور جب وہ مغرب کے قریب گھر کے اندر گئے تو انہوں نے دیکھا تمام نوکر بوکھلائے ہوئے ادھر اُدھر پھر رہے ہیں اور ان کی بیوی رو پیٹ رہی ہے۔ پہلے تو ان کو یہ شبہ ہوا کہ شاید گھر میں کوئی طاعون کا شکار بنا ہے مگر جب بڑی دقت سے انہوں نے واقعہ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ انہی کا ماتم ہو رہا ہے۔ ان کی بیوی نے محض اس اندیشہ میں کہ وہ خالد پور چھوڑنے سے انکار کریں گے صرف خود ہی رونا دھونا شروع نہیں کر دیا تھا بلکہ تمام محلہ والوں اور عزیزوں سے ان کی اس حماقت کی شکایت بھی کی تھی اور ہر ایک کو رو رو کر ان کے ارادہ کی مخالفت پر آمادہ کر لیا تھا۔ حکیم مسیح کھڑے تدبیریں سوچ رہے تھے کہ ان کے خسر اور سالے آ گئے اور انہیں گھیر کے کھڑے ہو گئے۔ باری باری سے ایک سمجھاتا دوسرا ڈانٹتا تھا اور دونوں اس قدر گھبرائے تھے کہ بہت دیر تک حکیم مسیح کو پتہ ہی

نہ چاہا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ لیکن وہ تو حکیم مسیح کو بات کہنے اور جواب سوچنے کا موقع ہی نہ دینا چاہتے تھے۔ اور قبل اس کے کہ حکیم مسیح زبان ہلا سکیں انہوں نے ان کے ہاتھ پکڑ لئے اور خدا اور رسولؐ اور مسلمانوں کی جانوں کی قسمیں دلائیں۔ ان کی جوان بیوی اور ننھے بچوں کی حفاظت کا فرض یاد دلایا اور آخر میں ہندو قوم پر لعنت بھیجی اور کہا کہ یہ اسی قابل ہے کہ طاعون اور ہیضہ میں ہلاک ہو اور کسی مسلمان کو اس کو بچانے کے لئے اپنی جان خطرہ میں نہ ڈالنی چاہئے۔

اب حکیم مسیح سمجھے کہ اس عجیب و غریب تقریر کا مقصد کیا ہے اور انہوں نے جو دلیلیں اپنی بیوی کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے سوچ رکھی تھیں ان سے کام لینا چاہا مگر ان کے خسر اور سالے نے ان کی ذرا سی خاموشی کو رضامندی قرار دیا اور چلا اٹھے:

"مسیح صاحب چارہ تو کچھ کہتا ہی نہیں۔ وہ خود جانے پر تیار ہے۔"

حکیم مسیح پھر کچھ عذر کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی بیوی جو اپنے فریق کو مضبوط پا کر ان کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھیں کہنے لگیں:

"آپ لوگوں کے کہہ دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ مجھے اطمینان اسی وقت ہو گا جب یہ خود اپنی زبان سے کہہ دیں کہ ہمارے ساتھ چلیں گے۔"

"چلیں گے کیوں نہیں۔" حکیم مسیح کے سالے نے کہا "تم سامان تیار کراؤ۔ وہ اپنی مرضی سے نہ گئے تو ہم زبردستی لے جائیں گے۔"

یہ کہہ کر حکیم مسیح کے سالے نے اندر سفر کی تیاری کا دوبارہ حکم دیا اور حکیم مسیح کا ہاتھ پکڑ کر انہیں باہر لے گئے۔ یہاں انہیں قائل کرنے کے لئے بہت سے مسلمان ہمسایہ موجود تھے، بزرگ جن کی حکیم مسیح بہت عزت کرتے تھے، ہم عمر دوست جن کی صحبت کے بغیر ان کا زندہ رہنا دشوار ہوتا۔ یہ لوگ بھی کبھی باری باری سے، کبھی ایک ساتھ تقریریں کرتے رہے مگر حکیم مسیح نے ان کی طرف توجہ نہ کی۔ انہوں نے اپنے دل میں یہ طے کر لیا تھا کہ ان کا خالد پور کے ہندو باشندوں کو اس طرح سے چھوڑ کر چلے جانا ایک شدید اخلاقی جرم ہے جس کا الزام نہ وہ اپنی بیوی پر لگا سکتے ہیں نہ رشتہ داروں پر لیکن انہوں نے اس وقت کی بھی تصویر کھینچی جب خالد پور میں ایک مسلمان باقی نہ رہا ہو گا، ان کے سارے دوست اور عزیز ہندوستان کی وسعت میں غائب ہو گئے ہوں گے۔ وہ طرز زندگی جس سے وہ مانوس تھے ناممکن ہو جائے گا۔ وہ خود اگر زندہ رہے تو گھر میں اکیلے بیٹھے دوائیں بناتے رہیں گے اور اگر مر گئے تو اکیلے دفن ہوں گے اور ان کے جنازہ کی نماز تک پڑھنے کے لئے کوئی مسلمان نہ ہو گا۔ خالد پور چھوڑنا ان کے لئے ایک اخلاقی جرم ضرور تھا مگر ایسی زندگی برداشت کرنا کسی جرم کی سزا بھگتنے سے بھی انہیں مشکل معلوم ہوا۔ انہوں نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ انہیں زندگی کے فرائض سے جلد سبکدوش کیا جائے اور سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

جب رات کو مسلمان قافلہ بستی سے نکلا تو حکیم مسیح اس کے ساتھ تھے۔

ان کو امید تھی کہ اپنے ضمیر کو وہ کسی طرح سمجھا بجھا کر منا لیں گے۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی ساری تدبیریں پلٹ گئیں۔ انہوں نے ہزار کوشش کی کہ گذشتہ زندگی کو بالکل بھول جائیں۔ مگر ان کا تصور قابو سے نکل گیا اور ہر لحہ ایک نیا صدمہ پہنچانے لگا۔ ذرا کہیں کھٹ کھٹ کی آواز آئی اور انہیں خیال آیا کہ اس وقت معلوم نہیں کتنے لوگ جن کو ابھی اس کی خبر نہیں ملی ہے کہ حکیم مسیح انہیں مصیبت میں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں ان کے دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹا رہے ہوں گے۔ کہیں کوئی بچہ رویا اور انہیں یاد آیا کہ ناگہانی موت

کیسی بلا ہوتی ہے۔ خالد پور میں کتنے بچے اس وقت اپنی مردہ ماؤں کے پیار کے لئے تڑپ رہے ہوں گے۔ کتنی مائیں اس وقت ہاتھ مل مل کر کہہ رہی ہوں گی کہ اگر حکیم مسیح چلے نہ گئے ہوتے تو ان کے بچوں کی جان بچا لیتے۔ حکیم مسیح کی آنکھوں میں بارہا آنسو بھر آئے' سر چکر کھانے لگا لیکن واپس جانے کی ہمت، انہیں پھر بھی نہ ہوئی۔

قافلہ نے خالد پور سے کوئی دس میل پر جا کر منزل کی۔ حکیم مسیح تھک کر چور ہو گئے تھے لیکن انہیں یقین تھا کہ نیند کسی طرح سے نصیب نہ ہو گی اور ہوا بھی یہی کچھ۔ کچھ دیر تک تو ان پر ایک غفلت سی طاری رہی جس سے ان کی تکان جاتی رہی لیکن پھر وہ پریشان خواب دیکھنے لگے۔ کبھی وہ پہاڑ کی چوٹی پر سے پھسل کر نیچے گرتے تھے' کبھی گھوڑے پر سوار ایک غار میں پھاند پڑتے تھے جس کی تہ میں خوفناک تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ خواب ہی میں ان کو خیال آیا کہ وہ دہلی جا رہے ہیں۔ ایک تیز آندھی آئی جس میں ان کا گھوڑا کئی مرتبہ زمین پر سے اڑا۔ اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ وہ ایک وسیع میدان میں کھڑے ہیں۔ ان کے سامنے ایک لمبی پتلی سی سڑک ہے جو دور جا کر کالے بادلوں میں گم ہو جاتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف ایک اونچی منڈیر ہے اور منڈیر کے بعد کھیتوں کا سلسلہ ہے جو کہیں ختم ہی نہیں ہوتا۔ انہوں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور کالی گھٹا کی طرف روانہ ہوئے۔ دہلی کا رخ وہی تھا۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد انہیں سامنے سڑک کے کنارے ایک سیاہ نقطہ سا نظر آیا۔ پاس پہنچے تو دیکھا کہ ایک آدمی غالباً ستانے کے لئے منڈیر پر بیٹھا ہے۔ انہوں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی اور آگے بڑھ گئے مگر کوئی دس قدم چلنے کے بعد ان کا گھوڑا رک گیا اور ایڑ اور چابک بھی اسے اس جگہ سے نہ ہلا سکے۔ واپس جانے پر وہ تیار تھا۔ آگے معلوم ہوتا تھا کہ اسے مردہ لیجانا بھی مشکل ہو گا۔ حکیم مسیح سمجھے کہ وہ کسی چیز کو دیکھ کر بھڑک گیا ہے اور اس کا مزاج درست کرنے کے لئے وہ تھوڑی دور واپس جانے پر راضی ہو گئے۔ مڑتے وقت ان کی نظریں پھر اس مسافر پر پڑی۔ وہ منڈیر پر بیٹھا انہیں تک رہا تھا۔ گھوڑا کسی وجہ سے خود بخود اس کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا اور حکیم مسیح نے سوچا کہ کچھ دیر اسی سے باتیں کر لیں۔

گفتگو شروع کرنے سے پہلے حکیم مسیح نے اسے غور سے دیکھا۔ مسافر کا لباس ایک خوشحال ہندو کاریگر کا تھا۔ یعنی نیچے ایک موٹے سوت کی دھوتی' اتنے ہی موٹے کپڑے کی بنڈی اور اور سر پر ایک پگڑی جو اس نے اس وقت اتار کر اپنے پاس زمین پر رکھ دی تھی۔ اس کے کندھوں اور پیٹھ پر ایک موٹی سخت اون کی کملی پڑی ہوئی تھی۔ مسافر کا قد بہت لمبا تھا' سینہ چوڑا' پٹھے تنے اور ابھرے ہوئے جس کی وجہ سے پہلی نظر میں وہ ایک معمولی انسان نہیں بلکہ ایک زندہ فولاد کی ڈھلی ہوئی مورت معلوم ہوتا تھا۔ اس کی داڑھی کے لمبے سیدھے بال' اونچی پتلی ناک' چوڑی پیشانی' چہرہ کا نمایاں سکون' سب اسی وہم میں ڈالتے تھے کہ اس کا جسم آہنی ہے مگر آنکھوں کو دیکھتے ہی یہ سارا طلسم ٹوٹ جاتا۔ اس کی بڑی بڑی نرگسی آنکھوں میں ایک نرمی' محبت اور ایثار تھا۔ حکیم مسیح پر بھی ان آنکھوں کا اثر ہوا۔ وہ جواب میں مسکرا دئے اور دیر تک مسافر کے مردانہ حسن کا لطف اٹھاتے رہے۔ آخر کار انہوں نے پوچھا:

"اے آہنی جسم کے مسافر! تو کہاں جا رہا ہے؟"

مسافر نے پہلے سر جھکا لیا' پھر ان سے آنکھ لڑا کر کچھ مایوسی کے لہجہ میں کہا۔ "خالد پور!"

"مگر وہاں تو طاعون ہے۔"

"ہاں میں اسی لئے جا رہا ہوں۔"

حکیم مسیح کو اس قدر حیرت ہوئی کہ وہ تھوڑی دیر تک کچھ نہ کہہ سکے لیکن مسافر نے انگڑائی سی لی اور انہیں اس خوبصورت

مریض کے جسم پر رحم آیا جو جان بوجھ کر موت کو دعوت دے رہا تھا۔ انہوں نے بڑی حسرت سے مسافر کی طرف دیکھا اور پوچھا:

"اے مسافر! کیا تجھے اپنی جان عزیز نہیں؟"

"مجھے اپنی جان بہت عزیز ہے اور ہمیشہ عزیز رہے گی۔" مسافر نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔ "جتنی وہ مجھے عزیز ہے اتنی ہی خدا کو عزیز ہو گی اگر میں نے اس کی راہ میں قربان کر دی۔"

حکیم مسیح الملک چپ ہو گئے۔ مسافر کی صورت سے ظاہر تھا کہ اس کا قول پکا ہے۔ انہیں اپنی کمزوری یاد آئی اور اس بلند ہمت اور بلند ارادہ پر رشک آیا۔ لیکن انہوں نے سوچا کہ شاید یہ دنیا میں اکیلا ہو اور انتہائی ایثار سے روکنے کے لئے کوئی دنیاوی تعلقات نہ ہوں۔ وہ دوسرا پہلو بھی کرنا چاہتے تھے۔

"اے مسافر! کیا دنیا میں تیرے ساتھ محبت کرنے والا کوئی نہیں؟"

"محبت کا جواب محبت ہے۔ میں جہاں جاتا ہوں مجھ سے محبت کرنے والے پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر محبت مجھے کسی بھلائی سے نہیں روکتی۔"

"اے مسافر! تو آخر کہاں سے آیا ہے؟" انہوں نے گھبرا کر پوچھا۔

"میں خدا کا بندہ ہوں، کسی ملک کا باشندہ نہیں۔" مسافر نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔ "جس ملک میں میرا خدا مجھے پہنچا دے وہی میرا وطن ہے۔ اسی کی خدمت میرا فرض ہے۔"

"لیکن تیرا مکان تو ضرور کہیں ہو گا؟"

"دنیا میں ہزاروں خدا کے بندے ہیں جن کے پاس مکان، بیوی بچے کچھ نہیں...... میں جہاں تھکا وہیں بیٹھ جاتا ہوں۔ جہاں نیند آئی وہیں سو جاتا ہوں۔"

"مگر مسافر! تیرے بیوی بچے ہوتے تو تو کیا کرتا؟"

"عورت کی محبت سے بہتر اور کوئی نعمت خدا نے انسان کو نہیں بخشی ہے۔ میری اگر بیوی ہوتی تو میں سب سے پہلے اس کے قدموں پر گرتا اور اس سے کہتا کہ مجھ میں طاقت نہیں، ہمت نہیں، صرف تیری محبت سیدھے راستے پر چلا سکتی ہے۔ چل میری رہبری کر میں تیرے بغیر بالکل مجبور ہوں........"

"مگر مسافر! طاعون کا علاج محبت سے کیسے ہو سکتا ہے؟" حکیم مسیح نے مسافر کو ٹوک کر کہا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے کو تیار تھے اور بدن پسینہ سے شرابور ہو گیا۔

"محبت ہر بیماری کا علاج ہے، ہر زخم کا مرہم ہے، محبت زندگی اور موت کا فرق مٹا دیتی ہے، ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔ انسان کی محبت میں خدا کی رحمت کی تاثیر ہے۔ تجھے یقین نہ آئے تو تجربہ کر کے دیکھ لے۔"

حکیم مسیح نے سر جھکا لیا اور زار و قطار رونے لگا۔

"حکیم مسیح!" مسافر اچانک بول اٹھا۔ "مسلمان کسی خاص ملک میں پیدا ہونے سے نہیں بنتا۔ اسلام کسی خاص طرز معاشرت کا نام نہیں۔ مسلمان بننا چاہتے ہو تو جاؤ، خدا کو سجدہ کرو، دنیا کی مصیبتیں جھیلو، دوسروں کی خدمت کرو، ان پر سے زندگی کا بوجھ ہلکا کرو، تمہارے

دل میں ایمان کا خزانہ ہے۔"

حکیم مسیح کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اس قدر روئے تھے کہ تکیہ بھیگ گیا تھا لیکن ان کو اب نہ اپنی سرخ آنکھوں کی پروا تھی نہ تھکے ماندے جسم کی۔ انہوں نے "یار سول" کا نعرہ مارا۔ پلنگ پر سے اچک کر دوڑتے ہوئے اصطبل گئے اور ایک گھوڑے پر بغیر زین کے سوار ہو کر خالد پور کی طرف چل دیئے۔

رات کو حکیم مسیح کے جانے کی خبر سن کر خالد پور کی آبادی میں اودھم مچ گیا۔ کسی میں اتنی ہمت باقی نہ رہ گئی تھی کہ طاعون سے بچنے کی امید کرے اور ہر شخص اپنا ماتم کرنے لگا۔ لیکن سویرے جب حکیم مسیح کی واپسی کی خبر مشہور ہوئی تو ہر ایک کی جان میں جان آگئی۔ جس نے بھی یہ خبر سنی وہ اپنا دل مضبوط کر کے ان کے مطب میں بھاگا ہوا آیا اور اس نے حکیم مسیح کو دواخانہ کے دروازہ پر بیٹھا پایا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ شرمندگی سے ان کی نظریں نیچی تھیں۔ مگر جس کسی نے چاہا نبض دکھائی اور دوالی۔

اُدھر صبح سویرے جب مسلمان قافلے نے کوچ کی تیاری کی تو معلوم ہوا کہ حکیم مسیح غائب ہیں۔ نوکروں میں سے ایک نے کہا کہ اس نے رات کے تیسرے پہر 'یار سول' کا ایک نعرہ سنا تھا۔ لیکن اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہ بتا سکا۔ حکیم مسیح کی بیوی کو جب یہ معلوم ہوا تو فوراً سمجھ گئیں کہ وہ خالد پور واپس بھاگ گئے ہیں۔ وہ بہت روئیں' اپنے دونوں بچوں کو بھائی کے سپرد کیا اور بیوہ کی زندگی سے بچنے کے لئے بیوی کی موت مرنے خالد پور چلیں۔ جب وہ اپنے گھر پہنچیں تو شام ہو چکی تھی۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ حکیم صاحب سویرے سے دواخانہ کے سامنے بیٹھے ہیں نہ پانی پیا ہے' نہ کھانا کھایا ہے' بال پریشان ہیں' آنکھیں سرخ' لیکن مریضوں کا تانتا بندھا ہے اور وہ برابر نبض دیکھ رہے ہیں اور دوائیں دے رہے ہیں۔ انہوں نے نوکر کے ذریعہ سے کچھ کہلا بھیجا۔ مگر نوکر کو حکیم صاحب کے پاس پہنچنے میں زیادہ دیر لگی اور جب وہ پہنچ گیا تو حکیم صاحب نے نہ اسے پہچانا نہ اس کی بات سمجھے۔ رات بھر انہوں نے حکیم صاحب کی آمد کا نہایت بے تابی سے انتظار کیا۔ لیکن جب وہ سویرے تک نہیں آئے تو خود باہر پہنچیں۔ وہاں ابھی سے لوگ موجود تھے لیکن انہیں دیکھ کر راستہ چھوڑ دیا اور وہ حکیم صاحب کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئیں۔ حکیم مسیح انہیں آسانی سے پہچان نہ سکے۔ لیکن جب پہچان لیا تو مسکرائے' کچھ سوچا اور کہا:

"لالہ سیتارام کی بیوی بیمار ہیں۔ میں نے دوا بھیج دی ہے لیکن ان کی تیمار داری کے لئے کوئی نہیں۔ اگر آپ وہاں چلی جائیں ...."

حکیم مسیح کی بیوی نے ان پر ایک سرسری نظر ڈالی۔ پچھلے دنوں کی تکان کا نام و نشان نہ تھا' آنکھیں اب بھی سرخ تھیں مگر چہرہ سے نور برس رہا تھا۔ کپڑوں پر کچھ مٹی سی لگی رہ گئی تھی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات کو زمین پر سوئے ہیں۔ یہ ایک نظر کافی تھی' وہ باہر نکلیں اور راستہ پوچھتے پوچھتے لالہ سیتارام کے گھر پہنچ گئیں........

خالد پور میں دو ماہ تک طاعون کا دورہ رہا' اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بیماروں کا علاج کیا جاتا تھا لیکن بیماری کو روکنے کی تدبیر کوئی نہ تھی۔ لیکن اگر حکیم مسیح نہ ہوتے تو غالباً ساری بستی تباہ ہو جاتی۔ ان کی موجودگی سے وہم اور خوف جو اکثر بیماری سے زیادہ مہلک ثابت ہوتے ہیں لوگوں کے دلوں میں جڑ نہ پکڑ سکے۔ کوئی مریض ایسا نہیں تھا جسے وہ دیکھ نہ سکے ہوں یا جس کی ہمت ان کے اخلاق اور ہمدردی نے دوگونہ نہ کی ہو۔ وہ دن رات مریضوں کو دیکھنے میں اور ان کے لئے دوائیں تیار کرنے میں مشغول رہتے تھے۔ لیکن یہ بھی ان کو تسکین دلانے کے لئے کافی نہ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ مردوں کو نہلانے دھلانے اور جنازے کو شہر سے باہر پہنچانے میں مدد دیں

لیکن اس کام کے لئے ان کی کبھی ضرورت نہیں ہوئی۔ یہ ان کی بیوی نے اپنے ذمہ لے لیا تھا جس کو وہ عورتوں کی تیمارداری اور یتیم بچوں کی دیکھ بھال کے ذریعے کرتی تھیں۔ اپنی اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے انہیں دن میں اکثر ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہ سکتے۔ مگر دونوں کو ایک دوسرے سے اس قدر محبت ہو گئی تھی کہ حکیم صاحب کو اپنی بیوی کی اور ان کی بیوی کو حکیم صاحب کی خبر ہر وقت پہنچتی رہتی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ بیماری اور موت کی پریشانیوں میں وہ دوسرے سے انہیں بھول گئے اور ان کے ضمیر نے ملاقات کے لئے فرائض ترک کرنے کی اجازت نہ دی مگر ان کے دلوں میں خدا پر اس قدر قوی اور زندہ ایمان تھا کہ کوئی سی خود غرضی یا خوف ان کے پاس نہ پھٹکنے پاتا۔ وقت اور فاصلہ ان کی روحوں کو جدا نہ کر سکا۔

آخر کار طاعون کا زور کم ہوا اور اب وہ حالت ممکن ہونے لگی جسے حکیم مسیح موت کی سزا سے زیادہ تکلیف دہ سمجھتے تھے۔ مریض کم ہوئے کام کم ہوا فرصت کا وقت بڑھا مگر اب حکیم مسیح ہندو آبادی میں گھل مل گئے تھے۔ جو دیوار وہم نے ان کے اور ہندوؤں کے درمیاں میں کھڑی کر دی تھی نیست و نابود ہو چکی تھی۔ بغیر کسی کوشش کے حکیم مسیح کا مکان بستی کی زندگی کا مرکز بن گیا تھا۔ ایک درگاہ جہاں حاجت مند مدد کے لئے آتے تھے، ماہران فن قدردانی اور ہمت افزائی کے لئے، مظلوم شکایات کے لئے اور جھگڑالو انصاف کے لئے۔ ان کی شہرت کا حلقہ ذرا دور دور تک پٹ چکا تھا لوگ دور دور سے ان کے پاس آتے تھے اور دل میں اس کا افسوس واپس لے جاتے تھے کہ حکیم صاحب کافی مشہور نہیں۔ جس نے حکیم مسیح کا نام سنا وہ ان کی بیوی کی شخصیت سے بھی ضرور واقف ہو جاتا تھا۔ ان کے لئے ہر جگہ سے قیمتی تحفے آتے تھے، گھر کا سامان، کپڑے، جواہرات ایسے جو بادشاہوں اور لٹیروں کو بھی نصیب نہیں ہوتے مگر حکیم صاحب اور ان کی بیوی اپنے مکان میں غریبوں کی طرح سے رہتے تھے۔ تجربہ انہیں سکھا چکا تھا کہ دنیا کی اصل نعمت کیا ہے اور تحفوں کو ہمیشہ اسی محبت سے دوسروں کو دے دیتے تھے جس سے وہ ان کی خدمت میں پیش کئے جاتے تھے۔

خالد پور میں کوئی ایسا ذاتی یا عام معاملہ نہ تھا جس کا حکیم مسیح اور ان کی بیوی کو علم نہ ہو، اور نہ کوئی ایسی تقریب تھی جس میں ان کی شرکت لازمی نہ سمجھی جاتی ہو لیکن باوجود اس کے ان کی زندگی کا ایک پہلو تھا جس کا راز سوائے ان کے اور ان کے خدا کے کسی پر ظاہر نہ تھا۔ لوگ انہیں مصروف دیکھتے تھے انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان دونوں کے دل کہیں اور ہیں اور وہ محبت اور پیار کی نظریں جو وہ اوروں پر برساتے ہیں اسی محبت کا دھندلا عکس ہے جس میں ان کی ہستیاں فنا ہو گئی ہیں۔ وہ دونوں بھی جانتے تھے کہ یہ محبت کوئی پرانی چیز نہیں ہے خود بخود پیدا نہیں ہوئی اور ہر حالت میں قائم نہیں رہ سکتی۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہی ان کی انسانیت کا جوہر ہے اور اگر وہ اس کی قیمت کم نہیں کرنا چاہتے تو انہیں وہ آگ جلاتے رہنا چاہیے جس میں وہ پختہ ہوئی تھی۔ اس لئے جب حکیم مسیح نے دیکھا کہ طاعون انہیں بہت مصروف نہیں رکھتا تو انہوں نے خالد پور کے باشندوں سے ایک مسجد بنانے کی اجازت مانگی۔ وہ اس پر بہت خوشی سے راضی ہو گئے بلکہ یہ خواہش بھی کی کہ چندہ جمع کر کے ایک عالی شان عمارت بنائی جائے لیکن حکیم مسیح کو یہ منظور نہ ہوا۔ انہوں نے اپنی بیوی کی مدد سے ایک چھوٹی سی مسجد ایک بڑے سایہ دار درخت کے نیچے تیار کر لی جس میں صرف یہ خوبی تھی کہ اسے دو سچے مسلمانوں نے اپنے دین اور اپنی محبت کو پختہ کرنے کے لئے بنایا تھا۔

ہر شام کو مغرب کے وقت حکیم مسیح اپنی بیوی کو ساتھ لے کر اس مسجد میں جایا کرتے تھے اور وہاں کبھی ایک گھنٹہ، کبھی دو کبھی ساری ساری رات گزارتے تھے۔ ایک مرتبہ ان کی بیوی کو آنے میں ذرا دیر ہو گئی۔ وہ مغرب کی نماز پڑھ چکے تھے، ان کی بیوی پڑھ رہی تھیں۔ حکیم مسیح ان کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئے۔ ان کی بیوی نہایت خلوص سے نماز پڑھ رہی تھیں اور اس خلوص سے ان کے چہرہ پر ایسی رونق آگئی تھی کہ حکیم مسیح اپنی نظر نہ ہٹا سکے۔ دیکھتے دیکھتے انہیں یاد آیا کہ انہوں نے اپنی بیوی سے نہ اپنے خواب کا ذکر کیا ہے نہ

اس آہنی جسم والے مسافر کا جس نے ان کو خالد پور واپس بھیجا۔ وہ خود اس خواب کے اثر میں ایثار کی مصیبتیں جھیل سکتے تھے اس بچاری عورت کو یہ روحانی تقویت بھی میسر نہیں ہوئی مگر اس پر بھی وہ ان سے ایک قدم پیچھے نہیں رہی۔ یہ ہمت سوائے اس محبت کے جو آہنی جسم والے مسافر کی طرح ہو حکیم مسیح بھی دل ہی دل میں اپنی بیوی کے قدموں پر گرے اور اس سے التجا کی کہ اپنی محبت سے ان کی ہمت کو دوگونہ کرے ان کے فرائض یاد دلاتی رہے اور انہیں ادا کرنے کی قوت بخشے۔

جب ان کی بیوی نے سلام پھیرا تو انہوں نے دیکھا کہ حکیم مسیح کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہیں اور وہ ٹکٹکی لگائے ان کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ انہوں نے وجہ پوچھی۔ حکیم مسیح کچھ دیر تک جواب نہ دے سکے۔ پھر اپنے خواب کا سارا قصہ سنایا اور آخر میں کہا:

"تم کو شاید یاد ہو میں نے ایک مرتبہ اسی وقت شام کو ایک ایسے کیمیاگر کی آرزو کی تھی جو اس ملک کو میرا وطن بنا دے اس قوم میں مجھے کھپا دے۔ دیکھو اس کیمیاگر نے ہم دونوں کو کیا سے کیا بنا دیا۔"

باتیں کرتے کرتے حکیم مسیح اپنی بیوی کے بالکل پاس پہنچ گئے تھے۔ ان کی بی بی نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں دبا کر چوما ان کے منہ پر ایک دعا پڑھ کر پھونکی اور پھر دونوں اپنے کیمیاگر کے تصور میں محو ہو گئے۔

نازو

اختر انصاری

میرے شوہر کو مناظر قدرت اور ان کی دل پذیر رنگینیوں سے بہت محبت ہے اسی لئے ہم شہر سے بہت کافی فاصلے پر رہتے ہیں۔ ہمارے چھوٹے سے مکان کے گرد ایک چھوٹا سا احاطہ ہے جس میں پھول ہیں' کیاریاں ہیں اور روشیں ہیں لیکن اس احاطے کے باہر عروس فطرت دست انسانی کی گستاخیوں سے نا آشنا ہے۔ چاند' سورج' مینہ اور شبنم مشاطہ کے فرائض دن رات انجام دیتے ہیں اور اس کے سادہ حسن اور معصوم شباب کو برقرار رکھتے ہیں۔ ہمارا مکان فطرت کی ان شادابیوں میں اس طرح محصور ہے جس طرح ایک آشیانہ درخت کے سرسبز پتوں اور گھنی شاخوں میں گھرا ہوتا ہے۔ مکان سے کوئی دو سو قدم کے فاصلے پر ریل کی پٹڑی ہے جس سے دن رات ریلیں گذرتی ہیں۔

یہ گذرنے والی ریلیں اکثر مجھے نازو کی یاد دلاتی ہیں۔ اس نازو کی جو اپنی بہن کی گود میں پرورش پا کر اپنی بہن کو داغ دے گئی؛ جوان ہوئی اور جوان ہو کر مر گئی۔ جو گلاب کے پھول کی طرح شاداب تھی اور چودھویں رات کے چاند کی طرح روشن' لیکن جس کی جوانی ان دونوں کی جوانی سے بھی زیادہ مختصر تھی۔

اماں جان کی ناگہانی موت کے وقت نازو صرف تین برس کی تھی۔ میں نے اس کو بڑی محبت اور بڑی محنت سے پالا۔ سارا دن گود میں لئے رہتی اور ساری ساری رات پنگوڑے میں لٹا کر لوریاں دیتی۔ میں اس کو اس قدر پیار کرتی تھی کہ اگر اماں جان بھی زندہ ہوتیں تو شاید نہ کر سکتیں۔ وہ میری محبت بھری گود میں سانس لے کر بڑی ہوئی' جوان ہوئی۔ اس کی جوانی چڑھتی ہوئی آندھی کی طرح آئی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے کچھ سے کچھ ہو گئی۔ اس کا چہرہ دمک اٹھا۔ جہان بھر کی تابانیاں اور رونقیں اس میں سمٹ کر آ گئیں۔ اس کے سیاہ بال حد لانبے اور گھنے ہو گئے۔ اس کا قد اتنا دراز ہو گیا کہ اگر وہ منہ موڑ کر کھڑی ہوتی تو سچ مچ ایک عورت معلوم ہوتی۔ میں اس اٹھان اور بالیدگی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ لیکن آہ! مجھے یہ علم نہ تھا کہ یہ ساری پھبن' یہ تمام رعنائی ایک سراب ہے' ایک دھوکا ہے۔ یہ جوانی جو آندھی کی طرح آئی ہے ایک جھونکے کی مانند گذر جائے گی۔

ہائے وہ کیسی منحوس اور نامراد صبح تھی جب نازو نے مجھ سے کہا تھا۔ "آپا میرے سر میں درد ہے اور کچھ حرارت محسوس ہو رہی ہے۔" میں نے اس کے چڑھتے ہوئے بخار کو سوءِ ہضم کا نتیجہ سمجھا تھا اور زیادہ توجہ نہ کی تھی۔ اس وقت میں کیا جانتی تھی کہ یہ بخار

بخار نہیں ہے جو ایک دن کی دوا کے بعد اتر جاتا ہے۔ بلکہ وہ بخار ہے جو اکثر و بیشتر موت کا نقیب بن کر آتا ہے۔ اباجان نے علاج میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ دہلی کے افضل سے افضل طبیب بلوائے اور جب ان کی کوششیں نامشکور رہیں تو باہر والوں سے رجوع کیا۔ لیکن بخار کسی طرح نہ اترا اور بالآخر ایک دن مجھ نامراد کو یقین دلا دیا گیا کہ کوئی ارضی طاقت میری بہن کو موت کے منہ سے نہیں بچا سکتی۔ مجھ سے جتنا رویا گیا میں روئی۔ جتنا غم کیا گیا کیا اور جتنی دعائیں مانگی جاسکیں مانگیں مگر طبیبوں کی اس رائے میں تبدیلی نہ ہوئی اور میری ناز کی پالی ہوئی نازو اسی طرح موت سے قریب تر ہوتی چلی گئی۔

نازو بچپن سے ایک بہت خاموش اور کم سخن لڑکی تھی۔ وہ بات کرنا جانتی ہی نہ تھی، صرف رونا جانتی تھی۔ جب تک اس نے ہوش نہیں سنبھالا بات کرنے کی بجائے ہمیشہ آنسو ہی بہائے۔ یعنی اگر کبھی اس کو کسی چیز کی ضرورت ہوتی یا کوئی تکلیف ہوتی تو بجائے اس کے کہ مجھ سے آکر کہے وہ کسی جگہ تنہائی میں بیٹھ کر رونے لگتی۔ جب بڑی ہو گئی تو یہ رونا بہت کم ہو گیا لیکن زبان کی ویسی ہی گونگی رہی۔ چنانچہ اس نے اپنی طویل بیماری کے زمانے میں کچھ بھی زبان سے کچھ نہ کہا۔ دن دن بھر خاموش آنکھیں کھولے پڑے رہتی۔ طبیبوں نے جو اس کی صحت کی طرف سے مایوسی ظاہر کی تھی، اس کی بابت اس سے کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ نادان نہ تھی، سب کچھ جانتی تھی اور اپنی بیماری کی نوعیت سے اچھی طرح واقف تھی۔ ایک دفعہ ــــ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ چلتی پھرتی تھی اور ابھی اتنی کمزور نہیں ہوئی تھی کہ بستر سے بھی نہ اٹھ سکے ــــ اس نے اپنے صندوق میں سے ایک قیمتی دوپٹہ نکال کر اوڑھ لیا۔ ایسے دوپٹے عام طور پر کسی تقریب کے سلسلہ میں نکالے جاتے ہیں اور روزانہ استعمال میں نہیں آتے۔ جس خیال کے تحت اس نے یہ دوپٹہ اوڑھا تھا مجھ پر اچھی طرح واضح تھا۔ تاہم میں نے تجاہل سے کام لیا اور جب وہ سامنے آئی تو مصنوعی تعجب کا اظہار کیا۔ لیکن وہ جواب میں بالکل خاموش رہی۔ اس طرح اکثر اس کی باتوں سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ اپنے لاعلاج مرض کو پہچانتی ہے اور نتیجہ سے اچھی طرح واقف ہے۔

جب نازو تندرست تھی ــــ بیمار نہ پڑی تھی ــــ تو اس کے جوان دل میں بہت سی جوان آرزوئیں تھیں۔ بخار میں یہ آرزوؤں کا لہلہاتا ہوا چمن بالکل جھلس کے رہ گیا اور اس کے سارے ذوق و شوق ختم ہو گئے۔ لیکن اس حالت میں بھی دو ارمان اس کے دل میں باقی تھے۔ وہ ریل میں بیٹھنا چاہتی تھی اور "زبیدہ آپا" کے بیاہ میں شریک ہونے کی آرزو مند تھی۔

نازو دہلی میں پیدا ہوئی اور ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی دہلی سے باہر نہیں گئی۔ اس لئے اس کو ریل کے سفر کا ارمان تھا۔ جن لوگوں کی رشتہ داری شہر سے باہر ہوتی ہے انہیں ریل کا سفر آئے دن پیش رہتا ہے۔ لیکن ہمارے تمام عزیز و اقارب دہلی ہی میں تھے۔ صرف نانا ابا کی وجہ سے تھوڑا سا تعلق میرٹھ سے تھا کہ وہ وہاں برسوں سے مقیم تھے چنانچہ جب نازو گود میں تھی تو اماں جان کے ساتھ چند مرتبہ میرٹھ گئی بھی تھی لیکن اس کو اس زمانے کا کچھ ہوش نہ تھا۔ پھر ادھر تو اماں جان کا انتقال ہوا اور اُدھر نانا ابا کی آنکھیں بند ہوئیں، یہ تعلق بالکل ختم ہو گیا اور نازو ہوش سنبھالنے کے بعد کبھی دہلی سے باہر نہ جا سکی۔ اس کی دوسری خواہش یہ تھی کہ وہ کسی لڑکی کے بیاہ میں شریک ہو۔ وہ بیاہ کی تمام رسموں کو دیکھنا چاہتی تھی اور اپنے اس شوق کے متعلق اکثر باتیں کیا کرتی تھی۔

بیماری سے کچھ دنوں پہلے اس کو امید ہو گئی تھی کہ اب یہ دونوں خواہشیں بہت جلد پوری ہو جائیں گی۔ میرٹھ میں ہماری خالہ کی لڑکی زبیدہ کا بیاہ ہونے والا تھا۔ خالہ اماں نے اباجان کو لکھا تھا کہ زبیدہ کی شادی اکتوبر میں ہو گی اور میں سب کو میرٹھ بلاؤں گی۔ وہ دن اور ہفتے گن گن کر کاٹ رہی تھی اور ابھی مارچ ہی کا مہینہ شروع ہوا تھا کہ اس موذی بخار نے اس کو آلیا۔

پھر بھی میں نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ جب زبیدہ کا بیاہ ہوگا تو میں تم کو ساتھ لے کر میرٹھ جاؤں گی اور فی الحقیقت میں اس لیے جانا چاہتی تھی کہ اس کے دل میں یہ ارمان نہ رہ جائے۔ جب بیاہ میں ایک ہفتہ رہ گیا اور خالہ اماں نے بلاوے کا خط لکھا تو میں نے اباجان سے ذکر کیا اور تاڑو کو میرٹھ لے جانے کی اجازت مانگی۔ انہوں نے قطعیت کے ساتھ انکار کر دیا۔ مجھے اس کی بالکل امید نہ تھی۔ میں حیران و ششدر رہ گئی۔ تھوڑی دیر کے لئے بدحواس ہو گئی اور پھر جب میں ذرا سنبھلی اور مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ یہ صدمہ تاڑو کے لئے ناقابل برداشت ہوگا تو میں نے اپنی تمام کوششیں اباجان کو راضی کرنے کے لئے صرف کر دیں۔ میں روئی بھی، منتیں بھی کیں، لوگوں سے سفارشیں بھی کرائیں لیکن اباجان نے جو ایک دفعہ کہہ دیا تھا وہی کہتے رہے۔

تاڑو خالہ اماں کے خط کی اطلاع پا کر بہت خوش ہوئی تھی اور اس دن سے دل ہی دل میں امید کر رہی تھی کہ اب بہت جلد میرے میرٹھ کے سفر کی تیاریاں ہوں گی لیکن تین دن گذر گئے اور نہ اباجان نے اجازت دی اور نہ مجھ میں کسی وقت باوجود کوشش کے اتنی ہمت پیدا ہو سکی کہ میں تاڑو سے کہہ دیتی کہ پیاری تاڑو! تمہارے ابا میاں تم کو میرٹھ جانے کی اجازت نہیں دیتے تم وہاں نہ جاؤ گی۔ آخر چوتھے روز دوپہر کے وقت جب وہ کھانا کھا کر لیٹی تو میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ تاڑو! صبح کی ڈاک سے خالہ اماں کا دوسرا خط آیا ہے۔ زبیدہ کی شادی ملتوی ہو گئی ہے۔ غالباً ایک دو مہینے کے بعد ہوگی۔ تاڑو نے یہ سن کر نظریں جھکا لیں اور منہ سے کچھ نہ کہا۔ تھوڑی دیر بعد میں اس کی دوا لینے الماری تک گئی۔ جب دوا شیشے میں انڈیل کر لائی تو میں نے دیکھا کہ تاڑو کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک سیلاب جاری ہے۔ یہ آنسو اس کے زرد زرد رخساروں سے ڈھلک کر نیچے گر رہے ہیں اور تکیے کو بھگو رہے ہیں۔

اس واقعہ کو پانچ برس گزر چکے ہیں۔ اب نہ تاڑو ہے نہ اباجان ہیں نہ وہ وطن ہے نہ وہ گھر ہے جس میں میں نے اپنی زندگی کا عظیم ترین صدمہ برداشت کیا۔

میں ہوں، میرا ویران دل ہے، پردیس ہے اور میرا جنگل میں یہ مکان ہے۔ رات کو جب ہر طرف سناٹے کا عالم ہوتا ہے آسمان سے تاریکیاں برستی ہیں اور جنگل کی وسیع پہنائیوں سے جھینگروں اور مینڈکوں کے شور کے سوا کوئی آواز نہیں آتی تو ٹھیک ساڑھے نو بجے ریل اپنی شاندار ہیبت انگیز گڑگڑاہٹ کے ساتھ میرے مکان کے سامنے سے گزر جاتی ہے۔ اس وقت میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ تاڑو افق کے کسی بعید ترین گوشے سے حسرت و اشتیاق کے ساتھ ریل کو دیکھ رہی ہے اور اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھائے ہوئے ہے۔ لیکن جب ریل اس کے اشتیاق کو پامال کرتی ہوئی اس کے ارمانوں کو کچلتی ہوئی، سفاکانہ بے التفاتی کے ساتھ نکل جاتی ہے تو اس کے ہاتھ گر پڑتے ہیں۔ اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے ہیں اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے۔

دولت خانہ

شوکت تھانوی

میں ابھی بستر کی چائے پی کر بستر کا پان کھانے کے لئے بیگم کو پاندان کی طرف متوجہ ہی کر رہا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی اور مجبوراً اسی حالت میں باہر آنا پڑا۔ باہر نکل کر دیکھا ریاض کھڑا مسکرا رہا تھا۔ میں نے دوڑ کر لپٹتے ہوئے کہا۔

"ارے ریاض۔ کمال کر دیا تم نے۔ یعنی تم مرے نہیں۔"

بات یہ ہے کہ ہم دونوں ساتھ ساتھ ہندوستان سے پاکستان کے لئے روانہ ہوئے تھے اور جب جالندھر کے قریب ہمارے قافلے پر حملہ ہوا ہے تو اس حملے کے بعد جتنے ساتھی نظر نہ آئے ان سب کے متعلق یہ طے کر لیا تھا کہ شہید ہو چکے ہوں گے بلکہ لاہور پہنچ کر اس ریاض کی تو غائبانہ نماز جنازہ تک میں شریک ہو چکے تھے۔ مگر ریاض زندہ سلامت کھڑا ہوا مزے سے سگریٹ پی رہا تھا۔ کہنے لگا۔

"اب یہیں کھڑے کھڑے محبت بگھارو گے یا گھر میں بھی لے چلو گے۔"

میں نے گھبرا کر کہا۔ "گھر؟ ـــــ ہاں ٹھیک ہے یہ گھر ہی تو ہے۔ ایک منٹ ٹھہرو۔" اور دروازے کے اندر جھانک کر کہا۔ "میں نے کہا سنتی ہو ریاض آ گیا ہے ذرا پردہ کر لو۔ اندر ہی بلا لیں۔"

ایک منٹ میں پردہ ہو گیا اور ریاض کو میں نے ڈرائینگ روم میں بلا لیا۔ ریاض نے اندر داخل ہو کر چاروں طرف وحشت سے گھور گھور کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب یعنی بس۔ صرف ایک دروازے کی کوٹھڑی جس میں صرف ایک چارپائی آ سکتی ہے تم اس میں رہتے کس طرح ہو؟ اور یہ جو تم نے بھابی سے پردہ کرنے کو کہا ہے وہ آخر گئیں کہاں اور کس دروازے سے گئیں۔ مجھ کو تو صرف ایک دروازہ نظر آ رہا ہے جس سے میں داخل ہوا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ہاں دروازہ تو اتفاق سے ایک ہی ہے ــــــ"

ریاض نے ایک اور دروازہ دیکھتے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ ہو گا اندر جانے کا دروازہ۔"

اس کی غلط فہمی رفع کرنے کے لئے عرض کیا۔ "جی نہیں یہ الماری ہے۔" اور الماری کھول کر ریاض کو دکھادی جس میں تین تختے لگے ہوئے تھے۔ ریاض نے پاگل ہو جانے کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ "ارے بھائی تو بھابی کہاں سما گئیں۔"

اب میں نے اس معمے کے حل میں دیر کرنا مناسب نہ سمجھا اس لئے کہ میں ریاض کے حالات معلوم کرنے کے لئے بے صبر ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔

"میاں مبارک باد دو مجھ کو مجھے یہ کوٹھڑی مل گئی ہے اور تم سے کسی فٹ پاتھ پر ملاقات نہیں ہوئی جہاں تمہاری بھابی کو تم سے پردہ بھی نہ کرا سکتا۔ خوش نصیب ہوں کہ خانہ بدوش نہ بنا اور شکر ہے اس پروردگار کا جو خود لامکان ہے مگر مجھے مکان دے دیا۔"

ریاض نے جل کر کہا۔ "عجیب آدمی ہیں آپ یعنی آپ اسے مکان کہہ رہے ہیں۔"

نہایت اطمینان سے کہا۔ "ہاں میں نے اپنی ضرورتوں کو اس کوٹھڑی میں سمیٹ لیا ہے۔ ایک بیوی تین بچے اور پانچواں میں خود۔ سب نہایت اطمینان سے اس میں رہتے ہیں یہی میرا ڈرائنگ روم ہے ہی میرا بیڈ روم ہے۔ یہی میرا آفس ہے۔ یہی میری لائبریری ہے۔ یہی کھانے کا کمرہ ہے اور یہی کھانا پکانے کا کمرا۔" اور پھر میں نے ذرا پکار کر کہا۔ "ارے بھئی میں نے کہا سنتی ہو ذرا پان بھیج دینا۔" اس پر ریاض نے پھر ادھر ادھر دیکھا کہ یہ آواز سننے والی آخر کہاں ہو سکتی ہے۔ آخر اس نے واقعی پریشان ہو کر پوچھا۔ "بھابی آخر ہیں کدھر؟"

میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "یہیں ہیں اور کہاں ہو تیں۔

عفو کیسا جلوۂ رحمت بھی نکلے گا یہیں

ذوقِ عصیاں چاہیے عرفانِ عصیاں چاہیے"

ریاض کو غالباً یہ شعر قطعاً پسند نہ آیا۔ اس نے ذرا تلخی سے کہا۔ "یہ آخر معمہ کیا ہے بتاتے کیوں نہیں صاف صاف۔"

میں نے کہا۔ "بھائی میرے کہہ چکا ہوں تم سے بس یہی اتنی سی جگہ ہے اسی میں اپنی تمام ضرورتیں پوری کرنا پڑتی ہیں۔ یہ الماری دیکھ رہے ہو اس کے تینوں تختوں پر تینوں بھتیجے سوتے ہیں تمہارے، رات کو اوپر والے خانے میں بڑا بچہ درمیانی تختے پر منجھلا بچہ نیچے چھوٹا جو ابالے میں پیدا ہوا تھا۔"

ریاض نے حیرت سے کہا۔ "کہاں ہے یعنی اس الماری میں۔ ارے بھئی اس میں تو ٹانگیں بھی نہ پھیلاتے ہوں گے یہ بچے۔"

میں نے کہا۔ "ٹانگیں پھیلانا یا سمیٹے رہنا سب عادت پر منحصر ہے۔ اب ان کو ٹانگیں سمیٹ کر سونے کی عادت پڑ گئی ہے اور ان کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی، صبح اٹھنے کے بعد دن بھر ٹانگیں پھیلاتے پھرتے ہیں وہ مثل تو تم نے سنی ہو گی کہ چادر دیکھ کر پیر پھیلائے جاتے ہیں میں نے اس میں بس ذرا سی ترمیم کر دی ہے کہ الماری دیکھ کر پیر پھیلانا میرے بچو۔"

ریاض نے ہکا بکا ہو کر کہا۔ "بچے نہ ہوئے اچار کا مرتبان ہو گئے۔ شربت کی بوتلیں ہو گئے کہ الماری میں رکھے جاتے ہیں۔ اور بھابی اس وقت کس الماری میں ہیں؟"

اور یہ کہہ کر وہ ایک دم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے سخت وحشت برس رہی تھی۔ وہ وحشت جو اچانک کرنٹ لگ جانے سے کسی پر طاری ہو گئی ہے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ میں خود گھبرا گیا اس کی یہ حالت دیکھ کر اور جلدی سے پوچھا۔ "کیا ہوا؟"

اس نے سہمے ہوئے انداز سے پلنگ کو گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ اچھلا تھا جیسے کسی نے ٹھوکا دیا ہو مجھے۔" اور میں نے ہنس کر

کہا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ وہ سمجھی ہوں گی کہ میں ادھر بیٹھا ہوں۔" اور پھر پلنگ کے نیچے ہاتھ ڈال کر خاصدان لے لیا۔ ریاض آنکھیں پھاڑے یہ سب کچھ دیکھتا رہا جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ جب میں نے خاصدان کھول کر پان اس کی طرف بڑھائے تو اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

"تو کیا بھابی پلنگ کے نیچے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "جب کوئی آ جاتا ہے وہ پلنگ کے نیچے ہی پردے میں چلی جاتی ہیں۔ کافی اونچا پلنگ ہے اور اس کے نیچے دری بچھی ہوئی ہے چاروں طرف چادر لٹک رہی ہے اچھا خاصا محل ہے۔"

ریاض نے جست کے انداز میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ۔ چلو باہر چلیں یہ کیا بیہودگی ہے کہ ان کے سر پر سوار بیٹھے ہیں۔"

بیگم نے پلنگ کے نیچے سے فرمایا۔ "نہیں بھائی صاحب آپ تشریف رکھیے یہ تو خانہ بے تکلف ہے یہاں ان باتوں کا خیال چھوڑ دینا پڑتا ہے۔"

اور میں نے بھی ریاض کا ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "بھیا وہ عادی ہو چکی ہیں آج یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے احباب آخر آتے ہی رہتے ہیں۔ دوسرے وہ تو نہایت آرام سے بیٹھی ہوں گی اس پلنگ کے نیچے دری ہے چادر ہے ایک گاؤ تکیہ ہے پورے رئیسانہ ٹھاٹھ ہیں جب تک ہم لوگ بیٹھے رہیں گے وہ مزے سے چھالیہ کترتی رہیں گی۔"

ریاض کی حیرت کسی طرح ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی کہنے لگا۔ "صاحب عجیب مہمل زندگی ہے۔ الماری میں بچے پلنگ کے نیچے بیوی ایک درکی قبر نما کوٹھڑی اور اسی میں ساری کائنات۔"

میں نے کہا۔ "توبہ کرو ریاض توبہ کرو۔ یہ بڑا بول ہے۔ میں تو بخدا اس کوٹھڑی پر ناز کرتا ہوں۔ اور میرے دوست میری قسمت پر رشک کرتے ہیں کہ مجھے یہ کوٹھڑی مل گئی ہے۔ وہ جو زندگی بھر گوشہ عافیت سنتے آئے تھے اب پتہ چلا ہے کہ وہ دراصل یہی کوٹھڑی ہے۔ اب ذرا اس کوٹھڑی کا پروگرام سن لو کہ رات کو جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں تینوں بچے احتیاط سے الماری میں رکھ دیئے جاتے ہیں اور ہم دونوں میاں بیوی اسی پلنگ پر اس طرح لیٹ جاتے ہیں جس طرح جوتے کے ڈبے میں جوتے رکھے جاتے ہیں یعنی ایک ایڑی ادھر پنجہ اُدھر دوسرے کی ایڑی اُدھر پنجہ ادھر۔ صبح اُٹھ کر وہ دیکھو کونے میں ایک انگیٹھی رکھی ہے اس پر بیگم چائے بناتی ہیں اور بڑا بچہ الماری کے اوپر والے خانے سے نکل کر دودھ لے آتا ہے پھر سب مل کر چائے پیتے ہیں اور بچے رات کا بچا ہوا کھا کر اسکول چلے جاتے ہیں صرف چھوٹا بچہ رہ جاتا ہے اس کے بعد بیگم برقع اوڑھ کر اور بچے کو گود میں لے کر شاپنگ کے لئے نکل جاتی ہیں اس لئے کہ اُن کا خیال یہ ہے کہ مجھے نہ دراصل گوشت کی پہچان ہے نہ میں ترکاری ٹھیک لا سکتا ہوں میں اس موقع کو غنیمت جان کر اس پلنگ کو کھڑا کر دیتا ہوں فرش سمیٹ لیتا ہوں اور سڑک کے نل سے ایک بالٹی پانی لا کر کوٹھڑی کا دروازہ بند کیا اور جھاڑو ہاتھ میں لے کر غسل شروع کر دیا___"

ریاض نے ٹوکا۔ "جھاڑو ہاتھ میں لے کر غسل؟"

میں نے کہا۔ "صاحب غسل کا غسل صفائی کی صفائی یعنی اپنی بھی صفائی کوٹھڑی کی بھی صفائی نہاتا جاتا ہوں اور جھاڑو دیتا جاتا ہوں۔ پھر یہ جو میز تم کو نظر آ رہی ہے نا۔ یہ بے نقاب ہو جاتی ہے اس کا سامان اُٹھا کر الماری میں رکھ دیتا ہوں اور میز پوش ہٹاتا ہوں تو

تلے اوپر رکھے ہوئے ٹرنک نمودار ہو جاتے ہیں ان میں سے اوپر والے ڈیک میں میرے دفتر جانے کے کپڑے ہیں۔ وہ پہن کر پھر ٹرنکوں پر میز پوش ڈال کر اس کو میز بنا دیتا ہوں اور اس کا سامان جوں کا توں اس پر سجا دیتا ہوں۔ فرش پھر کر دیا جاتا ہے۔ پلنگ پھر بچھ جاتا ہے اور میں سڑک کے نل سے ایک بالٹی پانی اور لا کر رکھ دیتا ہوں کہ دن میں بیگم کو تکلیف نہ ہو۔ اس عرصے میں بیگم واپس آجاتی ہیں اور اپنی شاپنگ کے کمالات کا بڑے فخر سے اظہار فرماتی ہیں کہ دیکھو اس کو کہتے ہیں گوشت پھر یہ کہ سارے شہر میں اتنا سستا شاید ہی کہیں ملے اور ٹماٹر تو دیکھو سیب نظر آرہے ہیں۔ میں کچھ اخلاقاً اور کچھ اتفاقاً داد دیتا ہوا ان سے رخصت ہو کر دفتر چلا جاتا ہوں۔ دفتر سے واپسی کا سودا میرے ذمے ہے یعنی صبح کے ناشتے کے لئے بسکٹ پان۔ رات کے لئے کچا گوشت ترکاری وغیرہ اس سلسلے میں روز باتیں سننا پڑتی ہیں کہ یہ گوشت آخر کس جانور کا اٹھا لائے ہو اور یہ جو ترکاری لانے ہو یہ اصلی ہے یہ بناسپتی۔ میرا تجربہ یہ ہے کہ اس قسم کے موقعوں پر اگر آدمی ذرا مسکرانے کا عادی ہو جائے تو بات زیادہ نہیں بڑھتی ورنہ اتنی سی کوٹھڑی میں بات کا بڑھ جانا نہایت خطرناک ہو سکتا ہے۔ میاں بیوی کی لڑائی تو خیر برحق ہے بشرطیکہ باقاعدہ میدان جنگ میسر ہو۔ ایک کمرہ لڑنے کے لئے ہو۔ دوسرا بیوی کے پھول سوج کر لیٹنے کے لئے تیسرا شوہر کے اینٹھ کر پڑ رہنے کے لئے اور چوتھا سہمے ہوئے بچوں کے لئے۔ پھر یہ کہ اس جنگ کے باوجود ملازم کم سے کم کھانا وغیرہ پکاتے رہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام ارمان اس کوٹھڑی میں چونکہ پورے نہیں ہو سکتے لہٰذا مجبوراً صلح صفائی سے کام رکھنا پڑتا ہے۔"

ریاض کو اب کچھ کچھ ہنسی آئی کہنے لگا "عجیب مسخرے ہیں آپ بھی ____"

میں نے کہا "بھئی کون کافر تم سے مسخرا پن کر رہا ہے۔ میں تو بخدا اظہار واقعہ کر رہا ہوں۔ مگر استاد عجیب عجیب فوائد ہیں اس کوٹھڑی کے۔ تم کو معلوم ہے لکھنؤ میں میرا گھر سرائے کی حیثیت رکھتا تھا۔ آئے دن بھانت بھانت کے مہمان تو مستقل قیام کے لئے آتے رہتے تھے۔ پھر مقامی مہمانوں کا تانتا بندھا رہتا تھا کسی کے لئے چائے بن رہی ہے تو کسی نے کہا چائے نقصان کرتی ہے شربت منگاؤ کوئی بے تکلف دوست ناشتہ مانگ بیٹھا دن بھر اور آدھی آدھی رات تک دربار گرم رہتا تھا۔ مگر جب سے یہ کوٹھڑی ملی ہے اول تو کوئی مہمان آیا ہی نہیں اور اگر آ بھی جائے تو اس کوٹھڑی میں رہنے کے بجائے غالباً یہی مناسب سمجھے گا کہ قیام کا انتظام کرنے کے لئے کسی کی جیب کاٹ کر جیل چلا جائے۔ مگر بہت سے مہمان ایسے ہوتے ہیں جن کو ٹھہرانے کے لئے خود جی چاہتا ہے کہ اور پھر کلیجہ مسوس کر رہ جانا پڑتا ہے۔ مثلاً اب تم آگئے ہو____"

ریاض نے بات کاٹ کر کہا۔ "بندہ نواز میں تو دو مہینے سے یہاں ہوں اور صرف دو چیزیں تلاش کر رہا ہوں ایک اپنے لئے مکان دوسرے جناب کا دولت خانہ۔"

میں نے کہا "شکر ہے کہ ایک چیز تو آپ کو مل گئی رہ گیا مکان اس کے متعلق اگر آپ فارسی جانتے ہوتے تو یہ مصرع پڑھتا کہ۔

ع

این خیال است و محال است و جنوں

اور فی الحال آپ ہیں کہاں۔"

ریاض نے بیزاری سے کہا "ہوتا کہاں ہوٹل میں ہوں۔ میرا کیا ہے اکیلی جان نہ بیوی نہ بچے۔ پھر بھی آخر ہوٹل میں زندگی

پھر تو کوئی رہ نہیں سکتا جی چاہتا ہے کہ اپنا بھی کوئی گھر ہوتا۔"

میں نے کہا "خیر اپنا گھر تو خدا کے فضل سے پورا پاکستان ہے البتہ یہ ہوٹل کے اخراجات بہت ہوتے ہیں۔"

ریاض نے کہا "بھیا اپنے کی بڑا بھگت رہا ہوں مجھے ایک مکان مل رہا تھا کرایہ زیادہ تھا اور مکانیت کم۔ تین کمرے تھے۔"

میں نے حیرت سے کہا "ایک نہ دو ہمشت تین کمرے۔ اچھا تو پھر۔۔۔"

کہنے لگا۔ "میں نے لینے سے انکار کر دیا اور زیادہ گنجائش کے مکان کی تلاش میں ناکام رہ کر پھر جو گیا اسی مکان کو لینے تیسرے دن تو معلوم ہوا کہ اب اس میں تین خاندان آباد ہیں۔ اپنا سر پیٹ کر چلا آیا۔ پھر پتہ چلا کہ ایک اور مکان خالی ہے وہاں گیا تو صاحب خانہ نے نہایت بے تکلفی سے پوچھا کہ شادی ہو چکی ہے؟ میں نے کہہ دیا نہیں۔ کہنے لگے کہ اگر میں اپنی لڑکی سے آپ کی شادی کر دوں تو اسے کہاں لے جا کر رکھیے گا۔ عرض کیا کہ گھر داماد بن کر رہنے کو تیار ہوں۔ وہ حضرت سخت برہمی سے بولے کہ میں شادی اس لئے تو کرنا چاہتا ہوں کہ لڑکی جائے تو کچھ گنجائش پیدا ہو گھر میں۔ آپ آئے خود بھی یہاں سمانے۔ چلتے پھرتے نظر آئیے۔"

میں نے کہا۔ "بھئی ریاض صاف بات یہ ہے کہ میں وعدہ تو نہیں کرتا مگر ایک موٹر گیراج خالی نظر آیا تھا۔ کچھ دن ہوئے دیکھو اس کی بات کرتا ہوں۔"

ریاض نے ٹوپی پیروں پر رکھنے کے انداز سے کہا۔ "میرے بھائی اگر وہ مل جائے تو میں بک جاؤں گا تمھارے ہاتھوں تم ابھی چلو میرے ساتھ۔"

لاکھ لاکھ کہا کہ یہ دفتر کا وقت ہے۔ مگر آخر دفتر کے ایک صاحب کو جا کر عرضی دینا پڑی اور ریاض کے ساتھ اس موٹر گیراج کی تلاش میں نکل گئے مگر توبہ کیجئے وہاں ایک بزرگ والدین اپنے ایک درجن بچوں کو لئے گیراج کے باہر ہی نظر آئے۔ گیراج پر ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا جس کے سوراخوں سے دھواں نکل رہا تھا اور اندر کسی ہانڈی میں میتھی کا بگھار دیا جا رہا تھا۔

اب ریاض کو بھی مجھ پر شک ہے اور میں شب و روز اس کے لئے مکان اور رشتہ دونوں چیزیں ڈھونڈھ رہا ہوں کہ یا تو مکان مل جائے ورنہ کوئی اسے گھر داماد بنا لے۔ آج خبر آئی ہے کہ ایک رئیس ہیں ان کے گھوڑے کا انتقال ہو گیا ہے خدا کرے اصطبل ہی مل جائے اور یہ چھینکا ریاض ہی کی قسمت سے ٹوٹا ہو۔

درونِ تیرگی

میرزا ادیب

کمرے کے سب دروازے، کھڑکیاں اور روشندان ایک مدت سے بند پڑے تھے، یہی وجہ تھی کہ کمرے کے اندر فضا پر ہر وقت ایک بوجھل، سرد اور بھیانک تاریکی رینگتی رہتی تھی۔ اس گہرے اندھیرے میں نہ تو کبھی سورج کی حیات آفریں شعاعوں نے سانس لینے کی کوشش کی تھی اور نہ کبھی چاند تاروں کی ٹھنڈی روشنی نے اسے چھوا تھا۔ اور تو اور ہوا کی لہریں بھی کسی وقت اندر آنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ شاید انہیں بھی کمرے کی نحوست آثار منجمد تیرگی سے ڈر لگتا تھا۔

یہ کمرہ زندگی کی تمام ہمہ ہمہ زائیوں سے بالکل محروم ہو چکا تھا ___ اور اگر اس میں زندگی کا کوئی نشان تھا بھی تو صرف ان ننھے ننھے نظر نہ آنے والے ہزاروں ذرات کی بدولت تھا جو ایک دیوار سے لے کر دوسری دیوار تک فضا میں دن رات سرکتے رہتے تھے۔ ان میں بھی حرکت اس وقت پیدا ہوتی تھی جب کبھی ہوا کی کوئی لہر یا سورج کی کوئی کرن دروازے کے سوراخ، دیوار کی درز میں سے اندر آجاتی تھی۔ اس کے علاوہ ان میں کبھی کسی قسم کا اضطراب یا ہلچل نہیں آتی تھی۔ وہ تاریکی کے جزوبن کر رہ گئے تھے ___ ان میں انفرادیت نام کو بھی باقی نہیں رہتی تھی۔

یہی ماحول طاری تھا کہ ایک دن اسی تاریک کمرے کے ایک تاریک تر گوشے میں ایک چھوٹا سا ذرہ نڈھال ہو کر زمین کے بالکل قریب پہنچ گیا اور انتہائی مایوسی کے عالم میں بولا:

"توبہ، کس قدر اندھیرا ہے، کہیں بھی روشنی کی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ نہ جانے کب اس سے نجات ملے گی؟"

یہ الفاظ سن کر ایک بوڑھے ذرے نے حقارت انگیز قہقہہ لگایا۔

"خوب! اتنا چیز ذرے ہو کر روشنی کی سوچ رہے ہو۔ بیٹا! ہم اندھیرے کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں اس لئے ہمیشہ اندھیرے سے وابستہ رہیں گے۔ ہمارا وجود تاریکی سے الگ نہیں ہے!"

"ہمیں کبھی نجات نہیں ملے گی۔ کبھی اس اندھیرے سے باہر نہیں نکل سکیں گے؟" ننھا ذرہ بولا۔

"کبھی نہیں ___ میری مانو ایسی بیہودہ باتیں نہ سوچا کرو۔ یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تم ایک حقیر ذرے ہو۔"

یہ کہہ کر بوڑھے ذرے نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ننھا ذرہ سہم کر خاموش ہو گیا۔ کچھ اور پوچھنے کی اس میں ہمت نہیں رہی تھی۔

اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنی ساری زندگی میں صرف ایک ہی دفعہ روشنی دیکھی تھی ___ اور اس وقت اس کا سینہ ایک شدید، تند و تیز ولولے کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ اس کی رگ رگ میں ایک لذت انگیز سنسنی سی دوڑ گئی اور اسے پہلی مرتبہ محسوس ہوا تھا کہ وہ ایک حقیر، بے مایہ وجود نہیں ہے ___ اپنی دنیا میں اس کی کچھ اہمیت بھی ہے ___ وہ کچھ کر بھی سکتا ہے اس میں کچھ کر سکنے کی ہمت بھی ہے اس کے سامنے ایک وسیع، ایک روشن دنیا پھیلی ہوئی ہے جس میں وہ پرواز کر سکتا ہے، ناچ سکتا ہے گا سکتا ہے ___ مگر افسوس اسی وقت ہوا کہ ایک جھونکے نے اسے دروازے سے پیچھے دھکیل دیا اور کچھ دیر کے بعد جب اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا تو اس کے ارد گرد دوبارہ بے کنار اور ہمہ گیر تاریکی چھائی ہوئی تھی اور اس کے جسم کا ہر عضو بری طرح دکھ رہا تھا۔ اس کے سارے حسین خواب چٹان کی طرح سخت اندھیرے سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئے تھے اور بظاہر تاریکی سے نکل کر روشن دنیا میں جانے کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ تاہم شدید سے شدید مایوسی بھی اس مشعل کو بجھانے میں کامیاب نہ ہو سکی جو ایک مرتبہ روشنی دیکھنے کے بعد اس کے دل کی گہرائیوں میں جل چکی تھی ___ اسے توقع تھی کہ ایک نہ ایک دن وہ ضرور اندھیرے کی تہوں سے نکل کر باہر کی لامحدود دنیا میں پہنچ جائیگا۔ اور وہ اس وقت سے لے کر اس وقت تک اسی گھڑی کا انتظار کر رہا تھا۔

بوڑھے ذرے کے تلخ اور ہمت شکن الفاظ نے اس پر گہرا اثر کیا تھا۔ اس لئے وہ اپنے وجود کو سنبھال نہ سکا اور زمین پر گر پڑا۔ چند لمحے خاموشی طاری رہی، وہ بے بس ہو کر، مجروح ہو کر، چپ چاپ بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اسی حالت میں یکایک بوڑھے ذرے نے حسب معمول کرخت لہجے میں کہا:

"تمہارا خیال ہے گھر کی مالکن پھر بھی یہاں آجائے گی اور کمرے کا دروازہ کھول دے گی۔"

ننھے ذرے نے کوئی جواب نہ دیا۔ دراصل یہ الفاظ اس کے کانوں تک پہنچ ہی نہ سکے تھے۔ اور اگر وہ یہ الفاظ سن بھی لیتا جب بھی کچھ نہ کہہ سکتا۔ مایوسی نے اسے بے دم کر دیا تھا۔

بزرگ ذرے نے آنکھیں جھپکا کر کہا:

"گھر کی مالکن کبھی نہیں آئے گی، یہ خیال اپنے دماغ سے نکال دو، اس زمانے میں گھر کا کچھ سامان یہاں پڑا تھا اور وہ یہی سامان لینے کے لئے یہاں آگئی تھی، ورنہ اس متعفن فضا میں کبھی آنے کا ارادہ نہ کرتی۔ سنا بیٹا! تم سن نہیں رہے کیا؟"

ننھا ذرہ خاموش تھا۔

"غائب کہاں ہو گئے ہو؟ ___ اچھا بھئی تمہاری مرضی، میں کیا کہہ سکتا ہوں!" بڑے ذرے کی بوڑھی آواز ایک لمحے کے لئے تھرتھرائی اور پھر گہرے اندھیرے میں جذب ہو گئی۔ کچھ دیر گزرنے پر ننھے ذرے کا شعور بیدار ہونے لگا۔ اسے وہ واقعہ تمام جزئیات کے ساتھ یاد آگیا جس سے وہ ابھی ابھی دوچار ہوا تھا۔ اس نے بزرگ ذرے کی آواز نہیں سنی تھی، تاہم وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے ارد گرد پھیلے ہوئے بزرگ ذرے کس انداز میں سوچا کرتے ہیں اور روشنی کی تمنا کو کتنا بیہودہ خیال تصور کرتے ہیں۔

ذروں کی دنیا کا یہ سب سے ننھا وجود چند لمحے مسلسل حیرت و مایوسی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ وہ پوری طرح مایوس ہو جاتا

چاہتا تھا مگر ہو نہیں سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک خلش سی ایک اضطراب سا موجزن تھا۔ اس خلش اور اضطراب میں روشنی کی آرزو کے علاوہ ایک قسم کا اضافہ احساس بھی کار فرما تھا۔ جسے آپ کو اتنی قدر حقیر نہیں سمجھتا تھا کہ ایک مرتبہ زمین پر گر کر وہ بارہ اپنے کام ہی نہ ہو سکے اور روشنی کی تمنا کو ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دے۔

اس سے بہت دور کافی بلندی پر اندھیرے کے سینے میں روشنی کی ایک نہایت مدھم سی، ننھی سی لکیر لرز رہی تھی اور یہی لکیر اس کی نظر کا مرکز بن گئی تھی ___ نہ صرف مرکز بن گئی تھی بلکہ اس کے اندر زندگی کی نئی امنگ اور نئی ترنگ بھی پیدا کر رہی تھی ___ وہ اوپر کی جانب بلند ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا ___ "آخر گھر والے اس کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے کھول کیوں نہیں دیتے؟ انہیں مرے لیے روشنی ہے تو ہمیں کیوں اس محدود فضا میں بند کر کے روشنی سے محروم کر رہے ہیں؟"

کافی دیر کے بعد وہ گرتا پڑتا اوپر آ گیا۔ اب وہ اپنے سامنے بزرگ ذرے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بوڑھے سے یہ سوال پوچھنا چاہتا تھا مگر اس خیال سے کہ یہ بوڑھا اسے مایوس کرنے کی کوشش کرے گا ___ اسے بولنے کی جرأت نہ ہوئی۔

بزرگ ذرہ اس کا خیال بھانپ گیا اور کہنے لگا:

میں نے ایک دفعہ کہہ دیا ہے کہ ہم تاریکی کا ایک حقیر حصہ ہیں ___ آخر سوچو روشنی کے ساتھ ہمارا کیا واسطہ ہے! تم بالکل ننھے ہو، بے فائدہ اس چیز کے لئے بیتاب ہو جسے کبھی حاصل نہیں کر سکتے۔ میری مانو اس قسم کی خیال آرائی نہ کیا کرو۔ سنا تم نے بیٹا!"

مخاطب خاموش نہ رہ سکا۔ جھٹ بول اٹھا:

"وہ لوگ دروازہ کیوں نہیں کھول دیتے۔ دروازہ کھلے گا تو روشنی خود بخود اندر آ جائے گی۔"

بہت خوب بھئی!" بزرگ ذرے نے خوفناک قہقہہ لگایا "تم انسان سے یہ توقع رکھتے ہو کہ وہ تمہاری بیتابی کا خیال کر کے دروازہ کھول دے گا یہ تمہاری بھول ہے۔ تم نے انسان کو سمجھا ہی نہیں ___ اسے ہم حقیر ذروں کی کیا پروا ہو سکتی ہے ___ اگر تم نے اس مجنونانہ خواہش کو دماغ سے نہ نکالا تو ایک دن تمہارا دم گھٹ جائے گا اور تم مر جاؤ گے۔"

اس وقت ذرے کی آنکھوں پر مایوسی کے سائے چھا گئے۔

تاریک فضا اور تاریک ہو گئی، روشنی کی وہ ننھی لکیر بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ ذرے کا دم سچ مچ گھٹنے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو ہوا میں چھوڑ دیا ___ اس حالت میں اسے کچھ خبر نہ تھی کہ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے ___

پستی سے لے کر انتہائی بلندی تک چاروں طرف گہری تاریکی مسلط تھی اس تاریکی میں اس کے بزرگ اس کے ہم عمر لاکھوں ذرے اپنی مختصر سی دنیا میں گردش کر رہے تھے۔ آگے بڑھتے تھے ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے اور پھر نیچے چلے جاتے تھے۔ ان میں کئی ایسے بھی ہوں گے جنہیں روشنی کی تمنا ہو گی، جو وسیع اور روشن دنیا میں پرواز کرنا چاہتے ہوں گے، لیکن اپنے گرد و پیش بے شمار رکاوٹیں دیکھ کر ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہوں گے ان کی خواہشیں سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہوں گی اور نوجوان ذرہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ [illegible] کی طاقت کا مقابلہ کر کے دروازے تک پہنچ جانا بہت مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے۔ اسے یاد آیا کہ ایک دفعہ پہلے بھی اس نے [illegible] کوشش کی تھی مگر طاقتور ذروں نے اس کا راستہ روک لیا تھا ___ وہ ایک بے وقوف اور ضدی بچے کو ہلاکت آفریں تک [illegible] ___ کیونکہ ان کا نقطہ نظر یہی تھا اور ان کی باتوں سے بزرگانہ شفقت نمایاں تھی۔

[illegible] ___ اس نے سوچا اور روشنی کا تصور پوری شدت کے ساتھ اس کے دل میں جاگ اٹھا اور وہ اپنے

اندر ایک نئے ولولے کا ہیجان محسوس کر کے بلندی کی طرف پرواز کرنے لگا۔

نئی فضاؤں میں گردش کرتے ہوئے ذرے جب اس سے ٹکراتے تو وہ ایک دم کہیں سے کہیں جا پہنچتا۔ ایک دفعہ تو وہ اسی پستی میں پہنچ گیا جہاں سے نکل کر وہ اوپر اٹھا تھا۔ اگرچہ وہ چند لمحے وہاں ٹھہرا لیکن اس مختصر سے وقفے میں بھی اس کے بزرگوں اور ساتھیوں نے طعن و تشنیع سے اسے پریشان کر دیا۔

ایک بزرگ کہنے لگا:

"دیکھو ایسی بیہودہ حرکت نہ کرو، تم نہیں جانتے کہ ————"

اس سے پہلے کہ بزرگ کا فقرہ مکمل ہو وہ تیزی سے اوپر کے کرے میں آ گیا۔

خوش قسمتی سے ہوا کا ایک جھونکا ادھر آ نکلا اور اس جھونکے نے اسے فضا کے اس حصے میں پہنچا دیا جو کافی بلند تھا اور جہاں وہ پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔ یہاں پہنچ کر ذرا رک کر اس نے نیچے دیکھا۔ دور اس کے پست ہمت ساتھی کلبلا رہے تھے اور اپنی محدود تاریک دنیا میں بے معنی گردش کر رہے تھے۔ یہاں سے اپنا پہلا مقام اسے اس قدر پست نظر آیا کہ وہ اپنی کامیابی پر حیران رہ گیا ____ مگر حیرت و مسرت کے یہ لمحے بہت جلد ختم ہو گئے۔ کیونکہ اب وہ جن ذروں کے درمیان موجود تھا وہ اسے اپنا ساتھی نہیں سمجھتے تھے بلکہ تاریک پستیوں کا باسی کہتے تھے اور اسے اپنے کرے میں آنے کی اجازت دینا پسند نہیں کرتے تھے۔ جب اس نے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو اسے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ نئے ساتھی بجائے اس کے کہ اس کی ہمت و عزم بلند پر تحسین کہیں الٹا اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ ایک ذرے نے تو صاف صاف کہہ دیا۔

"بھئی! یہ تمہاری خوش قسمتی تھی کہ یہاں تک پہنچ گئے۔ اب فوراً واپس چلے جاؤ۔ تمہارا مقام اسی پستی میں ہے جہاں سے تم آئے ہو اگر ہم میں سے کسی طاقتور وجود سے تمہارا تصادم ہو گیا تو ایک ہی لمحے کے اندر فنا ہو جاؤ گے یا زخمی ہو کر نیچے زمین پر گر پڑو گے اور زمین کے ذروں میں جذب ہو کر رہ جاؤ گے اور پھر کبھی نہیں اٹھ سکو گے!"

باقی ذروں نے بھی یہی کوشش کی کہ وہ ایک لحہ توقف کئے بغیر واپس چلا جائے۔ لیکن وہ تھکاوٹ کے باوجود اوپر جانے لگا۔ یہاں تک کہ ایک نئی بلندی پر پہنچ گیا۔

اس بلندی پر اس کی ملاقات ایک تیز رو مسافر سے ہو گئی۔ یہ ذرہ بھی اسی کی طرح ایک دور دراز گوشے سے نکل کر بالائی حصے کی طرف پرواز کر رہا تھا چنانچہ وہ خوشی خوشی اس کا ہم سفر بن گیا۔

ایک دن وہ دونوں ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے کہ یکایک اس کا ساتھی چیخ اٹھا:

"آندھی۔"

"کیا؟" نوجوان ذرہ آندھی کا مطلب نہیں سمجھتا تھا۔

"باہر آندھی آ رہی ہے۔ یہ شور سن رہے ہو نا!" اس کا ساتھی بولا۔

"مجھے معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔ باہر وسیع دنیا میں بھی اندھیرا چھا گیا ہے۔ اتنی جلدی رات کیونکر آ گئی ہے آج!"

اس کے ہم سفر نے بتایا "آندھی تیز و تند ہوا کو کہتے ہیں۔ اگرچہ کمرے کے سب دروازے بند ہیں، تاہم آندھی کے جھونکے اندر بھی آ جائیں گے اور اگر ہم کسی جھونکے کی زد میں آ گئے تو وہ نہ جانے ہمیں کہاں پھینک دے اور ___ یہ بھی خبر نہیں کہ ___"

یکایک ادھر ادھر ایک ہل چل سی مچ گئی ___ ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔ چھوٹے ذرے نے محسوس کیا کہ سب ذرے مل کر اسے پستیوں کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ خوف سے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اس کا ننھا سا وجود اس طرح گردش کرنے لگا جیسے کسی طاقتور چیز سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے گا۔

کافی عرصے کے بعد جب اس کا شعور بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ وہ ایک تنکے کے سرے پر چمٹا ہوا ہے اور یہ تنکا دیوار کی طرف جھکا ہے یہاں تک کہ دیوار کے ساتھ جا لگا ___ فضا میں ابھی تک اندھیرا مسلط تھا اور لحہ بہ لحہ گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے ارد گرد جتنے ذرے موجود تھے وہ سب کے سب تھک کر مضمحل ہو کر سو رہے تھے ___ ایک جان لیوا سا کن خیال اس کے ذہن میں آیا ___ "کیا میری زندگی حرکت اور حرارت سے محروم ہو گئی ہے۔ اور کیا میں اپنا سفر پورا کر کے پھر اسی ناپید اکنار تاریکی کا جزو بن رہا ہوں جس کے بطن سے میں پیدا ہوا تھا ___ کاش میں اس ناکامی سے پیشتر صرف ایک مرتبہ دروازے سے نکل کر روشنی کے سیلاب میں چھلانگ لگا سکتا ___ صرف ایک مرتبہ اور ___"

"روشنی میں جانے کا مزا دیکھ لیا ہے نا!" قریب سے ایک بوڑھی آواز آئی۔

"کیا مطلب؟" اس نے کہنے والے کی طرف مخاطب ہوئے بغیر پوچھا۔

"مطلب کیا ___ شکر کرو اس کمرے کے سب دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں ___ اگر ایک بھی کھڑکی کھلی رہتی تو ہم میں سے کسی کا وجود بھی سلامت نہ رہتا۔ ہم مٹی کے بوجھ تلے دب کر ختم ہو گئے ہوتے۔ ہمیں بند دروازوں اور کھڑکیوں نے بچا لیا ہے۔"

بات بالکل درست تھی۔ آندھی کا ایک ہلکا سے جھونکا اندر آسکا تھا اور اس ہلکے سے جھونکے نے ایک ہلچل سی مچا دی تھی اگر وہ باہر ہوتا یا دروازہ کھلا ہوتا تو نہ جانے کیا ہوتا۔ وہ مایوس تھا مگر اب کے مایوسی میں کچھ اطمینان بھی تھا۔

وقت چپ چاپ گذرتا رہا اور ایک دن پھر اس نے یکایک بلندی پر ایک روشن نقطہ دیکھ لیا۔ اس کے سینے میں سوئی ہوئی امید جاگ اٹھی۔ "ہائے وہ باہر کی دنیا کس قدر وسیع، کس قدر خوبصورت ہے۔" اس نے آہ بھر کر کہا اور اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ اوپر آگیا ہے۔ ایک نئے مقام پر۔

"ننھے بھائی کیا کر رہے ہو؟"

اس نے دائیں طرف دیکھا۔ اس کا پہلا باہمت ہم سفر پیار بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سفر جاری رکھنے کی امنگ از سر نو اس کے اندر پیدا ہو گئی۔

ابھی اس نے کچھ کہا نہیں تھا ___ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا کہے۔ اتنے میں اس کا ہم سفر بولا:

"مجھے افسوس ہے میں تمہارے ساتھ جا نہیں سکتا۔ دیوار کے ساتھ جالا لٹک رہا ہے، میں اس میں بری طرح پھنس گیا ہوں، نہ جانے کب تک یہاں گرفتار رہوں گا۔ ایک نہ ایک دن کہیں سے ہوا کا جھونکا آئے گا اور مجھے اس قید سے رہائی دلا دے گا۔ جب تک وہ جھونکا نہ آئے میں اس بوجھل غبار سے نہیں نکل سکتا۔"

"کوشش تو کرو!"

"کوشش تو کر چکا ہوں کہ تم تنہا روشنی کی تلاش میں نکل جاؤ۔ میں کبھی نہ کبھی آؤں گا ___ کبھی نہ کبھی ضرور آؤں گا۔"

"نہیں جب تک تم ساتھ نہیں چلو گے میں یہیں رہوں گا۔" یہ کہتے ہوئے چھوٹے ذرے کا دل ہمدردی سے لبریز ہو گیا۔

دوسرا ذرہ بولا۔ "اس کا خیال نہ کرو۔ اس وقت فضا کافی پرسکون ہے۔ تمہیں راستے میں زیادہ تکلیف نہیں ہو گی!" دوسرے ذرے کے لہجے میں عزم اور ارادے کی مضبوطی جھلک رہی تھی۔

اپنے ہم سفر سے محرومی کے احساس نے سینے میں درد کی لہریں دوڑا دیں اور اس کے ذہن میں ایک چبھن سی ہونے لگی۔ "یہیں ٹھہر جاؤں یار، انہ ہو جاؤں۔" وہ سوچنے لگا۔ اس وقت فضا واقعی پرسکون تھی اور دور بلندی پر تاریکی کی پیشانی سے روشنی کی ایک لہر پھوٹ رہی تھی۔ اس کے قدم بے اختیار اٹھنے لگے۔ اس نے اپنے ساتھی کو آخری بار دیکھا اور اوپر پرواز کرنے لگا۔

وہ تاریک فضا میں گرگر کر اڑتا رہا، اڑاڑ کر گرتا رہا۔ کبھی طاقتور ذروں سے ٹکرا کر بالکل زمین کے قریب پہنچ جاتا اور کبھی مسلسل تگ ودو سے کسی نئی فضا کو چھونے لگتا۔ نئی فضا کے ذرے اسے حقیر اور اجنبی سمجھ کر اپنی دنیا سے نکال دیتے۔ متکبر ذرے اس کا راستہ روک لیتے۔ اس کا مذاق اڑاتے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسے زخمی کر کے نیچے بھی گرا دیتے۔ ہر لمحہ بڑھتی ہوئی مشکلات کو دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو جاتے اس کی ہمت جواب دے جاتی لیکن اس کے دل میں روشنی میں جانے کی جو تمنا بے قرار تھی اس کا شعلہ کسی صورت میں بھی، کسی حال میں بھی نہیں بجھتا تھا یہی وہ شعلہ تھا جس کی حرارت نے اسے ہر لحہ مصائب کے ہجوم میں بھی سرگرم سفر رکھا، اور جو اسے ہر گھڑی ایک حسین، ایک شاداب دنیا کے خواب دکھاتا رہا تھا۔ جب کبھی زخمی ہو کر زمین پر گر پڑتا تو یہ رنگین خواب چپکے سے اس کے ذہن میں جھلملا اٹھتا اور وہ اسی حالت میں اپنے مجروح جسم کے ساتھ اوپر اٹھنے کی کوشش کرنے لگتا۔ تاریکی کی دنیا میں اس کا کوئی ہم سفر نہیں تھا، کوئی ہمدرد نہیں تھا، سب کے سب اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اس کو پاگل تصور کرتے تھے، تاہم وہ تاریکی میں جذب ہونے کے لئے تیار نہیں تھا ____ اور نہ اپنے دل سے اپنی عزیز ترین خواہش کو نکال سکتا تھا۔

وہ اڑتا رہا ____ بڑھتا رہا، یہاں تک کہ ایک دن اس کی آنکھیں حیرت انگیز مسرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ دروازے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ کثیف اندھیرے کی حدیں ختم ہو رہی تھیں اور اس کی ننھی ننھی آنکھوں کے آگے دور تک روشنی اور تاریکی کا ایک وسیع پھیلاؤ سا نظر آ رہا تھا۔ جس میں لاکھوں صحت مند ذرے ناچ رہے تھے۔ اس پھیلاؤ اور اس کے درمیان ابھی تاریکی حائل تھی_ وہ ٹھہر نہ سکا تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ برابر آگے بڑھتا گیا۔

اب اس پر ایک نیم بیہوشانہ سی کیفیت طاری تھی۔

وہ کہاں ہے، کس دنیا میں پہنچ گیا ہے، کیا وہ سنگین دروازے سے باہر نکل آیا ہے، یا ابھی تک اس دم گھٹنے والی تاریک فضا میں لڑکھڑا رہا ہے ____ اسے کچھ سوجھتا نہیں تھا ____ کچھ دیر کے بعد وہ اپنے نئے ماحول سے آشنا ہونے لگا ____ اس کے چاروں طرف ایک نئی دنیا بکھری ہوئی تھی ____ ایک نئی دنیا جس میں روشنی بھی تھی اور وسعت بھی، جو بڑی شاداب اور بڑی خوبصورت تھی۔ اسے روشن دنیا کے ذرے بڑے ہمدرد نظر آ رہے تھے کیونکہ ان کے صحت مند چہروں پر مایوسی اور افسردگی نہیں تھی بلکہ مسکراہٹ کی سرخی پھیلی ہوئی تھی اور اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس کا استقبال کر رہے ہیں اپنی کامیابی سے سرشار وہ روشنی کے چشمے میں تیرتا رہا ____ یہاں تک کہ تھک گیا ____ اچانک ایک دم تاریکی چھا گئی۔

اس نے حیران ہو کر ایک ذرے سے پوچھا:

"روشنی کہاں گئی؟"

ننھے ذرے نے جواب دیا:

"اب شام ہو گئی ہے کمرے کے باہر وسیع دنیا میں روشنی کا منبع یعنی سورج اپنی کرنوں کو سمیٹ کر رات کے غار میں اتر رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد چاند اور ستارے نکلیں گے ___ تھوڑی سی روشنی اندر آسکے گی ___ تو خوبصورت اور حیات آفریں روشنی تو باہر ہے ___ باہر کی لامحدود دنیا میں!"

"میں اسی لامحدود دنیا میں جانا چاہتا ہوں۔" بچہ تازہ بولا اور اس کا دل دھڑکنے لگا۔

"آگے ہوا کے بڑے تیز اور تند تھپیڑے ہیں جو ہمیں پیچھے دھکیل دیتے ہیں باہر جانا ممکن نہیں۔"

"___ مگر وہ دیکھو باہر جانے کا راستہ تو ہے ___ دروازے میں۔" وہ بولا۔

"راستہ ہے لیکن باہر نکلنا بے حد مشکل ہے۔ وہاں ہوا بہت تیز ہے۔"

"کوئی پروا نہیں ___ میں باہر جاؤں گا ___ میں باہر کی سنہری اور روشن دنیا میں ضرور جاؤں گا ___ ضرور جاؤں گا۔"

اور یہ کہتے ہوئے وہ پھر پرواز کرنے لگا اوپر ہی اوپر ___ بلند سے بلند تر فضا میں!

—— ——

صنوبر کے سائے

حجاب امتیاز علی

میں جب سے ان پہاڑی علاقوں میں آئی تھی۔ "نہر روحناک" کی رعنائیوں کا ذکر ہر خاص و عام سے سنتی تھی لوگ کہتے اس کے صنوبر کے سایوں سے ڈھپے ہوئے کناروں پر سہانے خوابوں کی رومان جھلملاتی ہے۔ پہاڑی خانہ بدوشوں کا بیان تھا کہ نامعلوم پہاڑوں کی بلندیوں نے ایک مقام پر آسمان کے نیل میں شگاف کر رکھا ہے۔ اور روحناک کی نیلی دھارو ہیں سے اترتی اور کوہساروں میں سے ہرتی پھرتی اس وادی میں ایک ندی بن کر آنکلتی ہے۔

بھلا آپ غور کیجئے۔ ان رومانی فقروں کو سن کر مجھ جیسی سیر وسیاحت کی دلدادہ سے کب نچلا بیٹھا جاسکتا تھا؟

ایک دن میں نے اپنی محبوب سہیلی جسوتی سے مچل کر کہا۔ "جسوتی! ہمیں یہاں آئے دو ہفتے گزر چکے۔ مگر ہم نے نہر روحناک کی سیر اب تک نہیں کی۔ تم پسند کرو تو آج شام کشتی کی سیر کو چلیں۔"

جسوتی کو آپ جانتے ہیں۔ سعید چہرے والی سلیم الطبع لڑکی ہے۔ اس سفر میں میں اسے اپنے ساتھ تقریباً کھینچ کر لائی تھی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "جیسی تمہاری مرضی روحی۔ لیکن پانی سے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

اس وقت جسوتی کے ایک محبوب حبشی نژاد خانہ زار نے کہا۔ "خاتون میں نے سنا ہے ساحل روحناک پر ایک بہت مشاق سو سال کا [illegible] رہتا ہے۔ اس کی کشتی کبھی لہروں پر نہیں ڈگمگاتی اگر آپ اجازت دیں تو اسی ملاح کی کشتی کرائے پر لے لی جائے۔"

[illegible] سے کہا۔ "کوئی ملاح اور کوئی کشتی ہو۔"

[illegible] سال کا ملاح خاک کشتی چلاتا ہوگا۔"

خانہ [illegible] سنا ہے وہ ستر سال سے کشتی بانی کرتا ہے۔ اور آج تک اس کی کشتی کو کوئی حادثہ پیش نہیں آیا۔"

غرض [illegible] کشتی کرایہ پر لینے اور شام کی چائے کا انتظام کشتی ہی میں کرنے کے لئے روانہ کر دیا۔

(۲)

جب ہم دونوں اس مقام پر پہنچے۔ جہاں سے سیاح روحتاک کی سیر کے لئے پانی کا سفر شروع کرتے ہیں۔ تو ہم نے دیکھا کہ ایک سرخ اور نیلے رنگ کا مرصع شکاری ہمارے انتظار میں ہے۔ اس کے موتیوں کے کانپتے ہوئے پردوں میں سے ایرانی قالین پاروں پر لے ہوئے خوش وضع اور خوش قطع تکیے دعوت استراحت دے رہے تھے۔

میں نے مسکرا کر جسوتی سے کہا۔ "یہ خلیفہ بغداد کا محراب تفریح معلوم ہوتا ہے۔"

اندر آرام سے نیم دراز ہونے کے بعد ہم نے مڑ کر کشتی چلانے والے کو دیکھا ایک پیر صد سالہ کشتی کے پرلے سرے پر چپو ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر سفید لمبی داڑھی کے بال ہلکی ہلکی ہوا سے کانپ رہے تھے۔ پرانی آنکھوں میں جوانی کی تابانی اور درخشانی نہ تھی۔ بلکہ ___ جیسے ایک دھند میں سے ماضی کی حسرت دیدار جھلکتی نظر آ رہی تھی۔

حبشی خانہ زاد نے چائے تیار کر رکھی تھی۔ ہم گرم گرم چائے کے خوشگوار گھونٹ حلق سے اتارتے دھیرے دھیرے روحتاک کی طرف جا رہے تھے۔ جس کے نیل پر غروب آفتاب مچل مچل کر شہاب پاشی کر رہا تھا۔

منظر بتدریج وارفتہ سا ہوا جا رہا تھا۔ ہواؤں میں نکہت بڑھ رہی تھی۔ پانی کی چھوٹی چھوٹی لہروں کی آواز پر شبہ ہوتا تھا جیسے کہیں دور خواب کے جزیرے میں پانی برس رہا ہو۔ فطرت اپنی بے ساختہ رعنائیوں کا دامن پھیلائے ہمارے سامنے تھی۔ ایک تصویر جس میں ڈھلتے ہوئے سورج کا ہر لمحہ نئے انداز سے رنگین موقلم کی شعبدہ بازیاں دکھا رہا تھا۔ اے اللہ؟ سچ مچ وہ خواب کی سرزمین تھی۔ وہاں کا جزیرہ تھا۔

سیدھے اور تناور صنوبر جیسے دم بخود کھڑے تھے۔ اور ان کے درمیان سے کہیں پھولوں سے ڈھکی ہوئی ڈھلوانیں نظر آتیں۔ کہیں باریک اچھوتے نور میں نہائے ہوئے ہرے ٹیلے اور کہیں افق کے سحاب پاروں میں کھوئے ہوئے کہسار۔

ہم چپ تھے۔ مجھے معلوم نہ تھا ہم کتنی دور نکل گئے۔ اور ہمارے شکارے کو چلتے کتنا وقت ہو گیا۔

یکایک حبشی خانہ زاد کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

"جناب واپس چلئے۔ آفتاب غروب ہو رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پانی کے راستوں پر ہم بھٹک جائیں۔"

بوڑھے ملاح نے ایسے چہرے سے جس پر مسکراہٹ کا شبہ ہو سکتا تھا کہا۔ "راہ سے بھٹکنا ناممکن ہے۔ میں ساٹھ ستر سال سے ان آبی راستوں کا عادی ہوں۔"

میں ذرا دیر چپ چاپ ملاح کا چہرہ تکتی رہی۔ جس پر زندگی کے گرم و سرد نے طرح طرح کی جھریاں ڈال رکھی تھیں۔ پھر پوچھا۔ "کیا تم قریب قریب ایک صدی سے یہاں رہتے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"تمہارا مکان کہاں ہے؟"

"مکان کہیں نہیں ___ صنوبر کے ان سایوں تلے پڑ رہتا ہوں ___"

مجھے محسوس ہوا جیسے کہتے ہوئے اس کے ضعیف سینے نے ایک آہ بھری ہے۔

صنوبر کے سایوں تلے؟ میں نے حیران ہو کر کہا۔ "بے پناہ گرمی اور لرزا دینے والی سردی تمہیں زندگی سے بیزار نہیں کرتی۔

اس کا تمہارے پاس کیا علاج ہے؟"

"علاج؟ اس نے ایک پھیکی ہنسی کے ساتھ کہا۔ میرے پاس پرانی یادیں ہیں۔ جس کے پاس کوئی یاد ہو۔ اس پر کسی موسم کا اثر نہیں ہوتا۔"

میری دلچسپی یکلخت بڑھ گئی۔ "تمہارا ماضی تو افسانوں سے لبریز معلوم ہوتا ہے۔"

مگر بوڑھے نے میری بات کی طرف توجہ نہ دی۔ آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا۔ مجھے صنوبر کے سایوں تلے رہنا پسند ہے۔ مجھ پرانے سایوں سے چند لمحے کی مسرت بھی شاق گزرتی ہے۔ جب ہی تو میں شہر میں مزدوری کرنے نہیں جاتا۔ میں ان سایوں تلے کشتی لئے ادھر ادھر پھرتا رہتا ہوں۔"

"کیا تم ہمیں اس راز سے آگاہ کر سکو گے کہ صنوبر کے سایوں سے تمہیں کیوں عشق ہے؟" میں نے التجا کے لہجہ میں پوچھا۔

"یہ کوئی راز نہیں۔" اس نے دم توڑتے ہوئے سورج کے مقابل ایک سیاہ تصویر بن کر کہا۔ "سبھی جانتے ہیں کہ مجھے صنوبر کے سایوں سے کیوں محبت ہے۔ اور کیوں میں اپنی زندگی کے آخری سانس ان کے نیچے ختم کرنا چاہتا ہوں۔"

جسوتی اور میں کہنیاں تکیوں پر رکھ کر متوجہ ہو گئیں۔ کشتی بہاؤ پر جا رہی تھی۔ بڈھا چپو ہاتھ میں تھامے بے پروائی سے اپنی کہانی کہہ رہا تھا۔

(۳)

"آج سے ستر سال پہلے کا ذکر ہے۔ کہ دنیا میری نظروں میں نوجوان تھی۔ زندگی کی ہر ہر کروٹ میں ہزاروں ہی دلفریبیاں محسوس ہوتی تھیں۔ میں غریب ملاح نہ تھا۔ ان پہاڑی علاقوں کا ایک خوشحال تاجر تھا۔

بہار کے موسم میں ایک دن شام کے آسمان پر سنہرا چاند ہنس رہا تھا۔ جب میں اسی روحناک کے ساحل پر انہیں صنوبر کے سایوں تلے چہل قدمی کے لئے نکل آیا۔

میری نظر پہاڑی حسن کے ایک نادر نمونہ پر پڑی...... ایک کمسن لڑکی پر جو صنوبر کے سائے تلے ایک سبز پتھر پر بیٹھی ایک ٹوکری بن رہی تھی۔ مجھ سے تفصیل کی رنگینی نہ مانگئے۔ رات کا اندھیرا اتر آئے گا۔ سمجھ لیجئے۔ میں خود وہاں نہ آیا تھا۔ مجھے وہ قوت وہاں کھینچ لائی تھی جو ہر نوجوان کے دل کو زندگی کے پھولوں کے درمیان کشاں کشاں لئے پھرتی ہے۔

ہم میں محبت شروع ہو گئی۔ ہم شباب کی ایک رنگین وارفتگی میں باہم محبت کرنے لگے۔ ہم ہر روز انہیں صنوبر کے کانپتے ہوئے سایوں تلے ملتے۔ اور اپنی آرزوئیں ایک دوسرے کے دھڑکتے ہوئے دل سے کہتے۔ بہت جلد ہماری شادی ہو گئی۔"

اسی وقت اچانک صنوبر کے درخت پر سے ایک ناشاد بلبل یکایک چلائی۔ بوڑھے نے مڑ کر اسے دیکھا اور پھر لرز کر کہا۔ "یہ دیوانہ پرند کیا کہہ رہا ہے؟ یہی نا؟ کہ محبت بہت ظالم چیز ہے۔"

جسوتی نے مجھے اور میں نے جسوتی کو چپ چاپ دیکھا۔ اس بوڑھے دل میں یقیناً کبھی شعر کے چشمے ابلتے رہے تھے۔ بوڑھے نے چند ہاتھ چپو کے چلائے اور ایک آہ بھر کر بولا۔

"شادی کے بعد چھ مہینے نہایت سنہرے گزرے۔ پھر ایک نحس خواب نے ہماری زندگی کا رخ پلٹا دیا۔

ایک صبح جونہی میری بیوی نے تکیے پر نیند سے آنکھیں کھولیں۔ تو اس لہجے میں بولی۔ میں نے ایک ہولناک خواب دیکھا ہے۔"

میری محبت کی نظروں نے اس سے پوچھا۔ "کیا خواب؟"

بیوی نے آہ کھینچ کر کہا۔ "میں نے رات تقدیر کے فرشتے کو دیکھا جو پہاڑوں کی بلندیوں پر اپنے پر ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا کہ اگر تم نے رات تک اپنے بالوں میں ایک کاسنی رنگ کا گلاب نہ سنوارا تو تمہارا گھر اجڑ جائے گا۔"

آج سے ستر سال پہلے دنیا بہت اوہام پرست تھی۔ چنانچہ بیوی کا یہ ہولناک خواب سن کر میرا عشق سہم سا گیا۔

میری پریشانی دیکھ کر بیوی بولی۔ "پر اتنے فکر کی کیا بات؟"

میں نے کہا۔ "فکر کیسے نہ ہو؟ شیریں تریں! کیا تجھے نہیں معلوم کہ کاسنی رنگ کا گلاب ان پہاڑی علاقوں میں نایاب ہے؟"

میری بیوی کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ "نایاب؟ پھر کیا کروں؟ کاسنی رنگ کا گلاب آج رات تک بالوں میں لگانا ضروری ہے۔ ورنہ ہمارا یہ مسکراتا ہوا گھر تباہ ہو جائے گا۔ فرشتے نے یہی کہا تھا۔"

نامعلوم اندیشوں سے گھبرا کر وہ رونے لگی۔ "میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا اور وعدہ کیا کہ اطراف کے علاقوں کے تمام باغوں میں شہر کے باغبانوں کو بھیجوں گا اور تاکید کروں گا کہ کسی نہ کسی طرح اسے دستیاب کر کے کاسنی رنگ کا ایک گلاب لے آئیں۔"

میری بیوی اپنے لمبے لمبے بال کھول کر نہانے کے لئے چشمے پر چلی گئی۔ تاکہ گلاب کے آنے سے پہلے بال سنوار لے۔

میں پریشانی کے عالم میں اسی وقت کاسنی گلاب کی تلاش میں نکل گیا۔ شہر کے ہر باغبان سے ملا۔ مگر ایک ایک نے کہا کہ اس علاقہ میں کاسنی رنگ کا گلاب کہیں نہیں مل سکتا۔ بیزار اور مایوس ہو کر میں حاکم شہر کے باغبان کے ہاں گیا۔ اپنی ضرورت اس کے آگے کہی۔ وہ بڑا ہی سفاک آدمی تھا۔ سوچ کر بولا۔ "کاسنی گلاب ہمارے باغ میں ہے تو۔ پر اس کی قیمت چھ اشرفی سے کم نہیں۔"

میں نے چھ اشرفیاں اس کی ہتھیلی پر رکھ دیں۔ اور کاسنی گلاب لے کر خوش خوش گھر پہنچا۔

میری بیوی کاسنی گلاب دیکھ کر باغ باغ ہو گئی اور مسکرا کر بولی۔ "اگر آج میں کاسنی گلاب بالوں میں نہ سنوار سکتی تو جانے ہم پر کیا مصیبت آتی۔"

میں نے کہا۔ "اسے فوراً بالوں میں لگاؤ۔"

نہ جانے اس نے کس خیال سے کہا۔ "میرے بال گیلے ہیں ابھی" "میں نہ لگاؤں گی۔ جب رات شروع ہو گی تو لگاؤں گی۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک بلوری صراحی میں پانی بھرا۔ اور پھول کو ہاتھ میں دیکھ کر تازہ ہوا کے خیال سے صراحی دریچے میں رکھ دی۔

میں دن بھر گلاب کی سرگردانی میں اپنے کام پر نہ جا سکا تھا۔ رات کے وقت جب گھر واپس آ رہا تھا۔ تو میرا پرانا دوست حمری مجھے میرے گھر کے قریب ہی مل گیا۔ اسے میں نے ادھر کئی ہفتوں سے نہ دیکھا تھا۔ خوش ہو کر گلے سے لگا لیا۔

"میں تمہارے ہی ہاں گیا تھا۔ تم نہ ملے تو مایوس ہو کر واپس آ گیا۔"

اس نے یہ جملہ ختم بھی نہ کیا تھا کہ میری نظر اس کی عبا کے کاج پر پڑ گئی۔ میرا خون میری رگوں میں جم گیا۔

میں نے یکلخت پوچھا۔ "حمری یہ کاسنی گلاب تمہیں کہاں سے ملا؟"

حمری طبعاً شوخ تھا۔ ہنس کر بولا۔ "کیوں؟ تمہیں کیونکر فکر پیدا ہوئی؟ میری محبوبہ نے مجھے تحفہ دیا ہے۔ نایاب چیز ہے۔"

میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا اور میں لڑکھڑا سا گیا۔ وہ خواب! تقدیر کا فرشتہ! اس کی پیشین گوئی! سب جھوٹ تھا! محض حمری کی عبا کا کاج سجانے کے لئے میری بیوی نے یہ رنگین جھوٹ تراشا تھا۔ ہائے ظالم زندگی! سنگدل زندگی!"

(۴)

میں غصہ میں کانپتا ہوا گھر پہنچا۔

مجھے دیکھتے ہی میری بیوی دوڑی دوڑی آئی۔ اور اشک آلود آنکھوں سے بولی۔ "افسوس! بدبختی دیکھو کہ وہ پھول غائب ہو گیا۔ اے خدا! میں اب کیا کروں؟ ہم پر ضرور مصیبت نازل ہو گی۔"

"ضرور نازل ہو گی۔" میں نے گرج کر کہا۔ "موت سے زیادہ بڑی مصیبت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ سمجھ لو کہ تمہاری موت آ گئی۔"

بیوی حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگی۔ مگر اس وقت مجھے اس کی ایک ایک حرکت سے عیاری ٹپکتی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے پھر چیخ کر کہا۔ "تمہاری موت آ گئی۔ تقدیر کے فرشتے کی پیشین گوئی کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

وہ متعجب ہو کر بولی۔ "تم کیا کہتے ہو؟ ایسا نہ کہو۔ خدا کے لئے کاسنی گلاب کو ڈھونڈو۔ میں نے اسے باغ کی دریچی میں تازہ ہوا کے لئے رکھ دیا تھا۔ اندر بال سنوارنے گئی تھی۔ واپس آکر دیکھتی ہوں۔ تو پھول وہاں نہ تھا۔"

اُس کی ان مکار باتوں نے میرے تن بدن میں شعلے بھڑکا دیئے۔ میں نے اُس کے نرم بازوؤں کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ اور اس زور سے دیوار پر دھکا دیا۔ کہ ٹکر کھا کر اس کے سر سے خون کا ایک سرخ فوارہ پھوٹ نکلا۔

راتوں رات میں نے اسے اسی صنوبر کے سائے تلے دفنا دیا جہاں اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔

ایک جنون کی بے اختیاری میں میں گھر کی طرف لوٹ رہا تھا۔ کہ اتفاق سے میرا دوست حمری پھر مجھے ایک گلی کے موڑ پر مل گیا۔ اسے دیکھتے ہی میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔

وہ ہنس کر بولا۔ "تمہاری آنکھیں ایسی سرخ ہو رہی ہیں جیسے تم خون کر کے آئے ہو۔"

وہ اس طرح باتیں کر رہا تھا گویا میں اس کے راز سے ناواقف ہوں۔

میں نے لپک کر اس کا گریبان پکڑ لیا اور بولا۔ "بدمعاش! تو سمجھتا ہے کہ میں نے خون نہیں کیا؟ میں اسے ٹھکانے لگا چکا ہوں۔"

یہ کہہ کر کاسنی رنگ کا گلاب میں نے اس کی عبا کے کاج سے نوچ کر زمین پر دے مارا' اور اپنے جوتوں کی مجنونانہ حرکت سے مسل ڈالا۔

حمری آنکھوں میں وحشت لئے میرا چہرہ تک رہا تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ میں نے اس کی محبوبہ کا خاتمہ کر دیا۔ اور اب اس کا کام تمام کر دینے پر آمادہ ہوں۔ تو اس نے ایک دلدوز چیخ ماری۔ اور کہنے لگا۔ "کوتاہ اندیش اور جلد باز! تو بدبخت ہے! وہ گلاب تو میں نے سڑک پر سے اٹھایا تھا۔ میں بازار میں سے گزر رہا تھا کہ گلاب کا پھول دیکھ کر اٹھا لیا۔ شاید تمہارے ہی دریچے سے نیچے گر پڑا ہو۔"

یہ سنکر میری آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ ایک ایسا اندھیرا ـــــ جس نے آج تک دنیا کی نیرنگیوں کو مجھ سے

و تصل کر رکھا ہے۔

(۵)

تقدیر کے فرشتے کا کہنا درست نکلا۔ میری بیوی اس رات کاسنی گلاب اپنے بالوں میں نہ سنوار سکی۔ ہمارا گھر میری بے وقوفی اور ضد بازی کے ہاتھوں تباہ ہو گیا۔

آج اس قصے کو ستر سال گزر گئے۔ مگر میں اپنی غلطی پر نادم اس مٹی کی پرستش کر رہا ہوں جس میں ان صنوبر کے سایوں تلے میری محبت دفن ہے۔"

کشتی ساحل سے آ لگی۔

———

نیا مریض

ایم اسلم

ہوا بھی کچھ بجھی بجھی تھکی تھکی تھی ندی بھی ممکن ہے تھم گئی ہو
ستارے آنکھیں جھپک رہے تھے چاند پھیکا پڑا ہوا تھا
سونے والی کے گیسوؤں کی مہک تھی کمرے میں بھینی بھینی
سانس رک رک کے آ رہا تھا سینہ اٹھتا تھا بیٹھتا تھا
وہ خواب میں کر رہی تھی ماتم لٹی لٹی سی جوانیوں کا!
کہ گورے گورے سے اس کے گالوں پہ ایک آنسو چمک رہا تھا

سائے ڈھل چکے تھے۔ سینی ٹوریم کے دروازے پر ایک کار آ کر رکی۔ ایک جوان لڑکی۔ ایک بھاری بھر کم عورت۔ خادمہ اور ایک نوکر اترے۔ دو تین سوٹ کیس بستر اور کچھ اور سامان بھی ساتھ۔ مزدور ادھر اُدھر سے بھاگ کر آ گئے اور موٹر پر سے اسباب اتار نے لگے۔ لڑکی نے فاختئی رنگ کی ساری پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں ملے جلے رنگ کی لفٹی ہیل کا سینڈل تھا۔ پتلی پتلی گوری گوری کلائیوں سے سونے کی باریک باریک چوڑیاں تھیں۔ بائیں ہاتھ کی کلائی میں سونے کی ایک خوبصورت گھڑی تھی۔ اور سیاہ رنگ کا فیتہ گوری گوری نازک کلائی میں بہت بھلا معلوم ہو تا تھا۔ پتلی پتلی انگلیوں میں جڑاؤ انگشتریاں تھیں۔ ناخن کیو ٹکس سے سرخ ہو رہے تھے۔ کانوں میں مرصع آویزے تھے اور گلے میں خوبصورت لاکٹ۔ چھوٹا سا قد پتلے پتلے نازک ہونٹ۔ نرگسی آنکھیں۔ صراحی دار گردن۔ ریشم ایسے لامبے بال اور ان خوبصورت بالوں میں ہلکی سنہری جھلک۔ بیس بائیس سال عمر۔ لیکن اس عمر میں حسن کا کارواں لٹا لٹا معلوم ہو تا تھا۔ شکل و صورت صاف بتلا رہی تھی کہ مریضہ یہی ہے۔

اور اس بھاری بھر کم عورت کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہو گی۔ لباس بھی صاف ستھرا تھا۔ بدن پر سونے کے دو چار زیور بھی تھے۔ چہرہ کو کچھ بے رونق سا تھا۔ لیکن بڑے ٹھسے کی عورت معلوم ہوتی تھی۔ سینی ٹوریم کے ایک ملازم نے پاس آ کر پوچھا:

"آپ نے کوئی کمرہ لے رکھا ہے یا علیحدہ انتظام ہے۔"

"ہاں" بڑی بی نے جواب دیا۔ "علیحدہ مکان کا انتظام ہے۔ موتی رام بانئے کی دوکان کہاں ہے؟"

"یہ دس قدم آگے جاکر بازار کی نکڑ پہ ہے۔" ملازم نے کہا "کس کی معرفت مکان لیا ہے آپ نے؟"

"ہاں!" بڑھیا نے جواب دیا۔ "اسی کو لکھا تھا۔"

"مکان تو ایسے بھی مل سکتا تھا۔" نوکر نے کہا۔

"خیر!" بڑھیا بولی۔ "پسند نہ ہوا تو اور دیکھ لیں گے۔ تم یہاں کام کرتے ہو۔"

"جی ہاں!" ملازم نے جواب دیا۔

"ڈاکٹر کیسا ہے۔" بڑھیا نے پوچھا۔

"بہت اچھا آدمی ہے" ملازم نے جواب دیا۔ "پادری ہے۔"

"کس وقت مل سکیں گے؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"جب بھی آپ چاہیں۔" ملازم نے کہا۔ "آپ اسباب ٹھکانے سے رکھ لیں پھر ان سے مل لیں۔"

"کھانے پینے کی چیزیں تو مل سکیں گی یہاں؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"جی ہاں!" ملازم نے جواب دیا۔ "بازار ہے برابر میں۔ سب کچھ مل جاتا ہے۔ سبزی۔ دودھ۔ مکھن۔ گاؤں والے خود لے آتے ہیں۔"

"اچھا بیٹا جیتے رہو۔" بڑھیا نے مسکرا کر کہا۔ پھر نوکر سے جو ایک پتھر پر بیٹھا باتیں سن رہا تھا۔ "تم بے چھدے! موتی رام کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ بی بی نصیبن آئی ہیں اور مکان کا پوچھتی ہیں۔"

نوکر بازار کی طرف چلا گیا۔ نصیبن نے لڑکی سے جو ایک بستر پر بیٹھی پہاڑوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پوچھا۔ "انوری! تمہارے چلنے کا انتظام کیا ہوگا۔ چڑھائی نظر آ رہی ہے۔"

"پہلے مکان کا تو پتہ چلے۔" انوری نے کچھ روکھے پن سے جواب دیا۔ "پھر چڑھائی کا بھی دیکھ لیں گے۔"

نصیبن نے نوکرانی سے کہا۔

"مہری! مہرالن! اونگھ رہی ہے کیا۔ انور کو پان تو بنا دے۔"

"مجھے نہیں چاہیے۔" انوری نے ذرا کھانستے ہوئے کہا۔

مہرالن مسکرا کر بولی۔

"آج تو انوری بی بہت تھک گئی۔"

"تو مجھے ہی ایک بنا دے۔" نصیبن نے کہا۔

مہرالن پاندان کھول کر پان لگانے لگی۔ انوری نے کلیا میں سے دو ایک الائچیاں اٹھا لیں۔ اتنے میں چھدو ایک آدمی کو ساتھ لے کر آ گیا۔ اور مزدوروں سے اسباب اٹھانے کو کہا۔ مزدور اسباب اٹھانے لگے۔

"چلو اب تم بھی۔" چھدو بھی ایک ٹوکری اٹھاتے ہوئے بولا۔ "کچھ دور نہیں جانا" اور انوری نے ذرا تیوری چڑھا کر کہا۔

"پہلے یہ تو بتاؤ۔ مکان ہے کہاں۔ کتنی دور ہے۔ چھوٹے منہ سے کچھ کہو گے بھی۔"

"الٰہی خیر!" چھدو کان کو ہاتھ لگا کر بولا۔

اور نصیبن بھی ذرا غصے سے بولی۔

"اے بکتا کیوں نہیں۔ کہاں ہے مکان۔ انوری کیسے جا سکے گی!"

"بی بی!" چھدو بھی ذرا اکڑ کر بولا۔ "میں دیکھ تھوڑی ہی آیا ہوں۔ یہ آدمی ساتھ آیا ہے بتاوے گا۔"

"کیوں بھیا!" نصیبن نے اس آدمی سے پوچھا۔ "کتنی دور چلنا ہو گا۔"

اس نے چیڑھ کے درختوں کے ایک جھنڈ کی طرف ہاتھ سے بتا کر کہا۔

"ان درختوں کے پاس ہے۔ بہت اچھا مکان ہے۔ کوئی دس ایک منٹ میں پہنچ جائیں گے۔"

"ہم تو پہنچ جائیں گے!" مرادن بولی۔ "لیکن لڑکی کیسے جا سکے گی؟"

"بالکل سیدھا راستہ ہے۔" قلیوں میں سے ایک بولا۔ "معمولی چڑھائی ہے۔"

"چلو" انوری اٹھتے ہوئے بولی۔ "وہ موا موتی رام خود کیوں نہ آیا۔"

تو خیر! کچھ اسباب قلیوں نے اٹھایا۔ کچھ چھدو نے سنبھالا۔ ایک آدھ چیز مرادن نے پکڑی۔ بی نصیبن نے پاندان لیا اور اس طرح یہ چھوٹا سا قافلہ منزل کی طرف چلا۔

ہسپتال سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ ساتھ ساتھ تین کمرے تھے۔ گو کچا مکان ہی تھا۔ لیکن خاصا صاف ستھرا اور ہوادار تھا۔ شمال کی جانب برآمدہ تھا۔ مکان سے کوئی دس ایک قدم کے فاصلے پر ایک اور کوٹھری تھی۔ یہ باورچی خانے کا کام دے سکتی تھی۔ اور گدام کا بھی۔ برآمدے میں تین چار چارپائیاں رکھی تھیں۔ اس کے علاوہ سامان نہ تھا۔ شمال کی جانب کہسار کا نظارہ بہت دلفریب تھا۔ پہاڑ کے دامن میں کسانوں کی مہکتی ہوئی ہری بھری کھیتیاں تھیں اور عقب میں چیڑھ کے درخت تھے۔ اور ایک پہاڑی ندی کسی شوخ اور چنچل حسینہ کی طرح اچھلتی کودتی مکان کے پاس سے گزرتی تھی۔ ادھر ادھر اور بھی چھوٹے چھوٹے مکان تھے۔ یہی سینی ٹوریم تھا۔ اور ان میں مریض رہتے تھے۔

چھدو اور مرادن نے جلدی سے ایک کمرے میں دری بچھائی اور چارپائی ڈال کر بستر جما دیا۔ انوری لحاف اوڑھ کر لیٹ گئی۔ اور مرادن دبانے لگی۔ نصیبن نے قلیوں سے اسباب ٹھکانے سے رکھوا دیا۔ پھر انوری کے پاس آئی اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"بیٹی! طبیعت تو اچھی ہے۔"

"اچھی ہوں۔" انوری نے جواب دیا۔

مرادن بولی۔

"تم نے جلدی کی۔ ہسپتال سے مریضوں کو اٹھانے کی کرسی منگوا لی ہوتی۔"

"ٹھیک کہا تم نے۔" نصیبن بولی۔ خیال ہی نہ آیا۔ خیر! اب اٹھو تم کچھ کھانے کا کرو۔ پہلے چائے تیار کر لو۔ بازار سے دودھ ابھی

آ جاتا ہے۔ سرسوتی اٹھ کر باورچی خانے کو چلی گئی۔

سورج پہاڑوں کی اوٹ میں چھپ رہا تھا۔ انوری برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ وادیوں میں بادل نے چھاؤنی چھائی تھی۔ تارپین کی خوشبو فضا میں پھیل رہی تھی۔ نصیبن نے ڈاکٹر کو بلا بھیجا تھا۔ اور اب اس کا انتظام ہو رہا تھا۔ سورج غروب ہونے سے پہلے ڈاکٹر آیا۔ اس کے ساتھ اس کی میم اور ایک ہندوستانی ڈاکٹر بھی تھا۔ نصیبن اور انوری نے اٹھ کر سلام کیا۔ چھدو دو اور کرسیاں اٹھا لایا۔ ڈاکٹر اور اس کی میم دونوں بیٹھ گئے۔ نصیبن اور دوسرا ڈاکٹر کھڑے رہے۔

ڈاکٹر کی میم نے انوری کی طرف دیکھ کر شوہر سے کہا۔

"ہاؤ ویری بیوٹی فل شی از! (لڑکی کتنی خوبصورت ہے)

اور ڈاکٹر نے کہا۔

"بٹ لکس سک!" (لیکن بیمار معلوم ہوتی ہے)۔

ڈاکٹر کے جو بہت اچھی ہندوستانی بولتا تھا۔ پوچھنے پر نصیبن نے بتلایا کہ انوری اس کی اکلوتی بیٹی ہے۔ چار پانچ مہینے سے کھانسی کی شکایت ہے۔ کسی وقت بخار بھی ہو جاتا ہے۔ اور ڈاکٹروں کے مشورے سے بیٹی کو سینی ٹوریم میں علاج کے لئے لائی ہوں۔

ڈاکٹر نے انوری سے پوچھا۔

"بخار کس وقت ہوتا ہے اور کتنا ہوتا ہے۔"

انوری نے کہا کہ کبھی دوپہر کو ہو جاتا ہے۔ کبھی شام کے وقت ٹمپریچر کبھی سو کبھی ایک سو ایک ہو جاتا ہے۔

"نیند کیسے آتی ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"بہت کم!" انوری نے جواب دیا۔ "اور کھانسی بھی رات کے وقت ہی زیادہ پریشان کرتی ہے۔"

ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔

"فکر مت کرو۔ اچھی ہو جاؤ گی۔ کل نو بجے ہسپتال میں معائنہ کرنے کے بعد دوا تجویز کی جائے گی۔"

نصیبن ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"حضور! میری بیٹی اچھی ہو جائے تو عمر بھر لونڈی بن کر رہوں گی۔"

ڈاکٹر کی میم نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا ہو جائے گا۔ اس کا شادی ہو گیا؟"

نصیبن نے کہا کہ ہم ناچنے گانے کا کام کرتے ہیں۔ یہی ایک لڑکی زندگی کا سہارا ہے۔

"ہم کو کسی روز ناچ دکھاؤ گی؟" میم نے انوری سے پوچھا۔

انوری مسکرانے لگی۔ نصیبن نے کہا۔

"میری بچی اچھی ہو جائے گی۔ تو ضرور دکھاؤں گی۔"

انوری کو سینی ٹوریم میں آئے بہت روز ہو چکے تھے۔ باقاعدہ علاج اور پرہیز سے اس کی صحت دن بدن اچھی ہو رہی تھی۔ لیکن وہ ہر وقت کچھ اداس اداس سی رہتی۔ پہاڑوں کے سکوت میں اسے گزرے ہوئے ایام کی یاد بہت ستاتی۔ رامش و رنگ کی مجلسیں، قدر دانوں کی قدر افزائیاں۔ چاہنے والوں کی ناز برداریاں، منتیں۔ خوشامدیں اور بے قراریاں بات بات پر قسم کھانا۔ وفا کے قول و قرار۔ نت نئے تحائف۔ نئی سوغاتیں۔ دلداریاں اور دلنوازیاں کوئی زیور بنوا کر لا رہا ہے۔ کسی کے ہاں سے ساری آرہی ہے۔ کوئی سیر کرنے کو موٹر بھیج رہا ہے۔ لیکن ایک انوری ہے جو سب کی ہے اور کسی کی بھی نہیں۔ ایک دل کس کس کو دے ایک جان کس کس کی نذر کرے۔ دین ایمان! صرف روپیہ! روپیہ! جس کی جیب بھاری وہی سب پہ بھاری۔

وہ گلابی باغ کی رات! چھٹکی ہوئی چاندنی۔ سیماب کی طرح حوض کا چمکتا ہوا پانی۔ اور رامش و رنگ! وہ نگاہوں کے تیر اور اہل محفل کی بیقراریاں! وہ رات! وہ دلفریب رات!

رات کا وقت تھا۔ انوری پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ چھدا برآمدے میں لحاف میں لیٹا خراٹے بھر رہا تھا۔ نصیبن ساتھ کی کوٹھڑی میں سوئی ہوئی پھنکارے مار رہی تھی۔ اور انوری کے پاس مرادن فرش پر سوئی ہوئی تھی۔ کمرے کے دونوں کواڑ بند تھے۔ لیکن کھڑکی جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کھلی تھی۔ چاندنی چیڑھ کے درختوں میں سے چھن کر آرہی تھی۔ ہر طرف خاموشی اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اور پہاڑی ندی فراق کی راگنی الاپتی مکان کے پاس سے گزر رہی تھی اور انوری ایک خواب دیکھ رہی تھی۔ ایک حسین خواب۔

شہر کے ایک مشہور سیٹھ کا بیٹا بدری ایک مدت سے انوری پر جان چھڑکتا تھا۔ مکان پر آتا۔ گانا سنتا اور سو پچاس نذر کئے۔ اور چلا گیا۔ کچھ روز اسی طرح گزر گئے پھر تحائف آنے شروع ہوئے۔ اور وہ بھی بن مانگے کبھی کوئی زیور پیش ہو رہا ہے۔ کبھی کوئی قیمتی ساری نذر ہو رہی ہے۔ کبھی انوری کے لئے قسم قسم کے ملبوسات بن رہے ہیں۔ سہیلیوں کے ساتھ سینما جانا ہو یا کہیں سیر و تفریح کو تو موٹر بھیجا جا رہا ہے۔ کبھی نصیبن آٹے کی بوری منگوا رہی ہے۔ کبھی گھی کا کنستر آرہا ہے۔ کبھی یہ کبھی وہ! کیا مجال جو ایک روز بھی خالی جائے۔ اور نہیں تو دو چار روپے کا پھل تو کہیں گیا نہیں۔ یہ سب کچھ تو ہے لیکن تخلیہ میں انوری سے بات کرنا کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ نصیبن سو عیاروں کی ایک عیار۔ ادھر انوری کو ہنسکر بات کرنے میں حجاب اور بدری حرف مطلب زبان پر لانے کے لئے بیتاب۔ وقت اسی طرح گزر رہا تھا۔ انوری کے ناچ گانے کی دور دور تک دھوم تھی۔ گلے میں رس اور آواز میں کوئل کا سوز تھا۔ اور وقت کی مشہور گانے والیوں میں شمار ہوتی تھی۔ دور دور سے ناچ گانے کے پیغام آرہے ہیں۔ مہینے میں دس روز گھر تو بیس روز باہر۔ لیکن سفر کے تمام اخراجات بدری کی جیب سے نکل رہے ہیں۔

ادھر انوری کہیں سے واپس آئی۔ ادھر بدری کا نوکر جو پل پل اور گھڑی گھڑی کی خبر رکھتا تھا۔ آیا۔ لیکن جواب کیا لے کر گیا۔

"سیٹھ جی سے ہماری طرف سے ہاتھ جوڑ کر کہنا کہ ابھی تو انوری بہت تھکی ہوئی ہے۔ دو ایک روز بعد تشریف لائیں۔"

اور ادھر انوری کسی اور کی آغوش میں بیٹھی مکر اور فریب کے جادو جگا رہی ہے۔

اسی اثنا میں بدری کا باپ مر گیا اور بی نصیبن کے لئے وہی بات ہوئی کہ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ اب بدری کی مراد بھی بر آئی۔ اور اس خوشی میں بدری نے گلابی باغ میں اپنے دوستوں کو دعوت دی۔ آج انوری کی سج دھج دیکھنے کے قابل تھی۔ اور نصیبن بھی رانی بنی ہوئی تھی۔ شہر کی دو ایک اور بھی گانے والیاں بلائی گئی تھیں۔ جب وہ گا چکیں تو انوری کی باری آئی۔ انوری کے ناچ نے سب کو مسحور

کر دیا۔ پھر اس نے کچھ گا کر سنایا۔ آج انوری پر اتنے روپے نچھاور ہوئے کہ نصیبن کی جھولی بھر گئی۔ انوری اور اس کی ماں نصیبن تو شاداں و خنداں گھر آئیں۔ لیکن دوسری گانے والیاں ایک داغِ حسرت لے کر لوٹیں۔

لیکن آج وہی انوری جس پر کبھی یہ مثال صادق آتی تھی۔ کہ ایک انار و صد بیمار۔ آج خود بیمار تھی۔ اور چاہنے والوں میں سے کسی ایک کو بھی اس کی خیر خیریت پوچھنے کا خیال نہ آیا۔ نہ کوئی سندیسہ۔ نہ پیام نہ خط۔

انوری سو رہی تھی۔ ہوا ابھی شاید کچھ تھکی تھکی سی تھی۔ اور ندی بھی غالباً ٹھہر گئی تھی۔ ستارے آنکھیں جھپک رہے تھے۔ چاند چھپا پڑا تھا۔ اور سونے ولی کے سنہری رنگت والے خوبصورت بالوں کی مہک کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ سانس رک رک کر آ رہا تھا۔ اور سینہ ابھرتا اور بیٹھتا معلوم ہوتا تھا۔ شاید انوری خواب میں اپنی اجڑی جوانی کا ماتم کر رہی تھی۔ کیونکہ اس کی پلکوں کے سائے میں دو موتیوں کی طرح چمک رہے تھے۔

انوری کا وقت عموماً گھومنے پھرنے میں گزرتا تھا۔ دھوپ ہوتی تو وہ ندی پر جا بیٹھتی۔ کبھی تنکے اٹھا اٹھا کر پانی میں پھینکتی کبھی کاغذ کی ناؤ بنا بنا کر ندی میں بہاتی اور میٹھے میٹھے گیت گاتی۔ وہ گیت جس کے سننے کو کبھی ایک دنیا بیتاب رہتی تھی۔ لیکن اب اسے دنیا پر کوئی اعتبار نہ تھا۔ وہ اپنے چاہنے والوں کے نام سے بھی بیزار معلوم ہوتی تھی۔ اور تو اور اسے اپنی ماں سے بھی اب نفرت تھی۔ وہ ماں جس کے لالچ اور ہوس نے اسے اس حال پر پہنچا دیا تھا۔ نصیبن کا دین ایمان خدا جو کچھ بھی تھا۔ پیسہ تھا۔ اور لوگوں کی جیب سے پیسہ کھینچنے کے لئے اس کے پاس ایک مقناطیس بھی تھا۔ اور اس مقناطیس کا نام تھا انوری۔ لیکن تابہ کے! حد سے بڑھی ہوئی بے اعتدالیوں نے اب انوری کو بھی موت کے گھاٹ پر لا کھڑا کیا تھا۔

انوری نے تھوڑے ہی دنوں میں گاؤں کی عورتوں سے بھی راہ و رسم پیدا کر لی تھی۔ گاؤں میں بھی دس بارہ گھر تھے۔ انوری جب کسی کے گھر جاتی تو اڑوس پڑوس کی عورتیں بھی آ جاتیں۔ ان عورتوں سے انوری کو باتیں کرنے میں بہت لطف آتا۔ وہ ہنستی تو دوسری عورتیں بھی ہنسنے لگتیں۔ ہر ایک کو یہی تمنا ہوتی کہ وہ کبھی ان کے گھر میں بھی آ جائے۔

ایک روز جو وہ گاؤں میں گئی تو اسی گوالے کے ہاں جو انھیں دودھ دیا کرتا تھا۔ جا بیٹھی۔ دو ایک روز سے دودھ اچھا نہیں آتا تھا اس لئے وہ شکایت کرنے گئی تھی۔ گوالا تو موجود نہ تھا لیکن اس کی بیوی موجود تھی۔ جب انوری نے اس سے کہا کہ معلوم ہوتا ہے کہ تم دودھ میں پانی ملا کر لاتے ہو۔ تو گوالے کی بیوی نے کہا۔

"بی بی! قسم لے لو جو ہم نے کبھی آج تک دودھ میں ایک قطرہ بھی پانی کا ملایا ہو۔ دودھ تو خدا کا نور ہوتا ہے۔ اتنا ظلم کر کے کسی نے دوزخ مول لینا ہے کیا۔ ایسے کام تو شہر والے ہی کرتے ہیں۔"

"تو جو!" انوری نے ہنس کر پوچھا۔ "تم ہم لوگوں کو بہت برا سمجھتی ہو۔"

"بی بی!" گوالن بولی۔ "خدا نہ کرے تم بری ہو لیکن شہر والے تو سنتی ہوں خدا کو بھی بھولے رہتے ہیں۔ اور ایک ہم لوگ ہیں کہ بس اسی کے سہارے ان بنوں میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں۔"

"تمہارا دل یہاں کیسے لگتا ہے۔" انوری نے پوچھا۔

"وطن جو ہوا!" پاس سے ایک اور نے کہا۔ "وطن کسے پیارا نہیں ہوتا۔"

ایک اور نے پوچھا۔

"بی بی! تمہارا بیاہ نہیں ہوا ابھی۔"

"ہو چکا۔" انوری ہنس کر بولی۔ "مدت ہو گئی۔"

"تمہارا شوہر ساتھ نہیں آیا ہو گا۔" اس نے پوچھا۔

"نہیں!" انوری نے جواب دیا۔

"کہیں شہر میں ملازم ہو گا۔" ایک اور نے پاس سے کہا۔

اور انوری نے ہنس کر کہا۔

"مجھے معلوم نہیں۔ چھوڑ دیا میں نے۔"

"چھوڑ دیا؟" ایک دو عورتوں نے تعجب سے پوچھا "طلاق لے لی کیا۔"

"نہیں!" انوری نے ہنس کر کہا۔ "میں نے طلاق دے دی۔"

"بن نہ آئی ہو گی۔" ایک بڑھیا نے کہا۔

ایک اور بولی۔

"تو پھر اور شادی نہیں کرو گی؟"

"کی تھی۔" انوری نے جواب دیا۔ لیکن اسے بھی چھوڑ دیا۔

سب عورتیں ہنسنے لگیں۔ گوالن بولی۔

"جب ساتھ نہیں آیا تو چھوڑنا ہی ہوا نا۔"

اور انوری نے ہنس کر کہا۔

"نکال دیا اسے بھی گھر سے۔"

یہ کہہ کر وہ ہنستی ہوئی اٹھی۔ اور واپس چلی گئی۔

اسی گاؤں میں ایک جوان لڑکا بھی رہتا تھا۔ یہی بیس اکیس کے لگ بھگ عمر ہو گی۔ اس کا نام تھا میر عالم۔ میر عالم کو ایک مفلس بڑھیا کا مفلس بیٹا تھا۔ لیکن قدرت نے اسے مردانہ حسن عطا کرنے میں بخل سے کام نہ لیا تھا۔ میر عالم گاؤں کی گائیں بھینسیں چراتا اور اس کے عوض اسے دونوں وقت کی روٹی مل جاتی اور فصل ہونے پر کچھ اناج۔ انوری جب گاؤں میں آتی تو میر عالم کچے اخروٹ انوری کے لئے توڑ کر لاتا۔ اور وہ بھی اسے کبھی دونی کبھی چونی دے دیتی۔ کبھی کبھی میر عالم سڑک تک بھی اس کے ساتھ آ جاتا۔

ایک روز انوری ندی کے کنارے بیٹھی تھی۔ ہوا چیڑھ کے درختوں میں سنک رہی تھی۔ اور دھوپ پتوں سے چھن چھن کر آرہی تھی۔ اتنے میں کہسار کے سکوت میں کہیں دور بنسری کی سریلی آواز جادو جگانے لگی۔ انوری نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ لیکن بنسری بجانے والا کہیں نظر نہ آیا۔ لیکن آواز بتدریج نزدیک چلی آرہی تھی۔ اچانک انوری نے میر عالم کو دیکھا۔ میر عالم اپنی دھن میں بنسری بجاتا چلا آرہا تھا۔ لیکن جب اس نے انوری کو دیکھا تو بنسری بجانی چھوڑ دی۔ اور اُس کے پاس آکر اپنے پھٹے ہوئے کرتے کی جیب سے ایک بھنا ہوا [illegible] کہا۔

"یہ لو گرم [illegible]۔"

انوری نے مسکرا کر پوچھا۔

"تم کھانا اپنے لئے ہی تو لائے ہو گے۔"

"نہیں!" میر عالم نے سادگی سے جواب دیا۔ "تمھارے لئے لایا ہوں۔"

"لیکن اس وقت میرے پاس تو کوئی پیسہ نہیں۔" انوری نے جواب دیا۔

"میں پیسے لینے کو نہیں لایا۔" میر عالم نے جواب دیا۔ "میں بھکاری نہیں۔ محنت کرتا ہوں اور روزی کماتا ہوں۔"

"نہیں! نہیں!" انوری نے کہا "میرا یہ مطلب نہیں۔ لیکن اگر کوئی کسی سے چیز لے تو اس کی قیمت تو دینی چاہیئے۔"

"امیر لوگ یوں ہی کہا کرتے ہیں۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"لیکن میں تو امیر نہیں۔" انوری نے ہنس کر کہا۔

میر عالم کے ایک ہاتھ میں بھٹا تھا۔ دوسرے میں جنس کی۔ اس کے چہرے پر [illegible] تھی چھوٹی چھوٹی خمدار مونچھیں تھیں۔ داڑھی منڈی ہوئی تھی۔ چوڑا چکلا سینہ تھا۔ لیکن اس [illegible] تھا [illegible] تھا
ذرا گھبرا کر۔ انوری نے اس سے بھٹا لے لیا اور دانتوں سے نوچ نوچ کر کھانے لگی۔

"سچ کہتے ہو۔" انوری نے پوچھا "تم میرے ہی لئے بھون کر لائے ہو۔"

"ہاں!" میر عالم نے جواب دیا۔ "تمھارے لئے۔"

"لیکن تم نے کیسے جانا کہ میں اس وقت تمھیں ندی پر ملوں گی۔" انوری نے پوچھا۔

"میں نے کئی بار تمھیں یہاں بیٹھے دیکھا ہے۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"چھپ چھپ کر دیکھا کرتے ہو گویا؟" انوری نے ہنس کر کہا۔

"مجھے چھپ کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"لیکن!" انوری نے پھر پوچھا "تم مجھے دیکھا کیوں کرتے تھے۔"

"جو چیز آنکھوں کے سامنے آجائے۔ انسان اسے دیکھ ہی لیتا ہے۔" میر عالم نے جواب دیا۔

انوری بولی۔

"بھٹا تو میں نے کھالیا۔ لیکن اگر پیٹ میں درد ہوا تو پھر۔"

ایک بھٹا کھالینے سے کیا۔ میر عالم نے تعجب سے کہا۔ "مجھے تو جتنے بھی ملیں کھالیتا ہوں۔"

"تم تگڑے آدمی ہو؟" انوری نے مسکرا کر کہا "میں بیمار ہوں۔ مجھے ڈاکٹر نے ایسی چیزیں کھانے سے منع کر رکھا ہے۔"

"تو پھر تم نے کھایا کیوں!" میر عالم نے کہا۔

"کوئی اگر محبت سے کچھ دے تو کیسے انکار ہو سکتا ہے۔" انوری نے جواب دیا۔

میر عالم نے کچھ جواب نہ دیا۔ انوری بولی۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"میں ڈر رہا ہوں کہیں تمھیں پیٹ میں درد نہ ہونے لگے۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"ڈرو نہیں!" انوری بولی۔ "جو چیز محبت سے کوئی کھلا دے اس سے تکلیف نہیں ہوتی۔ تم بھی تو محبت ہی سے لائے تھا۔"

میر عالم صرف مسکرا دیا۔ انوری بولی۔

"تم بنسری تو خوب بجا لیتے ہو۔"

"تم سنو گی؟" میر عالم نے اشتیاق سے پوچھا۔

"ہاں!" انوری نے جواب دیا۔ "سنوں گی۔ بجاؤ تو۔"

میر عالم بھی ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اور بنسری بجانے لگا۔ اور انوری پھر کھوئی ہوئی محبت کے خواب دیکھنے لگی۔

میر عالم کو انوری سے باتیں کرنے کا بہت شوق تھا۔ یہ تو میر عالم کو معلوم ہو گا۔ لیکن انوری کو آج پھر وہی فریبوں کی دنیا آباد کرنے کے سامان نظر آ رہے تھے۔ وجہ سے یہاں آئی تھی۔ اس کا ننھا سا دل ہمیشہ مرجھایا رہتا۔ یہاں وہ دن کو ملنے والے سو سو پھیرے ڈال رہے تھے جگہ جگہ سے بلاوے آ رہے ہیں۔ ایک جاتا ہے دوسرا آتا ہے۔ اور یہاں آ کے یہ حالت کہ دل بہلانے کا کوئی سامان ہی نہیں۔ لیکن قدرت کو شاید اس پر پھر رحم آ گیا تھا۔ جو اس نے دل لگی کے لئے میر عالم کو اس کے پاس بھیج دیا تھا۔ میر عالم جوان تھا۔ خوبصورت تھا۔ اور سادہ لوح تھا۔ تو پھر میر عالم ہی انوری کے لئے کھلونا کیوں نہ بنے۔ بیٹھا بیٹھا چلتا پھرتا۔ ہنستا بولتا کھلونا۔ اور اس نوجوان کے دل میں محبت کی گرمی پیدا کر دینا تو انوری کے بائیں ہاتھ کا کرتب تھا۔ اور نہیں تو وقت تو اچھا کٹ جائے گا۔

اور ہو سکتا ہے کہ انوری کی بیچارگی اور مایوسی پر قدرت نے ترس کھا کر اسے سنبھلنے کا ایک موقع دیا ہو۔ اور میر عالم کے ذریعہ اس کا امتحان لینا چاہتی ہو بہر کیف واقعات سے خود بخود روشن ہو جائے گا کہ عورت کی فطرت بدل سکتی ہے یا نہیں۔

تو خیر! انوری نے تھوڑے ہی دنوں میں میر عالم سے تعلقات کچھ اس قدر بڑھا لئے کہ اب وہ اس کا کلمہ پڑھنے لگا۔ جب دیکھو دونوں اکٹھے نظر آتے۔ کبھی انوری کسی درخت کی شاخ پر بیٹھتی اور میر عالم شاخ کو پکڑ کر جھولا دیتا۔ اور انوری جھولا جھولتی۔ کبھی دونوں بچوں کی طرح آنکھ مچولی کھیلتے۔ کبھی میر عالم بنسری بجاتا اور انوری گاتی۔ کبھی دونوں مل کر جھومر ڈالتے۔ کبھی انوری اسے میٹھے میٹھے گیت یاد کراتی۔ پھر دونوں مل کر گاتے۔ گائے بھینسیں چرتی چرتی دور نکل جاتیں۔ اور میر عالم کو خبر تک نہ ہوتی۔

ایک روز دونوں ندی پر بیٹھے تھے۔ انوری نے پوچھا۔

"ماشاء اللہ! تم جوان ہو شادی کیوں نہیں کرتے۔"

"شادی؟" میر عالم نے مسکرا کر کہا۔ "مجھ سے کون شادی کرے گی۔"

"کیوں؟" انوری نے پوچھا۔ "کیا انکار ہو سکتا ہے کسی کو؟"

"میرے پاس رکھا ہی کیا ہے۔" میر عالم نے جواب دیا۔ "جو کوئی میری جورو بننے پر راضی ہو گی۔"

"لیکن تمہارا دل تو کرتا ہو گا۔" انوری نے مسکرا کر پوچھا۔

"دل کس کا نہیں کرتا۔" میر عالم نے ہنس کر کہا۔

"تو پھر کوئی لڑکی پسند بھی آئی۔" انوری نے پوچھا۔ "کبھی کسی سے محبت بھی کی تم نے؟"

"جب میں ہی کسی کو پسند نہیں، تو میں کسی کو کیوں پسند کروں۔" میر عالم نے ہنس کر کہا۔

"لیکن کسی سے محبت تو ہو گی؟" انوری نے پوچھا۔

"نہیں!" میر عالم نے جواب دیا۔

"میر عالم!" انوری ہنس کر بولی۔ "مسلمان ہو کر جھوٹ بولتے ہو۔ کبھی دل سے بھی پوچھا۔"

"دل سے کیا پوچھنا ہے۔" میر عالم نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "دل کی باتیں تو انوکھی ہی ہوتی ہیں۔"

"تم میری بات کا جواب دو۔" انوری نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "کبھی کسی سے محبت کی تم نے؟"

"نہیں!" میر عالم نے ہنس کر کہا۔

"سچ کہتے ہو؟" انوری نے پوچھا۔ "کھاؤ تو میرے سر کی قسم۔"

لیکن میر عالم بنسری بجانے لگا۔ دریا کی جانب سے کبھی کبھی کسی ملاح یا موذن کی آواز سنائی دیتی تھی۔ کبھی کسی پیڑ پر سے جنگلی پرندے کی بھدی سی آواز آنے لگتی۔ میر عالم ایک بے خودی سے بنسری بجا رہا تھا۔ اور انوری چھوٹی چھوٹی کنکریاں اٹھا اٹھا کر ندی میں پھینک رہی تھی۔ ننھے ننھے گرداب پیدا ہوتے اور مٹ جاتے۔

جانے اس وقت انوری کیا سوچ رہی تھی۔ اس نے میر عالم سے بنسری لے لی۔ وہ خود بجانے لگی۔ بھلا اس سے کہاں بجتی تھی۔ میر عالم ہنس کر بولا۔

"بنسری تمہیں بجانی نہیں آتی۔ لیکن نقل خوب اتارتی ہو۔"

"تم نے کبھی سکھائی ہوتی تو بجانا بھی آ جاتی۔" انوری نے کہا۔ "خیر چھوڑو یہ باتیں تم یہ بتاؤ تمہیں میرے پاس بیٹھنا پسند ہے؟"

"یہ کیا پوچھا تم نے۔" میر عالم نے ہنس کر کہا۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا!"

"اچھا!" انوری نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ میں خوبصورت ہوں یا نہیں؟"

"بہت!" میر عالم نے ہنس کر کہا۔

"تمہیں پسند ہوں۔" انوری نے پوچھا۔

"بہت!" میر عالم نے پھر ہنس کر کہا۔

"کیوں؟" انوری نے پوچھا۔

"معلوم نہیں!" میر عالم نے مسکرا کر کہا۔

"معلوم کیوں نہیں!" انوری نے پوچھا۔

"بس!" میر عالم نے کہا۔ "معلوم نہیں۔"

"تمہیں مجھ سے محبت ہے؟" انوری نے پوچھا۔ "سچ سچ بتاؤ۔"

"سچ سچ!" میر عالم نے کہا۔

"ہاں!" انوری نے کہا۔ "سچ سچ۔"

"تو کل بتاؤں گا۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"آج کیوں نہیں۔" انوری نے پوچھا۔

"پوچھ کر بتاؤں گا۔" میر عالم نے ہنس کر کہا۔

اور انوری نے تعجب سے پوچھا۔

"پوچھ کر۔ کس سے؟"

"دل سے!" میر عالم نے ہنس کر کہا۔

یہ سُن کر انوری کو خیال ہونے لگا کہ جسے وہ بالکل سادہ لوح سمجھتی تھی وہ کچھ ہوشیار بھی ہے۔

ایک روز رات کا وقت تھا۔ اور انوری سو رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکی جو جنگل کی طرف کھلتی تھی۔ آدھی کھلی تھی اور آدھی بند۔ چاندنی پتوں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ اور میر عالم اس وقت ندی کے کنارے۔ بیٹھا بنسری بجا رہا تھا۔ شاید انوری کو کسی مچھر نے کاٹا ہوگا۔ جو اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ سر تھ ہی بنسری کی بھنک کان میں پڑی پہلے تو اس نے جانا کہ شاید وہ خواب دیکھ رہی ہے لیکن یہ خواب نہیں تھا۔ بلکہ ایک حقیقت تھی اور وہ بیدار تھی۔ کچھ دیر تو وہ پلنگ پر ہی لیٹی رہی پھر کمبل اوڑھ کر چپکے سے گھر سے نکلی اور ندی کے کنارے چلی۔ چھٹکی ہوئی چاندنی رات کی خاموشی۔ جنگل کا سکوت کائنات سوئی ہوئی۔ ندی کا پانی چمکتا ہوا اور بنسری کی پر سوز آواز۔ انوری کو آج ایک ایسی کیفیت ایک ایسا لطف اور ایک ایسی خوشی محسوس ہونے لگی جو آج سے پہلے اسے کبھی میسر نہ ہوئی تھی۔ میر عالم خاموش، بیٹھا ایک ایسا نغمہ بجا رہا تھا۔ جو دل میں ایک ہیجان پیدا کر رہا تھا اور جوانی کے جذبات کو بیدار کرنے والا تھا۔ جانے کیوں انوری کا دل بھی اس وقت دھڑک رہا تھا۔ وہ کبک کی طرح مست اداؤں کے ساتھ قدم اٹھاتی ہوئی اس کے پاس جا پہنچی۔ لیکن میر عالم کو جیسے خبر تک نہ ہوئی آخر انوری بولی۔

"میر عالم! کب سے یہاں بیٹھے ہو؟"

میر عالم نے ایک چیڑھ کے درخت کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"یہ درخت دیکھتی ہو۔ چاند ابھی اس کے عقب میں تھا۔ جب میں یہاں آیا۔"

"کوئی بھینس جنگل میں کھو گئی تھی کیا۔ جو اس وقت گاؤں سے نکل آئے" انوری نے پوچھا۔

"ہاں!" میر عالم نے جواب دیا۔ "کچھ کھو ہی گیا ہے۔"

"کیا؟" انوری نے اس کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ "کیا کھو بیٹھے تم؟"

میرے پاس ایک "من" تھا۔ میر عالم نے ایک آہ بھر کر کہا۔ "دنیا میں یہی میری دولت تھی۔ اور اسی پر مجھے بھروسہ تھا۔ ایک روز ایک خوبصورت ناگن کہیں سے آ نکلی۔ اور چپکے سے میرا "من" مجھ سے چھین کر لے گئی۔"

"ناگن؟" انوری نے ذرا مسکرا کر پوچھا۔

"ہاں!" میر عالم نے جواب دیا۔ "لیکن بڑی خوبصورت!"

"تو تم اس ناگن کو بلانے کے لئے اس وقت بنسری بجا رہے تھے۔" انوری نے پوچھا۔

"ہاں!" میر عالم نے جواب دیا۔

"تو پھر ناگن آئی بھی یا نہیں؟" انوری نے پوچھا۔

میر عالم نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور سر جھکا لیا۔ انوری کچھ دیر اس کی طرف خاموش بیٹھی دیکھتی رہی۔ پھر میر عالم نے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

"لیکن تم کیوں آئیں اس وقت؟"

انوری نے میر عالم سے بنسری لے لی۔ اور ہونٹوں سے لگا کر مسکرا مسکرا کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

میر عالم ہنس کر بولا۔

"سمجھا! بنسری کی آواز نے جگا دیا تمہیں؟"

"ہاں!" انوری نے مسکرا کر کہا۔ "اور اب تمہیں جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔"

"منظور۔" میر عالم نے مسکرا کر کہا۔

"کیا دو گے!" انوری نے پوچھا۔ "بولو۔"

"پانچ بھنے ہوئے بھٹے!" میر عالم نے ہنس کر کہا۔

انوری بھی ہنسنے لگی۔

"تم نے دل سے مشورہ کر لیا؟" انوری نے پوچھا۔

"ہاں کر لیا!" میر عالم نے جواب دیا۔

"پھر کیا کہا دل نے؟" انوری نے پوچھا۔

"دل نے کہا کہ پوچھنے والا اپنے دل سے پوچھے۔" میر عالم نے ہنس کر جواب دیا۔

"تمہیں تو کچھ نہیں بتایا۔" انوری نے پوچھا۔

"نہیں!" میر عالم نے کہا۔

"میں بتاؤں۔" انوری بولی۔ "تمہارا دل کیا کہہ رہا ہے۔"

"ہاں بتاؤ!" میر عالم نے کہا۔

انوری نے اپنی نازک اور خوبصورت بانہیں میر عالم کے گلے میں ڈال دیں اور مسکرا کر بولی۔

"ٹھیک ہے نا!"

میر عالم مسکرانے لگا۔ انوری بھی مسکرا رہی تھی۔ اور شاید ستارے بھی مسکرا رہے تھے اور ندی کے کنارے جو بوٹے تھے وہ بھی رقص کرتے معلوم ہوتے تھے۔ چاند ہالے میں چھپ گیا تھا۔

وقت اسی طرح گزر رہا تھا۔ پہاڑ کی آب و ہوا۔ دوا اور پرہیز سے انوری کی کایا پلٹ گئی تھی۔ سردی بھی کچھ پڑنے لگی تھی۔ اور ڈاکٹر نے انوری کو واپس جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اور واپسی کا دن بھی مقرر ہو چکا تھا۔ لیکن میر عالم غریب کو ان باتوں کی کچھ خبر نہ تھی۔ دن انوری کے ساتھ گزرتا رات سہانے خواب دیکھتے کٹ جاتی۔ جس روز انوری کو جانا تھا۔ اس رات وہ میر عالم سے جنگل میں

ملی۔ رات کافی سرد تھی۔ مطلع آسمان صاف تھا۔ شبنم پڑ رہی تھی۔ ہری ہری گھاس گیلی معلوم ہوتی تھی۔ ستاروں نے اپنی بساط بچھا رکھی تھی۔ اور ندی پر آج اداسیوں کا عالم چھایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ محو خواب تھا۔

"اف توبہ!" انوری نے میر عالم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ "آج تو بہت سردی ہے۔"

"ہاں" میر عالم نے کہا۔ "اس رات کے وقت باہر مت آیا کرو۔ کہیں ٹھنڈ نہ لگ جائے۔"

"تم یہ کہو۔" انوری بولی۔ "کیا تمہیں جاڑا لگتا ہے۔"

"میرا کیا ہے۔" میر عالم نے جواب دیا۔ "میں تو ہوں جنگل کا رہنے والا۔ گاؤں ہو یا جنگل میرے لئے برابر ہے۔ جہاں نیند آ گئی۔ وہیں سو رہا۔"

"اور میں!" انوری نے پوچھا۔

"تم پھولوں کی سیج پر سونے والی پھولوں کی رانی۔" میر عالم نے مسکرا کر جواب دیا۔

"پھولوں کی رانی! میں؟" انوری نے اس کے سینے کے ساتھ سر لگا کر کہا۔ "اور تم! بن کے راجہ! ٹھیک ہے نا۔"

"جو کچھ تم سمجھو!" میر عالم نے جواب دیا۔

"میر عالم!" انوری نے ہنس کر پوچھا۔ "سچ بتاؤ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔"

"یہ اپنے دل سے پوچھو" میر عالم نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

"تم نہیں بتاؤ گے؟" انوری نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

"میں غریب کیا بتاؤں۔" میر عالم نے ایک آہ بھر کر کہا۔

"تم نے آہ کیوں بھری؟" انوری نے پوچھا۔ "ناراض ہو کچھ؟"

"تم سے؟" میر عالم نے مسکرا کر کہا۔ "تمھارے لئے تو جان بھی حاضر ہے۔"

"میں جان لے کر کیا کروں گی۔" انوری نے مسکرا کر کہا۔ "کچھ اور دو۔"

"دینے کو کچھ ہوتا تو کیا چھپا کر رکھتا۔" میر عالم نے پھر ایک آہ بھر کر کہا۔

"من کہاں ہے؟" انوری نے پوچھا۔

"من جس کے پاس ہے تمہیں معلوم ہی ہے۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"میں جب تمہارے پاس نہیں ہوتی تو مجھے کبھی یاد بھی کیا کرتے ہو۔" انوری نے پوچھا۔

"یاد آدمی اسے کرتا ہے جو پاس نہ ہو۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"میں بھی تو تمام وقت تمہارے پاس نہیں ہوتی۔" انوری نے کہا۔

"یہ تو دل کی بات ہے۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"میں تمہارے دل میں رہتی ہوں کیا؟" انوری نے پوچھا۔

"یہ اپنے دل سے پوچھو!" میر عالم نے جواب دیا۔

"چاند کالے کالے بادلوں میں سے اچانک جھانکنے لگا۔ دنیا کا ذرہ ذرہ چاندی کی طرح چمکنے لگا۔ میر عالم کا ہاتھ انوری کی کمر میں تھا اور انوری کا خوبصورت سر اس کے سینے پر۔ اچانک کہیں پاس ہی سے الو کی منحوس آواز سنائی دی۔ میر عالم نے درختوں کی طرف دیکھ کر کہا:

"یہ ؟ جب بولے گا نحوست ہی لائے گا۔"

"میر عالم!" انوری نے پوچھا۔ "مجھے کبھی یاد بھی کیا کرو گے؟"

"تو کیا جانے کا ارادہ ہے اب؟" میر عالم نے ذرا تعجب سے پوچھا۔

"جانا تو پڑے ہی گا۔" انوری نے ہنس کر کہا۔

"کہاں؟" میر عالم نے پوچھا۔ "مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی؟"

"تم بھی تو چلے جاتے ہو۔" انوری نے کہا۔

"بس یہی ذرا گاؤں تک۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"اور میں بھی بس ذرا گھر تک ہی جاؤں گی۔" انوری نے ہنس کر کہا۔

"کب!" میر عالم نے پوچھا۔

"جب!" انوری نے ہنس کر جواب دیا۔

میر عالم نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اٹھا لیا اور ہنس کر کہا۔

"جاؤ تو بھلا۔ کیسے جاتی ہو۔"

دونوں ہنسنے لگے۔

"بہت خوش ہو۔" انوری نے پوچھا۔

"تم جو پاس ہو۔" میر عالم نے جواب دیا۔

"اور جب میں پاس نہیں ہوتی۔" انوری نے پوچھا۔ "پھر بھی خوش رہتے ہو۔"

"کون کہتا ہے تم پاس نہیں ہوتیں۔" میر عالم نے اس کی ٹھوڑی ہلا کر کہا۔ "میں نے تمہیں ایسی جگہ چھپا رکھا ہے۔ کہ اب تم کہیں جا ہی نہیں سکتیں۔"

"کہاں چھپا رکھا ہے؟" انوری نے ہنس کر پوچھا۔

"اونہوں!" میر عالم نے ہنس کر کہا۔ "یہ نہیں بتا سکتا۔"

"اور اگر میں نے پوچھ لیا۔" انوری نے پوچھا۔

"پوچھو!" میر عالم نے کہا۔

انوری نے اس کے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا "یہاں"۔ ٹھیک ہے نا؟ میر عالم ہنسنے لگا۔ چاند ایک کی عیاری دوسرے کی سادگی دیکھ کر پھر بادلوں میں چھپ گیا۔

"آؤ! وہ گیت گائیں!

"کیا؟"

"ہماری گلی آنا۔" انوری نے کہا۔ "اچھا جی!" میر عالم نے ہنس کر کہا۔

"بہت پسند ہے تمہیں۔" انوری نے پوچھا۔

"اور تمہیں بھی تو پسند ہے۔" میر عالم نے پوچھا۔

"ہاں!" انوری نے کہا۔ "تو گاؤ پھر۔"

دونوں گانے لگے۔

ہماری گلی آنا .... اچھا جی
ہمیں نہ بھلانا .... اچھا جی
پہلی محبت کی باتیں. اور ہیں جوانی کی راتیں
گاتا ہے پی پی پپیہا ڈولے ہے من کی نیا
ہم تم ہیں دونوں کھویا...... ..... اچھا جی
کشتی کنارے لگانا
ہماری گلی آنا .... اچھا جی
ہمیں نہ بھلانا .... اچھا جی

جنگل کی فضا گیت سے معمور معلوم ہوتی تھی۔ میر عالم مکان تک انوری کے ساتھ آیا۔ انوری مسکرا کر بولی۔

"میر عالم مجھے بھول نہ جانا۔"

میر عالم ہنستا ہوا چلا گیا۔

اگلے روز سورج نکلتے ہی ایک موٹر سینی ٹوریم کے دروازے پر آکر رکا۔ انوری اور اس کے ساتھ والے سوار ہو کر وطن کو چلدیئے۔ میر عالم جب مویشی لے کر مکان کے پاس سے بنسری بجاتے گزرا تو مکان خالی نظر آیا۔ غریب دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ لیکن اب انوری کہاں تھی۔ ایک مریض اچھا ہو کر چلا گیا تھا۔ اور اس کی جگہ ایک نیا مریض بر آمدے میں کھڑا بنسری بجا رہا تھا۔ اور جنگل کی خاموش فضاؤں کو اپنا دکھڑا سنا رہا تھا۔

سچ ہے عورت کی فطرت نہیں بدلتی۔

بنتِ قمر

صادق الخیری

اب کے موسم بہار کس تابانی سے آیا ہے! ہر جگہ سبزہ ' ہر طرف پھول ' ہر سمت تازگی۔ گویا کائنات کو حیات نو ملی ہے۔ لیکن یہ ہریالی اور یہ شادابی جاوداں نہیں۔ ایک دن اسے نذر خزاں ہونا ہے۔ زندگی کی بہار بھی عارضی ہے ' ہماری خوشیاں بھی زوال آمادہ ہیں۔ مگر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ گلشن حیات میں دائمی بہار کیوں نہیں آتی؟ ایسی بہار جو خزاں کو جنم نہ دے ' جس کے بطن سے افسردگی پیدا نہ ہو!

میرا دل چاہتا ہے کہ والد کی طرح جنھیں سے ڈیڈی کہتی ہوں ' اپنے اہم واقعات باقاعدہ تحریر کروں۔ وہ کہتے ہیں اس سے جی بہلتا ہے اور جو بات زبان پر برملا نہیں آسکتی ' وہ نوک قلم پر پوشیدہ طور پر آکر دل کی پھانس نکال دیتی ہے ' لیکن وہ اپنی ڈائری کسی کو نہیں دکھاتے ' مجھ تک کو نہیں ' بلکہ ایک دفعہ میں نے ضد کی تو وہ خاموش ہو گئے اور اس کے بعد پھر کبھی مجھے اصرار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ وہ کہتے ہیں ڈائری صرف اپنی ذات کے لئے ہوتی ہے ' یہ ایک ایسی آپ بیتی ہے جسے کسی غیر کو پڑھنے کا حق نہیں ' ڈیڈی یہ بھی کہتے ہیں کہ دوسرے کی ڈائری پڑھنا ' لکھنے والے پر ظلم ہے ' یہ تو دل کی کتاب ہے اور دل کا حال سوائے خدا کے کسی اور کو جاننا زیب نہیں دیتا ___ آج میں نے ڈائری لکھنے کا ارادہ کر لیا ہے ' اس یقین کے ساتھ کہ جو کچھ اس میں لکھا کروں گی ' اسے کوئی دوسرا نہیں پڑھے گا۔

۱ مارچ

یہ ڈائری نہ جانے کب شروع ہوتی لیکن شام کو ایک عجیب بات شروع ہو گئی ' یونیورسٹی کی طالبات لان کے ایک کونے میں جمع تھیں۔ گفتگو کا موضوع بار بار بدل رہا تھا اور بات میں سے بات نکلتی تھی ہم سب ہنس بول رہے تھے ' چہلیں ہو رہی تھیں ' کبھی سلمیٰ ' کبھی عابدہ اور کبھی انجری کو نقل محفل بنایا جا رہا تھا کہ ناموں کا ذکر چل نکلا۔ عابدہ ایک دفعہ ہی مجھ پر ڈھل گئی ' کہنے لگی "چلو میرا نام تو ماں باپ نے غلط رکھا مگر تم تو لا یہ بنت قمر کیا ہوا؟" قدسیہ نے میری طرف سے جواب دیا "ان کا نام تو بالکل ٹھیک ہے شکل جو چاند سی پائی ہے ' چشم بد دور ذرا ایک نظر دیکھو تو بدلے ہے یا نہیں؟ یہ قد موزوں ' یہ ستھرے بال ' یہ میدہ شہاب رنگ ' یہ ماہتاب سا چہرہ ......"

مگر میں چپ ہو گئی، دماغ میں بے شمار افکار بہ یک وقت تیزی سے گردش کرنے لگے۔ میں ایک بات اچھی طرح نہیں سوچ پاتی کہ وہ یہی سطحِ ذہن پر ابھر آتی تھی۔ .. میں ان سے نہ کہہ سکی کہ ہاں میرا نام بنت قمر ہے، میں قمر الزماں کی بیٹی ہوں، ڈیڈی نے یہ نام اس لئے تجویز کیا کہ وہ مجھے صرف اپنے وجود کا حصہ سمجھتے ہیں، وہ مجھے سر تاپا اپنا ہی عکس تصور کرتے ہیں۔ وہ یہ بھول جانا چاہتے ہیں کہ میری رگوں میں ایک ایسی عورت کا بھی خون دوڑتا ہے، جس نے دوسرے مرد کی خاطر ان سے بے وفائی کی، یہ عورت میری فرنگی ماں تھی جس نے میرے بعد جیا کو اپنی زندگی کا ساتھی چنا اور میری ماں ہوتے ہوئے بھی بڑے ابا کی ہو گئی، ڈیڈی نے اس سانحہ کو بہادر انسان کی طرح سہا اور اس کے بعد ان کی تمام توجہات ساری شفقتیں مجھ پر مرکوز ہو گئیں، میں نے جب سے ہوش سنبھالا یہی دیکھا کہ وہ زیادہ تر وقت میری تربیت اور نگرانی پر صرف کرتے ہیں، میرا بچپن اور لڑکپن ان ہی کی آغوش میں پروان چڑھا ہے۔ وہی میرے باپ اور وہی میری ماں ہیں۔ وہ مجھے اتنا چاہتے ہیں کہ انھوں نے میرا نام بھی اپنے نام پر رکھا ہے ____ لیکن یہ گھر کے لوگ مجھے کیوں نہیں بتاتے کہ ممی نے کیوں بے وفائی کی؟ کیوں انھوں نے ڈیڈی جیسے نیک دل اور اپنی کھیلتی مالتی بچی کو چھوڑ کر دوسرے آدمی کا گھر بسایا؟

جب وہ ڈیڈی سے علیحدہ ہوئیں تو میں بہت چھوٹی تھی، جدائی کے وقت کیا ہوا ہو گا یہ مجھے خبر نہیں بلکہ جب ان کا انتقال ہوا تو میں سن شعور کو پہنچ گئی تھی۔ شاید اس لئے کہ میں الگ رہنے کی عادی تھی مجھے ان کی موت کا کوئی صدمہ نہیں ہوا لیکن ڈیڈی رنج سے نڈھال ہو گئے، مجھے یاد ہے جس روز ان کے مرنے کی خبر آئی، وہ میری طرف ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے بہت دیر تک یونہی دیکھا کئے حتیٰ کہ مجھے رونا آ گیا، میں اُٹھ کر ان کے پاس چلی گئی اور انھوں نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔

ہمارا بھرا پرا گھر ہے۔ کنبہ وسیع اور آسودہ حال ہے۔ جب تک ڈیڈی نے مجھے سختی سے منع نہیں کیا، میں رشتے داروں سے اکثر ممی کے متعلق پوچھتی تھی، مگر صرف اتنا معلوم ہوا کہ ڈیڈی کی یہ شادی بھی غلط انتخاب کا نتیجہ تھی۔ پہلی شادی اس لئے ناکام رہی کہ وہ ان کی مرضی کے خلاف والدین نے کی تھی۔ ڈیڈی کو پہلی بیوی ایک آنکھ نہیں بھائی اور انھوں نے ولایت سے آ کر اسے طلاق دے دی، اور ولایت میں انھوں نے ممی سے شادی کی اور وہ چند سال بعد انھیں چھوڑ کر بڑے ابا کے پاس چلی گئیں، تو گویا دونوں شادیوں میں انھوں نے ٹھوکر کھائی۔ دوسری ٹھوکر بڑی تکلیف دہ ثابت ہوئی اس لئے انھوں نے پھر شادی نہیں کی ____ لیکن شادی میں ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کیا میاں بیوی کا غلط انتخاب زندگی کو اس قدر برباد کر دیتا ہے؟

۱۸۔ مئی

حمید جن سے میری نسبت ہوئی ہے مجھے وقتاً فوقتاً خطوط لکھتے ہیں۔ ان خطوط کو پڑھ کر مجھے افسوس ہوتا ہے۔ پہلے وہ اپنی برتری جتاتے تھے مگر میرے ٹوکنے پر انھوں نے تھوڑے عرصے کے لئے اپنا رویہ بدل لیا۔ لیکن جب سے وہ پی۔ اے۔ ایس کے امتحان میں شریک ہوئے ہیں، انھوں نے پھر شیخی بگھارنی شروع کر دی ہے۔ ان کے خیالات میں چھچھوراپن ہے اور ان کی نظر میں عورت کی کوئی قدر و منزلت نہیں معلوم ہوتی۔ دس پندرہ دن ہوئے میں نے انھیں پھر لکھا کہ آپ یہ نہ بھولئے، عورت بھی انسان ہے اور شریف انسان عزت نفس کو ہر چیز پر ترجیح دیتا ہے۔ بس اس بات نے جیسے شتابہ چھوڑ دیا۔ چنانچہ اب کے جو خط آیا ہے، اس میں وہ بد تمیزی پر اتر آئے ہیں اور مجھے بار بار یاد دلاتے ہیں کہ میں عنقریب ان کی بیوی ہونے والی ہوں، اس لئے مجھے ایسی کوئی بات نہیں لکھنی چاہیے جو ان کی شان میں گستاخی ہو۔ انھوں نے میرے اس خیال کا بھی مضحکہ اڑایا ہے کہ میں ایم۔ اے میں پولیٹکل سائنس لوں گی اور تائید کی

ہے کہ میں اب مزید تعلیم کا سودا اپنے دماغ سے نکال دوں۔ آخر میں انھوں نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں بے حجابی اور بے باکی ترک کر دوں اور شریفوں کی سی خو بو پیدا کروں تاکہ جب میں ان کے نکاح میں داخل ہوں تو ہر لحاظ سے ان کے لائق بن جاؤں۔
اس خط کو پڑھ کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے میرا دامن پکڑ کر گھسیٹا ہے۔ جی میں آئی اس خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں اور انھیں لکھ بھیجوں کہ آئندہ آپ مجھے کوئی خط نہ لکھئے لیکن اس سے ان کا کیا بگڑتا؟ میں غصے سے کھڑی کھڑی کانپتی رہی اور جب تک میں نے اس کا جواب نہیں لکھ لیا مجھے قطعی تسلی نہیں ہوئی۔

۳ جون

میرا خط پڑھ کر حمید آپے سے باہر ہو گیا ہے۔ اس دفعہ اس نے خط میں ایسی باتیں لکھی ہیں جن کی مجھے کبھی توقع نہ تھی۔ کیا وہ اس قدر گرا ہوا ہے۔ جو اس نے مجھے ممی کا طعنہ دیا ہے؟ اس نے لکھا ہے "اتنا مغرور ہونا اچھا نہیں ایسی بد زبان نہ ہو جاؤ کہ مجھے یہ کہنے لگے کہ تم اپنی فرنگن ماں کے نقش قدم پر چلو گی۔" کیا اس نے خط نہیں لکھا میرے دل پر گھونسہ مارا ہے۔ شادی کے بعد تو وہ میری چھاتی پر چڑھ بیٹھے گا۔ اٹھتے بیٹھتے ممی کے طعنے دے دے کر مجھے چھوکرے دیا کرے گا۔ میری حالت کو کیا ہو گیا ہے؟ رونا چاہتی ہوں تو آنسو نہیں نکلتے، چیخنا چاہتی ہوں تو فریاد حلق میں اٹک جاتی ہے، ضبط کرتی ہوں تو ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ ڈیڈی اے ڈیڈی! کیا آپ مجھے اس مردود سے بیاہ دیں گے؟ اس کناش سے جو ابھی سے مجھے پاؤں کی جوتی سمجھتا ہے؟ کیا یہ شریف آدمی ہے؟ کیا یہ کبھی مجھے رفیقۂ حیات سمجھے گا؟

۱۴ اگست

آج جشن پاکستان ہے۔ چاروں طرف خوشیاں ناچ رہی ہیں' میری قوم کو آج کے دن آزادی ملی تھی اور میں بھی آج آزاد ہوئی ہوں شب و روز سوچتے سوچتے' آخر صبح میں نے ڈیڈی کو حمید کے خطوط دکھا دیئے' میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے اور پیشتر اس سے کہ میں کچھ کہتی ڈیڈی نے نہایت شفقت سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "میں یہ منگنی ابھی توڑے دیتا ہوں۔"

آزادی کتنی بیش بہا شے ہے اسے میرا دل سمجھتا ہے۔ سچ کہتی ہوں' کل تک مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ کسی نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر مجھے کال کوٹھڑی میں دھکیل دیا ہے۔ میری راتیں اندھیری ہو گئیں اور میں سمجھتی تھی کہ اب صبح کبھی نہیں ہو گی۔ مگر ڈیڈی پیارے ڈیڈی نے میری قید کی بلائیں کاٹ ڈالی ہیں۔ انھوں نے غلامی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے پر ضرب کاری لگا کر چراغ نور پاش نصب کیا ہے' ہاں اب وہ سیاہی میری زندگی کے مطلع سے ہمیشہ کے لئے چھٹ گئی ہے میرے سامنے آزادی کا سورج لب بام جگمگا رہا ہے۔ آج ۱۴ اگست ہے۔

۲۳ اکتوبر

یہ سارا ہفتہ بڑا لطیف و پر کیف گزرا' صبح و شام سیر و تفریح' دن رات خوش کن باتیں' میری عم زاد بہن کے شوہر' جنھیں میں بھائی صاحب کہتی ہوں' جب کراچی آتے ہیں تو گویا عید آجاتی ہے وہ بڑے ہنس مکھ اور خوش مزاج ہیں کوئی پینتیس چالیس سال عمر ہو گی' مگر صحت مند اور ایسے ہیں کہ بالکل نوجوان لگتے ہیں' طبیعت ایسی شگفتہ پائی ہے کہ ہر وقت کنول کا کھلا ہوا پھول معلوم

ہوتے ہیں سست آدمی سے انھیں چڑ ہے' خود اس قدر چست و چالاک ہیں کہ جوانی کا سراپا کہیے ان کی زندگی رواں دواں ہے' ان کی گفتگو نغمہ ریز آبشار ہے' جمود سے انھیں وحشت ہوتی ہے' ان دنوں انھوں نے ہمیں خوب سیر کرائی' چچازاد اور پھوپھی زاد بہنیں' بھائی' بھاوجیں اور کنبے کے دوچار سب کو اپنے ساتھ لے کر گئے' کبھی کلفٹن کے ساحل پر' کبھی ملیر کے باغوں میں' کبھی ہم سینڈز پٹ کی لہروں میں گھنٹوں کھیلتے رہے۔ کبھی ہم نے ہوکس بے کی دلکش شاموں کا لطف اٹھایا' جس دن گھر سے نہیں نکلے۔ تو ہم نے سینما دیکھا ہندوستانی فلم بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں ان میں بے حیائی رچتی جا رہی ہے۔ جسے دیکھ کر بعض دفعہ تو سینہ دھڑکنے لگتا ہے۔

اب کے میں نے ایک نئی بات محسوس کی' بہنوں' بھاوجوں یا بھائیوں میں اگر کوئی مجھ سے لڑتا جھگڑتا ہے تو بھائی صاحب فوراً میری حمایت کرتے ہیں' انھوں نے کئی مرتبہ کہا "بھئی بہت قمر پھول ہے۔ اسے کوئی رنج نہ پہنچایا کرو ورنہ یہ کمھلا جائے گی۔" اور ایک دفعہ مجھ سے کہنے لگے "اب کے تم مجھے یاد آؤ گی۔" بھائی صاحب مجھے بے حد چاہتے ہیں' ان کے پیار میں خلوص اور بزرگی میں حمایت و حفاظت ہے' لیکن ان کی گھریلو زندگی کیوں تابناک نہیں؟ آپا نہ جانے کیسی بیوی ہیں' دل کی اتنی پیاری' پر زبان کی کڑوی' ذرا ذرا سی بات پر بگڑ جاتی ہیں اور بھائی صاحب ہر دفعہ مسکرا کر ٹال دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں بڑا صبر و ضبط ہے۔ لیکن آپا ان کے سامنے اتنی چڑچڑی کیوں ہو جاتی ہیں؟ کیوں صرف انھی سے بدمزاجی کرتی ہیں؟ باقی سب کے ساتھ باتیں کرتی ہیں تو گویا منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ باجی سے ان کی بڑی دوستی ہے۔ دونوں پرانی سہیلیاں ہیں' دوپہر کو وہ ان سے رازدارانہ باتیں کر رہی تھیں۔ میں نے چپکے چپکے سنا کہ بھائی صاحب کو خوبصورت عورتیں بڑی پسند ہیں اسی لئے وہ ان پر آنکھیں رکھتی ہیں۔ لیکن انھوں نے یہ نہیں کہا کہ بھائی صاحب آوارہ ہیں' بدچلن ہیں۔

یہ میاں بیوی کا تعلق کیسا ہے؟ چاہے دونوں میں اچھی نبھتی ہو لیکن اندر سے ٹٹولا جائے تو یہ اس سے نالاں' وہ اس سے شاکی' ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہاں میرے پھوپھی زاد بھائی ہیں' امانت مرزا وہ اپنی بیوی کو خوب چاہتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ اپنی محبت کا اظہار اتنی شدومد سے کرتے ہیں کہ عجیب سا لگتا ہے' مگر کسی کو اس سے کیا۔ وہ خود تو اپنی بیوی کے پرستار ہیں اور ان کی بیوی ان پر جان چھڑکتی ہیں' دراصل امانت بھائی مولوی طبیعت کے ہیں' نماز کبھی قضا نہیں کرتے اور سارے شرعی احکام کی باقاعدہ تعمیل کرتے ہیں۔ اگرچہ ابھی ادھیڑ عمر کے ہوں گے مگر ان کا حلیہ دن بدن اسلامی ہوتا چلا جاتا ہے' ماتھے پر سجدوں کا نشان' بھرواں داڑھی' کتری ہوئی لبیں اور کثیر الاولاد ــــــ اللہ میاں کی ساری برکتیں انھیں میسر ہیں۔ پچھلی دفعہ جب ہم سیر کو گئے تو میں ایک دن سمندر میں اتر کر پانی سے خوب کھیلی تھی' سب ہی ہنسنے بولنے میں مشغول تھے۔ میں نے ایکاایکی جو نظر اٹھائی تو امانت بھائی میری پنڈلیوں کو جو پائنچے سمٹنے سے کھل گئی تھیں۔ بڑے انہماک سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کچھ خیال نہ کیا' پھر بھی محسوس کرتی ہوں کہ ان کی نظریں مجھ پر اکثر جمی رہتی ہیں۔ آخر وہ مجھے یوں کیوں دیکھنے لگے ہیں ــــــ مگر نہیں' یہ میرا واہمہ ہوگا۔ وہ بیاہتا ہیں' اور اپنی بیوی پر فدا ہیں۔

۱۲۔ جنوری

اس دوران میں میری کئی نسبتیں آئیں مگر ڈیڈی نے میرے لئے جو رشتہ پسند کیا ہے وہ سب سے اچھا ہوگا۔ ایک دن پھوپھی' چھوٹی چچی سے کہہ رہی تھیں۔ "خدا کرے قمر کے سہرے کے پھول جلدی کھلیں' بھائی بڑے متفکر رہتے ہیں" لیکن ایسی جلدی کی کیا ضرورت ہے؟ ماں باپ کیوں چاہتے ہیں کہ بیٹی جلدی ان کے گھر سے چلی جائے' اور میرے ڈیڈی تو مجھ کو اتنا چاہتے ہیں۔ کیا وہ مجھے اپنے سے علیحدہ کر کے رنجیدہ نہیں ہوں گے؟ اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ میں اپنے دولہا کے پاس چلی جاؤں گی تو وہاں ہمیشہ مسرور و

شاد ابھی رہ سکوں گی۔

۱۰۔ فروری

اس وقت میں بڑی مشکل سے اپنے کو سنبھالے ہوئے یہ سطریں لکھ رہی ہوں پر سوں...... میری زندگی میں ایسا طوفان آیا۔ جس نے میرے ہوش و حواس مختل کر دیئے رات کو میں حسب معمول بے فکری کی نیند پڑی سو رہی تھی کہ ......ہائے میں کیسے لکھوں! مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرے جسم پر کوئی بے تابی سے ہاتھ پھیر رہا ہے۔ خوف سے میری زبان گنگ ہو گئی' سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں' لیکن میں کشمکش کرتی رہی اور وہ جلتا ہوا ہاتھ' کبھی میری بانہوں' کبھی کمر اور کبھی پنڈلیوں کی طرف بڑھتا رہا۔ اور جب میں میری ہمت واپس آئی تو میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ یہ دہکتا ہوا ہاتھ' یہ بھبکتا ہوا چہرہ ___ بھائی امانت مرزا کا تھا' مولوی امانت کا' اور وہ دم بہ دم مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کے لئے مچلے جا رہا تھا۔ میں نے پوری طاقت سے چیخنے کی کوشش کی' مگر کسی نے فوراً میرے کان میں کہا "ایسا نہ کرنا' ایسا نہ کرنا تم بدنام ہو جاؤ گی ___ تم عورت ہو!" میرا دماغ ماؤف ہو گیا' میری قوت فیصلہ جواب دے گئی اور مجھے بے حس و حرکت پا کر اس عفریت نے مجھے ننگا کرنا چاہا' تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے "چھوڑ دے۔ ظالم چھوڑ دے میں تیری بہن ہوں۔ دیکھ برابر کے کمرے میں تیری بیوی جاگ جائے گی...... خدا کے لئے میرے جسم کو ہاتھ نہ لگا' میری شادی ہونے والی ہے۔ میری کنوارے پنے کو بے داغ رہنے دے۔ میں تیرے ہاتھ جوڑتی ہوں" ___ لیکن یہ سب باتیں میری زبان سے نہیں نکلیں اور وہ شیطان اپنی مکروہ صورت' میرے چہرے کے قریب سے قریب تر لانے کی کوشش کرتا رہا' پھر دفعتاً میرے کانوں نے سنا کہ میری زبان میں گویائی آئی ہے اور میری روح چیخ کر فریاد کر رہی ہے۔ "ڈیڈی!"

اس کی گرفت یکلخت ڈھیلی پڑ گئی اور اس کے گہرے گہرے سانس بھاری ہوتے گئے' میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور میں دم بخود بستر پر پڑی دیکھتی رہی کہ وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں' رکتا رکتا' میرے کمرے سے باہر نکل گیا۔

۱۲۔ فروری

میں کئی دن سے اپنے کمرے میں الگ تھلگ پڑی ہوں۔ غصے' حیرت اور رنج نے مجھے شل کر دیا ہے۔ جی میں طرح طرح کی باتیں آتی ہیں۔ سوچتی ہوں کہ جا کر ڈیڈی یا پھوپھی سے کہہ دوں' پھر خیال آتا ہے اس کا نتیجہ بہت برا ہو گا' نہ جانے ڈیڈی کیا کر گزریں' اور مجھو امانت کی بیوی کا کیا حال ہو گا جو اس مغالطے میں مبتلا ہے کہ میرا شوہر میرا عاشق ہے۔ یہ بات کھل گئی تو صرف انہی کی نہیں' خاندان کی خوشیاں تباہ ہو جائیں گی۔ گھر کے کسی فرد پر کسی کو بھروسہ نہیں رہے گا۔ اندیشہ ہائے دور دراز مجھے کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں۔ مگر جو مصلحتیں اور مصلحتوں نے میرے لبوں پر مہر خاموشی لگا دی ہے' لیکن میں امانت کو ہرگز معاف نہیں کروں گی' اس نے میری عصمت کی طرف ہاتھ بڑھایا ہے۔

[illegible] فروری

وقت تیزی سے بے [illegible] کر رہا ہے۔ آج سو کر اٹھی تو دل کا بوجھ قدرے ہلکا تھا' ڈیڈی نے کہا "تمہاری طبیعت کئی دن سے ست ہے' تم میرا کہا کیوں نہیں مانتیں [illegible] ڈاکٹر کو ضرور بلواؤ" ان کا کہنا بھی ٹھیک تھا۔ اگر یونہی منہ لپیٹے لیٹی رہتی تو ان کو ناحق پریشانی ہوتی چنانچہ میں نے روزانہ کا معمول شروع کر دیا ہے۔

سہ پہر کو کالج سے واپس آئی تو بیچ کے کمرے میں وہ صاحب ایمان 'امانت جاء نماز پر کھڑا تھا۔ میرے پاؤں بلاارادہ رک گئے' اور اس نے معانیت توڑ کر میری طرف دیکھا میری آنکھوں سے شعلے برسنے لگے اور میں تیزی سے اس کے پاس پہنچی' تو اس نے چھوٹتے ہی کہا "میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں' بہت دن سے دل کے ارمان دل میں دبے ہیں ___" "میں غصے سے بے قابو ہو گئی "فریبی! شادی شدہ ہو کر..... "میری زبان نے آگے ساتھ نہ دیا اور وہ شکل کا مولوی چرب زبانی سے بولا "تم راضی ہو جاؤ تو میں فیروزہ کو چھوڑ دونگا اور یہ "تو حد ہو گئی۔ مجھے ایک دھکا سا لگا' اور میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا___ "تو کمینہ ہے"___ اتنے میں بھابی فیروزہ کی دور سے مسرور لہجے میں آواز آئی "دیکھنا تم جو میرے لئے آج چکن لائے ہو' وہ واقعی لاجواب ہے۔"

میرا خیال خود بخود بھابی فیروزہ کی طرف چلا گیا' جو صحن میں بیٹھی چھپا چھپ چکن کاکرتہ سی رہی تھیں لیکن انھیں نہیں معلوم تھا کہ میری محبت کادم بھرنے والا شوہر ایک دوسری عورت کی خاطر جس وقت چاہے مجھے لات مار کر گھر سے باہر نکال دے گا۔ اس تصور نے میرے غصے کو فرو کر دیا اور میں نے حیرت سے اس ملعون کی طرف دیکھا جو میری خشمگی اور بیوی کے ڈر سے' مصلے پر بیٹھے بیٹھے رکوع میں چلا گیا تھا۔

۲۸۔ فروری

وہ جو پنج وقتہ نمازی' پرہیزگار' مولوی امانت ہے۔ اس کی بزرگی کا بت زمین پر اوندھے منہ گر پڑا ہے' پہلے میں اس کا جس قدر احترام کرتی تھی اب اتنا ہی اس کو ذلیل سمجھتی ہوں۔ عمر کے تفاوت اور اس کے مذہبی ڈھکوسلے کے سبب پہلے مجھ پر اس کا بڑا رعب تھا' اب میں نڈر ہو گئی ہوں اور اسے بڑی حقارت و نفرت سے دیکھتی ہوں' وہ میری نظروں کو پہچانتا ہے لیکن کچھ نہیں کہتا احتجاج تک نہیں کرتا۔

۱۴۔ اپریل

کوئٹے سے بھائی صاحب کا خط آیا ہے' ڈیڈی کو اور مجھے بلایا ہے' لکھا ہے یہاں موسم بڑا دلکش ہے' یہاں کی آب وہوا آپ کے لئے مفید ہو گی' ڈیڈی نے مجھ سے پوچھا "تم چلو گی؟" میں نے کہا "شوق سے چلوں گی" بھائی صاحب مجھے اکثر یاد آتے ہیں" اور آپا کو دیکھے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے ہیں۔

۱۵۔ مئی

سنگ زار بلوچستان کا سلسلہ دور دور تک پھیلا ہوا بے آب و گیاہ علاقہ بڑا بے رونق ہے' راستے میں خشک چٹانیں بدصورت ٹیلے اور بے ہنگم پہاڑیاں دیکھ کر مجھے کوفت ہوئی' مگر جب ہم کوئٹہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس لحیم شحیم بھونڈے اور بھدے جسم کے اندر بھی ایک دل ہے' نازک شاداب اور حسین' یہ ایک ایسا نخلستان ہے جہاں شیریں پانی کے چشمے بہتے ہیں جہاں درختوں کی چھاؤں ٹھنڈی ہوتی ہے' جہاں ساری فضا پرسکون اور خیال افروز ہے۔

کوئٹہ ایک چھوٹا سا صاف ستھرا شہر ہے' جہاں امیر بہت زیادہ آسودہ حال اور غریب بہت زیادہ فلاکت زدہ ہے' یہاں کانیں ہیں' منڈیاں ہیں' غریبی ہے۔ یہاں مزدوری ہے' چاکری ہے مفلسی ہے۔ سیلانیوں کے لئے عیش ہیں' پھل ہیں اور گوشت کی فراوانی ہے'

بلوچیوں کے لئے جفاکشی ہے‘ محرومی ہے اور آمدنی کی قلت اتنی کہ وہ بمشکل روٹی کو پانی میں بھگو کر کھاتے ہیں‘ لیکن خدا نے انھیں غیرت سے مالا مال کیا ہے۔ شکستہ پائی اور بوسیدہ حالی کے باوجود‘ وہ تندرست و توانا ہیں ان میں خون کی کمی نہیں‘ انھیں طاقت کی دوا نہیں چاہیے انھیں قدم قدم پر احتیاطوں کی ضرورت نہیں ۔۔۔ وہ جو یہاں روپیہ کمانے آئے ہیں‘ مزے سے اپنی خواب گاہوں میں آرام کرتے ہیں‘ یہ جو بلوچ نظر آتے ہیں مہمانوں کے بھیس میں آنے والوں کی خاطر‘ خون پسینہ ایک کر کے اپنے گھر کی دولت ان کے قدموں میں ڈال دیتے ہیں اور خود الگ کھڑے ہو جاتے ہیں کہ لے جاؤ‘ یہ سیم وزر تمہارا ہے۔ اس پر تمہارا ہی حق ہے‘ تم اتنی دور سے چل کر جو سے لینے آئے ہو! دولت منہ سے لگاتا ہے‘ اور غریب بلوچی آسمان کی طرف منہ اٹھا کر دیکھنے لگتا ہے کہ کب تک یہ جہالت کا اندھیرا چھایا رہے گا؟ کب علم کی روشنی یہاں تک پھیلے گی؟ کب خدا ہمیں احساس اور اہلیت دے تاکہ ہم اپنی دولت سے خود متمتع ہوں؟

۲۰۔ مئی

یہاں کئی قدرتی سیر گاہیں ہیں جہاں انسان بازاروں کی گہما گہمی اور آمد و رفت کے ہنگاموں سے محفوظ ہو کر اپنے تفکرات بھول جاتا ہے‘ مجھے یہ خاموش مقامات ہمیشہ یاد رہیں گے خصوصاً بروری جہاں ہم لوگ کل پک نک کے لئے گئے تھے۔ یہ شہر سے چند میل کے فاصلے پر ایک عمدہ تفریح گاہ ہے‘ جہاں چٹانیں اور پہاڑیاں اس طرح آگے پیچھے اور دائیں بائیں کھڑی ہیں گویا انھیں کسی خاص مقصد سے ترتیب دیا گیا ہے۔ ہمارا مختصر سا قافلہ جس میں بھائی صاحب‘ ڈیڈی‘ آپا‘ بچے اور ملازم شامل تھے‘ بروری کے دامن میں چوٹی کی طرف خراماں خراماں آگے بڑھتا جاتا اور ہمارا راستہ کبھی کشادہ‘ کبھی تنگ اور کبھی پھر وسیع ہو جاتا تھا۔ دائیں جانب ایک لمبی پختہ نالی تھی جس میں چشمے کا شفاف پانی اٹھلاتا‘ ناچتا گاتا ہوا تیزی سے بہہ رہا تھا‘ ہم اس آب رواں کا مخرج نہ دیکھ سکے‘ جو کہیں بلندی پر پہاڑیوں میں چھپا ہوگا‘ لیکن وہ ہم سے بے خبر‘ اپنی منزل کی طرف مصروف سفر تھا‘ جو بہت دور نیچے آبادی میں تھی۔ چلتے چلتے بچے تھک جاتے تو کسی کی گود میں آجاتے‘ آپا کچھ تھک سی گئی تھیں‘ ڈیڈی بیٹھنے کی جگہ تلاش کر رہے تھے اور بھائی صاحب حسب معمول لطیفے سنا سنا کر ہمیں اور آگے بڑھنے پر اکسا رہے تھے۔ اتنے میں ایک بڑا سا میدان آیا جس کے ایک جانب اونچی اونچی پہاڑیوں کے دو سلسلے حبش کے وفادار غلاموں کی طرح کھڑے پہرہ دے رہے تھے‘ معلوم نہیں ان کے درمیان راستہ قدرتی تھا یا قرنوں پیشتر انسانی ہاتھوں نے پتھر کے سینے کو چیر کر اسے بنایا تھا۔ کیا خبر غیر متمدن ہندوستان کو فتح کرنے والے جانباز سینکڑوں سال پہلے اسی راہ پر گامزن ہوئے ہوں اور اس وقت ان کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سے یہ سارا سلسلہ گونج اٹھا ہو۔ جب ہم اس درے سے گذر کر باہر آئے تو آپا کی ہمت نے جواب دے دیا اور ڈیڈی نے ایک اونچی سی جگہ کی طرف اشارہ کر کے اعلان کیا کہ یہیں ہمارا ڈیرہ جمے گا۔ دن بھر سب لوگ گھومتے پھرتے رہے‘ بچے روتے کھیلتے رہے‘ آپا کھانا کھلا کر فارغ ہوئیں تو پکوان لے کر بیٹھ گئیں اور ڈیڈی کتب بینی میں مشغول ہو گئے۔ میرا دل اس ماحول سے کسی طرح نہیں بھرتا تھا‘ دور دور تک ہو آنے کے باوجود میری طبیعت یہی چاہتی تھی کہ ابھی اور چلوں‘ ابھی اور دوڑوں‘ بھاگوں۔ سب تھک کر ستانے بیٹھ گئے‘ مگر بھائی صاحب نے میرا برابر ساتھ دیا‘ بلکہ جب میں نے ڈیڈی سے کہا کہ بس سامنے والی پہاڑی کے اوپر اور ہو آؤں‘ تو اس وقت بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ چنانچہ‘ جب ہم منزل‘ منزل چوٹی پر پہنچے تو میرا سانس پھول گیا‘ بھائی صاحب بھی ہانپنے لگے تھے اس لئے ہم ایک کالی سی عمودی چٹان کی اوٹ میں تھوڑی دیر کے لئے بیٹھ گئے۔ میلوں پرے نشیب میں کوئٹہ کی چھوٹی سی آبادی سبزے میں گھری ہوئی نظر آرہی تھی‘ جگہ جگہ پھولوں کے باغات

کھڑے لہلہارہے تھے' دوردراز سے آنے والی ہوا اپنے دوش پر جنگلی پھولوں کی خوشبو اور بلوچستان کی خنکی لئے آرہی تھی۔ ڈھلتے ہوئے سورج کی روشنی میں دورونزدیک ایک طلسم سابندھا تھا اور اس میں گم ہو کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اسی جگہ کے لئے پیدا ہوئی ہوں' یہ چٹانیں' یہ بلندیاں' یہ خاموشی' یہ پرسکون مقام' کتنا امن ہے یہاں! کتنی آزادی ہے اس ماحول میں!! اور جب میں اپنے خواب سے چونکی تو آپ ہی آپ میرا ہاتھ بھائی صاحب کے شانے پر آ گیا' وہ بڑی ملائمت سے بولے "کس گہری سوچ میں ہو' واپس نہیں چلو گی؟" میں نے جواب دیا "ذرا اور ٹھہر جایئے میرا دل یہاں سے جانے کو نہیں چاہتا" پھر ہم دونوں قدرت کی بوقلمونیوں اور زندگی کے اجلے رخوں پر باتیں کرنے لگے' ایسی باتیں جن میں شیرینی اور خلوص تھا' ہمدردی اور ہم خیالی تھی اور جب سورج ار غوانی ہونے لگا تھا تو بھائی صاحب نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا ان کے کندھے پر سر رکھ کر' ان کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر' ان کے اتنے قریب بیٹھ کر مجھے بڑی راحت ہوئی۔ افسوس یہ وقت کتنی جلدی گزر گیا۔

۱۵۔ جون

آپا کو اللہ نے ایک اور چاند سا بیٹا دیا ہے۔ بالکل چینی کا بوا لگتا ہے۔ مسکراتا ہے تو دل باغ باغ ہو جاتا ہے' ہمکتا ہے تو جی چاہتا ہے سینے سے چمٹا لوں۔ بھائی صاحب کے سب بچے پیارے پیارے ہیں مگر یہ سب سے بڑھ گیا' اس کے خدوخال بھائی صاحب کے سے ہیں' اس کی آنکھوں میں ان کی جھلک ہے۔ مجھے ننھے بچے اچھے نہیں لگتے' وہ کلبلاتے ہیں تو مجھے پھریریاں سی آتی ہیں' مگر بھائی صاحب کا یہ منا مجھے بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ آپ ہی آپ مجھے اس پر پیار آتا ہے' پرسوں ہم لوگ واپس جارہے ہیں۔ روانگی کے خیال سے میں افسردہ ہو گئی ہوں' کاش یہ ممکن ہوتا کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جا سکتی۔

۲۔ جولائی

۱۶۔ تاریخ کو میری شادی ہے۔ جوں جوں دن قریب آتا جاتا ہے' شوق اور وحشت بڑھتی جاتی ہے۔ خدا جانے ایوب کس مزاج کے آدمی ہیں۔ ان کے خیالات کیسے ہیں' ان کے رجحانات کیا ہیں اور ہم دونوں کی کیسی نبھے گی؟ صبح میں نے ان کی تصویر بھی دیکھی' بڑے وجیہہ معلوم ہوتے ہیں' طبیعت بھلی ہو گی' میں کوشش کروں گی کہ ہم جلد ایک دوسرے سے واقف ہو جائیں۔ اگر دونوں ایک دوسرے کا احترام ملحوظ رکھیں تو ہمارا مستقبل ضرور خوش آئند ہو گا۔ لیکن سب ایسا کیوں نہیں کرتے؟ اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتی ہوں' تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر شادیاں ناکام ہیں' میاں بیوی کے جذبات واحساسات میں ہم آہنگی نہیں۔ وہ درگزر' چشم پوشی' اور فراخدلی کو اپنی عادت نہیں بناتے۔

یکم ستمبر

الٰہی یہ کیا ہو گیا؟ شادی کے نام سے مجھ پر یہ کیسا ستم ٹوٹا ہے۔ ایوب میں تو سرے سے آدمیت ہی نہیں' وہ تو انسان کا نقلی چہرہ لگا کر' بیاہنے آیا تھا' وہ سرتاپا____ حیوان ہے' اور عورت کو صرف عیش و عشرت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ شروع میں تو میں ہکا بکا رہ گئی اور سوچتی رہی کہ مرد اور عورت کا یہ رشتہ آخر بنا کیوں ہے؟ عورت کو پا کر' مرد کیوں بلندی خیال اور پاکیزگی نفس سے محروم ہو جاتا ہے؟ کیوں تنہائی میں' وہ اشرف المخلوقات نہیں رہتا؟ لیکن سب مرد تو ایسے نہ ہوتے ہوں گے' یہ ایوب ہی ہے جو صرف میرے جسم کی لذت چاہتا ہے۔ وہ میرے دل میں کبھی نہیں اترتا' میں اس سے بات کرتی ہوں' تو کوئی اثر نہیں لیتا' اسے صرف میرا حسن

چاہیے حسن کور مجھے یقین ہو گیا ہے کہ جب کچھ عرصے بعد میں بھی دوسری عورتوں کی طرح بھدی اور بےڈول ہو جاؤں گی' تو وہ مجھ سے بیزار ہو جائے گا' مجھے مجبور و مقہور چھوڑ دے گا۔

ایوب ریچھ کی طرح ہے' اس کے سینے' پیٹھ' ہاتھوں بلکہ سارے جسم پر اس قدر بال ہیں کہ دیکھ کر کراہیت ہوتی ہے۔ وہ جب اپنا ہاتھ میری طرف بڑھاتا ہے تو میرے بدن پر سینکڑوں چھپکلیاں رینگ جاتی ہیں اور میرا جی چاہتا ہے کہ کمرے سے نکل بھاگوں اور کہیں روپوش ہو جاؤں' لیکن ایسا نہیں ہوتا' میں خود اپنی سسرال میں قید ہوں' میری سہیلیاں بھی یہاں نہیں جو میرے دل کا حال سمجھیں' جن سے میں پوچھ سکوں "سچ بتاؤ کیا بیوی اسی کو کہتے ہیں؟"

۲۔ اکتوبر

میں نے کنوارپنے میں شادی کے جو محل بنائے تھے وہ ڈھے گئے ہیں' ایوب جنگلی اور اوباش ہے۔ اسے مجھ سے کوئی لگاؤ نہیں' وہ مجھ سے یوں پیش آتا ہے جیسے میں اس کی رفیقہ حیات نہیں' کرائے کی عورت ہوں۔ اس کے دل میں بہت سی عورتیں ہیں اور جب کسی عورت کا خیال' جسے وہ نہیں پا سکا' اسے دیوانہ کر دیتا ہے تو وہ اس کا بدلہ مجھ سے اتارتا ہے' کبھی کبھی تو بے رحمی سے گھسیٹ کر مجھے اپنے سے چمٹا لیتا ہے' میں مزاحمت کرتی ہوں تو اول فول بک کر دھکا دے دیتا ہے۔ کل میرے بڑی چوٹ لگی اور میری آنکھوں میں آنسو آ گئے' میں خیالات میں کھو گئی اور ہوتے ہوتے مجھے بھائی صاحب اور آپا یاد آ گئے' تو میں نے کہا "آپا' بھائی صاحب کو کچھ نہ کہا کرو۔ تم نے مرد نہیں دیکھے!"

۲۰۔ اکتوبر

میں بڑی مشکل سے میکے آئی ہوں' یہ میرا اپنا گھر تھا مگر آج یہ مجھے بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ قدم قدم پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں کوئی غیر ہوں۔ مہمانوں کی طرح میری خاطریں ہوتی ہیں اور بار بار مجھے یاد دلایا جاتا ہے کہ میں بہت جلد اپنے گھر واپس چلی جاؤں گی۔ ڈیڈی بھی جو میرے آنے سے بے حد خوش ہیں۔ موقع دیکھ کر یہی نصیحت کرتے ہیں کہ میرا اصلی گھر میرے شوہر کی دہلیز ہے اور مجھے تمام عمر وہیں رہنا ہو گا۔ جیسے رخصت کے وقت انھوں نے مجھے سمجھایا تھا' اب بھی وہ باتوں باتوں میں یہی دہراتے ہیں کہ جس شخص سے ایک دفعہ دامن بندھ جائے؟ ساری زندگی اسی کی ہو کر گذار دینی چاہیے' یہی شرافت کا تقاضا اور نسوانیت کا فرض ہے' مگر وہ مجھے یہ سبق دیتے ہیں؟ جی میں آتا ہے' ان سے کہہ دوں ڈیڈی! میں بڑی تکلیف میں مبتلا ہوں میرے اور ایوب کے درمیان کوئی ذہنی ہم آہنگی اور مفاہمت نہیں........ نہیں نہیں یہ میں کبھی نہیں کہوں گی' ان کو اگر شبہ ہو جائے تو ان کا دل ٹوٹ جائے گا اور کیا خبر' طیش میں آ کر وہ میری ماں کا طعنہ دے دیں' کہ میرے خون میں شوہر پرستی کا جذبہ اور شرافت مفقود ہے' اس لئے مجھے اپنے کردار پر شرافت کی مہندی لگانی پڑے گی۔ ایوب میری اہانت کریگا' اور میں اسے سر آنکھوں پر بٹھاؤں گی' وہ مجھے جلائے گا اور میں مسکراتی رہوں گی۔

۲۵۔ اکتوبر

کل رات گئے تار آیا کہ دل کی حرکت اچانک بند ہو جانے سے ایوب کا انتقال ہو گیا ہے' تھوڑی دیر میں وہاں جانے کے لئے سوار ہو جاؤں گی۔ دنیا کی رسوم کے مطابق مجھے سوگ کا پیراہن پہننا پڑے گا' لیکن دراصل میں رنجیدہ نہیں ہوں' اس کے یوں دفعتاً

مر جانے کا افسوس ضرور ہے۔

۱۴۔ مارچ

میں عدت پوری کر کے واپس آ گئی ہوں۔ ڈیڈی ایوب کی موت سے بے حد متاثر ہیں۔ ان کے دل پر دھاکہ بیٹھ گیا ہے۔ کہتے ہیں یہ میرے سان و گمان میں بھی نہیں تھا۔ تمہاری بیوگی دیکھنے کے لئے زندہ رہوں گا۔ ان کو یہ غم کھائے جاتا ہے کہ میرا گھر پھر بسا دیں، مگر میں اب شادی نہیں کروں گی، میرا دل پک گیا ہے۔

امانت مرزا جو اس عرصے میں اور زیادہ عابد و متقی بن گئے تھے پھر میری طرف گھور گھور کر دیکھنے لگے ہیں۔ ان کو گانے کا بھی شوق ہو گیا ہے۔ اور وقتاً فوقتاً ہجر و فراق کے اشعار آپ ہی آپ گنگناتے رہتے ہیں، مگر میں جانتی ہوں کہ یہ عشقیہ کلام کس لئے ہے؟

۳۱۔ مارچ

کوئٹہ سے خط آیا ہے کہ بھائی صاحب سخت علیل ہیں، معمولی سی بیماری نے خطرناک صورت اختیار کر لی ہے ان کی گھبراہٹ اور کم خوابی نے آپا کو پریشان کر دیا ہے۔ یہ خبر پڑھ کر میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ خدا کرے وہ جلد اچھے ہو جائیں، ان کی آئی کسی اور کو آ جائے۔ ان کی بجائے امانت مر جائے، میں مر جاؤں!

اگر خدانخواستہ انھیں کچھ ہو گیا تو کیا ہو گا؟ اس تصور سے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا جاتا ہے۔ میں کسی ایسی دنیا میں چلی جاتی ہوں، جہاں خزاں آ گئی ہے، جہاں ہر طرف حسرت اور اداسی چھائی ہوئی ہے، جہاں گل بوٹے نہیں کھلتے، جہاں سبزہ نہیں لہلہاتا۔ یہ کیسی فضا طاری ہو رہی ہے؟ ایک بھائی صاحب کے نہ ہونے سے، کس نے زندگی کی آرائش نوچ لی ہے، کس نے اس چمن کا سہاگ لوٹ لیا ہے؟ کیوں ایک، صرف ایک شخص کے چلے جانے سے آبشاروں کے نغمے ٹوٹ گئے ہیں، خوشیوں کی تابندگی مٹ گئی ہے، زندگی کا بانکپن غروب ہو گیا ہے؟

میں ڈیڈی کے ساتھ کوئٹہ جا رہی ہوں، کل صبح سے پہلے کوئی گاڑی نہیں جاتی، ساری پہاڑ سی رات باقی ہے، ایک ایک پل گذارنا عذاب معلوم ہو رہا ہے ابھی گیارہ ہی بجے ہیں، اتنی دیر سے یہی بج رہا ہے، سوئیاں کیوں تیزی سے نہیں چلتیں، یہ سیاہ شب کیوں جلدی دم نہیں توڑتی؟

صبح ہوتے ہی ہم سوار ہو جائیں گے، خدا کرے گاڑی کہیں لیٹ نہ ہو، پرسوں دوپہر تک کوئٹہ پہنچ جائیں گے اور میں سیدھی بھائی صاحب کے پاس چلی جاؤں گی، فوراً ان کے سرہانے بیٹھ کر ان کا سر اپنی گود میں لے لوں گی اور آہستہ آہستہ سہلاؤں گی، ان سے باتیں کروں گی، بردری کی پہاڑیوں پر جو ہم نے شام گذاری تھی وہ انھیں یاد دلاؤں گی، انھیں سکون آ جائے گا، انھیں ضرور نیند آ جائے گی...... لیکن، لیکن، کوئی میری راہ میں حائل ہو رہا ہے، کہتا ہے ایسا نہیں ہو سکتا، میں ان سے سب کے سامنے کھل مل کر باتیں نہیں کر سکتی، ان کے پاس یوں آزادانہ نہیں بیٹھ سکتی، کوئی میرا دل پکڑ کر بھینچتا ہے، میرے اٹھتے قدم روکتا ہے ___ یہ ناصح ٹھیک کہتا ہے ___ میرا دیدہ ہادی مجھے عرصہ سے سمجھا رہا تھا، مگر میں نے اس کی بات کبھی نہیں مانی، میں یہی کہتی رہی "تو جھوٹا ہے، تو مجھے نہیں سمجھا، میرے دل میں چور نہیں ہے۔ میں بھائی صاحب کو آپا سے چھیننا نہیں چاہتی۔" اور وہ مجھے یہ جواب دیتا "تم بیشک سچ کہتی ہو اور میں تمھیں جانتا ہوں، مگر دنیا نہیں جانتی، اسے تمہاری باتوں پر اعتبار نہیں آئے گا۔ تم جس حد کو توڑ کر آگے جانا چاہتی ہو،

وہ بہت سنگین اور بلند ہے اس سے ٹکراؤ گی تو پاش پاش ہو جاؤ گی۔" پہلے میں نے اس کا کہنا مانا لیکن ابھی ابھی اس نے یہ بات بھی کہی ہے "صرف تم ہی برباد نہیں ہو گی اس کی لپیٹ میں دوسرے بھی آجائیں گے' تمہاری آپا' ان کا ننھا منا گھرانا تمہارے بھائی صاحب!!"

یہ میرے دل نے بھرپور وار کیا ہے' جس سے میں پسپا ہو گئی ہوں۔ مجھ میں بغاوت کی بھی ہمت نہیں رہی میں کونے جاؤں گی تو دوسرے انھیں دیکھوں گی' آنکھیں روئیں گی تو آنچل کی اوٹ میں انھیں بہلالوں گی' مجھے اپنی قسمت معلوم ہو گئی ہے' میرے لیے موسم خزاں آگیا ہے' میں اب چراغ کشتہ کی مانند خاموش ہو جاؤں گی۔

لکھ داتا

شیر محمد اختر

"جگ جگ جیو' میرے لکھ داتا۔" کتنے پیارے الفاظ تھے۔ لیکن جس زبان سے یہ الفاظ نکلے۔ وہ ایک بد صورت ناپینا انسان کی زبان تھی۔ اس کی آواز بھدی اور کرخت تھی۔ لیکن یہ الفاظ میرے کانوں کو کس قدر شیریں معلوم ہو رہے تھے۔ یہ میں ہی جانتا ہوں۔

"جگ جگ جیو' میرے لکھ داتا۔" زندگی میں میرا لکھ داتا بن جانا ممکن تھا۔ یہ میں نے آج تک نہیں سوچا تھا۔ لیکن ایک شخص مجھے لکھ داتا کہہ کر میری زندگی کے لئے دعائیں کر رہا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی۔

واقعی! عجیب بات تھی۔ یہی مال روڈ' یہی لاٹ صاحب کے بنگلہ کا موڑ' یہی پولیس گارد کا لمبا سپاہی' یہی موٹریں' میں اب سب کو روز دیکھتا تھا' لیکن آج کا رنگ کچھ اور تھا' مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا میں ہوا میں اڑا جا رہا ہوں اور عام لوگوں سے بلند۔

ایک معمولی کلرک کی زندگی ایک مسلسل چکر ہے وہ ایک مشین کی طرح ہر صبح اٹھ کر نہاتا دھوتا ہے۔ ۹ بجے کھانا کھاتا ہے۔ ایک ایسا کھانا جس میں حیاتین کی کم از کم مقدار ہو۔ اس کے بعد تمام دن فائلوں کے انبار میں دبا رہتا ہے۔ فائل کتنا دلچسپ لفظ ہے۔ لیکن جب اس پر سرخ یا سبز لیبل فوراً (Urgent) یا آج ہی (Today) لگ کر آ جائے۔ تو روح کانپ اٹھتی ہے۔

دفتر کی زندگی سے چار بجے کے بعد رہائی ملی۔ گھر آئے' ذرا دم لیا۔ ستانے' نہا دھو کر بنے ٹھنے اور زندگی کے اسٹیج پر ایک نیا پارٹ ادا کرنے کے لئے گھومنے نکل پڑے۔ یہ ہے مشین کا چکر ___ میری زندگی۔

آج میں مشین کی حرکت پوری کرنے کے لئے لارنس گارڈن کی طرف جا رہا تھا۔ شام کا وقت تھا۔ لاٹ صاحب کے بنگلے کی نکڑ پر جا کر ایک ناپینا لکڑی کے سہارے کھڑا دردناک لہجہ میں چلا چلا کر بھیک مانگ رہا تھا۔

"سرکار ان بھک منگوں کو گرفتار کیوں نہیں کر لیتی۔" ایک حسین لڑکی نے اپنے ساتھی سے کہا۔ دونوں پاس سے گزر رہے تھے۔

"وہ بولا' یہ واقعی ہمارے دیس کے لئے لعنت ہیں۔" اپنے نزدیک گویا بڑی فلسفیانہ بات کہی۔

پاس سے ایک موٹر تیزی سے گزری اور غبار اڑاتی ہوئی غائب ہو گئی ـــــ حسین لڑکی ناک تک رومال بھی نہ لے جا سکی۔ اس کا ...ب ہو گیا۔ اس نے ناک چڑھائی اس کے ساتھی نے حقارت سے موٹر کی گرد کو دیکھا۔ بیچارا سوچتا ہوگا کہ اگر اس کے پاس بھی موٹر ہوتا تو وہ یوں غبار آلود ہو جاتے ـــــ موٹر کی آواز سن کر فقیر پھر زور زور سے چلانے لگا۔ "پرماتما کے نام پر بابا۔ اندھے محتاج کو بابا ایک ... ـــــ آنکھیں بڑی نعمت ہیں بابا ـــــ "لیکن موٹر نے جواب دیا۔ اندھے اور دھول آنکھوں میں ڈال دی۔ 'مجھے تم ایسے اندھوں ... ـــــ ایک سائیکل سوار ـــــ کسی کالج کا طالب علم معلوم ہوتا تھا ـــــ سیٹی بجاتا ہوا گزرا۔ سائیکل کی آواز پر فقیر پھر چوکنا ہو ... لگا۔ سائیکل موٹر کی طرح برق رفتار نہ سہی تیز رفتار تو تھی ہی 'سیٹی کی مسلسل آواز فضا میں ایک نغمہ پیدا کرتی ہوئی لارنس گارڈن ... ے میں غائب ہو گئی ـــــ سڑک پر ایک تانگہ آرہا تھا۔ اس میں ایک خان صاحب بیٹھے تھے۔ مونچھوں کا تاؤ ان کو اور بھی ... رعب دار بنا رہا تھا۔ اندھا پھر چلایا ـــــ لیکن غریب کی پکار کا جواب ہمیشہ ایک ہی ہوتا ہے ـــــ قہقہہ۔

مجھ سے یہ نہ دیکھا گیا۔ میرے پاس صرف ایک پیسہ تھا۔ ایک پیسہ ـــــ لیکن اس کی اہمیت میرے نزدیک بہت زیادہ تھی۔ لارنس گارڈن کے باہر بدر روک کے پل پر ایک پنواڑی بیٹھتا ہے۔ مجھے اس سے ایک پان خریدنا تھا۔ تاکہ تکمیل آرائش ہو جائے ـــــ ایک ایکٹر کی کامیابی کا انحصار اس کے رکھ رکھاؤ پر ہے۔ اور اس کی ذرا سی خامی اداکار کو ناکام رکھتی ہے۔ یہی حال میرا تھا، دو ایک سوٹ ہیں۔ وہ بھی ... کے زمانے کی یادگار، جنھیں میں گھر ہی میں دھو کر ہر دوسرے تیسرے استری کر لیا کرتا ہوں۔ اور لارنس گارڈن جانے کے لئے استعمال کرتا ہوں، پان کی ہلکی سی سرخی لبوں کو ذرا "دیدہ زیب" بنا دیتی ہے ـــــ اب اندھے کی پکار ـــــ اور میرے سوانگ کی تکمیل کا سوال تھا۔ میرا ہاتھ کئی بار جیب کی طرف گیا۔ لیکن پھر رکا ـــــ فقیر کی آواز میرے دل کے اندر ڈوبی جا رہی تھی۔ شاید غریب کی آواز کا غریب پر زیادہ اثر ہوتا ہے یا غریب کا دل زیادہ کمزور ہوتا ہے ـــــ میں مغلوب ہو ہی گیا۔ میں نے دل کڑا کر کے پیسہ فقیر کے ہاتھ پر رکھ دیا ـــــ اپنی ساری پونجی دان کر دی ـــــ "جگ جگ جیو، میرے لکھ داتا" ـــــ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا گویا میں کسی اور دنیا میں ہوں ـــــ موٹر کی شان، سائیکل سوار کی سیٹی، تانگہ پر جانے والے کی مونچھوں کا تاؤ، میری نگاہ میں سب ہیچ تھے ـــــ فقیر کی آواز کی گونج سن کر حسین لڑکی نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ گویا انھیں میرے دان دینے کا یقین ہی نہ آتا تھا۔ تانگے والے مجھے حقارت سے تک رہے تھے شاید وہ سمجھتے تھے کہ سوٹ پہن کر ہر پیدل چلنے والے کی جیب خالی ہوتی ہے۔ پنواڑی کی حسرت بھری نگاہ مجھ پر پڑ رہی تھی۔ کیونکہ اس کا ایک مستقل گاہک چھن گیا تھا ـــــ اچانک اس وقت ایک چھکڑا لارنس باغ سے نکلا، اور مال روڈ کو پار کرتے ہوئے لاٹ صاحب کے بنگلہ کے سامنے سے گزرا۔ چھکڑا اور موٹر ـــــ میں نے دل میں موازنہ کیا ـــــ تہذیب کی ساری داستان۔ چھکڑا موٹر کی ابتدائی شکل ہے، فقیر اور امیر۔ کیا یہ بھی ہندوستان کی تہذیب کی ساری داستان نہ تھی، خونی داستان، صنعت کا ارتقا چھکڑے سے موٹر تیار کرتا ہے۔ لیکن دولت کا ارتقا ـــــ لاکھوں اور کروڑوں انسانوں کو فقیر اور محتاج کر دیتا ہے۔ چھکڑے کی سست رفتاری موٹر کی برق رفتاری میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن زر کی ہوس نے "جنت نشان" کو جہنم میں تبدیل کر دیا۔ فقیر کو دیکھنا تک اب نازک طبائع پر ایک بار گراں ہے۔ اور سماج پر ایک دھبہ ـــــ "لکھ داتا" میرا دماغ اس لفظ کے گرد گھوم رہا تھا۔ لکھ پتی ہونا بہت بڑی بات ہے۔ لیکن لکھ داتا ہونا۔ لاکھ روپیہ دان کرنا۔ یہ کتنی بڑی بات ہے۔ میں نے لاکھ روپیہ دان کر دیا تھا۔ میری کل کائنات یہی ایک پیسہ تھی۔ یہی میرے لئے لاکھ روپیہ تھا ـــــ میں باغ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ اور حسب معمول "سکندر مونٹ" پر چڑھنے لگا۔ آج میرا ہر قدم خود بخود بلندی کی طرف اٹھ رہا تھا۔ میرے کان منتظر تھے کہ میری طرح اور کوئی لکھ داتا اسے خیرات دے اور پکارے کہ میرے لکھ داتا۔ لیکن میرے سوا اور کوئی لکھ داتا نہ بن سکا۔ میں نے ایک بنچ پر بیٹھتے ہوئے باغ کا جائزہ لیا۔ سبزہ زار، قسم قسم کے پھول، شیشے سے زیادہ شفاف سڑکیں، سامنے بینڈ بج رہا تھا۔ وسط باغ میں موٹروں کی قطاریں، کتنا پر لطف سماں تھا، شام کا دھندلکا۔ شفق کی سرخی، خوشگوار موسم، ہر طرف ہریاول ہی

ہریاول۔ لیکن میں نے سوچا یہاں آنے والوں میں سے ایک بھی لکھ داتا نہ تھا' حالانکہ ان کی موٹریں خریدی جاتی ہیں غریبوں کے لہو سے۔ ان کے عطر اور خوشبودار تیل حاصل کئے جاتے ہیں مزدوروں اور کسانوں کے پسینے سے' ان کے بڑے بڑے بنگلے' قبریں ہیں' نہیں بیکس انسانوں کی جن سے جانوروں سے بھی زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ مگر جب ان بے زبانوں میں سے کوئی قدرت کی ستم ظریفی کا شکار بن کر محتاج ہو جائے اور دست سوال دراز کرے۔ نہیں نہیں بلکہ اپنا حق مانگے' تو یہ قدرت کے چہیتے اسے حقارت سے دیکھ کر گزر جاتے ہیں' ان کی موٹریں اس پر زیادہ دھواں پھینکتی ہیں۔ ان کے تانگوں کے گھوڑے زور سے ہنہناتے ہیں۔ یہ قدرت کا قانون ہے۔ فقیر کی آواز ابھی تک میرے کانوں میں آ رہی تھی' وہ چلا رہا تھا۔ "بابا پرماتما کے نام پر ایک پیسہ۔ صبح سے بھوکا ہوں بابا۔ آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔۔۔" پرماتما کے نام پر۔ کیا پرماتما کوئی ایسی چیز ہے' جس کے نام پر صرف ایک پیسہ مانگا جا سکتا ہے' پرماتما یا خدا! کے یہ تصور کس قدر غلط ہے خدا کو کتنا محدود کر دیا گیا' اس کا نام صرف بھیک مانگنے کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے' لیکن پرماتما نے فقیر کو اندھا کیوں کر دیا۔ مالی باغ کو آراستہ پیراستہ کر رہا ہو' ہر طرف ... غریب پھول دکھائی دیتے ہوں' یکایک وہ چند پھولوں کو لے کر مسل دے تو اسے کیا کہیں گے۔ پرماتما نے ایسی مخلوق کو کیوں پیدا کیا' جو اس کے لئے خود باعث عار ہیں۔ اور پھر ان کا یوں سسک سسک کر زندگی کے دن کاٹنا خدا کی پناہ' اس کا جذبہ رحم کہاں چلا جاتا ہے۔ جب ایک غریب آدمی بیمار پڑ جاتا ہے اور اس پر انحصار رکھنے والا ایک کنبہ۔ فاقوں مرنے لگتا ہے ایک کی بیماری کئی اوروں کے لئے پیغام قضا بن جاتی ہے' وہ سوکھی روٹی کو ترستے ہیں' ان کے حلق خشک ہو کر ان میں کانٹے سے چبھنے لگتے ہیں' لیکن مین اس وقت ان کے پاس کے عالی شان محل ایک انسان اپنے ہوس نفس کو پورا کرنے کے لئے دعوتیں دے رہا ہوتا ہے۔ اس کے کتے کو ایک وقت کا اتنا راشن مل جاتا ہے جو اس کے ہمسایہ کے ایک غریب کنبہ کے لئے کئی دن کافی ہو سکتا ہے۔

"بنارسی پان بابو جی۔" ایک پنواڑی میرے سامنے کھڑا مجھ سے پوچھ رہا ہے۔ "نہیں" میں چونک اٹھا ___ پان ___ میں آج پان بھی نہ کھا سکا اور ___ فقیر اور میں ___ ہم میں سے کون مالدار تھا ___ جسے فقیر لکھ داتا بتا رہا تھا۔ وہ اب ایک پیسہ کے لئے محتاج تھا۔ اور فقیر ایک پیسہ کا مالک تھا۔ کیا امارت اور فقیری محض اضافی چیز نہیں؟

رسیلا

مسز عبد القادر

میں من کوٹ میں ایک برانچ سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ یہ سکول شہر ۔ سے باہر کھلی فضا میں ایک نہر کے قریب واقع تھا۔ جس سے تھوڑے فاصلہ پر مست رام کی کٹیا تھی۔ یہ ایک چرسی سادھو تھا۔ جس کے پاس قصبہ کے تمام چرسی جمع ہوا کرتے تھے۔ مست رام زندہ دل ملنسار اور خوددار آدمی تھا۔ اس نے نور کا گلا پایا تھا۔ اس کی آواز میں اتنا رس تھا کہ جانوروں تک کو اپنے داؤدی نغموں سے مسحور کر لیتا تھا۔ یہی چیز میری اور اس کی دوستی کا باعث تھی۔

جاڑا ہو یا طوفان رات کے پچھلے پہر راگنی آسا گانا گویا اس کے فرائض میں داخل تھا۔ چنانچہ پو پھٹنے پر جب وہ اپنی غمگین لے اور پرسوز آواز سے ملتانی زبان میں (وت نہیں آونا دیس پیارے کھیڈن دے دن چار نی مائے) گانا شروع کرتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ سرسوتی دیوی اپنی پوری شان ربوبیت کے ساتھ کسی جدید راگنی کی تخلیق میں مصروف ہے۔ یا کوئی فرشتہ آسمان کی انتہائی بلندیوں سے ملکوتی نغمے عالم ناسوت میں بکھیر رہا ہے۔ اس کے گیت میرے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جاتے تھے۔ میں اس کے گیتوں کا عاشق تھا اور خصوصاً راگنی آسا کا۔ کیونکہ یہ راگنی آسا میری روح کی غذا بن چکی تھی۔ اس لئے میں من کوٹ سے باہر نہ جانا چاہتا تھا۔ جب کبھی تبدیلی کی بھنک میرے کان میں پڑتی تو میں انسپکٹر کی منت وسماجت کر کے پھر یہیں رہ جایا کرتا۔

۲

من کوٹ کہنے کو تو قصبہ تھا۔ مگر اپنی دیرینہ شان وشوکت کے لحاظ سے اچھا خاصا شہر تھا۔ بڑے بڑے بازار۔ سکول۔ ہسپتال وغیرہ سب کچھ موجود تھے۔ اگر کچھ کمی تھی تو ریل گاڑی کی۔ کیونکہ ریل گاڑی صرف غازی گھاٹ تک ہی آتی تھی۔ اور باقی چالیس میل کا سفر لاری یا کسی دوسری سواری کے ذریعہ طے کرنا پڑتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ من کوٹ دوسرے شہروں کی طرح ترقی نہ کر سکا۔ اور اب تک قصبہ ہی کہلاتا رہا۔ یہاں آبادی زیادہ تر ہندوؤں کی تھی۔ جو چودھری کہلاتے تھے ان کی حویلیاں، بہت بڑی اور پرانے وقتوں کی بنی ہوئی قلعہ نما تھیں۔

من کوٹ گو ایک صحرائی علاقے میں واقع تھا۔ مگر شاہجہاں کے عہد کی قدیم نہر کے کنارے آباد ہونے کی وجہ سے یہ مقام بہت سرسبز و شاداب تھا۔ اس علاقے میں آم اور کھجور کے درخت کثرت سے تھے۔

نہر کے پاس کوس بھر کے فاصلے پر ٹکر نامی ایک گاؤں آباد تھا۔ جس کے ارد گرد من کوٹ کے چودھریوں کی جاگیریں تھیں اور موضع ٹکر میں پختہ حویلی صرف ایک ہی تھی جس کا مالک چودھری گوبند رام تھا۔

گوبند رام نہایت بوڑھا آدمی تھا۔ تمام چودھری برادری کا سردار تھا۔ راج دربار میں بھی اس کی عزت تھی۔ اس کی حویلی کے سیاہ رنگ آلود لاڑے گذشتہ عظمت اور مٹی ہوئی تہذیب کے گن گاتے ہوئے من کوٹ سے صاف دکھائی دیتے تھے۔

پار جانے کے لئے نہر پر شاہان مغلیہ کے وقت کا پل بنا ہوا تھا۔ یہ نہر بہت چوڑی اور دریا کا ہم پلہ تھی۔ اس نہر کے کنارے الگ تھلگ میرا اسکول تھا۔ عموماً شام کے وقت مست رام اپنے دو چار سنگی ساتھیوں کو لے کر میرے پاس آیا کرتا تھا۔ جو طرح طرح کی بے سر و پا خبریں سناتے اور بے تکی ہانکا کرتے اسی طرح ایک شام کو ہم لوگ اسکول کے احاطہ میں جس کے ایک طرف باغیچہ بھی تھا بیٹھے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ رات کی رانی کی بھینی بھینی خوشبو سے احاطہ مہک رہا تھا اور مست رام سرور کی حالت میں بیت بولنے لگا۔

اتنے میں اس کا ایک اور چرسی دوست آ گیا جسے مست رام نے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مگر وہ کھڑا رہا اور سر کھجلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "یار بڑے بیت باز بنے ہوئے بلبل کی طرح چہک رہے ہو کچھ بسنت کی بھی خبر ہے۔" مست رام بیت کو ادھورا چھوڑ کر حیرت سے پوچھنے لگا "یار کیا بات ہے۔" اس چرسی نے کہا۔ "سنا ہے کہ مظفر گڑھ اور غازی گھاٹ میں لوگ دھڑا دھڑ پلیگ سے مر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔ "ہاں اس کے متعلق آج میں نے بھی اخبار میں پڑھا ہے۔"

یہ خبر سن کر سب سہم گئے۔ "اب کیا ہو گا ماسٹر جی؟" سب نے پریشانی سے کہا۔ میں نے جواب دیا۔ "خدا رحم کرے۔ اگر زندگی ہے تو کوئی خطرہ نہیں۔" وہی چرسی کہنے لگا۔ "خدا اب کیا رحم کرے گا۔ دنیا تھوڑے ظلم کر رہی ہے۔ کلجگ ہے ماسٹر جی کلجگ۔ ابھی تھوڑے ہی دن گذرے۔ کہ ایک گائے بیچاری سڑک کے درمیان کہیں جا بیٹھی۔ ادھر سے لاری آ رہی تھی۔ تو لاری والے اندھے نے اس کے اوپر لاری چڑھا دی۔ جس سے گائے کی ٹانگ ٹوٹ گئی مگر لاری والے سے کسی نے پوچھا تک نہیں۔

اگلے دن پنڈت کا لڑکا ایک اچھوت عورت بیاہ لایا۔ سنا ہے کہ وہ کہیں تماشے میں رانی کا روپ بھرا کرتی تھی۔ وہیں اس پر ریجھ گیا اور اسے گھر ڈال لیا۔ ابھی پرسوں کی بات ہے کہ بھولا ناتھ کا ایک جوگی جو کہیں باہر سے آیا تھا۔ شامت کا مارا چودھری متھر اداس کے گھر چلا گیا اور شہری طریقے سے ناواقف ہونے کے باعث اندر جا گھسا۔ کمرے میں اس وقت چودھری متھر اداس کا چھوٹا لڑکا جو نیا نیا ولایت پاس کر کے آیا ہے۔ اپنی میم کے ساتھ بیٹھا رنگ رلیاں منا رہا تھا۔ وہ جوگی کو دیکھتے ہی غیظ و غضب سے دیوانہ ہو گیا۔ اور چور چور کہہ کر جوگی کو پکڑ لیا۔ پھر چمڑے کی چھڑی سے اس قدر پیٹا کہ وہ ادھ موا ہو گیا۔ مگر جوگی نے بھی اسے بڑے سراپ دیئے۔ رام رام جوگی کا سراپ بھی اٹل ہوتا ہے۔ جوگی کی زبان کالی ہوتی ہے۔ جو ظالم کو نشٹ کر دیتی ہے۔" وہ دیر تک نمک مرچ لگا کر اس قسم کی باتیں کرتا رہا۔

جوں جوں دن گذرتے گئے۔ نئی نئی افواہیں اڑتی رہیں۔ جس سے پتہ چلتا تھا کہ پلیگ مظفر گڑھ اور غازی گھاٹ کے علاوہ دیہات میں بھی پھیلنی شروع ہو گئی۔

بیساکھ کے آخری دن تھے۔ صحرا کی شفق آلود شام تھی۔ نیم گرم ہوا کے جھونکے بور سے لدے ہوئے آم کی ڈالیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔ کوئل اپنی پر درد آواز میں کوکو کا شور مچا رہی تھی۔ میں چبوترے پر چارپائی ڈالے بیٹھا حقے کے کش لگا رہا

تھا کہ اتنے میں مست رام بھی آگیا۔

"کچھ آپ نے بھی سنا ماسٹر جی اس نے دکھلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں تو۔ کیا کچھ نئی خبر لائے ہو۔ میں نے پوچھا۔ مست رام نے کہا "ہاں ماسٹر جی لوگ کہتے ہیں کہ موضع لوہڑی میں ایک ڈگھوترے کی عورت کے بچے کی بجائے بلا پیدا ہوئی ہے۔ جو پیدا ہوتے ہی بولنے لگی ہے۔ اس نے اپنے گھر کے لوگوں سے کہا میں نرک کی چڑیل ہوں۔ جو دنیا کو ہڑپ کرنے آئی ہوں۔ پھر وہ سارے گاؤں میں پھری۔ اور بعد ازاں اس نے من کوٹ کا رخ کیا۔ آواب کوئی دن میں اس شہر پر بھی تباہی آنے والی ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ اپنے گرد و پیش اس طرح دیکھنے لگا۔ گویا اسے خطرہ تھا کہ کہیں وہ بلا اس کی باتیں نہ سن لے۔ مجھے اس کی بدحواسی پر بے اختیار ہنسی آگئی۔ "کیوں ماسٹر جی اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے" اس نے کھسیانہ ہو کر کہا۔

میں نے کہا۔ "بھئی مست رام۔ بڑی بوڑھیاں کہا کرتی تھیں کہ پچھلے زمانے میں جب نیلاریوں کا نیل پھوٹ جایا کرتا تھا تو وہ ایسی لایعنی داستانیں جوڑا کرتے تھے" وہ چڑ کر کہنے لگا "واہ ماسٹر جی سب باتیں جھوٹ نہیں ہوتیں۔ پڑھے لکھے لوگوں میں یہی تو خرابی ہے کہ وہ کسی کی بات کو مانتے ہی نہیں۔ مگر ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ تھوڑے ہی دنوں میں آپ سب کچھ دیکھ لیں گے۔ برے آثار تو شروع ہو ہی گئے ہیں۔"

میں نے اکتا کر کہا "اچھا جو کچھ دیکھنا ہے بعد میں خود ہی دیکھ لوں گا۔ مگر وہ آثار جو تمہارے سوا کوئی دوسرا نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے بھی دکھا دو۔ مست رام نے متانت سے کہا۔ "تو کیا آپ نے رات کو کبھی کتوں کا رونا نہیں سنا۔ وہ آج کل ایسی خوفناک آواز سے روتے ہیں کہ سننے والوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور کئی لوگوں کا قول ہے کہ رات کو آسمان سے بلائیں اترتی ہیں۔ جنہیں کتا اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھ کر چیختا چلاتا ہے۔" مست رام کے کہنے پر فوراً مجھے ایک دن پہلے کا واقعہ یاد آگیا۔ کہ رات کو اتفاقاً میری آنکھ کھلی۔ تو اس وقت باہر ایک کتا منحوس آواز میں لمبی لمبی چیخیں لگا رہا تھا۔ جس کا میرے دل پر بہت ناگوار اثر ہوا۔ اور پھر تمام رات نیند نہ آئی۔ تاہم میں نے بے پروائی سے کہا۔ "اونہہ یہ کوئی بڑی بات نہیں 'کتے ہمیشہ رویا کرتے ہیں۔ یہ برے آثار کی کوئی معقول دلیل نہیں۔" مست رام نے زچ ہو کر کہا۔ "اچھا نہ سہی۔ لیکن یہ تو بتائیے آپ نے آسمان پر کبھی پہلے اتنی سرخی دیکھی تھی۔ پرانے زمانہ کے لوگ کہا کرتے تھے کہ جب کسی بے گناہ کو سولی چڑھایا جاتا تھا تو سرخ آندھی آتی تھی۔ مگر اب تو آندھی بھی نہیں۔ اور آسمان بلا وجہ خون کبوتر ہو رہا ہے۔ اگر یہ بدشگونیوں کے آثار نہیں تو اور کیا ہیں۔"

ایکدم میری نظر سامنے کی طرف اٹھی۔ نہ جانے واہمہ کا اثر تھا یا سچ مچ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ وہ لمبا چوڑا صحرا آسمان کی سرخی سے لہولہان ہو رہا ہے بلکہ نہر کا پانی بھی سرخ بانات کی چادر کی طرف ہلکورے لیتا اور موجوں کی خونیں سلوٹیں ڈالتا سست روی سے بہہ رہا ہے۔

یہ منظر دیکھ کر میرا دل لرز گیا۔ تاہم میں نے ایک اونہہ کے ساتھ بات کو ٹال دیا۔

۳

جیٹھ کا آغاز تھا حسب دستور گرمی کا جوش بڑھ رہا تھا دو دن سے میں نے مست رام کو کہیں نہ دیکھا۔ اس لئے سہ پہر کو خود اس کی کٹیا کی طرف گیا۔ جس کی کٹیا گلو کی بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ صحن میں ایک طرف پانی کا چہ بچہ تھا۔ جہاں اس نے کبوتروں کے لئے لمبی لمبی چھتریاں کھڑی کر رکھی تھیں۔ وہ اس وقت چرسیوں کے درمیان ایک کبوتر کو سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔
مجھے دیکھتے ہی وہ سب تعظیم کو اٹھے۔ ایک چرسی نے فوراً کٹیا سے ایک رنگیلی چارپائی نکال کر بچھا دی۔ میں نے چارپائی پر بیٹھتے

ہوئے کہا "بھئی مست رام دو دن کہاں غائب رہے۔" مست رام نے اپنے کبوتر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ماسٹر جی میرا بچہ ٹوٹرو بیمار ہو گیا تھا۔"

میں نے کہا "بچہ ٹوٹرو کون۔ کیا تمہاری مراد اس کبوتر سے ہے۔ جسے چھاتی سے لگائے ہو۔" اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا "ہاں ماسٹر جی یہ ہی میرے بال بچے ہیں۔ ان پر میری جان جاتی ہے۔ یہ خدا کے جی ہیں۔ مجھے ان کی خدمت میں بڑا آنند ملتا ہے۔"

اس کے بعد اس نے اٹھ کر ٹنڈا سے ایک نیا حقہ نکالا اور بھر کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں حقہ پینے لگا اور اس نے پاؤں دبانا شروع کئے۔ میں نے کہا۔ "بھئی کئی دن سے کوئی تازہ خبر سننے میں نہیں آئی۔" مست رام نے کہا "ماسٹر جی آج کل تو چاروں طرف پلیگ کی خبریں ہی پھیل رہی ہیں اور غالباً آج یا کل وہ یہاں بھی پہنچ جائے گی۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "وہ کیسے کیا اس نے تمہیں پیغام بھیجا ہے۔" اس کے جواب میں مست رام نے اپنے ایک چڑسی دوست سے کہا۔ "اچھا بھئی دھنی تم خود اپنی زبان سے ماسٹر جی کو وہ واقعہ سناؤ۔"

دھنی لمبی مونچھوں والا شخص تھا۔ جو عام چڑسیوں کی طرح مرا ہوا نہ تھا۔ یہ آدمی یکہ چلایا کرتا تھا۔ اس نے پہلے ایک جھر جھری سی لی۔ پھر گول مٹول دیدوں کو پھیلا کر کہنے لگا۔ "ماسٹر جی رام کچھ نہ پوچھئے۔" پھر کافی دیر سوچنے کے بعد بولا۔ "میں روزانہ رات کے ڈھائی تین بجے موضع دوہرہ سے سواریاں لادتا ہوں اور سورج کی پہلی کرن پھوٹتے ہی من کوٹ پہنچ جاتا ہوں۔ میری سواریوں میں زیادہ تر گوالے اور دھوبی وغیرہ ہوتے ہیں۔ جنہیں صبح سویرے ہی اپنے کام پر پہنچنا ہوتا ہے۔

چنانچہ گزشتہ رات جب سواریاں لادنے لگا تو ان میں ایک برقعہ والی عورت بھی تھی۔ میں رات کے وقت اکیلی عورت کو سوار کرنے سے ہچکچانے لگا جس پر وہ عورت منتیں کرنے لگی۔ ان سواریوں میں موضع لوہڑی کا ایک چٹھی رساں بھی تھا۔ جو رخصت گزار کر کسی گاؤں سے واپس آرہا تھا۔ اور صبح اسے اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہونا تھا۔ اس عورت کی منت سماجت پر اس نے کہا "بھئی لے بھی چلو اسے۔ یہ بیچاری اب رات کو کہاں بھٹکتی پھرے گی۔ ہم سب بہو بیٹی والے ہیں اسے لے جانے میں کوئی حرج نہیں۔"

چٹھی رساں کے کہنے پر میں نے اسے سوار کر لیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ من کوٹ جائے گی۔ خیر ہم لوگ وہاں سے روانہ ہوئے۔ لیکن رام جانے گھوڑے کو کیا ہو گیا۔ وہ چند قدم چل کر رک جاتا اور بری طرح ہانپنے لگتا۔ گویا منوں بوجھ کے تلے دبا ہوا ہو۔ آخر میں نے تنگ آکر اس کی لگام پکڑلی اور قدم قدم اسے چلانے لگا حتی کہ لگام کھینچتے کھینچتے میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے اور گھوڑے کا دہانہ بھی زخمی ہو گیا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیئے۔ جن پر واقعی چھالے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اچھا تو پھر کیا ہوا۔" دھنی کہنے لگا۔ "اسی طرح میں نے کوئی پانچ کوس کا فاصلہ طے کیا تھا۔ کہ گھوڑا پھر ٹھہر گیا۔ عین اسی وقت چٹھی رساں نے یکہ سے اترتے ہوئے کہا کہ میں ذرا پیشاب کر آؤں اور پھر آہستہ سے میرا ہاتھ دبا کر آگے بڑھ گیا۔ اس کا یہ اشارہ پا کر میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔

تھوڑی دور پر ایک درخت کی اوٹ میں جا کر اس نے مجھ سے کہا۔ "بھئی اس عورت کو تو سوار کر کے ہم نے بڑی غلطی کی۔ کیونکہ وہ انسان نہیں بلکہ کوئی ہوائی مخلوق ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کیسے؟" چٹھی رساں کہنے لگا۔ "میں اس کے ساتھ بیٹھا ہوں ہوں۔ وہ کسی وقت جوان دکھائی دیتی تھی۔ کسی وقت بوڑھی، کبھی گوری ہو جاتی اور کبھی کالی۔ اس لئے میں نے اسے زیادہ توجہ سے دیکھنا شروع کیا۔ لہذا اب معلوم ہوا کہ اس کی داڑھی مونچھیں بھی ہیں۔ میں ڈر کر پیشاب کے بہانے نیچے اتر آیا۔"

چھمی رساں کی بات سن کر میرا رنگ فق ہو گیا۔ مگر وہ دبلی گوری سی لڑکی تھی۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ ایسے موقع پر دل چھوٹا مناسب نہیں ہوتا اس کے بعد وہ پھر یکہ پر سوار نہ ہوئی۔ بلکہ گھوڑا ہانکتے ہوئے میری مدد کرتا رہا اور اس کی ہمت و کوشش تھی کہ میرا یکہ پہلے ہی موضع لوہڑی پہنچ گیا۔ جہاں میں نے اپنی سب سواریوں سے کہا۔ چونکہ میرا گھوڑا بیمار ہو گیا ہے۔ اور میں آگے نہیں جا سکتا اس لئے کرایہ معاف کرتا ہوں۔

سواریاں اتر گئیں مگر برقعے والی کہنے لگی۔ لالہ اور کسی سے خواہ کرایہ لو یا نہ لو۔ مجھ سے ضرور لے لو۔ یہ کہتے ہوئے اس نے میرے ہاتھ میں ایک نوٹ دے دیا۔ اور قریب کی ایک گلی میں داخل ہو کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد چھمی رساں نے کہا "بھئی تم پر تو وہ بہت مہربان تھی۔ دکھاؤ تو کتنے کا نوٹ دے گئی ہے۔"

میں نے نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا "ہائیں یہ کیا" اس نے نوٹ کو لالٹین کی روشنی میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ تو معمولی کاغذ ہے۔" میں تعجب سے اس کے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ پر جھک گیا۔ چھمی رساں نے کہا ٹھہرو بھئی اس پر تو کچھ لکھا ہوا بھی ہے۔ اور اس کاغذ کو لالٹین کے بالکل قریب لے جا کر پڑھنے لگا۔

کاغذ کا مضمون بہت لرزہ خیز تھا۔ لکھا تھا کہ یہ تم لوگوں کی خوش قسمتی تھی جو تم نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا۔ میں لاری سے جانا چاہتی تھی۔ مگر تمہارا یکہ دیکھ کر جی میں آئی کہ اسی پر چلی جاؤں۔ جلدی جا پہنچوں گی۔ مگر یہ خیال ہی نہ رہا کہ گھوڑا میرا بوجھ نہ اٹھا سکے گا کیونکہ میں دراصل عورت کے بھیس میں پلیگ تھی لیکن تم لوگ بھی بہادر نکلے۔ جو یکہ کو گھسیٹ گھسات کر لوہڑی تک لے آئے میں تم لوگوں سے بہت خوش ہوں۔ من کوٹ تو مجھے پہنچنا ہی ہے۔ آج نہ سہی کل سہی تاہم تم لوگوں کی جوانمردی کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتی اس کے صلہ میں تم لوگوں کی جان بخشی کرتی ہوں۔

اس مضمون سے ہمارے ہوش اڑ گئے۔ میں نے وہ کاغذ جیب میں رکھا اور فوراً وہاں سے روانہ ہوا۔ تاکہ من کوٹ جا کر یہ کاغذ لوگوں کو دکھاؤں اب میرا گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے فوراً مجھے من کوٹ پہنچا دیا۔ مگر من کوٹ پہنچ کر جب میں نے وہ کاغذ نکالنے کی خاطر جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب خالی تھی۔"

ابھی دھنی رام اپنا بیان ختم نہ کرنے پایا تھا کہ ہوا کا ایک تیز جھونکا خس و خاشاک اڑاتا ہوا کٹیا کی دیواروں سے ٹکرا گیا۔ "اوہ۔ کتنی سخت آندھی ہے" مست رام نے نہر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا۔ تو سچ مچ خوفناک اور سیاہ آندھی سیلاب کے پانی کی طرح تیز روی سے چلی آتی تھی۔ میں بوکھلایا ہوا اسکول کی طرف بھاگا۔ مگر میرے پہنچتے ہی پہنچتے ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

آندھی کیا تھی خدا کا قہر تھا۔ بڑے بڑے تناور درخت جڑوں سے اکھڑ گئے مکانوں کی منڈیریں اور مزدوروں کے چھپر صاف اڑ گئے۔ [illegible] بالکل جھڑ گیا تمام رات آندھی بڑے زور شور سے چلتی رہی اور صبح کے قریب بارش کا چھینٹا پڑنے سے اس کا جوش ٹھنڈا ہوا۔

دوسرے دن صبح صبح مست رام میرے پاس آیا اور آتے ہی رات والی آندھی کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ اس آندھی کو پلیگ کا پیش خیمہ تصور کرتا تھا کیونکہ [illegible] اس کو سوائے پلیگ کا چرچا کرنے کے دوسرا کوئی کام ہی نہ تھا۔ وہ بہت ہراساں تھا۔ میں نے ان توہمات باطلہ سے اس کا خیال [illegible] ہٹانے کی بہت کوشش کی۔ خیر اس وقت تو وہ کچھ قائل بھی ہو گیا۔ مگر شام کو پھر وہی خط لئے آدھمکا۔

اس وقت اس کے ساتھ ایک اور چپڑ اسی بھی تھا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "ماسٹر جی مہاراج۔ آج مادھو نے ایک اور تازہ خبر سنائی تھی کیا اسے بھی آپ جھوٹ ہی کہیں گے۔" میں نے کہا۔ "کیسی خبر ہے جلدی بیان کرو۔" مست رام نے جواب دیا۔ "مادھو خود ہی بیان کرے گا۔ اور اسی لئے اسے ساتھ لایا ہوں۔ کیونکہ میری بات کو تو آپ ہنسی میں اڑا دیتے ہیں۔"

مادھو ادھیڑ عمر کا بھدا سا آدمی تھا۔ جس کے سر پر لمبی سی چوٹی اور کانوں میں سونے کے مندرے پڑے تھے۔ اس نے ایک میلی کچیلی دھوتی پہن رکھی تھی اور جسم ننگا تھا۔ یہ کچھ نیم پاگل سا آدمی تھا۔ جس کی شکل و شباہت دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسی آتی تھی۔ لہٰذا میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا۔ "کہو بھئی مادھو کیا بات ہے۔"

مست رام نے میری تائید کرتے ہوئے کہا۔ "مگر دیکھو خبردار جھوٹ نہ بولنا" مادھو نے پھٹے پھٹے دیدوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لئے اور سونے کے مندروں کو پکڑ کر کہنے لگا۔ "مہاراج میں اس پوتر سونے کو چھو کر کہتا ہوں کہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گا۔" مست رام نے کہا۔ "اچھا تو پھر بیان کرو۔"

مادھو نے کہا۔ "مہاراج۔ دوپہر کو میں حسب معمول بھٹی کے لئے گھاس پھوس جمع کرنے کی خاطر شہر سے باہر گیا۔ اور قبرستان کے قریب سے گزرنے لگا تو پیچھے دور سے کسی نے مجھے مادھو مادھو کہہ کر پکارا۔ میں نے سمجھا کوئی جان پہچان والا ہو گا۔ کیونکہ سوائے جان پہچان والے کے کوئی کسی کا نام لیکر کیسے پکار سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ تو وہاں کوئی بھی آدمی نہ تھا۔ میں آگے بڑھا تو قریب کے کھیت سے پھر آواز آئی۔

بازو پر ہر مل کا کھیت تھا میں اس طرف ہو لیا۔ تو کچھ دور پر ہر مل کے کھیت میں ایک بوڑھیا دکھائی دی۔ جو اپنے بدن پر سالو تا لئے پڑی تھی اس عورت کا چہرہ اتنا ڈراونا تھا کہ میں دہل گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں سخت پیاسی ہوں۔ جلد کہیں سے پانی لاؤ۔ مارے خوف کے میری زبان تالو سے لگ گئی اور میں بول نہ سکا۔

میری اس خاموشی پر اسے بہت غصہ آیا اور اٹھ کر میرے سر پر ایسی چپت رسید کی کہ میں چکرا گیا۔ تو میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "ماتا پانی کہاں سے لاؤں۔ یہاں قریب تو پانی کہیں بھی نہیں۔" اس نے حکم دیا کہ جاکر نہر سے پانی لا۔ میں بہت بہتر کہہ کر واپس ہوا۔

ابھی میں تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اس نے پیچھے سے اونچی آواز میں پکار کر کہا۔ "مادھو میرے ساتھ دھوکا نہ کرنا۔ میں پلیگ ہوں اگر تم پانی لیکر نہ آئے تو تمہاری خیر نہیں۔" اس کے یہ الفاظ تیر کی طرح میرے دل میں اتر گئے اور (اور وہ خوفزدہ ہو کر ایسا بھاگا کہ گھر پر آکر دم لیا۔" اس کی یہ مضحکہ خیز داستان سن کر میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا تو پھر تم پانی لے کر گئے تھے؟" مادھو نے کہا۔ "رام رام پھر وہاں کون جاتا۔" میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "اچھا مٹی کے مادھو اب وہ تمہیں کبھی زندہ نہ چھوڑے گی۔"

میرے اس مذاق سے مادھو زیادہ پریشان ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد کہنے لگا۔ "بھئی مست رام میرے سر میں تو پہلے ہی بہت سخت درد تھا۔ مگر اب تو بدن بھی ٹوٹ رہا ہے۔ مجھے ضرور بخار آئے گا۔ اس لئے مجھے جلد گھر جانا چاہیے۔ اور تم مہربانی کر کے ذرا گھر تک پہنچا دو۔ کیونکہ اکیلا جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ابھی ماسٹر جی بھی کہہ رہے تھے کہ وہ تمہیں زندہ نہ چھوڑے گی۔"

میں نے اس کی حالت دیکھ کر تسلی دی اور مست رام بھی سمجھانے لگا۔ لیکن وہ اسی بات پر اڑا رہا کہ مست رام اسے گھر تک پہنچانے جائے آخر کار اسے مادھو کے ساتھ جانا پڑا۔

دوسرے دن صبح سویرے ہی مست رام ہاتھوں میں چلم دبائے ہوئے آ کھڑا ہوا۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا اور بہت دلگیر دکھائی دیتا تھا میں نے کہا "کہو بھئی مست رام خیر تو ہے۔ آج صبح صبح کیسے آنا ہوا" مست رام نے افسوسناک لہجے میں کہا "ماسٹر جی۔ اب خیر کہاں۔ آج مادھو بھی مر گیا ہے۔" یہ سنکر میں ہکا بکا رہ گیا اور بے اختیاری سے کہا "ہائیں رات کو تو اچھا بھلا تھا اس قدر جلد کیسے مر گیا" مست رام نے کہا "ماسٹر جی مر تو وہ اسی وقت گیا تھا جس وقت اس کے سر پر پلیگ نے چپت لگائی تھی۔" میں نے کہا "خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ وہ پاگل آدمی تھا واہمہ کا شکار ہو گیا ہو گا۔ مگر تمہیں اس کی موت کا کیسے پتہ لگا؟" مست رام نے کہا "اس نے آخری وقت میں مجھے بلایا تھا۔ صبح منہ اندھیرے ہی اس کا لڑکا آ کر مجھے لے گیا۔ لیکن میرے پہنچنے تک وہ ختم ہو چکا تھا۔ آدھا اس کا منہ اور سر سوجا ہوا تھا اس کے گلے میں پلیگ پھوٹی تھی۔"

مادھو کی اس اچانک موت سے میں بہت دل برداشتہ ہوا۔ جس کا اثر کئی دنوں تک میرے دل پر رہا۔ اس عرصہ میں مست رام بھی میرے پاس بہت کم آتا رہا اور اگر آتا بھی تو چپ چاپ بیٹھا رہتا غرضیکہ ہماری محفل پھیکی پڑ گئی۔

جیٹھ بیت چکا تھا۔ ہاڑ شروع ہو گیا۔ اتوار کے دن میں باغیچے کے قریب چارپائی پر لیٹا تھا۔ ہوائیں گنگنا رہی تھیں۔ آم کی پھلدار ڈالوں پر کوئل کوک رہی تھی۔ ڈاکیہ ڈاک لایا جس میں ایک سرکاری لفافہ تھا۔ کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ انسپکٹر صاحب کا حکم نامہ ہے کہ سکول میں لڑکوں کو پلیگ کا ٹیکہ لگوایا جائے۔

اسی وقت مست رام بھی بھولا بھٹکا آ نکلا۔ میں نے اسے یہ خبر سنائی۔ اس نے کہا "میں بھی نندو تیلی سے ابھی ابھی ایک نئی خبر سن کر آیا ہوں۔" میں نے کہا "کوئی نیک خبر ہے۔" اس نے کہا "نندو کہتا تھا کہ پرسوں رات کو چودھری درگا داس کسی اپنے کام کے واسطے تحصیلدار سے ملنے گیا۔ جہاں باتوں باتوں میں اسے بہت دیر ہو گئی۔ نصف شب کے قریب جب وہ واپس آیا۔ تو تحصیل کے نکڑ پر اسے ایک عورت ملی۔ جو دہاڑیں مار کر رو رہی تھی۔ اس کی آواز بہت دردناک تھی۔ اس نے چودھری سے خیرات مانگی۔ آدھی رات اور سنسان سے میں اس کی مکروہ آواز کا چودھری پر بہت اثر ہوا اس نے کچھ زر نقد عورت کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ مگر عورت نے وہ پیش کش قبول نہ کی۔ اور کہا کہ میں بھوکی ہوں۔ مجھے کھانے کو کچھ دو۔ چودھری نے نرمی سے کہا۔ یہاں میرے پاس کچھ نہیں۔ البتہ اگر میرے ساتھ گھر چلو گی تو ضرور تمہیں پیٹ بھر کر کھانا کھلا دوں گا۔

چودھری کا جواب سن کر وہ عورت کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ اور پھر بولی نہیں میں تمہارے گھر نہ چلوں گی۔ کیونکہ تم بھلے آدمی ہو۔ بس اتنا کہتے ہی اس کا قد لمبا ہونے لگا۔ یہ حالت دیکھ کر چودھری کے اوسان خطا ہو گئے۔ اور بے تحاشا وہاں سے بھاگا۔ اب سنا ہے کہ وہ یگیہ کی تیاری کر رہا ہے۔"

خیر مست رام تھوڑی دیر بعد چلا گیا۔ اسی دن سہ پہر کو چند آدمی پوری حلوا تقسیم کرتے ہوئے میرے پاس بھی آئے اور دو دونے انھوں نے مجھے بھی دیئے۔ میں نے پوچھا "یہ کہاں سے آئے ہیں۔" انھوں نے کہا "چودھری درگا داس کے ہاں سے۔" میں نے کہا "کیا تقریب ہے۔" انھوں نے جواب دیا "کہ چودھری جی نے یگیہ رچایا ہے۔" میں نے کہا "کیوں۔" انھوں نے ہنس کر جواب دیا "ان کی مرضی" میں لاجواب ہو گیا اور دونے چپکے سے اٹھا کر رسویا کے حوالے کر دیئے۔

۴

رفتہ رفتہ من کوٹ بھی پلیگ کی زد میں آ گیا۔ اور وبا نے اس سختی سے حملہ کیا کہ من کوٹ میں گویا اندھیر مچ گیا۔ موت اتنی

ارزاں ہوگئی کہ راستے میں چلتے چلتے انسان گر کر مر جاتے۔ اور کوئی ان کو اٹھانے والا تک نہ رہا۔ گھروں کے گھر بیمار پڑے تھے۔ اکثر لوگ بھاگ چلے تھے۔ اور باقی کثرت اموات کی بدولت مردوں سے بدتر ہو رہے تھے۔ غرضیکہ ہر طرف ہراس اور ابتری پھیلی ہوئی تھی۔

ہمارے سامنے بھی نہر کا پل تھا۔ جس پر سے ہر روز جوق در جوق خلقت بھاگتی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ ایک دن میں اور مست رام دونوں بیٹھے ہوئے اس وحشت خیز سلسلے کو نہایت افسوس سے دیکھ رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "بھلا یہ لوگ بھاگ کر جائیں گے کہاں۔ پلیگ تو چاروں طرف آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔" مست رام نے کہا۔ "یہ لوگ ضرور بچ جائیں گے کیونکہ یہ ٹھکر جا رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ٹھکر کونسا ایسا دور ہے جو اتنے آدمیوں کے اجتماع کے باوجود پلیگ سے محفوظ رہ سکتے۔" مست رام نے کہا۔ "نہیں وہاں پلیگ نہیں جا سکتی۔ ہاں اتنے آدمیوں کے اجتماع سے فساد کا ضرور خطرہ ہے۔" میں نے کہا۔ "ٹھکر۔ میں پلیگ کیوں نہیں پھوٹ سکتی۔"

مست رام نے جھوم کر کہا۔ "وہ رسیلے کی نگری ہے ماسٹر جی رسیلے کی۔ جس کا نام سنتے ہی پلیگ رفو چکر ہو جاتی ہے۔" میں نے تعجب سے کہا "رسیلے کی نگری! وہ رسیلا کون ہے۔" مست رام نے کہا "ماسٹر جی رسیلا ایک بھاگوان پرش تھا۔ جتی ستی سا۔ گنی آدمی تھا۔ بلوان تھا۔ ایشور کا روپ تھا۔ ایک وقت میں اس نے پلیگ کو اپنی قوت بازو سے زیر کیا تھا۔" میں نے اشتیاق سے کہا۔ "وہ کیسے؟" مست رام کہنے لگا "یہ بہت لمبا قصہ ہے جو پھر کسی وقت سناؤں گا۔ اس وقت میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔ اب جاتا ہوں۔"

آخر کار چند دن کے اندر ہی شہر قریباً خالی ہو گیا۔ سکول پہلے ہی سے بند تھا۔ ہر طرف ویرانی اور سنسنی پھیل رہی تھی۔ ہر طرف دھول محیط رہتی تھی اور نامعلوم طور پر آہ و بکا کی آوازیں گونجتی محسوس ہوتی تھیں۔ میں انسپکٹر صاحب کے حکم کا منتظر تھا۔ اور دعائیں مانگ رہا تھا کہ جلد رخصت کا حکم ملے تاکہ بستر گول کروں۔

مست رام نے بھی میرے پاس آنا جانا کم کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ ان دنوں بہت ہراساں تھا۔ اور اپنی زندہ دلی قطعی طور پر بھول چکا تھا۔ دو دن سے میں بھی بہت پریشان تھا۔ کیونکہ میرا رسویا بھاگ چکا تھا۔ اور کھانا مجھے اپنے ہاتھ سے تیار کرنا پڑتا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمیوں کی لمبی دوپہر جس کو ثقل دوپہر کہنا زیادہ موزوں تھا۔ میں نے خود چولھا جھونکا۔ اور کچا پکا کھانا زہر مار کر کے اندر کمرے میں بچھی ہوئی چارپائی پر لیٹ کر پنکھا جھلنے لگا۔

پشت کی طرف کھڑکی تھی جس پر کثرت سے گلو کی بیلیں پھیلی ہوئی تھیں گو باہر لو کے آتشیں جھونکے بدن کو جھلساتے تھے۔ مگر گلو کی پتیوں سے چھن کر اندر آنے والی ہوا قدرے ٹھنڈی اور خوشگوار تھی۔ میں اپنے دھیان میں لیٹا تھا کہ باہر سے کسی کے بڑبڑانے کی آواز سنائی دی۔ جس سے میں چونک اٹھا۔ اور پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

اُف خدا بچائے۔ کھڑکی کے باہر مجھے ایک نہایت مکروہ چہرہ دکھائی دیا۔ یہ چہرہ ایک ضعیف عورت کا تھا۔ جس کا رنگ مٹیالا تھا۔ اور منہ پر جا بجا سیاہ دھبے پڑے تھے۔ آنکھیں ابھری ہوئی اور سرخ تھیں۔ یہ عورت غصیلی آواز میں خود بخود بڑبڑا رہی تھی۔ میں نے نفرت سے کہا۔ "تم کون ہو؟" بڑھیا نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ہم ہیں۔"

اُس کے بے باکانہ جواب پر گو میں حیران رہ گیا۔ تاہم اسے جھڑک کر کھڑکی سے ہٹ جانے کو کہا۔ جس پر وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔ اور میں نے فوراً اٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔ لیکن جب واپس چارپائی کی طرف آیا۔ تو اسے سامنے دروازے پر کھڑا پایا۔

اُس نے ایک بدرنگ سا لہنگا اور چولی پہن رکھی تھی۔ اور سر سے ننگی تھی سر کے بال خشک ہو کر جٹاؤں کی شکل میں ایک

دوسرے سے الجھے ہوئے تھی مٹی سے اٹ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ خاص طور پر بدنما اور غلیظ تھے۔ انگلیاں کچھ عجیب طرز کی ٹیڑھی اور ٹوٹی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔

نہ جانے اس بڑھیا کو دیکھ کر کیوں میرے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اور میں نے نرمی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "کیوں مائی کیا چاہتی ہو۔" بڑھیا نے جواب دیا۔ "تمہارا سر صدقہ۔" میں نے کہا۔ "میرے پاس تو اس وقت کچھ بھی نہیں۔ میرا ہر سوا کل سے بھاگا ہوا ہے۔ خود کھانے سے ناچار ہوں۔" بڑھیا نے خشک لہجہ میں جواب دیا۔ "میں بھی تو ناچار ہوں۔ تمام شہر خالی پڑا ہے۔ اگر کچھ دیدو گے تو تمہارا ہی بھلا ہے۔ لیکن تم لوگ جان تو دیتے ہو تاہم اس کی قیمت نہیں دے سکتے۔" بڑھیا کی گفتگو سے میں حیران رہ گیا۔ کیونکہ اس کا انداز گفتگو سر بسر تحکمانہ تھا وہ بجائے التجا کے دھمکی دے رہی تھی۔

میں نے سہمی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو اس کی شکل وصورت میں کچھ ایسی ناپاک اور شیطانی جھلک دکھائی دی۔ جس سے گھبرا کر میں نے کہا "مائی جی یہ کمرہ تمہارے سامنے پڑا ہے۔ جو چاہو لے سکتی ہو۔" بڑھیا آگے بڑھی۔ اور برتنوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ مٹی کے ایک برتن میں تھوڑے سے کالے ماش پڑے تھے۔ جو اس نے لہنگے کے پلو میں باندھ لئے پھر تپائی سے چابیاں اٹھا کر میرا کیش بکس کھولنے لگی۔ یہ دیکھ کر مجھے زر نقد جانے کا اندیشہ ہوا لیکن روکنے کی ہمت نہ پڑی۔

کیش بکس میں ڈیڑھ سو کے قریب روپیہ تھے۔ مگر اس نے صرف ایک پیسہ اٹھایا اور باہر نکل گئی۔ میں ہکا بکا بھی اسی طرح کھڑا تھا۔ اور کیش بکس بھی بدستور میرے سامنے کھلا پڑا تھا۔ کہ عین اسی وقت باہر سے مست رام کی آواز سنائی دی۔ وہ بوکھلایا ہوا اندر داخل ہوا۔ اور بے صبری سے کہنے لگا "کیا وہ یہاں آئی تھی۔" میں نے پوچھا "کون۔" مست رام نے جواب دیا۔ "پلیگ۔ آہ۔ میں نے اس سے سخت کلامی کی؟

مست رام کی زبانی پلیگ کا نام سن کر میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ میں نے خوفزدہ ہو کر کہا۔ "پلیگ تو نہیں ایک بڑھیا بھکارن آئی تھی۔" اس نے کہا۔ "وہ کہاں ہے؟" میں نے کہا۔ "چلی گئی۔"

"آہ کدھر گئی۔ اس نے بدحواسی سے کہا۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی۔" تو اسے نے پوچھا۔ "تم نے اسے کیا دیا۔" اس پر میں نے سارا واقعہ سنایا کہ کس طرح آئی اور کس طرح خیرات لے کر رخصت ہو گئی۔

وہ کف افسوس ملتے ہوئے بولا۔ "بس اب تو اس کے پلیگ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ دیکھا اس نے صدقہ میں آپ سے صرف کالے ماش اور تانبے کا پیسہ لیا۔ یہی دو چیزیں تو صدقہ کے لئے مخصوص ہیں۔ اف اب میری خیر نہیں۔"

میں اس کے بڑھتے ہوئے اضطراب کو دیکھ کر تسلیاں دینے لگا۔ حالانکہ خود میرے دل میں بھی ہول اٹھ رہا تھا۔ وہ اسی طرح غم والم میں کھویا ہوا واپس چلا گیا۔ اور میں اس روز بہت مغموم رہا۔ شام کے قریب میں اس کی کٹیا کی طرف گیا۔ مگر وہ وہاں نہ ملا۔ وہ وہمی طبیعت کا آدمی تھا۔ اسی لئے مجھے خطرہ تھا کہ وہ کہیں واہمہ کا شکار نہ ہو جائے۔ اسی خیال میں میں نے رات کو بھی برے برے خواب دیکھے۔ مگر شب کی آخری ساعتوں میں جب مست رام نے گانا شروع کیا (وت نہیں آوناں دیس پیارے کھیڈن دے دن چار) تو جان میں جان آگئی۔

صبح اشنان سے فارغ ہو کر میں پھر مست رام کی کٹیا کی طرف گیا وہ گھٹنوں پر سر رکھے آنگن میں بیٹھا تھا۔ مجھے دور سے دیکھتے ہی چلا کر کہنے لگا۔ "ماسٹر جی ادھر مت آنا ابھی میری کٹیا میں ایک مردہ چوہا پایا گیا ہے۔" میں نے مضطرب ہو کر کہا "تو پھر تم یہاں کیوں

بیٹھے ہوئے ہو ادھر میرے مکان پر چلو۔ تمہارا یہاں رہنا اچھا نہیں۔" اس نے کہا "اچھا ابھی نہا کر آتا ہوں۔ آپ جائیے۔"

میں سکول میں آکر اس کا انتظار کرنے لگا۔ مگر وہ کہیں غائب رہا۔ آخر شام کو وہ میرے پاس آیا۔ آج اس نے نئے کپڑے پہنے تھے۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ آنکھوں کے گلابی ڈورے گویا نشہ کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ اس وقت ایک شکیل جوان دکھائی دیتا تھا۔

وہ آتے ہی پیڑ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اور تھکاوٹ کا اظہار کرنے لگا۔ میں نے کہا۔ "بھئی کہاں رہے۔ میں صبح سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" اس نے کہا "میونسپلٹی والے کنالی صفائی کرنے آگئے تھے پھر مجھے پکڑ کر لے گئے۔ جہاں انھوں نے تمام دن بٹھائے رکھا اور اب ٹیکہ لگوا کر خلاصی ہوئی۔ میں ادھر سے آتے ہی آخری سلام کے لئے آپ کے چرنوں میں حاضر ہو گیا ہوں۔"

میں نے تعجب سے کہا۔ "تو تم بھی کہیں جا رہے ہو۔" اس نے کہا۔ "ہاں سمن بو آچکا ہے۔ اب تو جانا ہی پڑے گا۔" میں نے پوچھا۔ "کیسا سمن" مست رام نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ "وہی مرن چوہا۔" میں نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "جانے بھی دو۔ وہم کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔ ابھی تمہاری عمر کیا ہے۔ ذرا آئینہ تو دیکھو۔ نئے کپڑے پہن کر کتنے بھلے معلوم ہوتے ہو۔" مست رام نے بدستور غمگین لہجے میں کہا۔ "ہاں اسی کو تو موت کا جوبن کہتے ہیں ورنہ آپ جانتے ہیں کہ میں ایک کریہہ المنظر آدمی ہوں۔ ماسٹر جی مجھے دنیا چھوڑنے کا کچھ غم نہیں صرف ان بے زبان جانوروں کا خیال ہے۔ جو بیچارے کل تک لاورث ہو جائیں گے۔" میں نے اکتا کر کہا۔ "اچھا یہ ذکر چھوڑو۔ اس وقت کوئی پھڑکتا ہوا گیت سناؤ۔"

میرے اصرار پر مست رام نے سوز و گداز سے بھرا ہوا ایک ایسا گیت شروع کیا۔ جو پچھلے زمانے میں دلہن کی رخصت کے وقت گایا جاتا تھا۔ اس کی درد بھری آواز بلند ہوتے ہی فضا میں ایک اداسی کی لہر دوڑ گئی۔ ان غمگین اور الوداعی نغمات کے اثر سے ایسا معلوم ہونے لگا۔ گویا ہزاروں بے بس دلھنیں اپنی مسرت بھری آزاد دنیا کھو کر سسرال کے مایوس کن اور تاریک ماحول میں دھکیلی یا ہزاروں مسافران عدم (جن کی رنگین اور دلچسپ زندگیاں فرشتہ اجل نے جبراً ختم کر لی ہوں) شمشان بھوم کی طرف روانہ ہیں۔ مجھ پر بے اختیار رقت طاری ہو گئی اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

کچھ دیر بعد مست رام نے گانا ختم کیا اور اپنی کٹیا میں واپس چلا گیا۔ کیونکہ رات بھر اسے اپنے کبوتروں سے جدا رہنا گوارا نہ تھا۔ چاندنی رات تھی میں بھی اپنا دل بہلانے کی خاطر نہر پر چلا گیا۔ اور رات کو دیر سے واپس آیا۔ چبوترے پر چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ بستر لگا کر لیٹ گیا۔

آج رات بہت گرم تھی۔ ہوا بند ہونے کی وجہ سے سخت امس ہو رہا تھا۔ ساکت و صامت آسمان کے عین درمیان چاند گوہر شب تاب کی طرح چمک رہا تھا۔ جس کی خاموش کرنیں درختوں کی گھنی تاریکیوں کو چیر کر تھکی ماندی شکستہ حال دھرتی کے میلے خاکستری دامن پر روپہلی نقش و نگار بنا رہی تھیں۔

دفعتاً ماحول کچھ ایسا گم سم اور چپ چاپ ہو گیا کہ میرا دل خود بخود کسی نامعلوم دہشت اور پوشیدہ خوف سے دھک دھک کرنے لگا میں حیران تھا کہ اس روح فرسا سناٹے میں کونسی ایسی بے چینی اور تلملاہٹ نہاں ہے۔ جسے آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں مگر دل شدت سے محسوس کر رہا ہے۔

نہ جانے اس قیامت خیز رات کے خطرناک لمحوں میں کونسی مخفی قوت کسی کوشش میں مصروف تھی۔ کونسی پراسرار ہستیاں ادھر ادھر چل پھر رہی تھیں۔ کونسی غائبانہ لاہوتی مخلوق کی آمد پر ایسا ہنگامہ خاموش برپا تھا۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ وہ ماحول

کیوں اتنا مسموم ہو رہا تھا جس کے جانکاہ اثر سے میری حالت دم بدم بگڑ رہی تھی۔

آخر میں گھبرا کر اُٹھ بیٹھا اور چندو بھنگی کو آواز دی۔ جو چبوترے کے قریب ہی چارپائی پر پڑا تھا۔ میری آواز سنتے ہی وہ فوراً اٹھا اور کہنے لگا "مالک میں تو پہلے ہی سے جاگ رہا ہوں۔" میں نے کہا "چندو خدا جانے مجھے کیا ہو رہا ہے۔ میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔"

چندو میرے قریب کھڑا اپنے ہاتھوں کو زور زور سے مل رہا تھا (جیسی کہ اس کی عادت تھی) میں نے کراہتے ہوئے پھر اسے مخاطب کیا۔ اس نے کہا "مالک میرا بھی یہی حال ہے۔" میں نے نڈھال ہو کر کہا "تو ایسا کیوں ہو رہا ہے۔" اس نے جواب دیا "مالک وجہ تو جانتا ہوں مگر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ کیونکہ میں بے علم آدمی ہوں ممکن ہے کہ میرا قیاس غلط ہو۔"

میں نے گھبرا کر کہا "ہاں ہاں وہ وجہ ضرور بتاؤ۔ یہاں علمیت کا سوال نہیں۔ تجربہ علیحدہ چیز ہے۔" چندو نے ایک طویل سکوت کے بعد کہا "مالک کئی برس گزر گئے۔ میں اس وقت جوان تھا اور میرا باپ بھی زندہ تھا۔ ہم لوگ اپنے گاؤں میں رہتے تھے۔

ہمارے گاؤں کے چودھری کی دوسرے گاؤں کے چودھری سے سخت دشمنی تھی۔ اور اسے چوری کا خطرہ تھا۔ لہٰذا اس نے مجھے چوکیداری پر ملازم رکھا۔ میرا باپ بہت بوڑھا آدمی تھا۔ اور اسے بےخوابی کی شکایت رہتی تھی۔ اس لئے وہ اکثر رات کو میرے ساتھ چودھری کی حویلی پر چلا آتا۔ تاکہ رات آسانی سے کٹ جائے۔

چنانچہ ایک رات جب ہم دونوں باپ بیٹے آپس میں باتیں کر رہے تھے تو ایسا ہی سماں چھا گیا اور اسی طرح ایک پر ہیبت خاموشی اور جانسوز پژمردگی طاری ہو گئی۔ میں بہت ہی خوفزدہ ہوا۔ مگر میرے باپ نے کہا "بیٹا حوصلہ کرو اور بھجن گاؤ۔ کیونکہ اس وقت کوئی پوتر روح دنیا سے جا رہی ہے۔ جس کی پیشوائی کے لئے معمولی یم دوتوں کے علاوہ ان کا سردار بھی آیا ہے۔"

غرضیکہ ہم دونوں بھجن گانے لگے۔ اور کچھ دیر بعد یہ کیفیت خود بخود زائل ہو گئی آخر صبح معلوم ہوا کہ رات کو قریب ہی کے گھر میں پجاری کی نوجوان اندھی کنیا گزر گئی ہے۔

میں نے متوحش ہو کر کہا۔ "تو کیا اس سے تمہاری مراد یہ ہے کہ یہاں بھی گردو پیش کوئی موت واقع ہونے والی ہے۔" "جی ہاں ضرور۔ چندو نے بڑے وثوق سے کہا۔ "اس وقت کوئی پوتر روح دنیا سے جا رہی ہے۔ جس کی خاطر خود موت کا فرشتہ یم دوتوں کے پورے لشکر سمیت وارد ہوا ہے۔ یہ اسی کے پروں کی تیکھی جنبش سے مہیب خاموشی۔ اور لرزہ خیز کیفیت پیدا ہو رہی ہے۔

چندو کی اس گفتگو سے میرے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔ میں فرط خوف سے بے حال ہو کر چارپائی پر گر گیا۔ اور کانپتی ہوئی آواز سے کہا "آہ وہ فرشتہ شاید میری ہی روح قبض کرنے کو آیا ہے۔" چندو نے دعائیں دیتے ہوئے کہا۔ "مالک ایسی بات نہ کہو ابھی کوئی دم میں یہ سختی رفع ہو جائے گی۔ آؤ وہی بھجن گائیں۔ جو ایک ایسے ہی وقت میں میں نے اپنے باپ کے ساتھ گائے تھے۔"

غرضیکہ اس نے نہایت عقیدت اور جوش سے بھجن گانا شروع کیا۔ ساتھ میں بھی لڑکھڑاتی زبان اور کمزور آواز میں اس کے ساتھ بھجن گاتا رہا مگر باوجود اس کے کئی گھنٹوں تک وہ حالت بدستور قائم رہی۔ رات اتنی لمبی ہو گئی کہ ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھی۔ مست رام بھی آج ایسا خاموش تھا جیسے راگنی آسا چھیڑنا بالکل بھول گیا ہو۔

آخر خدا خدا کر کے یہ کافر رات ختم ہوئی۔ صبح کاذب کی ہلکی ہلکی ہوا کے جھونکے آنے لگے۔ بے حس و حرکت درخت آہستہ آہستہ انگڑائیاں لیتے ہوئے گہری نیند سے جاگے۔ برگ و بار کے مردہ تنوں میں گویا جان سی پڑنے لگی۔ اور ماحول بتدریج سکون پذیر ہونے لگا۔ میرے دماغی انتشار اور دلی ہیجان میں بھی کمی ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ رفتہ رفتہ نیند آ گئی۔

آنکھ کھلی تو سورج میرے سر پر چمک رہا تھا۔ جس کی ہر کرن تپی ہوئی سلاخ بن کر جسم کو داغ رہی تھی۔ میں کلبلا کر اٹھ بیٹھا چندو اس وقت اپنے کام سے فارغ ہو کر حقہ پی رہا تھا۔ مجھے بیدار پا کر میرے پاس آگیا۔ اور مزاج پرسی کے بعد ساتھ حسب معمول اپنے ہاتھوں کو زور زور سے ملنے لگا۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے مگر ہچکچا رہا ہے۔ میں نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے کہا۔ "اگر تم کچھ کہنا چاہتے ہو تو بیشک کہہ دو۔" "مالک" اس نے رندھی آواز سے کہا۔ "رات کو جو بات میں نے کہی تھی بالکل سچی ثابت ہوئی۔" "میں نے اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر کہا۔ "یعنی" اس نے جواب دیا۔ "یعنی رات کو بھلا آدمی دنیا سے رخصت ہو گیا۔" "میں نے تعجب سے پوچھا۔ "وہ کون؟" چندو بولا۔ "مست رام۔" "میں نے بدحواسی سے چلا کر کہا۔ "مست رام مر گیا؟" "ہاں مالک ابھی اس کی لاش کمیٹی والے اٹھا کر لے گئے ہیں۔" "اس نے افسوس سے کہا۔

مست رام کی موت کی خبر ایک زبردست آہنی ہتھوڑے کی ضرب کی طرح میرے دماغ پر لگی۔ میں دیر تک دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔ اس دن بارہ بجے کی ڈاک میں مجھے اپنے صاحب کا حکم نامہ ملا۔ کہ میں سکول بند کر کے چھٹی پر چلا جاؤں۔ لہذا اسی دن میں روتا دھوتا اپنے گھر چلا آیا۔

۵

اس واقعہ کے چند ماہ بعد موضع ٹکر جانے کا اتفاق ہوا مجھے مست رام کے وہ الفاظ یاد تھے کہ ٹکر کے قریب رسیلی نگری ہے جس نے پلیگ کو قوت بازو سے زیر کیا تھا۔ رات کو میں چودھری گوبند رام کی حویلی ہی میں ٹھہرا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے بوڑھے چودھری سے رسیلے کا قصہ سننے کی خواہش ظاہر کی۔

کاتک کا مہینہ تھا۔ صحرائی گرمی کا جوش کسی حد تک سرد پڑ چکا تھا۔ ہلکی ہلکی معتدل ہوائیں چل رہی تھیں۔ دریچوں سے باہر وسیع ولامحدود صحرا۔ رات کی خاموشی اور تاریک آغوش میں گہری نیند سو رہا تھا۔ تاروں کی کثرت سے آسمان سیاہ و منقش چادر میں لپٹا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ہم دونوں پرانی حویلی کے کوٹھے پر (جس کے کونوں میں کلسوں پر بڑے بڑے روغنی آبدان نصب تھے) آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

بوڑھا چودھری گہری سانس لے کر کہنے لگا۔ کسی زمانے میں ہمارے گھر ایک بوڑھا مصری دیوی ناتھ رہتا تھا۔ یہ میرے باپ کے وقت کا بہت نیک اور وفادار ملازم تھا "رسیلا" اس کے بڑھاپے کی اولاد تھا۔ اس لئے بوڑھا مصرا سے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔ جب رسیلا نے زندگی کی ساتویں سیڑھی پر قدم رکھا تو بوڑھا مصرا چل بسا اور مرتے وقت اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے گیا۔

بوڑھی مصرانی بہت سمجھدار عورت تھی۔ اس نے میرے گھر کا کام کاج سنبھال لیا۔ ادھر رسیلے کو میں نے پاٹھ شالہ میں داخل کرا دیا۔ رسیلا بڑا ہونہار اور محنتی لڑکا تھا۔ دوپہر کو جب پاٹھ شالہ سے واپس آتا تو بڑی محبت سے ماں کا ہاتھ بٹاتا۔ بلکہ اس کے علاوہ گھر کے دوسرے کاموں میں بھی نہایت شوق سے حصہ لیتا۔ اور اپنی حسن لیاقت سے وہ بہت جلد گھر بھر میں عزیز ہو گیا۔ رادھا کے سوائے گھر کے تمام افراد اس سے خوش تھے۔

میری اکلوتی بیٹی رادھا اس وقت بارہ سال کی تھی یہ بہت تند اور تلخ مزاج کی لڑکی تھی۔ رسیلے کے ساتھ اسے خدا واسطے کی دشمنی تھی۔ یہ اسے اپنا حریف سمجھتے ہوئے اکثر بلاوجہ ہی اسے پیٹ ڈالتی تھی۔ بوڑھی مصرانی زبان سے تو کچھ نہیں کہتی تھی مگر اس کی غمناک آنکھوں کو دیکھ کر میں رادھا کی سرزنش کئے بغیر نہ رہتا تھا۔ اس لئے رادھا کی عداوت روز بروز بڑھتی گئی۔ اس طرح دن گزرتے

موہنی کی غلطیوں کا کفارہ تو ان کی بیماریوں نے کر دیا۔ مگر تم خدا کو کیا منہ دکھاؤ گے؟"

پرتاب سر جھکائے ڈاکٹر کی لعن طعن سن رہا تھا۔ اس کا چہرہ کبھی سرخ ہو جاتا اور کبھی زرد۔ آنکھیں غیر معمولی انہماک سے ایک طرف جمی ہوئی تھیں اور گذشتہ بیس سالہ زندگی کے واقعات متحرک تصویروں کی طرح اس کے دماغ کے پردوں پر ابھر رہے تھے۔

نرم و گداز بستر پر موہنی بے۔سدھ پڑی ہوئی ہے۔ اس کا سرخ و سفید رنگ بالکل زرد پڑ گیا ہے بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جو کبھی چشم آہو کو شرماتی تھیں گہرے گہرے گڑھوں اور سیاہ حلقوں سے گھری ہوئی ہیں لمبے لمبے سیاہ بال ماتھے اور تکئے پر پریشان تھے۔ اس کے چھوٹے چھوٹے خوبصورت ہاتھ اور پاؤں جو موزونیت میں بے مثل تھے اب سوج کر ڈبل روٹی کی طرح ہو رہے ہیں اور شیشے کی طرح چمک رہے ہیں۔ چہرے پر بھی ورم ہے۔ باقی تمام جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بنا ہوا ہے پہلی نظر میں دیکھنے والے کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ اور وہ ایک قسم کی وحشت سی محسوس کرتا ہے لیکن ذرا غور سے دیکھنے پر صاف معلوم ہوتا ہے کہ کھال اور ہڈیوں کا یہ پنجر کبھی حسن اور موزونیت کا مکمل نمونہ ہوگا۔ اس کی صورت "آثار پدید است صنادید عجم را" کا عبرت ناک مرقع ہے۔

پریم اور موہنی ماں کے پلنگ کے پاس تصویر کی طرح خاموش بیٹھے اس کی صورت ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ ایک طرف سرسوتی سر جھکائے بیٹھی ہے۔ موہن بے چینی سے کمرے میں ٹہل رہا ہے۔ موہنی کے سرہانے نرس ہاتھ میں انجکشن کی خالی پچکاری لئے کھڑی ہے۔ ڈاکٹر شہاب موہنی کی سوکھی اور زرد کلائی اپنے مضبوط اور طاقتور ہاتھ میں تھامے نبض پر انگلیاں رکھے اس کی طرف جھکا ہوا کھڑا ہے ____ ایک منٹ ____ دو ____ تین ____ چار ____ پانچ ____ دس ____ بیس ____ منٹ گذر گئے کمرے میں ہر شخص کی نظریں ڈاکٹر کے چہرے پر جمی تھیں۔ آخر ڈاکٹر نے آہستہ سے موہنی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے سے قدرے اطمینان ظاہر ہوتا تھا۔ موہن کی طرف دیکھ کر "مسٹر موہن! مسز پرتاب کی نبض اب بہتر حالت میں ہے کچھ دیر میں انھیں ہوش آجائے گا۔"

سوہنی اور پریم کے چہرے کھل گئے۔ "سچ ڈاکٹر صاحب۔"

"ہاں امید تو یہی ہے۔"

بیس پچیس منٹ اور گذر گئے۔ موہنی کی پلکوں میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر نے منہ پر انگلی رکھ کر کمرے کے بے چین لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا آہستہ آہستہ موہنی نے آنکھیں کھولیں اور نحیف نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ بچوں پر جا کر اس کی نظریں جم گئیں۔ لب ہلے ____ بہت خفیف سی جنبش ہوئی ____ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہا ہے ____ ڈاکٹر نے اپنا کان اس کے لبوں پر لگا دیا۔ "سوہنی...... پریم...... بلاؤ۔"

ڈاکٹر شہاب نے دونوں بچوں کو جو اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے دبائے ضبط گریہ کی انتہائی کوشش کر رہے تھے اشارہ کیا ____ وہ جلدی سے ماں کے قریب آئے۔ موہنی کی آنکھوں سے دو قطرے ادھر اُدھر گرے۔ کمزور آواز نکلی۔ "میرے بچے۔"

دونوں نے اپنے سر ماں کے سینے پر جھکا دیئے۔ آنکھوں سے دریا امنڈ آیا۔ ماں نے اپنا ہاتھ بڑی کوشش سے اٹھا کر بچوں کے

سرپر رکھا۔ کچھ دیر یونہی گزری۔ یکایک موہنی نے نسبتاً بلند آواز سے کہا۔ ''پریم ___ موہن بھیا کو ___ تار دے کر ___ بلا دو۔"موہن بیقرار ہو کر آگے بڑھا اور بہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔"موہنی۔ موہنی۔ میری پیاری بہن۔ میں تمھارے پاس موجود ہوں۔" اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔ فرط گریہ سے آواز رک گئی۔ موہنی نے بھائی کی طرف نظریں پھیریں۔ چہرے پر کچھ آثار زندگی ہویدا ہونے لگے۔ رک رک کر بولی۔ "بھیا تم آگئے ہاں اب میں اطمینان سے مر وں گی۔"ڈاکٹر نے اتنے میں دوسرا انجکشن تیار کرلیا تھا وہ موہنی کے بازو میں لگایا اور سب سے کہا۔"آپ لوگ باہر جائیے۔ان کو آرام کرنے دیجئے۔اب بیہوشی نہ ہوگی بلکہ نیند آئے گی۔"نرس نے پردے گرا دیئے۔ موہنی نے نقاہت سے آنکھیں بند کرلیں۔

باہر نکل کر دونوں بہن بھائی کرنل شہاب سے لپٹ گئے۔"ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر صاحب' ممی اب اچھی ہو گئیں؟اب کوئی خطرہ باقی نہیں؟ایشور نے ہماری دعائیں سن لیں" خوشی کے مارے پورے جملے ان کے منہ سے نہیں نکل رہے تھے۔ موہن نے بھی سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ڈاکٹر نے اطمینان سے اپنا سر ہلایا۔"میں سمجھتا ہوں خطرہ اس وقت ٹل گیا ہے"سوہنی نے پریم کا ہاتھ پکڑا۔ آؤ بھیا پاپا کو فون کر کے خوشخبری سنائیں"دونوں خوشی سے ناچتے ہوئے چلے۔ پیچھے پیچھے موہنی کا کتا ہیرا دم ہلا ہلا کر اظہار خوشی کرتا ہوا جا رہا تھا۔

آج موہنی کی حالت نسبتاً اچھی ہے۔ اس نے سفید کپڑے پہنے ہیں سر گندھوالیا ہے اور تکیوں کے سہارے نیم دراز ہے۔اس کے ملنے والے اور دوست ڈاکٹر کی اجازت سے دو دو منٹ کے لئے اس کے پاس آکر مزاج پرسی کر جاتے ہیں۔وہ مسکرا کر ان سے دو ایک باتیں کرتی ہے۔ سارا گھر خوش خرم ہے کہ وہ اب اچھی ہو رہی ہے۔

جب سب ملنے والے جا چکے تو موہنی نے بھائی کو بلا کر کہا۔"بھیا میرے دونوں بچوں اور بھابی کو بلا لو۔ آج میں تم سب سے دل کھول کر باتیں کروں گی۔"موہن نے ڈاکٹر شہاب کی طرف دیکھا جو ابھی تھوڑی دیر ہوئی اپنی مریضہ کو دیکھنے آئے تھے۔"ایسا نہ ہو کہ کمزوری ہو جائے۔"موہنی نے آزردگی سے کہا۔"کچھ ہو مجھے آج ان سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ معلوم نہیں پھر موقع ملے یا نہ ملے۔"ڈاکٹر شہاب نے کہا۔"آپ ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہیں۔اب آپ روبصحت ہیں مگر آپ کی مکمل صحت کے لئے سب سے لازمی چیز یہ ہے کہ آپ خود ہمت اور پوری قوت ارادی سے کام لے کر دل میں یہ بات جمالیں کہ میں ضرور اچھی ہو کر رہوں گی۔"

موہنی نے ڈاکٹر کی طرف تیز نظروں سے دیکھا۔"ڈاکٹر صاحب آپ مجھے ___ مریض کو دھوکا دیتے ہیں ___ مجھ سے زیادہ کون یہ جان سکتا ہے کہ میں اچھی ہوں گی یا نہیں ___ یہ صحت نہیں سنبھالا ہے۔ذرا میری طرف دیکھ کر کہیے کہ میری حالت اچھا ہونے کی ہے؟"ڈاکٹر شہاب نے سر جھکا لیا اور کھڑکی کے پاس جا کر باہر کی طرف دیکھنے لگے۔

موہن سوہنی 'پریم اور سرسوتی کو بلا لایا۔ چند منٹ بعد پرتاب بھی کمرے میں داخل ہوا اور موہنی کی مزاج پرسی کی۔ موہنی نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر بعد موہن سے بولی۔"تم سب میرے قریب آجاؤ تاکہ میری آواز اچھی طرح سن سکو۔ڈاکٹر صاحب آپ یہیں رہیے۔ آپ سے کیا پردہ ہے۔ہاں سسٹر (نرس) تم کچھ دیر کو باہر چلی جاؤ۔"نرس باہر چلی گئی۔ باقی سب لوگ آکر موہنی کے پلنگ کے قریب بیٹھ گئے صرف پرتاب ذرا سے ہٹ کر آرام کرسی پر پڑا کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ڈاکٹر نے انار کا عرق موہنی کو پلایا اور موہنی آہستہ آہستہ رک رک کر کہنے لگی۔

اس کی آرزو پوری نہ کر سکا۔ کیونکہ میں نے اپنی زندگی راوھا کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی۔ آہ آج ظالم پلیگ میری محبت کا خزانہ مجھ سے چھیننے کے درپے ہے۔ جس کی حفاظت پر میں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ آہ آج وہی راوھا جس کا میں پجاری ہوں۔ میرے سامنے دم توڑ رہی ہے۔ بھگوان اگر وہ مر گئی تو میں بھی زندہ نہ رہوں گا۔" کثرت گریہ سے اس کی آواز رک گئی۔

اس راز کے انکشاف پر میں ششدر رہ گیا۔ مگر مصلحتاً کونے میں دبکا رہا۔ کچھ وقفے کے بعد اس نے پھر سر اٹھایا اور کہنے لگا "تو بھگوان تم تو بالکل خاموش ہو۔ اگر خود میری مدد نہیں کر سکتے تو مجھے ہی موقعہ دو۔ تاکہ میں پلیگ سے زور آزمائی کر کے اسے شکست دوں۔ اور اس کے پنجے توڑ کر راوھا کو بچا لوں۔"

عین اسی وقت باہر سے ایک نہایت مکروہ اور کرخت آواز سنائی دی۔ "کہ اگر مجھے مندر میں داخل ہونے پر قدرت حاصل ہوتی۔ تو تمہیں شیخیاں بگھارنے کا مزہ چکھا دیتی۔ ہاں اتنے بہادر ہو تو باہر آ کر ذرا اپنی طاقت دکھاؤ" آواز سن کر میرا دل دہل گیا۔ مگر رسیلا جس کی رگوں میں جوانمردی کا خون پورے جوش سے رقص کر رہا تھا۔ بجلی کی سرعت سے تڑپ کر اٹھا۔ اور شیر نر کی طرح دروازے سے باہر کود گیا۔

یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا۔ میں اسے پکڑنے کے لئے اٹھا تو سہی۔ مگر دروازہ پر پہنچ کر میرے پاؤں خود بخود رک گئے۔ باہر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ اور حواس باختہ وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ اتنے میں کہیں دور سے مرغ سحر کی دھیمی سی (ککڑوں کوں) کی صدا خاموشیوں کو چیرتی ہوئی فضا میں گھل مل گئی۔

میں پیغام صبح سن کر ایک دم چونکا۔ اور حوصلہ کر کے باہر نکلا۔ باہر بدستور دہشت برس رہی تھی۔ خشک چاندنی۔ شبنمی ہواؤں سے قدرے نرم پڑ چکی تھی۔ لیلائے شب کے منتشر سیاہ گیسو بتدریج سنورتے اور سمٹتے جا رہے تھے۔ میں ادھر ادھر رسیلے کو تلاش کرنے لگا۔

یکایک مویشی خانہ کی طرف سے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز نہایت بھیانک اور الو کی چیخوں کے مانند تھی۔ میں تیزی سے دوڑ کر ادھر گیا۔ لیکن مویشی خانہ کے سامنے پہنچ کر مجھے رکنا پڑا۔ کیونکہ کوئی شخص چیختا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ جسے دیکھ کر مرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اور میں سہم کر درخت کی اوٹ میں چھپ گیا۔ آنے والی ایک نہایت میلی کچیلی اور بے حد کریہہ المنظر بڑھیا تھی۔ جس نے اپنے ہاتھ آگے بڑھا کر لٹکا رکھے تھے۔ گویا لوٹے ہوئے ہوں۔ وہ چیختی چلاتی اور بے تحاشا بھاگتی ہوئی میرے قریب سے گزر گئی۔

اس کے دور چلے جانے پر میں چھپر کی طرف بڑھا۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر رسیلا چھپر کی منڈیر کے سہارے نیم دراز تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کس کر چھاتی سے لگا رکھی تھیں۔ میں نے اسے پکارا۔ مگر اس نے جواب نہ دیا۔

اس کی بے ہوشی سے آگاہ ہو کر میں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور اس کی کنپٹیاں سہلائیں اور آہستہ آہستہ اس کی کسی ہوئی مٹھیوں کو کھولا۔ تو کوئی چیز اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر بکھر گئی۔ میں نے تعجب سے اس چیز کو جھک کر دیکھا۔ اف اس ہولناک اور ناپاک چیز کو دیکھ کر میرا رواں رواں کانپ گیا۔ خدا معاف کرے وہ تو دس لمبے لمبے ناخون تھے جو کسی درندے کے پنجوں سے تازہ جھڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وحشت اور کراہت سے میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ میرا بدن پسینے میں تر ہو گیا۔

کافی وقفہ کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں۔ رسیلا ابھی تک بدستور بے حس و حرکت پڑا تھا۔ کیونکہ وہ دوسری دنیا میں پہنچ چکا تھا۔ صبح صادق کی پرعظمت دھیمی روشنی اور چاندنی کے ڈھلتے سایوں میں ہوائیں موت کا راگ گاتی ہوئی ہچکیاں لے لے کر چل رہی تھیں۔ پڑوس کا کنواں نہایت حسرت ناک لے میں (وت نہیں آوناں دس پیارے کھیڈن دے دن چار) کی راگنی گاتا ہو اس کی جوانمرگی پر آنسو بہا رہا تھا۔ مگر اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے فتح اور کامیابی جھلک رہی تھی۔ کیونکہ وہ بازی جیت چکا تھا۔

رسیلے کی موت کے بعد ادھائی حالت روز بروز سنبھلتی گئی۔ یعنی رسیلے نے پلیگ کے پنجے توڑ کر اسے بچالیا۔ بلکہ بستی میں بھی بہت جلد امن قائم ہو گیا۔ اور پھر اس دن کے بعد کبھی اس گاؤں میں پلیگ نہیں پھوٹی۔ چنانچہ اس پرحسرت واقعہ کی یاد میں اس گاؤں کا نام ٹکر پڑ گیا۔ پرانے زمانے کے لوگ اسے رسیلے کی نگری بھی کہتے ہیں۔ ورنہ کسی زمانہ میں یہ گاؤں من کوٹ کا ہی ایک حصہ تھا جو نیا من کوٹ کہلاتا تھا۔

۲

رسیلے کے صبر و استقلال۔ پاکیزہ عشق اور بہادری کی انوکھی داستان سن کر میں نقش حیرت ہو گیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ آخری راتوں کا کمزور چاند گرد و نواح میں اپنی روکھی پھیکی چاندنی پھیلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ یک لخت ہوا کا ایک آوارہ جھونکا سوکھے پتوں کی جھانجھ بجاتا ہوا اُٹھا۔ اور بلند ہو کر کھجوروں کی دراز چوٹیوں سے ٹکرایا۔ تو کھجوروں کی سخت اور نوکیلی شاخوں نے زبان بے زبانی سے (وت آوناں دیس پیارے کھیڈن دے دن چار) کا غمگین ترانہ الاپنا شروع کیا۔ تمام صحرا میں ایک پردرد گونج پیدا ہو گئی عین اسی وقت کسی صحرا نشین نے بھی یہی راگنی چھیڑ دی۔

چاروں طرف سے پیغام فنا سن کر دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ آزردہ حالی سے میرا دماغ معطل ہو گیا۔ حتیٰ کہ میں نیند کی وادی میں داخل ہو کر ایک لاہوتی دنیا میں کھو گیا۔

سنبھالا

صالحہ عابد حسین

سارے گھر میں بھیانک سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مریضہ کے کمرے میں کئی ڈاکٹر معائنے میں مشغول تھے۔ موہنی کا شوہر پرتاب اور اس کا بھائی کمرے کے اندر تھے۔ اس کی بھاوج سرسوتی برآمدے میں ٹہل رہی تھی۔ موہنی کی تیرہ سال کی بچی سوہنی اور سترہ سال کا لڑکا پریم کمرے کے باہر دروازے سے لگے کھڑے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو خوفزدہ نظروں سے دیکھتے اور مایوسی کے اشارے کرتے۔ ان کے چہروں سے رنج و غم کے آثار ظاہر ہو رہے تھے .. . موہنی کا محبوب کتا ہیرا بھی ایک طرف خاموش اور اداس سا بیٹھا تھا۔ گویا وہ بھی آنے والے افسوسناک حادثہ سے سہما ہوا تھا۔

آہستہ سے کمرے کا دروازہ کھلا اور کرنل شہاب سر جھکائے باہر نکلے۔ ان کے پیچھے نرس اور دو تین اور ڈاکٹر بھی باہر آئے۔ پریم اور سوہنی ایک ساتھ دوڑے اور ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سوہنی نے بے قراری سے پوچھا "ڈاکٹر صاحب۔ ڈاکٹر صاحب بتائیے ممی کو ہوش آیا؟ اب وہ کیسی ہیں؟ اچھی ہو جائیں گی نا؟ بولئے ڈاکٹر صاحب ایشور کے لئے کچھ تو کہیے۔" پریم نے منہ سے کچھ نہ کہا مگر آنکھوں آنکھوں میں سینکڑوں سوال کر ڈالے۔ ڈاکٹر نے محبت اور افسوس بھری نگاہ سے دونوں بچوں کو دیکھا۔ اور سوہنی کے سر پہ ہاتھ پھیر کر صرف اتنا کہا "گھبراؤ نہیں اللہ پر بھروسہ رکھو۔"

موہن نے بیوی کو اشارہ کیا اور وہ سوہنی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گئی۔ پرتاب نے دوسرے ڈاکٹروں کو فیس دے کر رخصت کیا۔ اور ڈاکٹر شہاب۔ موہن اور پریم چاروں ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھ گئے۔ دو تین منٹ تک خاموشی رہی۔ آخر موہن نے خاموشی کو توڑا۔ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

[illegible] ڈاکٹر صاحب آپ نے کیا اندازہ قائم کیا؟ موہنی بچ جائے گی؟

[illegible] موہن آپ [illegible] رہے ہیں۔ آٹھ دن سے بالکل بیہوش ہیں۔ کمزوری حد سے بڑھ گئی ہے۔ طاقت کی دوائیں [illegible] سب [illegible] ایسی حالت میں کیا کہا جا سکتا ہے؟

پرتاب۔ ڈاکٹر۔ کیا اب کچھ نہیں ہو سکتا؟

ڈاکٹر۔ اگر تم صاف صاف پوچھتے ہو تو سچ یہ ہے کہ۔ مسز پرتاب کا بچنا اگر ناممکن نہیں تو محال ضرور ہے۔ (یکایک پریم کو دیکھ کر) لیکن اگر انھیں ہوش آگیا تو وہ ضرور اشارے کرے گی۔ ہم اپنی طرف سے کوئی کوشش اٹھا نہ رکھیں گے (کچھ دیر بعد) پرتاب مجھے تم سے کچھ پرائیویٹ باتیں کرنا ہیں۔

موہن اور پریم اٹھ کر باہر چلے گئے۔ پرتاب نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

پرتاب۔ کیوں شہاب کیا واقعی اب میری بیوی نہیں بچ سکتی؟

ڈاکٹر۔ خدا میں بڑی طاقت ہے۔ لیکن میرا علم اور تجربہ یہی کہتا ہے کہ اب مسز پرتاب نہیں بچیں گی۔

پرتاب۔ شہاب یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کچھ تو کرو۔ آپریشن!! کیا آپریشن کرنے سے زندگی کی امید ہو سکتی ہے؟

ڈاکٹر۔ آپریشن بالکل فضول ہے وہ پہلے ہی تکلیف اٹھا رہی ہیں۔ میں انھیں اور زیادہ تکلیف نہیں دوں گا۔ ان کا دل اس قدر کمزور ہے کہ وہ آپریشن تو بڑی چیز ہے معمولی بات بھی برداشت نہیں کر سکتیں۔

پرتاب۔ افسوس۔

ڈاکٹر۔ پرتاب میں صاف صاف کہتا ہوں کہ مسز پرتاب کی بیماری کا سبب تم اور اور صرف تم ہو۔ اگر وہ مر گئیں تو ان کا خون تمھاری گردن پر ہوگا۔

پرتاب۔ (خفگی سے) شہاب یا کیا بک رہے ہو؟ میں ان کی بیماری کا سبب کیسے ہو سکتا ہوں۔

ڈاکٹر۔ مجھ سے باتیں بنانے کی کوشش نہ کرو۔ میں بیس برس سے تمھیں اور انھیں جانتا ہوں۔ تمھارا دوست ہوں اور تمھارے خانگی حالات سے پوری طرح واقف۔ مجھے وہ وقت بھی یاد ہے۔ جب تم نے پہلی مرتبہ اس شہر میں قدم رکھا تھا۔ مسز پرتاب اس وقت شاید سترہ اور اٹھارہ سال کی ہوں گی۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ میں انھیں دیکھ کر مبہوت ہو کر رہ گیا تھا۔ کیسا بیمثل حسن تھا۔ اور پھر کتنی نیک اور بھولی طبیعت لیکن تم نے انھیں غلط راہ پر ڈال دیا۔ پہلے انھیں سوسائٹی سے روشناس کرایا۔ ہر اچھی بری محفل میں زبردستی لے گئے۔ اپنے کم ظرف اور ذلیل طینت دوستوں تک سے ان کی ملاقات کرائی۔ اپنی ذاتی اغراض کی وجہ سے تم نے انھیں تباہی کے گڑھے کی طرف دھکیل دیا۔ شراب جیسی مذموم چیز اور مہلک زہر کی انھیں زبردستی لت لگائی۔ ان کے حمل دواؤں سے ضائع کرائے۔ جس کی وجہ سے ان کی صحت اور بھی زیادہ خراب ہو گئی۔ اور پھر خود ہی ان سے آنکھیں پھیر لیں۔ خود بری صحبت میں پڑ گئے اور ان پر الزام رکھے۔ ان پر بے جا نکتہ چینیاں لگائیں اور ہر طرح ان کے نازک دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ وہ اپنا غم غلط کرنے کے لئے اور بھی زیادہ شراب پینے لگیں اور تم نے بجائے اس کے کہ ان کی اس عادت کو جو خود تمھاری ہی ڈالی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ چھڑاتے اس کی پروا بھی نہ کی۔ بجائے دلجمعی کے دل آزاری سے کام لیا۔ نتیجہ جو کچھ ہے تمھارے سامنے ہے۔ شراب کی کثرت اور دلی رنج و غم نے ان کی رہی سہی صحت بھی برباد کر دی۔ ان کے قویٰ غیر معمولی طور پر مضبوط تھے جو وہ اتنے سال بھی یہ سب جھیل گئیں۔ دوسری عورت دو چار سال بھی زندہ نہ رہ سکتی۔ پرتاب!

گئے۔ حتیٰ کہ رسیلا چھ سال کا ہو گیا۔ رودھا اس وقت بیس سال کی تھی۔ اس کی شادی میں نے ایک امیر گھرانے میں کی تھی۔ مگر وہ چوتھے سال ہی بیوہ ہو کر ہمارے گھر واپس آ گئی۔ مگر رسیلا پہلے سے زیادہ جانفشانی سے اس کی خدمت کرنے لگا۔ مگر وہ بدستور اس کی مخالف رہی۔

رفتہ رفتہ رسیلا جوان ہو تا گیا۔ جوان بھی ایسا حسین اور شکیل جوان کہ تمام پیارہ موزوں تھا۔ جس طرف نکل جاتا انگلیاں اٹھنے لگتیں۔ گاؤں کی لڑکیاں اس کی راہ میں آنکھیں بچھاتی تھیں۔ گاؤں کے لڑکے اس کی دوستی پر فخر کرتے اور بڑے بوڑھے اس کو دعائیں دیتے تھے۔ وہ مردانہ حسن کا بہترین نمونہ تھا۔ اس کی شکل و صورت میں کچھ ایسا شاہانہ پن تھا کہ سادہ لباس میں بھی راجکمار دکھائی دیتا تھا۔ اب میں نے بجائے گھر کے کاموں کے باغات کا انتظام اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ جس کے حسنِ انتظام سے میری آمدنی میں کافی اضافہ ہو گیا۔

بوڑھی مصرانی بیٹے کی سعادت مندی اور قابلیت پر پھولی نہ سماتی تھی۔ اس کی زبردست خواہش تھی کہ بیٹے کا بیاہ کر کے اپنا گھر آباد کرے۔ لہٰذا اس نے من کوٹ کے ایک اچھے کھاتے پیتے برہمن کی حسین لڑکی کے ساتھ اُس کی سگائی کر دی۔ لیکن جب لڑکی والوں نے شگن بھیجا تو رسیلے نے شگن لینے سے صاف انکار کر دیا۔ مصرانی نے بیٹے کو بہت سمجھایا اور منت سماجت بھی مگر اس پر کچھ اثر نہ ہوا۔

بوڑھی مصرانی اپنے فرمانبردار بیٹے کی جسارت اور گستاخی سے بہت آزردہ ہوئی۔ اور روتی ہوئی میرے پاس آئی تاکہ میں رسیلے کو سمجھا بجھا کر شادی پر آمادہ کر دوں۔ لیکن میں بھی کوشش میں ناکام ہوا۔

اس نے کہا "مالک یوں تو آپ کو مجھ پر ہر طرح کا حق حاصل ہے۔ لیکن شادی کے معاملے میں آپ دخل نہ دیں ورنہ میں کہیں بھاگ جاؤں گا۔ کیونکہ میں عورت ذات سے سخت نفرت کرتا ہوں۔" میں نے حیرت سے پوچھا "اس کی وجہ؟" اس نے جواب دیا کہ "میری مرضی۔" میں لاجواب ہو گیا۔

رسیلے کی اس ہٹ دھرمی سے اس کے متعلق گاؤں میں منافقت کی لہر دوڑ گئی گاؤں کی لڑکیاں اسے ذلیل و حقیر تصور کرنے لگیں۔ لوگ اپنے لڑکوں کو اس کے میل جول پر ٹوکنے لگے۔ تاکہ وہ اپنے زہریلے خیالات کہیں ان کے دماغوں میں نہ بھر دے۔

رودھا کو بھی اچھا موقع ہاتھ آ گیا۔ اس نے اسی بہانے سے رسیلے کو جی بھر کے کوسا۔ بہت بے عزت کیا اور آخر انتہائی نفرت سے اس کے منہ پر تھوک بھی دیا۔ غرضیکہ رسیلے نے زمانہ کی بدسلوکیوں کو نہایت حوصلے سے برداشت کیا اور اپنے ارادے سے بھی باز نہ آیا۔ بوڑھی مصرانی کو بیٹے کی اس ضد سے بہت صدمہ ہوا اور اسی سال وہ بہو کی آرزو دل میں لئے سرگباش ہو گئی۔

ماں کے مرنے کے بعد رسیلا بالکل خود مختار اور آزاد تھا۔ وقت کی رفتار کے ساتھ آہستہ آہستہ گاؤں والوں کا دل بھی اس کی طرف سے صاف ہو تا گیا۔ لوگ اسے سنت رسیلا کہنے لگے۔ اور اسی حالت میں اس نے زندگی کی پچیس منزلیں طے کر لیں۔

اس بات کو چالیس سال کا عرصہ گزر چکا۔ یہی موسم تھا کہ اس علاقے پر پلیگ کا زبردست حملہ ہوا۔ گاؤں کے گاؤں تباہ و برباد ہو گئے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ گھر کے تمام افراد یک دم مر گئے۔ ان کے مردے گھروں کے اندر ہی سڑتے رہے اور چوہے درندوں کی طرح ان کو کھاتے بھی [illegible] بعض اوقات یہ مردہ خور چوہے بھیڑ بکریوں کی طرح غول در غول گلی کوچوں میں پھرتے دکھائی دیتے۔

ان دنوں اکثر ایسی بعید از قیاس اور بے تکی باتیں ظہور پذیر ہوئیں کہ بہت سے آدمی تو دہشت سے ہی مر گئے۔ آخر کار خلقت نے بدحواسی سے گھر چھوڑ کر باہر صحرا میں چھپر ڈال لئے۔ ہم لوگ بھی یہ حویلی چھوڑ کر باہر کچی حویلی میں چلے گئے۔ جو سامنے والے باغ میں بنی ہوئی تھی۔ لیکن یہاں آتے ہی رادھا پلیگ میں مبتلا ہو گئی۔

رادھا چونکہ واحد اولاد ہونے کی وجہ سے میرے اندھیرے گھر کا چراغ تھی۔ سینہ کا سرور اور آنکھوں کا نور تھی اس لئے اس کی بیماری کوئی معمولی بات نہ تھی۔ سارا کنبہ تیمارداری میں مصروف ہو گیا۔ اس موقعہ رسیلے نے اس کی اتنی خدمت کی کہ اگر کوئی حقیقی بھائی ہوتا تو وہ بھی شاید نہ کر سکتا۔ وہ دن رات برابر اس کی پٹی سے لگا بیٹھا رہتا۔ اس کی صورت سے وحشت برستی تھی اس کی حالت دیکھ کر مجھے اندیشہ ہونے لگا مبادا بیمار نہ ہو جائے۔

خیر ایک ایک لحہ گنتے ہوئے رادھا کی بیماری کو چھ دن گزر گئے اور ہمیں اس کی زندگی کی کچھ آس بندھ گئی (کیونکہ عام طور پر یہ مرض آناً فاناً اپنا کام کرتا ہے۔ اور جو مریض کچھ لٹک جائے۔ وہ یقینی طور پر بچ جاتا ہے) لیکن جونہی ساتویں رات آئی تو رادھا نے پھر درد و کرب سے تڑپنا شروع کیا۔ یعنی اس کی دوسری بغل میں ایک اور گلٹی نمودار ہو گئی جس سے اس کی حالت دم بدم بگڑنے لگی۔

رادھا کو دم توڑتے دیکھ کر گھر بھر کے چہروں پر مردنی چھا گئی۔ میں فرط غم سے نڈھال ہو کر گھر سے باہر نکل گیا۔ باغ کے شمالی دامن میں ایک گھنے کنج کے درمیان ہمارے بزرگوں کے وقت کا ایک پرانا مندر تھا۔ جس میں کرشن بھگوان کی بڑی سی مورتی نصب تھی۔ انسان چاہے کتنا ہی پاپی ہو۔ مصیبت کے وقت ضرور پرماتما کا سہارا لیتا ہے۔ اسی کے چرنوں میں اسے شکتی اور شانتی نصیب ہوتی ہے۔ لہٰذا میری بھی یہی حالت تھی۔ میں نے بے اختیار مندر کا رخ کیا۔

پورنماشی کا چاند آسمان پر جگمگا رہا تھا۔ جس کی تیز روشنی میں صحرا کے ذرات اس آب و تاب سے چمک رہے تھے گویا ہر ذرہ بذات خود ایک چاند تھا۔ لیکن نصف شب کی بہکی بہکی ہواؤں کی فراقیہ گونج سے کائنات میں بجائے رنگینی کے ایک اداسی اور رقت چھا رہی تھی۔ صحن باغ میں چاندنی سے منور زمین پر درختوں کے سائے اس طرح متحرک تھے۔ جیسے پلیگ کے ہاتھوں بے موت مرے ہوئے انسانوں کی روحیں عالم ارواح سے اتر کر اپنے مردہ جسموں کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹک رہی ہوں۔ غرضیکہ اس سنسان اور ہو کے عالم میں میں بھی ایک روح کی طرح فکر و آلام کو پیچھے چھوڑتا ہوا مندر تک جا پہنچا۔

مندر کی پرہول اور گہری خاموشی میں حقیقی مسرت برس رہی تھی میرے دل میں روحانیت کا چشمہ ابلنے لگا۔ میں فوراً جوش عقیدت سے مورتی کے سامنے جھک گیا۔ اور نہایت عاجزی سے رادھا کی سلامتی کے لئے پرارتھنا کرنے لگا۔ درحقیقت من کی صفائی اور آتما کی تسلی کے لئے پرارتھنا سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔

اس طرح جب میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو میں مورتی کی پشت کی جانب سادھی لگا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد بڑے زور سے مندر کا دروازہ کھلا اور ایک شخص والہانہ جوش سے اندر داخل ہوا۔

آنیوالا رسیلا تھا جو اندر آتے ہی مورتی کے چرنوں میں گر گیا اور گڑگڑا کر بھگوان سے کہنے لگا "ہے بھگوان میری رادھا کو پلیگ کے خونخوار پنجے سے بچالے۔ یہ میں جانتا ہوں کہ وہ مجھ سے نفرت کرتی ہے اور ذلیل سمجھتی ہے مگر میرا دل اس پر مائل ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ وہ میرے من کی رانی ہے۔ آہ میری بوڑھی ماں شادی کی آرزو دل میں لئے ہی دنیا سے رخصت ہو گئی لیکن میں

"جانتے ہو میں نے تم سب لوگوں کو کیا کہنے کو بلایا ہے؟ شاید تم سمجھتے ہو کہ میں کچھ وصیت کروں گی۔ نہیں مجھے کوئی وصیت نہیں کرنی۔ میں تو تم لوگوں کو اپنی دردبھری مصیبت کی کہانی کے چند ورق سناؤں گی۔ دنیا ہمیشہ اس دھوکے میں رہی کہ میں بڑی خوش نصیب ہوں۔ کیوں؟؟ اس لئے کہ خوبصورت ہوں۔ بال بچے والی ہوں۔ گھر میں روپیہ پیسہ کی ریل پیل ہے۔ ہم، عزت، دولت، نوکر، حسن کیا چیز تھی جو میرے گھر میں نہ تھی۔ ایک غریب گھر کی لڑکی کی خوش قسمتی نے اس کے میاں کو معمولی اوورسیئر سے ایک لکھ پتی ٹھیکیدار بنا دیا آخر یہ خوش قسمتی نہیں تو کیا ہے؟ مگر آہ کسی کو کیا معلوم، کوئی کیا جانے کہ اس عزت اور دولت کے حصول کی خاطر ایک حسن شریف لڑکی کی شرافت کا اس کی نیکی اس کے ارمان اور آرزوؤں اس کی محبت اور سکون قلب اس کی صحت اور خدا جانے کن کن چیزوں کا خون کیا گیا ہے۔ ___ کاش اے کاش مجھے یہ جھوٹی عزت یہ منحوس دولت نصیب نہ ہوئی ہوتی ___ کاش میں ہمیشہ ایک غریب اوورسیئر کی بیوی رہتی۔ ہائے کیا اچھے دن تھے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ اپنی سسرال میں قدم رکھا تھا۔ بھیا آپ کو تو یاد ہوگا اس وقت میری عمر کیا ہوگی؟"

"چودہ یا پندرہ برس کی۔"

"تو بھیا پھر آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ شادی کے بعد تین چار سال میں نے کس قدر خوشی اور اطمینان سے گذارے؟ یہ (پرتاب کی طرف اشارہ کرکے) جو اب میری صورت سے بیزار ہیں۔ اس وقت پروانہ وار مجھ پہ نثار تھے۔ میری ہر خواہش پوری ہوتی۔ دن رات میری دلداری اور دلجوئی کی جاتی۔ مجھے ایک دیوی کی طرح پوجا جاتا تھا ___ آہ، میں اس وقت انھیں ایک فرشتہ سمجھتی تھی! ___ دنیا کا بہترین انسان تصور کرتی تھی! دیوتا جانتی تھی!!! مجھے یہ خبر نہیں تھی کہ اس ملمع کے نیچے کھوٹی چاندی بھی نہیں۔ سیاہ لوہے کا ٹکڑا ہے ___ ہائے مجھے کیا معلوم تھا کہ دیوتا کے بھیس میں شیطان ہے۔"

پریم اور سوہنی نے حیرت اور خوف سے ماں باپ کو اور پھر ایک دوسرے کو دیکھا۔ سرسوتی نے پرتاب پر جو خاموش سر جھکائے بیٹھا تھا، نفرت کی نظر ڈالی۔ موہن نے بہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ملائمت سے کہا۔ "سوہنی میری جان ذرا شانتی سے کام لو۔" موہنی نے آنسو بھری آنکھیں بھائی کی طرف اٹھائیں "بھیا سولہ سترہ برس سے میں یہ سب مصیبتیں سہہ رہی ہوں اور کبھی کسی کے سامنے اف نہیں کی۔ کون سا الزام انھوں نے مجھ پر نہیں لگایا۔ کیا کچھ جسمانی تکلیف اور روحانی اذیت میں نے نہیں اٹھائی۔ پر اپنا حال لوگوں پہ کھلنے نہ دیا ___ خصوصاً اپنے میکے والوں پر کبھی اپنے مصائب کا اظہار نہ کیا۔ کیا اب آخری وقت میں بھی تم مجھے دل کی بھڑاس نہ نکالنے دو گے۔ میں نہیں چاہتی کہ ساری دنیا کی طرح میرے بھائی بھاوج اور میری اولاد بھی مجھے مجرم گنہگار اور سیاہ کار سمجھیں۔ میں گنہگار ضرور ہوں، بہت ہوں مگر اتنی نہیں جتنی دنیا نے اور اس شخص نے مجھے مشہور کر رکھا ہے۔" تھوڑی دیر دم لینے کے بعد پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

"میں سترہ یا اٹھارہ برس کی تھی جب پریم بیٹا تم پیدا ہوئے۔ میری اس وقت کی خوشی کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ میں سچ مچ اپنے کو دنیا کی خوش نصیب ترین عورت سمجھتی تھی، تھوڑے دن بعد پرتاب نے نوکری چھوڑ دی۔ ان کا ایک افسر جو ان پر بہت مہربان تھا۔ انجینئر ہو کر اس شہر میں آیا۔ پرتاب کو امید تھی کہ اگر یہاں ٹھیکیداری کی جائے تو انجینئر صاحب کی عنایت سے خوب چلے گی۔ کچھ روپیہ ہم لوگوں نے کئی سال میں جوڑا تھا، کچھ میرا زیور بیچ کر فراہم کیا۔ افسروں کی سرپرستی سے انھیں حیرت انگیز کامیابی ہوئی اور [illegible] سارا خاندان خوش تھا، دوست احباب خوش تھے، یہ خوش تھے اور خود میں بہت خوش تھی ___ آہ

مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ خوشی مجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ اس پر عمر بھر خون کے آنسو بہانے پڑیں گے۔ دولت کے ساتھ ساتھ حیثیت بھی بڑھی اور ہم اونچی سوسائٹی میں آنے جانے لگے۔ تعلیم یافتہ فیشن ایبل عورتوں کے سامنے میں بالکل جاہل گنوار اور بے وقوف معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ان عورتوں کی عادتیں اور طریقے ناپسند تھے۔ دل میں ان سے نفرت کرتی تھی۔ مگر جب ان کے سامنے جاتی تو اپنے کو کچھ کمتر اور ذلیل سا محسوس کرتی ___ پرتاب نے مجھے انگریزی پڑھانے کا انتظام کیا اور ایک میم خاص اس لئے رکھی کہ مجھے موجودہ تہذیب اور آداب ومعاشرت اور "ہائی سوسائٹی" کے "ایٹیکیٹ" کی تعلیم دے۔ بہت جلد یہ سب باتیں میں نے سیکھ لیں۔

ہم لوگ خوب سیر تماشوں میں مصروف رہتے۔ کبھی سینما، کبھی تھیٹر، کبھی پک نک اور دعوتیں۔ کبھی بال روم میں جاکر تماشا دیکھنا، کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ اس عرصے میں انھوں نے اپنے خاص خاص دوستوں سے میری ملاقات بھی کرادی تھی۔ جنھوں نے مجھ سے بڑی عزت اور احترام کا برتاؤ کیا۔ رفتہ رفتہ میں سوسائٹی میں روشناس ہوگئی۔ ہر جگہ میں ہاتھوں ہاتھ لی جاتی۔ دعوتوں اور تقریبوں میں سب سے پہلے میرا بلاوا آتا ___ ڈراموں میں ہیروئن کا پارٹ مجھے ملتا، پارٹیوں میں مرکز نگاہ میں ہی ہوتی ___ ہر روز کہیں نہ کہیں آنے جانے دعوت وغیرہ کا پروگرام بنایا جاتا۔ میری گھریلو زندگی روز بروز ختم ہونے لگی۔ اور میں اپنے گھر سے بیگانہ ہوتی گئی ___ گھر کا انتظام اور خرچ باورچی اور بیرے وغیرہ کے ہاتھ میں تھا جن عورتوں سے میں نفرت کرتی تھی اب خود بھی ان کے رنگ میں رنگی جارہی تھی۔

دو تین سال بعد سوہنی۔ تم پیدا ہوئیں۔ کئی مہینے بیماری کے سبب مجھے بستر پر پڑا رہنا پڑا۔ اس زمانے میں میں نے محسوس کیا کہ پرتاب میری بیماری سے پریشان نہیں بلکہ بیزار سے ہیں۔ دراصل گذشتہ کئی سال ہر وقت اس قدر مصروفیت اور کھیل تماشوں میں بسر ہوئے تھے۔ کہ مجھے اپنے بارے میں سوچنے یا پرتاب کے طرز عمل پر غور کرنے کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ اب میں نے دیکھا کہ وہ اپنا تقریباً تمام وقت گھر سے باہر گزارتے ہیں بچی روتی تو خفا ہوتے کہ میری نیند خراب ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے اپنا سونے کا کمرہ الگ کرلیا اور کہا آج کل یہی فیشن ہے کہ میاں، بیوی کا بیڈروم بھی الگ الگ ہو۔ پہلا صدمہ تھا جو مجھے پہنچا مگر میں نے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ بچوں کے لئے آیائیں اور گورنس رکھ دی گئی اور مجھے حکم ملا کہ ان کے کمرے بھی الگ کردو۔ خیر چند مہینے بعد میں اچھی ہو گئی۔ کچھ دن بعد ایک پارٹی میں چیف انجینئر صاحب نے مجھے اپنے ہاں مدعو کیا پرتاب کا اصرار تھا کہ ضرور جاؤ بہر حال میں گئی۔ میں اس شخص کی دوستی سے بچنا چاہتی تھی کیونکہ مجھے وہ کچھ اچھا آدمی معلوم نہ ہوتا تھا۔ وہ میری حد سے زیادہ تعریف اور بے حد خاطر مدارات کرتا اور ان کی طرف رخ بھی نہ کرتا۔ یہ چیز مجھے کھٹکتی تھی اور ناگوار گزرتی تھی۔ مگر پرتاب اس کی بہت تعریف کرتے اور اس سے تعلقات بڑھانے پر زور دیتے۔ کیوں؟ تاکہ ان کا فائدہ ہو۔ اور انھیں اور زیادہ بڑے بڑے ٹھیکے ملیں۔ پہلی مرتبہ میرے دل میں پرتاب کی طرف سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوا کہ یہ شخص اس قدر بے غیرت اور خود غرض ہے کہ غیر لوگوں سے بیوی کی دوستی کراتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ ان سے اسے کوئی عقیدت ہے یا ان کے اخلاق وعادات سے بہت متاثر ہے بلکہ محض اس لئے کہ وہ اور زیادہ دولت سمیٹ سکے۔ اسے جائز یا ناجائز ہر طریقے سے لاکھوں کے ٹھیکے ملیں۔ خواہ اس کے لئے بیوی کو بد چلن مردوں سے دوستی ہی کیوں نہ کرنی پڑے ___ "موہنی نے تھک کر آنکھیں بند کرلیں۔ موہن نے تھوڑا سا انگور کا عرق اسے پلایا۔ اور زائد تکئے ہٹا کر آرام سے لٹادیا۔

"ان کی دولت روز بروز بڑھنے لگی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ طبیعت بھی بدلتی گئی۔ راتوں کو غائب رہتے۔ مجھ سے بے اعتنائی

رہتے۔ مزاج میں بھی سختی آگئی تھی۔ صرف سوشل موقعوں پر مجھ سے اظہار محبت اور خصوصیت ظاہر کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک واقعہ پیش آیا جس نے مجھے ان سے بالکل متنفر کر دیا۔ ڈاکٹر آپ تو جانتے ہیں کہ وہ واقعہ کیا تھا؟ نہیں میں خود بتاتی ہوں! انھوں نے ایک بے تکلف پارٹی میں مجھے جبراً شراب پلائی۔ میں اس کی تفصیل نہیں بتاؤں گی ____ مجھ میں اتنی طاقت اور برداشت نہیں ____ انھیں اس زمانے میں کسی بہت بڑے ٹھیکے کی فکر تھی اور انھوں نے اپنے خیال میں چیف انجینئر کو خوش کرنے کے لئے یہ حرکت کی تھی۔ اس دن سے ہمارے تعلقات اور بھی زیادہ کشیدہ ہو گئے۔ یہ روز بروز آزاد اور لاپرواہ ہوتے گئے۔ میں نے دو ایک مرتبہ شکایت کی تو مجھے سخت سست کہا۔ یہاں تک کہ ایک مرتبہ مجھ پر سخت شرمناک الزام لگایا۔ میں غصے میں آپے سے باہر ہو گئی اور برس پڑی۔ انھوں نے بھی کسر نہیں چھوڑی۔ مارنے تک سے دریغ نہیں کیا۔ اس کے بعد سے مجھے ان کی صورت سے دلی نفرت ہو گئی۔ انھوں نے مجھ پر کڑی نگرانی رکھنا شروع کر دی۔ صرف اس پارٹی اور جلسے میں مجھے جانے کی اجازت تھی۔ جس میں یہ خود بھی جائیں۔ یہی حال تفریح اور سینما وغیرہ کا تھا۔ اگر کبھی ملنے والی عورتوں سے یا عزیزوں سے بھی ملاقات ہو جاتی تو دو تین نوکر خفیہ پولیس کی طرح میری نگرانی کے لئے ساتھ ہوتے تھے۔ دفتر سے دس مرتبہ فون آتا کہ میں گھر پر ہوں یا نہیں۔ میری ذلت کی انتہا ہو چکی تھی۔ دن رات کی کوفت اور روحانی اذیت نے میری صحت پر برا اثر ڈالا۔ اور اس پر طرہ یہ ہوا مجھے کہتے بھی لاج آتی ہے ____ ڈاکٹر صاحب آپ تو جانتے ہی ہیں؟ جب کبھی بچہ ہونے والا ہوتا زبردستی دوائیں پلا کر اور انجکشن لگوا کر اسے ضائع کر دیا جاتا۔ اس طرح پانچ مرتبہ ہوا۔ صحت اور بھی بدتر ہو گئی۔ شراب کی لت تو یہ لگا ہی چکے تھے۔ اب میں اپنا غم غلط کرنے کو باقاعدہ شراب پینے لگی۔ اگرچہ یہ خود بھی پیتے تھے۔ اور خود ہی اس منحوس شے کو مجھے زبردستی کر کر کے پلایا کرتے تھے، مگر پھر بھی اس کو بھی ملامت اور طعن کرنے لگے۔ میں ضد میں آ کر اور زیادہ پیتی۔ مجھے اندر ہی اندر یہ گھن کھائے جاتا تھا کہ اس شخص نے جسے میں اپنا دین 'اپنا ایمان' اپنی جان' اپنا دیوتا' اپنا سب کچھ سمجھتی تھی اس نے میری غیرت پر' میری وفاداری پر شک کیا اور مجھ پر اتنا بڑا الزام لگایا۔"

موہنی کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ پرتاب جواب تک بالکل خاموش بیٹھا تھا آگے بڑھا اور موہنی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ "موہنی ____ آج مجھے سچ سچ بتا دو۔ کیا میں غلطی پر تھا اور میری بدگمانی بالکل بے بنیاد تھی ____ یا اس میں کچھ سچائی بھی تھی۔" موہنی نے بیباکی سے پرتاب کی نظروں کا مقابلہ کیا۔ "میں آخری وقت میں جب کہ پرمیشور کے سامنے جانے کو تیار ہوں ہرگز جھوٹ نہ بولوں گی ____ تم نے مجھ نا سمجھ کم عمر لڑکی کو یہ آزادی کی راہ دکھائی اور اپنی اس ذلیل سوسائٹی سے روشناس کرایا ____ میں کچی لکڑی تھی جس طرف جھکایا جھک گئی۔ بیشک میں لوگوں سے ہنستی بولتی تھی۔ مذاق دل لگی کرتی تھی۔ اس میں بھی شک نہیں کہ جب لوگ میرے حسن و جمال کی تعریفیں کرتے تو مجھے سرور سا حاصل ہوتا ____ لوگوں کے اشارے کنایوں میں اظہار والفت کو میں قہقہوں میں ٹال دیتی۔ میں نے شراب بھی پی ____ تمہارے مجبور کرنے پر ڈانس بھی کیا ____ لیکن پھر بھی ____ میں پاک ____ باعصمت ہوں۔ میں جھوٹ نہ بولوں گی۔ چیف انجینئر مجھ سے اکثر اشاروں کنایوں میں اظہار الفت کرتا تھا۔ مگر میں مذاق میں اڑاتی رہتی ____ ایک مرتبہ اس نے مجھ سے صاف صاف اظہار محبت کیا۔ مگر میں نے اسے ایسی ڈانٹ پلائی ____ اتنی غیرت دلائی ____ اس قدر شرمندہ کیا کہ وہ رونے لگا۔ مجھ سے معافی مانگی اور تب سے آج تک ____ اس نے مجھے اپنی چھوٹی بہن سمجھا اور ہمیشہ محبت اور احترام کا برتاؤ کیا ____ بیشک وہ شریف آدمی ہے اور تم...... تم...... نہایت ذلیل ____ کم ظرف ____ بدباطن ____ بدگمان ____ جاؤ ____ جاؤ ایشور کے لئے یہاں سے چلے جاؤ ____ میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جاؤ ____ تم نے خود بدکاریاں کیں اور اپنی بے

[illegible]

سکھیں گے........اس تک کے سامنے مجھے ذلیل کیا___ چلے جاؤ___ یہاں سے چلے جاؤ___ مجھے تم سے نفرت ہے___"

موہنی کا سر پیچھے کی طرف گر پڑا۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ پریم سر جھکائے بیٹھا رہا۔ سوہنی ہچکیوں سے روتی رہی۔ موہن کا چہرہ رنج اور غصے کو ضبط کرنے کی کوشش میں کبھی سرخ ہو جاتا کبھی زرد اور کبھی سفید۔ پرتاب تیزی سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹر شہاب نے نرس کو ملا، دونوں نے مل کر خدا جانے کیا کیا تدبیریں کیں انجکشن دیئے۔ دوائیں منہ میں ڈالیں تب کہیں گھنٹہ بھر بعد میں موہنی ہوش میں آئی۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ پریم اور موہنی کو اشارے سے قریب بلایا اور گلے سے لگایا اور آہستہ آہستہ کہنے لگی۔ "میرے بچو ۔ تمہاری ماں گنہگار ہے۔ تم اس کی مکتی کے لئے ایشور سے پرارتھنا کرتے رہنا ....اور ... اس کی ناکام و نامراد زندگی سے سبق لینا۔ دنیاوی جاہ و منزلت___ عزت اور دولت کی خواہش سے کبھی مغلوب نہ ہوتا___ ہمیشہ اپنی ماں اور باپ کی ناکام زندگی کی مثال پیش نظر رکھنا۔ سچی خوشی دولت سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ سچی محبت اور اعتبار سے، قناعت اور خدمت خلق سے حاصل ہوتی ہے۔" اس کی آواز دھیمی ہوتی جا رہی تھی۔ "بہنو میں بہت گنہگار ہوں___ ایشور سے میرے لئے دعائیں کرتے رہنا___ اور دیکھنا میرے بچوں کا خیال رکھنا___ یہ بھی میری طرح تباہ نہ ہو جائیں۔" موہن سے ضبط نہ ہو سکا۔ بہن کی پٹی پر سر رکھ کر زار و قطار رونے لگا۔ ڈاکٹر شہاب بہت پریشان، کبھی موہنی کی نبض دیکھتے، کبھی سانس کی رفتار گنتے، کبھی انجکشن دیتے اور پاؤں کے پاس گرم پانی کی بوتلیں رکھتے تھے۔ موہنی کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ زرد ہوتا جا رہا تھا اور اس پر ایک خود فراموشی کی سی کیفیت طاری تھی......اس نے آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھا۔ بہت نحیف آواز میں کہا "پرتاب کو بلاؤ___۔ میں آخری دفعہ انھیں دیکھنا چاہتی ہوں۔" سرسوتی جا کر پرتاب کو بلا لائی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور بال پریشان تھے۔ کمرے میں موت کا سا سکوت چھایا ہوا تھا جو کبھی کبھی سوہنی کی ہچکیوں سے ٹوٹ جاتا تھا۔ پرتاب نے جھک کر اپنا ہاتھ موہنی کے ماتھے پر رکھا___ اس کی آنکھیں بند تھیں پر لب ہل رہے تھے___ پرتاب نے اپنا کان اس کے لبوں سے ملا دیا___ "میں نے___ معاف کیا___ معاف کر دیا___ مجھے اب بھی___ ہاں ___ اب بھی ان سے___ محبت___ ہے___ ایشور___ میرے گناہ___ بخش دے___ شاید۔" پرتاب لڑکھڑا کر زمین پر بیٹھ گیا اور بے تاب ہو کر چیخ اٹھا۔ "موہنی___ میری مظلوم موہنی___ تم بے قصور ہو___ تم بے گناہ ہو___ میں نے تم پر بے جا شک کیا۔ خواہ مخواہ الزام دیا___ میں گنہگار ہوں___ سیاہ کار ہوں___ آہ موہنی تو دیوی ہے___" موہنی نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں پوری کھلی ہوئی اس وقت بہت بھیانک معلوم ہو رہی تھیں___ ان میں سے موت جھانک رہی تھی اس نے پرتاب کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں___ لبوں پر خفیف سا تبسم نمودار ہوا اور ایک نامعلوم سی آواز منہ سے نکلی۔ "اب میں شانتی سے مروں گی___ ایشور___ مجھے___ معاف___"

ڈاکٹر نے ہلکے سے موہنی کی کھلی ہوئی آنکھیں اپنے ہاتھ سے بند کر دیں۔ جن سے آنسوؤں کے دو قطرے اِدھر اُدھر ٹپک پڑے___ ڈاکٹر نے چادر سے موہنی کا منہ ڈھک دیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے___ سارا گھر شور و شیون کی آواز سے گونج اٹھا۔

زندگی کے موڑ پر

کرشن چندر

مسافر

پرکاش وتی کا بیاہ تھا اور سوشیلا اور لیلا بیاہ دیکھنے کی خوشی میں نئے نئے کپڑے سلوا رہی تھیں۔ جارجٹ کی سبز ساڑھی اور زری کا پتلے ٹیپون کا پوائل دوپٹہ اور اس کا جھلملاتا ہوا نقرئی کنارہ۔ آنکھ کے نشے کی قمیض اور امرت منتھن کی شلواریں' عجیب عجیب سے بلاؤز جو دور سے دیکھنے میں ایسے معلوم ہوں گویا صرف چائے دانی کو ڈھانپنے کے کام آ سکتے ہیں۔ لیکن جب سوشیلا اور لیلا انہیں پہن لیں تو گول گول قطع کئے ہوئے کناروں سے بازو ایسے نکل آئیں جیسے سیب کی شاخیں پھولوں کے بار سے جھک رہی ہوں۔ بچارا پرکاش چند سوشیلا اور لیلا کی طرف دیکھ دیکھ کر سوچتا کہ عورتیں بھی عجیب مصیبت ہیں۔ یہ پیدا ہوں تو مصیبت اور نہ پیدا ہوں تب بھی مصیبت' لیلا نے نئے طلائی آویزے خرید لئے تھے اور سوشیلا نے بلی کے پنجوں کی طرح اپنے ناخن بڑھا لئے تھے اور ہر روز انہیں پالش کیا کرتی اور سوچتی کہ جب سری پور جائیں گے تو لیلا کے طلائی آویزوں کو کون پوچھے گا' ہاں' اس چھوٹے سے قصبے کی سب لڑکیاں اس کے سپید سپید لمبے ناخنوں کو دیکھ کر ضرور حیران ہوں گی' اری یہ کیا ہے؟ دیکھ تو بہن یہ لاہور کا فیشن ہے' کیا تجھے خبر نہیں سوشیلا اب کالج میں پڑھتی ہے' ہاں کالج میں' اور پھر کیسی کیسی عجیب باتیں ہوں گی' خوب لطف آئے گا ان کی باتیں سن کر' اور لیلا نے تو جب سے "پریم کی پکار" میں ہیروئن کے کانوں میں نئی وضع کے آویزے دیکھے تھے تو اس کا دل للچا رہا تھا' اب پرکاش وتی کے بیاہ پر یہ موقع تھا کہ وہ ان طلائی آویزوں [illegible] کرتی' اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ آویزے جتنے لیلا کے کانوں میں بھلے معلوم ہوتے ہیں اور کسی کے کانوں میں نہیں ہوتے اور پھر یہ آویزے بھی تو بہت اچھے تھے۔ لمبے لمبے سے' ایک چھوٹے سے طلائی گنبد کے نیچے ایک اس سے ذرا بڑا طلائی گنبد حتیٰ کہ یہ طلائی گنبد ایک دوسرے سے ساتھ جڑے ہوئے اس کی سپید بلوریں گردن تک پہنچ جاتے تھے' یہ آویزے بالکل ایسے تھے جیسے مدورا کے مندر لٹکے ہوئے [illegible] ہوں اور جب آئینے کے سامنے وہ گردن ایک طرف جھکا کر مسکرا دیتی تو اس کا ہنسنا' اور طلائی گنبدوں کا جھومنا' اور اس کے کانوں کا [illegible] ہو جانا' یہ سب باتیں مل کر اس پر ایک نشہ سا طاری کر دیتیں اور وہ سوچتی کیا سوشیلا اور اس کے ناخن' اونہہ! یہ بات اور تھی کہ سوشیلا اس کی بہن تھی۔ بڑی بہن۔ لیکن جب پرکاش چند نے معصوم سے لہجے میں نئے آویزوں کی تعریف کی تو لیلا نے جواب دیا۔ "میں کیا کرتی بھائی جان! میرے پاس کوئی اچھے آویزے ہی نہیں تھے۔ وہ پہلے تین جوڑے تو بالکل ہی بھدے سے ہیں' کیا میں وہی پہن کر پرکاش کے بیاہ پر جاؤں؟"

اور سوشیلا نے ناخنوں پہ پالش کرتے ہوئے نہایت بھولپن سے کہا۔ "بھائی جان! آپ ہماری استانی مس سہگل کے ناخن دیکھیں تو

بالکل حیران رہ جائیں۔ بالکل سپید، بے داغ، سچے موتیوں کی طرح، میرے ناخنوں پر تو ویسی چمک آتی ہی نہیں اور بھاپا جی! پرکاش کے بیاہ میں ہم یہاں سے بس پر جائیں گے یا ریل پر؟"

پرکاش وتی کے بیاہ سے دو دن پہلے پرکاش چند، لیلا اور سوشیلا لاہور سے روانہ ہوئے۔ پرکاش کی ماں نے اپنے بیٹے کو خرچ کے لئے پچیس روپے دیئے۔ پرکاش وتی کے لئے پیلے رنگ کی جارجٹ کی ایک ساڑھی اور دو روپے شگن کے، پھر بولی۔ "دیکھو نا جب پرکاش ڈولی میں سوار ہو تو اسے اپنے پاس سے دو روپے شگن کے دے دینا اور ہاں دو روپے لڑکے کو بھی، دولھا کو اور ــــــ بس کافی ہے۔"

جب پرکاش اور لیلا اور سوشیلا گھر سے تانگے پر سوار ہوئے تو پرکاش کی ماں نے کہا۔ "دیکھنا بیٹا، ڈولی کے وقت میرا خیال ہے کہ بس دولھا دلہن دونوں کو ایک ایک روپیہ شگن دے دینا۔ آخر جب تمہارے بھائی کا بیاہ ہوا تھا تو پرکاش وتی کی ماں نے کون سے خزانے لٹا دیئے تھے، یہی ایک ایک روپیہ اس نے دونوں کو دیا تھا۔" اور کہا بس کافی ہے "اچھا بیٹا جاؤ اب دیر نہ کرو۔"

لیکن جب تانگہ بالکل ہی چلنے لگا تو پرکاش کی ماں نے پھر اشارے سے اسے ٹھہرا لیا اور پرکاش کے قریب جا کر سرگوشیانہ انداز میں بولی۔ "سوشیلا کو ننگے سر نہ پھرنے دینا، سری پور پرانی وضع کا شہر ہے، کوئی لاہور نہیں اور یہ عادت تو مجھے بہت ہی بری معلوم ہوتی ہے اور پھر انہیں نینوں کے دوپٹے بھی نہ اوڑھنے دینا، اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے، کنواری لڑکیوں کو بہت ہنسنے بولنے بھی نہیں دینا چاہئے، وہاں تو ہر وقت ڈھولک بجتی ہو گی اسی لئے کہتی ہوں بیٹا یہ دوآبے کے لوگ بڑے شکی مزاج ہوتے ہیں، ذرا کسی لڑکی کو ننگے سر دیکھ لیا اور وہیں انگلی اٹھا دی اور سر اٹھا کر چلنا بھی شریف زادیوں کا دستور نہیں، کم از کم دوآبے کے لوگ اسے پسند نہیں کرتے "نظر نیچی، شرم اپنی اور......."

پرکاش نے گھبرا کر کہا۔ "بہت اچھا ماں، بہت اچھا۔"

ریل جا چکی تھی اس لئے پرکاش، سوشیلا اور لیلا کو مجبوراً خضر بس کا آسرا لینا پڑا، دوپہر کے وقت خضر بس سروس کی لاری نے انہیں بٹالہ پہنچا دیا، بٹالہ پہنچ کر انہوں نے سری پور جانے والی لاریوں کے اڈے کی تلاش کی اور آخر انہوں نے اسے رابرٹس پارک کے قریب پا لیا۔ یہ ایک بالکل نئی دنیا تھی۔ پرکاش چند سو فی صدی خالص شہری تھا جس کی ساری زندگی لاہور کی گلیوں، سڑکوں اور پارکوں میں چکر کاٹتے اور سیٹیاں بجاتے گذری تھی، یہاں پہنچ کر اس نے کچھ اور ہی نقشہ دیکھا، ایک بڑا سا پیپل کا درخت تھا اور اس کے نیچے تین بوسیدہ لاریاں، دائیں طرف رابرٹس پارک اور اس کے قریب ایک بڑا سا تالاب، تالاب میں پانی نام کو نہ تھا۔ رابرٹس پارک کے درختوں پر پتوں کا نشان نہ تھا۔ سامنے ایک لق و دق چٹیل میدان تھا۔ کہیں کہیں خودرو جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور آک پر اودے اودے پھول آئے ہوئے تھے۔ مٹیالے رنگ کی کچی سڑک پر لاٹھی ٹیک کر چلتا ہوا ایک بوڑھا کسان نظر آ رہا تھا اور کہیں کہیں کھیتوں میں ہل چلے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اپنے لب کھولے آسمان کی طرف تک رہے ہیں کہ شاید کہیں سے پانی کی ایک بوند گر پڑے، واقعی ایک عجیب دنیا تھا۔ پرکاش نے اپنے ہیٹ کو دائیں طرف اور ترچھا کر لیا اور پھر ہمت سے کام لے کر اس نے ایک لاری میں لیٹے ہوئے ڈرائیور سے پوچھا۔ "سری پور کو لاری یہاں سے جاتی ہے؟"

ڈرائیور ہڑبڑا کر بیٹھا ـــــ "ہاں جناب، کیا کہا آپ نے؟"

"میں نے کہا سری پور ــــــ"

ڈرائیور نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں جناب، یہیں سے۔" پھر فرنٹ سیٹ کو جھاڑتے ہوئے بولا۔ "تشریف رکھئے، ایک روپیہ کرایہ۔"

"کس وقت چلنا ہو گا؟"

"چار بجے، اب کیا وقت ہو گا جناب؟"

"ڈھائی!"

"بہت اچھا، بہت اچھا جناب۔ ابھی تو بہت باقی ہے۔"

درمیانہ خانہ کھول کر پرکاش نے لیلا اور سوشیلا کو بٹھا دیا اور پھر ہیٹ اتار کر فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ دیہاتی ڈرائیور کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

"آپ سری پور جا رہے ہیں؟"

"ہاں!"

"کس کے ہاں؟"

ا۔ وسطی پنجاب میں [illegible] کو "[illegible]" کہتے ہیں۔ مقامی رنگ قائم رکھنے کے لئے اس لفظ کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔

"لالہ خودی رام کے ہاں؟"

"لالہ خودی رام؟ وہ جن کا بڑی ڈھاب کے پاس مکان ہے ڈپٹی محمد حسین کے ساتھ' وہ جن کا لڑکا ابھی چند دن ہوئے چین سے واپس آیا ہے' سنا ہے وہاں روئی کے کسی کارخانے میں کام کرتا ہے۔ اس کی ہمشیرہ کی شادی آج کل ہونے والی ہے جو ... ."

"ہاں' ہاں' وہی۔"

"میرے خیال میں آپ پہلے تو کبھی سری پور نہیں گئے؟"

"نہیں۔"

"جی ہاں' مجھے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے میں نے آپ کو پہلے وہاں کبھی نہیں دیکھا۔ سری پور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور ہم کس کو نہیں جانتے! لالہ خودی رام سے تو میں بہت اچھی طرح واقف ہوں' بڑے نیک آدمی ہیں۔ ان کا گھر ڈپٹی محمد حسین کے گھر کے ساتھ ہے۔ ڈپٹی صاحب بھی بڑے نیک آدمی ہیں' کیا بتاؤں جی ڈپٹی صاحب کا بڑا لڑکا کیسا خوش شکل اور نیک طینت تھا' طبیعت میں کھوٹ نام کو نہ تھا' پہلوان تھا جی پہلوان' ہمارے سری پور میں کشتی ہوئی ڈپٹی کمشنر صاحب بھی میلے پر آئے ہوئے تھے' وہاں اس اس نے کشتی کی اور اللہ بخش کو برابر کر دیا۔ اللہ بخش بھی بڑا تگڑا پہلوان ہے مگر ہار گیا جی' کیا بتاؤں جی بڑا اچھا آدمی تھا' ضلعداری کا امیدوار تھا' ستیلن دو بھتے ہوئے بچارے کو کسی نے اتوں رات قتل کر دیا۔ ہمارے ضلعے میں بہت قتل ہوتے ہیں' قتل اور چالان' ابھی پچھلے مہینے میں میرا کوئی سات مرتبہ چالان ہو چکا ہے۔ کیا کریں بابو جی' سڑکیں بالکل کچی ہیں گاڑیوں کا ستیاناس ہو جاتا ہے' یہ لاری میں نے دو سال ہوئے نئی لی تھی' آج آپ اس کی حالت دیکھیں۔ پائدان' پہیے' بریکیں' مڈگارڈ سب خراب ہو گئے ہیں۔ فضلے کی گاڑی اس سے بھی بُری حالت میں ہے ___ او فضل' او فضل' ابے حرامی اٹھ! دیکھتا کیا ہے' چل اسٹیشن پر چلیں' سواریاں لے آئیں' دیر ہو رہی ہے سوچ چھپا جاتا ہے۔ آج رات کو میری شاہ جی کے گھر دعوت ہے۔ سواری ملے نہ ملے دعوت پر تو پہنچنا ہی ہے۔"

اتنا کہہ کر رجب علی ڈرائیور فضل دین ڈرائیور کو ساتھ لے کر ریلوے سٹیشن کی طرف سواریاں لینے چلا گیا اور پرکاش چند کو چند لمحوں کے لئے جھونکا سا چھوڑ گیا۔

ساڑھے چار بجے کے قریب جب لاری چلنے کو ہی تھی تو لالہ گھسیٹا رام سڑک پر ہانپتے ہوئے آتے دکھائی دئے اور رجب علی کو انجن بند کرنا پڑا۔ پرکاش چند کی طرف دیکھ کر رجب علی نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "لالہ جی سری پور کے بڑے ساہوکار ہیں' اور یوں بھی مجھ سے یہ تو نہیں ہو سکتا کہ اپنے قصبے کے کسی آدمی کو یہاں رات بٹالے میں دھکے کھانے کے لئے چھوڑ جاؤں' مجبوری ہے' اگرچہ لاری تو اب بھر چکی ہے۔"

لاری واقعی بھر چکی تھی' درمیانے درجے میں جو عورتوں کے لئے تھا' سوشیلا اور لیلا کے علاوہ آٹھ دیہاتنیں بیٹھی ہوئی تھیں اور سوشیلا اور لیلا کے خوبصورت کپڑوں کی طرف دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں' یہ حیرانی دبی دبی سی تھی' ان سے پرے تیسرے درجے میں لاری کی چھت کے اوپر بھی جاٹ بیٹھے ہوئے تھے۔ چنانچہ جب لالہ گھسیٹا رام لاری کے قریب پہنچے تو رجب علی نے کہا:

"آؤ شاہ جی۔"

"کہاں بیٹھوں؟" لالہ گھسیٹا رام نے کہا۔

رجب علی نے ایک نظر پیچھے کی طرف دوڑائی' پھر آہستہ سے بولا۔ "یہیں میرے پاس بیٹھ جائیے۔" لالہ گھسیٹا رام رجب علی کے قریب بیٹھ گئے۔ ان کا چہرہ سرخ تھا اور وہ چیچک کے داغ اس طرح دکھائی دے رہے تھے جیسے راستے کی مٹی پر بارش کے چند قطرے' دونوں ہاتھوں کی چھنگلیوں پر سونے کی انگوٹھیاں تھیں اور گلے میں دانتوں کو صاف کرنے والا سونے کا خلال کانوں میں سونے کی بڑی بڑی بالیاں تھیں۔

"بھائی رجب؟" لالہ گھسیٹا رام نے آرام کا ایک لمبا سانس لے کر کہا۔ "میں تو کچہری سے بھاگتا ہوا آیا' امید نہ تھی کہ لاری مل جائے گی۔"

رجب علی نے پھر انجن کھولا۔ ایک پولیس کا سپاہی جس کو سری پور جانا تھا ڈرائیور کی کھڑکی کے قریب مڈگارڈ پر کھڑا ہو گیا۔ لاری آہستہ آہستہ چلنے لگی۔

سوشیلا اور لیلا بولیں۔ "بھاپا جی؟"

"کیوں؟" پرکاش نے پوچھا۔

"دم گھٹا جا رہا ہے۔"

رجب علی بولا۔ "بی بی جی! ابھی لاری زور سے چلے گی تو خوب ہوا آئے گی۔"

لالہ گھسیٹا رام نے ایک نظر پرکاش چند پر ڈالی اور ایک سوشیلا اور لیلا پر، پھر بولا۔ "آپ لالہ خودی رام کے ہاں جا رہے ہیں ہوں گے، پرکاش وو تی کی شادی ہے نا؟"

"جی!" پرکاش بولا۔

تیسرے درجے میں دو تین جاٹ، دو زور سے باتیں کرنے لگے، ایک بولا۔ "میں نے موجو سے کہا تھا کہ گواہی نہ دینا، وہ بنیا بڑا بد معاش ہے۔"

دوسرا بولا۔ "موجو خود کہاں کا شریف ٹھہرا؟"

تیسرا کہنے لگا۔ "موجو پھر جاٹ بھائی ہے، لیکن وہ مہاجن ہے، کھتری بھی نہیں۔"

لالہ گھسیٹا رام نے رجب علی سے کہا "زمانے کو تو جیسے آگ لگ گئی ہے، بھائی بھائی کا دشمن، اب تو بیوپار کا زمانہ نہیں رہا، ابھی میں راستے میں سیٹھو رنگ مل کے لڑکے کو سمجھا رہا تھا کہ جاٹوں کو روپیہ قرض نہ دو، سرکار سب قرضے معاف کرنے پر تلی ہوئی ہے اور اگر دوسرے بیوپاریوں کو دیکھا، وہ تو ساتھ ساتھ وصولی بھی کرتے رہے۔ ادھر ادھار دیا، اُدھر وصولی کے لئے اپنا آدمی دوڑا دیا۔ یہ آج کل کے بیوپار کا قاعدہ ہے۔"

رجب علی آہستہ سے بولا۔ "کم بخت پسٹن کام نہیں کرتا۔"

درمیانے درجے میں کالے رنگ کے لہنگے پہنے ہوئے ادھیڑ عمر کی دو لالائنیں باتیں کر رہی تھیں۔ "اس کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ تیرہ سال کی عمر میں ودھوا، ساری عمر رونے والے کو رونے کی! بےچاری کے بھاگ۔ میں نے کرایا پر دو ململ کے دوپٹے اور تین روپے نقد بھیج دئے تھے لیکن کرموں کی ماں تو بڑی کمینی اور بے مروت نکلی......"

ایک جاٹ عورت جس کے کانوں میں چاندی کی بڑی بڑی بالیاں پڑی ہوئی تھیں، بار بار اپنے بچے کو بہلانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، اس کے ساتھ کی عورت تنگ آکر بولی۔ "بہن اسے چھاتی کیوں نہیں دیتیں؟"

"میں تو چھاتی دیتی ہوں مگر یہ پیتا ہی نہیں۔ شاید اس کے پیٹ میں درد ہے، اُرر۔ آ۔ آ۔ آ۔ اُس۔ اِی۔ اِی۔ سو جا میرے لال۔ سو جا۔ ہائے مر جائے تو، جان کھائے جاتا ہے۔"

رجب علی گھسیٹا ل کی طرف اٹھ کر بولا۔ "پسٹن کام نہیں کرتا شاید۔" لیکن گھسیٹا ل پرکاش چند کی سیٹ پر جھکا ہوا اونگھ رہا تھا۔

پچھلے درجے میں تحصیل کا ایک چپڑاسی ایک جاٹ سے جھگڑ رہا تھا۔ "مالیہ پچاس فی صدی کم ہو، آبیانہ ہٹا دیا جائے، چوکیدارہ بند ہو جائے تو سرکار کام کیسے چلے؟"

جاٹ بولا۔ "پہلے کیسے چلتا تھا جب حاکم کی تنخواہ پانچ روپے ہوتی تھی۔"

"تم سکھا شاہی چاہتے ہو؟"

"نہیں جٹا شاہی۔" ایک اور جاٹ نے جواب دیا۔

ایک کسان عورت دوسری سے کہنے لگی۔ "بچن کی ماں دلدار سنگھ کے ساتھ بھاگ گئی ہے، تم نے سنا؟"

"اب بچن کا باپ ٹکوا لئے کی ان کی تلاش میں پھرتا ہے۔"

پرکاش چند کے ذہن میں چوتھی جماعت کی اُردو کی کتاب کا ایک سبق گھومنے لگا۔ دیہاتی اور شہری زندگی کا موازنہ، دیہات کی زندگی کتنی دلکش اور پُر لطف ہوتی ہے، سادہ اور معصوم، پرکاش نے سوچا کاش مجھے اُردو کی چوتھی کتاب کا مصنف کہیں مل جائے تو ٹکوے سے اس کا سر گردن سے الگ کر دوں۔

سوشیلا اور لیلا نے پکارا۔ "بھائی جان، پانی، دم گھٹا جا رہا ہے۔"

رجب علی بولا۔ "آگے نہر آئے گی اُس کے قریب ہی ایک کنواں ہے، اُس کا پانی بہت میٹھا اور ٹھنڈا ہے، کیوں لالہ جی؟"

گھسیٹا رام چونک پڑا۔ "ہاں، جی، کیا پیشی، کیا کہتے ہو، اوہ رجب کیا میں سو گیا تھا؟"

"ہم کہاں آپہنچے ہیں؟"

پرکاش نے چند سنگترے پھلوں کی ٹوکری سے نکال کر سوشیلا اور لیلا کو دئے۔

رجب علی بولا۔ "نہر کے قریب لالہ جی۔"

گھسیٹا رام لبوں پر زبان پھیر کر بولا۔ "اوہ بہت پیاس لگی ہے کنوئیں پہ پانی پئیں گے۔"

رجب علی کہنے لگا "میں بابو جی سے کہہ رہا تھا کہ کنوئیں کا پانی بہت ہی ٹھنڈا اور ٹھنڈا ہے۔"

پرکاش چند کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا' حدِ نظر تک خشک سے کھیت' کہیں کہیں کیکر کے جھنڈ' لاری آہستہ آہستہ ریتلے میدان میں چل رہی تھی' پکی سڑک پر گرد کا طوفان اٹھ رہا تھا' دھوپ بے حد تیز تھی اور آگ کے شراروں کی طرح زمین پر گرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی' آک کے پھول دھوپ میں بالکل مصنوعی معلوم ہوتے تھے۔ پیپل کے ایک بڑے درخت کے نیچے گائیں اور بھینسیں آرام کر رہی تھیں لیکن ان کا رکھوالا وہاں نہ تھا...... یہ ایک گاؤں تھا۔ سڑک کے اس طرف لاری ایک گندے جوہڑ کے قریب سے گذر رہی تھی' ایک بھینس پانی میں گھس رہی تھی' ایک عورت خاکی رنگ کی قمیض اور کالے رنگ کا لہنگا پہنے پانی بھر رہی تھی' ایک لڑکی' سڈول اور سانولی بانہوں والی نوجوان لڑکی' ڈنڈے سے چند بھیگے ہوئے کپڑے کوٹ رہی تھی' سڑک کی دوسری طرف ایک بڑا سا بورڈ نظر آ رہا تھا جس پر ڈاک کے لئے سرخ ڈبہ لٹکا ہوا تھا' درخت کے نیچے ایک ٹوٹا ہوا چھکڑا پڑا تھا اس پر چار سکھ جاٹ ایک بے حد میلی تاش سے کھیل رہے تھے' پھر وہی میدان تھا' وہی پکی سڑک' وہی تیز دھوپ اور میلوں تک پھیلے ہوئے کھیت۔

پرکاش چند نے سوچا' زندگی نہ دیہاتی ہوتی ہے نہ شہری بلکہ محض "زندگی" کوئی اس کا کوٹ پکڑ کر کھینچ رہا تھا' پرکاش چند نے مڑ کر دیکھا۔ ایک چھوٹا سا خوبصورت بچہ' اپنی ماں کے کندھے سے لگا ہوا اور اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کا کوٹ پکڑ رہا تھا' اس کی ماں سیٹ سے سر لگائے سو گئی تھی' وہ اس کا ایک رُخ دیکھ سکتا تھا' ایک جوان جاٹ عورت' گندمی سا رنگ' کان میں سونے کی بالیاں' تیکھے نقش' لمبی لمبی سیاہ پلکوں نے رخساروں پر صف باندھ رکھی تھی۔

بچہ پرکاش چند کو اپنی طرف مڑتے ہوئے دیکھ کر ایک لمحہ کے لئے حیران ہو گیا۔ پھر خود بخود ہنس پڑا' اور اس کا کوٹ کھینچتے ہوئے بولا۔ "ہو تو ___ تو ___ لی۔"

پرکاش چند نے اسے ایک سنگترہ دیا اور بچے نے اس کا کوٹ چھوڑ دیا اور گنگنایا۔ "ہو تو ___ او ___ لی ___ او۔"

جاٹ عورت بیدار ہو گئی' اس کی آنکھیں کھلتے ہی پرکاش چند کو محسوس ہوا گویا کہیں آسمان پر یکایک دو ستارے روشن ہو گئے ہیں۔ جب ماں نے اپنے بچے کے ہاتھ میں سنگترہ دیکھا تو اس کے خواب آلود چہرے پر اس کے نیم متبسم لب پرکاش چند کو بہت دلفریب معلوم ہوئے' اس کے شباب میں اس نے ایک آسودگی اور دوشیزگی سی محسوس کی اور اسے خیال آیا کہ دیہاتی زندگی شہری زندگی سے کہیں بہتر ہے۔

لاری چلتے چلتے تھم گئی' ایک بوڑھی عورت ایک چھوٹی سی لڑکی کو ساتھ لئے راستے کے بیچ میں کھڑی تھی' بولی۔ "ہمیں سری پور جانا ہے۔"

رجب علی بولا۔ "ماں' جگہ تو بالکل نہیں۔"

بوڑھی عورت بولی۔ "بیٹا! میں سہارا لے کر کہیں کھڑی ہو جاؤں گی' ہاں' مگر تو اس میری لڑکی کو کسی کونے میں بٹھا دے۔" رجب علی نے ایک کسان سے کہا کہ وہ لاری کی چھت پر چلا جائے اور بوڑھی عورت کے لئے جگہ خالی کر دے۔ کسان لاری کی چھت پر چلا گیا جہاں پہلے بھی چار پانچ دیہاتی بیٹھے ہوئے تھے اور جب لاری چلی تو انہوں نے گانا شروع کر دیا۔

او بنتو ______
بنتو دا سہ بن ورگا
بنتو دا منہ چن ورگا
بنتو دا لک چترا
او بنتو ______

پرکاش نے دل ہی دل میں جاٹ کی شاعری کی تعریف کی۔ بنتو ایک جاٹ کی محبوبہ ہے' لیکن اس کے سر کے بال ایسے ہیں جیسے ایک وسیع جنگل اس کا چہرہ چاند اور اس کی کمر چیتے کی سی' جاٹ کی شاعری میں اس کے دیہات کے کھلے کھیتوں کی سی وسعت اور سادگی پائی جاتی ہے۔ پرکاش نے چور نگاہوں سے پھر نوجوان عورت کی طرف دیکھا' بچے نے اس کا کوٹ پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھا دئے اور نوجوان عورت کی نگاہیں پرکاش کی نگاہوں سے مل گئیں۔

لاری نہر کے پُل سے گذر گئی' آگے جاکر ایک کنواں آیا' وہاں لاری ٹھہر گئی اور مسافر پانی پینے لگے' پرکاش نے چاندی کا سفری گلاس نکالا اور سوشیلا اور لیلا کو پانی پلانے لگا' جب وہ پانی پی چکیں تو نوجوان عورت نے بھی آہستہ سے پانی پینے کی خواہش ظاہر کی' پانی واقعی ٹھنڈا اور میٹھا تھا۔ پرکاش نے دیہاتی عورت کو پانی پلاتے ہوئے محسوس کیا کہ ان میں ایک فطری شائستگی ہوتی ہے' دیہاتی عورتوں میں' لیکن بچہ بڑا شریر تھا۔ اس نے پانی پیتے ہوئے گلاس کے پانی میں اپنے سانس سے بلبلے پیدا کرنے شروع کر دیئے اور اس کی ماں نے آہستہ سے گلاس کے ہاتھ سے چھین کر پانی نیچے گرا دیا اور پھر مجوب نگاہوں سے پرکاش کی طرف دیکھ کر گلاس اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

چند میل آگے جاکر نوجوان عورت لاری سے اتر گئی اسے سامنے کے ایک گاؤں میں جانا تھا۔ لاری سے اترتے ہی اس نے سرسوں کے ساگ کی سبز سبز کونپلوں کا گٹھا اپنے سر پر رکھ لیا اور بچے کو کمر کے خم میں' اس نے ایک نگاہ پرکاش پر ڈالی گویا کہہ رہی تھی مجھے اچھی طرح دیکھ لو' ہم تم پھر کبھی نہیں ملیں گے' میں اب اپنے گھر جا رہی ہوں' جہاں میرا خاوند اپنی بنتو کا انتظار کر رہا ہے' میں کماد کی فصل کاٹوں گی گیہوں کی بالیاں الگ کروں گی اور باجرے کی روٹیاں اور چھاچھ کی ٹھلیا لے کر اپنے گھر والے کے پاس کھیتوں میں جاؤں گی' یہی وہ پگڈنڈی ہے جہاں سے میرا اور تمہارا راستہ ہمیشہ کے لئے الگ ہوتا ہے۔

اور پرکاش جو باغیانہ خیالات رکھتا تھا اپنے دل میں کہنے لگا' ٹھیک ہے بنتو' اس میں میرا یا تمہارا کوئی قصور نہیں' یہ سماج کا قصور ہے۔ اس زندگی میں اب کوئی خالص مرد یا عورت نہیں' بھائی' بہن' خاوند' بیوی' بھانجا' بھتیجی' ماموں' پھوپھی اور خالہ ہیں لیکن ایسا کوئی نہیں جو اپنے آپ کو مرد یا عورت کہے۔ کیسی عجیب بات ہے۔

نوجوان عورت آہستہ سے پگڈنڈی پر مڑ گئی' اس کی ہلکے سبز رنگ کی قمیض پر روپہلی کناری دھوپ میں چمک رہی تھی۔

پرکاش نے دل میں کہا خدا حافظ' خدا حافظ اس لئے کہ ہم انسان ہیں۔ لیکن اگر ہم انسان نہ ہوتے بلکہ کبوتر یا چڑیا...... تو......اور پرکاش کے شاعرانہ تخیل نے دیکھا کہ وہ دونوں کبوتر بن گئے اور اپنے سفید پر پھیلائے ہوئے اڑے جا رہے ہیں۔ نڈر' بے باک' خوش' نہیں وہ چڑیوں کا ایک جوڑا تھے اور ایک دوسرے سے بھاگتے ہوئے' ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہوئے' ایک دوسرے پر جھپٹتے ہوئے اڑے جا رہے تھے' سورج مغرب میں غروب ہو رہا تھا اور کیکروں پر پیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔ مغربی آسمان پر شفق کی سرخی تھی اور سطح زمین پر ایک سنہری دھند' کیکر کی پتلی' گھنی اور خاردار ٹہنیوں کے بیچ میں سورج کی کرنوں نے ایک زریں گھونسلا بن دیا تھا۔

بنتو اڑ کر گھونسلے میں جا بیٹھی' پر پھیلائے ہوئے پرکاش کی طرف دیکھنے لگی اور چہکنے لگی "چ۔ چ۔ چوں چوں" پرکاش نے اپنی چونچ اس کی چونچ سے ملا دی اور کیکر کے بہت سے پیلے پیلے پھول ان کے پروں پر گر پڑے۔ یکایک رجب علی بولا۔ "یہ پسٹن کام نہیں کرتا۔"

محور

سری پور کا قصبہ دریائے بیاس کے کنارے واقع ہے' یہ قصبہ کسی زمانے میں ایک اچھا خاصا شہر تھا۔ اسے سکھوں کے ایک مقدس گورو نے چند اونچے ٹیلوں پر بسایا تھا۔ لیکن اونچے ٹیلوں پر آہستہ آہستہ دریا کی لہریں چھا گئیں۔ پھر گیہوں کی درآمد کم ہو گئی اور اونچی اونچی حویلیاں کھنڈر بن کر رہ گئیں' وقت' مذہب کا بھی پاس نہیں کرتا۔ چنانچہ سری پور کا مقدس شہر امتداد زمانہ سے ایک معمولی سا قصبہ بن کر رہ گیا۔ ایک چھوٹا سا بازار تھا جہاں اکثر دکانوں پر حقہ گڑگڑایا جا رہا تھا یا تاش کھیلی جا رہی تھی۔ نحیف اور آدھ موئے سے کتے بازار کی نالیوں میں لیٹے ہوئے تھے اور دو تین آوارہ گدھے اپنے لمبے لمبے کان ہلاتے' بازار کی رونق دیکھتے ہوئے جا رہے تھے۔ کیونکہ آج بازار میں دو رویہ رنگ برنگ کی جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ یہ جھنڈیاں بازار کے پہلے دروازے سے شروع ہو کر جہاں لاری کا اڈہ تھا' لالہ خودی رام کے گھر تک لگی ہوئی تھیں جو ایک چھوٹی سی جھیل کے قریب واقع تھا' یہ جھیل اس زمانے میں ایک اونچا ٹیلہ تھی۔ اب دریائے بیاس کے پانی سے بھری ہوئی تھی۔ پرکاش چند نے سوچا اس قصبے میں کتنا امن ہے۔ اچھا تو یہ دیہات ہے۔ یہاں تو لوگوں کو کوئی کام نہیں۔ زندگی کی رفتار کتنی مدھم اور سکون آمیز ہے۔ دریائے بیاس کے پانی کی طرح' یہاں آدمی چاہے دن بھر تاش کھیلے' چاہے چرخہ چلائے' بہرحال چرخہ تاش سے بہتر ہے۔ اس نے دل ہی دل میں گاندھی جی کی فراستِ طبع کی داد دی۔ چند ایک لوگوں نے اسے گھور کر دیکھا' سوشیلا اور لیلا اس کے ساتھ ساتھ لگی چلی آ رہی تھیں۔ ان کے بھڑکیلے لباس جو بازار میں لگی ہوئی جھنڈیوں کی طرح رنگین اور جاذب نظر تھے کتنوں ہی کی نظروں کو خیرہ کرتے رہے۔ ایک دکان پر ایک گاڑی بان چھکڑے پر سے بنولے کی بوریاں اتار کر رکھ رہا تھا' وہ انہیں دیکھ کر بنولے کی بوریاں اتارنا بھول گیا' پھر اس کے لبوں پر ایک شرارت آمیز مسکراہٹ نمودار

ہوئی تھی، جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی اور اس کا چہرہ جیسے کسی الجھن سے فوراً صاف ہو گیا۔ جب سوشیلا، لیلا اور پرکاش چند اس کے قریب سے گذرے تو کالی بان بڑے مزے سے گنگنایا۔

اک بنگلہ بنے نیارا......

اور پھر ہونے کی بولیاں دکان پر چھیکنے لگا۔ سوشیلا اور لیلا کے چہرے شرم سے گلابی ہو گئے اور پرکاش چند نے سوچا کہ ہندوستانی غریب طبقوں میں بھی شخصی جائداد کی حس کتنی تیز اور شدید ہے۔ اس بنگلے کی ہوس نے انہیں بدعمل کلام اور خوشامدی بنا دیا ہے۔ ایک ہندوستانی کی جنت تین چیزوں پر مشتمل ہے۔ بیوی بچے اور بنگلہ۔ لالہ خودی رام کے مکان کے دروازے پر بینڈ بج رہا تھا۔ پرکاش چند نے لالہ خودی رام کے پاؤں چھوئے اور سوشیلا اور لیلا نے ایک کونے میں سمٹ کر ہاتھ جوڑے۔ لالہ خودی رام کا لڑکا بیر بھاگتا اندر سے آیا اور پرکاش چند کے گلے سے لگ گیا۔ وہ دونوں چار سال کے بعد ایک دوسرے سے ملے تھے۔ بیر اب پہلے سے لمبا، مضبوط اور جوان ہو گیا تھا۔ چین کے دور دراز ملک میں رہ کر اس نے دنیا کے بہت سے نشیب و فراز دیکھ لئے تھے۔ اس کے لہجے میں خودداری تھی اور بلند حوصلگی اور خود اعتمادی۔ جب وہ سری پور سے گیا تھا تو بالکل ایک لڑکا سا تھا۔ چہرے پر خط بھی نہ آیا تھا اور بالکل کالج کے لڑکوں کی طرح باتیں کیا کرتا تھا اور اب ..... اب پرکاش چند کو افسوس ہوا کہ وہ خود کیوں اتنے عرصے تک لاہور کے کنوئیں کا مینڈک بنا رہا۔ ماحول کا اثر، تن آسانی یا ایک جبلی کمزوری۔ لالہ خودی رام کے گھر کے اندر پرکاش چند کی خالاؤں، پھوپھیوں، بھانجیوں، بھتیجیوں اور رشتے کی بہنوں کا شمار نہ تھا۔ انہوں نے سوشیلا اور لیلا کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور پانچ منٹ میں ان کے پاؤں سے سٹریم لائن Stream Line سینڈلوں سے لے کر کان کے آویزوں تک کو پرکھ کر رکھ دیا۔ بالاتفاق رائے پاس ہوا کہ سوشیلا اور لیلا دونوں لاہور کی میمیں ہیں۔ سوشیلا کے لمبے لمبے ناخن دیکھ کر کئی لڑکیوں کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ ناخنوں پر سُرخ رنگ کا پالش کیا گیا تھا جس کی یاقوتی چمک کے آگے خاکی رنگت ماند ہو گئی تھی۔ اری..... بہن یہ کیا چیز ہے؟ کہاں سے آتی ہے؟ پتہ، پتہ، پتہ، لکھ دو پتہ، لیلا کا چہرہ غصے سے بیر بہوٹی ہو رہا تھا۔ اس کے طلائی آویزوں کی طرف اب کسی کی توجہ نہیں رہی تھی۔ یہ چڑیلیں چلا رہی تھیں! کر سوشیلا کے ناخنوں کو سراہ رہی تھیں۔ لیلا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے مردار بلّیاں کہیں کی۔ اگر مجھے پتا ہوتا . . . آنگن میں چارپائی پر پرکاش اور بیر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ بیر کی ماں مسکراتی ہوئی ان کی طرف بڑھی۔ اس نے ریشمیں اور پھولدار شلوار پہن رکھی تھی۔ زعفرانی قمیض اور سر پر سنہری کنارے والا سُرخ دوپٹہ تھا۔ دونوں ہاتھوں میں دو انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ بیر کی ماں نے مسکراتے ہوئے پرکاش کی ماں کا پرکاش دتی کی شادی پر نہ آنے کا شکوہ کیا۔ بیر نے بھی جھوٹ موٹ غصے کا اظہار کیا اور پرکاش نے بھی کچھ اس طرح سر جھکا کر شرمساری اور ندامت دکھائی کہ ہر ایک کی عزت رہ گئی اور کسی کی بات بگڑنے نہ پائی۔ کیونکہ اس بات کا تو ہر ایک کو پتہ تھا کہ اگر شادی پر خاندان کے تمام قرابت دار اپنے گھر کے تمام لوگوں کو لے کر چلے آئیں تو جہاں جنگل میں منگل ہو سکتا ہے وہاں منگل ہونے والے جنگل میں آگ بھی لگ سکتی ہے یعنی ایک پوری بارات گھر کے دروازے کے اندر ہو گی اور ایک باہر اور اگرچہ بعض پرانے خیالات کے لوگوں کے نزدیک لطف کی بات بھی یہی ہے کہ دونوں طرف ہو آگ برابر لگی ہوئی۔ لیکن بیر کی ماں ان لوگوں میں سے نہیں تھی اس لئے جب پرکاش نے معذرت پیش کی کہ آخر گھر میں کسی کا رہنا ضروری تھا تو وہ سُن کر اور اس کے سر کی بلائیں لے کر وہاں سے چلی گئی۔ پرکاش نے بیر سے پوچھا کہ چین کیسا ملک ہے اور بیر جواب دینے ہی کو تھا کہ رُک گیا کیونکہ ایک حسین شرمیلی لڑکی جس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کنوارپنے کی نازک پاکیزگی کانپ رہی تھی، ان کی طرف جھجکتے ہوئے مدتوں سے بڑھی چلی آرہی تھی اور جب بالکل ہی قریب آگئی تو بیر کے لب کانپنے لگے اور لڑکی کے رخسار گلاب کے پھول بن گئے۔ اس نے اپنی آنکھوں کو پلکوں کے پردوں میں چھپا لیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں لسی کے دو گلاس تھام رکھے تھے وہ ان کے قریب آکر کھڑی ہو گئی اور منہ سے کچھ نہ بولی۔ بیر نے آہستہ سے جیسے [illegible] کی کسی پتی کو چھو رہا ہو، اس کے ہاتھوں سے گلاس لے لئے اور ایک گلاس پرکاش کے ہاتھ میں دے کر دوسرا اپنے منہ تک لے گیا۔ لڑکی [illegible] بھی خاموش تھی۔ لیکن پرکاش نے ایک لمحے کے لئے اس کی پلکیں اٹھتی ہوئی دیکھیں۔ ایک لمحے کے لئے اس نے اس لڑکی کی آنکھوں میں [illegible] اور پرکاش چند کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ آہ، یہ دل کی دھڑکن۔ اس نے سوچا "کبھی کبھی کسی خوبصورت چیز کو دیکھ کر میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ [illegible] ہوئے خون میں طوفانی ریلے آجاتے ہیں۔ شاید ابھی حُسن کا احساس پوری طرح مرا نہیں۔ "دفتر کی میز ابھی اس کی روح کو [illegible] نہ پائی تھی۔

کچھ دیر کے [illegible] پوچھا "یہ کون تھی؟"

بیر نے کہا "[illegible]"

پرکاش نے کہا "میرا اشارہ اس لڑکی کی طرف تھا جو لسی کے دو گلاس ہمارے لئے لائی تھی۔"

بیر نے کہا۔ "چین کے لوگ انیم کھاتے اور چینی کے برتن بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ان کی زندگی......"

پرکاش چارپائی سے اٹھ بیٹھا' کہنے لگا۔ "بھاڑ میں جائے ان کی زندگی۔ ہماری زندگی کب ان سے بہتر ہے اور تم یہاں چینیوں سے کیوں ہم پر آن اتا چاہتے ہو۔ ذرا سنبھل کر چلنا یہ شنگھائی نہیں۔ سری پور ہے۔ چینیوں کا خدا ہمارا خدا نہیں' ہماری زندگیاں چینی کے برتنوں کی طرح خوبصورت نہیں بلکہ مٹی کے برتنوں کی طرح میلی اور ناصاف ہیں لیکن میں کس گدھے سے بات کر رہا ہوں۔ اچھا میں کوٹھے پر چلتا ہوں۔ ذرا پرکاش وتی سے دو میٹھی میٹھی گالیاں سن آؤں۔"

بیر نے کہا۔ "پرکاش وتی سے مل کر باہر بیٹھک میں آجانا۔ تمہیں اپنے چند نئے دوستوں سے ملاؤں گا۔"

پرکاش وتی دوسری منزل پر ایک کمرے کے کونے میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ پرکاش کا خیال تھا کہ وہ بہت سی لڑکیوں میں گھری ہوگی اور اسے دو چار میٹھی میٹھی گالیاں سننے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ لیکن حسنِ اتفاق سے وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ پرکاش بہت خوش ہوا' اس نے پرکاش وتی کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی حنائی انگلیوں کو زور زور سے مسلنے لگا۔ لیکن پرکاش وتی بولی نہیں۔ پھر اس نے اپنے ہاتھ سے پرکاش وتی کی ٹھوڑی کو اونچا کیا اور کہنے لگا "سنتی ہو بہن! تمہارا بھائی تمہیں بدھائی دینے آیا ہے اور تم ہو کہ اپنی آنکھوں میں آنسو روکے بیٹھی ہو۔"

اور پرکاش وتی سچ مچ اپنی آنکھوں میں آنسو روکے بیٹھی تھی۔ یہ بات سنتے ہی وہ ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ پرکاش بولا۔ "تو تو کہتی تھی کہ میں بی۔ اے پاس کر کے نوکری کروں گی یا کہانیاں لکھوں گی اور شاعری کروں گی اب بتا' یہاں تو تجھے کسی نے گیارھویں جماعت سے آگے نہیں پڑھایا اور تو تو شاید فلم کی ایکٹرس بننا چاہتی تھی اب وہ اداکاری کے ولولے کہاں گئے؟ تیرے وہ سونے کے تمغے جو تو نے مہاودیالہ میں ناچ ناچ کر حاصل کئے تھے اب کہاں ہیں؟"

پرکاش وتی نے رو کر کہا۔ "اسی لئے تم مجھے جلانے آئے ہو۔ کیا میں اب تم سے بھی ہمدردی کی امید نہ رکھوں؟"

پرکاش چپ رہا اور چند لمحوں تک آنسوؤں کی ان دو ندیوں کی طرف تکتا رہا جو اپنی روانی میں زندگی کے پورے نہ ہونے والے سپنوں کی کو بہائے لئے جا رہی تھیں۔ اسے پرکاش وتی سے بہت محبت تھی۔ پرکاش وتی اسے بہنوں کی طرح عزیز تھی' شاید بہنوں سے بھی زیادہ۔ کیونکہ سارے خاندان میں وہی ایک لڑکی تھی جو اس کی طرح ادبی مذاق رکھتی تھی۔ اسے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ بہت اچھا گاتی تھی اور تیتری کی طرح ناچ سکتی تھی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ پرکاش وتی کی شادی کسی اچھے آدمی سے ہو اس کی مراد ایسے آدمی سے تھی جسے عام لوگ برا کہتے ہیں۔ مثلاً ایک خوبصورت طرح دار نوجوان جسے اچھے لباس کا شوق ہو' جو گانے اور ناچنے کا شوقین ہو' جو حسن کی قدر کر سکے' پڑھا لکھا ہو اور کبھی کبھی کوئی شعر گنگنا سکے۔ غرض کہ ایک ایسا آدمی جو ہندوؤں کے متوسط طبقے کی مستورات میں بہ نظرِ حقارت دیکھا جاتا ہو اور اسے یہ بھی پتہ تھا کہ پرکاش وتی کی بھی یہی مرضی تھی۔ لیکن نہ تو پرکاش وتی میں اپنی مرضی برتنے کی ہمت تھی اور نہ اس کے ماں باپ کا تخیل اس قدر بلند تھا۔ وہ "بے حیا" نہ تھے۔ انہوں نے کبھی سینما تک نہیں دیکھا تھا اور زندگی بھر اپنے بالوں میں آملے کا تیل درجہ اول نہیں لگایا تھا' نہ کبھی ٹیڑھی مانگ نکالی تھی۔ ان کے وقت میں سکولوں میں ناچ اور گانے نہیں سکھائے جاتے تھے بلکہ لوگ باشٹ سٹ اور استی باچن پڑھائے جاتے تھے۔ پھر بھی انہوں نے اپنی لڑکی کو گیارھویں تک پڑھایا تھا۔ اسے سری پور کے گاؤں سے دور ایک دوسرے شہر کے مہاودیالہ میں داخل کر دیا تھا۔ لیکن شادی کے معاملہ میں وہ بے حیائی نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے سوچ بچار کر کے اور اچھی طرح دیکھ بھال کے ایک امیر گھرانے کا لڑکا پسند کیا تھا۔ لڑکے کے ماں باپ امرت سر کے مشہور ساہوکار تھے اور تھوک ہلدی بیچتے تھے۔ ہلدی بیچ بیچ کر انہوں نے امرت سر میں لاکھوں کی جائیداد بنالی تھی۔ انہوں نے لڑکی کے لئے نہایت اچھا بر ڈھونڈھا تھا۔ کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ازدواجی زندگی کی اصلی مسرت چند شعروں پر نہیں بلکہ ہلدی کی بے شمار گانٹھوں پر قائم ہے۔ عورتوں کا کام پڑھنا لکھنا اور ناچنا نہیں' بچے جننا اور برتن مانجھنا ہے۔ زندگی کا اصلی لطف برتن صاف کرنے میں ہے شعر کہنے میں نہیں۔ خیالی دنیا عملی دنیا سے بہت الگ ہے۔ بے وقوف پرکاش وتی کے آنسوؤں کو دیکھ کر پرکاش کو بہت غصہ آیا۔ [illegible] "لاکھوں کی جائیداد کی مالک بن رہی ہو اور اب یوں ٹسوے بہا رہی ہو۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟"

پرکاش وتی روتے روتے ہنس پڑی۔ کہنے لگی۔ "مجھے اس طرح تنگ کرنے میں تمہیں کیا فائدہ ہے؟ جاؤ ہٹو۔"

پرکاش نے کہا۔ "ہم نہیں ہٹیں گے کوئی بات ہے بھلا یہ بھی؟ یوں آنسو بہا کر ہم پر رعب جمایا جا رہا ہے۔ اے ہلدی بیچنے والے کی ہونے والی بیوی! ہم تم سے ایک بات پوچھنا چاہتے ہیں۔ جواب دو گی؟"

پرکاش وتی نے کہا۔ "تم لاکھ بار پوچھو۔ ہم تب بھی نہیں بتائیں گے۔"

پرکاش نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ "تو دیکھو جب تک تم خود نہ اُڑو' اپنے پر پھڑ پھڑاؤ یہ زمین تمہیں اُڑنے نہ دے گی۔"

پرکاش وتی نے کہا "کوئی پر بھڑ پھڑائے بھی تو اڑ کر کہاں جائے؟ کبھی تم نے بھی سوچا ہے؟"

اس کی آواز پھر بھرا گئی اور آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔

اور پرکاش چپ ہو گیا۔ لاجواب ہو گیا۔ ہنسی ہنسی میں اس نے پرکاش وتی کے دل کے درد کو پا لیا تھا۔ اسے ہمدردی بھی تھی لیکن یہ بھی خیال تھا کہ اگر پرکاش وتی چاہتی تو اپنی مرضی کا بر ڈھونڈ سکتی تھی یا ہے ماں باپ کو مجبور کر سکتی تھی۔ لیکن پرکاش وتی کے دو بے ساختہ فقروں نے اسے احساس دلا دیا کہ یہ خیال کتنا غلط تھا اور عملی طور پر کس قدر ناممکن اور کھوکھلی سماج کے قفس میں پر پھڑ پھڑانا بے سود ہے۔ اس سے بھی بہتر ہے کہ مرد ہلدی بیچے اور عورت ہلدی بیچنے والے کی وفادار بیوی بن کر برتن صاف کرے۔ اس نے پرکاش وتی کے آنسو پونچھ ڈالے اور پرکاش وتی نے اس سے کہا کہ اگر تم شادی میں نہ آتے تو شاید میں مر ہی جاتی۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ اس خوفناک شادی کے تمام مراحل سے ایک انجان اور شرمیلی دلہن کی طرح گذر جاؤں۔ اب تمہارے ہوتے ہوئے میری ہمت بندھ جائے گی۔

پرکاش نے کہا "تم تو جھوٹ بھی اس طرح بولتی ہو کہ بالکل سچ معلوم ہوتا ہے۔" پھر ہنس کر کہنے لگا "آخر ایک دکاندار کی بیوی ہو نا؟"

پرکاش وتی نے بھویں اوپر چڑھائیں اور کچھ کہنے کو ہی تھی کہ ایک دبلا پتلا سا لڑکا اندر کمرے میں داخل ہوا کہنے لگا "پرکاش جی کو سائیں جی کے پتاجی بلاتے ہیں"

پرکاش نے پوچھا "سائیں جی کون ہیں؟"

پرکاش وتی بولی "یہ لڑکا اپنے آپ کو سائیں جی کہتا ہے پاگل ہے اس کا باپ پٹواری ہے۔"

پرکاش نے پوچھا "سائیں جی کے پتاجی کہاں ہیں؟"

لڑکے نے کہا "باہر بیٹھک میں ہیر کے پاس بیٹھے ہیں۔"

پرکاش نے کہا "اچھا تو میں چلتا ہوں۔ اب تم بھی سہیلیوں میں بیٹھو ہنسو کھیلو آخر یہ شادی ہے تمہاری۔"

پرکاش وتی پاؤں کے انگوٹھے سے مٹی کریدنے لگی۔

باہر بیٹھک میں بہت سے آدمی بیٹھے ہوئے تھے اور ہیر نے پرکاش کا تعارف سب سے کرایا۔ چونی لال قصبے بھر میں ہاکی کا زبردست کھلاڑی اور ہیر کا لنگوٹیا دوست' لالہ سیتارام پٹواری' لمبا دبلا' پتلا ناک پر عینک اور عینک کے پیچھے دو ویسی ہی آنکھیں' ایسی آنکھیں جو اکثر پٹواریوں کے پاس نہیں ہوتیں۔ خوش رو' تیس برجیندر' ہیر کا بہنوئی جو ڈاک خانے میں ایک ممتاز عہدے پر ملازم تھا۔ ہر وقت ہنسنے والا بوٹا سنگھ قصبے کے سیٹھ کا لڑکا دھن سیال جس کا باپ بمبئی کے ایک زبردست تاجر کا منیم تھا اور رام لال' منگت رائے' پھیرو' رامو' ڈھیرو اور گاؤں کے وہ تمام معزز آدمی جن کے بغیر کوئی شادی کامیاب نہیں ہو سکتی' جن کی صورتیں منحوس ہوتی ہیں' کپڑے غلیظ اور داڑھیاں الجھی ہوئی' لیکن جن کا دل سونے کا ہوتا ہے اور ہاتھ لوہے کی طرح مضبوط' یہ وہ نیک دل فرشتے ہوتے ہیں جو تین چار سو آدمیوں کی بارات کو چٹکیوں میں بھگتا دیتے ہیں اور جب گھی میں کڑھیاں تلنے بیٹھتے ہیں تو گھنٹوں بغیر تھکے کی مدد کے' تلتے ہی رہتے ہیں اور جب کڑاہیاں مانجھنے پر آ جائیں تو بڑے بڑے جغادری جمعداروں کو مات کر دیتے ہیں۔ یہ آدمی غریب ہوتے ہیں لیکن شادی کے دنوں میں ان کی سماجی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے ان دنوں وہ چاچا' ماموں' تایا کے معزز القاب سے بلائے جاتے ہیں۔ شادی کے رسم و رواج سے یہ لوگ بہت واقف ہوتے ہیں اور جب عورتیں گھنٹوں جھگڑنے کے بعد بھی یہ فیصلہ نہ کر سکیں کہ جب دولہا آئے تو دروازے کی چوکھٹ پر سرسوں کا تیل ڈالنا چاہئے یا زعفرانی گھی تو چاچا پھیرو ایک دم پانی کے گلاس میں چند چاول اور زعفران کے تنکے ڈال کر اسے لنڈھا دیں گے۔ یہ لو۔ نہ تیل کا نقصان ہوا اور نہ گھی خراب ہوا اور رسم بھی پوری ہو گئی۔ انہی باتوں سے تو یہ لوگ شادی بیاہ کے دنوں میں پوجے جاتے ہیں۔

برجیندر نے جس سے ہیر کی بڑی بہن بیاہی ہوئی تھی' پرکاش سے پوچھا "آپ بھاپاجی' لاہور میں کیا کام کرتے ہیں؟"

بھاپاجی؟ پرکاش نے سوچا یہ صاحب مجھ سے کئی سال بڑے ہوں گے۔ لیکن پھر بھی مجھے بڑا بھائی کہہ کر پکارنے پر مصر ہیں اور ایک انہی پر کیا موقوف ہے...... اور پھر پرکاش کو وہ تمام واقعات اور وہ تمام شادیاں اور دیگر تقاریب یاد آئیں جہاں بہت سے نئے ملنے والوں نے اسے جھٹ بڑا بھائی بنا لیا تھا۔ شاید یہ اس کی گنجی چندیا کا اثر تھا یا اس کے چہرے کی کیفیت کا جس سے ادھیڑ پن ٹپکتا تھا۔ لیکن اس میں اس کا کیا قصور تھا۔ پرانے خیالات کی بدولت یہ گنجی چندیا تھی جس نے اسے قبل از وقت معمر کر دیا تھا۔ لیکن موجودہ زندگی بھی چنداں خوشگوار نہ تھی' کنبے کا پیٹ بھرنے اور روزی کمانے کے جھمیلوں نے اس کی روح کو کچل دیا تھا اور اور اس کے ضمیر اور اس کے اخلاق کو نیم مردہ کر دیا تھا۔ ہاں کبھی کبھی وہ سوئی ہوئی خلش بیدار ہو جاتی تھی اور وہ اس کی چبھن سے متاثر ہو کر اس کا جی چاہتا کہ وہ کپڑے پھاڑ کے نکل جائے اور چیخ چیخ کر قدرت اور سماج کے وحشیانہ

مظالم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرے۔ لیکن یہ طوفان ہمیشہ دل کی چار دیواری تک ہی محدود رہتا۔ اس کا اثر صرف اس کی اپنی ذات پر ہی تھا اور جس طرح طوفان ساحل کی دیوار کو توڑ پھوڑ ڈالتا ہے۔ اسی طرح اس کی اندرونی زندگی بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی تھی اس کی جوانی راکھ کا ایک ڈھیر اور روح ایک لتھڑی ہوئی لاش اس لئے اب جب کوئی اسے بھلا جی کہہ دیتا تو اسے چنداں حیرت نہ ہوتی اور وہ اپنے دل کی اُداسی کو اپنے لبوں کی مسکراہٹ میں چھپا لیتا اور اپنے مخاطب کی شوخ کلامی کی داد دیتا جس نے ایک لمحے میں اسے بڑا بھائی کہہ کے اپنے آپ کو جوان بنا لیا تھا۔

پرکاش نے کہا۔ "میں کوآپریٹو بنک میں کلرک ہوں۔"

"کیا تنخواہ ملتی ہے؟"

"پچھتر روپے!"

"پچھتر روپے؟" پٹواری نے کہا۔ "تب تو مزے میں ہیں آپ بھائی صاحب!"

"جی! آپ کی عنایت ہے۔"

بوٹا سنگھ ہنسنے لگا۔ گاؤں کے سیٹھ کا لڑکا ہر وقت ہنستا رہتا تھا۔ پرکاش کو اس کا ہنسنا بہت بُرا لگا۔ لیکن اس ہنسنے میں کوئی برائی نہ تھی۔ یہ زندگی اور بے فکری کا ایک مسلسل قہقہہ تھا جس میں پرکاش کی ریاتی نگاہوں کو طنز کے تیر و نشتر چھپے ہوئے نظر آئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بوٹا سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پٹواری جی! کوئی گیت سنایئے۔"

پرکاش نے پٹواری کی اداس آنکھوں سے پوچھا۔ "کیا تمہیں گیت بھی یاد ہیں؟"

پٹواری نے بوٹا سنگھ سے کہا۔ "بھئی اس وقت جی نہیں چاہتا۔"

پرکاش نے پٹواری کی اُداس آنکھوں کی اُداسی کو دیکھ کر کہا۔ "بیشک تمہیں گانا آتا ہے۔ تمہیں کئی گیت یاد ہوں گے، کئی گیت، جو تمہاری اُداسی نے خود بنائے، جو تمہارے دل کے تاروں سے نکلے اور جو کئی جنموں تک تمہاری رُوح کے ویرانے میں گونجتے رہیں گے، لیکن کیا ہوا تمہیں؟ یہ اُداسی تم نے کہاں سے پائی؟"

پٹواری نے جیسے پرکاش کے دل کی بات سُن لی، کہنے لگا۔ "بھئی آج تو جی نہیں چاہتا۔ سائیں کی حالت ہر روز بگڑ جاتی ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔"

چاچا پھیرو نے حقہ آگے کر کے کہا۔ "حقہ پیجئے لالا جی۔ ذرا دیکھئے اس وقت تو خوب چل رہا ہے۔"

پرکاش نے پوچھا۔ "لالہ جی! سائیں آپ کا لڑکا ہے؟ بڑا عجیب لڑکا ہے۔"

"عجیب؟" پٹواری نے آہستہ سے کہا۔ "وہ تو پاگل ہے جی، کیا بتاؤں اس پر اکثر جنون کی کیفیت طاری رہتی ہے اور اول جلول بکنے لگتا ہے، ہمارے ہاں مسلمان تو اسے فقیر سمجھتے ہیں اور اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو پتھر کی لکیر اور قصبے کی سب عورتیں سمجھتی ہیں کہ وہ کوئی بڑا عامل ہے اور ہر مرض کا علاج جانتا ہے اور یہ شیطان بھی جسے چنگی اٹھا کر دے دیتا ہے ایشور کی مرضی سے وہ بالکل بھلا چنگا ہو جاتا ہے۔"

"سچ مچ؟"

چھوٹی لال نے کہا۔ "ہاں میرا چھوٹا بھائی دس روز بخار میں مبتلا رہا۔ حکیم صاحب نے بہتیری کوشش کی، لیکن کوئی افاقہ نہ ہوا۔ یہ سائیں گلی میں کھیل رہا تھا میں اسے بلا لایا۔ اس نے دیکھتے ہی کہا۔ "بھائی اچھے ہو جائے گا۔ بھائی ٹھیک ہو جائے گا۔ بھائی ٹھیک ہو جائے گا۔ کوئی فکر نہیں۔ کوئی فکر نہیں" ــــــ اور دوسرے دن میرے چھوٹے بھائی کا بخار اتر گیا۔"

"[illegible]" پرکاش نے حیرانی سے کہا۔

"[illegible] مسلمانوں کے گھروں میں جا کر سب کچھ کھا پی آتا ہے۔ اسے ان باتوں کی بالکل تمیز نہیں۔ ڈپٹی صاحب اس سے بڑی محبت کرتے [illegible] صاحب کا لڑکا قتل ہونے کو تھا اس نے انہیں پہلے ہی بتا دیا تھا۔"

"[illegible]" پرکاش نے کہا۔

"[illegible] تین لڑکے تھے، وہ سب مر گئے۔ اب یہی بچہ میری آنکھوں کا نور ہے۔ اب میں کسی سے رشوت بھی نہیں لیتا۔ [illegible] بھگوان کو نہ جانے کیا منظور ہے۔ پچھلے سال اس کا ایک چھوٹا بھائی پیدا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں پہلے ہی

بتایا تھا کہ میرا بھائی آئے گا۔ پھر اس لڑکے کی پیدائش کے چند سال بعد اس نے ایک دن اپنی ماں سے کہا کہ آج میرے بھائی کی اچھی طرح حفاظت کرنا۔ اسے باہر لے نہ جانا ورنہ اسے کوٹھے پر لے جانا اس کی ماں نے سنی ان سنی کر دی۔"

دھن سیال نے بات پوری کرتے ہوئے کہا "ہاں اسی دن وہ چھوٹے لڑکے کوٹھوں پر گر کر مر گئے۔"

چودھری نے کہا "اور وہ چھوٹا بچہ بیمار ہوا تو ہم نے سائیں سے کئی بار پوچھا لیکن اس کم بخت نے زبان تک نہ کھولی۔ آخری رات وہ رات مجھے اچھی طرح یاد ہے سائیں کی ماں سو گئی تھی۔ چھوٹا بچہ بھی اس کی گود میں لیٹا سو رہا تھا سائیں بھی اپنی چھوٹی چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ اس رات مجھے نہ جانے کیوں نیند نہ آئی اور میں بستر پر پڑا بہت دیر تک گنگناتا رہا۔

بزارو کی ندا لاچا
مٹی نہ پھرول جو گیا
مٹی نہ ٹول جو گیا
تیرا لبھنا ئیں لال گواچا
مٹی نہ پھرول جو گیا

یکایک سائیں نے چیخ ماری اور اٹھ کر کہنے لگا "لے گئے، لے گئے میرے بھائی کو لے گئے۔" میں گھبرا کر بستر کی طرف گیا جہاں بچہ سویا پڑا تھا۔ ہاتھ لگا کر دیکھا۔ ہائے میرا بچہ مردہ اور بے جان اپنی ماں کی گود میں لیٹا ہوا تھا۔ ماں بے خبر سوئی پڑی تھی اور اس کے لال کو رات کے اندھیارے میں یمراج کے دوت اٹھا کر لے گئے تھے ......"

شام کے وقت بیر کا بہنوئی برجندر اور پرکاش بیاس کے کنارے سیر کرنے کو نکلے۔ ریتلے ٹیلوں پر کہیں کہیں کیر کے درخت اُگے ہوئے تھے اور ان سے نیچے اتر کر کھیل رہے تھے لیکن فصل کاٹی جا چکی تھی، اس لئے بالکل روکھے سوکھے دکھائی دے رہے تھے۔ دریا کے کنارے کہیں کہیں سرکنڈے اگ رہے تھے اور کہیں کہیں کڑوے کسے بیریاں، مرغابیوں کا ایک جھنڈ مغرب کی طرف پر پھیلائے جا رہا تھا۔ کنارے پر دو تین مچھوے بندھے ہوئے تھے۔ ہوا رکی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور فضا میں سناٹا تھا۔ کہیں کہیں کوئی پرندہ چیخ اٹھتا اور دریا کی سطح پر دور ایک کشتی چلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ پرکاش نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور حدِ نظر پر اس کی نگاہیں بڑھتے ہوئے اندھیرے میں مل گئیں۔ اس منظر میں کہیں بھی کوئی ایسا نقطہ نہ تھا جسے وہ دلکش یا جاذبِ نظر کہہ سکتا۔ ایک عجیب سی غمناکی ایک عجیب سی ویرانی تھی جسے محسوس کر کے اس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ پرکاش نے برجندر کی طرف دیکھا لیکن وہ خوش نصیب آدمی اپنے گرد و نواح کے ماحول سے بے خبر اور بے نیاز مزے سے داتن کئے جاتا تھا۔ داتن کرتے کرتے کہنے لگا۔ "بھائی صاحب آپ ذرا بیر کو سمجھائیں نا۔"

"کیوں، کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے کہ لڑکا یوں تو سمجھ دار ہے، کماؤ بھی ہے۔ لیکن روپے کی قدر نہیں کرتا۔"

"وہ کس طرح، میرے خیال میں تو ......"

برجندر نے بات کاٹ کر کہا۔ "آپ نہیں جانتے۔ اول تو وہ دوستوں کو بہت کھلاتا پلاتا ہے اور پھر اس شادی میں تو میں نے دیکھا ہے وہ اندھا دھند روپیہ خرچ کر رہا ہے۔ جہاں دو روپے میں کام ہو سکتا ہے وہاں یہ دس روپے خرچ کر دیتا ہے۔ بھلا اس طرح بھی کبھی گھر کے کام چلتے ہیں اور پھر جب سے یہ چین سے واپس آیا ہے ہر وقت گھر والوں کو جھڑکیاں دیتا رہتا ہے اور کسی بزرگ کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ یہ بات اچھی نہیں۔ کیا ہوا اگر وہ پانچ سو روپیہ مہینہ کما لیتا ہے۔ آخر اس کے ماں باپ ہی نے تو اسے پڑھایا ہے۔ اگر انہیں کا کہنا نہ مانے تو اس سے بڑھ کر احسان فراموش اور کون ہوگا۔"

"بے شک، بے شک!" پرکاش نے اپنی ناک کھجاتے ہوئے کہا۔

"اب شادی ہی کے معاملے ہی کو لیجئے۔ پرکاش وتی کی شادی نہیں بلکہ اس کی اپنی۔ اس کی ماں چاہتی ہے کہ وہ اب اس کی منگنی کر دے اور اس سال بیاہ بھی دے لیکن اسے دیکھو پہ مانتا ہی نہیں۔ لالہ بسا کھامل کے ہاں سے ناطہ ملتا ہے۔ لڑکی سیانی ہے، گھر کے کام کاج سے واقف، سوشیل سمجھ دار، سینا پرونا جانتی ہے، لکھا پڑھ لیتی ہے، ماں باپ، بھائی بہنیں کسی میں کوئی نقص نہیں شریف گھرانا ہے۔ کھتری گھر ہے۔ پرانا خاندان ہے۔

امیر آدمی ہیں۔"

"تو یہ مانتا کیوں نہیں؟"

"کہتا ہے لڑکی ٹھگنی ہے' سانولا رنگ ہے' آواز بھاری ہے' اور اپنی طرف نگاہ ہی نہیں۔ بڑے یوسف ثانی بنے پھرتے ہیں۔ کہتا ہے میں شہر کی لڑکی لاؤں گا جو دسویں پاس ہو اور شعر و شاعری سے مس رکھتی ہو۔ سینما کی تصویروں پر بات چیت کر سکے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کیا ہو گیا ہے۔ بڑا شریف لڑکا تھا۔ بے خبر نہیں کہ آج کل زمانہ کیسا ہے۔ شریف گھرانے بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ اب پرکاش وتی کو دیکھو۔ گیارھویں پاس کر کے بھی کیا بنا۔ تعلیم عورتوں کے کس کام کی۔ لڑکی تو وہی ہے جو گھر کا کام کاج اچھی طرح جانے۔ اب ہم اسے کسی بے کار گریجویٹ کے پلے باندھ دیتے تو بے چاری کی زندگی تلخ ہو جاتی۔ اس وقت تو اسے ان باتوں کی سمجھ نہیں۔ لیکن بعد میں ہمیں دعائیں دے گی۔ پرکاش وتی تو خیر ایک لڑکی ہے' وہ ہمارے کہے سے باہر نہیں جا سکتی لیکن اب بیر کو کون سمجھائے۔ میں نے سوچا بیر آپ کا کہا مانتا ہے آپ سے کہوں گا۔ آپ اسے سمجھا بجھا کر راہ راست پر لے آئیں تاکہ گھر برباد نہ ہو۔'

اور پرکاش نے کہا وہ اسے ضرور سمجھانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن یہ ایک ذرا مشکل سی بات ہو گی۔ کیونکہ شادی زندگی کا محور ہے اور پھر یہ بیر تو شنگھائی کے کابرے Cobret بھی دیکھ چکا ہے اور شاید اسے ترد ن وسطی کی قسم کی شادی پسند نہ آئے۔ لیکن برجندر نے کہا۔ 'نہیں۔ آپ ضرور کوشش کریں' میری خاطر ہی سہی۔" اور پرکاش نے کہا۔ "اچھا میں آپ کی خاطر سے ضرور کوشش کروں گا۔ لیکن مجھے امید بہت کم ہے۔' برجندر نے کہا۔ "جی نہیں۔ یہ آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ اگر چاہیں تو اسے سمجھا سکتے ہیں۔" بہت دیر تک اسی طرح بے معنی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ صرف برجندر دانتن کرتے کرتے کبھی زور سے تھوک دیتا۔ دریا کی سطح پر چلتی ہوئی کشتی اب بالکل کنارے کے قریب آ گئی تھی۔ اس میں چند کسان بیٹھے ہوئے تھے جو پورب کے رہنے والے معلوم ہوتے تھے۔ ان کے بچے اور بیویاں اور لڑکیاں بھی ساتھ تھیں۔ وہ نہایت خاموشی سے بیٹھے تھے۔ بچے سہمے ہوئے تھے عورتوں کے چہرے پژمردہ تھے اور کسانوں کی آنکھوں میں چمک نہ تھی اور ان کی نگاہوں کی اوٹ میں ناامیدی جھانک رہی تھی۔ پرکاش نے سوچا یہ میرا خیال ہی ہے' میں ہر جگہ اور ہر مقام پر یوں ہی غم کی تلاش کرتا رہتا ہوں۔ ورنہ دراصل یہ معمولی سے چہرے ہیں' عام کسانوں کے' ان کے دلوں میں طمانیت ہے' صبر ہے' یقین ہے' شاید یہ رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے کا دھوکا ہے کہ مجھے ان کی صورتوں میں یاس کی جھلک نظر آتی ہے۔ شاید یہ میرے ہی دل کا عکس ہے' روح کا پرتو ہے' شام کے سناٹے' پھیکی فضا اور سائیں سائیں کرتی ہوئی ہوا کا اثر ہے۔

کشتی سے اتر کر کسانوں اور ملاحوں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ ملاح اونچی اونچی آواز میں گالیاں دینے لگا۔ پرکاش اور برجندر اٹھ کر اس گروہ کے قریب جا پہنچے۔ برجندر نے پوچھا "کیوں جھگڑتے ہو بھئی؟ کیا بات ہے؟

ایک ملاح نے کہا۔ "شاہ جی! بات یہ ہے کہ ہم ان پوربیوں کو بیاس پار لائے ہیں۔ یہ دوسرے کنارے پر صبح سے بیٹھے تھے اور کوئی انہیں پار نہیں اتار تا تھا۔ کیونکہ یہ پیسے پورے نہیں دیتے تھے۔ کہنے لگے ہم حصار کے قحط کے مارے ہوئے غریب کسان ہیں۔ ہمارے ڈھور ڈنگر مر گئے ہیں۔ ہم پر دیا کرو۔ ہمیں بیاس پار کرادو۔ ہم نے کہا اچھا تو سب آدمی ایک ایک پیسہ دے دو۔ ہم تمہیں بیاس پار لے چلتے ہیں۔ اب یہاں آکر یہ کل پندرہ پیسے دیتے ہیں اور یہ آدمی ہیں پچیس ____ آپ خود گن لیجئے۔"

کسانوں نے کہا۔ "ہم غریب ہیں' ہم قحط کے مارے ہوئے ہیں' ہم پر دیا کرو۔"

بچے رونے لگے۔ عورتوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔"

ایک ملاح نے کہا۔ "اور ہم کہاں سے کھائیں؟ سارے دن میں بیاس پار کتنے آدمی اترتے ہیں؟ ان چند پیسوں میں مشکل سے گذارا ہوتا ہے۔ ہم نے تمہیں دو دو پیسے آدمی چھوڑ دیئے۔ اب تم ایک ایک پیسہ بھی نہیں دیتے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

پرکاش نے دس پیسے ملاح کی ہتھیلی پر رکھ دیئے۔

ایک بوڑھے کسان نے آبدیدہ ہو کر کہا۔ "بھگوان تمہارا بھلا کرے۔ یہ میرا کنبہ ہے۔ میں بھی کبھی مال مویشی والا تھا۔ میرا گھر پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ ابھی کل تک میری کھیتیاں لہلہاتی تھیں۔ میرے دوارے پر بھکاری بھیک مانگتے تھے۔ میری بہوئیں اور بیٹیاں آنگن میں گیت گاتی تھیں' آج وہ بین کر رہی ہیں۔ بھگوان! میں نے ایسی چتا کبھی نہ دیکھی نہ تھی۔ اب دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کہیں سر چھپانے کو جگہ

نہیں ملی۔ پیٹ بھر کھانے کو روٹی نہیں ___ ایسا قحط میں نے اپنی ساری عمر میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ بھگوان! یہ کن کھوٹے کرموں کی سزا ہے؟"

پرکاش نے کہا۔ "تم ایک دو آدمی ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمہیں آٹا دال اور سب کچھ دیں گے۔"

بوڑھا کسان بولا۔ "پرماتما تمہارا بھلا کرے۔"

ایک بوڑھی عورت بولی۔ "اری لجیا! جا سرکنڈے گھاس پھوس اور لکڑیاں اکٹھی کر لے۔ اری منوا! حلاف اور چٹائیاں مجھ سے اٹھا کر ادھر لے آ۔ ارے سادھو! وہ کم بخت کدھر بھاگ گیا تو ....."

لجیا اٹھی اور سرکنڈوں کے جھنڈ کی طرف چلی۔ وہ ایک سانولے رنگ کی جوان عورت تھی۔ پرکاش نے دیکھا اس کی چولی اور لہنگا جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا اور وہ چلتے چلتے اپنی جوانی کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ لیکن غریبی میں نہ تو غریبی ہی چھپتی ہے اور نہ جوانی......

دریا سے واپس آ کر پتہ چلا کہ دوسرے دن شام کو سری پور پہنچ جائے گی۔ لڑکے والوں کا نائی آیا تھا اور اب وہ ایک بڑی سی گلابی رنگ کی پگڑی باندھے آنگن میں لکڑی کے تخت پوش پر بیٹھا ہوا حقہ پی رہا تھا۔ اس خبر نے گھر والوں کو چونکا سا دیا 'برات آئے گی' یہ بھی سب جانتے تھے لیکن یہ جانتے ہوئے بھی دل میں ایک واہمہ سا تھا۔ لیکن اب یہ واہمہ دور ہو گیا اور اب اس کی جگہ ایک اضطراب' ایک عجیب قسم کی بے چینی اور عجلت نے لے لی۔ چاچا پھیرو جو قصبے میں حلوائی کی دکان کرتے تھے اور پینتالیس برس گذر جانے پر بھی مجرد تھے۔ دوڑتے ہوئے لاریوں کے اڈے پر گئے تاکہ کل کے لئے بٹالے سے برف منگوانے کا انتظام کریں۔ منگت رائے اور برجندر کو برات گھر میں صفائی کروانے' برات گھر سجانے اور براتیوں کے لئے چارپائیاں بچھوانے کا کام سپرد ہوا۔ گھر میں آئی ہوئی عورتوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور ساڑھیوں اور قمیضوں کے رنگ شوخ تر ہوتے گئے۔ بیر اپنے باپ کی چاندی کے دستے والی چھڑی لے کر ادھر اُدھر گھومنے اور مزدوروں کو چستی سے کام کرنے کی ہدایت کرنے لگا' بیٹھک میں اب صرف پرکاش' چونی لال اور بوٹا سنگھ رہ گئے۔ پرکاش کھڑکی سے ان عورتوں کی طرف دیکھنے لگا جو گھر کے بڑے دروازے سے اندر آ رہی تھیں یا باہر جا رہی تھیں۔ ریشمیں لباس' سرسراتی ہوئی قمیضیں جن پر سنہری پھول بوٹے بنائے گئے تھے۔ چنریاں جن پر مقیش کے لہریئے تھے' پھر کبھی کبھی ان میں کوئی خوبصورت چہرہ بھی نظر آ جاتا۔ یوں ہی قصباتی سا حسن' جس میں رعنائی اور موہنی کی بجائے جوانی اور الھڑپن کی آمیزش زیادہ ہوتی۔ یکایک چونی لال اور بوٹا سنگھ نے ایک ساتھ دبی سی چیخ ماری۔ سامنے دو لڑکیاں جا رہی تھیں۔ نینون کے بادامی دوپٹوں میں ان کی چوٹیاں کالی ناگنوں کی طرح بل کھائی ہوئی تھیں اور ایک کی گردن کے خم میں مددرا کے مندر لٹکے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ پرکاش کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اسے یہ خیال نہیں رہا تھا کہ کوئی اس کی بہنوں کو دیکھ کر خوشی سے چیخیں مار سکتا ہے۔ سوشیلا اور لیلا گلی میں چلتے چلتے ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ اب مخالف سمت سے دو اور نوجوان اور حسین لڑکیاں آ رہی تھیں۔ انہیں دیکھ کر بوٹا سنگھ کے منہ سے پھر بے اختیار ایک دبی سی چیخ نکل گئی۔ ان دونوں نوجوان لڑکیوں میں سے ایک تو وہی دوشیزہ تھی جس نے بیر کو اور پرکاش کو لسی پلائی تھی۔ پرکاش نے پوچھا۔ "وہ کون ہے؟"

"وہ کون؟" چونی لال نے پوچھا۔

"وہ جو آسمانی رنگ کی ساڑھی پہنے ہوئے شرما سی رہی ہے اور مسکرا بھی رہی ہے اور......"

چونی لال نے کہا۔ 'وہ! ...... وہ مس اوورسیئر ہے۔" اور یہ کہہ کر چونی لال اور بوٹا سنگھ دونوں ہنسنے لگے۔

"مس اوورسیئر؟"

"ہاں ہاں" بوٹا سنگھ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اس کا باپ نہر کے محکمے میں اوورسیئر ہے نا۔"

چونی لال نے بوٹا سنگھ کی طرف دیکھ کر رازدارانہ لہجے میں کہا۔ 'میں نے سنا ہے کہ اوورسیئر کی تبدیلی جالندھر ہو گئی ہے اور اب وہ دو تین دن میں یہاں سے چلے جائیں گے ......"

"سچ سچ؟"

"ہاں! مجھے آج ہی پتہ لگا ہے' ایک بڑے معتبر آدمی سے۔ لیکن یہ بات کسی کو بتانا نہیں۔ اگر اس نے سن لیا تو بس بے چارے پر قیامت گذر جائے گی۔"

"نہیں، نہیں .... آہ بے چارہ۔" اتنا کہہ کر بوٹا سنگھ ہنسنے لگا۔ چونی لال بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ پرکاش نے سوچا' یہ لڑکے کیسے بدمذاق اور بے تربیت ہیں' بالکل دیہاتی۔ وہ بیٹھک سے اٹھ کر گھر کے آنگن میں چلا گیا۔ آنگن میں دری بچھ گئی تھی۔ ایک دیوار کے ساتھ گیس لیمپ لگ گیا تھا اور کم سن لڑکیوں نے ابھی سے ڈھولک بجانی شروع کر رکھی تھی......

کتھے گیوں! پردیسیا دے!

ٹک' ٹک ٹک ٹک بجتی ہوئی ڈھولک پر ایک لڑکی پتھر کے ٹکڑے سے تال دے رہی تھی' پرکاش نے سوچا ان نادانوں کو پتہ نہیں کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔ پردیسی سے پیار کیوں؟ اس نے دیس دیس کے گیت سنے تھے۔ بلوریں چشموں کے کنارے نیلی آنکھوں والی چرواہنوں کے گیت' اور ڈرائنگ روم میں رکھے ہوئے گیت' جہاں گلدان میں لمبی لمبی ڈنڈیوں پر نرگس کے پھول جھکے ہوئے تھے۔ گیت جو دوپہر کی تپتی ہوئی اُداسی میں گائے گئے' جب فضا میں پیپل کے پتے کھڑ کھڑا رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ گیت..... ..... لیکن حیرانی کی بات تو یہ تھی کہ عورت کے ہر نغمے میں پردیسی کے لئے پیار موجود تھا۔ یہ پیار کبھی تو مدھم سُروں میں لرزنے لگتا' اور کبھی اس کی گویائی کی حس اتنی شدید ہو جاتی کہ وہ نغمے کے الجھاؤ میں ایک زخمی پرندے کی طرح چیخ اُٹھتا۔ لیکن پردیسی کے لئے اس قدر تڑپ کیوں؟ پرکاش نے پوچھا اور اسے خیال آیا کہ یہ نغمہ انسان کی فطرت کا نغمہ تھا۔ وہی نغمہ جس نے دور کی ہر شے کو پیارا بنا دیا تھا' جس نے بچپن میں اسے چاند کی طرف ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر دیا تھا اور بڑا ہونے پر اسے بے قرار کر دیا تھا کہ وہ جنگلوں' پہاڑوں اور میدانوں کی خاک چھانے اور قدرت کو اپنا ذرا بنائے۔ یہ وہی انسانی فطرت کا نغمہ تھا جو ابھی تک عورت کی مقدس روح میں بے قرار تھا' یہ اچھا ہے۔ پرکاش نے سوچا کہ غلام ہوتے ہوئے بھی عورت کے دل میں پردیسی کی چاہ موجود ہے کیونکہ عورت زمین کی طرح ہے وہ زندگی کی تخلیق کرتی ہے اور جس دن اس کے دل سے پردیسی کی چاہ اٹھ گئی' انسانیت بھی فنا ہو جائے گی .... ٹک ٹک ٹک ٹک لڑکیوں نے ایک نیا گیا شروع کر دیا تھا۔

او نہوں لکھنا!

اساں پردیسیاں نوں یاد رکھنا

پرکاش نے سوچا ان معصوم لڑکیوں کو پتہ نہیں کہ وہ کیا گا رہی ہیں۔ کسی پردیسی کو یاد رکھنے کے لئے ایک حساس اور دردمند دل چاہئے۔ جوانی کی بے قرار رُوح نسائیت اور شباب' اور اس کی نگاہوں میں پگڈنڈی پر چلتی ہوئی عورت کی تصویر کھنچ گئی' جس کے سر پر سرسوں کی سبز کونپلوں کا گٹھا تھا اور جس کی سبز قمیضوں پر نقرئی فیتہ چمک رہا تھا۔

اساں پردیسیاں نوں یاد رکھنا

ٹِک' ٹِک' ٹِک' پرکاش کو ایسا معلوم ہوا گویا کوئی اس کے بجتے ہوئے دل پر اسی پتھر کے ٹکڑے سے ضربیں لگا رہا تھا۔ ٹِک' ٹِک' ٹِک' ٹِک' اور وہ سیڑھیوں کی طرف دوسری منزل پر جانے کے لئے مڑا۔ سیڑھیوں کے درمیان اس نے بیر اور مس اوورسیئر کو دیکھا جو ایک دوسرے کے قریب کھڑے تھے۔ بیر کا چہرہ سفید تھا اور مس اوورسیئر کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ پرکاش جلد جلد زینے پر چڑھ گیا۔ بیر نے آہستہ سے کہا۔ بھائی جان! میں بھی اوپر آ رہا ہوں۔ ابھی....... دوسری منزل میں ایک بڑے کمرے میں بہت سی لڑکیاں پرکاش وتی کو گھیرے ہوئے تھیں۔ وہ دبے دبے قہقہوں اور میٹھی میٹھی سرگوشیوں کے ساتھ پرکاش وتی کو دولھا بھائی کی آمد کے قصے سُنا کر چھیڑ رہی تھیں اور اپنی دبی ہوئی جنسی خواہشوں کی ناکام تکمیل کر رہی تھیں۔ پرکاش چند کو کمرے میں آتے دیکھ کر ساری مجلس درہم برہم ہو گئی۔ کئی لڑکیاں کھلکھلا کر ہنستی ہوئی اور ہنسنے کے باوجود بھی شرماتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئیں۔ اوروں نے جرات سے کام لے کر اسے اپنے نسوانی مزاج کا نشانہ بنانا چاہا۔ اتنے میں بیر آ گیا اور آ کر ایک کونے میں پڑی ہوئی چارپائی پر چپ چاپ لیٹ گیا' اس کا چہرہ سپید اور ستا ہوا تھا اور اس کے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ شاید اسے ابھی غش آنے کو ہے۔ بہت سی لڑکیوں نے دیکھا اور اندازہ لگایا کہ کوئی غیر معمولی بات ہے اور وہ کمرے سے باہر چلی گئیں۔ پرکاش اور پرکاش وتی دونوں جلد جلد بیر کے پاس گئے۔ پرکاش وتی نے اپنا ہاتھ بیر کے ماتھے پر رکھا۔ کہنے لگی۔ "ماتھا گرم ہے۔"

پرکاش نے پوچھا "کیا بات ہے بیر؟"

ہیر نے رُکتے رُکتے کہا "اُف... کوئی بات نہیں۔ بس دم گھٹ رہا ہے۔"

پرکاش نے کہا "پانی پانی۔"

پرکاش وتی نے گھبرا کر کہا "پانی پانی۔"

باہر کی لڑکیوں نے چیخ کر کہا "پانی پانی۔"

سارے گھر میں کہرام مچ گیا۔ پانی پانی۔ ہیر کی ماں دوڑتی ہوئی اوپر آئی اور ایک چھوٹے سے گلاس میں پانی اور گلاب ملا کر لائی۔ ہیر نے آنکھیں کھولیں اور کہا میں اب اچھا ہوں۔ کوئی بات نہیں، لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ کوئی ہاتھ دبانے لگا۔ کسی نے ہاتھ پکڑ لئے۔ کسی نے پاؤں۔ کسی نے کہا کھڑکی بند کر دو، ہوا لگ نہ جائے۔ کسی نے کہا کھڑکی کھول دو، ہوا لگنے دو۔ ایک پھوپھی جان بولیں اسے دودھ میں گرم گھی ملا کر پلاؤ۔ چچا کی دوسری بیوی پھوپھی جان بولیں۔ "اے ہے کہاں ہے ہیر کی ماں؟ ہیر کی ماں!"

ہیر کی ماں بولیں۔ "میں تمہارے پاس ہی تو کھڑی ہوں۔"

"اچھا اچھا جا بھاگ کر نیچے سے بادام روغن لا۔"

ہیر کی ماں نچلی منزل سے بادام روغن لانے گئی تو کالا بھاگوتی اس کے پیچھے دوڑیں۔ "ار...... ار...... میں کہتی ہوں ہیر کی ماں اس کے ہاتھ پاؤں پھنک رہے ہیں۔ بازار سے کاسنی پھل منگواؤ۔ اُسکے پیروں پر اچھی طرح مالش کریں اور گرمی چھٹے۔ اسے گرمی ہے اور کچھ نہیں۔" ہیر لاکھ انکار کیا کہ اسے گرمی نہیں تھی محض دم گھٹا جا رہا تھا اور اب وہ بھی نہیں گھٹتا تھا۔ اب اسے آرام تھا لیکن کسی نے اس کی ایک نہ مانی اور اسے آرام سے لیٹے رہنے کو کہا۔ ناچار ہیر نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

کوئی آدھ گھنٹہ شور و غل کرنے ہیر کا سر سہلانے اور اس کے پاؤں اور ہاتھوں پر کاسنی پھل کی مالش کرنے کے بعد گھر کی عورتوں کی میں جان آئی اور وہ اسے چارپائی پر آرام سے سویا ہوا چھوڑ کر چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد فوراً ہیر نے آنکھیں کھول کر کہا:

"ہائے بھاپاجی!"

پرکاش چند نے مسکرا کر پوچھا "چین کیسا ملک ہے؟"

ہیر نے کہا "ہائے میں مر جاؤں گا اب کیا ہوگا ان کی تبدیلی ہو گئی ہے۔"

پرکاش چند نے کہا "سُنا ہے شنگھائی میں بہت دل پسند کابرے ہیں اور اینگلو چینی عورتیں......"

ہیر نے کہا "میں اس کے بغیر نہیں جی سکتا۔"

پرکاش نے کہا "اور چین کے لوگ چینی کے برتن بنانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔"

ہیر نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ "بھاپاجی۔ ہائے بھاپاجی۔ اگر تمہیں پتہ ہوتا۔ اگر تمہیں پتہ ہوتا......"

پرکاش نے کہا "مجھے سب پتہ ہے۔" اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

کمرے کے باہر سیڑھیوں کے قریب کونے میں اس نے ایک لڑکی دیکھی۔ اس نے آسمانی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ اس کی ناک سُرخ تھی اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی۔ پرکاش نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس لڑکی نے اپنا چہرہ ساڑھی کے پلو میں چھپا لیا اور دیوار سے لگی لگی سسکیاں لینے لگی۔

یکایک پرکاش نے سوچا۔ کل پرکاش وتی کی شادی ہے۔

شادی کی رات پرکاش پل بھر کے لئے بھی نہ سو سکا۔ اس نے ہیر کی ماں سے کہہ سن کر چارپائی دوسری منزل میں رکھوالی تھی تاکہ آرام سے سو سکے۔ ہیر کی ماں نے نہایت چاؤ سے پوچھا تھا "بیٹا شادی نہیں دیکھو گے؟" اور پرکاش نے ہیر کی ماں سے کہا کہ وہ دو تین بجے کے قریب جب پھیرے ہونے لگیں گے، اپنی چارپائی سے اٹھ کے نیچے آنگن میں چلا آئے گا۔ لیکن اسے تو دو تین بجے تک بھی کسی نے سونے نہ دیا۔ کوئی بجے کے قریب چھنّی لال، دھن سیال، بوٹا سنگھ ہنستے ہوئے اور آنگن میں پھرتی ہوئی عورتوں کو تاکتے ہوئے اوپر کی منزل میں آ گئے۔

چھنّی لال نے آتے ہی پرکاش سے کہا۔ "بھائی صاحب آپ نے بہت اچھا کیا کہ آج رات کے لئے چارپائی یہاں رکھوالی۔ اب یہاں سارا رات بیٹھ کر کھڑکی میں سے نیچے آنگن کا تماشہ۔

پرکاش نے ذرا منہ بنا کر کہا "میں سونا چاہتا ہوں۔"

بوٹا سنگھ ہنسے "لالہ جی سونے کے لئے آپ نے اچھی جگہ تلاش نہیں کی۔"

دھن سیال نے کہا۔ "آج ہمارے قصبے میں دو شادیاں ہوئیں۔ آج کا دن بہت مبارک ہے۔"

پرکاش نے پوچھا۔ "دوسری شادی کس کے ہاں ہوئی؟"

دھن سیال نے مسکرا کر کہا۔ "ارے آپ کو پتہ ہی نہیں؟...... ہاں بہت سے لوگوں کو ابھی پتہ نہیں اور آپ تو نو وارد ٹھہرے۔ کل جب پرکاش وتی کی ڈولی جائے گی تو آپ بھی شاید ڈولی جانے کے ایک دو دن بعد چلے جائیں گے۔ آپ کو ہمارے قصبے کی شادیوں سے کیا دلچسپی؟..... لیکن میرے خیال میں آپ کو بتا دینا چاہئے۔ یہ چاچا پھیرو کی شادی ہوئی ہے۔ چاچا پھیرو کو جانتے ہیں نا؟ دُبلے پتلے، لمبے قد کے آدمی، وہ اس دن بیٹھک میں حقہ پی رہے تھے۔ میلی سی مونچھیں، کھچڑی سی داڑھی، رخساروں پر پرچھائیاں۔"

"وہ جو بازار میں حلوائی کی دکان کرتے ہیں؟" پرکاش نے پوچھا۔

"ہاں ہاں، وہی جو مٹھائی بنانے کے علاوہ سوڈا واٹر بھی تیار کرتے ہیں اور تمباکو بھی بیچتے ہیں۔ بچارے مجرد تھے ابھی تک۔ عمر چالیس برس سے اوپر ہو گئی اور غریبی کی وجہ سے ہماری برادری میں کوئی انہیں رشتہ نہیں دیتا تھا۔

"یہ تو بہت اچھی خبر سنائی تم نے۔ چاچا پھیرو کی شادی، آج کا دن واقعی بہت مبارک ہے۔"

چونی لال، دھن سیال اور بوٹا سنگھ ایک ساتھ ہنس پڑے۔ "ہم ابھی چاچا پھیرو کو مبارک دے کر آ رہے ہیں۔ وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے داڑھی منڈوا دی ہے۔ اگرچہ مونچھیں بدستور میلی ہیں اور ہونٹوں کے کونوں میں گرتی ہیں۔ انہوں نے ہمیں تازہ مٹھائی کھلائی اور کہنے لگے۔ ابھی اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا اور ہمیں بھی تو اچانک ہی پتہ چل گیا۔"

پرکاش نے پوچھا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

چونی لال بولا۔ "ہم دریا پر گئے تھے جہاں حصار کے قحط زدہ لوگ ڈیرے ڈالے پڑے ہیں۔ وہاں بہت شور و غل تھا۔ بچے بلک رہے تھے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں رو رہی تھیں اور ایک بوڑھی عورت اپنے خاوند کو صلواتیں سنا رہی تھی۔ ہائے ری میری لڑیا، میری جوان اور سندر لڑیا، پتہ چلا کہ بوڑھے کسان نے دو سو روپے کے عوض لڑیا کو چاچا پھیرو کے حوالے کر دیا تھا۔ پیٹ بری بلا ہے اور اب وہ بے وقوف بوڑھی عورت اپنے خاوند کو کوس رہی ہے۔ گویا حصار کے قحط کا ذمہ دار اس کا خاوند ہے۔"

بوٹا سنگھ بولا۔ "چاچا پھیرو بہت خوش نظر آتے تھے۔ انہوں نے اپنی دکان میں مٹھائی کے تھالوں کے پیچھے ایک میلی سی چادر لٹکا دی ہے تاکہ پردہ رہے اور آنے جانے والوں کی نظر نہ پڑے۔"

دھن سیال نے کہا۔ "دیکھئے بھائی صاحب! اس کا ذکر کسی سے نہ کیجئے۔ چاچا پھیرو نے کہا ہے، اور اگر انہیں پتہ لگ گیا کہ ہم نے کسی آدمی کو یہ بات بتادی ہے تو پھر وہ ہم سے ساری عمر بات نہیں کریں گے اور نہ اپنی دکان سے ہمیں مٹھائی کھلائیں گے اور قصبے میں ان کے سوا یہاں کوئی دوسرا حلوائی بھی نہیں۔" یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ پھر چونی لال اور بوٹا سنگھ بھی اس کی ہنسی میں شریک ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد چونی لال نے کہا۔ "آؤ بھاپا جی، ذرا بارات گھر میں باراتیوں کے درشن کر لیں اور ان کے قیام و طعام کے متعلق انتظامات کی بھی دیکھ بھال کریں۔ بچارے کل یہاں سے رخصت ہو جائیں گے...... کہیں انہیں کہنے کا موقع نہ ملے کہ سری پور گئے تھے اور وہاں ان کی اچھی طرح خاطر مدارت نہیں ہوئی۔"

باراتیوں کو کھانا کھلا کر کوئی دو ڈھائی گھنٹے کے بعد پرکاش فارغ ہوا اور آتے ہی چارپائی پر دراز ہو گیا۔ لیکن نیند کہاں، آج شادی کی رات تھی، ابھی ابھی لوگوں نے دولہا کا منہ دیکھا تھا اور بیر کی ماں نے دونوں ہاتھوں سے اس کی بلائیں لی تھیں، "سر وارنا" کیا تھا اور چاندی کی چونیاں پھینکی تھیں۔ عورتوں نے سہاگ کے گیت گائے تھے اور کنواری لڑکیوں کی چھاتیاں زور زور سے دھڑکنے لگی تھیں۔ دولہا کا چہرہ پرکاش نے دیکھا تھا، بالکل ہلدی کی گانٹھ کی طرح تھا، وہی زردی، وہی تلخی، وہی سختی اور سہرے کے زریں تار اور چمپا کی کلیاں بھی اس کے رنگ روپ میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی تھیں۔ اس کے ساتھ اس کا بڑا بھائی بھی آیا تھا۔ اس کی ناک چپٹی تھی،

ہوجانے سے اور رخساروں کی ہڈیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں روپوں سے بھری ہوئی لال کپڑے کی ایک تھیلی تھی جسے لے کر وہ ادھر ادھر اس طرح گھوم رہا تھا جیسے وہ اس سارے قصبے کا مالک ہو۔ اس کے ساتھ اس کا باپ بھی تھا۔ اس کی آنکھوں میں وہی چالاکی اور ذہانت تھا جس کی بدولت وہ ہلدی بیچتے بیچتے لکھ پتی بن گیا تھا۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے رشتہ دار تھے جن کے چلیے ایک دوسرے سے بہت ملتے تھے۔ کیونکہ ہلدی کی جڑ تو آخر ایک ہی ہوتی ہے گو شکلیں چاہے کتنی ہی جنتی چلی جائیں...... "ملنی" کی رسم کے وقت لڑکی والے اور لڑکے والے آپس میں بھینچ بھینچ کر گلے ملے تھے۔ چاندی کے گلاب دانوں میں پڑا ہوا عطر پانی ایک دوسرے پر چھڑکا گیا تھا۔ ڈھولوں، بھانڈوں اور میراسیوں نے بدھائی کے ترانے گائے تھے اور گداگروں کے جم غفیر نے گلی کے دونوں طرف ناکہ بندی کر لی تھی تاکہ جب فریقین کی طرف سے تانبے کے پیسے نچھاور کیے جائیں تو گلی کی سرخ اینٹوں پر، پیٹ رگڑ رگڑ کر اور گندی موریوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر انہیں لوٹا جا سکے۔ پیسوں کے نچھاور ہوتے ہی چھوٹے بڑے گداگر سب ایک دوسرے پر پل پڑے تھے اور وہ فقیرنی جس کی چھاتیوں سے ایک سوکھا ہوا بچہ لٹک رہا تھا اور وہ بوڑھی بھکارن جس کے بال بڑ کی شاخوں کی طرح تھے۔ ایک پیسے کے لئے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئی تھیں۔ لڑکا چلانے لگا تھا اور میراسی بدھائی کے گیت گا رہے تھے۔ کیا یہ شادی کی بدھائی تھی؟ یا سماج کے جنازے کا نوحہ یا کسی نے اپنے گھر کو آگ لگائی تھی اور اب بھڑکتے ہوئے شعلوں کو دیکھ کر خوشی سے ناچ رہا تھا... کوئی پرکاش کے قریب بستر پر بیٹھ گیا۔ پرکاش چونک پڑا۔ یہ پرکاش وتی تھی۔ وہ چاپ چاپ آ کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور وہ دونوں نیچے آنگن میں کام کرتی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھنے لگے۔ آنگن کے بیچ میں کاٹھ کی بیدی کھڑی کی گئی تھی۔ درمیان میں ہون کنڈ تھا۔ کاٹھ کی بیدی مندر کی طرح بنائی گئی۔ ایک چھ پہلو کی عمارت جو اوپر اٹھ کر ایک تکون کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ اسے پھولوں، کیلے کے پتوں اور زریں تاروں سے سجایا گیا تھا۔ بیدی کی چوٹی پر لکڑی کے سبز رنگ کے طوطے سے لگائے گئے تھے اور آنگن کی دیواروں پر ریشم سے کاڑھی ہوئی سرخ پھلکاریاں لٹکائی گئی تھیں۔ ان پر آدم کے قطعے اور گاتیری اور دیگر متبرک منتر کاڑھے ہوئے تھے۔ آنگن کے آر پار جھنڈیاں لگائی گئی تھیں اور فرش پر لکیروں والی دریاں بچھائی گئی تھیں۔ پرکاش نے پرکاش وتی سے کہا۔ "آج تمہارا بیاہ ہے، دیکھو بیدی کتنی خوبصورت بنائی گئی ہے۔ بالکل مندر سے ملتی جلتی ہے، لیکن پجاری ابھی نہیں آئے اور اب جب پجاری آ جائیں گے تو تمہیں نئے کپڑے پہن کر ایک دیوداسی کی طرح اپنے مندر کے دیوتا کو رجھانے کے لئے ناچنا ہوگا، اور تم تو بہت اچھا ناچ سکتی ہو، کیوں؟"

پرکاش وتی نے نمناک لہجے میں کہا۔ "نہیں۔ میں آج ذبح کی جاؤں گی..... خبر نہیں، پڑھا کر سکھا کر ہر طرح کے عیش و آرام دے کر ہمیں ماں باپ کیوں ذبح کر ڈالتے ہیں۔ شاید یہ بھی ایک رسم ہو گی۔ لیکن میں سوچتی ہوں کیا مجھے اسی لئے مہاودیالیہ میں داخل کرایا تھا ...... میرا جی بھرا ہوا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ چیخیں مار مار کر روؤں...... مجھے تم سے ہمدردی کی امید تھی اور تم ہو کہ جب سے آئے ہو ہر وقت جی جلاتے رہتے ہو۔"

پرکاش نے کہا، "بہن پرکاش وتی جی! جی جلانے کو تو ساری عمر پڑی ہے۔ اب اگر ہنس کر بھی تم نے اپنے غم کو نہ چھپایا تو تمہاری شاعری کس کام کی؟"

"بھاڑ میں جائے شاعری۔" پرکاش وتی نے جھلا کر کہا۔

"وہ تو اب خود بخود چلی جائے گی۔"

پرکاش نے پرکاش وتی کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا اور پھر اس کی ہتھیلی پر انگلی رکھ کر بولا۔ "تمہاری قسمت یہاں لکھی ہے۔ دیکھو یہ لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تم بہت لمبے عرصے تک جیو گی۔ تمہارے دس بچے ہوں گے اور ایک موٹر کار۔ یہ لکیر تمہاری شاعری کی تھی لیکن یہاں آ کر شاعری کا آبگینہ ہلدی کی ایک گانٹھ سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔ یہ لکیر ظاہر کرتی ہے کہ تمہارے خاوند

کو تم سے بہت محبت ہوگی۔ یوں بھی تو یہ محبت دس بچوں سے صاف ظاہر ہے لیکن ان کے علاوہ وہ تمہیں ہر سال سونے کے زیور اور ریشمیں کپڑوں کے بھاری بھر کم جوڑے سلوا دیا کرے گا۔ شادی کے پانچ سال بعد تم اتنی موٹی ہو جاؤگی کہ خود تمہاری ماں بھی تمہیں پہچان نہیں سکے گی اور ...."

پرکاش وتی نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے جلدی سے کہا۔ "ہٹو بھی۔ ہر وقت بے ہودہ مذاق۔ شرم نہیں آتی تمہیں؟"

پرکاش نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے تیر نشانے پر بیٹھا ہے۔ میں جانتا تھا کہ عورت ایک ہلدی بیچنے والے سے شادی کر کے خوش رہ سکتی ہے اپنے موٹاپے کا ذکر سن کر خائف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

یہ آخری رتجگا تھا۔ بیاہ کی رسمیں دو بجے کے بعد ادا کی جانی تھیں اس لئے قصبے کی سب عورتیں اپنے بہترین لباس اور زیور پہن کر آئی تھیں۔ ڈھولک پر اتنے زور سے ہاتھ پڑ تا تھا کہ پرکاش کو اس کی دھب دھب سمع خراش معلوم ہونے لگی۔ ہر ایک عورت اپنے گلے کی پوری قوت سے گا رہی تھی۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بیچ میں زور سے چلا اٹھتے تھے 'نائنیں شربت پلاتی جاتی تھیں اور دوسری منزل پر پرکاش کے پاس قصبے کے بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکی والوں کے رشتہ دار اکٹھے ہو گئے تھے اور کھڑکیوں میں سے جھانک جھانک کر رتجگے کا نظارہ کر رہے تھے۔ کئی لمبی لمبی داڑھیوں والے بزرگ بھی آگئے تھے جو حقہ پیتے' بار بار کھانستے اور نوجوانوں کو شرافت کی تلقین کرتے ہوئے اپنی آنکھیں سینکتے جاتے تھے۔ پرکاش نے ان کی آنکھوں میں دبی ہوئی حسرتیں دیکھیں جو اب اپنی قبروں سے باہر جھانک رہی تھیں جنہوں نے آج تک زندگی کو گناہ سمجھا تھا اور اسے ہر جگہ اور ہر مقام پر اپنی روح کی پوری قوت سے دبانے کی کوشش کی تھی۔ ان سے آج زندگی انتقام لے رہی تھی۔ کیونکہ جس مر چکی تھی لیکن حرص تیز ہو گئی تھی اور حقہ پینے والے بزرگ اب اس راکھ کے ڈھیر کو کرید رہے تھے جہاں زندگی کی ایک چنگاری بھی باقی نہ رہی تھی ___ شاید اگر بات یہیں تک رہ جاتی تو پرکاش کو چنداں افسوق نہ ہوتا۔ لیکن اسے تو رہ رہ کر غصہ آرہا تھا ان سفید داڑھیوں والے بزرگوں پر' جن کی جوانیاں مدت سے راکھ ہو چکی تھیں اور جو اب دوسروں کی جوانیاں راکھ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ جنہوں نے اپنی جنسی آلودگیوں پر شرافت کا پردہ ڈال لیا تھا' اور اب سب اس جھوٹی شرافت کے بل بوتے پر اپنے جوان لڑکوں اور پوتوں سے کھوئے ہوئے لمحوں کا انتقام لے رہے تھے' پرکاش نے سوچا کیسی بے انصافی ہے' ہم لوگ بچپن ہی میں بوڑھے کر دئے جاتے ہیں۔ ساری زندگی روتے گذرتی ہے اور پھر روتی ہوئے روتے ہوئے چہرے لے کر مرگھٹ کی نذر ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس وقت آنگن میں تو لڑکیاں خوب زور زور سے گا رہی تھیں اور قہقہے لگا رہی تھیں۔ پرکاش کو یہ ڈر تھا کہ ابھی کوئی بزرگ صورت آدمی کھڑکی میں سے جھانک کر کہہ دے گا۔ "لڑکیو! اتنا غل کیوں مچا رکھا ہے؟" رتجگے کی سب رونق ماند پڑ جائے گی اور چلاتے ہوئے گلے اس طرح خاموش ہو کر رہ جائیں گے جیسے موت کے سرد اور برفیلے ہاتھ نے انہیں زور سے گھونٹ دیا ہو۔ بے چاری عورتوں کو تو آج ہی مدت کے بعد اپنے دبے ہوئے ارمانوں کو ذرا ڈھیل دینے کا موقع ملا تھا۔ وہ اس وقت فحش' لچر اور بازاری گیت گا کر بہت مسرور ہو رہی تھیں۔ گیت کیا تھے سیدھی سادی جنسی گالیاں تھیں جن میں ماں باپ' بہنوں بھائیوں' بہوؤں اور آشناؤں کے جائز اور ناجائز تعلقات کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا تھا۔ وہ عورتیں جنہیں پرکاش شرم و حیا کی پتلیاں سمجھتا تھا اب سب سے اونچی آواز میں سب سے گندے گیت گا رہی تھیں اور ان کے ننگے سر اور لہراتی ہوئی چوٹیاں دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ لیکن ایسے موقعے تو بہت کم آتے ہیں۔ کبھی کبھی ہی تو کوئی شادی ہوتی ہے ورنہ کئی سال گذر جاتے ہیں اور ان عورتوں پر شرم و حیا کا جھوٹا ملمع چڑھا رہتا ہے اور پھر جب وہ بوڑھی مائیں [illegible] ساسیں بن جاتی ہیں تو اپنا سارا غصہ اپنی لڑکیوں اور بہوؤں پر اتارتی ہیں۔ یہ کرو' وہ نہ کرو۔ وہ کرو' یہ نہ کرو اور اس طرح اندھی سماج [illegible] زندگی کی منزل سے گذر جاتا ہے۔ برجندر بڑے انہماک سے کھڑکی سے نیچے دیکھ رہا تھا کہ ایک شوخ لڑکی نے اس کی طرف دیکھ کر کہا

[illegible] میری ماں

[illegible]

ہائے دے اک سنیاسی
ہائے دے اک سنیاسی
دھب دھب دھب دھب

اور بہت سی لڑکیاں اس کی طرف دیکھ کر قہقہے لگانے لگیں اور برجندر شرما کے پیچھے ہٹ گیا۔ ایک بوڑھے بزرگ نے اسے ڈانٹ پلائی 'تم کھڑکی میں کیوں کھڑے تھے۔ اگر گیت سننے کا اتنا ہی شوق ہے تو ادھر چارپائی پر بیٹھ کر آرام سے سنو۔ یہ بھی کیا ڈھنگ ہے اور پرکاش نے سوچا کہ یہ بھی کیا ڈھنگ ہے کہ برجندر کی ماسی کو لے جائے اک سنیاسی 'آخر ایک سنیاسی کیوں؟' ایک سنار یا چمار کیوں نہیں؟ اور پھر اسے خیال آیا کہ ہندوستانی سماج میں سنیاسی اور فقیر لوگ خاص عزت کے مالک ہیں۔ خدا کے یہ لاکھوں بندے کھاتے پیتے لوگوں سے بھیک مانگ کر ان کے ضمیر کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ عمل اور جوتش سے ان کے مستقبل کو روشن اور دلکش بناتے ہیں' کایا کلپ کرتے ہیں' مکتی دلاتے ہیں اور اولاد سے محروم بیویوں کو بچے عطا کرتے ہیں۔ مبارک ہیں ان کی زندگیاں اور محبت سے لبریز ہیں ان کی روحیں۔ اس لئے ماسی کا "سنیاسی" کے ساتھ بھاگ جانا چنداں تعجب خیز نہ تھا۔ ان فحش گیتوں میں عورتوں کی مسرور نگاہوں میں پرکاش کو اپنے تمدن کی ننگی رُوح جھلکتی ہوئی نظر آئی۔ جس چیز کو ہر بڑے اور چھوٹے فرد نے گناہ کہہ کر دل کے نہاں خانے میں چھپا دیا تھا آج وہی گناہ اُبل کر گانے والیوں کی آنکھوں میں جھلک رہا تھا اور ڈھولک کی تال اور باریک آوازوں کی لرزتی ہوئی لے میں ظاہر ہو رہا تھا' اور دوسری منزل پر یہ چیزیں ایسے ایسے بزرگ بھی سن رہے تھے جن کی طویل زندگی کا شاہکار یہ تھا کہ انہوں نے عمر بھر اپنی بیوی اور ماں کے علاوہ اور کسی عورت سے ہنس کر بات بھی نہیں کی تھی۔ اسی لئے تو ایک معصوم شاعرہ بادی کی ایک گانٹھ کے عوض بیچ دی گئی تھی اور کھیتوں کی کھلی فضاؤں میں پلی ہوئی سندر لڑکیاں باسی پکوڑوں اور مٹھائیوں کی دکان پر ایک سرسراتے ہوئے میلے پردے کی پیچھے قید کر دی گئی تھی۔ زندگی غیر محدود تھی' عشق تازہ اور شباب زندہ تھا لیکن تمدن بوڑھا اور عقل فرسودہ ہو چکی تھی اور سماج کے نیلام گھر میں اب بھی عورتوں کو کھلے بندوں بیچا جاتا تھا۔ البتہ قانوناً غلامی ممنوع تھی۔ پرکاش نے دل میں کہا اور وہ ایسی باتیں سوچتا سوچتا پاگل ہو جائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ وہ سو جانے کی کوشش کرے' آنکھیں موند لے' اپنے پپوٹوں کو نیند سے بوجھل بنائے اور سرہانے پر سر ٹیک کر سو جائے۔ اب گیت ہلکے ہو رہے تھے ... دولھا بھائی سہرا باندھے ہوئے تشریف سے لے آئے تھے... ... پرکاش وتی اور دولھا ہون کنڈ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پنڈت مقدس منتر پڑھ رہے تھے۔ شعلے تھی کا عطر چکھ کر بلند ہوتے جاتے تھے....... پنڈت زور زور سے منتر پڑھ رہا تھا.. پرکاش وتی اور دولھا خوشنما اور سبک بیدی کے ارد گرد گھوم رہے تھے۔ ایک.....دو. تین...چار....پانچ...چھ. سات ..

منزل

جب پرکاش چند نے آنکھ کھولی تو ابھی اندھیرا تھا۔ اگرچہ مشرقی افق پر روشنی کی ایک دھندلی سی لکیر آ گئی تھی لیکن آسمان پر ستارے ابھی تک بکھرے ہوئے تھے۔ نیچے آنگن کے فرش پر بیدی کے ارد گرد بہت سی عورتیں سوئی ہوئی تھیں۔ ہون کنڈ میں آگ بجھ گئی تھی اور بیدی پر لٹکے ہوئے کیلے کے پتے مُرجھا گئے تھے۔ پرکاش نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کے ارد گرد چارپائیوں پر گھر کے بہت سے لوگ سوئے ہوئے تھے۔ سوشیلا اور لیلا ڈھولک بجاتے بجاتے تھک کر چور ہو گئی تھیں۔ بیر کا چہرہ افسردہ تھا اور لب کھلے اور اس سے پرے پرکاش وتی ایک چمکیلی ساڑھی پہنے سو رہی تھی۔ اس کا ایک بازو چارپائی سے نیچے لٹک رہا تھا اور اسی بازو میں ہاتھی دانت کا سیندوری چوڑا چڑھا تھا۔ ماتھے پر سُرخ بندی۔ اسے اس کے لب مسکراتے ہوئے معلوم ہوئے۔ پرکاش نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ ہاں وہ اب تک مسکرا رہی تھی۔ نئی سہاگن جو لکڑی کی بیدی پر اپنا کنوارپن لٹا چکی تھی اب بھی خواب مسکرا رہی تھی۔ پرکاش اس مسکراہٹ کی طنز کی تاب نہ لا سکا۔

وہ آہستہ سے بستر پر سے اٹھ بیٹھا۔ وہ کسی کو جگانا نہ چاہتا تھا۔ وہ ہولے ہولے سیڑھیوں سے نیچے اُتر گیا۔ آنگن کے فرش پر وہ نہایت احتیاط سے گذرا۔ اس کے چاروں طرف لڑکے' لڑکیوں اور عورتوں کے جسم پڑے تھے۔ کسی کے بازو ننگے' کسی کی چھاتیاں' کسی کے بالوں کی لٹیں کھلے ہوئے ہونٹوں کے کناروں پر۔ کسی کی ٹانگیں سکڑی ہوئیں' کسی کی پھیلی ہوئیں' کسی کی سانس میں خراٹے

تھے...... کسی کی آنکھیں نیم وا......ان کے درمیان میں بیدی تھی۔ لیکن سنہری تار اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے' کیلے کے پتے مرجھا گئے تھے اور ہون کنڈ کی آگ بجھ گئی تھی' شعلوں نے قربانی لے لی تھی اور اب خاموش تھے۔ زندہ انسان کھانے والوں نے ایک زندہ روح کو نگل لیا تھا اور اب مدہوش تھے۔ پرکاش نے آہستہ سے دروازے کے کواڑ کھولے اور باہر چلا گیا۔

وہ قصبے سے باہر کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ آسمان پر ستارے بکھرے ہوئے تھے اور فرش زمین پر شبنم کے لاکھوں قطرے بیدار ہو رہے تھے۔ گم ہوتے ہوئے اندھیرے کی خنکی میں ایک عجیب سی تازگی تھی اور جاگتی ہوئی سحر کے نور میں ایک نیا حُسن' کیکر اور شیشم کے تنوں پر دکھائی دینے والے بینے ابھی تک چیں چیں کیے جاتے تھے اور کوئی نامعلوم پرندہ کو ہو' کو ہو رٹ رہا تھا۔ بیر کی جھاڑیوں پر گھاس کے ٹڈے ابھی تک سوئے پڑے تھے اور پتوں کے درمیان گول گول بیروں سے شبنم کے موتی اس طرح لگے ہوئے تھے گویا مدراکے مندر لٹکے ہوئے ہوں۔ زمین جیسے لمبے لمبے سانس لے کر بیدار ہو رہی تھی۔ کھیتوں کے کناروں پر اگی ہوئی گھاس میں ہزاروں نیلے نیلے پھول اپنی آنکھیں کھولنے لگے۔ پھر دور کہیں اس نے رہٹ کے چلنے کی ردل ردل سنی اور پورب میں حدِ افق پر روشنی کی لکیر بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔

وہ کھیتوں میں دوڑتا ہوا چلا گیا' اس کے پائجامے کے پائنچے اور پاؤں میں پہنے ہوئے چپل شبنم میں دھوئے گئے۔ لیکن وہ دوڑتا ہی گیا۔ تا۔یکی کم ہوتی گئی اور اس نے اپنے نتھنوں میں وہ عجیب سی خوشبو محسوس کی جس سے مشرق کی ہوا بوجھل تھی۔ آج اس نے پہلی مرتبہ صبح کو جاگتے دیکھا تھا ورنہ شہر میں رہتے ہوئے تو اس کی آنکھ اس وقت کھلتی تھی جب دھوپ کا پیالہ پر تو کھڑکی کے شیشے سے نکل کر اس کے چہرے پر آجاتا تھا۔ لیکن آج وہ ایک غیر مرئی ہستی سے تعارف حاصل کر رہا تھا اور جب پورب کی ہوا اس کے چہرے پر گذرنے لگی تو اس نے اپنی آنکھوں اور اپنے رخساروں پر صبح کی رانی کی نازک انگلیوں کے لمس کو محسوس کیا' اس کے عطر بیز بالوں کی خوشبو کو سونگھا اور اپنے ہونٹوں پر اس کے شبنمی لبوں کی حلاوت کا مزا چکھا اور خوشی سے بھرپور دوڑتا چلا گیا۔

زمین اسے اپنے پاس بلا رہی تھی۔ میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر مٹی کی سوندھی' لطیف اور پاکیزہ خوشبو ایک ہلکے کہرے کی طرح چھائی تھی۔ آہستہ آہستہ درختوں کے تنوں پر ٹلے اور گلہریوں کی دمیں سرکنے لگیں اور کھیت کے کناروں کی اوٹ میں چھپے ہوئے خرگوش بھاگنے لگے' دور ایک اونچی مینڈھ پر ایک مورنی کھڑی تھی اور مور اپنے دلکش پروں کے چھتر کو پھیلائے اس کے سامنے ناچ رہا تھا۔ ساری کائنات نغمہ ریز تھی اور زمین اپنے محور پر گھومتی ہوئی ناچ رہی تھی! اس دلکش' دلفریب اور ابدی رقص کے سامنے انسانی زندگیاں' اس کی مسرتیں اور غم کس قدر ہیچ تھے۔ ان کا منبع نامعلوم اور ان کی منزل ناپید... مور کے چھتر پر مختلف رنگوں کی نازک جھلکیاں بدلتی جاتی تھیں۔ ارغوانی..... آسمانی.....دھانی' خوشیاں..... غم... زندگیاں..... پرکاش نے سوچا یہ زمین ناچتی جائے گی' یہاں تک کہ انسانی زندگی' اس کی تہذیب' تمدن' اس کے دعاوی باطل راکھ کا ڈھیر ہو جائیں گے۔ زمین چاند کی طرح خاموش اور مغرور ہو جائے گی لیکن پھر بھی یہ زمین ناچتی رہے گی..... ہم کس قدر حقیر ہیں۔ پرکاش نے سوچا' بیر کی پتیوں پر سوئے ہوئے ٹڈوں کی طرح..... یکایک کیکر کے ایک درخت کی چوٹی پر بیٹھا ہوا کوا چیخ اٹھا اور ساری کائنات میں اُجالا ہی اُجالا ہو گیا۔ زمین کا رقص رُک گیا——بینے کی چیں چیں بند ہو گئی۔ مور اور مورنی مغرب میں آموں کے جھنڈ کی طرف پرواز کر گئے اور پرکاش کھیتوں میں دوڑتا دوڑتا رُک گیا اور کہنے لگا۔ ہائے وہ صبح کی رانی کہاں گئی؟..... وہ رانی جو گم ہوتے ہوئے اندھیرے کے نازک سایوں میں شبنم کے موتی چمکاتی ہوئی آئی تھی اور بڑھتے ہوئے نور سے شرما کر پھر اسی تاریکی میں گم ہو گئی ...... ہائے وہ صبح کی رانی! وہ بہت دیر تک ایک رہٹ پر نہاتا رہا۔ اس کی روح ہلکی ہو گئی تھی اور دل و دماغ ہر قسم کے خیالات سے گریزاں۔ آم کے درختوں پر چھوٹی چھوٹی سبز کیریاں لٹک رہی تھیں اور ہرے بھرے طوطے ٹیں ٹیں کر رہے تھے۔ بیلوں کے پیچھے بیٹھا ہوا کسان ایک کھلونا معلوم ہو رہا تھا اور بیل رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے تھے..... رُوں..... رُوں..... رُوں' اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے جسم کے ہر ذرے سے آواز نکل رہی ہے..... رُوں..... رُوں..... رُوں..... اس بے مطلب اور بے معنی صدا میں اسے ایک نامعلوم سی مسرت محسوس ہونے لگی اور وہ آنکھیں بند کر کے نہاتا گیا اور اسے سنتا گیا..... رُوں..... رُوں..... رُوں..... بے مطلب' بے معنی..... منبع نامعلوم..... اب وہ آنکھیں بند کیے ہوئے بھی بیلوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے اس کسان کو دیکھ رہا تھا جو کھلونے کی طرح معلوم ہو رہا تھا اور بیل جو رہٹ کے محور کے گرد گھومتے جاتے تھے..... رُوں..... رُوں..... رُوں.....

نیا قانون

سعادت حسن منٹو

منگو کوچوان اپنے اڈّے میں بہت عقلمند آدمی سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی اسکول کا منہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈّے کے وہ تمام کوچوان جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دُنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ اُستاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب اُستاد منگو نے اپنی ایک سواری سے اسپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اُس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبّرانہ انداز میں پیش گوئی کی تھی "دیکھ لینا چودھری، تھوڑے ہی دنوں میں اسپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔"

اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا تھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو اُستاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا "ولایت میں اور کہاں؟"

اسپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتہ چل گیا تو اسٹیشن کے اڈّے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حقہ پی رہے تھے دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلہ خیال کر رہا تھا۔

اس روز شام کے قریب جب وہ اڈّے میں آیا تو اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتمایا ہوا تھا۔ حقے کا دور چلتے چلتے جب ہندو مسلم فساد کی بات چھڑی تو استاد منگو نے سر پر سے خاکی پگڑی اتاری اور بغل میں داب کر بڑے مفکرانہ لہجے میں کہا ____

"یہ کسی پیر کی بددعا کا نتیجہ ہے کہ آئے دن ہندوؤں اور مسلمانوں میں چاقو چھریاں چلتے رہتے ہیں اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ اکبر بادشاہ نے کسی درویش کا دل دکھایا تھا اور اس درویش نے جل کر یہ بددعا دی تھی 'جا تیرے ہندوستان میں ہمیشہ فساد ہی ہوتے رہیں گے ____ اور دیکھ لو جب سے اکبر بادشاہ کا راج ختم ہوا ہے ہندوستان میں فساد پر فساد ہوتے رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے ٹھنڈی سانس بھری اور پھر حقے کا دم لگا کر اپنی بات شروع کی۔ "یہ کانگرسی ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے ہیں۔ میں کہتا ہوں اگر یہ لوگ ہزار سال بھی سر پٹکتے رہیں تو کچھ نہ ہوگا۔ بڑی سے بڑی بات یہ ہوگی کہ انگریز چلا جائے گا اور کوئی اٹلی والا آجائے گا۔ یا وہ روس والا جس کی بابت میں نے سنا ہے کہ بہت تگڑا آدمی ہے۔ لیکن ہندوستان سدا غلام رہے گا۔ ہاں میں یہ کہنا بھول ہی گیا کہ پیر نے بددعا بھی دی تھی کہ ہندوستان پر ہمیشہ باہر کے آدمی راج کرتے رہیں گے۔"

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ اس کے ہندوستان پر اپنا سکہ چلاتے ہیں

اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں۔ مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اسے بہت ستایا کرتے تھے وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے۔ گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی سی آ جاتی۔ نہ معلوم کیوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آ جاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو!

جب کسی شرابی گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدر رہتی اور وہ شام کو اڈے میں آ کر ہل مارکہ سگریٹ پیتا یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اس گورے کو جی بھر کر سنایا کرتا۔

". . . . . "یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی سمیت جھٹکا دے کر کہا کرتا تھا "آگ لینے آئے تھے۔ اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں......."

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ وہ اپنے سینے کی آگ اُگلتا رہتا۔

"شکل دیکھتے ہو نا تم اُس کی.. ... جیسے کوڑھ ہو رہا ہے____ بالکل مردار، ایک دھپے کی مار اور گٹ پٹ گٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم پہلے پہل جی میں آئی کہ ملاعون کی کھوپڑی کے پُرزے اڑا دوں۔ لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے"....... یہ کہتے کہتے وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیض کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا____

"قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ جب کبھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم جان میں جان آ جائے۔"

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفتگو سے اسے پتہ چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین کا نفاذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے____

"سنا ہے کہ پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا____ کیا ہر چیز بدل جائے گی؟"

"ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی۔"

"کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟"

"یہ پوچھنے کی بات ہے۔ کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔"

ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابلِ بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بری طرح پیٹا کرتا تھا مگر اس روز وہ بار بار پیچھے مڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال اُنگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اُونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا "چل بیٹا، چل____ ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔"

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پہنچا کر اُس نے انار کلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منہ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا "ہت تیری ایسی کی تیسی۔"

شام کو جب وہ اڈے کو لوٹا تو خلاف معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا ـــــــــ بہت بڑی خبر اور اس خبر کو اپنے اندر سے باہر نکالنے کے لئے وہ سخت مجبور ہو رہا تھا۔ لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کر کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا' اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ "کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟" بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔ کئی بار اپنی گھنی مونچھوں کے اندر ہنس کر اس نے مارواڑیوں کو گالی دی"........ غریبوں کی کھٹیا میں گھسے ہوئے کھٹمل ـــــــــ نیا قانون ان کے لئے کھولتا ہوا پانی ہوگا۔"

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی۔ جب وہ خیال کرتا کہ گوروں ـــــــــ سفید چوہوں (وہ ان کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لئے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا پگڑی بغل میں دبائے اڈے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا "لا ہاتھ ادھر . . . . ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے ـــــــــ تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اگ آئیں۔"

اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے. .... مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دوران گفتگو اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا "تو دیکھتا رہ' کیا بنتا ہے' یہ روس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔"

استاد منگو موجودہ سویٹ نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اور اُسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اسی لئے اُس نے "روس والے بادشاہ" کو "انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں پیدا ہونے والی تھیں وہ انہیں "روس والے بادشاہ" کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں "روس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں بہت خوش ہوتا تھا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تنقید کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا ـــــــــ

"جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا۔ ایسی فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سنی نہ دیکھی گئی ہے۔ سیاسی نظریہ کے اعتبار سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں!"

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفتگو ہوئی چونکہ اس میں بیشتر الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس سے استاد منگو صرف اُوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے خیال کیا کہ یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو برا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔ چنانچہ اس خیال کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا "ٹوڈی بچے!"

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں "ٹوڈی بچہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال

کیا ہے اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور "ٹوڈی بچے" میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز وہ گورنمنٹ کالج کے تین طلباء کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سنا ___

"نئے آئین نے میری امیدیں بڑھا دی ہیں' اگر........ صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔" "ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آ جائے۔"

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔"

"وہ بے کار گریجوایٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں ان میں کچھ تو کمی ہو گی۔"

اس گفتگو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی اور وہ اس کو ایسی "چیز" سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ "نیا قانون.....!" اور وہ دن میں کئی بار سوچتا "یعنی کوئی نئی چیز!" اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ نیا ساز آ جاتا جو اس نے دو برس ہوئے چوہدری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر جب وہ نیا تھا۔ جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی تھی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح' چمکتا تھا' اس لحاظ سے بھی "نئے قانون" کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا۔ مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلاف معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر تانگے میں گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی ___ وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی ___ آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خالص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں ۳۱۔ مارچ کو چوہدری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے' دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی جھنجھناہٹ' بازار میں چلتے پھرتے آدمی...... ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟ ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں۔ لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے۔ دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں۔" اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا۔ "ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟"

جب اس کا تانگہ گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبا کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ خوش پوش تھے مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انار کلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منیہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لئے ان تمام چیزوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی ___ وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

جب استاد منگو کے گھر میں بچہ پیدا ہونے والا تھا تو اس نے چار پانچ مہینے بڑی بے قراری میں گزارے تھے۔ اس کو یقین تھا کہ بچہ کسی نہ کسی دن ضرور پیدا ہوگا۔ مگر وہ انتظار کی گھڑیاں نہیں کاٹ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنے بچے کو صرف ایک نظر دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ پیدا ہوتا رہے۔ چنانچہ اسی غیر مغلوب خواہش کے زیر اثر اس نے کئی مرتبہ اپنی بیمار بیوی کے پیٹ کو دبا دبا کر اور اس کے اوپر کان رکھ رکھ کر اپنے بچے کے متعلق کچھ جاننا چاہا تھا مگر ناکام رہا تھا۔ ایک مرتبہ وہ انتظار کرتے کرتے اس قدر تنگ آگیا تھا کہ اپنی بیوی پر برس بھی پڑا تھا ___

"تو ہر وقت مردے کی طرح پڑی رہتی ہے۔ اُٹھ ذرا چل پھر، تیرے انگ میں تھوڑی سی طاقت تو آئے۔ یوں تختہ بنے رہنے سے کچھ نہ ہو سکے گا۔ تو سمجھتی ہے کہ اس طرح لیٹے لیٹے بچہ جن دے گی؟"

اُستاد منگو طبعاً بہت جلد باز واقع ہوا تھا۔ وہ ہر سبب کی عملی تشکیل دیکھنے کا نہ صرف خواہش مند تھا بلکہ متجسس تھا۔ اس کی بیوی گنگا وتی اس کی اس قسم کی بے قراریوں کو دیکھ کر عام طور پر یہ کہا کرتی تھی۔

"ابھی کنواں کھودا نہیں گیا اور تم پیاس سے بے حال ہو رہے ہو۔"

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہئے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لئے نکلتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو اُستاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انار کلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا ___

"چلو یہ بھی اچھا ہوا ___ شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتہ چل جائے۔'

چھاؤنی پہنچ کر استاد منگو نے سواری کو اس کی منزلِ مقصود پر اُتار دیا اور جیب سے سگریٹ نکال کر بائیں ہاتھ کی آخری دو انگلیوں میں دبا کر سلگایا اور اگلی نشست کے گدے پر بیٹھ گیا ___ جب استاد منگو کو کسی سواری کی تلاش نہیں ہوتی تھی یا اُسے کسی بیتے ہوئے واقعے پر غور کرنا ہوتا تو وہ عام طور پر اگلی نشست چھوڑ کر پچھلی نشست پر بڑے اطمینان سے بیٹھ کر اپنے گھوڑے کی باگیں دائیں ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا کرتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کا گھوڑا تھوڑا سا ہنہنانے کے بعد بڑی دھیمی چال چلنا شروع کر دیتا تھا۔ گویا اسے کچھ دیر کے لئے بھاگ دوڑ سے چھٹی مل گئی ہے۔

گھوڑے کی چال اور استاد منگو کے دماغ میں خیالات کی آمد بہت سست تھی جس طرح گھوڑا آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا اسی طرح استاد منگو کے ذہن میں نئے قانون کے متعلق نئے قیاسات داخل ہو رہے تھے۔

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا اور اس قابلِ غور بات کو آئینِ جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اُسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ

کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک "گورا" کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اُس کے دل میں نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ پہلے اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اُس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اُس کو خیال آیا "ان کے پیسے چھوڑنا بھی بیوقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیئے ہیں۔ ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہئیں۔ چلو چلتے ہیں۔"

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگہ موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگہ ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا ——

"صاحب بہادر کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے ٹھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی ایک لرزش کے ساتھ گہری ہو گئی گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا سارا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اس نے اس "گورے" کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

جب "گورے" نے جو بجلی کے کھمبے کی اوٹ میں ہوا کا رخ بچا کر سگریٹ سلگا رہا تھا مڑ کر تانگے کے پائیدان کی طرف قدم بڑھایا تو اچانک استاد منگو اور اس کی نگاہیں چار ہوئیں اور ایسا معلوم ہوا کہ بیک وقت آمنے سامنے کی بندوقوں سے گولیاں خارج ہوئیں اور آپس میں ٹکرا کر ایک آتشیں بگولا بن کر اُوپر کو اڑ گئیں۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا۔ اپنے سامنے کھڑے "گورے" کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرے ذرے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگریٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا "جانا مانگتا یا پھر گڑبڑ کرے گا؟"

"وہی ہے۔" یہ الفاظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

"وہی ہے۔" اُس نے یہ الفاظ اپنے منہ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہو گیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھی ہوئی شراب تھی۔ اُسے طوعاً کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پرزے اڑا دیئے ہوتے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں ہی پر گرتا ہے۔

اُستاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا "کہاں جانا مانگتا ہے؟"

اُستاد منگو کے لہجے میں چابک ایسی تیزی تھی۔

گورے نے جواب دیا۔ "ہیرا منڈی۔"

"کرایہ پانچ روپے ہوگا۔" استاد منگو کی مونچھیں تھر تھرائیں۔

یہ سُن کر گورا حیران ہو گیا۔ وہ چلایا "پانچ روپے۔ کیا تم ——؟"

"ہاں ہاں پانچ روپے۔" یہ کہتے ہوئے اُستاد منگو کا داہنا ہاتھ بھرا ہاتھ بھنچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔ "کیوں جاتے ہو یا بے کار باتیں بناؤ گے؟"

استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہو گیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیش نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیر اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے اُستاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی اُستاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پست قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اوپر کو اٹھا اور چشم زدن میں گورے کی ٹھوڑی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اتر کر اُسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے ادھر ادھر سمٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں سے شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ اس چیخ و پکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا۔ وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا ____

"پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں...... پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑ فوں ____ اب ہمارا راج ہے بچہ؟"

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی ہوئی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا ____

"وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے ____ اب نیا قانون ہے میاں ____ نیا قانون!"

اور بے چارا گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بیوقوفوں کی مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ 'نیا قانون' 'نیا قانون' چلاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

"نیا قانون 'نیا قانون' کیا بک رہے ہو ____ قانون وہی ہے پرانا!"

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا!

گرہن

راجندر سنگھ بیدی

رُوپو' شبو' نِتھو اور مُنا ____ ہولی نے اساڑھی کے کائستھوں کو چار بچے دیئے تھے اور پانچواں چند ہی مہینوں میں جننے والی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے پڑنے لگے گالوں کی ہڈیاں اُبھر آئیں اور گوشت ان میں پچک گیا۔ وہ ہولی جسے پہلے پہل میا پیار سے چاند رانی کہہ کر پکارا کرتی تھی اور جس کی صحت اور سندرتا کا سیلا حاسد تھا گرے ہوئے پتے کی طرح زرد اور پژمردہ ہو چکی تھی۔

آج رات چاند گرہن تھا۔ سر شام چاند گرہن کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ ہولی کو اجازت نہ تھی کہ وہ کوئی کپڑا پھاڑ سکے ____ پیٹ میں بچے کے کان پھٹ جائیں گے' وہ سی نہ سکتی تھی ____ منہ سلا بچہ پیدا ہوگا۔ اپنے میکے خط نہ لکھ سکتی تھی ____ اس کے ٹیڑھے میڑھے حروف بچے کے چہرے پر لکھے جائیں گے' اور اپنے میکے خط لکھنے کا اسے بڑا چاؤ تھا۔

میکے کا نام آتے ہی اس کا تمام جسم ایک نامعلوم جذبہ سے کانپ اٹھتا۔ وہ میکے تھی تو اسے سسرال کا کتنا چاؤ تھا لیکن اب وہ سسرال سے اتنی سیر ہو چکی تھی کہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ اس بات کا اس نے کئی مرتبہ تہیہ بھی کیا لیکن ہر دفعہ ناکام رہی۔ اس کے میکے اساڑھی گاؤں سے پچیس میل کے فاصلے پر تھے۔ سمندر کے کنارے ہر پھول بندر پر شام کے وقت سٹیمر لانچ مل جاتا تھا اور ساحل کے ساتھ ساتھ ڈیڑھ دو گھنٹے کی مسافت کے بعد اس کے میکے گاؤں کے بڑے مندر کے زنگ خوردہ کلس دکھائی دینے لگتے۔

آج شام ہونے سے پہلے روٹی' چوکا' برتن کے کام سے فارغ ہونا تھا۔ میا کہتی تھی گرہن سے پہلے روٹی وغیرہ کھا لینی چاہئے وگرنہ ہر حرکت پیٹ میں بچے کے جسم و تقدیر پر اثر انداز ہوتی ہے۔ گویا وہ بدزیب' فراخ نتھنوں والی مٹیلی میا اپنی بہو حمیدہ بانو کے پیٹ سے کسی اکبر اعظم کی متوقع ہے۔ چار بچوں' تین مردوں' دو عورتوں' چار بھینسوں پر مشتمل بڑا کنبہ اور اکیلی ہولی ____ دوپہر تک تو ہولی برتنوں کا انبار صاف کرتی رہی' پھر جانوروں کے لئے بنولے' کھلی اور چنے بھگونے چلی۔ حتےٰ کہ اس کے کولھے درد سے پھٹنے لگے اور بغاوت پسند بچہ پیٹ میں اپنی بے بضاعت مگر ہولی کو تڑپا دینے والی حرکتوں سے احتجاج کرنے لگا۔ ہولی شکست کے احساس سے چوکی پر بیٹھ گئی۔ لیکن وہ بہت دیر تک چوکی یا فرش پر بیٹھنے کے قابل نہ تھی اور پھر میا کے خیال کے مطابق چوڑی چکلی چوکی پر بہت دیر بیٹھنے سے بچے کا سر چپٹا ہو جاتا ہے۔ موڑھا ہو تو اچھا ہے۔ کبھی کبھی ہولی میا اور کائستھوں کی آنکھ بچا کر کھاٹ پر سیدھی پڑ جاتی اور ایک پر شکم کتیا کی طرح ٹانگوں کو اچھی طرح سے پھیلا کر جمائی لیتی اور پھر اسی وقت کانپتے ہوئے ہاتھ سے اپنے ننھے سے دوزخ کو سہلانے لگتی۔

یہ خیال کرنے سے کہ وہ سیتل کی بیٹی ہے' وہ اپنے آپ کو روک نہ سکتی تھی۔ سیتل سارنگ دیو گرام کا ایک متمول ساہوکار تھا اور سارنگ دیو گرام کے نواح کے بیس گاؤں کے کسان اس سے بیاج پر روپیہ لیتے تھے۔ اس کے باوجود اسے کائستھوں کے ہاں ذلیل کیا جاتا

تھا۔ ہولی کے ساتھ کتوں سے بھی برا سلوک ہوتا تھا۔ کائستھوں کو تو بچے چاہئیں، ہولی جہنم میں جائے۔ گویا سارے گجرات میں یہ کائستھ ہی کل وہو (کل کو بڑھانے والی ـــــ بہو) کا صحیح مطلب سمجھتے تھے۔

ہر سال ڈیڑھ سال کے بعد وہ ایک نیا کیڑا گھر میں رینگتا ہوا دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور بچے کی وجہ سے کھلایا پیا ہولی کے جسم پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ شاید اسے روٹی بھی اسی لئے دی جاتی تھی کہ پیٹ میں بچہ مانگتا ہے اور اسی لئے اسے حمل کے شروع میں چاٹ اور اب پھل آزادانہ دیئے جاتے تھے۔

"دیور ہے تو وہ الگ پیٹ لیتا ہے۔" ہولی سوچتی تھی "اور ساس کے کوسنے مار پیٹ سے کہیں برے ہیں اور بڑے کائستھ جب ڈانٹنے لگتے ہیں تو پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔ ان سب کو بھلا میری جان لینے کا کیا حق ہے؟...... رسیلا کی تو بات ہی دوسری ہے۔ شاستروں نے اسے پرماتما کا درجہ دیا ہے۔ وہ جس چھری سے مارے اس چھری کا بھلا!. . . . لیکن کیا شاستر کسی عورت نے بنائے ہیں؟ اور میا کی تو بات ہی علیحدہ ہے ـــــ شاستر کسی عورت نے لکھے ہوتے تو وہ اپنی ہم جنس پر اس سے بھی زیادہ پابندیاں عائد کرتی۔ ..."

.......راہو اپنے نئے بھیس میں نہایت اطمینان سے امرت پی رہا تھا۔ چاند اور سورج نے وشنو مہاراج کو اس کی اطلاع دی اور بھگوان نے سدرشن سے راہو کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ اس کا سر اور دھڑ دونوں آسمان پر جا کر راہو اور کیتو بن گئے۔ سورج اور چاند دونوں ان کے مقروض ہیں۔ اب وہ ہر سال دو مرتبہ چاند اور سورج سے بدلہ لیتے ہیں اور ہولی سوچتی تھی بھگوان کے کھیل بھی نیارے ہیں...... اور راہو کی شکل کیسی عجیب ہے۔ ایک کالا سا راکشس، شیر پر چڑھا ہوا، دیکھ کر کتنا ڈر لگتا ہے۔ رسیلا بھی تو شکل سے راہو ہی دکھائی دیتا ہے۔ منا کی پیدائش پر ابھی چالیسواں بھی نہ نہائی تھی تو آموجود ہوا ـــــ کیا میں نے بھی اس کا قرضہ دینا ہے؟

اس وقت ہولی کے کانوں میں ماں بیٹے کے آنے کی بھنک پڑی۔ ہولی نے دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو سنبھالا اور اٹھ کھڑی ہوئی اور جلدی سے توے کو دھیمی دھیمی آنچ پر رکھ دیا۔ اب اس میں جھکنے کی تاب نہ تھی کہ پھونکیں مار کر آگ جلا سکے۔ اس نے کوشش بھی کی لیکن اس کی آنکھیں پھٹ کر باہر آنے لگیں۔

رسیلا ایک نیا مرمت کیا ہوا چھاج ہاتھ میں لئے اندر داخل ہوا۔ اس نے جلدی سے ہاتھ دھوئے اور منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ اس کے پیچھے میا آئی اور آتے ہی بولی:

"بہو......اناج رکھا ہے کیا؟"

ہولی ڈرتے ڈرتے بولی۔ "ہاں ہاں.....رکھا ہے ـــــ نہیں رکھا، یاد آیا، بھول گئی تھی میا..... "

"تو بیٹھی کر کیا رہی ہے نباب جادی؟"

ہولی نے رحم جویانہ نگاہوں سے رسیلے کی طرف دیکھا اور بولی۔ "جی! مجھ سے اناج کی بوری ہلائی جاتی ہے کہیں؟"

میا کا جواب ہو گئی اور یوں بھی اسے ہولی کی نسبت اس کے پیٹ میں بچے کی زیادہ پروا تھی۔ شاید اسی لئے ہولی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی:

"تو نے سرمہ کیوں لگایا ہے ری؟ ـــــ رانڈ، جانتی بھی ہے آج گہن ہے جو بچہ اندھا ہو جائے تو تیرے ایسی بیسوا اسے پالنے چلے گی؟"

ہولی چپ ہو گئی اور نظریں زمین پر گاڑتے ہوئے منہ میں کچھ بڑبڑاتی گئی اور سب ہو جانے لیکن رانڈ کی گالی اس کی برداشت سے باہر تھی۔ اسے بڑبڑاتے دیکھ کر میا اور بھی بکتی اور جھکتی چابیوں کا گچھا تلاش کرنے لگی۔ ایک میلے شمع دان کے قریب سرمہ پینے کا کھرل

رکھا ہوا تھا۔ اس میں سے چابیوں کا گچھا نکال کر وہ بھنڈارے کی طرف چلی گئی۔ رسیلے نے ایک پر ہوس نگاہ سے ہولی کی طرف دیکھا۔ اس وقت ہولی اکیلی تھی۔ رسیلے نے آہستہ سے آنچل کو چھوا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے دامن جھٹک دیا اور اپنے دیور کو آوازیں دینے لگی۔ گویا دوسرے آدمی کی موجودگی چاہتی ہے۔ اس کیفیت میں مرد کو ٹھکرا دینا معمولی بات نہیں ہوتی۔ رسیلا آواز کو چباتے ہوئے بولا۔

"میں پوچھتا ہوں بھلا اتنی جلدی کاہے کی تھی؟"

"جلدی کیسی؟"

رسیلا پیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہی..... تم بھی تو کتیا ہو کتیا!"

ہولی سہم کر بولی۔ "تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

ہولی نے نادانستگی میں رسیلے کو وحشی' بدچلن' ہوس ران سبھی کچھ کہہ دیا۔ چوٹ سیدھی پڑی' رسیلا کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہ تھا___ لاجواب آدمی کا جواب چپت ہوتی ہے اور دوسرے لمحے میں انگلیوں کے نشان ہولی کے گالوں پر دکھائی دینے لگے۔

اس وقت میاماش کی ایک ٹوکری اٹھائے ہوئے بھنڈارے کی طرف سے آئی اور بہو سے بدسلوکی کرنے کی وجہ سے بیٹے کو جھڑکنے لگی۔ ہولی کو رسیلے پر تو غصہ نہ آیا۔ البتہ میا کی اس عادت سے جل بھن گئی____ "رانڈ' آپ مارے تو اس سے بھی جیادہ' اور جو بیٹا کچھ کہے تو ہمدردی جتاتی ہے' بڑی آئی ہے۔ . . ."

ہولی سوچتی تھی کل رسیلے نے مجھے اس لئے مارا تھا کہ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور آج اس لئے مارا ہے کہ میں نے بات کا جواب دے دیا ہے۔ میں جانتی ہوں وہ مجھ سے کیوں ناراض ہے' کیوں گالیاں دیتا ہے' میرے کھانے پکانے' اٹھنے بیٹھنے میں اسے کیوں سلیقہ دکھائی نہیں دیتا... ....اور میری یہ حالت ہے کہ ناک میں دم آچکا ہے اور مرد عورت کو مصیبت میں مبتلا کر کے آپ الگ ہو جاتے ہیں' یہ مرد .... !

میا نے کچھ باسمتی' دالیں اور نمک وغیرہ رسوئی میں بکھیر دیا اور پھر ایک جھکی ہوئی ترازو میں اسے تولنے لگی۔ ترازو گیلا تھا۔ یہ میا بھی دیکھ رہی تھی اور جب باسمتی چاول پیندے میں چمٹ گئے تو بہو سرزنش کرتی پھوہڑ ہو گئی اور آپ اتنی سگھڑ کہ نئے دوپٹے سے پیندا صاف کرنے لگی۔ جب بہت میلا ہو گیا تو دوپٹے کو سر سے اتار کر ہولی کی طرف پھینک دیا اور بولی:

"لے' دھو ڈال۔"

اب ہولی نہیں جانتی بچاری کہ وہ روٹیاں پکائے یا دوپٹہ دھوئے۔ بولے یا نہ بولے' ہلے یا نہ ہلے' وہ کتیا ہے یا نباب جادی۔ اس نے دوپٹہ دھونے ہی میں مصلحت سمجھی۔ اس وقت چاند گرہن کے زمرہ میں داخل ہونے والا ہی ہوگا۔ بچہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح چرمرسا پیدا ہوگا اور اگر ماہ دو ماہ بعد بچے کا برا سا چہرہ دیکھ کر اسے کوسا جائے تو اس میں ہولی کا کیا قصور ہے؟ .... لیکن قصور اور بے قصوری کی تو بات ہی علیحدہ ہے۔ کیونکہ یہ کوئی سننے کے لئے تیار نہیں کہ اس میں ہولی کا گناہ کیا ہے____ سب گناہ ہولی کا ہے۔

اسی وقت ہولی کو سارنگ دیو گرام یاد آگیا۔ کس طرح وہ اسوج کے شروع میں دوسری عورتوں کے ساتھ گربا ناچا کرتی تھی' اور بھابی کے سر پر رکھے ہوئے گھڑے کے سوراخوں میں سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر دالان کے چاروں کونوں کو منور کر دیا کرتی تھی۔ اس وقت سب عورتیں اپنے حنا مالیدہ ہاتھوں سے تالیاں بجایا کرتی تھیں اور گایا کرتی تھیں______

ماہندی[1] تو ادی ماوے اینو رنگ گیو گجرات رے
ماہندی رنگ لاگیو رے

اس وقت وہ ایک اچھلنے کودنے والی الہڑ چھوکری تھی ایک بحر و قافیہ سے آزاد نظم جو چاہتی تھی پورا ہو جاتا تھا۔ گھر میں سب سے چھوٹی تھی۔ باپ جادی تو نہ تھی اور اس کی سہیلیاں ـــــ وہ بھی اپنے اپنے قرض خواہوں کے پاس جا چکی ہوں گی۔

.... سادنگ دیو گرام میں گرہن کے موقع پر جی کھول کر دان پن کیا جاتا ہے۔ عورتیں اکٹھی ہو کر ترہ یدی گھاٹ پر اشنان کے لئے چلی جاتی ہیں۔ پھول 'ناریل' بتاشے سمندر میں بہاتی ہیں۔ پانی کی ایک اچھال منہ کھولے ہوئے آتی ہے اور سب پھول پتوں کو قبول کر لیتی ہے۔ اس وقت کے اشنان سے سب مرد عورتوں کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ ان گناہوں کا جن کا ارتکاب لوگ گذشتہ سال کرتے رہے ہیں۔ اشنان سے سب پاپ دھل جاتے ہیں۔ بدن اور روح پاک ہو جاتی ہے۔ سمندر کی لہر لوگوں کے سب گناہوں کو بہا کر دور 'بہت دور ـــــ ایک نامعلوم 'ناقابل عبور' ناقابل پیمائش سمندر میں لے جاتی ہے.... ایک سال بعد پھر لوگوں کے بدن گناہوں سے آلودہ ہو جاتے ہیں 'پھر گہنا جاتے ہیں' پھر، پاکی ایک لہر آتی ہے اور پھر پاک و صاف۔

جب گرہن شروع ہوتا ہے اور چاند کی نورانی عصمت پر داغ لگ جاتا ہے تو چند لمحات کے لئے چاروں طرف خاموشی اور پھر رام نام کا جاپ شروع ہوتا ہے۔ پھر گھنٹے 'ناقوس' سنکھ ایک دم بجنے لگتے ہیں۔ اس شور و غوغا میں اشنان کے بعد سب مرد عورتیں جگھٹے کی صورت میں گاتے بجاتے گاؤں واپس لوٹتے ہیں۔

گرہن کے دوران میں غریب لوگ بازاروں اور گلی کوچوں میں دوڑتے ہیں۔ لنگڑے بیساکھیاں گھماتے ہوئے اپنی اپنی جھولیاں اور کشکول تھامے پلیگ کے چوہوں کی طرح ایک دوسرے پر گرتے پڑتے بھاگتے چلے جاتے ہیں کیونکہ راہو اور کیتو نے خوبصورت چاند کو اپنی گرفت میں پوری طرح سے جکڑ لیا ہے۔ نرم دل ہندو دان دیتا ہے تاکہ غریب چاند کو چھوڑ دیا جائے اور دان لینے کے لئے بھاگنے والے بھکاری چھوڑ دو 'چھوڑ دو' دان کا وقت ہے ـــــ چھوڑ دو کا شور مچاتے ہوئے میلوں کی مسافت طے کر لیتے ہیں۔

چاند گرہن کے زمرہ میں آنے والا ہی تھا۔ ہولی نے بچوں کو بڑے کاستھ کے پاس چھوڑا۔ ایک میلی کچیلی دھوتی باندھی اور عورتوں کے ساتھ ہر پھول بندر کی طرف اشنان کے لئے چلی۔

اب میا 'رسیلا' بڑا لڑکا شبو اور ہولی سب سمندر کی طرف جا رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں پھول تھے 'گجرے تھے اور آم کے پتے تھے اور بڑی اماں کے ہاتھ میں رودرکش کی مالا کے علاوہ مشک کافور تھا جسے وہ جلا کر پانی کی لہروں پر بہا دینا چاہتی تھی تاکہ مرنے کے بعد سفر میں اس کا راستہ روشن ہو جائے اور ہولی ڈرتی تھی ـــــ کیا اس کے گناہ سمندر کے پانی سے دھل جائیں گے؟

سمندر کے کنارے گھاٹ سے پون میل کے قریب ایک لانچ کھڑا تھا۔ وہ جگہ ہر پھول بندر کا ایک حصہ تھی۔ بندر کے چھوٹے سے ناہموار ساحل اور ایک مختصر سے ڈاک پر کچھ ٹینڈل غروب آفتاب میں روشنی اور اندھیرے کی کشمکش کے خلاف ننھے ننھے بے بضاعت سے [illegible] رہے تھے۔ اور لانچ کے کسی کیبن سے ایک ہلکی سی ٹمٹماتی ہوئی روشنی سیماب وار پانی کی لہروں پر ناچ رہی تھی۔ اس کے بعد ایک [illegible] ہوئی دکھائی دی۔ چند ایک دھندلے سے سائے ایک اژدہا نما رسے کو کھینچنے لگے۔ آٹھ بجے سٹیمر لانچ کی آخری سیٹی تھی ـــــ [illegible] دیو گرام کی طرف روانہ ہو گا۔ اگر ہولی اس پر سوار ہو جائے تو پھر ڈیڑھ دو گھنٹے میں وہ چاندنی میں نہاتے

---

1. ماہندی (حنا) [illegible] اس میں گجرات رچا ہوا ہے۔ (گویا) اسے حنا کا رنگ چڑھ گیا ہے۔

ہوئے گویا صدیوں سے آشنا کلس دکھائی دینے لگیں...... اور پھر وہی اماں ..... کنوار پن اور گرہانا چ!

ہولی نے ایک نظر سے شبو کی طرف دیکھا۔ شبو حیران تھا کہ اس کی ماں نے اتنی بھیڑ میں جھک کر اس کا منہ کیوں چوما اور ایک گرم گرم قطرہ کہاں سے اس کے گالوں پر آپڑا۔ اس نے آگے بڑھ کر رسیلے کی انگلی پکڑلی۔ اب گھاٹ آچکا تھا جہاں سے مرد اور عورتیں علیحدہ ہوتی تھیں۔ ہمیشہ کے لئے نہیں، فقط چند گھنٹوں کے لئے ......اسی پانی کی گواہی میں وہ اپنے مردوں سے باندھ دی گئی تھیں۔ پانی میں بھی کیا پراسرار، بعید الفہم طاقت ہے ____ اور دور سے لانچ کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی ہولی تک پہنچ رہی تھی۔

ہولی نے بھاگنا چاہا مگر وہ بھاگ بھی تو نہ سکتی تھی۔ اس نے اپنی ہلکی سی دھوتی کو کس کر باندھا ____ دھوتی نیچے کی طرف ڈھلک جاتی تھی .... آدھ گھنٹے میں وہ لانچ کے سامنے کھڑی تھی۔ لانچ کے سامنے نہیں ____ سارنگ دیوگرام کے سامنے.....وہ کلس، مندر کے گھنٹے، لانچ کی سیٹی، اور ہولی کو یاد آیا کہ اس کے پاس تو ٹکٹ کے لئے بھی پیسے نہیں ہیں۔

وہ کچھ عرصہ تک لانچ کے ایک کونے میں بدحواس ہو کر بیٹھی رہی۔ پونے آٹھ بجے کے قریب ایک ٹینڈل آیا اور ہولی سے ٹکٹ مانگنے لگا۔ ٹکٹ نہ پانے پر وہ خاموشی سے وہاں سے ٹل گیا۔ کچھ دیر بعد ملازموں کی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں...... پھر اندھیرے میں خفیف سے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی کوئی لفظ ہولی کے کان میں بھی پڑ جاتا ـ ـ ـ ـ ـ مرغی ......دولے... چابیاں میرے پاس ہیں.....پانی زیادہ ہوگا........

اس کے بعد چند وحشیانہ قہقہے بلند ہوئے اور کچھ دیر بعد تین چار آدمی ہولی کو لانچ کے ایک تاریک کونے کی طرف دھکیلنے لگے۔ اسی وقت آبکاری کا ایک سپاہی لانچ میں وارد ہوا عین جبکہ دنیا ہولی کی آنکھوں میں تاریک ہو رہی تھی ہولی کو امید کی ایک شعاع دکھائی دی۔ وہ سپاہی سارنگ دیوگرام کا ہی ایک چھوکرا تھا اور شبکے کے رشتے سے بھائی تھا۔ چھ سال ہوئے وہ بڑی امنگوں کے ساتھ گاؤں سے باہر نکلا تھا اور سابرمتی پھاند کر کسی نامعلوم دیس کو چلا گیا تھا۔ کبھی کبھی مصیبت کے وقت انسان کے حواس بجا ہو جاتے ہیں۔ ہولی نے سپاہی کو آواز سے ہی پہچان لیا اور کچھ دلیری سے بولی۔

"کتھورام!"

کتھورام نے بھی سیتل کی چھوکری کی آواز پہچان لی۔ بچپن میں وہ اس کے ساتھ کھیلا تھا ____

کتھورام بولا:

"ہولے!"

ہولی یقین سے معمور مگر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "کتھو بھیا...... مجھے سارنگ دیوگرام پہنچا دو......"

ٹینڈل جو سب سے قریب تھا بولا:

"بیچاری کوئی دکھیا ہے۔ اس کے پاس تو ٹکٹ کے پیسے بھی نہیں تھے۔ ہم سوچ رہے تھے ہم اس کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

کتھورام نے ہولی کو ساتھ لیا اور لانچ سے نیچے اتر آیا۔ ڈاک پر قدم رکھتے ہوئے بولا:

"ہولے...... کیا تم اساڑھی سے بھاگ آئی ہو؟"

"ہاں!"

"یہ سرپھرے جادیوں کا کام ہے؟......اور جو میں کاستھوں کو خبر کر دوں تو؟"

ہولی لانچ سے کٹ چکی تھی۔ وہ نہ تو تاب جادی تھی اور نہ مرجھا جاتی اس جگہ۔ ایسی حالت میں وہ کھتورام کو تکتی کہ بھی تو نہ سکتی تھی۔ وہ اپنی کمزوری کو محسوس کرتی ہوئی خاموشی سے سمندر کی لہروں کے تلاطم کی آوازیں سننے لگی۔ پھر اس کے سامنے لانچ کے رسے ڈھیلے کئے گئے۔ ایک ہلکی سی وسل ہوئی اور ہولے ہولے سارنگ دیو گرام ہولی کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس نے ایک دفعہ پیچھے کی جانب دیکھا۔ لانچ کی ہلکی سی روشنی میں اسے جھاگ کی ایک لمبی سی لکیر لانچ کا پیچھا کرتی ہوئی دکھائی دی۔

کھتورام بولا۔ "ڈرو نہیں ہولے...... میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا۔ یہاں سے کچھ دور ناؤ پڑتی ہے۔ یہ پینے لے چلوں گا۔ یوں گھبراؤ نہیں۔ رات کی رات سرائے میں آرام کر لو۔"

کھتورام ہولی کو سرائے میں لے گیا۔ سرائے کا مالک بڑی حیرت سے کھتورام اور اس کی ساتھی کو دیکھتا رہا۔ آخر جب وہ نہ رہ سکا تو اس نے کھتورام سے نہایت آہستہ آواز میں پوچھا۔ "یہ کون ہیں؟"

کھتورام نے آہستہ سے جواب دیا۔ "میری پتنی ہے۔"

ہولی کی آنکھیں پتھرانے لگیں۔ ایک دفعہ اس نے اپنے پیٹ کو سہارا دیا اور دیوار کا سہارا لے کر بیٹھ گئی۔ کھتورام نے سرائے میں ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ ہولی نے ڈرتے ڈرتے اس کمرے میں قدم رکھا۔ کچھ دیر بعد کھتورام آیا تو اس کے منہ سے شراب کی بو آ رہی تھی..........

سمندر کی ایک بڑی بھاری اچھال آئی۔ سب پھول' بتاشے' آم کی ٹہنیاں' گجرے اور جلتا ہوا مشک کافور بہا کر لے گئی۔ اس کے ساتھ ہی انسان کے مہیب ترین گناہ بھی لیتی گئی___ دور' بہت دور' ایک نامعلوم' ناقابلِ عبور' ناقابلِ پیمائش سمندر کی طرف...... جہاں تاریکی ہی تاریکی تھی..... پھر سنکھ بجنے لگے۔ اس وقت سرائے میں سے کوئی عورت نکل کر بھاگی۔ سرپٹ' بگٹٹ...... وہ گرتی تھی بھاگتی تھی' پیٹ پکڑ کر بیٹھ جاتی' ہانپتی اور دوڑنے لگتی...... اس وقت آسمان پر چاند پورا گہنا چکا تھا۔ راہو اور کیتو نے جی بھر کر قرض وصول کیا تھا..... دو دھندلے سے سائے اس عورت کی مدد کے لئے سراسیمہ ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے.......... چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور دور اساڑھی سے ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں___

دان کا وقت ہے..........

چھوڑ دو...... چھوڑ دو..... چھوڑ دو........

ہر پھول بندر سے آواز آئی___

پکڑ لو...... پکڑ لو..... پکڑ لو ....

....

چھوڑ دو...... دان کا وقت ہے ..... . پکڑ لو ...... چھوڑ دو!!

چوتھی کا جوڑا

عصمت چغتائی

سہ دری کے چوکے پر آج پھر صاف ستھری جازم بچھی تھی۔ ٹوٹی پھوٹی کھپریل کی جھریوں میں سے دھوپ کے آڑے ترچھے قتلے پورے دالان میں بکھرے ہوئے تھے۔ محلے ٹولے کی عورتیں خاموش اور سہمی ہوئی تھیں جیسے کوئی بڑی واردات ہونے والی ہو۔ ماؤں نے بچے چھاتیوں سے لگا لئے تھے۔ کبھی کبھی کوئی منحنی سا چڑچڑا بچہ رسد کی کمی کی دہائی دے کر چلا اٹھتا۔

"نائیں نائیں میرے لال!" دبلی پتلی ماں اسے اپنے گھٹنے پر لٹا کر یوں ہلاتی جیسے دھان ملے چاول سوپ میں پھٹک رہی ہو' اور بچہ ہنکارے بھر کر خاموش ہو جاتا۔

آج کتنی آس بھری نگاہیں کبریٰ کی ماں کے متفکر چہرے کو تک رہی تھیں' چھوٹے عرض کی ٹول کے دو پاٹ تو جوڑ لئے گئے تھے' مگر ابھی سفید گزی کا نشان بیونتنے کی کسی کو ہمت نہ پڑتی تھی۔ کانٹ چھانٹ کے معاملہ میں کبریٰ کی ماں کا مرتبہ بہت اونچا تھا' ان کے سوکھے ہاتھوں نے نہ جانے کتنے جہیز سنوارے تھے' کتنے چھٹی چھوچھک تیار کئے تھے اور کتنے ہی کفن بیونتے تھے۔ جہاں کہیں محلہ میں کپڑا کم پڑ جاتا اور لاکھ جتن پر بھی بیونت نہ بیٹھتی' کبریٰ کی ماں کے پاس کیس لایا جاتا۔ کبریٰ کی ماں کپڑے کی کان نکالتیں' کلف توڑتیں' کبھی تکون بناتیں' کبھی چوکھٹا کرتیں اور دل ہی دل میں قینچی چلا کر آنکھوں سے ناپ تول کر مسکرا پڑتیں۔

"آستین اور گھیر تو نکل آئے گا' گریبان کے لئے کترن میری بقچی سے لے لو۔" اور مشکل آسان ہو جاتی۔ کپڑا تراش کر دہ کترنوں کی پنڈی بنا کر پکڑا دیتیں۔

پر آج تو سفید گزی کا ٹکڑا بہت ہی چھوٹا تھا اور سب کو یقین تھا کہ آج تو کبریٰ کی ماں کی ناپ تول ہار جائے گی' جب ہی تو سب دم سادھے ان کا منہ تک رہی تھیں۔ کبریٰ کی ماں کے پُر استقلال چہرے پر فکر کی کوئی شکل نہ تھی' چار گرہ گزی کے ٹکڑے کو وہ نگاہوں سے بیونت رہی تھیں۔ لال ٹول کا عکس ان کے نیلگوں زرد چہرے پر شفق کی طرح پھوٹ رہا تھا۔ وہ اُداس اُداس گہری جھریاں اندھیری گھٹاؤں کی طرح ایک دم اُجاگر ہو گئیں' جیسے گھنے جنگل میں آگ بھڑک اٹھی ہو' اور انہوں نے مسکرا کر قینچی اٹھالی۔

محلہ والیوں کے جمگھٹے سے ایک لمبی اطمینان کی سانس اُبھری۔ گود کے بچے بھی ٹھسک دئے گئے۔ چیل جیسی نگاہوں والی کنواریوں نے لپاجھپ سوئی کے ناکوں ڈورے پروئے' نئی بیاہی دلہنوں نے انگشتانے پہن لئے' کبریٰ کی ماں کی قینچی چل پڑی تھی۔

سہ دری کے آخری کونے میں پلنگڑی پر حمیدہ پیر لٹکائے ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے دور کچھ سوچ رہی تھی۔

دوپہر کا کھانا نمٹا کر اسی طرح بی اماں سہ دری کی چوکی پر جا بیٹھتی ہیں اور بقچی کھول کر رنگ برنگے کپڑوں کا جال بکھیر دیا کرتی

ہیں۔ کوٹھری کے پاس بیٹھی برتن مانجھتی ہوئی کبریٰ کن انکھیوں سے ان لال کپڑوں کو دیکھتی تو ایک سرخ چھپکلی سی اس کے زردی مائل نیالے رنگ میں لپک اٹھتی۔ روپہلی کٹوریوں کے جال جب پولے پولے ہاتھوں سے کھول کر اپنے زانوؤں پر پھیلاتیں تو ان کا مرجھایا ہوا چہرہ ایک عجیب ارمان بھری روشنی سے جگمگا اٹھتا ___ گہری صندوقوں جیسی شکنوں پر کٹوریوں کا عکس ننھی ننھی مشعلوں کی طرح جگمگانے لگتا۔ ہر ٹانکے پر زری کا کام ہلتا اور مشعلیں کپکپا اٹھتیں۔

یاد نہیں کب اس کے شبنمی دوپٹے بنے ٹکے تیار ہوئے اور گاذی کے بھاری قبر جیسے صندوق کی تہ میں ڈوب گئے۔ کٹوریوں کے جال دھندلا گئے گنگا جمنی کرنیں ماند پڑ گئیں۔ طولی کے لچھے اداس ہو گئے مگر کبریٰ کی برات نہ آئی۔ جب ایک جوڑا پرانا ہو جاتا تو اسے چالے کا جوڑا کہہ کر سینت دیا جاتا اور پھر ایک نئے جوڑے کے ساتھ نئی امیدوں کا افتتاح ہو جاتا۔ بڑی چھان بین کے بعد نئی دلہن چھانٹی جاتی۔ سہ دری کے چوکے پر صاف ستھری جازم بچھتی۔ محلے کی عورتیں ہاتھ میں پاندان اور بغلوں میں بچے دبائے جھانجھیں بجاتی آن پہنچتیں۔

"چھوٹے کپڑے کی گوٹ تو اتر آئے گی پر بچیوں کا کپڑا نہ نکلے گا۔"

"لو بوا لو اور سنو۔ تو کیا موئی ماری ٹول کی چولیں پڑیں گی؟" اور پھر سب کے چہرے فکر مند ہو جاتے۔ کبریٰ کی ماں خاموش کیمیاگری کی طرح آنکھوں کے فیتے سے طول و عرض ناپتیں اور بیویاں آپس میں چھوٹے کپڑے کے متعلق کھسر پھسر کر کے قہقہہ لگاتیں۔ ایسے میں کوئی من چلی کوئی سہاگ یا بنا چھیڑ دیتی۔ کوئی اور چار ہاتھ آگے والی سمدھنوں کو گالیاں سنانے لگتی، بیہودہ گندے مذاق اور چہلیں شروع ہو جاتیں۔ ایسے موقعوں پر کنواری بالیوں کو سہ دری سے دور سر ڈھانک کر کھپریل میں بیٹھنے کا حکم دے دیا جاتا اور جب کوئی نیا قہقہہ سہ دری سے ابھرتا تو بے چاریاں ایک ٹھنڈی سانس بھر کر رہ جاتیں اللہ! یہ قہقہے انہیں خود کب نصیب ہوں گے۔

اس چہل پہل سے دور کبریٰ شرم کی ماری مچھروں والی کوٹھری میں سر جھکائے بیٹھی رہتی۔ اتنے میں کتر بیونت نہایت نازک مرحلہ پر پہنچ جاتی۔ کوئی کلی الٹی کٹ جاتی اور اس کے ساتھ بیویوں کی مت بھی کٹ جاتی۔ کبریٰ سہم کر دروازے کی آڑ سے جھانکتی۔

یہی تو مشکل تھی۔ کوئی جوڑا اللہ مارا چین سے نہ سلنے پایا۔ جو کلی الٹی کٹ جائے تو جان لو نائن کی لگائی ہوئی بات میں ضرور کوئی اڑنگا لگے گا۔ یا تو دولہا کی کوئی داشتہ نکل آئے گی یا اس کی ماں ٹھوس کڑوں کا اڑنگا باندھے گی۔ جو گوٹ میں کان آ جائے تو سمجھ لو یا تو مہر پر بات ٹوٹے گی یا بھرت کے پایوں کے پلنگ پر جھگڑا ہو گا۔ چوتھی کے جوڑے کا شگون بڑا نازک ہوتا ہے۔ بی اماں کی ساری مشاقی اور سگھڑاپا دھرا رہ جاتا نہ جانے عین وقت پر کیا ہو جاتا کہ دھنیا برابر بات طول پکڑ جاتی۔ بسم اللہ کے زور سے سگھڑ ماں نے جہیز جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ ذرا سی کتر بھی بچتی تو تیلے دانی یا شیشے کا غلاف سی کر دھنک گوکھرو سے سنوار کر رکھ دیتیں۔ لڑکی کا کیا ہے کھیرے ککڑی کی طرح بڑھتی ہے جو برات آ گئی تو یہی سلیقہ کام آئے گا۔

اور جب سے ابا گذرے سلیقہ کا بھی دم پھول گیا۔ حمیدہ کو ایک دم اپنے ابا یاد آ گئے۔ ابا کتنے دبلے پتلے لمبے جیسے محرم کا علم۔ ایک بار جھک جاتے تو سیدھے کھڑا ہونا دشوار تھا۔ صبح ہی صبح اٹھ کر نیم کی مسواک توڑ لیتے اور حمیدہ کو گھٹنے پر بٹھا کر نہ جانے کیا سوچا کرتے۔ پھر سوچتے سوچتے نیم کی مسواک کا کوئی پھونسڑا حلق میں چلا جاتا اور وہ کھانستے ہی چلے جاتے۔ حمیدہ بگڑ کر ان کی گود سے اتر آتی۔ کھانسی کے دھکوں سے یوں ہل ہل جانا اسے قطعی پسند نہ تھا۔ اس کے ننھے سے غصے پر وہ اور ہنستے اور کھانسی سینہ میں بے طرح الجھتی۔ جیسے گردن کٹے کبوتر پھڑپھڑا رہے ہوں۔ پھر بی اماں آ کر انہیں سہارا دیتیں۔ پیٹھ پر دھپ دھپ ہاتھ مارتیں۔

"توبہ ہے ایسی بھی کیا ہنسی؟"

اچھو کے دباؤ سے سرخ آنکھیں اوپر اٹھا کر ابا بے کسی سے مسکراتے۔ کھانسی تو رک جاتی مگر وہ دیر تک بیٹھے ہانپا کرتے۔

"کچھ دوا دارو کیوں نہیں کرتے؟ کتنی بار کہا تم سے؟"

"بڑے شفاخانے کا ڈاکٹر کہتا ہے سوئیاں لگواؤ اور روز تین پاؤ دودھ اور آدھی چھٹانک مکھن۔"

"ہے خاک پڑے ان ڈاکٹروں کی صورت پر۔ بھلا ایک تو کھانسی ہے اُوپر سے چکنائی، بلغم نہ پیدا کر دے گی۔ حکیم کو دکھاؤ کسی کو۔"

"دکھاؤں گا۔" ابا حقہ گڑگڑاتے اور پھر اچھو لگتا۔

"آگ لگے اس موئے حقے کو۔ اسی نے تو یہ کھانسی لگائی ہے۔ جوان بیٹی کی طرف بھی دیکھتے ہو آنکھ اٹھا کر۔"

اور اب ابا کبریٰ کی جوانی کی طرف رحم طلب نگاہوں سے دیکھتے۔ کبریٰ جوان تھی، کون کہتا تھا جوان تھی۔ وہ تو جیسے بسم اللہ کے دن سے ہی اپنی جوانی کی آمد کی سناؤنی سن کر ٹھٹھک کر رہ گئی۔ نہ جانے کیسی جوانی آئی تھی کہ نہ تو اس کی آنکھوں میں کرنیں ناچیں نہ اس کے رخساروں پر زلفیں پریشان ہوئیں نہ اس کے سینے پر طوفان اٹھے اور نہ کبھی اس نے ساون بھادوں کی گھٹاؤں سے مچل مچل کر پریتم یا ساجن مانگے۔ وہ جھکی جھکی سہمی سہمی جوانی جو نہ جانے کب دبے پاؤں اس پر رینگ آئی، ویسے ہی چپ چاپ نہ جانے کدھر چل دی۔ میٹھا برس نمکین ہوا اور پھر کڑوا ہو گیا۔

ابا ایک دن چوکھٹ پر اوندھے منہ گرے اور انہیں اٹھانے کے لئے کسی حکیم یا ڈاکٹر کا نسخہ نہ آسکا۔

اور حمیدہ نے میٹھی روٹی کے لئے ضد کرنی چھوڑ دی۔

اور کبریٰ کے پیغام نہ جانے کدھر راستہ بھول گئے۔ جانو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ اس ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کسی کی جوانی آخری سسکیاں لے رہی ہے اور ایک نئی جوانی سانپ کے پھن کی طرح اٹھ رہی ہے۔

مگر بی اماں کا دستور نہ ٹوٹا۔ وہ اسی طرح روز دوپہر کو سہ دری میں رنگ برنگ کپڑے پھیلا کر گڑیوں کا کھیل کھیلا کرتی ہیں۔

کہیں نہ کہیں سے جوڑ جمع کر کے شبرات کے مہینے میں کریپ کا دوپٹہ ساڑھے سات روپے میں خرید ہی ڈالا۔ بات ہی ایسی تھی کہ بغیر خریدے گزارہ نہ تھا۔ منجھلے ماموں کا تار آیا کہ ان کا بڑا لڑکا راحت پولیس کی ٹریننگ کے سلسلہ میں آرہا ہے۔ بی اماں کو تو بس جیسے ایک دم گھبراہٹ کا دورہ پڑ گیا۔ جانو چوکھٹ پر برات آن کھڑی ہوئی اور انہوں نے ابھی دلہن کی مانگ کی افشاں بھی نہیں کتری۔ ہول سے تو ان کے چھکے چھوٹ گئے۔ جھٹ اپنی منہ بولی بہن بندو کی ماں کو بلا بھیجا کہ

"بہن میرا مری کا منہ دیکھو جو اسی گھڑی نہ آؤ۔"

اور پھر دونوں میں کھسر پھسر ہوئی۔ بیچ میں ایک نظر دونوں کبریٰ پر بھی ڈال دیتیں جو دالان میں بیٹھی چاول پھٹک رہی تھی۔ وہ اس کانا پھوسی کی زبان کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔

اسی وقت بی اماں نے کانوں کی چار ماشہ کی لونگیں اتار کر منہ بولی بہن کے حوالے کیں کہ جیسے تیسے کر کے شام تک تولہ بھر گوکھرو چھ ماشہ سلمہ ستارا اور پاؤ گز نیفے کے لئے ٹول لا دیں۔ باہر کی طرف والا کمرہ جھاڑ پونچھ کر تیار کیا۔ تھوڑا سا چونا منگا کر کبریٰ نے اپنے ہاتھوں سے کمرہ پوت ڈالا۔ کمرہ تو چٹا ہو گیا مگر اس کی ہتھیلیوں کی کھال اڑ گئی اور جب وہ شام کو مسالہ پیسنے بیٹھی تو چکر کھا کر دوہری ہو گئی۔ ساری رات کروٹیں بدلتے گزری۔ ایک تو ہتھیلیوں کی وجہ سے دوسرے صبح کی گاڑی سے راحت آرہے تھے۔

"اللہ! میرے اللہ میاں! اب کے تو میری آپا کا نصیبہ کھل جائے۔ میرے اللہ میں سو رکعت نفل تیری درگاہ میں پڑھوں گی۔" حمیدہ نے فجر کی نماز پڑھ کر دعا مانگی۔

صبح جب راحت بھائی آئے تو کبریٰ پہلے ہی سے مچھروں والی کوٹھڑی میں جا چھپی تھی۔ جب سویوں اور پراٹھوں کا ناشتہ کر کے بیٹھک میں چلے گئے تو دھیرے دھیرے نئی دلہن کی طرح پیر رکھتی کبریٰ کوٹھڑی سے نکلی اور جھوٹے برتن اٹھا لئے۔

"لاؤ میں دھودوں بی آپا۔" حمیدہ نے شرارت سے کہا۔

"نہیں!" وہ شرم سے جھک گئی۔

حمیدہ چھیڑتی رہی' بی اماں مسکراتی رہیں اور کریب کے دوپٹے میں لپاتا نکتی رہیں۔

جس راستہ کان کی لونگیں گئی تھیں اسی راستے پھول' پتہ اور چاندی کی پازیب بھی چل دی اور پھر ہاتھوں کی دو دو چوڑیاں بھی جو مجھلے ماموں نے رنڈاپا اتارنے پر دی تھیں۔ روکھی سوکھی خود کھا کر آئے دن راحت کے لئے پراٹھے تلے جاتے' کوفتے' بھنا پلاؤ مہکتے۔ خود سوکھا نوالہ پانی سے اتار کر وہ ہونے والے داماد کو گوشت کے لچھے کھلاتیں۔

"زمانہ بڑا خراب ہے بیٹی۔" وہ حمیدہ کو منہ پھلاتے دیکھ کر کہا کرتیں اور وہ سوچا کرتی۔ "ہم بھوکے رہ کر داماد کو کھلا رہے ہیں۔ بی آپا صبح سویرے اٹھ کر جادو کی مشین کی طرح جٹ جاتی ہے۔ نہار منہ پانی کا گھونٹ پی کر راحت کے لئے پراٹھے تلتی ہے۔ دودھ اونٹاتی ہے تاکہ موٹی سی ملائی پڑے اس کا بس نہیں تھا کہ وہ اپنی چربی نکال کر ان پراٹھوں میں بھر دے' اور کیوں نہ بھرے' آخر کو وہ ایک دن اس کا اپنا ہو جائے گا۔ جو کچھ کمائے گا اس کی ہتھیلی پر رکھ دے گا' پھل دینے والے پودے کو کون نہیں سینچتا؟ پھر جب ایک دن پھول کھلیں گے اور پھلوں سے لدی ہوئی ڈالی جھکے گی تو یہ طعنہ دینے والیوں کے منہ پر کیسا جوتا پڑے گا اور اس خیال ہی سے میری بی آپا کے چہرے پر سہاگ کھل اٹھتا۔ کانوں میں شہنائیاں بجنے لگتیں اور وہ راحت بھائی کے کمرے کو پلکوں سے جھاڑتیں۔ ان کے کپڑوں کو پیار سے تہ کرتیں جیسے وہ کچھ ان سے کہتے ہوں۔ وہ ان کے بدبودار چوہوں جیسے سڑے ہوئے موزے دھوتیں' بساندی بنیان اور ناک سے لتھڑے ہوئے رومال صاف کرتیں۔ ان کے تیل میں چپچپاتے ہوئے تکئے کے غلاف پر سوئٹ ڈریم کاڑھتیں' پر معاملہ چاروں کونے چوکس نہیں بیٹھ رہا تھا۔ راحت صبح انڈے پراٹھے ڈٹ کر کھاتا اور شام کو آ کر کوفتے کھا کر سو جاتا اور بی اماں کی منہ بولی بہن حکیمانہ انداز میں کھسر پھسر کرتیں۔

"بڑا شرمیلا ہے بے چارہ۔" بی اماں تاویلیں پیش کرتیں۔ "ہاں یہ تو ٹھیک ہے پر بھئی کچھ تو پتہ چلے رنگ ڈھنگ سے' کچھ آنکھوں سے۔"

"اے نوج' خدا نہ کرے میری لونڈیا آنکھیں لڑائے' اس کا آنچل بھی نہیں دیکھا ہے کسی نے۔" بی اماں فخر سے کہتیں۔

"اے تو پردہ تڑوانے کو کون کہے ہے؟" بی اماں کے پکے مہاسوں کو دیکھ کر انہیں بی اماں کی دوراندیشی کی داد دینی پڑتی۔

"اے بہن تم تو سچ میں بہت بھولی ہو۔ میں یہ کب کہوں ہوں۔ یہ چھوٹی نگوڑی کون سی بکرید کو کام آئے گی؟" وہ میری طرف دیکھ کر ہنستیں۔ "اری او نک چڑھی! بہنوئی سے کوئی بات چیت' کوئی ہنسی مذاق' اونہہ' اری چل دیوانی۔"

"اے تو میں کیا کروں خالہ؟"

"راحت میاں سے بات چیت کیوں نہیں کرتی؟"

"بھئی ہمیں تو شرم آتی ہے۔"

"اے ہے وہ تجھے پھاڑ ہی تو کھائے گا۔" بی اماں چڑ کر بولتیں۔

"نہیں تو۔ مگر......." میں لاجواب ہو گئی اور پھر مسکوٹ ہوئی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد کھل کے کباب بنائے گئے۔ آج بی آپا بھی کئی بار مسکرا پڑیں' چپکے سے بولیں:

"دیکھو ہنسنا نہیں' نہیں تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔؟

"نہیں ہنسوں گی۔" میں نے وعدہ کیا۔

"کھانا کھا لیجئے۔" میں نے چوکی پر کھانے کی سینی رکھتے ہوئے کہا۔ پھر جوپٹی کے نیچے رکھے ہوئے لوٹے سے ہاتھ دھوتے وقت میری طرف سر سے پاؤں تک دیکھا تو میں بھاگی وہاں سے۔

میرا دل دھک دھک سے رکا۔ اللہ تو بہ کیا خناس آنکھیں ہیں۔

"جانگوڑی ماری ذرا دیکھ تو سہی وہ کیسا منہ بناتا ہے۔ اے ہے سارا مزا کرکرا ہو جائے گا۔"

آپا بی نے ایک بار میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں التجا تھی لوٹی ہوئی براتوں کا غبار تھا اور چوتھی کے پرانے جوڑوں کی مانند اُداسی۔ میں سر جھکائے پھر کھمبے سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

راحت خاموش کھاتے رہے میری طرف نہ دیکھا۔ کھلی کے کباب کھاتے دیکھ کر مجھے چاہئے تھا کہ مذاق اڑاؤں قہقہہ لگاؤں کہ "واہ جی واہ دولھا بھائی! کھلی کے کباب کھا رہے ہو۔" مگر جانو کسی نے میرا نرخرہ دبوچ لیا ہو۔

بی اماں نے جل کر مجھے واپس بلا لیا اور منہ ہی منہ میں مجھے کوسنے لگیں۔ اب میں ان سے کیا کہتی کہ وہ تو مزے سے کھا رہا ہے کم بخت۔ "راحت بھائی! کوفتے پسند آئے؟" بی اماں کے سکھانے پر میں نے پوچھا۔

جواب ندارد

"بتایئے نا؟"

"اری ٹھیک سے جا کر پوچھ۔" بی اماں نے ٹھوکا دیا۔

"آپ نے لا کر دیئے اور ہم نے کھائے مزیدار ہی ہوں گے۔"

"ارے واہ رے جنگلی۔" بی اماں سے نہ رہا گیا۔

"تمہیں پتہ بھی نہ چلا کیا مزے سے کھلی کے کباب کھا گئے۔"

"کھلی کے؟ ارے تو روز کا ہے کے ہوتے ہیں؟ میں تو عادی ہو چلا ہوں کھلی اور بھوسہ کھانے کا۔"

بی اماں کا منہ اتر گیا۔ بی آپا کی جھکی ہوئی پلکیں اوپر نہ اٹھ سکیں دوسرے روز بی آپا نے روزانہ سے دگنی سلائی کی اور پھر جب شام کو میں کھانا لے کر گئی تو بولے:

"کہیئے آج کیا لائی ہیں؟ آج تو لکڑی کے برادے کی باری ہے۔"

"کیا ہمارے ہاں کا کھانا آپ کو پسند نہیں آتا؟" میں نے جل کر کہا۔

"یہ بات نہیں کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کبھی کھلی کے کباب تو کبھی بھوسے کی ترکاری۔"

میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ ہم سوکھی روٹی کھا کے اسے ہاتھی کی خوراک دیں گھی ٹپکتے پراٹھے ٹھسائیں میری بی آپا کو جوشاندہ نصیب نہیں اور اسے دودھ ملائی نگلوائیں۔ میں بھنّا کر چلی آئی۔

بی اماں کی منہ بولی بہن کا نسخہ کام آ گیا اور راحت نے دن کا زیادہ حصہ گھر ہی میں گزارنا شروع کر دیا۔ بی آپا تو چولھے میں جھکی رہتیں بی اماں چوتھی کے جوڑے سیا کرتیں اور راحت کی غلیظ آنکھیں تیر بن کر میرے دل میں چبھا کرتیں۔ بات بے بات چھیڑنا کھانا کھلاتے وقت کبھی پانی تو کبھی نمک کے بہانے سے اور ساتھ ساتھ جملہ بازی۔ میں کھسیا کر بی آپا کے پاس جا کر بیٹھتی۔ جی چاہتا کسی دن صاف

کہہ دوں کہ کس کی ککڑی اور کون ڈالے دانہ گھاس۔ اے بی مجھ سے تمہارا یہ قتل نہ ناتھا جائے گا۔ مگر بی آپا کے لٹکے ہوئے بالوں پر چولہے کی اڑتی ہوئی راکھ...... نہیں...... میرا کلیجہ دھک سے ہو گیا۔ میں نے ان کے سفید بال لٹ کے نیچے چھپا دیئے۔ ستیاناس جائے اس کم بخت نزلہ کا بچاری کے بال پکنے شروع ہو گئے۔

راحت نے پھر کسی بہانہ سے مجھے پکارا۔

"ہونہہ!" میں جل گئی۔ پر بی آپا نے کٹی ہوئی مرغی کی طرح جو پلٹ کر دیکھا تو مجھے جانا ہی پڑا۔

"آپ ہم سے خفا ہو گئیں؟" راحت نے پانی کا کٹورا لے کر میری کلائی پکڑ لی۔ میرا دم نکل گیا اور بھاگی تو ہاتھ جھٹک کر۔

"کیا کر رہے تھے؟" بی آپا نے شرم و حیا سے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔ میں چپ چاپ ان کا منہ تکنے لگی۔

"کہہ رہے تھے کس نے پکایا ہے کھانا۔ واہ واہ! جی چاہتا ہے کھاتا ہی چلا جاؤں' پکانے والی کے ہاتھ کھا جاؤں...... اوہ نہیں...... کھا نہیں لوں بلکہ چوم لوں۔" میں نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا اور بی آپا کا کھردرا ہلدی دھنیا کی بساند میں سڑا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ سے لگا لیا۔ میرے آنسو نکل آئے۔ "یہ ہاتھ" میں نے سوچا جو صبح سے شام تک مسالہ پیستے ہیں' پانی بھرتے ہیں' پیاز کاٹتے ہیں' بستر بچھاتے ہیں' جوتے صاف کرتے ہیں' یہ بے کس غلام صبح سے شام تک جٹے ہی رہتے ہیں۔ ان کی بیگار کب ختم ہو گی۔ کیا ان کا کوئی خریدار نہ آئے گا؟ کیا انہیں کبھی کوئی پیار سے نہ چومے گا؟ کیا ان میں کبھی مہندی نہ رچے گی؟ کیا ان میں کبھی سہاگ کا عطر نہ بسے گا؟ جی چاہا زور سے چیخ پڑوں۔

"اور کیا کہہ رہے تھے؟" بی آپا کے ہاتھ تو اتنے کھردرے تھے پر آواز اتنی رسیلی اور میٹھی تھی کہ اگر راحت کے کان ہوتے تو......
مگر راحت کے نہ کان تھے نہ ناک بس دوزخ جیسا پیٹ تھا۔

"اور کہہ رہے تھے اپنی بی آپا سے کہنا کہ اتنا کام نہ کیا کریں اور جوشاندہ پیا کریں۔"

"چل جھوٹی۔"

"ارے واہ جھوٹے ہوں گے آپ کے وہ......"

"اری چپ مردار!" انہوں نے میرا منہ بند کر دیا۔

"دیکھ تو سوئٹر بن گیا ہے انہیں دے آ۔ پر دیکھ تجھے میری قسم میرا نام نہ لیجیو۔"

"نہیں بی آپا۔ انہیں نہ دو وہ سوئٹر۔ تمہاری ان مٹھی بھر ہڈیوں کو سوئٹر کی کتنی ضرورت ہے؟" میں نے کہنا چاہا پر نہ کہہ سکی۔

"آپا بی! تم خود کیا پہنو گی؟"

"ارے مجھے کیا ضرورت ہے؟ چولہے کے پاس تو ویسے ہی جھلسن رہتی ہے۔"

سوئٹر دیکھ کر راحت نے اپنی ایک ابرو شرارت سے اُوپر تان کر کہا:

"کیا یہ سوئٹر آپ نے بنا ہے؟"

"نہیں تو۔"

"تو بھئی ہم نہیں پہنیں گے۔"

میرا جی چاہا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ کمینے' مٹی کے تھودے' یہ سوئٹر ان ہاتھوں نے بنا ہے جو جیتے جاگتے غلام ہیں۔ اس کے ایک ایک پھندے میں کسی نصیبوں جلی کے ارمانوں کی گردنیں پھنسی ہوئی ہیں' یہ ان ہاتھوں سے بنا ہوا ہے جو ننھے پنگورے جھلانے کے لئے

بنائے گئے ہیں۔ ان کو تمام لوگ گدھے کہیں گے اور یہ دو پتوار بڑے سے بڑے طوفان کے تھپیڑوں سے تمہاری زندگی کی ناؤ کو بچا کر پار لگا دیں گے۔ یہ ستار کی گیت نہ بجا سکیں گے منی پوری اور بھارت ناٹیم کے مدرانہ دکھا سکیں گے' انہیں پیانو پر رقص کرنا نہیں سکھایا گیا' انہیں پھولوں سے کھیلنا نہیں نصیب ہوا۔ مگر یہ ہاتھ تمہارے جسم پر چربی چڑھانے کے لئے صبح سے شام تک سلائی کرتے ہیں۔ صابن اور سوڈے میں ڈبکیاں لگاتے ہیں' چولھے کی آنچ سہتے ہیں' تمہاری غلاظتیں دھوتے ہیں تاکہ تم اُجلے چٹے بگلا بھگتی کا ڈھونگ رچائے رہو' محنت نے ان میں زخم ڈال دیے ہیں' ان میں کبھی چوڑیاں نہیں کھنکتی ہیں۔ انہیں کبھی کسی نے پیار سے نہیں تھاما۔

مگر میں چپ رہی۔ بی اماں کہتی ہیں میرا دماغ تو میری نئی نئی سہیلیوں نے خراب کر رکھا ہے۔ وہ مجھے کیسی نئی نئی باتیں بتایا کرتی ہیں۔ کیسی ڈراونی موت کی باتیں' بھوک اور کال کی باتیں' دھڑکتے ہوئے دل کے ایک دم چپ ہو جانے کی باتیں۔

"یہ سوئٹر تو آپ ہی پہن لیجئے۔ دیکھئے نا آپ کا کرتہ کتنا باریک ہے۔؟"

جنگلی بلی کی طرح میں نے اس کا منہ' ناک' گریبان اور بال نوچ ڈالے اور اپنی پلنگڑی پر جا گری۔ بی آپا نے آخری روٹی ڈال کر جلدی جلدی تسلے میں ہاتھ دھوئے اور آنچل سے پونچھتی میرے پاس آ بیٹھیں۔

"وہ بولے؟" ان سے نہ رہا گیا تو دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

"بی آپا! یہ راحت بھائی بڑے خراب آدمی ہیں" میں نے سوچا میں آج سب کچھ بتا دوں گی۔

"کیوں؟" وہ مسکرائیں۔

"مجھے اچھے نہیں لگتے.......دیکھئے میری ساری چوڑیاں چورہ ہو گئیں۔" میں نے کانپتے ہوئے کہا۔

"بڑے شریر ہیں۔" انہوں نے رومانٹک آواز میں شرمائے کہا۔

"بی آپا.... سنو بی آپا۔ یہ راحت اچھے آدمی نہیں۔" میں نے سلگ کر کہا۔ "آج میں بی اماں سے کہہ دوں گی۔"

"کیا ہوا؟" بی اماں نے جاء نماز بچھاتے ہوئے کہا۔

"دیکھو میری چوڑیاں بی اماں۔"

"راحت نے توڑ ڈالیں؟" بی اماں مسرت سے چہک کر بولیں۔

"ہاں!"

"خوب کیا۔ تو اسے ستاتی بھی تو بہت ہے۔ اے ہے تو دم کاہے کو نکل گیا۔ بڑی موم کی بنی ہوئی ہو کہ ہاتھ لگایا اور پگھل گئیں۔" پھر چمکار کر بولیں۔ "خیر تو بھی چوتھی میں بدلہ لے لیجو' وہ کسر نکالیو کہ یاد ہی کریں میاں جی۔" یہ کہہ کر انہوں نے نیت باندھ لی۔

منہ بولی بہن سے پھر کانفرنس ہوئی اور معاملات کو امید افزا راستے پر گامزن دیکھ کر از حد خوشنودی سے مسکرایا گیا۔

"اے ہے تو تو بڑی ہی ٹھس ہے۔ اے ہم تو اپنے بہنوئیوں کا خدا کی قسم ناک میں دم کر دیا کرتے تھے۔"

اور وہ مجھے بہنوئیوں سے چھیڑ چھاڑ کے ہتھکنڈے بتانے لگیں کہ کس طرح انہوں نے صرف چھیڑ چھاڑ کے تیر بہدف نسخے سے ان دو ممیری بہنوں کی شادی کرائی جن کی ناؤ پار لگنے کے سارے موقعے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ایک تو ان میں سے حکیم جی تھے جہاں بچارے کو لڑکیاں بالیاں چھیڑتیں شرمانے لگتے اور شرماتے اختلاج کے دورے پڑنے لگتے اور ایک دن ماموں صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے غلامی میں لے لیجئے۔

دوسرے وائسرائے کے دفتر میں کلرک تھے جہاں سنا کہ باہر آئے ہیں لڑکیاں چھیڑنا شروع کر دیتی تھیں۔ کبھی گلوریوں میں

مر فلیں بھر کے بھیج دیں کبھی سویوں میں نمک ڈال کر کھلا دیا۔

اے لو وہ تو روز آنے لگے۔ آندھی آئے پانی آئے کیا مجال جو وہ نہ آئیں۔ آخر ایک دن کہلوا ہی دیا۔ اپنے ایک جان پہچان والے سے کہا کہ ان کے ہاں شادی کرا دو۔ پوچھا کہ "بھئی کس سے؟" تو کہلا "کسی سے بھی کرا دو۔" اور خدا جھوٹ نہ بلائے تو بڑی بہن کی صورت تھی کہ دیکھو تو جیسے بچا چلا آتا ہے۔ چھوٹی تو بس سبحان اللہ۔ ایک آنکھ پورب تو دوسری پچھم۔ پندرہ تولے سونا دیا ہے باپ نے اور بڑے صاحب کے دفتر میں نوکری الگ دلوائی۔"

"ہاں بھئی جس کے پاس پندرہ تولے سونا ہو اور بڑے صاحب کے دفتر کی نوکری اسے لڑکا ملتے کیا دیر لگتی ہے؟" بی اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔ "یہ بات نہیں ہے بہن۔ آج کل کے لڑکوں کا دل بس تھالی کا بیگن ہوتا ہے۔ جدھر جھکاؤ ادھر ہی لڑھک جائے گا۔"

مگر راحت تو بیگن نہیں اچھا خاصا پہاڑ ہے۔ جھکاؤ دینے پر کہیں میں ہی نہ پس جاؤں۔ میں نے سوچا۔ پھر میں نے آپا کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش دہلیز پر بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھیں اور سب کچھ سنتی جا رہی تھیں۔ ان کا بس چلتا تو زمین کی چھاتی پھاڑ کر اپنے کنوار پتے کی لعنت سمیت اس میں سما جاتیں۔

"کیا میری آپا مرد کی بھوکی ہے؟ نہیں وہ بھوک کے احساس سے پہلے ہی سہم چکی ہے۔ مرد کا تصور اس کے ذہن میں ایک اُمنگ بن کر نہیں اُبھرا بلکہ روٹی کپڑے کا سوال بن کر ابھرا ہے۔ وہ ایک بیوہ کی چھاتی کا بوجھ ہے' اس بوجھ کو دھکیلنا ہی ہوگا۔"

مگر اشاروں کنایوں کے باوجود راحت میاں نہ تو خود منہ سے پھوٹے اور نہ ان کے گھر ہی سے پیغام آیا۔ تھک ہار کر بی اماں نے پیروں کی توڑے گروی رکھ کر پیر مشکل کشا کی نیاز دلا ڈالی دوپہر بھر محلے ٹولے کی لڑکیاں صحن میں اودھم مچاتی رہیں۔ بی آپا شرمائی لجائی مچھروں والی کوٹھڑی میں اپنے خون کی آخری بوندیں' چسانے کو جا بیٹھیں۔ بی اماں کمزوری میں اپنی چوکی پر بیٹھی چوتھی کے جوڑے میں آخری ٹانکے لگاتی رہیں۔ آج ان کے چہرے پر منزلوں کے نشان تھے' آج مشکل کشائی ہو گی' بس آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں' وہ بھی نکل جائیں گی' آج ان کی جھریوں میں پھر مشعلیں تھرتھرا رہی تھیں۔ بی آپا کی سہیلیاں ان کو چھیڑ رہی تھیں اور وہ خون کی بچی کچھی بوندوں کو تاؤ میں لا رہی تھیں۔ آج کئی روز سے ان کا بخار نہیں اُترا تھا۔ تھکے ہارے دیے کی طرح ان کا چہرہ ایک بار ٹمٹماتا اور پھر بجھ جاتا۔ اشارے سے انہوں نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ اپنا آنچل ہٹا کر نیاز کے ملیدے کی طشتری مجھے تھما دی۔

"اس پر مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔" ان کی بخار سے دہکتی ہوئی گرم گرم سانس میرے کان میں لگی۔

طشتری لے کر میں سوچنے لگی۔ مولوی صاحب نے دم کیا ہے۔ یہ مقدس ملیدہ اب راحت کے تندور میں جھونکا جائے گا۔ وہ تندور جو چھ مہینے سے ہمارے خون کے چھینٹوں سے گرم رکھا گیا۔ یہ دم کیا ہوا ملیدہ مراد بر لائے گا۔ میرے کانوں میں شادیانے بجنے لگے۔ میں بھاگی بھاگی کوٹھے سے برات دیکھنے جا رہی ہوں' دولہا کے منہ پر لمبا سا سہرا پڑا ہے جو گھوڑے کی ایالوں کو چوم رہا ہے ......

چوتھی کا شہابی جوڑا پہنے پھولوں سے لدی' شرم سے نڈھال' آہستہ آہستہ قدم تولتی بی آپا چلی آ رہی ہیں...... چوتھی کا زرتار جوڑا جھلمل جھلمل کر رہا ہے' بی اماں کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا ہے...... بی آپا کی حیا سے بوجھل نگاہیں ایک بار اوپر اٹھتی ہیں۔ شکریے کا ایک آنسو ڈھلک کر افشاں کے ذروں میں قمقمے کی طرح اُلجھ جاتا ہے۔

"یہ سب تیری ہی محنت کا پھل ہے۔" بی آپا کی خاموشی کہہ رہی ہے...... حمیدہ کا گلا بھر آیا.........

"جاؤ نہ میری بہنو بی آپا نے اسے جگا دیا اور وہ چونک کر اوڑھنی کے آنچل سے آنسو پونچھتی ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔

"یہ ......یہ ملیدہ" اس نے اُچھلتے ہوئے دل کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا......اس کے پیر لرز رہے تھے جیسے وہ سانپ کی بانبی میں

گھس آئی ہو اور پھر پہاڑ کھسکا.......! اور منہ کھول دیا۔ وہ ایک دم پیچھے ہٹ گئی۔ مگر دور کہیں شہنائیوں نے چیخ لگائی جیسے کوئی ان کا گلا گھونٹ رہا ہو۔ کانپتے ہاتھوں سے مقدس ملیدہ کا نوالہ بنا کر اس نے راحت کے منہ کی طرف بڑھا دیا۔

ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ پہاڑ کی کھوہ میں ڈوبتا چلا گیا....... نیچے تعفن اور تاریکی کے اتھاہ غار کی گہرائیوں میں، اور ایک بڑی سی چٹان نے اس کی چیخ کو گھونٹ دیا۔

نیاز کے ملیدے کی رکابی ہاتھ سے چھوٹ کر لالٹین کے اوپر گری اور لالٹین نے زمین پر گر کر دو چار سسکیاں بھریں اور گل ہو گئی۔ باہر آنگن میں محلہ کی بہو بیٹیاں مشکل کشا کی شان میں گیت گا رہی تھیں۔

صبح کی گاڑی سے راحت مہمان نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوا روانہ ہو گیا۔ اس کی شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی اور اسے جلدی تھی۔

اس کے بعد اس گھر میں کبھی انڈے نہ تلے گئے، پراٹھے نہ سکے اور سوئٹر نہ بنے گئے۔ دق نے جو ایک عرصہ سے بی آپا کی تاک میں بھاگی پیچھے پیچھے آ رہی تھی ایک ہی جست میں انہیں دبوچ لیا اور انہوں نے چپ چاپ اپنا نامراد وجود اس کی آغوش میں سونپ دیا۔

اور پھر اسی سہ دری میں چوکی پر صاف ستھری جازم بچھائی گئی۔ محلے کی بہو بیٹیاں جڑیں، کفن کا سفید سفید لٹھا موت کے آنچل کی طرح بی اماں کے سامنے پھیل گیا۔ تحمل کے بوجھ سے ان کا چہرہ لرز رہا تھا، بائیں ابرو پھڑک رہی تھی گالوں کی سنسان جھریاں بھائیں بھائیں کر رہی تھیں جیسے ان میں لاکھوں اژدہے پھنکار رہے ہوں۔

لٹھے کی کان نکال کر انہوں نے چوپرتہ کیا، اور ان کے دل میں ان گنت قینچیاں چل گئیں۔ آج ان کے چہرے پر بھیانک سکون اور ہرا بھرا اطمینان تھا جیسے انہیں پکا یقین ہو کہ دوسرے جوڑوں کی طرح چوتھی کا یہ جوڑا سینتا نہ جائے۔

ایک دم سہ دری میں بیٹھی لڑکیاں، بالیاں میناؤں کی طرح چہکنے لگیں۔ حمیدہ ماضی کو دور جھٹک کر ان کے ساتھ جا ملی۔ لال ٹول پر .... سفید گزی کا نشان! اس کی سرخی میں نہ جانے کتنی معصوم دلہنوں کا سہاگ رچا ہے اور سفیدی میں کتنی نامراد کنواریوں کے کفن کی سفیدی ڈوب کر ابھری ہے اور پھر سب ایک دم خاموش ہو گئے۔ بی اماں نے آخری ٹانکہ بھر کے ڈورہ توڑ لیا۔ دو موٹے موٹے آنسو ان کے روئی جیسے نرم گالوں پر دھیرے دھیرے رینگنے لگے ان کے چہرے کی شکنوں میں سے روشنی کی کرنیں پھوٹ نکلیں اور وہ مسکرا دیں جیسے آج انہیں اطمینان ہو گیا کہ ان کی کبریٰ کا سوہا جوڑا بن کر تیار ہو گیا ہو اور کوئی دم میں شہنائیاں بج اٹھیں گی۔

ہماری گلی

احمد علی

احمد علی کا ایک افسانہ "مہاوٹوں کی ایک رات" اس سے پہلے بھی پیش کیا گیا ہے لیکن وہ افسانہ ان کے فن کی نمائندگی نہیں کرتا۔ پہلے افسانے کی شمولیت سے محض ایک وقتی رجحان کی نشان دہی مقصود ہے۔

(مرتب)

میرا مکان پنڈت کے کوچہ میں تھا۔ میرے کمرے کے دروازے میں دو پٹ تھے۔ نیچے کا حصہ بند کر دینے سے صرف اوپر کا حصہ ایک کھڑکی کی طرح کھلا رہ جاتا تھا۔ یہ کھڑکی پتلی سڑک پر کھلتی تھی۔ سامنے مرزا دودھ والے کی دکان تھی اور میرے دروازہ کے برابر صدیق بنئے کی اور اس کے برابر عزیز خرادی کی اور آس پاس کہاروں کی دکانیں' عطار کی دکان' پان والے کی اور دو چار اور دکانیں تھیں۔ مثلاً قصائی کی' بساطی کی' حلوائی کی دکان۔

ہمارے محلہ میں سے ہو کر لوگ دوسرے محلوں میں جا سکتے تھے۔ اس لئے سڑک برابر چلا کرتی تھی اور اس طرح کے لوگ راستہ بچانے کے لئے میری کھڑکی کے سامنے سے گذرتے۔ کبھی کوئی سفید پوش گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں چھتری لگائے ہوئے چلا جاتا۔ کبھی شام کو کوئی ولایتی منڈا پہنے انگریزی ٹوپی لگائے چھڑکاؤ کے پانی سے بچتا ہوا اور اپنے کپڑوں کو چھینٹوں سے بچاتا' بچوں اور لڑکوں سے کتراتا ہوا ان کے گھورنے پر غراتا اور آنکھیں نکالتا ہوا گذر جاتا۔ کبھی کبھی راہگیر عاجز آ کر لڑکوں کو مارنے کے لئے لکڑی یا چھڑی اٹھاتا۔ دور بھاگ کر لڑکے چلاتے "لولو ہے بے لولو ہے۔" پھر مرزا دودھ والے کی بھرائی ہوئی آواز سنائی دیتی۔

"ابے لمڈو! کیا کرتے ہو۔ تم کو گھروں میں کچھ کام نہیں؟" اور اگر کوئی پاس بیٹھا ہوتا تو مرزا اس سے کہنے لگتا۔ "ان کی ماؤں کو تو دیکھو' لونڈوں کو چھوڑ رکھا ہے کہ سانڈ بیلوں کی طرح گلیوں میں رولا مچایا کریں۔ حرامزادوں کو گالی گلوچ اور دھینگا مشتی کے علاوہ اور کچھ کام ہی نہیں۔"

اور مرزا کی چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھیں چمکنے لگتیں اور وہ اپنی سفید تکونی داڑھی پر ایک ہاتھ پھیرتا اور کسی خریدار کی طرف مخاطب ہو جاتا اور کونڈے میں سے دہی یا کڑھاؤ میں سے دودھ نکال کر ملائی کا ٹکڑا اڑاتا اور خریدار کی طرف بڑھا دیتا۔

لوگ کہتے تھے کہ مرزا کی رگوں میں شریف خون دورہ کرتا ہے' لڑکپن میں سبق نہ یاد کرنے پر اس کے باپ نے اس کو گھر سے نکال دیا اور کچھ روز مارے مارے پھرنے کے بعد اس نے دکان کر لی۔ اس کے بعد اکثر اس کے باپ نے اس سے معافی بھی مانگی اور خوشامد بھی کی۔ لیکن مرزا نے شادی کر لی اور اس کا کام چل نکلا۔ اس کی دوکان کے چھوٹے چھوٹے ملائی کے پیڑے شہر بھر میں مشہور تھے اور اس

کا دودھ بہت لذیذ ہوتا تھا۔ رات کو جب کوئی دودھ لینے آتا تو وہ اس کو آبخورے اور لٹیا میں خوب اچھالتا۔ یہاں تک کہ اس میں سے جھاگ نکلنے لگتا۔ پھر کھچے سے ملائی کا ٹکڑا اس صفائی سے توڑتا کہ دودھ ہلنے تک نہ پاتا۔ اکثر اس کی بیوی دکان پر بیٹھتی تھی۔ وہ بوڑھی ہو گئی تھی۔۔۔ اس کے چہرے پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں' اس کی کمر جھک گئی تھی اور منہ میں ایک دانت باقی نہ تھا۔ اس کی اونچی پیشانی اور اس کے گورے رنگ سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی اچھے گھرانے کی عورت ہے۔

لیکن اب ان کا کاروبار کم ہو گیا تھا۔ کیونکہ ضعیفی کی وجہ سے وہ زیادہ محنت نہ کر سکتے تھے۔ ان کا اکلوتا بیٹا مر چکا تھا اور اب ان کا ہاتھ بٹانے والا کوئی نہ تھا۔ ترک موالات کے زمانے میں جب آزادی کا خیال ملک میں ادھر سے اُدھر تک ہلچل مچائے تھا' مرزا کا لڑکا اپنے دوستوں کے ساتھ جلوس میں شریک ہوا۔ گاندھی جی کی جے اور بندے ماترم کے نعروں سے فضا گونج رہی تھی گھنٹہ گھر پر گوروں کی فوجیں مسلح کھڑی تھیں۔ کپتان پولیس' ڈپٹی کمشنر اور چند اور انگریز کھڑے تھے اور لوگوں کے ہجوم اور قومی غصہ کو پریشانی سے دیکھ رہے تھے۔ لوگ آگے جانا چاہتے تھے لیکن فوجیں ان کو آگے جانے سے روک رہی تھیں۔ لوگوں نے آگے بڑھنے کی کوشش کی اور ڈپٹی کمشنر نے گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں بہت لوگ کام آئے اور مرزا کا بیٹا بھی مرنے والوں میں تھا۔ بڑی دیر کے بعد جب لاش لے جانے کی اجازت ملی تو لوگ مرزا کے لڑکے کی لاش کو اس کے گھر لائے۔

ساری دکانیں بند تھیں اور محلہ میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جاڑوں کی دھوپ مردہ اور سرد معلوم ہوتی تھی۔ نالیوں میں صفائی نہ ہوئی تھی اور ان میں سے سڑانڈ پھوٹ رہی تھی۔ جب لاش گھر میں آئی تو مرزا اور اس کی بیوی سکتے کے عالم میں رہ گئے۔ ان کو کسی طرح یقین نہ آتا تھا کہ ان کا بیٹا جو ابھی زندہ تھا' ہنس بول رہا تھا' جس نے صبح ہی کپڑے تیار کئے تھے 'کڑھاؤ مانجھا تھا۔ جو کپڑے بدل کر اپنے کسی دوست سے ملنے گیا تھا اب زندہ نہیں ہے بلکہ مر چکا ہے۔ وہ بار بار خون میں لتھڑی ہوئی لاش کو دیکھتے تھے اور مرزا کی بیوی لاش سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ لوگوں نے اس کو الگ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک منٹ کے لئے لاش سے علیحدہ نہ ہوتی تھی' وہ "یہ ہے میرا لال" کہہ کہہ کر روتی تھی اور کبھی کبھی اس کے منہ سے چیخ نکلتی اور وہ چلاتی۔

"ان فرنگیوں کو خدا غارت کرے' میرے لال کو مجھ سے چھین لیا۔ خدا کرے کہ یہ غارت ہوں۔"

مرزا پاگلوں کی طرح کبھی گھر کے اندر کبھی باہر بولایا ہوا پھرتا تھا۔ صدیق بنئے نے اپنی دکان کھولی تھی اور مرزا جو بال بکھیرے ہوئے ادھر سے گذرا تو کسی نے آواز دی اور پوچھا۔ بھائی بڑا افسوس ہوا اور حادثہ کیا پیش آیا؟"

مرزا کی آنکھوں میں ایک آنسو باقی نہ تھا لیکن اس کے سارے چہرے پر کرب کی حالت تھی۔

"تقدیر پھوٹ گئی۔ میرا پلا پلایا لڑکا جاتا رہا۔" یہ کہہ کر مرزا پھر گھر کی طرف چلا گیا۔

گاہک جو کھڑے ہوئے تھے پوچھنے لگے کیا ہوا۔ صدیق نے جھک کر دیکھا۔ اسی وقت ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور سڑک پر گرد و غبار اڑنے لگا۔ ایک کاغذ کا ٹکڑا ہوا میں اٹھا اور کچھ دور اوپر جا کر الٹتا پلٹتا نیچے کی طرف گرنے لگا۔ مرزا کے پھٹے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے اور وہ گلی میں غائب ہو گیا۔

"ہوا کیا۔ ترک موالات کرنے گیا تھا' گولی لگی اور مر گیا۔ نہ جانے اپنے کام میں دل کیوں نہیں لگاتے۔ سرکار کے خلاف جانے کا یہی نتیجہ ہے۔ تگڑا جوان تھا۔ ان دوزخ کے چیونٹوں اور کھدر پوشوں کا شکار ہو گیا۔"

یہ کہتے کہتے صدیق نے ایک مٹکے میں کفگیر ڈالا۔ بہت سے مٹکے دیوار میں گڑے ہوئے تھے اور کابک کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ کفگیر میں دال نکال کر صدیق نے گاہک کی طرف بڑھائی۔ گاہک جو بے غوری سے صدیق کی باتیں سن رہا تھا۔ دال کو اپنے کپڑے میں باندھنے لگا۔ یکایک اس کی نگاہ دال پر پڑی اور وہ بولا۔ "واہ میاں باشا' یہ کونسی دال دے رہے ہو۔ میں نے تو ارہر کی مانگی تھی۔ ذری پھرتی

کرو۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ بیوی بکے گی۔"

گھر میں مرزا کی بیوی اپنا سر دے دے مار رہی تھی اور بین کر کر کے روتی تھی اور انگریزوں اور گاندھی کو کوستی تھی۔ یامین کی ماں کو جب اس حادثے کی خبر ملی تو وہ پرسے کے لئے آئی۔ اس کا جوان لڑکا بھی دیوار کے نیچے دب کر مر گیا تھا اور وہ اس کے ننھے بچوں کو سلائی کر کے پالتی تھی۔ دونوں گلے مل کر خوب روئیں اور مرزا کی بیوی کو ذرا تسلی ہوئی...... آخر کار لڑکے کو دفن کرنے لے گئے۔

رات اندھیری تھی اور بے بسی تاریکی کی طرح سارے محلہ میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہوا سرد تھی اور محلہ میں سیل کی وجہ سے جاڑا زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ لیمپوں کی دھیمی روشنی میں محلہ بھیانک اور ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا اور سڑک پر کوئی جاندار چیز دکھائی نہ دیتی تھی۔ صرف مرزا کی دکان کے اندر کئی بلیوں کے غرانے اور کھڑبڑ کی آواز آ رہی تھی۔

اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد تک مرزا کی بیوی کے گانے کی آواز آیا کرتی تھی:

ع گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے

لیکن پھر وہ خاموش رہنے لگی اور کام کاج میں مشغول رہتی۔

میرے مکان کی ڈیوڑھی میں ایک پرانا کھجور کا درخت تھا۔ ایک زمانہ میں اس میں پھل لگا کرتے تھے اور شہد کی مکھیاں غذا کی تلاش میں نیچے اتر آتی تھیں۔ اس کی بڑی ڈالیوں پر اکثر جانور آ کر بیٹھتے اور بھولے بھٹکے کبوتر راتوں کو بسیرا کر لیا کرتے تھے لیکن اب اس کے پتے جھڑ گئے تھے ڈالیاں گر چکی تھیں اور اس کا تنا سیاہ اور بدہیبت رات کی تاریکی میں اس بانس کی طرح کھڑا رہتا جو کھیتوں میں جانوروں کو ڈرانے کے لئے گاڑ دیا جاتا ہے۔ اب نہ اس پر جانور منڈلاتے تھے نہ شہد کی مکھیاں اس طرف آتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی کوا اس کے ٹھنٹھ پر بیٹھ کر کائیں کائیں کرتا اور اپنا گلا پھاڑتا یا کوئی چیل اس پر ذرا دیر کو چلچلاتی اور پھر اڑ جاتی۔ صبح کی بڑھتی ہوئی روشنی میں تنا آسمان پر چمک اٹھتا تھا۔ لیکن شام کو فضا کی بڑھتی تاریکی میں آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا اور رات میں مل جاتا۔ رات کو اکثر گھر میں داخل ہوتے وقت میری نگاہ اس موٹے اور بھیانک تنے پر پڑتی۔ پھر اس کے ساتھ ساتھ اٹھتی ہوئی آسمان پر جاتی۔ تارے چمکتے ہوتے تھے اور ٹھیک اس کے سرے پر بنات النعش کا آخری ستارہ مجھ کو دکھائی دیتا تھا لیکن وہ تنا میری نگاہ اور آسمان کے درمیان حائل ہو جاتا اور میں تاروں کے پھیلاؤ کو نہ دیکھ سکتا۔

محلہ میں اکثر ایک پاگل عورت آیا کرتی تھی۔ کسی نے اس کے بال کاٹ دیئے تھے اور اس کا سر اس کے توانا اور بھاری جسم پر ایک اخروٹ کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ خدا ترس لوگ کبھی کبھی اسے کپڑے پہنا دیا کرتے تھے۔ لیکن چند ہی گھنٹوں کے بعد وہ پھر ننگی ہو جاتی تھی۔ یا تو کوئی کپڑوں کو اتار لیتا یا وہ خود ان کو پھاڑ کر پھینک دیتی تھی۔ اس کے منہ سے ہمیشہ رال بہا کرتی اور اس کے ہاتھ ہمیشہ اکڑے ہوئے رہتے۔ وہ اکثر مٹک مٹک کر سڑک پر ناچتی اور تھرکتی اور گونگوں کی طرح گن گن کرتی جیسے ہی وہ محلہ میں داخل ہوتی لڑکوں کا ایک غول اس کے پیچھے پیچھے تالیاں بجاتا اور "پگلی" کہہ کہہ کر پتھر پھینکتا اور منہ چڑاتا۔ عورت "ایں ایں" کرتی اور کونوں میں چھپتی۔ جب کبھی مرزا کی دکان کے سامنے یہ واقعہ ہوتا تو مرزا لڑکوں پر چیختا۔ "ابے سسرو! تمہیں مرنا نہیں ہے! بھاگو یہاں سے دور رہو۔"

لیکن ذرا دیر کے بعد لڑکے پھر جمع ہو جاتے۔

اکثر بڑے آدمی بھی اس سے مذاق کرتے۔ وہ بد صورت ضرور تھی لیکن اس کی عمر زیادہ نہ تھی۔ اس کا پیٹ بڑھا ہوا تھا۔ اکثر منو، جو کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا تھا لیکن اب بدمعاشوں میں مل گیا تھا۔ اس کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر کہتا۔ "کیوں، تیرے بچہ کب ہو گا؟"

اور پگلی ایک دردانگیز وحشیانہ آواز نکالتی اور اپنے ہاتھ آگے بڑھا کے جو ڈھیلے اور لجلجے رہتے کسی راہ گیر یا دوکاندار سے مخاطب ہو کر منو کی طرف اشارہ کرتی۔ اس کی کریہہ آواز میں ایک منت ہوتی تھی، ایک بے کس و بے بس شخص کی وہ التجا جو وہ اپنے حاکم یا اپنے سے زیادہ

طاقتور انسان سے کرتا ہے کہ مجھے بخش دو اور بچالو۔ مگر اور لوگ بھی مذاق کرنے میں شریک ہو جاتے اور زور زور سے قہقہہ لگاتے.......

ہندوستان میں ہزارہا لوگ ایسے ہیں جن کو سوائے کھانے پینے اور مر جانے کے کسی بات کا احساس نہیں۔ وہ پیدا ہوتے ہیں' بڑھتے ہیں' کمانے لگتے ہیں' کھاتے پیتے ہیں اور مر جاتے ہیں' اس کے علاوہ انہیں دنیا کی کسی بات سے کوئی واسطہ نہیں۔ انسانیت کی بوان میں نہیں ہوتی۔ زندگی کی عظمت کا ان کو کوئی احساس نہیں جیسے غلام جو کام کرنے اور مرنے کے علاوہ کوئی دوسری حقیقت ہی نہیں جانتے۔ زندگی کا طلوع اور موت کا غروب ان کے لئے دونوں یکساں ہیں۔ ان کے لئے دن کام کرنے اور راتیں سو رہنے کو بنی ہیں۔ بس یہی ان کی زندگی کی حقیقت ہے ____ اور صرف موت ان کو زندگی سے نجات دلا سکتی ہے۔

ایک اور چیز جو ہمارے محلے میں کثرت سے دکھائی دیتی تھی' وہ کتے تھے۔ مرے ہوئے اور فاقہ زدہ۔ اکثر کو کھجلی تھی اور ان کی کھال میں سے گوشت نظر آتا تھا۔ اپنے بڑے بڑے دانتوں کو نکوس کر وہ اپنے پٹھے کھجاتے تھے۔ یا قصائی کی دکان کے سامنے ایک ہڈی کے پیچھے ایک دوسرے کو نوچتے اور لہولہان کر دیتے۔ وہ اپنی دُمیں ٹانگوں کے بیچ میں دبائے نالیوں میں سونگھتے دبے دبے آتے تھے اور قصائی کی دکان کے سامنے چھیچھڑوں پر جھپٹتے۔ لیکن اکثر جیسے ہی ان کو کوئی گوشت کا ٹکڑا یا ہڈی دکھائی دیتی تو چیلیں اوپر سے جھپٹا مارتیں اور ان کے سامنے سے گوشت کو اٹھالے جاتیں۔ پھر وہ ایک ایسے آدمی کی طرح جو خفیف ہو گیا ہو' اپنی دم دبائے ہوئے سڑک کو سونگھا کرتے یا اپنی جھینپ آپس میں لڑائی لڑ کے اور ایک دوسرے کا خون بہا کر مٹاتے۔

صبح کو بہت سویرے شیرا چنے بیچنے والے کی آواز آتی تھی۔ وہ اپنی جھولی میں گرم گرم تازہ بھنے ہوئے موٹے چنے گلی گلی اور کوچہ کوچہ بیچتا پھرتا تھا۔ اس کی عمر کوئی چالیس سال کے قریب تھی لیکن وہ دبلا اور سوکھا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں ابھی سے نمایاں ہو گئی تھیں اور اس کی خشخشی داڑھی میں سفید بال آگئے تھے۔ اس کی آنکھیں ایک بیمار کی آنکھوں کی طرح تھیں جن کے نیچے سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے اور جن میں بھوک اور غربت و رنج اور مصیبت صاف جھلکتے تھے۔ ان کے ڈھیلوں میں باریک باریک سرخ رگیں دور سے دکھائی دیتی تھیں جیسے یا تو نشے میں یا کئی دنوں کے فاقے اور بخار کے بعد پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس کے سر پر ایک کپڑے کی میلی ٹوپی رکھی رہتی تھی۔ گلے میں پھٹی ہوئی قمیض اور اس کی اُنگی دھوتی میں سے پتلی پتلی ٹانگیں دکھائی دیتی تھیں۔

عرصہ ہوا وہ ہمارے شہر میں کسی نزدیک کے ضلع سے کام کی تلاش میں آگیا تھا۔ وہ رات کو ایک مسجد میں پڑا رہتا اور دن بھر شہر کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا لیکن شہروں کی حالت روزگار کے معاملہ میں گاؤں اور قصبوں سے کسی طرح بہتر نہیں! اور شیرا کو کوئی کام نہ ملا۔ مسجد میں میر امان اللہ نماز پڑھنے آیا کرتے تھے۔ شیرا نے ان کو اپنا قصہ سنایا۔ میر صاحب کو اس کی حالت پر ترس آیا اور وہ اسے اپنے گھر لے گئے۔ شیرا نیک اور دیانتدار آدمی تھا۔ کچھ عرصے کے بعد میر صاحب نے اسے پانچ روپے دیئے اور کہا:

"ان سے کوئی کام شروع کر دینا اس لئے میں یہ روپے دیتا ہوں۔ جب تمہارے پاس پیسے ہوں تو یہ رقم واپس کر دینا ورنہ کوئی فکر کی بات نہیں۔"

شیرا نے دال اور کابلی چنوں کا خوانچہ لگایا۔ کچھ عرصے میں شیرا کو بہت سے محلّہ والے جان گئے اور اس کا سودا خوب بکنے لگا۔ سال بھر کے اندر اس نے میر صاحب کے روپے واپس کر دیئے۔ اپنے بیوی بچوں کو بلایا اور ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگا اور بہت خوش تھا۔

انہی دنوں میں عبد الرشید کو سوامی شردھانند کو قتل کرنے کے جرم میں پھانسی کی سزا کا حکم ہو گیا۔ سارے شہر کے مسلمانوں میں ایک تہلکہ مچا ہوا تھا پھانسی والے روز جیل کے باہر ہزارہا آدمیوں کا ہجوم تھا۔ وہ سب دروازہ توڑ کر اندر گھس جانا چاہتے تھے لیکن جب پولیس نے عبد الرشید کی لاش کو دینے سے انکار کر دیا تو لوگوں کے جوش اور غصے کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا۔ ان کا بس نہیں چلتا تھا ___ کہ کس طرح جیل کو مسمار کر دیں اور اس مرد غازی کی لاش کو ایک شہید کی طرح دفن کریں۔

اس دن شیرا کسی کام سے جامع مسجد کی طرف گیا ہوا تھا۔ آسمان پر غبار چھایا ہوا تھا اور سڑکیں ایک شہر خموشاں کی طرح اجاڑ اور سنسان معلوم ہو رہی تھیں۔ اس کو کئی ایک بھوکے کتے پڑے ہوئے دوسے جاتتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ایک نالی میں ایک مرا ہوا کوتر پڑا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف کو مڑ گئی تھی اس کی ٹانگیں سخت اور نیلی ہو کر اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کے پر پانی میں بھیگ گئے تھے اور اس کی ایک آنکھ کریہہ معلوم ہو رہی تھی۔ شیرا کھڑا ہو کر اس کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں سامنے سڑک کے موڑ سے کلمہ کی آواز زور زور سے آنے لگی۔ لوگ ایک جنازہ لئے چلے آ رہے تھے۔ جوں جوں جنازہ شیرا کی طرف آتا گیا پیچھے بھیڑ اور زیادہ نظر آتی گئی۔ یہاں تک کہ دور دور آدمیوں کے علاوہ کچھ نہ دکھائی دیتا تھا۔ خلقت عبدالرشید کے جنازے کو کسی طرف لے بھاگی تھی۔ شیرا بھی جنازے کی طرف بڑھا اور کندھا دینے میں شریک ہو گیا۔ اتنے میں سامنے سے پولیس نمودار ہوئی اور انہوں نے جنازہ کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور کئی ایک آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان لوگوں میں شیرا بھی تھا اور اس کو اس بلوے میں شرکت کرنے کی بدولت دو سال کی سزا ہو گئی۔

اب وہ قید بھگت چکا تھا۔ لیکن اس کے گاہک اب اس کی آواز سے ناآشنا ہو چکے تھے اور اس کے پاس اتنے پیسے نہ تھے کہ وہ دوبارہ خوانچہ لگا سکے۔ کچھ لوگوں نے چندہ کر کے اسے دو روپے دے دیئے اور ان سے شیرا نے پھر کام شروع کیا اور اب چنے بیچتا پھرتا تھا۔ لیکن اب اس کی آواز میں پچھلا کرارا پن باقی نہ رہا تھا اور مصیبت اور تکلیف اس کی پکار میں سنائی دیتی تھی۔ تاہم بچے اس کی آواز سن کے چنے لینے کو دوڑتے تھے اور وہ مٹھی سے نکال نکال کر چنے تولتا اور ان کو دیتا تھا۔

ایک اور شخص جو ہمارے محلے میں ہر روز رات کو آیا کرتا تھا وہ ایک اندھا فقیر تھا۔ اس کا قد بہت چھوٹا تھا اور اس کی کھچڑی داڑھی پر ہمیشہ خاک پڑی رہتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹوٹا ہوا بانس کا ڈنڈا رہتا تھا جسے ٹیک ٹیک کر وہ آگے بڑھتا تھا۔ وہ بالکل حقیر اور ناچیز معلوم ہوتا تھا جیسے کوڑے کے ڈھیر پر مکھیوں کا غول یا کسی مری ہوئی بلی کا ڈھنچر لیکن اس کی آواز میں وہ مایوسی اور درد تھا جو دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچ دیتا تھا۔ جاڑوں میں اس کی آواز جیسے سارے محلہ میں بے بسی پھیلاتی ہوئی کہیں دور سے آتی۔ میں نے آج تک اس سے زیادہ اثر رکھنے والی آواز نہیں سنی اور ابھی تک وہ میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ بہادر شاہ کی غزل اس کے منہ سے پھر پرانے زمانے کی یاد تازہ کر دیتی تھی۔ جب ہندوستان اپنی نئی بندشوں میں نہیں جکڑا گیا تھا۔ اس کی آواز سے صرف بہادر شاہ کے رنج کا ہی اندازہ نہیں ہوتا تھا بلکہ ہندوستان کی غلامی کا نوحہ سننے میں آتا تھا دور سے اس کی آواز آتی تھی —

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آسکے وہ میں ایک مشتِ غبار ہوں

لیکن محلہ کے شرفا اس کو پیسے دینے سے گھبراتے تھے کیونکہ وہ چرس پیتا تھا.....

ایک روز رات کو میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا۔ گرمیوں کی رات تھی اور کوئی دس بجے کا وقت۔ زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں لیکن کوابی اور مرزا کی دکانیں ابھی تک کھلی ہوئی تھیں۔ سڑک کے دونوں طرف لوگ اپنی اپنی چارپائیوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ کچھ تو سو گئے تھے اور کچھ ابھی تک باتیں کر رہے تھے۔ ہوا میں خشکی اور گرمی تھی اور نالیوں میں سے سڑاند پھوٹ رہی تھی۔ مرزا کی دکان کے تختے کے نیچے ایک سیاہ بلی گھات لگائے بیٹھی تھی جیسے کسی شکار کی فکر میں بیٹھی ہو۔ ایک شخص نے ایک آنہ کا دودھ لے کر پیا اور آبخورے کو زمین پر ڈال دیا۔ بلی دبے پاؤں تختے کے نیچے سے نکلی اور آبخورے کو چاٹنے لگی۔ اسی وقت میری کھڑکی کے سامنے سے کلو گذری۔ اس کا رنگ سیاہ تھا لیکن شباب نے اس کے چہرے پر ایک رونق اور خوبصورتی پیدا کر دی تھی۔ اس کی چال میں ایک بے باکی اور الھڑ پن تھا اور جسم زندگی کے ابھار سے توانا اور سبک تھا۔ وہ منصف صاحب کے یہاں ملازم تھی جن کی بیوی نے اس کو بچپن ہی سے پالا تھا۔ اب وہ بیوہ ہو گئی تھی اور اسے بیوہ ہوئے بھی تین سال گذر گئے تھے لیکن محلہ کے نوجوانوں کی نگاہیں اس کی طرف گڑی رہتی تھیں۔

جب وہ گلی کے نکڑ پر پہنچی تو منو نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کلو جھنجھلا کر بولی:

"موا مشٹنڈا کہیں کا۔ تجھ پر خدائی سنوار۔ ایک عورت کو اکیلا دیکھ کر ہاتھ ڈالتا ہے۔"

منو بولا:

"تیری جوانی پھر کس دن کام آئے گی؟"

"ہٹ دور ہو' موئے میرا ہاتھ چھوڑ۔.."

برابر ایک مکان کی چھت پر دو بلیوں کے لڑنے کی آواز آئی۔ اسی وقت کلو نے زور سے جھٹکا دیا اور اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

"جھاڑو پیٹے' جوانا مرگ سمجھتا ہے مجھ میں دم نہیں۔ اتنا پٹواؤں گی کہ عمر بھر یاد کرے گا۔"

مرزا جو ایک خریدار کو دودھ دینے کے بعد ذرا دیر کے لئے گھر میں چلا گیا تھا اسی وقت واپس آیا اور کلو کا آخری جملہ اسے سنائی دیا اور وہ بولا:

"کیا بات ہے کلو! کیا ہوا؟"

لیکن کلو بغیر پیچھے مڑے تیزی سے گلی کے اندر داخل ہو گئی۔ عزیز خیراتی جو اپنی دکان کے سامنے سو رہا تھا' شور سے اٹھ گیا۔ منو کو کھڑا دیکھ کر پوچھنے لگا: "ابے منو کیا بات ہے؟"

منو مایوسی اور غصہ سے بھرا کھڑا تھا۔ اس کا منہ خشک ہو کر ستا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک سانپ کی آنکھوں کی طرح زہریلی اور تیز ہو گئی تھیں۔ کوڑے کے ڈھیر پر ایک بلی کی آنکھیں ذرا دیر چمکتی ہوئی دکھائی دیں لیکن پھر غائب ہو گئیں۔ منو نے چھپی ہوئی ناامیدی کی آواز میں جواب دیا:

"کچھ نہیں یار' کلو تھی۔"

"ابے کچھ سودا بھی پٹا؟"

"نہیں میاں' ہتھے نہیں چڑھی۔ ہاتھ جھٹک کے بھاگ گئی۔ لیکن سسری جائے گی کہاں؟"

اوپر بلیاں ابھی تک لڑ رہی تھیں۔ وہ ایک بھیانک طریقے سے غرانے کے بعد زور زور سے چیختی تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ایک دوسری کو کھا جائیں گی پھر میاؤں میاؤں کر کے ایک بھاگ نکلی اور بلا غراتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔

عزیز خیراتی نے منو کو اپنے پلنگ پر بٹھا لیا اور سرہانے سے بیڑی نکال کر اس کی طرف بڑھائی۔ لیکن منو نے اپنی قمیض کی جیب سے ایک چاندی کا سگریٹ کیس نکالا اور عزیز سے کہا:

"لو میاں تم بھی کیا یاد کرو گے۔ میں تمہیں بڑا بڑھیا سگریٹ پلاتا ہوں۔"

اور ایک سگریٹ نکال کر عزیز کو دیا۔

"ارے یار میں نے کہا اب کے کس کا مار لایا؟"

"میاں نوابزادوں کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ جس کو نہ دے مولا' اس کو دے آصف الدولہ۔ اگر اللہ میاں کے بھروسے پر رہتے تو کام چل لیا ہوتا۔"

"میاں ہوش کی لو' نوس سے ڈرو' دوزخ میں جلو گے' توبہ کرو۔"

"جا یار یہ بھی کیا گدھوں کی باتیں کرتا ہے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کھاؤ پیو اور مزے کرو۔ اس سے زیادہ استاد نے سکھایا ہی نہیں۔ میں تو مونچھوں کو تاؤ دیتا ہوں اور پڑے پڑے اینڈتا ہوں۔ کہاں کی دوزخ لگائی۔ اگر ہوئی بھی تو بھگت لیں گے۔ اب کہاں کا روگ پالا۔"

"بس یار بس۔ کیوں خراب باتیں منہ سے نکال رہا ہے۔ سب آگے آگے آجاتا ہے۔ ساری اکڑ دھری رہ جائے گی۔"

"اچھا یار تو تو اس طرح کی باتیں کرنے لگا میں اب چل دیا۔"

"تو ری سُن تو یار۔ ایک بات مجھے دنوں سے حیران کر رہی ہے۔ قسم کھاتا ہے گا؟"

"اچھا جا گیا یاد رکھے گا۔ اللہ قسم بتا دوں گا۔"

"یہ بتا تو آخر چوری کیوں کرتا ہے؟"

"بھئی اس کی نہیں بدی تھی۔"

"دیکھ قول دے چکا ہے۔"

اچھا جا تو جیتا میں ہارا۔ جو سچ پوچھو تو بات یہ ہے کہ میں کبھی چوری نہ کرتا۔ تو جانتا ہے میرے رشتہ دار کافی امیر لوگ ہیں۔"

"جبھی تو میں اور بھی حیران ہو رہا ہوں۔"

"میرا ایک بھائی لگتا تھا۔ لونڈا نمکین تھا۔ یہ کوئی دس برس کی بات ہے۔ تو میری کچھ اس سے چل گئی تھی۔ ہم دونوں مدرسے میں ساتھ پڑھتے تھے۔ اس نے ماسٹر سے میری شکایت کر دی اور جوتیں لگوائیں۔ میرے اوپر یہ بھوت سوار ہو گیا۔ میں نے کہا سالے بدلہ نہ لیا تو پیشاب سے مونچھیں منڈوا دوں گا۔ ایک موقعہ پا کر میں نے سالے کا بستہ چرا لیا۔ اس کے اندر بڑی بڑی بڑھیا چیزیں تھیں۔ اس سے شروعات ہوئی۔ پھر ایک مرتبہ مجھے ایک ماموں کا سگریٹ کیس پسند آگیا۔ میں ان سے مانگ تو نہ سکتا تھا لیکن میں نے پار کر دیا۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ ان حرامزادوں کے پاس روپے بھی ہیں اور اچھی اچھی چیزیں بھی۔ کیوں نہ اڑا لیا کرو اور پھر تو میرا ہاتھ خوب صاف ہو گیا۔ یار سچ پوچھو تو یہ لوگ کبھی غریب کو مر کر بھی کوئی چیز نہ دیں۔ ان سے تو بس اسی طرح چیزیں وصول ہو سکتی ہیں۔"

"لیکن اگر کدھی پکڑے گئے تو؟"

"پھر تو نے وہی فضول کی باتیں شروع کر دیں۔ اچھا اب میں چلا نہیں تو گھر میں تو تو میں میں ہو گی۔" یہ کہہ وہ اٹھا اور عزیز کی کمر پر زور سے تھپڑ مار کر روانہ ہو گیا۔ .....

ہمارے محلہ کی مسجد میں نثار احمد اذان دیا کرتے تھے۔ یہ قوی ہیکل اور مضبوط تھے۔ ان کا رنگ بالکل سیاہ تھا اور ان کی داڑھی مہندی سے سرخ رہتی تھی۔ ان کا سر تامڑا تھا لیکن پہلوؤں اور گدی پر ان کے پٹھے بال پڑے رہتے تھے۔ ان کے ماتھے پر ٹھیک بیچ میں ایک بڑا سا گٹا پڑ گیا تھا۔ جس کا رنگ راکھ کا سا تھا اور الگ دور سے چمکتا تھا۔ اکثر وہ میری کھڑکی کے سامنے سے کھنکارتے ہوئے گذرتے تھے۔ وہ گاڑھے کا ڈھیلی موریوں کا پاجامہ اور گاڑھے کا کرتا پہنے رہتے تھے اور ان کے کندھے پر ایک بڑا سرخ رنگ کا چھپا ہوا رومال پڑا رہتا تھا۔ ان کی آواز میں ایک ایسا کرارا پن گرمی کے ساتھ ساتھ وہ نرمی تھی جو انسان کو کم عطا ہوتی ہے۔ ان کی اذان دور دور مشہور تھی اور اس کی آواز بہت دور سے سنائی دیتی تھی۔ شروع شروع میں ان کی آواز سے اس پکار کی شان ٹپکتی تھی جو مسلمانوں کو نماز کے لئے بلاتی ہے۔ پھر اختتام کے قریب آواز کی جھنکار میں کمی ہوتی اور ان کے جملے بل کھاتے ہوئے ایک سناٹا اور خاموشی پیدا کرتے ہوئے فضا میں کھو جاتے تھے۔ لوگ نثار احمد کو حضرت بلال حبشی کہتے تھے اور اس مقابلہ میں بہت سی باتیں دونوں میں مشترک تھیں۔ ان کی شاندار آواز اور ان کا سیاہ رنگ۔

ایک مرتبہ میں اپنے مکان کی چھت پر اکیلا بیٹھا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل بچھے ہوئے تھے اور سورج کی روشنی ان کے پیچھے سے پڑ رہی تھی اور ان میں سے ہلکی سی پھیکی روشنی نمایاں تھی۔ کیونکہ مطلع صاف نہ تھا اور شہر کا گرد و غبار اور دور ملوں کی چمنیوں کا دھواں فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ شہر کے شور و شغب کی جھنکار مکھیوں کے بھنبھنانے کی طرح آ رہی تھی۔ ساری فضا میں ایک دل شکن مایوسی تھی، وہ

تکلیف وہ کیفیت جو ہمارے شہروں کی خاص پہچان ہوتی ہے جس میں غربت اور غلاظت' زندگی کی حقارت اور بے بسی کا احساس ہوتا ہے۔ گرد و غبار سے میلے اور پھیکے بادلوں میں ایک جنگلی کبوتر اڑتا ہوا گذرا اور ان کے ملگجے رنگوں میں غائب ہو گیا۔ دور سے ملوں کی سیٹیوں اور ریل کے انجنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ شہر کی اونچی ممٹیوں اور میناروں سے کبوتر اُڑتے تھے یا منڈلا منڈلا کر ان پر بیٹھ جاتے تھے۔ دور دور جدھر نگاہ دوڑتی تھی گندی اور بدنما میلی کچیلی عمارتیں اور ان کی چھتیں دکھائی دیتی تھیں۔ دور دور جدھر انسان دیکھ سکتا تھا زندگی کی سرد مہری اور بے کاری کا احساس ہوتا تھا۔ کہیں کہیں کوئی دو منزلہ مکان بن رہا تھا اور اس کی پاڑیں آسمان اور نگاہ کے درمیان سدِ راہ ہوتی تھیں۔ لیکن بانسوں اور بلیوں کے رنگ نگاہ کو تکلیف نہ پہنچاتے تھے اور بادلوں کے رنگوں میں مل کر ہلکے اور مدھم دکھائی دیتے تھے۔ اسی وقت نثار احمد نے کھنکارنے کی آواز اور پھر ان کی اٹھتی سنہری آواز فضا میں پھیل گئی۔ یہ آواز کچھ ایسی مایوس کن لیکن تسکین بخش تھی کہ میری کوفت ایک خاموش رنج سے بدل گئی۔ اس آواز میں کوئی عظمت اور بڑائی نہ تھی بلکہ اس سے زندگی کی بے ثباتی کا احساس ہوتا تھا۔ اس بات کا کہ دنیا مردار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے' اس بات کا کہ زندگی حقیر اور ناچیز ہے۔ اسی طرح جیسے بادلوں کے چہرے پر گرد اور دھواں اور غبار۔ اپنے موہوم خیالات کا شکار میں اذان کو سنتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ اختتام کے قریب آ گئی اور حیَ علی الصلوٰۃ حیَ علی الصلوٰۃ کی خاموشی پیدا کرنے والی آواز کانوں میں گونجنے لگی۔ پھر حیَ علی الفلاح حیَ علی الفلاح کی آواز۔ سناٹا چھاتی ہوئی' دنیا کی بے ثباتی کا یقین دلاتی باریک لمبی تان کے دھیمے سروں ہوتی اس آہستگی اور دل بستگی سے ختم ہوئی کہ یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ آواز رُک گئی ہے یا ساری دنیا پر خاموشی طاری ہے' ایک گہری خاموشی جس سے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا سے پرے بہت دور ایک اور دنیا ہے جس میں ازل اور ابد دونوں ایک ہیں اور یہ دنیا ہیچ اور موہوم ہے۔ آواز اس طرح فضا میں کھو گئی جس طرح افق پر زمین ختم ہوتی ہے اور آسمان شروع ہو جاتا ہے اور تمیز نہیں ہو سکتی کہ زمین ختم بھی ہو گئی یا ہر جگہ آسماں ہے۔ اسی طرح آواز اس آہستگی سے رُک گئی کہ آواز اور خاموشی میں امتیاز نہ ہو سکتا تھا۔ آواز کانوں میں گونج رہی تھی لیکن یہی شبہ تھا کہ صرف خاموشی کانوں میں ہیجان بپا کیے ہوئے ہے۔

اور میں سوچتا رہا کہ یہ اذان ہماری زندگی کی حقیقت کو کس خوبی سے ظاہر کرتی ہے۔ وہی بے بسی اور مایوسی جو ہماری رگ رگ میں پیوست ہو گئی ہے وہی ناامیدی اور خارجی حقیقت کا خوف جو ہم کو ایک داخلی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتا ہے' اس اذان میں موجود تھے۔ ہم دنیا کو چھوڑ کر ازل اور ابد کے خواب دیکھا کرتے تھے۔ آدمی کو بھلا کر خدا کی تلاش میں مشغول رہتے ہیں اور ہماری زندگی کی ہر چیز ہم کو اسی بات کی ترغیب دلاتی ہے' ہمارا ہر گیت ہمیں یہی لوریاں سناتا ہے۔ ہمارے پیروں میں بیڑیاں ہیں لیکن ہم ان کی رگڑ کے اتنے عادی ہو گئے ہیں کہ وہ ہم کو ایک خارجی حقیقت نہیں معلوم ہوتیں۔ ہمارے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پڑی ہیں' ہمارے گلوں میں طوق ہیں' ہماری زبانوں پر قفل ڈال دیے گئے ہیں لیکن ہم کو کسی بات کا احساس نہیں' ہمارا جسم سُن ہو چکا ہے' ہماری روح سو گئی ہے اور ہم اپنی بے بسی پر مگن ہیں اور لاپروائی اور بے حسی کی زندگی گذارتے ہیں حتیٰ کہ موت اپنے پنجے بڑھاتی ہے اور اپنی تاریک آغوش میں کھینچ لیتی ہے۔ ہماری نیک نامی اور بدنامی دونوں برابر ہیں۔ ہماری زندگی اور موت دونوں یکساں ہیں اور اذان کی آواز کی طرح ہم اس طرح زندگی سے موت میں بدل جاتے ہیں کہ کوئی تمیز نہیں کر سکتا ہم کبھی زندہ بھی تھے یا یہ سب وہم و گمان تھا اور ہم موت کے دلارے' ہمیشہ سے اس کی لوریوں میں مخمور غفلت کی نیند سویا کرتے تھے۔

ایک رات کو مرزا کی دکان پر تین چار آدمی بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو عزیز تھا' ایک کوابی اور ایک دو آدمی اور جمع ہو گئے تھے۔ ان کے سامنے حقہ رکھا تھا اور وہ باری باری کش کھینچ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کہہ رہا تھا:

"میں تو یار ہر ایک چیز میں اوس کی شان دیکھ رہا ہوں۔"

اس پر میرے کان کھڑے ہوئے اور میں غور سے سننے لگا۔

اتنے میں ایک گاہک آیا اور اس نے مرزا سے پانچ پیسے کا دودھ مانگا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ مرزا نے ایک آبخورہ اٹھایا اور دودھ نکالنے کے لئے لٹیا دودھ کی طرف بڑھائی۔ اس آواز نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "پرلے دن میں چاندنی چوک میں سے جا رہا تھا کہ سامنے سے ایک بچھیا آ رہی تھی۔ وہی جگہ ایک بچہ پڑا ہوا تھا گائے بچے کے پاس آن کے رُک گئی۔ میں نے سوچا کہ دیکھو اب کیا کرتی ہے۔ وتنے میں صاحب وس بچھیا نے اپنے چاروں پیر جوڑ کر ایک قلانچ ماری اور بچے کو صاف الانگ گئی۔ مجھ کو تو اس جناور کی عقل میں وس کی شان نظر آ گئی۔"

مرزا کا ایک ہاتھ کڑھاؤ کے پاس تھا دوسرے میں آبخورہ تھا اور وہ بولنے والے کی طرف گھور رہا تھا۔ عزیز بولا

"واہ واہ کیا وس کی شان ہے!"

مرزا نے لٹیا میں دودھ لیا اور اس کو اچھالنے لگا۔ اتنے میں ایک دوسرا شخص بولا۔

"ہاں میاں وس کی شان کا کیا پوچھ رہے ہو۔ ایک مرتبہ حضرت سلیمانؑ کو حکم ملا کہ محل بناؤ تو بس صاحب دنہوں نے تیاریاں شروع کر دیں۔ جناتوں نے آنا فانا میں بڑے بڑے فتر اور سلیں لالا کے جمع کر دیں اور مدت لگ گئی۔ تم جانتے ہو جناتوں کا کام کتنی فرتی کا ہوتا ہے۔ آج اتنا کل وتنا تھوڑے ہی دنوں میں محل آسمان سے باتیں کرنے لگ گیا۔ حضرت سلیمانؑ روز ودس جگہ جا کے دیکھا کرتے تھے کہ کوئی کام میں سستی تو نہیں کر رہا ہے تو بس صاحب ایک دن محل کھڑا ہو گیا۔ اب صرف وس کے اندر کی قتلیں اور فتر صاف کرنے رہ گئے۔ دوسرے روز پھر حضرت سلیمانؑ اپنی لکڑی ٹیک کے کھڑے ہو گئے اور ملبہ باہر پھینکنے کا حکم دے دیا لیکن وتنے میں وہاں سے کچھ اور حکم آ چکا تھا۔ اب دیکھئے محل کی شان کہ یہاں تو وس کی صفائی ہو رہی ہے اور وہاں وس لکڑی میں گھن لگنا شروع ہو گیا لیکن وہ تنے کھڑے رہے۔ یہاں تک کہ گھن لگتے لگتے مونٹھ تک پہنچ گیا۔ لیکن ون کو ذری بھی خبر نہیں ہوئی اور لکڑی اکھ کی طریوں جھڑ گئی اور ون کا خود کا دم نکل گیا۔ ادھر تو ون کا کام تمام ہوا اُدھر جب جناتوں نے دیکھا کہ جن کا رعاب شعاب تھا وہ ہی نہیں رہے تو چمپت بنے۔ لیکن میں تو اس بات پر حیران ہو رہا ہوں کہ اب ون قتلوں اور فتروں کو کون صاف کرے گا"

عزیز کے ہاتھ میں حقہ کی نلی اس کے منہ کے برابر رکھی ہوئی تھی اور وہ بولنے والے کی طرف گھور رہا تھا۔ مرزا کا ایک ہاتھ جس میں لٹیا تھی اُوپر تھا اور آبخورہ والا نیچے اور وہ قصہ میں محو تھا۔

میں نے زور سے قہقہہ لگایا لیکن پھر سوچ میں پڑ گیا کہ واقعی ان "قتلوں" اور "فتروں" کو کون صاف کرے گا۔

ہوا کا ایک جھونکا زور سے آیا اور مٹی کے تیل کا لیمپ گل ہو گیا اور سڑک پر اندھیرا تھا۔ اس وقت لوگ مرزا کی دکان سے اٹھ کر روانہ ہونے لگے اور میں بھی گھر کے اندر چلا گیا۔

آنندی

غلام عباس

بلدیہ کا اجلاس زوروں پر تھا۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور خلاف معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہ تھا۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ تھا کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کا وجود انسانیت، شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

بلدیہ کے ایک بھاری بھر کم رکن جو ملک و قوم کے سچے خیر خواہ سمجھے جاتے تھے نہایت فصاحت سے تقریر کر رہے تھے:

"... ...اور پھر حضرات آپ یہ بھی خیال فرمایئے کہ ان کا قیام شہر کے ایک ایسے حصے میں ہے جو نہ صرف شہر کے بیچوں بیچ عام گذرگاہ ہے بلکہ شہر کا سب سے بڑا تجارتی مرکز بھی ہے۔ چنانچہ ہر شریف آدمی کو چار و ناچار اس بازار سے گذرنا پڑتا ہے۔ علاوہ ازیں شرفاء کی پاک دامن بہو بیٹیاں اس بازار کی تجارتی اہمیت کی وجہ سے یہاں آنے اور خرید و فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ صاحبان! جب یہ شریف زادیاں ان آبرو باختہ نیم عریاں بیسواؤں کے بناؤ سنگار کو دیکھتی ہیں تو قدرتی طور پر ان کے دل میں بھی آرائش و دلربائی کی نئی نئی امنگیں اور ولولے پیدا ہوتے ہیں اور وہ اپنے غریب شوہروں سے طرح طرح کے غازوں، لونڈروں، زرق برق ساریوں اور قیمتی زیوروں کی فرمائشیں کرنے لگتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا پُر مسرت گھر ان کا راحت کدہ ہمیشہ کے لئے جہنم کا نمونہ بن جاتا ہے۔

"......اور صاحبان پھر آپ یہ بھی تو خیال فرمایئے کہ نونہالانِ قوم جو درسگاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں اور جن کی آئندہ ترقیوں سے قوم کی امیدیں وابستہ ہیں اور قیاس کہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن قوم کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کا سہرا ان ہی کے سر بندھے گا انہیں بھی صبح و شام اسی بازار سے ہو کر آنا جانا پڑتا ہے۔ یہ قحبائیں جو ہر وقت بارہ ابھرن سولہ سنگھار کئے ہر راہرو پر بے حجابانہ نگاہ و مژہ کے تیر و سناں برساتی اور اسے دعوت حسن پرستی دیتی ہیں کیا انہیں دیکھ کر ہمارے بھولے بھالے ناتجربہ کار، جوانی کے نشے میں سرشار، سود و زیاں سے بے پروا نونہالانِ قوم اپنے جذبات و خیالات اور اپنی اعلیٰ سیرت کو معصیت کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ صاحبان! کیا ان کا حسنِ زاہد فریب ہمارے نونہالانِ قوم کو جادہ مستقیم سے بھٹکا کر ان کے دل میں گناہ کی پُراسرار لذتوں کی تشنگی پیدا کر کے ایک بے کلی، ایک اضطراب، ایک ہیجان برپا نہ کر دیتا ہوگا......؟"

اس موقع پر ایک رکنِ بلدیہ جو کسی زمانہ میں مدرس رہ چکے تھے اور اعداد و شمار سے خاص شغف رکھتے تھے بول اُٹھے:

"صاحبان! واضح رہے کہ امتحانوں میں ناکام رہنے والے طلبہ کا تناسب پچھلے پانچ سال کی نسبت ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔"

ایک رکن نے جو چشمہ لگائے ہوئے تھے اور ایک ہفتہ وار اخبار کے مدیر اعزازی تھے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "حضرات! ہمارے شہر سے روز بروز غیرت، شرافت، مردانگی، نکوکاری و پرہیزگاری اٹھتی جا رہی ہے اور اس کے بجائے بے غیرتی، نامردی، بزدلی، بدمعاشی،

چوری اور جعل سازی کا دور دورہ ہوتا جارہا ہے۔ منشیات کا استعمال بہت بڑھ گیا ہے۔ قتل و غارت، خودکشی اور دیوالیہ نکلنے کی وارداتیں بڑھتی جارہی ہیں۔ اس کا سبب محض ان زنانِ بازاری کا ناپاک وجود ہے۔ کیونکہ ہمارے بھولے بھالے شہری ان کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہو کر ہوش و خرد کھو بیٹھتے ہیں اور ان کی بارگاہ تک رسائی کی زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کرنے کے لئے ہر جائز و ناجائز طریق سے زر حاصل کرتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اس سعی و کوشش میں جامہ انسانیت سے باہر ہو جاتے ہیں اور نہایت قبیح افعال کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو وہ جانِ عزیز ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور یا جیل خانوں میں پڑے سڑتے ہیں۔"

ایک پنشن یافتہ معمر رکن جو ایک وسیع خاندان کے سرپرست تھے اور دنیا کا سرد و گرم دیکھ چکے تھے اور اب کشمکشِ حیات سے تھک کر باقیماندہ عمر ستانے اور اپنے اہل و عیال کو اپنے سائے میں پنپتا ہوا دیکھنے کے متمنی تھے، تقریر کرنے اٹھے۔ ان کی آواز لرزتی ہوئی اور لہجہ فریاد کا انداز لئے ہوئے تھا ——— بولے۔

"صاحبان! رات رات بھر ان لوگوں کے طبلے کی تھاپ، ان کی گلے بازیاں، ان کے عشاق کی دھینگا مشتی، گالی گلوچ، شور و غوغا، ہاہا، ہوہو، سن سن کر آس پاس کے رہنے والے شرفا کے کان پک گئے ہیں۔ ضیق میں جان آگئی ہے۔ رات کی نیند حرام ہے تو دن کا چین مفقود۔ علاوہ ازیں ان کے قرب سے ہماری بہو بیٹیوں کے اخلاق پر جو برا اثر پڑتا ہے اس کا اندازہ ہر صاحبِ اولاد خود کر سکتا ہے......"

آخری فقرہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔ سب اراکینِ بلدیہ کو ان سے ہمدردی تھی۔ کیونکہ بدقسمتی سے ان کا قدیمی مکان اس بازارِ حسن کے عین وسط میں واقع تھا۔

ان کے بعد ایک رکنِ بلدیہ نے جو پرانی تہذیب کے علمبردار تھے اور آثارِ قدیمہ کو اولاد سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، تقریر کرتے ہوئے کہا:

"حضرات! باہر سے جو سیاح اور ہمارے احباب اس مشہور اور تاریخی شہر کو دیکھنے آتے ہیں جب وہ اس بازار سے گذرتے اور اس کے متعلق استفسار کرتے ہیں تو یقین کیجئے کہ ہم پر گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے۔"

اب صدرِ بلدیہ تقریر کرنے اُٹھے۔ گو قد ٹھگنا اور ہاتھ پاؤں چھوٹے چھوٹے تھے مگر سر بڑا تھا جس کی وجہ سے بردبار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ لہجہ میں حد درجہ متانت تھی۔ بولے "حضرات! میں اس امر میں قطعی طور پر آپ سے متفق ہوں کہ اس طبقہ کا وجود ہمارے شہر اور ہمارے تہذیب و تمدن کے لئے باعثِ صد عار ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا تدارک کس طرح کیا جائے۔ اگر ان لوگوں کو مجبور کیا جائے کہ یہ اپنا ذلیل پیشہ چھوڑ دیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ لوگ کھائیں گے کہاں سے؟"

ایک صاحب بول اٹھے۔ "یہ عورتیں شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

اس پر ایک طویل فرمائشی قہقہہ پڑا اور ہال کی ماتمی فضا میں یکبارگی شگفتگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ جب اجلاس میں خاموشی ہوئی تو صاحبِ صدر بولے۔ "حضرات! یہ تجویز بارہا ان لوگوں کے سامنے پیش کی جاچکی ہے۔ اس کا ان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ آسودہ اور عزت دار لوگ خاندانی حرمت و ناموس کے خیال سے انہیں اپنے گھروں میں نہ گھسنے دیں گے، اور مفلس اور ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کو جو محض ان کی دولت کے لئے ان سے شادی کرنے پر آمادہ ہوں گے، یہ عورتیں خود منہ نہیں لگائیں گی۔"

اس پر ایک صاحب بولے۔ "بلدیہ کو ان کے نجی معاملوں میں پڑنے کی ضرورت نہیں، بلدیہ کے سامنے تو یہ مسئلہ ہے کہ یہ لوگ چاہے جہنم میں جائیں مگر اس شہر کو خالی کر دیں۔"

صدر نے کہا۔ "صاحبان! یہ بھی آسان کام نہیں، ان کی تعداد دس بیس نہیں سینکڑوں تک پہنچتی ہے اور پھر ان میں سے بہت سی عورتوں کے ذاتی مکانات ہیں۔"

یہ مسئلہ کوئی مہینے بھر تک بلدیہ کے زیرِ بحث رہا اور بالآخر تمام اراکین کی اتفاق رائے سے یہ امر قرار پایا کہ زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کو خرید لینا چاہئے اور انہیں رہنے کے لئے شہر سے کافی دور کوئی الگ تھلگ علاقہ دے دینا چاہئے۔ ان عورتوں نے بلدیہ کے اس فیصلہ کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بعض نے نافرمانی کرکے بھاری جرمانے اور قیدیں تک بھگتیں مگر بلدیہ کی مرضی کے آگے ان کی کوئی پیش نہ چل سکی اور وہ ناچار صبر کرکے رہ گئیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک ان زنانِ بازاری کے مملوکہ مکانوں کی فہرستیں اور نقشے تیار ہوتے اور مکانوں کے گاہک پیدا کئے جاتے رہے۔ بیشتر مکانوں کو بذریعہ نیلام فروخت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان عورتوں کو چھ مہینے تک شہر میں اپنے پرانے ہی مکانوں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی تاکہ اس عرصے میں وہ نئے علاقہ میں مکان وغیرہ بنوا سکیں۔

ان عورتوں کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے چھ کوس دور تھا۔ پانچ کوس تک پکی سڑک جاتی تھی اور اس سے آگے کوس بھر کا کچا راستہ تھا۔ کسی زمانہ میں وہاں کوئی بستی ہو گی مگر اب تو کھنڈروں کے سوا کچھ نہ رہا تھا۔ جن میں سانپوں اور چمگادڑوں کے مسکن تھے اور دن دہاڑے الو بولتے تھے۔ اس علاقے کے نواح میں کچے گھروندوں والے کئی چھوٹے چھوٹے گاؤں تھے۔ مگر کسی کا فاصلہ بھی یہاں سے دو ڈھائی میل سے کم نہ تھا۔ ان گاؤں کے بسنے والے کسان دن کے وقت کھیتی باڑی کرتے یا یونہی پھرتے پھراتے ادھر نکل آتے تو نکل آتے ورنہ عام طور پر اس شہرِ خموشاں میں آدم زاد کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ بعض اوقات روزِ روشن ہی میں گیدڑ اس علاقے میں پھرتے دیکھے گئے تھے۔

پانسو سے کچھ اوپر بیسواؤں میں سے صرف چودہ ایسی تھیں جو اپنے عشاق کی وابستگی یا خود اپنی دل بستگی یا کسی اور وجہ سے شہر کے قریب آزادانہ رہنے پر مجبور تھیں اور اپنے دولت مند چاہنے والوں کی مستقل مالی سرپرستی کے بھروسے بادلِ ناخواستہ اس علاقہ میں رہنے پر آمادہ ہو گئی تھیں۔ ورنہ باقی عورتوں نے سوچ رکھا تھا کہ وہ یا تو اس شہر کے ہوٹلوں کو اپنا مسکن بنائیں گی یا بظاہر پارسائی کا جامہ پہن کر شہر کے شریف محلوں کے کونوں کھدروں میں جا چھپیں گی۔ یا پھر اس شہر ہی کو چھوڑ کر کہیں اور نکل جائیں گی۔

یہ چودہ بیسوائیں اچھی خاصی مالدار تھیں۔ اس پر شہر میں ان کے جو مملوکہ مکان تھے ان کے دام انہیں اچھے خاصے وصول ہو گئے تھے اور اس علاقہ میں زمین کی قیمت برائے نام تھی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ملنے والے دل و جان سے ان کی مالی امداد کرنے کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ انہوں نے اس علاقے میں جی کھول کر بڑے عالی شان مکان بنوانے کی ٹھان لی۔ ایک اونچی اور ہموار جگہ جو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے ہٹ کر تھی منتخب کی گئی۔ زمین کے قطعے صاف کرائے اور چابکدست نقشہ نویسوں سے مکانوں کے نقشے بنوائے گئے اور چند ہی روز میں تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

دن بھر اینٹ، مٹی، چونا، شہتیر، گارڈر اور دوسرا عمارتی سامان لاریوں، چھکڑوں، خچروں، گدھوں اور انسانوں پر لد کر اس بستی میں آتا اور منشی حساب کتاب کی کاپیاں بغلوں میں دبائے انہیں گنواتے اور کاپیوں میں درج کرتے۔ میر عمارت معماروں کو کام کے متعلق ہدایات دیتے۔ معمار مزدوروں کو ڈانٹتے ڈپٹتے، مزدور ادھر اُدھر دوڑتے پھرتے۔ مزدورنیوں کو چلا چلا کر پکارتے اور اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے بلاتے۔ غرض سارا دن ایک شور، ایک ہنگامہ رہتا اور سارا دن آس پاس کے گاؤں کے دیہاتی اپنے کھیتوں میں اور دیہاتنیں اپنے گھروں میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ دور سے آتی ہوئی کھٹ کھٹ کی دھیمی آوازیں سنتی رہتیں۔

اس بستی کے کھنڈروں میں ایک جگہ مسجد کے آثار تھے اور اس کے پاس ہی ایک کنواں تھا جو بند پڑا تھا۔ راج مزدوروں نے کچھ تو پانی حاصل کرنے اور کچھ دم لینے اور سستانے کی غرض سے اور کچھ ثواب کمانے اور اپنے نمازی بھائیوں کی عبادت گذاری کے خیال سے سب سے پہلے اسی کی مرمت کی۔ چونکہ یہ فائدہ بخش اور ثواب کا کام تھا اس لئے کسی نے کچھ اعتراض نہ کیا۔ چنانچہ دو تین روز میں مسجد

تیار ہو گئی۔

دن کو بارہ بجے جیسے ہی کھانا کھانے کی چھٹی ہوتی دو ڈھائی سو 'راج' مزدور' میر عمارت' منشی اور ان بیسواؤں کے رشتہ دار یا کارندے جو تعمیر کی نگرانی پر مامور تھے اس مسجد کے آس پاس جمع ہو جاتے اور اچھا خاصا میلہ سا لگ جاتا۔

ایک دن ایک دیہاتی بڑھیا جو پاس کے کسی گاؤں میں رہتی تھی اس بستی کی خبر سُن کر آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک خورد سال کا لڑکا تھا۔ دونوں نے مسجد کے قریب ایک درخت کے نیچے گھٹیا سگریٹ بیڑی' چنے اور گڑ کی بنی ہوئی مٹھائیوں کا خوانچہ لگا دیا۔ بڑھیا کو آئے ابھی دو دن بھی نہ گذرے تھے کہ ایک بوڑھا کسان کہیں سے ایک مٹکا اٹھا لایا اور کنویں کے پاس اینٹوں کا ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا پیسے کے دو دو شکر کے شربت کے گلاس بیچنے لگا۔ ایک کنجڑے کو خبر ہوئی وہ ایک ٹوکرے میں خربوزے بھر کر لے آیا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس بیٹھ کر "لے لو خربوزے' شہد سے میٹھے خربوزے" کی صدا لگانے لگا۔ ایک شخص نے کیا کیا' گھر سے سری پائے پکا' دیگچی میں رکھ' خوانچہ میں لگا' تھوڑی سی روٹیاں مٹی کے دو تین پیالے اور ٹین کا ایک گلاس لے کر آ موجود ہوا اور اس بستی کے کارکنوں کو جنگل میں ہنڈیا کا مزا چکھانے لگا۔

ظہر اور عصر کے وقت میر عمارت' معمار اور دوسرے لوگ مزدوروں سے کنویں سے پانی نکلوا نکلوا کر وضو کرتے نظر آتے۔ ایک شخص مسجد میں جا کر اذان دیتا۔ پھر ایک کو امام بنا یا جاتا اور دوسرے لوگ اس کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھتے۔ کسی گاؤں کے ایک ملا کے کان میں جو یہ بھنک پڑی کہ فلاں مسجد میں امام کی ضرورت ہے۔ وہ دوسرے ہی دن علی الصباح ایک سبز جزدان میں قرآن شریف' پنجسورہ' رحل اور مسئلے مسائل کے چند چھوٹے چھوٹے رسالے رکھ آ موجود ہوا اور اس مسجد کی امامت باقاعدہ طور پر اسے سونپ دی گئی۔

ہر روز تیسرے پہر گاؤں کا ایک کبابی سر پر اپنے سامان کا ٹوکرا اٹھائے آ جاتا اور خوانچہ والی بڑھیا کے پاس زمین پر چولہا بنا کر کباب' کلیجی' دل اور گردے سیخوں پر چڑھا بستی والوں کے ہاتھ بیچتا۔ ایک بھٹیارن نے جو یہ حال دیکھا تو اپنے میاں کو ساتھ لے مسجد کے سامنے میدان میں دھوپ سے بچنے کے لئے پھونس کا ایک چھپر ڈال تنور گرم کرنے لگی۔ کبھی کبھی ایک نوجوان دیہاتی نائی پھٹی پرانی کسبت گلے میں ڈالے جوتی کی ٹھوکروں سے راستے کے روڑوں کو لڑھکاتا ادھر اُدھر گشت کرتا دیکھنے میں آ جاتا۔

ان بیسواؤں کے مکانوں کی تعمیر کی نگرانی ان کے رشتہ دار یا کارندے تو کرتے ہی تھے۔ کسی کسی دن وہ دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر اپنے عشاق کے ہمراہ خود بھی اپنے اپنے مکانوں کو بنتا دیکھنے آ جاتیں اور غروب آفتاب سے پہلے یہاں سے نہ جاتیں۔ اس موقع پر فقیروں اور فقیرنیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں نہ جانے کہاں سے آ جاتیں' اور جب تک خیرات نہ لے لیتیں اپنی صداؤں سے برابر شور مچاتی رہتیں اور انہیں بات نہ کرنے دیتیں۔ کبھی کبھی شہر کے لفنگے اوباش' بے کار مباش کچھ کیا کر' کے مصداق شہر سے پیدل چل کر بیسواؤں کی اس نئی بستی کی سُن گُن لینے آ جاتے اور اگر اس دن بیسوائیں بھی آئی ہوتیں تو ان کی عید ہو جاتی۔ وہ ان سے ذرا ہٹ کر ان کے گرداگرد چکر لگاتے رہتے۔ فقرے کستے' بے تکے قہقہے لگاتے' عجیب عجیب شکلیں بناتے اور مجنونانہ حرکتیں کرتے۔ اس روز کبابی کی خوب بکری ہوتی۔

اس علاقے میں جہاں تھوڑے ہی دن پہلے ہو کا عالم تھا اب ہر طرف گہما گہمی اور چہل پہل نظر آنے لگی۔ شروع شروع میں اس علاقہ کی ویرانی سے ان بیسواؤں کو یہاں آ کر رہنے کے خیال سے جو وحشت ہوتی تھی وہ بڑی حد تک جاتی رہی تھی اور اب وہ ہر مرتبہ خوش خوش اپنے مکانوں کی آرائش اور اپنے مرغوب رنگوں کے متعلق معماروں کو تاکیدیں کر جاتی تھیں۔

بستی میں ایک جگہ ٹوٹا پھوٹا مزار تھا جو قرائن سے کسی بزرگ کا معلوم ہوتا تھا۔ جب یہ مکان نصف سے زیادہ تعمیر ہو چکے تو ایک دن بستی کے راج مزدوروں نے دیکھا کہ مزار کے پاس سے دھواں اُٹھ رہا ہے اور ایک سرخ سرخ آنکھوں والا لمبا تڑنگا مست فقیر لنگوٹ باندھے چار ابرو کا صفایا کرائے اس مزار کے اردگرد پھر رہا اور کنکر پتھر اٹھا اٹھا کر پرے پھینک رہا ہے۔ دوپہر کو وہ فقیر ایک

گھڑا لے کر کنوئیں پر آیا' اور پانی بھر بھر کے مزار پر لے جانے اور اسے دھونے لگا۔ ایک دفعہ جو آیا تو کنویں پر دو تین راج مزدور کھڑے تھے وہ نیم دیوانگی اور نیم فرزانگی کے عالم میں ان سے کہنے لگا۔ "جانتے ہو وہ کس کا مزار ہے؟ کڑک شاہ پیر بادشاہ کا! میرے باپ دادا ان کے مجاور تھے۔" اس کے بعد اس نے ہنس ہنس کر اور آنکھوں میں آنسو بھر کے پیر کڑک شاہ کی کچھ جلالی کرامات بھی ان راج مزدوروں سے بیان کیں۔

شام کو یہ فقیر کہیں سے مانگ تانگ کر مٹی کے دو دیے اور سرسوں کا تیل لے آیا اور پیر کڑک شاہ کی قبر کے سرہانے اور پائنتی چراغ روشن کر دیئے۔ رات کو پچھلے پہر کبھی کبھی اس مزار سے 'اللہ ہو' کا مست نعرہ سنائی دے جاتا۔

چھ مہینے گذرنے نہ پائے تھے کہ یہ چودہ مکان بن کر تیار ہو گئے۔ یہ سب کے سب دو منزلہ اور قریب قریب ایک ہی وضع کے تھے سات ایک طرف اور سات دوسری طرف۔ بیچ میں چوڑی چکلی سڑک تھی۔ ہر ایک مکان کے نیچے چار چار دکانیں تھیں۔ مکان کی بالائی منزل میں سڑک کے رخ وسیع برآمدہ تھا۔ اس کے آگے بیٹھنے کے لئے کشتی نما شہ نشین بنائی گئی تھی جس کے دونوں سروں پر یا تو سنگِ مرمر کے مور رقص کرتے ہوئے بنائے گئے تھے اور یا جل پریوں کے مجسمے تراشے گئے تھے جن کا آدھا دھڑ مچھلی کا اور آدھا انسان کا تھا۔ برآمدے کے پیچھے جو بڑا کمرہ بیٹھنے کے لیے تھا اس میں سنگِ مرمر کے نازک نازک ستون بنائے گئے تھے۔ دیواروں پر خوش نما پچی کاری کی گئی تھی۔ فرش سبز چمکدار پتھر کا بنایا گیا تھا۔ جب سنگِ مرمر کے ستونوں کے عکس اس فرشِ زمردیں پر پڑتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا سفید براق پروں والے راج ہنسوں نے اپنی لمبی لمبی گردنیں جھیل میں ڈبو دی ہیں۔

بدھ کا شبھ دن اس بستی میں آنے کے لئے مقرر کیا گیا۔ اس روز اس بستی کی سب بیسواؤں نے مل کر بہت بھاری نیاز دلوائی۔ بستی کے کھلے میدان میں زمین کو صاف کرا کر شامیانے نصب کر دیئے گئے۔ دیگیں کھڑکنے کی آواز اور گوشت اور گھی کی خوشبو بیس بیس کوس سے فقیروں اور کتوں کو کھینچ لائی۔ دوپہر ہوتے ہوتے پیر کڑک شاہ کے مزار کے پاس جہاں لنگر تقسیم کیا جاتا تھا' اس قدر فقیر جمع ہو گئے کہ عید کے روز کسی بڑے شہر کی جامع مسجد کے پاس بھی نہ ہوتے ہوں گے۔ پیر کڑک شاہ کے مزار کو خوب صاف کروایا اور دھلوایا گیا اور اس پر پھولوں کی چادر چڑھائی گئی اور اس مست فقیر کو نیا جوڑا سلوا کر پہنایا گیا جسے اس نے پہنتے ہی پھاڑ ڈالا۔

شام کو شامیانے کے نیچے دودھ سی اُجلی چاندنی کا فرش کر دیا گیا۔ گاؤ تکئے لگا دیئے گئے۔ پاندان' پیکدان' پیچوان اور گلاب پاش رکھ دیئے گئے اور راگ رنگ کی محفل سجائی گئی۔ دور دور سے بہت سی بیسواؤں کو بلوایا گیا جو ان کی سہیلیاں یا برادری کی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے بہت سے ملنے والے بھی آئے جن کے لئے ایک الگ شامیانے میں کرسیوں کا انتظام کیا گیا اور ان کے سامنے کے رخ چقیں ڈال دی گئیں۔ بے شمار گیسوں کی روشنی سے یہ جگہ بقعہ نور بنی ہوئی تھی۔ ان بیسواؤں کے توندل سیاہ فام سازندے زربفت اور کمخواب کی شیروانیاں پہنے عطر میں بسے ہوئے پھوئے کانوں میں رکھے ادھر اُدھر مونچھوں کو تاؤ دیتے پھرتے اور زرق برق لباسوں اور تتلی کے پر سے بھی باریک ساریوں میں ملبوس' غازوں اور خوشبوؤں میں بسی ہوئی نازنینیں اٹکھیلیوں سے چلتیں' رات بھر رقص و سرود کا ہنگامہ برپا رہا اور جنگل میں منگل ہو گیا۔

دو تین دن کے بعد جب اس جشن کی تھکاوٹ اُتر گئی تو یہ بیسوائیں ساز و سامان کی فراہمی اور مکانوں کی آرائش میں مصروف ہوئیں جھاڑ' فانوس' ظروفِ بلوری' قد آدم آئینے' نواڑی پلنگ' تصویریں اور قطعات سنہری چوکھٹوں میں جڑے ہوئے لائے گئے اور قرینے سے کمروں میں لگائے گئے اور کوئی آٹھ روز میں جا کر یہ مکان کیل کانٹے سے لیس ہوئے۔ یہ عورتیں دن کا بیشتر حصہ تو استادوں سے رقص و سرود کی تعلیم لینے' غزلیں یاد کرنے' دھنیں بٹھانے' سبق پڑھنے' تختی لکھنے' سینے پرونے' کاڑھنے' گراموفون سننے' استادوں سے تاش اور کیرم کھیلنے ضلع جگت' نوک جھونک سے جی بہلانے یا سونے میں گذارتیں اور تیسرے پہل غسل خانوں میں نہانے جاتیں

جہاں ان کے ملازموں نے دستی پمپوں سے پانی نکال نکال کر ٹب بھر رکھے ہوتے۔ اس کے بعد وہ بناؤ سنگار میں مصروف ہو جاتیں۔

جیسے ہی رات کا اندھیرا پھیلتا یہ مکان گیسوں کی روشنی سے جگمگا اٹھتے جو بجاسنگ مرمر کے آدھے کھلے ہوئے کنولوں میں نہایت صفائی سے چھپائے گئے تھے، اور ان مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے شیشے جو پھول پتیوں کی وضع کے کاٹ کر جڑے گئے تھے۔ ان کی قوسِ قزح کے رنگوں کی سی روشنیاں دور سے جھلمل جھلمل کرتی ہوئی نہایت بھلی معلوم ہوتیں۔ یہ بیسوائیں بناؤ سنگار کئے برآمدوں میں ٹہلتیں، آس پاس والیوں سے باتیں کرتیں، ہنستیں کھلکھلاتیں ــــ جب کھڑے کھڑے تھک جاتیں تو اندر کمرے میں چاندنی کے فرش پر گاؤ تکیوں سے لگ کر بیٹھ جاتیں۔ ان کے سازندے ساز ملاتے رہتے اور یہ چھالیا کترتی رہتیں۔ جب رات ذرا بھیگ جاتی تو ان سے ملنے والے ٹوکروں میں شراب کی بوتلیں اور پھل پھلاری لئے اپنے دوستوں کے ساتھ موٹروں یا تانگوں میں بیٹھ کر آتے۔ اس بستی میں ان کے قدم رکھتے ہی ایک خاص گہما گہمی اور چہل پہل ہونے لگتی۔ نغمہ و سرود، ساز کے سُر، رقص کرتی ہوئی نازنینوں کے گھنگھروؤں کی آواز قلقلِ مینا میں مل کر ایک عجیب سرور کی سی کیفیت پیدا کر دیتی۔ عیش و مستی کے ان ہنگاموں میں معلوم بھی نہ ہوتا اور رات بیت جاتی۔

ان بیسواؤں کو اس بستی میں آئے چند ہی روز ہوئے تھے کہ دکانوں کے کرایہ دار پیدا ہو گئے جن کا کرایہ اس بستی کو آباد کرنے کے خیال سے بہت ہی کم رکھا گیا تھا۔ سب سے پہلے جو دکاندار آیا وہ وہی بڑھیا تھی جس نے سب سے پہلے مسجد کے سامنے درخت کے نیچے خوانچہ لگایا تھا۔ دکان کو پُر کرنے کے لئے بڑھیا اور اس کا لڑکا سگریٹوں کے بہت سے خالی ڈبے اٹھالائے اور انہیں منبر کے طاقوں میں سجا کر رکھ دیا گیا۔ بوتلوں میں رنگ دار پانی بھر دیا گیا تاکہ معلوم ہو شربت کی بوتلیں ہیں۔ بڑھیا نے اپنی بساط کے مطابق کاغذی پھولوں اور سگریٹ کی خالی ڈبیوں سے بنائی ہوئی بیلوں سے دکان کی کچھ آرائش بھی کی۔ بعض ایکٹروں اور ایکٹرسوں کی تصویریں بھی پرانے فلمی رسالوں سے نکال کر لئی سے دیواروں پر چپکا دیں۔ دکان کی اصل مالیت دو تین قسم کے سگریٹ کے تین تین چار چار پیکٹوں، بیڑی کے آٹھ دس بنڈلوں، دیاسلائی کی نصف درجن ڈبیوں، پانوں کی ایک ڈھولی، پینے کے تمباکو کی تین چار ٹکیوں اور موم بتی کے نصف بنڈل سے زیادہ نہ تھی۔

دوسری دکان میں ایک بنیا، تیسری میں حلوائی اور شیر فروش، چوتھی میں قصائی، پانچویں میں کبابی اور چھٹی میں ایک کنجڑا آ بسے۔ کنجڑا آس پاس کے دیہات سے سستے داموں چار پانچ قسم کی سبزیاں لے آتا اور یہاں نا صے منافع پر بیچ دیتا۔ ایک آدھ ٹوکرا پھلوں کا بھی رکھ لیتا۔ چونکہ دکان خاصی کھلی تھی، ایک پھول والا اس کا ساجھی بن گیا۔ وہ دن بھر پھولوں کے ہار گجرے اور طرح طرح کے گہنے بناتا رہتا اور شام کو انہیں چنگیر میں ڈال کر ایک ایک مکان پر لے جاتا اور نہ صرف پھول ہی بیچ آتا بلکہ ہر جگہ ایک ایک دو دو گھڑی بیٹھ کے سازندوں سے گپ شپ بھی ہانک لیتا اور حقے کے دم بھی لگا آتا۔ جس دن تماش بینوں کی کوئی ٹولی اس کی موجودگی ہی میں کوٹھے پر چڑھ آتی اور گانا بجانا شروع ہو جاتا تو وہ سازندوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود گھنٹوں اُٹھنے کا نام نہ لیتا، مزے سے گانے پر سر دھنتا اور بیوقوفوں کی طرح ایک ایک کی صورت تکتا رہتا۔ جس دن رات زیادہ گذر جاتی اور کوئی ہار بچ جاتا تو اسے اپنے گلے میں ڈال لیتا اور بستی کے باہر گلا پھاڑ پھاڑ کر گاتا پھرتا۔

ایک دکان میں ایک بیسوا کا باپ اور بھائی جو درزیوں کا کام جانتے تھے، سینے کی ایک مشین رکھ کر بیٹھ گئے۔ ہوتے ہوتے ایک حجام بھی آ گیا اور اپنے ساتھ ایک رنگریز بھی لیتا آیا۔ اس کی دکان کے باہر الگنی پر لٹکے ہوئے طرح طرح کے رنگوں کے لہریا دوپٹے ہوا میں لہراتے ہوئے آنکھوں کو بہت بھلے معلوم ہونے لگے۔

چند ہی روز گذرے تھے کہ ایک ٹٹ پونجیئے بساطی نے جس کی دکان شہر میں چلتی نہ تھی، بلکہ اسے دکان کا کرایہ نکالنا بھی مشکل ہو

جاتا تھا شہر کو خیر باد کہہ کر اس بستی کا رُخ کیا۔ یہاں اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اس کے طرح طرح کے لونڈر، قسم قسم کے پاؤڈر، صابن، کنگھیاں، بٹن، سوئی، دھاگا، لیس، فیتے، خوشبودار تیل، رومال، منجن وغیرہ کی خوب بکری ہونے لگی۔

اس بستی کے رہنے والوں کی سرپرستی اور ان کے مربیانہ سلوک کی وجہ سے اسی طرح دوسرے تیسرے کوئی نہ کوئی ٹٹ پونجیا دکاندار کوئی بزاز، کوئی پنساری، کوئی نیچہ بند، کوئی نانبائی مندے کی وجہ سے یا شہر کے بڑھے ہوئے کرایہ سے گھبرا کر اس بستی میں آپناہ لیتا۔

ایک بڑے میاں عطار جو حکمت میں بھی کسی قدر دخل رکھتے تھے ان کا جی شہر کی گنجان آبادی اور حکیموں اور دواخانوں کی افراط سے جو گھبرایا تو وہ اپنے شاگرد کو ساتھ لے شہر سے اٹھ آئے اور اس بستی میں ایک دکان کرایہ پر لے لی۔ سارا دن بڑے میاں اور ان کے شاگرد دواؤں کے ڈبوں، شربت کی بوتلوں اور مربے، چٹنی، اچار کے بویاموں کو الماریوں اور طاقوں میں اپنے اپنے ٹھکانے پر رکھتے رہے۔ ایک طاق میں طبِ اکبر، قرابادین قادری اور دوسری طبی کتابیں جما کر رکھ دیں۔ کواڑوں کی اندرونی جانب اور دیواروں میں جو جگہ خالی بچی وہاں انہوں نے اپنے خاص الخاص مجربات کے اشتہار سیاہ روشنائی سے جلی لکھ کر اور دفتیوں پر چپکا کر آویزاں کر دئیے۔ ہر روز صبح کو بیسواؤں کے ملازم گلاس لے لے کر آموجود ہوتے اور شربت بزوری، شربت بنفشہ، شربت انار، اور ایسے ہی دور نزہت بخش، روح افزا شربت و عرق، خمیرہ گاؤزبان اور تقویت پہنچانے والے مربے مع ورق ہائے نقرہ لے جاتے۔

جو دکانیں بچ رہیں ان میں بیسواؤں کے بھائی بندوں اور سازندوں نے اپنی چارپائیاں ڈال دیں۔ دن بھر یہ لوگ ان دکانوں میں تاش، چوسر اور شطرنج کھیلتے، بدن پر تیل ملواتے، سبزی گھوٹتے، بٹیروں کی پالیاں کراتے، تیتروں سے 'سبحان تیری قدرت' کی رٹ لگواتے اور گھڑا بجا بجا کر گاتے۔

ایک بیسوا کے سازندے نے ایک دکان خالی دیکھ کر اپنے بھائی کو جو ساز بنانا جانتا تھا اس میں لا بٹھایا۔ دکان کی دیواروں کے ساتھ ساتھ کیلیں ٹھونک کر ٹوٹی پھوٹی مرمت طلب سارنگیاں، ستار، طنبورے، دلربا وغیرہ ٹانگ دئیے گئے۔ یہ شخص ستار بجانے میں بھی کمال رکھتا تھا۔ شام کو وہ اپنی دکان میں ستار بجاتا جس کی میٹھی آواز سن کر آس پاس کے دکاندار اپنی دکانوں سے اٹھ اٹھ کر آجاتے اور دیر تک بت بنے ستار سنتے رہتے۔ اس ستار نواز کا ایک شاگرد تھا جو ریلوے کے دفتر میں کلرک تھا۔ اسے ستار سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ جیسے ہی دفتر سے چھٹی ہوتی سیدھا سائیکل اڑاتا ہوا اس بستی کا رُخ کرتا اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دکان ہی میں بیٹھ کر مشق کیا کرتا۔ غرض اس ستار نواز کے دم سے بستی میں خاصی رونق رہنے لگی۔

مسجد کے ملا جی جب تک یہ بستی زیرِ تعمیر رہی رات کو دیہات میں اپنے گھر چلے جاتے رہے۔ مگر اب جبکہ انہیں دونوں وقت مرغن کھانا بافراط پہنچنے لگا تو وہ رات کو بھی یہیں رہنے لگے۔ رفتہ رفتہ بعض بیسواؤں کے گھروں سے بچے بھی مسجد میں آنے لگے جس سے ملا جی کو روپے پیسے کی آمدنی بھی ہونے لگی۔

ایک شہر شہر گھومنے والی گھٹیا درجہ کی تھیٹریکل کمپنی کو جب زمین کے چڑھے ہوئے کرائے اور اپنی بے مائگی کے باعث شہر میں کہیں جگہ نہ ملی تو اس نے اسی بستی کا رُخ کیا اور ان بیسواؤں کے مکانوں سے کچھ فاصلہ پر میدان میں تنبو کھڑے کر کے ڈیرے ڈال دیئے۔ اس کے ایکٹر اداکاری کے فن سے محض نابلد تھے۔ ان کے ڈریس پھٹے پرانے تھے جن کے بہت سے ستارے جھڑ چکے تھے اور یہ لوگ تماشے بھی بہت پرانے اور دقیانوسی دکھاتے تھے مگر اس کے باوجود یہ کمپنی چل نکلی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکٹ کے دام بہت کم تھے۔ شہر کے مزدوری پیشہ لوگ، کارخانوں میں کام کرنے والے اور غریب غربا جو دن بھر کی کڑی محنت و مشقت کی کسر شور و غل، خرمستیوں اور ادنیٰ عیاشیوں سے نکالنا چاہتے تھے پانچ پانچ چھ چھ کی ٹولیاں بنا کر، گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے ہنستے بولتے، بانسریاں اور الغوزے بجاتے، راہ چلتوں پر آوازے کستے، گالی گلوچ کرتے، شہر سے پیدل چل کر تھیٹر دیکھنے آتے اور لگے ہاتھوں بازارِ حسن کی سیر بھی کر

جاسکے۔ جب تک ناٹک شروع نہ ہوتا تھیٹر کا ایک مسخرہ تنبو کے باہر ایک اسٹول پر کھڑا کبھی کولہا مٹکاتا کبھی منہ چلاتا کبھی آنکھیں مٹکاتا۔ عجیب عجیب حیا سوز حرکتیں کرتا جنہیں دیکھ کر یہ لوگ زور زور سے قہقہے لگاتے اور گالیوں کی صورت میں داد دیتے۔

رفتہ رفتہ دوسرے لوگ بھی اس بستی میں آنے شروع ہوئے۔ چنانچہ شہر کے بڑے بڑے چوکوں میں تانگے والے صدائیں لگانے لگے۔ "آؤ کوئی نئی بستی کو" شہر سے پانچ کوس تک جو پکی سڑک جاتی تھی اس پر پہنچ کر تانگے والے سواریوں سے انعام حاصل کرنے کے لالچ میں یا ان کی فرمائش پر تانگوں کی دوڑیں کراتے' منہ سے ہارن بجاتے اور جب کوئی تانگہ آگے نکل جاتا تو اس کی سواریاں نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیتیں۔ اس دوڑ میں غریب گھوڑوں کا برا حال ہو جاتا اور ان کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے بجائے خوشبو کے پسینے کی بدبو آنے لگتی۔

رکشا والے تانگے والوں سے کیوں پیچھے رہتے۔ وہ ان سے کم داموں پر سواریاں بٹھا' طرارے بھرتے اور گھنگھرو بجاتے اس بستی کو جانے لگے۔ علاوہ ازیں ہر ہفتے کی شام کو اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ ایک ایک سائیکل پر دو دو لدے' جوق در جوق اس پراسرار بازار کی سیر کرنے آتے جس سے ان کے خیال کے مطابق ان کے بڑوں نے خواہ مخواہ انہیں محروم کر دیا تھا۔

رفتہ رفتہ اس بستی کی شہرت چاروں طرف پھیلنے اور مکانوں اور دکانوں کی مانگ ہونے لگی۔ وہ بیسوائیں جو پہلے اس بستی میں آنے پر تیار نہ ہوتی تھیں' اب اس کی یہ دن دونی رات چوگنی ترقی دیکھ کر اپنی بیوقوفی پر افسوس کرنے لگیں۔ کئی عورتوں نے جھٹ زمین خرید کر ان بیسواؤں کے ساتھ ساتھ اسی وضع قطع کے مکان بنوانے شروع کر دیئے۔ علاوہ ازیں شہر کے بعض مہاجنوں نے بھی اس بستی کے آس پاس سستے داموں زمینیں خرید خرید کر کرایہ پر اٹھانے کے لئے چھوٹے چھوٹے کئی مکان بنوا ڈالے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فاحشہ عورتیں جو ہوٹلوں اور شریف محلوں میں روپوش تھیں مور و ملخ کی طرح اپنے نہاں خانوں سے باہر نکل آئیں اور ان مکانوں میں آباد ہو گئیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے مکانوں میں اس بستی کے وہ دکاندار آ بسے جو عیال دار تھے اور رات کو دکانوں میں سو نہ سکتے تھے۔

اس بستی میں آبادی تو خاصی ہو گئی تھی مگر ابھی تک بجلی کی روشنی کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ ان بیسواؤں اور بستی کے تمام رہنے والوں کی طرف سے سرکار کے پاس بجلی کے لئے درخواست بھیجی گئی جو تھوڑے دنوں بعد منظور کر لی گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ڈاک خانہ بھی کھول دیا گیا۔ ایک بڑے میاں ڈاک خانے کے باہر ایک صندوقچے میں لفافے' کارڈ اور قلم دوات رکھ' بستی کے لوگوں کے خط پتر لکھنے لگے۔

ایک دفعہ بستی میں شرابیوں کی دو ٹولیوں میں فساد ہو گیا جس میں سوڈا واٹر کی بوتلوں' چاقوؤں اور اینٹوں کا آزادانہ استعمال کیا گیا اور کئی لوگ سخت مجروح ہوئے۔ اس پر سرکار کو خیال آیا کہ اس بستی میں ایک تھانہ بھی کھول دینا چاہئے۔

تھیٹریکل کمپنی دو مہینے تک رہی اور اپنی بساط کے مطابق خاصا کما لے گئی اس پر شہر کے ایک سنیما کے مالک نے سوچا کہ کیوں نہ اس بستی میں بھی ایک سنیما کھول دیا جائے۔ یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ اس نے جھٹ ایک موقع کی جگہ چن کر خرید لی اور جلد جلد تعمیر کا کام شروع کرا دیا۔ چند ہی مہینوں میں سنیما ہال تیار ہو گیا۔ اس کے باہر ایک باغیچہ بھی لگوایا گیا تاکہ تماشائی اگر بائیسکوپ شروع ہونے سے پہلے آ جائیں تو آرام سے باغیچہ میں بیٹھ سکیں۔ ان کے ساتھ بستی کے لوگ یونہی ستانے یا سیر دیکھنے کی غرض سے آ آ کر بیٹھنے لگے۔ یہ باغیچہ خاصی سیر گاہ بن گیا۔ رفتہ رفتہ سقے کٹوار بجاتے اس باغیچے میں آنے اور پیاسوں کی پیاس بجھانے لگے۔ سر کی تیل مالش والے نہایت گھٹیا قسم کے تیز خوشبو والے تیل کی شیشیاں واسکٹ کی جیبوں میں ٹھونسے کاندھے پر میلا کچیلا تولیہ ڈالے دل پسند' دل بہار مالش کی صدا لگاتے دردِ سر کے مریضوں کو اپنی خدمات پیش کرنے لگے۔

سنیما کے مالک نے سنیما ہال کی عمارت کی بیرونی جانب دو ایک مکان اور کئی دکانیں بھی بنوائیں۔ مکان میں تو ہوٹل کھل گیا جس

میں رات کو قیام کرنے کے لئے کمرے بھی مل سکتے تھے اور دکانوں میں ایک سوڈا واٹر کی فیکٹری والا' ایک فوٹو گرافر' ایک سائیکل کی مرمت والا' ایک لانڈری والا دو پنواڑی' ایک بوٹ شاپ والا اور ایک ڈاکٹر مع اپنے دواخانہ کے آرہے۔ ہوتے ہوتے پاس ہی ایک دکان میں کلال خانہ کھلنے کی اجازت مل گئی۔ فوٹو گرافر کی دکان کے باہر ایک کونے میں ایک گھڑی ساز نے آڈیرا جمایا اور ہر وقت محدب شیشہ آنکھ پر چڑھائے گھڑیوں کے کل پرزوں میں غلطاں و پیچاں رہنے لگا۔

اس کے کچھ ہی دن بعد بستی میں نل' روشنی اور صفائی کے باقاعدہ انتظام کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ سرکاری کارندے سرخ جھنڈیاں' جریبیں اور اونچ نیچ دیکھنے والے آلے لے لے کر آپہنچے اور ناپ ناپ کر سڑکوں اور گلی کوچوں کی داغ بیل ڈالنے لگے اور بستی کی کچی سڑکوں پر سڑک کوٹنے والا انجن چلنے لگا۔

اس واقعہ کو بیس برس گذر چکے ہیں۔ یہ بستی اب ایک بھرا پرا شہر بن گئی ہے جس کا اپنا ریلوے اسٹیشن بھی ہے اور ٹاؤن ہال بھی۔ کچہری بھی اور جیل خانہ بھی۔ آبادی ڈھائی لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ شہر میں ایک کالج' دو ہائی اسکول' ایک لڑکوں کے لئے' ایک لڑکیوں کے لئے اور آٹھ پرائمری اسکول ہیں جن میں میونسپلٹی کی طرف سے مفت تعلیم دی جاتی ہے۔ چھ سینما ہیں اور چار بنک جن میں سے دو دنیا کے بڑے بڑے بنکوں کی شاخیں ہیں۔

شہر سے دو روزنامہ' تین ہفتہ وار اور دس ماہانہ رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں۔ ان میں چار ادبی' دو اخلاقی و معاشرتی و مذہبی' ایک صنعتی' ایک طبی' ایک زنانہ اور ایک بچوں کا رسالہ ہے۔ شہر کے مختلف حصوں میں بیس مسجدیں' پندرہ مندر اور دھرم سال' چھ یتیم خانے' پانچ اناتھ آشرم اور تین بڑے سرکاری ہسپتال ہیں جن میں ایک صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔

شروع شروع میں کئی سال تک یہ شہر اپنے رہنے والوں کی مناسبت سے "حسن آباد" کے نام سے موسوم کیا جاتا رہا۔ مگر بعد میں اسے نامناسب سمجھ کر اس میں تھوڑی سی ترمیم کر دی گئی۔ یعنی بجائے "حُسن آباد" کے "حَسن آباد" کہلانے لگا۔ مگر یہ نام چل نہ سکا کیونکہ عوام حُسن اور حَسن میں کچھ امتیاز نہ کرتے۔ آخر بڑی بڑی بوسیدہ کتابوں کی ورق گردانی اور پرانے نوشتوں کی چھان بین کے بعد اس کا اصلی نام دریافت کیا گیا جس سے یہ بستی آج سے سینکڑوں برس قبل اُجڑنے سے پہلے موسوم تھی اور وہ نام ہے "آنندی!"

یوں تو سارا شہر بھرا پرا' صاف ستھرا اور خوش نما ہے۔ مگر سب سے خوبصورت' سب سے بارونق اور تجارت کا سب سے بڑا مرکز وہی بازار ہے جس میں زنانِ بازاری رہتی ہیں۔

آنندی کی بلدیہ کا اجلاس زوروں پر ہے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا ہے اور خلافِ معمول ایک ممبر بھی غیر حاضر نہیں۔ بلدیہ کے زیر بحث مسئلہ یہ ہے کہ زنانِ بازاری کو شہر بدر کر دیا جائے۔ کیونکہ ان کا وجود انسانیت' شرافت اور تہذیب کے دامن پر بدنما داغ ہے۔

ایک فصیح البیان مقرر تقریر کر رہے ہیں۔ "معلوم نہیں وہ کیا مصلحت تھی جس کے زیر اثر اس ناپاک طبقے کو ہمارے اس قدیمی اور تاریخی شہر کے عین بیچوں بیچ رہنے کی اجازت دے دی گئی...... "

اس مرتبہ ان عورتوں کے رہنے کے لئے جو علاقہ منتخب کیا گیا وہ شہر سے بارہ کوس دور تھا۔

پرمیشر سنگھ

احمد ندیم قاسمی

اختر اپنی ماں سے یوں اچانک بچھڑ گیا جیسے بھاگتے ہوئے کسی کی جیب سے روپیہ گر پڑے۔ ابھی تھا اور ابھی غائب۔ ڈھنڈیا پڑی مگر بس اس حد تک کہ لٹے پٹے قافلے کے آخری سرے پر ایک ہنگامہ صابن کے جھاگ کی طرح اٹھا اور بیٹھ گیا۔ "کہیں آ ہی رہا ہوگا۔" کسی نے کہہ دیا۔ "ہزاروں کا تو قافلہ ہے۔" اور اختر کی ماں اس تسلی کی لاٹھی تھامے پاکستان کی طرف چلی آئی تھی۔ "آ ہی رہا ہوگا۔" وہ سوچتی۔ "کوئی تتلی پکڑنے نکل گیا ہوگا اور پھر ماں کو نہ پاکر رویا ہوگا اور پھر ____ پھر اب کہیں آ ہی رہا ہوگا۔ سمجھدار ہے، پانچ سال سے تو کچھ اوپر ہو چلا ہے۔ آ جائے گا۔ وہاں پاکستان میں ذرا ٹھکانے سے بیٹھوں گی تو ڈھونڈ لوں گی ____"

لیکن اختر تو سرحد سے کوئی پندرہ میل اُدھر یونہی، بس کسی وجہ کے بغیر اتنے بڑے قافلے سے کٹ گیا تھا۔ اپنی ماں کے خیال کے مطابق اس نے تتلی کا تعاقب کیا یا کسی کھیت میں سے گنا توڑنے گیا اور توڑتا رہ گیا۔ بہرحال جب وہ روتا چلا تا ایک طرف بھاگا جا رہا تھا تو چند سکھوں نے اسے گھیر لیا تھا اور اختر نے طیش میں آکر کہا تھا۔ "میں نعرۂ تکبیر مار دوں گا ____ اور یہ کہہ کر سہم گیا تھا۔

سب سکھ بے اختیار ہنس پڑے تھے، سوائے ایک سکھ کے جس کا نام پرمیشر سنگھ تھا۔ ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے اس کے اُلجھے ہوئے کیس جھانک رہے تھے اور جوڑا تو بالکل ننگا تھا وہ بولا۔ "ہنسو نہیں یارو۔ اس بچے کو بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے جس نے تمہیں اور تمہارے بچوں کو پیدا کیا۔"

ایک نوجوان سکھ جس نے اب تک کرپان نکال لی تھی، بولا۔ "ذرا ٹھہر پرمیشرے! کرپان پناد ھرم پورا کر لے۔ پھر ہم اپنے دھرم کی بات کریں گے۔'

"مارو نہیں یارو۔" پرمیشر سنگھ کی آواز میں پکار تھی۔ "اسے مارو نہیں، اتنا ذرا سا تو ہے اور اسے بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے جس نے......"

"پوچھ لیتے ہیں اسی سے۔" ایک اور سکھ بولا۔ پھر اس نے سہمے ہوئے اختر کے پاس جا کر کہا۔ "بولو۔ تمہیں کس نے پیدا کیا ____؟ خدا نے کہ واہگورو جی نے؟"

اختر نے اس ساری خشکی کو نگلنے کی کوشش کی جو اس کی زبان کی نوک سے لے کر اس کی ناف تک پھیل چکی تھی۔ آنکھیں جھپک کر اس نے ان آنسوؤں کو گرا دینا چاہا جو ریت کی طرح اس کے پپوٹوں میں کھٹک رہے تھے۔ اس نے پرمیشر سنگھ کو یوں دیکھا جیسے ماں کو دیکھ رہا ہے۔ منہ میں گئے ہوئے ایک آنسو کو تھوک ڈالا اور بولا۔ "پتہ نہیں!"

"لو اور سنو!" کسی نے کہا اور اختر کو گالی دے کر ہنسنے لگا۔

اختر نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی۔ بولا۔ "اماں کہتی ہے میں بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔"

سب سکھ ہنسنے لگے۔ مگر پرمیشر سنگھ بچوں کی طرح بلبلا کر کچھ یوں رویا کہ دوسرے سکھ بھونچکا سے رہ گئے' اور پرمیشر سنگھ رونی آواز میں جیسے بین کرنے لگا۔ "سب بچے ایک سے ہوتے ہیں یارو۔ میرا کرتارا بھی تو یہی کہتا تھا۔ وہ بھی تو اس کی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔"

کرپانیں میان میں چلی گئیں۔ سکھوں نے پرمیشر سنگھ سے الگ تھوڑی دیر کھسر پھسر کی۔ پھر ایک سکھ آگے بڑھا۔ بلکتے ہوئے اختر کو بازو سے پکڑے وہ چپ چاپ روتے ہوئے پرمیشر سنگھ کے پاس آیا اور بولا۔ "لے پرمیشرے' سنبھال اسے کیس بڑھوا کر اسے اپنا کرتارا بنا لے' لے پکڑ۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کو یوں جھپٹ کر اٹھا لیا کہ اس کی پگڑی کھل گئی اور کیسوں کی لٹیں لٹکنے لگیں۔ اس نے اختر کو پاگلوں کی طرح چوما۔ اسے اپنے سینے سے بھینچا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور مسکرا مسکرا کر کچھ ایسی باتیں سوچنے لگا۔ جنھوں نے اس کے چہرے کو چمکا دیا۔ پھر اس نے پلٹ کر دوسرے سکھوں کی طرف دیکھا۔ اچانک وہ اختر کو نیچے اتار کر سکھوں کی طرف لپکا۔ مگر ان کے پاس سے گزر کر دور تک بھاگا چلا گیا۔ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں بندروں کی طرح کودتا اور جھپٹتا رہا اور اس کے کیس اس کی اس لپک جھپٹ کا ساتھ دیتے رہے' دوسرے سکھ حیران کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ پھر وہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ پر رکھے بھاگا ہوا واپس آیا۔ اس کی بھیگی ہوئی داڑھی میں پھنسے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور سرخ آنکھوں میں چمک تھی اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

اختر کے پاس آکر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بولا۔ "نام کیا ہے تمہارا؟"

"اختر!" اب کے اختر کی آواز بھرائی ہوئی نہیں تھی۔

"اختر بیٹے!" پرمیشر سنگھ نے بڑے پیار سے کہا۔ "ذرا میری انگلیوں میں سے جھانکو تو۔"

اختر ذرا سا جھک گیا۔ پرمیشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں میں ذرا سی جھری پیدا کی اور فوراً بند کر لی۔ "ہا!" اختر نے تالی بجا کر اپنے ہاتھوں کو پرمیشر سنگھ کے ہاتھوں کی طرح بند کر لیا اور آنسوؤں میں مسکرا کر بولا۔ "تتلی!"

"لو گے؟" پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

"ہاں!" اختر نے اپنے ہاتھوں کو ملا۔

"لو۔" پرمیشر سنگھ نے اپنے ہاتھوں کو کھولا اختر نے تتلی کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ راستہ پاتے ہی اڑ گئی اور اختر کی انگلیوں کی پوروں پر اپنے پروں کے رنگوں کے ذرّے چھوڑ گئی۔ اختر اداس ہو گیا اور پرمیشر سنگھ دوسرے سکھوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ "سب بچے ایک سے کیوں ہوتے ہیں یارو؟ کرتارے کی تتلی بھی اڑ جاتی تھی تو یونہی منہ لٹکا لیتا تھا۔"

"پرمیشر سنگھ تو آدھا پاگل ہو گیا ہے۔" نوجوان سکھ نے ناگواری سے کہا اور پھر سارا گروہ واپس جانے لگا۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور جب اسی طرف چلنے لگا جدھر دوسرے سکھ گئے تھے تو اختر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "ہم اماں پاس جائیں گے۔ اماں پاس جائیں گے؟" پرمیشر سنگھ نے ہاتھ اٹھا کر اسے تھپکنے کی کوشش کی مگر اختر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ نے کہا کہ "ہاں بیٹے' تمھیں تمہاری اماں کے پاس ہی لئے چلتا ہوں۔" تو اختر چپ ہو گیا۔ صرف کبھی کبھی سسک لیتا تھا اور پرمیشر سنگھ کی تھپکیوں کو بڑی ناگواری سے برداشت کرتا جا رہا تھا۔

پرمیشر سنگھ اسے اپنے گھر میں لے آیا۔ پہلے یہ کسی مسلمان کا گھر تھا۔ لٹا پٹا پرمیشر سنگھ جب ضلع لاہور سے ضلع امرتسر میں آیا تھا

تو گاؤں والوں نے اسے یہ مکان الاٹ کر دیا تھا۔ وہ اپنی بیوی اور بچی سمیت جب اس چار دیواری میں داخل ہوا تو ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹ سی گئی تھیں اور وہ بڑی پراسرار سرگوشی میں بولا تھا۔ "یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔"

گرنتھی جی اور گاؤں کے دوسرے لوگ ہنس پڑے تھے۔ پر میشر سنگھ کی بیوی نے انہیں پہلے سے بتا دیا تھا کہ کرتار سنگھ کے بچھڑتے ہی اسے کچھ ہو گیا ہے۔ "جانے کیا ہو گیا ہے اسے۔" اس نے کہا تھا۔ "واہگورو جی جھوٹ نہ بلوائیں تو وہاں دن میں کوئی دس بار تو یہ کرتار سنگھ کو گدھوں کی طرح پیٹ ڈالتا تھا اور جب کرتار سنگھ سے بچھڑا ہے۔ تو میں تو خیر رو دھو لی پر اس کا رونے سے بھی جی ہلکا نہیں ہوا۔ وہاں مجال ہے جو بچی امر کور کو میں بھی ذرا غصے سے دیکھ لیتی۔ بھڑ جاتا تھا' کہتا تھا۔ "بچی کو برا مت کہو۔ بچی بڑی مسکین ہوتی ہے۔ یہ تو ایک مسافر ہے بے چاری' ہمارے گھر وندے میں ستانے بیٹھ گئی ہے' وقت آئے گا تو چلی جائے گی"____ اور اب امر کور سے ذرا سا بھی کوئی قصور ہو جائے تو آپے ہی میں نہیں رہتا۔ یہ تک بک دیتا ہے کہ بیٹیاں بیویاں اغوا ہوتی سنی تھیں یارو۔ یہ نہیں سنا تھا کہ پانچ چھ برس کے بیٹے بھی اٹھ جاتے ہیں۔"

وہ ایک مہینے سے اس گھر میں مقیم تھا۔ مگر ہر رات اس کا معمول تھا کہ پہلے سوتے میں بے تحاشہ کروٹیں بدلتا۔ پھر بڑبڑانے لگتا اور پھر اٹھ بیٹھتا بڑی ڈری ہوئی سرگوشی میں بیوی سے کہتا۔ "سنتی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے!"____ بیوی اسے محض "اونہہ!" سے ٹال کر سو جاتی تھی۔ مگر امر کور کو اس سرگوشی کے بعد رات بھر نیند نہ آتی۔ اسے اندھیرے میں بہت سی پرچھائیاں ہر طرف بیٹھی قرآن پڑھتی نظر آتیں اور جب ذرا سی پو پھوٹتی تو وہ کانوں میں انگلیاں دے لیتی تھی۔ وہاں ضلع لاہور میں ان کا گھر مسجد کے پڑوس ہی میں تھا اور جب صبح اذان ہوتی تھی تو کیسا مزا آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پورب سے پھوٹتا ہوا اُجالا گانے لگا ہے۔ پھر جب اس کی پڑوسن پریتم کور کو چند نوجوانوں نے خراب کر کے چیتھڑے کی طرح گھورے پر پھینک دیا تھا تو جانے کیا ہوا کہ مؤذن کی آواز میں بھی اسے پریتم کور کی چیخ سنائی دے جاتی تھی' اذان کا تصور تک اسے خوفزدہ کر دیتا تھا اور وہ یہ بھول جاتی تھی کہ اب ان کے پڑوس میں مسجد نہیں ہے۔ یونہی کانوں میں انگلیاں دیئے ہوئے وہ سو جاتی اور رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے دن چڑھے تک سوئی رہتی اور پرمیشر سنگھ اس بات پر بگڑ جاتا۔ "ٹھیک ہے' سوئے نہیں تو اور کیا کرے۔ نکمی تو ہوتی ہی ہیں یہ چھوکریاں۔ لڑکا ہوتا تو اب تک جانے کتنے کام کر چکا ہوتا یارو۔"

پرمیشر سنگھ آنگن میں داخل ہوا تو آج خلاف معمول اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے کھلے کیس کنگھے سمیت اس کی پیٹھ اور ایک کندھے پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کا ایک ہاتھ اختر کی کمر کو تھپکے جا رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک طرف بیٹھی چھاج میں گندم پھٹک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رُک گئے اور وہ ٹکر ٹکر پرمیشر سنگھ کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ چھاج پر سے کودتی ہوئی آئی اور بولی۔ "یہ کون ہے؟"

پرمیشر سنگھ بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ "ڈرو نہیں بے وقوف اس کی عادتیں بالکل کرتارے کی سی ہیں۔ یہ بھی اپنی ماں کو بھوسے کی کوٹھڑی میں پڑا ملا تھا۔ یہ بھی تتلیوں کا عاشق ہے' اس کا نام اختر ہے"____

"اختر!" بیوی کے تیور بدل گئے۔

"تم اسے اختر سنگھ کہہ لینا۔" پرمیشر سنگھ نے وضاحت کی۔ "اور پھر کیسوں کا کیا ہے' دنوں میں بڑھ آتے ہیں۔ کڑا اور کچھیرا پہنا دو' کنگھا کیسوں کے بڑھتے ہی لگ جائے گا۔"

"پر یہ ہے کس کا؟" بیوی نے مزید وضاحت چاہی۔

"کس کا ہے!" پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر سے اُتار کر اسے زمین پر کھڑا کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ "واہگورو جی کا

ہے 'ہمارا اپنا ہے۔"

اور پھر یارو۔ یہ عورت اتنا بھی نہیں دیکھ سکتی کہ اختر کے ماتھے پر جو یہ ذرا سا تل ہے' یہ کرتارے ہی کا تل ہے۔ کرتارے کے بھی تو ایک تل تھا اور یہیں تھا۔ ذرا بڑا تھا پر ہم اسے یہیں تل پر ہی تو چومتے تھے اور یہ اختر کے کانوں کی لویں گلاب کے پھولوں کی طرح گلابی ہیں تو یارو۔ یہ عورت یہ تک نہیں سوچتی کہ کرتارے کے کانوں کی لویں بھی تو ایسی ہی تھیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ذرا موٹی تھیں۔ یہ ذرا پتلی ہیں اور ——— ۔"

اختر اب تک مارے حیرت کے ضبط کئے بیٹھا تھا۔ بلبلا اٹھا۔ "ہم یہاں نہیں رہیں گے ہم اماں پاس جائیں گے 'اماں پاس۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیوی کی طرف بڑھایا۔ "اری لو۔ یہ اماں پاس جانا چاہتا ہے۔"

"تو جائے۔" بیوی کی آنکھوں میں اور چہرے پر وہی آسیب آگیا تھا جسے کرتار سنگھ اپنی آنکھوں اور چہرے میں سے نوچ کر باہر کھیتوں میں جھٹک آیا تھا۔ "ڈاکہ ڈالنے گیا تھا سورما، اور اٹھالایا یہ ہاتھ بھر کا لونڈا۔ ارے کوئی لڑکی ہی اٹھالاتا تو ہزار میں نہ سہی ایک دو سو میں تو بک جاتی۔ اس اجڑے گھر کا کھاٹ کھٹولا بن جاتا اور پھر ——— پگلے ——— تجھے تو کچھ ہو گیا ہے۔ دیکھتے نہیں یہ لڑکا مُسلا ہے؟ جہاں سے اٹھالائے ہو وہیں ڈال آؤ اور خبر دار جو اس نے میرے چوکے میں پاؤں رکھا۔"

پرمیشر سنگھ نے التجا کی۔ "کرتارے اور اختر کو ایک ہی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے سمجھیں؟"

"نہیں۔" اب کے بیوی چیخ اٹھی۔ "میں نہیں سمجھی' نہ کچھ سمجھنا چاہتی ہوں' میں رات ہی رات جھٹکا کر ڈالوں گی اس کا۔ کاٹ کے پھینک دوں گی۔ اٹھالایا ہے وہاں سے۔ لے جا اسے' پھینک دے باہر۔"

"تمہیں نہ پھینک دوں باہر؟" اب کے پرمیشر سنگھ بگڑ گیا۔ "تمہارا نہ کر ڈالوں جھٹکا؟" وہ بیوی کی طرف بڑھا اور بیوی اپنے سینے کو دو ہتڑوں سے پیٹتی' چیختی' چلاتی بھاگی۔ پڑوس سے امر کور دوڑی آئی۔ اس کے پیچھے گلی کی دوسری عورتیں بھی آگئیں۔ "مرد بھی جمع ہو گئے اور پرمیشر سنگھ کی بیوی پٹنے سے بچ گئی۔ پھر سب نے اسے سمجھایا کہ نیک کام ہے۔ ایک مسلمان کو سکھ بنانا کوئی معمولی کام تو نہیں۔ پرانا زمانہ ہوتا تو اب تک پرمیشر سنگھ گورو مشہور ہو چکا ہوتا۔ بیوی کی ڈھارس بندھی مگر امر کور ایک کونے میں بیٹھی گھٹنوں میں سر دئے روتی رہی۔ اچانک پرمیشر سنگھ کی گرج نے سارے ہجوم کو ہلا دیا۔ "اختر کدھر گیا؟" وہ چنگھاڑا۔ "ارے وہ کدھر گیا ہمارا اختر۔ ارے وہ تم میں سے کسی قصائی کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا یارو۔ اختر! اختر!"

وہ چیختا ہوا مکان کے کونوں کھدروں میں جھانکتا ہوا باہر بھاگ گیا۔ بچے مارے دلچسپی کے اس کے تعاقب میں تھے۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ گئی تھیں اور پرمیشر سنگھ گلیوں میں سے باہر کھیتوں میں نکل گیا تھا۔ "ارے میں تو اسے اماں پاس لے چلتا یارو۔ ارے وہ گیا کہاں۔ اختر! اے اختر!"

"میں تمہارے پاس نہیں آؤں گا۔" پگڈنڈی کے ایک موڑ پر گیان سنگھ کے گنے کے کھیت کی آڑ سے' روتے ہوئے اختر نے پرمیشر سنگھ کو ڈانٹ دیا۔ "تم تو سکھ ہو۔"

"ہاں بیٹے۔ سکھ تو ہوں۔" پرمیشر سنگھ نے جیسے مجبور ہو کر اعتراف جرم کر لیا۔

"تو پھر ہم نہیں آئیں گے۔" اختر نے پرانے آنسوؤں کو پونچھ کر نئے آنسوؤں کے لئے راستہ صاف کیا۔

"نہیں آؤ گے؟" پرمیشر سنگھ کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

"نہیں!"

"نہیں آؤ گے؟"

"نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔"

"کیسے نہیں آؤ گے؟" پرمیشر سنگھ نے اختر کو کان سے پکڑا اور پھر نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر اس کے منہ پر چناخ سے ایک تھپڑ مار دیا۔ "چلو!" وہ کڑکا۔

اختر یوں سہم گیا جیسے ایک دم اس کا سارا خون نچڑ کر رہ گیا ہے، پھر ایکا ایکی وہ زمین پر گر کر پاؤں پٹخنے اور خاک اڑانے اور بلک بلک کر رونے لگا "نہیں چلتا۔ بس نہیں چلتا۔ تم سکھ ہو۔ میں سکھوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں اپنی اماں پاس جاؤں گا۔ میں تمہیں مار دوں گا۔"

اور جیسے اب پرمیشر سنگھ کے سہمنے کی باری تھی۔ اس کا بھی سارا خون جیسے نچڑ کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دانتوں میں جکڑ لیا۔ اس کے نتھنے پھڑکنے لگے اور پھر اس زور سے رو دیا کہ کھیت کی پرلی مینڈھ پر آتے ہوئے چند پڑوسی اور ان کے بچے بھی سہم کر رہ گئے اور ٹھٹک گئے۔ پرمیشر سنگھ گھٹنوں کے بل اختر کے سامنے بیٹھ گیا۔ بچوں کی طرح یوں سسک سسک کر رونے لگا کہ اس کا نچلا ہونٹ بھی بچوں کی طرح لٹک آیا اور پھر بچوں کی سی روتی آواز میں بولا۔ "مجھے معاف کر دے اختر۔ مجھے تمہارے خدا کی قسم! میں تمہارا دوست ہوں۔ تم اکیلے یہاں سے جاؤ گے تو تمہیں کوئی مار دے گا پھر تمہاری ماں پاکستان سے آ کر مجھے مارے گی۔ میں خود جا کر تمہیں پاکستان چھوڑ آؤں گا۔ سنا؟ سُن رہے ہو نا؟ پھر وہاں سے اگر تمہیں ایک لڑکا مل جائے نا کرتارا نام کا، تو تم اسے ادھر اس گاؤں میں چھوڑ جانا، اچھا؟"

"اچھا!" اختر نے اُلٹے ہاتھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پرمیشر سنگھ سے سودا کر لیا۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور چلا مگر ایک ہی قدم اٹھا کر رُک گیا۔ سامنے بہت سے بچے اور چند پڑوسی کھڑے اس کی تمام حرکات دیکھ رہے تھے۔ ادھیڑ عمر کا ایک پڑوسی بولا۔ "روتے کیوں ہو پرمیشرے۔ کل ایک مہینے کی تو بات ہے۔ ایک مہینے میں اس کے کیس بڑھ آئیں گے تو بالکل کرتارا لگے گا۔"

کچھ کہے بغیر وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ پھر ایک جگہ رُک کر اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آنے والے پڑوسیوں کی طرف دیکھا۔ "تم کتنے ظالم لوگ ہو یارو۔ اختر کو کرتارا بناتے ہو اور اگر اُدھر کوئی کرتارے کو اختر بنا لے تو؟ اسے ظالم ہی کہو گے نا؟" پھر اس کی آواز میں گرج آ گئی۔ "یہ لڑکا مسلمان ہی رہے گا۔ دربار صاحب کی سوں۔ میں کل ہی امرتسر جا کر اس کے انگریزی بال بنوا لاؤں گا۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے۔ خالصہ ہوں، سینے میں شیر کا دل ہے، مرغی کا نہیں۔"

پرمیشر سنگھ اپنے گھر میں داخل ہو کر بھی اپنی بیوی اور بیٹی کو اختر کی مدارات کے سلسلے میں احکام ہی دے رہا تھا کہ گاؤں کا گرنتھی سردار سنتوکھ سنگھ اندر آیا اور بولا۔ "پرمیشر سنگھ!"

"جی!" پرمیشر سنگھ نے پلٹ کر دیکھا۔ گرنتھی جی کے پیچھے اس کے سب پڑوسی بھی تھے۔

"دیکھو!" گرنتھی جی نے بڑے دبدبے سے کہا۔ "کل سے یہ لڑکا خالصے کی سی پگڑی باندھے گا، کڑا پہنے گا، دھرم شالہ آئے گا اور اسے پرشاد کھلایا جائے گا۔ اس کے کیسوں کو قینچی نہیں چھوئے گی۔ چھو گئی تو کل ہی سے یہ گھر خالی کر دو۔ سمجھے؟"

"جی!" پرمیشر سنگھ نے آہستہ سے کہا۔

"ہاں!" گرنتھی جی نے آخری ضرب لگائی۔

"ایسا ہی ہو گا گرنتھی جی!" پرمیشر سنگھ کی بیوی بولی۔ "پہلے ہی اسے راتوں کو گھر کے کونے کونے سے کوئی چیز قرآن پڑھتی سنائی دیتی ہے۔ لگتا ہے پہلے جنم میں یہ مُسلا رہ چکا ہے۔ امر کور بیٹی نے تو جب سے یہ سُنا ہے کہ ہمارے گھر میں مسلا چھو کرا آیا ہے تو بیٹھی رو رہی ہے، کہتی ہے گھر پر کوئی اور آفت آئے گی۔ پرمیشر نے آپ کا کہنا نہ مانا تو میں بھی دھرم شالہ میں چلی جاؤں گی اور امر کور بھی۔ پھر یہ پڑا

اس چھو کرے کو چاٹے۔ موا نکما۔ واہگورو جی کا بھی لحاظ نہیں۔"

"واہگورو جی کا کون لحاظ نہیں کرتا گدھی۔" پرمیشر سنگھ نے گرنتھی جی کی بات کا غصہ بیوی پر نکالا۔ پھر وہ دیر تک زیرِ لب گالیاں دیتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ کر گرنتھی جی کے سامنے آگیا ــــــ "اچھا جی! اچھا جی۔" اس نے کہا اور کچھ یوں کہا کہ گرنتھی جی پڑوسیوں کے ساتھ فوراً رخصت ہو گئے۔"

چند ہی دنوں میں اختر کو دوسرے سکھ لڑکوں سے پہچاننا مشکل ہو گیا۔ وہی کانوں کی لووں تک کس کر بندھی ہوئی پگڑی وہی ہاتھ کا کڑا اور وہی کچھیرا۔ صرف جب وہ گھر میں آکر پگڑی اتارتا تھا تو اس کے غیر سکھ ہونے کا راز کھلتا تھا۔ لیکن اس کے بال دھڑا دھڑ ابڑھ رہے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی ان بالوں کو چھو کر بہت خوش ہوتی تھی۔ "ذرا اِدھر آ امر کور! یہ دیکھ کیس بن رہے ہیں۔ پھر ایک دن جوڑا بنے گا۔ کنگھا لگے گا اور اس کا نام رکھا جائیگا۔ کرتار سنگھ۔"

"نہیں ماں!" امر کور وہیں سے جواب دیتی۔ "جیسے واہگورو جی ایک ہیں اور گرنتھ صاحب ایک ہیں اور چاند ایک ہے۔ اسی طرح کرتار ابھی ایک ہی ہے۔ "میرا ننھا منا بھائی!" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اور مچل کر کہتی۔ "میں اس کھلونے سے نہیں بہلوں گی ماں۔ میں جانتی ہوں یہ مُسلا ہے اور جو کرتار ا ہوتا ہے وہ مسلا نہیں ہوتا۔"

"میں کب کہتی ہوں کہ یہ سچ مچ کا کرتار ا ہے۔ میرا چاند سالاڈلا بچہ!" پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی رو دیتی۔ دونوں اختر کو اکیلا چھوڑ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاتیں۔ خوب خوب روتیں ایک دوسرے کو تسلیاں دیتیں اور پھر زار زار رونے لگتیں۔ وہ اپنے کرتارے کے لئے روتیں۔ اختر چند روز اپنی ماں کے لئے روتا رہا اب کسی اور بات پر روتا۔ جب پرمیشر سنگھ شرنارتھیوں کی امدادی پنچایت سے کچھ غلہ یا کپڑا لے کر آتا تو اختر بھاگ کر جاتا۔ اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا اور رو رو کر کہتا۔ "میرے سر پر پگڑی باندھو پر موں۔ میرے کیس بڑھا دو مجھے کنگھا خرید دو۔"

پرمیشر سنگھ اسے سینے سے لگا لیتا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتا۔ "یہ سب ہو جائے گا بچے سب کچھ ہو جائے گا۔ پر ایک بات نہیں ہوگی۔ وہ بات کبھی نہیں ہوگی۔ وہ نہیں ہو گا مجھ سے سمجھے؟ یہ کیس ویس سب بڑھ آئیں گے۔"

اختر اپنی اماں کو اب بہت کم یاد کرتا تھا۔ جب تک پرمیشر سنگھ گھر میں رہتا وہ اس سے چمٹا رہتا اور جب وہ کہیں باہر جاتا تو اختر اس کی بیوی اور امر کور کی طرف یوں دیکھتا رہتا جیسے ان سے صرف ایک پیار کی بھیک مانگ رہا ہو۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی اسے نہلاتی اس کے کپڑے دھوتی اور پھر اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے رونے لگتی اور روتی رہ جاتی۔ البتہ امر کور نے اختر کی طرف جب بھی دیکھا ناک اُچھال دی۔ شروع شروع میں تو اس نے اختر کو ایک دھموکا بھی جڑ دیا تھا۔ مگر جب اختر نے پرمیشر سنگھ سے اس کی شکایت کی تو پرمیشر سنگھ بپھر گیا اور امر کور کو بڑی ننگی ننگی گالیاں دیتا اس کی طرف یوں بڑھا کہ اگر اس کی بیوی راستے میں اس کے پاؤں نہ پڑ جاتی تو وہ بیٹی کو اٹھا کر دیوار پرسے گلی میں پٹخ دیتا۔ "اُلّو کی پٹھی!" اس روز اس نے کڑک کر کہا تھا۔ "سُنا تو یہی تھا کہ لڑکیاں اٹھ رہی ہیں پر یہاں یہ مسٹنڈی ہمارے ساتھ لگی چلی آئی اور اُٹھ گیا تو پانچ سال کا لڑکا جسے ابھی اچھی طرح ناک تک پونچھنا نہیں آتا۔ عجب اندھیر ہے یارو!" اس واقعے کے بعد امر کور نے اختر پر ہاتھ تو خیر کبھی نہ اٹھایا مگر اس کی نفرت دوچند تھی۔

ایک روز اختر کو تیز بخار آگیا۔ پرمیشر سنگھ وید کے پاس چلا گیا اور اس کے جانے کے کچھ دیر بعد اس کی بیوی پڑوسن سے پسی ہوئی سونف مانگنے چلی گئی۔ اختر کو پیاس لگی۔ "پانی" اس نے کہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد اس نے لال لال سوجی سوجی آنکھیں کھولیں۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور "پانی" کا لفظ ایک کراہ بن کر اس کے حلق سے نکلا۔ کچھ دیر کے بعد وہ لحاف کو ایک طرف جھٹک کر اُٹھ بیٹھا۔ امر کور سامنے دہلیز پر بیٹھی کھجور کے پتوں سے چنگیر بنا رہی تھی۔ "پانی دے!" اختر نے اسے ڈانٹا۔ امر کور نے بھویں سکیڑ کر اسے گھور کر دیکھا اور اپنے

کام میں جٹ گئی۔ اب کے اختر چلا گیا۔ "پانی دیتی ہے کہ نہیں۔ پانی دے ورنہ ماروں گا"____ امر کور نے اب کے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ بولی۔ "مار تو سہی۔ تو کرتار تو نہیں کہ میں تیری مار سہہ لوں گی۔ میں تو تیری بوٹی بوٹی کر ڈالوں۔" اختر بلک بلک کر رو دیا اور آج مدت کے بعد اس نے اپنی ماں کو یاد کیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ دوا لے آیا اور اس کی بیوی بھی پسی ہوئی سونف لے کر آ گئی تو اختر نے روتے روتے بُری حالت بنالی تھی اور وہ سسک سسک کر کہہ رہا تھا۔ "ہم تو اب اماں پاس چلیں گے۔ یہ امر کور سور کی بچی تو پانی بھی نہیں پلاتی۔ ہم تو اماں پاس جائیں گے۔" پرمیشر سنگھ نے امر کور کی طرف غصے سے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی اور اپنی ماں سے کہہ رہی تھی۔ "کیوں پانی پلاؤں؟ کرتارا بھی تو اسی طرح پانی مانگ رہا ہو گا کسی سے۔ کسی کو اس پر ترس نہ آئے تو ہمیں کیوں ترس آئے اس پر؟ ہاں!"

پرمیشر سنگھ اختر کی طرف بڑھا اور اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ بھی تو تمہاری اماں ہے بیٹے۔"

"نہیں۔" اختر بڑے غصے میں بولا۔ "یہ تو سکھ ہے۔ میری اماں تو پانچ وقت نماز پڑھتی ہے اور بسم اللہ کہہ کر پانی پلاتی ہے۔"

پرمیشر سنگھ کی بیوی جلدی سے ایک پیالہ بھر کر لائی تو اختر نے پیالے کو دیوار پر دے مارا اور چلایا۔ "تمہارے ہاتھ سے نہیں پئیں گے ہم تو امر کور سور کی بچی کی اماں ہو۔ ہم تو پرموں کے ہاتھ سے پئیں گے۔

"یہ بھی مجھی سور کی بچی کا باپ ہے۔" امر کور نے جل کر کہا۔

"تو ہوا کرے!" اختر بولا۔ "تمہیں اس سے کیا؟"

پرمیشر سنگھ کے چہرے پر عجیب کیفیتیں دھوپ چھاؤں سی پیدا کر گئیں۔ وہ اختر کے مطالبے پر مسکرایا بھی اور رو بھی دیا۔ پھر اس نے اختر کو پانی پلایا اس کے ماتھے کو چوما۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا۔ اسے بستر پر لٹا کر اس کے سر کو ہولے ہولے کھجاتا رہا اور کہیں شام کو جا کر اس نے پہلو بدلا۔ اس وقت اختر کا بخار اتر چکا تھا اور وہ بڑے مزے سے سو رہا تھا۔

آج بہت عرصے کے بعد رات کو پرمیشر سنگھ بھڑک اٹھا اور نہایت آہستہ سے بولا۔ "اری سنتی ہو؟ سن رہی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔" بیوی نے پہلے تو پرمیشر سنگھ کی پرانی عادت کہہ کر ٹالنا چاہا۔ پھر ایک دم بڑبڑا کر اٹھی اور امر کور کی کھاٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے ہولے ہولے سے ہلا کر آہستہ سے بولی۔ "بیٹی!"

"کیا ہے ماں؟" امر کور چونک اٹھی۔

اور اس نے سرگوشی کی۔ "سنو تو۔ سچ مچ کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔'

یہ ایک ثانیے کا سناٹا بڑا خوفناک تھا۔ امر کور کی چیخ اس سے بھی زیادہ خوفناک تھی اور پھر اختر کی چیخ خوفناک تر تھی۔

"کیا ہوا بیٹا؟" پرمیشر سنگھ تڑپ کر اٹھا اور اختر کی کھاٹ پر جا کر اسے اپنی چھاتی سے بھینچ لیا۔ "ڈر گئے بیٹا؟"

"ہاں!" اختر لحاف میں سے سر نکال کر بولا۔ "کوئی چیز چیخی تھی۔"

"امر کور چیخی تھی۔" پرمیشر سنگھ نے کہا۔ 'ہم سب یوں سمجھے جیسے کوئی چیز یہاں قرآن پڑھ رہی ہے۔"

"میں پڑھ رہا تھا!" اختر بولا۔

اب کے بھی امر کور کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

بیوی نے جلدی سے چراغ جلا دیا اور امر کور کی کھاٹ پر بیٹھ کر وہ دونوں اختر کو یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ ابھی دھواں بن کر دروازے کی جھریوں میں سے باہر اڑ جائے گا اور باہر سے ایک ڈراؤنی آواز آئے گی۔ "میں جن ہوں۔ میں کل رات پھر آ کر قرآن پڑھوں گا۔"

"کیا پڑھ رہے تھے بھلا؟" پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

"پڑھوں؟" اختر نے پوچھا۔

"ہاں ہاں!" پرمیشر سنگھ نے بڑے شوق سے کہا

اور اختر قل ہو اللہ احد پڑھنے لگا۔ کفواً احد پر پہنچ کر اس نے اپنے گریبان میں چھو کی اور پھر پرمیشر سنگھ کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارے سینے پر بھی چھو کر دوں؟"

"ہاں ہاں!" پرمیشر سنگھ نے گریبان کا بٹن کھول دیا اور اختر نے چھو کر دی۔

اب کے امر کور نے بڑی مشکل سے چیخ پر قابو پایا۔

پرمیشر سنگھ بولا۔ "کیا نیند نہیں آتی تھی؟"

"ہاں!" اختر بولا۔ "اماں یاد آ گئی۔ اماں کہتی ہے نیند نہ آئے تو تین بار قل ہو اللہ پڑھو، نیند آ جائے گی۔ اب آ رہی تھی پر امر کور نے ڈرا دیا۔"

"پھر سے پڑھ کے سو جاؤ۔" پرمیشر سنگھ نے کہا۔ "روز پڑھا کرو، اونچے اونچے پڑھا کرو، اسے بھولنا نہیں ورنہ تمہاری اماں تمہیں مارے گی۔ لو اب سو جاؤ۔" اس نے اختر کو لٹا کر اسے لحاف اوڑھا دیا۔ پھر چراغ بجھانے کے لئے بڑھا تو امر کور پکاری۔ "نہیں نہیں بابا۔۔۔۔ بجھاؤ نہیں۔ ڈر لگتا ہے۔"

"ڈر لگتا ہے؟" پرمیشر سنگھ نے حیران ہو کر پوچھا۔ "کس سے ڈر لگتا ہے؟"

"جلتا رہے۔ کیا ہے؟" بیوی بولی۔

اور پرمیشر سنگھ دیا بجھا کر ہنس دیا۔ "پگلیاں۔" وہ بولا۔ "گدھیاں۔"

رات کے اندھیرے میں اختر آہستہ آہستہ قل ہو اللہ پڑھتا رہا۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ ذرا ذرا سے خراٹے لینے لگا۔ پرمیشر سنگھ بھی سو گیا اور اس کی بیوی بھی۔ مگر امر کور رات بھر کبھی نیند میں "پڑوس" کی مسجد کی اذان سنتی رہی اور ڈرتی رہی۔

اب اختر کے اچھے خاصے کیس بڑھ آئے تھے۔ ننھے سے جوڑے میں کنگھا بھی اٹک جاتا تھا۔ گاؤں والوں کی طرح پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی اسے کرتارا کہنے لگی تھی اور اس سے خاصی شفقت سے پیش آتی تھی۔ مگر امر کور اختر کو یوں دیکھتی تھی جیسے وہ کوئی بہروپیا ہے اور ابھی پگڑی اور کیس اتار کر پھینک دیگا اور قل ہو اللہ پڑھتا ہوا غائب ہو جائے گا۔

ایک دن پرمیشر سنگھ بڑی تیزی سے گھر آیا اور ہانپتے ہوئے اپنی بیوی سے پوچھا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"کون؟ امر کور؟"

"نہیں۔"

"کرتارا؟"

"نہیں۔" پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "ہاں ہاں وہی کرتارا۔"

"باہر کھیلنے گیا ہے۔ گلی میں ہو گا۔"

پرمیشر سنگھ واپس لپکا۔ گلی میں جا کر بھاگنے لگا۔ باہر کھیتوں میں جا کر اس کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ پھر اسے دور گیان سنگھ کے گنے کی فصل کے پاس چند بچے کبڈی کھیلتے نظر آئے۔ کھیت کی اوٹ سے اس نے دیکھا کہ اختر نے ایک لڑکے کو گھٹنوں تلے دے رکھا ہے۔ لڑکے کے ہونٹوں سے خون پھوٹ رہا ہے مگر کبڈی کبڈی کی رٹ جاری ہے، پھر اس لڑکے نے جیسے ہار مان لی اور جب اختر کی گرفت سے چھوٹا تو بولا۔ "کیوں بے کرتارو! تم نے میرے منہ پر گھٹنا کیوں مارا؟"

"اچھا کیا جو مارا۔" اختر اکڑ کر بولا اور بکھرے ہوئے جوڑے کی لٹیں سنبھال کر ان میں کنگھا پھنسانے لگا۔

"تمہارے رسول نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟" لڑکے نے طنز سے پوچھا۔

اختر ایک لمحے کے لئے چکرا گیا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ "اور کیا تمہارے گرو نے تمہیں یہی سمجھایا ہے؟"

"ہنسلا۔" لڑکے نے اسے گالی دی۔

"سکھڑا۔" اختر نے اسے گالی دی۔

سب لڑکے اختر پر ٹوٹ پڑے۔ مگر پرمیشر سنگھ کی ایک ہی کڑک سے میدان صاف تھا۔ اس نے اختر کی پگڑی باندھی اور اسے ایک طرف لے جا کر بولا۔ "سنو بیٹے۔ میرے پاس رہو گے کہ اماں کے پاس جاؤ گے؟"

اختر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کچھ دیر تک پرمیشر سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ پھر مسکرانے لگا اور بولا۔ "اماں پاس جاؤں گا۔"

"اور میرے پاس نہیں رہو گے؟" پرمیشر سنگھ کا رنگ یوں سرخ ہو گیا جیسے وہ رو دے گا۔

"تمہارے پاس بھی رہوں گا۔" اختر نے معمے کا حل پیش کر دیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور وہ آنسو جو مایوسی سے آنکھوں میں جمع ہو گئے تھے خوشی کے آنسو بن کر ٹپک پڑے۔ وہ بولا۔ "دیکھو بیٹے۔ اختر بیٹے۔ اختر بیٹے! آج یہاں فوج آ رہی ہے۔ یہ فوجی تمہیں مجھ سے چھیننے آ رہے ہیں۔ سمجھے؟ کہیں چھپ جاؤ۔ پھر جب وہ چلے جائیں گے نا تو میں تمہیں لے آؤں گا۔"

پرمیشر سنگھ کو اس وقت دور غبار کا ایک پھیلتا ہوا بگولا دکھائی دیا۔ مینڈھ پر چڑھ کر اس نے لمبے ہوتے ہوئے بگولے کو غور سے دیکھا اور اچانک تڑپ کر بولا۔ "فوجیوں کی لاری آ گئی"___ وہ مینڈھ پر سے کود پڑا اور گنے کے کھیت کا پورا چکر کاٹ گیا۔ "گیانے! او گیان سنگھ!" وہ چلایا۔ گیان سنگھ فصل کے اندر سے نکل کر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں درانتی اور دوسرے میں تھوڑی سی گھاس تھی۔ پرمیشر سنگھ اسے الگ لے گیا۔ اسے کوئی بات سمجھائی۔ پھر دونوں اختر کی طرف آئے۔ گیان سنگھ نے فصل میں سے ایک گنا توڑ کر درانتی سے اس کے پتے کاٹے اور اسے اختر کے حوالے کر کے بولا۔ "آؤ بھئی کرتارے۔ تم میرے پاس بیٹھ کر گنا چوسو۔ جب تک یہ فوجی چلے جائیں۔ اچھا خاصا بنا بنایا خالصہ ہتھیانے آئے ہیں۔ اونہہ!" پرمیشر سنگھ نے اختر سے جانے کی اجازت مانگی۔ "جاؤں؟"

اور اختر نے دانتوں میں گنے کا لمبا سا چھلکا جکڑے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ اجازت پا کر پرمیشر سنگھ گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔ بگولا گاؤں کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔

گھر جا کر اس نے بیوی اور بیٹی کو سمجھایا۔ پھر بھاگم بھاگ گرنتھی جی کے پاس گیا۔ ان سے بات کر کے ادھر ادھر دوسرے لوگوں کو سمجھاتا پھرا اور جب فوجیوں کی لاری دھرم شالہ سے ادھر کھیت میں رک گئی تو سب فوجی اور پولیس والے گرنتھی جی کے پاس آئے۔ ان کے ساتھ علاقے کا نمبردار بھی تھا۔ مسلمان لڑکیوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوتی رہی...... گرنتھی جی نے گرنتھ صاحب کی قسم کھا کر کہہ دیا کہ اس گاؤں میں کوئی مسلمان لڑکی نہیں۔ "لڑکے کی بات دوسری ہے۔" کسی نے پرمیشر سنگھ کے کان میں سرگوشی کی اور آس پاس کے سکھ پرمیشر سنگھ سمیت زیر لب مسکرانے لگے۔ پھر ایک فوجی افسر نے گاؤں والوں کے سامنے ایک تقریر کی۔ اس نے اس ماستا پر بڑا زور دیا جو ان ماؤں کے دلوں میں ان دنوں ٹیس بن کر رہ گئی تھی، جن کی بیٹیاں چھن گئی تھیں اور ان بھائیوں اور شوہروں کے پیار کی بڑی دردناک تصویر کھینچی جن کی بہنیں اور بیویاں ان سے ہتھیالی گئی تھیں۔ "اور مذہب کا کیا ہے دوستو!" اس نے کہا تھا۔ "دنیا کا ہر مذہب انسان کو انسان بنانا سکھاتا ہے اور تم مذہب کا نام لے کر انسان کو انسان سے چرا لیتے ہو، ان کی آبرو پر ناچتے ہو۔ ہم سکھ ہیں، ہم مسلمان ہیں۔ ہم واہگورو جی کے چیلے ہیں۔ ہم رسول کے غلام ہیں۔"

تقریر کے بعد مجمع چھٹنے لگا۔ فوجیوں کے افسر نے گرنتھی جی کا شکریہ ادا کیا اور ان سے ہاتھ ملایا اور لاری چلی گئی۔

سب سے پہلے گرنتھی جی نے پرمیشر سنگھ کو مبارک باد دی۔ پھر دوسرے لوگوں نے پرمیشر سنگھ کو گھیر لیا اور اسے مبارکبادیں دینے لگے۔ لیکن پرمیشر سنگھ لاری کے آنے سے پہلے حواس باختہ ہو رہا تھا اب لاری کے جانے کے بعد لٹا لٹا سا لگ رہا تھا۔ پھر وہ گاؤں میں سے نکل کر گیان سنگھ کے کھیت میں آیا۔ اختر کو کندھے پر بٹھا کر گھر میں لے آیا۔ کھانا کھلانے کے بعد اسے کھاٹ پر لٹا کر کچھ یوں تھپکا کہ اسے نیند آ گئی۔ پرمیشر سنگھ دیر تک اختر کی کھاٹ پر بیٹھا رہا۔ کبھی کبھی داڑھی کھجاتا اور ادھر اُدھر دیکھ کر پھر سے سوچ میں ڈوب جاتا۔ پڑوس کی چھت پر کھیلتا ہوا ایک بچہ اچانک ایڑی پکڑ کر بیٹھ گیا اور زار زار رونے لگا۔ "ہائے اتنا بڑا کانٹا اُتر گیا پورے کا پورا۔" وہ چلایا اور پھر اس کی ماں ننگے سر اوپر بھاگی۔ اسے اٹھا کر گود میں بٹھا لیا پھر نیچے بیٹی کو پکار کر سوئی منگوائی۔ کانٹا نکالنے کے بعد اسے بے تحاشا چوما اور پھر نیچے جھک کر پکاری۔ "ارے میرا دوپٹہ تو اوپر پھینک دینا۔ کیسی بے حیائی سے اوپر بھاگی چلی آئی۔"

پرمیشر سنگھ نے کچھ دیر کے بعد چونک کر اپنی بیوی سے پوچھا۔ "سنو! کیا تمہیں کرتارا اب بھی یاد آتا ہے؟"

"لو اور سنو۔" بیوی بولی اور پھر ایک دم چھاجوں رو دی۔ "یہ کرتارا تو میرے کلیجے کا ناسور بن گیا ہے پرمیشرے۔"

کرتارے کا نام سُن کر ادھر سے امر کور اٹھ کر آئی اور ماں کے گھٹنے کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔

پرمیشر یوں بدک کر جلدی سے اٹھا جیسے اس نے شیشے کے برتنوں سے بھرا ہوا طشت اچانک زمین پر دے مارا ہے۔

شام کے کھانے کے بعد وہ اختر کو انگلی سے پکڑے باہر دالان میں آیا اور بولا۔ "آج تو دن بھر خوب سوئے بیٹا۔ چلو آج ذرا گھومنے چلتے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔"

اختر فوراً مان گیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے ایک کمبل میں لپیٹا اور کندھے پر بٹھا لیا۔ کھیتوں میں آ کر وہ بولا۔ "یہ چاند جو پورب سے نکل رہا ہے نا بیٹے۔ یہ جب ہمارے سر پر پہنچے گا تو صبح ہو جائے گی۔"

اختر چاند کی طرف دیکھنے لگا۔

"یہ چاند یہاں چمک رہا ہے نا یہ وہاں بھی چمک رہا ہو گا تمہاری اماں کے دیس میں۔"

اب کے اختر نے جھک کر پرمیشر سنگھ کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔

"یہ چاند جب ہمارے سر پر آئے گا تو وہاں تمہاری اماں کے سر پر بھی ہو گا۔"

اب کے اختر بولا۔ "ہم چاند دیکھ رہے ہیں تو کیا اماں بھی چاند کو دیکھ رہی ہو گی؟"

"ہاں!" پرمیشر سنگھ کی آواز میں گونج تھی۔ "جاؤ گے اماں کے پاس؟"

"ہاں!" اختر بولا۔ "پر تم لے جاتے نہیں تم بہت بُرے ہو۔ تم سکھ ہو۔"

پرمیشر سنگھ بولا۔ "نہیں بیٹے! آج تو تمہیں ضرور ہی لے جاؤں گا۔ تمہاری اماں کی چٹھی آئی ہے۔ وہ کہتی ہے میں اختر بیٹے کے لئے اُداس ہوں۔"

"میں بھی تو اُداس ہوں۔" اختر کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی۔

"میں تمہاری اماں ہی کے پاس لئے جا رہا ہوں۔"

"سچ؟" اختر پرمیشر سنگھ کے کندھے پر کودنے لگا اور زور زور سے بولنے لگا۔ "ہم اماں پاس جا رہے ہیں۔ پرموں ہمیں اماں پاس لے جائیگا ہم وہاں سے پرموں کو چٹھی لکھیں گے۔"

پرمیشر سنگھ چپ چاپ روئے جا رہا تھا۔ آنسو پونچھ کر اور گلا صاف کر کے اس نے اختر سے پوچھا۔ "گانا سنو گے؟"

"ہاں!"

"پہلے تم قرآن سناؤ۔"

"اچھا!" اور اختر قل ہو اللہ احد پڑھنے لگا۔ کفواً احد پر پہنچ کر اس نے اپنے سینے پر چھو کی اور بولا۔ "لاؤ تمہارے سینے پر بھی چھو کر دوں۔"

رُک کر پرمیشر سنگھ نے گریبان کا ایک بٹن کھولا اور اوپر دیکھا۔ اختر نے لٹک کر اس کے سینے پر چھو کر دی اور بولا:

"اب تو سناؤ۔"

پرمیشر سنگھ نے اختر کو دوسرے کندھے پر بٹھا لیا۔ اسے بچوں کا کوئی گیت یاد نہیں تھا۔ اس لئے اس نے قسم قسم کے گیت گانا شروع کئے اور گاتے ہوئے تیز تیز چلنے لگا۔ اختر چپ چاپ سنتا رہا۔

بنتو دا سر بن ورگا ہے

بنتو دا منہ چن ورگا ہے

بنتو دا لک چترا ہے

لوکو

بنتو دا لک چترا

"بنتو کون ہے؟" اختر نے پرمیشر سنگھ کو ٹوکا۔

پرمیشر سنگھ ہنسا۔ پھر ذرا سے وقفے کے بعد بولا۔ "میری بیوی ہے نا۔ امر کور کی ماں۔ اس کا نام بھی تو بنتو ہے۔ تمہاری اماں کا نام بھی بنتو ہی ہو گا۔"

"کیوں؟" اختر خفا ہو گیا۔ "وہ کوئی سکھ ہے؟"

پرمیشر سنگھ خاموش ہو گیا۔

چاند بہت بلند ہو گیا تھا۔ رات خاموش تھی۔ کبھی کبھی گنے کے کھیتوں کے آس پاس گیدڑ روتے اور پھر سناٹا چھا جاتا۔ اختر پہلے تو گیدڑوں کی آواز سے ڈرا مگر پرمیشر سنگھ کے سمجھانے سے بہل گیا اور ایک بار خاموشی کے طویل وقفے کے بعد اس نے پرمیشر سنگھ سے پوچھا۔ "اب کیوں نہیں روتے گیدڑ؟" پرمیشر سنگھ ہنس دیا۔ پھر اسے ایک کہانی یاد آ گئی۔ یہ گورو گوبند کی کہانی تھی۔ لیکن اس نے بڑے سلیقے سے سکھوں کے ناموں کو مسلمانوں کے ناموں میں بدل دیا اور اختر "پھر؟ پھر؟" کی رٹ لگاتا رہا اور کہانی ابھی جاری تھی جب اختر ایک دم بولا۔ "ارے چاند تو سر پر آ گیا۔"

پرمیشر سنگھ نے بھی رُک کر اوپر دیکھا۔ پھر وہ قریب کے ٹیلے پر چڑھ کر دور دیکھنے لگا اور بولا۔ "تمہاری اماں کا دیس جانے کدھر چلا گیا؟"

وہ کچھ دیر ٹیلے پر کھڑا رہا جب اچانک کہیں بہت دور سے اذان کی آواز آنے لگی اور اختر مارے خوشی کے یوں کودا کہ پرمیشر سنگھ اسے بڑی مشکل سے سنبھال سکا۔ اسے کندھے پر سے اتار کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھڑے ہوئے اختر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "جاؤ بیٹے تمہیں تمہاری اماں نے پکارا ہے۔ بس تم اس آواز کی سیدھ میں ______"

"شش!" اختر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور سرگوشی میں بولا۔ "اذان کے وقت نہیں بولتے!"

"پر میں تو سکھ ہوں بیٹے!" پرمیشر سنگھ بولا۔

"شش" اب کے اختر نے بگڑ کر اسے گھورا۔

اور پرمیشر سنگھ نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ اس کے ماتھے پر ایک بہت طویل پیار دیا اور اذان ختم ہونے کے بعد آستینوں سے آنکھوں کو رگڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "میں یہاں سے آگے نہیں جاؤں گا۔ بس تم ـــــــ"

"کیوں؟ کیوں نہیں جاؤ گے؟" اختر نے پوچھا۔

"تمہاری اماں نے چٹھی میں یہی لکھا ہے کہ اختر اکیلا آئے۔" پرمیشر سنگھ نے اختر کو پھسلا لیا۔ "بس تم سیدھے چلے جاؤ۔ سامنے ایک گاؤں آئے گا وہاں جا کر اپنا نام بتانا۔ کرتار نہیں، اختر۔ پھر اپنی اماں کا نام بتانا، اپنے گاؤں کا نام بتانا اور دیکھو مجھے ایک چٹھی ضرور لکھنا۔"

"لکھوں گا۔" اختر نے وعدہ کیا۔

"اور ہاں، نہیں کرتار نام کا کوئی لڑکا ملے تو اسے ادھر بھیج دینا، اچھا؟"

"اچھا!"

پرمیشر سنگھ نے ایک بار پھر اختر کا منہ چوما اور جیسے کچھ نگل کر بولا۔ "جاؤ۔"

اختر چند قدم چلا مگر پلٹ آیا۔ "تم بھی آجاؤ نا۔"

"نہیں بھئی۔" پرمیشر سنگھ نے اسے سمجھایا۔ "تمہاری اماں نے چٹھی میں یہ نہیں لکھا۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" اختر بولا۔

"قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟" پرمیشر سنگھ نے مشورہ دیا۔

"اچھا" بات اختر کی سمجھ میں آ گئی اور وہ قل ہو اللہ کا ورد کرتا ہوا جانے لگا۔

نرم نرم افق کے دائرے پر اندھیرے سے لڑ رہی تھی اور ننھا سا اختر دور دھندلی پگڈنڈی پر ایک لمبے تڑنگے سکھ جوان کی طرح تیز تیز جا رہا تھا۔ پرمیشر سنگھ اس پر نظریں گاڑے ٹیلے پر بیٹھا رہا اور جب اختر کا نقطہ فضا کا ایک حصہ بن گیا تو وہ وہاں سے اتر آیا۔

اختر ابھی گاؤں کے قریب نہیں پہنچا تھا کہ دو سپاہی لپک کر آئے اور اسے روک کر بولے۔ "کون ہو تم؟"

"اختر!" وہ یوں بولا جیسے ساری دنیا اس کا نام جانتی ہے۔

"اختر!" دونوں سپاہی کبھی اختر کے چہرے کو دیکھتے تھے اور کبھی اس کی سکھوں کی سی پگڑی کو۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر اس کی پگڑی جھٹکے سے اتار لی تو اختر کے کیس کھل کر ادھر ادھر بکھر گئے۔

اختر نے بھنا کر پگڑی چھین لی اور پھر سر کو ایک ہاتھ سے ٹٹولتے ہوئے وہ زمین پر لیٹ گیا اور زور زور سے روتے ہوئے بولا۔ "میرا کنگھا لاؤ تم نے میرا کنگھا لے لیا ہے۔ دے دو ورنہ میں تمہیں مار دوں گا۔"

ایک دم دونوں سپاہی زمین پر دھب سے گرے اور رائفلوں کو کندھے سے لگا کر جیسے نشانہ باندھنے لگے۔ "ہالٹ!" ایک پکارا اور جیسے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پھر بڑھتے ہوئے اُجالے میں انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا .... اور ایک نے فائر کر دیا۔ اختر فائر کی آواز سے دہل کر رہ گیا اور سپاہیوں کو ایک طرف بھاگتا دیکھ کر وہ بھی روتا چلاتا ہوا ان کے پیچھے بھاگا۔

سپاہی جب ایک جگہ جا کر رکے تو پرمیشر سنگھ اپنی ران پر کس کر پگڑی باندھ چکا تھا۔ مگر خون اس کی پگڑی کی سینکڑوں پرتوں میں سے بھی پھوٹ آیا تھا اور وہ کہہ رہا تھا۔ "مجھے کیوں مارا تم نے؟ میں تو اختر کے کیس کاٹنا بھول گیا تھا۔ میں تو اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا یارو۔"

دور اختر بھاگا آ رہا تھا اور اس کے کیس ہوا میں اُڑ رہے تھے۔

آپا

ممتاز مفتی

جب کبھی بیٹھے بٹھائے مجھے آپا یاد آتی ہے تو میری آنکھوں کے آگے ایک چھوٹا سا بلوری دیا آجاتا ہے جو مدھم لو سے جل رہا ہو۔

مجھے یاد ہے ایک رات ہم سب چپ چاپ باورچی خانے میں بیٹھے تھے میں، آپا اور امی جان کہ چھوٹا بدو بھاگتا ہوا آیا۔ ان دنوں بدو یہی چھ سات سال کا ہو گا۔ کہنے لگا۔ "امی جان! میں بھی بیاہ کروں گا۔"

"او ابھی سے؟" اماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر کہنے لگیں۔ "اچھا بدو تمہارا بیاہ آپا سے کر دیں؟"

"او نہوں!" بدو نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

اماں کہنے لگیں۔ "کیوں آپا کو کیا ہے؟"

"ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔" بدو نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔

اماں نے آپا کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگیں۔ "کیوں دیکھو تو آپا کیسی اچھی ہیں؟"

"میں بتاؤں کیسی ہے؟" وہ چلایا۔

"ہاں بتاؤ تو بھلا۔" اماں نے پوچھا۔ بدو نے آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف دیکھا جیسے کچھ ڈھونڈھ رہا ہو۔ پھر اس کی نگاہ چولھے پر آ کر رکی چولھے میں اُپلے کا ایک جلا ہوا ٹکڑا پڑا تھا۔ بدو نے اس کی طرف اشارہ کیا اور بولا "ایسی!" پھر بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی اٹھا کر چیخنے لگا۔ "اور چھاجو باجی ایسی!" اس بات پر ہم سب دیر تک ہنستے رہے اتنے میں تصدق بھائی آ گئے۔ اماں کہنے لگیں۔ "تصدق بدو سے پوچھنا تو کہ آپا کیسی ہیں؟" آپا نے تصدق بھائی کو آتے ہوئے دیکھا تو منہ موڑ کر یوں بیٹھ گئی جیسے ہنڈیا پکانے میں منہمک ہو۔

"ہاں تو کیسی ہے آپا بدو؟" وہ بولے۔ "بتاؤں؟" بدو چلایا اور اس نے اُپلے کا ٹکڑا اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ غالباً وہ اسے ہاتھ میں لے کر ہمیں دکھانا چاہتا تھا مگر آپا نے جھٹ اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور انگلی ہلاتے ہوئے بولی "اونہہ!" بدو رونے لگا تو اماں کہنے لگیں۔ "پگلے اسے ہاتھ میں نہیں اٹھاتے، اس میں چنگاری ہے"____"وہ تو جلا ہوا ہے اماں!" بدو نے بسورتے ہوئے کہا۔ اماں بولیں۔ "میرے لال تمہیں معلوم نہیں اس کے اندر تو آگ ہے۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔" بدو نے بھولے پن سے پوچھا۔ "کیوں آپا اس میں آگ ہے؟" اس وقت آپا کے منہ پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی۔ "میں کیا جانوں؟" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی اور پھکنی اٹھا کر جلتی ہوئی آگ میں بے مصرف پھونکیں مارنے لگی۔

اب میں سمجھتی ہوں کہ آپا دل کی گہرائیوں میں جیتی تھی اور وہ گہرائیاں اتنی عمیق تھیں کہ بات اُبھرتی بھی تو نکل نہ سکتی۔ اس روز بدو نے کیسے پتے کی بات کہی تھی مگر میں کہا کرتی تھی۔ "آپا تم تو بس بیٹھ رہتی ہو۔" اور وہ مسکرا کر کہتی "پگلی!" اور اپنے کام میں لگ جاتی۔ ویسے تو وہ سارا دن کام میں لگی رہتی تھی۔ ہر کوئی اسے کسی نہ کسی کام کو کہہ دیتا اور ایک ہی وقت میں اسے کئی کام کرنے پڑ جاتے۔ اِدھر بدو چیختا۔ "آپا میرا دلیا۔" اُدھر ابا گھورتے۔ "سجادہ ابھی تک چائے کیوں نہیں بنی؟" بیچ میں اماں بول اٹھتیں۔ "بیٹا دھوبی کب سے باہر کھڑا ہے؟" اور آپا چپ چاپ سارے کاموں سے نپٹ لیتی یہ تو میں خوب جانتی تھی مگر اس کے باوجود جانے کیوں اسے کام کرتے ہوئے دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کام کر رہی ہے یا وہ اتنا کام کرتی ہے۔ مجھے تو بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ بیٹھی ہی رہتی ہے اور اسے اِدھر سے اُدھر گردن موڑنے میں بھی اتنی دیر لگتی ہے اور چلتی ہے تو چلتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ میں نے آپا کو کبھی قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے نہیں سنا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ مسکرا دیا کرتی تھی اور بس۔ البتہ وہ مسکرایا اکثر کرتی۔ جب وہ مسکراتی تو اس کے ہونٹ کھل جاتے اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔ ہاں تو میں سمجھتی تھی کہ آپا چپکی بیٹھی ہی رہتی ہے۔ ذرا نہیں ہلتی اور بن چلے ٹرھک کر یہاں سے وہاں پہنچ جاتی ہے جیسے کسی نے اسے دھکیل دیا ہو۔ اس کے برعکس ساحرہ کتنے مزے میں چلتی تھی جیسے دادرے کی تال پر ناچ رہی ہو اور اپنی خالہ زاد بہن ساجو باجی کو چلتے دیکھ کر تو میں کبھی نہ اکتاتی۔ جی چاہتا تھا کہ باجی ہمیشہ میرے پاس رہے اور چلتی چلتی اسی طرح گردن موڑ کر پنچم آواز میں کہے۔ "ہیں جی! کیوں جی؟" اور اس کی کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگیں۔ باجی کی بات بات مجھے کتنی پیاری تھی۔

ساحرہ اور ثریا پڑوس ہی میں رہتی تھیں۔ دن بھر ان کا مکان ان کے قہقہوں سے گونجتا رہتا جیسے کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ بس میرا جی چاہتا تھا کہ انہیں کے گھر جا رہوں۔ ہمارے گھر میں رکھا ہی کیا تھا۔ ایک بیٹھ رہنے والی آپا ایک "یہ کرو۔ وہ کرو۔" والی اماں اور دن بھر حقے پر گڑگڑ کرنے والے ابا۔

اس روز جب میں نے ابا کو امی سے کہتے ہوئے سنا۔ سچ تو یہ ہے مجھے بے حد غصہ آیا۔ ابا کہنے لگے۔ "سجادہ کی ماں! معلوم ہوتا ہے ساحرہ کے گھر میں بہت سے برتن ہیں۔"

"کیوں؟" اماں پوچھنے لگیں۔

کہنے لگے۔ "بس تمام دن برتن ہی بجتے رہتے ہیں اور یا قہقہے لگتے ہیں جیسے میلہ لگا ہو۔"

اماں تنک کر بولیں۔ "مجھے کیا معلوم۔ آپ تو بس لوگوں کے گھر کی طرف کان لگائے بیٹھے رہتے ہیں۔"

ابا کہنے لگے۔ "افوہ! میرا تو یہ مطلب ہے کہ جہاں لڑکی جوان ہوئی برتن بجنے لگے۔ بازار کے اس موڑ تک لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے کہ فلاں گھر میں لڑکی جوان ہو چکی ہے۔ مگر دیکھو نا ہماری سجادہ میں یہ بات نہیں۔" میں نے ابا کی بات سنی اور میرا دل کھولنے لگا۔ بڑی آئی ہے۔ سجادہ جی ہاں! اپنی بیٹی جو ہوئی۔ اس وقت میرا جی چاہتا تھا کہ جا کر باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی آپا کا منہ چڑاؤں۔ اسی بات پر میں نے دن بھر کھانا نہ کھایا اور دل ہی دل میں کھولتی رہی۔ ابا جانتے ہی کیا ہیں۔ بس حقہ لیا اور گڑگڑ کر لیا یا زیادہ سے زیادہ کتاب کھول کر بیٹھ گئے اور گٹ مٹ گٹ مٹ کرنے لگے جیسے کوئی بھٹیاری مکی کے دانے بھون رہی ہو۔ سارے گھر میں لے دے کے صرف تصدق بھائی ہی تھے جو دلچسپ باتیں کیا کرتے تھے اور جب ابا گھر پر نہ ہوتے تو وہ بھاری آواز میں گایا بھی کرتے تھے۔ جانے وہ کون سا شعر تھا ——— ہاں

چپ چپ سے وہ بیٹھے ہیں آنکھوں میں نمی سی ہے نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

آپا انہیں گاتے ہوئے سن کر کسی نہ کسی بات پر مسکرا دیتی اور کوئی بات نہ ہوتی تو وہ بدو کو ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی۔ "بدو رونا" اور پھر

آپ ہی بیٹھی مسکراتی رہتی۔

تصدق بھائی میرے پھوپھا کے بیٹے بھائی تھے۔ انہیں ہمارے گھر آئے ابھی دو ماہ ہوئے ہوں گے۔ کالج میں پڑھتے تھے۔ پہلے تو وہ بورڈنگ میں رہا کرتے تھے پھر ایک دن جب پھوپھی آئی ہوئی تھی تو باتوں باتوں میں ان کا ذکر چھڑ گیا۔ پھوپھی کہنے لگی بورڈنگ میں کھانے کا انتظام ٹھیک نہیں۔ لڑکا آئے دن بیمار رہتا ہے۔ اماں اس بات پر خوب لڑیں۔ کہنے لگیں اپنا گھر موجود ہے تو بورڈنگ میں پڑے رہنے کا مطلب؟ پھر ان دونوں میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ اماں کی تو عادت ہے کہ اگلی پچھلی تمام باتیں لے بیٹھتی ہیں۔ غرضیکہ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہفتہ کے بعد تصدق بھائی بورڈنگ کو چھوڑ کر ہمارے ہاں آ ٹھہرے۔

تصدق بھائی مجھ سے اور بدو سے بڑی گپیں ہانکا کرتے تھے۔ ان کی باتیں بے حد دلچسپ ہوتیں۔ بدو سے تو وہ دن بھر نہ اکتاتے۔ البتہ آپا سے وہ زیادہ باتیں نہ کرتے۔ کرتے بھی کیسے' جب کبھی وہ آپا کے سامنے جاتے تو آپا کے دوپٹے کا پلو آپ ہی آپ سرک کر نیم گھونگھٹ سا بن جاتا اور آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھک جاتیں اور وہ کسی نہ کسی کام میں شدت سے مصروف دکھائی دیتی۔ اب مجھے خیال آتا ہے کہ آپا ان کی باتیں غور سے سنا کرتی تھی گو کہتی کچھ نہ تھی۔ بھائی صاحب بھی بدو سے آپا کے متعلق پوچھتے رہتے لیکن صرف اسی وقت جب وہ دونوں اکیلے ہوتے' پوچھتے۔ "بدو تمہاری آپا کیا کر رہی ہے؟"

"آپا؟" بدو لاپروائی سے دہراتا۔ "بیٹھی ہے ـــــ بلاؤں؟"

بھائی صاحب گھبرا کر کہتے۔ "نہیں نہیں۔ اچھا بدو' آج تمہیں' یہ دیکھو اس طرف تمہیں دکھائیں"

اور جب بدو کا دھیان ادھر ادھر ہو جاتا تو وہ مدھم آواز میں کہتے۔ "ارے یار تم تو مفت کا ڈھنڈورا ہو۔"

بدو چیخ اٹھتا۔ "کیا ہوں میں؟" اس پر وہ میز بجانے لگتے۔ "ڈگمگ ڈگمگ ڈھنڈورا یعنی یہ ڈھنڈورا ہے' دیکھا؟ جیسے ڈھول بھی کہتے ہیں ڈگمگ ڈگمگ سمجھے؟" اور آپا اکثر چلتے چلتے ان کے دروازے پر ٹھہر جاتی اور ان کی باتیں سنتی رہتی اور پھر چولہے کے پاس بیٹھ کر آپ ہی آپ مسکراتی۔ اس وقت اس کے سر سے دوپٹہ سرک جاتا' بالوں کی لٹ پھسل کر گال پر آ گرتی اور وہ بھیگی بھیگی آنکھیں چولھے میں ناچتے ہوئے شعلوں کی طرح جھومتیں۔ آپا کے ہونٹ یوں ہلتے گویا گا رہی ہو مگر الفاظ سنائی نہ دیتے۔ ایسے میں اگر اماں یا ابا باورچی خانے میں آ جاتے تو وہ ٹھٹھک کر یوں اپنا دوپٹہ' بال اور آنکھیں سنبھالتی گویا کسی بے تکلف محفل میں کوئی بیگانہ آ گھسا ہو۔

ایک دن میں' آپا اور اماں باہر صحن میں بیٹھی تھیں۔ اس وقت بھائی صاحب اندر اپنے کمرے میں بدو سے باتیں کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے بھائی صاحب کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم باہر بیٹھے ہوئے ان کی باتیں سن رہے ہیں۔ بھائی صاحب بدو سے کہہ رہے تھے۔ "میرے یار ہم تو اس سے بیاہ کریں گے جو ہم سے انگریزی میں باتیں کر سکے' کتابیں پڑھ سکے' شطرنج' کیرم اور چڑیا کھیل سکے۔ چڑیا جانتے ہو؟ وہ گول گول پروں والا گیند بلے سے یوں ڈز' ٹن' ڈز اور سب سے ضروری بات یہ ہے کہ ہمیں مزے دار کھانے پکا کر کھلا سکے' سمجھے؟"

بدو بولا۔ "ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔"

"اونہہ!" بھائی صاحب نے کہا۔

بدو چیخنے لگا۔ "میں جانتا ہوں تم آپا سے بیاہ کرو گے۔ ہاں!" اس وقت اماں نے مسکرا کر آپا کی طرف دیکھا۔ مگر آپا اپنے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن توڑنے میں اس قدر مصروف تھی جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ اندر بھائی صاحب کہہ رہے تھے۔ "واہ! تمہاری آپا فرنی پکاتی ہے تو اس میں پوری طرح شکر بھی نہیں ڈالتی۔ بالکل پھیکی۔ آخ تھو!"

بدّو نے کہا۔ "ابّا جو کہتے ہیں فرنی میں کم میٹھا ہونا چاہئے۔"

"تو وہ اپنے ابّا کے لئے پکاتی ہے۔ نا۔ ہمارے لئے تو نہیں!"

"میں کہوں آپا سے؟" بدّو چیخا۔

بھائی چلائے۔ "اوہ پگلا۔ ڈ ھنڈورا۔ لو تمہیں ڈھنڈورا پیٹ کر دکھائیں۔ یہ دیکھو اس طرف ڈھمک ڈھمک۔" بدّو پھر چلّانے لگا۔ "میں جانتا ہوں تم میز بجا رہے ہو نا؟" ______ "ہاں ہاں اسی طرح ڈھنڈورا پٹتا ہے نا۔" بھائی صاحب کہہ رہے تھے۔ "کشتیوں میں 'اچھا بدّو تم نے کبھی کشتی لڑی ہے' آ، ہم تم کشتی لڑیں۔ میں ہوا گاما اور تم بدّو پہلوان ___ لو آؤ ___ ٹھہرو ___ جب میں تین کہوں" اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے مدھم آواز میں کہا۔ 'ارے یار تمہاری دوستی تو مجھے بہت مہنگی پڑتی ہے۔"

میرا خیال ہے آپا ہنسی نہ روک سکی اس لئے وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ میرا تو ہنسی کے مارے دم نکلا جا رہا تھا اور اماں نے اپنے منہ میں دوپٹہ ٹھونس لیا تھا کہ آواز نہ نکلے۔

میں اور آپا دونوں اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے کہ بھائی صاحب آ گئے۔ کہنے لگے۔ "کیا پڑھ رہی ہو جہینا؟" ان کے منہ سے جہینا سن کے مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ حالانکہ مجھے اپنے نام سے بے حد نفرت تھی۔ نور جہاں کیسا پرانا نام ہے۔ بولتے ہی منہ میں باسی روٹی کا مزا آنے لگتا ہے میں تو نور جہاں سن کر یوں محسوس کیا کرتی تھی جیسے کسی تاریخ کی کتاب کے بوسیدہ ورق سے کوئی بوڑھی اماں سونٹا ٹیکتی ہوئی آ رہی ہوں ___ مگر بھائی صاحب کو نام بگاڑ کر اسے سنوار دینے میں کمال حاصل تھا۔ ان کے منہ سے جہینا سن کر مجھے اپنے نام سے کوئی شکایت نہ رہتی اور میں محسوس کرتی گویا ایران کی شہزادی ہوں۔ آپا کو وہ سجّادہ سے سجدے کہا کرتے تھے مگر وہ تو پرانی بات تھی' جب آپا چھوٹی تھی۔ اب تو بھائی جان اسے سجدے نہ کہتے بلکہ اس کا پورا نام تک لینے سے گھبراتے تھے۔ خیر میں نے جواب دے دیا۔ "سکول کا کام کر رہی ہوں۔"

پوچھنے لگے۔ "تم نے کوئی برنارڈ شا کی کتاب پڑھی ہے کیا؟"

میں نے کہا۔ "نہیں!"

انہوں نے میرے اور آپا کے درمیان دیوار پر لٹکی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری آپا نے تو ہارٹ بریک ہاؤس پڑھی ہو گی۔" وہ انکھیوں سے آپا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

آپا نے آنکھیں اٹھائے بغیر ہی سر ہلا دیا اور مدھم آواز میں کہا "نہیں!" اور سویٹر بننے میں لگی رہی۔

بھائی جان بولے۔ "اوہ کیا بتاؤں جہینا کہ وہ کیا چیز ہے' نشہ ہے نشہ' خالص شہد' تم اسے ضرور پڑھو بالکل آسان ہے یعنی امتحان کے بعد ضرور پڑھنا۔ میرے پاس پڑی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ضرور پڑھوں گی۔"

پھر پوچھنے لگے۔ "میں کہتا ہوں تمہاری آپا نے میٹرک کے بعد پڑھنا چھوڑ کیوں دیا؟"

میں نے چڑ کر کہا۔ "مجھے کیا معلوم آپ خود ہی پوچھ لیجئے۔" حالانکہ مجھے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ آپا نے کالج میں جانے سے کیوں انکار کیا تھا۔ کہتی تھی میرا تو کالج جانے کو جی نہیں چاہتا۔ وہاں لڑکیوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا کوئی نمائش گاہ ہو۔ درسگاہ تو معلوم ہی نہیں ہوتی۔ جیسے مطالعے کے بہانے میلہ لگا ہو۔ مجھے آپا کی یہ بات بہت بری لگی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ گھر میں بیٹھ رہنے کے لئے کالج جانا نہیں چاہتی۔ بڑی آئی تھی نکتہ چیں۔ اس کے علاوہ جب کبھی بھائی جان آپا کی بات کرتے تو میں خواہ مخواہ چڑ جاتی۔ آپا تو بات

کا جواب تک نہیں دیتی اور یہ آپا آپا کر رہے ہیں اور پھر آپا کی بات مجھ سے پوچھنے کا مطلب؟ میں کیا ٹیلیفون تھی؟ خود آپا سے پوچھ لیتے اور آپا۔ بیٹھی ہوئی گم سم آپا۔ بھیگی بلی۔

شام کو ابا کھانے پر بیٹھے ہوئے چلا اٹھے۔ "آج فیرنی میں اتنی شکر کیوں ہے؟ قند سے ہونٹ چپکے جاتے ہیں۔ سجادہ! سجادہ بیٹی! کیا کھانڈ اتنی سستی ہو گئی ہے ایک لقمہ نگلنا بھی مشکل ہے۔"

آپا کی بھیگی بھیگی آنکھیں جھوم رہی تھیں۔ حالانکہ جب کبھی ابا جان خفا ہوتے تو آپا کا رنگ زرد پڑ جاتا۔ مگر اس وقت اس کے گال تمتمار ہے تھے، کہنے لگی۔ "شاید زیادہ پڑ گئی ہو۔" یہ کہہ کر وہ تو باورچی خانے میں چلی گئی اور میں دانت پیس رہی تھی۔ شاید۔ کیا خوب۔ شاید۔

اُدھر ابا بدستور بڑبڑا رہے تھے۔ "چار پانچ دن سے دیکھ رہا ہوں کہ فیرنی میں قند بڑھتی جا رہی ہے۔" صحن سے اماں دوڑی دوڑی آئیں اور آتے ہی ابا پر برس پڑیں، جیسے ان کی عادت ہے۔ "آپ تو ناحق بگڑتے ہیں۔ آپ ہلکا میٹھا پسند کرتے ہیں تو کیا باقی لوگ بھی کم کھائیں؟ ___ اللہ رکھے گھر میں جوان لڑکا ہے اس کا تو خیال کرنا چاہئے؟۔" ابا کو جان چھڑانی مشکل ہو گئی، کہنے لگے۔ "اوہ یہ بات ہے مجھے بتا دیا ہوتا۔ میں کہتا ہوں سجادہ کی ماں ___ " اور وہ دونوں کھسر پھسر کرنے لگے۔

آپا، ساحرہ کے گھر جانے کو تیار ہوئی تو میں بڑی حیران ہوئی۔ آپا اس سے ملنا تو کیا بات تک کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ بلکہ اس کے نام پر ہی ناک بھوں چڑھایا کرتی تھی۔ میں نے خیال کیا ضرور کوئی بھید ہے اس بات میں، کبھی کبھار ساحرہ دیوار کے ساتھ چارپائی کھڑی کر کے اس پر چڑھ کر ہماری طرف جھانکتی اور کسی نہ کسی بہانے سلسلہ گفتگو کو دراز کرنے کی کوشش کرتی تو آپا بڑی بے دلی سے دو ایک باتوں سے اسے ٹال دیتی۔ آپ ہی آپ بول اٹھتی۔ "ابھی تو اتنا کام پڑا ہے اور میں یہاں کھڑی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باورچی خانے میں جا بیٹھتی۔ خیر اس وقت تو میں چپ چاپ بیٹھی رہی مگر جب آپا لوٹ چکی تو کچھ دیر کے بعد چپکے سے میں بھی ساحرہ کے گھر جا پہنچی۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے ذکر چھیڑ دیا۔ "آج آپا آئی تھی؟"

ساحرہ نے ناخن پر پالش لگاتے ہوئے کہا۔ "ہاں کوئی کتاب منگوانے کو کہہ گئی ہے۔ نہ جانے کیا نام ہے اس کا۔ ہاں! ہارٹ بریک ہاؤس!"

آپا اس کتاب کو مجھ سے چھپا کر دراز میں مقفل رکھتی تھی۔ مجھے کیا معلوم نہ تھا رات کو وہ بار بار کبھی میری طرف اور کبھی گھڑی کی طرف دیکھتی رہتی اسے یوں مضطرب دیکھ کر میں دو ایک جھوٹی انگڑائیاں لیتی اور پھر کتاب بند کر کے رضائی میں یوں پڑ جاتی جیسے مدت سے گہری نیند میں ڈوب چکی ہوں۔ جب اسے یقین ہو جاتا کہ میں سو چکی ہوں تو دراز کھول کر کتاب نکال لیتی اور اسے پڑھنا شروع کر دیتی۔ آخر ایک دن مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے رضائی سے منہ نکال کر پوچھ ہی لیا۔ "آپا یہ ہارٹ بریک ہاؤس کا مطلب کیا ہے۔ دل توڑنے والا گھر؟ اس کے کیا معنی ہوئے؟" آپا پہلے تو ٹھٹھک گئی، پھر وہ سنبھل کر اٹھی اور بیٹھ گئی۔ مگر اس نے میری بات کا جواب نہ دیا۔ میں نے اس کی خاموشی سے جل کر کہا۔ "اس لحاظ سے تو ہمارا گھر بھی ہارٹ بریک ہے۔"

کہنے لگی۔ "میں کیا جانوں؟"

میں نے اسے جلانے کو کہا۔ "ہاں! ہماری آپا بھلا کیا جانے؟" میرا خیال ہے یہ بات ضرور اسے بری لگی۔ کیونکہ اس نے کتاب رکھ دی اور بتی بجھا کر سو گئی۔

ایک دن یوں ہی پھرتے پھراتے میں بھائی جان کے کمرے میں جا نکلی۔ پہلے تو بھائی جان اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر پوچھنے لگے "مجیبا اچھا یہ تو بتاؤ کیا تمہاری آپا کو فروٹ سلاد بنانا آتا ہے؟" میں نے کہا۔ "میں کیا جانوں؟ جا کر آپا سے پوچھ لیجئے۔" ہنس کر کہنے لگے

"آج کیا کسی سے لڑ کر آئی ہو؟"

"کیوں میں لڑاکا ہوں؟" میں نے کہا۔

بولے۔ "نہیں ابھی تو لڑکی ہو شاید کسی دن لڑاکا ہو جاؤ۔" اس پر میری ہنسی نکل گئی۔ وہ کہنے لگے۔ "دیکھو چھینا مجھے لڑنا بے حد پسند ہے۔ میں تو ایسی لڑکی سے بیاہ کروں گا جو باقاعدہ صبح سے شام تک لڑ سکے ' ذرا نہ اکتائے۔" جانے کیوں میں شرما گئی اور بات بدلنے کی خاطر پوچھا۔ "فروٹ سلاد کیا ہوتا ہے بھائی جان؟"

بولے۔ "وہ بھی کچھ ہوتا ہے۔ سفید سفید' لال لال 'کالا کالا' نیلا نیلا سا۔" میں ان کی بات سن کر بہت ہنسی' پھر کہنے لگے۔ "وہ مجھے بے حد پسند ہے' یہاں تو چھینا ہم فیرنی کھا کر اکتا گئے۔" میرا خیال ہے بات آپا نے ضرور سن لی ہو گی۔ کیونکہ اسی شام کو وہ باورچی خانے میں بیٹھی "نعمت خانہ" پڑھ رہی تھی۔ اس دن کے بعد روز بلاناغہ وہ کھانے پکانے سے فارغ ہو کر فروٹ سلاد بنانے کی مشق کیا کرتی اور ہم میں سے کوئی اس کے پاس چلا جاتا تو جھٹ فروٹ سلاد کی کشتی چھپا دیتی۔ ایک روز آپا کو چھیڑنے کی خاطر میں نے بدو سے کہا۔ "بدو بھلا بوجھو تو وہ کشتی جو آپا کے پیچھے پڑی ہے اس میں کیا ہے؟"

بدو ہاتھ دھو کر آپا کے پیچھے پڑ گیا۔ حتیٰ کہ آپا کو وہ کشتی بدو کو دینی ہی پڑی۔ پھر میں نے بدو کو اور بھی چمکا دیا۔ میں نے کہا۔ "بدو جاؤ تو' بھائی جان سے پوچھو اس کھانے کا کیا نام ہے——"

بدو بھائی جان کے کمرے کی طرف جانے لگا تو آپا نے اٹھ کر وہ کشتی اس سے چھین لی اور میری طرف گھور کر دیکھا۔ اس روز پہلی مرتبہ آپا نے مجھے کیوں گھورا تھا؟

اس رات آپا شام ہی سے لیٹ گئی۔ مجھے صاف دکھائی دیتا تھا کہ وہ رضائی میں پڑی رو رہی ہے۔ اس وقت مجھے اپنی بات پہ بہت افسوس ہوا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر آپا کے پاؤں پڑ جاؤں اور اسے خوب پیار کروں مگر میں ویسے ہی چپ چاپ بیٹھی رہی اور کتاب کا ایک لفظ تک نہ پڑھ سکی۔

انہی دنوں میری خالہ زاد بہن ساجدہ جسے ہم سب ساجو باجی کہا کرتے تھے میٹرک کا امتحان دینے کے لئے ہمارے گھر آ ٹھہری۔ ساجو باجی کے آنے پر ہمارے گھر میں رونق ہو گئی۔ ہمارا گھر بھی قہقہوں سے گونج اٹھا۔ ساحرہ اور ثریا چارپائیوں پر کھڑی ہو کر باجی سے باتیں کرتی رہتیں۔ بدو چھاجو باجی' چھاجو باجی چیختا پھرتا اور کہتا۔ "ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے۔"

باجی کہتی۔ "شکل تو دیکھو اپنی' پہلے منہ دھو آؤ۔" پھر وہ بھائی صاحب کی طرف یوں گردن موڑتی کہ کالی کالی آنکھوں کے گوشے مسکرانے لگتے اور وہ پنچم تان میں پوچھتی۔ "تا بھئی جا آن کیوں جی؟"

باجی کے منہ سے "بھئی جا آن" کچھ ایسا بھلا سنائی دیتا کہ میں خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ اس کے برعکس جب کبھی آپا "بھائی صاحب" کہتی تو کیسا بھدا معلوم ہوتا۔ گویا وہ واقعی انہیں بھائی کہہ رہی ہو اور پھر "صاحب" جیسے حلق میں کچھ پھنسا ہوا ہو مگر باجی "صاحب" کی جگہ "جا آن" کہہ کر اس سادے سے لفظ میں جان ڈال دیتی تھی۔ "جا آن" کی گونج میں بھائی دب جاتا اور یہ محسوس نہ ہوتا کہ وہ انہیں بھائی کہہ رہی ہے۔ اس کے علاوہ "بھئی جا آن" کہہ کر وہ اپنی کالی کالی چمکدار آنکھوں سے دیکھتی اور آنکھوں ہی آنکھوں میں مسکراتی تو سننے والے کو قطعی یہ گمان نہ ہوتا کہ اسے بھائی کہا گیا ہے۔ آپا کے "بھائی صاحب" اور باجی کے "بھئی جا آن" میں کتنا فرق تھا۔

باجی کے آنے پر آپا کا بیٹھ رہنا بالکل بیٹھ رہنا ہی رہ گیا۔ بدو نے بھائی جان سے کھیلنا چھوڑ دیا۔ وہ باجی کے گرد طواف کرتا رہتا اور باجی بھائی جان سے کبھی شطرنج کبھی کیرم کھیلتی۔

باجی کہتی۔ "بھئی جا آن ایک بورڈ لگے گا" یا بھائی جان باجی کی موجودگی میں بدو سے کہتے "کیوں میاں بدو! کوئی ہے جو ہم سے شطرنج میں لڑنا چاہتا ہو؟" باجی بول اٹھتی۔ "آپا سے پوچھئے۔" بھائی جان کہتے۔ "اور تم؟" باجی جھوٹ موٹ کی سوچ میں پڑ جاتی' چہرے پر سنجیدگی پیدا کر لیتی' بھویں سمٹا لیتی اور تیوری چڑھا کر کھڑی رہتی پھر کہتی۔ "اونہہ مجھ سے تو آپ پٹ جائیں گے۔" بھائی جان کھلکھلا کر ہنس پڑتے اور کہتے۔ "کل جو پٹی تھی بھول گئیں کیا؟" وہ جواب دیتی۔ "میں نے کہا چلو بھئی جا آن کا لحاظ کر دو۔ ورنہ دنیا کیا کہے گی کہ مجھ سے ہار گئے۔" اور پھر یوں ہنستی جیسے گھنگھرو بج رہے ہوں۔

رات کو بھائی جان باورچی خانے میں ہی کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ آپا چپ چاپ چولہے کے سامنے بیٹھی تھی۔ بدو چھاجو باجی' چھاجو باجی کہتا ہوا باجی کے دوپٹے کا پلو پکڑے اس کے آس پاس گھوم رہا تھا۔ باجی بھائی جان کو چھیڑ رہی تھی۔ کہتی تھی۔ "بھئی جا آن تو صرف ساڑھے چھ پھلکے کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فیرنی کی پلیٹ مل جائے تو قطعی مضائقہ نہیں۔ کریں بھی کیا۔ نہ کھائیں تو ممانی ناراض ہو جائیں۔ انہیں جو خوش رکھنا ہوا' ہے نا بھئی جا آن۔" ہم سب اس بات پر خوب ہنستے۔ پھر باجی ادھر اُدھر ٹہلنے لگی اور آپا کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ آپا کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی پڑی تھی۔ باجی نے ڈھکنا سرکا کر دیکھا تو کشتی کو اٹھا لیا۔ پیشتر اس کے کہ آپا کچھ کہہ سکے باجی وہ کشتی بھائی جان کی طرف لے آئی۔ "لیجئے بھئی جا آن" اس نے آنکھوں میں ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ بھی کیا کہیں گے کہ ساجو باجی نے کبھی کچھ کھلایا ہی نہیں۔"

بھائی جان نے دو تین چمچے منہ میں ٹھونس کر کہا۔ "خدا کی قسم بہت اچھا بنا ہے' کس نے بنایا ہے؟" ساجو باجی نے آپا کی طرف کنکھیوں سے دیکھا اور ہنستے ہوئے کہا۔ "ساجو باجی نے اور کس نے بھئی جا آن کے لئے۔" بدو نے آپا کے منہ کی طرف غور سے دیکھا۔ آپا کا منہ لال ہو رہا تھا۔ بدو چلا اٹھا۔ "میں بتاؤں بھائی جان؟" ____ آپا نے بڑھ کر بدو کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے گود میں اٹھا کر باہر چلی گئی۔ باجی کے قہقہوں سے کمرہ گونج اٹھا اور بدو کی بات آئی گئی ہو گئی۔ بھائی جان نے باجی کی طرف دیکھا۔ پھر جانے؛ نہیں کیا ہوا۔ منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ آنکھیں باجی کے چہرے پر گڑ گئیں' جانے کیوں میں نے محسوس کیا جیسے کوئی زبردستی مجھے کمرے سے باہر گھسیٹ رہا ہو۔ میں باہر چلی آئی۔ باہر آپا الگنی کے قریب کھڑی تھی۔ اندر بھائی صاحب نے مدھم آواز میں کچھ کہا۔ آپا نے کان سے دوپٹہ سرکا دیا۔ پھر باجی کی آواز آئی۔ "چھوڑیئے' چھوڑیئے۔" اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اگلے دن ہم صحن میں بیٹھے تھے۔ اس وقت بھائی جان اپنے کمرہ میں پڑھ رہے تھے۔ بدو بھی کہیں اُدھر ہی کھیل رہا تھا۔ باجی حسبِ معمول بھائی جان کے کمرے میں چلی گئی' کہنے لگی۔ "آج ایک دھندناتا بورڈ کر دکھاؤں۔ کیا رائے ہے آپ کی؟" بھائی جان بولے۔ "واہ یہاں سے کک لگاؤں تو جانے کہاں جا پڑو۔" غالباً انہوں نے باجی کی طرف زور سے پیر چلایا ہو گا۔ وہ بناوٹی غصے میں چلائی۔ "واہ آپ تو ہمیشہ پیر ہی سے چھیڑتے ہیں!" بھائی جان بول اٹھے۔ "تو کیا ہاتھ سے" ____ "چپ ___ خاموش۔" باجی چیخی۔ اس کے بھاگنے کی آواز آئی۔ ایک منٹ تک تو پکڑ دھکڑ سنائی دی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

اتنے میں کہیں سے بدو بھاگتا ہوا آیا کہنے لگا۔ "آپا! اندر بھائی جان باجی سے کشتی لڑ رہے ہیں۔ چلو دکھاؤں تمہیں۔ چلو بھی۔" وہ آپا کا بازو پکڑ کر گھسیٹنے لگا۔ آپا کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا اور وہ بت بنی کھڑی تھی۔ بدو نے آپا کو چھوڑ دیا۔ کہنے لگا۔ 'اماں کہاں ہے؟' اور وہ اماں کے پاس جانے کے لئے دوڑا۔ آپا نے لپک کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ "آؤ تمہیں مٹھائی دوں۔" بدو بسورنے لگا۔ آپا بولیں۔ "آؤ دیکھو تو کیسی اچھی مٹھائی ہے میرے پاس۔" اور اسے باورچی خانے میں لے گئی۔

اسی شام میں نے اپنی کتابوں کی الماری کھولی تو اس میں آپا کی ہارٹ بریک ہاؤس پڑی تھی۔ شاید آپا نے اسے وہاں رکھ دیا ہو۔ میں حیران ہوئی کہ بات کیا ہے مگر آپا باورچی خانے میں چپ چاپ بیٹھی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اس کے پیچھے فروٹ سلاد کی کشتی خالی پڑی

تھی۔ آپا کے ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

جب نی تصدق اور باجی کی شادی کے دو سال بعد ہمیں پہلی بار ان کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ اب باجی وہ باجی نہ تھی۔ اس کے وہ قہقہے بھی نہ تھے۔ اس کا رنگ زرد تھا اور ماتھے پر شکن چڑھی تھی۔ بھائی صاحب بھی چپ چاپ رہتے تھے۔ ایک شام اماں کے علاوہ ہم سب باورچی خانے میں بیٹھے تھے۔ بھائی کہنے لگے۔ "بدو ساجو باجی سے بیاہ کرو گے۔؟"

"ہونہہ!" بدو نے کہا۔ "ہم بیاہ کریں گے ہی نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ بھائی جان یاد ہے جب بدو کہا کرتا تھا۔ "ہم تو چھاجو باجی سے بیاہ کریں گے" اماں نے پوچھا "آپا سے کیوں نہیں؟" تو کہنے لگا "بتاؤں آپا کیسی ہے؟" پھر چولھے میں جلے ہوئے اُپلے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔ "ایسی" "اور چھاجو باجی؟" میں نے بدو کی طرح بجلی کے روشن بلب کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔ "ایسی!" عین اسی وقت بجلی بجھ گئی اور کمرے میں انگاروں کی روشنی کے سوا اندھیرا چھا گیا۔ "ہاں یاد ہے!" بھائی جان نے کہا۔ پھر جب باجی کسی کام کے لئے باہر چلی گئی تو بھائی کہنے لگے۔ "نہ جانے اب بجلی کو کیا ہو گیا۔ جلتی بجھتی ہی رہتی ہے۔" آپا چپ چاپ بیٹھی چولھے میں راکھ سے دبی ہوئی چنگاریوں کو کرید رہی تھی۔ بھائی جان نے مغموم سی آواز میں کہا۔ "اُف کتنی سردی ہے؟" پھر اٹھ کر آپا کے قریب چولھے کے سامنے جا بیٹھے اور ان سلگتے ہوئے اپلوں سے ہاتھ سینکنے لگے۔ بولے۔ "ممانی سچ کہتی تھیں کہ ان جلے ہوئے اُپلوں میں آگ دبی ہوتی ہے۔ اوپر سے نہیں دکھائی دیتی۔ کیوں سجدے؟" آپا پرے سرکنے لگی تو چھن سی آواز آئی جیسے کسی دبی ہوئی چنگاری پر پانی کی بوند پڑی ہو۔ بھائی جان منت بھری آواز میں کہنے لگے۔ "اب اس چنگاری کو تو نہ بجھاؤ سجدے دیکھو تو کتنی ٹھنڈ ہے؟"

زعفران کے پُھول

خواجہ احمد عباس

آؤ' مسافر' یہاں ! اس چنار کے سائے میں بیٹھ جاؤ۔ میں ابھی پانی پلاتی ہوں ....وہ نیلی نیلی لمبی سی موٹر ہے نا تمہاری؟........ پنکچر ہو گیا ہے؟ .... کوئی بات نہیں اندھیرا ہونے سے پہلے سری نگر پہنچ جاؤ گے. .... ..اب بیس کوس کی تو بات ہی ہے .. .. نہیں بیٹا مجھے پانی کی قیمت نہیں چاہئے 'اور پھر پیسہ لے کر کروں گی بھی کیا۔ میرا ہے ہی کون؟......اکیلی جان ہوں' ذیلدار کے کھیت میں کام کرتی ہوں' چشمے سے پانی بھر لاتی ہوں' دھان کوٹ دیتی ہوں' اللہ کا شکر ہے مٹھی بھر چاول تو مل ہی جاتا ہے' پانچ اوپر ساٹھ عمر ہونے کو آئی اور چاہئے ہی کیا ایک بڑھیا کو۔ آج مری کل دوسرا دن . ... تم بھی کہتے ہو گے کس بکواسن سے پالا پڑ گیا ہے .. ...

کیا کہا تم نے بیٹا؟.... ... نہیں نہیں گل لالہ کا نہیں یہ زعفران کا کھیت ہے... ... ٹھیک کہتے ہو زعفران کے پھول سچ مچ کاسنی ہی ہوتے ہیں۔ ابھی آگے جاؤ گے تو دوسرے کھیتوں میں کاسنی پھول ہی پاؤ گے۔ پر یہاں اس سال زعفران کے سرخ پھول ہی کھلے ہیں..... اس کی کیا وجہ ہے؟. . ... یہ خدا کی قدرت ہے بیٹا۔ پر تم میدانوں کے رہنے والے آج کل کے نوجوان' خدا اور اس کے کرشموں کو کب مانتے ہو۔ ہم کشمیریوں کو وہمی اور بیوقوف سمجھتے ہو کہ ہم ایسی باتوں میں اعتقاد رکھتے ہیں .. . . .

اب ان پھولوں کی پوری کہانی سن کر کیا کرو گے؟... ...ابھی تمہاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم چلے جاؤ گے اور کہانی ادھوری رہ جائے گی... ... موٹریں تو اس سڑک پر سے گذرتی ہی رہتی ہیں' بیٹا! پل دو پل کو ٹھہرتی بھی ہیں تو پھر دھول کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں۔ پر یہ زعفران کی کھیتی' یوں ہی کھڑی رہے گی' یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آ جائے گا اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے شگوفے سکھا کر دساور کو بھیج دیے جائیں گے' اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دستر خوانوں پر مہکے گی اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے۔ اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح سرخ کیوں ہے؟... ...پر کوئی نہ بتائے گا۔ کیونکہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں۔

تم مجھے پاگل سمجھتے ہو نا؟......دیوانی بڑھیا جو نہ جانے کیا کیا بک رہی ہے... ...ہے نا؟... ...پھر بھی اس لال زعفران کا بھید جاننا چاہتے ہو؟.....یا ابھی تمہاری موٹر کے ٹھیک ہونے میں دیر ہے اور تم اس وقت کو ایک پگلی کی بڑ سن کر ہی کاٹنا چاہتے ہو؟

... ...خیر جو بھی ہو۔ سننا چاہتے ہو تو سنو ... ...

ہاں تو اس کھیت میں لال زعفران کے پھول تو اسی سال لگے ہیں پہلے یہاں بھی کاسنی پھول ہی لگا کرتے تھے۔ ساری وادی پر بہار

آ جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی نئی نویلی دلہن زعفرانی دوشالہ اوڑھے لیٹی ہے اور خوشبو سے یہ سارا علاقہ مہک اٹھتا۔ سڑک پر موٹریں جو گزرتیں ان کی دھول کے بادلوں میں بھی خوشبو پھیل جاتی اور ایسا معلوم ہوتا کہ زمین سے آسمان تک ہر چیز زعفران میں بسی ہوئی ہے.....

تمہاری ہی طرح ایک اور مسافر بھی ایک بار اس کھیت کے پھولوں کو دیکھنے ٹھہر گیا تھا..... کئی برس کی بات ہے۔ کوئی بہت ہی سیدھا آدمی معلوم ہوتا تھا' بے چارہ' کھیت میں جا کر پھولوں کے بیچوں بیچ میں کھڑا ہو گیا' اور لگا نتھنے پھلا پھلا کر ناک سے سانس لینے' جیسے پھولوں کو سونگھ رہا ہو بلکہ ان کی خوشبو کو پی رہا ہو۔ پھر آپ سے آپ ہی کہنے لگا۔

"عجیب بات ہے۔ کوئی بھی نہیں آئی؟"

میں نے پوچھا۔

"کون؟ آخر کس کو کھوجتے ہو۔"

تو جواب ملا۔

"ہنسی۔ ہنسی نہیں آئی۔ عجیب بات ہے حالانکہ کتابوں میں تو ....."

تو بیٹا تب پتہ چلا کہ وہ بے چارہ کتابوں میں یہ پڑھ کر آیا تھا کہ اگر زعفران کے کھیت میں کھڑے ہو کر اس کی خوشبو سونگھو تو آپ سے آپ ہنسی آنے لگتی ہے۔ اتنے میں خدا کا کرنا کیا ہوا کہ سر پر لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے زعفرانی آگئی۔ میں نے جو اسے یہ بات بتائی تو وہ لگی کھلکھلا کر ہنسنے اور وہ اجنبی پہلے تو کھسیانا ہو گیا۔ مگر جب اُس نے دیکھا کہ زعفرانی کے قہقہے ختم ہونے ہی میں نہیں آتے تو لگا وہ بھی ہنسنے۔ ان دونوں کو ہنستے دیکھ کر مجھے بھی ہنسی آگئی اور بعد میں اجنبی کہنے لگا کہ دیکھو کتابوں کا لکھا پورا ہوا کیونکہ زعفران کے کھیت میں ہم تینوں ہی کھڑے تھے اور تینوں کا ہنسی کے مارے برا حال تھا۔

... ...میں بھی کہاں سے کہاں پہنچ گئی ... ... بیٹا بڑھاپے میں دماغ قابو میں نہیں رہتا۔ بات کرتے کرتے بہک جاتی ہوں ...ہاں تو زعفرانی... کیا کہا ... ...زعفرانی کون؟ ... . ابھی تو بتا چکی ہوں کہ زعفرانی میری بیٹی تھی... ... نہیں بتایا تھا؟ ... ... بھول گئی ہوں گی۔ ...لو دیکھو لو یاد کا یہ حال ہے بیٹا۔ . . ہاں تو اس کا نام تو اصل میں نوراں تھا' مگر گاؤں میں سب اسے زعفرانی کہہ کر پکارے تھے۔ بات یہ ہے کہ بچپن ہی سے اس کی رنگت کچھ پیلی پیلی سی تھی' لڑکپن میں بچوں بچیوں کے ساتھ کدال مچایا کرتی تھی۔ وہ اسے زعفرانی کہہ کر چھیڑا کرتے اور جتنا وہ چڑتی اتنا ہی اور شور مچاتے زعفرانی! زعفرانی!!... ... تم جانو بچے کسی کی مانتے تھوڑا ہی ہیں ... ...ہاں تو جب وہ جوان ہو گئی تو گاؤں کے لڑکے کہنے لگے کہ نوراں جیسی خوبصورت لڑکی تو ہمارے ہاں ایک بھی نہیں ہے۔ اس کی رنگت تو زعفران کے پھول کی طرح ہے۔ اسکی آنکھیں تو کھلے ہوئے کنول ہیں اور نہ جانے کیا کیا اوندھی سیدھی باتیں' مجھے تو اس میں کوئی خوبصورتی وبصورتی نظر نہیں آتی تھی۔ ایک تو دُبلی تھی۔ جیسے چشمے کے کنارے اُگے ہوئے بید۔ بید مجنوں۔ میں کہتی بھلا ایسی لڑکی بچے کیسے جنے گی۔ پھر رنگت بالکل پیلی جیسے بیمار ہو۔ دیدے پھٹے ہوئے۔ اُوپر سے یہ کہ تمیز نام کو نہیں' نہ چھوٹے کا خیال نہ بڑے کا۔ بس ہر وقت دھینگا مشتی' لڑکی سے مطلب' میں تو ذرا منہ نہیں لگاتی تھی۔ پر تین بھائیوں میں ایک بہن تھی۔ وہ بھی دو سے چھوٹی۔ باپ اور دونوں بڑے بھائیوں نے لاڈ پیار میں بگاڑ رکھا تھا۔ میں سوچتی' ایسی لڑکی سے کون شادی کرے گا پر وہاں تو جس کو دیکھو وہ زعفرانی ہی سے بیاہ کرنے پر تلا ہوا تھا... تم لڑکوں کی پسند کا بھی کچھ ٹھیک نہیں بیٹا... ...

ہاں تو پیغام چاروں طرف سے آرہے تھے۔ یہاں تک کہ ذیلدار نے اپنے لڑکے کا پیغام بھی دے دیا جو شہر کے اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ بھلا ایک معمولی کسان کی بیٹی کو اس سے اچھا کون سا بر مل سکتا تھا؟... ...میں نے سوچا زعفرانی کی قسمت کھل گئی... ... پر خدا کو تو کچھ اور ہی منظور تھا اُس سال جاڑے کے موسم میں نمونیہ کا بخار ایسا چلا کہ گھر والا اللہ کو پیارا ہو گیا۔ خدا اُسے جنت نصیب کرے اس کا

مرنا تھا کہ ہمارے گھر میں تو آفتوں پر آفتیں آنی شروع ہو گئیں۔ مرنے والے نے مہاجن سے قرضہ لے رکھا تھا۔ اس میں زمین کی قرقی ہو گئی۔ اس پر بھی میری ہمت نہ ٹوٹی۔ تین بیٹے تھے نا۔ میں نے سوچا روپے زمین سے کیا ہوتا ہے میری اصلی پونجی میری اولاد ہے۔ ہاں ایک زعفرانی کی طرف سے فکر ضرور تھی کہ غریب اور یتیم بچی کو کون بیاہے گا؟

...... سیکڑوں برسوں سے ہم اس گاؤں میں رہتے چلے آرہے ہیں۔ کبھی فصل اچھی ہوتی ہے کبھی بری۔ کبھی بارش ہوتی ہے کبھی نہیں۔ کبھی اتنا پانی برستا ہے کہ کھیتیاں بہہ جاتی ہیں کبھی دھوپ میں جل جاتی ہیں۔ کبھی برف میں تباہ ہو جاتی ہیں۔ کبھی ہم اپنی زمین بوتے ہیں کبھی دوسرے کی۔ قسمت کی اونچ نیچ تو ہر ایک کے ساتھ لگی ہی رہتی ہے اور بیٹا کبھی کبھی راجہ کے افسر ظلم بھی کرتے ہیں۔ پر راجہ پر جاکا کیا مقابلہ۔ صبر شکر سے زندگی کسی نہ کسی طرح بسر ہوتی جاتی ہے۔ مگر ٹھیک کہتے ہیں کہ یہ کلجگ ہے کلجگ۔ اس میں جو نہ ہو تھوڑا ہے...... کئی برس کی بات ہے ابھی گھر والا زندہ ہی تھا کہ ایک دن میں دھان کوٹ رہی تھی کہ میرا بیٹا نور دچلاتا ہوا آیا۔

"ماں۔ ماں! شیر کشمیر آئے ہیں شیر کشمیر۔"

بس اتنا کہہ یہ جا وہ جا۔ میں چلاتی ہی رہ گئی کہ ارے اگر شیر آیا ہے تو دیدار صاحب کو بول جا کے بندوق لے کے آویں۔ ......

تھوڑی ہی دیر میں کیا دیکھتی ہوں کہ سارے ہی گاؤں والے تو ____ کیا مرد اور کیا عورت اور کیا بچے بھاگے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا شیر کو پکڑ لیا ہو گا' تبھی تو عورتیں بچے بھی نڈر ہو کر جا رہے ہیں۔ چلو میں بھی تماشہ دیکھوں ....

وہ نقشہ آج تک یاد ہے مجھے۔ گاؤں کے اس سرے پر... اے وہ دیکھو ان درختوں کے پیچھے ____________ ایک اسکول ہے ____________ اب تو مڈل کا ہو گیا ہے۔ پر جب چار جماعتوں ہی کی پڑھائی ہوتی تھی ______ ہاں تو کیا دیکھتی ہوں کہ اسی اسکول کے سامنے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے ہیں اور سامنے نہ شیر نہ چیتا' ایک لمبا سا گورا سا آدمی چبوترے پر کھڑا زور زور سے کچھ کہہ رہا ہے۔ لو جی یہ تھا وہ شیر کشمیر...... میں نے کہا۔"لو خواہ مخواہ ہی ڈرا دیا۔ شیر یہ تو شیر یہ تو کوئی معمولی درجے کا سرکاری افسر بھی نہیں ہے۔ بھلا افسر کہیں گاڑھے کھدر کے موٹے جھوٹے کپڑے پہنتے ہیں۔ جس طرح سے وہ زور زور سے تقریر کر رہا تھا اس سے میں سمجھی کہ چائے بیچنے والا ہو گا۔ اب تھوڑی دیر میں کالا توا رکھ کے بھونپو والا باجا بجائے گا۔ پھر مفت چائے سب کو بانٹے گا' اسی انتظار میں میں بھی وہاں جا کر کھڑی ہو گئی۔ پر وہ تو کشمیری میں بول رہا تھا اور اگر یہ چائے والا تھا تو اس کی چائے تو بہت ہی گرما گرم اور خطرناک تھی۔ میں نے دو چار بول ہی سنے تھے کہ ڈر گئی۔ یا اللہ اب ہمارے گاؤں پر کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آئے گی۔ وہ باتیں ہی ایسی کر رہا تھا کہ دل دہل جائے۔ ریاست کے اصل مالک راجہ اور اس کے افسر نہیں بلکہ ہم کسان ہیں۔ ہم پر ظلم ہو رہا ہے۔ سب کو مل کر اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہئے۔ آپس میں ایک ہو جانا چاہئے۔ لڑکوں لڑکیوں کو پڑھانا چاہئے۔ پڑھ لکھ کر یہ کشمیری قوم کے لیڈر بنیں گے اور نہ جانے کیا کیا۔ میں نے تو پوری بات سنی بھی نہیں۔ زعفرانی منہ پھاڑے ایک کونے میں بیٹھی تھی۔

میں اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی چلی کہ گھر جا کر اس کے باپ سے ایسا پٹواؤں گی کہ پھر کبھی ہمت نہ پڑے ایسی خطرناک جگہ قدم دھرنے کی۔ پر بھیڑ کے آگے جہاں بڑے بوڑھے بیٹھے ہوئے تھے وہاں کیا دیکھتی ہوں کہ وہ تو خود ہی وہاں بیٹھا بڑے غور سے سن رہا ہے۔ جل ہی تو گئی میں... تم تو جانتے ہی ہو تلاؤ کے بیچ میں ایک پتھر پھینک دو' سارے پانی میں ہل چل مچ جاتی ہے۔ تو بیٹا' یہ شیر کشمیر بھی ایسا ہی ایک پتھر تھا جس نے ہمارے گاؤں کے ٹھیرے ہوئے پانی کو ہلا دیا۔ وہ دن اور آج کا دن آرام اور چین' صلح' شانتی کا نام نہیں رہا۔ جس کو دیکھو بے چین جس کو دیکھو اس کی زبان پر شکایت۔ ہر ایک اپنی زندگی سے نالاں' اس کو بدلنے پر تلا ہوا۔ میں کہتی ارے تمہارے باپ دادا نے بھی تو اپنی عمریں انھیں راجوں مہاراجوں کے افسروں کے ظلم سہتے سہتے روکھی سوکھی کھا کر صبر شکر سے کاٹ دیں' تم میں کون سرخاب کے پر لگے ہیں کہ ساری دنیا کو بدلنے پر تلے ہوئے ہو...... پر میری کون سنتا ہے' بیٹا...... وہ تو اس شیر کشمیر نے جادو ہی

ایسا کیا تھا...... تم میری باتوں سے اکتا گئے نا؟...... وہ زعفران کے لال پھولوں کا بھید؟ ہاں۔ ہاں۔ بیٹا۔ اس کی بات تو کر رہی ہوں۔ تم بھی کیسے ہو گئے۔ یہ کہاں کا جھگڑا لے بیٹھی۔ پر بات یہ ہے کہ نہ تو گاؤں کے ٹھیرے، شانت تلاؤ میں اس شیر کشمیر کی تقریر کا وہ پتھر گرتا اور نہ یہ زعفران کے پھول لال ہوتے...... یہ کیسے؟ یہی تو بتا رہی ہوں پر تم بیچ میں ٹوکتے ہی جاتے ہو۔

ہمارے گاؤں میں اس کو آئے ہوئے دو چار مہینے ہوئے ہوں گے کہ خبر آئی کہ شیر کشمیر کو راجہ نے پکڑ لیا اور جیل میں بند کر دیا۔ میں نے کہا چلو اچھا ہوا۔ اب سب اس کی سکھائی پڑھائی باتیں بھول جائیں گے اور وادی میں صبر شکر کے دن پھر لوٹ آئیں گے۔ پر جی اس کی گرفتاری پر تو اور بھی اس کا چرچا ہونے لگا۔ جس کو دیکھو غصے میں بھرا ہوا ہے کہ ہمارے شیر کشمیر کو پکڑ لیا۔ اب اس سرکار کی خیر نہیں اور ایسی باتیں کرنیوالوں میں سب سے آگے آگے میرے لڑکے۔ تھوڑے دنوں میں سنا کہ چھوٹ گیا۔ میں نے سوچا یہ بھی اچھا ہوا۔ نہیں تو یہ لڑکے سرکار کو برا بھلا کہتے رہتے اور ذیلدار یا کوئی سرکاری افسر سن لیتا تو لینے کے دینے پڑ جاتے ......

...... جب تک باپ زندہ رہا تب تک بیٹے کچھ قابو میں رہے اس کا مرنا تھا کہ جس کا جدھر منہ اُٹھا اُدھر چل دیا۔ زمین تو جاتی ہی رہی تھی بڑا غلام نبی کہنے لگا، میں دوسرے کی زمین پر مزدوری نہیں کروں گا۔ اس سے تو بہتر ہے سری نگر یا گلمرگ میں مسافروں کا سامان اُٹھا کر لے جانے کا کام کروں۔ دو تین روپے روز کما سکتا ہوں۔ میں نے لاکھ سر پٹخا پر وہ ایک نہ مانا۔ جب کیا ہے تو سارے گاؤں کے لڑکوں میں سب سے زیادہ چوڑا چکلا سینہ تھا اس کا۔ چھ مہینے بعد دو چار دن کو جو آیا تو پہچاننا مشکل ہو گیا۔ رنگت زعفرانی سے بھی زیادہ پیلی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ماتھے پر گھاؤ جیسا گہرا گڈھا جہاں بوجھا سنبھالنے کے لئے مزدور پٹا باندھتے ہیں اور رات بھر کھانستا۔ کبھی کبھی تو اتنا کہ ہوش نہ رہتا۔ میں نے کہا یہ کیا حالت ہو گئی تیری۔ کیا بیمار ہے۔ بولا نہیں ماں۔ بوجھ اُٹھانے والوں کے ماتھوں پر ایسا گڈھا تو پڑا ہی رہتا ہے۔ رہی کھانسی تو وہ اس دن تنگ مرگ سے ایک صاحب کا سامان گلمرگ لے جا رہا تھا، بیچ میں بارش آ گئی۔ بھیگنے سے زکام کھانسی ہو گئی ہے...... چار دن کے بعد جب وہ تنگ مرگ گیا تو منجھلا نورو بھی ساتھ ہو لیا۔ کہنے لگا ماں باپ کا لحاظ ہی نہیں رہا تو یہاں رہنے سے کیا فائدہ۔ نورو کو گئے تین چار مہینے ہوئے ہوں گے ذیلدار نے شہر سے آ کر کہا۔ غلام نبی کی ماں اب تمہاری خیر نہیں ہے۔ تمہارا منجھلا بیٹا نورو شیخ عبداللہ کی پارٹی میں مل گیا ہے۔ دن میں کشتی چلاتا ہے۔ رات کو مزدوروں کے جلسوں میں جا جا کے تقریریں کرتا ہے۔ میں نے کہا۔ بی مینڈکی کو بھی زکام ہوا وہ شیر کشمیر تو سنا ماسٹر تھا پہلے۔ اس کسان کے چھوکرے کو دیکھو یہ بھی چلا ہے لیڈری کرنے۔ پر میں نے سب سے کہہ دیا کہ آج سے میرے سامنے اس کا نام نہ لینا۔ نہ وہ میرا بیٹا نہ میں اُس کی ماں ....

.... زعفرانی؟ تو اس کا ذکر کرنا ہی بھول گئی۔ تو بیٹا اب ہمارے گھر میں رہ ہی کون گیا تھا بس میں، زعفرانی اور سب سے چھوٹا لڑکا غفورا۔ زعفرانی اب بیس برس کی بن بیاہی بیٹھی تھی۔ گھر میں پیسے ہوں تو اس کی شادی کی بات چیت کروں اور یہاں اول تو آمدنی ہی صفر تھی۔ ادھر سُنا۔ سمندر پار ولایت میں لڑائی شروع ہو گئی، تو مہنگائی کا یہ عالم ہوا کہ بس کچھ مت پوچھو۔ میں اور زعفرانی دونوں کام کرتے تھے۔ کبھی کسی کے کھیت پر، کبھی جنگل سے لکڑیاں چن لاتے، کبھی پانی بھرتے۔ کبھی اُون کاتتے۔ تب جا کے دو وقت چولھا جلتا۔ میں نے کہا۔ غفورا دس برس کا ہو گیا۔ لاؤ اس کو بھی کام پر لگا دیں۔ پر زعفرانی بولی نہیں ماں ہم تو غفورا کو مدرسے پڑھنے بھیجیں گے۔ میں نے کہا پاگل ہو گئی ہے۔ پر وہ ایک نہ مانی۔ مجھ سے کہے سنے بغیر اگلے دن سویرے خود اسے لے جا مدرسے میں داخل کروا آئی۔ جوان برابر کی لڑکی۔ اب میں اسے کہوں بھی تو کیا کہوں پھر اس کے بیاہ نہ ہونے کا بھی دُکھ تھا۔ اس واسطے میں چپ ہی ہو گئی...... مگر میرا ماتھا ضرور ٹھنکا کہ آج اس گھر کا پہلا لڑکا مدرسے گیا ہے اب نہ جانے کون سی مصیبت آئے گی...... پر بیٹا اسے لونڈیا پر تو پڑھائی کا بھوت سوار تھا دن رات بھائی کے پیچھے پڑی رہتی تھی...... مدرسے سے آتا تو کہتی گھر پر بیٹھ کر پڑھ۔ حساب کے سوال پوچھنے ماسٹر کے ہاں جا۔ یہ کر وہ کر۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کتابیں گھول کر غفورا کو پلا دے...... ...... جس گھر میں بیری کا پیڑ ہوتا ہے بیٹا، وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں...... جیں

اکیس برس کی لڑکی۔ پھر شکل صورت میں حور کا بچہ نہیں تھی تو کانی بھینگی چیچک داغ بھی نہیں تھی اور تم جانو آج کل کے لونڈے۔ شہر جا کے سیلما' بائسکوپ' ناچ رنگ نہ جانے کیا کیا دیکھ کے کتنے آوارہ ہو گئے ہیں ایک دن زعفرانی لکڑیاں چننے گئی تھی کہ کیا دیکھتی ہوں خالی ہاتھ واپس چلی آرہی ہے۔ زاروقطار روتے ہوئے۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا' تو کچھ جواب نہیں' یا روئے چلی جا رہی ہے۔ اری کم بخت کچھ کہے گی بھی کیا ہوا۔ کسی نے مارا گالی دی۔ چوٹ لگ گئی۔ آخر ہوا کیا۔ اس کا جواب سُن کر میں تو دنگ رہ گئی' بیٹا بات ہی اُس نے ایسی کہی جو کسی ماں نے اپنی بیٹی کی زبان سے کبھی نہیں سنی ہوگی۔ کہنے لگی۔

"ماں! میرا بیاہ کردو۔" اور پھر لگی رونے۔ دس دفعہ پوچھا تب یہ بات کھلی کہ لکڑیاں چن رہی تھی کہ زیلدار کا لڑکا جو شہر سے آیا ہوا ہے ادھر آن نکلا اور لڑکی کو اکیلا دیکھ کر لگا اول فول بکنے۔ جب زعفرانی نے جھڑکا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر بدارادے سے اپنی طرف گھسیٹنے لگا بڑی مصیبت سے ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی آئی تھی بے چاری۔ مگر اس بدمعاش کی ہول دل میں تھی ___ میں ابھی تک پتے کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی اور رو رہی تھی اور جب ذرا ہچکیاں رکتیں تو یہی کہتی۔

"ماں میرا بیاہ کردو۔ نہیں تو ایک دن میری عزت مٹی میں مل جائے گی۔"

. . . اب تم ہی بولو بیٹا' غریب عورت کرے تو کیا کرے۔ جب دمڑی پاس نہ ہو تو کس برتے پر لڑکی کا بیاہ رچائے . . . پھر بھی میں نے ادھر اُدھر نگاہ ڈالی کہ کوئی غریب مگر طبیعت کا شریف آدمی مل جائے جو زعفرانی کو بیاہ لے' تو یہ فکر تو دور ہو جائے۔ مگر پچاس ساٹھ روپے تو تب بھی چاہئیں۔ زمین زیور یہاں تک کہ میرے اور زعفرانی کے کانوں کے بالے بھی بک چکے تھے۔ اب تو کچھ بھی نہیں تھا جس کے سہارے قرضہ ہی مل جاتا۔ اسی ادھیڑ بن میں لگی ہوئی تھی کہ ایک دن ایک آدمی آیا۔ شکل صورت سے بے چارہ قلی معلوم ہوتا تھا۔ وہی ماتھے پر پٹے کا نشان۔ عمر پتہ نہیں کیا تھی۔ پر پچاس کا معلوم ہوتا تھا۔ کہنے لگا۔

"غلام نبی نے یہ بھیجا ہے۔ میں اس کا دوست ہوں محمدو۔" یہ کہہ کر ایک میلے سے کپڑے کی پوٹلی میرے سامنے رکھ دی۔ کھول کر دیکھا تو نوٹ اور روپے اور کچھ ریزگاری۔ گنے تو پانچ اوپر ساٹھ روپے اور دس آنے ہوئے۔ وہ بولا۔

"غلام نبی نے کہا تھا کہ ماں سے کہنا اس روپے سے زعفرانی کا بیاہ کردیں"

میں نے خدا کا شکر کیا کہ بیٹے کے دل میں ماں بہن کا خیال تو آیا۔ پھر محمدو کے منہ پر کچھ عجیب سی حالت دیکھ کر میں نے پوچھا۔

"غلام نبی کا کیا حال ہے؟ وہ نہیں آیا؟"

محمدو کے گلے میں آواز پھنسی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ٹھہر ٹھہر کر بولا جیسے بولنا نہ چاہتا ہو۔

"ماں جی! غلام نبی تو چل بسا۔ اُسے دق ہو گئی تھی۔" اور بس چپ ہو گیا۔

. . . بیٹا! تم لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ بیٹے کی موت کا ماں پر کیا اثر ہوتا ہے . . . ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کلیجے کا ٹکڑا کسی نے کاٹ کر نکال لیا ہو۔ ماں نو مہینے بچے کو پیٹ میں رکھتی ہے نا۔ دو سال دودھ پلاتی ہے۔ بچہ اس کے خون' اس کے گوشت پوست سے بنتا ہے اور پھر وہ بڑا ہو کر غلام نبی کی طرح چوڑے چکلے سینے والا نوجوان ہو جاتا ہے اور پھر گدھے کی طرح صاحب لوگوں کا سامان ڈھوتے ڈھوتے خون کی کھانسی کھانستا ہوا مر جاتا ہے اور اس کے ساتھ ماں بھی مر جاتی ہے . . . . اور سب سے بڑی موت یہ ہوتی ہے کہ وہ پھر بھی زندہ رہتی ہے . . . .

میرا تو جو حال ہوا سو ہوا زعفرانی پر بھائی کی موت کا کچھ عجیب ہی اثر ہوا' چھوٹے بھائی کی پڑھائی کی فکر اور بھی بڑھ گئی۔ ہر وقت اس کی جان پر سوار رہتی کہ پڑھ۔ تختی لکھ۔ مدرسے کا کام کر۔ گھڑی بھر کھیلنے کی بھی چھٹی نہ دیتی۔ جیسے اُسے کوئی خاص جلدی ہو کہ سال بھر کی

مدرسے کی پڑھائی دو چار دن ہی میں پوری ہو جائے۔ نہ جانے کیوں اتنی جلدی تھی اُسے۔ نہ جانے کیوں؟.. ...

ہاں اور محمد و کے پاس بیٹھ کر زعفرانی نے بھائی کے آخری ایام کا سب حال کرید کرید کر پوچھا۔

"کب اور کیسے بیمار پڑا، علاج ہوا یا نہیں؟ کیا سب سامان ڈھونے والے مزدوروں کو اسی طرح دق ہو جاتی ہے؟"

اور جب محمد و نے کہا۔

'ہاں بہت سوں کو۔" تو نہ جانے کیوں زعفرانی نے اس سے پوچھا۔

'تو کیا تم واپس جا کر پھر یہی کام کرنے لگو گے؟ یہاں کیوں نہیں رہ جاتے؟" ....نہ جانے کیوں... ...

... ...میرے کہنے سے محمد و دو رے ہاں تین دن اور ٹھیرا۔ جس روز وہ جا رہا تھا میں نے اس سے پوچھا

"کیوں محمد و! جب یہ کام اتنا خطرناک ہے تو چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟"

وہ بولا

"چھوڑ کر کیا کروں گا، ماں جی؟ اور کوئی کام آتا نہیں ہے اور پھر کوئی آگے ہے نہ پیچھے نہ ماں نہ باپ . . ..."

میں نے جلدی سے پوچھا

"اور بیوی؟"

اُس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"کب کی مر گئی"

پتہ نہیں وہ میرا مطلب سمجھا یا نہیں پر میں نے کہا۔

"دوسری کیوں نہیں کر لیتے؟"

اس کو تین دن میں نے ہنستے تو کیا مسکراتے بھی نہ دیکھا تھا۔ پر اس بات پر اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک پیدا ہوئی اس کے سوکھے چمڑے جیسے چہرے پر ہنسی کی جھریاں پڑ گئیں۔

"مجھ سے کون بیاہ کرے ہے ماں جی؟"

.... تو بیٹا یوں زعفرانی کا بیاہ محمد و سے طے پایا۔

... ... کیا کہا؟ زعفرانی کی رائے؟ بیٹا بھلا شادی بیاہ کیا لڑکیوں کی صلاح سے ہوتے ہیں۔ پر میں نے زعفرانی سے ذکر کیا کہ اگلے چاند کی بیسویں کو محمد و اسے بیاہنے آئے گا۔ تو یہ تو میں نہیں کہوں گی کہ وہ سُن کر خوش ہو گئی۔ بھلا شریف لڑکیاں کیا شادی کے ذکر پر خوش ہوا کرتی ہیں.... پر اس کے چہرے سے اطمینان ضرور ٹپکتا تھا۔ جیسے اب اس کی کوئی چنتا دور ہو گئی ہے۔

شادی کی چھوٹی موٹی تیاریوں میں دن گزر گئے۔ ہاں بیٹا' آخر ہم غریبوں کو بھی کچھ نہ کچھ تو دینا ہی پڑتا ہے۔ چاہے ایک ہی جوڑا اور دو چاندی کے بالے ہوں۔ جس دن محمد و آنے والا تھا اسی دن میں نے سویرے ہی سے زعفرانی کو اٹھا کر نہلا دھلا کر شادی کا جوڑا پہنا دیا۔ گلابی رنگ کا پیراہن اور اس کے نیچے سبز پھول دار چھینٹ کی شلوار۔ ہم پرانے زمانے کے کشمیری عورتیں تو بس لمبے لمبے پیراہن ہی پہنا کرتی تھیں۔ مگر اسی شیر کشمیر کے کہنے سے آج کل لڑکیوں نے شلواریں بھی پہننی شروع کر دی ہیں۔ یہاں تک کہ زعفرانی تو مجھے مجبور کرتی تھی کہ ہاں شلوار پہنو نہیں تو شیر کشمیر خفا ہو جائیں گے۔ شیر دیر سے ڈرے میری بلا' پر اور عورتیں بھی اب شلوار پہننے لگی

تھیں۔ سو میں نے سوچا میں ہی کیوں کنواری رہوں۔ سو میں نے بھی سلوالی۔ ...

اتنا قصہ آیا ہے مجھے اس شیر کشمیر پر کہ کمبخت کو اگر پکڑا جانا تھا تو کیا اسے وہی دن جڑا تھا جب میری بچی کا بیاہ طے پایا تھا۔ یکایک سارے گاؤں میں شور مچ گیا 'شیر کشمیر پکڑے گئے۔ شیر کشمیر پکڑے گئے" مجھے کیا پتہ کیوں سرکار نے اسے پکڑا تھا..... میری طرف سے اگر سال کے بارہ مہینے قید رکھا جاتا تو اور بھی اچھا تھا...... پر یہ ضرور سنا کہ اب کے اس نے خود راجہ ہی کو ریاست سے باہر نکالنے کی بات چلائی تھی۔ میں نے کہا اب اس شیر نے شیر ببر کے بھٹ میں پنجہ ڈالا ہے۔اب یہ زندہ نہیں بچے گا۔ باہر شور کی آواز ہوئی تو میں گلی میں آئی یہ سوچ کر کہ شاید محمد داور اس کے ساتھی برات لائے ہوں مگر وہاں تو بچے دھینگا مشتی مچا رہے تھے۔ دو چار لال جھنڈے جن پر ہل بنا ہوا تھا لئے "شیر کشمیر زندہ باد" "ڈوگرا راج مردہ باد" کہتے پھر رہے تھے اور ہمارا نوکر چھ اینٹوں کا چبوترہ بنائے سفید کھریا سے دیوار پر لکھ رہا تھا اور زور زور سے ہجے پڑھتا جاتا تھا"..... ک ش م ی ر چ ھ و ڑ د و"...... اور زعفرانی دروازے میں کھڑی غفورا کو دیکھ رہی تھی اور اب اس کے چہرے پر اتنی خوشی تھی جیسے اُس نے ایک بڑا کام پورا کر لیا ہو۔

... ہاں تو ابھی میں اندر جا کر بیٹھی ہی تھی کہ باہر سے رونے اور چلانے کی آوازیں آئیں۔ میں نے جو دیکھا تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ ایک خاکی رنگ کی موٹر لاری کھڑی تھی' اور اس میں سے سپاہی کود کود کر بچوں کو لاٹھیوں سے مار رہے تھے' میں دیوار کی طرف دوڑی' جہاں پل بھر ہوئے غفورا کھڑا ہو کر کھریا مٹی سے لکھ رہا تھا۔ غفورا اب نہیں تھا۔ ہاں خون کی ایک لکیر زمین پر کھنچی ہوئی تھی اور اس لکیر کی سیدھ میں جو میں نے دیکھا تو غفورا کو زمین پر بے ہوش پڑا پایا۔ اس کے سر میں ایک گہرا گھاؤ تھا جس میں سے خون بہہ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں ابھی تک کھریا کا ٹکڑا تھا...... میں اپنے غفورا کو اٹھا کر اندر لے آئی اور وہاں اپنی بہن کی گود میں اُس نے جان دے دی اور بے ہوشی میں بھی آخر وقت تک اس کے ہونٹ انہی حرفوں کو دہراتے رہے۔ جنہیں وہ باہر دیوار پر لکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ک۔ ش۔ م۔ ی اور ابھی ر نہیں کہہ پایا تھا کہ گڑ گڑاہٹ کے ساتھ ایک ہچکی آئی اور اس مہینے میں دوسری بار مجھے موت آئی پر نہ آئی ...

..

... اور اس کے بعد کیا ہوا۔ بیٹا' یہ مجھے ایسا یاد ہے' جیسے کوئی ڈراؤنا خواب ہو جس میں ایک خوفناک بات کا دوسری خوفناک بات سے کوئی تعلق نہ ہو' مگر پھر بھی خوف اور دہشت کا پہاڑ اُٹھتا چلا جائے۔ ...

... زعفرانی کی آنکھیں جو کبھی کنول سے ملتی جلتی ہوا کرتی تھیں اس وقت دو دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح تھیں۔ ... آنسوؤں کا نام نہیں تھا۔ نہیں تو وہ آگ بجھ جاتی جو اس وقت ان میں سلگ رہی تھی..... اور پھر سارے گاؤں والوں کا ایک جلوس۔ مردوں سے آگے عورتیں اور عورتوں میں سب سے آگے زعفرانی۔ وہی اپنی شادی کا جوڑا پہنے ہوئے اور اس کی آنکھوں میں وہی دہکتی ہوئی آگ اور یہ سارا مجمع گاتے ہوئے کھیتوں میں سے ہو کر سڑک کی طرف جاتا ہوا۔ جہاں بالکل اسی جگہ جہاں تمہاری موٹر کھڑی ہے' سپاہیوں کی خاکی لاری کھڑی تھی۔

... بڑی بڑی مونچھوں اور کالی رنگت والے سپاہی اور ان کی بندوقیں جو ٹکٹکی باندھے اس جلوس کی طرف ان عورتوں کی طرف' زعفرانی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ...

... ایک تڑاخہ۔ دس بارہ تڑاخے۔ سب تتر بتر ہو کر بھاگے اور اس کھیت کے بیچوں بیچ اپنی چھاتی کو سنبھالتی ہوئی زعفرانی نرم مٹی میں اس طرح گری جیسے ماں کی گود میں بچہ آن کر گر پڑے میں ادھر بھاگی۔ پر جب تک میں پہنچوں' زعفرانی کی چھاتی میں سے خون کی ایک دھار بہتی ہوئی کھیت کی سوکھی مٹی کو سیراب کر رہی تھی۔ ... عورت کی چھاتی اور اس میں سے دودھ کی بجائے خون ... ... خون مٹی میں مل رہا تھا۔ ...

اور میری بچی میری گود میں جان دے رہی تھی۔ پر مرتے دم تک اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور نہ جانے کیوں آخری ہچکی سے پہلے اُس نے مسکرا کر مجھ سے کہا۔

"میرا بیاہ ہو گیا ماں"

... ... یہیں اس کھیت میں جہاں تم اب گلِ لالہ کی طرح سُرخ زعفران کے پھول دیکھتے ہو۔

... ... سنی بیٹا، تم نے میری کہانی؟... ... پر تم کہاں ہو؟... . چلے گئے نا تم؟ ... ... میں نہ کہتی تھی کہ ابھی تمہاری موٹر ٹھیک ہو جائے گی اور تم اُوک چلے جاؤ گے اور کہانی نہ سُن پاؤ گے۔

... ... موٹریں تو اس سڑک پر سے گزرتی ہی رہتی ہیں، بیٹا، پل دو پل کو ٹھہرتی بھی ہیں تو پھر دھول کے بادل اڑاتی چلی جاتی ہیں پر یہ زعفران کی کھیتی یوں ہی کھڑی رہے گی، یہاں تک کہ پھول چننے کا وقت آ جائے گا اور یہ لال لال لہو کی بوندوں جیسے شگوفے سکھا کر دساور کو بھیج دیئے جائیں گے اور نہ جانے ان کی خوشبو کہاں کہاں اور کس کس کے دستر خوانوں پر سے مہکے گی اور تمہاری طرح کتنے ہی آدمی سوال کریں گے "اس زعفران کا رنگ لہو کی طرح لال کیوں ہے؟"... ..... پر کوئی نہ بتا پائے گا۔ کیونکہ اس کی وجہ تو صرف میں ہی جانتی ہوں ... ."

مجھے جانے دو

اختر حسین رائے پوری

"مجھے جانے دو۔" اس نے کہا اور جب تک میں اسے روکوں وہ ہاتھ چھڑا کر جا چکی تھی۔ اندھیرے میں اس کی آنکھوں کی ایک جھپک اور دہلیز پر پاؤں کے بچھوے کی ایک جھنک سنائی دی۔ وہ چلی گئی اور میں کوٹھڑی میں اکیلا رہ گیا۔

میں وہاں جانا چاہتا تھا۔ میں اکثر اس مکان کے آگے سے گزرتا تھا اور شام کے وقت کچھ جوان لڑکیوں کو اس کے پھاٹک کے آگے کھڑا پاتا تھا۔ جاڑے کی راتوں میں نیم آستیں جمپر پہنے ہوئے یہ چھوکریاں راہ چلتوں کو لبھانے کی تدبیر کیا کرتی تھیں۔ کوئی بھی آنکھوں والا غازے سُرخی میں عصمت کے خون کی جھلک دیکھ سکتا تھا ان کے جسم کا ہر رواں تھر تھرا کر کہہ رہا تھا ـــــ ہمیں لے لو ـــــ ایک روپیہ کے بدلے۔

ان میں سے بعض سگریٹ کا دھواں نہایت نزاکت سے کسی رنگیلے کے منہ پر پھونک دیتی تھیں اور کوئی منچلی کسی بد نما مارواڑی کے جوتے پر پان کی پیک تھوک دیتی تھی۔ جب وہ پلٹ کر دیکھتا تو لڑکیاں آنکھ مار کر کھل کھلا پڑتی تھیں۔ ان کی ہر ادا زبانِ حال سے کہتی تھی ـــــ ہمیں لے لو ـــــ ایک روپیہ کے بدلے۔

ٹرام پر شریف زادیوں اور موٹروں پر امیر زادیوں کے کھیپ کے کھیپ گزرا کرتے تھے۔ ان سستی طوائفوں پر نظر پڑتے ہی وہ توبہ استغفار کے ساتھ دوسری طرف دیکھنے لگتی تھیں۔ یہ بدبخت 'نسوانیت کی کلنک' خدا غارت کرے 'چند ٹکوں کے لئے۔ شراب کی بوتل یا سگریٹ کی ایک ڈبیہ کے لئے۔ یہ اپنا تن ہر ایرے غیرے کے سپرد کر دیتی ہیں ـــــ اور ہم؟ ـــــ پھر وہ اپنے شوہروں کو یاد کرنے لگتی تھیں جنھوں نے انہیں اونچی حویلیاں' ریشمی ساریاں اور چھ چھ بچے عطا کئے تھے۔

اس مکان سے لگ کر کالی دیوی کا ایک چھوٹا سا مندر تھا۔ یہ کالی کلوٹی اور ننگ دھڑنگ دیوی اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے لیل و نہار کا تماشا دیکھا کرتی تھی۔ شام جب آرتی شروع ہوتی اور کم سن لڑکیاں اس کے سامنے ناچنے لگتیں تو مٹی کے چراغوں کی دھندلی جوت میں اس کی شکل زیادہ پر اسرار ہو جاتی۔ معلوم ہوتا کہ عورت کی روح ایک سیاہ کفن اوڑھے ہوئے اپنی قبر سے اٹھی ہے اور ایک آن میں مرد کو فنا کر دے گی۔ جو لوگ درشن کے لئے آتے وہ ہاتھ باندھے ہوئے للچائی ہوئی نظروں سے ان رقاصاؤں کو تاکا کرتے تھے اور جب وہ التفات نہ کرتیں تو یہ زیادہ بے باکی سے ان طوائفوں کو گھورنے لگتے جو پجاری کے ڈر کے مارے سیڑھی کے نیچے سر جھکائے

کھڑی رہتی تھیں۔

ان میں سے ایک کا انداز سب سے نرالا تھا۔ اس کے دل میں پوجا کی عظمت کا احساس مطلق نہ تھا۔ وہ سگریٹ پیتے ہوئے اطمینان سے آرتی کا تماشا دیکھتی اور وقتاً فوقتاً کیرتن کے لے پر پیروں سے ٹیک دینے لگتی۔ جب کوئی بوڑھا اپنی پھٹی ہوئی آواز سے تال کو بے تال کر دیتا تو وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑتی اور پنواڑی کو پکار کر کہتی ________ "ارے ذرا سی سرتی تو بنانا۔"

اور کیرتن کا نغمہ کسی مجروح پرندے کی طرح دیر تک تڑپتا رہتا۔

جب میں نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو میرا دل آپ ہی آپ مبہوت ہو کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں وہاں سے بھاگتے بھاگتے بھی اس کے قریب پہنچ گیا۔

لیکن اس نے بے پروائی سے مجھے دیکھا اور اپنی ایک سہیلی سے پوچھنے لگی ______ "اری اس حرام زادے سے کتنے اینٹھے؟"

اب میں ہر شام کو اس فٹ پاتھ پر ڈیرے کرنے لگا۔ جب وہ اس مقام پر ہوتی تو ذرا حیرانی سے میری طرف دیکھتی اور پھر کچھ مسکرا کر اپنی ہم چشموں سے باتیں کرنے لگتی۔ کبھی وہ وہاں نہیں بھی ہوتی تھی اور میں سمجھ جاتا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ میرے دل پر چوٹ سی لگتی۔ خون کی روانی تیز ہو جاتی اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں آ جاتیں۔ دور ہٹ کر لیمپ کے کھمبے کا سہارا لئے میں گھنٹوں کھڑا رہتا تھا۔ حتیٰ کہ پیر شل ہو جاتے تھے۔ میں یونہی ٹکٹکی باندھے اس پھاٹک کو تاکتا رہتا تھا۔ بہتیرے شریف اس کے اندر سے نکلتے اور دائیں بائیں دیکھ کر لپکتے ہوئے بھیڑ میں گم ہو جاتے تھے۔ لمبی لمبی چوٹیوں اور گھنیری داڑھیوں والے بیسیوں بدمعاش اس چکلہ گھر سے برآمد ہو کر بھیگی بلیوں کی طرح پنجے دبائے بھاگتے نظر آتے تھے۔

مجھے یاد ہے کہ میں نے اس سے کیونکر ہم کلام ہونے کی جرأت کی تھی۔

اس روز میں اپنے سب سے پیارے دوست کو قبر میں لٹا کر لوٹا تھا۔ اب دنیا میں کوئی اپنا نہ تھا۔ وہ دق میں گھل گھل کر مر گیا اور میں اس کے علاج کا کوئی انتظام نہ کر سکا۔ جب وہ مر گیا تو ہم نے اسے مٹی کے تودوں کے نیچے دبا دیا۔ جب وہ قبر میں سلا دیا گیا تو میں نے کلیجہ تھام کر آخری مرتبہ اس کے چہرے کو دیکھا۔ اس پر اب بھی وہی بھولا پن تھا۔ گویا انسان سماج کی قبر میں چاندی کے ڈھیلوں کے نیچے دب گیا اور اس نے مرتے مرتے کہا "میری پیپ تمہارے جسم کو سڑائے گی' میرا خون تمہارے بدن کو تپائے گا میرے آنسو تمہارے گوشت کو گلائیں گے۔"

میں قبرستان سے لوٹا تو میرے جسم کے اندر کچھ نہ تھا۔ ضمیر کی جگہ کوئی چیز بھائیں بھائیں کر رہی تھی۔ ایک خلا جس میں کاہش کے سوا کچھ نہ تھا۔ شام کے وقت بلا ارادہ میں اسی مکان کے آگے موجود تھا۔ میں نے بنا کچھ کہے ہاتھ پکڑ کر اسے اندر گھسیٹ لیا۔

اس نے مجھے ایک روپیہ دے کر کہا "اس مندر کے پیچھے کی گلی میں ایک کلال کی دکان ہے۔ وہاں سے ایک ادھا خرید لاؤ۔"

میں نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ لیکن اس وقت نہ جانے کیا ہو گیا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ ہر وہ کام اچھا ہے جسے دنیا برا کہتی ہے۔ پھر میں اس کلال کی دوکان میں گھس گیا۔

مٹی کے بڑے بڑے مٹکے جن پر جھاگ کے بادل سمٹ آئے تھے' جیسے بھینس کے تھن سے دودھ چمک رہا ہو۔ ان میں مکھیاں اور مکوڑے تیرتے ہوئے' اندر متوالے مل کر گا رہے تھے۔

"ایکشا نمبر ون کا آآآآ......بھاآآآ......دے نالا......"

میں نے جلدی سے ایک اَدھا خریدا اور دوتی کی چاٹ چٹنی مسالے دار۔

اس نے منہ لگا کر دیکھتے دیکھتے آدھی بوتل ختم کر دی۔ پھر چپ چاپ ایک سگریٹ سلگایا اور میری گود میں اپنے پاؤں پھیلا کر ٹوٹی ہوئی آرام کرسی پر دراز ہو گئی۔

یک بیک وہ زور سے ہنسی اور مجھے غور سے دیکھ کر پوچھا "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

ہوا بند تھی۔ کھڑکی سے آسمان کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آ رہا تھا جس میں دو تین۔ تارے چنبیلی کے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس سوال کا جواب کیا ہو سکتا تھا۔

بولتے نہیں۔ میں پوچھ رہی ہوں کہ تم یہاں کس غرض سے آئے ہو۔ مجھے اس مرد سے نفرت ہوتی ہے جو عورت کے پاس بیٹھ کر اپنا مدعا زبان سے نہیں بلکہ نگاہ سے ظاہر کیا کرتا ہے اور اس گھڑی کا منتظر رہتا ہے جب عورت خود اس سے پوچھے کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

اس نے بوتل کی بچی ہوئی شراب اپنے گلے کے نیچے اتار لی۔ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر باہر دیکھنے لگی۔ میں بدستور چپ تھا۔ خود مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ میں کیوں آیا ہوں اور کیا چاہتا ہوں۔

پھر وہ اٹھ کر کوٹھڑی میں ٹہلنے لگی۔ ٹہلتے ٹہلتے وہ آئینہ کے سامنے کھڑی ہو گئی اور اس میں اپنی صورت دیکھنے لگی۔ وہ دوبارہ ہنسی تو مجھے ایسا لگا کہ کوئی مردہ ہنس رہا ہے۔

"یہ میری ہی صورت ہے۔ اگر میں کاجل' غازہ اور لاکھے کو دھوڈالوں تو لیارہ جائے ____ دھندلی آنکھیں' پچکے ہوئے گال' سوکھے ہوئے ہونٹ۔ تین سال کے اندر کیا سے کیا ہو گیا۔ میرے جسم کو گھن لگ چکا ہے' میں اندر سے کھوکھلی ہو گئی ہوں مجھے ایسی ایسی بیماریاں لگ گئی ہیں جن کے تصور سے تمہیں وحشت ہو گی اور تم یہاں سے بھاگ جاؤ گے!"

دیر تک وہ کچھ سوچتی رہی۔ اس کا منہ غصہ سے تمتما رہا تھا۔ مجھ پر آنکھیں گاڑ کر وہ کہنے لگی "اور یہ بیماریاں مجھے کہاں سے لگیں؟ یہ تم جیسے چاہنے والوں کا ہی عطیہ ہے۔ مرد ____ سوزاک اور آتشک کے جراثیم کا باپ!

تم ابھی اس کوچے سے ناواقف ہو۔ تم نہیں جانتے کہ عورت کیا ہے۔ اگر تمہیں اپنے دو۔۔ بھائیوں کی طرح معلوم ہوتا کہ وہ مٹی کا ایک کھلونا ہے اور بس۔ تو تم آتے ہی اسے توڑ دیتے۔ یوں حیرت اور ہیبت سے مجھے نہ تاکا کرتے۔ مگر تم ان لوگوں سے اچھے ہو جو درندوں کی طرح ہی ہمارے سینوں پر آتے ہیں۔ ہمیں کتوں کی طرح جھنجھوڑتے ہیں اور جب ہڈیوں میں گودا نہیں رہتا تو ہمارے پلوں میں دو چار ٹکلیاں باندھ کر چلے جاتے ہیں۔

پھر گھر والی آتی ہے۔ ہماری گرہ سے ایک ایک چھدام نکال کر لے جاتی ہے اور اس کے بدلے ہمیں کھانے کے لئے روٹیاں اور سنگھار کے لئے کاجل کی سلائی دے جاتی ہے۔

دن کے اُجالے میں جب تم لوگ ادھر آتے جاتے ہو تو حقارت سے منہ پھیر کر اپنے ساتھیوں سے کہتے ہو یہاں چھنالا ہے۔ ان شکیتی طوائفوں کو عصمت یا عزت کا ذرا پاس نہیں انہیں شہر سے نکال دینا چاہئے۔

مگر رات کے اندھیرے میں تم کشاں کشاں آتے ہو اور ان خرابوں کو آباد کرتے ہو۔ تم اپنا منہ کالا کر کے اپنی حرام کمائی کے چند درم ہمیں دیتے ہو اور پھر اس تجسس میں اپنی حرم سرا کو بھاگتے ہو کہ بیوی تو خیریت سے ہے۔"

وہ ہانپنے اور کھانسنے لگی۔ اس کا سانس پھول گیا اور وہ چارپائی پر گر پڑی۔ اس نے درودیوار کو دیکھا اور آپ ہی آپ کہنے لگی۔ "زیادہ دن نہیں۔ یہ مصائب بہت جلد ختم ہو جائیں گے۔ اب سب کچھ خواب معلوم ہوتا ہے۔

جب میں مر جاؤں اور میری لاش لاوارثوں کے قبرستان میں پھینک دی جائے تو تم علی گڑھ کے مولانا نورالاسلام سے ملنا۔ اس وقت ان کے پاس جانا جب وہ منبر پر بیٹھے جمعہ کا خطبہ سنا رہے ہوں اور تمہیں شرافت کی قسم کہ وہ اخلاق کی تفسیر بیان کرنے لگیں تو اپنی صف سے نکل کر کہنا۔ مولانا! میں ایک پردیسی ہوں اور آپ کو یہ پیغام سنانے کلکتہ سے آیا ہوں کہ بداخلاقی اس دنیا سے چل بسی۔ اب آپ ناحق نہ بسورئیے۔

اور جب سب بڈھے اپنی عینکیں کھسکا کر تمہیں گھوریں اور پوچھیں کہ یہ کیا بکتا ہے' تو کہنا میں آپ کی بیٹی کے جنازہ کا تماشا دیکھ کر آرہا ہوں وہ جسے ایک حرامی بچہ پیدا کرنے کے جرم میں آپ نے گھر سے نکال دیا تھا۔ اسے ایک مرد مومن نے کچھ دنوں کے لئے اپنے گھر پر ڈال لیا اور اسی طرح ہاتھوں ہاتھ وہ کلکتہ پہنچ کر طوائف کا پیشہ کرنے لگی۔ آپ کے ہم جنسوں نے تحفہ میں اسے گھناؤنی بیماریاں دیں اور جب وہ مر گئی تو ایک حافظ نے اس کی قبر پر فاتحہ خوانی کی۔ جب تم یہ کہہ چکو گے تو لوگ تمہیں بہت پیٹیں گے۔ لیکن اپنی محبت کے صدقے میں اتنی تکلیف اٹھا لینا۔"

میرا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہاں سے بھاگ جاؤں مگر پیروں میں جیسے زنجیر پڑ گئی۔

وہ پھر کھانسنے لگی۔ جب اس کا جی کچھ سنبھلا تو میں نے دیکھا کہ وہ چپکے چپکے رو رہی ہے۔ "تم لوگ جانوروں پر رحم کھاتے ہو۔ ان پر کوئی تشدد کرتا ہے تو سزائیں دیتے ہو۔ میں نے سیٹھوں کو دیکھا ہے کہ چیونٹیوں کو شکر اور سانڈوں کو پوریاں کھلاتے ہیں ———— مگر عورت! آہ عورت پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہو؟

مگر عورتیں بیویاں بن کر طوائفوں سے مردوں کی بہ نسبت زیادہ نفرت کرتی ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ ہمارا وجود ان کے حق میں کتنی بڑی نعمت ہے ہم انہیں زنا بالجبر' اغوا اور علانیہ عصمت دری سے بچاتی ہیں۔

اور خدا! ———— وہ ہماری کیوں نہیں سنتا۔ اگر اس کی جنت میں حوروں کے لئے جگہ ہے تو دنیا کا ایک کونہ ہمیں کیوں نہیں مل سکتا؟"

اب ہوا چل رہی تھی اور تاڑ کے پتے غم ناک آواز میں کراہ رہے تھے۔ سڑک پر ٹریموں اور موٹروں کا شور بہت کم ہو گیا تھا۔ البتہ اکّے دکّے رکشا کی گھنٹی بج اٹھتی تھی۔ بادلوں نے آسمان کے اس ٹکڑے کو گھیر لیا تھا اور ان میں کبھی کبھی بجلی چمک جاتی تھی۔

وہ پھر بولنے لگی۔ "میں نے صرف ایک مرتبہ محبت کی ہے اور اب بھی اس فریب میں مبتلا ہوں کہ وہ سچی محبت تھی۔ یہ فریب کبھی نہ ٹوٹنے گا۔ کیونکہ قبل اس کے کہ میں اس کا امتحان لوں وہ مر چکا تھا۔

وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں اٹھا کر کس التجا سے مجھے دیکھتا تھا۔ وہی تصور مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہے۔ میں نے اپنا مایہ حیات اسے سونپ دیا اور اس سے پہلے کہ وہ اس امانت کو لوٹائے وہ پلیگ میں مر گیا۔

اس نے مجھے جو بچہ دیا وہ حرامی تھا۔ کاش ہماری محبت کو اخلاق کی مہر مل جاتی اور میرا بچہ مل جاتا۔"

ان بھولی ہوئی باتوں کی یاد سے اس کا دل بھر آیا اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کس طرح دلاسا دوں۔ جس ماں کے آگے اس کے بچے کی لاش پڑی ہوئی ہو' اور جس عورت کے آگے اس کے محبوب کا جنازہ' اسے تسلی دینے کا اسلوب

کوئی زبان پیدا نہیں کر سکتی۔

جیسے وہ عدالت کے آگے بیان دے رہی ہو' میری سوتیلی ماں نے اندھیری رات میں اس بچے کی لاش آنگن میں گاڑ دی۔ اپنے بستر پر لیٹے لیٹے بجلی کی روشنی میں میں نے وہ نظارہ دیکھا اور پھر بے ہوش ہو گئی۔

دو تین روز بعد میرے سوتیلے ماموں نے مجھے گاڑی میں بٹھا کر الہ آباد کا ٹکٹ ہاتھ میں تھما دیا۔ یہیں سے میری مصیبت کا آغاز ہے۔

الہ آباد .... میرے نصیحتی خالو کا مکان ...... میری مرضی کے خلاف عصمت دری...... بدنامی کا ڈر ...کلکتہ........ .... یہ چکلہ گھر... ..."

زیر لب وہ ٹوٹے پھوٹے جملے دہراتی رہی اور چند لمحوں کے لئے اس کی آنکھ لگ گئی۔

میں دبے پاؤں اٹھا اور نکل بھاگنے کی نیت سے جوتے پہننے لگا۔ اتنے میں وہ چونک کر اٹھ بیٹھی "کیا تم جا رہے ہو؟" اس نے اداسی سے پوچھا۔ اب اس کی آواز نرم و نحیف ہو گئی تھی۔

میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اب بھی کچھ نہ کر سکا۔

"اچھا تو جاؤ خدا حافظ! اب نہ آنا۔ میں تم سے انتقام نہیں چاہتی۔ اور کوئی ہوتا تو میں بصد شکر سوزاک اور آتشک کے چند جراثیم نذر کرتی۔ وہ کسی اور کو دیتا۔ اور یہ اس کے بچوں کو ورثہ میں ملتے۔ غرض ساری انسانیت ان امراض میں مبتلا ہو جاتی۔ تب شاید سماج کے ٹھیکیداروں کو ہوش آتا کہ اس بلا کی جڑ کہاں ہے۔

مگر کبھی کبھی آکر پوچھ لینا کہ میرے مرنے میں کتنی دیر ہے۔ کوئی کانوں میں کہہ رہا ہے کہ زیادہ دیر نہیں۔

کوئی بھری جوانی میں مرتا ہے تو لوگ افسوس کرتے ہیں کہ کیسا نامراد چلا۔ لیکن مجھے دیکھو کہ زندگی سے موت کے سوا کچھ نہیں مانگتی۔ تم نہیں جانتے کہ ہم آپ اپنی نظر میں کتنی ذلیل ہیں۔ ہمارا ہر لمحہ دوسروں کی خوشنودی میں بسر ہوتا ہے۔ ہم ایسی لونڈیاں ہیں جن کے آقا ہر روز بدلتے ہیں کیوں کس خیال میں گم ہو گئے۔ جاؤ خدا کے لئے چلے جاؤ۔"

لیکن میں نہ جا سکا۔ مجھے اس سے کچھ نہیں لینا تھا۔ پھر میں گرفتار نظر پرندے کی طرح اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا سر اس کے آغوش میں رکھ دیا۔ وہ ایک بے جان لاش کی طرح یونہی پڑی رہی۔ اس کے دل کی دھڑکن کو میں صاف سن سکتا تھا۔ اس کی روح کا نوحہ میری کانوں میں گونج رہا تھا۔

"تو پھر مجھے جانے دو۔" اس نے کہا ———— اور وہ چلی گئی۔

حجاموں کی یونین

ملک راج آنند

جدید ہندوستان کی تعمیر میں ہمارے گاؤں کے چندو حجام کا بھی بڑا حصہ تھا۔ ضرورت ہے کہ میں اُس کی تاریخی خدمات کی طرف توجہ دلاؤں، ورنہ ممکن ہے دنیا اُسے فراموش ہی کر دے۔ اس نے ایک عظیم الشان کارنامہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ دنیا کو حق شناسی کا ثبوت دینا چاہئے۔ یہ عجیب و غریب کارنامہ کچھ اس قسم کا ہے کہ شروع میں خود چندو بھی اُس کی پوری پوری اہمیت سے واقف نہ تھا۔ اس وقت وہ ہندوستان کے دوسرے بڑے آدمیوں کی طرح اپنی اہمیت کو بہت زیادہ نہیں خیال کرتا تھا۔ لیکن قدرتاً جو خود پسندی بڑے آدمیوں میں ہوتی ہے وہ اس میں بھی آ گئی ہے۔ یہ خود پسندی اُسے بُری بھی لگتی تھی اور اسے زیب بھی دیتی تھی۔

میں چندو کو ان دنوں سے جانتا ہوں، جب وہ ایک پھٹا ہوا کرتا پہنتا تھا۔ یہ کرتا پھٹا ہوا بھی کچھ اس طور سے تھا کہ بمشکل اس کا ننگا اور پھولا ہوا پیٹ ڈھکتا تھا۔ ہم اکٹھے گاؤں کی گلیوں کی کیچڑ میں کھیلا کرتے تھے۔ کبھی سپاہی بنتے تھے، کبھی دوکاندار اور کبھی کلرک ان کے علاوہ اور بھی کئی کھیل تھے۔ جو ہم نے اپنی تفریح کے لئے ایجاد کئے تھے۔ اس تفریح میں اور کوئی شریک نہیں ہوتا تھا۔ ہاں البتہ ہماری مائیں کبھی کبھی آ کر دیکھ جاتی تھیں۔

چندو مجھ سے کوئی چھ ماہ بڑا ہو گا۔ ساری باتوں میں وہی پیش پیش رہتا تھا۔ میں بھی بخوشی اُس کے نقش قدم پر چلتا رہا۔ چونکہ اُسے بھڑ پکڑنے کا خاص ملکہ تھا۔ وہ بھڑ کی دم کو دبا کر بڑی ہوشیاری سے ڈنک نکال لیتا اور پھر اس کی ننھی ٹانگوں سے تاگا باندھ کر اڑاتا تھا۔ لیکن میں جب کبھی کوئیں کی منڈیر کے چھوٹے چھوٹے گڑھوں پر سے بھڑ پکڑنے کی کوشش کرتا تو مجھے ضرور سزا بھگتنا پڑتی۔ بھڑ اکثر میرے گالوں پر کاٹ لیتی تھی۔

ہم کچھ بڑے ہوئے تو پھر بھی ویسے ہی چندو مجھے دنیا بھر کی خوبیوں کا مجسمہ معلوم ہوتا تھا۔ اب تو وہ قسم قسم کے کنکوے بھی اُڑا لیتا تھا ان کنکوں کا توازن کچھ اس ڈھب کا ہوتا تھا کہ اُنہیں قابو میں رکھنا میرے بس کی بات نہ تھی۔

اسکول کے کام کاج میں وہ مجھ سے پیچھے تھا۔ وہ میری طرح سوال نہیں نکال سکتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ اس کے پتا نے اسے شروع ہی سے آبائی پیشہ سکھا دیا تھا اور لوگوں کی حجامت بنانے کے لئے اُس کو گھر گھر جانا پڑتا تھا۔ اسکول کا کام کرنے کے لئے اس غریب کو وقت ہی کہاں ملتا تھا لیکن اُسے گیت بہت یاد تھے۔ اس فن میں وہ مجھ سے بہت بڑھا ہوا تھا۔ اُسے نہ صرف یہ کہ کتاب کے سارے گیت ازبر یاد تھے۔ بلکہ وہ نثر کے صفحے اس شان سے زبانی سنا دیتا تھا کہ وہ سب گیت ہی معلوم ہوتے تھے۔

امتحان ہوا۔ چندو نے وظیفہ حاصل کیا۔ ماتاجی کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی، کہ اس کو تو اسکول سے کچھ نقد بھی ملے اور میں فیس

۔بلکہ وہ نثر کے ٹکڑے اس شان سے زبانی سنا دیتا تھا کہ وہ سب گیت ہی معلوم ہوتے تھے۔

امتحان ہوا۔ چندو نے وظیفہ حاصل کیا۔ ماتا جی کو یہ بات ناگوار معلوم ہوئی' کہ اس کو تو اسکول سے کچھ نقد بھی ملے اور میں فیس پاس سے دیکر تعلیم حاصل کروں۔ اب وہ مجھے چندو کے ساتھ کھیلنے سے منع کرتی تھیں۔ کہتی تھیں چندو ایک حجام کا بیٹا ہے اور کمین ذات کا ہے اور یہ بھی کہتی تھیں کہ مجھے اپنی ذات اور مرتبے کو پہچاننا چاہئے۔ میں نے اپنے والدین سے اور کوئی باطنی اوصاف تو حاصل کئے ہوں گے۔ لیکن برتری کا کوئی احساس یقیناً وراثت میں نہیں پایا تھا۔ مجھے تو اس سرخ نشان سے بھی شرم آتی تھی۔ جو ماتا جی صبح کو میرے ماتھے پر لگایا کرتی تھیں۔ چست اچکن' سفید لٹھے کا پاجامہ' سنہری طلا کا جوتا۔ سلک کی پگڑی غرض کہ مجھے ایسی کوئی چیز نہ بھاتی تھی۔ چندو جو کپڑے پہنتا تھا۔ کچھ عجیب سے ہوتے تھے ان میں شکن بھی ہوتے تھے اور چیکے چیکے بھی رہتے تھے۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ مجھے بھی حق ہونا چاہئے کہ چندو کی طرح کپڑے پہنوں ـــــــــ ایسے کپڑے۔ جو وضع داری سے بے نیاز ہوں۔

چندو کُرتہ پہنا کرتا تھا جو اُسے ایک پنشن یافتہ صوبیدار نے دی تھی۔ اس کی قمیض کے اوپر ایک مخمل کی واسکٹ بھی ہوتی تھی۔ جو سیپ کے بٹنوں سے سجی ہوئی تھی۔ وہ ایک گول نمدے کی بنی ہوئی ٹوپی پہنتا تھا۔ یہ ٹوپی کبھی ہمارے گاؤں کے وکیل لالہ حکم چند جی کے سر کی زینت ہوا کرتی تھی۔

چندو کے پتا پلیگ کی بیماری سے اس دنیا سے سدھار گئے۔ ان کے بعد چندو بالکل آزاد ہو گیا۔ جو جی میں آتا تھا کرتا تھا۔ اسکی آزادی قابل رشک تھی۔ صبح ہی صبح وہ اونچی ذات کے شرفا کے گھروں میں جا کر ان کے سر اور خط بنایا کرتا تھا۔ پھر خود نہا دھو کر اپنے کپڑے پہن لیتا تھا اتنے میں لالہ حکم چند جی کی گاڑی تیار ہو جاتی تھی اور وہ بھی وکیل صاحب کے ساتھ پائیدان پر بیٹھ کر شہر کو چل دیتا تھا۔ یہ شہر گاؤں سے چھ میل کے فاصلے پر تھا۔

چندو مجھ پر بڑی نوازش کرتا تھا۔ وہ جانتا تھا۔ مجھے شہر جانے کے بہت کم موقعے ملتے ہیں۔ سوائے اس کے کہ تین میل تک جوتیاں چٹخاتے خوف خدا دل میں لئے ہوئے جودھیالہ کے مڈل سکول میں پہنچ جاؤں اور کہیں آنا جانا نہیں ہوتا۔ اس نے پتا کی وفات کے فوراً بعد ہی اسکول کو خیر باد کہہ دیا اور بے رحم اُستادوں کی زودوکوب سے بچ گیا تھا۔ وہ میرے لئے شہر سے رنگ بھرنے والا برش سنہری روشنائی سفید چاک' پنسل تراش' جس میں دو طرفوں والا پھل لگا ہوتا ہے اور اس قسم کے اور بھی کئی تحفے لایا کرتا تھا۔ وہ مجھے متمدن دنیا کے بازاروں کی مختلف النوع چیزوں کی تفصیل سنایا کرتا تھا۔ اس سے مجھے بے حد خوشی ہوتی تھی۔ واپسی پر اُسے پھر وکیل صاحب کی گاڑی کے پائیدان پر آنا ہوتا تھا۔ اس لئے اُسے کچہری میں انتظار کرنا پڑتا تھا۔ یہاں پر اکثر وہ صاحب لوگوں وکیلوں' چپراسیوں اور پولیس کے سپاہیوں کو دیکھا کرتا تھا اور اُن کی انگریزی وضع قطع کی پوشاک پر دل کھول کر تبصرہ کیا کرتا تھا۔ اُس نے دو ایک مرتبہ مجھ پر یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنے گھر کے مٹکے سے کچھ رقم اڑا لے۔ یہ مٹکا گویا ان کا دولت خانہ تھا۔ جہاں چندو کی ماں اس کی پیشہ وارانہ چابکدستی سے حاصل کی ہوئی مزدوری کو جمع رکھتی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس رقم سے کلام خان کا ساز و سامان خریدے اور یہ کلام خان شہر کے دندان ساز تھے۔ چندو کہا کرتا تھا۔ یہ خانصاحب لوگوں کے منہ میں دانتوں کی قطاریں لگا کر اور مصنوعی آنکھیں جما کر معجزہ ہی تو کر دیتے ہیں۔ کلام خان کا حلیہ اُس نے اس طرح بیان کیا تھا۔ وہ ایک آدمی ہے' بالوں میں ایک طرف کو چیر نکالتا ہے اور مادے سے سخت کی ہوئی قمیض پہنتا ہے۔ اس کے اوپر گلے میں ایک ہاتھی دانت کا سا کالر ہوتا ہے اور اس میں ایک بوٹائی لگ رہی ہوتی ہے۔ ایک سفید رنگ کا کوٹ ہوتا ہے۔ نیچے ایک پٹی دار پتلون اور سیاہ رنگ کا پمپ شو' اوپری پوشاک جو وہ کام کرنے کے وقت پہنتا ہے۔ ربڑ کی بنی ہوئی ہے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ یہ جادوگر بڑی مہارت کے ساتھ اپنے چمڑے کے بیگ کو کھولتا ہے اور اپنے چمکدار لوہے کے اوزاروں کو بڑے طمطراق کے ساتھ باہر نکالتا ہے۔ پھر چندو نے اس مسئلے پر میری رائے دریافت کی کہ کیا وہ حجام جس کے پاس پرائمری سند بھی موجود ہو۔ اگر کلام خان کا سا لباس پہن لے تو زیادہ معزز شخص بن جائے گا؟ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا۔ اگرچہ میں نے کچھ زیادہ تعلیم حاصل نہیں کی۔ لیکن انسان کے

جسم کے اوپر جو کیل' پھنسی' پھوڑے وغیرہ نکل آتے ہیں ان کا علاج تو میں جانتا ہوں۔ میں نے اپنے پتا جی سے سیکھا تھا اور انہوں نے اپنے پتا جی سے یہ تعلیم لی تھی۔

میں نے اُس کے اس منصوبے کی تائید کی اور پرجوش انداز میں اُس کی حوصلہ افزائی بھی کی۔ ایک دن وہ صبح ہی صبح ہمارے ہاں آیا۔ اسے دیکھ کر میرے رگ و پے میں جذبات کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اُس نے ایک سفید پگڑی باندھی ہوئی تھی۔ ایک ربڑ کا کوٹ زیب بدن تھا اگرچہ یہ کچھ بڑا تھا۔ لیکن تھا بڑے ٹھاٹھ والا۔ پاؤں میں سیاہ رنگ کا ایک پمپ شو تھا' اتنا چمکدار کہ اُس میں مجھے اپنا چہرہ صاف صاف دکھائی دیتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمڑے کا بیگ تھا۔ وہ اپنے روزمرّہ کے چکر پر نکلا تھا۔ اور مجھے دکھانے آیا تھا کہ وہ اپنے اس نئے ساز و سامان سے کتنا بارعب ہو گیا ہے۔

اُسے دیکھتے ہی بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ "عجیب! عجیب!"

وہ زمیندار کے گھر کی طرف جس کا خیال وہ ہر روز بنایا کرتا تھا۔ تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا چل دیا۔ میں بھی اس کی داد دیتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ اس وقت گلی میں کوئی بھی نہ تھا۔ تنہا میں ہی اس کی شان و شوکت کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ڈاکٹر کے لباس میں ملبوس تھا۔ خود شناسی میں محو گاؤں کی دیواروں کے اوپلوں سے اپنی پوشاک کو بچاتا ہوا اور غلیظ پانی سے ہٹتا ہوا' جو گاؤں کی گلیوں میں اکثر بہتا رہتا ہے۔ چلا جا رہا تھا۔ جیسے ہی کہ ہم زمیندار کے گھر میں داخل ہوئے ہمیں دیوی ملا۔ یہ زمیندار کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر تالیاں بجائیں اور کہا چندو آیا! چندو آیا! کسی مشن اسکول کے پادری صاحب کی طرح خوبصورت اور شاندار کپڑے پہنے ہوئے۔

توندوالے زمیندار بجے چند نے اپنا ہاتھ پوتر جینو پر پھیرتے ہوئے کہا۔ "رام! رام! رام! یہ جینو اس کے کان پر سے لٹک رہا تھا۔ چونکہ وہ ابھی ابھی نہا کر آیا تھا۔ اُسے دیکھتے ہی کہنے لگا۔ "سور کہیں کا! ہمارے گھر میں گنوماتا کے چمڑے کا بیگ لئے اور کسی جانور کے' نہ جانے کس جانور کے گودے کا بنا ہوا کوٹ اور منحوس کالا انگریزی جوتا پہنے چلا آرہا ہے۔ نکل! دُور ہو! شیطان کے بچّے۔ تم ہمارے دھرم کو بھرشٹ کرو گے۔ پتا نے آنکھیں بند کیں۔ تو ایسا ہو گیا کہ دنیا میں کسی کا بھی ڈر نہیں؟"

چندو کہنے لگا۔ "لیکن جاگیردار صاحب! میں نے تو ایک ڈاکٹر کا لباس پہنا ہوا ہے۔"

"سور کہیں کا! نکل یہاں سے! جا اور وہ کپڑے پہن جو ایک نیچ ذات حجام کو زیب دیں۔ اپنے ان نئے نرالے خیالات سے ہاتھ اُٹھا ورنہ ڈنڈوں سے تمہاری تواضع کی جائے گی۔"

چندو نے عرض کی۔ "لیکن لالہ بجے چند جی......"

"چلے جاؤ! چلے جاؤ! نکلے کہیں کے قریب مت آنا ورنہ ہمیں گھر بھر کو گئو کے گوبر سے پوتر کرنا ہوگا۔"

چندو کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ وہاں سے واپس ہولیا۔ کچھ بدحواس بھی ہو رہا تھا۔ میری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھ بھی نہ سکا۔ اس کی توہین ایک ایسے شخص کے سامنے ہو رہی تھی جو اسے ایک برگزیدہ ہستی خیال کرتا تھا۔ پھر وہ بڑھتا ہوا تھانو رام کی دوکان کی طرف چلا گیا۔ یہ صاحب گاؤں کے ساہوکار تھے اور گلی کے موڑ پر پنساری کی دوکان کرتے ہیں۔

زمیندار کا لڑکا دیوی اپنے پتا کے اس سخت سلوک کو برداشت نہ کر سکا اور شور و شغب کرنے لگا۔ میں اس کو خاموش کرانے کے لئے ٹھہر گیا۔ اس کے بعد جب میں گلی کے سرے پر آیا تو دیکھا کہ وہ ساہوکار صاحب چنے تولنے کے لئے ہاتھ میں ترازو لئے ہوئے ہیں اور چندو غریب کو بے نقط سُنا رہے ہیں۔ "سور تمہیں چاہئے تھا کہ پتا کے مرنے کے بعد اپنی ذمہ داریوں کو سمجھتے اور اپنی بوڑھی ماں کی خدمت کرتے' نہ یہ کہ کسی بھانڈ مسخرے کی طرح رنگ رنگ کے سوانگ بھرتے پھرتے۔ ہسپتال کے لوگوں کے سے ناپاک کپڑے پہن کر پھر رہے ہو۔ جاؤ اپنے کپڑے پہن کر آؤ۔ ورنہ میں تم سے خط نہیں بنواؤں گا۔" ساہوکار صاحب جوش میں یہ لعن طعن کرتے تھے اور اپنے ہاتھ سے چوٹی کی مقدس گانٹھ پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے۔

چندو بہت دل برداشتہ ہو گیا۔ غصے میں آکر میرے پاس سے بھاگ کھڑا ہوا۔ گویا کہ اس سارے افسوسناک حادثے کا میں ہی ذمہ دار تھا۔ مجھے بے حد تشویش تھی۔ میں اس سوچ میں تھا کہ چندو مجھ سے نفرت کرنے لگا ہے۔ اس لئے کہ میں بھی اونچی ذات سے تعلق رکھتا ہوں۔

میں نے پیچھے سے بلند آواز میں کہا۔ "پنڈت پرمانند جی کے پاس جاؤ اور کہو جو کپڑے تم نے پہن رکھے ہیں غلیظ نہیں ہیں۔"

پرمانند جی کو زمیندار نے بلا بھیجا تھا کہ فوراً اس ناپاک مسئلے پر بات چیت کر لی جائے میں نے یہی کہا تھا کہ پرمانند جی زمیندار کے گھر سے نکلتے ہی کہنے لگے۔ "اچھا تو تم بھی اس کے ساتھ شامل ہو۔ اسکول کی تعلیم نے آج کل کے لڑکوں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ تم یہ لباس پہن لو تو مناسب بھی ہے۔ چونکہ تم بڑے دو دان پنے والے ہو۔ لیکن اس نیچ ذات کے لڑکے کا اس لباس سے کیا واسطہ تھا۔ وہ ہماری ڈاڑھیوں کو ہاتھ لگاتا ہے۔ سروں کو چھوتا ہے اور ہمارے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں پکڑتا ہے۔ پرماتما نے پہلے ہی سے اسے ناپاک بنایا ہے اور اب وہ اور زیادہ ناپاک کیوں بنتا ہے۔ تم اونچی ذات کے ہونہار ہو اور وہ نیچ ذات میں پیدا ہوا ہے۔"

چندو نے بھی یہ باتیں سن لی تھیں۔ اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا بھی نہیں۔ غصے میں بھاگتا ہوا چلا گیا۔ ایسے کہ اسے کوئی اشد ضروری کام آن پڑا ہو۔

میری ماتا مجھے کہہ رہی تھیں۔ بیٹا! اب تمہارے اسکول جانے کا وقت ہے۔ کھانا کھا لو اور اسکول جاؤ۔ ورنہ تمہیں دیر ہو جائے گی موقع تو مل ہی گیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی مجھے اس حجام لڑکے سے میل ملاپ نہ رکھنے پر لیکچر پلانے لگیں۔

چندو کی شامتِ اعمال نے سارا دن مجھے بے چین رکھا۔ وہ اپنی ماں کے ساتھ ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں رہتا تھا۔ جب میں اسکول سے واپس آیا تو اُسے وہاں سے بلانا چاہا۔ اس کی ماں مشہور زبان دراز عورت تھی۔ چونکہ وہ اونچی ذات کی بہو بیٹیوں سے جا ملتی تھی اور بے تکلفی کے ساتھ کہ وہ شاید آپس میں بھی اس طرح سے نہ ملتی ہوں گی۔ اس سے اُس کو کافی جرات ہو گئی تھی۔ لیکن مجھ پر وہ ہمیشہ سے مہربان تھی۔ اب کچھ طنز آمیز لہجے میں کہنے لگی۔ کیوں نہ ہو پورے ساٹھ سال کی ذلت اور رسوائی کوئی برداشت کرے تو اس کے لب و لہجہ میں طنز آ ہی جاتی ہے۔

"ہاں تو تم آگئے۔ تم یہاں اپنے دوست سے ملنے کے لئے آئے ہو گے۔ اگر تمہاری ماں تمہیں یہاں دیکھ پائیں تو میری آنکھیں پھوڑ دیں کہ میری نگاہیں تمہارے خوبصورت چہرے پر کیوں پڑیں۔ تم ایسے ہی بھولے بھالے ہو جیسے کہ نظر آتے ہو یا کہ تم بھی اپنے بھائی بندوں کی طرح چھپے ہوئے بگلے بھگت ہو۔"

میں نے اس سے دریافت کیا "اماں چندو کہاں ہے؟"

اب اُس نے قدرے مخلصانہ لہجے میں کہا۔ بیٹے! میں نہیں جانتی ہوں کہ وہ کدھر کو نکل گیا ہے۔ شہر ہی کی طرف کہیں گیا ہو گا۔ کہتا تھا سڑک پر کچھ آدمیوں نے حجامت بنوائی تھی اور اُن سے کافی پیسے مل گئے تھے۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ وہ کس خیال میں ہے۔ کچھ ہی ہو۔ اسے اپنے پتا کے گاہکوں کو ناراض نہیں کرنا چاہئے۔ وہ ابھی بچہ ہی ہے۔ اس کے دل میں عجیب و غریب خیال آتے ہیں۔ ان لوگوں کو چندو پر خفا نہیں ہونا چاہئے۔ بچہ ہی تو ہے۔ میرا خیال ہے تم اس کے ساتھ کھیلنے کے لئے آئے ہو۔ اچھا تو جب وہ آئیگا میں اس سے کہہ دوں گی۔ وہ کہیں سڑک ہی کی طرف گیا ہو گا۔

میں نے کہا۔ "بہت اچھا اماں۔" اور گھر کو چلا آیا۔

اسی دن شام کو چندو میرے یہاں آیا اور معمول کے مطابق سیٹی بجائی۔ سیٹی ہی ہمارا ایک اشارہ تھا۔ جس کو ہم سُن سمجھ لیتے تھے اور بڑے بوڑھوں کی لعن طعن سے بچے رہتے تھے چونکہ انہیں ہمارا میل جول ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ چندو نے دیکھتے ہی مجھ سے کہا۔ بازار کی طرف چلے آؤ میں تم سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

میں اُس کے پاس پہنچا ہی تھا کہ اُس نے کہنا شروع کیا۔ "تمہیں خبر ہے آج صبح میں نے کچہری کے قریب لوگوں کے سر مونڈ کر اور خط بنا کر ایک روپیہ کما لیا ہے۔ اگر مجھے پچھلے پہر جلدی ہی لالہ جی کی گاڑی پر واپس نہ آنا ہوتا تو میں اور بھی بہت کچھ کما لیتا۔ اب دیکھو تو میں ان رسم و رواج کے دیوانوں کو کس طرح سبق سکھاتا ہوں۔ میں ستیہ گرہ کرنے والا ہوں۔ میں اب ان کی خدمت گزاری کے لئے ان کے گھروں میں نہیں جاؤں گا۔ لال حکم چند جی کے بیٹے سے جو کبھی کبھی جوئے کا داؤ بھی لگاتا ہے۔ جاپانی بائیسکل پانچ روپے کو خرید کر چلانا سیکھ لوں گا اور اس پر سوار ہو کر شہر جایا کروں گا۔ میں جب اپنی سفید پگڑی باندھ کر اور دُوسرے کپڑے پہن کر بائیسکل پر سوار ہوں گا ________ اور خاص طور سے جب کہ اس دوپہیہ گاڑی کے سامنے بیگ لٹکانے کی ایک کھونٹی بھی ہے ________ تو کہو دوست! بارعب معلوم ہوں گا کہ نہیں؟"

مجھے اس کی رائے سے اتفاق تھا۔ میں نے کہا۔ "ہاں!" میرے جسم میں جذبات کی پھریری سی آ گئی۔ اس لئے نہیں کہ سائیکل سوار چندو کی عظمت و شوکت کو خیال میں لا رہا تھا، بلکہ اس لئے کہ اب میری خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ مجھے خیال تھا کہ اگر چندو نے بائیسکل خرید لیا تو مجھے بھی کبھی کبھار چڑھنے کے لئے دیدیا کریگا اور اگر یوں نہ ہوا تو سائیکل کی پچھلی کھونٹی پر یا اُس کے ساتھ آگے بیٹھ کر شہر تو چلا ہی جایا کروں گا۔"

چندو نے بائیسکل کا معاملہ کچھ اس خوبی سے طے کیا کہ مجھے اس قسم کا گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ روپیہ پیسہ وہ بے دریغ خرچ کر دیا کرتا تھا لیکن اس معاملہ کو دیکھ کر مجھے یہ خیال ہوا کہ یہ واقعہ چندو کی تجارتی قابلیت کا اتنا بڑا اظہار ہے جس کا مجھے گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ اس نے رازداری کے طریقے سے مجھ سے کہا۔ "تم دو ایک روز اور انتظار کرو میں تمہیں کچھ بتاؤں گا۔ تم اتنا ہنسو گے کہ کبھی عمر بھر میں اتنا نہیں ہنسے۔"

"مجھے ابھی بتا دو۔" میں نے بے صبری سے اُسے کہا۔ اس وقت میرے جسم کا ذرہ ذرہ اس کے کارنمایاں کے جوہر کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

اُس نے کہا۔ "نہیں! ابھی انتظار کرو۔ میں سردست تمہیں صرف اشارۃً ہی بتا سکتا ہوں ________ یہ ایک راز ہے جو صرف ایک حجام ہی جان سکتا ہے۔ اب مجھے یہ مشین سیکھنے دو۔ تم اُسے پکڑلو۔ میں اس پر بیٹھتا ہوں۔ خیال ہے کہ اسے چلا ہی لوں گا۔"

میں نے کہا۔ "لیکن سائیکل سیکھنے کا تو یہ طریقہ نہیں۔ میرے پتاجی نے پچھلے پہیے کی کھونٹی سے چڑھنا سیکھا تھا اور بھائی نے پہلے کوشش کی تھی کہ پیڈل پر کھڑا ہو کر اپنے بوجھ کا توازن قائم رکھے۔"

"تمہارے پتاجی تو ایک بھاری ستون ہیں اور تمہارا بھائی لمبی ٹانگوں والا کیکڑا ہے۔"

میں نے کہا۔ "بہتر" اور اس کے سوار ہونے کے لئے بائیسکل تھام لیا۔ میری نگاہیں ابھی بائیسکل کے پالش کی چمک دمک کی داد دے رہی تھیں کہ ہینڈل میرے ہاتھوں سے نکل گیا اور چندو سائیکل سمیت دھپ سے دوسری طرف جا گرا۔ ساہوکار کی دکان سے 'جہاں کئی کسان و زمیندار کے ارد گرد اکٹھے ہوئے تھے' ایک ساتھ فضا میں قہقہے بلند ہوئے۔ ساہوکار نے بھی چیخ کر کہا۔ کل یُگ کے شیطان! خوب سزا پائی۔ چھچھورے کہیں کے ہڈی پسلی توڑ دو اور مرو۔ یوں تو تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں آئیں گے۔"

چندو کا سر ندامت سے جھک گیا اور لگا مجھے سخت سست کہنے۔ میرا تو خیال تھا کہ اُسے یہ پریشانی میری وجہ سے ہوئی ہے۔ اس لئے وہ مجھے گردن سے پکڑ کر نیچے گرا لیگا لیکن اُس نے صرف اسی قدر کہا "احمق! تم بڑے ہی نکمے ہو۔" پھر وہ میری طرف دیکھ کر کھسیانی ہنسی ہنسا اور کہا۔ "دیکھ لیں گے اور دنیا کس پر ہنستی ہے۔ مجھ پر یا ان پر۔"

میں نے مستعدی سے کہا۔ "اب کے میں مضبوطی سے پکڑوں گا۔" پھر میں نے گرے ہوئے سائیکل کو اُٹھا لیا۔

زمیندار نے کہا۔ "ہاں ہاں توڑ دو ہڈی پسلی۔ سؤر کہیں کے۔"

چندو نے مجھ سے کہا۔ "پروانہ کرو۔ میں اُنھیں بتادوں گا۔" میں نے پورے زور سے سائکل کو پکڑ لیا اور وہ ہمت کرکے گدی پر بیٹھ گیا اور مجھ سے کہا۔ "چھوڑ دو۔"

میں نے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ اُس نے دائیں پاؤں کے زور سے پیڈل کو دبایا۔ پہیئے گھومے ہی تھے کہ چندو کا بوجھ ایک طرف کو جا پڑا۔ گرنے ہی والا تھا کہ اس کا پاؤں دوسرے پیڈل پر آگیا۔ توازن کچھ قائم ہو گیا۔ لیکن جھکاؤ اب کچھ دائیں طرف کو تھا۔ چندو کچھ اس طور سے گدی پر سے ہلا کہ خوف وہراس سے دل کانپ اُٹھا۔ لمحے بھر کے لئے وہ ایک طرف کو خطرناک طور سے تنگ بھی گیا۔ اس کا ہینڈل ڈگمگا گیا اور وہ لڑکھڑانے لگا اس موقع پر ہنسی اور طنز کی ملی جلی آوازیں دکان سے آتی ہوئی سنائی دیں۔ میرا خیال تھا کہ اگر وہ اب کے اپنے اناڑی پن کی وجہ سے ذلیل نہ بھی ہوا تو یہ شور وغل اسے لے ڈوبے گا۔ لیکن کچھ معجزہ ہی ہوا۔ چندو کے پاؤں ٹھیک ٹھیک پیڈلوں پر چلنے لگے۔ ہینڈل کو بھی اُس نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور اس کو بھی کوئی جنبش نہ ہوئی اور آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ میرا گلا "شاباش شاباش" کی پرجوش آواز سے پھٹا جاتا تھا۔

ایک میل تک وہ اسی طرح چلا گیا اور واپسی پر بھی اُس نے ایسا ہی کیا۔

یہ چندو کا ایک نیا کمال تھا۔ اُسے بے حد خوشی حاصل ہوئی۔ میں بھی اس کی خوشی میں شریک ہونے کا مشتاق تھا۔ لیکن میں دوسرے دن اس سے نہ مل سکا۔ کیونکہ مجھے سیدھے اسکول سے ہی اپنی چچی سے ملنے کے لئے دیر کے بعد جانا پڑا تھا۔

تیسرے دن وہ میرے ہاں آیا اور اُس نے کہا۔ "کل جس مذاق کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔ ابھی ابھی تم پر ظاہر ہو جائے گا۔ میں فوراً اسکے پیچھے پیچھے ہولیا۔ اس سے پوچھتا جاتا تھا۔ "بتاؤ وہ ہے کیا؟"

وہ خود گاؤں کے کمہار کے تنور میں چھپ گیا اور کہنے لگا دیکھو! ساہوکار کی دکان میں جمگھٹا لگا ہوا ہے۔ اسے تم دیکھتے ہو! پہچانو تو کون کون ہے؟

میں نے مختلف مورتوں کو پہچاننے کی کوشش کی۔ لمحے بھر کے لئے دماغ کو چکر سا آگیا۔ میں نے کہا۔ "مجھے تو صرف کسان نظر آتے ہیں جو زمیندار کا انتظار کر رہے ہیں۔"

اُس نے کہا پھر دیکھو! تم تو احمق ہو۔ زمیندار وہیں ہے۔ وہ دیکھو لمبے لمبے جبڑوں والا۔ اُس کے منہ پر سفید سفید جھاگ لگا ہوا ہے۔ یہ جھاگ نہیں سفید بال ہیں جو حجامت نہ ہونے کی وجہ سے بڑھ آئے ہیں۔ زمیندار اپنی گھنی مونچھوں پر مہندی لگایا کرتا تھا۔ میں جوں جوں رنگدار مونچھوں اور گردن کے سفید جھاڑی دار بالوں کو دیکھتا تھا۔ حیرانی سی ہوتی تھی۔ دفعتہ میرے منہ سے نکل گیا۔ "اہاہا! بیار شیر کتنا زیادہ بیار نظر آتا ہے۔"

چندو نے تنبیہہ کے طور سے کہا۔ "چپ رہو۔ شور نہ کرو۔ ساہوکار کو تو دیکھو۔ کوڑھی نظر آتا ہے۔ اس کی مونچھیں دیکھو۔ تمباکو کے دھوئیں سے زرد ہو رہی ہیں۔ اُنھیں کبھی میں تراشا کرتا تھا۔ اب تم دوکان کے پاس جاؤ اور وہاں پہنچ کر کہو۔ "اود بلاؤ۔ اود بلاؤ۔ وہ تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

میں شریر چندو کا ایک پرجوش چیلا تھا۔ ذرا بھی تو دیر نہ کی۔ میں نے دکان کے پاس پہنچ کر اود بلاؤ! اود بلاؤ کہا۔ کسان جو زمیندار کے ارد گرد کھڑے تھے۔ ان کے دل گداگدار ہے تھے۔ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ لیکن پاس ادب کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکے۔

ساہوکار نے چلا کر کہا۔ پکڑلو اس چھوٹے شیطان کو۔ یہ اُس حجام لڑکے چندو کا ساتھی ہے۔

لیکن میں اتنے میں بڑ کے درخت پر چڑھ چکا تھا اور وہاں سے مندر کی دیوار پر کود گیا تھا۔ وہاں میں نے پجاری پر بھی فقرے کسے۔

اس حجام لڑکے کی ستم گری کی افواہ سارے گاؤں میں پھیل گئی اور گھر گھر بڑے بوڑھوں کی بڑھی ہوئی داڑھیوں کا مذاق اڑنے لگا۔ اونچی ذات کے لوگ یہاں تک کہ خود ان بزرگوں کے گھر کے افراد بھی اس اجنبیت پر ہنس ہنس پڑتے تھے اور ان کی شکل وصورت پر

عجیب و غریب خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ جب تک داڑھی مونچھ کٹتی رہی زمیندار کی جوان بیوی خاموش رہی۔ لیکن اب تو اسے کراہت سی ہو گئی تھی۔ اس کراہت کے دُور ہونے کی کوئی صورت نہ تھی۔ چنانچہ اب اُس نے کسی جوانمرد کے ساتھ ہم سفر ہونے کی دھمکی بھی دے دی تھی۔ کیوں نہ ہو آخر وہ اپنے میاں سے بیس برس چھوٹی بھی تو تھی۔

چندو ان دنوں بدستور شہر جاتا رہا اور وہاں خوب خوب ہاتھ رنگے۔ ان دنوں چندو کا کام کاج شہر میں خوب چلا اور اُس نے کافی رقم بچالی۔ اپنے لئے نئے کپڑے اور نئے اوزار بھی خرید لئے اور مجھے بھی کئی تحفے لا کر دیئے۔

گاؤں والے یہ دھمکی دیتے تھے کہ اُسے بد عنوانیوں کی وجہ سے جیل بھجوا دیں گے اُس کی ماں کو بھی حکم ملا تھا کہ وہ اُسے ٹھیک راستے پر چلائے ورنہ نقضِ امن کی پاداش میں اُسے پولیس کے حوالے کرنا پڑے گا۔

لیکن چندو کی ماں نے اپنی عمر میں پہلی مرتبہ خوش حالی کا منہ دیکھا تھا۔ وہ اُن کے متعلق جو کچھ خیال رکھتی تھی۔ صاف صاف اُن کے منہ پر کہدیا اور اتنا صاف کہ اُس سے پہلے کبھی نہیں کہا تھا۔ گاؤں والوں نے سوچا کہ یوں کام نہ چلے گا۔ دیر کا کے حجام کو بلا لو۔

چندو کو وہ عام طور سے حجامت کے دو پیسے دیا کرتے تھے۔ دیر کا کے حجام کو دو پیسے کے بجائے ایک آنہ پیش کرنا منظور کیا۔

چندو کے ذہن میں نئے نئے تصورات تھے۔ اتنے نئے کہ پہلے اُسے کبھی سجھائی نہ دیتے تھے۔ شہر کے حجام نرنجن داس کی دکان کو دیکھ کر اُسے بھی تجویز سوجھی کہ شروع بازار میں عین شاہراہ پر اپنے چچیرے بھائی ڈھونڈو اور حجاموں کو ساتھ ملا کر دکان کھول لے۔

اس کا چچیرا بھائی وہی "دیر کے" کا حجام تھا اور یہ لوگ گاؤں کے ارد گرد کام کیا کرتے تھے۔ ان کے کام کاج کا دائرہ سات میل تک تھا۔ اُس نے اپنی تجویز اپنے چچیرے بھائی ڈھونڈو اور دوسرے حجاموں کو ذات برادری کا عام جلسہ کر کے بتائی دل اور دماغ کی خوبیوں کے ساتھ قدرت نے اُسے فصاحت کا مادہ بھی ودیعت کیا تھا۔ اس نے اپنی لسّانی سے حاضرین کو یقین دلایا کہ اب وقت آگیا ہے کہ یہ امیر و کبیر حجامت بنوانے کے لئے ہمارے ہاں خود چل کر آئیں۔ نہ یہ کہ ہم اپنا ساز و سامان لئے لئے ان کے گھروں کا طواف کریں۔

"چندو برادرس ہیئر کٹنگ اینڈ شیونگ سیلون" نے حقیقت میں دنیا کے لئے ایک راستہ تیار کر دیا اور آج تک ہمارے ملک کے مزدوروں کی بی سرگرم انجمنیں اسی سیلون کا اتباع کرتی ہیں۔

نئی مصیبتیں[1]

رشید جہاں

"لو مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ یہ اون کیا بھاؤ ملا تھا؟" اماں نے بھابی صغرا سے پوچھا۔ جو میری چچازاد بھاوج تھیں اور دو سال ہوئے بیوہ ہو گئیں تھیں۔

"شاید بارہ روپئے پاؤنڈ تھا۔ کیوں نہ اماں جان؟" وہ ساس کے لئے اون کھول کر گولے بنا رہی تھیں۔

"اُف اون اس سال کتنے مہنگے ہو گئے ہیں۔" صغرا کی جٹھانی عطیہ بولیں "بچوں کے سب جمپر اُونچے ہو گئے۔ اب مسز رابرٹ کو اون لاکر دیا ہے کہ ان کے سوئٹر بنا دے۔ بڑی مشکل ہے۔"

"آپ کو کیا مشکل' بنے گی تو بے چاری نرس ___" مجھ میں اور بھابی عطیہ میں بالکل نند بھاوجوں کے تعلقات تھے۔ ایک دوسرے کی کمزوریوں اور برائیوں کو خوب سمجھتے تھے اور موقع پر بغیر چوٹ کئے نہ رہتے تھے۔ بھابی عطیہ کی زندگی میں علاوہ تین بچے پیدا کرنے کے ایک کام اور بھی تھا کہ وہ سال میں دو تین جمپر یا بُن لیں اور پھر اس کا چرچا کریں۔

"کیوں کیا میں نہیں بنتی؟" بھابی عطیہ نے چیخ کر کہا۔ میں جواب دینے کو تھی ہی کہ اماں نے میری طرف گھورا اور زور زور سے باتیں کرنے لگیں تاکہ مجھ کو جواب کا موقع ہی نہ ملے اور بقول صغرا کے میری اور بھابی عطیہ کی شائستہ لڑائی نہ ہو۔ اماں کو صغرا نے بھی مدد دی اور کہنے لگیں۔ "سچ تو ہے اون بہت مہنگا ہو گیا ہے اور اس سے پہلے کہ اور مہنگا ہو میں بھی اپنے لئے ایک جمپر کا لے آؤں گی۔"

میری چچی اماں یعنی صغرا کی ساس آتش دان کے سامنے اپنی سفید بلّی کو گود میں لئے بیٹھی تھیں۔ ادھر بلّی اونگھ رہی تھی۔ ادھر چچی اماں' لیکن نہ معلوم کس طرح صغرا کی بات سن کر اسی طرح آنکھیں بند کئے کئے بولیں۔ "لاؤ گی کہاں سے؟ آج کل لڑائی کے زمانہ میں اون رہا ہی کہاں ہے جو لے آؤ گی۔"

"ابھی ابھی صبح ہی تو آپ دکان سے لے کر آئی ہیں اور اب کیا دن بھر میں ساری دکانیں خالی ہو گئیں۔" چچا جان بیوی کی بات کو بغیر ٹوکے نہ جانے دیتے تھے۔

چچی اماں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں۔

۱۔ رشید جہاں کا اس سے پہلا افسانہ (دلّی کی سیر) ایک رجحان کی ترجمانی کرتا ہے۔ ان کا فن آپ کو اس افسانے میں ملے گا۔ (مرتب)

"میں نے کب کہا تھا کہ دکانیں خالی ہو گئیں۔"

"تو پھر آپ ایسی باتیں کیوں کرتی ہیں؟" چچا جان نے کافی بگڑ کر کہا یہ کوئی نیا قصہ نہ تھا۔

جب صغرا سہاگن تھیں تب بھی ساس کی فکر تھیں اور اب تو اور بھی زیادہ۔ ان کے اُوپر روپے کا خرچ ہونا چچی اماں کو ہمیشہ سے ناگوار گذرتا تھا اور صغرا چچا جان کی آنکھوں کا تارا تھیں۔ بیٹے کی موت کے بعد تو وہ ان کو بالکل ہاتھوں پر رکھے تھے۔

"تو کیا میں جھوٹ کہتی ہوں۔ اون کیا اب کوئی خریدنے کی چیز رہ گئی ہے!"

"تو پھر آپ نے کیوں خریدا؟......... صغرا کل چلنا میرے ساتھ اور جو پسند آئے لے آنا ... ."

"اے ہے ابا رہنے بھی دیجئے۔ میں نے تو یوں ہی کہہ دیا تھا۔ اماں جان ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔ لڑائی کا زمانہ ہے۔ ہر چیز مہنگی ہو گئی ہے۔" چچا جان بڑبڑاتے ہوئے کھانے کے لئے تیار ہونے چلے گئے۔ بس اتنا سمجھ میں آیا۔ "خیر تم مت لینا۔ مجھ کو تو اون چاہئے......... میں ضرور خریدوں گا......."

"میری تو ہر بات کو اب یہ الٹ دیتے ہیں........... "لو میں نے کیا غلط کہا تھا کہ اون اب ناپید ہو گیا ہے۔" چچی اماں نے شکایت بھرے لہجہ میں کہا کہ سننے والے کو ترس آجائے۔ آج ہی صبح میں بھابی عطیہ 'ماں جان' چچی اماں سب مل کر سو روپے سے زیادہ کا اُون لے کر آئے تھے۔

"اُون ہی پر کیا ہے۔ ہر چیز اسی طرح اُجڑ گئی ہے۔" میری اماں نے بات کو رفع دفع کرنے کو کہا۔

"جی ہاں، چچی جان ٹھیک ہے اب جارجٹ کے دام ہی دیکھ لیجئے۔ پچھلے سال میں نے ساڑھے تین روپے گز بہت اچھی جارجٹ لی تھی۔ وہ اب پانچ روپے گز بھی نصیب نہیں۔ اب اس دفعہ میں نے اتنے تھوڑے کپڑے سوری میں بنائے' اب پہننے تک کو بھی نہیں ہیں۔"

"کم از کم آٹھ ساڑیاں تھیں۔ ذرا تم اپنی الماری تو ملاحظہ فرماؤ۔"

"نوکروں کی وردیاں ہر سال سو سوا سو میں بن جاتی تھیں۔ ان کو تو عادت ہے اندھا دھند اٹھانے کی۔ نوکروں کا ستیاناس کر دیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس سال رہنے دو۔ ابھی تو اچھی خاصی ہیں تو بگڑ گئے۔ کہ میں نوکروں کو گندا نہیں رکھ سکتا۔ کبھی جو کوئی بات سُن لیں۔" چچی اماں نے پھر شکایت کی۔

"اے ہے یہ تو ان سب بھائیوں میں عیب ہے کہ صفائی کے نام پر ہزاروں روپیہ خرچ کر دیتے ہیں۔" اماں نے کہا۔

"ہاں بھلا بی بی آج کل یہ خرچ کہاں چل سکتے ہیں۔ اب گھر میں ایک آدمی ایسا تو ہو سب کیوں ایسے ہو جائیں۔" یہ چوٹ بچاری صغرا پر ساس نے کی...... ہماری چچی بس اپنے اوپر روپیہ خرچ کرنا فضول خرچی نہ سمجھتی تھیں۔ ساٹھ برس کی عمر ہونے پر بھی بہت شوقین تھیں اور باوجود بے شمار ساڑھیاں ہونے کے صبح ہی دو نئی ساڑھیاں خریدی تھیں۔ مجھ سے چھیڑے بغیر نہ رہا گیا میں نے کہا۔

"چچی اماں آپ جو نئی ساڑھیاں لائی ہیں وہ کتنے کی ہیں؟"

چچی اماں جن کو ابھی تک چچا جان پر غصہ آرہا تھا۔ کچھ نہ سمجھیں اور بہت سنجیدگی سے کہنے لگیں۔ "کیا بتاؤں بیٹی کریپ ڈیشن کی قیمت نو روپے گز زیادہ ہو گئی۔ ۲۷ روپے میں ساڑھی ملی۔ لو بھلا اب کوئی کیا کپڑا پہن سکتا ہے اور دوسری تو خیر سودیشی سلک تھا۔ ۱۷ روپے میں سستی ہی مل گئی۔ میں کہتی ہوں کہ آج کل تو وہ برا زمانہ آگیا ہے کہ نہ کھانے کا ٹھیک رہا ہے اور نہ پہننے کا۔ بڑی مصیبت کے دن ہیں......... اور ابھی تو دیکھو کیا کیا ہونے والا ہے.........."

"آپ سچ کہتی ہیں اماں جان" بھابی عطیہ نے ٹھنڈا سانس لے کر دل دُکھا دینے والی آواز میں کہا۔ "یہ موئی لڑائی نہ معلوم کیسی ہے۔

کہ کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتی۔ میرا تو سارا آرام وچین اس کمبخت کی نذر ہو گیا ہے......."

صغرا میری طرف دیکھ کر مسکرائیں اور پھر منہ دوسری طرف کر لیا۔

"کسی چیز کا ٹھیک ہو......." پٹرول کے دام ہیں کہ باوا کے مول اور پھر بھی ناپید' وہ تو کہو کہ تمہارے بھائی جان کے پاس ٹوٹی ہوئی پرانی شکاری' موٹر پڑی تھی۔ اس چھکڑے کو پچاس روپے دے کر رجسٹر کروایا تو جا کر، موٹروں کا تیل چوبیس گیلن نصیب ہوا۔ سچ مچ اس لڑائی میں تو پچھلی سے بھی زیادہ تکلیف اور مصیبت ہے۔" چچی اماں قریب قریب رو دیں۔

ہم نے تو اپنی موٹر بند ہی کر دی ہے۔ مجھ تو روز صبح سویرے سیر کرنے کی عادت برسوں سے ہے۔ میری صحت تو جب سے پٹرول کی قلت ہوئی ہے ناس ہی ہو گئی۔" میری اماں نے صاد کی۔

"ہاں یہی تو میں بھی کہتی ہوں کہ یہ پٹرول پر پابندی سرکار نے کیوں لگا دی۔ اب دام دو روپے چار آنہ گیلن تھے چلو تین روپے کر دیتی۔ لیکن یہ بارہ اور چودہ گیلن کی قید نہ لگتی جس کے پاس دام ہوتے وہ خریدتا۔ جس کے پاس نہ ہوتے وہ نہ خریدتا" بھابی عطیہ نے اس طرح جل کر کہا۔ جیسے گورنمنٹ کو خاص ان سے دشمنی ہے۔

"پٹرول پر ہی کیا ہے اس لڑائی کی وجہ سے تو ہر چیز پر آفت آئی ہوئی ہے لو بھلا سیب پونے دو روپے سیر ہیں۔ کیا سیب بھی یہ نگوڑے سپاہی لے جاتے ہیں؟" میری اماں نے بہت ہی جلی بھنی آواز میں پوچھا۔

"اور انڈے؟" چچی اماں نے کہا۔ "بارہ آنہ درجن تو ہو گئے اور مرغی وہ بھی اب دو روپے تک ہو گئی۔ کوئی کھائے تو کیا کھائے اور تو اور آج تمہارے سامنے ساری دکانیں دیکھ لیں۔ پرونس (Prunes) کہیں ملے ہی نہیں' بلا سے' پچھلے مہینے میں بیس روپیہ میں سات سیر کا ٹین مل گیا تھا۔ اب وہ بھی نہیں....... فروٹ سلیڈ بغیر پرونس کے بچے تو چکھتے بھی نہیں......"

"اے لو تو میں کیا کروں دولھن کوکنگ چیز (Cooking Chees) تو ایسا غائب ہوا ہے کہ اب دکھائی ہی نہیں دیتا۔ میں اسلم کی دکان پر گئی اور کہا کہ بھئی سونے کے مول ہی دے دو۔ ہمارے بچے کا دل بہت چاہ رہا ہے لیکن وہ کہیں ہو تو ملے۔"

"ایک تکلیف ہو تو ذکر کیا جائے۔" اماں نے ہاں میں ہاں ملا دی۔

"اے ہے یہ ساری آگ ایک دم کہاں غائب ہو گئی۔" بھابی عطیہ نے سُو سُو کر کے ایک دم سے کہا۔

"اے سچ تو ہے۔ اس کم بخت واجد نے نہ تو لکڑی پوری ڈالی' اور نہ ہیٹر اب تک لگایا۔ ارجمند ذرا اس گھنٹی کا بٹن دبانا.......... چار چار تو ہیٹر ہیں اور پھر بھی بیٹھے سردی میں سکڑا کرو۔ بوا آج کل تو کوئلہ بھی دو آنے سے دو روپے ہو گیا۔ بجلی ہی سستی رہتی ہے۔ اے لو وہ تو کوئی جواب ہی نہیں دیتا۔"

پھر صغرا سے کہا۔ "ذرا صغرا تم جانا دیکھو تو یہ سب لوگ کہاں غائب ہو گئے تمہاری جٹھانی کو سردی لگ رہی ہے۔"......... صغرا اُون کو چھوڑ کر جلدی سے اُٹھیں اور ساتھ ہی میں بھی۔ "بھابی ٹھیرو۔ میں بھی آتی ہوں" کہہ کر پیچھے بھاگی۔

"دیکھو گرم کپڑے میں....... جانا۔ ٹھنڈ میں نہ جانا۔" اماں کی آواز میرے کان میں آتی ہی رہی کہ میں اور بھابی برآمدہ سے ہو کر باہر آ گئے۔ باہر ہوا اتنی تیز اور ٹھنڈی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ جسم کے آرپار ہو رہی ہے۔ بھابی نے باہر نکل کر واجد! واجد! کہہ کر آواز دی اور کوئی جواب نہ پا کر بولیں "بیچارا سردی کے مارے پلنگ میں گھس گیا ہو گا۔ جانتا ہے کہ کھانے میں ابھی آدھ گھنٹہ ہے۔" وہ شاگرد پیشہ کی طرف بڑھیں۔ تھوڑی دُور چل کر نیم کے درخت کے نیچے ایک الاؤ نظر آیا اور ہم شاگرد پیشہ میں جب داخل ہوئے تو وہاں پنچایت جڑی ہوئی تھی۔ مالن مع اپنے تین چار بچوں کے بیٹھی تھی۔ دھوبن بھی مع اپنی فوج کے جمی ہوئی تھی۔ واجد اور دُوسرے خدمت گار

یاں موجود تھے۔ مہتر بھی ایک کونہ میں بیٹھا چلم پی رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی دھوبن چیخی۔ "اے چھوٹی دولھن ذرا ادھر آنا۔"
چھوٹی دولھن ذرا جھک کر آگ تاپنے لگی۔ سب مزدور نوکر کھڑے ہوگئے۔

"کیوں کیا ہے؟" صغرا نے پوچھا۔

"اے دولھن! یہ لڑائی اب تک چلے گی؟"

"بہت دن...... کیوں؟"

"ہے رام!......... سچی؟"

"ہاں ہاں سچ ہے۔ ابھی بہت دن چلے گی۔" صغرا نے لاپروائی سے کہا۔

"ہم لوگ کیسے جئیں گے؟"

"پرسوں تک تو آٹا چھ سیر کا تھا آج تین سیر کا ہے۔"

"تین سیر کا تو گیہوں ہے۔" ایک مزدور نوکر نے اطلاع دی۔

"اے بیٹا سچ بتاؤ۔ یہ بپتا کب کھتم ہوگی؟ ہمرا اور ہمرے بچن کا پیٹ کیسے بھرے گا۔" مالن میری طرف مخاطب ہوئی۔

"چنا بھی تو آٹھ سیر کا ہے!"

"دولھن تم تو ہر بات میں مجاخ کرتی ہو سچی بتاؤ کھبار میں کیا لکھا ہے؟" دھوبن نے بھابی کی طرف بہت سنجیدگی سے دیکھا۔

"ارے بھئی کہہ تو رہی ہوں۔ میرا یقین نہیں تو ان سے پوچھ لو۔" سب نے اُمید بھری نظر میری طرف پھیری۔ جب میں چپ رہی تو دھوبن بولی۔

"دولھن تمھن بوا کہت رہیں کہ نوکروں کی چھٹنی ہوگی؟ کا یہ ٹھیک ہے؟"

"مجھے کیا معلوم۔"

واجد ہیٹر لگانے چلا گیا میں اور بھابی وہیں الاؤ پر کھڑے باتیں کرتے رہے۔ جب کھانے کی گھنٹی بجی تو ہم گھر کی طرف چلے۔
راستے میں بھابی نے دیکھا کہ میں کچھ گرم کپڑا نہیں پہنے تھی ——— بولیں "اُوئی ارجمند تم بھی خدا کی قسم ایک چلتی پھرتی آفت ہو۔ بیمار پڑ گئیں تو ایک اور نئی مصیبت آجائے گی......"

میں ابھی تک نوکروں کے پریشان چہروں میں کھوئی ہوئی تھی۔ بغیر سوچے سمجھے "اور" پر زور دے کر بولی۔ "یہ اور کی آپ نے خوب کہی۔"

بھابی ہنسیں۔ "اور نہیں تو کیا۔ بھابی عطیہ کی جارجٹ مہنگی ہوگئی۔ یہ کم مصیبت ہے۔ تمہاری اماں کی ہواخوری کم ہوگئی یہ کچھ کم مصیبت ہے اور ہماری ساس بےچاری کی مصیبتوں کا شمار ہی نہیں۔ نہ کوکنگ چیز ہی ملتا ہے اور نہ پرونس.......اور اگر اس پر تمہیں نمونیا ہوگیا؟"

حرام جادی

محمد حسن عسکری

دروازہ کی دھڑ دھڑ اور کواڑ کھولو کی مسلسل اور مدھم چیخیں اس کے دماغ میں اس طرح گونجیں جیسے گہرے تاریک کنوئیں میں ڈول کے گرنے کی طویل، کراہتی ہوئی آواز۔ اس کی پر خواب اور نیم رضا مند آنکھیں آہستہ آہستہ کھلیں لیکن دوسرے لمحہ ہی منہ اندھیرے کے ہلکے ہلکے اُجالے میں ملی ہوئی سرمہ جیسی سیاہی اس کے پپوٹوں میں بھرنے لگی اور وہ پھر بند ہو گئیں۔ آنکھوں کے پردے بوجھل کمبلوں کی طرح نیچے لٹک گئے اور ڈیلوں کو دبا دبا کر سلانے لگے۔ لیکن کان آنکھوں کی ہم آہنگی چھوڑ کر بھنبھنا رہے تھے۔ وہ اس سحر خیز حملہ آور کی تازہ یورش کے خلاف اپنے روزن بند کر لینا چاہتے تھے ــــــــــ اور پھر بھی وہ بھنبھنا رہے تھے۔

امید و بیم کی یہ کشمکش جسے نیند شاید جلد ہی اپنے دھارے میں غرق کر لیتی، زیادہ دیر جاری نہ رہی۔ اب کے تو دروازہ کی چولیں تک ہلی جا رہی تھیں اور آوازیں زیادہ بے صبر، بے تاب، کرخت اور بھرائے ہوئے گلے سے نکل رہی تھیں۔ "کھولو ــــ کھولو۔" یہ آوازیں پتلی نوک دار تیلیوں کی طرح دماغ میں گھس کر نیند کے پردوں کو تار تار کئے دے رہی تھیں۔ وہ یہ بھی سن رہی تھی کہ پکارنے والا کھولو۔ کھولو کے وقفہ کے درمیان آہستہ سے ناخوشگوار ارادوں کا اظہار بھی کر دیتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ کوئی شخص اسے سڑک کے ڈھیلوں کو استعمال کرنے کی ترغیب دے رہا تھا..... آخر اس نے آنکھیں کھولیں پوری کھول ہی دیں اور ہاتھوں کو چارپائی پر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "نصیبن دیکھو تو کون ہے؟"

یہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہ تھی جب سے وہ اس قصبہ میں مڈوائف ہو کر آئی تھی یہ سب کچھ روز ہوتا تھا ــــــ یہی چیخیں، یہی دھڑ دھڑاہٹ فرض اور آرام کی یہی تلخ کشمکش یہی جھلاہٹ اور پسپائی ــــــ سب اسی طرح، اسے صبح ہی اٹھ کر جانا پڑتا تھا اور پھر اس کا سارا دن نو واردوں کو احتجاجانہ چیختے چلاتے، ہاتھ پاؤں پھینکتے دنیا میں آتے ہوئے دیکھنے میں، کچھ دن آئے ہوؤں کی رفتارِ ترقی کے معائنہ میں اور آمد و رفت کے اندراج کے لئے ٹاؤن ایریا کے دفتر تک بار بار دوڑنے میں گذرتا تھا۔ اسے دوپہر کو کھانا کھانے اور آرام کرنے کا وقت بھی ہزار کھینچ تان کے بعد ملتا تھا، اور وہ بھی یقینی نہ تھا کیونکہ بچے پیدا ہونے میں موقع و محل کا مطلق لحاظ نہیں کرتے۔ صبح چار بجے، دوپہر کے بارہ بجے، رات دو بجے ــــــ ہر گھنٹہ ہر گھڑی اسے کوہ ندا کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے تیار رہنا پڑتا تھا اور بچے تھے کہ ایسی تیزی سے چلے آ رہے تھے جیسے پہاڑی ندی میں لڑھکتے ہوئے پتھر، ضبطِ تولید کے چرچے دولت نگر کو شہر سے ملانے والی کچی اور گڑھوں والی سڑک کو طے نہ کر سکے تھے اور اگر بفرضِ محال وہ رینگتے ہوئے وہاں تک پہنچ بھی جاتے تو یہ یقینی بات تھی کہ قصبے والے انہیں ذرا بھی قابلِ اعتنا نہ سمجھتے۔ کیونکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بچے خدا کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس میں انسان کا کیا دخل۔ ۱۸ سالہ لڑکے، ۵٦

سیاہ بڑھے 'الھڑ لڑکیاں' ادھیڑ عورتیں' سب کے سب حیرت انگیز تن دہی اور یک جہتی کے ساتھ سڑکوں کی نالیوں میں کھیلنے والے بچوں کی تعداد میں اضافہ کئے چلے جا رہے تھے۔ گویا وہ قومی دفاع کی خاطر کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور ہیں اور پھر وہ بیچارے کرتے بھی کیا۔ وہ تو خدا کے حکم سے بے بس تھے۔ غرضیکہ بچے چلے آ رہے تھے۔ کالے بچے' پیلے بچے' پر نچے مرغ کی طرح سرخ بچے اور کبھی کبھی گورے بچے' دبلے پتلے' ہڈیوں کا ڈھانچہ یا بعض موٹے تازے بچے' مڑے ہوئے بالوں والے چپٹی ناک والے' چھچھوندر کی طرح کلبلے' لکڑی جیسے سخت' ہر رنگ اور ہر قسم کے بچے۔

ایملی نے اپنی دادی سے سنا تھا کہ ان کے بچپن میں ایک مرتبہ پاؤ پاؤ بھر کے مینڈک برسے تھے۔ وہ کبھی کبھی سوچا کرتی تھی ———— اور اس وقت اسے بے ساختہ ہنسی بھی آ جاتی تھی ———— کہ یہ بچے وہی برسنے والے مینڈک ہیں۔ پاؤ پاؤ بھر کے زرد زرد مینڈک۔

اور اسے انہی زرد مینڈکوں کی بارش کے ہر قطرہ کو برستے ہوئے دیکھنے کے لئے قصبے کی ٹوٹی پھوٹی روڑوں کی سڑکوں' تنگ و تاریک' سیلی ہوئی گلیوں' گرد و غبار' کوڑے کرکٹ کے ڈھیروں' بھونکتے ہوئے لال پیلے کتوں اور کسانوں کی گاڑیوں اور گھاس والیوں سے ٹھنسے ہوئے بازاروں میں سارا سارا دن گھومنا پڑتا تھا۔ پتلی پتلی سڑکوں پر دونوں طرف ریت کا حاشیہ ضرور بنا ہوتا تھا اور پھر نالیاں تو ٹھیک سڑکوں کے بیچوں بیچ بہتی تھیں جن کی سیاہی کسی گنوارن کے بہے ہوئے کاجل کی طرح سڑک کا کافی حصہ غصب کئے رہتی تھی۔ صفائی کے بھنگی نالیوں کی گندگی سمیٹ سمیٹ کر سڑک پر پھیلا دیتے تھے جن سے اپنی ساڑھی کو محفوظ رکھنے کے لئے ایملی کو ہلکے ہلکے فیروزی سینڈل کے بجائے اونچی ایڑی والا جوتا پہننا پڑتا تھا۔ گو اس صورت میں سڑک کے اُبھرے ہوئے لاتعداد کنکر اس کے پیروں کو ڈگمگا دیتے تھے۔ راستہ میں گلی ڈنڈا اور کبڈی کھیلنے والے لونڈوں کا لاابالی پن اس کے کپڑوں پر ہر دفعہ اپنا نشان چھوڑ جاتا تھا۔ مگر خیر شکر تھا کہ وہ ہمیشہ اپنی آنکھیں اور دانت سلامت لے آتی تھی اور یہاں کی گرمی! اسے معلوم ہوتا تھا کہ وہ یقیناً پسینوں میں گھل گھل کر ختم ہو جائے گی۔ ان تنگ سڑکوں پر بھی سورج اس تیزی سے چمکتا تھا کہ اس کے بدن پر چنگاریاں ناچنے لگتیں اور اس کی نیلے پھولوں والی چھتری محض ایک بوجھ بن جاتی۔ جب وہ اپنی اونچی ایڑیوں پر لڑکھڑاتی' سنبھلتی' دھوپ میں جلتی بھنتی سڑکوں پر سے گذرتی تو اسے دور آلھا گانے کی آواز ڈھول کی کھٹ کھٹ اور درخت کے نیچے تاش کی پارٹیوں کے بلند اور کرخت قہقہے دوپہر کی نیند حرام کر دینے والی بوجھل مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح بیزار کن اور پر استہزا معلوم ہوتے اور وہ چار مہینے پہلے چھوڑے ہوئے شہر کا خیال کرنے لگتی۔ مگر شہر اس وقت خوابوں کی وہ سرزمین بن جاتا ہے جسے صبح اٹھ کر ہزار کوششوں کے باوجود یاد نہیں کیا جا سکتا اور جس کی لطافت کا یقین دن بھر دل کو بے چین کئے رکھتا ہے۔ اسے کچھ روشنی سی معلوم ہوتی ———— ایک چمک' ایک کشادگی' ایک پہنائی ———— کچھ ہریالی اس کے سامنے تیرتی...... اور وہ پھر اسی تپتی ہوئی کنکروں' نالیوں اور ریت والی سڑک پر لڑکھڑاتی سنبھلتی چل رہی ہوتی۔ بجلی کے پنکھے والے کمرے کا تصور تک اس تپش اور سوزش کو کم کرنے میں اس کی مدد نہ کرتا تھا۔ لیکن' ہاں! جب کبھی وہ خوش قسمتی سے رات کو فارغ ہوتی اور اسے اپنے بستر پر کچھ دیر جاگنے کا موقع مل جاتا تو اس وقت شہر کی زندگی کی تصویریں سینما کے پردے کی طرح پوری طرح روشنی اور صفائی کے ساتھ اس کی نظروں کے سامنے گذرنے لگتیں اور وہ جس تصویر کو جتنا دیر چاہتی ٹھہرا لیتی۔ لیکن جب وہ ان تصویروں سے لطف اُٹھانے کے درمیان ان مناظر کو یاد کرتی جن سے اسے ہر وقت دوچار ہونا پڑتا تھا تو اس کی خستگی اور بیزاری آہستہ آہستہ عود کر آتی۔ گھر کی دیواریں معدودات کی تاریکیوں کے اس پر جھک پڑتیں۔ دل بھنچنے لگتا' سانس گرم اور دشوار ہو جاتا اور اس کا سر گھمنی کھا کھا کر نیند کی بے ہوشی میں غرق ہو جاتا اور وہ خواب میں دیکھتی کہ وہ پھر اسی شہر کے اسپتال میں پہنچ گئی ہے' مگر ان در و دیوار سے بجائے رفاقت کے کچھ بیگانگی سی ٹپکتی ہے اور خود اس کے اعضاء منجمد اور ناقابل حرکت ہو گئے اور کوئی نامعلوم خوف اس کے دل پر مسلط۔ وہ صبح تک یہی خواب تین چار مرتبہ دیکھتی' اور در اصل اس کے لئے ان زندگیوں کا تقابل ہونا بھی چاہئے تھا۔ ایسے ہی اثرات پیدا کرنے والا' مانا کہ شہر میں بھی

ایسی ہی ملی ہوئی گلیاں' ٹوٹی پھوٹی سڑکیں' گرد و غبار' شریر لڑکے موجود تھے اور وہ ان کے وجود سے بے خبر نہ تھی لیکن وہ تو ہوا کی چڑیوں کی طرح ان سب سے بے پرواہ اور مطمئن تانگے کے گدوں پر جھولتی ہوئی ان اطراف سے کبھی دسویں پندرھویں نکل جایا کرتی تھی۔ اس کی دنیا تو ان علاقوں سے دور ضلع کے صدر ہسپتال میں تھی۔ کتنی کھلی ہوئی جگہ تھی وہ اور وہاں کی ہوا کا لطف تو ساری عمر نہ بھول سکے گی۔ اسپتال کے سامنے تارکول کی چوڑی سڑک تھی جس پر دن میں دو مرتبہ جھاڑو دی جاتی تھی اور جو ہمیشہ شیشے کی طرح چمکا کرتی تھی۔ جب وہ اپنی سہیلی ڈینا کے ساتھ اس پر ٹہلنے کے لئے نکلتی تھی تو دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں اور میدانوں پر سے آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چہرے اور آنکھوں پر لگ لگ کر دماغ کو ہلکا کر دیتے تھے۔ اس کی ساڑھی پھڑ پھڑانے لگتی' ماتھے پر بالوں کی ایک لڑی تیرتی اور اس کی رفتار سبک اور تیز ہو جاتی۔ ایسے وقت باتیں کرنا کتنا خوشگوار اور پر لطف ہوتا تھا۔ گرد و غبار کا تو یہاں نام بھی نہ تھا۔ مئی جون کے جھکڑ بھی اسپتال کی سفید اور شیشوں والی عمارتوں پر سے سنسناتے ہوئے شہر کی طرف گذرتے چلے جاتے تھے اور بجلی کے پنکھے سے سرد رہنے والے کمرہ میں دوپہر کی سختی اور اداسی اپنا سایہ تک نہ ڈال سکتی تھی۔ جب وہ پر وقار انداز سے ساڑھی کا پلہ سنبھالے گذرتی تھی تو اسپتال کے نوکر چاروں طرف سے اسے "میم صاحب" کہہ کر سلام کرنے لگتے تھے۔ گو یہاں بھی اسے سب لوگ میم صاحب ہی کہتے تھے۔ سڑکوں پر جھاڑو دینے والے بھنگی اسے آتے دیکھ کر تھم جاتے تھے۔ بلکہ قصبہ کے زمیندار تک اسے "آپ" سے مخاطب کرتے تھے۔ مگر پھر بھی یہاں وہ بات کہاں حاصل ہو سکتی تھی۔ وہ رعب' وہ دبدبہ' وہ مالکانہ احساس۔ وہاں تو اس کی شخصیت اسپتال کا ایک جزو لاینفک تھی۔ اس سفید' سرد اور متین عمارت اور اس کے غیر مرئی مگر اٹل قانونوں اور اصولوں کا ایک زندہ مجسمہ۔ اسپتال کے نشتر کے سامنے آنے کے بعد کوئی شخص احتجاجانہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ اسی طرح اس کی حدود میں داخل ہونے والی ہر چیز کو اس کی مرضی کا پابند ہونا پڑتا تھا۔ جب اس کا مریضوں کے معائنہ کا وقت آتا تھا تو وارڈ میں پہلے ہی سے تیاریاں ہونے لگتی تھیں۔ وہ دو روپے روزانہ کرایہ دینے والیوں تک کو جھڑک دیتی تھی کیونکہ اسے اپنے صاف کمروں میں پان کی پیک تک دیکھنا گوارا نہ تھا۔ وہ بڑی بڑی نازک مزاجوں کو ذرا سی بے احتیاطی اور ہدایات کی خلاف ورزی پر بے طرح ڈانٹتی تھی اور ہمیشہ سب سے تم کہہ کر بولتی تھی۔ مگر یہاں کی عورتیں تو بہت ہی منہ پھٹ تھیں۔ وہ اس سے ہراساں اور خوف زدہ تو ضرور تھیں مگر اسے دوبدو جواب دینے سے نہ چوکتی تھیں۔ تھوڑے دن تک ان پر اپنا اختیار جمانے کی کوشش کرنے کے بعد اب وہ تھک چکی تھی اور ان کی باتوں میں زیادہ دخل نہ دیتی تھی اور صفائی اور سلیقہ کی توان عورتوں کو ہوا تک نہ

لگی تھی۔ زچہ کو گرمی میں بھی فوراً ایک کمرہ میں بند کر دیا جاتا تھا جس میں جاڑوں کے لحاف بچھونے' چادروں اور دوسری جنسوں کے مٹکے' ٹوٹی ہوئی چارپائیاں' برتن' کوئلوں کا گھڑا' سوت اور روہڑ کی گٹھڑیاں' سب آلم غلم بھرے ہوتے تھے اور ایک انگیٹھی پر گھٹی چڑھا دی جاتی تھی۔ بعض بعض جگہ تو جلدی جلدی کمرہ میں گوبری ہونے لگتی تھی جو پیروں سے اکھڑ اکھڑ کر فرش کو چلنے کے قابل بھی نہ رہنے دیتی تھی اور جس کی سیلن انگیٹھی کی گرمی سے مل کر سانس لینا دشوار کر دیتی تھی۔ گھر کی سب عورتیں ____ اور وہ کم سے کم چار ہوتی تھیں' اپنے بدبودار کپڑوں سمیت کمرے میں گھس آتی تھیں اور گھبراہٹ میں سارے سامان کو ایسا الٹ پلٹ کر دیتی تھیں کہ ذرا سی کتر تک نہ ملتی تھی۔ اندر کی کھسر پھسر' کھڑ بڑ' کراہوں "یا اللہ' یا اللہ" اور عورتوں کے بار بار کواڑ کھول کر اندر باہر آنے جانے سے گھر کے بچے جاگ جاتے تھے اور اپنے آپ کو اماں کے قریب نہ پاکر چیخنا شروع کر دیتے تھے اور ان کی بڑی بہنیں چمکار چمکار کر اور تھپک تھپک کر انہیں بہلانے کی کوشش کرتی تھیں۔ "ارے چپ چپ...... دیکھ بھیا آیا ہے.. . صبح کو دیکھو.. .منا سا بھیا۔" مگر صبح کو منا سا بھیا دیکھ سکنے کی امید انہیں اس وقت تک کوئی تسکین نہ دے سکتی اور ان کی روں روں دھاڑوں کی شکل میں تبدیل ہو کر کمرہ کے خلفشار میں اور اضافہ کر دیتی۔ یہ تو خیر جو کچھ تھا سو تھا کثیف بستروں پر لیپ چڑھے ہوئے تکیوں' پسینے میں سڑے ہوئے کپڑوں اور مدتوں سے نہ دھلے

پسینے پاؤں کی بدبو سے جسے گرمی اور بھی دو آتشہ کر دیتی تھی' اس کا جی الٹنے لگتا تھا۔ وہ تمام وقت ہر چیز سے دامن بچاتی ہوئی کھڑی کھڑی پھرتی تھی۔ اس کمرہ میں ایک گھنٹہ گذارنا گویا جہنم کے عذابوں کے لئے تیاری کرنا تھا یہ مانا کہ خود اسے کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا۔ کیونکہ قصبہ کی عورتیں اپنے آپ کو نئے نئے انگریزی تجربوں کے لئے پیش کرنے اور اپنے آپ کو ایک اجنبی اور عیسائی مڈوائف کے' جو ان دیکھے اور مشتبہ آلات سے مسلح تھی' ہاتھ میں دے دینے کے لئے قطعاً تیار نہ تھیں انہیں تو قصبہ کی پرانی دائی اور پھوٹے ہوئے گھڑے کے ٹھیکروں پر ہی اعتقاد تھا تاہم ان کے مردوں نے ٹاؤن ایریا سے ڈر کر انہیں اس پر راضی کر لیا تھا کہ وہ نئی عیسائی مڈوائف کی کمرے میں موجودگی برداشت کر لیں۔ اس طرح عملی حیثیت سے تو اس کا کام بہت کم ہو گیا تھا۔ لیکن آخر ذمہ داری تو اس کی ہی تھی اور وہی ٹاؤن ایریا کمیٹی کے سامنے ہر برائی بھلائی کے لئے جواب دہ تھی اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوتا ہواؤں سے لڑنا تھا۔ اکثر تو گرفتار لڑکیاں اتنا چیختی چلاتیں اور ہاتھ پیر پھینکتی تھیں کہ انہیں قابو میں کرنا دوبھر ہو جاتا تھا پھر ایسی سہم جاتی تھیں کہ وہ ڈر کے مارے ذرا سی حرکت نہ کرتی تھیں۔ تین تین چار چار بچوں کی مائیں تو اور بھی آفت تھیں۔ وہ اپنے تجربوں کے سامنے اس ساڑھی پہن کر باہر گھومنے والی عیسائی عورت کی انوکھی ہدایتوں کو کوئی وقعت دینے پر تیار نہ تھیں۔ وہ اپنی آہوں کے درمیان رُک کر دائی کو مشورہ دینے لگتی تھیں اور ایملی کو دانتوں سے ہونٹ چبا چبا کر خاموش رہ جانا پڑتا تھا اور دائی تو بھلا اس کی کہاں سننے والی تھی۔ اسے اپنی برتری اور مڈوائف کی نا اہلیت کا یقین تو خیر تھا ہی مگر اس کی موجودگی سے اپنی آمدنی پر اثر پڑتا دیکھ کر اس نے ایملی کی ہر بات کی تردید کرنا اپنا فرض بنا لیا تھا۔ گو ایملی نے اس کے طنزیہ جملوں کو پینے کی عادت ڈال لی تھی لیکن اس کا دل کوئی پتھر کا تھوڑے ہی تھا۔ دائی کے طرزِ عمل کو دیکھ دیکھ کر دوسری عورتیں بھی دلیر ہو گئی تھیں۔ اس کی طرف توجہ کئے بغیر ہی وہ پلنگ کو گھیر لیتی تھیں اور وہ سب سے پیچھے چھوڑ دی جاتی تھی۔ اب اس کے سوا کیا رہ جاتا تھا کہ وہ جھنجھلا جھنجھلا کر پیر پٹخنے اور انہیں پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کرے۔

ان سب آزمائشوں سے گذرنے کے بعد اسے ہر بار اندراج کے لئے ٹاؤن ایریا کے دفتر جانا پڑتا تھا۔ اسے دیکھ کر بخشی جی کی آنکھیں چمکنے لگتیں اور ان کے پان میں سنے ہوئے کالے دانت نیم تمسخرانہ انداز میں ان کی چھوٹی داڑھی اور بڑی بڑی مونچھوں سے باہر نکل آتے اور وہ اس کی طرف کرسی کھسکائے ہوئے کہتے۔ "کہو میم صاحب! لڑکا کہ لڑکی؟" مونچھوں کے ان گھنے کالے بالوں کی قربت اسے ہراساں کر دیتی اور اسے ایسا معلوم ہونے لگتا جیسے ان بالوں میں یکایک بجلی کی لہر دوڑ جائے گی اور وہ سیدھے ہو کر اس کے چہرہ سے آملیں گے۔ وہ نفرت اور خوف سے پیچھے سمٹ جاتی اور بخشی جی سے نظریں بچاتی ہوئی جلد سے جلد اپنا کام ختم کرنے کی کوشش کرتی۔

یہ سارے مرحلے طے کرتی ہوئی وہ عموماً آٹھ نو بجے رات کو تھکی ہاری اپنے گھر پہنچتی تھی۔ جب پیر کہیں سے کہیں پڑ رہے ہوں' سر بھنایا ہوا ہو' جب جسم کا کوئی بھی عضو ایک دوسرے کا ساتھ دینے کو تیار نہ ہو' تو بھلا بھوک کیا خاک لگ سکتی ہے۔ وہ جوتا کھول کر پیر سے کونے میں اچھال دیتی اور کپڑے اس طرح جھنجھلا جھنجھلا کر اتارتی کہ دوسرے دن نصیبن کو انہیں دھوبی کے یہاں استری کرانے لے جانا پڑتا۔ الٹا سیدھا کھانا حلق کے نیچے اتار کر وہ بستر پر گر پڑتی۔ تکئے پر سر رکھتے ہی دیواریں' پیٹر' ساری دنیا اس کے گرد تیزی سے گھومنے لگتی۔ بھیجا دھڑ دھڑا دھڑ دھڑا کر کھوپڑی میں سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتا۔ سر تکئے میں گھسا جاتا مگر تکیہ اسے اوپر اچھالتا معلوم ہوتا۔ بازو شل ہو جاتے۔ ہتھیلیوں میں سیسہ سا بھر جاتا اور ہاتھ اوپر نہ اٹھ سکتے۔ اسی طرح ٹانگیں بھی حرکت سے انکار کر دیتیں اور کمر تو بالکل پتھر بن جاتی۔ وہ اپنے پرانے اسپتال کو یاد کرنا چاہتی' مگر وہ کسی چیز کو بھی پوری طرح یاد نہ کر سکتی ___ کھڑکی کا کواڑ' مریضوں کی آہنی چارپائی کا پایہ' موٹر کے پہیئے' نیم کے پیڑ کی چوٹی' پان میں سنے ہوئے کالے دانت اور گھنی سخت مونچھیں' یہ سب باری باری بجلی کے کوندے کی طرح سامنے آتے اور آنکھ جھپکتے میں غائب ہو جاتے وہ کھڑکی کے کواڑ میں ایک کمرہ جوڑنا چاہتی۔ مگر اس میں زیادہ سے زیادہ ایک چٹخنی کا اضافہ کر سکتی بلکہ بعض اوقات آہنی چارپائی کا ایک پایہ تو ایک کھونٹے کی طرح اس کے دماغ میں گڑ جاتا اور کوشش کے باوجود

بھی ٹس سے مس نہ ہوتا' نیم کی چوٹی کو کبھی تنا حاصل نہ ہو سکتا..... پھر نیم کی ہری ہری چوٹی پر ایک دیت کے حاشیہ والی تھالی چینے لگتی اور کھڑکی کے شیشے پر پان میں سنے ہوئے کالے دانت مسکراتے اور گھنے سخت بالوں والی مونچھیں جنابی سے ہلتیں....... مختلف شکلیں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو جاتیں اور دماغ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لڑتی جھگڑتی ٹکراتی' روندتی' دوڑتی...... سیاہ آسمان پر روشن اَن گنت تاروں کے گچھے کے گچھے جگنوؤں کی طرح آنکھوں میں گھس گھس کر ناچنے لگتے اور جلتی ہوئی آنکھیں کنپٹیوں کی خواب آور بھد بھد سے آہستہ آہستہ بند ہو جاتیں .. . سونے کے بعد تو ان شکلوں کے اور بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو جاتے جو باری باری آتے اور اس کے دماغ پر مسلط ہو جانا چاہتے۔ اتنے ہی میں ایک دوسرا آ پہنچتا اور پہلے والے کو دھکے دے کر باہر نکال دیتا۔ ابھی یہ کشمکش ختم بھی نہ ہوتی کہ ایک تیسرا آ دھمکتا۔ ان سب کی حریفانہ زور آزمائیاں اسے بار بار چونکا دیتیں اور وہ ہلکی سی کراہ کے ساتھ آنکھیں کھول دیتی ... پھر آنکھوں میں تاروں کے گچھے کے گچھے بھرنے لگتے . . . کہیں صبح کے قریب جا کر یہ شکلیں تھکتیں اور اپنی رزم گاہ سے رخصت ہوتیں ہلکی ہلکی ہوا بھی چلنی شروع ہو جاتی اور ایملی نیند میں بالکل بیہوش ہو جاتی مگر اس کی نیند پوری ہونے سے پہلے "کواڑ کھولو" کی مسلسل اور ضدی چیخیں اس کے دماغ میں گونجتیں____ وہی چیخیں' وہی دھڑ دھڑاہٹ' فرض اور آرام کی وہی تلخ کشمکش' وہی جھلاہٹ اور پسپائی۔

نصیبن باہر سے لوٹ آئی تھی۔ اسے شیخ صفدر علی کے ہاں بلایا گیا تھا اور پکارنے والے نے بار بار کہا تھا۔ "جلدی____ بلایا ہے____ جلدی____" ہر ایک یہی کہتا ہوا آتا ہے جلدی____ آخر وہ کیوں جلدی کرے؟ کیا وہ ان کی نوکر ہے؟ یا وہ اسے دولت بخش دیتے ہیں۔ ہونہہ____ جلدی! وہ نہ پہنچے گی تو کیا سب مر جائیں گے؟ اور پھر وہ کریں گے ہی کیا اسے بلا کر؟ ____ کہتی ہیں چڑیلیں "ہم سے کیا خاک آتا ہے____" کیا خاک آتا ہے____ کچھ نہیں آتا____ اچھا پھر؟ بیٹھیں اپنے گھر' کون ان کی خوشامد کرنے جاتا ہے ____ کچھ نہیں آتا! جیسے جیسے آ لے اس نے دیکھے ہیں ان لوگوں کے تو خواب و خیال میں بھی نہ گذرے ہوں گے____ چمکدار' تیز' ہاتھی دانت کے دستے والے____ اور وہ ڈاکٹر کارٹ فیلڈ سے نپٹ کر ... تے د ... م سے ... ہوں و ... سمجھاتی تھیں____ کچھ نہیں آتا____ ہونہہ!

ایملی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ پہلے تو اس نے چاہا کہ ... عدی نہیں ... ... بالکل نہیں ... ۔ مگر پھر اسے خیال آیا کہ یہ لوگ محض جاہل ہی تو ہیں۔ ان کے کہنے سے اس کا بگڑتا کیا ہے اور ... ذمہ داری تو خود اس کی ہی ہے۔ چنانچہ اس نے نصیبن سے کہا۔ "کہہ دو کہ چلو میں آ رہی ہوں۔" مطمئن ہو کر اس نے کروٹ لے لی۔ ... تکیے پر ڈھیلا چھوڑ دیا۔ آنکھیں بند کر لیں' ایک بازو بستر کی ٹھنڈی چادر پر پھیلا دیا' اور ہاتھ چہرے پر رکھ لیا۔ اس نے چاہا کہ دماغ کو بالکل خالی کر لے اور ساکت ہو جائے مگر اس کے دل کی کھٹ کھٹ کھٹ کانوں میں بج رہی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد یکایک ایک پتھر سا دماغ میں آ کر لگتا تھا۔ "جلدی"____ جس سے اس کے ماتھے اور کنپٹیوں کی نسیں تن جاتی تھیں اور ٹوٹتی ہوئی معلوم ہونے لگتی تھیں۔ اسے جلدی جانا تھا____ جلدی . . . اور اسی بات کے تو وہ ٹاؤن ایریا کمیٹی سے تیس روپے ماہوار پاتی تھی۔ جلدی جانا تھا. . . لیکن آخر وہ فرض پر صحت کو تو نہیں قربان کر سکتی تھی۔ کل رات ہی اسے بہت دیر ہو گئی تھی۔ وہ انسان ہی تو تھی نہ کہ مشین____ اب وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے سر میں درد ہو رہا ہے' کمر بیٹھی جا رہی ہے' کندھے اور ٹانگیں بے جان ہو گئی ہیں۔ ایسی حالت میں اتنی جلدی اٹھ جانا بہت مضر ہو گا' اور خصوصاً اس قصبہ جیسی آب و ہوا میں جہاں اس کی صحت روز بروز گرتی جا رہی ہے۔ ابھی آخر چار مہینے میں اسے چار دن بخار آ چکا تھا____ اور پھر وہ وہاں جا کر بنا ہی کیا لے گی' ان لوگوں کو ایسی کیا خاص ضرورت ہے اس کی____ تھوڑا سا اور سو لینا ہی بہتر ہو گا۔

وہ سو جاتی مگر انگلیوں کے بیچ میں ہو کر صبح کی روشنی آ رہی تھی اور اس کی آنکھوں کو بند نہ ہونے دیتی تھی۔ اس نے ہاتھ آنکھوں

پر کھسکا لیا اور آنکھیں خوب بھینچ کر بند کر لیں۔ اب اسے جھپکیاں آنا شروع ہو گئیں۔ مگر ہر دفعہ "دودھ لو' دودھ۔" "ابے او کلو ہو سکے' اٹھو اٹھو! ابے پڑھنے نہیں جانے کا؟" کی صداؤں اور نصیبن کے لکڑیاں توڑنے اور دیگچیاں اٹھانے کی آوازوں سے وہ چونک پڑتی تھی۔ سونے کی کوشش کرتے کرتے اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ سر میں درد ہونے لگا اور ماتھا جلنے لگا۔ وہ مایوس ہو کر سیدھی لیٹ گئی اور آنکھوں پر دونوں بازو رکھ لئے۔ اب اس کے اعضاء اور بھی بوجھل اور ناقابلِ حرکت ہو گئے اور وہ ان صداؤں' آوازوں' ان تھکسانہ طلبوں ___ "جلدی بلایا ہے۔" "اس صبح کے چاند نے' اس قصبے' سب سے چھپا لے' جس کے نیچے ان میں سے کسی کی بھی پہنچ نہ ہو' جہاں وہ ان سب سے ___ اپنے آپ سے غافل ہو جائے ___ اپنے کو کھو دے..... اسے محسوس ہوا کہ وہ مضبوط اور مدت کے آشنا بازو اس کے جسم کا حلقہ کئے بھینچ رہے ہیں..... سر کے درد کو گویا کسی نے پکڑ لیا..... دو آنکھیں بھی ذرا کچھ دور چمکیں' مسکراتی ہوئی معلوم ہوئیں اور اس نے اپنے آپ کو ان بازوؤں کی گرفت میں چھوڑ دیا..... جسم ہوا کی طرح ہلکا ہو گیا تھا۔ سر ہلکے ہلکے جھکولے کھاتا موجوں پر بہا چلا جا رہا تھا۔ سکون تھا' خاموشی تھی اور صرف دل کے مسرت سے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی..... دو بازو اس کے جسم کو بھینچ رہے تھے۔ دو مضبوط اور مدت نے آشنا بازو.. ....

اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں۔ صبح کے چاند نے میں چمک آ گئی تھی۔ نصیبن نے چولھے پر دیگچی رکھی۔ بکری والا محلہ سے جان کیے لئے بکریاں جمع کر رہا تھا اور کنویں کی گراری زور زور سے چل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں اوپر اٹھیں اور ہوا میں کسی چیز کو تلاش کرنے لگیں۔ ...دو بادامی سائے اترنے لگے۔ آنکھوں کے پردے پھڑکے اور پلکیں آہستہ آہستہ ایک دوسرے سے مل گئیں ___ گویا وہ ان سایوں کو پھنسا لینا چاہتی ہیں۔ .... سائے کچھ دور رُک گئے' وہ ڈگمگائے اور دھندلے ہوتے ہوئے ہوا میں تحلیل ہو گئے...... آنکھیں صبح بے رنگ آسمان کو دیکھ رہی تھیں۔ اس کی گردن ڈھلک گئی اور بازو دونوں طرف گر پڑے..... دو مدت کے آشنا بازو..... مگر وہ یہاں کہاں!

چند لمحے بے حس پڑے رہنے کے بعد وہ ولیمن کو یاد کرنے لگی۔ لمبے لمبے پیچھے اُلٹے ہوئے بال' چوڑا سینہ' سرخ ڈوروں والی جلد جلد پھرتی ہوئی آنکھیں' موٹا سا نچلا ہونٹ' کان کی لو تک کٹی ہوئی قلمیں' سانولے رنگ پر منڈی ہوئی داڑھی کا گہرا نشان' آنکھوں کے نیچے اُبھری ہوئی ہڈیاں اور مضبوط بازو...... دن میں کتنی کتنی مرتبہ اس کے بازو اسے بھینچتے تھے اور ان کے درمیان وہ بالکل بے بس ہو جاتی تھی اور بعض دفعہ تو جھنجھلا پڑتی تھی مگر اس کے جواب میں اس کا پیار اور بڑھ جاتا تھا...... اور اس کے دونوں گالوں پر وہ گرم اور نم آلود بوسے...... اور دن میں کتنی کتنی مرتبہ اس کے منہ سے شراب کی تیز بدبو تو ضرور آتی تھی۔ مگر وہ کیسے جوش سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیتا تھا' اور پاگلوں کی طرح اس کے چہرے' ہاتھوں' گردن' سینے سب پر بوسے دے ڈالتا تھا اور پھر قہقہے مار مار کر ہنستا تھا۔ "...... میری جان...... ہاہاہا..... اے می لی..... ڈی یر..... پیاری پاری ...... ہاہاہا ___ " اور وہ اس کی کیسی نگہداشت کرتا تھا۔ وہ اس سے اپنے بازوؤں میں پوچھتا۔ "اس مہینے میں کیسی ساڑھی لاؤ گی' میری جان؟ . . ... ہیں؟....... اس مہینے پر تو سُرخ کھلے گی! کہو' کیسی رہی؟ ہاہاہا ___ اور وہ اسے دوپہر میں تو کبھی نہ نکلنے دیتا تھا۔ اگر اسے ایسے وقت اسپتال سے بلایا جاتا تو وہ کہلوا دیتا کہ مسز ولیمن سو رہی ہیں اور وہ اس کے اٹھنے سے پہلے چائے تیار کرا کے اپنے آپ اس کے قریب میز پر لا رکھتا تھا اور وہ اسے کتنے پیار سے بھینچتا تھا مگر وہ یہاں کہاں! ___ اگر وہ یہاں ہوتا تو وہ اسے اتنے سویرے کہیں نہ جانے دیتا۔ وہ یہاں ہوتا تو وہ خود کہیں نہ جاتی۔ وہ تو ایسے کو اڑ پیٹ کر جگانے والے کا سر توڑ دیتا ___ لیکن وہ یہاں ہوتا ___ وہ اس کے پاس ہوتا تو وہ خود یہاں کیوں ہوتی۔

لیکن ___ کچھ دوسری شکلیں ابھریں ___ اچھا ہی ہے کہ وہ اس کے پاس نہیں ہے ___ اس کے بال الجھے ہوئے اور پریشان تھے' اور وہ اس طرح دانتوں سے ہونٹ چبا رہا تھا گویا ان کا قیمہ کر کے رکھ دے گا اور اس نے اسے ایسی بے رحمی سے بید سے پیٹا تھا۔ "لے

. اور لے گی...... بڑی بن کے آئی ہے وہاں سے وہ...... "اگر میم صاحب شور سُن کر نہ آجاتیں تو نہ معلوم وہ ابھی اور کتنا مارتا ____ ایملی اپنے بازوؤں پر نشان ڈھونڈنے لگی ____ ایسے ظالم سے تو چھٹکارا ہی اچھا ____ کیسی خونی آنکھیں اور آخر میں وہ شراب کتنی پینے لگا تھا ____ مگر وہ ہوتا تو اسے اتنے سویرے کہیں نہ جانے دیتا ____ مانا کہ وہ روز اس کے ساتھ رات کو بڑی دیر ٹہلتا رہتا تھا۔ لیکن ظاہرا تو اس کے ساتھ اس کا برتاؤ ویسا ہی رہا تھا ____ اگر وہ خود اتنا نہ بگڑتی اور اسے اٹھتے بیٹھتے طعنے نہ دیتی تو شاید بات یہاں تک نہ پہنچتی ____ وہ اسے کتنے پیار سے بھینچتا تھا ____ لیکن وہ لمبے منہ، ہڈیاں نکلی ہوئی، سوکھی جیسے لکڑی ہو ____ اور فراک پہننے کا بڑا شوق تھا آپ کو، بڑی میم صاحب بنتی تھیں۔ چار حرف انگریزی کے آگئے تھے تو زمین پر قدم نہ رکھتی تھی مارے شیخی کے ____ نہ معلوم اسکی کیا چیز لگی ہوئی تھی۔ اس میں جو وہ ایسے لٹو ہو گیا تھا ____ اس نے خواہ مخواہ فکر کی۔ وہ خود اسے تھک کر چھوڑ دیتا ____ وہ اسے تھوڑے دن یونہی چلنے دیتی تو کیا تھا ____ مگر اس نے کیسی بے رحمی سے اسے مارا تھا ____ ہاں ____ ایک دفعہ مار ہی لیا تو کیا ہو گیا۔ وہ خود بھی شرمندہ معلوم ہوتا تھا اور اس کے سامنے نہ آتا تھا ____ اور اگر ڈینا اسے اتنا نہ بہکاتی تو وہ شاید طلاق بھی نہ لیتی۔ بس وہ اپنا ذرا مزا لینے کو اسے اکساتی رہی ____ یہ اچھی دوستی ہے ____ اب وہ ڈینا سے نہیں بولے گی، اور اگر وہ ملے گی بھی تو وہ منہ پھیر کر دوسری طرف چل دے گی اور جو ڈینا اس سے بولی تو وہ صاف کہہ دے گی کہ وہ دھوکا دینے والوں سے نہیں بولنا چاہتی ____ ڈینا بگڑ جائے گی تو بگڑا کرے۔ اب وہ شہر کے اسپتال سے چلی ہی آئی، اب کوئی روز کا کام کاج تو ہے نہیں کہ بولنا ہی پڑے ......

وہ اسی طرح ڈینا کی مکاری پر پیچ و تاب کھاتی رہتی اگر نصیبن اسے نہ پکارتی۔ "اجی میم صاحب اٹھو، سورج نکل آیا۔" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور چاروں طرف دیکھا اب تو واقعی اسے چلنا چاہئے تھا مگر پھر بھی پلنگ سے نیچے اترنے سے پہلے اس نے کئی مرتبہ انگڑائیاں لیں اور تکیہ پر سر رگڑا۔

وہ منہ دھو کر چائے کے انتظار میں پھر بستر پر آ بیٹھی۔ نصیبن لکڑیوں کو چولھے میں ٹھیک کرتی ہوئی بولی۔ "وہ منیاین کہہ رہی تھیں کہ تمہاری میم صاحب تو عید کا چاند ہو گئیں۔ کبھی آئے بھی نہیں جھانکتی...... اتی ہو ہی آؤ ان کی طرف میم صاحب کسی دن، بڑا یاد کریں ہیں تمہیں۔!"

ہو ہی آئے ان کی طرف ____ کیا کرے وہ جا کر میلے کچیلے پلنگوں پر بیٹھنا پڑتا ہے۔ ٹوٹے ناٹے ____ یہاں کی عورتوں سے وہ کیا باتیں کرے؟ بس انہیں تو قصے سناتے جاؤ کہ اس کے بچہ مرا ہوا پیدا ہوا۔ اس کو اتنی تکلیف ہوئی۔ اس کو ایسی بیماری تھی۔ وہ کہاں تک لائے ایسے قصے سنانے کو، اور کوئی بات تو جیسے آتی ہی نہیں انہیں...... اور پھر یہ لوگ کتنی بدتمیز ہیں۔ سڑے ہوئے کپڑے لے کر سر پر چڑھی جاتی ہیں...... اسے ان لوگوں کے ہاتھ کا پان کھاتے ہوئے کتنی گھن آتی ہے مگر مجبوراً کھانا ہی پڑتا ہے ..... جب وہ اس سے باتیں کرتی ہیں تو ہلکے ہلکے مسکراتی جاتی ہیں جیسے اس کا مذاق اڑا رہی ہوں...... کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو اور سارے گھر کو دیکھتی جاتی ہیں گویا وہ چور ہے اور ان کی آنکھ بچتے ہی کوئی چیز اڑا دے گی ____ یہ اس سے سب عورتیں جھجکتی کیوں ہیں؟ کیا وہ ان کی طرح عورت نہیں ہے؟ یا وہ کوئی ہوا ہے ____ عجب بے وقوف ہیں یہ عورتیں ____ اور ہاں جب وہ ان کے ہاں جاتی ہے تو ان کے اشارے سے جوان لڑکیاں جلدی جلدی بھاگ کر کمرے میں چھپ جاتی ہیں۔ وہ اندر سے جھانک جھانک کر اسے دیکھتی ہیں اور اگر کہیں اس کی نظر پڑ جائے تو وہ فوراً ہٹ جاتی ہیں اور اندر سے ہنسنے کی آواز آتی ہے اور اگر انہیں اس کے سامنے آنا ہی پڑ جائے تو وہ بدن چراتی ہوئی اوپر سے نیچے تک خوب دوپٹہ تانے ہوئے آتی ہیں جیسے اس کی نظر ان میں سے کچھ چھنالے گی یا اس کی نگاہ پڑ جانے سے ان میں کوئی گندگی لگ جائے گی ____ ان کی یہ حرکت اسے بالکل ناپسند ہے۔ کیا انہیں اس پر اعتماد نہیں، اور وہ اس پر شک کرتی ہیں ____؟ اس سے تو ان کے ہاں نہ جانا ہی اچھا ____ بیٹھیں دبی لڑکیوں کو لے کے اپنے گھر میں ____ اور وہ گندے بچے، مٹی میں سنے "ناک بہتی" آدھے ننگے، پیٹ نکلا ہوا،

وہ سامنے آکر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اسے ایسے غور سے دیکھتے رہتے ہیں' جیسے وہ نیا پکڑا ہوا عجیب و غریب جانور ہے ____ اور جب وہ ان سے بولتی ہے تو وہ سیدھے باہر بھاگ جاتے ہیں ____ وحشی ہیں بالکل' جانور...... بالکل ____ اور یہ خوب ہے کہ اس کے پہنچتے ہی وہاں جھاڑو شروع ہو جاتی ہے۔ مارے گرد کے سانس لینا مشکل ہو جاتا ہے۔ ذرا خیال نہیں تندرستی کا انہیں' اور کوئی کیوں ان کے ہاں جاکر بیماری مول لے اور ان کے مرد' کتنی شرم آتی ہے اسے ان حرکتوں سے۔ وہ ہمیشہ ڈیوڑھی میں راستہ گھیرے بیٹھے رہتے ہیں اور جب تک وہ بالکل قریب نہ پہنچ جائے نہیں ہٹتے ____ "ارے حقہ ہٹاؤ' حقہ ہٹاؤ" اٹھتے اٹھتے ہی اتنی دیر لگا دیتے ہیں کہ وہ گھبرا جاتی ہے ____ جان کے کرتے ہوں گے یہ ایسی باتیں ____ تاکہ کھڑی رہے وہ تھوڑی دیر وہاں ____ اور جب وہ اندر پہنچ جاتی ہے تو اسے قہقہوں کی آواز آتی ہے۔ عجب بد تمیز ہیں ____ انگریزوں کے ہاں کتنی عزت ہوتی ہے عورتوں کی۔ وہ بڈھے پادری صاحب جو آیا کرتے تھے۔ بہت اچھے آدمی تھے بیچارے' ہر ایک سے کوئی نہ کوئی بات ضرور کرتے تھے' بلکہ اسے تو وہ پہچان گئے تھے ____ سب مل کر جایا کرتے تھے اتوار کو گرجا ____ وہ خود' دینا' کٹی' میری' شیلا اور ہاں مرسی ____ مسز جیمس کا کتنا مذاق اڑاتے تھے سب مل کر ____ سب سے پیچھے چلتی تھیں' چھتری ہاتھ میں لئے ہانپتی ہوئی اور ان میں تھا ہی کیا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ تھیں بس ____ اور جب لوٹتے ہوئے تو اور بھی مزا آتا تھا۔ سب چلتے تھے' آپس میں ہنستے' مذاق کرتے ____ اُفوہ' شیلا کس قدر ہنسوڑ تھی' کیسے کیسے منہ بناتی تھی۔ جب ہنسنے پر آتی تھی تو رُکنے کا نام نہ لیتی تھی ____ مگر یہاں وہ سب باتیں کہاں ____ اب تو جیسے وہ آدمیوں میں رہتی ہی نہیں ____ اور واقعی کیا آدمی ہیں یہاں والے؟ اول تو اسے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی ہے۔ ہر وقت پاؤں میں چکر رہتا ہے' اور پھر ایسوں سے کوئی کیا ملے؟ ____ جیسے جانور ____ نہ کوئی بات کرنے کو' نہ کوئی ذرا ہنسنے بولنے کو' بس آؤ اور پڑ رہو ____ لے دے کے رہ گئی نصیبن' تو اسے اس کے سوا کوئی بات ہی نہیں آتی کہ اس کا بیٹا بھاگ گیا' اس کی اپنے میاں سے لڑائی ہو گئی۔ اس کے یہاں برات بڑی دھوم دھام سے آئی ____ اسے کیا ان باتوں سے ہوا کرے' اس سے مطلب' ____ یا بہت ہوا تو اسے خواہ مخواہ ڈراتی رہے گی چوروں کے قصے سُنا سُنا کر ____ ایک دفعہ اس نے سُنایا تھا کہ ایک دوسرے قصبے کی مڈوائف کو کچھ لوگ کیسے بہکا کر لے گئے تھے اور اس کے ساتھ کیسا سلوک کیا تھا ____ بکتی ہے بھلا کہیں یوں بھی ہوا ہے۔ لیکن اگر کہیں اس کے ساتھ ____ مگر نہیں' بیکار کا ڈر ہے' ____ جو یوں ہوا کرے تو لوگ گھر سے نکلنا چھوڑ دیں ____ بھلا دنیا کا کام کیسے چلے ____ پاگل ہے بڑھیا' بہکا دیا ہے کسی نے اسے ____ مگر ایسی جگہ کا کیا اعتبار' نہ معلوم کیا ہو کیا نہ ہو ____ کوئی ساتھ بھی تو نہیں ____ اگر وہ مڈوائف نہ بنتی تو اچھا تھا اور وہ تو خود ٹیچر بننا چاہتی تھی بلکہ پاپا بھی یہی چاہتے تھے مگر ماما ہی کسی طرح راضی نہ ہوئیں ____ کتنے دن ہو گئے پاپا کو بھی مرے ہوئے ____ بارہ سال' کتنا زمانہ گذر گیا اور معلوم ہوتا ہے جیسے کل کی بات ہو ____ کتنا پیار کرتے تھے وہ اسے ____ روز اسکول پہنچانے جاتے تھے اور ساتھ ____ کلاس میں اس کی سیٹ میز کے پاس تھی ____ اور وہ انگریزی کے ماسٹر صاحب بہت اچھے آدمی تھے ____ بچارے' چاہے وہ کام کر کے نہ لے جائے' مگر کبھی کچھ نہیں کہتے تھے ____ اور لڑکے تو نہ جانے اسے کیا سمجھتے تھے۔ سارے اسکول میں وہ اکیلی ہی لڑکی تھی نا' سب کے سب ماسٹر صاحب کی نظریں بچا بچا کر اس کی طرف دیکھتے رہتے تھے ____ ارے وہ موٹا کرم چند' بھلا وہ بھی تو اس کی طرف دیکھتا تھا جیسے وہ بڑا خوبصورت سمجھتی تھی اسے ____ اور ہاں وہ عظیم! بڑا بھولا تھا بچارا' سوکھا سا زرد' مگر آنکھیں بڑی بڑی تھیں اس کی۔ دیکھتا تو وہ بھی رہتا تھا اس کی طرف' مگر جب کبھی وہ اسے دیکھ لیتی تھی تو وہ فوراً شرما کر نظریں نیچی کر لیتا تھا اور رومال نکال کر منہ پونچھنے لگتا تھا ____ اور اس دن وہ دل میں کتنا ہنسی تھی۔ اس دن وہ اتفاق سے جلدی آگئی تھی۔ برآمدہ میں دوسری طرف وہ آرہا تھا' جب وہ قریب آیا تو اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کے پاس پہنچ کر وہ رُک گیا اور کچھ کہنے سا لگا' ڈرتے ڈرتے عظیم نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور پھر جلدی سے چھوڑ دیا' اسے گھبرایا ہوا دیکھ کر وہ خود کتنا پریشان ہو گیا تھا' اور اس نے بہت گڑگڑا کر کہا تھا۔ "کہئے گا نہیں۔" وہ کتنے دن اس بات کو یاد کر کے ہنستی رہی تھی ____ کتنا

سیدھا سادا تھی وہ ___ وہ ابھی اسکول ہی میں رہتی تو کتنا مزا رہتا ___ مگر ___ دمشاد تو اب گیا ___ اب تو وہ یہاں دنیا سے الگ پڑی ہے۔ کوئی بات تک کرنے کو نہیں ___ کسی کا خط بھی تو نہیں آتا ___ دمشاد لاہور کے ... سے پوچھتی ہے کہ اس کا کوئی خط تو نہیں مگر ___ روز جواب وہی "نہیں" ___ او جو آیا بھی تو بس وہی لمبے بادامی لفافے ___ آن ہز مجسٹیز سروس ___ ڈسٹرکٹ ہیلتھ آفیسر کی ہدایتیں، یوں کرو اور ووں کرو ___ کوئی اس کی مانے بھی جو وہ یوں کرے ___ خواہ مخواہ کی آفت ___ اور پھر خط آئے بھی کہاں سے؟ ___ اگر آپا ہی دلی سے خط بھیج دیا کریں تو کیا ہے ___ مگر وہ تو برسوں بھی خبر نہیں لیتیں ___ ایک دفعہ جانا چاہئے اسے دلی ___ اچھا شہر ہے ___ کیا چوڑی سڑکیں ہیں ___ اور سینما کس کثرت سے ہیں ___ اور وہ ___ وہ خیر ہے ہی ___ مگر وہ ___

کائیں کائیں کائیں نے اسے چونکا دیا۔ دھوپ آدھی دیوار تک اتر آئی تھی کوا زور زور سے چیخ رہا تھا اور وہ بستر پر پیر نیچے لٹکائے لیٹی تھی۔ اسے جلدی جانا تھا اور اس نے بیکار لیٹے لیٹے اتنی دیر لگادی تھی۔ وہ نصیبن پر اپنا غصہ اتارنے لگی کہ اس نے چائے کیوں نہیں لا کر رکھی مگر وہ سمجھ رہی تھی کہ میم صاحب سو رہی ہیں اور واقعی' اس نے خیال کیا۔ اس سے تو وہ اتنی دیر سو ہی لیتی تو اچھا تھا۔ بہر حال اس نے نصیبن سے جلدی چائے لانے کو کہا۔

اس نے دوبارہ منہ دھویا اور الٹی سیدھی چائے پینے کے بعد وہ کپڑے بدلنے چلی۔ ٹرنک کھول کر وہ سوچنے لگی کہ کونسی ساڑھی پہنے ___ سفید' سرخ کناروں والی۔ مگر کیا روز روز ایک ہی رنگ ___ اور پھر سفید ساڑھی میلی کتنی جلدی ہوتی ہے اس کی بہار تو بس ایک دن ہے۔ اگلے دن کام کی نہیں رہتی ___ نیلی ساڑھی نیچے سے جھانک رہی تھی ___ اسے ہی کیوں نہ پہنے؟ ___ مگر اسے نیلی ساڑھی پہنے دیکھ کر تو لوگ اور بھی باؤلے ہو جائیں گے ___ وہ جدھر سے نکلتی ہے سب کے سب اسے گھورنے لگتے ہیں۔ اسے بڑی بُری معلوم ہوتی ہے ان کی یہ عادت ___ اور ان زمینداروں کو دیکھو' بڑے شریف بنتے ہیں؟ ___ خیر یہ تو جو کچھ ہے سو ہے' جب وہ آگے بڑھ جاتی ہے تو وہ ہنستے ہیں ___ اور طرح طرح کے آوازے کستے ہیں ___ "کہو یار!" ___ "ابے مجید ذرا الجھو!" ___ کوئی کھانسنے لگتا ہے کیا وہ سمجھتی نہیں ___ ذرا شہر میں کر کے دیکھتے ایسی باتیں ___ وہ مزا چکھا دیتی انہیں ___ مگر یہاں وہ کیا کرے' مجبور ہو جاتی ہے ___ ان کی ہی وجہ سے تو اس نے رنگدار ساڑھیاں چھوڑ دیں اور سفید پہننے لگی' مگر پھر بھی نہیں مانتے ___ اب اگر آج وہ نیلی ساڑھی پہن کر جائے گی تو نہ معلوم کیا کیا کریں گے ___ تو پھر سفید ہی پہنے لے ___ مگر روز روز سفید اور کیا' وہ کوئی ان سے ڈرتی ہے۔ ہنستے ہیں تو ہنسا کریں' کوئی اسے کھا تھوڑی لیں گے' بھلا کیا بگاڑ سکتے ہیں وہ اس کا؟ ___ اب وہ پھر رنگدار ساڑھیاں پہنا کرے گی ___ دیکھیں وہ اس کا کیا بناتے ہیں ___ ہنسیں گے تو ضرور ___ مگر اس سے ہوتا ہی کیا ہے ___ آج وہ ضرور نیلی ساڑھی پہنے گی!

نیلی ساڑھی پہن کر اس نے بال بنانے کے لئے آئینہ سامنے رکھا۔ کم خوابی سے اس کی آنکھیں لال اور کچھ سوجی ہوئی تھیں۔ وہ ہاتھ میں آئینہ اٹھا کر آنکھوں کو غور سے دیکھنے لگی ___ مگر یہ اس کا رنگ کیوں خراب ہوتا چلا جا رہا تھا اور کھال بھی کھردری ہو چلی تھی۔ جب وہ لڑکی تھی تو اس کے چہرے پر کتنی چمک تھی ___ رنگ سانولا تھا تو کیا' چمکدار تو تھا ___ اس کی آنٹی ہمیشہ ماما سے کہا کرتی تھیں۔ "تمہیں بیٹی اچھی ملی ہے ___ مگر اب ___

اس نے آئینہ رکھ دیا اور اپنے جسم کو اوپر سے نیچے تک ایسی حسرت سے دیکھنے لگی جیسے مور اپنے پیروں کو ___ اس کے بازوؤں کا گوشت لٹک آیا ہے اور ٹھوڑی بھی موٹی ہو گئی ہے اور ہاتھ اب کتنے سخت ہیں۔ بال بھی سوکھے سوکھے اور ہلکے رہ گئے ہیں' اور تیزی تو اس میں بالکل نہیں رہی ہے۔ پہلے وہ کتنا کتنا دوڑتی بھاگتی تھی اور پھر بھی نہ تھکتی تھی۔ مگر اب تو تھوڑی دیر میں اس کی کمر ٹوٹنے لگتی ہے۔

اس نے ایک لمبی سی انگڑائی اور پھر ایک گہرا سانس لیا۔ بے رونق چہرے اور پلپلے بازوؤں نے نیلی ساڑھی کا رنگ اڑا دیا تھا۔ اس نے بال ایسی بے دلی سے بنائے کہ بہت سے تو ادھر اُدھر اڑتے رہ گئے۔ بال بن چکے تھے مگر وہ برابر آئینے کو تکے جا رہی تھی اور اس کا دماغ

ہٹ کر آنکھوں کے پپوٹوں میں آ گیا تھا جن میں ایک ہی جگہ ٹھہرے ٹھہرے مرچیں سی لگنے لگی تھیں۔

جب اس نے آئینہ رکھا تو اسے میز کے کونے پر دیوار کے قریب بائبل رکھی نظر آئی۔ یہ بچپن میں سالگرہ کے موقع پر اس کے پاپا نے اسے دی تھی۔ مدتوں سے اس نے اسے کھولا تک نہ تھا اور وہ گرد سے اٹی پڑی تھی۔ اس کتاب نے اسے پھر پاپا کی یاد دلادی اور وہ اسے اٹھانے پر مجبور ہو گئی پہلے ہی صفحہ پر اس کا نام لکھا تھا۔ لیکن اب اس کی روشنائی بہت پھیکی پڑ چکی تھی۔ یہ اس نے پانچویں کلاس میں لکھا تھا۔ یہ دیکھ کر اسے ہنسی آئی کہ وہ اس وقت کیسے ٹیڑھے میڑھے حرف بنایا کرتی تھی۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس زمانہ میں اس کے پاس ہرا قلم تھا۔ اس کا ارادہ ہوا کہ اب کے جب وہ شہر جائے گی تو ایک ہرا قلم ضرور خریدے گی مگر اسے خیال آیا کہ آخر وہ قلم لے کر کرے گی ہی کیا۔ اب اسے کون سا بڑا لکھنا پڑھنا رہتا ہے۔

اس کے پاپا اسے بائبل پڑھنے کی کتنی ہدایت کیا کرتے تھے۔ اسے اپنی بے پروائی پر شرم سی محسوس ہوئی اور وہ بائبل کے ورق الٹنے لگی ___ پیدائش ___ خروج ___ ورق تیزی سے الٹے جانے لگے ___ استثنا ___ روت ___ یرمیاہ ___ حقوق ___ متی ___ لوقا ___ رسولوں کے اعمال ___ کہاں سے پڑھے ___ آدم ___ نوح ___ طوفان ___ ابراہیم ___ کشتی ___ صلیب ___ مسیح ___ یسوع راجا آئے ___ گرجا کا گھنٹہ ___ سب مل کر گرجا جاتے تھے' ہنستے' مذاق کرتے ___

آخر وہ فیصلہ نہ کر سکی کہ کون سی جگہ سے پڑھے اور اسے جلدی جانا تھا اتنا وقت بھی نہیں تھا لیکن اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ اب روز صبح کو بائبل پڑھا کرے گی ورنہ کم سے کم اتوار کو ضرور ___ لیکن دعا تو مانگ ہی لینی چاہئے ___ بہت ہی بری بات ہے۔ ماما کبھی بغیر دعا مانگے نہیں سونے دیتی تھی ___ اور پھر اس میں وقت بھی کچھ نہیں لگتا' اور لگے بھی تو کیا ہے دنیا کے دھندے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔

اس نے دماغ کو ساکن بنانا چاہا اور آنکھیں بند کر لیں لیکن باوجود اس کے آنکھیں پھٹ پھٹانے سے پہلے تو اس کی ماما اس کی آنکھوں میں گھس آئیں اور پھر پاپا ان کے پیچھے پیچھے گرجا کی سڑک' گھنٹہ اور سب مل کر گرجا جایا کرتے تھے۔ ہنستے' مذاق کرتے۔ اس نے آنکھیں کھول کر سر کو اس طرح جھٹکے دئے گویا ان سب کو اپنی آنکھوں میں سے جھاڑ رہی ہے ___ آخر دماغ بالکل خالی ہو گیا' اور خاموش۔ صرف کانوں اور سر میں دل کے دھڑکنے کی آواز آ رہی تھی۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ دونوں ہاتھ جوڑ لئے اور دعا کو دہراتی چلی گئی۔ "اے میرے باپ تو جو آسمان پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے تیری بادشاہی آئے۔ تیری مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے ویسے ہی زمین پر ہو۔ ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہمارے قصوروں کو معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قصوروں کو معاف کرتے ہیں۔ کیونکہ قدرت جلال ابد تک تیرا ہی ہو۔ آمین!"

آنکھیں کھولنے پر اس نے کچھ اطمینان سا محسوس کیا اور مسکرانے کی کوشش کرنے لگی اس نے پھر آئینہ میں جھانکا اور چاہا کہ کسی خاص چیز کے لئے دعا مانگے۔ لیکن کیا چیز؟ کوئی! ___ اس کا تبادلہ شہر میں ہو جائے ___ مگر وہاں اسے پھر ولیسن کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس سے تو یہ قصبہ ہی بہتر ہے ___ اور پھر کیا؟ ___ وہ ایک کہانی تھی کہ ایک پری نے ایک آدمی سے تین خواہشیں پوری کرنے کا وعدہ کیا تھا ___ پھر آخر کیا؟ ___

اس نے بہت بازو ملے۔ مگر کوئی بات یاد نہ آئی۔ اسے دیر ہو رہی تھی اس لئے اس نے اپنی دعاؤں اور خواہشوں کو چھوڑ دیا اور چھتری اٹھا کر چل پڑی۔

سڑک پر پہنچ کر اس پر محض ایک جلدی پہنچنے کا خیال غالب تھا۔ صبح کی اس تمام کاہلی اور سستی کے بعد اسے اعضا کو حرکت دینے میں فرحت محسوس ہو رہی تھی۔ سورج کی ہلکی سی گرمی' اور چلنے سے اس کے خون کی حرکت تیز ہو گئی تھی اور وہ سڑک کی نالی' ریت کنکروں سب سے بے پرواہ اپنا راستہ طے کرنے میں لگی ہوئی تھی۔ اگر اسے اپنی رفتار میں کبھی سستی معلوم ہوتی تو وہ اور قدم بڑھانے کی

کوشش کرتی۔ سڑک پر کھیلنے والے لڑکے ابھی تک نہ نکلے تھے اس لئے اسے اپنی آنکھ ناک کی حفاظت کی ضرورت نہ تھی۔ جب وہ دیواروں کے سایہ میں سے گذرتی تو اس کے پیر اور بھی تیز اٹھنے لگتے تھے۔

وہ جلدی ہی بازار میں پہنچ گئی۔ شیخ صفدر علی کا مکان اب تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا اور اطمینان سا ہو گیا تھا کہ زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ وہ چلی جا رہی تھی کہ اس کی نظر ایک دکاندار پر پڑی۔ وہ اپنے سامنے والے کو آنکھ سے اشارہ کر رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ کیا یہ اسے دیکھ رہا تھا؟ ممکن ہے وہ پہلے سے کسی بات پر ہنس رہے ہوں، اور اسے دیر بھی ہو گئی تھی ___ وہ آگے بڑھی ہی تھی کہ آواز آئی۔ "آج تو آسمان نیلا ہے بھئی...... بڑے دن میں ایسا ہوا ہے آج" ___ اس نے چاہا پلٹ کر چھتری رسید کرے اس بد تمیز کے...... چاہے کچھ ہو آج وہ کھڑی ہو جائے اور صاف صاف کہہ دے کہ وہ ان لوگوں کی باتیں اچھی طرح سمجھتی ہے، اور اب وہ زیادہ برداشت نہیں کر سکتی ___ آخر کہاں تک؟ ___ پیر من من بھر کے ہو گئے تھے اور ٹانگیں تھر تھرا رہی تھیں جس سے وہ کئی دفعہ چلتے چلتے ڈگمگا گئی ___ مگر ان آنکھوں نے جواب ہر طرف سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں اسے رُکنے نہ دیا۔ وہ اپنی ساڑھی میں کچھ سکڑ سی گئی۔ اس نے پلہ اچھی طرح سینے پر کھینچ لیا اور سر جھکا کر قدموں کو سڑک پر سے اکھاڑنے لگی۔ . . .

جب وہ شیخ صفدر علی کے مکان پر پہنچی تو وہ ڈیوڑھی میں کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے، اور ایسے شکایت آمیز لہجے میں جیسے اس نے کوئی نایاب موقع ہاتھ سے نکل جانے دیا تھا جس پر شیخ جی کو اس سے ہمدردی تھی، بولے۔

"اخاہ میم صاحب! بڑی ہی دیر کر دی تم نے تو!"

"جی...... ہاں... . وہ ذرا دیر ہو گئی۔" کہتی ہوئی وہ زنانہ کی طرف بڑھی۔ جب وہ دروازہ پر پہنچی تو اس نے دیکھا کہ قصبہ کی پرانی دائی بائیں ہاتھ پر کپڑے اٹھائے اور داہنے ہاتھ میں لوٹا ہلاتی صحن سے گزر رہی ہے، یہ کہتی ہوئی "جرا دیکھو تو..... ابھی تک نہ نکلی گھروے سے حرام جادی!"

زرّیں تاج

عزیز احمد

جیپ بہر حال دغا دینے پر تلی ہوئی تھی۔ ہر دس دس گز پر رُک رُک جاتی۔ بچارا موٹا ڈرائیور محنت کرتے کرتے ہانپتے ہانپتے عاجز آچکا تھا۔ ارشد نے حسین چاندنی کی طرف دیکھا۔ یہ خوبصورت سڑک' اس پر بکھری ہوئی چاندنی' کناروں پر یہ اونچے اونچے درخت۔ کتنی محنت سے یہ سڑک تیار ہوئی تھی اور آج جنگ کا پہلا دن تھا۔ بھلا جنگ اور جیپ کی اس مسلسل سکرات کو چاندنی رات اور ان حسین درختوں اور اس دوشیزہ سڑک سے ذرا بھی واسطہ تھا؟

موٹا ڈرائیور شیخ احمد بڑے کمالات کا آئینہ تھا۔ ایک چھوٹی سی گلی ذریج کے سلسلے میں کئی فٹ کھدی ہوئی تھی اور کنارے سے موٹر تو کجا آدمی بھی بڑی مشکل سے جاسکتا تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے ارشد سے پوچھا تھا۔ "سرکار گلی بالکل کھدی ہوئی ہے۔ پھر کیا حکم ہوتا ہے۔ گاڑی کو لے چلوں۔" آج انجن کے پیچھے اس کے ہانپ ہانپ جانے پر ارشد کو ترس آرہا تھا اور غصہ بھی۔ دور پر کوئی ریل گاڑی کھڑ کھڑ کرتی گذر جاتی۔ لیکن ہر طرف سناٹا تھا۔ دور دور کسی آدمی کا سراغ نہیں' کوئی گھر نہیں۔ مذاق تو نہیں تھا۔ آج جنگ کا پہلا دن تھا۔ سب جگہ بلیک آؤٹ تھی۔ لیکن چاند نے اپنا ٹھنڈا سا چراغ آسمان پر جلا رکھا تھا اور سوئی ہوئی زمین پر انسان یا سنہرے خواب دیکھ رہے تھے یا ایک دوسرے کو تباہ کرنے میں اسی روشنی سے مدد لے رہے تھے۔ یہ عجیب طرح کی ٹھنڈی روشنی ہے' چاند کی روشنی جس سے دو طرح کے جنون کی قندیلیں جلتی ہیں۔ جنگ کے جنون کی اور عشق کے جنون کی۔

اتنے میں اوپر سے گھر گھراہٹ کی آواز آئی۔ ارشد نے اپنے دل میں کہا ——— امجد بھائی نے آج دعوت کے لئے اچھا دن چنا تھا ...... چاندنی میں سڑک کے کنارے کے حسین درخت جیپ کو چھپا نہیں سکتے تھے اور اگر کہیں یہ بدشکل سا کپڑا اوپر سے ہوا باز کو نظر آگیا تو ...... موت آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ اس نے شیخ احمد کو جلدی سے چھپ جانے کے لئے کہا۔ وہیں کہیں جھاڑیوں میں' اور خود تیزی سے سڑک کے کنارے کنارے چاندنی سے بچتا ہوا قد آور درختوں کے سائے میں پناہ لیتا وہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ اب دور پر ...... چشم زدن میں نزدیک ایک تیز نیلا سا ستارا دکھائی دیا' اور پھر سڑک کے بالکل قریب تقریباً پانچ سو فٹ اوپر اس تیزی سے ہوائی جہاز اُڑتا چلا گیا گویا اس کی ٹوپی کو گراتا ہوا گذر گیا۔ اس کے دل کی دھڑکن ایک منٹ کے لئے رُک گئی۔ جسم نے تھر تھری سی لی۔ جیپ کے قریب ہی ایک شعلہ سا بلند ہوا۔ ایک سُرخ سا گولہ زمین پر پھٹا اور شعلہ بلند ہوا' سرخ شعلہ۔ "سرخ شعلہ" اس نے اپنے دل میں کہا۔ ہوائی جہاز نے جیپ کو مشین گن نہیں کیا تھا۔ اسے بعد میں معلوم ہوا کہ ہوائی بیڑے کو شہر یا اس کے اطراف کسی طرح کی بمباری وغیرہ کی سخت مخالفت تھی۔ اب ہوائی جہاز بہت دُور جاچکا تھا۔ شہر کی طرف۔ اس نے پلٹ کر شیخ احمد کو پکارا۔ کوئی جواب نہیں آیا۔ اُلٹے پاؤں وہ

جیپ کی طرف واپس ہوا۔ شیخ احمد جھاڑیوں سے نکل کر تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے پھر انجن کا رُخ کیا اور اس خوف کے باوجود اس کی ہمت پر ارشد کو تعجب ہوا۔ "میں پیدل چلتا ہوں۔ تم گاڑی کو یہیں چھوڑ دو۔ چلے چلو۔"

"آپ جایئے سرکار میں تو اس گاڑی کا نوکر ہوں اس کو لے کر ہی آؤں گا۔"

اسے پھر تعجب ہوا۔ ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ پھر معلوم ہوئی۔ دیکھ بھال کی اڑان کے بعد اب وہ دوسری طرف سے واپس جا رہا تھا۔ بہت دُور پر اور اب بہت اُوپر۔ نیلا ستارہ گھڑ گھڑاہٹ کی طرح مدھم ہوا پھر غائب ہو گیا۔ دونوں نے پھر بیمار جیپ کی طرف دیکھا اور ارشد نے گیبر وڈین کے پتلون کی جیبوں میں ہاتھوں کو گرم رکھنے کے ارادے سے گھسیڑ کے سیٹی بجانے کی کوشش کی۔ مگر فارسی اشعار تھے کہ بادلوں کی طرح اُمڈتے چلے آتے تھے۔ اس نے حسین رات کی طرف دیکھا۔ معشوقوں کی طرح' عجمی شاعروں کے معشوقوں کی طرح دل ربا اور خونریز۔ معشوقوں کے رخ زیبا جیسا چاند' ان کی آنکھوں کی طرح چمکتے ستارے۔ ان کی زلفوں کی طرح سیاہ درختوں اور چٹانوں کے سائے۔ ان کی پلکوں کی طرح سڑک کے کنارے کے صف بستہ درخت ان کی حنائی انگلیوں اور سُرخ ہونٹوں کی طرح سرخ سرخ ____ اور اسے جنگ پھر یاد آگئی اور وہ ہوائی جہاز جو ابھی ابھی گزرا تھا ____ دیور پر ایک موٹر گذری۔ اس وقت اور اس رات اس کے سوا کسی اور بیوقوف کی شامت آئی تھی۔ جہاں سے موٹر گذری وہاں چوراہا ضرور ہو گا۔ چوراہہ ضرور تھا۔

اس رات کو معشوق کی حنا آلودہ ہتھیلی اور سرخ ہونٹوں کی طرح سُرخ خونریز کوئی مرئی چیز نہیں تھی۔ ٹینکوں اور توپ خانے کی گھن گرج ابھی سینکڑوں میل دور تھی' تیزی سے ہوا پر صرف موت کے آہنی فرشتے آسکتے تھے اور ان کو دیکھ کر سائرن کی وہ تیز' خون کو منجمد کر دینے والی آواز۔ ایک مسلسل فریاد' ایک مسلسل کراہ۔ وہ جو نعرے لگاتے ہیں اور ' وہ جو دوسروں کی رہنمائی کرتے ہیں' وہ جو دوسروں کی رہنمائی میں چلتے ہیں۔ ذرا دیکھ بھی لیں کہ جنگ کیسی ہوتی ہے۔

کیا ہو گا؟ آج صبح سے اس کے ذہن نے تصفیہ کر لیا تھا کہ وہ اس کا جواب نہ دے گا۔ ایک اور چوراہہ پر آج دوپہر کو ایک طرف سے تیز' بہت تیز ایک فوجی لاری آ رہی تھی اور ایک آدمی آرپار جانے والی سڑک سے تیزی سے موٹر سائیکل پر چلا آ رہا تھا۔ ارشد نے بڑی حماقت سے اپنے حق میں پیشین گوئی کی "اگر اس فوجی لاری سے یہ سائیکل ٹکرائی تو میں بھی اس جنگ میں ختم ہو جاؤں گا۔" لیکن سائیکل نہیں ٹکرائی ____ سائیکل سوار فوجی لاری کو جل دے کر نکل گیا۔ آنکھ مچولی میں تھوڑی دیر کے لئے زندگی موت سے جیت گئی۔

آدمی نہ آدم زاد اور ابھی رات کے دس ہی بجے تھے۔ شہر سے صرف سات میل دُور۔ جیسے طلسم ہوشربا کا کوئی شہزادہ کسی طلسمی جنگل میں چلا جا رہا ہے ____ حشرات الارض کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ جھینگوں کی' سانپوں کی' اور دور دور کتوں کی۔ ابھی بہت دُور تک کوئی مکان نہیں تھا۔ ایک فیکٹری کے چراغ بہت فاصلے پر نظر آ رہے تھے۔ لیکن باہر سے چاندنی کفن کی طرح اسے بھی لپیٹے تھی۔

اور دفعتہً چاندنی اسے بڑی ہی دلکش معلوم ہوئی' خواب کی طرح' عشق حقیقی کی طرح' ذرا ذرا سے سلجھے ہوئے جنوں یعنی جنونِ ذی فنون کی طرح اور اسے سڑک پر اپنے جوتوں کی چاپ کچھ عجیب معلوم ہوئی جیسے کوئی اس زندگی میں نہیں کسی اور زندگی میں چل رہا ہے' جیسے وقت کی طنابیں گر گئی ہیں۔ جیسے وہ ماضی میں یا مستقبل میں چل رہا ہے اور حال معدوم ہے۔ جیسے وہ مردہ ہے .....

اور اگر کہیں یہ سچ ہو۔ وہ ہوائی جہاز جو اس قدر نیچے سے گذرا تھا۔ فرض کرو کہ اس نے "سرخ پیاز" نہیں گرایا تھا۔ وہ ایک بم تھا۔ جیپ' شیخ احمد اور وہ خود سب مر چکے ہیں' فنا ہو چکے ہیں۔ وہ اس سڑک پر چلا جا رہا ہے کہ اس زندگی اور اُس زندگی میں تسلسل ہے یا یہ محض اسی کی یاد' اسی کا سلسلہ ہے ....

اور معلوم نہیں یہ کون ہے جو اس کے ساتھ چلا آ رہا ہے۔ برفانی قطب جنوبی کے سیاحوں کا زائد ساتھی۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ والا۔ "یہ تیسرا کون ہے۔" یہ کون ہے جو اس کے ساتھ چلا جا رہا ہے وجود سے عدم' عدم سے وجود کی طرف۔ جیسے ماضی اور حال اور

مستقبل کی سرحدیں مٹ گئی ہوں جیسے۔

یہ قدموں کی چاپ' یہ جوتوں کی چاپ۔ یہ اس کی اپنی رفتار کی نشانی ہے۔ وہ اپنے گھر جا رہا ہے' پیدل' کیونکہ جیپ خراب ہو گئی ہے اور بچارا شیخ احمد اب بھی اس کے انجن سے گتھا ہوا ہے۔ مگر یہ چاندنی رات اس قدر دلکش اور حسین اور یہ سڑک' یہ چاندنی رات میں نہائی ہوئی دوشیزہ۔ یہ درختوں کے سائے' یہ کالی کالی زلفیں ....

اور وہ جس کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی' وہ دوسرا ساتھی' چاندنی رات میں اس ویران حسین سڑک پر اس کا ہم سفر' اس کی ہم سفر....... اس نے چاند کی طرف دیکھا اور پھر اپنی حسین ساتھی کی طرف۔

"تم نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں زرّیں تاج ہوں۔"

اس نے بیسیوں زندہ عورتوں سے عشق کیا تھا۔ ہوس آرائی کی تھی' تفریح کی تھی' کشش محسوس کی تھی۔ کبھی ہوس کا خاتمہ عشق پر ہوتا۔ کبھی عشق کا ہوس پر اور ہمیشہ اس کا باعث یہ ہوتا کہ دونوں لاکھ کوشش کرتے۔ "دوئی" فنا نہ ہوتی۔ دونوں ایک معاشی عمرانی نظام کی پیداوار ہوتے' اور یہ نظام ان کے راستے میں سنگلاخ مزاحمتیں' کانٹوں کی جھاڑیاں' دیو ہیکل چٹانیں حائل کرتا جاتا۔ جن سے ہوس عشق بن جاتی اور کبھی یہ مزاحمتیں غائب ہو جاتیں تو عشق ہوس ہو جاتا اور پھر ہوس کے بعد تھکن اور پھر عذر واماندگی اے حسرتِ دل..... .اور پھر یہی سلسلہ۔

ایک دن اس نے اکتا کے کہا تھا اب میں کسی ایسی عورت سے محبت کروں گا۔ جسے مرے صدیاں ہو چکی ہوں گی۔ ایک دن انسان ماضی میں سفر کر سکے گا۔ اس دن اس کے ساتھ بھی یہی مسائل پیدا ہوں گے۔ لیکن ابھی تو یہ ممکن نہیں۔

زرّیں تاج کو مرے سو سال کے قریب ہونے کو آئے ہیں اور اس شاعرہ کا کلام پڑھ کر جس نے باب کو دیکھنے سے پہلے اس کی تعریف اور اشتیاق میں دنیا کی دو حسین ترین نظمیں لکھیں ہیں۔ اس نے زرّیں تاج کو مخاطب کر کے کہا۔ "ان تمام عورتوں میں جو مر چکی ہیں مجھے سب سے زیادہ تم سے محبت ہوئی ہے۔ اگر کبھی حال ماضی کی طرف جا سکا یا میری روح تمہاری روح کے جمال کا دیدار کر سکی۔ اگر یہ بھی نہ ہو تب بھی دورانِ محض میں' مرورِ خالص میں تم سے مخاطب ہوں گا اور تم سے اپنی اس محبت کا اظہار کروں گا جو عشق سے' ہوس سے' خواہش سے' ادراک سے' جواب سے ماورا ہے۔

آج اس چاندنی میں لپٹی ہوئی حسین' ویران تنہا سڑک پر ایک اجنبی ساحرہ کی طرح وہ اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اس پل صراط پر۔ زندگی سے موت کی طرف....... صدیوں کے آرپار اور پھر اس نے زرّیں تاج کی طرف دیکھا۔ اس نے نقاب اُلٹ دیا تھا' یوں اس کا لباس سیاہ تھا۔ فلمی عورتوں کی طرح۔ ایسا لباس جیسا کہ شاید اس نے محمد علی بار فروش کے ساتھ کجاوے میں پہنا ہو گا اور اس کا چہرہ چاندنی میں جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ یہ موت کی' کافور کی چمک تھی۔ ایک حسین آسیب الفت کے چہرے کی چمک۔ جیسے ملکہ کوکاچین کی مہکی ہوئی لاش کا مارکو پولو کے نام یہ پیغام۔

"یہ کہہ دینا کہ میں نے محبت کی اور مر گئی۔ اب میں محبت ہوں اور زندہ ہوں اور چونکہ زندہ ہوں بھول گئی اور چونکہ محبت کرتی ہوں معاف کر دوں گی۔"

تب ارشد نے اس طرح جیسے کوئی سلسلہ خیال سے چونک پڑتا ہے۔ جیسے کوئی خواب میں خواب سے بیدار ہوتا ہے' جیسے کسی نے ابھی ابھی آنکھ کھولی ہو۔ کہا۔ "تم ملکہ کوکاچین ہو۔ تم زرّیں تاج ہو۔"

اور اس کی ہم راہ حسینہ ہنسی۔ "کوکاچین نہیں وہ چینی تھی۔ وہ تو صرف عجم بیاہ کر آئی تھی۔ میں عجم کی نسوانیت ہوں جو صدیوں میں ایک آدھ مرتبہ انگڑائی لے کر اٹھتی ہے' اور مردوں کو ششدر کر دیتی ہے۔ وہ پہلے مجھے دیکھ کر عش عش کرتے ہیں۔ پھر محبت

کرتے ہیں' جس کے معنی زیادہ تر یہ ہوتے ہیں کہ بڑی سے بڑی قیمت دے کر وہ میرا جسم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ شہنشاہ مجھے موتیوں میں تولنا چاہتا ہے۔ فن کار خونِ جگر میں اور مزدور مجھے دیکھے بغیر چپکے سے گذر جاتا ہے اور اگر وہ محبت میں کامیاب نہیں ہوتے تو پھر مجھے مار ڈالنا چاہتے ہیں' اپنی رقیب سمجھ کر اور جب میں مر جاتی ہوں تو سینکڑوں برس میری پرستش کرتے ہیں۔ اب تم نے مجھے پہچانا۔

پھر سائرن کی خوفناک ہسٹریائی چیخ نے فضا میں لہرانا شروع کیا۔ رات نے ایک جھرجھری لی' چاندنی کانپ گئی' سب درختوں اور ان کے سایوں کو فالج مار گیا۔ دور پھر ایک ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ پھر ایک نیلا ستارہ چمکا۔ پھر کتے بھونکے جھینگروں کے گانے میں خلل نہیں آیا اور ارشد نے سیدھے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ زریں تاج برابر اس کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ موت اور حیات کی درمیانی شاہراہ پر پلِ صراط پر چاندنی کے برزخ میں۔

دور پر ہوائی جہاز نے پھر "سرخ پیاز پھینکے" زمین سے ٹکرا کے پھر سرخ شعلے اٹھے۔ پھر ہوائی جہاز نے شہر کے اطراف ایک چکر لگایا اور وہ چاندنی سے زیادہ خوبصورت تھی' چاندنی سے زیادہ حسین' ایرانی شاعری کی روح کی طرح جمیل' اس کے لب لعلین چاندنی رات میں چمک رہے تھے۔ سینکڑوں میل دور ٹینکوں سے بچ بچ کا خون بہہ رہا ہوگا اور بچ بچ کے پناہ گزین غنڈوں کے ہاتھ لٹ رہے ہوں گے اور بچ بچ کی عورتیں اپنی عزت ــــ زمانہ امن کا تصور ــــ کو بچانے کے لئے کنوؤں اور باولیوں میں گر رہی ہوں گی۔ مگر یہاں تو ابھی تک صرف ہوائی جہاز کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ پلِ صراط کے اس پار تک' جس پر سے گزرتے ہوئے زریں تاج نے پوچھا۔ "اپنی کہانی سناؤں؟

اب ہوائی جہاز جا چکا تھا۔ اب پھر رات کے پرانے محرم راز کتے' سانپ اور جھینگر باقی رہ گئے تھے اور انسان کھڑکیوں کے شیشوں پر سیاہ کاغذ لگائے حشرات الارض کی طرح چھپے ہوئے تھے۔

اور چاندنی رات میں زریں تاج حد سے زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اپنے آپ سے ارشد نے اس طرح کہا گویا اسے زریں تاج کے ساتھ ہونے کا یقین نہیں آیا" میں نے دیکھے بغیر تجھ سے محبت کی۔ کاش مرنے سے پہلے' ایک بار تجھے دیکھ لیتا۔"

مگر وہ تو اس کے ساتھ پلِ صراط پر چل رہی تھی۔ چاندنی رات میں اور وہ مسکرائی۔ چاندنی رات میں چاند چڑھا اور موتی بکھر گئے۔

اور ارشد نے اس کی طرف نظر بھر کے دیکھا۔ گویا وہ پہلی مرتبہ چاند کو دیکھ رہا تھا۔ اسے نہیں دیکھا۔ مگر کتنی بار دیکھا ہے۔

تب زریں تاج کا کالا' طلسمی حوروں کا سا لباس چاندنی رات میں یکلخت چمکا۔ جیسے سڑک پر پڑا ہوا شیشے کا ایک ٹکڑا ــــ اور اس نے اپنا قصہ سنانا شروع کیا۔

میرا نام سیرا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ میں یونان سے ایران آئی۔ لیکن میرے خون کے ایک ایک قطرے میں عجمیت ہے۔ مجھے ایرانیوں نے شیریں کہا اور مجھ میں ایرانی نسوانیت کی مٹھاس بھر دی۔

میں رومی نژاد تھی' عیسائی تھی' مجھے کسی افسانہ نگار نے ماریس شہنشاہ کی بیٹی قرار دیا۔ کسی نے مہین بانو کی' لیکن میں ایرانیت میں اس قدر کھو گئی کہ نہ مجھے اور نہ کسی اور کو میرے اجنبی ہونے کا احساس تھا۔ مجھے ایران نے شیریں بنایا اور میں نے ایران کو اس کا سب سے پیارا افسانہ عشق دیا۔

خسرو نے رومیوں سے ہزار عورتیں چھینیں' ہزاروں کو بیوہ کیا۔ اس کے سپاہیوں نے ہزاروں کو بے آبرو کیا۔ یہ اس زمانے کا دستور تھا۔ تمہارے ملک میں اب تک یہی ہوتا ہے۔ میں تاریخ سے گھبراتی ہوں جو اپنے آپ کو نہیں دہراتی۔ مگر اپنی سیہ کاریوں کو ضرور دہراتی ہے۔ اس لئے نظامی گنجوی کے ساتھ ساتھ چلو۔

میں مہین بانو کی تربیت کا اعلیٰ نمونہ ہوں۔ مجھے شہسواری آتی ہے' شکار کھیلنا آتا ہے' راویوں سے کہانیاں اور نظمیں سننا آتا ہے'

ہیں مکالمات عشق میں ماہر ہوں اور اپنی سہیلیوں میں اس طرح دمکتی ہوں جیسے تاروں میں چاند۔ خسرو، جس کو اس کے مردانہ حسن کی وجہ سے سب پرویز کہتے ہیں، میرے حسن وجمال کی تعریف سنتا ہے مجھ پر نادیدہ عاشق ہو جاتا ہے اور مجھے ڈھونڈنے شیرویہ کو بھیجتا ہے۔ گویا شہزادہ "دل" ہے جو "نظر" کو میری تلاش میں روانہ کرتا ہے۔

اور میں شکار کھیل رہی ہوں اور اپنے تیر مژگاں سے ہرنوں کا شکار، اور اپنی ہرنوں جیسی آنکھوں سے دلوں کا شکار۔ میری سہیلیاں میرے ساتھ ہیں، جنھیں مہین بانو نے میری دلجوئی، میرا دل بہلانے اور میری نگرانی کے لئے مقرر کیا ہے۔ شیرویہ آتا ہے۔ دل کا چالاک وزیر، خسرو کا چالاک وزیر، اور پتھر پر اس کی تصویر بنا دیتا ہے، میں مبہوت رہ جاتی ہوں۔ سہیلیاں کہتی ہیں۔ "شیریں۔ شیریں تو خواب دیکھ رہی ہے، یہ طلسمات کا جنگل ہے" اور ہم سب وہاں سے آگے چلتے ہیں کسی اور جنگل میں جو زلفوں کی طرح تاریک ہے، جس میں صبا تک اچھی طرح شانہ نہیں کرتی۔ "اور یہاں مژگاں کو پھر ہرنوں کی نئی ڈار، نئے بسملوں، نئے مقتولوں کی تلاش ہوتی ہے۔ مگر وہ چالاک وزیر شیرویہ، بزرگ مہر کا خسر پھر آتا ہے، پھر پتھر پر ایک تصویر بناتا ہے۔ میں پھر محو ہو جاتی ہوں۔ گویا میں خواب میں چل پھر رہی ہوں۔ سہیلیاں پھر تاڑ جاتی ہیں کہ اس نقش کا رنگ گہرا ہو رہا ہے۔ مجھے پھر وہاں سے لے چلتی ہیں۔ ایک اور صحرا اور زلفیں اور ہرنوں جیسی آنکھیں، مژگاں کے اور سوفار، ابروؤں کی اور کمانیں۔ لیکن شیرویہ پھر آ پہنچتا ہے، اور ایک چٹان پر پھر خسرو کی تصویر بناتا ہے۔ اب میرا دل اپنے قابو میں نہیں رہتا۔ مجھے فارسی کی ایک روایت کو جنم دینا ہے۔

عشقِ اوّل در دلِ معشوق پیدا میشود

مجھے اس شہریار سے دل وجان سے محبت ہو جاتی ہے۔ جس کی یہ تصویر تھی۔ اس مرتبہ مہین بانو کی سکھائی ہوئی سہیلیاں مجھے بہلا نہیں سکتیں۔ جل نہیں دے سکتیں۔ وہ پتھر کا نقش میرے دل پر مرتسم ہو چکا ہے۔ میں چپکے سے ان کو چھوڑ کر نکل پڑتی ہوں۔ میں شہسوار ہوں۔ یہ صفت میں نے تاتاری معشوقوں سے لی اور ایرانی نازنینوں کو عطا کر دی۔ راستے میں چشمہ ملتا ہے چشمہ آب حیواں، چشمہ نرگس، چشمہ آب حیات، چشمہ تسلسلِ حیات۔ یہاں میں گھوڑے پر سے اتر پڑتی ہوں۔ میں کپڑے اتارتی ہوں۔ میں شاعروں کا سراپا بن جاتی ہوں۔ میری سیاہ زلفوں میں راتوں کی تاریکی اور سانپوں کا رنگ ہے، اور یہ زلف حبل المتین بھی ہے۔ میری آنکھیں نرگس ہیں، میری پیشانی چاند، میرے ہونٹ عقیق و لعل، میرے دانت موتی، میرے شانے آئینے اور پھر ناز پستان، موئے کمرے، ساقِ سیمیں میں جب ٹھہر جاتی ہوں سرو ہوں اور جب چلتی ہوں قیامت، یہ کیا غضب ہے کہ تمہارے شاعروں نے میرا سراپا تو یاد رکھا مگر مجھے بھول گئے۔

اور داستانوں کے شہزادوں کی طرح خسرو پرویز بھی اسی چشمے پر آ نکلتا ہے۔ بہرام کو شکست دینے کے بعد ہمارے افسانے میں کوئی مقام نہیں، کوئی موسم نہیں، کوئی دیار نہیں، زمین زمین ہے اور آسمان آسمان ہے۔ خسرو چشمے میں پہلے میرا عکس دیکھتا ہے، پھر میری جانسو زعریانی دیکھتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ مجھ تک پہنچ سکے۔ میں اپنا تن ڈھانک کے، اپنے بادپا ہوا پر سوار ہو کے اس کی نظروں سے او جھل ہو جاتی ہوں۔ مگر اسے اپنی نظروں سے گھائل کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے......

اور وہ شیرویہ کو مہین بانو کے پاس بھیجتا ہے۔ اس کی دال نہیں گلتی۔ مہین بانو مجھے سمجھاتی ہے کہ جو آسانی سے حاصل اور آسانی سے فنا ہو گیا وہ ہوس ہے اور وہ جو مشکل سے حاصل ہوا اور کبھی فنا ہوا کبھی فنا نہیں ہوا، عشق ہے اور وہ جو بڑی مشکل سے حاصل ہوا کبھی فنا نہیں ہو گا عرفان ہے اور وہ مجھے سمجھاتی ہے کہ ایرانی خواتین میں سے وہ جن کا صدیوں میں ایک آدھ بار بروز ہوتا ہے آسانی سے اپنے آپ کو اپنے عاشق کے حوالے نہیں کرتیں۔ عشق کی بجلی ٹھوکروں سے پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے "جفا" کی ضرورت ہے۔ جس کے بغیر "وفا" پیدا نہیں ہوتی۔ میں یہ سب سنتی ہوں، یہ سب مان لیتی ہوں کیونکہ مجھے تمہاری عجمی شاعری کی روایتوں کی تخلیق کرنی ہے۔ خسرو، مجھ تک پہنچنا چاہتا ہے اور میں اسے پہنچنے نہیں دیتی۔ شیرویہ آتا ہے اور ناکام واپس جاتا ہے۔ اب مہین بانو مر چکی ہے۔ اس کی جگہ

میں اپنی اقلیم کی ملکہ ہوں۔ خسرو پرویز دیارِ عشق کا شہریار ہے۔ میں دیارِ حسن کی ملکہ ہوں۔ زاری 'زر' زور کی طاقت مجھے آسانی سے حاصل نہیں کر سکتی۔

اور جب وہ مجھے پا نہیں سکتا تو شکر سے دل بہلانے لگتا ہے۔ تم جانتے ہو یہ شکر کون ہے۔ یہ عورت کا جسم ہے اور میں جو شیریں ہوں عورت کی روح ہوں۔ ایرانی عورت کی۔ شکر حرم میں داخل ہو سکتی ہے۔ میں یا ملکہ عالم ہو کے رہ سکتی ہوں یا پھر بھاڑ دی جاتی ہوں۔ خسرو شکر سے دل بہلاتا ہے۔ مگر شکر بھی اسے آسانی سے نہیں ملتی۔ وہ خسرو پرویز کو شراب کے نشے میں بدمست کر دیتی ہے اور ایک بدہیئت کنیز کو اپنی جگہ اس کے پاس بھیج دیتی ہے۔ جسم جسم سب برابر ہیں۔ یہاں تک کہ جب نشہ اترتا ہے تو خسرو پرویز کو غصہ آتا ہے۔ جسم جسم کا فرق اس پر ظاہر ہوتا ہے۔ وہی سراپا والی بات اور بالآخر شکر اسے مل جاتی ہے۔ لیکن میں جو شیریں ہوں۔ عجمی نسوانیت کی روح اب سے اب بھی دُور ہوں۔ بہت دُور۔ وہ اگر اپنے ملک کا بادشاہ ہے تو میں اپنے دیار کی ملکہ 'اور زاری 'زر' زور کسی کی مجھ تک پہنچ نہیں۔ زاری البتہ کبھی کبھی میرے کنگرہ بام سے ٹکرا جاتی ہے۔ مگر میرے سکون و اطمینان میں فرق نہیں آتا۔ میں شیریں ہوں۔ عجمیت کی روح کوئی خرید نہیں سکتا۔

نظامی نے بڑی بڑی غلطیاں کی ہیں۔ دربار کی ملی ہوئی شاعری سے اور توقع ہی کیا ہے۔ فرہاد کا قصہ بیچ کا نہیں بعد کا ہے' میں اسے بعد میں بیان کروں گی۔ اب خسرو پرویز میرے دیار میں آنا چاہتا ہے' دیارِ جمال میں۔ اس کی سپاہ' میرے دارالسلطنت میرے قلعے کے اطراف حیران کھڑی ہے۔ وہ خندق کے پاس کھڑا ہے' منت وزاری کر رہا ہے۔ میں ایک جھروکے میں نمودار ہوتی ہوں۔ وہ اندر آنے کی اجازت چاہتا ہے اور یہ اجازت اسے نہیں ملتی۔ وہ حجت کرتا ہے اور میں اس کو ہر حجت کا جواب دیتی ہوں۔ وہ وفا جتاتا ہے۔ میں اسے شکر کے عشق کا طعنہ دیتی ہوں۔ وہ مجھے جفا پر ملامت کرتا ہے۔ میں اسے جفا کے معنی سمجھاتی ہوں اور اسی طرح سوال و جواب ہوتے رہتے ہیں۔ آنکھوں کے جھروکوں سے حواسِ خمسہ سے شخصیتوں کی بجلی سے اور بالآخر میں اسے اندر آنے کی اجازت دیتی ہوں تو وہ مجھے مسحور کرنے کے لئے اپنی وارداتِ دل باربد کی زبانی سنواتا ہے' میں نکیسا کی زبانی اس کا جواب سنواتی ہوں۔ روح کی فصیل میں جگہ جگہ شگاف ہیں' جن میں اس کا امڈتا ہوا شکر داخل ہو چکا ہے۔ مگر قلب میں کوئی چیز محفوظ ہے۔ ایک زمہریر ہے جسے کوئی گرما نہیں سکتا پگھلا نہیں سکتا۔ کیونکہ میرا جوہر ایسا تھا کہ اسے کوئی خرید نہیں سکتا۔ خسرو پرویز نے مجھے خرید لیا۔ میری جنس خرید لی' میرا حسن خرید لیا' میری ہوس خرید لی۔ میری نسوانیت خرید لی۔ مگر اب بھی قلب میں ایک مقام ایسا تھا جہاں وہ پہنچ نہ سکتا تھا۔ "ہزار افسانہ" کے چالیس دروازوں والے قصر کی طرح میں نے ان میں سے انتالیس دروازوں کی کنجیاں اس کے حوالے کر دیں اور چالیسویں دروازے کی کنجی اس کے حوالے کرنا میرے بس کی بات نہ تھی' حالانکہ اس کی محبت' اس کا جسم' اس کی وجاہت جس نے اسے پرویز کا خطاب دلوایا مجھے بہت عزیز تھی۔

یہ چالیسویں کنجی کسی اور کے قبضے میں چلی گئی۔ میں نے نہیں دی۔ خود بخود چلی گئی۔ کیونکہ ان معاملات پر کسی کا اختیار نہیں اور جس شخص کے پاس یہ کنجی گئی۔ اس کا نام فرہاد تھا۔ وہ ایک مہندس تھا____اس کا ترجمہ اپنے زمانے کی زبان میں چیف انجینئر نہ کرنا____اس زمانے میں دو ہی طبقے تھے۔ ایک امیر اور دوسرا غریب اور مہندس مزدور تھا۔ میں تم سے کیا کہوں۔ میرا فرہاد نظامی کا فرہاد نہیں تھا وہ شیرویہ کی ضد تھا۔ وہ مزدور کا مظہر جمالی تھا۔ اس کے اعصاب پتھر توڑتے توڑتے فولاد کی طرح مضبوط ہو گئے تھے اور اس کے چہرے پر عشق کے درد کے ساتھ بھوک کا جلال تھا۔ لیکن پرویز سونے سے اس کی بھوک نہ بجھا سکا۔ وہ اس کے عشق ہی کا ایک حصہ تھی۔

بقیہ قصہ تو تم کو معلوم ہے۔ میری زبانی میرے رنج و درد کی کہانی سن کر تم کیا کرو گے۔ جب دیکھا کہ میں اپنا دل ہار چکی ہوں' تو وہ شہنشاہ جس کے لشکریوں نے لاکھوں کا خون بہایا تھا۔ اپنے آپ میں اتنی جرات نہ پیدا کر سکا کہ اس مزدور کو قتل کر سکتا۔ شیرویہ کا بھی یہی مشورہ تھا۔ شیر کے ساتھ ایک روباہ ہوا کرتی ہے۔ جس کا مشورہ ہمیشہ یہی ہوا کرتا ہے کہ جو گڑ سے مر سکتا ہے اسے زہر

دینے کی ضرورت نہیں۔

اور اس طرح جیسے مدن سینا نے اپنے عاشق سے وعدہ کیا تھا' خسرو نے میری طرف سے وعدہ کر لیا کہ اگر اس نے بے ستون کو کھود دیا تاکہ جوئے شیر پہاڑ کے اس طرف آ سکے تو میں اس کے حوالے کر دی جاؤں گی۔ وہ شہنشاہ جس کے حرم میں سینکڑوں عورتیں تھیں اور سینکڑوں عورتیں آ سکتی تھیں۔ اس قسم کے لین دین کو عار نہ سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ کام ناممکن بھی تو تھا۔

اور فرہاد وہ "گرسنہ مزدور، طرب گاو رقیب" اپنے تیشے سے پہاڑ کاٹتا رہا۔ وہ پتھر پر میرا نقش بناتا۔ جیسے شیرویہ نے رجھانے کے لئے میری دوشیزگی کے زمانے میں تین بار چٹانوں پر پرویز کا نقش بنا دیا تھا۔ فرہاد ہر بار میرا نقش بنا کے مایوس ہو جاتا۔ میرے حسن میں ایک بات تھی۔ جو وہ بار' بران نقوش میں پیدا کرنا چاہتا اور بار بار ہار جاتا وہ پھر سے اس مجسمے کے ٹکڑے کر دیتا اور پھر نئی تصویر کھودتا اور اس طرح پورا پہاڑ کٹ گیا۔

اور تب میرا شہریار شوہر بہت پریشان ہوا۔ اس نے پھر شیرویہ کو بلایا' شطرنج کے موجد کے نانا جان کو۔ اور روباہ نے پھر روباہی کی چال چلی میرے مرنے کی افواہ فرہاد کو پہنچائی ——— اور اس کم ہمت مزدور' کم ہمت مہندس نے اسی تیشے سے اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالا' جس سے اس نے میرے مجسمے بنائے تھے' بے ستون کو کھودا تھا' مجھے پالیا تھا۔ تمہارے اس ہندوستانی شاعر نے بہت خوب لکھا تھا۔ میری روح سُن کر پھڑک اٹھی۔ وہ مزدور' اپنی بے بسی کی رسوم و قیود کا کس قدر پابند تھا۔ مر جانے کے لئے اسے اسی تیشہ کی ضرورت ہوئی۔ وہ اپنے دل کی حرکت روک کے مر سکتا تھا یا بے موت کے اس طرح مر سکتا تھا کہ اس کی زندگی کے ہر ہر لمحے میں موت کا مزہ ہوتا۔ وہ سقراط کی طرح ہلاہل کا جام تلچھٹ تک مزے لے لے کر پی سکتا تھا۔ یہ رومیو کی سی موت کتنی بے معنی تھی۔

اور اب زرّیں تاج یعنی شیریں یعنی عجمی نسوانیت کی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہوئی اور اس نے کہا۔ کبھی کبھی مجھے اس کا بھی خیال آتا ہے کہ وہ اسی تیشے سے خسرو پرویز کی سلطنت اُلٹ سکتا تھا۔ مگر افسوس اس کا تیشہ درفشِ کاویانی نہ بن سکا۔

سائرن کی دلدوز چیخ پھر ہوا میں ذرا دیر کے لئے گونج کے خاموش ہو گئی۔

اور پھر زرّیں تاج نے کہا۔

میرا نام مہر النسا تھا۔ میں ایرانی تھی اور میرا ریشہ ریشہ ایرانی تھا۔ ماں باپ کے ساتھ میں ہندوستان آئی۔ مغلوں کے دربار میں میرے خاندان کو جگہ ملی اور وہ افسانہ تو تم کو معلوم ہی ہے کہ پائین باغ میں شہزادہ سلیم دو کبوتر میرے دونوں ہاتھوں میں تھما کے کسی کام سے گیا۔ ایک کبوتر پھڑ پھڑا کر اڑ گیا۔ اس نے واپس آ کے مجھ سے ناراض ہو کے پوچھا' کیسے اُڑ گیا تو میں نے دوسرا کبوتر بھی چھوڑ دیا۔ اور کہا۔ "ایسے اُڑ گیا۔" کہتے ہیں میری یہ ادا شہزادے کے دل میں کھب گئی اور مجھ پر دل و جان سے عاشق ہو گیا۔ جیسے وہ اس سے پہلے دل و جان سے انارکلی پر عاشق ہو گیا تھا اور اس سے پہلے .... ..

لیکن مجھے معلوم نہ تھا عشق و محبت کیا چیز ہوتی ہے۔ ابھی میں دوشیزہ تھی۔ میری ایرانیت ابھی خوابیدہ تھی۔ شہنشاہ اکبر البتہ جانتا تھا کہ محبت ذرا خطرناک سی چیز ہوتی ہے۔ اب اس کے لئے دو صورتیں تھیں کہ یا تو وہ مجھے انارکلی کی طرح دیوار میں چنوا دے یا کسی اور سے میری شادی کرا دے۔

میں ایسی حسین اور ایسی معصوم تھی کہ شہنشاہ نے مجھے قتل نہیں کیا۔ ایسا اکثر ہوا ہے کہ کسی نہ کسی شہنشاہ نے کسی نہ کسی زرّیں تاج کو قتل کرا دیا ہو۔ لیکن میں خوش قسمت تھی۔ میری شادی ایک بڑے ہی حسین مرد بڑے ہی بہادر آدمی سے کرا دی گئی۔ اس کی شجاعت کی وجہ سے اسے شیر افگن خاں کا خطاب دیا گیا اور اپنے شوہر کے آغوش میں مَیں نے پہلی بار محبت کرنا سیکھا۔

وہ بہادر تھا' جری تھا' اس کے قویٰ مضبوط تھے' اس کا سینہ چوڑا چکلا تھا' اور میں اس کے ساتھ خوش تھی۔ مجھے اس سے ایسی محبت

ہوئی جو کسی اور سے کبھی نہیں ہوئی نہ ہو سکتی تھی۔

مگر بادشاہ مرتے ہیں اور ان کی جگہ ان کے بیٹے بادشاہ ہوتے ہیں اور اپنا انتقام لیتے ہیں۔ مگر میرے جری اور بہادر شوہر نے تو جہانگیر کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ کبھی اس کی مخالفت نہیں کی تھی۔ وہ اس کے باپ کا وفادار تھا اور اس کے مرنے کے بعد اس کا وفادار رہا۔

اس پر بغاوت کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ سرکشی کا الزام نہ لگ سکتا تھا۔ اس لئے اسے ایک دن جب کہ وہ شکار کھیلنے گیا تھا۔ دھوکے سے قتل کرادیا گیا۔ وہی فرہاد والی بات۔ وہ جو شیر افگن تھا۔ شیروں کا شکار کھیلتا تھا شاہانہ۔ وہاں کا شکار ہو گیا۔

اور میں حرم میں لائی گئی۔ مہینوں اور برسوں میں داخل ہونے سے انکار کرتی رہی۔ مگر شہنشاہ کو تو جو نے پن سے مہر النساء کا دوسرے کبوتر کو اڑا دینا یاد تھا۔ اس لئے جوں جوں انکار بڑھتا گیا میری قیمت بڑھتی گئی۔

عورت کے خون میں قدرت نے کچھ عجیب کمزوری دی ہے جو جتنا زیادہ تعاقب کرتا ہے اپنے صیاد سے دور بھاگنے میں اس کی قوتِ ارادی اتنی ہی کمزور ہوتی جاتی ہے۔ جتنے عرصے تک یہ تعاقب جاری رہتا ہے اسی کی مناسبت سے اس کی مزاحمت گھٹتی جاتی ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقتول محبوب کے قاتل کو پہلے برداشت اور پھر پیار کرنے لگتی ہے۔ اس وجہ سے بھی بہت سی عورتیں جو تمہارے اس برِاعظم میں آجکل اغوا کی جاتی ہیں، اپنے ظالم عاشقوں کے چنگل سے چھوٹ کے آنا نہیں چاہتیں۔ کچھ اسی طرح کمزوری مجھ پر بھی حادی ہوتی گئی اور بالآخر میں نے "ہاں" کہہ دیا اور میں کئی بیں سے بیت۔ کئی بیگموں میں سے ایک ہو کے رہ گئی اور مجھے "نور محل" کے نام سے سرفراز کیا گیا۔ ایسی محلات کئی تھیں۔

محبت، یعنی اس قسم کی محبت جیسی مجھے شیر افگن سے تھی، اب میرے دل میں مر چکی تھی۔ بالکل مٹ چکی تھی۔ اس کی جگہ ایک عجیب طنزیہ محبت تھی۔ مقید طائر کی محبت صیاد کے ساتھ۔ گھوڑے کی محبت اپنے آقا کے ساتھ اور اس طنزیہ محبت میں میں نے گردو پیش کا جائزہ لینا چاہا تو اپنے آقا اور شہنشاہ اور نئے شوہر کو موم کا بنا ہوا پایا جس کے ہاتھ میں آہنی گرز دے دیا گیا ہو اور جس نے ہزار ہا شیر افگنوں اور ابوالفضلوں کے قتل کی تلافیِ مافات کے طور پر ایک طلائی زنجیر کھلونے کی طرح آویزاں کر رکھی تھی اور اسے زنجیر عدل کا خوش نما نام دیا تھا۔

سلطنت اس نے شراب کے ایک جام کے عوض میرے حوالے کر دی تھی۔ میں نے بہت سے امرا کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ میں نے اس کی کوشش کی کہ جہانگیر کے بعد میرا نام چلے۔

ادھر حسن و جمال کے محاذ پر میں نے بہت سی نفاستیں ایجاد کیں۔ عرقِ گلاب سے غسل کرنے کے اصول دریافت کئے، خوشبوؤں پیشوازوں، زیوروں میں نئی نئی ایجادیں کیں۔ میرے تاج میں ہیرے جگمگاتے تھے۔ انھیں میں سے ایک ہیرا جہانگیر بھی تھا۔

اور عین اس زمانے میں جو میرے عروج کا زمانہ تھا ایک درویش نے میرے شہنشاہ شوہر کے سامنے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ شیخ احمد سرہندی کے متعلق میں نے جہانگیر کو بہت سمجھایا۔ ان لوگوں میں ایک بڑی آرزو یہ ہوتی ہے کہ بادشاہوں سے اونچے سمجھے جائیں۔ میں نے شہنشاہ سے کہا اسی تیری سلطنت میں برہمن کھتریوں سے افضل سمجھے جاتے ہیں۔ درویشوں کا عجیب عالم ہوتا ہے۔ اگر تو انھیں قتل کر دے تو دنیا قیامت تک تجھ پر نفرین بھیجتی رہے گی اور ان کو شہید تصوّر کر کے ان کے مزار کی زیارت کو آیا کرے گی۔ اس کو اپنے حال پر چھوڑ تجھے ہندوستان کی شہنشاہی میسر ہے۔ اسے دل کی شہنشاہی کرنے دے۔ وہ تیرا کیا بگاڑ رہا ہے؟

لیکن ایک پیالی کے عوض سلطنت میرے ہاتھ بیچ چکنے پر بھی جہانگیر کو طاقت کا گھمنڈ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اور سر ہندوستان میں اس کا اتنا بلند ہو یا اس کے آگے نہ جھکے۔ آخر وہی جہانگیر تو تھا جس نے ابوالفضل کو اور میرے شیر افگن خاں کو قتل کرادیا تھا۔

اس نے دربار کیا اور کھڑکی اتنی نیچی بنائی کہ سر جھکا کے آنا پڑتا۔ شیخ احمد سرہندی بیٹھ کے اس طرح آئے کہ پہلے ان کے پیر دربار میں داخل ہوں اور جو سر خدا کے آگے جھکا ہے کسی اور کے سامنے نہ جھکے۔

شیخ احمد سرہندی کے بہت سے مرید تھے۔ ان میں مہابت خاں بھی تھا اور ہم لوگ کشمیر میں تھے کہ اس نے ہمارے لئے جال تیار کیا۔

وہاں ڈل جھیل کے کنارے فواروں کے نیچے چراغاں تھا۔ جہاں پناہ کو میں جام بھر بھر کے دیتی جاتی تھی۔ کھلی ہوئی فضا میں' آسمان کے نیچے راجپوت رقاصہ مارواڑی ناچ ناچ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دور پر پہاڑ برف کے تاج پہنے کھڑے تھے جو چنار جہاں پناہ نے نصب کئے تھے۔ ابھی چھوٹے چھوٹے تھے' لیکن بید مجنوں کے جھنڈ جھیل کے کنارے کنارے بہت حسین معلوم ہوتے تھے۔ ہمیں معلوم ہوتا تھا کہ پورا ہندوستان ہمارے قدموں پر لوٹ رہا تھا اور پیر پنجال کے برف پوش پہاڑوں کے اس پار مہابت خاں ہمارا راستہ روکنے کی تیاری کر رہا تھا۔

اور اس نابنجار نے اس طرح جہاں پناہ کا اور میرا راستہ روکا جیسے کوئی شطرنج میں شہ دیتا ہے لیکن ادب سے شاہِ شطرنج کو پیٹتا نہیں۔ شیخ احمد سرہندی کی درویشی آخر رنگ لائی۔ میں نے بھی اس نابنجار مہابت خاں کو بہت سمجھایا۔ مگر جہاں پناہ اس کے چنگل میں تھے' سارا ہندوستان انھیں بچانا چاہتا تھا اور نہیں بچا سکتا تھا اور مہابت خاں اگرچہ صیاد تھا اس کی مجال نہیں تھی کہ اپنے آقا پر ہاتھ اٹھا سکے۔ میں اب وہ مہرالنساء نہیں تھی جس نے دونوں ہاتھوں سے کبوتر اڑا دیئے تھے۔ میں نے ہندوستان کی سیاسی شطرنج کے سب مہرے چل کے بالآخر بادشاہ کو بچا لیا۔

اور اسی طرح کشمیر سے واپسی میں جہاں پناہ شکار کے لئے ایک پہاڑ کے دامن میں ٹھہرے۔ میں ابھی تک اسی طرح ان کے دل پر' ہندوستان پر حکومت کر رہی تھی۔ اب بھی میں شراب کا جام بھر بھر کے دیتی جاتی تھی کہ ایک شکاری پہاڑ سے نیچے گرا اور ہڈی پسلی چور چور ہو گئی۔ جہاں پناہ کی طبیعت اسی وقت سے خراب ہو گئی۔ میرے ہاتھ سے انھوں نے شراب کا جام پھر لیا مگر اب یہ نشاط کا جام نہیں تھا علاج کا جام تھا۔ مجھے حیرت تھی یہ وہی آدمی ہے جس نے ابوالفضل کو قتل کرایا' شیر افگن کو شکار کرادیا جس نے زندہ عورتوں کی کھالیں کھچوا دیں' جس نے مردوں کو دیواروں میں زندہ چنوا دیا۔ اس وقت ایک معمولی سے قدرتی واقع سے اتنا متاثر تھا۔

اور پھر کوئی طاقت جہانگیر کو سنبھال نہ سکی۔ اس کی نبض ڈوبتی ہی گئی' اس کے ساتھ میرے اقبال کا سورج ڈوبتا گیا۔ سلطنت سوتیلے بیٹے کے ہاتھ آئی۔ مہرالنساء تو کبھی کی مر چکی تھی۔ اب نور جہاں بیوہ ہو کر جیتے جی مر گئی۔ وہ جو گلاب کے عرق میں غسل کیا کرتی تھی' جس نے مہابت خاں کا کفر توڑا تھا۔ یہاں تک کہ راوی کے کنارے لاہور کے قریب آرام کرنے کا وقت آ گیا۔

چاندنی اسی طرح درختوں کے سبز رنگوں کو گہرا کر کے فضا میں ٹھنڈی ٹھنڈی آگ بکھیر رہی تھی۔

زرّیں تاج خاموش ہو گئی۔

پھر زرّیں تاج نے کہا۔

میرا نام زرّیں تاج تھا۔ میں قزوین میں پیدا ہوئی۔ میں اتنی ذہین تھی کہ اس مرد سے جو میرے باپ میں تھا عورت سے صدہا سال کی رقابت سلب ہو گئی اور اس نے مجھے بہت اعلیٰ تعلیم دلائی۔ جیسی ہونہار لڑکوں کو دلائی جاتی ہے۔ حدیث' تفسیر' فقہ' الٰہیات' میں نے مردوں کی طرح سیکھا اور مردوں سے زیادہ بہتر میں مناظرہ کر سکتی تھی۔

جب میں پڑھ لکھ چکی تو میری شادی میرے چچازاد بھائی ملا محمد سے کر دی گئی۔ عربوں میں ابن عجم سے عشق مشہور ہے' مجھے اپنے ابن عجم سے ہمیشہ چڑ تھی۔ ملا محمد کو بھی علم و فضل کا بڑا دعویٰ تھا۔ مگر میں اسے چٹکیوں میں اڑاتی تھی۔ میں خود علوم میں اس قدر کامل تھی

کہ مجھے کامل تر مرد کی تلاش تھی۔ ایسے مرد کی جو میرے ذہن کی گردن مروڑ سکے۔

پھر جب میں نے محمد علی باب کے حالات سنے تو اسے ایک خفیہ خط لکھا۔ وہ بہت سن رسیدہ تھا اور میں جواں سال تھی۔ لیکن میں اس کے جمال سے بن دیکھے اس کی طرف کھنچی جاتی تھی۔ ایک طاقت تھی جو اندر ہی اندر مجھ سے کہہ رہی تھی۔ تیری منزل وہی ہے۔ جب باب کا جواب مجھے ملا تو میں بے دیکھے اس پر ایمان لے آئی۔ کچھ روز میں نے اپنی بابیت کو پوشیدہ رکھا اور پوشیدہ طور پر اسے خط لکھتی رہی۔ جب اس کا جواب آتا تو بصیرت کی آنکھ کھل سی جاتی اور جو عورت مجھ میں تھی وہ کہتی تجھے تیرا مقام مل گیا۔

یہاں تک کہ جب باب نے دیکھا کہ علم مناظرہ اور جوش بحث میں بڑے بڑے فاضل میرے مقابل ٹھیر نہ سکیں گے تو اس نے مجھے کھلم کھلا تبلیغ کا حکم دے دیا۔ وہ جو آفتاب بصیرت تھا اس نے مجھے قرۃ العین (آنکھ کی پتلی) کا خطاب دیا۔ دوسرے بابی بھی مجھ سے بحث کرتے کرتے عاجز آجاتے۔ انھوں نے باب سے میری شکایت لکھ کر بھیجی۔ اس پر باب نے طاہرہ کا لقب دیا۔ اس لقب کو میں نے اپنا تخلص بنالیا۔

میں نے اپنے شوہر کو بابیت کے نور سے منور کرنا چاہا۔ وہ میرے خیالات کیا بدل سکتا۔ لیکن میں بھی اس کے دل میں چراغ نور نہ جلا سکی۔ دراصل یہ مرد کے ذہن اور عورت کے ذہن کی ٹکر تھی۔ ایک عورت جو صدیوں کے بعد پھر ابھری تھی، ایک ایسے مرد سے بیاہی گئی تھی جس کی ذہانت صدیوں کے استعمال سے فرسودہ ہو گئی تھی۔ پھر میرا شوہر شیر افگن نہیں تھا جسے میں ہمیشہ کے لئے دل سے چاہتی وہ خسرو پرویز تھا۔ وہی فاتحانہ ملکیت کا دعویٰ۔ اس لئے کہ نکاح کے چند کلمے پڑھا کے میں اسے سونپ دی گئی۔ میری نس نس میں بغاوت جاگ اٹھی۔ میرے لہو کی بوند بوند میں محمد علی باب کا جگایا ہوا جادو تھا۔ میری آنکھوں نے کبھی باب کو نہیں دیکھا۔ میں کبھی اس سے نہیں ملی۔ لیکن وہ ہر وقت حاضر اور موجود تھا اور اس کی موجودگی سے اس دائمی حضور سے میرے شوہر ملا محمد کی ہستی میری نظروں میں صفر سے کم رہ گئی۔

آخر میرے شوہر نے اپنے والد اور میرے والد سے شکایت کی۔ انھوں نے مجھ پر بہت دباؤ ڈالنا چاہا میں نے کسی ایک کی نہ سنی اپنے باپ سے میں نے کہا کہ میں طاہرہ ہوں۔ باب نے مجھے طاہرہ کا لقب دیا ہے۔ میرا شوہر حق سے منہ چھپاتا ہے اور اس لئے وہ خبیث و مردود ہو گیا ہے۔ طاہرہ کا کسی خبیث سے جنسی تعلق باقی نہیں رہتا اور جنسی تعلق باقی نہ رہنا طلاق کے برابر ہے۔ پھر اپنے والد کو قائل کرنے کے لئے میں نے بحث شروع کر دی کہ کیا مکہ کی جو عورتیں ایمان لے آئی تھیں۔ مگر ان کے شوہر بدستور کافر رہے تھے انھیں رسول اللہؐ نے بلا طوق دوسروں کے نکاح میں نہیں دے دیا تھا؟

اس درمیان میں میں باب سے دور تھی۔ میری آنکھیں کبھی روبرو اُس کا عمال کا مشاہدہ نہ کر سکیں۔ میری روح اسے ڈھونڈتی تھی کہ اسے اپنا حال سنائے اور جب میری روح اس مردِ کامل کے لئے تڑپ رہی تھی۔ عقلِ نسوانی 'مردانہ وجدان کی برق کی متلاشی تھی۔ میں نے اپنے ذہن پر فکرِ سخن کے دروازے کھلتے دیکھے۔ وہ مجھ سے دُور تھا اور میری روح اس کے لئے بے تاب تھی۔ وہ کہیں مجھے مل جاتا تو میں کس کس طرح سے اسے حالِ دل سناتی۔

گر بہ تو افتدم نظر چہرہ بہ چہرہ رو بہ رو
شرح دہم غم ترا نکتہ بہ نکتہ مو بہ مو

تمھارے اقبال نے اس شعر کو پسند نہیں کیا۔ غالب کی عیاشی کو بھی اس نے اپنے جاوید نامے سے نکال باہر کیا۔ لیکن باب کا تصور میری نظروں میں معشوق بکا تھا۔ معشوق حقیقی کے مظہر کا اور ساتھ ہی ساتھ مکمل مرد کا جس کی روح کائنات کو آغوش میں لئے ہوئی تھی۔

دور دہانِ تنگِ تو عارضِ عنبریں خطت

غنچہ بہ غنچہ گل بہ گل لالہ بہ لالہ بو بہ بو

یہ زمانہ میرے لئے عجیب و غریب جذب و احساس کا زمانہ تھا۔ یہ عشق کا زمانہ تھا۔ نشاط و فنا کی لہریں یکے بعد دیگرے پیدا ہوتیں، کبھی مجھے بقائے دوام بخشتیں، کبھی لمحہ لمحہ نئی موت نئی لذتِ مرگ عطا کرتیں۔

اس نے مجھے طاہرہ کا خطاب دیا تھا۔ یہی میرا تخلص تھا اور میں نے آبشار گرتے دیکھے۔ الفاظ کے آبشار اور پھر جو میں نے آنکھ کھولی تو ان آبشاروں کی لگام میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے قرآن مجید سے شوکت لی اور متنبی کے ترنم کو قاآنی کے ترنم میں حل کر دیا۔ ایران کی خاک سے ایک ہزار شاعر اُٹھے تھے۔ میں پہلی شاعرہ تھی جو ان ایک ہزار شاعروں سے آگے کھڑی تھی اور میری انگلیوں کے درمیان سے یہ عظیم الشان آبشار گر رہا تھا۔

چہ شود کہ آتشِ حیرتے بزنی بہ قلہ طور دل
فلکتہ' دوکتہ' متدکدکا' متزلزلا

یہ آبشار الفاظ ہی کا نہیں تھا، ایک جہاں سوز عشق کی آگ تھی، سیال آگ جو اس آبشار سے گرتی چلی جا رہی تھی، جس کی تہہ میں نیستی کے نہنگ منہ پھاڑے ہوئے تیار تھے کہ مجھے اور دوسروں کو نگل جائیں۔ میں نے اپنی طرح دوسروں کو ان نہنگوں کے خروش لاسننے کی دعوت دی۔

اب آبشار کے گرجتے ہوئے تخت پر وہ جلوہ افروز تھا۔ محمد علی باب۔ اس کے چہرے کا قدس، ظہور حق کی بشارت دیتا تھا۔ جس کسی نے اس کا راستہ اختیار کیا وہ تو محنت اور ابتلا سے بچ گیا۔ لیکن جس نے اس سے سرتابی کی تو گویا وہ داورِ محشر کی طرح تختِ قیامت پر متمکن تھا، قہار اور جبار۔ کامل مرد، مجھ کو اور میرے ساتھ ساری کائنات کو سرتابی کے جرم میں فنا کرنے والا۔ قہار اور جبار ہی نہیں تھا۔ اس میں رحم و لطف شہنشاہی کی تمام صفتیں بھی تھیں۔

کسے ار نہ کردا طاعتم نہ گرفت حبل ولایتم
کُنمش بعید زساحتم و ہمش بہ قہر بیادلا
منم آں ظہور مہیمنی، منم آں مینت بے منی
منم آں سفینہ ایمنی و تصد ظہرت مجلجلا
شہدائے طلعتِ نارِ من، بدرید سوئے دیارِ من
سروجاں کینندر نثارِ من کہ منم شہنشہ کربلا

اور باشوکت، باعظمت اُگرجدار آبشار تھی کہ بلندیوں سے گرتا ہی جاتا تھا۔ عرش سے فلک۔ جلال سے جمال تک۔ اس کی ہمہ گیر ہستی سے میرے حساس ذہن تک

طیر العماء تکلفکفت، ورق الہہا تصفصفت
دیک الیفاء و رقت متجملا متجلا

اس سیلاب، اس آبشار میں میرا شوہر ملا محمد قزوینی خس و خاشاک کی طرح بہ گیا۔ میں اب بڑے انہماک سے بابیت کی تبلیغ کرنے لگی تھی۔ جب قزوین میں مزاحمتیں بہت بڑھ گئیں تو میں کربلا چلی گئی۔ تقریروں میں جوش اور سرور کے عالم میں میں اکثر چہرے سے نقاب اُلٹ دیتی اور وہ جو مجھ سے بڑی بڑی عالمانہ بحثیں کرتے ہوئے میرے ذہن کے تمام حربوں کے بعد حسن کے اس حربے سے اتنے مسحور ہو جاتے کہ بحث کرنا بھول جاتے۔ یہ وہی زلیخا اور زنانِ مصر والی ترکیب تھی۔ آخر میں عورت تھی۔ عورت کا آخری حربہ کیوں نہ استعمال کرتی۔

بدرالنسا کی معصیت کے مصنف نے اتنا غلط نہیں لکھا کہ میں آہستہ آہستہ پردہ توڑ رہی تھی۔ براؤن سے میکڈانل نے محض میری مروت میں کہہ دیا ہوگا کہ میں پردے کی پابند تھی۔ لیکن میرا کام تو تمام پابندیاں توڑنا تھا۔ فرہاد کی پابندیاں 'شیریں کی پابندیاں یعنی تخیل کی پابندیاں' اور موضوعِ جمال کی پابندیاں۔ میں نے باب کی روحانیت کے ساتھ مزدک کی تعلیم کو حل کر دیا۔ میں اپنے ہی محاذ پر لڑتی رہی۔ باقی عورت کے محاذ پر۔ ابھی تک تو وہ جماعت نہیں بنی تھی اور قوم السلطنت نے نہ وزارت کی تھی نہ نکالے گئے تھے۔ لوگ جمال الدین افغانی کا نام ڈر ڈر کے لیتے تھے۔ میری طرح وہ بھی ایک متعصب کا فرہائی تھا۔ دونوں نے ناصر الدین شاہ قاچار کو للکی تھی اور دونوں کا کام بادشاہوں پرویزوں' جہانگیروں نے تمام کیا۔ وہ مردوں کی جمہوریت کے محاذ پر لڑا' میں روحانی جمہوریت اور عورت کی آزادی کے محاذ پر لڑتی رہی۔ میں مزدک کی ہم خیال تھی کہ کیوں عورت ایک ہی مرد کی پابند بنادی جائے ممکن ہے کہ اس کا مرد مُلا محمد قزوینی جیسا خشک نوجوان ہو۔ نقاب کے شگاف کو میں نے اور زیادہ چاک کر دیا تاکہ عورت کی صورت اور اس کے دماغ اچھی طرح پہچانے جاسکیں۔

جب میں کربلا سے نکالی گئی تو بغداد پہنچی۔ وہاں سے نکالی گئی تو کرمان شاہ اور ہمدان ہوتی ہوئی پھر قزوین واپس آگئی۔ اب باب کا جمال میری ہستی میں اس قدر بس چکا تھا اور اپنے شوہر سے میری نفرت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ میں نے بابیوں کو فتویٰ دے دیا کہ وہ میرے شوہر مُلا محمد اور اس کے باپ مُلا تقی کو قتل کر دیں۔

اور اس طرح جیسے تمہارے ملک میں ہوتا ہے ذرا سا اشارہ پاتے ہی انھوں نے میرے خسر کو نہ صرف قتل کیا بلکہ ناک کان کاٹ کر اس کی لاش کو مسخ کر دیا۔ اب سارا قزوین میرا اور تمام بابیوں کا جانی دشمن تھا۔ لوگ مجھے قتل کرنے پر تُلے ہوئے تھے میں نے چھپ چھپا کے خراسان کا رخ کیا۔ جہاں شاہِ ایران کے خلاف بغاوت عروج پر تھی۔

راستے میں مجھے محمد علی بارفروشی ملا محمد علی باب میرے لئے مرد کی روح اور وجدان تھا۔ محمد علی بارفروشی مرد کا ذہن اور جسم اور تم نے بہت سے قصّے تو سنے ہوں گے۔ کیونکہ آوارگی کے قصّے عورت کی زندگی میں شروع ہوتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے۔

سبز درختوں کے گہرے سائے میں زرّیں تاج قدم سے قدم ملائے ارشد کے ساتھ چلی جا رہی تھی۔ اپنی داستان سناتی ہوئی نقاب الٹی ہوئی تھی' اس کا چہرہ چاند کی روشنی میں چاند سے زیادہ بے جان اور ٹھنڈا معلوم ہو رہا تھا۔ ارشد نے اس سے پوچھا۔ "تمہارے اور محمد علی بارفروشی کے درمیان کیا واقعہ پیش آیا۔ کیا سچ مچ اس کے جسم سے تمہارے جسم کو محبت تھی۔ تم جو غائبانہ طور پر تمام عمر محمد باب کی روح کی شیدا رہیں۔

وہ مسکرائی۔ چاند کی سی ٹھنڈی مسکراہٹ جس سے پتہ نہیں چلتا کہ اس کرے پر زندگی کے آثار ہیں یا نہیں اور کہنے لگی "خدا جانے جب تم نے کسی عورت کے متعلق ایسا کوئی الزام سنا ہے تو کیا تم کبھی یقین سے کہہ سکتے ہو کہ یہ الزام صحیح ہے یا غلط۔ صرف ملزم عورت اور ملزم مرد جانتے ہیں کہ یہ کتنا صحیح ہے اور کتنا غلط اور کبھی کبھی جو واقعہ پیش آچکا ہے غلط معلوم ہوتا ہے اور جو پیش نہیں آیا ہے صحیح معلوم ہوتا ہے۔"

قصہ مختصر یہ کہ میں اس سے بارہا ملی۔ خلوت کی ملاقاتیں کی۔ باب میرے لئے محض روح تھا۔ ملا محمد محض جسم' محض ہوس۔ محمد علی بارفروشی ان دونوں کے درمیان تھا' ذی روح جسم' جسم کے اندر جان۔ میں اس سے بے حجاب ملتی رہی۔ اگر کوئی ان ملاقاتوں کو ناجائز کہتا ہے' فاسقانہ قرار دیتا ہے' قرار دے لے۔ مجھے ایسے مرد کے جسم کی ضرورت تھی جو میری ٹکر کا ہو۔ جس سے مل کے میں آپنے آپ کو اس سے بدتر نہ سمجھوں۔ اس کے علاوہ میں عورت تھی۔ عورت کے جسم میں مجھے مرد کے جسم کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنے

باپ کو اس کے حوالے کر دیا۔

یہاں تک کہ قزاقوں نے قافلہ لوٹا اور ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ میں گرفتار ہو کر طہران آئی۔ یہاں میں افواہ اور افسانہ بن گئی۔ شیریں کی طرح' نور جہاں کی طرح۔ لوگوں نے مجھے اسیر زندان کو طہران کی گلیوں میں دیکھا۔ ہارون الرشید کی طرح۔ میری شہرت سُن کے ناصر الدین شاہ قاچار جہانگیر بن گیا۔ گویا میں نے روحانیت کا دوسرا کیوتر بھی نور جہاں کی طرح بڑے بھولے پن سے اڑا دیا تھا۔ لیکن میں جو کبھی نور جہاں تھی نور جہاں کی زندگی سے سبق لے چکی تھی۔ میرا شیر افگن محمد علی بار فروشی مجھ سے چھن چکا تھا۔ مگر میں شراب کے ایک پیالے کے عوض کسی شہنشاہ کے سلطنت خرید نانہ چاہتی تھی۔ جمال الدین افغانی کی طرح اپنے سوتیلے رفیق کی طرح میری زندگی کا مقصد بھی شہنشاہوں کے تختے اُلٹنا تھا۔ فرہاد کے تیشے کو زمین کی گہرائی میں دفن کرنا تھا۔ ناصر الدین شاہ نے جب مجھے اپنی خاص الخاص ملکہ' اپنی نور جہاں بنانا چاہا تو میں ہنسی۔ ایک شعر جو میں نے بڑی عقیدت سے انکسار و عجز کے عالم میں باب کے لئے لکھا تھا' اب استغناء طنز کے عالم میں شہنشاہ کو لکھ بھیجا۔

تو و ملک وجاہ سکندری' من ورسم و راہ قلندری

اگر آں خوش است تو در خوری' وگرایں بداست مرا سرا

اور ظاہر ہے کہ اس جرات انکار کی سزا مجھے کیسے نہ ملتی۔ میں بڑی بے دردی سے قتل کی گئی۔ اپنی موت کا مزا اور اس کی تفصیل مجھے یاد نہیں۔ باغ میں گانت سے میرا گلا گھونٹ دیا گیا یا مجھے کنویں میں دھکیل دیا گیا اور کنویں کو پتھروں سے پاٹ دیا گیا یا میری زلفیں چاروں طرف سے کاٹ ڈالی گئیں اور باقی بالوں کی خچر کی دم میں باندھ کے گھسیٹتے ہوئے مجھے دار القضا لے گئے۔ غرض ہم ایرانی بھی تم ہندوستانیوں سے کم وحشی نہیں۔

پھر زور سے سائرن بجا اور دفعتہً رُک گیا۔ یہ وہ ہوائی جہاز تھا جو چوری سے لڑائی کا سامان لایا کرتا تھا۔ چند منٹ بعد پھر سائرن کی دلدوز چیخ سنائی دی' اور سکرات کی طرح اکھڑے ہوئے سانس کی طرح سنائی دیتی رہی۔ دو ہوائی جہاز دیکھ بھال کی اڑان کرنے کے لئے دور پر دو سبز اور سرخ نقطوں کی طرح پرواز کر رہے تھے۔ قریب ہی گھڑ گھڑاہٹ کی آواز آئی۔ سڑک پر۔ یہ اس کی اپنی جیپ تھی۔ بالآخر شیخ احمد اسے اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

زرّیں تاج مسکرائی۔ چاند کی پھیکی موہوم مسکراہٹ۔ چاند میں پانی نہیں ہوتا۔ اس لئے زندگی نہیں ہوتی۔ زرّیں تاج ایک خاص تمدن کی پیداوار تھی۔ اگرچہ وہ اس سے آگے آگے رہی۔ اب اس جیپوں کی دُنیا میں اس کا کیا کام تھا۔ وہ جو اعلیٰ ترین فارسی شعر لکھتی تھی۔ اب گویا ایک کا چستانی سُر الاپ رہی تھی۔ تم اونچی سڑک پر جاؤ۔ میں نیچی سڑک سے جاؤں گی۔ دوراہہ آ چکا تھا۔

وہ تو ماضی کی طرف چلی گئی۔ چاندنی میں غائب ہو گئی اور ارشد نے جیپ میں بیٹھ کے محسوس کیا کہ اس کے لئے مستقبل ابھی بہت بہت دُور تھا۔

آخری کوشش

حیات اللہ انصاری

ٹکٹ بابو نے گیٹ پر گھسیٹے کو روک کر کہا:
"ٹکٹ!"
گھسیٹے نے گھگھیا کر بابو کی طرف دیکھا۔ انہوں نے ماں کو گالی دے کر اسے پھاٹک کے باہر دھکیل دیا۔ ایسے بھک منگوں کے ساتھ جب وہ بلا ٹکٹ سفر کریں اور کیا ہی کیا جاسکتا ہے؟
گھسیٹے نے اسٹیشن سے باہر نکل کر اطمینان کی سانس لی کہ خدا خدا کر کے سفر ختم ہو گیا۔ راستہ بھر ٹکٹ بابوؤں کی گالیاں سنیں' ٹھوکریں سہیں' بیسیوں بار ریل سے اتارا گیا۔ ایک اسٹیشن سے دوسرے تک پیدل بھی چلنا پڑا' ایک دن کے سفر میں بائیس دن لگے مگر ان باتوں سے کیا؟ کسی نہ کسی طرح اپنے وطن تو پہنچ گئے ___ وطن! پچیس برس کے بعد وطن۔ ہاں پچیس ہی برس تو ہوئے۔ جب میں کلکتہ پہنچا ہوں تو کالی مل کھلی تھی اور اب لوگ کہتے ہیں کہ اس کو کھلے پچیس برس سے زیادہ ہو گئے۔ آگئے وطن۔ ہاں اب فاصلہ ہی کیا ہے۔ اگر یاد غلطی نہیں کرتی ہے تو دو کوس کا کچا راستہ اور ___ وہ گھنٹہ کی بات۔
اپنا گھر! اپنے لوگ! وہ نعمتیں جن کا پچیس سال سے مزا نہیں چکھا۔ کلکتہ میں گھر کے نام کو سڑک تھی یا دکانوں کے تختے' یا پھر شہر سے میلوں دور ٹھیکیدار کی جھونپڑیا۔ جس کی زمین پر اتنے آدمی ہوتے تھے کہ کروٹ لینے بھر کی جگہ نہ ملتی تھی۔ رہے اپنے لوگ سو وہاں اپنا کون تھا؟ سب غرض کے بندے' بے ایمان' حرامزادے' ایک وہ سالا تھا بھوندو' اور وہ دوسرا تھا بھورا' اور وہ ڈائن بھنگوی جو خونچے کی ساری آمدنی کھا گئی۔ وہ ملوں کے مزدور ___ بھائی ہیں بھائی ہیں۔ مگر مزدوری کا موقع آیا کہ ہر ایک کو اپنی اپنی پڑ گئی۔ جہاں جاؤ کوئی دوسرا مزدور سفارش لئے موجود۔ یہاں سفارش کرنے والا کون تھا؟ ___ جب جیلر نے آکر مجھے حکم سنایا ہے کہ "تیری میعاد ختم" تو آنکھوں سے نہ جانے کیوں آنسو نکل آئے۔ بس اکدم سے گھر کی یاد آئی۔ گھر! کیا پیزے ہے!
گھسیٹے کے دل کو یقین تھا کہ پچیس سال کی تھکی ماندی آتما کو گھر پہنچتے ہی سکھ مل جائے گا' اور گھر اب قریب تھا۔
اسٹیشن سے کچھ دور آکر گھسیٹے بھونچکا سا رہ گیا۔ یہاں کی دنیا ہی اب اور تھی۔ کھیتوں اور باغوں کی جگہ ایک شکر مل کھڑی دھواں اڑا رہی تھی جس کی عمارتیں یہاں سے وہاں تک نظر آتی تھیں' کچی سڑک کی جگہ اب پکی سڑک تھی اور اس کے برابر مل تک ریل کی پٹریاں بچھی ہوئی تھیں سڑک خوب آباد تھی' مزدوروں کے بہت سے چھوٹے چھوٹے غول آجا رہے تھے۔ اتنی دیر میں کئی موٹریں فرائے بھرتی نکل گئی تھیں۔ ایک مال گاڑی چھک چھک کرتی جا رہی تھی۔ غرضیکہ جغرافیہ اتنا بدل گیا تھا کہ راستہ پہچاننا بس سے باہر تھا لیکن پھر بھی گھسیٹے کا دل اس بات پر راضی نہ ہوا کہ میں اپنے اسٹیشن پر اتر کر' اپنے ہی قصبہ کا راستہ پوچھوں۔ یہ آپ ہی آپ ایک طرف مڑ گیا۔ تھوڑی دور آکر جب شکر مل کی حدیں ختم ہونے لگیں اور اوکھ کے کھیتوں اور باغوں کا سلسلہ آگیا۔ تب اس کے دل نے دھڑک کر کہا میرا راستہ ٹھیک

ڈیڑھ کوس چلنے کے بعد اپنے قصبے کے تاڑ دکھائی دینے لگے۔ ذرا اور چل کر شاہی زمانے کی ایک ٹوٹی ہوئی مسجد ملی جس کا ایک مینار ٹوٹا جھکی ہوئی اینٹوں سے منڈھا اور جنگلی کبوتروں سے آباد تھا اور دوسرا تقریباً مسلم زمین پر لیٹا کائی کی مخملیں چادر اوڑھے تھا۔ اس پر نظر پڑنا تھی کہ بچپن کی بہت سی چھوٹی چھوٹی یادیں جو کب کی بھول چکی تھیں' پچیس برسوں کے بھاری بوجھ کے نیچے سے اکدم پھڑ پھڑا کر تڑپ کر نکل آئیں اور کمسن دیہاتی چھوکریوں کی طرح سامنے اُچکنے کودنے لگیں۔ وہ زمانے آنکھوں کے سامنے پھر گئے جب اس مسجد کے گرد برساتی پانی بھر جاتا اور گاؤں بھر کے لونڈے ننگے اس میں نہاتے تھے۔ اس وقت بھی یہ کھڑا مینار یونہی کھڑا تھا اور لیٹا مینار یونہی لیٹا تھا۔

آگے چل کر برگد کا درخت ملا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں' ہیرا' بقاتی' بلاقی' پھو' نیولا' سورج' بلی اور وہ کنوا سالا کیا نام تھا اس کا' اور کون کون' ساری کی ساری ٹولی جمع ہوتی تھی اور دن دن بھر سیار مار ڈنڈا اڑا کرتا تھا۔ وہ گڑھیا کے اس پار امرود کا باغ تھا۔ اس پر بھی کبھی لونڈا ڈاکا' پڑا کرتا تھا۔ لونڈے گھس گئے او' چپکے چپکے کچے پکے امرود نوچ نوچ کر جیبوں میں بھرنے لگے اور رکھوالا ماں بہن کی سناتا دوڑا اور ادھر آناً فاناً میں سب ہوا ہو گئے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ لونڈے امرود کھسوٹ رہے تھے کہ ادھر سے ایک فقیرنی آ نکلی جو منمنا منمنا کر گا رہی تھی۔ کچھ لونڈیوں کو سوجھی شرارت۔ وہ چڑیل چڑیل چلا کر بھاگے' پھر کیا تھا سب سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ بلاقی رہ گیا۔ ارے ڈر کے مارے اس کی جو گھگھی بندھی ہے اور وہ جو لگا ہے فقیرنی کے سامنے ہاتھ جوڑنے

گھسیٹے یہ یاد کر کے بے اختیار ہنس پڑا۔

سورج دن بھر کا سفر طے کر کے افق کے قریب پہنچ چکا تھا۔ دھوپ میں ملایمت آگئی تھی اور ہوا میں خوش گوار خنکی۔ راستے کے ایک طرف پہاڑ کے ہرے بھرے جھاڑ تھے' جن کے بیچ بیچ سے بوڑھی سرکیاں سروں کو نکالے جوانوں کی طرح کھڑی ہونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دوسری طرف آسمان کے کنارے تک کھیتوں اور امرود کے باغوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ بسیرا لینے والی میناؤں اور کووں کا شور' کھیتوں سے واپس آنے والے بیلوں کی گھنٹیوں' ہلواہوں کی ہٹ ہٹ' باغوں سے [illegible] سب سے ہوا کی طرح بکھری ہوئی تھی جیسے پہاڑوں کی بھینی بھینی میٹھی میٹھی خوشبو سے معلوم ہوتا تھا کہ ساری دنیا ایک بہت بڑا گھر ہے جس کے رہنے والے [illegible] درخت' ہوا' آنے والی صدائیں اور خوشبوئیں قریبی رشتہ دار ہیں اور خوشی خوشی مل جل کر رہتے ہیں۔

کسانوں کا ایک جتھا کھیتوں سے واپس آ رہا تھا۔ [illegible] ایک [illegible] پیچھے کاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہلوں کو کندھے پر رکھے' بیلوں کو ہنکاتے چھ سات مرد تھے۔ ان لوگوں نے پھٹے حال گھسیٹے کی طرف توجہ نہ کی مگر جیسے ہی گھسیٹے کی ان میں سے ایک شخص سے نگاہ ملی۔ وہ بے اختیار مسکرا دیا جیسے کوئی دور دراز سفر سے آنے والا اپنے عزیزوں کو دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔

ادھر سورج افق کے دامن میں چھپا اور ادھر قصبہ آ گیا۔ اس کا نشان ایک اکل کھرا تاڑ تھا جس سے چھ [illegible] ہٹ کے آم کے دو چار بوڑھے درخت شام کا دھندلکا اوڑھے کسی یاد میں کھوئے کھڑے تھے۔ اس مقام سے ایک بہت رومان بھری یاد انگڑائی لے کر اٹھی اور گھسیٹے کے پاؤں تھام لیے۔ وہ بلا ارادہ کھڑا ہو گیا۔ وہ سامنے کی جھاڑی اور گڑھیا' یہیں' لاری سے چھپ چھپ کر ملتے تھے۔ وہ بھرے جسم کی حسا' ایسی دلاری جس کے نہ روٹھنے کا ٹھیک پتہ چلتا تھا اور نہ منے کا۔ جب وہاں بیٹھ کر وہ لاری کا انتظار کرتا تھا تو دل میں کیا کیا نقشے بنتے تھے شہر جاؤں گا تو کری کروں گا۔ دونوں وقت چنے چباؤں گا' مگر روپیہ جوڑ جوڑ رکھوں گا۔ پھر جب ڈھائی سو روپیہ ہو جائے گا تو واپس آؤں گا اور ہیرا لال کی طرح اکدم سے ایک گوئی بیل لے کر کھیتی شروع کروں گا۔ اس وقت لاری میری کتنی خوشامدیں کرے گی۔ میں تو مہینے تک اس سے بات بھی نہ کروں گا۔ بس اس جگہ ٹہلنے آجایا کروں گا۔ وہ آئے گی ضرور اور وہاں درخت کی جڑ پر بیٹھ گڑھیا میں ڈھیلے پھینکے گی گنگنائے گی' میری طرف کن انکھیوں سے دیکھ دیکھ کر ہنسے گی ____ بڑی چڑیل تھی۔ نہ جانے اب کہاں ہے؟

گھسیٹے درختوں کے اندر گھس کر دیکھنے لگا کہ پرانی گڑھیا اب تک ہے؟ ہاں ہے تو ____ اور وہ سامنے جمنی کا درخت بھی ہے' جس کی

جڑ پر وہ بیٹھتی تھی۔ کیا زمانہ تھا!

گھسیٹے درختوں سے نکل کر سڑک پر آگیا اور قصبے کے اندر چلا۔ مگر اب اس کی چال دھیمی تھی۔ وہ ان یادوں میں ایسا ڈوب گیا تھا کہ آنکھیں دیکھنا اور کان سننا بھول گئے تھے۔ ایکا ایکی ایک موڑ پر چونک پڑا جیسے کوئی بسری بات اک دم یاد آگئی ہو۔ یہی جگہ تو ہے ہاں یہیں ابا نے دو چانٹے مار کر میرے گلے سے شمن میاں کی قمیض کا بٹن نوچ لیا تھا۔ اِدھر شمن میاں گھر کے اندر آئے اور اُدھر ڈانٹ لگائی "گھسیٹے! گھسیٹے!____ کدھر مر گیا؟" ٹانگیں پھیلا کر دونوں بوٹ میرے منہ کی طرف بڑھا دیئے۔ ان کو اتارو، پھر جرابیں اتارو، پھر انگلیوں کو تولئے سے پونچھو، پھر جوتی لا کر پاؤں کے نیچے دھرو____ شمن میاں کی چیزیں دیکھ دیکھ کر جی چاہتا تھا کہ ان میں سے دو ایک ہمارے پاس بھی ہوتیں! ہمارے پاس کیا تھا؟ ایک پھٹا کرتہ پاجامہ پہنے رہتے تھے۔ جب وہ بالکل چیتھڑے ہو جاتا تو خاں صاحب پھر کسی کا پرانا دھرانا جوڑا دے دیتیں۔ "پھر پھاڑ لایا؟"____ "اس کے بدن پر تو کانٹے ہیں"____ "یہ کہاں سے کھونچا لگایا؟"____ "کمینے کو کبھی تمیز نہ آئے گی"۔ ایک بار شمن میاں کے کمرے میں جو گیا تو دیکھتا کیا ہوں کہ قمیض کے کف کے دو بٹن پلنگ پر پڑے چم چم کر رہے ہیں۔ اس وقت کچھ ایسے پیارے معلوم ہوئے کہ میں نے چپکے سے ایک مٹھی میں دبا لیا۔ تھوڑی دیر میں شمن میاں چلا نے لگے۔ "ایک بٹن کیا ہوا؟ کون لے گیا؟" میں نے جی میں کہا۔ میں لایا ہوں۔ کہو کیا کہتے ہو؟ بٹن تو دوں گا چاہے کچھ کرو۔ بلکہ اب تو تمہارے گھر کام بھی نہ کروں گا۔ سب کی آنکھ بچا کر باہر چلا آیا۔ میری قمیض میں آستین کہاں تھی؟ میں نے وہ بٹن گلے میں اس طرح لگایا کہ بٹن اور زنجیر دونوں چیزیں باہر چم چم کریں اور پھر دن بھر بھوکا پیاسا کھیتوں کھیتوں گھومتا رہا۔ جب رات آگئی تب فکر ہوئی کہ اب کہاں جاؤں گاؤں میں ادھر اُدھر دبکتا پھرتا تھا کہ ابا نے جو میری کھوج میں لگے تھے، دیکھ لیا۔ "تو شمن میاں کا سونے کا بٹن لے آیا____ سونے کا بٹن۔" دو تھپڑ پڑے تھے کہ میں بھاگا۔ سونے کا بٹن! کلکتہ میں چار چار پیسے پتہ ملتا ہے۔ جتنے چاہو اتنے لے لو۔

چھپروں اور نیچی نیچی کچی دیواروں پر شام کی سانولی رنگت پھیل گئی۔ فضا میں ہلکی ہلکی خنکی سی تھی جس سے دل کو عجب سکون ملتا تھا۔ گھروں میں چولہے جل گئے تھے جن کا دھواں اور سرخی چھپروں سے نکل نکل کر ہلکی تہ بناتے ہوئے اوپر چڑھ رہے تھے۔ پکارنے اور زور زور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں جو اپنے ساتھ دن بھر کی تکان کو ساتھ بہائے جا رہی تھیں۔ دروازے پر لڑکے لڑکیاں اونچا نیچا کھیل رہے تھے اور بے حد شور مچا رہے تھے جیسے بسیرا لیتے وقت چڑیاں____ یہ تھوڑی دیر بعد دور سے ابھی ابھی تھان پر آیا تھا اور خوشی سے ہنہنا رہا تھا۔

آخر مسجد آگئی۔ اسی کی بغل سے گھسیٹے کا راستہ جاتا تھا۔ پہلی تاریخوں کا ہلال مسجد کے ایک مینارے سے لگا ہوا چمک رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گھسیٹے کو ایک بات یاد آگئی جو باپ گاجے نے مشعلیں جلانے ایک کمزوری ناو پر چڑھی بکانی خونی لہروں کو پار کر کے کنارے آ اتری تھی۔

بغیا بھی آگئی۔ اس کے پار آبادی سے ذرا نکل کر گھر تھا۔ گھسیٹے کا دل امید و بیم سے زور زور سے دھڑکنے لگا اور ساتھ ساتھ خوشی کے مارے آنسو نکل پڑے۔ آنکھوں کے سامنے گھر کی تصویر پھر گئی۔ بڑا سا صاف ستھرا لیپا پوتا چھپر۔ دو بڑی بڑی اناج کی کٹھیاں۔ رات کو نہ معلوم کب سے اٹھ کر اماں کا گھرڑ گھرڑ چکی پیسنا اور اس پر گانا "موری چھاکل نہ بولے" "دن کو کام کاج کر کے گھر آؤ اور لاکھ چلاؤ۔ "اماں روٹی دے۔ اماں روٹی دے۔" اور چلاتے چلاتے تھک جاؤ، رو دو تو کچھ کرو، اماں اسی طرح پیسے چلی جاتی ہیں۔ جب اس کا جی چاہتا تب اٹھ کر چولہا جلاتی۔ جمیا اور شبراتن! افوہ! دونوں کو اماں کتنا مارتی تھی اور تھیں وہ بھی دونوں بڑی ہی حرامزادی۔ کبھی جو کام کرتیں____ ادھر تایا کلہاڑی کندھے پر رکھے بکریاں ہانکتا گھر میں گھستا اور ادھر چلانے لگتا۔ ادھر اماں پر غصہ آیا اور جھونٹے پکڑ کر دھوئیں دھوئیں____ واہ ری اماں! جہاں کسی کا جی خراب ہوا اس کے جی کو لگ گئی۔ پھر تو یہ ہے کہ "ارے آتیر اسرداب دوں" ____ "ادھر آنجر گجر اتار دوں"____

"چاندنی میں بیٹھ کر نہ کھا"____ "دونوں وقت ملتے نہ چلا۔" ہر وقت ٹٹکا اتار رہی ہے۔ آنے جانے والوں سے پوچھ پوچھ دوا پلا رہی

ہے ____ کھانے کی کتنی شوقین تھی۔ کچے پکے' گلے سڑے' کھٹے میٹھے جیسے بھی آم مل جائیں بڑے مزے سے بیٹھ کر کھا جاتی تھی۔ کچے پکے امرود جھڑ بیریاں کیتھے اور کیا کیا سب بہت شوق سے کھاتی تھی مگر بچوں کا کھانا اسے بُرا نہیں لگتا تھا۔ ادھر سے آؤں پڑا کے ایک ٹکوا منہ میں رکھ لوں۔ شام کو ابا ۔نے جو دیکھا تو ذرا سا گڑ تھا وہ لگے ڈکارنے۔ "کون کھا گیا؟" اماں سمجھ گئیں۔ سہولت سے بولیں۔ "چوہا کھا گیا ہوگا" ____ "تو کھا گئی ہے تو۔ کیا" چوہے بلّی گڑ ھیا کھاتے ہیں؟" اماں نے کہا۔ "کیوں؟ کیا ان میں جان نہیں ہے؟" میں نے جی میں کہا کہ دیکھو جب شہر سے کما کر لونوں گا تو گڑ کی ایک پاری بھی لاؤں گا۔ تب تو یہی ابا چٹخارے ماریں گے۔ "واہ کیا مجا ہے۔" جمیا اور شبراتن آنکھیں پھیلا پھیلا کر تکیں گی۔ منہ سے پانی چھوٹے گا۔

گھر میں اب کون کون ہو گا؟ ابا اماں بھلا کیا زندہ ہوں گے۔ ستر اسی برس کون جیتا ہے؟ جمیا اور شبراتن کہیں بیاہ دی گئی ہوں گی۔ ہاں فقیرا تو جوان ہو گا۔ بھو ۔ ے کے تو بیوی بچے ہوں گے اور بکریاں؟ اوہ کلّو کے ناتنوں کی بھی ناتنیں ہوں گی۔ کلّو زندہ ہو تو پہچانے گی؟ جب بھوکی ہوتی تھی تو میری طرف دیکھ دیکھ کر کیسا میں میں کرتی۔

(۲)

سامنے گھر ہے کہ نہیں؟ بغیا سے باہر آتے ہی گھسیٹے کے دل نے دھڑک کر بڑی بے تابی سے پوچھا ____ وہ جگہ تھی وہ ____ ہاں ____ وہاں کچھ ہے تو ضرور۔

شروع تاریخوں کی اوس کی ماری بیمار چاندنی میں اندھیرے اجالے کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ ایک دیوار تھی جس کا آدھا حصہ تو ٹیلے کی طرح ڈھیر تھا۔ آدھا جو کھڑا تھا اس پر ایک ٹوٹا پھوٹا چھپر تھما تھا جس کا پھونس دھواں کھائے ہوئے مکڑی کے جالے کی طرح ہر طرف جھول رہا تھا۔ چھپر کے سامنے کی طرف چوحدی کی جگہ جھانکڑوں' تاڑ کے پتوں اور کسی سوکھی بیل کا ملا جُلا ایک اژدم تھا جن کے پتلے پتلے ٹیڑھے بیڑھے سائے کیچوؤں اور کنکھجوروں کی طرح زمین پر بجبجا رہے تھے۔ گھر اپنے سناٹے میں قبرستان تھا۔ اندر نہ چولھا جل رہا تھا نہ چراغ۔ گھر کی ایک ایک چیز پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ ہم خود ٹکڑے ٹکڑے کو محتاج ہیں ____ تم کو کیا کھلائیں گے؟

یہی گھر تھا جہاں مسافر کی تھکی ماندی آتما کو چین کی تلاش تھی۔ گھسیٹے کی امیدوں کا چمن جسے وہ بائیس روز سے' پچیس برسوں کے کچلے ارمانوں کے خون سے سینچ رہا تھا' اکبارگی مرجھا گیا۔ اس کا دل بار بار شک دلاتا کہ یہ گھر خالی ہو گا' وہ لوگ کہیں اور اُٹھ گئے ہوں گے' اور بار بار بکریوں کے موت کی کھراہند اور نابدان کی سڑاہند جو بوجھل ہوا سے دبی ہوئی گھر کے گرد مقید تھی' ان بالو کے گھروندوں کو ڈھا دیتیں۔ گھسیٹے آدھ گھنٹے تک جہاں کا تہاں کھڑا رہا۔ اس میں اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اندر جاتا یا کسی کو آواز دیتا۔

دور کہیں پر ایک پلّا رو رہا تھا' رفتہ رفتہ اس کی آواز سے ایک طرح کی ڈھارس بندھی اور یہ کھکھارا' جواب نہ ملنے پر کھکھارا' بار بار کھکھارنے پر کوئی دبے پاؤں باہر آیا اور رازدارانہ لہجے میں بولا:

"اندر چلی آؤ نا۔"

اس دھوکے سے گھسیٹے کی ہمت اور سکڑ گئی۔ اب کی وہ سہارا لینے کو سچ مچ کھکھارا' پھر کہنے لگا:

"کون فقیرا؟"

"ہاں!"

فقیرا ذرا اچڑ کر بولا:

"تم کون ہو؟"

"ذرا ادھر آؤ۔"

فقیرا نکل کر قریب آیا اور بولا:

"تم کون ہو؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"تو سنو تو بھائی تم فقیرا ہو نا؟"

"ہاں ـــ کہہ تو دیا"

"تم یہیں رہتے ہو؟"

گھسیٹے کی آواز میں کچھ اتنا پیار تھا کہ فقیرا کا غصہ تو غائب ہو گیا مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شخص کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ دوسری طرف گھسیٹے کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اپنے کو کیسے پہچنوائے۔ اسے خیال تک نہ آیا تھا کہ اپنے گھر پہنچ کر یہ کام بھی کرنا ہو گا۔ آخر دل کڑا کر کے بولا:

"میں بائیس روز کا سفر کر کے آ رہا ہوں ـــ تمہارے پاس۔"

اب بھی فقیرا کچھ نہیں سمجھا مگر بلاارادہ اس کی زبان سے نکل گیا

"تو اندر آؤ۔"

اندر آ کر گھسیٹے کی ہمت بندھی اور ساتھ ہی راحت پانے کی امید بھی بلاوجہ بر یانے لگی۔ فقیرا نے دیا سلائی کھینچ کر چراغ جلایا۔ چھپر کے نیچے سات بکریاں اور بکریوں کے بچے بندھے تھے۔ انہیں سے شاید گھرانے کی روٹی چلتی تھی۔ ذرا ادھر ہٹ کے زمین پر ایک چیتھڑا جس پر ایک میلی سی چیز جو شاید کبھی رضائی ہو مگر اب چیتھڑا ہو کر گمنام ہو گئی تھی اوڑھنے کے لئے پڑی تھی۔ گھسیٹے نے ٹاٹ پر بیٹھ کر کپکپاتے چراغ کی دھندلی روشنی میں فقیرا کو غور سے دیکھا۔ دبلا پتلا' آنکھیں اندر دھنسی ہوئیں اور بے نور چہرے کی کھال جوتے کے چمڑے کی طرح کھردری اور اس پر دونوں طرف دو لمبی لمبی جھریاں' جیسے کچی دیوار پر برکھا کے پانی کی لکیریں۔ بال کھچڑی جن میں سفیدی زیادہ۔ یہ تھا گھسیٹے کا جوان بھائی فقیرا! مصیبت زدہ گھسیٹے دیکھنے میں اس سے زیادہ جوان تھا۔

گھسیٹے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "بھیا تم جوانی ہی میں بڑھائے گئے۔"

فقیرا ٹھنڈی سانس بھر کر بولا:

"جوانی تو کھلائی پلائی سے ٹھہرتی ہے۔"

"سچ ہے بھیا ـــ بھورا بھیا اور شبراتن کہاں ہیں؟"

اب فقیرا ٹھٹکا۔

"پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو ـــ گھسیٹ تو نہیں ہو؟"

"ہاں گھسیٹے ہوں اور کون بائیس دن ٹھوکر کھا کر آ رہا ہے۔"

بھیا کہہ کر فقیرا اس سے لپٹ گیا۔ گھسیٹے نے بھی بھینچ کر لپٹا لیا اور جیسے کوئی سوتا پھوٹ جائے' اس کے آنسو ڈھل ڈھل بہنے لگے۔ فقیرا بھی رو دیا۔ تھوڑی دیر تک دونوں روتے رہے۔ پھر فقیرا نے اپنے آنسو پونچھے اور گھسیٹے ڈھارس دلائی کہ "اب نہ رویہ تو خوشی کی بات ہے کہ تم گھر آ گئے ـــ اماں کو دیکھو گے؟"

گھسیٹے کی آنسوؤں سے لبریز آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"اماں! ـــ ہے کیا؟"

"ہاں!"

چھپر کے ایک کونے میں چیتھڑوں کا ڈھیر لگا تھا۔ فقیرا اس کی طرف انگلی اٹھا کر بولا:

"وہ پڑی ہے۔"

گھسیٹے محبت اور اشتیاق کے جوش میں اُدھر بھاگا۔

یہاں چیتھڑوں کے انبار میں دفن ایک انسانی پنجر پڑا تھا جس پر مرجھائی ہوئی بدرنگ گندی کھال ڈھیلے کپڑوں کی طرح جھول رہی تھی۔ سر کے بال بیمار بکری کی دم کے نیچے کے بالوں کی طرح میل کچیل میں لتھڑ کر نمدے کی طرح جم گئے تھے۔ آنکھیں دھول میں

سوکھی کوڑیوں کی طرح بے رنگ 'اپنے ویران حلقوں میں ڈگور ڈگر کر رہی تھیں ان کے کوئے کیچڑ اور آنسوؤں میں لت پت تھے۔ گال کی جگہ پتلی سی کھال رہ گئی تھی جو دانتوں کے غائب ہونے سے کئی تہوں میں ہو کر جبڑوں کے نیچے آ گئی تھی۔ گال کے اوپر کی ہڈیوں پر کچھ پھولا پن سا تھا' بد گوشت ہو یا ورم' جیسے روتے روتے ورم آ گیا ہو۔ گردن اتنی سوکھی تھی کہ ایک ایک رگ نظر آ رہی تھی۔ ننگے سینے پر چھاتیاں لٹک رہی تھیں جیسے بھیگی ہوئی اُلٹی ہنڈی کی خالی تھیلیں۔ چہرے کی ایک ایک جھری سخت گھناؤنی مصیبتوں کی مہر تھی جسے دیکھ کر بے اختیار دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا تھا۔

فقیرا چراغ لے کر آیا۔ روشنی دیکھتے ہی بڑھیا کچھ بکنے لگی اور داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے جھوٹ موٹ کا نوالہ بنا کر اپنے منہ کی طرف بار بار لے جانے لگی جیسے گونگا کھانے مانگے۔ بڑھیا نہ معلوم کیا کہہ رہی تھی مگر سننے میں صرف یہ آتا تھا "باب... ...باب......باب .....باب. .....باب.. .....باب.... "

اس کی آواز ایسے ویرانی کے مارے گاؤں کی یاد تازہ کرتی تھی' جہاں کے رہنے والے آگ سے جل مرے تھے اور اب اس کے کھنڈروں میں دن کو بندر چیختے اور رات کو سیار روتے ہیں۔

فقیرا نے گھسیٹے کی طرف دیکھ کر کہا:

"جب اس کے پاس آؤ یہ اسی طرح کھانا مانگنے لگتی ہے۔ چاہے جتنا کھلاؤ اس کا جی نہیں بھرتا۔ منہ سے نکل نکل پڑتا ہے' پھر بھی مانگے جاتی ہے۔"

آخر گھسیٹے بڑی کوشش سے بولا:

"اماں!"

آواز بتا رہی تھی کہ اس کا دل اندر ہی اندر کراہ رہا تھا۔

فقیرا نے کہا۔ "نہ وہ سنتی ہے نہ سمجھتی۔ بس کھانے کی بات سمجھتی ہے۔"

بڑھیا کا پوپلا منہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا' باب کی آواز نکل رہی تھی' اور انگلیوں کا بنا ہوا نوالہ بار بار منہ کی طرف جا رہا تھا مگر ان حرکتوں پر بھی یقین نہ آتا تھا کہ یہ پنجر زندہ ہے۔

یہ وہی چوڑی چکلی تندرست اماں تھی جو منہ اندھیرے سے دوپہر تک مسلسل چکی پیسا کرتی تھی! جسے دن رات یہی دھن سوار رہتی تھی کہ کسی طرح گھر کی حالت سنبھل جائے' اس نے کیسا کیسا اپنا جی مارا! ذرا ذرا سی چیز کے لئے کیسا کیسا ترستی رہی!

گھسیٹے کے دل میں ماں کے لئے ترس بھرا پیار اُبل پڑا جو ہاتھ پھیلا پھیلا کر یہ دعا مانگنے لگا کہ اے خدا اس کی مشکل آسان کر اور اب تو اسے ناپاک دنیا سے اٹھا لے۔ اگر اس وقت گھسیٹے کی آنکھیں رو دیتیں تو اسے سکون مل جاتا مگر افسوس آنسوؤں جیسی نعمت کوسوں دور تھی۔

فقیرا کے لئے اس نظارے میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس نے کہا:

"بھیّا تم ذرا ہاتھ منہ دھو لو۔ میں کھانے پینے کا کچھ بیتا کروں۔"

فقیرا بھاگتا ہوا بنیا کے اس پار جوگیوں کے گھر سے آدھ سیر جوار کا آٹا ادھار مانگ لایا اور پھر چولھا جلا کر روٹیاں پکانے بیٹھ گیا۔ گھسیٹے بھی چولھے کے پاس آ بیٹھا اور بولا:

"اتنا آٹا کیا تم نے ابھی نہیں کھایا؟"

"نہیں' آج آٹا ختم ہو گیا تھا تو میں نے کہا کہ ایک رات یوں ہی سہی۔"

"اب کھیتی نہیں ہوتی؟"

"وہ کب کی بند ہو گئی۔ ابا کے مرنے کے بعد بھورے کو جیل ہو گئی۔ میں اکیلا رہ گیا۔ دو برس تک ترکاریاں ورکاریاں بوئیں مگر وہ بکیں بکائیں نہیں۔ لگان تک نہیں ادا ہوا۔"

"بھورے کاہے میں پکڑا گیا؟"

"سونی چند کی ایک بکری بیچ لی تھی۔ پھر جب جیل سے چھوٹ کر یہاں آیا تو اس کی بیوی دوسرے کے گھر بیٹھ چکی تھی۔ یہ فوجداری کرنے پر تیار ہو گیا مگر اس کی طرف سے کوئی کاہے کو کھڑا ہوتا؟ دو مہینے سب کو گالیاں دیتا رہا۔ پھر ایک رات کہنے لگا۔ "فقیرا مجھ سے تو اب تیری طرح نہ بھوکوں مرا جائے گا اور نہ اس گاؤں میں رہا جائے گا۔ بلا سے جیل ہو جائے چار دن عیس' تو کر لیں گے ____ دوسرے دن منہ اندھیرے کہیں نکل گیا ____ بانکے کہتا تھا کہ اب پھر جیل پہنچ گیا ہے۔"

"تمیا اور شبراتن کہاں ہیں؟"

"تمیا حرامزادی کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ شبراتن کا دس کوس پر تکیہ والوں میں بیاہ ہو گیا ہے۔ ایک امرود کا باغ ہے' کسی طرح گذر بسر ہو جاتی ہے مگر کبھی ماں کو نہیں پوچھتی۔

ذرا دیر خاموشی رہی۔ پھر فقیرا روٹی کے کناروں کو انگاروں پر سینکتے ہوئے بولا۔

"تمہارے جانے کے بعد بھیّا وہ وہ آفتیں آئیں۔ سب گھر مٹ گیا۔ وہ بھی کیا' جمانا تھا ابا کہا کرتے تھے کہ "یہ سب پلے پیٹ بھرے ہیں پیٹ بھرے" سچ کہتے تھے۔ اس زمانے میں تو کوئی رات ایسی نہیں گذری جب چولھا نہ جلا ہو۔"

گھسیٹے لمبی سی ٹھنڈی سانس بھر کر چپ ہو گیا اور لپکتے کوئلوں کی طرف اس طرح تکنے لگا جیسے ان میں پرانے دنوں کو ڈھونڈ رہا ہو۔

فقیرا نے اس سناٹے کو توڑا:

"کہاں کہاں رہے گھسیٹے؟"

"ہم کلکتہ جا کر ایسے پھنسے کہ خط پتر کو بھی چار پیسے نہ بچے۔ گھر یاد کر کر کے کتنی بار رونا آیا۔ بڑی کٹھن گذری وہاں' ملوں کی خاک چھانی' امیدواری میں کام کیا' بھوت گھر میں روٹی ڈھوئی' ہفتوں قبض رہتا تھا' چار سال رکشا چلائی' پھر خونچہ لگایا' ارے فقیرا بڑا کٹھن ہے کلکتہ میں رہنا۔ جس کے دو چار جاننے والے ہوں اور جس کے پاس لینے دینے کو ذرا پیسا ہو اس کے لئے تو وہاں سب کچھ ہے۔ لیکن ایسے ویسوں کو تو کوئی پوچھتا ہی نہیں۔ وہاں تو روئے رلائی نہیں آتی تھی۔ مرنے کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔

فقیرا نے لال لال روٹی کپڑے پر رکھ دی اور دونوں ٹکڑے توڑ توڑ کر کھانے لگے۔

فقیرا بولا:

"بھیّا ذرا چپکے چپکے کھاؤ۔ اماں سُن لے گی تو چلا چلا کر رات بھر نہ سونے دے گی۔"

گھسیٹے نے شک اور حیرت سے فقیرا کی طرف دیکھا:

"تم تو کہتے ہو وہ بالکل نہیں سنتی۔"

"ہاں' مگر نجانے کیا بات ہے کہ کھانا کھانے کی آواز سُن لیتی ہے اور کھانے کی بو بھی پا لیتی ہے اور پھر باپ' باپ کرنے لگتی ہے۔

گھسیٹے بجھتے انگاروں کی طرف تکنے لگا۔ اس کا حلق اتنا سوکھ گیا کہ منہ کا نوالا بلا پانی کے گھونٹ کے نہ اتار سکا۔

(۳)

گھسیٹے گھر کے دوارے ہونٹوں پر بکری کا مسکا ملے' دھوپ میں ننگے بند بیٹھا' اپنے میلے کرتے کے جلوے جن رہا تھا۔ کئی روز سے

ہاتھوں پیروں اور ہونٹوں کو چٹخا دینے والی سرد ہوا کے تیز جھکڑ چل رہے تھے جن میں سیکڑوں منوں گرد و غبار بھرا ہوا تھا جو ناک اور حلق میں گھس رہا تھا۔ کھیتوں کے پودے اور درخت ہوا کی چوٹ کھا کر جھک جاتے تھے اور بے بسی سے اپنے پتے پھڑ پھڑاتے تھے جیسے ہوا سے فریاد کر رہے ہوں کہ اب تو للہ جان چھوڑ دے۔ کھیتوں میں کسان اپنی چادروں کو بدن پر سمیٹے ہاتھ پاؤں سکیڑے کندھوں کو آگے جھکائے سُوں سُوں کر رہے تھے۔ ہر جگہ اتنی اجاڑ اجاڑ تھی اور ہر چیز اتنی دکھ بھری کہ بے اختیار جی گھبرا گھبرا کر کہتا تھا چلو کہیں بھاگ چلیں۔

گھسیٹے دھوپ میں بیٹھا کانپ رہا تھا اور کلکتہ کو یاد کر رہا تھا۔ آنے کے دوسرے ہی دن سے وہ ٹوٹے پھوٹے ویران چھپر' بکریوں کے مُوت کی کھراہند اور اپنی ماں کی باب' ماب سے گھبرا گیا تھا۔ دن بھر بھوک بہلانا اور بکریاں چرانا اور رات کو بورے کی روکھی سوکھی روٹی اور کبھی کبھی تو رات کو بھی فاقہ۔ پھر یہاں کی سردی! افوہ! بدن ہے کہ کٹا جاتا ہے۔ اوڑھنے کو کھویا پہننے کو دو آدمیوں کے بیچ میں ایک' سب سے بڑی کوفت یہ کہ جوانی کے پچیس سال کلکتہ میں گنوانے کے بعد گھسیٹے کو یہاں کی کسی چیز سے اب لطف نہ آتا تھا۔ چوپال کی باتیں روکھی پھیکی گاؤں کی عورتوں میں شرم اور کھچاؤ۔ پھر جس سفید پوش کو دیکھو تھانیدار کی طرح اکڑ دکھاتا ہے اور فقیرا؟ وہ تو بات بات میں باپ بنتا ہے۔ سب مصیبتوں سے بڑی مصیبت یہ کہ پیسہ کمانے کا کوئی راستہ نہیں دمڑی دمڑی کے لئے فقیرا کی محتاجی۔ ہر بات میں اس کا دست نگر رہنا۔

گھسیٹے چلوے مار رہا تھا اور کلکتہ سے آنے پر پچھتا رہا تھا۔ وہ دکانوں کے تختوں پر رات کاٹنا' وہ سڑکوں پر جو جاڑوں میں برف کی سل اور گرمیوں میں دہکتا ہوا توا ہوتی تھیں' خچر کی طرح رکشا لے کر دوڑنا۔ وہ کبھی کبھی تین تین چار چار فاقے کر لینا اپنے گھر کی اس زندگی سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ وہ کلکتہ کی ایک پیسہ والی سنگل چاء' وہ دھیلے والا پان کا بیڑا' وہ پیسے کی ۲۵ بیڑیاں' یہ وہ نعمتیں تھیں جن کے لئے یہاں وہ ترس گیا تھا۔

گھسیٹے نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور دور تک پھیلے ہوئے مٹر کے کھیتوں کی طرف دیکھا۔ میری زندگی بھی کیا زندگی رہی ہے۔ پندرہ سولہ برس کے سن تک باپ کی اور ججمانوں کی مار کھائی! کھانے پینے کو ترستے رہے' پھر ہمت کر کے کمانے کھانے کے لئے شہر بھاگے' وہاں مہینوں ٹھوکریں کھائیں' کہا چلو کلکتہ چلو' وہاں پہنچتے ہی' اچھی سی نوکری مل جائے گی اور سب پاپ کٹ جائے گا' کلکتہ کے پچیس برس! افوہ! کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی' رکشا تک چلائی سیٹھ جی نے کہا کہ گاڑی لینا ہے تو' جمانتی' لاؤ۔ میں کہے لاتا؟ جو وہاں کے رہنے والے تھے ایک دوسرے کو جانتے تھے گھرانے کے گھرانے رہتے تھے۔ جمانتی لے آتے تھے۔ چھمن بولا دو آنے روز دو تو کلوٹا مہاجن جمانی ہو جائے گا۔ دو آنے روز اسے دئے' پھر بھی سالے سیٹھ نے ٹوٹی پھوٹی گاڑی دی۔ اسے دور ہی سے دیکھ کر لوگ ہٹ جاتے تھے جب سیٹھ سے خوشامد کرو کہ ایک اچھی سی گاڑی دے دو تو وہ اکڑ کر کہتا تھا کچھ روپیہ جمع کراؤنا۔ روپیہ بچتا تو کیسے بچتا؟ آمدنی بھر تو کلوٹا کھا جاتا تھا۔ چار سال دوڑتے مگر رہے وہی موچی کے موچی۔ بخار جو آیا تو کسی طرح گیا ہی نہیں۔ اسپتال میں پڑے پڑے مہینوں بیت گئے' اچھے ہوئے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا اب خبردار رکشا نہ چلانا اور نہ زیادہ محنت کا کام کرنا۔ پھر دو روپیہ قرض ادھار کر کے پان سگریٹ' دیا سلائی کا خوانچہ لگایا۔ اب جو آتا کہتا سیزر لاؤ' ٹیمی کٹ لاؤ' یہ لاؤ' وہ لاؤ۔ یہاں کیا تھا؟ کہتے "نہیں صاحب' نہیں ہے ہجور" وہ بھی تماشا کچھ دنوں تک رہا۔ نہ بیٹھنے کو اچھی جگہ تھی نہ اچھا سامان تھا۔ اس پر جو کچھ بھی آیا حرامزادی بھنگوی کھا گئی۔ نہ جانے مجھ سالے کو عورت رکھنے کی کیا پڑی تھی لنگوٹی میں پھاگ......

گھسیٹے کو اپنے اوپر سخت غصہ آیا اور اپنے کو خوب گالیاں دینے لگا۔ اتنے میں فقیرا سامنے سے آیا اور آتے ہی کڑے پن سے بولا.

"پھر تم نے بکرا کر دودھ بیچ لیا۔ اب ہمارا تمہارا گزارا نہیں ہو سکتا۔ جہاں جانا ہو چلے جاؤ۔"

گھسیٹے نے جواب دیا۔ "کیسی چوری؟ کچھ پاگل ہو گیا ہے تو؟ روز کا یہی قصہ 'روز کا یہی قصہ۔ بڑا آیا ہے گھر سے نکالنے والا۔ جیسے گھر میں میرا حصہ ہی نہیں اور بکریوں میں میرا حصہ ہی نہیں۔"

"گھر میں حصہ؟ بکریوں میں حصہ 'تو حصہ بٹائے گا؟ کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا۔ پچیس سال کلکتہ میں گنوا کر ہماری جان کو آیا ہے گیا تھا روپیہ کمانے"

گھسیٹے گرم ہو کر بولا:

"کلکتہ میں کمانا کچھ آسان ہے؟ تو خود تو زندگی بھر قصبہ سے باہر نہیں گیا اور چلا ہے کلکتہ کی کمائی کی بات کرنے۔ وہاں وہ کماتا ہے جس کے دس جاننے والے ہوں جو اس کے لئے تکڑم لگائیں۔ وہ کماتا ہے جس کے پاس روپیہ ہو کہ کچھ کھو کر سیکھے۔ کام کچھ دنوں کے بعد آتا ہے کہ آپ ہی آپ؟"

فقیرا نے طعن سے کہا:

"ہاں جو یہاں سے جاتے ہیں روپے کے ڈھیر تولے کر جاتے ہی ہیں۔ بلّو جو اتنا روپیہ لایا ہے کیسے لایا ہے؟"

اب تو گھسیٹے تلملا گیا۔ وہ سب کچھ سن سکتا تھا مگر یہ کہ اس نے کلکتہ میں رہ کر کچھ نہیں کیا بالکل ہی نہیں سن سکتا تھا۔ وہ چلا کر بولا:

"اور تو نے کیا کر لیا ہے؟ چوٹٹا کہیں کا۔ ان بکریوں میں 'اس گھر میں کیا میرا حصہ نہیں تھا؟ سب کا سب بیچ کر کھا گیا۔ لا میرا حصہ دے میں آج ہی اس منحوس گاؤں سے جاتا ہوں۔ بے ایمان کہیں کا۔"

گھسیٹے سے بن نہیں پڑتا تھا کہ اپنا سر پھوڑ ڈالے یا جان نکال کر رکھ دے۔ کیا کرے جو فقیرا کو یقین دلائے کہ کلکتے میں میں نے کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی۔

کچھ یوں ہی تو تو میں میں ہوتی رہی۔ پھر فقیرا بڑبڑاتا ہوا اندر چلا گیا۔ دیر تک وہ اندر سے اور یہ باہر سے بڑبڑاتے رہے۔

یہ قصہ آج کچھ نیا نہیں تھا بلکہ پورے چار مہینے سے یہی ہو رہا تھا۔ روز یہی جھگڑا اٹھتا 'روز یہی باتیں ہوتیں اور روز دونوں اسی طرح بڑبڑا بڑبڑا کر چپ ہو جاتے۔

رات جب روکھی روٹی کھا کر گھسیٹے بستر پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑانے لگا تو پھر ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ کلکتہ کی یاد آئی اور وہ سوچنے لگا کہ شاید اب میں ہمیشہ کے لئے اس اجاڑ گاؤں میں دفن ہو گیا۔ اب باقی زندگی اسی طرح بتانا ہے۔ کاش ایک بار صرف ایک بار میرے پاس کچھ پیسہ آ جاتا جو میں کچھ دنوں اپنی تھکی ماندی آتما کو سکھ دے دیتا۔ چالیس برس کی تھکی ماندی آتما! میں یہ نہیں کہتا کہ بڑا سا گھر ہو' دوارے بھینس بندھی ہو' کٹھیوں میں اناج بھرا ہو۔ گھر والی ہو جو ساری کے پلّو سے تھالی صاف کرے 'اس میں دال بھات لا کر سامنے رکھ دے 'اس کے پاؤں میں موٹے موٹے کڑے پڑے ہوں جو بدھی کی طرح آڑے آڑے ایک طرف جھکے ہوں جیسے شرمائی سالی کا سر۔ بس مجھے تو بس اتنا مل جائے کہ اپنا ایک الگ چھپر ہو 'دونوں وقت اپنی روکھی سوکھی ہو۔ بس ارے ہاں اپنے پاس کچھ تو ہو۔ اب کہاں گھر والی کی خواہش اور کہاں بچوں کا ارمان چالیس کا سن ہونے کو آیا......

سن کا خیال آتے ہی دل میں ایک تیز ہوک اٹھی کہ اب دو چار برس جوانی اور ہے پھر اندھیرا پاکھ۔ جانے کب موت آجائے.......

ایک زبردست اُمنگ اٹھی کہ جیسے بنے ایک بار اور ہاتھ پاؤں مارو۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے فقیرا کو پکارا:

"بھئی فقیرا!"

فقیرا پیار کی پکار سن کر فوراً پاس آگیا۔ جب وہ آرام سے بیٹھ گیا اور حقہ کا ایک دم لے چکا تو گھسیٹے بولا:

"میں یہ کب کہتا ہوں' نہ میں کچھ کروں گا ہی نہیں۔ مگر کوئی کام بھی تو ایسا ہو جس سے کچھ ملے۔ ارے بھیا تم کہتے ہو کہ کلکتہ میں میں نے پچیس برس بھاڑ جھانکا' مگر میں کہتا ہوں کہ میں کم سے کم اتنا تو سیکھ ہی گیا ہوں کہ کون کام چل سکتا ہے اور کون نہیں۔ تم کہتے ہو پھیری لگائیں' یہ کریں وہ کریں' سچ کہتا ہوں کہ ان میں کچھ نہیں دھرا ہے۔ پیسے والوں کے سامنے کون اپنا روزگار جما سکتا ہے؟"

گھسیٹے یہ کہہ کر اس طرح خاموش ہو گیا جیسے ابھی بات نہیں ہوئی' پھر فقیرا کی طرف دیکھ کر بولا:

"اگر کچھ مل سکتا ہے تو اسی طرح جیسے ہم کہتے ہیں۔ مگر جو ہم کہتے ہیں...... وہ تو تم مانتے ہی نہیں ——— اس میں تمہارا بھی بھلا' ہمارا بھی بھلا۔ کون جانے گا کہ ہم کیسے کماتے ہیں؟ اور جان بھی گیا تو کیا؟ جب ہمارے پاس پیسے ہوں گے تو سب ہماری برائی کو بھی اچھائی کہیں گے جوگیوں کو دیکھو' ان کے گھر ہن برس رہا ہے ہُن۔ کہنے کو ہم شریف اور وہ رزیل۔ مگر کون کس کی خوشامد کرتا ہے؟ ہم ہی ہیں جو آئے دن دوڑے جاتے ہیں کہ اچھے منگلو سیر بھر آٹا اُدھار دے دو' دو کنکویاں نمک دے دو' ذرا سی تمباکو دے دو۔ وہ ٹال مٹول بھی کرتے ہیں' دھتکار بھی دیتے ہیں' مگر ہم پھر جاتے ہیں' نہ جائیں تو کریں کیا؟"

فقیرا بیٹھا چپ چاپ سنتا رہا' گھسیٹے دم لے کر پھر کہنے لگا:

"اور ہم تو کہتے ہیں کہ سب ہم کو چھوڑ بھی دیں تو کیا؟ کیا کوئی لڑکا لڑکی بیاہنے کو بیٹھے ہیں ہم؟ ہم دونوں چین سے الگ ہی رہ لیں گے۔" گھسیٹے نے ایک دم سے کچھ یاد کر کے فقیرا کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور پھر کہا:

"ہاں تمہارا سادی بیاہ کرنا ہے' روپیہ دیکھ کر سب ہی لڑکی دینے کو راضی ہو جاتے ہیں اور نہیں تو پھر اپنی برادری میں نہ سہی کسی اور میں سہی۔ ارے ہاں! اس طرح تو کہیں بھی نہیں کر سکتے اور پھر یہ اماں کے لئے بھی اچھا ہے۔ جب پیسے ہوں گے تو ان کو بھی خوب کھانے کو ملے گا۔"

فقیرا اب بھی کچھ نہیں بولا۔ اس سے پہلے بھی گھسیٹے کئی بار یہی باتیں کر چکا تھا۔ مگر تب انہیں سن کر فقیرا کو غصہ آگیا تھا۔ روپیہ کے لئے کہیں شرافت بیچی جاتی ہے؟ روپیہ ہے کیا؟ ہاتھ کا میل۔ آج آیا تو کل گیا اور شرافت وہ دھن ہے جو پیڑھیوں چلتا ہے اور خرچ نہیں ہوتا۔ شریف پھول کا برتن ہے جتنا بھی کیچڑ میں سوند جائے جب بھی مانجو چم چم کرنے لگتا ہے اور جہاں شرافت گئی پھر آدمی مٹی ہو جاتا ہے مٹی۔ مانا جوگیوں کے پاس روپیہ ہے' پیسہ ہے' گھر ہے گرہستی ہے' ہم ہی ان کی خوشامد کرتے ہیں وہ نہیں کرتے' ہم ہی ان سے روٹی اُدھار مانگتے ہیں وہ نہیں۔ مگر اس سے کیا؟ ہاتھی لاکھ لٹ جائے پھر بھی سوا لاکھ ٹکے گا۔ ابھی ہم اور وہ مکھیا کے گھر جائیں تو ہم تو چبوترے پر بیٹھیں گے اور وہ دور زمین پر۔

فقیرا پانچ برس کا تھا جب گھسیٹے روپیہ کمانے شہر بھاگ گیا تھا، تب سے اس کے دل میں بھی کمانے کی تمنا پیدا ہو گئی تھی لیکن جیسے جیسے دن بیتتے گئے اور گھسیٹے روپیہ کا ٹکڑا لے کر نہیں لوٹا اس کی خواہش مرتی گئی۔ غریبوں کو کہاں پیسہ ملتا ہے۔ پیسہ مل جاتا تو کوئی غریب کیوں رہتا؟ اس جیون میں بس یہی ہے کہ اپنا دو زخ پاٹ لو اور موقع ملے تو کسی سے ہنسی دل لگی کر لو اور کیا دھرا ہے؟ بھورے کا حشر دیکھ کر تو رہی سہی آس بھی گہری نیند سو گئی۔ لیکن اب جو گھسیٹے روزانہ شام کو، جب یہ دونوں کام کاج سے فارغ ہو کر بیٹھتے، آس جگانے کا یہ منتر اسی سوہنی سے پڑھتا رہا تو رفتہ رفتہ فقیرا کی سوئی ہوئی آس چونکی، انگڑائی لے کر اٹھی اور پر پرزے نکالنے لگی۔ وہی فقیرا جسے کل تک کل کی کوئی فکر نہ تھی، آج جوہیا کے مندر کی راہ سو جھائی دی تو لگا کچھ اور ہی سپنے دیکھنے۔ ذرا یہ چکر بدل جاتا، تھوڑی سی بکریاں اور ہو جاتیں اور ذرا پانچ روپے اکٹھے ہو جاتے پھر ہمارا گھر بس جاتا۔ ارے ہاں اب گھر نہ بسا تو پھر کب بسے گا؟ وہ رمضانی کی بیوہ، آنکھ ملاؤ تو کیا ہنستی ہے۔ اس سے آج کہو تو آج گھر بیٹھ جائے۔ کیسا گدرایا گدرایا بدن ہے! جیسے پکا آم۔ کیسا ٹھمک ٹھمک چلتی ہے! اور کتنی محنتی ہے وہ۔ دو دو دو ہے، او پلے وہ تھاپے، وہی وہ تھے، اکیلی جھوؤں پانس اٹھا اٹھا کھیتوں میں وہ ڈالے۔ کیا عورت ہے! میں نے دیر کی تو کوئی اور اپنے گھر بٹھالے گا اور پھر میں منہ تکتا رہ جاؤں گا۔

جس دن سے فقیرا کے دل میں یہ خیالات گونجنے لگے، وہ رمضان کی بیوہ سے کنائی کاٹنے لگا۔ ادھر وہ سامنے دکھائی دیتی اور یہ راہ کترا کر نکل جاتا۔ پندرہ بیس روز یوں ہی کٹ گئے۔ ایک دن یہ لکڑی چیر رہا تھا کہ وہ اکبارگی پیچھے سے آ گئی، اسے بھاگتے نہ بنی، کچھ باتیں ہوئیں، کچھ ہنسی دل لگی ہوئی۔ پھر وہی ہوا جس کا فقیرا کو دھڑکا تھا یعنی اسی دن اس نے گھسیٹے کی بات مان لی۔

(۴)

ابھی پہر رات باقی تھی کہ گھسیٹے نے فقیرا کو جگایا۔ دونوں تاروں کی مدھم روشنی میں اٹھے اور ایک ٹوکرے کو بانس سے لٹکا کر ایک ڈولی سی بنالی اور اس میں خوب ساپیال بھر دیا اور پھر بڑھیا کے پاس گئے۔ گھسیٹے نے ایک ہاتھ گلے میں اور ایک کمر میں ڈال کر اس کو چھپکلی کی طرح اٹھالیا۔ آنکھ کا کھلنا تھا کہ وہ گنگی بات 'باب' باب کر کے اشارے سے کھانا مانگنے۔ گھسیٹے نے پہلی بار اسے چھوا تھا۔ اسے ایک عجیب اذیت ہوئی جس سے اس کا چہرہ عجب ہونق ہو گیا۔ ایک طرف تو آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے اور دوسری طرف بدن کے روئیں کھڑے ہو گئے تھے۔

گھسیٹے نے اسے لے جا کر آہستہ سے جیسے کوئی شیشہ کا برتن ہو ٹوکرے میں رکھ دیا اور پھر اسے چیتھڑوں سے چھپا دیا۔

ایک طرف کا بانس فقیرا نے تھاما اور دوسری طرف کا گھسیٹے نے اور دونوں گھر کے باہر چلے۔ بکریاں ان لوگوں کو اس طرح جاتے دیکھ کر بے کسی سے میں میں کرنے لگیں جیسے یہ لوگ ان کو ہمیشہ کے لئے بے یار و مددگار چھوڑے جا رہے ہوں۔

جب یہ دونوں رات کے کالے پردوں کی اوٹ میں منہ چھپائے ہوئے گاؤں کے نکڑ پر آ گئے تو پو پھٹی اور نسیم اٹھلا اٹھلا کے چلنے لگی۔ یہ خوش تھے کہ چلو ہم نظروں سے بچ کر نکل آئے کہ اچانک ایک طرف سے ایک کسان کندھے پر ہل رکھے نکل پڑا اور پہچان کر پوچھنے لگا

"کہاں چلے فقیرا؟"

ہوا کا ٹھنڈا جھونکا فقیرا کے کلیجے کو برماتا نکل گیا۔ اس کے کندھے کا بانس کانپا۔ کسی وجہ سے گھسیٹے گھبرا کر فقیرا کی جگہ خود بول اٹھا:

"شبراتن کا حال خراب ہے۔ ماں کو لئے وہاں جا رہے ہیں۔"

"ماں کو لئے؟" کسان اتنا متاثر ہوا کہ بے اختیار کہہ اٹھا:

"شاباش تم لوگوں کو ——— اپنی مہتاری کی اتنی سیوا کرتے ہو!"

شہر کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کا خطبہ شروع ہو چکا تھا اس وقت فقیرا اور گھسیٹے نے مسجد سے ذرا ہٹ کر ایک گلی میں آ کر ڈولی رکھی۔ گھسیٹے نے بڑھیا کو جو کنڈلی مارے ٹوکرے میں سو رہی تھی' اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور پھر اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ کو ٹوکرے میں دو چیتھڑے باندھ کر اس پر رکھ دیا۔ یہ احتیاط تھی اس بات کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ باب باب کرتے وقت ہاتھ بجائے منہ کی طرف آنے کے کانپ کر کسی اور طرف نکل جائے۔ مگر یہ احتیاط فضول تھی۔ کیونکہ دس برس سے اس ہاتھ کا صرف یہی کام رہ گیا تھا کہ منہ کی طرف جا جا کر اشارے سے کھانا مانگا کرے۔ اب سوائے ادھر کے اور کسی طرف جانے کی ہاتھ میں سکت ہی نہ تھی۔

بڑھیا جاگ پڑی مگر وہ بچکولے کھاتے کھاتے اور رات رہے سے اس وقت تک باب باب کرتے کرتے اتنی تھک گئی تھی کہ بلا چلائے اور کھانا مانگے' جیسے بٹھائی گئی تھی ویسے ہی بیٹھی رہی۔ یہ تو بری رہی' ساری کی کرائی پر پانی پھرا جاتا تھا۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے' فوراً گھسیٹے نے لپک کر سامنے کی حلوائی کی دکان سے ایک پیسہ کا جلیبیوں کا شیرا نگا۔ اس نے تھال پر چپٹی ہوئی ٹکڑوں اور بھنکتی ہوئی مکھیوں کو اڑا کر تھال ایک طرف جھکا دیا اور جتنا شیرا بہہ آیا اسے انگلی سے پونچھ پانچھ کر ایک پتہ پر ٹپکا کر گھسیٹے کو تھما دیا۔ اس نے لا کر شیرے کی ایک انگلی بڑھیا کو چٹا دی۔ اس کا چٹانا تھا کہ وہ فوراً باب باب کرنے اور مانگنے لگی۔

چلو عمل کامیاب رہا۔ بڑھیا کی کوک ہاتھ آ گئی۔ گھسیٹے نے پتہ فقیرے کو پکڑا کر ہدایت کی کہ موقع پہ بڑھیا کو ایک انگلی چٹا دینا۔ فقیرا زندگی میں تیسری بار شہر آیا تھا۔ یہاں کی گہما گہمی' بھیڑ بھاڑ اور بڑی بڑی دکانوں سے وہ بھونچکا ہو گیا تھا' عقل چندھیا گئی تھی۔ اس کے برخلاف شہر کی ہوا لگتے ہی گھسیٹے کی ہر بات میں خود اعتمادی آ گئی تھی۔ گھسیٹے مشاق پیراک کی طرح تھا جو دریا میں اترتے ہی چہلیں کرنے لگتا ہے اور فقیرا نوسکھیے کی طرح جو پانی دیکھ دیکھ سہا جاتا ہے' گھسیٹے فقیرا کو حکم دے رہا تھا اور وہ کل کی طرح اس کے اشاروں پر چل رہا تھا۔

دونوں ڈولی لے کر مسجد کے سامنے آئے۔ خدا کے گھر کے سامنے انسانی کوڑے کا ڈھیر لگا تھا۔ کٹی انگلیاں اور بیٹھی ناک والے کوڑھی' منمنا کر ڈراؤنی آواز میں بولنے والی آتشکی بڑھیاں' چندھے چیچڑے بچے جن کے ہاتھ پاؤں سے سوکھے اور پیٹ بڑھے ہوئے تھے' جو نہ جانے کیوں مسلسل ریں ریں کر رہے تھے' پھیکے' بے حیا دیدوں والی جوان عورتیں جن کے سر پر جوؤں کا جنگل اور بدن میل کی کیچل' چیتھڑے' ٹھیکرے' میل' آخور' بلغم' ناک' پیپ' مکھیاں' جراثیم' فریب' جھوٹ اور ان سب کو ڈھانک دینے والی لوریاں دے دے کر' تھپک تھپک کر سلا دینے والی مہا پاپن بے حسی!

——— اس سمندر میں گھسیٹے اور فقیرا نے بھی ماں کی ڈولی لے کر غوطہ مارا۔ میل کچیل ہو' چاہے ذلت ہو' حیوانیت ہو' چاہے انسانیت ہو' مایا کے مندر کو یہی راستہ جاتا ہے۔ اس وقت جبکہ سب دروازے بند ہو چکے ہیں۔ اکیلا یہ کھلا ہوا ہے۔ صاف اور سیدھا راستہ' تنہا راستہ ——— پھوٹی آنکھ کا دیا۔

ڈولی رکھی ہی تھی کہ پاس کے ایک بڈھے فقیر نے ماں کی گالی دے کر کہا:

"ابے ادھر کہاں آیا؟ بھاگ یہاں سے۔"

پھر تو آس پاس کے سب فقیر گالیاں دینے اور غل مچانے لگے۔ کیوں ان کی ڈولی دیکھ کر ہر ایک کو اپنی روزی کی پڑ گئی۔ فقیر اکی تو یہ ہنگامہ دیکھ کر جان ہی نکل گئی۔ اس نے جھٹ ڈولی کا ڈنڈا کاندھے پر رکھ کر وہاں سے ٹلنا چاہا مگر گھسیٹے نے دیکھا کہ ان گیدڑ بھبکیوں سے اگر دبا تو پھر اس برادری میں گھس چکا۔ اس نے دو چار ماں بہن کی سنا کر کہا:

"تمہارے باپ کی زمین ہے۔ چپ رہو ورنہ سب کے سر پھوڑ دوں گا۔"

ڈانٹ سنتے ہی فقیر تو ذرا ذرا بڑبڑا کر چپ ہو گئے مگر بڑھیاں اسی طرح کائیں کائیں کرتی رہیں۔ آخر ایک نمازی نے جو جماعت کے لالچ میں دوڑا جا رہا تھا۔ ان کو ڈانٹا۔

"چپ رہو بد نصیبو نماز ہو رہی ہے۔"

نماز کے خیال سے یا ڈانٹ کے ڈر سے کسی نہ کسی وجہ سے خاموشی ہو گئی۔ آخر کوئی بات نہ ہوتی تو بھی خاموشی ہو جاتی۔ کیونکہ اس سے زیادہ احتجاج کرنے کا بوتا ان لوگوں میں تھا ہی نہیں اور دوسرے گھسیٹے بھی اب جگہ پر پورا قبضہ پا چکا تھا۔

ابھی نمازی نکلنا نہیں شروع ہوئے تھے۔ لیکن وہاں کی فضا سے فقیر اایسا متاثر ہوا کہ اس نے بے سمجھ بوجھے بڑھیا کو ایک انگلی شیرا چٹا دیا۔ شیرا لگتے ہی گراموفون کے ریکارڈ کی طرح وہ بجنے لگی اور مشین کی طرح اس کے جبڑے اور ہاتھ چلنے لگے۔ اسے دیکھ کر ایک دو برس کے بچے نے جسے ایک شخص پھونک ڈلوانے کو لایا تھا' گود میں سہم کر زور سے چیخ ماری اور بسورنے لگا۔ ایک جوان اینگلو انڈین لڑکی ہاتھ میں بٹوا لئے اِدھر سے گذر رہی تھی۔ اس نے جو بڑھیا کو دیکھا تو ایک بار سر سے پاؤں تک کانپ گئی جیسے ایسا ہی بھیانک بڑھاپا اس کا پیچھا کر رہا ہو اس نے بے تحاشا دو پیسے نکال کر بڑھیا کے آگے پھینک دیئے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی بوڑھے کے سامنے ترنوالہ پھینک دیتا ہے کہ وہ ہمیں بھول کر اس میں جٹ جائے۔ پیسے بڑھیا کے سامنے لگے ہوئے چیتھڑوں کے انبار میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ اب گھسیٹے کو اپنی ایک غلطی کا احساس ہوا۔ بھیک کوئی اس کے ہاتھ میں تھوڑی دے گا دے گا بڑھیا کو۔ اس کے سامنے کوئی چادر ہونی چاہئے جس پر آ کر پیسے گریں۔ گھسیٹے نے جلدی سے اپنا پھٹا انگوچھا بڑھیا کی گود میں پھیلا دیا۔

نماز ختم ہوئی اور نمازی غول کے غول باہر نکلنے لگے۔ فقیروں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ بھوکا ہوں بابا' بھوکا ہوں بابا' ایک فقیرنی گھگھیانے لگی جیسے کوئی نئی نویلی بیوہ سسکیاں بھرتی ہو۔ ایک تگڑا فقیر حلق پھاڑ پھاڑ کر آوازیں لگانے لگا۔ "جب دے گا اللہ ہی دے گا۔" فقیر ابھیڑ بھاڑ دھکم دھکا اور شور ہنگامے سے ایسا بھونچکا ہوا کہ منہ پھیلا کر ایک طرف تکنے لگا اور شیر اچٹانا بھول گیا۔ گھسیٹے نے چلا چلا کر اسے کئی بار حکم دیا مگر جب دیکھا کہ اس کے حواس بالکل غائب ہیں تو جلدی سے پتر چھین کر خود ہی چٹا دیا۔ شیرے کا لگنا تھا کہ مشین پھر تیزی سے چلنے لگی۔ مگر پھر بھی لوگ ادھر متوجہ نہیں ہوئے۔ گھسیٹے نے فوراً محسوس کیا کہ کیا کمی ہے، پہلے اس نے کوئی صدا تو سوچی نہیں تھی۔ جلدی میں اس کے منہ سے نکلا "اللہ ہر آفت سے بچائے" اس صدا کو اس طرح دینے لگا جیسے کوئی والنٹیئر انقلاب زندہ باد' کہے کیونکہ دوسری لے اسے یاد ہی نہ آئی۔ اس کی صدا میں اگر تاثیر تھی تو صرف اتنی کہ لوگ ادھر ادھر دیکھ لیتے تھے۔ دیکھتے ہی بڑھیا پر نگاہ پڑ جاتی تھی۔ یہ درد انگیز نظارہ دل کو ویرانی اور وحشت سے بھر دیتا تھا جس کی دوا صرف بھیک کے چند پیسے تھے۔ بڑھیا کے سامنے پیسوں کی بارش ہونے لگی۔ آس پاس کے فقیر یا تو خالی ہاتھ' یا ایک ایک دو پیسے لئے حسرت سے ان

دونوں خوش نصیبوں کو تک رہے تھے اور دل ہی دل میں کڑھ رہے تھے کہ ہمارے پاس بھی کوئی ایسی ہی بڈھیا چیز کیوں نہیں ہے۔ گھسیٹے اپنی اتنی کامیابی دیکھ کر خوشی اور غرور سے متوالا ہو گیا اور خوب کڑک کڑک کر صدا لگانے لگا۔ آج زندگی میں پہلا دن تھا کہ جس پیشے میں وہ گھسا تھا اس میں چوٹی پر جگہ ملی تھی۔ حسرت رہی کہ کبھی ایسا ہو تا کہ جس پیشے میں گھسوں اس کا اچھا سامان ہو' اس کا سب اونچ نیچ معلوم ہو مگر آخر آج دونوں نعمتیں میسر آ ہی گئیں۔ میرے پاس جو سامان ہے وہ کسی کے پاس نہیں اور میں صدا بھی خوب لگا رہا ہوں۔ سب خدا کی دین ہے۔ آخر وہ کب تک اپنے بندے کا امتحان لیتا۔ دیکھو پیسے کیسے برس رہے ہیں! تو ہی داتا ہے اور تو ہی جیون کا کھیون ہار ہے مالک۔ اماں زندگی بھر کوشش کر مریں کہ کچھ پیس جوڑ گھر کی حالت سدھاریں۔ ایک ایک بات کے پیچھے جان دے مریں' مگر کچھ نہ ہوا اور اب ہوا بھی تو کیسی آسانی سے۔ یہ خدا کے کارخانے ہیں۔ جیلے روزی بہانے موت۔

(۵)

سہ پہر کی سنہری دھوپ میں گھسیٹے اور فقیرا ڈولی لئے شہر کے باہر ایک شاہی کھنڈر کے پاس آئے۔ دونوں سارا دن ڈولی لادے لادے پھیری لگاتے رہے تھے' تکان سے چُور چُور تھے مگر پھر بھی آنکھوں میں اطمینان اور خوشی موجیں مار رہی تھی۔ مست تھے گا رہے تھے اور زور زور سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

ایک کھنڈر کے سایہ میں ڈولی اتار دی گئی۔ گھسیٹے نے بھیک کی جھولی کھولی۔ اس میں پانچ چھ آدمیوں کے کھانے بھر روٹیوں کے ٹکڑے' دال بھات اور ترکاریاں ملی جلی بھری تھیں۔ ان پر ایک نظر ڈال کر ماں کی گالی دے کر ایک طرف پھینک دیا۔ پھر ذرا اطمینان سے بیٹھ کر ایک پوٹلی کھولی جس میں تھیں بہت سی تیل کی پوریاں' کئی قسم کی ترکاریاں' سیر بھر بیچ میل مٹھائی' چٹ پٹے کباب' مولیاں اور بیڑی کا بنڈل۔ آج کے پھیرے میں پونے دو روپے ملے تھے جس میں سے ڈیڑھ کی یہ سب خریداری تھی اور چار آنے ابھی گھسیٹے کی جیب میں اچھل رہے تھے۔ گھسیٹے نے سب نعمتیں نکال کر سامنے یہاں سے وہاں تک چُن دیں۔ سب ملا کر چار آدمیوں بھر کا کھانا تھا۔ دونوں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ سامنے نعمتوں کا ڈھیر تھا جو تھا اپنا تھا۔ جس طرح چاہے کھاؤ اور جو چاہے پھینکو۔ پہلے دونوں نے مٹھائی کی ایک ایک ڈلی منہ میں ڈالی اور بدحواسی سے ان کو نگل گئے پھر مر بھکوں کی طرح مٹھائی پر ٹوٹ پڑے گویا زندگی بھر کی بھوک اسی ایک آن میں بجھا دیں گے۔ پوریوں کی باری آئی' ایک ایک پوری کا ایک ایک نوالہ۔ کس کس کر دو چار دانت مارتے اور پھر غپ سے دوزخ میں اتار لیتے۔ اس شور سے بڑھیا جو سو رہی تھی جاگ پڑی اور جاگتے ہی کھانا مانگنے لگی۔ اب ان دونوں کو وہ بھی یاد آئی۔ گھسیٹے اس کی طرف پیار سے دیکھ کر ہنسا اور اسے اٹھا کر ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔

"لو آج تم بھی مزے دار چیزیں کھا لو۔ کبھی کاہے کو کھائی ہوں گی۔"

گھسیٹے نے کچھ ٹکیاں اس کے منہ میں دے دیں۔ وہ جلدی سے ان کو نگل گئی اور نگلتے ہی بدحواسی سے باب باب کرنے لگی۔ حیرت کی بات یہ کہ وہ کبھی نہ کسی طرح ہاتھوں پیروں کو ہلا جُلا کر آگے سرک آئی۔ گویا کہ چاہتی تھی ایک جھپٹا مار کر سب کچھ ایک ہی دفعہ اپنے منہ میں بھر لے۔ فقیرا اور گھسیٹے کے لئے دشواری یہ تھی کہ خود کھائیں یا اسے کھلائیں۔ ادھر اس کے منہ میں کچھ دیتے اور ادھر وہ نگل کر اور مانگنے لگتی ــــــ گھسیٹے جھلا کر بولا:

"لو تم بھی کیا یاد کرو گی؟"

ہاتھ سے کاٹ کر حلوے کا ایک ٹکڑا بڑھیا کے منہ میں دے دیا۔ بڑھیا فوراً خوش خوش اسے چبانے لگی۔ مگر چپڑا کیا وہ بار بار منہ سے نکل آتا اور یہ پھر کسی نہ کسی طرح کانپتے ہاتھوں سے اسے اندر ٹھیل لیتی۔

دونوں پھر اپنا پیٹ پاٹنے میں جٹ گئے۔ ذرا دیر میں بڑھیا کھانسی۔ اس کے حلق میں ٹکڑا پھنس گیا تھا۔ آنکھیں چڑھ گئیں اور آگے پیچھے جھوم جھوم کر سوں سوں کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب دم نکلا اور تب دم نکلا۔ گھسیٹے اسے مرتے دیکھ کر کھانا بھول گیا اور جلدی سے انگلی ڈال کر اس کے حلق سے ٹکڑا نکال لیا۔ نکلتے ہی بڑھیا نے ایک چیخ ماری جیسے کسی نے اس کا خزانہ لوٹ لیا ہو اور حلق پھاڑ پھاڑ اسے پھر مانگنے لگی۔ اب گھسیٹے نے اسے مشغول رکھنے کو ہاتھ میں ایک رس گلا پکڑا دیا۔ بڑھیا نے اسے اپنی مٹھی میں زور سے دبا لیا اور منہ کی طرف لے چلی۔ مگر ایک تو ہاتھ کانپ رہا تھا اور دوسرے رس گلے کی پکڑ بے تکی تھی، وہ کسی طرح منہ کے اندر نہ جا سکا۔ رس گلا دب رہا تھا۔ اس کا شیرہ ٹھنڈی ٹھنڈی باچھوں سے ہوتا ہوا گلے پر اور گلے سے چھاتیوں پر بہہ رہا تھا۔ بڑھیا ساری کی ساری میٹھی ہو گئی تھی۔

ماں اور بیٹے کھاتے چلے جاتے تھے۔ نہ یہ تھکتی تھی اور نہ وہ۔ رفتہ رفتہ دونوں کا ہاتھ سست ہوتا گیا۔ ماں کا باب باب تیز ہی ہوتا گیا آخر جب گھسیٹے اور فقیرا میں نگلنے کی بالکل سکت نہیں رہی تو دونوں نے بچا کھچا کھانا آگے سرکا دیا اور وہیں پڑ کر بیڑیاں پینے لگے۔ بڑھیا چلاتی رہی چلاتی رہی۔ آخر چلاتے چلاتے تھک کر وہ بھی ڈکرے میں گر پڑی۔

فقیرا بہت خوش تھا۔ اس کے دل میں اب تو یہ خیال تک نہ تھا کہ اگر کہیں کسی کو معلوم ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اب اس کے سامنے ایک دنیا تھی جس میں چھپر نیا ہو گیا تھا۔ اس میں ایک طرف نیا پتا چولھا تھا جسے رمضانی کی بیوہ جگی ہوئی پھونک رہی تھی۔ جب چراغ جلے بکریوں کا ایک بڑا سا گلہ لئے وہ واپس آتا ہے تو رمضانی کی بیوہ جلدی جلدی بالی سر پر سرخ روٹیاں پکا کر سامنے رکھ دیتی ہے۔ تھالی میں (گھر میں ایک پھول کی تھالی بھی آ گئی ہے) ایک طرف بکری کا ... فقیرا خوش تھا۔ بہت خوش ___

گھسیٹے کی طبیعت بھی زوروں پر تھی۔ زندگی میں پہلی بار کامیابی ہوئی تھی۔ کامیابی بھی کامیابی! دو نے دو روپے اور صرف ایک دن میں! پچاس روپے مہینہ! اُفوہ! اگر کہیں ہم کلکتہ میں ہوتے تو وہاں کتنی آمدنی ہوتی! پھر جب روپیہ ہو تو کلکتہ کی زندگی! منگل چاء، بیڑیاں، تاڑی خانہ، بھنا گوشت، وہ سالی نخریلی رنڈیاں، وہ ان کا مٹک مٹک کر چلنا، کوئی بس لُٹا لُٹا جاتا۔ گھسیٹے مسکرانے لگا۔ بڑی دیر تک انہی خیالوں میں ڈوبا رہا۔ پھر ذرا سنجیدہ ہو گیا۔ سوچنے کی بات ہی تھی۔ فقیرا نے سارے گھر پر قبضہ کر لیا ہے۔ سب چیزیں اپنی کر لی ہیں۔ حصہ مانگا تو سسرا بگڑتا ہے۔ جی چاہتا ہے سر پھوڑ دوں سالے کا۔ اب اس میں بھی حصہ بنائے گا ... نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں گھر دے دوں گا، بکریاں دے دوں گا مگر اماں کو نہیں دے سکتا۔ آخر میں بھی تو اس کا لڑکا ہوں اور اب فقیرا کا حق ہی کیا ہے؟ وہ سب کچھ تو لے چکا۔ اتنے دنوں تک اماں بھی اسی کی رہی، آخر مجھے بھی تو کچھ ملے۔ اماں کو میں نہیں دے سکتا۔ اگر وہ تکرار کرے گا تو ماروں گا، سر پھوڑ دوں گا ___ حرامی سالا فقیرا!"

گھسیٹے سوچ سوچ کر کھولنے لگا۔ فقیرا اتنی دیر میں اونگھ گیا تھا۔ گھسیٹے نے اس کو جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا

"فقیرا سونا بعد کو پہلے حصہ بانٹ لو۔ آج یہ جھگڑا چک جانا چاہئے۔"

"کاہے کا حصہ بانٹ؟"

"ہاں اب تو کہو گے کاہے کا حصہ بانٹ۔ ارے گھر کا، بکریوں کا اور جو لمایا ہے اس کا۔"

فقیرا تلملا کر اٹھ بیٹھا۔

"پھر وہی گھر' پھر وہی بکریاں' ہزار بار کہہ دیا کہ ابا کا بنایا ہوا چھپر پندرہ برس ہوئے جب ہی سڑ گل کر ختم ہو گیا تھا۔ یہ میں نے بنوایا ہے اور وہ بکریاں بھی مر کھپ گئیں۔ یہ سب میری پالی ہوئی ہیں۔ چلا ہے حصہ بانٹ کرنے اور اتنے دنوں تو جو ہماری روٹی توڑتا رہا ہے۔"

فقیرا اب شہر والا فقیرا نہیں تھا۔ شہر سے نکلتے ہی پھر شیر ہو گیا تھا۔

گھسیٹے غصہ میں مگر سمجھانے کے انداز میں کہنے لگا:

"اچھا چلو گھر تم لے جاؤ اور بکریاں بھی تم ہی لے لاؤ۔ ہماری اماں کو ہمیں دے دو۔ اتنے دنوں ان کو اگر تم نے کھلایا ہے تو اب ہم کھلائیں گے۔"

"ہاں اب تو تو کھلائے ہی گا؟ پندرہ برس میں پالتا رہا۔ گو موت صاف کرتا رہا۔ تب اماں کی یاد نہ آئی' اب جو کمائی کے قابل ہو گئی تو اماں تیری ہے؟ تجھے دے دوں؟ مجال ہے تیری کہ تو لے جائے؟"

گھسیٹے پر بھوت سوار ہو گیا اور وہ غصہ میں ماں کی طرف لپکا جیسے اس کو جیب ہی میں تو رکھ لے گا مگر فقیرا فوراً کود کر سامنے آ گیا اور لگا گھسیٹے کو گالیاں دینے۔ گھسیٹے کا پارا حد سے اونچا ہو گیا اور اس نے بڑھ کر فقیرا کو زور سے دھکا دیا اور دوڑ کر بڑھیا کو اس طرح ہاتھوں میں دبوچ لیا گویا وہ کوئی گٹھڑی ہے۔ جس طرح بلی چوہے پر جھپٹتی ہے فقیرا بڑھیا پر جھپٹا اور اس کے سر اور کمر میں ہاتھ دے کر اپنی طرف کھینچنے لگا۔ بڑھیا اس بلی کی طرح جس کا بچہ مر گیا ہو عوعو کر کے حلق پھاڑ پھاڑ رونے لگی۔ مگر ان دونوں کی گالیوں اور غل غپاڑے کے نیچے اس کی آواز دب گئی۔ تھوڑی دیر چھینا جھپٹی ہوئی تھی کہ بڑھیا فقیرا کے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ نہ جانے فقیرا نے زور کر کے چھین لیا یا گھسیٹے نے بڑھیا کے مر جانے کے ڈر سے اسے خود ہی چھوڑ دیا۔ مگر فقیرا جیسے ہی اس کو گالیاں دیتا پیچھے ہٹا ہے گھسیٹے بھوکے بھیڑیے کی طرح اس پر پھاند پڑا۔ وہ تڑ سے لڑھکتے قد نیچے گر پڑا اور بڑھیا چیختی قلابازی کھاتی ایک طرف جا پڑی۔ گھسیٹے فقیرا پر چڑھ بیٹھا اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ فقیرا کا اور تو کوئی بس نہیں چلا وہ نیچے سے اس کے سینے اور منہ پر گھونسے جمانے لگا۔ گھسیٹے جیسے جیسے گھونسے کھاتا ویسے ہی ویسے زور سے گلا دباتا۔ آخر فقیرا کے ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے' گھسیٹے نے کس کس کر دو جھٹکے اور دیئے۔ فقیرا کی آنکھوں کے ڈیلے غلول کی طرح باہر نکل آئے' منہ بھیانک ہو گیا اور ہاتھ پاؤں بر رگئے۔ اب گھسیٹے کا غصہ اترا اور پتہ چلا کہ میں نے کیا کیا۔ وہ کانپ کر کھڑا ہو گیا اور سکتے کی سی حالت میں فقیرا کو گھورنے لگا۔ اس کا چہرہ رام لیلا کے بیچا کی طرح ہونق ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر میں گھسیٹے نے اپنے حواس درست کر لئے۔ کلکتہ میں ایسے کئی قصے یہ دیکھ چکا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ اس کے ساتھیوں میں آپس میں لڑائی ہوئی اور ایک نے دوسرے کو مار ڈالا۔ ڈر کس بات کا؟ فقیروں کے مرنے جینے کی کس کو پرواہ ہوتی ہے؟ مر گیا ___ مر گیا ___ پاپی فقیرا ___ ناحق مرا ___ مان لیتا میری بات۔ میں نے کیا برا کہا تھا کہ اتنے دنوں تک اماں تم نے رکھی ہے اب مجھے دے دو۔ ارے ہاں میں بھی تو کچھ دن زندگی کی بہار دیکھ لوں۔ میرے بھی جان ہے۔ مجھے اینٹ پتھر سمجھا تھا' جیسا کیا ویسا بھگتا۔

ہاں اب جلدی سے اماں کو لو اور بھاگو ___ پیاری اماں ___ کلکتہ' وہاں کی بھیک کا کیا کہنا! اب مزا ملے گا کلکتہ کا۔

گھسیٹے جلدی سے بڑھیا کی طرف مڑا' دیکھا تو وہ آدھی چت آدھی پٹ' مٹی کے چونتھ کی طرح ڈھیر ہے۔ آنکھیں چڑھ گئی ہیں۔

ـــہ کھیا کی طرح کھلا ہوا ہے اور اس میں سے رہ رہ کر بلغم اور تھوک لتھڑی آدمی جیسی آدمی پوری غذا نکل رہی ہے۔ کلیاں گلاب جامن پوری کے بھیگے ہوئے ٹکڑے ـــــ لونڈے کے لونڈے ـــــ زرد زرد چھین۔

گھسیٹے نے بڑھ کر ہاتھ لگایا ـــــ بڑھیا میں کچھ نہیں تھا۔

سورج ڈوب گیا تھا۔ کھنڈر کا ہر کونہ کالی بلاؤں کا بھٹ معلوم ہوتا تھا' پت جھاڑ ہوا کے جھکڑ سینکڑوں میل سے کروڑوں درختوں کو تاراج کرتے' مردہ پتوں کو اٹھا اٹھا کر پٹکتے' وحشت ناک سروں میں سائیں سائیں کرتے ایک طرف سے آرہے تھے اور دوسری طرف بھاگے جا رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر چیز کو اڑالے جائیں گے۔ گھسیٹے ہکابکا کھڑا تھا۔ اس کے ایک طرف بھائی کی لاش تھی اور دوسری طرف ماں کی۔ دونوں کے پہلو میں اس کی آخری کوشش کی بھی لاش تھی۔ جب تک ماں زندہ تھی بھیک کا ٹھیکرا تھی مگر مرکر وہ اس کے دل میں سچ مچ ماں بن گئی تھی۔ یہ وہی ماں تھی جو اس کے ہر دکھ پر بیتاب ہو جاتی تھی۔ اس کی ہر خوشی پر اپنی خوشی قربان کر دیتی تھی۔ نفیرا بھی آخر بھائی ہی تھا۔ زندگی کا سہارا۔ اس کی یاد کلکتہ کی بے کسی میں بھٹکے مسافر کا دیا تھی۔ ان دونوں کے مرتے ہی جو رہا سہا دنیا سے رشتہ تھا وہ بھی ٹوٹ گیا۔ سمجھتا تھا کہ اب تو کشتی کنارے لگ چکی ہے۔ پیشہ مل گیا ہے اور اس کا بہتر سے بہتر سامان ہاتھ آگیا ہے۔ سب کچھ مل گیا تھا مگر ابھی خود اس کے قابل نہیں بنا تھا ـــــ امید کی آخری کرن ڈوب گئی۔ اب زندگی کی اتھاہ مصیبتیں' طوفانی سمندر کی طرح آگے پیچھے' دائیں بائیں' اوپر نیچے ہر طرف گھسیٹے سر جھکائے افق کی طرف چل کھڑا ہوا۔

———

بینگن کا پودا

اوپندر ناتھ اشک

اگرچہ ماہی رام نے وہ بینگن کا پودا اکھاڑ دیا ہے۔ پھر بھی جب میں ترکاری کے کھیت کی مینڈھ پر سے ہوتا ہوا اپنی کوٹھی کو جاتا ہوں تو میری آنکھوں میں بینگن کا وہ سوکھا ہوا پودا اور اس پر لٹکتا ہوا مرجھایا ہوا پچکا سا زرد بینگن پھر جاتا ہے۔

سردیوں کے مختصر سے دن کو گذرے ہوئے دیر ہو چکی تھی۔ کھانا کھانے کے بعد جب میں ایک لمبا سا چکر لگا کر نیچے کھادی کی موٹی سی بنیان، اس پر چھوٹا گرم انڈرویئر، اس پر موٹے کھدر کی قمیض، اس پر اچکن اور گلوبند اور ان سب کے اوپر اوور کوٹ پہنے، ہاتھ میں چھڑی لئے اپنے لوہے کی ایڑی والے فلیکس کے بوٹوں کی ٹھک ٹھک میں مست، دسمبر کی تیکھی ٹھنڈی ہوا سے بچنے کے لئے کانوں کو اوور کوٹ کے کالروں میں چھپاتا ہوا اپنی کوٹھی کے برآمدے میں داخل ہوا تو وہاں میلی سی چارپائی پر ایک نحیف و ناتواں بوڑھے کو خستہ اور بوسیدہ، اندھیری کالی رات کی طرح کالا لحاف لپیٹے دیکھ کر کچھ ٹھٹک سا گیا۔

"کیوں بھئی کیا بات ہے؟" میں نے اوور کوٹ کی جیبوں میں پڑے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لا کر کہا۔

"کچھ نہیں بابوجی! میں ماہی رام کا آدمی ہوں۔"

"ماہی رام کے ہی سہی۔" میں نے کہا۔ "لیکن اتنی سخت سردی میں تم اس کھلے برآمدے میں کیوں پڑے ہو؟"

"میرے پاس کپڑا ہے بابوجی!"

میں نے چپ چاپ اپنا کمرہ کھولا۔ ٹیبل لیمپ جلتا چھوڑ دیا تھا۔ اگرچہ اوپر کے دونوں روشن دان کھلے تھے پھر بھی کمرہ گرم ہو گیا تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی مٹی کے تیل کا گرم تیز بھبکا آیا۔ بارہا میرے دوستوں نے اس طرح لیمپ جلا کر چھوڑ جانے سے منع کیا ہے۔ "شہر کی گندی فضا کو چھوڑ کر اس کھلے ماحول میں رہنے کا فائدہ ہی کیا؟" وہ کہا کرتے ہیں۔ "اگر شہر کی مضر عادتوں کو نہ چھوڑا جائے۔" اور بتایا کرتے ہیں کہ ڈاکٹروں کی رائے کے مطابق کمرے کو بند کر کے اندر لیمپ جلائے رکھنا نہایت مضر ہے۔ سانس کے راستے گندی ہوا پھیپھڑوں میں داخل ہو جاتی ہے اور پھیپھڑوں پر اس کا دباؤ پڑتا ہے۔ میں بارہا محسوس بھی کرتا ہوں لیکن مجبور ہو جاتا ہوں۔ جب بھی کبھی دروازہ کھول کر بیٹھتا ہوں تیز ہوا کا جھونکا اندر آتا ہے۔ میرے ہاتھ یخ ہو جاتے ہیں اور قلم چلنے سے انکار کر دیتا ہے تو میں اٹھ کر پھر کواڑ بھیڑ دیتا ہوں جیسے سگریٹ پینے والوں کو اس کی کڑوی کسیلی سر چکرا دینے والی بو اچھی لگتی ہے۔ کچھ اس طرح یہ سب کچھ بھی مجھے اچھا معلوم ہونے لگا ہے۔

ہیٹ کو کھونٹی پر لٹکا کر اور گلوبند کو سر اور کانوں کے گرد لپیٹ کر کام پر آ بیٹھا۔

بیٹھ تو گیا۔ لیکن میرا دھیان برابر برآمدے ہی کی طرف لگا رہا۔

اس بوڑھے کو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ صبح ہی دیکھا تھا۔ وہ بینگن کے پودے چھانٹ رہا تھا اور "کیونی کمن" سے گھر کو آتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ وہ کیوں ایسا کر رہا ہے۔ اس نے بتایا تھا بینگن کا پودا دوبار پھل دیتا ہے۔ ایک بار چھانٹ دیا جائے تو اور بھی پھلتا پھولتا ہے۔ میں نے ان سوکھے چھتوں سے محروم بینگن کے پودوں پر ایک نگاہ ڈالی تھی۔ ایک پودے پر ایک مرجھایا ہوا سوکھا سکڑا بیکار زرد بینگن لٹک رہا تھا۔ وہاں سے ہٹ کر میری نظر اس بوڑھے پر جا پڑی تھی۔ اس کی عمر نہ جانے کتنی تھی لیکن وہ بے حد ضعیف دکھائی دیتا تھا۔ حالانکہ سردی سے بچنے کے لئے اس نے کھیس اوڑھ رکھا تھا۔ پھر بھی اس کے لکڑی کے سے پتلے ہاتھ 'بانس کی سی ٹانگیں' سوکھا چہرہ اور آنکھوں کے حلقے صاف نظر آتے تھے۔ اس وقت 'ایک عجیب سا خیال میرے دل میں پیدا ہوا تھا ___ بینگن کا پودا جب سوکھ جاتا ہے تب چھانٹ دینے پر پھر سے پھل لے آتا ہے۔ سہاجنا بھی چھانٹنے پر بڑھتا ہے۔ دنیا میں ایسے درختوں اور پودوں کی کمی نہیں جو چھانٹنے پر پہلے سے زیادہ پھلتے پھولتے ہیں تو پھر انسان کو اس خدائے برتر نے ایسا کیوں نہیں بنایا۔ لیکن وہیں کھڑے کھڑے جیسے مجھ سے کسی نے کہا۔ انسان کی بیل بھی تو امر ہے۔ موت اس کی قینچی ہے۔ مرد 'عورتیں' بچے 'بوڑھے اس کے پھل' پھول اور شاخیں ___ جب یہ سوکھ جاتے ہیں یا گل سڑ جاتے ہیں یہ قینچی انہیں کاٹ دیتی ہے اور ان کی جگہ نت نئے ہرے بھرے زندگی سے بھرپور اچھلتے' کودتے' ناچتے گاتے پھول اور پتے لگتے ہیں اور زندگی کی امر بیل بڑھتی ہوئی پھولتی جھومتی چلی جاتی ہے۔

لیکن یہ بوڑھا یہاں سردی میں آ پڑا ہے۔ کیا اس کا کوئی گھر گھاٹ نہیں؟ اور اپنی اس محویت سے ذرا چونک کر میں نے پوچھا۔ "ارے بھئی تم ہو کون ___؟"

"میں جی! ماہی رام کا آدمی ہوں۔"

بوڑھا کچھ جواب دینے والا ہی تھا کہ اسے کھانسی کا دورہ پڑا۔ کئی لمحے لگا تار کھانسنے کے بعد اپنے سانس کو مشکل سے درست کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ وہ رشتہ میں ماہی رام کا کچھ نہیں لگتا۔ وہ اس کا ہم وطن ہے۔ اس کا کنبہ بہت بڑا ہے۔ پانچ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور بیوی ہے۔ دو لڑکیاں ہیں ___ بیاہنے کے قابل ___ اور وہ روزگار کے لئے ماہی رام کے ساتھ آ گیا ہے۔

اس کی آواز میں کچھ ایسا سوز تھا کہ کام کرنا میرے لئے ناممکن ہو گیا۔ میں اتنے کپڑے پہننے کے باوجود پتلون پر کمبل ڈال کر بیٹھا ہوں اور وہ غریب باہر سردی میں پڑا ہے۔ بستر کے نام پر شاید ایک میلی پھٹی دلائی اس کے پاس ہے اور وہ میلا کالا لحاف بھی برسوں کا پرانا ہے ___ قریب قریب پگھل کر میں نے کہا۔ "تو بھائی اندر لیٹ جاؤ۔ باہر تو بڑی سردی ہے۔ برآمدہ دونوں طرف سے کھلا ہے۔ باہر تم کیوں بیٹھے ہو؟"

لیکن اس وقت سیمنٹ کے فرش پر بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی اور دوسرے لمحے ماہی رام ___ وہ ٹھیکیدار گوپال داس کا چھ فٹ تین انچ لمبا آدمی دروازہ پر آ کھڑا ہوا۔ بڑی سی پگڑی۔ اس کے نیچے کالا موٹا کمبل گھٹنوں تک دھوتی اور پاؤں میں سیر سوا سیر کا جوتا۔ ایک دن چھ مولیوں کے لئے وہ ایک میل تک ایک آدمی کے پیچھے دوڑتا گیا تھا اور اسے پکڑ کر اس نے وہ وہ پٹخنیاں دی تھیں کہ پھر اس نے کبھی ادھر کا رُخ نہ کیا تھا۔

"ہم نے اسے خود یہاں سلایا ہے بابو جی۔" ماہی رام نے کہا۔ "نہ جانے کون سالا رات کو کھیتوں میں ڈاکہ ڈالتا ہے۔ دو دن دیکھتے ہو گئے ہیں ___ ایک رات گوبھی کے دس پھول غائب تھے۔ سارے کھیت میں ایسے پھول نہ ملیں گے۔ پرسوں کوئی تمام پکے ہوئے ٹماٹر اتار کر لے گیا۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں کچن کو بھی سپلائی کرنی پڑتی ہے اور پھر دو سو روپیہ کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ وہ سب بھی تو اسی میں سے

... اور پھر مزدوروں کی مزدوری......"

"تمہاری ترکاری پر کون ڈاکہ ڈال جاتا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہاں تو کبھی چوری ہوتے سنی نہیں۔ میری کوٹھی سنسان جگہ پر ہے۔ ابھی کوئی کوٹھی بھی نہیں۔ لیکن میں تو دروازے کھلے چھوڑ کر گھنٹوں غائب رہتا ہوں۔"

"نہیں بابو جی باہر کا آدمی اتنی سردی میں صرف دس گوبھی کے پھول لینے نہیں آسکتا۔"

"لیکن اس دن مولیاں ....."

"وہ اور بات تھی بابو جی۔ وہ تو کوئی راہ چلتا آدمی تھا۔ جاتے جاتے اکھاڑ کر لے گیا۔ کوئی یہیں کا ہے۔ میں سالے کو ایسا سبق دوں گا کہ عمر بھر کو کان ہو جائیں۔" اور اس کے موٹے موٹے ہونٹ پھیل گئے اور چیچک کا مارا ہوا چہرہ تن گیا۔

"لیکن بھائی اگر چاہو تو اسے اندر سلادو۔"

"نہیں بابو جی سردی تو امیروں کو لگتی ہے' اسے تو یونہی محض دکھاوے کے لئے یہاں سلادیا ہے۔ ورنہ رکھوالی تو میں کروں گا ——— ان مونگروں کے پیچھے بیٹھ کر۔ جونہی یہ سمجھ کر کہ بوڑھا سو گیا ہے' کوئی آیا کہ میں نے اسے دبوچا۔" اور وہ ہنسا۔

"لیکن اس کے پاس کپڑے... .."

"کافی ہیں بابو جی۔"

اور یہ کہتا ہوا وہ چلا گیا۔ بوڑھے کو پھر کھانسی کا دورہ پڑا۔

میں پھر کام میں منہمک ہو گیا۔ لیکن کام مجھ سے ہو نہ سکا۔ میرے سامنے ان دونوں کے مالک کی تصویر کھنچ گئی۔ ٹھیکیدار گوپال داس ——— دھن' دولت' اولاد اور بے فکری کی وجہ سے اس کے گال اس پچاس برس کی عمر میں بھی گلاب کی طرح سرخ تھے ——— اس ہڈیوں میں پیوست ہونے والی سردی میں جب یہ بوڑھا باہر پڑا ہے وہ اپنے گرم لحاف میں لیٹا۔ دہکتی ہوئی انگیٹھی سے گرم اپنے کمرے میں مزے سے گپیں ہانک رہا ہو گا۔ تاش اور شطرنج میں مشغول ہو گا۔

اور یونہی سوچتے سوچتے میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ کچھ غنودگی سی مجھ پر طاری ہونے لگی۔ کھانا زیادہ کھا گیا تھا۔ کپڑوں کا بوجھ میں نے لاد رکھا تھا اور کمرہ خوب گرم تھا ——— میں اٹھا۔ کچھ ضروری کاغذ اور قلم دوات لے کر سونے کے کمرے میں چھوڑ آیا۔ میں نے سوچا کل سویرے ذرا جلدی اٹھ کر کام کروں گا۔ دفتر کے کمرے میں تالا لگاتے ہوئے میں نے ایک بار پوچھا کہ اگر وہ چاہے تو دفتر کو کھلا چھوڑ دوں۔ لیکن "نہیں بابو جی میرے پاس کافی کپڑے ہیں۔" اس کا یہ جواب سن کر قفل بند کر کے میں اپنے چھوٹے سے سونے کے کمرے میں چلا گیا۔ بستر بچھا ہوا تھا صرف لحاف پر میں نے کمبل ڈال لیا اور کپڑے بدل کر لیٹ گیا۔

بستر برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ میں نے پاؤں سکیڑ لئے اور پھر انہیں آہستہ آہستہ پھیلایا۔ کئی طرح کے خیالات دماغ میں گھومنے لگے ——— بے ربط ——— بے ترتیب۔ لیکن لحاف کی گرمی سے آنکھیں بوجھل ہو گئیں اور پھر بند۔

سوتے سوتے کبھی ماہی رام' کبھی اس بوڑھے اور کبھی اس کے مالک ٹھیکیدار کی صورتیں میرے سامنے آنے لگیں۔

میں نے دیکھا۔ ماہی رام نے چور پکڑ لیا ہے اور وہ اسے مارتا مارتا پاس کے گاؤں تک لے گیا ہے۔ سب گاؤں والوں کو جمع کر کے اس نے اعلان کیا ہے کہ جو ہماری سبزی چرائے گا اسے ایسی ہی سزا دی جائے گی۔ اتنا کہہ کر وہ پھر چور کو زدوکوب کرنے لگتا ہے۔ چور نہایت درد بھری نگاہوں سے اسی کی طرف تکتا ہے اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ وہ چور ٹھیکیدار گوپال داس کے سوا کوئی نہیں۔ وہی گھٹا ہوا سر' وہی پھولے ہوئے گال اور چپٹی ناک۔

میری آنکھ لگ گئی۔ دیکھا پاؤں سے رضائی اتر گئی۔ زیادہ کھا جانے کی وجہ سے سینہ کچھ بھاری ہے اور گلا سوکھا جارہا ہے۔

میں نے سرہانے رکھے ہوئے لوٹے سے پانی پیا اور پھر لحاف کو اچھی طرح سے اوڑھ کر دونوں طرف سے اسے پاؤں کے نیچے کر کے لیٹ گیا باہر ہوا مکانوں سے ٹکریں مار رہی تھی۔ درخت حتی الامکان اس کا مقابلہ کرتے ہوئے جوش کی شدت سے چنگھاڑ رہے تھے۔ شاں شاں ____ اور دور بادل کی گرج اور رعد کی کڑک سنائی دے رہی تھی۔ لیکن گرم ہو کر جسم ڈھیلا پڑ گیا اور میں پھر سو گیا۔

اس بار کیا دیکھتا ہوں کہ زور کی بارش ہو رہی ہے۔ تیز ہوا چلتی ہے پاؤ پاؤ بھر کے اولے پڑتے ہیں کیاریوں میں پانی کھڑا ہو جاتا ہے۔ ساری کی ساری سبزی تباہ ہو جاتی ہے۔ صرف اسی مرجھائے ہوئے سکڑے سمٹے پیلے زرد بینگن کا پودا رہ جاتا ہے۔ پھر وہ بینگن میرے سامنے بڑا ہونا شروع ہو جاتا ہے اور میں دیکھتا ہوں کہ اس کی شکل اس بوڑھے کی سی ہو گئی۔ گھٹنوں کو پاؤں میں لے کر سینے سے لگائے وہ سکڑا سمٹا اپنی لمبی چوٹی کے سہارے لٹک رہا ہے۔ اولے اس کے سر پر لگتے ہیں اور وہ اس بینگن کے پودے کے ساتھ لٹکا ہوا جھولتا ہے۔

پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ بینگن کا پودا ایک بڑا اونچا نہ جانے جامن کا نہ جانے آم کا درخت بن جاتا ہے۔ لوگوں کی بھیڑ نیچے کھڑی شور مچا رہی ہے "بوڑھا مر گیا ____ بوڑھا پھانسی لگا کر مر گیا۔"

پھر میرے کانوں میں صرف "مر گیا' مر گیا" کی آواز آتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاخ ٹوٹ رہی ہے..... کٹر کٹر..... کٹر کٹر ...... میری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا کوئی زور سے دروازہ کھٹ کھٹا رہا ہے۔

جلدی سے گرم جرابیں پہن' سر پر ٹوپی پہن اور کمبل کو اچھی طرح لپیٹ کر میں اٹھا۔ دروازہ کھولا۔ دیکھا تو سیکرٹری صاحب دوسرے کئی اصحاب کے ساتھ کھڑے ہیں۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رات آپ کے برآمدہ میں بوڑھا مر گیا۔"

میں نے دیکھا۔ اس میلی سی کالی چارپائی پر اپنے ارد گرد وہی میلا کچیلا لحاف لپیٹے بوڑھا جھکا ہوا پڑا ہے۔ اس کا جسم اکڑ گیا ہے اور آنکھیں پھٹی پڑی ہیں۔ اس کا لحاف بھیگ گیا ہے۔ دور دور تک پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہے اور برآمدے کا سارا فرش گیلا ہے۔

"میں نے تو رات ہی اس سے کہا تھا کہ دروازہ کھلا...... "میں نے کہنا شروع کیا۔

لیکن سیکرٹری صاحب نے میری بات کو کاٹ دیا۔ "میں چائے کے لئے کچن سے دودھ لینے جا رہا تھا۔" وہ بولے۔ "کہ اسے بارش میں بھیگتے پایا۔ آواز دی لیکن یہ ہلا تک نہیں۔ آ کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رات سردی میں اکڑ گیا ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ٹھیکیدار کے آدمیوں کو حکم دیا کہ اسے اٹھوانے کا انتظام کیا جائے۔

اس کے دو دن بعد کچن کو جاتے ہوئے اچانک رُک کر میں نے ماہی رام سے کہا۔ "خدا کے لئے اس پیلے سے بینگن کے پودے کو اکھاڑ دو۔" میری آواز میں کچھ ایسی بات تھی کہ ماہی رام حیران میری طرف دیکھنے لگا اور پھر اس نے کہا:

"بہت اچھا سرکار!"

لال دھرتی

دیوندر ستیارتھی

کوئی رنگ مظلوم نگاہوں کی طرح خاموش اور فریادی ہوتا ہے۔ کوئی رنگ خوبصورتی کی طرح کچھ کہتا ہوا اور داد طلب دکھائی دیتا ہے۔ کوئی رنگ مچلتا ہوا ہمیں کسی ضدی بچے کی یاد دلا جاتا ہے اور کسی کو دیکھ کر غنودگی سی چھا جاتی ہے... ...لاری کے ڈرائیور نے دریا پار کرتے ہوئے کہا۔"اب ہم آندھر دیش میں داخل ہو رہے ہیں بابو جی؟" میں نے چاروں طرف پھیلی ہوئی سُرخ زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔" آندھر دیش کی سُرخ زمین کیا کہہ رہی ہے۔"

آنکھیں موند کر میں نے اپنے دل میں جھانکا۔ وہاں سبز رنگ لہلہا رہا تھا۔ اپنے دماغ سے اس رنگ کا مطلب سمجھنے کی میں نے چنداں ضرورت نہ سمجھی اور آنکھیں کھول کر سُرخ زمین کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ دھیرے دھیرے میں نے محسوس کیا کہ یہ رنگ بہت بلوان ہے اور میرا نیا رنگ اس کے سامنے ٹک نہ سکے گا۔

ڈرائیور نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ایسا نظر آتا تھا کہ اس نے سُرخ زمین کے بھید خود اس کی زبان سے سُن لئے ہیں اور اب اس کیلئے یہ مشکل ہو رہا ہے کہ انھیں چھپا کر رکھ سکے۔

لاری بھاگی جا رہی تھی۔ سُرخ دھول اُڑ اُڑ کر ڈرائیور کے گالوں پر اپنا رنگ چڑھا چکی تھی۔ میں نے اپنے گالوں پر ہاتھ پھیرا۔ یہ دھول وہاں بھی آ جمی تھی۔ میں نے سوچا کہ میرے چہرے کی میل خوری زمین پر سُرخ رنگ چڑھ گیا ہو گا اور بہت بھدا تو نہ لگتا تھا۔

"پہلے یہ سارا ضلع بہار اڑیسہ میں تھا' بابو جی!"

"اور اب؟"

"اب نقشہ بدل گیا ہے' بابو جی!"

"نقشہ بدل گیا ہے؟"

"جی ہاں۔ جب سے اڑیسہ الگ صوبہ بن گیا ہے' اس ضلعے کے تیلگو بولنے والے حصے آندھر دیش کو مل گئے ہیں۔"

"بہت خوب۔"

"لیکن ہم خوش ہیں' بابو جی! گورنمنٹ نے ابھی تک آندھر دیش کو الگ صوبہ بنانا منظور نہیں کیا۔"

"مگر کانگریس تو کبھی کی یہ قرارداد پاس کر چکی ہے کہ زبان کی اہمیت کو قبول کیا جائے۔ ہر بڑی زبان کا اپنا صوبہ ہو تاکہ ہر زبان کے لوگ کی پوری پوری پرورش کی جا سکے، ہر تمدن اپنے اچھے ماحول میں آزاد ہو کر نشوونما پا سکے۔

"جی ہاں۔ کانگریس نے یہی کیا ہے کہ آندھرا دیش کا الگ صوبہ بنا دیا جائے مگر گورنمنٹ نہیں مانتی۔"

"گورنمنٹ کیوں نہیں مانتی؟ مدراس میں تو اب کانگریس منسٹری قائم ہو چکی ہے اور اس کے پردھان شری راج گوپال آچاریہ بڑے زبردست آدمی ہیں۔ وہ یہ کام ضرور کر سکتے ہیں۔"

"مگر اس کا حکم تو لندن سے آنا چاہئے، بابو جی!"

"لندن سے؟"

"جی ہاں . . . . . اور اگر یہ حکم نہ آیا تو ہم بڑی سے بڑی قربانی دیں گے اپنا لہو بہانے سے بھی گریز نہ کریں گے۔"

"لہو بہا دو گے اپنا؟ پہلے ہی یہ زمین کم سرخ ہے؟"

ڈرائیور نے ایک بار پھر معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نیا رنگ جھانک رہا تھا۔ وہ نیا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ زمین سرخ تھی۔ کبھی گہرا بادامی رنگ زور پکڑ لیتا۔ پھر یہ سیندوری بن جاتا ..... سیندوری رنگ گلناری میں تبدیل ہو جاتا. . . . . سرخ رنگ مجھے جھنجھوڑ رہا تھا۔ میرے لہو کی روانی تیز ہو چکی تھی۔ کئی بڑے چھوٹے پلوں اور ننھی ننھی پلیوں کو پھاندتے ہوئے لاری وجے نگرم کے قریب جا پہنچی۔ مندروں کے بڑے بڑے کلس دکھائی دینے لگے۔ اس بھاگم دوڑی میں ہمیں وجے نگرم اپنی طرف بھاگتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ گویا ہماری لاری ساکن تھی۔

قصبے میں داخل ہوتے ہی سڑک تربینی کی طرح تین طرف دوڑی جاتی تھی۔ وہ سڑکوں کے سنگم پر بھیم راؤ کا مکان تھا۔ ڈرائیور انھیں پہچانتا تھا۔ ان کے گھر کے سامنے مجھے اُتارتے ہوئے اس نے دوست نواز آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ "آندھرا دیش کی سرخ زمین کیا کہہ رہی ہے؟" میں نے کہا۔ وہ مسکرایا۔ لاری آگے بڑھ گئی۔

میں نے آواز دی بھیم راؤ باہر نکلے۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی تھے۔ چہرے پر سیتلا مائی کا آٹوگراف نظر آ رہا تھا ___ چیچک کے بڑے بڑے داغ! توند کی طرف دھیان گیا تو میں بڑی مشکل سے ہنسی کو روک سکا۔ ہمارے اسکول میں ایسا ہیڈ ماسٹر کبھی رعب قائم نہ رکھ سکتا۔

تعارفی چٹھی کو پڑھتے ہی وہ مجھے اندر لے گئے۔ بولے۔ "آپ نے بہت اچھا کیا کہ اس غریب کے ہاں چلے آئے۔ اس چٹھی کی بھی کچھ ضرورت نہ تھی۔"

"آندھرا دیش کی بہت تعریف سنی تھی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ بہت دنوں سے ادھر آنا چاہتا تھا۔"

"آپ شوق سے رہیے۔"

مجھے ایک الگ کمرہ مل گیا۔ فرش پر سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ ننگے پاؤں چلنے سے ہمیشہ یہ محسوس ہوتا کہ آندھرا دیش کی سرخ زمین میرے پیروں سے چھو رہی ہے۔ اندر سے کمرے کا دروازہ بند کر کے کبھی کبھی میں قالین پر لیٹ جاتا اور دھیان سے اپنے دل کی دھڑکنیں سننے لگتا۔ اچھا شغل تھا۔ سرخ رنگ کیا کہہ رہا ہے؟ ___ بار بار یہ سوال زبان تک آیا مگر ہونٹ بند رہے۔

بھیم راؤ کے مکان پر کانگریس کا ترنگا جھنڈا لہرا رہا تھا...... سبز اور سفید اور سرخ...... اس ترنگے جھنڈے کا مفہوم میرے ذہن میں اجاگر ہو اٹھتا۔ دل ہی دل میں [illegible] کہنے لگتا کہ اس جھنڈے کا سرخ رنگ آندھرا دیش کی ترجمانی کر رہا ہے اور یہ خیال آتے ہی

مجھے ایک ناقابل بیان مسرت حاصل ہوتی۔ جہاں سفید رنگ ختم ہو کر سرخ رنگ شروع ہو تا تھا۔ وہیں میری نگاہ جم جاتی اور ایک نوجوان ٹیکسی ڈرائیور کے الفاظ میرے کانوں میں گونج اُٹھتے۔ "اب ہم آندھرا دیش میں داخل ہو رہے ہیں' بابوجی۔"

میرے کمرے میں بڑا مختصر سا فرنیچر تھا۔ ایک طرف ایک ٹائلٹ میز پڑا ہوا تھا۔ دو کرسیاں' ایک تپائی اور ایک طرف ایک تخت جس پر مجھے سونا ہو تا تھا' بستر پر دن کے وقت کھادی کی دودھیا سفید چادر بچھادی جاتی تھی۔ اب سوچتا ہوں کہ اس ٹائلٹ میز کا گول آئینہ وہاں نہ ہو تا تو وہ چند دن اتنے دلچسپ نہ ہو جاتے۔ میرے جذبات کا رنگ پکی ہوئی اینٹوں کی طرح سُرخ ہو چلا تھا۔ یہ رنگ میرے چہرے پر بھی تحرک اُٹھتا۔ اس کے لئے میں آئینے کا ممنون ہو تا۔

میرے کمرے کی دائیں کھڑکی میدان کی طرف کھلتی تھی۔ وہاں سبز گھاس او گھستی ہوئی نظر آتی۔ پانی نہ ملنے پر یہ گھاس پیلی ہو سکتی تھی سُرخ نہیں۔

دن چڑھتا اور پتہ ہی نہ چلتا' کہ کیسے بیت گیا۔ وجے نگرم میرے لئے نیا تھا' ہر آنکھ میں کوئی نہ کوئی صدیوں کا جمع شدہ رنگ تحرک اُٹھتا۔ اس سے پہلے کہیں ماضی او۔ حال کو یوں بغلگیر ہوتے نہ دیکھا تھا۔ رات ختم ہوئی تو صبح سُورج کا تمتماتا ہوا تلک لگائے آحاضر ہونا اسے دیکھ کر مجھے کرشنا دینی کی پیشانی کا "بوٹو" یاد آجاتا۔

پیچھے سے آکر کرشنا دینی میری آنکھیں بند کر لیتی۔ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور جوں ہی پرے ہٹتی۔ میری آنکھیں اس کی پیشانی کی طرف اُٹھتی کم کم کا سرخ "بوٹو" کینڈل کی بجائے پچاس کینڈل کا برقی قمقمہ بن کر اس کی پیشانی روشن کرتا دکھائی دیتا۔ کوشش کرنے پر بھی میں کبھی اسے ایسی حالت میں نہ دیکھ سکا۔ جبکہ غسل کے بعد یہ "بوٹو" ڈھل کر اُتر چکا ہو۔ پھر میں نے یہ کوشش چھوڑ دی۔ بس ٹھیک ہے یہ قمقمہ ہمیشہ روشن رہے' دن ہو چاہے رات ——— کم کم کا سُرخ بوٹو!

ان پورنا اور کرشنا دینی دونوں بہنیں تھیں۔ دینی پورنا سے دو سال چھوٹی تھی۔ دونوں گھر پر پڑھتی تھیں۔ بڑی بہن سنگیت کی ابتدائی منزلوں کو طے کر کے اس کی گہرائیوں میں پہنچ چکی تھی۔ چھوٹی بہن صرف بہن کی وینا کو دیکھ چھوڑتی تھی۔ اس کا گانا سُن لیتی تھی اور اگر اس نغمہ نے اس کی فطانت کا کوئی سویا ہوا رنگ جگا دیا تو اس نے تھوڑی بہت تک بندی کر لی۔ نہیں تو کس کی وینا' کون ان پورنا' وہ اپنی کتابوں میں اُلجھی رہتی۔

بھیم راؤ اپنی بیٹیوں کی تعریف میرے سامنے بھی لے بیٹھتے۔ دونوں کے سُرخ "بوٹو" میرے ذہن میں تیرنے لگتے اور مجھے محسوس ہوتا کہ میرے منہ میں پان کی پیک اور بھی سُرخ ہو گئی ہے۔ میرے جذبات چھالیا کے ننھے باریک ریزے بن جاتے جو پان چباتے وقت پھس سے دانتوں کی درزوں میں سے گذر جاتے ہیں۔

"یہ تو اپنے آدمی ہیں' بیٹیو!" بھیم راؤ کہتے' ان سے خوب باتیں کرو' ان کی کہانیاں سنو۔ دیس دیس کا پانی پی رکھا ہے انھوں نے ——— ہاں دیس دیس کا" اپنی یہ تعریف سُن کر میرے ہر مسام کے کان لگ جاتے' پٹھوں میں ایک عجیب سا تناؤ پیدا ہو جاتا' ذہن میں ایک گدگدی سی ہونے لگتی' یہ آندھرا دیش کی سُرخ زمین کا خلوص تھا' ایک ترقی پسند خلوص!

"یہ کرشنا دینی تو نری گلہری ہے' مسٹر راؤ" ایک دن میں نے دونوں بہنوں کی موجودگی میں کہا۔ "اور یہ اچھا ہی ہے۔"

"خوب! خوب! اِدھر سے اُدھر' اُدھر سے اِدھر' مجال تو بیٹھ ہی نہیں سکتی گلہری ہی تو ہے۔"

کرشنا دینی ہنسی نہیں۔ آخر اس میں گلہری کی کیا بات ہے؟ شاید ہمارے معزز مہمان کے دیش میں لڑکیاں نہیں ہوتیں۔ وہ حیا سے سمٹی رہتی ہوں گی۔ لیکن دیس دیس میں' دھرتی دھرتی میں فرق بھی ہوتا ہے نا۔

بھیم راؤ بولے۔ "یہ آنند مر دیش ہے۔"

انّ پورنا نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "اور یہاں کی کنیائیں آزاد نظمیں بن گئی ہیں____"

کرشنا دیبی کی آنکھوں میں ایک بجلی سی چمک گئی۔ بولی۔ "جی ہاں آزاد نظمیں۔"

اور میں نے محسوس کیا کہ کم از کم کرشنا دیبی ضرور ایک آزاد نظم ہے' نہ بحر کی حاجتمند' نہ قافیے کی پابند۔

انّ پورنا نے اپنے بازو کرشنا دیبی کے بازوؤں پر ڈال دیئے اور بولی "دیّی! چلو آج دھیشری کے ہاں چلیں۔ کل تو آئی تھی ادھر۔ آج اس نے شکل ہی نہیں دکھائی۔"

کرشنا دیبی نے اپنا چھوٹا سا خوبصورت سر ہلا دیا اور پنکھے کی ڈنڈی کو قالین پر پھیرتے ہوئے بولی۔ "انّ پورنا میں باہر نہیں جاسکتی۔"

"کیوں نہیں جاسکتی باہر؟" انّ پورنا نے حیران ہو کر پوچھا۔

دیّی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے انّ پورنا کے گلے میں بازو ڈال دیئے' بولی "دی دی____" اور اس کے بعد اس کے کان میں کچھ کہہ گئی۔ انّ پورنا اچھل پڑی۔ بولی۔

"سچ۔"

دیبی نے ہاں میں سر ہلا دیا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ میرا دل زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑایا۔ دیّی اُٹھ کر کھڑی ہو گئی اور غسل خانے کے طرف چل دی۔ انّ پورنا نے تالی بجائی اور گھڑی کی طرف دیکھا۔ اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ وہ بھی اپنی کھڑاؤں پر گھوم گئی اور سامنے رسوئی کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی جہاں اماں بیٹھی ہوئی زمین پر قند چھیل رہی تھی۔

انّ پورنا نے کہا "اماں____"

اماں نے سر ہلا دیا۔ انّ پورنا اس کے قریب پہنچ کر جھک گئی اور اس کے کان میں کچھ کہہ دیا۔ اماں کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اسکے گالوں پر ایک تمتماتی ہوئی سرخی نمودار ہوئی۔ پھر ایک مسکراہٹ ناچتی ہوئی اس کے چوڑے چہرے پر چوگان کھیلنے لگی۔ اماں نے چاقو اور زمین قند کو ایک طرف رکھ دیا اور اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ بولی۔

"چلو کارو (پنڈت جی!")

میرے لئے یہ سب ایک پہیلی سے بڑھ کر تھا۔ میرا خیال تھا کہ بھیم راؤ اس سے کورے ہیں۔ وہ اُٹھ کر اپنی بیوی کے پاس چلے گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں ریل گاڑی میں بیٹھا ہوں جو دندناتی ہوئی ایک سرنگ میں سے گذر رہی ہے۔ گھپ اندھیرا چھا گیا ہے......کوئی عورتوں کی بات ہوگی۔ یہ سوچتے ہی سرنگ ختم ہو گئی۔

کرشنا دیبی نے پہلے بھی وہ سبز رنگ کی ہلکی گھگھری نہ پہنی تھی۔ گھگھری کا رنگ گہرا سبز تھا' رانگیا کا پھیکا سبز۔ اس کی آنکھوں کی جھیلوں میں بھی سبز رنگ کا عکس چڑھا تھا۔ یہ رنگ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ سوال مجھے اس سے ضرور کرنا چاہیے تھا۔ اس کے لہو میں کسی نے سونا پگھلا کر ڈال دیا تھا؟ یہ سونا ہی تھا جو اس کے گالوں پر دمک رہا تھا۔ یہ سونا کیا کہہ رہا تھا؟ مانگ کیا تھی۔ پوری پوری پگڈنڈی تھی۔ کیا مجال کوئی لٹ پھسل جائے۔ کوئی بال سرک جائے۔ کنگھی چوٹی کا فن جوانی کے ساتھ ساتھ اپنے کمال کو پہنچتا ہے۔ ناک کی سیدھ رکھ کر سر کے بیچوں بیچ مانگ کاڑھنا انّ پورنا کو سرے سے ناپسند تھا۔ مگر نہیں کرشنا دیبی کی سیدھی مانگ انّ پورنا کی ٹیڑھی مانگ سے کہیں سندر لگتی تھی۔ اس وقت دونوں بہنیں میرے قریب بیٹھی ہوتیں تو میں اپنا ووٹ چھوٹی بہن کے حق میں دیتا۔

کوئی ایک گھنٹہ بعد پورے گیارہ بجے اندر سے وینا کے سر سنائی دیئے صرف ان پورنا ہی کی وینا تو یہ رنگ نہیں جما سکتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ محلے بھر کی وینا بجانے والی سہیلیاں سر میں سُر ملا کر کوئی راگ سادھ رہی ہیں۔ ایسی بھی کیا خوشی تھی؟

بہت سی عورتیں اور لڑکیاں بن کا ٹھٹھا اور ہنسی مذاق ہوا کو چیرے ڈالتا تھا آخر کس تقریب پر بلائی گئی تھیں؟ مجھ سے نہ رہا گیا۔ بائیں کھڑکی کا پردہ ذرا سرکا میں نے آنگن کی طرف نظر ڈالی تو کیا کیا دیکھتا ہوں کہ کرشنا دینی سامنے والے کمرے میں پیلی دھوتی پہنے بیٹھی ہے اور آرتی اتاری جا رہی ہے تھال میں کم کم نظر آرہا تھا۔ لیکن اس میں کوئی چو مکھا دیا نہیں جلایا گیا تھا۔ کرشنا دینی نے آنکھیں جھکا رکھی تھیں۔ اتنی بھی کیا لاج تھی؟ یہ نیا نئی دیوی بننے کا اپائے تھا۔

کرشنا دینی کی ماں کو بدھائیاں مل رہی تھیں۔ ان پورنا کی دنیا سب سے زیادہ چمک رہی تھی۔ رنگا رنگ کی ساڑھیاں میرے ذہن میں غلط ملط ہو رہی تھیں۔ ابھی ایک بچی رونے لگی۔ اسے ایک کیلا مل گیا۔ ادھر ایک لڑکی اپنے چھوٹے بھائی کے منہ میں گڑ اور تلوں کا لڈو ڈالنے لگی کہ ایک لڑکا اچک کر اسے چھین لے گیا۔ کچھ پروا نہیں لڈوؤں کی کیا کمی ہے؟ بھائی خوش رہے' جیتا رہے . . . .. میری فطرت کے ایک پراسرار کونے میں کوئی تان سین جاگ اٹھا جسے ان پورنا نے اپنے گیت کی لہروں پر اٹھا لیا۔ یہ کیسا گیت تھا؟ شاید یہ دودھ اور شہد کا گیت تھا۔ دودھ دوہتے وقت جو آواز پیدا ہوتی ہے کچھ ایسی ہی آواز ان پورنا کی وینا پر پیدا ہوتی تھی۔

"اب تو گاؤ دشیشری"

"تم سے اچھا تو نہ گا سکوں گی۔ انّ پورنا! اچھا بتاؤ کونسا گیت گاؤں؟"

وہی جو تم نے اس روز گایا تھا۔ جب دینی کی طرح میں نے پیلی دھوتی پہنی تھی اور اسی طرح اسی آنگن میں ____ برکت والے آنگن میں' عورتیں اور لڑکیاں جمع ہوئی تھیں ____ وہی شہد کی مکھیوں والا گیت۔"

دشیشری نے گانا شروع کیا۔ آندھرا دیش کی شہد کی مکھیاں کیا کہہ رہی ہیں۔ یہ سوال میرے ذہن کی چار دیواری میں بند رہا۔ وینا کے سُر آگے بڑھتے گئے۔ یہ کوئی معمولی گیت نہ تھا۔ صدیوں کی نسوانیت کا جذبہ برتری تھا۔ ابھی تو دوپہر تھی۔ لیکن ہر عورت اور لڑکی کی پیشانی پر ایک ایک چاند نظر آرہا تھا۔ کم کم کے سرخ بوٹو!

کرشنا دینی کی آنکھیں اوپر نہ اٹھیں۔ کیا یہ وہی لڑکی تھی جو اب تک کبھی ہانی چوکڑی نہ بھولی تھی۔ اس کے آویزے ساکن تھے۔ اس کے نگینے چپ تھے' لاج اور دوشیزگی پہلے تو کبھی یوں توام بہنوں کے روپ میں نظر نہ آئی تھیں۔ مگر وہ کوئی کبوتری تو نہ تھی جسے پہلی بار انڈے سینے سے سابقہ پڑا ہو۔

ٹھٹھا اور ہنسی مذاق خاموشی میں بدلتے گئے۔ گیت بھی کافی ہو چکے تھے۔ ویناؤں کے تار تھک گئے تھے۔ کرشنا دینی کی ماں اور بہن نے کم کم کی تھالیاں اٹھا کر ہر کسی کی پیشانی پر پھر سے نئے بوٹو لگا دیئے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ پہلے لگے ہوئے بوٹو ہی جلی کر دیئے گئے ایسا دن تو بہت مبارک تھا۔ ہر کسی کو پان پیش کیا گیا۔ ناریل اور کیلے تقسیم کئے گئے اور یوں سب کو وداع کیا گیا۔ صدیوں سے یوں ہی ہوتا آیا تھا۔ کم کم کے سرخ بوٹو ان گنت نسلوں سے قائم رہے تھے۔ ان کا رنگ کبھی پھیکا پڑنے نہیں دیا جائے گا۔

دوسرے روز یہ محفل شام کے قریب جمی۔ پھر تیسرے روز بھی شام ہی کو چوتھے دن شام کی بجائے صبح ہی کو یہ رونق شروع ہو گئی۔ اس اثنا میں مجھے پتہ چل چکا تھا کہ کرشنا دینی رجسولا (حائضہ) ہو گئی ہے۔ مجھے حیرت ضرور ہوئی۔ کیونکہ اس سے پہلے ہندوستان میں کوئی ایسی رسم میرے دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

بھیم راؤ کی باتوں میں میناکاری کا رنگ پیدا ہو گیا تھا۔ بولے۔ "جھوٹی شرم میں آندھرا دیش کوئی وشواش نہیں رکھتا۔ سچ کہتا ہوں

"تو جیرانی ہوئی یہ سن کر کہ آپ کے ہاں ایسی کوئی رسم جاری نہیں ہے۔"

"کیا یہاں ہر لڑکی تو دلہن بنا چاہتی ہے" میں نے بڑھاوا دیا۔

"ہمارے ہاں یہ دھرتی دھرتی ہے۔"

"یہ تو ٹھیک ہے۔"

"رجسولا ہونے پر کنیا کو قدرت کا آشیرباد ملتا ہے۔"

"آپ کا نقطۂ نظر بالکل ٹھیک ہے مسٹر راؤ اور ایسے موقع پر خوشی منانے سے ہر گز نہ چوکنا چاہئے۔"

"اور یہ گیت آپ کو کیسے لگتے ہیں۔"

"یہ سب گیت تو ایسے کہ یہ نئے آندھرا دیش کے ابدی بول معلوم ہوتے ہیں۔

آندھرا دیش کے ابدی بول" ہماری یہ رسم بہت پرانی ہے۔"

"ضرور پرانی ہو گی۔"

پہلے روز جب کنیا کو اپنے رجسولا ہونے کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح فوراً ماں تک یہ خبر پہنچاتی ہے۔ تین دن تک اسے ہلدی کے پانی میں رنگی ہوئی دھوتی پہن کر الگ کمرے میں بیٹھنا ہوتا ہے۔ کوئی اسے چھوئے گا نہیں۔ اس کی آرتی بھی دور ہی سے اُتاری جاتی ہے۔

"آرتی میں ہمارے یہاں جلتا ہوا دیا۔ چو مکھا دیا نہ بھی ہو تو پروا نہیں۔ ضروری سمجھا جاتا ہے۔ مگر آپ کے ہاں ——"

فرق تو ہوتا ہی ہے دھرتی دھرتی کا۔ ہمارے ہاں بس کم کم ہی سب سے ضروری مان لیا گیا ہے آرتی کے لئے؟ "

سرخ کم کم؟

"کم کم ہمیشہ سرخ ہی ہوتا ہے۔"

میں نے مسکرا کر آنکھیں جھکا لیں۔ بھیم راؤ نے اپنی بات جاری رکھی۔ کھانے میں بھی رجسولا کو کافی پرہیز کرنا ہوتا ہے۔ سرخ مرچ اور گرم مسالے اس کے لئے منع ہیں۔ بیٹھے بٹھائے اسے کھچڑی دودھ اور کچھ پھل مل جاتے ہیں۔ کھائے اور پورا آرام کرے۔ یہ ضروری ہے۔"

"تین دن کے بعد کیا ہوا ہے؟" میں نے پھر بڑھاوا دیا۔

"کنیا اشنان کر کے پوتر ہو جایا کرتی ہے اس کی وہ پہلی دھوتی دھوبن کو بطور تحفے کے دے دی جاتی ہے۔ اب وہ ماتا پتا کی حیثیت کے مطابق ستھرے وستر پہن کر بیٹھتی ہے اور یہ چوتھی یعنی آخری آرتی اتارتے وقت اس کی پیشانی پر بونو لگایا جاتا ہے۔"

"بونو کے لئے کم کم نہ ہو تو آندھرا دیش کا کام ہی نہ چل سکے۔ مسٹر راؤ!"

"کم کم؟ یہ ضروری ہے۔"

"بلکہ یہ کہئے کہ آندھرا دیش اور کم کم دونوں ہم معنی الفاظ ہیں۔"

"بس اب آپ نے ٹھیک سمجھ لی ہے بات۔"

"میرا رجحان سرخ رنگ سے سبز رنگ کی طرف رہا ہے' مسٹر راؤ!"

"سبز رنگ کی طرف بھی لیکن سرخ رنگ نرالی زبان میں بولتا ہے...... کم کم کا پیغام آندھرا دیش صدیوں سے سنتا آیا ہے۔"

رنگوں کا مطالعہ میں نے بھی کر رکھا ہے' مسٹر راؤ! سبز رنگ اپنی جگہ ہے یہ شانتی کا رنگ ہے۔ ہر سبز چیز امن و سکون کا مظاہرہ کرتی ہے۔ قدرت کو شاید یہی رنگ سب سے زیادہ پسند ہے۔ جب تک دھرتی بنجر نہیں ہو جاتی۔ اس کی کوکھ سے اس رنگ کے کارنامے ہمیشہ ہمارا دھیان کھینچتے رہیں گے۔ کانگرس نے بہت اچھا کیا کہ اپنے جھنڈے پر اس رنگ کو اس کی جگہ دینے کی بات فراموش نہ کی۔ سفید رنگ میرے خیال میں پوترتا (پاکیزگی) کا رنگ ہے۔ ہمارے جھنڈے پر تبھی یہ رنگ بھی موجود ہے اور سُرخ رنگ؟ میں سمجھتا ہوں یہ خون کا رنگ ہے۔ اچھے تندرست خون کا رنگ ____ تازہ مضبوط زندگی کا رنگ .... سبز 'سفید 'سُرخ' خوب رنگ چنے ہیں کانگرس نے یہ جھنڈا بنانے کا کام آندھرا دیش کے سپرد کیا جاتا تو سارے جھنڈے پر کم کم ہی کم کم پھیل جاتا۔"

"لیکن یاد رہے کہ سُرخ رنگ کا مفہوم سمجھنے میں آندھرا دیش نے خوب قدم بڑھایا ہے ...... کانگرس کے بائیں ہاتھ نے ادھر جو زور پکڑا ہے۔ وہ بھی ظاہر ہے۔ پچھلے دنوں جب شری شبھاس چندر بوس کانگرس پردھان کے انتخاب میں دوبارہ کھڑے ہوئے تو آندھرا دیش کے ووٹ بہت بھاری تعداد میں انھیں کو ملے۔ حالانکہ ان کے مقابلے پر کھڑے ہونے والے ڈاکٹر پٹا بھی سیتارامیا آندھرا دیش کے اپنے آدمی ہیں مگر آپ جانتے ہیں ان باتوں میں لحاظ داری تو ٹھیک نہیں ہوتی۔ سوشلزم اور ہندوستان کی آزادی ہمارے دو بڑے آدرش ہیں اور آندھرا دیش کو الگ صوبے کا وقار حاصل ہو جائے' اس کے لئے ہم اپنی جانیں لڑانے پر آمادہ ہیں۔"

"پنتلوگارو (پنڈت جی؟!") باہر سے کسی نے آواز دی۔

بھیم راؤ باہر چلے گئے۔ میں کھڑکی میں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ یوں محسوس ہوا کہ کسی کے غیر مرئی ہاتھ میری پیشانی پر کم کم کا بوٹو لگا رہے ہیں۔ میں جھٹ وہاں سے ہٹ گیا اور کمرے کو اندر سے بند کر کے میں نے بائیں کھڑکی کا پردہ ہولے ہولے ایک کونے سے سرکایا۔ سامنے بڑی خوشنما مجلس نظر آ رہی تھی۔ کرشنا دیی نے ہلکی نیلی انگیا کے ساتھ گہری نیلی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ آویزوں کے نگینے سروئی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے ذہن کے بچے کھچے سبز رنگ نے ان رنگینیوں میں پناہ پالی ہے۔

انّ پورنا نے وینا پر ملہار کا راگ شروع کیا۔ اس کی انگلیاں بہت ہمک ہمک کر چل رہی تھیں۔ مگر اس راگ سے بھی کرشنا دیی کی آنکھیں اُوپر نہ اُٹھیں' انّ پورنا آسمان کی طرف دیکھ رہی تھی اور کرشنا دیی دھرتی کی طرف آنکھیں جھکائے بیٹھی تھی۔ کس نے چھو دیا تھا اپنے غیر مرئی ہاتھ سے اس کنیا کو؟ ...... ہر رجسولا تو یوں چھوئی موئی بن کر نہ جاتی ہوگی ...... ہلکی نیلی انگیا' گہری نیلی ساڑھی اور آویزوں کے سروئی نگینے! ...... باہر سے تازہ ہوا کا جھونکا آ رہا تھا۔

بہت ہو چکی یہ لاج دیی" انّ پورنا بولی "میں بھی ہوئی تھی۔ رجسولا تیری طرح۔ میں نے تو پہلے ہی روز کے بعد مسکرانا شروع کر دیا تھا اوپر دائیں بائیں' سامنے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔"

"میں تو کبھی نہیں ستاتی کسی کو۔'

کرشنا دیی کے چہرے پر ہولے ہولے وہی پرانی شوخی آتی گئی۔ اماں نے آگے بڑھ کر کم کم اُٹھایا اور اس کے بوٹو کو جلی کر دیا۔

کرشنا دیی اب کوئی چھوئی موئی نہ تھی۔ ہر چہرے کی طرف اس کی آنکھیں اُٹھ جاتی تھیں۔ کالی جھیلوں میں نہ جانے کتنی لہریں تھرک رہی تھیں .... کرشنا دیی کے صندلی بازو' جنھیں دیکھ کر تازہ تازہ زندہ کئے جانے کا گماں ہوتا تھا۔ اوپر اُٹھے اور اس نے سب کو نمسکار کیا۔

سب عورتیں اور لڑکیاں مسکرائیں۔ سب کے سُرخ بوٹو تازے کم کم سے جلی کر دیئے گئے۔ جانے کیا کہہ رہی تھی۔ کاجل کی لکیریں ہر آنکھ میں؟ ...... پان بٹے ____ سبز پان' جو اپنے سینوں میں سُرخ رنگ چھپائے پڑے تھے' کیلے بٹے۔ ناریل بٹے۔ سب اُٹھ

کنڑی ہو گئی۔..... کیا سے کر رکھیں تھیں۔ یہ ساڑھیاں؟ کیا سے کر سرخ تھی یہ زمین؟ ——— اس کے علاوہ اس کی تو کوئی ... کہاں کہیں؟ ہے؟ کون فنکار ان کی تخلیق کرتا تھا؟ کون تھا جو زمین کی ہریالی کو ٹھیک وقت پر جھولا بنا دیتا تھا؟ ...... یہ تو بہت ضروری تھا۔ ان گنت صدیوں سے سبز، سفید اور سرخ صدیوں سے بھی ہوتا آیا تھا۔

سب چھوٹی بھی چلی گئیں۔ سب لڑکیاں بھی تتر بتر ہو کر اپنے اپنے گھر بھاگ گئیں۔ اب صرف کرشنا دیدی اور راج پورنا رہ گئیں۔ ان کی ... جاگتی تھی۔

"دیدی، ذرا ایک بات بتاؤ گی؟"

"ہاں پوچھو۔"

رجسولا ہو کر بھی میں اتنی کمزور نہیں ہوئی۔ بھلا کیسے؟

"کیسے؟ یہی ہوتا آیا ہے۔ جب سے شروع دنیا سے، میں کون سی کمزور ہو گئی تھی؟ بلکہ رنگ نکھر جاتا ہے اس سے۔ . . پھر . . ہر مہینے!

ہر مہینے؟

"چپ رہو، ابھی کوئی سن لے گا۔"

پھر دونوں بہنیں اُٹھ کر اندر چلی گئیں۔ میں اپنے سرخ قالین پر لیٹ گیا۔ میری روح کی گہرائیوں سے ایک خیال اٹھا اور باہر سے آنے والی ہوا کے جھونکے سے ٹکرا گیا۔

میرے ذہن میں کانگریس کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔ سبز، سفید اور سرخ ——— اس جھنڈے کی عمر بہت زیادہ تو نہ تھی۔ مگر یہ رنگ تو پرانے تھے۔ ہمالہ کے ہم عمر رنگ 'گنگا' برہم پتر اور گوداوری کے ہم عمر رنگ! ہو گا ان رنگوں کا اپنا اپنا مفہوم۔ مگر میں تو اس مفہوم پر لٹو تھا جو خود ہندوستان نے ان رنگوں کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا . ... اور میری آنکھوں میں وہی ناری پھرنے لگی جس پر سوار ہو کر میں بھیم راؤ کے مکان تک پہنچا تھا۔

دائیں بائیں آمنے سامنے۔ جہاں تک میرے ذہن کی پہنچ تھی۔ سرخ زمین لیٹی ہوئی تھی۔ ایک رجسولا کنیا کی طرح وہ آرام کر رہی تھی۔ وہ وقت مجھے بہت قریب آتا دکھائی دیا جب اس کی کوکھ ہری ہو گی اور کوئی ایسا آدمی پیدا ہو گا جو بہ آواز بلند پکار اٹھے گا۔ ہلوں کی ... اب ان کھیتوں میں غلام نہیں اُگیں گے۔ یہ لال دھرتی ہے۔

کلیاں اور کانٹے

اختر اورینوی

وہ تعداد میں نو تھیں۔ گوری' سانولی' گوارا اور ناگوار' بعض ان میں دلکش کہی جا سکتی تھیں مگر خوبصورت کوئی نہیں۔ سورج اسی طرف سے طلوع ہوتا تھا جس طرف سے وہ اپنی سفید ساریوں میں ملبوس طیور صبح کے چہچہوں کے ساتھ بانس اور رینڈا کی جھاڑیوں کی اوٹ سے نکلتی دکھائی دیتی تھیں۔ ہر صبح اٹھ کر ادھر آتی تھیں اور ایک ٹوٹے ہوئے تارے کی طرح مشرقی افق کی طرف سفر کر جاتی تھی۔ درجہ اول کے کوارٹر 'صحت گاہ کے عام وارڈوں سے قریباً تین فرلانگ پورب کی جانب تھے۔ ان میں سے کسی ایک کی ڈیوٹی اسی طرف ہوتی تھی اور ڈیوٹیاں بدلتی رہتی تھیں۔ ہر پندرھویں روز۔ عام وارڈ کے بھی دو درجے تھے۔ دوم و سوم۔ درجہ اول کے کوارٹر تو خاصے بنگلے تھے۔ ان کی اپنی شخصیت تھی۔ وہ اسپتال نہیں گھر معلوم ہوتے تھے۔ ساٹھ روپے ماہوار ان کا کرایہ تھا۔ درجہ دوم کے چالیس روپے ماہانہ تھے۔ ایک مریض کو دو کوٹھڑیاں مل جاتی تھیں۔ ایک اپنے لئے ایک تیمار دار کے لئے۔ تیسرے درجے کے معنی تھے ایک وسیع سالا لمبا چوڑا کمرہ۔ ایک کمرے میں آٹھ پلنگ ہوتے تھے اور جب حیات کے لعب و لہو کی رفتار میں زیادہ تیزی ہو جاتی تو سل و دق کے جراثیم کے چند اور شکار آ جاتے تھے اور کمرے کی آبادی بارہ تیرہ تک پہنچ جاتی تھی۔ درجہ سوم کا کرایہ پچیس روپے ماہوار تھا۔ زندگی' موت اور زندگی' موت کے درمیان بھی انسانیت درجوں میں بٹی ہوئی ہے۔ گھر' اسپتال اور قبرستان' ہر جگہ نمبر ایک' نمبر دو اور نمبر تین کی تفریق ہوتی ہے۔ کالوں کا قبرستان' گوروں کا قبرستان' شرفاء کے مدفن اور غریبوں کے گورستان ہر شہر' ہر قصبے اور گاؤں میں پائے جاتے ہیں۔ 'صحت گاہ' اسی کرہ پر قائم تھا اور اسی کے بھلے برے قانون کا پابند۔

ہم ان دنوں دس تھے۔ 'صحت گاہ' کے انتہائی جنوبی طرف تیسرے درجے کے وارڈ میں۔ یہاں سے نرس کوارٹر سامنے نظر آتا تھا۔ لوہے کے پلنگ پر پڑے ہوئے مریض درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان نرسوں کی اقامت گاہ کو اس طرح دیکھتے تھے جیسے فٹ پاتھ پر چلتی ہوئی مزدہ رنوں کے ترسے ہوئے بچے پرستانی دکانوں میں شیشے کی الماریوں کے اندر کھلونے دیکھتے ہیں۔ وہ نو نرسیں ہم سے شناسا تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کی ڈیوٹی ہم لوگوں کے وارڈ میں کبھی نہ کبھی رہ چکی تھی۔ اس کے علاوہ گاہے گاہے کی پارٹیوں اور پکنکوں میں ہم لوگوں کا ساتھ رہتا تھا۔ ہم سب نرسوں کو اچھی طرح جانتے تھے اور وہ ہمیں۔ ہماری گفتگو کا اکثر حصہ انہی سے متعلق ہوتا تھا۔ ان کی تعریف' ان کی برائیاں' ان کے ناز' ان کی سازشیں' ان کی محبت و نفرت۔ ہم رومان سے تھک کر ٹھیٹھ حقیقت طرازی پر اتر آئے تھے۔ ہمارے گرسنہ جذبات رومانی بیانات کے شربت کو برداشت کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ ہمیں مصالحہ دار چٹپٹی چیزوں کی ضرورت ہوتی تھی۔ ہم میں سے اکثر افراد اس وارڈ میں ایک سال گذار چکے تھے اور چند ایسے بھی تھے' جن کے تین سال ختم ہو گئے تھے۔ امید و ناامیدی کے تین سال' ارمانوں اور محرومیوں کے تین طویل سال۔ ایک دو نو وارد تھے' یہ نو گرفتار سہمے سہمے' سنجیدہ' متحمل' متردد' بے بس اور ملتجی

سے نظر آتے تھے۔ چند ہفتوں میں یہ عزک محو اور ہو جاتی تھی اور نئے بہت جلد پرانے بن جاتے تھے۔ لیکن ایک دو پرانے بھی ایسے تھے جن کی مستقل مایوسی اور گھبراہٹ کبھی دور نہ ہوتی۔ بہرکیف موت اور بیماری کے درمیان بھی وارڈ کی مجموعی فضا خوشگوار تھی۔ استراحت کے گھنٹوں کے علاوہ وقتوں میں ہم لوگ کھیلتے تھے' ہنستے تھے' جملہ بازیاں ہوتی تھیں' قہقہے لگتے تھے' نرسوں سے لگاوٹ ہوتی تھی' اصلی اور نقلی آہیں کھینچی جاتی تھیں' سرگوشیاں ہوتی تھیں اور راز داریاں بھی۔ ہم دسوں کا ایک خاندان تھا' ایک مذہب۔ ہم ایک دوسرے کے ساتھ خوش ہوتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ رنجیدہ۔ وارڈ میں بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی' پر سب ایک رنگ میں رنگے ہوئے تھے کم از کم ایسا نظر آتا تھا۔ ہاں استراحت کے گھنٹوں میں ہماری اجتماعیت ٹوٹ کر بکھر جاتی تھی اور ہم میں سے ہر ایک اپنی دنیا بساتا تھا اور ویران کرتا رہتا تھا۔ رات کے آرام کے علاوہ دن بھر میں تین استراحت کے وقفے ہوتے تھے۔ باضابطہ طور پر نرسیں گھنٹی بجا کر مریضوں کو بار بستر ہو جانے پر مجبور کرتی تھیں۔ یہ بھی ایک علاج تھا۔ نیند اور گفتگو ممنوع زندہ لاش کی طرح پڑے رہیے۔ جہاں تک ممکن ہو کم سے کم کروٹ لیجئے اور کچھ مت سوچئے۔ فکر و تردد ایسے مریض کے لئے مہلک ہے۔

"سوچا مت کیجئے۔ اچھے! ہاں.....ں!"

نرسیں بڑے پیار سے کہتیں۔ مگر بھلا کوئی کیسے نہ سوچے؟ ہم اکیلے پلنگ پر پڑے پڑے سوچتے رہتے ہیں۔ زندگی کا سوچ' موت کا سوچ' کل کا سوچ' دق کا سوچ' آرزوؤں کی لاش' ماضی کا ماتم' مستقبل کا روگ اور سب سے بڑھ کر روح کی وہ مہیب کپکپی جو مادہ کے سہارے سے علیحدگی کے محض تصور سے ہی طاری ہو جاتی ہے۔ جسم! محسوس' ٹھوس' تپاں' متحرک' خود نگر' خوبصورت اور حقیقت کا اچانک سرد اور بے حس ہو جانا! احساس وادراک جھنجھنانے لگتے ہیں۔ فرد کے وجود کا لامعلوم' تاریک' بے پایاں' لامکاں' بے زماں وسعتوں میں تحلیل ہو کے فنا ہو جانا' سوچنے والے دماغ' دھڑکتے ہوئے دل' تیرتے ہوئے خون کا تعطل اور لاعلمی کا لرزہ خیز ناقابل تصور پھیلاؤ۔ یہ کائنات کا سب سے المناک سانحہ ہے۔ ہم 'صحت گاہ' کی خاموشیوں میں پھسلتے ہوئے لمحات کو' سرکتی' گھٹتی' ڈوبتی ہوئی زندگی کے انجام کو سوچ کر لرز اٹھتے تھے۔ ہم خیالات کے بوجھ جو فضا میں پھینک کر اپنی قمیضوں کے بٹن یا پلنگ کی پٹی پکڑ لیتے ہیں تاکہ معلوم اور شناسا چیزوں کی ہستی کا ٹیک مل جائے۔ ہم گاہ ٹماٹر کے دام اور چینی کوٹ کے حاشیے کو تخیل سے چھو کر درد زندگی کی لذتوں سے پناہ لیتے تھے اور کبھی خواب راتوں کی نیند کا کاجل گھول کر احساس کو افیون دینے کی کوشش کرتے۔ مرجھائے ہوئے پھول کی طرح پوپٹے نڈھال ہونے لگتے تو ———

"اوہ......رے......رے! بڑے صاحب سے کہہ دوں گی' یہ تو سونے لگے ہیں!"

کی آواز سنائی دیتی اور گاہے گاہے گال یا پیشانی پر ایک آشنا سی چپت۔ یہ نجات دہندہ آواز سر سے بوجھ اتار دیتی تھی۔ ہماری آنکھیں مسکراتی ہوئی کھل جاتیں۔

"میں تو آپ سے مذاق کر رہا تھا مس صاحب' سوتا کون ہے؟" ——— "آیئے آپ بھی سو جایئے۔" یہ جواب ملتا۔ پھر کئی تسکین دہ ردعمل۔

روزانہ طلوع آفتاب کے بعد کرنوں کی طرح وارڈ میں آتی دکھائی دیتی تھیں۔ پہلے نسائی آوازوں کے گھنگھرو بولنے لگتے تھے۔ ہم چوکنا ہو کر اس طرف دیکھتے۔ 'صحت گاہ' کی ویرانیوں میں یہ روزانہ کا واقعہ بھی کافی اہمیت رکھتا تھا۔ سفید ساریاں سبز جھاڑیوں سے نکلتیں جیسے بیلے کے پھول کو پو پھٹی کے اندھیرے پردے سے نکلتے ہیں۔ بگلوں کا پرا قریب تر ہوتا جاتا اور آوازیں زیادہ واضح۔

پنکھڑی پنکھڑی اور سوہا پھول ہم لوگوں کے وارڈ میں آ گرتے۔ ہم دسوں مریض انہیں اپنے دامن نظارہ میں لے لیتے۔

جب کسی نرس کی [illegible] کے کوارٹرسے اس وارڈ میں بدلتی عموماً ہی ہوتا کہ بجا یا بے جا طور پر کردہ و ناکردہ غلطیوں پر ہم

لوگوں کی سرزنش یوں کی جاتی۔

"میں اے وارڈ میں بھلی تھی کیسے اچھے مریض ہیں اس وارڈ کے مریض تو جان کھا جاتے ہیں"۔

"کیسے اچھے ہیں اے وارڈ والے! اپنے نوکروں سے کام کرا لیتے ہیں بے چارے اور یہ لوگ تو جوتے سیدھے کرواتے ہیں جیسے میں نوکرانی ہوں..... "اور کبھی زیادہ دلدوز:

"گھر میں کرتے ہوں یہ ٹھاٹھ! شان دکھلانے آئے ہیں۔ اے وارڈ میں نواب صاحب اپنا منہ تک میلا نہیں کرتے تھے۔"

ہم دسوں مریض مختلف زاویوں سے درجہ اوّل کے کوارٹر کو معاندانہ دیکھنے لگتے اور کوارٹر کی سرخ اینٹیں طرح طرح کی شکل نظر آتیں۔ معمر نواب صاحب کی موٹر' ان کا جوان لڑکا' منصف صاحب دھن راج جی کے بھائی کی توند اور شہوتی چھوٹی چھوٹی آنکھیں' صوبے کے صدر اسپتال کے سپرنٹنڈنٹ صاحب کا گورا چٹا چالاک و فتنہ کار نورِ نظر' بیمار و تیمار دار' غرض درجہ اوّل کی ساری مخلوق سیل کے کیڑوں کی طرح محسوس ہوتی۔ جو ہمارے پھیپھڑوں کو چھلنی کر رہی ہے۔ ہم ان سب کو اپنے اندر سے نکال کر تھوک دینا چاہتے تھے۔ تھوک دانی کے کاربالک ایسڈ میں فنا ہونے کے لئے۔

اس روز سینے کے گھاؤ زیادہ خلش پیدا کرتے اور ہم میں سے کئی برسِ ستمگار کے جسم کا جغرافیہ بیان کر کے دل کی بھڑاس اور چھپے ہوئے جنسی ارمان نکالتے تھے۔

ہمارے دلوں میں بھی چور تھا اور ان کے دلوں میں بھی۔ ہمارے اندر کوئی ٹیڑھی سیدھی رگ ضرور ایسی تھی جو نرسوں کو ذلیل سمجھنے پر اکساتی رہتی تھی اور نرسیں بھی ہر وقت اپنی شخصیت اور پندار کے تحفظ کے لئے تیار رہتی تھیں۔ ان کے تجربے رنگ رنگ کے تھے۔ ماضی کے نہال خانے میں سینکڑوں مریض' بیسیوں ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر چھپے ہوئے تھے۔ نرسوں کے دلوں سے ہو کر ایک تار گذرتا تھا جو ان مریضوں اور ڈاکٹروں کو گوندھے ہوئے ہمیں بھی پروتا چلا جاتا تھا۔

تیسرے درجے میں خلوت کا سکون اور مواقع نہ تھے لیکن اجتماع کا تنوع' ہمدردی اور رونق تھی۔ اے وارڈ کے علاوہ اپر سی وارڈ اور لوئر سی وارڈ کے درمیان بھی رقابتیں تھیں مگر یہ دوسری رقابت ولولہ انگیز اور عمل پرور تھی۔ یہ اپر اور لوئر محض زمین کے نشیب و فراز کا فرق تھا۔ پہاڑی علاقوں میں زمین کا اونچ نیچ بہت ہی نظر نواز ہوتا ہے۔ دونوں سی وارڈ تیسرے درجے کے وارڈ تھے۔ دونوں کا اعتبار اور امکانات برابر تھے۔ لیکن ہمارے وارڈ کا ایکہ ساری 'صحت گاہ' میں مشہور تھا۔ ہماری لاگ اور لگاؤ بس سمجھئے متحدہ ہی تھی۔

وارڈ کے انتہائی داہنی طرف اٹھارہ سال کے ایک گورے نازک سے لڑکے کا بیڈ تھا۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں میں "اے پی" دی جاتی تھی۔ یہ اس صحت گاہ کا معجزہ تھا اور مثالی نمونے کی حیثیت رکھتا تھا۔ مدراسی ڈاکٹر نے اسے حیرت انگیز طور پر سیل کے پنجوں سے چھینا تھا۔ اسے بہت زیادہ آرام کرنے کی ہدایت تھی۔ پھر بھی وہ وارڈ کی دلچسپیوں میں کافی حصہ لیتا تھا۔ وہ نرسوں کا کھلونا تھا۔ "ننھا گوپال" گوپال پندرھویں سال میں سینی ٹوریم آیا تھا۔ اس کے ایک جانب ایک مارواڑی تھا' بہت ہی موٹا تازہ۔ تین من اس کا وزن تھا۔ پر یہ غریب ساڑھے تین سال 'صحت گاہ' میں رہ کر بغیر شفایاب ہوئے ہی چلا گیا۔ اس کے دونوں پھیپھڑوں میں بڑے بڑے غار تھے۔ اس کے بڈ پر ایک مارواڑی ہی آیا۔ یہ اتنا دبلا تھا کہ ہم لوگ اسے منگنی رام کا بھوت کہتے تھے۔ تیسری ہستی ایک سیاہ رنگ کے مریض کی تھی جو حیاتین کے جنون میں صرف ایک سیر ٹماٹر دن بھر میں کھا جایا کرتا تھا۔ وہ کم سخن مگر زندہ دل تھا۔ یہ حضرت مر مر کے بچے تھے۔ شاید ان کی صورت دیکھ کر ملک الموت بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ چوتھا خود میں تھا۔ 'صحت گاہ' میں اپنی شادی کے سوٹ پہن پہن کر حسرتیں نکالنے والا۔ میرا دوسرا ہمسایہ نقی تھا۔ ایک طرف بھائی حاذق کی سیاہ فامی اور دوسری جانب نقی کا کافوری رنگ ہم تینوں مل کر اس اشتہار کی تصویر بن جاتے تھے جس کے نیچے لکھا ہوتا ہے۔ "اب کالا کوئی نہیں رہے گا۔" نقی حسین اور بے حد جوان معلوم ہوتا تھا۔ شوخ' چونچال' بیباک

دور نس گئے۔ اس کی آمد سے نرسری وارڈ کا پتہ گراں ہو گیا تھا۔ پہلے اسی وارڈ میں کوئی نرسوں کا مرکز ثقل تھا۔ مگر اب ڈیوٹی ختم ہوتے ہی ساری نرسیں اپنے کوارٹر جاتے ہوئے نرسری میں چلی آتی تھیں۔ گھڑی دو گھڑی کے لئے کھانے کی میز کے گرد جوئی دل نواز نشست ہو جاتی تھی۔ چالیس سالہ وکیل صاحب کے چست فقرے نرسوں کو بہت بھاتے تھے۔ وارڈ میں دو وکیل صاحبان تھے۔ ایک داڑھی رکھتے اور تعظیم کرتے تھے' دوسرے پیشانی پر چندن کا ٹیکا لگاتے اور نرسوں سے فحش مذاق کرتے تھے۔ جونیر وکیل صاحب کی تابناک پیشانی پر مجیر کی طرح چندری نرسوں کے لئے سرمایہ تفریح تھی۔ ان دونوں بزرگوں کی تکنیک ایک سی تھی۔ یہ پہلے بے وقوف بن کر اور جملے سہہ کر اپنا حق جتا لیتے تھے اور پھر معصومانہ انداز میں مذاق کا جواب دیتے تھے۔ ان دونوں کا نشانہ بے خطا تھا مگر ایک کی فطرت میں بیانی طنز زیادہ تھا اور دوسرے میں واقعیت نمایاں۔

تقی کے بائیں پہلو میں ایک نوجوان مصری جی تھے۔ گورا رنگ جس پر سرخی کی چھوٹ تھی۔ مصری جی بہت جذباتی اور رقیق القلب تھے۔ جسمانی طور پر یہ جو بھی رہے ہوں مگر ذہنی طور پر بالکل کنوارے تھے۔ اچھوت نیا کی طرح۔ مجھے' تقی اور مصری جی کو ایک پھیپھڑے میں "اے پی" دی جاتی تھی۔ مصری جی کہنہ مریض تھے۔ "اے پی" کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ان کے مریض پھیپھڑے کو "فرینک زو" کی جراحت کے ذریعہ معطل کر دیا گیا تھا۔ میں اور مصری جی میڈیکل کالج کے طالب علم رہ چکے تھے۔

نویں صاحب ایک اڑتالیس سال کے دیسی عیسائی تھے۔ یہ نہایت ہی سعادت مند قسم کے مریض تھے۔ استراحت کے گھنٹوں کے اندر اور اس کے بعد بھی وہ قطعی طور پر لکڑی کے تختے کی طرح چت لیٹے یسوع مسیح سے لو لگائے رہتے تھے۔ کوئی جنبش نہیں' کسی قسم کے آثار حیات نہیں۔ وہ جب ضرورتاً چلنے پھرنے پر مجبور ہو جاتے تھے تو یوں چلتے تھے کہ "زیر قدمت ہزار جان است" اصولاً وہ اپنے سل زدہ پھیپھڑوں کو کم سے کم حرکت اور زیادہ سے زیادہ آرام دینا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک گفتگو بھی زیان حیات تھی۔ ہر وقت' ہر روز' ہر سال یونہی زندگی گذارتے تھے جیسے سسرال میں نئی دلہن۔ صحت گاہ میں انہیں ڈھائی سال ہو چکے تھے۔

دسویں ہستی ایک بنگالی مسلمان لڑکے کی تھی۔ سولہ سترہ سال اس کی عمر ہوگی۔ موٹا' ول منول سا گردن ندارد۔ یہ لڑکا غلام ربانی بھی پرتھو بابو کا مرید تھا۔ کم سخن و کم آمیز مگر بسیار خور و بسیار خواب۔ اسے ہم لوگ "مرغ" کہتے تھے اور پرتھو بابو کو "پطرس دلی"۔ "مرغ" وضو کے علاوہ غسل بھی "بناتا" تھا۔

یہ دسوں مختلف طبائع کے لوگ ایک انوکھی ہمدردی کے ذریعہ ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ سے تھے۔ نرسوں سے مذاق کے وقت "پطرس دلی" بھی ایک دو مسکراہٹیں ضرور ارزاں کر دیا کرتے تھے۔ ویسے بھی وہ ہمارے رومانوں سے کافی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ کیتھرن اور ایشری کی آواز سنتے ہی "مرغ" بھی بانگ دینے لگتا تھا۔

یہ دو نرسیں جان سینا ٹوریم تھیں۔ ایشری بیس سال کی صندلی رنگ' دراز قد' چھوٹی مگر مسکراتی ہوئی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ وہ چلتی تھی جیسے اسپ تازی "قدم" چلتا ہے۔ وہ اس کی گردن اور سینے کا "کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق" قسم کا خم! ایشری ملنسار' دلنواز اور مجسم سپردگی تھی۔ وہ نسیم خوش خرام کی مثال آزاد و ہمہ گیر تھی۔ ایشری کیتھرن کو کٹو بوا کہتی تھی۔ کیتھرن پچیس سالہ بھرپور جوان عورت تھی۔ سانولا رنگ' جراحاتِ جفا پر نمک ریز' اس کے چھپلے اور گداز کولھے' اس کی گول کمر' اس کی مثالی ہندی چال' مست ہاتھی کی طرح۔ وہ یوں افق نظر میں داخل ہوتی تھی جیسے سمندری سفر کے بعد جہاز ہچکولے کھاتا ہوا ساحل کی طرف آتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے بھاری کولھوں کے محور پر بالائی جسم چلتے وقت جھوم سا جاتا تھا جیسے پھلدار شاخ موٹے تنے پر لچک سی جائے۔ پھر اس کے کولھے پیش و پس ڈگمگا کے متانت سے آگے بڑھتے جاتے تھے۔ وہ اپنے ہاتھ سے ہلکا سا اشارہ کر کے ساری کے پلو میں تناؤ پیدا کرتی اور چھوڑ دیتی تھی۔ آنچل کی پلٹن میں اس کے سینے ابھر آتے تھے اور پلو لہرانے لگتا تھا۔ کیتھرن عموماً متین سی رہتی تھی۔ مگر اچانک طور پر وہ شوخ و سحر کار بن

جاتی تھی اور پھر سنجیدہ۔ بجلی کا چنچل پن اور امنڈتے ہوئے کالے موج در موج بادل کی گمبھرتا۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کو نمایاں کرنے کے قابل ترجمانی تھیں۔ اس کی فطرت میں بحرالکاہل کی گہرائی تھی۔

ان دو کے علاوہ سات اور تھیں۔ ایک جوڑا تھا مارتھا اور فیبی۔ مارتھا مردانہ اور لانبی چپٹی سی عورت تھی۔ منہ زور اور بے جھجک۔ فیبی اس کے زیرحکومت تھی۔ نرسز کوارٹر کے ایک ہی کمرے میں دونوں رہتی تھیں۔ وہاں دو پلنگ کے کمرے تھے۔ "فیبی تو فلاں مریض سے کھل مل کر کیوں ملی؟ فلاں نے تجھ سے چھیڑ چھاڑ کیوں کی؟" اس جوڑے کے "نصف بہتر" حصے پر ہر وقت پہرہ تھا۔ مارتھا اس صورت سے خوش تھی۔ شرمیلے اچھوت کنیا سے مصر تھی۔

ایک جوڑا تھا دو چچازاد بہنوں کا سلوتی اور فلورنس۔ دونوں گوری گوری گداز گداز مائل بہ فربہی عورتیں تھیں۔ مگر لڑکیاں کہے جانے پر مصر۔ سلوتی اخلاقاً ضرور تنا لڑکی کہی اور سمجھی جاسکتی تھی لیکن فلورنس تو بہت ہی بلند اخلاقی اور اشد ضرورت کے باوجود عورت سے لڑکی نہیں بن سکتی تھی۔

مینکی اور دلارتی کالی کالی چپٹی ناکوں والی نرسیں تھیں۔ خوش اخلاق، نرم، فرماں بردار، عزیز، ایثار پسند۔ مینکی ادھیڑ عمر کی تھی اور دلارتی جوان۔ اس کے چھوٹا نا پوری سینوں کی سنگینی ناک کے چپٹے پن کا اس حد تک کفارہ ضرور ادا کر دیتی تھی کہ اس کی پیشانی کے محاذ سے نظریں پھسل کر صدر میں ٹھوس سہارے کے بل پر تھم جاتی تھیں۔

نویں تھی ڈولی۔ وہ سراپا ڈولی تھی۔ چھوٹا سا کھلونا، شریر آنکھیں مٹکانے اور چیں چیں کرنے والی گڑیا۔ گہرا سانولا رنگ، بوٹا سا قد، پاجی آنکھیں، کھلنڈری، بے باک، لڑ پڑنے والی اور لڑ کر ہنس دینے والی۔ یہ سب سے کم عمر تھی۔ اٹھارہ انیس سال کی ہوگی۔ کبھی تو یہ بدصورت دکھتی تھی اور کبھی گوارے حد تک بھولی۔

'صحت گاہ' ایک ویرانے میں تھی۔ سب سے نزدیک کا گاؤں ڈیڑھ میل پر تھا اور سب سے نزدیک کا شہر اٹھارہ میل پر۔ 'صحت گاہ' کی بس اپنی ایک چھوٹی سی دنیا تھی۔ الگ تھلگ دو ڈاکٹر' ایک کمپاؤنڈر' ایک ڈریسر' ایک ایکس رے بابو' دو کلرک' نو نرسیں' ایک میٹرن اور سسٹر' آٹھ وارڈ بوائے' چند مہترانیاں اور پچاس کے لگ بھگ سل ودق کے مریض مع اپنے باورچیوں اور چند تیمارداروں کے' وارڈوں کے چاروں طرف باغ' جنگل اور سرخ سرخ مورم کے بڑے بڑے ٹیلے تھے۔ کچھ دور چھوٹی چھوٹی مگر پرشور پہاڑی ندیاں تھیں۔ جاڑوں اور گرمیوں میں یہ ندیاں مریضوں کے آنسوؤں کی طرح خشک ہو جاتی تھیں۔

ایک روز میں اور نقی ایکس رے کے لئے نرس ڈولی کے ساتھ جا رہے تھے۔ ڈولی صبح سے غمگین اور چڑچڑی تھی۔ بڑے صاحب نے اسے ڈانٹا تھا۔ راستے میں اس نے دور سے بڑے صاحب کو دیکھا کہنے لگی:

"بڑا بنتا ہے۔ ایکس رے کرنے کے بہانے ڈارک روم میں خود جو چاہے کر گزرے اور دوسروں سے جلتا ہے۔"

ڈولی نے غصے کی بے خیالی میں یہ جملے ادا کئے۔ ہم لوگوں کی موجودگی کے احساس نے اسے چونکا دیا۔ پردہ داری کے بغیر نہ رومان رہتا ہے نہ کشش۔ وہ کہہ چلی۔

"نرسیں اگر ایسی ہوتیں تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔ خدا باپ ہم لوگوں کو بچا لیتا ہے۔"

بات یہ تھی کہ بڑے صاحب کے جذبہ اجارہ داری کے باوجود نرسوں کی انفرادیت ہمیشہ سرکشی پر تلی رہتی تھی۔ مہینے میں ایک روز نرسوں کو "ڈے آف" ملتا تھا۔ وہ تنہا یا دو تین کی ٹولی بنا کر شہر چلی جاتی تھیں۔ مگر اجنبی شہر میں دل کی پیاس کا بجھنا بلاؤز یا پیٹی کوٹ کی لیس خریدنا تو ہے نہیں۔ نرسیں عموماً وہاں سے دل کا بوجھ اٹھائے ہوئے واپس آتیں بلکہ سینما دیکھنے کے بعد آرزوؤں کی خاکستر کے اندر چند چنگاریاں اور سلگ اٹھتیں۔

کوارٹر میں دو نرسوں کی ٹولیاں تھیں۔ یہ ٹولیاں زیادہ تر زندگی کی تلخ حقیقتوں اور مطالبوں پر جانبدارانہ تبصرہ کیا کرتی تھیں۔ فاش صداقتوں کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی تھیں۔ جب سب مل کر بیٹھتیں تو پھر مریضوں ڈاکٹروں اور ڈے آف کی باتیں ختم، دھر پکڑ چھڑ جاتا اور کبھی جھوم کے گیت ۔

آگے آگے میں چلی اور پیچھے پیچھے سیاں
سر دتا کاہے بھول آئے پیارے نندویا

اور غزلیں ع

اے عشق عطا ۔ دے وہ کیف کا پیمانہ

سیاں تو خیر دور کی بات تھی مگر کیف کے پیمانے کی تلاش جاری رہتی۔ ہر نرس کی کئی نئی داستانیں تھیں مگر ان سے ان کی طبیعت بھی سیر نہ ہوئی۔ جوانی 'عورت' بیوی اور ماں ہمیشہ ان میں جاگتی رہتی تھیں اور نہ جانے کتنے جانے اور ان جانے روپ بدل بدل کر ان کے جذبوں پر چھا جاتی تھیں۔ سطح کے نیچے نا آسودگی اور بیزاری پوشیدہ رہتی تھی۔ ارادی اور غیر ارادی قوتوں نے انہیں زندگی کی اس منزل میں لا ڈالا تھا ___ لطافت مٹی نہ تھی روپوش ہو گئی تھی۔

کچھ عجیب بات معلوم ہوگی مگر ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی نرس نے مریض کے بلغم میں سل کے کیڑوں کے پائے جانے کے باوجود اس کے لئے اپنے لب و رخسار ارزاں کر دیئے اور یہ مسلول سل کے کیڑوں کو مکمل طور پر اپنے دل و دماغ میں ہضم کر جاتے تھے۔ 'مثبت' مریض کھمنا سانپ سے زیادہ خطرناک سمجھے جاتے ہیں مگر یہ دیویاں بخوشی گھول کر پی جاتی تھیں۔ کون جانے محبت کے امرت میں ملا کے یا آتشِ بداماں ہوس کی آگ میں بجھا کر۔ مریض تو جراثیم کو تمنائے حیات لی رو میں بہا دیتے تھے۔ وہ اتنی بار ٹی۔بی۔ ٹی۔بی کا ورد کرتے تھے کہ ٹی۔بی بے حقیقت ہو جاتی تھی۔ جیسے ملا کی تسبیح پر گھومتے گھومتے خدا بے حقیقت ہو جاتا ہے۔ ایک بار بھائی حاذق نے 'اسپیوٹم فلاسک' میں سخت کھانسی کے بعد بلغم پھینکتے ہوئے مُصرجی سے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

میں نے کہا تھا۔ مسکی بھی تو ہم قافیہ ہے۔ اپنی غزل کے لئے آپ اسے استعمال کیجئے۔" بھائی حاذق ہنسنے لگے اور انہیں زور سے تکلیف دہ کھانسی آ گئی۔

ہم لوگ کرسمس' عید اور ہولی سب تہوار منایا کرتے تھے اور یوں مریضوں کے علاوہ وہ ذی فراش مریض بھی اپنے دکھ درد کو بھلا کر غم غلط کر لیا کرتے تھے۔ تقی کو صحت گاہ میں آئے ہوئے ساتواں مہینہ تھا اور مجھے پانچواں کہ کرسمس آگیا۔ اس عرصے کے اندر میں اور تقی بہت قریب ہو چکے تھے۔ عورتوں کے وارڈ والیاں ہمیں "سارس کا جوڑا" کہتی تھیں۔ زنانہ وارڈ ہم لوگوں کے وارڈ کے پہلو میں تھا۔ معصوم سے مُصرجی گاہے گاہے وہاں برج یا کیرم کھیلنے کے لئے بلا لئے جاتے تھے۔ مسز شنکر اور مسز اکرم نے ایک دو دفعہ سارس کے جوڑے کو بلاوا بھی بھیجا مگر ہم لوگوں نے تابِ مقابلہ نہ پا کر بلاوے کو ٹال دیا۔ مگر جب ہم لوگ ڈرامے کھیلتے تھے' تو پھر زیور اور کپڑے مانگنے کی تقریب سے جنسِ لطیف سے ملاقاتیں ہو ہی جایا کرتی تھیں۔ کرسمس کے موقعہ پر ہم لوگوں نے ڈرامہ کھیلا۔ نرسوں نے بھی شرکت کی مگر یہ کرسمس نرسوں کے جذبات میں طوفان بپا کرتا ہوا آیا۔

تقی لوئر سی وارڈ میں سب سے زیادہ خوبصورت اور زندہ دل نوجوان تھا۔ اس کی شوخ حسین آنکھیں چشمہ شیریں کی طرح تھیں۔ صنفِ نازک کے لئے دل کی پیاس بجھانے کا نہایت ہی شاداب ذریعہ۔ ہر نرس نے اس کی لانبی اور گھنی پلکوں کے نخلستان میں پناہ لینی چاہی مگر ایشری کی جراتوں کے سامنے بیچاری سب عشقیہ زمین کی آرائش بن کر رہ گئیں۔ ہاں ننھی ڈولی اس طرح وابستہ رہی جیسے ہندوستان کے ساتھ لنکا۔ ڈولی گلہری تھی ہر دم فلسفے پر چڑھ کر پھل کترنے والی۔ مگر چوری چوری یہ لے اور وہ بھاگ۔

ایشری بے حد جذباتی تھی۔ اس کے جذبات کی رو میں ماضی، حال اور مستقبل سب بہہ جاتے تھے۔ اس پر محبت کے دورے پڑتے تھے۔ دو تین ماہ سے زیادہ وہ شدت کے ساتھ کسی کو نہیں چاہتی تھی مگر نقی نے اسے رام کر لیا تھا۔ محبت کے دورے کے وقت بھی وہ کسی کے جذباتی مطالبے کو رد نہیں کر سکتی تھی۔ اے وارڈ کے منصف صاحب اس پر مرنے لگے تھے۔ ایشری نے ان کا دل بھی نہیں توڑا اور دل دہی کے لئے وہ انتہائی بخششوں سے کام بھی لیا کرتی تھی۔ "مجھ سے کسی کا کڑھنا دیکھا نہیں جاتا نقی اور ایک تم ہو۔"

ایشری نے میرے سامنے ایک بار جھوے کے سائے میں میں کہا تھا۔

وہ اپنے سارے قصے ہم لوگوں سے کہہ دیتی تھی۔ اس کا کوئی راز نہ تھا۔

کیتھرن ایشری کی ضد تھی۔ وہ مجسم راز رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس کی فتوحات پس پردہ ہوا کرتی تھیں۔ اپنے کو وہ نہایت ہی پارسا ثابت کرنا چاہتی تھی مگر نقاب و حجاب کا تانا گوشہ وہ چٹکیوں سے ارادتاً ضرور اٹھا دیتی تھی کہ اس کی محبوبیت اور گراں مائگی ارمان انگیز طور پر ظاہر ہو جائیں۔ کیتھرن نے بھی نقی کو اپنا شکار بنانا چاہا مگر نقی اس کی آہستہ خرامی اور رازدارانہ انداز کی فطرتاً تاب لا ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ محبت میں جری تھا۔ بیباک ایشری کی ذات میں اس کو وہ ٹائپ مل گیا جو جذبات کے کھیل میں ہر رکاوٹ کو گناہ سمجھتا ہے۔

یہ سب کچھ ہو چکا تھا جب میں سینا ٹوریم آیا۔ ایک مہینے کے اندر ہی میں اور نقی گھل مل گئے تھے۔ ایشری میرے سامنے بھی نقی سے بے تکلف باتیں کرتی تھی مگر کیتھرن نے جب ایک روز میرا بستر درست کرتے ہوئے چپ چاپ اوڑھنے والی چادر کے اندر میرے ہاتھوں میں گلاب کا پھول دے کر آہستہ سے کہا۔ "ڈارلنگ!" اور میں نے اس سانحہ کا تذکرہ نقی سے کر دیا تو کیتھرن نے مجھ سے شکوے کئے "آپ تو بڑے ناسمجھ ہیں۔ دیکھئے نقی مجھے بھابی کہنے لگا ہے۔ میں یہ باتیں پسند نہیں کرتی۔ میری بھی تو عزت ہے۔ وہ تو آپ سے" کیتھرن نے اپنی سنجیدہ 'شیریں' لوچدار آواز میں شکایت کی اور بات کو مکمل کرتے کرتے دانستہ رک کر ہنسنے لگی۔

کرسمس کی تیاریاں خوب ہوئیں۔ ہم مریضوں نے رنگ برنگ کے کاغذوں کے زنجیرے اور جھنڈیاں بنائیں۔ ساری 'صحت گاہ' کی آرائش کی گئی۔ چوبیس دسمبر کو ہر جگہ خوشی کھم کھم کر ابلنے کے لئے بے چین ہو رہی تھی۔ نرسیں نونیز ہرنیوں کی طرح کلیلیں کرتی پھرتی تھیں۔ اسی روز بڑے صاحب نے بھی رقابت اور فرض کی زنجیریں ڈھیلی کر دی تھیں۔ شام کو نرسیں وارڈ میں جھرمٹ بنا کر صرف یہ پیام دینے آئیں کہ وہ لوگ کرسمس کا "نغمہ شب" گاتی ہوئی صبح کاذب کے وقت ہی وارڈ میں آئیں گی۔ سب لوگ ان کی پذیرائی کے لئے تیار رہیں۔ وہ سب کی سب وردی برطرف کئے حسین و آرزو خیز ساریوں میں لپٹی' جذبات کے بوجھ سے لڑکھڑاتی فضا میں رقص مستانہ کرتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ ایشری طوفان و سیلاب تھی۔ کیتھرن نے اپنی فطرت کا نقاب الٹ دیا تھا۔ وہ بھی "کرسمس ایو" میں بے محابا تھی اور کرن اس شام کو متحرک سپردگی نہ تھا۔ لوئر سی وارڈ میں کہربائی لہر دوڑ گئی۔ معمر وکیل صاحب (جنہیں ہم لوگ "پیر مغاں" کہتے تھے) سے لے کر غلام زبانی تک لوگ تلاطم محسوسات میں ڈانواں ڈول ہو رہے تھے۔ ہمارے ہاتھ اٹھے نہ تھے لیکن ہمارے جذبات آغوش وا کئے ہوئے تھے۔ اف! سی وارڈ کے ممکنات اور مواقع کتنے محدود تھے! ہمارے دل میں اپنی جبیں اور 'اے وارڈ' کی خلوتیں انفرادی شان میں آسودہ کھٹک رہی تھیں۔

"نرسیں بڑے صاحب کے یہاں "کرسمس ٹری" بنانے جا رہی ہیں۔ جاگتے رہنا—— ہاں!" ایک لوچدار آواز فضا میں لہرا کر دلوں میں اتر گئی۔

"اوہ......رے.......ے انہیں سو کیسے جائیں گے۔ بوا تم بھی تو جان کے بنتی ہو۔ بھلا آج رات نیند ہی کب آئے گی انہیں؟ ذرا معمر جی کو تو دیکھو......"

ایک رہزن تمکین ہوش نے دکھتی ہوئی رگ چھو لی۔ پھر جلوہ برق فنا تبسم کا قہقہہ ترنم بار ہوا اور فیمی کو چھیڑتی ہوئی سب نرسیں

یوں چلی گئیں جیسے آنکھ ہی چھوٹ کر رہ گئی ہو۔

وہ رات قیامت خیز تھی۔ نرسوں کے چلے جانے کے بعد ہم سب لوگ یک بیک محزون ہو گئے۔ بیس دسمبر کو گیارھواں مریض ہم لوگوں کے وارڈ میں داخل ہوا۔ بائیس کو وہ بہت ہی درد و کرب کے عالم میں جاں بحق ہو گیا۔ اس کا پھیپھڑا پھٹ گیا تھا۔ ہم دسوں کی نظریں خالی بیڈ پر جا کر ہم آغوش ہوئیں' خاموش' ماتم کی حالت میں۔ پرچھائیں آپ ہی آپ جاری تھی۔ کچھ دیر تک ہم سب ہر دانستہ انداز میں چپ چپ سے رہے۔ ہم اس اندوہ بلا سے پناہ چاہ رہے تھے اور اتفاقاً ہم سارے جہاں کی خوشیاں چھین کر اپنے دل میں جمع کر لینے کی تمنا کر رہے تھے۔ "پیر مغاں" مغرب کی نماز پڑھنے چلے گئے۔ وہاں سے انہوں نے کچھ سکون مستعار لیا اور سالم پھیرتے ہی آخر سب کی امیدوں کے تذکرے چھیڑ دیئے۔ ہم سب لوگ ٹوٹ کر ان تصورات سے لطف لینے لگے۔ نمبر گیارہ کے جسم کو پھر سے جلا کر ہم نے ذرات فضا میں بکھیر دیئے اور اس کی روح خیالات کی انتہائی گہرائیوں میں دفن کر دی۔ اس شام کو ہم نے استراحت کے گھنٹے میں بھی بلند آواز سے گفتگو کی' بے ہنسی کی ہنسی ہنسے اور نرسوں کا اتنے پہلو اور زاویوں سے تجزیہ کیا کہ ان کے جسم تحلیل ہو کر ہم میں سما گئے اور ہم ان میں۔

نصف شب ہی سے نرس کوارٹر بیدار ہو گیا تھا۔ گیتوں اور ہنسیوں کی آوازیں ہماری مضطرب نیندوں کو اور بے کل کر رہی تھیں۔ ابھی رات ہی تھی کہ کرسمس کا حسین "نغمہ شب" اچانک طور پر لوئر ی وارڈ کے بہت قریب سامعہ نواز ہوا۔ ہم غنودگی اور نیند کے درمیان سے آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ بیٹھے۔ ہم میں سے اکثر نے جلد جلد اپنے الجھے ہوئے بال درست کر لئے۔ نرسیں ہارمونیم پر کرسمس کرول گاتی چہلیں کرتی' لڑکھڑاتی چلی آ رہی تھیں۔ وہ آ گئیں' چیت کی شستی ہوئی ہواؤں کی طرح شباب کی امنگوں کی مثال۔ کچھ دیر کے لئے نغمے رک گئے' خندہ بیباک تھم گئے اور فضا سکر و مستی سے لبریز ہو کر چھلکنے لگی۔ ولولہ بداماں خاموشی کا ترنم' زندہ سلوٹ کی انگڑائی لے آغوش وجود میں تھر تھرا رہی تھی اس کے قبل کہ بڑھ کر کوئی بجلی کا بٹن دبائے بہت سی حسرتیں پوری ہو گئیں' بہت سی آرزوئیں جوان ہو گئیں' کئی ارمان پیدا ہوئے اور ان گنت' ناکردہ گناہ' حسرت کی داد لینے کے لئے دردناک مضحکہ کا سامان بن گئے۔ آج انفعال خود و جرات رندانہ پر تلا ہوا تھا۔ باہر سطح مرتفع پر چلنے والی تیز ہوائیں سرد' بوڑھے' خاموش گہرے نیلے آسمان کے سائے میں الھڑ دوشیزاؤں کی طرح لغزیدہ تھیں۔ پورب کے دروازے کھلے ہوئے تھے میں نے تاروں کی چند آوارہ شعاعوں کی مدھم روشنی میں مائل با نحطاط فلورنس کو اپنے بہت قریب پایا اور جب کسی نے بھک سے روشنی جلا دی تو میں نے دیکھا کہ ڈولی اور نقی کے درمیان ایک سیکنڈ میں تھوڑی سی دوری پیدا ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی کئی قیاس بنے اور بکھرے نغمے پھر بلند ہوئے۔ ہارمونیم' ایشری بجا رہی تھی اور سالومی نے 'فادر کرسمس' کا سوانگ بھرا تھا۔ سرخ پاجامہ' سرخ عبا' نیلی اونچی خرطومی ٹوپی اور سفید لانبی داڑھی۔ ہم سب لوگ اسے دیکھ کر بے تحاشا قہقہے لگانے لگے۔ "پیر مغاں" نے بڑھ کر' فادر کرسمس' سے معانقہ کیا۔ اس پر ایک اور گونجتا ہوا قہقہہ لگا۔ دالان کے کھلے ہوئے حصے میں ایک حلقہ ڈال دیا گیا۔ رقص و نغمے شروع ہوئے۔ نرسیں اپنا بہترین لباس زیب تن کئے ہوئے مور کی طرح ناچ رہی تھیں۔ باری باری اور گاہ جھومر ڈال کر گا رہی تھیں۔ ان کی بے پناہ سپردگی ہم لوگوں کو مدہوش کر رہی تھی۔ گاتے گاتے ان کے حشر خیز اشارے' ناچتے ناچتے ان کا شانوں پر سر رکھ کر ذرا آسودگی حاصل کر لینا' موت اور حیات کی سرحدیں ملا رہا تھا۔ "پیر مغاں" نے ایشری کے گلے سے بندھا ہوا ہارمونیم اتار کر اپنے گلے میں ڈال لیا۔ میں نے اور نقی نے ہارمونیم کو سہارا دیا۔ ہمیں اس گھڑی بھی مجروح پھیپھڑوں پر وزن پڑ جانے کی مضرت بھولی نہ تھی۔ معمر وکیل صاحب نے جھوم جھوم کر خوب ولولہ خیز گت بجائے اور رات کی پریاں مجسم غزل الغزلات بنی ہوئی خدائے محبت کے جلووں کے خیر مقدم میں عرض نغمہ اور گذارش رقص پیش کرتی رہیں۔

کرسمس کے بعد حجابات اٹھ گئے تھے۔ صبح کی شریملی سرخی بڑے دن کے بعد روز روشن کی تنویر بن گئی۔ ہم مریضوں کے جذبات

کی جڑیں 'صحت گاہ' کی زمین سے زیادہ پیوست ہو گئیں۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بوڑھے کرسمس نے سیناٹوریم کی بالائی سطح کھرچ کر معجزانہ طور پر ایک نئی دنیا بنا دی ہے جس میں اسپتال کی تلخ حقیقتوں کے ساتھ گھریلو فضا کی لطافت اور ہمدردی بھی ہے۔ ہم لوگوں نے 'پیر مغاں' کی شادی تقریباً "قادر کرسمس" سے کردی جو صبح ہوتے ہی چولا بدل کر "بدر کرسمس" تھی۔ 'پیر مغاں' اسے ہمیری "گھر میں" کے اصول سے میری "وارڈ میں" کہنے لگے۔ ایشری باضابطہ طور پر میری 'سالی' بن گئی اور کیتھرن تقی کی 'بھابی' تھی۔ اسی نوع کی اور بھی کئی رشتہ داریاں قائم ہو گئی تھیں۔ ہم لوگ ان رشتہ داریوں کو یوں استعمال کرتے تھے جیسے لنگڑے بیساکھیاں استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے یہ ذہنی سہارے فریب کی بنا پر قائم تھے مگر زندگی میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فریب حقیقت سے زیادہ حقیقی بن جاتا ہے۔ ہم لوگ کشتی شکستہ سندباد جہازی یا رابن سن کروسو کی طرح 'صحت گاہ' کے 'صحارئی جزیرے' میں بیٹھے 'سنسار سے الگ تھلگ' انتظار کی دبی ہوئی آگ سینوں میں لئے بُری بھلی اپنی ایک چھوٹی سی دنیا بنا رہے تھے۔ انسانیت کے دل میں کتنی لاانتہا حسرتِ تعمیر 'بھری ہوئی ہے۔

یوں تو پہلے بھی نرسیں ہم لوگوں کے لئے 'ڈے آف' میں شہر سے پھل اور میوے لے آتی تھیں مگر کرسمس کے تحفوں کی رنگینی ودلآویزی سے ایک نئے دور کی ابتدا ہوئی۔ پہلے پھل اور میووں نے رومانی لطافتوں کی شکل اختیار کی۔ جذبے کی حدت نے انہیں حریری رومالوں اور عطر و سینٹ میں تبدیل کر دیا۔ حقیقت کی ایک سیال صورت رومان ہے۔ جیسے برف سے پانی اور پانی سے بھاپ بن جاتا ہے۔ مگر کچھ دنوں کے بعد رومال اور سینٹ تناسخ کے چکر میں پڑ کر بیسنی روٹی اور پوڈنگ بن گئے۔ استمرارِ حیات کے لئے روزمرہ کی واقعیت کا وسیلہ لازمی ہے۔

گوپال بہت خوش تھا۔ اکثر کہتا 'تقی بھائی! وارڈ میں بہت جی لگتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میری بیماری اچھی ہو گئی...... تب بھائی انور ہم جا کر پھر اسکول میں نام لکھا سکیں گے نا؟" اس کی آنکھوں میں زندگی کی آرزوئیں جھلکنے لگتیں۔ وہ ذرا نڈھال ہو کر کہہ چلتا۔ "مگر پوڈنگ اور بیسنی روٹی اور کٹوبوا کے گیت۔ طبیعت بہت گھبرائے گی یہاں سے جا کے ہے نا؟ پھر ہم سِل کے مریضوں سے کون گھل مل کرے گا؟ سانپ سے کون کھیلے گا۔ ایشری بھابی اور کٹو بوا کا پریم کہاں۔ ملے گا؟" نادان اور پُرارمان گوپال پر رقت سی طاری ہو گئی۔

لوئر سی وارڈ کے تعلقات میں اجتماعیت کا رنگ چوکھا تھا۔ پربھو بابو اپنی صوفیت اور گوپال اپنے کومل ارمانوں کے باوجود دوسرے وارڈوں سے ہم سب لوگوں سے زیادہ رقابت کرتے تھے۔ وہ سِل و دِق کے ہلاہل میں نسائی لطافتوں کا امرت انڈیل کر سمیّت کو گوارا بنانے کے لئے بے چین تھے۔ پربھو بابو کو اپنے بڑے سے کنبے کی ذمہ داریاں یاد آتی تھیں۔ یسوع مسیح کی محبت 'برج اور کیرم کے کھیل یا نرسوں کا لوچ جو بھی زخم پر مرہم کا پھاہا رکھ دے' جس سے بھی غم غلط ہو جائے۔ ایک روز گوپال برہم برہم سا ٹہل کر واپس آیا۔ اب اسے چند فرلانگ چلنے پھرنے کی اجازت مل گئی تھی اور سیر کے بعد اس کی حرارت کا درجہ بڑھتا نہ تھا۔ ان دنوں وہ بہت مسرور تھا۔ اسے امید تھی کہ رفتہ رفتہ اسے بھائی حاذق کی طرح ایک میل سیر کی اجازت مل جائے گی۔ گوپال کو بیزار اور برہم دیکھ کر مجھے اور تقی کو سخت تعجب ہوا۔ ہم لوگ بھی دو میل کی سیر کے بعد پلنگ پر لیٹ کر تھرمامیٹر لگا رہے تھے۔ اس کے بعد فوراً شام کی استراحت کا گھنٹہ شروع ہو گیا۔ ڈولی کی ڈیوٹی تھی۔ اس بک بک کرنے والی لڑکی نے ہم لوگوں کو باتیں کرنے نہیں دیں۔ گوپال کا نازک سا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ کچھ کہنے کے لئے بے چین تھا اور ہم لوگ سننے کے لئے۔ مگر قہرِ مریض بر جانِ مریض۔ ایک گھنٹہ ہم لوگوں نے عجب اُلجھن میں گذارا۔ ٹن ٹن ٹن ٹن! گھنٹی بجی اور گوپال جھٹ اٹھ کر میرے اور تقی کے پلنگ کے درمیان آ کھڑا ہوا۔ ہم بھی اُٹھ بیٹھے۔ "کٹو باوا! آبزرویشن وارڈ میں مہندر بابو سے...... "گوپال رُک گیا۔ اس کا چہرہ اور سُرخ ہو گیا۔ "مہندر بابو نے کٹو کے گال میں........ "اب کے اس نے بوا نہیں کہا......" انور بھائی کیتھرن سے مت بولئے۔" گوپال بہت خفا تھا۔ اس کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔

ایک گھنٹے کے بعد ڈیوٹی سے فراغت ہو گئی تو کیتھرن ہم لوگوں کے وارڈ میں آئی' کچھ شرمائی ہوئی اور خفیف۔ وہ سیدھی میرے

پاس آئی۔ "منور بابو! مجھے والی بات ذہن میں نہیں آتی۔ ذرا سے میں میرا سر دھتکار دیتی ہے۔ میں آپ سے ہی تو اپنی کلاس بند کرواؤں گی۔" یہ کہہ کر وہ مسکرائی بھی اور روز دیدہ نگاہوں سے اس نے گوپال کو بھانپا۔ کیتھرین نے بھی کام ختم کرتے وقت خاص گوپال کو دیکھ کر لیا تھا۔ یہ جملے تھے جن کے اندر احساس لغزش نہ مشتبہ پذیرائی کو امید افزا بنانے کے لئے نوازش اور شیرینی کی آمیزش کر دی تھی۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے کچھ اور کہا تو میں ایک کتاب اٹھا کے پڑھنے لگا۔ کیتھرین چلی گئی۔ اس کے اندر نسائی پندار کافی تھا اور پھر روز کو وہ شرمندہ مریض کرنا کب گوارا کر سکتی۔

ہم لوگوں میں بات چیت بند ہو گئی۔ ایک روز ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ ایشری دوسرے وارڈ جاتے ہوئے میرے پاس آئی اور چپ چاپ سے صرف یہ کہہ گئی:

"کٹو بوا کا آج ڈے آف ہے۔ وہ شہر نہیں گئیں۔ اپنے کمرے میں چادر سے منہ لپیٹے رو رہی ہیں۔"

ان دنوں ایشری بھی اے وارڈ کے منصف صاحب سے خوب پینگیں بڑھا رہی تھی۔ میں نے اور نقی نے یہ مشورہ کیا کہ کیتھرین اور ایشری دونوں لات اور منات کو کشیدگی کا مزا چکھایا جائے۔ اپنے فیصلے سے ہم نے اہل وارڈ کو بھی مطلع کر دیا۔ بھوبابو اور "پیر مغاں" نے صاد کیا۔ طے یہ ہوا کہ صرف کیتھرین سے مراسم ترک کر دوں اور نقی صرف ایشری سے۔ دوسرے مریض حسب سابق میل جول جاری رکھیں ورنہ وہ نرسیں وارڈ ہی سے گریز کر جائیں گی۔

یہ چپ چپ ایک ہفتے تک جاری رہا۔ ایک روز شام کی سیر سے پہلے 'اسور روم' سے نقی عجوب سی ہنسی ہنستا ہوا نکلا اور مجھے علیحدہ لے جا کر کہنے لگا۔ "سیلاب کو مضبوط دیوار روک سکتی ہے۔ مگر سیلابِ سیلاب بھی نہیں روک پاتا ہے۔ چلو کشیدگی ہو چکی۔"

ایشری کی شخصیت کی طوفان وشی نقی کی شعلہ مزاجی کو پنکھا جھل گئی۔ میں نے اسے بہت برا بھلا کہا۔ وہ ایک قہقہہ لگاتے ہوئے بس اتنا بولا۔ "منصف بھی کیا یاد کرے گا!"

میں نے جواب دیا ——— "مگر تم ایشری کو اپنا تو نہ سکے۔"

"تو کیا تم نے چپ رہ کر کیتھرین کو اپنا لیا؟" وہ تنک کر بولا اور پھر کامیاب ہنسی ہنسنے لگا۔ میں نے واقعیت کا ٹھوس پن اور جذبات پروری کی نامرادی کا زہر محسوس کیا۔ بات یہ ہے کہ گوپال کی رپورٹ میرے احساس کی بالائی سطح سے کافی نیچے اتر گئی تھی۔ نرسس نے ہم لوگوں کی توقعات کو بہت آگے بڑھا دیا تھا اور توقعات کا قیام خلشِ نامرادی میں بس بھر دیتا ہے۔ فرق یہ تھا کہ نقی حقیقت پسند تھا اور ذرا خیالی بلندیوں پر اڑ کر غیر معمولی لذت حاصل کرنے کا عادی۔

دو تین روز کے بعد میں اور نقی رات کے کھانے سے فارغ ہو کر وارڈ کے صحن کے ایک گوشے میں یوکلپٹس کے درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ چاندنی رات تھی مگر ابر کے سفید سفید ٹکڑے چاند کو پیار کرتے ہوئے نیلے آسمان میں تیر جاتے تھے۔ بادِ شمال یوں چل رہی تھی جیسے آسودگی کے بعد خیالات ماضی کی رنگین و آباد وسعتوں میں لطفِ پرواز حاصل کرتے ہیں۔ ہم لوگ ذرا سنجیدہ حالات میں ایک دوسرے کے مستقبل کے متعلق ہمدردانہ سوچ بچار کر رہے تھے۔ کیف بار ماحول میں کبھی طبیعت بڑی سنجیدہ اور گداز ہو جاتی ہے۔

اچانک خوشگوار ہنسی کا نغمہ ہوا کے فرش پر رقص کر گیا۔

"پاگلوں کو دیکھو۔" کیتھرین کی لوچدار آواز عین عقب سے آئی۔

"پاگلوں سے بھی بڑے پاگل۔ بالکل باؤلے۔ اچھا یہ سارس کا جوڑا کیا کر رہا ہے؟ چاند سے پریم ہو رہا ہے۔" یہ ایشری کی شوخ بولی ٹھولی تھی۔

میں نے کہا۔ "آؤ ایشری! ہم سے پریم کریں!"

"واہ میں کیوں آؤں؟ اوہ ..... رے ...... رے بڑی کھونا کٹو بوا تمہیں منانے آئی ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ کیتھرن میرے پاس گھاس پر بیٹھ گئی۔

"دیکھو! آج بڑے صاحب نے میرے بازو میں 'کولو کیلسم' کا انجکشن دیا ہے۔ چھی! کتنا پھول گیا ہے۔ بتہ ہے درد ہے انور بابو....."

اس نے مترجم نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا . . . میں بیگانہ سا بنا رہا۔ وہ کہہ چلی:

"ارے ہم نرسوں کی زندگی کیا۔ غیروں کے لیے سب کچھ کرو۔ مگر کبھی کوئی اپنا نہ ہوا اور اپنے ہمارا اپنا کون بیٹھا ہوا ہے۔ ننھی تو یتیم ہے نا اور میں . . . میرا ایک بوڑھا باپ اور ایک سوتیلا بھائی ہے۔ ہو بھی جائے ٹی۔بی مر جائیں گے تو کون دو آنسو بہانے والا آئے گا۔ بڑے صاحب کہتے تھے کہ کیتھرن کے لنگس بہت کمزور ہیں . اسی لئے تو یہ نگوڑی سوئیاں چبھوتے ہیں۔ چل ننھی کو ادر ٹر! ذرا سینک دے اسے.... "

وہ ایشری سے مخاطب ہو کر اٹھنے لگی۔ نقی نے بڑھ کر کیتھرن کا بازو عیادتاً مس کیا۔ اس نے ناز سے ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا:

"جس ڈالی پر میں گھائل پرندے کی طرح گھونسلا بنانے آئی تھی وہ اکڑی ہوئی ہے تو پھر دوسری شاخ کیوں میری پوچھ کرے؟"

اب بیگانگی جرم تھی۔ تیر ہدف پر لگا۔ پرستش نے سکوت کی مہر توڑ دی۔ اس روز ہم لوگ کچھ دیر تک اپنی اور نرسوں کی زندگیوں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ میں نے گویاں والی اطلاع سے گریز ہی کرنا چاہا۔ لیکن چلتے چلتے کیتھرن نے ایشری سے کہا

"سنتی ہے ننھی؟ میں مہندر کے حلق میں 'مینڈلس پینٹ' لگا رہی تھی۔ نہ جانے اس نے کیا کیا الو۔ بابو سے کہہ دیا۔ بڑا خراب ہے۔ میں تو اسی وقت ڈر ی تھی۔ یہ مریض بھی عجیب ہوتے ہیں۔ نرسوں کی عزت ان کے نزدیک کوڑی کی بھی نہیں۔ بات کا بتنگڑ بنانا خوب جانیں۔"

ایشری نے ہنستے ہوئے کہا:

"اتنا جلتے ہیں تو پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" دونوں ہنستی ہوئی چل دیں۔ باد شمال ان کے جانے کے بعد ذری دیر تک ان کی ہنسی کی لہریں ہم تک پہنچاتی رہی۔

اس واقعہ کے تیسرے روز "پیر مغاں" "صحت گاہ" سے چل دئے۔ وہ صحت یاب ہو چکے تھے۔ ایک سال کے بعد بڑے صاحب نے انہیں پریکٹس کی اجازت بھی دے دی تھی۔ رخصت کے وقت نرس سلومی نے مذاقیہ طور پر رونے کی نقل کی۔ "پیر مغاں" بھی ہنستے ہوئے اپنی "وارڈ مین" سے رخصت ہوئے مگر جب وہ ہم لوگوں سے رخصت ہونے لگے تو ان کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ کتنے درد آگیں اور کتنے تفریحی دن ہم لوگوں نے ساتھ گذارے تھے۔ بڑے وکیل صاحب بڑے زندہ دل شخص تھے اور غمگسار ہفتوں وارڈ سونا سا رہا۔

ہم لوگوں نے چھوٹے وکیل صاحب کو "پیر مغاں" منتخب کیا اور 'صحت گاہ' اپنے زخم و مرہم کے ساتھ اسی طرح چلتا رہا۔ ایک مہینے کے بعد پر بھو بابو کو بھی جانے کا پروانہ مل گیا۔ وہ احتیاطاً ابھی سیناٹوریم سے جانا نہیں چاہتے تھے مگر مریضوں کی کثرت ہو رہی تھی اور جگہ محدود ان کو جانا ہی پڑا۔ ہائے اس گرفتار کا آزاد ہونا جس کے بازو ٹوٹے ہوئے ہوں! پر بھو بابو ساڑھے تین سال کے بعد گھر جاتے ہوئے جھجک محسوس کر رہے تھے۔ جانے پھر وہاں پھیپھڑے کیسے رہیں۔ وہ رخصت کے روز بہت دیر تک بائبل پڑھتے رہے اور روتے رہے۔ سیر کی انہیں اجازت تو دی تھی لیکن اسٹیشن جاتے ہوئے ان کے پاؤں ڈگمگانے لگتے۔ 'صحت گاہ' میں صرف ایک ہی رکشا تھا۔ وہ صرف ذی فراش مریضوں کو وارڈ سے ایکس رے روم لے جایا کرتا تھا۔ پر بھو بابو کی پرشکستگی دیکھ کر نرس کو رکشا منگوانا پڑا۔ ان کو صحت گاہ سے اچھے ہو کر جانے کی مسرت تھی مگر اس مسرت کے آنسو کے ساتھ ان جان مستقبل کا خوف بھی انہیں رلا رہا تھا۔ ایک دفعہ مجروح ہو کر گرفتار ہونے کے بعد وہ فضا میں پرواز کرنے سے ڈرتے تھے۔ ہم لوگ اسٹیشن تک انہیں پہنچانے گئے اور سہارا دے کر گاڑی پر چڑھا لیا۔ ہم سب لوگوں پر

رشتہ داری تھی۔ وہیں آ کر ہم لوگوں نے دیکھا کہ نرس دلداری مدد کر رہی ہوتی ہے۔ وہ پر بھو بابو کو باپ کی طرح چاہتی تھی۔

ہم لوگوں کے وارڈ کے کبھی پرانے مریض اچھے ہو گئے تھے مگر بیٹا نوریم کا اچھا ہونا بہت ہی کچھ دار حالت ہے۔ کبھی غم دل کو کھاتا ہے اور کبھی دل غم کو۔ پہلے سِل کے کیڑے ہمارے پھیپھڑوں کو کھا رہے تھے اور اب ہمارے پھیپھڑے ان کیڑوں کو کھا رہے تھے۔ محاذ کا رُخ کب پلٹ جائے یہ کابوس ہم لوگوں کے خیالات پر سوار تھا۔ ہم لوگوں نے اس خلش سے نجات پانے کے لئے تواتر کے ساتھ تمثیل و اداکاری کا سلسلہ جاری کیا۔ نرسوں نے اس کھیل میں بھی ہماری بہت مدد کی۔ کیتھرن اور ایشری نے ان دنوں ہم لوگوں پر الطاف و کرم کی بارش کر دی اور ان دونوں کی سیرت کا ایک خاص پہلو اجاگر ہو کر ہمارے سامنے آیا۔ اس کی ابتدا تو اس چاندنی رات ہی کو ہو گئی تھی۔ میں نے کیتھرن سے زندگی کے سنجیدہ مسئلوں کے متعلق گفتگو کی طرح ڈالی۔ وہ اپنے ماضی سے بیزار مستقبل کی طرف سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانا چاہتی تھی۔ "انور بابو! تیرہ سال کے سن سے میں مشن اسکول میں پڑھنے لگی۔ وہاں کی لڑکیاں نرس بننے کو بہت اچھا سمجھتی تھیں۔ وہ آزادی کو پسند کرتی تھیں۔ میں نادان تھی۔ میں نے چپ چاپ اسی طرف رُخ کیا۔ بہت بُرا ہوا انور بابو!" کیتھرن نے ایک بار کہا۔

"آپ نہ ہوتیں تو یہ مریض اچھے کیسے ہوتے؟" میں بولا۔

"تو کیا ہماری اپنی زندگی کوئی نہیں۔ دوسروں کے لئے اچھی بنیں پر دوسرے ہمیں اچھا نہ سمجھیں۔ انور بابو! ہم صرف نرسیں تو نہیں، عورت بھی تو ہیں اور یہ مرد بس جسم کے بھوکے ہیں۔ سب کچھ ان کے سامنے پیش کر دو، سب کچھ اور ادنیٰ سی عزت بھی نہ دیں۔" کیتھرن بیزاری سے کہہ اٹھی۔

"سب تو ایسے نہیں ہوتے۔"

"کون! سب مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ سب عورتیں ایک جیسی۔ مگر ہماری مٹھاس ہماری زندگیوں کو تلخ کر دیتی ہے اور مٹھاس کے لالچی مرد شہد کی مکھی کی طرح ڈنک مارتے ہیں اور اڑ جاتے ہیں۔ انور بابو! جب تک صحت ہے کام کرتی ہوں اور اس کے بعد کیا ہوگا؟ شادی کر لوں گی کر لوں؟" کیتھرن ہنسنے لگی۔

"ضرور کر لیجئے!"

"کر لو نا!"

اسے 'کر لیجئے' کہنا تھا۔ اس نے مجھے ہمیشہ آپ کہا اور میں نے بھی اسے آپ ہی سے مخاطب کیا۔ اس 'کر لو نا' کی بے تکلفی میں یوں ہوتا تو کیا ہوتا' کی حسرت پوشیدہ تھی۔ "ہم سِل کے مریض آپ کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟" میں نے یہ ٹھس سا جواب دیا۔

"تم نرسوں کو نہیں سمجھے انور بابو۔" اب کے بھی 'تم' تھا۔

کیتھرن بڑی عمیق نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ زندگی اور تقدیر کی گتھیاں پر پیچ و خاردار راستوں کی طرح سامنے آ گئیں۔

کیتھرن اس نوع کی درد آشنا بات چیت کی پیاسی تھی۔ لیکن ایشری ان سنجیدہ باتوں کی تاب بھی نہیں لا سکتی تھی۔ جب اس طرح کی باتیں چھڑ جاتیں تو ایشری اکتا جاتی۔ عین اسی وقت وہ ہمارا منہ چڑا دیتی یا پہلو میں چٹکی بھر لیتی۔ وہ صرف گرم جوشی کی قائل تھی۔ حال اس کے لئے سب کچھ تھا۔ اپنی شادکامیوں اور محرومیوں کے ساتھ نقی نے ایک بار ایشری سے کہا:

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں؟"

ایشری نے جواب دیا:

"کتنے مردوں سے شادی کروں؟ سب ہی تو شکنجے میں جکڑ کر اپنی من مانی مرادیں جی بھر کر پوری کرنی چاہتے ہیں۔"

نرس سلوی کو [illegible] اِدھر اُدھر کی بات اُدھر کرنے کی بہت عادت تھی۔ اس نے ایک روز کیتھرن کے سارے پوست کندہ حالات مجھے سنائے اور بال کے کھال نکالی۔ کیتھرن نے آج تک کسی کو کچھ تحفہ نہ دیا تھا۔ وہ صرف لینے کی عادی تھی۔ مہندر، گھوش، وہ

[illegible]ں کی ٹی۔بی والا ڈی فراش مریض ہریش چندر سمھوں کو باری باری اس نے اپنا پروانہ بنایا تھا۔ کلرک کمپاؤنڈر ایکس رے بابو یہ سبھی اس کے گھائل رہ چکے تھے۔ پروہ رازداری کی قائل تھی اور داد و ستد کے بعد ایسا کٹ کر جدا ہوتی تھی کہ کسی کو بھنک تک نہ لگے۔ مہدر سے لب تک کچھ سلسلہ تھا۔ وہ ایک صاحبِ ثروت تاجر کا لڑکا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ کیتھرن نے اپنا اصول بدل کیسے ڈالا۔ اس نے مجھے بہت سے تحفے دئے تھے وہ کبھی کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا اور ایشری کا تو یہ عالم تھا کہ نقی پر اپنا سارا مشاہرہ صرف کر سکتی تھی۔ اس نے مختلف اوقات میں اونی سوئٹر' پائے کا طشت' کرم پاتابے' مفلر وغیرہ تحفے نقی کو دئے تھے۔ ایک بار وہ نقی کا سوٹ بنوانے پر مصر تھی مگر نقی نے انکار کر دیا۔ ایشری کئی دنوں تک روٹھی رہی۔ اس نے شکایتاً کہا۔ "آخر نرس میکی سین گپتا کو اپنا نصف مشاہرہ کیسے دے دیتی ہے؟"

ہم لوگ حیرت زدہ رہ گئے۔ اڑتیس سالہ میکی اور سین گپتا۔ سین گپتا بیس سال کا ایک گورا چٹا بنگالی لڑکا تھا۔ بہت ہی غریب۔ وہ مریض دوستوں کی مدد سے اور نہ جانے کیسے سیناٹوریم کا خرچ چلا رہا تھا۔ یہ نیا انکشاف تھا کہ میکی اس کی مدد کرتی ہے۔

میکی کی الفت میں ماں اور بیوی کی محبت کا امتزاج تھا۔ وہ سین گپتا کی مربی بننے میں اپنے مادرانہ جذبات کی تسکین چاہتی تھی۔ نیز حیات کی منزلیں طے کرتے ہوئے وہ کسی مرد کو اتنا قریب کر لینا چاہتی تھی کہ اسے اپنا سہارا' اپنا جذباتی ٹیک سمجھ سکے۔ ایشری نے بتایا کہ جب نرسیں اسے سین گپتا کے بارے میں چھیڑتی ہیں تو وہ خوش ہوتی ہے۔ شاید اس کی نسائیت تذکرۂ التفات ہی سے وجد کرنے لگتی ہے۔ مگر اس کی جنسیت میں عجلت کا کوئی پہلو نہ تھا۔ اس نے سین گپتا کی حماقتوں کو ہمیشہ یوں رد کیا جیسا ماں بچے کو کھانے سے روکتی ہے۔ مگر ایشری اور میکی میں آکاش اور پاتال کا فرق تھا۔ ایشری مردوں سے اس طرح برتاؤ کرتی تھی جیسے وہ زردہ' ساریاں اور بولتے ہوئے بلاؤز ہیں۔ آج اس کو سینے سے لگالیا کل اُس کو اپنے گرد لپیٹ لیا۔ اسے سب ساریاں عزیز تھیں۔ نقی اس کی سب سے پیاری ساری کی طرح تھا۔ میکی گھریلو چکی کی طرح اٹل اور ایک محور کے گرد گھومنے والی تھی۔

مہینہ دو مہینہ پر سیناٹوریم کا ڈاکٹر نرسوں کا ایکس رے اسکرین بھی کر لیا کرتا تھا۔ نرس ڈولی نے مجھے رازدارانہ طور پر بتایا کہ میکی اور نرس سوشیلا کے پھیپھڑوں میں داغ پائے گئے۔ یہ نئی نرس سوشیلا' سلوتی کی جگہ پر بلائی گئی تھی۔ کیونکہ سلوتی نوکری سے استعفاد ے کر ایک موٹر ڈرائیور سے شادی کرنے دلی جا رہی تھی۔ نئی نرس دوسری صحت گاہوں میں بھی کام کر چکی تھی اور بیمار پڑ کر عرصے سے گھر پر تھی۔ لیکن مسلسل گھر پرانے گنے لوگ ہی رہ سکتے ہیں۔ اونچے خاندانوں کے لوگ' بڑے لوگ۔ خلقت تو بائبل کی بددعا کی شکار رہتی ہے۔ "تیرے لئے اس زمین پر لعنتیں ہیں۔ اپنی زندگی کے سارے دن تجھے غم و اندوہ کے ساتھ غذا ملے گی۔ اپنے چہرے کے پسینے میں شرابور ہو کر تو روٹیاں کھائے گا۔"

سلوتی چلی گئی۔ اب پھر وہ نوکی نو تھیں۔ سوشیلا کو بھائی حاذق سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ دونوں ہم رنگ تھے مگر بھائی حاذق اس سے پناہ مانگتے تھے تاہم ہم لوگوں کی شہ پر سوشیلا کو ایسے ایسے مغالطے ہوئے کہ کیا کہنے۔ سوشیلا کے اظہار خلوص کا انداز نرالا تھا۔ وہ اپنے محبوب کو پیٹنے کی عادی تھی بھائی حاذق ٹمپریچر چارٹ پر پٹا کرتے تھے' چپت کھاتے تھے۔ کبھی سوشیلا کی چٹکیوں کی مسلن سے بلبلا اٹھتے اور ہم لوگوں کے نام پر صبر کرتے تھے۔ وہ تو خیریت تھی کہ مریض تھے ورنہ وہ شہید ناز ہو ہی چکے تھے۔ یہ حُسن زنگار ترک ستمگار سے بہت آگے بڑھا ہوا تھا۔ بھائی حاذق ردِ بلا کی دعائیں پڑھا کرتے تھے مگر یہ بھوت ان کے سر پر سوار ہی رہا۔ آخر کار وہ خود ہی سیناٹوریم سے چل دئے۔ لوئر سی وارڈ سے صرف وہی شخص تھے جو مسکراتے ہوئے رخصت ہوئے۔ شاید ان کی نگاہیں ہمیشہ اپنی ڈاک خانے کی کلرکی پر جمی رہتی تھیں اور جو تھوڑا بہت وقار ان سے انہیں لگاؤ تھا وہ سوشیلا کی بے پناہ دلنوازیوں نے ہرن کر دیا تھا۔

بھائی حاذق کے بعد غلام ربانی بھی چلا گیا اور مصری جی بھی یوں گئے جیسے کوئی سفر پر جاتا ہو۔ وہ لوگوں سے رخصت بھی ہوئے' نرسوں سے مل مل کر وہ نے بھی مگر ان کے انداز میں ایک ایسی بات تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ فرقت کے دن زیادہ نہیں۔

سیناٹوریم کا ڈاکٹر [illegible] مریضوں کو لوئر سی وارڈ میں جگہ دیتا تھا۔ کچھ تو یہ وجہ تھی اور کچھ یہاں کی خوش باشانہ روایات کا اثر کہ

ذی فراش مریض ایک دو ماہ میں چلتے پھرتے ہنستے کھیلتے آدمی بن جاتے تھے۔ زندگی سے دلچسپی ضامنِ حیات ہے۔ ارادۂ زیست بڑا کاسب سے زبردست سامان ہے۔ بددل اکتائے ہوئے فکر مند مریض اپنی قبر خود کھودتے ہیں۔ اپر ی وارڈ کے پنڈت گنیش اور مسیح کی حالت کچھ ایسی خراب نہ تھی۔ لیکن ان میں حیات کی امنگ باقی نہ تھی۔ ان کا ارادہ بڑا فکر مندیوں کی آغوش میں سویا ہوا تھا اور اس حسین کرہ کے پھر تگ ِ حیات نہ ان کی نیکیوں کو اکساتے تھے اور نہ بدیوں کو۔ ان کے لئے نہ ثواب میں لذت تھی اور نہ گناہ میں کیف۔ جب خدا اور شیطان دونوں مر جائیں تو پھر موت اور عدم بھی ایک ذہنی لاشہ ہو جاتا ہے۔ زندگی کا پیر تو تمک کہاں!

وارڈ میں جو نئے مریض بھی آئے سوائے ایک کے سب صحت کی طرف قدم اٹھا رہے تھے۔ مگر ابھی وہ ہم لوگوں سے بہت گھلے ملے نہ تھے ہم لوگ صرف پانچ پرانے مریض رہ گئے تھے۔ تقی میں چھوٹے وکیل صاحب گوپال اور مارووڑی۔ ہم لوگوں میں اب اضطرابی کیفیت کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ صحت کی قربت نے زندگی کی توقعات اور مطالبے کو بڑھا کر اپنی محرومیوں اور نامرادیوں کے احساس کو تلخ تر بنا دیا تھا۔ آپس میں تو نہیں مگر دوسرے وارڈوں سے ہم لوگوں کی رقابت بہت بڑھ گئی تھی اور نرسوں سے ہم لوگ بےجا طور پر الجھ پڑتے تھے۔ آج مارتھا سے لڑائی ہوئی کل فیمی کو ڈانٹ بتائی گئی۔ آخر ان نرسوں کی باری آئی جو ہم لوگوں سے زیادہ قریب ہو گئی تھیں یا جنہیں قریب ہونے کا مغالطہ تھا۔ ان نرسوں کی آپس میں بڑی رقابتیں تھیں۔ ورنہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی کہ پوری صحت گاہ میں ہم لوگوں کا ایک ہمدرد بھی نہ رہ جاتا۔ ایشری کو کسی سے رقابت نہ تھی۔ لیکن وہ کبھی اتنی سنجیدہ ہو ہی نہیں سکتی تھی کہ اپنی یا دوسری نرسوں کی تضحیک کے بارے میں سوچنا گوارا بھی کرے۔ بس وہ اتنا کہتی "چپ کرو!" پھر چل دیتی اور سب کچھ بھول جاتی۔

سیناٹوریم میں بھی شہنشاہ معظم کی جوبلی منائی گئی۔ مٹی پانی آگ ہوا اور جملہ عناصر پر بادشاہ کی حکومت ہے۔ وارڈوں کے درمیان تزئین و آرائش کا مقابلہ ہوا۔ لوئر ی وارڈ اول آیا۔ ہم لوگوں کی خوشی مت پوچھئے۔ جب خوش ہونے کو بڑی بڑی باتیں نہ ہوں تو پھر کچھ تو خوش ہونے کو چاہئے۔ کبھی انسان غم منا کر بھی غم غلط کرتا ہے اور یہ تو خوشی ہی تھی۔ نرسوں نے بھی خوشیاں منائیں اور نرس ڈولی تو اس روز کھلی جاتی تھی۔ نہ جانے کیوں چند ہفتوں سے ڈولی بے حد ہنسوڑ اور چونچال ہو گئی تھی۔ جوبلی کے قبل وہ ایک مہینہ کی رخصت پر گھر گئی۔ وہاں سے آئی تو اس کا عجیب حال تھا ہنسی ہنسی میں وہ ناگفتنی باتوں کا تذکرہ کر جاتی تھی۔ اب کے اس نے اپنے گھر کی کرسچن کالونی کے قریب مویشیوں کا اختلاط دیکھا تھا۔ وہ اس بات تک کا تذکرہ کرتی اور ہنس پڑتی تھی۔

عین جوبلی کے روز دس بجے دن کو کرن کے پھیپھڑوں سے شدت کے ساتھ خون آنے لگا۔ وہ ہمارے وارڈ کے پہلو کے وارڈ کا مریض تھا۔ بہت بلند پیشانی' لانبے لانبے بال اور وحشت ناک چھوٹی آنکھیں اور بیزار و باغی جذبات سے تملایا ہوا چہرہ' لانبا قد' دوہرا بدن مگر بیماری سے ڈھیلا۔ وقفے وقفے سے اسے دن بھر خون آتا رہا۔ شام کو سارے سیناٹوریم میں چراغاں کیا گیا۔ پارٹی ہوئی' ریڈیو بجا' کھیل کود ہوا۔ نرسوں نے گانے گائے' غرض بڑی تفریح رہی اور یہ ہوا کہ کرن کی اچانک علالت کے سبب ڈولی کی نائٹ ڈیوٹی ہو گئی۔ ہم لوگ شہنشاہ معظم سے وفاداری کا ثبوت دے کر اور اپنا جی بہلا کر وارڈ واپس آئے تو پہلے کے وارڈ سے اطلاع ملی کہ کرن اب تک خون تھوک رہا ہے۔ ہم سب لوگ افسردہ ہو گئے۔ مگر ڈولی اُدھر سے ہنستی ہوئی آئی اور چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ آج وہ مذاق پر تلی ہوئی تھی۔ ہم لوگوں نے بھی کرن کو بھول جانے کے خیال سے اس کی حسرتوں کی خوب داد دی اور ویسے بھی ہم لوگ ان جانفشار خوں فشانیوں کے عادی بھی ہو گئے تھے۔

ابھی اندھیرا ہی تھا کہ مسہری کے پردے کے اندر اپنا بالائی جسم داخل کر کے کسی نے مجھے جگایا۔ میں چونک اٹھا۔ ڈولی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں پکی نیند کی غنودگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ڈولی کی سانس تیز اور گرم تھی۔ وہ بیقرار سی معلوم ہوئی' اس نے میرے لب شرارت سے اپنی چٹکیوں میں مسل دئے۔ میری نیند غائب ہو گئی' مجھے عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔ میں نے یک بیک محسوس کیا کہ کرن کے سر کی بلا میرے سر پر سوار ہو رہی ہے۔ مگر ڈولی اس رات کو جذبات کی ایک سیاہ آندھی تھی' روحِ تاریکی تھی۔ اس آندھی میں

[illegible] نے میرا کیا حشر ہوتا مگر ہوا یہ کہ بغل کے بڈ پر شاید وکیل صاحب جاگ پڑے اور انہوں نے کچھ سمجھ کر مسلسل کروٹیں لیں [illegible] گئیں۔ لوہے کا اسپرنگ دار بڈ ردِ بلا کے لئے طلسم کا بول ثابت ہوا۔

صبح کے آٹھ بجتے بجتے سینا نوریم بھر میں یہ خبر مشہور ہو گئی کہ بھور کوا ے وارڈ کے چوبے جی نے ڈوتی کا سارا زہر دور کر دیا۔ یہ [illegible] سنتے ہی بس پی کر بھی آنند ہی ہوئے۔ کتنی حریص دلچسپی سے ہم سب لوگوں نے اس کرامت کا تذکرہ سنا۔ بات یہ ہے کہ ناگن کی دُم پکڑ کر اسے فضا میں چرخ دے لی گدگدی تو سب کو ہوتی ہے مگر ڈسے جانے کا خوف اور نہ جانے کتنے قسم کے خیالی بچھو تصور میں رینگ رینگ کر سہلاتے ہیں۔

ہم سب لوگوں نے اپنی نیتوں پر پردہ ڈالنے کے لئے چوبے جی اور ڈوتی دونوں پر لعنتیں بھیجیں۔ اس واقعہ کے بعد سے ہمارے وارڈ کے اکثر مریض ڈوتی سے لڑ پڑنے لگے۔ ان کے دلوں کا بھوت انہیں انتقام کے لئے اکساتا تھا۔ آخر ایک دن میری ڈوتی سے سخت لڑائی ہو گئی۔ اس نے ایک نئے مریض خان صاحب کو بس اتنا کہا تھا۔ "کہاں چلا جاتا ہے خان؟ میں حلق میں پینٹ لگانے کے لئے کب سے کھڑی ہوں۔" خان بگڑ گیا تھا۔ میں نے خان کی پاسداری کی۔ بات بڑھ گئی اور بڑھی تو اتنی کہ میں نے ڈوتی کو کیا نہیں کہہ ڈالا۔ میں غصے سے کانپ رہا تھا اور وہ ٹرتے لڑتے سسکیاں لے کر رونے لگی۔ ایک دوسرے کے خلاف رپورٹیں ہوئیں اور یہ ہوا کہ سلسلہ کلام قطعی بند۔ ایشرنی اور کپتان نے بات کو سلجھانا چاہا لیکن گرہ نہ کھلی۔

مجھے گیارہ ماہ سینا ٹوریم میں ہو گئے تھے اور نقی کو ایک سال سے کچھ زیادہ۔ ہم دونوں اکتا گئے مگر گرمیاں درپیش تھیں اور اس موسم میں سینا ٹوریم سے جانا مناسب نہ تھا۔ کرن کے خون تھوکنے سے ہم لوگ اور گھبرا گئے تھے۔ وہ چلتا پھرتا مریض تھا کہ اچانک اس پر مرض نے حملے کا اعادہ کیا کرن عجیب طرح ہماری زندگی میں داخل ہو گیا تھا۔ جوبلی کے بعد ایک ہفتے تک اسے خون آتا رہا۔ ایک ماہ ہوا تھا کہ وہ سینا ٹوریم میں آیا تھا۔ دو ہفتے ذی فراش رہنے کے بعد اسے سیر کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ کچھ پاگلوں کی طرح دکھائی دیتا تھا۔ اکثر چپ رہتا تھا اور معمولی سی بات پر بے تحاشا ہنسنے لگتا۔ وہ اپنے لباس کی طرف سے بے پروا تھا۔ وہ کبھی کبھی ایسی باتوں سے چڑ جاتا جو پرسش دوستانہ کے تحت آئیں۔ اس کا کوئی ماموں اسے برما سے روپے بھیجتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے ماموں کو خط لکھنے سے منع کر دیا تھا۔ اس کا اور کوئی دنیا میں تھا بھی یا نہیں، یہ ایک راز تھا۔ وہ اپنے ماموں کو گالیاں دیتا تھا۔ کہتا ——— " اس نے مجھے مرنے کیوں نہ دیا۔ ناحق میرا علاج کرا کے مجھ میں زندگی کا لالچ پیدا کر دیا اور اب مسلسل خوف، جینے کی مصیبت، مرنے کا ڈر۔ سل کے مریض کا علاج! سینا نوریم سے جا کر ہم لوگ کیا کریں گے؟ آرام اور غذا! ہونہہ! آرام و استراحت کے گھنٹے! اصول! پروگرام! انڈے! دودھ! مکھن! چوزے! پھل! ہوا اور مکان! اور کچھ فکر نہیں! گدھے کے بچے ڈاکٹر! جیسے بیماری سے پہلے ہمارے پیٹ بھر ہی تو رہے تھے۔ سب نوجوانوں کو سل کے کیڑے کا انجکشن دے کر مار ڈالنا سماج اور حکومت کا فرض ہے نہ کہ بیماریوں کا علاج کرانا۔" اس کی آنکھیں شعلہ بار ہونے لگتیں اور وہ پاگلوں کی طرح بکنے لگتا۔ "جب میں خون تھوک رہا تھا تو اسے روکا کیوں گیا؟ میں دو گھنٹے میں مر چکا ہوتا اور اب کیسے مروں؟ خدا اور شیطان نے مل کر انسان کا جگر چھلنی کر دیا۔ یہ احمق انسان خدا اور انسان کے درمیان بٹ گیا ہے اور زندگی نہ خدا کے پاس ہے نہ شیطان کے پاس۔ یہ ہے ٹاٹا کے پاس، فورڈ کے پاس، برلا کے پاس، جو خدا اور شیطان دونوں سے زیادہ طاقتور اور زیادہ خطرناک ہیں۔ مگر انسان اس قابل ہے کہ اس کے ہر فرد کو ہلاک کر دیا جائے۔

کرن کلکتہ یونیورسٹی کا ایم۔ اے تھا۔ وہ نہ زندگی کے ماضی پر ایمان رکھتا تھا نہ مستقبل پر۔ اس میں عدمیت کی روح حلول کر گئی تھی۔ وہ سب سے نفرت کرتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی غیر معمولی طور پر وہ بڑی محبت سے گفتگو کرتا۔ بچوں کی طرح اور باتیں کرتے کرتے اس پر رقت سی طاری ہو جاتی، وہ حیات کی آغوش کے کسی کھوئے ہوئے سرچشمے کو ڈھونڈ ھتا تھا۔

اب کے جو کرن کو خون آنا شروع ہوا تو ہم لوگ اس کی بیمار پرسی کو گئے۔ ایسی حالت میں بولنے کی سخت ممانعت ہوتی ہے۔ مگر ہم

لوگوں کو دیکھ کر وہ زور زور سے بولنے لگا اور پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ یہ اصولاً زہر تھا۔ کہنے لگا:

"اب کے آسانی سے مر سکوں گا۔"

وہ دیر تک بکتا رہا۔ صبح کو نرس دلاری اور کیتھرین کی اس روز ڈیوٹی تھی۔ دلاری دوڑی ہوئی آئی کہ اسے لٹائے۔ ہم لوگوں نے بھی بہتیرا سمجھایا مگر وہ چیختا رہا۔ اسے دو دفعہ خون کی ابکائی بھی آئی۔ کرن نرسوں سے بہت چڑتا تھا مگر اس روز جب کیتھرین نے اسے آ کر اپنے خاص انداز سے کہا "کرن بابو!" تو وہ فوراً لیٹ گیا اور کیتھرین کو حسرت سے دیکھنے لگا۔ خدا جانے ان دو لفظوں میں نرس نے کتنی مٹھاس، شکایت، تادیب اور خلوص گھول دیا تھا کہ کرن رام ہو گیا۔

استراحت کے گھنٹوں کے علاوہ میں اور تقی اس کی تیمارداری کرتے تھے۔ اسے برف کے ٹکڑے دیتا، پھل کا عرق پلاتا اور چپ چاپ اس کے پاس بیٹھے رہنا۔ جریان خون کے دورے کے وقت وہ باولا ہو جاتا اور اس پر بحرانی حالت سی طاری ہو جاتی۔ وہ اٹھ جاتا اور پلنگ چھوڑ کر دوڑنے کی کوشش کرنے لگتا۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ یا تو میری بات ایک حد تک سنتا یا کیتھرین کی مان لیتا۔ کیتھرین نے مجھ سے دوپہر کو آ کر کہا:

"انور بابو میں ہر وقت تو نہیں رہوں گی۔ پاگل ہے پاگل۔ آپ کا کچھ خیال کرتا ہے۔ سرٹ پیریڈ کے بعد کرن کو دیکھ لیا کیجئے گا۔" مجھے اسی وقت کرن سے بجلی کے کوندے کی طرح رقابت محسوس ہوئی۔ میں نے کیتھرین کے لہجے اور تیور میں کچھ محسوس کیا۔ بہر حال میں وہی کرتا رہا جو کیتھرین نے کہا تھا۔ پتہ نہیں یہ کیتھرین کا پاس تھا یا کرن کا خیال۔ کیتھرین کرن کے لئے غیر معمولی توجہ کا عملی اظہار کر رہی تھی۔

تیسرے روز کرن پر بیماری کا شدید حملہ ہوا۔ بڑے ڈاکٹر نے اے۔ پی۔ وی، بارس سریم، کیلشیم، امیٹین، مورفیا اور کوگولن کے انجکشن دیئے۔ مگر خون نہ تھما۔ رات کو حالت نازک ہو گئی۔ میں اور تقی کرن کے پاس تھے۔ اس نے یک بیک جیلی کھانے کی خواہش کی۔ اسے سوائے رقیق غذا دینے کے اور کسی چیز کی اجازت نہ تھی مگر ایسی وقت اور حالت سے اس نے جیلی مانگی کہ ہم لوگ اسے منہ مانگی چیز دینے پر تیار ہو گئے۔ وارڈ میں جیلی نہ ملی۔ اسی درمیان میں پھر اس کے منہ سے خون آیا۔ میرے دل میں یہ خواہش سفید کاغذ پر سیاہ روشنائی کی طرح پھیل گئی کہ کرن کا خون نہ تھمے اور وہ ختم ہو جائے۔ پھر یک بیک جیسے کسی نے اس روشنائی کو جاذب سے اٹھا لیا ہو۔ اب بھی ایک کالا سا دھبہ موجود تھا۔ میں نے اس داغ کو اپنی انسانیت کی نگاہوں سے چھپانے کے لئے فوراً اپنے پیسوں سے کرن کے لئے اسٹور سے جیلی منگوائی اور اپنے ہاتھوں سے اسے کھلائی وہ بے پایاں ممنونیت کی نظر سے مجھے دیکھ کر بس اتنا کہہ کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ "تم خدا سے بہت بہتر ہو۔"

ایک ہفتے کے بعد کرن اچھا ہو گیا۔ سبھوں کو حیرت ہوئی اور کیتھرین کو حیرت کے ساتھ ناقابل بیان نوعیت کی مسرت بھی۔ وہ اپنے کو کرن کا فرشتہ حفاظت محسوس کرنے لگی تھی۔ مجھے کرن سے پوشیدہ نفرت ہونے لگی۔ میں کیتھرین پر فقرے کسنے لگا۔ وہ قسمیں کھاتی اور صرف اتنا کہتی "وہ تو پاگل ہے بیچارہ کرن۔" اس بیچارہ سے مجھے چڑ تھی مگر حالات نے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ کرن کو یوں چاہتی ہے جیسے کوئی نادان مگر شریر بچے کو پیار کرے۔ پھر بھی میرے دل میں عجیب سی کھوٹ تھی۔ کرن اچھا ہو کر کیتھرین سے 'مجھ سے' اور ڈاکٹر سے شدید نفرت کرنے لگا۔ پر جیلی کو یاد کر کے اب بھی وہ میرا مخلصانہ شکریہ ادا کرتا تھا۔ کہتا تھا۔ "وہ میری جان بچانے کی کوشش نہ تھی، تمہاری خالص محبت تھی۔ حیوانی، بے عقل، آزاد، مہیب مگر پیاری اور اندھی محبت، پر میں تمہیں اس محبت کے طفیل بھی معاف نہیں کر سکتا۔ تم اور کیتھرین۔" اس نفرت کے باوجود کیتھرین کرن کو چاہتی ہی رہی، وہ اس کے لئے کڑھتی تھی۔ کہتی۔ "ایسے پاگل مریض کہیں اچھے ہوتے ہیں۔"

نہ میں سمجھ سکا اور نہ کیتھرین کو اپنی اصلیت معلوم تھی کہ وہ کرن کی مجنونانہ بے بسی کی وجہ سے اس کی طرف کھنچی تھی یا اس کے بے

شعور ذاتی قوت کے سبب۔ وہ اب بھی میرے پاس آ آ کر زندگی، مستقبل، محبت، ملازمت کی پریشانیاں اور اپنی خیالی شاعری کے متعلق گفتگو کرتی تھی۔ اسے میری اور کرتن دونوں کی جذباتی احتیاج تھی۔ پر وہ اس کا تجزیہ نہ کرپائی اور میں نفرت کے کیچڑ میں کیڑے کی طرح کلبلاتا رہا۔

گرمیوں میں سل کے مریضوں کی اور کثرت ہونے لگی۔ بہت سی درخواستیں سیٹ کی کمی کی بنا پر واپس کردی گئیں۔ لیکن کچھ تو تھیں ایسی بھی ہیں جن کی درخواستیں رد نہیں کی جاسکتیں۔ یہاں ڈاکٹر کی شش و پنج کا مسئلہ نہیں بلکہ خاص اثر و رسوخ اور زر کا مسئلہ تھا ایسے طبقے کے چند لوگوں کو جگہ کی ضرورت تھی جس کے افراد دوسرے طبقات کے سر آنکھوں پر اٹھائے جاتے ہیں۔ اے وارڈ میں جگہ نہ تھی اور وہاں کسے ہٹایا جاتا۔ وہاں والوں کی رگوں میں بھی تو خون تھا، تو طے یہ ہوا کہ فوری طور پر سی وارڈ میں جگہ خالی کی جائے اور پھر موقع ملتے ہی ان بیش قیمت ہستیوں کو اے وارڈ میں منتقل کردیا جائے۔ گوپال، نقی اور جونیر وکیل صاحب کو بہ یک قلم ڈسچارج کردیا گیا۔ میں نے کچھ ایسی گھبراہٹ محسوس کی، بس ارادہ ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ سے کہوں کہ میرا نام بھی کاٹ دے مگر جون کے مہینے میں سینا ٹوریم چھوڑنے کے خوف سے لرز گیا اور خود حفاظتی کی حس میرے دوسرے احساسات پر غالب آگئی۔

گوپال اضطراب میں ڈاکٹر کے جانے کے بعد ٹہلنے لگا۔ وہ پہلے بہت خوش ہوا، پھر اس پر حیرانی اور تذبذب طاری ہوا۔ آخر کار وہ رونے لگا۔ وہ میرے پاس آیا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ "انور بھائی! تم بھی چلو نہ۔ گھر جائیں ہم انور بھائی؟ وہاں اے۔ پی کون دے گا۔؟ جاڑے میں جاتے یہاں سے، ساڑھے تین برس اسی وارڈ میں رہے۔ ڈھائی سال تو اس بیڈ پر ہو گئے۔" گوپال نے اپنے خاص گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں امنڈ آئیں۔ "پھر ہم سب لوگ نقی بھائی، آپ، پیر مغاں، مصر جی، بھائی حاذق، پربھو بابو، انور بھائی! ہم پانچوں آدمی چلئے شہر کے کنارے کرایہ کا مکان لے کر رہیں۔" اس نے اس پروگرام کی دقت کو محسوس کیا اور مجبوری کے احساس سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ میں، نقی اور وکیل صاحب سب بے چین تھے۔ میری اور نقی کی رفاقت سینا ٹوریم میں مثال کے طور پر مشہور تھی۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ ہم سب لوگ ملے جلے، واضح اور مبہم جذبات کے نوع در نوع اثرات کے تصادم کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے آنسو بہارہے تھے جیسے کسی بھاری چٹان کے نیچے سے پانی کا سوتا رس رہا ہو۔

نرسوں نے بھی اس خبر کو بے چینی سے سنا۔ ایشری تو اس اچانک حادثے سے بدحواس ہو گئی۔ یہ تینوں مریض دوسرے روز جا رہے تھے ہم لوگ دن بھر باتیں کرتے رہے۔ دکھ درد، امید و ناامیدی، خوشی اور موت، رفاقت اور غمگساری، بیماری اور صحت کی باتیں۔ ہم لوگوں میں وعدے وعید ہوئے کہ ایک دوسرے کو خط لکھیں گے۔ لوئر سی وارڈ کے خاندان کا بقیہ بھی بکھر رہا تھا۔ مریض صحت پاکر جا رہے تھے۔ مگر اس ناقابلِ بیان مسرت کے ساتھ شکستِ رفاقت کا عجیب غم بھی تھا۔ سینا ٹوریم کی رفاقت بھی میدانِ جنگ کی رفاقت سے کم نہیں۔ کیسے کیسے قاتل لمحات کا ہم لوگوں نے مل جل کر مقابلہ کیا تھا! کتنی ناامیدیوں کو ہم نے شکست دی تھی! کتنے ارمان، کتنی حسرتوں کو ہم سب نے ساتھ ساتھ پالا تھا! مسرت اور فریب کی گھڑیاں! بے آسرا شامیں، تاریک صبحیں، دلداریاں، غمگساریاں، ہمدردیاں، سب یاد آرہی تھیں۔ موت سے ہم لوگوں نے لڑائی جیتی تھی۔ وقتی ہی سہی، فتح کے احساس سے بالیدگی حاصل ہوتی ہے۔ کاش اس سیاہ بھیانک عفریت کے آئندہ حملوں کے وقت بھی ہم سب لوگ ایک ساتھ رہتے۔ آہ زمانہ ہر دانے کو علیحدہ علیحدہ کر کے اپنی چکی میں پیس لیتا ہے۔

ڈیوٹی سے فارغ ہو کر ایشری نقی سے ملنے آئی۔ سبھی نرسیں آئیں۔ ایشری سب کے چلے جانے کے بعد بھی دیر تک ٹھہری رہی۔ وارڈ کے صحن میں ہم لوگ ساتھ بیٹھے۔ وہ نقی کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لئے روتی جاتی اور باتیں کرتی جاتی تھی جیسے نقی کے ہاتھ کبوتر کا ایک جوڑا ہو جسے کسی بچے کے ہاتھ سے چھین لئے جانے کی دھمکی دی جارہی ہو، وہ ہاتھوں کو اس طرح دبائے ہوئے تھی کہ انہیں کبھی نہ چھوڑے گی۔ اس نے رخصت ہوتے وقت نہایت بیباک خلوص کے ساتھ کہا:

"اگر مجھے یہ خیال ہوتا کہ تم جون ہی میں چلے جاؤ گے تو میں دعا کرتی کہ ابھی بیمار ہی رہو۔ میں تمہیں بیمار دیکھ سکتی ہوں مگر تم سے

مگر زندگی تاب نہیں لا سکی۔"

وہ تینوں چلے گئے۔ مدراسی اور میں رہ گئے۔ دو مریض اور تھے۔ مگر پھر بھی ہم لوگ سخت تنہائی محسوس کر رہے تھے۔ میرا دل تو بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ بیزار اکتایا ہوا اور کچھ خائف۔ تنہائی میں بیماری کا بوجھ محسوس ہو رہا تھا اور اس کا خوف دامن گیر۔ کیتھرن نے میری بڑی دلجوئی کی۔ لیکن نہ جانے کیوں ان دنوں اسے دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ میں دنیا میں یکا و تنہا ہوں۔ مجھے یہ شدید احساس ہو رہا تھا کہ ہر فرد کی زندگی ایک علیحدہ کال کوٹھری ہے جس کے اندر کوئی دوسرا نہیں آ سکتا۔ دوسرے وقتی طور پر اس کے اندر جھانک کر دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ قیدیوں کا مل جانا محال ہے۔ آنا جانا ممکن ہے مگر اور زیادہ دردناک۔ ہم ایک دوسرے کی روزن میں جھانک کر دیکھتے۔ اس سے نفرت یا محبت کرتے گذر جاتے ہیں۔ ہماری روحیں مل نہیں سکتیں۔ ایک ہو جانا فریب ہے۔ سراسر فریب۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کیتھرن نے دو دن کے لئے میری باطنی زندگی میں جھانکا اور اب دوسری روح کی کھڑکیوں کے پٹ کھول رہی ہے۔ سچ ہے کوئی دھکے سے لگا ہوا کوٹھری کے اندر کب تک جھانکتا رہے۔ وصال داخلی ناممکن ہے اور خارجی اتصال قرب احساس ہے۔ المناک طربیہ اور مضحکہ خیز بھی۔

ایک روز میں نے کیتھرن کو صاف کہہ دیا۔ "دھوکا دینے سے کیا فائدہ؟ آپ کرن کو چاہتی ہیں، چاہئے۔"

وہ بگڑ گئی۔ "چاہتی ہوں مگر...... ....اور آپ کتنے تنگ نظر، تنگدل، بدظن اور ناعتبار ہیں۔"

مجھے آگ ہی تو لگ گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ میرا مقابلہ کرن سے کیا جا رہا ہے اور مجھے مردود قرار دیا گیا۔ اگر یہ جملے کبھی اور مجھ سے کہے جاتے تو میں صرف ہنس دیتا۔ مگر اس میں مقابلہ کا اشارہ پایا جاتا تھا۔ یہ میری خودی کا دم گھونٹ رہا تھا۔ میں تلملا اٹھا۔ کیتھرن نرس روم میں چلی گئی۔ میں نے اپنا بکس کھول کر اس کی دی ہوئی بچی کچی چیزیں نکالیں اور انہیں واپس کرنے ڈیوٹی روم میں گیا۔ میں نے انہیں کیتھرن کے ہاتھ میں لوٹا دینا چاہا پر اس نے لیا نہیں اور تنک کر جھنجھناتی ہوئی دوسری جانب چلی گئی۔ میں نے سب چیزیں اس کے سامنے پھینک دیں اور لوٹ آیا۔ کیتھرن بھپر گئی اور میں نے واپس ہوتے یہ جملے سنے۔

"مجھے یہ باتیں بالکل پسند نہیں۔ کس پر ناز کرتے ہیں۔ مغرور آدمی! میں کسی کی بیاہتا نہیں ہوں۔ بڑے آئے ہیں کہیں کے......"

نازک دھاگا ٹوٹ چکا تھا۔ میں اپنی تنہائیوں میں اور زیادہ تنہا ہو گیا تھا۔ کوئی سہارا نہیں، کوئی تسکین نہیں۔

کرن کے بعد اب میری باری تھی۔ جون کے ایک دو دن باقی تھے کہ سوتے سوتے چار بجے صبح کو میرے منہ سے خون آ گیا۔ میں بستر پر لیٹا ہوا خوف کے مارے پسینے پسینے ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا کہ یہ دنیا، یہ کرہ سارے سامان حیات کو لے کر میرے سامنے گولی کی طرح شن سے کائنات کی انجان وسعتوں میں دور نکل گیا اور میں خلا، تاریک و سرد خلا میں معلق ڈوب جانے کے لئے اکیلا رہ گیا۔ موت کی کالی کالی موجیں مجھے ڈھانپے جا رہی ہیں اور میں فنا کے غار میں غرق ہو رہا ہوں۔ آس اور نراس کے درمیان زندگی کے عنکبوتی تانے بانے کو ایک سال، مکمل ایک سال تک بنا تھا۔ طوفان کے بعد پھر سے تنکے اکٹھا کر کے آنسو اور مسکراہٹوں کے بندھن سے باندھا تھا اور اب ایک نئی آندھی آشیانہ حیات کو نوچ نوچ کر برباد کر رہی تھی۔ میں نے کتنی باتوں کو بھلایا تھا۔ کتنی یادوں کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا، کتنے ارمانوں کو بہلا کر خاموش کر دیا تھا اور پھر زندگی کی خشک شاخ پر نازک نازک ننھی ننھی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، کلیاں بھی پھول بننے کا سندیسہ دے رہی تھیں اور آرزوؤں کی نئی بسنت بہار تازہ کا پیغام لا رہی تھی۔ مستقبل پھر فریب تمنا دے رہا تھا اور یہ اچانک موت کے ترکش کا ایک تیر آ لگا۔ ہر طرف خزاں تھی، ویرانیاں تھیں اور بے بس سکوت!

زندگی کی نیرنگی ناامیدیوں میں بھی امید کے بت تراش لیتی ہے۔ یہ کیفیت گذر جانے کے بعد مجھے یہ خیال آیا۔ شاید کیتھرن یوں واپس آ جائے شاید روایتی خون ٹوٹی ہوئی رگوں کو جوڑ دے، مجھے مسرت ہوئی۔ میں نے زہر سے امرت بنا لیا۔ انسان میں بھی کتنی الوہیت

ہے۔ وہ ہر آن اپنے کو بچوانا چاہتا ہے اور اس کے لئے اپنا اور دوسروں کا خون بھی بہا سکتا ہے' خدا تو صرف دوسروں کا خون بہاتا ہے۔ اپنا خون بہا کر لذت آزار حاصل کرنے کا اسے تجربہ کہاں۔ یہ انوکھا احساس اس کے بس سے باہر ہے۔

مجھے بھی بار بستر کر دیا گیا۔ وہی باتیں ہوئیں جو کرن کے ساتھ ہو چکی تھیں۔ ڈاکٹر نے مجھے تسکین دی کہ پھیپھڑے کی حالت بہت اچھی ہے۔ سل کے مریضوں کے ساتھ ایسے واقعات ہوتے ہی ہیں۔ جراثیم خفتہ حالت میں رہتے ہیں اور کبھی کبھی سوئے سوئے بھی پھیپھڑے کی رگوں کو چاٹتے رہتے ہیں کسی رگ کی دیوار پھٹ جاتی ہے اور خون آنے لگتا ہے۔ تمہارے پرانے زخم میں فائبروسس ہو چکی ہے' نئے ریشے نکل آئے ہیں اور مرض قبضے کے اندر آگیا ہے۔ یہ گذر جانے والا درد ہے۔ گھبراؤ مت!" نرسوں نے بھی عیادت کی' جی بہلایا اور تشفی دی۔ مگر میں عجیب حالت میں تھا۔

گذشتہ سال جو میرے منہ سے ایک ماہ تک خون آتا رہا تھا تو میں نے اپنے جذباتی سہارے کے لئے روحانی' مابعد الطبیعاتی عالم کی طرف رُخ کیا تھا۔ اب کے میرا دل بنجر تھا' بالکل بنجر۔ مگر بنجر زمین کو سب سے زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے یہ ٹھنڈک عورت کے جسم میں نظر آئی۔ حیرت انگیز طور پر مجھے اسی حسرت کی طلب ہوئی مگر محرومی نے دل میں جہنم سا بھڑکا دیا۔ موت سے قربت ہو تو خدا یاد آتا ہے لیکن شاید مادہ کے بچھڑ جانے کے احساس نے مجھ میں مادہ' جسم اور دنیا کی شدید حریصانہ محبت پیدا کر دی تھی۔ جو چیزیں چھٹ جانے والی ہوں ان سے کتنا بیتاب عشق ہوتا ہے۔ پائدار اشیاء تو اکثر اکتاہٹ پیدا کرتی ہیں۔ فنا کے سبب بقا سے محبت ہوتی ہے اور غیر فانی ہستی کبھی اتنی مستحکم' وزنی اور عظیم و جلیل معلوم ہونے لگتی ہے کہ اس کے وزن اور باقی و حاضر ناظر ہونے کے تصور سے رُوح پسی جاتی ہے۔ خدا اتنی بڑی حقیقت ہے کہ دل اس کو بھول کر اپنے کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ دنیا کا آنی جانی ہونا ہی کشش کا باعث ہے۔ اس مادی دنیا کی سب سے حسین ترکیب مادہ عورت ہے۔ مادہ کا نقطہ کمال' جسم کے حُسنِ تعمیر کا عروج جمیل۔ اسے لئے مادی سہارے میں سب سے بڑا سہارا عورت ہے۔ میں بستر پر لیٹا لیٹا فنا کا خیال کر کے جب لرزنے لگتا تھا تو دل میں ایک ہوک اٹھتی تھی اور حیات کا ذرہ ذرہ جنس لطیف کو ڈھونڈھتا تھا۔ مجھے اٹھنے کی اجازت نہ تھی مگر جذب' دل ایسی حرکتوں پر اکساتا تھا جو سامان بقا ہیں۔ مجھے اپنی رومانی مثال پسندی سے نفرت ہونے لگتی۔ میں سوچتا کہ نرا گاؤدی ہوں۔ بدن کی رومانیت مجسم اور حقیقت مثالی کو چھوڑ کر جذب و کشش کی لطافتوں کے جالے میں الجھے رہنا' بے بسی' بے عملی اور نامرادی کی دلیل ہے۔ مجھے فتی اور اس کی قوت قدام و عمل یاد آتی اور میں انتہائی محرومی کا ناکردگی کے غم میں غلطان ہو جاتا۔ یہ فطرت کا کتنا المناک طنز تھا کہ اس بجھی ہوئی خاکستری حالت میں مجھے عمل کے چراغ جلانے کی شدید تمنا ہو رہی تھی۔ میں نرسوں کو صرف دیکھنا نہیں چاہتا تھا بلکہ انہیں چھونا' سننا' دیکھنا' سونگھنا اور چکھنا چاہتا تھا۔ عورت ہی ایک ایسا عطر مجموعہ ہے جو سارے حواس کو بیک وقت شاد کام کرتا ہے۔ جس گھڑی میرے منہ سے خون آتا' میں مجبوری و محرومی کے احساس میں غرق ہو کر اپنے ہی جسم کو انتہائی پیار و محبت سے چھو کے رونے لگتا۔ مجھے اپنا ہاتھ' اپنی انگلیاں بہت ہی عزیز معلوم ہوتیں۔ میں نے ان سے اتنی شدید محبت کا احساس کبھی نہیں کیا تھا۔ اتنی بار میں نے کبھی ان کو اتنے انہماک سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں نے جو امید قائم کی تھی کہ کیتھرن اس حال میں تو ضرور مجھ سے من ہی جائے گی' ٹوٹ گئی۔ کیتھرن بس ڈیوٹی کے طور پر وارڈ میں آتی اور چلی جاتی۔ اس نے میرا حال تک دریافت نہ کیا۔ مصیبت تنہا نہیں آتی' غم کی گھٹائیں موج در موج ہوتی ہیں۔ کیتھرن کتنی خوددار اور خود بیں تھی۔

مگر اس کے خلاف ڈولی جسے میں نے کیا نہیں کہہ ڈالا تھا۔ جس سے میری کوئی توقع وابستہ نہیں تھی' وہ ڈیوٹی نہ ہونے کے باوجود میری علالت کی خبر سنتے ہی بھاگی ہوئی آئی اور مضطرب مسکراہٹ کے ساتھ میری خیریت دریافت کی۔ میں چپ رہا۔ خفگی سے نہیں شرمندگی سے۔ اس وقت وہ چارٹ دیکھ کر چلی گئی۔ پھر وہ برابر آتی رہی۔ مجھے اور ڈکی بیگانگی سے وحشت ہوتی تھی لہذا مجھے معائنہ کے کمرے میں رکھ دیا گیا تھا۔ ایک دوپہر کو ڈولی مزاج پرسی کے لئے آئی۔ میں انتہائی ندامت میں گڑ گیا اور ہیجان جذبات نے مجھے رو پڑنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے ڈولی کا ہاتھ پکڑ کر بہ رقت معافی مانگی۔ وہ بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور صرف اتنا کہا۔ "انور صاحب! آپ

نہیں جانتا۔"

میں نے ان آنسوؤں میں ماضی کے کانٹوں کی چبھن محسوس کی اور زندگی کے کمیاب حُسن کی چند نورانی کلیاں کھلتی ہوئی دکھائی دیں۔ غیر شعوری طور پر میں نے یہ محسوس کیا کہ عورت ہی مرد کی ابدیت کا ذریعہ ہے۔ فانی انسان ہے عورت ہی کی مدد اور ربوبیت سے چند قطروں کو ناپید کنار سمندر بنا رہا ہے میں نے دیکھا کہ انسانیت کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر عورت کی آغوش سے نکل کر ازل اور ابد کو گھیرے ہوئے ہے۔

آخرکار میں اچھا ہو گیا۔ چند ماہ اور سینا ٹوریم میں رہ کر مجھے گھر واپس آنے کی اجازت مل گئی۔ میں بہت بہت اتنا بھی گیا تھا۔ ادھر کیتھرن نے مجھ سے روٹھ کر اپنی زندگی ہی بدل دی تھی۔ وہ سب سے تعلقات توڑ چکی تھی۔ گروہ مجھ سے باتیں نہیں کرتی تھی تو اور دوگوں سے بھی گریزاں ہی رہتی تھی۔ شاید وہ اپنی زندگی کے تجربات تلخ و شیریں کے بعد شکست فریب کی تلخیاں برداشت کر رہی تھی۔ اب وہ صرف کھیلنا نہیں زندگی بسر کرنا چاہتی تھی۔

درخت کا اکھڑنا کچھ آسان نہیں ہوتا۔ دردِ زندگی میں سب سے بڑا دکھ انتقال ہے۔ جڑیں وصلِ زمین سے محروم کئے جاتے وقت کراہنے لگتی ہیں۔ میری حیات کا درخت بھی صحت گاہ میں ڈیڑھ سال تک نصب رہا تھا اور اب علیحدگی کے وقت اعصاب کے سوتے دردناک ہو رہے تھے۔ میں رخصت سے پہلے نرسوں سے ملنے ان کی اقامت گاہ کو گیا۔ سب بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھیں۔ سبھوں نے بڑے اُنس اور خلوص سے میری پذیرائی کی اور بعض نے خوشی کا اظہار کیا کہ اب میں اچھا ہو کر اپنے گھر جا رہا تھا۔ مگر کیتھرن وہاں بھی خاموش رہی۔

رخصت کی صبح کو ایشری نے مجھ سے کہا۔ "کٹو بوا رات بھر روتی رہی ہیں اور ڈولی بھی۔ آپ کو سبھی لوگ چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "جو میری خطرناک حالت میں بھی بیگانہ رہا ہو وہ بلاؤز کے پیرس بٹن ٹوٹ جانے پر تو رو سکتا ہے مگر میرے لئے اس کے آنسو کی ایک بوند بھی نہیں ہو سکتی۔ ہاں ڈولی سے میں بے حد شرمندہ ہوں۔"

ایشری مجھ سے باتیں کر رہی تھی کہ کیتھرن آئی اور اس نے ایشری کو ڈیوٹی روم میں بلا لیا۔ ذرا دیر میں وہ مسکراتی ہوئی لوٹ آئی اور ہنس کر کہنے لگی:

"جا کے مل لیجئے! بوا بلاتی ہیں۔"

نہ جانے کیوں میں ارادے کے خلاف اندر چلا گیا اور ایشری وارڈ میں مریضوں کا ٹمپریچر لینے چلی گئی۔

خوددار و خودبین کیتھرن کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی اس نے مجھے دیکھا۔ میں اس کے قریب چلا گیا۔ اس نے میرا ہاتھ زور سے جذباتی انداز میں پکڑ لیا اور اسی حال میں میز پر ٹیک لگا کر آہستہ آہستہ سسکیاں بھرنے لگی۔ اسے اپنے آنسو دکھلانے میں بھی عار تھی۔ اچانک اس نے سر اٹھا کر کہا:

"انور بابو! آپ نے ہم نرسوں کو عورت نہ سمجھا۔ بس ایک گڑیا! ایک گڑیا!"

جگا

بلونت سنگھ

ماجھا کے علاقہ میں بھیکن ایک چھوٹا سا اور غیر معروف گاؤں تھا۔ مشکل سے سو گھر ہوں گے، زیادہ تر سکھوں کی آبادی تھی۔ یہاں کی ایک بات تھی۔ وہ یہ کہ بعض اوقات یہاں کوئی غیر معمولی طور پر حسین لڑکی وجود میں آتی جس کے ساتھ کسی نوجوان مرد کے عشق کی داستان اس قدر پُر رومان ہوتی کہ سسی پنوں، سوہنی مہینوال اور ہیر رانجھے کے قصے بھی مات ہو جاتے تھے ___ اور اب کے قرعہ گورنام کور کے نام پڑا تھا۔

گورنام کے حسن نے آس پاس کی بستیوں کے نوجوانوں میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔ وہ ایک گڑیا کی مانند تھی، چینی کی مورت، چلتی تو اس سبک رفتاری کے ساتھ کہ نقشِ قدم معدوم، سرمگیں اور بدمست آنکھیں ایسے گناہ کی دعوت دیتی تھیں کہ جس سے بہتر ثواب کا تصور ذہن میں نہ آتا تھا۔ لیکن ابھی وہ معصوم تھی۔ شباب کی آمد آمد تھی اور وہ ایک بے فکر اور پُر شباب دوشیزہ کی پرزور حس کو ابھی اس طرح محسوس کرتی تھی جیسے خاموش اور پرسکون سمے میں کہیں دور سے شہنائی کی اُڑتی ہوئی آواز سنائی دے جائے۔ ابھی وہ مردوں کے اشاروں اور کنایوں کا مطلب نہ سمجھتی تھی۔ وہ اپنی مسکراہٹ ہر کسی کو پیش کر دیتی، وہ سب سے ہنس کر بات کر لیتی، ابھی اس میں پندارِ حسن پیدا نہ ہوا تھا، اس لئے جو بھی شخص اس سے بات کر لیتا یہی سمجھتا کہ گورنام اس سے محبت کرتی ہے ___ ایک مرتبہ تو شدگارا سنگھ نے علانیہ نوجوانوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا کہ وہ گورنام کو بھگا لے جائے گا۔ اس وقت دلیپ سنگھ ادھر سے گذرا تو دوسروں نے اسے سمجھایا کہ دیکھو دلیپ سنگھ بھی گورنام کے عاشقوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے سن پایا تو حالات خطرناک صورت اختیار کر لیں گے۔ اس پر شدگارا سنگھ نے زبردست قہقہہ لگایا اور دلیپ کے پیچھے کھڑے ہو کر بلکہ بکرا بلا دیا[1]۔ اس پر دلیپ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اس نے خشمگیں نظروں سے شدگارے کی طرف دیکھا اور کڑک کر بولا۔ "تو نے بکرا کیوں بُلایا ہے؟"

شدگارے نے تہبند کس لیا اور خم ٹھونک کر مقابلہ پر آن کھڑا ہوا۔ دلیپ کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں۔ قریب تھا کہ دونوں جوان باہم گتھ جائیں مگر سب نے بیچ بچاؤ کر دیا ___ آخر کہاں تک؟ ایک دن خونی پل پر دونوں کا مقابلہ ہو گیا۔ دلیپ کا ٹخنہ اُتر گیا اور دلیپ کی لاٹھی کی ایک ہی ضرب سے شدگارے کا جبڑا ٹوٹ گیا، جان تو بچ گئی مگر صورت بگڑ گئی۔ اس دن سے سب کو کان ہو گئے اور اب دلیپ کے جیتے جی گرنام کا دعوے دار پیدا ہونا ناممکن تھا۔

۱۔ کسی کی تضحیک کرنے کے لئے اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر بھق بھق کی آواز نکالنا۔

رات بھیگ چکی تھی' چاند جوبن پر تھا گاؤں پر ایک پر اسرار خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آجاتی یا اس وقت رہٹ کی چرخی کے پاس ایک جنگلی بلا بیٹھا دم ہلا رہا تھا اور نہایت انہماک کے ساتھ میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔

یہ رہٹ اروڑیوں[1] کے پاس گاؤں کے باہر کی طرف تھا۔ ساتھ ہی پیپل کا ایک بہت بڑا اور گھنا درخت' جس پر ایک جھولا پڑا تھا۔ چونکہ بیلوں کو ہانکنے والا کوئی تھا نہیں' جی چاہتا چل دیتے' جی چاہتا ٹھہر جاتے' اس وقت خاموشی سے کھڑے سینگ ہلا رہے تھے۔

اتنے میں سانڈنی سوار ایک سکھ مرد پیپل کے نیچے آکر رکا' اس نے سانڈنی کو نیچے بٹھانا چاہا۔ سانڈنی بلبلا کر مچلی اور پھر دھپ سے بیٹھ گئی۔ پنجاب کے دیہات میں چھ فٹ اونچا نوجوان کوئی خلاف معمول بات نہیں' مگر اس مرد کے کاندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ ہاتھوں اور چہرہ کی رگیں اُبھری ہوئی' آنکھیں سرخ انگارہ' ناک جیسے عقاب کی چونچ' رنگ سیاہ چوڑے اور مضبوط جبڑے' سر ایسے دکھائی پڑتا تھا جیسے گردن میں سے تراش کر بنایا گیا ہو' جوڑے پر رنگ برنگ کی جالی' جس میں سے تین بڑے بڑے پھندے نکل کر اس کی سیاہ داڑھی کے پاس لٹک رہے تھے' کانوں میں بڑے بڑے مندرے' کالے رنگ کی چھوٹی سی پگڑی کے دو تین بل سر پر' بدن پر ابا کرتا اور موتگیا رنگ کا دھاری دار تہبند اس کی ایڑیوں تک لٹکتا ہوا گریبان کا تسمہ کھلا ہوا' اور اس کے سینہ پر کسے گھنے بال نمایاں' اور پھر اس کے ہاتھ میں ایک تیز اور چمکدار چھوی[2]۔

آتے ہی اس نے بیلوں کو دھتکارا اور وہ چلنے لگے' اس نے جوتے اتارے' تہبند کو اوپر اٹھایا اور اپنے موٹے کڑے[3] کو پیچھے ہٹا پانی کی جھال کی طرف بڑھا۔ پہلے اس نے منہ دھویا' زور سے کھانسا اور پھر پانی پینے لگا۔

جب وہ پگڑی کے شملے منہ پونچھنے لگا تو ایک نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ لڑکی نے پانی بھرنے کے لئے گھڑا جھال کے نیچے کیا اس کی گوری کلائی پر کی کالی کالی چوڑیاں ایک چھن کی آواز کے ساتھ یک جا ہو گئیں۔ گلابی رنگ کی شلوار' چھینٹ کا گھٹنوں تک کا کرتا' سر پر دھانی رنگ کی ہلکی پھلکی اوڑھنی' کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں' جب اس نے اپنا نازک ہونٹ دانتوں تلے دبایا' گھڑے کو ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا کر کولھے پر رکھا تو اس کی کمر میں ایک دل نشین خم سا پیدا ہو کر رہ گیا۔

مرد نے پہلے ایک پاؤں اُولو[4] سے باہر نکالا اور اسے جھٹک کر جوتا پہن لیا۔ پھر اس نے اپنے دوسرے پاؤں کو جھٹکا دیا اور دوسرا جوتا بھی پہن لیا۔ تب وہ اپنی چھوی ہاتھ میں لئے ہوئے اور اروڑی پر جہاں کہ ایک سفید مرغی کے بہت سے پر پڑے تھے' کھڑا ہو گیا۔ پاس ہی کسی کے گھر کی کچی دیوار تھی جس پر اُپلے رکھے تھے۔ جب لڑکی دیوار کے قریب سے گزرنے لگی تو مرد نے چھوی سے ایک اُپلا نیچے گرا دیا جو لڑکی کے پاؤں کے پاس جا کر گرا۔ اس وقت اجنبی مرد نے اس کے پاؤں دیکھے جیسے سپید کبوتر' تلوؤں کی ہلکی گلابی رنگت ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے وہ پاؤں ابھی ابھی گلاب کی کلیوں کو روند کر چلے آرہے ہوں ___ لڑکی نے اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا' شاید اس نے اسے محض ایک راہ گیر سمجھا تھا۔ مگر اس کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر اس کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں خوف کا سایہ دکھائی دینے لگا۔

مرد نے بھاری بھرکم اور کرخت آواز میں پوچھا۔ "تو کون ہے؟"

لڑکی کی نظریں مرد کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں' یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص نے اسے اس قدر بے مروتی کے ساتھ مخاطب کیا۔ اس کے سُرخ سُرخ نازک ہونٹ پھڑکنے لگے جیسے کسی نے لال مرچیں ان پر چھڑک دی ہوں' مگر مرد غیر معمولی طور پر بھیانک تھا۔ مرد نے اسی لہجہ میں اپنا سوال دہرایا۔ "تو کون ہے؟"

لڑکی سمجھ نہ سکی کہ اس بات کا کیا جواب دے۔ اس نے اپنی حنائی انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں وہاں اس گھر میں رہتی ہوں۔"

۱۔ کوڑے کا ڈھیر۔ ۲۔ ایک تیز دھار ہتھیار جو کہ لاٹھی کے سرے پر چڑھا لیا جاتا ہے۔
۳۔ آہنی کڑا جو سکھ کلائی میں پہنے رہتے ہیں۔ ۴۔ جہاں پانی گرتا ہے۔

مرد نے چبھتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دے کر بولا۔ "تیرا نام کیا ہے؟"

دوشیزہ کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ بولی "گورنام!"

"تو وہاں کس کے ساتھ رہتی ہے؟"

"میری ماں ہے 'بے بے[1]' 'ویر[2]' 'چاچا[3]' 'باپو[4]' سب ہی رہتے ہیں۔"

"مجھے اپنے گھر لے چل۔" مرد نے اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تجھ سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

مرد کی پیشانی پر بہت سی تیوریاں پڑ گئیں' اس نے اپنی دُلہن کی طرح آراستہ سانڈنی کی مہار پکڑ کر اپنی دانست میں ذرا نرم لہجہ میں پوچھا۔ "کیوں؟ کیا تم لوگ سکھ نہیں ہو کیا؟"

لڑکی کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہو گیا۔ "لیکن مجھے تم سے خوف معلوم ہوتا ہے۔"

"کیوں؟" مرد نے اُجڈپن سے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی نے ایک لمحہ کے لئے اس کی چمکدار آنکھوں کی طرف دیکھا۔ "تم ہنستے کیوں نہیں؟"

"ارے یہ بات؟" یہ کہہ کر اجنبی نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا' جیسے کوئی پانی سے لبریز مٹکا زمین پر انڈیل دے ' اس کے قہقہہ کی آواز سُن کر چمگادڑیں اپنی کمین گاہوں سے نکل کر پرواز کر گئیں۔

گورنام کا گھر گاؤں سے باہر دھریک[5] کے درختوں کے جُھنڈ کے پاس تھا۔ اس کی ممٹی تو بہت دور سے نظر آتی تھی۔

دروازہ کے سامنے پہنچ کر اجنبی رُک گیا اور گورنام نے اندر سے اپنے باپو اور بھائی کو باہر بھیجا۔ ان کو دیکھتے ہی اجنبی نے بلند آواز میں کہا۔ "واہ گوروجی کا خالصہ سری واہ گوروجی کی فتح!"

"واہ گوروجی کا خالصہ سری واہ گوروجی کی فتح!"

اجنبی بلا کسی ہچکچاہٹ کے بولا۔ "میں دور سے آرہا ہوں' رات زیادہ گزر چکی ہے۔ میں آج یہیں ٹھہروں گا۔"

باپو درانتی اپنے پوتے کے ہاتھ میں دے کر اجنبی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بہت خوش خلق اور ملنسار شخص تھا مگر اجنبی کی بھیانک شکل اسے کشمکش و پیچ میں ڈالے ہوئے تھی۔ خیر اس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ہر طرح سے خدمت کے......"

پیشتر اس کے کہ وہ اپنا فقرہ پورا کر سکے اجنبی سانڈنی لڑکے کے سپرد کر کے دروازہ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔

اگرچہ گھر کا کل سامان غریبانہ تھا مگر گوبر سے لپی ہوئی کچی دیواریں اس کا ثبوت دے رہی تھیں کہ گھر کی عورتیں کاہل یا آرام طلب ہرگز نہ تھیں۔ گھر کے سب افراد بیاہ والے گھر گئے ہوئے تھے' سوائے چار کے۔

ڈیوڑھی سے نکل کر اجنبی صحن میں داخل ہو گیا۔ ایک بچہ سینہ سے گلی ڈنڈا لگائے سو رہا تھا۔ صحن مویشیوں کے مُوت اور گوبر سے اٹا پڑا تھا۔ ایک طرف کھرلی[6] کے پاس ایک بھینس جگالی کر رہی تھی۔ بھُس اور کھلی کی سانی کی بو ہر چہار جانب پھیلی ہوئی تھی۔ رسی پر میلے کچیلے کپڑے لٹک رہے تھے۔ ایک طرف خراس[7]' دوسری طرف تنور اور اس کے پاس ہی دیوار سے لگا ہوا چھکڑے کا پہیہ' بڑے بڑے اُپلے' کونے میں کپاس کی چھڑیاں' چولھے کے پاس جھوٹے برتنوں کا انبار' ایک کمرہ میں سے سفید چمکتے ہوئے برتن دکھائی دے رہے

۱۔ ماں ۲۔ بھائی ۳۔ باپ ۴۔ دادا ۵۔ نیم کے درخت سے ملتا جلتا ایک پیڑ۔
۶۔ ناند جس میں سانی کی جاتی ہے۔ ۷۔ بیلوں کے ذریعے چلنے والی چکی۔

تھے۔ ساتھ ہی تاگے میں پروئے ہوئے شلغم کے قتلے سوکھنے کے واسطے لٹک رہے تھے۔

صحن سے گزر کے بوڑھا بابا اجنبی کو دروازہ سے باہر چھپر کے نیچے لے گیا تھوڑی سی جگہ کے تینوں طرف ایک کچی دیوار اٹھا دی گئی تھی۔ سوکھے ہوئے اُپلے جو جلانے کے کام میں آسکتے تھے اسی جگہ رکھے جاتے تھے۔ یہاں پر ایک چارپائی ڈال دی گئی۔ چار خانوں والا ایک کھیس اور اجنبی کے دل کی طرح سخت ایک عدد تکیہ اس پر رکھ دیا گیا۔

گرنام نے کپاس کی چھڑیوں کا ایک گٹھا تنور میں پھینکا اور خود آٹا گوندھنے لگی۔ جس وقت وہ تنور میں روٹیاں لگانے لگی تو اس کی اوڑھنی سر سے کھسک گئی۔ اس کی لانبی چوٹی کے رنگ برنگ کے پھندنے اس کی پنڈلیوں تک لٹک رہے تھے۔ دہکتے ہوئے تنور کی روشنی اس کے حسین چہرہ پر پڑ رہی تھی ــــــ اور اجنبی چپکے چپکے اسے دیکھ رہا تھا۔

شلغم کی ترکاری ایک کٹورے میں شکر گھی ڈیلوں کا اچار دو بڑی بڑی پیاز کی گٹھیاں اور آٹھ چوڑی چوڑی روٹیاں تھال میں رکھ کر گرنام اس کو دے آئی۔

جب اجنبی نے اونچے سُر میں تین چار ڈکاریں لیں اور بڑے زور شور سے ساتھ منہ میں انگلی پھیر کر کلی کی تو گرنام کو معلوم ہو گیا کہ وہ کھانا ختم کر چکا ہے۔

وہ برتن اٹھانے لگی تو اس نے دیکھا کہ اجنبی کپڑے اتار رہا ہے۔ جب اس نے تہبند اتارا اور اسے جھاڑ کر تکیہ کے قریب رکھنے لگا تو سونے کا ایک کنٹھا نیچے گر پڑا گرنام ٹھٹک کر واپس جانے لگی تو اجنبی نے آہستہ سے پوچھا۔ "گرنام! بس جا رہی ہو کیا؟"

گرنام حسبِ معمول اپنے دلفریب طفلانہ انداز سے مسکرائی اور اوڑھنی سنبھالتے ہوئے آگے جھک کر آہستہ سے بولی۔ "سب لوگ سو جائیں تو میں آؤں گی۔"

اجنبی دور کھیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شرینہہ اور ببول کے پیڑ سیاہ دیوؤں کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ لنڈ منڈ بیریوں پر چیلوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے۔

ایسے سنسان وقت میں تاروں بھرے آسمان تلے کسی دور افتادہ رہٹ سے کسی نوجوان کے مسرت انگیز گانے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔

باگے وچ کیلا ای
نکل کے مل بالو!
ساڈا ونجھنے دا ویلا ای
نکل کے مل بالو!

اتنے میں گرنام دبے پاؤں شلوار کے پائنچے اٹھائے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے چپکے چپکے قدم ناپتی ہوئی آئی۔

تھوڑی دیر بعد دونوں میں گھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔

اجنبی نے بہت سے سونے کے زیورات اور موتیوں کے ہار نکالے۔ قریب تھا کہ گرنام کے منہ سے حیرت اور مسرت کے مارے ایک چیخ نکل جاتی مگر اجنبی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

گرنام بہت دیر تک مینا کی طرح چہکتی رہی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی مگر اس کا دھیان زیورات کی طرف تھا۔ آخر کار اس نے

ا۔ ہار کی مانند ایک گہنا۔

[اپنے] باتوں سے آپ ہی اکتا کر ایک گہری سانس لی اور تکان زدہ آواز میں بولی۔

"کیوں تم یہ زیورات کہاں سے لائے ہو____؟ میرے خیال میں تم جیب کترے تو نہیں ہو۔ مجھے جیب کتروں' چوروں اور ڈاکوؤں سے سخت نفرت ہے۔ وہ جھٹ سے گلا دبا کر آدمی کو مار ڈالتے ہیں۔" یہ کہہ کر گرنام اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے خلا میں گھورنے لگی۔ جیسے کوئی سچ مچ کا قاتل اس کا گلا دابنے کو آرہا ہو۔

"مت گھبراؤ۔ تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ بھلا میرے ہوتے ہوئے تم کو کس بات خطرہ؟ اٹھو یہاں میرے پاس چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔"

گرنام اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اجنبی کے چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا تہ دل سے مطمئن ہو کر کہنے لگی۔ "تم کتنے اچھے ہو____ یہ زیورات تو تم اپنی بیوی کے لئے لائے ہو گے نا؟"

"ہاں!"

"گرنام نے اپنی ہتھیلی پر رخسار رکھتے ہوئے بڑے اشتیاق سے پوچھا:

"تمہاری بیوی کیسی ہے؟"

"مگر میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"اچھا تو ہونے والی بیوی کے لئے لائے ہو؟"

اجنبی نے اپنی ڈاڑھی کے کھردرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میری بیوی کون بنے گی۔ بنے گی بھی یا نہیں' گرنام نے اپنی دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کر اپنی آنکھوں کو جلد جلد جھپکاتے ہوئے' ناک ذرا سکیڑ کر بھولے پن سے کہا۔ "ہاں تم کالے ہو ذرا۔"

اجنبی کے سینہ میں جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا۔

مگر گرنام نہایت سنجیدگی سے کسی گہری سوچ میں ڈوب چکی تھی۔ شاید وہ اجنبی کے لئے بیوی حاصل کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی۔

"یہ زیور تم لے لو۔"

گرنام نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا۔ "پھر تم اپنی بیوی کو کیا دو گے؟"

اجنبی کو کچھ جواب نہ سوجھا۔ لڑکھڑاتی زبان سے بولا۔ "پھر میں تم سے لے لوں گا۔"

گرنام کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ تالی بجا کر بولی۔ "میں ان کو اُپلوں میں چھپا دوں گی____ کبھی کبھی رات کو اچھے اچھے زیورات پہن کر کھیتوں میں جایا کروں گی۔"

کچھ دیر سکوت کے بعد اجنبی نے کہا۔ "گرنام تم بھی تو مجھ کو کچھ دو۔"

گرنام نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ "میرے پاس کیا ہے؟"

"کچھ بھی ہو۔"

گرنام چہرہ سے ہاتھ ہٹا کر کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنے گلے سے کوڑیوں اور خربوزہ کے رنگ برنگ کے بیجوں کا ہار اتار کر اجنبی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اپنے اس حقیر تحفہ کو دیکھ کر جھینپ سی گئی اور اس کے رخسار دہکنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد گرنام نے ایک انگشتری اٹھا کر کہا۔ "یہ میری انگلی میں پہنا دو۔ دیکھوں کیسی لگتی ہے۔"

اجنبی نے اپنے کالے کالے میلے کچیلے لمبے چوڑے ہاتھوں میں گرنام کا کنول سا ہاتھ لیا۔ گرنام نظریں جھکائے بچوں کی سی سادگی اور انہماک کے ساتھ انگوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی زلفوں نے اس کے رخساروں کا ایک بڑا حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اجنبی وارفتگی کے عالم میں اس کے خوبصورت سیپوں جیسے ہونٹوں پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ جب وہ اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا تو اس کی اپنی انگلیاں لرزنے لگیں اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کی چار چار انگل چوڑی کلائیوں کی تمام طاقت کشید کی جا رہی ہو۔

گرنام چونکی اور سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اماں کھانس رہی ہے ___ اب میں جاتی ہوں۔"

اجنبی اپنے خواب سے چونکا۔

گرنام نے آگے جھک کر نقرئی آواز میں پوچھا۔ "جاؤں کیا؟"

اجنبی کی اجازت نے کر وہ زیورات کی پوٹلی بغل میں دبائے جھٹ اندر چلی گئی۔

علی الصبح گاؤں کے مویشی رات بھر کی گرمی سے گھبرا کر جوہڑ میں گھس پڑے۔

اجنبی جانے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ گرنام نے اسے ایک باسی روٹی پر مکھن اور چھنا[1] لسی کا دیا اور جب اجنبی کپڑے پہن کر تیار ہوا تو گرنام رونے لگی۔ اجنبی نے آہستہ سے کہا۔ "روتی کیوں ہو؟"

"تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ تم مت جاؤ۔"

اجنبی ہنس پڑا۔ "میں پھر آؤں گا۔"

باپو کو آتے دیکھ کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔

باپو اجنبی کو رخصت کرنے کے لئے کچھ دور تک اس کے ساتھ گیا۔ اس نے اجنبی سے پوچھا۔ "کیا میں اپنے معزز مہمان کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟"

"ہاں!" اجنبی نے اپنی تیز نظریں اس کے چہرہ پر گاڑ کر جواب دیا۔ پھر اس نے اپنی دھوپ میں چمکنے والی چھوی کی طرف فخریہ انداز سے دیکھتے ہوئے مزید کہا۔ "اور تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اگر میرے نام کا ذکر اپنے یا بیگانے کسی سے بھی کیا تو تمہارے اور تمہارے خاندان کے سب افراد کے خون سے مجھے ہاتھ رنگنے پڑیں گے۔"

بوڑھے کا چہرہ فق ہو گیا۔

اجنبی سانڈنی پر سوار ہو گیا اور مہار کو جھٹکا دے کر اپنی بھاری آواز میں بولا۔ "آج رات جگا ڈاکو تمہارا مہمان تھا۔"

جگا ڈاکو کا اصلی نام سردار جگت سنگھ ورک[2] وہ خوفناک شخص تھا کہ جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ قتل، غارت گری، ظلم، لوٹ مار اس کے ہر روز کے مشاغل تھے۔ لڑکپن اور شباب خون کی ہولی کھیلنے میں ہی گزر گیا۔ بہت سی زمین کا مالک تھا۔ بڑوں بڑوں پر ہاتھ صاف کرتا تھا، غریب خوش تھے۔ اس کے خلاف گواہی دینے کا کوئی شخص حوصلہ نہ کر سکتا تھا۔ اب

۱۔ بڑا کٹورا۔ ۲۔ جاٹوں کی ایک ذات۔

تیس برس سے اوپر سن تھا۔ موت کے ساتھ کھیلتا ہوا سو جاتا اور موت کا مذاق اڑاتا ہوا جاگ اٹھتا۔ محبت، حسن، لطافت، نیکی وغیرہ اس کے نزدیک کچھ بھی مفہوم متعین نہ تھا۔ دور دور تک اس کی دھوم تھی۔ علاقہ بھر اس سے تھراتا تھا اس کا دل پتھر، بازو آہن، قد و قامت، ذہن شعلہ ___ وہ قہر تھا۔

لوگوں نے اس کے نام پر کئی گانے بنالئے تھے۔ نوجوان جھوم جھوم کر ان کو گایا کرتے تھے۔ ایک واقعہ کا ذکر یوں ہوتا تھا ؎

پکے پُل تے لڑائیاں ہوئیاں، پکے پل تے
پکے پل تے لڑائیاں ہوئیاں تے چھویاں دے کل ٹُٹ گئے.......... جگیا[1]

یا پھر لائل پور میں اس نے ایک زبردست ڈاکہ ڈالا تھا اور بچ کر واپس بھی آگیا تھا۔ اس کا ذکر یوں ہوتا تھا ؎

جگے ماریا لائل پور ڈاکہ، جگے ماریا
جگے ماریا لائل پور ڈاکہ تے تاراں کھڑک گیاں آپے[2]

اس کی طویل، تاریک اور ہیبت ناک شبِ حیات میں ایک تارا طلوع ہوا جس نے اس کی نظروں کو خیرہ کر دیا اور وہ تارا تھی ___ گرنام!

گرنام بیچاری نادان چھوکری اُسے عشق و محبت کا پتہ ہی نہ تھا۔ اسے لوگ کنکھیوں سے دیکھتے وہ ہنس دیتی اُس کے جذبہ پندار حسن و شباب کو کسی نے بھی صحیح طور پر متحرک کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ ابھی اس کو اتنا ہوش ہی نہ تھا کہ دیدہ و دانستہ شکار کھیلے، بسملوں کا تڑپنا دیکھے اور اس لذت سے محظوظ ہو جو صیادوں کے لئے مخصوص ہے۔ وہ بھولی بھالی سادہ رو چھوکری یہ جانتی ہی نہ تھی کہ وہ شاہین جس کو زخمی کرنے کے لئے پنجاب کے شہزور نوجوانوں کی کمانیں ٹوٹ چکی تھیں، اور جس پر جو بھی تیر پھینکا جاتا تھا وہ اسے چھو کر اور کند ہو کر زمین پر گر پڑتا تھا، وہی شاہین اس کے تیر غلط انداز کا شکار ہو کر نیم بسمل اسکے پیروں کے پاس پڑا تھا اور وہ تیر قدرت نے اس کی پلکوں میں پنہاں کر کے رکھ چھوڑا تھا۔

رات کی تاریکیوں میں جگا ان کے ہاں آتا اور سپیدہ سحر کے نمودار ہونے سے پہلے ہی رخصت ہو جاتا۔ اس نے خود کو ایک متمول زمیندار ظاہر کیا۔ باپو کے علاوہ گھر کے سبھی افراد اس کو دھرم سنگھ کے نام سے جانتے تھے۔ گرنام کی کشش اسے کھینچ لاتی تھی۔ اس کے دل میں ایک خلش سی رہتی تھی کہ وہ اس فرشتہ کو اپنانے سے پہلے خود کو کیونکر اس کے قابل بنائے، اس نے کبھی بھی اس سے محبت جتلانے کی کوشش نہیں کی، وہ نہیں جانتا تھا کہ کیونکر اس کا آغاز کرے، وہ سوچتا تھا کہ نامعلوم اس نے اظہارِ محبت کرنے پر گرنام کیا رویہ اختیار کرے۔ وہ اس کے پاس بیٹھی چہکتی رہتی تھی اور وہ مبہوت سا بیٹھا سنا کرتا۔ کبھی کبھی اس کو خود سے نفرت ہونے لگتی۔ صورت تو اس کی پہلے ہی مکروہ تھی۔ مگر اس کی سیرت پر تو شیطان دامن میں منہ چھپاتا تھا۔ گرنام تھی کہ اس نے کبھی بھی اس سے اظہارِ نفرت نہ کیا۔ وہ نہایت مہر و محبت کے ساتھ اس سے پیش آتی۔ اگر وہ اسے اپنے قریب بیٹھنے کے لئے کہتا تو وہ اس کے قریب ہی بیٹھ جاتی، اگرچہ اس نے آج تک اس کو چھونے کی جرات نہ کی تھی۔ گرنام کی فرشتہ سیرتی اس کے دل میں دھڑکا پیدا کر دیتی تھی۔ اس کا ملکوتی جمال اس کا سر نگوں کر دیتا تھا۔ صرف اس کے دل کی بے چینی اور ضمیر کی ملامت بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے نہایت حیرت سے سنا کہ:

جگے نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے۔

ڈیڑھ برس کا عرصہ آنکھ جھپکتے میں گزر گیا۔

1۔ پکے پُل پر اتنی سخت لڑائی ہوئی کہ چھویوں کے کیل ہی ٹوٹ گئے۔

2۔ جب جگے نے لائل پور میں ڈاکہ ڈالا تو ہر طرف برقی تاروں کے ذریعہ سے اس بات کی خبر کر دی گئی۔

وہ صبح و شام پاٹھ کرتا، غریبوں کو کھلاتا پلاتا، دان کرتا، گوردوارے میں جا کر سیوا کرتا، ہر کسی کے ساتھ نرمی اور میٹھی سے گفتگو کرتا۔

اس نے باپو کی منت کی کہ گرنام کور کی شادی اس کے ساتھ کر دی جائے۔ اس نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے اور جو کچھ اس نے لوٹا وہ سب ڈنڈ والوں کا تھا۔ غریبوں کی کمائی کا ایک پیسہ اس کے پاس نہ تھا۔ وہ اپنی بہت سی زمین اور روپیہ ان کو دینے کو تیار تھا اور باپو کو وہ ہمیشہ بزرگ سمجھ کر اس کی خدمت کرے گا۔ لیکن گرنام کور کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ وہ جگا ڈاکو تھا اور نہ ہی اسے فی الحال اس بات کا علم ہونے پائے کہ اس کی شادی کس سے ہونے والی ہے کیونکہ اس کو یقین تھا کہ وہ اس کو چاہتی تھی اور جب وہ اپنے پریتم کو یک بیک اپنا خاوند دیکھے گی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی۔

نیک باپو نے سب کچھ منظور کر لیا۔

جگا کھیلن سے چودہ کوس پرے رہتا تھا۔ اس کی آمد و رفت کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ لوگوں نے اس اجنبی کو کبھی کبھار ان کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ کیونکہ اول تو وہ آتا ہی کبھی کبھار تھا اور دوسرے وہ راتوں رات واپس بھی چلا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتوں کا بہانہ کر دیتا تھا۔ جگے کو دنیا جانتی تھی مگر اس کو کوئی نہ پہچانتا تھا۔

جگے کو شادی کی منظوری مل ہی چکی تھی، اب وہ چاہتا تھا کہ گرنام کی زبان سے بھی اس عشق کا اقرار کروا لے، خواہ اسے یہ نہ بتلائے کہ اس کا ہونے والا خاوند وہی تھا۔

ایک دن بعد از غروب آفتاب وہ کھیلن میں داخل ہوا۔ گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ گرنام ساتھ والے گاؤں میں جولاہوں کو سوت دینے کے لئے گئی ہوئی تھی۔

جگے نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اس نے پگڑی کو ذرا ٹیڑھا کیا۔ شملہ کو ذرا بلند کیا اور پھر اس نے سب کی نظریں بچا کر چراغ میں سے سرسوں کا تیل ہتھیلی پر اُلٹ لیا اور اسے اپنی گھنی اور کھردرے بالوں والی گرد آلود داڑھی پر خوب اچھی طرح مل لیا۔ پھر وہ مونچھوں کو بل دیتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا پانچ چھ فرلانگ تک چلا گیا۔

ہر طرف دھندلی سی چھائی ہوئی تھی۔ چاند کی ملگجی روشنی میں وہ ایک بھوت کی مانند دکھائی پڑتا تھا۔

دور سے ایک صورت دکھائی دی۔ اسے غور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا۔ کوئی عورت تھی اور یقیناً وہ تھی بھی گرنام۔

جگا اصیل مرغ کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔

گرنام قریب آتے ہی مسکرا دی۔ لیکن مسکراہٹ میں کچھ متانت جھلکتی تھی۔ سر پر ایک بھاری گٹھڑی تھی۔ "میری گردن ٹوٹ گئی۔"

"اس گٹھڑی میں کیا بھر لائی ہو؟" یہ کہتے ہوئے جگے نے ایک ہاتھ سے یہ من بھر بوجھ اس کے سر پر سے یوں اٹھا لیا۔ جیسے کوئی دو سال کے بچے کو ٹانگ پکڑ کر اٹھا دے۔

"اُپلے ——— اور ہوتا کیا؟" گرنام نے اپنی پتلی سی ناک سکیڑ کر کہا۔ "آ رہی تھی رستہ میں اُپلے چننے لگی۔ یہاں تک کہ شام اسی میں ہو گئی۔"

دونوں کھیت کی مینڈھ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

آج جگے نے گرنام کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہونے لگے۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹیوں اور ساگ کا تصور اسے بے چین کیے دیتا تھا۔ کبھی تو اس کے دل میں آتی کہ ہمارا بھید

کھول دے اور کبھی سوچتا کہ ہرگز نہ بتائے۔ آخرکار اس سے رہا نہ گیا۔ کیونکہ گرنام کچھ افسردہ ہو رہی تھی۔ "گرنام!" یہ کہتے کہتے رال اس کی ڈاڑھی پر ٹپک پڑی۔ اس نے اسے اپنی آستین سے پونچھا اور پھر بولا۔ "گرنام! تم کو ایک خوشخبری سُنانا چاہتا ہوں۔"

گرنام نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے میں مصروف تھی اور گہری سوچ میں تھی۔ اگرچہ وہ پہلے سی شوخ اور الھڑ نہ رہی تھی مگر چونکہ جگے سے کافی مانوس تھی۔ اس لئے اس سے زیادہ شرماتی بھی نہیں تھی۔

جگے کو کچھ اُلجھن سی ہونے لگی۔ اس نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا۔ "کیوں گرنام کس سوچ میں ہو؟"

گرنام پہلے تو چونکی۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا۔ "میں بہت پریشان ہوں ——— میں بہت دنوں سے چاہتی تھی کہ تم کو سب حال سناؤں لیکن۔۔۔۔"

"لیکن کیا؟"

"شرم آتی تھی۔" گرنام نے جھینپ کر جواب دیا۔

جگا کچھ تاڑ گیا۔ زیرِ مونچھ مسکرایا۔ "ارے مجھ سے شرم کیسی؟"

گرنام چپ رہی۔

جگا کھسک کر اس کے قریب آگیا۔ اس کے بار بار اصرار کرنے پر گرنام نے بتایا۔ "وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ شادی تو سبھی کی ہوتی ہے۔"

گرنام کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "وہ کسی روپیہ پیسہ والے شخص سے میرا بیاہ کرنا چاہتے ہیں جسے میں نے دیکھا بھی نہیں۔ مگر میں اور کسی سے۔۔۔۔۔۔"

یہ کہہ کر وہ رو پڑی۔

جگے نے اپنے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے شملہ کو چھو کر دیکھا کہ وہ نیچے تو نہیں جھک گیا۔ پھر اس نے سینہ پھلا کر کہا۔ "نہیں گرنام، نہیں۔ جس کو تم چاہو گی اسی سے تمہاری شادی ہو گی۔ میں باپو کو خود سمجھاؤں گا۔۔۔۔۔۔ ہاں تو۔۔۔۔۔۔ مگر وہ ہے کون؟"

جگے کی آنکھیں مارے خوشی کے چمک رہی تھیں۔

گرنام نے اس کے سینہ پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج اسے اس کے چوڑے شانوں اور صندوق جیسے سینہ کو چھو کر گونہ تسکین حاصل ہو رہی تھی۔

جگا گھبرا گیا۔ اس نے اس کو چمکایا اور دلاسا دیا اور پھر اس شخص کا نام پوچھا۔

گرنام نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر رُک گئی۔۔۔۔۔۔ اور زور زور سے رونے لگی۔ جگے نے تسکین دی تو وہ بولی۔ "تم ضرور میری مدد کرو گے، ان سب کے ہاتھوں سے سخت بیزار ہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔ اس کا نام۔۔۔۔۔۔"

جگے کا دل بلّیوں اُچھلنے لگا۔

"اس کا نام ہے دلیپ۔۔۔۔۔۔ دلیپ سنگھ۔"

جگے کو سانپ نے ڈس لیا۔

اس کا چہرہ یکایک بھیانک ہو گیا۔

"دلیپ سنگھ اس کا نام ہے۔" گرنام نے دہرایا۔

جگے کی مونچھیں لٹکنے لگیں۔

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ جسم کے رونگٹے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ گردن کی رگیں

پھیل گئیں ___ کرمام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"ٹھہر جاؤ۔" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"تم فوراً واپس چلی جاؤ۔" اس نے کرخت لہجہ میں گرج کر کہا۔ کرمام چپ چاپ حیرت کے ساتھ اٹھی اور گٹھڑی سر پر رکھ کر گھر کی طرف چل دی۔ جگا اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔ عقاب کی چونچ نما ناک سرخ ہو گئی' آنکھیں خون آلود ہو کر رہ گئیں اور چہرے سے بربریت ٹپکنے لگی ___ معاً اس نے خنجر نکالا اور اسے مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دانت پیستے ہوئے آہستہ سے بولا ___ "دلیپ سنگھ؟ ___"

موت کا فرشتہ دلیپ سنگھ کے سر پر منڈلانے لگا۔

خونی پُل علاقہ بھر میں مشہور تھا۔

یہ پُل ایک چھوٹی سی نہر پر واقع تھا۔ نہر کے دونوں کناروں پر شیشم کے بہت ہی گھنے پیڑ تھے۔ وہاں نہ تو سورج کی دھوپ پہنچ سکتی اور نہ چاند کی چاندنی۔ پُل بڑے بڑے اور بھدے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے نیچے صرف ایک کوٹھی تھی اور پانی دو حصوں میں تقسیم ہو کر بہتا تھا۔ رات کے وقت یہ دو بڑے بڑے منہ ایسے دکھائی پڑتے تھے جیسے دو منہ والا کوئی دیو' انسانوں کو ہڑپ کر لینے کے منہ کھولے بیٹھا ہو' یا جیسے کسی مُردے کی دو بڑی بڑی آنکھیں جن کی پتلیاں کوے نوچ کر کھا گئے ہوں۔

پاس ہی ایک قبرستان تھا اور کچھ فاصلہ پر مرگھٹ۔ رات کے وقت کوئی شخص اُدھر سے گذرنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس پُل پر اتنے قتل ہو چکے تھے کہ اس کا نام ہی "خونی پُل" رکھ دیا گیا تھا۔ نوجوان لڑکیاں اور بچے تو دن کے وقت بھی اکیلے ادھر نہ آتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہاں ایک سر کٹا سیّد رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا سر تو پُل کے نیچے دلدوز چیخیں مارا کرتا اور وہ خود بلا سر کے نہایت اطمینان کے ساتھ قبرستان میں ٹہلا کرتا تھا۔

نصف رات گذر چکی تھی۔

دلیپ سنگھ شہر سے واپس آ رہا تھا۔ چھوٹے سے گدھے پر دو بوریوں میں سامان تھا۔ وہ سُنار کا کام بھی کرتا تھا اور پنساری کی دکان بھی اس کی اپنی تیار کردہ گلقند خوب بکتی تھی۔

وہ نوجوان تھا۔ خوش رو خوش وضع' مسیں ابھی بھیگ ہی رہی تھیں گالوں اور ٹھوڑی پر بالکل چھوٹے چھوٹے بال جیسے زعفران' آنکھیں شربت سے لبریز کٹورے' سر پر اس وقت لنگی باندھے ہوئے تھا' اس کا ایک چھوٹا سا شملہ نیچے کی جانب لٹکتا ہوا اور دوسرا اوپر کی طرف اٹھا ہوا۔ الغوزے خوب بجاتا تھا۔ جب رانجھا ہیر کی شادی کے بعد اس کے ہاں بھیک مانگنے کے لئے جاتا ہے' اس واقعہ کو وارث شاہ کی ہیر سے بڑی دردناک لے میں گایا کرتا تھا بلکہ اس میں تو دور دور تک اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔

دلیپ طاقتور اور دلیر نوجوان تھا۔ مگر خونی پُل کا نظارہ اور پھر اس کے ساتھ وابستہ خونی روایات اس جگہ کو اور بھی بھیانک بنا دیتی تھیں۔ رات کی تاریکی میں شیشم کے گھنے درختوں کے تلے نہر کے سسک سسک کر بہنے والے پانی کی آواز سن کر اس کے دل کو کوفت سی ہونے لگی ___ اس نے ذرا بلند آواز میں "چھلا"[1] گانا شروع کر دیا۔ تاریکی اور خاموشی میں اپنی آواز سن کر اس کو تسکین ہوئی۔

۱۔ پنجاب کا ایک مشہور گیت۔

اس کا گدھا ٹیل پر سے پار ہو چکا تھا۔ وہ عین ٹیل کے درمیان میں تھا۔ دل میں شاداں تھا کہ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ معاً اسے اپنی گردن میں کسی تیز شے کی چبھن محسوس ہوئی اور جیسے کوئی اس کے کرتے کو پکڑے پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہو ——— اس نے گھوم کر دیکھا۔

ایک دیو ہیکل مرد ٹیل کی دیوار پر سے اُچکا ہوا تھا۔ اس نے اپنی چھوی پیچھے سے اس کی قمیض میں اڑا دی تھی۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

"تم کون ہو؟" دلیپ نے ہمت کر کے بلند آواز میں پوچھا۔

"ادھر آ" بھاری اور تحکمانہ آواز آئی۔

دلیپ اس کی طرف بڑھا ——— یکایک اس نے اجنبی کو پہچان لیا۔ بولا۔ "مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے تم کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔ کیا تم وہی شخص نہیں جس نے تین سال پہلے چند اشخاص سے لڑتے وقت میرا ساتھ دیا تھا ... ہاں شاید وہ ننکانہ صاحب کا میلہ تھا۔ تبھی کا واقعہ ہے...... اور تم نے دو آدمی جان سے بھی مار ڈالے تھے۔"

"بے شک میں وہی ہوں۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تیرا نام دلیپ سنگھ ہے۔ میں تجھے ایک اجنبی اور نو عمر چھوکرا سمجھ کر تیرا مددگار بنا ——— اور قتل تو میں نے بہت کئے ہیں 'اسی ٹیل پر گیارہ آدمی قتل کر چکا ہوں... ...اور آج مجھ کو بارھواں قتل کرنا ہے۔"

دلیپ کو اس کے اُجڈ پن پر تعجب ہوا۔ بولا۔ "میں نہیں جانتا تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے۔ تم تو میرے محسن ہو۔"

"تو گرنام سے محبت کرتا ہے جو صرف میری ہے۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تو نے شنگارا سنگھ کو اسی ٹیل پر سخت زخمی کیا تھا ——— آج تیرا میرا فیصلہ ہوگا۔"

یہ کہہ کر اجنبی نے چھوی ہاتھ سے رکھ دی اور اس کی طرف بڑھا"......اور میں چاہتا ہوں کہ تو ایک مرد کی طرح میرے مقابل آجائے۔"

دلیپ پس و پیش کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں اپنے محسن سے لڑنا پسند نہیں کرتا۔"

اجنبی نے گرج کر جواب دیا۔ "تو بزدل ہے۔ یہ عورتوں کی طرح گلے میں ریشمی رومال لپیٹ کر گھومنا اور بات ہے اور کسی مرد کے ساتھ دست پنجہ لڑانا کچھ اور بات ہے۔ اگر تو واقعی اپنے باپ کے ہی تخم سے ہے تو میرے سامنے آ۔" یہ کہہ کر اس نے اس کے منہ پر تھوکا۔

دلیپ کو غیرت آگئی۔ وہ شیر کی طرح بپھر گیا۔ وہ ڈنڈا جو گدھے کو ہانکنے کے لئے ہاتھ میں لئے تھا اس نے اس کے منہ پر دے مارا۔ لیکن اجنبی نے وار روکنے کی کوشش نہیں کی۔ دلیپ نے دوسری ضرب اس کے کان پر رسید کی 'ڈنڈا ٹوٹ گیا۔ اس کی پیشانی اور کان سے خون بہنے لگا۔ دلیپ جوش میں تھا اس نے پوری قوت کے ساتھ ایک مکہ اس کے منہ پر رسید کیا جس سے اس کا جبڑا اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور منہ بگڑ گیا..... مگر اجنبی نہایت سکون کے ساتھ کھڑا رہا۔

اس وقت اس کی پیشانی سے خون بہہ بہہ کر اس کی ڈاڑھی کو تر کر رہا تھا۔ ایک کان کا اوپر والا حصہ ٹوٹ کر لٹک رہا تھا اور اس میں سے خون کی دھارا چھوٹ رہی تھی۔ منہ ٹیڑھا ہو جانے کی وجہ سے اس کی صورت اور بھی بھیانک ہو رہی تھی ——— مگر وہ حیرت انگیز طور پر مطمئن تھا۔

پھر اس نے دلیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی گہری اور بھاری آواز میں کہا۔ "اس طرح نہیں 'دلیپ! تم ابھی محض بچے

لیکن جگا کوئی غلط حرکت نہیں کرنا چاہتا۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک گھونسا اپنے منہ پر دیا اور اس کا جبڑا اپنی اصلی جگہ پر آ گیا ـــــ دلیپ جگے کا کام سُن کر بھی خوفزدہ سا ہو گیا۔

اجنبی اپنی چھوری پکڑ کر بولا:

"تیرے پاس چھوری ہے؟"

"نہیں!"

"تلوار ہے؟"

"نہیں!"

"سفا جنگ؟"

"نہیں!"

"مگر لاٹھی تو ہے وہ تیرے گدھے کی پیٹھ پر بوری میں ٹھنسی ہوئی۔"

دلیپ مارے تعجب کے چپ چاپ کھڑا تھا۔

"جا!" اجنبی نے پکار کر کہا۔ "لاٹھی لے آ ـــــ میں نے سنا ہے کہ تو علاقہ بھر میں سب سے زیادہ تیز دوڑنے والا جوان ہے۔ لیکن امید کرتا ہوں کہ تیری غیرت تجھے ایک بزدل کی موت ہرگز نہ مرنے دے گی۔"

دلیپ بہادر تھا مگر اس قسم کے شخص سے آج تک پالا نہ پڑا تھا۔

جگے نے چھوری اتار کر علیحدہ رکھ دی اور صرف لاٹھی اٹھالی اور وہ دونوں ایک دوسرے کو للکارتے ہوئے میدان میں کود پڑے۔

ان کی للکار کی آواز سُن کر پرندے گھونسلوں میں پھڑ پھڑانے لگے۔ گیدڑوں نے ہو ہو ہوہو کا شور بلند کیا۔ چاروں طرف گرد ہی نظر آنے لگی۔

لاٹھی سے لاٹھی بج رہی تھی۔ دلیپ ہلکا پھلکا چست چالاک نو آموز اور نوجوان چھوکرا۔ بجلی کی طرح بے چین، جوڑ جوڑ میں پارہ۔ بھاری بھر کم، قوی ہیکل، کہنہ مشق دیو۔ باوجود موٹا ہونے کے اب بھی جس وقت سرک لگاتا تھا تو ایسے معلوم پڑتا جیسے سطح آب پر رہی پھسلتی ہوئی چلی جا رہی ہو۔ دلیپ نے داؤ لگا کر پہلا وار کیا۔ جگا اسے خالی دے کر چلایا۔ "ایک!"

دلیپ نے پھر وار کیا۔ جگا اسے بچا کر گرجا۔ "دو!"

دلیپ نے تیسرا وار کیا۔ جگے نے اسے بھی روکا اور کڑکا۔ "تین!" یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف لپکا۔ "او سنبھل بے چھوکرے اب وار کرتا ہے۔"

پسینہ کی وجہ سے دلیپ کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ وہ فوراً چھرا لے کر جھپٹا۔ جگے نے ایک لات اس کے پیٹ میں رسید کی وہ لڑکھڑاتا ہوا ٹیلے کی دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا۔

اب جگے کے لبوں پر خونی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے ایک وحشی بھیڑیئے کی مانند حلق سے ایک خوفناک آواز نکالی اور پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر آگے کی طرف اُچک کر اس نے بھرپور وار کیا۔ دلیپ نے چھرا سنبھالا اور چیتے کی مانند تڑپ کر ہوا میں جست کر گیا۔ مگر کہنہ استاد کا وار اپنا کام کر گیا۔ شاید پہلی صورت میں یہ وار اس کے سر کو توڑ دیتا۔ لاٹھی اس کے سینہ تک پہنچ جاتی مگر اب بھی لاٹھی کافی کے ساتھ سر پر پڑی۔ سر پھٹ گیا اور وہ تڑپ کر بارہ سنگھے کی مانند سنہر کے کنارہ پر جا گرا..... کچھ دیر تک تڑپتا رہا اور پھر سرد پڑ گیا۔

گرم گرم خون بہہ بہہ کر نہر میں ملنے لگا۔ نہر کے پانی کی کل کل کی آواز ایسے معلوم پڑتی تھی جیسے خونی بَل قہقہہ لگا رہا ہو۔

قبرستان میں بوسیدہ قبروں کے روزنوں میں سے ہوا سسکیاں لیتی ہوئی چل رہی تھی۔

زرد چاند بدلی میں سے نکل آیا۔ مگر اس کی شعاعیں شیشم کے گھنے پتوں میں اُلجھ کر رہ گئیں۔

جگے نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی خون آلود پیشانی کو صاف کیا۔ منہ ہاتھ دھویا کان پر پگڑی پھاڑ کر پٹی باندھی۔ اس نے دلیپ کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر دل کی حرکت سننے کی کوشش کی۔ پھر اس نے چھوی اُٹھائی اور دلیپ کو پیٹھ پر لاد کھیتوں کی طرف چل کھڑا ہوا۔

اس واقعہ کے پچیس دن بعد۔

دیہات میں شام ہوتے ہی خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ خصوصاً سردیوں میں تو لوگ فوراً اپنے گھروں میں گھس بیٹھتے ہیں۔

گرنام کے ہاں سب ہی لوگ اپنے اپنے کاموں سے فراغت پا کر بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔ عورتیں چرخہ کات رہی تھیں، بڑے بوڑھے باتوں میں مشغول تھے اور بچے شرارتوں میں مصروف۔

اتنے میں جگا اندر داخل ہوا۔

شاید ڈیڑھ برس کے بعد آج پھر اس کے مضبوط ہاتھ میں چھوی چمک رہی تھی۔ سب نے اس کو دیکھ کر اظہارِ مسرت کیا۔

گرنام حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ بے بے نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا مگر اس نے بتایا کہ اس کی ڈاچی[1] باہر کھڑی ہے اور اسے جلد ہی واپس جانا ہے۔

چند لمحوں کے لئے اس نے سکوت کیا۔ پھر نہایت مختصر اور فیصلہ کن انداز کہنا شروع کیا۔ "میں آپ لوگوں سے صرف اتنی بات کہنے کے لئے آیا ہوں کہ آپ گرنام کی شادی جس شخص سے کرنا چاہتے ہیں وہ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی____ بلکہ اس کی شادی اس شخص سے ہوگی جس سے کہ میں چاہوں گا۔"

سب لوگ حیران تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ گرنام کا ہونے والا خاوند وہ خود ہی ہوگا۔ مگر چونکہ انہیں یہ راز پوشیدہ رکھنے کی سخت تاکید کی گئی تھی اس لئے وہ خاموش رہے۔

"......اور وہ شخص یہ ہے۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کی طرف دیکھا____ اور دلیپ اندر داخل ہوا۔

ہر شخص پر حیرت زدہ خاموشی طاری ہو گئی۔

گرنام نامعلوم کس دنیا میں پہنچ گئی۔ اس کو شرما جانا چاہئے تھا مگر وہ اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔

جگے نے دلیپ کے کان میں کہا۔ "اگر گرنام کو مجھ سے محبت ہوتی تو تم آج زندہ نظر نہ آتے۔ دلیپ! تم مرد ہو۔ میں نے اچھی طرح سے تم کو آزما کر دیکھ لیا ہے۔ میں چاہتا تو تم کو قتل کر ڈالتا۔ مگر مردوں سے مجھ کو محبت ہے۔ اب جبکہ تمہاری گرنام تمہارے سپرد کر رہا ہوں امید کرتا ہوں کہ تم میرا راز ظاہر نہ کرو گے......"

دلیپ نے تشکرانہ آمیز نظروں سے اپنے محسن کی طرف دیکھا۔

جگا بلند آواز میں بولا۔ "باپو! ماں!! بے بے!!! میں ان کی شادی کے لئے ضرورت سے بھی کہیں زیادہ روپیہ دوں گا اور ان کو بہت

ا۔ سانڈنی۔

ی زمین دوں گا۔"

بابو اصل قصہ بھانپ گیا۔ لیکن سب کو زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ دلیپ زندہ کیونکر ہو گیا۔ مشہور ہو چکا تھا کہ دلیپ کو ڈاکوؤں نے خونی نیل پر قتل کر دیا تھا۔

دلیپ نے قصہ گھڑ کر سنایا کہ خونی نیل پر ڈاکوؤں نے اس کو گھیر لیا۔ اس لڑائی میں وہ سخت زخمی ہوا اور قریب تھا کہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا کہ سردار دھرم سنگھ وہاں پہنچ گئے اور وہ اس قدر تندی سے لڑے کہ ڈاکوؤں کے چھکے چھوٹ گئے اور ان کو بھاگتے ہی بنی۔ پھر وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور تیمارداری کرتے رہے۔

جگے کی مونچھوں کے نیچے اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

گرنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ مسحور ہو کر آگے بڑھی۔ اس نے جگے کا بھدا ہاتھ اپنے کومل ہاتھوں میں لے لیا۔ پہلے اس نے جگے کے بلند سینے اور اس کے غیر معمولی طور پر چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا مطمئن ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "تم کتنے اچھے ہو... تم ہمیں ہمارے پاس ہی رہا کرو۔"

قریب تھا کہ جگا چیخیں مار مار کر رو پڑے۔ مگر جلدی سے پگڑی کے شملے میں منہ چھپا کر بگولے کی طرح دروازہ میں سے باہر نکل گیا۔

شادی ہو گئی ____

کچھ عرصہ بعد رات کے وقت گرنام باپو کے ساتھ گھر سے باہر کریلے کے نیل کے پاس کھڑی تھی۔ معاً دور سے غبار اٹھا کچھ سانڈنی سوار نمودار ہوئے' ان کی سجی سجائی سانڈنیاں' مردانہ اور دیو پیکر صورتیں' چمکتی ہوئی چھویاں ____ عجب منظر پیش کرتی تھیں ____ ان کا سالار تو غیر معمولی طور پر چوڑا چکلا شخص تھا۔ گرنام اسے دیکھتے ہی چلا اٹھی۔ "باپو! وہ کون لوگ ہیں؟ ____ یہ سب سے آگے والا شخص تو دھرم سنگھ دکھائی پڑتا ہے۔"

"نہیں بیٹی نہیں' وہ دھرم سنگھ نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی پوتی کا سر سینہ سے لگا لیا ____ اور پھر ببول کے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے ہوئے سانڈنی سواروں کی طرف خواب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "آج جگا ڈاکو ڈاکہ ڈالنے کے لئے جا رہا ہے۔"

بھالو

ہاجرہ مسرور

آج جمعرات تھی۔ ابھی چراغ نہ جلے تھے ـــــ اللہ رکھی گلابی چھینٹ کا لہنگا اور مہین ململ کا کرتہ اور سر پر ہرا دوپٹہ حاجنوں کی طرح لپیٹے آج بھی سلیپریں گھسیٹتی درگاہ میں حاضری دینے نکلی۔ لیکن ایسی بے تابی سے کہ انوری اس کی تیزی کا ساتھ نہ دے سکی۔ مکئی برابر پیٹ' اس پر دل کی پیاس کا سوٹ' شلوار پیٹ پر ٹکتی نہ تھی' پیروں پر وہ سوجن کہ کبھی کبھار پاؤں میں پڑنے والی گرگابی سے پیر تو جیسے گوشت کا بوٹا ہو کر اُبلے پڑتے۔ گھر سے دو قدم پر تو درگاہ تھی۔ مگر معلوم ہوتا کالے کوسوں کی بات ہے' مٹھی میں چراغ کا چار پیسے اور دوسری ہتھیلی پر ملیدے کی طشتری' یوں منوں کا بوجھ نہ معلوم ہوتی اگر اللہ رکھی کی چال پر ایسی منہ زور جوانی نہ آئی ہوتی۔

انوری نے ہانپتے ہوئے سوچا۔ "سب اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔ ذرا خیال نہیں کرتے اب جیسے اماں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ میں بھی ساتھ ہوں۔" یہ سوچتے ہی اس کے روئیں روئیں سے کوئی شے کھول کھول کر سر تک آئی اور پھر دو ننھے ننھے قطروں کی صورت میں آنکھوں میں پھیل گئی۔

لیکن یہ قطرے اس وقت بھاپ بن کر اڑ گئے جب اس نے دیکھا کہ اللہ رکھی مزار شریف کے پائنتی کھڑی تمباکو سے پیلی ہتھیلیاں پھیلا پھیلا کر روتے ہوئے کہہ رہی ہے ـــــ "میاں ـــــ اے میرے میاں ـــ پھر یاد سُن لو میری۔ وہ حرامجادی پھر بھاگ گئی۔ میں تو تمھی سے لوں گی اس حرافہ کو' میاں اے میاں۔" فرطِ احترام سے' وہ چھانٹ چھانٹ کر کم سے کم "روزمرہ" میں اپنا دُکھڑا میاں حضور کی درگاہ میں پیش کر رہی تھی۔

انوری کا دل بھی غوطہ سا کھا گیا۔ مگر کھل کر روتی کیسے۔ درگاہ تو درگاہ ہے' کئی لوگ ادھر اُدھر کھڑے تھے۔ یہی لوگ بعد میں آکر چھیڑتے۔ نظریں نیچے کئے بکئے ملیدے کی طشتری اور چراغی کے پیسے مزار کے مجاور احسان اللہ میاں کے حوالے کئے جو انہوں نے پھرتی سے مزار کے طاق میں چڑھا دیئے۔ چڑھاوے کے ساتھ ہی اللہ رکھی اور بھی بکھر گئی۔ ایسا بکھر کر روئی کہ انوری کے آنسو بھی بہہ نکلے' سویرے سے بھوکی بھی تو تھی۔ صبح ممدو قصائی بچے کھچے چھیچھڑے اور ہڈیاں کاغذ میں لپیٹ لایا تھا جو پک کر بھی نظر میں نہ سمائے۔ پھر پہلوان سے جو بچے وہ اللہ رکھی اور بچوں کے نیگ لگے۔ اسے بالشت بھر اونچے شوربے میں ایک ہڈی ڈوبی ملی۔ وہ بھی چچوڑنے کی جی نہ چاہا۔ ان دنوں گوشت تو اسے یو بھی اچھا نہ لگتا۔ سویرے سے کیسا کیسا جی ہو رہا تھا کہ ایک کھٹی نارنگی چوس لے مگر ان دنوں اس کی فرمائش آج کل پر ہی ٹلتی رہتی۔ حد تو یہ ہے کہ صبح چولھے کی مٹی کھانے کو جی مچلا۔ ایک ذرا سی کھرچی تھی کہ اللہ رکھی ڈکاری۔ "اری ناس پٹی چولھا ٹھونسے لیتی ہے۔ تیرے یار آکر چولھا بنائیں گے۔؟"

انوری نے جلدی سے سسکتے ہوئے آنسو پونچھ ڈالے اور اللہ رکھی کی بانہہ پکڑ کر باہر لائی۔ یہاں احسان اللہ ایک طویل ٹھنڈی سانس لے کر بولے "نہ رہ بھئی، زمانہ ہی برا ہے۔ اولاد ماں سے سرتابی کر کے بھی سرخرو نہیں ہو سکتی۔ انوری اللہ رکھی کو سمجھاؤ تا رپٹ لکھا دو تھانے میں' جہاں ہو گی پکڑی آئے گی سالی۔"

خوب تو گویا اللہ رکھی اب میاں احسان اللہ سے عقل سیکھے گی ____ وہ اسی دن رپورٹ لکھا چکی تھی جس دن بھالو غائب ہوئی۔ داروغہ جی نے پہلے تو اللہ رکھی کو فراشی سنائیں' مگر جب اللہ رکھی نے ہاتھوں سے چاندی کے کڑے اتار کر ان کے قدموں پر رکھے تو کہیں جا کر بکو دھیمے پڑے۔

داروغہ کا غصہ کم ہونے کی ایک اور وجہ بھی تھی جو اللہ رکھی کے علاوہ اور بہنوں کو بھی معلوم تھی لیکن کس کے سر پر اتنے بال تھے جو یہ بات زور سے کہہ سکتا؟

اس وقت جبکہ وہ چھوٹے سے اُجڑے مارے قصبے کے واحد کھلے بندوں خوانین گھرانے کی طرف سے رپورٹ سن رہے تھے اور گالیاں بک رہے تھے تو گھر سے ملازم چھوکرا نکلا اور کہا ____ اندر بلاتی ہیں۔

اندر پہنچے تو نازک بدن سنگار پٹار سے لدی ہوئی بیگم تھانے کی طرف کھلنے والے دروازے سے لگی غصے سے تھر تھر کانپ رہی تھیں' سرمگیں آنکھوں میں آنسو' داروغہ جی کو دیکھتے ہی تڑپ کر بولیں۔ "اللہ سے کچھ تو خوف کھاؤ۔ کیوں بے قصور نگوڑی بڑھیا کے پیچھے لٹھ لے کر پڑ گئے ____ یہ نہیں سوچتے کہ اپنے ہی دام کھوٹے تو پرکھنے والوں کا کیا دوش ____ کئی دن سے قدیر میاں جو رات رات بھر غائب رہتے ہیں۔ ایسے ننھے بن گئے کہ سمجھ ہی میں نہیں آتا۔" یہ کہتے کہتے آواز بھرائی رُکی رُکی آواز میں کہا۔ "بھئی واہ خوب خاندان کا نام روشن ہو رہا ہے۔ بڑے بھائی ہو کر اتنے بھی نہیں کر سکتے کہ ____ آج تک ہمارے گھرانے کے لڑکے رنڈیوں پنڈیوں کے پیچھے بھٹکے ہیں بھلا؟"

اس پر داروغہ جی گھبرا گئے' ہکلا گئے' کانپتے ہوئے کہنے لگے:

"ارے بھئی کیسے کہہ سکتی ہو کہ بھالو کے معاملے میں قدیر میاں ____ واہ مجھے تو یقین نہیں آتا۔"

"اچھا ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ آج ہی قدیر میاں کا پیچھا کر کے دیکھ لو' ارے میں تو قدیر میاں کی آنکھیں پہچان لیتی ہوں' ہاں نہیں تو۔" اتنا کہہ کر بیگم جھاگ جیسی سفید چاندنیوں سے ڈھکے ہوئے تختوں والے کمرے میں کھسک لیں اور گاؤ تکیے سے ٹک کر بیٹھ رہیں۔

اس ادا سے داروغہ جی نے سمجھ لیا کہ بیگم اپنی بات سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر ہونے والی نہیں۔

اور دل و جان سے ان کی بات تسلیم کرتے ہوئے تھانے میں پہنچ گئے۔

رپورٹ رجسٹر میں درج نہ ہوئی۔ اپنی عزت کا معاملہ تھا۔ داروغہ جی نے چپ چپاتے بھالو کو برآمد کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔

لیکن بے چاری اللہ رکھی کو اس کا کیا علم تھا۔ اس کے کلیجے میں تو آگ بھڑک رہی تھی' بچھڑی ہوئی سارس کی طرح ڈول رہی تھی' ہر طرف منہ اٹھا اٹھا کر پکار رہی تھی۔ اری بھالو تجھے موت کیوں نہ آ گئی۔ کیسے دکھوں سے پالا' خود اچھا نہ کھایا تجھے کھلایا' پال پال کر سانڈ کر دیا۔ ارے ان بالشت بالشت بھر کی تھیکڑیوں کے سامنے کمائی کو کمائی نہیں سمجھا' آنے جانے والوں کی بغل سے اٹھ اٹھ کر دودھ پلایا اور باتیں سنیں' یہی تو زندگی کا آسرا تھیں اور اب جبکہ بڑھاپا آیا تو دنیا یوں اندھیر ہو گئی۔" انوری فرمانبردار سہی پر کتیا کا جنم لے کر آئی تھی۔ بچوں پر بچے' لاکھ لاکھ علاج کرو۔ پچاسوں روپے جنیا وائی کھا گئی مگر بات نہ بنی اور بچی بھالو' جو بُرے وقت میں ماں کا سہارا بنتی اس کا یہ حال کہ آئے دن کم بخت ماری لونڈوں' لاریوں کی طرح گھر سے بھاگ رہی ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اللہ رکھی کسی کے گھر برتن مانجھ کر پیٹ پالے؟ اپنا ہی پیٹ ہوتا تو خیر مگر یہاں تو کھانے والے کتنے تھے۔ اللہ رکھی' پہلوان' انوری کے تین لڑکے اور پھر انوری بھی تو ____ اب ایسے دنوں میں جبکہ اٹھتے بیٹھتے میں بے چاری کی سانس پھولتی تو اسے کوئی کہاں دھکیل دیتا۔ پورے دنوں سے بیٹھی تھی۔ چہرہ ایک دم سفید کھریا مٹی' ہونٹ نیلے' آنکھیں مارے نقاہت کے خالی خالی' اس پر سے اس کا چھوٹا بچہ ابھی تک خالی چھاتی چھوڑنے

ــــــ ٹانہ آتا تھا۔ ساری جان کھنچنے لگتی۔ ابھی دو ایک مہینہ پہلے تک وہ ہنس بول کر کسی نہ کسی سے اٹھی جوتی تو جھک فرش تک۔ مگر اب تو
اسے سارے بدن کے ہنسی تک نہ آتی تھی۔

اور اس زمانے میں بھالو پھر چلتی بنی۔

"ہائے بیچ نخ نرا زمانہ لگا ہے۔ نفسی نفسی ہے' یہ قرب قیامت نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ بھالو حرامزادی میری کمائی پر پل پل کر جوان ہوئی اور جب احسان چکانے کے لائق ہوئی تو حرافہ کئی انگلی پر موتی بھی نہیں' ٹکڑے ٹکڑے یاروں کے پیچھے بھاگتی ہے۔ ارے کیا ہم کبھی اس کی عمر کے نہیں تھے؟ کبھی پیسے کے سوا کسی سے کوئی لالچ نہیں کی' اور ایک یہ بھالو ہے۔ ارے کیا یہ بھالو جانتی نہیں کہ انوری کسی کی کمائی کھانے والی نہیں۔ بس یہ مجبوری کے دن سدا تھوڑی رہیں گے۔ یہ وقت نکل جاتا تو اپنی جوانی کا صدقہ اسے سال بھر بٹھا کر روٹی کھلا دیتی۔ پر اسے میر' خیال کہاں؟" انوری درگاہ سے واپسی پر رینگ رینگ کر چلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ اُجڑے قصبے کا اُجڑا بازار اس وقت چراغوں اور لالٹینوں کی روشنی میں چمک گیا تھا۔ کئی لوگوں نے انوری کو یوں چلتے دیکھ کر آوازے بھی کسے اور انوری شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ اس نے چپکے سے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ اللہ رکھی سلیپریں گھسیٹتی گلابی چھینٹ کا لہنگا گھماتی گھر کے دروازے میں غائب ہو گئی ___ اور انوری پھر کھول اٹھی۔ "سچ ہے کہ کسی کو کسی کا خیال نہیں۔ اب اماں کو نہیں معلوم کہ میں بھی ساتھ ہوں اور یہ دل کی پیاس کی شلوار بھی تو مصیبت ہے۔" انوری کا جی چاہا کہ بیچ بازار میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس بات پر خوب روئے۔ پر وہ رو نہ سکی۔ بس چکرا کر ایک دوکان کے پٹے سے لگ کر آنکھیں بند کر لیں۔

"اے ہے انوری یہاں کیوں رُک گئیں' گھر چلو۔" کسی نے دھیرے سے کہا۔ انوری نے پسینے میں ڈوبے ڈوبے ایک ذرا آنکھیں کھولیں۔ یہ غالباً حفیظ تھا۔ نہیں یہ یقیناً حفیظ تھا۔ یہ نرمی حفیظ کے ہاتھ کے سوا کس کے ہاتھ میں ہو سکتی ہے؟ اس نے کمر میں درد کی لہر محسوس کرتے ہوئے آنکھیں تھوڑی سی کھول کر سوچا اور پھر اپنا بازو حفیظ کے نرم ہاتھ میں پکڑائے اپنے گھر میں داخل ہوئی ___ اور انگنائی میں پڑی ہوئی کھاٹ پر دھم سے گر پڑی ___ گھر میں بھی ذرا دیر کو سکون نہ ملا۔

اللہ رکھی اور پہلوان گھریلو اور بازاری سیاست پر زور شور سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔

"اے خالہ ذرا انوری کو دیکھو۔ اس کا جی بگڑ رہا ہے۔" حفیظ غالباً زندگی میں پہلی مرتبہ کڑی آواز میں بولا۔

"اللہ خیر کریو' میاں جوجو کا صدقہ۔" اللہ رکھی جھپٹ کر انوری کے قریب آئی اور جھلنگی کھاٹ میں انوری کے ڈوبے ہوئے جسم کو ٹٹولنے لگی۔ "جیناوائی کو بلاؤں بیٹا؟"

"ایں نہیں' بس اب ٹھیک ہے جی۔" انوری نقاہت سے بولی اور اللہ رکھی لحہ بھر رُک کر اپنے مورچے پر جاڈٹی۔ چھپریا تلے بنے ہوئے چولہے کے پاس لہنگا پھیلا کر بدستور بیٹھ گئی۔ چلم کو ہتھیلیوں میں ایک خاص زاویے سے دبا کر ایک دو زور کے کش لئے۔

حفیظ بیڑی سلگاتا چلا۔ "خالہ میں دوکان پر چلا' پھر آؤں گا۔"

اللہ رکھی نے جواباً ایک دو کش اور لئے۔

"اس بار لونڈیا آتی دکھائی پڑے ہے۔ پورے دن بھر رہے ہیں۔" اللہ رکھی نے روٹھے ہوئے پہلوان کو خوشخبری سنائی۔

"ہاں لے ٹھینگا۔ ہوئی نہ ہو لونڈیا۔ دیکھ لیجو۔ پیشاب سے مونچھ منڈوا دوں جو پھر لونڈا نہ جنے۔ چھاتی پر چڑھ کر کمائی کھائیں گے کتے کے بچے۔ تمہیں کیا کم ہیں جو جو تھا بھی گھر دیکھ رہا ہے۔ پتریاجات شرم نہیں آتی۔ شریف جادیوں کی طرح لونڈے جنتے۔" پہلوان اپنی پنڈلیوں پر تیل کی مالش کرتے ہوئے ڈکارا۔

"چل رہنے دے نگھو۔ لونڈے ہوں یا لونڈیا۔ تیری کمائی تھوڑی کھائیں گے۔" اللہ رکھی کا پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ "ارے ہاں کم بخت کی ناک بھوں چڑھ وقت چڑھی رہتی ہے جیسے بیچ کا خاوند ہو۔ کھا کھا کے ساری کمائی اڑا دی کم بخت نے۔ ہے دو کوڑی کا نہیں نخرے

لاکھ روپے کے۔"

"ہوں' بڑی کمائی ہے تیرے گھر' خود تو دو کوڑی کی نہیں۔ ایک لونڈیا کتیا کی طرح سال پیچھے جننے بیٹھ جاتی ہے۔ دوسری ستانی باتھی ہو رہی ہے کمائی کے نام دھیلا نہیں' بھاگ بھاگ کر تبرک کی طرح بٹتی ہے۔ تو بھی تو جوانی میں ایسی ہی ہوگی۔ بیٹی ماں پر جاتی ہے۔" پہلوان نے چیخ کر کہا۔

"کہے دیتی ہوں زبان روک لے۔ لو بھلا میں کیوں ایسی ہوتی' جو ماں نے کہا وہ کیا۔ مجال ہے جو کبھی کسی سے ماں کی مرضی کے بغیر ہاتھ بھی چھو لیا ہو۔ اب تو زمانہ ہی برا ہے' اس میں کسی کا کیا دوش؟"

"دوش (دوش) کیوں نہیں؟ اری تو نے کسی میرے جیسے کے پاس ایک بار رکھا ہوتا تو ساری منہ زوری (زوری) ——— اونٹ پہاڑ تلے آئے تو بلبلانا چھوڑ دے۔ میں نے کتنی بار کہا ———" پہلوان کے منہ پر دل کی بات آ گئی۔

"بس بس سرم گھول کر پی گیا۔ لے بھلا کوئی دیکھو تو سہی' ہائے میری ماں!" اللہ رکھی چلم چولھے میں اوندھا کر بے بسی سے رو پڑی۔

سچ مچ رونے کی تو بات تھی۔ جب لوگ سارے قاعدے قرینے بالوں تلے روندنے کو تیار ہو جائیں تو پھر بے چاری اللہ رکھی اور کرے بھی کیا۔ دو دن سے پیسے کوڑی کی صورت نظر نہ آئی تھی۔ آج تو پنساری نے آٹا دال بھی ادھار نہ دیا تھا۔ بھالو جو بھاگی ہوئی تھی۔ اب اس میں بے چارے پنساری کا بھی کیا قصور؟ جب گروی رکھنے کو چیز ہی نہ ہو تو پھر ادھار کوئی کس برتے پر دے؟ ادھر تو پیٹ کی ہائے دیا پڑی ادھر پہلوان پر پہلوانی سوار۔ اللہ رکھی چھپر تلے بیٹھی زرد زرد آنسو بہا رہی تھی۔ اچھا خاصا اندھیرا ہو گیا تھا۔ ابھی تک گھر میں چراغ بھی نہ جلا تھا۔

پہلوان محاذ پر خاموشی دیکھ کر لال لنگوٹ پر تہبند باندھتا ہوا باہر نکل گیا۔ آج یہاں روٹی کا آسرا نہ تھا پھر بیٹھ کر کیا کرے؟ اس بے رخی پر اللہ رکھی اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ایک زمانہ وہ تھا۔ ایک زمانہ یہ ہے۔" اللہ رکھی نے روتے ہوئے سوچا۔ "اماں بوڑھی ہو چکی تھیں۔ دانت ٹوٹ رہے تھے۔ پر خیر وہ کافی ٹاٹھا تھا۔ اس کی بیاہتا کے گھر دو سال پہلے ہی بچہ ہوا تھا ——— مگر اللہ اللہ کیا وضعداری تھی۔ اس زمانے میں اللہ رکھی کی جوانی کچے پھوٹ کی طرح کھل رہی تھی۔ مگر مجال ہے جو خیرو قصائی نے کبھی اللہ رکھی کی طرف ایسی ویسی نظر ڈالی ہو۔ بیٹی کہہ کر پکارا اور بیٹی ہی سمجھا اور ایک یہ پہلوان ہے' کھانے چاٹنے کو آگے آگے۔ نام کرے اللہ رکھی سے یاری کا اور نظر رکھے اس کی بیٹی بھالو پر ——— آگ لگے ایسے زمانے کو۔ نیتیں سلامت نہیں رہیں۔ جبھی تو ہر چیز سونے کے بھاؤ ہو گئی۔ جوان جوان لڑکے قصبے سے بھاگ نکلتے ہیں۔ کبھی برس دو برس میں فوجی سپاہی بن کر آتے ہیں یا پھر کسی مل کے مزدور' تو ناک بھوں چڑھاتے پھرتے ہیں۔ جو اس اجڑے دیار میں رہ گئے تو سمجھو دور اندیش ہیں۔ اللہ رکھی کے گھر قدم رکھتے ہیں تو پیسے پیسے پر تکرار کرتے ہیں۔ نہ کوئی انعام نہ کوئی تحفہ۔ قصبے میں سچ پوچھو تو اب ایک اللہ رکھی کا گھر ہی مشکل کشائی اور حاجت روائی کا منبع نہ تھا۔ اب تو چوری چھپوال کنیوں کے گھر فیض جاری تھا۔ ہائے دوسروں کے پیٹے ہیں گھستے۔ دوسروں کے پیٹ پر لات مارتے شرم نہیں آتی لوگوں کو ——— اماں نانی کے زمانے کا بنا ہوا مکان جگہ جگہ سے نمک لگ لگ کر گر رہا ہے۔ اتنا نہیں کہ دو نئی اینٹیں لگ جائیں ——— ارے جس کے دو بیٹیاں پہلے زمانے میں ہوتیں تو سمجھ کہیں کی مہارانی اور اب دو بیٹیوں کے ہوتے بھکارن سے بدتر۔ آٹا روپے کا دو سیر نہیں جڑتا۔ اس پر ایک جنم جلی سہرے جلوؤں والی شریف زادی کی طرح سال پیچھے بچہ جنتی ہے اور دوسری آگ لگی دوسروں کے پیچھے چھچھوندر کی طرح چھچھیاتی پھرتی ہے ——— اور یہ پہلوان بس کم بخت روٹیاں ٹھونسنے بیٹھ جاتا ہے۔ اس سے کیا کوئی عیش اٹھائے۔"

اللہ رکھی امنڈ گھمنڈ کر آنسو برسانے لگی۔

"اری بھالو تو مر جائے۔ کسی کوے کتے کی آئی تجھے آ جائے' تو میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ جائے۔ اری بھالو تیری مچھپاتی کھٹیا نکلے۔

اری متیا میری' یہ اولاد تو میرے لئے سانپ بچھو ہو گئی ری میا ——"

اور اسی لمحے تین عدد اولاد گھر کے اندھیرے میں چیں چیں کرتی تھی۔ اللہ رکھی کا رونا پیٹنا سن کر تھکی۔ کسی نے کیچڑ سے لت پت کرتے سے ناک پونچھی۔ کسی نے آنکھ اور کسی نے ناک' اولاد بڑی آسانی سے سمجھ گئی کہ اس وقت کھانا ملنے کی امید نہیں۔

اور پھر سب نے انکھار دا شروع کر دیا۔ چھوٹی چھوٹی پرانی اینٹوں کی گرتی ہوئی دیواریں ایک دم بھیانک سی لگنے لگیں۔ آسمان پر ایک تارہ چمک کر ٹوٹا۔ انوری ہول کر چیخی۔ "اے ہے اماں بچوں والے گھر میں شام کو نہ رو۔" اور اس نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر سب سے چھوٹے بچے کو گھسیٹ لیا جیسے وہ اسے کہیں بھاگنے سے روک رہی ہو۔

اللہ رکھی اس مداخلت بے جا پر سانپ کی طرح پھپھنا کر اٹھی۔ "کیا کہا تو نے؟ لو یہ اور آئی حرام جادی بچوں والی۔ اری یہ چونچلے تجھے نہیں سجتے۔ شرم ہوتی تو ڈوب مرتی کسی تلیا میں۔ ایک تو حرامی پلوں کی پھوج کھڑی کر دی اس پر سے ——صدکے کردوں سے پھوج کو۔"

انوری غریب سدا کی نازک' کم سخن اور فرمانبردار' مگر اس وقت تو وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"بس بس اماں کھمردار۔ میرے بچوں کو کوسا' واہ جرا کھیال نہیں' میرے بچے کسی کی روٹی نہیں توڑیں گے۔ اپنی جوانی کا صدکہ تمہیں بہت کھلایا۔ اپنی جان کو جان نہیں سمجھا' بیماری دکھی میں کمائی سے منہ نہیں موڑا اور تمہاری مٹھی گرم کی۔ کوستا ہے تو اس حرامیہ کو کوسو۔ میرا نام لوگی تو میں اپنے بچوں کو لے کر کہیں منہ کالا کر جاؤں گی۔ اللہ کی جمین بہت پڑی ہے۔ جہاں بیٹھوں کی روکھی سوکھی کھاؤں گی۔ پھر دیکھیں گے کہ تم بھالو کو کیسے میری طرح دبالو گی۔"

انوری کی اس خوفناک دھمکی کے بعد خدا جانے اللہ رکھی کیا طوفان اٹھاتی۔ مگر خیر ہوئی کہ اس وقت بازار کے بہت سے لوگ ایک لال پگڑی کے پیچھے پیچھے اندر گھس آئے اور پھر کسی نے بڑھ کر چراغ روشن کر دیا۔ یہ حفیظ تھا' وہی سفید شلوار اور سرمئی ریشمی قمیض اور وہی تیل میں چپڑے ہوئے پٹے' سرمے سے لبریز آنکھیں اور پان سے سرخ ہونٹ' انوری کو بے تکا سا خیال بجلی کی طرح کوند کر آیا۔ "ارے یہ تو موا حفیظ دوستی دوستی میں ہمارے گھر گھس کر ہمارے گاہک اپنے واسطے پھنسانے آتا ہے ——" حفیظ کو انوری کے اس خیال کا پتہ لگتا تو اس کے خلوص کو کیسی ٹھیس لگتی —— اسے یہی کرنا ہوتا تو کم بخت پنواڑی کی دوکان سے سر کیوں مارتا؟

"اے خالہ بھالو آ گئی۔ مبارک۔" حفیظ خوشی سے چہک کر بولا۔

اور اسی وقت مجمع میں گپ شپ شروع ہو گئی۔ بھالو کو مجمع کے بیچ میں سے دھکیل کر تھانے کا سپاہی سامنے لایا۔

ہاتھ رسی سے کس کر بندھے ہوئے۔ ململ کی وہی نئی ساری جو بھاگنے کے دن پہنے ہوئے تھی۔ پیٹی کوٹ کے بجائے سرخ رنگ جانگیہ اور وہی چھوٹی سے کرتی' مگر ہر چیز کیچڑ میں لت پت اور نچی کھچی' حبشیوں جیسے سخت گھنگھریالے بال' جھونجھ کی کھوپڑی پر چھائے ہوئے' جیسے اس نے سکھوں سے خوب ڈٹ کر ہاتھاپائی کی ہو۔ مگر اب ماں کے سامنے نظر نیچی کئے کھڑی جھوم رہی تھی —— مارے تندرستی کے جھومتے رہنا اس کی عادت تھی۔ جبھی تو سب اسے بھالو کہتے تھے۔

"آ گئی ——" اللہ رکھی نے اپنے اور بھالو کے درمیان ایک ایسی قطار سی سڑی سڑی گالیوں کی کھڑی کر دی —— اور ——

"چل اندر!" یہ کہہ کر اس نے بھالو کا ہاتھ پکڑا اور کوٹھڑی میں دھکیل کر کنڈی چڑھا دی۔ چلو قصہ ختم' مجمع بڑا مایوس ہوا' ذرا بھی گرما گرمی نہ پیدا ہوئی۔

لیکن اللہ رکھی کی تجربہ کار نگاہیں سمجھ گئی تھیں کہ اس وقت لوگ باتیں کرنے اور سننے کے موڈ میں ہیں۔ ہاں بھئی کسی کا گھر جلے اور کوئی تاپے —— اچھا تاپنے نہ دیا ہو بھلا۔ اللہ رکھی تیوری چڑھائے چولہے کے پاس گئی اور چلم بھرنے لگی۔

"جنگل میں مانک پور کی طرف جاتی ملی۔ میں نے پکڑ لیا۔" سپاہی مونچھوں پر تاؤ دے کر بولا۔

اللہ رکھی چلم بھرتی رہی۔

"اب باندھ کر رکھو اسے—— کو اب بھی چیں بیں کرے تو مجھے بتانا ساری مستی مار مار کر نکال دوں گا۔"
پنساری بات کو سمجھا کر بولا۔ "بھائی اللہ رکھی کم مار دیتی ہے؟ پچھلی دفعہ بھاگی تھی تو تین دن کھانا نہیں دیا۔ زنجیر میں باندھ کر رکھا' پہلوان نے یہ تمہارے سوانگ—— بالکل سیدھی ہو گئی تھی مگر پھر تھوڑے دن میں بھاگ نکلی—— کیوں اللہ رکھی؟"
اللہ رکھی اطمینان سے کھسکتی آئی اور چلم سپاہی کو پکڑا دی اور خود انوری کے بچوں کو لے کر کھسکتی ہوئی چھپریا تلے بیٹھ کر چولہا سلگانے لگی۔

مطلب یہ دربار برخاست' کھانے پکانے کا وقت ہے۔
لوگوں کو کیا پڑی تھی کہ اپنا خرچ کرتے ایک ایک کر کے کھسک لئے' سپاہی نے بیٹھ کر تمباکو کے دو ایک کش لگائے۔ انوری یا تو اب تک مٹی کے مادھو کی طرح بیٹھی تھی کہ سپاہی کو اپنی طرف دیکھتا پا کر دوبارہ جھلنگا کھاٹ میں ڈوب گئی۔ اس کا چھوٹا بچہ دودھ چھوڑے جا رہا تھا۔
سپاہی نے اکتا کر گوبر جیسی بے مزہ تمباکو کے دو ایک کش اور لئے۔ قطعی کھٹ لیو فضا تھی وہاں۔ وہ زیادہ دیر نہ رکا' چلتے چلتے سوچا۔ آہا بھالو ہے بڑی مزے دار۔ کل پرسوں اللہ رکھی سے بات کروں گا۔
سپاہی کے جانے کے بعد اللہ رکھی لہنگا جھاڑ کر اٹھی اور باہر نکل گئی اور جب چند منٹ بعد واپس آئی تو دوپٹے کے پلو میں ادھر کی کھچڑی بندھی ہوئی تھی۔ چولہے کے پاس بیٹھے ہوئے بچوں کی آنکھیں آگ کی روشنی میں چمک اٹھیں۔
انوری اور اللہ رکھی میں کوئی بات نہ ہوئی۔ انوری کو انگنائی میں ٹھنڈ لگ رہی تھی اور نیند بھی آ رہی تھی مگر وہ جائے کہاں۔ چھپریا تلے اللہ رکھی اور کوٹھڑی میں بھالو۔ اس وقت تو اسے سبھی سے نفرت ہو رہی تھی۔ وہ چپ چاپ پڑی اونگھتی رہی—— رات کافی گزر چکی تھی۔
"لو انوری اُٹھ یہ کھا لے۔" اللہ رکھی تام چینی کی پلیٹ میں سلیقے سے کھچڑی لئے حاضر ہوئی۔
"نہیں کھانا انوری؟" انوری کی ناک میں گھی کی خوشبو آئی۔ اس نے جبر کر کے کروٹ بدل لی۔
"کھالو انوری؟" حفیظ عطر میں مہکتا پٹی پر بیٹھ گیا۔ "اے ہے بے چاری خالہ نے ابھی تک کچھ نہیں کھا۔ تم کھالو تو——"
مگر حفیظ کا صلح کا جھنڈا انوری نے پیروں تلے روند دیا۔
"نہیں مجھے دوسرے کی کمائی سور حرام ہے۔ اب تو میں اس گھر میں نہیں رہوں گی۔" انوری نے زور سے کہا۔ پلیٹ میں کھچڑی رکھی ہوئی آم کے اچار کی پھانک بھی کتنی ظالم ہوتی ہے۔ انوری نے منہ کا پانی نگل کر دوسری طرف کروٹ بدل لی۔
"اری تو کہیں نہیں جائے گی۔ اب چھوڑ' تجھے کھانا ہے سوگنے سے کھالے۔"
حفیظ اسے اٹھانے لگا' اور اس وقت اسے حفیظ زہر لگا۔ آخر یہ کیوں ہمارے پھٹے میں پاؤں اڑاتا ہے' موا پنواڑی اپنی دکان سنبھالے جا کر۔ انوری نے بگڑ کر سوچا۔ وہ حفیظ کے اور اپنے گھرانے کے گہرے ہمدردانہ تعلقات کو یکسر بھلا بیٹھی تھی۔
مگر حفیظ نے جو کہا وہ سچ ہی تھا۔ اسے کہیں نہیں جانا تھا اور کھانا تو بہرحال کھاتا ہی ہے انسان' پھر جبکہ آم کا اچار ہو۔ بالآخر وہ نیند کے جھونکوں میں پلیٹ صاف کر کے چھپریا تلے بچھے ہوئے اپنے بستر پر لیٹ گئی۔ پہلوان چولہے کے پاس اکڑوں بیٹھا کھچڑی کے بڑے بڑے نوالے نگل رہا تھا۔ انوری کو دیکھ کر اس نے بھالو کی جنسیت کے بارے میں کچھ گفتگو چھیڑی مگر انوری تو سو بھی چکی تھی۔ پہلوان سچ کہتا تھا انوری تو تھی ہی سدا کی مٹی' پتہ نہیں ایسی مٹی پر کون اپنے دام پھینک جاتا ہے۔
آدھی رات کے قریب جب آسمان پر ستارے جگمگا رہے تھے اور انگنائی شبنم سے بھیگ رہی تھی تو بے چارہ حفیظ اللہ رکھی کے مشورے کے مطابق کھچڑی کی پلیٹ اور چراغ لے کر بھالو کی کوٹھڑی میں پہنچا۔
بھالو زمین پر پڑی مزے سے سو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ اب تک رسی میں جکڑے ہوئے تھے۔ ململ کی ساری گھٹنوں سے اوپر تھی اور سرخ جانگیہ رانوں پر بالکل فٹ تھا۔
حفیظ کو ہنسی آ گئی۔ کیسی جنگلی ہے۔ یہ بھی۔ رنڈی کو مردوں کی کیا کمی' پھر بھی مردوں کے پیچھے بھاگتی ہے' سچ کہتا ہے پہلوان' اس

کے لئے تو بیچ بھالو ہی ہو۔ مگر بے چاری اس کی خاطر کبھی بیٹا ہے ... کھاتی ہے کبھی تھانے میں کبھی ... کی۔
کبھی ... اللہ یہ کیسی آگ کی بنی ہوئی ہے؟

حفیظ کے دل میں ہمدردی اور حیرانگی کی ایک ملی جلی سی لہر اٹھی اور اس نے چراغ طاق پر رکھ کر بھالو کو جگایا۔

بھالو نے لال لال آنکھیں کھول دیں۔

"بھالو یہ کھالے خالہ سے کھچڑی لایا ہوں۔"

بھالو مٹی کھچڑی میں سنے ہوئے ہاتھوں سے کھچڑی کھانے لگی۔

حفیظ اپنی سفید شلوار سمیٹ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ بیڑی پینے لگا اور گفتگو شروع کرنے کے لئے کوئی عمدہ فقرہ تلاش کرنے لگا۔

"بھالو تو جانتی ہے میرا تجھ سے کوئی میٹھا لالچ نہیں۔ نہ خالہ مجھے کچھ دے دیتی ہے نہ تو ___ پر کہوں گا لگی بات۔ بھلا بتا سکی اس طرح روز روز بھاگنے سے کیا فائدہ۔ دو کوڑی کی نہیں رہے گی۔ اب تو ہی دیکھ لے یہ چھٹی دفعہ بھاگی ہے۔ اب کی کس کے پاس رہی تھی؟ لا مجھے دکھا اس نے تجھے کیا دیا؟"

بھالو نے ایک لمحے کو کھچڑی پر سے ہاتھ اٹھالیا۔ اپنی موٹی سیاہ روئیں سے ڈھکی ہوئی پنڈلی کھجا کر دھیرے سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"سچ بتا قدیر بابو کے پاس رہی تھی نا؟ تو ملا کچھ نہیں ارے یہ بابو لوگ تو مفت کام چلاتے ہیں۔ ٹھیک کہتا ہوں نا؟"

بھالو نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کھچڑی کھاتی رہی۔

"اری سر تو ڈھائی سیر کا یوں ہلاتی ہے جیسے تجھے پہلے ہی سب پتہ تھا۔ پھر تو گئی کیوں تھی؟ سب سمجھ لے تھانے دار دشمن ہو گیا تو اس کے بھائی کو پھنساتی ہے ___ اب یوں بھی اس نے تیرے منہ میں کون سا سونے کا نوالہ دیا؟"

"روٹی کا نوالہ بھی پیٹ بھر نہ دیا۔ ابرار کے گھر کوٹھڑی میں بند کرکے دن بھر کو چلا جاتا تھا اور شام کو ایک دو روٹی لے کر آتا تھا۔ رات بھر سونے نہ دیتا تھا۔ پھر بھی صبر کیا۔" بھالو روہانسی ہو کر آنکھیں ملنے لگی۔

"اری دیوانی اس طرح بھلا رنڈیاں پنڈیاں کرتی ہیں۔ صبر کرے تیری جوتی۔ اس سے پہلے تو جن کے ساتھ بھاگی تھی انہوں نے بھی دو چار دن کے بعد گھر سے نکال باہر کیا۔ اچھا قدیر بابو کے پاس سے تو خود بھاگی یا ___؟" حفیظ کرید تا ہی گیا۔

"انہوں نے کہا اب جاؤ بھالو۔ بھابی ناگن کی طرح پھنکار رہی ہے ___ میں وہاں سے چل پڑی۔"

"اچھا یہ تو بتا تو اس کے ساتھ گئی کس لئے تھی؟" حفیظ اسے داؤں پر لا کر چاروں شانے چت قائل کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"قدیر بابو کہتے تھے بھابی کے نخرے نہیں اُٹھتے 'سوکھی چھوہارا تو ہے پر نخرے گاڑی بھر دکھاتی ہے۔"

"یہ بات تھی بابو صاحب کو اپنے گھر بلاتی۔ ذرا بابو صاحب کی گرہ سے کچھ نکلتا۔ ارے بابا دو پیسے آنے سے کم میں نہیں ملتا ہے۔ مجھے تو تیری عقل پر غصہ آتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں اگر خالہ سے تیرا دل خوش نہیں تو الگ ہو جا۔ مکان دلانے کا میرا ذمہ 'بس خالہ کا روزینہ باندھ دیجا۔ اب بچاری کا لہ کا بھی تیرے سوا کون بیٹھا ہے؟" حفیظ نے اللہ رکھی کی پوری پوری وکالت کی ___ بھالو خاموشی سے کھاتی رہی۔

حفیظ کو اپنا جادو اثر کرتا معلوم ہو رہا تھا۔ اس لئے اس کی زبان بھی قینچی کی طرح چلی رہی تھی۔ قصبے بھر میں اس کا کوئی سنجیدگی سے نوٹس تک نہ لیتا تھا۔ اس گھر میں اس کی بات تو سنی جاتی تھی۔ پھر وہ کیوں نہ اس کو گھر بنانے کی کوشش کرتا۔

"سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کوئی سونے یا ہیرے کا بنا تھوڑی ہوتا ہے۔" حفیظ نے ہزار باتوں کو ایک بات میں سمو دیا۔

بھالو نے کھچڑی سے ہاتھ اٹھا کر اثبات میں سر ہلایا اور بڑی دیر تک ہلاتی رہی اور سیاہ طاق میں رکھے ہوئے چراغ کو گھورتی رہی ___ حفیظ سمجھا بھٹکا ہوا راہ پر لگ گیا۔

"چل اٹھ بھالو! خالہ کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگ اور وعدہ کر پھر کبھی کسی مرد کے پیچھے نہیں بھاگے گی۔" حفیظ نے بھالو کا موٹا سا بازو پکڑ کر کھینچا۔

بھالو چپ رہی مگر وہ اٹھی بھی نہیں۔ بس چپ چاپ چراغ کو گھورتی رہی۔

"اب کس سوچ میں پڑ گئی ہو؟"

بھالو پھر بھی چپ رہی۔ حفیظ تنگ آ کر اپنے آپ کو سمجھانے لگا۔ یہ بھالو بھی بس سالی ____!

"حفیج!" (حفیظ) بھالو نے دھیرے سے پکارا۔

"ہاں بھالو!" حفیظ نے بھالو کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا۔

بھالو کی آنکھوں میں جانے کہاں سے ایک دم آنسو اٹھ پڑے۔ تھانے میں ایک بار چوہدری سے مار پڑی۔ جب تو ایک آنسو نہ گرایا اور آج پتہ نہیں کیسی چوٹ لگی۔ حفیظ ہوا کا ہو کر رہ گیا۔

"میں جس کے ساتھ بھاگی اچھا کیا یا برا اس بات کو جانے دے۔" بھالو نے جلدی جلدی آنسو خشک کئے۔

"پھر تو چاہتی کیا ہے؟" حفیظ کچیا گیا۔

"میں تو سوچتی تھی میرے بچے ہوں میں بھی نات کے پردے والے گھر میں رہوں جیسے تیری ماں رہتی ہے۔" بھالو دھیرے سے بولی۔

"اچھا؟" حفیظ کو کچھ غصہ آیا اور پھر وہ کھسیا کر ہنس پڑا۔ وہ بھالو کے منہ سے اپنی بیوہ دکھاری ماں کا ذکر نہیں سننا چاہتا تھا۔

"حفیج!"

"ہاں!"

"تو سچ مچ مرد نہیں؟" بھالو نے بھولے پن سے منہ اٹھا کر پوچھا۔

حفیظ اس اچانک حملے سے ٹھٹک گیا۔ ایک لمحے کو اس نے سر اٹھایا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ مرد نہیں تو اس میں اس کا کیا قصور۔ بقول اس کی ماں کے 'اللہ دینے والا ہے' جو چاہے دے دے۔

"میں تیری دوکان کے لئے چھالیا کترا کروں گی۔ تیری ماں کی کھدمت کروں گی حفیج' میں بہو بن کر رہوں گی حفیج! حفیج!!"

اسی رات بھالو پھر بھاگ گئی۔

دوسرے دن حفیظ اکڑ اکڑ کر چلتا جو دوکان پر آیا تو لوگ وہ سارے گھسے پٹے فقرے بھول گئے جنہیں سن سن کر حفیظ کے کان پکے گئے تھے۔

خون

انور

ساجا ایک اکیلے مسافر کی مخصوص خاموشی کے ساتھ جہاز سے اُتر کر جیٹی پر کھڑا ہو گیا۔ چودہ سال کے لمبے عرصے نے لُوٹرم گھاٹ میں بہت سی تبدیلیاں پیدا کر دی ہو نگی۔ وہ ان تبدیلیوں پر غور کرنے کی بجائے اپنے لٹھے کی نئی شلوار پر جہاز کے گندے ڈیک سے لگے ہوئے تیل کے دھبوں کو دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کے لئے اُس کے احساس کی چادر پر ملال کے بڑے بڑے دھبے آ گئے' ہگلی کی ہلکی ہلکی لہروں نے جہاز کی سیاہ کھردری دیواروں سے ہولے ہولے ٹکرا کر اس کی شلوار کے سیاہ دھبوں کو مٹا دیا اُس نے بغل سے اپنی ململ کی' کلف سے اکڑی ہوئی' نئی پگڑی کو نکال کر دیکھا اُس کا دماغ اُس کو یہ نہ بتا سکا کہ کلف نے اس کی پگڑی میں بھی ہگلی کی لہریں پیدا کر دی ہیں' لیکن جب اُس نے اِس پگڑی کو جہلمی انداز میں اپنے سر پر باندھ لیا تو اُس کے دل نے محسوس کیا کہ وہ ہگلی کی نہروں میں نہا رہا ہے۔
ایک دفعہ پھر اُس کی طبیعت میں دبی دبی مسرّت کا خاموش ساکن جیسا طوفان برپا ہو گیا اور اُس نے لائنوں پر ادھر اُدھر حرکت کرنے والی اونچی اونچی کرینوں کی طرف دیکھنے کی بجائے اس سے گذرنے والے تیل سے بھیگے ہوئے چیتھڑوں میں ملبوس ایک کالے مریل' مریل مُرادو بنگالی قلی کو کہا:

"جوان تم کو معلوم ہے' پنجاب کو گاڑی کتنے بجے جاتی ہے۔"

قلی نے بیڑی کا ایک لمبا کش لے کر دھوئیں میں سے جواب دیا۔

"ہم کو نئیں مالوم۔"

ساجے نے قلی کو جانے سے روکنے کے لئے کندھے کے پاس سے اُس کی قمیض کا کپڑا پکڑ لیا۔

"اچھا یہ بتاؤ سٹیشن کو جانے والی سڑک کونسی ہے؟"

بوداکپڑا قلی کے معمولی جھٹکے سے سرے تک پھٹ گیا۔ قلی کے کالے منہ پر زرد آنکھوں میں سُرخ خون اُتر آیا۔

"تمہارے کو ایک دپھے بولا ہم نہیں جانتا۔ پھر کائے کو پکڑتا؟"

ساجے کو غصہ آ گیا۔ اُس نے ہوا میں ایک مُکا بلند کر کے پنجابی اردو میں کہا

"سوٗر ـــــ کا ـــــ کُور۔"

قلی جلتی ہوئی بیڑی ساجے کے منہ پر مار کر رفو چکر ہو گیا۔

اگر ساجے کے پاؤں کے پاس اُس کا کالا ٹرنک نہ پڑا ہوتا تو وہ اُس قلی کے پیچھے بھاگ کر اُس کو دریا میں دھکا دے دیتا' یا کم از کم کسٹم والوں میں سے تو ضرور وہ کسی ایک کو پیٹ ڈالتا اگر وہ جلدی سے اس کا چھٹکارا نہ کر دیتے' اچھا ہوا' سٹرینڈ روڈ کے سرے تک اُس کو غصہ چڑھا رہا ورنہ سٹیشن تک جانے کے لئے کسی رکشا والے کو آدھا دے دیتا ___________ اور خواہ مخواہ روپیہ بارہ آنے کا نقصان ہو جاتا' وہ اپنی بغل میں ٹرنک دبائے جا رہا تھا۔

سٹرینڈ روڈ پر پہنچ کر اُس کو ایک بنگالی بابو نظر آیا۔ ایک ہاتھ میں سفید کھدر کی دھوتی کا ایک کنارہ' جسم چاولوں کی بادی سے پھولا ہوا' کندھوں پر سر کی بجائے فٹ بال' ساجا اُس کے پاس چلا گیا۔

"یہ سڑک کہاں جاتی ہے بابو جی؟"

"آپ کو کدھر جانے کو مانگتا مسٹر؟"

"سٹیشن۔"

"یہ سڑک تمہارے کو ہاوڑہ برج لے جائیگا۔ برج کا دوسرا سائڈ ہاوڑا سٹیشن ملے گا۔"

ساجے نے سوچا کہ اگر وہ پانچ جماعتیں نہ پڑھا ہوتا تو اس بنگالی بابو کی طرح اُردو بولتا اور نمبر ۹۴۸ کی طرح اردو کی جھٹکا پوٹا کرتا تھا۔ "ہم نے تمہارے کو بولیا ہمارے تاں پتھر گٹ گٹ کے ہتھاں میں جھولے پڑ گئے نے۔ اللہ نے تیرے کو جمعداری دی ہے۔ گرائیں ہو کے بھی آپ ہمارے لوگاں دا کھیال نہ رکھوں گا تاں ______"

نمبر ۹۴۸ بھی جہلم کے ضلع کا رہنے والا تھا۔ بے چارہ اَن پڑھ' ساجا بھی اگر اَن پڑھ ہوتا تو وہ قیدیوں کا جمعدار نہ بن سکتا اور گرفتار ہونے پر اپنے آپ کو سراج الدین ولد معراج الدین نہ لکھواتا۔ بلکہ ساجا ولد ماجا لکھواتا وہ زہریلی ہنسی والا تھانیدار۔ ساجے کو کئی دفعہ خیال آیا کہ تھانیدار کا بھی خاتمہ کر ڈالے۔ کتنا اچھا ہوتا اگر وہ انگریزی سے ڈر کر پانچویں جماعت سے نہ بھاگ اُٹھتا۔ جس طرح وہ قلی اُس کے کے سے ڈر کر بھاگ گیا تھا۔ بھاگ گیا۔ نہیں تو وہ اس کی ریڑھ کی ہڈی توڑ ڈالتا اور پھر وہی پولیس۔ پھر وہی چودہ سال یا شاید پھانسی لیکن پھانسی کیوں ہوتی اگر وہ پانچویں جماعت سے نہ بھاگا ہوتا۔ شاید وہ تھانیدار ہو جاتا یا کم از کم سڑک کے دونوں طرف لگے ہوئے انگریزی کے ان اشتہاروں کو تو پڑھ سکتا۔ چودہ سال پہلے جب وہ قیدیوں کی بند لاری میں اس سڑک سے گذرا تھا تو اُسے یہ خیال نہ تھا کہ یہ سڑک اتنی لمبی اور وسیع ہو گی۔ اوٹرم گھاٹ پر وہ جہازوں اور کرینوں کو دیکھ کر یہ بھول گیا تھا کہ وہ ایک طویل عرصے کے لئے اپنے عزیز وطن کو چھوڑ رہا ہے ۔ جہاز' کرینیں' سمندر اور انڈمان۔

جاج پال گھاٹ کے سامنے پہنچ کر اُس نے دم لینے کے لئے اپنے ٹرنک کو فٹ پاتھ پر رکھ دیا۔ اپنی نئی سفید پگڑی سے اپنے منہ اور گردن سے پسینہ پونچھا۔ سامنے کی دوکان سے دو آنے کے چنے مول لئے۔ میونسپلٹی کے ایک نلکے پر پانی پینے کے لئے چلا گیا۔ جب وہ ہاتھ دھو کر پانی پینے کے لئے جھکا تو یکایک اُس کو کچھ فاصلے پر ایک رکشا جاتی دکھائی دی۔ وہ ہڑبڑا کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ رکشا والے کا پیچھے کی طرف سے تین چوتھائی حصہ نظر آ رہا تھا۔ ساجا پانی کو بھول کر رکشا والے کو غور سے دیکھنے کے لئے آگے بڑھا۔ لیکن رکشا ریڈ روڈ کی طرف مڑ گئی۔ اُس نے اپنے آپ کو کہا نہیں ____ نہیں۔

پانی پینے کے بعد اُس کو معلوم ہوا کہ اسٹیشن ابھی دور ہے۔ اس کی دبی دبی مسرت پر بوجھ کا ایک ہلکا سا چھلکا آ گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اب وہ ٹرنک کے بوجھ کو نہیں اٹھا سکے گا۔ اُس نے ایک رکشا والے کو بلایا۔ اپنا ٹرنک اُس میں رکھ دیا اور خود اس میں بیٹھ کر بولا۔ "ہوڑا اسٹیشن۔"

تمام راستے اُس کو اپنے دل پر ایک غیر معلوم وزن کا احساس رہا۔

ہاوڑا برج پر پہنچ کر معلوم ہوا کہ پنجاب میل روانہ ہو چکی ہے۔ ساجے نے ہگلی کی لہروں کی طرف دیکھا۔ ہگلی ساجے کی زندگی کے گھنے جنگل میں سے خاموشی کے ساتھ بہی جا رہی تھی۔

اُس نے رکشا والے کو کہا۔ "مجھے یہیں اتار دے۔"

رکشا والے نے ٹرنک پُل کے ایک کنارے رکھتے ہوئے پوچھا۔ "رات کو کدھر سونے کا 'دادا؟" ساجے نے اُس کی بات کا کچھ جواب نہ دیا۔ رکشا والے نے رکشا کا کرایہ لیتے ہوئے رازدارانہ انداز میں پھر کہا۔ "ہم بتائیں گا؟"

ساجے نے انڈمان میں کلکتے کے رکشا والوں کی بابت بہت کچھ سنا ہوا تھا۔ اُس نے ایک دفعہ حقارت سے رکشا والے کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ٹرنک پر جا کر بیٹھ گیا۔ رکشا والا چلا گیا۔

سامنے ہگلی پر نیا پُل بن رہا تھا۔ کتنا مشکل کام ہے پُل بنانا۔ خصوصاً جب دریا کا طاس بہت چوڑا ہو۔ اُس پانی میں ستونوں کی بنیادیں کھوکھلی کرتا رہے گا۔ پُل پرانے ہو جایا کرینگے۔ اُن کی جگہ نئے پل بنا کرینگے۔ وہ سامنے ہگلی پر نیا پُل بھی پرانا ہو جائیگا ____

پھر اس کی جگہ ایک اور نیا پل بنانا پڑے گا۔ کیا اس نئے پل پر بھی ساجا بیٹھے گا؟ لیکن ساجا اپنے لئے خود ایک نیا پل کیوں نہیں بناتا۔ اُس کی زندگی کی بنجر زمین میں سے بھی تو ہگلی گذرتی ہے۔ اس ہگلی نے اس کی زندگی کی بنجر زمین کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے ان دور افتادہ حصوں کو ملانے کے لئے ایک نئے پُل کی ضرورت ہے اور ساجا ہگلی پر بننے والے نئے پل کی طرف دیکھتا رہا۔

آسمان پر شام کی شفق چھا گئی۔ بادلوں کی سُرخی نے ہگلی کے پانی پر سُرخی چھڑک دی۔ ساجے نے دیکھا کہ ہگلی میں خون بہا جا رہا ہے خالص انسانی خون۔ وہی خون جس نے آج سے پندرہ سال پہلے اس کے کنوئیں کی منڈیر کو رنگ دیا تھا اور جس نے کنوئیں کی منڈیر سے بہہ کر کھیتوں کی طرف جانے والے پانی کو ہگلی کے پانی کی طرح سُرخ کر دیا تھا۔ گودو کا خون اور گودو کے باپ کا خون گودو جو کلکتہ سے کبھی کبھی گاؤں میں آ کر سُوٹ بوٹ پہن کر لوگوں کو کہا کرتا تھا کہ وہ اس کو گودو کی بجائے گوبند رام ورما کہا کریں۔ گودو جو گاؤں کی بھولی بھالی معصوم لڑکیوں کو کلکتہ کے خواب دکھا کر ان کو اکثر اپنے ساتھ بھگا لے جاتا تھا جو ساجے کے کنوئیں پر ہر روز اُس وقت نہانے کے لئے آیا کرتا تھا۔ جب ساجے کی نوجوان خوبصورت بیوی 'دارو' ساجے کے لئے کھانا لے کر آتی تھی۔ ساجا اُس کی حرکت کو خوب سمجھتا تھا۔ لیکن گاؤں میں کوئی کسی کو اپنے کنوئیں پر نہانے سے منع نہیں کر سکتا۔ پھر جب ایک دن دارو کپاس کے کھیت کے پاس سے گھبراہٹ سے ہانپتی ہوئی دوڑی دوڑی آئی اور ساجے کو کہنے لگی۔ "گودو مجھے کہتا ہے میرے ساتھ کلکتہ چلو۔" تو ساجے کے آتش فشاں پہاڑ کی دبی ہوئی آگ بھڑک اُٹھی۔ وہ اس وقت ایک کلہاڑی سے اپنے کھیت کی باڑ کے چھدرے حصوں میں کیکر کی جھینکیں اگا رہا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح کنوئیں کی طرف بھاگا۔ پہلا وار گودو کے سر کے پاس سے ہو کر اُس کے کندھے میں اُتر گیا۔ دوسرے وار کے وقت گودو لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گر رہا تھا۔ اس لئے کلہاڑی اُس کے کولھے میں گڑ گئی۔ تیسرے وار کے وقت گودو کا باپ درمیان آ گیا۔ پہلی ضرب اس پر اتنی کاری پڑی کہ اس کی گردن ایک طرف کو لٹک گئی اور وہ سیدھے گرتے ہوئے گودو پر اوندھا گر پڑا۔ اس لئے بعد کی دو ضربیں بھی گودو کے بجائے گودو کے باپ پر ہی پڑیں۔ اس کے بعد گاؤں کے لوگ 'وہ زہریلی ہنسی والا تھانیدار' مقدمہ اور پھر چودہ سال کی قید۔ کالے پانی کو جاتے وقت جب اس نے اپنے ماں باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تو اُس نے کہا۔ "مجھے آپ لوگوں کے آنسوؤں کا افسوس نہیں۔ اس بات کا افسوس ہے کہ جس کو میں مارنا چاہتا تھا۔ وہ بچ گیا اور اور جس کو میں مارنا نہیں چاہتا تھا وہ مر گیا۔ گودو بچ گیا۔ گودو کا باپ مر گیا۔" جب اُس نے دارو کی سسکیاں سنیں تو اُس نے کہا:۔

"دارو! چودہ سال کوئی بڑی بات نہیں۔ میرا انتظار کرنا؟" اور پھر جب اپنی دو تین سال کی بہن نوری کی طرف دیکھا جو سب کو روتا

دیکھو کانگی مار مار کر رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی "میں بھی ساتھ جاؤں گی۔ میں بھی ساتھ جاؤں گی۔" تو اس کے دل کے کسی کونے میں پہلی دفعہ یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید اُس نے غلطی کی ہے۔ اُس نے نوری کو اٹھا کر گلے سے لگا لیا اور کہا "نوری ______ نوری" اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بجلی کی لہریں شاید اُن آنسوؤں کو مذ کیہ گئی ہوں۔ کیونکہ شفق کی سرخی سلیٹی ہو کر سیاہی مائل ہو گئی گودو اور گودو کے باپ کا خون بھی دیر تک کنوئیں کی منڈیر پر جمع رہنے کی وجہ سے شام کے وقت سلیٹی ہو کر سیاہی مائل ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنی پگڑی کے شملے سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور جب اس نے شملے کے اُس حصہ کو دیکھا' جہاں اُس نے آنسو پونچھے تھے تو اس نے دیکھا کہ اُس کا دل سلیٹی ہو کر سیاہی مائل ہو گیا ہے اور یہ سیاہی شام کی سیاہی کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ وہ ڈر گیا کہ کہیں رات نہ آ جائے۔ اُس نے اپنی طرف بڑھتے ہوئے سایوں کو اپنی پوری قوت سے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی اور ایک دفعہ تو وہ ان بڑھتی ہوئی بھیانک تاریکیوں کو چیر کر اپنے گاؤں میں پہنچ گیا جہاں اُس نے اپنے گھر کی دہلیز پر دادو کو اپنی چودہ سال کے انتظار سے پتھرائی ہوئی آنکھوں کے ساتھ بیٹھے دیکھا۔ وہ پاگلوں کی طرح اُس کو چومنے کے لئے بڑھا لیکن یک بیک ٹیل پر بجلی کے قمقموں کی قطار روشن ہو گئی۔ اُس نے ایک ہارے ہوئے سپاہی کی دلدوز مایوسی کے ساتھ اوپر کو دیکھا اور اُس کو یقین ہو گیا کہ رات آ گئی۔

رکشا والے نے اُسی راز دارانہ لہجے میں کہیں سے آ کر کہا۔ "دادا۔"

ساجا چونک گیا اور اس سے پہلے اُس کا دماغ اُس کے معاملے میں دخل دے سکتا اُٹھ کے کھڑا ہو گیا۔ "کہاں لے جاؤ گے ؟"

"فس کلاس پنجابن ہے ______ مس نیلم ______ کیسا پیارا نام ہے ______"

کرائے کی کچھ باتیں ہوئیں اور رکشا چل پڑی۔

ہریسن روڈ

گرے سٹریٹ

سوناگچی

تھوڑی دیر کے بعد رکشا والے نے آ کر کہا۔ "ہم تمہارے کو کیا بولینگے دادا' تم بڑا لکی ہے' وہ سالہ سنیما جانے کو دیکھتا تھا۔ آؤ ______ آؤ ______" اور ٹرنک اٹھا کر آگے آگے چل پڑا۔

چودہ سال کے بعد ساجا پہلی دفعہ ایک ایسی رات کے دروازے پر آیا جس کے قفل کی چابیاں اُس کے ہاتھ میں تھیں۔ وہ رات اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ اُس کے پیروں پر پڑی تھی۔ وہ اس کو ٹھکرا سکتا تھا۔ اچھال سکتا تھا۔ جھنجوڑ سکتا تھا۔ چاہتا تو قمقموں کی زرد روشنی میں رنگ دیتا۔ چاہتا تو اُس کو اندھیرے کے اتھاہ غار میں دھکیل دیتا۔ اختیار کے اس احساس نے اُس کے جذبات میں آگ لگا دی۔

گندمی رنگ کی ایک پنجابی عورت جس کا سب سے بڑا حسن اُس کی گدرائی ہوئی جوانی تھا۔ اپنے ہوش رُبا سینہ کے ساتھ' اپنی بڑی بڑی معصوم آنکھوں کے ساتھ گہرے سبز دوپٹے میں آسمانی رنگ کی ریشمی قمیض میں اور ساٹن کی سفید شلوار میں اُس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔

"اندر آ جاؤ ______ کیا سوچتے ہو؟ ______ اداس ہو؟" ______

"نہیں تو۔"

وہ اُس کو بازو سے پکڑ کر اندر لے گئی۔ ایک کرسی پر بٹھا دیا ______ کرسی کے بازو پر بیٹھ کر اُس کی پگڑی کے شملے سے کھیلنے لگی اور پھر

پھنس کر اس کی رانوں پر بیٹھ گئی۔ ساجے میں اختیار کا احساس جاگ اُٹھا۔ اختیار کے اس احساس نے اُس کے جذبات میں آگ لگا دی اور جذبات کی اس آگ نے اس کو بے اختیار کر دیا۔ اُس نے نیلم کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور اپنے ہونٹوں کے انگاروں کو اُس کے گالوں پر رکھ دیا۔ ایک منٹ۔ دو منٹ۔ تین منٹ۔ وہ گھبرا گئی۔ اُس نے ایک دو دفعہ سی سی کی اور پھر یکا یک اُوئی اوئی کر کے اُس کے بازوؤں میں سے نکل گئی۔ وہ اُٹھ کر اُس کے پیچھے بھاگا۔ ایک ہاتھ نیلم کی کمر میں چلا گیا' دوسرے ہاتھ نے بجلی کا قمقمہ بجھا دیا۔

کپڑوں کی سرسراہٹ ــــ اور ــــ اور

پھر روشنی ہو گئی۔ ساجا اپنی گیبرون کی قمیض کے بٹن لگا رہا تھا۔ نیلم آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی اور پریشان بالوں میں کنگھی کرنے لگی۔ دوبارہ میک اپ کرتے ہوئے اُس نے کہا:

"سنو ــــ ہم سینما جا رہے ہیں ــــ سیکنڈ شو۔"

"نہیں' نیلم' میں تمہیں نہیں جانے دوں گا۔"

"میری سہیلی آیا ہی چاہتی ہے۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔"

وہ اُس کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا اور اُس کی بنگالی فیشن میں گندھی ہوئی دو چوٹیوں کے ساتھ کھیلتا رہا۔ کچھ عرصے آئینے کے سامنے وہ اُس کے جسم کے مختلف حصوں کو سہلاتا رہا' پھر وہ دونوں بستر پر لیٹ گئے اور امریکہ کے ایک رسالہ میں سے ننگی تصویریں دیکھنے لگے۔ ساجے نے انگڑائی لے کر کروٹ بدلی۔ اُس کا بازو بے خودی میں نیم عریاں سینہ پر چلا گیا۔ رسالہ پلنگ سے نیچے گر پڑا' بجلی کا قمقمہ بجھ گیا اور پھر ــــ

ایک عرصہ تک پُراسرار خاموشی کے بعد دونوں بستر پر لیٹے لیٹے باتیں کرنے لگے۔

"مجھے اپنا نام بتا دو۔"

"نام پوچھ کر کیا لو گی کل شام کو جا رہا ہوں۔"

"کلکتہ میں کیا کرتے ہو؟"

"یہاں تو میں آج ہی آیا ہوں۔"

"کہاں سے؟"

"کالے پانی سے۔"

"تم کالے پانی سے آئے ہو"؟

"ہاں"

"پھر تو تم ساجے کو جانتے ہو گے۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ سوال ساجے کے دماغ پر پتھر کی طرح گرا' وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنے ارادے پر زور دے کر اپنی حیرت کو تجسس میں تبدیل کر لیا اور کمرے کا بلب روشن کرتے ہوئے کہنے لگا۔

"ہاں میں ساجے کو جانتا ہوں۔ وہ میرا دوست ہے۔"

روشنی میں بھی وہ بالوں اور کپڑوں کی پریشان حالت میں اُسی طرح بے حجابانہ بستر پر لیٹی رہی۔ اُس نے اپنے جسم کے اُن حصوں کو

بھی جنھیں آدمیوں سے چھپایا جاتا ہے چھپانے کی پروا نہیں کی اور کروٹ لے کر اپنی ہتھیلی میں اپنا سر رکھے ہوئے بے پروائی سے باتیں کرتی رہی۔

"پچھلے سال میں اپنے گاؤں میں گئی تھی۔ ساجے کی بہن نزدیک کے گاؤں سے میرے پاس آئی اور مجھے کہنے لگی۔ تم کلکتہ میں رہتی ہو۔ کلکتہ کالے پانی کے پاس ہے۔ کالے پانی میں میرا بھائی رہتا ہے۔ اس نے پچھلے پانچ سال سے ہمیں کوئی خط نہیں لکھا۔ اگر تم کو وہ کہیں ملے تو اُس کو میرا پیغام دے دینا۔

ساجا بے چینی کے ساتھ ادھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

"ہاں میں جانتا ہوں وہ بڑا لا پروا ہے۔ اُس نے ضرور ایسا کیا ہوگا۔ اُس نے ضرور کوئی خط نہیں لکھا ہوگا۔"

"اُس نے مجھے کہا کہ اگر تم کو ساجا ملے تو اُس کو بتانا کہ ہمارے ماں باپ غم سے نڈھال ہو کر مر گئے ہیں۔ ہماری ساری زمین بک گئی ہے اُس کی بیوی دارو اُسی گودو کے ساتھ جس کو ساجے نے قتل کرنے کی کوشش کی تھی بھاگ گئی ہے___ گودو کی بابت معلوم ہوا کہ وہ کلکتہ میں کوئی اچھا کاروبار نہیں کرتا۔ وہ وہاں رکشا چلاتا ہے اور بازاری عورتوں کا دھندا کرتا ہے۔ اُس نے دارو کو بھی بازار میں بٹھا دیا ہے___"

ساجے پر غشی کی سی حالت طاری ہو گئی لیکن زہر کے ان گھونٹوں کو جو ساجے نے پیئے تھے اُس کے چہرے پر ظاہر نہیں ہونا چاہئے اس بازاری عورت کے سامنے اس کو یہ راز فاش نہیں کر دینا چاہئے کہ وہ بدکار عورت اُسی کی بیوی ہے۔ وہ دیوار پر ایک تصویر کو دیکھنے لگا۔ لیکن اس کو اُس میں اصلی نقوش کی بجائے ریڈ روڈ کی طرف مڑنے والی رکشا دکھائی دی اور ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اس کے کانوں میں کہہ رہا ہو "ہاں۔ہاں___"

نیلم کی آواز مدھم ہو گئی۔ اُس کے الفاظ بھیگ گئے۔

"___اُس نے کہا ساجے کو بتانا۔ اب میرا دنیا میں کوئی نہیں۔ نمبردار کے بچے کھلاتی ہوں۔ گوبر کوڑا اٹھاتی ہوں۔ گالیاں سہتی ہوں مار کھاتی ہوں___"

ساجا بڑبڑا اٹھا۔

"نیلم میں جاتا ہوں۔"

"کہاں؟"

"میں ابھی ساجے کو یہ سب باتیں بتا دوں گا۔ میں اُس کو مجبور کر دوں گا کہ وہ ابھی اپنے گاؤں کو چلا جائے۔ اسے رات ہونے سے پہلے چلا جانا چاہئے تھا وہ موڑ کھے ہے۔ وہ نہیں جائے گا۔ وہ نہیں جائے گا۔"

نیلم حیران ہو کر بیٹھ گئی اور اپنے کپڑے سنبھالتے ہوئے بولی:

"تو کیا ساجا کلکتہ میں ہے؟"

"ہاں۔"

"تو اُس کو فوراً جا کر کہہ دو کہ وہ اپنے گاؤں کو نہ جائے۔"

ساجے نے ایک لمحہ خاموش حیرت سے نیلم کی طرف دیکھا اور پھر اُسی تیقّن کے انداز میں کہا۔

ساجا ضرور اپنے گاؤں کو جائے گا۔ کیا وہ اپنی بہن کی یہ حالت___"

"بلکہ اس کو اِن باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی نہ بتانا اور اُس کو گاؤں تو ہرگز نہ جانے دینا۔"

"کیوں نہ جانے دوں آخر؟"

"اُس کا گاؤں کو جانا بے سود ہوگا۔ اُس کی بہن اُس کو وہاں نہیں ملے گی۔"

"کیوں نہیں ملے گی؟"

"میں اس کی بہن ہوں۔"

ساجے کی کنپٹیاں پھٹنے لگیں۔ اُس کا دماغ دُھواں بن کر کمرے میں پھیلنا شروع ہو گیا۔ بجلی کی روشنی چھوٹے چھوٹے دھبے بن کر اُڑنے لگی۔ اس رنگ برنگ دُھندلکے میں اس کو اپنے کالے ٹرنک کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ وہ کالے ٹرنک پر اپنے ہاتھوں میں اپنی کنپٹیاں لے کر بیٹھ گیا۔

نیلم پلنگ کے پاس کھڑی ساجے کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

سیڑھیوں میں سے پیروں کی آہٹ نے ساجے کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ جذبات کے غاروں میں سے نکلنے کی کوشش میں اس کو کچھ راحت محسوس ہوئی۔

"نیلم ___ جلدی ___ جلدی ___ نی ___ لم"

اور دوسرے لمحے نیلم کی سہیلی دروازے پر آگئی۔ ساجے کے زخمی دماغ نے ایک اور تازہ زخم کھایا۔ درد کے رَتے ہوئے سیلاب میں بھیگی ہوئی آواز پھڑ پھڑائی۔

"وارو ___"

اور وارو نے دروازے کی چوکھٹ کو مضبوطی سے پکڑ کر گرنے سے بچتے ہوئے حیرت آمیز مردہ لہجے میں کہا۔

"ساجا!"

نیلم نوری بن کر تھرا گئی۔ اُس کے رونگٹے اُس کے جسم پر دوڑنے لگے۔ اُس کے جسم سے تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گہرائیوں کی طرف بھاگنے لگے اور جب نوری کو یقین ہو گیا کہ وہ عنقریب کسی بھیانک چٹان سے ٹکرا کر فنا ہو جائے گی تو اس کے خشک گلے اور خشک ہونٹوں سے ایک دل ہلا دینے والی چیخ نکلی اور پلنگ کے بیک سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑی۔

"بھیا ___ بھیا ___ یہ کیا ___ میرے اللہ ___ میرے اللہ"

ساجا کالے ٹرنک پر پتھر بن گیا۔ اُس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں کے سامنے انڈمان کے قیدی انسانی دماغوں کے پتھروں کو ہتھوڑوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے تھے۔ رنگ برنگ دُھندلکوں اور روشنی کے چھوٹے دھبوں کے درمیان ہگلی بہہ رہی تھی۔ ہگلی کی طوفانی لہروں پر ایک رکشا والا اپنی رکشا دوڑائے جا رہا تھا۔ نئے ہاوڑا برج کے پاس ایک سمندری جہاز اُس رکشا سے ٹکرا کر ڈوب گیا۔ خزاں دیدہ جنگل کے تمام پتے جھڑ کر ہگلی میں بہہ گئے۔

جلاوطن

قرۃ العین حیدر

نندر لالہ۔ بے ذلالہ۔ ناچے سری ہری کیرتن میں۔

ناچے سری ہری کیرتن میں

ناچے

چوکھٹ پر اکڑوں بیٹھی رام رکھی نہایت انہماک سے چاول صاف کر رہی تھی۔ اس کے گانے کی آواز دیر تک نیچے کو والی سنسان گلی میں گونجا کی۔ پھر ڈاکٹر آفتاب رائے صدر اعلیٰ کے چبوترے کی اور سے بڑے پھاٹک کی سمت آتے دکھلائی پڑے۔

"بندگی بھتین صاحب ——" رام رکھی نے گھونگھٹ اور زیادہ طویل کر کے آواز لگائی۔

"بندگی —— بندگی ——" ڈاکٹر آفتاب رائے نے زینے پر پہنچتے ہوئے بے خیالی سے جواب دیا۔

"راجی کھسی ہو بھتین صاحب ——" رام رکھی نے اخلاقاً دریافت کیا۔

"اور کیا —— مجھے کیا ہوا ہے جو راضی خوشی نہ ہونگا۔ یہ سُوپ ہٹا بیچ میں سے" انھوں نے جھنجھلا کر کہا۔

"بھتین صاحب ناج پھٹک رہی تھی۔"

"تو ناج پھٹکنے کے لئے تجھے گاڑی بھر راستہ چاہئے۔ چل ہٹا سب چیز ——"

ڈاکٹر آفتاب رائے نے دنیا بھر کی ڈگریاں تو لے ڈالی تھیں۔ لیکن حالت یہ تھی کہ ذری ذری سی بات پر بچوں کی طرح خفا ہو جایا کرتے تھے۔ رام رکھی پر برستے ہوئے وہ اُوپر آئے اور مونڈھے پر پیر ٹکا کر انھوں نے اپنی بہن کو آواز دی —— جیجی —— جی ای ای —— جی ای ی ی —— (چھورا ہے اب تلک مورا بھتین —— ہیم کرن پیار سے کہا کرتیں) دالان کے آگے کھلی چھت پر نیم کی ڈالیاں منڈیر پر جھکی پچھوا ہوا میں سرسرا رہی تھیں۔ شام کی گہری کیفیت موسم کی اُداسی کے ساتھ ساتھ سارے میں بکھری تھی۔ دن بھر نیچے مہوا کے باغ میں شہد کی مکھیاں بھنبھنایا کرتیں اور ہر چیز پر غنودگی ایسی چھائی رہتی آم اب پیلے ہو چلے تھے۔ "ٹھکرائن کی بگیا" میں صبح سے لے رات گئے تک رُوں رُوں کرتا رہٹ چلا کرتا۔

"آوت ہیں بھتین صاحب ——" ہیم کرن نے دالان کا پیتل کے نقش و نگار والا کواڑ کھولتے ہوئے غلے کے گودام میں سے باہر آکر جواب دیا اور کنجیوں کا گچھا ساری کے پلو میں باندھ کر چھن سے پشت پر پھینکتی ہوئی صحنچی میں آگئیں۔

"جے رام جی کی بھتین صاحب___" رسوئی سے نرچوکے کے پیچھے سے آواز لگائی___ "کٹھل کی ترکاری کھاؤ بھتین صاحب"___

"ہاں۔ہاں۔ ضرور کھیا بھائی___" ڈاکٹر آفتاب رائے مونڈھے پر سے ہٹ کر ٹہلتے ہوئے تلسی کے چبوترے کے پاس آگئے۔ بیچ میں رنگ برنگی مورتیاں الگ رام سے لے کر بجرنگ بلی مہراج تک سیندور سے لپی پتی اور گنگا جل سے نہائی دھوئی قرینے سے سجی تھیں۔ ہیم کرن تھیں تو بڑی سخت رام بھگت لیکن باقی کے سبھی دیوی دیوتاؤں سے سمجھوتہ رکھتی تھیں کہ نہ جانے کون کس سمے آڑے آجائے۔ سب سے بنائے رکھنی چاہئے ابھی سرین رماکانت کھیل کے میدان سے لوٹیں گے۔ آٹھ بجے کھیا کتھک کے توڑے سیکھ کر جمنا مہراج کے ہاں سے واپس آئے گی۔ پھر چوکے میں کھانا پروسا جائے گا (پیتل کے برتن ٹھنڈی چاندنی میں جھلملائیں گے۔ نیچے آنگن میں رام رکھی کوئی کجری شروع کردے گی) یہاں پر بلا کا امن تھا اور سکون۔

اب کھیم نیچے پکے گلیارے میں سے چلتی ہوئی اوپر آرہی تھی۔ (ٹھکرائن کی بگیا میں سے ابھی اس نے کروندے اور کمرکھیں اور مکوہ توڑ کر جلدی جلدی منہ میں ٹھونسے تھے۔ دھاکر دادھمی تاکت تا___ دھاکر دا___ ارے باپ رے۔ اس نے منڈیر پر سے اوپر جھانک کر دمینتی سے کہا___ ماما آئے ہیں۔ بھاگ جاورنہ ماما مجھے ماریں گے کہ ہر سمے کھیلتی ہے___ دمینتی بھاگ گئی)

کھیم چھت پر آئی۔ لمبے سے ڈھیلے ڈھالے فراک میں ملبوس' جس پر موتیوں سے خوب تتلیاں اور پھول پتے بنے تھے' خوب کھینچ کر بالوں کی مینڈھیاں گوندھے' ہاتھوں میں چھنا چھن چوڑیاں بجاتی کھیم دتی رائے زادہ اپنے اتنے پیارے اور اتنے سندر ماما کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئی۔

"نمستے ماما___ ابھی کتاب لاتی ہوں بس ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں___"

"چل چڑیل___ بہانے باز___ سبق سنا پہلے___ ڈاکٹر آفتاب رائے نے پیار سے کہا (لیکن یہ کچھ تجربہ انھیں تھا کہ اپنے سے کم عمر لوگوں سے اور کنبے برادری والوں سے یہ گھر گرہستی اور لاڈ پیار کے مکالمے وہ زیادہ کامیابی سے ادا نہ کر پاتے تھے)

"تجھے تو میں انٹرمیڈیٹ میں بھی حساب دلاؤں گا۔ دیکھتی جا___" (انھوں نے پھر ماما بننے کی سعی کی)

"ارے باپ رے___!!" کھیم نے مصنوعی خوف کا اظہار کیا۔

"اور تو نے چوڑیاں تو بڑی خوبصورت خریدی ہیں ری___"

"ہی ہی ہی___ ماما___" کھیم نے دلی مسرت سے اپنی چوڑیوں کو دیکھا۔

"اور تو ساری بھی تو پہنا کر' کہ فراک ہی پہنے پھرے گی___ باؤلی سی___" (انھوں نے اپنی بزرگی کا احساس خود اپنے اوپر طاری کرنا چاہا)۔

جی ماما___ کھیم کے ذہن میں وہ ساریاں جھما جھم کرتی کوند گئیں۔ جو ماں کے صندوقوں میں ٹھنسی تھیں۔ وہ تو خدا سے چاہتی تھی کہ کل کی پہنتی آج ہی وہ ساریاں پہن ڈالے مگر' ہیم کرن ہی پر انگریزیت سوار تھی۔ ایک تو وہ یہ نہیں بھولی تھیں کہ تھیں تو وہ جونپور کے اس ٹھیٹھ' دقیانوسی سریواستوا گھرانے کی بٹیا___ پر ان کا بیاہ ہوا تھا۔ الہ آباد کے اتنے فیشن ایبل کنبے میں جس کے سارے افراد سول لائنز میں رہتے تھے اور جوتے پہنے پہنے کھانا کھاتے تھے اور مسلمانوں کے ساتھ بیٹھ کر چاء پانی پیتے تھے اور گود دھوا ہوئے ان کو اب سات برس ہونے آئے تھے اور تب سے وہ میکے ہی میں رہتی تھیں۔ لیکن محلے پر اُن کا رعب تھا۔ کیونکہ وہ الہ آباد کے رائے زادوں کی بہو تھیں___ دوسرے یہ کہ یہ فراک کا فیشن ڈاکٹر سین گپتا کے ہاں سے چلا تھا۔ ڈاکٹر سین گپتا ضلع کے سول ہسپتال کے اسسٹنٹ

سرجن تھے اور ہسپتال سے ملحق ان کے پیلے رنگ کے احاطے سے مکان کے سامنے ان کی پانچوں بیٹیاں رنگ برنگے فراک پہنے دن بھر ادھم مچایا کرتیں۔ شام ہوتی تو آگے آگے ڈاکٹر سین گپتا دھوتی کا پلا نہایت نفاست سے ایک انگلی میں سنبھالے' ذرا پیچھے ان کی بیوی سرخ کنارے والی سفید ساری پہنے' پھر پانچوں کی پانچوں لڑکیاں سیدھے سیدھے بال کندھوں پر بکھرائے چلی جا رہی ہیں۔ ہوا خوری کرنے۔ اللہ کیا افسانہ تھا بھلا۔ بس ہر بنگالی گھرانے میں یہ لڑکیوں کی فوج دیکھ لو۔ تیم کرن کو ڈاکٹر سین گپتا سے بڑی ہمدردی تھی۔ تسنیم کی ان سب سے بہت گھٹتی تھی۔ خصوصاً موندیا سے اور اسکول کے ڈرامے کے دنوں میں تو بس تسنیم اور موندیا ہی سب پر چھائی رہتیں۔ کیا کیا ڈرامے مہادیوی کنیا پاٹھ شالہ نے نہ کر ڈالے ____ "نل دمینتی" ____ "اور شکنتلا ہریش چندر" اور "راج رانی میرا ____ "اور اوپر سے ڈانس الگ ____ گربا بھی ہو رہا ہے کہ آ تیرے گنگا پار تیرے جمنا بیچ میں ٹھاڑے ہیں نند لال ____ اور آپ کا خدا بھلا کرے رادھا کرشنا ڈانس بھی لیجئے کہ میں تو گردھر آگے ناچوں گی ____ جی ہاں اور وہ گگری والا ناچ بھی موجود ہے کہ چلو چلو سکھی سکھیاری ری چلو پنگھٹ بھر دلیاں ____ اور ساتھ ساتھ موندیرا سین گپتا بے کہ فرنے سے بلد مونیم بجا رہی ہے۔

ایسے ہونے کو تو مسلمانوں کا بھی ایک اسکول تھا۔ انجمن اسلامیہ گرلز اسکول ____ وہاں یہ سب ٹھاٹھ کہاں۔ بس بارہ وفات کی بارہ وفات میلاد شریف ہو جایا کرتا اور اس میں کھڑے ہو کر لڑکیاں نے خاصی بے سری آوازوں میں پڑھ دیا۔

تم ہی فخر انبیا ہو۔ یا نبی سلام علیکا ____ چلئے قصہ ختم۔ ایک مرتبہ ایک سرپھری ہیڈ مسٹریس نے جو نئی نئی لکھنؤ سے آئی تھی ____ "روپ متی باز بہادر" خواتین کے سالانہ جلسے میں اسٹیج کروا دیا تو جناب عالی لوگوں نے اسکول کے پھاٹک پر پکٹنگ کر ڈالی ____ اور روزنامہ صدائے حق نے پہلے صفحے پر جلی حروف میں شائع کیا:۔

ملتِ اسلامیہ کی غیرت کا جنازہ ____

گرلز اسکول کے اسٹیج پر نکل گیا۔

مسلمانو! تم کو خدا کے آگے بھی جواب دینا ہو گا ____ بنات الاسلام کو رقص و سرود کی تعلیم ____ اسکول کو بند کرو ____

(یہ سب قصے تسنیم کی مسلمان سہیلی کشوری اسے سنایا کرتی تھی جو پڑوس میں رہتی تھی۔ صدرِ اعلیٰ کے چبوترے کے آگے والے مکان میں۔ وہ اسلامیہ گرلز اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس کا بڑا بھائی اصغر عباس' سرین اور رماکانت کے ساتھ ہاکی کھیلنے آیا کرتا تھا۔ ویسے پڑھتے وہ لوگ بھی الگ الگ تھے۔ سرین اور رماکانت ڈی اے وی کالج میں تھے۔ اصغر عباس قیس اسلام کنگ جارج انٹر کالج میں۔

"تسنیم بی بی ____ ایف اے کرنے کہاں جائے گی۔ جولائی آ رہی ہے۔ بنارس جائے گی یا لکھنؤ ____؟" ڈاکٹر آفتاب رائے نے چوکے میں بیٹھتے ہوئے سوال کیا۔

اب یہ ایک ٹیڑھا اور اچانک سوال تھا۔ جس کا جواب دینے کے لئے تسنیم دتی ہرگز تیار نہ تھی۔ دونوں جگہوں سے متعلق اسے کافی انفرمیشن حاصل تھی۔ لیکن دو ٹوک فیصلہ وہ فی الحال کسی ایک کے حق میں نہ کر سکتی تھی۔ بنارس میں ایک تو یہ کہ چوڑیاں بہت عمدہ ملتی تھیں۔ لیکن لکھنؤ کو بھی بہت سی باتوں میں فوقیت حاصل تھی۔ مثلاً سینما تھے اور دس سینماؤں کا ایک سینما تو خود مہیلا ودیالہ تھا۔ جہاں اُسے بھیجنے کا تذکرہ ماما نے کیا تھا۔ پردہ غالباً اسے بہرصورت ہر جگہ کرنا تھا۔ تانگے پر پردہ یہاں بھی تیم کرن اپنے اور اس کے لئے بندھواتی تھیں اور ماما جو اتنا بڑا ڈنڈا لئے سر پر موجود تھے۔

یہ ماما اس کے آج تک پلے نہ پڑے۔ ولایت سے ان گنت ڈگریاں لے آئے تھے۔ یونیورسٹی میں پروفیسری کرتے تھے۔ تاریخ پر کتابیں لکھتے تھے۔ فارسی میں شعر کہتے تھے۔ چوں چوں کا مربہ تھے کلیم کے ماما۔

رہے رما کانت اور سرین۔ تو رما کانت تو شاعر آدمی تھے۔ سارے مقامی شاعروں میں جا کر دو غزلے سہ غزلے پڑھ ڈالتا اور حضرت ناشاد جونپوری کے نام نامی سے یاد کیا جاتا۔ سرین اس کے برعکس بالکل انجینئر تھا اس سال وہ بھی انٹر کر کے بنارس انجینئرنگ کالج چلا جائے گا۔ باقی سے سارے کنبے برادری کے بہن بھائی یونہی بکواس تھے۔ اس سلسلے میں اس کی گویاں کشوری یعنی کشور آرا بیگم کے بڑے ٹھاٹھ تھے۔ اس کے بیشمار رشتے کے بھائی تھے اور سب ایک سے ایک سورما۔ یہاں کسی کے سورما پنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ کسی نے آج تک اس سے یہ نہ کہا کہ چل کلیم تجھے سرکس یا نوٹنکی ہی دکھلا لاویں——(نوٹنکی کے دنوں میں رسو یا تک لہک لہک کر گاتا——اب بھی ہے میں نے ٹھانی——لاؤں گا نوٹن کی رانی——) کہاں کشوری کے ماجد بھائی ہیں تو اس کے لئے لکھنو سے چوڑیاں لئے چلے آتے ہیں۔ اکرام بھائی ہیں تو کشوری ان کے لئے جھپا جھپ نیل اوڑھنی رہی ہے۔ اشفاق بھائی ہیں تو کشوری کو بیٹھے انگریزی شاعری پڑھا رہے ہیں۔ ان بھائیوں اور کلیم کے بھائیوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کہاں کی چوڑیاں اور نیل اوڑھنی۔ یہاں تو جوتیوں میں دال بٹتی تھی۔

ہیم کرن کو گھر کا کام دھندوں ہی سے فرصت نہ ملتی۔ آفتاب رائے ان کے لئے بڑا سہارا تھے۔ وہ ہر تیسرے چوتھے مہینے لکھنو سے آکر مل جاتے۔ رہنے والے ان کے بھتیجے صاحب جونپور ہی کے تھے۔ پر یہاں اُن کی کسی سے ملاقات نہ تھی۔ "ضلع کے روساء اور مقامی نمائندین شہر" میں ان کا شمار تھا۔ پر آپ کا خیال اگر یہ ہے کہ ڈاکٹر آفتاب رائے جون پور کے اُن معززین کے ساتھ اپنا وقت خراب کریں گے تو آپ غلطی پر ہیں حکام سے اُن کی کبھی نہ بنی۔ انٹلیکچوئیل آدمی تھے۔ ان سول سروس اور پولیس والوں سے کیا دماغ سوزی کرتے۔ جگن ناتھ جین آئی سی ایس جب نیا نیا حاکم ضلع ہو کر آیا تو اُس نے کئی بار ان کو کلب میں بلا بھیجا۔ پر یہ ہرگز نہ گئے۔ رئیس الدین کاظمی ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج نے دعوت کی۔ اس میں بھی نہ پہنچے اور تو اور ولایت واپس جاتے وقت مسٹر چارلس مارٹن نے کوئین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کی پرنسپل شپ پیش کی۔ لیکن کلیم کے ماما نے اُسے بھی رد کر دیا۔ یوں تو خیر کانگریسی وانگریسی ہونا کوئی خاص بات نہیں۔ شہر اور قصبہ جات کا ہر ہندو جو سرکاری ملازم نہ تھا۔ گھر پر ترنگا لگاتا تھا اور ہر مسلمان کے اپنے وسیوں مشغلے تھے۔ احرار پارٹی تھی۔ شیعہ کانفرنس تھی۔ ڈسٹرکٹ کانگریس کمیٹی میں مسلمان بھرے ہوئے تھے۔ مسلم لیگ کا تو خیر اس وقت کسی نے نام بھی نہ سنا تھا۔ پر بہت سے مسلمان اگر انصاف کی پوچھئے تو کچھ بھی نہ تھے یا تو شاعری کرتے تھے یا مجلسیں پڑھتے تھے۔

تو کہنے کا مطلب یہ کہ کوئی ایسی تشویشناک بات نہ تھی۔ پر ڈاکٹر آفتاب رائے کی زیادہ تر لوگوں سے کبھی نہ پٹی۔ ارے صاحب یہاں تک سنا گیا ہے کہ تری پورہ کانگریس کے موقع پر انھوں نے سب کو کھری کھری سنا دیں۔ گو یہ راوی کو یاد نہیں کہ انھوں نے کیا کہا تھا۔

ضلع کی سوسائٹی جن عناصر پر مشتمل تھی۔ انھیں سے ڈاکٹر آفتاب رائے کوسوں دور بھاگتے تھے۔ وسط شہر میں مہاجنوں' ساہوکاروں اور زمینداروں کی اونچی حویلیاں تھیں۔ یہ لوگ سرکاری فنڈوں میں ہزاروں روپیہ چندہ دیتے۔ اسکول کھلواتے' مجرے اور مشاعرے اور دنگل کرواتے۔ جلسے جلوس اور سرپھٹول بھی ان ہی کی زیرِ سرپرستی منعقد ہوتے۔ ہندو مسلمانوں کا معاشرہ بالکل ایک تھا۔ وہی تیج تہوار۔ میلے ٹھیلے۔ محرم بالے میاں کی برات۔ پھر اُس سے اونچی سطح پر وہی مقدمے بازیاں۔ موکل۔ گواہ۔ پیشکار۔ سمن۔ عدالتیں۔ صاحب لوگوں کے لئے ڈالیاں۔

شہر کے باہر ضلع کا ہسپتال تھا۔ لق ودق ہری گھاس کے میدانوں میں بکھری ہوئی اُداس پیلے رنگ کی عمارتیں۔ کچے احاطے۔ نیم کے درختوں کی چھاؤں میں 'آؤٹ ڈور' مریضوں کے ہجوم۔ گرد آلود یکوں کے اڈے۔ سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے دودو آنے میں خط

قلم کر دینے والے بہت بوڑھے اور شکستہ حال منشی جو دھاگوں والی عینکیں لگائے دھندلی آنکھوں سے راہگیروں کو دیکھتے۔ پھر گلیاں تھیں جن کے گھروں کے فرش پر پانی بہتا تھا۔ سیاہی مائل دیواروں پر کوئلے سے اشتہار لکھے تھے ____ حکیم مارکہ دھاگہ خریدیے۔ پرتی براعظ بیڑی پیجیے۔ ایک پیسہ بابو سے لو ____ چار جا کر ماں کو دو ____ آگیا۔ آگیا۔ آگیا ____ سال رواں کا سنسنی خیز فلم "لہری راجہ" آگیا جس میں مس مادھوری کام کرتی ہے ____

پھر سایہ دار سڑکوں کے پرے آم اور مولسری میں چھپی ہوئی حکام ضلع کی بڑی بڑی کوٹھیاں تھیں۔ انگریزی کلب تھا۔ جس میں بے اندازہ خنکی ہوتی۔ چپ چاپ اور سائے کی طرح چلتے ہوئے مودب اور شائستہ "بیرے" انگریز اور کالے صاحب لوگوں کے لئے ٹھنڈے پانی کی بوتلیں اور برف کی بالٹیاں لا کر گھاس پر رکھتے۔ پیلے پردوں کی قناتوں کے پیچھے ٹینس کی گیندیں سبزے پر لڑھکتی رہتیں۔

(۲)

اور سول لائنز کی اس دُنیا میں اُوپر سے آئی کنول کماری جین جگن ناتھ جین آئی سی ایس کی بالوں کٹی بیوی جس نے لکھنو کے مشہور انگریزی کالج ازابلا تھوبرن میں پڑھا تھا اور جو گیند بلا کھیلتی تھی۔ کلب میں بڑی چہل پہل ہو گئی ____ گنتی کی کل تین تو میمیں ہی تھیں کلب میں۔ کوئین وکٹوریہ گورنمنٹ انٹر کالج کے انگریز پرنسپل کی میم ایک۔ زنانہ ہسپتال کی بڑی ڈاکٹرنی میم مس مک کنزی دو۔ اور اے پی مشن گرلز ہائی اسکول کی بڑی استانی مس سالفرڈ جو چڑچڑیا میم کہلاتی تھی کہ نوکروں پر چلاتی بہت تھی۔ ان تین کے علاوہ ڈاکٹرنی میم کی چھوٹی بہن مس اولیو مک کنزی تھی۔ جو اپنی بہن سے ملنے نینی تال سے آئی ہوئی تھی اور ضلع کے غیر شادی شدہ حکام کے ساتھ ٹینس کھیلنا اُس کا خاص مشغلہ تھا اور اس میں ایسا کچھ اس کا جی لگا تھا کہ اب واپس جانے کا نام نہ لیتی تھی۔ شام ہوتے ہی وہ کلب میں آن موجود ہوتی اور دے مسٹر سکسینہ اور دے مسٹر فرحت علی اور دے مسٹر پانڈے۔ کبھی تو اس کے چاروں طرف کھڑے دانت نکوسے ہنس رہے ہیں۔ اس ایک سیانے بھائی لوگوں کو تگنی کا ناچ نچا رکھا تھا۔ باقیماندہ حضرات بھی کہتے تھے کہ میاں کیا مضائقہ ہے۔ جونپور ایسی ذل جگہ پر مس مک کنزی کا دم وہی غنیمت جانو۔ اب غور کرنے کا مقام ہے کہ مس شبیر حمایت علی جو دوسری لیڈی ڈاکٹر تھیں۔ ان کا تو نام سن کر ہی جی بیٹھ جاتا تھا۔ مگر وہ خود بچاری بڑی اسپورٹنگ آدمی تھیں۔ برابر جی داری سے ٹینس کھیلنے آیا کرتیں۔ لکھنو کے کننگ جارجز کی پڑھی ہوئی تھیں۔ لندن جا کر ایک ڈپلوما بھی مار لائی تھیں لیکن کیا مجال جو کبھی بد دماغی دکھا جاویں۔ لوگ کہتے تھے۔ صاحب بڑی شریف ڈاکٹرنی ہے۔ بالکل گائے سمجھئے۔ گائے۔ جی ہاں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ آپ یہ توقع کریں کہ ہر لیڈی ڈاکٹر افسانوں اور ناولوں کی روایت کے مطابق بالکل حور شمائل، مہ وش، پری پیکر ہو۔ اچھی آدمی کا بچہ تھیں۔ بلکہ ایک مرتبہ تو ڈسٹرکٹ جج مسٹر کاظمی کی بیگم صاحب نے مسٹر فرحت علی سے تجویز بھی کی تھی کہ بھیا آزادی کا زمانہ ہے مس شبیرہ ہی سے بیاہ کر لو۔ یہ جو سال کے سال چھٹیوں میں تمہاری اماں تمہیں لڑکیاں دیکھنے کے لئے نینی تال، مسوری بھیجا کرتی ہیں۔ اس دردِ سر سے بھی نجات ملے گی اور کیا۔

راوی کہتا ہے کہ فرحت علی نے جو ان دنوں بڑے معرکے کا سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ بیگم کاظمی کے سامنے کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کی تھی اور تھر تھر کانپا تھا اور دست بستہ یوں گویا ہوا تھا کہ آئندہ وہ مس شبیرہ حمایت سے جو گفتگو کرے گا۔ وہ صرف چار جملوں پر مشتمل ہو گی ____ آداب عرض۔ آپ اچھی طرح سے ہیں؟ جی ہاں میں بالکل اچھی طرح ہوں۔ شکریہ۔ آداب عرض۔

مصیبت یہ تھی کہ جہاں کسی شامت کے مارے نے کسی "غیر منسلک" خاتون محترم سے سوشل گفتگو کے دوران میں ان چار جملوں سے تجاوز کیا تو بس سمجھ لیجیے ایکوٹی ہو گئی۔

تو غرضیکہ راوی دنیا گویوں کو نے میں بند کرتا ہے کہ کنول کماری کے میاں کا تقرر اس جگہ پر ہوا (انگریز حاکموں کی اصطلاح

میں

صوبے کے ضلع "اسٹیشن" کہلاتا تھا)

اور نئے حکام ضلع کے اعزاز میں کنور نرنجن داس رئیس اعظم جونپور نے (کہ یہ سارا کا سارا ایک نام تھا) اپنے باغ میں بڑی دھوم کی دعوت کی۔ چبوترے پر زرتار شامیانہ تانا گیا۔ رات گئے تک جلسہ رہا۔ بیبیوں کے لئے اندر علیحدہ دعوت تھی۔ مصرانیوں نے کیا کیا کھانے نہ بنائے۔ مسلمان مہمانوں کے لئے باؤلے ڈپٹیوں کے وہاں سے باورچی بلوائے گئے تھے (باؤلے ڈپٹیوں کا ایک خاندان تھا۔ جس میں عرصہ ہوا ایک ڈپٹی صاحب کا دماغ چل گیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ پورا خاندان باؤلے ڈپٹیوں کا گھرانہ کہلاتا تھا۔ کہار آواز لگاتے۔ اجی باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں سے سواریاں آئی ہیں اتروالو مہریوں سے کہا جاتا ارے باؤلے ڈپٹیوں کے ہاں نیوتہ دینے آنا ری رام رکھی جھاڑو پٹی)

بیگم کرن ایسے تو کہیں آتی جاتی نہ تھیں۔ پر رانی نرنجن داس کی زبردستی پردہ بھی دعوت میں آئی تھی۔ کلکٹر کی بیوی' سے ملنے کیلئے' عمائدین شہر کی بیویوں نے کیا جوڑے نہ پہنے تھے۔ لیکن جب خود کنول کماری کو دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تو پوری میم ہے۔ غضب خدا کا ہاتھوں میں چوڑیاں تک نہ تھیں۔ ناک کی کیل تو گئی چولھے بھاڑ میں ہلکے نیلے رنگ کی ساری سی پہنے گاؤ تکیے سے ذرا ہٹ کر بیٹھی وہ سب سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتی رہی۔

"اے لو بیٹا تم نے تو سہاگ کی نشانی ہی کو جھاڑ پیٹے فیشن کی بھینٹ کر دیا۔" صدر اعلیٰ کی بیگم نے ناک پہ انگلی رکھ کر اس سے کہا۔

"اے ہاں سچ تو ہے۔ کیا ڈنڈا ایسے ہاتھ لئے بیٹھی ہو۔ دور پار چھائیں پھوئیں دیکھے ہی سے ہول آتا ہے!" بیگم کاظمی نے بھی صاد کیا۔

کھیم کی تو بہر حال' آج عید تھی۔ اس نے تیز جامنی رنگ کی بنارسی ساری باندھی تھی۔ پاؤں میں رام جھول پہنے تھے۔ سونے کی کردھنی اور دوسرے سارے گہنے پاتے علیحدہ کندن کا چھپکا' اور نمر کشوری بھی پہن آئی تھی۔ لیکن کشوری کی اماں (جو محلے میں بڑی بھاوج کے نام سے یاد کی جاتی تھیں) بن بیاہی لڑکیوں کے زیادہ سنگار پٹار کی قطعی قائل نہ تھیں۔ ان کے یہاں تو لڑکیاں بالیاں مانگ تک باؤں میں نہ کاڑھ سکتی تھیں۔ پر اب زمانے کی ہوا کے زیر اثر نئی پود کی لڑکیوں نے سیدھی اور آڑی مانگیں کاڑھنی شروع کر دی تھیں۔ کھیم دور سے بیٹھی کنول کماری کو دیکھتی رہی۔ کتنی سندر ہے اور پھر ایم' اے پاس۔ ایم۔ اے پاس لڑکی کھیم اور کشوری کی نظروں میں بالکل دیوی دیوتا کا درجہ رکھتی تھی۔

کنول کماری چین ساری مہمان بیبیوں سے ہنس ہنس کر سخت خوش اخلاقی سے گفتگو کرنے میں مصروف تھی (اور ساری حاضرات محفل نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ یہ لڑکی سابق کلکٹر کی بیوی اس چڑیل مسز بھار گوا سے کہیں زیادہ اچھی اور ملنسار ہے۔ رانی بٹیا ہے بالکل)

دالان کے گملوں کی اوٹ میں کھیم اور کشوری بیٹھی تھیں اور منٹ منٹ پر ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہوئی جاتی تھیں۔ اب ایک بات ہو تو بتلائی جائے۔ دسیوں تھیں۔ مثلاً موٹی مصرانی کی چال ہی دیکھ لو اور اوپر سے کنور نرنجن داس صاحب خانہ کی اسٹیٹ کے منیجر صاحب لالہ گنیش مہاشے بار بار ڈیوڑھی میں آن کر للکارتے ___ "اجی پردہ کر لو کہار اندر آ رہے ہیں۔" تو ان کے حلق میں ایسی آواز نکلتی جیسے ہارمونیم کے پردوں کو برساتی ہوا مار گئی ہو۔

اب کے سے جب ماما لکھنو سے گھر آئے تو کھیم نے دعوت کی ساری داستان ان کے گوش گزار کر دی کنول کماری ایسی اور کنول کماری ویسی ماما چپکے بیٹھے سنتے رہے۔

(۳)

کمیم جب رات کا کھانا کھا کر سونے چلی گئی اور سارے گھر میں خاموشی چھا گئی تو ڈاکٹر آفتاب رائے چھت کی منڈیر پر آ کر کھڑے ہو گئے۔ باغ اب سنسان پڑے تھے۔ گرمیوں کا موسم نکلتا جا رہا تھا اور گلابی جاڑے شروع ہو گئے تھے۔ پروائی ہوا آہستہ آہستہ بہہ رہی تھی۔ نیچے ٹھکرائن کی بگیا والی گلی کے برابر سے مسلمانوں کا محلہ شروع ہوتا تھا۔ اس کے بعد بازار تھا۔ جس میں مدھم گیس اور لالٹین کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پھر پولیس لائنز کے میدان تھے۔ اس کے بعد کچہری اور سول لائنز۔

سول لائنز میں حاکم ضلع کی بڑی کوٹھی تھی۔ جس پر یونین جیک جھٹ پٹے کی نیم تاریکی میں بڑے سکون سے لہرا رہا تھا۔ سارے ماحول میں یہ تھکی ہوئی خاموشی چھائی تھی۔ سامنے سلطان حسین شرقی کے زمانے کے اونچے پھاٹک اور مسجدوں کے بلند مینار رات کے آسمان کے نیچے سات سو سال سے اسی طرح ساکت اور صامت کھڑے تھے۔ زندگی میں بے کیفی تھی اور اداسی اور ذلت تھی اور شدید غلامی کا احساس تھا۔

عمر بھر آفتاب رائے نے یونہی سوچا تھا کہ اب وہ اور کچھ نہ کریں گے۔ لیکن دنیا موجود تھی۔ وہ کام بھی کرتے۔ کھانا بھی کھاتے۔ سال میں چار دفعہ جون پور آ کر جی جی سے دماغ سوزی بھی کرتے۔ زندگی کے بھاری پن کے باوجود گاڑی تھی کہ چلے جا رہی تھی۔

کنول کماری اس منظر کے پرے، مولسری کے جھنڈ کے دوسری طرف یونین جیک کے سائے میں براجتی تھی۔ بہت سے لوگ ہیں کہ جو راستہ سوچا اختیار کر لیا۔ آرام سے اس پر چلتے چلے گئے۔ یہاں کسی راستے کا تعین ہی نہ ہو پاتا تھا۔ ایک کے بعد ایک سب ادھر اُدھر نکل گئے تھے۔ آفتاب رائے وہیں کے وہیں تھے۔

کنول کماری___؟ لاحول ولا قوۃ۔

جب وہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کے لئے ولایت جا رہے تھے تو کنول نے اُن سے کہا تھا۔ "آفتاب بہادر تم کو اپنے اوپر بڑا مان ہے۔ پر وہ مان ایک روز ٹوٹ جائے گا۔ جب میں بھی کہیں چلی جاؤں گی۔'

"تم کہاں چلی جاؤ گی۔؟"

"فوہ___ لڑکیاں کہاں چلی جاتی ہیں___؟!"

"گویا تمہارا مطلب ہے کہ تم بیاہ کر لو گی۔؟'

"میں خود تھوڑا ہی بیاہ کرتی پھروں گی۔ ارے عقلمند داس۔ میرا بیاہ کر دیا جائے گا۔" اس نے جھنجھلا کر جواب دیا تھا۔

"ارے جاؤ___" آفتاب رائے خوب ہنسے تھے___ "میں اس جھانسے میں آنے والا نہیں ہوں۔ تم لڑکیوں کی پسند بھی کیا شے ہے۔ تم جیسی موڈرن لڑکیاں آخر میں پسند اسی کو کرتی ہیں جو ان کے سماجی اور معاشی معیار پر پورا اترتا ہے باقی سب بکواس ہے۔ پسند اضافی چیز ہے تمہارے لئے___"

"ہاں___ بالکل اضافی چیز ہے۔ آفتاب بہادر۔___" وہ غصے کے مارے بالکل خاموش ہو گئی تھی۔

وہ چاند باغ میں تھی۔ آپ بادشاہ باغ میں بڑی دھوم دھام سے براجتے تھے یونین کی پریذیڈنٹی کرتے تھے۔ تقریریں بگھارتے

تھے۔ ایک منٹ نچلے نہ بیٹھتے تھے۔ تاکہ کنول نوٹس نہ بھی لیتی ہو تو لے۔ وہ اے پی سین روڈ پر رہتی تھی اور سائیکل پر روز چاند باغ آیا کرتی تھی۔ لکھنو کی بڑی نمائش ہوئی تو وہ بھی اپنے کنبے کے ساتھ میوزک کانفرس میں گئی۔ وہاں یونیورسٹی والوں نے سہگل کو اپنے محاصرے میں لے رکھا تھا۔ جس گانے کی یونیورسٹی اور چاند باغ کا مجمع فرمائش کرتا۔ وہی سہگل کو بار بار گانا پڑتا۔ بھائی آفتاب بھی شور مچانے میں پیش پیش۔ لیکن اگلی صف میں کنول کو بیٹھا دیکھ کر فوراً سٹ پٹا کر چپ ہو گئے اور سنجیدگی سے دوستوں سے بولے کہ یار چھوڑو کیا ہلڑ مچا رکھا ہے۔ اس پر عزت نے عکسری بلگرامی سے کہا (آج ان دونوں پیارے دوستوں کو مرے بھی اتنا عرصہ ہو گیا تھا' منڈیر پر کھڑے ہوئے آفتاب رائے کو خیال آیا) عزت نے عسکری سے کہا۔ استاد یہ اپنا آفتاب جو ہے یہ اس لونڈیا پر اچھا امپریشن ڈالنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے۔ اب خداوند تعالیٰ ہی اس پر رحم کرے ___

"بی۔ اے کے بعد تم کیا کرو گی ___؟" ایک روز آفتاب رائے نے کنول سے سوال کیا۔

"مجھے کچھ پتہ نہیں ___" کنول نے کہا تھا۔ اس میں گویا یہ اشارہ تھا کہ مجھے تو کچھ پتہ نہیں تم ہی کوئی پروگرام بتاؤ۔

لیکن کچھ عرصے بعد وہ سیدھے سیدھے ولایت نکل لئے۔ کیونکہ غالباً اُن کی زندگی ان کے لئے۔ ان کے گھر والوں کے لئے کنول کے وجود سے کہیں زیادہ اہم تھی' پھر اُن کی آئیڈیالوجی تھی۔ (یار کیا بکواس اکار کی ہے۔ عزت نے ڈپٹ کر کہا تھا)

پر ایک روز' لندن میں' جب وہ سینٹ ہاؤس کی لائبریری سے گھر کی اور جا رہے تھے تو راہ میں انھیں مہیلِ نظر آیا۔ جس نے دور سے آواز لگائی ___ "چاء پینے چلو تو ایک واقعہ فاجعہ گوش گزار کروں۔ کنول کماری کا جگن ناتھ جین سے بیاہ ہو گیا۔ وہی جو سن پچیس کے بیچ کا ہے ___"۔

لڑکیوں کی عجب بے ہودہ قوم ہے۔ اس روز آفتاب رائے اس نتیجے پر پہنچے "ان کو سمجھنا ہمارے تمھارے بس کا روگ نہیں۔ میاں وہ جو بڑی انٹلکچوئیل بنی ساس بنی پھرتی تھی۔ ہو گئی ہو گی۔ اب کلیڈ ___ جگن ناتھ جین مائی فٹ ___ کون تھا یہ الو ___ میں نے کبھی دیکھا ہے اسے۔؟" مہیلِ کے کمرے میں پہنچ کر آتشدان سلگاتے ہوئے انھوں نے سوال کیا۔

مہیلِ رائے زادہ کھڑکی میں جھکا باہر سڑک کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں ٹھیلے والے کوئی دن بھر گلا پھاڑ کر چلاتے رہنے کے بعد اب اپنے اپنے ترکاریوں کے ٹھیلے گھسیٹتے ہوئے سر جھکائے آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ شام کا دھندلکا سارے میں بکھر گیا تھا۔ زندگی بڑی اداس ہے۔ اس نے خیال کیا تھا۔ ہاں۔ اس نے آفتاب رائے سے کہا تھا میں نے اسے پٹنے میں دیکھا تھا۔ کالا سا آدمی ہے۔ عینک لگاتا ہے۔ کچھ کچھ لومڑی سے ملتی جلتی اس کی شکل ہے۔

"بیوقوف بھی ہے ___؟" آفتاب رائے نے پوچھا تھا۔

"خاصا بیوقوف ہے ___ مہیلِ رائے زادہ نے جواب دیا تھا۔

"___ پھر کنول اس کے ساتھ خوش کیسے رہ سکے گی؟" آفتاب رائے نے مہیلِ سے مطالبہ کیا۔

"میاں آفتاب بہادر ___" مہیلِ نے مڑ کر ان کو مخاطب کیا ___ "یہ جتنی لڑکیاں ہیں نا ___ جو افلاطونِ زماں بنی پھرتی ہیں۔ یہ بیوقوفوں کے ساتھ ہی خوش رہتی ہیں آیا عقل میں تمھاری ___؟"

"کیا بکواس ہے ___" آفتاب رائے نے بڑی آزردگی سے کہا۔

اب مہیلِ رائے زادہ کو صریحاً غصہ آگیا۔ اس نے جھنجھلا کر کہا تھا ___ "تو میاں تم کو روکا کس نے تھا۔ اس سے بیاہ کرنے کو۔

جواب مجھے بور کر رہے ہو۔ کیا وہ تم سے خود آ کر کہتی کہ میاں آفتاب بہادر میں تم سے بیاہ کرنا چاہتی ہوں۔ ایں ____؟ اور فرض کرو اگر وہ خود سے ہی انکار کر دیتی تو کیا قیامت آ جاتی۔ یہاں لڑکی تھی یا ہوّا۔ کیا مارتی وہ تم کو جھاڑو لے کر ____ کیا کرتی ____؟ تم نے لکھن کہہ کے ہی نہیں دیکھا۔ خیر چلو ____ خیریت گذر گئی۔ اچھا ہی ہوا۔ کہاں کا جھگڑا مول لیتے بیکار میں۔ کیونکہ میرا معقولہ ہے (اس نے انگلی اُٹھا کر عالمانہ انداز میں کہا) کہ شادی کے چار سال بعد سب شادیاں ایک سی ہو جاتی ہیں ____ تم کو تو جگن ناتھ جین کا شکر گذار ہونا چاہئے کہ اس نے تم کو ایک بارِ عظیم سے سبکدوش کیا۔ بلکہ وہ تمہارے حق میں بالکل دافع بلّیات ثابت ہوا ____"

"بیہودہ ہیں آپ انتہا سے زیادہ ____" آفتاب رائے نے جھنجھلا کر کہا تھا۔

لکھنؤ لوٹ کر ایک روز آفتاب رائے اتفاقاً اے پی سین روڈ پر سے گزرے۔ سامنے کنول کے باپ کی سُرخ رنگ کی بڑی سی کوٹھی تھی۔ جس کی برساتی پر کاسنی پھولوں کی بیل پھیلی تھی۔ یہاں ایک زمانے میں کتنا اودھم مچتا۔ کنول کے سارے بہن بھائیوں نے مل کر اپنا آرکیسٹرا بنا رکھا تھا۔ کوئی بانسری بجاتا۔ کوئی جل ترنگ۔ کنول طبلہ بجاتی۔ ایک بھائی وائلن کا استاد تھا۔ سب مل کر جے جے ونتی شروع کر دیتے۔ مورے مندرا اب لوں نہیں آئے ____ کیسی چوک بھئی مو سے آلی ____ پھر ارچنا بینرجی آ جاتی اور کومل ایسی آواز میں گاتی ____ آئی پو ہوڑی جھور ناگر ملکر بو جوئے ____ بو جوئے ہو ____ اتوار کو دن بھر بیڈمنٹن ہوتا۔ ہر سے تو آفتاب رائے ان لوگوں کے یہاں موجود رہتے تھے اور جب ایک روز خود ہی چپکے سے ولایت کھسک لئے تو ان لوگوں کا کیا قصور۔ وہ لڑکی کو بنک کے سیف ڈیپازٹ میں تو ان کے خیال سے رکھنے سے رہے اور جگن ناتھ جین ایسا رشتہ تو بھائی قسمت والوں ہی کو ملتا ہے۔

پھر ایک روز امین آباد میں انھوں نے کنول کو دیکھا۔ وہ کار سے اُتر رہی اپنی سُسرال والوں کے ساتھ پارک کے مندر کی اور جا رہی تھی اور سُرخ ساری میں ملبوس تھی اور آلتا اس کے پیروں میں تھا (آلی ری سائیں کے مندر دیا بار آؤں۔ کر آؤں سولہ شرنگار ____ وہ گرمیوں کی شام تھی۔ امین آباد جگمگا رہا تھا۔ ہوا میں موتیا اور خس کی مہک تھی اور مندر کا گھنٹہ یکسانیت سے بجے جا رہا تھا)۔

اب آفتاب رائے یونیورسٹی میں تاریخ کی چیئر سنبھالے ہوئے تھے ساتھیوں کی محفل میں خوب اودھم مچاتے۔ ٹینس کھیلتے اور صوفی ازم کی تاریخ پر ایک مقالہ لکھ رہے تھے۔ میں وہ نہیں ہوں۔ جو میں ہوں۔ میں وہ ہوں جو میں نہیں ہوں۔ ہر چیز باقی ساری چیزیں ہیں۔ بھگوان کرشن جب ارجن سے کہتے ہیں ____ او پرنس ارجنا ____" (ارے جا ____" عسکری ڈانٹ بتاتا۔ "اگر تم اس چکر میں ہو کہ تم بھی پروفیسر ڈی پی مکرجی کی طرح مہاگرو بن کے بیٹھ جاؤ گے تو تم غلطی پر ہو۔ ڈاکٹر آفتاب رائے۔ تمھارا تو ہم مارتے مارتے حلیہ ٹھیک کر دیں گے ____" مہیپل اضافہ کرتا۔)

جونپور آ کر وہ کھیم کو دیکھتے کہ تندہی سے کچالو کھا رہی ہے۔ کتھک سیکھ رہی ہے۔ جل بھرنے چلی رے گوئیاں آس آس گاتی پھر رہی ہے۔ یہ بھی کنول کماری کی قوم سے ہے۔

"اری او باؤلی ____ بتا تو کیا کرنے والی ہے ____" وہ سوال کرتے۔

"پتہ نہیں ماما ____" وہ معصومیت سے جواب دیتی۔

"پتہ نہیں کی بچی" ____ وہ دل میں کہتے۔

چھت کی منڈیر پر ٹہلتے ٹہلتے آفتاب رائے نیم کی ڈالیوں کے نیچے آ گئے۔ سامنے بہت دُور سول لائنز کے درختوں میں چھپی ہوئی حاکم ضلع کی کوٹھی میں گیس کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پروائی ہوا بہے جا رہی تھی۔ یہ چاندرات تھی اور مسلمانوں کے محلوں کی طرف سے محرم کے نقاروں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئی تھیں۔

محرم آگیا ___ آفتاب رائے کو خیال آیا ___ شاید اب کے سے پھر سر پھٹول ہو۔ بہت دنوں سے نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے سوچا۔

ویسے انگریز کی پالیسی یہ تھی کہ جن ضلعوں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ وہاں ہندو افسروں کو تعینات کیا جاتا تھا اور جہاں ہندو زیادہ ہوتے تھے۔ وہاں مسلمان حاکموں کو بھیجا جاتا تھا تاکہ توازن قائم رہے۔ یہ دوسری بات تھی کہ صوبے کی چھ کروڑ آبادی کا صرف ۱۳ فی صدی حصہ مسلمان تھے۔ لیکن اتنی شدید اقلیت ہونے کے باوجود تہذیبی اور سماجی طور پر مسلمان ہی سارے صوبے پر چھائے ہوئے تھے۔ جونپور' لکھنؤ' آگرہ' علی گڑھ' بریلی' مراد آباد' شاہجہان پور' وغیرہ جیسے ضلعوں میں تو مسلمانوں کی دھاک بیٹھی ہی ہوئی تھی۔ لیکن باقی کے سارے خطوں میں بھی ان کا بول بالا تھا۔ 'صوبے کی تہذیب' سے مراد وہ کلچر تھا جس پر مسلمانوں کا رنگ غالب تھا۔ گلی گلی محلے محلے گاؤں گاؤں سینکڑوں ہزاروں مسجدیں اور امام باڑے تھے۔ کتب' مدرسے' درگاہیں' قلعے' حویلیاں۔ چپے چپے سے مسلمانوں کی آٹھ سو سال پرانی روایات وابستہ تھیں اور لطف یہ کہ مسلمان اب تک نہیں مرے تھے۔ بڑے زور شور سے زندہ تھے۔

ہندو مسلمانوں میں سماجی سطح پر کوئی واضح فرق نہ تھا۔ خصوصاً دیہاتوں اور قصبہ جات میں عورتیں زیادہ تر ساریاں اور ڈھیلے پائجامے پہنتیں۔ اودھ کے بہت سے پرانے خاندانوں میں بیگمات اب تک لہنگے بھی پہنتیں۔ بن بیاہی لڑکیاں ہندو اور مسلمان دونوں ساری کے بجائے کھڑے پائچوں کا پائجامہ پہنتیں۔ ہندوؤں کے ہاں اسے "اجار" کہا جاتا۔ مشغلوں کی تقسیم بڑی دلچسپ تھی۔ پولس کا عملہ اسی ۸۰ فی صدی مسلمان تھا محکمہ تعلیم میں ان کی اتنی ہی کمی تھی۔ تجارت تو خیر کبھی مسلمان بھائی نے ڈھنگ سے کر کے نہ دی۔ چند پیشے مگر خاص مسلمانوں کے تھے۔ جن کے دم سے صوبے کی مشہور صنعتیں قائم تھیں۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے کچھ ایسا مضبوط نظام تھا کہ سارا منافع تو بازار تک پہنچاتے پہنچاتے مڈل مین ہی مارے جاتا تھا اور جو بھائی کے پاس بچتا تھا۔ اس میں قرضے چکانے تھے۔ بٹیا کا جہیز بنانا تھا اور ہزاروں قصے تھے آپ جانئے۔

زبان اور محاورے ایک ہی تھے۔ مسلمان بچے برسات کی دعا مانگنے کے لئے منہ نیلا پیلا کئے گلی گلی ٹین بجاتے پھرتے اور چلّاتے ___ برسو رام دھڑاکے سے بڑھیا مر گئی فاقے سے۔ گڑیوں کی بارات نکلتی تو وظیفہ کیا جاتا ___ ہاتھی گھوڑا پالکی ___ جے کنہیا لال کی۔ ذہنی اور نفسیاتی پس منظر چونکہ یکساں تھا۔ لہٰذا غیر شعوری طور پر ___ Imagery بھی ایک ہی تھی۔ جس میں رادھا اور سیتا اور پنگھٹ کی گوپیوں کا عمل دخل تھا۔ مسلمان پردہ دار عورتیں جنھوں نے ساری عمر کسی ہندو سے بات نہ کی تھی۔ رات کو جب ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو لہک لہک کر الاپتیں ___ بھری گگری موری ڈھرکائی شام ___ کرشن کنہیا کے اس تصور سے ان لوگوں کے اسلام پر کوئی حرف نہ آتا تھا۔ یہ سب چیزیں اس تمدن کی مظہر تھیں۔ جنھیں پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کی تہذیبی ہمہ گیری اور وسعتِ نظر اور ایک رچے ہوئے جمالیاتی حس نے جنم دیا تھا۔ یہ گیت اور کجریاں اور خیال' یہ محاورے' یہ زبان' ان سب کی بڑی پیاری اور دلآویز مشترکہ میراث تھی۔ یہ معاشرہ جس کا دائرہ مرزاپور اور جونپور سے لے کر لکھنؤ اور دلّی تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک مکمل اور واضح تصور رہا تھا۔ جس میں آٹھ سو سال کے تہذیبی ارتقاء نے بڑے گمبھیر اور بڑے خوبصورت رنگ بھرے تھے۔

ڈاکٹر آفتاب رائے نے (کہ ان کا نام ہی اس مشترکہ تمدن کی لطافت کا ایک مظہر تھا) ایک بار سوچا تھا کہ وہ کبھی ایک کتاب لکھیں گے کہ کس طرح پندرھویں صدی میں بھگتی تحریک کے ذریعے ایک خوبصورت مستقبل کی بنیاد رکھی جارہی تھی۔ کس طرح نانک کا مذہب ہندوؤں کی فرقہ پرستی کے خلاف ایک پروگریسو ردعمل ثابت ہو سکتا تھا۔ کس طرح انیسویں صدی کی وہابی تحریک کو غیر ملکی راج کے مقابلے میں ایک قومی محاذ بننے کے بجائے اُس کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا گیا تھا۔ آریہ سماجیوں اور فرقہ پرستوں کو کیسے کیسے شہ دی گئی۔ یہ اور اس طرح کی سو باتیں ان کے ذہن میں آتیں۔ لیکن ذہن ہی کو مکمل سکون کہاں میسر تھا پہلے یہ کنول کماری کود پڑی۔ پھر ان کی

معاشی مجبوریاں آڑے آئیں اور ان کو ولایت سے لوٹ کر بنارس میں لیکچرر شپ سنبھالنی پڑی۔ جہاں دن رات ہندی یا تھوا ہندوستانی کے گن گائے جاتے اور مالویہ جی کی تصویر کے آگے آرتی اتاری جاتی ____ یہ میں تم سے کہتا ہوں ____ کہ شدھ ہندی اور گئو رکھشا اور رام راجیہ یہ سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس خطرے سے بچو۔ انھوں نے ایک دفعہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے پنڈال میں چلا کر کہا تھا ____ بھائی اگر یہی بات ہے تو سیدھے سیدھے مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے ____ ان سے کہا گیا ____ ہم تو ہندو پیدا ہوئے اور ہندو ہی مریں گے۔ تمھاری طرح سے تھوڑا ہی ہیں۔ عمل یقین ____

آفتاب رائے کے ساتھی مذاق میں انھیں جونپور کا قاضی کہا کرتے۔ "یہ جو کتاب تم لکھنے والے ہو اس کا نام رکھنا ____ "جونپور کا قاضی" ____ حرف "میں شہر کے اندیشے میں دبلا کیوں ہوا ____؟"

رات کی ہوا میں خنکی بڑھ چکی تھی۔ نیم کے پتے بڑے پر اسرار طریقے سے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ہاں زندگی میں بے پایاں اداسی تھی اور ویرانہ اور تاریکی۔

محلے کے مکانوں میں مدھم روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ پیچھے بڑی بھاوج کے مکان کے بڑے آنگن میں مجلس کے لئے جو گیس کا ہنڈہ نصب کیا گیا تھا۔ اس کی روشنی رات کے اس ویرانے میں بڑی لرزہ خیز معلوم ہوتی تھی۔ جیسے مہوے کے جنگل میں اگیا بیتال اور مسان چپکے چپکے روتے ہوں۔

مجلسوں کے گریہ و بکا کی مدھم آوازیں پروائی کے جھونکوں میں رل مل کر وقفے وقفے کے بعد یک لخت بلند ہو جاتی تھیں۔ نکڑ پر کنور نرنجن داس کے ہاں کی محرم کی سبیل کے پاس رکھی ہوئی نوبت یکسانیت سے بجے جا رہی تھی۔

(۴)

"عاشور کی شب لیلیٰ ارے سرہانے شمع رکھے ____ "بی مدن نے تکیہ پر کرم خوردہ کتاب رکھ کر پڑھنا شروع کیا ____

" ____ اے تکتی رہیں چہرہ علی اکبر کا ____ " بگن نے باریک تیز آواز میں ساتھ دینا شروع کیا۔

"اے لو دونوں کی دونوں سٹھیا گئی ہیں ____ اے بیوی چاند رات کو نویں تاریخ کے مرثیے نکال کر بیٹھ گئیں ____!؟" بڑی بھاوج نے باورچی خانے میں سے پکارا۔

"توبہ۔ توبہ۔ کمبخت ایسی سٹھ سٹی پڑی ہے کہ اب تو کچھ بھی یاد نہیں رہتا ____ اے لو میں تو عینک لانا ہی بھول گئی۔ اب مجھے کچھ سجھائی تھوڑی دے رہا تھا ____ میں نے تو اٹکل سے پڑھنا شروع کر دیا ____ اے بہن ____ اے نیازی بیگم ____ ذرا اپنی عینک تو دینا ____ "بو امدن نے طویل سانس بھر کے کہا۔

نیازی بیگم نے اپنی عینک اُتار کے دی جو بو امدن نے ناک کی پھننگ پر رکھ کر پھر سے بیاض کی ورق گردانی شروع کی۔

"اے بو امدن نجم الملت کی بیاض بھی لائی ہو کہ نہیں ____؟" بڑی بھاوج نے تخت کے پائے کے قریب آکر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"لو کیوں نہیں پوچھئے ____ بڑی بھاوج ____ نجم الملت کے نوحے تو یہی لوگ پڑھتے ہیں ____ " بگن نے جواب دیا۔

"ہاں بٹیا ہم تو پرانے فیشن کے آدمی ہیں۔ اب تو نوحوں میں بھی نئے راگ رنگ نکلے ہیں ____ "بوا مدن نے قدرے بے نیازی

سے اضافہ کیا۔

یہ لڑکیوں پر صفا چوٹ تھی۔ بوا لندن نے لڑکیوں کی نوحہ خوانی کو کبھی بھی بنظر استحسان نہ دیکھا تھا۔

کنبے اور محلے کی ساری لڑکیاں دیوار کے سہارے بڑے اسٹائل سے سیاہ جارجٹ کے دوپٹوں سے سر ڈھانپے خاموش بیٹھی تھیں۔ بوا لندن کے اس طعنے کا انھوں نے ہرگز نوٹس نہیں لیا۔

"ڈولی اترو الو____" باہر سے رام بھروسے کی آواز آئی۔

"پردہ کرلو لوگو____ کہار اندر آتے ہیں____"

فیریبی کی سیٹی دھم سے گھڑونچی پر ٹکا کر مولّو تیز آواز میں چلائی____ چھمّو بیگم آگئیں۔"

چھمّو بیگم ڈولی میں سے اُتریں اور پائنچے سمیٹ کے پانی سے لبریز نالی کو الانگنے کے ارادے سے آگے بڑھیں۔ "اللہ رکھے بڑی بھاوج کے ہاں تو ہر وقت بس بہیا ہی آئی رہتی ہے۔" انھوں نے ذرا بیزاری سے کہا۔

کہیں مولّو نے یہ سُن لیا۔ "اے چھمّو بیگم____ ذری زبان سنبھال کے بات کیا کیجئے بڑی بھاوج کے دشمنوں کے گھر بہیا آوے۔ شیطان کے کان بہرے____ ایسا تو میں نے آنگن کا سارا پانی سونتا ہے۔ اپنے ہاں نہیں دیکھتیں۔ ساری گلی کو لیکے نوبت رائے کا تلاؤ بنا رکھا ہے۔ اتا اِتا پانی آپ کے گھر میں گھڑا رہتا ہے۔ ہاں۔" اس نے منہ در منہ جواب دیا۔

"اے بی مولّو____ ذری آپے میں رہنا____ میں خود سے نہیں آگئی۔ بڑی بھاوج نے سو دفعہ بلایا کہ آکر مجلس پڑھ جاؤ____ مجلس پڑھ جاؤ____ میں اپنے گھر سے فالتو نہیں ہوں کہ ماری ماری پھروں اور ٹکے کی ڈومنیوں کی باتیں سنوں۔ ہاں۔ لو بھائی ڈولی واپس کرو۔ '____" چھمّو بیگم نے بیچ آنگن کے کھڑے ہو کر رجز پڑھا۔

بڑی بھاوج جلدی سے اُٹھ کر باہر آئیں____ "اے ہے____ یہ کیا کوا زوچن مچی ہے____ اماموں پر مصیبت کی گھڑی آن پہنچی اور تم ہو کہ کھڑی جھگڑ رہی ہو____ چل نکل مولّو یہاں سے____ ڈوبی جب دیکھو تب یہی فضیحتا شروع کرتی ہے____ آؤ چھمّو بیگم جم جم آؤ____"

ڈیوڑھی میں کہاروں نے زور سے ڈنڈا بجایا۔ اجی پیسے تو بھجوایئے بیگم صاحب____

(ارے دیارے____ ساری دیہہ دکھن لاگت ہے____ رام بھروسے نے دیوار سے ٹک کر ماتا دین کی بیڑی سلگاتے ہوئے اظہار خیال کیا۔ ویسے محرم کی وجہ سے اب پیسے خوب ملیں گے۔ چہلم تک دس دس پھیرے ایک گلی کے ہوتے تھے اور ہر پھیرا تین پیسے۔ دور کے محلوں تک آنے جانے کے تو دو دو آنے تک ہو جاتے تھے۔ بس چاندی تھی آج کل بھائی رام بھروسے اور ان کی برادری کی اور ریڑوے جو چل رہے تھے وہ الگ۔ ریڑہ ایک طرح کا لکڑی کا کرسی نما ٹھیلہ ہوتا تھا۔ جس میں چاروں طرف پردہ باندھ دیا جاتا تھا۔ اندر دو دو تین تین "سواریاں" گھس پٹ کر بیٹھ جاتی تھیں اور بچوں کی انگریزی پرام کی طرح پیچھے سے دھکیلا جاتا تھا اور چرخ چوں کرتا ریڑہ گلیوں کے پتھریلے فرش پر بڑے ٹھاٹھ سے چلتا۔ پالکی کا کرایہ بہت زیادہ تھا۔ یعنی چھ آنے فی پھیرا۔ پرائیویٹ پالکی چوپہلہ صدر اعلیٰ کے یہاں تھا۔

چھمّو بیگم اس معرکے کے بعد ٹھک ٹھک چلتی آن کر چاندنی پر بیٹھ گئیں اور عینک لگا کر بڑے ٹھسے سے چاروں طرف نظر ڈالی۔ بوا لندن خود بڑی ہائی برو سوز خواں تھیں۔ انھوں نے کبھی چھمّو بیگم کی پروانہ کی۔

سوز ختم ہو چکا تھا۔ گوٹے کے پھنکے لگاتی بوا مدن طمانیت سے جا کر ایک کونے میں بیٹھ گئیں۔ چناپی کی گوٹ کا ڈھیلا پاجامہ اور طوطے کے پروں ایسے ہرے رنگ کا دوپٹہ اوڑھے وہ اس شان سے دیوار سے لگ کر بیٹھتی تھیں کہ دور سے معلوم ہو جاتا تھا کہ ہاں یہ رام پور کی میراثن ہیں۔ مذاق نہیں ہے۔

چھمو بیگم ایک تو یہ کہ سیدانی تھیں۔ دوسرے یہ کہ نگن سلمیٰ کے بیاہ کے سلسلے میں ان سے جنگ ہو چکی تھی۔ لہٰذا وہ بوا مدن کو ہرگز خاطر میں نہ لاتیں۔ بوا مدن کو اگر یہ زعم تھا کہ ماکوس اور سوہنی سہاگ میں وہ سوز ایسے پڑھتی ہیں کہ مجلس میں پٹس پڑ جاتی ہے۔ تو چھمو بیگم کو بھی اپنے اوپر ناز بے جا نہ تھا کہ آٹھویں تاریخ والا میر انیس کا مرثیہ پوری راگ داری کے ساتھ ان جیسا کوئی اور نہ پڑھ سکتا تھا۔

چھمو بیگم نے تہ در تہ ریشمی غلافوں میں سے چاندرات کا بیان نکالا اور مجمع کو نہایت گھور کے دیکھا۔

لڑکیوں کا گروہ اپنی جگہ پر ذرا چوکنا ہو گیا۔ ان لڑکیوں پر فرض تھا کہ جب چھمو بیگم حدیث پڑھیں یا وعظ کریں تو یہ لوگ دوپٹے منہ میں ٹھونس کر کھل کھل کر ہنسیں پر بظاہر یہی معلوم ہو تا کہ زار و قطار رو رہی ہیں اور چھمو بیگم کس قیامت کی حدیث پڑھتی تھیں کہ کہرام بپا ہو جاتا تھا۔

چھمو بیگم کے وعظ بہت موڈرن ہوتے تھے۔ کیا جناب کیفن صاحب بلکہ خود قبلہ جار چوی صاحب ایسے ایسے رموز نکات۔ انگریزی فلسفے کے واقعہ شہادت میں سے نہ نکال سکتے۔ جو چھمو بیگم پل کی پل دریا کو رے میں بند کر کے رکھ دیتی تھیں۔

اے صاحبانِ مجلس ___ جب باری تعالیٰ نے اپنے نور کے دو حصے کئے ___ والی تمہید سے لے کر جب وہ اس کلائمیکس تک پہنچتی تھیں کہ "اے بیبیو ___ جناب عباس نے رو کر کہا بالی سکینہ اُٹھو ___" تو اس وقت مجلس میں نالہ و شیون سے قیامت بپا ہو چکی ہوتی تھی۔ اندر باہر سب کہتے تھے کہ ماشاء اللہ سے چھمو بیگم نے سماں باندھ دیا۔ ان کے زورِ خطابت کا یہ عالم تھا کہ منٹوں میں بات کہیں سے کہیں پہنچتی تھی۔ ابھی حضرت جبرئیل علیہ السلام کا بیان ہو رہا ہے۔ ابھی یزید ملعون کے خاندان کا ذکر آ گیا۔ جنگ جمل کا واقعہ سنا رہی ہیں۔ ساتھ ساتھ اُس کا موازنہ جرمن اور انگریز کی لڑائی سے بھی ہوتا رہتا ہے۔ رسالتمآبؐ کے بیان پر جب آئیں تو کہتیں ___ بیبیو ___ میں کوئی مورخ کوئی تاریخ دان کوئی فلاسفہ نہیں ہوں۔ مگر اتنا جانتی ہوں اور کہے دیتی ہوں کہ ایک طرف عیسائیوں اور رومیوں کی دس لاکھ فوج تھی۔ ایک طرف جناب رسالتمآبؐ کے ساتھ صرف پندرہ آدمی تھے۔ مگر وہ گھمسان کا رن پڑا تھا کہ سارے فرشتے چرخِ اوّل پر اُتر آئے تھے اور نور کی جھاڑو سے رسالتمآبؐ کے لئے راستہ صاف کرتے جاتے تھے۔ خداوند تعالیٰ کے مسئلے پر فرماتیں ___ اے بیبیو ___ جو انگریزی داں دہریے خدا کے منکر ہیں۔ ان کا احوال مجھ سے سنو اور کان کھول کے سنو ___ کہ خداوند کریم ان سب شیطانی وسوسوں اور چالوں سے واقف ہے جو فرنگیوں کے علم کے ذریعے ابلیس ملعون نے تم مسلمانوں کے دلوں میں ڈال دی ہیں۔ بلکہ میں تم کو آج یہ بتانا چاہتی ہوں اے مومنو بیبیو ___ کہ قرآن حکیم کے اندر اللہ تعالیٰ نے خود انگریزی میں اپنی توحید کا ثبوت دیا ہے۔ فرماتا ہے وہ رب ذوالجلال کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۚ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ یُوْلَدْ ۙ وَلَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا اَحَدٌ ۚ ___ یہ وَن کیا ہے ___؟ وَن انگریزی میں ایک کو کہتے ہیں ___ مسئلہ توحید سے سلسلہ کھینچ کر پھر واقعہ کربلا اور شہادتِ علی اکبرؑ سے ملا دیا جاتا۔ یہ چھمو بیگم کے آرٹ کا کمال تھا۔

بڑی بھاوج کیا سارے محلّے کو معلوم تھا کہ چھمو بیگم خاصی فراڈ ہیں۔ لیکن ان کی شمولیت کے بغیر مجلس میں جان ہی نہ پڑ سکتی تھی۔ لہٰذا ان کی بدمزاجی کو بھی برداشت کیا جاتا۔

برسوں سے، جب سے بڑی بھاوج پیدا ہوئیں، بڑی ہوئیں، رخصت ہو کر بارہ بنکی سے جونپور آئیں۔ زندگی کا ایک چلن قائم تھا جس میں شادی بیاہ تیج تہوار، لڑائی جھگڑے، محرم، کونڈے جوگی رمپورے کی سالانہ زیارت، غرضیکہ ہر چیز کی اہمیت اپنی جگہ مسلم تھی۔ ڈپٹی جعفر عباس سے بڑی دھوم دھام سے ان کا بیاہ رچایا گیا تھا۔ جب وہ پندرہ سال کی تھیں۔ کیا زمانے تھے۔ دو میل لمبا تو ماہی مراتب ہی تھا۔ براتیوں کو چاندی کی طشتریوں میں سندیلے کے لڈو بانٹے گئے تھے اور جناتیوں یعنی لڑکی کے گاؤں والوں کے یہاں ہفتوں مہینوں پہلے سے ڈھولک رکھ دی گئی تھی۔ ان کا میکہ، سسرال دونوں طرف سے ماشاءاللہ سے بھرا پرا کنبہ تھا۔ بس ایک چھوٹی اماں ہی سے ان کی نہ بنی۔ دیورانی جٹھانی کا دیوار بیچ گھر تھا۔ لیکن مدتوں کھڑکی میں تالا پڑا رہا۔ مقدمہ کا قصہ دراصل امام باڑے والے آموں کے باغ سے چلا تھا بعد میں رفتہ رفتہ دونوں بھائیوں کے گھرانوں میں بول چال تک بند ہوگئی۔ سچ کہا ہے، زر، زمین، زن، تین چیزیں گھر کا گھر دا کر دیتی ہیں۔ سگے بھائی غیر ہو جاتے ہیں۔ پر جب چھوٹی اماں بیمار پڑیں تو بڑی بھاوج نے وضعداری پر حرف نہ آنے دیا اور مرنے سے پہلے دیورانی نے ساری اگلی پچھلی شکایتوں کو بھول کر کہا سنا معاف کروالیا۔ اس پر بھی کہنے والوں کا منہ کس نے بند کیا ہے محلے میں اڑ گئی کہ یہ چھوٹی اماں اپنی غلے کی کوٹھڑی میں سونے کی مہریں دفن کیے بیٹھی تھیں۔ یہ ان کو حاصل کرنے کی ترکیبیں تھیں۔ پوچھو بڑی بھاوج کے پاس خدا کا دیا خود کیا کچھ نہیں۔ جو وہ ایسے کمینے خیالات دل میں لاتیں اور اصلیت یہ ہے کہ چھوٹی اماں کی وہ سونے کی مہروں والی جھجھری جس پر وہ عمر بھر مایا کا سانپ بنی بیٹھی رہیں۔ اُوت کے مال سے بھی بدتر ثابت ہوئی۔ لڑکوں نے لے کر سارا پیسہ دو سال کے اندر اڑا دیا۔ بلکہ بوا مدسن تو یقین محکم کے ساتھ کہتی تھیں کہ چھوٹی اماں اور بڑی بھاوج کی لڑائی کروانے میں زیادہ ہاتھ چھمّو بیگم کا ہے۔ حرافہ ادھر کی ادھر لگاتی تھی اور پھر سال کے سال منبر پر مولون بن کر چڑھ بیٹھتی ہے۔ چڑیل۔

رونا بہر حال فرض تھا۔ خواہ چھمّو بیگم جیسی کتنی ہی بیان کیوں نہ پڑھے۔ لہذا بوا مدسن دیوار کے سہارے بیٹھی بڑے مشہدی رومال سے منہ ڈھانپے شائستگی سے سسکیاں بھرتی رہیں۔ لڑکیاں دہلیز پر بیٹھی بیٹھی اونگھ رہی تھیں اور منتظر تھیں کہ کب حدیث ختم ہو اور نوحہ خوانی کی باری آئے۔

نوحے پڑھنے میں بڑی بھاوج کی لڑکی کشوری کو ملکہ حاصل تھا۔ ہاتھ آئے تھے کیا کیا گُلِ زہرا کو فدائی ____ نوماؤں نے دیکھی درِ خیمہ سے لڑائی ____ ارے لڑتے ہوئے گرتے ہوئے مرتے ہوئے دیکھا ____ اور جانے کون کون سے سارے جدید نوحے۔ جی ہاں۔ ایسی پاٹ دار آواز میں آخری بند اٹھاتی کہ کھیم کے گھر تک آواز پہنچ جاتی تھی۔

نوحوں کی طرزیں نکالنا لڑکیوں کا خاص مشغلہ تھا۔ جہاں کوئی چلتا چلتا لیکن غمگین سی دھن کا گیت ریکارڈ پر سنا جھٹ ذرا سی تبدیلی کر کے نجم الملت کے کسی نوحے پر اس دھن کو چپکا دیا۔ طلعت آراء اس معاملے میں بڑی رجعت پسند واقع ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ بھئی یہ غلط بات ہے۔ یہ کیا ساتویں کی رات کو معلوم ہو کہ کانن بالا کا ریکارڈ بج رہا ہے۔ توبہ توبہ۔ مگر کشوری کس کی سنتی تھی۔ ویسے بھی وہ بڑی آزاد خیال روشن دماغ انسان تھی۔ ہائی اسکول تو اس نے پاس کر لیا تھا۔ وہ تو لکھنو جا کر لگے ہاتھوں انٹر اور بی۔ اے بھی کر لے۔ لیکن چھوٹی اماں جب مرتے وقت بڑی بھاوج سے صلح صفائی کرنے پر تلیں تو یہاں تک طے کر گئیں کہ ان کے بڑے لڑکے میاں اعزاز سے اس کا بیاہ بھی کر دیا جائے۔

اب یہاں سے مسلم سوشل پکچر بننا شروع ہوئی۔ کشوری کہاں ایک تیز لڑکی۔ سارے نئے فیشن کے نمونے اس کو آویں۔ جہاں پر وہ باغ میں کوئی نیا نمونہ سوئٹر کا کسی کو پہنے دیکھ پاوے گھر آ کر فوراً تیار۔ افسانے پڑھنے کی وہ شوقین۔ فیاض علی کی انور د شمیم سے لے کر کرشن چندر کی "نظارے" اور حجاب امتیاز علی کی "ظالم محبت" تک اُس کی الماری میں موجود۔ سنیما بھی جب موقع ملتا ضرور دیکھ لیتی۔ میاں اعزاز ایک تو یہ کہ خاصے مولوی آدمی تھے۔ پی سی ایس میں آ گئے تھے۔ کیننگ کالج سے ایم۔ اے، ایل۔ ایل۔ بی کر رکھا تھا۔ لیکن اس کے رواداد

نہیں تھے کہ گھر کی لڑکیاں ذرا کی ذرا نمائش ہی میں ہو آئیں۔ خود بڑی ذون کی لیتے تھے کہ مس سکینہ سے یونین میں یوں بحث چلی اور مس صدیقی کے یہاں یوں چاء پر گیا۔ لیکن اپنے کنبے کی لڑکیوں کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ لڑکیاں جہاں گھر سے باہر نکلیں میاں زمانہ خراب ہے۔ کسی کو بدنام ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔

بڑی بھاوج نے لطیفہ یہ تھا کہ کشوری کے لئے بڑی منتیں مرادیں مان رکھی تھیں عاشورہ نے روز جب ذوالجناح اندر لایا جاتا تو جلیبی کھلانے کے بعد اس کے کان سے منہ لگا کر ساری بیبیاں اور ساری لونڈی باندیاں دعا مانگتیں کہ یا مولا کشوری بٹیا کا نصیبہ اب کے سال ہی کھلے ____

اب یہ پوچھو کہ یہ میاں اعزاز کے پلے باندھنا نصیبے کا کھلنا سمجھا جا رہا تھا۔ لیکن کشوری نے بھی طے کر لیا تھا کہ عین بیاہ کے موقع پر وہ انکار کر دے گی۔ برات میں ایک ہڑبونگ مچ جائے گی۔ وہ جیسا کہ سوشل فلموں میں ہوتا ہے کہ عین وقت پر جب پھیرے پڑنے والے ہوں تو اصل ہیرو ہسپتال یا جیل سے چھوٹ کر پہنچ جاتا ہے اور گرج کر کہتا ہے کہ ٹھہر جاؤ یہ شادی نہیں ہو سکتی ____

کشوری کے بابا سید جعفر عباس ڈپٹی کلکٹر تھے۔ لیکن دل کے بڑے پکے قوم پرست مسلمان تھے۔ جب کانگریسی وزارت قائم ہوئی تو آپ نے بھی خوب خوب خوشیاں منائیں۔ حافظ ابراہیم ضلع میں آئے تو آپ مارے محبت کے جا کے ان سے لپٹ گئے۔ جب جنگ چھڑی اور کانگریسی وزارت نے استعفا دیا اور مسلم لیگ نے یوم نجات منایا تو کشوری کے بابا کو بڑا دکھ ہوا۔ اب وہ ریٹائر ہو چکے تھے اور چبوترے پر بیٹھے بیٹھے پیچوان لگائے سوچا کرتے کہ دنیا ہی بدلتی جا رہی ہے۔ لڑکے جن کو نوکری نہ ملتی تھی۔ اب فوج میں چلے جا رہے تھے۔ اپنا اصغر عباس ہی اب لفٹنٹ تھا۔ مہنگائی شدید تھی۔ لیڈر جیل میں تھے۔ لیکن زندگی میں یک بیک ایک نیا رنگ آ گیا تھا۔ حافظ ابراہیم کے موقع پر ضلع کے اُردو اخباروں نے لکھا تھا ____ کہاں گئی موٹر سرکاری بیچا کر سبزی ترکاری' یہ بھی دیکھا' وہ بھی دیکھ ____ کشوری کے بابا کو یہ سب پڑھ اور سنکر صدمہ ہوتا۔ وہ بڑے پکے مسلماں تھے۔ دراصل مسلمانوں کے معاشرے کا استحکام انھیں پرانے مدرسہ فکر کے ڈپٹی کلکٹروں کے دم قدم سے قائم تھا۔ پردے کے بڑے پابند۔ کیا مجال جو لڑکیاں بغیر قناتوں چادروں کے گھر سے قدم نکالیں (صوبے کے مشرقی ضلعوں میں برقعے کا رواج نہ تھا۔ "باعزت متوسط طبقے" کی مسلمان اور ہندو عورتیں چادریں اور دلائیاں اوڑھ کر باہر نکلتی تھیں۔ ہندو عورتیں تو خیر گھونگٹ کاڑھ کر سڑک پر سے گزر جاتی تھیں۔ لیکن مسلمان بیبیوں کا دن دہاڑے باہر نکلنا سخت معیوب خیال کیا جاتا تھا)

اصغر عباس فوج میں رہ کر بالکل انگریز بنتا جا رہا تھا۔ اب کے جب وہ چھٹی پر گھر آیا تو چند شرائط بابا کے سامنے رکھیں:۔

(الف) وہ خود کنبے میں بیاہ نہ کرے گا۔

(ب) کشوری جب اس کے ساتھ رہنے کے لئے جیل پور جائے گی تو پردہ نہ کرے گی۔

(ج) اعزاز میاں سے بیاہ کا پروگرام منسوخ۔

(د) کشوری کو ایف۔ اے کے لئے مسلم گرلز کالج لکھنو بھیجا جائے گا۔

بڑے بحث مباحثے کے بعد بابا اور بڑی بھاوج دونوں نے ان شرائط کے بیشتر نکات منظور کر لئے۔

ہندوستان کے مسلمان متوسط اور اوپری متوسط طبقے کا کوئی ہی خاندان ایسا ہو گا جس کی لڑکیوں نے کبھی نہ کبھی علی گڑھ گرلز کالج یا لکھنو مسلم اسکول میں نہ پڑھا ہو۔ بیشتر لڑکیوں کو اس بات پر فخر ہوتا ہے کہ انھوں نے چاہے چند روز ہی کے لئے کیوں نہیں، لیکن پڑھا مسلم اسکول میں ہے۔

بعینہٖ یہی احوال مہیلا ودیالہ لکھنؤ کا تھا۔ صوبے کے سارے ٹھوس ہندو متوسط طبقے کی سپتریاں اس وش ودیالے کی دیوار تھی رو چکی تھیں۔ سرکاری اور عیسائی اداروں کا ماحول مختلف تھا۔ وہاں انگریز کے اقبال کی وجہ سے شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔

اب کی جولائی میں کیمیم اور کشوری اکٹھی ہی جونپور سے ٹرین میں سوار ہوئیں اور لکھنؤ آن پہنچیں۔ چار باغ پر ماما کیمیم کو اُتروانے کے لئے آگئے تھے اور کشوری کو پہنچانے کے لئے تو ماجد بھائی بچارے مردانہ ڈبے میں موجود ہی تھے۔ اسٹیشن کی برساتی میں پہنچ کر کیمیم اور کشوری نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور روئیں اور کبھی کبھی ملنے کی کوشش کرنے کا وعدہ کیا اور تانگوں میں بیٹھ کر اپنی اپنی راہ چلی گئیں۔

(۶)

"کیمیم دتی رائے زادہ سے میری ملاقات اتنے برسوں بعد منیٹ ہال کی سیڑھیوں پر ہوئی ــــ وہ چودھری سلطان کے لیکچر کے لئے اوپر جا رہی تھی۔ میں احتشام صاحب کی کلاس کے بعد پرشین تھیز سے اُتر رہی تھی ــــ کشوری نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ــــ اور پھر وہ خاموش ہوگئی ــــ اور کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ جہاں برف کے گالے چپکے چپکے نیچے گر رہے تھے ــــ

"کیا تم نے کبھی سوچا ہے۔" اس نے ساتھیوں کو مخاطب کیا ــــ "کہ ہم جو چھ سو سال تک ایک دیوار کے سائے میں رہے' ایک مٹی سے ہماری اور اس کی تخلیق ہوئی تھی اس کے اور ہمارے گھر والوں کو اپنی مشترکہ کلچر پر ناز تھا اور ایک قسم کا احساس برتری ــــ چار سال بعد جب اس وقت کیمیم نے مجھے دیکھا تو ایک لحظے کے لئے ذرا جھجکی پھر "ہلو کشوری" کہتی ہوئی آگے چلی گئی۔

"اور میں نے سوچا ٹھیک ہے۔ میں نے اور اس نے اسی دن کے لئے ساری تیاریاں کی تھیں۔ وہ مہیلا ودیالہ کی لڑکی ہے۔ کانگریس میں یقین رکھتی ہے۔ میرے بابا بڑے نیشنلسٹ بنتے تھے۔ لیکن میں کٹر مسلم لیگی ہوں۔ یوم پاکستان کے جلسے کے موقع پر کیمیم کے ساتھیوں نے ہمارے اُوپر اینٹیں پھینکی تھیں۔ اکھنڈ ہندوستان ویک کے دنوں میں ہمارے رفقاء نے ان کے پنڈال پر پکٹنگ کی تھی۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے یہی ٹھیک ہے اور بھائی زندگی نہ ہوئی شانتارام کا فلم ہو گئی۔ بنو اچھے پڑوسی کرو بھائی چارہ نہیں کرتے بھائی چارہ میاں زبردستی ہے تمہاری۔ یہی ایک مثال میری اور کیمیم کی دیکھ لو۔ جنم جنم کے پڑوسی تھے اور کیا دوستی اور یگانگت کا عالم تھا۔ پر تھے ہم ان کے لئے ملیچھ۔ ان کے چوکے کے قریب نہ پھٹک سکتے تھے اور ہماری اماں کا یہ سلسلہ تھا کہ اگر ہندو کی دُکان سے کوئی چیز آئی تو اسے فوراً حوض میں غوطہ دے کر پاک کیا جاتا تھا۔ ایک قوم اس طرح بنتی ہے؟ تقسیم کا مطالبہ ہند کی ساری تاریخ کا نہایت فطری اور نہایت منطقی نتیجہ ہے ــــ "کشوری چپ ہو گئی۔

آتشدان میں آگ لپک رہی تھی۔ کسی نے آہستہ سے ایک انگارہ الاؤ میں سے نکال کر باہر گرا دیا۔ جہاں وہ چند لمحوں تک سلگتا رہا اور پھر بجھ گیا۔ نیچے سڑک پر کوئی بھکاری اور اکارڈین پر "موجوں کے اُوپر" کا والٹز بجاتا ہوا گذر رہا تھا۔

"آج میں کنول کماری کے ہاں چاء پر گئی تھی۔" ارملا نے کہا۔ "وہاں بہت سے لوگ آئے ہوئے تھے۔ ان سب سے میں نے کہا کہ ہمارے "مجلس میلے" کو کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔"

"کنول کماری" ــــ؟ کشوری نے کچھ یاد کرتے ہوئے سوال کیا۔

"ہاں۔ ہمارے ہاں کے فرسٹ سیکرٹری کی بیوی اور میں نے سوچا کہ قابل عورت ہے اس سے میلے کے موقع پر ہندوستانی آرٹ پر لگے ہاتھوں ایک تقریر بھی کروالیں۔ پام دت وغیرہ سبھی ہوں گے۔ بچاری نے وعدہ کر لیا ــــ"

سو ریہ است ہو گیا___ سو ریہ است ہو گیا___ دوسرے کمرے میں "میلے کے پروگرام کی ریہرسل کرتے ہوئے چند لڑکیوں نے ہریندر ناتھ چٹوپادھیا کا کورس یک لخت زور زور سے الاپنا شروع کر دیا۔

"___ میں نے بہت کوشش کر کے سوچا کہ میں جب یونیورسٹی میں اور لوگوں سے ملتی ہوں___ اٹلی کے لوگ ہیں' برازیل کے' عراق اور مصر کے۔ میں ان سے اس طرح کیوں نہیں باتیں کرنا چاہتی۔ پھر ہمارے پروفیسر ہیں۔ ہمعصر فنون کی انجمن کے اراکین ہیں۔ انھوں نے ہمارے مسائل پر بڑی بڑی کتابیں لکھیں ہیں۔ ہمارا بڑا دقیق مطالعہ کیا ہے۔ اخباروں میں وہ ہمارے متعلق فیچر لکھتے ہیں۔ دارالعوام میں اور ریڈیو پر بحثیں کرتے ہیں___" کشوری نے کہا۔

چاروں اور آگ لگی___ دل میں بھوک پیاس جگی___ پگ پگ ہم گاتے___ ہم گاتے ہم گاتے___ لڑکیاں چلا رہی تھیں۔ "میرا جی چاہتا ہے۔ میں تم سے یہ سب باتیں کہوں۔ تم کو یہ سارا قصہ یہ سارا گورکھ دھندا سمجھاؤں"___ اُس نے ساتھیوں کی اداس آواز میں مخاطب کیا___ تاکہ تم لوگ مجھے بھی ایک مضحکہ خیز کردار نہ سمجھو اور اس سارے پس منظر اس ساری کہانی کو اس فاصلے سے دیکھ کر اپنی نئی راہ کا تعین کرو۔

سڑک پر کیرل گانے والوں کی ٹولیاں گذرنی شروع ہو گئی تھیں۔

"کرسمس کا زمانہ بھی اختتام پر ہے۔" روزماری نے اظہار خیال کیا۔

ہاں' جونپور میں' میرے محلے میں' شاید تین چار بچے کچھے سوگوار جہلم کے تعزیوں کے سائے میں بیٹھے اپنی قسمت کو روتے ہوں گے۔ نہیں شاید محرم کا زمانہ گزر گیا ہوگا۔ پرانے کیلنڈر بیکار ہو چکے ہیں۔ مجھے کچھ پتہ نہیں___ کشوری نے دل میں کہا۔

"برفباری شدید ہو گئی ہے۔ پھر بہار آئے گی۔ کیا سارے زمانے' سارے موسم اتنے بے مصرف ہیں___"؟ روزماری نے اپنے آپ سے بات کی۔

نہیں___ کشوری نے کہا۔

پگ پگ ہم گاتے چلیں___ لڑکیوں کی آواز نے تکرار کی۔

(۷)

چار باغ اسٹیشن پر تقسیم کو آخری بار خدا حافظ کہنے کے بعد اب کشوری کو دم مارنے کی فرصت بھی کہاں تھی۔ پہلے مسلم اسکول۔ پھر چاند باغ پھر کیننگ کالج۔ زمانہ کہاں سے کہاں نکل گیا تھا۔ ہر ہنگامے میں کشوری موجود۔ مباحثے ہو رہے ہیں۔ بیڈ منٹن ٹورنامنٹ ہیں۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی مصروفیات ہیں۔ ادھر ہندو اسٹوڈنٹس فیڈریشن تھا۔ مہا سبھائی طالبات کے جلسے جلوس تھے۔ جن میں کبھی کبھی کھیم رائے زادہ دُور سے نظر آ جاتی۔ طالب علموں کی دُنیا اچھی خاصی سیاسی اکھاڑہ بن گئی تھی۔ گھر پر واپس جاؤ تو وہی سیاست۔ کل کی تشویش' مستقبل کی فکر۔ ملک کی تقسیم ہو گی۔ نہیں ہو گی۔ ہو گی۔ نہیں ہو گی۔

یونیورسٹی میں لیکچرز کے دوران میں پروفیسروں سے جھڑپ ہو جاتی۔ سطحی طور پر ابھی دوستی اور بھائی چارہ قائم تھا۔ لیکن آخری "شوڈاؤن" کے لئے اسٹیج بالکل تیار تھا۔

ڈاکٹر آفتاب رائے ابھی تک ہسٹری ڈپارٹمنٹ میں موجود تھے۔ ایک روز ایک لیکچر کے دَوران میں ان سے بھی کچھ تکرار ہو گئی۔ ایک ہندو طالب علم نے کہا: آزادی کا مطلب ڈاکٹر صاحب مکمل سوراج ہے۔ ہند کی دھرتی کو پھر سے شدھ کرنا ہے۔ ساری ان قوموں

کے اثر سے آزاد ہوتا ہے جنھوں نے باہر سے آکر حملہ کیا۔ یہی تلک جی نے کہا تھا جی ہاں۔

اس پیریڈ میں شیواجی کے اوپر گفتگو ہو رہی تھی۔ لہٰذا خانہ جنگی ناگزیر تھی۔ شام تک ساری یونیورسٹی میں خبر پھیل گئی کہ ڈاکٹر آفتاب رائے کی کلاس میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔

اگلی صبح کشوری پورا جلوس بنا کر ڈاکٹر آفتاب رائے کے دفتر میں پہنچی۔

"ڈاکٹر صاحب ___" اس نے نہایت رعب داب سے کہنا شروع کیا ___ "کل جس طرح آپ نے حضرت اورنگ زیب علیہ الرحمتہ کے متعلق اظہار خیال کیا۔ اس کے لئے معافی مانگئے۔ ورنہ ہم اسٹرائیک کر دیں گے۔ بلکہ کر دیا ہے اسٹرائیک ہم نے ___ آپ نے ہماری سخت دل آزاری کی ہے۔"

آفتاب رائے اچنبھے سے کشوری کو دیکھتے رہے ___ اری تُو تو ڈپٹی جعفر عباس کی بٹیا ہے نا۔ اری باؤلی سی ___ وہ بے ساختہ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن کشوری کے تیور دیکھ کر رُک گئے اور پہلو بدل کر سنجیدگی سے کھنکارے۔ "بات یہ ہے مس عباس ___" انھوں نے کہنا شروع کیا۔ سیاست اور حصولِ تعلیم کے درمیان جو ___"

"اجی ڈاکٹر صاحب لے بس اب رہنے دیجئے ___" کسی نے آگے بڑھ کر کہا ___ ہم خوب اس ڈھونگ کو جانتے ہیں۔ معافی مانگئے قبلہ ___"

"ڈاکٹر صاحب میں نے کہا بنارس کیوں نہیں واپس چلے جاتے ___؟" دوسری آواز آئی۔

"دیکھو میاں صاحبزادے ___" آفتاب رائے نے رسان سے کہا ___ "معافی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تاریخ کے متعلق میرے چند نظریے اور اصول ہیں۔ میں اور تمھاری دل آزاری کروں گا؟ کیا باتیں کرتے ہو ___؟"

"ہم کچھ نہیں جانتے ___" انھوں نے شور مچایا ___ "معافی مانگئے۔ ورنہ ہم کل اورنگ زیب ڈے منائیں گے۔"

"ضرور منائے ___" آفتاب رائے نے یک لخت بے حد اُکتا کر کہا۔

"مکمل اسٹرائیک کریں گے۔"

"ضرور کرو ___ خدا مبارک کرے ___" اُنھوں نے آہستہ سے کہا اور چق اٹھا کر اندر چلے گئے۔

"کٹر مہا سبھائی نکلا یہ بھی ___" لڑکوں اور لڑکیوں نے آپس میں کہا اور برساتی سے باہر نکل آئے۔

وہ رات آفتاب رائے نے شدید بے چینی سے کاٹی۔ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ مسلمان طالب علموں کو اچھے نمبر نہ ملتے۔ ہندوؤں کو یونہی پاس کر دیا جاتا۔ ہوسٹلوں میں ہندو مسلمان اکٹھے رہتے تھے۔ لیکن جس ہوسٹل میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس پر سبز پرچم لہرانے لگا تھا۔ اس کے جواب میں عین مغرب کی نماز کے وقت ہندو اکثریت والے ہوسٹلوں میں لاؤڈ سپیکر نصب کر کے گراموفون بجایا جاتا۔

چند روز بعد آفتاب رائے کے سر میں جانے کیا سمائی کہ استعفادے دیا اور غائب ہو گئے۔ سارے میں ڈھنڈیا مچ گئی۔ مگر ڈاکٹر آفتاب رائے نہ اب ملتے ہیں نہ تب لوگوں نے کہا ایک چول ہمیشہ سے ذرا ڈھیلی تھی۔ سنیاس لے لیا ہو گا۔ پھر تقسیم کا زمانہ آیا۔ اب کسے ہوش تھا کہ آفتاب رائے کی فکر کرتا۔ اپنی ہی جانوں کے لالے پڑے تھے۔

ملک آزاد ہو گیا۔ کھیم وتی کی شادی ہو گئی۔ کشوری کے گھر والے آدھے پاکستان چلے گئے۔ اس کے بابا اب بہت بوڑھے ہو گئے تھے۔ آنکھوں سے کم دکھائی دیتا تھا۔ ایک ٹانگ پر فالج کا اثر تھا۔ دن بھر وہ جونپور میں اپنے گھر کی بیٹھک میں پلنگڑی پر لیٹے نادِ علی کا ورد کیا

کرتے اور پولیس ہر سے ان کو تنگ کرتی۔ آپ کے بیٹے کا پاکستان سے آپ کے پاس کب خط آیا تھا؟ آپ نے کراچی میں کتنی جائداد خرید لی ہے؟ آپ خود کب جا رہے ہیں؟ اصغر عباس ان کا اکلوتا لڑکا تھا اور اب پاکستانی فوج میں میجر تھا۔ نہ وہ ان کو خط تک لکھ سکتا تھا اور اگر مر جائیں تو مرتے وقت وہ اس کو دیکھ بھی نہ سکتے تھے۔ وہ تو کشوری کے لئے مصر تھا کہ وہ اس کے پاس راولپنڈی چلی آئے۔ لیکن ڈپٹی صاحب ہی نہ راضی ہوئے کہ ان سے بٹیا کو بھی نظروں سے اوجھل کر دیں۔ وہی کشوری تھی۔ جس کی ایسے بسم اللہ کے گنبد میں پرورش ہوئی تھی اور اب وقت نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ وہ جونپور کے گھر کی چار دیواری سے باہر مدتوں سے لکھنو کے کیلاش ہوسٹل میں رہ رہی تھی۔ ایم۔ اے میں پڑھتی تھی اور اس فکر میں تھی کہ بس ایم۔ اے کرتے ہی پاکستان پہنچ جائے گی اور ملازمت کرے گی۔ ارے صاحب آزاد قوم کی لڑکیوں کے لئے ہزاروں باعزت راہیں کھلی ہیں۔ کالج میں پڑھائیے۔ نیشنل گارڈ میں بھرتی ہو جئے۔ اخباروں میں مضمون لکھئے۔ ریڈیو پر بولئے۔ کوئی ایک چیز ہے جی ہاں۔ وہ دن گن رہی تھی کہ کب دو سال ختم ہوں اور کب وہ پاکستان اڑنچھو ہو ____ لیکن پھر بابا کی محبت آڑے آجاتی۔ دُکھیا اتنے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ آنکھوں سے سجھائی بھی نہیں دیتا۔ کہتے ہیں بیٹا چھ دن اور باپ کا ساتھ دے دو۔ جب میں مر جاؤں تو جہاں چاہنا جانا۔ چاہے پاکستان چاہے انگلینڈ اور امریکہ۔ بیٹی۔ میں اب تمہیں کسی بات سے روکتا تھوڑا ہی ہوں۔ بیٹا تم بھی چلی گئیں تو میں کیا کروں گا۔ محرم میں میرے لئے سوز خوانی کون کرے گا۔ میرے لئے لوکی کا حلوہ کون بنائے گا۔ پوت پہلے ہی مجھے چھوڑ کر چل دیا پھر ان کی آنکھیں بھر آتیں اور وہ اپنی سفید داڑھی کو جلدی جلدی پونچھتے ہوئے یا علی کہہ کر دیوار کی طرف کروٹ کر لیتے۔

بڑی بھاوج ان سے کہتیں ____ دیوانے ہوئے ہو۔ بٹیا کو کب تلک اپنے پاس بٹھلاؤ گے۔ آج نہ گئی کل گئی۔ جانا تو اسے ہے ہی ایک دن۔ یہاں اس کے لئے اب کون سے رشتے رکھے ہیں۔ سارے اچھے اچھے لڑکے ایکو ایک پاکستان چلے گئے اور وہاں ان کی شادیاں بھی دھبا دھب ہو رہی ہیں۔ یہ اصغر عباس کے پاس پہنچ جاتی تو وہ اسے بھی کوئی ڈھنگ کا لڑکا دیکھ کر ٹھکانے لگا دیتا ____ بڑی بھاوج کی اس شدید حقیقت پسندی سے کشوری کو اور زیادہ کوفت ہوتی اور یہ ایک واقعہ تھا کہ اس نے پاکستان کے مسئلے پر اس زاویے سے کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ ویسے وہ سوچتی کہ بابا ہندوستان میں ایسا کھونٹا گاڑ کر بیٹھے ہیں۔ اچھے خاصے ہوائی جہاز سے چلے چلتے مگر نہیں اور یہ جو بابا کی ساری قوم پرستی تھی۔ سارا جونپور عمر بھر سے واقف ہے کہ بابا کتنے بڑے نیشنلسٹ تھے تب بھی پولیس پیچھا نہیں چھوڑتی۔ سارے حکام اور پولیس والے جن کے سنگ جنم بھر کا ساتھ کا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔ وہی اب جان کے لاگو ہیں۔ کل ہی عجائب سنگھ چوہان نے جو عمر بھر سے روزانہ بابا کے پاس بیٹھ کر شعر و شاعری کرتا تھا دوبارہ دوڑ بھجوا کر خانہ تلاشی لی۔ گویا ہم نے بندوقوں اور ہتھیاروں کا پورا میگزین دفن کر رکھا ہے۔ پھر اسے بابا پر ترس آجاتا۔ بیچارے بابا۔

اب ڈپٹی صاحب کی مالی حالت بھی ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ اصغر عباس پاکستان سے روپیہ نہ بھیج سکتا تھا۔ جو تھوڑی بہت زمینیں تھیں ان پر ہندو کاشتکار قابض ہو گئے تھے اور دیوانی کی عدالت میں ڈپٹی صاحب کی فریاد کی شنوائی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چھوٹی اماں مرحومہ کی مقدمہ بازیوں کے بعد جو کچھ زیور بچ رہا تھا۔ وہ بڑی بھاوج نے سمیٹ کر بہو کے حوالے کر دیا تھا۔ جو وہ پاکستان لے گئی تھی۔ باقی روپیہ ڈپٹی صاحب کی پنشن کا کشوری کی تعلیم پر خرچ ہو رہا تھا۔ ان کے علاج کے لئے کہاں سے آتا اور فالج تو بوا ایسا روگ ہے کہ جان لے کر پیچھا چھوڑتا ہے۔ چنانچہ نوبت یہ پہنچی کہ چپکے چپکے بڑی بھاوج نے چھمو بیگم کے ذریعے چند ایک گہنے جو بچ رہے تھے فروخت کروا دیئے۔ ویسے اس میں ایسی شرم لی تو کوئی وجہ نہ تھی۔ وہ جو مثل ہے کہ مرگِ انبوہ جشنے دارد' ان گنت مسلمان گھرانے ایسے تھے جن کو ملازمتوں سے نکالا جا رہا تھا یا جن کو نوکریاں نہ دی جاتی تھیں اور وہ اپنے اپنے گہنے اور چاندی کے برتن بیچ بیچ کر گذارہ کر رہے تھے لیکن بڑی بھاوج ناک والی آدمی تھیں اور ابھی ان کے بھلے وقتوں کو گذرے عرصہ ہی کتنا ہوا تھا۔ کشوری کو جب یہ معلوم ہوا تو اس کی تو سٹی گم ہو گئی۔ اس نے پاکستان جانے کا خیال بالکل ترک کر دیا اور سرگرمی سے ملازمت کی تلاش میں جٹ گئی۔

اسے یقین کامل تھا کہ اب ایسا بھی کیا اندھیرا ہے کہ اچھے سیکنڈ ڈویژن والی اکنومکس کی ایم۔ اے کو کہیں جونیر لیکچرر شپ بھی نہ ملے

گئی۔ لیکن واقعہ یہ تھا کہ ایک جگہ تو اس سے صاف صاف کہہ دیا گیا کہ صاحب بات یہ ہے کہ جگہ تو خالی ہے۔ لیکن ہم پاکستان سے آئی ہوئی شرنارتھی لڑکیوں کو ترجیح دے رہی ہیں اور ویسے ایمان کی یہ بات ہے کہ آپ مسلمان ہیں۔ ہمارے پاس آپ کی وفاداری کا کیا ثبوت ہے ظاہر ہے کہ آپ کسی خانگی مجبوری کی وجہ سے ہندوستان میں رکی ہوئی ہیں۔ پہلا موقع ملتے ہی آپ بھی پاکستان چلی جائیں گی۔ ہم موقع پرستی، مجبوری اور وفاداری کے مدارج الگ الگ پہچانتے ہیں۔

قدم قدم پر اسے نئی نئی ذلتیں ملتیں اور وہ گھوم پھر کر جونپور لوٹ آتی۔ بڑی بھاوج نے اس سے کہا ___ وہ تمھاری کو ٹھیالی تھیم کے ماموں آفتاب بہادر تھے۔ ان کو ہی جا کر پکڑو۔ وہ تو بڑے بااثر آدمی تھے اور بڑے شریف۔ ضرور مدد کریں گے اور کشوری کو خیال آیا۔ کس طرح وہ جلوس بنا کر ان کے پاس پہنچی تھی اور ان کو سخت سست سنائی تھیں۔ اس کے اگلے ہفتے ہی وہ غائب ہو گئے تھے۔

آفتاب رائے ___ اب پتہ نہیں وہ کہاں ہوں گے۔ اڑتی اڑتی سنی تھی کہ بمبئی میں حکومت کے خلاف تقریر کرنے کے جرم میں ان کو مرارجی ڈیسائی نے پکڑ کر احمد آباد جیل میں بند کر دیا تھا۔ جیل سے چھٹے تو کچھ اور گڑبڑ ہوئی اور غالباً ان کو ڈی پورٹ کر دیا گیا۔ اب شاید وہ روس میں ہیں اور سمرقند ریڈیو سے اردو میں خبریں سناتے ہیں۔ دوسری روایت تھی کہ نہیں صاحب ڈاکٹر آفتاب رائے تو آج کل پنڈت نہرو کی بالکل مونچھ کا بال بنے ہوئے ہیں اور ان کو ری پبلک لمبی ڈورا میں ہند کا سفیر بنا کر بھیجا جا رہا ہے۔ بہر حال۔ ڈاکٹر صاحب تو عرصے سے گویا مستقل "زیر زمین" تھے۔

بچارے آفتاب رائے

آج چاندرات تھی۔ محلّے میں نقارہ رکھا جا چکا تھا۔ مجلسیں اب بھی ہوتیں۔ لیکن وہ چہل پہل، رونق، اور بے فکری نہ جانے کب کی خواب و خیال ہو چکی تھی۔ ڈیوڑھی میں ڈولیاں اترنی شروع ہوئیں اور بیبیاں آ آ کر امام باڑے کے دالان میں بیٹھنے لگیں۔ کشوری بیدلی سے دہلیز پر اپنی پرانی جگہ پر بیٹھی رہی۔ دالان کی چاندنی جس پر تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی اب چھدری چھدری نظر آتی تھی۔ سارے خاندانوں میں سے دو دو تین تین افراد تو ضرور ہی ہجرت کر گئے تھے بڑی بھاوج بہت مشکل سے پاؤں گھسیٹتی ادھر ادھر چل پھر رہی تھیں۔ اب وہ الّلے تلّلے کہاں۔ ساری مہریاں اور کہارنیں اور پاسنیں ایک ایک کر کے چھوڑ کر چلدیں۔ بس تھوڑی مولّہ رہ گئی تھی سو اس کی آواز کو بھی پالہ مار گیا تھا لیکن چھمّو بیگم کو آتا دیکھ کر وہ پھر للکاری ___ آگئیں چھمّو بیگم ___ آؤ جم جم آؤ ___

چھمّو بیگم چپ چاپ آن کے منبر کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ زیارت پڑھ کر تعزیوں کو جھک کر سلام کرنے اور کنپٹیوں پر انگلیاں چٹخا کر جناب علی اصغرؑ کے سبز جارجٹ کے گہوارے کی بلائیں لینے کے بعد انھوں نے علموں کو مخاطب کر کے آہستہ سے کہا ___ "مولا یہ میرا آخری محرم ہے۔ ارے اب تمھاری مجلسیں یہاں کیسے کروں گی ___ اور یہ کہہ کر انھوں نے زور شور سے رونا شروع کر دیا۔

بوامدن اپنی پرانی "دشمناگی" فراموش کر کے سرک کر ان کے قریب آ بیٹھیں اور بولیں ___ "لو بوا غم حسینؑ کو یاد کرو۔ اپنا غم ہلکا ہو جائیگا ___ مولا تو ہر جگہ ہیں۔ کیا پاکستان میں نہیں ہیں ___"

"ہاں ___ ہاں ___" باقی بیبیوں نے آنسو خشک کرتے ہوئے تائید کی ___ مولا کیا پاکستان میں نہیں ___ تم وہاں مولا کی مجلسیں قائم کرنا۔

"لو بوا ___ ہم بھی چلدیئے پاکستان ___" جب محفل کی رقت ذرا کم ہوئی اور چھمّو بیگم چاندرات کا بیان ختم کر چکیں تو بوا مدن نے اپنا اناؤنسمنٹ بھی کر ڈالا۔

"سچ کہو بوامدن ___" بڑی بھاوج نے گوٹا پھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بیوی۔ ہم بھی چلدیئے ___" بوامدن نے اعتراف کیا۔

"کیسے چل دیں ___؟" بڑی بھاوج کو ایک طرح سے رشک ہی آیا۔ اچھے خاصے لوگ نکلتے چلے جا رہے ہیں۔ سب فضیحتوں سے

الگ۔ سارے دلدر دور ہو جاویں گے وہاں پہنچ کر ___

"میں بڑی بھاوج کا لڑکا نہیں مانتا ___ وہاں سے ہر بار خط میں لکھتا ہے کہ بس اماں آ جاؤ ___ کوئی تھوڑی جگہ سکھر ہے۔ وہاں اس نے راشن کی ڈپو کھول لی ہے۔

"اچھا ___ ؟ شکر ہے۔ مولا سب کی بگڑی بنائیں ___ " بڑی بھاوج نے کہا۔

"عاشور کی شب کی لیجئے" ___ بوا حسن نے جو حسب معمول عینک گھر بھول آئی تھیں دوبارہ غلط مرثیہ شروع کیا۔ لیکن سب پر ایسی اداسی اور اکتاہٹ طاری تھی کہ کسی نے ان کی تصحیح کرنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ بگلن نے آواز ملائی ___ چراغوں کی روشنی دالان میں مدھم سا زرد اُجالا بکھیرتی رہی۔ آنگن کا گیس کا ہنڈہ پیلا پڑتا جا رہا تھا۔

اس تاریکی میں کشوری سیاہ دوپٹے سے سر ڈھانپے اپنی جگہ پر اکڑوں بیٹھی سامنے رات کے آسمان کو دیکھتی رہی۔

(۸)

کنول کماری جین نے مہمانوں کے جانے کے بعد نشست کے کمرے میں واپس آکر در یچوں کے پردے گرائے اور چاء کا سامان میزوں پر سے سمیٹنے لگی۔ مدراسی آیا ایک ہی تھی جسے وہ ہمراہ لیتی آئی تھی اور پردیس میں ملازموں کے فقدان پر اس نے ملٹری اڈوائزر بریگیڈیر کھنہ کی بیوی سے بڑا رقت انگیز تبادلہ خیالات کیا تھا۔ گھر کی سنبھال اور بچے کی دیکھ بھال کے بعد جو سے وقت ملتا اس میں وہ رائل اکیڈمی آف ڈرامیٹک آرٹ جا کر کریو گرافی سیکھتی تھی۔ سر لارنس اور لیڈی اولیویر، اینتھی اسکویتھ، کرسٹفر فرائی ان سب سے اس کی بڑی گہری دوستی تھی۔ یہ سب مل کر گھنٹوں فن اداکاری، جدید آرٹ اور ہندوستانی بیلے پر گفتگو کرتے۔ جین کے پاس ان سب بکھیڑوں کا وقت نہ تھا۔ ساڑھے آٹھ بجے رات کے تو وہ دفتر سے نپٹ کر انڈیا ہاؤس سے لوٹتا اور وہ تو صاف بات کہتا تھا کہ بھائی میں انٹلکچوئل و نٹلکچوئل نہیں ہوں۔ سیدھا سیدھا آدمی ہوں جس ڈھرے پر سن پچیس سے چل رہا ہوں وہی میرے لئے ٹھیک ہے انگریز کے زمانے میں وہ ملک کے طبقاتی قطب مینار کی سب سے اونچی سیڑھی پر پہنچ چکا تھا اور اب تو وہ اتنا اونچا تھا کہ بالکل بادلوں پر براجمان تھا۔ انگریز کے زمانے میں ڈریس سوٹ پہنتا۔ اب سفید چوڑی دار پائجامے اور سیاہ شیروانی میں ملبوس سفارتی ضیافتوں میں نیا تلی ہلکی پھلکی نپی تلی باتیں کرتا۔ خود کنول کیا کم معرکے کی "ڈپلومیٹک وائف" تھی۔ جہاں جاتی محفل جگمگا اُٹھتی۔ واہ واہ۔ مثلاً آج ہی کی پارٹی میں اس نے کوریا کی کرشنا مینن والی تجویز کے سلسلے میں "نیو اسٹیٹسمین اینڈ نیشن" کے ایڈیٹر کنگز لے مارٹن اور جدید شاعر لوئی مک نیس دونوں کے چھکے چھڑا دیئے۔ سب کو قائل ہونا پڑا۔ چاند باغ کے اچھے پرانے سنہرے دنوں میں تو خیر وہ یونہی جھپٹ میں انٹلکچوئل بن گئی تھی کہ یہ یونیورسٹی کی زندگی کا ایک لازمی جزو تھا۔ پر یہ تو ان دنوں اس کے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز وہ ان ساری جید بین الاقوامی گلیمرس ہستیوں سے یوں بھائی چارے کے ساتھ ملا کرے گی جیسے وہ سب گاجر مولی ہیں۔

سورج یہ است ہو گیا ___ سوریہ است ہو گیا ___ ارملا گنگناتی ہوئی اندر آئی۔

کنول دیدی ___ جاتے جاتے مجھے خیال آیا کہ ایک بار آپ کو پھر یاد دلا دوں کہ آپ کو مجلس میلے میں آنا ہے ___ "

"ہاں ہاں بھئی ___ " کنول نے جواب دیا۔ "اور وہ میری کتاب تو دیتی جاؤ ___ "

"ارے ہائے ___ " ارملا نے رُک کر کہا۔ "وہ تو ڈاکٹر آفتاب رائے نے مجھ سے لے لی۔ وہ مجھے انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے چھین کر لے گئے، کہنے لگے کل دے دیں گے ___ "

"ڈاکٹر ___ آفتاب ___ رائے ___ ؟" کنول نے دہرایا۔

"ہاں ___ کنول دیدی ___ " ارملا نے اسی طرح لاپروائی سے بات جاری رکھی۔ "وہ تو دن بھر یونہی لائبریوں میں گھسے رہتے

ہیں۔ آج کل ایک نئی کتاب لکھ رہے ہیں آج مہینوں کے بعد اتفاقاً نظر آگئے۔ ان کا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ لیکن کل وہ براڈکاسٹنگ ہاؤس آرہے ہیں۔ وہاں کتاب مجھے لوٹا دیں گے۔ اچھا گڈ نائٹ کنول ڈیئر____"

"گڈ نائٹ ارملا____"

"ارے ہاں۔" اُس نے جاتے ہوئے رُک کر پھر کہا۔ "کل آپ رائل کمانڈ پرفورمنس میں جارہی ہیں____؟ آپ کو تو سر رالف رچرڈسن نے خود ہی بلایا ہوگا____"

"ارے نہیں بھئی____" کنول نے پیشانی پر سے بال ہٹا کر تھکی تھکی ہوئی آواز میں کہا" (یہ بھی اس کا ایک پوز ہے۔" ایک دل جلی مسز اچاریہ نے جو سکنڈ سیکریٹری کی بیوی تھی۔ مارے حسد کے اپنی ایک سہیلی سے کہا تھا۔ "جانتی ہے کہ بکھرے ہوئے بال اس کے اوپر زیادہ اچھے لگتے ہیں۔ جزیل کہیں کی") نہیں بھئی ارملا۔ مجھے یہ پارٹیوں اور سفارتی مصروفیتوں کا سلسلہ بعض دفعہ بالکل بور کر دیتا ہے۔ اس سے کہیں پناہ نہیں____"

"اچھا گڈ نائٹ"

"اچھی طرح سوؤ____" کنول نے کہا۔ ارملا بریندر ناتھ چٹوپادھیا کا کورس گنگناتی ہوئی نچلی منزل میں اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

انڈیا آفس لائبریری سے نکلتے ہوئے مل گئے____ ڈاکٹر آفتاب رائے مل گئے____ اجی ان کا کوئی بھروسہ تھوڑا ہی ہے۔ چھین کرلے گئے____ کہنے لگے کل دیدیں گے____ وہ صوفے پر بیٹھ گئی____ دا سنتھیی____ اس نے چلّا کر آواز دی۔ کھانا گرم پر لگادو____ اس نے ٹیلی ویژن کھولا۔ بکواس ہے۔ بند کر دیا۔ پھر اس نے ریڈیو لگایا۔ بکواس تھا۔ اسے بھی بند کر دیا۔ کیا پتہ اس سے لکھنؤ ریڈیو پر ارچنا بنرجی گاتی ہوئی یو ہوڑی جھورنا____ نکر مکر بوجوئے بوجوئے ہو____ اور چاند باغ کی خاموش سڑکوں پر سے لڑکیاں لنٹرن سروس کے بعد لوٹتی ہوں گی____

میں نے لیا کیا تھا____؟ اس نے سوال کیا۔ کچھ نہیں۔ میں اب دس سال سے کنول کماری جیین ہوں۔ یہ تو کچھ بات نہ بنی۔ بات کس طرح بنتی ہے۔ کیوں نہیں بنتی____ سال گذرتے جارہے ہیں۔ میں کنول کماری جس نے یہ سب دیکھا۔ ایک روز یونہی ختم ہو جاؤں گی اور تب بہت اچھا ہوگا۔

ایسا نہ ہونا چاہئے تھا۔ پر ہو گیا۔

کنول ڈارلنگ____ ثروت نے انگلی اُٹھا کر سخت صوفیانہ انداز میں اس سے کہا تھا____ جن ڈھونڈھا تن پائیاں گہرے پانی پیٹھ____ ____ میں برہن ڈوبت ڈری رہی کنارے بیٹھ____ کنول نے سوچا تھا۔

کنارا بھی تو نہیں ہے۔

پانے کے کیا معنی ہیں۔؟ کیا ملتا ہے۔؟

باہر اندھیرا تھا۔ اور سردی اور بیکراں خاموشی۔ میں زندہ ہوں۔

ارے بھئی آفتاب بہادر____ اس نے غصّے سے سر ہلا کر دل میں سوال کیا____ تم کیوں چلے گئے تھے۔ میں نے تمہارا کچھ بگاڑا تھوڑا ہی تھا۔ تم اپنے آپ میں مگن رہتے میں وہیں کہیں تمہاری زندگی کے تانے بانے میں کسی کونے میں آکر چپکی بیٹھ جاتی اور بس تمہارے لئے پوریاں تلا کرتی۔ تم اسی طرح رہتے۔ اس میں تمہاری شکست نہ تھی۔ تمہاری تکمیل تھی میاں آفتاب بہادر____؟

بیچ کیرل گانے والے بچّے کی اور نکل گئے تھے۔

آفتاب بہادر____ جو میں ہوں اور جو تم ہو____ کیا یہی بہت ٹھیک ہے۔؟

بہت زمانہ ہوا کسی پارٹی میں ایک لڑکی کو دیکھ کر جو آفتاب رائے کو بہت پہلے سے جانتی تھی۔ سوچا تھا کہ جنے آفتاب کی بیوی

یسی ہوگی (ایک بار خود اس کے لئے اس کی دوست ثروت نے ایک بوڑھے آدمی کی تصویر سامنے لا کر کہا تھا۔ آنے والے دور کی دھندلی سی اِک تصویر دیکھ ——!! اور کمال یہ کہ عین اسی طرح کا آدمی جیمن نکلا ——) آفتاب کی بیوی۔ یہ فقرہ کتنا عجیب لگتا تھا۔ کوئی ہوگی چڑیل۔ آخر میں یہ سب کر کری کھاتے ہیں —— ثروت نے اضافہ کیا تھا۔ خوبصورت تو ضرور ہوگی اور نینس کھیلتی ہوگی۔ جس کا آفتاب کو اتنا شوق ہے۔ لیکن فراٹے بھرنے اور ہوا میں اُڑنے والی لڑکیاں تو وہ سخت ناپسند کرتا تھا۔ جس کو وہ پسند کرے گا وہ تو بہت ہی عمدہ ہوگی بالکل مجموعہ خوبی۔ چندے آفتاب چندے مہتاب۔ جی ہاں اور مجھ میں کیا بُرائی تھی؟ اس نے طے کرنا چاہا۔ کہ آفتاب کا رویہ یہ تھا کہ اس پر کنول کماری پر یہ وحی اُترنی چاہئے تھی کہ یہ مہاپرش آسمان پر سے خاص اس کے لئے بھیجا گیا ہے۔ لیکن یہ اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اس کنول کماری سے روزانہ آکر ملے یا کبھی نہ ملے۔ اُس سے طبلہ اور جے جے وتی سنے۔ پوریاں بنوا کر کھائے۔ پھر ایک روز اطمینان سے آگے چلا جائے اور یہ کنول کماری بعد میں بیٹھ کر جھک مارتی رہے۔ اور کیا وہ اس کے پیچھے پیچھے ڈنڈا لے کر دوڑتی کہ اے میاں آفتاب بہادر ایک بات سنتے جاؤ —— ان دنوں ثروت نے ایک اور لطیفہ ایجاد کیا۔ چھٹی کے بعد ایک روز اس نے "گینگ" کی باقی افراد سے کہا: —— بھئی ۲۹۔ اے پی سین روڈ پر آج کل یہ سلسلہ ہے کہ اگر بھائی آفتاب چاء پیتے پیتے رک کے دفعتاً کنولا رانی سے کہتے ہیں۔ بھئی کنول مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے تو ہماری کنولا رانی کو فوراً یہ دھیان ہوتا ہے کہ اب شاید یہ پروپوز کرنے والا ہے۔ پر وہ بات محض اتنی ہوتی ہے کہ بھئی ذرا مینپل کو فون کر دو کہ آم خرید تا لائے۔ یا اسی قسم کی کوئی اور شدید اینٹی کلائمکس۔ ثروت اس قدر کمینی تھی —— وہ سارے مسخرے پن کے قصے یاد کر کے اب اُس نے دل میں ہنسنا چاہا۔ لیکن سردی بڑھتی گئی اور بیکراں تنہائی اور زندگی کے ازلی اور ابدی پچھتاووں کا ویرانہ۔ آفتاب بہادر تم کو پتہ ہے کہ میری کیسی جلاوطنی کی زندگی ہے۔ ذہنی طمانیت اور مکمل مسرت کی دُنیا جو ہو سکتی تھی۔ اس سے دیس نکالا جو مجھے ملا ہے اسے بھی اتنا عرصہ ہو گیا کہ اب میں اپنے متعلق کچھ سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب میرے سامنے صرف رائل کمانڈ پرفورمنس ہیں اور جیمن کے صبح کے ناشتے کی دیکھ بھال اور یہ ہر دلعزیزی جو مجھ پر ٹھونس دی گئی ہے لیکن تم بھلا کیا سوچو گے (اس نے کہا تھا۔ ارے تم لوگ اسی کو پسند کرتی ہو جو ایک مخصوص معیار پر پورا اُترتا ہے۔ کیا اُلٹی منطق تھی۔ یعنی چت بھی تمہاری پٹ بھی۔ آخر اس ساری لفاظی، اس ذہنی اور تصوراتی گورکھ دھندے سے تمہارا مطلب کیا نکلا۔ واہ وا۔ چغد آدمی کہیں کے۔

ثروت نے اس کی شادی کے بعد ایک اور سہیلی کے سامنے نہایت جامع و مانع اختصار کے ساتھ اس طرح تشریح کر دی تھی کہ قصہ کو یوں مختصر کرتی ہوں اے عزیزہ۔ کنول کی ٹریجڈی یہ ہوئی کہ ساری عمر تو کوئی ان کی سمجھ میں نہ آیا۔ سب میں مین میکھ نکالتی رہیں اور مارے بددماغی کے کسی کو خاطر ہی میں نہ لاویں اور جن بزرگوار کو آپ نے نہایت صدقِ دل سے پسند فرمایا۔ وہ خود ہی ہری جھنڈی دکھا گئے —— بس اب کیا ہے پیاری بہن۔ جب آنکھ کھلی تو گاڑی نکل چکی تھی۔ پٹری چمک رہی تھی —— جی ہاں۔

اری ثروت —— کروک کہیں کی۔

مگر سوال یہ تھا کہ ہر چیز کے متعلق اس مذاق اور خوش دلی کا رویہ کہاں تک گھسیٹا جا سکتا تھا۔ (لیکن اس کے علاوہ تم اور کر بھی کیا سکتی ہو۔ ثروت نے کہا تھا) زندگی نہ ہوئی اسٹیفن لیکاک کا مسخرہ پن ہو گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تمہارا مذاق کہاں ہوتا ہے اور سنجیدگی کہاں سے شروع ہوئی ہے (یا —— Vice Versa)

ڈاکٹر صاحب تو دن بھر لائبریریوں میں گھسے رہتے ہیں اور آج کل ایک اور کتاب لکھ رہے ہیں۔ اسے ارملا نے مطلع کیا ہے۔ اب وہ کیا کر رہا ہے۔ ڈاکٹر ڈی پی مکرجی کی طرح مہا گرو بن چکا ہے۔ غالباً اس نے شادی کر لی ہوگی۔ یہاں پہنچ کر اسے عجیب و غریب اور انتہائی شدید تکلیف کا احساس ہوا —— (وہ کون ہوگی —— کیسی ہوگی —— آفتاب کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی کیسی نظر آتی ہوگی۔ آفتاب اس سے کہاں ملا ہوگا) یا اب تک وہ کنفرمڈ بیچلر بن چکا ہوگا (بہت سے لوگوں کے لئے اس میں بھی سخت گلیمر تھا —— کیا بات ہے صاحب —— ان ساری حماقتوں سے علیحدہ اور برگزیدہ —— اپنی نہایت شخصی دُنیا، اپنے مشغلے، کتابیں، موسیقی، بیتھوون کے کونسرٹ،

چند دلچسپ سے گنے چنے دوست۔ اتوار کے روز دن بھر کسی کنٹری کلب کی لاؤنج میں بیٹھے ٹائمز پڑھ رہے ہیں۔ تیسرے پہر کورائیڈنگ کو چلے گئے اور ٹینس کھیلا۔ اِدھر اُدھر خواتین سے بھی مل لئے۔ لیکن لڑکیوں کو ہمیشہ بڑے ترحم کی نگاہوں سے دیکھا گویا ____ بیچاریاں ____!! اور اپنا بے نیازی اور سرپرستی کا رویہ قائم رکھا ____ یہ سب ثروت نے ایک دفعہ ارشاد کیا تھا) اچھا بھئی آفتاب بہادر ____ تم کتابیں لکھتے رہو میں ان پر تھرڈ پروگرام میں ریویو کروں گی۔ راستہ اسی طرح طے ہوتا رہے گا۔

صبح ہوئی شام ہوئی ____ زندگی تمام ہوئی ____ زندگی تمام ہوئی ____ نچلی منزل میں ارملا ہریندر ناتھ چٹوپادھیا کا وہ کمبخت کورس آہستہ آہستہ الاپ رہی تھی۔

وہ دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ کہرا اب کم ہو گیا تھا اور آسمان کا رنگ قرمزی تھا جس کے مقابل میں کیتھولک چرچ کے ہولناک گنبد کا سلہٹ نحوست سے اپنی جگہ پر قائم تھا۔

اونی لبادوں میں ملفوف مشرقی یورپ سے بھاگے ہوئے لوگ بھاری بھاری قدم اٹھاتے ہاتھوں میں شمعیں لئے مڈنائٹ ماس کے لئے گرجا کی سمت بڑھ رہے تھے ____

صبح ہوئی شام ہوئی

زندگی تمام ہوئی

زندگی تمام ہوئی

زندگی تمام ہوئی

(۹)

جب مجھے ملازمت نہ ملی تو میں نے سمندر پار کے وظیفوں کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ وہاں بھی وہی نقشہ تھا۔ لیکن انگریز پھر آڑے آیا اور برٹش کونسل نے مجھے یہاں آنے کا وظیفہ دے دیا اور جب میں نے روانہ ہونے کی خبر بابا کو سنائی تو وہ بالکل چپ ہو گئے اور اس کے بعد ایک لفظ منہ سے نہ بولے اور ابھی میں راستے ہی میں تھی۔ جب مجھے اطلاع ملی کہ بابا مر گئے ____ "کشوری نے مدھم آواز میں بات ختم کی اور چمٹے سے آتشدان میں لکڑی کے کندوں کو ٹھیک کرنے میں منہمک ہو گئی۔

آج مڈنائیٹ ماس منانے جائیں گے۔ روزماری نے اپنے برش اور کینوس سمیٹتے ہوئے کہا۔ چلو ہم برومپٹن اورٹری چلیں۔ جہاں ایک شام میں نے پیلے بالوں اور اُداس چہرے والی ایک ہیلنگرین پناہ گزین لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ سر پر سیاہ اسکارف باندھے تسبیح ہاتھ میں لئے گھٹنوں سے ساکت اور منجمد بیٹھی تھی۔ اس کا یہ انداز کتنا قابلِ رحم تھا۔ میں نے قربان گاہ کے ستونوں کے پیچھے چھپ کر اس کی تصویر بنائی۔ میں نے اس تصویر کا نام "آزادی سے فرار" رکھا تھا۔ لیکن جب اسے نمائش میں رکھا جانے لگا تو ہم عصر فنون کی انجمن نے اس کا نام بدل کے "آزادی کا شکرانہ" کر دیا ____ آج کی رات میں وہاں امید اور ناامیدی کی ان کرب ناک کیفیتوں کے چند اور اسکیچ تیار کروں گی۔

کتنی کیفیتیں ہیں جنھیں الفاظ اور رنگوں کے روپ میں ڈھالا ہی نہیں جا سکتا۔ جن کے اظہار سے ان کی بے وقعتی اور توہین ہوتی ہے ____ کشوری نے سوچا (یہی بات اپنے لئے کتنی بار کنول نے محسوس کی تھی۔ لیکن کوئی کچھ نہ جانتا تھا۔)

کیسی بے بسی ہے کہ سب اپنے اپنے دماغوں میں محصور رہے جانے پر مجبور ہیں۔

تم کو معلوم ہے کہ میں یکلخت اس طرح تم سب سے یہ باتیں کیوں کر رہی ہوں۔ کشوری نے کہا۔

"سنتے ہیں کہ جب مدتوں کے بچھڑے ہوئے دو بچے دوبارہ ملتے ہیں تو ساری پرانی یگانگت یاد آجاتی ہے۔ پرانے دوستوں سے مل کر بھی کو خوشی ہوتی ہے۔" اس نے بات آہستہ آہستہ جاری رکھی ____ "لیکن پرانے "دشمن" سے مل کر مجھے کیسی مسرت ہوئی ____ آج صبح مجھے بالکل اتفاقیہ کھیم وتی پھر سے نظر آئی۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ وہ یہاں پر ہے وہ ایک دوکان سے نکل رہی تھی۔ "ارے کھیم ____ کھیما" ____ میں چلا کر اس کی اور دوڑی۔ اس نے مجھے واقعی نہ پہچانا۔ وہ بہت موٹی ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ غالباً اس کا شوہر تھا۔ "کھیما رانی تم ہم کا ناہی چینہیں؟" میں نے بالکل بے ساختگی سے اپنی زبان میں اس سے کہا۔ جو اس کی اور میری مادری زبان تھی ____ ہلو کشوری ____ اس نے مطلق کسی گرمجوشی کا اظہار نہ کیا۔ نمستے۔ اس کے شوہر نے مسکرا کر سلام کیا۔ یہ میرے پتی ہیں۔ کھیم نے اس سرد مہری کے انداز میں بات کی۔ نمستے بھائی صاحب ____ ! میں نے بے حد خوش دلی سے کہا۔

"تم تو پاکستانی ہو۔ تمھیں نمستے نہ کہنا چاہئے۔" کھیم نے بڑی طنز سے ساتھ کہا۔ میرے اوپر جانو کسی نے برف ڈال دی۔ میں نے کھسیانی ہنسی ہنس کر دوسری اور دیکھا اس کے شوہر نے جو بہت سمجھ دار معلوم ہوتا تھا۔ فوراً بات سنبھالی اور کہنے لگا ____ "اچھا بہن جی ____ اس سے تو ہم بہت جلدی میں ہیں۔ آپ کسی روز ہمارے یہاں آیئے۔ ہم یہیں ساؤتھ کنیز نگٹن میں رہتے ہیں ____ "اچھا۔ ضرور آؤں گی۔ بائی بائی کھیم" ____ میں نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا اور آگے چلی گئی۔ میں نے اسے یہ بھی نہ بتانا چاہا کہ میں پاکستانی ہوں۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

"میں اس وقت کوئی رقت انگیز تقریر نہ کروں گی۔ کہ رفیقو۔ انسان نے خودکشی کر لی۔ پرانی اقدار تباہ ہو گئیں۔ اپنے پرائے ہو گئے۔ یہ سب پچھلے پانچ سال سے دہراتے دہراتے تم لوگ اکتا نہیں گئے۔ یہ جو کچھ ہوا یہی ہونا تھا۔ اور آپ تھیں کہ ایک نہایت رومینٹک تصور لئے بیٹھی تھیں۔ گویا زندگی نہ ہوئی شانتارام کا فلم ہو گئی۔ میں نے اور ضیم نے جو کچھ کیا وہ ان سب باتوں کا نہایت منطقی نتیجہ تھا اور باقی تم جو کہنا چاہتی ہو وہ جھک مارتی ہو۔ سمجھیں۔

"اس انداز سے میں نے اپنے آپ کو سمجھانا چاہا۔ لیکن چلو روزماری۔ اب ہم نئی تصویریں بنائیں گے۔" اس نے روزماری کو مخاطب کیا۔ "تم اگر ہمارے اسکیچ تیار کر دو تو تمھاری آرٹ کونسل اور ہم عصر فنون کی انجمن ان کے لئے کون سے عنوان منتخب کرے گی۔"

"ہم اپنے بدقسمت ملک کی وہ نوجوان نسل ہیں جو یورپ کی جنگ اور اپنے سیاسی انتشار کے زمانے میں پروان چڑھی۔ اپنی خانہ جنگی کے دور میں اس کی ذہنی تربیت کی اور اب اس ہولناک "سرد لڑائی" کے محاذ پر اسے اپنے اور دنیا کے مستقبل کا تعین کرنا ہے۔

"ہم لوگ یونیورسٹی کی اونچی اونچی ڈگریاں حاصل کر رہے ہیں۔ تہذیبی میلے اور تہوار منعقد کرنے میں مصروف ہیں۔ ہے مارکیٹ کے مخصوص تھیٹروں میں اپنے بیلے کے پروگرام پیش کرتے ہیں۔ امن کانفرنسوں اور یوتھ فیسٹولز میں شامل ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں سے واپس لوٹ کر کیا ہو گا۔

"تم نے کبھی خیال کیا ہے کہ میں کہاں جاؤں گی ____ ؟ میرا گھر اب کہاں ہے۔؟ کیا میں اور میری طرح دوسرے ہندوستانی مسلمان ایسے مضحکہ خیز اور قابل رحم کردار بننے کے مستحق تھے ____ ؟؟"

وہ خاموش ہو گئی۔ سب لوگ چپ بیٹھے آگ کے شعلوں کو دیکھتے رہے۔ سڑک کے دوسری طرف ایک مکان میں "وائٹ کرسمس" گائی جا رہی تھی۔

"شاید میں نے تمھیں بتایا تھا ___" ارملا نے نیچی آواز میں کہا۔ "آج دفتر سے واپسی میں ڈاکٹر آفتاب رائے مل گئے میں نے اُن سے پوچھا۔ ڈاکٹر صاحب۔ میں نے تو سنا تھا کہ آپ ری پبلک لمبی ڈورا میں سفیر ہیں۔ تم نے غلط سُنا تھا ___! انھوں نے رسان سے مسکرا کر کہا۔ میں نے گھبرا کر ان کو دیکھا۔ تو کیا آپ بھی ___ میں نے سوال کرنا چاہا۔ ہاں ___ میں بھی ___ اتنا کہہ کر وہ جلدی سے خدا حافظ کہتے ہوئے مجمع میں غائب ہوگئے! دوسرے لمحے اسٹیشن کی مہیب انڈر گراونڈ نے اُن کو نگل لیا۔ ان کے ہاتھوں میں کتابیں تھیں اور وہ کسی سے بات کرنا نہ چاہتے تھے ___ نجانے وہ کہاں رہتے ہیں۔ کیا کرتے ہیں۔ اتنا عرصہ انھوں نے کیسے گذارا۔ وطن واپس جانے کی اجازت انھیں کب ملے گی ___ کیا ہوگا ___"

دُور گرجاؤں کے گھنٹے بجنے شروع ہوگئے تھے۔ وہ سب باہر سڑک پر آگئے۔

ہماری غلطیوں کا سایہ ہمارے آگے آگے چلتا ہے اور رات ہمارے تعاقب میں ہے۔ انھوں نے سوچا ___ لیکن ہم رات کی وادی کو تیزی سے عبور کر رہے ہیں۔

ہمارے چاروں طرف یہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کا ہجوم یہ لوگ جو اپنی قسمتوں کو روتے ہیں۔ لیکن دیکھو۔ یہ راستے۔ یہ جھیلیں۔ یہ باغات۔ ہمارے منتظر ہیں۔ سناٹے میں صرف موت کے قدموں کی چاپ تھی۔ اجنبی موت جو یک لخت ہمارے سامنے آگئی۔ لیکن ہم اسے چھوڑ کر ہنستے ہوئے آگے نکل جائیں گے۔ سنو۔ ہمارے پاس یقین ہے اور کامل اعتماد۔ جسے اس محبت نے تخلیق کیا ہے جو غداری کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ یہ غداری محض یاسمین کے پھولوں کی آرزو ہے۔ وہ گرجا کی سمت بڑھتے رہے۔

سامنے راستے کی نیم تاریکی میں الزبتھن وضع کے میز ہاؤس میں دھندلی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ یہ ہندوستانی سفیر کے فرسٹ سیکرٹری کا مکان تھا۔ اس کے آگے پھر اندھیرا تھا۔ یہ کون دیوانی روح اپنی تنہائی سے گھبرا کر باہر نکل آئی ہے۔ انھوں نے سوال کیا۔ اس سے کہو یہ یہاں کیوں کھڑی ہے ان لیمپوں کے نیچے۔ گھاس کے ان راستوں پر۔ زمین کے ان پھولوں کے درمیان اسے کچھ نہ ملے گا۔ سنسان سیڑھیوں پر یہ کون لوگ نظر آرہے ہیں۔ ان سے کہو کہ واپس جائیں اور صبح کا انتظار کریں۔

ہمارے اور ان کے خیالوں کے بھٹکنے ___

لیکن پھر گھنٹوں نے پکارا ___ آؤ ___ آج کی رات تمھارے وجود کے گناہ کا کفارہ ادا کیا جائے گا۔ میں تمھارے خدا کی آواز ہوں اور تمھاری ہر تباہی میں شریک ہوں اور ہر موت کا محافظ ہوں اور اب پادریوں اور راہبوں کا جلوس آگے بڑھا۔ جو اپنے اپنے ملکوں سے جلاوطن ہو کر اس سے خداوند خدا کی تقدیس کرتے تھے اور گرجا کی مرمریں سیڑھیوں پر سیاہ اسکارف سے سر ڈھانپے عورتیں اور بوڑھے اور جوان بڑے صبر سے بیٹھے تسبیحیں پھیر رہے تھے اور ہولی کمیونین کے منتظر تھے۔

ایک راستہ یہیں پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔ پھر ایک دیوار ہے۔ لیکن ریشمی پردوں میں سے چھن چھن کر روشنی ادھر بھی پہنچ رہی ہے۔ گو بہت سے سیاہ پوش مریض دیوانے فلسفی اور بیمار سیاستدان راستہ روکے کھڑے ہیں۔

ہمیں تمھاری موت عزیز ہے۔ کیونکہ تمھاری موت میں نجات ہے۔ ماس کے گھنٹوں نے کہا۔

ہماری ماں۔ چٹانوں کی بہن۔ سمندر کے روشن ستارے ہمیں چپکا بیٹھنا سکھا۔ یہ ہمارا عہد نامہ ہے۔

یہ ہمارا پرانا عہد نامہ تھا۔ ان کے خیالات تباہ ہو چکے۔ اب ان کے پاس کیا باقی رہا ہے ___ آرگن کے مدھم اور لرزہ خیز سروں کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے وہ سب آہستہ سے اپنے راستے میں واپس آئے۔

"کنولا رانی"___ کسی نے اندھیرے میں یک لخت پہچان کر چپکے سے پکارا۔ یہاں آجاؤ۔

اور ہمارے ساتھ کھڑے ہو کر اس خوب صورت روشنی کو دیکھو جو آسمان پر پھیل رہی ہے۔ اب کسی پچھتاوے۔ کسی افسوس کا وقت نہیں ہے۔

"یہ اپنے عہد نامے منسوخ ہو گئے۔" شوری نے آہستہ سے دہرایا۔ "ہم اس طرح زندہ نہ رہیں گے۔ ہم یوں اپنے آپ کو نہ مرنے دیں گے۔ ہماری جلاوطنی ختم ہو گی ___ ہمارے سامنے آج کی صبح ہے۔ مستقبل ہے۔ ساری دنیا کی نئی تخلیق ہے۔"

لیکن کنول کماری ___ تم اب بھی رو رہی ہو ___ ؟

مینوں لے چلے بابلا لے چلے وے

خدیجہ مستور

پتلی سی نالی میں پانی کی دھار رینگ رہی تھی اور صابن کا پھولا پھولا جھاگ پانی پر غلاف کی طرح چڑھا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ابھی ابھی اندھیرے غسل خانے سے نہا کر نکلا تھا اور تولیہ سے بال خشک کرتا ہوا صحن میں پڑی ہوئی آرام کرسی کو دھوپ میں گھسیٹ کر سردی سے اکڑتے ہوئے جسم کو ذرا گرم کرنے کے لئے بیٹھ گیا تھا۔ تولیہ سے بالوں کو رگڑتے ہوئے اس کی نظر نالی پر پڑ گئی۔ گندی کیچڑ بھری نالی میں پانی رُک رُک کر بہہ رہا تھا ___ اسے اچانک وہ واقعہ یاد آ گیا جس نے اس کے بے حد حساس دل و دماغ پر بُری طرح اثر کیا تھا۔ کئی دن تک اس کی یہ حالت رہی تھی جیسے وہ اس ایک واقعے کے علاوہ کچھ سوچ ہی نہ سکتا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ سب کچھ بھولتا گیا لیکن آج بہت دن بعد صابن کے جھاگ کے ساتھ بہتی ہوئی پانی کی دھار نے اس کے ذہن میں اس واقعے کی یاد پوری شدت سے اُبھار دی۔ اس کے دل کی گہرائیوں میں بے شمار آہیں گھٹنے لگیں۔ اس وقت اس کی کیفیت کچھ اس دن جیسی ہونے لگی جب وہ اس واقعے سے دوچار ہوا تھا۔ حالانکہ اس سے قبل ایسے ایسے دردناک منظر دیکھے تھے کہ پتھر بھی پگھل کر رہ جاتا، لیکن کبھی وہ اس حد تک متاثر نہ ہوا تھا۔

شہر کی گہما گہمی کو موت نے نگل لیا تھا۔ زندگی کونوں کھدروں میں منہ چھپائے سسک رہی تھی۔ ویرانی کہتی تھی کہ اب کبھی آباد نہ ہوں گے۔ موت کہتی تھی کہ ہمارے چنگل سے اب کوئی بھی نہ بچ سکے گا۔ مگر امدادی کمیٹی کے دردمند دل کہتے تھے کہ زندگی اتنی ارزاں نہیں کہ ہم انہیں کیڑوں مکوڑوں کی طرح موت کے جال میں پھنس جانے دیں گے۔ وہ جہاں جہاں جا سکتے تھے، جہاں جہاں پہنچ سکتے تھے روتی سسکتی مایوس زندگیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈھ کر چُن چُن کر پناہ گزینوں کے کیمپ میں پہنچا رہے تھے۔ اس روز بھی وہ سارا دن لاری پر ویران شہر کے گوشے گوشے کا چکر لگا کر پچاس فساد زدہ انسانوں کو کیمپ میں پہنچا کر محفوظ کر چکا تھا اور سارے دن کا تھکا ہارا پولیس چوکی پر لاری سے اتر کر گھر جانے کے لئے پیدل چل رہا تھا۔ شام کے پانچ بج رہے ہوں گے۔ وہ جلد سے جلد گھر پہنچ کر آرام کرنے کے لئے تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا کہ ایک دم اس کے پاؤں رُک گئے۔ سڑک کے کنارے بارہ تیرہ آدمی کھڑے جھک جھک کر نالی میں نہ جانے کیا دیکھ رہے تھے۔ وہ ان سب کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا ___ بلڈنگ کے صدر دروازے میں بڑا سا تالا پڑا ہوا تھا اور وہ سب اسے توڑنے کے متعلق سوچ رہے تھے۔

"ہم لوگوں نے آج تین دن ہوئے کہ اس گھر کے بچے بچے کو پار لگا دیا پر جانے کیسے بچ رہا۔" سرخ آنکھوں اور بھیانک چہرے والا آدمی چھرا لہرانے لگا۔

"پھر توڑ دو نا تالا جی!" دوسرے نے زمین پر لٹکتے ہوئے کمربند سے اپنا اُلجھتا ہوا پاؤں نکال کر کہا۔ "لیکن سوچو تو ___ تالا پڑا ہے۔

بھلا گھر میں کون ہوگا؟" اس نے لوگوں کو سمجھانا چاہا۔ "کوئی نہیں ہوگا تو کیا یہ جادو کا کھیل ہو رہا ہے؟" تیسرا سرخ سرخ آنکھیں نکال کر نالی کی طرف اشارہ کرنے لگا ___ چوڑی اتھلی نالی میں بلڈنگ سے آتا ہوا صابن کا جھاگ ملا پانی کیچڑ میں رینگ رہا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے کہ غسل فرمایا گیا ہے۔" چوتھا شخص اپنی قمیض سے چہرا صاف کرنے لگا اور وہ ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا کرے۔ اس وقت وہ سپاہیوں کو بہت دور پولیس چوکی پر چھوڑ کر آیا تھا اور پولیس کا کہیں دور دور پتہ نہ تھا۔

"تالا توڑ دو جی۔!" کئی آوازیں ایک ساتھ جھنجھنائیں۔

"لیکن دیکھو نا' انسانیت کا تو یہ تقاضا ہے ___" وہ انتقام کے جوش سے کھوئے ہوئے دماغوں پر انسانیت کے تقاضوں کے چھینٹے دینا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی بات بیچ ہی سے جھپٹ لی گئی۔

"جب ہماری ماؤں' بہنوں' اور ہمارے بھائیوں کو خون میں نہلایا جا رہا تھا۔ جب انسانیت کہاں تھی اور جب آپ کہاں تھے؟" کئی آدمیوں نے ایک ساتھ سوال کر دیا۔

"اپنی انسانیت کے ساتھ سو رہے ہوں گے۔" بھیانک صورت اور سرخ آنکھوں والے نے شیطانی قہقہہ لگایا۔

"لیکن دیکھو نا ___" اس کے دونوں ہاتھ بلند ہو کر جھک گئے۔

"تالا توڑا جائے گا۔ آپ کیوں منع کر رہے ہیں؟" لوگ اسے ایسی نظروں سے دیکھنے لگے جیسے وہ ان میں سے ایک نہیں۔

"میں منع نہیں کرتا تالا ضرور توڑ دو۔" اس نے بے بسی سے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس کی بات کوئی بھی نہ سنے گا اور اگر زیادہ مخالفت کی تو اسے بھی چیر پھاڑ کر پھینک دیں گے۔ تالے کو تھوڑی ہی دیر میں کنڈے سے جدا کر دیا گیا اور وہ سب اندر داخل ہو گئے۔ وہ سب کے پیچھے تھا اور جیسے اس کی روح پھڑک پھڑک کر رو رہی تھی ___ وہ چھپے ہوئے انسان کی جان بچانے کے لئے تیزی سے سوچنے لگا اور اچانک اس کے ذہن نے جان بچانے کی ایک موہوم سی ترکیب سوچ ہی لی۔

"دیکھو یوں اندھا دھند آگے مت بڑھو۔ ممکن ہے کہ اس کے پاس بندوق ہو۔ میرے پاس رائفل ہے میں آگے چلتا ہوں تم سب دبے قدموں میرے پیچھے چلو۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ سب اس کا کہا مان کر اس کے پیچھے ہو لئے۔ وہ آہستہ آہستہ سیڑھیاں طے کرنے لگا ___ ایک دو تین ___ سیڑھیاں جیسے نہ ختم ہونے والی کڑی ہو گئی تھیں۔ وہ سارا دن کام کرنے کی وجہ سے بہت تھکا ہوا تھا۔ اس کا جسم اور دل و دماغ سب ہی نڈھال ہو گئے تھے۔ لیکن اس وقت وہ ذرا بھی تھکان نہ محسوس کر رہا تھا وہ سب سے آگے تھا اور برابر سوچ رہا تھا کہ جب پہلے اس اونچی بلڈنگ میں قتل و خون کا بازار گرم کر لیا گیا تھا' ایک کو بھی تو اپنے حساب میں نہ چھوڑا تھا۔ پھر بھی وہ چھپ کر اپنی جان بچا گیا۔ اس وقت بھی وہ جیسے ہی اسے نظر آئے گا اسے چھپ جانے کا اشارہ کر دے گا۔ اسے بتا دے گا کہ موت تم سے چند قدم کے فاصلے پر لپکی چلی آ رہی ہے۔ یقیناً اس گھر میں ایسی جگہ ضرور ہو گی جس میں وہ پہلے کی طرح چھپ سکتا ہے۔

پہلی منزل ___ دوسری ___ تیسری ___ ہر منزل کے ایک ایک کونے کو چھان مارا ہر کمرے میں سب سے پہلے وہ داخل ہوتا تھا۔ وہاں خاموشی اور ویرانی کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ الوؤں کا راج ہے۔ لیکن جب چوتھی منزل پر جانے کے لئے قدم اٹھ رہے تھے تو نہ جانے کیوں اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کا دل پھڑک پھڑک کر دعائیں کر رہا تھا کہ وہاں بھی کوئی نہ ہو۔ کوئی نہیں۔ وہاں بھی الوؤں کا راج ہو ___ وہ انسانی تراش خراش کے ایسے نمونے دیکھ چکا تھا کہ اب اپنے میں کوئی اور نمونہ دیکھنے کی سکت نہ پاتا تھا ___ اس کے قدم تیز ہو گئے تھے۔ اس نے پیچھے دبے دبے قدموں آنے والوں کو کئی گز پیچھے چھوڑ دیا تھا اور جب سیڑھیاں ختم ہوتے ہی سب سے پہلے سامنے پڑنے والے کمرے میں داخل ہوا تو جیسے دم بخود رہ گیا۔ نیلے صاف ستھرے لباس میں ملبوس ایک بوٹے سے قد کی خوبصورت لڑکی اس کے سامنے زمین پر بیٹھی تھی۔ اس کی ناک سُرخ تھی۔ پپوٹے سرخ اور پھولے ہوئے' آنکھیں

منڈی منڈی اور جسم نڈھال' اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور وہ ہاتھ میں کنگھا تھامے سامنے رکھے ہوئے آئینے میں نیم وا آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے پاس ہی زمین پر صابن دانی' تولیہ' کلپ اور بال پنیں پڑی ہوئی تھیں ___ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا تھا کہ اس کے سامنے کوئی جیتا جاگتا انسان ہے۔ وہ کوئی خوبصورت روح ہے' وہ کوئی پری ہے' لیکن جب لڑکی نے اپنی بوجھل آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا اور اس کے ہاتھ سے کنگھا چھٹ کر زمین پر گر گیا تو اس کے جیتے جاگتے وجود کا احساس ہوا' اور پھر اسے بچانے کے لئے اس کی روح پھڑکی۔ اس نے اسے چھپ جانے کے لئے اشارہ کیا۔ آہستہ سے اسے بتایا کہ لوگ پیچھے آرہے ہیں۔ مگر لڑکی جیسے اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی تھی۔ اسے ہلکی سی جنبش بھی نہ ہوئی۔ لڑکی نے بس ایک بار اسے بے بسی سے دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ سب لوگ کمرے میں گھس آئے۔ ان کے لہراتے ہوئے خنجر ے چمک گئے۔ وہ سب شیطانی ہنسی ہنسنے لگے۔

"پہاڑ کھود ا تھا تو چوہیا نکلی۔" سرخ آنکھوں والا لڑکی کی طرف بڑھا اور اسے محسوس ہوا کہ زور سے زلزلہ آگیا ہے۔ لڑکی کا چہرہ ایک دم سفید ہو رہا تھا۔

"رحم کرو۔ اسے مت چھونا۔" وہ لڑکی اور سرخ آنکھوں والے کے درمیان آکر پاگلوں کی طرح چیخنے لگا۔

"ارے تو کیا بدن میلا ہو جائے گا۔ محنت کریں بی فاختہ' کوے میوے کھائیں۔ اچی اپنی راہ لگئے۔" ایک نے کہا اور سب پھر ہنسنے لگے۔ دو آدمیوں نے دھکے دے کر اسے لڑکی کے پاس سے ہٹا دیا۔

"نہیں۔ نہیں ___" وہ پھر لڑکی کے سامنے آجانا چاہتا تھا کہ سرخ آنکھوں والے نے اپنا چھرا اس کے سینے پر رکھ دیا ___ پھر ایک نے لڑکی کو اٹھا کر بھیڑ کی طرح کاندھے پر ڈال لیا۔ لڑکی کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی' اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ لیکن جب وہ لڑکی کو لے کر جانے لگے تو اس نے اپنی لٹکتی ہوئی باہیں اس کی طرف پھیلا دیں۔ اس کا جی چاہا کہ کاش اس وقت تو سچ مچ وہ چھرا اس کے سینے کے پار ہو جاتا۔ وہ بے چین ہو کر اس کی طرف بڑھا مگر اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹا دیا گیا اور سرخ آنکھوں والے نے آگے بڑھ کر لڑکی کی پھیلی ہوئی باہیں اپنے گلے میں ڈال لیں۔ لڑکی کی آنکھیں جیسے بے انتہا کرب سے بند ہو گئیں۔

پھر آن کی آن میں کمرہ خالی تھا۔ پہلے سے زیادہ ویران اور خاموش۔ وہ سب جا چکے تھے اور وہ اسی جگہ زمین پر بیٹھا تھا جہاں لڑکی ذرا دیر پہلے کنگھی کر رہی تھی۔ وہ پھیلی ہوئی باہوں کا سہارا نہ بن سکا تھا۔ وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے سینے میں کوئی ضدی ساجذبہ مچل مچل کر اسے رلا رہا تھا۔ اس نے جانے کتنی جوان عورتوں کو اغوا ہوتے دیکھا۔ ان کی چیخیں' ان کی فریادیں سنی تھیں۔ مگر اس طرح کوئی بھی تو اس کے دل پر اثر نہ کر سکا تھا۔ مگر یہ گم سم لڑکی صرف باہیں پھیلا کر اسے کس قدر متاثر کر گئی تھی۔ اس کے دل جیسے نازک گوشت میں بھرپور چٹکی لے گئی تھی۔

جب وہ جی بھر کر رو چکا تو اس نے قدموں سے روندی ہوئی بال پنوں اور کلپوں کو سمیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ انہیں دیکھتا رہا' انہیں چھوتا رہا اور ہلکی سی نم تولیہ کو اٹھا کر سہلاتا رہا اور پھر اس بستر کو دیکھنے لگا جس پر اس قدر شکنیں پڑی ہوئی تھیں کہ جیسے اس پر مسلسل کئی دن تک کوئی پڑا کروٹیں بدلتا رہا ہو' پاؤں رگڑتا رہا ہو۔ وہ سوچنے لگا کہ اس خوبصورت اور عجیب لڑکی نے تین دن' تین راتیں اس بستر پر تڑپ کر گذاری ہیں' اور پھر وہ اٹھ کر آہستہ آہستہ بستر کی شکنیں درست کرنے لگا۔ تکیہ پر جگہ جگہ آنسوؤں کے بڑے بڑے دھبے پڑے ہوئے تھے۔ تین دن' مسلسل تین دن تک روتی رہی اور پھر اس نے تھکن سے نڈھال ہو کر منہ دھویا تھا۔ تاکہ اس میں پھر رونے کی سکت پیدا ہو جائے ___ اور پھر وہ اپنے بال سنوارنے بیٹھ گئی تھی۔ لیکن بال کیوں سنوار رہی تھی؟ اس نے صابن سے منہ کیوں دھویا ___ اگر تھک گئی تھی تو منہ پر یوں ہی پانی کے چھینٹے بھی تو دے سکتی تھی۔ مگر اس نے تو باقاعدہ صابن سے منہ دھویا تھا اور انہماک سے سنگار کر رہی تھی ___ شہر میں سناٹا تھا' اس کی بلڈنگ میں سناٹا تھا' موت سب کو نگل گئی تھی۔ پوری بلڈنگ میں بھیانک ویرانی تھی۔

زندگی کا آس پاس کیا دور دور پتہ نہ تھا اور وہ سنگار کر رہی تھی۔ اس تنہا خاموش کمرے میں مسلسل تین دن رہ چکنے کے بعد سنگار کر رہی تھی۔ تھکن سے نڈھال اور بیزار، آخر وہ کس کے لئے سنگار کر رہی تھی۔ کیوں ___ وہ کون سا جذبہ تھا۔ کتنی عجیب، کتنی حسین لڑکی ___ اور جب اسے اٹھا کر لے گئے تو وہ چپ چاپ چلی گئی ___ اور پھر اس کے دل و دماغ کو دو پھیلی ہوئی باہوں نے جکڑ لیا۔ کاش وہ اس تھکی تھکی لڑکی کا سر اپنے زانو پر رکھ سکتا اس کے سرخ پھولے ہوئے پپوٹوں کو سہلا سکتا۔ وہ اس کے لئے وہ سب کچھ کر سکتا جو وہ چاہتی تھی اور پھر کچھ نہ کر سکنے کے جذبے نے اسے بے چین کر دیا۔ اس نے سرہانے سے تکیہ اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ تکئے کے نیچے ایک کاغذ پڑا تھا۔ میلا بوسیدہ۔ وہ اسے کھول کر پڑھنے لگا۔ "میری جان!" ___ وہ پورا خط جلدی جلدی پڑھ گیا۔ لیکن آخر میں جب وہ پڑھ رہا تھا کہ "میں تم سے جلد ہی آکر ملنے والا ہوں۔ میں تمہیں دیکھنے کے لئے بے حد بے چین ہوں۔ اتنا بے چین کہ اگر میری راہ میں کوئی بڑے سے بڑا طوفان بھی حائل ہو جائے تو وہ مجھے تم تک پہنچنے سے نہ روک سکے گا۔ میں تمہارے پاس سیدھا تمہارے کمرے میں پہنچوں گا۔ جہاں تم بنی سنوری بیٹھی میری راہ دیکھ رہی ہو گی اور" ___ ہاتھ کانپے۔ خط چھوٹ کر زمین پر گر گیا ___

نیچے اچانک شور ہونے لگا۔ دھادھم کی تیز آوازیں آنے لگیں۔ شاید قریب کی کسی بلڈنگ کا سامان لوٹا جا رہا تھا۔ اس نے بال پنیں کلپ اٹھا کر جیب میں ڈال لئے اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے سیڑھیاں طے کر کے چپ چاپ گھر کی طرف چل پڑا۔

سوچتے سوچتے اس نے ایک بار پھر نالی کی طرف دیکھا۔ پانی بہہ چکا تھا اور صابن کا جھاگ بجھ کر ختم ہو چکا تھا۔

جینی

شفیق الرحمٰن

ہوائی جہاز پر سوار ہوتے وقت مجھے کچھ شبہ سا ہوا۔ نیلے لباس والی لڑکی سے پوچھا تو اس نے بھی اثبات میں سر ہلایا' جب ہم جہاز سے اترے تو مجھے یقین ہو گیا اور میں نے پائپ پیتے آکسفورڈ لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے پائیلٹ کو دبوچ لیا۔ ہم مدتوں کے بعد ملے تھے کالج میں دیر تک اکٹھے رہے کچھ عرصہ تک خط و کتابت بھی رہی۔ پھر ایک دوسرے کے لئے معدوم ہو گئے اتنے دنوں کے بعد اور اتنی دور اچانک ملاقات بڑی عجیب سی معلوم ہو رہی تھی۔

طے ہوا کہ یہ شام کسی اچھی جگہ گزاری جائے اور بیتے دنوں کی یاد میں جشن منایا جائے۔ میں نے اپنا سفر ایک روز کے لئے ملتوی کر دیا۔

جب باتیں ہو رہی تھیں تو میں نے دیکھا کہ وہ کافی حد تک بدل چکا تھا مٹاپے نے اس کے تیکھے خد و خال کو مبہم بنا دیا تھا اس کی آنکھوں کا وہ تجسس' نگاہوں کی وہ بے چینی' وہ ذہین گفتگو سب مفقود ہو چکے تھے وہ عامیانہ سی گفتگو کر رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنی زندگی اور ماحول سے اس قدر مطمئن ہے کہ اس نے سوچنا بالکل ترک کر دیا ہے۔ دیر تک ہم پرانی باتیں دہراتے رہے۔

سہ پہر کو وہ مجھے ایک اینگلو انڈین لڑکی کے ہاں لے گیا جسے وہ شام کو مدعو کرنا چاہتا تھا لڑکی نے بتایا کہ شام کا وقت وہ گرجے کے لئے وقف کر چکی ہے۔ ہم ایک اور لڑکی کے ہاں گئے اس نے بھی معذرت چاہی کیوں کہ اس کی طبیعت ناساز تھی۔ پھر تیسری کے گھر پہنچے اگرچہ دوسرے کمرے سے خوشبوئیں بھی آ رہی تھیں اور کبھی کبھار آہٹ بھی سنائی دے جاتی تھی لیکن دروازہ نہیں کھلا وہ ایک اور شناسا لڑکی کے ہاں جانا چاہتا تھا لیکن میں نے منع کر دیا تھا کہ کوئی ضرورت نہیں اور پھر اگر کوئی اور ساتھ ہوا تو اچھی طرح باتیں نہ کر سکیں گے۔ واپس آ کر اس نے ٹیلیفون پر کوشش کی تیسری لڑکی گھر پہنچ چکی تھی لیکن شام کو اس کی امّی اسے نانی جان کے ہاں لے جا رہی تھی۔

شام ہوئی تو ہم وہاں کے سب سے بڑے ہوٹل میں گئے رقص کا پروگرام بھی تھا۔ اس نے پینا شروع کر دی میرے لئے بھی انڈیلی اور اصرار کرنے لگا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔

میں نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے چھوا' کچھ دیر گلاس سے کھیلتا رہا پھر ٹہلتا ٹہلتا دریچے تک گیا ایک بڑے سے گملے میں انڈیل کر واپس آ گیا۔ اس نے دوسری مرتبہ انڈیلی مجھے بھی دی میں پھر اٹھا اور اپنا حصہ کھڑکی سے باہر پھینک آیا۔

وہ اپنی روزانہ زندگی کی باتیں سنا رہا تھا کمپنی کی لڑکیوں کے متعلق جو نہایت طوطا چشم تھیں۔ شراب کے متعلق جو دن بدن مہنگی ہوتی جا رہی تھی۔ اپنے معاشقوں کے متعلق جو اسے بے حد پریشان رکھتے تھے۔ اس کی بیوی بھی اسی شہر میں رہتی تھی۔ لیکن وہ اس سے مہینوں نہ ملتا۔ جب کبھی بھولے سے گھر جاتا تو وہ اتنے سوال پوچھتی کہ عاجز آ جاتا اتنا نہیں سمجھتی کہ ایک ہواباز کی زندگی کس قدر خطرناک زندگی ہے۔ اگرچہ یہ زندگی اس نے خوب منتخب کی تھی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دفعتاً ہم نے اس لڑکی کو رقص گاہ میں دیکھا جسے اس وقت کمرے میں ہونا چاہئے تھا۔ وہ ایک لڑکے کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ اس کے بعد وہ لڑکی آگئی جس کی طبیعت ناساز تھی پھر معلوم ہوا کہ تیسری لڑکی بھی ہمارے سامنے رقص کر رہی ہے اپنی امی یا نانی جان کے ساتھ نہیں' ایک دوسرے ہواباز کے ساتھ۔

وہ اپنی قسمت کو کوسنے لگا' نہ جانے یہ لڑکیاں ہمیشہ اسی کو کیوں دھوکہ دیتی ہیں۔ ہمیشہ دغا دیتی ہیں آج تک کسی لڑکی نے اسے دل سے نہیں چاہا۔ یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجیڈی ہے۔

وہ گلاس پر گلاس خالی کئے جا رہا تھا میرے حصے کی ساری شراب گملوں اور پودوں کو سیراب کر رہی تھی۔ اسے حیرت تھی کہ مجھ جیسا لڑکا جو کالج کے دنوں میں باقاعدہ سگریٹ بھی نہ پیتا اب ایسا شرابی ہو گیا کہ اتنی پی چکنے کے بعد بھی ہوش میں ہے۔ اس کے خیال میں ایسے شخص کو پلانا قیمتی شراب کا ستیاناس کرنا تھا۔

پھر ان اجنبی چہروں میں ایک جانا پہچانا مانوس چہرہ دکھائی دیا۔ یہ جینی تھی۔ جو رقص کا لباس پہنے ایک ادھیڑ عمر کے شخص کے ساتھ ابھی ابھی آئی تھی۔ ہم دونوں اُٹھے' ہمیں دیکھ کر جینی کا مسکراتا ہوا چہرہ کھل گیا۔ وہ بڑے تپاک سے ملی تعارف ہوا ____ میرے خاوند سے ملئے ____ اور یہ دونوں میرے پرانے دوست ہیں ____

میں نے ہاتھ ملاتے وقت اس کے خاوند کو مبارکباد دی ____ اور کہا کہ وہ دنیا کا سب سے خوش نصیب انسان ہے۔

میں نے اسے غور سے دیکھا وہ چالیس سے اوپر کا ہوگا۔ اچھا خاصا سیاہ رنگ' سندلی تھکی تھکی آنکھیں' بے حد معمولی شکل پست قد۔ اگر وہ جینی کا خاوند نہ ہوتا تو شاید ہم اس کی طرف دوسری مرتبہ نہ دیکھتے۔ لیکن جینی کی مسکراتی ہوئی آنکھیں اس کے سوا اور کسی کی طرف دیکھتی ہی نہ تھیں۔ وہ اس کی تعریفیں کر رہی تھی کہ وہ قریب کی بندرگاہ کا سب سے بڑا بیرسٹر ہے اس علاقے میں سب سے مشہور شخص ہے۔ میں نے جینی کو رقص کے لئے کہا اس نے محسوس کیا کہ وہ بے حد مسرور ہے۔ اس قدر مسرور شاید میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا اس کے چہرے کی چمک دمک ویسی ہی ہے اس کے ہونٹوں کی وہ دلآویز مخمور مسکراہٹ جوں کی توں ہے۔ وہ مسکراہٹ جو اس قدر مشہور تھی' جسے مونالزا کی مسکراہٹ سے تشبیہ دی جاتی تھی ____ نہایت پر اسرار اور نافہم مسکراہٹ۔ جس کی گہرائیوں کا کسی کو علم نہ ہو سکا۔ جو ہمیشہ راز رہی۔

اور یہی مسکراہٹ میں نے سالہا سال سے دیکھی تھی۔ اس مسکراہٹ سے میں مدتوں شناسا رہا۔ جینی کے خاوند کے دوست آگئے اور مقامی باتیں ہونے لگیں۔ کچھ دیر کے بعد میں اور میرا دوست اٹھ کر واپس اپنی جگہ چلے آئے' جہاں بوتل اس کی منتظر تھی۔

میں نے اس سے جینی کے متعلق باتیں کرنا چاہیں لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ ان تین لڑکیوں کے لئے اداس تھا جو اسے دھوکہ دے کر دوسروں کے ساتھ چلی آئیں۔ آج یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا پہلے بھی بارہا ہو چکا تھا اور یہ لڑکیاں اجنبی نہیں تھیں' پرانی دوست تھیں اس کے ساتھ باہر جا چکی تھیں۔ اس سے بیش قیمت تحائف لے چکی تھیں دراصل اب ایسی ٹھوکریں اسے ہر طرف سے لگ رہی تھیں سر مس 'برج' شاہر جگہ وہ ہار رہا تھا۔ ایک ادنےٰ فلم کمپنی کی ایکٹرس لڑکی جس کے لئے اس نے سمندر کے کنارے مکان لیا اسے چھوڑ کر کسی بوڑھے سیٹھ کے ساتھ چلی گئی __ اور میں دزدیدہ نگاہوں سے اس طرف دیکھ رہا تھا جہاں جینی تھی۔ وفور مسرت سے اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا اس کی آنکھیں روشن تھیں ____ وہی آنکھیں جو کبھی غمگین اور نمناک رہا کرتیں اب مسرور تھیں۔ رخسار جن پر مدتوں آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرتی ہیں اب تاباں تھے۔ وہ کھلی ہوئی مسکراہٹ شاہد تھی کہ دل سے اس شدید الم کا احساس جا چکا ہے جو جینی کی قسمت بن چکا تھا۔ اس خوشی میں اب غم کی رمق تک نہیں دکھائی دیتی تھی۔

لیکن اتنی زاید مسرت کیسی تھی؟ یہ انبساط کیسا تھا؟ اور اس پر اسرار مسکراہٹ کے پیچھے کیا تھا؟

میں صرف اس کے چہرے کو دیکھ سکتا تھا۔ اس کی روح بہت دور تھی۔ وہاں تک میری نگاہیں نہیں پہنچ سکتی تھیں کیا وہاں کوئی عظیم طوفان بپا تھا؟ اذیت کن کربناک شدید تلاطم۔ یا جلتے ہوئے شعلوں کی تپش نے بہت کچھ بھسم کر دیا تھا؟ یا وہاں سب کچھ یخ ہو چکا تھا؟

برف کے تودوں کے سوا کچھ بھی نہ رہا تھا؟
اس کا جواب میں نے اس کی مسکراہٹ سے مانگا۔
وہ لگاتار اپنے خاوند کے ساتھ رقص کرتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔ کئی مرتبہ وہ بالکل قریب سے گزرے اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرائی پھر جیسے وہ مسکراہٹ پھیلتی گئی۔ اس نے ماضی اور حال کی حدوں کو محیط کر لیا۔ وہ سب تصویریں سامنے آنے لگیں جو ذہن کے تاریک گوشوں میں مدفون تھیں۔
میں نے برسوں پہلے اسے یونیورسٹی کے مباحثے میں دیکھا۔ میرے ساتھ میرا پرانا رفیق اور ہم جماعت جی بی تھا۔ ہم دونوں بہترین مقرر تھے۔ سٹیج پر ہمیشہ فاتح کی طرح جاتا اور فاتح کی طرح لوٹتا۔ اس کی تقریر ختم ہوئی تو ایک لڑکی سٹیج پر آئی۔ گھنگھریالے بال' جھکی ہوئی آنکھیں' لبوں پر مجوب مسکراہٹ۔ ملا جلا انگریزی اور ہندوستانی لباس پہنے ___
ہال میں سرگوشیاں ہونے لگیں ہمیں بتایا گیا کہ یہ نئی نئی کہیں سے آئی ہے اس کا نام کچھ اور ہے لیکن اسے لیلےٰ کہتے ہیں۔ شاید اس کی ملیح رنگت اور گھنگھریالی پریشان زلفوں کی وجہ سے۔
کچھ دیر وہ شرماتی رہی' بول ہی نہ سکی۔ پھر ذرا سنبھل کر اس نے جی بی کی تقریر کی مخالفت شروع کی۔ ایسے ایسے نکتے لائی کہ سب حیران رہ گئے۔ جی بی کی تقریر بالکل بے معنی معلوم ہونے لگی۔
جب وہ سٹیج سے اتری تو دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ پھر معلوم ہوا کہ پہلا انعام جی بی اور اس لڑکی میں تقسیم کیا جائے لیکن جی بی نے ججوں سے درخواست کی کہ انعام کی وہی حقدار ہے اور اسی کو ملنا چاہئے جی بی کے رویے کو سراہا گیا ہجوم میں ہیجان پھیل گیا۔ مدتوں کے بعد ایک لڑکی پہلا انعام جیت رہی تھی' وہ بھی ایسی لڑکی جو بالکل نووارد تھی۔
جب لیلےٰ سٹیج پر چاندی کا بڑا سا وزنی کپ لینے آئی تو اس کی پریشان زلفیں اور پریشان ہو گئیں نگاہیں اور جھک گئیں جب اس سے اتنا بڑا کپ نہ سنبھالا گیا تو جی بی نے لپک کر کپ کا چوبی حصہ خود اٹھالیا۔ لیلےٰ نے جی بی کو جھکی ہوئی نگاہوں سے ایک مرتبہ دیکھا۔
اس بھولی بھالی اور الھڑ لڑکی سے ہمارا تعارف یوں ہوا۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا تانتا بندھ گیا۔ جی بی کالج کا ہیرو تھا۔ لڑکوں اور استادوں میں ہر دلعزیز کالج میں سب سے ذہین' چست' ہنس مکھ اور خوش پوشاک۔ بڑے امیر والدین کا اکلوتا بیٹا۔ اس کی کار پروفیسروں کی کاروں سے بھی بڑھیا تھی۔ جہاں کہیں ادبی تقریب ہوتی مجھے اور جی بی کو مدعو کیا جاتا۔ ہمارے کہنے پر لیلےٰ کو بھی بلایا جاتا ____ لیلےٰ کے خدو خال حسین نہیں تھے۔ اگر اسے نقادانہ طور سے دیکھا جاتا تو وہ حسین ہرگز نہیں تھی __________ لیکن اگر حسین خدوخال کے بغیر بھی کوئی خوبصورت ہو سکتا ہے تو وہ لیلےٰ تھی۔ اس کی لہراتی ہوئی زلفیں جھکی ہوئی شرمیلی آنکھیں' مسکراتے ہوئے ننھے منے ہونٹ ملیح چمپئی رنگت ___ اور نہایت معصوم باتیں ___ سب مل کر نرالی جاذبیت پیدا کر دیتے۔ بعض اوقات تو وہ بے حد پیاری معلوم ہوتی۔
وہ ہوسٹل میں رہتی تھی' سب سے الگ تھلگ۔ کبھی ہم نے اسے کسی کے ساتھ نہیں دیکھا۔ اس کے والدین کے متعلق طرح طرح کی افواہیں سننے میں آتیں ان کے خاندان میں انگریزی اور پرتگالی خون کی آمیزش تھی۔ اس کی والدہ جنوبی ہندوستان کی تھی۔ اس لئے نہ ان کا کوئی خاص مذہب تھا نہ کوئی نسل۔ لیلےٰ کا نام بھی عجیب سا تھا' اس کا لباس بھی ملا جلا ہوتا وہ اپنے والدین کے ذکر سے احتراز کرتی۔ یہ مشہور تھا کہ ان کی خانگی زندگی نہایت ناخوشگوار ہے وہ ہمیشہ جدا رہتے ہیں۔ ایک دفعہ ان کا تنازعہ عدالت تک پہنچ چکا ہے۔
پھر کسی نے یونہی کہہ دیا کہ لیلےٰ جی بی کی طرف دیکھتی رہتی ہے' یہ افواہ بنی' پھر عام ہو گئی ہر جگہ اس نئے معاشقے پر تبصرے ہونے لگے۔ سب نے دیکھا کہ لیلےٰ کے دل کا راز عیاں ہو چکا تھا۔ وہ جی بی کو چاہتی ہے طرح طرح کے بہانوں سے وہ اسے ملتی۔ جانے پہچانے راستوں سے ایسے وقت گزرتی کہ جی بی نظر آ جاتا جی بی کو دیکھ کر اسے دنیا بھر کی نعمتیں مل جاتیں یہ نوزائیدہ محبت اس کی زندگی میں طرح طرح کی تبدیلیاں لے آئی۔ وہ مسرور رہنے لگی۔ ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لینے لگی اس کا اجنبی لہجہ درست ہو تا گیا' اس کی گفتگو میں

منے س آگئی۔

لیکن جی بی کچھ اتنا متاثر نہیں ہوا۔ اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کتنی ہی مرتبہ اس اسے محبت خراج کے طور پر ملی تھی۔ وہ لیلے سے ملتا اسے ملنے کے موقعے دیتا خوب باتیں کرتا بڑی شوخ اور چنچل قسم کی گفتگو' جس کا وہ عادی تھا۔

چاندنی رات میں دور ایک باغ میں تقریب ہوئی۔ لڑکیوں کے ساتھ نیلی بھی آئی۔ جی آبی ہمارے ساتھ نہیں آیا معلوم ہوا کہ وہ ایک انگریز لڑکی کو لے کر آئے گا۔ جس کا شہر بھر میں چرچا تھا جو نوجوانوں کی گفتگو کا محبوب ترین موضوع تھی۔ یہ اس کی نئی محبوبہ تھی۔

جی آبی دیر میں آیا کار سے وہ اکیلا اترا۔ وہ لڑکی اس کے ساتھ نہیں تھی' وہ مایوس اور کھویا کھویا سا تھا اور فوراً واپس جانا چاہتا تھا لیکن اسے اجازت نہ ملی' وہ تو ایسی محفلوں کی جان تھا۔ جب وہ اپنا ساز ستار اٹھا تو لیلے اسے ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جیسے آئینے میں خود اپنا عکس دیکھ رہی ہو جیسے خود اپنی روح کو کسی اور روپ میں دیکھ رہی ہو۔ جی بی نے خلاف توقع غم آمیز اشعار سنائے جن میں شکوے تھے' التجا تھی اور وہ اشعار کسی خاص ہستی کے لئے تھے جو وہاں نہیں تھی۔

لیلے نے کئی مرتبہ اس سے باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بدستور خاموش رہا۔ میں نے اسے ٹوکا' ایک طرف لے جا کر ڈانٹا بھی لیکن جیسے وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ ہم دونوں اکیلے کھڑے تھے کہ لیلے آ گئی۔ جی بی کچھ دیر اس کی طرف یونہی دیکھتا رہا پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک اونچے سرو کے پیچھے لے گیا وہ مبہوت بنی چپ چاپ چلی گئی۔ جی بی نے اسے بازوؤں میں لے کر چوم لیا پہلے بوسے پر وہ کانپ اٹھی۔ ان جانی لذت سے مغلوب ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور جی بی کے سینے سے سر لگا دیا وہ اسے پھیکے ہونٹوں سے چومتا رہا ایسے الفاظ اس کے لبوں سے نکلتے رہے جو لیلے کے لئے نہیں کسی اور کے لئے تھے۔ اس کے بازوؤں میں لیلے نہیں تھی' کوئی اور بے وفا حسینہ تھی جس کے لئے وہ بے تاب تھا۔

لیلے شدت احساس سے آنکھیں بند کئے خاموش کھڑی رہی' وہ جی بی اور اس کے بوسوں کی دنیا سے دور نکل گئی۔ وہ شعر و نغمے کی وادیوں میں جا پہنچی جہاں اس کے سہمے ہوئے خوابوں کی تعبیریں آباد تھیں جہاں فضاؤں میں اس کی معصوم امنگیں تحلیل ہو چکی تھیں' جہاں کیف و خمار چھائے ہوئے تھے۔ جہاں صرف رعنائیاں تھیں اور محبت پاشیاں!

اس کے بعد لیلے کی نئی زندگی شروع ہوئی۔ اس کی دنیا میں ہر چیز پر نیا نکھار آ گیا جو پہلے محض تخیل تھا وہ تخلیق ہو گیا۔ غنچے چٹکے' خوش الحان طیور چہچہانے لگے۔ رنگ برنگے پھولوں کی خوشبوؤں نے ہوائیں بوجھل کر دیں۔ زمین سے آسمان تک قوس قزح کے رنگ مچلنے لگے' ہر شے کا خوابیدہ حسن جاگ اٹھا۔ اس کے بعد نہ دنیا رہی اور نہ زندگی۔ محض خواب تخیل اور حقیقت کی حدوں پر چھا گیا۔

بہت دیر کے بعد لیلے اس خواب سے چونکی۔ دفعتاً اس پر اس بھیانک حقیقت کا انکشاف ہوا کہ وہ جی بی کے لئے محض ایک کھلونا تھی۔ جی بی کو اس سے محبت نہیں تھی وہ جی بی کے لئے ان متعدد لڑکیوں میں سے ایک تھی جو اس کا تعاقب کرتی تھیں۔ بغیر کسی صلے کے اسے چاہتی تھیں۔

جب بات بہت مشہور ہوئی تو جی بی کترانے لگا اس نے تقریبوں میں آنا بند کر دیا۔ لیلے کو دیکھ کر کار تیز کر دیتا اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا۔

اپنی پہلی محبت کی شکست پر لیلے کو یقین نہ آیا اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔ اس صدمے کو اس نے اپنی روح کی گہرائیوں میں چھپا لیا لیکن اس کی محبت جوں کی توں رہی۔ وہ اس سے ملنے کے بہانے تلاش کرتی اسے خط لکھتی' تحائف بھیجتی۔ وہ دوسرے کالج میں تھی۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح جی بی کو ہر روز دیکھ لیتی۔

ایک روز سب نے لیلے کے خطوط کو نوٹس بورڈ پر دیکھا۔ یہ وہ محبت بھرے خطوط تھے جو اس نے جی بی کو لکھے۔ بہت سے لڑکے یہ خطوط دیکھنے گئے۔ میں بھی گیا سب نے مزے لے لے کر خطوط کو پڑھا دلچسپ فقرے نقل کئے' خوب ہنسے بھی۔

بعد میں جب مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے جی آبی کو برا بھلا کہا' اس کو یہ حرکت ہرگز نہیں کرنی چاہئے تھی۔ وہ کہنے لگا کہ لیلے نے

اسے اس قدر بدنام کر دیا ہے کہ اب وہ اس کے نام سے نفرت کرتا ہے۔ وہ اس سے متاثر ضرور رہا ہے لیکن کسے علم تھا کہ معمولی سا مذاق ایسی شکل اختیار کر لے گا' اور وہ مفت میں بدنام ہو جائے گا۔ محض لیلیٰ کی وجہ سے بقیہ لڑکیاں اس سے دور دور رہنے لگی ہیں۔

جی بی میرا گہرا دوست تھا' ہم دونوں ہم عمر تھے' ہمارے خیالات یکساں تھے ___ میں خاموش ہو گیا۔ دیر تک خطوط کا چرچا رہا' لیلےٰ کئی دن کالج نہیں آئی تنہا گوشوں میں بیٹھ کر رویا کی۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا ___ جو کچھ اسے کہا گیا اس نے خاموشی سے برداشت کیا۔

جی بی نے لیلیٰ کی سہیلیوں کی منتیں کیں کہ اسے سمجھائیں' کسی طرح اسے دور رکھیں اس نے ان راستوں سے گزرنا چھوڑ دیا' جہاں لیلیٰ کے نظر آنے کا امکان ہوتا' اپنے کمرے کی وہ کھڑکیاں مقفل کر دیں جو سڑک کی طرف کھلتی تھیں جن کی طرف لیلےٰ گزرتے ہوئے دیکھ لیا کرتی۔

ایک دن مجھے ترس آگیا' میں جی بی سے خوب لڑا' جہاں ہم اتنی لڑکیوں سے ملتے رہتے ہیں وہاں کبھی کبھی لیلےٰ سے مل لینے میں کیا حرج ہے۔ وہ بولا ___ تمہیں معصومیت اور سادگی پسند ہے مجھے نہیں۔ مجھے ناپختہ اور الھڑ لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔ ذرا ذرا سی بات پر آنسو نکل آتے ہیں۔ خوش ہوئیں تو رونے لگیں' غمگین ہوئیں تو آنسو بہنے لگے۔ دنیا کی کسی چیز کا بھی انہیں علم نہیں۔ ہر چیز خود بتانی پڑتی ہے اور میرے پاس اتنا وقت نہیں مجھے تجربہ کار اور کھیلی ہوئی لڑکیاں زیادہ پسند ہیں۔

جی بی کے اس رویے کا اثر یہ ہوا کہ لیلےٰ اس سے ڈرنے لگی' وہ اسے دور سے دیکھتی کہیں آمنا سامنا ہوتا تو وہ کترا جاتی۔ دوسروں سے جی بی کے متعلق پوچھتی رہی۔ کئی مرتبہ میں نے خود اسے جی بی کے بارے میں باتیں بتائیں اس کی تصویریں بھی دیں جس پر وہ مجھ سے خفا ہو گیا۔

پھر جی بی کو کچھ عرصے کے لئے اپنی تعلیم چھوڑ دینی پڑی۔ اس کے کچھ رشتہ دار دوسرے ملک میں بہت بڑے تجار تھے۔ اسی سلسلے میں جی بی کے والد اسے باہر بھیجنا چاہتے تھے اور ان کے لئے تعلیم اتنی ہی اہم نہ تھی ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بچھڑنے کا بہت افسوس ہوا ایک شام کو ہم اداس بیٹھے تھے کہ میں نے اسے لیلےٰ سے آخری مرتبہ ملنے کو کہا' اس نے انکار کر دیا جب میں نے پرانی دوستی کا واسطہ دلایا تو وہ راضی ہو گیا میں نے لیلیٰ کو بتایا تو اسے یقین نہ آیا اس نے آنسو خشک کئے اپنا بہترین لباس پہنا سہیلیوں سے مانگ کر زیور پہنے' ان کے مشورے سے سنگار کیا اپنے چہرے پر مسکراہٹ اور دل میں آرزوئیں لئے اپنے محبوب سے ملنے گئی۔ اس رات جی بی پئے ہوئے تھا' بعد میں اس نے بتایا کہ اس نے محض میری وجہ سے پی تھی تاکہ وہ لیلیٰ سے پیار بھری باتیں کر سکے۔

اس نے لیلیٰ سے بہت سی باتیں کیں' اسے ہمیشہ مسرور رہنے کو کہا' جلد لوٹنے کے وعدے کئے۔ لیلیٰ کو ایک بار پھر اس فردوسِ گمشدہ کی جھلک دکھائی دی جسے محبت کے پہلے بوسے نے تخلیق کیا تھا۔ لیلےٰ نے اقرار کیا کہ وہ ہمیشہ خوش رہے گی اور اس کا انتظار کرے گی اگر اس کی وجہ سے جی بی کو کوئی تکلیف پہنچی ہو تو وہ سزا کی طالب ہے اگر جی بی حکم دے تو وہ کہیں دور چلی جائے اگر وہ چاہے تو لیلےٰ مر جائے جدا ہوتے وقت اس نے اپنا رومال جی بی کو نشانی کے طور پر دیا۔ یہ رومال جی بی نے مجھے دے دیا کہنے لگا شاید تمہارے پاس محفوظ رہے ورنہ میں تو اسے کہیں ادھر ادھر پھینک دوں گا۔" رومال سے بھینی بھینی خوشبو آ رہی تھی ایک کونے میں سرخ دھاگے سے ننھا سا دل بنا ہوا تھا جسے لیلےٰ نے خود کاڑھا تھا۔

جی بی کے چلے جانے پر لیلیٰ ذرا بھی غمگین نہ ہوئی' اس کے وعدوں کو دل سے لگائے انتظار کرتی رہی یہ انتظار طویل ہوتا گیا۔

پتے زرد ہو کر گر پڑے' پھول مرجھا گئے' ٹہنیاں لنج منج رہ گئیں' خزاں آ گئی۔ وہ نہ آیا۔ جھکڑ چلے سوکھے پتے اڑنے لگے گرد و غبار نے آسمان پر چھا کر چاندنی اداس کر دی' تاروں کو بے نور کر دیا' وحشتیں پھیل گئیں ___ وہ نہ آیا۔

کونپلیں پھوٹیں' ہریالی میں پیلی پیلی سرسوں پھولی' رنگین تتلیاں اڑنے لگیں' غنچے مسکرانے لگے' پرندوں کے نغموں سے ویرانے گونج اٹھے' بہار آ گئی۔ لیکن وہ نہ آیا۔ دن لمبے ہوتے گئے' لمبی لمبی جھڑیاں لگیں۔ سفید بگلوں کی قطاریں سیاہ گھٹاؤں کو چیرتی ہوئی گزر گئیں۔ نیلے بادل آئے نور برسا کر چلے گئے۔ جھیلوں کے کنارے قوسِ قزح سے رنگین ہو گئے ___ لیکن وہ پھر بھی نہ آیا۔

بہت دنوں تک لیلیٰ کھوئی کھوئی سی رہی۔ بہت دیر کے بعد وہ سب کچھ سمجھ سکی۔ جب جی پی لوٹا تو وہ سنبھل چکی تھی۔ جی پی اکیلا نہیں آیا اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔ گوری چٹی فربہ عورت جو کسی لکھ پتی کی بیٹی تھی۔ جس کا گول مول چہرہ کسی قسم کے اظہار سے منزا تھا جس کے دل میں جذبات کے لئے جگہ نہ تھی۔ جو اس ٹھوس اور مادی دنیا میں پیدا ہوئی اور اسی دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔

ایسے اونچے اور امیر گھرانے میں شادی ہو جانے پر سب نے جی پی کو مبارکباد دی۔ اس کی قسمت پر رشک کیا۔

میں لیلیٰ کو بھی جانتا تھا اور جی پی کو بھی یہ محض اتفاق تھا کہ وہ دونوں اس وقت رقص گاہ میں تھے۔ جی پی میرا پرانا دوست تھا جو میرے ساتھ بیٹھا تھا اور پی رہا تھا اور یہ لیلیٰ وہ جینی تھی۔ جو میرے سامنے اپنے خاوند کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔

لیلیٰ کو بدستور چھیڑا جاتا۔ طعنے دیئے جاتے۔ سب اس کا مذاق اڑاتے۔ ایک روز ہم نے سنا کہ وہ کالج چھوڑ کر گھر چلی گئی۔ کچھ دنوں تک اس کا انتظار کیا گیا لیکن وہ واپس نہ آئی۔ آہستہ آہستہ۔ اس کی باتیں بھی بھولتی گئیں۔ کچھ عرصے کے بعد لیلیٰ کا ذکر ایک پرانی بات ہو گئی۔

ایک دن وہ کہیں سے آ کر کالج میں داخل ہوئی۔ اب وہ بالکل بدلی ہوئی تھی اب وہ شرماتی لجاتی سہمی ہوئی لیلیٰ نہیں بلکہ شوخ و بے باک جینی تھی یہ نیا نام اس نے خود اپنے عیسائی نام سے چنا تھا وہ کالج کے قریب ہی ایک عیسائی کنبے میں رہتی۔ صبح صبح جب گردن اونچی کئے نگاہیں اٹھائے سائیکل پر آتی تو لڑکے ٹھٹھک کر رہ جاتے۔ ہر وقت اس کے لبوں پر نہایت بیباک مسکراہٹ ہوتی۔

یونین کا جلسہ ہے تو جینی تقریر کر رہی ہے۔ ڈراما ہے تو وہ ضرور حصہ لے گی۔ مباحثہ ہے تو جینی اچھے اچھوں کی دھجیاں اڑا دے گی۔ اس کی دلیری اور صاف گوئی سے لوگ ڈرتے تھے۔

جینی کی بے باکی کو سراہا جانے لگا اور سب اسے عزت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

ڈے یونین کا صدر تھا' وہ دبلا پتلا سا بنگالی لڑکا تھا اس میں صرف یہ خوبی تھی کہ وہ کئی سال سے یونین کا صدر تھا میری اس کی جان پہچان تب سے ہوئی جب وہ ہوسٹل میں میرا پڑوسی بنا۔ اس کی شاعرانہ باتیں اس کے انوکھے نظریئے۔ اس کا حساس پن' وائلن پر غم ناک نغمے ---- یہ سب مجھے اچھے معلوم ہوئے لیکن مجموعی طور پر بطور انسان کے میں نے اسے کبھی پسند نہیں کیا ویسے اس میں کوئی نمایاں عیب یا خامی نظر نہیں آئی شاید یہ اس کا اجڑا سا حلیہ' اس کی آنکھوں کی مجرمانہ بناوٹ' اس کے چہرے کا فاقہ زدہ اظہار تھا جو مجھے ہمیشہ اس سے دور رکھتا۔

کبھی کبھی شام کو بھی اسے ہمراہ لے جاتا۔ اس طرح اس کی جینی سے ملاقات ہوئی۔

غالباً ڈے کی سب سے بڑی خوبی اس کا انکسار تھا اسے اپنی کمزوریوں کا ہمیشہ احساس رہتا بعض اوقات تو وہ اس قدر کسر نفسی سے کام لیتا کہ ترس آنے لگتا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے وہ رحم کا طلب گار ہے۔ شروع شروع میں شاید جینی کو اس کی یہی ادا بھا گئی۔

وہ جینی میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ پھر جیسے جینی بھی اس کی جانب ملتفت ہوتی گئی۔ جب وہ وائلن پر درد بھرے نغمے سناتا تو اس کی نگاہیں جینی کے چہرے پر جم جاتیں نغمے کی پرواز نہایت مختصر ہوتی۔ ڈے کی انگلیوں سے لے کر جینی کے دل تک ---!

جب وہ دونوں فلسفے کی کتابیں ہاتھ میں لئے بحث میں مصروف ہوتے تو اکثر بہک بہک جاتے آنکھوں آنکھوں میں کچھ اور گفتگو ہونے لگتی۔

ان دونوں کی دوستی اشاروں اور کتابوں کی حدود سے نکل کر کھلم کھلا ملاقاتوں تک پہنچ چکی تھی۔ جینی کو بنگالی موسیقی سے لگاؤ ہو چلا تھا۔ وہ بنگالی زبان سیکھ رہی تھی جب وہ بالوں میں پھول لگا کر ساڑی کو ایک خاص وضع سے پہن کر نکلتی تو بالکل بنگالی لڑکی معلوم ہوتی کالج کی کئی لڑکیاں اسے دیکھ کر بالوں میں پھول لگانے لگیں۔

ان دنوں ہم ڈراما کھیل رہے تھے' دوپہر سے ریہرسل شروع ہو جاتی شام بھی اکٹھے گذرتی۔ اکثر میں اسے گھر چھوڑنے جاتا' اس کے کمرے کی زیبائش خوب ہوتی' کسی روز تو یوں معلوم ہوتا جیسے کمرہ نہیں جنگل ہے۔ دیواروں پر گہرا سبز وال پیپر ہے جس پر درخت اور

گھنی جھاڑیاں بنی ہوئی ہیں گلدانوں میں لمبی لمبی گھاس اور بڑے بڑے پتے ہیں سبز قمقمے روشن ہیں' فرش پر بچھے ہوئے قالینوں کے نقش و نگار' دیوار سے ٹنگی ہوئی تصویریں سبزی مائل پردے' گملوں میں رکھے ہوئے پودے ___ یوں معلوم ہوتا جیسے درندوں کی یہ تصویریں ابھی متحرک ہو جائیں گی۔ پھر کسی روز سب کچھ زرد ہوتا۔ دیواریں' پردے' غلاف' قالین' قمقموں کے شیڈ۔ گلدانوں میں صحرائی پھول اور خشک ٹہنیاں ہوتیں انگیٹھی کے سامنے ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے۔ خیالات کہیں سے کہیں پہنچ جاتے۔ تصور میں لق و دق صحرا پھرنے لگتا۔ تاروں کی چھت تلے حدی خوانوں کا نغمہ گونجنے لگتا۔

پھر کسی روز برف باری کے نظارے آنکھوں کے سامنے آجاتے یہی آرائش کبھی طوفان زدہ سمندر کی یاد دلا دیتی۔ جھاگ اڑاتی ہوئی چنگھاڑتی لہریں' ہوا کے تند و تیز تھپیڑے اور آندھیوں میں پتے کی طرح کانپتا ہوا سفینہ ___!

اس کے کمرے میں کبھی ایک جیسا گلدستہ میں نے دو مرتبہ نہیں دیکھا۔ گلدان میں بڑے بڑے پھول بھی ہیں۔ شوخ پھول بھی ہیں' لیکن صرف ننھی منھی کلیاں نمایاں ہیں' باقی سب رنگ آپس میں گھل مل کر کھو گئے ہیں۔ کبھی غنچے' کلیاں' پھول سب کہیں جا چھپے ہیں' صرف خوشنما وسیع سے پتے سامنے آگئے ہیں اس کے ترتیب دیئے ہوئے گلدستوں کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی کہ ایسے حسین و جمیل پھول بھی آسمان تلے کھلتے ہیں جنھیں گلشن میں نگاہ پہچانتی تک نہیں۔

ایک پروفیسر کی تبدیلی پر باغ میں پارٹی ہوئی طے ہوا کہ وہیں شام کو بارہ دری میں چھوٹا سا ڈرامہ بھی کھیلا جائے۔ جینی کو ایسا پارٹ ملا وہ دن اس نے اکیلے گزارا کسی سے بات نہیں کی دن بھر اداس لیمپوں کی روشنی میں ڈراما شروع ہوا جینی نے اپنا گانا بالکل آخر میں رکھا۔ لیمپ بجھا دیئے گئے۔ سب نے دیکھا کہ درختوں کے جھنڈ سے چاند طلوع ہو رہا تھا وہ ایک بنگالی نظم گا رہی تھی' جس میں چودھویں کے چاند کو مخاطب کیا گیا تھا۔ ڈے وائلن بجا رہا تھا۔ وہ سارا سا گیت اور وائلن کا تھرتھراتا ہوا نغمہ اس کی انگلیوں کی جنبش جسم کے لوچ اور گھنگھرو کی تال پر چاند تارے ناچنے لگے پھر جیسے مندروں میں گھنٹیاں بجنے لگیں دیو داسیاں سنگار کئے کنول کے پھول تھامے آگئیں پجاریوں کے سر جھک گئے۔ فضاؤں میں تقدس برسنے لگا چراغوں سے دھواں اٹھا' دھند بن کر چھا گیا۔ سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ صرف جینی رہ گئی اور اس کا محبوب ___ پجاری اور دیوتا۔

یہ غنائیہ باغ کی اس چاندنی رات میں ختم ہوا۔ ساز اور لے دیر تک ہم آہنگ رہے۔ ڈے نے ان پیار بھرے جذبات کا اظہار کر دیا۔ جنہیں وہ دیر سے چھپائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی بے پایاں محبت کا یقین دلایا۔ یہ بھی کہا کہ مرتے دم تک وہ جینی سے اسی شدت کے ساتھ محبت کرتا رہے گا۔ اس نے اپنے والدین کو سب کچھ لکھ دیا ہے عنقریب اس کی والدہ آئیں گی اور جینی سے ملیں گی۔ پھر وہ جینی کو رسم کے مطابق سنہرا ہار دے گا جس میں دل کی شکل کا لاکٹ پرویا ہوا ہو گا۔ ان دونوں کو ایک بہت بڑی قوت نے آپس میں ملا دیا ہے۔ آرٹ نے۔ وہ دونوں آرٹسٹ ہیں انسان فنا ہو جاتے ہیں آرٹ فنا نہیں ہوتا۔ آرٹ جاوداں ہے۔

میں نے اس کے کمرے میں ساز دیکھے' معلوم ہوا کہ وہ ہندوستانی موسیقی سیکھ رہی ہے مغربی موسیقی سے وہ شناسا تھی میں نے اسے جانے پہچانے نغمے گنگناتے سنا تھا۔ پیانو پر اس کی انگلیاں خوب چلتیں کئی مرتبہ یوں ہوا کہ ریڈیو پر آرکسٹرا سمفنی بجا رہا ہے اور جینی مجھے سمجھا رہی ہے کہ سمفنی ایک نغمہ نہیں مختلف نغموں کا مرکب ہے۔ ایسے نغمے جو مختلف کیفیتوں کو ظاہر کرتے ہیں اور یہ کیفیتیں بغیر کسی تسلسل کے آتی ہیں رنج و مسرت' انبساط و حسرت آشامیاں' شک' وسوسے' امید و بیم' اعتراف غم۔ ہماری مسرتیں کبھی رنج کی آمیزش سے خالی نہیں ہوتیں' اسی طرح غم کی گھٹائیں بھی اکثر بہجت کی کرنوں سے جگمگا اٹھتی ہیں۔ انسان کے دل میں کوئی جذبہ مکمل اور دیرپا نہیں ہوتا۔ یہ کیفیتیں بدلتی رہتی ہیں ___ تبھی سمفنی میں اتنے اتار چڑھاؤ آتے ہیں اور کئی کئی گتیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔

میں نے اسے ہندوستانی راگ راگنیوں کے کچھ ریکارڈ دیئے جنہیں اس نے بڑے شوق سے سنا اسے یہ نغمے نہایت دلکش معلوم ہوئے۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ یہ سب راگ مختلف جذبوں اور کیفیتوں کو ظاہر کرتے ہیں۔

میں نے درباری کی تشریح کی کہ جیسے ایک بہت بڑا ہال ہے' سامنے تخت پر بادشاہ بیٹھا ہے۔ قندیلیں روشن ہیں' فانوس جگمگا رہے

ہیں دور دور تک امراء اور وزراء بیٹھے ہیں پر ہول خاموشی طاری ہے موسیقار کو بلایا جاتا ہے ایسے ماحول میں شوخ موسیقی بے ادبی میں شمار ہوگی غمگین موسیقی بھی موزوں نہیں بلکی پھلکی چیزوں سے بھی موسیقار گریز کرے گا۔ وہ اپنے جوہر دکھانا چاہتا ہے ___ ان سب باتوں کو مد نظر رکھ کر وہ جو چیز چنے گا وہ درباری ہے۔

جینی سنتی رہی۔ پھر ایک روز اس نے مجھے چند تصویریں دکھائیں جو اس نے خود بنائیں تھیں اسے مصوری کا شوق ضرور تھا لیکن یونہی معمولی سا۔ یہ اس کی پہلی کوشش تھی ان تصویروں میں اس نے ذہنی تاثرات برش کے ذریعے کاغذ پر منتقل کئے تھے وہ تاثرات جو مختلف راگنیاں سن کر اس نے محسوس کئے نغمے اس نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے ہندوستانی موسیقی اس کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔ جوگیا کی تصویریں تاحد افق ننھے منھے خودرو پھول کھلے ہوئے تھے' چھوٹے چھوٹے رنگ برنگے پھول جن میں کلیاں بھی شامل تھیں اور ادھ کھلے ہوئے غنچے بھی۔ پتیوں پر شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ پس منظر دور افق کے پرے برفانی چوٹیاں تھیں' اونچی اونچی برف سے لدی ہوئی چوٹیاں ___ جن سے نورانی شعاعیں منعکس تھیں۔ پودوں کے سائے شبنم کے چمکیلے قطرے اور جگمگاتی چوٹیاں ___ سب اس امر کے مشاہدے تھے کہ سورج ابھی ابھی نکلا ہے اور سارے نظارے پر ایک اداس سی دھند پھیلی ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی نوزائیدہ دھند جس نے فضا میں رنگ و بو کے اس طوفان کے باوجود ایک غمگین تاثر پیدا کر دیا تھا۔

دوسری تصویر مالکوس کی تھی' اس میں سمندر کی لہروں کو پیانو کے پردوں سے کھیلتے ہوئے دکھایا تھا سفید اور سیاہ پردوں کی لڑیاں لہروں پر تیر رہی تھیں۔ کبھی کبھی ایک اونچی سی لہر آتی تو سارے پردوں کو یک لخت بلندیوں پر لے جاتی۔ راگ کی روانی اور زیر و بم کو لہروں کے کھیل سے ظاہر کیا گیا تھا۔

چھایانٹ کی تصویر منظوم موسیقی کی تصویر تھی۔ جس میں مچلتے ہوئے شوخ نغمے مرتعش تھے چنچل رقاصائیں گھنگھرو باندھے ناچ رہی تھیں ہر جنبش میں بلا کا لوچ تھا مخمور کر دینے والی مستی تھی۔

جینی انکار کرتی رہی لیکن میں نے ان تصویروں کو نمائش میں رکھوا دیا۔ ایک روز ہم نمائش میں تھے کسی نے یونہی جینی کا نام لے لیا۔ چند لمحوں میں ہجوم اکٹھا ہو گیا یہ سب جینی کے مداح تھے جو اس کی تعریفیں کرنے لگے۔ اس روز معلوم ہوا کہ جینی مشہور ہوتی جا رہی تھی۔ قریب ہی بہت بھیڑ ہو رہی تھی ایک چینی پہلوان کی کشتی تھی۔ سانگ یا کچھ ایسا ہی نام تھا لوگ دور دور سے اسے دیکھنے آئے تھے اسے ہجوم نے گھیر رکھا تھا۔ جہاں وہ اس قدر ہر دلعزیز ثابت ہو رہا تھا وہاں اس کے حریف کو جو مقامی پہلوان تھا کوئی پوچھتا ہی نہ تھا۔ کشتی شروع ہوئی غل مچ گیا۔ کچھ دیر برابر کا مقابلہ رہا۔ پھر دفعتاً مقامی پہلوان نے سانگ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سر سے اونچا اٹھا لیا اور زمین پر دے مارا سانگ بے ہوش ہو گیا۔ اسی ہجوم نے جو اس کی تعریفیں کر رہا تھا اس پر آوازے کسنے شروع کر دیئے۔ اس پر اشتہار اور کاغذوں کے ٹکڑے پھینک کر اکھاڑے میں تنہا چھوڑ دیا سانگ ایک بنچ پر اکیلا بیٹھا تھا جینی مسکراتی ہوئی گئی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ اسے پسینہ پونچھنے کے لئے اپنا چھوٹا سا معطر رومال دیا جسے اس نے شکریے کے ساتھ لے لیا۔ جینی کی پیاری مسکراہٹ اور دلکش باتوں نے اسے موہ لیا' ان باتوں میں ایسی حلاوت تھی کہ سانگ کو اپنی زبوں حالت کا احساس نہ رہا۔ ساری شام ہم نے اکٹھے گزاری۔ جب وہ رخصت ہوا تو اس کے ہونٹ لرز رہے تھے اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

ڈے کے والدین آگئے وہ ہوسٹل سے چلا گیا اس کی والدہ نے جینی کو دیکھا۔ جینی کو ان کے گھر بلایا گیا' لیکن یہ آنا جانا بہت جلد ختم ہو گیا۔ ایک روز ڈے جینی سے ملا اور جی بی کے متعلق پوچھنے لگا۔ جینی نے شروع سے اخیر تک ساری کہانی سنا دی سب کچھ بتا دیا۔ ڈے اس پر برس پڑا یہ باتیں اس سے پوشیدہ کیوں رکھی گئیں۔ اسے پہلے کیوں نہیں بتایا گیا۔ جی بی کے علاوہ اور بھی نہ جانے کتنے عاشق ہوں گے اب اسے کیوں کر یقین آسکتا ہے کہ جینی کی محبت صادق ہے۔ یہ تو محض ڈھونگ تھا۔ کھیل تھا اب اس کھیل کو فوراً ختم ہو جانا چاہئے۔

میں نے سنا تو ڈے کو سمجھایا کہ جن دنوں وہ جی بی سے ملا کرتی تھی ڈے بنگال سے آیا بھی نہ تھا۔ بھلا وہ ڈے پر اتنی دور کیوں کر عاشق ہو سکتی تھی اور وہ بھی بلا دیکھے یا سنے اور پھر وہ خود جینی کے علاوہ کئی لڑکیوں سے محبت جتا چکا تھا۔ جینی جانتی تھی پھر بھی اس نے باز

پرس نہ کی لیکن ڈے نہیں مانا اس کے خیال میں ہر مرد کا فطری حق ہے کہ خود دنیا بھر کی لڑکیوں سے چہلیں کرتا پھرے، لیکن لڑکی سے یہ توقع رکھے کہ وہ زندگی بھر صرف اسی کو چاہے گی اس کی منتظر رہے گی بچپن ہی سے اسے الہام ہو جائے گا کہ فلاں مرد آج سے اتنے سال بعد اسے چاہنے آئے گا جو خود ہرجائی ہوگا اور چاہنے سے پہلے لڑکی کی گزشتہ زندگی کو اچھی طرح کرید کر اپنی تسلی کرے گا۔

جینی نے اسے سارے وعدے یاد دلائے جو اس نے قسمیں کھا کھا کر کئے تھے وہ محبت بھری باتیں یاد دلائیں جو ہزاروں بار دہرائی گئی تھیں۔ وہ خواب بتائے جو دونوں نے اکٹھے دیکھے تھے لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا وہ تو جیسے کسی بہانے کی تلاش میں تھا دیکھتے دیکھتے جینی میں بے شمار نقص نکل آئے نہ اس کا کوئی خاندان تھا نہ مذہب۔ سوسائٹی میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کے خون میں آمیزش تھی۔ اس کی تربیت ایسے والدین کے زیر سایہ ہوئی جن کی زندگی ہمیشہ ناخوشگوار رہی جن میں سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ غریب بھی تھے اور پھر جینی کچھ اتنی خوبصورت بھی نہیں تھی۔ اس سے کہیں حسین اور بہتر لڑکیاں ڈے کو مل سکتی تھیں ایک حسین اور بہتر لڑکی تو ڈے کی والدہ نے ڈھونڈ بھی لی تھی۔ لڑکی کے والد رائے بہادر تھے لڑکی کے ساتھ لاکھوں کی جائداد دے رہے تھے۔ انہوں نے ڈے کو انگلستان بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

شادی کی تاریخ مقرر ہوئی۔ میرے نام دعوتی رقعہ آیا۔ میں خاموش رہا۔ جب جینی کے نام رقعہ بھیجا گیا تو مجھے بہت غصہ آیا طیش میں آکر میں نے کئی منصوبے باندھے۔ سب سے پہلا منصوبہ ڈے کی ہڈی پسلی ایک کر دینے کا تھا لیکن جینی کے کہنے پر میں خاموش رہا۔

شادی پر ہم دونوں گئے جینی شادی کا تحفہ لے کر گئی سب کے سامنے یہ تحفہ کھولا گیا۔ ڈے کی بیوی کے لئے سنہرا ہار تھا جس میں دل کی شکل کا لاکٹ پرویا ہوا تھا۔

اگلے مہینے جینی نے کالج چھوڑ دیا اور گھر چلی گئی۔

ایک پارٹی میں میرا تعارف ڈے کی بیوی سے ہوا۔ معلوم ہوا کہ اسے دنیا میں اگر کسی چیز سے نفرت تھی تو آرٹ سے۔ یہ سارے مصور، موسیقار، شاعر اسے زہر دکھائی دیتے تھے اور سب سے زیادہ چڑ اسے ان امیر لوگوں سے تھی جو اس قسم کی فضولیات میں پڑ کر اپنا وقت ضائع کرتے تھے۔ بھلا ستار یا وائلن سیکھنے کی کیا ضرورت ہے جب صبح سے شام تک ریڈیو پر ساز بجتے رہتے ہیں۔ مصوری سیکھنے میں کیا تک ہے، جب بازار میں ہر قسم کی تصویریں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ اگر کسی نے الفاظ کو توڑ مروڑ کر کچھ شعر گھڑ لئے تو اس پر آنسو بہانے یا بے قابو ہو جانے کی کیا ضرورت ہے۔

آخری امتحان پاس کر کے میں کالج سے چلا آیا۔ مصروفیتوں نے آن دبوچا۔ ملک کے مختلف حصوں میں پھرتا رہا۔ مدتوں تک میں نے جینی کے متعلق نہیں سنا۔

پھر ایک دن ایک پرانا دوست ملا۔ میں نے جینی کا ذکر کیا تو اس نے باتیں سنائیں کہ وہ پہلے سے بالکل بدل چکی ہے۔ ہر جگہ یہی مشہور ہے کہ وہ محبت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ایک معاشقہ ختم ہوا ہے تو دوسرا عنقریب شروع ہوگا۔ کالج چھوڑ کر اس نے ملازمت کر لی بالکل آزادانہ طور پر رہتی ہے ہر شام اس کے ہاں لوگوں کا جمگھٹا رہتا ہے قسم قسم کے لوگ آتے ہیں نہایت عجیب و غریب ہجوم ہوتا ہے۔ خوب افواہیں اڑتی ہیں لوگ سیٹیاں مارتے ہیں۔ ہم نے یہ کیا وہ کیا۔ میرے کوٹ کے کالر سے جو بال چسپاں ہے وہ جینی کا ہے۔ یہ تصویر جینی نے مجھے دی تھی۔ میرے رومال پر جو سرخی ہے وہ جینی کے ہونٹوں کی ہے۔

پچھلے سال سیلاب آیا۔ لوگ بے گھر ہوگئے قحط پڑا۔ جینی نے کچھ لڑکوں لڑکیوں کو ساتھ لیا گاؤں گاؤں پھر کر مصیبت زدہ مخلوق کی مدد کی امیروں سے فلرٹ کر کے چندہ اکٹھا کیا۔ اپنی صحت اور آرام کا خیال نہ رکھا رات دن محنت کی کئی مرتبہ بیمار ہوئی کچھ اوباش قسم کے لوگ محض جینی کی وجہ سے حلقوں کی امداد پر تیار ہوگئے۔ اسے چھیڑا تنگ کیا۔ ایک شام کو بہانے سے اپنے ساتھ لے گئے انہیں شراب پلانی چاہی جینی نے گروہ کے سرغنے کے بال نوچ لئے اس کا منہ طمانچوں سے لال کر دیا۔ وہ ایسے گھبرائے کہ اسی وقت جینی کو واپس چھوڑ گئے۔

پھر کسی نے جینی کی تصویر اخباروں میں نکلوادی اس کی تعریف بھی شائع تھی۔ سب نے یہی سمجھا کہ اس سستی شہرت کی غرض

سے جینی نے لوگوں کی مدد کی تھی۔

پھر ایسا اتفاق ہوا کہ ایک تبادلے نے مجھے جینی کے قریب پہنچا دیا محض چند گھنٹوں کی مسافت تھی۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے میں اسے ملنے چلا جاتا لیکن اب وہ پرانی جینی نہیں رہی تھی پہلے سے کہیں تندرست اور چست معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر تازگی تھی' نکھار تھا' ہونٹوں میں رسیلا پن اور رخساروں پر سرخی آگئی تھی۔ اب وہ اک شعلۂ فروزاں تھی۔ وہ طرح طرح سے میک اپ کرتی شوخ و بھڑکیلے لباس پہنتی جگمگ جگمگ کرتے ہوئے زیور' قسم قسم کی خوشبوئیں۔ وہ ہر موضوع پر بلا دھڑک گفتگو کر سکتی تھی۔ کلبوں اور رقص گاہوں میں اسے باقاعدگی کے ساتھ دیکھا جاتا۔ ہفتے بھر کی شامیں پہلے ہی مختلف معروفیتوں کے لئے وقف ہو جاتیں پرانی سیدھی سادی جینی کی جگہ اس شوخ و شنگ لڑکی کو دیکھ کر میں کچھ چڑ سا گیا۔ یہ جذبہ محض حسد و رشک کا جذبہ تھا شاید میں برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ گفتگو کرتے وقت مجھے بار بار یہ احساس ہو کہ وہ مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔ ہر بحث میں وہ برادے' تاش کھیلتے وقت میں بغلیں جھانکنے لگوں۔ رقص گاہ میں بعض دفعہ مجھے ایک لڑکی بھی نہ ملے' اور اس کے لئے بیسیوں لڑکے بے قرار ہوں۔ وہ ایسی چیزوں کا ذکر کرتی رہے جن کا مجھے شوق تو ہے لیکن ان تک پہنچ ذرا مشکل ہے۔

شام کو اس کے ہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا۔ ان میں زیادہ تعداد عشاق کی ہوتی جو طرح طرح سے اپنی محبت کا اظہار کرتے شادی شدہ حضرات اپنی غمگین ازدواجی زندگی کا رونا رویا کرتے کہ کس طرح قدرت نے ان کو دغا دی اور نہایت بدمذاق اور تُرش طبیعت کی رفیقہ پلے باندھ دی۔ اب ان کے لئے دنیا جہنم سے کم نہیں۔ اب یہ عذاب برداشت نہیں ہو سکتا۔ خودکشی کے سوا اور کوئی چارہ نہیں لیکن اس سیاہ خانے میں امید کی ایک نورانی کرن نظر آتی ہے ___ وہ ہے جینی۔

پُر مغز اور ذہین قسم کے لوگ اکثر سیاسیات اور ادب پر بحث کرتے۔ کارل مارکس' فرائیڈ اور مولانا روم کے تذکرے چھیڑتے' سیاست دانوں کی غلطیاں گنواتے' مشاہیر پر تنقیدیں کرتے' بے لوث اور پُر دوستی کا دم بھرتے لیکن موقعہ پا کر عشق بھی جتا دیتے۔

ایک طبقہ نفاست پسند اور نازک اندام لوگوں کا تھا۔ یہ لوگ ہر وقت اپنی کمزوریاں گنواتے رہتے اپنی بیماریوں کا ذکر کرتے اپنے آپ کو بے حد ذلیل اور کم تر سمجھتے۔ بار بار جینی سے پوچھتے ___ اگر تمہیں برا معلوم ہوتا ہو تو میں آئندہ نہ آیا کروں۔ اگرچہ ایسا کرنے سے مجھے قلبی' جگری اور روحانی صدمہ پہنچے گا ___ مگر ہر شام کو آدھمکتے۔

کئی ایسے شرمیلے بھی تھے جو چھپ چھپ کر خطوط لکھتے۔ جینی پر نظمیں کہہ کر اسے بدنام کرتے' سامنے آتے تو شرما شرما کر برا حال ہو جاتا۔

سب سے گھٹیا وہ عاشق تھے جو اپنے آپ کو جینی کا بھائی کہتے۔ بھائیوں کی سی دلچسپی لیتے۔ اس کی حفاظت اور بہبودگی کے خواہاں رہتے لیکن دل میں کچھ اور سوچتے رہتے۔

مجھے یہ تماشا دیکھ کر غصہ آتا۔ آخر یہ لڑکی چاہتی کیا ہے یہ سب کے سب تو اسے پسند آنے سے رہے' سارے ہجوم کو برخاست کر کے ان میں سے ایک دو سے ملتی رہا کرے۔ میرا ارادہ بھی ہوا کہ اسے ٹوکوں' پھر سوچا کہ بھلا میں اس کا کیا لگتا ہوں' دیکھا جائے تو میں خود اسی ہجوم میں سے ایک ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں اسے ذرا پہلے سے جانتا ہوں۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک شخص کی جانب ملتفت ہوتی جا رہی ہے یہ شخص بالکل عجیب تھا۔ پہلے پہل تو میں اسے سمجھ ہی نہ سکا۔ یہی سوچتا کہ آخر اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اسے قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس کی زندگی کا واقعی کوئی مقصد نہیں۔ اسے کسی چیز پر یقین نہیں تھا۔ محبت' نفرت' زندگی' موت' انسان' خدا ___ سب سے منکر تھا۔ بات بات پر بحث کرنے کے لئے تیار ہو جاتا۔ سب اس سے کتراتے تھے' اسے کامریڈ کے نام سے پکارا جاتا۔ محض جینی کی وجہ سے میں اس سے ملتا ورنہ میرے دل میں اس کے لئے نفرت تھی۔ یہ نفرت شاید اس دن پیدا ہوئی' جب ہم نے پہلی اور آخری بحث کی۔ کامریڈ عورتوں کو ہمیشہ برا بھلا کہتا۔ نکتہ چینیاں کرتا۔ ایک روز میں نے اختلاف کیا۔ عورت کی زندگی کی ان گنت مجبوریاں جتلائیں۔ لڑکی کی پیدائش کو نامبارک سمجھا جاتا ہے لڑکوں کے

مقابلے میں اس کی پرورش میں کوتاہی برتی جاتی ہے۔ بھائی اسے ڈانٹتے دھمکاتے ہیں۔ اس کا حصہ چھین لیتے ہیں۔ اس کے دل میں احساس کمتری پیدا کرتے ہیں۔ ذرا بڑی ہونے پر کنبے اور پڑوسیوں کی تنقید شروع ہو جاتی ہے۔ دوپٹے کا ذرا سر سے اتر جانا خاندان کی ناک پر اثرانداز ہوتا ہے۔ ذرا سی بھول اسے زندگی بھر کے لئے مجرم بنا دیتی ہے۔ کالج میں اسے فلسفہ سکھایا جاتا ہے مساوات اور آزادی کے سبق دیئے جاتے ہیں لیکن جب شادی کا سوال آتا ہے تو اس سے کوئی نہیں پوچھتا' اسے وہی کرنا پڑتا ہے جو چند خشک مزاج بزرگ چاہتے ہیں۔ لیکن لڑکوں کی زندگی بالکل مختلف ہے وہ بڑی آسانی سے جھوٹی قسمیں کھا کر لڑکیوں کو دھوکا دے سکتے ہیں محبت کا واسطہ دلا کر سب کچھ منوا لیتے ہیں —— پھر چند خاندانی مجبوریوں کی بنا پر انہیں بڑی آسانی سے دھتکار سکتے ہیں اور سلیٹ کی طرح بار بار سب کچھ دھل جاتا ہے۔ ان کا ماضی کوئی معنے ہی نہیں رکھتا۔ ان کے لئے بیاہ شادی کھیل ہے۔ لیکن لڑکیوں کے لئے شادی نئی مصیبتوں کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ بیوی بن کر بچوں کی پرورش معاشی بے بسی' ذرا ذرا سی بات کے لئے خاوند کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ عمر رسیدہ ہو جانے پر اولاد بے مصرف سمجھتی ہے' مذاق اڑاتی ہے ——

کامریڈ کو میری باتیں بالکل فضول معلوم ہوئیں۔ وہ یہی کہتا رہا کہ ویسے عورت اور مرد برابر ہیں لیکن مرد کا رتبہ دماغی اور جسمانی لحاظ سے بلند ہے۔ اس نے دونوں کے دماغ کی بناوٹ اور وزن کا ذکر بھی کیا۔ مرد کے لمبے قد اور مضبوط بازوؤں کا حوالہ دیا۔

اس کے بعد میری اور اس کی کبھی بحث نہیں ہوئی۔

پتہ نہیں اس کا ذریعہ معاش کیا تھا' وہ رہتا کہاں تھا۔ اس کی گزشتہ زندگی کہاں اور کیسے گزری۔ بس یہ مشہور تھا کہ وہ جینی کا مداح ہے۔ جینی ان دنوں بڑی ٹھوس قسم کی کتابیں پڑھتی۔ مشکل مضامین کی بے حد خشک اور سنجیدہ کتابیں جب وہ دونوں باتیں کرتے تو بہت کم لوگ سمجھ سکتے کہ کس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے۔ ان دونوں کی دوستی کا یہ پہلو مجھے بہت اچھا معلوم ہوتا جینی کی مدلل اور ذہین باتیں ظاہر کرتیں کہ وہ دماغی ارتقاء کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کر رہی ہے۔

ہم پکنک پر گئے' اس تاریخی عمارت کو ہم نے بارہا دیکھا تھا۔ لیکن جب جینی نے ایک خاص زاویے سے ہمیں دیکھنے کو کہا تو یوں معلوم ہوا جیسے اس باغ اور عمارت کو آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ کامریڈ اچھل پڑا بولا! صرف ایک آرٹسٹ کی آنکھ اس زاویے کو دیکھ سکتی تھی۔ جب قصے کہانیاں ہو رہی تھیں تو ایک لڑکا اپنا رومان سنانے لگا۔ اسے ایک لڑکی دور دور سے دیکھا کرتی۔ اشارے ہوتے' پتھروں سے لپٹے ہوئے خطوط آتے' عہد و پیمان ہوتے۔ لیکن وہ فاصلہ اتنے کا اتنا تھا۔ نہ وہ خود قریب آتی نہ آنے دیتی۔ تنگ آ کر اس نے چھت پر جانا چھوڑ دیا' کئی دنوں کے بعد گیا تو لڑکی نے بڑی منت سماجت کی' اس نے صاف کہہ دیا کہ اگر اب بھی قریب نہ آنے دو گی تو آئندہ کبھی چھت پر نہیں آؤں گا۔ بڑی مشکلوں کے بعد وہ رضامند ہوئی بار بار یہی کہتی —— آپ وعدہ کیجئے کہ مجھ سے نفرت تو نہیں کرنے لگیں گے۔ اس نے وعدہ کیا تو مانی۔ یہ اسے ملنے گیا لڑکی نہایت حسین تھی لیکن اس کی آنکھوں میں نقص تھا' وہ بھینگی تھی۔

اس پر بڑے قہقہے پڑے۔ ہنستے ہنستے لوگ دوہرے ہو گئے۔ لیکن جینی خاموش رہی اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ وہ چپ چاپ رہی مجھے بھی اس کہانی نے اداس کر دیا۔ یہ کہانی ہرگز مضحکہ انگیز نہیں تھی۔

باغ کے گوشے میں ایک کنواں تھا جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس میں جھانک کر جو خواہش کی جائے پوری ہو جاتی ہے سب نے کچھ مانگا۔ جب جینی کی باری آئی تو اس نے کہا کہ مجھے کسی سے کچھ نہیں چاہئے' مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں' کوئی ارضی یا سماوی طاقت مجھے کچھ نہیں دے سکتی۔ بس مجھے ایک زندگی ملی ہے اور مجھے زندہ رہنا ہے۔

کامریڈ [illegible] کہنے لگا جینی کا یہ نظریہ صحیح ترین نظریہ ہے' ایسی دنیا میں جہاں لوگ اب تک بارش کے لئے دعا مانگتے ہیں اس سے بہتر نظریہ [illegible] کوئی کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتا' تقدیر اور قسمت فضول چیزیں ہیں۔ ہر شخص اپنے گرد بچھے ہوئے جال میں گرفتار ہے [illegible] زندگی کے اٹل ارادے' شدید جذبے سے حوادث کے غلام ہیں۔ ہم اس لئے ایک دوسرے کے

دوست ہیں کہ اتفاق نے ہمیں ملادیا۔ اسی طرح محض اتفاق سے ہم ان لوگوں کی رفاقت سے محروم ہیں جنہیں ملتے تو شاید گہرے دوست بن جاتے۔

پھر ایک روز وہی کامریڈ جو افلاطونی دوستی اور خلوص کے گن گایا کرتا تھا جینی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ انہوں نے اکٹھے چائے پی پکچر دیکھی چھوٹے موٹے تحفے خریدے جب ٹیکسی میں دونو واپس آرہے تھے تو اس نے جینی کو چومنے کی کوشش کی۔ جینی نے ٹیکسی ٹھہرائی جتنے روپے کامریڈ نے اس شام صرف کئے تھے اس کے منہ پر مارے اور پیدل واپس چلی آئی۔

کامریڈ کئی روز تک غائب رہا پھر معافی مانگنے آیا۔ جینی نے کہا مجھے طیش نہیں آیا مایوسی ہوئی ہے۔ میں تمہیں ان سب سے مختلف سمجھتی تھی میرا خیال تھا کہ تم اس ہجوم میں سے نہیں ہو لیکن تم میں اور ایک عام انسان میں فرق نہیں۔

کامریڈ نادم تھا بولا "____ میرے نظریے خواہ کیسے ہوں میں انسان بھی ہوں۔ تم میں اتنی زبردست کشش ہے کہ میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یہی کرتا۔ میں نے کبھی تمہارے چہرے کو غور سے نہیں دیکھا تمہاری بے چین روح کو دیکھا ہے اور یہی روح مجھے عزیز ہے۔ اگر تمہارے خدوخال بہتر ہوتے اور تم زیادہ خوبصورت ہوتیں تو تمہاری زندگی مختلف ہوتی۔ اگر تم کسی بہتر گھرانے میں پیدا ہوئی ہوتیں تو تمہاری زندگی مقابلتاً آسان ہوتی۔ لیکن تم اتنی صلاحیتوں کی مالک نہ ہوتیں تمہاری روح اتنی حسین نہ ہوتی۔"

جینی عورت تھی کامریڈ کے رنگین فقروں نے اسے موہ لیا اس کی آنکھیں جھک گئیں دل دھڑکنے لگا رخسار سرخ ہوگئے۔ جب کامریڈ نے بازو پھیلائے تو جینی نے مزاحمت نہ کی۔ اس کے بعد کامریڈ کی گفتگو کا انداز بدل گیا "محبت ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کا نام نہیں بلکہ دونوں کے ایک سمت میں دیکھتے رہنے کا نام ہے محبت میں اگر رفاقت کی آمیزش ہو تو وہ بلندیوں تک جا پہنچتی ہے" ____ اس قسم کی باتیں بار بار دوہراتا۔

کبھی کبھی وہ مجھے کافی دلچسپ معلوم ہوتا اس کی چند چیزیں مجھے پسند تھیں اس کی صحرانوردیاں بے چین طبیعت' سیلانی پن ____ لیکن اس کے شکست خوردہ نظریے' بلاوجہ کا حزن' تلخ خیالات برے معلوم ہوتے۔ وہ قنوطی تھا اور اذیت پسند اس نے کبھی زندگی کا مقابلہ نہیں کیا۔ مصیبت کو آتے دیکھ کر وہ ہمیشہ راستہ کترا جاتا اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا دنیا بھر کا ستایا ہوا۔ اس کا ارادہ تھا عمر بھر اسی طرح سرگرداں رہے گا' اس کی منزل کہیں نہیں ہے۔

میرا تبادلہ ہوا تو جینی مجھے چھوڑنے سٹیشن پر آئی' جدا ہوتے وقت میں نے رومال مانگا پوچھنے لگی "رومال لے کر کیا کرو گے۔" کہا "رومال تمہاری شوخ مسکراہٹوں کی یاد دلاتا رہے گا۔" بولی "تم ہر مرتبہ رومال ہی کیوں مانگتے ہو۔" بتایا کہ اس کی مخمور کن خوشبو اور ننھے سے سرخ دل کی وجہ سے۔

اگلے سال مجھے کسی نے بتایا کہ کامریڈ جینی کو چھوڑ کر چلا گیا وہ بالکل ویسے کا ویسا رہا۔ جینی کی تمام کوششیں اس میں کوئی تبدیلی نہ لا سکیں۔ چلتے وقت اس نے جینی سے کہا کہ بے سروسامانی اس کی تقدیر میں ہے اسکی منزل مفقود ہے۔ وہ جینی سے محبت کرتا رہے گا اس کی تصویر دل سے لگا کر رکھے گا' دوسرے ملکوں سے اسے خط لکھا کرے گا۔ اسے ہمیشہ یاد رکھے گا ____ اور بس!

جینی نے اس کا تعاقب کرنا چاہا جو کچھ اس کے پاس تھا فروخت کر دیا۔ پتہ نہیں وہ اسے ملا یا نہیں جب وہ واپس آئی تو طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی تھیں جینی کے والد نے جواب تنہار ہتا تھا اسے سخت سست کہا اور گھر سے نکال دیا۔ کچھ اوباش قسم کے لوگوں نے اس کی مدد کرنی چاہی لیکن جینی اس شہر چھوڑ کر کہیں نکل گئی۔

کنیری سے میں [illegible] ملا۔ وہ ہندوستانی تھا لوگ اس کی حرکتوں کی وجہ سے اسے کنیز انوا کہتے اسی سے یہ نام پڑ گیا۔ پہلی ملاقات پہاڑوں میں ایک کیمپ [illegible] سے کچھ شہریوں کو کھانے پر بلایا ہوا تھا۔ خیمے میں باتیں ہو رہی تھیں کہ وہ ایک روسی افسر سے لڑ پڑا۔ لڑائی کی [illegible] نے فوراً اسے ڈوئیل کی دعوت دی اپنے ریوالور سے چار گولیاں نکال لیں اور روسی سے

بولا ہم اسے باری باری اپنے کان سے چھوا کر چلائیں گے۔ اس میں صرف دو گولیاں ہیں ___ جس کی قسمت میں گولی لکھی ہو گی اس کے دماغ میں سے نکل جائے گی۔ روسی پئے ہوئے تھا فوراً راضی ہو گیا۔ پہلا فائر کنیری نے اپنے آپ پر کیا' وہ خانہ خالی تھا۔ دوسرا فائر روسی نے کیا' کچھ نہ ہوا۔ کنیری تیسرا فائر کر چکا تو ہم نے بڑی مشکلوں سے انہیں علیحدہ کیا روسی کو یقین نہ آتا تھا کہ ریوالور میں گولیاں ہیں اس نے یونہی لبلبی دبادی' دھماکا ہوا' گولی خیمے کی دیوار چیر گئی۔

اس کا تبادلہ ہوا' وہ ہمارے کیمپ میں آ گیا۔ ہم دونوں بہت جلد دوست بن گئے۔

شہر کے حاکم نے ہمیں دعوت دی' ہم دونوں گئے۔ نہایت دلچسپ پروگرام تھا۔ آغا نے کنیری کا تعارف ایک نہایت خوبصورت ایرانی لڑکی سے کرایا۔ کنیری اس سے گھل مل کر باتیں کر رہا تھا۔ محفل گرم ہوتی جا رہی تھی کہ یکایک گھڑی دیکھ کر کنیری اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مجھے بتایا کہ دور کیمپ میں اس نے کسی لڑکی سے رات کو ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ سردیوں کی اندھیری رات تھی۔ کیمپ وہاں سے سو میل کے لگ بھگ تھا۔ ہمیں سب نے منع کیا کنیری کا وعدہ تھا۔ کیوں کر پورا نہ ہوتا۔ ہم جیپ میں روانہ ہوئے تو ہلکی ہلکی برفباری ہو رہی تھی۔ پہاڑوں کی پیچیدہ دشوار گزار سڑک برف سے سفید ہو چکی تھی ہم اتنی تیزی سے جا رہے تھے کہ موڑوں پر جیپ ہوا میں اٹھ جاتی۔ راستے بھر وہ اپنی محبوبہ کے لافانی حسن کی تعریفیں کرتا رہا جب ہم وہاں پہنچے تو دعوت ختم ہو چکی تھی' شراب کا دور چل رہا تھا۔ لڑکی منتظر ملی' کنیری نے میرا تعارف کرایا۔ ان دنوں میں بے حد اداس تھا مہینوں سے مجھے کسی دوست یا عزیز کا خط نہیں ملا تھا۔ میں نے بڑی جذباتی قسم کی گفتگو شروع کر دی اسے یہ باتیں اچھی معلوم ہوئیں ہم ایک گوشے میں جا بیٹھے کنیری ایک دو بار ہمارے پاس آیا لیکن جلد اٹھ کر چلا گیا۔ جب لوگ جانے لگے تو اس نے مجھے ایک طرف بلا کر کہا ___ "میں کیمپ میں جا رہا ہوں' تھوڑی دیر تک تمہارے لئے جیپ بھجوا دوں گا۔"

"اور یہ لڑکی" ___ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہ اب تمہاری ہے ___ میں یاروں کا یار ہوں۔ میں تمہارے چہروں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ میں نے تم دونوں کو آنکھوں میں اس روشنی کی چمک بھی دیکھی ہے جو پہلی ملاقات پر بلاوجہ پیدا نہیں ہوتی۔ میں اسے چاہتا ضرور ہوں۔ لیکن تم بھی میرے دوست ہو ___"

اس کی شخصیت عجیب تھی' نہ اسے کسی خطرے کا احساس تھا نہ کسی مصیبت کا ڈر وہ ہمیشہ کام کر چکنے کے بعد یہ سوچتا کہ یہ کام اسے کس طرح کرنا چاہئے تھا۔ اس کے مزاج میں بلا کی تندی اور گرمی تھی کیسی ہی آفت آن پڑے وہ کبھی نہ گھبراتا ذرا ذرا سی باتوں پر بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کو تیار ہو جاتا۔ اسے سکون سے نفرت تھی اس سے لڑ۔ اس سے جھگڑ۔ محاذ سے واپس آیا ہے تو ڈوئیل لڑ رہا ہے' جوئے میں آج ہزاروں جیتے تو کل سب ہار دیئے۔

سب اس کے کامیاب معاشقوں پر رشک کرتے' اس کامیابی کا راز پوچھتے وہ سر ہلا کر کہتا یہ تو کچھ بھی نہیں' ہزاروں محبتیں ایسی بھی تھیں جو ادھوری رہ گئیں' جو کبھی نہ پنپ سکیں۔ جنہوں نے بار بار میرا دل توڑا۔

ہمارے قریب ایک چھوٹا سا خوش نما قصبہ تھا ___ گلشن ___ آس پاس کے باشندوں میں کنیری شہنشاہ گلشن کے نام سے مشہور تھا۔

پہلے کبھی اس پر قتل کا مقدمہ بن گیا تھا' موت کی سزا یقینی تھی' پھر عجیب سے حالات میں وہ بری ہو گیا۔ آزاد ہو کر اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بقیہ زندگی کو ایک نئی زندگی سمجھے گا جو اسے تحفتاً ملی ہے' اس زندگی کا گزشتہ زندگی سے کوئی واسطہ نہیں وہ ہمیشہ مسرور رہے گا' آزاد رہے گا' جو چیز ناپسند ہوئی اسے فنا کر دے گا' جو بھا گئی اس پر چھا جائے گا۔

محض اتفاق تھا کہ ایسا شخص زندگی کی شاہراہ میں جینی سے ملا۔

اس کا پیار آندھی کی طرح اٹھا' آناً فاناً میں چھا گیا اور طوفان کی طرح اتر گیا۔

وہ چھٹی پر [illegible] آیا۔ شام کو کسی شناسا لڑکی سے ملاقات کا پروگرام بنا' اسے ملنے گیا' وہ نہیں ملی مگر وہاں ایک اور لڑکی سے

ملاقات ہو گئی ــــ یہ لڑکی جینی تھی جو اپنی سہیلی سے ملنے آئی تھی۔ کیری نے جینی کو اپنی محبوبہ کا نعم البدل سمجھا جتنے دن وہ وہاں رہا اسے نعم البدل سمجھتا رہا اس نے قیمتی تحفوں کی بارش کر دی اپنی دلچسپ باتوں اور رنگین کہانیوں سے جینی پر جادو کر دیا۔ جھڑ کیلی کاروں میں اسے لئے لئے پھرا ایک چاندنی رات میں جب وہ سمندر میں تیرنے لگا تو ریت پر بیٹھ کر اس نے محبت کا واسطہ دے کر جینی کو [illegible] عمر بھر وفادار صادق رہنے کا حلف اٹھایا ہمیشہ اکٹھے رہنے کے عہد و پیمان کئے یہ سب کچھ اس قدر پر خلوص تھا کہ جینی نے سچ مان لیا۔

اس آغاز کے بعد انجام وہی ہوا جس کی توقع کی جا سکتی تھی' جو ناگزیر تھا۔ جینی کی زندگی میں وہ جس طرح آیا تھا اسی طرح چلا گیا۔

لیکن جینی کی یاد اس کے دل سے مکمل طور پر نہ گئی۔ جب کبھی اسے کوئی ٹھکرا دیتا جب دیر تک تنہا رہنا پڑتا' کوئی بری خبر سننے میں آتی' اداسیاں عود کر آتیں تو اسے جینی کی معصومیت' اس کا خلوص اور پیار یاد آتا۔ رات کی تنہائی میں ہم دونوں دیر تک خیمے میں بیٹھے رہتے باہر سرد ہواؤں کے جھکڑ چلتے تو وہ جینی کو یاد کرتا۔ اپنے جھوٹے وعدوں کو یاد کر کے شرمندہ ہوتا' اپنے آپ کو گنہ گار سمجھتا بار بار کہتا کہ جینی ان سب لڑکیوں سے مختلف تھی جو اسکی زندگی میں آئیں اگر اس کی زندگی میں شادی کی کوئی گنجائش ہوتی تو وہ جینی سے ضرور شادی کرتا۔ وہ نہایت غیر معمولی لڑکی تھی' اسے کسی نے سمجھا نہیں ــــ کسی کی نگاہیں اس کے خدوخال سے آگے نہیں پہنچیں۔ اس کی روح کی عظمت کو کسی نے نہیں پہچانا۔ اس میں کسی مصور کی روح تھی کسی عظیم شاعر اور بت تراش کی روح' اس میں اتنی صلاحتیں تھیں کہ ان کی رفاقت کسی کی بھی زندگی چمکا سکتی تھی۔ اس میں بالا کی معصومیت تھی' اس میں سیتا کا تقدس تھا۔ مریم کی پاکیزگی تھی۔ اس نے کئی مردوں سے محبت نہیں کی بلکہ صرف ایک مرد سے محبت کی ــــ ایک مرد جسے اس نے کلبلاتے رینگتے ہجوم سے چنا اور دوسروں سے مختلف سمجھا' لیکن اس مرد نے اسے ہمیشہ دھوکہ دیا۔ اس کی مسکراہٹ کیسی تھی ــــ بالکل مونالیزا کی مسکراہٹ' معصوم' اتھاہ اور پراسرار' اس کی مسکراہٹ' کے سامنے کیری جیسا انسان بھی کانپ اٹھتا تھا۔

لیکن ایسی باتیں وہ کبھی کبھی کیا کرتا اور اگلی صبح اکثر بھول جاتا۔

اس کے بعد ایک طویل وقفہ آیا۔ یہ وقفہ ایسا تھا کہ اس نے سب کچھ بھلا دیا جینی بھی یاد نہ رہی۔ میں ہزاروں میل کے فاصلے سے واپس ملک میں آیا تو پھر دور بھیج دیا گیا اس عرصے میں کبھی کوئی پرانی یاد تازہ ہو جاتی اور خیالات کے تسلسل میں جینی کا خیال آ جاتا تو میں یہی سوچتا کہ غالباً اب اس سے کبھی ملاقات نہیں ہو گی۔

لگاتار تنہائی اور بہت سے کٹھن لمحوں کے بعد مجھے مختصر سی چھٹی ملی' میں قریب کی پہاڑیوں پر چلا گیا وہ علاقہ نہایت سرسبز و شاداب تھا دور دور تک چائے کے باغات تھے اور مالدار سوداگروں کی آبادیاں۔ جہاں میں مقیم تھا وہاں خوب رونق تھی میری طرح بہت سے اجنبی سکون کی تلاش میں آئے ہوئے تھے چند ہی دنوں کے بعد مجھے معلوم ہو گیا کہ باوجود اتنی چہل پہل اور شور شغب کے وہ احساس تنہائی کم نہیں ہوا جو مجھے کھینچ کر لایا تھا۔ ایک روز میں یونہی کھویا کھویا سا پھر رہا تھا کہ مجھے جینی مل گئی ایسے دور دراز خطے میں اسے پا کر مجھے بے حد مسرت ہوئی اس مرتبہ تو وہ پہلے سے بالکل مختلف معلوم ہوئی اس کی باتوں میں حزن کی آمیزش تھی اس کے چہرے پر پژمردگی تھی۔ لیکن ایسی پژمردگی جس میں عجیب جاذبیت تھی جو حسن و شباب کی تازگی سے کہیں دلفریب معلوم ہو رہی تھی' اسی مسکراہٹ میں افسردگی کی رمق نے ایک عجیب وقار پیدا کر دیا تھا۔

وہ وہاں اپنے کسی عزیز کے ہاں رہتی تھی جو چائے کے سوداگر تھے وہ بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہی تھی۔ کلب' رقص' پارٹیاں' بے حد اکتا دینے والی تھیں وہاں اس کا صرف ایک دوست تھا' اسی کمپنی کا ایک بوڑھا ملازم جو تنہا رہتا جس کی زندگی کا سب سے قیمتی خزانہ کتابیں تھیں کام سے لوٹ کر وہ بڑے اہتمام سے کتابیں نکالتا۔ دونوں پڑھتے بحث کرتے' لڑتے' اب ہم تین ساتھی ہو گئے۔ چھٹی کے بقیہ دن یوں گزرے کہ پتہ بھی نہ چلا۔ واپس آ کر میں نے تبادلہ کرا لیا اور جینی کے پاس چلا گیا ہم جنگلوں میں نکل جاتے' سیریں کرتے' کتابیں پڑھتے۔ بچوں کی طرح ہنستے کھیلتے' میں اسے جتنا قریب سے دیکھتا اتنی نئی خوبیاں پاتا وہ بہترین رفیق تھی اکثر مجھے محسوس ہوتا

جیسے میں اسے پہلے کبھی نہیں ملا اس کی بے پناہ جاذبیت سے آشنا نہیں ہوا' ہم رقص پر جاتے تو وہ سارا وقت مجھے دیتی' میری جانب متوجہ رہتی اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی رہتیں' مجھے اس پر فخر ہونے لگتا۔

ہم ایک دوسرے کے قریب خاموش بیٹھے پڑھتے رہتے کئی کئی گھنٹوں تک ایک بات بھی نہ ہوتی' لیکن ہمارے خیالات ہم آہنگ ہو جاتے' دونوں میں طمانیت ہوتی خاموشی اور تقریر کا فرق یوں مٹ جاتا جیسے ہم باتیں کر رہے ہوں۔ پتہ نہیں' وہ کون سا رشتہ تھا جس نے ہم دونوں کو قریب رکھ تھا' دوستی کا جذبہ۔ یہ قریب اس قدر ضروری ہو گیا کہ ذرا سی جدائی شاق گزرنے لگتی۔

ایک روز میں نے اس کی کتابوں میں نظموں کی کاپی دیکھی' یہ نظمیں جینی نے لکھیں تھیں' یہ نظمیں کس قدر حزینہ تھیں' کتنی کرب انگیز اور درد ناک۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ اس نے کب اور کن حالات میں لکھیں یہ اس کی لکھی ہوئی ہرگز نہیں معلوم ہوتیں جسے میں جانتا ہوں' دلیر اور نڈر جینی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا' اور خاموش رہی۔

ایک سہ پہر کو ہم سیر سے واپس آ رہے تھے کہ بارش شروع ہو گئی پہلے تو درختوں کے نیچے چھپتے رہے جب موسلادھار مینہ برسنے لگا تو بھاگ کر ایک شکستہ جھونپڑی میں پناہ لی۔ میں نے اپنا کوٹ سوکھی ہوئی گھاس پر بچھا دیا۔ ہم دونوں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموشی رہی' میں نظموں کی باتیں کرنے لگا یونہی تنگ کرنے کو کہا کہ پہلے تو کبھی بھولے سے بھی کوئی شعر اس کی زبان پر نہ آتا تھا اب ہزاروں اشعار زبانی یاد ہیں کہیں اسے کوئی شاعر تو پسند نہیں آ گیا تھا۔ اس کا چہرہ اتر گیا آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے معافی مانگی شاید میں نے کوئی دکھتی ہوئی رگ چھیڑ دی تھی یا تلخ یادیں تازہ کرا دی تھیں میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دوبارہ معافی مانگی ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی۔ جب وہ میرے شانے سے سر لگائے بیٹھی تھی' تو ایسی ننھی منھی بچی معلوم ہو رہی تھی جو راستہ بھول گئی ہو' بالکل بے یار و مددگار۔ جو سہارے کی طالب ہو۔ میں نے اس کے آنسو خشک کیے دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو تھام کر اسے پیار کیا۔ ان بارہا چومے ہوئے ہونٹوں پر اب تک تازگی تھی ان آنکھوں میں اب تک معصومیت تھی ان رخساروں پر وہی جلاء تھی' یہ لڑکی اب تک وہی لڑکی تھی جسے میں نے برسوں پہلے جی بی کے ساتھ مباحثے میں دیکھا تھا۔

اس کی زندگی کی ایک کہانی ایسی بھی رہ گئی تھی جو میں نے نہیں سنی تھی یہ کہانی اس نے خود سنائی یہ ایک شاعر کے متعلق تھی' جو شرابی تھا' جواری تھا' مفلس تھا' جھوٹا تھا' اپنی خودداری اور انفرادیت کو خیرباد کہہ چکا تھا' جس کی حرکتیں دیکھ کر افسوس کی بجائے غصہ آتا۔ جینی ہمیشہ اس پر ترس کھاتی ______ ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کرتی سفارش کر کر کے اس کا کلام چھپوایا' اسے ادھر ادھر متعارف کرایا اس کی حوصلہ افزائی کی کہ شاید یہ اسی طرح سدھر جائے۔ اس کی زندگی بہتر بن سکے اور وہ بیش بہا خزانہ جو اس کے دماغ میں محفوظ ہے کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ ترس کا یہ جذبہ دن بدن بڑھتا گیا جینی غیر شعوری طور پر اس کے قریب ہوتی گئی پھر اس جذبے نے ایک اور شکل اختیار کی۔ جینی کو خود علم نہیں تھا کہ جسے وہ محض جذبہ ترحم سمجھ رہی ہے ایک دن محبت کا پیش خیمہ ثابت ہو گا۔ جینی نے ایک آوارہ و بے خانماں کو پناہ دی' اپنی توجہ اور اپنا پیار ایسے انسان پر ضائع کیا جو ہرگز اس کا حق دار نہ تھا۔ وہ سدھرتا جا رہا تھا اس کی حالت پہلے سے بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کہا کرتا کہ اسے جینی کی گزشتہ زندگی سے کوئی سروکار نہیں اب تو اس اپنی گزشتہ زندگی سے بھی تعلق نہ رہا تھا اس کی زندگی تب سے شروع ہوئی جب اس نے جینی کو پہلی مرتبہ دیکھا پتہ نہیں اس سے پہلے وہ کیوں جیتا رہا لیکن اب وہ جینی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس نے اپنی نظموں میں بارہا جینی کو مخاطب کیا تھا ____ تمہارے دل میں خلوص کے چشمے ابلتے ہیں۔ محبت کا قلزم رواں ہے' تمہارے دل میں وہ جذبات ہیں جن پر رات دن کا تسلسل قائم ہے' زمین و آسمان کی گردش قائم ہے۔ یہ جذبات جس دن فنا ہو گئے' انسانیت فنا ہو جائے گی دنیا چاند ستاروں کی طرح اجاڑ اور سنسان ہو جائے گی یہاں کچھ بھی نہ رہے گا۔

ایک روز اس نے جینی کو بتایا کہ وہ بیمار ہے اسے دق ہے۔ کبھی کبھی یہ بیماری عود کر آتی ہے کاش کہ وہ تندرست ہوتا' تب کسی روز وہ دونوں شادی کر لیتے زندگی کتنی سہانی ہو سکتی تھی۔ کیسی کیسی راحتیں میسر ہوتیں۔ تب وہ سب اذیتیں بھول جاتیں جو دنیا کے جہنم میں

اب تک برداشت کی تھیں۔

وہ یونہی آوارگی میں مرنا چاہتا تھا لیکن بڑی مشکلوں سے جینی نے اسے سینی ٹوریم بھجوایا۔ فالتو خرچ برداشت کرنے کے لئے وہ دن بھر دفتر میں کام کرتی رات کو ٹیوشن پر لڑکیوں کو پڑھاتی، لگاتار مشقت نے اسے کمزور کر دیا۔ وہ بیمار رہنے لگی وقت گزرتا گیا ایک دن اسے معلوم ہوا کہ شاعر صرف اسی کے لئے نظمیں نہیں کہتا اس کے تخیل میں کوئی اور بھی شریک ہے ___ یہ سینی ٹوریم کی ایک نرس تھی جسے وہ بعد میں ملا۔

جینی نے اس افواہ پر توجہ نہ دی یونہی کسی نے اڑا دی ہوگی۔ وہ وہاں رات دن ایک سے ماحول میں رہ کر تھک گیا ہوگا اسے تفریح بھی تو چاہیے کسی سے ہنسنے بولنے میں کوئی حرج نہیں جب وہ اس سے ملنے جاتی تو نرس کے لئے بھی تحائف لے جاتی ان دونوں کی دوستی پر اس نے کبھی شبہ نہیں کیا لیکن یہ افواہ محض افواہ نہیں رہی۔ شاعر سینی ٹوریم سے تندرست ہو کر آیا تو اس نے شادی کر لی۔ نرس کے ساتھ۔ جینی پھر بھی اس سے ملتی رہی اسے روپے دیتی رہی۔ آخر نرس نے ان ملاقاتوں پر اعتراض کیا کہ جینی جیسی لڑکی سے ملنا بدنامی مول لینا ہے۔ شاعر نے اس اعتراض کو سر آنکھوں پر لیا اور جینی سے ملنا چھوڑ دیا۔ موقع ملنے پر وہ اسے بدنام بھی کرتا اپنے کارنامے سناتا جینی کے پرانے عاشقوں کے قصے لے بیٹھتا۔

وہ کہانی سنا چکی تو میں نے اسے بتایا کہ ہم پرانے دوست ہیں۔ دوستی عظیم ترین رشتہ ہے خلوص پر میرا ایمان ہے۔ میں انسانی کمزوریوں سے ہرگز منکر نہیں۔ شاید مجھے اچھے برے کی تمیز نہ ہو لیکن ان جذبات کی قدر کرتا ہوں، جن میں خلوص کارفرما ہو خواہ ان جذبات کا انجام کیسا ہی ہو۔ زندگی میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں ذہنی کیفیتیں بھی دیرپا نہیں ہوتیں لیکن وہ جذبات جو اپنے وقت پر صادق تھے ہمیشہ صادق رہتے ہیں۔ اس لئے وہ مدوجزر جو تمہاری زندگی میں آئے ناگزیر تھے تم سچی تھیں۔ تمہارے جذبات سچے تھے میں نے تمہیں بہت قریب سے دیکھا ہے تمہیں پسند کرنے کے علاوہ تمہاری عزت بھی کرتا ہوں۔

آہستہ آہستہ اس نے لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا باہر جانا بند کر دیا وہ ہر وقت میری منتظر رہتی۔ لیکن اب وہ مسرور نہیں تھی اب اسے ماضی یا حال کا اتنا خیال نہیں رہا تھا جتنا مستقبل کا، وہ تنہا اور اداس تھی۔ کئی مرتبہ میں نے اسے قبرستان میں بیٹھے دیکھا۔ ایک روز میں بھی اس کے پاس چلا گیا وہ عجیب سی باتیں کرنے لگی کبھی ایسے پرسکون لمحات بھی آئیں گے جب میں بھی اسی طرح سو جاؤں گی۔ وہ خاموشی کتنی سہانی ہوگی؟ موت کے بعد اگرچہ محض خلاء ہوگا دل دوز تاریکی ہوگی لیکن وہ تاریکی اس کرب انگیز اجالے سے ہرگز بری نہیں ہوگی۔ اپنی نظم کا ایک بند اس نے کئی بار دہرایا ___ "میں ان بدنصیبوں میں سے ہوں جنہیں ہر صبح نہایت قلیل روشنی ملتی ہے۔ امید کی اتنی سی جلاء کہ صرف دن بھر زندہ رہ سکیں۔ جس روز یہ روشنی نہ مل سکی میں ظلمتوں میں کھو جاؤں گی۔"

میں نے رنگین اور خوش نما چیزوں کی باتیں کر کے موضوع بدلنا چاہا لیکن وہ بولی ___ "کاش تم اندازہ لگا سکتے کہ میں کس قدر غمگین ہوں، کس قدر دل شکستہ ہوں، اگر اب مجھے سہارا نہ ملا تو میرے خواب تمام ہو جائیں گے اصول ختم ہو جائیں گے میں گم ہو جاؤں گی ___"

پھر ایک دن جب میں ان افواہوں کی تردید کرنا چاہتا تھا جو ہم دونوں نے بارہا اپنے متعلق سنی تھیں وہ کہنے لگی ___ تم مجھے جانتے ہو، سمجھتے ہو۔ میں بھی تمہاری سیاح روح سے آشنا ہوں، تمہارے ان گنت مشغلوں طرح طرح کے خوابوں کا مجھے احساس ہے، میں تم سے صرف ذرا سی توجہ مانگتی ہوں، بالکل ذرا سا سہارا اپنی زندگی کا قلیل ساحصہ مجھے دے دو، میں ہمیشہ قانع رہوں گی، میں کبھی تم پر بار نہیں ہو ں گی تم میرا ساتھ نہ دینا میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔

میں اس اشارے کو سمجھ گیا، پہلے بھی کئی مرتبہ اس نے ایسی باتیں کی تھیں۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ عورت اور مرد کی دوستی نہایت محدود ہے اس پر کئی اخلاقی اور سماجی بندشیں عائد ہیں۔ یہ بندشیں ایک حد تک درست بھی ہیں آخر ایک مقام آتا ہے جہاں فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔

میں اس مقام سے لوٹ آیا۔

فیصلہ کرنے کا وقت آیا تو میں بزدل ثابت ہوا میں خاموش ہو گیا۔ خاموش ہو کر میں اس گروہ میں شامل ہو گیا جو جینی کی زندگی میں مجھ سے پہلے آیا وہ گروہ جو بظاہر اپنے آپ کو باغی ظاہر کرتا ہے لیکن دراصل سماجی روایات کا غلام تھا۔ جینی سمجھ گئی' پھر اس نے کبھی ایسی باتیں نہیں کیں ہم دونوں میں ایک معاہدہ سا ہو گیا اگرچہ یہ معاہدہ زبان پر نہیں آیا لیکن طے ہو گیا کہ جب تک ایک دوسرے کے قریب ہیں پرانے دوستوں کی طرح رہیں۔

میں نے تبادلے کے لئے کہا تو مجھے دوسری جگہ بھیج دیا گیا۔ چلتے وقت جینی مجھے چھوڑنے آئی اس کی آنکھوں میں آنسو تھے پہلی مرتبہ میں نے اسے سب کے سامنے روتے دیکھا ان آنسوؤں کے باوجود وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی بار بار وہ آنکھیں خشک کرتی میں نے رومال مانگا' اس نے بالکل پہلی سی شوخی سے پوچھا کہ رومال لے کر کیا کرو گے؟ میں نے کہا کہ اسے یاد کے طور پر رکھوں گا۔

"اور میرے آنسو کیوں کر خشک ہوں گے ___؟" اس نے گیلا رومال دیتے ہوئے پوچھا۔

چند مہینوں کے بعد میں نے سنا کہ اس نے کسی سے شادی کر لی۔

جو جواب میں نے اس کی مسکراہٹ سے مانگا تھا وہ نہیں ملا۔ پھر یک لخت معلوم ہوا کہ موسیقی ختم ہو چکی تھی رقص ختم ہو چکا تھا' لوگ کھانے کے لئے دوسرے کمرے میں جا رہے تھے۔ میں اور جی بی بھی چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد واپس آئے تو جینی جا چکی تھی۔ اس کا خاوند بھی وہاں نہیں تھا۔

مجھے یونہی خیال سا آیا کہ اس مرتبہ جینی سے بہت کم باتیں ہوئیں۔ میں اس سے دور دور رہا۔ نہ اس سے کچھ پوچھا نہ بتایا اس سے رومال بھی تو نہیں مانگا۔ نہ جانے کیوں' میں اس گوشے میں چلا گیا جہاں جینی اور اس کا خاوند بیٹھے رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ میز کے نیچے ایک مسلا ہوا رومال پڑا تھا جو رقص کرتے ہوئے لوگوں کے قدموں تلے آ چکا تھا۔ میں نے اسے اٹھا لیا جھاڑا' سلوٹیں دور کیں جانی پہچانی خوشبو سے فضا معطر ہو گئی۔

یہ رومال یہاں کیسے آیا' جینی جان بوجھ کر میرے لئے چھوڑ گئی' یا یونہی اتفاق سے رہ گیا۔

دیر تک میں اس رومال کو لئے وہیں کھڑا رہا۔ اس روندے ہوئے مسلے ہوئے سرخ دل کو دیکھتا رہا جو اب تک خمار آگیں خوشبو میں بسا ہوا تھا۔

جینی کا دل ___ عورت کا دل۔

الاؤ

سہیل عظیم آبادی

گاؤں سے پورب کو ایک بڑا سا میدان ہے۔ کھیت کی سطح سے کچھ اونچا اور چوکس۔ لوگ کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں کسی راجہ کا یہاں پر راج محل تھا۔ اسی کی مٹی اور اینٹ سے زمین اونچی ہو گئی ہے۔ میدان کے پوربی کنارے پر پیپل اور برگد کے پیڑ ہیں اور اس کے بعد کھیت۔ اُتر کی طرف ناگ پھنی کی گھنی اور لمبی قطار ہے اس کے بیچ میں کئی نیم یا پاکڑ کے پیڑ، اور اس کے بعد کھیت۔ دکھن میں ایک کنارے پر ایک پیپل کا پیڑ ہے۔ اس کے پاس ہی ایک کنواں اور اس کے بعد ایک کھیت۔ پورب دکھن کونے پر ایک بڑا سا گڑھا ہے جس میں برسات کا پانی جمع ہو کر کئی مہینے رہا کرتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ راج محل کا یہ پوکھر تھا۔ اس میں رانی اپنی سہیلیوں کے ساتھ نہایا کرتی تھی۔ نہانے سے پہلے پوکھر میں گلاب کا عرق ڈال دیا جاتا تھا جس کی مہک دور دور تک پھیل جاتی تھی۔ چاندنی راتوں میں راجہ اور رانی دونوں ناؤ پر اس پوکھر پر سیر کیا کرتے تھے۔ یہ پوکھر بہت بڑا تھا بھرتے بھرتے بھر گیا اور جو نشان باقی رہ گیا ہے۔ وہ بھی راجہ اور راج محل کی طرح مٹ جائے گا۔

گاؤں میں اب کسان ہی کسان رہتے ہیں۔ پرجا ہی پرجا ــــ راجہ کو مرے، برباد ہوئے تو زمانہ بیت گیا اس کا راج محل تو میدان ہے۔

یہ میدان گاؤں والوں کے لئے سب کچھ ہے۔ ہر روز سارے گاؤں کے ڈھور اس میدان میں جمع ہوتے ہیں۔ لوگ اپنی اپنی بھینسوں کو کنوئیں پر دھوتے ہیں پھر گھر لے جاتے ہیں۔ فصل کٹنے پر کھلیان لگاتے ہیں۔ رو کھ پیڑنے کو کولہو بٹھاتے ہیں اور کولہو سار بناتے ہیں۔ گاؤں کے لڑکے صبح سے شام تک کھیلتے اور بڑے بوڑھے کسی پیڑ کے نیچے بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔

کاتک کا مہینہ تھا۔ ٹھنڈک اچھی خاصی پڑنے لگی تھی اور میدان میں کنکی دھان کا کھلیان لگایا جانے لگا تھا۔ گاؤں میں نئی زندگی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ لڑکے میدان میں کبڈی کھیل رہے تھے۔ عورتیں کنوئیں سے پانی بھر کے اپنے گھروں کو لے جا رہی تھیں۔ پھگوا پورب کی طرف آگ جلا کر اپنی لاٹھی کو سینک کر سیدھی کر رہا تھا۔ اسی دن وہ اپنی بہن کے گھر دھرم پور سے آیا تھا۔ بہنوئی نے چلتے وقت یہ لاٹھی اپنی بسواڑی میں سے کاٹ کر دی تھی۔ لاٹھی نیچے کی طرف سے ذرا ٹیڑھی تھی اس کا سیدھا کرنا ضروری تھا۔

پھگوا نے لاٹھی سیدھی کرنے کو الاؤ جلا رکھا تھا۔ پہلے لاٹھی کو سینک کر پھر پیپل کی چیڑ میں پھنسا کر اسے سیدھا کرتا۔ وہ اپنی بہن کے یہاں سے ایک گیت سیکھ کر آیا تھا۔ اس گیت کو ہلکے ہلکے سروں میں گاتا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی اس کے دماغ میں بہت باتیں گھوم رہی تھیں۔ سب سے زیادہ یہ کہ گاؤں میں ایک بہت بڑی سبھا ہونی چاہئے۔ ٹھیک ویسی ہی، یا اس سے بڑی جیسی اس کی بہن کی سسرال میں ہوئی تھی اور اس سبھا میں دو نکڑ بیٹھ کر کل لوگوں کو ساری باتیں سمجھائے۔ جیسے وہاں ایک آدمی نے سمجھایا تھا۔

پھگوا اپنے خیالوں میں مگن تھا کہ اکلو آگیا۔ یہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا اور گاؤں کے ناطے میں پھگوا کا چچا تھا۔ اکلو نے آتے ہی کہا:

"بیٹا لاٹھی تو اچھی ہے مگر اس میں گڑا سا لگے تب۔"

پھگوا نے پلٹ کر دیکھا اور بولا۔

"ہاں چچا! پر گڑاسا اچھا سا مل جے تب نا۔"

شام ہو چکی تھی دھیرے دھیرے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ لاٹھی سیدھی بھی ہو چکی تھی۔ اس نے خوب گھما گھما کر لاٹھی کو دیکھا۔ پھر پیپل کے پیڑ کے سہارے کھڑا کر کے، دو قدم پیچھے ہٹ کر دیکھنے لگا۔ اکلو بھی لاٹھی کو ایک خاص نظر سے دیکھتا رہا جس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ لاٹھی اچھی ہے، اور اگر مل جے تو بہت اچھا ہو۔

ابھی لاٹھی کو یہ دونوں دیکھ ہی رہے تھے کہ سامو اور باڑھو بھی گھومتے پھرتے آگئے۔ باڑھو نے آتے ہی کہا:

"ارے بھیا! ابھی اتنا جاڑا تو نہیں پڑا۔ ابھی سے الاؤ تاپنے لگے؟"

اکلو بولا:

"پھگوا اپنی لاٹھی سیدھی کر رہا تھا۔ الاؤ کون تاپے گا ابھی۔"

باڑھو بولا:

"مگر آگ بھلی معلوم ہوتی ہے بھائی۔"

وہ آگ کے پاس بیٹھ گیا اور آگ تاپنے لگا۔ اس کے بیٹھتے ہی اور لوگ بھی بیٹھ گئے۔ سانول اسی طرف آرہا تھا اور ان لوگوں کی باتیں سُن چکا تھا۔ وہ آتے ہی بولا:

"واہ! باڑھو چچا پہلے تو دوسروں کو ٹوکا اور سب سے پہلے بیٹھے بھی آگ تاپنے، واہ!"

باڑھو بولا:

"ہاں بیٹا! اب آگ بھلی معلوم ہوتی ہے، اور ہم نے ٹوکا کب تھا۔ ارے ایسے ہی بول رہا تھا۔"

سب کے سب آگ تاپنے لگے۔ آگ ابھی زیادہ تھی اس لئے کچھ دور ہی دور بیٹھے۔ باڑھو نے پاؤں پھیلاتے ہوئے کہا:

"ارے یہ لونڈے سب اتنے بدمعاش ہوتے جا رہے ہیں کہ کیا کہا جائے۔"

سانول نے کہا:

"کیا چچا! ہم لوگوں نے تو کوئی بدمعاشی نہیں کی۔"

باڑھو بولا:

"نہیں۔ تم سب کی بات نہیں۔ یہی تو میرا کہنا ہے۔ تم سب جوان اور بال بچے والے ہوئے۔ کبھی کوئی اونچی نیچی بات دیکھنے میں نہ آئی۔ پر اب کی تو دنیا ہی بدلتی جا رہی ہے۔ دیکھ ابھی راستے میں آرہے تھے تو دیکھا کہ چھپی اور چھیدو کے دونوں لڑکے ریڑ (ارنڈ) کی ڈنٹھل جلا کر بیڑی کی طرح بھک بھک کھینچ کر دھواں اُڑا رہے ہیں۔ ڈانٹا تو دونوں کھانستے ہوئے بھاگے۔ سب کا کلیجہ جل جائے گا۔"

اتنے میں چھپی آگیا اور باڑھو نے اس سے بھی یہ بات دہرا دی لیکن چھپی نے کہا:

"بھیا۔ اب او جمانا ہی نہ رہا۔ ہم سب بھی کبھی لڑکے تھے۔ ایک دفعہ کا قصہ سنو گے تو دنگ رہ جاؤ گے۔ ابھی کل کی بات ہے ہم

میدان سے آ رہے تھے۔ میرے ہاتھ میں لوٹا تھا۔ خیال ہوا کہ بڑے کنوئیں پر لوٹا مانجھ کر پانی بھر لیں۔ جیسے ہی کنوئیں پر پہنچے تو دیکھا رتیو، کلوا کی عورت کا راستہ روکے کھڑا ہے۔ وہ کہہ رہی ہے 'جانے دو رتیو' تو رتیو کہتا ہے ایسے نہیں جانے دوں گا۔ بھوتی۔ ویسے کہو۔ ع

مورے راہ چھوڑ دو گردھاری دیر ہوئی

یا یہ کرشن لیلا والا گانا۔ جب اس نے بالٹی اٹھا کر کہا کہ سارا پانی اچھل دوں گی تو راستے سے بھاگا۔"

"چچا! یہ بھی کوئی بات ہے۔ بھوجائی ہے وہ ہنسی ٹھٹھا کرتا ہوگا ___ جانتے ہی ہو رتیو کیسا مسخرا ہے۔"

لیکن چھیمی نے بزرگانہ انداز میں کہا۔

"ہش! یہ بھی کیا ٹھٹھا ہے۔ ایسے ہی لڑکے خراب ہو جاتے ہیں۔ یہ تو ہم نے دیکھا تھا۔ کوئی دوسرا دیکھ لیتا تو نہ جانے کتنی باتیں جوڑ کر کہتا اور بدنامی ہوتی۔ گاؤں میں ایسی بات کبھی نہیں ہوئی۔

سانول چپ ہو گیا اور بڈھو نہ جانے کب تک بولتا رہتا لیکن سامو نے بیچ ہی میں روک کر کہا:

"ارے بھاگو تو نے تو کچھ کہا نہیں۔ سُنا ہے دھرمپور میں بڑی بڑی سبھا ہوئی۔ بڑے بڑے لوگ جمع ہوئے۔ کسانوں کے فائدہ کی بات ہوئی۔"

بھاگو نے اس انداز سے سب پر نگاہ ڈالی جیسے وہی اکیلا سب کچھ جانتا ہے۔ باقی سب کاٹھ کے الو ہیں۔ پھر بولا:

"ہاں بہت بڑی سبھا ہوئی تھی۔ ایک سادھو جی بھی آئے تھے۔ وہ سب کو ایک بات کہہ گئے۔ سب کسان ایک ہو جائیں۔ آپس میں مل جل کر رہیں۔ تب ہی زمیندار کے ظلم سے بچ سکتے ہیں۔"

سانول بولا:

"بھیا بات پتے کی ہے۔ ہم لوگوں پر جتنا ظلم ہوتا ہے اسے کون جانے۔ سال بھر محنت کر کے اپجاتے ہیں اور ہمارے ہی بال بچے بھوکوں مرتے ہیں۔"

آگ کچھ دھیمی ہو چلی تھی اس لئے بڈھو کچھ اور بھی آگ سے قریب ہو گیا اور بولا۔

"بات تو ٹھیک ہے پر ہونا مشکل ہے نا۔'

بھاگو بولا:

"مشکل کیا ہے؟ آج سے ہم لوگ ٹھان لیں کہ آپس میں مل جل کر رہیں گے۔ زمیندار کو بیگار نہیں دیں گے۔ کوئی ناجائز دباؤ نہیں سہیں گے۔ بس! دھرمپور میں تو ایسا ہی ہوا ہے۔ اب تو وہاں چین ہی چین ہے۔"

ابھی بات آگے نہیں بڑھی تھی کہ طوفانی میاں آ گئے۔ یہ بوڑھے آدمی تھے اور تیس برس سے گاؤں میں کرگھہ چلاتے تھے۔ طوفانی میاں نے آتے ہی اپنا نٹریا (معمولی قسم کا حقہ) ذرا الگ رکھ کر ایک دم لگایا اور اس انداز سے سب کی طرف متوجہ ہوئے جیسے ایک مجسٹریٹ وکیلوں کی بحث سننے کے لئے تیار ہو۔ لیکن طوفانی میاں کو متوجہ دیکھ کر سب چپ ہو گئے جیسے اب وہ کچھ کہنے والے تھے۔

"ارے سب چپ ہو گئے' بات کیا تھی؟"

سانول نے جواب دیا:

"بھاگو دھرمپور گیا تھا طوفانی چچا۔ وہیں کی بات تھی۔"

"کیابات تھی؟"

طوفانی میاں نے اس انداز میں سوال کیا جیسے اگر انہیں نہ بتایا گیا تو پھر کوئی بات ہوئی ہی نہیں۔ سب کا سننا بے کار ہوا۔ بھاگو نے پھر سے ساری بات دہرا دی۔ طوفانی میاں نے حقے کا لمبا دم لگا کر بزرگانہ انداز میں کہا:

"بات تو ٹھیک ہے۔ مگر بھائی یہ کرم کی لکھی باتیں ہیں۔ آدمی کیا کر سکتا ہے۔ یہ سب خدائی کارخانہ ہے۔"

طوفانی میاں نے ایک ہی جملے میں سب کی ہمت توڑ دی۔ اب بھلا خدائی کارخانے میں بحث کرنے کا سوال کیسے پیدا ہوتا۔ چھکو تیلی نے کہا:

"طوفانی میاں نے سولہ آنے ٹھیک بات کہی ہے۔ پرماتما نے سدا کے لئے آدمی کو چھوٹا بڑا بنایا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اپنا کام ہی نہ چلتا___"

چھٹو دھوبی نے اور آگے بڑھ کر داد دی اور کہا۔

"ہونہہ اگر جمیندار نہ رہے گا تو کون رہے گا؟ سب جمیندار ہو جائیں تو پھر کھیتی کون کرے گا؟"

دلو چپ چاپ بیٹھا سن رہا تھا۔ وہ بڑا جوشیلا تھا۔ سب کی باتیں سن کر اس کا خون کھول رہا تھا۔ لیکن اس کا چچا طوفانی بیٹھا تھا۔ بات آ آکر اس کے ہونٹوں پر رک جاتی تھی۔ لیکن اب اس سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے کہا۔

"اپنے کیے سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

طوفانی میاں نے اور ان کے ساتھ دوسروں نے اس کو آنکھیں نکال کر دیکھا۔ وہ حال ہی میں کلکتہ سے آیا تھا۔ کلکتہ میں وہ جہاز گھاٹ پر قلی کا کام کرتا تھا۔ دن رات محنت 'چین' جاپان اور امریکہ سے آیا ہوا مال جہاز سے اتارا کرتا تھا۔ اس کو کمپنی سے روز جھگڑنا پڑتا تھا۔ وہ پہلے کئی ہڑتالوں میں شریک ہو چکا تھا اور وہ یہاں میں زمینداروں کے ظلم سے بھی واقف تھا۔ اس نے کہا:

"ہم لوگوں کو اب تیار ہونا ہی پڑے گا۔"

سانول نے کہا:

"ٹھیک کہتے ہو دلو___"

طوفانی میاں نے قہر آلود نگاہوں سے دلو کو دیکھا اور بڑبڑاتے ہوئے اٹھے۔ "سچ ہے کلکتہ جانے سے آدمی کا دماغ کھراب ہو جاتا ہے۔" اس کے ساتھ ہی چھٹو اور چھکو اور ایک دو آدمی اٹھ کر چلے گئے اور اس انداز سے جیسے اس جگہ پر کوئی آفت آنے والی ہے۔ لیکن ان لوگوں کو اس کی پروانہ ہوئی۔ بلکہ سانول نے کہا:

"جلم پر جلم ہے' پرسوں ہی کی بات ہے میگھو کو پٹواری جی نے مارا ہے۔ بات یہ تھی کہ پٹواری جی چاہتے تھے میگھو کی عورت آکر ان کا چوکا کرے اور اس نے انکار کر دیا۔"

"یہ سب اب نہیں چل سکتا۔ کل میگھو کو کہا جائے کہ وہ بھی کام کرنے نہ جائے۔

دلو نے رائے پیش کی اور سب نے ہاں کہی۔ پھر آگے چل کر کیا ہوگا؟ اس پر بھی بحث رہی لیکن سب نے نتیجے سے بے پرواہ ہو کر یہی فیصلہ کیا کہ پٹواری کو رسید لنہ نہ دیا جائے۔ دباؤ ڈال کر دودھ گھی وصول کر لیتے ہیں' وہ بھی بند اور بیگاری آخری طور پر ختم___"

"بیگار ختم" کہتے وقت دلو نے تھوڑا سا کوڑا کرکٹ اٹھا کر الاؤ میں ڈال دیا۔ الاؤ سے پھر ایک بار تھوڑی سے آگ بلند ہوئی اور بجھ گئی۔

سانول نے کہا:

"تب دلو ٹھیک ہے نا؟"

دلو نے کہا:

"کیا بات ہے بھائی۔ مرد بات سے نہیں پلٹتا۔"

بھاگو نے کہا___"بالکل ٹھیک۔"

پھر سیتل بولا:

"لیکن دلو بھیا۔ وہ جو پنڈت جی آتے ہیں نا۔ کہتے تھے کہ تم سب چپ چاپ بیٹھے رہو۔ یہ سب کام کانگریس کردے گی۔"

سیتل کے بولنے سے جم کو بھی ہمت ہوئی۔ وہ بھی اپنے ماموں کے گھر گیا تھا۔ وہاں مسلمانوں کا ایک بڑا جلسہ ہوا تھا جس میں کانگریس کی برائیاں وہ سن چکا تھا اس نے کہا:

"دلو بھائی___کانگریس___مولانا صاحب تو کہتے تھے___"

دلو نے ذرا تیکھے انداز میں کہا:

"دھت۔ یہ سب بکتے ہیں۔ کریب کا کوئی سالا نہیں ہوتا۔ اپے کرنا دکا جو ہو۔"

یہ کہتے ہوئے دلو اٹھ کھڑا ہوا۔ رات بھی کافی جا چکی تھی۔ الاؤ بھی بجھ چکا تھا اور فضا میں ٹھنڈک کافی پیدا ہو چکی تھی۔ دلو کے اٹھتے ہی سب کے سب اٹھ گئے۔

دوسرے دن صبح سے سارے گاؤں میں ہلچل تھی۔ بوڑھے بچے اور جوان سب کے سب کچھ نہ کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے تھے۔ جوان تو ہر دروازے پر کہتے پھرتے تھے۔ "آج سبھا ہوگی۔" بچے تماشا سمجھ رہے تھے اور بوڑھے نتیجہ پر غور کر رہے تھے کہ بھس میں چنگاری پڑ گئی۔ پٹواری نے اندر مہتوں اور طوطارام کو بلا کر خوب ڈانٹا گالیاں دیں اور صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اس سال تم لوگوں نے بقایا بے باق نہیں کر دیا تو کوئی کھلیان سے ایک دانہ بھی اٹھا کر نہ لے جا سکے گا___اس سے جوش اور بھی بڑھ گیا۔

شام کو دو چار نوجوان میدان میں جمع ہو گئے۔ مگر زیادہ لوگ کترا کر نکل گئے۔ سبھا کرنے والوں کو سخت غصہ ہوا۔ وہ سب کے گھروں میں پھر گئے اور سب سے کہا۔ "سب کا حشر طوطارام اور اندر مہتوں کا ہوگا۔ تم سب چڑیوں کی ٹولی کی طرح چیں چیں کرتے رہ جاؤ گے اور پٹواری تمہیں باز کی طرح ہر روز شکار کرے گا۔ آج وہ کل وہ۔"

صبح اٹھ کر سانول منہ دھونے بیٹھا تھا کہ پیادے نے آکر کہا:

"سانول بھائی! تمہیں پٹواری جی نے بلایا ہے۔ کوئی ضروری بات ہے۔"

سانول کا ماتھا ٹھنکا تو ضرور لیکن وہ چور نہیں تھا جو منہ چھپاتا' منہ ہاتھ دھو کر اس نے کچھ کھایا پیا اور کچہری کی طرف چلا۔ راستے میں اسے خیال آیا کہ اس کی خبر دلو کو بھی کرتا جائے۔ جیسے ہی دلو کے گھر کی طرف مڑا' بھاگو اور دلو آتے دکھائی پڑے۔ بھاگو نے سانول کو دیکھتے ہی کہا:

"بھیا جانتے ہو کچہری سے بلاوا آیا تھا۔ گماشتہ جی بھی آئے ہوئے ہیں' اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مالک سے کوئی خاص حکم لے کر آئے ہیں___کیا رائے ہے___؟"

سانول نے جواب دیا:

"چلو تمہارے دالان میں بیٹھ کر بات کریں گے۔"

تینوں گئے اور بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ بھاگو نے یہ بھی بتایا کہ ان کی ساری باتیں پٹواری کے کانوں تک چھٹو دھوبی پہنچاتا ہے۔ اس سے سانول کو بڑا غصہ آیا اور وہ بولا:

"دو سالے کو پکڑ کر چار لاٹھی۔ ہم لوگ سے کچھ کھود کھود کر بات پوچھتا ہے اور اپنے باوا کو کہہ آتا ہے۔ حرامی!"

دلو نے کہا

"غصہ کرنے کی بات نہیں۔ سانول۔ کام کرنا ہے۔ دھیرج سے کام کرنا ہوگا۔__"

سانول نے کہا:

"ایسے سالوں کو سزا ضرور ملنی چاہئے۔"

بھاگو نے پوچھا:

"تو اب کیا ہوگا؟"

سانول نے کہا:

"ڈرنے کی بات کیا ہے۔ ٹھہرو، پٹواری نے بلایا ہے وہاں سے ہو آؤں۔ دیکھوں بات کیا ہے؟"

سانول چلا گیا۔ دلو اور بھاگو کچہری سے ہو کر آئے تھے۔ ان دونوں پر ڈانٹ پڑ چکی تھی۔ لیکن ان دونوں نے سانول سے باتیں اس لئے نہیں کہیں کہ وہ اور غصہ ہو جائے گا۔ ذرا سی بات میں اس کو غصہ آ جاتا ہے اور روکنے کی کوشش اس لئے نہ کی کہ وہ ہرگز نہ رُکتا۔ بلکہ بات اور بھی بڑھنے کا ڈر تھا۔ وہ دونوں دیر تک چپ رہے لیکن بھاگو نے کہا:

"دلو بھائی سانول کو وہاں نہ جانے دینا۔ گماشتہ جی اگر ٹیڑھے ہو کر بولیں گے تو سانول بھیا نہیں سہہ سکتے۔ وہ تیکھے مزاج کے آدمی ہیں۔"

دلو نے ایک لمبے سانس کے ساتھ کہا:

"یہ ٹھیک ہے۔ پر نہ جانے پر بھی تو بات بڑھتی ہے۔ اب جو بھی ہو دیکھا جائے گا۔"

بھاگو بولا:

"پھر بھی......."

یکایک وہ چپ ہو گیا۔ سانول تیزی کے ساتھ سامنے سے آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا اور دھوتی پھٹی ہوئی تھی۔ ابھی وہ دلو سے کچھ کہہ بھی نہ سکا تھا کہ دلو آ گیا اور آتے ہی بولا:

"بھاگو لاٹھی تو دے____"

دلو اور بھاگو دونوں کھڑے ہو گئے۔ دونوں نے سانول کو سمجھایا مگر وہ تنتا جا رہا تھا____ اس نے بتایا کہ وہاں پٹواری اور گماشتہ نے ڈانٹا۔ بات بڑھی۔ اس پر گماشتہ نے پھاٹک بند کروا دیا اور چاہتا تھا کہ مار پیٹ کرے مگر وہ اس طرف کی دیوار کو جو نیچی ہے پھاند کر بھاگ آیا ہے۔ اس نے بھی بتایا کہ چھٹو اور جھیمی حجام سارے فساد کی جڑ ہیں اور وہ ان دونوں سے بدلہ ضرور لے گا۔

دلو ہوشیار آدمی تھا اس نے سانول کو ایک کمرے میں بند کر دیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ بھاگو کچھ جوش میں تھا اور کچھ ڈر رہا تھا۔ دلو پر کوئی خاص اثر نہ تھا۔ وہ ایسے جھگڑے کلکتہ میں بار بار دیکھ چکا تھا۔ بھاگو کے لئے بات نئی تھی۔ جوش تو ضرور تھا مگر ایک تو دل کا کچا تھا اور دوسرے سمجھ بھی زیادہ نہ تھی۔ وہ گھبرا کر دلو کا منہ دیکھنے لگا۔ پھر بولا:

"اب کیا ہوگا دلو بھائی؟"

دلو بولا:

"دیکھا جائے گا"____

اتنے میں گاؤں کے کچھ بڑے بوڑھے آگئے اور لگے دونوں کو سمجھانے۔ دلو سب کی بات کا ٹھنڈے دل سے جواب دیا گیا۔ سب سے یہ بھی کہہ دیا کہ اب کوئی بات نہ ہوگی۔ سانول چلا گیا۔ لیکن جب پتہ چلا تو ان آدمی آنے تو ان سے بولا:

"بولو اب کیا ارادہ ہے؟ اب عزت چاہتے ہو یا ذلت؟"

ذلت کون چاہتا ہے؟ سب نے کہا کہ کچھ بھی ہو ہم ساتھ دیں گے۔ لیکن دلو نے سب کو سمجھایا کہ کوئی اونچی نیچی بات نہ ہونے پائے۔ اب صرف کام یہ کرنا ہے کہ آس پاس کے گاؤں میں لوگوں کو تیار کیا جائے۔ ابھی بات ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ کچہری سے زمیندار کے پیادے لاٹھیاں لے کر سانول کو پوچھتے آئے۔ دلو نے کہہ دیا کہ وہ کہیں چلا گیا۔ لیکن جھیمی حجام نے دیکھ لیا تھا کہ وہ ان مکان میں آیا ہے اور ان دونوں نے اس کو کمرے میں بند کر دیا ہے۔ جھیمی نے پیادوں کو بتا دیا تھا اور پیادوں نے بات بات میں کہہ دیا کہ جھیمی سے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اسی مکان میں ہے۔ ایک دو نے یہ بھی کہا کہ وہ اسے پکڑ کر لے جائے بغیر نہیں رہیں گے۔

اب دلو کو تاب نہ رہی۔ اس کا چہرہ غصے سے لال ہو گیا۔ ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے تن کر کہا:

"تم اسے نہیں لے جا سکتے۔ اگر تم زمین لال کرنا چاہتے ہو تو کنڈی کو ہاتھ لگاؤ۔"

پیادے آگے بڑھنا چاہتے تھے مگر پندرہ بیس آدمیوں کو دیکھ کر ان کی ہمت نہ پڑی۔ ان میں سے ایک دو نے یہ بھی رائے دی کہ چل کر مالک سے سارا حال کہہ سنانا چاہئے۔ بغیر حکم کے جھگڑا مول لینا ٹھیک نہیں۔

اس وقت سے شام تک ایک ہی خبر اڑتی رہی۔ گماشتہ جی دوسری جگہوں سے آدمی بلوا رہے ہیں کہ گاؤں کو لوٹ لیا جائے کھلیان پر قبضہ کر لیا جائے۔ اب کھلم کھلا لڑائی کا اعلان تھا۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے چپ تھے۔ اب کس کی طرف سے بولتے اور کس کو سمجھاتے____ اور ان کی سنتا بھی کون تھا۔ ایک طرف تھا حکومت کا غرور اور دوسری طرف عزت کا احساس۔ ان دونوں میں سمجھوتے کی گنجائش کہاں ہے۔

بات بڑھی تو کام بھی بڑھ گیا۔ آس پاس کے گاؤں میں سنسنی پھیل گئی۔ ہر گاؤں کے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ سب کے ساتھ ایک ہی جیسی بات تھی۔ ہر ایک کو ایک ہی قسم کی مصیبت کا سامنا تھا۔ اب سب کے سب ایک دوسرے کی مدد کرنے پر تیار تھے۔

زمیندار کے کارندے کسانوں سے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں۔ ان کا کام ہی ہے کسانوں پر زمیندار کا رعب باقی رکھنا۔ ان کے لئے کام کرنا تحصیل وصول اور حکم نہ ماننے والوں کی سزا۔ سر اٹھانے والوں کا سر کچلنا۔ اسی لئے تو زمیندار انہیں رکھتا ہے۔ یہ لوگ سب کچھ جانتے ہیں کس وقت کیا کام کرنا چاہئے۔ فیل بان جانتا ہے کہ ہاتھی کس طرح قبضے میں رکھا جاتا ہے۔

پٹواری جی کچہری سے نکلے اور تھانہ پہنچے۔ ایک رپورٹ لکھوائی کہ گاؤں کے کسان کچہری کو لوٹنا اور کھلیان سے سارا غلہ اٹھا لینا چاہتے ہیں۔ گماشتہ جی گئے اور مالک کے کان بھرنے اور بہکے ہوئے کسانوں کو راستے پر لانے کا سامان ہو گیا۔ یہ لوگ گاؤں میں چڑیوں کی

طرح چیں چیں کرتے رہے۔

دو چار دن بھی نہ گزرے تھے کہ سانول ڈلو اور بھاگو کے ساتھ کئی آدمیوں کو دفعہ ۱۴۴ کا نوٹس مل گیا۔ وہ نہ تو کھلیان کی طرف جا سکتے تھے اور نہ کچہری کی طرف ___ گاؤں میں ایک بڑی سبھا بھی ہوئی تو یہ لوگ میدان میں نہ جا سکے۔ وہاں کھلیان تھا۔

سبھا ہونے کے بعد کچھ اور لوگ بھی سامنے آ گئے اور ان پر بھی نظر کڑی پڑنے لگی۔ لیکن آگ جو سلگی تھی وہ بجھی نہیں بڑھتی ہی گئی۔

سانول صبح سویرے اپنی ضرورت سے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پانی کا بھرا ہوا لوٹا تھا۔ سامنے جھمیی آتا ہو دکھائی پڑا سانول ٹھہر گیا۔ جھمیی جیسے ہی پاس آیا۔ سانول بولا:

"تم کو ہم سب سے بیر کاہے کا جھمیی بھائی۔ تم کو سوچنا چاہئے کہ تم بھی کسان ہو۔"

جھمیی بولا۔

"تم لوگ تو جھوٹ موٹ بدنام کرتے ہو۔"

سانول کو اس کا یہ کہنا دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ وہ سب کچھ جانتا تھا۔ بولا:

"دیکھو جھمیی بھائی، یہ سب کہنے سے ہم نہ مانیں گے۔ یاد ہے تم کو۔ اسی پٹواری نے تم کو مارا تھا۔ بات ذرا سی تھی نا۔ ایک دن بدن میں تیل ملنے نہ گئے تھے ___ اپنی بے عزتی بھی بھول گئے؟"

جھمیی کترا کر نکل جانا چاہتا تھا کہ بولا:

"بیکار باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

سانول نے کہا:

"یہی تو کہتا ہوں۔ ایسی بات کیوں کرتے ہو جس سے تمہارا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

لیکن سانول اس بات کو بھول گیا تھا کہ بھاگو کا باپ گاؤں کا بڑا اہل تھا اور اسی زمانے میں بہت سا کھیت جھمیی سے لے کر زمیندار نے بھاگو کے باپ کو دے دیا تھا۔ اس سے اُس کا دل اب تک صاف نہیں ہوا تھا۔ گو بات بہت پرانی ہو چکی تھی۔ جھمیی نے کہا:

"سنو سانول! تم بیچ میں نہ پڑو۔ بھاگو کے باپ نے بڑا ظلم ڈھایا ہے ہم پر......."

"یہ بات بڑی پرانی ہو چکی ہے اسے بھول جاؤ۔ یا کہو کہ تو بھاگو سے کہہ کر تمہارا کھیت دلوا دوں ___ لیکن یہ تو سوچ کھیت تم سے باڑھو چاچا نے تو لیا نہیں۔ لیا تو ٹھاز میندار ہی نے۔ قصور کس کا ہے؟"

مگر جھمیی پر ان باتوں کا اثر کیا ہوتا۔ اس نے کہا:

"سانول میں تم سے بحث کرنے نہیں آیا ہوں ___"

"سب ٹھیک۔ پر یہ تو بتاؤ اس دن تم پیادے کیوں لائے تھے۔ ان کو کیوں بتایا تھا کہ سانول بھاگو کے گھر پر ہے۔ میرے باپ نے تو تمہارا کھیت نہیں لیا تھا۔"

جھمیی کھسیا گیا اور اس نے کہا:

"مجھے بحث کرنے کی فرصت نہیں۔"

وہ دو قدم آگے بڑھا۔ لیکن سانول نے اس کا راستہ روک لیا اور ذرا تیکھا ہو کر بولا:

"سنو جھیمی بھائی۔ تمہیں جواب دینا ہو گا۔ کسی کی راہ میں کانٹے بچھانا اچھا نہیں۔ یہ تمہارے حق میں بڑا برا ہو گا۔"

جھیمی جانتا تھا کہ سانول غصیل آدمی ہے۔ اس لئے وہ کسی طرح بات کاٹ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ بھاگو کے باپ پر جو الزام رکھ رہا تھا۔ وہ بھی غلط تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ گاؤں میں کسی نے کچھ اس کا بگاڑا نہیں تھا اور وہ صرف اپنے فائدے کے لئے گاؤں بھر کے آدمیوں کو نقصان پہنچا رہا تھا اور پٹواری تک خبر پہنچانے کے بعد گاؤں کے سارے لوگوں سے الگ سا ہو گیا تھا مگر اب بُرے کے پھندے پڑ گیا تھا۔ سانول کو جواب دیئے بغیر چلے جانا ممکن نہ تھا۔ اس نے کہا:

"سانول دیر ہو رہی ہے۔ ہمیں کام ہے راستہ چھوڑ دو۔"

اگر کھلا ہوا راستہ ہوتا تو شاید جھیمی کسی دوسری طرف سے چلا جاتا مگر راستہ کے لئے ایک ہی پگڈنڈی تھی اور اس کے دونوں طرف اکھ کے گھنے کھیت تھے جن میں آدمی سے زیادہ اونچے اوکھ لہلہا رہے تھے۔ راستہ بالکل نہ تھا۔ اس کے کہنے پر بھی سانول نے راستہ نہ دیا تو جھیمی نے چاہا۔ اس کو ہٹا کر چلا جائے ___ لیکن سانول نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ جھیمی نے جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا اور بولا:

"لڑنا چاہتے ہو کیا؟"

سانول بولا:

"ہم لڑنا نہیں چاہتے۔ لیکن اس کی ضرورت پڑی تو باز بھی نہ آئیں گے۔ ہم تو تم سے یہی پوچھ رہے ہیں کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟"

جھیمی کو غصہ آ چکا تھا اس نے کہا:

"کیا تو اس میں کسی کے باپ کا کیا ___"

سانول کو ایسی باتوں کی تاب کہاں تھی۔ وہ دیر سے اپنے غصے کو دبائے ہوئے تھا۔ گالی جھیمی کے منہ سے نکلی ہی تھی کہ پانی سے بھرا ہوا لوٹا اس نے جھیمی کے سر پر دے مارا۔ جھیمی کے سر سے خون اور لوٹے سے پانی بہنے لگا اور وہ چکرا کر گر گیا۔

بات اور زیادہ بڑھ گئی۔ شکار خود ہی پھنس گیا۔ پولیس آئی اور سانول کو گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن سوال یہ تھا کہ گواہ کہاں سے آئے؟ مقدمہ میں دوسرے لوگ کیسے پھنسیں۔ مگر روپیہ ہو تو یہ بھی مشکل نہیں۔ روپیہ خرچ کرنے والا ہونا چاہئے۔ کام کون سا ہے جو نہیں ہوتا۔ روپیہ ہو تو ایشور بھی خوش ہو سکتا ہے۔ مندر اور دھرم سالے بنا کر اور کسی کو پھنسا لینا کیا مشکل ہے۔ زمیندار نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے گاؤں اجڑ جائے لیکن سر اٹھانے والوں کا سر کچلا ضرور جانا چاہئے۔

ایک طرف سانول کا مقدمہ کھلا' دوسری طرف دلو اور بھاگو اور دوسروں کے خلاف دھڑا دھڑ رپورٹیں ہونے لگیں۔ یہاں تک کہ جب پورا غلہ کھلیان میں آ گیا تو ان سب پر 'جن پر کسی طرح کا شک تھا دفعہ ۱۴۴ کے نوٹس کی تعمیل ہو گئی۔ سب کے سب ڈر سے کانپ رہے تھے زمینداری تھی زمیندار کی اور راج تھا پٹواری کا ___

آخر اس طرح کب تک چلتا لوگ اکتا گئے۔ غریبوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آئے جو مقدمہ لڑیں۔ اس لئے چپ رہنا ہی بہتر۔ لیکن چپ رہیں تو کب تک۔ دلو نے بھاگو کو ایک دن بلا کر کہا:

"اب کچھ کرنا چاہئے۔ اگر چپ رہے تو مطلب یہ کہ پٹواری جی من مانی کرتے جائیں گے۔ اب جو بھی ہو۔"

بھاگو اور دوسرے لوگوں نے بھی رائے کا ساتھ دیا اور بات طے پائی کہ جب تک کھلیان اٹھے دوسرے گاؤں میں جلسے کئے جائیں اور اسی پر عمل بھی کیا گیا۔ جب آس پاس کے سارے گاؤں میں تحریک چل پڑی تو دوسرے لوگ بھی جن پر اس کا اثر پڑ سکتا تھا' سر جوڑ کے بیٹھے اور سر پر آنے والی آفت سے بچنے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔

بات بڑھتی گئی اور اس کا اثر بھی بڑھتا گیا۔ دھنی رام بھی ایک کسان تھا جو ان لوگوں کے ساتھ پورے جوش سے کام کر رہا تھا جب سانول کی ضمانت نہیں ہوئی تو وہ کچھ بول پڑا اور سب کے ساتھ بدمعاشوں کی فہرست میں اس کا نام بھی آ گیا اور نشانہ بن گیا۔

ایک دن صبح ہونے سے پہلے ہی وہ کسی کام سے دوسرے گاؤں جا رہا تھا۔ بیچ میں راستہ تھا اور دونوں طرف اوکھ کا کھیت 'ہر طرف سناٹا اور اندھیرا تھا۔ وہ بہت دور جا بھی نہ سکا تھا کہ پیچھے سے کسی نے اس کے سر پر لاٹھی مار دی۔ وہ گر پڑا۔ پھر ایک دو چار پانچ دس'______ وہ اُدھ مرا ہو گیا۔ سارے گاؤں میں اس سے کھلبلی مچ گئی۔

پولیس آئی۔ بہت سے لوگ گرفتار ہوئے۔ گرفتار ہونے والوں میں دلو' بھاگو' جگن' ہرکھو سبھی تھے۔ یہ سب کے سب تھانے سدھارے ان پر کھیت کا نے کھلیان لوٹنے اور دھنی رام پر حملہ کرنے کا الزام تھا۔ سب کا جیل جانا یقینی۔ پٹواری خوش تھا۔ سارے بدمعاش پکڑے جا چکے تھے۔__ وہ اپنی کامیابی پر خوش تھا۔ لیکن آئندہ کیا ہو گا' یہ سوال لرزہ خیز طور پر اس کے دماغ میں پیدا ہو جایا کرتا تھا۔

کھلیان بھر تا جا رہا تھا لیکن اب کھلیان میں کسانوں سے زیادہ پولیس کے سپاہی نظر آتے تھے۔ انہیں کھلیان کی حفاظت کرنا تھی۔ کسان سارے بے ایمان ہو چکے تھے اور اس کی سزا بھی پا چکے تھے مگر یہ بوڑھے اور بچے جو گاؤں میں بچ رہے تھے۔ وہ بھی تو آخر کسان ہی تھے۔

پوس کا مہینہ تھا۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ کھلیان کی حفاظت کرنے والے سپاہی اپنے گرم کوٹوں کے باوجود ٹھنڈک سے سکڑے جاتے تھے۔ سب نے مل کر بڑا سا الاؤ جلایا تھا۔ آگ تاپ رہے تھے اور کہانیاں کہی جا رہی تھیں۔ الاؤ بجھنے لگا' ایک سپاہی اٹھتے ہوئے بولا:

"ایک دن ساری چیز اسی طرح ختم ہو جائے گی۔"

دوسرا بولا:

"سالے پٹواری کا کچھڑ۔ اوہ لائن میں کیسے آرام سے رہتے ہیں اس وقت۔"

اس کے اٹھتے ہی دوسرے سپاہی بھی اٹھ کر جھونپڑے میں چلے گئے اور الاؤ بجھ گیا۔ کھلیان میں سپاہیوں کا شور گاؤں کے سناٹے میں مل گیا______

______

آئینہ

ممتاز شیریں

میں ایک بڑے آئینہ کے سامنے کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ میری توجہ بال بنانے پر نہ تھی۔ یونہی کنگھی کئے جا رہی تھی۔ دراصل میں اپنے چہرہ پر طرح طرح کے جذبات کے اظہار کا مطالعہ کر رہی تھی اور کیا کہنے بڑا ہی مزہ آ رہا تھا..... بال بنانے میں ضرورت سے زیادہ دیر لگ رہی تھی۔ امی۔ کہیں گی "کچھ کام بھی کرو گی پروین! تم ہو' آئینہ ہے' اور بس۔ جب دیکھو آئینہ کے سامنے"...... نہیں آج امی بھی کچھ نہ کہیں گی۔ آج تو وہ مجھ سے بہت خوش ہیں' ابھی ابھی آج ہی میرا رزلٹ معلوم ہوا ہے نا؟ رزلٹ اور آئینہ نے خوشی کی تصویر پیش کر دی۔ سیکنڈ ڈویژن! اور میرے گال تمتا رہے تھے..... ہونہہ! سیکنڈ ڈویژن بھی کوئی بڑی بات ہوئی میرے لئے؟ میں تو ہمیشہ جماعت میں اوّل آیا کرتی تھی۔ مجھے تو فسٹ ڈویژن میں کامیاب ہونا چاہیئے تھا۔ ایک ہلکی سی تحقیر اور ناز...... ارے میں یوں بھی بھلی معلوم ہوتی ہوں؟..... پھر بھی اگر کسی دوسرے امتحان کا نتیجہ ہوتا تو کچھ پروا نہ تھی۔ بی اے! ان دو ننھے سے حرفوں میں کتنی شان ہے۔ کتنا دبدبہ! اب تو میں گریجویٹ ہوں۔ آئینہ کی تصویر پر رعب اور فخر چھا گیا...... گویا میں اپنی صورت نہیں دیکھ رہی تھی۔ بلکہ پردہ فلم کی کسی ہیروئن کے چہرہ پر بدلتے جذبات کو یا کسی مصور کی بنائی ہوئی تصویروں کو جن میں مصور نے خاص خاص جذبے کو کینوس پر کھینچا ہے...... اب لڑکیاں میرا پیچھا نہ چھوڑیں گی' خوب ستائیں گی۔ "مٹھائی کھلاؤ۔ مٹھائی کھلاؤ" اور میں کہتی پھرتی تھی نا کہ اس سال ہرگز کامیاب نہ ہوں گی۔ میں نے امتحان کے لئے ذرا بھر بھی تیاری نہ کی تھی اور وہ کہتی تھیں۔ "آخر تم کامیاب نہ ہو تو کسی اور کی کامیابی کی امید بھی ہو سکتی ہے۔" اور مجھ سے شرطوں پر شرطیں بدھا کرتی تھیں۔ بھلا مٹھائی پر راضی ہو جائیں گی۔ شاید پارٹی ہی دینی پڑے۔ ہاں' کیوں نہ آج ہی' اپنی چند خاص سہیلیوں کو بلا کر پارٹی دوں۔ خوب لطف آئے گا۔ گھر بیٹھے بیٹھے میرا جی اکتا گیا ہے...... اوہ! امی ادھر آ نکلیں۔ "آج ہی میں سہیلیوں کو چائے پر بلاؤں امی؟"

"ہاں' ہاں' کیوں نہیں بیٹی۔ شوق سے بلاؤ۔ آخر ایسی خوشی کے موقع بار بار نہیں آتے" آہا! آج امی نے کتنی جلد اجازت دے دی۔ زینی کو ضرور بلاؤں گی۔ وہ تو پارٹی کی جان ہو گی پھر اور صرف اسی کو معلوم ہے نا کہ...... اوں..... اوں! بڑی شریر ہے وہ تو سب سے کہہ دی گی۔ پروین کو ڈبل کنگریچولیشن دو۔ ایک تو اس کے گریجویٹ بننے پر اور دوسرا اس سے بڑھ کر اس کی انگیجمنٹ (Engagement) پر۔" اور سب لڑکیاں مجھ پر ٹوٹ پڑیں گی۔ چھیڑتی چھیڑتی میرا ناک میں دم کر دیں گی اور میں بناوٹی غصہ سے یوں منہ بنالوں گی...... ارے تو غصہ بھی مجھے بھاتا ہے۔ منہ پھلائے ہوئے میں بھی میں اچھی لگتی ہوں۔ یہ تو آج ہی معلوم ہوا۔ ہاں ہاں لڑکیاں کہا کرتی تھیں نا۔ "غصہ کا اظہار کرتی ہوئی تم تو بالکل مادھوری کی سی دکھائی دیتی ہو۔" لیکن میں نے آج تک توجہ

سے نہ دیکھا تھا۔ واللہ یہ آئینہ بھی بڑی انوکھی ایجاد ہے۔ اپنی تصویر کو جس پوز میں، جس پہلو میں چاہو دیکھ لو۔ جس طرح بھی چاہے دیکھ لو...... ہاں تو میں اپنے چہرے پر مصنوعی غصہ پیدا کر دوں گی۔ گو جی تو یہی چاہتا ہوگا کہ وہ یونہی چھیڑتی جائیں۔ ہاں۔ گھنٹوں یونہی چھیڑتی رہیں۔ کیسا لطف آئے گا ان کی اس چھیڑ چھاڑ میں۔ ایک خاص لذت ...... چائے کے اختتام پر زینی مجھ سے گانے کے لئے اصرار کرے گی تو کیا گاؤں؟...... ہاں وہ فلمی گیت گاؤں گی۔ وہ گیت ــــ

ساجنا جمنا پیچھے کھیلوں۔ کھیلوں اکیلی کیا؟

اور جب میں یہ گیت گا رہی ہوں گی تو زینی ایسی معنی خیز، ایسی شرارت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی ہوگی.... اور پھر وہ برس ہی تو پڑے گی۔ ساتھ ہی گدگداتی ہوئی "اکیلی" اکیلی؟ ہم اتنی سکھیاں جو ہیں۔ ہونہہ! اب ہماری حقیقت ہی کیا ہے۔ اسے تو اپنا ساجن چاہیے۔ اپنا ــــ نہ ہو تو" .... اُف ــــ میں ــــ کے خیال ہی سے کیسے شرما جاتی ہوں۔ میں نے ذرا سی نظریں اٹھا کر آئینہ پھر دیکھا۔ یہ تصویر تو سب سے دلکش تھی۔ میں ــــ کے سامنے شرماتی ہوئی بھی ایسی ہی نظر آؤں گی نا ــــ

"چھوٹی بی بی!" کیا ہے خیرن بی۔" "ایک خبر سنانے آئی تھی۔" "خبر"۔ میں نے مڑ کر پوچھا۔ "ہاں ہاں کہو نا کیا خبر۔"

"ارے آج تو تم بہت خوش نظر آ رہی ہو۔ بی بی! ہاں یاد آیا۔ بڑی بیگم کہہ رہی تھیں۔ تم کسی بڑے امتحان میں کامیاب ہو گئی ہو۔ ایسی خوشی کے وقت تمہیں بُری خبریں سنا کر رنجیدہ کروں۔ چھی چھی۔ توبہ توبہ" وہ جانے لگی۔

"ارے ٹھہرو خیرن بی! آخر کچھ معلوم بھی ہو۔"

"کچھ نہیں بی بی۔ وہ جو ہمارے محلے میں نانی بی رہتی تھیں نا۔ وہی جو بچپن میں تمہیں کھلایا کرتی تھیں..... ارے تو یہ میرے منہ سے نکل ہی گیا۔ نا بابا۔ چھی چھی خوشی کے وقت یہ خبر کیسے سناؤں۔"

"میری خوشی جائے بھاڑ میں۔ آخر کہتی کیوں نہیں ہو۔ اور یہ نانی بی کی بات ہے تو میں سنوں گی ہی۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے۔"

"اوئی میرے اللہ میں نے کیا کیا! بڑی بیگم مجھ پر خفا ہو جائیں تو؟ جس وقت تم چھوٹی تھیں۔ انہوں نے تاکید کی تھی کہ 'نانی بی' کا نام تمہارے سامنے نہ لیا کروں۔"

"امی تمہیں کچھ نہ کہیں گی۔ اس کا ذمہ میں لیتی ہوں۔"

"کل رات نانی بی جاتی رہیں۔ بیٹی ہم سب محلہ کی عورتیں ان کے پاس جمع تھیں۔" خیرن بی نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "مرتے وقت تمہارا ہی نام زبان پر تھا۔"

گویا تصویروں کے سٹ کو مکمل کرنے میں ایک اور جذبہ کی کمی تھی ــــ اداسی کی جھلک ــــ اور میں بال گوندھتی ہوئی آئینہ کے سامنے سے چلی آئی۔

"نانی بی' ــــ میری بوڑھی انا' وہی جس نے اتنے سال مجھے اپنی گود میں کھلایا تھا۔ اب اس دنیا میں نہیں ہے؟ کاش میں اپنی انا کو مرنے سے پہلے ایک بار دیکھ لیتی میں کیا کچھ نہ دے دوں گی۔ پھر اپنی انا سے صرف ایک بار ملنے کے لئے! میری انا کیا تم میرے سہانے بچپن کی ان تمام یادوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئی ہو؟ ان ننھی ننھی دلچسپیوں کی یاد کو' ان خیالات کو جو تمہارے بڑھاپے اور میرے بچپن کے جوڑ سے پیدا ہو گئے تھے؟ آخر تم نے اس دنیا کو چھوڑا کیسے؟ تم جو اس دنیا کو اتنا عزیز رکھتی تھیں گو اس دنیا میں تمہارے لئے کوئی خوشی نہ تھی۔ ہاں میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ تاہم تمہیں زندگی سے محبت تھی۔ تم زندہ رہنا چاہتی تھیں۔ ایک بے بسی۔ ایک مایوسی کے ساتھ اس دنیا سے چمٹی ہوئی تھیں۔ غم کے مارے بھی اس مصیبت بھری دنیا سے کیسے چمٹے رہتے ہیں!...... اور تم تو' نانی بی! چھوٹی چھوٹی مصیبتوں کو بھی سہہ نہ سکتی تھیں۔ ستائی ہوئی تصور کرتی تھیں۔ میں نے تمہیں کبھی ہنستے نہ دیکھا تھا۔ تمہارے لئے اس دکھ بھری دنیا میں اگر ذرا سی خوشی اور دلچسپی کا کوئی ذریعہ تھا تو وہ میں ہی تھی۔ تم مجھے گود میں لے کر سب کچھ بھول جاتی تھیں......... ہاں میری انا۔ تم

معصیبت زدہ تھیں۔ مگر دنیا کو تم سے ہمدردی نہ تھی۔ امی۔ ابا کو بھی نہیں۔ گو ان کے گھر میں تم اتنا کام کیا کرتی تھیں۔ آخر کیوں؟ اگر تمہارے چہرہ پر تمہارے دلی دکھ کا ذرا بھی اظہار ہوتا تو شاید لوگوں کو تم سے کچھ ہمدردی ہوتی۔ مگر تم یوں دکھائی دیتی تھیں۔ گویا تم میں جذبات ہی نہیں۔ ایک پتھر کی مورت سی..... اور میری غریب اماّ! تمہارے چہرہ میں کچھ ایسی چیز بھی نہ تھی جو ذرا سی بھی کشش رکھتی جو لوگوں کے دلوں میں رحم کے جذبہ کو ابھار سکتی۔ سیاہ رنگ 'پچکے ہوئے گال' روکھے سفید بال' پوپلا منہ 'لٹکتے ہوئے ہونٹ' بے نور' اندر کو دھنسی ہوئی' چھوٹی چھوٹی منکوں کی سی آنکھیں___ انسانی زندگی کی بوسیدگی کی مکمل تصویر! تمہاری یہ ہئیت اور اس پر ظاہری بے حسی دلوں میں رحم کی بجائے ایک ہلکی سی نفرت ایک خوف سا پیدا کر دیتی تھی۔ گویا تم پرانے قصوں کی کوئی جادوگرنی ہو اور امی تو تمہیں جادوگرنی ہی سمجھتی تھیں۔ جب بھی وہ تمہیں ڈانٹ بتاتیں تو تم کچھ جواب دینے کی بجائے خاموش نگاہوں سے گھورنے لگتیں۔ شاید تمہارے یوں دیکھنے سے تمہارا مدعا طالب رحم ہوتا۔ مگر تمہاری پچپلی بے نور آنکھیں اس کو ظاہر نہ کر سکتی تھیں اور امی کسی خوف سے سہم جاتیں۔ گویا تم ان پر آنکھوں کے ذریعہ جادو اتار رہی ہو۔ ابا بھی تم سے دور دور رہتے تھے۔ جب کبھی انہیں تم سے بات کرنے کی ضرورت ہوتی تو دوسری طرف منہ پھیر کر نہایت بے پروائی سے جواب دیتے ... وہی خوف ملی ہوئی نفرت کا جذبہ...... گھر میں کوئی بھی تمہیں چاہتا نہ تھا۔ مگر' میری بوڑھی بے بس اماّ' میں تمہیں چاہتی تھی' ننھے دل سے۔ اس محبت نے مجھے ایک چھوٹی فلاسفر بنا دیا تھا۔ کیوں کہ میں ہی تمہیں سمجھ سکتی تھی۔ ابا کا علم' ان کی عمر' امی کا تجربہ تمہیں سمجھنے میں مدد نہ دے سکے تھے۔ مگر میں گو ننھی سی تھی۔ تمہیں اچھی طرح سمجھتی تھی۔ کیوں کہ مجھے تم سے محبت تھی۔ ہمدردی تھی۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ تم میں کوئی جادو کی طاقت نہیں تھی۔ تم بے بس تھیں' کمزور تھیں۔

دس بارہ سال پہلے کی زندگی میری آنکھوں میں پھرنے لگی۔ بہت سی تصویریں میرے دماغ کے پردہ پر ابھرنے لگیں۔ اس وقت کی تصویریں جب میں ننھی سی تھی۔ ہر وقت نانی بی کے دامن سے چمٹی پھرتی تھی۔ نانی بی رسوئی میں کھانا پکا رہی ہوتیں (وہ مجھے کھلانے کے علاوہ گھر کا سب کام بھی کر دیتی تھیں) میں بھی دوڑی ہوئی وہاں جا پہنچتی۔ امی روکنے کی کتنی ہی کوشش کرتیں۔ طرح طرح کے کھلونے میرے سامنے لا رکھتیں۔ مٹھائیاں منگواتیں مگر میں مچلنے لگتی۔

"اوں' یہ مٹھائیاں نہیں کھاؤں گی۔ مجھے تو کھوپرے کی مٹھائی پسند ہے۔ نانی بی لے دیں گی۔" امی بڑبڑانے لگتیں۔ "کمبخت بازار کی سستی مٹھائیاں دلا کر بچی کی صحت خراب کرتی ہے۔" میں پھر بھی اپنی ہٹ سے باز نہ آتی تو لڑکے کو دوڑا کر وہی سستی مٹھائی منگا دیتیں مٹھائی ملتے ہی میں وہاں سے بھاگ نکلتی۔ میں تو نانی بی کے ہاتھ سے مٹھائی کھاؤں گی۔" امی جھلا اٹھتیں۔ "اری پروین! کہاں بھاگ چلی۔ خدا لیا اس بوڑھی نے تو میری بچی پر جادو کر دیا ہے۔" ہاں امی نانی بی نے سچ مچ مجھ پر جادو کر دیا تھا۔ محبت کا جادو' وہ مجھ سے کتنا پیار کرتی تھیں' میری ننھی پربن' ارے کیا نام ہے تمہارا___ اونہہ بابا کیسے کیسے نام نکل گئے ہیں اس جمانے میں۔ ہم پرانے جمانے کی بوڑھیاں کیسے بول سکیں۔ یہ جمانا ہی کیا میرا نام بھی بجرگوں نے کچھ ایسا ہی رکھا ہے۔ جھا۔ را۔ جہرہ۔ مجھے کھود بولنے نہیں آتا۔ میں تمہیں شہجادی پکارا کروں گی۔ چھوٹی شہجادی ہا' تم ایک شہجادی کی طرح کھبصورت ہو۔ ہوں۔ تو میری چھوٹی شہجادی کو کیا چاہئے۔" یہ مٹھائی تم اپنے ہاتھ سے کھلا دو نانی بی۔" میں اپنی مٹھی کھول کر ننھی سی ہتھیلی پسار دیتی' نانی بی ذرا ذرا سی مٹھائی توڑ کر مجھے کھلانے لگتیں اور یہ معمولی مٹھائی اس سوکھے ہاتھ سے کھاتے ہوئے مجھے ایسا مزہ آتا کہ امی کے پاس بیٹھ کر خوبصورت ننھی طشتریوں میں سجے ہوئے گلاب جامن' برفی' لڈو پیڑے اور حلوہ سوہن کھاتے ہوئے کبھی نہ آتا تھا۔

میں نے ایک دن امی سے نانی بی کا نام پوچھا۔ "نانی بی' اور کیا" انہوں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "نہیں امی کچھ ایسا نام جھارا" "زہرہ" اور مجھے بڑا ہی تعجب ہوا۔ زہرہ! نانی بی کا نام "زہرہ" ایسا پیارا نام ایک چھوٹی سی خوبصورت لڑکی کے نام کا سا! اور امی مجھے پروین کہہ کر بلاتیں تو مجھے خاک اچھا نہ لگتا۔ اوں___ امی مجھے شہجادی کہو۔ پروین نہیں" امی سر پیٹ لیتیں۔ "ارے کیا ہو گیا میری بچی کو؟ میرے

اس بوڑھی نے کچھ کھلا نہ دیا ہو۔" آخر امّی کو نانی بی سے اتنی چڑ کیوں تھی؟ شاید اس نفرت کا سبب حسد بھی تھا۔ ان کی اپنی بچی انہیں چھوڑ کر کسی اور سے ایسی چمٹ جائے انہیں کیسا بُرا معلوم ہوتا ہو گا۔ پھر جب نسیم اور نسرین پیدا ہوئے تو امّی نے یوں انتقام لینا شروع کیا ہماری توجہ ان دونوں پر صرف کر دیتیں۔ ہر بات میں ان کی طرفداری کرتیں اور مجھے جھڑکتی رہتیں۔ جب کبھی امّی مجھے جھڑک دیتیں تو میرے ننھے دل میں بہت دکھ بھر آتا اور میں نانی بی کے سینے سے چمٹ کر زور زور سے سسکیاں لینے لگتی۔ "نانی بی میں تم.... تمہاری بے ٹی ہوں۔ امّی کی نہیں۔" "رو نہ میری ننھی! میری شہزادی کو کس نے رلایا۔" وہ اپنے لٹکے ہوئے نچلے ہونٹ کو اور سامنے لا کر ٹھوڑی پکڑ کر رونے لگتیں۔ "میری بچی! نہ جانے بیگم کا دل اتنی پیاری بچی کو جھڑکنے کو کیسے چاہتا ہو گا۔ وہ ان دو چھوٹے بچوں پر ہی کیوں جان چھڑکتی ہیں؟ وہ میری شہزادی سے خوبصورت بھی تو نہیں۔

آخر امّی یہ کب تک سہہ سکتی تھیں وہ صرف انتقام کے لئے مجھ سے بے توجہی برتا کرتیں۔ دل میں تو مجھی کو سب سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ مجھے یوں الگ ہوتی دیکھ کر کئی بار انہوں نے نانی بی کو ہمارے گھر کا کام چھوڑ دینے پر مجبور کرنا چاہا مگر یہ خیال کر کے تو مجھے بہت ہی دکھ پہنچے گا اور نانی بی اس سلیقہ سے سب کام سنبھال لیتی تھیں کہ ان کے کام میں کوئی نقص نکالنا مشکل تھا۔ نئے نوکروں سے ایسے سلیقہ کی امید نہ تھی۔ پھر نانی بی کے جادو کا ڈر! امی چپ ہو رہتیں۔ مگر آخر یہ ہو کر ہی رہا۔ ایک دن نسرین نے میری سب سے پیاری گڑیا توڑ ڈالی۔ اس پر میں نے اسے نوچا۔ وہ تھی ہی امّی کی لاڈلی۔ منہ بسورتے ہوئے امّی کے پاس دوڑی "ارے کیا ہوا میری بچی کو؟"____ ہونہہ ان کی بچی کو بچھو نے کاٹ کھایا تھا____ امّی کا یہ کہنا تھا کہ نسرین نے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ "آپا پروین نے میرا۔ منہ۔ نوچ لیا۔ خون۔ نکل۔ آیا۔ ہے۔ اوں۔ اوں۔ اوں" "اُف ری مکارنی گویا سچ مچ خون نکل آیا تھا۔ بس کیا تھا۔ امّی نے مجھے گھسیٹ کر طمانچے پر طمانچے لگانے شروع کئے۔ میں نے سسکتے ہوئے کہا۔ "نہیں امّی نسرین نے میری گڑیا توڑ دی ہے۔" میں نے خیال کیا کہ یہ کہہ کر بچ جاؤں گی۔ مگر امّی کہیں سننے والی تھیں۔ میں نانی بی کی بیٹی جو ہوئی۔ "او نہہ! گڑیا توڑ ڈالی تو دوسری منگوا دیں گے۔" "گویا تیری گڑیا میری منی سے زیادہ ہے دیکھ تو میری بچی رو رو کر ہلکان ہوئے جا رہی ہے۔" اور ساتھ ہی ایک ایسا چانٹا رسید کیا کہ میں مارے درد کے بے حس ہو گئی۔ نانی بی میرے رونے کی آواز سن کر باورچی خانہ سے بھاگی بھاگی آئی تھیں۔ یہ دیکھتے ہی مجھے امّی سے چھین لینا چاہا۔ "بیگم آخر کیوں بچی کو مارے دیتی ہو۔ کیا قصور کیا تھا اس ننھی نے، ننھی سی جان ناجوں کی پلی، اتنی مار سہہ سکے گی۔" امّی کی آنکھوں سے گویا آگ برس رہی تھی۔ میں اپنی سسکیوں کو روکے سہمی سہمی کھڑی تھی۔ "دور ہو جاؤ۔" امّی نے مجھے کھینچ کر نانی بی سے الگ کرتے ہوئے گرج کر کہا۔ "تم کون ہوتی ہو مجھے روکنے والی؟ کیا حق ہے تمہارا اس بچی پر۔ میں اس کی ماں ہوں جو چاہے کر سکتی ہوں۔"

"نہیں بی بی، سوچو تو ننھی سی جان،،،، غصہ اترنے پر تمہیں خود رنج ہو گا۔"

"چلی جاؤ، میں ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتی۔ دور ہو جاؤ، میری نظروں کے سامنے سے۔" امّی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ میں دوڑ کر نانی بی سے چمٹ گئی۔ پھر کیا تھا۔ امّی آگ بگولہ ہو گئیں۔ مجھے بے تحاشہ تڑتڑ مارنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ خود مارتی مارتی تھک گئیں۔ "اچھا لے جاؤ، اس دیوانی کو ابھی لے جاؤ میرے سامنے سے۔ یہ میری بچی نہیں۔" امّی نے ایک زور کا چانٹا رسید کر کے مجھے دھکیل دیا۔ نانی بی کی منکوں کی سی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔ "میرے اللہ خدا جانے کیوں کچھ روز سے بیگم کا دل اس بچی سے پھر گیا ہے۔" نانی بی اپنے میلے آنچل سے آنسو خشک کرتی ہوئی مجھے گود میں لے کر چلی آئیں۔ روتے روتے میری ہچکی بندھ گئی تھی۔ کچھ دیر تک تو یہ حالت رہی گویا مجھے آس پاس کی چیزوں کا احساس ہی نہیں۔ اتنے میں نسرین میرے سامنے آ کھڑی ہوئی اس کے ایک ہاتھ میں میری ٹوٹی ہوئی گڑیا تھی اور دوسرے میں چاکلیٹ کا ڈبہ۔ وہ میری طرف شریر نظروں سے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ پھر اس نے وہ گڑیا زور سے صحن میں پھینک دی۔ میرا منہ چڑا چڑا کر بہت سے چاکلیٹ منہ میں بھر لئے اور "نوکرانی کی بیٹی" کہہ کر قہقہہ لگاتی ہوئی زور سے بھاگی۔ یہ میری برداشت سے باہر تھا۔ میری ہی گڑیا ٹوٹے۔ میں خود ہی پٹوں اور پھر نسرین میری ہنسی اڑائے، میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "نانی بی میں

تمہارے ساتھ رہوں گی۔ مجھے اپنے گھر لے چلو۔ تمہارا گھر کہاں ہے نانی بی؟ میں امی کے پاس جانے کے لئے کبھی ضد نہ کروں گی۔ تمہاری بیٹی بن کر رہوں گی۔"

"میری بھولی بچی! میرا گھر کہاں؟ گھر ہوتا تو یہاں تمہارے گھر میں رات دن کیوں پڑی رہتی؟" پھر نانی بی نے مجھے منانے کی بہت کوشش کی۔ مٹھائی لے آئیں ہنسانے والی کہانیاں سنائیں مگر اس دن مجھے اتنا دکھ پہنچا کہ کوئی چیز میرے آنسو کو تھمانہ سکتی تھی۔ میں دن بھر روتی رہی اور رات کو یونہی روتی روتی باورچی خانہ میں ہی نانی بی کے پہلو میں سو گئی۔ دوسری صبح امی کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ امی دروازے کے کواڑ سے لگی کھڑی تھیں۔ ان کا منہ سوجا ہوا تھا اور آنکھیں سرخ تھیں۔ شاید وہ بھی روتی تھیں۔ وہ کچھ کہے بغیر نانی بی کی طرف گھور کر دیکھ رہی تھیں دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش گویا ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس ہی نہیں مگر جونہی امی نے یہ دیکھ لیا کہ میں جاگ رہی ہوں۔ کمبخت منظر ہی بدل گیا۔ میں سہمی ہوئی نظروں سے امی کو تک رہی تھی۔ امی نے لپک کر مجھے گود میں اٹھا لیا اور چومنے لگیں۔ "میری بچی، مجھ سے ڈرتی ہے کیوں ڈرتی ہو ننھی۔ میں تمہاری ماں نہیں ہوں؟ زہرہ بی! (امی نے پہلی دفعہ نانی بی کو نام سے پکارا تھا ورنہ ہمیشہ نانی بی ہی کہا کرتیں) تم نے میری بچی کو ڈس لیا ہے۔ تم ناگن ہو! تم کون ہوتی ہو میری بچی کو مجھ سے چھیننے والی؟ تم نے میرے اپنے خون کو چھینا ہے۔ میرے جگر کے ٹکڑے کو چھینا ہے۔ تم ڈائن ہو۔ سنتی ہو میرا دل بچی سے پھر گیا ہے۔ اس کی ذمہ دار تم ہو۔ تمہاری طرف سے میں نے اپنی ننھی کو اتنا ستایا۔ میں حسد کی آگ میں جلتی رہتی تھی۔ سن رہی ہو اپنے ظلم کی داستان؟"

"بی بی، میں کیا کروں بچی کا دل مجھ سے لگ گیا ہے۔"

"بچی کا دل لگ گیا ہے! شرم نہیں آتی بوڑھے منہ سے جھوٹ بولتے۔ تمہیں اپنے سفید چونڈے کی لاج نہیں؟ خدا کی قسم تم نے بچی کو کچھ کھلا دیا ہے ورنہ وہ ایسی کریہہ صورت بوڑھی سے مانوس ہو جاتی (میں دل ہی دل میں ملامت کر رہی تھی وہ غصہ میں کیسی کیسی باتیں کہے جا رہی تھیں) میں نے کلیجہ پر پتھر رکھ کر بہت دن تک یہ سہا ہے۔ اب میں ایک لمحہ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔ ہونہہ! برداشت میں ایک موئی نوکرانی کی خاطر یہ رنج سہوں؟ ہونہہ! میں بھی کتنی دیوانی ہوں! ادنیٰ نوکرانی سے دبوں؟" امی جذبات کی شدت سے کانپ رہی تھیں؟ "سنتی ہو کان کھول کر سن لو۔ تم اب ایک لمحہ بھی اب اس گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ چلی جاؤ اسی وقت۔ تمہاری یہ منحوس صورت ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔ اٹھو، بوریا بستر باندھ لو...... بیٹھی کیا تک رہی ہو۔ مجھے پھٹے پھٹے دیدوں سے؟ کیا مجھ پر بھی جادو کرنے کا ارادہ ہے۔"

"بیگم میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں مجھے کبھی کبھی بچی کو آکر دیکھنے کی اجازت دو۔ اس دکھ بھری دنیا میں یہ ننھی سی جان ہی میرے دل بہلاوے کا جریہ (ذریعہ) ہے بی بی۔ اس کو بھی نہ چھین کو۔ کھدا واسطے اتنا جلم (ظلم) نہ کرو۔ اللہ میاں تمہیں برکت دے۔ میں نے بہت دنوں تمہارا نمک کھایا ہے۔"

بچی کو دیکھنے، بچی کو دیکھنے۔ اب تمہارا سایہ بھی اس پر پڑنے نہ دوں گی۔ اگر پھر کبھی تم نے اس گھر میں قدم رکھا۔ اپنی منحوس صورت دکھائی!...... میری بچی کو پھر مجھ سے چھیننے...... میری ننھی، میں تمہاری ماں نہیں۔" امی نے مجھے بھینچ لیا اور رونے لگیں اور میں حیرت سے کبھی ادھر دیکھ رہی تھی کبھی ادھر۔ ان دونوں عورتوں میں کتنا فرق تھا! ایک جذبات مجسم دوسری گویا پتھر کی مورت امی کی خوبصورت آنکھیں سوجی ہوئی اور سرخ تھیں۔ ان کی لانبی گھنی پلکوں پر آنسو تھر تھرا رہے تھے۔ چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ پھول کی سی تراش کے ہونٹوں کے کونے کانپ رہے تھے۔ مرمریں گردن اور سینہ میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ غم اور حُسن کا امتزاج۔

ادھر نانی بی پھٹی پھٹی آنکھوں سے امی کو تک رہی تھیں۔ خاموش نگاہوں سے۔ اگر ان پھیکی، بے نور آنکھوں میں جذبات کے اظہار کی قوت ہوتی تو ان نگاہوں میں یاس اور رنج کی ایک دنیا ہوتی مگر بظاہر جذبات سے عاری معلوم ہوتی تھیں۔ پتھرائی ہوئی، وہ بے حس بیٹھی ہوئی تھیں۔ جیسے سکتے کا عالم۔ مگر میرا ننھا دل انصاف کرنا چاہتا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو ضرور امی کی طرفداری کرتا۔ آخر "غمگین

حسین"اپنے اندر بہت اثر رکھتا ہے نا۔ مگر مجھ پر نہ تو اس حسن کا کوئی اثر تھا نہ نانی بی کے پچکے ہوئی گالوں اور پوپلے منہ سے نفرت تھی۔ ہاں مجھے امی پر ترس آ رہا تھا مگر اس دل کا کیا حال ہوگا۔ جس سے ایک عزیز چیز چھین لی گئی ہو۔ امی کے پاس دولت تھی، عزت تھی، ہر طرح کا آرام تھا۔ چاند سے بچے تھے، اس قسمت کی ستائی ہوئی بوڑھیا کے پاس کیا رکھا تھا۔ رہنے کے لئے ٹھکانہ بھی تو نہیں۔ ہاں امی کے چہرے سے بہت رنج ظاہر ہو رہا تھا۔ مگر میں اچھی طرح جانتی تھی۔ ان سادہ نگاہوں میں کتنی یاس چھپی ہوئی تھی اور ان سوکھے سینے کے اندر رکا ہوا سیلاب تھا۔ کتنی دبی دبی ہلچل تھی۔ کیسا طوفان تھا۔

نسیم کے رونے کی آواز آئی اور امی مجھے گود سے اتار کر آنسو پونچھتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ نانی بی خاموشی سے اپنا بستر اور کپڑے باندھ رہی تھیں۔ امی کے جاتے ہی میں دوڑی ہوئی ان کے گود میں جا بیٹھی۔ "نانی بی، مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ گی نانی بی۔" میں نے سسکتے ہوئے کہا۔ نانی بی نے مجھے گلے لگالیا۔ پھر کیا تھا جیسے بند ٹوٹ گیا ہو۔ رکا ہوا سیلاب اُمڈ آیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ نانی بی کا دل پگھل کر آنکھوں کے ذریعہ بہہ رہا ہے۔ "میری بچی، میری ننھی شہزادی تمہیں چھوڑ کر کیسے جاؤں۔ اچھی نانی بی اقرار کرو، تم مجھے دیکھنے کبھی کبھی آیا کرو گی نا؟" نہیں بیٹی اب اس گھر میں قدم نہ رکھوں گی۔ "کیوں نانی بی! مجھ سے روٹھ تو نہیں گئیں میں تمہارے لئے سب کچھ کروں گی۔ تم جو کچھ کہو وہ سنوں گی۔ نہ روٹھو نانی بی! آتی رہو مجھے دیکھنے۔"

"اچھا میں جو کچھ کہوں وہ سنو گی؟" "ضرور۔" "مجھے وہ آئینہ کا ٹکڑا دے دو نا اچھی بیٹی۔" نانی بی نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہا۔ میں بھاگی بھاگی اپنے کمرے میں گئی اپنے چھوٹے ٹرنک میں سے ریشمی بٹوہ نکالا۔ اس بٹوے میں میں نے قارون کا خزانہ جمع کر رکھا تھا۔ بہت سی ٹوٹی ہوئی چوڑیاں، رنگین منکے موتی کانچ کے ٹکڑے۔ گڑیوں کے ننھے زیور، نئے ڈھالے ہوئے تانبے کے پیسے، جسے میں "ساورن" کہا کرتی تھی۔ سفید چمکتی ہوئی چونیاں، دونیاں..... اسی میں میں نے نانی بی کا آئینہ رکھا تھا۔ آئینہ کے ٹکڑے پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ چکنائی کے دھبے بھی تھے۔ پھر بھی کیسا پیارا لگتا تھا وہ آئینہ۔ کیسے خوبصورت کنارے ان پر رنگین شیشوں سے تراشے ہوئے خوبصورت پھول تھے۔ سنہری، عنابی، فیروزی، آسمانی۔ اس دن جب میں نے نانی بی سے یہ آئینہ مانگا تھا تو انہوں نے پیار سے چمکار کر کہا۔ "میری اچھی بیٹی تمہیں مٹھائی لادوں گی۔ یہ نہ لو" میں کوئی چیز مانگوں اور نانی بی نہ دیں۔ وہ کبھی نہ نہ کرتی تھیں۔ ہونہ ہو اس میں کچھ ہو گا ہی اور میں آئینہ لینے پر مصر ہو گئی۔ "ہونہہ میں تو یہ آئینہ ہی لوں گی۔" بچپن کی ضد میں نے ہٹ کر کے، رو رو کے آخر آئینہ چھین ہی لیا۔ آئینہ دیتے ہوئے نانی بی کی آنکھوں میں آنسو نکل آئے تھے۔ مگر میں تو چھوٹی تھی۔ ان آنسو کے معنی کیسے جان سکتی؟ پھر وہ آئینہ میرے پاس رہا۔ کئی بار نانی بی نے ترسی ہوئی التجا بھری آواز میں مجھ سے وہ آئینہ واپس مانگا تھا۔ مگر میں ہر دفعہ رونے لگتی۔ "ہوں، وہ غلیظ آئینہ کا ٹکڑا مجھ سے پیارا ہے؟" نانی بی ناچار چپ ہو جاتیں" مگر آج جب کہ وہ مجھ سے جدا ہو رہی تھیں، مجھے چھوڑ کر چلی جا رہی تھیں، میں وہ آئینہ تو کیا سب کچھ دینے کو تیار تھی۔ میں بٹوہ لئے نانی بی کے پاس واپس آئی اور سب خزانہ ان کے سامنے انڈیل دیا۔ میں اپنے دل میں ایک عجیب طرح کی مسرت محسوس کر رہی تھی گویا میں اپنی پیاری چیزیں دے کر بہت بڑا ایثار کر رہی ہوں۔

"یہ سب کچھ لے لو نانی بی۔ مگر ضرور آتی رہنا۔ نہیں تو میں خوب روؤں گی۔" "اچھا بیٹی اللہ نے مجھے جیتا رکھا تو جب تم اپنا گھر بساؤ گی میں آکر جان و دل سے تمہاری خدمت کروں گی۔ مرتے دم تک وہیں پڑی رہوں گی۔ پھر مجھ پر دو مٹھی خاک ڈال دینا بیٹی" نانی بی نے ایک سرد آہ بھر کر اپنی چادر اوڑھ لی اور اپنے سامنے پھیلی ہوئی چیزوں سے صرف آئینہ اٹھالیا۔ اسے آنکھوں سے لگالیا اور اپنے میلے رومال میں لپیٹ کر کرتے میں چھپالیا۔ پھر مجھے گود میں لے کر میری بلائیں لیں، گلے سے لگایا۔ پیار کیا اور مجھے آہستہ سے اُتار کر اُٹھ کھڑی ہوئیں کپڑوں کی گٹھڑی بغل میں دبائی اور سر جھکائے خاموشی سے چلی گئیں۔ اب میں رو نہیں رہی تھی۔ کیوں کہ مجھے یقین تھا کہ نانی بی پھر آئیں گی۔ جب تم اپنا گھر بساؤ گی کی شرط کو تو میں سمجھ نہ سکی تھی! میں اپنے بکھرے ہوئے خزانہ کو سمیٹ کر بٹوے میں ڈالنے لگی۔ کیسی پیاری چیزیں تھیں۔ نانی بی نے ان سب کو چھوڑ کر گرد آلود ٹوٹے پھوٹے آئینہ کو ہی کیوں چن لیا تھا؟ اس وقت میں اس گتھی کو سلجھانہ

سکی۔ اس آئینہ کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے چند سال اور گذرنے تھے۔ اس کے بعد میں اس آئینہ کی یاد کے بغیر نانی بی کا تصور کر ہی نہ سکتی۔ اب اس وقت کی تمام یادوں میں جب نانی بی کا اور میرا ساتھ تھا اس آئینہ والے واقعہ کا نقش ہی سب سے گہرا ہے ہاں وہ نقش جو کبھی تحت الشعور میں چھپا ہوا تھا۔ اب کتنا صاف ہے! نانی بی کا ایک ایک لفظ ان کی ایک ایک حرکت 'اس دن کی جب انہیں آئینہ ملا تھا۔ ان کی وہ آئینہ لینے کے لئے التجائیں وہ آخری سین جب انہوں نے آئینہ کو آنکھوں سے لگا کر سینہ میں چھپا لیا تھا۔ دل کے پاس۔ یہ تصویریں بار ہا اُبھرتی ہیں۔ یہ یادیں بار ہا میرے دماغ میں گھومنے لگتی ہیں اور میں سوچتی ہوں۔ بظاہر اس بے حس مجسمہ میں ایسے جذبات بھی تھے؟ اس بجھے ہوئے دل کی راکھ میں اتنی چنگاریاں دبی ہوئیں تھیں۔ اس سوکھے سینے میں اتنی آگ سلگ رہی تھی۔ ایسی یاد چٹکیاں لے رہی تھی' یہ آئینہ انہیں راستہ میں پڑا ہوا ملا تھا۔ جب ہم ہوا خوری کے لئے جارہے تھے ہر شام مجھے نانی بی ہوا خوری کے لئے باہر لے جایا کرتی تھیں۔ ہم گھر سے دور نکل جاتے ایک کھلے میدان کی طرف جہاں بہت سی خود رو گھاس بے ترتیبی سے اُگی ہوئی تھی اور دور دور پر کہیں کہیں گھنے درخت تھے۔ شام ہوتے ہی میٹھی بولی بولتی ہوئی چڑیاں ان درختوں پر آ بیٹھتیں۔ ان کے چہچہوں سے ساری فضا شیریں نغموں سے معمور ہو جاتی مجھے یہ جگہ بہت پسند تھی اور میں ہر روز نانی بی کی چادر کھینچتی ہوئی انہیں اس طرف لے جاتی۔ راستہ میں ہمیں ایک چھوٹی سی دوکان ملتی تھی۔ جہاں صرف پان کی بیڑی بکتی تھی۔ نانی بی ہر روز وہاں جاتی تھیں۔ ایک پیسہ کے پان اور سپاری خرید لیتیں۔ وہیں سے ایک پان میں بہت سا چونا بھی مانگ لیتیں۔ دوکان کے سامنے کچھ تختے بچھے ہوئے تھے۔ نانی بی وہیں بیٹھ کر بڑے انہماک سے پان کی نسیں نکالنے لگتیں۔ بوڑھا دوکاندار اندر جا کر "پان کوٹنی" لے آتا' اور نانی بی کے سامنے رکھ دیتا اتنے میں دو چار پوپلے منہ والی بوڑھیاں اور آجاتیں۔ سب کی سب پان خرید کر "پان کوٹنی" کا انتظار کرتی ہوئی نسیں نکالنے لگتیں۔ ایک بوڑھے میاں بھی چلم لئے آجتے۔ اچھی خاصی محفل جم جاتی۔ مجھے اس بوڑھوں کی مجلس سے بڑی دلچسپی تھی۔ اپنی دونوں مٹھیوں میں نانی بی کی چادر تھامے ان سے لگ کر کھڑی ہو جاتی اور ان سب کی عجیب عجیب حرکتوں کو غور سے دیکھتی رہتی۔ بوڑھیاں نسیں نکالتی ہوئی' پان کوٹتی ہوئی' اور بوڑھے میاں چلم بھر کر کش لگاتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں چھیڑ دیتے۔ کبھی اپنے بیٹا بیٹی۔ پوتے پوتوں کی' کبھی محلے والوں کی اور اکثر "ہمارے جمانے" اور "اب کے جمانے کی" "اب کے جیور بھی کوئی جیور ہوئے! بابا اب کی چھوکریوں کا دماگ تو آسمان پر چڑھ گیا ہے۔" ایک بوڑھی منہ پر زور سے ہاتھ مار کر کہتی۔ "پرانے جیوروں کے نام ہی سے کان پکڑتے ہیں۔ ہونہہ ہاتھوں میں دو چوڑیاں' گلے میں باریک "سنگل" کانوں کی لو میں ایک "باریک" کرن پھول یا جھومر اور بس بھلا یہ بھی کوئی جیور ہوئے۔ ہمارے جمانے میں جو پہنتی تھیں کان بھر کر سونے کی چتیاں۔ ہاہا "نخشاروں" پر جھومتی ہوئی کیسی بھلی لگتی تھیں۔"

"اور یہ بھی دیکھا' ناک چھدوانا تو گویا عیب ہی ہو گیا۔ چھی چھی کیسی بری لگتی ہے۔ ناک۔' نتھنے چڑھا کر نفرت ظاہر کرتی۔

"تانا یہ جمانے کی چھوکریاں بھی کیسے بال بناتی ہیں۔ تیل نام کو نہیں۔ روکھے بال سر سے دو انگل اوپر اٹھے ہوئے۔ موٹی موٹی لٹیں نکلی ہوئیں۔ سر کو اچھا خاصا کوڑے کا ڈھیر بنالیتی ہیں۔ حشر کے دن پُل صراط پر سے پھسل پھسل گر نہ پڑیں تو جب جانیں۔ کیا ہمارے بجرگوں نے جھوٹ کہا تھا۔ "بیچ میں سیدھی مانگ نکالی تو پل بھر میں سیدھے پل صراط طے کر لو گی۔" اب تو اللہ ہی بچائے ان تیڑھی مانگ والوں کو۔ سیدھے مانگ نکالو چہرہ پر کیسا نور جھلکتا ہے۔ تیڑھی مانگ تو کیسی اچھی صورت بگاڑ دیتی ہے۔ اب اس بچی ہی کو دیکھ لو بوا۔ کیسا پھول سا مکھڑا' چاند سی پیشانی' سیدھی مانگ نکالتی تو چہرہ پر کیسی رونق آجاتی اب تو کرستان لگتی ہے۔ کرستان۔" اور ایک بوڑھی بھویں چڑھا کر نفرت سے منہ پھیر لیتی۔

کوئی اور میرے ریشمی فراک کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگتی۔ "اماں اب کے کپڑے تو دیکھو کیسے کیسے فیشن۔'

"وہ بُوا' وہ فیشن کی بھی تم نے ایک ہی کہی۔ ذرا تو دیکھو تو پنڈلیاں ننگی بازو ننگے 'لعنت بھیجو لعنت۔"

اور یہ رنگ تو دیکھو بوا' کیسا پھیکا چھی چھی' یہی کیا اب کے سب رنگ پھیکے۔ سچ پوچھو تو اجلے رنگ میں اور ان میں کوئی فرق ہی

نہیں۔"

"ہونہہ اجلا رنگ !اب کی چھوکریاں اجلے کپڑے پہننے کو عار نہیں سمجھتیں۔ابھی سے بوڑھیاں بنی پھرتی ہیں۔ بھلا ان بھئی چھوکریاں کو کہیں اجلا رنگ ساجتاہے ۔"

"ان بھئی چھوکریاں کا۔ارے بابا اب تو گجب ہو گیا گجب !سہاگنیں تک اجلے کپڑے بے دھڑک پہن لیتی ہیں گجب ہو گیا گجب۔ توبہ توبہ کچھ سہاگ کاپاس بھی ہے انہیں؟"

کبھی شادی بیاہ کی باتیں ہونے لگتیں۔ . . .

"ہمارے زمانے کی شادیاں 'شادیاں تھیں۔ کئی ہفتے لگتے تھے 'کیسی کیسی رسمیں اب دیکھو جھٹ منگنی پٹ بیاہ 'اور بیاہ بھی کیسا بیاہ 'لو ادھر نکاح پڑھ آگیا ادھر دلہن کی رخصتی ہوئی۔ نہ کوئی رسم نہ ریت۔"

"اور اب کی دلہنیں توخالہ !اباری چھوریاں 'توبہ توبہ آنکھ کا پانی بہہ گیا ہے کیسی ہنسی خوشی رخصت ہوتی ہیں۔اپنے خصم کے گھر کو ہم تھے کہ تین تین روز تک آنکھ کاپانی نہ سوکھتا تھا۔ رو رو کر بے سدھ ہو جاتے تھے اللہ اللہ کیا زمانہ آیا۔"

"پرسوں میں ایک شادی میں گئی تھی۔ اماں!کاہے کو بولوں اس دلہن کی بے شرمی"اور سب بوڑھیاں ٹھوڑیوں کو ہاتھ لگائے آنکھیں پھاڑے بڑے غور سے سننے لگتیں۔

"جب اس کی ہجولیاں چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں تو ہنس رہی تھی بھری مجلس میں نوشہ کے گھر والے بھی پاس ہی بیٹھے تھے' توبہ توبہ ہم پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ماں بیچاری نے سر پیٹ لیا۔ کیا کرتی سدھنوں کو منہ دکھانے سے رہی۔جب رخصتی کا وقت آیا تو وہ تیار ہی بیٹھی تھی۔اوئی' میرے اللہ ایک بوند بھی نہ تھی'اس چھوکری کی آنکھوں میں ؟نابابا ہم سے تو رہانہ گیا۔ آخر بیٹی والوں کی لاج رکھنی تھی سدھنوں کے سامنے۔ ہم دو چار بوڑھیوں نے مل کر کپڑے برابر کرنے کے بہانے سے اتنے زور سے نوچا کہ اس کے چیخ نکل گئی۔جب کہیں جاکر دو بوند پانی نکلا۔وہ تو خیر ہوئی کہ چھوکری ہم پر پلٹ نہ پڑی۔ورنہ رہی سہی عزت بھی جاتی رہتی۔

"اچھا لیا بہت اچھا کیا۔اس بے شرم کے ساتھ ایسا ہی کرنا چاہئے تھا۔"سب یک زبان ہو کر کہتیں اور بوڑھے میاں بھی بڑے زور سے سر ہلا ہلا کر داد دیتے۔یہ بوڑھے میاں سر کو ہاتھ لگائے ہمہ تن گوش ہو کر بوڑھیوں کی باتیں سنا کرتے۔جب کبھی ان کے بات کرنے کی باری آتی تو پگڑی ذرا ہٹا کر (کیسی پگڑی'ایک بڑے سے رومال کو سر کے گرد لپیٹ لیا کرتے تھے)اپنے چمکتے ہوئے گنجے سر کو زور زور سے کھجلانے لگتے اور بڑی ہی سوچ بچار کے بعد ایک جملہ نکالتے گویا انہیں کی رائے آخری اور فیصلہ کن ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں ہوتیں مگر یہاں بھی نانی بی خاموشی سے سب کی باتیں سنتیں۔"اب کے جمانے پر اتنے اعتراضات سن کر بھی کوئی رائے ظاہر نہ کرتی تھیں اور نہ ہی ان کے چہرہ سے کوئی جذبہ کا اظہار ہوتا۔شاید ان باتوں سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا...... پھر جب یہ محفل برخاست ہو جاتی تو میں نانی بی کی چادر کھینچتی ہوئی انہیں اس میدان میں لے جاتی۔

یہاں ہم کسی گھنے درخت کے سائے میں بیٹھ جاتے۔ میں گرے ہوئے سرخ پھولوں سے کھیلنے لگتی۔ پھر انہیں سمیٹ کر اپنے دامن میں بھر لیتی 'اور نانی بی کی گود میں آ بیٹھتی۔

"ایک اچھی سی کہانی بولو نانی بی۔ 'آج کون سی کانی (کہانی) بولوں۔"اور ساتھ ہی اپنی نسوار کی ڈبیا نکال لیتیں۔ ایک چٹکی بھر کر نتھنوں میں چڑھا لیتیں۔ پھر ایک میلا سا رومال اپنی سوسی کے "لہنگے" کے نیفے سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر نکالتی ہوئی کہانی شروع کرتیں۔"اچھا سنو ایک بادچھا تھا۔ اس کی سات بیٹیاں تھیں۔"پھر ناس پونچھتی ہوئی آہستہ آہستہ کہتیں۔اس نے سب شہجادیوں کو باری باری اپنے دربار میں بلایا۔ پوچھا تمہیں کون پالتا ہے' سب بولیں۔ 'آپ" مگر چھوٹی شہجادی بولی۔"اور نانی بی اس حیلے سے رومال کو پھر نیفے میں ٹھونس لیتیں۔ اس سے پونچھنے پر بھی کالی کالی دھول کی ایک تہہ سی ان کے نتھنوں پر جمی رہتی۔اتنی باتیں ایک ساتھ کہنے سے ان کے پوپلے منہ

کے کناروں پر پان کی لال لال پیک بہ آتی اور وہ ایک طرف منہ کر کے پیک کو تھوکتی ہوئی اپنی کہانی کو جاری رکھتیں۔ "چھوٹی شہجادی بولی۔ ہم سب کو اللہ میاں ہی پالتے ہیں اور ہجور آپ کو بھی۔" اس جواب کو سن کر بادشاہ.....

"کیسی چھوٹی شہجادی نانی بی؟ مجھ جیسی؟" میں بیچ میں کہہ اٹھتی اور وہ لپک کر مجھے گود میں اٹھا لیتیں۔ "ہاں بٹی تمہاری جیسی شہجادی ایسی ہی کھوبصورت شہجادی۔" میں خوشی سے پھول جاتی اور نانی بی کی طرف محبت بھری نگاہوں سے دیکھنے لگتی۔ "ننھی کیسا پیارا مکھڑا ہے تمہارا ایہ۔ چاند کا ٹکڑا" نانی بی میری بلائیں لینے لگتیں۔ تٹ، تٹ، تٹ۔ "دیکھو تو سب انگلیاں ٹوٹیں۔ کتنا پیار ہے مجھے اپنی بچی سے۔" اور میں اپنی ننھی ننھی باہیں نانی بی کی گردن میں ڈال دیتی۔ اس وقت مجھے ان نتھنوں پر جمی راکھ دھول اور پوپلے منہ سے بہتی ہوئی پیک سے بھی نفرت محسوس نہ ہوتی۔

"اس کے بعد کیا ہوا نانی بی؟ جلدی جلدی کہو نا۔"

"نا بٹی جلدی بولوں تو کھاک مجا آئے گا۔" اور یہ سچ تھا۔ ان کے یوں بیان کرنے میں کہانی کا دوگنا مزا آتا اور وہ واقعات کو ایسی تفصیل سے اتنی اچھی طرح بیان کرتیں کہ میں اپنے آپ کو اس ماحول میں تصور کرنے لگتی۔ مجھے نانی بی کی ہر کہانی کی "شہجادی" سے محبت ہو جاتی مگر نہ جانے کیوں ان کی ہر "شہجادی" پر کوئی نہ کوئی مصیبت آپڑتی۔ پھر کہیں سے ایک "شہجادہ" آٹپکتا۔ شکار کھیلتے ہوئے یا اور کچھ طریقے سے، اور اس شہجادی کو مصیبت سے نجات دلا کر اپنے محل لے جاتا۔ دونوں ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگتے۔ نانی بی کی ہر کہانی یوں ہی ختم ہوتی۔ یہ شہجادہ کتنا اچھا ہے۔ چھوٹی شہجادی کو بچانے والا، میں سوچا کرتی۔

"میں چھوٹی شہجادی ہوں، نانی بی! مجھے بھی ایک ایسا چھوٹا شہجادہ لے جائے گا۔" میں نہایت بھولے پن سے پوچھ بیٹھتی اور نانی بی کی بے نور آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے چمک آجاتی۔

"ہاں کیوں نہیں میری ننھی! جب تم بڑی ہو کر انگریجی پڑھو گی۔ کھوب پڑھ کر بی۔ اے پاس ہو جاؤ گی تو...... اس پر تم ہو بھی کھوبصورت تمہیں جرور ایک بڑا آدمی بیاہ لے جائے گا۔ کوئی بہت بڑا بافیسر۔"

"ہوں، ہوں بڑا بافیسر نہیں چاہئے۔ چھوٹا شہجادہ۔" میں مچلنے لگتی۔

"ہاں ننھی۔ وہ شہجادہ ہی ہو گا۔ میری شہجادی وہ دن کب آئے گا۔ اللہ مجھے اس وکھت تک جیتا رکھے۔ تمہیں دلہن بنی دیکھ لوں۔ تو چین سے مر سکوں گی........" آہ نانی بی، شہجادہ تمہاری شہجادی کو لینے آگیا ہے۔ مگر تم اس دنیا میں نہیں ہو۔ کاش تم چند ہی دن اور زندہ رہتیں وہ دن بھی دیکھ لیتیں جس کو دیکھنے کی تمہاری آخری آرزو تھی ___ کو دیکھ کر فرطِ خوشی سے پھولے نہ ساتیں۔ ان کے حسین چہرے کی کتنی ہی بلائیں نہ لیتیں تم ضرور انہیں شہزادہ ہی سمجھتیں.......

ہاں تو یہ ہمارا معمول تھا۔ میں ہر روز نانی بی کے ساتھ اس میدان میں جاتی۔ کچھ دور پر ایک چھوٹا سا گدلے پانی کا تالاب تھا۔ کئی بار میں نانی بی سے کہنا چاہتی تھی کہ اس تالاب تک ہو آئیں، مگر نانی بی کے کہانی بولتے ہی میں اندھیرا ہو جاتا، اور ہم گھر لوٹ آتے۔ ایک دن جب نانی بی نے ابھی کہانی شروع نہیں کی تھی میں نے ایک آدمی کو بندریا ساتھ لئے آتے دیکھا۔ اس کے پیچھے بہت سے بچے شور مچاتے آرہے تھے، تالاب کے پاس آکر وہ بندر والا اکڑوں بیٹھ گیا اور اس نے تماشہ دکھانا شروع کیا۔ لڑکے اس کے گرد حلقہ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ چند بے فکرے مرد بھی جمع ہو گئے۔ "میں بندر کا تماشہ دیکھوں گی نانی بی تالاب کے پاس لے چلو۔" نانی بی میری ہر خواہش کو پورا کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھے دور لے جا کر ایک اونچے ٹیلے پر کھڑا کیا۔ جہاں سے میں اچھی طرح دیکھ سکتی تھی۔ "یہاں نہیں اور بھی قریب سے چلو نانی بی۔" "نا بٹی، یہ مجھ سے نہ ہو گا۔ اتنے گیر مردوے کھڑے ہیں، اوئی میرے اللہ" اور نانی بی نے چادر کھینچ کر اپنے چہرہ کو اور زیادہ ڈھانپ لیا۔ "اچھا تم نہیں آؤ تو میں بھی یہیں رہوں گی۔" میں نانی کی چادر تھامے تماشہ دیکھنے لگی۔

"اچھا بیٹا اب اپنی ماں کے گھر کا کام کرو۔" بندر والے نے ڈگڈگی بجا کر حکم دیا۔

بندریا نے جلدی سے ایک چھتری اٹھائی اور اسے سر پر رکھ کر ادھر اُدھر پھرنے لگی۔ گویا بہت کام کر رہی ہے۔ "اچھا اب ساس کے گھر کا بھی کام کر دو بیٹا۔" بندریا نے زور سے چھتری زمین پر پھینک دی اور منہ پھلائے ایک طرف جا کر بیٹھ رہی۔

"بندریا نے چھتری کیوں پھینک دی نانی بی۔" کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے چادر کو دو ایک جھٹکے دے کر پھر وہی پوچھا۔ پھر بھی نانی بی نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو نانی بی ایک مٹی کے ڈھیروں میں کرید کرید کر کوئی چیز نکال رہی تھیں۔

____ اُنہوں نے میری بات سنی تھی۔ کچھ دیر بعد نانی بی نے وہ چیز نکال لی۔ ایک آئینہ کا ٹکڑا ____ "کیسا آئینہ نانی بی مجھے بھی دکھاؤ نا۔" نانی بی نے پھر بھی کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بڑے غور سے آئینہ کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھیں بہت دیر کے بعد انہوں نے دبی آواز میں کہا۔ مجھ سے نہیں اپنے آپ سے۔

"آہ! انہوں نے ایسا ہی آئینہ میرے لئے منگوایا تھا۔"

"ایسا آئینہ کس نے منگوایا تھا نانی بی؟" "وہی ہمارے گھر والے' ہمارے آدمی۔" "تمہارے گھر والے کون نانی بی۔" "وہی بزرگوں نے جن کے ساتھ میرا بیاہ کیا تھا۔" "تو تمہارا بیاہ ہوا تھا نانی بی۔ باجے بجے تھے' تمہارے بیاہ میں؟ اور تم نے اچھے اچھے کپڑے اور زیور پہنے تھے۔ اپنے بیاہ کا قصہ سناؤ' نانی بی' آج کہانی کے لئے اصرار نہ کروں گی۔"

"میری بھولی بچی۔ ہاں میں نے اچھے اچھے جیور اور کپڑے پہنے تھے۔ مگر بیاہ کے معنی ہی نہیں۔ اچھا آج کانی (کہانی) نہ سنو گی۔ مگر میری جندگی کی کہانی سے کیا کم ہے بیٹی۔ کیا بتاؤں کیسے دھوم دھام سے ہوا تھا میرا بیاہ! کہتے ہیں پانچ ہزار کھرچ ہوئے پانچ ہزار! برابر ایک مہینہ لگا تھا' پورا ایک مہینہ۔ کیا کہوں میں تو گہنوں سے گویا لد گئی تھی گلے میں اتنا مال کے بوجھ سے گردن جھکی پڑتی تھی۔ جھومر' مانگ میں موتی' پیشانی پر ٹیکہ جھومتا ہوا' ہاتھوں میں کنگن' پونچیاں' گوٹ اور گوٹوں کے بیچ میں ہاتھ بھر کر ہری" ریشم کی چوڑیاں" اتنی بڑی سی نتھ۔ پاؤں میں چار جوڑی جیور' کان بھر کے سونے کی پتیاں اور مجھے کیسا سنوارا گیا تھا۔ بال پیشانی پر اُتار کر ایسے صاف کئے گئے تھے ایسے صاف کہ اپنی صورت دیکھ لو۔ منہ پر چمکتا ہوا ریز چمکیاں پھر مہندی' کاجل مسی سے سولہ سنگار اور میں ایسی کاہے کو تھی بیٹی ____"

نانی بی نے پچکے ہوئے گالوں پر ہاتھ پھیر کر آئینہ میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "گول صورت' پھولے پھولے گال' کیسی رونق تھی چہرہ پر۔ اب کیا دیکھتی ہو بٹی ہڈ چمڑا ہو کر رہ گئی ہوں۔ اس جمانے میں کیسی بھاری جوان تھی میں۔ ایک ایک باجو یہ موٹا' رواج میں نہ سماتی تھی"......

اور کپڑوں کی بھڑک کا کیا کہنا لال دامنی یہ بڑے بڑے طلائی بوٹوں والی" نانی بی نے بوٹوں کی چوڑائی بتانے کے لئے اپنی ہتھیلی پھیلا دی۔ 'ہرا بنارسی لہنگا اور اطلس کا کرتہ یہ کیسی بن کر سنور کر بیٹھی تھی میں۔" میں نانی بی کے قصہ کو بڑی دلچسپی سے سن رہی تھی اور تصوّر میں نانی بی کو دلہن بنا دیکھ رہی تھی پچکے ہوئے نہیں' پھولے پھولے گالوں والی" نانی بی کو۔

"میں ایک اچھے کھاتے پیتے گھرانے سے تھی اور ہم تھے ہی کتنے 'ایک بھائی' ایک بہن' بابا نے میرے بیاہ پر جی کھول کر روپیہ کھرچ کیا۔ "ان" کے ماں باپ تو ہم سے بھی زیادہ مال والے تھے۔ کیا مجال میرا دل کوئی چیج مانگے اور وہ نہ ملے بات ابھی جبان پر بھی نہیں آتی تھی کہ وہ چیج میرے کھدموں میں۔ کیسا کہوں بیٹی میرے بیاہ کے بعد چند سال کیسے سکھ سے گجرے۔ ان کے بابا مجھ پر جان چھڑکتے تھے اور میں ساس کی آنکھوں کا تارا تھی۔ کیسے ارمانوں سے بہو کو بیاہ کر لائی تھیں آخر ایک ہی تو بیٹا تھا۔ جگر کا ٹکڑا۔ میں سجوں پر بیٹھی رہتی۔ کام کرنے کی بھی ایک بات تھی۔ میں تو ادھر کا تنکا ادھر اٹھا کر نہ رکھتی تھی اور وہ مجھ سے کتنا پیار کرتے تھے' مجھے گھر کی "پا چھا جادنی" کہا کرتے تھے' مجھ سے پوچھے بنا کوئی کام نہ کرتے ہر وقت کوئی نہ کوئی اچھی چیج میرے لئے لے آتے' کیسے کیسے پیار کے ڈھنگ آتے تھے انہیں۔ نہ جانے کہاں سے سیکھ آئے تھے۔ ایک دن مسہری پر بیٹھی اپنے دامن میں گوٹا ٹانک رہی تھی پیچھے سے آکر میری آنکھیں بند کر دیں۔" پھر جلد ہی کچھ شرماتے ہوئے نانی بی نے اپنی زبان دانتوں میں دبالی۔ 'چھی چھی کیسی باتیں کر رہی ہوں بچی کے سامنے۔ کھیر تم تو بڑی ہی بھولی بچی ہو۔ ان باتوں کو کیا سمجھو گی۔ ہاں آنکھیں بند کر دیں اور چیج میرے کانوں میں پہنا کر ہاتھ ہٹا لیا۔ اوئی میرے اللہ میں تو شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ انہوں نے دوسرے ہاتھ سے آئینہ میرے چہرے کے سامنے پکڑ رکھا تھا۔ کہنے لگے دیکھو کیسے

بھلے لگتے ہیں۔ جھومر تمہارے کانوں میں۔" میں نے جلدی سے جھومر نکال ڈالے۔ مجھے تو بڑے بڑے لگتے تھے۔ اتنے لانبے لٹکتے ہوئے "بابا مجھے تو کھاک اچھے نہیں لگتے۔" وہ ہنس کر بولے۔ "تم تو پرانے ڈگر پر چلتی ہو۔ آٹھ پہر دن رات چار دیواری میں بند رہتی ہو نا۔ تم کیا جانو۔ جمانہ کیسے بدل رہا ہے۔ ارے بھئی یہ نیا فیشن ہے نیا فیشن۔" "فیشن ویشن کیا جانوں مجھے تو انہیں پہنتے شرم لگتی ہے۔" "خیر جانے دو، یہ آئینہ تو تمہیں پسند ہے۔ دیکھو اسے بھی نہ نہ کہنا۔ بڑی دور سے منگوایا ہے۔ پچھتر روپے لگے ہیں پچھتر" "ہا آئینہ! آئینہ کیا کہوں۔ کیسا پیارا تھا۔ کھیر یہ تو ایک ٹکڑا ہے۔ اس سے اس کی کھوبصورتی کی کیا کھبر ہے۔ کناروں پر کیسے کیسے رنگارنگ پھول گویا ہیرے جواہرات جڑے تھے۔ دل میں تو بہت کھوس تھی مگر یونہی گلہ کرنے لگی۔ "ارے بھلے آدمی کاہے کو اتنا روپیہ کھرچ کرتے ہو مجھ پر۔" "تمہیں تو پیسوں کی کھدر ہی نہیں۔ کیا ٹھیکریاں ہو گئی ہیں تمہاری نجر میں۔ پچھتر روپے بابا۔" اور وہ میری طرف کیسے پیار سے دیکھ کر بولے تھے۔ "جہرہ تمہیں یوں کھوس دیکھ کر کیمت ویمت سب کچھ بھول جاتا ہوں۔ تمہاری کھوسی پر پچھتر روپیہ تو کیا سب کچھ صدکے ہیں۔" "آہ! ان کی کونسی کونسی بات یاد کروں۔ ان باتوں کو یاد کروں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔" تانی بی نے آنسو پونچھے اور دبی آواز میں کہنے لگیں۔ "آہ اس جمانے میں وہ مجھے کتنا چاہتے تھے، پچھتر روپیہ دے کر اتنی دور سے پرائے ملک سے میرے لئے آئینہ منگائے تھا۔ اللہ اللہ یہ آئینہ تو ان کی یادگار محبت ہے۔" اور انہوں نے اس آئینہ کے ٹکڑے کو آنکھوں سے لگا لیا۔ "اور میں کیسے پھکر سے وہ آئینہ اپنی سہیلیوں کو دکھاتی پھرتی تھی۔ وہ کہتیں۔ "اری جہرہ تو تو بڑے بھاگ والی ہے۔ کیسا اچھا میاں ملا ہے تجھے ....

آہ کسی کے بھاگ ہمیشہ ایک سے ہوتے ہیں، یہ آسمان کا چکر! یہ جمانا کسی کو سکھی نہیں دیکھ سکتا۔ اپنا دکھڑا کیا سناؤں بیٹی۔ میرا ستارہ بھی گردس میں آگیا۔ میری کسمت ایسی پھوٹی ایسی پھوٹی کھدا وہ دن دشمن کو بھی نہ دکھائے۔" تانی بی پھر رونے لگیں "میرے سسر جاتے رہے۔ اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔" تانی بی نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھا کر اپنا آنچل پھیلا دیا۔ "میرے باپ سے بھی جیادہ تھے۔ اللہ کا دیا اتنی دھن دولت تھی۔ باپ کے مرنے پر انہیں کے ہاتھ آئی۔ انہوں نے دنیا ہی کیا دیکھی تھی۔ پیسہ ہاتھ لگا اور ان کا ہر کوئی دوست اور ہمدرد بن گیا۔ اتنے دوست پیدا ہو گئے ہر وکھت انہیں گھیرے رہتے۔ وہ تعریفوں کے پل باندھتے اور یہ تھے سیدھے سادھے آدمی۔ پھولے نہ سماتے اپنی تعریفیں سن کر سب کو سچے دوست جان کر کھوب کھاطر کرتے۔ انہوں نے دنیا ہی کیا دیکھی تھی کہ اچھے برے کی تمیج کرتے اور پھر کھدا نے انہیں ایسا نرم دل دیا تھا۔ کسی کو اپنے دروازے سے دھتکار کر نکالنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ تم جانو بہت سے لچے لفنگے گنڈے بھی جمع ہونے شروع ہوئے۔ بری صوبت (صحبت) سے اللہ ہر ایک کو بچائے۔ جب پیگمبر کا بیٹا تک کھراب ہو گیا تھا تو ہم جیسوں کی کیا بساط۔ پیسہ تو ہر ایک کو کھراب کرتا ہی ہے۔ پھر بھری جوانی۔ ان شہدوں نے اپنی جیبیں بھرنے کے لئے ان کو شراب اور جوئے کا چسکہ لگا دیا۔ کھدا ان سب کو گارت کرے۔ میرے ہیرے ایسے آدمی کو کھراب کیا۔ پھر کیا تھا بیٹی! باپ کی اتنی محبت سے کمائی ہوئی پونجی مہینوں میں اڑ گئی۔ پھر میرے جہیج کی چیزیں بھی ایک ایک کر کے بک گئیں۔ یہاں تک تو کھیر تھی۔ جب کچھ نہ رہا تو کیا کہوں بیٹی!" تانی بی زور زور سے سسکیاں لینے لگیں..... "تو میرے گہنے مانگنے لگے۔ شراب کے نشہ میں چور آدھی آدھی رات کو آتے اور جیور کے لئے تکھا جا کرتے۔ کبھی ہاتھ روک لیتی تو بس میری شامت ہی آجاتی۔ اتنا مارتے، اتنا مارتے، لاتوں سے، گھونسوں سے، لکڑی کہیں دیکھ پاتے تو اس سے بھی بے دھڑک پیٹتے۔ میرے ہاتھ پاؤں سوج جاتے اور ان پر نیلے نیلے نسان ابھر آتے۔ سارے جیور کپڑے برتن ٹھکانے لگ گئے یہاں تک کہ میرے بدن پر ایک دامنی کے سوا کچھ نہیں رہا۔ پھاکوں پہ پھاکے گجار کے میرے دیدے اندر دھس گئے۔ گلوں میں گڑھے پڑ گئے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئی۔ ایک رات انہوں نے خوب شراب پی لی تھی۔ لڑکھڑاتے گرتے پڑتے آئے اور باہر دریچہ سے پکارا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا۔ مگر وہ اندر نہیں آئے۔ مجھے وہیں بلایا۔ گئی، تو کیا کہوں بیٹی انہیں برابر ہوش بھی نہ تھا۔ رہا سہا کپڑا بھی کھینچنے لگے، یا اللہ میں کیا کرتی۔ پوری طاکت لگائی بہت روئی بھی۔ مگر انہوں نے دامنی کھینچ ہی لی۔ وہ دامنی تھی ریشم کی۔ یوں چند پیسوں کی امید میں مجھے ننگ دھڑنگ چھوڑ کر چلے گئے۔ میں اس رات کیا سوتی بدن پر ایک کپڑا نہیں بھوکی، ٹھنڈ سے ٹھٹھری ہوئی، ایک کونے میں دبی بیٹھی رہی۔ رات بھر اپنی پھوٹی کسمت پر رویا کی۔ صبح رسوئی میں ادھر اُدھر سے کچھ کوئلے

جمع کر کے انہیں سلگا کر چولہے کے پاس بیٹھی آگ تاپ رہی تھی۔ ایسے میں کیا دیکھتی ہوں میرا بھائی آ کھڑا ہوا ہے کھدایا گھڑوں پانی پڑ گیا۔ جمین میں گڑ جاتی ایسی حالت میں 'مادر جاد ننگی' کھدیا جمین سکھ (شق) ہو جاتی اور میں گڑ جاتی۔ آہ! ہم جیسی گناہگاروں کی دعا کہاں کھبول ہوتی ہے۔ وہ تو اگلی نیک بیبیوں کا ہی لکھا تھا۔ ادھر دعا ہونٹ سے نکلی اور جمین سکھ ہو گئی۔ کھیر کیا کرتی 'ادھر ادھر دیکھا تو ہاتھ میں پکڑنے کا کالکھ سے بھرا کپڑا پڑا تھا۔ تن ڈھانکنے کو وہ بھی گنیمت تھا۔ جلدی سے اوڑھ کر کونے میں سمیٹ کر بیٹھ رہی۔ بھائی' پھٹی پھٹی حیران نجروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ جبان سے ایک لفظ نہ بولا۔ میرے میکے والوں کو کچھ کھبر نہ تھی کہ مجھ پر یہاں کیا گجر رہی ہے۔ ہاں ایک دو دپھے میرا بھائی آیا تھا مگر میں ان کے کھلاپھ کیسے جبان کھولتی۔ اب میرا بھائی چند دنوں کے لئے مجھے میکے لے جانے آیا تھا۔ پچھلی دپھے کہہ گیا تھا جہرہ کتنے دن ہو گئے تمہیں میکے آئے۔ بچاری اماں بہت یاد کرتی ہیں۔ اب میں نوکری کی خاطر پرائی بستی جا رہا ہوں۔ وہاں سے لوٹ آؤں گا تو اب کی دپھے تمہیں جرور بلا کر جاؤں گا اور بیٹی جب وہ آیا تو میں ایسے حال میں تھی۔ ایسی لاچار ایسی بے بس اسے کتنا دکھ پہنچا ہو گا؟ آکھر کھون سے کھون لگا تھا۔" اس کے بعد دیر تک نانی بی کچھ بول نہ سکیں۔ روتے روتے ان کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ کیسی بری حالت ہو رہی تھی ان کی۔ آواز ہی نہ نکلتی تھی۔ اٹکا ہوا نچلا ہونٹ اور زیادہ لٹک آتا اور آنسو ابل ابل آتے۔ نانی بی کو اس حالت میں دیکھ کر میرا ننھا دل بھر آیا۔ گو میں ان کی کہانی کو پورے طور پر سمجھ نہ سکی تھی۔ پھر بھی نانی بی کو یوں روتی دیکھ کر میں بھی رونے لگی۔ انہوں نے بہت مشکل سے اپنی حالت سنبھالی۔ آنسو پونچھے اور مجھے سینے سے لگا لیا۔ "رو نہ ننھی 'تم کاہے کو روتی ہو ننھی شہجادی۔ اتنا درد ہے میرا بچی کو۔"

"اچھی نانی بی' تمہیں کہانی سنانے میں سے اتنا دکھ ہوتا ہے تو نہ سناؤ۔ میں اچھی بچی ہوں۔ ضد نہیں کرتی۔ چلو گھر چلیں۔"

"نہیں بیٹی تمہیں اپنی دکھ بھری کانی سنا کر میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے اب تلک میں کسی سے نہ بولی تھی۔ کس سے بولتی۔ اس کھود گرجی (خود غرضی) دنیا میں میرا کوئی درد پہچاننے والا نہیں 'مگر تم بیٹی ننھی ہو۔ پر کیسا درد بھرا دل رکھتی ہو۔ اب تم یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکتیں۔ جب بڑی ہو گی تو سمجھو گی۔ نانی بی کی یاد کے ساتھ تمہیں آج کی باتیں یاد آئیں گی...... اور دکھ سکھ کا کہنا ہی کیا وہ اس جندگی میں لگا ہی رہتا ہے۔ پھر میں اتنا سکھ نہیں پاتی تو اتنا دکھ کاہے کو اٹھاتی۔ کھیر۔ لو تمہیں باکھی کہانی بھی سنائے دیتی ہوں۔ کم سے کم دل کا بوجھ تو ہلکا ہو جائے۔

"یہ تمہارا کیا حال ہوا ہے جہرہ؟" میرے بھائی نے پوچھا۔ میں پھر بھی کچھ نہ بولی کھدا حاجر ناجر ہے۔ ان کے کھلاف میری زبان نہ کھلی۔ مگر میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ میرا بھائی روتا ہوا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ آیا۔ ایک گٹھری پھینک کے وہ بولا۔ "لو جہرہ یہ پہن لو۔" اور آپ دوسری طرپھ منہ پھیر کر توشہ دان میں سے کچھ کھانے کی چیجیں نکالنے لگا۔ میں نے گٹھری کھولی کپڑے پہنے اور ہم دونوں کھانے پر بیٹھے کھاتے ہوئے اس نے کوئی بات نہ کی۔ نجریں نیچے کئے بیٹھا رہا۔ کھا چکنے کے بعد آہستہ سے دبی آواج میں بولا' چلو جہرہ گھر چلو' مجھے اس بدماس کے سب کرتوت معلوم ہو چکے ہیں۔ کھدا کی کسم میں تمہیں پھر اس نالائکھ کے گھر بھیجوں۔ اس جالم کو اپنے گھر میں کھدم رکھنے دوں تو میں ایک باپ کی اولاد نہیں پھر بھی اس بے گیرت (بے غیرت) نے کھدم رکھا تو محلہ بھر میں پھجیتی (فضیحت) کراؤں گا" پھر وہ کچھ نہ بولا۔ کھاموسی سے مجھے گاڑی میں بٹھا کر گھر لے آیا۔ میں تبھی سمجھ گئی تھی کہ وہ ایسا ضرور کرے گا۔ آہ! میں تبھی سمجھ گئی تھی کہ وہ مجھے اُن سے پھر ملنے نہ دے گا۔ نانی بی بہت زور سے سسکیاں بھر کر رونے لگیں۔ "وہ گھسہ میں یہ باتیں کہتا تو اور بات تھی۔ گھسہ اتر ہی جاتا اور مجھے کچھ آس ہوتی۔ لیکن یہ کہتے وقت اس وقت اس کے چہرہ پر کیسا سکون تھا۔ گھسہ نام کو نہیں..... میں تبھی جان گئی کہ اس کا ارادہ پکا ہے نانی بی نے سرد آہ بھری۔ "میرا گمان صحیح نکلا۔ کچھ دن بعد وہ آئے۔ آہ بیٹی 'بیٹی۔" میں تعجب سے تکنے لگی۔ نانی بی کے سینے میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ "آہ! کیا کہوں... وہ بے..... لی ...... ان کے چہرہ پر پچھتاوا تھا۔ اداسی تھی۔ وہ جرورا پنے کئے پر رنجیدہ تھے اور بیٹی ان کے ہاتھ میں ایک نئی ساری بھی تھی۔ میں دروازہ کھولنے بھاگی۔ بہت جلد بھاگی۔ پھر بھی میرا بھائی آ ہی گیا...... آ ہی گیا۔ مجھے جور سے دھکیل کر آگے بڑھا۔ انہیں ایسی ایسی باتیں

سنائیں انہیں شہدا' لفنگا' بدماس کہا۔ بے سرم کہا۔ بے گیرت کہا میرے اللہ! نہیں' کبھی نہیں' وہ بے گیرت نہیں تھے۔ ان میں سر جھوں کا خون تھا' میں بھائی کے پاؤں پر گر پڑی۔ "اللہ واسطے ایسا نہ کہو بھائی۔" اس نے مجھے بھی بے گیرت کہا۔ اللہ اللہ یہ سن کر بھی وہ کھاموس کھڑے تھے۔ صرف اتنا بولے۔ "میں تمہارے گھر پڑے رہنے نہیں' جہرہ کو لینے آیا ہوں۔ اب اس کا تم سے کوئی تعلقہ نہیں۔" سرم نہیں آتی اسے اتنا ستا کر۔ "میرا بھائی دانت پیس کر برس پڑا۔ "کیا میری بہن اتنی سستی ہے ہمارے پاس دو ٹکڑے روٹی بھی نہیں کہ اسے پال سکیں؟ کھدا کی کھسم گر میری بہن بھوکوں مرے۔ پرا سے' تم جیسے جالم کے پاس نہ بھیجوں گا۔ ساری تو دیا ت" میرے بھائی نے ان کے ہاتھ سے ساری کھینچ کر نالی میں پھینک دی۔

"مجھے جہرہ سے تو پوچھ لینے دو۔ اگر وہ نہ کہے تو میں جرور چلا جاؤں گا۔ اگر راجی ہے تو تمہارا کوئی حلقہ نہیں اس پر وہ میری بیوی ہے۔ میں اسے جرور لے جاؤں گا۔" ہونہہ! کیوں نہ کہے گی؟ پھر آ جانے گی تمہارے ساتھ اپنا مردہ نکلوانے" اور میں پیچھے سے رو رو کر التجا کر رہی تھی۔ "بھائی میں جاؤں گی۔ بھائی مجھے جانے دو" اور بھائی نے مجھے برساتی نجروں سے دیکھا۔ چپ بے گیرت کہیں کی۔"

"نہیں میں جہرہ ہی سے پوچھوں گا۔ انہوں نے دہلیز پر کھدم رکھتے ہوئے کہا کھریب تھا' میرا بھائی انہیں دھکا دے کر باہر نکال دے۔ 'بے سرم اندر کھدم رکھتا ہے؟ ایسا بے سرم نہ ہوتا تو عورت جات کے آنے بیچتا۔ کیا پوچھتا ہے جہرہ سے۔ وہ تو رو رو کر کہہ رہی ہے۔" میں اس جالم کے ساتھ نہ جاؤں گی" آہ بھائی نے کیسا جھوٹ بولا .. کیسا جھوٹ بولا۔ "اگر تجھ میں جرا بھی گیرت ہے تو جا فوراً یہاں سے چلا جا۔ پھر کبھی ادھر نہ پھٹکنا۔' پھر میرے بھائی نے اتنے زور سے کواڑ بند کیا۔ کچھ دیر بعد میں نے ڈرتے ڈرتے کھڑکی میں سے جا کر دیکھا۔ وہ ہمارے گھر سے کچھ دور کھڑے تھے۔ آہ بیٹی میں نے اچھی طرح دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں پانی کھڑا تھا ...ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ پھر وہ چلے گئے۔ ہمیشہ کے لئے چلے گئے۔ وہ بڑے گیرت والے تھے۔ بیٹی۔ اتنا ہونے کے بعد پھر اس گھر پر آتے؟ .. آہ میرے بھائی نے مجھے کیوں جانے نہ دیا؟ نہ جانے دیا تو کیا ہوا۔ میں موکھا پا کر وہاں چلی آئی۔ وہاں سے نکل کر انہیں بہت ڈھونڈا بھی مگر کہاں ملتے۔ میرے ایسے نصیب کہاں۔ وہاں سے جو نکلی۔ بیٹی' تو نکری کے لئے ماری ماری پھری۔ مگر پھر اس گھر میں کھدم نہ رکھا.. میں ماں کے ہاں چین سے رہ سکتی تھی۔ مگر میری گیرت کیسے کھولتی کہ وہاں پڑی رہوں مجھے کسی کے گھر کی نوکری کرنا منجور تھا۔ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا' بھیک مانگنا منجور تھا۔ مگر اس دروازے پر جانا منجور نہ تھا۔ جو ان پر بند ہوا تھا.....اگر ہمارے بابا اس وقت پر جندہ ہوتے تو کبھی ایسا نہ کرتے۔ مجھے جرور بھیج دیتے۔ انہیں بیٹی کا لاکھ درد تھی۔ وہ میاں کا درجہ پہچانتے تھے۔

کہا کرتے۔ عورت کا ٹھکانہ سوہر کا گھر ہی ہے۔ بھائی نے جوش میں یہ نہ پہچانا۔ بابا ہوتے تو ضرور بھیج دیتے.... سبھی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ ان کی تو بھری جوانی تھی۔ بعد میں سنبھل ہی جاتے اور مجھے تو ایسا معلوم پڑتا کہ وہ تبھی ڈیڑھ دو مہینوں میں ہی بہت سنبھل گئے تھے پھر میری جندگی کیسے سکھ سے گجرتی! ایک دو دن تکلیف سہہ لیتی اور پھر وہ مارتے تھے تو گیا کچھ جان کر مارا کرتے تھے۔ شراب پی کر انہیں ہوش تھوڑا ہی رہتا تھا۔ صبح جب ان کی حالت اچھی رہتی تو ان نیلے سوجے ہوئے حصوں پر ہاتھ نہ پھیرا کرتے۔ پھر ایک دو دفعہ تو انہوں نے گرم پانی میں روئی بھگو کر سینکا بھی تھا۔ ان دنوں بھی کبھی کبھی کیسی پیار بھری نجروں سے دیکھ لیا کرتے تھے۔ میں سب کچھ بھول جاتی ہو کھدایا! ان کی ایسی ایک نجر ہی بس تھی......ایک نجر ہی بس تھی۔" نانی بی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھیں۔ میں تو ڈر ہی گئی ان کا سوکھا جسم ایسے ہل رہا تھا گویا اس کے اندر بھونچال آگیا ہو کچھ دیر تک نانی بی خاموش ہو گئیں۔ پھر جب طوفان آہستہ آہستہ تھما' کہنے لگیں۔

"اور ان میں کوئی ایسی ویسی بات بھی نہ تھی۔ سراب جوئے کو کیا کہنا اگر یہ لت پھر شتوں کو بھی پڑے تو نہ چھوٹے۔ مگر کسی کی کیا مجال کہ دوسری ہاتوں میں ان کی طرف انگلی اٹھائے۔ ایسے تھے وہ۔ گیر عورت کی طرف کبھی نجر اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔ اور بیٹی! جب مرد میں یہ گن ہو۔ یہ بات ہو تو عورت کیا کچھ نہیں سہہ لیتی۔"

نانی بی کی طویل کہانی ختم ہوئی۔ مگر اس کہانی کی بہت سی باتیں میرے دماغ کے کسی کونے میں جا گھسی تھیں۔ صرف ایک بات مجھے

اہم معلوم ورہی تھی۔ "نانی بی کا آدمی انہیں مار کر ان کے زیور چھین لیا کرتا تھا۔" اور میں بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی تھی کہ نانی بی اپنی کہانی ختم کریں۔ تو اپنی ننھی زبان سے ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ہمدردی ظاہر کر کے انہیں تسلی دوں۔ جب نانی بی نے رونا بند کیا اور آنسو پونچھ لئے تو میں بڑی ہمدرد صورت بنائے بولی:۔

"نانی بی! تم سچ مچ کتنا دکھ اٹھائی ہو۔ کیسا خراب تھا تمہارا آدمی۔ تمہیں یوں مار کر تمہارے اچھے اچھے زیور چھین لیتا تھا؟ کیسا خراب آدمی تمہیں اس کی صورت دیکھ کر نفرت ہوتی تھی نا؟"

"نفرت بٹی؟ اس کی صورت سے نفرت" کیا بتاؤں تمہیں وہ کیسا تھا کیسا ہنس مکھ کیسا بانکا سجیلا جوان!! گٹھا ہوا بدن چوڑا سینہ اور صورت کا تو کیا کہنا۔ گوری صورت، یہ اونچی ناک، چوڑی پیشانی، موٹی موٹی کالی آنکھیں۔ میں تو گھنٹوں بیٹھی اس صورت کو تکا کرتی۔ پھر بھی جی نہ بھرتا، جب اُجلے اُجلے کپڑے پہنے لال کشمیری رومال کندھوں پر ڈالے باہر نکلتا تو دیکھنے کو دو آنکھیں بس نہیں تھیں۔ میں جلدی جلدی لال پیلا پانی لے آتی اور ڈیوڑھی کے باہر قدم رکھتے ہی اتار پھینکتی کہ کہیں چاند سے مکھڑے کو نجر نہ لگ جائے۔ اس کی صورت سے نفرت بٹی! وہ تو با چھا ہوں کا با چھا تھا۔ شہجادوں کا شہجادہ!"

"کیا کر رہی ہو پروین؟ اگر تم نے اپنی سہیلیوں کے نام چٹھیاں لکھ دی ہیں تو لاؤ انہیں رحیم کے ہاتھ بھجوا دوں سب سامان آگیا ہے، تم آؤ نا خیرن بی کی کچھ مدد کرو۔ بیچاری اکیلی اتنی چیزیں کیسے تیار کر سکے گی۔ دو ایک تم کر لو۔ تم دیکھتی ہو تسنیم تو میری گود چھوڑتا ہی نہیں۔"

"نہیں امی آج پارٹی نہیں دوں گی۔"

"کیوں بٹی؟ تم بھی عجیب ہو۔ آج خوشی کا دن ہے۔ جی بھر کے خوشیاں مناؤ۔"

"اس دنیا میں تو صرف خوشی ہی نہیں ہے امی! اس کے ساتھ غم بھی تو لگا ہوا ہے۔"

"ہونہہ۔" امی زور سے ہنس پڑیں۔ ابھی سے قنوطی ہوتی جا رہی ہو۔ اپنی زندگی کے سب سے رنگین زمانے میں ہی۔'

"امی! شاید آپ کو معلوم نہیں۔ کل نانی بی انتقال کر گئیں۔" میں نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔

"پھر وہی نانی بی! سچ مچ اس بوڑھی نے تم پر جادو کر دیا تھا۔"

امی تم اب بھی نانی بی کو نہ سمجھ سکیں۔

زرد چہرے

ابراہیم جلیس

آصف کی بہن جوان تھی اور پانچ سال سے اپنے دولہا کا انتظار کر رہی تھی۔ نہ جانے اس کا دولہا کون تھا۔ کیسا تھا۔ کہاں کا رہنے والا تھا اور کب آنے والا تھا ___؟ آصف کو کچھ ایسا محسوس ہوتا کہ جب تک اس کی بہن کے رخساروں پر گیندے کے پیلے پیلے پھول کھلے ہیں۔ اس کا دولہا کبھی نہ آئیگا۔ کیونکہ دولھے گیندے کے پھولوں کو مطلق پسند نہیں کرتے۔ وہ تو گلاب کے سُرخ سُرخ پھولوں پر جان دیتے ہیں۔ اس کی سہیلیوں ہاجرہ، پروتما، زہرہ، شیلا اور سعیدہ کے گالوں میں کتنے بڑے بڑے سُرخ گلاب تھے اور ان کے دولھے کتنی جلدی، کتنے اضطراب اور کتنی بے تابی سے آ آ کر ان سُرخ سُرخ پھولوں کو توڑ توڑ کر لے گئے۔ اب سارے محلے میں صرف ایک ہی پھول رہ گیا تھا ___ گیندے کا پیلا پیلا پھول ___ اس کی بہن جو پورے پانچ سال سے خوابوں میں، تصور میں، خلاؤں میں اپنے دولھا کو دیکھ رہی تھی۔ ممکن ہے خوابوں میں اس کا دولھا دکھائی دیتا ہو۔ تصور میں چلا آتا ہو اور خلاؤں میں اس کی طرف بڑھتا ہو ___ لیکن وہ تو دھرتی پر رہتی تھی۔ خوابوں، خلاؤں اور تصور میں آنے والے دولھے دھرتی پر کیسے اتر سکتے ہیں۔ وہ تو خوابوں کی نرم نرم سطح پر ہی چل پھر سکتے ہیں۔ دھرتی تو ان کے لئے بڑی سخت کھردری اور پتھریلی ہوتی ہے۔

سارے محلے میں مشہور تھا کہ اس کی بہن کو دق ہو گئی ہے۔ لیکن شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں نے بتایا تھا کہ دق وق کچھ بھی نہیں۔ صرف ایک مرض ہے ___ طویل کنوارپن۔ جو بہت ممکن ہے طویل ہوتے ہوئے دق کے گلے میں بھی بانہیں ڈال دے۔ جُوں جُوں اس کی بہن کا کنوارپن لمبا ہوتا جاتا تھا۔ وہ بھی اس کی فکر میں گُھل گُھل کر سوکھ سوکھ کر لمبا ہوتا جا رہا تھا ___ ہڈیوں کا لمبا ہی لمبا ڈھانچہ۔

بہن کی مانگ میں افشاں چننے کے لئے اُس نے کیا کیا کچھ نہ کیا۔ جب باپ بغیر کسی بیماری کے اچانک مر گیا تو اس نے قانون کی تعلیم ادھوری چھوڑ کر تیس روپیہ ماہوار کی کلرکی جیسی ادنےٰ غلامی بھی چار و ناچار قبول کر لی۔ اگر اس کی بہن نہ ہوتی یا جوان نہ ہوتی یا وہ مفلس نہ ہوتا تو اپنے مشہور قوم پرست باپ کی طرح وکالت یا کوئی دوسرا آزاد پیشہ اختیار کرتا۔ دفتری غلامی کبھی نہ کرتا۔ اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے آزاد منش باپ کے لہو کی توہین نہ کرتا۔ اسکی طرح خود بھی حکومت سے ٹکریں لیتا رہتا۔ لیکن جس کا باپ مر گیا ہو جس کی آمدنی تیس روپیہ ماہوار ہو۔ جس کی بہن کنواری ہو اور جس کی بہن کے رخساروں پر گیندے کے زرد زرد پھول کھلے ہوں وہ کیا حکومت سے ٹکر لے سکتا ہے۔ وہ کیا دفتر سے جیت سکتا ہے۔

مگر اس کی بہن تو ابھی عورت بننے سے پہلے معمر بن گئی تھی۔ وہ بے چارا تو اس کے لئے صبح سے شام تک دفتر کی میز پر جھکا رہتا۔ صاحبوں کی پھنکاریں سنتا اور مہینے کے مہینے تیس روپے اپنی بہن کی ہتھیلی پر رکھ دیتا اور اس کے باوجود اس کے ہونٹوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ تک نہ آتی۔ اس کے پیلے پیلے گالوں میں لہو کی مدھم سی دھار ___ ایک ہلکی سی شہابی رو تک نہ رینگتی۔ اسی بات پر وہ جھلّا اٹھتا اور بات بے بات اسکو جھڑک دیتا۔ لیکن جب پیلے پیلے پھولوں پر شبنم کی بوندیں رینگنے لگتیں تو وہ ان بھیگے ہوئے پھولوں کو اپنے میلے دبیز کوٹ کے لمبے لمبے

کالروں میں چھپا کر خود بھی رونے لگتا ____ کیونکہ شبنم کی بوندوں سے دُھل کر ان پھولوں کی زردی خطرناک حد تک نکھر جاتی۔

مگر وہ مایوس نہیں تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنی بہن کے دُولھا کو خوابوں' تصورات اور خلاؤں سے گھسیٹ کر اسی دھرتی پہ لے آئیگا ____ کیونکہ دولھے بڑے لالچی ہوتے ہیں پھول خواہ کتنا ہی معمولی اور پیلا کیوں نہ ہو۔ اگر اس کو سونے اور چاندی کے گلدان میں رکھ کر پیش کرو تو دولھا آنکھ بند کر کے وہ گلدان لے لیتے ہیں............ اسی لئے وہ کلرکی کے علاوہ اخباروں اور رسالوں کے دفاتر میں بھی آدھی آدھی رات تک کام کرنے لگا۔ اس کی آمدنی بڑھنے لگی۔ پچاس روپیہ۔ ساٹھ روپیہ۔ ستر روپیہ۔

صبح بالوں میں کنگھا کرتے وقت وہ آئینے میں اپنی صورت دیکھتا کہ آدھی آدھی رات تک کام کرنے سے اس کے اپنے گالوں کے سُرخ ڈورے مدھم پڑ رہے ہیں۔ لیکن اب اس کو ان سُرخ ڈوروں کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ تو چاہتا تھا کہ یہی سُرخ ڈورے اس کی بہن کے رخساروں میں داخل ہو جائیں اور بس ____ اور اگر یہ نہیں ہو سکا۔ تو وہ اپنی بہن کو سونے اور چاندی کے جگمگ جگمگ کرتے زیوروں سے ایسا سجائے گا کہ ہاجرہ' پروتما' زہرہ' شیلا اور سعیدہ کے دولھوں کی آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ وہ اپنے بے مصرف' فضول مسکرانے والے سُرخ گالوں سے متنفر ہو جائیں گے اور جب شہر کی سڑکوں پر سے دولھا اس کی بہن کے گلے میں پڑے ہوئے جڑاؤ ہار کو پکڑے اسکو باجوں ڈھولوں اور تاشوں کے شور اور گیس لیمپوں کی سپید چمک دار روشنی میں فاتحانہ انداز میں کھینچے لئے جائے گا تو وہ ہاتھ مل مل کر اپنی جلد بازی' اپنی بیوقوفی اور اپنی حماقت پر پچھتاتے رہیں گے۔

جس مہینے اس کی آمدنی پچاسی روپے ہو گئی۔ اس کے گالوں کی شفق بالکل ہی ڈوب گئی۔ اب اس کے چہرے کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی زرد رنگ کے شیشوں والی کھڑکی سے منعکس ہوتی ہوئی روشنی میں کھڑا ہے۔ اس کے دوست احباب جب اس کے پیلے مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھتے تو کڑوا کڑوا مذاق کرتے۔

"علاج کراؤ اپنا۔ کوئی لڑکی تم سے شادی کرنا پسند نہ کرے گی۔"

"جوانی ساری عورت بغیر ہی گذر جائے گی۔"

وہ مسکرا دیتا۔ اب اُس کے ہونٹ بہت مسکرانے لگے تھے۔ بار بار مسکراتے تھے۔ ایک مہینے میں اس کو پچاسی روپے ملتے تھے اور وہ پچاسی دفعہ مسکراتا تھا۔

> "ارے کوئی لڑکی شادی نہ کرے۔ اس کی بلا سے۔ جوانی صرف عورت کے آغوش میں گزار دینے کے لئے تو نہیں ہے۔ جوانی حجلہ عروسی اور عورت کی خلوتوں میں بسر کرنے کے لئے تو عطا نہیں ہوئی۔ جوانی تو الف لیلیٰ کے سورماؤں کی طرح اتال پتال چھاننے کے لئے ہے۔"

اور پھر بقیہ جملے وہ اپنے دل ہی دل میں چپکے چپکے کہتا۔

> "جوانی' زندگی سے لڑنے کے لئے ہے۔ اپنی جوان بہنوں کی مانگ میں سہاگ کی افشاں بھرنے کے لئے ہے۔ ان کے شرمیلے' لالچی رنگ و بو پر جان دینے والے دولھوں کو آسماں سے دھرتی پر گھسیٹ لانے کے لئے ہے ____ میں جو اپنی بہن کا حجلہ عروسی بناؤں گا۔ وہ تاج محل سے زیادہ شاندار ہو گا۔"

چند ہی مہینوں بعد وہ سو سو اور سوا سو روپے ایک ایک مہینے میں کمانے لگا۔ صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔ جان عزیز رونے بسورنے لگی تھی۔ وہ [illegible] دن کے اُجالے اور رات کے اندھیرے میں روپوں کے پیچھے دوڑتا رہا۔ اپنی نیندیں' اپنے تصوّر کے جزیرے اپنے چہیتے اور اپنی [illegible] ____ یعنی برجیس جہاں کو بھی بھول گیا۔ اس کی برجیس جہاں۔ جس سے اس کو ایک دبی دبی ڈھکی چھپی اور چور محبت تھی ____ جس کی بڑی بڑی آنکھوں سے نکلے ہوئے تیروں نے اس کے ننھے سے دل میں بیشمار آنکھیں پیدا کر دی تھیں۔

ایک دن وہ بہت تھکا ہارا لوٹا اور چارپائی پر گر کر بری طرح کھانسنے لگا۔ اس کی بہن نے اس کے جوتے کے تسمے کھولے۔ اس کا میلا دبیز کوٹ اُتارا اور اس کے سرہانے بیٹھ کر نمکری کے تیل سے اس کے سینے کی مالش کرنے لگی۔ اُس نے مسکراتی ہوئی آنکھوں سے اپنی بے زبان، مجبور بہن کے پیلے پیلے افسردگی سے کملائے ہوئے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میری اچھی گڑیا ـــــ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو کیا ہوا اب میں اپنے سائے میں تیرے ہاتھوں کو ایسی لال لال مہندی سے رنگ دوں گا کہ تو..... ..ہاں تو جا اسی بات پر میرے لئے اچھی سی چائے بنالا۔"

بہن ایک حزن بھری مسکراہٹ سے منہ چھپا کر چلی گئی۔ اپنے بھائی کی یہ حالت دیکھ کر اپنے ہاتھوں کو مہندی سے رنگا دیکھنے سے بالکل ہی مایوس ہو گئی تھی۔

مسرت کے موقع پر عقل کہاں چلی جاتی ہے! وہ اپنے سائے کا باپ کے سائے سے مقابلہ کر رہا تھا۔ اس کا باپ تو کھاتے پیتے پرانے ہندوستان کا ایک بھاری بھر کم انسان تھا۔ چھ فٹ لمبا تین فٹ چوڑا اور اس کی آمدنی بیٹے کی آمدنی سے چھ گنی زیادہ تھی۔ اس کے سائے میں تو اٹھارہ انسانوں کا ایک خاندان پل رہا تھا۔ کئی غریب رشتہ دار عورتوں کے ماتھوں میں سہاگ کی افشاں چنی گئی تھی ـــــ اب یہ ڈینگیں مارنے والا ہڈیوں کا لمبا سا لمباڈ ھچر۔ میلا دبیز کوٹ اتار دینے پر اس کا سایہ ٹیلیفون کے کھمبے کی طرح اتنا پتلا اور منحنی تھا کہ ایک ہی دبلی پتلی نرم و نازک بہن جوانی کی دھوپ اور حدت سے نہیں بچتی تھی۔ وہ تو اس دھوپ میں جیسے جل رہی تھی۔ ابل رہی تھی۔ بالکل اس دیگچی کی طرح جس میں پکتے ہوئے چائے کے پانی کو ابال آ رہا ہو ـــــ ہاں جب وہ روپوں سے پھولی ہوئی جیبوں والا دبیز کوٹ پہن لیتی تو اس کے بڑے بڑے کالروں میں منہ چھپا کر جوانی، حدت، دھوپ سبھی کچھ بھول جاتی تھی۔

بھائی کی دن بہ دن گرتی ہوئی صحت اور سوکھتے ہوئے جسم کو دیکھ کر بہن نے آخر جی کڑا کر کے شرم کی کینچلی اتار کر پھینکتے ہوئے ایک دن کہہ دیا:۔

"بھیا ـــــ آپ کی زندگی سے میری زندگی ہے۔ آپ پر سے میری جیسی ہزار بہنیں وار کر کے پھینکی جا سکتی ہیں۔ آپ میرے لئے کیوں اپنی زندگی اپنی جوانی اس طرح برباد کر رہے ہیں۔ مجھے آپ جیسے پیارے بھائی کے قدموں میں بڑی آرام اور چین کی زندگی حاصل ہے۔ میں کہیں اور جانا نہیں چاہتی۔ میں.........میں شادی بھی نہیں کرنا چاہتی ـــــ ہاں آپ شادی کر لیجئے۔ گلاب کے پھول جیسی بھابی بیاہ لائیے۔ میں آپ دونوں کی خدمت میں ہنستے مسکراتے زندگی گزار دوں گی۔ جبھی آپ دونوں کے ہوتے ہوئے مجھے شادی کی کیا ضرورت ہے۔"

اس نے اس کے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے گالوں پر محبت کی لطافت سے گدگدایا ہوا ایک نرم طمانچہ لگاتے ہوئے کہا۔

"پگلی ـــــ میں جانتا ہوں کہ تو اتنی بھولی ہے کہ تیرے جسم میں لہو کی بہت تھوڑی بوندیں ہیں۔ ان بوندوں میں کبھی تلاطم پیدا نہ ہو گا۔ تو چاہے یا نہ چاہے لیکن دنیا اور دنیا والوں کے لئے تیری شادی کرنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ اگر تو مصلیٰ پر بیٹھ کر بھی قسم کھائے تو بھی کوئی تیری پاکدامنی کا یقین نہ کرے گا۔"

اس نے بھی جی کڑا کر کے شرم کو بالائے طاق رکھ کر کہہ دیا۔ اس وقت اس کے جی میں آئی کہ یہ بھی کہہ دے۔ "تو جھوٹی ہے۔ تجھے شادی کی ضرورت ہے۔ میں خود ہر رات تیری چارپائی سے ابلتی ہوئی دبی دبی بھیانک آہیں سنتا ہوں۔ بیشمار کروٹوں سے چرچراتی ہوئی چارپائی سے تیری پیاسی جوانی کی چیخیں سنتا ہوں۔ مجھے دھوکہ دینے کی کوشش نہ کر۔ تو نے صرف یہ گھر کی چار دیواری دیکھی۔ مگر میں نے تو بہت بڑی دنیا دیکھی ہے۔ اٹھائیسویں برس میں سر میں سپید بال گردن میں جھکاؤ اور آنکھوں میں یاسیت کا دھندلکا........ یہ کیا ہے؟ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ تو تو صرف چوبیس برس کی ایک کنواری ہے۔"

پھر اس کی زندگی میں ایک سہانا چمکیلا دن طلوع ہوا۔ اپنی بہن کو سر سے پاؤں تک سونے اور چاندی کے زیورات سے جگمگا دیا۔ اس

کی مانگ کو کہکشاں سے زیادہ چمکیلا بنا کر سنوارا۔ اس کی ہتھیلیوں میں ایسی سُرخ سُرخ مہندی لگائی کہ شفق تک شرما کر پہاڑیوں کے پیچھے چھپ گئی۔ سبز رنگ کی سلمٰی ستارا ٹنکی ہوئی بنارسی ساڑھی اور سونے کے پیلے پیلے چمکتے زیور ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے سبز رنگ کے گلدان پر پرانے ہندوستان کے کسی مشہور نقاش نے بڑے فن کارانہ انداز سے منبت کاری کی ہو اور اس میں گیندے کا ایک پیلا پیلا پھول شرمارہا ہو......... اس پھول کی پتیاں شبنم کی لاتعداد بوندوں سے بھیگ رہی تھیں وہ خود بھی رو تا ہوا مصنوعی خوشی سے مسکراتے ہوئے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے دلا سادے رہا تھا۔ "ارے ____ دلہنیں روتی ہیں ____ کہیں روتی ہیں ____؟ ہونہہ"

اور تاشوں' نفیریوں' ڈھولوں کا شور فضاؤں میں بلند ہو کر اس پر ٹھٹھے لگا رہا تھا کہ دیکھو ____ یہ آنسو پونچھنے والا خود بھی تو آنسو بہا رہا ہے۔ ہاہا!... ....ڈھم ڈھم۔ پیں پیں۔ پیں پیں۔ ترررت۔ ترترر.....

بہن کے چلے جانے کے بعد اس کی زندگی اس کا گھر سبھی سنسان پڑ گیا تھا۔ اس کی بہن کی چارپائی اب چپ چاپ اکیلی پڑی رہتی۔ وہ اب آہیں نہیں بھرتی تھی اور نہ اس سے کسی پیاسی جوانی کی چرچراتی ہوئی چیخیں سنائی دیتی تھیں۔ وہ اب ہوٹلوں میں کھانا کھا رہا تھا۔ کسی دیگچی میں اُبال ہی نہ آتا تھا۔ مگر ہاں اس کی گردن اب پھر سے اونچی ہو گئی تھی۔ کتنے سال سے اس کی بہن کی وزنی جوانی اس کے گلے میں بانہیں ڈالے جھول رہی تھی۔ اب تو بوجھ اتر گیا تھا۔ وہ فخر سے گردن اٹھا کر سڑکوں پر چلتا تھا۔ بات بات پر گردن پیچھے پھینک پھینک کر قہقہے لگاتا تھا۔ کتنے عرصے سے اس کے قہقہے اس کے حلق میں رُکے ہوئے تھے۔ محفوظ تھے۔ اب وہ شاذونادر ہی زمین کی طرف دیکھتا۔ اب اس کو زمین کی طرف دیکھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ جتنا سونا چاندی اور روپیہ پیسہ اس کی بہن کی شادی کے لئے ضروری تھا اُس نے زمین کے حلق میں انگلی ڈال کر سب اگلوا لیا تھا۔

اب وہ دن میں ایک بار ضرور اپنی بہن کو دیکھنے سسرال چلا جاتا اور نہایت مسرور گھر لوٹتا کہ بہن کے گالوں میں گلاب کی سُرخ سُرخ کلیاں نمودار ہو رہی ہیں۔ آج کل یا پرسوں یہ کلیاں کھل کر بڑے بڑے لال پھول بن جائیں گی اور اس کا دولہا پھولوں کے گرد مست مخمور اور مسرور بھنورے کی طرح منڈلایا کرے گا۔ اس مزیدار خیال سے خوش ہو کر سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے وہ آسمان کی طرف دیکھ کر مسکرا دیتا جیسے وہ تنہا فاتح ہے۔ جسے نہ آسمان شکست دے سکا اور نہ زندگی۔ البتہ اس کو ساری زندگی میں صرف ایک دُکھ تھا کہ وہ برجیس جہان کو اپنا نہ بنا سکا۔ اگرچہ برجیس جہاں ابھی تک کنواری تھی۔ لیکن اس کا کنوار پن ایک ٹرافی تھا جس کو جیتنے کے لئے چند خاص خاص شرائط مقرر تھے۔ آصف نے برجیس جہاں کے باپ کو اس کے بے تکلف دوستوں اور عزیزوں سے کہلوا بھیجا کہ وہ برجیس جہاں سے محبت کرتا ہے۔ برجیس کے باپ نے جواب دیا کہ شادی کے لئے محبت اتنی اہم نہیں۔ بیوی کو اچھا مکان' اچھی غذا' اچھے کپڑے زیادہ ضروری ہیں ____ آصف کے رقیب نیلام کی بولی لگا رہے تھے۔

"میرے تین مکانات ہیں۔ وہ تینوں برجیس کے نام لکھ دوں گا۔"

"میری آمدنی چار سو روپیہ ماہانہ ہے۔"

"میری جواہرات کی دوکان ہے۔ برجیس ساری عمر جگمگاتی رہے گی۔"

"میری دو موٹر ہیں۔ برجیس کو دنیا جہاں کی سیر کراؤں گا۔"

"میری پنشن پندرہ سو روپیہ ماہانہ ہے۔ میں برجیس کو کشمیر کی جنت میں لے جاؤں گا۔"

آصف ہار گیا۔ اسی کے دفتر میں ہیڈ کلرک نے وہ ٹرافی جیت لی۔ آصف کی جانِ تمنا جیت لی۔

محبوبہ کے چھن جانے کے بعد آصف کو کسی دوسری محبوبہ کی ضرورت نہیں تھی۔ البتہ اس کی جوانی کے خلاء میں اس کو اتنا سناٹا' سکوت اور ڈر محسوس ہوتا کہ اس کا جی چاہتا کہ اس مہیب سناٹے میں دفعتاً کانچ کی چوڑیاں بجنے لگیں۔ پازیب کی میٹھی میٹھی جھنکار پیدا ہو۔ دوپٹے سرسرانے لگیں۔ ٹکر ٹکر ٹکر راپ ٹکر ____ محبوبہ نہیں سہی کوئی عورت ہی سہی جو اس کی زندگی میں مہمان کی طرح ہی کیوں

نہ آئے۔

اور جلد ہی ایک عورت اسے مل گئی۔ شہر میں عیسائیت کی تبلیغ کرنے کے لئے ایک مشن آیا ہوا تھا۔ اس میں بہت سی لال پریاں تھیں۔ ان کے جسم جیسے سپید سپید شیشوں سے بنائے گئے تھے اور اندر گہرا سرخ رنگ بھر دیا گیا تھا۔ ہندوستان کے بھوکوں اور ننگوں کی جان میں جان آئی۔ وہ اپنے اپنے ویران راستوں جیسے مذاہب کو چھوڑ کر اس شاہراہ پر چلنے لگے۔ جہاں قدم قدم پر ہوٹلیں اور سرائیں لگی ہوئی تھیں۔ کھانا پینا ___ روپیہ پیسہ عورتیں۔ آصف کو ان نعمتوں میں صرف ایک ہی نعمت چاہئے تھی........ ..... مس فاکس۔

واللہ کیا عورت تھی مس فاکس! پہلی بار آصف نے اس کو امپریل پوسٹ آفس سے نکلتے دیکھا تھا۔ بھرا بھرا جسم۔ لمبا قد اور اس کے مصور نے اس کو رنگنے میں جیسے سارا گلابی رنگ صرف کر دیا تھا۔ اس کے گالوں پر جیسے سیبوں کے بجائے پارک شائر کے کیلے ٹماٹر تھے۔ پوسٹ آفس سے نکل کر جب وہ اپنی سائیکل پر چڑھ رہی تھی تو اس کی پنڈلیوں کی تھرکتی ہوئی لال لال مچھلیوں کو دیکھ کر اس نے ایسا محسوس کیا جیسے وہ زندہ ہے۔ وہ مر گیا ہے وہ مر گیا ہے۔ وہ زندہ ہے.. . .....

اس نے قومی نسلی تعصب کو دل ہی دل میں دھتکار بتائی اور ایک صاف دل سے اعتراف کرنے لگا کہ واقعی دنیا کے دوسرے ملکوں نے عورت کی اصلی قدر جانی پہچانی ہے۔ یہاں ہندوستان میں تو عورت کی مٹی پلید ہو گئی۔ اس مٹی لو تو صرف گیندے زعفران بنفشے اور سورج مکھی کے پھول ہی اگانے آتے ہیں۔

دوسرے تیسرے ہی دن اس نے مس فاکس سے راہ و رسم بڑھالی اور جوانی پھر لوٹ آئی۔ وہ اب اپنی بہن کو بہت کم یاد کرنے لگا۔ گلاب کا پھول سامنے ہو تو گیندا کہاں یاد آتا ہے؟

ایک دن مس فاکس آرکسٹرا پر ایک المیہ فراقیہ گیت الاپ رہی تھی اور آصف اس شاعر کو جس نے ایسا گیت لکھا، دل ہی دل میں کوستا ہوا چپ چاپ سن رہا تھا کہ اچانک اس کو گیندے کا پھول یاد آ گیا ___ کیونکہ دروازے سے اس کی بہن کا لالچی شوہر داخل ہوا اور آصف کو دیکھ کر ٹھٹھکا۔ رکا، جھجکا۔ لیکن جب مس فاکس مسکراتے ہوئے اس کو بلانے لگی تو آصف صوفہ سے اٹھ کر کھڑا ہوا مس فاکس آصف کے بدلتے تیور دیکھ کر ہنس پڑی۔ یعنی" ....وہ تو روز یہاں آتا ہے۔"

اسی شام وہ اپنی بہن کے گھر گیا۔ اس نے اس سے ایک لفظ نہ پوچھا۔ سگریٹ پیتا رہا اور اس کے بھینچے ہوئے ہونٹ جو بار بار ہلکی سی کپکپاہٹ سے کھل جاتے تھے۔ اس کی جھکی جھکی پلکیں اور پلکوں کی گھنیری چھاؤں میں کانپتے ہوئے تارے دیکھے۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے انہی گالوں پر اس نے سرخ سرخ لکیروں کا ایک جال بنتے دیکھا تھا۔ آج وہ جال...... .... اونہ! عورت کا رنگ بھی کیسا تغیر پذیر، کیسا بے اعتبار، کیسا ناپائدار اور کیسا عارضی ہوتا ہے۔!

جب وہ گھر پہنچا تو اس کا دماغ ایک دم ساکت ہو گیا تھا۔ اس کو اب کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہنس رہا ہے تو کیوں ہنس رہا ہے۔ رو رہا ہے تو کیوں رو رہا ہے۔ اب شاید اس احساس کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ زندگی نے اس کے ہڈیاں نکلے ہوئے سینے پر ایسا زبردست گھونسا لگایا تھا کہ وہ تین دن تک چارپائی سے نہ اٹھ سکا۔ کھانستا رہا۔ بال نوچ نوچ کر روتا رہا۔ کبھی ہنستا رہا۔ کبھی گاتا رہا اور چوتھے دن جانے کیا اس کے جی میں سمائی اپنا پرانا رفیق وہی میلا دبیز کوٹ پہنے باہر نکلا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ سرخ شعلے لپک رہے تھے جیسے کسی کو جھلس ہی دیں گے۔

چینی ریستورانوں کے چوراہے پر نکھری ہوئی شام اپنا سفید بھیگا ہوا دوپٹہ پھیلائے کھڑی تھی۔ وہ بس اسٹاپ کے ستون سے کندھا ٹیکے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بنا بنا کر توڑ رہا تھا اور ہر آنے جانے والے کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا ___ ایک بھاری بھرکم۔ پنجابی عورت کو اپنے دبلے پتلے ٹھگنی پستہ قد شوہر کے ساتھ ٹھمک ٹھمک کر باتیں کرتا دیکھ کر تو وہ بڑے زور سے ہنس پڑا۔ پنجابی عورت خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنے شوہر کا قصہ رفع کرنے لگی ___ "کوئی پاگل معلوم ہوتا ہے۔ ہوں۔" وہ ان کے قریب جا کر کہنے لگا۔

"نہیں نہیں ___ میں پاگل نہیں ہوں پاگل تو گاندھی ہے۔ نہیں جناح پاگل ہے ___ نہیں فقیر اپی پاگل ہے۔ وہ مزدوری کرتا ہے۔ ہوہوہو۔"

پنجابی عورت چوراہے پر کھڑے ہوئے پولیس مین کو دیکھنے لگی اور اس اثنا میں سامنے سے مس فاکس سائیکل پر آتی دکھائی دی اور آصف اسے ڈارلنگ حسینہ ___ تیرا انتظار کب سے تھا۔ کہتا ہوا اُس کی طرف بڑھا وہ بھی اس کو دیکھ کر مسکراتی ہوئی سائیکل سے اتر پڑی۔ پھر جانے کیا ہوا...

چینی ریستوران کا سارا چہ ابا غضب تائے چیخوں سے گونج رہا تھا.. .مار ڈالا۔ ہاں مار ڈالا۔ خون۔ دوڑو پکڑو۔ پکڑو۔ مارو ....

جب چیخیں مدھم ہو کر بھنبھنانے لگیں تو آسمان کے پہلے ستارے نے دکھا کہ مس فاکس خون میں لتھڑی سمنٹ روڈ پر پڑی ہوئی تھی اور خون کی دھاریں اس کی مرمریں لمبی پتلی دلآویز گردن سے نکل نکل کر بہہ رہی تھیں۔ آصف کو دو سپاہیوں نے پکڑ رکھا تھا اور وہ اپنا خونی چہرا فضا میں اُٹھائے چیخ رہا تھا۔

"دیکھو! سارا چوسا ہوا خون بہہ رہا ہے۔ اب میری بہن کے رخساروں پر گیندے کے پھول کبھی نہ کھلیں گے.. .... ہاں اہل وطن۔ سارا چوسا ہوا خون.. .میں نے مس فاکس کو مار ڈالا ہے اپنی جوانی کو مار ڈالا ہے۔ ہاں اہل وطن۔

پولیس انسپکٹر آصف کو گردنیاں دے رہا تھا اور لوگوں کی چرچر ___ چرچر زبانیں چل رہی تھیں۔

"واہ....... بڑا بہادر ہے.... عورت کو مار ڈالا۔"

"پاگل معلوم ہوتا ہے کوئی۔"

'ہائے رقابت ___ "شاید کوئی شاعر بولا۔

"اجی کوئی انقلابی معلوم ہوتا ہے۔" شاید کوئی کلرک بولا۔

"کمبخت ان نمک حرام انقلابیوں کی وجہ سے ہی دیس کو آزادی نہیں ملتی۔" شاید کوئی جیالا بولا۔

پولیس انسپکٹر غصے کے رعشے سے کانپتی ہوئی آواز میں اسے گردنی دیتے ہوئے بول رہا تھا۔ "بدمعاش ذلیل کمینہ....."

آصف چیخ رہا تھا۔

مار ڈالا ہے۔ اپنی جوانی کو مار ڈالا ہے۔ سارا چوسا ہوا خون. . .....مس فاکس کو مار ڈالا ہے۔"

سپاہی گردنیاں دے دے کر اس کو اکسفورڈ اسٹریٹ پر دھکیلتے لے جانے لگے۔

"ہاں اہل وطن...."

سردار جسونت سنگھ

قدرت اللہ شہاب

راجہ بازار کے عقب میں گوردوارہ دمدمہ صاحب کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اندرونی دالان میں دسویں پادشاہ سری گورو گوبند سنگھ کلغی والے کا گر پر بھ منانے کے لئے دیوان لگا ہوا تھا' اور بیرونی صحن اور گوردوارہ کے آس پاس ساری کھلی جگہوں میں راولپنڈی اور راولپنڈی کے مضافات کی بیشتر خالصہ آبادی سنگھ سبھا منا رہی تھی۔ کہوٹہ' مری' گوجر خان' چکوال اور پنجاڑ تک سے لوگ جوق در جوق آئے ہوئے تھے اور صبح سے راولپنڈی کے کوچہ و بازار چوڑی چوڑی چھاتیوں والے گبرو جوانوں اور رنگ برنگ دوپٹوں والی خوبصورت' صحت مند عورتوں کی ٹولیوں سے بھرے ہوئے تھے۔

ہر گاؤں کی اپنی اپنی الگ ٹولی تھی اور برادری کا کوئی بڑا بوڑھا اس کی قیادت کر رہا تھا۔ اسی ایک ٹولی میں ماں باپ تھے' میاں بیوی تھے' بھائی بہن تھے' عاشق معشوق تھے____ اور پھر بچے تھے۔ خوبصورت' صحت مند' چاق و چوبند بچے جو راہ چلتے چلتے چوکڑیاں بھرتے تھے' قلابازیاں لگاتے تھے' بکرے بلاتے تھے' چھی گاتے تھے اور اپنی چھوٹی چھوٹی لاٹھیاں ہوا میں اچھال کر "جو بولے سو نہال____ ست سری اکال۔" کے نعرے لگاتے جاتے تھے۔

جوانوں نے سفید' نسواری اور نیلے لٹھے کے تہ بند پہنے ہوئے تھے' گھٹنوں تک لمبی بوسکی کی دھاری دار قمیض۔ اوپر مخملی' ریشمی یا گبرون کی شوخ واسکٹیں' سیپ کے بٹنوں کی قطاریں' جیبوں میں سے دو دو بالشت باہر لٹکتے ہوئے رومال' سر پر رنگ برنگے صافے' آنکھوں میں سرمہ' ہاتھوں میں لمبی لمبی چمکتی ہوئی خمدار لاٹھیاں' کسی نے تہ بند گانٹھ میں چھپائی ہوئی شراب کی بوتل یا ٹھرے کا ادھا۔ عورتوں نے اخروٹ کے چھلکے مل مل کر ہونٹ کبوتر کے خون کی طرح سُرخ کئے ہوئے تھے' ان کی بڑی بڑی آنکھوں میں کاجل کی موٹی موٹی لکیریں اور دھوپ میں پا پیادہ چلنے کی وجہ سے گالوں میں تمتماتے ہوئے سُرخ سُرخ انگارے ان کے لباس کی زرق برق بھڑک کے ساتھ مل کر رنگ اور نور کی پھلجھڑیاں سی پیدا کر رہے تھے۔

گوردوارہ دمدمہ صاحب کے باہر سنگھ سبھا میں پہنچ کر گاؤں کی ٹولیوں کی دستہ بندی قائم نہیں رہتی تھی۔ جھولے' چنڈول' کشتی کے اکھاڑے' دو پیسے میں بارہ من کی دھوبن اور بنگالے کا جادو دکھانے والے مداری' ایک آنے میں "جوان عاشق عرف بہرام" دکھانے والے تھیٹر' دو آنے میں تین تصویریں کھینچنے والے فوٹو گرافر' چار آنے میں بچھڑے ہوئے محبوب سے ملانے والے نجومی____ کنگھیوں' آئینوں' رومالوں' حلوائیوں' دہی بڑوں اور چاٹ والوں کی دکانیں____ یہ سب اپنی کشش سے گاؤں کی بندھی بندھائی ٹولیوں کو تتر بتر کر دیتے تھے اور کچھ عرصہ کے لئے اس ہجوم میں سے پانی کی ہر پریشانی لہر اپنی سطح کو پا لیتی تھی____ اور پھر رفتہ رفتہ یہ ساری بکھری ہوئی

ٹکڑیاں اپنے مکر پر اکٹھی ہو جاتی تھیں۔ ہر مرکز گوردوارہ دمدمہ صاحب کے اندرونی دالان میں تھا جہاں ایک زرکار شامیانہ کے نیچے گرنتھ صاحب مخملی غلافوں اور تکیوں کے درمیان رکھا ہوا تھا۔ گرنتھی انوپ سنگھ برابر کبھی دائیں کبھی بائیں ہاتھ سے سفید گھوڑے کی دم سے بنائی ہوئی چوری جھل رہا تھا اور سامنے ایک طرف مرد اور دوسری طرف عورتیں دیوان میں سنگت سجائے بیٹھی تھیں۔

عورتوں کی سنگت میں گاؤں کی بھری بھری گدری گدری لڑکیاں بھی تھیں جن کے چہرے کچے ناریل کے گودے کی طرح نکھرے ہوئے تھے اور جن کے تن بدن سے سینٹ یا عطر کی جگہ صرف جوانی کی مہکار آتی تھی۔ کالجوں میں پڑھنے والی شہر کی چھوکریاں بھی تھیں جنہوں نے اپنے رخساروں پر غازے اور پاؤڈر' سرخی اور سرمے کی نوکدار پنسلوں کی مدد سے عجیب و غریب سنگار کیے ہوئے تھے۔ ان کے اجسام سے جوان خون کی جگہ مصنوعی عطریات اور سینٹوں کی خوشبوئیں آ رہی تھیں اور انہوں نے اپنی زلفوں کی سیاہ ناگنیں کٹوا کر ان کی جگہ مشینوں کے کاڑھے ہوئے کنڈل بنوائے ہوئے تھے' اسی شان میں حسن ابدال کی بڑی سردارنی آنند کور گہنوں سے لدی بیٹھی تھی۔ اس کے اردگرد اس کی چاروں لڑکیاں تھیں انہوں نے الگ الگ رنگ کی بنارسی ساڑھیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ان کی انگوٹھیاں' کانوں کی بالیاں' کلائی گھڑیوں کی پٹیاں' سینڈل اور ہینڈ بیگ بھی ساڑھیوں کے ہم رنگ تھے۔ رات کے آٹھ بجے بھی انہوں نے آنکھوں پر تازہ فیشن کے سیاہ چشمے آویزاں کیے ہوئے تھے تاکہ کالے شیشوں کے مقابلے میں ان کے گورے رنگ اور بھی زیادہ نکھرے ہوئے نظر آئیں اور پنڈال میں جگمگاتی ہوئی بجلیوں کی روشنی ان کی نازک آنکھوں پر گراں نہ گزرے۔ جب یہ لڑکیاں لاہور میں ہوں تو انہیں بلاناغہ گانے' ناچنے' بندوق کا نشانہ لگانے' تیرنے اور پڑھنے لکھنے کے سوا باقی تمام فنونِ لطیفہ کے مقابلوں میں اول انعام ملا کرتے تھے۔ جب وہ چھٹیاں گزارنے حسن ابدال آتیں تو راولپنڈی کوہ مری اور ایبٹ آباد سے سہیلیوں کو اکٹھا کر کے دیہات سدھار کے پروگرام بنتے تھے۔ کہیں نائٹ سکول کھل رہا ہے' کہیں بچوں کو نہلانے کا دن منایا جا رہا ہے' کہیں صفائی کا ہفتہ' کہیں پھولوں' پھلوں یا سبزیوں کی نمائش ہے' ان گوناگوں مشاغل سے تھک کر کبھی کبھی چاندنی راتوں میں مون لائٹ پک نک ہوتی تھی اور یہ نازک اندام خواتین سیاہ چشمے لگائے' ہلکی پھلکی خوبصورت چھتریاں تان کر اپنے جسم کو چاند کی کرنوں سے بچائے چہل قدمی کو نکلا کرتی تھیں ____

گوردوارہ دمدمہ صاحب کے دالان میں نہ تو لاہور کی رقص گاہوں کی نفاست تھی اور نہ چاندنی رات میں حسن ابدال کے مرغزاروں کی پاکیزہ لطافت' بلکہ یہاں تو ایک دوسرے سے جڑ کر بیٹھے ہوئے اجسام سے بہتے ہوئے پسینے کی بوچھائی ہوئی تھی اور اس فضا میں حسن ابدال کی بڑی سردارنی کی چاروں بیٹیوں کا دم بُری طرح گھٹ رہا تھا۔ تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد بڑی سردارنی اپنے سامنے رکھے ہوئے چاندی کے بکس میں سے کبھی الائچی کبھی سپاری' کبھی پیپر منٹ کی ٹکیاں اور کبھی روح کیوڑہ اور عرقِ گلاب میں بھگوئے ہوئے منقے نکال کر چاروں بیٹیوں میں تقسیم کرتی تھی۔ لیکن ان مفرح اشیاء سے کوئی چیز بھی ان کو تسکین پہنچانے میں کامیاب نہ ہوتی تھی۔ بڑی سردارنی خود اپنے ہاتھ سے باری باری ان کے چہروں پر صندل کے بنے ہوئے ہلکے پھلکے پنکھے سے ہوا کرتی تھی۔ یہ پنکھا میسور سے اس نے خاص طور پر بنوایا تھا اور اس کی ہر جنبش کے ساتھ فضا میں صندل کے مشام نواز مہک پھیل جاتی تھی۔ لیکن بڑی سردارنی کی نازک اندام بیٹیاں جس تکلیف میں مبتلا تھیں' اس میں صندل کی مسیحائی بھی کارگر ثابت نہیں ہو رہی تھی۔

عورتیں تو خیر نازک مزاجی کے اس مظاہرے پر ناک بھوں چڑھانے کے علاوہ اور کیا کرتیں لیکن مردوں کے دل اس تکلف کو دیکھ کر بہت بے چین تھے۔ گیانی ترلوچن سنگھ اور اس کے ساتھی بڑے سوز و گداز سے ایک الم ناک شبد الاپ رہے تھے جس کا مفہوم یہ تھا کہ "اے گرو کے بیٹو! اپنے سارے دُکھ مجھے دو اور میرے سارے سکھ تم لے لو۔ اگر تمہیں کانٹا چبھے تو میرے سینے میں تلوار مار دو' اگر تمہیں ٹھوکر لگے تو مجھے زندہ زمین میں گاڑ دو۔ اگر تمہیں ذرا سی آنچ آئے تو مجھے آگ میں پھینک کر جلا ڈالو۔ اے گرو کے صاحبزادو......."

عورتوں کی آنکھیں اس شبد کو گاتے گاتے نمناک تھیں۔ اس کے سینے میں عقیدت اور عبودیت اور قربانی کے جذبات بڑی

شدت سے موجزن ہو رہے تھے۔ ایک ہاتھ سے وہ آنچل سے آنسو پونچھتی جا رہی تھیں اور دوسرے ہاتھ سے اپنے سینے کا تلاطم تھامے بڑی غم ناک لے میں شبد کے بول گا رہی تھیں۔ مردوں پر بھی رقت طاری تھی لیکن ان میں سے اکثر گرو کے بیٹوں کی جگہ حسن ابدال کی بڑی سردارنی کی صاحبزادیوں کے حضور میں اپنی قربانیوں کی بھینٹ چڑھا رہے تھے۔

گاؤں کے لمبے لمبے، چوڑے چوڑے کڑیل جوان ان شبدوں کی لے میں اپنے دل پسند "ماہیا" کے دوہے گنگنا رہے تھے:

اے حسین دوشیزہ!
اگر اس چار دیواری میں تیرا دم گھٹتا ہے
تو آ میرے ساتھ بھاگ چل
میں تجھے اپنے کندھوں پر اٹھا کے
بہت دور لے جاؤں گا
کھجوروں کے جھنڈ میں
چنے کے سر سبز لہلہاتے ہوئے کھیتوں کے پاس۔ ۔ ۔
اے نازک اندام دوشیزہ۔ ۔ ۔ ۔
اگر تیرے سینے کے کبوتر پھڑ پھڑا رہے ہیں
تو رات کے وقت چوری چوری میرے کنوئیں پر آ جا
وہاں میں نے بڑے خوبصورت جال بچھائے ہوئے ہیں
جو جنگلی کبوتر ایک دفعہ زیر دام آیا
وہ پھر واپس نہیں گیا۔۔۔۔۔۔ ۔۔

....

شہر کے نوجوان بھی اپنے دل میں کچھ ایسے ہی ارادے رکھتے تھے لیکن کھجوروں کے جھنڈ، چنے کے سر سبز لہلہاتے ہوئے کھیت اور رات کے وقت چرر چوں، چرر چوں چلتے ہوئے رہٹ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لئے وہ بڑی سردرنی کی چاروں بیٹیوں کی ڈلہوزی روڈ، لال کرتی یا راجہ بازار کے کسی ریسٹوران میں لے جانے کی آرزو پر ہی قناعت کرتے تھے جہاں بلوری میزوں کے گرد بیٹھ کر وہ پنکھوں کی ہوا میں، لیمونیڈ، آئس کریم، سوڈا، روز اور وِمٹو کا آرڈر دیں اور برفائے ہوئے گلاسوں کا لمس ان خوبصورت ہونٹوں کو تازگی بخش دے، جو اس گرمی میں گلاب کی پتیوں کی طرح خشک ہو کر مرجھائے جا رہے تھے ___ البتہ سردار جسونت سنگھ کو یہ تشویش تھی کہ اس کم بخت شہر راولپنڈی میں ایک بھی سلیقے کا ریسٹوران نہیں جس میں انسان لڑکیوں کو بلا پس و پیش لے جائے اور اگر اور نہیں تو کم از کم دو چار ڈانس ہی مار لے۔ ولایت سے آنے کے بعد وہ خالی شربت یا لیمونیڈ یا آئس کریم پر عشق لڑانے کا قائل نہیں تھا۔ اس معاملہ میں اب وہ ضرورت سے زیادہ ترقی پسند ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب کبھی اس کا کسی لڑکی سے سامنا ہوتا تو اس کے دل میں پہلی امنگ یہ اٹھتی کہ ہاتھ جوڑ کر "ست سری اکال" کہنے کی بجائے وہ اس کے ساتھ مسکرا کر ہاتھ ملائے، سینما لے جا کر شانہ سے شانہ بھڑا کر بیٹھے اور پھر کسی ریسٹوران میں کھانا کھلائے، ڈانس کرے۔۔۔۔۔۔۔۔ راولپنڈی میں سینما تو تھے لیکن شانوں کی کمی تھی اور ریسٹوران تو گویا نہ ہونے کے برابر تھے۔ ابھی چند برس کی بات ہے کہ جنگ کے زمانے میں یہی ریسٹوران پیرس کی نقل کرتے تھے۔ شراب، ڈنر اور تمبولا کے کوپنوں کے ساتھ ڈانس کے پاٹنر بھی مہیا ہوتے تھے اور ایک ایک کوپن کو حاصل کرنے کے گھنٹوں 'کیو' میں کھڑا ہونا پڑتا تھا لیکن اب چاروں طرف الو بول رہا

تھا۔ شراب کی جگہ "سری رام مارکہ" لیمونیڈ اور جگادھر سنگھ گجادھر سنگھ کے کارخانے کی بنی ہوئی آئس کریم بک رہی تھی 'آرکسٹرا کی جگہ فلمی گانوں کے گھسے ہوئے ریکارڈ بجتے تھے اور ناچ کا تو کہیں نام و نشان ہی نہ تھا۔

اس ذہنی اور اعصابی تشنگی کو بجھانے کی کوشش میں وہ کئی بار پٹتے پٹتے بچا تھا کیونکہ اس کے والد سردار گوردیال سنگھ پرانی وضع کے بزرگ تھے اور کسی حالت میں بھی اس بات کے روادار نہ تھے کہ ان کا بیٹا پرائی لڑکیوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر "ست سری اکال" کہنے اور حیاداری سے آنکھیں جھکا لینے کی جگہ ہاتھ ملانے یا شانہ سے شانہ بھڑانے کی کوشش کرے اور ڈانس تو خیر بہت دور کی بات تھی۔

سردار جسونت سنگھ دل ہی دل میں پریشان ہو رہا تھا کہ ہائے اب کے بھی بہار یونہی بیت جائے گی! حسن ابدال کی بڑی سردانی کی چاروں لڑکیاں کوئی ہر روز تو راولپنڈی آتی نہیں ہیں تو صد حیف کہ انہیں ایک ڈانس پر بھی نہ لے جاسکے۔ یہ احساس اس کے زخموں پر بڑی شدت سے نمک پاشی کر رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر کے راولپنڈی اور راولپنڈی کے بے کیف ریستورانوں کے مالکوں اور منیجروں کی ماؤں' بہنوں اور بیٹیوں کو بڑی بڑی ثقیل گالیوں سے نوازنا شروع کر دیا۔ غصے سے بل کھا کھا کر وہ اندر ہی اندر گالیاں دیتا تھا اور دایاں ہاتھ زور زور سے اپنی ران پر مارتا جاتا تھا۔

سردار جسونت سنگھ کے والد بزرگوار سردار گوردیال سنگھ قریب ہی بیٹھے شبد الاپ رہے تھے' بیٹے کی وارفتگی دیکھ کر ان کا جی باغ باغ ہو گیا اور دل ہی دل میں انہوں نے واہگورو جی مہاراج کو تعظیم دی کہ ولایت سے ہو آنے کے بعد بھی ان کا فرزند دلبند یوں مذہب کے جذبات سے بدستور سرشار ہے اور گورو کے صاحبزادوں کی شہادت کے شبد پر بھری محفل میں بے اختیار گریہ وزاری کر رہا ہے......

شبد ختم ہوا تو عورتوں اور مردوں نے اپنے اپنے تصورات کی بھول بھلیوں سے نکل کر زور زور سے ناک صاف کئے اور بلند آواز سے "جو بولے سو نہال ____ ست سری اکال" کا نعرہ لگایا' شبد کے بعد گورو گرنتھ صاحب اور جپ جی کا پاٹھ ہوا۔ پھر ارداس ہوئی۔ ارداس کے بعد لانگری سنتوکھ سنگھ دو نہنگ سیواکاریوں کے ساتھ نمودار ہوا اور سنگت میں پرشاد تقسیم ہونے لگا۔

نہنگ سیواکاریوں نے سوجی کے حلوے کی بڑی بڑی بالٹیاں اٹھائی ہوئی تھیں' اور وہ خطِ مستقیم میں لانگری سنتوکھ سنگھ کے آگے پیچھے چل رہے تھے۔ لانگری سنتوکھ سنگھ نے آستینیں چڑھائی ہوئی تھیں اور وہ غڑاپ سے کہنیوں تک بازو بالٹی میں ڈبو ڈبو کر مٹھی بھر تربتر حلوہ برآمد کرتا تھا اور بڑی چابکدستی سے اسے ہوا میں اچھال کر گیند کی صورت بنا بنا کر تقسیم کرتا جاتا تھا۔ اس عمل میں اس کا بازو سرگودھا کے گھی میں بُری طرح لتھڑ جاتا تھا اور وہ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے بازو پر لگا ہوا گھی اکٹھا کر کے واپس بالٹی میں نچوڑتا جاتا تھا اور پھر وہ اپنی گھنی داڑھی کو انگوچھے کی طرح رگڑ کے اپنے بازو' ہاتھ اور انگلیوں کی صفائی کر لیتا تھا۔ سالہا سال سرگودھے کا خالص گھی پی پی کر لانگری سنتوکھ سنگھ کی داڑھی پچاس برس کے سن میں بھی کاجل کی طرح سیاہ' ابرک کی طرح چمکیلی اور پرانے بڑ کے تنے کی طرح گھنی اور پیچ دار تھی۔ داڑھی میں جابجا بڑے بڑے پیچیدہ کنڈل تھے جیسے تالاب میں بانس گھما کر بھنور در بھنور پیدا کئے گئے ہوں۔ پرشاد بانٹتے وقت لانگری سنتوکھ سنگھ کے ہاتھ اور پاؤں یکساں برق رفتاری سے چلتے تھے۔ ہاتھوں سے تو وہ حلوے کی گولیاں بنا بنا کر تقسیم کرتا تھا لیکن پاؤں کے انگوٹھے کی داب سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جڑ کر بیٹھے ہوئے انسانوں کے ہجوم میں اپنا راستہ تلاش کرتا تھا۔ اس جستجو میں کبھی اس کے پاؤں کے انگوٹھے کسی کی رانوں میں گدگدی کرتے تھے' کبھی ان کا تصادم پنڈلیوں کے ساتھ ہوتا تھا اور کبھی وہ راستہ ٹٹولتے ٹٹولتے ایسی پگڈنڈیوں پر بھی جا بھٹکتے تھے جو شارع عام نہیں ہوتیں! خاص طور پر جب لانگری سنتوکھ سنگھ عورتوں کی سنگت میں پرشاد بانٹ رہا ہو تو بھولنے بھٹکنے کے یہ حادثات بڑی شدت سے رونما ہوا کرتے تھے۔

پرشاد ہو چکا تھا سب نے کھڑے ہو کر بڑے جوش و خروش سے "راج کرے گا خالصہ" کا ملی ترانہ گایا اور پھر "ست سری اکال" کے نعروں کے درمیان دیوان برخاست ہوا' اس موقع پر ایک بار پھر بڑے زوروں کی ریل پیل ہوئی اور کچھ عرصہ کے لئے نہ کوئی بندہ رہا نہ

کوئی بندہ نواز__ گوردوارہ ودمدمہ صاحب کے اندرونی صحن سے بیرونی صحن تک آتے آتے بہت سے یاران تیز گام نے منزل کو جالیا۔ لیکن سردار جسونت سنگھ کٹہرے کا کھڑا ہی رہا۔ ولایت میں اس نے "لیڈیز فسٹ" کے آداب بڑی محنت سے سیکھے تھے۔ اب وہ ریل پیل اور دھکم دھکا میں شامل ہو کے عورتوں کی ٹانگوں' چھاتیوں اور کولھوں سے ٹکرا ٹکرا کر اپنے کچھر کو پراگندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ سلیقے سے ایک طرف کھڑا رہا اور اس کے سامنے سے عورتوں اور مردوں کے ہجوم سمندر کی لہروں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکراتے' ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوتے گذرتے رہے۔ جب بھیڑ چھٹ گئی تو سردار جسونت سنگھ گوردوارہ سے باہر آیا جہاں تین تانگے کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک تانگے میں اس کا باپ' اس کی ماں اور حسن ابدال کی بڑی سردارنی آنند کور سوار تھیں۔ دوسرے تانگے میں سردارنی کی تین بیٹیاں بیٹھی تھیں۔ تیسرے تانگے میں بڑی سردارنی کی چوتھی بیٹی اور سردار جسونت سنگھ کی بہن کوشلیا تھیں' جسونت سنگھ کے پاس اپنا موٹر سائیکل تھا۔ اس نے سٹارٹر پر زور سے پاؤں مار کر انجن چلایا۔ پہلے تانگے نے جو چکوال کا ہندو کھتری تھا "دیوی ہیرے والی تیری سدا ہی جے" کا نعرہ لگا کر گھوڑے کو چابک مارا' دوسرا تانگے والا کوہالے کا مسلمان سید تھا' جواب میں اس نے "پنج نعرے پنج تن کے کے ایک نعرہ حیدری ___ یا علی" کی صدا لگائی۔ تیسرا تانگے والا نسبتاً جوان تھا اس لئے وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی خوبصورت لڑکیوں میں زیادہ منہمک تھا۔ اپنی بغل والی خالی جگہ دیکھ کر اس کے سینے پر سانپ سالوٹ گیا۔ اس نے گھوڑے کی لگام کھینچ کر اسے روکا اور کہا:

"ایک بی بی آگے آجائے۔"

"کیوں جی! ہم ٹھیک ٹھاک بیٹھے ہیں یہاں۔" کوشلیا نے جواب دیا۔

"پیچھے بوجھ زیادہ ہے۔ تانگہ ہلکا ہو جاتا ہے۔ اس لئے ایک بی بی آگے آجائے۔"

کوشلیا بڑی جزبز ہوئی لیکن بڑی سردارنی کی چھوٹی لڑکی نے ایک ہاتھ سے کوشلیا اور دوسرے ہاتھ سے تانگے والے کے کندھے کا سہارا لے کر بیٹھے بیٹھے چھلانگ لگائی اور اُچک کر اگلی سیٹ پر آ بیٹھی۔ "گوری گوری۔ او بانکی چھوری۔ کبھی میری گلی آیا کرو......." اب اس تانگے والے کے منہ سے بھی نغمے پھوٹنے لگے اس کا چابک بار بار ہوا میں لہراتا تھا اور وہ حسن و جوانی کے قرب سے سرشار ہو کر گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا دوسرے تانگوں سے آگے نکل آیا۔ سڑک پر لوگ ادھر اُدھر بھاگ کر اس کی زد سے بچ رہے تھے اور شور مچا رہے تھے کہ "پکڑنا' پکڑنا گھوڑا بے قابو ہو رہا ہے۔" لیکن رحمان تانگے والا اپنے گھوڑے سے واقف تھا۔ یہ اس کا گھوڑا نہیں بلکہ اس کا دل تھا جو بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ کوشلیا دونوں ہاتھوں سے چھت کو پکڑے سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ بڑی سردارنی کی چھوٹی بیٹی ڈر کر تانگے والے کے بالکل قریب آگئی تھی۔ اس کی زلفیں تانگے والے کے شانے کے بالکل قریب لہرا رہی تھیں۔ اس کا نشیلا تنفس تانگے والے کے بائیں بازو پر شعلے سے برسا رہا تھا۔ گھوڑے کی برق رفتاری میں ہر نئی سرعت کے ساتھ وہ سہم کر تانگے والے کے اور بھی قریب آرہی تھی جو کئی فلمی دھنیں ختم کرنے کے بعد اب گا رہا تھا ____

"ہاتھ سینے پہ جو رکھ دو تو قرار آجائے"

خدا خدا کر کے محلہ موہن پورہ آیا اور محلے کے سرے پر سردار گوردیال سنگھ کی حویلی۔ سردار جسونت سنگھ باہر کھڑا تانگوں کا انتظار کر رہا تھا۔ جب سب پہنچ گئے تو سردار گوردیال سنگھ نے رحمان کو ڈانٹا۔ "کیوں بے اناڑی گھوڑا نہیں سنبھال سکتے تو ماں کے پاس گھر بیٹھو' تانگہ کیوں ہانکتے ہو؟"

رحمان نے اپنی ترچھی ٹوپی کا زاویہ بدلا۔ "سردار جی یہ گھوڑا بجلی ہے بجلی' کبھی بے قابو نہیں ہوتا۔ جاؤ اپنے ہیرے گن لو موتیوں کی طرح سنبھال کر لایا ہوں ____ ہاں!"

"موتیوں کا بچہ!" سردار گوردیال زیر لب بڑبڑائے۔ وہ اس وقت خواہ مخواہ جھگڑے کو طول دینا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ کھانا کھانے

کے بعد حسن ابدال کی بڑی سردارنی اور اس کی بیٹیوں کو لاہور کی ساڑھے بارہ بجے کی گاڑی پکڑنی تھی۔ چنانچہ انہوں نے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر چکوال کے ہندو کھتری تانگے والے کو دیا۔ "جاؤ تینوں برابر برابر بانٹ لینا۔"

رحمان نے چکوال کے ہندو کھتری اور کوہالے کے مسلمان سیّد تانگے والوں کو کن انکھیوں سے دیکھا۔ "جاؤ بیٹا دونوں بانٹ لو تم بھی کیا یاد کرو گے کہ کسی رئیس سے بالا پڑا تھا یاروں نے تو اپنی فیس وصول کرلی ہے ــــــ چل میرے شیر چھم چھم چھم چھم" اس نے گھوڑے کو اشارہ کیا اور چشم زدن میں یہ جاوہ جا۔

حویلی پہنچ کر گوردوارہ دمدمہ صاحب کے دیوان کی ریل پیل کی صدائے بازگشت ایک بار پھر بلند ہوئی۔ حسن ابدال کی سردارنی کی بڑی لڑکی نے دیکھا کہ اس کے بائیں کان کی بالی غائب ہے اور ساتھ والے رخسار پر ایک کھردری سی انگلی کا نشان یوں نمودار ہے جیسے قندھاری انار کو تیز ناخن سے چھیل دیا گیا ہو۔ دوسری کی گردن پر چٹکیوں کے سرخ سُرخ دھبّے خون کی طرح جھلک رہے تھے۔ تیسری کے سینے کا بروچ غنقا تھا اور چوتھی کا بلاؤز تار تار ہو کر پس پردہ کے مرمریں اور مہتابی رموز کو افشا کر رہا تھا۔ پر خود بڑی سردارنی پر بھی کوئی من چلا کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچ گیا تھا اور اب ان کی کمر میں بڑی شدت کا درد ہو رہا تھا۔ سردار جسونت سنگھ نے دیکھا کہ اس کی بہن کوشلیا کی انگوٹھی بھی موجود نہیں جو اس نے لندن سے خاص طور پر اس کے لئے بیس پونڈ میں خریدی تھی۔ اگر اس انگوٹھی پر بھیڑ میں کوئی جیب کترا ہاتھ صاف کر گیا ہے تو بے شک بڑے قلق کی بات ہو گی لیکن اگر خود کوشلیا نے آج چوری چھپے اپنی انگوٹھی ترلوچن سنگھ کی نذر کر دی ہے تو کوئی بات نہیں سردار جسونت سنگھ کو کوشلیا اور ترلوچن سنگھ کے عشق کا حال معلوم تھا۔ وہ دونوں گوڈن کالج راولپنڈی میں تھرڈ ایر میں پڑھتے تھے اور آپس میں شدت سے محبت کرتے تھے۔ اگر دو تین برس پہلے سردار جسونت سنگھ پر یہ راز افشا ہوتا تو وہ گنڈاسا اٹھا کر کوشلیا اور ترلوچن سنگھ دونوں کے سر قلم کر دیتا۔ لیکن ولایت سے آکر وہ کوشلیا کو بہن کے علاوہ ایک ہمدرد اور رفیق کی حیثیت سے بھی چاہنے لگا تھا۔

رفتہ رفتہ وہ ایک دوسرے کے گہرے ہم راز بن گئے تھے اور جب کبھی سردار جسونت سنگھ کے اعصاب پر راولپنڈی کے بے کیف ریستورانوں اور ویران ہوٹلوں کا احساس بری طرح حملہ آور ہوتا تو وہ اپنے کمرے کے دروازے بند کر کے مغربی موسیقی کے ریکارڈ لگا کر کوشلیا کو رمبا' والز اور فاکس ٹروٹ کے ڈانس سکھاتا تھا۔

سردار جسونت سنگھ کا اصرار تھا کہ حسن ابدال کی بڑی سردارنی اور اس کی چاروں بیٹیوں کے کھانے کا انتظام میز' کرسی کانٹے اور چھری کے ساتھ ہونا چاہئے۔ کوشلیا نے بھی حسب توفیق اس کی تائید کی لیکن دستور کے مطابق سردار گوردیال سنگھ کی رائے کا پلہ بھاری رہا' دالان میں دری بچھا کر اس پر مرزاپور کے دو قالین لگائے گئے تھے۔ مہمانوں میں محلّہ موہن پورہ کے بہت سے سردار اور سردارنیاں شامل تھیں۔ لانگری سنتو کھ سنگھ بھی موجود تھا ــــ گوردوارہ میں پرشاد بانٹ کر اس نے دن بھر کی تکان دور کرنے کے لئے بھنگ کے تین چار گلاس چڑھا لئے تھے اور اب وہ نشے کی ترنگ میں بڑی سردارنی کے گھٹنے کے ساتھ گھٹنا لگائے بیٹھا کلغی والے دسویں بادشاہ کے شجاعانہ کارناموں پر گورمکھی پُر اثر اشلوک سنا رہا تھا ــــ اس کے دو نہنگ سیواکاری یہاں بھی بڑے بڑے مور چھل پنکھے اٹھائے مہمانوں کے درمیان گھوم رہے تھے اور حتی الوسع کوشش کرتے تھے کہ پنکھے کی ہر جنبش کے ساتھ بڑی سردارنی کی بیٹیوں کے بالوں اور کپڑوں کی ساری مہک ان کے پاس کھنچ کر آجائے۔

کھانے کے بعد بڑی سردارنی کی بیٹیوں نے یکے بعد دیگرے سردار جسونت سنگھ کے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ کر تیسری بار اپنے چہروں کو آراستہ کیا۔ جسونت سنگھ اور کوشلیا دونوں انہیں رات کے ساڑھے بارہ بجے والی گاڑی پر سوار کرانے پر مامور ہوئے۔ گاڑی روانہ ہونے کے بعد سردار جسونت سنگھ نے کوشلیا کو اپنے پیچھے موٹر سائیکل پر بٹھالیا اور پوچھا:

"کوشلیا! تم نے آج اپنی انگوٹھی نہیں پہنی کیا بات ہے؟"

"کوئی بات نہیں بھرا تا جی! پہنی تو تھی شاید کہیں بھیڑ بھاڑ میں گر گئی ہو۔" کوشلیا نے بات بنانے کی کوشش کی۔

"گرتی کیسے؟ تمہاری انگلی پر تو وہ بہت پھنس کے آتی تھی نا؟"

سردار جسونت سنگھ کا منہ سامنے کی طرف تھا اس لئے وہ قرمزی رنگ کے اس غبار کو نہ دیکھ سکا جو شفق شام کی طرح کوشلیا کی آنکھوں، ہونٹوں اور رخساروں پر چھایا جا رہا تھا۔

"بھرا تا جی!" کوشلیا کی آواز کا تناؤ ڈھیلا پڑ گیا، جیسے تیر نکل جانے کے بعد کمان اپنی اصلی حالت پر آ جاتی ہے۔

"چلو اس کی طرف چلیں میری بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

"بھرا تا جی؟" کوشلیا حیرت اور احسان کے جذبوں میں گڈ مڈ ہو گئی۔

"تو را میں بھی دیکھوں کہ وہ جانور ہے کس ڈھب کا۔ ولایت میں لڑکیاں اپنے چاہنے والوں کی بوے فخر سے نمائش کیا کرتی ہیں۔ میں تمہیں مارگریٹ براؤنی کا قصہ سناتا ہوں جو میرے ساتھ ہندوستان آنے پر جان دے رہی تھی۔" سردار جسونت سنگھ یہ کہانی سنانے میں اس درجہ منہمک ہوئے کہ کئی جگہ راہگیروں، چھکڑوں، ٹانگوں، تانگوں اور بجلی کے کھمبوں سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔ "بھلا سوچو تو کوشلیا اگر میں اسے لے آتا تو بھائیا جی جوتے مار مار کر ہوش ٹھکانے لگا دیتے دونوں کے۔ معلوم نہیں بیچاری کس حال میں ہو گی۔ کل یاد دلانا میں اسے ضرور خط لکھوں گا۔"

کوشلیا نے نہ تو مارگریٹ براؤنی کے حالِ زار پر کوئی خاص توجہ دی نہ ہی سردار جسونت سنگھ کے خط لکھنے کی یاد دہانی کرائی۔ کیونکہ اس کے دماغ میں اول تو ترلوچن سنگھ ہی ترلوچن بسا ہوا تھا اور اب اس کے علاوہ بھائیا جی کے جوتوں کا خیال بھی دوش بدوش اُبھر آیا تھا۔ یوں سردار گوردیال سنگھ بڑے شفیق اور ہنس مکھ باپ تھے لیکن جہاں بچوں کی تعلیم و تربیت یا چلن میں کسی قسم کا رخنہ نظر آئے وہاں ان کا ہاتھ بے اختیار جوتوں کی طرف لپکتا تھا۔ تنبیہہ و سرزنش کا یہ فن انہوں نے اپنے ایام تحصیلداری میں حاصل کیا تھا اور ان کے تجربہ کے مطابق یہ طریق کار بہت موثر تھا۔

گورڈن کالج کے ہوسٹل کے کمپاؤنڈ میں پہنچ کر کوشلیا موٹر سائیکل سے اتری اور ایک بجلی کے کھمبے کے پاس جا کر اس نے ایک پتھر سے کئی بار اپنے مخصوص انداز میں ٹن ٹن کی، جیسے تار گھر کا بابو گٹر گٹ گٹ کے ذریعہ اپنے پیغامات دنیا بھر میں نشر کیا کرتا ہے، ٹن ٹن کی آواز سن کر اوپر والے ایک کمرے میں روشنی ہوئی اور بجھ گئی۔ کچھ عرصہ کے بعد ترلوچن سنگھ کھڑکی میں نمودار ہوا اور قریب لگے ہوئے پانی کے پائپ کو پکڑ اس نے ہاتھوں اور گھٹنوں کے سہارے نیچے پھسلنا شروع کیا۔ اس عمل میں اس کے دونوں ہاتھ اور گھٹنے زنگ آلودہ نل سے رگڑ کھا کر بُری طرح شل ہو گئے تھے۔ نیچے پہنچ کر وہ لپکا کہ اپنی زخمی ہتھیلیوں کو کوشلیا کی خنک اور مشام نواز زلفوں میں چھپا لے لیکن یکایک اس کی نظر سردار جسونت سنگھ پر پڑی جو اپنی موٹر سائیکل کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

ترلوچن سنگھ کے قدم من من جیسے بھاری ہو گئے۔ جہاں تھا وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ جیسے کسی نے اچانک اسے منجمد کر دیا ہو۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر اس کا دایاں ہاتھ اٹھا اور کرتے کے نیچے لگی ہوئی کرپان پر جا کے رُک گیا۔

"ترلو جی آ جاؤ۔" کوشلیا نے اس کی ہچکچاہٹ دور کرنے کی کوشش کی۔ "یہ میرے بھرا تا جی ہیں۔"

ترلوچن سنگھ بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ سردار جسونت سنگھ کوشلیا کے برادرِ بزرگوار ہیں لیکن جو چیز اس کے دل میں بُری طرح کھٹک رہی تھی وہ اسی وقت ان کی یہاں موجودگی تھی۔ کیونکہ ترلوچن سنگھ کے وہم و گمان میں یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ کوئی بھائی رات کے

ایک بچے اپنی بہن کو اس کے عاشق سے ملاتا پھرے۔ ضرور دال میں کچھ کالا ہے' اس نے سوچا۔ چنانچہ کرپان پر اس کی گرفت اور بھی مضبوط ہو گئی۔

"ٹھہر او مت۔ "اب سردار جسونت سنگھ نے ترلوچن سنگھ کو مخاطب کیا۔ "اگر تمہارے پاس چھ انچ کرپان ہے تو میرے پاس ۳۲ بور کا جرمن ریوالور ہے۔ لیکن میں تمہاری طرح بزدل یا گنوار نہیں ہوں۔ تم بے خوف و خطر یہاں آ جاؤ۔"

ترلوچن سنگھ آگے بڑھنے لگا لیکن کرپان پر اپنی گرفت نہ چھوڑی۔

سردار جسونت سنگھ نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ "میرا نام جسونت سنگھ ہے' ہاؤ ڈو یو ڈو مسٹر۔"

ترلوچن سنگھ حیرانی' پریشانی اور تذبذب کے جال میں ایسا گرفتار تھا کہ اس وقت اسے ان رسمی تکلفات کا ہوش نہ تھا۔

سردار جسونت سنگھ نے سلسلہ کلام جاری کیا۔ "مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ میں کوشلیا کا بھائی ہوں۔ مجھے دیکھ کر شاید تمہیں پہلے یہ خیال آیا ہو کہ میں تمہارا سر قلم کرنے آیا ہوں۔ اب ہمارے جانے کے بعد شاید تم سوچو گے کہ میں آدھی رات میں بہن کی دلالی کرتا پھر رہا ہوں۔ دونوں خیال اس ملک میں بڑی آسانی سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن میں نہیں چاہتا کہ کسی کے بھی ذہنی تانے بانے کو بدل کر رکھ دوں۔ ہاں اگر تم ایک شریف آدمی کی طرح واقعی میری بہن سے محبت کرتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم یہاں چاندنی میں جی کھول کر باتیں کر سکتے ہو۔ میں گیٹ کے باہر انتظار کروں گا۔" سردار جسونت سنگھ موٹر سائیکل کو گھسیٹتا گھسیٹتا باہر لے گیا۔

"ترلو جی!" کوشلیا نے کہا۔

"کوشل!" ترلوچن نے جواب دیا اور پھر دونوں خاموش ہو گئے۔

چاندنی بھی چھائی ہوئی تھی اور قریب ہی پیپل کا وہ دانائے راز درخت بھی تھا جس کی کہنہ سال آنکھ نے سال بہ سال نئی کوشلیاؤں اور نت نئے ترلوچنوں کے رومان پروان چڑھتے دیکھے تھے۔ اسی درخت کے سائے میں پیمان بندھتے اور ٹوٹتے تھے۔ یہیں حسن و محبت کی طلسماتی روایتیں اپنا سحر پھیلاتی تھیں۔ اسی کی چھاؤں میں شاعری جنم لیتی تھی۔ افسانوں کے جال بنتے تھے۔ شیریں فرہاد' ہیر رانجھا' لیلیٰ مجنوں کو حیاتِ جاودانی نصیب ہوئی تھی ____ لیکن اس وقت کوشلیا اور ترلوچن کوئی اور بات نہ کر سکے۔ انہیں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سکول کے دو روٹھے ہوئے بچوں کو کمرے میں بند کر دیا گیا ہو کہ گھنٹی کے ختم ہونے سے پہلے پہلے آپس میں صلح کر لو ____ اور دروازے پر ماسٹر صاحب چھڑی لئے منتظر بیٹھے ہوں!

ٹوٹ گیا اِک تارا

تسنیم سلیم چھتاری

سائنس کا گھنٹہ تھا اور اسٹرانومی پڑھائی جا رہی تھی۔ ایک لڑکے نے پروفیسر سے پوچھا۔ "تارے کیوں ٹوٹ جاتے ہیں؟" پروفیسر صاحب اس وقت لیکچر میں گم تھے۔ انہوں نے اس سوال پر دھیان نہیں دیا۔

اسی لڑکے نے پھر یہی سوال کیا اور پروفیسر صاحب نے دوبارہ بھی نہیں سنا تو میرے قریب سے ایک دوسرے لڑکے نے آہستہ سے کہا۔

"مجھ سے پوچھو.......جب کسی کی موت آتی ہے تو تارا ٹوٹتا ہے۔"

'جب کسی انسان کی موت آتی ہے تو آسمان سے ایک چمکتا ہوا تارا ٹوٹ کر تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے۔" اس فقرے سے سب کے کان آشنا تھے۔ یہ بات لاکھ مرتبہ چمکتے تارے کی طرح دل کے آسمان پر طلوع ہوئی تھی اور تکلیف کی اندھیری گہرائیوں میں کھو گئی تھی۔

مجھے اس جواب نے وہ ساری کہانی یاد دلا دی جس میں ایک تارہ نکلا' چمکا اور پھر اپنے پیچھے یاد کی گہری لکیر چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے غائب ہو گیا۔

پانچ برس پہلے کی بات! مگر کیا پچاس برس کے بعد بھی میں انجم کو بھول سکوں گا! مگر کاش! ان دنوں میں آٹھویں کلاس میں تھا۔ شور و شغب کا عادی اور شرارت پسند! دنیا بھر کے کھیلوں میں حصہ لیا کرتا تھا اور صبح سے شام تک نت نئی حرکتیں کیا کرتا........ روز کپڑے پھٹتے گھٹنے اور کہنیاں لہولہان رہتیں! اماں ابا کی ڈانٹ بھی پڑتی اور چوٹوں کی تکلیف بھی ہوتی' پر اس دکھ میں کیسا خوشی کا پہلو تھا۔ میں پھٹے ہوئے کپڑے اور مجروح جسم لے کر انجم کے پاس پہنچتا۔

"انجم خدا کے لئے........دیکھئے آج اماں سے ضرور پٹ جاؤں گا۔"

'کیا ہو گیا؟" وہ پوچھتیں۔

"دیکھئے کیسی خراش لگی ہے ....اور قمیض کی آستین مونڈھے پر سے الگ...........اور کوٹ کا بٹن ندارد .... اُف کتنا خون نکلا ہے؟"

"شریر!" ایک ہلکا سا تھپڑ میرے بے ترتیب بالوں پر پھسلتا۔ "چلو اب خالہ کو دکھا کر لاؤں......لاڈلے کے ڈھنگ۔"

"ارے ارے......کیا جوتیاں کھلوایئے گا...... قسم آپ کی چھپ کر آیا ہوں' اب یہاں منہ ہاتھ دھو کر جاؤں گا......اگر انہوں نے دیکھ لیا اس شان میں تو آپ سمجھ لیجئے کیا ہو گا؟"

"اچھا ہے مجھے تو خوشی ہو گی تم مہینے میں چار چھ جوڑے تو چیتھڑے کر لیتے ہو! اور یہ جو روز مرہ چوٹیں لگتی ہیں...... مجھے تو ڈر ہے کسی دن ایک آدھ ہڈی نہ ٹوٹ جائے...... ."

"میرا کیا بگڑے گا.... آپ ہی تیمارداری کیجئے گا۔"

"ہاں جیسے تمہاری نوکر ہوں نا!"

پھر سچ مچ وہ نوکروں کی طرح سے ہاتھ منہ دھلواتیں' کپڑے سیتیں' زخموں پر ان کے پرانے دوپٹوں کی پٹیاں بندھتیں۔ جب میں درست ہو کر چلنے لگتا تو وہ ہنس کر کہتیں۔ "پرویز کہے دیتی ہوں اگر اب تم نے......" میں ہنستا ہوا بھاگ آتا اور دوسرے دن پھر اسی حالت میں پہنچتا۔

انجم مجھ سے کئی سال بڑی تھیں۔ پھر کوئی رشتہ ناطہ بھی نہیں...... میں اپنی شرمیلی طبیعت کے باوجود ان سے کچھ اس طرح کھل گیا تھا جیسے چھوٹے بڑے اور اپنے پرائے کا فرق ہی باقی نہ رہا ہو۔ اپنی دلچسپی کی ساری باتیں ان کو سناتا اور ان کی ساری باتیں بڑے شوق سے سنتا...... اور کبھی سوچنے لگتا کہ مجھے کشیدہ کاری اور کھانا پکانے کی ترکیبوں سے کیا تعلق!___ انجم کو ہاکی اور فٹ بال سے کیا واسطہ! مگر یہ نہیں کہ ہم باتیں کرتے اکتا جاتے ہوں.. ..ایک کہہ رہا ہے دوسرا محویت سے سُن رہا ہے کچھ ایسی باتیں کہ تیسرا آ بیٹھے تو حشر تک نہ سمجھے کہ آخر گفتگو کا موضوع کیا ہے۔

ایک سال میں کیسی کایا پلٹ ہوئی تھی جب شروع میں ہم ان کے یہاں کرایہ دار ہو کر آئے تو مجھے سخت کوفت ہوئی کہ یہ ایک عدد لمبی تڑنگی لڑکی یہاں موجود ہے۔ ان دنوں میں لڑکیوں سے بے حد گھبراتا تھا۔ آج بھی اسی قدر! مگر انجم کو شاید اشرف المخلوقات سے بھی کچھ بڑھ کر پایا اور وہ بہت جلد میرے خیالات اور احساسات کی شریک بن گئیں۔

دنیا میں کتنی تبدیلیاں ہو رہی تھیں مجھ میں لاکھوں باتیں نئی پیدا ہوئیں اور پرانی علیحدہ ہو گئیں۔ نئے کھیل سیکھے' نئے دوست بنائے' نئی باتیں سوچیں اور نئی باتیں سنیں...... آنکھوں میں بھی شاید نئے نئے رنگ تیرتے تھے۔ جب ہی تو جدھر نگاہ اٹھتی ہر چیز بدلی ہوئی نظر آتی مگر انجم! کیا اس ایک سال نے رتی بھر فرق بھی پیدا نہ کیا تھا ان میں وہی لبوں کی خفیف سی لرزش پر دھیمی مسکراہٹ کا رقص! وہی ہلکے سے تھرتھراتی ہوئی پلکوں کے درمیان سے دو تاروں کی شعاعیں وہی سیاہ بالوں میں ڈوبتی اُبھرتی لہریں...... وہی ہاتھوں کی نرمی اور وہی آواز کا رس! وہ کہیں سے ذرہ برابر نہیں بدلیں اور میں اس یک رنگی سے کتنا مانوس ہو گیا تھا.... کبھی کبھی سوچتا کہ اگر انجم اپنے مخصوص انداز کے بجائے ذرا اکڑ کر چلنا شروع کر دیں خوابیدہ سی آنکھوں کے بجائے اور لڑکیوں کی طرح دیدے پھاڑ کر باتیں کرنے لگیں تو کیسی عجیب لگیں گی! تجربہ! اور مجھے خیال آتا وہ ہلکے ہلکے رنگوں کے بجائے گہرے رنگ کے کپڑے پہننا شروع کر دیں یا شلوار قمیض کے بجائے ساڑھی باندھنے لگیں تو کیا میں انہیں بیک نظر پہچان لوں گا! اور کیا تب بھی ان کے چہرے پر یہی دلکشی ہو گی......شاید نہیں۔

ان کی باتیں کیسی اچھی اور کتنی مخصوص تھیں!

میں سونے کے معاملے میں بہت ماہر تھا مگر جب سے انہوں نے بتایا کہ وہ روز صبح کو باغ میں پھول چننے جاتی ہیں اور دیر تک وہاں ٹہلتی ہیں' تو آپ سے آپ میری آنکھ صبح سویرے کھل جاتی اور میں سلیپر گھسیٹتا ہوا باغ میں پہنچتا۔ وہ حوض کے کنارے ٹوکری لئے مجھے اپنی منتظر ملتیں...... سفید شلوار کے شبنم سے بھیگے ہوئے پائنچے...... کسی ہلکے رنگ کے باریک سے دوپٹہ میں شگفتہ چہرہ جیسے اوس میں بھیگا ہوا گلاب! اور ایک مخصوص فقرہ!

"کہو..... کیا حال چال ہے؟"

"رات بھر گھٹنے میں درد رہا...... جانیے آپ نے کیا منحوس دوا لگائی تھی؟"

"تو اب مجھے الزام دیتے ہو...... شریر...... اچھا اب میں پھول جمع کرتی ہوں...... شرط یہ ہے کہ تم کسی پھول کو ہاتھ نہ لگانا۔"
"واہ یہ کیا پابندی ہے؟" میں جل جاتا۔
"بھائی پرویز تم مرد ہو...... سنا ہے کہ مردوں کے ہاتھ بہت سخت ہوتے ہیں...... پھول مرجھا جاتا ہے۔"
میں اس دلیل کو روز مان لیتا اور چپ چاپ بیٹھا انہیں تکتا رہتا۔ وہ پھول توڑ کر واپس جانے لگتیں تو میں ان سے ایک پھول مانگ لیتا۔
"میرا حصہ لائیے!"
وہ کوئی اچھا سا پھول لے کر میرے نائٹ ڈریس کے کوٹ میں اٹکا دیتیں۔ میں واپس آ کر کپڑے بدلتا اور ناشتہ کر کے اسکول چلا جاتا...... دن بھر دماغ میں میٹھی میٹھی سوچ کی بارش ہوتی رہتی اور جب شام کو کھیل سے واپسی پر سید حا ان کے یہاں پہنچتا تو وہ پرانے دوپٹوں کی پٹیاں بنائے اور مختلف اقسام کے مرہم لئے میری راہ تک رہی ہوتیں۔
زندگی کا یہ دور بھی کتنا مطمئن اور پُرسکون تھا مجھے ہر صبح شام کا انتظار رہتا کہ اپنا زخم خوردہ جسم ان کی تیمارداری کے سپرد کر دوں اور شام گذرنے پر صبح کا رستہ تکتا کہ ان سے باغ میں جا کر ملوں! اسی چکر میں دن بھاگتے چلے گئے۔
رفتہ رفتہ میری یہ کیفیت ہو گئی کہ نہ کسی دوست سے دوستی اور نہ کسی کھیل سے دلچسپی! ہر دم یہی خواہش کہ بیٹھا ان سے باتیں کرتا رہوں خود بخود بھی خیال آتا کہ وہ مجھ سے گھبرا نہ جائیں یہ نہ پوچھیں کہ بلا ضرورت کیوں آئے ہو...... میں وہاں جانے کو لاکھوں بہانے ڈھونڈتا ایسا بھی ہوا کہ دانستہ ٹھوکر کھائی اور چوٹ مارلی' جان بوجھ کر کپڑے پھاڑے اور پہنچ گیا۔ یہ بھی نہیں تو جا کر منہ بسورنے لگا۔
"خیر تو ہے کیا ہوا؟"
"بھوک کے مارے دم نکلا جاتا ہے۔"
"کیوں دوپہر کو کھانا نہیں ملا تھا؟"
"وہ سب ہضم ہو گیا۔"
"تو پھر؟" گہری مسکراہٹ سے آنکھوں کی لو بھڑک اٹھتی۔
"کچھ کھلائیے جلدی سے......"
"ایک شرط پر!"
"کہئے!"
"مجھے بازار سے اس رنگ کا اُون لادو گے؟" وہ نمونہ دکھلاتیں۔
"ایک شرط پر!" مجھے بھی شرارت سوجھتی۔
"وہ کیا؟"
"اگر آپ اُون کے پیسے دیں۔"
ہم دونوں دیر تک ہنستے رہتے۔ وہ مجھے اپنے ہاتھ سے کچھ بنا کر کھلاتیں اور میں بازار سے اُون لے آتا۔
پھر ایک ایسا احساس جو میرے لئے عجیب بھی تھا اور پریشان کن بھی! میں نے محسوس کیا کہ جب وہ میرے علاوہ کسی اور سے باتیں کرتی ہیں تو مجھے ناگوار ہوتا ہے۔ وہ اپنی سہیلیوں سے ملنے جاتی ہیں تو میرا جی اُلجھتا ہے' ان سے کوئی ملنے آتا ہے تو مجھے بُرا لگتا ہے...... خدا جانے کیوں' کبھی ایسا بھی ہوا کہ میں ان کے یہاں پہنچا تو اور دو چار لڑکیوں کو بیٹھے پایا۔ میں لوٹنے لگتا تو انجم مجھے روک لیتیں۔
"ارے بھئی پرویز کہاں بھاگ رہے ہو؟"

میں ٹھہر جاتا تو......."یہ تمہارے پسندیدہ تکونے ہیں! کھاؤ تا منہ کیا تک رہے ہو.......ارے بھئی ایسی بھی کیا شرم ہے"

ایسے میں ان کی میٹھی میٹھی باتیں بھی کڑوی لگتیں.......سب تو جمع ہیں اور میں تماشہ بنا بیٹھا ہوں یہ کیا زبردستی ہے......اٹھنے لگوں گا تو روکا جاؤں گا اور رُک جاؤں گا تو مجھ سے بے فکر ہو کر اِدھر اُدھر باتوں میں لگ جائیں گی! مجھے بھی اتنا غصہ آتا کہ بیان سے باہر.....مگر ان سے احتراز تو ناممکن تھا .... .ایک نامعلوم سی کشش!

اور ہاں مجھے ایک دُکھ بھی تھا میں انہیں اپنا ساتھی اپنا دوست اپنا رفیق اپنا ہم راز سب کچھ سمجھتا.........اور وہ مجھے ایک کمسن اور نادان بچہ! وہ مجھ سے عمر میں یقیناً بہت بڑی تھیں پانچ چھ سال! مگر میں ناسمجھ اور نادان بچہ نہیں میں محبت اور نفرت کو سمجھتا ہوں مجھے آنسو اور ہنسی کی حقیقت معلوم ہے......بے تکلفی اور محبت کے علاوہ مجھے ان کے سلوک میں ایک طرح کا بزرگانہ اور ناصحانہ انداز دکھائی دیتا اور میں جھنجھلا جاتا.... ..یا تو وہ مجھے اپنے برابر کا سمجھیں۔ میری نگاہوں میں کچھ دیکھیں میری باتوں میں کچھ پائیں ......اور میری کمسنی کا ان کو اسی قدر احساس ہے تو مجھے صحیح معنوں میں بچہ سمجھ لیں...... مجھے دیکھ کر لیٹے سے بیٹھ جاتی ہیں' پھسلا ہوا دوپٹہ گلے میں آلپٹتا ہے ......اور مجھے اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگتا ہے تو وہ کسی نہ کسی بات پر کہہ اٹھتی ہیں۔"تم نہیں سمجھتے پرویز تم ابھی بچے ہو......افوہ بچپن سے عطر لگانے کا شوق!"

میں چکرا جاتا ......مگر خاموش!

پھر ایک دن.......

"انجم! انجم! کہاں ہیں آپ؟"

"یہ رہی! وہ ہمیشہ کی طرح ایک آدھ بنے سویٹر سے الجھ رہی تھیں۔

"آج تو ایسی بھوک لگی ہے کہ زندگی میں نہ لگی ہوگی۔"

"ارے تب تو کسی ثقیل غذا کی ضرورت ہے۔'

"ہاں بس جلدی کیجئے۔"

"بلامعاوضہ کے نہیں!"

"کیا چاہئے؟" میں نے شان کے ساتھ کہا۔

"دیکھو پرویز! یہ میں اپنی ایک سہیلی کا سویٹر بن رہی ہوں اور بدقسمتی سے اس میں ایک لچھی اُون کم پڑے گا۔"

"میں تو نہیں لاؤں گا۔" سہیلی کے ذکر ست میں چڑ گیا۔

"کیوں بھئی یہ خفگی کیسی۔؟"

"جب دیکھو آپ سہیلیوں کے سوئیٹر بنتی ہیں...... کبھی ہم کو بھی کچھ بُن کر دیا.......میں تو اب ہرگز ہی اُون لا کر نہ دوں گا۔"

"اچھا یہ بات ہے.......ایمان سے کہنا کبھی تم نے فرمائش بھی کی!"

"میں کیوں فرمائش کرتا جب آپ کو خود ہی خیال نہ آیا۔"

"تو میں چاہتی تھی کہ تم اپنے منہ سے کہو۔"

"میرا دل تھا کہ آپ کو اپنی طرف سے رحم آجائے۔"

وہ ہنسنے لگیں اور پھر بولیں۔"مجھے یہ بات تسلیم ہے مگر دیکھو پرویز اگر تم نے اس کا شکوہ کیا تو ہم دونوں کے لئے خوشی کی بات نہیں؟"

ان کا یہ سوال! کہنے [illegible] اپنی مسرت کی انتہا مجھے ہمیشہ ہمیشہ یاد رہے گی۔

ایک ہفتہ بعد جو گیا تو انہوں نے سفید رنگ کا بے حد خوبصورت اور نرم سویٹر مجھے پہنا دیا۔

"بولو پسند ہے؟"

"سویٹر تو پسند ہے مگر آپ کا یہ سوال کرنے کا انداز پسند نہیں آیا۔"

"کیوں؟"

"آپ کا خیال تھا کہ میں اسے ناپسند بھی کر سکتا ہوں؟"

جب اپنی طرف لوٹا تو زمین پر قدم نہیں پڑتے تھے اور آپ سے آپ ہنسنے کو دل چاہتا تھا۔

اماں نے دیکھ کر کہا۔ "ارے یہ نیا سویٹر!"

میں نے کہا۔ "جی ہاں انجم نے بُن کر دیا ہے۔"

وہ کہنے لگیں۔ "انجم بہت محبت کرتی ہے تجھ سے...... اگر تیری عمر کی ہوتی تو ہم شادی کر دیتے۔"

اماں یہ فقرہ یونہی سرسری طور پر ازراہِ مذاق کہا تھا۔ مگر میں اس حد تک حواس باختہ ہوا کہ دیر تک اسی کے متعلق سوچتا رہا۔

"انجم کی شادی اور میرے ساتھ...... کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے مگر نہیں! میں ایسا خواب بھی دیکھوں تو پھر آنکھ کھولنے کی نوبت نہ آئے! میں انجم سے محبت کرتا ہوں، ان کا احترام کرتا ہوں! وہ کہیں تو جان دینے سے بھی دریغ نہ کروں مگر شادی! ان کی تو محض پرستش کی جا سکتی ہے۔ ...... اگر کہیں یہ ممکنات سے ہوتا تو بھی میں اس کے لئے تیار نہ ہوتا...... میری نگاہ میں تو یہ ان کی توہین ہے...... اگر وہ سنیں تو شاید پھر مجھ سے بات بھی نہ کریں...... مجھے تو وہ بچہ سمجھتی ہیں...... چھوٹا سا بچہ جو چوٹ کھا کر بسورتا ہوا ان کے پاس پہنچ جاتا ہے...... جو بھوک کی حالت میں ان کے پاس جاتا ہے اور کچھ کھا کر مطمئن ہو جاتا ہے...... کمسن بچہ جسے ابھی سگریٹ نہیں پینا چاہئے عطر نہیں لگانا چاہئے...... اور شاید وہ یہ بھی سمجھتی ہوں کہ اس دودھ پیتے بچے کو ان سے محبت کرنے کا حق تک حاصل نہیں ہے...... اسی لئے انہوں نے میری حالت کو قابلِ غور نہیں سمجھا اور مجھے ان سے ان لاکھ باتوں میں سے ایک بھی بات کہنے کی جرات نہیں ہوتی جو میں دن رات سوچا کرتا تھا...... میں انہیں ہر دم دیکھنا، بات کرنا، پاس بیٹھنا ضرور چاہتا ہوں مگر شادی! اگر اس کی کوئی صورت ہوتی تو کیا میں اسے برداشت کر لیتا...... میری صرف یہ خواہش ہے کہ میں تاحیات ان کو باغ کے پھول چنتا ہوا دیکھتا رہوں، ان کی میٹھی میٹھی باتیں سنتا رہوں! وہ سر جھکائے میرے ہاتھ پیروں کی چوٹوں کا معالجہ کرتی رہیں اور میں ٹکٹکی باندھے ان کے بالوں میں گھونگھر کی لہریں تکتا رہوں۔ وہ بڑے انہماک سے میرے لئے تکیے کے غلاف پر بوٹے کاڑھتی رہیں اور میں پاس بیٹھا ان کے رخساروں پر جھکی ہوئی لمبی لمبی پلکوں کا سایہ تھرکتا ہوا دیکھتا رہوں...... ایسی ہی ایک موہوم سی لرزش جیسے ان کے سامنے پہنچ کر میرے پیر ڈگمگا جاتے ہیں۔

میں جاؤں تو وہ مسکرا کر پوچھیں۔ "ہاں تو کیا حال چال ہے؟" میں واپس آنے لگوں تو ہنس کر کہیں۔ "پرویز میں کہے دیتی ہوں......"

شادی تو ان کی جلد ہی کسی نہ کسی کے ساتھ ہو جائے گی۔ کسی ایسے شخص کے ساتھ جو ان سے عمر میں دو چار سال بڑا ہو گا کہیں نوکر ہو گا...... اور پھر جسے وہ پسند کریں گی۔"

مجھے خیال آیا کہ اگر ان کی شادی ہو گئی تو کیا وہ یہاں سے چلی جائیں گی اور میری زندگی کا سہانا خواب بکھر کے رہ جائے گا۔ دل کو زبردست دھکا لگا...... کیا اب میں ان سے جدا رہ کر بھی خوش رہ سکتا ہوں...... وہ میری زندگی کا ایک جزو بن چکی ہیں۔ ان کی مسکراہٹ ان کی باتیں، ان کی گہری گہری آنکھیں...... اور میں گہری گھاٹیوں میں ڈوب گیا......

اماں نے کہا۔ "کل جاوید آ رہا ہے۔"

میری محویت کا تسلسل ٹوٹ گیا...... چلو اچھا ہے بھائی جان آ رہے ہیں ڈیڑھ سال بعد ان سے ملاقات ہو گی۔ دیکھیں اب بھی پہلے کی طرح شعر و افسانہ [illegible] نوکری نے کچھ تبدیل کر دیا۔

اُدھر بھائی جان بی۔اے کر کے نوکر ہوئے اُدھر اباجان کا تبادلہ ہوا اور ہم یہاں آگئے۔اماں بیچ میں ایک مہینہ کے لئے ان کے پاس ہو آئی تھیں اور اباجان بھی اکثر دورے کے سلسلے میں ان سے مل لیتے بس میں نے ہی ڈیڑھ سال سے نہ دیکھا تھا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں ابا جان کو بھائی جان نے لکھا بھی تھا کہ پرویز کو یہاں بھیج دیجئے۔ میں نیم راضی ہو چلا تھا جو انجم نے کہا کہ "تم ناحق جا رہے ہو گول کر جاؤ۔" میں نے جھٹ سے آ کر اماں جان سے انکار کر دیا کہ میں نہ جاؤں گا۔ اب بھائی جان کو ایک مہینہ کی چھٹی ملی تو وہ یہاں خود ہی آ رہے تھے!

میں بھائی جان کو لینے اسٹیشن گیا،وہ حسبِ توقع خوب صاحب بہادر بنے ہوئے تھے۔ کہنے لگے۔"کیسی جگہ ہے؟ ایک مہینہ خوب شاندار گزرے گا یا نہیں؟"

میں نے کہا۔"اب جیسی بھی جگہ ہے آپ خود ہی دیکھ لیجئے گا۔"

"یوں نہیں ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔"

"کیا بتاؤں؟"

"یہی کہ سوسائٹی کیسی ہے؟..... سینما ہاؤس کیسے ہیں، کلب کتنے ہیں اور ہوٹل کہاں کہاں ہیں؟..... تفریح کا کیا پروگرام رہتا ہے؟"

میں نے کہا۔"مجھے ہوٹل اور کلب کی تو خود خبر نہیں! سوسائٹی اچھی خاصی ہے، دو چار سینما ہاؤس بھی ہیں۔"

"انگلش فلم چلتی ہیں؟"

"کبھی کبھی....."

"لاحول ولا قوۃ۔"

"کیوں؟"

"وقت ضائع ہو گا یہاں اور کیا....... آخر تم چھٹیوں میں میرے پاس کیوں نہ آگئے.......... کیا کرتے رہتے ہو دن بھر؟ اسکول اور گھر؟ بس؟"

"ہاں بس اور کیا۔"

"دل نہیں گھبراتا؟ صحت ٹھیک ہے!"

"کمال کرتے ہیں آپ بھائی جان......."

"بھئی کم از کم میں تو اس طرح نہیں رہ سکتا.......... سوچتا ہوں کہ مہینہ بھر کے بجائے دس پندرہ دن میں بھاگ جاؤں..... بھی میرے ساتھ چلنا! سمجھے؟ وہیں اسکول میں داخل ہو جانا.....انسان بن جاؤ گے! سمجھے؟"

اسٹیشن سے گھر تک وہ ایسی ہی باتیں کرتے رہے۔

اماں سے ملنے کے بعد انہوں نے مجھ سے سوالات کرنے شروع کئے!

"یہ کس کا بنگلہ ہے؟ وہ کس کی کوٹھی ہے؟ اُدھر کون رہتا ہے؟"

میں سب بتاتا رہا۔

"اور یہ برابر کا گھر.......؟"

"انجم!"

"کون انجم؟ یہ کون صاحب ہیں؟"

اور مجھے محسوس ہوا کہ میں نے انتہائی مہمل قسم کا جواب دیا تھا۔

"ایک وکیل صاحب ہیں وہ مع فیملی رہتے ہیں۔"

"وکیل صاحب کا نام زوردار ہے! انجم!" بھائی جان نے زیرِ لب کہا۔

میں گھبرا گیا۔ "وکیل صاحب کا نہیں انجم تو ان کی لڑکی کا نام ہے۔"

"اوہ! بھائی جان نے مجھے سر تا پا گھورا۔ "تو کیا بہت دوستی ہے تم سے؟

"دوستی کیا...... بس۔" میں سٹپٹا گیا۔

"خوب! گویا کہ آپ بھی؟" انہوں نے معنی خیز طریقے پر ہنسنا شروع کیا۔

"تو پھر تفصیل بتاؤ کیسی لڑکی ہے؟"

"اچھی خاصی ہیں۔ ... آپ کی برابر ہوں گی۔" میں نے ان کا شبہ مٹانا چاہا۔

"میری برابر؟ اوہ! یوں کہو! میں تو سمجھا تھا کہ آپ!...... "

میں سوچنے لگا کہ جو بات میں آج تک نہیں سمجھ سکا ہوں اسے بھائی جان یوں لمحوں میں کیسے سمجھ لے رہے تھے!

بھائی جان کرسی پر لیٹ کر انگریزی کا ناول پڑھنے لگے اور میں نے سوچا کہ دیر تو ہو گئی ہے مگر لاؤ انجم کے یہاں ہو آؤں..... ان کو بتاؤں گا کہ ہمارے بھائی جان آئے ہیں.. ...... دفعتہً مجھے دروازے پر ان کی آواز سنائی دی۔ "پرویز!"

میں نے چونک کر کہا "جی!"

"کیا ہوا آج تم ......" وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی ٹھٹھک گئیں۔ بھائی جان بھی سر اٹھا کر گھورنے لگے۔

"یہ میرے بھائی جان ہیں۔" میں نے تعارف کی رسم ضروری سمجھی۔ "اور بھائی جان یہ انجم ہیں..... میں نے آپ کو بتایا تھا۔"

بھائی جان نے مسکرا کر ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا:

انہوں نے عمداً بھائی جان کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا اور کھڑکی سے باہر نگاہ جما کر بولیں۔ "معاف کیجئے مجھے انگریزی نہیں آتی۔"

"اوہ!" بھائی جان نے سنبھل کر کہا۔ "کوئی حرج نہیں مجھے تو اردو آتی ہے۔"

"اچھا تو میں چلتی ہوں۔" وہ مڑ کر جانے لگیں۔

"انجم ذرا تو بیٹھئے نا۔" میں نے سوچا کہ اب بھائی جان ان کو بد اخلاق اور پتہ نہیں کیا کیا کہیں گے اور میرا جی جلے گا۔

"جی ہاں آپ تشریف لائی ہیں تو بیٹھئے نا۔" بھائی جان نے بھی کہا۔

"بہت کام ہے .... آج پرویز نہیں آئے تو میں سمجھی کہ نہ جانے کیا بات ہوئی .... اچھا آداب عرض!" اور وہ چلی گئیں۔

میں نے سہمی سہمی نظروں سے بھائی جان کی طرف دیکھا کہ کیا کہتے ہیں مگر وہ کسی سوچ میں گم تھے۔

دوسرے دن اسکول کی واپسی پر میں نے سوچا کہ اب ان کے یہاں چلنا چاہئے ..... اور اٹھا ہی تھا جو بھائی جان نے کہا۔

"کہاں چلے؟"

"کہیں نہیں۔"

"انجم کے یہاں نہیں جاؤ گے؟"

"سوچ رہا ہوں۔"

"چلو! ہم بھی چلتے ہیں۔" وہ اٹھ کر میرے ساتھ چل دئے۔ میرا دل چاہا کہ کاش وہ میرے ساتھ نہ جاتے میں انجم سے اچھی طرح

بات بھی نہ کر سکوں گا اور کل کی سی وحشت پھیلے گی۔

وہاں پہنچے تو انجم کی والدہ سے بھی ملاقات ہوئی انہوں نے بھائی جان کو بہت پیار کیا دعائیں دیں۔ وکیل صاحب آئے چائے کا دور چلتا رہا اور میں چپ چاپ بیٹھا انجم کو دیکھتا رہا جو آج بالکل مہر بہ لب تھیں۔ تھوڑی دیر بعد ہم لوٹ آئے! بھائی جان دیر تک اماں سے وکیل صاحب کی تعریف کرتے رہے۔

تیسرے روز میں اسکول کی واپسی پر اپنے معمول کے مطابق سیدھا انجم کے یہاں پہنچا۔ اول گھر جانے میں خطرہ تھا کہ پھر بھائی جان ساتھ چلیں گے اور انجم سے بات چیت نہ ہو سکے گی! میں انہیں یہ بتانے کے لئے مضطرب تھا کہ اس دفعہ مجھے کرکٹ میں کپ ملنے کی امید ہے پہنچا تو دیکھا کہ صوفے پر لیٹی آہستہ آہستہ گنگنا رہی ہیں۔ میں چپ چاپ جا کر پیچھے کھڑا ہو گیا اور بصد مشکل یہ شعر سمجھ سکا ۔

نہ جانے آج کیوں دھڑکن مرے دل کی نہیں رُکتی
یہ آہٹ آپ کی تھی آپ گزرے تھے ابھی دل سے

کچھ دیر یونہی کھڑا رہا پھر شرارت سوجھی اور پانی کا گلاس میز پر سے اٹھا کر ان کے منہ پر چھینٹا دیا۔

تڑپ کر انہوں نے گردن موڑی اور مجھے دیکھ کر ہنس دیں۔ "اچھا ٹھہر و جاؤ بدلہ نہ لیا ہو تو..... بہت شریر ہوتے جا رہے ہو۔"

"آہا آپ کتنا اچھا گاتی ہیں ......افوہ!"

"واقعی؟"

"ہاں میں ڈرا تھا کہ کہیں، دھوبی گدھے کی تلاش میں ادھر نہ آ نکلے۔"

"تو ہماری آواز گدھے جیسی ہے؟"

"نہیں توبہ .... معاف کیجئے منہ سے سچی بات نکل گئی۔"

"ٹھہر جاؤ بد تمیز تمہارے لئے کھانے کی چیزیں رکھی تھیں اب ہرگز نہ دوں گی۔"

"کھل گئی قسمت..... آپ بھی کتنی اچھی ہیں۔"

"جی ہاں تب ہی تو یہ قدر ہوتی ہے۔"

"کہہ تو رہا ہوں بھول کر منہ سے نکل گیا .... اب کھلایئے نا کیا ہے؟...... پہلے آپ کبھی ایسی عمدہ نہ تھیں............ کیسے میرا خیال آیا؟"

"جاوید صاحب کے لئے بنائے تھے............ چونکہ تمہاری پسند کے تکونے تھے اس لئے رکھ لئے۔"

"تو کیا بھائی جان یہاں آئے تھے؟"

"ہاں ابھی تو گئے ہیں تمہارے آنے سے دس منٹ پہلے۔"

"آپ سے باتیں ہوئیں؟"

"ظاہر ہے ابا جان بھی یہاں موجود نہ تھے اور اماں کو تم جانتے ہو کہ وہ کتنی کم گو ہیں...... بیچارے جاوید صاحب چپکے ہی بیٹھے رہتے۔"

"کیا کیا باتیں ہوئیں؟" میں یہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہو گیا۔

"وہ اپنے دوران تعلیم کی کچھ دلچسپ باتیں سناتے رہے۔"

نہ جانے کیوں میرا دل اُداس ہو گیا...... شاید میں یہ چاہتا تھا کہ انجم کو سوائے میرے اور کسی کی باتیں دلچسپ نہ لگیں۔

پھر کچھ ایسا ہوا کہ روز جب میں اسکول کی واپسی پر ان کے پاس جاتا تو وہ مجھے بتاتیں کہ ابھی جاوید صاحب یہاں سے گئے ہیں۔ .....اور یہ بھی کہ ان کی باتیں بہت دلچسپ ہوتی ہیں......انجم کا میرے ساتھ وہی سلوک تھا اسی طرح باتیں 'چوٹوں کا معالجہ' کپڑوں کی درستی' مگر نہ جانے کیوں مجھے لگتا کہ وہ مجھ سے دور ہوتی جا رہی ہیں......کوئی ہمارے درمیان حائل ہو گیا ہے! کون؟ بھائی جان! مگر ہم دونوں ایک دوسرے کے رقیب تو نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ باتیں اب سوچتا ہوں اس وقت تو ایک ہی خیال تھا کہ وہ مجھ سے نہ چھن جائے......اور بس!

اتوار کی صبح بھائی جان اور میں دونوں ایک ساتھ ان کے یہاں پہنچے باتوں باتوں میں گانے کا ذکر نکل آیا۔ میں نے کہا۔ "بھائی جان بہت اچھا گاتے ہیں۔" یہ بات سچ بھی تھی! انجم نے کہا کہ جاوید صاحب کو گانا سنانا پڑے گا۔ بھائی جان نے اوّل دو چار دفعہ معذرت کی' پھر تیار ہو گئے!

گانا شروع کیا۔ "کون سا گیت سنو گی انجم؟"

انجم نے کہا۔ "جو آپ سنائیں گے۔"

"کون سا گیت سنو گی انجم؟"

"کوئی سا بھی گائیے تو آخر!"

"گا تو رہا ہوں۔" بھائی جان نے جواب دیا۔

"واہ یہ کوئی گانا ہے؟"

"ارے اور کیا...... یہ تو جاں نثار اختر کی نظم ہے۔"

"ہم نہیں سنتے......کوئی ڈھنگ کی چیز سنائیے۔"

بھائی جان نے ایک غزل گائی جس کا ایک شعر مجھے آج تک یاد ہے ؎

شروعِ راہِ محبت ارے معاذ اللہ
یہ حال ہے کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

انجم ساکت بیٹھی سنتی رہیں! بعد میں تعریف کچھ اس طرح سے کی کہ بھائی جان کو بہت سی چیزیں گانی پڑیں۔

انجم کو بھائی جان کی آواز اتنی پسند آئی کہ اب وہ ہر ملاقات میں گانے کی فرمائش کرتیں۔ ان بہت سی ملاقاتوں میں سے جن میں شریک ہونے کا مجھے بہت کم موقعہ ملتا تھا۔

بھائی جان ہمیشہ اسی سے شروع کرتے:

"کون سا گیت سنو گی انجم؟
گنگناتا سا فسانہ کوئی
یا محبت کا ترانہ کوئی
کیسے بنتا ہے نشانہ کوئی
کون سا گیت سنو گی انجم؟"

اور آخر کار سب ہی طرح کے گیت سنا ڈالتے ...... میں کچھ کھویا کھویا سا رہنے لگا...... بھائی جان کو یہاں آئے ایک مہینہ گذر گیا..... پہلے دن ان کا خیال تھا کہ دس پندرہ دن بھی نہ رہ سکیں گے اور اب انہوں نے بیماری کے نام سے ایک مہینے کی چھٹی بڑھوالی۔ حالانکہ یہ بہت چھوٹا شہر تھا جس میں نہ اچھے ہوٹل اور نہ عمدہ کلب! مگر بھائی جان خوش تھے اور انجم بھی..... اگر میں رنجیدہ تھا تو اس کی وجہ سے خود بھی باخبر نہ تھا پھر اس کا تذکرہ کس سے کرتا ..... ہاں مگر دل پر ہر لمحہ ایک بوجھ سا رہتا اور روح جیسے تھک کر آنکھیں بند کرنا چاہتی ہو۔

وقت کی رفتار کو بس نہ روکنا چاہتا تھا اور پھر مشیت کو ان کھیلوں سے کیا ایسے نامکمل افسانوں کے خاکے بہت سے بکھرے پڑے رہتے ہیں. .... اگر آنسو کسی لمحہ بھی نہ رُکیں تو ان کا دل سے احترام ہی جاتا رہتا ہے۔

یونہی چپ چاپ وہ دوسرا مہینہ بھی بیت گیا۔

ابا جان نے کہا۔ "جاوید تم نوکری پر کب جا رہے ہو؟"

"سمجھ میں نہیں آتا ابا جان۔'

"کیوں؟ چھٹی کون سی تاریخ سے ختم ہوتی ہے؟'

"مجھے آج وہاں موجود ہونا چاہئے تھا۔"

"تو پھر تم کیوں نہیں گئے؟"

"سوچتا ہوں کہ اب خود جاؤں یا استعفا بھیج دوں۔"

"استعفا!" ابا جان نے چونک کر پوچھا۔ 'اب نوکری کا ارادہ نہیں ہے۔'

"یہ نوکری کچھ ٹھیک نہیں ہے ابا جان........ پھر ہمارا افسر بڑا سخت ہے۔ بس ذرا ذرا سی بات پر .. ...اور سب سے بڑی مشکل یہ کہ وہاں مجھے اچھا کھانا نہیں ملتا.. ..... آپ نے محسوس کیا کہ یہاں آکر میری صحت کتنی سنبھل گئی ہے۔ اب چاہتا ہوں کچھ دن یہاں رہ کر بے فکری کروں۔"

میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جہاں لے جا کر بھائی جان مجھے آدمی بنانا چاہتے تھے وہ جگہ ان کی نظر میں اب کیوں بے رنگ و بو ہو گئی ہے۔ جہاں اچھے اچھے ہوٹل ہیں وہاں کھانا بُرا کیوں ملتا ہے۔ جہاں اچھی انگلش فلمیں چلتی ہیں وہاں کیوں دل نہیں لگتا اور جس افسر کی وہ ہمیشہ تعریف لکھا کرتے تھے وہ اب بُرا کیوں ہو گیا ہے. .... میں یہ سب جانتا تھا اور مجھے بھائی جان سے ہمدردی بھی تھی... ..وہ میرے رقیب تو نہیں۔ انہوں نے انجم کو میری طرف سے تو نہیں بدل ڈالا..... اور پھر وہ کیا جانیں کہ میں اداس رہتا ہوں!

میرے دل میں شدید آرزو پیدا ہوتی کہ کاش انجم کی بھائی جان کے ساتھ شادی ہو جائے! میں انہیں خود کوئی گیت نہ سنا سکا مگر زندگی بھر گیت سنتے تو دیکھتا رہوں گا......... اور کیا یہ میرے لئے بہت نہیں!

بھائی جان نے نوکری چھوڑ دی........ انجم سنتی رہتیں میں دیکھتا رہتا اور وہ گاتے رہتے۔

کوئی فطرت کا بہاریں نغمہ؟ چاند تاروں کا خماریں نغمہ؟

یا شگوفوں کا نگاریں نغمہ؟ کون سا گیت سنو گی انجم؟

نغموں کا ایک تانا بانا سا بن کر کہ ہمارے چاروں طرف پھیل گیا۔ ایک طرف بھائی جان تھے مختار...... ...دوسری طرف میں تھا مجبور! بیچ میں انجم! ہمیشہ کی طرح مسکراتی ہوئی! ایک کے حال سے غافل اور دوسرے کی باتوں سے باخبر! میں دن رات اس الجھن میں اپنے لئے سکون کی تلاش کرتا رہتا...... مگر میں چاہتا کیا تھا یہ مجھے آج بھی معلوم نہیں ہے۔

ایک صبح جب ابا جان کسی ضروری کام سے ہفتہ بھر کے لئے باہر جا رہے تھے تو چچا جان کی علالت کا تار موصول ہوا...... ابا جان کو

انتہائی ضروری کام تھا۔ انہوں نے بھائی جان سے کہا کہ تم آج ہی شام کو اپنے چچا کے پاس لکھنو چلے جاؤ اور ہفتہ بھر بعد جب میں وہاں پہنچوں تو تم واپس چلے آنا۔ بھائی جان اس خبر سے مضطرب ہو گئے مگر لاچار تھے۔ اسی شام کو جانا تھا۔ انجم سے ملنے گئے تو میں ہی گھر پر رہ گیا۔ میرا دل ہی نہ چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ جاؤں! واپس لوٹے تو کتنے افسردہ تھے۔ مجھے رحم آنے لگا...... بھائی جان کو اسٹیشن پہنچا کر میں نے سوچا کہ انجم کے پاس چلتا ہوں ان سے کہوں گا کہ بھائی جان ایک ہفتہ بعد ضرور آجائیں گے۔

ان کے یہاں پہنچا وہ اپنے پلنگ پر آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹی تھیں۔ میری ہمت نہ ہوئی کہ ان کو آواز دوں! چپ چاپ لوٹ آیا۔

پھر دوسرے دن صبح کو باغ میں گیا۔ نومبر کی شروع تاریخیں تھیں اور صبح کے وقت خاصی ٹھنڈ ہوتی تھی مگر میں صبح کو باغ ضرور جاتا تھا اور وہ مجھے وہاں ضرور ملتی تھیں۔ سوچ رہا تھا کہ آج خدا جانے وہ موجود ہوں گی یا نہیں مگر پہلی نظر میں ان کو حوض کے کنارے بیٹھا ہوا دیکھ لیا! حال چال پوچھنے کے بعد انہوں نے پہلا سوال کیا۔

"جاوید ایک ہفتہ بعد ضرور واپس آجائیں گے؟"

"ہاں ضرور!"

"اچھا...... پھولوں کو ہاتھ نہ لگانا! سمجھے؟"

"سمجھ گیا۔"

انہوں نے پھول توڑے اور جب ایک گلاب کا پھول میرے کوٹ میں اٹکا کر واپس چلی گئیں تو میں نے سنگِ مرمر کے چبوترہ پر بیٹھ کر محسوس کیا آج بہت دن بعد میری بے چین روح کو کسی نے لوریاں دے کر آرام کی نیند سُلا دیا ہے .... اور میں بہت خوش ہوں!

ایک ہفتہ گذر گیا۔

"آج تمہارے بھائی جان کے آنے کا دن ہے؟"

"جی ہاں آج آجائیں گے!"

"تم اسٹیشن جاؤ گے؟"

"ضرور جاؤں گا۔"

"پھر ان کے ساتھ یہاں آؤ گے؟"

"ضرور آؤں گا۔"

میں شام کو گیا ضرور مگر بھائی جان کے ساتھ نہیں بلکہ تنہا! انجم کو یہ بتانے کہ چچا کی طبیعت بدستور خراب ہے بھائی جان ایک ہفتہ بعد آئیں گے ——— اور ایک ہفتہ!

یہ دوسرا ہفتہ ان کے چہرہ پر اُداسی کا رنگ مل مل کر گذر گیا مگر بھائی جان پھر بھی نہیں آئے .... چچا کی طبیعت ابھی تک خراب تھی۔

آخرکار اباجان اماں کو لے کر وہاں چلے گئے اور میں یہاں تنہا رہ گیا۔ زیادہ وقت اسکول کے علاوہ انجم کے پاس گزرتا وہ باتیں کرتے کرتے چپ ہو جاتیں اور ہنستے ہنستے آنکھوں میں آنسو امڈ آتے........ میرا دل ڈوب جاتا...... میں اس آتش بداماں جنت سے بھی باز آیا..... ..... بھائی جان لوٹ آئیں تو پھر بلا سے انجم کی یہ اداسی ساری کی ساری زندگی کے لئے مجھ پر مسلط ہو جائے! مگر ان کے آنسو! جیسے یہ میرا گناہ ہو ——— دو ڈھائی مہینے ایسے عجیب گزرے..... رُکے رُکے اور پھیکے پھیکے...... اباجان لوٹ آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ چچا جان اچھی طرح سے ہیں اور اب میں جاؤں گا تو تمہاری ماں کو لے آؤں گا جاوید بھی تب آئیں گے۔

میں نے انجم کو جا کر بتایا۔

"آ جائیں تب کی بات ہے۔" انجم نے کہا۔

اور میں نے سوچا کہ آخر کیوں نہیں آئیں گے .... ضرور آئیں گے۔

ابا جان دوبارہ گئے۔ واپسی کا جو دن بتا گئے تھے اس کا میں نے لمحہ لمحہ گن کر انتظار کیا۔ "آج بھائی جان ضرور آ جائیں گے۔"

"دیکھو!"

"مذاق نہیں ڈٹ کر ناشتہ کھلانا پڑے گا آپ کو۔"

"اچھا!"

اسٹیشن پہنچا۔ گاڑی لیٹ تھی اور مجھے جھونجھل آ رہی تھی خدا خدا کر کے ریل آئی تو ابا جان تنہا اُترے۔ میں گھٹ کر رہ گیا۔

"بھائی جان اور اماں کہاں ہیں؟"

"وہیں ہیں!" ابا جان نے جواب دیا۔

"کیوں نہیں آئے؟"

"بس ہفتہ بھر بعد آنے والے ہیں....... جاوید تو انگلینڈ جا رہا ہے۔"

"ایں!" مجھے ابا جان کی بات کا اعتبار نہ آیا۔

"مذاق نہیں.. ... سارا انتظام ہو چکا ہفتہ بھر بعد تو یہاں آئے گا اور دو دن ٹھہر کر اپنا سامان لے کر چلا جائے گا۔"

"یہ کیا سوجھا؟"

"اس کو تو ایسی ہی نئی نئی سوجھتی ہے پہلے کہا نوکری کروں گا میں نے کہا تمہاری مرضی پھر استعفاد ے دیا۔ میں نے اس پر اعتراض نہ کیا۔ اب بیٹھے بٹھائے تعلیم کا شوق ہوا تو ولایت چل دئے! مجھ کو تو اب خبر ہوئی جب ان کا پاسپورٹ تک بن چکا ہے۔"

"آپ نے روکا نہیں؟" میں نے ابا جان سے پوچھا۔

"میں کیا روکتا وہ اس قدر خود مختار ہیں ان کو چاہئے تھا کہ اوّل مجھ سے اجازت لیتے۔ ماں رو رو کر جان کا خون کر رہی تھی مگر صاحب زادے نے قسم کھائی ہے کہ ولایت جا کر پڑھوں گا۔"

میں سکتہ کے عالم میں گھر لوٹ آیا۔ انجم کے پاس جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ یہ ولایت کا قصہ اگر وہ سنیں گی تو کیا کہیں گی..... اُف توبہ!

میں نے کوشش بھی کی تو وہاں نہ جا سکا...... صبح کو باغ میں گیا۔

"جاوید نہ آئے تو آپ بھی چھپ گئے!"

"ابا جان نے کچھ کام بتا دیا تھا۔"

"تمہارے بھائی جان تو خیر اب کیا آئیں گے مگر خالہ جان کیوں نہیں آئیں؟"

"جناب شرط ہے اگر اگلے ہفتہ سب نہ آ جائیں۔"

"بس جاؤ بھی۔" انجم نے ہونٹوں کو دانت سے کاٹتے ہوئے بھیگی بھیگی پلکیں میری طرف اٹھائیں...... میں سر سے پیر تک لرز گیا۔

اور لاکھ کوشش کی مگر بھائی جان کے ولایت جانے کی بات نہ سنا سکا۔ جس دن پھر ان کے آنے کی خبر تھی اس دن مجھ کو علم تھا کہ وہ ضرور آ جائیں گے۔ مگر اس یقین میں کتنا دُکھ اور غم تھا یہ میں جانتا ہوں۔ وہ آئیں گے اور تیسرے دن چلے جائیں گے...... ایسی جگہ جہاں سے واپسی کے لئے ہفتے نہیں گنے جاتے بلکہ برسوں کا شمار ہوتا ہے۔

بھائی جان ریل سے اترے۔

"آپ ولایت جارہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں!"

"کیوں؟"

"پڑھنے!"

"کیا پڑھنے؟"

"بس کچھ.. .... محض ایک ولایتی ڈگری چاہئے!" اور وہ ہنسنے لگے۔ گھر آ کر انہوں نے سامان باندھنا شروع کر دیا۔ مجھ سے انجم کے متعلق ایک بھی سوال نہ کیا اور نہ وہاں گئے۔ میں بھی دم بخود بیٹھا رہا۔

اماں بہت دن کے بعد آئی تھیں اس لئے انجم کی والدہ ان سے ملنے کو آئیں۔ اماں نے انہیں بتادیا کہ جاوید پرسوں ولایت جا رہا ہے۔ میں بوکھلا گیا کہ اب یہ انجم سے جا کر کہہ دیں گی اور پھر نہ جانے کیا ہوگا! مجھے رہ رہ کر بھائی جان پر غصہ آ رہا تھا۔ اس طرح بنتے تھے کہ جیسے ان کو انجم سے بہت محبت ہے اور اب بلا وجہ ولایت جا رہے ہیں تو ان سے ملے تک نہیں .... ان کی زندگی برباد کرنے کے یہ ذمہ دار ہیں۔ ان کا کیا بگڑا؟! انجم بجھ کر رہ جائے گی اور میری زندگی پھیکی اور بے رس! کیا مجھے انجم سے محبت نہیں؟ اور میں ان کا دکھ خوشی سے برداشت کر سکوں گا؟! اس گہرے سوچ نے دوسرے دن شام تک میرا پیچھا نہ چھوڑا اور میں ڈر کے مارے انجم کے پاس بھی تو نہ جا سکا۔ نہ جانے ان کی کیا حالت ہوگی۔ بھائی جان کے سامان کی مکمل فہرست بنا کر میں کمرے میں گیا جہاں وہ ادھر ادھر کی چھوٹی موٹی چیزیں ہینڈ بیگ میں بند کر رہے تھے! ______ دروازے پر پہنچا تو مجھے سسکیوں کی آواز سنائی دی اور پھر کچھ الجھے ہوئے سے الفاظ! انجم وہاں موجود تھیں! میرے قدم رک گئے ______ کچھ دیر بعد بھائی جان کی آواز آئی

"زندگی صرف محبت تو نہیں ہے انجم"

بھائی جان کو اب بھی جاں نثار اختر کی کوئی نظم یاد آ گئی تھی۔ مگر انجم اس کا مطلب نہیں سمجھ سکیں۔

"تو پھر زندگی کیا ہے؟"

میں بھائی جان کا جواب سننے سے پہلے وہاں سے لوٹ آیا۔ انجم کے آنسو بہتی آگ کی طرح میری رگوں میں گھل کر مجھے جھلسے دے رہے تھے۔

دوسرے دن صبح کو بھائی جان نے مجھ سے کہا اسٹیشن جا کر گاڑی کا صحیح وقت معلوم کر آؤ۔ میں نے بمبئی جانے والی گاڑی کا وقت معلوم کیا جو رات کو ساڑھے دس بجے یہاں سے جاتی تھی اور پھر گھر کی طرف لوٹا تو انجم مجھے اپنے باغ کے پھاٹک پر مل گئی۔

"پرویز میرا ایک کام کرو گے؟"

"کہئے۔" میں نے ان کی متورم آنکھوں اور تمتماتے ہوئے چہرہ کو دیکھ کر بے بسی کے ساتھ کہا۔

"جاوید آج جا رہے ہیں؟"

"ہاں!

"کے بجے؟"

"رات کو ساڑھے دس بجے!"

"اچھا...... تو اس سے کہنا کہ جانے سے پہلے میں ان سے ایک مرتبہ ملنا چاہتی ہوں۔"

"بہت اچھا۔"

"اور دیکھو کہنا کہ سات بجے شام کے بعد سے میں ان کا یہاں باغ میں انتظار کروں گی وہ مجھ سے کھڑے کھڑے مل لیں۔"

"مگر انجم یہاں باغ میں تو رات کو شدید سردی ہوتی ہے۔"

"کوئی حرج نہیں میں ان کو زیادہ دیر نہیں روکوں گی۔"

"لیکن آپ خود؟"

"میری پروانہ کرو۔ . . . تو پرویز تم ان سے کہہ دو گے نا؟"

"ہاں ہاں ضرور!"

میں دیر تک کھڑا ہوا ان کو ڈگمگاتے قدموں سے واپس جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ گھر آکر بھائی جان کو ان کا پیغام سنا دیا۔ وہ سُن کر چپ ہو گئے اور پھر مہمانوں کا تانتا لگ گیا۔ ابا جان کے دوست اور اماں کی سہیلیاں سب جمع ہونے لگیں۔ کوئی امام ضامن لے کر آیا تھا اور کوئی صدقہ اتارتا تھا۔

شام گزری اور رات ہو گئی۔ "بھائی جان آپ انجم سے مل لیجئے۔"

"وہ خود یہاں کیوں نہیں آئیں؟"

"باغ میں آپ کا انتظار کر رہی ہیں نا!"

"میں کس طرح جاؤں یہاں اتنے لوگ جمع ہیں؟"

"دس پندرہ منٹ کو ہو آتے اب آٹھ بج گئے اور وہ سات بجے سے وہاں آپ کی منتظر ہوں گی۔"

"اچھا دیکھو موقع نکالتا ہوں۔"

نو بج گئے۔

"بھائی جان اب نو بج چکے...... آپ گھنٹہ سوا گھنٹہ میں چلے جائیں گے۔"

"ہاں!"

"انجم سے مل لیجئے نا۔"

"دیکھو اماں کس قدر رو رہی ہیں۔ یہاں سے اٹھ کر گیا تو وہ کیا سوچیں گی؟"

"بس پانچ منٹ کے لئے۔"

"کوشش کرتا ہوں۔"

"بھائی جان دس بج گئے۔"

"کیا کروں پرویز سمجھ میں نہیں آتا۔"

"ایک لمحے کو ہو آیئے۔"

سوا دس ہوئے تو ابا جان نے کہا۔ "بیٹا جاوید اب تمہاری روانگی کا وقت ہو گیا۔"

"چلتا ہوں ابا جان!"

میں نے مضطرب ہو کر بھائی جان سے کہا۔ "بھائی جان انجم!"

"مجبور ہوں پرویز۔"

اور جب موٹروں میں بیٹھ کر سب اسٹیشن چلنے لگے تو میرے کانوں میں سے آپ سے آپ انجم کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ کاش بھائی جان ان سے لمحہ بھر کو ہی جا کر مل لیتے وہ اس شدت کی سردی میں دھڑکتے دل سے منتظر ہوں گی۔ اسٹیشن پہنچے تو اماں کی روتے

روتے بُری حالت ہو رہی تھی۔ بھائی جان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ "خط لکھتے رہنا پرویز۔"

جب ریل نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو میں نے آنسو پونچھ کر اماں سے کہا "آیا جان تو بھائی جان کو چھوڑنے بھی نہیں گئے تھے میں اور اماں لوٹ کر آئے اماں کے آنسو کسی طرح نہ تھمتے تھے ورنہ میں اسی وقت جا کر انجم سے ملتا میرے سینے میں آنسوؤں کا طوفان اُبل رہا تھا اور میری خواہش تھی کہ یہ سارے آنسو میں انہی کے سامنے جا کر بہاؤں...... ممکن ہے کہ ہم دونوں کو تسکین ہو جائے! رات بھر بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور سینے میں نامعلوم چبھن ہوتی رہی۔

صبح کو چھ بجے کے قریب میں بستر سے اٹھ کر آمدے میں نکل آیا۔ فروری کا شروع تھا اور گذشتہ رات غیر معمولی سردی رہ چکی تھی۔ کہر کے اثر سے آس پاس کچھ نظر نہ آتا تھا۔ خلا میں نظر جمائے خاموش کھڑا رہا۔ جب سے سردیاں شدت کی ہوئیں تو انجم نے صبح سویرے کے بجائے دن چڑھے باغ میں نکلنا شروع کر دیا تھا۔ میرے اسکول کے اوقات بھی بدل گئے تھے اس لئے میں بھی دیر سے جایا کرتا تھا۔ آج ایک عجیب سی خواہش پیدا ہوئی کہ اس کمرے اور ٹھنڈ میں نکل جاؤں اور باغ کا چکر کاٹوں اوور کوٹ پہن کر میں باغ میں چلا گیا جہاں اوس سے ہر چیز تر تھی اور ٹھٹھری ہوئی نظر آتی تھی۔ .. چکر لگا کر سنگِ مرمر کے چبوترے تک پہنچا اور دفعتہً ٹھٹک کر رہ گیا ...... کوئی لیٹا ہوا تھا! شاید انجم!

میں دوڑ کر قریب گیا........ وہی تو تھیں!

"انجم........ انجم!" وہ شاید سو رہی تھیں..... وہ اتنے سویرے بغیر کسی گرم کپڑے کے یہاں آ گئی ہیں اور اس برف جیسے سنگِ مرمر پر لیٹی ہیں.. ...... میں نے حیران ہو کر ان کا ہاتھ کھینچا۔ "انجم!"

مگر وہ بے حس و حرکت تھیں۔ کپڑے اوس کے اثر سے بالکل بھیگے ہوئے تھے ہاتھ برف سے زیادہ ٹھنڈے اور چہرہ سنگِ مرمر سے زیادہ سفید۔ کیا انہوں نے ساری رات یہاں گزاری ہے! اور یہ حالت!

بجلی کی طرح ایک وحشت ناک خیال میرے دماغ میں پیدا ہوا اور میں نے ان کو پاگلوں کی طرح جھنجھوڑ دیا۔ "انجم! انجم!"

انہوں نے آنکھیں کھول دیں چونک کر نہیں بلکہ سہم کر!

"پرویز!"

"یہ آپ کیا کر رہی تھیں؟" میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں۔" انہوں نے گرد و پیش پر اپنی ویران نگاہیں دوڑا کر کہا۔

"کب سے یہاں لیٹی ہیں؟"

"کب سے؟ دس بجے تک تو مجھے یاد ہے کہ میں بیٹھی ہوئی تھی۔"

"تو آپ رات بھر یہاں رہی ہیں؟"

"ہاں!"

"اس شدید ٹھنڈ میں؟"

"نہیں زیادہ ٹھنڈ تو نہ تھی۔"

"واہ رات کو قیامت کی سردی تھی جب ہم اسٹیشن سے لوٹ رہے تھے تو دانت سے دانت بج رہا تھا۔"

"تمہارے بھائی جان گئے؟"

میں اس کا جواب نہ دے سکا۔

"تم نے میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟"

میں اب بھی خاموش رہا۔

"اچھا یہ تو بتاؤ انہوں نے میرے لئے کوئی بات بھی نہیں کہلوائی؟"

میں نے بیتاب ہو کر ان سے کہا۔ "انجم میں آپ سے یہاں بات نہ کروں گا۔ خدا کے لئے اندر چلئے آپ کو احساس نہیں آپ کا کیا حال ہے؟"

"چلو!" وہ چلنے لگیں مگر لڑکھڑا کر گئیں۔

"ٹھہریئے۔" میں نے ان کے بازو کو سہارا دیا ان کے چہرے پر شبنم کی بوندیں چمک رہی تھیں اور کپڑے تو اس قدر تر تھے کہ نچوڑے جا سکتے تھے۔ میں نے ان کو پکڑ کر ان کے کمرے تک پہنچا دیا اور واپس آتے ہوئے کہا کہ "میں اسکول سے واپسی پر آپ کے پاس آؤں گا۔ آپ جا کر آگ کے پاس بیٹھئے۔ خدا نہ کرے اگر سردی لگ گئی تو غضب ہو جائے گا۔

اسکول گیا مگر مطلق کام نہ ہو سکا۔ ایسا اضمحلال تھا کہ جس کو بیان ہی نہیں کر سکتا......واپس لوٹا تو سیدھا ان کے یہاں گیا اور برآمدے میں ہی حیران کھڑا رہ گیا۔ کمرے سے ڈاکٹر نکل رہا تھا وکیل صاحب انتہائی پریشانی کے عالم میں ساتھ تھے۔

"کیا بات ہے؟" میں نے مضطرب ہو کر وکیل صاحب سے پوچھا۔

"انجم کی طبیعت خراب ہے!"

میں سمجھ گیا کہ یہ رات کی سردی کا نتیجہ ہے کمرے میں جا کر دیکھا تو بخار کی تیزی سے بیہوش تھیں اور گہرے گہرے سانس لے رہی تھیں! مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے گھر آکر اماں کو بتایا اور بستر پر گر پڑا۔

"خدایا اب کیا ہوگا؟"

پھر تھوڑی دیر بعد گیا وہی کیفیت تھی دیکھتا رہا اور پھر لوٹ آیا۔ صبح کو اسکول سے پہلے گیا پتہ چلا رات بھر طبیعت سخت خراب رہی ہے اور اب بھی بیہوش ہیں......

اسکول جانے کی ہمت نہ تھی مگر کہیں سکون بھی نہ ملتا تھا لاچار چلا گیا اور پورے وقت کلاس میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ شام کو دھڑکتے دل سے جا کر دیکھا.....سارے گھر میں مُردنی چھا رہی تھی۔ برآمدے میں ڈاکٹر اور وکیل صاحب باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا "نمونیہ ہو گیا ہے۔ دونوں پھیپھڑوں پر اثر ہے.......پوری احتیاط کیجئے آگے خدا مالک ہے۔"

میں وہیں سے بھاگ آیا اور باغ میں ایک تنے سے کمر لگا کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اور دل کو کوئی دونوں ہاتھوں سے مسل رہا تھا۔

"اللہ کرے انجم اچھی ہو جائیں اور ان کے بدلے مجھے موت آجائے۔"

رات کو گیارہ بجے تک پلنگ کے پاس کھڑا رہا۔ ان کی طبیعت بدستور خراب تھی اور بیہوش تھیں........ میں نے واپس آکر ساری رات کرسی پر بیٹھے گذار دی......اور تڑپ تڑپ کر دو اور دن!

ڈاکٹروں نے انجکشن دے دے کر ان کے دونوں بازو چھلنی کر دیئے تھے مگر ان کو احساس نہ تھا۔

بیماری کے چار جان لیوا دن گزرنے کے بعد پانچویں دن صبح کو پتہ چلا کہ ان کی طبیعت بہتر ہے اور ہوش میں ہیں! میری خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا اماں اکثر وہیں رہتی تھیں۔ اس وقت بھی موجود تھیں میں نے کمرے میں جا کر دیکھا تو انجم آنکھیں کھولے ہوئے لیٹی

تھیں۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے سلام کیا اور جواب میں ایک مدھم سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

وکیل صاحب کی بیوی بھی مطمئن تھیں انہوں نے اماں سے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں۔

"جاوید میاں کب لوٹیں گے؟"

اماں نے کہا۔ "دو سال کی کہہ گیا ہے۔"

"بہن تم نے ناحق جانے دیا ماشاءاللہ اچھے خاصے پڑھے لکھے تو ہیں۔"

"آج کے زمانہ میں اماں باوا کی کون سنتا ہے جو جی میں آئے کرتے ہیں۔ میں نے تو بہتیرا روکا مگر وہ باز نہ آیا۔"

"پھر بھی آخر گئے کیوں ہیں؟"

"کیا بتاؤں بہن آج کل لڑکیوں میں شرم کا تو نام نہیں۔ دیدہ کا پانی ڈھل گیا ہے۔ جاوید چچا کی بیماری میں گئے تھے ان کی لڑکی بہت فیشن ایبل ہے۔ بی۔ اے پاس ہے! وہ کہنے لگی کہ میں تو اس سے شادی کروں گی جس کے پاس ولایت کی ڈگری ہوگی! بس جاوید کو چڑ ہوگئی کہ ولایت جاؤں گا..... پھر کس کے کہنے سے رکتا؟"

"تو چچا کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

"اور کیا یہی بات ہے۔"

وکیل صاحب کی بیوی اور اماں میں گفتگو ہو رہی تھی اور میرا دم رکا جا رہا تھا۔ مجھے خود بھی علم نہ تھا کہ بھائی جان کس وجہ سے دفعتہ ولایت جانے کو تیار ہو گئے ہیں! اب پتہ چلا کہ چچا کی لڑکی نے یہ فرمائش کی تھی! کاش اماں نے یہ سب انجم کے سامنے نہ کہا ہوتا میں نے انجم کی طرف دیکھا تو انہوں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

وکیل صاحب نے آکر کہا ڈاکٹر نے مریض کے کمرے میں زیادہ بیٹھنے کو منع کر دیا ہے۔ ہم واپس آگئے۔

اماں کی گفتگو نے مجھے عجب الجھن میں مبتلا کر دیا تھا۔ خدا خدا کر کے آج ان کی طبیعت سنبھلی تو یہ خبر سنی اب اللہ جانے اس کا کیا اثر لیں گی۔

شام کو گھر سے نکل ہی رہا تھا جوان کا نوکر بھاگتا ہوا آیا میں نے گھبرا کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"بیگم صاحبہ کو جلدی بھیجئے" انجم بی بی کی حالت بہت خراب ہو گئی ہے۔"

میں ان کی بات ختم ہونے سے پہلے بھاگا اور سیدھا ان کے کمرے میں گیا۔ ...یا اللہ کیا عجب عالم تھا۔ تین چار ڈاکٹر پلنگ کے پاس جمع تھے اور بار بار انجکشن دے رہے تھے! انجم بالکل غافل تھیں اور زور زور سے سانس آ رہا تھا۔ اتنی زور سے کہ باہر برآمدے میں بھی اس کی آواز صاف سنائی دے۔

وکیل صاحب نے روتے ہوئے کہا۔ "اب کیا ہوگا؟"

ڈاکٹر نے مایوس لہجے میں جواب دیا۔ "خدا بہتر جانتا ہے دعا کیجئے۔"

میں تیر کی طرح کمرے سے باہر نکلا اور بے خبری میں بھاگتا ہوا باغ میں پہنچ کر اسی سنگِ مرمر کے چبوترہ پر گر پڑا جس پر انجم نے ایک رات گزاری تھی۔ دماغ میں کوئی خیال نہ تھا دل کو صدمے کا احساس! میں پھوٹ پھوٹ کر روتا گیا۔ یہاں تک کہ سر چکرانے لگا' ہاتھ پیر ڈھیلے ہوتے ہوئے.. ...اور میں بیہوش ہو گیا۔

پھر ہوش آیا رات کا وقت تھا اندھیرا جس میں پھیکی چاندنی کا بس نہ چل رہا تھا.....وہاں اب کچھ باقی بھی ہو گا یا سب کچھ ختم ہو چکا۔ میرے قدم گھر کی طرف اٹھنے لگے جہاں گہری خاموشی طاری تھی.......یا اللہ اب کیا سنوں گا! میں نے ستون کا سہارا لیتے ہوئے سوچا .....برابر سے ایک نوکر گزرا میں نے بمشکل کہا۔ "انجم!"

اس نے کہا۔"اچھی ہیں!"

"اچھی ہیں!"میں پھر بھاگا اور کمرے کے پاس جا کر رک گیا انجم کی والدہ برآمدے میں بیٹھی تھیں۔

"انجم کیسی ہیں؟"

"خدا کا شکر ہے۔"

"میں جا کر دیکھ لوں؟"

"ڈاکٹر نے منع کر دیا ہے کہ بات چیت نہ کریں۔"

"میں بات نہ کروں گا۔"

"اچھا تو جا کر دیکھ لو۔"

میں آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا وہ آنکھیں کھولے ہوئے دروازے کی طرف رخ کئے لیٹی تھیں! مجھے دیکھ لیا۔

"کیا حال چال ہے؟"بے حد نحیف آواز آئی۔

میں بے قرار ہو کر پلنگ کے پاس دو زانو ہو گیا۔

"آپ اچھی ہیں تو میں بھی اچھا ہوں۔"

"آنکھیں سوج رہی ہیں! کیا روئے تھے؟"

میں نے بے قابو ہو کر ان کے ہاتھ کو تھام لیا اور کوشش کے باوجود آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکا۔ نظر اٹھا کر دیکھا تو ان کی آنکھوں میں بھی آنسو چمک رہے تھے۔

مسرت کے احساس نے مجھے بیخود کر دیا اور اپنے حواس سنبھالنے کو میں کھلی ہوئی کھڑکی کے باہر تکنے لگا جہاں آسمان پر تاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایک چمکتا ہوا بڑا سا تارا ٹوٹا اور اندھیرے میں ڈوب گیا۔ میں نے مڑ کر انجم کی طرف دیکھا تو وہ بھی آسمان کو تک رہی تھیں۔

"یہ تارے کیوں ٹوٹا کرتے ہیں؟"میں نے موضوع بدلنے کے خیال سے کہا۔

"جب کسی انسان کی موت آتی ہے تو آسمان سے ایک چمکتا ہوا تارا ٹوٹ کر تاریکیوں میں ڈوب جاتا ہے۔"

"میں نے کہا۔"واہ یہ آپ نے نرالی منطق نکالی۔"

"نہیں سچ کہہ رہی ہوں۔"

"اچھا خیر ہوگا۔"میں نے چاہا کہ کسی طرح بات کو ٹال دوں۔

"پرویز تم کو میرا نام تو معلوم ہے؟"

"جی ہاں کیوں نہیں۔"میں اس سوال پر حیران ہو گیا۔

"جانتے ہو انجم کسے کہتے ہیں؟"

میں بات کا مطلب سمجھ گیا۔"مجھے معلوم نہیں۔"

"تارے کو کہتے ہیں۔"

اس سے قبل کہ میں کچھ کہوں ان کی والدہ کمرے میں داخل ہوئیں۔

"پرویز تم نے وعدہ کیا تھا کہ بات نہیں کروں گا۔"

"معاف کیجئے...... چلتا ہوں۔" میں انجم کو خدا حافظ کہہ کر اطمینان اور خوشی کے سانس لیتے ہوئے گھر لوٹا۔ اب کی طبیعت بہتر ہے۔ خدا نے چاہا تو دو چار دن میں بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔

کئی دن کے بعد رات کو نیند آئی اور میں بے سدھ ہو کر سو گیا۔

صبح کو آنکھ کھلی کمرے سے باہر نکلا تو اماں موجود نہ تھیں۔ میں نے نوکر سے پوچھا۔

"اماں کہاں ہیں؟"

"وکیل صاحب کے یہاں!"

میرا جی دھک سے ہو گیا...... پھر سے طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو۔ ننگے پاؤں نکل کر دوڑا۔

بہت لوگ جمع تھے۔ میں دیوانوں کی طرح سب کے بیچ میں سے گزرتا ہوا اندر داخل ہوا۔ رونے کی آوازیں چاروں طرف سے سنائی دے رہی تھیں...... اور جب میں نے کمرے میں قدم رکھا تو میری نگاہیں انجم کے پلنگ سے ٹکرائیں۔ نہ وہ مسکراتی ہوئی آنکھیں تھیں۔ نہ ہلتے ہوئے لب..... صرف ایک سفید چادر... جس نے ان کا آخری پیغام مجھ تک پہنچا دیا... "تارہ ٹوٹ چکا تھا!"

سمندر اور تین کمرے

مدھو سودن

اپنے قریب اس کی موجودگی کے ایک شدید احساس کو لئے ہوئے وہ بینچ پر بیٹھی رہی۔ یہاں سے اٹھنا بے تکا معلوم ہوتا تھا اور یہاں بیٹھے رہنا بھی بے ہنگم سا معلوم ہو رہا تھا' بنچ پر اس اجنبی نوجوان کے پاس بیٹھے ہوئے اُس کے اعصاب میں ایک عجیب سی حرکت پھیل گئی تھی۔ جسے نیم اختیاری طور پر روکنے کی کوشش میں وہ سنجیدہ ہو گئی تھی۔ اپنی یہ سنجیدگی اُسے پسند نہ تھی لیکن وہ خاموش بیٹھی رہی۔۔

سمندر کے کنارے پڑے ہوئے ان بنچوں پر دُور دُور تک لوگ بیٹھے ہوئے نظر آتے تھے۔ لیکن وہ خود کو اس نوجوان کے ساتھ تنہا سا محسوس کر رہی تھی جو اس کے پاس آبیٹھا تھا۔ اس کے بھاری ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھے ہوئے تھے اور وہ ٹھہر ٹھہر کر ایک پریشان تفکر کے سے انداز میں انگلیوں سے اپنے گھٹنوں پر تھپکی دینے لگتا تھا اور اس کی طرف سے بظاہر بالکل لاپروا سا تھا' جیسے اسے سیما یعنی مسز ورمن کی موجودگی کا احساس نہیں ہے۔ سیما کو محسوس ہوا تھا کہ اس کا یہ اندازِ استغنا مصنوعی ہے اور اس سے اُسے ایک غیر شعوری تحقیر کا سا احساس ہو رہا تھا لیکن وہ بے توجہی سے سمندر کے افق کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں فاصلے پر خشکی کا ایک مختصر سا ٹکڑا سمندر میں گھستا چلا گیا تھا اور اس پر استادہ بلند واٹر ریزوئر کے عقب میں سورج غروب ہو چکا تھا۔ غروب آفتاب کی سُرخی کا سایہ سمندر اور آسمان کے سنگم پر ساکن ہو گیا تھا سمندر کی سطح کو چھوتا ہوا یہ سایہ سرمئی ہوتا گیا تھا اور تاریکی کا منبع سمندر کا نیلا پانی معلوم ہوتا تھا۔

سیما کی توجہ لہروں کی طرف منعطف ہو گئی تھی اور لہروں کے شور سے جو اس کے شعور سے فیڈ ہو گیا تھا وہ پھر سُن رہی تھی سمندر آج ساکن نہ تھا' ہوا تیز تھی۔ لہریں گررر۔ کا شور کرتی ہوئی کنارے کی طرف بھاگی آتی تھیں اور کنارے سے ٹکرا کر پھیل جاتی تھیں اور پھر واپس سمندر میں چلی جاتی تھیں لہروں کو دیکھتے ہوئے سیما ایک لمحہ کے لئے اس کی موجودگی سے غافل ہو گئی' وہ یہ چاہتی تھی اور وہ توجہ سے دیکھنے لگی کہ یہ لہریں کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔ لیکن اُسے معلوم نہ ہو سکا' سمندر کی حرکت تھوڑے سے فاصلے پر آکر لہر بن جاتی تھی اور وہ لہر اپنے آگے ایک اندھیرا سا سایہ لئے کنارے کی طرف دوڑی آتی تھی اور اس کے پیچھے دوسری لہر' اور اس سے پہلے کو پہلی لہر کنارے سے ٹکر کھا کر واپس جائے دوسری لہر اس سے آکر ٹکرا جاتی تھی۔ لہروں کے تصادم سے ایک شور ہوتا تھا جو بیک وقت پھیلا ہوا بھی ہوتا اور مجتمع بھی' اور مجموعی شور میں مل جاتا تھا جو ایک مسلسل صوتی حرکت معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس میں منہمک ہو گئی تھی کہ اچانک سیٹ پر نوجوان نے حرکت کی۔ وہ اپنی صورت نشست بدلنے کے لئے ایک ٹانگ کو دوسری ٹانگ پر رکھ رہا تھا' پھر ایک خفیف سی بے چینی سے اس نے اس ارادے کو ملتوی کر دیا اور پاؤں پھیلا کر بنچ کے سہارے پیچھے کو جھک گیا۔ سیما کے دل میں اُسے دیکھنے کا ایک مختصر سا تجسس پیدا ہوا اور اُس نے دیکھ لیا' اس کی پیشانی پر بے چینی کی مختصر شکنیں تھیں اور ___ اچانک اس نے چہرے کی ایک خفیف سی

جنبش سے سیما کو دیکھا اور سیما کی نگاہیں اس کے وجود سے پھسل گئیں۔ لیکن یہ خیال رہ گیا کہ نوجوان نے دیکھتا ہو تو دیکھ لیا ہے اور اس خیال سے اُسے اپنے احساس میں ایک عدم آسانی سی محسوس ہونے لگی۔ وہ اٹھنا چاہتی تھی۔ لیکن اٹھی نہیں جسم میں کچھ لہریں سی پیدا ہو رہی تھیں اور یہ لہریں اس کے جسم میں داخل ہو رہی تھیں' اُسے چھوڑ رہی تھیں۔

"میں آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کر رہا ہوں۔" اس نے اچانک کہا۔

"نہیں" سیما نے بغیر سوچے ہوئے جواب دیا' اور یکایک اُس کے جسم میں حرکت کرتی ہوئی لہریں رک گئیں اور اس نے ایک آسانی سی محسوس کی جیسے سیما کی اور اس کی شخصیت کے درمیان سے ایک اسرار سا تفریق ہو گیا ہے۔

"تعجب ہے" اس نے نیم طنزیہ سے لہجے میں کہا۔ 'لیکن آپ کو اگر کسی دوسرے آدمی کے ساتھ بیٹھنا پسند نہ ہو تو میں یہ بینچ چھوڑ دونگا۔"

"نہیں آپ بیٹھے رہیں۔" سیما نے پھر ایک عدم آسانی سی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال تھا اس سمندر کے کنارے ایسی کوئی عورت نہ ہو گی جو کسی دوسرے آدمی کے ساتھ بیٹھنا پسند کرے۔"

سیما نے اس کی طرف دیکھا" یہ بات اُسے پسند نہ آئی لیکن اسے ایک مخصوص سے تعجب نے مس کیا۔

دہلی میں میرا خیال تھا کہ صرف یہیں کے لوگوں میں ملنساری کی اتنی کمی ہے اور شاید بمبئی میں ایسا نہیں ہوگا' لیکن یہاں ہر شخص کی اپنی الگ زندگی ہے اور وہ اس میں کسی کو شریک کرنا نہیں چاہتا۔"

"آپ دہلی سے آئے ہیں؟" سیما نے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے پوچھا' اور اسے اپنا یہ استفسار عجیب معلوم ہوا۔

"ہاں' اُس نے جواب دیا" اور یہاں معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک دور دراز جزیرہ ہے' جہاں ساتھ دینے کو کوئی نہیں اور انسان بازاروں میں بیوقوفوں کی طرح چلتا ہے اور دکانیں بالکل اجنبی معلوم ہوتی ہیں اور سڑکیں پرائی اور وہ زبان سنائی نہیں دیتی اپنی جسے سننے کی عادت ہے۔"

وہ خاموش ہو گیا اور سیما کو تعجب ہوا کہ یہ شخص کچھ زیادہ بے تکلفی سے بات کر رہا ہے۔ یہ بے تکلفی اس نے اپنے لئے محسوس نہ کی اس کی گفتگو کا انداز کچھ ایسا تھا گویا وہ سیما سے زیادہ خود کو مخاطب کر رہا ہو' یا کسی کو بھی نہیں' یا سب کو' بغیر اس بات کی پرواکئے کہ اس کا ردّ عمل کیا ہوگا۔ وہ سفید قمیض اور سفید پتلون پہنے ہوئے تھا اور اس کے سر کے ہلکے بال ماتھے پر سے پیچھے چلے گئے تھے' ماتھے پر خفیف سی شکنیں تھیں اور ان سے سیما کو ایک پُراسرار سی دلچسپی ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی گفتگو میں ایک صداقت سی ہے اور وہ اس کے جذبات کے متعلق متجسس ہو گئی۔ وہ خاموش ہو گیا تھا' اور پھر اچانک اس نے کہا۔ میرا خیال ہے آپ بمبئی کی رہنے والی نہیں؟"

"نہیں" سیما نے جواب دیا۔ "لیکن مجھے بمبئی میں تین سال ہو گئے ہیں۔"

"اوہ' تین سال تو بہت ہوتے ہیں" وہ رک گیا' پھر بولا__ یہاں میرا اُن لوگوں سے گفتگو کرنے کو جی چاہتا ہے جو بمبئی کے نہیں ہیں' یا جو مجھے بمبئی کے معلوم نہیں ہوتے۔ آپ کو میری گفتگو ناگوار تو نہیں؟"

سیما شاید کہنے لگی تھی کہ نہیں' لیکن اس نے جواب کا انتظار نہیں کیا

بمبئی میں آکر میں نے صرف تین آدمیوں سے بات کی ہے اور ان لوگوں سے اکتا گیا ہوں انہیں چھوڑ نہیں سکتا اور ان سے نفرت کرنے لگا ہوں۔"

"آپ یہاں اکیلے ہیں؟"

ہاں__" اور پھر ایک مسکراہٹ میں جو مسکراہٹ سے زیادہ کچھ اور تھی' وہ کہنے لگا__ تین مہینے کی تنہائی کے بعد اب کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ پاس سے گزرتے ہوئے یا قریب بیٹھے ہوئے کسی آدمی کو مخاطب کروں لیکن میں ایسا کر نہیں سکتا............ یہ بات

کہ انسان تنہائی سے اتنا پریشان ہو جاتا ہے کہ راہ چلتے آدمیوں سے تعارف پیدا کرنا چاہتا ہے؟ شاید آپ اسے صحیح نہ سمجھتی ہوں ملیکن یہ صحیح ہے اور کبھی کبھی تعجب ہوتا ہے اور غصہ آتا ہے کہ میں اتنے آدمیوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی اپنے کو اکیلا محسوس کرتا ہوں۔"

سیما سمجھ نہ سکی کہ کیا جواب دے اور وہ خاموش رہی۔ اِس شخص کی گفتگو اس پر ایک مثبت اثر کر رہی تھی' لیکن اُسے اپنی زبان کے آگے ایک رکاوٹ سی محسوس ہوتی تھی' درمیان میں ایک جھجک سی حائل تھی' دل کے اندر اُسے محسوس ہوتا تھا کہ کچھ کہے لیکن جو کچھ کہنا تھا وہ باہر نہ آتا تھا اور وہ خاموش بیٹھی رہی۔ سمندری افق پر سُرخی غائب ہو چکی تھی اور سُرخی کے سائے پر ایک بڑا ستارہ چمک رہا تھا اور روشنی کی ایک طویل لکیر سمندر کی سطح پر پڑ رہی تھی جو سرمئی ہو گئی تھی۔ پانی کی نیلاہٹ میں اندھیرا گھل گیا تھا۔ ہوا میں ایک عجیب سی سمندری بو پھیل گئی تھی اور وہ یہ جان نہ سکی کہ یہ بو سمندر کی سیپیوں کی ہے یا ریت کی' یا پانی کی یہ بو عجیب تھی' اس میں سمندر کی دلکشی اور ایک شامی برگشتگی دونوں پائی جاتی تھیں' وہ اس کے متعلق ایک مخصوص احساس کی عادی تھی۔ ہوا ہلکی پڑ گئی تھی اور اس کے سر پر ناریل کے درختوں کا جوش سرد ہو گیا تھا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ ساحل پر ٹہلتے ہوئے لوگ واپس جا رہے تھے' واپس چلے گئے تھے۔ قریب کے بینچ خالی پڑے تھے۔ سیما نے پھر خود کو نوجوان کے ساتھ اکیلا محسوس کیا اور عادتی طور پر اسے خیال آیا کہ اب چلنا چاہئے۔ وہ چلنے کو تیار ہو گئی۔ نوجوان اپنی انگلیوں کو ایک مبہوم سی بے چینی میں مسل رہا تھا اور سیما نے اُٹھنے میں ایک تردد سا محسوس کیا۔ وہ ایک کشمکش میں پڑ گئی کہ اُٹھنے سے پہلے اس سے کچھ کہے یا نہیں کہے تو کیا کہے یہ سمجھ میں نہ آتا تھا اور پھر وہ تھوڑی دیر بیٹھی رہی۔ اندرونی طور پر وہ کچھ کہنے کے لئے محسوس کر رہی تھی لیکن سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے اور سیما انتظار کرتی رہی کہ وہ خود ہی کچھ کہے۔ لیکن اُس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کی آنکھیں سمندر کی سطح پر روشنی کی لکیر کو دیکھ رہی تھیں۔ سمندر کا کنارا سنسان ہو گیا تھا۔ سیما اُٹھ کھڑی ہوئی۔ نوجوان نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا جیسے اُسے بُرا لگا ہو کہ وہ جا رہی ہے وہ چلی گئی۔ اس کی نگاہ میں تعجب اور ناگواری کے اس جذبے سے سیما کو محسوس ہوا کہ اس نے اس کی توہین کی ہے اور آگے جا کر جب اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ اب بھی اُسے دیکھ رہا تھا۔ پھر یکبارگی ہی دونوں نے منہ پھیر لیا۔ وہ ساحل پر خالی بنچوں کو دیکھنے لگا اور وہ آگے چلی گئی۔

ماہم سے دادر جاتی ہوئی بس میں بیٹھی ہوئی وہ سوچتی رہی۔ سیما کو معلوم ہو رہا تھا کہ اُس نے اجنبی کی ہتک کی ہے' نہایت عجیب ڈھنگ سے وہ خود کو قصوروار سمجھ رہی تھی.......یاد کر رہی تھی کہ جب پیچھے مڑ کر اُس نے دیکھا تھا تو جیسے اُس نے برا مان کر منہ پھیر لیا تھا' بُرا مان کر اور حقیقت میں وہ یہ نہیں چاہتی تھی۔ سیما کے دل کی عورت اس کی گفتگو سے متاثر ہوئی تھی اور وہ خود کو قصوروار سمجھ رہی تھی۔ اس تاثر کا وہ خود سے اعتراف کرنا نہ چاہتی تھی اور اس نے اِس احساس قصور کو اپنے اوپر سے ہٹانے کی کوشش کی۔ کتنی عجیب تھی اس کی یہ بات کہ یوں خواہ مخواہ اس سے باتیں کرنے لگا' اس نے سوچا' اسے یہ امید ہی کیوں تھی کہ وہ اُسے اس طرح جواب دے گی لیکن____ سیما کے دل میں کوئی چیز اس کی حمایت کر رہی تھی' وہ اس ضد سے رہائی چاہتی تھی لیکن نوجوان کی ساری شخصیت ایک غیر عمومی تاثر کی شکل میں اس کے ذہن میں مجتمع ہو گئی تھی' یہ شخص___ اچانک بے ربط طور پر اُسے اپنے شوہر کا خیال آگیا۔ اس نے سوچا وہ اس وقت گھر پر نہ ہوں گے۔ اپنے شوہر کے ساتھ وہ ایک غیر خوشگوار حالت میں رہ رہی تھی۔ وہ دن میں لڑکیوں کو پڑھاتی تھی اور____

بس رک گئی تھی۔ سیما کے ساتھ والی عورت اُتر گئی اور وہ کھڑکی کے قریب سرک گئی۔ بس اب دادر میں داخل ہو رہی تھی۔ مکانوں کے اندرونی حصوں میں دھیمی روشنیاں تھیں اور بس اندھیرے میں سے گزر رہی تھی۔ بلیک آوٹ میں دور دور کھمبوں سے لٹکتی ہوئی ڈھکی ہوئی روشنیوں کے دھبّے تھے اور اُن کے چاروں طرف اندھیرا۔ یہ اندھیرا اب اُس کے لئے اجنبی نہ رہا تھا۔ یہ بلیک آوٹ اس سے بھی پہلے شروع ہوا تھا جب اُس نے ٹیوٹوریل سکول میں لڑکیوں کو پڑھانا شروع کیا تھا اور وہ____ اُسے پھر اپنے شوہر کا خیال آگیا اور پھر اس اجنبی کا۔

اب شوہر کے ساتھ وہ خوش نہ تھی' اس شخص کی قربت وہ اب بھی بڑی یگانگت کے ساتھ محسوس کر رہی تھی۔ کیوں____ اور

اُس نے اس کے خیال سے دُور ہٹنے کی کوشش کی۔ بس اب داور کے پُل سے گزر رہی تھی' پانچ منٹ میں وہ گھر پہنچ جائے گی۔ وہ گھر پر نہیں ہوں گے' اپنے شوہر کا وہ اس وقت گھر پر موجود ہونا نہ چاہتی تھی۔

لیکن جب وہ گھر پہنچی تو ورمن موجود تھا۔

"سیر کر آئیں۔" اس کے لہجے میں ایک طنز تھا۔

"ہاں" سیما نے لاپروائی سے جواب دیا۔ اس نے طنز کو محسوس کیا تھا لیکن اس کی پروا کرنا نہ چاہتی تھی۔ پچھلے دنوں سے وہ خود کو اپنے شوہر کے مقابلے میں مساوی سمجھنے لگی تھی' اور اس طنز کو ایک طنز کی طرح محسوس کر کے اس کی مخالفت کرنا ذلیل سا معلوم ہوتا تھا۔

"مجھے تمہارا چوبیس گھنٹے گھومتے رہنا پسند نہیں۔"

مجھے معلوم ہے تمہیں پسند نہیں ہوا۔" سیما نے جواب دیا۔ تم چاہتے ہو میں دن بھر ان تین کمروں میں قید رہوں۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم اس طرح سڑکوں کی خاک نہ چھانو۔"

"کون چھانتا ہے سڑکوں کی خاک۔ جب تم رات کو دس بجے گھر آتے ہو تو میں شام کو سیر بھی نہیں کر سکتی۔"

ورمن چپ ہو گیا اور وہ کپڑے اتارنے کے لئے اندر کمرے میں چلی گئی۔ سیما جانتی تھی کہ ورمن اس کے ملازمت کرنے سے بھی برگشتہ ہے۔ اب وہ اسے اپنے شوہر کی خود غرضی پر محمول کرتی تھی۔ اس کی وجہ سے وہ خود کو بڑا آزاد محسوس کرنے لگی تھی اور خود کو اپنے شوہر کا دستِ نگر نہ سمجھتی تھی' اور اس احساس سے اس کی اپنی مرضی کو تقویت مل گئی تھی۔ وہ اب وہی کرنا چاہتی تھی جسے خود ٹھیک سمجھتی ہو۔

کپڑے بدل کر جب وہ باہر آئی ورمن کھڑکی میں کھڑا ہوا باہر دیکھ رہا تھا۔

"سیما" اُس نے مڑ کر کہا۔ "میرا خیال ہے تمہارا یہ رویہ ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیوں؟" سیما نے استفسار کیا۔

"کیونکہ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔"

"کیوں برداشت نہیں کر سکتے' یوں کہو کہ تم سے میری ذرا سی آزادی دیکھی نہیں جاتی۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تم عورتوں کی طرح رہو۔" ورمن نے بگڑ کر کہا۔

"میں بالکل عورتوں کی طرح رہتی ہوں۔ لیکن تم چاہتے ہو کہ مجھے اپنے رعب میں رکھو۔" سیما نے جواب دیا۔

"مجھے تمہارا یہ سکول جانا بھی پسند نہیں۔ یہ میری توہین ہے۔"

"میں تو اُسے توہین نہیں سمجھتی۔" اُس نے ورمن کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنا بوجھ خود اٹھانا چاہتی ہوں' اور میں اٹھا سکتی ہوں۔"

ورمن نے غصے میں اس کی طرف دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ یہ جھگڑے عموماً اس سے آگے نہ بڑھتے تھے۔ سیما کہہ چکی تھی کہ تمہیں مجھ پر رعب جمانے کا کوئی حق نہیں ہے اور ورمن نے اس پر رعب جمانا چھوڑ دیا تھا' اور بات سنجیدہ ہوتی جا رہی تھی۔

رات بستر پر وہ دیر تک جاگتی رہی کمرے میں وہ اکیلی نہ تھی' درمیان میں چند فٹ کا فاصلہ تھا اور پھر ورمن کا بستر۔ لیٹے ہوئے۔ سیما کو احساس تھا کہ وہ جاگ رہے ہیں' یعنی ورمن جاگ رہا تھا۔ لیکن وہ سو رہی تھی' ورمن کے سامنے وہ جاگنا نہ چاہتی تھی' آنکھیں بند کئے وہ لیٹی رہی۔

تین سال پہلے سیما کی شادی ورمن سے ہوئی تھی' جیسے شادیاں ہوتی ہیں۔ آگ کے گرد گھوم کر' منتر پڑھ کر' شہنائیوں کی آوازوں کے درمیان' جب شادی ہو گئی تھی تو سیما نے اس کا برا نہ مانا تھا۔ ورمن ایم۔ اے تھا اور اسسٹنٹ پوسٹ آفیسر اور وہ مندر پر ستھ گرلز

کالج کی گریجویٹ تھی۔ جہاں ان لڑکیوں میں جنسی معاملات پر باتیں کر کر کے اس نے اپنے ذہن میں اپنی دوشیزگی کو کھو دیا تھا۔ کتنی حسرت تھی اُسے ________!

ورمن نے یہ حسرت پوری کر دی تھی وہ یہ چاہتی تھی۔ اُن دنوں کئی کئی نصف گھنٹوں تک وہ لیٹے ہوئے ورمن کے پاس بیٹھی رہتی' اس کا بازو ورمن کے اوپر سے ہوتا ہوا فرش کا سہارا لئے رہتا۔ اس کا سینہ ورمن کے سینے سے چھوتا رہتا' اور وہ ورمن کے سینے پر اپنی انگلیوں سے بے معنی لکیریں کھینچتی رہتی اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے یا وہ ورمن کے بازوؤں میں' اس کے گھٹنوں پر لیٹی رہتی اور اس کی قمیص کے بٹنوں کو کھولتی۔ بند کرتی رہتی اور ورمن کے بازو اس کی کمر کے گرد حلقہ کئے رہتے۔ کتنی لذت تھی ایک مرد کے بازوؤں کو اس طرح اپنی کمر کے گرد محسوس کرنے میں' کتنی راحت تھی' اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے اور بوسے' اور ___ اوہ' کتنا کیف تھا اس میں پہلے جاڑوں کی طویل راتوں میں وہ بستر پر اس کے جسم کی گرمی کو محسوس کرتی کتنی جنسی ہوتی تھی یہ گرمی اور کتنی راحت بخش اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے ___ جسمانی ملاپ جن کے متعلق پشپا کپور اور ودیا وتی اور شمع اور شبنم اتنے ہیجانی انداز میں باتیں کیا کرتی تھیں' اور جن کے متعلق سوچ سوچ کر اس نے اپنے ذہن میں اپنی دوشیزگی سے ہاتھ دھو لئے تھے۔ بے شک وہ اتنے لذیذ نہ تھے جتنا اس نے تصور کیا تھا۔ لیکن اُس نے خود کو ان بوسوں اور بازوؤں اور حرارت اور ان سب چیزوں کے سپرد کر دیا تھا۔ جذبات کی شدت میں ان دونوں نے ایک دوسرے کی تقصیروں کو نظر انداز کر دیا تھا اور وہ محبت کی باتیں کرتے رہتے تھے اور ایک سال گزر گیا اور محبت کی باتیں گویا ختم ہوتی گئیں' باتیں ہی تو تھیں اور سیما کا انہیں بار بار دہرانے کو جی نہ چاہتا تھا' جی ہی تو تھا!

لیکن وہ جسمانی لمس وہ بوسے' وہ جسمانی ملاپ ____

اور دن گزرتے گئے اور وہ ان کی عادی ہوتی گئی اور اوپر دیکھنے لگی کہ ورمن میں ایسی بہت سی باتیں ہیں جو اُسے پسند نہیں اس میں خود بھی ایسی باتیں تھیں جو ورمن کو پسند نہ تھیں اور سیما کو یہ سخت ناگوار معلوم ہوتا تھا کہ ورمن انہیں دیکھنے لگا ہے لیکن ورمن انہیں دیکھنے لگا تھا اور سب سے بُری بات یہ تھی کہ وہ سیما کو اُن کا احساس کرا دیتا تھا۔ سیما کو یہ بات پسند نہ آئی' پھر وہ اُسے بری لگنے لگی۔ لیکن ورمن باز نہ آیا اور وہ بھی باز نہ آئی اور اُسے ورمن کے نقص اجاگر معلوم ہونے لگے۔ پھر اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اُس کے اور ورمن کے خیالات نہیں ملتے' اور کہ ورمن کے ذہن میں ایم۔اے کرنے کے باوجود بھی وہی روایاتی تنگ نظری ہے۔

"____ لیکن تم اتنی اتنی دیر اس سے باتیں کیوں کرتی رہتی ہو؟"

"باتیں کرنے میں کوئی حرج ہے؟"

"وہ کیوں اتنی اتنی دیر یہاں بیٹھا رہتا ہے مجھے یہ بالکل پسند نہیں۔"

تمہیں تو کوئی چیز پسند نہیں۔ اوّل تو باتیں کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔ دوسرے وہ بالکل بچہ ہے' تمہیں تو ہر ایک کے متعلق بُری بُری باتیں سوچنے کی عادت سی ہو گئی ہے۔"

'عادت نہیں' میں ان سب بچوں کو جانتا ہوں' یہ چودہ برس کے ہونے سے پہلے ہی جوان ہو جاتے ہیں۔

"وہ نہیں ہے۔"

"ہو یا نہ ہو" ورمن نے درشتی سے کہا۔ 'لیکن میں تمہیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا اپنے گھر تم ایسا کر سکتیں تھیں؟"

"اپنے گھر میں آزاد نہ تھی۔"

"آزاد تم اب بھی نہیں ہو۔" ورمن نے گرتی سی آواز میں کہا۔"

"کیا ____؟"

"میں کہتا ہوں تم نے یہ قمیض میں بٹن کیوں نہیں ٹانکے۔ اگر تم سے اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو اس شادی کا سکھ ہی کیا ہے؟"

"تم نے مجھ سے کھانا پکوانے کے لئے شادی کی ہے؟" سیما غصّے سے بولی۔ اس نے سُن لیا تھا کہ وہ کہہ رہا ہے' مندر پرستھ گرلز کالج کی گریجویٹ آزاد نہیں ہے' یعنی وہ کبھی آزاد نہیں رہے گی' اپنی شادی کے بعد بھی نہیں' تو پھر اس شادی کا مقصد ہی کیا ہے۔ اسے ورمن کی اس بات سے کتنی نفرت تھی' ورمن کی اس بات میں کتنی تنگ نظری تھی۔ اس کے خیالات سنے ورمن سے ملنا چھوڑ دیا اور دن گزرتے گئے اور اپنے خیالات اس کے ساتھ روز بروز متضاد ہوتے گئے۔ اس کے اور ورمن کے درمیان خیالات کا اختلاف آگیا۔ حقیقت میں وہ اپنے اور ورمن کے درمیان اب کچھ چاہتی تھی اور اس نے آسانی سے خیالات کے اختلاف کا سہارا لے لیا اور اپنے خیالات اُسے زیادہ عزیز ہو گئے اور پھر ___ یعنی اگر خیالات میں اختلاف ہو تو جنسی ملاپ وہ لذت نہیں بخش سکتے۔ وہ اب پریمی نہ ہو کر میاں بیوی رہ گئے تھے' اور میاں بیوی کی طرح رہتے تھے اور اب سیما کو محسوس ہوتا تھا کہ اُس نے آرزو کو کھو دیا ہے' لیکن ایسا نہیں تھا' آرزو موجود تھی۔ لیکن وہ اسی شدت سے پوری نہیں ہوتی تھی' اور وہ اس کے ردعمل کو محسوس کرتی تھی اور اُسے معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اُسے کھو دیا ہے۔ ان تعلقات میں اب وہ کشش نہ تھی وہ اب ان کی کچھ ایسی خواہش مند نہ تھی اور کبھی کبھی اسے یہ بالکل پیشہ ورانہ سے معلوم ہوتے' اور ورمن اس سے ملنا چاہتا تھا۔ جب وہ اس کی خواہش مند نہ ہوتی تھی۔ کتنی ذلیل بات تھی یہ کتنی ناپسند تھی اُسے۔

سیما نے دراصل محبت ورمن سے کبھی نہیں کی تھی' یہ اس کی جنسیت تھی۔ جس نے ورمن کے مرد سے محبت کی تھی۔ اپنے جذبے کی شدت میں اُس نے خود کو ورمن میں اس شے کے سپرد کر دیا تھا۔ جو اسے تسکین دیتی تھی۔ اس وقت وہ ایسی تسکین چاہتی تھی جو پشپا کپور اور دویا دتی سے باتیں کر کے حاصل نہ ہوتی تھی۔ وہ سچائی نہ چاہتی تھی اور سچائی مل گئی تھی اور اس نے اس سچائی سے محبت کی تھی' جس سے سب عورتیں کرتی ہیں۔

سیما کو اپنے احساسات پر اعتبار نہ تھا' اپنے ادراک سے نیچے وہ ان سے ڈرتی تھی اور اسے اب بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ورمن سے محبت کرتی ہے' جیسا سب عورتوں کو معلوم ہوتا ہے' لیکن یہ محبت نہ تھی' اگر محبت کچھ اور ہوتی ہے' یہ صرف ایک احساس ملکیت تھا' ورمن اس کا شوہر تھا' اور ورمن کے علاوہ اس کا اور کچھ نہ تھا' اس کے لئے صرف وہ سب کچھ تھا اور سیما اس سے ایک شوہر کے روپ میں محبت کرتی تھی اور رازدارانہ طور پر اپنی روح کے نہاں خانے میں ایک مرد کی حیثیت سے اب اس سے خوش نہ ہوتی تھی۔ یہ جنسی تعلقات ان کے درمیان ایسے ہو گئے تھے جیسے رات کے کھانے کے بعد کبھی تاش کھیلنے کو جی چاہتا ہو یا جیسے انسان کبھی اپنے اوپر سے کچھ اتار پھینکنا چاہتا ہے یہ تجربے ہمیشہ اُسے ایک ناگوار سی حالت میں چھوڑ جاتے تھے اور وہ محسوس کرنا چاہتی تھی اور محسوس کرنے کو کچھ نہ تھا اور ورمن اپنا بوجھ اتارنا چاہتا تھا جب وہ اس کی خواہش مند نہ ہوتی تھی۔ کبھی خواہش ہوتی بھی تھی تو یہ صرف اپنی آرزو ہوتی تھی' دوسرے کی جذباتی ضرورت نہیں' صرف اپنی خواہش کی تسکین کی آرزو' لیکن وہ پھر بھی خود کو ورمن کے لئے رزرو سمجھتی تھی' جس کے ساتھ اس نے آگ کے گرد پھیرے لئے تھے۔ اس رزرویشن سے وہ اپنی سے روح میں برگشتہ تھی لیکن اپنی ماتحتی کا ایک احساس جس سے وہ تقریباً ناواقف تھی۔ درمیان میں حائل تھا اور اس نے کبھی یہ سوچنے کی جسارت نہ کی تھی۔ خواہش اس کے اندر مردہ ہو گئی تھی اور اکثر ان میں جھگڑے ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کی تقصیروں کو برداشت کرنا انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔

پھر وہ ایک ٹیوٹوریل اسکول میں پڑھانے لگی۔ مندر پرستھ کالج کی گریجویٹ ورمن نے اس کی مخالفت کی تھی۔ لیکن وہ مانی نہ تھی اور اُس نے ملازمت کر لی تھی۔ اپنی ماتحتی کو کبھی اس نے ادراکی طور پر محسوس نہیں کیا تھا' لیکن اس آزادی کو اس نے پورے طور سے پہچان لیا۔ وہ آزاد تھی اور ایک داخلی رہائی محسوس کرتی تھی۔ خود بخود ان دونوں کے درمیان اب جھگڑے کم ہو گئے تھے اور دوری بڑھ گئی تھی۔

"سیما ___" بستر پر لیٹے ہوئے اُس نے ورمن کی آواز سنی' لیکن وہ بولی نہیں' وہ جاگ نہیں رہی تھی' وہ سو بھی نہیں رہی تھی' وہ جواب دینا نہ چاہتی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ ورمن کیا کہے گا' وہی جو وہ شام کو کہہ چکا ہے' اور اس سے پہلے کئی بار' مجھے تمہارا یہ رویہ پسند

نہیں۔ آخر وہ ایسا کیا کرتی ہے' کیا پسند نہیں ہے انہیں' پسند' پسند' ان دونوں کی پسند جدا ہے' اُن کے خیالات نہیں ملتے — وہ سوچتی رہی۔ ورمن نے کروٹ بدل لی اور اُس نے ایک آسانی سی محسوس کی۔ اب وہ اپنے جسم کو حرکت دے سکتی تھی' سوتے میں کیا آدمی ہاتھ پاؤں ہلاتا اور اس نے اپنا بازو اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ مرد چاہتے ہیں کہ ان کی غرض پوری ہوتی رہے' عورتوں کا کوئی خیال نہیں' کیوں' خود غرض مرد' اچانک اُسے سمندر کے کنارے اس اجنبی کا خیال آگیا اور اس نے فوراً ہی اس خیال کو اپنے ذہن سے برخاست کر دیا' پھر تک وہ لیٹی رہی اور اُس کے اوپر ایک ویرانی کا احساس ابھرنے لگا جس میں چڑچڑے پن کا بڑا جزو شامل تھا۔ اُسے زندگی کی بے رنگی پر ہمیشہ غصہ آتا تھا۔ لیکن اس ویرانی کے بارے میں اُس نے سوچا کبھی نہ تھا۔

بہت دیر تک وہ جاگتی رہی' بہت دیر بعد وہ سو گئی۔

دوسرے دن۔

دیر تک وہ سمندر کے کنارے گھومتی رہی۔ ساحل پر آج بھیڑ زیادہ تھی۔ لیکن وہ ایک تنہائی سی محسوس کر رہی تھی۔ کسی چیز کی کمی محسوس ہو رہی تھی اور وہ یہ جانتی تھی کہ یہ کیا ہے۔ سمندر کے کنارے بکھری ہوئی اس بھیڑ سے اُسے ایک علیحدگی کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ احساس خفا کانہ تھا بلکہ جیسے وہ ایک وسیع مجمع میں اکیلی ہے اور مجمع کا دائرہ اس کے گرد تنگ ہے۔ سمندر کی وسعت بھی تنگ معلوم ہوتی تھی۔ جیسے بالکل پاس ہی بسیط سمندر کو آسمان نے روک لیا ہو۔ آج مغربی افق پر شفق نہیں پھیلی تھی' دن ڈوب گیا تھا لیکن آسمان ویران تھا اور اس نے سمندر کو روک رکھا تھا۔ کسی چیز کی کمی تھی' یہ بھیڑ اور یہ تنہائی لیکن وہ بھیڑ سے الگ رہنا چاہتی تھی' اکیلی رہنا چاہتی تھی سمندر کے کنارے اکیلی آئی تھی' اور پھر یہ تنہائی' اسے کسی ضرورت کا نیم شعوری احساس تھا' کوئی چیز محسوس نہ تھی۔

کنارے پر کھڑی ہوئی وہ لہروں کو ساحل کی گیلی ریت پر پھیلتے ہوئے دیکھتی رہی' لوٹتی ہوئی لہر سے ٹکرا کر پانی کنارے پر پھیل جاتا تھا اور ساحل کی ریت اس کے جھاگوں سے چمک اٹھتی تھی اور پھر پانی واپس لوٹ جاتا اور ریت میں جذب ہو جاتا اور ریت کی چمک معدوم ہو جاتی۔ دیر تک وہ تماشا دیکھتی رہی پھر وہ چند قدم آگے بڑھ آئی تھی' اور وہ دیکھتی رہی۔ سمندر کی سطح سے اُبھر کر پانی کا ایک ڈھیر بڑھ آتا تھا' جیسے ایک وسیع چادر آپ سطح پر کھلتی آ رہی ہو' سمندر کی سطح پر اس سے اونچی ایک اور سطح بہتی جا رہی تھی اور قریب آ رہی تھی' اور ____ اور اچانک وہ ٹکرا گئی اور ایک شور میں بکھر گئی اور پانی سیما کے قدموں میں پھیل گیا۔ سیما نے منہ سے تعجب کی ایک چھوٹی سی آواز نکالی اور وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ پانی غیر متوقع طور پر اس کے قدموں میں آ گیا تھا اس کا شعور اس کے لئے تیار نہ تھا' وہ لہر سے چھو جانا چاہتی تھی لیکن ____

واپس جاتا ہوا پانی اب کنارے میں جذب ہو رہا تھا وہ بڑھی اور خشک ریت پر پاؤں رکھتی ہوئی اوپر بینچوں کی طرف چلی گئی' اوپر بینچوں کی طرف۔ ریت اس کی گیلی سینڈلوں اور پاؤں میں چمٹ گئی تھی اور اپنے تصور میں اُسے اس کے کرکرے پن کا احساس ہوتا رہا۔

بینچ کوئی خالی نہ تھا وہ ان کے آگے سے گزرتی گئی' عورتیں اور مرد' اور صرف عورتیں اور صرف مرد۔ بینچوں پر بیٹھے تھے' اور وہ خالی جگہ کی تلاش میں آگے گزرتی گئی' یہ پارسی اپنی بوڑھی عورت کے ساتھ کسی نوجوان کی طرح بیٹھا تھا' یہ دو لڑکیاں آپس میں باتیں کر رہی تھیں اُن کے جوڑوں میں چنبیلی کے پھول تھے۔ یہ ____ اوہ' اس بینچ پر وہی کل والا نوجوان بیٹھا تھا اور اس کے برابر کی دو سیٹیں خالی پڑی تھیں لیکن وہ گزر گئی' قریب سے گزرتے ہوئے اُس نے سیما کو سر سے پاؤں تک دیکھا جیسے کہتا ہو کیا تم وہی نہیں ہو جو کل گھنٹہ بھر تک میرے قریب بیٹھی رہی تھیں۔ اب سیما اسے پیچھے چھوڑ آئی تھی۔ وہ یہ فیصلہ نہ کر سکی تھی کہ اس کے قریب بیٹھے' ایک جھجک سی محسوس ہوئی تھی شعور و دو نیم میں اسے اس بات کا احساس یا شاید ڈر تھا کہ اس کے پاس بیٹھنا غیر اہم نہ ہوگا۔ وہ اس اہمیت سے مخوف تھی۔

آخر تک کوئی بینچ خالی نہ تھا اور اب وہ واپس آ رہی تھی کہ آخر ایک خالی سیٹ پر بیٹھنے میں حرج ہی کیا ہے اور اُسے کوئی حرج نظر نہیں آ رہا تھا۔ لیکن جب وہ اس کے قریب آئی تو وہاں رکنے میں اُسے پھر ایک جھجک محسوس ہوئی' یہ نوجوان اس کی رُوح میں ایک اہمیت

بیٹا تھا اور اس کی نگاہ خالی سیٹوں میں اٹکتی ہوئی آگے بڑھ گئی وہ پھر آگے جا رہی تھی تو جوان بینچ پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

آپ بیٹھئے۔" اس نے کہا۔ میں تو بہت دیر سے بیٹھا ہوا ہوں۔" اور غالباً وہ سیٹ چھوڑ کر جا رہا تھا۔ بغیر ارادہ کئے ہوئے سیما نے کہا۔

"آپ میری وجہ سے نہ جائیں۔ میں کوئی اور سیٹ تلاش کر لوں گی۔"

"خالی بینچ شاید آپ کو نہ ملے۔"

"لیکن میں یہ نہیں چاہتی کہ کسی کو اٹھا دوں۔"

"اور نہ یہ برداشت کر سکتی ہیں کہ کسی کے قریب بیٹھیں۔"

سیما نے اس کی طرف دیکھا اُس کے ہونٹوں پر ایک بڑی نامعلوم سی مسکراہٹ تھی اور آنکھیں بالکل سنجیدہ تھیں۔

"دیکھئے" اُس نے کہا اور پھر ———

"شکریہ"

سیما سیٹ کی طرف بڑھ چکی تھی، وہ بیٹھ گئی۔

چند لمحوں تک خاموش رہی۔ ایک منٹ دو منٹ ——— یہ خاموشی سیما کو بے ہنگم سی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا یہ ارادہ نہ تھا کہ اس سے بات کرے، لیکن یہ خاموشی ——— اور چند لمحوں تک خاموشی رہی اور سیما کی توجہ ان حالات پر جمی رہی جن میں وہ خود کو محسوس کر رہی تھی یکایک اُس نے کہا ——— "میں دراصل بڑا ڈھیٹ آدمی ہوں کہ یہاں سے ہٹا نہیں۔ آپ کو شاید امید تو ہو گی کہ میں سیٹ خالی کر دوں گا۔" اس کے ہونٹوں پر سے ایک نامعلوم سی مسکراہٹ گزر گئی۔

"نہیں تو" سیما نے کہا۔

"اوہ ——— اپنے خشک بالوں میں انگلیاں پھیرتا ہوا وہ مسکرایا ——— "میرا خیال ہے عورتوں کو اس بات کی امید ہوتی ہے کہ ہم ان کے لئے جگہ خالی کر دیں۔"

"شاید ——— "سیما نے مختصر طور سے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہوتی ہے" اُس نے 'ہے' پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ کچھ سراہنے کے قابل بات نہیں۔ میں سمجھتا ہوں جب تک عورت کو یہ اُمید رہے گی وہ آزاد نہیں ہو سکتیں۔"

سیما نے اس کی طرف دیکھا، ظاہر تھا کہ وہ گفتگو کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔

"کسی دوسرے آدمی سے کچھ امید کرنا ہمیشہ خود کو بالواسطہ اس کا ماتحت بنا دینا ہوتا ہے، اور عورتیں ہمیشہ امید کرتی رہتی ہیں اور خود کوشش نہیں کرتیں۔ ان کے ساتھ صدیوں سے خود کو Passive سمجھنے کی ایک عادت بن گئی ہے اور یہ عادت ان کی فطرت کا حصہ بنتی جا رہی ہے۔"

"میرا خیال ہے نیچر نے عورتوں کو Passive بنایا ہے۔" سیما نے کہا۔

"اوہ نہیں ——— "اس نے نہیں کو طول دیتے ہوئے کہا۔ "قدرت اتنی بیوقوف نہیں ہو سکتی ہے بے شک صحیح ہے کہ بعض حالتوں میں عورتوں کا عملی پارٹ بعد میں شروع ہوتا ہے، لیکن قدرت نے عورتوں کو Passive بنایا ہے یہ غلط ہے۔ عورتوں کی اس حالت کی وجہ صرف یہ ہے کہ بنیادی خواہشات میں سماج نے ایسا لازمی (جو حقیقت میں غیر ضروری ہے) تعلق پیدا کر دیا ہے کہ اس کی تسکین کا انحصار دوسرے پر ہے اور یہ دوسری چیزیں عورتوں کو کرنے نہیں دی جاتیں اور ایک عورت اس وقت تک کسی آدمی کے ساتھ نہیں رہ سکتی جب تک وہ اس کی بیوی نہ ہو۔

سیما سمندر کی طرف دیکھنے لگی، لیکن اس کی توجہ کا مرکز گفتگو تھی، بلکہ گفتگو سے بھی زیادہ اپنی توجہ کا مرکز وہ خود تھی، اس کی بے

تکلفی سے وہ ایک مخصوص قسم کا نسوانی حجاب محسوس کرنے لگی' لیکن یہ اُسے ناپسند نہ تھا' وہ کہہ رہا تھا۔

"بنیادہ جذبات کے ساتھ ساتھ اکونومک مسئلہ لگا رہا ہے' اور عورتیں اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتیں جب تک وہ اقتصادی طور پر کسی دوسرے کی دست نگر رہیں گی۔" اور پھر یکایک رک کر وہ بولا ___ "آپ کو شاید عورتوں کی آزادی سے دلچسپی نہیں۔"

"جی!"

میں پوچھ رہا تھا کیا آپ عورتوں کی آزادی میں دلچسپی نہیں لیتیں؟ دراصل آپ کو یہ بڑی عجیب بات معلوم ہوئی ہو گی کہ میں چند منٹ کی ملاقات کے بعد آپ سے عورتوں کی آزادی کے بارے میں بات کرنے لگا ہوں۔ حقیقت یہ ہے اور اس جس کا میں اقبال کر لینا چاہتا ہوں کہ دراصل میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ بمبئی میں پچھلے تین مہینے سے میں نے کسی عورت سے بات نہیں کی اور اب میں اس سے اکتا سا گیا ہوں۔"

وہ ہنسا' لیکن اس کا قہقہہ مسکراہٹ سے کچھ ہی زیادہ تھا۔

"آپ کو میری بے تکلفی پر تعجب ہوا ہو گا' کم از کم ہونا چاہئے تھا" وہ بولا۔ "لیکن مَیں نے کہا نا کہ میں باتیں کرنا چاہتا ہوں اور عورتوں کی آزادی کے سوا اور بات ہی کیا کی جا سکتی ہے۔"

آپ عورتوں کی آزادی کے بارے میں بڑے پریشان معلوم ہوتے ہیں۔

"ہاں' کیونکہ عورتیں اپنی آزادی کے بارے میں پریشان نہیں ہیں۔"

سیما مسکرائی' وہ اب اس کی گفتگو میں براہِ راست دلچسپی لے رہی تھی۔ اس نے کہا "لیکن عورتیں کسی کا سہارا چاہتی ہیں۔"

"واقعی؟" اس نے ایک ہلکے سے طنز سے کہا' پھر وہ سنجیدہ ہو گیا۔ "لیکن سوال چاہنے کا آجاتا ہے۔ چاہنا ایک دوسری بات ہے' خواہش ایک مقدس چیز ہے۔ میرا خیال ہے انسان اپنی روح سے جو چاہتا ہے وہ پورا ہونا چاہئے اگر کوئی شخص خود کو کسی دوسرے آدمی کے سپرد کرنا چاہتا ہے تو اس میں رکاٹ نہیں ہونی چاہئے Submission اس آدمی کو خوشی' مسرت اور راحت بخشتی ہے جو خود کو Submit کرتا ہے اور اس آدمی کو آرام اور سکھ پہنچاتی ہے جسے Submit کیا جاتا ہے' یہ صرف Submission ہے۔ جس پر ایک حسین زندگی کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے اور اس کے لئے روح کی آزادی کی ضرورت ہے۔ لیکن ہمارے پاس روحیں نہیں ہیں' ہماری روحوں کے دروازوں میں دھات کی تہذیب کے تالے پڑے ہوئے ہیں۔"

اس کی گفتگو سیما کو متاثر کر رہی تھی' وہ اس سے متاثر ہوئی تھی' جیسے اس کے الفاظ سیما کے اپنے ان سوچے خیالات کی گونج ہیں۔ اپنے ہی خیالات کے اظہار کی دلکشی نے اُسے رجھایا تھا' اور اُس نے نوجوان کے لئے دل میں ایک خصوص سا محسوس کیا' اور ایک کشش بھی جو واضح نہ تھی' جو یا اس کے خیالات کی طرف تھی یا اس کی شخصیت کی' یا اس کی آواز کی۔ یہ کشش بالکل عجیب تھی اور اس نے خود کو اس کے تاثر میں محسوس کیا۔

"لیکن موجودہ حالات میں عورتیں سہارا نہیں چاہتیں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "سہارا چاہنا پڑتا ہے' ہر عورت خود کو Prostitute کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ یہ صرف ایک غرض ہوتی ہے' مجبوری جس کی وجہ سے انہیں ایک سہارے کی ضرورت رہتی ہے۔ اس میں سچائی نہیں اور اپنی تہ میں یہ چاہت بڑا کمینہ پن لئے ہوئے ہے۔"

سیما اس بات سے متفق نہ تھی' لیکن وہ اس کی مخالفت نہ کر سکی اور بالکل ایک ہپناٹک اثر میں سنتی رہی۔

"اور اس کے لئے عورتیں ذمہ دار نہیں ہیں' مرد بھی نہیں۔ یا شاید اس کے لئے دونوں ہی ذمہ دار ہیں۔"

"یا کوئی بھی نہیں" سیما نے کہا۔

نہیں میرا خیال ہے عورتیں اس کے لئے اتنی ہی مجرم ہیں جتنے مرد' یا شاید مرد زیادہ ہیں' کیونکہ ان کے ہاتھ میں طاقت ہے' لیکن

انہوں نے طاقت کو ذلیل کر دیا ہے' اور اس کی تقدیس کو کھو دیا ہے۔ عورتیں فطرتاً مرد کی حفاظت میں رہنا چاہتی ہیں' لیکن مرد انہیں اپنے قابو میں رکھنے کے لئے ذلیل اور کمینے اور غیر فطری ہتھیار استعمال کرتا ہے' اُسے ہر طرح اپنا دست نگر رکھنا چاہتا ہے' اپنی جائداد بنا کر اور اس نے عورت کی روح کو کھو دیا ہے اور اس کے جسم سے مطمئن ہے۔"

دیر تک وہ باتیں کرتا رہا' اور سیما کو محسوس ہوا کہ وہ ورمن سے کس قدر مختلف ہے! صرف ایک بار اُسے اس فرق کا ایک بہت مختصر سا احساس ہوا' وہ سنتی رہی۔ وہ زیادہ تر خود ہی بولتا رہا تھا۔ سیما کو کچھ کہنے کا موقعہ ہی نہ آتا تھا۔ وہ کچھ کہنا نہ چاہتی تھی۔ سننا چاہتی تھی۔ اس کی گفتگو میں ایک مخصوص دلکشی تھی' اور اُسے سنتے ہوئے سیما کو ایک مخصوص سی ملائمت کا احساس ہو رہا تھا' یہ ملائمت اس کی گفتگو سے سیما کے احساس میں پھیل رہی تھی اور احساس سے نیچے اتر رہی تھی۔ ملائمت کا یہ تاثر ایک پر اسرار سحر کے مانند تھا اور اس کے شعور پر قابو پا رہا تھا' وہ خود اپنے اوپر اس سحر کا اثر چھا رہی تھی' یہ اتنا خوبصورت' اتنا ملائم اور پھر اتنا غالب تھا۔

دیر تک وہ باتیں کرتا رہا اور اُس سے علیحدہ ہونے کے بعد بھی سیما نے اپنے اوپر اس سحر کی ملائمت کو محسوس کیا۔

اور اس کی گفتگو کی دلکشی نے سیما کو مغلوب کر لیا۔ ہر شام وہ سیما کو یہاں مل جاتا تھا اور باتوں کے دوران میں سیما پر ایک پر اسرار اثر رہتا۔ یہ اثر اس کی آواز میں قدرتی تھا اور سیما کے تصور نے اُسے پر مبالغہ بنا لیا تھا وہ خود کچھ کہے جاتا تھا اور سیما کے بولنے کا انتظار نہ کرتا تھا' اور وہ ایک نیم مسحور سی حالت میں سنتی تھی۔ گفتگو کے دوران میں وہ خود کو اس سحر کے تاثر کے سپرد کر دیتی تھی اور اس کے سامنے اپنی طاقت کو کھو دیتی۔ اُس کی موجودگی اور خصوصاً اس کی گفتگو سے سیما کو اپنے اندر پر اسرار لہروں کا ایک تسلسل سا محسوس ہوتا تھا' جو کچھ کہتا تھا اس پر وہ یقین نہ بھی کرتی ہو' لیکن پھر بھی وہ خود کو اس کی آواز کے سامنے کمزور محسوس کرتی اور اس کی بات کاٹنا نہ چاہتی تھی۔ اس کے سامنے سیما کو اپنے وجود کا احساس کم رہتا تھا اور اس کا زیادہ۔ اس کی توجہ نہایت عجیب ڈھنگ سے اس کی گفتگو میں مدغم رہتی' بلکہ اس کی گفتگو سے بھی زیادہ کسی اور شے میں' وہ بخوبی یہ سمجھنے کی کوشش نہ کرتی تھی کہ وہ کیا کہتا ہے۔ کسی دوسری شے کے قابو میں اس کا ذہن صرف اس بات پر منعطف رہتا کہ وہ کچھ کہہ رہا ہے' یہ اس کی آواز تھی یا اس کے کہنے کا ڈھنگ' یا کچھ اور تھا یہ اُس نے کبھی نہیں پہچانا۔ اس سحر نے اس کے تحت الشعور پر تسلط کر لیا تھا' اس سے دور ہونے پر بھی وہ اُس کے اثر میں آنا چاہتی تھی۔ کبھی اس چاہت کی شکل خواہش کی ہوتی تھی' کبھی محض ایک کشش کی۔ تمام دن وہ شام کا انتظار کرتی اور اُسے کبھی یہ محسوس نہ ہوتا کہ وہ انتظار کر رہی ہے' صرف ایک بے چینی' ایک بے کلی سی محسوس ہوتی تھی۔ ورمن کی بیوی اس انتظار کو اپنی دانست کے دائرے میں داخل کرنا نہ چاہتی تھی۔

"اب یہ ہر وقت غائب رہنا کیا اختیار کیا ہے تم نے' ورمن نے ایک دن سوال کیا۔

"غائب رہنا؟"

"اور کیا' صبح ہوتی ہے سکول چل دیتی ہو' شام کو تمہاری سیر ختم نہیں ہوتی معلوم ہوتا ہے گھر کو سرائے سمجھ رکھا ہے۔"

"میرے باہر جانے سے تمہارا کونسا کام حرج ہوتا ہے۔"

"کام ——— ورمن نے چڑ کر کہا۔ "کام تو بہت کرتی ہو تم!"

"تو میں صرف کام کرنے کے لئے ہوں۔" سیما نے لوٹاتے ہوئے کہا۔

"نہیں' تم صرف سیر کرنے کے لئے ہو۔"

"تمہیں میرے ذرا سی دیر شام کو باہر جانے سے کیوں جلن ہوتی ہے۔"

"میں پوچھتا ہوں تم یہ جاتی کہاں ہو؟" ورمن گستاخی سے بولا۔

"تم کیا سمجھتے ہو؟" سیما نے کہا۔

"مجھے کیا پتہ کہاں ماری پھرتی ہو' کیا جانے کہاں جاتی ہو۔"

"تمہیں مجھ پر کیا شبہ ہے؟" سیما نے جیسے چوٹ کھا کر پوچھا۔

"بحث مت کرو۔" ورمن نے کہا۔ "مجھے نہ تم پر شبہ ہے نہ تم پر اعتبار!"

"کیا؟____" سیما نے روتی آواز میں کہا' لیکن ورمن کمرے کے باہر چلا گیا تھا۔

ایک لمحے تک سیما ایک عجیب سی ذہنی حالت میں کھڑی رہی۔ اپنے دل کی تہ میں اُسے خود اپنے اوپر اعتبار نہ تھا۔ لیکن وہ اسے جاننا نہ چاہتی تھی اور اس وقت ورمن نے اس کی طرف اشارہ کر دیا تھا اور کتنے تحقیر آمیز انداز میں۔ لیکن ان الفاظ کو سیما نے سچا نہیں سمجھا' ورمن کے یہ لفظ اسے ذلیل معلوم ہوئے' ذلیل اور کمینے' اور ایک انتقامی سے جذبے میں اس نے سوچا کہ وہ گھر سے باہر نہیں جائے گی' نہیں جائے گی۔

لیکن اس نے سکول جانا نہ چھوڑا' شام کو سیر کرنے جانا چھوڑ دیا' اور تین دن خاموشی میں کٹ گئے نہ وہ ورمن سے بولی' نہ ورمن اس سے بولا وہ سوچتی رہی۔

اس نو متعارف نوجوان کے متعلق بظاہر اس کے ذہن میں یہ رشتہ بالکل افلاطونی قسم کا تھا اس نے کبھی اس کے لئے شعوری طور پر جنسی کشش محسوس نہ کی تھی' جو کشش تھی وہ اُسے جنسی نہ سمجھتی تھی' سیما نے کبھی اس نوجوان کو اس قسم کی مخصوص اہمیت نہ دی تھی لیکن حقیقت میں اب یہ نوجوان اس کے تمام احساسات کا ذمہ دار تھا اور سیما کی روح اس ممانعت کے خلاف بغاوت کر رہی تھی۔ وہ اسے ناحق سمجھتی تھی' جیسے ورمن کو اس طرح منع کرنے کا ادھیکار نہیں ہے' لیکن ورمن کا ادھیکار تھا اور وہ اس امر سے واقف تھی' زیر نفسی طور پر پہلے بھی تھی اور اب اسے ادھیکار کے خلاف باغی ہوتی جا رہی تھی۔ یہ حق کیوں ہے' وہ سوچتی تھی' کیا عورتوں کا جنم گھر کی دیواروں میں پیدا ہو کر وہیں مر جانے کے لئے ہوتا ہے' کیا انہیں دنیا میں کچھ دیکھنے کا حق نہیں' انہیں کیوں زندگی سے محروم رکھا جاتا ہے' کیوں____ اس مخالفت کے بارے میں وہ ایک عمومی ڈھنگ سے سوچتی تھی لیکن حقیقت میں مرکز وہ خود تھی' اُسے ورمن کی شخصیت سے ایک رقابت سی ہو گئی' ورمن اور وہ____ وہ کیا ہے' وہ کیا ہے؟ وہ خود کو اکتساب لذت کی محض ایک مشین تصور کرنے لگی' جو ورمن کو لذت بخشتی تھی' یعنی اس کا مطلب یہ ہے' وہ سوچتی تھی کہ مرد تو ہر قسم کی آزادی کا لطف لیتے ہوئے اپنا دل خوش کرتا ہے اور عورت' عورت؟

اور تین دن خاموشی میں کٹ گئے' چوتھے دن۔

رات کو ورمن نے اُسے منانا چاہا تھا' ایک جسمانی اتصال سے وہ سیما کو اپنا غلام بنائے رکھنا چاہتا تھا'____ لیکن سیما نے کہہ دیا کہ اُن کے درمیان میاں بیوی کا تعلق نہیں ہے' کیا؟ ورمن کو یقین نہیں آیا' پھر ورمن کو یقین آ گیا اور وہ جیسے ایک غصے اور توہین کو ضبط کر کے اس کے پاس سے ہٹ گیا۔ ان کے درمیان میاں بیوی کا تعلق نہیں ہے' یعنی' یعنی' تو پھر اس شادی کا سکھ ہی کیا ہے! لیکن سیما نے ایک رہائی سی محسوس کی' جیسے اُس نے ورمن سے کوئی چیز لے لی ہے' یا ورمن کو کسی چیز سے محروم کر دیا ہے! اُس نے سوچا کہ جب انہیں اپنی زندگی میں کوئی کمی محسوس ہو گی تو علم ہو گا کہ____

خود اس کے لئے میاں بیوی کے اس تعلق میں کوئی دلچسپی نہ تھی' ورنہ وہ یہ نہ کر سکتی' اب کیوں وہ اُن کی خوشی کا آلہ بنے جب وہ اس کی خوشی کی پروا نہیں کرتے' وہ سوچتی تھی' مرد کا یہ فرض ہے کہ وہ عورت کی خوشی کا خیال رکھے۔ وہ خوشی چاہتی تھی اور خوشی ملتی نہ تھی اور وہ ان حالات کو چھوڑ نہ سکتی اور انہیں میں وہ ان سے ایک نسوانی انتقام لے رہی تھی' اور اپنی اقتصادی آزادی کا جذبہ غیر شعوری طور پر اسے سہارا دئے رہا تھا۔

اور دن گزرتے گئے' اس نے ورمن کے بستر میں شرکت کرنا چھوڑ دیا تھا' وہ گھر میں Indifferent آواز میں گفتگو کرتے' گفتگو جو لازمی ہوتی تھی' وہ اس سے بچنا بھی نہ چاہتی تھی' بلکہ چاہتی تھی کہ ان حالات میں اور جھگڑا نہ بڑھے اور یہ گفتگو بالکل کاروباری قسم کی ہوتی تھی۔

اس نے سمندر کے کنارے جانا چھوڑ دیا تھا۔ اپنی حقیقی خواہشات کو دبایا تھا۔ ورمن نے اس دن وہ الفاظ کہہ کر اُس کے زیرِ نفسی احساسات پر جنہیں وہ جاننا نہ چاہتی تھی ایک ناگوار روشنی ڈال دی تھی اور اس نے انہیں Preustrate کیا تھا اور سمندر کے کنارے جانا چھوڑ دیا تھا۔

لیکن اب اسے ایک ویرانی سی محسوس ہوتی تھی، ویرانی، ویرانی، ویرانی، وہ اسکول جاتی، لڑکیوں کو پڑھاتی اور ایک اکتاہٹ سی اُس پر اُمڈی چلی آتی۔ اس کے گرد ہر شے بے خبر ہو گئی تھی، ہر شے نے اپنی دلکشی کھو دی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ زندگی کے لئے ایک ناگوار مشقت کر رہی ہے۔ وہ گھر میں رہتی اور یہ تین کمرے اُسے بالکل تنہا معلوم ہوتے، یہ تین کمرے، ان کے مجسم وجود میں سے کوئی چیز زائل ہو گئی تھی، وہ چیز جو انہیں زندہ رکھتی تھی، وہ چیز جو ان کے اور سیما کے درمیان رشتہ تھی۔ اس کی دلچسپی ان میں سے تفریق ہو گئی تھی۔ ورمن گھر میں ہوتا تو وہ اس سے الگ الگ رہتی، ورمن کا باہر جانا بھی اُسے پسند نہ آتا، ورمن سے رقابت بڑھ رہی تھی۔ لیکن اس کا اپنا وجود خود اُس میں اکتاہٹ پیدا کر رہا تھا۔

پچھلے دنوں وہ بے چینی اور بے کلی جو وہ محسوس کیا کرتی تھی، دب گئی تھی، اب وہ پھر اُبھرنے لگی۔ اُسے پھر وہی انتظار کا سا اضطراب ہوتا تھا۔ اپنے جذبات پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ دن طویل ہو گئے تھے اور دن ڈھلنے کے ساتھ ساتھ وہ پھر اپنے تصور میں خود کو اس سحر کے زیرِ اثر محسوس کرنے لگی تھی۔ نیچے اس کی روح کی تہہ میں خود کو اس سحر کے سپرد کر دینے کی آرزو تھی، وہ اس ویرانی سے اس سحر کے دُھند میں پناہ چاہتی تھی ملائم، ڈھکتے ہوئے، غالب دھند میں۔

اپنے ادراک میں وہ خود اپنے خیالات سے جھگڑنے لگی۔ وہ کیوں ان تین کمروں میں محبوس ہے، تمام دنیا اور زندگی سے منقطع ہو کر ان تین کمروں میں اور اب اس نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اس کے گھر میں رہنے کا نتیجہ کچھ نہیں۔ اس کے باہر نہ جانے سے ورمن پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ جیسے اس کی ورمن کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں اس کی برداشت کا کوئی خیال نہیں، کیوں___؟ وہ اسی کے لئے بنائی گئی ہے وہ عورت ہے۔ مگر عورت اس کے لئے کیوں بنائی گئی ہے، یہ مردوں کی خود غرضی ہے، یہ مردوں کی دنیا ہے، وہ گھر سے باہر جانا بند کر دیتی ہے لیکن "ان" پر کوئی اثر نہیں ہوتا، ان کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی، اُسے محسوس ہونے لگا کہ اس نے ورمن سے جنسی علیحدگی اختیار کر کے بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ اُسے اس بات کا تاسف نہ تھا۔ لیکن___ کتنی غیر اہم ہے وہ، وہ کیا کر سکتی ہے، وہ کچھ نہیں کر سکتی، وہ صرف ایک عورت ہے۔

لیکن اس میں جو عورت تھی وہ ان حالات کے بر خلاف ہو گئی۔ وہ کس بات میں اس سے کمتر ہے، اگر ہے بھی تو ورمن کو اسے زندگی سے علیحدہ رکھنے کا حق ہے، حق! وہ حق پر مصر تھی، ایک عورت کے حق پر، ایک اِنسان کے حق پر۔

اور اب یہ ویرانی، یہ کسی چیز کی آرزو جو نہیں ہے، کچھ بھی نہیں ہے، ہر ایک چیز کی دلکشی مُردہ پڑ چکی ہے، ہر شے ایک Decay میں پڑی ہے، ہر ایک شے پر سے خزاں گزر گئی ہے، اُسے اپنے اندر خزاں کا ایک مادی احساس ہوتا تھا، وہ اسے اپنے دل میں محسوس کرتی تھی، خزاں۔

اور اپنے گرد خزاں کے اس دائرے سے باہر آنا چاہتی تھی۔ وہ باہر آ گئی۔

سمندر آج ساحل سے پیچھے گیا ہوا تھا، دھند نکا ہو چلا تھا، وہ دیر سے آئی تھی۔ سمندر کا شور فاصلے پر سنائی دیتا تھا اور زیادہ صاف اور زیادہ سنسان تھا۔ فضا میں سے دن کی روشنی غائب ہو چلی تھی اور چاندنی واضح ہوتی جا رہی تھی۔ سیما بنچوں کے سہارے چلتی رہی، سمندر دور چلا گیا تھا، اور کنارے پر ٹہلنا بیکار تھا! اور وہ بنچوں کے قریب ٹہلتی رہی، اس کونے سے اُدھر تک ادھر سے اس کونے تک۔ اکثر بنچ خالی پڑے تھے۔ ایک سناٹا سا تھا، جسے اس نے ایک مبالغہ آمیز حد تک گہرا محسوس کیا۔ یونہی اُسے معمولی سا خیال آیا کہ شاید وہ یہاں پھر مل جائے۔ اپنے دل میں وہ اس سے ملنا چاہتی تھی، اپنی روح میں اُسے ڈھونڈ رہی تھی۔ لیکن اکثر بنچ خالی پڑے تھے۔ سناٹا گہرا ہو رہا تھا،

ہوا بند تھی اور سمندر دور چلا گیا تھا۔ ہر شے خود کو اس سے چھپائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ گھر سے باہر بھی ہر شے خالی تھی۔ اس نے گرد و پیش سے علیحدہ ہونا چاہا اور وہ بینچ پر بیٹھ گئی۔ دن کی روشنی چاندنی میں جذب ہو گئی تھی۔ اس کے قریب چاندنی روشن تھی لیکن اس سے دُور جاتی ہوئی مٹیالی ہوتی گئی تھی۔ ایک سفید سی دھند چھائی ہوئی تھی، سمندر پر ہر جگہ اندھیرا تھا، روشنی تھی۔ چاند جیسے ایک مُردہ دنیا پر چمک رہا تھا۔ لیکن اس نے چاند کو نہیں دیکھا، اس کی روح پر ایک بار سا تھا، وہ نیچے جا رہی تھی۔ نیچے وہ ایک عجیب سی یاس سے ہم آغوش تھی اور ہر شے پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

دیر تک وہ بینچ پر بیٹھی رہی، ایک خیالی دیوانے پن کی سی حالت میں اور غیر متوجہ شعور میں سمندر کا شور سنتی رہی۔ اب فاصلے پر سمندر کی سمت ایک روشنی چمک رہی تھی، سمندر کی موہوم سطح سے ادھر ایک آدمی کا سلہوٹ اپنے ہاتھ میں لالٹین لئے ادھر آ رہا تھا۔ اس نے سلہوٹ کی موجودگی کو نظر انداز کر دیا اور لالٹین قریب آتی گئی۔ بیرونی تاریکی سے روشنی اس کے شعور میں گھسی آ رہی تھی، بیرونی تاریکی سے روشنی اس کے شعور میں گھستی آئی اور وہ ہوشیار سی ہوتی گئی۔ آنے والا سلہوٹ اُدھر خشکی پر آ گیا تھا، اس کے ہاتھ میں لٹکتی ہوئی لالٹین ہل رہی تھی، روشنی کا سایہ کنارے کی ریت پر حرکت کر رہا تھا اور وہ روشنی کا وجود ریت پر گذرتا ہوا سڑک پر چلا گیا اور سیما نے جانا کہ وہ یہاں ہے، دھندلکے میں، اور اُسے جانا ہے، وہ اٹھ کھڑی ہوئی اُسے جانا ہے، وہ جانے لگی۔

سمندر سے بازار جاتی ہوئی سنسان سڑک پر برقی بتیوں کی قطار چلی گئی تھی۔ شیڈ میں روشنیاں منجمد ہو گئی تھیں۔ ساکت، غیر متحرک، جامد روشنیاں، سڑک پر لائٹ کے دھبے تھے اور اُن کے گرد تاریکی، اندھیرا روشنی سے زیادہ تھا، روشنی اندھیرے سے کم تھی۔ وہ جا رہی تھی۔ وہ آ رہا تھا اور روشنی کے دو دھبوں کے درمیان اندھیرے میں وہ ایک دوسرے کے پاس سے گزرے۔

"سیما دیوی"

سیما کے سینے میں دل رک گیا، وہ کھڑی تھی۔

اب وہ قریب آ گیا تھا، اس نے پوچھا۔ "آپ واپس جا رہی ہیں۔"

سیما کہہ نہ سکی وہ جا رہی ہے، صرف کہہ نہ سکی۔

جاتے جاتے مجھے شبہ ہوا تھا کہ یہ آپ ہیں۔ آپ تھوڑی دیر ٹھہریں گی نہیں۔"

"چلیے۔" سیما نے کہا، ایک تیسری طاقت کے زیرِ اثر جو نہ اس کی اپنی تھی اور نہ اس نوجوان کی، اور وہ واپس ساحل پر گئے۔

سمندر کئی روز سے آگے گیا ہوا ہے۔" اس نے کہا۔ "میرا خیال ہے۔ ہم اس خشکی پر سے گذر کر کنارے پر چلے چلیں۔" اور اُس نے سیما کے جواب کا انتظار نہ کیا جیسے اُسے معلوم ہو کہ وہ انکار نہیں کر سکتی اور سیما اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔ یہ یا اس کی اپنی طاقت کا اثر تھا یا اس نوجوان کا اثر یا دونوں ہی تھے اور وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔

"جب سے چاند بڑا ہونا شروع ہوا ہے میں اب رات کو آتا ہوں۔" وہ کہہ رہا تھا۔ "آپ نے تو اب آنا ہی چھوڑ دیا۔ ایک ہفتے تک مجھے محسوس ہوا کہ میں روز آپ کا انتظار کرتا ہوں، اور مجھے اپنے اوپر تعجب ہوتا تھا کہ میں یہ انتظار کیوں کرتا ہوں۔ میں نے سوچا تھا کہ شاید آپ چلی گئی ہیں، لیکن پھر بھی مجھے امید تھی کہ آپ یہیں ہیں اور مجھے پھر ملیں گی۔"

سیما خاموشی سے اس کے ساتھ چلتی رہی۔ وہ کیا کہے، اس کے اندر کہنے کو کچھ نہیں تھا، وہ خالی تھی، لیکن وہ کچھ کہتا رہا۔ اس کی مکمل موجودگی کا احساس سیما کو پھر سے متاثر کرتا جا رہا تھا، وہ پھر اپنی طاقت کو کھو کر کمزور ہو رہی تھی، وہی ایک نرمی کا تاثر اس کے ہوشیار شعور کو ڈھک رہا تھا۔

"آج کل میں رات کو دیر تک یہیں بیٹھا رہتا ہوں' گھر میں خود کو اکیلا محسوس کرتا ہوں لیکن یہاں اس سناٹے میں مجھے تنہائی محسوس نہیں ہوتی۔ پھیلی ہوئی سی جگہ میں اکیلا ہونے پر بھی وحشت نہیں ہوتی لیکن گھر میں ہمیشہ ایک جلاوطنی سی محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے تعجب ہوتا ہے کہ عورتیں کس طرح ساری عمر گھروں میں رہ کر گزار دیتی ہیں۔"

"انہیں گھروں میں رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔" سیما نے آہستہ سے کہا۔

وہ رک گیا اور سیما جیسے خاموشی میں گرنے لگی' پھر وہ بولا۔ "اگر انسان کی فطرت میں عادت نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ شاید اس وقت زندگی کی شکل ہی بدل جاتی' یا یوں کہئے کہ زندگی کی کوئی شکل ہی نہ ہوتی یا اتنی شکلیں ہوتیں اور وہ اتنی جلدی جلدی بدلتی رہتیں۔ عادت نے زندگی کو بالکل ساکت کر دیا ہے' ورنہ زندگی اتنی اکتا دینے والی نہ ہوتی' نہ اتنی یکساں۔ خیال کرو کہ اگر انسان کی فطرت میں عادت نہ ہوتی تو زندگی کی رفتار کتنی تیز ہو جاتی۔"

وہ ہنس پڑا۔ لیکن بہت آہستہ سے' جیسے یا تو وہ خود اپنی آواز کے سحر میں ہو' یا اس سحر سے واقف ہو اور اس کے دائرے سے باہر نہ جانا چاہتا ہو۔ جیسے اُسے ایک ڈر ہو کہ ایک اُونچا قہقہہ سحر کے دائرے کی قوس کو توڑ دے گا۔ اس کے ہنسنے نے سیما کو متحرک سا کر دیا' جیسے پانی کی سطح پر چند بوندیں پڑ جائیں' لیکن پانی کی سطح پھر ساکن ہو گئی تھی اور وہ چلتی رہی وہ کنارے پر آ گئے تھے۔ یہاں زمین زیادہ نمدار تھی اور نرم زمین پر پاؤں رکھتے ہوئے اُسے وہی ایک گداز سا احساس ہو رہا تھا۔ اس کا اور اک پگھل رہا تھا اور گردو پیش کا احساس ایک ملائمت کی سی کیفیت لے کر اس میں سمایا جا رہا تھا۔ سمندر کا شور گداز اور شفقت آمیز تھا' جیسے اس کا ذہن بہت ملائم ربڑ کا بنا ہوا ہو اور سمندر ربڑ کے ساحل سے ٹکرا رہا ہو۔

وہ کنارے پر پہنچ گئی۔

یہاں تک آتے آتے وہ خاموش ہو گیا تھا' لیکن اس کی خاموشی عجیب تھی۔ کسی دوسری شے سے حاملہ تھی۔ چپ ہو کر وہ کنارے پر سمندر کے جھاگوں کو پھیلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ جن کی سفیدی چاند کی روشنی میں بکھر جاتی تھی۔ اس کی آنکھیں آگے آگے' ساحل کے کنارے کنارے ان جھاگوں کو دیکھتی رہیں۔ لہر لہر سے ٹکراتی تھی اور کنارے پر جھاگ بکھیر جاتی تھی' صرف ان سمندری جھاگوں کو چاندنی نے سفید کر دیا تھا اور باقی ہر شے دھندلی تھی' وہ ان جھاگوں سے الگ کچھ اور سوچ رہا تھا اور سیما اپنی حالت سے ناواقف اس کے قریب کھڑی رہی۔ اس کے پاس تھی اور ہر شے ساکن ہو گئی تھی۔ لیکن اس سکون سے نیچے یا اس سکون کے پار ایک دوسرا متحرک احساس تھا اور اس احساس نے سیما کو ڈھک لیا تھا۔ وہ اس احساس کے تحت میں کھڑی رہی جیسے عمیق عمیق روح کی عمیق گہرائی میں وہ کسی چیز کا انتظار کر رہی ہو' وہ کسی چیز کا انتظار کر رہی تھی۔

"آپ بیٹھیں گی؟" اس نے پوچھا اور کنارے سے ہٹ کر گیلی ریت پر اپنا کوٹ بچھا دیا۔

"بیٹھ جاؤ" اس نے کہا' اس کی آواز میں دور دراز تحکم کی ایک طاقت تھی اور سیما بیٹھ گئی اور وہ خود بھی بیٹھ گیا۔ سیما اپنی آواز سے محروم تھی' وہ کچھ چاہ رہی تھی اور اپنی روح میں اس سے ڈر بھی رہی تھی اور بولنے کی طاقت سے محروم ہو گئی تھی۔ وہ عجیب ڈھنگ سے خاموش تھا' اس کی خاموشی خاموشی کائنات میں جو صوتی حرکت تھی وہ سیما کی توجہ کے دائرے سے باہر ہو گئی تھی۔ پھر آہستہ سے اس نے سیما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا' اور سیما نے ایسا ہونے دیا وہ جیسے پیار سے سیما کی ہتھیلی پر اپنی انگلی سے لکیریں سی بنا رہا تھا۔ صلیب کے سے نشان وہ کچھ کہہ رہا تھا' سیما سن رہی تھی' لیکن وہ سن نہیں رہی تھی اُسے معلوم نہ تھا وہ کیا کہہ رہا تھا۔ سیما کو صرف اس کی آواز کا احساس تھا بلکہ اس سے بھی آگے صرف اس آواز کے تاثر کا' اور اس میں الفاظ نہیں تھے' الفاظ سے جدا وہ صرف اس سحر کے زیر اثر تھی اور ہاتھ کا یہ لمس ایک معمول تھا' یہ اس سحر کی ایک مادی صورت تھی جس کے سپرد وہ خود کو کر دینا چاہتی تھی' یہ لمس اس سحر اور

سیما کے درمیان میں ایک رشتہ تھا' پھر اس کا بازو سیما کی کمر کے گرد آگیا اور سیما نے روکا نہیں' وہ اپنی عملی طاقت سے مستعفی ہو گئی اور اس کے بازو کا دباؤ سیما کو قریب لاتا گیا' وہ سحر اُسے چھو رہا تھا سحر اُسے اپنے آغوش میں لے رہا تھا وہ آغوش میں آگئی اس کے جسم کا ہر عضو ڈھیلا ہوتا گیا۔ اس کے تمام وجود نے خود کو چھوڑ دیا اور سیما اس کے آغوش میں پڑی رہی۔ وہ اگر اسے چھوڑ دیتا تو وہ گر پڑتی۔ لیکن وہ سیما کو اپنے بازوؤں میں لئے رہا اور خاموشی کے لمحے اس Contact میں جذب ہوتے گئے اور سیما نے اس کے ہاتھ کو اپنے سینے پر محسوس کیا۔ جیسے وہ اپنے ہاتھ سے ایک بلی کی ملائم سمور کو برش کر رہا ہو اور اس کے ہاتھ کے نیچے سیما نے خود کو ایک بلی مانند محسوس کیا' ایک مسحور بلی مانند اس کی تمام توجہ اپنے سینے پر سمٹ آئی۔ وہ اپنے آپ سے غافل تھی' اس سے بھی غافل تھی' اُسے اپنے سینے کا احساس تھا' صرف اس لمس کا جو اس کے سینے اور اس سحر کے درمیان تھا' وہ آہستہ آہستہ اس کے سینے پر ہاتھ پھیر رہا تھا' اس کی چھاتی کو اپنی انگلیوں کے نرم دباؤ سے محسوس کر رہا تھا۔ وہ غافل تھی اور اس کے لب سیما کے لبوں پر رکھے تھے اور وہ غافل تھی' اور ____

جب وہ گھر پہنچی تو اب تک اس سحر کے اثر میں مبتلا تھی۔ اس کی روح کو چھید کر کوئی چیز اس کے اندر داخل ہو گئی تھی اور اُس نے اُسے لاعمل اور (سیم میو) کر دیا تھا۔ اُس نے اپنے شعور کو اور اپنے عمل کو دوسرے ہاتھوں میں سونپ دیا تھا۔ اُن ہاتھوں کی طاقت' ان میں بہت' بہت' بہت زیادہ کچھ تھا جس کے خلاف وہ کھڑی رہ سکتی تھی' اور اس نے خود کو فیل کر دیا تھا اور ابھی تک اس سحر کے غالب اثر میں مبتلا تھی۔

لیکن اب مکان کا دروازہ بند تھا۔ بند دروازے کے آگے کھڑے ہوئے اُسے محسوس ہوا کہ دیر ہو گئی ہے' دیر ہو گئی تھی اور دیر کا احساس اُسے پورے شعور کی ذلیل حالت میں لاتا گیا ____ گررر' گررر' وہ گھنٹی بجا رہی تھی اور گھنٹی کی آواز اُس کی روح کو جھنجھوڑ رہی تھی۔ ایک تقصیر کا سا احساس لیے ہوئے' خوف زدہ سی۔

گررر گررر' گررر گررر' گررر گررر ____

کوئی آ رہا تھا۔

دروازہ کھل گیا۔ ورمن اندر کھڑا تھا۔ وہ ورمن کا سامنا نہ کر سکی' بالکل وہ ایک قصوروار کی طرح اندر آگئی ورمن مڑ گیا تھا اور اندر آ کر سیما نے دروازہ بند کر لیا' بالکل آہستہ سے کہ شور نہ ہو' وہ آواز سے خوف زدہ تھی' اور اچانک کلاک نے گھنٹا بجایا اور وہ چونک پڑی اور ایک' دو' تین...... کلاک گیارہ کے گھنٹے بجاتا رہا اور وہ گھنٹوں کی آواز پر قدم رکھتی ہوئی اندر چلی گئی' گیارہ بج گئے تھے۔

"کہاں تھیں؟" ورمن نے سنجیدہ درشتی سے پوچھا۔

"سمندر کے کنارے" سیما نے آہستہ سے جواب دیا۔

"وہاں نہیں تھیں تم' میں خود تمہیں وہاں دیکھ آیا ہوں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم کہاں تھیں۔"

"وہیں تھی۔" اس کی آواز قصوروار تھی۔

"جھوٹ بولتی ہو۔ مجھے تم پر بالکل یقین نہیں' تمہارے منہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تم ____ کہاں تھیں تم؟ تمہیں اپنی عزت کا خیال ہے نہ گھر کا یہ رات کے گیارہ بجے تم سمندر کے کنارے تھیں۔ شرم نہیں آتی جھوٹ بولتے ہوئے۔ کل سے تم نہ سمندر کے کنارے جا سکتی ہو نہ کہیں اور تمہیں جہاں جانا ہے میرے ساتھ جاؤ۔"

"کیوں؟" سیما نے حفاظت نفس کے سے جذبے سے کہا۔

کیوں کہ میں جانتا ہوں تم کیا کرنا چاہتی ہو اور میں تمہیں اپنے چہرے پر سیاہی نہیں پوتنے دوں گا۔ کل سے تمہارا سکول جانا بھی

بند ہے۔ تم کہیں اکیلی نہیں جا سکتیں۔"

لیکن میں خود اپنے آپ کو سپورٹ کرنا چاہتی ہوں، میں تم سے کچھ نہیں چاہتی، کچھ نہیں چاہتی۔"

"تم میری بیوی ہو۔" ورمن نے زور سے کہا۔

اور الفاظ براہ راست سیما کے لاشعور سے آئے ____

لیکن میں اس سے محبت کرتی ہوں، محبت کرتی ہوں، محبت کرتی ہوں" ____

"سیما!"

اور اُس نے اپنے ہاتھوں میں منہ چھپا لیا اور رونے لگی۔

کلوا

سید رفیق حسین

منہ پر پسینہ 'گالوں پر سرخی' کوٹ کے بٹن کھلے وئے۔ قمیض کے دامن اور ہاتھ پر روشنائی کے دھبے 'ازار بند پیروں تک لٹکا ہوا' ایک بغل میں کالا بستہ اور دوسری بغل میں کالا کتے کا پلا۔ مٹن گھر میں داخل ہوا۔ اماں نے چیخ ماری۔ "اے ہے میں مر گئی۔" سنگر مشین نے گنگنانا بند کر دیا۔ ماں کا ایک ہاتھ مشین کے ہنڈل پر تھا دوسرا ماتھے پر! وہ ساکت بچے کو دیکھ رہی تھی۔ چہرے پر ہلکی مسکراہٹ اور گہری محبت نمایاں تھی۔ لڑکے نے چھوٹے سے گھر میں ایک طرف سے دوسری طرف گردن گھما کر دیکھا اور بھاری آواز بنا کر بولا۔ "اماں ہم اسے پالیں گے۔"

ماں نے ماتھے سے ہاتھ ہٹا کر پلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اسے خدا کے لئے گود سے تو پھینکو۔" کچھ خفگی کی آواز میں۔ "سارے کپڑے نجس کر لئے پھینکو اسے۔ تمہارے ابا آتے ہوں گے۔"

لڑکے نے جلدی سے پلے کو زمین پر رکھ دیا۔ پلا تین انچ کی دم ہلا ہلا کر مٹن کے جوتوں پر لوٹنے لگا۔ ماما نے باورچی خانہ سے گردن باہر نکال کر ناک پر انگلی رکھ کر ہنستے ہوئے کہا۔ "بیوی دیکھئے تو موا کیسا پیروں میں لوٹ رہا ہے۔" دو برس کی لڑکی تخت کے پاس سے صحن کی طرف بڑھی۔ ماں چلائی۔ "لو یہ بھی چلیں' اب گھر پھر گندا ہو گا۔ مٹن تم یہ کیا مصیبت لے آئے!"

مٹن نے کہا۔ "بٹو کاٹ کھائے گا ادھر نہ آنا۔"

ڈیڑھ گھنٹے بعد مٹن منہ دھوئے' صاف کپڑے پہنے' اُجلے بنے' چارپائی پر بیٹھے تھے۔ صرف سیدھے ہاتھ کی اُنگلیوں پر ہلکے نیلی روشنائی کے نشان ابھی تھے۔ سامنے مرادآبادی تھالی میں دو بسکٹ تین جلیبیاں اور ایک پیالی دودھ تھا۔ جس پر تین مکھیاں مشغول تھیں۔ خود کتے کی طرف مشغول تھے۔ کتے کا پلا صحن کے دروازے کے سامنے کھٹولے کے پائے میں دھجی سے بندھا ہوا ایک ہڈی میں پوری طرح مشغول تھا۔ ماں نے توریاں چھیلتے ہوئے کہا۔ "اب ناشتہ کر لو۔ یہی تو بات بُری ہے۔ مکھیاں بھنکار رہی ہیں۔ دیکھو دودھ میں مکھی گر جائے گی۔"

"اماں اس سے ہڈی چھٹتی تو ہے نہیں۔ بسکٹ دیدوں۔" یہ کہا اور لڑکا بسکٹ لیکر اُٹھنے لگا۔

ماں نے کہا۔ "چلے پھر چھونے کو۔ ارے تم کھا تو لو' میں اور......."

گھر میں آہستہ سے مالکِ خانہ داخل ہوئے۔ سیاہ ٹوپی' سیاہ فریم کی عینک۔ سیاہ تکونی داڑھی۔ سیاہ شیروانی۔ سیاہ چھڑی ہاتھ میں اور سیاہ

جو تا پیر میں۔ کھٹولے کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔ بیوی تلی ہوئی جائے کی ٹرے میں سے چائے دان لیکر باورچی خانہ کی طرف چلیں۔ لڑکا وہیں دبک کر بیٹھ گیا۔ سر جھکا کر دودھ میں بسکٹ توڑ توڑ کر ڈالنے لگا۔ میاں نے جھنجھلاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "یہ کیا ہے جی؟ کون لایا اسے؟"

بیوی چائے دان ہاتھ میں لئے باورچی خانے کے سامنے رُک گئیں۔ مسکرا کر بولیں۔ "اے موا! یوڑھی میں آ گیا تھا۔ کوں کوں کر رہا تھا۔ دیکھ کر ترس آ گیا۔ کیسا پیارا ہے۔ میں نے باندھ لیا۔"

میں نے لاحول کو قرات سے ادا کر کے کہا۔ "بھگے گا تو؟"

"بھنگن اُٹھائے گی۔"

"موتے گا جو؟"

"تولوٹے سے دھویا جائیگا۔ آؤ چائے پی لو۔"

"بچے جو چھوئیں گے؟"

بیوی اب باورچی خانہ میں تھیں اس لئے کوئی جواب نہ ملا۔ منّن کا سر البتہ پیالے کی طرف اور جھک گیا۔ میاں نے کمرے میں جا کر اپنے سوا باقی تمام چیزیں ایک ہی کھونٹی پر لٹکا دیں۔ دوسرا قمیض اور پاجامہ پہن کر منہ دھویا۔ تولیہ سے رگڑ رگڑ کر داڑھی کو پونچھا اور چائے پینے کو بیٹھ گئے۔ بیوی پاس بیٹھ کر مکھیاں جھلنے لگیں اب پھر میاں بولے۔ "کیا نجاست پھیلائی ہے پھکواؤ باہر!"

بیوی نے بگڑ کر کہا۔ "بس تم کو تو ایک بات کی دھن ہو جاتی ہے۔ ہمارا کیا لیتا ہے۔ پڑا ہے بچے کھیلیں گے!"

"ہاں یہ انہی حضرت کا شوق ہو گا؟"

حضرت تینوں جلیبیاں، آدھا بسکٹ اور تھوڑا سا دودھ چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور سیدھے زینے میں گھس کر چھت پر پہنچ گئے۔

کالا پلا آٹھ دن اس گھر میں مہمان رہا۔ دو دن صحن میں جہاں دو دفعہ میاں نے گود والے لڑکے کو اُسے چھوتے دیکھا۔ پھر پانچ دن ڈیوڑھی میں، جہاں ایک دفعہ اسکی رسی پیروں میں پھنسی اور دوسری دفعہ یہ خود اُن کے پیروں میں آ گیا۔ آخر یعنی آٹھویں رات اس کو کوٹھے پر بسر کرنی پڑی۔ یہاں اُسکو ماں کی یاد نے ستایا۔ یہ یادِ ماضی پر چیخیں مارتا رہا اور میاں، بیوی کو بھنبھوڑتے رہے اوپر اور نیچے دونوں جگہ رت جگا رہا۔

دوسرے دن گیارہ بجے کالا پلا صدائے احتجاج بلند کرتا رحیمن بوا (ماما) کے پیچھے گھسٹتا ہوا نخاس کی چوڑی سڑک پر پہنچ گیا اور سڑک کے سپرد کر دیا گیا۔ پانچ منٹ کے بعد ایک موٹر نے غیں۔ غیں کرنا شروع کی۔ ایک بڑے لڑکے نے ہنستے ہوئے لپک کر اُسے ایسی ٹھوکر ماری کہ یہ گیند کی طرح لڑھکتا ہوا ایک نالی میں جا گرا۔ موٹر ایک دفعہ اور غیں کر کے چل دیا۔ لیکن کالا پلا عرصے تک ٹیاؤں! ٹیاؤں کرتا رہا۔

نالی میں کیچڑ اور پانی صرف اتنا ہی تھا کہ اس کے پنجے ڈوبے ہوئے تھے۔ لیکن نالی اُس کے واسطے کافی گہری تھی۔ جس میں سے وہ نکل نہ سکتا تھا۔ اس نے چار چھ زبان کی سڑاپوں سے کچھ پانی پیا اور پھر نالی پر چڑھنے کو اگلے پیر اُٹھا کر نالی کی دیوار پر رکھے۔ تین دفعہ کوں کوں کی اور پھر پیر نیچے کر کے چل دیا۔ آٹھ قدم چل کر پھر اُس نے وہی کوشش کی اور کوں کوں کر کے پھر چل دیا۔ گلے کی رسی پیچھے گھسٹ رہی تھی۔ یہ ایسی ہی کوششیں کرتا چلا جا رہا تھا کہ ایک قصائی کے لڑکے کی اس پر نگاہ پڑی۔ ایک ہاتھ میں بستہ اور بغل میں تختی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں مٹی کی دوات اور سینٹھے کا قلم۔ صرف پیر آزاد تھے۔ چنانچہ اس نے ننگا پیر لٹکا کر اس کی مدد کرنا شروع کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی دیر میں پلا کیچڑ میں لت پت ہو گیا۔ اتنے میں قصائیوں کے دو لڑکے اور آ گئے۔ کچھ دیر وہ اُسکا تماشہ دیکھتے رہے۔ پھر ان میں سے

ایک نے جھک کر اس کی رسّی کا سر پکڑ لیا اور ایک ہی جھٹکے میں اسے اور اس کی رسّی کو نالی سے باہر نکال دیا۔ رسّی پر لپٹی ہوئی کیچڑ کے چھینٹے اُڑے۔ ایک کی آنکھ میں اور دوسرے کے کھلے ہوئے ہنستے منہ میں کیچڑ نے اپنا مزہ چکھایا۔ چنانچہ تینوں لڑکوں میں آپس میں ماں اور بہنوں سے متعلق شستہ گفتگو شروع ہو گئی۔ کالے پلّے نے محبت بھری نگاہوں سے اُس لڑکے کو دیکھا جو جھکا ہوا اپنے ہاتھ کی کیچڑ سڑک پر پھینک رہا تھا اور اپنے ساتھی کو گالی کے جواب میں گالی برابر لوٹا رہا تھا۔ پلا دُم ہلاتا ہوا اس کی طرف چلا۔ اب اس نے پلّے کو غور سے دیکھ کر کہا۔ "شیرا ہے شیرا۔" پھر اس نے رسّی کے سرے کو پیر سے زمین پر رگڑا اور اُٹھا لیا۔ "آؤ شیرا آؤ!" کر کے رسّی تانی۔ شیرا نے تین چار پھدکیاں اس کی طرف بھریں۔ اب لڑکا بھاگنے لگا۔ دو چار قدم شیرا نے ساتھ دیا پھر گھسٹنے لگا۔ جب پیر چھلنے لگے تو پیں پیں کر کے چت ہو کر ہی گھسٹنا بہتر سمجھا۔ باقی دونوں لڑکے اسکے پیچھے پیچھے تھے۔ گلی کے نکڑ پر مونڈا بچھائے پہلوان بیٹھے تھے۔ انہوں نے لونڈوں کو ڈانٹ پلائی۔ "ارے تمہارا ایسا ویسا لونڈو کیا کرتے ہو۔ چھوڑو پلّے کو۔" لونڈے پلّے کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ پلا تین انچ کی دُم ٹانگوں میں دبائے سر زمین سے لگائے پہلوان کی طرف بڑھا۔ پہلوان نے پیر سے دو تین دفعہ اسے لڑھکا کے گلی کے اندر کر دیا اور خود بے فکر ہو کر پھر مونڈھے پر جا بیٹھے۔ وہیں پر چار دو کانوں میں کہار رہتے تھے۔ ایک کہاری بیٹھی لوہے کی کڑھائی مانجھ رہی تھی۔ پلا اس کے پاس اسی حالت سے سر زمین سے ملا دُم پیروں کے اندر 'کوں کوں' کرتا گیا۔ کہاری نے کہا۔ "دھو دھو۔"

ایک تیرہ برس کی دبلی میلی کہار کی لونڈیا نے برابر کی دوکان سے چھلانگ ماری اور پلّے کو اُٹھا لیا۔ لیکن فوراً ہی رام رام کہہ کر زمین پر رکھ دیا۔ دونوں ہاتھ دیوار پر رگڑ کر دوکان میں گئی۔ ایک لٹیا پانی لائی اور اسے غسل دیا۔ پلّے کا یہ پہلا غسل تھا۔ بہت ناپسند آیا۔ ہر طرف بھاگنے کی کوشش کی۔ ناک میں بھی پانی چلا گیا۔ بُری طرح چھینکیں آئیں۔ جب غسل ہو چکا تو وہ کانپ رہا تھا۔ لڑکی نے اس کا بدن ایک میلے چیتھڑے سے پونچھا۔ مٹھے میں بجور کر بھرے کی روٹی کھانے کو دی۔ اسی لڑکی نے اس کا نام کلوا رکھا۔ لڑکی کا خود نام چندو تھا۔

کلوا نے ڈھائی مہینے چندو کے ہاتھ اور پیر چاٹے۔ اس کا یہ زمانہ بڑے عیش میں کٹا۔ لیکن اسی قلیل عرصے میں بھوریا نامی قصائی کے لڑکے نے پہلے تو چندو سے تعشق بڑھایا۔ لیکن جب چندو نے ایک دو مرتبہ بُری طرح جھڑک دیا تو پھر اُس نے بیر بڑھایا اور اب بھی جب بس نہ چلا تو ایک رات جب یہ لوگ گلی میں سو رہے تھے تو کلوا کو کھٹیا کے پاس سے اُٹھا بھاگ گیا۔ پہلے کلوا نے کوں کوں کی پھر ناراضگی کے دانت دکھائے اور آخر میں جب کاٹنے کی کوشش کی تو بیچارے کی تھوتھنی پکڑ لی گئی۔ بھوریا نے اسے بہت دُور بلوچپورہ کے ایک پرانے قبرستان میں لے جا کر قبروں کے بیچ میں ایک بیری سے باندھ دیا۔

کلوا تمام رات سینکڑوں قبروں پر اکیلا نوحہ خوانی کرتا رہا۔ صبح کو ایک لونڈا زمین سے صرف چار انچ اُونچا کرتا پہنے قبروں میں کچھ ڈھونڈتا ہوا آیا۔ کلوا کو دیکھ کر بڑے زور سے چلایا۔ "بابا رے یہ دھرا سالا۔" "بابا" قبرستان کے تکیہ دار فقیر 'مہندی کی قمچی ہاتھ میں لے آئے اور کلوا کہ بہن کو یاد کر کے بولے۔ "رات بھر چلایا گیا۔" اور مہندی کی قمچی سے کلوا کو 'دھنکنا شروع کر دیا۔ لمبے کرتے والا لڑکا کلوا کی واویلا سے بہت محظوظ ہوا۔ ہنسی کے مارے لوٹا جائے۔ یہاں کلوا کی یہ حالت کہ جب پیٹھ میں برداشت کی طاقت نہ رہی تو چت ہو گیا اور پیروں پر قمچیو کو روکنے لگا۔ خدا خدا کر کے قمچی ٹوٹی تو اسکی جان بچی۔

کلوا دن بھر اسی بیری کے نیچے بھوکا پیاسا بندھا ہوا چندو کی یاد میں پڑا رہا۔ دن بھر کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ دُور کچھ عورتوں اور بچّوں کے بولنے کی آوازیں آیا کیں۔ لیکن اس طرف ایک قبر کے لمبے چوڑے تکئے نے آڑ کر رکھی تھی۔ شام کو جب اندھیرا ہونے لگا تو اسی طرف سے کلوا کی تیز ناک نے بھنتے ہوئے گوشت کی خوشبو محسوس کی۔ صبر پر جبر نہ ہو سکا۔ ایک مہین اور لمبی چیخ نکل گئی۔ جب تھوڑی دیر بعد ایک عورت اس کے پاس آئی تو کلوا ڈر کے مارے چت لیٹ گیا۔ دُم پیروں میں سکیڑلی۔ زبان گو پیاس سے لٹکی پڑتی تھی لیکن جلدی جلدی اندر سمیٹ کر ہلکے ہلکے کوں کوں کرنے لگا۔ عورت نے اسے کھولا اور لے چلی۔ کلوا خاموشی سے ساتھ ہو لیا۔ قبرستان کے دوسرے

برسے پھوٹ مختلف قسم کے مکان تھے۔ ایک کوٹھڑی اور ایک مختصر سا دالان۔ ان ہی دونوں میں ان لوگوں کی رہائش تھی۔

وہاں ایک بکری بندھی تھی۔ چار کٹھیاں ایک لائن میں چڑی تھیں۔ ایک عورت اور چھ بچے چٹائی پر بیٹھے تھے۔ گیسو دراز فقیر صاحب مقبرہ کے چبوترے پر اکڑوں بیٹھے گانجے کے دم لگا رہے تھے۔ کلوا نے ہانپتی ہوئی زبان اندر کر کے گانجے کی خوشبو پر غور کیا۔ غالباً بری معلوم ہوئی۔ ناک کی نوک کو ایک دفعہ دائیں اور پھر بائیں طرف جنبش دے کر زبان پھر لٹکا دی اور ہانپنے لگا۔ عورت نے اس کو بھی اسی کھونٹی سے باندھ دیا جس سے کہ بکری بندھی تھی۔ اُس نے جاتے ہی بکری کے کونڈے میں سے پانی چاٹا۔ بکری کو اس دوہری ہتک عزت پر غصہ آگیا۔ اس نے تین چار دفعہ کھریاں جوڑ کر اور سینگ کی نوکیں کلوا کی طرف کر کے حملہ کرنے کی دھمکی دی۔ لیکن کلوا نے ظاہرا اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ اطمینان سے دونوں اگلے پیر آگے پھیلا کر اور پچھلے سمیٹ کر اس چٹائی کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ جب اس چٹائی پر کھانا ہونے لگا تو اس کی ہم کھونٹا بکری نے بھی جگالی شروع کر دی۔ پہلی بوٹی جب کلوا کے پاس آ کر گری تو اُس نے اپنی دُم کو شکریہ کے واسطے دو دفعہ زمین پر مارا۔ تہذیب سے وہیں بیٹھے بیٹھے گردن لمبی کر کے سر بڑھا کر بوٹی کو اُٹھا لیا۔ چونکہ مزے دار تھی دو ہی دانت مار کر نگل لی۔ زبان سے ناک اور ہونٹوں کو چاٹ کر صاف کر لیا اور پھر انتظار کرنے لگا۔ دوسری بوٹی ہوا میں اڑی۔ اُس کے پھیلے ہوئے پیروں کے بیچ میں گردن کے نیچے آ کر رُک گئی۔ دُم کو تین جھٹکے شکریہ کے دے کر کلوا کھڑا ہو گیا۔ بوٹی نرم تھی، ویسے ہی نگل گیا۔ پھر جو ایک ہڈی اُچھلی تو بکری کے پاس گری، یہ جو اس طرف بڑھا تو بکری چونک پڑی۔ چابن نگل کر جگالی کے نئے غلہ کے گردن میں سے چل کر منہ میں آنے کے انتظار میں تھی، کوئی بھلا جانور ایسے موقع پر دخل اندازی پسند نہیں کرتا۔ فوراً سر نیچا کر کے سینگوں کی نوکیں پیش کر کھریاں جوڑ حملہ آور ہوئی۔ معاملہ ہڈی کا تھا۔ معمولی بات نہ تھی۔ کلوا نے بھی جواب دیا۔ "ہڈی" اور پھر "ہم ہم" کر کے دو چھوٹے حملے کیے۔ بکری صاحبہ ڈر گئیں۔ اب جو بھاگیں تو رسّی کو بھی بھول گئیں۔ بس بھاگ پڑیں۔ رسّی تنی جھٹکا کھایا۔ دھم سے زمین پر دراز ہو گئیں۔ کلوا کی جان نے بلا۔ ہڈی اُٹھا دوسری طرف چل دئے۔ جب رسّی تن گئی۔ بیٹھ کر مزے لینے لگے۔ گیسو دراز صاحب نے اُٹھ کر ایک رسّی کے ٹکڑے سے کلوا کو بڑی مار ماری۔

سات دن کلوا کو قبرستان میں پیٹ بھر مار اور آدھے پیٹ کھانے پر گذر کرنی پڑی۔ ایک رات خیال آیا کہ اگر دانتوں کو رسّی پر ورزش دی جائے تو کیا حرج ہے۔ چنانچہ ایک گھنٹے کی متواتر محنت کے بعد ایک عجیب نتیجہ یہ ہوا کہ کلوا آزاد تھے۔

غلامی کا نشان صرف فٹ بھر کا ٹکڑا گلے میں باقی تھا۔ اس کی فکر کلوا کو مطلق نہ ہوئی۔ فوراً ایک طرف روانہ ہو گیا۔ چندو کی یاد اور پیٹ کی خواہش، ان دو اثرات کے تابع اس کے قدم اٹھنے لگے۔ نیم کا سایہ، نیم کی جڑ، تین کچی قبریں، دو پکی قبریں۔ ایک بہت اونچی پکی قبر۔ وہی بیت جھڑی بیری، دو دھنسی قبریں! ایک چھوٹی قبر۔ اس کے برابر ایک بڑی قبر۔ ایک قبر کا خالی گڑھا، قبرستان کی دیوار کا ایک گرا ہوا حصہ۔ سب کو دُم آسمان کی طرف اور ناک زمین کی طرف کئے ہوئے پار کیا۔ دُوسری طرف دیوار سے ملا ایک نیولا کھڑا تھا۔ اس نے اس کو دیکھا اور لپکا۔ اس نے اُسے دیکھا اور بھاگا۔ چار چار چھلانگوں میں یہ اُس کے پاس پہنچ گیا۔ نیولا پلٹ پڑا۔ دُم پھول کر جھاڑو ہو گئی۔ پچھلے پیروں پر بیٹھ کر مقابلہ کو تیار ہو گیا۔ کلوا بھی اگلے دونوں پیر جوڑ کر بدن کو پیچھے تان کر رُک گئے۔ اب غالباً اشاروں میں ایک سے دوسرے نے معافی مانگی۔ وہ اُدھر چل دیا اور یہ اِدھر روانہ ہو گئے۔ پھر وہی دُم آسمان کی طرف اور ناک زمین کی طرف۔ چندو یا غذا دونوں میں سے ایک جس کی بو مل جائے۔

جاتے جاتے پکی سڑک پر ہو لیا۔ عیش باغ کے سامنے پولیس کی چوکی پر پہنچا۔ ایک موٹے کتے نے لیٹے لیٹے غرا کر کہا۔ "ہوں۔" کلوا نے دُم دبائی اور ایک سپاٹا بھرا۔ ایسے ہی چلا جا رہا تھا کہ ایک ہڈی کی بو پائی۔ ٹھٹک کر رہ گیا۔ ناک زمین پر سُوں سُوں کر کے فوراً ڈھونڈ لی۔ دیکھا تو کچھ حصہ اس میں کام کا تھا۔ کھایا اور پھر چل دیا۔ آر۔ کے۔ ریلوے کی چوکی آ گئی۔ ایک بوچے کتے نے لپک کر ان کا راستہ روکا۔ ٹیڑھے کھڑے ہو کر کھیسیں دکھا کر بردباری سے کھینچ کر کہا۔ "کھیسیں۔" کلوا نے بھی کچلیاں دکھا کر کہا۔ "کھیسیں۔" بوچے نے اور گہری آواز گلے سے نکال کر کہا۔ "دیکھیں۔" کلوا نے دانت نکال کر تین دفعہ جھٹکوں سے منہ بنا کر کہا۔ "ہیں۔ ہیں۔ ہیں۔" ایک کتیا اور

آ گئی۔ اُس نے کلوا کو باری باری دونوں سروں سے سونگھا اور پھر بے پروائی سے انھیں چھوڑ کر چل دی۔ جس کے صاف معنی اس کی زبان میں یہ تھے۔ "جانے بھی دو لونڈا ہے" مگر بگڑے دل بوچے کو کب گوارا تھا۔ ہم ہم ہم کر کے اوپر چڑھ بیٹھا ناچار کلوا نے اطاعت قبول کی' چت لیٹ گیا۔

دو مہینے کلوا نے بوچا کی اطاعت میں عیش باغ اسٹیشن سے آغا میر کی ڈیوڑھی تک آر۔ کے آر لائن کے اُوپر چکر لگائے۔ یہی بوچا کے دانتوں اور پنجوں کے زور سے حاصل کردہ جائداد تھی۔ کلوا نے بارہا چندو کی یاد میں اس جائداد کو چھوڑ کر دُور کے سفر کے قصد کئے۔ لیکن ہر دفعہ اس کو ناکامیاب واپس آنا پڑا۔ کیونکہ زمین کا چپہ چپہ کتوں کی جائدادوں میں تقسیم ہوا پڑا تھا۔ جس پر کہ غیر کا قدم رکھنا کتوں کے قانون میں سخت جُرم ہے۔ اگر کسی بڑی جائداد کے تنہا خونخوار مالک سے بچ کر نکل بھی گیا تو دوسری سرحد پر وہاں کے حاکم اور ایک 'دو یا تین جتنے بھی شاگرد ہوئے اُن سے تنہا مقابلہ کرنا پڑا۔ ان ناکامیاب کوششوں سے اُسے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ زخم کھا کھا کر اس کا جسم پکا پڑ گیا اور آداب جنگ کی تمام باریکیوں سے واقف ہو گیا۔

ایک روز کلوا تنہا آغا میر کی ڈیوڑھی کی طرف سے واپس آ رہے تھے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ ریلوے کراسنگ سے کچھ دُور بوچا اُستاد کی لاش لائن پر کٹی پڑی ہے۔ اُستانی پریشان کھڑی اس کو سونگھ رہی ہے۔ کیا کر سکتے تھے سوائے ہمدردی کے۔ خُود بھی سونگھا۔ پاس کھڑے ہو کر اُستانی کا غم غلط کیا۔ وراثتاً جائداد کے مالک تھے۔ اس کا انتظام ہاتھ میں لیا۔ متعینہ غذا جو اس جائداد میں ریل سے گرتی تھی اور چیلوں کے پنجے سے ٹپکتی تھی۔ اب اس کے کھانے والے تین کی جگہ دو ہی منہ رہ گئے۔ ایک ہی مہینے میں اُستانی چربیا گئیں اور ان کے بھی ہاتھ پیروں پر رونق آ گئی۔ لیکن اب استانی کو اُن کا تعشق لونڈھیایا معلوم ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ایک دن کلوا کو اکیلا چھوڑ کر ایک کبرے کتے کے پیچھے نکل گئیں۔ اب یہ تنہا رہ گئے۔ اکیلے کھانے والے اور اکیلے جائداد کی حفاظت کرنے والے۔ پیٹ بھر ورزش تھی اور پیٹ بھر خوراک۔ ایک مہینہ جو اور گذرا تو اب کلوا کی شان ہی نرالی تھی۔ سیاہ چمکدار مخملی کوٹ' لہراتی ہوئی لمبی دُم' گٹھا ہوا بھاری تھوتھنا' ہاتھ اور پیروں پر اُبھرے ہوئے پٹھے۔ بل کھائے ہوئے۔ قد میں بڑے سے بڑا کتا ان کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ چور اور آوارہ گرد کتوں کا ان کو دیکھ کر دم نکلتا تھا۔ اس عرصے میں اس نے اپنی جائداد کو بھی اور وسعت دے لی تھی۔ آغا میر کی ڈیوڑھی کے پلیٹ فارم کی اپنی طرف کی آدھی لمبائی تک قبضہ بڑھا لیا تھا۔ ایک دن اس پلیٹ فارم پر ایک جگہ ایک بُو تھی۔۔ کلوا کا محبت کا بھوکا دل تڑپ گیا۔ یہیں چندو بیٹھی تھی۔

کلوا اس جگہ کو سونگھنے اور منہ اُونچا کر کے خاموش کھڑا ہوا جائے۔ قدرت نے آنسو نہ دئے تھے کہ جاری ہوتے۔ بہت دیر تک یہی کیا کیا۔ پھر ایک دفعہ دُم آسمان کی طرف اور ناک زمین پر' یہ روانہ ہو گیا۔ سینکڑوں ہزاروں ہر طرح کی بوؤں میں چندو کی بُو اس کے واسطے الگ تھی۔ بولیتا بُو ہی بُو چل دیا۔ سکندر اعظم نے ہندوستان آنے تک اتنی مہموں کا سامنا نہ کیا ہو گا جتنی مصیبتوں اور رکاوٹوں کو اس نے بلوچپورے تک پہنچنے میں عبور کیا۔ بیسوں کتوں کو زخمی کر کے خود زخموں سے چور جس وقت وہاں پہنچا رات کا ایک بج چکا تھا۔ گلی وہی تھی' مکاں وہی تھا' دوکان وہی تھی مگر بند تھی۔ اب لوگ اس کے اندر سو رہے تھے۔ دروازے سونگھے۔ چندو کے ماں اور باپ دونوں کی بوئیں تازہ تھیں مگر چندو کی بو بہت خفیف تھی۔ کتے آتے اس پر بھونکتے اور چلے جاتے۔ مگر یہ وہیں بیٹھا رہا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد چندو کی بو سونگھتا رہا جو برابر زائل ہوتی چلی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ صبح چار بجے چندو کی بو گم ہو گئی۔ اُس نے دکان کے سامنے منہ اُٹھا کر رونا شروع کر دیا۔ کاش کوئی انسان کو یہ بتا دیتا کہ چندو اپنے دولھا کے ساتھ دولھن بن کر بانس بریلی گئی۔ مگر کون بتاتا۔ چندو کا باپ ہاتھ میں لٹیا لئے یہ کہتا ہوا نکلا۔ "روئے جات رے کو کر۔"

قصائیوں کے کتے نہ اس کے ایسے تندرست تھے نہ قد آور۔ لیکن کچے گوشت کے کھانے والے بے انتہا خونخوار۔ کلوا کے بھی دانت کھٹے ہو گئے۔ جب کہیں جا کر ان کو گلی اور گلی کے پیچھے تھوڑے میدان پر قبضہ ملا۔ دن رات کا زیادہ تر حصہ یہ چندو کی دکان کے آگے ہی گذارتا۔ جہاں اب اس [illegible] والا کوئی نہ تھا۔ کلوا چندو کے باپ اور ماں دونوں کی مار برابر کھاتا رہا۔ لیکن اُس نے دکان کا دامن نہ چھوڑا۔ یہاں کھانے کو [illegible] مل جایا کرتی تھیں۔ لیکن افسوس دل کی آگ محبت کے چھینٹوں کی طالب بلکے گی۔ کچھ عرصے

جو اُس نے ان دونوں کے علاوہ غیروں سے بھی اشارے کئے اور محبت کے لین دین کا خواہشمند ہوا۔ مگر دل کا سودا کہیں نہ پٹا۔ ایک برس اسی طرح گذر گیا۔ مگر آخر چندو آ ہی گئی۔

بالکل وہی چندو کچھ دبلی اور ہو گئی تھی۔ بچہ گود میں تھا۔ لیکن کلوا کو بھول چکی تھی۔ وہ کلوا سے ڈر گئی۔ انسان کا کلیجہ پھٹ جاتا۔ لیکن کلوا کتا تھا۔ زمین پر بچھ گیا۔ پیٹ کے بل زبان نکال کر پیر چاٹنے کو آگے بڑھا۔ پیر نہ ملے تو زمین چاٹی۔ کہاری کی جو تیاں جب پڑیں لیٹ گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ کہارے نے ڈنڈے جب مارے تو سمٹ کر چلایا۔ لیکن سب لاحاصل۔ اس بڑی چکی کے دونوں پاٹوں میں پتھر کم پستے ہیں اور دل زیادہ۔ آٹھویں دن چندو پھر سسرال چلی گئی۔

آج کالا کتا غیظ و غضب کی تصویر بنا ہوا آوارہ گرد ہے۔ کتے اس کو دیکھ کر ڈرتے ہیں۔ سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔ سیاہ منہ پر آنکھیں لال انگارہ ہیں۔ موٹی گردن پر بال کھڑے ہیں اور دُم بالکل سیدھی پھیلی ہوئی ہے۔

اور آج ہی وہی پیارا بچہ منّن' باپ کی بے تختی اور ماں کی اندھی محبت کے باعث آوارہ ہے۔ اسکول میں جھڑکیاں اُٹھانے اور مار کھانے کے بجائے آج کے دن اُس نے سونی عیدگاہ میں آزادی کی عید منائی ہے۔ اب چار بج چکے تھے۔ منّن عیدگاہ کی چار فٹ اُونچی دیوار پر بیٹھا سوچ میں تھا' دن تو گذر گیا' اب کیا کرے۔ گھر جائے یا نہ جائے' وہاں خبر ضرور ہو گئی ہوگی۔ ننھے سے دل میں دحشت کے چھینٹے چل رہے تھے۔ وارفتہ دل' صحرا نورد کلوا کا گذر ادھر سے ہوا۔ اس کی نگاہ بچے پر پڑی۔

جس طرح انسانوں کے واسطے راتیں تاریک ہوتی ہیں لیکن کتوں کے لئے ان میں سہانی روشنی ہوتی ہے۔ اسی طرح انسانوں کے واسطے صورتیں' آنکھ' ناک' کان اور منہ کا صرف مجموعہ ہوتی ہیں۔ لیکن کتوں کے لئے ان پر خوشی کی چمک' غم کی سیاہی اور محبت کی ارغوانی شعاعیں بھی عیاں ہوتی ہیں۔ کلوا نے دیکھا بچہ اداس بیٹھا ہے۔ لیکن وہ اپنی دُھن میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ دیوار کے نیچے نیچے جہاں وہ جا رہا تھا بچے کی بو رواں دواں تھی۔ اس نے اس بو میں کچھ خصوصیت محسوس کی۔

خیال اور خیالوں کے تحت واقعات کی یادداشت اس کو قدرت نے عطا کی ہی نہ تھی۔ نہ رہا گیا' گھوم کر بچے کو دیکھنے لگا۔

چاروں طرف آگ کا ایک سمندر موجزن تھا۔ جس میں سے لپلپاتے شعلے تا بہ فلک اُٹھ رہے تھے۔ ٹوکری بھر کے ایک بچے کو اس میں پھینکا گیا۔ تو کیا ہوا؟ پلک جھپکی بھی نہ تھی اور وہاں سبزے میں پھولوں کا ایک تختہ تھا' جو خوشبوؤں سے مہکتا تھا۔ اس میں بچہ بیٹھا کھیل رہا تھا۔ یہ قصہ حضرت ابراہیمؑ کا ہے۔ اب جن دماغوں میں عقل کی زیادتی ہو گئی ہے اور اس قصے کو صحیح ماننے سے قاصر ہیں' آئیں ادھر آئیں' میں اُن کو دکھائے دیتا ہوں کہ یہی ہو سکتا ہے' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر' جفاکاری میں بھینسا کتے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ استقلال میں پتھر کی سِل کتے کے آگے گھس جائے گی۔ خونخواری اور دلیری میں جس وقت کتے سے مقابلہ پڑتا ہے تو شیر بھی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ لیکن محبت کی ایک چھوٹی سی چنگاری میں کتا پیروں پر گر پڑتا ہے اور اس وقت وہ حلم' عاجزی' انکساری اور خاکساری ایسی رقیق چیزوں کی جیتی جاگتی تصویر ہوتا ہے۔

منّن اور کلوا میں ایک دفعہ پھر نئے سرے سے دوستی شروع ہوئی۔ اس کی جیب میں بچی ہوئی ایک روغنی ٹکیا اور تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کلوا کو پیش کی گئی۔ انڈا تھا نہ انڈے کی بو اس پر بھی ٹکیہ کلوا کو بڑی میٹھی معلوم ہوئی۔ منّن نے ڈرتے ڈرتے کلوا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ کلوا نے منہ کھول کر محبت کے نشے میں 'عاؤں' کہہ کر انگڑائی لی۔ منّن کھیلتا کھیلتا کتے کو ڈھیلوں کے پیچھے بھگاتا بھگاتا گھر کی طرف آ گیا۔ [illegible] تھی کہ گھر میں اسکول سے بھاگنے کی خبر نہ پہنچی ہو۔ ڈرتے ڈرتے گھر میں گھسا۔ کلوا باہر ہی رہ گیا۔

محبت کی دیوانی ماں نے منہ دھلایا' ناشتہ کھلایا۔ اکنی کنکیا کے واسطے دی۔ دو پیسے کی برف کی قلفی لے دی۔ دو دفعہ باپ کے بے جا غصے اور منّن کی بیچ میں سب [illegible] کے حائل ہو گئی۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی اور منّن سو گیا۔ افسوس اے جاہل ماں تو نے سب کچھ کیا لیکن بچے کے دل کی [illegible] کے دل میں بچہ بن کر گھسا ہوتا ہے۔ وہاں اس کے چھوٹے چھوٹے رنج' ننھی ننھی خوشیاں' معصوم گلے اور شکوے ہوتے ہیں [illegible] کس مپرسی میں چھوڑ دیتی ہیں۔

چھ دن کلوا نے استقلال سے بیٹھے بیٹھے اسکول کے سب تماشے دیکھے۔ ساتویں دن ضبط برداشت سے باہر ہو گیا۔ سیاہ کلوٹے سیر کا جسم ایک جست سے دروازے سے باہر نکلا اور ماسٹر سے تصادم ہوا۔ ماسٹر زمین پر گر پڑا ——— کلوا اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ روتے ہوئے مّن نے جلدی جلدی کتابیں اور بستہ سمیٹا اور سیدھا اسکول سے باہر بھاگا۔ سڑک پر جا "آؤ" "آؤ" کی آوازیں لگائیں اور دوڑ پڑا۔ تھوڑی دیر میں خون آلودہ کان کو جھٹکتا ہوا کلوا بھی مّن سے آن ملا۔ سر اُٹھا کر مّن کا منہ چاٹنا چاہا۔ تو اُس نے سر پر سلیٹ ماری کلوا خوش ہو گئے۔ اچھل کے آگے آگے ہو لئے۔

دوسرے دن بستہ بغل میں لیکر مّن نے پھر عید گاہ کا رُخ کیا۔ کلوا کو اس سے کیا مطلب تھا۔ جدھر وہ چلا اس کے پیچھے ہو لیا۔ واٹرورکس کی دیوار کے نیچے پہنچ کر باہر لٹکی ہوئی املی کی شاخوں کے سایہ میں دونوں بیٹھے۔ مّن نے کوٹ کی جیبوں سے چرائے ہوئے روٹی کے ٹکڑے 'ہڈیاں' اور بوٹیاں کلوا کو کھلائیں۔ اس کے بعد املی پر اُلجھی ہوئی پتنگ پر اینٹ کے ڈھیلے کا نشانہ اُچھالنا شروع کیا۔ کلوا بھی ڈھیلے کی ہر اُچھال پر اُچھلتے تھے۔ لیکن فٹ سوافٹ ان کی حد تھی۔ اس کے بعد عید گاہ میں بسیار ڈھیلے بازی کے بعد ایک کچا کیتھا اُٹھا کر 'تال کٹورے' کا رُخ کیا۔ راستہ میں مّن نے کیتھے کے وہ چٹخارے لئے کہ کلوا کی بھی رال ٹپک پڑی۔ لیکن جب حصہ ملا تو سونگھ کر ہی چھوڑ دیا ؎

آسمان بارِ امانت نتوانست کشید

قرعہ فال بنامِ من دیوانہ زدند.....

جانوروں کو انسٹنکٹ (Instinct) کا مادہ دیا گیا ہے جس میں غلطی کا احتمال ہی نہیں اور ہم کو عقل! جو ہر قدم پر ٹھوکر کھاتی ہے۔

تیسرے دن شام کو جب آوارہ گردی کے مکتب سے مّن گھر واپس ہوا تو اُس نے دیکھا کہ مکان کے آگے اسکول کے تین لڑکے اور ایک ماسٹر کھڑے ہیں باپ دروازے پر کھڑے اُن سے باتیں کر رہے ہیں۔ سر سے پیر تک کانپ گیا اور فوراً واپس لوٹ آیا۔ پھر عید گاہ پہنچا' وہاں پھرتے پھرتے جب شام ہونے لگی تو قدم گھر کی طرف خود بخود اُٹھنے لگے۔ واٹرورکس کے پاس آکر پھر دل میں سٹپے چلنے لگے۔ عقل نے قدم روک دیئے۔ واٹرورکس کی دیوار پر چڑھا۔ اندر بالکل سنسان تھا۔ تھوڑی دور پکے تالاب تھے۔ دیوار سے کود ان کے کنارے پہنچا۔ کلوا بھی کود پھاند کے ساتھ تھا۔ تالاب کے چاروں طرف پکی دیوار تھی۔ جس دیوار کی جڑ تک آگئی۔ مّن نے جھک کر اُسے پکڑنا چاہا۔ پوری جان سے اندر لڑھک گیا۔ کلوا کچھ دُور تھا۔ اس کی ہلکی سی چیخ نکلی اور وہیں سے اُس نے پانی میں چست ماری۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ پاس پہنچے بچہ پانی کی تلی کی طرف روانہ تھا۔ پانی بہت گہرا تھا۔ کئی منٹ کے بعد بچے نے اُچھالا کھایا۔ کلوا کے دھوکا نہ کھانے والے احساس نے اسے بتادیا کہ بچہ کس جگہ اُبھرے گا۔ وہیں پر موجود تھا۔ کلوا نے ڈھال کی طرح اپنا جسم بچے کے سینے کے نیچے کر دیا۔ بچے کے پیٹ میں کافی پانی جا چکا تھا۔ وہ قریب قریب بے ہوش تھا۔ لیکن قدرتاً اس کا ایک ہاتھ بچے کی گردن میں اور دُوسرا پچھلے پیروں میں لپٹ گیا۔

اُفق کی سُرخی گہری پڑتے پڑتے سیاہی میں تبدیل ہو گئی۔ سیاہ آسمان پر جھانک جھانک کر تارے نکل آئے۔ ایک چمگادڑے نے پانی کی سطح پر سراٹا مارا دو بوند پانی منہ میں اُٹھاتا ہوا نکلا چلا گیا۔ دو گھنٹے بعد ایک نیولے نے پچھلے سروں پر کھڑے ہو کر تالاب کو دیکھا اور سمٹ کر سرسراتا ہوا جھاڑیوں میں گھس گیا۔ رات بڑھتی چلی گئی۔ راہِ عدم سے ایک تارہ ٹوٹا اور راہِ عدم میں غائب ہو گیا۔ اب کلوا کا بھی پیٹ پھول چکا تھا۔ جسم میں طاقت نہ تھی یا اپنی ناک سے پانی باہر رکھ سکتا تھا یا بچے کی۔ دل میں طاقت وہی باقی تھی۔ مالک کی ناک اُوپر رہی اور تھکی ہوئی گردن نیچے جھک گئی۔ صبح کو کچھ لوگ جمع ہوئے۔ سسکتے ہوئے بچے کو نکال کر میڈیکل کالج کی طرف دوڑے۔ کلوا کی پھولی ہوئی لاش وہیں چھوڑ دی۔ جس کو تھوڑی دیر بعد دو بھنگیوں نے نکال کر احاطہ سے باہر میدان میں پھینک دیا۔

تین گدھ فضائے آسمانی سے سنسناتے ہوئے اُترے۔ چھ فٹ کے پھیلے ہوئے بازو سمیٹ کر آہستہ آہستہ اس لاش کی طرف بڑھنے لگے۔

بازگشت

ابو الفضل صدیقی

تمام علاقہ میں سناٹا تھا ــــــ عورتیں خائف خائف نگاہوں سے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر ایک آدھ سرگوشی کر کے آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرتیں، پھر بھی بچے سب کچھ سمجھ کر سہم کر رہ جاتے، مرد الاؤ کے گرد چلموں کے دھوئیں میں چپکے چپکے افواہوں پر تبصرہ کرتے، اور ڈر کے مارے گھٹ گھٹ کر خاموش ہو جاتے اور منٹ دو منٹ کی خاموشی کے بعد جب سکوت ٹوٹتا تو باوجود گریز کے بھی وہ کوئی اور موضوع گفتگو تلاش نہ کر پاتے اور پھر یہی سلسلہ جاری ہو جاتا۔ جدید سے جدید تر افواہیں حرکت میں تھیں اور ادھر ادھر سے ہر آنے والا آدمی افواہوں کی زنجیر میں ایک نئی کڑی کا اضافہ کرتا اور افواہوں کی زنجیر کا سلسلہ تمام ضلع کے اندر ملا ہوا تھا اور آئے دن یہ زنجیر مضبوط تر ہوتی جاتی اور ہراس در ہراس میں یہ مخصوص علاقہ لپٹا تھا اور کولو آکھار کے علاقہ کی جانب جانا تو درکنار نظر اٹھانے کی بھی کسی بڑے دیر بہادر کی ہمت نہ پڑتی۔ دیہاتی ذہنیتیں یوں بھی بھوت پریت قسم کے خوفوں کو بڑی جلد قبول کرتی ہیں اور پھر یہ کولو آکھار والا بھوت کوئی سنی سنائی چیز تو تھا نہیں، کتنی ہی مرتبہ کا آنکھوں دیکھا ــــــ پھر کڑوا کریلا اور نیم چڑھا، علاقہ بھر میں بھیڑیوں ہی کا ہراس کیا کم تھا۔ اس کے ساتھ بھوت کے خوف نے اچھے اچھوں کے پتے پانی کر دیئے۔

کولو آکھار کا خشک غیر کاشتہ اونچا نیچا، سخت کنکریلی مٹی کا رقبہ میلوں کے گرد میں پھیلا ہوا تھا۔ پچھلی صدی کے وسط تک یہ ہرا بھرا زرخیز میدان تھا۔ رفتہ رفتہ برسات کے پانی کا رخ شدت کے ساتھ ادھر کو ہوا اور یہ زرخیز میدان پانی کے بہاؤ نے کاٹ کر پھینک دیا اور پندرہ بیس میل لمبا اور دس پندرہ میل چوڑا رقبہ اونچی نیچی اور گہری اوتھلی نالیوں کی شکل میں تبدیل ہو کر رہ گیا۔ نشیب بڑھتا گیا۔ دور دراز کا برسات کا پانی ادھر کو رجوع ہوتا گیا اور کولو آکھار رفتہ رفتہ پھیلتا گیا۔ ہر سال نئی اراضیات نئے نئے گاؤں کے رقبے برسات کے پانی کے کٹاؤ کی تباہ کاری میں لپٹتے گئے۔ برسات میں پانی کا تند بہاؤ کھیتیاں برباد کرتا گیا اور کنکریلے مٹی کے ٹیلوں اور گہری اوتھلی نالیوں کی تشکیل کرتا رہا۔ گاؤں ویراں ہوتے رہے اور اس مخصوص علاقے کے سکان کھیتی کرنا بھولتے گئے اور پانی نہ معلوم زمین کی کتنی تہیں اڑاتا رہا اور بھانت بھانت کی مٹیاں ادھر سے ادھر کرتا رہا۔ ہر برسات کے اندر دو بارشوں کے درمیان چند روز دھوپ پڑتے ہی یکدم خشک ہو کر یہ علاقہ سنگلاخ کنکریلی شکل اختیار کر لیتا اور برسات ختم ہونے پر تو یہ اونچے نیچے پیلی مٹی کے ٹیلے اور نالیاں ایسی خشک ہو جاتیں کہ کہیں پر گھاس بھی نظر نہ آتی۔ جگہ جگہ پانی کی دھار سے بچے ہوئے ٹیلوں میں گز گز ڈیڑھ ڈیڑھ گز اونچی جنگلی جھاڑیاں جن کے تخم پانی کبھی کبھی چھوڑا جاتا یا کہیں سرکنڈے کے جھنڈ اگ آتے جن کی عمر بالعموم اگلی برسات تک ہوتی اور یہ نمو آنے والی برسات کے پانی کی بے تکی رو میں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی۔

اور یہ لق و دق، اونچی نیچی خشک وادی بھیڑیوں، خرگوشوں، لومڑیوں کا مسکن تھی اور بھاگے ہوئے ہرنوں کی پناہ گاہ۔ جن کے زردی مائل خاکی رنگ میں اس کی مٹی کے مطابق تھے۔ اس علاقے کے تمام گاؤں تقریباً ویران تھے مگر جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی عارضی

چھپروں کی جھونپڑیاں نظر آتیں۔ البتہ اس کے ملحقہ گاؤں معمولی گاؤں سے ذرا بڑے تھے۔ ان میں اس ویران علاقے کے کسان جا بسے تھے۔ کولو آکھار کا علاقہ یوں تو سب ہی جانوروں کا مسکن تھا، مگر خاص جولانگاہ بھیڑیوں کی تھی۔ اس علاقے اور اس کے ملحقہ دیہات کا مخصوص پیشہ بھیڑ بکریاں پالنا تھا اور بھیڑیے دن دہاڑے چرتے ہوئے گلوں پر آپڑتے اور بھیڑ بکریوں کو اٹھا کر لے جاتے۔ اچھلتے کودتے ہرنوں پر داؤں کر کے وار کرتے اور خرگوشوں لومڑیوں کو لقمہ بناتے اور رات کو کولو آکھار کے اندر کی جھونپڑیوں اور گونٹیوں پر اور ملحقہ علاقے کے گاؤں پر چھاپے مارتے باڑھوں میں سے بھیڑ بکریاں لے کر ایک جست میں نو فٹ اونچی دیواریں پھاند کر مع بکری کے باہر آپڑتے۔ سوتی ہوئی ماؤں کی بھری گودوں پر دندان آز تیز کرتے۔ بھیڑیا' چیتا' آدم خور' بز خور' آہو خور' غرض کہ جو کچھ بھی اس کے منہ میں پڑ جائے وہ سب کچھ خور واقع ہوا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے ہم جنس بھیڑیے پر بھی بند نہیں ہوتا اور ذرا سی کمزوری پر بھیڑیا بھیڑیے کو چٹ کر جاتا ہے اور آدم خوری کے معاملہ میں آدم خور شیر سے زیادہ بے پناہ اور خطرناک ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کی آدم خوری بچوں تک محدود ہوتی ہے' اور طریقہ چور جیسا ہے۔ یوں تو آدم خور درندہ بڑی خطرناک مخلوق ہے۔ مگر بھیڑیا سب سے زیادہ خطرناک یوں ہے کہ یہ رات کے شروع حصے میں پہلی نیند کے وقت سوتے ہوئے دیہاتیوں کے گھروں کی نیچی نیچی دیواریں پھاند پھاند کر یا دروازوں کی ٹٹیوں میں سے کھسک کر چور کی طرح گھر میں گھستا ہے اور ٹوہ لے کر سیدھا خورد سال یا شیر خوار بچوں کی ماؤں کے بستر پر پہنچتا ہے۔ تمام دن کے کام کی تھکی ہاری' سوتی عورتوں کے پہلو سے چمٹے ہوئے بچوں کو لے بھاگتا ہے۔ نیند میں غلطاں ماحول کے اندر بھیڑیے کا یہ حملہ بڑا کامیاب ہوتا ہے۔ بچے کی چیخ پر بالعموم بدنصیب سوتی ہوئی ماں لوری دیتی ہے اور اگر خطرے کا احساس ہو گیا تو شور مچاتی رہ جاتی ہے۔ بھیڑیا بچہ منہ میں دبا کر ایک جست میں باہر دکھائی دیتا ہے اور ماں پیچھے پکارتی ہوتی ہے۔ سال میں دو چار حادثے ایسے ہولناک بھی دیکھنے میں آجاتے ہیں کہ بچے کی چیخ پر ماں ہوشیار ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی بچے کی ٹانگیں ماں کے ہاتھ میں رہ جاتی ہیں اور سر اور گردن تو جبلت کے مطابق بھیڑیے کے جبڑوں میں ہوتی ہی ہے۔ اس رسہ کشی میں سو فیصدی ماں کی جیت ہوتی ہے اور بھیڑیا چبائی ہوئی کھوپڑی اور گردن کا بچہ ماں کے ہاتھ میں چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔ بھیڑیا ہمارے علاقے میں برسات بھر پریشان اور بے گھر سار ہتا ہے۔ برسات شروع ہونے سے پیشتر نئے بچے جوان ہو کر ماں باپ کے ساتھ اور کبھی کبھی تنہا شکار کھیلتے ہیں۔ یہ برسات بھر پریشان اور بے گھر سار ہتا ہے۔ برسات شروع ہونے سے پیشتر نئے بچے جوان ہو کر ماں باپ کے ساتھ اور کبھی کبھی تنہا شکار کھیلتے ہیں۔ یہ برسات میں منتشر ہو جاتے ہیں اور برسات ختم ہوتے ہی موقع موقع سے اپنے نئے بھٹ تیار کر لیتے ہیں جو ان کی جاڑے گرمی کی پناہ گاہ اور بچہ دینے کی جگہ کا کام مئی جون تک دیتے رہتے ہیں۔ ان بھٹوں میں آرامگاہ' مردانہ مکان وغیرہ تقسیم ہوتی ہے اور بچہ دینے کے وقت بھٹ کو گہرا کر کے مادہ علیحدہ جگہ بنا لیتی ہے۔ یہ بھٹ بالعموم ایسی جگہ واقع ہوتے ہیں جہاں برسات کے سیلاب کا پانی نہ پہنچ سکے۔ ۴۳ء کی برسات ختم ہوتے ہی یکدم کولو آکھار کے علاقہ میں بھیڑیوں کی وارداتیں بڑھ گئیں۔ یوپی گورنمنٹ کی جانب سے بھیڑیا مارنے پر ہمیشہ سے دس روپیہ انعام ملتا آرہا تھا۔ ۴۴ء اور ۴۵ء میں حکام ضلع کو ان کے استیصال کے لئے ہتھیار تقسیم کرنا پڑے اور بیسیوں غریب شکاریوں نے اسے پیشے کے طور پر اختیار کر لیا۔ اس کے باوجود وارداتیں بڑھتی گئیں اور ۴۶ء کے ستمبر میں یکدم تمام علاقے میں یہ خبر بڑے زور سے پھیل گئی کہ کولو آکھار پر بھوتوں نے قبضہ کر لیا ہے۔

بھیڑیے کا شکار یوں بھی تیسرے درجے کا اسپورٹ خیال کیا جاتا ہے۔ جس کو تقسیم انعام اور پیشہ ور شکاریوں کے لالچ کے سبب مخصوص طور پر ہمارے علاقے میں اچھے شکاری ذرا حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔ ضلع مجسٹریٹ نے انعام دگنا کر دیا اور مزید ہتھیار تقسیم کئے مگر جب ان بھیڑیا مار شکاریوں نے بھوت اپنی آنکھ سے دیکھ لیا تو وہ بھی دست کش سے ہو گئے۔ دلیر شبان زادوں نے اپنے ریوڑ کولو آکھار کے علاقے میں لے جانا بند کر دئے۔ یہاں آبادی تو یوں بھی عارضی تھی' البتہ اس لق و دق اونچے نیچے بیابان سے کئی کچے

دیہاتی راستے گزرتے تھے۔ اب یہ بھی بند ہو گئے اور چھوٹی چھوٹی کوٹھیاں اجڑ کر ملحقہ بڑے گاؤں میں جا بسیں اور دیکھتے دیکھتے یہ تمام علاقہ غیر آباد ہو کر بھیڑیوں کی خود مختار ریاست بن گیا۔ بھیڑیئے ملحقہ گاؤں سے بھی آگے بڑھ بڑھ کر چھاپے مارنے لگے اور ضلع کے تین چار تھانے ان سے بری طرح متاثر ہوئے۔ اب کوڑہ میں کھاج یہ ہوئی کہ یکدم بھوت والی افواہ تیز تر ہو گئی۔ چاروں طرف پانچ پانچ دس دس میل تک دیہات میں شدید ہراس پھیل گیا۔ مدتوں سے بھیڑیوں کے مارے تمام تمام رات جاگتے گزرتی تھی۔ بھیڑیئے گھر گھر، باڑے باڑے پھاندتے، کتے بھونکتے رہ جاتے۔ مائیں مضبوطی کے ساتھ اپنے ننھے ننھے بچوں کو چمٹا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں رات کاٹ دیتیں۔ پھر بھی چیرہ دستی سے جس کا بچہ منہ میں پڑتا چھین کر چمپت ہو جاتے اور کولو آکھار کی گھاٹی میں گھس پڑتے اور ان حدود میں کسی کو جانے کی ہمت نہ پڑتی اور بدنصیب ماں باپ رات کے چھینے ہوئے بچوں کی ہڈیوں اور کپڑے کے چیتھڑوں کا سراغ لگانے نہ پہنچ سکتے کیونکہ اب وہاں بھوتوں کا قبضہ تھا۔

یہ اندھیر دیکھ کر حاکم ضلع نے انعام کی رقم پچیس روپیہ کر دی۔ جن شکاریوں کو بھیڑیئے مارنے کے لئے بندوقیں دی تھیں ان کو تنبیہ کرنی شروع کی مگر پیشہ ور شکاری ٹس سے مس نہ ہوئے۔ ان میں سے اکثر اپنی آنکھوں سے بھوت دیکھ چکے تھے۔ حاکم ضلع نے اب مضافاتی دیہات اور شہر کے مشہور شکاری جمع کئے اور اس انتظام میں مدد طلب کی۔

ہماری مخصوص چھ آدمیوں کی پارٹی اپنی نوعیت اور طرزِ شکار کے اعتبار سے ایک خاص انفرادیت کی حامل تھی۔ شہر کے شکاری ہمارے ساتھ نہ لگ سکتے تھے۔ سرکاری حکام اور شوقین شکاریوں کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ ہمارا ساتھ دے سکیں۔ جب مجسٹریٹ ضلع نے ہم کو بلوا کر یہ استدعا کی تو ہماری توجہ ادھر ہوئی ورنہ ہم لوگ اس کو پیسہ پیدا کرنے والے شکاریوں، خانہ بدوش کنجروں اور پارسیوں کا کام سمجھ کر اب تک ذلیل سمجھے ہوئے تھے۔ میں تو خیر شہر کے قریب ترین مضافاتی مقام کا رہنے والا ہوں۔ بقیہ اور سب ساتھی دیہات کے رہنے والے تھے اور تین دن کے اندر میری دعوت پر استاد رضا خان، سنگھ بابو، صابر خاں اور انوار خاں بھی جمع ہو گئے اور بڑے شوق کے ساتھ اسکیم بن گئی۔ استاد رضا خاں کی رائے ہوئی کہ شکار شروع کرنے اور کولو آکھار کے علاقے میں داخل ہونے سے پیشتر ان پیشہ ور شکاریوں سے بات چیت کی جائے جو اس علاقے میں بھیڑیئے مارنے کا کام برسوں سے کر رہے ہیں اور پھر کولو آکھار کے چاروں طرف لگے ہوئے دیہات کا دورہ کر کے معلومات حاصل کی جائیں۔ اس کے بعد اچھی طرح تمام وادی کو پرتالا جائے اور بھیڑیوں کی جولانگاہیں، بھٹ اور ان کے راستے اور نقل و حرکت کا دن میں کھوج لگایا جائے اور پھر بھیڑیئے کے مخصوص طریقہ شکار کے مطابق راتوں میں شکار شروع کیا جائے۔ ویسے یہ علاقے تھوڑا بہت ہمارا گھوما ہوا تھا۔ کبھی کبھی زخمی ہرن میدان سے چوٹ کھا کر اس میں پناہ لیتے تھے اور ہم تعاقب کرتے اس میں جا پہنچتے تھے۔ دو چار مرتبہ اس کے بعض ایسے حصوں میں جہاں جھاڑیاں اور جھنڈ تھے تیتروں کا شکار کیا تھا دو ایک مرتبہ خرگوش مارے تھے اور کبھی کبھی اس کے اندر سے جاتے ہوئے راستوں سے گزرے تھے۔

سب سے پہلے ہم نے بھیڑیئے مار شکاریوں سے رجوع کیا جو آج کل حکامِ ضلع کے معتوبوں میں تھے۔ غریب رونے سے لگے اور روزگار ہاتھ سے نکل جانے پر پریشانی کا اظہار کیا، ورنہ دو آنے کا کارتوس میں دس روپے ہاتھ آجایا کرتے تھے اور تین بھیڑیوں میں مہینہ سارے گھر کا پیٹ پلتا تھا۔ ان کی تقریر سن کر ہمیں بھیڑیئے کے شکار سے گھن سی آنے لگی، اور پھر ان میں سے بعض نے اپنے چشم دید بھوت کے واقعات بیان کئے۔ باتیں دونوں اچھے شکاریوں کے شایانِ شان نہ تھیں۔ شکار کے معاوضے میں روپیہ پیسہ لینے کا تذکرہ اور پھر بھوت کا حوالہ۔ مشہور بات ہے جہاں بندوق چلتی ہے وہاں جادو نہیں چلا کرتا۔ مگر پہلی چیز ہم میں رجعت پیدا کرتی تھی تو دوسری دعوت دیتی تھی کہ یہ شکار جس میں بھوت کا واسطہ لگا ہے اور جس کے ڈر سے ہر آدمی میدان چھوڑ گیا ہے ضرور کیا جائے۔ ہم چار روز تمام دیہات میں طوفانی دورہ کرتے پھرے اور ہر جگہ بھوت والی روایت نہایت شدت کے ساتھ ذہنوں میں راسخ پائی۔ "بھوت پریت کے

لئے دیہاتی ذہنیتوں کی مٹی یوں بھی بہت زرخیز ہوا کرتی ہے۔ ہم نے آپس میں کہا' آدم خور بھیڑیوں اور بھوتوں کے عمل میں [illegible] حد تک یکسانیت بھی ہوتی ہے اور ہم شوق سے شکار کے لئے تیار ہو گئے۔ بھیڑیے کے شکار کا مخصوص اور نہایت آسان طریقہ ہے۔ بھیڑیا رات میں شکار کرتا ہے اور علی الصبح بھٹ میں واپس آ جاتا ہے۔ بالعموم وہ رات کے نو دس بجے بھٹ سے برآمد ہوتا ہے اور رات کے شروع حصے میں شکار کر لیتا ہے' ورنہ تمام رات داؤ گھات کرتا پھرتا ہے اور صبح کاذب کے وقت ہاتھ مارتا ہے۔ یہ وقت بالعموم گاؤں کے اندر بکریوں کے باڑوں اور آدمی کے بچوں پر چھاپہ مارنے کا ہوتا ہے اور تمام دن بھٹ میں آرام کرتا ہے۔ سیدھے سادے اندھے دھندے شکاری رات کو بھیڑیئے کے نکلنے سے پیشتر بھٹ کے دروازے کے قریب چھپ کر جا بیٹھتے ہیں اور نکلتے ہی ٹھائیں سے مار دیتے ہیں۔ بالعموم بیس پچیس گز کے فاصلے سے فیر ہوتا ہے۔ خالی جانے امکان نہیں ہوتا۔ چوٹ اتنی کاری پڑتی ہے کہ سانس بھی نہیں لیتا اور جہاں کا تہاں ڈھیر ہو جاتا ہے۔ ہر شکاری سمجھ سکتا ہے کہ اس قسم کے شکار میں اسپورٹ کی کتنی روح ہو سکتی ہے اور کیا لطف آ سکتا ہے۔

سب معلومات حاصل کر کے ایک دن دوپہر سے شام تک ہماری چھ آدمیوں کی مختصر سی پارٹی وادی کے اس مخصوص حصے میں گھومتی رہی جس میں بھیڑیوں کی کثرت کے ساتھ بھوتوں کی کارفرمائی بیان کی جاتی تھی۔ تمام گزرگاہیں اور مواقع دیکھ کر ہم اپنی جائے قیام پر واپس آ گئے جو کولو آکھار کے عین وسط میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں تھی۔ تھوڑا سا کھانا کھا کر اور چائے پی کر دس بجے کے قریب ہم اپنی جائے قیام سے نکلے اور اپنی اپنی مقررہ جگہ پر پہنچ گئے۔ رات تو چاندنی تھی مگر آسمان پر ہلکی ابر کی چادر پھیلی ہوئی تھی جس نے جنگل کے سناٹے کو زیادہ بھیانک بنا دیا تھا۔ ایسے ہی بھیانک سناٹوں میں شکاری کی فطرت جلا پاتی ہے اور لطف دوچند ہو جاتا ہے۔ ہم نے اپنی نشستوں کے لئے تین بھٹ منتخب کئے تھے۔ ایسے بھٹ اور بھی تھے مگر ہم چھ کی مختصر پارٹی اس سے زیادہ گھیر نہ سکتی تھی۔ ایک بھٹ استاد رضا خاں اور میں نے پسند کیا تھا' اس سے پورب کی جانب تین سو گز کے فاصلے پر ٹیلوں کی آڑ میں ایک بھٹ پر انوار خاں اور صابر خاں تھے اور اوپر ایک ٹیلے کے اس پار تقریباً ایک فرلانگ کی مسافت پر سنگھ بابو اور مسلم براجمان تھے۔ سنگھ بابو شام ہی کے وقت سے کچھ ست سے ہو گئے تھے اور چپ چپ سے تھے۔ دراصل انہیں دیہات کی افواہوں نے قدرے متاثر کر دیا تھا اور شاید وہ بھوت کے وجود پر پہلے سے بھی کچھ یقین رکھتے ہوں۔ دبی زبان سے ایک آدھ مرتبہ انہوں نے کچھ ایسے الفاظ بھی کھانا کھانے میں ادا کئے تھے جن سے مترشح ہوتا تھا کہ یہ پروگرام انہیں زیادہ پسند نہیں ہے ___ تمام علاقہ دم بخود تھا کہ چند پٹھان اور ٹھاکر بچے' سر پھرے شکاری آج بھوتوں سے لڑنے کو کولو آکھار میں گھس پڑے ہیں۔ دیکھئے کیا انجام ہو۔ کہیں کہیں لوگ ڈر رہے تھے کہ مبادا کوئی مصیبت اردگرد کے گاؤں والوں پر آ جائے اور کوئی پرانا تجربہ کار بوڑھا یقین کئے ہوئے تھا کہ ان کا بچ کر آنا مشکل ہے۔ غرض تمام علاقے میں ہمارے اس اقدام کی شہرت تھی اور [illegible] اسی طرف لگی ہوئی تھیں کہ کیا ہوتا ہے۔

ہر بھٹ کے تین تین دروازے تھے۔ ہم نے اپنی نشستوں کی تقسیم اس طرح کی تھی کہ دو شکاریوں میں سے ایک ایک کی کمان [illegible] ایک دروازہ تھا اور تیسرا دونوں کمان میں مشترکہ تھا۔ ہم قریب گیارہ بجے کے اپنی اپنی جگہ پہنچے اور چھپ کر بیٹھ گئے اور بھٹوں کے [illegible] ٹکٹکی باندھے انتظار کرنے لگے۔ نومبر کے شروع ہفتے کی خنکی اونچے نیچے ماحول میں پھیلی ہوئی تھی۔ وادی کے اندر نرم نرم [illegible] کی آواز آ رہی تھی اور جگہ جگہ جھینگر نغمہ ریزی سی کر رہے تھے۔ کسی کسی وقت کہیں دور کے گاؤں سے کسی کتے کے بھونکنے [illegible] ہلکی ہلکی سائیں سائیں اور جھینگروں کی آوازیں جلترنگ سا بجانے لگتیں۔ ہم چھ کے سوا وادی کے طول و عرض میں کسی [illegible] آسمان سے چاندنی چھن چھن کر آ رہی تھی اور کل وادی میں صبح کاذب والی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔

[illegible] اندازہ ہو گیا کہ ہم بھٹ کے قریب آ گئے ہیں اور بھیڑیئے اس قدر نڈر ہو گئے ہیں کہ اپنی جگہ کے [illegible] نکل پڑتے ہیں۔ ہر شام کو واردات کی افواہیں ہم لوگ تمام علاقے میں سن کر آ رہے

تھے۔ مگر تمام دیہات میں تو افواہیں ہی افواہیں تھیں اور پھر بھیڑیے کے حادثے کی ہر حکایت کے ساتھ بھوت کا کردار کسی نہ کسی پہلو سے لگا ہوتا اور ہمارے لئے کسی قطعی نتیجہ پر پہنچنا مشکل تھا مگر اب یقین ہو گیا کہ بھیڑیے جاتے پہر بھر رات گئے نکلنے کے سر شام ہی نکل پڑتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے والا بھٹ بھی خالی تھا اور بقیہ بھٹوں سے بھی کوئی آواز دھماکے کی سنائی نہ دی۔ استاد رضا محمد خاں مجھ سے تقریباً بیس گز کے فاصلے پر داہنی جانب ایک چھوٹے سے مٹی کے ٹیلے کی آڑ میں اپنی نشست لئے ہوئے تھے اور میں ڈھلوان سے اترتی ہوئی ایک نالی میں دبکا ہوا تھا۔ استاد رضا محمد خاں نے اشارے ہی اشارے میں مجھ سے کہہ دیا کہ بھٹ خالی ہے اور اب ساری رات بیٹھنا پڑے گا۔ کہیں صبح ہوتے امید ہو سکتی ہے۔ جب بھیڑیے شکار کر کے پلٹنے لگیں___ ان کا شکار بہت مشکل سے کامیاب رہتا ہے' بھیڑیا کھلے میدان میں ہوتا ہے۔ تمام رات شکار کرتے رہنے کے سبب وہ غیر معمولی ذکی الحس ہوتا ہے اور بہت دیکھ بھال' جانچ پڑتال کر کے بھٹ کے قریب آتا ہے۔ بھٹ سے نکلتے وقت خواہ کتنا ہی چوکنا ہو کر نکلے پھر بھی تمام دن کا سکون پائے ہوئے ہوتا ہے۔ بہر صورت بھٹ میں سے یکدم باہر کھلے میدان میں آن پڑتا ہے اور دروازے کے ارد گرد چھپے ہوئے آدمی کا باہر نکل کر ہی اندازہ کر سکتا ہے۔ پہلی جھلک پر شکاری یکدم ایک دو تین کر دیتا ہے۔ باہر سے اندر جاتے وقت پہلے تو تمام رات کا ستایا ہوا یوں بھی قدم قدم پھونک پھونک کر دھرتا ہے اور پھر کھلے میدان میں اچھی طرح ناک کان اور آنکھ سے کام لے کر قریب آتا ہے۔ سب سے بڑی قباحت یہ ہوتی ہے کہ شکاری کو معلوم نہیں ہوتا کہ بھیڑیا اس کے دائیں بائیں آگے پیچھے کس سمت سے آئے گا۔

خیر ہم نے تھوڑی دیر اطمینان کے ساتھ نشستوں پر پہلو بدلے۔ شروع میں کچھ دیر ڈھیلے ڈھیلے بیٹھے رہے اور سمجھ گئے کہ شکار کا جو نقشہ بنا کر چلے تھے وہ بگڑ گیا۔ نصف شب گزرنے پر آگے پیچھے دائیں بائیں اور اوپر نیچے ہر طرف گہری توجہ شروع کی اور اس حد تک دبک کر بیٹھ گئے کہ مٹی کا تودہ معلوم ہونے لگے۔ اگرچہ اس شکار میں اس سے زیادہ لطف آرہا تھا جو بھٹ سے نکلتے ہی کتے کی موت مارنے کے طریقے میں آتا۔ کم سے کم کچھ کشش و پیچ' کچھ غیر یقینی صورت تو تھی۔ ورنہ وہ بھی کیا شکار کہ ایک سوراخ پر نگاہ جمی ہوئی ہے اور سر نکالتے ہی ٹھائیں سے شکار ختم۔

چاند کی حرکت کے ساتھ بادل کی سفید چادر میں سے چھن چھن کر گرتی ہوئی چاندنی کی کیفیات بدلتی رہیں۔ خنکی اور نمی بڑھتے بڑھتے کل منور رات کی سیمیں و داتر ہو کر ٹپکنے سی لگی۔ تمام رات انتظار کے شکار اس سے پہلے بھی بہت کئے تھے مگر بھیڑیے کے لئے آج پہلی مرتبہ بیٹھے تھے۔ آدھی رات گزرنے پر میں نے غور کیا کہ آغازِ شب سے ہی آج کچھ شکار کا جوش اور جذبہ شعور پر اچھی طرح طاری نہ ہوا تھا اور اس وقت کچھ طبیعت کند بھی ہو گئی اور ایک مبہم سا اچاٹ پن جو ٹٹولنے پر ایک نامعلوم خوف کی حد تک پہنچا محسوس ہوتا تھا' میرے دماغ پر آہستہ آہستہ مسلط ہوتا جا رہا تھا جیسے انتظار بار سا معلوم ہو رہا تھا' اگرچہ ہر قسم کے انتظاروں میں شکار کا انتظار خوشگوار ہوتا ہے اور شکار کا سارا لطف مشکل اور جدوجہد کی سختی میں مضمر ہے۔

دیکھتے دیکھتے جیسے کل فضائے بسیط انگڑائی سی لے اٹھی اور ابر آلود چاندنی کے ساتھ صبح کاذب کا اجالا مل کر عجیب رومانوی قسم کے انتظار سے ماحول کو درخشاں کرنے لگا۔ موتیا رنگ کی آبدار بھیگی ہوئی خاموش رات' پرسکوت اونچا نیچا ماحول اور ہمارے جسم اور ہمارے حسیات سب نیند میں غلطاں ہو گئے۔ میں نے بندوق کی نالی پر ہاتھ پھیرا۔ سردی میں یخ اور اوس میں بھیگا ہوا فولاد۔ پھر اپنے تو ہاتھ کپڑوں پر پھیر کر منہ پر پھیرے اور نشست پر پہلو بدل کر ایک گہری جماہی لی' پھر ایک لمبی انگڑائی کے ذریعے جیسے تمام رات کا کسل دور کرنے کی کوشش کی اور خیال کیا کہ ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی اور نہایت احتیاط کے ساتھ بدن کو پوری طرح چرا کر نالی میں چت سا گیا اور میرے دائیں ہاتھ کی جانب سے آہستہ آہستہ چٹ چٹ کی آواز کان میں پڑی۔ اس وقت شکاری کے حواس خمسہ بھی بھیڑیے سے کم تیز نہیں ہوتے۔ یہ چٹ چٹ بھیڑیے کے چلنے کی مخصوص آواز تھی۔ جس کو دیہاتی کہا کرتے ہیں کہ چلتے وقت

بھیڑیے کے پاؤں کی تلیاں چٹختی ہیں۔ میں نے نہایت فن کارانہ انداز میں بندوق سنبھالی اور اپنی کمان والے دو دولتے پر پوری توجہ کے ساتھ ٹکٹکی باندھی۔ مگر تمام رات کے مجرم اور مغرور بھیڑیے کی شاید سامعہ اور باصرہ پوری قوت کے ساتھ بیدار تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹے میں نے مٹی کے تودے کی طرح بے حس و حرکت پڑے انتظار کیا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ یا تو پلٹ گیا یا روگردہ کسی جھاڑی یا نالی میں دب کر میرے ہٹنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس کا بھٹ کی جانب نہ آنا اس امر کی قوی دلیل تھی کہ اس نے مجھ کو بھانپ لیا ہے۔ میں نے بہت ہی آہستہ سے گردن پھیر کر استاد رضا خاں کی جانب دیکھا جو اپنی نشست پر مجھے نظر آ رہے تھے اور دونوں بالکل ہی پیلی مٹی کا تودہ معلوم ہو رہے تھے۔ میں سمجھ گیا کہ استاد کے ہاتھ پر بھی چاپ سنائی پڑی ہے۔ ہمیں مردہ ساپڑے ہوئے آدھ گھنٹے سے زیادہ ہو گیا تھا ایک آدھ مرتبہ تھوڑی چاپ اور سنائی دی اور پھر سناٹا۔

نومبر کے شروع کی خوشگوار خنکی قدرے تیز سردی میں تبدیل ہو گئی۔ پچھم سے چلتی ہوئی سبک رفتار ٹھنڈی ہوا میں دھار جیسی کاٹتی کیفیت پیدا ہو گئی۔ تمام رات کے اوس میں نم کپڑے گیلے گیلے سے معلوم ہونے لگے۔ میری ناک اور کان برف سے ہو گئے۔ سرِ شام کا ابھرا چاند بادلوں کی سیمیں ردا کے اندر ہی اندر ضوفشانیاں کرتا افق کی پستیوں میں جا لٹکا اور ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک آسمان پر ایک خطِ نور بڑھتا چلا گیا اور صبحِ کاذب کے سفیدے کے ساتھ مکر چاندی کا نور مل کر تمام فضا کو پگھلی ہوئی چاندی کے آبشاروں میں تبدیل کرنے لگا۔ جگہ جگہ آسمان پر سپیدہ صبح کی جھلک دکھائی دینے لگی اور نیچے جیسے ساری دنیا کچی چینی سے پکی چاندی میں تبدیل ہونے لگی۔ میں نے وقت کا اندازہ لگانے کے لئے آسمان پر نظر کی۔ بادلوں کی کھڑکیوں سے پھیکی پھیکی چاندنی اور درخشاں سپیدہ صبح جگہ جگہ افشاں کی پھواریں سی چھوڑ رہا تھا۔ میں ایک لمبی سانس لے کر استاد رضا خاں سے کچھ اشاروں میں بات کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ استاد میری جانب گھور کر دیکھ رہے تھے اور مائل بہ تکلم سے تھے۔

استاد نے اشارہ سے کہا کہ آج کا شکار بگڑ گیا۔ میں نے ہفتہ بھر کی محنت یوں رائیگاں جانے پر افسوس کیا۔ کیونکہ ہم لوگ اتنے تھکے ہوئے تھے کہ آنے والی شب میں شکار پر نہ بیٹھ سکتے تھے۔ آج تمام دن آرام کیا جائے' پھر ساری رات آرام کیا جائے اور پرسوں کے تمام دن۔ تو کہیں جا کر پرسوں شب میں شکار کے قابل ہو سکیں گے۔ دیکھتے دیکھتے موتی جیسی آبدار رات کے ڈانڈے درخشاں صبح سے آ ملے۔ مغرب سے روشنی کا ایک سیلاب پھٹ پڑا اور مشرقی افق قرمزی درخشانیوں سے چمکنا شروع ہوا۔ جھاڑیوں پر چھوٹی چھوٹی چڑیاں پھدکیں۔ مٹی میں سے جگہ جگہ ٹڈے اچھلے ایک ٹیٹری بار بار ہمارے سروں پر منڈلاتی ادھر سے ادھر اڑنے لگی۔ صبح صادق کے آثار زمین سے آسمان تک نمودار ہو گئے اور ایک مخصوص شور جیسے سناٹے کی آواز سے سارا ماحول سنسنانے لگا۔ اس مخصوص صبح والے سناٹے میں کسی کسی وقت دور سے آتی ہوئی کوؤں کی آوازیں کان میں آئیں۔

ہماری' سنگھ بابو اور مسلم کی نشستوں کے درمیان ایک اونچا خشک کنکریلی پیلی مٹی کا ٹیلا اور ادھر ادھر گہری گہری کٹی ہوئی [illegible] جال تھا۔ دوسرا ٹیلا اس سے قدرے اونچا اور اس ٹیلے کے ڈھلان پر وہ بھٹ واقع تھا۔ جس پر یہ لوگ داؤں کئے بیٹھے تھے۔ [illegible] ان کے درمیان دو چوڑی نالیاں اور ایک اونچا ٹیلا حائل تھا۔ دوسرے برابر والے ٹیلے کا چند گز ڈھلان چڑھ کر یہ بھٹ آتا تھا [illegible] جا رہی تھی اور میرا اچاٹ پن اکتاہٹ میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا کہ یکدم سنگھ بابو کی نشست کی جانب سے ایک بھیانک آواز سنائی دی [illegible] 'کھے' کھے کھکھے کھے! بھو' بھو'! بھواوت!" اور باوجودیکہ حلق اور زبان کے بجائے یہ پیٹ سے بلند ہوئی تھی مگر میں [illegible] سنگھ بابو کی آواز ہے اور پھر ہم نے دو منٹ دھماکے کا انتظار کیا مگر بجائے دھماکے کے بت بتاہٹ سنائی دی۔ ہم لوگ اپنی نشستوں [illegible] سکتے تھے کیونکہ یہ قاعدہ کے خلاف تھا۔ چند منٹ اور انتظار کیا۔ اتنے میں سیٹی کی آواز سنائی دی اور پھر صاف صاف بلانے کی [illegible] کی جانب سے بھی۔ جس کا جواب صابر اور انوار کی نشست کی جانب سے آیا تو استاد رضا خاں نے بھی

جو اپنی سیلی بجائی اور سیٹی کی مخصوص آوازوں کے تبادلہ میں طے ہو گیا کہ سنگھ بابو کی جانب چلنا چاہئے۔ ہم نے بندوقیں نیچی کیے تیز تیز نالے کے نشیب و فراز طے کیے اور ٹیلے کے ادھر والے ڈھلان پر چڑھ کر چوٹی پر سے کچھ دیکھنے کی کوشش کی' اور پھر سنگھ بابو کی جانب سے پیہم بلانے کی سیٹیوں پر بڑھے۔ دوسرے ڈھلان کی جانب اترے اور پھر تیز تیز ادھر والے نالے کی چھوٹی بڑی' اونچی نیچی سطح پر جستیں سی لگاتے اس ٹیلے کی جانب بڑھنے لگے۔ ادھر والا ڈھلان ہم نے تیز تیز چڑھنا شروع کیا' اور جب ہم اس کی چوٹی پر پہنچے تو ہمیں اپنی داہنی جانب سے صابر خاں اور انوار خاں چڑھتے دکھائی دیئے اور نیچے ادھر ہماری جانب بڑھ رہے تھے لہذا ہم وہیں چوٹی کی نوک پر ٹھٹک کر انتظار کرنے لگے۔ اب ہم چھیوں ٹیلے کی نوک پر جمع تھے جس کے ڈھلان پر ادھر والے نالے سے ذرا اوپر پر ڈھلان پر وہ بھٹ تھا جس پر سنگھ بابو اور مسلم داؤں کئے بیٹھے تھے۔ سنگھ بابو دوڑنے اور چلنے کی درمیانی چال چلتے ہوئے قریب آئے۔ مسلم پیچھے پیچھے لپک رہے تھے۔ میں 'کیا ہے بھائی؟" سوال کرنے ہی والا تھا کہ استاد رضا خاں بول پڑے ————

"کیوں جی' کیا عذر تھا بھائی؟" مگر کنور جی تو بہت بد حواس ہو رہے تھے۔ "وہ' واں' بھوت' استاد بھو بھوت!" اور میں نے غور کیا کہا سنگھ بابو کی زبان لکنت کر رہی ہے اور جسم پسینہ پسینہ تھا۔ جب میں نے قریب جا کر ان کے چہرے پر غور کیا تو آنکھوں میں بلا کی وحشت اور پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ میں نے اور قریب جا کر ہمدردی کے ساتھ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تو اندازا کیا کہ ان کے نہ صرف ہاتھ میں بلکہ تمام جسم پر رعشہ سا ہے۔ جیسے ان کی رگ رگ بکھری جا رہی ہے۔ سنگھ بابو جیسے پختہ کار اور بہادر راجپوت شکاری کو اس درجہ خائف دیکھ کر میرے شعور میں بھی یک گونہ خوف کا احساس بیدار ہوا۔ اتنے میں صابر خاں اور انوار خاں بھی لپک کر آگئے اور دونوں نے بے ساختہ ایک منہ ہو کر کہا کہ 'کیا ہے بھائی خیر تو ہے؟"

استاد رضا خاں تمسخرانہ سنجیدگی سے بولے "میاں ہوتا کیا' وہی بھوت تھا۔ ہمارے کنور جی کو دبوچ ہی لیا تھا۔ بے چارے بڑی مشکل سے جان بچا کر بندوق لٹکائے بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ خیر گزری۔"

سنگھ بابو ہماری صحبت کا رکن تھا اور ہماری پارٹی کا سب سے زیادہ چلتا پرزہ! میری طرح وہ بھی استاد رضا خاں کا دوست قسم کا شاگرد تھا۔ استاد کے انداز پر ذرا سنبھلا اور نہایت سنجیدگی سے کہا ————

"میاں ہم اپنی آنکھ سے دیکھ کر آ رہے ہیں۔ وہ واں ٹیلے کی آڑ میں سے یک دم پہلے دو ٹانگوں پر کھڑے ہو کر مڑ کا یا' پھر ایک مرتبہ دبکا' پھر اُچکا اور پھر لنگور کی سی جست لگا کر یک دم غپ سے بھٹ میں گھس گیا۔" یہ کہتے ہوئے مسلم سے اپنے بیان کی تصدیق چاہی۔

مسلم بھی خائف سے تھے مگر چہرہ سے سنجیدگی ظاہر ہو رہی تھی اور خوف کے آثار محض آنکھوں میں تھوڑے بہت نمایاں تھے۔ انہوں نے بیٹھ کر حلق صاف کیا اور پست آواز میں بولے "بھئی وہ ان کے ہاتھ پر آیا تھا' جو کچھ بھی تھا اور مجھ سے وہ جگہ بالکل آڑ میں تھی۔ جہاں سے سنگھ بابو اس کا اچکنا اور پھر بھٹ کے اندر کو جست کرنا بیان کرتے ہیں۔ البتہ پھیکی چاندنی میں نے ٹیلے کی آڑ سے لمبا سا سایہ اپنی بائیں جانب متحرک ہونے کا احساس کیا۔ تیزی کے ساتھ قدرتی طور پر ادھر کو میری نظر مڑی تو ہر چیز غائب تھی۔ سایہ میں نے تیقن کے ساتھ دیکھا بھی نہیں۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ انکھیوں سے کسی سایہ جیسی حرکت کا مبہم سا احساس کیا اور جہاں تک خیال ہے ایک نامانوس سی سرسراہٹ بھی کان میں گئی اور بھئی میں اس سے تو انکار نہیں کر سکتا کہ کوئی چیز نہیں تھی۔ اس میں شک نہیں کہ کوئی چیز تھی ضرور' یہ کیا تھی؟ یہ یہ جانیں اور پھر یک دم گھگھیا پڑے "بھوت' بھوت!"

سب نے ایک قہقہہ لگایا مگر سنگھ بابو نے زیادہ درست ہو کر کہا "دیکھو بھیا مسلم! وہ جو کچھ بھی تھا مگر بھیڑیا نہیں تھا کیونکہ تمہارے کان میں سرسراہٹ کی آواز گئی۔ چٹ چٹ نہیں گئی نا۔"

"ہاں صاحب چٹ چٹ نہیں گئی۔"

"اور بھیڑیے کی چاپ میں چٹ چٹ یقینی ہے۔" سنگھ بابو نے سنبھل کر کہا

"ہوں۔" مسلم نے کہا اور استاد رضا خاں بولے "تو بس بھوت تھا اور تم بال بال بچے۔ میاں کنور جی کوئی بھیڑیا ہو یا ہو، تم پر سر شام ہی سے بھوت کا خوف طاری تھا آج۔ ہم نے اندازہ کر لیا تھا کل ہی سے۔"

استاد کے جملہ پر سنگھ بابو کچھ تلخ سے ہو گئے اور بولے "استاد! بھوت اور بھوت کے سوا کوئی اور چیز ہو تو اور استاد ہم نے کبھی کسی زمانہ میں تھوڑا بہت بھیڑیئے کے شکار کا شوق کیا ہے اور آپ کی عنایت سے ہر رنگ کا بھیڑیا جنگل کے اندر دیکھا مارا ہے۔ بھٹ کے اندر گھستے بھی دیکھا ہے اور اندر سے نکلتے بھی۔"

"اچھا تم نے پہلے بھی کبھی بھوت دیکھا ہے؟" استاد نے کہا

"جی مگر آج ضرورت بھوت ہی دیکھا' اور گاؤں والے سچے ہیں۔ ضرور اس جنگل میں بھوت رہتے ہیں۔"

'خیر جانے دیجئے' بھیڑیا ممکن ہے۔ بھیڑیا نہ ہو' اور کوئی چیز ہو' آخر اسے ہم بھوت ہی کیوں کہیں۔"

"تو کسی اور چیز کا نام آپ مجھے بتا دیجئے کہ کیا ہو سکتی ہے؟ آخر ساری عمر آپ کی بھی شکار میں کٹی ہے اور میں نے بھی آپ جیسے لوگوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔ آپ اس جنگل کے لحاظ سے کسی ایسی چیز کا تعین کیجئے جو اس حلیہ کی ہو۔ جناب اس کے سر پر بالوں کا گچھا ہے۔ بلکہ مجھ کو تو جسم پر بھی بال معلوم ہوئے اور جب اس نے اندر کو جست کی تو مجھے اس کے پاؤں بھی ایسے معلوم ہوئے کہ پنجے پیچھے کو پھرے ہوئے ہیں۔"

صابر خاں نے دخل در معقولات کیا "معلوم ہوتا ہے صبح کی نیند میں آنکھ جھپک گئی۔ کئی دن سے گاؤں والوں میں بھوت کی روایت سنے ہوئے تھے۔ کچھ خواب یا نظر بندی کا قصہ ہے بھیّا' ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔"

سنگھ بابو چڑ سے گئے اور بولے "جی مجھے ہذیان ہو گیا تھا' میں پاگل ہوں۔ جاگتے میں خواب دیکھتا ہوں اور بڑبڑاتا ہوں۔ شکار آپ ہی نے کھیلا ہے' اور میں نے تو تیس برس بھاڑ جھونکا ہے۔ گویا آپ کے نزدیک میں ایسا گدھا ہوں کہ داؤں پر سو گیا تھا! اور آپ جاگ رہے تھے۔"

صابر غریب قائل سا ہو گیا اور میں نے نیم سنجیدگی کے ساتھ ایک ایک لفظ چن چن کر کہا "جناب! ہم بھوت ووت نہیں جانتے ہم تو صرف بندوق جانتے ہیں۔"

"خیر آپ مانیں یا نہ مانیں مگر آپ بھی میری جگہ ہوتے تو پھر بھوت کے سوا اور کچھ نہ کہتے۔"

"جی خیر' مگر شاید ہم کہتے پیچھے' پہلے دونوں نالیں دے بجاتے' پھر دیکھتے کہ سالا کیسے بچ کر نکل جاتا ہے سامنے سے۔" صابر نے کہا "پرخچے اڑ جاتے۔"

"جی آپ تو بڑے تیس مار خاں ہیں!" سنگھ بابو نے خشمگیں انداز میں کہا "کل سے بندوق ہاتھ میں لی ہے' دس پانچ ہرن کبوتر مار کر شکاری بن گئے۔ میاں میں نے جتنے کارتوس پھونک دیئے اتنے چھرے بھی ابھی بندوق کی نال سے نکال پائے ہوں گے 'صاحب بہادر!"

"تیس مار خاں نہ سہی مگر کنور جی آپ کی طرح گھگھیا بھی نہ پڑتا۔" صابر خاں نے کچھ دریدہ دہنی سے کہا

"اجی صاحب زادہ صاحب! میں خیر گھگھیا تو پڑا" آپ کے حلق سے تو آواز بھی نہ نکلتی۔ دیکھتے ہی وہیں پر غش آ جاتا۔" سنگھ بابو نے کہا

سنگھ بابو [illegible] جوان راجپوت تھا اور اپنے وقت کا بڑا بہادر سپاہی قسم کا جوانمرد شکاری' جو جنگلی سور سے ایک برچھا لے کر جا بھڑتا تھا' اور دو تین شیر [illegible] اور زمین پر کھڑے ہو کر رائفل سے شکار کر چکا تھا۔ بلا کا مضبوط اور جفاکش' پرانا تجربہ کار چابک دست

وقار احمد اور صابر خاں 'نوجوان خام کار شکاری تھے۔ مجھے اور استاد رضا خاں کو سنگھ بابو کی آزردگی کا خیال ہوا اور میں نے کہا "بھیا صاحب! گنگیا ہمت سے ہار گئے اور تم کہتے ہو کہ بندوق چلائے۔ یہ سب وقت پر اوسان بند ہونے والی بات ہے ورنہ سنگھ بابو ہماری پارٹی کا سردار ہے اور ضلع کیا دور دور تک اپنا جواب نہیں رکھتا۔"

استاد سنگھ بابو کا انداز دیکھ کر بولے "ارے مردے آدمیوں اس میں بحث کیا ہے' اور بھئی تم بھی اُٹھتے ہو یار سنگھ بابو کل کے لونڈے سے۔ مٹی تو پولی ہو گی ہی۔ وہاں پر بھٹ کے اندر کی نکالی ہوئی' ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ چلو جس دروازہ سے تم نے گھستے دیکھا ہے وہاں پر کھوج (نشانات قدم) دیکھ لیں۔ چلئے چھٹی ہوئی۔ سب روشن ہو جائے گا۔"

ہماری مختصر سی پارٹی ایک اونچے ٹیلے کی نوک پر بیٹھی ہوئی تھی اور بحث استاد رضا خاں کے اخیر جملہ میں ختم ہو گئی تھی۔ مشرق سے سورج کی دمکتی ہوئی پیشانی چمکی اور بے آب و گیاہ خشک کنکریلی زرد مٹی کی اونچی نیچی وادی سنہری خیر گیوں سے منور ہو گئی۔ یوں تو ناکامی' تکان اور جاگنے کا کسل رگ رگ پر سوار تھا۔ مگر بھوت کے کھوج دیکھنے کا اشتیاق ہم سب پر سوار تھا۔ ہم بھٹ پر پہنچے' پہلے ماحول کا جائزہ لیا اور پھر اندر کی نکلی ہوئی نرم مٹی پر سنگھ بابو نے بھوت کے قدموں کے نشان دکھائے۔ یہ مٹی ڈھلوان کی صورت پنجوں سے کھود کر گھر بنانے والے جانوروں کے بھٹوں میں اندر جاتے ہوئے نرم راستہ کی طرح جمع رہتی ہے اور بھیڑیئے کے بھٹوں پر پنجوں کے پھینکنے سے پچاس پچاس گز تک لمبی پتلی سڑک سی بن جاتی ہے جو بھٹ کے اندر کو جاتی ہے' بالکل اسی طرح چوہوں کے بلوں پر جمع رہتی ہے۔

دور سے نرم پیلی گہرائی کی نکلی ہوئی مٹی کے اوپر بھوت کے پنجوں کے نہایت واضح نشانات بنے ہوئے اندر کو چلے آرہے تھے۔ جتنا چوڑا پنجہ اتنی ہی چوڑی ایڑی۔ رُخ الٹا پھرا ہوا۔ اور سنگھ بابو بولے "یہ دیکھئے یہ الٹا پنجہ' آپ ہی بتائیے کس کا ہو سکتا ہے؟"

"مگر یہ کیسے سمجھ لیا جائے کہ یہ باہر کو نکلنے کے نشانات نہیں ہیں' اور یہ پنجہ پیچھے کو پھرا ہوا ہے۔' استاد رضا خاں نے سوچ میں پڑتے ہوئے جواب دیا۔

"یہ یوں کہ میں سچ بول رہا ہوں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔" سنگھ بابو نے کہا۔

"مگر آپ ان نشانات کے بارے میں کیا کہیں گے؟" استاد نے چند اور نشانات کی جانب توجہ مبذول کراتے ہوئے کہ جو ان نشانات سے بالکل خلاف رخ میں لگے ہوئے تھے "اور پھر آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس ٹیلے کی آڑ سے اسے اچکتے ہوئے دیکھا اور اس ٹیلے سے براہ راست آتے ہوئے اس بل کے اندر کو بھی نشانات معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہوں۔ خیر یہ کہا ضرور جا سکتا ہے۔ لیکن اگر آپ میرے پوائنٹ آؤٹ کے نشانات کو بھٹ کے اندر سے نکلنے کے گردانتے ہیں تو آپ سب تجربہ کار لوگ ہیں یہ اندازہ لگائیے کہ ان میں سے تازہ کون سے ہیں۔ یعنی شروع رات کے کون سے اور اخیر کے کون سے؟"

میں نے کہا "اوس تو اب سب پر یکساں ہے اور چند گھنٹہ کے ال بل کے نشانات پر کوئی قطعی محاکمہ کرنا مشکل ہے۔"

"تو آپ یقین کیجئے کہ میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا کہ وہ انہیں پنجوں اندر گیا ہے۔"

ہم تینوں میں بات ہو رہی تھی' صابر خاں قائل تھے اور مسلم اور انوار خاں متحیر۔ مسلم نے ہماری گفتگو کے درمیان نہایت سنجیدگی کے ساتھ دخل دیا اور کہا "دیکھئے بات بزرگوں اور استادوں کے درمیان ہو رہی ہے۔ لیکن آپ حضرات کی اس فنکارانہ بحث کی علت غائی میری سمجھ میں نہیں آتی کہ پنجے پیچھے کو پھرے ہوئے ہیں یا آگے کو سیدھے ہیں۔ گستاخی معاف قبلہ! میں آپ حضرات سے یہ سوال کرتا ہوں کہ یہ پنجے بھیڑیئے کے ہیں؟"

"نہیں۔" استاد رضا خاں اور میرے منہ سے یک دم نکلا۔

"پھر کسی اور ایسے جانور کے ہیں جس کا اس جنگل میں پایا جانا قرین قیاس ہو؟"

"نہیں ہمارے پندار میں یہ کھوج کسی جانور کی جانب منسوب ہی نہیں کئے جا سکتے۔ یہ تو عجیب ہی سے ہیں اور سنگھ بابو کے قول کے مطابق بھوت کے ہی کہنا پڑیں گے۔"

"تو پھر قبلہ معاف کیجئے۔ یہ بے کار بحث کیوں! اگر آپ بھوت کے وجود میں یقین نہیں رکھتے تو میرے اس سوال کا جواب دے دیجئے کہ ان کھوجوں پر کیا چیز اندر گئی ہے اور کیا چیز نکلی تھی۔ اب بحث اس پر نہ کیجئے کہ یہ ہے کیا بلا' بلکہ آپ کو کرنا کیا ہے۔ اس پر سر جوڑ کر غور کیجئے یا پھر چپکے سے اپنے اپنے گھروں کو سرک جایئے اور پھر عمر بھر جنگل میں منہ نہ دکھایئے۔ ایک شکل تو یہ ہے' اور دوسری صورت یہ ہے کہ کم از کم اس معمہ کو اس حد تک حل کیجئے کہ یہ کس مخلوق کے نشانات قدم ہیں۔"

"غرض کسی نتیجہ پر پہنچنا تو ضروری ہے ہی' او کھل میں سر دیا ہے تو موسلوں کا کیا ڈر؟ اب میدان چھوڑ کر بھاگیں گے تو نہیں' بھوت نہ سہی بھوت کے ابا سہی۔"

سنگھ بابو نے پھر تفصیل کے ساتھ بھوت کے آنے 'اچکنے' جست کرنے اور اندر گھسنے کی تمام روئداد جگہ اور موقع کا حوالہ دے دے کر بیان کرنی شروع کر دی اور مسلم نے آہستہ سے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا" میرے اللہ! ٹھاکر جی وہ تو سب سنی' مگر میری عرض یہ ہے کہ اب کرنا کیا چاہئے؟ اس کی بات کیجئے' وہ تو آپ کے قول کی تصدیق میں یہ نشان موجود ہیں۔"

اور یہ سوال بے جواب تھا' ہر شخص گومگو میں تھا' لیکن جائے استاد خالی است! بوڑھے استاد رضا خاں بول پڑے "اماں کرنا کیا' بھوت سالے کے بھی دو ہاتھ پاؤں ہیں۔" اور پھر تمام بھٹ کے منہ کا اوپر سے اندازہ لگایا اور آہستہ سے متھار کر بولے "بہت بڑا لمبا چوڑا ہے پنار یئے' دو تین گھنٹہ بیڑی چلنے تو دو پانی ذرا نیچے ہے' چار پانچ نددھئے اور ٹھونکیاں لگیں گی___ پھر نکلی ہوئی مٹی پر نظر کی اور بولے "بھوت ذرا گہرا ہے اور جس پر ہم بیٹھے تھے اس سے ذرا لمبا چوڑا بھی۔ خیر بہر حال کچھ نہ کچھ تو ہمیں کرنا ہی ہے۔"

"کیا مطلب استاد؟ آپ اس بھٹ میں پانی بھر کر بھوت کو نکالیں گے؟ کیا بھوت کو پکڑنے کا ارادہ ہے؟" سنگھ بابو نے حیرت سے کہا

"اب وہ جو کچھ بھی ہو۔ جب بھوت سالا مٹی پر نشانات قدم چھوڑ سکتا ہے تو ہماری بندوق کی گولی بھی اس کے جسم میں گھس سکتی ہے اور اس کے جسم کو ہم پکڑ بھی سکتے ہیں۔"

"تو کیا یعنی۔ اوں۔ آں گویا آپ بھوت کو بندوق سے مار لیں گے؟"

"اجی ٹھاکر جی آپ نے سنا نہیں کہ مار کے آگے بھوت بھاگتے ہیں۔ ہمیں تو دکھنا یہ ہے کہ یہ ہے کیا بلا؟" استاد رضا خاں نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ "آپ پچیس تیس آدمی ایسے فراہم کیجئے جو بیڑی سے نیچے گڑھے میں سے پانی اٹھا کر اس بھٹ میں بھر دیں۔"

یہ زیر زمین رہنے والے جانوروں کے شکار کا بڑا موٹا اور پرانا طریقہ ہے' بھٹ میں پانی بھر دیا جاتا ہے' اور جب اندر سے پوری کھنڈال بھر جاتی ہے تو مجبور ہو کر جانور نکل بھاگتے ہیں اور باہر بندوق' کتوں' برچھوں اور کبھی کبھی جالوں سے شکار کرتے ہیں۔

مگر اتنی بلندی تک پانی اٹھانا بڑا طول عمل تھا۔ حساب لگایا تو بیک وقت پچیس آدمی درکار تھے۔ مگر ابھی سویرا تھا اور تمام دن پڑا ہوا تھا۔ استاد رضا خاں کا خیال تھا کہ دو بجے تک بھٹ بہ آسانی لبریز ہو سکتا ہے اور مزدوروں کی فراہمی کے سلسلے میں مجھے اور سنگھ بابو کو جانا پڑا کیونکہ اس جنگل کے کنارے ہماری زمینداری کے چند گاؤں لگے ہوئے تھے۔ ہم پہلے اس گونٹے میں پہنچے جس میں ہم خیال کئے ہوئے تھے۔ یہ گدڑیوں اور میراؤں کی چھوٹی سی بستی تھی۔ مگر ہماری کوشش کے باوجود خوف کے مارے ایک متنفس بھی ہمارے کام میں شریک ہونے کے لئے تیار نہ ہوا۔ یہاں سے اپنا بیل تانگہ جتوا کر دوسرے گاؤں میں پہنچے مگر یہاں بھی ہر ایک نے بھوت کے خوف سے اس کام میں ہمارا ہاتھ بٹانے سے انکار کیا تو سنگھ بابو نے کہا چلو پس گنوے چلیں۔ یہ پاسیوں کے گاؤں تھا اور میری اور سنگھ بابو کی مشترکہ

زمینداری تھی۔ راستہ میں سنگھ بابو بار بار اپنی نبض پر ہاتھ لے جاتے اور دو ایک مرتبہ دوران سر کی شکایت کی۔ بس گنوتے پہنچتے پہنچتے انہیں خوب اچھی طرح بخار چڑھ آیا تھا اور میں نے کہا "وقت کی بات ہے! کتنے کتنے جاڑے پالے میں ہم شکار کو گئے۔ ٹھنڈے پانی اور دلدل میں سارا سارا دن اور پوری پوری راتیں گزاریں مگر یہ رات کی سردی تمہیں نقصان کر گئی اور کاتک کی سردی چپکے سے آ دبوچتی ہے۔"

"ہاں۔ سر میں بڑا درد ہے۔"

اور جب میں نے غور کیا تو بری طرح جل رہے تھے۔ جتنی دیر میں پچیس تیس پاسیوں کے نوجوان پٹھے فراہم کیے اتنی دیر میں سنگھ بابو ڈیرہ میں پڑی ہوئی چارپائی پے بے ہوش ہو گئے۔ میں نے وہاں دو تین معتبر آدمی ان کی خدمت اور تیمارداری کے لئے مامور کیے اور بیل تانگے میں جوڑ چار بیڑیاں اور پیچھے پیچھے پچیس تیس آدمی ساتھ لے کر چل پڑا۔ تمام راستہ ان آدمیوں کے دل سے بھوت کا خوف اتارتا گیا اور جو انعام ہمیں گورنمنٹ کی طرف سے بھیڑیا مارنے پر ملے گا اس کو جوں کا توں ان کے اندر تقسیم کر دینے کا لالچ دیتا گیا۔ اس کے علاوہ آج کے دن کی مزدوری کا بھی وعدہ کیا۔

پھر پتلے پاسیوں نے کام پر ہمت کر ذرا دیر میں نیچے سے اوپر تک نالیاں اور رندھے تیار کر لئے۔ پانی گڈھے سے تقریباً بیس فٹ کی بلندی تک اٹھانا تھا۔ جتنی دیر میں میں نے مزدور فراہم کیے اتنی دیر میں استاد رضا خاں اور بقیہ تین ساتھیوں نے بھٹ کے تمام مواقع بغور دیکھ لئے تھے اور جب مجھ کو تنہا واپس آتے دیکھا تو سنگھ بابو کے متعلق سوال کیا۔ میں نے بتایا کہ غریب رات سردی کھا گئے۔ بس گنوے کے ڈیرہ میں تیز بخار میں بھنتا بیہوش چھوڑ آیا ہوں اس پر استاد رضا خاں نے افسوس کیا مگر صابر اور مسلم یک زبان ہو کر بولے "وہ ہم جانتے تھے اسی وقت جس وقت وہ گئے تھے کہ اب یہ گئے کام سے۔"

"ہیں جی کیا بکتے ہو۔ بڑا تیز بخار چڑھا۔"

ابھی بکار نہیں ان پر بھوت چڑھا ہے۔" صابر نے کہا۔ "مگر اس پر کوئی ہنسا نہیں۔ جیسے بھوت کے خوف سے ہر ایک متاثر تھا۔"

اس بھٹ کے تین دروازے یا سوراخ یا خل تھے۔ ایک ڈھال کے اوپری حصہ میں اور دو سرا نیچے نیچے پورے ٹیلے کو اندر ہی اندر کاٹتا ٹیلے کی اس ڈھال پر نکلا تھا جو دوسری سائڈ پر تھا' اور ایک اس ڈھال پر۔ بیڑیوں سے پاسیوں نے پانی چڑھایا اور اوپر والے دروازے سے پانی بڑے زور سے سوراخ کے اندر کو پرنالے کی طرح چلنے لگا۔ سنگھ بابو تو بے چارے بیمار ہی ہو گئے تھے۔ اب ہم پانچ تھے۔ نیچے کے دونوں سوراخوں پر استاد رضا خاں اور مسلم' انوار اور صابر جوڑ بجوڑی بنا کر اپنی اپنی سائڈ لئے تعینات تھے اور میں سب سے اوپر ٹیلے کی نوک پر کھڑا تینوں سوراخوں کا تماشہ دیکھ رہا تھا۔ ایک جانب سے پانی داخل ہو رہا تھا اور دو سوراخوں پر چار بندوقیں پہرہ دے رہی تھیں۔ پانی بڑے تسلسل اور تیز رفتاری کے ساتھ اوپر چڑھ کر اندر داخل ہو رہا تھا۔ میں کچھ دیر تو اوپر کھڑا تماشہ دیکھتا رہا۔ پانی اندر گھستے ہی پہلے اندر سے ہلکی ہلکی گرد سوراخوں میں سے نکلی پھر کچھ کیڑے۔ ٹڈے پھدکے۔ ہم لوگ مطمئن اور جیسے اس معمہ کے حل ہو جانے کے شوق میں سرشار سے تھے۔ بھوت کا خوف تو دلوں سے بالکل ہی نکل گیا۔ شکار سے زیادہ اس تحقیق کا جذبہ کار فرما تھا کہ اندر کیا چیز ہے۔ ہم لوگ تھوڑی بہت بات چیت بھی کر لیتے اور میں تینوں سوراخوں پر یکساں نظر ڈال لیتا۔ ورنہ جس سوراخ سے پانی داخل ہو رہا تھا اس سے ایک سوراخ تو نظر آ سکتا تھا اور تیسرا سوراخ ٹیلے کی آڑ میں ہونے کے سبب ان دونوں سوراخوں سے چھپا ہوا تھا۔

ایک گھنٹہ دو گھنٹے۔ تین گھنٹے۔ چار گھنٹے پانی بھٹ کے اندر جاتے ہو گئے۔ مجھے اشارہ کر کے صابر خاں نے بلایا اور سگریٹ دکھائی۔ سگریٹ دیکھ کر میں ان کے پاس پہنچ گیا۔ یہاں سے وہ سوراخ جس میں پانی داخل ہو رہا تھا نظر آتا تھا۔ مگر ادھر والا سوراخ ٹیلے کی آڑ میں تھا۔ میں نے اس سوراخ پر جھک کر دیکھا تو تھوڑی دور اندر تک پانی اتنا اوپر کو بڑھ آیا تھا۔ میں نے سگریٹ سلگا کر کہا۔ "بس اب بھر ہی چکا ہے

بھٹ۔" اور اپنی بندوق کا سیف چڑھایا استاد رضا خاں نے جو دیکھا کہ میں ٹیلے کی چوٹی خالی چھوڑ کر چلا گیا ہوں تو اپنے والے بھٹ پر صرف مسلم کو چھوڑ کر وہاں آ بیٹھے اور مجھے ہاتھ کے اشارے سے وہیں رہنے کو کہا۔

پانی اور بھرا۔ یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے اوپر بخوبی نظر آنے لگا۔ متحرک پانی کی سطح پر میں نے چند بلبلے دیکھے اور پھر ایک بھیڑیئے کی ناک پانی سے اوپر دو انچ کے قریب باہر سانس لیتی نظر آئی جو بظاہر ایسی معلوم ہوتی تھی کہ مکوڑا پانی پر تیر رہا ہے۔ میں نے صابر کو اشارے سے دکھانا چاہا مگر وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ اوّل تو سائڈ ہی خالی تھی۔ پھر میں بلندی پر تھا اور بہت ہی قریب۔ بڑے اطمینان کے ساتھ بھرپور شست لے کر گراب کا فیر مارا پانی اور کیچڑ اچھل کر باہر آیا اور جب اک ذرا دھواں ہٹا تو پانی سرخ ہو رہا تھا۔ ایک آواز پانی کے بلبلوں کے ساتھ بھیڑیئے کی جانکنی جیسی آئی کھوپڑی پاش پاش ہو گئی اور اندر ہی اندر بھیڑیا ختم ہو گیا۔ اتنے میں سوراخ کی جانب سے جو ہم سے آڑ میں تھا یک دم دو دھماکے سنائی دیئے اور اوپر سے استاد رضا خان للکارے "بہت اچھے بہت اچھے۔ واہ!" دوسرا بھیڑیا ادھر والے سوراخ سے نکل کر بھاگا اور مسلم نے نکلتے ہی مار دیا ابھی ہم شکاری حادثہ کی اچھی طرح رنگینی کا بھی اندازہ نہ کرنے پائے تھے کہ یک دم اوپر والے دروازے سے جس میں سے لگاتار چار گھنٹہ سے پانی داخل ہو رہا تھا ایک عجیب النوع مخلوق برآمد ہوئی جسے دیکھ کر بے ساختہ منہ سے نکلا "بھوت! بھوت! بھوت!!" اور وہ بھی کلام موضوع کی آواز میں زبان سے نہیں بلکہ بیچ بیچ سینہ اور پیٹ کی گہرائیوں سے پھاڑتی چیرتی چیخ میں ——— یک دم بھوت نیم ایستادہ ہو کر اپنے سامنے والے پاسی سے دست و گریباں نظر آیا۔ جو بھٹ کے سامنے پانی کا راستہ اپنے پاؤں سے درست کر رہا تھا۔ پاسی اور بھوت میں بمشکل دو چار ہاتھ کا تبادلہ سا ہوا ہوگا کہ وہ دونوں گتھ گئے اور کیچڑ میں لت پت بھوت نے پاسی کو اور پاسی نے بھوت کو دبوچ لیا۔ بھیڑیئے سے ملتی جلتی دو چار غراہٹیں سنائی دیں۔ انوار دبک گیا۔ صابر بے ہوش سا ہو کر ایک نشیب میں ہو گیا۔ میں نے بھی جھاڑی کی آڑ پکڑی۔ بھوت اور پاسی میں ایک پکڑ بھی اچھی طرح نہ ہونے پائی تھی کہ کیچڑ میں چکنا بھوت گرفت سے پھسل کر بھاگا۔ سامنے دوسرا پاسی بیلچہ لئے کھڑا تھا۔ بھوت کو بڑھتے دیکھ کر اور کوئی راہِ فرار نہ پا کر مرتا کیا نہ کرتا۔ بیلچہ لے کر جھپٹا۔ بھوت پلٹ پڑا۔ اتنی دیر میں بوڑھے استاد رضا خاں اوپر سے شیر کی سی دو تین جستیں لگا کر نیچے آگرے تھے۔ میرے سامنے تھوڑا سا موقع تھا اور میں نے بھوت پر بندوق سیدھی کی مگر استاد نے بڑے زور سے ڈانٹ کر مجھ کو فیر کرنے سے روکا۔ ایک جست اور لگائی۔ ادھر بھوت جیسے کچھ راہِ فرار کا اندازہ کرنے کے لئے چند سیکنڈ ٹھٹھکا سا۔ اتنے میں استاد نے اسے جا لیا۔ بڑی پھرتی سے بنوٹ باز استاد نے اس کے سامنے اپنی پگڑی سر سے اتار کر پھینک دی۔ وہ کچھ پگڑی میں الجھا۔ کچھ لڑنے کا موڈ بنایا۔ اب کی جست میں استاد اس کے پیچھے پیچھے جا پہنچے اور بڑی دلیری کے ساتھ بندوق پھینک کر اس کے سر پر ہاتھ ڈال دیا اور پیچھے سے بالوں کا گچھا پکڑ لیا۔ بھوت پھر دو پاؤں پر نیم ایستادہ ہو گیا۔ استاد نے اس کا سیدھا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور پھر دوسرا اپنے دوسرے ہاتھ میں پکڑ کر گڈی چڑھائی اور جکڑ لیا اور بھوت کو بے بس کر کے قابو میں کر لیا۔ ہمارے دل دہل اٹھے۔ بوڑھا پچاس سالہ تجربہ کار شکاری آج اپنے صید افگنی کے فن کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گیا تھا۔ قادر انداز شکاری بندوق پھینک کر کلائیوں کے بل پر بھوت کو پکڑے ہمارے سامنے کھڑا تھا بھوت بری طرح غرا رہا تھا۔

اس سنسنی خیز حادثہ میں بھٹ سے نکلنے سے استاد کے گڈی چڑھانے تک بمشکل ڈیڑھ دو منٹ لگے ہوں گے اور ابھی تک ہم حادثہ کی رنگینی لذت آفرینی کا بھی بھرپور اندازہ نہ کرنے پائے تھے کہ استاد نے اپنی مضبوط کلائیوں سے بھوت کا سامنے کا رخ ہماری جانب کو پھیرتے ہوئے مسکرا کر بھرائی آواز میں کہا "دیکھو تو یہ کیا ہے؟" اب حرکتوں کا کہرباتی تسلسل جو اتنا شدید تھا کہ آنکھ کی شعاعیں بھی تعاقب سے عاجز سی تھیں۔ استاد رضا خان کے مضبوط ہاتھوں میں بل سے کھا رہا تھا اور یہ ہولناک مخلوق ان کے ہاتھوں میں اچھلنے کودنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہم سب پر ہیبت کم اور تحیر زیادہ طاری تھا جس وقت گڈی چڑھائے ہی چڑھائے غراتے ہوئے کیچڑ میں لتھڑے بھوت کا سامنے کا رخ ہماری جانب کو ہوا تو اس بھیانک چہرہ اور اس پر بالوں کا گچھا دیکھ کر حیرت اور خوف کے ملے جلے احساس سے ہمارے

منہ سے بیساختہ چیخ نکل گئی۔ بھوت غصہ میں غرا رہا تھا۔ بل کھا کھا کر دہاڑنے دبلنے لگا رہا تھا۔ الامان الحفیظ! کیسا سنسنی خیز منظر تھا۔ شدت خوف سے ہماری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ دونوں پاسی فرار ہو گئے تھے اور ہم سب جہاں کے تہاں منقوش سے تھے۔ استاد رضا خاں بھوت کو شکنجے میں کسے مسکرا رہے تھے اور بولے "ارے بزدلو! تم نے تو بھد توں کو مات کر دیا۔ دیکھو تو ادھر چلو۔ پتہ کیا بلا ہے؟" اور بھوت نے پھر بل کھا کر دانت چبائے۔ بری طرح غرایا اور نکلنے کی کوشش کی مگر استاد نے اسکو اس بری طرح جکڑا تھا کہ قلم کی طرح گاڑ سا دیا تھا اور ستم بالائے ستم یہ کر رہے تھے کہ جب وہ کمر جھکاتا تھا تو استاد گھٹنا مار کر کم بخت کو سیدھا کھڑا کر دیتے تھے۔ جب اس طرح بھوت کی نمائش کرتے ہوئے تقریباً دو تین منٹ ہو گئے اور ہماری رگ رگ پر حیرت نے قبضہ کر لیا تو ہم نے معاملہ پر غور کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ نہ سمجھے البتہ اس دو تین منٹ کے اندر ہم نے عقل و حیرت و خوف سے چھڑایا اور میرا دماغ ادھر لگا کہ آخر بھوت پکڑنے کے بعد استاد رضا خاں اس قدر مطمئن کیسے ہیں یا اللہ! یہ کیا طلسم ہے۔ میں نے ایک قدم ادھر بڑھایا اور شاید بقیہ اور ساتھیوں کے شعور بھی حادثہ کے عجوبہ پن سے گلو خلاصی کر کے معاملہ کی اصلیت معلوم کرنے کی جانب رجوع ہوئے۔ انہوں نے بھی بندوقیں سیدھی کر کے ایک ایک قدم بڑھایا۔ اتنے میں استاد نے بھوت کو اور بھی زیادہ بے قابو کر کے اس کو اپنی گرفت میں کس لیا۔ میرا رونگٹا رونگٹا اس ہیبت ناک شکل اور بھیانک سراپا دیکھ کر اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ میں ٹھٹک گیا اور استاد مسکرا کر بولے "ارے لڑکو بھوت نہیں یہ آدمی کا بچہ ہے۔" مگر اس پر آدمی کے بچہ ہونے کا کسی پہلو سے اطلاق نہ ہوتا تھا۔ کیچڑ میں لتھڑے ہونے کے سبب اسکی ہیبت بھوت کے اس حلیہ سے بھی زیادہ بھیانک تھی جو ہر ایک کے دماغ میں خیالی قسم کی شکل کے بھوت کی ہوا کرتی ہے یا جو مخصوص صورت کی بیان کی جایا کرتی ہے۔

ہم تینوں استاد کے پاس دوڑ کر پہنچے۔ ادھر سے شور سن کر مسلم بھی بھاگتا ہوا اترا۔ بھوت کھڑا غرا رہا تھا۔ بل کھا رہا تھا۔ استاد اپنی قوی کلائیوں میں اسے سختی کے ساتھ جکڑے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ بولے اب دیکھتے کیا ہو کم بخت نے میرے کس بل توڑ لئے۔ زور کراتے کراتے پگڑی اٹھا کر کس لو سالے کے پنجے بڑے تیز ہیں۔ اس پاسی کو تو لہو لہان کر دیا۔"

صابر خاں نے پگڑی اٹھا کر بڑھائی۔ استاد نے کہا پہلے اس میں سے ایک پٹی پھاڑ کر ذرا اس کے منہ پر کس پیچھے کو گرہ تو لگا دو۔ اس کے دانت اور کچلیاں بڑی غضب کی ہیں۔ اگر کوئی پڑ گیا تو پار چے اڑا دے گا۔ پٹی پھاڑ کر اس کے ہونٹوں پر باندھی اور پیچھے لا کر گرہ لگا دی۔ بقیہ پگڑی سے پہلے گُدّی چڑھے ہاتھ جوں کے توں گدی چڑھے چڑھائے مضبوطی کے ساتھ باندھ لئے اور احتیاطاً دونوں پنڈلیاں بھی کس لیں اور گٹھڑی سی بنا کر پابدست دگرے دست بدست دگرے لٹکا کر وہاں تک لائے جہاں ہمارا اتنل تانگہ کھڑا ہوا تھا۔ پاسی کے بھاگنے سے مزدوروں میں بھاگڑ مچ گئی۔ حتیٰ کہ ہمارا گاڑی بان بھی تانگہ اور بیل چھوڑ کر فرار ہو گیا تھا۔ استاد نے بیل جوڑے اور بھوت کی گٹھڑی بنا کر تانگے میں ڈال لی۔ ہم چاروں پیدل ساتھ ہو گئے استاد نے گاڑی بانی کے فرائض انجام دیئے اور ہم اپنی جائے قیام کی جانب روانہ ہو گئے۔

جوں ہی ہم بھیڑیا انسان لے کر گاؤں میں پہنچے بھاگڑ سی پڑ گئی۔ بڑی مشکل سے ہم لوگوں نے گاؤں کے سمجھدار آدمیوں کو اس بھوت کی حقیقت سے آگاہ کیا۔ پھر بھی افواہیں بہت راسخ ہو چکی تھیں۔ استاد نے بہشتی کو بلوایا اور دو تین مشک پانی کی دھار سے اس کا غسل کرایا۔ غصہ ٹھنڈا ہوا اور بھیڑیے انسان کی شکل بھی مٹی دھل کر نمودار ہوئی۔ حجام بلوا کر دو تین آدمی اس کے ساتھ لگا کر اس کے بال کٹوائے۔ سترہ اٹھارہ سولہ سترہ سال کی عمر کا نوجوان برآمد ہوا جس کے جسم کی تمام کھال گوہ کے چمڑے کی طرح کھردری اور سیاہی مائل نیلی تھی۔ ہاتھ پاؤں بھی آدمی کے بجائے ریچھ، بندر سے مشابہ تھے۔ کچلیاں آدمی کی کچلیوں سے زیادہ بڑھی ہوئی اور نوک دار۔ منہ سے کف جاری اور آنکھوں میں لالی و وحشت۔ ناخن آگے کو بڑھ کر اور نوک دار ہو کر مڑ گئے تھے اور اچھے خاصے درندے کے پنجوں

کی شکل بن گئے تھے۔ جنہیں حجام بڑی مشکل سے تراش پایا۔ استاد نے حقیقۃ کرا کر "اللہ دیا" نام رکھا۔ بھیڑیے سے ملتی جلتی فوں فاں کرتا تھا۔ جس وقت کسی کسی وقت مبہم آواز نکالنے پر کلام کا دھوکہ ہو جاتا تھا اور گاؤں والے سمجھتے تھے آدمی کی بولی بول رہا ہے۔ شروع میں دو تین روز تو بڑے ہی غیظ میں رہا اور اگر اچھی طرح کس کر نہ بندھا ہوتا تو کود پھاند کر ہاتھ پاؤں توڑ لیتا یا چیخ چیخ کر سر پھوڑ لیتا۔ تیسرے روز جب چوپال کے نیچے سے بکریوں کا ریوڑ گزرا تو چھپک سا گیا اور اچھل کر حملہ کرنا چاہا۔

اب ہم کو بھیڑیوں کے شکار میں مزہ آنے لگا تھا۔ ایک ایک آدمی رات کو ایک ایک گاؤں والے نوجوان کو ساتھ لے کر بھٹ پر جا بیٹھتا اور بالعموم شروع شب ہی میں ایک ایک دو دو بھیڑیے مار کر آدھی رات تک پلٹ آتا اور ہم چھ آدمیوں کی پارٹی آٹھ دس بھیڑیے مار کر ہر شب پلٹتی تمام دن اللہ دیا سے کھیل کرتے۔ ہفتہ بھر کے اندر اللہ دیا اس حد تک مانوس ہو گیا کہ دونوں ہاتھوں اور دونوں پاؤں میں زنجیر ڈال دی گئی اور زنجیر کے اس گول کڑے پر کپڑا لپیٹ دیا گیا جو ہاتھوں اور پاؤں میں رہتا ہے کودتا۔ اچھلنا۔ سر پٹخنا چھوڑ دیا جس کی وجہ سے ہمہ وقت نگرانی کرنی پڑتی تھی اور تمام جسم جکڑ کر رکھنا پڑتا تھا۔ پہلے روز کچھ پوریاں اور ترکاری سامنے رکھی مگر اس سے مکدر ہو کر منہ پھیر لیا اور تین چار دن تک کوئی چیز حتیٰ کہ گوشت بھی نہ کھایا پھر ہم نے ہرن اور خرگوش کا گوشت دیا تو تھوڑا سا کھانا شروع کیا۔

دیہات سے دور دراز کے لوگ تماشہ دیکھنے آتے رہے۔ تین روز گزر گئے مگر ابھی عورتوں کی آنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ حتیٰ کہ اس گاؤں کی بھی عورتیں نہ آتی تھیں۔ ہم نے دو روز آرام کیا۔ ان دو روز میں بھیڑیوں کے شکار کی نئی مہم کی اسکیم بنائی۔ کچھ پیشہ ور شکاری بھی دیکھنے آئے اور ہماری سکیم میں شریک ہوئے۔

تیسرے روز گاؤں کی لڑکیاں جمع ہو کر آئیں اور چند قدم کے فاصلے پر کھڑی ہو گئیں چند منٹ کے بعد حسین۔ چنچل۔ شوخ و شنگ چمپا جو گاؤں کی سب سے خوبصورت لڑکی سمجھی جاتی تھی غول سے نکل کر مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ جب وہ قریب پہنچی تو اللہ دیا نے اوپر نگاہ اٹھائی اور ذرا اسٹ کر پاؤں پر پاؤں رکھا اور ستر پوشی کی اور منہ پر بار بار ہاتھ پھیرا جیسے اپنا آپا سنبھالا۔ پھر چمپا کی جانب سلونے سلونے تیوروں سے دیکھا۔ بھیڑیئے انسان کی وحشی آنکھوں میں رس آگیا اور محبت کے مرغولے ناچنے لگے۔ بڑی میٹھی نظروں سے چمپا کو بار بار سر سے پاؤں تک دیکھتا رہا۔ چمپا کھلکھلا کر ہنستی رہی اور لڑکیاں پیچھے سے مذاق کرتی رہیں۔ جب لڑکیاں چلنے لگیں تو جاتے وقت دور تک پیار بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

دوسرے روز پھر لڑکیاں جمع ہو کر آئیں اور پھر بھیڑیئے انسان پر رومانی کیفیات طاری ہو گئیں۔ چمپا پھر آگے بڑھی اور دوپٹہ کی آڑ سے دودھ کی بالٹی نکال کر اس کی جانب بڑھائی۔ بالٹی کی جانب اللہ دیا کھسکا۔ چمپا نے جھک کر بالٹی اور بڑھائی۔ ادھر سے اللہ دیا نے بالٹی کا کنڈا پکڑا اور چمپا کے نرم و نازک گداز ہاتھ سے اس کی کھردری موٹی انگلیاں چھو گئیں اور جیسے اس کے جسم میں بجلی کی رو دوڑ گئی۔ آنکھوں میں نشہ سا اتر گیا اور چمپا پھر کھلکھلا کر ہنسی تو صریحاً اللہ دیا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل گئی اور دودھ کی بالٹی اپنے ہاتھ سے سر کا کر غراغٹ پی گیا اور پی کر بڑے محبت بھرے تیوروں سے چمپا کی جانب دیکھا۔

اس کی داخلی کیفیات کا اندازہ کر کے چمپا پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی اور اللہ دیا کے تمام وجود کی درشتی اور وحشت ایک عجیب نرمی اور رومانٹک انداز میں بدل گئی۔ پھر بڑے اہتمام کے ساتھ ستر پوشی کے لئے پاؤں پر پاؤں رکھا اور جیسے اپنے اردگرد دیکھا گویا ستر پوشی کے لئے کپڑا تلاش کر رہا ہے۔

ہم کو بھیڑیوں کے استیصال کی مہم کے سلسلے میں ٹھہرے ہوئے تقریباً چھ ہفتے ہو چکے تھے۔ پیشہ ور شکاری بھی ہمارے ساتھ پوری طرح اشتراک کر رہے تھے اور مہم پوری تیزی سے جاری تھی۔ قریب دس بھیڑیئے روزانہ شکار کی اوسط تھی اور اب تو ہمارا بھی جی لگ گیا تھا۔ تمام دن عورتیں مرد۔ بچے اللہ دیا سے کھیلتے اور چمپا سے تو اللہ دیا اس قدر مانوس ہو گیا تھا کہ وقتاً فوقتاً اس کی موجودگی میں زنجیریں

کھول دی جاتیں مگر ہم کو قاعدہ کے مطابق بھیڑیا انسان کو گورنمنٹ کے حوالے کرنا تھا۔ چنانچہ ایک روز یہی کر دیا۔

جسم پر اچھی طرح کڑوا تیل مل کر اور اپنے ہاتھوں بنے چمپا نے بالوں میں کنگھی کر کے تیل لگا کے پر سوار کر کے مجسٹریٹ ضلع کے پاس بھیج دیا اور مجسٹریٹ ضلع نے اس کو پاگل خانے بھیج دیا۔ اللہ دیا خود بھی پاگل خانے رہا اور وہاں ماہرین نے اس کی حالت پر غور کرنے کے بعد یہ تجویہ کیا کہ اس کی بہترین تربیت چمپا جیسی شبان زادی ہی کر سکتی ہے اور پھر گاؤں واپس بھیج دیا۔

چھ مہینے بعد جب ہمارا گزر پس گوٹ میں ہوا تو اللہ دیا کو دیکھ کر متحیر ہو گئے۔ اللہ دیا اس قدر شائستہ ہو گئے تھے کہ بکریوں کے ریوڑ کو دیکھ کر زقندیں نہ لگاتے تھے اور گھنٹہ دو گھنٹہ کے لئے زنجیر سے آزاد کر دیئے جاتے تھے۔ چمپا کا حکم تو اس شان سے مانتے تھے کہ کوئی سرکس کا گھوڑا اپنے رنگ ماسٹر کا کہنا بھی اس سے زیادہ قاعدہ کے ساتھ نہ مانتا ہوگا اور اب چمپا نے اللہ دسایا کو تھوڑے بہت گھر کے اندر کے کام پر لگا لیا تھا۔ بھینسوں کا تھان صاف کرتے۔ گوبر تھاپتے۔ کبھی کبھی چکی پیستے اور جب چمپا قہقہہ لگاتی تو ہنسنے کی کوشش کرتے۔ وہ چمپا کی جانب دیکھ کر نشہ میں سرشار ہو جاتے اور کچھ مبہم سے الفاظ بھی نکالنے کی کوشش کرتے اور ایک روز جب چمپا نے ایک لنگوٹی لگائی تو چند منٹ تو پہنے رہے۔ مگر جب چمپا سامنے سے ہٹ گئی تو پھاڑ کر پھینک دی اور جب وہ پھر آگئی تو چیتھڑے لپٹنے کی کوشش کرنے لگے۔

سال ختم ہوئے چمپا نے اسے خوب اچھی طرح سدھا لیا اور اپنے رومانٹک احساس سے زیادہ کام پر لگا لیا۔ اس طرح چمپا کے گھر والوں کو ایک بے تنخواہ کا ملازم یا بن داموں کا غلام مل گیا جو اپنی اجرت اس کی صورت دیکھ کر پوری کر لیا کرتا۔ چمپا اسے ایک فرمانبردار ٹٹو ایک وفادار کتے کی طرح چاہتی تھی۔ اس کے جذبات سے بھرپور فائدہ حاصل کرتی اور اس کو زیادہ سے زیادہ کام پر لگاتی چلی جاتی۔

دیکھتے دیکھتے چمپا نے اللہ دیا کو بولی دی اور پھر وہ زبان کی شکل اختیار کرنے لگی۔ ایک سیدھے سادے انسان کی طرح کام پر لگایا لباس کا شعور دیا۔ دو ٹانگوں پر چلنا سکھایا یہاں تک کہ گنڈاسا لے کر چارہ کاٹنا' بیلوں' بھینسوں' گایوں کی خدمت کرنا سکھایا۔ ایسا معلوم ہوا کہ بھیڑیا انسان بڑی تیزی سے ارتقا کی منازل طے کر کے دوش بدوش پہنچ جائے گا اور مجھے تو ایسا محسوس ہوا کہ ایک وقت آئے گا جب چمپا اس کے متعلق سنجیدگی کے ساتھ سوچنے پر مجبور ہوگی اور شاید اس وحشی انسان کے رومان کا جواب دینے پر بھی!

جہاں میں رہتا ہوں

مہندر ناتھ

میں دن رات یہی سوچتا رہتا ہوں کہ تمہیں کیا لکھوں؟ وہ کون سا مضمون ہے جس میں مصنفوں نے خامہ فرسائی نہ کی ہو۔ تم نے لکھا ہے کہ میں عورت کی محبت کے متعلق کیوں نہیں لکھتا؟ یہ قصہ بہت پرانا ہو چکا ہے اور میں نے عورت کی محبت کے متعلق اتنا لکھا ہے کہ میرا جی خود ان باتوں سے اکتا گیا ہے لیکن خدا کے لئے مجھے اس طرف نہ دھکیلو۔ مجھے اپنے متعلق لکھنے دو ——— مجھے اپنی اُداسی' اپنے غم' اپنے دکھ کے متعلق لکھنے دو۔ شاید تم اس اداسی' اس غم' اس یاست میں ہندوستان کی اداس روح کی جھلک دیکھ سکو۔

یہ تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ میں کتنی دور سے چل کر آیا ہوں۔ کشمیر کی حسین وادیوں کا چکر کاٹ کر' پنجاب کے حُسن سے مرعوب ہو کر۔ دہلی اور لکھنو کا چکر لگا کر اور پونا کے طریبے سے سیراب ہو کر بمبئی پہنچ گیا ہوں۔ آخر اتنا لمبا سفر کیوں؟ کیا اتنی پھیلی ہوئی دنیا میں میرے لئے کوئی جگہ نہ تھی کہ میں ہندوستان کے ایک کونے سے چل کر دوسرے کونے تک پہنچ گیا ہوں۔ لیکن پھر بھی مجھے سکون نہیں ملتا! راحت نصیب نہیں ہوتی' خوشی محسوس نہیں ہوتی ———!

لوگوں نے بمبئی کی عمارتوں کی تعریف کی ہے۔ لوگوں نے سڑکوں' بسوں اور ریلوں کی تعریف کی ہے۔ مگر میں ان فلک بوس عمارتوں سے کبھی مرعوب نہیں ہوا۔ مجھے ان ٹراموں اور بسوں میں بیٹھ کر کبھی خوشی محسوس نہیں ہوئی۔ ہاں! جب کبھی سمندر کے کنارے جاتا ہوں تو جی خوش ہو جاتا ہے یہ پھیلا ہوا وسیع سمندر اور دور ——— بہت دور ——— ایک کشتی لہروں پر ہچکولے کھاتی ہوئی ایک نامعلوم منزل کی طرف رُخ کئے ہوئے چلی جاتی ہے اور پھر سمندر کے کنارے ناریل کے جھنڈ کے جھنڈ ——— ناریل کے درخت کافی لمبے ہوتے ہیں شاید سرو اور یوکلپٹس کے درختوں سے بھی لمبے اور اونچے ——— یہ درخت ہر وقت ہوا میں جھومتے ہیں۔ آپس میں ایک عجیب انداز سے سرگوشیاں کرتے ہیں اور رات کے وقت جب ہوا ان درختوں میں سے ہو کر گزرتی ہے تو ایک عجیب سرسراہٹ پیدا ہوتی ہے۔ پتے جھومتے ہیں۔ کسی جوان لڑکی کے پریشان بالوں کی طرح ——— چاند شرمائی ہوئی دلہن کی طرح ان درختوں کے پیچھے چھپا رہتا ہے۔ لیکن چاند کی سیمیں کرنیں سمندر سے ہم آغوش ہوتی ہیں۔ لہروں کو چومتی ہیں۔ کھیلتی ہیں۔ لہریں بڑھتی ہیں۔ کھیلتی ہیں۔ ریت کے ذرّے بکھرتے ہیں۔ چمکتے ہیں اور سمندر کی ٹھنڈی تازہ ہوا ناریل کے درختوں میں سے گزرتی ہوئی ایک اداس نغمہ پیدا کرتی ہے......

بمبئی میں مجھے تین چیزیں پسند آئی ہیں۔ سمندر۔ ناریل کے درخت اور بمبئی کی ایکٹرس ——— اصل میں ان تینوں چیزوں سے بمبئی زندہ ہے۔ اگر ان تین چیزوں کو بمبئی سے نکال دیا جائے تو بمبئی ——— بمبئی نہ رہے۔ شاید دہلی بن جائے یا لاہور یا ایک ایسا ہی معمولی

ماسٹر۔ میں یہاں کیوں آیا؟ اس کی وجہ تم جانتے ہو۔ وہی روزگار کی تلاش۔ پیٹ کا مسئلہ بہت پرانا مسئلہ ہے مگر انسانوں نے ابھی تک اس مسئلے کا کوئی حل تلاش نہیں کیا اور جب تک اس مسئلے کو حل نہ کیا جائے گا۔ پیٹ کی بھوک رہے گی۔ اس وقت میری جیب میں صرف چار آنے ہیں لیکن مجھے روزی کی اتنی فکر نہیں۔ آخر کھانے کو [illegible] ضرور مل جاتا ہے۔ کہیں نہ کہیں تمہارے جیسا دوست مل جاتا ہے اور پھر ہم کسی ہوٹل میں چلے جاتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں۔ میں کبھی کبھی اپنے دوستوں سے روپے اُدھار لیتا ہوں۔ لیکن یہ روپے کبھی واپس نہیں کرتا۔ کہہ دو یہ کمینگی ہے' ہوگی' بھوک ہی کمینگی سکھاتی ہے۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں۔ سرمایہ دار مزدور کی روزی چھین کر عالی شان محل تیار کرتا ہے۔ کیا یہ کمینگی نہیں؟ جابر کمزور کو مار کر سلطنت کی بنیاد رکھتا ہے۔ کیا کمینگی نہیں؟ حاکم محکوم کو کچل کر حکومت کرتا ہے' کیا یہ کمینگی نہیں؟ اور اگر میں اپنے مالدار دوستوں سے چند ٹکے قرض لیتا ہوں اور پھر واپس نہیں کرتا تو میں کمینہ ہو گیا؟ چھوڑو میاں تمہارے سماج کی عجیب قدریں ہیں اور میں ہر کام' ہر قدم' ہر منٹ' ہر سیکنڈ ان قدروں کو توڑنا چاہتا ہوں اور ان قدروں کا مضحکہ اڑانا چاہتا ہوں۔ چاہے تم مجھے کمینہ کہو یا گنوار۔

پہلے میں سیواجی پارک میں رہتا تھا۔ یہ جگہ ایکٹر اور ایکٹرسوں کی محبوب ترین جگہ ہے۔ شیواجی پارک کے چوک میں کھڑے ہو کر تم تمام ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو دیکھ سکتے ہو۔ سڑک کے ہر نکڑ پر' کسی نہ کسی موڑ پر۔ حلوائی کی دکان پر یا ایرانی کی دکان پر تم ایکٹروں کو دیکھ لو گے۔ یہ لوگ اتنے عامیانہ انداز سے رہتے ہیں جتنا تم یا میں۔ یہاں آ کر ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو دیکھنے کے لئے دل نہیں چاہتا۔ کیونکہ ہر روز تم انہیں دیکھ سکتے ہو اور جو چیز روز دیکھی جائے اس کی دلکشی جاتی رہتی ہے۔

تم نے یوں پرو تما گیتا کی تصویر مانگی ہے۔ ارے بھئی چھوڑو ان ایکٹرسوں کو___ کیوں دردِ سر مول لیتے ہو۔ بچاری اب بہت موٹی ہو گئی ہے کسی اور ایکٹرس کا نام لو۔ کوئی ہو بھی تو___ شاید مہتاب تمہیں پسند آئے۔ میری نگاہوں میں وہی عورت ہے جسے ہیروئن کہا جا سکتا ہے باقی تو پھول کر کپا ہو گئی ہیں۔ دراصل ہندوستان میں ایکٹرسیں اپنے جسموں کا خیال نہیں رکھتیں۔ ایک بار ایکٹرس بن گئی اور ہیروئن کا رول مل گیا تو بس لگی موٹا ہونے۔ نہ کمر رہی نہ لچک۔ نہ آنکھوں میں شوخی۔ چہرے پر گوشت چڑھنے لگا۔ کولہے اتنے پھیلے کہ ٹانگیں غائب اور آخر پھیلتے پھیلتے مجسم کپا بن گئیں اور اب بتاؤ___ کیا کرو گے تم ان کا فوٹو لے کر۔ کل ہی میں نے 'Metro' کے سامنے ایک اشتہار دیکھا جس میں مغربی ناچنے والی لڑکیوں کی ٹانگیں دکھائی گئی تھیں۔ اُف! کیا ٹانگیں تھیں۔ کتنی سڈول۔ جیسے سانچے میں ڈھلی ہوئی___ کتنی خوبصورت___ کتنی پر فریب، جیسے نگاہوں میں جذب ہو رہی ہیں۔ سارا ہندوستان چھان ڈالو۔ ایسی خوبصورت [illegible] ملیں گی۔ یہاں ان لوگوں سے رہنا سہنا سیکھو۔ ان لوگوں سے پوچھو کہ خوبصورتی کس چیز کا نام ہے؟ ان لوگوں سے پوچھو کہ [illegible] ٹانگیں کیسے تیار ہوتی ہیں؟ سڈول بازو کہاں سے ملتے ہیں؟ یہ کروCutuc یہ حسین۔ جوان۔ خوبصورت Curve جو عورت [illegible] ہوتی ہے۔ کہاں سے آتی ہے؟ کس طرح بنتی ہے؟ اس میں شرمانے کی کوئی بات نہیں۔ تم کہو گے کہ ہندوستان [illegible] لوگوں میں اتنی توفیق کہاں جو وہ اپنے جسموں کا خیال رکھیں؟ لیکن ان ایکٹرسوں کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے [illegible] جو لاکھوں روپے کماتی ہیں۔ رونا تو اس بات کا ہے کہ انہیں بھی خوبصورتی کا احساس نہیں۔ ہماری عورتیں تو پھول کر [illegible] پھول کر کپا ہو گئیں تو سمجھ لو "نروان" حاصل کر لیا۔

اور [illegible] عورت نظر آتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اپنی ٹانگوں کو اتنا چھپا کر رکھتی ہے کہ دنیا والوں کی نظریں اُدھر نہ جا سکیں ہمیں [illegible] احساس نہیں۔ ہمیں ان بزرگوں سے کچھ سیکھنا چاہئے۔

ارے [illegible] بہک گیا اور ہالی وڈ کی خوبصورت ٹانگوں کا ذکر کرنے لگا۔ اگر تم واقعی ان خوبصورت ایکٹرسوں سے [illegible] چلے جاؤ۔ میں بمبئی کی مشہور ایکٹرسوں سے تمہارا تعارف کرا دوں گا۔ یہ لوگ

بھی شہرت کے اتنے بھوکے ہیں جتنے ہم یا تم۔ یہ بھی ہماری طرح انسان ہیں۔ میں یوں ہی ایکٹرسوں کے جھمیلے میں پھنس گیا۔ کر رہا تھا ذکر اپنا۔ بیچ میں بیچاری ایکٹرس آ گئی تم نے میرے مکان کا پتہ پوچھا ہے۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ کہاں رہتا ہوں؟ میں پہلے شیواجی پارک میں رہتا تھا۔ وہاں سے کیوں چلا آیا؟ اس کی وجہ تمہیں بتاتا ہوں۔ ایک دوست کے پاس قیام پذیر تھا۔ آج کل کسی کو دوست بنانا اتنا ہی آسان ہے جتنا کہ دشمن ___ میرا دوست جس کا نام تم "R" رکھ لو۔ ایک نہایت ہی پہلوان قسم کا انسان ہے۔ جسم دیکھو تو جی پھڑک اٹھے۔ ورزش کا بہت شوقین ___ اکثر وہ دن رات ورزش کرتا ہے۔ ہر وقت جسم کو مضبوط اور توانا بنانے کے خواب دیکھتا ہے۔ دراصل اس کا خواب حقیقت بن چکا ہے۔ بچارے میں صرف ایک خامی ہے کہ وہ عورت کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتا اور اگر میں کبھی کسی عورت کی طرف دیکھتا ہوں تو اکثر وہ اس فعل کو برا مانتا ہے کبھی کبھی میں خیال کرتا ہوں کہ میرے دوست کا نظریہ درست ہے۔ آخر یوں ہی اپنے دل و دماغ کو خراب کرنے سے کیا فائدہ؟ ہر وقت عورت کے متعلق سوچنے سے کیا حاصل؟ بہتر یہ ہے کہ ورزش کی جائے۔ ڈنڑ پیلے جائیں۔ من یا وزنی پتھر ہر روز اٹھایا جائے اور جب انسان پتھر اٹھا اٹھا کر تھک جائے تو سمندر کے کنارے سیر کرنے چلا جائے اور سمندر کی لہروں کو تکتا رہے۔ جہاں تک نظر جاتی ہے پانی ہی پانی! یا لہریں ہی لہریں ___ دور ___ نظروں سے دور ___ سمندر اور آسمان آپس میں بغل گیر ہوتے ہیں۔ سورج اپنی کرنوں کو سمیٹ کر سمندر کو چومتا ہے اور آخر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخی۔ آسمان پر بھاگتے ہوئے بادل اور ٹھنڈی تازہ زندہ ہوا فراٹے بھرتی ہوئی اور ناریل کے درخت اور ان کی سوندھی سوندھی خوشبو ___ ان کو چھوڑ کر عورت کے پیچھے بھاگنا حماقت ہے' سراسر حماقت ہے۔

اگر تم میرے دوست کو دیکھ لو تو یہی کہو گے کہ کتنا اچھا حسین تراشا ہوا بت ہے۔ بالکل یونانی مجسمے کی طرح حسین اور خوبصورت۔ اس کی آنکھوں میں سرسبز گھاس کی نیلاہٹ اور اس کے رخساروں کی رنگت سیبوں کی طرح سرخ۔ اگر تم اس کے قریب بیٹھو تو اس کے جسم سے ایک ہلکی ہلکی صحت مندانہ خوشبو نکلتی ہے جو مکھن 'ٹماٹر' دودھ' دہی کھانے سے پیدا ہوتی ہے ___ عورتیں میرے دوست کی طرف دیکھتی ہیں ان کی نگاہوں میں تعریف ہوتی ہے۔ وہ سوچتی ہیں کہ یہ بازو اتنے سڈول کیوں ہیں؟ اس کی آنکھوں میں اتنی چمک کیوں ہے؟ اس کا جسم اتنا متناسب کیوں ہے؟ لیکن میرا دوست عورت کو دیکھنا نہیں چاہتا۔ نہ جانے اسے عورت سے کیوں چڑ ہے؟ اور جب عورت ایک حقیقت ہے تو حقیقت سے منہ موڑنا کہاں کی عقل مندی ہے۔ صرف ورزش کرنا اور گھی کھانا اور ایک خوبصورت جسم بنانا ہی زندگی نہیں ہو سکتا۔

میری طرف دیکھ لو۔ میں ورزش بھی کرتا ہوں اور صحت مند بھی رہنا چاہتا ہوں۔ لیکن میں صرف Boxer بننا نہیں چاہتا۔ زندگی میں کچھ اور بھی کرنا چاہتا ہوں۔ مثال کے طور پر اس لڑکی کو دیکھنا چاہتا ہوں جو اس بالکونی میں کھڑی رہتی ہے۔ کیا تم نے اس لڑکی کی طرف دیکھا؟ دیکھا ہو گا' ضرور دیکھا ہو گا۔ میں نے تمہیں اکثر دیکھا ہے کہ تم اپنے باغ میں چلے جاتے ہو اور ریشمی شبنمی گھاس پر' ایک سفید چادر بچھا دیتے ہو اور اس چادر پر لیٹ جاتے ہو۔ چاند آکاش پر مسکراتا ہے اور اس کی روپہلی کرنوں میں تم نہاتے ہو۔ ٹھنڈی اور برفانی کرنیں۔ گھنٹوں تک تم ان کرنوں میں نہاتے رہتے ہو۔ پھولوں کی خوشبو سے اپنے جسم کو بھگو لیتے ہو اور بڑی بڑی گھاس کو چومتے رہتے ہو۔ یہ تم کیوں کرتے ہو؟ کیا تم نے اس لڑکی کی طرف نہیں دیکھا؟ وہ بھی تو چاند کا ٹکڑا ہے۔ اس کے جسم سے بھی خوشبو نکلتی ہے۔ بہت ہی پیاری اور بھینی بھینی بالکل اس چاند کی طرح خوبصورت اور حسین ___ کیا تمہارے دل میں چاند کو چھونے کی خواہش پیدا ہوئی ہو گی۔ چاند تو خوشی اور مسرت کا منبع اعظم ہے۔ میں بھی اپنے چاند کو چھونا چاہتا ہوں۔ اسی خوشی میں نہانا چاہتا ہوں۔ اس مسرت کو اپنانا چاہتا ہوں۔ اسی لڑکی کے قریب سے گزرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اسے میرے وجود کا علم ہو جائے' تاکہ اسے معلوم ہو جائے کہ جو شخص ہر روز اس کی بالکونی کے نیچے سے گزرتا ہے اسے پسند کرتا ہے۔ اس عمل میں برائی کی بات کوئی نہیں یہ تو بالکل ایک ذہنی خواہش ہے۔

اور پھر میرے دوست کو ایک لانبے بالوں والی لڑکی سے سخت نفرت ہے۔ اگر وہ تمہیں پسند کرتی تو اس میں کیا حرج ہے اور اگر وہ ایک دن تمہیں دیکھنے کے لئے تمہارے کمرے میں چلی آئی تو اس میں غصہ ہونے کی کونسی بات تھی؟ اسے گھر سے نکالنے میں کون سی دانشمندی تھی؟ کیا اس حرکت کی لوگ تعریف کریں گے؟ کیا یہ اخلاق کا بہترین نمونہ ہے؟ تم نے اس قسم کی حرکتیں کر کے اس کی خواہش کو کچل ڈالا؟ خوشی کے سرچشمے کو خشک کر دیا۔ وہ آج کل اُداس اور غمگین کیوں نظر آتی ہے؟ اس کے رخسار آج کل کیوں زرد ہیں؟ وہ کیوں کھوئی کھوئی اور مغموم سی رہتی ہے؟ تم نے ورزش کی اور مکھن کھایا کھا کر آرام کی نیند سو گئے لیکن اس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی اور بیچاری سوکھ کر کانٹا ہوتی گئی۔ میں اس قسم کی اخلاقی قدروں کو پسند نہیں کرتا۔ میں جانتا ہوں جب تمہیں عورت کی ضرورت پڑتی ہے تو تم کیا کرتے ہو؟ تم ٹھنڈا پانی پیتے ہو اور ٹھنڈے پانی کے ٹب میں نہاتے ہو۔ یہ کب تک کرتے رہو گے؟ اور اگر دنیا کے سب لوگ اسی فارمولے پر عمل کرنے لگیں تو زندگی بے کیف اور بے رنگ ہو کر رہ جائے۔

تو ہاں! میرے کہنے کا یہ مطلب تھا کہ ایک دن ایک لڑکی میرے دوست کے کمرے میں آئی۔ میں بھی وہیں موجود تھا۔ لڑکی کو دیکھ کر میرے دوست کو غصہ آ گیا۔ اس نے لڑکی کو گالی دی، برا بھلا کہا ____ کہ وہ طوائف ہے، وہ ایک بدمعاش عورت ہے۔ لڑکی بیچاری بکی بکی رہ گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ لڑکی نے نیا نیا دھندا شروع کیا تھا اور وہ ہم لوگوں سے دوستی کرنے آئی تھی اور چاہتی تھی کہ ہم لوگوں کو وہ اچھی لگے اور پسند آئے۔ اس سے پہلے وہ ایک لونڈے سے محبت کر چکی تھی اور اب وہ میری طرف جھک گئی مگر میرے دوست نے لڑکی کی بے عزتی کی اور گھر سے نکال دیا اور میں دیر تک اس واقعہ پر غور کرتا رہا۔ اگر میرا دوست ان پڑھ ہوتا تو شاید میں اسے معاف کر دیتا۔ لیکن جو شخص پڑھا لکھا ہو اور پھر ایک طوائف کو گالی دے کہ وہ کیوں پیشہ کراتی ہے، وہ کیوں اپنے جسم کو بیچتی ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ شخص زندگی کے بنیادی مسئلوں کو نہیں سمجھتا، اور اگر سمجھتا ہے تو اپنے اصولوں کی خاطر ایک ایسی عورت پر وار کرتا ہے جو نہتی ہے، جو اکیلی ہے، جس کا وارث کوئی نہیں، جس کی بے عزتی کی ذمہ دار سماج ہے، گورنمنٹ ہے، موجودہ سامراج ہے۔

طوائف کا مسئلہ ____ طوائفوں کو گالی دینے سے حل نہ ہو گا۔ بلکہ عورتوں کو تعلیم دینے سے، عورتوں کی بھوک مٹانے سے، عورتوں کو نوکری دینے سے، عورتوں کے لئے کام مہیا کرنے سے، عورتوں کو آزادی دینے سے اور عورت کے اقتصادی مسئلوں کو حل کرنے سے ہو گا۔ جب تک یہ کام حکومت نہ کرے گی طوائفیں رہیں گی اور آج بھی وہ واقعہ مجھے نہیں بھولتا۔ مجھے معلوم ہوتا ہے اس دن اس لڑکی کی بے عزتی نہیں ہوئی تھی بلکہ میری بہن کی بے عزتی ہوئی تھی۔ اس میرے دوست نے اس لڑکی کی بے عزتی کر کے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ مجھے بھی اس گھر میں نہیں رہنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ میں بھی ایک دن اسی طرح اس گھر سے نکالا جاؤں۔ اس لڑکی نے جن قہر آلود نظروں سے میرے دوست کی طرف دیکھا، اس سے صاف عیاں تھا کہ اگر وہ مرد ہوتی تو اسے تھپڑ لگا کر اس کے ہوش ٹھکانے لگا دیتی۔ وہ کون شخص ہے جو اچھی زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔ آخر اس لڑکی کو کیا غرض تھی کہ وہ اپنا جسم راہگیروں کے ہاتھ بیچتی پھرے۔ کیا اس کے سینے کے ایک گوشے میں یہ تمنا نہ تھی کہ اسے ایک ایسا شوہر خاوند ملے جو خوبصورت ہو، جو نیک ہو، جو کماتا ہو اور جو اس سے محبت کرتا ہو اور اگر زندگی میں یہ چیزیں میسر نہ ہو سکیں اور بھوک اور فاقوں سے نڈھال ہو کر اپنے آپ کو بیچنا پڑے تو اس لڑکی کا کیا قصور! وہ اُداس شام مجھے کبھی نہیں بھولتی۔ وہ گالیاں ابھی تک میرے ذہن پر مرقم ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ گالی میرے سینے میں ایک زخم پیدا کر گئی ہے۔ اس دن کے بعد میں اپنے دوست کے گھر سے چلا آیا۔

آج کل ماہم میں رہتا ہوں۔ سمرسٹ کا ماہم نہیں، منٹو کا ماہم نہیں بلکہ شیواجی پارک سے ایک اسٹیشن آگے۔ یہ جگہ مجھے بہت پسند ہے۔ اس جگہ نے میری اُداسی میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ میرے گھر کے سامنے ناریل کے درخت ایستادہ ہیں۔ یہ درخت ہوا میں جھومتے ہیں۔ ہوا ناریل کے پتوں سے کھیلتی ہوئی آگے نکل جاتی ہے۔ میں اکثر بالکونی میں کھڑا رہتا ہوں اور اِدھر اُدھر دیکھتا رہتا ہوں۔

اکثر لوگ میری طرف اشارہ کرکے کہتے ہیں کہ یہ لڑکا یہاں کیوں کھڑا رہتا ہے 'کیا یہ پاگل ہے؟ کیا اس کا دماغ ٹھیک نہیں ہے؟ اور میں ان کی طرف اس طرح دیکھتا ہوں جیسے میں ان کی ہر بات کو اچھی طرح سمجھتا ہوں' جیسے میں ان کے دل کی ویرانی' ان کی بے بسی' ان کی لاچاری کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ لیکن میں نے انہیں بتانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میرے مکان کے سامنے ایک ایکٹر کا مکان ہے۔ میں اکثر ایک خوبصورت لڑکی کو کمرے میں اِدھر اُدھر پھرتے دیکھتا ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ پہلے یہ لڑکی ایکسٹرا Extra وغیرہ کا کام کرتی تھی پھر اس ایکٹر کو پسند آگئی اور اب اس نے اسے گھر کی چار دیواری میں قید کر دیا ہے۔ بمبئی میں عام طور لوگ ایکٹرسوں سے شادیاں کرتے ہیں اور پھر اپنی بیویوں کو گھر کی چار دیواری میں بند کر دیتے ہیں۔ اکثر ان لڑکیوں نے آزاد زندگی بسر کی ہے۔ ایک انتہا سے گذر کر دوسری انتہا تک پہنچ جاتی ہیں۔ کہاں وہ پہلے کھلم کھلا ہر مرد سے مل سکتی تھیں لیکن اب وہ کسی غیر مرد کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھ سکتیں۔ نتیجہ بے بسی' ایک یاسیت' ایک ڈر جو ہمیشہ ان کے ارد گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ مبادا ان کا مرد انہیں کسی غیر مرد سے باتیں کرتے نہ دیکھ لے' اور ان کا پھر وہی حشر نہ ہو جائے جس سے اکتا کر انہوں نے اس زندگی کو قبول کیا تھا۔ لیکن ازدواجی زندگی کے چند سال بعد انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ اس زندگی میں اتنا ہی زہر ہے' اتنی ہی تلخی ہے' اتنی ہی اُداسی ہے جتنی کہ ان کی زندگی میں پہلے تھی۔ کبھی کبھی سامنے والے ایکٹر کی بیوی میری طرف جھانک کر دیکھتی ہے۔ آنکھوں میں بے پناہ اُداسی ہے' چہرے پر ڈر کے آثار ہیں اور زندگی میں حسرت اور غم کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ ہوا زور زور سے چلتی ہے' کھڑکی کے پردے ہلتے ہیں' آنکھیں چمکتی ہیں' لمحہ بھر کے لئے' اور پھر تاریکی چھا جاتی ہے۔ میرے مکان کے نیچے اکثر گندگی کا انبار لگا رہتا ہے۔ کہتے ہیں بمبئی نہایت صاف جگہ ہے۔ اگر کبھی ماہم آؤ تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ماہم لاہور کی طرح گندا سڑا علاقہ ہے۔ مکان کے بائیں طرف دھوبی گھاٹ ہے جہاں دن بھر دھوبی کپڑے دھوتے ہیں۔ رسیوں پر طرح طرح کے فراک لٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ سُرخ فراک دیکھ لو' کسی جوان لڑکی کا ہوگا۔ وہ سفید فراک دیکھ لو' یہ کتنا لمبا فراک ہے کسی بڑھیا کا ہوگا۔ رنگ برنگ کی ساڑھیاں' پائجامے' قمیضیں' دھوتیاں' ٹائیاں' انڈرویر' چادریں جا بجا لٹکی ہوئی نظر آئیں گی۔ گلی کے قریب ہی ناریل کا درخت گرا ہوا ہے۔ چند دن ہوئے ہوا بہت زور سے چلی تھی جس کی وجہ سے ناریل کا درخت گر گیا تھا۔ بالکونی کے سامنے ایک چھوٹا سا مندر دکھائی دیتا ہے' اور اصل یہ مندر نہیں ہے۔ بمبئی میں بہت کم مندر ہیں۔ یہاں گوردوارے اور مسجدیں کم دکھائی دیتی ہیں۔ یہاں گرجے زیادہ نظر آتے ہیں۔ تو ہاں! شاید یہاں کے ہندوؤں کو مندر کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی تو انہوں نے ایک گڑھا کھود کر اس میں ایک پتھر رکھ دیا ہے اور ارد گرد ٹین کی چادریں لگا دی ہیں۔ عورتیں صبح سویرے آتی ہیں اور پتھر کی پوجا کرتی ہیں۔ چند دن ہوئے ناریل کا درخت اس پتھر پر گر پڑا تھا۔ میرا مطلب ہے اس خدا پر۔ لیکن درخت بھاری تھا' خدا کچھ نہ کر سکا' بچارا درخت کے بوجھ تلے دب گیا۔ آج کل جنگ کا زمانہ ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو کھانے پینے کے لئے کافی مل جاتا ہے۔ نہیں تو اسی بات پر ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ ہندو کہہ سکتے تھے کہ مسلمانوں نے جان بوجھ کر درخت کو گرایا ہے تاکہ ہندوؤں کے پرماتما کی بے عزتی ہو۔ لیکن آج کل ان مسئلوں کو کون پوچھتا ہے ___ جب پیٹ بھرا ہو تو خدا بھی یاد نہیں آتا۔ مذہب ___ بچارا ___!

میرا فلیٹ سیکنڈ فلور پر ہے اس لئے جب کبھی بالکونی میں کھڑا ہوتا ہوں تو ارد گرد کے مکانوں کو اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں۔ مکان کے دائیں طرف ایک گجراتی رہتا ہے۔ گجراتی بچارا بوڑھا ہے لیکن اس کی بیوی جوان ہے' اگر خوبصورت ہوتی تو میں ضرور اس سے عشق کرتا۔ بچاری نہایت ہی بدصورت ہے۔ کاش اس کے دانت باہر نکلے ہوئے نہ ہوتے تو شاید مجھے پسند آجاتی' اکثر وہ پھولوں کا گچھا اپنے جوڑے کے ارد گرد باندھتی ہے یہاں کی عورتوں کو پھولوں سے بہت رغبت ہے۔ معلوم ہوتا ہے عورت جتنی زیادہ بدصورت ہوتی ہے اتنی ہی اسے پھولوں سے محبت ہوتی ہے۔ یہاں تم ہر لڑکی کو' ہر عورت کو پھولوں سے لدی ہوئی پاؤ گے۔ عورت بیاہی ہوئی ہو یا کنواری لیکن پھول اس کی جان ہے' بغیر پھولوں کے تمہیں یہاں کوئی دکھائی نہ دے گی لیکن یہاں کے لوگ بدصورت ہیں' عورتیں اس سے

بڑی بدصورت عورت ہیں۔ صحت اچھی ہے لیکن چہرے کے خطوط ان کی چال ڈھال ان کا رہنا سہنا بالکل عجیب ہے۔ کم از کم مجھے تو بالکل پسند نہیں آیا۔ کاش بمبئی کی عورتیں پھولوں سے کم محبت کرتیں تو شاید ان کی خوبصورتی میں کچھ اضافہ ہو جاتا۔ جب ایک خوبصورت پھول کو دیکھنے کے بعد ایک بدنما چہرے پر نظر پڑتی ہے تو جی چاہتا ہے کہ دونوں کو سمندر میں غرق کر دیا جائے۔ بہر حال اس گجراتی عورت کو پھولوں سے محبت ہے۔ بوڑھا گجراتی اکثر باہر رہتا ہے اور شام ہونے کے بعد گھر آتا ہے۔ عورت دن بھر چارپائی پر پڑی رہتی ہے' بالکل اوندھی' اور سرہانے پر منہ رکھ کر ٹانگوں کو دن بھر ہلاتی رہتی ہے اور آج کل گجراتی نے ایک نوکر رکھ لیا ہے جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ گجراتی خود تو باہر رہتا ہے اور نوکر دن بھر گھر میں رہتا ہے۔ آج میں نے نوکر کو گجراتی کو چومتے ہوئے دیکھا۔ اس نے گجراتن کی کمر میں ہاتھ ڈال کر بستر پر لٹایا اور پھر دروازے کی چٹخنی بند کر دی۔ شام کے وقت گجراتن پھر باہر نکلی۔ آج اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی' اس کے حسن میں ناریل کی سوندھی سوندھی خوشبو تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہزاروں پھول کھلے ہوئے تھے۔ لیکن یہ خوشی جلد ہی فنا ہو گئی۔ بوڑھے گجراتی کو اس عشق کا علم ہو گیا اور اس نے نوکر کو گھر سے نکال دیا۔ آج پھر گجراتن کے لب سوکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں وہی یاسیت ابھر آئی ہے' اس کی ہنسی میں اداسی ہے' اس کی باتوں میں غم کی جھلک ہے۔ وہ اکثر بستر پر اوندھے منہ لیٹی رہتی ہے اور اس کی ٹانگیں ہلتی رہتی ہیں۔

تم کہتے ہو گے کہ میں پھر محبت کا قصہ لے بیٹھا۔ سچ کہوں تو بُرا تو نہ مناؤ گے___ میں ہر طریقے سے یہ کوشش کرتا ہوں کہ عورت کے متعلق کچھ نہ سوچوں' عورت کے متعلق کچھ نہ لکھوں لیکن ہر بار جب لکھنے بیٹھتا ہوں عورت سامنے آجاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عورت کے بغیر افسانہ پھیکا رہے گا۔

لیکن آؤ۔ عورت کی دنیا سے تمہیں دور لے چلتا ہوں۔ میں تمہیں اپنے دوستوں سے متعارف کراتا ہوں۔ جس جگہ میں رہتا ہوں' یعنی جس فلیٹ میں رہتا ہوں وہ فلیٹ صرف ایک انسان کے رہنے کے لئے ہے لیکن آج کل اس فلیٹ میں پانچ انسان رہتے ہیں۔

میرے ساتھ ایک بنگالی نوجوان رہتا ہے' اس کا نام چٹرجی ہے' یہ بنگال کے ایک دور افتادہ گاؤں سے چل کر بمبئی آیا ہے تاکہ روزگار مل سکے اور وہ امن اور چین کی زندگی بسر کر سکے۔ چٹرجی کا رنگ سیاہ ہے۔ وہ نہایت ہی دبلا اور پتلا ہے۔ اس کی ماں تپ دق سے مر گئی تھی۔ شاید اس کے پھیپھڑے جسم میں تپ دق کے جراثیم موجود ہیں۔ اس کے گال پچکے ہوئے ہیں' اس کی آنکھوں میں پریشانی جھلک رہتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ لیکن چٹرجی نہایت چالاک آدمی ہے' ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ میں نے اسے کبھی بے کار نہیں دیکھا۔ لیکن حالت یہ ہے کہ آج تک اسے کوئی کام نہیں ملا۔ وہ بمبئی میں اسے لئے آیا تھا کہ ایک کامیاب کیمرہ مین بن سکے۔ اس کا بھائی فوٹو گرافر ہے اور اس نے فوٹو کھینچنے کا کام بھائی کی دکان پر سیکھا تھا۔ اس کے بعد بمبئی کی طرف رُخ کیا۔ وہ اردو اچھی طرح بول سکتا ہے یہ عجیب بات ہے کہ بنگالی ہو کر اُردو بول لیتا ہے۔ لیکن وہ ہندی بھی جانتا ہے' ٹوٹی پھوٹی انگلش بھی بول لیتا ہے۔ اس کے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے لیکن ایک عام گریجویٹ سے بہتر انگریزی بول سکتا ہے۔ ایک بار اسے فلم میں جگہ ملی' لیکن کام اچھا نہ کرنے کی وجہ سے نکال دیا گیا۔ اب وہ ڈائریکٹر بننا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ ایک دن پروڈیوسر بن کر دکھائے گا۔ اس کے پاس کھانے کے لئے پیسے نہیں ہوتے۔ اکثر وہ ایک وقت کھانا کھاتا ہے۔ اس لئے اس کی صحت دن بدن کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ ایک بار اسے زکام ہو گیا اور ساتھ ہی بخار بھی۔ آگے ہی کیا تھا کہ زکام اور بخار نے اسے اور لاغر کر دیا۔ دو دن سے اس نے کچھ نہیں کھایا اس کی آنکھیں دھنس چکی ہیں۔ چہرہ زرد ہو چکا ہے اور جب وہ چلتا ہے تو اس کی ٹانگیں کانپتی ہیں۔ باتیں کرتے وقت اس کا سانس پھول جاتا ہے لیکن اس نے ابھی تک ہمت نہیں ہاری۔ وہ اب بھی کہتا ہے کہ وہ ایک دن پروڈیوسر ضرور بنے گا۔ وہ ایک دن فلم ضرور ڈائریکٹ کرے گا۔ کیا ہوا کہ اس کے پاس پیسہ نہیں۔ کیا ہوا وہ دن میں صرف ایک بار کھانا کھا سکتا ہے۔ وہ فاقے کرے گا' وہ زندگی سے لڑے گا۔ وہ فلمی دنیا کے ہر شخص سے جنگ

کرے گا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ لوگ کس طرح پروڈیوسر بن جاتے ہیں۔ بمبئی میں اگر کوئی پروڈیوسر بننا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ کسی حسین خاتون کو پھانس لے یا کوئی حسین خاتون اسے پھانس لے۔ بس چند دنوں کے اندر وہ شخص پروڈیوسر بن جائے گا۔ لیکن چٹرجی خوبصورت نہ ہونے کے باوجود بھی پروڈیوسر بننا چاہتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کوئی سمجھدار عورت اس پر عاشق نہیں ہو سکتی۔ اس سے عشق نہیں کر سکتی لیکن وہ اپنی دُھن کا پکا ہے۔ اس کا ارادہ چٹان کی طرح مضبوط ہے۔ اکثر وہ بمبئی کے اسٹوڈیو کا چکر لگا کر تھک جاتا ہے اور پھر تھک کر کہتا ہے کہ وہ اس زندگی سے اکتا گیا ہے' وہ کب تک ہاتھ پاؤں مارتا رہے' وہ کب تک جدوجہد کرے' وہ کب تک لوگوں کی گھرکیاں سنے اسے لوگوں سے نفرت ہو گئی ہے' اسے زندگی سے نفرت ہو گئی ہے' وہ خودکشی کرے گا۔ جب بھی وہ کرسی پر بیٹھ کر خودکشی کے متعلق سوچتا ہے تو اس کے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر ایک عجیب سی ہنسی ہوتی ہے' وہ پھانسی میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھی۔ اس ہنسی میں کتنی شکستیں پنہاں ہوتی ہیں جو زندہ ہو کر اس کے لبوں پر ناچتی ہیں۔ کائنات کا ہر ذرّہ خاموش ہے' بمبئی کا ہر سیٹھ زندہ ہے' بمبئی کے ہر ہوٹل میں روشنی کے قمقمے روشن ہیں۔ بمبئی کے ہر ہوٹل میں لوگ شراب پیتے ہیں' ڈانس کرتے ہیں' ہزاروں لاکھوں قمقموں کی روشنی پھیلتی ہے اور ہر طرف پھیلتی رہتی ہے۔ ٹراموں' بسوں اور موٹروں کی آوازیں مدھم نہیں پڑتیں۔ لیکن یہ شخص اس بے نور کمرے میں بیٹھ کر کیوں اُداس دکھائی دیتا ہے' اس کی آنکھوں میں کیوں مرنے کی تمنا ہے۔ آخر اس اندھی جدوجہد کے کیا مقصد ___؟ آج کل وہ کبھی کبھی کھانتا ہے' کیا اس کو تپ دق ہو گئی ہے؟ کیا وہ زندگی میں کبھی ڈائریکٹر بن سکے گا؟ کیا اس کی خواہش کبھی پروان چڑھے گی؟

میرے ساتھی اکثر چٹرجی کو چھیڑتے ہیں' اس سے مذاق کرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ کب ڈائریکٹر ہو گے؟ کب پروڈیوسر ہو گے؟ یہ ہی اس کے ساتھی ہیں جو خود بھی بھوکے مرتے ہیں' لیکن چٹرجی پر فقرے کسنے سے باز نہیں آتے اور جب زندگی میں اور کچھ نہیں کر سکتے تو سب مل کر چٹرجی کو گالیاں دیتے ہیں' اسے گھر سے نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ محض اس لئے کہ اس کا کوئی والی وارث نہیں' محض اس لئے کہ اس کے پاس اتنے روپے نہیں ہوتے کہ وہ فلیٹ کے کرائے میں اپنا حصہ ادا کر سکے۔ وہ اکثر دوسروں کا دستِ نگر رہتا ہے اور چٹرجی ان سب کی گالیاں خاموشی سے سنتا ہے' وہ جانتا ہے کہ اگر وہ یہاں سے نکال دیا جائے تو وہ کہاں رات بسر کرے گا؟ اس کا اور کوئی ٹھکانا نہیں بن سکتا وہ غصے میں آکر خط لکھنے لگتا ہے۔ کس کو؟ شاید اپنے باپ کو جس نے اسے پیدا کیا۔ شاید اپنی ماں کو جو کب کی مر چکی تھی' یا اپنے بھائی کو جو ایک دور افتادہ گاؤں میں زندگی کے دن کاٹ رہا تھا۔ خط لکھو' لکھتے جاؤ۔ دنیا کے ناخداؤں کو خط لکھو' چرچل کو خط لکھو' ٹرومین کو خط لکھو کہ وہ تمہیں روپے بھیجے' دنیا کے ہر بڑے انسان کو خط لکھو کہ وہ تمہیں اس زندگی سے نجات دلا دے' تم دنیا کے ہر بڑے انسان سے پوچھو کہ تم کیوں فاقے کرتے ہو؟ تم کیوں بھوکے مرتے ہو؟ تمہیں کیوں سونے کے لئے جگہ نہیں ملتی۔ لیکن خدا کے لئے خاموش نہ رہو۔ دوستوں کی گالیاں نہ سنو' تم اس ذلت کو برداشت نہ کرو۔ یہ ذلت میرے دل میں آگ لگا دیتی ہے۔ یہ سلوک میں برداشت نہیں کر سکتا اور کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ان سب لوگوں کو بالکونی سے نیچے پھینک دوں۔ دنیا میں ہر شخص ہٹلر ہے' مسولینی ہے' کمینہ ہے' رذیل ہے............

دنیا میں ایک ایسے نظام کی ضرورت ہے ___ ٹھہرو! میں کمیونزم کا پرچار نہیں کرنا چاہتا۔ میں کسی ازم کا پرچار نہیں کرنا چاہتا۔ میں کہانی نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں کہانی لکھنا نہیں جانتا۔ میری کہانی میں نہ پلاٹ ہوتا ہے نہ ماحول۔ میں کردار نگاری کے معجزے نہیں دکھانا چاہتا۔ میں رنگین عبارت نہیں لکھ سکتا' میں اردو ادب کی خدمت نہیں کرنا چاہتا۔ میری تشبیہیں نئی نہیں ہوتیں' میں غلط محاورے لکھتا ہوں' میری نثر میں خوبصورت اسٹائل کا مالک نہیں ہوں۔ میں موپساں اور زولا بننا نہیں چاہتا۔ میں شہرت کا قائل نہیں ___ میرے پاس اس

وقت صرف چار آنے ہیں۔ صرف چار آنے۔ لیکن میں جو کچھ بھی کہوں گا صاف صاف کہوں گا۔ میں وہ زبان لکھنا چاہتا ہوں جو ہر شخص کی سمجھ میں آجائے' میں وہ نظام چاہتا ہوں جس میں ہر شخص کو روٹی ملے۔ کپڑا ملے ایک گھر ملے۔ میں انسانیت کا قائل ہوں۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں اتنی کمینگی کیوں ہے۔ اتنی بے کاری کیوں ہے؟ اتنی بھوک کیوں ہے؟ اس کا جواب تم کیا دو گے 'انسانی خداؤں کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔

خیر___ ان سے ملو۔ ان کا نام ہری چند ہے۔ یو۔ پی ان کا دیس ہے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے 'ہری چند اپنے مالدار چچا کے ساتھ سٹہ کھیلتا تھا لیکن جوں ہی جنگ شروع ہوئی اس کا چچا سب کچھ سٹے میں ہار گیا اور بیچارے ہری چند کو نوکری کی تلاش میں بمبئی آنا پڑا۔ یہاں کچھ عرصہ سرکاری ڈپو میں کام کرتا رہا۔ لیکن ڈپو کی نوکری موافق نہ آئی۔ نوکری چھوڑ دی۔ کسی نے کہا کہ تم ایکٹر بن سکتے ہو۔ بس پھر کیا تھا 'ایکٹر بننے کا جنون سر پر سوار ہو گیا۔ بمبئی کی آدھی آبادی ایکٹر بننے کی تمنا کرتے کرتے مر جاتی ہے۔ بیچارے ہری کو بھی یہی جنون سوار ہے۔ کاش اسے اصلیت سے آگاہ کر دیا جاتا۔ مگر انسان اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتا ہے۔ وہ اصلیت کا کبھی سامنا کرنا نہیں چاہتا۔ آج کل دن بھر میں بیس بار کنگھی کرتا ہے۔ آئینہ ہر وقت اس کے سامنے رہتا ہے۔ غسل خانے میں دو دو گھنٹے صرف کرتا ہے اور جب نہا دھو کر نکلتا ہے تو کریم پاؤڈر کی آفت آتی ہے۔ تقریباً ایک ہفتہ میں Afgan Snow کی ایک شیشی ختم ہو جاتی ہے' وہ ہر روز دو گنی قیمت پر کپڑے دھلواتا ہے۔ آج کل وہ روپے گھر سے منگوا کر گزارہ کرتا ہے۔ لیکن کب تک___؟ وہ پھر سٹہ کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سرکاری نوکری کر کے کوئی انسان امیر نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک اچھے گھر میں رہنا چاہتا ہے' وہ ریڈیو خریدنا چاہتا ہے' وہ خوبصورت عورتوں سے محبت کرنا چاہتا ہے___ بتاؤ ان سب باتوں میں کون سی بُری بات ہے؟ ہر عقلمند شخص ان ہی باتوں کی خواہش کرے گا۔ ہری چند جانتا ہے کہ ڈپو کی نوکری کر کے وہ ان چیزوں کو حاصل نہیں کر سکتا اس لئے وہ ایکٹر بننا چاہتا ہے کیونکہ آج کل ایک ایکٹر ہزاروں روپے کما تا ہے۔ وہ سٹہ کھیلنا چاہتا ہے کیونکہ سٹہ کھیلنے سے یا وہ امیر ہو جائے گا یا محض بھکاری۔ ہری چند زندگی سے جوا کھیلنا چاہتا ہے۔ وہ جن حالات' جس ماحول میں رہتا ہے اس میں اسے رتی بھر خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ دن بدن اس کا وزن کم ہو رہا ہے' سر کے بال جھڑ رہے ہیں' آنکھوں میں مایوسی کے آثار نمایاں ہیں۔ وہ کچھ تھکا تھکا سا معلوم پڑتا ہے۔ آج وہ طاقت کی دوا خرید کر لایا ہے۔ وہ دوائی کا استعمال کرے گا اور زندگی کی کشمکش جاری رکھے گا۔ دوائیوں کے استعمال سے انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ آخر کب تک؟ جس ہوٹل میں وہ کھانا کھاتا ہے' وہاں نہایت ہی خراب خوراک ملتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ ان مسلسل مصیبتوں کا مقابلہ نہ کر سکے گا۔ میں نے اس سے کئی بار کہا ہے کہ وہ پھر سے ڈپو میں نوکر ہو جائے مگر وہ ہمیشہ نفی میں جواب دیتا ہے اور شیشے کو سامنے رکھ کر مسکراتا ہے اور بے جان کھردرے بالوں میں کنگھی کرتا ہے اور زور زور سے چہرے پر کریم ملتا ہے اور کہتا ہے کہ میں آہستہ آہستہ مرنا نہیں چاہتا۔ میں جانتا ہوں کہ میں اب زیادہ عرصے تک زندہ نہیں رہ سکتا۔ روز رات کو بخار ہو جاتا ہے اور ہلکی ہلکی کھانسی ہو جاتی ہے لیکن میں ڈپو میں نوکری نہیں کر سکتا۔ وہ با مشقت قید ہے۔ میں اس قید کو برداشت نہیں کر سکتا۔ دیکھو! اس ٹرنک میں میری بی۔ اے کی ڈگری ہے۔ اگر میں مر گیا تو (وہ پھر ہنستا ہے ایک کھسیانی ہنسی' جیسے وہ کبھی نہیں مرے گا) یہ ڈگری لکھنؤ یونیورسٹی کو واپس بھیج دینا۔ زیادہ عرصہ اپنے پاس نہ رکھنا___ ڈگری کا کافی حصہ دیمک چاٹ گئی ہے اور باقی___ ہے بھی کیا___

میں اسے سمجھاتا ہوں کہ بھائی کوئی نوکری کر لو لیکن وہ بالکل نہیں سنتا اور دور ابتدا میں عجیب انسانوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے' ہر طرف ابتری پھیلی ہوئی ہے اور ہر شخص ایک بہتر زندگی بسر کرنے کی فکر میں ہے۔ مگر وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں دنیا کی قسمت ہے' وہ چپ چاپ بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی شہرت' عزت اور عہدے کو برقرار رکھنے کے لئے انہیں پرانے راستوں پر گامزن ہیں جن پر کئی صدیوں سے باپ دادا نے حکومت کی تھی۔

اور رگھبیر سے تعارف کرانا تو میں بھول ہی گیا۔ رگھبیر دن بھر باہر رہتا ہے اور رات کے تقریباً بارہ بجے گھر واپس آتا ہے۔ تم پوچھو گے کہ وہ کیا کام کرتا ہے تو میں اس کا کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ اس فلیٹ میں جو شخص رہتا ہے اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا کام کرتا ہے۔ ؟دراصل اس فلیٹ میں جو لوگ رہتے ہیں وہ کچھ کام نہیں کرتے' ہاں اوتار سنگھ کو چھوڑ کر۔ اس کا ذکر میں پھر کروں گا۔

رگھبیر کو تم نے نہیں دیکھا۔ نہایت ہی چھوٹے قد کا انسان ہے' دور سے دیکھو تو ایک کھلونے کی طرح دکھائی دے گا اور جب نزدیک سے دیکھو گے تو شاید تمہیں خوبصورت دکھائی نہ دے۔ اس کے بال بھورے ہیں۔ اس کا رنگ گورا ہے' اسے سفید کپڑے پہننے کا شوق ہے اور عورتیں اسے کھلونا سمجھ کر پیار کرتی ہیں۔ رگھبیر جب کبھی گھر آتا ہے تو اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ ہوتا ہے جس پر وہ شعر لکھتا رہتا ہے پہلے پہل وہ کچھ گنگناتا ہے' پھر شعر لکھتا ہے۔ دراصل وہ شاعر نہیں ہے۔ وہ ایک فلمی شاعر ہے۔ شاعر اور فلمی شاعر میں جتنا فرق ہوتا ہے وہ تمہیں معلوم ہی ہو گا۔ رگھبیر ایک دلچسپ عاشق ہے' وہ ہر عورت سے عشق کر سکتا ہے بلکہ وہ ہر عورت سے عشق کرتا ہے اگر وہ کسی عورت کی طرف دیکھ لے اور اسے پسند آئے تو سمجھ اور گھبیر کو اس لڑکی سے عشق ہو گیا۔ سڑک پر چلتے پھرتے' ٹرام یا بس میں چڑھتے اُترتے' گلی کے موڑ پر' ہوٹل' سینما' گارڈن ہر جگہ وہ لڑکیوں سے عشق کرتا ہے' وہ صرف لڑکی کی طرف دیکھتا ہے اور گنگناتا ہے۔ "زندگی چاندسی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں۔" آہ بھرتا ہے اپنی محبت کے قصے دوستوں کو سناتا ہے۔ من گھڑت فسانے سنانے میں وہ نہایت کامیاب انسان ہے۔ جس لڑکی سے وہ عشق کرتا ہے اس سے شادی کا وعدہ ضرور کرتا ہے۔ چند دنوں بعد عشق کا اُبال سرد پڑ جاتا ہے لیکن رگھبیر کی نگاہیں کسی اور لڑکی کو تلاش کر لیتی ہیں۔ آج کل اسے ایک بنگالن سے عشق ہو گیا ہے۔ رگھبیر کہتا ہے کہ وہ واقعی عشق کر رہا ہے' یہ سُن کر ہم سب ہنس پڑتے ہیں۔ ہم سب اس کی محبت کی گہرائی کو جانتے ہیں۔ آج کل وہ ہر روز اپنی محبوبہ کو خط لکھتا ہے اور رات بھر جاگتا رہتا ہے۔ میں اکثر رگھبیر کی محبت کا مذاق اڑاتا ہوں۔ لیکن وہ ہنس کر ٹال دیتا ہے۔ اس کی ہنسی میں واقعی کچھ یاسیت سی آگئی ہے۔ کیا واقعی رگھبیر بنگالن سے عشق کرتا ہے۔ رگھبیر کہتا ہے کہ بنگالن جس کا نام گیتا ہے شروع میں اس سے شادی کرنے پر تیار ہو گئی تھی۔ گیتا ایک نرتکی ہے' وہ ایک مشہور فلم اسٹار کے روپ میں کام کرتی ہے اور بچارا رگھبیر اس بار اس ٹروپ میں شامل ہو گیا اور بنگالن کے پیچھے ہندوستان کا چکر لگاتا رہا۔ لیکن جب یہ ٹروپ کلکتہ پہنچا تو اس بنگالن نے صاف جواب دے دیا۔ اس کے چاہنے والوں نے اصرار کیا کہ وہ کیوں ایک غریب آوارہ لونڈے سے عشق کر رہی ہے۔ ہماری طرف دیکھو' ان فلک بوس عمارتوں کو دیکھو' ان کاروں اور چمکتی ہوئی ہیرے کی مالاؤں کو دیکھو' وہ شاعر تمہیں کیا دے گا! فقط چند شعر اور کچھ نہیں۔ اگر تم اس سے شادی کر وی گی تو بھوکی مر جاؤ گی' وہ کماتا ہی کیا ہے' وہ خود بھوکا ہے تمہیں کیا کھلائے گا؟ اور پھر وہ بنگالی نہیں ہے وہ پنجاب کی ایک نام نہاد ریاست کا باشندہ ہے' اپنے گھر رہو' اس کلکتہ میں رہو' یہاں ناچو گاؤ' لوگوں کو اُلّو بناؤ اور زندگی کے دن اس ہنسی خوشی میں بسر کرتی جاؤ اور بچارہ رگھبیر جب سے وہ کلکتہ سے واپس آیا ہے اس کا حلیہ بگڑ گیا ہے' عورت کی بیوفائی نے اسے بُری طرح اُداس کر دیا ہے۔ اب وہ ہر روز شراب پیتا ہے اور رات کے بارہ بجے گھر آتا ہے' وہ اپنے مستقبل کے متعلق بہت پُر امید تھا لیکن آج کل اس کے حوصلے پست ہو گئے ہیں۔ اس کے دل کی ویرانی دن بدن بڑھتی جا رہی ہے آج وہ کہہ رہا تھا کہ وہ بمبئی میں نہیں رہ سکتا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ شہر کی لڑکیاں اتنی چالاک ہوتی ہیں۔ وہ شملہ کی خوبصورت وادی میں اپنا مسکن بنائے گا' وہ یہاں نہیں رہ سکتا۔ وہ شملہ کی ایک انجان' الھڑ لڑکی سے شادی کرے گا۔ تیل اور نمک کی دکان کھولے گا' اسے فلمی دنیا سے نفرت ہو گئی ہے' اسے شاعری سے نفرت ہو گئی ہے۔ وہ زندگی کو دوبارہ شملہ میں زندہ جاوید کرے گا۔ وہ شملہ کے پہاڑوں کو بھول نہیں سکتا اور پہاڑوں پر پھیلی ہوئی دھند کو فراموش نہیں کر سکتا اور اس کے ذہن میں الھڑ لڑکی کے نقوش اُبھر آتے ہیں جس نے اس شہر جانے سے ایک بار روکا تھا۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے اور دھند چاروں طرف سے ان کی طرف بڑھ گئی تھی۔

لڑکی کافی عرصہ تک رگھبیر کی طرف دیکھتی رہی اور رگھبیر اسے بے یارومددگار چھوڑ کر شہر چلا آیا اور اب وہ پھر واپس جانا چاہتا تھا۔ کیا وہ لڑکی اب بھی اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ شاید! کون کہہ سکتا ہے۔ کیا اس کی شادی نہ ہوئی ہوگی کسی زمیندار کے ساتھ کسی نمبردار کے ساتھ۔ ایسی حسین لڑکی کو کون کنواری رہنے دیتا ہے۔ شہری اور گاؤں کی زندگی میں کوئی فرق نہیں دونوں میں جبر ہے' ہر جگہ ظلم ہے' ہر جگہ محبت کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے اور ظلم واستبداد کی پھیلی ہوئی سیاہی انسانوں کے دلوں کو اور سیاہ کر دیتی ہے۔ آج کل رگھبیر روتا ہے' شراب پیتا ہے اور شعر لکھتا ہے____ بیچارہ رگھبیر____ !

اوتار سنگھ بڑی عجیب شخصیت کا مالک ہے۔ یہ ایک سرکاری ڈپو میں نوکر ہے۔ صبح ۶ بجے گھر سے نکل جاتا ہے اور شام کے ۸ بجے گھر آتا ہے۔ وہ ایک ایسے ڈپو میں نوکر ہے جہاں جتنا زیادہ کام کیا جائے اتنی زیادہ تنخواہ ملتی ہے اور اس لئے اوتار سنگھ زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانا چاہتا ہے۔ وہ پنجاب کے ایک مالدار جاٹ کا لڑکا ہے' وہ نہایت اچھا سوٹ پہنتا ہے' اور ہمیشہ ٹائی لگا کر دفتر جاتا ہے اوتار سنگھ کہتا ہے کہ اسے آج کل ترقی ملنے والی ہے اور ترقی ملنے کی وجہ صرف اس کے صاف اور ستھرے کپڑے ہیں خاص کر اس کی نیلی ٹائی جو وہ عام طور سے پہنتا ہے۔ دفتر کا سپرنٹنڈنٹ اس سے بہت خوش ہے' اور ہمیشہ باقی کلرکوں کو لعنت ملامت کرتا ہے کہ تم کو بھی اس سردار کی طرح کپڑے پہن کر آنا چاہئے۔ اور تار سنگھ کو سکھ ازم پر یقین نہیں ہے' وہ گوردوارے نہیں جاتا اور اکثر قینچی سے داڑھی بھی صاف کرتا ہے۔ لیکن اگر سکھوں کے متعلق کوئی مذاق کیا جائے تو وہ اسے بہت برا مانتا ہے۔ وہ سکھوں کے خلاف کوئی بات سننا گوارا نہیں کر سکتا۔ وہ آزاد خیال ہوتے ہوئے بھی سخت رجعت پسند ہے۔

آج کل وہ بھی زندگی سے تنگ آ گیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسے ڈپو کی زندگی پسند نہیں' آخر کب تک آدمی دن رات کام کرے۔ ڈپو کی کلرکی انسان کو غلام بنا دیتی ہے اور نوکری کتنی ذلیل ہے۔ پھاٹک سے اندر داخل ہونے کے لئے Identification Card چاہئے۔ کارڈ دکھا کر اندر جانا پڑتا ہے' حاضری لگانی پڑتی ہے اور اگر کلرک کو____ اس کی تنخواہ سے پیسے کاٹ لئے جاتے ہیں۔ یہ زندگی نہیں دولت کی غلامی ہے' موت ہے اور پھر ان لمحوں میں کبھی بھی خوشی نصیب نہیں ہوتی۔ کبھی تو انسان جی بھر کر ہنس لے' کبھی کسی عورت کی طرف مسکرا کر دیکھ لے' یا عورت ہماری طرف ہنس کر دیکھ لے۔ میں کہتا ہوں کہ اس فلیٹ کے رہنے والوں میں اتنی جنسی بھوک ہے کہ تم ان کی باتیں سن کر گھبرا جاؤ اور سوچتے رہو کہ یہ لوگ کس ملک کے باشندے ہیں؟ یہ انسان نہیں بھوت ہیں۔

تم نے بمبئی آنے کے لئے کہا ہے۔ آؤ بڑے شوق سے آؤ اور میرے پاس ٹھہرو۔ اگر برا نہ مانو تو میں تمہیں اپنے گھر کا نقشہ کھینچ دوں تاکہ تمہیں میرے پاس پہنچنے میں کوئی تکلیف نہ ہو اور تم یونہی ادھر ادھر نہ بھٹکتے پھرو۔ اسٹیشن سے اترو تو بس میں بیٹھ کر شیواجی پارک کا ٹکٹ لو' اور پھر ماہم پوسٹ آفس کے سامنے ایک گلی ہے سیدھے اس گلی کی طرف مارچ کرو۔ جو دوسرا مکان ہے اس کی طرف نگاہ اٹھاؤ آشیانہ بلڈنگ کا نام پڑھ لینا' اور جوں ہی تم داخل ہو گے تو تمہیں ایک پاگل آدمی کا سامنا کرنا ہوگا۔ یہ انسان اکثر دروازے کے باہر پڑا رہتا ہے۔ لوگ اسے پاگل کہتے ہیں لیکن میں نے کبھی اسے کوئی ایسی حرکت کرتے نہیں دیکھا جس سے میں یہ سمجھ سکوں کہ یہ شخص پاگل ہے۔ اکثر یہ آوارہ پھرتا رہتا ہے' ایک پھٹی ہوئی قمیض پہنتا ہے۔ اس کے سر کے بال بکھرے رہتے ہیں اور ان میں مٹی کی تہہ جمی رہتی ہے۔ مسلسل فاقوں کی وجہ سے یہ انسان کافی دبلا پتلا ہو گیا ہے۔ میں نے اسے کبھی بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ اکثر یہ چپ چاپ لیٹا رہتا ہے اور جب لیٹے رہنے سے تنگ آ جاتا ہے تو سر کو جھٹک کر چلنا شروع کر دیتا ہے کبھی پیچھے مڑ دیکھتا ہے جیسے زندگی کا سرمایہ کہیں بھول آیا ہو۔ اس پاگل کے ساتھ تم ایک کتے کو دیکھو گے۔ کتا تمہیں دیکھ کر بھونکے گا کتے سے گھبراتا نہیں۔ یہ کتا ہر نوارد کو دیکھ کر بھونکتا ہے۔ اس کی سرخ آنکھوں میں تم یاسیت کی جھلک پاؤ گے۔ اس کے جسم کو دیکھ کر آشیانہ بلڈنگ کے رہنے والوں کی بھوک اندازہ لگا سکو گے۔ صاف ظاہر ہے کہ جس گھر کا کتا بھوکا ہو وہاں کے رہنے والے خود کتنے بھوکے ہوں گے۔ یہ کتا ایک دو بار دیکھ کر تم سے گھل مل

جائے گا اور پھر تمہیں دیکھ کر کبھی نہیں غرائے گا۔ نچلی منزل میں ایک میوزک ماسٹر رہتے ہیں' انہوں نے ایک طوائف کو پھانس رکھا ہے میں نے اس لونڈیا کو اکثر روتے ہوئے دیکھا ہے۔ اکثر یہ عورت سلاخوں والی کھڑکی میں بیٹھ کر ادھر اُدھر جانے والے لوگوں کو پریشان نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے مجھے معلوم نہیں کہ یہ میوزک ماسٹر اس لونڈیا کو کہاں سے لے آیا؟ میوزک ماسٹر کی شکل کسی بھٹیارے سے ملتی جلتی ہے' لیکن اس کے گھر کے باہر ایک موٹر کھڑی رہتی ہے۔ یہ موٹر اکثر ہر روز خراب ہو جاتی ہے۔ معلوم پڑتا ہے کہ موٹر اچھی طرح صاف نہیں کی جاتی' پٹرول کی کمی کی وجہ سے انجن خراب ہو گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود شام کے بعد میوزک ماسٹر اپنی خوبصورت بیوی کو کار میں بٹھا کر باہر لے جاتا ہے اور رات کے بارہ بجنے کے بعد دونوں واپس آتے ہیں۔ میں نے دونوں کو کبھی خوش نہیں دیکھا' وہ مسرت جو ازدواجی زندگی میں ہونا چاہئے' کبھی ان کے چہروں سے نمایاں نہ تھی' بلکہ ہر روز کمرے میں سے لڑائی جھگڑے کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ میوزک ماسٹر کی بیوی زور زور سے چیختی ہے' چلاتی ہے' میوزک ماسٹر کو دھمکی دیتی ہے کہ یہاں سے چلی جائے گی' وہ یہاں نہ رہے گی۔ دونوں زور زور سے باتیں کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے دن دونوں کو پھر اسی کمرے میں دیکھتا ہوں اور لڑکی پھر اسی کمرے کی کھڑکی میں بیٹھ کر لوگوں کی طرف دیکھتی ہے' معلوم نہیں کیوں____؟

ذرا سیڑھیاں چڑھ کر دوسری منزل آ جائے گی۔ یہاں ذرا ٹھہر جاؤ۔ ذرا دم لے لو' یہاں ایک ہی آشیانے میں تمام ہندوستان نظر آئیگا۔ یہاں ایک کرسچن لڑکی رہتی ہے۔ یہ لڑکی ہے یا عورت ہے یا ماں یا کسی کی بیوی' اس کا مجھے علم نہیں۔ کہتے ہیں کہ اس کے تین بچے ہیں۔ یہ تینوں بچے سیڑھیوں پر کھیلتے رہتے ہیں اور یہ کرسچین لڑکی دروازے میں کھڑی ہو کر اپنے بچوں سے انگریزی میں باتیں کرتی ہے۔ اس لڑکی کا کیا نام ہے اس کے مجھے علم نہیں اور نام پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ بچاری کی بُری حالت ہے' گو رنگ سفید ہے لیکن جسم پر گوشت نہیں' چہرے کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ اوپر والے جبڑے کے تین دانت آگے بڑھے ہوئے ہیں اور پنڈلیاں جو اکثر ننگی رہتی ہیں نہایت میلی اور سڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ میں نے اس کے خاوند کو کبھی نہیں دیکھا یعنی میں نے اس گھر میں کسی مرد کو نہیں دیکھا۔ بہر حال کوئی مرد تو اس گھر میں آتا ہی ہوگا ورنہ یہ بچے کہاں سے آ گئے اور بچاری کرسچین لڑکی گذارہ کس طرح کرتی ہوگی۔ جب تم یہاں پہلی بار آؤ گے تو تم کرسچین لڑکی کو دروازے میں کھڑی پاؤ گے' وہ تمہاری طرف دیکھے گی اور پھر منہ موڑ لے گی وہ ہر روز کس کا انتظار کرتی ہے' اس کا مجھے علم نہیں لیکن اس کی آنکھوں میں اس کے آنے والے محبوب کا انتظار ضرور ہوتا ہے۔ وہ کب تک انتظار کرے گی میں کیا بتا سکتا ہوں۔ میں نے ہمیشہ اس لڑکی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن میں نے ہمیشہ اسے دروازے میں کھڑا دیکھا ہے۔

کرسچین لڑکی کے دروازے کے سامنے چند مدراسی عورتیں رہتی ہیں' یہاں ایک بیوہ عورت رہتی ہے جس کی بہت سی بدصورت لڑکیاں ہیں۔ لڑکیاں سب جوان ہیں کاش ایسی لڑکیوں پر جوانی نہ آتی۔ وہ شباب ہی کیا جو تمہیں اپنی طرف نہ کھینچ سکے۔ وہ عورت ہی کیا جس کی طرف ایک نظر دیکھنے کے لئے جی نہ چاہے۔ عورت کے حُسن میں کشش ہونا چاہئے۔ اگر تم اسے ایک بار دیکھ لو تو تمہیں یہ محسوس ہو جائے گا کہ تم ایک زندہ متحرک دائرے کے اندر کھڑے ہو۔ لیکن آشیانہ بلڈنگ میں حُسن مردہ ہے' شباب عنقا ہے' زندگی جامد ہے' میں سمجھتا ہوں کہ زندگی حُسن سے پیدا ہوتی ہے' خوبصورت چیز کو دیکھ کر خوبصورت بننے کو جی چاہتا ہے لیکن یہاں تو بدصورتی کا مقابلہ ہے' معلوم پڑتا ہے کہ لڑکیوں کی ماں بیوہ ہے اور اس نے اپنی بیوگی کے تمام قوانین اپنی لڑکیوں پر عائد کر رکھے ہیں۔ میں نے ان لڑکیوں کو کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔ گھر کے دروازے اکثر بند رہتے ہیں اور جب کبھی مدراسن کے گھر کا دروازہ کھلتا ہے تو اس میں ایک بیوہ کا چہرہ تمہیں گھورتا ہے۔ ایک چہرے پر نفرت کی جھریاں ہیں' مٹتے ہوئے شباب کے آخری لمحے' بیوگی کی تلخیاں' زندگی سے انتہائی نفرت اور ایک نہ مٹنے والی پیاس اور تشنگی کا اظہار جو مدراسن کی آنکھوں سے جھلکتا ہے۔ صرف مدراسن کی آنکھوں سے نہیں بلکہ اس کا پرچھائیں تو تم ان جوان لڑکیوں کی آنکھوں میں بھی دیکھ سکتے ہو' صرف آنکھوں میں نہیں بلکہ اس نفرت' اس بھوک' اس تشنگی اور اس کی بیوگی کی

تشکیل تم ان لڑکیوں میں دیکھ سکتے ہو۔ اکثر یہ لڑکیاں خاموش رہتی ہیں، اداس اور پریشان رہتی ہیں۔ ہم سب اکثر اپنے کمرے کی چابی ان مدراسنو کو دے جاتے ہیں۔ اگر تم ان لڑکیوں کی جنسی بھوک کا اندازہ کرنا چاہو تو تم ایک دن کمرے کی چابی خود انہیں دینا تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ چابی لینے کے لئے کتنی بیقرار رہتی ہیں۔ اکثر وہ دروازے میں کھڑی رہتی ہیں اور جب تم سیڑھیاں طے کر کے نیچے اترو گے تو ایک بدصورت چہرہ تمہاری طرف دیکھے گا، اور ایک میلا گندہ سا ہاتھ تمہاری طرف بڑھے گا۔ میری انگلیاں کئی بار غیر شعوری طور پر ان بُری انگلیوں سے ٹکرا گئیں۔ لیکن ایک بار بھی ایسی دھڑکن پیدا نہ ہوئی۔ جو ایک جوان لڑکی کے جسم سے مس ہو کر پیدا ہوتی ہے، ان سب لڑکیوں کی شکلیں ایک جیسی ہیں، ان کے کام، ان کے چلنے پھرنے کا انداز، ان کے دیکھنے کا انداز ایک ہی ہے۔ وہ اکثر تمہاری طرف بار بار دیکھیں گی لیکن ان کی نگاہوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں جوانی میں شکست کا احساس ہو چکا ہے اگر ان لڑکیوں کی تربیت، ان کے ماحول، ان کے رہنے سہنے کے طریقوں کو ایک نئی ترتیب دی جائے تو ممکن ہو سکتا ہے کہ یہی لڑکیاں آفت کا پرکالہ بن جائیں۔ اس سوئی ہوئی زندگی میں شعلہ بن کر چمکیں۔ گو ان کا رنگ سیاہ ہے لیکن کیا ہوا۔ جوانی کو رنگ سے کیا نسبت؟ دور کیوں جاؤ ہمارے محلے میں ایک لڑکی رہتی ہے جس کا رنگ ان مدراسنوں سے بالکل ملتا جلتا ہے لیکن اس کے حُسن میں کتنی کشش ہے۔ اس کا اندازہ ہم ہی لگا سکتے ہیں یہ لڑکی اکثر سفید ساڑھی پہنتی ہے۔ کالی رنگت والی کو سفید ساڑھی بہت اچھی لگتی ہے۔ کالی رنگت اور سفید ساڑھی۔ سفید ساڑھی اور کالی رنگت۔ لڑکی کو ساڑھی پہننے کا سلیقہ آتا ہے۔ ساڑھی پہننے سے جسم کا ہر نقش ابھر آتا ہے اور ایسا معلوم پڑتا ہے کہ لڑکی ایک مصوّر ہے جو ساڑھی کو مصوّر کے برش کی طرح استعمال کرنا چاہتی ہے ___ حُسن بدلتا ہے، جوانی بدلتی ہے، ہر چیز بدل جاتی ہے لیکن لڑکی کا حُسن اسی طرح قائم رہتا ہے۔

آؤ میرے قریب آؤ۔ وہ لڑکی آرہی ہے، لو وہ آرہی ہے اور آشیانہ بلڈنگ کے سیکنڈ فلور کے رہنے والے بالکونی میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ لڑکی کے ہر قدم کی آواز، ان کے دل کی دھڑکن سے ہم آہنگ ہو رہی ہے، اور کبوتر ہوا میں پرواز کر رہے ہیں۔ ناریل کے پتے ہوا میں جھومتے ہیں، سورج کی سنہری کرنیں بالکونی پر ناچتی ہیں، ساڑھی جسم سے چپکی ہوئی ہے، جسم کا ہر خط واضح ہے، پنڈلیوں سے اوپر رانوں سے بڑھ کر کولھوں کا سنگھم، کتنا دلفریب ہے، مصوّر کو داد دو، اس کی انگلیوں کو چوم لو اگر چوم سکتے ہو۔ نظر کمر تک جاتی ہے، کمر پر زیادہ گوشت نہیں اور سینے کا پھیلاؤ، چھاتیوں کا زیر و بم، اور سمندر لہریں مار رہا ہے۔ لہریں آتی ہیں۔ ساحل سے ٹکراتی ہیں اور واپس چلی جاتی ہیں اور اوپر ایک چھوٹا سا خوبصورت چہرہ چھوٹے چھوٹے پتلے ہونٹ اور کبھی کبھی زبان، ان مرمریں ہونٹوں پر پھرتی ہوئی ___ ہونٹ چمکتے ہیں جیسے سبز پتوں پر شبنم کے قطرے، نچلا ہونٹ کچھ کچھ کھنچا ہوا، آنکھیں سیاہ، پلکیں جوانی کے بوجھ سے جھکی ہوئیں ___ یہ جانتے ہوئے کہ لوگ دیکھ رہے ہیں، لڑکی شرماتی نہیں۔ آنکھوں میں فتح ہے کامرانی ہے، لڑکی کو احساس ہے کہ وہ اپنے حُسن سے لوگوں کو مسحور کر سکتی ہے۔ وہ آگے بڑھتی ہے۔ ہری چند ایک آہ بھرتا ہے اور پھر کہتا ہے "مار ڈالا، مار ڈالا، ہائے مار ڈالا۔" اور چنر جی کی ہنسی ___ جیسے مُردہ زندہ ہو گیا اور اوتار سنگھ کا جھک کر دیکھنا اور رگھبیر کا شعر پڑھنا "زندگی چاندی عورت کے سوا کچھ بھی نہیں" اور پھر سب کا پیچھے ہٹ جانا اور کرسیوں پر بیٹھ گالیاں بکنا خدا کو، تہذیب کو، سرمایہ داروں کو، گورنمنٹ کو، ماں باپ کو، اور کمرے میں پاگلوں کی طرح چکر لگانا، چنر جی کا کرسی میں دھنس جانا، اوتار سنگھ کا اپنی پگڑی اتارنا اور لمبے لمبے بدبودار بالوں میں کنگھی کرنا ___ اور میرا لڑکی کی طرف دیکھتے رہنا ___ حتیٰ کہ حُسن آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے، اور شباب کی خوشبو ہوا میں گم ہو جاتی ہے اور صرف گالیوں کی آوازیں مکھیوں کے بھنبھنانے کی طرح دماغ سے ٹکراتی رہتی ہیں۔ "ابے او حرام زادے۔ اُلّو کے پٹھے ___ تیری ماں کو لے جائیں. ...."

آبِ حیات

راما نند ساگر

"ہیضہ ہو گیا___"

اور پھر قے کرنے کی مسلسل اور پریشان کن آوازیں۔

میں ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا۔ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ ساتھ والے کمرے سے کئی آوازیں آرہی تھیں۔ جنہیں میں بخوبی پہچان رہا تھا۔ کل سارا دن انہی لوگوں کے ساتھ ایک ہی لاری میں بیٹھ کر سفر کیا تھا۔ اس وقت یہ سب مسافر یہاں کیوں جمع ہو گئے ہیں____ "آدھی رات ادھر، آدھی رات اُدھر۔ مکان کی پچھلی طرف واقع ہزاروں فٹ گہری گھاٹی میں سے وہ آندھی جیسی سرد ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی جسے یہاں کے لوگ "ڈھوڈو" کہتے ہیں۔ ہوا کی آمد پر چیل کا جنگل بھیانک آواز میں سیٹیاں بجانے لگ گیا تھا۔ دن کی روشنی میں نظر آنے والا دُور نیچے بہتا ہوا دریا اب جنگل کی سیاہی میں گم ہو چکا تھا۔ البتہ پتھروں سے ٹکراتے ہوئے پانی کا مسلسل شور اس کی موجودگی کا ضامن تھا یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کئی ہاتھی ایک ساتھ چنگھاڑ رہے ہوں اور پھر بغل والے کمرہ سے قے کرنے کی مسلسل آوازیں..........

میں جلدی سے اُٹھا۔ ماچس کی تیلی جلا کر چارپائی کے ساتھ پڑے ہوئے ٹرنک پر رکھی ادھ جلی موم بتی کو جلایا اور تیلی بجھنے سے پہلے نہایت پھرتی اور کفایت کرتے ہوئے...... سگریٹ بھی سلگالی۔ کمرے میں روشنی ہو جانے اور سگریٹ کا ایک لمبا کش لگانے کے بعد اس ماحول کا خوف آور تاثر کسی حد تک دُور ہوا۔

بڑی بڑی درزیں چھوڑ کر رکھے گئے تختوں کی دیوار کے اس پار سرگوشیوں میں باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

"صاف ظاہر ہے کہ ہیضہ ہی ہے۔"

"کس غریب الوطنی میں موت آئی ہے"

"کشمیر دیکھنے کے ارمان بھی دل ہی میں رہ جائیں گے"

"یہاں کوئی ڈاکٹر........."

ڈاکٹر کی بات کہنے والے پر مجھے غصہ آیا اور ہنسی بھی۔ یہاں بنوت میں ڈاکٹر ڈھونڈ رہا ہے۔ جہاں گنتی کے چار شکستہ سے مکان کشمیر جانے والی سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ رات کو اگر دو چار لاریاں یہاں پڑاؤ ڈال دیں تو کسبیوں کے "حجلہ عروس" کی مانند

رات کی رات کے لئے یہ مکان بس جاتے ہیں۔ لیکن دن کے وقت یہ خانہ بدوشوں کی طرح دھوپ میں اونگھتے ہوئے کشمیر یا جموں کی طرف جانے والی موٹروں اور لاریوں کو ارمان بھری نگاہوں سے دیکھتے رہتے ہیں اور موٹروں کی پٹرول کی بو کو (جسے وہ کافی مقدار میں نہایت فیاضی کے ساتھ فضا میں معلق چھوڑ جاتی ہیں) اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں۔ بیمار ہو ڈاکٹر ——— "تم لوگ خود ڈاکٹر کیوں نہیں بن جاتے۔

مجھے اچانک کچھ یاد آیا اور میں سامنے کونے میں پڑے ہوئے سامان میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ سارا سامان بڑی بے ترتیبی سے ایک دوسرے کے اوپر گڈمڈ کیا گیا تھا کہ مجھے کم بخت ڈرائیور پر غصہ آنے لگا۔ میں نے جلدی سے ایک چھوٹی سی صندوقچی اٹھائی اور ساتھ والے کمرے میں چلا گیا۔

"ہٹو۔ ہٹو۔ ایک طرف ہٹ جاؤ۔ کیوں گھیر رکھا ہے مریض کو"

سب لوگ چھٹ گئے۔ بے ترتیب کپڑوں۔ پریشاں بالوں اور ایک ننھی سی صندوقچی کے ساتھ آتا ہوا اس وقت میں کوئی ایمرجنسی کیس کرنے والا ڈاکٹر نظر آ رہا تھا۔

میں نے کلائی پر ہاتھ رکھا۔ نبض ہو رہی تھی۔

"کتنی مرتبہ قے ہوئی"

"چار دفعہ"

"اور دست"

"یہی کوئی دو تین دفعہ"

"تو کوئی فکر کی بات نہیں۔ ابھی طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔" میں نے طفل تسلی سے کام لیتے ہوئے کہا اور اس صندوقچی میں سے سوم رس نکال کر چند قطرے اسے پلا دئے۔ سُن رکھا تھا کہ ہر بیماری میں کار آمد شے ہے اور پھر اس کام کے لئے تھی بھی یہی ایک چیز میرے پاس۔ لمبے سفر اور خصوصاً پہاڑوں پر آتے جاتے وقت یہ صندوقچی ضرور ساتھ رکھتا ہوں جس میں برانڈی' سپرٹ' آئیوڈین' بوران' سوم رس وغیرہ چند معمولی دواؤں کی شیشیاں اور پٹی کرنے کی رُوئی کے گالے دھرے رہتے ہیں۔ کئی مرتبہ میرے دوست اس کا مذاق اڑا چکے ہیں اور اسی لئے کبھی کبھی مجھے ڈاکٹر بھی کہنے لگتے ہیں۔ لیکن اس وقت تو اگر ایک ہزار بار بھی میں اس صندوقچی کو لمبے سفروں پر یونہی بیکار اُٹھائے گیا ہو تا تو اس کا صلہ مجھے اس ایک رات میں مل گیا——— میں نے اُسے بچالیا تھا۔

اس وقت وہ میرے سامنے چارپائی پر قریب قریب بے سدھ پڑی تھی۔ دوسرے تمام مسافروں کو میں نے کمرے سے نکال دیا تھا اور اُس کی ماں چارپائی کی پٹی پکڑے پرلی طرف بیٹھی مجھ پر سے صدقے واری ہو رہی تھی۔

"تم نے جو احسان مجھ پر کیا ہے۔ عمر بھر نہ بھولوں گی۔ میں اکیلی عورت ذات اس بیاباں میں کیا کرتی اور پھر صرف ایک مہینہ رہ گیا ہے اس کی شادی کو——— اس کے سسرال والوں کو کو نسا منہ دکھاتی۔ تم نے میری لاج رکھ لی بیٹا———"

اور وہ اپنا پروگرام سناتی چلی گئی کہ کس طرح اُس نے سوچا تھا کہ "چلو شادی سے پہلے اُسے ایک بار کشمیر کی سیر ہی کرا لاؤں——— ایک مدت سے کہہ رہی تھی اور اس طرح لگے ہاتھوں خود بھی امر ناتھ کا تیر تھ کر آؤں گی" اور اُس نے آپ ہی آپ یہ طے بھی کر لیا کہ اب میں بھی کشمیر میں انہی کے ساتھ رہونگا۔ وہ اپنی باتیں کئے گئی اور شاید مجھ سے بھی اس نے چند سوال پوچھے۔ جن کے جواب میں مَیں نے بھی لاشعوری طور پر لشتم پشتم کچھ نہ کچھ کہہ دیا۔ لیکن میرے تو حواس خمسہ کا اجتماع گویا صرف آنکھوں میں ہو گیا تھا..... آنکھیں' جو

اس حسنِ نیم خوابیدہ کے مرمریں مجسمے کو جیسے لگنے جا رہی تھیں۔

سارا دن جموں لاری میں بیٹھے بیٹھے اس کی طرف نگاہ بھر کر ایک دفعہ بھی نہ دیکھ سکا تھا۔ اس کی ماں کا ڈر تھا یا یہی فکر ذرا سی کوئی بات ہو جاتی تو ساتھی مسافر کیا کہتے اور پھر میں اکیلا ____! وہ سب لوگ جو خود اُسے بار بار اس طرح تاک رہے تھے۔ جیسے کچا ہی چبا جائیں گے۔ ادھیڑ عمر کے مسافروں کو اسے دیکھ دیکھ کر کس طرح انگڑائیاں آ رہی تھیں۔ وہی سب لوگ ذرا سی بات اُٹھنے پر اپنی شرافت و نجابت کا ثبوت دینے کے لئے مجھے کس کس طرح نہ ڈانٹتے۔ اور ___! لیکن لاری ہی میں اس بجلی کے کوندنے نہ صرف میری آنکھیں چندھیا دی تھیں۔ بلکہ ایک مرتبہ مجھے احساس ہوا تھا کہ میرے پاؤں کے نیچے کچھ نرم نرم شے مسلی جا رہی ہے اور جب میں نے جھک کر دیکھا تھا تو وہ اُسی کا پیر تھا۔ تو اس بجلی کی رو بھی ایک مرتبہ میری رگ وپے کو ایک زبردست دھچکا پہنچا چکی تھی ____ اور اِس وقت تو اس کے جسم سے چھو جانے والی جھرجھری کی لذت کو بار بار محسوس کرنے کیلئے میں گھڑی گھڑی اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔ اُسے ہاتھ لگاتے ہی یوں محسوس ہوتا۔ گویا برقی رو کی مدد سے کوئی میرے خون کو بلو رہا ہے اس کی ماں ابھی تک پوری طرح شکریہ ادا نہ کر پائی تھی "تمہیں تو شاید بھگوان نے میرے لئے ہی...... ."

میں نے ایک مرتبہ پھر صندوقچی کھولی اور سوم رس کے چند قطرے پانی میں ملا کر اسے پلا دیئے۔

دوسرے دن ہم سب لوگ لاری میں بیٹھے ہوئے پہاڑوں اور پر ہول گھاٹیوں کے درمیان چکر کاٹتے چلے جا رہے تھے۔ وہ میرے سامنے والی سیٹ پر اپنی ماں کے ہمراہ بیٹھی ہوئی تھی۔ بعینہ اسی طرح جس طرح اس وقت بیٹھی ہوئی ہے۔ لیکن اس روز آپس میں اتنی بے تکلفی نہیں ہوئی تھی۔ جتنی آج ہے آج تو........! بس صرف دس دن کا فرق ہے اور ان دس دنوں میں کیا کچھ نہیں ہو گیا۔ اس روز کشمیر جانیوالی لاری میں بیٹھی ہوئی ایک جوان لڑکی اپنی جان بچانے والے محسن سے کوئی بات بھی کرتی تھی تو اپنی ماں کو مخاطب کر کے 'اور آج ____ واپس جموں آتی ہوئی ایک لاری میں وہی لڑکی ماں کی آنکھ بچا کر کبھی اس کے چٹکی لے لیتی ہے۔ کبھی لاری کی کھڑکی میں سے باہر بازو نکال کر اس سے پنجہ ملا لیتی ہے اور کبھی ایک لمحہ بھر کے لئے آنکھوں سے آنکھیں ملا کر مسکراتی ہوئی سر جھکا لیتی ہے۔ ہم کہاں سے کہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ محض دس دن میں............

"ابھی کتنی دیر میں جموں پہنچیں گے ہم ______؟" اُس نے اچانک سوال کیا۔

"بس ۳۵ میل تو رہ گیا ہے کوئی ایک گھنٹہ لگے گا اور ________" ساتھ ہی اُسے چڑانے کے لئے کہہ دیا ________

"اتنی سی دیر کے لئے اب اداس کیوں ہوئی جا رہی ہو۔ بس آیا ہی سمجھو گھر۔ پھر مل لینا سہیلیوں سے جتنا جی چاہے ______"

اُس نے منہ موڑ لیا اور توی کی گھاٹی کے اس پار سلیٹ پتھر کے نیلے نیلے سے پہاڑ کو دیکھنے لگ گئی۔ آنکھوں کے کونے بتا رہے تھے کہ کس بُری طرح چوٹ کھائی تھی اس فقرے سے ______ میں بھی باہر کی طرف دیکھنے لگا اور سڑک کے پیچ و خم میں اُلجھ کر میرے خیالات کا سلسلہ پھر سلجھ گیا۔ میں پھر سوچنے لگا کہ آج سے دس دن پہلے بھی قریب قریب یہی وقت تھا۔ جب اُس نے ایسا ہی سوال پوچھا تھا۔

"ابھی کتنی دیر میں کشمیر پہنچیں گے ہم ______؟"

لیکن اس دن یہ سوال اپنی ماں کو مخاطب کر کے پوچھا گیا تھا۔ گو جواب کی توقع مجھی سے تھی اور پھر........ کشمیر پہنچ کر کس طرح آہستہ آہستہ یہ تکلف داریاں اُٹھ گئیں۔

"آپ کی بیوی تو بہت خوبصورت ہو گی" کس انداز سے پوچھا گیا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ آپ تو کسی کے لئے دیوتا سے کم نہیں، چنانچہ ہم کون ایسے ہیں ہوں گے ...... "کسی نے کہا ہے کہ اس کی ماں نے اس بیچاری کے لئے کیا کیا تھا، مجھ سے ذکر والی تھیں اور کیا اس لئے مجھ سے پوچھی گئی تھیں کہ سب کچھ بتاتے کہاں گئی، وہ شاید بچوں تو ذرا بس ہے ......

لیکن وہ تو اس وقت امرناتھ کی یاترا کر رہی تھی۔ اس تسلی بخش خیال سے مطمئن ہو کر لڑکی اور دوسرے بچے نہایت محفوظ اور معتبر ہاتھوں میں چھوڑ آئی ہوں اسے مجھ پر کتنی جلدی یقین ہو گیا تھا ___ جانے وہاں بیچاری ہوا تھا بھی یا نہیں۔ لیکن اس وقت چند قطرے دوا کے پلا کے میں اس کے لئے بھولے مسیحا کے ہو چکا تھا۔ چنانچہ کیا کیا واسطے دیکر مجھے اپنے ساتھ ہی ٹھہرنے پر مجبور کر لیا گیا تھا۔ چلو مجھے بھی تو آخر پردیس میں روٹی روٹی کی ضرورت تھی ہی۔ غنیمت سمجھا۔ لیکن اب اس پر ستم یہ ......

"تمہیں بتاؤ بیٹا کہ میں اکیلی عورت ذات۔ ان بچوں کو ساتھ لئے ان پہاڑوں میں کہاں ٹکریں مارتی رہوں گی۔ تمہیں بھی جب یہیں ٹھہرنا ہے تو کیا حرج ہے بس چار دن تو مجھے لگیں گے کُل ___"

"اچھا بچے چھوڑ جایئے۔ لیکن جندرو کو تو ساتھ لے جایئے۔ برف کے پہاڑ دیکھ آئے گی ___" میں نے بھی اُسے اسی نام سے بلانا شروع کر دیا تھا جو غالباً راجندر کماری کا مخفف تھا۔

"اوئی بیٹا! تو کیسی باتیں کرتا ہے۔ میں اکیلی عورت ذات۔ جوان لڑکی ساتھ لے کر کہاں ماری ماری پھروں گی۔ پھر سنا ہے کہ امرناتھ کے راستہ میں ایسی ایسی بوٹیاں بھی ہیں۔ جن کی خوشبو سے کمزور آدمی بیہوش بھی ہو جاتے ہیں۔ گھر سے تو یہی خیال تھا کہ ساتھ لے جاؤں گی۔ لیکن جب تم سا دیوتا مل گیا تو خیال بدل گیا۔ اب جان بوجھ پر خطرہ کیوں مول لوں ___"

عجب عورت تھی۔ جسے میں دیوتا نظر آ رہا تھا۔ جو اس کی جوان لڑکی کی حفاظت کرے گا اور جس دیوتا کے درشن کرنے وہ جا رہی تھی۔ پھر وہ کیا تھا؟ ہم ہندو لوگ اپنے ویدوں اور پرانوں کی کتھائیں سُن کر انہیں سمجھتے کیوں نہیں۔ کیا وہاں صاف نہیں لکھا ہوا کہ اگر ان کا جنسی تعلق منظور نہ ہو تو سگے بہن بھائی کو بھی کبھی خلوت میں یکجا نہ ہونے دو۔ ایک روایت کے مطابق تو خود دھرم راج یدھشٹر کا دل اپنی سگی ماں کے خوبصورت بال دیکھ کر میلا ہو گیا تھا ___ اور میں تھا دیوتا ___!

میری طرف سے جتنا انکار بڑھا۔ اتنا ہی اسکا اصرار بڑھ گیا۔ شاید میرے پیہم انکار کے باعث اس کا یقین اور پختہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ میری کوئی پیش نہ گئی۔

امرناتھ کے جاتریوں کے واپس آنے میں صرف ایک دن رہ گیا تھا میں نے بیوی والے مذاق کا جواب ڈھونڈ لیا تھا۔

"تمہارا دولہا ہو گا کوئی بڈھا کھوسٹ۔ منہ میں دانت نہ پیٹ میں آنت۔ بڑے پوپلے پوپلے منہ سے باتیں کیا کرے گا تم سے ......"

میں اور بھی کتنی ہی باتیں کہتا اور وہ خوب سٹپٹاتی۔ لیکن ارے ___ اس کی آنکھوں میں پانی ڈل ڈل چھلکنے لگے۔ اسے پیشتر کہ میں کوئی کلمہ حیرت منہ سے نکالوں۔ اس نے جلدی سے دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیا۔

"ارے سوئی آنکھوں میں اتر جائے گی۔"

میں نے گھبرا کر اس کی انگلیوں سے کشیدہ کی سوئی چھیننے کو ہاتھ بڑھایا۔ وہ پریس میں لگا ہوا میز پوش پھینک کر جلدی سے اُٹھی اور ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ یہ ہو کیا گیا۔ مجھے کچھ پتہ نہ چلا۔ آخر میں نے ایسا کیا کہہ دیا۔ سسرال اور دولہا کے متعلق باتیں کرنے سے لڑکیاں شرماتی ہیں ___ روتی تھیں۔

میں نے اس کے قریب ہی بیٹھتے ہوئے اس کی پیٹھ کو تھپتھپایا۔

"کیا ہوا۔ آخر کچھ بولو بھی ____ بھئی یہ رونا ہمیں اچھا نہیں لگتا۔ کچھ ہو بھی۔ کہ یونہی آدمی بات بے بات رونے جائے۔ اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو تو بھئی معافی مانگ لیتے ہیں۔ ادھر دیکھو۔ ہم ہاتھ جوڑ دیتے ہیں"

اور میں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے ایک ہاتھ بڑھایا اور میرے ہاتھوں کو علیحدہ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں دبالیا اور پھر بازو سے کھینچ کر اسے سیدھا بٹھالیا۔

"آخر ہوا کیا ____ کچھ کہو گی بھی ____ کہ بس ____!" میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں ____" اُس نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔ اس کا رنگ اتنی ہی دیر میں سفید ہو گیا تھا اور چہرے پر پھیلے ہوئے آنسوؤں کے نشان اس طرح تھے۔ جیسے چمبیلی کا کوئی پھول شبنم کے کسی آوارہ قطرے سے لتھڑ جائے۔ میرے آجانے پر وہ بڑی گھٹی گھٹی سی سسکیاں لے رہی تھی ____ کس بُری طرح وہ طوفان کے سامنے بند لگانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"نہیں۔ کچھ تو ہے۔ مجھے تم پرایا سمجھتی ہو۔ جبھی چھپاتی ہو۔ میں آج ہی چلا جاؤں گا اور کہیں ____"

طوفان رُک نہ سکا۔ بند خشخاش کے پہاڑ کی طرح ڈھے گیا۔ بے قابو ہو کر وہ مجھ سے لپٹ گئی اور آنسوؤں کا یہ عالم کہ ایک مسلسل دھار کی صورت میں ڈھلتے ہی چلے آتے تھے۔ آخر میں کہاں تک برداشت کرتا.......

وہ شام بڑی بے چینی سے کٹی۔ بار بار اس کی بیان کردہ کہانی ذہن میں گھوم جاتی اور کہانی ہی کیا تھی۔ اُسے ایک ایسے شخص سے بیاہا جا رہا تھا جس کے بچوں کے آگے بھی بچے تھے۔ ہونے والے خاوند کے نام کا تو اسے علم نہ تھا۔ لیکن وہ رہنے والا میرے شہر سے بیس میل کی دُوری پر واقع ایک قصبہ کا تھا۔ مگر اُسے خیال کیا یقین تھا کہ اُسے اس مقام کا پتہ بھی غلط بتایا گیا ہے اور کہ اس کی سسرال کہیں مہذب دنیا سے بہت دُور ہے۔ جہاں دن رات جھلسا دینے والی لو ہی لو چلتی ہو گی اور جہاں پیاس بجھانے کے لئے پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہ ہوگا۔ اور...... ....

اس کی بپتا نے میرے ذہن کو اپنے گھریلو واقعات کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ ہمارے پڑوس میں رہنے والی وہ پتھر دل۔ ظالم۔ سوتیلی ماں اور پھر مجھے اپنے پچاس سال بڑے بھائی کا خیال آیا۔ جنہوں نے والدین کی موت کے بعد مجھے اپنے لڑکوں کی طرح پالا تھا۔ حتیٰ کہ میں مرنے والی بھابی کو ماں کہا کرتا تھا اور جو اس وقت جبکہ انہیں میرے اور اپنے بچوں سے دل بہلانا چاہئے تھا۔ کسی نئی لڑکی کی تلاش میں تھے۔ اس لڑکی کے جذبات بھی کیا جندرو ہی کے مانند نہ ہوں گے اگر انہیں دُوسری شادی ہی کرنا ہے تو کیوں نہیں وہ اپنی کسی ہم عمر اور بیوہ عورت سے شادی کرتے۔ حسین کنواری لڑکیوں کے چہروں پر کیوں آنسو کھلے جاتے ہیں اور پھر مجھے اپنے ننھے بھتیجوں کی ہونے والی سوتیلی ماں پر ترس آنے لگا........ لیکن یہ سوتیلی مائیں تو روایتا ظالم ثابت ہوتی ہیں..... شاید اپنے اوپر کئے گئے ظلم کا انتقام وہ مرنے والی سوتن کے ننھے بچوں سے لیا کرتی ہیں انتقام کا انہیں حق ہے لیکن......، مجھے اپنے پڑوسی کے ننھے ننھے بچوں کے بدن پر تھپیوں کی مار کے اُبھرے ہوئے نشانات یاد آنے لگے۔ جنہیں میری مرحوم ماں آہستہ آہستہ سہلایا کرتی تھی اور میرے بسکٹ انہیں کھلا دیا کرتی تھی۔ گو ان دنوں میرا بچپن تھا لیکن انہیں دیکھ کر مرحومہ کی آنکھوں میں چھلک جانے والے آنسو مجھے ابھی تک یاد ہیں ____ مجھے سوتیلی ماؤں سے نفرت ہے۔ یہ جندرو جو آج یوں بلک رہی ہے چند ہی دنوں میں یہ بھی ایک سوتیلی ماں بننے والی ہے ____ دل میں جندرو کے تئیں نفرت کے جذبات پیدا ہونے لگے لیکن ____ اس کا وہ بے اختیار لپٹ جانا ____ بدن میں ایک جھرجھری سی سرایت کرتی محسوس ہوئی۔

صبح اس کی ماں کو [illegible] پھر ہم سو نہ سکے اور باتیں تھیں کہ ختم ہی نہ ہو پاتی تھیں۔

"لیکن چندرو۔ ایک بات ہے کہ ہم نے کچھ اچھا نہیں کیا۔"

"تو کیا ہوا۔" کس قدر بے باکی تھی ____ اور کتنی طمانیت کہ پشیمانی کا شائبہ تک نہ تھا۔

اور پھر ایک خاموشی دراز کی طرح اس کے دل کی ایک ایک بات کی کوئیاں کرنے والی اس کی باتیں ......

"دراصل میں تو یہاں امرت کی تلاش میں آئی تھی۔ وہ امرت جو کسی کی زندگی کے لئے آب حیات کا کام دے نہ دے۔ لیکن اس زندگی کی حسرتوں کے لئے آب حیات ہو۔ تاکہ وہ حسرتیں مرنے والی روح کے دل میں بھی کانٹا بن کر رہ جائیں ____ اب کے بیاہ کے سلسلہ میں میرے ماں باپ نے جو میرے سسرال والوں سے بہت سے روپے وصول کئے تو سالہا سال کی تنگدستی سے ایک دم کے لئے چھٹکارا ہوا مدت سے سُن رکھا تھا کہ کشمیر جنت نظیر ہے۔ دل نے کہا۔ چند ہی دنوں بعد جہنم میں جانا ہی ہے۔ کیوں نہ ایک مرتبہ جنت کا نظارہ کر لیا جائے۔ ایسے مقام میں دل پر حسرتوں کے جو نقش بیٹھیں گے وہ زیادہ گہرے اور پائندہ تر ہوں گے اور ماں بھی امرناتھ کے درشنوں کے لالچ سے چلی آئی ____ کیا پتہ تھا کہ اس وادی میں تم مجھے وہ آب حیات پلاؤ گے ____ اب میں اس اطمینان کے ساتھ تو شادی کی موت کے گھاٹ اتر سکوں گی کہ ایک رات ہی کے لئے سہی۔ مگر میں نے زندگی پائی تو.....

میرے دل نے چاہا تو تھا کہ اس کے ساتھ ابھی اسی وقت شادی کر لوں اور کہہ دوں کہ ____ چاہے تو اب نہا بھی لے آب حیات سے "پھر اس کا جوبن بھی کیا گدرایا ہوا ہے اس وقت ____ جوانی کے مارے حسن پھوٹا پڑتا ہے۔ لیکن میری بیوی ____ اس کا بھی تو یہی عالم تھا کسی دن تین چار بچے کیا ہوئے بس یوں ہو گئی جیسے ____ اس کے بھی جب بچے ہو جائیں گے تو اس کی بھی وہی حالت نہ ہو جائے گی؟ اور یوں بھی ہمارے سماج میں سینکڑوں بلکہ ہزاروں ایسی جوبن اور حسن سے مالا مال لڑکیاں اور ادھیڑ رنڈوے کھوسٹوں سے بیاہی جاتی ہیں جو مہذب دنیا سے دور ان مقامات میں رہتے ہیں جہاں دن رات جھلسا دینے والی لو ہی لو چلتی ہے اور جہاں پیاس بجھانے کے لئے پانی کا ایک قطرہ بھی میسر نہیں آتا ____ تو اکیلا میں کس کس کو آب حیات پلاتا پھروں........

اچانک ایک دھچکے کے ساتھ لاری کھڑی ہو گئی۔ گذشتہ دس دنوں کے واقعات کا جو فلم میرے ذہن میں چل رہا تھا۔ اس کا جیسے ایک دم سے فیتہ ٹوٹ گیا۔ فلم ٹوٹ جانے پر سینما حال میں جیسا بے ہنگم شور مچ جاتا ہے کچھ اسی طرح کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"کوئی محصول والی چیز تو نہیں آپ کے پاس" ____ کسی نے مجھے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

"نہیں کوئی نہیں ____ یہ کون سی جگہ ہے" میں نے متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

"جموں کی محصول چونگی ___ اور وہ شخص اگلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی سواریوں کی طرف متوجہ ہوا۔

"آپ تو ایسے سوئے ہیں اور ھم پورے کہ بس یہاں تک تو کچھ ہوش ہی نہیں" چندرو مسکراتی ہوئی کہنے لگی۔ میں نے مسکراہٹ کے سوا کوئی جواب نہ دیا۔

اتنے میں چنگی والوں کا ایک سواری سے جھگڑا ہو گیا۔ یہ لوگ محصول چنگی مانگ رہے تھے اور وہ بیچارا کہتا تھا کہ "میں نے اسی لاری میں جموں سے آگے نکل جانا ہے تو یہاں محصول چنگی دینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔"

"ہم کچھ نہیں جانتے۔ اگر آپ دوسرے راستہ سے نکلیں گے تو وہاں کے محرر چنگی سے رسید لے آیئے گا۔ ہم محصول واپس کر دینگے۔"

"میں وہاں لاری چھوڑ کر واپس آؤں۔ یہ کیسا ظلم ہے۔ کیا آپ کا یہی قانون ہے۔؟"

"ہم کچھ نہیں جانتے۔ محصول دیجئے جلدی سے" وہ بیچارا مدد طلب نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔

"ریاست میں کیا کیا ظلم قانون کی آڑ میں نہیں ہوتے۔ چھوڑیئے اس قصہ کو۔ یہ جرمانہ تو بھرنا ہی ہو گا" اس کے ساتھی نے کہا۔ اسے مجبور ہو کر ایک روپیہ ادا کر دیا۔ جو غالباً ریاستی خزانہ کی بجائے محرر کی جیب میں داخل ہو گیا ہو گا۔

لاری پہاڑی علاقہ چھوڑ کر میدان میں داخل ہوئی۔ حد نظر تک پھیلے ہوئے چپے چپے کھیتوں میں ہریاول لہلہا رہی تھی۔ مغرب میں ایک چمکدار سرخ رنگ کے بادل کا ٹکڑا ڈوبے ہوئے سورج کا پسماندہ نشان رہ گیا تھا۔ جندرو کی ماں اپنے بچوں کے کوٹ وغیرہ ٹھیک کرنے لگ گئی تھی اُن کا شہر نزدیک آ رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ وہ امرناتھ کا تیرتھ کر آئی تھی۔ جہاں بھگوان شنکر نے پاربتی کو امر کتھا سنائی تھی۔ یعنی ایک طرح کا آب حیات پلا دیا تھا جس کے چند چھینٹے دو کبوتروں کے حصہ میں بھی آ گئے تھے۔ وہ ابھی تک وہاں رہتے ہیں۔ وہ بھی ان کبوتروں کے درشن کر آئی تھی۔ جن پر آب حیات نے اثر کیا تھا اور خود اس لڑکی...... تیرتھ میں تمام گذشتہ گناہوں کے دھل جانے سے اس کی آتما کتنی ہلکی ہو گئی تھی اور اب وہ کس طمانیت قلب سے لڑکی کی شادی کا ثواب حاصل کرنے جا رہی تھی........

لاری کو ایک اور دھچکہ لگا۔ سیالکوٹ آ گیا تھا____ میں نے انہیں تانگے میں بٹھا دیا۔ اس کی ماں نے جندرو کی شادی پر آنے کا وعدہ لیا تھا اُسے پھر پکا کرنے لگی۔

میں انہیں چھوڑ لاری میں قدم رکھنے ہی لگا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی۔

"منوہر____________"

مڑ کر دیکھا تو جندرو تانگے سے اتر کر میری طرف آ رہی تھی۔

"آپ کا فاؤنٹین پن رہ گیا ہے لیتے جایئے" اُس نے اونچی آواز میں کہا۔

مجھے یاد تھا اپنا قلم۔ میں تو جان بوجھ کر اس کے پاس چھوڑے جا رہا تھا۔ لیکن______ فاؤنٹین پن کا تو محض بہانہ تھا۔

"شادی پر آنے کا وعدہ پھر پکا ہے نا____________" اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"بالکل پکا______"

"میری آنکھوں کی طرف دیکھئے____________" میں نے دیکھا۔

"یہ تب تک راہ میں بچھی رہیں گی__________"

گھر پہنچ کر حالات نے ایک اور پلٹا کھایا۔ بیوی میری عدم موجودگی میں محسوس کرتی رہی تھی کہ بھیا جنہیں میں بابو جی کہا کرتا تھا۔ کسی خاص تیاری میں منہمک ہیں۔ میں نے بھی تاڑا۔ غالباً وہ چوری چھپے کہیں شادی کی بات پکی کر رہے تھے اور یا پھر کر چکے تھے____ مجھے سخت صدمہ پہنچا اور کوئی بہانہ کر کے اس موقعہ پر گھر سے چلے جانے کی سوچنے لگا۔ اپنے افسر سے کہا کہ فرنٹیر میں کہیں تبدیلی کر دو۔ جنگ کے زمانہ میں کوئی کلرک خود ہی فرنٹیر جانے کے لئے کہے اور پھر وجہ محکمہ____ افسر کو اور کیا چاہئے تھا۔ ہفتہ بھر کے اندر اندر تبدیلی کا حکم آ گیا۔

اس تبدیلی سے مجھے سب سے بڑا افسوس اس بات کا ہوا کہ میں وعدہ کر کے بھی جندرو کے پاس نہ پہنچ سکا۔ اگر میں اپنے ہی شہر میں ہوتا تو کبھی وقت نکال کر اس کے سسرال ہو آیا کرتا۔ لیکن میں اپنے شہر میں بھی تو نہ رہ سکتا تھا۔ اگر بابو جی کو شادی کرنا ہی تھی تو برات کے موقعہ پر اپنے بچوں کی شکل تک دیکھنا اُن کے لئے بدشگونی تھا۔ یہ ظلم کون اپنی آنکھوں سے دیکھتا۔

کوہاٹ میں بھی میں اس روز کا منتظر رہا۔ جب گھر سے کوئی بلاوا آئے تاکہ اسی بہانے جندرو کے قصبہ تک جانے کا موقع ملے۔ چنانچہ اس روز سجدہ شکر کیا۔ جب شادی کے تین نو ماہ بعد ننھے بھتیجے کی آمد پر گھر سے بلاوا آیا۔

واپس آتے وقت اپنے سٹیشن پر گاڑی سے اترنے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔ صرف ایک ہی سٹیشن آگے ____ اور جندرو کا قصبہ ____! لیکن بچے جو ساتھ تھے اور پھر نئی بھابھی ____ بابو جی پہلے ہی لکھ چکے تھے کہ ہماری نئی بھابھی کے خیال میں شادی کے موقع پر گھر نہ رہ کر میں نے ہی ناطبہ نفرت کی ابتدا کی تھی .. ...

جلدی سے آگے بڑھ کر میں نے نئی بھابی کے پیر چھوئے۔

"خوب وقت پر آئے ____" کتنا کٹیلا اور طعن آمیز تھا فقرہ۔ "آخر بوڑھوں کی ان نوجوان بیویوں کے دل اس طرح پتھر کے کیوں بنے ہوتے ہیں۔ پہلے بچوں کے لئے ان کی زبان پر دُعا یا اشیر باد کا لفظ کس مشکل سے آتا ہے۔ چلو میں شادی کے موقعہ پر نہ پہنچ سکا تو کیا اس کے لئے اتنا........

میں نے نفرت بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا. . . سامنے جندرو کھڑی تھی۔

اُس کی نگاہیں ____ یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے کسی کو ذبح کر کے اس کی لاش کو آب حیات کے تالاب میں ڈال دیا گیا ہو۔

....

باجی ولایت

آغا بابر

"... . عورت اچھی بھلی حالت میں وہ کچھ کر سکتی ہے جو مرد نشے میں بھی نہیں کر سکتا۔ میں نے جو جو کچھ لاہور میں ہوتے دیکھا ہے زبان پر نہیں لا سکتا۔ اتنی بدمعاشی ہے وہاں کہ خدا بچائے۔" یہ الفاظ جیسے نواز کے خون میں سرایت کر گئے تھے۔ خون جب دل کے پاس سے گذرتا چپکے سے یہ الفاظ دل کے کان میں کہہ جاتا اور نواز سوچنے لگتا____

دفتر والوں نے آج زیادہ وقت لاہور کی باتیں سننے میں صرف کیا تھا اور ظہیر جو کوئٹہ سے ایک سال کے لئے ڈپوٹیشن پر لاہور بھیجا گیا تھا' لاہور کی باتیں سنا رہا تھا۔ "وہ تو ایک شہرستانِ حسن ہے۔ وہاں کی جلوہ افروزی اور نمائش کی فراوانی کا نظارہ کرنے کے بعد آنکھوں میں کوئی اور شہر نہیں بچ سکتا۔ پلے ہوئے گداز گداز سانولے بدن' بیمار بیمار زیتونی رنگ کے چہرے' جھکی جھکی آنکھیں اور سینے پر بٹے ہوئے دوپٹے کا پڑا ہوا جھولا دل کو سینے میں بھونے لگتا ہے اور پھر خود نمائی اور عریانی کی کئی بجلی حرکتیں اپنی بے عنانی اور بے تکلفی میں اتنی فزوں تر ہو جاتی ہیں کہ شباب کی للکار سُن کر قدم تھم جاتے ہیں۔" اس نے مزے لے لے کر بہت کچھ کہا' احباب نے چٹخارے لے لے کر سنا۔ مگر ناز پر ان باتوں کا چنداں اثر نہ ہوا۔ ہاں ظہیر کچھ باتیں ایسی ضرور کہہ گیا تھا جو اس کے سینے پر بوجھل پتھر بن کر رہ گئی تھیں۔ مثلاً جب اس نے مولانا سے خطاب کر کے کہا تھا۔ "مولانا آپ کیا کہہ رہے ہیں____ عورت پر ابھی بندشیں ہیں۔ اس کی راہ میں رکاوٹیں ہیں۔ اسے بچپن سے کہا جاتا ہے سر پر دوپٹہ لو سینہ ڈھکو' یہ کرو یہ نہ کرو تو یہ عالم ہے۔ اگر یہ بندشیں بھی اٹھ جائیں تو عورت جسے مقدس کہتے کہتے آپ کا منہ سوکھتا ہے آپ کے سامنے ننگی ہو کر ناچے۔" کیا یہ ظہیر کی زیادتی نہ تھی؟____ نواز کروٹ بدل کر سیدھا لیٹ گیا۔ سیمل کا تکیہ سر کے نیچے سے کھسکا تو اس نے اسے اکٹھا کر کے سر کے نیچے دے لیا۔ اس نرم لمس کے احساس نے جیسے چند سوئی ہوئی یادوں کو جھنجھوڑ دیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے چھت کی ایک کڑی اس کے سینے پر آن گری ہے جس سے وہاں پڑی ہوئی بوجھل سل ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور وہ ایک ایک ٹکڑا اٹھا کر نیچے رکھتا جا رہا ہے۔ وہ خود بھی تو ایک سنگریزہ ہی تھا۔ کہیں ادھر اُدھر پڑا ہوا۔ جسے جو چاہے اٹھا لے اور جس کو پسند آیا تھا اس نے اٹھا لیا تھا۔ اس کا بچپن ماں باپ کے سایہ میں نہیں بلکہ اپنے بڑے بھائی کے گھر میں گذرا تھا جس نے اپنے دو چھوٹے بھائیوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ ہی نہیں کیا تھا' بلکہ لوگوں کی خوشامدیں کر کے انہیں نوکر کرایا اور پھر شادیاں بھی کیں اور خوب صورت بیویاں دلوائیں۔ مہرِ مادری اور شفقتِ پدری کی محرومی کا اس کی ذہنی نشو و نما پر اثر انداز ہونا ایک لازمی بات تھی۔ وہ بچپن میں اپنے ہمجولیوں سے بہت کم کھیلتا تھا۔ زیادہ تر اپنی بھابی کے گھٹنوں کے ساتھ لگ کر بیٹھا رہتا۔ بازار سے سودا سلف لا دیتا یا اپنے بھائی کے بچوں کو کھلاتا رہتا____ بھائی اور بھابی دونوں اس کی اس برخورداری پر بہت خوش ہوتے تھے۔ وہ اور بھی پھولتا اور

جب محلے سے ملنے والیاں آتیں تو وہ سارا سارا دن ان کی خدمت میں لگی رہتی تھیں۔ عورتوں کی صحبت اچھی لگتی تھی گھر کی کیا اور باہر کی کیا کبھی عورت کو بھی نواز کے سامنے کسی قسم کی بات کرنے میں جھجک نہ ہوتی تھی جیسے ان کو نواز پر ایک اعتماد سا تھا کہ وہ ہمیشہ اسی طرح بھولا بھالا سا رہے گا۔ اس کی اداس اداس آنکھوں میں کبھی تبدیلی نہ آئے گی اور اس کے چہرے پر چھائی ہوئی گرد کبھی دور نہ ہو گی۔

نواز پلنگ پر لیٹا قمیر کی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ سیمل کا نرم نرم تکیہ چھونے پر اس کے دماغ میں اس بیتے ہوئے بچپن کے واقعات دوڑنے بھاگنے لگے جب وہ منہ بہت ڈھیلا چھوڑ کر بات کیا کرتا تھا۔ اس کے لب و لہجہ میں ابھی تک تسلیم و رضا اور عاجزی کی وہی آٹھویں جماعت والی ملائمت موجود تھی۔ اس وقت عورتوں میں زیادہ بیٹھنے کی وجہ سے اس کی زبان پر عورتوں کے کئی محاورے چڑھ گئے تھے۔ رجو میاں کی شادی پر عورتوں کو اس نے فرنی کی کتنی صحنکیں لا کر دی تھیں۔ مردانے میں سے چوری چھپے فرنی لانا کوئی آسان کام نہ تھا مگر عورتوں کا کام کر کے اسے کتنا اطمینان ہوتا تھا اور جب کوئی عورت اسے دعا دیتی تو اسے کتنی تسکین حاصل ہوتی تھی۔ رجو میاں کی برات چڑھنے سے پہلے اس کے ہجولی چھپ چھپ کر سگریٹ پی رہے تھے۔ کئی باہر مردانے میں گاؤ تکیوں پر ناچ رہے تھے کئی پان کی پچکاریاں مار رہے تھے اور وہ اندر عورتوں کو پھولوں کے گجرے پکڑا کر ان کی شلواروں میں ازار بند ڈال کر ڈبوں میں سے نئی نئی گورگابیاں نکال نکال کر ان سے دعائیں لے رہا تھا۔ "تاجی بیٹا! اب ازار تیلی ادھر دے جانا۔" وہ ایک دالان میں سے دوسرے میں جاتا کبھی ازار تیلی اس کے ہاتھ میں ہوتی کبھی پراندہ۔ کسی دالان میں شلوار پہنی جا رہی تھی کسی کوٹھڑی میں قمیص اتر رہی ہوتی۔ اسے اندر دیکھ کر کئی صورتیں پہلے جھجکتیں مگر پھر تاجی کی مانوس صورت دیکھ کر ان کے چہرے کہنے لگتے۔ "اچھا تم تھے ___ کوئی بات نہیں۔" دلہن والوں کے گھر بھی وہ عورتوں میں جا گھسا تھا۔ وہاں بھی کئی بنی ٹھنی لڑکیوں پر اس کی نظر پڑی تھی۔ مگر اسے ان میں کوئی جاذبیت نظر نہ آتی تھی۔ بڑی عمر کی عورتوں کے مقابلہ میں وہ کم سم نظر آتی تھیں۔ ان کی گھٹی گھٹی ہنسی دبی دبی کھلکھلی اسے قطعاً نہ بھاتی تھی۔ کام کرنے کو وہ ان کا بھی کر دیتا تھا مگر وہ اسے دعائیں نہ دیتی تھیں۔ دلہن والوں کے گھر ایک عورت نے یہ کہہ کر "اچھا تاجی پھوپھی بتول کا بیٹا ہے؟" کتنے پیار اور محبت سے اسے گلے لگایا تھا اور کتنے پر خلوص لہجہ میں دعائیں دی تھیں اور پاس کھڑی ہوئی باجی ولایت کی مسکراہٹ اسے کتنی اچھی لگی تھی۔ اس وقت باجی کے ڈھلے ہوئے سانولے جسم میں سے زندگی پھوٹ پھوٹ کر نکلتی معلوم ہو رہی تھی۔ باجی ولایت ان عورتوں میں سے تھیں جو نواز کو پسند تھیں اور باجی کی شکل اسے بے انتہا پسند تھی۔ باجی کے ماہتابی گال ہمیشہ چمکتے رہتے اور انکی غلافی آنکھوں کی پلکوں میں سے ایک ساحرانہ گھلاوٹ جھانکتی رہتی۔ نواز کے لئے باجی کی شخصیت میں ایک گرفت تھی اور علاوہ اس کے وہ نواز سے پیار بھی بہت کرتی تھیں اور ان کا کام کر کے نواز کو بے حد خوشی ہوتی تھی ایک مرتبہ ان کا کوئی کام کرتے ہوئے وہ گر پڑا تھا اور اس کی نکسیر پھوٹ پڑنے پر جس پیار سے باجی ولایت نے چٹ چٹ اٹھ کر اپنی اوک سے اسے پانی پلایا تھا۔ اس دن سے نواز کو وہ اور بھی اچھی لگنے لگی تھیں۔ نواز کی بھابی کبھی بچوں کو نہلا دھلا کر نواز کے ساتھ باجی ولایت کے گھر بھیج دیتی اور نواز باجی کے قریب بیٹھ کر گھنٹوں سکول کا کام کرتا رہتا۔ ساتھ ساتھ بچوں کی خبر گیری بھی کرتا انہیں چھابڑی والے سے کچھ لا بھی دیتا اور باجی کبھی کہہ دیتی۔ "نواز پکڑلو یہ کپڑا ذرا۔ اس کنارے سے۔ کھینچو اپنی طرف ___ اور ___ اور ___ بس نکل گئی۔ پنکھ ___ اب یہ کنارا کھینچو۔" مشین پھر چلنے لگی اور نواز سکول کا کام کرنے لگتا۔ باجی ولائت کے بال بادامی تھے۔ نواز کو یہ معلوم تھا کہ وہ ہائیڈروجن پر آکسائیڈ استعمال کرتی ہے۔ بال ریشم معلوم ہوتے تھے۔ ایک روز باجی کا سر دکھتا تھا۔ ان کی لڑکی نجمی ان کے بالوں میں تیل جھس رہی تھی کہ سالن جلنے کی بو آئی۔ نجمی باورچی خانہ کو بھاگی۔ باجی نے سر دبا کر کہا "ہائے ہائے" ___ "باجی میں تیل جھس دوں؟" جواب کا انتظار کئے بغیر وہ تیل جھسنے لگا۔ "جیتے رہو تاجی کتنے اچھے ہو تم۔" بس اتنی سے بات سے تاجی پھول گیا تھا۔

"اسے ٹھنڈا ٹھنڈا تیل ڈال کر باجی کے بال سہلانے میں کتنا لطف آیا تھا۔ وہ اپنے سر میں بھی تیل لگاتا تھا بھائی کے بچوں کے سر میں

بھی مگر باجی کے بادامی بالوں میں تیل لگانے سے اسے ایک عجیب طرح کا لطف آرہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بجھی جلی ہوئی ہنڈیا سے ابھی اور بنی رہے۔ سینے پرونے کے دوران میں باجی کو کئی مرتبہ اپنی قمیض اتار کر نئی قمیض سے ماپنے کی ضرورت پیش آتی تھی اور نواز نے قمیض اترتے وقت بنیان کے ذرا تھوڑا اوپر اٹھ جانے سے کئی دفعہ باجی کی کسی ہوئی چھوٹی سی توند کو دیکھا تھا۔ باجی اپنی قمیض آپ بہت کم سیتی تھی زیادہ درزی سے سلوانی تھی۔ کہا کرتی تھی درزی قمیض میں جان ڈال دیتا ہے اور یہ بات ناز نے بھی محسوس کی تھی کہ جب باجی قمیص پہن کر سج کر چھلکاتی پھرتی تو اکثر عورتوں کی نظریں باجی کی قمیض پر جم جاتی تھیں اور کئی تو جل بھن کر کہتیں:

"سب ڈھل گئے یہ نہ ڈھلی"

دوسری ناک بھوں چڑھاتی۔ "ڈھلے کیونکر ____ دو بیٹیاں جن کر آرام سے بیٹھ گئی ہے۔"

تیسری کڑھتی۔ "ہم تو جن جن کر بوڑھی ہو گئیں بوا۔ "ذرا سوچو ولایت مجھ سے دو سال بڑی ہے۔"

"وہی تو میں نے کہا۔ بٹی کیوں نہ لگے۔ نخرا تھوڑا ہے اس کا جیسے نئی جوانی چڑھی ہو۔ کوئی پوچھے خاوند نے تو میم کر لی ہے۔ وہ اپنے گھر تمہیں رکھتا نہیں اور تو یہ کیا بالوں میں آگ لگا کر میم بن رہی ہے۔"

"میں کہتی ہوں کیا یہ آن بان دکھاتے اس کا جی برا نہیں ہوتا؟"

نواز سوچتا واقعی باجی ولایت میں ایک آن بان تو ضرور ہے۔ عورتوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ آن بان رکھنے کے لئے باجی کو کیا کیا خوشبودار اُبٹنے کوٹنے پڑتے تھے۔ چنبیلی اور گلاب کی کلیاں اُبٹنے اور کیا کیا اور لابلا کوٹنے چھاننے میں نواز کو بھی کئی بار باجی کا ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ وطن آنے سے پہلے اس کی بھابی نے اپنی ملنے والیوں سے کہا تھا۔ "ولایت بیگم میری ایک سہیلی ہیں۔ جیسی باڈی وہ بناتی ہیں کوئی نہیں بنا سکتا۔ کبھی وطن گئی تو ان سے سلوا کر لاؤں گی۔" نواز نے وطن آکر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ باجی ولایت باڈی سینے پر کتنی جان مارتی تھیں۔ کس طرح اریب سریب کترنیں کاٹتیں پھر جوڑتیں۔ کئی باڈیاں آگے سے کھلتی کئی پیچھے سے۔ کسی پر بٹن لگتے تھے کسی پر ڈوریاں اور کئی باڈیوں کو مختلف رنگ کے چھوٹے چھوٹے چوکور ٹکڑوں سے اس طرح جوڑ کر بنایا گیا تھا کہ دیکھنے پر یوں معلوم ہوتا تھا جیسے طوطے کے رنگداروں سے بنی ہوئی ہیں۔ باجی کو بس باڈیاں سینے اور پہننے کا شوق تھا۔

ہاں تو جب وہ عورت اس کو گلے لگا کر دعائیں دے رہی تھی تو اس کی پیاسی روح کتنی سرشار ہوئی تھی اور پاس کھڑی ہوئی باجی ولایت کی مسکراہٹ اسے کتنی اچھی لگی تھی۔ نواز کے دل نے جیسے کوئی بٹن دبا دیا اور ذہن میں یہ دوڑتے بھاگتے واقعات وہیں رُک گئے۔

اس نے کہا۔ "میں نے تو باجی کو مسکراتے سینکڑوں بار پہلے دیکھا تھا مگر وہ مسکراہٹ مجھے کیوں اتنی اچھی لگی؟" ____ شاید اس لئے کہ اس وقت دعاؤں سے میری روح سرشار ہو کر مسکرا رہی تھی اور اس پس منظر پر باجی کی مسکراہٹ نہایت موزوں اور مناسب نقش کا کام دے گئی۔ کتنی ہم کاری تھی کتنی مطابقت۔ میری روح مسکرا رہی تھی اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے ____ واقعات پھر دوڑنے لگے ____ باجی کے بدن پر سفید لباس کتنا کھلتا تھا اور اسے شاید اس بات کا علم تھا جبھی وہ اکثر سفید لباس ہی پہنا کرتی۔ نصرت، باجی ولایت، خالہ نفیسہ اور کتنی اور عورتیں تھیں جو رجو میاں کی دلہن کو سنوارنے میں لگی ہوئی تھیں۔ نصرت نے عطردان تھام رکھا تھا مگر جب وہ کھلکھلا کر ہنستی تو معلوم ہوتا کہ عطردان اب گرا اب گرا۔ ایک سرخ دوپٹہ پکڑے کھڑی تھی۔ باجی ولایت ہنس ہنس کر دلہن کے ہونٹوں پر سرخی جما رہی تھی۔ خالہ نفیسہ دلہن کی آنکھوں میں بڑی احتیاط سے سرمے کی دھاریاں کھینچ کر بولی۔ "دلہا کو ذرا مست نگاہوں سے دیکھنا۔" اس پر پھر کھلکھلی مچی۔ دلہن اٹھ کر کھڑی ہوئی تو باجی ولایت نے عطر لگایا۔ ایک نے کہا۔ "چشم بد دور خوب بجی ہے دلہن۔" باجی ولایت نے قمیض کو بغل کے نیچے سے کھینچ کر کہا۔ "قمیض ذرا کھلی ہے۔ چنٹیں ٹھیک نہیں آئیں۔"

نصرت نے ہنس کر کہا "تو اپنی دے دو ایک بالی دلہن کا کیا بگڑتا ہے"

ایک عورت نے ایک پیڑا ہاتھ میں تولتے ہوئے کہا "ہری والے نے دلہن کو ابٹن ذرا زیادہ دیا ہو تو ہاتھ منہ دھونے میں ہی آدھا رہ گیا ہے۔"

"کہاں تھوڑا ہے بولا اتنا ابٹنا ملنے کے بعد پندرہ دن تک خوشبو پھوٹے گی بدن سے۔"

"ٹھیک کہا ہے بابی نے، جس چوکی پر باجی نہاتی ہیں اس میں سے بھی ابٹنے کی خوشبو آتی رہتی ہے۔" قہقہے ہنسی اور کھلکھلاہٹ کے نقار خانے میں نواز کی آواز سنائی۔

"ارے تو میرے ساتھ کب نہایا تھا؟" ہنستی ہنستی نصرت نے اپنی رانیں پیٹ لیں۔

اس ہجوم میں گھسے ہوئے نواز کی طرف بعض عورتوں نے اس طرح دیکھا تھا جیسے اس کی موجودگی کا انہیں اب احساس ہوا ہو حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ وہ ان کے پاس کھڑا تھا۔

ایک عورت نے کہا "ارے ناجی تو کہاں آن گھسا ہے؟"

خالہ نفیسہ نے اپنے ساتھ لپٹا کر کہا "رہنے دو اسے یہ تو سات بیٹیوں جیسا ایک بیٹا ہے۔ ہمیں تو ایسی ایسی چیزیں لا کر دیتا ہے جو ہم کسی سے منگا نہیں سکتیں، کیوں ناجی؟"

اس فقرے کا لہجہ شرارت اور طنز سے بھرا ہوا تھا کہ اسے منہ چھپانے کے لئے اپنا سر خالہ کے پیٹ میں دینا پڑا تھا۔ پھر یہ ہنستی کھیلتی عورتیں دلہن کو لے کر اس کمرے میں پہنچیں جو اس کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ وہاں بھی کچھ عورتیں پہلے سے موجود تھیں۔ کمرے میں سلگتی ہوئی اگربتیوں کی ہلکی ہلکی خوشبو پھیل رہی تھی۔ ایک تخت پوش پر مصلے بچھا تھا دوسرے پر کچھ چیزیں ڈھکی پڑی تھیں۔ سرخ لباس پہنی ہوئی دلہن کو چھپر کھٹ پر بٹھا دیا گیا۔ نصرت نے ڈھکی ہوئی چیزوں پر سے کپڑا اٹھا کر کہا تھا۔ "دلہن یہ چیزیں پڑی ہیں، دیکھ لو۔" ایک چنگیر میں پھولوں کے ہار پڑے تھے، ایک میں چھوہارے، ایک ٹوکری مٹھائی سے بھری پڑی تھی۔ ان چیزوں پر تولیہ دے کر نصرت نے پھر انہیں سرخ کپڑے سے ڈھک دیا۔

ہنستی ہوئی عورتیں سر جھکائی دلہن کو چھپر کھٹ پر تنہا چھوڑ کر باہر آ گئیں۔ حویلی کے دوسرے حصے میں میراثنیں گا رہی تھیں۔ عورتوں کا یہ ریلا سیدھا ادھر پہنچا۔ نواز دبک کر ایک کونے میں بیٹھ گیا۔ میراثنیں اس وقت کوئی نقل کر رہی تھیں۔ ایک سر پر پگڑی باندھے توے کی سیاہی سے مونچھیں بنائے مرد بنی ہوئی تھی اور دوسری نے ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ دونوں ناچتی اور گاتی تھیں۔ پگڑی والی میراثن کبھی کبھی ساڑھی والی کا منہ چومنے کو بڑھتی تو وہ کمر میں لچک ڈال کر علیحدہ ہو جاتی تھی۔ ڈھولک تیز تیز بج رہی تھی۔ گانے کا کوئی سر پیر نہ تھا۔ کبھی کبھی پگڑی والی میراثن اپنے زیریں حصے کو اس طرح ہلاتی کہ مجلس دیوار قہقہہ بن جاتی تھی۔ عورتوں کے چہروں پر شریر مسکراہٹیں ناچ رہی تھیں نواز کو ان کے چہرے عجیب طرح کے معلوم ہو رہے تھے۔ اسے ہر طرف سے نفس ہی کی برات چڑھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اتنے میں ایک اور میراثن اپنی قمیض کے نیچے بہت سے کپڑے ٹھونسے بڑا سا پیٹ بنائے آ دھمکی اور آتے ہی اپنے پیٹ کو پگڑی والی میراثن کے ساتھ ٹکرا ٹکرا کر اوٹ پٹانگ سی باتیں کرنے لگی۔ نواز کو اچھی طرح یاد تھا کہ وہ اس نقل کے دوران میں سو گیا تھا۔ اس کی آنکھ جب کھلی تھی جب کوئی عورت اسے اٹھا رہی تھی۔ اس نے دیکھا تھا مجلس بہت مختصر سی رہ گئی تھی۔ کوئی عورت اس کا ہاتھ پکڑے ایک بستر میں لٹا گئی۔ اس کا جی ابھی اور جاگنے کو چاہتا تھا۔ اس نے لحاف میں سے منہ نکال کر ادھر ادھر دیکھا۔ کمرے میں دو

پلنگ اور بچھے تھے جن پر کوئی لحاف اوڑھے سویا پڑا تھا۔ گانے والے کمرے میں سے ابھی تک ڈھولک کی آواز آرہی تھی۔ ۔۔۔ ہوا ہو گیا کیونکہ میراسنیں اس لچر گیت کے آخری بول گا رہی تھیں جو اس نے بازاری لوگوں کو اکثر گاتے سنا تھا۔ اس کی نیند چند لمحوں کے لئے اڑ گئی۔ ڈھولک پر نئی تھاپ پڑنے کے ساتھ میراسنوں نے ایک اور فحش گانا شروع کر دیا تھا اور وہ حیرت میں ڈوبتا ڈوبتا نیند کے سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ جب اسے اپنی ٹانگیں گھٹتی ہوئی محسوس ہوئیں تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔۔۔۔ "باجی!"۔۔۔۔ "ہاں ہاں سو جاؤ۔" باجی نے اسے بھینچ کر کہا۔ اس کی ٹانگیں باجی کی رانوں میں دب رہی تھیں۔ اس نے ہاتھوں کی مدد سے علیحدہ ہونا چاہا مگر اس کا ہاتھ الجھا ہوا تھا۔ باجی نے تو اس کی ٹانگوں کو آزاد کرتے ہوئے مری ہوئی آواز سے کہا۔ "درد ہو رہا ہے۔" جب اس نے نواز کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پیٹ پر رکھ دیا تو نواز گھبرا سا گیا مگر اب اس کے لئے سوائے چکنی چکنی توند دبانے کے اور کوئی چارہ نہ تھا اور باجی نواز کا ہاتھ پکڑ کر پیٹ پر ادھر ادھر رکھتی جا رہی تھی اور سوتا جاگتا نواز دباتا دباتا خواب سا دیکھنے لگا جیسے وہ رجو میاں کی پھولوں سے سجی موٹر کا ہارن بجا رہا ہے۔ اچانک ایک نئی سنسنی نے اسے بیدار کر دیا اور اس نے آنکھیں کھولتے ہی اپنا ہاتھ کھینچا مگر باجی نے زور سے اس کا منہ چوم کر بھینچ لیا تھا۔ اس نے گھبرا کر باجی کی طرف دیکھا۔ سڑک کے بلب کے کمرے میں پھیلی ہوئی تھکی تھکی روشنی دم توڑ رہی تھی۔ اس مدھم روشنی میں باجی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ اس کی گہری گہری گرم گرم آنکھوں کے پپوٹے بوجھل ہو رہے تھے۔ نواز کو ایک نامعلوم ڈر سے وحشت ہونے لگی تھی۔ وہ سمجھا شاید پیٹ کا درد بڑھ رہا ہے۔ اس نے ہمدردی سے کہا "باجی!" باجی کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ بستر میں آن گھسی۔ نواز سمٹ کر ایک طرف ہو گیا مگر باجی اب لیٹ کر پھیکے اور بے رونق چہرے سے چھت کی طرف اسی طرح دیکھنے لگی تھی جس طرح اب نواز لیٹا ہوا چھت کی کڑیوں پر نظریں جما کر بچپن کے واقعات یاد کر رہا تھا۔

سیمبل کے تکیے کے نرم لمس نے آج اس کے ذہن میں کیا کیا پرانے قصّے نچانے شروع کر دئے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا جیسے اس کی زندگی اسی ہاتھ میں منجمد ہو گئی تھی یا جیسے اس کی موجودہ زندگی کا ذمہ دار صرف یہی ہاتھ تھا۔ اس نے سگریٹ کے باقیماندہ حصّے کو انگلیوں میں مسل کر پھینک دیا اور نیا سگریٹ سلگایا۔ یہ سگریٹ پینے کی عادت بھی اسے کالج میں خواہ مخواہ ہی پڑ گئی تھی۔ کالج کے لڑکے کتنے شریر تھے۔ اگر وہ سگریٹ پینے سے انکار کر دیتا تو وہ کہتے۔ 'یہ گھونٹو ہے۔ یہ کھاتا بھی کتاب ہے' پیتا بھی کتاب ہے۔ ہم نے اس کا نام یونہی تو نہیں رکھا ہوا 'نواز گھونٹو'"۔۔۔۔ آخر اس نے مجبور ہو کر پیش کئے ہوئے سگریٹ قبول کر لینے میں ہی اپنی خیر سمجھی تھی۔ اس کی واقفیت معدودے چند لڑکوں سے تھی۔ جب وہ اپنی محبت کے کارنامے بیان کرتے تو وہ حیرت سے سنا کرتا اور جب وہ کسی لڑکی کو چھیڑتے تو وہ تھر تھر کانپنے لگتا۔ ایک کہتا۔ "ارے نواز تم بھی کوئی آپ بیتی سناؤ۔"

اس سوال پر وہ ہمیشہ خفیف سا ہو جاتا۔ "یہ تو بس گھونٹو ہے گھونٹو۔" دوسرا کہتا اور بات ٹل جاتی۔ اب جب وہ کالج میں تھا اسے اپنی آپ بیتی کے خاکے میں کچھ جان پڑی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ واقعات نے اس کے ایف۔ اے تک پہنچتے پہنچتے ایسی کروٹ لے لی تھی جس کی اسے کبھی توقع بھی نہ ہو سکتی تھی۔ بھابی کو خالق کے لئے باجی ولایت نے نجمی کا رشتہ دے دیا تھا اور سب سے بڑے بھائی نے اس پر صاد کیا۔ خالق نواز سے بڑا تھا۔ بی۔ اے پاس نوکر چاکر نجمی کو بیاہ کر اپنے گھر لے گیا۔ ایک مدّت کے بعد اسے شادی پر وطن جانا پڑا تھا۔ باجی کے ۔۔۔ اگرچہ اس سے اَن بن تھی مگر جب تک وہ آیا نہ تھا باجی کتنی اداس اداس نظر آتی تھی اور اس کا اداس چہرہ دیکھ کر نواز کا جی کتنا جلتا تھا۔ اور اب باجی ولایت کے ہونٹ بھی اچھے لگنے لگے تھے۔ ہونٹ بھی کیسے تھے۔ عجیب عجیب آگے کو بڑھ کر نیچے کو مڑے ہوئے جیسے ۔۔۔ گلاب کی پتیاں سُرخ سُرخ شاداب سی۔ جب وہ خالق بھائی کو دعائیں دیتی اور اس کے وارے نیارے جاتی تو نواز کو یہ بات بُری لگتی ۔۔۔ پر پہلے اس کا قبضہ تھا اور اب خالق بھائی نے قبضہ جما لیا تھا۔ پھر یہ سوچ کر آپ ہی آپ نادم ہو جاتا کہ وہ اس کا لاڈلا ہے۔ اس کی ۔۔۔ باجی تو اور کس کی لے گی۔ مگر اپنے آپ کو سمجھاتے ہوئے بھی وہ گوارا ہی نہ کر سکتا تھا یہ باتیں۔

اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے باجی اپنے فرض سے کوتاہی کر رہی ہے [illegible] کو بھرنا باجی کا فرض تھا جو وہ اپنی یتیم روح میں محسوس کر رہا تھا۔ بی۔ اے میں داخل ہوئے ابھی پورا سال بھی نہ ہوا تھا کہ اسے بھائی کی کوششوں سے ملازمت مل گئی۔ اس بے روزگاری کے زمانہ میں ملازمت کا ملنا معجزہ سے کم نہ تھا۔

اس نے دھوئیں کا مرغولہ چھوڑتے ہوئے سوچا۔ ضمیر نے سچ کہا ہے کہ لاہور کی جلوہ افروزی اور نمائش کی فراوانی دیکھ کر دل تڑپنے لگتا ہے اور شباب کی للکار سن کر واقعی قدم تھم جاتے ہیں۔ شباب۔ شباب بھی کیا بلا ہوتا ہے۔ ان دنوں اسے نامعلوم کیا ہو گیا تھا جیسے اس کی آنکھوں پر عینک لگ گئی تھی جس کے شیشوں میں سے ہر چیز اسے خوبصورت نظر آتی تھی۔ ہر نسوانی چہرہ اسے حسین و جمیل نظر آتا تھا اور کبھی کبھی تو بدصورتی بھی اسے حسن اور دلکشی کا پرتو لیے ہوئے معلوم ہوتی تھی۔ سانولے اور زیتونی چہروں کو چھونے اور سفید چہروں پر سگریٹ کے دھوئیں کی پھونکیں مارنے کی عجیب سی خواہش اس کے اندر پیدا ہو گئی تھی اور جب وہ کسی مرد اور عورت کو سگریٹ پیتے دیکھتا تو اس کا شدت کے ساتھ جی چاہنے لگتا کہ اس کے ساتھ بھی کوئی عورت ہو اور وہ بھی دیا سلائی جلا کر اس کے ہونٹوں تک لے جائے اور پھر عورت کے ہونٹ اس ہلکی سی لو میں سرخ سرخ شعلے نظر آئیں۔ سینما میں کبھی کبھی اس سے ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ اگر قریب بیٹھی ہوئی عورت کے منہ سے نکلا ہوا سگریٹ کا دھواں اس کی طرف آتا تو وہ اپنے سانس کے زور سے اندر کھینچنے لگتا۔ اسے عجیب عجیب بے ہنگم سے خواب آتے تھے مثلاً اسے اپنی ہمسائی جنگل بیابان میں نظر آتی ہے۔ جب وہ اس کی طرف غور سے دیکھتا کہ یہ جنگل میں کیا لینے آئی ہے تو وہ نظروں سے اوجھل ہو جاتی اور اس کے گذر چکنے کے بعد اسے پیچھے سے پکارتی رہتی۔ ایک روز اسے کسی کام کے سلسلہ میں ایک رئیس زادے کے ہاں جانا پڑا تھا جس کے بچھے ہوئے صاف ستھرے بستر پر چار تکیے دیکھ کر اسے تعجب ہوا تھا۔ دو سرہانے کی طرف پڑے تھے۔ ایک دائیں ایک بائیں۔ اس نے انہیں چھو کر دیکھا۔ ان میں سیمبل بھری تھی اور وہ نرم نرم لمس ایک عجیب طرح سرور انگیز تھا۔ اس نے وہیں تہیہ کر لیا اور وہ تنخواہ پاتے ہی بازار سے سیمبل کے چار تکیے خرید لایا تھا۔ دونوں طرف کروٹ لینے پر وہ نرم نرم تکیوں کو اپنے ساتھ لٹا لیا کرتا۔ اس کی انگلیاں کس طرح ان میں دھنس جاتی تھیں اور اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے بیقرار خون کی بڑھتی ہوئی حرارت کسی تسکین کی جویاں تھی۔ جب وہ خالی الذہن ہوتا تو رجو میاں کی شادی والی رات کا واقعہ کسی خفیہ کمین گاہ سے نکل کر اس کے دل پر ٹھونگیں سی مارنے لگتا تھا اور اس یقین ہو جاتا کہ وہ واقعہ اس کے ذہن میں گرم لوہے کے داغ کی طرح محفوظ ہو چکا ہے اس کا جی چاہتا کہ باجی اب پھر کسی موقع پر اسے اپنے ساتھ سلا کر اس کی ٹانگوں کو اپنی زندگی بھری رانوں میں دبائے مگر اسے ان خیالوں سے شرم بھی آنے لگتی اور وہ سوچتا باجی اس کے بھائی کی خوشدامن بن چکی ہے۔ بھائی کو اگر ان خیالوں کا پتہ چل جائے تو کیا ہو۔ جتنا وہ ان خیالوں سے بچتا اتنا ہی یہ اس کے سر پر تھنبہ بن کر سوار ہو جاتے اور جذبات کو فسوں کاری اسے دم نہ لینے دیتی۔ باجی کے سینے کی کامل گولائیاں اس کی آنکھوں کے سامنے آنے لگتیں جیسے باجی نے اس کی جوانی پر کوئی افسوں پھونک دیا تھا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ باجی اس کے اندر سے نہیں نکل سکتی وہ تو اس کی ہڈیوں میں نفوذ کر گئی تھی' تو اس نے ہتھیار ڈال دئے اور کھلم کھلا اوٹ پٹانگ خیالات کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اس لطافتِ گریزاں کی تلاش میں سرگرداں پھرنے لگا جو اس کے نفس کے دروازے پر بیباک دستک دے کر کہیں فضا میں گم ہو گئی تھی اور جسے نہ پا کر اس کی ترستی ہوئی روح ایک پیاسا اور معطر درد محسوس کرنے لگی تھی۔ باجی کے پھرتیلے بدن کا گرم اور معطر دباؤ' اس کے کسے ہوئے چھوٹے سے پیٹ کی چکناہٹ اور اس کی بے باکانہ اور بجلی حرکات کی یاد اس کی جوانی کا محور تھی۔ اسے خیال آتا اگر باجی اسے کبھی ملی تو وہ اس سے کہہ دے گا۔ باجی تمہیں معلوم نہیں کہ تم میں کتنی طاقت ہے۔ وہ سوچتا باجی کو کیا شاید سب ہی عورتوں کو پتہ نہیں کہ ان میں کتنی طاقت ہے۔ دماغ کی بے بسیوں اور دل کی حکمرانیوں سے اس کا چہرہ پھیکا پڑنے لگا تھا۔ مسرت کے دروازے پر سے ترسی ہوئی روح ان دنوں اس کی آنکھوں میں سے جھانکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہ جب بات ہے جب اسے

خالق بھائی کا بمبئی سے خط آیا تھا کہ اگر تمہاری صحت ابھی تک اچھی نہیں ہوئی تو چھٹی لے کر بمبئی آجاؤ۔ باجی اور زرینہ بھی آئی ہوئی ہیں۔ یہ خط پاکر اسے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ خالق بھائی نے اگرچہ پہلے بھی بمبئی آنے کے لئے اسے کئی بار لکھا تھا مگر اب کے تو اس نے ذرا دیر نہ کی اور دو مہینے کی رخصت لے کر بمبئی پہنچ گیا۔

خالق بھائی کے پاس چھوٹا سا فلیٹ تھا صرف دو کمرے اور ایک غسلخانہ اور رہنے والے پانچ شخص۔ خالق ان کی بیوی باجی ولایت زرینہ اور نواز۔ ایک کمرہ خالق اور نجمی کے دو پلنگوں سے ہی بھرا بھرا معلوم ہوتا تھا اور دوسرے میں سنگار میز اور چند کرسیاں بچھی تھیں۔ رات کو زرینہ نے اس کمرے کی کرسیاں تہ کر کے دیوار کے ساتھ لگا دیں اور کونے میں سے لپٹے ہوئے بستر نکال کر بچھانے لگی۔ موٹے موٹے دو گدے ان پر سفید چادریں اور تکیے۔ جب وہ اپنا اور باجی کا بستر بچھا چکی تو نواز کے ہولڈال کی طرف بڑھی۔ "بڑے نفیس تکیے ہیں آپ کے نواز بھائی۔" اس نے نواز کے بستر پر تکیے رکھتے ہوئے۔ "مگر ایں!!! چار تکیے؟" اس نے مذاق اور حیرت کے ملے جلے تبسم سے اپنی ماں کی طرف دیکھا تھا اور باجی بھی مسکرا دی تھی۔ "یہ سیمبل سر کے نیچے سے کھسک جاتی ہے اور مجھے نیچے تکیے پر نیند نہیں آتی"_____

""اچھا یہ بات ہے!" جھکی ہوئی زرینہ نے اپنا کھسکتا دوپٹہ سنبھال کر کہا۔ زرینہ اب خاصی جوان ہو چکی تھی۔ اس کی لمبی لمبی چٹیا کتنی موٹی تھی ساری گردن کو ڈھک رکھا تھا اس نے۔

بیچ میں باجی کا بستر تھا۔ دیوار کی طرف زرینہ کا اور دروازے کی طرف نواز کا۔ بستر فرش پر ساتھ ساتھ بچھے تھے۔ نواز لیٹا ہوا تھا اور باجی اس کی طرف پشت کئے سنگار میز کے سامنے کھڑی منہ پر کریم مل رہی تھی۔ اس وقت اس کی پیٹھ کا اتار کتنا خوبصورت لگا تھا نواز کو اور کہنی کے پاس جو ڈمپل پڑ رہا تھا خاکستری رنگ کا۔ اس کا جی چاہتا تھا باجی کی کلائی پر پنجے گاڑ دے اور اس داغ کو چوم لے_____ باجی جب اس کے پاس لیٹ گئی تھی تو وہ اسے اپنے ارمان کی طرح ایک نئی اور تازہ شے معلوم ہو رہی تھی۔

اگلے روز وہ تیار ہو کر سیر کے لئے نکلے تھے۔ باجی کی قمیض پر درزی نے کتنی اچھی چنٹیں دے رکھی تھیں جیسے خرگوش کے چھوٹے چھوٹے بچے پھدک رہے ہوں۔

"باجی آپ کو سفید لباس بہت اچھا لگتا ہے۔" یہ الفاظ اس کے منہ سے آپ ہی نکل گئے۔

فرخ نے بھی کل یہی کہا تھا کیوں امی؟" زرینہ نے ٹانگ اڑائی۔

"فرخ کون ہے؟"

باجی بولی۔ "فرخ زرینہ کی سہیلی ہے۔ ہمارے اوپر کے فلیٹ میں بھی کوئی پنجابی رہتے ہیں۔ ان کی بیٹی کا نام فرخ ہے۔ اکیلی اولاد ہے بڑے چاؤ چونچلے ہوتے ہیں اس کے۔ زرینہ سے اس کا بڑا پیار ہو گیا ہے۔ یہ تو کئی کئی راتیں اور دن اس کے پاس گذارتی ہے۔"

"اس نے ہماری دعوت بھی کی تھی۔" زرینہ نے کہا تھا مگر نواز نے یہ بات ان سنی کر دی تھی۔

نواز کو چند دنوں کے بعد یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے اس کی آنکھوں میں ایک تکان' ایک انوکھی بے کلی نے ڈیرے ڈال لئے ہوں مگر باجی کی غلافی آنکھوں میں وہی پرانی ساحرانہ گھلاوٹ موجود تھی بلکہ اب وہاں پلکوں کی چلمن میں ایک سحر رقیق کبھی اندر چھپتا اور کبھی باہر جھانکتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ایسی حالتوں میں اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے۔ جب یہ نشے میں لپٹا ہوا جادو پلکوں کی چلمن سے جھانکتا تو وہ اپنی جراتوں کو اکٹھا کر رہا ہو تا کہ وہ سحر رقیق پھر چلمن کے پیچھے جا چھپتا اور اسے باجی کی غلافی آنکھیں اسی طرح ٹھیک

شکیب نظر آنے لگتی جس طرح چوپاٹی کا ساحل پانی کا ریلا چلے جانے کے بعد معمول حالت میں نظر آنے لگتا تھا ــــ وہ غسل خانہ میں باجی کو دودھ والے کی لوٹے میں سے صابن دانی بھی پکڑا چکا تھا۔ باجی اپنے ہونٹوں پر اس سے منہ پر بھی لگوا چکی تھی اور ایک شام جب وہ کرافورڈ مارکیٹ کے پاس کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے وہ جا کر جوڑے پر لگانے والے گدھے ہوئے پھول لے آیا تھا جو اس نے مرہٹہ عورتوں کو لگائے ہوئے دیکھا تھا۔ باجی نے پھول ہاتھ میں پکڑ کر اس کی طرف پیٹھ موڑ دی تھی۔ جب وہ باجی کے جوڑے پر پھول لگا چکا تھا تو زرینہ نے پھولوں کا دوسرا نصف چکر باجی سے پکڑ کر خود اپنے بالوں پر لگانا چاہا تھا مگر باجی نے پھول نواز کے ہاتھ میں دے کر کہا تھا۔ "جو لایا ہے وہی لگائے گا۔" چنانچہ زرینہ کو بھی اپنے بالوں پر پھول نواز سے ہی لگوانے پڑے تھے۔ اس کو باجی کا کام کر کے اب بھی ویسی ہی خوشی ہوتی تھی مگر اس خوشی کے ساتھ اب اسے بے چینی سی بھی ہونے لگتی تھی۔ ایک بار جب ان کی ٹریم بوری بندر کے پاس ٹھہری تھی تو نواز نے ایک گھاٹن کی طرف دو تین بار دیکھا تھا۔ اس کے سینے کی گولائیاں باجی کی چھاتیوں کی طرح سڈول تھیں اور باجی نے ایک دم پوچھ لیا تھا۔ "بڑا دیکھ رہے ہو کیا ہے اس عورت میں؟" اس بیباک سوال پر وہ گھبرا سا گیا تھا مگر اس نے ہمت کر کے کہہ دیا تھا۔ "کچھ نہیں دیکھئے باجی! کتنا متناسب بدن ہے اس کا۔" اس پر باجی نے شرارت سے مسکرا کر کہا تھا۔ "کیا تمہیں ایسا بدن پسند ہے؟" یہ غیر متوقع جواب سن کر نواز کے بدن پر چوہیا سی دوڑ گئی تھی۔ اس نے ڈر کر کنکھیوں سے اُدھر دیکھا جدھر زرینہ اور نجمی بیٹھی تھیں مگر وہ دونوں باہر دیکھ رہی تھیں ــــ پھر ایک روز باجی کہنے لگی۔ "زرینہ تیری بچپن کی عادت نہ گئی۔ کس طرح سوتی ہے رات کو۔ ٹانگیں مار مار کے میرا برا حال کر دیتی ہے۔ جوں دھکیلنے لگتی ہے مجھے، میں تو باجی بیچارے پر جا چڑھتی ہوں۔" اگلی رات نواز کی آنکھ کھلی تو باجی واقعی نواز کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ نواز سوچنے لگا کیا کرے اور آگے کھسکتا تو گدے سے نیچے فرش تھا۔ اس نے اپنے آپ کو سکیڑ کر کہا۔ "باجی! باجی! دیکھیے آپ کھسک کر کہاں آ گئی ہیں۔" باجی نے نیند بھری آواز میں کہا۔ "مجھے سردی لگ رہی ہے۔" اور نواز کی دولائی میں گھس آئیں ــــ چند منٹ کے بعد باجی کے بازو پر نواز کا سر تھا اور اس کے دل میں یہ خیال 'باجی کتنی اچھی ماں بن سکتی ہے' عجیب عجیب نئی نئی صورتیں بدل رہا تھا۔

اگلے روز زرینہ کی سہیلی فرخ کا سر دکھتا رہا اور زرینہ سارا دن اس کے پائے کے ساتھ لگ کر بیٹھی رہی تھی۔ شام کا کھانا بھی اس نے اُدھر ہی کھایا تھا اور اپنی سہیلی کے پاس ہی سوئی تھی۔ اس رات نواز نے محسوس کیا تھا کہ اس کے ارادوں اور جراتوں نے ہلکورے کھانے چھوڑ دیے تھے۔ نئی حوصلہ افزائیاں سنسنیوں کے نئے ریلے پیدا کر رہی تھیں اور وہ باجی کے نرم نرم سے حرارت اور اس کے کانپتے ہوئے تنفس سے نشہ پا رہا تھا۔ کمرے کے گاڑھے اندھیرے میں باجی کی گھٹی گھٹی آوازیں تحلیل ہو رہی تھیں۔ نواز کے خشک ہونٹوں کے رستے اس کے سارے بدن میں رس اتر رہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ قوس و قزح کے خوبصورت رنگوں میں سے گذرتا ہوا چاند کے پاس پہنچ رہا تھا۔ پھر ایک خوش آیند غنودگی اس پر چھانے لگی تھی اور وہ خوشبوؤں میں بسی ہوئی باجی کو اپنے ساتھ لگا کر سو گیا تھا۔

خالق بھائی تو اپنے کام پر جا کر شام کو لوٹتے تھے۔ نجمی کو ان کے آنے کا انتظار اور پھر گھر کا سو کام کاج۔ زرینہ کو پیار کرنے والی سہیلی مل گئی تھی اکثر شام کو نواز اور باجی دلایت ہی سیر کرنے جاتے تھے۔ نواز بمبئی اور ولایت دونوں کی سیر کراتا رہا اور ولایت کیسے کیسے عمدہ اور نفیس کپڑے پہن کر اس کے ساتھ پھرتی رہی۔ بمبئی کتنا اچھا شہر تھا۔ وہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اپالو بندر پر گھومیں یا چوپاٹی کی گیلی گیلی ریت پر پھریں کوئی ان کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔ عورت کتنی محفوظ تھی وہاں' اور پہلی بار جب دونوں نے جا کر ریسٹوران میں چائے پی تھی تو نواز نے کتنا اصرار کر کے باجی کو سگریٹ پلایا تھا اور وہ کتنی پیاری لگی تھی۔ اس کے ابھرے ہوئے مڑے مڑے ہونٹوں میں سگریٹ کتنا اچھا لگتا تھا اور ہونٹ سے ہونٹ لگنے پر کس طرح اس کی آنکھوں کی پلکوں کی چلمن سے سحر رقیق جھانکنے لگتا تھا اور وہ بے قابو ہو جاتی تھی۔ وہ اس کی ایسی انگلیوں اور پوروں کو گدگداتی تھی کہ اسے یوں معلوم ہونے لگتا تھا کہ زمین آسمان کے بیچ میں گدگدی ہی گدگدی

بھری پڑی تھی۔ لاہور جاکر وہ کس قدر شدت کے ساتھ چاہتا رہا تھا کہ وہی سنسناہٹ پھر پھر اس کے خون میں دوڑتی چلی جائے لیکن وہ اس کی پھریریاں اسے پھر بے چین کر دیں مگر اسے اطمینان تھا کہ اب باجی اس اپنی تھی اور اپنی ہی رہے گی کیونکہ اس نے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ زرینہ سے شادی کرے گا اور یہی ایک طریقہ تھا باجی کے ساتھ تعلق استوار رکھنے کا_____ اور جب اسے خالق بھائی نے لکھا تھا کہ "تمہارا اس رشتہ کے متعلق کیا خیال ہے" تو اس نے جھٹ رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔

اس کا خیال تھا کہ زرینہ بھی کڑاکڑا بولتی ریوڑی ہو گی مگر جب دانتوں تلے آئی تو سیلی ہوئی۔ ماں کا بالکل عکس، سرد اور بے حس۔ مگر بے چاری اپنی نشانی چھوڑ کر خود چل بسی۔ تخیل کی سحر کاری کی ان سمٹتی ہوئی کرنوں میں نواز نے کروٹ لے کر ساتھ والے پلنگ پر نظر ڈالی۔ ڈھائی برس کی ننھی منی بچی لحاف میں بڑی گڑیا معلوم ہو رہی تھی۔ نواز پھر سیدھا ہو کر لیٹ گیا مگر اب چھت کی کڑیوں سے اسے خوف سا محسوس ہونے لگا جیسے ان کڑیوں نے اس کے تمام رازوں کو اپنے اندر بھینچ رکھا ہو اور وہ جب چاہیں افشا کر دیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا اور کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ایک لمبی بھاری بھر کم نعش کی طرح پھیلے ہوئے کوہِ مردار کی بلندیاں اسے فضائی مٹی مٹی روشنی میں نظر آ رہی تھیں۔ ملازم لڑکا جو نیچے ڈیوڑھی میں اپنا کوٹ رہا تھا مدت سے دھماکوں کی آواز ختم کر کے سو چکا تھا۔ اس نے سوچا۔ "بابو محلہ اتنی دور تو نہیں مگر عورتیں جب بیٹھ جائیں تو کب اٹھتی ہیں۔" وہ آ کر پھر لیٹ گیا۔ رازوں سے آگاہ چھت کی کڑیاں اسے پھر گھورنے لگیں جیسے وہ اُگل دینا چاہتی تھیں، سب کچھ جو وہ دیکھتی رہی تھیں۔ اس نے کروٹ لے لی۔ سامنے کھونٹی پر دو باڈیاں ٹنگی تھیں ان کے پاس ہی تازہ اتری ہوئی سفید قمیض لٹکی تھی جس کی سطح پر چھوٹے چھوٹے ابھرے ہوئے شکن پہننے والی کے جسم کے کئی حصوں کی غمازی کر رہے تھے۔ وہ ہمیشہ بھنچی بھنچی فٹ قمیض پہنتی اور جب اتارتی تو اس پر سے سانپ کی اتری ہوئی کینچلی کی طرح اس کے گٹھیلے بدن کا ایک ایک پٹھا گنا جا سکتا تھا۔ تخت پر علیحدہ علیحدہ لئے دھوبی کے دُھلے کپڑے پڑے تھے جن میں مختلف ڈیزائن کی باڈیوں کا ڈھیر ننھی بچی کے کرتوں کے برابر تھا۔ اس نے سوچا خیالوں کا اڑن کھٹولا! اسے آج کہاں کہاں سے لئے پھرا ہے اور جب اسے یاد آیا کہ وہ اڑا کہاں سے تھا تو اس نے سوچا کہ اسے ظہیر کی باتوں کی تائید کرنی چاہئے تھی۔ اس نے دل سے کہا۔ آج تو اس نے کسی پارٹی کا ساتھ نہیں دیا۔ بالکل غیر جانبدار رہا تھا۔ ہاں اگر کل ظہیر نے یہی باتیں دہرائیں کہ عورت اچھی، بھلی حالت میں وہ کچھ کر سکتی ہے جو مرد نشے میں بھی نہیں کر سکتا...... ....اور اگر بند شیں بھی اٹھ جائیں تو عورت جسے مقدس کہتے ہیں آپ کا منہ سوکھتا ہے.. ......

کمرے میں داخل ہوتے ہی ولایت نے میلاد شریف کی شیرینی کا لفافہ تخت پر رکھتے ہوئے اک انداز سے کہا۔ "ابھی تک آپ جاگ رہے ہیں؟"

سیمبل کے تکیوں کو سر کے نیچے سمیٹتا ہوا نواز یوں اٹھ بیٹھا گویا بالکل خالی الذہن تھا۔ "تمہارے انتظار میں جاگ رہا تھا!"

ولایت کی غلافی آنکھوں میں سے ایک گھلاوٹ نے جھانکا اور وہ مڑ کر آئینے میں اپنا آپ دیکھنے لگی۔

آنکھ مچولی

شکیلہ اختر

وہ بچپن ہی سے بہت شوخ و چنچل اور بڑی ہنس مکھ تھی' دیکھنے والے اسے دیکھ کر کہتے "ہنستے ہی ہنستے تو گھر بستے ہیں" اور جب اس کی زندگی کا دوسرا اور سب سے اہم دور شروع ہوا تو اس کے تبسم اور زیادہ رنگین ہوتے اور ہنسی کی سریلی جھنکاریں ستاروں کی طرح تابناک ہو گئیں۔ اسے تنہائی سے وحشت ہوتی تھی اسی لئے وہ رنگ و بو کی طرح ہر محفل پر چھائی رہتی۔ اس بجی جائی کوٹھی سے ہر گھڑی قہقہے بلند ہوتے رہتے تھے اور احاطے میں سائکلوں کی قطاریں لگ جاتیں لیکن وقت اور بے وقت بھرے بھرے رکشوں اور آتے ہوئے موٹروں سے وہ اکتا گئی تھی۔ ایک ہی طرح کے ہنگاموں سے اب اس کا جی گھبرا گیا تھا۔ دن اور رات کے اکثر حصوں میں لوگوں کی طرح طرح کی ٹولیاں اس کے یہاں آتیں۔ کچھ اس کے بھائی کے دوات آتے جن کے آتے ہی ڈرائینگ روم کے پردے کھنچ جاتے' برج کا دور چلنے لگتا۔ مونوپلی اور کیرم کے کھیل کھیلے جاتے۔ پھر اس کے دیور اور دوسرے بھائی کے ساتھی آتے۔ موٹی موٹی لال پیلی جلدوں کی کتابیں دبائے' کبھی تو ان کے آتے ہی کمرے بند ہو کر پڑھائی شروع ہو جاتی اور کبھی وہ بلے اور گیند لئے ٹینس لان پر اچکنے لگتے اور ہر روز شام ہوتے ہی گیارہ گیارہ بجے رات تک اس کے شوہر فیض کے ملنے والے آتے رہتے۔ ڈرائینگ روم بر آمدہ اور کبھی کبھی سامنے کا احاطہ کرسیوں سے بھر جاتا۔ پھر تو شاعری اور فن شاعری کے جام چھلکتے اور ادب کی باریکیاں بیان ہوتیں۔ فیض کا ذوق ادب بہت بلند اور اس کا مشاہدہ بہت گہرا تھا۔ وہ ایک کامیاب ادیب تھا جس کے افسانے' ڈرامے' تنقید اور نظموں میں زندگی کی جاگتی ہوئی لہریں رواں اور دواں رہتی تھیں' کبھی زندگی کے اہم اصول اور دنیا کے نظام پر نگاہیں ہو ڑائی جاتیں گہرے اور دقیق مسئلوں اور ان کی باریکیوں پر تبصرے ہوتے۔ قہقہے گونجتے ہنسی کی لہریں اٹھتیں۔ اس کی کوٹھی میں زندگی لہراتی رہتی مگر یہ سب کے ہوتے ہوئے بھی وہ گھر کے اندر اپنے کو ایک [illegible] وسیع خلاء میں تنہا محسوس کرتی۔ ایک عرصہ تک انہی قہقہوں اور ہنسی کی انہی موجوں میں اپنے کو فریب دیتی رہی تھی' دیر دیر تک پردے کے [illegible] کمرے کے دریچے پر بیٹھی ان کی باتیں سنتی' ان کے تماشے دیکھتی اور بیل کے شربت' انڈے کے حلوے' ناشتے اور چائے سے [illegible] کرتی رہتی تھی پس پردہ اس نے ان رنگینیوں میں اپنے آپ کو بہلانا چاہا تھا' مگر اب اسے اس گھر سے وحشت ہونے لگی تھی۔ [illegible] گھر نہیں تھا۔ زندگی کی شاہراہ پر ایک پُر رونق کلب تھا اور اس کا جی چاہتا کہ اس کا اپنا بھی کوئی گھر ہوتا۔ بارہ سال کا ایک طویل عرصہ [illegible] گذار کر اب تھک گئی تھی' تاش کے پتے' کیرم کی کھٹا کھٹ اور مونوپلی کی ہار جیت میں وہ اپنی زندگی کی شکست ہی [illegible] بلے اور گیند کی ہر ایک ضرب نے اس کے دل کو مجروح کر دیا تھا اور ادب' دنیا اور نظامِ حیات کے گہرے گہرے تبصروں [illegible] کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بکھیر دیا تھا۔ گھر میں اتنے ہنگاموں کے ہوتے ہوئے بھی وہ خود ایک

اجاڑ ویرانہ میں ایک اکیلی ٹھنٹھ درخت تھی اور ڈرائنگ روم کی حسین آرائش سے وہ اکتا گئی تھی اپنی تنہائیوں سے [illegible] دن بھر میں کتنی کتنی دفعہ اپنے ہاتھوں سے گھر کی ایک ایک چیز جھاڑتی رہی تھی۔ مگر ان ساری چیزوں سے اب اس کا دل بھر گیا تھا [illegible] ان لٹکتی ہوئی تصویروں کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ آتش دان پر رکھے ہوئے خوبصورت کھلونوں پر [illegible] گرد دیکھ کر بھی اب وہ بے پروا رہتی۔ کارنس پر سجائی ہوئی گڑیاں بارہ سال سے بس ایک ہی طرح سے بے حس پڑی تھیں رنگ برنگ کی کپڑے اور مٹی کی گڑیاں جنکے کپڑے نمک کی طرح گل کر اب پھٹتے جا رہے تھے اور اُن کے چہرے پر جگہ جگہ سے خراشیں پڑ گئی تھیں مگر وہ بے حس و حرکت تھکے ہوئے انداز میں بارہ سال کی طویل مدت سے مسکرائے جا رہی تھیں۔ اس کو محسوس ہوتا جیسے وہ خود بھی مٹی یا کپڑے کی ایک بے جان گڑیا ہے' اس پر بھی ایک جگ بیت گیا تھا اور وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی سرک نہ سکی تھی۔ اس کی رُوح کی دھجیاں بھی تار تار ہو چکی تھیں اور مٹی کی گڑیوں کے چہرے سے کہیں زیادہ........ کھرچنیں اس کے دل پر پڑ گئی تھیں۔ انہی کی طرح اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ وہی مردنی سی بے حس مسکراہٹ' اب تک وہ انجان طور پر ایک بچہ کی طرح ان کھلونوں سے کھیلتی رہی تھی' نقلی کھلونے' اور مٹی کی بے جان گڑیوں سے۔ مگر یک بیک اتنے دنوں کے بعد اب اس کا جی بے اختیار چاہنے لگا تھا کہ کمرے کے ان ریشمی پردوں سے لپٹ لپٹ کر کوئی جھولتا رہے' اس کی رُوح کو ایک طوفان کا انتظار تھا اور وہ اس آندھی میں گھر کی ایک ایک چیز کو تتر بتر دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ کوئی لمبا بانس لئے ان چمکتی ہوئی ساری نفیس تصویروں کو گرا کر چکنا چور کر دے اور اس کا منہ چڑاتی ان مسکراتی ہوئی بے حس گڑیوں کو توڑ توڑ کر کوئی اس کی نگاہوں سے انہیں دور کر دیتا۔ وہ چاہتی تھی کہ میز اور کرسیاں اوندھی رہتیں اور سنگاردان کے شیشے پر بڑے بڑے دھبے پڑے رہتے' اس صاف ستھری اور جھلملاتی ہوئی کوٹھی سے اب اس کا جی اکتا گیا تھا۔ وہ کوئی تبدیلی چاہتی تھی۔ ایسی اہم تبدیلی جو گھر کے کونے کونے پر چھا جائے۔ لمبے بانسوں میں ریڈیو کے ایریل دیکھتے ہی بیتابانہ اس کا دل چاہتا کہ گھر کے ایک ایک حصے میں وہ رسی کی بھدی بھدی الگنی ٹانگ کر ان پر ننھے ننھے بے شمار کپڑے پھیلا دئے عجیب عجیب طرح سے بے ہنگم کپڑے جو کبھی اس گھر میں استعمال نہ ہوئے تھے۔ سب سے زیادہ اس کو اپنی بے کاری کھلتی رہی۔ سارا کا سارا دن پڑا رہتا۔ وہ کتابیں پڑھتے پڑھتے تھک جاتی۔ ایک ہی طرح سے آخر کتنی دیر وہ لکھتی رہتی۔ لکھی ہوئی سطریں جب اس کی نگاہوں کے سامنے ناچنے لگتیں تب وہ اُٹھ کر اکیلی کوٹھی میں بے مقصد چکر لگاتی' باورچی خانہ کے در پر کھڑی نوکروں کی باتیں سنتی' ڈاکیہ کی آواز سنتے ہی وہ خود ڈاک لینے چلی جاتی۔ ترکاری والی' دھوبن اور دودھ والیوں سے وہ خواہ مخواہ کی مہمل باتیں دیر دیر تک کرتی رہتی۔ ایسا کرتے ہوئے اُس کی خودداری کو ٹھیس لگتی اور وہ تلملا کر رہ جاتی۔ ایسی باتیں اس کی شان کے خلاف تھیں۔ پھر وہ کیا کرتی کچھ وقت تو جیسے تیسے کر کے گزر جاتا تھا۔ مگر آخر کب تک ایک ہی شاہراہ پر کھڑی رہ اپنے کو فریب دے سکتی تھی____!

اس کی کوٹھی سے لگی ہوئی دوسری کوٹھی میں گھوش بابو رہتے تھے۔ خوبصورت نازک سے' خوش نظر اور خوش سلیقہ' ان کی کوٹھی اور احاطے کا ہر ہر کونا گلزار جنت بنا رہتا انھیں پھولوں سے فطری طور پر ایک مجنونانہ عشق تھا' وہ خود بھی اسی شاخ کے ایک شگفتہ سے پھول نظر آتے اور ان کی بیوی اس گلدستے کے سارے پھولوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور حسین پھول تھیں' وہ سچ مچ میں ایک گلدستہ جیسے لگتے۔ شگفتہ' خوبصورت رنگین اور خاموش____ ایک گہرا سکون ان کی کوٹھی پر ہر وقت چھایا رہتا' مگر جب سے ننھا گلاب ان کے درمیان آ گیا تھا تب سے ان کے گھر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی' دبلا پتلا حسین سا بچہ جب غوں غاں کے بعد اپنے کمرے کے دریچہ پر کھڑا ہو کر "ماں' ماں' کہہ کر شور مچانے لگا تو ایک دن پروین اپنے دریچہ سے پکار کر بولی "گلاب! ماں نہیں امی بولو امی____ اور یہ اس کا گلاب نام بھی اسی نے رکھا تھا۔ ننھی ننھی انگلیوں سے دریچہ کے جنگلے کو پکڑے دو ایک روز تک تو چپ چاپ سے وہ پروین کی امی امی کہتی ہوئی آواز کو سنتا رہا اس کے بعد سے وہ دریچہ کے سفید پردے کے اُوپر سے اُچک اُچک کر چیخنے لگا____ "امی! امی!" پہلے تو پروین نے سمجھا کہ گلاب اپنا

سمجھا کرتا ہے مگر جس دن اُس نے یہ محسوس کیا کہ سارا سارا دن اور کبھی رات کو بھی امی امی کہہ کر وہ خود اسے پکارنے لگا ہے تو ایک عجیب سی ہُوک اسکے دل میں پیدا ہوئی۔ "امی۔ امی" کتنی پیاری تھی آواز جسے سننے کی وہ کتنے دنوں سے منتظر تھی ___ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ اس کی زوجیت میں ننھی ننھی انگلیاں آچکی تھیں مگر اس آواز نے اسے ہولناک طور پر بیدار کر دیا تھا یاقوت کی طرح سُرخ سُرخ لب اور بھیگی بھیگی سیاہ آنکھوں والا حسین سا بچہ جب اس سے لپٹ لپٹ کر کہتا "امی" تو وہ اکیلے میں اس کے سفید گالوں پر اپنے بھیگے ہوئے رخسار رکھ کر کہتی ___ "میرا گلاب ___ میرا گلاب۔" وہ اس کے سارے گھر بھر میں ایک تتری کی طرح دوڑتا رہتا اور جب گھوش بابو کی بیوی گلاب کو پروین کے پاس رکھ کر گھوش بابو کے ساتھ کسی اچھی سی انگریزی فلم دیکھنے چلی جاتیں تو پروین تھوڑی دیر کے لئے یہ بھول جاتی تھی کہ گلاب کس کا بچہ تھا ___ !اسی گلاب اور گلاب کی مسلسل پکاروں نے اس کی رُوح میں ایک خلفشار مچا دیا تھا۔!

یک بیک بارہ سال کی طویل مدت کے بعد پروین نے اپنے میں ایک مبہم سی تبدیلی محسوس کی اور یکایک اس کا دل نئی نئی کیفیتوں سے ہم آہنگ ہونے لگا' رستے ہوئے جذبات نے ایک دھارے کی طرح اس کی رگ رگ میں ہل چل مچا دی تھی اور وہ اپنے خواب و خیال کے حسین تصورات میں کھوئی ہوئی سی رہنے لگی ___ "امی ___ امی" کہتا ہوا گلاب جب اس کی گود میں آنے کو مچلنے لگتا تو وہ اسے آہستہ سے تھپتھپا کر بہلا دیتی" ___ "گلاب! تم گلاب ہو نا؟ اور تمہیں ایک ننھا چمیلی کا پھول دوں گی لو گے نا؟" ___ پھر اس کی نگاہیں چمیلی کے اس حسین سے پھول کے تصور پر جم جاتیں۔ نازک خوبصورت ننھا سا چہرہ۔ بڑی بڑی معصوم سی آنکھیں' سر پر اسی کی طرح گھنگھریالے بال' چھوٹی چھوٹی انگلیوں والا مہندی لگا ہوا سا پاؤں کبھی ہنستا کبھی ہلکتا ہوا پھول کی پنکھڑیوں جیسا یاقوتی ہونٹ" ___ یہ سب کیا ہو رہا تھا۔ کیسے ہو رہا تھا۔ وہ ایک آرٹ کی تخلیق کر رہی تھی اور اسے خود ہی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا شاہکار بنا رہی ہے

فیض نے جب یہ خبر سنی مسرت سے وہ جھوم گیا۔ پھر اس کی بڑی بڑی خاطریں ہونے لگیں اس کے سونے کے کمرے میں سُرخ سُرخ شاداب امریکن سیب خوش رنگ نارنگیاں اور بلور کی طرح چمکتے ہوئے دانوں والے انگور کے خوشے رکھے جانے لگے۔ فیض حُسن کا پرستار اور شعر و ادب کا ایک کامیاب آرٹسٹ تھا' اسی لئے وہ چاہتا تھا کہ نیند سے بیدار ہوتی ہوئی پروین کی نگاہوں کے پہلا ٹھہراؤ حسین اور لطیف ہو اور اسی رنگینیوں اور شادابیوں کی آمیزش وہ پروین کے اس آرٹ میں دیکھنا چاہتا تھا ___ !

پروین اپنے دل و دماغ پر چھائے ہوئے کیف و سرور سے گھبرا کر کبھی کبھی سوچتی کہ دنیا کی اس پرانی روایت کو اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہے ایک ایک گلی میں کتنے کتنے بچے پڑے ہوئے تھے پیسے میں ۔۔۔۔ ملنے والی گڑ کی مٹھائی اور رینگتے بلبلاتے ہوئے بچوں کی اس دُنیا میں کوئی کمی نہ تھی اور ایک ہی وقت میں ان دونوں پر کتنی مکھیاں بھنکتی رہتی تھیں ___ شاید خود سرمدی انتظار طویل ہو کر اپنی قدر کرانے لگتا ہے اور اگر یہ بارہ سال کا ایک جگ نہ بیت جاتا تو چمیلی کا نازک سا پھول اس کے لئے اتنا خوشبودار نہ ہوتا۔ اسی لئے بیچارہ گلاب چھوٹے چھوٹے سے قصور پر بھی اکثر پٹ جایا کرتا تھا۔ پھول کی ایک کلی اور ایک کالے سے بیگن توڑ لینے کے جرم میں گھوش بابو نے اسے کئی دفعہ مارا تھا۔ گلاب کے لئے صرف پروین کی ایک اکیلی گود ہی پر سکون تھی وہ اپنی سزاؤں کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ کسی قصور پر بلا کہے سنے بھی اپنے ہاتھوں سے دونوں کان پکڑے وہ اپنے مخصوص کونہ میں کھڑا ہو جاتا۔ مگر جب اس کو اکیلے کمرے میں بند ہونے کی سزا دی جاتی تو وہ دریچے پر چڑھ کر زور زور سے پکارتا ___ "امی! امی!" اور پروین اپنے سارے کام کو چھوڑ کر اپنے کمرے کے دریچے سے لگ کر گلاب کے سامنے کھڑی ہو جاتی ___ پھر گلاب اپنی زبان میں شکایت شروع کر دیتا ___ "امی! امی! ہم کو ماں۔ بن بن۔" "یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی پروین کو ایک لطیف انتظار تھا۔ وہ لیٹی لیٹی سوچتی رہتی اور بہت سے خوبصورت نازک نازک سے معصوم بچے اس کے پاس چکر لگاتے۔ کبھی نزدیک اور کبھی اس سے بہت دُور۔ اس کے گرد منڈلاتے ہوئے ننھے ننھے سے کلبلاتے ہوئے بچے کبھی کبھی اس کی رُوح سے سرگوشیاں کرتے [illegible] پھر "اسے ٹیگور کی کہانی یاد آ کر دکھلا دیتی پھر اسے لگتا جیسے بارہ سال سے چھپے ہوئے اس کے بہت سے

پھول جیسے بچے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اب اس سے قریب آرہے تھے۔"امی تا!" ——— !!اسے گھر کے کونے کونے سے یہی آواز آتی ہوئی محسوس ہوتی ـــ "امی تا" ——— "امی تا" ـــ لیکن اس آواز کے ساتھ اس کی افسانہ کی وہ بچی یاد آجاتی جسے تا بولنا نہ آتا تھا اور وہ الماری، شلف اور کواڑوں کے پیچھے چھپ چھپ کر اپنی ماں سے بس یہی ایک کھیل کھیلا کرتی "امی چیکو" ——— "امی چیکو" ـــ اور اس کی ماں جان بوجھ کر اسے ڈھونڈتی پھرتی، مگر اس بچی کی آیا اس منحوس کھیل کھیلنے سے ان کو اکثر منع کرتی تھی اور آخر ایک دن بخار میں سر کو دھنتی "امی چیکو۔ "امی چیکو۔" کہتی ہوئی وہ بچی اپنی ماں کی ڈھونڈتی ہوئی نگاہوں سے ہمیشہ کے لئے چھپ گئی تھی اور اب یہی تکلیف دہ آواز پروین کو سنائی دے رہی تھی۔ سارے لوگ خوش تھے زندگی کی ایک مچلتی ہوئی لہر گھر بھر میں دوڑ گئی تھی ——— وہ کمزور ہوتی جارہی تھی لیکن نقاہت کے اس پردے میں اس کی بیتابانہ مسرتیں چھپی ہوئی تھیں۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی کرنوں کی طرح اس کا چہرہ زرد ہوتا جارہا تھا۔ فیض نے بار بار اسے ڈاکٹر کو دکھانا چاہا مگر پروین کو ڈاکٹر کے نام سے وحشت ہونے لگتی۔ ایک مبہم سا خوف اس کے سارے جسم کو کپکپا دیتا۔ شاید یہ اس کی رُوح کا ایک فریب ہو اور اگر یہ صرف ایک خواب تھا تو وہ اسے ہمیشہ اپنی آنکھیں بند کئے دیکھتی رہنے کی آرزومند تھی ـــ اس کی مسہری کے چاروں طرف دیوار میں خوبصورت سے فریم میں کئی تصویریں فیض نے لاکر خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے لگائی تھیں کسی کے بال گھنگریالے تھے، کوئی پھولے پھولے گالوں والا بچہ منہ پھاڑے ہوئے ہنس رہا تھا اور کسی کا مسکراتا ہوا پیارا سا چہرہ کوئی ہمک ہمک کر اس کی گود میں آنے کو مچل رہا تھا اور کسی طرف سے بلکتا ہوا بچہ اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اسے بلا رہا تھا ـــ پروین کو ان تصویروں سے شدید طور پر محبت ہو گئی تھی۔ یہ سارے بچے اسی کے تھے صرف اسی کے بارہ سال سے چھپے ہوئے یہ ہنستے، بلکتے اور ہمکتے ہوئے اتنے سارے بچے ایک ہی دفعہ اس کی خالی گود میں آنے کو مچل رہے تھے، پروین انہیں دیکھ کر کبھی کبھی تڑپ سی جاتی۔ وہ ان کے نزدیک جاتی پھولے پھولے گالوں اور بلاتی ہوئی ننھی ننھی انگلیوں کو دیوانہ وار چوم چوم کر کہتی "میرے بچے میرے لال میں کیسے تمہیں اپنے کلیجے میں بٹھالوں" ـــ سجے ہوئے کمروں کو دیکھتی ہوئی وہ انتقام سوچتی ـــ تمہاری سفیدیاں میرے دل پر چرکے لگاتی رہی ہیں، اب یہاں ہر ہر جگہ دھبے نظر آئیں گے، دودھ کی شیشی رہے گی ہورلس کی بوتلیں رہیں گی اور دہکتی ہوئی انگیٹھی اور ہر طرف اس کی راکھ بکھری پڑی رہے گی وہ اس کوٹھی کا منہ چڑا چڑا کر بہت سی الگنی ٹانگے گی اور ان کرسیوں پر بھی بہت سے بے ہنگم سے کپڑے پھیلے رہیں گے۔ اس گھر کی ترتیب وار سنائی سے وہ تھک گئی تھی۔ اسی لئے ہر ہر طریقے سے وہ اپنی رُوح کی اس بیزاری کا اعلان کرے گی ـــ گلاب بہت زیادہ نزدیک رہ کر اب اس سے دُور ہوتا جارہا تھا۔ پروین کی نگاہیں پھولوں کے حسین ڈھیر میں اپنے لئے ایک انوکھے پھول کا انتخاب کر رہی تھیں۔ مگر اس کا وہ لہلہاتا ہوا پھول اس کے تخیل سے بھی بہت بلند تھا۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے بہت سے خیالات اس کے دماغ میں چکر لگاتے رہتے کبھی تصویر میں چمیلی کی نازک پنکھڑیوں کی طرح ننھے ننھے سے ہاتھوں کو بیتابانہ چومنے لگتی اور کوئی "امی! امی" کہتا ہوا اس کے کلیجے سے لپٹ جاتا مگر کبھی یاس کے ہیبت ناک جھولے میں اس کا مضطرب دھڑکتا ہوا دل جھولنے لگتا۔ "ہاں۔" "نہیں" ـــ! جھولے کی پرانی رسی ہر ایک پینگ لینے پر مچکچا رہی تھی اور پروین یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ "ہاں اور" نہیں" کے کس کنارے پر گرے گی۔ کاش یہ مچکچاتی ہوئی رسی کبھی نہ ٹوٹے اور وہ "نہیں" سے گزرتی ہوئی بھی "ہاں" کے وقتی کناروں سے ٹکرا کر جھولتی رہے ـــ

گلاب کی ایک ٹوٹی ہوئی ننھی سی کلی گھوش بابو نے گلاب کے ہاتھ میں دیکھ لی۔ باپ کی نگاہوں کو پہچان کر گلاب سہم گیا۔ گھوش بابو اپنا غصہ برداشت نہ کر سکے وہ زور سے چلائے؟ "نکلو یہاں سے" نکلو یہاں سے" گلاب اپنی آنسوؤں سے بھری ہوئی حسین آنکھوں کو اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے ملتا ہوا اپنے گھر کے پھاٹک سے باہر نکل آیا اور روتا ہوا گلاب دوسرے پھاٹک سے ہو کر سیدھا پروین کے پاس چلا آیا اور اس کی گود میں منہ چھپا کر سسک سسک کر رونے لگا۔ پروین کی آنکھیں بھی پرنم ہو گئیں اور وہ فطرت کی اس غلط تقسیم کو اپنے سینے سے لگائے اسے زور زور سے بھینچ کر پیار کر رہی تھی گلاب پھر اپنے کھیل میں لگ گیا۔ وہ کمرے میں دوڑ دوڑ کر چوں چوں کر کے

بیٹھی ہوئی گوریا کو پکڑنے لگا۔ اس نے گوریا کی دم پکڑنی ہی چاہی تھی کہ اس کے ہاتھ کی ٹھوکر سے میز پر رکھا ہوا گلاس چھن سے گر کر چور چور ہو گیا۔ گلاب اپنی جگہ پر سہم گیا۔ یک بیک اس کے ننھے ننھے ہاتھ اوپر اٹھے اور وہ اپنے کان کو پکڑے کونے میں کھڑا ہونے کو جا رہا تھا کہ پروین دوڑتی ہوئی آ کر اس سے لپٹ گئی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔ "میرا اچھا! میرا لال!" پروین کو تو یہ "چھن" کی آواز بڑی پیاری لگی تھی اور کاش وہ اس پیاری سی آواز کو ہر روز سنتی رہتی۔ گلاب کے لئے اس کے تصور پر پروین کا اتنا بیتابانہ پیار ایک نئی چیز تھی۔ وہ اسے حیرت سے تکتا ہوا اپنا سفید ہاتھ پروین کے گلے میں ڈال کر محبت بھری خوشامد سے کہنے لگا۔ "امی! امی!"

پروین کی صحت کی کمزوری سے گھبرا کر آخر فیض نے لیڈی ڈاکٹر کو بلا ہی لیا۔ ذبح ہوتا ہے بکرا جس طرح قصائی کی چمکتی ہوئی چھری دیکھ کر لرز جاتا ہے۔ اسی طرح پروین لیڈی ڈاکٹر کو دیکھ کر کانپ گئی۔ امیدوں کے جھولے میں زور زور سے پینگیں پڑنے لگیں اور جھولے کی وہ پرانی کچاتی ہوئی رسی اس کے سامنے ٹوٹتی ہوئی سی لگ رہی تھی۔ "ہاں۔" "نہیں" دونوں کناروں سے اس کی روح زور زور سے ٹکر لگا رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا کہ وہ اپنا آخری انجام نہ دیکھ سکے۔ جھولے کی رسی ٹوٹ رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اس کی روح میں ایک زبردست دھماکہ ہوا اور اس کو لگا جیسے گھٹاٹوپ اندھیرے چھا گئے ہیں۔ کوٹھی کے سفید چونے اور کمروں کی سجاوٹیں اس طوفان میں بجلی کی طرح رہ رہ کے چمک رہی تھیں۔ ہنستی بلکتی اور ہمکتی ہوئی تصویریں گہری تاریکیوں میں چھپتی جا رہی تھیں۔ ایسے اندھیرے اور ایسی آندھی میں اس کے کانوں میں ایک آواز آئی "امی تا" اور اس کی دیوانہ وار روح بیتابانہ طور پر دوڑتی ہوئی اسے پکڑنا چاہ رہی تھی مگر اس بڑھتے ہوئے طوفان میں آواز کا فاصلہ دور ہٹتا جا رہا تھا "امی تا" "امی تا" اور پھر ہولناک اندھیرے میں یہ آواز ہلکی ہوتی ہوتی ڈوب کر رہ گئی ______ ! فطرت اتنے دنوں تک پروین سے ایک ہولناک آنکھ مچولی کھیل رہی تھی اور پروین کے بے بس ہاتھ "امی تا" ___ کی اس آواز کو نہ پکڑ سکے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں تکیہ سے لپٹی ہوئی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی "میرے بچے میرے لال۔"

اب اور تب

ہنس راج رہبر

شربتی کا سر ننگا تھا اور بال قدرے بکھرے ہوئے تھے۔ جنھیں وہ بائیں ہاتھ سے گاہے گاہے درست کر لیتی تھی۔ ورنہ اس کی تمام تر توجہ اپنے کام پر مرکوز تھی۔ ماحول سے بے نیاز وہ رضائیاں سینے میں منہمک تھی۔ وہ جانتی تھی کہ دن بھر محنت کر کے وہ جتنی رضائیوں میں دھاگے ڈال دیگی اتنے ہی پیسے اسے مل جائیں گے۔ پہلے روز وہ بمشکل ایک رضائی میں دھاگے ڈال سکی تھی۔ لیکن اب دو میں ڈال لیتی تھی اور اپنے کام کی رفتار اس سے کم ہونے دینا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے اس کا ہاتھ جلدی جلدی چل رہا تھا۔ اسے تن کی سدھ بھول گئی تھی۔ وہ ایک قمیض اور شلوار پہنے ہوئے تھی اور رضائی کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک گھوم رہی تھی۔ جہاں بیٹھ کر اس نے کام شروع کیا تھا۔ دوپٹہ وہیں زمین پر پڑا رہ گیا تھا۔ جس کی اسے مطلق پروانہ تھی۔ کیونکہ سر کو ڈھانپنے کی فکر کرنے سے کام میں حرج واقع ہوتا تھا۔ کام ادھورا رہنے سے ٹھیکیدار آدھی مزدوری کاٹ لیتا تھا۔

سرکار فوج کے لئے رضائیاں تیار کروا رہی تھی۔ کام ٹھیکے پر ہو رہا تھا۔ روئی بھرنے کے بعد سینا درکار تھا۔ چنانچہ قرول باغ کے مغربی کونے پر جو نئی بستی آباد ہوئی ہے وہاں ایک کھلے میدان میں رضائیاں بچھی ہوئی تھیں اور سینکڑوں عورتیں ان میں دھاگے ڈالنے کا کام کر رہی تھیں۔ ان میں سے اکثریت مزدور عورتوں کی تھی۔ جو برسوں اور پشتوں سے مزدوری کرتی چلی آ رہی تھیں اس لئے محنت مزدوری کرنا اس کی عادت بن چکی تھی۔ اس کام میں انھیں ذرا بھی جھجک یا شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ اطمینان سے رضائیاں سی رہی تھیں اور ان کے بچے قریب ہی کھیل رہے تھے۔

لیکن ان میں کافی تعداد ایسی عورتوں کی بھی تھی جنھوں نے پہلے پہل اس میدان میں قدم رکھا تھا۔ محنت کی اُجرت میں تبدیل کرنے کا ان کا زندگی میں یہ پہلا موقع تھا۔ انھیں اس جگہ تک پہنچنے میں بہت کچھ ذہنی تذبذب اور روحانی کش مکش کا سامنا کرنا پڑا تھا اور جب آئی تھیں تو ان پر ایک غیر قدرتی احساس طاری تھا۔ سانس پھولی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے کوئی دیوار پھاندنا پڑی ہو۔ بہت سے اُصول توڑے ہوں۔

شربتی بھی ایسی ہی عورت تھی اس نے بہت ہی ناسازگار حالات میں محنت مزدوری کرنے کا فیصلہ کیا تھا اور جب پہلے روز اپنے خاوند کرپارام سے کام پر آنے کی اجازت طلب کی تھی تو اس پر ایک دم سناٹا سا چھا گیا تھا۔ جیسے اس کی روح کو بجلی نے چھو دیا ہو۔ اس پر کافی دیر تک سکتے کا سا عالم طاری رہا۔ جب شربتی نے اپنی بات ایک بار پر دہرائی تو اس نے بے بس اور مغموم نگاہوں سے

دیکھا اور چپ رہ گیا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ جب شربتی چلی گئی تو وہ کافی دیر تک اسی حالت میں بیٹھا رہا۔ معلوم کیا سوچتا رہا اور دل ہی دل میں کڑھتا اور جھنجھلاتا رہا۔

کرپارام مغربی پنجاب سے اُجڑ کر دہلی آیا تھا۔ کافی دیر تک وہ شرنارتھی کہلاتا رہا۔ لیکن اسے اور اس کے اکثر بھائیوں کو اس نام سے چڑ تھی۔ کیونکہ وہ کسی کی شرن میں نہیں آئے تھے۔ وقت کی ایک طوفانی اور خوفناک لہر نے انھیں یہاں لا پھینکا تھا۔ اس لئے حکومت نے ان کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اُنھیں پرشارتھی کہنا شروع کر دیا۔ لیکن کرپارام کو یہ نام بھی پسند نہیں تھا۔ وہ اس کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ یہ نام اور الفاظ کیا اسے اپنی موجودہ زندگی تک سے کوئی اُنس نہیں تھا۔ وہ صرف کرپارام تھا اور اسے اکثر اپنا ماضی یاد آتا تھا۔

میانوالی ضلع کے ایک گاؤں کلور کوٹ میں اس کی دوکان تھی۔ قصبہ کی آبادی دو ڈھائی ہزار کے لگ بھگ تھی۔ چار پانچ گھر ہندوؤں کے تھے باقی سب مسلمانوں کے لئے۔ کرپارام کا کاروبار خوب چلتا تھا۔ گھر کے مکان اور مویشی تھے۔ دوکان کے علاوہ بیوپار تھا۔ وہ ٹھاٹھ سے رہتا تھا۔ یہ سارا کاروبار اُسے اپنے باپ دادا سے ورثے میں ملا تھا اور وہ ان کی دی ہوئی جائداد میں اضافہ کر رہا تھا۔

گاؤں کے مرکز میں اس کا پکا مکان تھا۔ جس میں متعدد کمرے تھے اور ایک تہہ خانہ تھا۔ جس میں وہ نقد روپیہ اور زیورات چھپا کر رکھتا تھا۔ زیورات شربتی کے نہیں گاؤں کی عورتوں کے تھے۔ لوگ انھیں اس کے پاس گروی رکھ جاتے تھے۔ لیکن ایک بار اس تہہ خانے میں پہنچ کر باہر کم نکلتے تھے۔ اپنے زیور اور قیمتی کپڑے رکھنے کے لئے شربتی کے پاس ایک آہنی صندوق تھا جو دو مضبوط تالوں سے مقفل رہتا تھا۔

کرپارام کے نزدیک شربتی بذاتِ خود ایک ایسی شے تھی جسے روپے پیسے اور زیوروں کی طرح چھپا کر رکھنے کی ضرورت تھی۔ بلکہ روپے اور زیوروں سے کہیں زیادہ۔ کیونکہ اس کے ساتھ خاندان کی عزت منسوب تھی۔ اس لئے کرپارام نہایت مستعدی سے شربتی کی حفاظت کرتا تھا اور اس کی ہوا تک مکان سے باہر نہیں نکلنے دیتا تھا۔ کیا مجال غیر مرد کا سایہ تک اس پر پڑ جائے۔

جب تک گاؤں میں اسے اپنے مکان کے اندر رہنا نصیب تھا وہ شربتی کی یونہی حفاظت کرتا رہا۔ وہ اس کی بیوی تھی۔ اس کا کام خاوند کی خدمت کرنا تھا۔ جب سے وہ بیاہی آئی تھی کرپارام نے کبھی بھی اپنی دھوتی خود نہیں نچوڑی تھی۔ خانہ داری کا سب کام اسے کرنا ہوتا تھا۔ کرپارام کا فرض اس کے کام کی داد دینا نہیں بلکہ اس میں نقص نکال کر سو طرح برس پڑنا تھا۔

شربتی حسین تھی۔ درمیانہ قد۔ سڈول اور متناسب جسم۔ گول چہرہ۔ گورا رنگ اور موٹی موٹی آنکھیں۔ یہ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ اس پر جوانی کب آئی۔ کیونکہ چھوٹی عمر ہی میں اس کی شادی کرپارام سے ہو گئی تھی جسے کسی طرح بھی قبول صورت نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اس کا جسم بھاری اور رنگ سیاہ تھا۔ چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور ہونٹ موٹے تھے اور اس کے علاوہ اسے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اس کی کھال بھینسے کی کھال کی طرح سخت اور کھردری ہو۔ اس کے اعضاء میں گھلاوٹ اور ملائمیت کا نام تک نہیں تھا۔ روح تک بے حسی کے خول میں لپٹی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔ اسے اپنی جائداد اور دھن دولت پر ناز تھا۔ اس کے بل بوتے پر وہ آسامیوں پر جبر کرتا تھا اور خود شربتی پر جبر کرتا تھا وہ اپنے کاروبار کو توسیع دے کر بہت بڑا سیٹھ بن جانا چاہتا تھا۔ جس طرح ہر کھاتے پیتے خوشحال مرد کے گھر میں بیوی ہوتی ہے۔ اس کے گھر میں بھی شربتی موجود تھی۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس نے کبھی اس کی دلجوئی نہیں کی۔ اس کے حسن کی تعریف نہیں کی۔ اسے عورت بھی ماں باپ سے وراثت میں ملی تھی۔

لیکن جب ملک تقسیم ہوا تو اسے اپنا گاؤں چھوڑنا پڑا اور وہ جائداد بھی چھوڑنی پڑی جو اسے جان سے زیادہ عزیز تھی۔ بصد مشکل چند زیور اور کچھ روپیہ بچا کر لا سکا تھا۔ یا پھر شربتی اس کے ساتھ آ گئی تھی۔ جگہ جگہ کی ٹھوکریں کھاتا ہوا وہ دہلی پہنچ گیا اور آخر وہیں رہنے لگا۔

کچھ دن رفیوجی کیمپ میں گذارے۔ وہاں سرکار کی طرف سے راشن مفت ملتا تھا اور کرایہ وغیرہ بھی نہیں دینا پڑتا تھا۔ اس لئے گانٹھ کا پیسہ محفوظ رہا۔ مگر وہاں ایک مصیبت تھی اور یہ مصیبت اسے اپنے اُجڑنے سے بھی زیادہ کھلتی تھی۔ یہاں شربتی کو پردے میں رکھنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ہر کس و ناکس کی نظر اس پر پڑتی تھی اور وہ بھی بے حیائی سے مڑ مڑ دوسروں کی طرف دیکھتی رہتی تھی جیسے عجائب گھر میں گئی ہو۔ جیسے اس نے جب سے پیدا ہوئی ہے لوگ نہ دیکھے ہوں۔

سامنے والے کیمپ میں شیخوپورہ کا جو ملکھراج رہتا تھا اسے دیکھ کر کرپارام بہت کڑھتا تھا۔ جی میں آتی تھی کہ اس پر کوئی الزام لگوا کر کیمپ سے نکلوا دے، اُنہیں یہاں پہنچوا دے۔

ملکھراج کی مردانہ شبیہہ جاذب نظر تھی۔ وہ تندرست اور خوبصورت تھا اور پچیس چھبیس سال کا نوجوان تھا۔ ہنس مکھ اور ملنسار واقع ہوا تھا۔ سب کے ساتھ گھل مل کے رہتا تھا۔ ہمدردی سے پیش آتا تھا۔ دوسروں کا چھوٹا موٹا کام کر دینے میں بھی اسے کوئی دریغ نہ تھا۔ کیمپ کے سب لوگ اس کی تعریف کرتے تھے۔ مرد، عورتیں اور بچے اس سے ہنس ہنس کر بولتے تھے۔ لیکن کرپارام کو وہ چالاک اور حیلہ باز نظر آتے تھے۔ ورنہ کیا مطلب کہ وہ یوں عورتوں سے چڑ چڑ باتیں کرے اور ہنسے۔ جب وہ شربتی سے باتیں کرتا تو کرپارام کی چھاتی پر سانپ لوٹ جاتا اور آگے سے شربتی کا مسکرانا تو بہت ہی ناگوار گزرتا۔ اس کے نزدیک یہ بے حیائی کی انتہا تھی۔ وہ اس حرکت کے لئے شربتی کو کئی مرتبہ سخت سست کہہ چکا تھا۔ لیکن شربتی کو اس کی مطلق پروا نہ تھی۔ وہ اسے اکثر ملکھراج سے ہنستے اور باتیں کرتے دیکھتا تھا۔

ایک ملکھراج ہی کیا وہ اسے کس کس سے باتیں کرنے سے روکے۔ طرح طرح کے لوگ اکٹھے ہوئے تھے۔ سبھی مل جل کے رہتے تھے۔ میدان میں کیمپ لگے ہوئے تھے۔ درمیان میں کوئی دیوار حائل نہیں تھی۔ پھر ایک دوسرے سے دُکھ سکھ کہتا ہوتا تھا۔ عام طور پر چولہے کی چیزوں کی بھی کمی تھی۔ جو کچھ برتن بھانڈے بچا کر لا سکتے تھے انھیں عورتیں آپس میں لے دے کر استعمال کرتی تھیں۔ شہر کے لوگ ربط ضبط بڑھانے میں خاص طور پر تیز واقع ہوئے تھے۔ بات کرتے ذرا نہیں جھجکتے تھے۔ "بہن جی! تمھارے گھر والے کہاں ہیں؟ سب خیریت سے تو آگئے؟" وغیرہ وغیرہ قسم کے سینکڑوں سوال پوچھتے اور جواب دینا ہی پڑتا۔ ان کی عورتیں بھی کتنی چونچال تھیں۔ پھرکی کی طرح ادھر اُدھر گھومتی پھرتی تھیں۔ سر ننگے صرف بلاؤز اور پیٹی کوٹ کھلے بندوں سامنے نل پر کپڑے دھوتیں اور مردوں کی طرح صرف ایک کپڑا زیب تن کر کے نہانے لگتیں۔ مرد چاہے تو نگاہ نیچی کر لے۔ مگر ان کی نگاہیں ذرا نہ جھکتیں۔

کرپارام شرم کے مارے زمین میں گڑا جاتا تھا اور چاہتا تھا کہ اس دلدل سے دُور بھاگ جائے۔ اس نے ہم کیمپوں سے بارہا شکایت کی تھی کہ عورتوں کو اس بے حیائی سے روکا جائے۔ یہ سب کچھ تہذیب کے خلاف ہے۔ ہم نے بڑوں کی مریادا چھوڑ دی ہے۔ تبھی تو یہاں تک پہنچے ہیں۔ لوگ اس کی باتوں پر مطلق دھیان نہ دیتے۔ لیکن وہ رٹ لگائے رکھتا۔ جس کو ذرا ہمدرد پاتا اسی کے پاس اپنا دُکھ درد لے بیٹھتا۔ یہاں تک کہ جب رفیوجی ایکشن کمیٹی کے رضا کار یہ پرچار کرنے آتے کہ ہم کب تک یوں بیٹھے رہیں گے۔ حکومت سے مطالبہ کریں کہ وہ ہمیں بسانے کا اپنا وعدہ پورا کرے تو کرپارام انھیں بھی اپنی رام کہانی سنانے لگتا۔ "اور تو سب کچھ پاکستان میں لٹا آئے ہیں ایک عزت بچی ہے وہ بھی محفوظ نہیں۔ کوئی اوٹ نہیں۔ پردہ نہیں۔ بہو بیٹیوں کی آنکھ کا پانی اُترتا جارہا ہے۔"

شربتی کو اس کی ہر وقت کی یہ بِل بِل اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ کئی مرتبہ اس سے اُلجھ پڑتی اور تنگ کر کہتی "اور کسی کو تو اپنی بہو بیٹی کی فکر نہیں ایک صرف تمھاری ہی عزت لٹی جارہی ہے۔ بڑے ایسے آئے ہیں کہیں کے، مجھے مکھی بنا کے ڈبی میں بند کر لو۔"

اسے شربتی کی یہ زبان درازی اچھی نہیں لگتی تھی۔ جب وہ گاؤں میں رہتا تھا تو اسے کبھی منہ کھولنے کی جرات نہ ہوئی تھی۔ مگر

یہاں وہ سردوں کو کیا تماشہ دکھائے۔ جب کبھی آپس کی کہاسنی میں ذرا اونچا بولنے کی نوبت آئی تھی تو لوگوں نے شربتی کو لعنت ملامت کرنے کی جگہ خود اسے برا بھلا کہا تھا اور وہ خفیف سا ہو کر رہ گیا تھا۔

شربتی دن بدن بدلتی جا رہی تھی۔ دوسری عورتوں کی روش اپنا رہی تھی۔ پہلے پہل وہ مجبور ہو کر کسی غیر مرد سے بات کرتی تھی۔ لیکن اب بات کرنا اپنا حق سمجھتی تھی۔ پہلے وہ کسی کی نظر اپنی طرف اٹھتے دیکھ کر چھاتیوں پر نہایت احتیاط سے کپڑا ڈھک لیتی تھی۔ لیکن اب وہ سمجھتی تھی کہ کوئی دیکھتا ہے تو دیکھتا رہے۔ اس کا کیا چھین لے گا نہ اس کا جسم شہد ہے اور نہ اس کی آنکھیں مکھیاں جو اُسے چاٹ جائیں گی۔ وہ نگاہ کی ہوس کاریوں سے بھی بے نیاز ہو گئی تھی۔ اپنے آپ کو چھپا کر رکھنے کے بجائے اسے اپنے ماضی پر غصہ آتا تھا' کرپارام پر غصہ آتا تھا جو دروازے سے باہر جھانکنے تک سے منع کر دیتا تھا۔ وہ کیوں اس پر اپنی اجارہ داری جتاتا تھا۔ وہ جتنا ہی ان باتوں کو سوچتی تھی اتنا ہی اسے کرپارام کریہہ اور بدصورت نظر آتا ــــــ وہ یہاں تک سوچنے لگی کہ اسے کیوں ناحق اس مرد سے باندھ دیا گیا؟

جب وہ دوسروں کے ساتھ بیٹھ کر فساد کی باتیں کرتا' مسلمانوں کے فرضی اور حقیقی مظالم بیان کرتا تو اسے وہ مظالم یاد آیا کرتے جو کرپارام اس پر ڈھایا کرتا تھا۔

کرپارام دوکان پر کام میں مصروف رہتا اور وہ گھر میں تنہا بیٹھی بیٹھی تنگ آ جاتی ــــــ گھر میں ساس نندیا چھوٹا بچہ تک نہیں تھا۔ جس سے باتیں کرے دل بہلائے۔ ایک دن وہ یونہی اُٹھ کر ڈیوڑھی کے دروازہ پر آ گئی اور کواڑ کی دراز میں سے گلی میں جھانکنے لگی۔ اچانک اس کھڑکی سے جو دوکان میں کھلتی تھی کرپارام اندر آ گیا۔ شربتی کو باہر جھانکتے دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ اسے چٹیا سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا اندر لے گیا اور فرش پر پٹک کر ادھر اُدھر سے دو چار لاتیں جما دیں۔

اب اُسے محسوس ہوتا کہ وہ یہ سب مظالم ناحق برداشت کرتی رہی ہے۔ اسی لئے اب کرپارام اگر ایک بات کہتا تو وہ چار سناتی اور جس حرکت سے وہ ناراض ہوتا اُسے بار بار دہراتی۔ ملکھراج سے باتیں کرنے میں اُسے ایک گونہ تسکین حاصل ہوتی وہ کرپارام کو دکھا دکھا کر اس سے بولتی اور مسکراتی تھی۔ اب اُسے کیمپ کے کسی مرد سے بات کرتے جھجک محسوس نہیں ہوتی تھی۔

کرپارام نے جب دیکھا کہ شربتی ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے۔ سیدھی بات کہنے سے منہ نوچنے آتی ہے تو اس نے دل پر جبر کر کے کیمپ چھوڑ دیا۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اسے قرول باغ میں ایک کمرہ کرایہ پر مل گیا اور وہ شربتی کو ساتھ لے کر اس میں رہنے لگا۔

لیکن اب روزی کی فکر سر پر سوار ہوئی دو چار روز ہی میں اسے معلوم ہو گیا کہ پہلے ہی یہ بات کیوں نہ سوچی۔ راشن بازار سے خریدنا پڑتا اور مکان کا بیس روپے ماہوار کرایہ بھی پیشگی دینا پڑتا تھا۔ اتنا کیا کم تھا کہ بنا پگڑی کے اسے یہ کمرہ تو مل گیا۔ جوں جوں دن گذرتے تھے فکر بڑھتی جاتی تھی۔ پہلے خیال تھا کہ سرکار کچھ مدد کرے گی۔ پاکستان میں وہ جو اتنی جائداد چھوڑ آیا ہے۔ اس کا کچھ معاوضہ ملے گا۔ لیکن یہ سب کچھ نہ ہو سکا۔ اس نے اپنا کیس رجسٹرڈ کرا دیا تھا۔ معاوضہ ملنے کی کچھ نہ کچھ اُمید بھی ضرور تھی۔ مگر جب تک کچھ نہیں ملتا اس وقت تک تو خرچ اُسے ہی چلانا پڑے گا۔

کرپارام نے معاش کی تلاش شروع کی۔ جان پہچان کے کئی آدمیوں نے کام کا چھوٹا موٹا سلسلہ شروع کیا تھا۔ مثلاً لڑندا رام نے لانڈری کی دوکان کھولی تھی اور نتھو کھتری نے حلوائی کی دوکان' وہ چاہتا تھا کہ ان میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ ساجھا کرے۔ لیکن کوئی رضامند نہ ہوا۔ کام اتنا تھوڑا تھا کہ اس کے اپنے ٹکڑے مشکل سے چلتے تھے۔

آخر اس نے جس خاندانی کاروبار کو اتنا عرصہ سنبھال سنبھال کر رکھا تھا' خیر باد کہہ دیا اور پھلوں کا خوانچہ لگانے کا فیصلہ کیا۔ وہ ایک روز صبح سویرے منڈی گیا۔ کچھ سنگترے کیلے لایا اور بازار میں بیٹھ کر بیچنے لگا۔

اب کرپارام کے لئے یہ بالکل نیا کام تھا اور یوں بھی بازار میں کیلے سنگترے بیچنے والوں کی کمی نہ تھی۔ ہزاروں مہاجرین دلی میں آ کر آباد ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر چھوٹے چھوٹے دوکاندار یا خوانچہ فروش تھے انھوں نے بہت پہلے یہ کام شروع کر دیا تھا اور ایسی جگہوں پر قبضہ کر لیا تھا جہاں پیٹ بھرنے لائق بکری ہو جاتی تھی۔

کرپارام ہزار کوشش کرنے کے باوجود دس آنے روزانہ سے زیادہ نہ کما سکتا تھا۔ جس دن اُسے سوا تیرہ آنے بچت ہوئی اس دن وہ بہت ہی زیادہ خوش ہوا اور رات گئے تک بیٹھا پیسے گنتا رہا۔ کئی بار گن چکا تھا۔ پھر بھی طبیعت نہیں بھرتی تھی۔ جی میں آتی کہ ساری رات گنتا ہی رہے۔ جیسے وہ سوا تیرہ آنے نہیں۔ سوا تیرہ ہزار روپے ہوں۔ گاؤں میں رہتے اس نے ایک دن میں کتنے ہی سوا تیرہ آنے کمائے تھے۔ لیکن اسے اتنی خوشی کبھی نہیں ہوئی تھی۔

کبھی کبھار بکری کم ہوتی تھی اس لئے ایک دو آنے کا خسارہ رہتا تھا۔ ہاں پھل ضرور بچ جاتے تھے۔ ان میں کچھ خاص کر کیلے ایسے ہوتے تھے۔ جنھیں دوسرے روز اُٹھا کر رکھنے میں خراب ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے کرپارام انھیں کھا لینے میں مصلحت سمجھتا۔ جتنے پھل کھاتا اتنی اناج میں کفایت ہو جاتی۔ بعض مرتبہ میاں بیوی شام کو روٹی ہی نہیں پکاتے تھے۔

پھل کے طور پر پھل کھانا اچھی بات ہے۔ لیکن مجبور ہو کر روٹی کی جگہ پھل کھانے پڑیں تو آدمی کی طبیعت جلد اُچاٹ ہو جاتی ہے اس لئے کرپارام کو من مار کر پھل کھانے پڑتے اور کئی مرتبہ ضرورت سے زیادہ کھانے پڑتے۔ جس کی وجہ سے بدہضمی کی شکایت رہنے لگی۔ لیکن اس نے پھل کھانا جاری رکھا اور بدہضمی بڑھتی گئی جو آخر پیچش بن گئی۔ پھل بیچنا تو درکنار گھر سے باہر نکلنا مشکل ہو گیا۔

کرپارام مرتے مرتے بچا۔ دو مہینے چارپائی پر پڑا رہا۔ قریب ہی ایک وید کی دوکان تھی۔ شربتی اُسے بلا لاتی اور اس سے دوائی لے آتی۔ دوائی کے علاوہ ضرورت کی دوسری چیزیں بھی اُسے خود خرید کر لانا پڑتی تھیں۔ کرپارام کو یہ پسند نہیں تھا کہ وہ بازار جائے اور دوکانوں پر گھومتی پھرے مگر کیا کرے بیماری کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اتنا کیا تھوڑا تھا کہ بیوی کی دوادوش کے کارن جان بچ جائے۔

وہ بدستور چارپائی پر پڑا تھا۔ مگر افاقہ ہو رہا تھا۔ اس دوران میں اس کے اندر ایک تبدیلی واقع ہوئی کہ اسے اپنا جسم کچھ ہلکا پھلکا معلوم ہونے لگا۔ جیسے پیچش سے اندر کا میل دُھل گیا ہو۔ اب شربتی کو دیکھنے کا انداز بھی بدل گیا تھا۔ نگاہیں اکثر اس کے چہرے پر گڑی رہتی تھیں اور اس میں خاص جاذبیت تھی۔ ملائمت اور راحت تھی۔ اس کا لہجہ بھی پہلے کی طرح کرخت اور تحکم آمیز نہیں تھا۔ اس میں نرمی اور متانت تھی۔ وہ پیار سے بولتا تھا۔

شربتی نے بھی اس تبدیلی کو دیکھ لیا تھا۔ اسے بھی اب کرپارام کو دیکھ کر کراہت نہیں ہوتی تھی۔ تندی اور سختی سے پیش آنے کی بجائے وہ اس کی خدمت کرنا چاہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگرچہ بیماری دُور ہو گئی ہے لیکن کرپارام ابھی پندرہ بیس روز اور کوئی کام نہ کر سکے گا۔ اس لئے وہ چاہتی تھی کہ خود کام کرے۔ ایک روز بولی۔

"منگو اور بسنتی رضائیاں سینے جاتی ہیں۔ میں بھی چلی جاؤں؟"

"تم ـــــ تم مزدوری کرنے جاؤ گی؟" کرپارام تجویز سُن کر حیران رہ گیا۔

"جب سب جاتی ہیں تو مجھے کونسا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے؟"

کرپارام چپ ہو گیا۔ اپنی حالت اور گھر کی کیفیت کا دل ہی دل میں جائزہ لیا اور پھر دبی زبان میں کہا۔ "کوئی سُنے گا تو کیا کہے گا؟"

"کہنے کو کون اپنا بیٹھا ہے۔ سبھی پردیسی ہیں۔" شربتی نے جواب دیا اور مزید کہا۔ "پھر کہنے سُننے کی بات ہی کہاں رہ گئی ہے۔ جس سے جیسے بن پڑتا ہے۔ پیٹ کا دھندا چلا رہا ہے۔"

اس دن سے شربتی رضائیاں سینے کا کام کر رہی تھی۔ شروع شروع میں وہ مزدور عورتوں سے کتراتی تھی۔ دوسری شرنارتھی

دونوں کے ساتھ ان سے ذرا فاصلے پر بیٹھتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ تمیز مٹ گئی۔ وہ ان سے ملنے جلنے اور باتیں کرنے لگی۔ ہم پیشہ کی ہم پیشہ سے نفرت کیسی۔ وہ بھی تو محنت مزدوری کرتی ہیں۔ کوئی عیب تو نہیں کرتیں۔

ثریا رام کی نگاہ اب اور بھی بدل گئی ہے۔ اسے شرافت کے چہرے پر ہمت اور استقلال کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اس کے خد و خال زیادہ مضبوط بنتے جا رہے ہیں۔ اگر کسی دن کارخانے کا کوئی افسر اس کے ساتھ سختی سے پیش آتا ہے تو وہ برداشت نہیں کر سکتی اور اس پر کسی قسم کا شک کرنا تو اسے خود اپنی حماقت نظر آتی ہے۔

رُوپ چند

صدیقہ بیگم

اگر ندی کے پاس سوکھے درخت کا تانہ ہوتا تو لوگ ضرور پوچھتے کہ آج تک بوڑھا روپ چند ندی کے کنارے کیسے بیٹھا رہ گیا تھا' یہ تیز و تند ہوا کے جھونکے اس کا کچھ بھی تو نہ بگاڑ سکے تھے' ریت کے ٹیلے بنتے اور بگڑتے رہے مگر وہ درخت نہ تو کبھی ہرا ہوا اور نہ اس پر کبھی پھل پھول ہی کھلے اور نہ پت جھڑ میں اس کے نیچے سوکھی پتیاں ہی نظر آئیں____ وہ بوڑھا آج بھی ندی کی لہریں گن رہا تھا۔ جب ندی کے دونوں طرف بستیوں میں خون کی چھوٹی چھوٹی ندیاں بہہ رہی تھیں اور یہ ندی شاید اسی لئے اور بھی کروٹ سے بہہ رہی تھی____ کہ کہیں یہ ندیاں اس سے آکر نہ مل جائیں____ اور جب زمین کے شعلے آسمان کی طرف لپک رہے تھے تب بھی روپ چند ندی کے کنارے بیٹھا تھا اور کسی نے اس سے یہ نہ پوچھا کہ وہ کون ہے؟ ہندو یا مسلمان؟____ برس بیتے وہ اس ندی کے کنارے آیا تھا اور اس نے سوکھے پیڑ کا سہارا لے کر اپنی کٹیا بنائی تھی۔ مگر دیکھنے والوں نے ہمیشہ ہی اسے لہریں گنتے ہی پایا۔ گویا وہ لہریں گننے ہی کے لئے پیدا ہوا تھا اور لہریں گنتے گنتے ہی مر جائے گا۔ اس نے کبھی بھولے سے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ ندی جو شام کو تاریکی اور روشنی کا سنگم نظر آتی ہے دراصل شہر کے بیچوں بیچ سے بہہ رہی ہے اور کس طرح شہر کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی چلی جاتی ہے____ بالکل بے خبر____ اگر وہ لوہے کا سُرخ پُل نہ ہوتا تو شاید یہ ایک شہر پہلے ہی سے دو ہو چکا ہوتا' تاہم یہ تقسیم قدرتی نہ ہوتے ہوئے بھی قدرتی تقسیم کا درجہ رکھتی تھی' اور شہر والوں کے نزدیک اس کی وقعت روزمرہ کی زندگی میں بھی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ حالانکہ وہ بہت چوڑی ندی بھی نہ تھی اور اس کا پُل کوئی بڑا پُل نہ تھا۔ تاہم دریا کا وجود ایسا بھی نہ تھا کہ اُسے نظر انداز کیا جا سکے۔ ویسے تو گھاٹوں پر شہر کی بساط کے مطابق کشتیوں کا بھی بندوبست تھا' مگر تپ دق کے مریضوں نے ان کے نرخ میں کافی اضافہ کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ ایک طرف سے دوسری طرف ناؤ سے پار کرنا عیاشی کے مترادف سمجھا جاتا تھا اور پھر جب لوہے کا پُل موجود ہے تو اب ناؤ پر سے جانا تو یقیناً فضول خرچی تھی' اور بھی ایک وجہ تھی جس نے لوگوں کو کشتیوں سے ذرا بدظن کر دیا تھا اور یہ تھا ہندو مسلمانوں کا جھگڑا____ کیوں کہ ایک عرصہ سے شہر کی فضا میں نفرت گھلتی چلی جا رہی تھی اور اسی لئے شہر روز بروز دو حصوں میں بٹتا جا رہا تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا وہ صفیں منظم ہو رہی ہیں اور پُل کے اس پار اسلام پور کی بستی بستے بستے بس گئی تھی۔ کہنے کو تو اس میں کچھ غیر مسلم بھی تھے۔ پر تھے چمار چوڑھے ہی جو کسی گنتی میں نہیں اس لئے کہ اچھوت تھے ان کو مار کر کون مسلمان اپنے جسم کو ناپاک کرتا۔

دریا کے پاس بیٹھا ہوا بوڑھا شہر کی تاریخ سے بخوبی واقف تھا۔ اس لئے کہ وہ خود بھی تو اسی شہر کا رہنے والا تھا۔ وہ خود بھی اس کی بستیوں میں کھیلا کرتا تھا اس نے زندگی کی کتنی المناک راتیں اور کتنی کربناک شامیں اس شہر کی نذر کر دی تھیں____ ایک عرصہ سے وہ

دریا کے کنارے آکر بیٹھ گیا تھا اور اسی لئے وہ شہر کی سیاست سے بے خبر تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ آج شہر کی زندگی میں مذہب سیاست بن چکا ہے، اور اگر وہ جانتا تو شاید تھوڑی دیر کے لئے خوش ہو لیتا کہ اچھا ہی ہوا کہ جو وہ ندی کی لہروں کو گن رہا ہے۔

روپ چند اچھی طرح جانتا تھا کہ کس طرح دھرم پور کے بالمقابل اسلام پور کی یہ بستی ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل جل کر بسائی تھی اور وہ چمار چوڑھے کس طرح وہیں اپنے آبائی گھروں میں رہتے چلے آرہے تھے اور ان کے آباؤاجداد کی ہڈیاں کس طرح راکھ بن کر اس دھرتی کا جزو بن چکی تھیں اور اسی لئے وہ شاید ڈھیٹھ بھی تھے۔ یہاں تک کہ شہر میں مشہور ہے کہ جب ۱۹۲۶ء میں ندی میں باڑھ آئی اور چمار ٹولی کے جھونپڑوں کے اُوپر سے پانی بہہ رہا تھا تو درختوں کی پھنگیاں نظر آتی تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ صرف یہ نیم کا درخت ہے جو چمار ٹولی کا سب سے اُونچا پیڑ تھا۔ وہاں لہرا رہا ہے اور لوگوں کا خیال تھا کہ اب چمار ٹولی کبھی نہ بس سکے گی اور جہاں اس باڑھ سے ہزاروں اور لاکھوں کا نقصان ہوا وہاں لوگوں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب چمار ٹولی تو کبھی نہ بس سکے گی۔ ہمارے شہر کا ناسور ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ ہمارے شہر کے درمیان سے یہ چمار ٹولی تو سدا کے لئے نیست و نابود ہو گئی۔

سیٹھ دھنی چند اور مُلّا دولت حسین دونوں خوش تھے کہ ان کی زمین واپس مل گئی جس کو ان چماروں نے موروثی کہہ کر غصب کر لیا تھا اور اب وہ عالیشان عمارتیں بنا سکیں گے اور اسی لئے وہ خوش تھے کہ بڑی عدالت نے ان کی سن لی اور جھونپڑوں کو زمین سے ملا دیا۔ مگر پھر کیا ہوا یہی نا کہ اُس وقت اسی رُوپ چند نے مُلّا دولت حسین بھائی کے بیٹے اور بہو کو پانی کے ریلے میں سے نکالا تھا۔ جب آدھی رات گئے پانی ان کے مکان میں چڑھ آیا تھا اور سارا گھر پڑا بے خبر سو رہا تھا۔ اس وقت نوجوان رُوپ چند نے چیخ کر سارا گھر اپنے سر پر اٹھا لیا تھا اور پھر جب سب لوگ گھر سے باہر نکل آئے تو بھی مُلّا دولت حسین کے بیٹے اور بہو اپنے کمرے سے باہر نہ نکل سکے۔ دولت حسین چلاتے رہ گئے اور کوئی سننے والا نہ تھا۔ تب رُوپ چند نے اندر گھس کر کمرے سے دونوں کو باہر نکالا اور بہت سامان بھی دریا برد ہونے سے بچا لیا اور یہی وجہ تھی کہ باڑھ کے بعد جب دولت حسین نے خاندانی روایات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے رُوپ چند سے پوچھا کہ "مانگ کیا مانگتا ہے۔" تو نوجوان رُوپ چند کی زبان سے بیساختہ نکلا۔

"حضور ٹولی کو بسا دیجئے، نہیں تو پھر ہم کدھر جائیں گے ــــ آپ کی سیوا میں رہنا چاہتے ہیں۔ آپ اور سیٹھ دھنی چند چاہیں تو پانی اُترتے ہی چمار ٹولی کو بسا دیں ــــ"

"مُلّا دولت حسین بھائی تیار ہو گئے اور سیٹھ دھنی چند بھی کیسے انکار کرتے کیونکہ وہ تو وہی کرتے جو دولت حسین سوچتے تھے اور ان کی اس دوستی کا چرچا بھی شہر کے اندر ضرب المثل کی حیثیت رکھتا تھا۔ پھر کیا ہوا یہی نا کہ پانی اُترتے ہی مہینہ بھر میں چمار ٹولی بس گئی اور اس بار انھوں نے ایسی لکھا پڑھی کی کہ چمار ٹولی پھر موروثی نہ ہو سکے۔ وہ ناسور شہر کے سینہ پر بدستور قائم رہا۔ اس لئے کہ وہ چماروں کی ملکیت نہ تھا۔

روپ بھی چمار ٹولی کا ہیرو بن گیا اور مائیں اپنے بچّوں کو روپ چند بننے کی ترغیب دینے لگیں ــــ آخر روپ چند نے ان سب کو برباد ہونے سے بچا لیا تھا ــــ جبکہ وہ چاہتا تو دو چار ہزار روپیہ مانگ لیتا۔ جو دولت حسین کے ہاتھ کا میل تھا۔ لیکن ۱۹۲۶ء کا زمانہ کتنے دن رہتا۔ آخر ایک دن ایسا آیا کہ دولت حسین اس بات کو بھول گئے اور یہ قصہ صرف گاؤں کے بڑے بوڑھوں کو یاد رہ گیا۔ کیونکہ بیس برس کے بعد جب رُوپ چند کی لڑکی جوان ہو گئی تو اس ندی کے کنارے وہ پانی بھرنے آئی اور دولت حسین کے لڑکے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ــــ وہ چیختی رہ گئی مگر دریا کی لہروں کو کیا پڑی تھی کہ وہ اس کی مدد کرتیں، وہ تو اُٹھ اُٹھ کر دیکھتی ہی رہیں اور پھر اس کی چیخ بھی فضا میں دب کر رہ گئی اور شہر والوں نے اتنا سُنا کہ دھنی چند نے خود اپنے ہاتھوں سے روپ چند کی لڑکی کو بُرے فعل میں پکڑا۔ چنانچہ اس بدنامی کے خوف سے وہ ندی میں کود پڑی۔ چلو اچھا ہی ہوا جو اسلام پور کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ لگنے سے بچ گیا۔ مگر ندی کی لہروں کو بھی اس پر ترس

آ گیا اور وہ اس کو بہا کر لے گئیں۔

وہ دن ہے اور آج کا دن کہ روپ چند اسی کنارے پر بیٹھا لہریں گن رہا ہے اور اپنی سرسوتی کو ڈھونڈ رہا ہے جو اس کے سامنے آتی ہوئی شرماتی ہے۔ ا را لئے کہ اس نے پاپ کیا ہے اور سیٹھ دھنی چند کی موجودگی میں ان کے دوست کے پوتے کی عزت لی ہے۔

لیکن پھر اس کے گیارہ بارہ برس کے بعد شہر کی زندگی میں ایک اور زلزلہ آیا اور روپ نے وہیں ندی کے کنارے بیٹھے بیٹھے دیکھا کہ پل کے دونوں طرف کے لوگ گھبرائے ہوئے بھاگنے لگے اور دھرم پور اور اسلام پور آہستہ آہستہ الگ ہو گئے ____ کسی ہندو کی مجال نہ تھی جو اسلام پور میں داخل ہو سکے اور اسلام پور کے مسلمان ندی کے پار جاتے ہوئے جھجکتے تھے۔ شہر کی زندگی میں یہ زہر کچھ اس طرح سرایت کر چکا تھا کہ بچوں میں بھی یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ ندی کے پاس دوسرے گھاٹ کے ہندو ملاح آتے ہیں اور بچوں کو اٹھا لے جاتے ہیں اور عرصہ تک اس قسم کے قصے سننے میں آتے تھے جو اسلام پور میں روایات کا درجہ رکھتے تھے۔ لیکن ابھی تک ندی کے دونوں طرف کوئی فساد نہ ہوا تھا۔ فساد سے میری مراد ہندو مسلم جھگڑا ہے۔ ورنہ یوں تو بہت سے ایسے واقعات ہو چکے تھے جس سے اسلام پور اور دھرم پور کو کبھی بھی شرمندگی نہ ہوئی تھی یعنی آزاد ہند فوج پر جب لال قلعے میں مقدمہ چل رہا تھا تو ایک مسلمان نوجوان نے دھرم پور کے انگریز جج کو مار ڈالا تھا اور راحت علی کی اس جوانمردی نے دھرم پور کی سطح کو بلند کر دیا تھا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ دھرم پور کے پاس بہتی ہوئی ندی کا پانی بھی اُچھل اُچھل کر دھرم پور کے اس نوجوان کو دیکھنا چاہتا تھا اور راحت علی کے نعروں سے شہر کی فضا گونج رہی تھی۔ دھرم پور کے رہنے والے خوش تھے کہ ان کی دھرتی نے ایک ایسے ویر کو جنم دیا جس نے بھارت ماتا کی لاج رکھ لی ہے اور برطانوی عدل و انصاف کو منہ توڑ جواب دیا ہے۔ اس وقت لال قلعے کے انصاف پسندوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں ____ چنانچہ جب راحت علی کو پھانسی کی سزا سنائی گئی تو سارے شہر میں بغاوت کی آگ بھڑک اُٹھی تھی اور اس کے ساتھ دھرم پور کے ہندوؤں نے بھی مل جل کر جلوس نکالے تھے اور سارا دھرم پور ہل گیا تھا۔ دریا کے دونوں طرف جشن ہو رہا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اگر کہیں اس روز گولیاں چلتیں تو دھرم پور اور اسلام پور ایک ہو جاتے اور پھر ندی کے پانی کو بھی اپنا رخ بدلنا پڑتا اور شاید پھر اسی خوف سے سرکار کو اپنا حکم واپس لینا پڑا ____ حکم حاکم مرگِ مفاجات نہ بن سکا۔ پھر ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل جل کر اپنے معبدوں کو سجایا۔ بھگوان اور خدا کے حضور میں شکر بجالائے اور بیچارے سفید فام آقا منہ تکتے رہ گئے اور کم از کم اس وقت تو بدلہ نہ لے سکے۔ مگر یہ خون ایسا تھا جس کو انگریز شاید کبھی نہ معاف کر سکیں، پھر انھوں نے اس کا ایسا بدلہ لیا ____ کیونکہ جب نیا کلکٹر آیا تو شہر میں چراغاں بھی نہ ہوا اور اس کے بعد بھی کلکٹر صاحب نے عام جلسہ میں وہاں کے لوگوں کی تعریف کی اور اس وقت شہر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں زمین سے اُٹھتی ہوئی نظر آئیں۔

رُوپ چند ان تمام کھیل تماشوں کو بیٹھے بیٹھے دیکھتا رہا اور کئی بار تو اس کے جی میں آیا کہ وہ اپنی لڑکی کے قاتل کو بھول جائے اور اپنی بستی میں جا کر رہے اور ان جلسے جلوسوں میں حصہ لے، مگر وہ ایسا نہ کر سکا اور یوں ہی بیٹھا تکتا رہا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بوڑھا اپنی اکلوتی لڑکی کا [illegible] کر رہا ہے' وہ پاگل ہو گیا ہے' یہاں تک کہ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ انھوں نے اسے رات کے سناٹے میں زور زور سے چیختے سنا ہے' [illegible] بھگوان سے پرارتھنا کرتا ہے کہ وہ اسے مُلّا دولت حسین اور اس کی سات نسلوں سے انتقام لینے کی شکتی دے' مگر بڈھے کی صورت [illegible] سکتا ہے کہ وہ داڑھی والا درویش فقیر جو دراصل چمار ٹولی کا رہنے والا ہے اور جس نے کبھی اپنی جوانی میں دولت حسین کے [illegible] کی جان بچائی تھی' دولت حسین سے انتقام لے سکے گا اور اس کی سات نسلوں سے اپنی لڑکی کے خون کا بدلہ لے گا ____ ہاں تو [illegible] رہ گئی۔ وہ نیا کلکٹر جو شہر میں آیا تھا اس نے بڑے صبر و استقلال سے اپنے عہدے کو سنبھالا اور شہر کے عمائدین کا خیال [illegible] اس شہر میں کبھی نہیں آیا تھا۔ یہاں تک کہ بوڑھے دولت حسین کا بھی یہی خیال تھا۔ ہاں ہاں انھیں مُلّا

دولت حسین کا ان کی پلکیں جھڑ گئیں تھیں اور بھویں سفید ہو گئی تھیں ــــ یہ بھی کہتے تھے کہ ہمارے ہوش سنبھالتے کوئی حاکم شہر اس جیسا نہیں آیا۔ یوں تو انگریز افسروں کی بات ہی کچھ اور ہے جب سے کمپنی راج ختم ہو کر ملکہ کی سرکار آئی ہے اور انگریز حکام سے اپنا واسطہ پڑا مگر ان جیسا حاکم شہر کبھی آیا نہیں۔ پھر ہندو مسلمان سب کے ساتھ اچھا سلوک اور رواداری بھی غضب کی۔

ـــــ پھر اس کی وجہ بھی تھی۔ ملا دولت حسین کو بلانے کے لئے صاحب کلکٹر اپنی موٹر بھیج دیتے اور بڑے بڑے حکام اس وقت منہ تکتے رہ جاتے تھے۔ آخر یہ بات تو دو چار دن میں بنتی نہیں۔ اس کے لئے کتنا دریا پانی کی طرح بہانا پڑتا ہے اور سیٹھ دھنی چند بھی ان کو موٹر میں بیٹھ کر جاتے دیکھ کر منہ تکتے رہ جاتے۔ حالانکہ ابھی تک کوئی ایسی بات نہ ہوئی تھی کہ ملا دولت حسین نے سیٹھ دھنی چند کی کوئی بات ٹالی ہو۔ کیونکہ وہ تو ایک جان دو قالب تھے ـــــ

اب جو بات بگڑی تو ایسی کہ ملا دولت حسین اور سیٹھ دھنی چند صاحب کلکٹر کے پاس ایک ساتھ دکھائی نہ دیتے تھے۔ حالانکہ دونوں کا بڑھاپا تھا اور صاحب کلکٹر کے یہاں حاضری ہوتی تھی اور جب پاس پڑوس کے نوجوانوں میں اس پر چہ میگوئیاں شروع ہوئیں اور ملا دولت حسین کے بیٹے نے ان سے کہا کہ آپ کا صاحب کلکٹر کے یہاں روز روز کا جانا لوگوں کو ناگوار گذرتا ہے تو انھوں نے بڑی لاپروائی سے کہا کہ ـــــ "بیٹا ہمارا کیا ہے' آج مرے کل دوسرا دن' مگر وقت کی بات ہے۔ ہندوؤں کے تیور پہچانو' اگر ایسے وقت میں انگریزوں سے مل کر نہ رہے تو پھر چمار ٹولی کے کمینے ہماری اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیں گے ـــــ ان چماروں کو کم مت سمجھنا ـــــ اور پھر آدھی چمار ٹولی تو سیٹھ دھنی چند کے قبضے میں ہے ـــــ سیٹھ دھنی چند کو بھی کم مت سمجھنا ـــــ میں تو ان سے اپنی عزت برقرار رکھنے کے لئے ملتا ہوں۔" ملا دولت حسین چمار ٹولی کا ذکر کر رہے تھے تو وہ روپ چند کو بھول گئے تھے' وہ ١٩١٦ء کو بھول گئے تھے' وہ سرسوتی کو بھول گئے تھے کہ وہ ندی میں ڈوب مری تھی۔ ہاں انھیں کچھ یاد تھا تو یہی کہ چمار ٹولی کے کمینوں سے بچ کر رہنا چاہئے۔ وہ ہماری اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیں گے اور ملا دولت حسین جب ہندوؤں کے تیور پہچان رہے تھے تو وہ بھول گئے تھے کہ ان کے اپنے تیور بھی بدل چکے ہیں ـــــ آج وہ دھنی چند سے اپنی عزت برقرار رکھنے کے لئے ملتے ہیں ـــــ یہ اور بات ہے کہ سرسوتی کو اپنی عزت برقرار رکھنے کے لئے ڈوب مرنا پڑا تھا۔

لیکن اپنے باپ سے یہ جملے سن کر ان کے لڑکے کا بھی ماتھا ٹھنکا تھا کہ اب دن اچھے نہیں بڈھے روپ چند کی لڑکی مرنے کے بعد بھی انتقام کی تیاری کر رہی ہے ـــــ اور ملا کے چند جملوں نے اس کو سمجھا بجھا لیا۔

ادھر سیٹھ دھنی چند سے جب دھرم پور کے لوگوں نے پوچھا تو انھوں نے دبی زبان سے کہا ـــــ

"صاحب کلکٹر کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ آخر یہ بال دھوپ میں تھوڑا ہی سفید کئے ہیں۔ ایسا ہندو نواز کلکٹر تو اس شہر میں کبھی آیا نہیں۔ میں نے اس کو شیشے میں اتار لیا ہے۔ ملا دولت حسین کتنا ہی اس کے دروازے کے چکر لگائیں مگر سیٹھ دھنی چند کی بات ہی کچھ اور ہے۔ دو چار اشارے ہی کافی ہیں۔ سارے اسلام پور کی بستی میرے اشارے پر موت کے گھاٹ اتر سکتی ہے ـــــ" اور دھرم پور کے لوگ سیٹھ دھنی چند کی باتیں سن رہے تھے اس وقت کانپ ہی تو گئے' آخر اسلام پور بھی دھرم پور کا ایک حصہ ہی تو تھا مگر بعد میں ان کو یہ سوچ کر خوشی ہوئی کہ چلو یہ مسلمان تباہ ہو جائیں تو کیا ہوتا ہے۔ پہلے اسلام پور اور دھرم پور کو دریا نے الگ کر دیا تھا اور اب سیٹھ دھنی چند اور ملا دولت حسین کی نااتفاقیوں نے ـــــ اور جو کچھ کسر رہ گئی تھی وہ صاحب کلکٹر نے پہلے ہی پوری کر دی تھی اور نفرت کا ایک زہر سا گھول دیا تھا جو دھرم پور اور اسلام پور کی روح میں سرایت کرتا چلا جا رہا تھا۔

بڈھا روپ چند آج کی اس سیاست سے بے خبر تھا۔ اس کو معلوم نہ تھا کہ دھرم پور اور اسلام پور کی بستی کس طرح ایک دوسرے سے الگ ہو گئی اور صاحب کلکٹر نے وہاں کون کون سے جال بچھائے تھے۔

اور آج جبکہ شہر کی فضا میں اچانک ایک دھماکا ہوا۔ دونوں بستیوں کے دل دہل گئے۔ چاروں طرف سے مار دھاڑ کا شور سنائی دینے لگا اور روپ چند دریا کی لہریں گنتے گنتے چونک پڑا۔ جب گولیوں نے دونوں بستیوں کا سینہ چھلنی کر دیا تھا اور روپ چند کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یہ گولیاں خود اس کے سینے پر پڑ رہی ہیں۔ ساری بستی میں آگ لگی ہوئی تھی اور دونوں طرف کی آگ کا عکس دن کی روشنی کے باوجود ندی میں پڑ رہا تھا شعلے ہواؤں میں پرواز کر رہے تھے' بستی کے ساتھ وہاں کی تہذیب جل رہی تھی' روایات جل رہی تھیں' عورتیں جل رہی تھیں بچے جل رہے تھے' دل جل رہا تھا' مستقبل جل رہا تھا اور ندی کا پانی اُٹھ اُٹھ کر دیکھ رہا تھا ___ روپ چند نے بھی کئی بار اُٹھنے کا ارادہ کیا ___ وہ چمار ٹولی کے بارے میں سوچنے لگا کہ نہ جانے چمار ٹولی کا کیا حال ہو ___ مُلّا دولت حسین نے چمار ٹولی کو جلا ڈالا یا اپنی جائداد کو جلنے سے بچالیا۔ سیٹھ دھنی چند نے نہ جانے اس کے آبائی گھر کے ساتھ کیا سلوک کیا' اور آج بے طرح اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ جا کر بوڑھے دولت حسین سے ملے۔ سیٹھ دھنی چند سے جا کر پوچھے کہ دھن اور دولت کی بستی میں یہ آگ کے شعلے کیسے ___ اس کے کانوں میں عورتوں کی چیخیں کیوں آ رہی ہیں' کیا انھیں اس عظیم سانحہ کی خبر ہو چکی ہے ___ مگر فوراً ہی روپ چند کے چہرے پر اطمینان کی لہریں دکھائی دینے لگیں بالکل ویسی ہی لہریں جیسے اس کے پاس بہتی ہوئی ندی کے سینے پر بہتی جا رہی تھیں اور جو آس پاس کے ماحول سے بالکل بے خبر تھیں۔

روپ چند کو یہ نہ معلوم تھا کہ آج شہر کا نیک اور رحم دل نیا آقا کس طرح دونوں بستیوں پر گولیاں چلوا رہا ہے۔ شہر کے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں اور کتنی لڑکیوں کی عصمتیں لوٹی جا رہی ہیں ___ وہ ان سب واقعات سے بے خبر تھا۔ لیکن دریا کے پاس بیٹھے بیٹھے روپ چند سوچنے لگا کہ ضرور آج دھرم پور کی آخری شام ہے' آج اسلام پور میں آخری بار چراغاں ہو رہا ہے۔ اس کے بعد یہ بستی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی اور صبح کا سورج ندی کے دونوں طرف صرف راکھ کا ایک ڈھیر دیکھے گا۔ اس کی اپنی چمار ٹولی بھی ختم ہو جائے گی' اور ایک بار پھر اس نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو اچھا ہی ہوا جو وہ دریا کے کنارے آ کر بس گیا وہ ان ہزاروں سے اچھا ہے جو شہر کی گھٹی گھٹی فضا میں سانس لیتے ہیں اور جبکہ وہ صبح سے بھوکا ہے کوئی اس کو روٹی دینے والا نہیں آیا ہے اور وہ شدت سے محسوس کرنے لگا کہ ضرور شہر میں کوئی ناشدنی واقعہ ہو گیا اور ابھی شام پورے طور پر نہ ہوئی تھی کہ اس نے دیکھا کہ لوگوں کا غول پُل کے پاس چلا آ رہا ہے اور اتنی دوری کے باوجود وہ گھبرا گیا' اور جب وہ لوگ روپ چند کی طرف بڑھنے لگے تو اس کی گھبراہٹ اور زیادہ بڑھ گئی۔ مگر پھر اس نے اپنے حواس پر قابو پالیا اور ندی کی خاموش لہروں کو دیکھنے میں محو ہو گیا' یہ اُٹھتی ہوئی لہریں یہ سانس لیتی ہوئی ندی اور اس میں جھلملاتا ہوا پُل کا عکس اور پھر ڈھلے ہوئے دن میں پُل کا ڈوبتا ہوا سایہ بھی ندی میں جھلملا رہا تھا اور آسمان کی لالی کا عکس بھی ندی میں سرمئی ہوتا جا رہا تھا۔ اس جلتے ہوئے شہر کے آدمیوں کو دیکھنے کے بعد وہ کتنی دیر دریا کی لہروں کو بے مقصد دیکھتا رہا۔ مگر اپنی طبیعت کے اس تضاد کو زیادہ دیر برقرار نہ رکھ سکا اور اس بار جب روپ چند کی نظریں اس غول پر پڑیں تو اس نے دیکھا کہ سیٹھ دھنی چند آگے آگے چلے آ رہے تھے اور ان کے پیچھے ایک آدمی نیزے میں سر گڑوئے چلا آ رہا ہے اور روپ چند کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں جب اس نے پہچانا کہ وہ سر مُلّا دولت حسین کا تھا اس کے چہرے کی جھریاں لٹک گئی تھیں' جیسے وہ سر اپنے محسن کو تلاش کر رہا تھا اور معاً روپ چند کو اپنی لڑکی کا خیال آ گیا۔ جس کے بعد اس کی نسل ختم ہو گئی تھی اور روپ چند لاوارث مرنے والا تھا۔

مُلّا دولت حسین کا پوتا ___ وہی پوتا جس نے اس کے خاندان کو تباہ کیا تھا۔ جو ابھی پیدا بھی نہ ہوا تھا۔ جس نے اس کی اکلوتی لڑکی کی نورس تمناؤں کو ختم کیا تھا۔ جس نے اس کی بھرپور اُمنگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا ___ اس کی اپنی سرسوتی کا قاتل ___ اس کے سامنے کھڑا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ مُلّا دولت حسین کا سارا خاندان موجود تھا ___ عورتیں چیتھڑے لپیٹے چلی آ رہی تھیں۔ جن کے آنچلوں کو بھی کسی نے آج تک نہ دیکھا تھا۔

"روپ چند نے لو اپنی لڑکی کا انتقام ان مسلمانوں سے "آج تمھاری تمنا پوری ہونے کا دن آگیا۔"

روپ چند دیوانہ ہو گیا' وہ لوگوں کی طرف جھپٹا اور لوگ سوچ رہے تھے کہ وہ ملا دولت حسین کے لڑکے کو چباڈالے گا____ توں کو چینخنے والا روپ چند آج اپنے دشمن کے مدِ مقابل کھڑا تھا اور اس کا یہ بڑا دشمن بے دست و پا تھا____ مگر روپ چند نے آناً فاناً بیٹو دھنی چند پر ایک زور کا وار کیا کہ مجمع دیکھتا رہ گیا اور لوگوں کے دیکھتے دیکھتے اس کی لاش کو اس نے اپنے ہاتھوں سے اُٹھا کر ندی کی لہروں کے سپرد کر دیا۔

"کمینے کہیں کے پنڈت اور سیٹھ بنتے ہیں۔" اس نے نیزہ چھین کے دور پھینک دیا اور ملا دولت حسین کا سر لڑھکتا ہوا ندی کی طرف بڑھ رہا تھا____ لیکن روپ چند مجمع کی طرف دیکھ کر بد حواسی سے چیخ رہا تھا۔

____"چھوڑ دو دولت حسین کے یتیموں کو____ شرم نہیں آتی اپنی بستی کی عورتوں کی بے عزتی کرتے۔" اور مجمع کے لوگ حیران اس کا منہ تک رہے تھے۔

"آخر ہے نہ چمار ٹولی کا' مسلمانوں کا نمک کھاتا ہے۔"

اور بھیڑ میں سے ایک آدمی نے نکل کر روپ چند کے سینے پر چھری کا ایک وار کیا اور ذرا سی دیر میں روپ چند کی لاش زمین پر پڑی تھی۔ نفرت سے کسی نے اس کو دریا کی آغوش میں پھینک دیا اور وہ لہریں اس کو اسی طرح بہا کر لے گئیں____ جیسے چند برس پیشتر اس کی سرسوتی کو لے گئی تھیں۔

پھر دولت حسین کا سارا خاندان ان لہروں میں بہا دیا گیا____ اور تمام لاشیں یکے بعد دیگرے ندی کی آغوش میں پہنچ چکی تھیں اور تھوڑی دیر بعد پھر وہی سناٹا فضا پر چھا گیا۔

سورج کب کا ڈوب چکا تھا اور اس کا عکس بھی یونہی تاریکی میں مدغم ہو گیا۔ گویا وہ سورج یوں ہی ندی کے نیچے دب گیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا جیسے یہ لہریں بالکل ساکن و جامد ہیں جو کبھی سانس نہیں لیتیں' یوں ہی بے حس رہتی ہیں اور ابھی تھوڑی دیر پہلے جب ڈوبتا سورج اس میں ہولے ہولے اپنا عکس ڈال رہا تھا یہ لہریں جاندار معلوم ہو رہی تھیں گویا وہ آخری بار ہچکی لے رہی تھیں۔ جس نے سارے دریا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا اور اب سورج کے ڈوبتے ہی بالکل بے جان ہو چکی تھیں۔ ایک بے حس و حرکت لاش کی طرح____ بے بصر آنکھوں میں کوئی جھلک نظر نہیں آ رہی تھی اور ندی بھی یوں ہی ساکت و جامد ہو گئی تھی۔ اس کے دونوں جانب سڑک کے قمقمے جھلملا رہے تھے اور ایک عجیب بے کیفی کے ساتھ جل رہے تھے اور ان کا عکس بڑی مناسبت سے پانی میں جھلک رہا تھا اور اگر ان کا عکس نہ پڑتا تو پھر شاید یہ رات کی تاریکی ندی کو بالکل ہی اپنی آغوش میں لپیٹ لیتی اور راہگیروں کی نظریں بھی کروٹ سے بہتی ہوئی ندی پر نہ پڑتیں لیکن روپ چند کی کٹیا کا عکس ہلکا ہلکا پڑ رہا تھا۔ گویا یہ کٹیا بھی ندی کی گہرائی میں رُوپ چند کی لاش کو ڈھونڈ رہی تھی۔

تجاوز

عبدالرحمٰن چغتائی

اس کی عمر ستر سال سے تجاوز کر گئی تھی اور جب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس کی عمر ستر سال سے تجاوز کر گئی ہے تو اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ اس وقت اس کے سرخ چہرے پر زندگی کا والہانہ پن موجود تھا۔ رگوں میں خون گرمار رہا تھا۔ غلافی آنکھیں پپوٹوں سے ڈھکی ہوئی شاہین کے مانند معلوم دے رہی تھیں۔ آنکھوں کی چمک اور سرخ ڈوروں سے ظاہر تھا کہ وہ جو کچھ سوچ رہا ہے اس کی کچھ حقیقت ہے۔ اسے اپنی تنہائی کا احساس نہ تھا۔ اپنے سے علاوہ بھی ہر چیز متحرک دکھائی دے رہی تھی۔ انتشار ابھر رہا تھا۔ پل کی پل میں بدن شدت سے کانپنے لگتا تھا ____ صبح اس نے بڑے چاؤ سے داڑھی اور مونچھوں پر حنا لگائی تھی۔ حنا کا سیاہی مائل سرخ رنگ اس تندرست اور دمکتے ہوئے چہرے پر حیات افروز معلوم دے رہا تھا۔ جہاں جہاں اس کی نگاہ اٹھتی تھی ہر چیز اسے اپنی عمر سے کہیں زیادہ نظر آتی تھی۔ آئینہ کی طرف دیکھ کر بولا۔ میری ماں کا کہنا ہے جب وہ اس گھر میں آئی تھی تو یہ آئینہ یوں کا توں اس دیوار پر لٹک رہا تھا۔ اٹھ کر آئینہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کا بازو پکڑ لیا ہے۔ وہ جھجکا رہا۔ آئینے کی تہ سے اندر تک اپنا اور اپنے بالوں کا سرخ رنگ شام کی شعاعوں کے مانند بہت گہرا گہرا نظر آیا۔ اس نے کبھی اس آئینہ کی تاریخ پر غور نہ کیا تھا کہ یہ آئینہ کس کس نے دیکھا ہے اور کس کس عمر میں۔ اس نے آئینے کی سطح پر بڑی لجاجت سے ہاتھ پھیرا۔ آئینہ آئینہ ہی تو ہے۔ اس کی آب و تاب میں سر مو فرق نہیں آیا۔ اسے یاد تھا ایک بار اسے اس کی ماں نے بڑے پر وقار طریق پر آئینہ کے سامنے کھڑے ہونے سے روکا تھا جیسے وہ گناہ کا مرتکب ہو رہا تھا۔ آج اسے خیال آیا وہ شروع شروع میں خود بھی کئی بار گھڑی پل کے لئے اسی آئینہ کے سامنے رکی ہوگی' کھڑی ہوتی ہوگی۔ آنکھیں کتنی جھومتی ہیں آئینہ کے سامنے۔ پھر زندگی میں ایسے لمحے بھی آتے ہیں کہ برسوں آئینہ دیکھنے کی نوبت نہیں آتی۔ وہ سوچنے لگا۔ جہاں تک یادداشت کا تعلق ہے آہستہ آہستہ ماں کو آئینہ کی موجودگی کا احساس ہی جاتا رہا تھا اور جب اس نے رلدو کو آئینہ کے سامنے کھڑے ہونے سے روکا تھا۔ وہ اپنے اندر گدگدیاں محسوس کرنے لگا۔ وہ مسکرایا' وہ ہنس پڑا۔ یہاں تک کہ قہقہہ بلند ہوا اور اس نے اپنے قہقہے کے ساتھ ایک اور قہقہہ سنا وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا جیسے ماں نے بازو سے پکڑ کر اسے آئینہ کے سامنے سے ہٹا دیا ہو۔ وہ پیچھے ہٹتا چلا گیا مگر آنکھیں آئینہ پر لگی رہیں۔ اس کی نگاہوں میں انسان کی عزت دیوتا سے کم نہ تھی ____ کانسی کا کٹورہ پیاس بجھانے کی غرض سے اٹھا لیا۔ پیشتر اس کے کہ وہ اسے پانی سے بھرے پیاس بجھائے اس کی بناوٹ پر غور کرنے لگا اور کہنے لگا اس کی سرگزشت بھی انسان سے کم نہیں ہے۔ اس پر میرے دادا کا نام اور دادا کے باپ کا نام کندہ ہے۔ وہ کتنا چمکیلا اور کتنا خوبصورت ہے۔ گھس گھس کر اس میں رس پیدا ہو گیا ہے۔ اس کی عمر کا کوئی کیا اندازہ لگائے گا۔ تیوری چڑھا کر بڑے اعتماد سے عمر کے سوال پر نکتہ چینی کرنے لگا۔ آخر یہ عمر کا سوال ہے کیا' اور پھر یہ کم

بہت لوگ عمر کے سوال کو طول دے کر زندگی آدھی کر دیتے ہیں یا انسان کی؟ میں بہتر سال کا جوان اڑھائی سو سال سے کیا کم بوڑھا ہوں گا۔ سانپ کی طرح تن گیا اور انگوٹھی سے کھیلنے لگا جو اس کے باپ دادا کی نشانی تھی۔ اسے گھر میں ہر چیز کی عمر اپنی عمر سے کہیں زیادہ نظر آتی تھی۔ خود توانا توانا اور تازہ دم تھا۔

باہر سرائے کی ہوا چل رہی تھی۔ اس کا دل بے قابو ہو کر اچھلنے لگا۔ دلیز سے اچھل کر باہر نکل گیا جیسے بچہ ہی تو ہے ابھی گیند کی طرح پھدکنے لگے گا اور جہاں اس کا من بھائے گا منہ اٹھا کے چل دے گا۔ یہ ظاہر کی حرکتیں کر رہا تھا مگر جو چاہتا تھا یا محسوس کر رہا تھا۔ ملتے جلتے' چلنے پھرنے سے پورا ہوتا ہوا نظر نہ آتا تھا۔ بدن کے اندر تشنگی سی پیدا ہو رہی تھی۔ چاہتا تھا کوئی قوت راہ میں حائل نہ ہو۔ جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر ایک ایک کا جائزہ لیتا رہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ان کی عمر کا بھی اندازہ لگا رہا ہے۔ جس ہاتھ میں چابیوں کا گچھا پکڑ رکھا تھا اس کی گرفت میں کچھ فرق آ گیا تھا مگر ضرورت کی چابی نگاہ میں تھی۔ اسے انگلیوں میں دبا کر سیف کی طرف بڑھا۔ لوہے کا بھاری مضبوط دروازہ ایک ہی جھٹکے سے پرے ہٹا دیا اور قدموں پہ کھڑا کھڑا سیف کے اندر دیکھنے لگا۔ کرنسی نوٹ' سونے چاندی کے سکے آنکھوں کے سامنے تھے۔ زندگی کی ہر دھڑکن دولت کو چپ سادھے دیکھ کر اسے کہیں سے کہیں بہا کر لے گئی۔ سناٹا اور غنودگی کا عالم طاری تھا۔ پر اس کا فولادی پنجہ پھیلتا اور بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ جو کچھ بھی اس کی کشادہ مٹھی میں آیا بھینچ لیا۔ کچھ ادھر کچھ ادھر دونوں جیبیں بھر لیں اور خدا کی بخشش پر ایک زہر آلود طنز سے مسکراتے ہوئے سیف کو پھر مقفل کر دیا۔

ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں ہوتا ہوا صحن میں آ گیا اور ڈیوڑھی کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ مستعد اور بے فکر ___ نواسے 'نواسیوں' پوتے' پوتیوں کا شور' گھر کی گہما گہمی کانوں میں سنائی جا رہی تھی۔ صحن میں ایک بہت پرانا نیم کا درخت موجود تھا۔ اسے اس کی موجودگی کا احساس تھا۔ سب کچھ تھا مگر وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے سب کچھ پھاند گیا ___ باہر آیا تو سرد سرد ہوا سے دو چار ہونا پڑا۔ پیشانی پر گرم گرم پسینہ پھوٹ نکلا تھا۔ شانوں کو جھٹکا اور سر بلند ہو کر تن گیا۔ نواسے نواسیوں' پوتے اور پوتیوں کو' نیم کے درخت کو' اپنی عمر کو کسی کو خاطر میں نہ لایا۔ رخساروں کی سرخی پیشانی کی چمک دمک' اقبال کا ساتھ سب کچھ تھا۔ بغیر کسی الجھن اور سوچ بچار کے دور نکل آیا تھا۔ ادھر ادھر سے کئی آوازیں کانوں میں پڑنے لگی تھیں۔ ایک کھونچے والے نے سامنے سے آواز دی۔ "چمن کا ہے میرا انگور' سونے کا کشتہ ہے' تازہ ہے تازہ۔ تازہ دم بناتا ہے۔" ابھی کھونچے والا نظر سے اوجھل بھی ہونے نہ پایا تھا کہ ایکا ایکی اسے بچوں کا شور سنائی دیا۔ جانے پہچانے بچے تھے۔ رلدو بابا! بابا رلدو کہہ کر لپٹ گئے۔ وہ اس سے پیسہ چاہتے تھے۔ یہ عادت اس نے خود ہی بچوں کو ڈال رکھی تھی۔ کہتا تھا ایسا کرنے سے اسے زندگی ملتی ہے۔ وہ تازہ دم محسوس کرتا ہے۔ بچوں کے ساتھ بچہ اور داناؤں کے ساتھ دانا۔ رلدو کا ہر وصف دنیا کو اور اسے پسند تھا اور سب سے بڑی بات اس کی دولت اس کا دم بھرتی تھی۔ مگر اس وقت بچوں کو دیکھ کر بھی کھڑا نہ ہوا نہ ان سے مخاطب ہوا۔ دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال دیئے اور جو ہاتھ آیا نکال کر بچوں کی طرف پھینک دیا۔ کچھ سکے ابھی مٹھی میں تھے۔ انہیں ٹٹولتا کھیلتا برابر چلتا رہا۔ موڑ کے قریب پہنچا جہاں ہمیشہ ایک اندھی بھکارن بیٹھی بھیک مانگا کرتی تھی۔ اس کی آواز پر کچھ سکے اس کی طرف بھی پھینک دیئے۔ مگر چلنے میں ذرا فرق نہ آیا۔ موڑ مڑا ہی تھا کہ سامنے سے خسا پہلوان مع اپنے دونوں مینڈھوں کے نظر آیا۔ خسا پہلوان ہمیشہ بازار سے بڑے انداز میں گزرتا تھا۔ اس کا یہ انداز ہی تھا جو وہ پہلوان کہلاتا تھا۔ کانوں میں مرکیاں' گلے میں سونے کا کنٹھا کلائیوں پر جڑاؤ کڑے' سفید چکن کا کرتا' ملتانی وضع کا تہبند' طلائی گلدار جوتا' سر پر سجے پوری مدین ڈنی رہتی تھی۔ اس کا ایڑی اٹھا کر چلنا' بھاری بھرکم شانوں کو ہر سانس کے ساتھ جھٹکنا یہ خسے پہلوان کے خصوصی نشان تھے۔ شہر بھر میں خسے کا نام تھا۔ اس کے طمطراق اور ہر دلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ ایک بازار سے دوسرے بازار تک جاتے جاتے دن کٹ جاتا تھا پر ملاقاتیوں کا جی نہ بھرتا تھا۔ خسا تھا تو پہلوان مگر اس کی اخلاقی حالت اچھی تھی۔ مینڈھے جو اس نے پال رکھے تھے کھا کھا کر بے لگام ہو رہے تھے۔ کہتا تھا ان کو سنوارنے اور

بنانے میں جتنی ریاضت لی ہے یہ خسا ہی جانتا ہے۔ ان کی جنسی شوخیاں ہلکی ہلکی لہریں تھیں اور یہ لہریں خسے کے نزدیک اس کی محنت کا پھل تھا۔ نہایت نفاست سے تراشے ہوئے بال 'سر سراہٹیں تھیں' انتشار تھا' ذرا سی حرکت پر تھوتھنی اٹھا کر سونگھنے لگتے تھے۔ رلدو کیردوں کے پیچھے بھاگتے تھے۔ بچے اکثر ان کے نام سے کوسوں دور بھاگتے تھے اور وہ جو نڈر اور شرارتی تھے 'مینڈھوں کو چھوڑ پہلوان کو بھی تنگ کرتے تھے۔ خسا اس پر ان کو زبردست ڈانٹ بتاتا تھا اور مینڈھوں کا ساڈھیلا چھوڑ دیتا تھا۔ بچے اس پر بڑے بڑے عجیب و غریب آوازے کستے تھے اور پہلوان کو برا بھلا کہتے اٹھ بھاگتے تھے۔ وہ غصے سے کانپتا تھا پر موٹے موٹے لبوں پر مسکراہٹ دکھائی دیتی تھی۔ خسے پہلوان کے سینڈھے خسے کو پہچانتے تھے۔ وہ کسی حالت میں بھی ہوں جب وہ ان پر ہاتھ رکھ دیتا تھا تو وہ ایک اطمینان محسوس کرنے لگتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ اس کی شخصیت پر اتراتے تھے اور جب ایسا ہوتا تھا تو یوں وہ ایک صحت مند جسم ہچکولے لینے لگتا تھا' رانوں کی مچھلیاں پھڑکنے لگتی تھیں۔ خسے کی بے کاری کا قصہ سلجھانے سے بھی نہ سلجھتا تھا۔ رلدو نے جب خسے کو اپنی طرف آتے دیکھا تو اس نے اس سے آنکھیں ملانے میں دریغ نہ کیا۔ خسا اس کا پروردہ تھا۔ اس نے رلدو بابا کو دیکھتے ہی بڑے احترام سے کہا۔ آج تو میرا داتا جوش جوانی میں خسے سے بھی بازی لے گیا ہے۔ یہ الفاظ وہ کہہ ہی رہا تھا کہ اس کے مینڈھے رلدو پر پل پڑے پر رلدو نے بڑی بے پروائی سے دونوں کو پرے دھکیل دیا۔ خسا بابے رلدو کی اس حرکت پر ششدر رہ گیا اور مینڈھوں کو دوبارہ جرات نہ ہوئی کہ وہ اس کی طرف جھکتے۔ خسا پہلوان آنے بہانے اس وقت رلدو سے چھٹکارا چاہتا تھا۔ اسے اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ وہ آج غیر معمولی طور پر چڑھا جا رہا ہے۔ جب تک خسا رلدو بابا کے سامنے کھڑا رہا نہ تو اس نے مینڈھوں کو پکارا اور نہ قصداً کوئی ایسی حرکت کی کہ اسے جواب دینا پڑتا۔

رلدو نے خسے کی ملاقات کو کوئی اہمیت نہ دی تھی۔ ویسے بھی اسے اس کی بے کاری نہ بھاتی تھی اور نہ اس نے اس بات پر غور کیا کہ پہلوان اس کی غیر معمولی شخصیت سے متاثر تھا۔ وہ اس کا سرپرست ضرور تھا۔ اس لئے نہیں کہ وہ اس سے خائف تھا۔ محض اس لئے کہ وہ شہر کا ایک نامی پہلوان تھا۔

بابا رلدو کہیں کا کہیں پہنچ گیا تھا اور خسا یہ محسوس ہی کرتا رہا کہ اس نے اسے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا رلدو بابا کے الفاظ دہرا رہا تھا ——— بڑے آئے جوان۔ جوانی نام ہی اور جنس کا ہے۔ بچو تم نے اتنا پانی نہیں پیا جتنا ہم نے گھی کھایا ہے۔ خسا دودھ اور گھی کے چکر میں اتنا الجھا کہ رلدو اسے نامی پہلوان 'بڑے پہلوان' کہہ کر پکارتا تو وہ پھر بھی نہ سنتا۔ اسے اپنی بے کاری کے احساس کا صدمہ ہو رہا تھا۔ وہ سوچتا تھا دولت کس کے پاس نہیں ہوتی۔ خوشیاں کس نے نہیں دیکھیں۔ مگر یہ رلدو بابا کی خوشیاں اور امنگیں رلدو بابا ہی جانے۔ دولت وولت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

رلدو بابا تھا۔ اس کی عمر بھی بہتر سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ اس کی مصروفیتیں بھی دوسروں سے کہیں زیادہ تھیں۔ یہ تھا وہ تھا سب کچھ تھا۔ پر وہ ہفتہ میں ایک بار حنا ضرور لگاتا تھا۔ ہر دوسرے روز ایک پر تکلف جوڑا بدلتا' عطر لگاتا فلم دیکھنا اس کا ایک من بھاتا شغل تھا۔ سیر تماشے' شکار بندوق اور آئے دن کی مجلسیں ناقابل فراموش تھیں۔ اس پر بھی تشنگی بڑھتی رہتی تھی اور وہ اسے کبھی نہ بھولتا تھا۔

ہوا ٹھنڈی اور تیز تھی۔ جوں جوں وہ بازار کو چیرتا بڑھتا چلا جاتا تھا اسے ٹھنڈی اور تیز ہوا نہایت خوشگوار اور بھلی معلوم دے رہی تھی۔ [illegible] اور اُبھرا، قدم تیز ہو گئے، جسم تن گیا، رگ رگ میں طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ بغیر ہچکچاہٹ کے جذبات کی رو میں بہتا گیا۔ جذبات کا [illegible] اس وقت جب رلدو مسجد کے سامنے سے گزر رہا تھا تو اذان ہو رہی تھی۔ اس کے قدم رک گئے۔ تقدس سے سر جھک گیا۔ ادھر ادھر [illegible] کر آگے پیچھے دیکھا' اور سوچ بچار میں بہت دور نکل گیا۔ طبیعت پر بوجھ محسوس ہوا تو واپس لوٹ آیا۔ غلبے کی صورت مسجد کی [illegible] سارا بناؤ سنگار اس جذبے کا حل تھا۔

بازار میں پہنچا تو پھر ایک سرسراہٹ کروٹیں لینے لگی۔ وہی آنکھوں کی وہی لذتیں لئے ساتھ تھے۔ چہرے پر وہی سرور وہی انبساط کے نشان تھے۔ بالکل ان تھک چلا جا رہا تھا۔ ایک رنگین تجسس سے اکثر ٹھہرا اور بڑھ ارادتاً اس سے پیچھا چھڑا سکا۔

چلتے چلتے بے وجہ ایک پان فروش کی دکان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ کبھی پان کی طرف ہاتھ بڑھاتا تھا اور کبھی سگریٹ کی طرف۔ پان کھاتا تھا نہ سگریٹ پیتا تھا۔ کچھ کہنا بھی چاہتا تھا اور جو چاہتا تھا حلق سے باہر نہ آتا تھا کہ اچانک ہی بازار کے سرے پر سے ایک شور اٹھا۔ شور میں چیخنے اور چلانے کی آوازیں بھی شامل تھیں۔ ایک بپھرا ہوا سانڈ بھاگا آ رہا تھا۔ راہ گیر مارے ڈر کے بھاگے جا رہے تھے۔ کیا بوڑھے کیا جوان، عورتیں اور بچے دیواروں سے چپٹے کھڑے تھے۔ رلدو اپنے حال پر ہوتے پر سانڈ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ سب کچھ بھول گیا اور چٹان کی طرح ڈٹ گیا۔ اس نے بغیر سوچ بچار اور ہچکچاہٹ کے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے سینگوں سے پکڑ کر ایک ہی جھٹکے میں ادھ موا کر دے گا۔ سڑک کے درمیان اسے چند خوش پوش لڑکیاں بھاگتی چلاتی اور بے دست و پا نظر آئیں۔ کسی کا پرس گر گیا تھا۔ کسی کی ساڑھی کا پلو الجھ گیا تھا۔ بابا رلدو پوری مردانگی سے بڑھا اور ڈٹ کر سڑک کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ ابھی وہ سانڈ سے دو چار نہ ہوا تھا کہ سانڈ راستہ چیر کر نکل گیا۔ اک اور شور بلند ہوا۔ سارے کا سارا بازار رلدو بابا کی یہ جرات دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ لڑکیاں دیر تک اس کے ساتھ لگی کھڑی رہیں۔ انہوں نے جی بھر کر رلدو کا شکریہ ادا کیا۔ رلدو کی مسکراہٹ میں لڑکیوں کی سی چاشنی نہ ہو لیکن وہ مطمئن تھیں اور کہتی جا رہی تھیں 'بپھرے ہوئے سانڈ کا مقابلہ آسان تھوڑا ہے۔

اب وہ گڈ بازار کے بہت قریب پہنچ گیا تھا۔ انبساط سے دیوانہ ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے قرضدار مولو کو سامنے سے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ مولو رلدو بابا کا قرض دار تو تھا ہی مگر وہ ویسے بھی رلدو بابا سے ڈرتا تھا اور ہمیشہ کوشش کرتا تھا کہ اس کا اور رلدو کا سامنا نہ ہو۔ اگر اتفاقیہ کبھی سامنا ہو بھی جاتا تو وہ آنکھ بچا کر نکل جاتا تھا۔ آج بے وقت گڈ بازار میں بابے رلدو کا اسے نظر آنا اس کے لئے تعجب سے خالی نہ تھا اور جبکہ رلدو بابا اس کے چال چلن سے واقف بھی خوب تھا۔ مولو کو اس افراتفری میں اور تو کچھ نہ سوجھا وہ پاس کے ایک ہیئر کٹنگ سیلون میں داخل ہو گیا اور چھپ کر گدلے سے شیشے کے اندر سے بابے رلدو کو دیکھنے لگا جو ہیئر کٹنگ سیلون کے دروازے سے لگا ہوا تھا۔ اس کا سانس زور زور سے چل رہا تھا۔ اس نے خیال کیا یہ رلدو آج بے وقت اس جانب اس کی تلاش ہی میں آنکلا ہے۔

گڈ بازار کا نام اصل میں کھڈ بازار تھا اور جب سے چھاؤنی والوں کی آمد و رفت اس بازار میں ہوئی ہے اس بازار کا حلیہ ہی بدل گیا ہے۔ مدراسی، گورکھے، چھاچھی تو ڈھنڈے کے لئے آتے ہی تھے مگر جب سے چھاؤنی کا زور بڑھا ہے گورے بھی منہ اٹھائے نجات تلاش کرنے چلے آتے ہیں اور یہ ان کی زبان دانی کا کمال ہے کہ انہوں نے کھڈ بازار کو گڈ بازار بنا دیا تھا اور وہ گڈ بازار کا مفہوم بھی خوب سمجھتے تھے۔ آتے تھے تو اس نام پر پھبتیاں بھی کستے تھے۔

جوں جوں وہ بازار کی رونق میں پہنچتا گیا اس کی امنگیں بڑھتی گئیں اور وہ اپنے بھاری بھرکم جسم کی دھڑکنوں کا مزہ لیتا رہا ـــــ کوئی اس کے شانوں سے شانہ مار کر نکل جاتا تھا اور کوئی نہایت بے تکلفی سے نگاہیں اوپر اٹھائے چوباروں پر بیٹھنے والیوں کو گھور رہا تھا۔ اس ہماہمی میں اگر کوئی اتفاقیہ اس سے ٹکرا بھی جاتا تو اسے کوئی صدمہ نہ ہوتا تھا اور نہ اس کے وقار میں فرق آتا تھا۔

ایک لذت، ایک سرسراہٹ اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر چکی تھی۔ اس طرح چلتے اور سینہ تانے کسی نے تو کیا اس نے خود بھی اپنے تئیں محسوس نہ کیا تھا۔ روشنی کی زیادتی سے ایک چکا چوند سی پھیلی تھی۔ بازار میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھ رہا تھا۔ ہر کوئی انتشار اور جنسی لذتوں سے کھیلتا جا رہا تھا کہ دو ردو شرابیوں میں جھگڑا ہو گیا۔ وہ ایک دوسرے کا سر بوتلوں سے توڑنے پھوڑنے پر تل گئے تھے۔ ایک کہرام مچ رہا تھا۔ تماشائیوں نے سارا بازار سر پر اٹھا رکھا تھا۔ ایک مجذوب جنسی لذتوں کا مارا وحشیانہ طور پر بھاگا آ رہا تھا۔ وہ پان والے کی دوکان سے پان اٹھا لایا تھا۔ وہ بڑی بے نیازی سے رلدو کے سامنے آکر رک گیا۔ رلدو نے بھی بڑی بے نیازی سے اپنا ہاتھ

جیب میں ڈالا اور سکے نکالے اور بغیر کسی جانچ پڑتال کے مجذوب کی طرف بڑھادئے۔ مجذوب نے سکے تولے لئے مگر بڑی بے پروائی سے آسمان کی طرف منہ اٹھایا اور سکے بکھیر دئے۔ جب زمین پر سکوں کے گرنے کی مختلف آوازیں پیدا ہوئیں تو ادھر اُدھر بیٹھی ہوئی کسبیوں اور رنڈیوں میں ایک قہقہہ بلند ہوا جیسے سب نے مل کر رلدو اور مجذوب دونوں کو داد دی ہو۔ اتنے میں مجذوب رلدو سے چمٹ گیا اور اس نے جی بھر کر رلدو کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ وہ لذتِ ارتعاش سے تھر تھرا رہا تھا اور جب اسے کچھ ہوش آیا تو رلدو کو پکڑ کر گل فروش کے پاس لے گیا اور درخواست کی کہ وہ اس کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈال دے۔ رلدو نے وہی کچھ کیا جو وہ چاہتا تھا۔ مجذوب کا دل اُبھر آیا اور وہ جی سے دعائیں دیتا ہوا چل دیا۔

پان سگریٹ بیچنے والے کی دکان کے ایک پہلو میں ایک چنچل سی رنڈی بیٹھی انگڑائی لے رہی تھی۔ اس نے رلدو کو دور سے تاکا تھا۔ اس نے رلدو کو اشارہ کیا' اس نے ظاہر کیا وہ اس کی منتظر ہے مگر وہ منہ موڑ گیا۔ موڑ پر وہ ایک دوسری سے دوچار ہوا مگر وہ رلدو کی چمکیلی آنکھوں کی تاب نہ لا سکی۔ اپنی طرف سے ظاہر کرتی رہی وہ داشتہ ہے۔ وہ اپنے آپ کو فروخت کرنا چاہتی ہے مگر رلدو اس کی پیش کش کو خاطر میں نہ لایا اور نہایت اطمینان سے اپنے مقصد کا پیچھا کرتا رہا۔

اس نئے چوک میں نئی دنیا تھی۔ سب کچھ دیکھتا بھانپتا۔ مگر توجہ نہ دی۔ اس خیال سے بھی کہ آخر ہر کوئی رلدو تھوڑا ہے ____ گڈ بازار میں رلدو اب ایسی جگہ پہنچ گیا تھا جہاں گڈ بازار کے بسنے والے اپنے حقیقی رنگ میں بسے ہوئے نظر آرہے تھے۔ واقعات کی سرمستیاں جنسی حدود سے بھی تجاوز کر رہی تھیں۔ قرینے سے بیٹھی ہوئی کسبیوں کی سج دھج اور ان کے زرق برق لباس نگاہوں کو خیرہ کر رہے تھے وہ چاہتا تھا رک جائے۔ قدم قدم چلنے لگے۔ اپنا آپ بیچنے والیوں کو جی بھر کر دیکھے مگر قدم ایک پل کے لئے بھی نہ رُکے اور نہ وہ تقدس سے جھکا۔ اس کی بائیں جانب ایک کسبی سر بازار کھڑی تھی۔ اس نے جرات کر کے رلدو کو بازو سے پکڑا مگر جب آنکھیں چار ہوئیں تو وہ اس کے جلال و جمال کا مقابلہ نہ کر سکی۔ ایک اور کسبی جس کے گال کچھ پچک گئے تھے مگر آنکھوں میں زندگی تھی' حُسن تھا' سب کچھ تھا۔ مگر ذرا سی مایوسی سے راہ گزاروں کو اشارے کرنے پر اور بلانے پر اتر آتی تھی۔ اس نے بھی رلدو سے سودا کرنا چاہا مگر رلدو کی گاہکی کا طریقہ ابھی وضع نہ ہوا تھا۔

ایک تنگ سی گلی کے موڑ پر ایک سیاہ فام لڑکی بیٹھی تھی وہ مشکل سے پندرہ سولہ سال کی معلوم دیتی تھی۔ اس کی جلد باوجود سیاہ ہونے کے خون کی سی معلوم دیتی تھی۔ اس میں لطافت کچھ اس طرح نظر آئی تھی جیسے برسات کے بعد پتے خود بخود چمکنے لگے ہوں۔ بدن سڈول اور تناؤ سے بھرپور۔ وہ خوش وضع تھی۔ شکل و صورت میں لجاجت پائی جاتی تھی۔ غازہ لگانے سے اس کا حسین چہرہ انوکھا اور سرخی مائل نیلا نیلا دکھائی دے رہا تھا اور اس نیلے رنگ نے روشنی میں ایک ایسا لچاپیدا کر دیا تھا کہ خواہ مخواہ نگاہ اس پر اٹھتی تھی۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ جوانی اور خوبصورتی کے ساتھ اسے غازہ لگانے کا سلیقہ بھی خوب آتا تھا۔ رلدو کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ لچا اٹھا۔ وہ فیصلہ کر بھی نہ پایا تھا کہ کوئی دوسرا جو بڑی جرات رکھتا تھا بغیر سوچے سمجھے سیاہ ناگن کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کا اپنا رنگ سفید تھا۔ عینک کے اندر سے آنکھوں کی چمک بہت بھلی معلوم دے رہی تھی۔ بارونق چہرے پر سنجیدگی کے آثار نمایاں تھے۔ بغل میں چند کتابیں تھیں۔ اوپر والی جیب میں فونٹین پن اور پنسل دونوں قرینے سے لگا رکھے تھے۔ اس سیاہ فام چھوٹی کسبی نے اس کا استقبال بڑے سلیقے سے کیا اور اپنی الگنی کا دروازہ بند کرتے ہوئے بازار پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ رلدو کو اس کے جی بھر کر نہ دیکھنے کا صدمہ تھا۔

ایک اور چھچھوری سی بازار میں اِدھر اُدھر پھدکتی پھرتی تھی۔ نظر تو یہی آتا تھا کہ اس نے اپنی بے قدری کر رکھی ہے مگر فطرتاً وہ چالاک تھی اپنے پیشے کی نوعیت کو خوب سمجھتی تھی اور اپنی بُرائی بھلائی کو بھی نظر انداز نہ کرتی تھی۔ اگر کوئی اس کی بے تکلفی اور بے نیازی کو دیکھ کر اس سے دام پوچھ بیٹھتا تھا تو وہ منہ مانگی قیمت وصول کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ اس نے رلدو کو ایک بے بہا دینے والی

[illegible] کراس کے دل کی دھڑکنیں تیز اور نظریں [illegible] کے کہنے سے [illegible]
ہو [illegible] تھے۔ مگر رلدو اس کی گرفت سے [illegible]

کئی ایک کسبیوں نے رلدو کا راستہ بھی روکا۔ کئی ایک نے فاصلے سے [illegible] کئے مگر وہ مغرور اپنی رفتار کو کم کئے اپنی دھن میں چلا گیا۔ اس کا بدن پسینہ سے تر تھا۔ اس کا اضطراب اب دم [illegible] تھا۔ اس نے جرأت والیوں کی دل ہی دل میں داد بھی دی مگر وہ یہ دلانہ [illegible] تھا کہ وہ ابھی تک اپنے مقصد سے دور ہے۔ متانت نے چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے آپ سے کہنے لگی تو جگہ ہے جہاں نہ چھوٹے بڑے کی تمیز ہے اور نہ اچھے بُرے کی پہچان۔ چند قدم ہی بڑھا ہوگا کہ دو نوجوانوں میں جھگڑا ہو گیا۔ ایک نے بڑے اعتماد سے کہا۔ میری نگاہ ہرگز ہرگز دھوکہ نہیں کھا رہی یہ بابا رلدو ہے۔ دوسرا بھی پورے اعتماد سے بولا دماغ تو نہیں پھر گیا تمہارا۔ کہاں یہ گندہ بازار اور کہاں بابا رلدو۔ دونوں میں شرط تک نوبت پہنچ گئی۔ وہ دونوں اس کا پیچھا کرتے رہے مگر رلدو نے بھی اپنے اعتماد کو ہاتھ سے نہ دیا اور ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

جب وہ اس کے سامنے جا کر بیٹھ گیا تو وہ بھونچکا سی ہو کر رہ گئی۔ مگر اندرونی طور پر اتنی خوش تھی کہ بازار بھر میں کوئی اس کی اس خوشی کا اندازہ نہ کر سکتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ آج بن مانگے' بن بلائے' رحمت چل کر اس کے پاس آگئی ہے۔ رلدو رولیات کا دیوتا مگر باوقار طریق سے بیٹھا اس کے انگ انگ کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ نہایت احترام سے جھکی جھکی چپ چاپ اپنا تعارف کرا رہی تھی۔ اگر اس کی روح میں کوئی تبدیلی پیدا ہو گئی تھی تو جسم پر بھی نیکی اُبھر آئی تھی۔ وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے اس کے روئیں روئیں سے کوئی خوابیدہ قوت بیدار ہو رہی ہے۔ وہ شدت ارتعاش سے اٹھ کھڑی ہوئی تقدس سے جھکی جھکی دروازے کے پاس پہنچی تو ملازم نیچے کھڑا آوازیں دے رہا تھا۔ "نازلی بی بی! نازلی بی بی!" اصل میں وہ رلدو کے آنے کی اطلاع دے رہا تھا۔ نازلی انہی قدموں پر نیچے اتر گئی اور جاتے ہی اس کا گلا دبا دیا اور بڑے نرم سے لہجے میں کہا دوبارہ آواز نہ نکالے۔ خود خوشی میں لڑکھڑاتی پھولے نہ سماتی تھی۔ ایک کمرے سے دوسرے اور پھر تیسرے کمرے میں چلی گئی۔ اول تو جرأت نہ ہوتی تھی کہ رلدو کے سامنے جا کر بیٹھ جاتی۔ دوسرے یہ بھی چاہتی تھی کہ آئی رحمت کو کوئی دیکھ نہ پائے' کوئی سُن نہ پائے۔ بے سوچے سمجھے غسل خانے میں جا پہنچی اور جاتے ہی ہونٹوں کی سُرخی اور رخساروں پر سے غازے کو دھو ڈالا۔ بال الٹے سیدھے کر کے صورت کو سیدھا سادہ بنا لیا۔ نہ سمجھ سکی اور نہ دیکھ سکی کہ وہ اس سادگی میں اتنے معصومانہ انداز سے کیا کی کیا بن گئی ہے۔

نازلی بازار والیوں سے ویسے بھی کچھ مختلف واقع ہوئی تھی۔ لٹکے ہوئے پردے کے پیچھے آدھی ڈھکی ہوئی اپنا توازن کھو بیٹھی تھی۔ اس نے جلدی جلدی سینے پر سے باڈی کو نیچے کی طرف سرکا دیا تھا۔ رخساروں پر خوشی کے آنسو آ ٹھہرے تھے۔ اس خواب گاہ کی جہاں وہ اپنے گاہکوں سے ملتی تھی' روشنی بجھا دی تھی۔ زندگی کے بارے میں لمحہ بھر کے اندر اندر اتنا کچھ سوچ گئی تھی شاید اس سے پہلے اس نے ساری زندگی میں اتنا نہ سوچا ہوگا۔ وہ تھر تھرا اٹھی۔ کبھی باہر آنے کی کوشش کرتی اور کبھی سامنے والے دریچے سے ادھر ادھر جھانکتی اور پھر اندر چلی جاتی اور تکیے میں بیٹھ کر اپنے بھاگوں پر غور کرتی اور سوچتی آخر کرے تو کیا کرے ——— اس کے پاس خدا کی رحمت چل کر آگئی تھی۔ تو وہ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ اس کی تاب نہ لا سکی تھی' ہوش بھی بجا نہ رہے تھے۔ رلدو اس کی ان حرکات سے بوکھلا اٹھا۔ وہ سارا بازار چیر تا چیرتا اس تک پہنچا تھا۔ وہ جانتا تھا آخر رنڈی ہی تو ہے۔ وہ رنڈی کے پاس آیا ہے۔ اس کے آ جانے سے وہ اتنی خوش اور بے قابو کیوں ہوتی جا رہی ہے ——— یہ وہ رلدو کی آمد کو قدرت کا کرشمہ اور معجزہ سمجھ رہی تھی اور کہتی تھی وہ انسانیت کا آئینہ دار ہے۔ آج اسے ایک انسان سے واسطہ پڑا ہے۔ جرأت ہوتی تھی اور نہ اسے کہہ سکتی تھی کہ وہ کس طرح اپنا دکھ درد کہنا چاہتی ہے کس طرح اپنی کیفیت کے اظہار کے لئے دل چیر کر سامنے رکھ دینا چاہتی ہے۔ وہ اپنے نازک احساسات اور جذبات کے اظہار کے لئے یہی چاہتی تھی کہ

آنے والا خود ہی اس کے جذبات' اس کے احساسات کی ترجمانی کرنے لگے۔ وہ سمجھتی آئی۔ رحمت میری کمزوریوں پر پردہ ڈال دے گی۔ اس کا جاہ و جلال میرا راز دار بن جائے گا اور کہے گا وہ اسے اچھی طرح سے سمجھ رہا ہے اور اس کی بخشش اور گناہوں کا کفارہ دینے میں اس کا مددگار ہے۔

رلدو چاہتا تھا وہ نازلی کو کسی پہلوان کی طرح ایک جھٹکا دے اور اس سے بے تکلف باتیں کرتا چلا جائے اور اپنے قرض دار مولوی کی طرح اس کی عزت اتار کر ہاتھ میں دے دے لیکن نازلی کی بے کلی اور گردن کا جھکاؤ دیکھ کر سمٹ گیا ___ نازلی آخر ایک کسبی تھی۔ اسے اپنے اندر کئی طوفان اٹھتے ہوئے محسوس ہوئے ___ کسی ہمسائی کو آواز دی۔ ملازم کو پھل پھول اور چائے لانے کا اشارہ کیا اور یہ بھی سمجھا دیا کہ جو کچھ بھی وہ کرے بڑے عقیدے سے انجام دے۔ نازلی اپنی دوسری بہنوں سے کچھ زیادہ ہی توہمات کی قائل تھی۔ دل بلیوں اچھل رہا تھا اور رہ رہ کر دھیان اس طرف جاتا تھا کہ سارے بازار کو اپنے کوٹھے پر آنے کی دعوت دے اور سب کو زندہ کرامات' رحمت صورت رلدو دکھائے اور کہے بخشش کے طریق ہمیشہ ہی نرالے ہوتے ہیں۔

دہلیز سے آگے بڑھا ہی تھا تو اس نے یقین کر لیا تھا آنے والا زندگی کا تمام بوجھ ہلکا کر دے گا۔ اس کی برکت نازلی کو دنیا پر بھاری بنا دے گی۔ اس کا نورانی چہرہ' فرشتہ صورت' سرخ داڑھی اسے وہ کچھ دے گی جو آج تک کسی نے کسی کو نہ دیا ہو گا۔ اس کا نامہ اعمال جو مدتوں سے سیاہ ہو چکا ہے' دھل جائے گا۔ وہ نئے قالب اور نئی روح میں ڈھل جائے گی۔

اس نے اپنی دولت' حسن اور شیریں کلامی پر بھروسہ نہ کیا۔ صرف عقیدتمندی سے اپنے پاکیزہ اخلاق کا اظہار کرتی رہی اور سمجھتی رہی آنے والا بھی اس کے خوش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے گا اور وہ دیکھتے دیکھتے دنیا کی ہر نعمت سے بے نیاز ہو جائے گی ___ اس نے بڑھ کر جرات سے اپنے پورے خلوص سے اس کی گردن میں پھولوں کے ہار ڈال دیئے اور خود تقدس سے اتنی جھک گئی کہ اس کا چہرہ بھی صاف طور پر دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس نے اپنی ہر کمزوری کو انتہائی طور پر چھپانے کی کوشش کی کہ رلدو اس کی معصومیت اور معصیت کے فرق کا اندازہ نہ کر سکا۔ ارادے باندھتا رہا۔ للچائی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔

آخر کار سادہ نازلی اپنے گھر کی زینت بن مانگی رحمت کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ اس وقت اس کے چہرے پر ایک انمول سی روشنی کھیل رہی تھی اور اس کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ یقیناً وہ اس وقت تک ایک عورت معلوم دے رہی تھی جس کے سینے میں گداز دل اور نیک آرزوئیں ناچ رہی ہوں۔ بار بار ایک ایک آرزو' ایک سوال اس کے ہونٹوں تک آتا مگر وہ رلدو کا جلال دیکھ کر رُک جاتی اور حیا سے آنکھیں جھکا لیتی۔

دونوں ایک دوسرے کے قریب ہوتے گئے۔ نازلی جوں کی توں دوزانو بیٹھی رہی۔ بازار کی ہاؤ ہو میں کچھ فرق محسوس ہو رہا تھا۔ روشنیاں مدھم ہوتی جا رہی تھیں رلدو کہتا تھا۔ دنیا کچھ نہ کہتی تو وہ بہتر سال کا جوان اور اڑھائی سو سال کا بوڑھا ہوتا ___ نازلی کا دل اب دھڑک رہا تھا۔ رلدو اب اور بھی اس کے قریب تھا۔ اس کا بازو ایک اجنبی سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑھا اور اس کی کمرے کے گرد حمائل ہو گیا۔ تو وہ عورت سہم گئی۔ وہ آبدیدہ سی ہو گئی ___ "تم عورتیں اپنی اپنی قیمت کے مطابق محبت کرتی ہو ___ تم چپ ہو ___ شرما گئی ہو؟ میں تمہارے پاس تمہاری قیمت ادا کرنے آیا ہوں۔ بھاری سے بھاری قیمت جو تم نے کبھی وصول نہ کی ہو۔" اس کا جسم سرد ہو گیا۔ گویا کسی نے اسے کبھی شہزادی' بہشتی' دو کوڑی کی رنڈی کہہ دیا ہے ___ رلدو نے اسے زور سے بازوؤں میں بھینچ لیا۔ نازلی کی آنکھوں میں غیر معمولی روشنی موجود تھی ___ وہ کیا سوچ رہی تھی۔ کیا چاہتی تھی۔ ابھی تک واقعات نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا تھا۔

رلدو نے [illegible] کر نازلی کو اپنے سینے سے لگا لیا اور اپنے دہکتے ہوئے لب اس کے تھرکتے ہوئے ہونٹوں پر رکھ دیئے اور جب اس کا [illegible] کے گریبان تک پہنچا گیا تو معاً اسے خیال آیا کہ وہ پیشے بیٹھی ہے۔ بکنے کے لئے' بار بار بکنے کے لئے۔ ہر آنے والا اس [illegible]

---

(۹)

اُردو افسانہ

چوتھا دور

گڈریا

اشفاق احمد

یہ سردیوں کی ایک یخ بستہ اور طویل رات کی بات ہے میں اپنے گرم گرم بستر میں سر ڈھانپے گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے زور سے جھنجھوڑ کر مجھے جگا دیا۔

"کون ہے۔" میں نے چیخ کر پوچھا اور اس کے جواب میں ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر سے ٹکرایا' اور گھپ اندھیرے سے آواز آئی "تھانے والوں نے راتو کو گرفتار کر لیا۔"

"کیا؟" میں نے لرزتے ہوئے ہاتھ کو پرے دھکیلنا چاہا۔ "کیا ہے؟"

اور تاریکی کا بھوت بولا "تھانے والوں نے راتو کو گرفتار کر لیا ___ اس کا فارسی ترجمہ کرو۔"

"داؤ جی کے بچے" میں نے اوکھے ہو کر کہا "آدھی آدھی رات تنگ کرتے ہو ___ دفع ہو جاؤ ___ میں نہیں ___ میں نہیں آپ کے گھر رہتا۔ میں نہیں پڑھتا ___ داؤ جی کے بچے ___ کتے!" اور میں رونے لگا۔

داؤ جی نے چمکار کر کہا "اگر پڑھے گا نہیں تو پاس کیسے ہو گا! پاس نہیں ہو گا تو بڑا آدمی نہ بن سکے گا' پھر لوگ تیرے داؤ کو کیسے جانیں گے؟"

"اللہ کرے سب مر جائیں۔ آپ بھی آپ کو جاننے والے بھی .... اور میں بھی ___ میں بھی .... میں بھی" اپنی جوانا مرگی پر میں ایسا رویا کہ دو ہی لمحوں میں گھگی بندھ گئی۔

داؤ جی بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے' اور کہہ رہے تھے "بس اب چپ کر شاباش ___ میرا اچھا بیٹا۔ اس وقت یہ ترجمہ کر دے پھر نہیں جگاؤں گا۔"

آنسوؤں کا تار ٹوٹتا جا رہا تھا۔ میں نے جل کر کہا "آج حرامزادے راتو کو پکڑ کر لے گئے کل کسی اور کو پکڑ لیں گے۔ آپ کا ترجمہ تو ......"

"نہیں نہیں" انھوں نے بات کاٹ کر کہا "میرا تیرا وعدہ رہا آج کے بعد رات کو جگا کر کچھ نہ پوچھوں گا ___ شاباش اب بتا "تھانے والوں نے راتو کو گرفتار کر لیا۔"

میں نے روٹھ کر کہا "مجھے نہیں آتا۔"

"فوراً نہیں کہہ دیتے" انھوں نے سر سے ہاتھ اُٹھا کر کہا "کوشش تو کرو۔"

"بھول گیا" میں نے جل کر جواب دیا۔

اس پر دادا جی اُٹھے اور بولے "دیکھو خانہ [illegible] گز مہ خانہ [illegible] ہے۔ [illegible] دس مرتبہ کہو۔"

مجھے پتہ تھا کہ یہ بلا ٹلنے والی نہیں ناچار گز مہ خانہ والوں کا پہاڑہ شروع کر دیا جسے دس مرتبہ کہہ چکا تو دادا جی نے بڑی لجاجت سے کہا اب سارا فقرہ پانچ بار کہو۔ جب یہ کڑی مصیبت بھی ختم ہوئی تو انھوں نے مجھے آرام سے بستر میں لٹاتے ہوئے اور رضائی اوڑھاتے ہوئے کہا۔

"بھولنا نہیں! صبح اُٹھتے ہی پوچھوں گا۔"

پھر وہ جدھر سے آئے تھے اُدھر لوٹ گئے۔

شام کو جب میں ملا جی سے سیپارے کا سبق لے کر لوٹتا تو خراسیوں والی گلی سے ہو کر اپنے گھر جایا کرتا۔ اس گلی میں طرح طرح کے لوگ بستے تھے۔ مگر میں صرف موٹے ماشکی سے واقف تھا جس کو ہم سب "ندو کریا ڈھائی آنے" کہتے تھے۔ ماشکی کے گھر کے ساتھ بکریوں کا ایک باڑہ تھا۔ جس کے تین طرف کچے پکے مکانوں کی دیواریں اور سامنے رُخ آڑی ترچھی لکڑیوں اور خاردار جھاڑیوں کا اُونچا اونچا جنگلا تھا۔ اس کے بعد ایک چوکور میدان آتا تھا۔ پھر لنگڑے کمہار کی کوٹھڑی اور اس کے ساتھ گیرو رنگی کھڑکیوں اور پیتل کی کیلوں والے دروازے کا ایک چھوٹا سا پکا مکان۔ اس کے بعد گلی میں ذرا سا خم پیدا ہوتا اور قدرے تنگ ہو جاتی پھر ہوں ہوں اس کی لمبائی بڑھتی محسوس ہوتی اس کے دونوں بازو بھی ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے۔ شاید وہ ہمارے قصبے میں سب سے لمبی گلی تھی اور حد سے زیادہ سنسان! اس میں اکیلے چلتے ہوئے مجھے ہمیشہ یوں لگتا تھا جیسے میں بندوق کی نالی میں چلا جا رہا ہوں اور جونہی میں اس کے دہانے سے باہر نکلوں گا زور سے "ٹھائیں" ہو گا اور میں مر جاؤں گا۔ مگر شام کے وقت کوئی نہ کوئی راہگیر اس گلی میں ضرور مل جاتا اور میری جان بچ جاتی۔ ان آنے والوں میں کبھی کبھار ایک سفید سی مونچھوں والا لمبا سا آدمی ہوتا جس کی شکل بارہ ماہ والے ملکھی سے بہت ملتی تھی۔ سر پر ململ کی بڑی سی پگڑی۔ ذرا سی خمیدہ کمر پر خاکی رنگ کا ڈھیلا اور لمبا کوٹ۔ کھدر کا تنگ پائجامہ اور پاؤں میں فلیٹ بوٹ۔ اکثر اس کے ساتھ میری ہی عمر کا ایک لڑکا بھی ہوتا۔ جس نے عین اسی طرح کے کپڑے پہنے ہوتے اور وہ آدمی سر جھکائے اور اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ اس سے باتیں کیا کرتا۔ جب وہ میرے برابر آتے تو لڑکا میری طرف دیکھتا اور میں اس کی طرف اور پھر ایک ثانیہ ٹھٹھکے بغیر گردنوں کو ذرا ذرا موڑتے ہم اپنی اپنی راہ چلے جاتے۔

ایک دن میں اور میرا بھائی ٹھٹھیاں کے جوہڑ سے مچھلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کے بعد قصبہ کو واپس آ رہے تھے تو نہر کے پُل پر یہی آدمی اپنی پگڑی گود میں ڈالے بیٹھا تھا اور اس کی سفید چٹیا میری مرغی کے پَر کی طرح اس کے سر سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے بھائی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے سلام کہا "داؤجی سلام۔"

اور داؤجی نے سر ہلا کر جواب دیا "جیتے رہو۔"

یہ جان کر میرا بھائی اس سے واقف ہے میں بے حد خوش ہوا اور تھوڑی دیر بعد اپنی منھی آواز میں چلایا "داؤجی سلام" "جیتے رہو۔ جیتے رہو!!" اُنھوں نے دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر کہا اور میرے بھائی نے پٹاخ سے میرے زناٹے کا ایک تھپڑ دیا۔

"شیخی خورے کتے" وہ چیخا۔ جب میں نے سلام کر دیا تو تیری کیا ضرورت رہ گئی تھی؟ ہر بات میں اپنی ٹانگ پھنساتا ہے کمینہ ——

"بھلا کون ہے وہ؟"

"داؤجی!" میں نے بسور کر کہا۔

"کون داؤجی؟" میرے بھائی نے تنک کر پوچھا۔

"بکواس نہ کر" میرا بھائی چڑ گیا اور آنکھیں نکال کر بولا "ہر بات میں میری نقل کرتا ہے کتا ____ شیخی خورا۔"

میں نہیں بولا اور خاموشی کے ساتھ راہ چلتا رہا۔ دراصل مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ داؤجی سے تعارف ہو گیا۔ اس کا رنج نہ تھا کہ بھائی نے میرے تھپڑ کیوں مارا۔ وہ تو اس کی عادت تھی۔ بڑا تھا نا اس لئے ہر بات میں اپنی شیخی بگھارتا تھا۔

داؤجی سے علیک سلیک تو ہو ہی گئی تھی۔ اس لئے میں کوشش کر کے گلی میں سے اس وقت گذرنے لگا جب وہ آ جا رہے ہوں۔ انھیں سلام کر کے بڑا مزہ آتا تھا اور جواب پا کر اس سے بھی زیادہ۔ وہ جیتے رہو کچھ ایسی محبت سے کہتے کہ زندگی دوچندسی ہو جاتی اور آدمی زمین سے ذرا اُوپر اُٹھ کر ہوا میں چلنے لگتا ____ سلام کا یہ سلسلہ کوئی سال بھر یونہی چلتا رہا اور اس اثنا میں مجھے اس قدر معلوم ہو سکا کہ داؤجی گیرو رنگی کھڑکیوں والے مکان میں رہتے ہیں اور چھوٹا لڑکا ان کا بیٹا ہے' میں نے اپنے بھائی سے ان کے متعلق کچھ اور بھی پوچھنا چاہا مگر وہ بڑا سخت آدمی تھا اور میری چھوٹی سے چھوٹی بات پر چڑ جاتا تھا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اس کے پاس گھڑے گھڑائے دو فقرے ہوتے تھے۔ "تجھے کیا" اور "بکواس نہ کر" مگر خدا کا شکر ہے میرے تجسس کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا۔ اسلامیہ پرائمری سکول سے چوتھی پاس کر کے میں ایم۔ بی ہائی سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا' تو وہی داؤجی کا لڑکا میرا ہم جماعت نکلا۔ اس کی مدد سے اور اپنے بھائی کا احسان اُٹھائے بغیر میں یہ جان گیا کہ داؤجی کھتری تھے اور قصبہ کی منصفی میں عرضی نویسی کا کام کرتے تھے لڑکے کا نام امی چند تھا اور وہ جماعت میں سب سے زیادہ ہشیار تھا۔ اس کی پگڑی کلاس بھر میں سب سے بڑی تھی اور چہرہ تلی کی طرح چھوٹا۔ چند لڑکے اسے میاؤں کہتے تھے اور باقی نیولا کہہ کر پکارتے تھے۔ مگر میں داؤجی کی وجہ سے اس کو اس کے اصلی نام ہی سے پکارتا تھا۔ اس لئے وہ میرا دوست بن گیا تھا اور ہم نے ایک دوسرے کو نشانیاں دے کر پکے یار بننے کا وعدہ کر لیا تھا۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے میں کوئی ایک ہفتہ ہو گا جب میں امی چند کے ساتھ پہلی مرتبہ اس کے گھر گیا۔ وہ گرمیوں کی ایک جھلسانے والی دوپہر تھی۔ لیکن شیخ چلی کی کہانیاں حاصل کرنے کا شوق مجھ پر بھوت بن کر سوار تھا اور میں بھوک اور دھوپ دونوں سے بے پروا ہو کر سکول سے سیدھا اس کے ساتھ چل دیا۔

امی چند کا گھر چھوٹا سا تھا لیکن بہت ہی صاف ستھرا اور روشن۔ پیتل کی کیلوں والے دروازے کے بعد ذرا سی ڈیوڑھی تھی۔ آگے مستطیل صحن' سامنے سُرخ رنگ کا برآمدہ اور اس کے پیچھے اتنا ہی بڑا ایک کمرہ۔ صحن میں ایک طرف انار کا پیڑ۔ عقیق کے چند پودے اور دھنیا کی ایک چھوٹی سی کیاری تھی۔ دوسری طرف چوڑی سیڑھیوں کا ایک زینہ جس کی محراب تلے مختصر سی رسوئی تھی۔ گیرو' رنگی کھڑکیاں ڈیوڑھی سے ملحقہ بیٹھک میں کھلتی تھیں' اور بیٹھک کا دروازہ نیلے رنگ کا تھا۔ جب ہم ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو امی چند نے چلا کر کہا "بے بے نمستے!" اور مجھے صحن کے بیچوں بیچ چھوڑ کر بیٹھک میں گھس گیا۔ برآمدے میں بوریا بچھائے بے بے مشین چلا رہی تھی اور اس کے پاس ہی ایک لڑکی بڑی سی قینچی سے کپڑے قطع کر رہی تھی۔ بے بے نے منہ ہی منہ میں کچھ جواب دیا اور ویسے ہی مشین چلاتی رہی۔ لڑکی نے آنکھیں اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن موڑ کر کہا "بے بے شاید ڈاکٹر صاحب کا لڑکا ہے۔"

مشین رُک گئی۔

"ہاں ہاں" بے بے نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں اپنے جزدان کی رسی مروڑتا اور ٹیڑھے

نیچے پاؤں دھر تا بر آمدے کے ستون کے ساتھ آلگا۔

"کیانام ہے تمھارا؟" بے بے نے چمکار کر پوچھا اور میں نے نگاہیں جھکا کر آہستہ سے اپنا نام بتادیا۔

"آفتاب سے بہت شکل ملتی ہے" اس لڑکی نے قینچی زمین پر رکھ کر کہا "ہے نا بے بے؟"

"کیوں نہیں بھائی جو ہوا۔"

"آفتاب کیا؟" اندر سے آواز آئی "آفتاب کیا بیٹا؟"

"آفتاب کا بھائی ہے داؤجی" لڑکی نے رُکتے ہوئے کہا "امی چند کے ساتھ آیا ہے۔"

اندر سے داؤجی بر آمد ہوئے۔ انھوں نے گھٹنوں تک اپنا پاجامہ چڑھا رکھا اور کرتہ اُتارا ہوا تھا۔ مگر سر پر پگڑی بدستور تھی پانی کی ہلکی سی بالٹی اُٹھائے وہ بر آمدے میں آگئے اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے "ہاں بہت شکل ملتی ہے۔ مگر میرا آفتاب بہت دبلا ہے اور یہ گولو مولو سا ہے۔" پھر بالٹی فرش پر رکھ کر انھوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پاس کاٹھ کا ایک اسٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔ زمین سے پاؤں اُوپر اُٹھا کر انھوں نے آہستہ سے انھیں جھاڑا اور پھر بالٹی میں ڈال دیئے۔

"آفتاب کا خط آتا ہے؟" انھوں نے بالٹی سے پانی کے چلو بھر بھر کر ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"آتا ہے جی" میں نے ہولے سے کہا "پرسوں آیا تھا۔"

"کیا لکھتا ہے۔"

"پتہ نہیں ابا جی کو پتہ ہے۔"

"اچھا" انھوں نے سر ہلا کر کہا "تو ابا جی سے پوچھا کر نا!____ جو پوچھتا نہیں اسے کسی بھی بات کا علم نہیں ہوتا۔"

میں چُپ رہا۔

تھوڑی دیر انھوں نے ویسے ہی چلو ڈالتے ہوئے پوچھا "کونسا سیپارہ پڑھ رہے ہو؟"

"چوتھا" میں نے وثوق سے جواب دیا۔

"کیانام ہے تیسرے سیپارے کا؟" اُنھوں نے پوچھا۔

"جی پتہ نہیں" میری آواز پھر ڈوب گئی۔

"**تِلْكَ الرُّسُلُ**" انھوں نے پانی سے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ پھر تھوڑی دیر وہ ہاتھ جھٹکتے اور ہوا میں لہراتے رہے۔ بے بے مشین چلاتی رہی۔ وہ لڑکی نعمت خانے سے روئی نکال کر بر آمدے کی چوکی پر لگانے لگی اور میں جزدان کی ڈوری کو کھولتا لپیٹتا رہا۔ امی چند ابھی تک بیٹھک کے اندر ہی تھا اور میں ستون کے ساتھ ساتھ جھینپ کی عمیق گہرائیوں میں اُتر تا جا رہا تھا' معاً داؤجی نے نگاہیں میری طرف پھیر کر کہا____

"سورہ فاتحہ سناؤ۔"

"مجھے نہیں آتی جی" میں نے شرمندہ ہو کر کہا۔

انھوں نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا "الحمد للّٰہ بھی نہیں جانتے؟"

"الحمد للّٰہ تو جانتا ہوں جی" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ مسکرائے اور گویا اپنے آپ سے کہنے لگے ایک ہی بات ہے ایک ہی بات ہے!!" پھر انھوں نے سر کے اشارے سے کہا سناؤ۔ جب میں سنانے لگا تو انھوں نے اپنا پائجامہ گھٹنوں سے نیچے کر لیا اور پگڑی کا شملہ چوڑا کر کے کندھوں پر ڈال لیا اور جب میں نے **وَلاَ الضالِّین** کہا تو میرے ساتھ ہی انھوں نے بھی آمین کہا۔ مجھے خیال ہوا کہ وہ ابھی اُٹھ کر مجھے کچھ انعام دیں گے۔ کیونکہ پہلی مرتبہ جب میں نے اپنے تایا جی کو الحمد سنائی تھی تو انھوں نے بھی ایسے ہی آمین کہا تھا اور ساتھ ہی ایک روپیہ مجھے انعام بھی دیا تھا مگر داؤ جی اسی طرح بیٹھے رہے۔ بلکہ اور بھی پتھر ہو گئے۔ اتنے میں امی چند کتاب تلاش کر کے لے آیا اور جب میں چلنے لگا تو میں نے عادت کے خلاف آہستہ سے کہا "داؤ جی سلام" اور انھوں نے ویسے ہی ڈوبے ڈوبے ہولے سے جواب دیا "جیتے رہو"

بے بے نے مشین روک کر کہا "کبھی کبھی امی چند کے ساتھ کھیلنے آجایا کرو ......"

"ہاں ہاں آجایا کر" داؤ جی چونک کر بولے "آفتاب بھی آیا کرتا تھا" پھر انہوں نے بالٹی پر جھکتے ہوئے کہا "ہمارا آفتاب تو ہم سے بہت دُور ہو گیا ہے اور فارسی کا شعر پڑھنے لگے۔

یہ داؤ جی سے میری باقاعدہ پہلی ملاقات تھی اور اس ملاقات سے میں یہ نتائج اخذ کر کے چلا کہ داؤ جی بڑے کنجوس ہیں' حد سے زیادہ ڈپٹے ہیں اور کچھ بہرے سے ہیں۔ اسی دن شام کو میں نے اپنی اماں کو بتایا کہ میں داؤ جی کے گھر گیا تھا اور وہ آفتاب بھائی کو بہت یاد کر رہے تھے۔

اماں نے قدرے تلخی سے کہا "تو مجھ سے پوچھ تو لینا بے شک آفتاب ان سے پڑھتا ہے اور ان کی بہت عزت کرتا ہے مگر تیرے ابا جی ان سے بولتے نہیں۔ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا سو اب تک ناراضی چلی آتی ہے۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ تو ان کے ہاں گیا تھا تو وہ خفا ہوں گے" پھر اماں نے ہمدرد بن کر کہا "اپنے ابا سے اس کا ذکر نہ کرنا۔"

میں ابا جی سے بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا' مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میں داؤ جی کے ہاں جاتا رہا اور خوب خوب ان سے معتبری کی باتیں کرتا رہا۔ وہ چٹائی بچھائے کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے۔ میں آہستہ سے ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا اور وہ کتاب بند کر کے کہتے "گولو آگیا" پھر میری طرف مڑتے اور ہنس کر کہتے "کوئی گپ سُنا" اور میں اپنی بساط اور اپنی سمجھ کے مطابق ڈھونڈھ ڈھانڈ کے کوئی بات سناتا تو وہ خوب ہنستے بس یونہی میرے لئے ہنستے حالانکہ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایسی دلچسپ باتیں بھی نہ ہوتی تھیں' پھر وہ اپنے رجسٹر سے کوئی کاغذ نکال کر کہتے لے ایک سوال نکال۔ اس بات سے میری جان جاتی تھی۔ لیکن ان کا وعدہ بڑا رسیلا ہوتا تھا کہ ایک سوال اور پندرہ منٹ باتیں۔ اس کے بعد ایک اور سوال اور پھر پندرہ منٹ گپیں۔ چنانچہ مان جاتا اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتا۔ لیکن ان کے خود ساختہ سوال کچھ ایسے الجھیلے ہوتے کہ اگلی باتوں اور اگلے سوالوں کا وقت بھی نکل جاتا۔ اگر خوش قسمتی سے سوال جلد حل ہو جاتا تو وہ چٹائی کو ہاتھ لگا کر پوچھتے یہ کیا ہے؟ "چٹائی" میں منہ پھاڑ کر جواب دیتا "اوں ہوں" وہ سر ہلا کر کہتے "فارسی میں بتاؤ" تو میں تنگ کر جواب دیتا "لو جی ہمیں کوئی فارسی پڑھائی جاتی ہے" اس پر وہ چمکار کر کہتے "میں جو پڑھاتا ہوں گولو___ میں جو سکھاتا ہوں___ سنو! فارسی میں بوریا' عربی میں حصیر" میں شرارت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "بخشو جی بخشو' فارسی بھی اور عربی بھی میں نہیں پڑھتا جی معاف کرو" مگر وہ سنی اَن سنی ایک کر کے کہے جاتے۔ فارسی بوریا' عربی حصیر اور پھر کوئی چاہے اپنے کانوں میں سیسہ بھر لیتا داؤ جی کے الفاظ گھستے چلے جاتے تھے___ امی چند کتابوں کا کیڑا تھا۔ سارا دن بیٹھک میں لکھتا پڑھتا رہتا۔ داؤ جی اس کے اوقات میں مخل نہ ہوتے تھے' لیکن ان کے وار امی چند پر بھی برابر ہوتے تھے وہ اپنی نشست سے اُٹھ کر گھڑے سے پانی پینے آیا داؤ جی نے کتاب سے نگاہیں اُٹھا کر پوچھا "بیٹا ڈو کا ناؤں کیا ہے؟"

اس نے گلاس کے ساتھ منہ لگائے لگائے "ڈیڈ" کہا اور پھر گلاس گھڑونچی تلے پھینک کر اپنے کمرے میں آگیا۔ داؤ جی پھر پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ گھر میں ان کو اپنی بیٹی سے بڑا پیار تھا۔ ہم سب اسے بی بی کہہ کر پکارتے تھے اکیلے داؤ جی نے اس کا نام قرۃ رکھا ہوا تھا۔ اکثر

بیٹھے بیٹھے ہانک لگا کر کہتے "قرۃ بٹیا یہ قینچی تم سے کب چھوٹے گی؟" اور وہ اس کے جواب میں مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ بے بے کو اس نام سے بڑی چڑ تھی۔ وہ چیخ کر جواب دیتی "تم نے اس کا نام قرۃ رکھ کر اس کے بھاگ میں کرتے سینے لکھوا دیئے ہیں۔ منہ اچھانہ ہو تا شبد تو اچھے نکالنے چاہئیں" اور داؤجی ایک لمبی سانس لے کر کہتے "جاہل اس کا مطلب کیا جانیں" اس پر بے بے کا غصہ چمک اٹھتا اور اس کے منہ میں جو کچھ آتا کہتی چلی جاتی۔ پہلے کوسنے، پھر بد دعائیں اور آخر میں گالیوں پر اتر آتی۔ بے بے رکتی تو داؤجی کہتے "ہوائیں چلنے کو ہوتی ہیں بٹیا اور گالیاں برسنے کو" تم انھیں روکو مت' انھیں ٹوکو مت۔ پھر وہ اپنی کتابیں سمیٹتے اور اپنا محبوب "میر اُٹھ" پچھلے سے سیڑھیاں چڑھ جاتے۔

نویں جماعت کے شروع ہی میں مجھے ایک بُری عادت پڑ گئی اور اس بری عادت نے عجیب گل کھلائے۔ حکیم علی احمد مرحوم ہمارے قصبے کے ایک ہی حکیم تھے۔ علاج معالجہ سے تو ان کو کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن باتیں بڑی مزیدار سناتے تھے۔ اولیاؤں کے تذکرے۔ جنوں بھوتوں کی کہانیاں اور حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کی گھریلو زندگی کی داستانیں ان کے تیر بہدف ٹونے تھے۔ ان کے تنگ و تاریک مطب میں معجون کے چند ڈبوں۔ شربت کی دس پندرہ بوتلوں اور دو آتشی شیشوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دواؤں کے علاوہ وہ اپنی طلسماتی تقریر اور حضرت سلیمانؑ کے خاص صدری تعویذوں سے مریض کا علاج کیا کرتے تھے۔ انہی باتوں کے لئے دور دراز گاؤں کے مریض ان کے پاس کھنچے چلے آتے اور فیض یاب ہو کر جاتے' ہفتہ دو ہفتہ کی صحبت میں میرا ان کے ساتھ ایک معاہدہ ہو گیا' میں اپنے ہسپتال سے ان کے لئے خالی بوتلیں اور شیشیاں چرا کے لاتا اور اس کے بدلے وہ مجھے داستانِ امیر حمزہ کی جلدیں پڑھنے کے لئے دیا کرتے۔

یہ کتابیں کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ میں رات رات بھر اپنے بستر میں دبک کر انھیں پڑھا کرتا اور صبح دیر تک سویا رہتا' اماں میرے اس رویہ سے سخت نالاں تھیں' اباجی کو میری صحت برباد ہونے کا خطرہ لاحق تھا' لیکن میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے اب کے دسویں میں وظیفہ ضرور حاصل کروں گا۔ رات طلسم ہوشربا کے ایوانوں میں بسر ہوتی' اور دن کلاس میں بینچ پر کھڑے ہو کر۔ سہ ماہی امتحان میں فیل ہوتے ہوتے بچا۔ ششماہی میں بیمار پڑ گیا اور سالانہ امتحان کے موقعہ پر حکیم جی کی مدد سے ماسٹروں سے مل ملا کر پاس ہو گیا۔ دسویں میں صندلی نامہ' فسانہ آزاد' اور الف لیلہ ساتھ ساتھ چلتے تھے' فسانہ آزاد اور صندلی نامہ گھر پر رکھے تھے' لیکن الف لیلہ سکول کے ڈیسک میں بند رہتی۔ آخری بینچ پر جغرافیہ کی کتاب تلے سند باد جہازی کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس طرح دُنیا کی سیر کرتا...... بائیس مئی کا واقعہ ہے صبح دس بجے یونیورسٹی سے نتیجہ کی کتاب ایم۔ بی ہائی سکول پہنچی۔ امی چند نہ صرف سکول میں بلکہ ضلع بھر میں اوّل آیا تھا۔ چھ لڑکے فیل تھے اور بائیس پاس۔ حکیم جی کا جادو یونیورسٹی پر نہ چل سکا اور پنجاب کی جابر دانش گاہ نے میرا نام بھی ان چھوں لڑکوں میں شامل کر دیا۔ اسی شام قبلہ گاہی نے بید سے میری پٹائی کی اور گھر سے باہر نکل دیا۔ میں ہسپتال کے رہٹ کی گدی پر آ بیٹھا اور رات گئے تک سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہئے اور اب کدھر جانا چاہئے۔ خدا کا ملک تنگ نہیں تھا اور میں عمرو عیار کے ہتھکنڈوں اور سند باد جہازی کے تمام طریقوں سے واقف تھا مگر پھر بھی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ کوئی دو تین گھنٹے اسی طرح ساکت و جامد اس گدی پر بیٹھا زیست کرنے کی راہیں سوچتا رہا۔ اتنے میں اماں سفید چادر اوڑھے مجھے ڈھونڈتی ڈھونڈتی ادھر آ گئیں اور اباجی سے معافی لے دینے کا وعدہ کر کے مجھے پھر گھر لے گئیں۔ مجھے معافی وافی سے کوئی دلچسپی نہ تھی' مجھے تو بس ایک رات اور ان کے یہاں گزارنی تھی اور صبح سویرے اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا' چنانچہ میں آرام سے ان کے ساتھ جا کر حسبِ معمول اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

اگلے دن میرے فیل ہونے والے ساتھیوں میں سے خوشیا کوڈو اور دیسو یب یب مسجد کے پچھواڑے ٹال کے پاس بیٹھے مل گئے وہ لاہور جا کر بزنس کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ دیسو یب یب نے مجھے بتایا کہ لاہور میں بہت بزنس ہے کیونکہ اس کے جاپاجی اکثر

اپنے دوست فتح چند کے ٹھیکوں کاذکر کیا کرتے تھے۔ جس نے سال کے اندر اندر دو کاریں خرید لی تھیں' میں نے ان سے بزنس کی نوعیت کے بارے میں پوچھا تو یب یب نے کہا لاہور میں ہر طرح کا بزنس مل جاتا ہے۔ بس ایک دفتر ہونا چاہئے اور اس کے سامنے بڑا سا سائن بورڈ۔ سائن بورڈ دیکھ کر لوگ خود ہی بزنس دے جاتے ہیں۔ اس وقت بزنس سے مراد وہ کرنسی نوٹ لے رہا تھا۔

میں نے اب مرتبہ پھر وضاحت چاہی تو کوڈو چمک کر بولا "یار دیسو سب جانتا ہے۔ یہ بتا تو تیار ہے یا نہیں؟"

پھر اس نے پلٹ کر دیسو سے پوچھا "انار کلی دفتر بنائیں گے نا؟"

دیسو نے ذرا سوچکر کہا "انار کلی میں یا شاہ عالمی کے باہر دونوں ہی جگہیں ایک سی ہیں۔"

میں نے کہا انار کلی زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہی زیادہ مشہور جگہ ہے اور اخباروں میں جتنے بھی اشتہار نکلتے ہیں ان میں انار کلی لاہور لکھا ہوتا ہے۔"

چنانچہ یہ طے پایا کہ اگلے دن دو بجے کی گاڑی سے ہم لاہور روانہ ہو جائیں!

گھر پہنچ کر میں سفر کی تیاری کرنے لگا۔ بوٹ پالش کر رہا تھا کہ نوکر نے آکر شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا "چلو جی ڈاکٹر صاحب بلاتے ہیں۔"

"کہاں ہیں؟" میں نے برش زمین پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔

"ہسپتال میں" وہ بدستور مسکرا رہا تھا کیونکہ میری پٹائی کے روز حاضرین میں وہ بھی شامل تھا۔

میں ڈرتے ڈرتے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا۔ پھر آہستہ سے جالی والا دروازہ کھول کر ابا جی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ان کے علاوہ داؤجی بھی بیٹھے تھے۔ میں نے سہمے سہمے داؤجی کو سلام کیا اور اس کے جواب میں بڑی دیر کے بعد جیتے رہو کی مانوس دعا سنی۔

ان کو پہچانتے ہو؟" ابا جی نے تلخی سے پوچھا۔

"بے شک" میں نے ایک مہذب سیلزمین کی طرح کہا۔

"بے شک کے بچے' حرامزادے' میں تیری یہ سب......."

"نہ نہ ڈاکٹر صاحب" داؤجی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا "یہ تو بہت ہی اچھا بچہ ہے اس کو تو......"

اور ڈاکٹر صاحب بے بات کاٹ کر تلخی سے کہا "آپ نہیں جانتے منشی جی اس کمینے نے میری عزت خاک میں ملادی۔"

"آپ فکر نہ کریں" داؤجی نے سر جھکائے کہا "یہ ہمارے آفتاب سے بھی ذہین ہے اور ایک دن......"

اب کے ڈاکٹر صاحب کو غصہ آگیا اور انھوں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا "کیسی بات کرتے ہو منشی جی! یہ آفتاب کے جوتے کی برابری نہیں کر سکتا۔"

"کرلے گا' کرلے گا___ ڈاکٹر صاحب" داؤجی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "آپ خاطر جمع رکھیں۔"

پھر وہ اپنی کرسی سے اٹھے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے "میں سیر کو چلتا ہوں تم بھی میرے ساتھ آؤ راستے میں باتیں کریں گے۔"

ابا جی اسی طرح کرسی پر بیٹھے غصے کے عالم میں اپنا رجسٹر الٹ پلٹ کرتے اور بڑبڑاتے رہے۔ میں نے آہستہ آہستہ چل کر جالی والا دروازہ کھولا تو داؤجی نے پیچھے مڑ کر کہا "ڈاکٹر صاحب بھول نہ جائیے ابھی بھجوا دیجئے گا۔"

[illegible] ادھر ادھر گھماتے اور مختلف درختوں کے نام [illegible] کے اسی ٹیلے پر لے گئے جہاں پہلے دن [illegible] اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر انھوں نے مجھے [illegible]۔ میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے سامنے بٹھا لیا۔ پھر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور کہا آج سے میں تمھیں پڑھاؤں گا اور اگر جماعت میں اول نہ لا سکا تو فرسٹ ڈویژن ضرور دلوا دوں گا۔ میرے ہر ارادے میں خدا تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس ہستی نے مجھے [illegible] کبھی مایوس نہیں کیا......"

"مجھ سے پڑھائی نہ ہو گی" میں نے گستاخی سے بات کاٹی۔

"تو اور کیا ہو گا گولو؟" انھوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے کہا "میں بزنس کرونگا روپیہ کماؤں گا اور اپنی کار لے کر یہاں آؤنگا پھر دیکھنا......"

اب کے داؤجی نے میری بات کاٹی اور بڑی محبت سے کہا "خدا ایک چھوڑ تجھے دس کاریں دے لیکن ایک ان پڑھ کی کار میں نہ بیٹھونگا نہ ڈاکٹر صاحب۔"

میں نے جل کر کہا "مجھے کسی کی پرواہ نہیں ڈاکٹر صاحب اپنے گھر راضی میں اپنے یہاں خوش۔"

انھوں نے حیران ہو کر پوچھا "میری بھی پرواہ نہیں؟" میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ دکھی سے ہو گئے اور بار بار پوچھنے لگے "میری بھی پرواہ نہیں؟"

"او گولا میری بھی پرواہ نہیں؟"

مجھے ان کے لہجے پر ترس آنے لگا اور میں نے آہستہ سے کہا "آپ کی تو ہے مگر......" مگر انھوں نے میری بات نہ سنی اور کہنے لگے اگر اپنے حضرت کے سامنے میرے منہ سے ایسی بات نکل جاتی؟ اگر میں یہ کفر کا کلمہ کہہ جاتا...... تو...... تو...... "انھوں نے فوراً پگڑی اُٹھا کر سر پر رکھ لی اور ہاتھ جوڑ کہنے لگے "میں حضور کے دربار کا ایک ادنیٰ کتا۔ میں حضرت مولانا کی خاک سے بدتر۔ بندہ ہو کر آقا سے یہ کہتا لعنت کا طوق نہ پہنتا؟ خاندان ابو جہل کا خانوادہ اور آقا کی ایک نظر کرم۔ حضرت کا ایک اشارہ۔ حضور نے چنتو کو منشی چنت رام بنا دیا۔ لوگ کہتے ہیں منشی جی، میں کہتا ہوں رحمتہ اللہ علیہ کا کفش بردار...... لوگ سمجھتے ہیں .... "داؤجی کبھی ہاتھ جوڑتے، کبھی سر جھکاتے کبھی انگلیاں چوم کر آنکھوں کو لگاتے اور بیچ بیچ میں فارسی کے شعر پڑھتے جاتے۔ میں کچھ پریشان سا پشیمان سا ان کا زانو چھو کر آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا "داؤجی! داؤجی! داؤجی؟" اور داؤجی "میرے آقا' میرے مولانا' میرے مرشد" کا وظیفہ کئے جاتے۔ جب جذب کا یہ عالم دور ہوا تو نگاہیں اوپر اُٹھا کر بولے "کیا اچھا موسم ہے دن بھر دھوپ پڑتی ہے تو خوشگوار شاموں کا نزول ہوتا ہے" پھر وہ ٹیلے کی دیوار سے اُٹھے اور بولے "چلو اب چلیں بازار سے تھوڑا سودا خریدنا ہے" میں جیسا سرکش و بدمزاج بن کر ان کے ساتھ آیا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ مضمحل اور جھل ان کے ساتھ لوٹا۔ گسے پنساری یعنی دیسو بیب کے باپ کی دوکان سے انھوں نے گھریلو ضروریات کی چند چیزیں خریدیں اور لفافے گود میں اُٹھا کر چل دیئے' میں بار بار ان سے لفافے لینے کی کوشش کرتا۔ مگر ہمت نہ پڑتی ایک عجیب سی شرم ایک انوکھی سی جھجک مانع تھی اور اسی تامل اور جھجک میں ڈوبتا اُبھرتا میں ان کے گھر پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کر یہ بھید کھلا کہ اب میں انہی کے ہاں سویا کرونگا اور وہیں پڑھا کرونگا۔ کیونکہ میرا بستر مجھ سے بھی پہلے وہاں پہنچا ہوا تھا اور اس کے پاس [illegible] سے یہاں سے بھیجی ہوئی ایک ہریکین لالٹین بھی رکھی تھی۔

بزنس میں [illegible] یہاں کرتی پیکار ڈالے پھرنا میرے مقدر میں نہ تھا۔ گو میرے ساتھیوں کی روانگی کے تیسرے ہی روز بعد ان کے والدین بھی [illegible] کر لائے۔ لیکن اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو شاید اس وقت انارکلی میں ہمارا دفتر یہ نہیں ترقی کے کونسے

[illegible] سال میں داخل ہو چکا ہوتا۔

داؤجی نے میری زندگی اجیرن کر دی' مجھے تباہ کر دیا' مجھ پر جینا حرام کر دیا' سارا دن سکول کی کلاس میں گزر [illegible] کی مختصر رات' ان کے سوالات کا جواب دینے میں' کوٹھے پر ان کی کھاٹ میرے بستر کے ساتھ لگی ہے' اور وہ [illegible] کی نہروں کی بات پوچھ رہے ہیں' میں نے بالکل ٹھیک بتا دیا ہے' تو وہ پھر اسی سوال کو دہرا رہے ہیں' میں نے [illegible] اور انھوں نے پھر انہی نہروں کو آگے لا کھڑا کیا ہے' میں جل جاتا اور جھڑک کر کہتا "مجھے نہیں پتہ میں نہیں جانتا" تو وہ خاموش ہو جاتے اور دم سادھ لیتے' میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا تو وہ شرمندگی کنکر بن کر پتلیوں میں اتر جاتی۔

میں آہستہ سے کہتا "داؤجی۔"

"ہوں" ایک گمبھیر سی آواز آتی۔

"داؤجی کچھ اور پوچھو۔"

داؤجی نے کہا "بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے ____ اس کی ترکیب نحوی کرو۔"

میں نے سعادت مندی کے ساتھ کہا "جی یہ تو بہت لمبا فقرہ ہے صبح لکھ کر بتا دونگا کوئی اور پوچھئے۔"

انھوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھائے کہا "میرا گولو بہت اچھا ہے۔"

میں نے ذرا سوچکر کہنا شروع کیا بہت! اچھا صفت' بے حرف ربط مل کر بنا مسند......

اور داؤجی اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئے ہاتھ اُٹھا کر بولے جانِ پدر تجھے پہلے بھی کہا ہے مسند الیہ پہلے بنایا کر۔"

میں نے ترکیب نحوی سے جان چھڑانے کے لئے پوچھا "آپ مجھے جانِ پدر کیوں کہتے ہیں جانِ داؤ کیوں نہیں کہتے؟"

"شاباش" وہ خوش ہو کر کہتے "ایسی باتیں پوچھنے کی ہوتی ہیں۔ جان لفظ فارسی کا ہے اور داؤ بھاشا کا ان کے درمیان فارسی اضافت نہیں لگ سکتی۔ جو لوگ دن بدن لکھتے یا بولتے ہیں سخت غلطی کرتے ہیں' روز بروز کہو یا دن پر دن اسی طرح سے......"

اور جب میں سوچتا کہ یہ تو ترکیب نحوی سے بھی زیادہ خطرناک معاملے میں اُلجھ گیا ہوں تو جمائی لے کر پیار سے کہتا "داؤجی اب تو نیند آ رہی ہے!"

"اور وہ ترکیب نحوی؟ وہ جھٹ سے پوچھتے۔

اس کے بعد چاہے میں لاکھ بہانے کرتا ادھر اُدھر کی ہزار باتیں کرتا' مگر وہ اپنی کھاٹ پر ایسے ہی بیٹھے رہتے' بلکہ اگر ذرا سی دیر ہو جاتی تو کرسی پر رکھی ہوئی پگڑی اُٹھا کر سر پر دھر لیتے۔ چنانچہ کچھ بھی ہوتا۔ ان کے ہر سوال کا خاطر خواہ جواب دینا پڑتا۔

امی چند کالج چلا گیا تو اس کی بیٹھک مجھے مل گئی اور داؤجی کے دل میں اس کی محبت پر بھی میں نے قبضہ کر لیا۔ اب مجھے داؤجی بہت اچھے لگتے [illegible]۔ لیکن ان کی باتیں جو اس وقت مجھے بری لگتی تھیں۔ وہ اب بھی بُری لگتی ہیں بلکہ اب پہلے سے بھی کسی قدر زیادہ' شاید اس لئے کہ اب میں نفسیات کا ایک ہونہار طالب علم ہوں اور داؤجی پرانے مُلائی مکتب کے پروردہ تھے۔ سب سے بُری عادت ان کی اُٹھتے بیٹھتے سوال پوچھتے رہنے کی تھی اور دوسری کھیل کود سے منع کرنے کی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ آدمی پڑھتا رہے پڑھتا رہے اور جب اس مدقوق کی موت کا دن قریب آئے تو کتابوں کے ڈھیر پر جان دے دے۔ صحتِ جسمانی قائم رکھنے کے لئے ان کے پاس بس ایک ہی نسخہ تھا' لمبی سیر اور وہ بھی [illegible]۔ تقریباً سورج نکلنے سے دو گھنٹے پیشتر وہ مجھے بیٹھک میں جگانے آتے اور میرا کندھا ہلا کر کہتے "اُٹھ گولو موٹا ہو گیا بیٹا تو نیا جہان [illegible] کے لئے کہا کرتے ہیں کہ اٹھو بیٹا صبح ہو گئی یا سورج نکل آیا مگر وہ "موٹا ہو گیا" کہہ کر میری تذلیل

کرتے "میں سنتا تا تو پکار کر کہتے "مصندا ہو جائے گا بیٹا تو گھونسے پر شلغم کا دودھ کیسے کیا کرے گا؟" اور میں گرم گرم بستر سے ہاتھ جوڑ کر کہتا "داؤجی خدا کے لئے مجھے مسکنہ جگاؤ چاہے مجھے قتل کر دو' جان سے مار ڈالو۔"

یہ فقرہ ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی وہ فوراً میرے سر پر لحاف ڈال دیتے اور باہر نکل جاتے۔

بے بے کو ان داؤجی سے اللہ واسطے کا بیر تھا اور داؤجی ان سے بہت ڈرتے تھے' وہ سارا دن محلے والیوں کے کپڑے سیا کرتیں اور داؤجی کو کوستے دیتے جاتیں۔ ان کی اس زبان درازی پر مجھے بڑا غصہ آتا تھا مگر دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر نہ ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھار جب وہ ناگفتنی گالیوں پر اتر آتیں تو داؤجی میری بیٹھک میں آجاتے اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر کرسی پہ بیٹھ جاتے تھوڑی دیر بعد کہتے "غیبت کرنا بڑا گناہ ہے لیکن میرا خدا مجھے معاف کرے تیری بے بے بھٹیارن ہے اور اس کی سرائے میں 'میں' 'تیری قرۃ العین اور تھوڑا تھوڑا تو بھی' ہم تینوں بڑے عاجز مسافر ہیں۔" اور واقعی بے بے بھٹیارن سی تھی۔ اس کا سخت رنگ کالا تھا اور دانت بے حد سفید' ماتھا محراب دار اور آنکھیں چھیاں سی۔ چلتی تو ایسی گردبہ پائی کے ساتھ جیسے (خدا مجھے بھی معاف کرے) کٹنی کنسوئیاں لیتی پھرتی ہے۔ بچاری بی بی کو ایسی بری باتیں کہتی کہ وہ دونوں دن رو رو کر ہلکان ہوا کرتی۔ ایک آپی چند کے ساتھ ہی بنتی تھی شاید اس وجہ سے کہ دونوں ہم شکل تھے یا شاید اس وجہ سے کہ اس کو بی بی کی طرح اپنے داؤجی سے پیار نہ تھا یوں تو بی بی بے چاری بہت اچھی لگتی تھی مگر اس سے میری بھی نہ بنتی تھی۔ میں کوٹھے پر بیٹھا سوال نکال رہا ہوں داؤجی نیچے بیٹھے ہیں اور بی بی اُوپر برساتی سے ایندھن لینے آئی تو ذرا رک کر مجھے دیکھا پھر منڈیر سے جھانک کر بولی "داؤجی پڑھ نہیں رہا' تنکوں کی چارپائیاں بنا رہا ہے۔"

میں غصیلے بچے کی طرح منہ چڑا کر کہتا "تجھے کیا' نہیں پڑھتا' تو کیوں بڑبڑ کرتی ہے ـــــ آئی بڑی تھانیدارنی۔"

اور داؤجی نیچے سے ہانک لگا کر کہتے "نہ گولو مولو۔ بہنوں سے نہیں جھگڑا کرتے۔"

اور میں زور سے چلاتا "پڑھ رہا ہوں جی جھوٹ بولتی ہے۔"

داؤجی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اُوپر آجاتے اور کاپیوں کے نیچے نیم پوشیدہ چارپائی دیکھ کر کہتے "قرۃ بیٹا تو اس کو چڑایا نہ کر۔ یہ ذہن بڑی مشکل سے قابو کیا ہے۔ اگر ایک بار پھر بگڑ گیا تو مشکل سے سنبھلے گا۔"

بی بی کہتی "کاپی اُٹھا کر دیکھ لو داؤجی اس کے نیچے ہے وہ چارپائی جس سے کھیل رہا تھا۔"

میں قہر آلود نگاہوں سے بی بی کو دیکھتا اور وہ لکڑیاں اُٹھا کر نیچے اُتر جاتی۔ پھر داؤجی سمجھاتے کہ بی بی یہ سب کچھ تیرے فائدے کے لئے کہتی ہے۔ ورنہ اسے کیا پڑی کہ مجھے بتاتی پھرے۔ تو فیل ہو یا پاس اس کی بلا سے! مگر وہ تیری بھلائی چاہتی ہے تیری بہتری چاہتی ہے" اور داؤجی کی یہ بات ہرگز سمجھ میں نہ آتی تھی۔ میری شکایتیں کرنے والی میری بھلائی کیونکر چاہ سکتی تھی!

ان دنوں معمول یہ تھا کہ صبح دس بجے سے پہلے داؤجی کے ہاں سے چل دیتا گھر جا کر ناشتہ کرتا اور پھر سکول پہنچ جاتا۔ آدھی چھٹی پر میرا کھانا سکول بھیجا جاتا اور شام کو سکول بند ہونے پر گھر آکے اپنی لالٹین تیل سے بھرتا اور داؤجی کے یہاں آجاتا۔ پھر رات کا کھانا بھی مجھے داؤجی کے گھر پر ہی بھجوا دیا جاتا۔ جن ایام میں منصفی بند ہوتی داؤجی سکول کی گراؤنڈ میں آکر بیٹھ جاتے اور میرا انتظار کرنے لگتے۔ وہاں سے گھر تک سوالات کی بوچھاڑ رہتی سکول میں جو کچھ پڑھایا گیا ہوتا اس کی تفصیل پوچھتے' پھر مجھے گھر تک چھوڑ کر خود سیر کو چلے جاتے۔ ہمارے قصبہ میں منصفی کا کام مہینے میں دس دن ہوتا تھا اور بیس دن منصف صاحب بہادر کی کچہری ضلع میں رہتی تھی۔ یہ دس دن داؤجی باقاعدہ کچہری میں گذارتے تھے۔ ایک آدھ عرضی آجاتی تو دو چار روپے کما لیتے ورنہ فارغ اوقات میں وہاں بھی مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھتے۔ بے بے کا کام اچھا تھا اس کی کتر بیونت اور محلے والیوں سے جوڑ توڑ اچھے مالی نتائج پیدا کرتی تھی۔ چونکہ پچھلے چند سالوں سے گھر کا بیشتر خرچ [illegible] سے چلتا تھا۔ اس لئے وہ داؤجی پر اور بھی حاوی ہو گئی تھی ـــــ ایک دن خلاف معمول داؤجی کو لینے میں

منصفی چلا گیا۔ اس وقت کچہری بند ہو گئی تھی اور داؤجی نانبائی کے چھپر تلے ایک بنچ پر بیٹھے گڑ کی چائے پی رہے تھے۔ میں نے ہولے سے جا کر ان کا بستہ اُٹھا لیا اور ان کے گلے میں باہیں ڈال کر کہا "چلئے آج میں آپ کو لینے آیا ہوں" انھوں نے میری طرف دیکھے بغیر چائے کے بڑے بڑے گھونٹ بھرے ایک آنہ جیب سے نکال کر نانبائی کے حوالے کیا اور چپ چاپ میرے ساتھ چل دیئے۔

میں نے شرارت سے ناچ کر کہا "گھر چلئے' بے بے کو بتاؤں گا کہ آپ چوری چوری یہاں چائے پیتے ہیں۔"

داؤجی جیسے شرمندگی ٹالنے کو مسکرائے اور بولے "اس کی چائے بہت اچھی ہوتی ہے اور گڑ کی چائے سے تھکن بھی دور ہو جاتی ہے۔ پھر یہ ایک آنہ میں گلاس بھر کے دیتا ہے' تم اپنی بے بے سے نہ کہنا خواہ مخواہ ہنگامہ کھڑا کر دے گی" پھر انہوں نے خوفزدہ ہو کر کچھ مایوس ہو کر کہا "اسکی تو فطرت ہی ایسی ہے۔" اس دن مجھے داؤجی پر بڑا رحم آیا۔ میرا جی ان کے لئے بہت کچھ کرنے کو چاہنے لگا مگر اس میں میں نے بے بے سے نہ کہنے کا ہی وعدہ کر کے ان کے لئے بہت کچھ کیا۔ جب اس واقعہ کا ذکر میں نے اماں سے کیا تو وہ کبھی میرے ہاتھ اور کبھی نوکر کی معرفت داؤجی کے ہاں دودھ' پھل اور چینی وغیرہ بھیجنے لگیں مگر اس رسد سے داؤجی کو کبھی بھی کچھ نصیب نہ ہوا۔ ہاں بے بے کی نگاہوں میں میری قدر بڑھ گئی اور اس نے کسی حد تک مجھ سے رعایتی برتاؤ کرنا شروع کر دیا۔

مجھے یاد ہے ایک صبح میں دودھ سے بھرا تاملوٹ ان کے یہاں لے آیا تھا اور بے بے گھر پر نہ تھی وہ اپنی سکھیوں کے ساتھ بابا ساون کے جوہڑ میں اشنان کرنے گئی تھی اور گھر میں صرف داؤجی اور بی بی تھے۔ دودھ دیکھ کر داؤجی نے کہا "چلو آج تینوں چائے پئیں گے۔ میں دوکان سے گڑ لے آتا ہوں' تم پانی چولھے پر رکھو" بی بی نے جلدی جلدی چولھا سلگایا۔ میں پتیلی میں پانی ڈال کر لایا اور پھر ہم دونوں وہیں چوکے پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ داؤجی گڑ لے کر آ گئے تو انھوں نے کہا "تم دونوں اپنے اپنے کام پر بیٹھو چائے میں بناتا ہوں۔" چنانچہ بی بی مشین چلانے لگی اور میں ڈائرکٹ اِن ڈائرکٹ کی مشقیں لکھنے لگا۔ داؤجی چولہا بھی جھونکے جاتے تھے اور عادت کے مطابق مجھے بھی اُونچے اونچے بتاتے جاتے تھے گلیلو نے کہا "زمین سُورج کے گرد گھومتی ہے۔" گلیلو نے دریافت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے یہ نہ لکھ دینا کہ سُورج کے گرد گھومتی تھی' پانی اُبل رہا تھا داؤجی خوش ہو رہے تھے اسی خوشی میں جھوم جھوم کر وہ اپنا تازہ بنایا ہوا گیت گا رہے تھے۔ او گولو! او گولو! گلیلو کی بات مت بھولنا' گلیلو کی بات مت بھولنا۔ انھوں نے چائے کی پتی کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دی۔ برتن ابھی تک چولھے پر ہی تھا اور داؤجی ایک چھوٹے سے بچے کی طرح پانی کی گل بل گل بل کے ساتھ گولو گلیلو! گولو گلیلو کئے جا رہے تھے' میں ہنس رہا تھا اور اپنا کام کئے جا رہا تھا' بی بی مسکرا رہی تھی اور مشین چلائے جاتی تھی اور ہم تینوں اپنے چھوٹے سے گھر میں بڑے ہی خوش تھے گویا سارے محلے بلکہ سارے قصبہ کی خوشیاں بڑے بڑے رنگین پروں والی پریوں کی طرح ہمارے گھر میں اُتر آئی ہوں۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور بے بے اندر داخل ہوئی۔ داؤجی نے دروازہ کھلنے کی آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا اور ان کا رنگ فق ہو گیا۔ چمکتی ہوئی پتیلی سے گرم گرم بھاپ اُٹھ رہی تھی۔ اس کے اندر چائے کے چھوٹے چھوٹے چھلاوے ایک دوسرے کے پیچھے شور مچاتے پھرتے تھے اور ممنوعہ کھیل رچانے والا بڈھا موقع پر پکڑا گیا تھا۔ بے بے نے آگے بڑھ کر چولھے کی طرف دیکھا اور داؤجی نے چوکے سے اُٹھتے ہوئے معذرت بھرے لہجہ میں کہا۔ "چائے ہے!"

بے بے نے ایک دوہتڑ داؤجی کی کمر میں مارا اور کہا "بڈھے بردھا تجھے لاج نہیں آتی۔ تجھ پر بُہار پھرے تجھے یم سمیٹے یہ تیرے چائے پینے کے دن ہیں۔ میں بیوہ گھر میں نہ تھی تو تجھے کسی کا ڈر نہ رہا۔ تیرے بھانیوں میں کل کی مرتی آج مروں تیرا من راضی ہو۔ تیری آسیں پوری ہوں' کس مرنے جوگی نے جنا اور کس لیکھ کی ریکھا نے میرے پلے باندھ دیا...... تجھے موت نہیں آتی...... اوں ہوں تجھے کہاں آئے گی" اسی فقرے کی گردان کرتے ہوئے بے بے نے بھیڑنی کی طرح چوکے پر چڑھی کپڑے سے پتیلی پکڑ کر چولھے سے اٹھائی اور زمین پر دے ماری۔ گرم گرم چائے کے چھپاکے داؤجی کی پنڈلیوں اور پاؤں پر گرے اور وہ "اوہ تیرا بھلا ہو جائے! اوہ تیرا بھلا ہو

[illegible] ایک بچے کی طرح بھاگے اور [illegible] کے اس فرو [illegible] کو دیکھ کر [illegible] بی بی [illegible] [illegible] مدری کی آواز ایک ثانیہ کے لئے چاروں دیواروں سے [illegible] کیا۔ [illegible] بے بے نے سیدھے جا کر بی بی کو بالوں سے پکڑ لیا اور چیخ کر بولی "میری سوت متا بڑھے سے تیرا کیا ناطہ ہے۔ [illegible] پر مر مٹی ہوں۔ تو نے اس کو چائے کیا کبھی کیوں دی؟"

بی بی بیچاری چپس چپس رونے لگی تو میں بھی اُٹھ کر اندر بیٹھک میں کھسک آیا۔ داؤجی اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھے اور اپنی پنڈلیاں سہلا رہے تھے پتہ نہیں انھیں اس حالت میں دیکھ کر مجھے پھر کیوں گدگدی ہوئی کہ میں المار ی کے اندر منہ کر کے ہنسنے لگا۔ انھوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے پاس بلایا اور بولے "شکر کردگار کنم کہ گرفتارم بہ مصیبتے کہ معصیتے۔"

تھوڑی دیر رُک کر پھر کہا "میں اس کے کتوں کا بھی کتا ہوں جس کے سرِ مطہر پر کے کی ایک کم نصیب بڑھیا غلاظت پھینکا کرتی تھی۔"

میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے "آقائے نامدار کا ایک ادنیٰ حلقہ بگوش گرم پانی کے چند چھینٹے پڑنے پر نالہ شیون کرے تو لعنت ہے اس کی زندگی پر وہ اپنے محبوب کے طفیل نارِ جہنم سے بچائے۔ خدائے ابراہیمؑ مجھے جرأت عطا کرے، مولائے ایوبؑ مجھے صبر کی نعمت دے۔"

میں نے کہا "داؤجی آقا نامدار کون؟"

تو داؤجی کو یہ سُن کر ذرا تکلیف ہوئی۔ انھوں نے شفقت سے کہا "جانِ پدر یوں نہ پوچھا کر۔ میرے استاد میرے حضرت کی روح کو مجھ سے بیزار نہ کر، وہ میرے آقا بھی تھے، میرے باپ بھی، اور میرے استاد بھی وہ تیرے دادا استاد ہیں...... دادا اُستاد......" انھوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ آقائے نامدار کا لفظ اور کوتاہ قسمت مجوزہ کی ترکیب میں نے پہلی بار داؤجی سے سنی۔ یہ واقعہ سنانے میں انھوں نے کتنی ہی دیر لگا دی کیونکہ ایک ایک فقرے کے بعد فارسی کے بے شمار نعتیہ اشعار پڑھتے تھے اور بار بار اپنے اُستاد کی روح کو ثواب پہنچاتے تھے۔

جب وہ یہ واقعہ بیان کر چکے تو میں نے بڑے ادب سے پوچھا "داؤجی آپ کو اپنے اُستاد صاحب اس قدر اچھے کیوں لگتے تھے اور آپ ان کا نام لے کر ہاتھ کیوں جوڑتے ہیں اپنے آپ کو ان کا نوکر کیوں کہتے ہیں؟"

داؤجی نے مسکرا کر کہا "جو طویلے کے ایک خر کو ایسا بنا دے کہ لوگ کہیں یہ منشی چنت رام جی ہیں وہ مسیحا نہ ہو آقا نہ ہو تو پھر کیا ہو؟"

[illegible] چارپائی کے کونے سے آہستہ آہستہ پھسل کر بستر میں پہنچ گیا، اور چاروں طرف رضائی لپیٹ کر داؤجی کی طرف دیکھنے لگا جو سر جھکا کر کبھی پنڈلیوں کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی پنڈلیاں سہلاتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے وقفوں کے بعد ذرا سا ہنستے اور پھر خاموش ہو جاتے [illegible] میں کیا تھا اور کیا ہو گیا____ حضرت مولانا کی پہلی آواز کیا تھی! میری طرف سر مبارک اُٹھا کر فرمایا، چوپال زادے ہمارے پاس آؤ، میں [illegible] کے پاس جا کھڑا ہوا۔ جمعہ پٹھار اور دیگر دیہات کے لڑکے نیم دائرہ بنائے ان کے سامنے بیٹھے سبق یاد کر رہے تھے [illegible] اور کسی کو آنکھ اُوپر اُٹھانے کی ہمت نہ تھی____ میں حضور کے قریب گیا تو فرمایا، بھئی ہم تم کو روز یہاں بکریاں چراتے دیکھتے ہیں [illegible] چرنے چگنے کے لئے چھوڑ کر ہمارے پاس آ جایا کرو اور کچھ پڑھ لیا کرو____ پھر حضور نے میری عرض سنے بغیر پوچھا کیا نام [illegible] کی طرح کہا چنتو____ حضرت مسکرائے____ تھوڑا سا ہنسے بھی____ فرمانے لگے پورا نام کیا ہے؟ پھر خود ہی [illegible] میں نے سر ہلایا____ حضور کے شاگرد کتاب سے نظریں چرا کر میری طرف دیکھ رہے تھے

میرے گلے میں کھدر کا لمبا کرتا تھا۔ پائجامہ کی بجائے صرف لنگوٹ بندھا تھا۔ پاؤں میں ادھوڑی کے جوتے [illegible] کا جانگیہ لپیٹا ہوا تھا۔ بکریاں میری ....

میں نے بات کاٹ کر پوچھا "آپ بکریاں چراتے تھے داؤ جی؟"

"ہاں ہاں" وہ فخر سے بولے "میں گڈریا تھا اور میرے باپ کی بارہ بکریاں تھیں۔"

حیرانی سے میرا منہ کھلا رہ گیا اور میں نے معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے لئے جلدی سے پوچھا "اور آپ سکول کے پاس بکریاں چرایا کرتے تھے" داؤ جی نے کرسی چارپائی سے کے قریب کھینچ لی اور اپنے پاؤں پائے پر رکھ کر بولے "جان پدر اس زمانے میں تو شہروں میں سکول نہ ہوتے تھے میں گاؤں کی بات کر رہا ہوں۔ آج سے چوہتر برس پہلے بھلا کوئی تمہارے ایم۔ بی ہائی سکول کا نام بھی جانتا تھا؟ وہ تو میرے آقا کو پڑھانے کا شوق تھا۔ ارد گرد کے لوگ اپنے لڑکے چار حرف پڑھنے کو ان کے پاس بھیجدیتے ____ ان کا سارا خاندان زیور تعلیم سے آراستہ اور دینی اور دُنیوی نعمتوں سے مالا مال تھا۔ والد ان کے ضلع بھر کے ایک ہی حکیم اور چوٹی کے مبلغ تھے۔ جد امجد مہاراجہ کشمیر کے میر منشی۔ گھر میں علم کے دریا بہتے تھے' فارسی' عربی' جبر و مقابلہ' اقلیدس' حکمت اور علم ہیئت ان کے گھر کی لونڈیاں تھیں۔ حضور کے والد کو دیکھنا مجھے نصیب نہیں ہوا۔ لیکن آپ کی زبانی ان کے تبحر علمی کی سب داستانیں سنیں' شیفتہ اور حکیم مومن خاں مومن سے ان کے بڑے مراسم تھے اور خود مولانا کی تعلیم دِلّی میں مفتی آزردہ مرحوم کی نگرانی میں ہوئی تھی.......

مجھے داؤ جی کے موضوع سے بھٹک جانے کا ڈر تھا اس لئے میں نے جلدی سے پوچھا "پھر آپ نے حضرت مولانا کے پاس پڑھنا شروع کر دیا"

"ہاں" داؤ جی اپنے آپ سے باتیں کرنے لگے "ان کی باتیں ہی ایسی تھیں۔ ان کی نگاہیں ہی ایسی تھیں۔ جس کی طرف توجہ فرماتے تھے' بندے سے مولا کر دیتے تھے۔ مٹی کے ذرے کو اکسیر کی خاصیت دیتے تھے ____ میں تو اپنی لاٹھی زمین پر ڈال کر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ فرمایا' اپنے بھائیوں کے پاس بوریئے پر بیٹھو۔ میں نے کہا جی اٹھارہ برس دھرتی پر بیٹھے گذر گئے اب کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر مسکرا دیئے اپنے چوبی صندوقچے سے حروف ابجد کا ایک مقوا نکالا اور بولے الف۔ بے۔ پے۔ تے ____ سبحان اللہ کیا آواز تھی کس شفقت سے بولے تھے کس لہجہ سے فرما رہے تھے الف' بے' پے' تے" اور داؤ جی ان حرفوں کا وِرد کرتے ہوئے اپنے ماضی میں کھو گئے۔

تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ اُٹھا کر کہا ادھر رہٹ تھا اور اس کے ساتھ مچھلیوں کا حوض۔ پھر انھوں نے بایاں ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا "اور اس طرف مزارعین کے کوٹھے' دونوں کے درمیان حضور کا باغیچہ تھا اور سامنے ان کی عظیم الشان حویلی۔ اسی باغیچے میں ان کا مکتب تھا۔ در فیض کھلا تھا جس کا جی چاہے آئے نہ مذہب کی قید نہ ملک کی پابندی......

میں نے کافی دیر سوچنے کے بعد بادب ملاحظہ قسم کا فقرہ تیار کر کے پوچھا "حضرت مولانا کا اسم گرامی شریف کیا تھا؟" تو پہلے انھوں نے میرا فقرہ ٹھیک کیا اور پھر بولے "حضرت اسماعیل چشتی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ان کے والد ہمہ انھیں جان جاناں کہہ کر پکارتے تھے کبھی جان جاناں کی رعایت سے مظہر جان جاناں بھی کہہ دیتے تھے۔"

میں ابھی دلچسپ کہانی سننے کا ابھی اور خواہشمند تھا کہ داؤ جی اچانک رُک گئے اور بولے "سب سڈی ایری سسٹم کیا تھا؟" ان انگریزوں کا [illegible] ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں آئیں یا ملکہ وکٹوریہ کا فرمان لے کر سارے معاملے میں کھنڈت ڈال دیتے ہیں۔ سوائے کے بہانے کی طرح میں نے سب سڈی ایری سسٹم کا ڈھانچہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پھر انھوں نے میز سے گرائمر اُٹھائی اور بولے "باہر جا کر دیکھو کے [illegible] کا قصہ ختم ہوا یا نہیں" میں دوات میں پانی ڈالنے کے بہانے باہر گیا تو بے بے کو مشین چلاتے اور بی بی کو [illegible] صاف کرتے [illegible]

[illegible] کی کوئی حسن [illegible]
[illegible] کر کہتے "اب ایک ایک شعر سناؤ" پہلے ممی سے [illegible]

لازم تھا کہ دیکھو میرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

اس پر وہ مچل جاتے اور کہتے "ہو لیں شعر نہ سنوں گا اردو کا کم سنوں گا اور مسلسل نظم کا بیر گز نہ سنوں گا۔"

میں کہتا مجھے سوچنے دیجئے۔ اتنے میں بی بی سنائے۔"

بی بی بھی میری طرح اکثر اس شعر سے شروع کرتی۔

شنیدم کہ شاپور دم در کشید
چو خسرو براسمش قلم در کشید

اس پر داؤجی ایک مرتبہ پھر آرڈر آرڈر پکارتے۔

بی بی قینچی رکھ کر کہتی۔

"شورے شد واز خواب عدم چشم کشودیم
دیدکم باقی ست شب فتنہ غنودیم ——"

داؤجی شاباش تو ضرور کہہ دیتے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے "بٹیا یہ شعر تو کئی مرتبہ سنا چکی ہے۔"

پھر وہ بے بے کی طرف دیکھ کر کہتے "بھئی آج تمھاری بے بے بھی ایک سنائے گی" مگر بے بے ایک روکھا سا جواب دیتی "مجھے نہیں آتے شیر کبت۔"

اس پر داؤجی کہتے "گھوڑیاں ہی سنا دے۔ اپنے بیٹوں کے بیاہ کی گھوڑیاں ہی گا دے" اس پر بے بے کے ہونٹ مسکرانے کو کرتے لیکن وہ مسکرا نہ سکتی اور داؤجی عین عورتوں کی طرح گھوڑیاں گانے لگتے۔ ان کے درمیان کبھی امی چند کا اور کبھی میرا نام ٹانک دیتے۔ پھر کہتے "میں اپنے اس گولو مولو کی شادی پر سُرخ پگڑی باندھوں گا۔ برات میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ چلوں گا اور نکاح نامے میں شہادت کے دستخط کرونگا۔ میں دستور کے مطابق شرما کر نگاہیں نیچی کر لیتا تو وہ کہتے "پتہ نہیں اس ملک کے کسی شہر میں میری چھوٹی سی بہو پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھ رہی ہوگی ہفتہ میں ایک دن لڑکیوں کی خانہ داری ہوتی ہے۔ اس نے تو بہت سی چیزیں پکانی سیکھ لی ہوں گی۔ پڑھنے میں بھی ہوشیار ہوگی۔ اس بدھو کو تو یہ یاد نہیں رہتا کہ مادیاں گھوڑیاں ہوتی ہے یا مرغی۔ وہ تو فر فر سب کچھ سناتی ہوگی۔ میں تو اس کو فارسی پڑھاؤں گا پہلے اس کو خطاطی کی تعلیم دوں گا پھر خطِ شکستہ سکھاؤں گا۔ مستورات کو خطِ شکستہ نہیں آتا۔ میں تو اپنی بہو کو سکھاؤں گا —— سُن گولو! پھر میں تیرے ہی پاس رہونگا۔ میں اور میری بہو فارسی میں باتیں کریں گے۔ وہ بات بات پر بفرمائید بفرمائید کہے گی اور تو احمقوں کی طرح منہ دیکھا کرے گا" پھر وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے جُھکے خوب خوب کہتے۔ جانِ پدر چرا ایں قدر زحمت می کشی!...... خوب...... ممنونم...... اور پتہ نہیں کیا کیا کچھ کہتے۔ بیچارے داؤجی! چٹائی پر اپنی چھوٹی سی دُنیا بسا کر اس میں فارسی کے فرمان جاری کئے جاتے —— ایک دن جب چھت پر دھوپ میں بیٹھے ہوئے وہ ایسی ہی دُنیا بسا چکے تھے تو ہولے سے مجھے کہنے لگے "جس طرح خدا نے تجھے ایک نیک بیر جدیدی اور مجھے سعادت مند بہو عطا کی ہے ویسے ہی وہ اپنے فضل سے میرے امی چند کو بھی دے۔

اس کے خیالات کچھ مجھے ایسے نہیں لگتے یہ سونگ یہ مسلم لیگ یہ بیلچہ پارٹیاں مجھے پسند نہیں اور امی چند لاٹھی چلانا گتکا کھیلنا سیکھ رہا

ہے۔ میری تو وہ کب مانے گا ہاں خدائے بزرگ و برتر اس کو ایک نیک مومن سی بیوی دلادے تو وہ ات زبردستی پہلے آئے گی۔

اس مومن کے لفظ پر مجھے بہت تکلیف ہوئی اور میں چپ سا ہو گیا۔ چپ محض اس لئے ہوا تھا کہ اگر میں نے منہ کھولا تو [illegible] کی بات نکلے گی جس سے داؤجی کو بڑا دکھ ہوگا ——— میری اور امی چند کی تو خیر باتیں ہی تھیں، لیکن بارہ جنوری کو بی بی کی برات بھی آ گئی۔ جیجاجی رام پرتاب کے بارے میں داؤجی مجھے بہت کچھ بتا چکے تھے کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور اس شادی کے بارے میں انھوں نے جو استخارہ کیا تھا اس پر وہ پورا اترا ہے۔ سب سے زیادہ خوشی داؤجی کو اس بات کی تھی کہ ان کے سمدھی فارسی کے استاد تھے اور کبیر پنتھی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بارہ تاریخ کی شام کو بی بی وداع ہونے لگی تو گھر بھر میں کہرام مچ گیا' بے زار و قطار رو رہی ہے' امی چند آنسو بہا رہا ہے اور محلے کی عورتیں پھس پھس کر رہی ہیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوں اور داؤجی میرے کندھے پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں اور بار بار کہہ رہے ہیں آج زمین کچھ میرے پاؤں نہیں پکڑتی۔ میں توازن قائم نہیں رکھ سکتا" جیجاجی کے باپ بولے "منشی جی اب ہمیں اجازت دیجئے" تو بی بی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ اسے چارپائی پر ڈالا' عورتیں ہوا کرنے لگیں اور داؤجی میرا سہارا لے کر اس کی چارپائی کی طرف چلے انھوں نے بی بی کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا "یہ کیا ہوا بیٹیا۔ اٹھو! یہ تو تمھاری نئی اور خود مختار زندگی کی پہلی گھڑی ہے اسے یوں منحوس نہ بناؤ" بی بی اسی طرح دھاڑیں مارتے ہوئے داؤجی سے لپٹ گئی انھوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "قرۃ العین میں تیرا گنہگار ہوں کہ تجھے پڑھا نہ سکا۔ تیرے سامنے شرمندہ ہوں کہ تجھے علم کا جہیز نہ دے سکا۔ تو مجھے معاف کر دے گی اور شاید برخوردار رام پرتاب بھی۔ لیکن میں اپنے کو معاف نہ کر سکوں گا۔ میں خطاکار ہوں اور میرا خجل سر تیرے سامنے خم ہے۔" یہ سن کر بی بی اور بھی زور زور سے رونے لگی اور داؤجی کی آنکھوں سے کتنے سارے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے ٹوٹ کر زمین پر گرے۔ ان کے سمدھی نے آگے بڑھ کر کہا "منشی جی آپ فکر نہ کریں میں بیٹی کو کریما پڑھا دونگا" داؤجی ادھر پلٹے اور ہاتھ جوڑ کر بولے "کریما تو یہ پڑھ چکی ہے' گلستاں' بوستاں بھی ختم کرا چکا ہوں' لیکن میری حسرت پوری نہیں ہوئی" اس پر وہ ہنس کر بولے "ساری گلستاں تو میں نے بھی نہیں پڑھی' جہاں عربی آتی تھی آگے گذر جاتا تھا" ——— داؤجی اسی طرح ہاتھ جوڑے کتنی دیر خاموش کھڑے رہے' بی بی نے گوٹہ لگی سرخ رنگ کی ریشمیک چادر سے ہاتھ نکال کر پہلے امی چند اور پھر میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور سکھیوں کے بازوؤں میں ڈیوڑھی کی طرف چلدی۔ داؤجی میرا سہارا لے کر چلے تو انھوں نے مجھے اپنے ساتھ زور سے بھینچ کر کہا "لو یہ بھی لا رہا ہے۔ دیکھو یہ ہمارا سہارا بنا پھرتا ہے۔ او گولو ......او مردم دیدہ...... تجھے کیا ہو گیا...... جانِ پدر تو کیوں......"

اس پر ان کا گلا رندھ گیا اور میرے آنسو بھی تیز ہو گئے۔ برات والے تانگوں اور اکوں پر سوار تھے۔ بی بی رتھ میں جا رہی تھی اور اس کے پیچھے امی چند اور میں اور ہمارے درمیان داؤجی پیدل چلے رہے تھے۔ اگر بی بی کی چیخ ذرا زور سے نکل جاتی تو داؤجی آگے بڑھ کر رتھ کا پردہ اٹھاتے اور کہتے "لاحول پڑھو بیٹیا لاحول پڑھو۔"

اور خود آنکھوں پر دکھے رکھے ان کی پگڑی کا شملہ بھیگ گیا تھا!

[illegible] محلے کا بڑا ہی کثیف سا انسان تھا' بدی اور کینہ پروری اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ باڑہ جس کا میں نے ذکر کیا [illegible] میں بیس تیس بکریاں اور گائیں تھیں جن کا دودھ صبح و شام رانو گلی کے بغلی میدان میں بیٹھ کر بیچا کرتا تھا۔ تقریباً سارے [illegible] لیتے تھے اور اس کی شرارتوں کی وجہ سے دبتے بھی تھے۔ ہمارے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے وہ یونہی [illegible] داؤجی کو "پنڈتا جے رام جی کی" کہہ کر سلام کیا کرتا۔ داؤجی نے اسے کئی مرتبہ سمجھایا بھی کہ وہ پنڈت نہیں ہیں [illegible] ان کے نزدیک بڑے پڑھے لکھے اور فاضل آدمی کو کہا جا سکتا تھا۔ لیکن رانو نہیں مانتا تھا وہ اپنی موتچھ [illegible] (پڑھا) ہو وہی پنڈت ہوتا ہے" ——— چوروں یاروں سے اس کی آشنائی تھی شام کو اس

کے [illegible] اور کنڈی اور [illegible] ایک دن [illegible] میں اس سے وہ [illegible] اس نے [illegible] آگے [illegible] کر کہا سورنی تو چلی گئی [illegible] کر [illegible] نے بھاگ [illegible] آپ [illegible] ہوئے کہا گھر میں لگا بہتی تھی کہ بتا کہ خود نکلا کہ نہیں [illegible] آگیا اور میں نے تالو کھا کر اس کے سر پہ مارا۔ اس ضرب شدید سے خون وغیرہ تو برآمد ہوا۔ لیکن وہ چکرا کر [illegible] میں گھر بھاگ گیا۔ داؤجی کو سارا واقعہ سنا کر میں دوڑا دوڑا اپنے گھر گیا اور تاجی سے ساری حکایت بیان کی۔ ان کی بدولت [illegible] کی قلعہ میں [illegible] اور جو والد صاحب نے [illegible] کی گوشالی کے بعد اسے سخت متنبہ کر کے چھوڑ دیا۔ اس دن کے بعد سے رفتو داؤجی پر آتے جاتے طرح طرح کے فقرے کسنے لگا۔ وہ سب سے زیادہ مذاق ان کی بودی کا اڑایا کرتا تھا اور واقعی داؤجی کے فاضل سر پر وہ چٹیا سی بودی ذرا بھی اچھی نہ لگتی تھی۔ مگر وہ کہتے تھے "یہ میری مرحوم ماں کی نشانی ہے اور مجھے اپنی زندگی کی طرح عزیز ہے۔ وہ اپنی آغوش میں میرا سر رکھ کر اسے دہی سے دھوتی تھی اور کڑوا تیل لگا کر چپکاتی تھی گو میں نے حضرت مولانا کے سامنے کبھی بھی پگڑی اُتارنے کی جسارت نہیں کی لیکن وہ جانتے تھے اور جب میں دیال سنگھ میموریل ہائی سکول سے ایک سال کی ملازمت کے بعد چھٹیوں میں گاؤں آیا تو حضور نے پوچھا شہر جا کر چوٹی تو نہیں کٹوا دی؟" تو میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا تم سا سعادت مند بیٹا کم ماؤں کو نصیب ہوتا ہے اور ہم سا خوش قسمت اُستاد بھی خال خال ہوگا۔ جسے تم ایسے شاگردوں کو پڑھانے کا فخر حاصل ہوا ہو' میں نے ان کے پاؤں چھو کر کہا حضور آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں یہ سب آپ کے قدموں کی برکت ہے' ہنس کر فرمانے لگے چنت رام ہمارے پاؤں نہ چھوا کرو بھلا ایسے لمس سے کیا فائدہ جس کا ہمیں احساس نہ ہو۔ میری آنکھوں میں آنسو آگئے میں نے کہا اگر کوئی مجھے بتا دے تو سمندر پھاڑ کر بھی آپ کے لئے دوائی نکال لاؤں۔ اپنی زندگی کی حرارت حضور کی ٹانگوں کے لئے نذر کر دوں لیکن میرا بس نہیں چلتا ___ خاموش ہو گئے اور نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے خدا کو یہی منظور ہے تو ایسے ہی سہی۔ تم سلامت رہو کہ تمہارے کندھوں پر میں نے کوئی دس سال بعد سارا گاؤں دیکھ لیا ہے" ___ داؤجی گذرے ایام کی تہہ میں اُترتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"میں صبح سویرے حویلی کی ڈیوڑھی میں جا کر آواز دیتا "خادم آگیا" مستورات ایک طرف ہو جاتیں تو حضور صحن سے آواز دے کر مجھے بلاتے اور میں اپنی قسمت کو سراہتا ہاتھ جوڑے جوڑے ان کی طرف بڑھتا۔ پاؤں چھوتا اور پھر حکم کا انتظار کرنے لگتا' وہ دعا دیتے میرے والدین کی خیریت پوچھتے گاؤں کا حال دریافت فرماتے اور پھر کہتے "لو بھئی چنت رام ان گناہوں کی گٹھڑی کو اٹھالو" میں سید گل کی طرح انھیں اُٹھاتا اور کمر پر لاد کر حویلی سے باہر آ جاتا۔ کبھی فرماتے ہمیں باغ کا چکر دو کبھی حکم ہوتا سیدھے رہٹ کے پاس لے چلو اور کبھی کبھار بڑی نرمی سے کہتے چنت رام تھک نہ جاؤ تو ہمیں مسجد تک لے چلو۔ میں نے کئی بار عرض کیا کہ حضور ہر روز مسجد لے جایا کروں گا مگر تھیں مانتے یہی فرماتے رہے کہ کبھی جی چاہتا ہے تم سے کہہ دیتا ہوں۔ میں وضو کرانے والے چبوترے پر بٹھا کر ان کے ہلکے ہلکے جوتے اُتارتا اور انھیں جھولی میں رکھ کر دیوار سے لگ کر بیٹھ جاتا۔ چبوترے سے حضور خود گھسٹ کر صف کی جانب جاتے تھے۔ میں نے صرف ایک مرتبہ انھیں اس طرح جاتے دیکھا تھا اور اس کے بعد جرات نہ ہوئی۔ ان کے جوتے اُتارنے کے بعد دامن میں منہ چھپا لیتا اور پھر اسی وقت سر اُٹھاتا جب وہ میرا نام لے کر یاد فرماتے۔ واپسی پر میں قصبے کی لمبی لمبی گلیوں کا چکر کاٹ کر حویلی کو لوٹتا۔ تو فرماتے ہم جانتے ہیں چنت رام تم ہماری خوشنودی کے لئے قصبہ کی سیر کراتے ہو لیکن ہمیں بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ ایک تو تم پر لدا لدا پھرتا ہوں اور دوسرے تمہارا وقت ضائع کرتا ہوں اور حضور سے کون کہہ سکتا کہ آقا یہ وقت ہی میری زندگی کا نقطہ عروج ہے اور یہ تکلیف ہی میری حیات کا مرکز ہے۔ آپ تو فرماتے تھے کہ لدا لدا پھرتا ہوں اور مجھے یہ افسوس ہوتا تھا کہ ایک ہما ہے جس نے اپنا سایہ محض میرے لئے وقف کر دیا ہے ___ جس دن میں نے سکندر نامہ زبانی یاد کر کے انھیں سنایا۔ اس قدر خوش ہو گئے گویا ہفت اقلیم کی بادشاہی نصیب ہو گئی [illegible]

دنیا کی ہر دعا سے مجھے مالامال کر دیا۔ دستِ شفقت میرے سر پر پھیرا اور جیب سے ایک روپیہ نکال کر انعام [illegible] کر بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگایا اور سکندر کا افسر سمجھ کر پگڑی میں رکھ لیا۔ دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر دعائیں دے [illegible] کام ہم سے نہ ہو سکا وہ تو نے کر دکھایا۔ تو نیک ہے خدا نے تجھے یہ سعادت نصیب کی۔ چنت رام تیرا موسی چھپاں کا پیشہ ہے تو [illegible] پیرو ہے اس لئے خدائے عزوجل تجھے برکت دیتا ہے وہ تجھے اور بھی برکت دے گا تجھے اور کشائش میسر آئے گی۔۔۔۔

داؤجی یہ باتیں کرتے کرتے گھٹنوں پر سر رکھ کر خاموش ہو گئے۔

میرا امتحان قریب آرہا تھا اور داؤجی سخت ہوتے جا رہے تھے۔ انھوں نے میرے ہر فارغ وقت پر کوئی نہ کوئی کام پھیلا دیا تھا۔ ایک مضمون سے عہدہ برآ ہوتا تھا تو دوسرے کی کتابیں نکال کر سر پر سوار ہو جاتے تھے۔ پانی پینے اُٹھتا تو سایہ کی طرح ساتھ ساتھ چلے آتے اور نہیں تو تاریخ کے سن ہی پوچھتے جاتے شام کے وقت سکول پہنچنے کا انھوں نے وطیرہ بنا لیا تھا۔ ایک دن میں سکول کے بڑے دروازے سے نکلنے کے بجائے بورڈنگ کی راہ کھسک گیا تو انھوں نے جماعت کے کمرے کے سامنے آکر بیٹھنا شروع کر دیا۔ میں چڑچڑا اور ضدی ہونے کے علاوہ بد زبان بھی ہو گیا تھا۔ داؤجی کے بچے گویا میرا تکیہ بن گیا تھا اور کبھی کبھی جب ان کی یا ان کے سوالات کی سختی بڑھ جاتی تو تو میں انھیں کتے کہنے سے بھی نہ چوکتا۔ ناراض ہو جاتے تو بس اس قدر کہتے "دیکھ لے ڈومنی تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ تیری بیوی بیاہ کر لاؤں گا تو پہلے اسے یہی بتاؤں گا کہ جانِ پدر یہ تیرے بڈھے باپ کو کتا کہتا تھا" میری گالیوں کے بدلے وہ مجھے ڈومنی کہا کرتے تھے۔ اگر انھیں زیادہ دُکھ ہوتا تو منہ چڑھی ڈومنی کہتے۔ اس سے زیادہ نہ انھیں غصہ آتا تھا دُکھ ہوتا تھا۔ مجھے میرے اصلی نام سے انھوں نے کبھی نہیں پکارا۔ میرے بڑے بھائی کا ذکر آتا تو بیٹا آفتاب' برخوردار آفتاب کہہ کر انھیں یاد کرتے تھے لیکن میرے ہر روز نئے نئے نام رکھتے تھے۔ جن میں گولو انھیں بہت مرغوب تھا طنبو اور دوسرے درجہ پر مسٹر ہونق اور اخفش اسکوائر ان سب کے بعد آتے تھے اور ڈومنی صرف غصہ کی حالت میں۔ کبھی کبھی میں ان کو بہت دِق کرتا۔ وہ اپنی چٹائی پر بیٹھے کچھ پڑھ رہے ہیں مجھے الجبرے کا ایک سوال دے رکھا ہے اور میں سارے جہان کی ابجد کو ضرب دے دے کر تنگ آچکا ہوں تو میں کاپیوں اور کتابوں کے ڈھیر کو پاؤں سے پرے دھکیل کر اُونچے اُونچے گانے لگتا......

تیرے سامنے بیٹھ کے روناتے دُکھ تینوں نیوں دسنا

داؤجی حیرانی سے میری طرف دیکھتے تو میں تالیاں بجانے لگتا اور قوالی شروع کر دیتا۔ نیوں نیوں نیوں دسنا۔ دُکھ تینوں نیوں دسنا ـــــ دسنادسنادسنادسنا...... تینوں تینوں تینوں تینوں۔ سارے گاماروناروناروناسارے گاماروناروناـــــــ نئے دُکھ تینوں نیوں دسنا۔ [illegible] کے اُوپر سے مسکراتے۔ میرے پاس آکر کاپی اُٹھاتے' صفحہ نکالتے اور میری تالیوں کے درمیان اپنا بڑا سا ہاتھ کھڑا کر دیتے۔

"[illegible] بیٹا" وہ بڑی محبت سے کہتے "یہ کوئی مشکل سوال ہے!" جونہی وہ سوال سمجھانے کے لئے ہاتھ نیچے کرتے میں پھر تالیاں بجانے لگتا [illegible] میں تیرا داؤ نہیں ہوں؟" وہ بڑے مان سے پوچھتے۔

"[illegible]" میں منہ پھاڑ کر کہتا۔

"[illegible] ہے؟" وہ مایوس سے ہو جاتے۔

"[illegible] میں اُنگلی آسمان کی طرف کر کے شرارت سے کہتا "وہ بچی سرکار' وہ سب کا پالنے والا ـــــ بول بکرے سب کا والی کون؟"

"وہ میرے [illegible] لگتے تو میں ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیتا" داؤجی خفا ہو گئے کیا۔"

[illegible] کے [illegible] طنبورے [illegible] [illegible]
[illegible] پر [illegible] کر کہتا [illegible] جب مجھے سوال [illegible]
وہ آرام سے بیٹھ جاتے اور کاپی کھول کر کہتے "شش اسکوائر جب مجھے [illegible] نظر آرہا تھا تو تو نے تیسرا فقرہ حل کیوں نہ [illegible] اگر ایسا نہ بھی کرتا تو......"

اور اس کے بعد پتہ نہیں داؤجی کتنے دن پانی نہ پیتے۔

فروری کے دوسرے ہفتہ کی بات ہے۔ امتحان میں کل ڈیڑھ مہینہ رہ گیا تھا اور مجھ پر آنے والے خطرناک وقت کا خوف بھوت بن کر سوار ہو گیا تھا۔ میں نے خود اپنی پڑھائی پہلے سے تیز کر دی تھی اور کافی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ لیکن جیومیٹری کے مسائل میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ داؤجی نے بہت کوشش کی لیکن بات نہ بنی۔ آخر ایک دن انھوں نے کہا کل باون پراپوزیشنیں ہیں زبانی یاد کر لے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ میں انھیں رٹنے میں مصروف ہو گیا۔ لیکن جو پراپوزیشن رات کو یاد کرتا صبح کو بھول جاتی۔ میں دل برداشتہ ہو کر ہمت چھوڑ ہی بیٹھا۔ ایک رات داؤجی مجھ سے جیومیٹری کی شکلیں بنوا کر اور مشقیں سن کر اٹھے تو وہ بھی کچھ پریشان سے ہو گئے تھے۔ میں بار بار اٹکا تھا اور انھیں بہت کوفت ہوئی تھی۔ مجھے سونے کی تاکید کر کے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں کاپی پنسل لے کر پھر بیٹھ گیا اور رات کے ڈیڑھ بجے تک لکھ لکھ کر رٹا لگاتا رہا۔ مگر جب کتاب بند کر کے لکھنے لگتا تو چند فقروں کے بعد اٹک جاتا۔ مجھے داؤجی کا مایوس چہرہ یاد کر کے اور اپنی حالت کا اندازہ کر کے رونا آگیا' اور میں باہر صحن میں آکر سیڑھیوں پر بیٹھ کر سچ مچ رونے لگا گھٹنوں میں سر رکھے رو رہا تھا اور سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ گذر گیا تو میں نے داؤجی کی عزت بچانے کے لئے یہی ترکیب سوچی کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر چپکے سے نکل جاؤں اور پھر واپس نہ آؤں۔ جب فیصلہ کر چکا اور عملی قدم آگے بڑھانے کے لئے سر اُوپر اُٹھایا تو داؤجی کمبل اوڑھے میرے پاس کھڑے تھے۔ انھوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے ساتھ لگایا تو سسکیوں کا لا متناہی سلسلہ صحن میں پھیل گیا۔ داؤجی نے میرا سر چوم کر کہا" لے بھئی طنبورے میں تو یوں نہ سمجھتا تھا۔ تو تو بہت ہی کم ہمت نکلا۔" پھر انھوں نے مجھے اپنے ساتھ کمبل میں لپیٹ لیا اور بیٹھک میں لے آئے۔ بستر میں بٹھا کر انھوں نے میرے چاروں طرف رضائی لپیٹی اور خود پاؤں اُوپر کر کے کرسی پر بیٹھ گئے۔

انھوں نے کہا" اقلیدس چیز ہی ایسی ہے۔ تو اس کے ہاتھوں یوں نالاں ہے میں اس سے اور طرح تنگ ہوا تھا۔ حضرت مولانا کے پاس جبر و مقابلہ اور اقلیدس کی جس قدر کتابیں تھیں انھیں میں اچھی طرح پڑھ کر اپنی کاپیوں پر اُتار چکا تھا۔ کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے الجھن ہوتی۔ میں نے یہ جانا کہ ریاضی کا ماہر ہو گیا ہوں۔ لیکن ایک رات میں اپنی کھاٹ پر پڑا متساوی الساقین کے ایک مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ بات اُلجھ گئی۔ میں نے دیا جلا کر شکل بنائی اور اس پر غور کرنے لگا۔ جبر و مقابلہ کی رُو سے اس کا جواب ٹھیک آتا تھا۔ لیکن علم علم ہندسہ سے پایہ ثبوت کو نہ پہنچتا تھا۔ میں ساری رات کاغذ سیاہ کرتا رہا لیکن تیری طرح سے رویا نہیں۔ علی الصبح میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انھوں نے اپنے دستِ مبارک سے کاغذ پر شکل کھینچکر سمجھانا شروع کیا۔ لیکن جہاں مجھے اُلجھن تھی وہیں حضرت مولانا کی طبع رسا کو بھی کوفت ہوئی۔ فرمانے لگے "چنت رام اب ہم تم کو نہیں پڑھا سکتے۔ جب اُستاد اور شاگرد کا علم ایک سا ہو جائے تو شاگرد کو کسی اور معلم کی طرف رجوع کرنا چاہئے"۔ میں نے جرات کر کے کہہ دیا کہ حضور اگر کوئی اور یہ جملہ کہتا تو میں اسے کفر کے مترادف سمجھتا۔ لیکن آپ کا ہر حرف اور ہر شوشہ میرے لئے حکم ربانی سے کم نہیں اس لئے خاموش ہوں بھلا آقائے غزنوی کے سامنے ایاز کی مجال! لیکن حضور مجھے بہت دُکھ ہوا ہے۔ فرمانے لگے تم بیحد جذباتی آدمی ہو۔ بات تو سُن لی ہوتی' میں نے سر جھکا کر کہا ارشاد! فرمایا" دہلی میں حکیم ناصر سیستانی علم ہندسہ کے بڑے ماہر ہیں اگر تم کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو ان کے پاس چلے جاؤ اور اکتسابِ علم کرو۔ ہم ان کے نام

دیں گے۔ میں نے رضامندی ظاہر کی تو فرمایا اپنی والدہ سے پوچھ لینا اگر وہ رضامند ہوں تو ہمارے پاس آنا [illegible] اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق جواب پانا انہونی بات تھی۔ چنانچہ میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ حضور پوچھتے تو [illegible] لیتا کہ گھر کی لیپائی تپائی کر رہا ہوں جب فارغ ہوں گا تو والدہ سے عرض کروں گا۔

چند ایام بڑے اضطرار کی حالت میں گذرے۔ میں دن رات اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرتا کہ [illegible] جواب پر آمادہ ہوتا۔ اس لاینحل مسئلہ سے طبیعت میں اور انتشار پیدا ہوا۔ میں دِلّی جانا چاہتا تھا لیکن حضور سے اجازت مل سکتی تھی نہ ڈر تھا وہ والدہ کی رضامندی کے بغیر اجازت دینے والے نہ تھے اور والدہ اس بڑھاپے میں کیسے آمادہ ہو سکتی تھیں ——— ایک رات جب سارا گاؤں سو رہا تھا اور میں تیری طرح پریشان تھا۔ تو میں نے اپنی والدہ کی پٹاری سے اس کی کل پونجی دو روپے چرائے اور نصف اس کے لئے چھوڑ کر گاؤں سے نکل گیا۔ خدا مجھے معاف کرے اور میرے دونوں بزرگوں کی روحوں کو مجھ پر مہربان رکھے! واقعی میں نے بڑا گناہ کیا اور ابد تک میرا سر ان دونوں کرمفرماؤں کے سامنے ندامت سے جھکا رہے گا ——— گاؤں سے نکل کر میں حضور کی حویلی کے پیچھے ان کے مسند کے پاس پہنچا جہاں بیٹھ کر آپ پڑھاتے تھے۔ گھٹنوں کے بل ہو کر میں نے زمین کو بوسہ دیا اور دل میں کہا 'بد قسمت ہوں' بے اجازت جا رہا ہوں۔ لیکن آپ کی دعاؤں کا عمر بھر محتاج رہونگا۔ میرا قصور معاف نہ کیا تو آپ کے قدموں میں جان دے دونگا۔ اتنا کہہ کر اور لاٹھی کندھے پر رکھ کر میں وہاں سے چل دیا ——— سُن رہا ہے؟"

داؤجی نے میری طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

رضائی کے بیچ خارپشت بنے میں نے آنکھیں جھپکائیں اور ہولے سے کہا "جی؟"

داؤجی نے پھر کہنا شروع کیا "قدرت نے میری کمال مدد کی۔ اُن دنوں جاکھل جیند براستہ حصار والی ریل کی پٹڑی بن رہی تھی۔ یہی سیدھا راستہ دِلّی کو جاتا تھا اور یہیں مزدوری ملتی تھی۔ ایک دن میں مزدوری کرتا اور دو دن چلتا' اس طرح تائیدِ غیبی کے سہارے سولہ دن میں دِلّی پہنچ گیا۔ منزلِ مقصود تو ہاتھ آ گئی تھی۔ لیکن گوہر مقصود کا سُراغ نہ ملتا تھا جس کسی سے پوچھتا حکیم ناصر علی سیستانی کا دولت خانہ کہاں ہے نفی میں جواب ملتا۔ دو دن کی تلاش جاری رہی لیکن پتہ نہ پا سکا۔ قسمت یاور تھی صحت اچھی تھی۔ انگریزوں کے لئے نئی کوٹھیاں بن رہی تھیں۔ وہاں کام پر جانے لگا۔ شام کو فارغ ہو کر حکیم صاحب کا پتہ معلوم کرتا اور رات کے وقت ایک دھرم شالہ میں کھیس پھینک کر گہری نیند سو جاتا۔ مثل مشہور ہے جو یندہ یابندہ! آخر ایک دن مجھے حکیم صاحب کی جائے رہائش معلوم ہو گئی' وہ پتھر [illegible]وٹوں کے محلہ کی ایک تیرہ و تاریک گلی میں رہتے تھے۔ شام کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں [illegible] تھے اور چند دوستوں سے اونچے اُونچے گفتگو ہو رہی تھی۔ میں جوتے اُتار کر دہلیز کے اندر کھڑا ہو گیا۔ ایک صاحب نے [illegible] ہے؟" میں نے سلام کر کے کہا "حکیم صاحب سے ملنا ہے۔" حکیم صاحب دوستوں کے حلقہ میں سر جھکائے بیٹھے اور ان کی [illegible] تھی۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بولے "اسم گرامی" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا "پنجاب سے آیا ہوں اور......." میں بات پوری [illegible] ور سے بولے "ہوہو! چنت رام ہو؟ میں کچھ جواب نہ دے سکا فرمانے لگے مجھے اسماعیل کا خط ملا ہے لکھتا ہے شاید چنت [illegible] ہمیں بتائے بغیر گھر سے فرار ہو گیا ہے۔ اس کی مدد کرنا۔ میں اسی طرح خاموش کھڑا رہا تو پاٹ دار آواز میں بولے [illegible] کا روزہ رکھا ہے؟" میں ذرا آگے بڑھا تو بھی میری طرف نہ دیکھا اور ویسے ہی عروس نو کی طرح بیٹھے رہے پھر [illegible] کہا "برخوردار بیٹھ جاؤ" میں وہیں بیٹھ گیا تو اپنے دوستوں سے فرمایا' بھئی ذرا ٹھہرو مجھے اس سے دو دو ہاتھ کر لینے [illegible] کونسا مسئلہ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا تو انھوں نے اسی طرح کندھوں کی [illegible] آہستہ آہستہ کرتے یوں اُوپر کھینچ لیا کہ ان کی کمر برہنہ ہو گئی۔ پھر فرمایا "بتاؤ اپنی اُنگلی سے

میری کاپی پر ایک متساوی الساقین مثلث بنا تھی۔ مثلث پر نقطہ کا نام [illegible] گئے تھے [illegible] کے [illegible]
میاں جلدی کرو۔ جا رہا ہوں۔ کاغذ قلم کچھ نہیں سمجھنے میں دو تین [illegible] کے پیچھا [illegible] کی چاروں چال کر کا [illegible] ہوئی آگل سے
متساوی الساقین بننے لگا۔ جب وہ غیر مرئی شکل بن چکی تو بولے اب اس نقطہ کی طرف [illegible] گر [illegible] ایک تو میں گھبرایا ہوا؟
دوسرے وہاں کچھ نہ آتا تھا۔ یونہی اٹکل سے میں نے ایک مقام پر انگلی رکھ کر چھوڑ [illegible] تو جھڑکی سے بولے یہ ہے کیا کرتے ہو۔
نقطہ س ہے کیا؟ پھر خود ہی بولے آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے۔ بائیں کندھے سے کوئی چوہ انگل نیچے نقطہ س ہے وہاں خط کھینچو ___ اللہ
اکبر اللہ اکبر کیا علم تھا۔ کیا آواز تھی اور کیسی تیز فہم تھی۔ وہ بول رہے تھے اور میں مبہوت بیٹھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابھی ان کے آخری
جملے کے ساتھ نور کی لکیریں متساوی الساقین بن کر ان کی کمر پر اُبھر آئیں گی۔ "پھر داؤجی ہوتی کے وقوں میں ڈوب گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی
تھیں وہ میری طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے بے تابی ہو کر پوچھا "پھر کیا ہوا داؤجی؟" انھوں نے کرسی
سے اُٹھتے ہوئے کہا "رات بہت گذر چکی ہے۔ اب تو سو جا پھر بتاؤں گا" میں ضدی بچے کی طرح ان کے پیچھے پڑ گیا تو انھوں نے کہا "پہلا
وعدہ کر کہ آئندہ مایوس نہیں ہوگا اور ان چھوٹی چھوٹی پراپوزیشنوں کو بتاشے سمجھے گا" میں نے جواب دیا "حلوا سمجھوں گا آپ فکر نہ
کریں" انھوں نے کھڑے کھڑے کمبل لپیٹتے ہوئے کہا "بس مختصر یہ کہ میں ایک سال حکیم صاحب کی حضوری میں رہا اور اس بحر علم سے
چند قطرے حاصل کر کے اپنی کور آنکھوں کو دھویا۔ واپسی پر میں سیدھا اپنے آقا کی خدمت میں پہنچا اور ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔
فرمانے لگے چنت رام اگر ہم میں قوت ہو تو ان پاؤں کو کھینچ لیں۔ اس پر میں رو دیا تو دست مبارک محبت سے میرے سر پر پھیر کر کہنے لگے
ہم تم سے ناراض نہیں ہیں لیکن ایک سال کی مفارقت بہت طویل ہے۔ آئندہ کہیں جانا تو ہمیں بھی ساتھ لے جانا' یہ کہتے ہوئے داؤجی
کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ مجھے اسی طرح گم سم چھوڑ کر بیٹھک سے باہر نکل گئے۔

امتحان کی قربت سے میرا خون خشک ہو رہا تھا لیکن جسم پھول رہا تھا۔ داؤجی کو میرے موٹاپے کی فکر رہنے لگی۔ اکثر میرے تھوڑ
میتنے ہاتھ پکڑ کر کہتے 'اسپ تازی بن طویلہ خر نہ بن۔ مجھے ان کا یہ فقرہ بہت ناگوار گذرتا اور میں احتجاجاً ان سے کلام بند کر دیتا۔ میرے
مسلسل مون برت نے بھی ان پر کوئی اثر نہ کیا اور ان کی فکر اندیشہ کی حد تک پہنچ گئی۔ ایک صبح سیر کو جانے سے پہلے انھوں نے مجھے آ جگا
اور میری منتوں، خوشامدوں، گالیوں اور جھڑکیوں کے باوجود بستر سے اُٹھا کر کوٹ پہنا کر کھڑا کر دیا۔ پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گویا گھسیٹتے
ہوئے باہر لے گئے۔ سردیوں کی صبح کوئی چار کا عمل۔ گلی میں نہ آدم نہ آدم زاد' تاریکی سے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا اور داؤجی مجھے اسی
طرح سیر کو لے جا رہے تھے۔ میں کچھ بک رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے ابھی گراں خوابی دور نہیں ہوئی ابھی طنبورا بڑبڑا رہا ہے۔ تھوڑے
تھوڑے وقفہ کے بعد کہتے کوئی سر نکال طنبورے کسی آہنگ پر بج یہ کیا کر رہا ہے!' جب ہم بستی سے دُور نکل گئے اور صبح کی یخ ہوا نے
میری آنکھوں کو زبردستی کھول دیا تو داؤجی نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ سرداروں کا رہٹ آیا اور نکل گیا۔ ندی آئی اور پیچھے رہ گئی' قبرستان گذر
گیا مگر داؤجی تھے کہ کچھ آیتیں سی پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جب تھہہ پر پہنچے تو میری روح فنا ہو گئی۔ یہاں سے لوگ دوپہر کے وقت بھی
نہ گذرتے تھے کیونکہ پرانے زمانے میں یہاں ایک شہر غرق ہوا تھا۔ مرنے والوں کی روحیں اسی ٹیلے پر رہتی تھیں اور آنے جانے والوں کا
کلیجہ چبا جاتی تھیں۔ میں خوف سے کانپنے لگا تو داؤجی نے میرے گلے کے گرد مفلر اچھی طرح لپیٹ کر کہا۔

سامنے ان دو کیکروں کے درمیان اپنی پوری رفتار سے دس چکر لگاؤ' پھر سو لمبی سانسیں کھینچو اور چھوڑ دو' تب میرے پاس آؤ' میں
یہاں بیٹھتا ہوں۔ میں تھہہ سے جان بچانے کے لئے سیدھا ان کیکروں کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے ایک بڑے سے ڈھیلے پر بیٹھ کر آرام کیا
اور ساتھ ہی حساب لگایا کہ چھ چکروں کا وقت گزر چکا ہو گا' اس کے بعد آہستہ آہستہ اُونٹ کی طرح کیکروں کے درمیان دوڑنے لگا اور
جب دس یعنی چار چکر پورے ہو گئے تو پھر اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگا۔ ایک تو درختوں پر عجیب و غریب قسم کے جانور

جانے لگے تھے دوسرے میری پسلی میں بلا کا درد شروع ہو گیا تھا۔ یہی مناسب سمجھا کہ قصبہ پر جا کر داؤجی کو سوئے سے اٹھاؤں اور گھر نے جا کر خوب خاطر کروں اغصہ سے بھرا اور وحشت سے لرزتا میں ٹیلے کے پاس پہنچا۔ داؤجی قصبہ کی ٹھیکریوں پر گھٹنے ٹیکے ہی کرتے ہوئے دیوانوں کی طرح سر مار رہے تھے اور اُونچے اُونچے اپنا محبوب شعر گا رہے تھے۔

جفا کم کن کہ فردا روز محشر

بہ پیش عاشقاں شرمندہ باشی!

کبھی دونوں ہتھیلیاں زور سے زمین پر مارتے اور سر اُوپر اُٹھا کہ انگشتِ شہادت فضا میں یوں ہلاتے جیسے کوئی ان کے سامنے کھڑا ہو اور اس سے کہہ رہے ہوں دیکھ لو 'سوچ لو' میں تمھیں...... میں تمھیں بتا رہا ہوں...... سُنا رہا ہوں...... ایک دھمکی دیئے جاتے تھے پھر تڑپ کر ٹھیکریوں پر گرتے اور جفا کم کن جفا کم کن کہتے ہوئے رونے سے لگتے۔ تھوڑی دیر میں ساکت و جامد وہاں کھڑا رہا اور پھر زور سے چیخ مار کر کہا، بجائے قصبہ کی طرف بھاگنے کے پھر کیکروں کی طرف دوڑ گیا۔ داؤجی ضرور اسم اعظم جانتے تھے اور وہ جن قابو کر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک جن ان کے سامنے کھڑا دیکھا تھا۔ بالکل الف لیلہ با تصویر والا جن تھا۔ جب داؤجی کا طلسم اس پر نہ چل سکا تو اس نے انھیں نیچے گرا لیا تھا۔ وہ چیخ رہے تھے جفا کم کن جفا کم کن مگر وہ چھوڑتا نہیں تھا۔ میں اس ڈھیلے پر بیٹھ کر رونے لگا ___ تھوڑی دیر بعد داؤجی آئے انھوں نے پہلے جیسا چہرہ بنا کر کہا" چل طنبورے "اور میں ڈرتا ڈرتا ان کے پیچھے ہو لیا۔ راستہ میں انھوں نے گلے میں لٹکتی ہوئی کھلی پگڑی کے دونوں کونے ہاتھ میں پکڑ لئے اور جھوم جھوم کر گانے لگے۔

تیرے سلے ملے واں فریدا ٹریا جا!

اس جادوگر کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے ان آنکھوں سے دیکھا کہ اس کا سر تبدیل ہو گیا اس کی لمبی لمبی زلفیں کندھوں پر جھولنے لگیں اور اس کا سارا وجود جٹا دھاری ہو گیا ___ اس کے بعد چاہے کوئی میری بوٹی بوٹی اڑا دیتا میں ان کے ساتھ سیر کو ہرگز نہ جاتا!

اس واقعہ کے چند ہی دن بعد کا قصہ ہے کہ ہمارے گھر میں مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے اور اینٹوں کے ٹکڑے آکر گرنے لگے۔ بے بے نے آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ بچوں والی کتیا کی طرح داؤجی سے چمٹ گئی۔ سچ مچ اس سے لپٹ گئی اور انھیں دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ وہ چلا رہی تھی "بڈھے ٹونکی یہ سب تیرے منتر ہیں۔ یہ سب تیری خارسی ہے۔ تیرا کالا علم ہے جو اُلٹا ہمارے سر پر آ گیا ہے۔ تیرے پریت میرے گھر میں اینٹیں پھینکتے ہیں۔ اُجاڑ مانگتے ہیں۔ موت چاہتے ہیں۔" پھر وہ زور زور سے چیخنے لگی "میں مر گئی' میں جل گئی' لوگو اس بڈھے نے میرے امی چند کی جان لینے کا بندھ کیا ہے۔ مجھ پر جادو کیا ہے' میرا انگ انگ توڑ دیا ہے" امی چند تو داؤجی کو اپنی زندگی کی طرح عزیز تھا وہ اس کی جان کے دشمن بھلا دہ کیونکر ہو سکتے تھے لیکن جنوں کی خشت باری انھیں کی وجہ سے عمل میں آئی تھی۔ جب میں نے بھی بے بے کی تائید کی تو داؤجی نے زندگی میں پہلی بار مجھے جھڑک کر کہا "تو احمق ہے اور تیری بے بے اُمّ الجاہلین ___ میری ایک سال کی تعلیم کا یہ صلہ کہ تو جنوں بھوتوں میں اعتقاد کرنے لگا۔ افسوس تو نے مجھے مایوس کر دیا' اے وائے کہ تو شعور کی بجائے عورتوں کے اعتقاد کا ... افسوس ___ صد افسوس" بے بے کو اُسی طرح چلاتے اور داؤجی کو یوں کراہتے چھوڑ کر میں اُوپر کوٹھے پر دھوپ میں جا بیٹھا ... شام کو جب میں اپنے گھر سے آ رہا تھا تو راستے میں راتو نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ کانی کر کے پوچھا "سُنا بابو تیرے کوئی ... نہیں لگا؟ سُنا ہے تمھارے پنڈت کے گھر میں روڑے گرتے ہیں۔"

میں ... کیا اور چپ چاپ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ رات کے وقت داؤجی مجھ سے جیومیٹری کی پرابلم ... 'بھوت یا پری چڑیل کو کوئی مخلوق سمجھتے ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ ہنس

[illegible] نے "داؤجی [illegible] ہوتا ہے اور میں نے [illegible] [illegible] ہم نے جو دلیل [illegible] [illegible] کسی [illegible] کر لیتے [illegible] بیٹھے کا کام ہی کرتے ہیں کہ چٹائی بھی کر لیتے ہیں [illegible] کر لو مگر جس دن سر پہ [illegible] "داؤجی نے کہا۔ "تیرے جن کو تھپکی ہوئی اجند سے تو [illegible] سکتا اس لئے کہ [illegible] جائے گی اور نہ میرے تیرے یا تیری بے بے کے سر میں لگے گی۔"

پھر بولے "حسن! علم طبعی کا موٹا اصول ہے کہ کوئی مادی شے کسی غیر مادی وجود سے حرکت میں نہیں لائی جا سکتی ____ سمجھ گیا؟"

"سمجھ گیا" میں نے چڑ کر کہا۔

ہمارے قصبہ میں ہائی سکول ضرور تھا۔ لیکن میٹرک کے امتحان کا سنٹر نہ تھا۔ امتحان دینے کے لئے ہمیں ضلع جانا ہوتا تھا۔ چنانچہ وہ صبح آ گئی جب ہماری جماعت امتحان دینے کے لئے ضلع جاری تھی اور لاری کے ارد گرد والدین قسم کے لوگوں کا ہجوم جمع تھا اور اس ہجوم سے داؤجی کیسے پیچھے رہ سکتے تھے اور سب لڑکوں کے گھر والے انھیں خیر و برکت کی دعاؤں سے نواز رہے تھے اور داؤجی سارے سال کی پڑھائی کا خلاصہ تیار کر کے جلدی جلدی سوال پوچھ رہے تھے اور میرے ساتھ ساتھ خود ہی جواب دیتے جاتے تھے۔ اکبر کی اصلاحات سے اچھل کر موسم کے تغیر و تبدل پر پہنچ جاتے وہاں سے پلٹتے تو "اس کے بعد اور بادشاہ آیا کہ اپنی وضع سے ہندو معلوم ہوتا تھا۔ وہ نشہ میں چور تھا ایک صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آئی تھی اور جدھر چاہتی تھی پھراتی تھی" کہہ کر پوچھتے یہ کون تھا؟

"جہانگیر" میں نے جواب دیا اور وہ عورت "نور جہاں" ہم دونوں ایک ساتھ بولے ____ "صفت مشبہ اور اسم فاعل میں فرق؟"

میں نے دونوں کی تعریفیں بیان کیں۔ بولے مثالیں؟ میں نے مثالیں دیں۔ سب لڑکے لاری میں بیٹھ گئے اور میں ان سے جان چھڑا کر جلدی سے داخل ہوا۔ تو گھوم کر کھڑکی کے پاس آ گئے اور پوچھنے لگے۔ بریک ان اور بریک اِن ٹو کو فقروں میں استعمال کرو۔ ان کا استعمال بھی ہو گیا اور موٹر سٹارٹ ہو چلی تو اس کے ساتھ قدم اُٹھا کر بولے طنبورے مادیاں گھوڑی ماکیاں مرغی.....مادیاں گھوڑی......ماکیاں.......مرغی ____ ایک سال بعد خدا خدا کر کے یہ آواز دُور ہوئی اور میں نے آزادی کا سانس لیا!

پہلے دن تاریخ کا پرچہ بہت اچھا ہوا۔ دوسرے دن جغرافیہ کا اس سے بھی بڑھ کر تیسرے دن اتوار تھا اور اس کے بعد حساب کی باری تھی اتوار کی صبح کو داؤجی کا کوئی بیس صفحہ لمبا خط ملا جس میں الجبرے کے فارمولوں اور حساب کے قاعدوں کے علاوہ اور کوئی بات نہ تھی۔

حساب کا پرچہ کرنے کے بعد برآمدے میں میں نے لڑکوں سے جوابات ملائے تو سو میں سے اسی نمبر کا پرچہ ٹھیک تھا۔ میں خوشی سے [illegible] ہو گیا۔ زمین پر پاؤں نہ پڑتا تھا اور میرے منہ سے مسرت کے نعرے نکل رہے تھے۔ جونہی میں نے برآمدے سے پاؤں باہر نکالا [illegible] کھڑے پر ڈالے ایک لڑکے کا پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں چیخ مار کر ان سے لپٹ گیا اور "اسی نمبر! اسی نمبر" کے نعرے لگانے [illegible] انھوں نے پرچہ میرے ہاتھ سے چھین کر تلخی سے پوچھا "کون سوال غلط ہو گیا؟" میں نے جھوم کر کہا "چار دیواری والا [illegible] کھڑکیاں اور دروازے منفی نہ کئے ہوں گے" میں نے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر پیڑ کی طرح جھلاتے ہوئے کہا "ہاں [illegible] کھڑکیوں کو" داؤجی ڈوبی ہوئی آواز میں بولے "تو نے مجھے برباد کر دیا طنبورے سال کے تین سو پینسٹھ دن میں [illegible] کا سوال آنکھیں کھول کر حل کرنا مگر تو نے میری بات نہ مانی۔ تو نے میری بات نہ مانی۔ بیس نمبر ضائع کئے.....[illegible]

اور داؤجی [illegible] فیصدی کامیابی [illegible] فیصدی ناکامی کے نیچے یوں دب گئی گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ راستہ بھر وہ

اپنے آپ سے کہتے رہے "اگر ممتحن اچھے دل کا ہوا تو دو ایک نمبر تو ضرور دے گا' تیرا باقی حل تو ٹھیک ہے [illegible] امتحان کے آخری دن تک میرے ساتھ رہے وہ رات کے بارہ بجے تک مجھے اس سرائے میں بیٹھ کر پڑھاتے جہاں [illegible] اور اس کے بعد بقول ان کے اپنے ایک دوست کے ہاں چلے جاتے۔ صبح آٹھ بجے پھر آجاتے اور کمرہ امتحان تک میرے ساتھ جاتے۔

امتحان ختم ہوتے ہی میں نے داؤجی کو یوں چھوڑ دیا گویا میری ان سے جان پہچان ہی نہ تھی۔ سارا دن آوارہ دوستوں یاروں کے ساتھ گھومتا اور شام کو ناولیں پڑھا کرتا۔ اس دوران میں اگر کبھی فرصت ملتی تو داؤجی کو سلام کرنے بھی چلا جاتا۔ وہ اس بات پر مصر تھے کہ میں ہر روز کم از کم ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گزارا کروں تاکہ وہ مجھے کالج کی پڑھائی کے لئے بھی تیار کر دیں۔ لیکن میں ان کے پھندے میں آنے والا نہ تھا۔ مجھے کالج میں سو بار فیل ہونا گوارا تھا اور ہے لیکن داؤجی سے پڑھنا منظور نہیں۔ پڑھنے کو چھوڑیئے ان سے باتیں کرنا بھی مشکل تھا۔ میں نے کچھ پوچھا انھوں نے کہا اس کا فارسی میں ترجمہ کرو' میں نے کچھ جواب دیا فرمایا اس کی ترکیب نحوی کرو۔ حوالداروں کی گائے اندر گھس آئی۔ میں اسے لکڑی سے باہر نکال رہا ہوں اور داؤجی پوچھ رہے ہیں Cow ناؤن ہے یا ورب۔ اب ہر عقل کا اندھا پانچویں جماعت تک پڑھا جاتا ہے کہ گائے اسم ہے مگر داؤجی فرمار ہے ہیں کہ اسم بھی ہے اور فعل بھی To Cow کا مطلب ہے ڈرانا۔ دھمکی دینا اور یہ ان دنوں کی باتیں ہیں جب میں امتحان سے فارغ ہو کر نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا____ پھر ایک وہ دن بھی آیا جب ہم چند دوست شکار کھیلنے کے لئے نکلے تو میں نے ان سے درخواست کی کہ منصفی کے آگے سے نہ جائیں۔ کیونکہ وہاں داؤجی ہوں گے اور مجھے روک کر شکار۔ بندوق اور کارتوسوں کے محاورے پوچھنے لگیں گے۔ بازار میں دکھائی دیتے تو میں کسی بغل گلی میں گھس جاتا۔ گھر پر سامنے جاتا تو بے بے سے زیادہ اور داؤجی سے کم باتیں کرتا۔ اکثر کہا کرتے۔ افسوس آفتاب کی طرح تو بھی ہمیں فراموش کر رہا ہے میں شرارتاً خیلے خوب نیلے خوب کہہ کر ہنسنے لگتا۔

جس دن نتیجہ نکلا اور اباجی لڈوؤں کی چھوٹی سی ٹوکری لیکر ان کے گھر گئے۔ داؤجی سر جھکائے اپنے حصیر میں بیٹھے تھے۔ اباجی کو دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اندر سے کرسی اُٹھا لائے اور اپنے بوریئے کے پاس ڈال کر بولے "ڈاکٹر صاحب آپ کے سامنے شرمندہ ہوں لیکن اسے بھی مقسوم کی خوبی سمجھئے' میرا خیال تھا کہ اس کی فرسٹ ڈویژن آجائے گی۔ لیکن نہ آسکی۔ بنیاد کمزور تھی......."

"ایک ہی تو نمبر کم" میں نے چمک کر بات کاٹی۔"

اور وہ میری طرف دیکھ کر بولے "تو نہیں جانتا اس ایک نمبر سے میرا دل دو نیم ہو گیا ہے خیر میں اسے منجانب اللہ خیال کرتا ہوں۔"

پھر اباجی اور وہ باتیں کرنے لگے اور میں بے بے کے ساتھ گپیں لڑانے میں مشغول ہو گیا۔

اوّل اوّل کالج سے میں داؤجی کے خطوں کا باقاعدہ جواب دیتا رہا۔ اس کے بعد بے قاعدگی سے لکھنے لگا' اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا چھٹیوں میں جب گھر آیا تو جیسے سکول کے دیگر ماسٹروں سے ملتا ویسے ہی داؤجی کو بھی سلام کر آتا۔ اب وہ مجھ سے سوال وغیرہ نہ پوچھتے تھے۔ کوٹ' پتلون اور ٹائی دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ چارپائی پر بیٹھنے نہ دیتے۔ اگر مجھے اٹھانے نہیں دیتا تو خود کرسی لے لیتے اور میں کرسی کھینچ کر ان کے پاس ڈٹ جاتا۔ کالج لائبریری سے میں جو کتابیں ساتھ لایا کرتا انھیں دیکھنے کی تمنا ضرور کرتے اور میرے وعدے کے باوجود اگلے دن خود ہمارے گھر آکر کتابیں دیکھ جاتے۔ ابّی چند بوجوہ کالج چھوڑ کر بنک میں ملازم ہو گیا تھا اور دلّی چلا گیا تھا۔ بے بے کی سلائی کا کام بدستور تھا۔ داؤجی منصفی جاتے تھے۔ لیکن کچھ نہ لاتے تھے۔ بی بی کے خط آتے تھے وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی____ کالج کی ایک سال کی زندگی نے مجھے داؤجی سے بہت دُور کھینچ لیا۔ وہ لڑکیاں جو دو سال پہلے ہمارے ساتھ آبوٹاپو کھیلا کرتی تھیں بعدِ عم بن گئی تھیں۔ [illegible] کے زمانے کی ہر چھٹی میں آبوٹاپو میں گزارنے کی کوشش کرتا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا۔

[illegible] کے سامنے احمد آباد کا [illegible]

[illegible] میں نے پہلی مرتبہ ایک خوبصورت [illegible] کو [illegible]
[illegible] کی جھنیوں میں داؤجی سے [illegible] ایسے ہی [illegible]
[illegible] رہے...... ملک کو آزادی ملنے لگی تو کچھ ہونے [illegible] ہر طرف سے فسادات کی خبریں آنے
[illegible] نے ہم سب کو گھر بلا لیا۔ ہمارے لئے یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔ [illegible] گھر بار چھوڑ کر بھاگ رہے تھے۔ لیکن دوسرے
لوگ خاموش تھے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہی لوگ یہ خبر لائے کہ آزادی مل گئی'! ایک دن
ہمارے قصبے میں بھی چند گھروں کو آگ لگی اور دوناکوں پر سخت لڑائی ہوئی۔ [illegible] فوجی کے سپاہیوں نے کرفیو لگا دیا اور جب
کرفیو ختم ہوا تو سب ہندو سکھ قصبہ چھوڑ کر چل دیئے' دوپہر کو اماں نے مجھے داؤجی کی خبر لینے کو بھیجا تو اس جانی پہچانی گلی میں عجیب و
غریب صورتیں نظر آئیں۔ ہمارے گھر یعنی داؤجی کے گھر کی ڈیوڑھی میں ایک بیل بندھا تھا اور اس کے پیچھے بوری کا پردہ لٹک رہا تھا۔
میں نے گھر آ کر بتایا کہ داؤجی اور بے بے اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور یہ کہتے ہوئے میرا گلا رندھ گیا۔ اس دن مجھے یوں لگا جیسے داؤجی
[illegible] کے لئے چلے گئے ہیں اور اب لوٹ کر نہ آئیں گے۔ داؤجی ایسے بے وفا تھے! ____

کوئی تیسرے روز غروب آفتاب کے بہت بعد جب میں مسجد میں نئے پناہ گزینوں کے نام نوٹ کر کے اور کمبل بھجوانے کا وعدہ کر کے اس گلی سے گزرا تو کھلے میدان میں سو دو سو آدمیوں کی بھیڑ جمع دیکھی۔ مہاجر لڑکے لاٹھیاں پکڑے نعرے لگا رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے تماشائیوں کو پھاڑ کر مرکز میں گھسنے کی کوشش کی مگر مہاجرین کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ ایک لڑکا کسی بزرگ سے کہہ رہا تھا۔

"ساتھ کے گاؤں میں گیا ہوا تھا جب لوٹا تو اپنے گھر میں گھستا چلا گیا۔"

"کونسے گھر میں؟" بزرگ نے پوچھا۔

"مرہٹی مہاجروں کے گھر میں" لڑکے نے کہا۔

"پھر کیا انھوں نے پکڑ لیا۔ دیکھا تو ہندو نکلا۔"

[illegible] بھیڑ میں سے کسی نے چلا کر کہا "ہوئے راتو جلدی آ ادے جلدی آ ____ تیری سامی ____
____ تیری سامی۔"

[illegible] کا ریوڑ باڑے کی طرف لے جا رہا تھا۔ انھیں روک کر اور ایک لاٹھی والے لڑکے کو ان کے آگے کھڑا کر کے وہ بھیڑ [illegible] کو ایک دھکا سا لگا جیسے انھوں نے داؤجی کو پکڑ لیا ہو۔ میں نے ملزم کو دیکھے بغیر اپنے قریبی لوگوں سے کہا۔
[illegible] بڑا ایک آدمی ہے ____ اسے کچھ مت کہو...... یہ تو ... . یہ تو "خون میں نہائی ہوئی چند آنکھوں نے میری طرف [illegible] ایک نوجوان گنڈاسی تول کر بولا۔

[illegible] ____ آگیا بڑا حمایتی بن کر ____ تیرے ساتھ کچھ ہوا نہیں نا" اور لوگوں نے گالیاں بک کر کہا "انصار ہو گا [illegible]"

میں [illegible] بھیڑ میں گھس گیا۔ رانو کی قیادت میں اس کے دوست داؤجی کو گھیرے کھڑے تھے اور رانو داؤجی کی تھوڑی پکڑ کر [illegible] بول بیٹا اب بول" اور داؤجی خاموش کھڑے تھے' ایک لڑکے نے پگڑی اُتار کر کہا "پہلے [illegible]

[illegible] دی" اور راتو نے سوا کیں کاٹنے والی درانتی سے داؤجی کی بودی کاٹ دی۔ وہی لڑکا پھر بولا "بابا جی سے [illegible] ہے میرے ساتھ بکریاں چرا لیا کرے گا" پھر اس نے داؤجی کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "کلمہ پڑھ [illegible] بولے:-

"کون؟"

راتو نے ان کے ننگے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا "سالے کلمے بھی کئی پانچ سات ہیں؟"

جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو راتو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا "چل بکریاں تیری انتظاری کرتی ہیں۔"

اور ننگے سر داؤجی بکریوں کے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فرید اچل رہا ہو!

راون کے دیس میں

اے حمید

ہمارا اسٹیمر بڑی ہموار رفتار کے ساتھ لنکا کی طرف بڑھ رہا تھا۔

آسمان پر اکا دُکا تارے نمودار ہونے لگے تھے اور سمندر کا گہرا سبز رنگ سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ آبی پرندے ہمارا ساتھ چھوڑ کر ساحل کی جانب اُڑ گئے تھے مرطوب ہوا میں رچی ہوئی خنکی' ہمارے کپڑوں سے موم بن کر چپک رہی تھی۔ تقریباً اڑھائی گھنٹے کے پرسکون سمندری سفر کے بعد ہمیں دُور ___ لنکا کے ساحل پر روشنی کے مینار کی جلتی بجھتی بتی نظر آئی۔ امی اور چھوٹا بھائی بے تابی سے اس روشنی کو دیکھنے لگے جو جگنو کی مانند پل بھر چمک کر پھر بجھ جاتی تھی۔ ڈیک کے جنگلے کے ساتھ لگے کھڑے اور مسافر بھی اسے اشتیاق بھری نگاہوں سے تک رہے تھے۔ جوں جوں ساحل قریب آ رہا تھا' کئی اور جگہوں پر بھی دھندلی دھندلی روشنیاں اُبھرنے لگی تھیں۔

کھاڑی میں پہنچ کر سٹیمر نے دو تین بار وِسل دیا اور ڈیک پر لگی ہوئی مشین گڑگڑاہٹ کے ساتھ لنگر پھینکنے لگی۔ گودی پر بالکل تیار کھڑے اور ننگے مزدوروں نے موٹے موٹے رسے ڈیک کی طرف اُچھالے اور تھوڑی دیر کے بعد ہمارا اسٹیمر بڑے آرام سے کنارے آن لگا۔

یہ لنکا کی شمال مشرقی بندرگاہ تالی مینار تھی

گودی پر ایک طرف کولمبو ایکسپریس تیار کھڑی تھی۔ کسٹم والوں سے بمشکل تمام چھٹکارا پانے کے بعد جب ہم گاڑی میں سوار ہو گئے تو باہر طرف ناریل اور سپاری کے درختوں تلے چھوٹے چھوٹے چائے خانوں میں گراموفون ریکارڈ بجنے لگے۔

"ساون کے بادلو ___ اور ل کے بچھڑ گئیں اکھیاں۔

ہمارے چہرے حیرت اور مسرت کے ملے جلے احساسات سے چمکنے لگے۔ اپنے وطن کے گلی کوچوں میں سنے ہوئے گیتوں کی ایک ہی لے نے پرائے دیس کی اجنبیت کو ایک دم زائل کر دیا اور ہمیں یوں معلوم ہونے لگا گویا ہم کسی طویل سمندری سفر کے بعد اپنے وطن میں داخل ہو رہے ہوں۔

رات بھر کولمبو ایکسپریس برق رفتاری کے ساتھ جزیرہ سنگلدیپ کے مہیب جنگلات اور تاریک غاروں میں سے گزرتی رہی۔ علی الصبح میری آنکھ کھلی تو گاڑی ایک معمولی سے پہاڑی اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ میں نے کھڑکی کا پٹ نیچے گرا کر باہر دیکھا۔

آسمان بھورے بھورے بادلوں کے لطیف نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ بارش ابھی ابھی رُکی تھی اور پلیٹ فارم پر بچھی ہوئی سُرخ بجری دُھل کر چمک رہی تھی [illegible] کے نوکیلے پتے نکھر کر گہرے سبز ہو گئے تھے اور فضا میں ان کی سوندھی سوندھی مرطوب مہک بسی ہوئی تھی۔ [illegible] کے باریک کرتوں پر خوب کس کر دھوتیاں باندھے' ننگے پاؤں' بالوں کے جوڑوں میں رنگ

[illegible] پھولوں کے گچھے لگائے 'پان' سگریٹ' سگار اور اناناس کے قتلے [illegible] رہی تھیں۔ ان کے رنگ زیادہ تر [illegible] [illegible] ہوئے 'مضبوط اور صحت مند تھے۔ ایک لڑکی اناناس کے قتلے لے کر میری کھڑکی کے قریب آئی۔

"پائن ایپل سر ——— ویری سویٹ سر ——— فائیو سینٹ سر۔"

اس کا جسم بھی ایک چھوٹا سا پائن ایپل تھا' لیکن ابھی ویری سویٹ نہیں تھا' اس کی رنگت زرد زرد و سنہری [illegible] تھی [illegible] بھی پوری طرح پکا نہیں تھا۔ اس نے ابھی سورج کی کرنوں سے رس' پرسکون ٹھنڈی راتوں سے مٹھاس اور نیلگوں چاندنی سے رنگ حاصل کرنا تھا۔

میں نے ایک قتلہ لے 'پانچ سینٹ ادا کر دیئے۔ سینٹ اپنی انگیا میں چھپا کر وہ جلدی سے دوسرے ڈبے کی طرف مڑ گئی۔ یہ کام اس نے اتنی تیزی سے کیا کہ میں بالکل اندازہ نہ لگا سکا کہ پائن ایپل کتنا پک چکا ہے؟

گاڑی اس مضافاتی اسٹیشن سے چلی تو ایک دم بارش شروع ہو گئی اور دُور دُور تک سرسبز پہاڑیوں کی غیر ہموار چوٹیاں دھندلا گئیں' نیچان کی وادیوں میں جہاں بانس کے گنجان جنگل کھڑے تھے' بارش کی دُھواں دھار چادر سی تن گئی۔ گاڑی کی رفتار کافی تیز تھی اور وہ پے در پے معمولی اسٹیشن چھوڑتے جا رہی تھی۔ ہر بند پھاٹک پر ہمیں ناریلوں سے لدی ہوئی بیل گاڑیاں' نیم برہنہ عورتیں اور مرد' کیلوں کے گچھے یا پانوں کی ٹوکریاں اُٹھائے نظر آتے۔ ایک جگہ ایک زرد اور نیلے رنگ کی بس دکھائی دی' جس کی پیشانی پر انگریزی الفاظ میں کولمبو لکھا تھا' اور ہم سامان وغیرہ درست کرنے لگے' کولمبو قریب آ رہا تھا اور دائیں بائیں چھوٹی چھوٹی جھیلوں میں کھلے ہوئے کنول کے پھولوں اور بانس کے جنگلات کا قدرتی سلسلہ ختم ہو رہا تھا۔ ایک پتلی سی کالی چمکدار سڑک 'ریل کی پٹڑی کے ساتھ ساتھ نمودار ہو گئی تھی اور کہیں کہیں کوٹھی نما پکے مکانات بھی دکھائی دینے لگے تھے۔ جب کولمبو کا پہلا بڑا جنکشن "مرادانہ" آیا تو گاڑی تقریباً آدھی خالی ہو گئی۔ یہاں بھائی جان اور صدیقی صاحب مل گئے۔ ہمیں تین میل پر دوسرے بڑے جنکشن "فورٹ" اُترنا تھا۔ یہ لوگ ہمارے ڈبے میں گھس آئے۔

بھائی جان نے صدیقی صاحب سے میرا تعارف کرایا جو ملٹری ریڈیو پر اُن کے مددگار اناؤنسر تھے۔

فورٹ پر ہم لوگ بھی اُتر پڑے۔

گھر پہنچ کر تازہ دم ہونے کے بعد جب ہم صحن میں کرسیاں ڈالے بیٹھے تھے تو میں نے دیکھا کہ برسات کی مرطوب ہوا میں ہمارے سامنے والی کوٹھیوں کے عقب میں ناریل اور پام کے چھریرے درخت ہولے ہولے جھوم رہے ہیں اور ایک طرف دیوار پر چڑھی ہوئی گنجان بیل میں سُرخ سُرخ پھول روشن ہیں' ہمارے سروں پر کیلے کے درختوں کے جھاڑ میں قرمزی بور لٹک رہے تھے اور میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے صدیقی صاحب کے بالوں میں سے یارڈلے ہیر کریم کی مدھم خوشبو اُٹھ رہی تھی۔

دوسرے روز صدیقی صاحب ماؤنٹ لیوینیا لے گئے۔ اس مقام تک ریل سمندر کے کنارے کنارے چلی گئی ہے۔ ہم سہ پہر تک وہاں رہے شام کی چائے ہم نے صنوبر کے درختوں میں گھرے ہوئے لیوینیا ہوٹل میں پی اور پھر کنارے والی گیلی ریت پر سگریٹ [illegible] گھومتے رہے۔ ہوا چل رہی تھی اور اس میں مچھلیوں کی بو تھی' جیسے وہ سمندر کی سطح پر منہ نکالے لمبے لمبے سانس لے رہی ہوں' سبک [illegible] لہریں ساحل پر جابجا بکھری ہوئی بھوسلے رنگ کی چھوٹی چھوٹی چٹانوں تک آتیں اور ان کے گرد حلقے کی صورت میں گھوم کر' جھاگ [illegible] واپس چلی جاتیں۔

لیوینیا کلب کے باہر دو تین انگریز عورتیں نہا رہی تھیں' کھلی ہوئی دھوپ میں ان کے گیلے اور سُرخ و سفید جسم چمک رہے تھے۔ ناریل کے لمبے لمبے جھومتے ہوئے درختوں کی بے ڈھنگی قطاریں کنارے کنارے دُور تک چلی گئی تھیں۔ ان درختوں تلے 'سیلونی عورتیں' مدراسی [illegible] [illegible] عورتیں' خوبصورت اور بدصورت عورتیں' اپنے مردوں' غیر مردوں' پچکے ہوئے گالوں اور سوکھی ہوئی ٹانگوں والے [illegible] کے بازوؤں میں بازو ڈالے اخلاقی بکھر رہی تھیں۔ گہرے سبز سمندر کے بیکراں سینے پر دُور ایک مچھلی پکڑنے والی کشتی کے [illegible] رہے تھے۔

[illegible] ریڈیو اسٹیشن کی طرف جا رہے تھے۔
[illegible] قدم [illegible] سے پرے [illegible] جھونپڑوں [illegible] جہاں [illegible]
سے [illegible] جھونپڑوں کے باہر، نیا کنکریٹ [illegible] کے جسم کی کھال کروم لیدر سے بنی تھی،
[illegible] رسیاں بٹ رہے تھے۔ کروم لیدر کے جوتے بڑے مضبوط ہوتے ہیں [illegible] کے جسم بھی بڑے مضبوط تھے۔ ان کی
[illegible] کھلی جسموں والی عورتیں کام میں ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں۔

صدیقی صاحب نے بتایا:
"یہ لوگ لنکا کے اصلی باشندے ہیں، لیکن شہروں نے انھیں سمندر کے کنارے پھینک دیا ہے۔"

ان کے قریب سے گزرتے ہوئے ہمارے قدم خود بخود رک گئے۔ بعض عورتوں کے سیاہی مائل سانولے جسم تنی ہوئی کمانوں ایسے تھے۔ سوائے ایک میلی سرخ دھوتی کے اُن کے جسموں پر اور کچھ نہ تھا، دھوپ میں ان کے جسم سانپ کی کھال کی مانند چمک رہے تھے۔ اس چمک اور لیونیا کلب کے باہر نہانے والی انگریز عورتوں کے جسموں کی چمک میں رات دن کا فرق تھا، وہ جسم نیلے نیلے سمندروں کی شفاف جھاگ سے پیدا ہوئے تھے، اور ان جسموں نے کپرا گلیوں کی سڑاند اور تعفن میں جنم لیا تھا، اور اب یہ تعفن اور سڑاند سنگلدیپ کے ساحلی علاقوں میں پھیل رہی تھی، شاید اسے لیونیا کلب تک پہنچنا تھا۔ لیونیا کلب ——— جہاں ریشمی پردوں والی کھلی کھڑکیوں میں سے نکلتی ہوئی ارغنون کی دلنواز موسیقی، بحر ہند اور خلیج بنگالہ کی پردیسی لہروں کو دُور دُور سے کھینچ لاتی تھی ——— جس کے بال روم میں ہر ماہ کی آخری رات کو پانچ منٹ کے لئے تمام روشنیاں بجھ جاتی تھیں، پھر رقص کرتے ہوئے نیم عریاں جوڑوں کے قدم خود بخود لڑکھڑانے لگتے اور پانچ منٹ کا مختصر وقفہ پومیپائی کی آخری رات میں تبدیل ہو جاتا، اور جب یہ قلیل عرصہ گزر جاتا اور پومیپائی کی آخری رات ختم ہو جاتی تو کوئی جوالا مکھی نہ پھٹتا۔ کسی طرف سے دہکتے ہوئے لاوے کا مہیب طوفان لیونیا کلب کو اپنی آتشیں لپیٹ میں نہ لیتا، وہاں ہر ماہ کی آخری رات پومیپائی کی اوّلین رات تھی اور یہاں تاڑ اور ناریل کے درختوں تلے یہ کروم لیدر کے جسم، ناریل کی رسیاں بٹ رہے تھے اور میلی کچیلی سرخ دھوتیاں باندھے عورتیں ان کا ہاتھ بٹا رہی تھیں، ایک نوعمر لڑکی جس کے بال اس کی پیٹھ سے بھی نیچے تک پہنچ رہے تھے، ایک ہاتھ میں بٹے ہوئے رسوں کا گچھا سا لئے ہمارے قریب سے ہو کر گزری، اس کے سیاہ جسم میں سے کچے ناریل کی رسیلی خوشبو اُٹھ رہی تھی، اس نے جھونپڑی کے دروازے پر پہنچ کر گردن گھمائی اور ہمیں غور سے دیکھا اور پھر جلدی سے اندر داخل ہو گئی۔

اس کی شربتی آنکھوں میں وحشی ہرنیوں ایسا الھڑپن اور معصومیت تھی۔
اس کا جسم کس قدر کھردرا سا تھا؟
اس کی آنکھیں کس قدر نرم اور معصوم تھیں۔؟

[illegible] کے دیسی گیت یاد آ گئے۔ صدیقی صاحب نے گھڑی میں وقت دیکھا، ریڈیو پروگرام کا وقت ہو رہا تھا، ہم تیز تیز قدم [illegible] سے فورٹ اور فورٹ سے بس میں بیٹھ کر ریڈیو اسٹیشن پہنچ گئے۔
[illegible] کی دو منزلہ عمارت کولمبو کی بیشتر عمارتوں کی مانند بدھی مندروں سے ملتی جلتی تھی۔ عمارت کے اندر درمیان میں ایک [illegible] شریفے کے تین چار درخت تھے۔
[illegible] کے ساتھ ہی تھا، انگریز اناؤنسر، نیوز ایڈیٹرز اور سکرپٹ رائٹرز، دن بھر خالی نیکریں پہنے گھومتے رہتے تھے، ان کے [illegible] بالوں کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں، بعض جسموں پر چتکبرے داغ تھے، انھیں دیکھ کر مجھے [illegible] [illegible] محسوس ہوتی تھی، ان میں دو لیڈی اناؤنسرز بھی تھیں۔ ایک انگریز لڑکی تھی جس کا نا[illegible] [illegible] آواز میں رس اور نوچ تھا اور اس کی سفید رنگت میں [illegible]

سبزی کی جھلک تھی۔ کچی خوبانیوں کی مانند____

اس کے لہریا بالوں کا رنگ بھوسلا تھا' خزاں نصیب پتوں ایسا اور اسکی آنکھوں میں نیلے اور سبز رنگ کا ملا جلا رنگ، یہ رنگ روم کے ساحلی سمندروں کا رنگ تھا اور ان آنکھوں میں بحیرہ روم کی اتھاہ گہرائیاں چھپی ہوئی تھیں۔

مسز کنداسوامی کی آواز کافی اچھی تھی' مگر اس کا جامنی جسم دن بدن سوکھ رہا تھا' اس کے بال لمبے لمبے تھے جنہیں وہ چوٹیوں میں گوندھے رکھتی تھی۔ لیکن اس کا نام ان بالوں سے بھی زیادہ لمبا تھا اور جسے میں کبھی ایک سانس میں ادا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ہر تیسرے روز نئی ساڑھی پہن کر آتی' اسے اپنی لوچدار آواز پر بڑا ناز تھا' ۔ یہ آواز ریڈیو پر بڑے بڑوں کو دھوکا دے جاتی تھی۔ کاش وہ خود بھی اپنی آواز کی مانند ہوتی____ میرے ذہن میں اس کی آواز کا زندہ تصور' فیلس ڈکنز کا مدور شانوں' ریشمی گالوں اور بھرے بھرے بازوؤں والا جسم تھا اور مجھے ہمیشہ مسز کنداسوامی کی آواز پر فیلس کے جسم کا دھوکا ہوتا تھا۔

فیلس ڈکنز سے میری پہلی ملاقات سٹوڈیو نمبر ۳ میں ہوئی۔

میں اکیلا اندر بیٹھا چند پنجابی ڈسکیں (Discs) ٹسٹ کر رہا تھا کہ فیلس کا نیم سبز آنکھوں والا اور نیم سنہری بالوں والا چہرہ دروازے کے چوکور شیشے پر نمودار ہوا' وہ بالکل کسی فریم کی ہوئی تصویر کی طرح تھا۔ سٹوڈیو آف تھا وہ اندر آ گئی' ہلکے آسمانی رنگ کے مہین لباس میں اس کی سپید شمیز کا ابھار کسی دودھیا بادل کے ٹکڑے کی مانند تھا' جو کبر آلود رات کے دھندلے آسمان پر چپ چاپ سو رہا ہو۔

ٹائپ کیا ہوا پروگرام چارٹ' دیوار سے لٹکا کر وہ لاؤڈ سپیکر پر قدرے جھک کر کھڑی ہو گئی اور بڑے غور سے پنجابی موسیقی سننے لگی' طمنچہ جان ہیر گا رہی تھیں۔

ہیر آکھدی جوگیا جھوٹھ بولیں کون رٹھڑے یار مناوندا ای

ڈسک ختم ہوئی تو وہ میرے قریب آ گئی۔

"یہ کیا گا رہی تھی۔؟"

فیلس میرے اس قدر قریب تھی کہ لونڈر کی خنک مہک میرے دماغ پر ایک خوشگوار کیفیت طاری کر رہی تھی۔

میں نے ڈسک لفافے میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "یہ ہیر گا رہی تھی۔"

"ہی ائر؟____ یہ کیا ہوتا ہے؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"یہ ہوتی ہے میڈم"

"تو یہ کوئی عورت.........."

"ہاں' ہاں عورت____ یہ پنجاب کی جیولیٹ ہیر کی محبت کا گیت تھا اور ہیر چوہدری چوچک کی بیٹی تھی۔ اور چوچک جھنگ سیال کیہ...... میرا مطلب ہے' جھنگ مگھیانہ کا باشندہ تھا' اور برائے خدا اب یہ مت پوچھنا کہ جھنگ مگھیانہ کیا ہوتا ہے؟"

فیلس ہنسنے لگی' بے اختیار ہنسنے لگی اس کی ہنسی ایک بچے کی ہنسی تھی جو سوتے میں اپنے آپ مسکرانے لگے۔ معصوم' بے لوث' بے داغ۔ اس میں ایک خوابناک سرگوشی تھی' ایک والہانہ موسیقی تھی____ وہ مجھ پر ذرا جھک کر بولی: "کیا تم شاعر ہو؟"

میں اب لونڈر کی خنک مہک کے علاوہ کچی خوبانیوں کی نیم گرم' نیم ترش خوشبو بھی سونگھ رہا تھا' میں اُسے کہنا چاہتا تھا: "مادام میں شاعر نہیں ہوں' مگر تمہاری مسکراہٹ کے عنوان سے ایک بھرپور نظم لکھ سکتا ہوں' کئی بھرپور نظمیں' کئی مثنویاں اور کئی دیوان لکھ سکتا ہوں۔

لیکن میں نے کہا: "مادام میں شاعر نہیں ہوں........ "But I feel Poetic" اور اچھوتے سیپ کا منہ کھل گیا اور انمول' آبدار اور کنوارے موتیوں کی لڑیاں بکھر گئیں۔ فیلس وہ مسکراتی ہوئی باہر نکل گئی اور میں سٹوڈیو میں بیٹھا دیر تک کچی خوبانیوں کی نیم گرم' نیم ترش خوشبو سونگھتا رہا جیسے میرے سامنے خوبانیوں کے ڈھیر لگے ہوں۔ میں نے برٹش پروگرام سننے کے لئے دوسرے سٹوڈیو کا بٹن دبا دیا۔ مسز

کی [illegible] ستاری تھیں' اس کی [illegible] ٹیلی فون کے جسم کی [illegible] اس کی آنکھ
[illegible] کے جسم کی [illegible] اور مجھے یوں [illegible] میں نے جلدی
سے [illegible] کرلیا اور سٹوڈیو سے باہر نکل آیا۔

میں گھر میں داخل ہوتے ہی مس گلیشی کی صورت دیکھتا تھی۔

یہ پچاس پچپن سال کی ڈھیلے ڈھالے' بد نما جسم والی عورت تھی' کے سر کے سفید بال خضاب کے مسلسل استعمال کی وجہ سے
جامنی رنگ اختیار کر چکے تھے' صحن میں ٹیلیفون ایکس چینج کے سیٹ کے پاس بیٹھی تھی اور قریب سے گزرنے والے کو ایک بار اپنے
پاس ضرور بلاتی تھی' تنگ دھڑنگ گوروں سے باتیں کرتے ہوئے اُس کے بعد سے پر [illegible] کنواری لڑکیوں ایسا حجاب چھلک جاتا۔ میں اُس
کے کنواری لڑکیوں ایسے حجاب سے بڑا گھبراتا تھا۔ اس کا نام ہمیشہ مجھے فرانس کی گلوٹین کی خوفناک یاد دلاتا۔ گلیشی ——— گلیشی.........
اس نام میں گلے کو بڑے اطمینان سے کاٹ ڈالنے کی دھمکی تھی۔ اس سے باتیں کرتے وقت میرے جسم پر سر سے لیکر پاؤں تک کپکپی کا
عالم طاری رہتا' جیسے لوگوں کا ہجوم مجھے گلوٹین کی طرف کھینچے لئے جارہا ہو' صدیقی صاحب نے بتایا کہ ایک بار وہ گلا کٹوانے سے بال بال بچ
گئے۔ وہ ایک ہاتھ کاؤنٹر پر رکھے مس گلیشی سے کسی نمبر کی بابت گفتگو کر رہے تھے کہ اس نے صدیقی صاحب کی انگلی میں ہیرے کی
انگوٹھی دیکھ لی اور اس کا چہرہ کنواری لڑکیوں ایسے حجاب کے نقاب میں پہلے سے زیادہ چھپ گیا۔

"مجھے یہ انگوٹھی بڑی پسند ہے مسٹر ڈی۔"

اور مسٹر ڈی نے گلوٹین کا تیز پھل اپنی گردن کے بالکل قریب محسوس کیا' انھوں نے آہستہ سے پوچھا: "تمھاری عمر کیا ہوگی
میڈم؟"

"تقریباً پچیس سال......."

یہ کہتے ہوئے میڈم "گلوٹین" مسکرانے لگی اور کانچ کے بناوٹی دانتوں کی نیلی لکیر چمک اُٹھی اور صدیقی صاحب تیزی سے کنٹرول
روم کی طرف گھوم گئے۔

لنکا پہنچنے سے پہلے میں نے سونے کی اس سرزمین کے متعلق ایک خواب دیکھا تھا' ایک حسین اور پراسرار خواب ——— میں نے دیو
پیکر فصیلوں میں گھرے ہوئے چھوٹے چھوٹے پر سکون' چپ چاپ' آرام پسند شہر دیکھے تھے جن کے اردگرد بانس' تاڑ' ناریل اور صنوبر
کے گھنے جنگلات کا مہیب سلسلہ حد نگاہ تک پھیلا ہوا تھا' جہاں بدھی مندروں کے سنہری کلس نکھری ہوئی دھوپ میں چمک رہے تھے'
اور ان مندروں کے نیم روشن ایوانوں میں' پر جلال دیوتاؤں کے سنگین مجسموں کے روبرو کالی آنکھوں والی' سیم تن دیوداسیاں عود و عنبر
کے بخوروں' دھوئیں میں بیخود ہو کر والہانہ انداز میں رقص کر رہی تھیں۔ موی روشنیوں کی ملائم دھند میں ان کے نیم عریاں جسم
[illegible] اور اُن مندروں کے باہر مرمریں سیڑھیوں کے کناروں پر بیٹھی ہوئیں بدھ کی کنواری بیٹیاں اندر
جانے والے عقیدتمندوں کو گل صد بارگ' موگرہ' چنبیلی اور شبو کے پھول پیش کر رہی تھیں' ان کے سیاہ بال پھولوں میں بسے ہوئے
تھے اور کانوں میں بگھرا کے مندر لٹک رہے تھے۔

میں نے عظیم الشان محلات کی مرمریں بارہ دریوں میں شاہی رقاصوں کو انناس کی شراب میں بدمست آسانی ناچ ناچتے دیکھا۔ ان
بارہ دریوں سے جھانکتے جھروکوں میں [illegible] بیلوں کی پھولوں بھری ڈالیاں داخل ہو رہی تھیں' باغوں میں صنوبر اور آم کے پیڑوں پر
رنگین پرندے چہچہا رہے تھے' جگہ جگہ کنول کی شکل ایسے دودھیا پتھر کے پیالوں میں چاندی کے فوارے اُبل رہے تھے اور گلاب کے
جھاڑوں پر سیاہ بھونروں کی [illegible] تھیں۔

لیکن لنکا پہنچ کر [illegible] حسین خواب جیسے اپنا منہ چھپا کر کہیں گم ہو گیا' مجھ سے رُوٹھ گیا' منتشر ہو گیا۔

کولمبو میں سوائے ایک دھوبی کے اور کوئی شخص لنکا سے واقف نہ تھا۔ اس دھوبی نے اس خیمہ گیری کے [illegible] کی پیشانی پر "لنکا واشنگ کمپنی" کا بورڈ لگا رکھا تھا۔ لوہے اور کنکریٹ سے بنے ہوئے اس عظیم الشان شہر کے [illegible] غیر ملکی جوڑے شراب کے ہلکے ہلکے سرور میں ڈوب کر بے ربطی سے ناچ رہے تھے اور بدھی مندروں کے [illegible] غوطے لگا رہی تھیں۔ عود و عنبر کی نیلگوں دھند میں والہانہ رقص کرنے والی سیم تن دیو داسیاں اور مندروں کی [illegible] موگرہ، چنبیلی اور شبو کے پھول پیش کرنے والی، سیاہ بالوں اور چمکیلی آنکھوں والی، بدھ کی کنواری بیٹیاں اب کولمبو کی پتھریلی سڑکوں اور کارخانوں کی گھٹی ہوئی فضا میں دن بھر مشقت کرتی تھیں اور رات کو گندے تاڑی خانوں کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر تاڑی پیتی تھیں، لڑتی جھگڑتی تھیں اور نشے میں دُھت ہو کر وہیں پڑ رہتی تھیں اور سونے کی لنکا کے بیٹے، راون کے غیور سپاہی، شہر سے باہر ناریل کی رسیاں بٹ رہے تھے۔ شہروں نے انھیں کڑوی شے کی مانند تھوک دیا تھا۔ کونے کھدروں میں رینگنے والے کیڑے سمجھ کر انھیں دھرتی کے آخری کناروں پر پھینک دیا تھا اور یہ سنگلدیپ کے لال، لنکا کے راج دلارے، سمندر کے کنارے، چمکیلی ریت پر شام کے بعد الاؤ روشن کر کے اس کے گرد بیٹھ جاتے اور ناچ گانوں میں مگن ہو جاتے تھے۔۔ ڈھولک کی تیز تھاپ پر صدیوں کا پرانا غم، ان کے تاریک سینوں کی تہوں سے لمبی گہری اور درد انگیز تانوں میں ڈھل کر بہہ نکلتا، الاؤ کی تابناک روشنی میں ان کے نیم عریاں سیاہ جسم کسی انوکھے، انجانے کیف میں بھیگ کر اپنے آپ جھومنے لگتے اور ان کے سروں پر ناریل کی ترچھی شاخوں میں چاند چمکنے لگتا۔ دودھیا چاندنی کے نقرئی خلاؤں میں لنکا کے بھوکے ننگے بیٹوں کے گیتوں کا طلسم مرمریں خواب بن کر پھیل جاتا۔ یہ خواب ایک خاموش اور پرسکون جھیل تھی، جس کی سطح پر ان کے جسم، محبت، اخوت اور آزادی کے کنول بن کر تیر رہے تھے اور شہروں نے انھیں کڑوی اور گندی شے سمجھ کر سمندر کے پاس تھوک دیا تھا اور یہ اپنے وطن، اپنے گھر میں بے وطن، بے گھر اور پردیسی لوگ الاؤ بھڑکتے ہوئے شعلوں کے گرد اگرد بیٹھے کسی نئی تہذیب کا گیت گا رہے تھے۔ شاید وہ نیم خوابیدہ حالت میں، منتظر نگاہوں سے اس وقت کی راہ دیکھ رہے تھے جب اس تہذیب کا قافلہ سمندر کے بیکراں سینے پر اپنی کشتیوں کا بادبان پھیلائے اُن کی سمت بڑھتا چلا آئے گا اور وہ آنکھوں میں مسرت کے آنسو لئے اس قافلے میں شامل ہو کر محبت، خوشحالی اور آزادی کا سنہرا خواب دیکھیں گے۔

ان کی نگاہوں میں انتظار کی بے کلی تھی اور ان کے گیتوں میں پہاڑ کی اونچانوں سے پھسلنے والی ندیوں ایسا اضطراب اور دفعتاً بھڑک اُٹھنے والے شعلوں ایسا ہیجان تھا، تڑپ تھی، درد تھا، میٹھا اور عزیز ترین درد، جو سیپ کے پہلی بار منہ کھلنے سے پیدا ہوتا ہے اور جب سیپ کا منہ کھل جاتا ہے تو فیلس ڈکنز مسکرانے لگتی اور اچھوتے موتیوں کی آبدار لڑیاں جھلملا اُٹھتی ہیں اور یہ تبسم ایک چھوٹے سے آبشار کی مانند فیلس کے سُرخ ہونٹوں سے گلپوش وادیوں میں گرتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

فیلس ہوٹل گال فیس کے بال روم میں بیٹھی مسکرا رہی تھی اور کوئی خوبصورت چرواہا آلوچے کی پھولوں بھری لمبی ڈالیوں کو ہلا رہا [illegible] سپید نرم نرم کومل پتیاں گھاس پر گر رہی تھیں۔ آج فیلس کی سالگرہ تھی۔ روشنی میں اس کے بھورے بال سونے کے تاروں کی مانند [illegible] رہے تھے جیسے جنگل میں کسی مکڑی کے جال پر ڈوبتے سورج کی نارنجی شعاعیں تھرک رہی ہوں۔ شمپین کا سلگتا ہوا خمار اس کی آنکھوں کی [illegible] سبز جھیلوں پر صنوبر کا سایہ بن کر جھکا ہوا تھا اور جھیلوں کا رنگ گہرا و پراسرار ہو رہا تھا۔

[illegible] موسیقی شروع تھی۔ ایک پھولے ہوئے سرخ گالوں والی موٹی سی لڑکی پورا منہ کھولے گا رہی تھی:۔

"O ! Night in June

If I were never to see you again"

اس کی [illegible] میں [illegible] عقاب ایسی جھپٹ تھی اور یہ عقاب اپنے خوفناک پنجے پھیلائے ہر آدمی کو اپنی طرف بڑھتا محسوس ہو رہا تھا۔ [illegible] سے ہنسی مذاق اور چھیڑ چھاڑ میں مشغول تھے، اور عورتوں کی ٹانگیں رانوں تک

تنگ تھیں جن کے بازو شانوں تک کھلے تھے اور جن کی چھاتیوں تک عریاں تھیں۔ ہال میں گہرا اور خمار آلود جسموں کی نیم گرم خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ فیلس اپنی سالگرہ کا پانچواں جام خالی کر رہی تھی اور جنگل کی آگ پر جھومنے کے بعد زیادہ گرم ہو گئی اور گھٹنے ہو رہے تھے۔ انگلی وائن بیچنے والی بیٹھا ریڈیو اسٹیشن کا موسیقار وکٹر پول دسویں بار اس کے رنگین گال چوم رہا تھا۔ یونانی نرس ہریس 'تھوک میں بجھا ہوا سگریٹ منہ میں دبائے' شراب میں تر انگلیاں اپنی کھوپڑی پر رگڑ رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں شراب کے نشے میں سمٹ کر سکڑ گئی تھیں۔ لیفٹیننٹ گرفن نے جام ہوا میں لہرایا اور فیلس کی سالگرہ کا پانچواں جام بھی خالی ہو گیا۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتا وہ فیلس پر جھکا اور اپنے شراب آلود لب اس کے نیم عریاں مرمریں سینے پر رکھ دیئے۔ وکٹر جو بجاتے ہوئے گلاس میں شیمپین انڈیلنے لگا اور ہریس نے اتنے زور سے کش کھینچا کہ گیلا سگریٹ ایک دم سکڑ گیا۔ فیلس کا مخمور جسم ہولے ہولے جھوم رہا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ میری پنڈلیوں میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ ہم ایشیائی طبعاً شریف ہوتے ہیں۔ ہم ایسے مناظر برداشت نہیں کر سکتے۔ ہم محبت کرنے سے پہلے روشنی بجھا دیتے ہیں۔ ہماری محبت تاریکی اور تنہائی کے غار میں جنم لیتی ہے اور اسی غار میں دم توڑ دیتی ہے۔ ہمیں غاروں سے محبت ہے' محبت کے غار' نفرت کے غار' ذلت کے غار اور شرافت کے غار۔ ہم فطرتاً غار پسند ہیں اور یہاں روشنی ہی روشنی تھی گوری لوگ ......

اور لیفٹیننٹ گرفن کے شرابی لب فیلس کے پتلے ریشمی ہونٹوں سے پیوست تھے۔ پھولے ہوئے سرخ گالوں والی امریکن لڑکی بدستور گا رہی تھی:-

" O ! Night in June .... "

اور بیابانی عقاب اپنے خوفناک پنجے کھولے ہمارے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ قریب ہی ایک میز پر کوئی نوعمر ملاح' نیلی اور سفید وردی میں ملبوس' کہنیاں گھٹنوں پر رکھے' ذرا آگے کو جھکا' ایک اینگلو انڈین دبلی پتلی بے زبان سی لڑکی سے اظہار محبت کر رہا تھا اور وہ لڑکی گاہے کی زبان کے ٹھنڈے قتلوں پر ٹماٹر کی چٹنی لگائے انھیں چبا چبا کر کھا رہی تھی۔

ایک خالص سیلونی ادھیڑ عمر جوڑا بڑے دروازے پر نمودار ہوا۔ ویٹر نے ہاتھ پھیلا کر ایک خالی میز کی طرف اشارہ کیا۔ عورت کا تھل تھل بلبل بھدا جسم جامنی رنگ کی ساری میں لپٹا تھا۔ اس کے مریل سے خاوند کا مختصر ہاتھ بمشکل اپنی بیوی کی کمر تک پہنچ رہا تھا۔ عورت کے ہونٹ سرخ تھے گہرے سرخ۔ خون کے رنگ ایسے ____ گویا وہ ابھی ابھی کسی کا خون پی کر آ رہی ہو' اُس کے بازوؤں پر' کلائیوں پر' گلے میں بیش قیمت ہیرے موتی جھلملا رہے تھے' اس کے خاوند کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں اور سوکھی گردن' قمیض میں سے خشک ٹہنی کی مانند باہر نکلی ہوئی تھی۔ سیلونی عورت نے ڈائس پر گاتی امریکن لڑکی کو دیکھا اور نفرت سے منہ پھیر لیا۔

لڑکی نے ایکدم گانا بند کر دیا اور عقاب نے اپنے پنجے سمیٹ لئے اور لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر دفعتاً ہال کے درمیانی حصے کے سوا ہر طرف روشنیاں گل ہو گئیں اور سازوں پر ہلکے ہلکے سروں میں کوئی اور ہی دھن شروع ہو گئی۔ ادھر اُدھر میزوں پر سے نیم برہنہ عورتیں اور مدہوش مرد ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کنارے پر سے کھسکتی ہوئی کشتیوں کی مانند اُٹھے اور ان کے جسم موسیقی کی پر سکون لہروں پر اپنے آپ ڈولنے لگے۔ سبز روشنی کے غبار میں اُن کے لہراتے ہوئے جسم خواب ایسا منظر پیش کر رہے تھے۔ ہمارے آس پاس ہلکے ہلکے اندھیرے کا غبار پھیلا ہوا تھا۔ ہمیں ایک دوسرے کے چہرے بڑے پراسرار دکھائی دے رہے تھے۔ نیم گرم سلگتی ہوئی شرابی آنکھیں مدھم اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ وکٹر اپنے پیچھے کرسی گراتا ہوا اُٹھا اور فیلس کو اپنے لمبے بازوؤں میں تھام کر محو رقص جوڑوں میں شامل ہو گیا۔ لیفٹیننٹ گرفن شراب سے بھرے ہوئے گلاس میں سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر' ناک سکیڑ کر بولا

"بدمعاش کہیں کا"

ہیریس نے پانچوں انگلیاں شراب میں ڈبو کر انھیں اپنی کھوپڑی پر رگڑا اور سر کرسی کی پشت سے جا لگا۔ بازو لٹکائے بولا:-

"___ And this is the end of the news! "

گھومتیں، لہراتیں، کبھی آگے بڑھتیں کبھی پیچھے ہٹتیں، سانولی گندمی، زرد اور سپید سپید عریاں پنڈلیوں کے ساتھ ساتھ فیلس کی چکنی چکنی پنڈلیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ وکٹر اسے اپنے ساتھ چمٹائے بڑے بھونڈے انداز میں ناچ رہا تھا اور فیلس کا تھرکتا جسم اس کے لمبے بازوؤں کی شاخوں پر پکی ہوئی انجیر کی مانند لٹک رہا تھا اور میرا سر بھاری ہو رہا تھا۔ میری آنکھوں میں سینک اُٹھ رہا تھا اور گرد میزوں پر اب صرف بوڑھے اور بدصورت چہرے ہی تھے، جھلملاتے، بیش قیمت، ہیرے موتیوں والی، بھاری بھر کم بیلونی عورت کا مکھ دور سے خاکہ ہی نظر آ رہا تھا جو اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے مریل اور زیادہ پھیکے خاکے پر جھکا ہوا تھا۔ میری آنکھوں میں سُرخ سُرخ ہونٹ پھر گئے۔ گہرے سُرخ ہونٹ اور مجھے یوں لگا جیسے پہلا خاکہ، دوسرے خاکہ پر جھکا اُس کا خون پی رہا ہو۔

گلاسوں کے بوتلوں سے ٹکرانے کی کھنکاریں اور بوڑھے قہقہوں کی بے جان آوازیں، ڈانس کے لمبے لمبے سروں میں مدغم ہو رہی تھیں اور نیوز اناؤنسر ہیریس خبریں ختم کرنے کے بعد ٹانگیں پھیلائے مدہوش پڑا تھا۔ لیفٹیننٹ گرفن پی رہا تھا اور بی بی سی کے نئے ریکارڈوں کی مختلف دھنیں گنگنا رہا تھا۔ کسی وقت وہ اپنی گھٹی ہوئی آنکھیں اُٹھا کر ہچکی روک کر مجھ سے پوچھتا۔

" Do you like Gypsy songs ? "

اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کوئی اور دُھن شروع کر دیتا۔ شمپین کا جام میرے ہاتھ میں ختم ہو رہا تھا اور فیلس کا جسم وکٹر کے سینے سے چمٹا ہوا تھا اور انجیر اپنی شاخ پر لٹک رہی تھی، وہ پک چکی تھی اور گرنے والی تھی اور اس سے پیشتر کہ وہ اپنی شاخ سے ٹوٹ کر گرے، ہال کی تمام بتیاں ایک ساتھ روشن ہو گئیں، بوڑھے اور بدنصیب چہروں نے چندھیائی ہوئی آنکھوں سے رقص کے ٹوٹتے دائروں کو دیکھا اور سرد آہیں بھرنے لگے۔ عورتیں اپنے ڈھیلے بازو درست کرتیں، پریشان بال سنوارتیں، مردوں کے سہارے اپنی اپنی میزوں کی سمت بڑھنے لگیں۔ وکٹر کے بالوں کی ایک لٹ اس کی چوڑی پیشانی پر جھول رہی تھی۔ فیلس کے قدم ڈگمگا رہے تھے اور وکٹر اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ یوں اسے اپنے بازوؤں میں تھام رہا تھا جیسے فیلس کوئی مجسمہ ہو جس کے پاؤں تلے سے چبوترہ کھسک گیا ہو، وہ بے قابو ہوئی جا رہی تھی اور بے اختیار ہنسے جا رہی تھی۔ اس کی شراب میں ڈوبی ہوئی نگاہیں کسی جگہ نہ ٹھہرتی تھیں وہ کبھی ہیریس کو دیکھتی، کبھی گرفن اور کبھی مجھے۔ جیسے ہمیں پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ لیفٹننٹ گرفن پر نا شرابی تھا، چنانچہ اس نے اُٹھ کر فیلس کو تھام لیا۔ وکٹر نے ہیریس کو بالوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا، وہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور بلند آواز میں بولا:۔

"Here is the news ! "

ہم سب ایک دوسرے کا سہارا لئے، لڑکھڑاتے، ڈگمگاتے، باہر نکل کر ایک ٹیکسی میں ڈھیر ہو گئے۔ پرائیویٹ ہوسٹل کے احاطے میں آ کر ہم نے ہیریس اور فیلس کو بمشکل برآمدے تک پہنچایا۔ ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی فیلس صوفے پر گر پڑی اور لیفٹیننٹ گرفن اس کا سر دبانے لگا۔ ہیریس کا نشہ جیسے سو کر بالکل ہی اُڑ گیا تھا۔ اس نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے گرفن کو فیلس پر جھکے دیکھا، وہ گالیاں بکتا ہوا اُٹھا اور اندر سے وائٹ جن کی ایک اور بوتل لے آیا، وکٹر پول آرام کرسی میں لیٹا، ٹانگیں قالین پر پھیلائے بڑے مزے میں گا رہا تھا:۔

" I know

Where you sing O Sea ! "

میری آنکھیں جل رہی تھیں اور بند بند ٹوٹ رہا تھا۔ میرے اردگرد ہر شے دھندلا رہی تھی۔ وکٹر پول کے گانے کی نرم آواز جیسے کسی ویران اور اندھیرے کنوئیں میں سے نکل رہی تھی۔ یہ آواز مجھ سے دُور ہوتی جا رہی تھی۔ دُور ____ اور دُور ______ یہاں تک کہ وہ بالکل ڈوب گئی اور میں سو گیا۔

جانے میں کتنی دیر تک سویا ہوں گا کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ وکٹر پول مجھے دوسرے کمرے میں کھینچے لئے جا رہا تھا۔ مجھے اندر

دھکیل کر اس کمرے میں دھکیل دیا اور دروازہ باہر سے بند کر دیا۔

میں عورتوں کی حفاظت ہوا کرے۔"

میں نے بمشکل تمام اپنے آپ کو سنبھالا اور آنکھیں ملتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمزور لیمپ کی مدھم روشنی میں فیلس ڈکنز پلنگ پر بھورے رنگ کا ریشمی کمبل اوڑھے بے سدھ پڑی تھی۔ میں اس کے پاس پہنچ کر آہستہ سے اس پر جھک گیا۔ فیلس کا رنگ زرد ہو رہا تھا' پتلے ہونٹوں پر پسینے کے ننھے ننھے موتی چمک رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ بالکل بے سدھ پڑی تھی۔ میں نے اسے شانے سے پکڑ کر نرمی سے ہلایا: "فیلس، فیلس۔"

فیلس کی مخمور پلکیں آہستگی سے اوپر اٹھیں جن میں شراب کا سرور دھند بن کر چھایا ہوا تھا' وہ ہولے سے مسکرائی' میں نے اپنے ہونٹ اس کے نیم وا ہونٹوں پر رکھ دیئے' شراب اور پسینے کے نمکین ذائقے نے میرا منہ بدمزہ کر دیا۔ میں نے کمبل منہ پر کر لیا' کیونکہ کمرے میں روشنی تھی اور ہم ایشیائی اندھیرے سے محبت کرتے ہیں۔ ہمیں روشنی راس نہیں آتی' لیکن کمبل پر منہ کرنے سے ایک عجیب قسم کی بو میرے نتھنوں میں گھسنے لگی' جیسے میں نے گندے ٹماٹروں سے بھری ہوئی بوری میں منہ ڈال دیا ہو' یا جیسے میں کسی مچھلی مارکیٹ میں داخل ہو گیا ہوں' وہ خوبانیوں کی میٹھی خوشبو کہاں گئی تھی' وہ پاؤڈر کریم کی ٹھنڈی مہک کہاں غائب ہو گئی تھی؟ میرا دماغ پھٹنے لگا' میں نے جلدی سے منہ باہر نکال لیا لیکن باہر وہی روشنی تھی' اور ہم ایشیائی . . . .

میں جلدی سے مچھلی مارکیٹ میں داخل ہو گیا اور تمام رات وہاں بغیر ناک پر رومال رکھے گھومتا رہا۔ پچھلے پہر جب میں مچھلی مارکیٹ سے باہر نکلا تو ڈرائنگ روم میں لیفٹیننٹ گرفن' ہیرلیس اور وکٹر پول نیم برہنہ حالت میں' قالین پر الٹے سیدھے پڑے تھے۔ میں نے میزپوش اٹھا کر ان پر ڈال دیا اور ہوٹل سے باہر نکل آیا' سڑک پر پہنچ کر مجھے فیلس ڈکنز کا خیال آ گیا اور یوں محسوس ہوا جیسے کسی نائی نے شیو کے بعد بالوں بھرا جھاگ میرے منہ پر پھینک دیا ہو' میں نے زور سے تھوک دیا۔

ہماری ساتھ والی کوٹھی میں ایک اچھے خاصے بدصورت سیلونی بیرسٹر کی اچھی خاصی بدصورت بیوی رہتی تھی۔ بیرسٹر صاحب کو خوبصورت عورتوں کی تصویریں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا' بھائی جان نے مجھے بتایا کہ اس کے ذاتی البم میں دنیا جہان کی حسین ترین عورتوں کی تصویریں موجود ہیں' اور وہ اس البم کو اپنی بیوی سے چھپا کر رکھتا ہے۔ شام کے وقت دونوں میاں بیوی برآمدے میں آرام کرسیوں پر بیٹھ جاتے اور ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے رہتے۔ وہ بولتے کم اور مسکراتے زیادہ تھے۔ بیگم صاحبہ کو پیانو سیکھنے کا خبط تھا' رات کے کھانے سے فارغ ہو کر بیرسٹر اپنے کمرے میں جا کر ذاتی البم کھول لیتا اور اس کی بیوی پیانو پر جا بیٹھتی' پھر ان کے گھر سے پیانو کے بھدے' کرخت' بے ڈھنگے اور بے ربط سر سنائی دینے لگتے۔ جیسے وہ ان سروں کو دھکے دے کر گھر سے باہر نکال رہی ہو۔ کسی وقت محسوس ہوتا کہ وہ پیانو بجا نہیں رہی بلکہ اس سے جھگڑ رہی ہے اور جب پیانو کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی تو پردوں پر زور سے انگلی مار کر پوچھتی ہے: "کیا کہا؟"

کبھی کبھی جی بے اختیار چاہتا کہ اس کے کمرے میں داخل ہو کر' پیانو کے پاس جا کر زار و قطار رونا شروع کر دوں۔ جب وہ حیران ہو کر وجہ دریافت کرے تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگوں' یہاں تک کہ وہ ڈر کر بھاگ اٹھے اور میں اطمینان سے آنسو پونچھ کر باہر نکل آؤں۔ وہ ہر رات باقاعدہ گھنٹہ بھر پیانو سے لڑتی اور اس دوران میں اس کا خاوند جی کھول کر اپنے ذاتی البم کا مطالعہ کرتا۔

سامنے والی کوٹھی میں ایک عیسائی انجینئر کا کنبہ رہتا تھا۔

انجینئر کی دو لڑکیاں تھیں' ایک کی عمر بارہ سال ہو گی اور دوسری لڑکی سترہ اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی۔ چھوٹی لڑکی کا رنگ کھلتا ہوا تھا اور آنکھیں بالکل بلی کی سی تھیں۔ اس کی چال بھی بلی کی طرح سمٹی سمٹائی اور دبی دبی تھی اور ذرا سی آہٹ پر چونک پڑتی تھی۔ البتہ

کی سیدھی اور چکنی پنڈلیاں بڑی سڈول تھیں۔ اس کے سینے کی گولائیاں ابھی بن رہی تھیں اور ان کی طرف دیکھنے سے کبھی کبھی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے قہوہ پینے والی دو پیالیاں قمیض کے اندر اوندھی کر رکھی ہوں۔

بڑی لڑکی کا رنگ زردی مائل گندمی تھا' وہ دبلی پتلی اور بے اختیار لمبی تھی' اس کی بائیں آنکھ ذرا ٹیڑھی تھی اور ناک اس کے قد کا چوتھا حصہ تھی' اس کا نام مس ایملی تھا یہ نام سن کر مجھے ہمیشہ کھٹی املی کے درخت یاد آ جاتے اور منہ میں پانی بھر آتا تھا' اس کی آواز تیز تیکھی اور کرخت تھی وہ بولتی تو یوں محسوس ہوتا جیسے ریل کے انجن کا کوئی پرزہ لیک کر رہا ہے اور تیز بھاپ سیٹی بجاتی خارج ہو رہی ہے' اُسے اپنے مریل کتے سے بڑا پیار تھا اور وہ ہر شام کوٹھیوں کے درمیان والی سڑک پر اسے ساتھ لئے ٹہلا کرتی تھی۔

چوک میں کسی بدھی بھکشوؤں خانقاہ تھی' جہاں ہفتے میں کئی بار میلہ ہوا کرتا' اس روز عورتیں' بچے' مرد گیروے زرد لبادوں والے بھکشو خانقاہ میں جمع ہو کر دن بھر مذہبی گیت گاتے رہتے' یہاں اکثر دیسی عطروں کی تیز خوشبو پھیلی رہتی تھی۔

اس خانقاہ کے عقب میں شہر کے غریب واڑے تھے' لکڑی اور گھاس پھونس سے بنے ہوئے ڈربہ نما مکانوں کے بیچوں بیچ ایک خستہ حال سڑک چلی گئی تھی اس سڑک کا نام ٹمپل روڈ تھا یہاں رات کو عموماً اندھیرا چھایا رہتا اور مکانوں کے اندر سُرخ سُرخ سبز بتیاں ٹمٹماتی رہتیں' یہاں بجلی کے کھمبے ضرور تھے' مگر بلب کسی ایک پر بھی سلامت نہ تھا۔ ایک جگہ ناریل کے درختوں تلے تاڑی خانہ تھا' جہاں صبح و شام مزدور عورتیں اور مرد تاڑی پیتے' شور مچاتے اور لڑتے جھگڑتے رہتے۔ اس جگہ' انہی ڈربہ نما مکانوں میں' چوری چھپے جسم بیچنے والیوں کے دلال رہتے تھے' ٹمپل روڈ دراصل قحبہ روڈ تھی یہ کسی مندر کی طرف نہیں بلکہ کوٹھی خانوں کی طرف جاتی تھی۔ شام ہوتے ہی جب اندھیرا پھیلنے لگتا تو رنڈیوں کے دلال' تاڑی کے نشے میں مگن' کٹے ہوئے پتنگوں کی طرح ٹمپل روڈ پر منڈلانے لگتے کسی وقت وہ تاڑی کے درختوں تلے یا بجلی کے کھمبوں کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو جاتے اور بیڑی پیتے' اپنی خطرناک چمکیلی آنکھوں سے ہر راہ گیر کو گھورنے لگتے' پھر وہ ایکا ایکی لپکتے اور کسی نہ کسی حاجتمند پر حملہ کر دیتے۔

"مُرغی صاحب؟——— ایکدم "اچھاوالا" صاحب؟"

"اچھاوالا" سے ان کی مراد ایسی عورت سے ہوتی تھی جو پیشہ ور نہ ہو' بلکہ عطائی ہو۔

ایک روز میں بھی ایک "اچھاوالا" کے پاس چلا گیا۔

اس رات ہلکی ہلکی بوندیں برس رہی تھیں' میں برساتی اوڑھے فٹ پاتھ پر درختوں کے نیچے سے ہو کر گزر رہا تھا' فضا میں درختوں کے گیلے تنوں کی مرطوب خوشبو رچی ہوئی تھی۔ سڑک پر کبھی کوئی موٹر روشنی کا سیلاب لئے گزر جاتی تو گرتی بارش کی لڑیاں کانچ کے موتیوں کی مانند چمک اُٹھتیں۔ فٹ پاتھ کے ساتھ کھائی میں جھینگر' مینڈک اور پپیہے' چوک میں پہنچ کر میں ٹمپل روڈ کی طرف گھوم گیا' سڑک پر حسبِ معمول اندھیرا تھا کہیں کہیں مکانوں اور تاڑی خانوں میں سے روشنی جھانک رہی تھی' ایک جگہ اچانک مجھ پر حملہ کر دیا گیا۔

"مرغی صاحب———؟"

[illegible] "اچھاوالا" کہنے سے پیشتر ہی میں اس کے ساتھ ہو لیا' جیسے سودا پہلے ہی سے طے تھا' اپنی فوری کامیابی پر وہ پستہ قد دلال [illegible] آگے چلنے لگا' کچھ دور چل کر ہم ایک تنگ گلی میں گھوم گئے' یہاں کچے ناریلوں اور سڑے بسے پیازوں کی بو پھیلی ہوئی تھی' [illegible] دبی ہوئی ٹارچ جلائی اور اس کی کمزور روشنی میں مجھے ایک مکان میں لے گیا' مکان بالکل ڈربہ معلوم ہو رہا تھا' مجھے یوں محسوس [illegible] واقعی میں وہاں مرغیاں خریدنے آیا ہوں۔ ایک کمرے میں پھیکی سی روشنی ہو رہی تھی اور کھڑکیوں پر زرد رنگ کے [illegible] تھے' وہ مجھے اس کمرہ میں چھوڑ کر چلا گیا' کمرہ اگرچہ چھوٹا تھا' مگر سلیقے سے سجا ہوا تھا' فرش پر ایک نیلی دری [illegible] کے تھال میں مہاتما بدھ کی سیاہ پتھر کی مورتی رکھی ہوئی تھی' میں نے برساتی ایک طرف

رکھ کر سگریٹ سلگایا اور پلنگ پر نیم دراز ہو گیا۔ ابھی میرا سر دیوار سے لگا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک پتلی دبلی لڑکی اندر داخل ہوئی اور مسکراتی ہوئی میرے قریب ہی پلنگ پر آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے بال اس کی لمبی پلکوں والی آنکھوں کی مانند گہرے سیاہ تھے' جنھیں اکٹھا کر جوڑے کی شکل میں اس نے گردن پر باندھ رکھا تھا۔ جوڑے میں ننھی ننھی زرد کلیوں کا گچھا لگا ہوا تھا۔ اس کا رنگ موگرہ کی کلی ایسا زردی مائل سپید اور کومل تھا۔ وہ ہلکے عنابی رنگ کی ساری میں ملبوس تھی اور اس کے آدھے ننگے بازو گداز اور گول تھے' پیشانی پر سرخ بندی خوب کا داغ معلوم ہو رہی تھی۔ میری نظروں میں ایکا ایکی وہ مقدس معبد پھر گئے جن کے نیم روشن تہہ خانوں میں کالی کالی آنکھوں والی دیوداسیاں' عود و عنبر کی نیلگوں دھند میں والہانہ رقص کیا کرتی ہیں۔ وہ مجھے اپنی روشن اور چمکیلی آنکھوں سے دیکھتی ہوئی مسکرا رہی تھی۔ میں بھی اپنے آپ مسکرا رہا تھا اور مجھے خواہ مخواہ اپنے ہمسائے ____ بیرسٹر صاحب اور ان کی بیوی کا خیال آ رہا تھا۔

"آپ ذرا کھل کر بیٹھ جائیں" اس نے بڑی صاف انگریزی میں کہا۔ اس کی آواز نرم اور خواب آلود تھی۔

"تم انگریزی جانتی ہو؟"

"کیوں نہیں' ہمیں سیکھنا ہی پڑتی ہے' آپ تو جانتے ہی ہیں' سیلون میں عیسائی زیادہ ہیں۔"

"ہاں' ہاں' ٹھیک ہے۔"

وہ ہنس پڑی اور اس کے گدرائے ہوئے گالوں میں ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے' میں نے سگریٹ راکھ دان میں بجھا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پیار سے دبانے لگا اور دیوداسی کی سیاہ آنکھوں میں پرنور اجالا جھلکنے لگا' وہ جلدی سے اٹھ کر گوتم بدھ کی مورتی کے پاس گئی اور کانسی کے تھال میں اپنے جوڑے کی زرد کلیاں رکھ کر واپس چلی آئی' اب اس کے لمبے بال اس کے شانوں پر بکھر گئے تھے' پلنگ پر لیٹ کر اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور اس کے سیاہ بال میرے بازوؤں پر بکھر گئے اور مجھے غالب کا مشہور شعر یاد آ گیا' میں نے ان بالوں کی بھینی بھینی خوشبو سونگھتے ہوئے پوچھا:

"تمھارا نام کیا ہے؟"

وہ میرا ہاتھ نرمی سے سہلاتے ہوئے خواب آلود آواز میں بولی: "یشودھرا! ____ اور تمھارا نام؟"

میں اُن آنکھوں کی سیاہ جھیلوں پر جھک گیا: "سدھارتھ۔"

وہ چونک اُٹھی: "سدھارتھ؟"

"ہاں!"

"یہ تو ہمارے مقدس بدھا کا نام تھا۔"

"ہاں!"

"اور یشودھرا اس کی بیوی تھی۔"

"ہاں!"

"کیا تم بدھی ہو؟"

"ہاں!"

اور اس نے کسی پراسرار طاقت سے مغلوب ہو کر اپنے آبنوسی بازو میری گردن میں حمائل کر دیے اور مجھے اپنی طرف کھینچ لیا' مجھے اپنا جسم لطیف ہو کر کسی آفاقی رقص میں ڈھلتا محسوس ہو رہا تھا' جیسے ملایا کی طرف سے آنے والی مشرقی ہواؤں کے مہربان جھونکے مجھے ان مندروں میں اُڑا لے گئے ہوں جن کے دھندلے تہہ خانوں میں نیم عریاں دیوداسیاں' بدھ کی کنواری بیٹیاں' گجرے پہنے' عنبر و لوبان کی خوشبوؤں میں مقدس بدھا کے روبرو تھرک تھرک کر رقص کر رہی ہوں۔ دھیمی روشنی میں ان کے لوچدار اعضا دمک رہے ہوا

رقص، نغمے، گلِ صد برگ، موگرہ کلی، چمپا کلی، گومتی، انومندی اور یشودھرا ــــــ صندلیں، نیم عریاں، کنوارے جسم اور سیاہ بالوں والی یشودھرا ــــــ حسین ساکیہ شہزادی!

اور یشودھرا کا جسم کانپ رہا تھا، لرز رہا تھا، کسے ہوئے تار کی طرح، جسے زور سے جھنجھنا دیا گیا ہو۔

یشودھرا نے دراز پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا، ان آنکھوں میں دن کا اُجالا، شفق کا زریں سونا پگھل رہا تھا، صبح ہو رہی تھی، شام ہو رہی تھی۔ اس کے جسم کے ہر بن مُو سے شیریں مہک کی لہریں اُمڈ رہی تھیں، اس کے ہونٹوں میں شراب اور پسینے کے کسیلے ذائقے کی بجائے، سنگلدیپ کے جزیرے کے جنگلی شہد ایسی مٹھاس تھی۔ اس کے گداز جسم کی ریشمی سطح پر ایک کنواری اور لذیذ تھرتھراہٹ تھی جیسے وہ اپنی دوشیزگی کا سرمایہ پہلی بار کسی کو سونپ رہی ہو۔

یہ ایک شرمیلی دلہن کا اچھوتا اور بے داغ جسم تھا۔

اس میں نرمل خون کی حدت اور پاکیزگی تھی۔

"تم سدہارتھ ہو، میں یشودھرا ہوں۔ ساکیہ شہزادی، میں تمھاری بیوی ہوں، میرے جسم کی سیج پر تم زندگی کے آخری لمحات تک آرام کر سکتے ہو۔ اس سیج کے پھول تمھارے انتظار میں سوکھ رہے تھے۔ تم کہاں تھے؟ کدھر تھے؟"

یشودھرا جیسے خواب میں بول رہی تھی، اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں، اس کے بازوؤں کی گرفت میری گردن میں زیادہ مضبوط ہو رہی تھی، مجھے ایک طرح کا خوف سا محسوس ہونے لگا تھا، جیسے میں کوئی شرمیلی دلہن ہوں اور کسی اکھڑ مرد کا کھردرا ہاتھ میری طرف بڑھ رہا ہو۔

میرے دل پر ہاتھ رکھ دو میرے شہزادے! مجھے اپنے سینے سے لگا لو، تاکہ میری سانس تمھاری سانس میں ڈوب جائے اور میرا دل، تمھارے دل کی تال پر دھڑکنے لگے، اور قریب آجاؤ ساکیہ ــــــ میرے ساتھ لگ جاؤ، آج میں تمھیں ان سرحدوں تک لے جاؤں گی جہاں پہنچ کر عورت کی مملکت ختم ہو جاتی ہے۔ میرے ساتھ رہنا میرے سدہارتھ، ہم زمین کی نچلی تہوں میں اُتر رہے ہیں۔ نیچے، نیچے، اور نیچے، یہاں تک کہ زمین اپنی ٹھنڈک کھو بیٹھے گی اور گرم سے گرم تر ہوتی جائے گی، ہم ایک انجانے خلا میں پہنچ جائیں گے۔ غیر مرئی، نورانی، اَن دیکھا، انوکھا، نیم روشن، نیم تاریک، جہاں بے شمار چاند ستارے چکر لگا رہے ہوں گے اور ہم ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈالے، سینہ بسینہ بڑھتے چلے جائیں گے، آگے ہی آگے.......

یشودھرا کی آواز بتدریج جیسے کسی تاریک غار میں ڈوب گئی، اور ہماری سانس ایک دوسرے سے مل گئی اور ہمارے دل ایک ہی تال پر دھڑکنے لگے زمین کی تہیں ہمارے قدموں تلے سرکتی چلی گئیں اور ہم نیم روشن، نیم تاریک گہرائیوں میں اُترتے چلے گئے، نیچے، نیچے اور نیچے ــــــ یہاں تک کہ زمین اپنی ٹھنڈک کھو بیٹھی، وہ گرم سے گرم تر ہوتی چلی گئی اور پھر ــــــ

پھر ــــــ جب ہمارے دل اپنی اپنی تال پر دھڑکنے لگے اور ہم ایک بار پھر زمین کی اصلی سطح پر آگئے تو میں نے برساتی کاندھے پر رکھی، بال درست کئے سگریٹ سلگایا اور بستر پر بے سدھ پڑی ہوئی، اپنی رات بھر کی بیوی، ساکیہ شہزادی کو جھک کر دیکھنے لگا، بجلی کی پھیکی روشنی میں اس کا کنوارا جسم یوں نڈھال پڑا تھا جیسے یکے بعد دیگرے اس نے کئی بچوں کو جنم دیا ہو، اسکی آنکھیں بند تھیں اور پیشانی پر سرخ بندی کا خون پسینے میں گھل مل رہا تھا، ہونٹ اندر سے کھلے تھے اور ہموار دانتوں کی سپید لکیر چمک رہی تھی، تنفس کے ساتھ اس کا سینہ آہستہ آہستہ ڈوب اُبھر رہا تھا، سیاہ لانبے بال گول گول مدوّر چھاتیوں کی مخملیں ڈھلوانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

یہ صندل کے سایوں میں چھپے ہوئے بدھی مندروں کے دودھیا گنبد، یہ آندھیرا دیش کے نیلے نیلے تالوں میں کھلنے والے کنول کے پھول ــــــ انہی گنبدوں کے مقدس سایوں میں بیٹھ کر کالیداس نے شکنتلا لکھی تھی اور یہی وہ کنول کے پھول تھے جن کی کومل پتیوں پر

شکنتلا نے راجہ دشینت کو اپنا پریم سندیسہ لکھ کر بھیجا تھا۔

یہ متعفن اور پگھلا ہوا غلیظ جسم نہیں تھا۔ یہ کمیل مدولا کی بازاری عورت نہیں تھی۔

یہ بورو بدور اور ملایا کے معبدوں کی سیڑھیوں پر عظیم ستونوں کے سایوں میں بیٹھ کر پھول بیچنے والی دوشیزہ تھی۔۔۔ یہ مس ہیلن کیلینگ اور فیلس ڈکنز نہیں تھی۔۔۔ یہ سیتا تھی۔ رام کی سیتا۔ جسے بھوک، غریبی اور افلاس کا راون اس کے وطن سے اٹھا کر یہاں لے آیا تھا اور جسے کسی رام اور لچھمن کا انتظار تھا۔

یہ یشودھرا تھی، ساکیہ شہزادی، جس نے جنوبی ہند کے نیلے پانیوں کے جھاگ سے جنم لیا تھا۔

یہ سنگلدیپ کی افراؤ ڈیٹی تھی، یہ لنکا کی لاڈلی تھی۔

یہ مچھلی مارکیٹ نہ تھی، پھول مارکیٹ تھی، لوگ اس کے قریب سے ہو کر گزرتے تھے۔ یہ پاؤڈر کی نقلی مہک نہ تھی، بلکہ جنگلی پھول کی قدرتی خوشبو تھی، یہ دھوپ میں چمکنے والا سنہری کلس تھا۔

یہ لنکا تھی، زندہ لنکا۔۔۔ سیتا کی لنکا، سونے کی لنکا۔

میں نے سونے کی لنکا پر الوداعی نظر ڈالی، جیسے شہزادہ سدھارتھ رتناگری کے مہیب جنگلوں میں نکل جانے سے پیشتر اپنی بیوی یشودھرا کو آخری مرتبہ دیکھ رہا ہو، اور باہر نکل آیا۔۔۔ باہر چوک والی خانقاہ میں پچھلے پہر کا گجر بج رہا تھا، اور اس کے چمکیلے کلس کے اوپر ایک بڑا سا نیلا ستارہ پھوٹتی سحر کی کافوری جھلکیوں میں ماند پڑ رہا تھا۔

میں یوں مطمئن اور پُر سکون تھا، جیسے میں سچ مچ گوتم بدھ ہوں، اور مجھے ابھی ابھی گیان حاصل ہوا ہے۔

تیسرا آدمی

شوکت صدیقی

دونوں ٹرک سنسان سڑک پر تیزی سے گزرتے رہے!

پتمبر پور روڈ مشرق کی طرف مڑتے ہی ایک دم سے نشیب میں چلی گئی ہے اور جھکے ہوئے ٹیلوں کے درمیان کسی زخمی پرندے کی طرح ہانپتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ رات اب گہری ہو چکی ہے اور آغازِ سرما کی بپھری ہوئی ہوائیں چل رہی ہیں۔ دونوں ٹرک ڈھلوانوں پر کھڑکھڑاتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ ان کا بے ہنگم شور پتھریلی چٹانوں میں دھڑک رہا ہے۔ ایکا ایکی اندھیرے میں سے کسی نے چیخ کر کہا ___

"اے کون جا رہا ہے ٹرک روک لو!"

رات کے سناٹے میں یہ آواز بڑی پراسرار معلوم ہوئی۔ لیکن ٹرکوں کے اندر بیٹھے ہوئے لوگوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی' وہ اسی طرح بیٹھے رہے اور دونوں ٹرک جھکی ہوئی چٹانوں کی گہرائی میں تیزی سے گزرنے ہے۔ اس دفعہ ذرا دور سے آواز سنائی دی ___

"روکو' روک لو ٹرکوں کو!" اور اس کے ساتھ ہی موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی گڑگڑاہٹ اُبھرنے لگی۔ اس کی تیز روشنی کبھی کبھی دھوپ چھاؤں کی طرح ٹرکوں کے پچھلے حصوں پر لہرا جاتی ہے۔ لیکن ٹرک رک نہیں سکتے' اس لئے کہ یہ خطرے کا الارم ہے۔ ان کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ سڑک بالکل ویران ہے اور دونوں ڈرائیور بڑے اکسپرٹ ہیں۔

موٹر سائیکل کی روشنی قریب ہوتی جا رہی ہے' اور قریب! اور قریب!! اور اس کا شور ٹرکوں کے نزدیک ہی دھڑکنے لگا ہے۔ ان کی رفتار اب زیادہ نہیں بڑھ سکتی ہے' اس لئے کہ ڈھلوان پر ٹرکوں کے بے قابو ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ دونوں ڈرائیوروں کے سہمے ہوئے چہرے خوف زدہ ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن نیلی آنکھوں والا وانچو خاموشی سے بیٹھا ہوا سگریٹ پیتا رہا اور برابر سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔ پھر ایک بارگی کوہستانی ٹیلوں کی گہرائی میں ریوالور چلنے کی آواز بڑے بھیانک انداز سے گرجنے لگی اور گولی ٹرک کے پچھلے پہیّوں کے پاس سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ ایک بار پھر کسی نے اونچی آواز میں کہا ___

"روک لو ٹرک کو نہیں تو میں ٹائر برسٹ کر دوں گا۔"

اور اس وارننگ کے ساتھ ہی دونوں ٹرک ٹھہر گئے۔ ٹرک کے اندر سے صرف وانچو اُتر کر نیچے آیا۔ باہر پت جھڑ کی شوریدہ سرد ہوائیں چل رہی تھیں اور ان کی تیز خنکی جسم میں چبھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ وانچو نے اپنے لمبے اوور کوٹ کے کالروں کو درست کیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا موٹر سائیکل کے قریب پہنچ گیا پھر اس نے جلتی ہوئی سگریٹ کو جھنجھلاہٹ کے سے انداز میں سڑک پر پھینک کر جوتے سے مسل ڈالا اور بڑے تیکھے لہجہ میں پوچھنے لگا

"اس طرح ٹرکس کو رکوا لینے کا مطلب کیا چاہتے ہیں آپ؟"

لیکن موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر وانچو کے اس انداز سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا بلکہ بڑی بے نیازی سے کہنے

[illegible] دونوں ٹرکوں کی [illegible]
[illegible] اس کی طرف دیکھ [illegible] اس کی [illegible]
[illegible] نظر میں اداکار [illegible] کرنے پر [illegible] اس نے
[illegible] جولا اور ذرا سے تلخی سے کہنے لگا "اچھا تو آپ [illegible] اگر آپ [illegible] تو دیکھئے
دونوں ٹرکوں پر آلو کے بورے لدے ہوئے ہیں۔ میں ثبوت میں [illegible] کی رسید پیش کر سکتا ہوں۔ چونگی کا یہ
محصول ابھی [illegible] ادا کیا ہے اور جو کچھ اصلیت ہے وہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے اس لئے کہ [illegible] کو اس طرح لے جانے کا
یہ کوئی پہلا اتفاق تو ہے نہیں یہ سلسلہ تو ایک مدت سے چل رہا ہے۔"

انسپکٹر گردن ہلا کر بولا ____

"جی ہاں سنا تو کچھ میں نے بھی یہی ہے اور اسی لئے کئی گھنٹوں سے اس سڑک پر تپسیا کر رہا تھا۔"

وانچو چڑنے لگا "یہ تپسیا تو آپ نے خواہ مخواہ اپنے سر مول لی۔ میں نے آپ کو دو مرتبہ ٹیلیفون کیا۔ اگر آپ دفتر میں مل جاتے تو آپ کو اس طرح کیوں پریشانی اٹھانا پڑتی اور خود مجھے بھی یہاں سردی میں نہ آنا پڑتا۔ مگر چلئے یہ بھی ٹھیک ہی رہا۔ اس بہانے آپ کے درشن تو ہو گئے!"

اور وہ تین سو روپے جو احمد پور کے اس ٹرپ میں وہ بچا لینا چاہتا تھا۔ آخر اس نے ان کرنسی نوٹوں کو اندرونی جیب میں سے نکالا اور انسپکٹر کی طرف ان کو بڑھا کر کہنے لگا ____

"آپ سے پہلی بار ملاقات ہوئی ہے۔ اس لئے کچھ نہ کچھ نذرانہ تو دینا ہی پڑے گا۔ لیجئے ان کو رکھ لیجئے۔ فرمایئے اور کیا سیوا کی جائے؟"

انٹی کرپشن کا انسپکٹر روکھے پن سے بولا۔

"اس مہربانی کا شکریہ! اب اتنی اور مہربانی کیجئے کہ ان کو اپنے ہی پاس رہنے دیجئے۔"

وانچو ذرا سنجیدہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ دونوں اندھیرے میں چپ چاپ کھڑے رہے اور کوہستانی چٹانوں میں پت جھڑ کی بپھری ہوئی ہوائیں چیختی رہیں۔ آگے کھڑے ہوئے ٹرکوں کے اندر سرگوشیوں کی دبی دبی آوازیں بھنبھنا رہی تھیں۔

وانچو غور کرنے لگا کہ یہ آسانی سے ماننے والی آسامی نہیں ہے۔ اس سالے کو ابھی کچھ اور بھی دکشنا دینا پڑے گی۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ ہر کامیاب جرم کی سازش پہلے پولیس اسٹیشن کے اندر ہوتی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ سودا بعد میں بھی طے ہو سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سب مایا کے کھیل ہیں اور مایا کے روپ نیارے ہیں۔ اسی لئے جرائم کی نوعیتیں جداگانہ ہیں۔ جیب کاٹنے والا زیادہ سے زیادہ [illegible] بن سکتا ہے اور کارہائے نمایاں انجام دینے والا سرمایہ دار ہو جاتا ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ہسٹری شیٹر بننے کے لئے پولیس کی [illegible] ہوتی ہے اور سرمایہ کاری کے لئے گورنمنٹ سے ساز باز کئے بغیر کام نہیں چلتا۔ وانچو نے جیب کے اندر سے کچھ اور کرنسی [illegible] آہستہ سے کہنے لگا

[illegible] تک اس سرکل میں تعینات رہے ہماری انڈسٹری کی طرف سے ان کو اسی حساب سے ان کا حق برابر پہنچتا رہا۔" پھر [illegible] وہ جھنجھلا کر بولا "لیکن آپ کو اس طرح جاڑے پالے میں آکر پریشان ہونا پڑا ہے اب اس پریشانی کا بھی کچھ خیال کرنا [illegible] ہیں۔ دیکھئے اب کچھ نہ کہئے گا اور اپنا یہ ریوالور تو آپ اب اندر رکھ لیجئے۔ خواہ مخواہ آپ سے خوف معلوم ہو رہا ہے۔"

[illegible] کے سے انداز میں بولا ____

"دیکھئے آپ مجھے غلط سمجھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ میں ان دونوں ٹرکوں کو پولیس اسٹیشن لے جائے بغیر باز نہ آؤں گا۔ آپ خواہ مخواہ میرا بھی وقت خراب کر رہے ہیں اور خود بھی پریشانی اٹھا رہے ہیں۔" اور وہ موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے لگا۔

اس دفعہ وانچو کی مسکراہٹ نے دم توڑ دیا۔ اس نے بڑی تیکھی نظروں سے انسپکٹر کو گھور کر دیکھا۔ اس عرصہ میں پہلی بار اس کو خطرے کی نوعیت کا احساس ہوا تھا۔ اس لئے کہ دونوں ٹرکس کسی طرح بھی پولیس اسٹیشن نہیں جا سکتے تھے۔ کمپنی کا یہی حکم تھا، یہی ہدایت تھی اور اس ذمہ داری کے لئے کمپنی سے اس کو نو سو روپے ماہوار تنخواہ کے علاوہ مینجنگ ڈائریکٹر کی طرف سے چھ سو روپے اکسٹرا الاؤنس بھی ملتا تھا۔ وانچو کئی ماہ سے اپنی اس ڈیوٹی کو بڑی مستعدی سے انجام دے رہا تھا۔ کمپنی اس کی کارگزاریوں کو سراہتی رہتی ہے اور بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں بہت سی باتوں کے لئے اس کو جواب دہ بھی ہونا پڑتا ہے اور اکثر ایسے بے تکے سوالوں سے اس کو سابقہ پڑتا کہ وہ بدحواس سا ہو جاتا۔ اس لئے وہ پانچسو روپے سے زیادہ دو ٹرکوں کے لئے رشوت نہیں دے سکتا۔ ورنہ آئندہ میٹنگ میں اگر کوئی ڈائریکٹر اُلجھ گیا تو بہت ممکن ہے کہ زائد رقم اس کو اپنی تنخواہ سے ادا کرنا پڑے اور بات بھی کچھ ایسی ہے۔ دراصل ابھی تک فیکٹری کی تعمیر کے لئے کمپنی اپنے پاس سے صرف روپیہ ہی لگا رہی ہے۔ شوگر پلانٹ کی تعمیر ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے۔ البتہ کمپنی کے وہ فارم جن میں ایک کی کاشت ہو گی ان میں ٹریکٹر چلنے لگے ہیں اور آلو کی فصلیں تیار کی جا رہی ہیں اور یہ آلو گنی بیگس میں بھر کر قصباتی بازاروں میں فروخت ہونے کے لئے بھیج دئے جاتے ہیں۔ آلوؤں کے ساتھ سیمنٹ کی بوریاں اور آئرن شیٹس بھی ٹرکوں میں لاد کر پوشیدہ طور پر بلیک مارکیٹ میں جاتے ہیں۔ کمپنی کو اپنی انڈسٹری کی تعمیر کے لئے سیمنٹ اور آئرن کا بہت بڑا سرپلس کوٹا مل گیا ہے جس کی سمگلنگ سنسان راتوں میں بڑے پراسرار طریقے پر ہوتی ہے اور اس سازش میں پولیس کے علاوہ دوسرے محکمے بھی کمپنی کے شریک ہیں۔

وانچو غور کرنے کے سے انداز میں خاموش کھڑا رہا۔ اس کی گھنی بھنویں آنکھوں پر جھکی ہوئی معلوم ہو رہی ہیں اور چہرے کے تیکھے نقوش مجسموں کی طرح ٹھوس نظر آ رہے ہیں۔ پھر ایک بارگی اس نے طے کر لیا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ انہیں وحشت ناک موقعوں کے لئے وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا کہ جو کچھ کرنا ہے اس کے فیصلے کے لئے منٹ بھر کا عرصہ بہت ہے اور جو لوگ صرف انجام ہی پر غور کرتے ہیں وہ کبھی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے اور پھر بوجھل قدموں سے چلتا ہوا وہ آگے والے ٹرک کے پاس پہنچ گیا اور سرگوشی کے سے انداز میں آہستہ آہستہ پکارنے لگا ___

"نیل کنٹھ اے نیل کنٹھ مہاراج۔"

اور ٹرک کے اندر سے مضبوط پٹھوں والا نیل کنٹھ دھنسی ہوئی آواز میں بولا ___

"کیا ہے سکڑی ساب؟"

پھر وہ اتر کر نیچے آگیا۔ اس کا آبنوسی جسم رات کے گہرے اندھیرے میں پرچھائیوں کی طرح دھندلا نظر آ رہا تھا۔

وانچو کہنے لگا ___ "دیکھو نیل کنٹھ یہ سالا انسپکٹر تو مانتا ہی نہیں اور تم جانتے ہو کہ دونوں ٹرک تھانے پر بھی نہیں جا سکتے۔"

وہ سینہ تان کر بولا۔

"تو پھر حکم ہو؟"

گہری نیلی آنکھوں والے وانچو نے اس کو بھرپور نظروں سے دیکھا اور پھر سازش کرنے کے سے انداز میں اس نے ایک آنکھ دبا کر آہستہ سے کہا

"مجھ کو تو صرف اس کی ٹکر کی ضرورت ہے زیادہ جھنجھٹ نہیں چاہئے۔" پھر مڑتے ہوئے اتنا اور کہا "میں جا کر اس سے باتیں کرتا ہوں۔ تم ٹرکوں کی پشت پر سے گھوم کر آ جانا۔ سمجھ گئے نا!"

اور نیل کنٹھ جیسے [illegible] کی آنکھیں جرائم پیشہ لوگوں کی طرح خونخوار نظر آنے لگیں۔ وانچو وہاں سے سیدھا انس

ر پشن کے انسپکٹر کے پاس چلا گیا۔ وہ اس کو آتے ہوئے دیکھ کر بجلی [illegible]

"آپ نے ٹرک کو سٹارٹ نہیں کروایا بلاوجہ دیر ہو رہی ہے"

وانچو بڑی سنجیدگی سے بولا "آپ تلاشی لیں گے یا ٹرک اسی طرح کھڑے رہیں گے؟"

وہ کہنے لگا "بظاہر تو اب کوئی ایسی ضرورت نہیں ہے یوں جیسے آپ کی مرضی۔"

وانچو ایک بار پھر کاروباری انداز سے مسکرایا "انسپکٹر صاحب مرضی ہماری کہاں، مرضی تو آپ کی ہے۔ ہم نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، مگر آپ کی ناراضگی ختم ہی نہیں ہوتی۔"

وہ بے نیازی سے بولا "دیکھئے ان بے کار باتوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہو آپ تھانے پر چل کر کہہ لیجئے گا۔"

وانچو سنجیدہ ہو گیا "بہت اچھی بات ہے۔ لیکن اتنا میں آپ کو ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ آئرن شیٹس اور سیمنٹ کا سرپلس کوٹا لے سکتے ہیں اور جو اس کو سمگل بھی کرا سکتے ہیں وہ اپنے بچاؤ کے طریقے بھی جانتے ہی ہوں گے۔ چور چوری کرنے جاتا ہے تو باہر نکلنے کا رستہ بھی پہلے دیکھ لیتا ہے۔"

اور اس میں شک نہیں کہ وانچو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس لئے کہ "یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ" کے دو ڈائریکٹر ایم ایل اے ہیں اور ان میں سے ایک تو ریونیو منسٹر کا داماد بھی ہے اور اسی لئے سرکاری محکموں میں کمپنی کا اثر بھی ہے اور زور بھی ہے۔ لیکن بھاری بھر کم جسم والا انسپکٹر ان رازہائے سربستہ کو نہیں جانتا۔ اس سرکل میں ابھی اس کا نیا نیا ٹرانسفر ہوا ہے۔ اس لئے پورے علاقہ میں وہ اپنی دھاک بٹھا دینا چاہتا ہے اور اس کے لئے ایک آدھ بڑا کیس بنائے بغیر بات نہیں بنتی اور پولیس کی تکنیک کے مطابق ایک بار جہاں ہوا بندھ گئی پھر تو لکشمی آکر خود قدم چومتی ہے اور اسی لئے وہ کسی طرح باز نہیں آ سکتا۔ وانچو کی باتوں پر جھنجھلا کر اس نے جواب دیا____

"ممکن ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ ابھی تو آپ چل کر ذرا حوالات میں ٹھہریئے۔ پھر دیکھیں گے کہ آپ لوگ اپنے بچاؤ کا کون سا طریقہ جانتے ہیں۔"

اس دفعہ وانچو بھی بپھر گیا۔ اس نے تیزی سے کہا

"انسپکٹر صاحب مجھے کیلاش ناتھ وانچو کہتے ہیں۔ میں تھانہ تک جانے سے پہلے بات کو یہاں بھی طے کر سکتا ہوں۔ آپ کے ایسے اینٹی کرپشن کے انسپکٹروں سے یہاں اکثر سابقہ پڑا کرتا ہے۔ اگر ان میں سے آپ کو کوئی مل گیا ہوتا تو اس طرح مونچھ اونچی کر کے آپ کو بات کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔"

انسپکٹر کے چہرے پر اور بھی خشونت آ گئی۔ وہ اس کو بڑی تیکھی نظروں سے گھورنے لگا اور اسی وقت آبنوسی جسم والے نیل کنٹھ نے اس کے سر پر "آہنی راڈ" اٹھا کر زور سے دے مارا۔ انسپکٹر نے دبی ہوئی کراہ کے ساتھ ہائے کر کے پھٹی ہوئی بھیانک آواز نکالی اور لڑکھڑا کر سڑک پر گر پڑا۔ اس کی انگلیوں میں دبا ہوا ریوالور ابھی تک کانپ رہا تھا۔ وانچو نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ کو اپنے بوجھل جوتے سے رگڑ دیا اور ریوالور کو چھین کر ٹیلوں کی طرف پھینک دیا اور اس کی ریڑھ کی ہڈی پر ایک بھرپور لات مار کر بڑبڑانے لگا____

"دھت تیرے کی، سالا کسی طرح مانتا ہی نہ تھا۔" اور پھر وہ نیل کنٹھ سے کہنے لگا "مہاراج ڈال دو سالے کو ادھر کنارے کی طرف۔" اور پھر اطمینان سے ایک سگریٹ سلگا کر پوچھنے لگا "ہاں یہ دیکھ لو کہ زخم گہرا تو نہیں، ورنہ بلاوجہ بات اور بڑھ جائے گی۔"

نیل کنٹھ کہنے لگا "ہاتھ بھرپور نہیں پڑا ہے۔ کوئی گھبرانے کی بات نہیں ہے۔"

پھر نیل کنٹھ نے سڑک پر بے سدھ پڑے ہوئے بھاری بھرکم جسم والے انسپکٹر کا بازو پکڑا اور اس کو گھسیٹتا ہوا دور تک چلا گیا۔ اس کا کرخت چہرا خون میں ڈوب کر بڑا بھیانک نظر آ رہا تھا اور سانس سہمی ہوئی سی چل رہی تھی۔ وہ اسی طرح جھکے ہوئے کوہستانی ٹیلوں کے دامن میں کسی لاش کی طرح بے سدھ پڑا رہا اور آغازِ سرما کی تیکھی ہوائیں پتھریلی چٹانوں میں ہانپتی رہیں اور ایک بار گی کہیں نزدیک ہی

گیدڑوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔

دونوں ٹرکوں کے اسٹارٹ ہونے کی گڑگڑاہٹ سنسان رات میں اُبھرنے لگی اور وہ موٹر سائیکل کو ٹمری طرح روندتے ہوئے سڑک پر پھر چلنے لگے۔ لیکن احمد پور جانے کے بجائے اب وہ جنوبی ٹیلوں کی طرف مڑ رہے تھے اور کوئی ستر میل کا چکر کاٹنے کے بعد دونوں ٹرک پھر اسی چوراہے پر پہنچ گئے جہاں لوہے کے کھمبے پر لگے ہوئے بورڈوں پر لکھا تھا:۔

بلبیر گھاٹ اکیاون میل

بھوال کلاں' اٹھارہ میل

شیام باڑہ' چوراسی میل

احمد پور ایک سو باون میل

قریب ہی ڈسٹرکٹ آکٹرائے ٹیکس آفس تھا۔ جس کے جھکے ہوئے سائبان کے نیچے ایک دھندلا سا لیمپ جل رہا تھا اور بوڑھا محرر رجسٹروں کو کھولے ہوئے کھانس رہا تھا۔ ابھی کچھ عرصہ قبل یہاں پر دونوں ٹرکوں کی چونگی کا محصول ادا کیا گیا تھا۔ وانچو ٹرک پر سے اُترا اور سیدھا سائبان کے نیچے چلا گیا اور سرگوشی کے لہجہ میں آہستہ سے بولا ___

"منشی جی میرے خیال میں آپ کے رجسٹروں میں ٹائم تو درج نہ ہوتا ہوگا" اور پھر جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور تیس روپے کے کرنسی نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ "لیجئے ان کو رکھ لیجئے اگر کوئی دریافت کرنے آئے تو کہہ دیجئے گا کہ دونوں ٹرکس کوئی ساڑھے آٹھ بجے کے قریب یہاں آئے تھے۔ سمجھ گئے نہ آپ۔"

اور بوڑھے محرر نے اپنی گردن ہلا دی "ایسا ہی ہو جائے گا۔ پر کوئی گھبرانے کی بات تو نہیں؟"

وانچو ڈرامائی انداز میں قہقہہ لگا کر کہنے لگا

"جب تک ہم موجود ہیں اس وقت تک بھلا آپ پر کوئی آنچ آ سکتی ہے۔"

وہ بھی ہنسنے لگا "سو تو ہے' پر بات اتنی ہے سرکار کے اب زمانہ بڑا خراب لگ گیا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر سر سے بال کی کھال نکالتے ہیں۔"

اور پھر چونگی کے بوڑھے محرر کو مطمئن کر کے وہ مسکراتا ہوا ٹرک کے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ دونوں ٹرک پھر روانہ ہو گئے۔ سامنے چتمبر روڈ اندھیرے میں بل کھاتی ہوئی چلی گئی ہے۔ مگر دونوں ٹرک پھر اس پر جانے کی بجائے راحیل روڈ کی طرف مڑ گئے۔ وانچو نے گھڑی میں وقت دیکھا' اب ڈیڑھ بج رہا تھا' اور پھر دو بجنے سے پہلے ہی دونوں ٹرک لبیر گڑھ پولیس سٹیشن کے قریب جا کر ٹھہر گئے۔ وانچو تھانہ کے اندر چلا گیا اور ڈیوٹی انسپکٹر کو ڈیڑھ سو روپے دے کر اس نے ایک ٹرک کا چالان کرا دیا۔ روزنامچہ میں درج کر دیا گیا۔

"ٹرک نمبر ۳۱۳۶' نو بجے شب کو راحیل روڈ پر سے گزرتے ہوئے بغیر ہیڈ لائٹس کے پایا گیا۔
تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ' اس کی بیٹری خراب تھی۔ ٹرک مذکور یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کی ملکیت ہے اور اس میں آلو کے بورے لدے تھے۔"

اور اسی طرح کیم پور کے تھانہ پر مزید ڈیڑھ سو روپے رشوت دے کر دوسرے ٹرک کا بھی چالان کرا دیا گیا' اور ہیڈ کانسٹیبل سرکاری روزنامچہ میں اندراج کرنے لگا:۔

"...نے دس بجے شب کو ٹرک نمبر ۶۲۲۸ راحیل روڈ پر اتنی تیز رفتار سے گزر رہا تھا کہ کسی حادثہ کے ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ڈیوٹی انسپکٹر ہرنام سنگھ نے اس کو رکوا کر تحقیقات کی تو یہ بھی معلوم ہوا کہ ڈرائیور محمد... کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی موجود نہ تھا۔"

اس کے بعد وہ اس لڑکی کو راتیل روڈ پر [illegible] کی گہری سوچ میں [illegible] لڑکی [illegible] کے ساتھ [illegible] فیکٹری [illegible] کی [illegible] طرح [illegible] چلی گئی کہ اس کی کار فیکٹری کے پھاٹک کے اندر داخل ہو گئی۔

وانچو اپنے دفتر میں جا کر حسب معمول کمپنی کے کاموں میں الجھ گیا اور اس کے علاوہ کی اہمیت سنیچر کے روز ہونے والے اس ڈویلپمنٹ سے زیادہ نہ رہی' جس میں ریلوے کی ایک بکرج فیکٹری کے یارڈ کے اندر لٹک ہو گئی تھی اور اس نقصان کے لئے ریلوے نے کوئی چار ہزار روپے کا تخمینہ کیا تھا اور عدالتی کارروائیوں کے لئے ہیر نذر پرشاد اور وہ کیٹ کمپنی کے مشیر قانونی موجود ہی تھے۔

پولیس تحقیقات کرتی رہی۔ تفتیش برابر ہوتی رہی اور انٹی کرپشن کا بھاری بھرکم جسم والا انسپکٹر ہسپتال میں پڑا کر اہتا رہا اور مضبوط پنجوں والا نیل کنٹھ بھنگ چڑھا کر شانتو سے گالیاں بکتا اور اپنے کوارٹر کے اندر لیٹا ہوا رات گئے تک اونچی آواز میں آلہا گاتا رہا۔

"اور اگر تمہاری بات نہ مانی جائے تو؟"

"پھر تو کنور صاحب اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں نکلے گا۔"

"لیکن دلیپ چند تمہیں معلوم ہے کہ میں کمپنی کا مینیجنگ ڈائریکٹر ہوں؟"

کمرے کے اندر اسی طرح تیز لہجے میں باتیں ہوتی رہیں۔ آتشدان میں کوئلے چٹخ رہے تھے۔ دہکتے ہوئے سرخ انگاروں کی روشنی میں وانچو کا گنجا سر چمکنے لگا تھا۔ مگر وہ خاموش بیٹھا ہوا اپنا بھدا سا پائپ پیتا رہا۔ دریچے سے ہوا کے یخ بستہ جھونکے اندر آ رہے تھے اور فیکٹری کے ورکشاپ میں دھڑکتی ہوئی لوہے کی جھنکاروں کا شور سنائی دے رہا تھا باہر ہلکی نیلگوں کہر کے لچھے منڈلا رہے تھے اور اس دھند میں لپٹی ہوئی مینیجنگ ڈائریکٹر کی خوبصورت کوٹھی اونگھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی' جس کے باہر ہی برآمدے میں نیل کنٹھ دیوار سے پیٹھ لگائے چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ برآمدے میں بالکل اندھیرا تھا اور اس گہری تاریکی میں نیل کنٹھ کا سیاہ آبنوسی جسم آسیب زدہ سایہ کی طرح ڈراؤنا معلوم ہو رہا تھا۔

نیل کنٹھ اس طرح اندھیرے میں خاموش بیٹھا رہا اور جب کبھی دیپ چند تیزی سے بولتا تو وہ چونک کر کمرے کے دروازے کی طرف گھبرا کر دیکھتا جیسے اب کچھ نہ کچھ ہونے ہی والا ہے۔ لیکن دیپ چند اندر بیٹھا ہوا اطمینان سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر ٹیبل لیمپ کے "شیڈ" کی پرچھائیں پڑ رہی ہے اور اس دھندلی روشنی میں اس کا مخنی جسم ناٹک کے کسی مسخرے کی طرح حقیر نظر آ رہا ہے۔ مگر دیپ چند کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ ہے۔ کمپنی کی غیر قانونی سازشوں میں اس کا کردار بہت اہم ہے۔ یہ بات نیلی آنکھوں والا وانچو بھی جانتا ہے اور اس کی اہمیت مینیجنگ ڈائریکٹر کو بھی معلوم ہے' جس کو فیکٹری کے اندر سب لوگ کنور صاحب کہتے ہیں۔ اس لئے کہ رانی بازار کے علاقہ کا جاگیردار ہے۔ وہ کاروباری تکنیک سے زیادہ گھوڑوں کی نسلوں اور عورتوں کی مختلف قسموں کے متعلق بہت کچھ جانتا ہے اس لئے کہ اس نے زندگی بھر ریس میں گھوڑے دوڑائے ہیں اور عورت کے جسم پر کسی کیمیاگر کی طرح کوک شاستری تجربے کئے ہیں اور جب سے جاگیرداری پر زوال آنے کی افواہیں سرکاری حلقوں میں گشت کرنے لگی ہیں اس نے بھی اپنے سرمائے کو محفوظ کرنے کے لئے کسی انڈسٹری میں داخل ہو جانا ہی اپنے حق میں بہتر سمجھا اور اس دوراندیشی نے اس کو کنور شیو راج سنگھ سے ایکبارگی یونائیٹڈ انڈسٹریز کا مینیجنگ ڈائریکٹر بنا دیا ہے۔ لیکن کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ اس کی باتوں سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا۔ بلکہ اس نے بڑی بے نیازی سے کہہ دیا۔

"اور آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ ہوں۔ سارے رجسٹر میرے ہی پاس رہتے ہیں۔"

مینیجنگ ڈائریکٹر یکبارگی برافروختہ ہو کر بولا۔

"ٹھیک ہے کہ [illegible] رہتے ہیں۔ مگر اس بات سے تمہارا مطلب؟"

وہ کہنے لگا "چوٹ کھایا ہوا انسان بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ کنور صاحب آپ میرے ساتھ حق گلی کریں ... کی سارے رجسٹروں کو کل ڈائریکٹروں کی میٹنگ میں پیش کر سکتا ہوں۔"

میجنگ ڈائریکٹر کے سانس کی رفتار ایک دم سے تیز ہو گئی اور وہ منحنی جسم والے دیپ چند کو قہر آلود نظروں سے گھورنے لگا لیکن دیپ چند بیٹھا ہوا مزے سے اپنی کنپٹی کھجاتا رہا۔ اس لئے کہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ میجنگ ڈائریکٹر اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ پوری طرح اس کے قابو میں ہے۔

دیپ چند اس کی سازش کے اتنے بڑے راز کا محافظ ہے کہ وہ جس وقت بھی چاہے اس کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ سیمنٹ اور آئرن جن داموں میں چور بازار میں فروخت ہوتا ہے کمپنی کے رجسٹروں میں اس کی قیمت بہت کم درج کی جاتی ہے اور اس طرح اب تک میجنگ ڈائریکٹر نے پوشیدہ طور پر کوئی دو لاکھ روپیہ غبن کر لیا ہے۔ لیکن دیپ چند کو اپنے اعتماد میں رکھنے کے لئے اس نے دس فیصد کا شرکت دار بنا لیا تھا اور اس بیس ہزار روپے کی ادائیگی کے لئے اس کی نیت بدل گئی اور دیپ چند کے اکثر توجہ دلانے پر بھی وہ برابر ٹالتا رہا۔ لیکن دیپ چند یہ طے کر کے آیا تھا کہ آج وہ کچھ نہ کچھ فیصلہ کر کے جائے گا۔ اس لئے کہ اس کی بڑی لڑکی کی شادی بیاہ کی بات ایک ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کے لڑکے سے طے پا چکی ہے' گھرانا اچھا ہے اس کے لئے کوئی شبہ گھڑی دیکھ کر لگن ہو جانا چاہئے۔ لیکن اس کے لئے کائستھوں کے رواج کے مطابق ابھی اس کو دس ہزار روپیہ تلک میں دینا ہے۔ ورنہ یہ سگائی نہیں ہو سکتی۔ لیکن میجنگ ڈائریکٹر چاہتا ہے کہ بورڈ آف ڈائریکٹرز سے سفارش کر کے اس کی تنخواہ ڈھائی سو روپے ماہانہ سے ساڑھے تین سو کروا دے۔ مگر دیپ چند کو یہ رشوت منظور نہیں ہے۔ اسے بیس ہزار روپیہ چاہئے____ اس لئے کہ وہ اپنی لڑکی کا بیاہ جلد ہی کر دینا چاہتا ہے۔

میجنگ ڈائریکٹر کا چہرہ جھنجھلاہٹ کے اثر سے برابر غضبناک ہوتا جا رہا ہے۔ اس کی کاروباری زندگی پر جاگیرداری کا روپ برابر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔ پھر یک بارگی وہ کمپنی کے میجنگ ڈائریکٹر سے صرف رانی بازار کے علاقہ کا کنور شیوراج سنگھ رہ گیا۔ اس نے میز پر زور سے گھونسہ مار کر کہا۔

"تم میرے کمرے سے باہر نکل جاؤ۔" اور پھر وہ چیخ کر زور سے بولا "جاؤ جو تمہارے جی میں آئے کرو۔"

اور منحنی جسم والا ناٹک کا مسخرہ مسکین سی شکل بنائے ہوئے خاموشی سے اٹھ کر دروازے سے باہر چلا گیا۔ کمرے کے اندر گہری خاموشی چھا گئی۔ آتش دان میں دہکتے ہوئے کوئلے کبھی کبھی چٹخنے لگتے ہیں اور باہر لان میں دیپ چند کے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔ پھر وانچو نے اپنا پائپ میز پر رکھ دیا اور میجنگ ڈائریکٹر سے کہنے لگا____

"کنور صاحب یہ آپ نے کیا کر دیا؟"

"کچھ نہیں سب ٹھیک ہے۔ کل سویرے ہی اس کو نوٹس دے کر نوکری سے علیحدہ کر دو۔"

وانچو گھبرا کر بولا

"لیکن اس طرح سے کام تو نہیں چلے گا۔ بلکہ اب تو وہ اور بھی آسانی سے ہم کو بلیک میل کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے پاس ہمارے ... سے ڈاکومینٹری ثبوت موجود ہیں۔"

کنور شیوراج سنگھ گہری خاموشی میں کھو گیا' اور خود کو بڑا بے بس محسوس کرنے لگا۔ پھر اس نے بڑی بے چارگی سے کہا____

"اچھا تو ... تم ہی کرو۔"

وانچو کہنے لگا "آپ ... کوٹھی میں تشریف لے جائیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے ہوتے ہوئے بھلا آپ پر کوئی حرف آ سکتا ہے۔"

کنور شیوراج سنگھ ... اس کی طرف دیکھا اور پھر کرسی پر سے اٹھ کر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس

کے چلے جانے کے بعد وانچو نے نیل کنٹھ کو اندر کمرے میں بلایا اور اس سے کہنے لگا ___

"نیل کنٹھ مہاراج، دیکھو دیپ چند ابھی زیادہ دور نہ گیا ہو گا۔ تم جا کر اس کو بلا لاؤ، کہنا کہ سیکرٹری صاحب نے بلایا ہے۔" مور نیل کنٹھ تیز تیز قدموں سے کوٹھی کے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ لوٹا تو اس کے ہمراہ دیپ چند بھی تھا۔ نیل کنٹھ پھر جا کر دراندے میں ٹھہر گیا اور وانچو دیپ چند سے کہنے لگا

"اکاؤنٹنٹ صاحب آپ بھی خوب آدمی ہیں بوڑھے ہونے لگے مگر مزاج پہچاننا آپ کو ابھی تک نہیں آیا۔ بھلا اس طرح بھی کوئی بات طے ہوتی ہے۔"

لیکن دیپ چند بھی کم سیانا نہ تھا۔ وہ پہلے ہی بھانپ گیا تھا کہ اس کا "ترپ" ٹھیک پڑا ہے اور اب وہ اس کے قابو سے نکل کر جا نہیں سکتے۔ اس دفعہ وہ بھی ذرا نرمی سے بولا ___

مگر سیکرٹری صاحب یہ تو دیکھئے کہ کنور صاحب تو میرا گلا کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ میں کرتا بھی کیا؟"

وانچو اپنے خاص انداز میں ہنسنے لگا ___

"کمال کر دیا آپ نے اتنا تو آپ جانتے ہی ہیں کہ زندگی میں پہلی بار وہ اس کاروباری بکھیڑے میں آ کر پھنسے ہیں۔ انہوں نے تو ہمیشہ حکم چلائے ہیں اور اپنی جاگیر میں من مانی حکومت کی ہے۔ دیکھئے رئیسوں سے بات کرنے کا اور ہی گر ہوتا ہے۔ ان کے سامنے تو ہر بات پر بس ہاں کرتے جائیے پھر جو کام جی چاہے ان سے کرا لیجئے۔"

اور دیپ چند نے جیسے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔ ذرا پشیمانی کے سے انداز میں کہنے لگا

"اب کیا عرض کروں سیکرٹری صاحب مجھے بھی اس وقت نامعلوم کیا سوجھی کہ ان کے سامنے ذرا تیزی سے بات کرنے لگا۔ دراصل میں اپنی لڑکی کی سگائی کے سلسلے میں ادھر بڑا پریشان ہوں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ میں بواسیر کا پرانا مریض ہوں۔ روز بروز تندرستی گرتی جا رہی ہے۔ اپنی زندگی میں ہی اس کے ہاتھ پیلے کر دوں، بس اب تو یہی لگن ہے۔"

وانچو ہمدردی کرنے لگا

"جی ہاں لڑکی کا ہونا بھی اس سوسائٹی میں اچھی خاصی مصیبت ہی ہے۔ لیکن بات کے اسی پہلو پر آپ نے زور دیا تھا تو بھلا کنور صاحب انکار کر سکتے تھے۔ انہوں نے لاکھوں روپیہ ریس بازی پر تباہ کر دیا ہے۔ کیا اس کنیا دان کے لئے وہ کچھ نہ کرتے۔"

"اچھا تو آپ ہی بتائیے کہ میں کیا کروں؟"

وانچو کہنے لگا "کیجئے گا کیا! کنور صاحب نے جب آپ سے وعدہ کیا ہے تو آپ کو اپنا روپیہ ملے گا۔"

منحنی جسم والے دیپ چند کے روکھے چہرے پر یک بارگی زندگی کی رمق ہویدا ہو گئی۔ وہ مسکرا کر بولا "تو پھر اس کام کو اب کرا ہی دیجئے سیکرٹری صاحب! آپ کا بہت بڑا احسان ہو گا۔"

وانچو جلدی سے بولا ___

"آپ خواہ مخواہ مجھ کو شرمندہ کر رہے ہیں۔" پھر اس نے میز کی دراز سے کنجی نکالی اور دیپ چند کے سامنے اس کو ڈال کر کہنے لگا "لیجئے ذرا سیف میں سے چیک بک نکال لیجئے۔ میں آپ کے لئے ابھی چیک تیار کئے دیتا ہوں۔ اس وقت تو کنور صاحب کا موڈ بگڑا ہوا ہے۔ سویرے آفس پہنچنے سے پہلے ہی میں ان سے دستخط کروا کے آپ کو چیک دے دوں گا۔ آپ بالکل اطمینان رکھیں۔"

اور دیپ چند جیسے واقعی مطمئن ہو گیا۔ اُس نے کچھ بھی نہ کہا اور چپ چاپ گھبرائے ہوئے انداز میں کنجی اٹھائی اور دیوار کے پاس کھڑے ہوئے آہنی سیف کے پاس پہنچ گیا۔ پھر دیپ چند نے اس کے اوپر لگے ہوئے گہرے سبزی مائل چھوٹے سے بلب کو دیکھا جو اپنی ایک آنکھ سے اس کی طرف گھور رہا تھا۔ گویا خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے تالے کو کھول کر دروازے کو باہر کی طرف کھینچ لیا۔

آہنی سیف کا اندرونی حصہ منہ پھاڑے ہوئے نظر آنے لگا اور وانچو گردن موڑے ہوئے مجرمانہ نظروں سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا اور جیسے ہی دیپ چند نے آہنی سیف کے نچلے خانے کا ہینڈل مضبوطی سے پکڑ کر اس کو کھولنا چاہا اسی وقت وانچو نے دیوار میں لگے ہوئے سوئچ کو دبایا۔ دیپ چند ایکا ایکی بڑی بھیانک آواز سے چیخا۔ پھر اس کے کراہنے کی دبی دبی آوازیں گہری خاموشی میں ہانپنے لگیں اور وانچو نے جھٹ سے کمرے کے اندر اندھیرا کر دیا۔ آتش دان کی گہری سُرخ روشنی میں اس کا بے ہنگم سایہ سامنے والی دیوار پر بڑا مہیب نظر آنے لگا۔ دیپ چند کے حلق کے اندر سے بلبلوں کے غرانے کی سی آوازیں نکل رہی تھیں اور باہر فیکٹری کے ورکشاپ میں لوہے کے ٹکرانے کی جھنکاریں دھڑک رہی تھیں۔ ہر طرف گہرا دھندلکا چھایا ہوا تھا اور کمرے کی آسیب زدہ تاریکی میں کھڑا ہوا وانچو بڑا پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت تھی اور اس کے گنجے سر پر پسینہ کی نمی آگئی تھی۔ پھر وہ خواب میں بھٹکنے والے سایوں کی طرح آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا آہنی سیف کے قریب جا کر ٹھہر گیا اور ذرا دیر تک بالکل ساکت کھڑے رہنے کے بعد اس نے دیپ چند کی طرف دیکھا جس کا ہاتھ ابھی تک ہینڈل سے اُلجھا ہوا تھا اور وہ فرش پر خاموش پڑا ہوا تھا۔ دھندلی روشنی میں اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں بڑی ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھیں۔ لیکن وانچو خونخوار نگاہوں سے کھڑا ہوا اس کو چپ چاپ دیکھتا رہا۔ پھر اس نے نیل کنٹھ کو آواز دی اور نیل کنٹھ سہمی ہوئی آواز میں بولا ___

"کیا حکم ہے سیکرٹری صاب؟"

وانچو کہنے لگا "جاؤ ورانڈے میں لگے ہوئے مین سوئچ کو آف کر دو اور اس کے بعد کمرے کے اندر چلے آنا۔"

باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر آہنی سیف پر جلتا ہوا سرخ رنگ کا چھوٹا سا بلب بھی بجھ گیا۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں تھی اور اس کے ساتھ ہی دیپ چند کا ہاتھ ہینڈل پر سے چھوٹ گیا اور اس کا بے جان جسم فرش پر ایک طرف لڑھک گیا۔ پھر ذرا دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور نیل کنٹھ اندر آگیا۔ وانچو اس سے کہنے لگا ___

"اس کو اٹھا کر باہر لان میں لے جاؤ۔ میں ابھی ذرا دیر میں آتا ہوں۔" اس کی آواز میں دبی ہوئی تھرتھراہٹ تھی۔

نیل کنٹھ نے ایک بار بھرپور نظروں سے وانچو کو دیکھا۔ جیسے وہ پوچھ رہا ہو کہ کیا یہ مر گیا؟ پھر اس نے دیپ چند کی لاش کو اٹھا کر اپنی چوڑی چکلی پیٹھ پر لاد لیا اور کسی کبڑے کی طرح کمر کو جھکائے ہوئے سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ وانچو نے دیوار پر لگے ہوئے آہنی سیف کے سوئچ کو احتیاطاً دبا کر آف کر دیا اور پھر اپنی کوٹ کی جیب میں سے ٹارچ نکال کر اس کو روشن کیا۔ اس تیز روشنی میں وہ سیف کے پاس پہنچا اور اس کی پشت پر لگے ہوئے فلکس ایبل وائر کو علیحدہ کر دیا اور دیوار پر لگے ہوئے برہنہ الیکٹرک وائر پر لڈ شیٹ چڑھا کر دونوں اسکرو اچھی طرح کس دیئے۔ لیکن ابھی تک آہنی سیف کا اندرونی حصہ منہ پھاڑے ہوئے نظر آ رہا تھا اور جب وہ اس کے دروازے کو بند کرنے لگا تو یک بارگی اس کو دیپ چند کی پھٹی ہوئی آنکھیں یاد آگئیں۔ اس کا سارا جسم لرز اٹھا اور آتشدان کے اندر دہکتے ہوئے انگارے کسی جلتی ہوئی چتا کی طرح چٹخنے لگے۔ وانچو کی سانس اب تیزی سے چلنے لگی اور بدحواس سا کمرے کے باہر چلا گیا۔ کوٹھی کے اندر بالکل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اسنے جلدی سے مین سوئچ آن کر دیا اور ایک دم سے دریچوں پر روشنی کی ہلکی ہلکی لہریں جھلملانے لگیں۔ اس وقت کوٹھی کے اندر سے کنور صاحب کے کھانسنے کی آواز سنائی دی مگر اس نے ادھر کوئی توجہ نہ دی اور تیزی سے ورانڈے کی سیڑھیوں پر سے اترتا ہوا باہر لان میں چلا گیا جہاں نیل کنٹھ کھڑا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وانچو نے سرگوشی کے سے انداز میں اس کو دھیرے سے آواز دی اور دونوں گہری دھند میں کھوئے ہوئے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ ان کے قدموں کی دبی دبی آہٹ سنسان راستہ پر دور تک سنائی دیتی رہی ___!!

رات گئے جب نیل کنٹھ اپنے کوارٹر پر واپس آیا تو دھندلی روشنی میں اس نے ایک دبلے پتلے بچے کو دیکھا جو سردی سے سکڑا ہوا کھڑا تھا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ وہ دیپ چند اکاؤنٹنٹ کا لڑکا منا تھا اور تھرتھراتی ہوئی آواز میں بوڑھے چوکیدار کو پکار رہا تھا۔

[illegible] ———— [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"بابوجی ابھی تک گھر نہیں گئے۔ ماں جی گھبراتی ہیں۔ سو انہوں نے مجھ کو پوچھنے کے لئے بھیجا ہے اور کرشنا بڑی دیر سے رو رہی ہے"

بولا چوکیدار کہنے لگا کہ "وہ کنور صاحب کی کوٹھی پر گئے ہوں گے۔ میں ابھی جا کر ان سے کہہ دوں گا۔ چلو پہلے تم کو کوارٹر تک چھوڑ آؤں۔" وہ لڑکے کو اپنے ہمراہ لے کر چل دیا۔ نیل کنٹھ اندھیرے میں کھڑا ہو کر یہ سب کچھ دیکھتا رہا، پھر یک بارگی اس نے ساکت سا ٹھہر کر کہنے لگا تھا ____

"یہ بھولا ادام تم جا کر بابوجی کو لے آؤ۔ میں کوارٹر چلا جاؤں گا۔ تم جلدی سے آ جانا۔ وہ منھی بچہ ہے نا بابوجی کے بنا اس کو نیند نہیں آتی۔ خوب زور زور سے روتی ہے۔"

اور جیسے نیل کنٹھ کے کان کے پاس کوئی سرگوشی کے سے انداز میں کہنے لگا "جاؤ سنا اب تمہارے بابوجی کبھی نہیں آئیں گے اور منھی بلو روتے روتے ان کے بغیر ہی سو جائے گی۔ وہ فیکٹری کے پاور ہاؤس کے اندر چپ چاپ پڑے ہیں نہ کچھ بولتے ہیں نہ کسی کی کچھ سن سکتے ہیں۔ تمہاری آواز اب ان تک نہیں پہنچ سکتی۔"

اور نیل کنٹھ محسوس کرنے لگا کہ جیسے وہ بہت تھک گیا ہے۔ اس کا مضبوط پٹھوں والا جسم موم بتی کی طرح پگھلنے لگا ہے اور اس کے چاروں طرف جیسے دبی دبی سسکیاں دھڑک رہی ہیں۔ پھر وہ خواب کے سے عالم میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے کوارٹر کے دروازے پر پہنچا اور اس کو کھٹکھٹانے لگا۔ لیکن اس شور سے وہ اچانک چونک پڑا اور اس کو یاد آ گیا کہ دروازہ تو اندر سے بند ہے۔ پھر کوارٹر کی پشت پر جا کر صحن کی پچھلی دیوار کو پھاند کر وہ اندر آ گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ ڈسٹرکٹ جیل کی پتھروں والی اونچی دیوار کو پھاند کر رات کے سناٹے میں فرار ہوا تھا۔ اس کے پیچھے گشت کرنے والے پہرے داروں کی بھیانک سیٹیاں دیر تک چیختی رہیں اور پھر اپنے کمرے کے اندر لیٹا ہوا وہ بڑی رات تک نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ قسم کی باتیں سوچتا رہا۔

دوسرے دن فیکٹری کے تمام ڈیپارٹمنٹ بند رہے۔ اس لئے کہ چیف اکاؤنٹنٹ دیپ چند کی اچانک موت ہو گئی تھی۔ اس کی لاش پاور ہاؤس کے اندر پائی گئی ہے۔ اس نے الیکٹرک جنریٹر کے "سوئچ" بار کو غلطی سے چھو لیا تھا اور اس حادثہ سے وہ جانبر نہ ہو سکا۔

اس اطلاع کے ساتھ ہی فیکٹری کے یارڈ میں یہ بھی سرگوشیاں ہو رہی تھیں کہ دیپ چند نے خودکشی کر لی ہے اور اس کی وجہ جاننے کے لئے کتنی ہی قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن سہ پہر کو پروگرام کے مطابق ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہوئی اور کنور شیوراج سنگھ کی سفارش پر دیپ چند کے بے سہارا خاندان کے لئے پانچ ہزار کی رقم گزارے کے لئے منظور کر دی گئی۔

فیکٹری کی تعمیر [illegible] کی سست چال جاری ہے ___!

پھاگن کی [illegible] ہوائیں چلنے لگی ہیں اور ان تیز ہواؤں میں سرسوں کے گہرے زرد پھولوں کی ڈالیاں جھومنے لگی ہیں اور کھیتوں میں جیسے بسنتی آنچل لہرا جاتے ہیں۔ کھیتوں میں رات گئے تک ڈھولک اور جھانجھیں بجا کرتی ہیں اور ہولی کے راگ اونچے سروں میں گائے جاتے ہیں۔ پھر گاؤں [illegible] الاؤ دہکنے لگیں گے اور عبیر و گلال اڑنے لگے گا۔ پھاگن کی ہوائیں چیختی پھر رہی ہیں کہ ہولی آ رہی ہے۔ ہولی آ رہی ہے۔ پھر گیہوں کی لہلاتی ہوئی کھیتیاں کٹنا شروع ہو جائیں گی اور دور دور کے شہروں میں کام کرنے والے گاؤں کے لوگ موسم سرما میں [illegible] والے آبی پرندوں کی طرح اپنی بستیوں میں آنا شروع ہو جائیں گے۔ یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کی فیکٹری کے یارڈ میں [illegible] کم پڑتا جا رہا ہے۔ فصلوں کی کٹائی کرنے کے لئے کمپنی کے سارے [illegible] دھیرے

دھیرے دھیرے فیکٹری کا کام چھوڑ کر بھاگنے لگے ہیں۔ کمپنی نے گھبرا کر ان کی کئی ہفتہ کی مزدوری روک لی ہے۔ اس بات سے قلیوں کے ورکروں کے چہرے پر ہر وقت جھنجلاہٹ چھائی رہتی ہے۔ وہ ٹائم کیپر آفس میں اکٹھے ہو کر زور زور سے چلاتے ہیں ——

"یہ مزدوری کیوں نہیں ملتی ایسا کیوں ہو رہا ہے؟"

"یہ سب کیا ہے؟ ہولی کا تہوار آ رہا ہے۔ ہم کو پیسہ چاہئے ہے۔"

"ہاں ہم کو اپنی مزدوری چاہئے ہے۔ ہم کو اپنی مزدوری چاہئے ہے۔"

لیکن مزدوری ابھی نہیں مل سکتی اس لئے کہ کمپنی چاہتی ہے کہ شوگر کا پلانٹ جلد ہی تعمیر ہو جائے۔ نہیں تو کمپنی کا بہت نقصان ہو جائے گا۔ مگر مزدور لوگ اس کے باوجود بھی نہیں ٹھہرتے۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے ہیں۔ سب کو گالیاں دیتے ہیں۔ پھر کسی روز تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر اپنی بستی کو چل دیتے ہیں۔ ان باتوں کو دیکھ کر بورڈ آف ڈائریکٹرز کی ایمرجنسی میٹنگ بلائی گئی اور یہ طے ہوا کہ قلی لوگوں کا ریٹ بڑھا دیا جائے۔ اس لئے کہ فیکٹری کی تعمیر میں کسی قسم کی تاخیر نہیں ہونا چاہئے۔ پھر اس کے بعد مزدوری کے ریٹ بڑھنا شروع ہو گئے ——

ایک روپیہ چھ آنے یومیہ!

- ایک روپیہ دس آنے یومیہ!

ایک روپیہ چودہ آنے یومیہ!

مگر ان تین ہفتوں میں ریٹ بڑھانے کا تجربہ بھی کچھ کارگر ثابت نہ ہوا۔ بلکہ ہولی کا الاؤ دیکھتے ہی مزدوروں نے اور بھی تیزی سے کام پر سے فرار ہونا شروع کر دیا۔ ہر روز ٹائم کیپر رجسٹر لے کر مینجنگ ڈائریکٹر کے آفس میں جاتا اور سہمی ہوئی سی آواز میں رپورٹ سناتا۔ مینجنگ ڈائریکٹر جھنجلا کر مزدوروں کے ساتھ سہمے ہوئے ٹائم کیپر کو بھی گالیاں دینے لگتا۔ پھر ایک روز اس نے وانچو کو اپنے دفتر میں بلایا اور پریشانی کے عالم میں اس کو کہنے لگا ——

"مسٹر وانچو آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ ریٹ اس طرح کب تک بڑھایا جائے گا؟"

مگر وانچو بھی کچھ گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا ——

"کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کنور صاحب' بات یہ ہے کہ یہ ترائی کا علاقہ ہے۔ یہاں کی زمین بڑی زرخیز ہے۔ اس دفعہ بھی سُن رہا ہوں کہ فصلیں بہت اچھی رہی ہیں۔ راشن کا زمانہ ہے کسانوں کے ٹھاٹھ ہو گئے ہیں۔ اب انہیں فیکٹری کی نوکری کیا اچھی لگے گی اور یہ زمینداری ابالیشن کی خبروں نے تو ان کا اور بھی دماغ خراب کر دیا ہے۔"

وہ اور بھی پریشان ہو کر بولا ——

"تم نے تو پوری کتھا سنانا شروع کر دی۔ اس طرح کیسے کام چلے گا۔ یہ بتاؤ کہ لیبر کا کیسے بندوبست ہو۔"

وانچو دیر تک مینجنگ ڈائریکٹر کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ بڑے اعتماد سے بولا:

"[illegible] ایک ہی بات آتی ہے۔ لیکن اس میں خطرہ بھی ہے اور روپیہ بھی اچھا خاصا خرچ ہو گا۔"

[illegible] جلدی کہنے لگا

"[illegible] روپیہ کی تم فکر نہ کرو۔ میں ڈائریکٹروں سے نپٹ لوں گا اور یوں بھی کچھ کم خرچ نہیں ہو رہا ہے۔ اگر [illegible] تو سمجھ لو یہ کمپنی دیوالیہ ہو جائے گی۔"

"[illegible] کیمسٹ سانیال کیسا آدمی ہے اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟"

[illegible] ایک آدمی تو وہ کام کرتا ہے [illegible]
[illegible] کیا مگر اس [illegible] بھی [illegible]

پھر وانچو نے [illegible] اس کو آواز دی اور اس کو سانیال کے [illegible] کے لئے [illegible] کے بعد [illegible] والا کیمسٹ [illegible]
کے اندر آ گیا۔ وانچو نے خاموشی کے ساتھ اس کا گہری نظروں سے جائزہ لیا [illegible]

"مسٹر سانیال۔ نومبر کے مہینے میں آپ کمپنی کے کام سے بمبئی گئے تھے اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے وہاں آپ نے گورنمنٹ لیبارٹری سے بھی کچھ مشورہ کیا تھا۔ وہاں کوئی آپ کا جاننے والا تو نہیں ہے؟"

بھدے چہرے والا سانیال ذرا دیر تک غور کرنے کے بعد بولا ___

"جی ہاں، میری وائف کے ایک رشتہ دار اس میں کام کر رہے ہیں۔ جن کے فلیٹ میں میں دو روز تک ٹھہرا بھی تھا۔"

اور وانچو کا گھبرایا ہوا چہرہ یک بارگی جیسے دمک اُٹھا۔ وہ چٹکی بجا کر بولا "پھر تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ دیکھئے آج رات کی گاڑی سے آپ دہلی چلے جائیں اور وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے بمبئی پہنچ جایئے۔ آپ کو گورنمنٹ لیبارٹری کے ذریعے ایک بڑا اہم کام کرنا ہے۔"

اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے ٹیلیفون اٹھا کر دہلی کے واسطے سیٹ کی ریزرویشن کے لئے اسٹیشن ماسٹر سے گفتگو کی اور سہ پہر تک دس ہزار روپے کا ڈرافٹ بنوا کر اس کو دے دیا۔ پھر شام کے وقت مینجنگ ڈائریکٹر کی کوٹھی پر سانیال وانچو کے ساتھ بند کمرے کے اندر دیر تک رازدارانہ باتیں کرتا رہا اور پروگرام کے مطابق شب کی ٹرین سے دہلی روانہ ہو گیا۔

پانچویں دن فیکوی میں سانیال کا بمبئی سے ٹیلیگرام آیا، لکھا تھا

"ہارڈ ویئر کا بازار بہت خراب ہے۔ کرشنگ سلنڈر ابھی تک نہیں ملا۔"

وانچو نے تار کو کئی بار پڑھا اور اپنے دفتر میں خاموش بیٹھا ہوا اس "کوڈ مینوز" پر غور کرتا رہا۔

پھر کئی روز اور گزر گئے کوئی اطلاع نہ آئی اور وانچو کی بے چینی بڑھنے لگی۔ اس پریشانی میں اس کے رخساروں کی اُبھری ہوئی ہڈیاں اور بدنما معلوم ہونے لگی تھیں۔ پھر ایک روز فیکوی کا کیمسٹ سراسیمگی کے عالم میں اس کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے کے بھدے نقوش گھبراہٹ سے دھندلے معلوم ہو رہے تھے۔

وانچو کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا اس کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے پوچھا

"کیا خبر لائے ہو؟"

"کام تو بن گیا!"

وانچو مسکرانے لگا۔ "تو پھر تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

سانیال دروازے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے لگا۔ پھر اس کے قریب جھک کر کہنے لگا ___

"مجھے ایک شخص پر شبہ ہوا ہے کہ وہ بمبئی سے میرا پیچھا کر رہا ہے۔"

وانچو لمحہ بھر کے لئے گہری خاموشی میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا

"اچھا آپ جا کر ذرا اطمینان سے آرام کیجئے۔ اس قدر گھبرانے کی کوئی بات نہیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

سانیال ذرا دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر دفتر سے باہر چلا گیا اور وانچو آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کے قریب آکر کھڑا ہو گیا۔ بھدے چہرے والا کیمسٹ فیکوی کے پھاٹک سے نکل کر اپنے کوارٹر کی طرف جا رہا تھا۔

وانچو چپ چاپ کھڑا ہوا اس کو دیکھتا رہا اور جب ایک موڑ پر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ پھر اپنی میز پر آگیا اور ٹیلیفون اٹھا کر مینجنگ ڈائریکٹر کو رنگ کیا۔ وہ کوٹھی پر موجود تھا۔ وانچو نے بنگالی کیمسٹ کے آنے کی اس کو اطلاع دی اور خود بھی دفتر سے نکل کر کنور

صاحب کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔

اور جب رات ذرا ڈھل گئی اور گہرے سناٹے میں ہواؤں کا شور تیز ہو گیا تو وانچو نے فیکٹری کی جیپ اسٹارٹ کی۔ جس کی پچھلی سیٹ پر آبنوسی جسم والا نیل کنٹھ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ فیکٹری کے احاطے سے نکل کر جیپ روشن نگر روڈ کی طرف مڑ گئی۔ جیورہ تحصیل تک پختہ سڑک ہے' اس لئے جیپ سنسناتی ہوئی تیزی کے ساتھ گزرتی رہی۔ مگر جب ناہموار پتھریلی سڑک آگئی تو جیپ کو جھٹکے لگنے لگے اور وہ کھڑکھڑانے لگی۔ لیکن وانچو خاموشی سے بیٹھا ہوا اس کو ڈرائیو کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر بڑا پراسرار سکوت چھایا ہوا تھا اور نیل کنٹھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا سوچ رہا کہ جھٹکوں سے اس کا سر بوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ باہر پھاگن کی ہوائیں چل رہی ہیں۔ پھاگن کی ہوائیں جو ہولی کا سندیسہ لاتی ہیں اور ہولی جواب ختم ہو چکی ہے۔ اب تو گیہوں کی فصلیں کٹ رہی ہیں اور ہنسیا کی تیز باڑ سے لہلہاتی ہوئی گیہوں کی بالیاں کھیتوں میں ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ جانے اشیر گڑھ کے خوبصورت گاؤں میں اب بھی نیل کنٹھ مہاراج کو کوئی یاد کرتا ہے جس کی کٹھائی کا چوپال پر بڑا چرچا رہا کرتا تھا اور ایکا ایکی بانبی کی لے پر جھومنے والے ناگ کی طرح وہ بے ہوشی کے عالم میں بڑبڑانے لگا۔

"میں ایک کسان ہوں' ہاں میں کسان ہوں۔"

پھر کسی نے فوراً ہی اس کا گلا دبوچ لیا' نہیں تو مجرم ہے تو مجرم ہے۔ پولیس تیرا وارنٹ لئے ابھی تک تلاش کر رہی ہے۔

نیل کنٹھ نے چونک کر دیکھا۔ سامنے وانچو اطمینان سے اسٹیرنگ پر بیٹھا ہوا تھا اور جیپ پتھریلی سڑک پر ہچکولے کھا رہی تھی اور ستاروں کی مدھم روشنی میں کوہستانی چٹانیں سایوں کی طرح کوسوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔ پھر یکبارگی وانچو نے جیپ کو نیچے ڈھلوان پر گھما دیا۔ نیل کنٹھ گھبرا کر اپنی سیٹ سے چمٹ گیا۔ لیکن جیپ ڈگمگاتی ہوئی آہستہ آہستہ گنجان درختوں کے نیچے کچھ دور تک چلتی رہی اور پھر گہرے اندھیرے میں جا کر ٹھہر گئی اور دونوں اتر کر نیچے آگئے۔

وانچو نے آگے والی سیٹ کے نیچے سے ڈائنا میٹ کے بھاری کیس کو باہر نکالا۔ یہ ڈائنا میٹ جس کو فیکٹری کا کیمسٹ بمبئی سے اپنے ہمراہ لایا تھا۔ جس کو گورنمنٹ لیبارٹری سے سمگل کیا گیا تھا اور جس پر کمپنی کا نو ہزار سے زائد روپیہ خرچ ہوا تھا۔ پھر نیل کنٹھ نے اسے اپنے مضبوط ہاتھوں میں سنبھال لیا اور دونوں اندھیرے میں چلنے لگے۔ ان کے قدموں کے نیچے خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے اور درختوں سے الجھتی ہوئی کوہستانی ہوائیں ہانپتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ اندھیرا بہت گہرا تھا اور پتھریلی چٹانوں میں بہنے والی کوکیلا ندی کا شور سنائی دینے لگا تھا۔ دونوں اسی طرح کئی فرلانگ تک چلتے رہے۔ پھر ایک جھکے ہوئے ٹیلے پر سے گزر کر جب وہ نشیب میں پہنچے تو پتھروں سے ٹکراتا ہوا دریا کا شور بڑا ہیبت ناک معلوم ہونے لگا تھا۔ اس وادی میں کوکیلا ندی کا بہاؤ بہت تیز ہے۔ دونوں طرف سر بلند کوہسار ہیں اور جہاں پر دریا کا دھارا بہت تیز ہو گیا ہے۔ اس مقام پر سرکاری ڈیم بنا ہوا ہے۔ گورنمنٹ نے ہائیڈرو الیکٹرک پیدا کرنے کے لئے اس کو تعمیر کروایا ہے۔ اس باندھ کے پاس پانی گرجتا ہوا اونچائی پر سے گرتا ہے اور قریب ہی میں پتھروں کی بنی ہوئی چھوٹی سی عمارت ہے۔ جس کے سامنے دو پہرے دار سنگینوں کو سنبھالے ہوئے مستعدی سے کھڑے رہتے ہیں۔

پھر وانچو کی ہدایات کے مطابق نیل کنٹھ ڈائنا میٹ کو سنبھالے ہوئے آہستہ آہستہ بکھرے ہوئے پتھروں پر چلنے لگا اور پھر وانچو اس [illegible] مضبوطی سے پکڑے ہوئے پتھریلی چٹانوں کے اندھیرے میں بیٹھا رہا۔ اس کی تیکھی نظریں سامنے پتھروں پر جاتے ہوئے نیل کنٹھ [illegible] رہیں۔ ڈیم کے پاس پہنچ کر اچانک وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا اور دریائے کوکیلا کا تیز دھارا ڈیم کے نیچے گرجتا رہا اور مہیب [illegible] کی ہوائیں جیسے سو گئی تھیں اور سر بلند کوہسار خوابوں میں ڈھکے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ پھر ایکا ایکی ڈیم کے اوپر دھندلی [illegible] سایہ لہرایا اور اسی وقت پتھریلی عمارت کے نزدیک کھڑے ہوئے پہرے دار نے چیخ کر کہا۔

"[illegible]

[illegible]

اور اس کے ساتھ ہی بندوق کی تیز آواز وادی کے اندر دور تک گونج گئی۔ نیل کنٹھ آنی گھڑ سے چپکا ہوا ڈائنامیٹ کو فٹ کرتا رہا۔ گولی اس کی کنپٹی کے پاس سے ایک بار زن سے گزر گئی۔ وانچو اندھیرے میں بیٹھا ہوا سہمی ہوئی نظروں سے ڈیم کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک دفعہ پھر بندوق کی آواز کوہستانی چٹانوں میں گونجنے لگی اور اس کی دھڑکن کو ہسٹیریائی گہرائی میں دیر تک ہانپتی رہی۔ وانچو کا جسم تھرتھرا کر رہ گیا۔ پھر ایک دم سے ڈائنامیٹ کا وائر زور سے جلنے لگا۔ گویا اسے اب اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔ مگر نیل کنٹھ ابھی تک کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

کوئی ایک منٹ اس کے انتظار میں گزر گیا۔

پھر کئی منٹ بڑی بے چینی کے عالم میں گزر گئے!!

وانچو نے یک بارگی جھنجھلا کر سوچا کہ وہ ڈیم کو اڑا دے۔ اس لئے کہ اب زیادہ تاخیر کرنا بہت خطرناک تھا۔ لیکن خطرے کے شدید احساس کے باوجود بھی وہ کچھ طے نہ کر سکا۔ اس لئے کہ اگر نیل کنٹھ ڈیم کی تباہی کے ساتھ وہیں مر گیا اور بعد میں اس کی لاش شناخت کر لی گئی جب تو بہت خطرہ پیدا ہو جائے گا اور یہ سوچ کر وہ بڑے اذیت ناک لمحوں سے گزرتا رہا اور سامنے ڈیم کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر رات کی مدھم روشنی میں نیل کنٹھ کا کبڑا جسم نظر آیا۔ وہ پتھروں پر جھکا ہوا آہستہ آہستہ آ رہا تھا جب وہ بالکل قریب آ گیا تو وانچو نے آہستہ سے صرف اس قدر پوچھا "سب ٹھیک ہے؟" اور نیل کنٹھ نے اثبات میں اپنی گردن ہلا دی۔ وانچو نے مزید تاخیر کئے بغیر یک بارگی ڈائنامیٹ کو "آن" کر دیا اور پھر کوہستانی وادی میں بڑی ہیبت ناک گھڑگھڑاہٹ پیدا ہوئی اور خوابوں میں ڈھکی ہوئی سربلند پہاڑیاں لرزنے لگیں۔ سرکاری ڈیم چیتھڑوں کی طرح بکھر کر رہ گیا اور دریائے کوکیلا کا دھارا بڑی تیزی کے ساتھ نشیب میں بہنے لگا۔

نیلی آنکھوں والا وانچو نیل کنٹھ کو اپنے ہمراہ لے کر درختوں کے گہرے اندھیرے میں تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ مگر نیل کنٹھ ہر قدم پر لڑکھڑا جاتا۔ اس کے کندھے پر سے برابر خون بہہ رہا تھا جو گولی سے بری طرح زخمی ہو گیا تھا اور جب وہ جیپ کے پاس پہنچا تو اس کے پیر بالکل بے قابو ہو چکے تھے۔ وہ ڈگمگاتا ہوا بے جان ہو کر پچھلی سیٹ پر گر پڑا اور جیپ اسٹارٹ ہو گئی۔ راستہ بھر وہ کراہتا رہا اور اس کے زخم سے خون بہتا رہا۔ جیپ ہچکولے کھاتی تیزی سے گزرتی رہی اور جب وہ فیکٹری کے اندر پہنچی تو نیل کنٹھ پر بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کا آبنوسی جسم چھپکلی کی طرح زردی مائل ہو گیا تھا اور اسی لئے کوارٹر پر بھیجنے کی بجائے اسے مینجنگ ڈائریکٹر کی کوٹھی پر ٹھہرا دیا گیا۔

دریائے کوکیلا پر بنے ہوئے ڈیم کے اس طرح تباہ ہو جانے پر ترائی کے علاقہ میں بڑی سنسنی پھیل گئی ہے اور سرکاری حلقوں میں ایک تہلکہ مچ گیا ہے۔ اس لئے کہ اس باندھ کی تعمیر پر گورنمنٹ کا کئی کروڑ روپیہ خرچ ہوا تھا۔ تحقیقات کرنے کے لئے تمام سرکاری افسروں نے بڑی دوڑ دھوپ شروع کر دی ہے۔ ڈاک بنگلہ کی مرمت ہو رہی تھی۔ اس لئے فیکٹری کے "گیسٹ ہاؤس" میں مشتبہ آدمی کو حراست میں لے کر پولیس بری طرح "ٹارچر" کر رہی ہے اور انہیں دنوں اچانک ریونیو منسٹر کا داماد نرائن ولبھ فیکٹری میں آ گیا۔ وہ کمپنی کا سب سے اہم ڈائریکٹر ہے۔ رات کو مینجنگ ڈائریکٹر کے پرائیویٹ کمرے میں جب وہ اس کے پاس پہنچا تو ایک دم سے اس پر برس پڑا۔

"کنور صاحب یہ آپ نے سب کیا کر کے رکھ دیا ہے۔ مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے کہ یہ فیکٹری اب برباد ہونے والی ہے۔"

مینجنگ ڈائریکٹر پہلے ہی سرکاری افسروں کی آمد سے بوکھلایا ہوا تھا۔ نرائن ولبھ کی باتوں پر وہ اور بھی بدحواس ہو گیا۔ آہستہ سے بولا "بھئی میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ میں تو یہاں سے بڑا عاجز آ گیا ہوں۔"

مگر وہ کہتا ہی رہا "صاحب تو آپ ایسا کہیں گے ہی۔ مگر آپ کو کم سے کم یہ تو سوچنا چاہئے تھا کہ گورنمنٹ کا انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ اتنا احمق تو نہیں کہ اتنی بڑی بات کو بھی نہیں سمجھ سکتا۔ ہوم سیکرٹری کے پاس جو رپورٹ پہنچی ہے اس میں فیکٹری پر بھی شبہ ظاہر کیا گیا

ہے اس لئے کہ اُدھر جو لیبر کی بالکل کمی پڑ گئی تھی اور جس طرح یہ مشکل خود بخود ختم ہو گئی ہے اس بات پر کون شبہ کر سکتا ہے دراصل ہوا بھی ایسا ہی ہے اُس لئے کہ اب کمپنی کو قلیوں کی تلاش میں اپنے ایجنٹ گردو نواح کی بستیوں میں نہیں بھیجنا پڑتے۔ بلکہ اب تو فیکٹری کے بڑے پھاٹک کے سامنے آدمیوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ کمپنی کا لیبر آفیسر ہر روز سویرے صرف پچاس آدمیوں کو اندر بلاتا ہے اور وہ اس کے سامنے قطار بنا کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ ہر ایک کا جسم ٹٹول کر گوشت کے مضبوط پٹھوں کا اندازہ لگاتا ہے اور جس آدمی کو وہ فٹ سمجھتا ہے اس کی چوڑی چکلی چھاتی پر کھریا سے سفید نشان بنا دیتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اب اس فیکٹری میں کام مل گیا ہے اور چودہ آنے روز مزدوری ملے گی۔ اس کا نام اور پتہ ٹائم کیپر کے رجسٹر میں درج کر دیا جاتا ہے۔ پھاٹک سے باہر کھڑے ہوئے لوگ جانوروں کی طرح گردن اٹھا اٹھا کر یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور سہمے ہوئے لہجے میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہیں۔!!"

مینجنگ ڈائریکٹر اور بھی گھبرا گیا۔ وہ بڑے شکست خوردہ لہجہ میں کہنے لگا۔

"مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ وانچو تو مجھے یہی کہتا رہا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس طرح وانچو پر سارا الزام رکھ کر جیسے وہ کسی قدر مطمئن ہو گیا اور اس کی بات کا اثر بھی ٹھیک ہی ہوا۔ یوں بھی کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر ہونے کے علاوہ وہ رانی بازار کے علاقہ کا جاگیر دار بھی تھا۔ اس لئے نرائن دلبھ ایک دم سے وانچو پر بگڑنے لگا۔

"وہ تو میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ وانچو مجھ کو بڑا خطرناک آدمی معلوم ہوتا ہے۔ آپ اس کی سازشوں کو نہیں سمجھ سکتے۔ دیکھئے اب یہی بہتر طریقہ ہے کہ وانچو کو اسی اشوع بر فیکٹری سے فوراً علیحدہ کر دیا جائے۔ ورنہ جب تک وہ یہاں موجود ہے ہر وقت خطرہ سامنے ہے۔

آپ پریشان نہ ہوں۔ میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔'

مینجنگ ڈائریکٹر گہری خاموشی میں کھو گیا اس لئے کہ وہ کسی طرح یہ نہیں چاہتا تھا کہ وانچو اس کے خلاف ہو جائے۔ وہ اس کے ہر خطرناک راز کو جانتا ہے۔ اس طرح نوکری سے برطرف ہو جانے پر اس کے برگشتہ ہو جانے کا پورا خوف تھا۔ تھوڑی دیر تک اسی طرح چپ رہنے کے بعد وہ کہنے لگا۔

"میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس بات پر اگر وہ کمپنی کا مخالف ہو گیا تو سرکاری گواہ بن کر بہت بڑی مصیبت بن سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کسی اور طریقہ سے اس کو یہاں سے ابھی ہٹا دیا جائے۔ بعد میں دیکھا جائے گا۔" اور یہ بات نرائن دلبھ ایم ایل اے کی سمجھ میں بھی آ گئی اور پھر دونوں کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے دیر تک کمرے کے اندر بیٹھے ہوئے باتیں کرتے رہے۔

اور جب نرائن دلبھ کمرے سے باہر چلا گیا تو کنور صاحب نے وانچو کو بلوا لیا اور ساری باتیں اس کو بتا دیں۔ پھر یہ طے ہوا کہ وہ نیپال کی راجدھانی کھٹمنڈو چلا جائے۔ سرحد کو پار کرنے میں کوئی مشکل نہ ہو گی۔ اس لئے کہ رانا دلیر جنگ جو ریاست کے ایک اہم رکن تھے وہ کنور صاحب کی شکار گاہوں میں اکثر شکار کھیل چکے تھے اور دونوں کے آپس میں اچھے مراسم تھے اور جب تک وہ کھٹمنڈو میں رہے گا اس کو برابر ایک ہزار روپیہ مینجنگ ڈائریکٹر کی طرف سے ملتا رہے گا۔ پھر ایک روز فیکٹری کی کار میں بیٹھ کر وہ اسٹیشن کی طرف چل دیا۔ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ دفتر میں کام کرنے والے صرف اس قدر جانتے ہیں کہ وہ کمپنی کے کسی ضروری کام کے سلسلے میں کلکتہ جا رہا ہے اور وہ کار میں خاموش بیٹھا ہوا دور ہوتی ہوئی فیکٹری کی عمارت کو دیکھتا رہا' جس کی تعمیر کے لئے اس نے خطرناک سازشیں کی تھیں اور وہ فیکٹری اس کی آنکھوں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی گہری نیلی آنکھیں بڑی پر اسرار معلوم ہوتی تھیں۔

سرکاری [illegible] سے کوگیلا ندی میں بڑا بھیانک طوفان آ گیا ہے۔ بپھری ہوئی لہریں ترائی کے میدانی علاقوں میں شب

[illegible] کی طرح کچلی جا رہی ہیں۔ [illegible] گئی ہیں۔ سارے [illegible] ہزاروں کسان اپنے گھروں کو چھوڑ چھوڑ کر بھاگ [illegible] کے قافلے گزرا کرتے ہیں۔ ان کے لئے سیلاب زدگان کے لئے امیر گڑھ میں سرکار نے ریلیف کیمپ کھولا ہے۔ اس سلسلہ میں گورنمنٹ کا جو پریس نوٹ شائع ہوا ہے اس میں اعلان کیا گیا ہے کہ اس تباہی میں کمیونسٹوں کی دہشت پسندی کو دخل ہے جو اپنے سیاسی مفاد کے لئے ملک میں بے اطمینانی اور ہیجان پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اسی لئے پولیس نے کسان سبھا کے دفتر پر چھاپہ مار کر کتنے ہی کسان ورکروں کو حراست میں لے لیا ہے۔

نیل کنٹھ کنور صاحب کی کوٹھی کے ایک مختصر سے کمرے میں لیٹا ہوا آہستہ آہستہ کراہ رہا ہے۔ اس کے کندھے پر سفید پٹیاں بندھی ہوئی ہیں اور اس کا مضبوط پٹھوں والا آبنوسی جسم چھپکلی کی طرح زردی مائل ہو گیا ہے۔ خون کے زیادہ بہہ جانے سے اس پر بار بار غشی کے دورے پڑتے ہیں اور کنور صاحب نے کمپنی کی طرف سے کمشنر کے اعزاز میں اپنی خوبصورت کوٹھی پر ایک شاندار ڈنر کا انتظام کیا ہے جس کا ہنگامہ رات گئے تک فیکٹری کے اندر گونجتا رہا۔

اجودھیا

انتظار حسین

وہ آج بھی چلتے چلاتے دونی کی ریوڑیاں خرید لایا تھا۔ کتے کی دم اور انسان کی عادت یہ دو چیزیں تو ایسی ہیں جیسی ہو گئیں ہو گئیں۔ بدلتی بدلاتی نہیں ہیں۔ دودھ کا جلا چھاچھ کو پھونک پھونک کے پیتا ہے۔ لیکن اسے تو اتنے پیسے پھونکنے کے بعد بھی عقل نہ آئی تھی۔ کسی خوانچہ والے کے پاس اُجلی ریوڑیاں نظر آئیں اور وہ پھسلا۔ لیکن جب خرید کر وہ ایک ریوڑی منہ میں ڈالتا تھا تو اس کی صورت اس خان کی سی بن جاتی تھی جس نے صابونی کے چکر میں صابون خرید لیا تھا۔ لیکن اگر ایمان کی پوچھو تو اس بے چارے کی بھی بڑی مشکل تھی۔ وہ نہ تو شراب پیتا تھا اور نہ سگریٹ۔ وہ تو ریوڑیوں سے ہی اک گونہ بے خودی پیدا کرنے کا عادی تھا۔ کفر جس چیز میں بھی ہو وہ پھر ایسی منہ کو لگتی ہے کہ چھٹنے کا نام نہیں لیتی۔ اب یہ دیکھو کہ اسے گھر چھوڑے ہوئے ایک ڈیڑھ سال تو ہو ہی گیا ہو گا۔ لیکن وہی مرغ کی ایک ٹانگ والی بات تھی۔ وہ جب انار کلی بازار سے گزرتا تھا تو ادبدا کر چار چھ پیسے کی ریوڑیاں خرید ڈالتا تھا اور ہر مرتبہ انہیں منہ میں ڈالنے پر اس پر وہی ایک قسم کی کیفیت گزرتی تھی۔ آج وہ خوانچہ میں بچھے ہوئے رنگین پتنگیا کاغذوں پر لٹو ہو گیا تھا۔ ان کی تڑک بھڑک کو دیکھ کر اسے یہ امید بندھ گئی کہ ریوڑیاں کچھ اچھی ہوں گی۔ لیکن جب اس نے ایک ریوڑھی منہ میں ڈالی حسبِ معمول وہی تمباکو میں بسا ہوا گڑ منہ میں گھل گیا۔ اس کے تن بدن میں آگ ہی تو لگ گئی۔ شاید اگر خوانچہ والا اس وقت سامنے ہوتا تو انہیں اس کے منہ پر دے مارتا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا۔ اس وقت تو وہ لحاف میں لپٹا لپٹایا پڑا تھا اور پھر کسی نہ کسی بہانے منہ چلنا بھی ضروری تھا۔ یوں بھی وہ صابون خریدنے والے خان کے اصول کا قائل تھا بلکہ شاید اس سے چار قدم آگے ہی تھا کیونکہ پٹھان نے تو ایک دفعہ ہی اپنا پیسہ کھایا تھا لیکن وہ بار بار ریوڑھی خریدتا تھا اور پیسہ کھاتا تھا۔ اس نے ہاتھ روکا تو نہیں۔ ہاں یہ سوچ کر اس کا خون ضرور کھولتا رہا کہ یہاں والوں کو ریوڑیاں بنانی بھی نہیں آتیں۔ اس نے سوچا یار یہ تو کچھ نہ ہوا۔ رمیش سے ریوڑیوں کی فرمائش کرنی چاہئے۔ اس میں شرم کی بات بھی نہیں ہے۔ تحفے تحائف کا سلسلہ چلتا ہی ہے۔ آموں کی ہی مثال لے لو۔ لوگ منہ سے کہہ کہہ کر آموں کی فصل میں آموں کے تحفے قریب و دور سے منگاتے ہیں۔ چچا غالب کی بھی یہی عادت تھی۔ دنیا بھر سے فرمائش کرتے تھے۔ برسات میں جس کو خط لکھا آموں کا مطالبہ کیا جا رہا ہے اور خود ریوڑیوں کے سلسلے میں بھی چکر چلتا ہے۔ راجندری ریوڑی والے کے زیادہ گاہک تو تحفہ تحائف بھیجنے والے ہی ہوتے تھے۔ تو اگر رمیش بھی اسے تھوڑی سی ریوڑیاں تحفتاً بھیج دے گا تو ایسا غضب تو نہ ہو جائے گا۔ لیکن پھر اس کی قومی غیرت نے یکایک جوش مارا۔ نہیں جی گولی مارو۔ رمیش سوچے گا کہ سالا یہ کیا [illegible] کچھڑا الگ رہا، ریوڑی کے دانے تک کو محتاج ہو گیا۔ ابھی دیکھا کیا ہے۔ ابھی تو معلوم پڑے گا۔ بیٹا کی طبیعت ہری ہو جائے [illegible] اسے جو لذت پیدا کرنے کی کوشش پر مائل کر دیا ___ آخر ریوڑی بنانا ایسے کون سے کمال کی

[illegible] ہوتے ہیں [illegible] گئے [illegible]
[illegible] ہوتی ہیں [illegible] پھر وہاں [illegible] تھیں [illegible]
[illegible] نے خواہ مخواہ [illegible] کی [illegible]
[illegible] ہوتی ہے۔ جسے حسن کہتے ہیں وہ تمام [illegible] ریوڑیاں [illegible]
[illegible] کہیں [illegible] مختصر یہ کہ ریوڑیاں اگر کہیں تھیں تو [illegible] تھیں [illegible] ہوا [illegible]

رحمدی ریوڑی والے کی دکان ____ اس کے ذہن میں ایک تصویر ابھرنے لگی ____ جاڑوں میں کیسی رونق رہتی تھی اس پہ۔ شیشے کے مختلف مرتبانوں میں ریوڑیاں اور مختلف قسم کی گزک رکھی رہتی تھی۔ [illegible] کی [illegible] تھالوں میں حلوا سوہن اور تل بھگا رکھا رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو اس دکان پر اتنی بھیڑ ہوتی کہ کھڑے کھڑے پاؤں دکھ جاتے اور باری مشکل سے آتی تھی۔ حق یہ ہے کہ بی۔ اے کا امتحان تو اس نے رحمدی کی ریوڑیوں کے بل پر ہی دیا تھا ورنہ ایک ڈیڑھ بجے رات تک کتابوں سے مغز پچی کرنا کس کے بس کا تھا۔ ایک دفعہ تو وہ کوئی بارہ بجے رات کو اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کی دکان پر جا پہنچا۔ اس کی دکان پر بالکل دن نکل رہا تھا اور وہ ڈھائی من کی لاش۔ رحمدی گاہکوں کے بھیڑ بھڑکے کو نپٹا کر اب ذرا اطمینان کا سانس لیتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ رحمدی کی دکان کی ساری ریوڑیاں باندھ لاتا اور پاکستان کی ہر ریوڑی کی دکان کو رحمدی ریوڑی والے کی دکان بنا دیتا۔ لیکن اسے بھلا کون ایسا کرنے دیتا اور پھر اس وقت اتنی فرصت اسے تھی ہی کہاں۔ ورنہ چلتے ہوئے کیا جیب اس نے گیارہ آنے کے سنترے اور سات آنے کے کیلے خریدے تھے بارہ چودہ آنے کی وہ ریوڑیاں نہ خرید سکتا تھا۔ شاید اسے معلوم ہی نہ تھا کہ ہندوستان سے پاکستان آنے کے معنے کیا ہوتے ہیں اس نے سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی تھی۔ وہ تو بس دھرا سا اٹھ کھڑا ہوا تھا اپنے ایک بستر ے اور صندوق کے ساتھ اسٹیشن پر دھرا تھا اسٹیشن ____ اس کی آنکھوں میں پھر وہی سارا نقشہ پھر گیا۔ وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ اس نقشہ کو وہ اس نقشہ سے کیسے الگ رکھے جو اس نے بچپن میں مذہبی کتابوں میں عرصہ محشر کے متعلق پڑھ رکھا تھا۔ یہ وہی اسٹیشن تھا جہاں عام طور پر سناٹا چھایا رہتا تھا۔ بھلا کنٹونمنٹ اسٹیشن کون رُخ کرتا تھا۔ کوئی مارا پڑا مسافر پہنچ گیا تو پہنچ گیا۔ ورنہ وہاں تو ہمیشہ خاک ہی اُڑی لیکن اس روز وہاں آدمی پٹا پڑا تھا۔ ایسے ایسے وضعدار آدمی بھی وہاں نظر آتے تھے جن کا تصور ان کی ڈیوڑھی یا گلی کو نظر انداز کر کے کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ آج اپنی ڈیوڑھیوں اور گلیوں سے رسہ تڑا کر نکل بھاگے تھے اور ایسے لگتے تھے جیسے کوئی شرعی قسم کا آدمی بڑھاپے میں یکایک ایک دن اپنی داڑھی منڈا ڈالے۔ طرح طرح سامان کے انبار لگے ہوئے تھے اور اسٹیشن کے گیٹ اور ٹکٹ گھر پر کیفیت یہ تھی کہ آدمی پہ آدمی گرتا تھا ایک دفعہ ایک قلی کو بھی غصہ آ ہی گیا اور اس نے ٹکٹ گھر پر کھڑے ہو کر ہنٹر برسا دیا........ ایک کھدر پوش داڑھی والے صاحب نے مجمع لگا رکھا اور فرما رہے تھے۔ "مسلمانوں کا یہ برا حشر مسلم لیگ نے کرایا۔ میں کہتا ہوں کہ جہاں یہ لوگ جنت سمجھ کر جا رہے ہیں وہ جہنم ہے جسے جہنم سمجھ کر چھوڑ رہے ہیں وہ جنت ہے۔" کسی صاحب نے پیچھے سے فقرہ کسا اور توفیق نے اسے یکایک پیچھے [illegible] مسخرے باتیں بنا رہا ہے ذرا سامان پہ لگ۔" اور وہ ہڑبڑا کر ____ مگر خیالات کی زنجیر الجھ کر ٹوٹ گئی اور اسے [illegible] تو بھول ہی گیا ہے۔

اس نے [illegible] سے چھ سات ریوڑیاں ایک ساتھ نکال لیں اور چبانے لگا۔ ریوڑی کا گڑ بار بار دانتوں کے درمیان چپک کر جاتا۔ [illegible] قسم کی ریوڑیاں ہیں۔ یہ سالے ریگل کے سامنے والے خوانچہ والے تو آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں۔ انار کلی میں [illegible] ریوڑیاں ہوتی ہیں ____ یہ انار کلی بھی خوب بازار ہے ____ بچھڑے ہوؤں کے ملنے کی جگہ ____ ایک زمانہ میں [illegible] کے ملنے کا اڈا بن گیا تھا۔ رشید صاحب اسے ایک روز یہیں تو ملے تھے۔ دیکھتے ہی لپٹ

[illegible] بھی کب آئے۔ میں کہتا ہوں تم نے بہت اچھا کیا کہ چلے آئے۔ ابھی یہاں کچھ نہ سکا مگر [illegible] تو [illegible] رہے گا ـــــ اس کی پیشانی پر پسینہ آگیا تھا۔ شاید رشید صاحب طنز کر رہے تھے۔ ممکن اس نے [illegible] کہا تھا۔ ان کے تیوروں سے تو بڑا خلوص ٹپک رہا تھا۔ تاہم اگر یہ طنز نہیں تھا تو کیا تھا وہ تو اپنا ایمان بچالایا مگر ـــــ [illegible] کی رو آئی اور اسے بہا کر ایک اور ہی طرف لے گئی ـــــ یہ ایمان کیا ہوتا ہے کچھ بھی نہیں محض ایک [illegible] ایک طرح سے ایمان ہوتی ہے۔ نہ ٹوٹنے والا کفر سب سے زیادہ پختہ ایمان ہوتا ہے اور پھر ایمان کا ہجرت سے کیا [illegible] اس کے حلق سے اتر نہ سکا پھر وہ کون ہے ـــــ مہاجر 'مفرور' بھگوڑا' پناہ گزین؟ اسے ہلکا پھلکا سیدھا سچا لفظ بھگوڑا بہت پسند آیا ویسے بھی [illegible] اردو لفظ تھا۔ لیکن ان مترادفات میں بھٹکتے بھٹکتے اس کا ذہن ایک اور لفظ کی طرف جالپکا ـــــ بن باس' اس لفظ میں اسے بڑی مٹھاس معلوم ہوئی تو وہ بن باسی ہے۔ اپنے وقت کا راجہ رامچندر ـــــ وہ پھر اپنے نسل کو آدرشی جامہ پہنا رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ جو من اپنے وطن کو باپ تصور کرتے ہیں لیکن اس نے ان کی تقلید کرنا مناسب نہ سمجھی۔ ماں بھی تو آخر بن باس دے سکتی ہے۔ راجہ دسرتھ نے سوتیلی ماں کے کہنے سے راجہ رام چندر جی کو بن باس دے دیا۔ اس کی ماں نے اسے اس کے سوتیلے بھائی کے بہکانے میں آکر بن باس دے دیا۔ یہ بھائی کا رشتہ بھی خوب ہے۔ اس نے ہمیشہ فساد پیدا کیا۔ اسے برادران یوسف کا قصہ یاد آیا اور پھر وہ سوچنے لگا کہ یہ سارا فساد ہندو مسلم بھائی بھائی کے نعرے کا پیدا کیا ہوا ہے۔ آج کوئی نئی بات تھوڑا ہی ہے۔ بھائی نے بھائی کا ہمیشہ یہی حشر کیا ہابیل قابیل کے وقت سے یہی ہوتا چلا آیا ہے۔ لیکن رام چندر جی کے بھی تو بھائی تھے ـــــ اور یہاں آکر اس کا ذہن دوسرے رستہ پر پڑ گیا۔ رام لیلا کے بہت سے مناظر اس کی نگاہوں میں پھر گئے۔ اجودھیا رام چندر جی کے جانے کے بعد کیسا ویران ہو گیا تھا۔ ساری رونق تو راجہ رام چندر کے دم سے تھی۔ راجہ دسرتھ خود انہی کو دیکھ دیکھ کے جیتے تھے۔ رامچندر جی بن کو سدھارے۔ راجہ دسرتھ دنیا سے چل بسے۔ وہ تو من کا سانپ تھے من پہ ناند ڈھک دو سانپ اندھا ہو جائے گا اور ناند سے ٹکریں مار مار کے مر جائے گا۔ دسرتھ جی اکیلے ڈھنڈار میں ٹکریں مار مار کے مر گئے۔ اس کے اجودھیا میں بھی اب خاک اڑتی ہوگی اور من کا سانپ ناند سے ٹکرا ٹکرا کے دم توڑ چکا ہوگا۔ من بھی کیا چیز ہوتا ہے۔ جب رات کو من کا سانپ نکلتا ہے تو سارے جنگل میں اجالا ہو جاتا ہے۔ من اگر کسی کے ہاتھ پڑ جائے تو اس کے تو بس وارے کے نیارے ہیں۔ وہ سالا ننھی سنار گپ ہانکا کرتا تھا کہ اسے من مل گیا تھا۔ لیکن ایک چوٹا اسے چوٹ دے گیا۔ وہ بھی بے پر کی اڑاتا تھا۔ ویسے ایک بات ہے۔ آدمی خوب تھا۔ اس کی دکان پہ ہر وقت چوکڑی جمی رہتی تھی اور وہ آلھا اودل کا بھی موقعہ رکھتا تھا۔ دوپہر ہوئی اور وہ جھلنگا چارپائی دوکان کے نیچے نالی کے قریب بچھ گئی۔ گھنٹوں گزر جاتے تھے اور آلھا اودل گلتی رہتی تھی۔ اس کے دل میں اک گدگدی سی اٹھی [illegible] آلھا اودل کے شعر گنگنائے۔ وہ شعر یاد کرنے لگا لیکن اس کے حافظہ کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ کسی مصرعہ کا کوئی ٹکڑا یاد آتا تھا اور [illegible] کے رہ جاتا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے ایک مصرع یاد آیا ع

آلھا اودل بڑے لڑیا!

اس نے [illegible] دوہرایا لیکن دوسرا مصرع اسے یاد ہی نہیں آیا۔ اسے پسینہ آگیا۔ وہ یادوں کے سہارے جیون بتانا چاہتا تھا اور یادیں دھندلی پڑتی جا رہی تھیں' ساتھ چھوڑتی جا رہی تھیں۔ اسے محسوس ہوا گویا اس کے پیروں تلے کی زمین کھسکتی جا رہی ہے اور اب تھوڑی دیر میں وہ خلا میں [illegible] بہت دیر تک چپکا پڑا رہا۔ اس چپکے پن میں ایک مبہم خوف کی بھی جھلک تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا ذہن پھر اپنے کام سے لگ گیا۔ اسے خیال [illegible] آلھا اودل کے پڑھے جانے کا زمانہ برسات کا ہوا کرتا تھا اور برسات کے خیال کے ساتھ ساتھ اس کے کانوں میں ایک سریلی [illegible] ـــــ باغ میں پپیا بولا' میں جانوں میرا بھیا بولا۔ پپیا کو وہ ہمیشہ پپیا کہتی تھی اور خود بھی وہ کچھ پپیا سی ہی تھی جب دیکھو [illegible]۔ اس روز جب وہ بڑی یکسوئی کے ساتھ پپیا بجانے میں مصروف تھی تو اس نے پیچھے سے آکے

[illegible] کی [illegible] تھا۔ [illegible] بدلی [illegible] کی [illegible] جب وہ آجاتا تھا تو [illegible] [illegible] جب بادل گھر گھر کر آرہے ہوتے تھے اور [illegible] تو [illegible] معلوم [illegible] برسات بھی خوب موسم ہوتا ہے۔ چیزوں کا رنگ روپ بدل جاتا ہے۔ [illegible] سر پر ایک تہوار کھڑا رہتا ہے۔ آج [illegible] ہے کل رکشابندھن ہے۔ پرسوں جنم اشٹمی ہے اور ہر تہوار پر [illegible] ضرور [illegible] جنم اشٹمی پر اگر مینہ نہ برسا کرتا تو کہا [illegible] کے پاؤں کیسے دھلا کرتے اور رکشابندھن پر مینہ پڑے اور پھر پڑے۔ خواہ ایک بوندی چھینٹ۔ رکشابندھن کے ساتھ ساتھ اسے پھر رمیش کا خیال آگیا۔ رکشابندھن پر وہ رمیش کو ضرور ڈیڑھ دو روپے سے کچھ دیا کرتا تھا۔ رمیش ذات کا برہمن سہی لیکن دل کا [illegible] اس لئے بات اصل سے شروع کرتا تھا۔ لیکن جب وہ ایک دفعہ حلوائی کی دکان پر آجاتا تھا تو پھر وہ رمیش کو ایسے اڑ گئے پہ لا کے مارتا تھا کہ ڈیڑھ دو روپے پہ بھی مشکل سے ہی چھوڑتا تھا۔ جب وہ اس کے گھر پہنچتا تھا تو بملا اس کی کلائی میں راکھی باندھ دیا کرتی تھی۔ ویسے راکھی ہوتی ہی کیا ہے۔ چند ریشمی دھاگے اور سنہری پنیاں۔ لیکن جب وہ کلائی پر بندھ جاتی ہے تو پھر دیکھو آدمی کیا سے کیا بن جاتا ہے۔ اس نے اس رکشابندھن والے دن کا تصور کیا۔ جب وہ گاڑی سے اتر کر سیدھا رمیش کے گھر پہنچا تھا۔ بملا نے اس کے راکھی باندھی تھی۔ پھر وہ اور رمیش شام تک سجے ہوئے بازاروں اور گلیوں کے چکر کاٹتے رہے اور مختلف دکانوں پر رک رک کے مٹھائی بھی اڑائی تھی لیکن وہ اس دن کا کوئی چمکتا ہوا تصور قائم نہ کر سکا۔ اسے وہ دن خواب آلود دھندلکوں میں لپٹا ہوا سا دکھائی دیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا گویا وہ کوئی بھولا ہوا خواب ہے جسے وہ ہزار کوشش کے باوجود بھولا چلا جارہا ہے یا پچھلے جنم کے کسی واقعہ کا ایک خیال ہے جس کی خوشبو اڑتی جارہی ہے۔ اس کی زندگی کا سہارا لے دے کے چند ایک یادیں رہ گئی تھیں اور یہ یادیں چپ چاپ ایک ایک کر کے کھسکتی جا رہی تھیں۔ شاید اسے واضح طور پر یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ میرٹھ کی ریوڑیوں کا مزا کیسا ہوتا ہے۔ بس ایک خیال سا تھا۔ اس خیال کے بل پر وہ اظہار خیال کرتا تھا اسے یاد آیا کہ خود اس کے قصبے کے حلوائی تو علی گڑھ اسکول کے حلقہ اثر میں تھے۔ وہی علی گڑھ کی طرز کی چھوٹی چھوٹی گول گول بھربھری ریوڑیاں بناتے تھے۔ لیکن وہ خود میرٹھ کی ریوڑیوں کا رسیا تھا اور اس اسکول کے سب سے بڑے نمائندے رجھو ری کی ریوڑیوں پر جان دیتا تھا۔ ان ریوڑیوں سے رمیش کی نہ معلوم کتنی یادیں وابستہ تھیں ________ وہ 'رمیش' ریوڑیاں __ لیکن اب یہ تثلیث بکھر چکی تھی۔ رمیش اور ریوڑیاں دونوں چھوٹ گئے تھے۔ رمیش کے پاس ریوڑیاں رہ گئی تھیں اور وہ الگ ہو گیا تھا۔ اب وہ ریوڑیاں نہ [illegible] کھاتا ہے۔ رمیش اب ریوڑیاں کٹکٹا نہیں ہوگا زہر مار کرتا ہوگا۔ رمیش کے ساتھ مل کر وہ بھی کیسی عجیب عجیب حرکتیں [illegible] اس کی رونی صورت بنی رہتی تھی۔ لیکن جب رمیش ایک دو دن کی چھٹی لے کر دلی سے آجاتا تھا تو وہ پاگل [illegible] تو وہ اس روز ریوڑیاں کٹکٹاتا ہوا اماں محلہ میں سے گزر رہا تھا۔ ایک لڑکی چوک میں کھڑی انہیں یونہی دیکھ رہی تھی۔ [illegible] منہ میں ڈال لی تھی __ اس کے سٹ پٹا کر بھاگ جانے کی تصویر اس کی آنکھوں میں پھر گئی اور [illegible] ہنسی رفتہ رفتہ ایک اداسی کی کیفیت میں بدل گئی۔ کیا زمانہ تھا وہ بھی ____ وہ سوچنے لگا ____ اور [illegible] بھی عجیب بے تکم قسم کا ہے۔ اس کا سر پیر تو ہے ہی نہیں۔ اسے تو بس بے پیندی کا لوٹا سمجھو۔ [illegible] ساری چیزوں کو بھی لڑھکائے جاتا ہے۔ گزری ہوئی باتیں خواب و خیال بن کر رہ جاتی ہیں۔ [illegible] محسوس ہوا کہ گویا وہ بھی بادشاہ کی بھولی بسری کہانی ہے جو اس نے بچپن میں نانی اماں سے

[illegible] یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کسی زمانہ میں ایک بادشاہ تھا۔ اس بادشاہ کے دو شہزادے تھے۔ ایک [illegible]۔ کیا [illegible] ہیں کہ ایک ہرن چوکڑیاں بھرتا ہوا جا رہا ہے۔ بڑے شہزادے نے اس کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ دو بھرا [illegible] کسی اور راستہ پر نکل گیا۔ وہ دونوں راستہ بھول گئے اور ایک دوسرے سے جدا ہو گئے.......... یہاں آ کر اس کے [illegible] دیا۔ اسے اتنا تو یاد تھا کہ بہت سی مصیبتوں کے بعد وہ بالآخر آپس میں مل جاتے ہیں اور اندھے راجہ کی آنکھوں میں نور آ جاتا ہے لیکن کب ملے کیسے ملے یہ اسے بالکل یاد نہیں آیا۔ اسے کہانی کا آغاز یاد تھا انجام وہ بھول گیا تھا۔ انجام یاد رکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے ـــــ وہ سوچنے لگا ـــــ آج کل کہانیوں کا انجام بھی نرالا ہوتا ہے۔ اب شہزادے بچھڑ جاتے ہیں ملتے نہیں۔ پہلے بادشاہ روتے روتے اندھے ہو جایا کرتے تھے اور پھر ان کے کھوئے ہوئے لال مل جایا کرتے تھے اور ان کی آنکھوں میں نور آ جایا کرتا تھا۔ اب شہزادے گھر سے نکل جاتے ہیں اور بادشاہ روتے روتے اندھے ہو جاتے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں اور شہزادے نہیں پلٹتے اور محل کھنڈر بن جاتے ہیں اور کھنڈروں میں جن بھوت رہنے لگتے ہیں ـــــ اور پھر رام چندر جی کی کہانی یاد آ گئی۔ اس کا ذہن عجیب اینڈی بینڈی پگڈنڈیوں پر بھٹکنے لگا۔ اسے ایسے لگا گویا اجودھیا پھر ویران ہو گیا ہے۔ رام چندر جی بن کو نکل گئے ہیں اور راجہ دسرتھ اس غم میں دنیا سے سدھار گئے ہیں اور اجودھیا میں اندھیرا پڑا ہے۔ لیکن ـــــ اس کے خیال نے پٹڑی بدلی ـــــ اجودھیا کے دن چودہ برس بعد پھرے تھے اور اب........ اس کا تصور دھندلا گیا۔ گویا ایک لاری تیزی سے اس کے پاس سے گزر گئی اور وہ گرد میں اس بری طرح اٹ گیا کہ سوائے ایک مٹیالے پن کے اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔

اس کا ہاتھ پھر ریوڑیوں کی طرف بڑھنا چاہتا تھا لیکن جنبش نہ کر سکا۔ اس کا ہاتھ ایک جگہ رکھے رکھے سو گیا تھا۔ اس نے ایک تھوڑی سی کوشش سے اسے جنبش دی اور ایک میٹھی میٹھی گدگدی پیدا کر دینے والی سرسراہٹ اس کی رگوں نسوں میں تیرنے لگی۔ سوچتے سوچتے وہ کچھ تھک سا گیا تھا۔ اس نے ٹانگوں کو سیدھا کر کے اکڑا لیا اور پھر کروٹ لیتے ہوئے ایک لمبی سی جمائی لی۔ اس کی زندگی میں ـــــ اس نے سوچا ـــــ اب رہ ہی کیا گیا ہے ـــــ یادیں اور جمائیاں۔ یادیں دھندلی پڑتی جا رہی ہیں اور جمائیاں طویل ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کے دل میں وہ جو ایک بوند لہو کی نظر آتی تھی وہ سکڑ رہی تھی، معدوم ہو رہی تھی۔ اسے ایسا معلوم ہوا گویا اس کا مستقبل ایک طویل بے کیف جمائی ہے۔ اس احساس سے سہم کر اس نے پھر ایک بار اپنے حافظہ کو جھنجھوڑا۔ کئی تصویریں ایک ساتھ ابھریں اور آپس میں متصادم ہو کر گڈمڈ ہو گئیں۔ اس نے کسی شام کا تصور کرنا چاہا جو اس نے رمیش کے ساتھ گزاری ہو۔ لیکن یہ شامیں ایک تو تھیں بہت کثیر تعداد میں اور پھر پتنگ کے مانجھے کو سلجھانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن وہ تو بے طرح الجھا ہوا تھا اور تو اور خود [illegible] کے چہرے کے خطوط اب اس کے تصور میں ایسے بہت واضح نہیں رہے تھے۔ اسے یہ وسوسہ ستانے لگا کہ رمیش اب اس سے چپ چاپ دور ہوتا چلا جا رہا ہے پہلے وہ کتنی جلدی جلدی خط بھیجتا تھا اور بعض دفعہ تو وہ خطوں کی ریل گاڑی چھوڑ دیتا تھا۔ لیکن اب تو اس کے پاس [illegible] دو مہینے سے اس کا خط نہیں آیا تھا۔ شروع میں وہ اپنے خطوں میں اس پر کس بری طرح برستا تھا لیکن اب تو اس کا لہجہ بہت دھیما پڑ گیا تھا۔ یہ دھیما پن کسی دوری کی علامت تو نہیں ہے ـــــ اس کے دل میں ایک سوال دھیرے سے ابھرا اور مبہم سی کپکپی پیدا کر کے ڈوب گیا۔ اسے رمیش کا وہ پاکستان آنے پر پہلا خط یاد آ گیا جس میں اس نے اسے بڑی جلی کٹی سنائی تھیں۔ اسے بھی خاصا جوش آ گیا تھا اور تیر کا جواب تلوار سے دینے کی نیت سے اس نے قلم اٹھا کر بے تکان لکھنا شروع کر دیا تھا۔

[illegible] پوچھتے ہو کہ یہ تیرا دامن سیاست میں کیسے سن گیا۔ یہ بات بالکل ایسی ہی ہے کہ کسی شہر میں زوروں کا طاعون پھیل جائے اور کوئی شخص [illegible] مریض کے پاس پہنچے اور کہے کہ میاں تم تو اپنی تندرستی کی بڑی برائیاں کیا کرتے تھے۔ یہ تمہارے گلٹی کیسے نکل آئی۔ رہا تمہارا [illegible] تو میں یہ پوچھتا ہوں کہ یو۔پی کہاں ہے کدھر ہے؟ اسے تو میں مٹی دے کر آیا ہوں.........."

اور بیچارے کے اس کا قلم رُک گیا تھا۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس قسم کے فضول نعرے وہ اور نہیں لکھ سکتا تھا۔ تنگ کرنا ایک وقت کی ... انتقام کر ہی سکتا تھا۔ لیکن وہ کسی بات پر جم کب سکتا تھا ... تھالی کا بینگن تھا۔ لیکن وہ جواز پیش کرنے میں تو بہت مردِ ... ____ آدمی ہے ہی تھالی کا بینگن۔ ہو گی زمین گول، ویسے وہ کھائی تو تھالی کی طرح چپٹی ہی پڑتی ہے۔ کوئی ایک بات پکڑ لینا اور اسے عقیدہ بنا لینا تو ذہنی جمود کی نشانی ہے۔ یہ تو گویا زمین کی گردش سے کشتم کشتا کرنا ہے۔ لیکن ____ ایک مخالف لہر ابھری ____ یہ بات بھی تو ایک عقیدہ ہی ہوئی۔ اس کا ذہن مناظرہ کا میدان بنتا جا رہا تھا۔ لیکن وہ ورسہ ترا کر بھاگ چھٹا۔ اس نے ہٹ دھرمی کے انداز میں سوچا کہ مارو گولی۔ جو لوگ لٹھے کو کھڑا کیا کھڑا ہے قسم کی چیز بنانا چاہتے ہیں شوق سے بنیں، لٹھ چھوڑ قطب مینار بنیں اس کی بلا سے۔ وہ تو تھالی کا بینگن ہے۔ عقیدہ والوں کو عقیدہ کی دُم مبارک۔ وہ تو لنڈورا ہی بھلا ہے اور اس بحث سے چھٹکارا پا کے اس نے سوچنا شروع کیا کہ وہ کیا سوچ رہا تھا۔ آخر بات کہاں سے چلی تھی اور یہ تھالی کا بینگن بیچ میں کیسے لڑھک آیا۔ سوچتے سوچتے اسے یاد آیا کہ بات کچھ رمیش کے متعلق تھی۔ لیکن رمیش کا تھالی کے بینگن سے کیا واسطہ۔ یہ تو وہ بات ہوئی کہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ کوئی تک بھی ہے۔ رمیش، تھالی کا بینگن ____ آخر کیا ربط ہے ان دونوں باتوں میں...... اسے یکایک ایک خیال آیا کہ وہ جو خود تھالی کا بینگن ہے اس لئے رمیش کا تھالی کے بینگن سے تعلق ہوا ____ اور اب اسے یاد آیا کہ وہ در حقیقت اسی تعلق کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ رمیش سے اس کا کیا تعلق رہ گیا ہے۔ رمیش اسے مہینوں خط کے پرزے سے بھی یاد نہیں کرتا اور خود اسے اب رمیش کی صورت بھی شاید اچھی طرح یاد نہیں رہی ہے۔ غلط ____ اس نے فتویٰ لگایا ____ اور کوئی ہوتا تو ____ خیر مان بھی لیا جاتا لیکن رمیش کو وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ آخر کون سی بات ہے جو اسے یاد نہیں ہے اور اپنی بات کی بیچ میں وہ ایک دفعہ پھر اپنے حافظہ سے کشتم کشتا کرنے لگا۔ دھند میں لپٹی ہوئی کئی تصویریں اس کی نگاہوں کے سامنے آئیں اور گم ہو گئیں۔ اس کی کیفیت تو کچھ ایسی ہی رہی تھی گویا کوئی بل میں اُدھ گھسے سانپ کی دم پکڑ لے اور وہ دم پھسل کر سناک سے غائب ہو جائے۔ اس پر پھر افسردگی کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔

آخر یادوں کا کیا اعتبار وقت پڑنے پر تو ایسی سٹکتی ہیں کہ دور دور تک ان کی صورت نظر نہیں آتی۔ یادیں تو چار دن کی چاندنی ہوتی ہیں پھر غائب ہو جاتی ہیں۔ آدمی کا پھر اپنی روح کی اس بھائیں بھائیں کرتی ہوئی اندھیری رات سے پالا پڑتا ہے۔ رام چندر جی بن کو سدھارتے ہیں اور اجودھیا میں اندھیرا ہو جاتا ہے۔ آدمی کی روح تو اجودھیا ہوتی ہے۔ اس کی رونق تو دوسرے کے ہاتھ ہے اور یہ دوسرے وفا نہیں کرتے ____ اجودھیا کی تقریب سے اسے رام لیلا کے دن یاد آ گئے۔ اس کا ذہن اس دسہرے کی طرف منتقل ہو گیا جو اس نے آخری بار رمیش کے ساتھ گزارا تھا۔ وہ دسہرہ بھی ____ اس کے ذہن میں پوری تصویر اُبھر آئی تھی ____ عجب رنگ کا آیا تھا اس کا طور ہی بے طور تھا۔ ساری فضا میں ایک وحشت ایک ڈراؤنے پن کی کیفیت بسی ہوئی تھی ویسے آدمی اس مرتبہ بھی کچھ کم نہ تھے۔ بازار سے لے کر میلہ تک تانگوں بگھیوں اور چھکڑوں کی لین ڈوری لگی ہوئی تھی۔ لیکن پھر بھی کھمبوں کے اس اونچے دروازے میں گھستے ہوئے اس نے واضح طور پر یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ پچھلے سال والا میلہ نہیں ہے اس میں سے کوئی چیز گم ہو گئی ہے۔ میلہ کا ایک چکر کاٹنے کے بعد اسے اس بات کا بھی پتہ چل گیا تھا کہ پورے میلے میں وہ اکیلا اس کھوئی ہوئی چیز کی نمائندگی کر رہا ہے۔ چکر کاٹتے کاٹتے رمیش یکایک چونک پڑا تھا۔ "بے کشن کہاں گیا" ____ اور پھر وہ اسے شامیانہ کے نیچے کھڑا کر کے ڈھونڈتا نہ معلوم کدھر نکل گیا تھا۔ وہاں کافی دیر تک کھڑا رہا تھا۔ دور کھمبوں کے تین دیو قامت ڈھانچے کھڑے تھے۔ گردن تک کالے سیاہ کانوں میں بڑے بڑے پنی منڈھے ہوئے بالے۔ کالی لمبی لمبی مونچھیں ایک ہاتھ میں تلوار دوسرے میں ڈھال۔ یہ وہی رسمی قسم کے ڈھانچے تھے جنہیں وہ بچپن سے دیکھتا چلا آیا تھا اور ... دیکھ کر اس کا تخیل ماضی کی پُراسرار خواب میں ڈوبی ہوئی پگڈنڈیوں پر بھٹک نکلتا تھا لیکن آج خوف کی ...

مبہم ننھی منی لہرا اس کے دل میں سرسرا رہی تھی بھیڑا اتنی تھی کہ کئی چکر کاٹنے کے باوجود انہیں وہ زرد پوش زرد رو زندہ ممیں نظر نہ آئیں جوان بھیانک ڈھانچوں سے پیدا ہونے والے تاثر کو اپنی حدود سے آگے نہیں بڑھنے دیتیں اور یہاں کھڑے کھڑے جب اسے کشن کے کھو جانے کا خیال آیا تو وہ سوچنے لگا کہ اگر یہ بھیڑ اسے بھی نگل جائے تو...... اور اتنے میں رمیش آگیا تھا۔ چل بھئی کشن تو ملا نہیں ــــ وہ خاموش سر نیوڑھائے گھر پہنچے تھے۔ لیکن گھر پہ کشن موجود تھا اور اپنے تاؤ کی گود میں بیٹھا پوچھ رہا تھا۔ "تاؤ رے راجہ نے شہزادے کی آنکھوں سے رومال چھوایا نا تو اس میں کیا تھا جو راجہ کو ٹیپنے لگا۔" اور اب وہ خود سوچ رہا تھا کہ اس رومال میں کیا تھا۔ یہ سوال اس کے خیالات کی زنجیر میں کچھ اس آڑے ترچھے طریقہ سے اٹکا کہ وہ زنجیر ہی ٹوٹ گئی وہ سوچتے سوچتے اب تقریباً بالکل تھک گیا تھا۔ اس کا ہاتھ سر کے نیچے رکھے رکھے پھر سو گیا تھا اور جب اس نے ہاتھ کو جنبش دی تو پھر وہی ننھی منی لہریں اس کی رگوں نسوں میں تیرنے لگیں۔ اس کا دماغ خالی ہو گیا تھا۔ شاید سوچنے کے لئے فی الحال اس کے پاس کچھ باقی نہ رہا تھا۔ لیکن ایک خیال دھند کی پرچھائیں کی طرح اب بھی اس کے ذہن پر منڈلائے جا رہا تھا۔ گویا رام چندر جی بن کو چلے گئے ہیں 'اجودھیا میں اندھیرا پڑا ہے اور راجہ دسرتھ اس غم میں دنیا سے سدھار گئے ہیں۔

سمجھوتہ

پرکاش پنڈت

وہ چھت سے نیچے اتر آئی اور چوبارے میں بچھے ہوئے پلنگ پر آلیٹی لیکن خیالات کا وہ لامتناہی طوفان بدستور اس کے ذہن میں مدو جزر بپا کرتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہی مہمل سے خیالات نئے سرے سے اس کے ذہن میں اجاگر ہونے لگے کہ جن کی وجہ سے وہ تمام رات ایک لمحہ کے لئے بھی نہ سو سکی تھی۔ رت جگے کے سبب اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور چہرے پر خاص قسم کی تھکن کے آثار ابھر آئے تھے۔

وہ اس قسم کی ذہنی الجھنوں اور بے قراریوں سے بخوبی واقف تھی۔ ایک مدت ہی سے تو اس کا دل اس قسم کی سوچ بچار میں پنپ رہا تھا۔ وہ بے ہنگم، غیر واضح سے خیالات تو جیسے اس کی زندگی کا ایک اہم ترین جزو بن کر رہ گئے تھے لیکن آج نہ جانے کیوں اسے کچھ یہ محسوس ہو رہا تھا گویا زندگی میں پہلی بار اس کے احساسات درد کی ٹیسوں میں اُلجھ رہے ہوں اور جیسے پہلی ہی مرتبہ اس کا دل اس قسم کے دکھوں کی وحشت سے آشنا ہو رہا ہو۔

اس کی آنکھوں کے ڈورے دو دھیا ہو آئے تھے اور ڈلوں سے کچھ ایسے ہی پھوٹ پھوٹ کر نکلتا ہوا سیاہ و سپید لاوے کی قسم کا مادہ ان کے کونوں پر جمے خاکستری رنگ میں جم چکا تھا۔ ہونٹوں پر کل کی مسی کے چکیلے رنگ نے بھی اِدھر اُدھر سے سمٹ کر پپڑیوں کی صورت اختیار کر لی تھی اور جگہ بہ جگہ ان پپڑیوں کے اکھڑ جانے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ نہایت شدت سے اپنے ہونٹ کاٹتی رہی تھی۔

اس کی عمر ابھی چودہ برس کی تھی۔ شہروں کی تنگ اور غلیظ گلیوں میں بسنے والی عام لڑکیوں کی طرح دبلی پتلی اور زرد رو لیکن کھٹی [illegible] چیزیں یعنی اچار وغیرہ کی دلدادہ ہونے سے جو شے شاید اس میں دو برس بعد پیدا ہوتی اس نے قبل از وقت ہی اپنا رنگ نکھار دیا تھا۔ اس عمر میں جو بھولپن کسی بھی کنواری کے چہرے سے جھلک سکتا ہے وہ گویا کسی نے بُری طرح سے کھرچ لیا تھا۔ اس کی ہنسی میں عجب قسم کی [illegible] اس کی روح کھلکھلانے کے بجائے مرجھا جاتی ہو۔ جیسے وہ ہنسنا تو چاہتی ہے لیکن کسی نامعلوم طاقت نے اس [illegible]

اس [illegible] بوجھ تلے دبا رہتا تھا۔ عرصے سے ایک غیر معمولی خلا ہر وقت اس کے ذہن میں پھیلتا سمٹتا چلا آ رہا تھا [illegible] ایک طرح کی بھوک اس کی آنکھوں میں بلبلاتی۔ یہ غیر معمولی خلا کس طرح پر ہو۔ یہ خیال آٹھوں پہر [illegible] کوششوں کے باوجود وہ ذہن کی گہرائیوں میں خلط ملط کر سکنے کے ناقابل ہو چکی تھی۔ وہ آنکھیں جذب [illegible] ایک تہ و بالا کیفیت بپا ہو جاتی۔

اس کی آنکھ [illegible] ہر جذبہ دوسرے پر سبقت لے جانے کی سعی [illegible]

کر [illegible] کبھی کوئی طاقت عود کر آتی، کبھی کوئی جذبہ غالب آ جاتا۔ اس کش مکش کے رد عمل سے یہ نتیجہ [illegible] آنکھوں میں کیا ہے؟ وہ نگاہیں کیا کہنا چاہتی ہیں؟ بعض اوقات یوں معلوم ہوتا گویا التجا کا جذبہ دوسرے جذبوں کو پیچھے چھوڑ کے نمایاں صورت اختیار کر گیا ہے اور نہایت ہی دردمندانہ انداز میں گڑگڑا رہا ہے ____ "کچھ ہو، واضح غیر واضح بس ایک نظر آ جائے۔"

اسے کائنات کی ہر چیز سے نفرت تھی۔ اپنے آپ سے اپنے ان غیر اختیاری اضطراری کیفیات سے [illegible] خیالوں سے، اپنی سہیلیوں سے جو بڑی چترائی اور دل جمعی سے اپنی محبت کے قصے سنا سنا کر اس کے دل میں بھی کچھ اسی طرح کا [illegible] اور فخر سے باتیں بنانے کا احساس پیدا کرتی تھیں۔ گھر کے کام کاج سے 'کیا وہ اسی لئے پیدا ہوئی ہے کہ صبح سے شام تک کولہو کے بیل کی طرح گھر کے کام میں جتی رہے۔ اسے اپنے ماں باپ کے اس جھوٹے پیار سے بھی بے انداز نفرت تھی جو خواہ مخواہ اس کے تئیں جتایا جاتا تھا۔ ماں باپ کی میٹھی میٹھی باتیں بھی اسے بالکل ہی بے سروپا معلوم ہوتیں۔ بلکہ اسے غصہ آتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ ان کے لاڈ پیار میں محبت کی نہیں، ہمدردی کی آمیزش ہے۔ ہمدردی جو کسی بھی بیگانے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ رات کے دس بجتے ہی وہ چار بچوں کو اس کے سپرد کر کے علیحدہ کمرے میں سونے کو چل دیتے تھے اور بچے آدھی آدھی رات تک ریں ریں کرتے ہوئے اس کے لئے وبالِ جان بنے رہتے تھے۔ پھر وہ طویل، بھیانک اور تاریک راتیں، وہ تو ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں ____ ایک ایک رات میں وہ کئی کئی بار ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی اور گم سم لیٹی ہوئی پہروں کمرے کی تاریک فضا میں اِدھر اُدھر آنکھیں بھٹکاتی رہتی۔ کبھی کبھی انتہائی کوشش کے باوجود سو نہ سکنے سے وہ کمرے کی کھڑکی کھول کر باہر آسمان کی طرف ایک ٹک دیکھنے لگ جاتی جیسے کسی آسمانی طاقت کی راہ دیکھ رہی ہو۔ لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے ٹمٹماتے ہوئے ستارے مجھے کیوں اچھے نہیں لگتے۔ یہ چاند کیوں چاندنی بکھیر رہا ہے۔ یہ موت کا سا سکوت کیوں؟ یہ سب کیا ہے، یہ سب کیوں ہے؟ لیکن کوئی پھانس اس کے حلق میں پھنس کر رہ جاتی اور وہ پھر اپنے تئیں چارپائی پر گرا دیتی ____

دن تو کسی نہ کسی حیلے کٹ ہی جاتا۔ ادھر اُدھر کی باتوں میں، گھر کے کام کاج میں، اور اسے اس قسم کے خیالات سے قدرے نجات ملی رہتی۔ لیکن جونہی شام ہونے کو آتی اس کا دل پھر بیٹھنے لگتا۔ اس وقت اسے کچھ اچھا نہ لگتا۔ ساری رات یونہی خیالات میں غلطاں و پیچاں رہنے کے احساس سے ایک جان لیوا سی افسردگی اس کے چہرے پر دھرنا مارے بیٹھتی اور اُداس مضمحل سی وہ یہاں وہاں گرنے پڑنے لگتی۔ یہ دن کب ختم ہوں گے، یہ راتیں کب ختم ہوں گی؟ اسے یقین ہو چکا تھا کہ جو وہ چاہتی تھی ایک آرزوئے ناتمام ہی تھی۔

اس ذہنی انتشار اور اس قسم کی بیقراریوں کو اندر ہی اندر دباتے رہنے سے اس کا ذہن ایک طرح کی دلدل بن چکا تھا جس میں کئی طرح کی اُمنگیں، امیدیں اور تشنہ کامیاں اور حسرتیں دھنس کر رہ گئی تھیں۔ ہر لحظہ وہ کئی کئی ڈھنگوں سے اُبھر اُبھر پڑتیں اور تڑپ تڑپ کر اس کی تمام تر توجہ اپنی طرف کھینچ لیتیں ____ سوچو ہمارے لئے، ہماری رہائی کے لئے کچھ سوچو ____

مگر وہ سوچ سوچ کر عاجز آ چکی تھی۔

بسا اوقات سوچتے ہی سوچتے وہ اپنے خیالوں کی زندگی کو بھی پالتی تھی گوناگوں مسرتوں سے لبریز زندگی۔ زندگی کہ جس میں اسے سوچنا نہ ہوگا۔ اس وقت اس کا ذہن کئی قسم کے ہوائی قلعے تعمیر کرنے لگتا۔ اسے اپنے چاروں طرف سینکڑوں پیار بھری نگاہیں سرگوشیانہ انداز میں کچھ کہتی ہوئی دکھائی دینے لگتیں۔ اس احساس سے معاً پیاری پیاری لہریں اس کے جسم میں سرسرا اٹھتیں۔ اس کی رگوں میں ایک کپکپاہٹ سی دوڑنے لگتی جیسے وہ کسی نئے ولولے کسی نئی امنگ سے آشنا ہو رہی ہو۔ اس کا دل کسی نامعلوم خواہش کے زیر اثر جگمگا سا اٹھتا اور خواہ مخواہ اس کا جی چاہتا کہ وہ ایک اَنُوٹ قہقہہ فضا میں بکھیر دے کہ اسے گرد و پیش کی ہر شے ہنستی ہوئی نظر آنے لگے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے بجلی کے کوندنے کی سی تیزی کے ساتھ کوئی دل شکن احساس اس کے قلب کی گہرائیوں سے اُبھر آتا اور کہرے کی صورت میں ہر گوشے پر چھا جاتا۔ اس پر ایک ہیبت سی طاری ہو جاتی ____ پھر وہی بھیانک طویل راتوں کی گرانیاں، پھیکے اُداس دن

——— جھنجھلاہٹ اور وہی اس کا وجود۔

کبھی رات اسے کوئی سہانا شیریں خواب بھی دکھائی دے جاتا جو بعد میں کئی کئی دن تک اس کے دل میں لذت انگیز گدگدی کرتا رہتا۔ پھر وہ ہر رات اسی قسم کے کسی خواب کی توقع میں اپنے دل میں رنگینی لانے کی کوشش کرتی۔ بارہا اسے محسوس ہوتا کہ کمرے کی فضا میں میٹھے میٹھے سپنے منڈلا رہے ہیں لیکن وہ ان تک کیونکر پہنچے۔ پوری کوشش کے باوجود بھی وہ انہیں پانے میں کامیاب نہ ہوتی ———

سورج کافی اونچا اٹھ چکا تھا اور پچھواڑے کی جانب کھلنے والی کھڑکی میں لگی ہوئی بھاری بھرکم کائی کانے کی چق سے ہلکی ہلکی دھوپ چھن چھن کر اس کے پلنگ پر اور اس کے آس پاس لہریں فرش پر جال سا بن رہی تھیں۔ اس جال پر اچٹتی سی نگاہ ڈال کر اس نے لیٹے لیٹے پورے زور سے ایک انگڑائی لی۔ اس کا انگ انگ چیخ اٹھا۔ اسی دوران میں اس کی ماں نے رسوئی گھر سے اسے نیچے آنے کو آواز دی لیکن وہ ان سنی سی کر کے اسی طرح لیٹی رہی۔ اس کا ذہن ایک ماہ پہلے کی طرف پلٹ رہا تھا۔ وہ عجیب سی بات ابھی تک اس کے ذہن پر مرتسم تھی اور اکثر وہ بات اسے یاد آجاتی تھی اس وقت بھی اپنے دل میں اسے دہرانے سے وہ طنزاً ہلکا سا مسکرا دی۔ وہ بھاری بھرکم کائی کانے کی چق خود اسی نے ماں سے یہ کہہ کر یہاں لگوائی تھی کہ وہ موا درزی یوں دیدے پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھتا ہے ——— "بھینگا کلموہا" ——— طنزیہ حقارت سے وہ بڑبڑائی۔ "یوں دیدے مٹکا مٹکا کر دیکھتا تھا گویا اسے اپنی آنکھ کے پھولے کا احساس ہی نہ ہو ——— بڑا چھیلا بنتا ہے۔ اونہہ! کوئی اس سے کہے کہ تمہیں تو کوئی چڑیل بھی دیکھنا گوارا نہیں کر سکتی۔"

جب کبھی وہ کھڑکی میں جاتی۔ درزی یوں تیزی سے مشین چلانے لگتا گویا دکھانا چاہتا ہو۔ میں دن بھر اسی رفتار سے مشین چلاتا ہوں اور میری باہوں کے پٹھے تھکتے نہیں ——— یونہی اسے خیال آیا کہ وہ ذرا اٹھ کر دیکھے کہ کیا وہ دوکان کھول چکا ہے۔ لیکن پھر نہ جانے کس خیال سے وہ اسی طرح لیٹی رہی ——— وہ ایک اور ہی حیران کن بات سوچنے لگی ——— آخر وہ کیوں اس شدت سے میری طرف تاکتا ہے جبکہ اسے اچھی طرح علم ہے کہ میں لنگڑی ہوں۔

وہ لنگڑی تھی۔ یہی غم اسے گھن کی طرح کھائے جاتا تھا اس کی ماں کے کہنے کے مطابق بچپن میں کہیں وہ گھر کی سیڑھیوں سے لڑھک پڑی تھی جس سے دائیں ٹانگ کا ٹخنہ اتر گیا تھا۔ بہتیرے حیلے کئے گئے مگر اصلی حالت پر نہ ٹک سکا۔ یہ قصہ اکثر اس کی ماں سائے ڈھلے گلی کی عورتوں میں بیٹھ کر چھٹی سے خربوزے تربوز کے بیج نکالتی ہوئی دہراتی اور جب وہ سب عورتیں اس کے بُرے نصیب پر چچ چچ کرنے لگتیں تو اس کے دل میں کئی قسم کے اضطراری شعلے ایک ساتھ بھڑک اٹھتے۔ اس وقت اس کا جی چاہتا کہ وہ جانے بوجھے ایک بار پھر سیڑھیوں پر سے لڑھک پڑے اور اپنی دوسری ٹانگ کو بھی ناکارہ کر لے کہ وہ چل پھر تو نہ سکے گی۔ نہ کوئی اسے دیکھے گا نہ اس کی چال بے ڈھنگی پر افسوس کرے گا اس کے وقار کی ہیٹی تو نہ ہوگی۔

یوں وہ بناؤ سنگھار کی بڑی دلدادہ تھی۔ گھنٹوں آئینے کے سامنے کنگھی لئے وہ بال سنوارتی رہتی۔ اس کے بال کو چھوٹے اور چھدرے سے تھے لیکن وہ ایک ایک لٹ کو چن کر اس طرح جما لیتی کہ ان میں ایک عجیب قسم کی پھبن پیدا ہو اُٹھتی۔ وہ اپنے ابروؤں کے بال بڑی محنت سے کے ساتھ سوچنے سے تراشتی کہ قدرتی بے ترتیبی ناپید ہو کر سہانا تناؤ آ سکے۔ آنکھوں کی پلکوں پر کریم مل مل کر وہ انہیں دہرا کرتی اور کاجل سرمہ کی سلائیوں کو اس ہنر مندی سے آنکھوں میں پھیرتی کہ چھوٹی ہونے کے باوجود آنکھیں کنپٹیوں تک لانبی دکھائی دینے لگتیں۔ پھر دل ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی رہتی، جس سے ہونٹوں میں غضب کی دل آویزی اور رسیلی چمک پیدا ہو اٹھتی تھی۔

کپڑے پہننے میں بھی وہ بڑی احتیاط برتتی۔ کس جمپر کے ساتھ کون سی شلوار کا میل ہے۔ چنری کے کون سے رنگ میں وہ زیادہ جاذب نظر دکھائی دے گی۔ آنچل کس طرح لہرائے کس ڈھنگ اوڑھنے سے لہریئے زیادہ چمک سکتے ہیں۔ ان سب باتوں میں اسے کمال حاصل تھا لیکن یہ سب کچھ بھی لنگڑے پن کے آسیب کے زیر اثر ہر دم زوتے ہی رہتے۔ وہ غیر مطمئن تھی۔ وہ یہ نہ چاہتی تھی کہ کوئی

اسے دیکھ کر اس کی حالتِ زار پر افسوس کرنا شروع کر دے' اس سے ہمدردی جتانے لگے۔ بلکہ وہ تو کچھ اور ہی چاہتی تھی۔ اس کی تسکین کا محض ایک ہی ذریعہ تھا کہ کوئی بھی نوجوان اسے کسی اور ہی جذبے کے زیرِ اثر دیکھے ـــــ وہ سحر طراز جانا پہچانا جذبہ جو صرف محسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ وہ اپنی سہیلیوں کی طرح لڑکوں سے چھپ چھپ کر ملنا بھی نہیں چاہتی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی کہ کسی خوبرو نوجوان کے ساتھ پہروں بیٹھی پیار، محبت کی باتیں کرتی رہے' کوئی اس کی تعریفوں کے پل باندھے۔ وہ تو صرف یہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے ان نگاہوں سے دیکھے جن نگاہوں کا تصور ایک مدت سے اس کے خیالوں میں رچ چکا ہے۔

دھوپ لمحہ بہ لمحہ گرمی پکڑ رہی تھی۔ اس کی ماں نے نیچے سے ایک اور آواز دی لیکن اس نے کروٹ بدل لی۔ سامنے گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں سرمئی رنگ کا پھولدار پردہ ہوا کے دوش پر لہرا رہا تھا اس کی طرف نظر جاتے ہی یک لخت نہ جانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ وہ پردہ پھبتی آمیز قہقہے لگاتا ہوا اس پر نہایت ذلیل فقرے کس رہا ہے' وہ جھپٹا کر اٹھ بیٹھی۔ اس کا سانس قدرے زور سے چلنے لگا۔ ایک بار اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ لپک کر اس پردے کو کھینچ لے اور چیتھڑا چیتھڑا کر کے ہوا میں اچھال دے لیکن دوسرے ہی لمحے اسے پردے سے ایک طرح کی وحشت آنے لگی گویا سچ مچ ہی وہ اس سے مخاطب ہو ـــــ "سنہری سپنوں کا جال ٹوٹ چکا۔ مجھے ہی نہیں تم نے اپنے آپ کو بھی دھوکا دیا ہے۔ اب تڑپو' تلملاؤ کہ یہی انصاف ہے" ـــــ

اس پھولدار سرمئی رنگ کے پردے سے اس کی کس قدر رنگین اور پیاری گھڑیاں چمٹی ہوئی تھیں۔ ایک ہی ہفتہ پہلے اس نے خود اپنے ہاتھوں اپنی ذرا سی پھٹی ہوئی ساڑھی پھاڑ کر کے یہ پردہ یہاں لٹکایا تھا گو اس میں اس کی ماں کا بھی ہاتھ تھا۔ تاہم اس پردے کے ساتھ ایک اور بھی پردہ پڑا رہے گا' اس نے اپنی ذارسی پھٹی ہوئی ساڑھی پھاڑ دی تھی ـــــ ایک ہفتہ ـــــ یعنی کل سات دن ـــــ وہ سوچنے لگی۔ کتنا مختصر وقت ہے لیکن اس نے اس دوران میں کیا کچھ نہیں پایا ـــــ اس سنہری دور کا وہ پہلا دن جب اس نے مہندر کو سامنے کے مکان کے چھجے پر آرام کرسی پر لیٹے پڑھتے دیکھا تھا۔ صبح ہی صبح جب وہ چوبارے کی اس کھڑکی میں آکر کھڑی ہوئی تو ایک دم جیسے اس کا دل بول اٹھا تھا۔ ہاں' جس کی تلاش میں تم برسوں سے سرگرداں ہو آج وہی تمہارے سامنے آ موجود ہوا ہے۔ یہ موسیقار تمہارے دل کے تاروں پر وجد آور نغمے گائے گا ـــــ یہ مسیحا تمہاری صدیوں کی تڑپ ہرنے آیا ہے اور واقعی مہندر کی ایک ہی میٹھی نظر نے اس کی تڑپ ہر لی۔ صدیوں کا روگ مٹ گیا۔ اسے دنیا کی ہر شے مسکراتی اور خوشی سے ناچتی ہوئی دکھائی دینے لگی۔

مہندر اٹھ کر اندر چلا گیا لیکن وہ کتنی دیر تک وہاں کھڑی رہی تھی۔ کس قدر تعجب کی بات ہے' اس نے سوچا گھر کے بالکل مقابل کے مکان کو اس سے پہلے اس نے غور سے نہیں دیکھا ـــــ وہ تو جب بھی اپنی کسی نئی سہیلی کو اپنے مکان کا پتہ بتایا کرتی تھی تو محض اتنا ہی کہ فلاں گلی میں ہے۔ دائیں ہاتھ کے تین چار مکانوں کے بعد پیلے رنگ کے چھجے والے مکان کے ٹھیک سامنے ہی اس کا گھر ہے۔ بھلا وہ یوں کیوں نہ کہتی تھی کہ اس پیلے مکان کے چھجے کے جنگلے میں انیس سلاخیں ہیں جن میں سے تیرہ سلاخیں تو شاید دھوپ اور بارش میں ہونے کے سبب زنگ آلود ہو چکی ہیں لیکن باقی پر لگا ہوا تار کول ابھی اپنی پوری آب پر ہے اس مکان کے دروازوں پر نہایت ہی چمکیلا سبز روغن کیا ہوا ہے۔ لیکن آتے جاتے تختوں کو چھوتے رہنے سے ان کے درمیانی حصے کی کچھ جگہ مٹمیلی بھی ہو گئی ہے یا یہ کہ چھجہ کافی کھلا ہے اور وہاں بڑی آسانی سے آرام کرسی بچھا کر کوئی پڑھ سکتا ہے۔

اس واقعہ نے اسے یکسر بدل دیا۔ اس کے قلب کی گہرائیوں سے نکلتی ہوئی درد و کرب کی چیخیں جانے کہاں دفن ہو گئیں اور ان کی بجائے نہایت لطیف تسکین دہ احساسات نے جگہ پالی جیسے کسی لق و دق صحرا میں بھٹکتی ہوئی یکایک وہ کسی سرسبز رنگین وادی میں پہنچ گئی ہو۔ ایسی وادی جو اس کے خیالوں کی وادی سے بھی کہیں زیادہ خوشنما تھی جہاں کرل کرل کرتے ہوئے ٹھنڈے' میٹھے پانی کے چشمے اس کی تڑپ اور تشنگی مٹانے کو مچل اٹھے تھے ـــــ اس میں ایک غیر معمولی پھرتی آ گئی۔ گھر کے کام کاج میں بھی وہ بڑی مستعدی دکھانے لگی۔

اس سے پہلے برتن مانجھنے سے وہ اکثر کنی کترا جاتی تھی اور اس وجہ سے اسے ماں کے جھڑکوں کو سنتے پڑتے تھے لیکن اب وہ خود بخود ہی چٹکیوں میں برتن چمکا کر الماری میں جوڑ دیتی اور منٹوں میں دوسرے سلائی کے کاموں سے بھی نمٹ جاتی۔ اپنے بہن بھائیوں اور ماں کے تئیں بھی وہ بڑی محبت جتانے لگ گئی تھی۔

لیکن اس کی ماں بڑی جہاں دیدہ عورت تھی۔ پہلے ایک دو دن تو اس نے اس اچانک تبدیلی کو کوئی خاص اہمیت نہ دی۔ عمر کا تقاضا سمجھ کر درگزر کرتی رہی لیکن جب پانی سر سے گزرتا ہوا دکھائی دیا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ سامنے کے مکان میں آکر بسے ہوئے نئے کرایہ دار کے لڑکے مہندر کو بھی وہ اکثر چھجے پر بیٹھے اور اوپر کھڑکی کی طرف بار بار دیکھتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ لہٰذا کسی قسم کی انگشت نمائی کے ڈر سے اس نے کھلے طور پر تو کوئی قدم نہ اٹھایا۔ صرف اپنی لڑکی کو طرح طرح کی لیلیں دے کر اور باتوں باتوں میں بات لگا کر سمجھانے کی کوشش کی اور اسی کے کہنے پر ہی کھڑکی میں یہ پردہ لٹکایا گیا تھا لیکن وہ ماں کی آنکھ بچا کر دن میں بیسیوں مرتبہ کھڑکی میں چلی آتی تھی۔

چوبارے کی یہ کھڑکی سامنے کے چھجے سے قدرے اونچائی پر تھی۔ اس طرح چھجے پر سے کھڑکی میں کھڑے کسی شخص کی کمر تک ہی کا حصہ دکھائی دے سکتا تھا۔ پھر بھی وہ وہاں کھڑی ہو کر پردے کو اس انداز سے سرکائے رکھتی کہ مہندر صرف اس کا منہ یا زیادہ سے زیادہ چھاتیاں ہی دیکھ سکے۔

دن کو تو زیادہ تر ماں اسے نیچے اپنے پاس بٹھائے رکھتی تھی۔ لیکن رات کو کسی قسم کی روک ٹوک نہ ہونے سے وہ اپنے بہن بھائیوں کو پچکار سلا کر کھڑکی میں چلی جاتی۔ گو اس کی ماں ایک بار سونے کے لئے جا چکنے کے بعد پھر کبھی اس کے پاس نہ آتی تھی۔ پھر بھی احتیاط کے طور پر وہ چوبارے کی بتی بجھائے ہی رکھتی۔

چھجے کے اندر کی طرف دروازہ مہندر کے کمرے میں کھلتا تھا جسے شاید وہ ہوا آنے کی غرض سے کھولے رکھتا تھا۔ کھڑکی میں سے وہ بخوبی اسے پڑھتا ہوا دیکھ سکتی تھی۔ پہروں وہ اندھیرے میں کھڑی اسے تاکے جاتی۔ مہندر کو شاید اس بات کا علم نہ تھا وہ بے خبر اپنی پڑھائی میں مگن رہتا اور جونہی گھڑیاں بارہ بجاتیں اس کے کمرے کی بجلی بجھ جاتی۔ کئی بار اس کے دل نے بغاوت بھی کی کہ وہ کسی طرح اسے اپنی موجودگی کا احساس دلائے اور التجا کرے کہ خدارا کچھ دیر کے لئے اور رہ جاؤ ——— تم اتنی جلدی کس طرح سو جاتے ہو ——— لیکن وہ بے دلی سے کھڑکی سے ہٹ جاتی۔

لیکن تیسرے دن کے بعد مہندر نے بھی کمرے میں بیٹھنے کے بجائے باہر چھجے پر آکر ٹہلنا اپنا معمول بنا لیا۔ کبھی کبھی وہ سیدھا کھڑا ہو کر اس کی طرف ٹکٹکی بھی باندھ لیتا۔ کوئی اشارہ یا بات تو نہ ہوتی لیکن اس دن کے بعد دونوں ہی اس دھن میں رہنے لگے کہ ایک دوسرے سے پہلے مخصوص جگہ پر پہنچ جائیں۔ اسے گھر کے کام کاج میں اکثر دیر ہو جاتی۔ ماں کوئی بیگار ڈال دیتی یا بچے ہی سونے کا نام نہ لیتے تو وہ جھنجھلا جھنجھلا کر اس اونچی آواز میں انہیں ڈانٹتی کہ مہندر اگر چھجے پر پہنچ چکا ہے تو اس کی آواز اس تک پہنچ سکے یا اگر ماں جاگ رہی ہے تو اسے کسی قسم کا شبہ نہ ہو اور جونہی سب صحیح ٹھیک دیکھ کر وہ کھڑکی میں آکر مہندر کو انتظار کرتا ہوا پاتی تو اس کا رواں رواں خوشی سے کھل اٹھتا۔

اب اس کی سہیلیاں جب اسے ملنے آتیں اور حسبِ معمول اپنے کسی محبت کے قصے کو نمک مرچ لگا کر بیان کرتیں؟ تو خلافِ معمول وہ ان میں زیادہ دلچسپی لینے لگتی۔ بات بات پر وہ کھلکھلا اٹھتی گویا ان کی محبت کا مذاق اڑا رہی ہو ——— "اچھا کل اس نے تمہاری گلی میں بارہ چکر لگائے" ——— اور یہ کہتے ہوئے وہ قہقہے لگا کر ہنسنا شروع کر دیتی۔ ہنستے ہنستے اسے اچھو آنے لگتا۔ کئی بار اسے بھی خیال آیا کہ وہ ان سے کہے آخر میں بھی تو محبت کرتی ہوں' ہماری طرف دیکھو۔ وہ میری بابت سوچتا ہے میں اس کی بابت سوچتی ہوں اور بس! اور

یہ جو تم گلیوں کے چکر کاٹنے والی باتیں سنا رہی ہو یہ سب لغویات ہیں ——— فضول ——— واہیات ———

مگر وہ اپنے تصور کی کل یکسوئی کے باوجود کچھ بھی کہنا پسند نہ کرتی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی سہیلیاں اس کا مذاق اڑانے لگیں گی۔ ایسے ایسے دل شکن فقرے دہرائیں گی کہ اس کی روح کا ہر ذرّہ رو اٹھے گا۔ کسی کو بھی اس کی باتوں پر یقین نہ آئے گا۔ وہ سب تو شاید یہی سمجھے بیٹھی ہیں کہ دنیا بھر کے کسی بھی شخص کی دلچسپیوں کا مرکز اگر کوئی ہو سکتا ہے تو محض انہی کی ذات۔ ہونہہ! وہ سوچتی، یہ خود اعتمادی دراصل کس قدر بے وقعت ہے اسے یاد تھا کہ اسی شانتی کا چاہنے والا جس کے متعلق وہ بڑی بڑی ڈینگیں مارا کرتی تھی اور جس کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے تک ملاتے نہ چوکتی تھی، پچھلے دنوں گھر کی نوکرانی کے ساتھ پکڑا گیا تھا ———

سرمئی رنگ کا پھولدار پردہ بدستور ہوا سے پھڑ پھڑا رہا تھا اور کانی کانی کی بوجھل، گم سم چھت سے چھن کر آتی ہوئی دھوپ کمرے میں گرمی بھر رہی تھی ——— پردے کی طرف دیکھنے سے پھر اس کے سینے میں کسک سی ہوئی اور اس کا چہرہ غیر معمولی طور پر تمتما اٹھا۔ کسی غیر معلوم خواہش کے زیر اثر ایک دم اس کے ذہن میں خیال ابھرا کہ وہ ایک لحہ کے لئے پردے کی اوٹ میں جا کر کھڑی ہو جائے۔ یونہی ——— لیکن فوراً ہی بعد پھر اسے اپنے اس احساس سے بھی وحشت سی ہونے لگی۔ پردہ جیسے پھر کچھ کہنے کو دکھائی دیا ———

وہ تن کر سیدھی لیٹ گئی۔ اس کی پیشانی عرق آلود ہو چکی تھی۔ آنکھیں آبگوں ہو آئی تھیں اور اس کا ذہن کسی فیصلہ کن راہ پر چلنے کے بجائے اِدھر اُدھر بھٹکنے سے جواب دینے لگا۔ نڈھال سی ہو کر وہ چھت کی کڑیاں گننے لگی لیکن اس سمت بھی اس کا دھیان زیادہ دیر نہ جم سکا سینے کی آگ اور زور سے بھڑکنے لگی۔ آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے اور وہ سسک سسک کر رونے لگی۔

ماضی کی اس کے تئیں سرد مہری اور مستقبل میں بھی روشنی کی کسی ہلکی سی کرن کے لئے ناامیدی سے اس کے چہرے پر مردنی سی چھا گئی ——— بیاہ ——— یکایک یہ خیال نہ جانے اس کے ذہن کے کس گوشے سے اُمڈا اور تھوڑی دیر کے لئے اس خیال نے اسے ذرا سی قوت بخشی۔ اس نے آنسو پونچھ ڈالے لیکن پھر جب وہ اپنی گزشتہ زندگی کا تجزیہ کرنے لگی تو اسے یہ خیال بھی محض دل بہلاوے ہی کا ایک سامان معلوم ہونے لگا۔ کئی بار اس کی سگائی کا چرچا اٹھا تھا۔ جس دن لڑکے والوں کی طرف سے کسی عورت کی آمد آمد ہوتی وہ لگا تار کئی کئی گھنٹے نوک پلک درست کرنے میں گزار دیتی۔ لیکن جونہی اس عورت کا سامنا ہوتا ساری سحر انگیزی ٹوٹ جاتی۔ خود نمائی کا جادو اپنے ہی سر چڑھ کر بول اٹھتا۔ اسے انتہائی یقین ہو چکا تھا کہ کسی بھی حالت میں وہ شادی کے قابل نہیں سمجھی جا سکتی۔ کبھی کبھی اسے یہ خیال بھی گزرتا کہ یہ جو چہروں پر چیچک کے بدنما داغ، پھلبہری کے نشان جمیٹے موٹی، بھدی کالی، بھینگی، سینکڑوں عورتیں گھروں کی رانیاں بنی بیٹھی ہیں۔ یہ بھلا کیونکر قبول کی گئی ہوں گی؟ اور اس خیال سے اس کے دل کو ذرا دیر کے لئے ڈھارس بندھ جاتی کہ شاید۔ ——— لیکن جونہی یہ پیوند لگتا کہ ممکن ہے یہ سب کچھ شادی کے بعد ظہور میں آیا ہو تو وہ اپنی ہی قسمت پر لعنت ملامت کر کے خاموش ہو [illegible] کہ قدرت نے اسے لنگڑی نہ کیا ہوتا۔ شادی ہو جانے کے بعد چاہے اس کے کل جسم کو فالج مار جاتا ——— وہ کوڑھی ہو [illegible]

[illegible] کی ایک زوردار آواز نے اس کے خیالات کے تسلسل کو توڑا۔ اسے خیال آیا کہ اٹھ کر نیچے چلی جائے۔ ماں جانے اس کے [illegible] میں مبتلا ہو گی۔ لیکن پھر اسے اپنی ماں پر بھی غصہ آنے لگا۔ وہ سوچنے لگی آخر یہ سب اسی کی تو لگائی ہوئی ہے۔ اگر وہ کل پڑوس [illegible] ہوتی تو.........

کل [illegible] آنکھوں کے سامنے آتے ہی اس کی آنکھیں پھر نمناک ہو اُٹھیں۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ ماں پڑوسن کے یہاں گئی ہوئی [illegible] آتے ہی وہ بھی کھڑکی سے جا لگی۔ سامنے مہندر بھی کرسی بچھائے پڑھ رہا تھا۔ آج پہلی مرتبہ دونوں ایک دوسرے کو [illegible] وہ کس قدر چالاکی سے کتاب کو منہ تک سرکائے بظاہر پڑھنے میں منہمک نظر آتا تھا مگر اس کی

آنکھوں کی آتشیں چمک سورج کے سامنے رکھے ہوئے آئینے کے [illegible] کی طرح اس کی آنکھوں میں پیوست ہوتی جا رہی تھی۔ ان آنکھوں میں کیا کچھ نہیں ____؟ وہ سوچ ہی رہی تھی کہ یکایک پڑوسن کی لڑکی نے جو اس کی سہیلی بھی تھی اسے نیچے گلی سے پکارا۔ ابھی کے ہاں سے ماں نے اس کو بلانے کے لئے اسے بھیجا تھا۔ دفعتہً بجلی کے جھٹکے سے جس طرح کوئی سر سے پاؤں تک لرز اٹھتا ہے وہی کیفیت اس پر طاری ہو گئی۔ وہ کیونکر گلی میں جائے گی؟ یہ خیال اسے کسی غیر معمولی طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہونے لگا۔ اس کے جسم کے ہر حصے میں ایک ہیجان امنڈ پڑا۔ اسے محسوس ہوا گویا ماں اس سے پچھلے جنم کا انتقام لینا چاہتی ہے۔

اس کی سہیلی اب اوپر اس کے پاس آ چکی تھی اور ساتھ چلنے کو کہہ رہی تھی۔ اس نے سر درد کا بہانہ کیا پھر پیٹ درد' حتیٰ کہ ہر درد گن ڈالا۔ کئی اور بھی بہانے بنائے مگر اس نے ایک نہ سنی اور آخر اسے کھینچتی ہوئی نیچے لے ہی گئی۔ اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ سارا جسم کانپ رہا تھا۔ ڈیوڑھی میں پہنچ کر ایک بار اسے خیال آیا کہ وہ ذرا سی دیر میں آنے کو کہہ کر اوپر کھڑکی میں چلی جائے اور بے باکانہ انداز میں گڑگڑا کر مہندر سے التجا کرے کہ اے میری روح کے نور' میرے مسیحا' آج تک میں نے تجھ سے بات تک نہیں کی۔ چاہت بھری نگاہوں کی دین کے علاوہ کچھ نہیں چاہا۔ آج میں جھولی پھیلا کر تجھ سے ایک بھیک مانگتی ہوں۔ خدارا تھوڑی دیر کے لئے اندر کمرے میں چلے جاؤ۔ مگر وہ ابھی تک پوری طرح یہ سب سوچ بھی نہ پائی تھی کہ اس کی سہیلی گھسیٹ لرا سے باہر لے گئی۔

اس پر غشی کا سا عالم طاری تھا۔ کل جسم سے پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ کاش اس وقت زمین پھٹ سکتی کہ وہ اس میں سما جاتی۔ اپنی سہیلی کا کندھا تھامے رہنے اور ٹانگ کو پوری قوت سے اکڑانے کے باوجود اس کا پاؤں گھوم کر لڑکھڑا ہی جاتا۔ ہر قدم پر اسے محسوس ہوتا گویا سینکڑوں بچھو ایک ساتھ اس کے جسم پر ڈنک چلا رہے ہوں۔

ماں کی باتوں پر وہ پوری طرح سے توجہ نہ دے سکی۔ ہر لحظہ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ صرف اتنی ہی بات اس کی سمجھ میں آ سکی کہ تمہارے پتاجی کے آنے کا وقت ہو گیا ہے چولھے پر چائے کے لئے پانی رکھ دو اور نیچے اپنے بہن بھائیوں کے پاس بیٹھو۔

وہ جلد ہی واپس لوٹ آئی۔ آتے ہوئے اس نے اوپر چھجے کی طرف دیکھا۔ مہندر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ گرتی پڑتی سیڑھیاں طے کر کے جب وہ چوبارے کی کھڑکی میں پہنچی تو مہندر چھجے پر موجود نہ تھا۔ چھجے اور کمرے کو ملاتا ہوا رات دن کھلا رہنے والا دروازہ بھی بند ہو چکا تھا۔

شام تک وہ کھڑکی سے نہ ہٹی۔ ماں نے جب اوپر آ کر چوٹی سے پکڑ کر کھینچا گالیوں اور دول دھپوں کی بوچھاڑ کی تب کہیں وہ نیچے اتری۔ باپ الگ خفا ہو رہا تھا۔ لیکن اسے تو اب جیسے کسی کی پروا ہی نہ تھی۔ جیسے وہ کچھ سُن ہی نہ رہی تھی۔

رات بھی وہ آدھی رات تک کھڑکی میں کھڑی رہی لیکن اس کے دل کی طرح سامنے کا چھجہ بھی ویران ہی رہا۔

وہ جانتی تھی کہ اب وہ دروازہ کبھی نہ کھلے گا۔ پھر جانے اس خیال سے وہ وہاں جمی رہی کہ گزشتہ سات دنوں کی اس زندگی کو وہاں سے کھرچ کر اپنے دل میں سنبھال کر رکھ لے۔ ماضی کی طرح پھر جب خیالات کا تصادم ہو گا تو اسے اپنی اس زندگی سے تھوڑی بہت تو تسکین مل سکے گی۔

چھجے کے دروازے کی درزوں میں سے تیز دھار کٹاریوں کی صورت میں اس کے کلیجے کو چھلنی کرتی ہوئی بجلی کی روشنی اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ وہ پڑھ رہا تھا۔ "یقیناً وہ پڑھ رہا ہو گا۔" اس نے سوچا' اسے تو کچھ بھی نہیں ہوا اتنے بڑے انقلاب کا اثر کائنات کی کسی بھی چیز پر تو نہیں ہوا۔ ستارے اسی طرح جھلملا رہے ہیں۔ چاند چاندنی بکھیر رہا ہے۔ لوگ نیند میں گھوک سو رہے ہیں.......... یہ خوفناک طویل بھیانک رات یہ تنہائی۔ یہ خلا____

اس کی حالت پیاس سے مرتے ہوئے اس انسان کی سی تھی' جس کے ہاتھوں میں ٹھنڈے پانی سے لبالب پیالہ دے کر پھر اسی دم

چھین لیا گیا ہو۔ جس نے صدیوں کی تشنگی کو دبا کر اس ساعتِ خوش کن کا انتظار کیا ہو اور جو ناکام ہونے کی صورت میں بجھتے ہوئے دیے کی لو کی مانند بھڑک اٹھے۔

اس کا دھیان پھر پردے کی طرف گھوم گیا۔ ہوا کے زور سے پردہ بدستور پھڑپھڑا رہا تھا ——— ان تھک زبان سے کہے جا رہے وہ فقرے اس کی روح کو تڑپانے لگے ——— سنہری سپنوں کا جال ٹوٹ چکا۔ مجھے ہی نہیں تم نے اپنے آپ کو دھوکا دیا ہے۔ اب تڑپو، تلملاؤ کہ یہی انصاف ہے۔ کسی غم یا غصے کے بجائے وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی گویا گرد و پیش کی ہر شے سے پوچھ رہی ہو۔ "کیا سچ مچ یہ انصاف ہی ہے؟"

پھر غیر ارادی طور پر اس کی آنکھیں چپ چاپ لٹکتی ہوئی کائی کانے کی بوجھل چق کی طرف اٹھ گئیں اور ایسے ہی وہ سوچنے بھی لگی۔ آخر اس چق پر ہوا کے جھونکے کیوں اثر انداز نہیں ہوتے۔ یہ کیوں خاموش ہے؟ ——— کہ یکایک اس چق پر تیز تیز ہاتھوں سے مشین چلاتا ہوا درزی اُبھر آیا اور جیسے اس کی آواز بھی واضح طور پر سنائی دینے لگی۔ "میں سب انقلابوں سے بے نیاز ہوں ——— میں سب انقلابوں سے بے نیاز ہوں۔"

وہ دونوں کھڑکیوں کے درمیانی فاصلے کا جائزہ لینے لگی۔ صرف ایک ثانیہ کے لئے اس کے ذہن کے کسی گوشے سے کوئی جذبہ پکارا ——— ایک خلیج ہی تو ہے گہری، ناقابلِ غور" ——— لیکن دوسرے ہی لمحے کسی خوفناک عزم کے دبدبے سے گویا وہ جذبہ پھر ذہن کی گہرائیوں میں لڑھک گیا۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔

چند ہی لمحوں کے بعد گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کائی کانے کی بوجھل چق سے ڈھک گئی اور پچھواڑے کی کھڑکی میں پھولدار پردہ ہوا کی لہروں پر ناچنے لگا۔

———

چاند بُجھ گیا

سرلا دیوی

جب سے ڈاکٹر ہو کر گیا تھا گھر میں ایک منحوس سی خاموشی چھا گئی تھی۔ سب غیر معمولی طور پر چپ ہو گئے تھے۔ ان کے ہونٹوں سے ہنسی یکسر غائب ہو گئی تھی۔ وہ چل پھر رہے تھے، مگر سایوں کی طرح خاموش۔ ان کے چہرے ایک ساتھ لمبے لمبے ہو گئے۔ ان کی آنکھوں کی سفیدی ضرورت سے زیادہ نمایاں ہو گئی تھی اور چیزوں کو پکڑتے اور اٹھاتے وقت ان کی انگلیاں کانپ کانپ جاتی تھیں۔ گھر کے لوگوں میں اس تبدیلی کو موہنی نے بخوبی محسوس کیا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ کمرے میں جو شخص بھی داخل ہوتا ہے اُس سے آنکھیں نہیں ملاتا بلکہ جلد سے جلد باہر چلے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اُس نے ایک دو بار دریافت بھی کیا کہ ڈاکٹر کیا مرض بتا گیا ہے۔ مگر کسی نے تسلی بخش جواب نہ دیا تھا۔ سب لوگ اس سے کچھ چھپانا چاہتے تھے۔ وہ اس کی آواز سُن کر چونک پڑے تھے اور ایک بار آنکھیں ملا کر فوراً نظریں چرا جاتے تھے۔ موہنی کو کسی نے کچھ نہ بتایا لیکن وہ سب کچھ جان گئی۔ یہ اس کی زندگی کا پہلا تجربہ نہ تھا۔ اس قسم کے تجربہ سے وہ پہلے بھی ایک بار دوچار ہو چکی تھی۔

لیکن پہلے تجربہ میں اور دوسرے تجربہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اُس دفعہ موہنی چارپائی پر نہیں پڑی تھی۔ اُن دنوں وہ تندرست تھی، خوبصورت تھی۔ اس کے رخساروں کی رنگت گلابی اور ہونٹوں کی سُرخی تازہ تھی۔ چارپائی پر اس کے پتا پڑے تھے۔ بخار نے ان کا خون اور گوشت گھلا ڈالا تھا اور ہڈیاں پیلی مردہ کھال کے نیچے بے ڈھنگ سے انداز میں پڑی رہ گئی تھیں۔ وہ چار مہینے سے بیمار تھے۔ پہلے ڈاکٹروں نے معمولی بخار بتایا پھر ملیریا۔ ٹائیفائیڈ اور پھر ایک دن سارے گھر میں آج کی طرح سناٹا چھا گیا۔ خوف و ہراس سے سب کانپ اٹھے۔ ہمت اور حوصلہ جواب دے گیا۔ گھر میں موت کے سیاہ پروں کا سایہ پھیلتا دکھائی دیا۔ ڈاکٹروں نے اس کے پتا کو تپ دق کا مریض قرار دے دیا تھا۔ آج پھر موہنی کی آنکھوں کے آگے اس کے بیمار پتا کی تصویر گھومنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد یہ تصویر دھندلی پڑنے لگی اور اس میں سے ایک نئی تصویر اُبھرنے لگی ___ یہ دوسری تصویر موہنی کی تھی ___ موہنی کو سمجھنے میں کچھ دیر نہ لگی کہ اس نے اپنے پتا کی چارپائی سنبھال لی ہے۔

دق۔ ٹی بی ___ موہنی کی چھاتی میں برچھیاں سی اُتر گئیں۔ وہ لرز اُٹھی۔ اس کا سارا بدن پسینہ سے شرابور ہو گیا۔ کیا اسے واقعی دق ہو گئی ہے؟ کیا اس کی زندگی میں واقعی گھن لگ گیا ہے؟ موت!

موت کا خیال آتے ہی موہنی کا سر چکرا گیا۔ موت کے خوف نے اس کی روح کو جکڑ لیا ___ لیکن دوسرے لمحے یہ خوف کافور ہو گیا۔ اس کی جگہ چنتا نے لے لی۔ میں مر جاؤں گی تو میرے بعد میرے بچوں کا کیا ہوگا؟ میری سویٹ کا اور میرے اِس مُنے کا جس کا میں

ابھی نام بھی نہ رکھ پائی ہوں؟اور گویا موہنی کے لئے زندگی اور موت کے تمام مسائل سمٹ کر اس مسئلہ میں سما گئے ——— میرے بچوں کا کیا ہو گا۔ میرے بچوں کا کیا ہو گا؟

اس کا تخیل تصویر پیش کرنے لگا ——— وہ موت کا شکار ہو گئی ہے ——— مر گئی ہے۔ اس کے بچے بھوک پیاس سے بلک رہے ہیں۔ کسی نے ان کے بالوں کو نہیں سنوارا۔ کسی نے ان کے کپڑے نہیں بدلے۔ کسی نے ان کے ماتھوں پر نظر سے بچنے کے ٹیکے نہیں لگائے۔ یکایک اس کا پتی ایک غیر عورت کو لے کر گھر میں آیا۔ وہ عورت بہت خوبصورت ہے۔ اُس نے اُس کے کپڑے اور زیور پہنے ہوئے ہیں۔ لیکن جونہی وہ اس کے بچوں کو دیکھتی ہے اس کی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں۔ چہرے کے خطوط بگڑ جاتے ہیں۔ آنکھوں سے شعلے نکلنے لگتے ہیں... اور پھر ——— پھر وہ بچوں سے دن بھر گھر کا کام کراتی ہے اور شام کو ان کی جھوٹی جھوٹی شکایتیں کر کے اپنے شوہر سے پٹواتی ہے اور رات کے تاریک سناٹے میں بچے اپنی ماں کو یاد کر کے روتے رہتے ہیں۔ بلکتے رہتے ہیں اور پھر تھک کر سو جاتے ہیں "کیا میرے بعد میرے بچوں کا یہ حال ہو گا؟ ——— موہنی پریشان ہو اٹھی۔ 'نہیں' نہیں میں جیوں گی۔ میں اپنے بچوں کی خاطر مرض سے لڑوں گی۔ مرض کو شکست دوں گی۔"

موہنی زندہ رہنا چاہتی تھی' اس نے سدا زندوں کی طرح رہنا چاہا تھا۔ اس نے غریب شیکھر سے اپنی ماں کی مرضی کے خلاف صرف اس لئے شادی کی تھی کہ شیکھر سے جدا رہ کر وہ جیتے جی مر جاتی۔ مردوں کی طرح جینا اسے پسند نہ تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ غریب ہوتے ہوئے بھی اس کے لئے اچھے گھرانوں کے رشتے آئے تھے۔ وہ اگر چاہتی تو کسی امیر گھرانے میں شادی کر کے زندگی عیش سے گزارتی۔ لیکن اس نے ہر قسم کے بوجھ اور لالچ کو تیاگ کر شیکھر سے پریم وِواہ کر لیا ——— شیکھر جو ۱۲۵ روپیہ ماہوار کا کلرک تھا۔

شادی کے بعد ایک سال اُنہوں نے بڑے سکھ اور شانتی میں بتایا تھا۔ جیون مسکراہٹوں اور قہقہوں کی لڑی بن گیا تھا۔ ان کی صبحیں روشن' شامیں سلونی اور راتیں کجراری تھیں۔ گھر میں فرنیچر نہ تھا' ٹرنک میں ریشمی کپڑوں کے ڈھیر نہ تھے۔ مخملی ڈبیروں میں زیور نہ تھے۔ سیر کے لئے کار اور تفریح کے لئے روپے نہ تھے۔ مگر محبت تھی۔ خوشی تھی۔ شانتی تھی۔ گھر میں دو پرانی تھے۔ جو تنخواہ ملتی اس میں گزر کر لیتے اور زندگی کی دوسری آسائشوں کی کمی کو اُن خوابوں سے پورا کرتے جو دونوں مل کر اس وقت دیکھا کرتے جب رات کا کاجل رچ جاتا۔ ستارے بڑے بڑے ہیروں کی طرح آسمان کی گہری نیلی مخمل پر جگ مگ کرنے لگتے اور چاند آسمان کی پیشانی پر جھومر کی طرح چمکنے لگتا۔ وہ خواب دیکھا کرتے ——— 'ہمارے بچہ ہو گا۔ ہم اُسے بڑے پیار سے پالیں گے' پڑھائیں گے' لکھائیں گے۔ وہ بڑا ہو کر ایک خوبصورت جوان نکلے گا اور ہم بوڑھے ہو کر آرام کی زندگی گزاریں گے' سچا سادہ معصوم خواب' زندگی سے اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے بچے کے لئے ایک درخشاں مستقبل کی آس۔ جس دن ان کو اپنے اس خواب کے پورا ہونے کی آس بندھی' وہ کس قدر خوش تھے۔ ان کی آنکھوں میں تارے ناچ رہے تھے اور ان کے کانوں میں اُن کے ہونے والے بچے کی کلکاریاں گونج رہی تھیں۔ انہوں نے بڑے شوق اور بے قراری سے اُس دن کا انتظار کرنا شروع کیا جب ان کا بچہ ان کی گود میں آئے گا۔

لیکن موہنی کو جوں جوں دن چڑھنے لگے' یہ شوق' یہ بے قراری مرجھاتی گئی۔ موہنی کی صحت گرنے لگی۔ وہ تھکی تھکی سی رہنے لگی۔ اس کے گالوں کا گلابی پن اور ہونٹوں کی سُرخی غائب ہونے لگی۔ ناچتی ہوئی پتلیوں پر تھکی ہوئی پلکیں پڑی رہنے لگیں۔ شیکھر اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے معائنہ کیا اور بتایا کہ جسم میں خون کی بہت کمی ہے۔ اسے وٹامن چاہئیں لیور ایکسٹریکٹ چاہئے۔ خوراک میں مکھن' گھی' دودھ' پھل زیادہ ملنے چاہئیں' اور پورا آرام دیا جائے۔ وہ دونوں وہاں سے لوٹ آئے لیکن اب ان کے درمیان ایک پیار اسندر بالک ہی نہ تھا' ان کے درمیان دوائیں پھل' دودھ' گھی اور ایک نوکر بھی تھا۔ موہنی سوچ رہی تھی کہ بناسپتی کی بجائے اسے اصلی گھی کھانا چاہئے۔ صحت اچھی ہونے پر ہی بچہ تندرست پیدا ہو سکے گا۔ مگر ان سب چیزوں کے لئے روپیہ چاہئے' روپیہ اور پہلی بار اس کی زندگی میں روپے کی اہمیت اُبھر کر سامنے آئی۔ پہلی بار اسے احساس ہوا کہ شیکھر کی تنخواہ بہت تھوڑی ہے۔ پہلی بار اسے خواہش پیدا ہوئی کہ شیکھر کے پاس بہت سی دولت ہو' اس کی تنخواہ زیادہ ہو ——— عیش کرنے کے لئے نہیں بلکہ ایک صحت مند زندگی گزارنے کے لئے۔

ایک محبت جسے بچہ کی ماں بننے کے لئے ایک جیو آتما کو جنم دینے کے [illegible]

لیکن شنکر ایک کلرک تھا۔ اس کی تنخواہ بندھی ہوئی تھی وہ بندھی ہوئی آمدنی میں ناچتی تھی اور ہاتنے کے بھورے پانی کے علاوہ کسی اور چیز کی آشا کرنا پاگل پن تھا۔ موہنی کا چہرہ مرجھا گیا۔

اب ہر لحہ اور ہر قدم پر موہنی کے سامنے تلخ حقیقت آکھڑی ہوتی۔ زندگی کے متعلق جو رومان انگیز تصور اس نے باندھے تھے وہ اب منہ چڑاتے ہوئے بھاگنے لگے۔ موہنی کو محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنے کو دھوکا دے رہی تھی۔ وہ ایک خیالی دنیا میں رہ رہی تھی۔ جن چیزوں کی ضرورت کو اس نے شنکر کی محبت میں فراموش کر دیا تھا وہ اب کانٹوں کی طرح اس کی زندگی کے راستے میں آن کھڑی ہوئی ہیں۔ اب موہنی کے دن شنکر کے دفتر سے آنے کی آس میں' اور راتیں چاند تاروں کے رومان کی تلاش میں گزرنے کی بجائے اُلجھنوں' تشنگیوں اور محرومیوں کے لحہ بہ لحہ گہرے ہوتے ہوئے احساس میں بیتنے لگیں۔ ہر لحہ ایک نئی محرومی کا احساس ہوتا ___ اور یہ احساس اس کے اور شنکر کے درمیان جھنجھلاہٹ کی ایک دیوار کھڑی کرنے لگا۔ لیکن یہ سب کچھ صرف ایسے لمحوں میں ہوتا جب موہنی تھکی ہوتی۔ اس کی طبیعت گری ہوتی۔ کوئی کام کرنے کو جی نہ کرتا اور کام کا اونچا پہاڑ اس کے سامنے ہوتا۔ موہنی کے لئے کچھ طاقت کی دوائیاں لانے اور دودھ وغیرہ منگانے کی وجہ سے تنخواہ ضرورت سے زیادہ ناکافی معلوم ہونے لگی ___ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوائیں پیتے وقت یا غذا کھاتے وقت موہنی کے ذہن میں حساب کی گردان سی ہوتی رہتی ___ یہ چار روپے کی وٹامن کی گولیاں ہیں۔ اور ایکسٹریکٹ کی گولیاں گیارہ روپے کی آتی ہیں اور دودھ کا بل اب کے تیس روپے آئے گا اور اسے محسوس ہوتا جیسے اگلے مہینے گھر کی گاڑی کسی صورت میں نہ چل سکے گی اور کھایا پیا اُسے کچھ نہ لگتا۔ تکان' کمزوری' پریشانی' جھنجھلاہٹ ___ اور جیسے موہنی کے مزاج میں ایک غیر معمولی تبدیلی آنے لگی ___ ہونٹ بھنچے رہتے اور ماتھے پر ایک شکن ہر وقت پڑی رہتی۔ مگر ایسے لمحے بھی آتے جب ایک لمحے کے لئے گھٹائیں چھٹ جاتیں اور چاند اپنی پوری آب و تاب سے نکل آتا۔ انہیں حالات میں موہنی نے ایک بچی کو جنم دیا۔

بچی بہت خوبصورت تھی۔ اس کا گورا گول مٹول معصوم چہرہ دیکھ کر دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی۔ وہ اُسے گود میں لے کر کھلاتے تو ان کے ماتھے سے پریشانی اور تردد کی لکیریں تھوڑی دیر کے لئے مٹ جاتیں۔ وہ غیر شعوری کشیدگی جو موہنی اور شنکر کے درمیان پچھلے چار پانچ مہینے میں پیدا ہو گئی تھی ایک حد تک دور ہو جاتی۔

اب ان کی زندگی میں پھر ایک ایسی چیز آگئی تھی جسے وہ مشترک طور پر پیار کر سکتے تھے۔ جس کے متعلق ہم آہنگی سے باتیں کر سکتے اور جس میں دونوں اپنے غموں کو بھلا سکتے تھے۔ ماحول کی کشیدگی کم ہو گئی تھی۔ مگر یہ سب کچھ جذبات کی سطح پر تھا۔ حقیقت کی سطح پر حالات زیادہ خراب ہو گئے تھے۔ بچی کے ہونے سے دس طرح کے خرچ بڑھ گئے تھے۔ آمدنی کسی طرح نہ بڑھی تھی۔ تنخواہ آتی اور پچھلے مہینے کا حساب چکاتے چکاتے ختم ہو جاتی اور پورے اکتیس دن کاٹنے کے لئے صرف پندرہ روپے ہاتھ میں رہ جاتے۔ وہ تمام خواہشیں اور وہ تمام منصوبے جو وہ اگلے مہینے پورا کرنے کی امید سے باندھتے خاک میں مل جاتے اور پھر تنگی اور کفایت شعاری اور من مارنے کا دور شروع ہو جاتا۔ اس تنگ حالی کے نشانات گھر میں بھی دکھائی دینے لگے۔ کالروں' پتلونوں' ساڑیوں اور پلنگ کی چادروں میں جوڑ اور پیوند نظر آنے لگے۔ جو گلاس یا پیالے ٹوٹ جاتے ان کی جگہ نئے نہ آپاتے۔ بچی کے کپڑے بنانے کی آرزو پرانی ساڑیوں کو پھاڑ کر اور ان میں سے ناپ کے [illegible] کر پوری کی جاتی۔ آنہ دو آنہ کے خرچ پر میاں بیوی میں کھینچا تانی ہوتی۔ سینما اور سیر کرنا یکسر بند ہو گئے۔ پیسے پیسے کا حساب [illegible] دونوں میں سے جس کا رشتہ دار یا مہمان آجاتا اس کی گویا شامت آجاتی ___ دونوں ایک دوسرے کو پھاڑ کھانے کو دوڑتے۔ [illegible] ان کے سبھاؤ میں رچ گیا ___ ہر وقت گھر میں یہی سنائی دیتا ___ 'کھانا ضائع نہ کرو' کپڑے نہ بنواؤ' کپڑے ہاتھ سے [illegible] کم خرچ کرو' غرض یہ کہ ذرا ذرا سی چیز پر روک ٹوک شروع ہو گئی۔ اب جب کبھی وہ ساتھ ساتھ بازار جاتے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرانے اور ایک دوسرے میں مگن رہنے کی بجائے ان کی آنکھوں میں دوسرے مرد عورتوں کے سوٹ' ساڑیاں' [illegible] پاؤں کے جوڑے کھٹکتے۔ زندگی کا سکون غائب ہو گیا۔ محرومی کا احساس ہر لحہ زیادہ شدید اور گہرا

ہونے لگا اور پیار کی وہ دنیا جس میں شادی کے بعد ایک سال تک وہ مسکراہٹ اور پیار کے دن گزارتے رہے تھے اب مکمل طور پر برباد ہو گئی تھی۔

شاید اس حد تک بھی موہنی زندگی کے مقابلے میں ڈٹی رہ سکتی تھی۔ لیکن زندگی نے اس کی صحت کو بھی کھانا شروع کر دیا تھا۔ وہ ہر وقت تھکی تھکی رہتی۔ اس کی کمر اور گھٹنوں میں جان نہ رہی۔ اٹھتے اٹھتے اس کی آنکھوں کے آگے سیاہی کے دائرے سے پھیلتے اور سمٹتے۔ اس کی جلد کی سفیدی میں سرخی کے بجائے ہلدی جیسی زردی جھلکنے لگی۔ رخسار جو کبھی مسکراہٹ کی وجہ سے سدا دمکتے رہتے تھے اب مرجھائے مرجھائے رہتے اور ہونٹ کنیر کی باسی کلیوں کی طرح بے رنگ ہو گئے۔

ششیکھر کو موہنی کی گرتی ہوئی صحت کا احساس تھا۔ وہ جب دیکھتا کہ بلاؤز جو کبھی موہنی کے انگ انگ کو اجاگر کر دیتے تھے 'اب ڈھیلے ڈھیلے لٹکتے رہتے ہیں اور چوڑیاں جو کبھی موہنی کی کلائیوں میں چندن کی ریکھاؤں کی طرح نظر آتی تھیں اب پونچوں میں پڑی رہتی ہیں تو اس کی چھاتی میں گھونسا سا لگتا۔ وہ اس کو آرام پہنچانے کا پورا خیال رکھتا۔ وہ اپنا پیٹ کاٹ کے اور من مار کے اس کے لئے کچھ نہ کچھ لاتا رہتا۔ مگر مہنگائی اسے مات پہ مات دے رہی تھی۔ تنگی کر کے وہ جتنا خرچ کم کرتا تھا اتنا ہی چیزوں کے مہنگا ہونے سے بڑھ جاتا تھا۔ اب وہ ہاتھ پاؤں سے بھی موہنی کی مدد کرتا اور اسے زیادہ سے آرام دیتا۔ کپڑے خود دھوتا بستر خود بچھاتا۔ دفتر سے آکر بچی کو کھلاتا اور جب کبھی موہنی کی کمر یا اس کے سر میں درد ہوتا تو اپنی تھکن بھول کر گھنٹوں اس کا سر دباتا ——— لیکن اس کے قدموں کے نیچے کی زمین سرکتی جا رہی تھی۔ گھر کی حالت سنبھلنے میں نہ آتی تھی اور موہنی کے جسم کی ہڈیاں نمایاں ہوتی چلی جا رہی تھیں۔

اسی طرح آرام اور خوشی کے لئے چھینا جھپٹی کرتے کرتے زندگی کے دو سال گزر گئے۔ اب ان کی حالت اس قدر تنگ ہو گئی تھی کہ کھانے میں تنگی کرنے کی نوبت آ گئی۔ گوشت کی بجائے اب ان کے ہاں دونوں وقت دال پکنے لگی۔ کوئی مہمان آ جاتا یا کچھ لینا دینا پڑ جاتا تو قرض سر پر سوار ہو جاتا ——— زندگی کی چکی میں پستے پستے ان کے جذبات بھی سرد پڑ گئے۔ اب کئی کئی دن تک وہ ایک دوسرے سے بات نہ کرتے۔ انہیں خیال بھی نہ ہوتا کہ انہوں نے کئی دنوں سے ایک دوسرے سے باتیں نہیں کی ہیں۔ موہنی اپنے حلقہ میں گھومتی رہتی' ششیکھر اپنے دائرہ میں گردش کرتا رہتا ——— رات کو دونوں اپنے اپنے جوئے سے مکتی پا کر نیم جان سے چارپائی پر پڑے رہتے۔ پیار کرنے کو چاؤ سے باتیں کرنے کو دیکھ کر مسکرانے کو' زندگی میں کچھ نہ رہا تھا۔ چاند ان کے لئے بجھ گیا تھا اور تارے ان کے لئے چیچک کے سوکھے ہوئے داغ بن گئے تھے۔ اب ان کے دل میں ایک دوسرے کے لئے کوئی جذبہ پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ چپ چاپ گھر میں چلتے پھرتے کام کرتے۔ پڑ کر سو جاتے۔ کبھی کبھار ایک آدھ لفظ منہ سے نکل جاتا' چونک کر نگاہیں مل جاتیں مگر راکھ کی چنگاری کی طرح صرف ایک لمحہ کے لئے ——— پھر وہی غیریت ——— بے حسی ——— مٹیالی مردنی۔

اسی غیریت' بے حسی' مٹیالی مردنی کے سائے میں موہنی دوبارہ حاملہ ہو گئی ——— زندگی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی گئی۔ موہنی کے جسم میں بچہ جوں جوں پرورش پانے لگا موہنی کے ہونٹوں کی خشکی' آنکھوں کا پھیکا پن اور رگوں کا نیلا پن زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ جسم نے اس دوسری جان کو سینچنے سے انکار کر دیا۔ موہنی نے کھاٹ پکڑ لی۔ بچہ ہونے سے پہلے ہی حرارت رہنے لگی۔ بچہ ہوا تو بخار نے آدبوچا۔ بخار جڑ پکڑ گیا اور موہنی کی زندگی کی جڑ کھوکھلی ہو گئی اور ایک دن ڈاکٹر نے کہہ ہی دیا "موہنی کو دق ہو گئی ہے۔"

موہنی کمرے میں پڑی تھی۔ ششیکھر اور اس کی بہن جو تیمارداری کے لئے آئی ہوئی تھیں' نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ کمرے ہی میں نہیں بلکہ سارے گھر میں سناٹا تھا۔ پاس ہی پالنے میں بچہ پڑا سو رہا تھا ——— 'میرا لال' میرا چاند ——— کیا میں اپنے چاند کو اپنی گود میں لے کر نہ کھلا سکوں گی؟ جس کو میں نے اپنے خون سے سینچا ہے' کیا اسے بے سہارا چھوڑ کر چلی جاؤں گی؟ نہیں نہیں! میں نہیں مروں گی۔ میں جیوں گی ——— میں نے اس دنیا میں ایک نئی زندگی کو جنم دیا ہے۔ کیا دنیا اس کے بدلے مجھے میری زندگی کا دان نہیں دے گی؟ مجھے میری زندگی کا دان دیا جا سکتا ہے۔ میرا علاج کر کے۔ مجھے اچھی غذا دے کر۔ ہوا اور روشنی دے کر۔ یہ میرا حق ہے۔ میرا حق مجھے ملنا چاہئے۔

——— میرا حق مجھے ملنا چاہئے! اس کی آتما پکار اٹھی۔

موم کی مریم

جیلانی بانو

آج بھی اندھیرے کمرے میں لیٹا میں خیالی ہیولوں سے کھیل رہا تھا۔

اور جب بھی اندھیرا چھا جاتا ہے تم نہ جانے کہاں سے نکل آتی ہو جیسے تم نے تاریکی کی کوکھ سے ہی جنم لیا ہو' اور مجبوراً مجھے جلے ہوئے سگریٹ کی راکھ کی طرح تمہیں بھی زمین پر جھٹک دینا پڑتا ہے۔

میں نے کبھی تمہارے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائے۔ کبھی تمہارے لئے نظمیں نہیں لکھیں۔ کبھی تمہاری یاد میں تارے نہیں گنے۔ پھر کیوں میں تمہیں یاد کئے جاؤں ____؟

زندگی میں تم سے اتنی دور رہا کہ کبھی اس رنگ و بو کے سیلاب میں غرق نہ ہو سکا جو تمہارے چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ ہمارے بیچ میں جھوٹی عقیدت اور مضحکہ خیز احترام کی خلیج حائل رہی۔ پھر آج تم اپنی آہوں اور سسکیوں سے کون سے مرے ہوئے جذبے جگانا چاہتی ہو ___؟

آج صبح عائشہ کے خط سے مجھے تمہاری موت کی خبر مل چکی ہے۔ مگر میں اس موت پر اظہارِ افسوس نہ کر سکا۔ روز نہ جانے بنا برسے کتنے بادل گذر جاتے ہیں۔ کتنے نغمے ساز کے اندر ہی دم توڑ دیتے ہیں' کتنے انسان ایک لمحہ کی خوشی ڈھونڈتے ڈھونڈتے مر جاتے ہیں۔ پھر تمہاری موت تو میرے سامنے کتنی ہی بار ہو چکی ہے' اگرچہ مادی طور پر تم چلتی پھرتی نظر آتی تھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے آج میرے کمرے میں آ بیٹھی ہو۔

جب سے میں نے عائشہ کا خط پڑھا ہے میرے خیالات کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈولتے پھرتے ہیں اور نہ جانے کیوں بہت سی دھندلی دھندلی یادیں جھلملانے لگی ہیں اور اس اندھیرے اُجالے میں بہت سے چہرے خلط ملط ہو گئے ہیں۔

مگر میں اس وقت تمہارے خیالی وجود سے باتیں نہیں کر رہا ہوں۔ کیونکہ تمہاری جانی پہچانی سسکیاں مجھے تمہاری موجودگی کا یقین دلا رہی ہیں' تو میں اسے واہمہ کیسے تصوّر کر سکتا ہوں ____؟

تمہارا اور اندھیرے کا ہمیشہ ساتھ رہا ہے۔ تم زندگی بھر جہاں جہاں بھی گئیں چراغ گل ہوتے گئے۔ تاریکی کے حلقے تمہیں اپنے گھیرے میں اسیر کئے رہے۔ جس طرح مریم کی تصویر کے گرد مصوّر نے نور کا ہالہ کھینچ دیا ہے۔ عصمت' تقدس اور معصومیت کی لکیریں' جن کے اندر پاک مریم کی رُوح کو محصور کر دیا گیا ہے۔

اس وقت بھی جب تمہارے مستقبل کی طرح کمرے میں تاریکی چھائی ہوئی ہے۔ تمہارے آنسو یوں چمک رہے ہیں جیسے پر امید بحرین نے دریا کی سطح پر چراغوں کی قطار چھوڑ دی ہو۔ میرے کمرے میں تمہارے آنسوؤں نے اُجالے کی امید قائم رکھی ہے ____ ہم

مشرق کے مرد صدیوں سے اپنی عیش گاہوں میں تمہارے اشکوں سے جشنِ چراغاں مناتے آئے ہیں ___

تمہارے متعلق لوگوں نے کہانیاں مشہور کر رکھی ہیں وہ بالکل سطحی تھیں اور اسی لئے میں نے حقیقت کی سطح پر اتر کر تمہیں سمجھنا چاہا تھا۔ تم کیا تھیں! اماوس کی رات کو ٹوٹنے والا ایک ستارہ جو اپنی آخری جھلک سے بہت سے دلوں میں امید کی کرن چمکا کر غائب ہو جائے ___ ایک تند لہر جو اپنے زعم میں ساحل کے پرخچے اڑا دینے کے ساتھ خود بھی مٹ گئی ہو۔

آج جب تم اپنے گواہوں کی لمبی فہرست سمیت خود ہی میرے کمرے میں آگئی ہو تو مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ تم ایک عام سی لڑکی ہونے کے باوجود دوسروں سے اس قدر مختلف تھیں۔ تم ایک مسحور کرنے والا جادو بن گئی تھیں جو کتنے ہی خریداروں کو کھینچ لایا۔ مگر سونگھا ہوا پھول سمجھ کر سب واپس چلے گئے۔

دوکاندار کے نزدیک وہ چیز کتنی حقیر ہو جاتی ہے جسے گاہک الٹ پلٹ کر پھر دکان پر رکھ جائے ___ شیشے کے کیس میں بند رہنے والی گڑیا ___ آج تم اتنی صاف صاف باتیں سُن کر حیران ہو رہی ہو۔ جبکہ تم نے اپنے آس پاس کے شیش محل چکنا چور کر ڈالے تھے اور سماج کی کھینچی ہوئی لکیروں پر چلنے سے انکار کر دیا تھا۔ ایک بار تم سب لڑکیوں کو آنگن میں دھاچوکڑی مچاتے دیکھ کر امی نے کہا تھا۔

"اونہہ مت روکو نگوڑی ماریوں کو ___ کنواری لڑکیاں برساتی چڑیاں ہوتی ہیں۔ کون جانے کل کس کا ڈولا دروازے پر کھڑا ہو گا۔" اس وقت اخبار پڑھتے پڑھتے میں نے تمہاری زندگی کا پورا فلم دیکھ ڈالا تھا۔

جب تم کسی ناصر یا شاہد کلرک سے بیاہی جاؤ گی اور آنسو پونچھتے ڈولے میں سوار کرائی جاؤ گی۔ پھر ہر سال ایک ننھے منے کی پیدائش میں اضافہ ہوتا رہے گا اور ساتویں یا آٹھویں ننھے کی پیدائش پر تپ دق کا شکار ہو کر مر جاؤ گی۔ ہر لڑکی انہی لکیروں پر دوڑتی آئی ہے۔ مگر تم نے اپنی انفرادیت سے ایک دوسرا راستہ ڈھونڈھنا چاہا جس کی سزا میں موت و زندگی تم پر حرام ہو گئی۔

تم مجھلے چچا کی دسویں یا گیارھویں اولاد تھیں ___ پھر نامراد لڑکی ___ "اونہہ لڑکی ہے تو کیا ہوا ___ نصیب اچھے ہوں ___ لڑکے کون سا فیض پہنچاتے ہیں ___ ماں باپ کی موت پر آنسو بہانے والی تو بیٹی ہوتی ہے۔"

اور اپنی موت کی نوحہ گر کے پیدا ہوتے ہی کسی نے تمہیں خوش آمدید نہ کہا۔

اپنے اردگرد کے ماحول نے تمہیں زیادہ حساس بنا دیا۔ حقارت کی نظروں نے خودی کا احساس پیدا کیا اور تم نے کچھ کرنے اور کچھ پانے کی قسم کھالی۔ تمہارے متعلق بدنامیاں اور سرگوشیاں بڑھتی گئیں۔ جاہل 'بددماغ' بدصورت اور مغرور ___ دن بھر تمہیں ان ہی خطابوں سے یاد کیا جاتا۔ مگر تم ایک ننھی سی چڑیا کی طرح اترا اترا کر کہتی رہیں ___ جو میرے پاس ہے وہ رانی کے محل میں بھی نہیں۔

اسی انانیت پسندی سے تم ایک ایسا شعر بن گئی جس کے غالب کے شارحین کی طرح ہر ایک نے الگ معنی نکالنا چاہے' مگر پھر بھی بہت کم حقیقت کی تہ تک پہنچ سکے۔

اور میں نے بہت دور ہو کر بھی تمہیں سمجھنا چاہا۔ یہ سچ ہے کہ میں نے دوسرے مردوں کی طرح تمہاری دوشیزگی کی جانب ہاتھ نہیں بڑھایا۔ کبھی اس قدر نزدیک نہیں آیا کہ تمہارے تنفس کی رفتار سے کوئی راز پا سکوں۔ پھر بھی میں نے اس شعر پر کافی ریسرچ کی' دماغ کی [illegible] ڑی میں دو سال تک تجربے کئے مگر کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔

[illegible] اپنی جانب جھکتے دیکھ کر تم نے کہا تھا:

[illegible] آپ کی بہت عزت کرتی ہوں' اور یہ نہیں چاہتی کہ کوئلوں کی دلالی میں آپ بھی اپنے ہاتھ کالے کر بیٹھیں ___ [illegible] قرینہ ہے کہ تم نے بہت سوں کو کوئلوں کی دلالی سے بچانے کی خاطر اپنے منہ پر کالک مل لی تھی تاکہ ان کے سفید دامن سیاہی [illegible] ___ تم میری بہت عزت کرتی تھیں ___ ایک نوجوان مرد کی ___ جو تمہارے ذرا سے سہارے پر آگے بڑھنا چاہتا تھا ___ [illegible] اٹھارہ سال کی زندگی میں مسلسل فریب دیئے تھے' جس نے تمہیں منزل کے قریب لا کر بھٹکا

[illegible] تکمیل کر [illegible] [illegible]
[illegible] تو خیر ہوئی کہ تم [illegible] بھی [illegible] گیا کہ [illegible]
[illegible] گئے ورنہ ممکن تھا ایک دن میری خود [illegible] کی [illegible]
[illegible] پر چھوڑ کر کہتیں:

"میں نے تمہیں پانے کے لئے بہت سی ٹھوکریں کھائیں مگر تمہارے [illegible] پہلا [illegible] پر [illegible] گئی کہ جب تم وہاں پہنچ [illegible] تھی۔"

[illegible] تم نے یہ الفاظ [illegible] سے خود نہیں کہے مگر آج تک تم نے کون کون سی باتیں زبان سے کی ہیں تم تو اس گونگی کی طرح ہو جسے اپنا مفہوم ہمیشہ عملی طور پر سمجھانا پڑتا ہے۔

صرف اٹھارہ سال کی زندگی میں تم نے اتنی ساری باتیں کیسے کہہ لیں۔

بظاہر تم کتنی معمولی تھیں ــــــ چھوٹے چھوٹے کاندھوں تک لہراتے ہوئے بال جن کی باریک باریک آوارہ لٹیں چہرے کے گرد ہالہ سا بنائے کانپتی رہتیں۔ معمولی سا قد ــــــ دُبلا پتلا دھان پان جسم جیسے تیز ہوا کے جھونکے بھی تمہیں اڑا کر لے جائیں گے' جیسے تمہاری جانب ہاتھ بھی بڑھایا تو چھوئی موئی کی طرح کملا جاؤ گی ــــــ ایک واہمی سی ــــــ ایک ادھورا خاکہ ــــــ کتنے ہلکے ہلکے تھے تمہارے خدوخال پتلے خمیدہ لب جو ہمیشہ سرد مہری سے بند رہتے' ہر چیز کو تجسس سے دیکھنے والی ہمدرد آنکھیں جو اپنے سارے گناہ آشکار کرنے کو تیار نہیں اور اسی خیال سے بات کرتے وقت بار بار بند ہو جاتیں' تاکہ ان کی گہرائیوں کا کوئی پتہ نہ لگا سکے اور ہر لمحہ بدلنے والا رنگ' جو کبھی شعلے کی طرح دہکنے لگتا' کبھی راکھ کی طرح میلا پڑ جاتا۔

اور جب باتیں کرتیں تو تمہارے خدوخال میں کوئی تبدیلی نہ آتی۔ کتنی مشکل بات تھی تمہارے چہرے سے کسی بات کا اندازہ لگانا۔

اس معمولی سی شکل و صورت ہی نے تمہیں گھر میں ایک ناقابلِ التفات چیز بنادیا تھا۔ اپنی خوبصورت سعادت مند بہنوں کے مقابلے میں تمہاری کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ خرید و فروخت کے اس بازار میں صرف اچھی صورت والی لڑکی ہی فائدہ اٹھاتی ہے ــــــ اور یہ خیال چچا اور چچی کے لئے سوہانِ رُوح تھا۔

مجھے آج سے تین سال پہلے والی جاڑوں کی ایک صبح یاد آ رہی ہے۔

تم اس وقت نہا کر آئی تھیں۔ نسرین اور عائشہ کے ساتھ صحن میں بیٹھی' سوئیٹر کا ایک نمونہ بنا بنا کر اُدھیڑ رہی تھیں۔ نومبر کی لطیف دھوپ آنگن میں بکھری ہوئی تھی۔ چچی نیچے بیٹھی نئے لحافوں میں دھاگے پرو رہی تھیں۔ اس وقت تمہارے گلابی دوپٹے' بھیگے بال اور نکھرے ہوئے رنگ کو دیکھ کر بھی مجھے کوئی شعر یاد نہیں آیا۔ کوئی تشبیہہ دماغ میں نہیں اُبھری۔ عائشہ' نسرین اور فرزانہ کے فروزاں حسن نے وہاں تمہارے چراغ کو ٹمٹمانے نہیں دیا ــــــ کتنی کمتر تھیں اپنی مغرور اور اپنے حسن پر خود ہی مر مٹنے والی بہنوں کے حلقے میں ــــــ اس وقت میں نے سوچا تھا کہ حسن کے اس جمگھٹ میں تمہاری کہانی کتنی مختصر اور پھیکی ہو گی۔

ان [illegible] مسلسل بیکاری نے مجھے نئی نئی راہوں سے واقف کر دیا تھا اور گھر سے بہت دور ایک ہڑتال کے سلسلے میں گرفتار ہوا تھا تو عائشہ کا خط پڑھ کر پہلی بار تمہاری جانب متوجہ ہوا تھا ــــــ تم لڑکیوں کو خط لکھنے کو بھی تو کوئی بات نہیں ملتی۔ عائشہ کے خط بھی اسی کی طرح خوبصورت اور معصوم ہوتے' جن میں وہ ابا کی ناراضگی سے لے کر خاندان کی اہم تقریبوں میں آنے والی عورتوں کے کپڑے' زیوروں کے ڈیزائن اور اسکول کی سہیلیوں کے رومان تک ــــــ سب کا تفصیل کے ساتھ ذکر کرتی۔ ساتھ ہی وہ مجھے بھی ایسا ہی مزے دار لمبا خط لکھنے کی ہدایت کرتی ــــــ میری بے وقوف بہن نہیں جانتی تھی کہ میں رومانوں' سرگوشیوں اور رنگینیوں کی دنیا سے کتنی دور تھا

مگر وہ میری مسلسل خاموشی کے باوجود ایک ہنگامہ پرور گھر کے کمرے میں بیٹھی بار بار منہ پر جھٹ سے ... رہی ... "آپ نے ایک اور خبر سنی بھائی جان؟ قدسیہ کے یہاں چھوٹی خالہ احمد بھائی کا پیغام لے کر گئیں تو ... کہہ دیا کہ وہ احمد سے شادی نہیں کرے گی۔

سنا ہے چچا ابا زہر کھانے والے ہیں اور سارے خاندان میں تھو تھو ہو رہی ہے۔"

اس دن بہت دنوں کے بعد میں جیل کی تنہا کوٹھڑی میں مسکرا سکا۔ اس دلیرانہ جرات پر میں نے غائبانہ طور پر تمہاری ... ٹھونکی تھی اور محسوس کیا تھا کہ جس خول میں ہم اپنے آپ کو لپیٹے ہوئے ہیں وہ جگہ جگہ سے ٹوٹ رہا ہے۔ جی چاہا کہ فوراً چچا ابا کو زہر کی ایک شیشی بھیج دوں تاکہ وہ صرف ارادہ کر کے ہی نہ رہ جائیں۔ تم پھر ایک بار میرے سامنے آئی تھیں۔ جھنجھلا کر ... ہوئی۔

پھر میں اس واقعے کو بھول گیا۔ عائشہ اپنے خطوں میں لکھتی رہتی کہ تمہارا اور ریاض کا رومان چل رہا ہے ____ اپنی صفائی میں کچھ کہنے کی کوشش مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کہ تم نے محبت کو کامیاب بنانے کی کتنی کوشش کی۔ لیکن ریاض تمہارے ہاں کا نمک خوار تھا ۔ تمہارے دستر خوان کے جھوٹے ٹکڑوں پر پلا تھا۔ پھر چچا ابا کو اس کی سُن گن ملی تو ریاض گھر ہی سے نہیں شہر ہی سے نکال دیا گیا اور تم نے بڑے تحمل سے محبت کی اس لاش کو دل کے قبرستان میں دفن کر دینا چاہا ____ لیکن شاید ایسا نہ ہو سکا۔ کیونکہ مردار کھانے والے گدھ جو ایسے موقعوں کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں' اس لاش کو باہر کھینچ لائے' جی بھر کے اس سے لطف اٹھایا اور پھر اسے چیر پھاڑ کے پھینک دیا۔ تمہاری بیماری کو بڑے خوفناک معنی پہنائے گئے۔ یعنی یہ سب ریاض کی امانت کو ٹھکانے لگانے کے بہانے ہیں اور تم اپنے کمرے ہی میں نہیں پڑی رہتیں بلکہ ریاض کے ساتھ فرار ہو چکی ہو۔

یہ باتیں میں نے بہت دور بیٹھ کر سنیں اور ہر بات کو یقین کے خانے میں ڈالتا گیا۔ یہ کوئی ناقابلِ یقین بات بھی نہ تھی۔ بقول عائشہ کے تم اپنی اہمیت کا احساس دلانے کا فیصلہ کر چکی تھیں اور تم نے ساری دنیا کو ٹھکرا کے اپنی من مانی کرنے کا عزم کر لیا تھا ____ پھر تم جیسی محبت کی ماری لڑکیاں اس سے زیادہ اپنی اہمیت کا کیا ثبوت دے سکتی ہیں ____ ؟

اس کے بعد جب میں رہا ہو کر گھر آیا تو تم وقت کا ایک اہم موضوع بن چکی تھی عائشہ کے الفاظ میں کچھ کر دکھانے کی دُھن میں اپنا رہا سہا وقار بھی کھو بیٹھی تھیں۔

اس دوران میں تم اپنے ماسٹر سے بھی محبت کر چکی تھیں جو تمہیں پڑھانے آتا تھا۔ ایک سیدھا سادھا' خطرناک حد تک شریف انسان' جو اپنی مظلومی اور بے چارگی ظاہر کر کے دوسروں سے رحم کی بھیک مانگتا تھا۔

پہلے اس نے تمہیں شرافت اور عزت کے سبق پڑھائے۔ اپنی بے چارگی اور دُکھ کے افسانے سنائے' اس کی محبوبہ نے اسے دھوکا دیا تھا۔ محض غربت کی وجہ سے ٹھکرا دیا تھا (یہ محبوباؤں کے دھوکا دینے کا دکھڑا بھی کتنا فرسودہ ہو چکا ہے؟) پھر اس کی پیاسی دنیا میں ... ہمدردی کے چند قطرے برسانا چاہے۔ اپنے طرزِ عمل سے اس کا دُکھ کم کرنا چاہا' اپنے غم کی کہانی بھی اسے سُنا ڈالی ____ پھر کورس کی کتابوں کو ایک جانب سمیٹ کر تسلی اور تسکین کے سبق پڑھائے جانے لگے۔

پھر ... بیمار ہو گیا اور چچا ابا نے دوسرا ماسٹر رکھنا چاہا تو تم نے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ تم اسی ماسٹر سے پڑھنا چاہتی تھیں اور اس کی ... کے گھر جانے پر مصر تھیں۔

یہ ساری ... ہم تک نے مجھے سنائیں۔ میں کیسے یقین کر لوں کہ تمہیں اس ماسٹر سے محبت نہیں تھی' صرف ہمدردی تھی۔ یہ ... تمہیں ایک رات چپکے سے اٹھا کر ماسٹر کے گھر لے گیا اور جب تم ابھی دروازہ ہی کھٹکھٹا رہی تھیں کہ چچا ابا کے ... گئیں۔

پھر [illegible] گھر والے تمہارے سامنے سے اچھوتوں کی طرح [illegible] کر کی [illegible] ایک سال عورتوں نے خاندان میں [illegible] [illegible] دیکھتے پہلے شش سال اور بعد [illegible] تم [illegible] پر [illegible] گئیں اور [illegible] آگئیں [illegible] کر تم نے اپنی [illegible] سے کہا کہ [illegible] جو میرا جی چاہے گا کروں گی [illegible] آپ لوگ [illegible] ڈال لیجئے۔ پھر سب نے دوسری بات سے [illegible] کر لیا یعنی تم پہ ڈالی گئی تھیں ___ سب نے تم پر فاتحہ پڑھ لی لیکن شمیم ماموں اس [illegible] میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ دوسرا زخم بھی بھرنے لگا تھا پھر شمیم ماموں کی ناز برداریوں نے اسے مندمل [illegible] ___ وہ تم پر بہت مہربان تھے۔ عائشہ کہتی تھی:

"شمیم ماموں کی عذرا تو قدسیہ کی کلاس فیلو ہے۔ جیسی ان کی لڑکی ویسی قدسیہ پھر کیسے ایک لڑکی کو گھل گھل کر مر جانے دیں۔" شمیم ماموں مدتوں سے اپنی بیوی بچوں سے قطع تعلق کر کے اکیلی زندگی گزار رہے تھے۔ صرف اتنی سی بات پر کہ ان کی بیوی کبھی اچھی ساڑھی نہ باندھ سکیں۔ ایک بار مجھے عائشہ نے لکھا تھا کہ تم بہترین ساڑھی باندھنے پر اسکول سے انعام لے چکی ہو۔ وہ اپنے بچوں کو چھوڑ کر تمہیں سیر کرانے لے جاتے۔ تمہارے صدقے میں سارا گھر سینما دیکھتا پکنک پر جاتا۔ تم کوئی اعلیٰ ڈگری لینا چاہتی تھیں اور چچا ابا تمہیں تنہا ہوسٹل میں چھوڑنے پر تیار نہ تھے اس لئے بچارے شمیم ماموں اپنی وکالت کے بے شمار اہم کام چھوڑ کے بارہ بارہ بجے رات تک فارسی اور اردو شاعروں کا کلام پڑھاتے اور عشق و تصوف میں ڈوبے ہوئے اشعار کا مطلب تم سے پوچھتے۔

سب کے ٹھکرائے جانے سے پہلے تم خود ہی کسی سے بات کرنا پسند نہ کرتی تھیں۔ دن بھر پلنگ پر اوندھی پڑی نہ جانے کیا سوچا کرتیں۔ کوئی بات نہ کرتا تو شکایت نہ کرتیں۔ شمیم ماموں سر پر ہاتھ پھیرتے تو منع نہ کرتیں۔ ہاتھ پکڑ کے موٹر میں بٹھا دیتے تو بیٹھ جاتیں۔ ممکن ہے تم سے ان کی ویران زندگی دیکھی نہ گئی ہو اور انسانیت کے تقاضے نے مجبور کر دیا ہو۔ مگر تمہاری روش کتنی تعجب خیز تھی۔ ممانی کو اپنا مستقبل خطرے میں نظر آنے لگا اور سب کی سوالیہ نگاہیں پھر تمہارے چہرے پر گڑ گئیں ___ ایک رات جب شمیم ماموں تمہیں پڑھا رہے تھے۔ کمرے میں کچھ شور سا ہوا۔ پھر تم بغیر دوپٹے کے بھاگتی ہوئی کمرے میں آئیں اور پلنگ پر گر کے رونے لگیں۔

پیچھے پیچھے گھر کے سب لوگوں کی لمبی قطار تھی۔ میں بڑی دلچسپی سے یہ تماشہ دیکھنے لگا۔

چچی نے تمہارے کمزور جسم پر اپنی دانست میں بڑے زوردار دھماکے رسید کئے اور بہت سی مرغیاں کڑکڑانے لگیں۔ جواب میں سسکیاں روک کے تم نے بڑی مشکل سے کہا:

"میں جدھر بھی جاؤں سب مجھی کو برا کہتے ہیں۔ مجھے کیا معلوم تھا وہ اتنا کمینہ۔"

اور مجھے ہنسی آگئی ___ کوئی مرد ماموں نہیں ہوتا، ماسٹر نہیں ہوتا، شریف نہیں ہوتا، صرف کمینہ ہوتا ہے جو عورت سے سب کچھ لینے کے بعد بھی اسے جھلملاتے آنسوؤں کے علاوہ کچھ نہیں دے سکتا۔

شمیم ماموں نے سوچا ہوگا کہ اگر ریاض یا ماسٹر تمہیں کوئی امانت نہ دے سکا تو وہ کیوں نہ اس بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لیں۔ جبکہ وہ کسی واسطے رشتے سے تمہارے فرضی ماموں بھی بنے ہوئے تھے۔

پھر تو ان کی بیوی نے شہر بھر میں یہ خبر عام کر دی کہ تم چاہو تو بیوی بچوں والے بوڑھے مردوں کو بھی بھٹکا سکتی ہو۔ پھر کسی میوزیم میں رکھی ہوئی لاکھوں سال پرانی ممی کی طرح تم ایک نمائش کی چیز بن گئیں۔ لمبی لمبی چھتوں کو پھلانگتی ہوئی یہ بات سارے شہر کا گشت لگا کر تمہارے ماتھے پر چپک گئی۔ عورتیں اور لڑکیاں دور دور سے بچے کولھوں پر لٹکائے، ناک پر انگلیاں رکھے تمہیں دیکھنے آتیں، مردوں کی محفلوں میں بلا [illegible] کے درمیان تمہارا نام آجاتا تو خود بھی اس لٹنے والے باغ میں جانے کو طبیعت مچل اٹھتی۔

اطہر اسی سال [illegible]

میرا چھوٹا بھائی جو اپنی آوارگی کے سبب حوالات تک ہو آیا تھا کالج سے نکال دیا گیا تھا اور [illegible] کوئی اپنی بیٹی نہ دے گا۔ متوسط طبقے کا ایک بیکار نوجوان جس سے سب لوگ مایوس ہو گئے تھے۔

باہر کی تفریحوں کے علاوہ اور بھی کئی لڑکیوں کو جھانسا دے چکا تھا بلکہ راحت کے متعلق تو مشہور ہے کہ صرف اطہر کی وجہ سے اس کے شوہر نے اسے چھوڑ دیا ہے اور وہ میکے میں دن گزار رہی ہے۔

مگر اتنے سیاہ کارناموں کے باوجود وہ تمہاری جانب سے مایوس نہ لوٹا۔

ساری دنیا سے دھتکارا ہوا بے رحم، منہ پھٹ، چیخ چیخ کر باتیں کرنے والا اطہر، جسے ابا روز گھر سے نکال دینے کی دھمکی دیتے، اماں کوستے، بہنیں اور عائشہ اپنی قسمت پر صبر کر کے بیٹھ جاتی ___ اگر بہنوں کے بھائی قابلِ فخر نہ ہوں تو وہ کتنی بدنصیب نظر آتی ہیں، خوبصورت کماؤ بھائیوں کے بھروسے پر ہی تو وہ کتنی ہی ناکوں کو اپنے سامنے رگڑوا سکتی ہیں اور عائشہ کی ساری توجہ مجھ پر مرکوز ہو گئی تھی۔ لڑکیوں کے لئے میری خشک اور بے ربط زندگی میں بھی کوئی کشش نہ تھی۔ مگر پھر بھی میری شخصیت کو گھر میں کافی اہمیت دی جاتی تھی۔

تمہاری بارگاہ میں اطہر کو کیسے شرفِ نیاز بخشا گیا۔ یہ بات سب کے لئے حیران کن تھی۔ وہ تو صرف اپنے خوبصورت جسم اور بے باک لہجے سے معرکے سر کرتا تھا اور تم نے ہمیشہ بجھے ہوئے دل اور بیمار ذہن تلاش کئے تھے۔

یہاں پر مجھے اپنی پچھلی ریسرچ بیکار معلوم ہوئی اور اسے اٹھا کر پھینکنے سے پہلے میں نے تم سے راہ و رسم بڑھانا چاہی مجھے گھر میں رہنے کا اتفاق بہت کم ہوتا۔ خصوصاً تم سے تو کبھی بے تکلفی سے بات بھی نہ کر سکا تھا۔ اس لئے ایک گھر میں رہنے کے باوجود ہم بہت دور رہتے۔ تم ہمیشہ مجھ سے چھپنا چاہتیں۔ کیونکہ پہلے دن ہماری ملاقات نے بڑی تلخ فضا پیدا کر دی تھی۔ اس دن ہماری ملاقات ناشتے کی میز پر ہوئی تھی۔ تم شاید میری سنجیدگی کی بابت عائشہ سے پہلے ہی سُن چکی تھیں اور مجھ تک اپنے کارنامے پہنچانے سے گریز کر رہی تھیں۔ احتیاط سے سر پر پلو ڈالے نظریں جھکائے یوں بیٹھی تھیں جیسے کسی پادری کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے آئی ہو۔ عائشہ نے میری جانب بڑی بامعنی نظروں سے دیکھ کر کہا تھا:

"بھائی جان! دیکھئے یہ ہیں قدسیہ" ___ عائشہ کی طنزیہ نظروں کو تم نے بیچ میں سے ہی پکڑ لیا اور ہونٹوں پر زبان پھیر کر شکستہ لہجے میں کہا ___ "تو احمد بھائی بھی مجھے پہلے سے جانتے ہیں؟"

اور تم چائے کی پیالی رکھ کر اٹھ گئی تھیں۔

پھر برسات کی ایک شام کو ہلکی ہلکی رم جھم نے موسم بڑا پر کیف بنا دیا تھا۔ بہت دیر تک فیض کی "نقشِ فریادی" پڑھنے کے بعد میں حسبِ عادت سگریٹ کے دھوئیں سے خیالی ہیولے بنا رہا تھا۔

عائشہ، پروین، چھوٹی بھابی اور فرزانہ قریب بیٹھی کیرم کھیل رہی تھیں اور کسی فلم پر زوردار بحث کر رہی تھیں جس میں ایک ہیرو دو لڑکیوں سے محبت کرتا ہے اور ڈائریکٹر ہر بار اس محبت کو سچی محبت بنانے پر مصر ہے۔ عائشہ کے خیال میں یہ محبت کی توہین تھی یا ہیرو کی بوالہوسی۔

تم [illegible] کے قریب والی کرسی پر بیٹھی سیاہ ساٹن کے ایک ٹکڑے پر ننھے ننھے آئینے ٹانک رہی تھیں جن کی بہت سی شعاعوں نے مل کر تمہارے [illegible] مشعلیں سی جلا دیں تھیں۔

اپنی [illegible] وزنی بنانے کے لئے عائشہ نے مجھ سے پوچھا:

"آپ [illegible] جان! کیا محبت ایک بار سے زیادہ کی جا سکتی ہے؟"

اور میں نے [illegible] کہہ دیا۔ "قدسیہ سے پوچھو۔"

تمہارے ہاتھ کام کرتے کرتے رک گئے۔ چہرے پر اداسی پھیل گئی اور تم گہری شکایت آمیز نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ بھابی اور پروین آہستہ آہستہ چپکے چپکے [illegible] کو گنگنانے لگی اور مالک نے دو طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر میں نے اس خوبصورت شام کا زرتار لباس نوچ کر پھینک دیا۔ رم جھم کا شور مچانے والی بوندیں آنسوؤں کے دھارے بن گئیں۔ فیض کے دلنشیں شعر ہاتھ ملا کر مجھ سے رخصت ہو گئے اور کمرے میں اندھیرا بڑھنے لگا۔

"آج موسم کتنا خوشگوار ہو رہا ہے!"

"ہوں ہوں!"

"جی چاہ رہا ہے کہیں باہر گھومنے جاؤں۔"

"تو جائیے۔" تم حسبِ عادت مختصر جواب دے رہی تھیں۔

"مگر کوئی ساتھ چلنے والا جو نہیں۔ اطہر نے وعدہ کیا تھا مگر نہیں آیا۔ کتنا غیر ذمہ دار اور جھوٹا ہو گیا ہے یہ لڑکا ——"

جان بوجھ کر اطہر کی برائی کر کے میں نے تمہارے چہرے پر کچھ ڈھونڈا۔ تمہاری آنکھیں سامنے کھلی ہوئی کتاب پر تھیں اور ہاتھ نیبل کلاتھ کی شکنیں درست کرنے میں مصروف۔ پھر بڑے طنز سے تم نے کہا:

"اتنے سہانے موسم میں تو وہ کسی بار میں بے ہوش پڑے ہوں گے۔ آپ لوگ تو انہیں اچھی طرح جانتے ہیں نا" ——

یہ تم کہہ رہی تھیں۔ تم، جس کے متعلق مشہور تھا کہ سارے خاندان کی عزت جوتے کی نوک پر اچھال کر تم اطہر سے شادی کرو گی۔ سب سے چھپا کر اسے روپے دیتی ہو۔ وہ شراب پی کر آتا ہے تو اس کی پردہ پوشی کرتی ہو۔ اتنے بُرے انسان پر تمہاری یہ عنایتیں کیوں تھیں جبکہ پچھلی زندگی میں کئی قابلِ اعتبار مرد تمہیں دھوکا دے چکے تھے۔

تمہارے متعلق پھیلی ہوئی بدنامیوں کے درمیان مجھے اپنی اچھی رائے بڑی مضحکہ خیز لگی۔ اسے میں نے اپنے دماغ سے کھرچ دیا۔ تم سب کے لئے ناقابلِ فہم بن گئی تھیں۔ بھول بھلیوں کے پیچیدہ راستوں کی طرح تم نے اپنے مکر و فریب کے جو جال بچھا رکھے تھے انہیں دیکھ کر مجھے تم سے نفرت ہو گئی۔ پھر ایک دن بڑی سوچ بچار کے بعد میں کچھ حواس باختہ سا تمہارے کمرے میں آیا۔

"میں تمہارے متعلق کچھ جاننا چاہتا ہوں قدسیہ 'اگر تم مجھے اجازت دو تو —— تو" —— اپنی گھبراہٹ پر میں خود متعجب تھا۔ اس دن تمہارے چہرے پر میں نے پہلی بار ڈر کی پرچھائیاں دیکھیں جن پر حیرانی غالب تھی۔ تم یوں کھڑی ہو گئیں جیسے شمیم ماموں تم پر جھپٹنا چاہتے ہیں۔ تم نے دوپٹے کو سینے پر سنبھال کے کہا:

"آپ بھی مجھے جاننا چاہتے ہیں احمد بھائی! میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔ پھر آپ کیوں کوئلوں کی دلالی میں اپنے ہاتھ کالے کرنا چاہتے ہیں۔" اور تم پیچھے دیکھے بغیر باہر بھاگ گئی تھیں۔

ان ہی دنوں اتفاق سے مجھے تمہارا ایک خط ہاتھ لگا جو تم نے ریاض کو لکھا تھا مگر اسے بھیج نہ سکی تھیں 'یا شاید اسے بھیجنے کو لکھا ہی نہ ہو۔ کیونکہ یہ صرف تمہاری روح کی پکار تھی جس کو ریاض جیسا بے وقوف انسان کبھی نہ سمجھ سکتا۔ اس کی محبت میں تمہاری برتری اور پرستش کا جذبہ غالب تھا اور تم اسے روح کی بلندی کبھی نہ دے سکتی تھیں۔ بارش بہت زور کی ہو رہی تھی اور دریچوں سے نیچے گرنے والے قطروں کو بچے ہاتھوں میں روک کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ اتنے میں بھائی کا چھوٹا بچہ راشد ناؤ بنوانے کو ایک کاغذ لے آیا۔ یہ نیلے کاغذ پر لکھا ہوا ایک لمبا چوڑا خط تھا۔ نیچے تمہارے بہت ہی بگڑے ہوئے دستخط۔ وہ خط راشد تمہاری اٹیچی سے نکال کر لایا تھا۔ اپنی شرافت کا ثبوت دینے کے لیے میں نے اسے واپس رکھوانا چاہا مگر ایک بار پڑھنے سے باز نہ رہ سکا۔

میری جانب ملامت آمیز نظروں سے نہ دیکھو۔ ان دنوں میں تم پر ریسرچ کر رہا تھا۔ بیسویں صدی کا ایک نکما انٹلکچوئیل —— تمہارا یہ [illegible] باتوں کو سامنے لے آیا اور میری رائے پھر ڈگمگانے لگی۔

اس خط میں ریاض کو لکھا تھا کہ بچپن سے تم نے ہر دل میں اپنے لئے حقارت اور نفرت پائی اور صرف کسی کی نظر میں برتری حاصل کرنے کا یہ جذبہ تمہیں ریاض کی جانب لے گیا جو تمہاری طرح سب کی جانب سے دھتکارا ہوا دوسرا فرد تھا۔ ریاض کی بیماری، تنگدستی اور احساس کمتری نے اسے اور گھبرا کر دیا اور گھر والوں کی مخالفت نے اسے جنگل میں لگی ہوئی آگ کی طرح بھڑکا دیا۔ پھر تم نے ہر قیمت پا کر کے ریاض کو پانے کا تہیہ کر لیا مگر ریاض کے قدم اس دشوار راستے پر لڑکھڑا گئے۔ تایا کی ایک ڈانٹ پر محبت اچھل کر دور جا پڑی اور وہ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر بھاگ گیا۔

خط کے آخر میں تم نے اسے خوب ذلیل کیا تھا ___ بزدل تو سمجھتا ہے اس طرح تو نے اپنی محبت کو رسوائی سے بچا کر میری لاج رکھ لی۔ مگر ابھی ہماری محبت شروع ہی کہاں ہوئی تھی۔ پہلے ہی میری عزت کون سے جھنڈے پر چڑھی بیٹھی تھی۔ میں تجھے وہ دے ہی نہ سکی جو میری زندگی کا بلند آدرش ہے ___ کاش میں تجھے اس بلندی پر پہنچا سکتی جہاں تک خود میرا ہاتھ بھی نہ جا سکتا۔ اب میری رُوح اس وسیع سمندر میں اس تنکے کو تلاش کرتی پھرے گی۔

تو اب تم اس تنکے کی تلاش میں خوفناک چٹانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ تم ___ جو موم کی مورتی کی طرح اپنے خالق کے تخیل کی گرمی سے پگھل سکتی تھیں۔ کسی کی تیز نگاہوں سے سلگ سکتی تھیں۔ پھر اپنے چاروں طرف چھائی ہوئی اس بھیانک آگ میں تمہارے قدم کیسے نہیں ڈگمگاتے ___؟

دوسرے دن میں نے اطہر کو تمہارے سامنے خوب ڈانٹا۔

"کل تم مجھ سے وعدہ کرنے کے بعد کیوں نہیں آئے؟ کبھی تو تمہیں اپنے وعدے کا خیال کرنا چاہئے۔ میں یہاں انتظار میں بیٹھا رہا اور بقول قدسیہ کے جناب کسی بار میں پڑے رہے۔"

اطہر کے بے ساختہ قہقہے رُک گئے اور وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے میں نے اسے پھانسی کا حکم سنایا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ بڑا پشیمان میرے پاس آیا۔

"اور اس نے میرے متعلق کیا کہا ___؟ اسے میری عادتوں کی خبر ہے؟ کیا اس نے میری شکایت کی تھی۔ وہ بہت رنجیدہ ہو گی ___؟" زندگی میں آج پہلی بار میں نے اطہر کو شرمندہ دیکھا تھا۔ وہ بھی کسی کی شکایت سننے کو تیار تھا' اس سے متاثر ہو سکتا تھا۔

"یہ تو نئی بات ہے۔ جبکہ تم ہمیشہ سے فریب دیتے آئے ہو اور قدسیہ ہمیشہ فریب کھاتی آئی ہے۔"

"آپ بھی اسے ایسا سمجھتے ہیں بھائی جان!" اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

"قدسیہ کے بگڑنے میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ بڑی بد نصیب لڑکی ہے لیکن میں یہ چاہتا ہوں کہ اگر اسے کچھ دے نہ سکوں تو اس کی بدنامیوں میں اضافے کا سبب بھی نہ بنوں۔ میں سچ مچ بہت برا ہوں اور قدسیہ کو فریب دے کر بھی نقصان ہی میں رہوں گا۔"

وہ باہر چلا گیا اور ایک بار پھر تم میرے سامنے نئی گتھیاں لئے آ گئیں اطہر کو نسا راستہ اختیار کر رہا تھا!

وہ بے رحم انسان جو اپنے مفاد کے آگے کسی پر رحم نہ کر سکتا تھا ___ تم مجھے ایک کسوٹی نظر آئیں جس پر سونا اور پیتل دونوں واضح شکل میں چمک اٹھتے ہیں۔

"گناہوں کے اتصال سے اتنا پاک جذبہ بھی وجود میں آتا ہے؟"

پھر تمہاری کہانی کا باقی حصہ میں خود نہ دیکھ سکا۔ میری مصروفیتیں مجھے کلکتہ کھینچ کر لے گئیں اور وہاں سے مجھے آندھرا کے علاقوں میں جانا پڑا اور آندھرا کی ہیجان خیز زندگی اور پرجوش سرگرمیوں نے تمہاری محبت کی نیم مردہ رنگین کہانی بھلا دی اور گھر میں ہونے والے چھوٹے چھوٹے حادثے ذہن کے کسی کونے میں تھک کر سو گئے۔

ایک بار عائشہ نے لکھا کہ اطہر کی مسلسل نفرتوں کے سبب [illegible] معلوم ہوا کہ تم اچانک گھر سے غائب ہو گئیں اور کسی نے ایک بار مجھے بتایا کہ تم [illegible] اب لکھنؤ میں رہتی ہو [illegible]۔

اس سے آگے کی کہانی مجھے کسی نے نہیں سنائی۔ مگر میں اس بات کا منتظر رہا کہ اب [illegible] گا۔ جہاں کئی برسوں تک ٹھوکریں کھانے کے بعد تمہیں ایک دن کسی قلم میں دیکھوں گا۔ ہیروئن کے [illegible] ہوئے کوئی آوارہ سا گیت تمہارے لبوں پر ہوگا' جو تمہارے مصنوعی چہرے' چھاتیوں' پنڈلیوں اور کمر کی [illegible] خول ہوگی "سلولائیڈ کی گڑیا" جس کی ہر جنبش دوسروں کی تابع ہوتی ہے' اور تم اپنی خودداری کی لاش پر ناچ رہی ہو گی۔

ایک حد سے زیادہ جذباتی لڑکی کے تخیل کی اڑان ہمیشہ یوں ہی کھائیوں میں گر کے دم توڑ دیتی ہے ـــــ مجھے تم [illegible] نفرت ہو گئی۔ عائشہ نے ایک بار لکھا بھی کہ قدسیہ وہاں کسی پرائیویٹ اسکول میں نوکر ہو گئی ہے' اطہر بیمار ہے اور وہ دونوں بڑی [illegible] دن گزار رہے ہیں۔

لیکن میں نے بڑی سختی سے اسے لکھ دیا کہ میں اب قدسیہ کے متعلق کچھ سننا نہیں چاہتا۔ اطہر کی یہ تبدیلی جتنی نفرت انگیز تھی [illegible] ہی تعجب خیز بھی تھی ـــــ وہ کسی کی شادی کی خبر سُن کر بھی مذاق اڑایا کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "ایک ہی راگ مسلسل لوگ کیسے سنے جاتے ہیں۔ میں تو دو ہی دن میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

پھر اس نے دو سال تک اس راگ کو کیسے سنا؟

امی اپنی قسمت کو رو کر بیٹھ رہیں' ان کی زندگی کے دونوں کڑوے پھل گئے۔ میں تو خیر اپنی خطرناک زندگی سے انہیں کوئی فیض نہ پہنچا سکتا تھا۔ مگر تایا بھی برداشت نہ کر سکے کہ اطہر کی قسمت اچانک پلٹا کھائے' وہ کوئی اچھی ملازمت حاصل کر لے۔

پھر امی کے آنسوؤں نے ابا سے خط لکھوا دئے جس میں اطہر کی اپنی خاندانی عزت اور بے شمار دولت کا واسطہ دیا گیا تھا اور تمہیں اطہر کی محبت کا ـــــ اور آج عائشہ نے لکھا ہے ـــــ "بھائی جان! آپ قدسیہ سے نفرت کرتے رہے۔ کیونکہ آئندہ اس کے متعلق کوئی بات نہیں ہو گی جو میں آپ کو سناؤں گی۔ آج اطہر بھائی کو تایا تنہا گھر لے آئے ہیں' قدسیہ کسی معمولی سی بیماری سے مر چکی ہے۔"

تم زندگی بھر میری عزت کرتی رہیں اور میں تم سے نفرت کرتا رہا۔ یہ ہم دونوں کی اپنی اپنی ذہنیت کا قصور ہے' اُدھر مت کرو ـــــ تمہاری آنکھوں میں چمکتے ہوئے آنسو کیا کہہ رہے ہیں؟

کیا سچ مچ تم کسی معمولی سی بیماری سے مر گئیں! اس چھوٹی سی بیماری کو اپنے نازک جسم پر نہ سہہ سکیں اور اس بیماری کا علاج کسی سے نہ ہو سکا ـــــ اطہر سے بھی نہیں۔ مجھ سے بھی نہیں جو تم سے نفرت کرتا رہا۔

تمہیں اپنی شکست پر آنسو نہیں بہانا چاہئیں۔ کیونکہ تم نے اطہر کو وہ تحفہ دے دیا جس کے لئے تم زندگی بھر سرگرداں رہیں اور چپ چاپ اندھیرے میں کھو گئیں۔ اب تمہاری روندی ہوئی سسکیاں اور جھلملاتے آنسو ہی مجھے تمہاری موجودگی کا احساس دلاتے ہیں۔

تم آج گھٹی گھٹی آہوں اور بہتے ہوئے آنسوؤں سے اس کمرے میں میرے لئے اپنی عزت کا تحفہ لے کر آئی ہو۔ مگر میں اس کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا کہ جلتے ہوئے سگریٹ کو ایش ٹرے میں پھینک کر' تمہارے خیال کو بھی ذہن سے جھٹک دوں۔

لڑھکتی چٹان

انور عظیم

رات بھر بادلوں کے گرجنے کی آواز آتی رہی۔ جیسے اونچی پہاڑی چوٹیوں سے مسلسل بڑی بڑی چٹانیں پھسل رہی ہوں لڑھک رہی ہوں۔

تنگ کمرہ بالکل تاریک تھا۔ اس اندھیرے میں تمام رات چمگادڑ پھڑ پھڑاتے اور دیواروں سے سر ٹکراتے رہے تھے۔ شاہد اپنی بیوی کے لچھے دار نرم بالوں میں اپنا منہ لپیٹے پڑا تھا۔ بالوں سے تل کے تیل کی ناگوار خوشبو نکل کر اس کے نتھنوں سے ہوتی ہوئی اُس کی بے خواب کملائی ہوئی روح میں تیرتی، بھٹکتی اور رچتی چلی جا رہی تھی۔ اس کی ناک سے چھوٹتی ہوئی زہریلی سانسیں بالوں کے گھونسلے میں گرمی بھر رہی تھیں اور اس کا تمتماتا ہوا چہرہ اس گھونسلے میں ایک سہمی ہوئی چڑیا کی طرح چھپا ہوا تھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور جب پہلی بار اس کی نظریں دریچے کے کھلے ہوئے حصّے سے باہر گئیں تو اندھیرے کا رنگ پھیکا ہوتا ہوا نظر آیا۔ مدھم مدھم، جیسے ہر چیز دھواں دھواں ہو رہی ہو۔ کمرے نے وسعتوں میں اڑتی ہوئی بھاپ کا طوفان سا اٹھا رکھا تھا۔ اسے ہر چیز خواب میں کھوئی ہوئی، دبی دبی معلوم ہو رہی تھی۔ اُس نے اپنی آنکھیں پھر بند کر لیں۔ اُس کے حلق میں کھٹی کھٹی کوئی چیز رقیق سی پسیجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جیسے وہ جلے ہوئے پیاز اور سرکے کو چاٹ رہا ہو۔ اُس کی طبیعت میں مالش سی ہوئی۔ اس نے اپنا ذہن دوسری طرف پھیرنا چاہا۔ لحاف کے اندر گھسیڑ کر اُس نے ایک کرب کے سے عالم میں ثروت کے بالوں میں چھپے ہوئے چہرے کو اپنے چہرے سے قریب کیا اور اس کے ٹھنڈے لبوں کو چوس کر آہستہ سے بولا ــــــ جیسے نشے میں ہو، جیسے اُس کا تیزابی نشتر ٹوٹ رہا ہو۔

"میری جان، میری ثروت، صبح ہو رہی ہے، آخر صبح ہو ہی گئی۔ آخر صبح ہو ہی جاتی ہے۔ یار خاں کا باپ بھی صبح کو نہیں روک سکتا...... میری ثروت، میری جان......."

ثروت کے ہونٹ شاہد کے تھوک سے گیلے ہو گئے تھے اور وہ شبنم میں نہائے گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح ٹھنڈے تھے۔ زندگی اور سپردگی کی آگ سے خالی، شاہد کے لب.......... جن سے سڑے ہوئے سرکے اور جلے ہوئے پیاز کی بو آ رہی تھی، بے طرح جل رہے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور بند آنکھوں میں بجھتے ہوئے انگاروں کی راکھ کسمسا رہی تھی۔ ثروت کا جسم گرم تھا۔ پالتو بلی کے جسم کی طرح نرم، آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ پھر بھی شل تھے شاہد کو محسوس ہوا کہ وہ شعلوں کے دریا میں بہتے بہتے ڈوبنے لگا ہے۔ شعلوں کا دریا جم کر برف بن گیا ہے اور اس کے منہ میں برف کی دو قاشیں ایک دوسرے میں چپکی ہوئی، چھپی ہوئی تھیں۔ کیا وہ ثروت ہی کے ہونٹ

تھے۔ پھر ان میں وہ آگ کیوں نہ تھی۔ جس میں اُس نے اپنی ساری زندگی کو زندگی کے سارے رس کو شعور کے تمام آدرشوں کو جھلس کر رکھ دیا تھا۔

منی جاگ پڑی۔ ثروت نے اُس کی طرف کروٹ لے لی اور منی کے پوپلے منہ میں اپنی ٹھنڈی چھاتی ڈال کر اُسے تھپکنے لگی۔

شاہد کو اپنی بیٹی کا یہ دخل در معقولات بہت بُرا معلوم ہوا۔ اس کو اپنی تنہائی اور محرومی کے احساس نے آدبوچا۔ نیم غنودگی کے عالم میں وہ ایک خواب کے ریلے سے گزر گیا' ٹائپ رائٹروں کی آواز' سپرنٹنڈنٹ کی منحوس کھنکتی ہوئی ڈانٹیں۔ عینک کے شیشے کو توڑ کر جھپٹتی ہوئی آنکھیں' آنکھوں کی کمین گاہ میں چھپے ہوئے تتنے گدھ' کتی چیلیں' دوسری طرف ہیڈ اسسٹنٹ کا رعب' اس کے مڑے ہوئے دانت' سڑی ہوئی بدبودار مسکراہٹ' مسکراہٹ کی جھریوں میں کچاتا ہوا' بنگتا ہوا رحم' چھچھورا پن' زعم برتری ——— "تم اب تک دفتر کا کام نہیں سمجھ سکے۔ اِن فائلوں کو دیکھ کر ریکارڈ ٹھیک کر لو' ہاں مسٹر! معشوق کے ٹپے اور سرکاری کام میں بڑا فرق ہے۔ نوکری نوکری ہے۔ دعوت کی میز پر رکھا ہوا ایک مکھن کیک نہیں ہے۔ ملائی' ملائی' او' اں ——— ہو ہو ہو ———" سپرنٹنڈنٹ اسے اسی طرح دھمکایا کرتا تھا اور وہ اپنی سانسیں پھیپھڑوں میں لیکر زینے پر سے اُترتے ہوئے اپنے آفس کے کمرے میں پہنچتے پہنچتے دانت پیس کر کہتا۔ "معشوق کا بچہ' دو ٹکے کی اولاد۔ کیک کا سالا" ——— اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ وہ بے بسی سے اپنے چاروں طرف بکھری ہوئی فائلوں کو دیکھتا۔ ان پر رینگتے ہوئے اعداد کے کچھوؤں کو دیکھتا جو خرگوش سے بازی لگا کر تیرتے چلے جا رہے تھے۔ ٹائپ رائٹروں کے مقبروں سے کھٹ کھٹا کھٹ کا نغمہ چھنتا رہتا اور اس کی روح کے پرخچے اڑتے رہتے۔

گزشتہ شام کو ہی سپرنٹنڈنٹ نے اسے کہا تھا۔ "مسٹر تم دیکھنے میں آدمی انٹیلی جنٹ معلوم ہوتے ہو۔ لیکن تمہارے کام سے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ تم ٹمپریری کلرک ہو۔ اگر تم نے کام اچھا نہیں کیا تو تم ہی بتاؤ ———"

وہ پوری بات سنے بغیر بھناتا ہوا نکل آیا تھا۔ فائلوں کو میز پر پٹک کر اور صراحی سے ایک گلاس پانی انڈیل کر کھڑا کھڑا سڑ سڑا گیا تھا۔ روز روز کی دھمکی' روز کی دھونس' نوکری کی ایسی تیسی۔ چپراسی اُسے گھور رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ وہ اس کے قریب آیا۔ "بابو جی یہ کالا صاحب بڑا کائیاں ہے۔ نذرانہ مانگتا ہے۔ مچھلی' کھلونے' مٹھائیاں۔"

شاہد نے بڈھے چپراسی کا منہ دیکھا۔ دو تین بار اپنے پھٹے ہوئے گرم کوٹ اور دیمک کھائے ہوئے مفلر کو مٹھیوں میں بھینچا اور سیکرٹریٹ کی اژدہا نما زرد عمارت سے نکل کر باہر چلا آیا۔

ابھی سڑک پر ہی پہنچا تھا اور بڑے پھاٹک سے باہر نکلنے والا تھا کہ ایک وزیر کی فاختئی کار پھر پھراتی ہوئی نکل گئی۔ یکہ رُکا اور اُس میں سے قربان ہوٹل کا مالک نکل پڑا۔

"کہیئے شاہد صاحب! آپ نے تو نہ ملنے کی قسم کھا رکھی ہے۔"

شاہد کا دم گھٹنے لگا۔ یہ بجلی کہاں سے گر پڑی۔ "آخر آپ کا ارادہ کیا ہے۔ کب تک میں یکے کا کرایہ بھرتا رہوں گا۔؟"

"بس اب کے ضرور دے دوں گا۔ میں تو خود ہی آپ کے یہاں آنے والا تھا اور کہیئے سب خیریت ہے نا؟"

"آپ کی دعا ہے۔ مگر دیکھئے اب کے وعدہ خلافی۔"

"توبہ کیجئے ———" اُس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے مفلر کو مسلتا رہا۔ اُسے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنی موت سے ہاتھ ملا رہا ہے۔

اس سے جان چھوٹی تو اس کے ماتھے پر پسینہ تھا۔ وہ کئی مہینے سے اس ہوٹل والے کو جل دے رہا تھا۔ اُس نے سڑک پر چلنا چھوڑ دیا

تھا۔ جس پر وہ ہوٹل تھا۔ اسی لئے وہ بس سے نہیں جاتا تھا۔ بس ہوٹل کے سامنے رُکتی تھی اور روز خطرے کے منہ میں سے گزرنا اس جیسے مرد میدان کا کام نہ تھا۔ وہ پرانے شہر سے پنجرے سے روانہ ہوتا اور وقت سے کافی پہلے روانہ ہوتا اور یہاں آکر ادھر اُدھر مٹرگشت کرتا۔ اس کی اس مصیبت کی وجہ سے اس کی .... بیوی کو سویرے سویرے اس کا کھانا پکانا پڑتا۔ وہ اسے بار بار کہتی تم بس میں کیوں نہیں جاتے۔ لیکن وہ اس نیک مشورے کی اہمیت کو حسب معمول بہت سی مرعوب کرنے والی باتیں کر کے دبا دیتا تھا۔ بس کیا ٹھکانا تھا۔ اکثر پٹرول ختم ہو جاتا ہے اور بس راستے میں بچہ جننے لگتی ہے۔ اب ایسے میں___ خیر چھوڑو۔ بات یہ ہے کہ آفس میں میری دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ میں کام بڑا پختہ کرتا ہوں اور اب کے چانس ہے۔ سپرنٹنڈنٹ ہونے کا۔ میں کسی طرح آفس دیر سے پہنچ کر بدنام ہونا نہیں چاہتا۔ اچھا ذرا کبھی کبھار پودینے کی چٹنی تو بنا لیا کرو___ بڑا روکھا کھلاتی ہو___"ثروت کا ذہن بس سے ہٹ کر روکھے کھانے اور پودینے کی چٹنی کی طرف چل دیتا۔

ہوٹل کا قرض تو اس پر اخبار کی نوکری کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ اخبار کی نوکری بھی خوب تھی۔ ایڈیٹر نے ایک وزیر کے اشتہار کا ٹھیکہ لے رکھا تھا وہ روپے دیتا تھا۔ زیادہ بڑا حصہ تو خود ایڈیٹر کے پیٹ میں چلا جاتا تھا۔ تھوڑے سے حصے میں کاتب' چپراسی' کلرک اور شاہد جیسے مترجموں کی روٹی کا انتظام ہوتا تھا۔ ایک کا پیٹ بھرتا تو دوسرے کا خالی رہتا اور پھر شاہد پر ایڈیٹر کا احسان ہی تھا۔ وہ تو کہتا تھا محض مروت میں اس سے اس جیسے ہونہار نوجوان کی فاقہ کشی دیکھی نہ جاتی تھی اور اسی لئے ترجمہ اور اداریہ سے لے کر کاپی جوڑنے کا کام تک اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ وہ اپنی میلی قمیض اور بوسیدہ پاجامے میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا۔ ریڈیو سے خبریں اڑاتا' ترجمے کرتا' دو کالمی' تین کالمی سرخیاں لگاتا جاتا۔ ناراض کاتبوں کی خوشامدیں کرتا جاتا اور جب رات کے دو بجے آخری کاپی جوڑ کر پریس بھیجتا تو اُسے محسوس ہوتا کہ اس کا دماغ چھچھوندر کی طرح شرارے اُگلتا ہوا ناچ رہا ہے۔ وہ چکرا کر دری پر گر جاتا۔ جس پر مسطر' اخبار' گوند اور دواتیں بکھری ہوتیں۔ وہ کئی کئی دن نہ نہا پاتا تھا۔ اس کے جسم پر میل کی پھٹی پھٹی سی تہیں جمی رہتی تھیں۔ جب لوگ اس سے نہانے کا مطالبہ کرتے تو وہ جھلا کر کہتا۔ "سالے نہانے کو سب کہتے ہیں۔ مگر یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ نہانے کا مطلب ہوتا ہے کپڑا' صابن' تیل___

اسے جو کچھ بھی پیسہ چھین جھپٹ میں ہاتھ لگ جاتا ثروت کو بھیج دیتا۔ اس نے اپنی بیوی کو اپنے ڈاکٹر ہم زلف کے یہاں بھیج دیا تھا۔ وہ اِن دنوں پاکستان میں تھی۔ وہ اسے پیسے بھجوانے کے لئے بے قرار رہتا تھا۔ کلکتے میں اپنے ایک دوست کے ذریعے پاکستانی سکوں میں ہندوستانی سکے تبدیل کرواتا اور اس طرح اُس کی بیوی کا ہر ماہ ایک شکریہ کا خط آجاتا اور اس کی جان میں جان آجاتی۔ ثروت اس کی قربانیوں کو سمجھتی ہے۔ اس کی مصیبت کو سمجھتی ہے۔ ثروت اس سے بے حد محبت کرتی ہے۔

وہ لکھتا___ میری پیاری ثروت' زندگی کا یہ اندھیرا دور ہونے والا ہے۔ بہت جلد میں ایڈیٹر ہو جاؤں گا۔ میرا ایڈیٹر ہندوستانی سفارت خانے کے ساتھ ایران جانے والا ہے۔ اس کے بعد میں بھی کہیں باہر چلا جاؤں گا۔ تم میرے ساتھ ہو گی۔ پھر سمندر ہو گا۔ سمندر سے نکلتا ہوا نیا نیا سورج ہو گا۔ سروں پر گاتے ہوئے پرندے ہوں گے___ گھبراؤ نہیں گھبراؤ نہیں___ یہ دن ہمیشہ ایسے ہی نہیں رہیں [illegible] کبھی کے دن بڑے ہوتے ہیں۔ کبھی کی راتیں۔ نہیں سمجھیں___ جاڑے کی راتیں بڑی ہوتی ہیں اور گرمی کے دن۔ یہی حال زندگی [illegible]

[illegible] بھی آئیں اور گرمی کے دن بھی۔ لیکن اس کے دن جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ اس کی زندگی سکڑتی گئی۔ گھٹتی گئی۔ اس کے کپڑے [illegible] ہوٹل کا قرض چڑھتا گیا۔ ہوٹل والے نے تو انتظار سے گھبرا کر اب سیکریٹریٹ کا پھیرا لگانا شروع کر دیا تھا۔ دو مہینے وہ [illegible] کے ٹالنا مشکل تھا۔ اب کے تو اس نے حلق میں انگلی ڈال کر تے کروا لینے کا عہد کر رکھا تھا۔

[illegible] بوندوں کی بارش ہونے لگی۔ سامنے پٹرولیم میں موبل آئیل کے کنستروں پر اولے برسنے لگے

اور [illegible] سے بنگلے کے سبزہ پارک میں برف روئی کی طرح بکھر گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر طرف [illegible] حسین گزر رہی ہے اس کی جیب میں پیسے بہت کم تھے۔ مشکل سے وہ واپسی کا ٹکٹ خرید سکتا تھا اگر وہ تھوڑی دیر اور وہاں پہ کھڑا رہتا تو یقیناً بھیگ جاتا۔ اس نے دوڑ کر سامنے کے پیرا ڈائز بار میں پناہ لی۔ وہاں یار خاں اس کے مکان کا مالک کھڑا تھا۔ اس کی پتلی پتلی مونچھیں پھڑک رہی تھیں اور وہ سگرٹ کے کش لگا رہا تھا۔ شاہد وہاں سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں مکان کے کرائے کا تقاضا نہ کر دے۔ کہیں کیا یہ تو یقینی تھا۔

"کہاں شاہد صاحب، دفتر سے آرہے ہیں کیا؟" اس کے ہاتھ میں بنڈل تھا جس میں ایک ریشمی ساڑھی چمک رہی تھی۔

"آداب عرض ہے۔ جی ہاں! اُف کتنی خوفناک بارش ہو رہی ہے میں تو پانی سے بچنے کے لئے یہاں چلا آیا۔"

"آیئے اندر آجایئے۔ باہر کب تک کھڑے رہیں گے؟"

وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ دروازہ خود بخود اسپرنگ سے بند ہو گیا۔ اندر جتنے چہرے تھے۔ اس کے چہرے سے مختلف تھے۔ اس کے چہرے کی سی تھکن، اضمحلال، شکست اور گھبراہٹ کسی کے چہرے پر نہ تھی۔

ایک طرف کونے میں ایک سُرخ میز خالی تھی۔ باہر بجلی چمکتی تھی تو شیشے کا رنگین دریچہ جھلک اُٹھتا تھا۔ سگار، سگریٹ اور پائپ کے دھوئیں سے اندر کی نم آلود فضا بسی ہوئی تھی۔

میز پر بیٹھتے ہی یار خاں کا لہجہ بہت دوستانہ ہو گیا۔ وہ ایک ہی جست میں آپ سے تم پر چلا آیا۔ کہو تم کیا پسند کرو گے؟"

"جی؟"

"کیا پیو گے؟" اور اس کی آنکھوں میں ایسی عیاش اور مکار چمک پیدا ہوئی کہ اس کی آنکھیں لومڑی کی آنکھوں کی طرح چمک اٹھیں۔

میں نہیں پیتا۔" شاہد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"بکواس، جب بیرا اس کے سامنے آکر جھکا تو اس نے کہا۔ سولن وہسکی، ایک بوتل۔"

بیرا نے پہلے سولن کی بوتل کھولی پھر دو گلاس لاکر رکھے اور دو پلیٹ میں کباب۔ سوڈے کی بوتلیں پھک سے کھلیں اور بیرے دوسری طرف چلے گئے۔

یار خاں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "تم بہت تکلف کرتے ہو بھئی پینے کے لئے ایک ساتھ بیٹھے ہیں تو فرق کیا ہے۔ پینے والوں کی ایک [illegible] ہوتی ہے۔"

ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلا ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا اندر چلا آیا۔ شاہد کا پورا بدن جھرجھرا گیا۔ کار کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی [illegible] ایک کھدر پوش تنومند بابو جی اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک اینگلو انڈین عورت تھی اور پیچھے پیچھے ایک [illegible] جسے وہ عورت "ہلو ٹائیگر، ٹائیگر ___" کہتی ہوئی چمکارتی رہی۔ وہ کھدر پوش بابو جی کے ساتھ کیبن میں داخل ہو گئی اور [illegible] کر کاؤنٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں آئینے کے پس منظر میں ایک بلند شوکیس میں طرح طرح کی شراب کی بوتلیں چمک رہی [illegible] کی طرح۔

یار خاں نے [illegible] گلاسوں میں انڈیلی۔ ماچس سے دونوں کی مقدار کا اندازہ لگایا۔ اپنی نیلی ٹائی کی گانٹھ کو چھو کر دیکھا۔ دور بیٹھی ہوئی چھوکریوں [illegible] ہوئے وہ تین کالج کے لڑکوں کو دیکھا جو بڑے لوگوں کے سپوت تھے اور فضا کی رنگینی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ اس نے [illegible] کیا۔ شاہد نے گلاس اٹھالیا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ شراب لرز رہی تھی۔ سوڈا کی وجہ سے

اس کا رنگ ہلکا ہو گیا تھا۔ یار خاں نے اپنا گلاس اس کے گلاس سے ٹکرلیا ____ "سرما کی اس حسین شام کے نام" شاہد نے شراب کا گھونٹ پیٹ میں انڈیل لیا۔ اس کے جسم میں ایک تلخ سی حدت دوڑ گئی۔ وہ اپنے لب چوستے ہوئے یار خاں کو دیکھنے لگا۔ جو اپنے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال رہا تھا۔

شاہد نے اس کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا۔ اُس کی مےخواری کا بڑا چرچا تھا۔ وہ روز شام کے بعد کسی نہ کسی بار میں پہنچ جاتا تھا اور کسی نہ کسی نئے آدمی کو پھانس لیتا تھا اور اُسے اپنی جیب سے شراب پلاتا تھا۔ جب سیر ہو جاتا تھا تو نشے میں اُسے چھوڑ کر روانہ ہو جاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ نئے آدمی کو نشے میں گالیاں دینے اور اس کی زندگی کا حال سننے اور سنانے میں بڑا مزا آتا ہے۔ پُرانے لوگوں کے شراب پینے سے شراب بھی پُرانی ہو جاتی ہے۔

دو تین گھونٹ حلق میں اُترنے کے بعد شاہد کی سراسیمگی مٹنے لگی۔ اُس نے اپنی ہتھیلیاں ملیں۔ آنکھیں جلدی جلدی جھپکیں۔ جیسے اب کسی پرندے پر بندوق سے نشانہ باندھنے کا ارادہ کر رہا ہو۔ "لاؤ آج اس خناس مالکِ مکان کو بھی جھیل لوں اور اس طرح جھیلوں کہ یہ سالا بھی کیایاد کرے گا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم ایک شریف آدمی ہو۔ کئی بار میرے منشی نے تمہاری شکایت کی کہ تم وقت پر کرایہ نہیں دیتے۔ خیر یہ تو ایسی بات ہے جسے بار میں چھیڑنا غلط ہے۔ کیوں؟"

"آپ کا خیال درست ہے۔" شاہد نے جھلا کر اور ایک حد تک بیزار ہو کر کہا۔

"ہاہاہا۔ تمہاری بچی بہت شور مچاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اسے دودھ نہیں ملتا۔ تم ماما کیوں نہیں رکھ لیتے لیکن جب تم کرایہ وقت پر نہیں دے سکتے تو پھر ____ خیر چھوڑو۔"

شاہد کے کان جل اٹھے اور اُس نے اپنے مفلر کو اتنی سختی سے مروڑنا شروع کیا کہ وہ اس کے لئے پھانسی کا پھندا بن گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ سور مجھے چھیڑنا چاہتا ہے۔ ستانا چاہتا ہے۔ سمجھتا ہے اس طرح کچوکے لگا کر اپنا کرایہ وصول کر لے گا۔ بڑا خبیث ہے۔ ذلیل کرتا ہے۔ حالانکہ اب میں جس منزل پر ہوں وہاں ذلت اور عزت ایک ہی انڈے کے چھلکے ہیں زردی اور سفیدی کی طرح جذب ہو جاتی ہے۔ اُس نے مسکراتے ہوئے گلاس اٹھایا اور ایک بڑا سا جلتا ہوا شراب کا گھونٹ مزا لے کر حلق کے پار اتار دیا۔ گلاس کو ہاتھ میں پکڑے گھورتا رہا۔ پھر مسکرایا اور پھر ایک گھونٹ حلق میں انڈیل لیا۔ یہاں تک کہ گلاس خالی ہو گیا۔ اُس نے جھٹکے سے گلاس کو میز پر رکھ دیا۔ اتنے زور سے کہ یار خاں چونک گیا اور قریب کی میزوں پر بیٹھے ہوئے کچھ لوگ بھی متوجہ ہو گئے۔

"شاہد تم آدمی سمجھ دار معلوم ہوتے ہو۔"

"یہ تو واقعہ ہے۔"

"بہت خوب۔"

شاہد نے چرچ مینس کے ٹین سے ایک سگریٹ نکالی' سلگائی اور رئیسانہ ٹھاٹھ سے دھواں پھینکنے لگا اور پھر اس خود پرست نظر سے اُس نے یار خاں کو دیکھا کہ وہ بھی گھبرا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود یار خاں اُس کی میز پر بیٹھا اس کی عطا کی ہوئی شراب پی رہا ہو۔

"اچھا بتاؤ تم کتنے اسٹیشن تک چلتے ہو؟"

"میں یہاں سے دہلی تک جا سکتا ہوں۔ یہاں سے لندن تک کتنے اسٹیشن ہیں۔ تم ہی بتاؤ' بتاؤ' ہاں بتاؤ' بڑے آدمی بنتے ہو۔ بنگلے میں رہتے ہو ____ ہو ہو ہا' بس؟" وہ پورا گلاس پی گیا۔ اُس کی آنکھیں سُرخ ہو گئی تھیں اور ان میں نشاط انگیز چمک پیدا ہو گئی تھی۔

"میرا مطلب ہے تم کتنے پیگ پی سکتے ہو؟" یار خاں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں پوچھا۔

"تو پھر سیدھی طرح کیوں نہیں پوچھتے؟ کتنے اسٹیشن 'کتنے اسٹیشن ____ تم پیگ کو اسٹیشن کیتے ہو [illegible] کہتے ہیں۔ اب پوچھو گے کہ تم کتنے زینے چڑھ سکتے ہو۔ میں قطب مینار پر چڑھ سکتا ہوں ____ تمہارے سر پر چڑھ [illegible] اور چڑھ گیا۔ اب وہ خود ہی پٹیالہ پیگ بنا رہا تھا اور یار خاں کو پیچھے چھوڑتا ہوا بڑھا چلا جا رہا تھا۔

یار خاں کا منہ لال ہو گیا۔ اُس نے اپنے ہونٹ چبائے اور ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ کبھی کبھی لوگ ان کی میز کی طرف [illegible] تھے۔ بغل میں ایک میز پر ایک حسین سی سکھ عورت فر کا لانگ کوٹ پہنے بیٹھی بیئر سپ کر رہی تھی اور سردار جی [illegible] لگاتے اور ایک آدھ دھول بڑے پیار سے اس کے کندھے پر جماتے۔ اس کا موٹا ہاتھ بلی کے رونیں کی طرح نرم گوشت میں [illegible] دونوں قہقہہ لگاتے۔

شاہد کو زور سے ہچکی آئی۔

"تم بہت پی گئے ہو۔ اب تم گھر چلے جاؤ۔"

"تم گھر جاؤ۔ میں تو ابھی اور پیوں گا۔ میں دہلی اسٹیشن تک جاؤں گا۔" شاہد نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"بیکار بات ہے۔ اب مت پیو۔ میں سمجھتا تھا۔ تم ڈھنگ کے آدمی ہو۔ تم شراب ہضم بھی نہیں کر سکتے۔"

"کیا کہا ____؟" اُس نے اپنے کان پکڑ لئے "لو معافی مانگتا ہوں۔ اب گستاخی نہیں کروں گا۔ بس پینے دو مجھے ____ بس جینے دو مجھے۔" اُس نے گانے کی سی آواز میں ایک ایک لفظ کو کھینچ کر ادا کیا۔

تھوڑی دیر شاہد بڑی متانت سے بیٹھا رہا۔ وہ خرگوش کی آنکھوں کی طرح اپنی سُرخ آنکھوں کو اِدھر اُدھر گھماتا رہا۔ دھوئیں سے بھرا ہوا ہال ٹھنڈا تھا۔ برف کے سے قہقہے' برف کے سے گلاس' برف کے سے سفید بیروں کے سائے۔ کھدر پوش بابو کا برف کی طرح خاموش ٹائیگر۔ سب کچھ برف تھا۔ شراب برف' بوتلیں برف' مسکراہٹیں برف' تمنائیں برف' برف حیات' برف موت ____ صرف اسے اپنا وجود آتشیں معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ہنسا اور گویا اس کی روح کا منہ توڑ کر لاوے پھوٹ رہے تھے۔ لیکن برف ہال کے باہر برس رہی تھی اور برف ہال کے اندر جم رہی تھی۔

اب یار خاں سرور میں آ گیا تھا۔ یکایک اُس کی گنگناہٹ ختم ہو گئی۔ اس کی آنکھیں مونچھوں کے اُوپر سلگ اٹھی تھیں اور باہر نکل آئی تھیں اس نے بھی پورا گلاس حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

"اب گلپ کا وقت آ گیا ہے۔ رات پُر اسرار ہو گئی ہے۔ خون چیخ رہا ہے۔ کیا چیخ رہا ہے ____ بتاؤ ____ بتاؤں ____ بتاؤں ____ عورت' عورت" ____ اُس نے بوتل کی تہ میں چمکتی ہوئی زیتون کے رنگ کی شراب اپنے گلاس میں انڈیل لی اور بغیر سوڈا ملائے اسے اپنے منہ سے لگا لیا۔

"شاہد تم سے ملاقات ہو گئی اچھا ہوا۔ میں اکیلا نہیں پیتا۔ یہ میری شان کے خلاف ہے۔ لیکن عام طور پر مجھے اونچے درجے کے لوگ مل جاتے ہیں۔ تم ذلیل آدمی ہو۔ تمہارا لباس بھی ذلیل ہے۔ تم میرے مکان میں رہتے ہو۔ مجھے کرایہ بھی نہیں دیتے۔ تمہاری تنخواہ کے میرے ملازم ہیں۔ تمہاری بیوی عشق لڑاتی ہے تو تمہاری روٹی چلتی ہے۔"

"چپ سور کے بچے۔ چپ۔ چپ' چپ" شاہد کے منہ سے جھاگ نکلنے لگی۔ اُس نے گلاس کو دبوچ لیا۔ یار خاں چپ ہو گیا۔ "تم نے مجھے شراب پلائی ہے تو کیا تم گالیاں بکو گے؟"

یار خاں نے بیرے کو بلا کر دو گلاس رم کے منگائے اور شاہد سے کہا "پی لو" شاہد [illegible] جھک گئیں۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

جانتے ہو شاہد' میرا بھتیجا ہی میرا منشی ہے۔ میں اس کی پرورش کر رہا ہوں۔ جاہل ہے' آوارہ [illegible] شریف ہے۔ جیسے تم خاندان کے شریف ہو۔ پہلے تمہاری شکایت کرتا تھا۔ اب وہ شکایت نہیں کرتا اور یہ بری بات ہے۔ [illegible]

"یار خاں تمہارا کرایہ تمہیں مل جائے گا۔ مگر مجھے گالی نہ دو۔ میری ثروت بہت پیاری عورت ہے۔ [illegible] ہے وہ شہید ہے ——

اور اب میں جاتا ہوں۔ تم اپنے بھائی کو امریکہ بھیجنا چاہتے ہو بھیجو۔ تم تیسری جنگ کا انتظار کر رہے ہو۔ تم نفع کمانا چاہتے ہو [illegible] مجھے گالی نہ دو۔"

"بیٹھو بیٹھو ——— یہ سب میرے بھتیجے نے بتایا ہوگا۔ اس کا پٹھا بہت حرامی ہے۔ لیکن اس میں حرج بھی کیا ہے۔ پچھلی لڑائی میں کتنے رئیس بن گئے۔ میں بھی ———"

"میں اب جاتا ہوں۔" شاہد کھڑا ہو گیا۔

جب وہ بھٹکتا ہوا بس سے اتر کر گھر پہنچا تو اُس کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ اُس نے آواز دے کر دروازہ کھلوایا۔ ثروت کی آنکھیں خواب سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ شاہد نے اپنی نشہ سے بھری ہوئی آنکھوں سے اُسے گھور کر دیکھا۔ "ثروت یار خاں بہت برا آدمی ہے۔ وہ خبیث ہے۔ اُس نے مجھے شراب پلائی ہے۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ مجھے معاف کر دو۔" اُس نے اپنا منہ ثروت کی گود میں ڈال دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

دیر تک چارپائی میں ثروت کے پاس سویا ہوا وہ اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ثروت کے لئے ہی اپنی زندگی کی بلندی سے کود پڑا تھا۔ اس کے دوست' اُس کے ساتھی' اُس کی عملی سیاسی زندگی اُس سے چھوٹ گئی تھی۔ وہ بڑا خطرناک زمانہ تھا۔ اُس کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ تھا۔ وہ ایک اندھیری کوٹھڑی میں بند تھا۔ اسے مچھر کاٹے کھا رہے تھے۔ وہ بار بار موم بتی جلاتا تھا اور کوئی ہوا کا تیز جھونکا آتا تھا اور موم بتی بجھ جاتی تھی۔ پولیس مزدوروں کے علاقے میں دورے لگا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے اور اس وقت اسے اپنی بیوی کے خیال نے آ جکڑا تھا۔ ثروت کی بڑی بڑی بیتاب پلکیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ ابھی چند دن پہلے ہی جب وہ اس سے ملا تھا تو اس نے اس کے کان میں کہا تھا۔ "آپ کچھ نہیں سمجھتے۔ آپ کچھ تو سمجھئے۔"

"کیا؟ کچھ کہو بھی تو۔ تم کہتیں تو کچھ نہیں اور مجھے کند ذہن کہتی ہو۔"

"کچھ پیسے جمع کر رکھئے۔ ہم تین ہونے والے ہیں۔"

شاہد کی سانسیں رُک گئیں۔ اُس نے ثروت کے گھنے بالوں کو اس کے چہرے پر بکھیر دیا تھا اور بڑی سرگوشی کے سے انداز میں بولا تھا۔ "ہو جائے گا۔ سب ہو جائے گا۔"

شاہد کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ اس کا وہ جھوٹ تھا جو وہ ثروت کے سامنے ایک خوبصورت زندگی کا عینی نقشہ کھینچتا چلا جاتا تھا۔ اس میں اس کی کبھی ہمت ہی نہ ہوتی کہ وہ اسے اِن تمام تلخ حقیقتوں سے آگاہ کر دے۔ بتا دے کہ اس کے گھر کی چھتیں کبھی مرمت نہیں ہوں گی۔ یہ چھتیں گر جائیں گی۔ کمرے برسات میں مٹی کے گھڑے کی طرح پگھل کر بہہ جائیں گے۔ چھتوں کی مرمت اس وقت تک نہیں ہو ہوگی جب تک کہ ایک نئی زندگی کھیتوں میں گاؤں میں شہروں میں جنم نہ لے اور ابھی اس میں دیر تھی۔ ابھی ہزاروں چھتیں

[illegible] تھے۔ بڑے بڑے پھول اور خون ہوتا تھا۔ یہ سب اس کی [illegible] ثروت کے گھر کے کھوکھلے زرد [illegible] رنگ [illegible] میں اپنے آپ کو بے بس پاتا تھا۔ اس کا سارا [illegible] تھے لیکن وقت [illegible] ثروت کے پاس پہنچ کر تیزی سے [illegible] جاتا تھا۔

"آپ جب بڑی تنخواہ پانے لگیں گے تو بڑا اچھا رہے گا۔ ایک چھوٹا سا سفید مکان بنوائیں گے۔ باورچی خانے کا فرش الگ ہوگا۔ جس کی چھت سفید رنگ کی ہوگی۔ باغ میں جوہی، بیلا اور موتیا لگائیں گے۔"

"ضرور لگائیں گے اور میں پھول توڑ کر تمہارے بالوں میں لگاؤں گا۔ ہیں؟" وہ چاندنی میں چمکتے، اونگھتے کسانوں کے جھونپڑوں کو دیکھتے ہوئے کہتا۔ الاؤ کی چمک اس کی سسرال کی پچھلی دیوار تک پہنچتی تھی۔

"ریڈیو کتنے داموں آتا ہے؟"

"ریڈیو ——— لاحول ولا ——— ریڈیو کی فکر نہ کرو۔ وہ آج کے ہر شریف گھر میں ہوگا۔ میں کوئی معمولی آدمی ہوں۔ میں بڑا انٹلکچول ہوں۔ لیکن تم انٹلکچول کے معنی نہیں جانتیں۔"

ثروت بمشکل سے خط لکھ سکتی تھی۔ وہ البتہ سو تک گنتی ضرور جانتی تھی۔ اس کا سارا جادو اس کی آنکھوں میں تھا۔ اس کے ہونٹوں کی خواب آور مسکراہٹوں میں تھا۔ جیسے کسی شاخ گل پر کوئی روپہلی چڑیا پر تول رہی ہو۔ جیسے بہار کی صبح گا رہی ہو۔ اُس کی بے خودی نے شاہد کو ایسی تمناؤں کا شکار بنا دیا تھا۔ جو اُس کی موجودہ زندگی کبھی پوری نہیں کر سکتی تھی۔

شاہد اس جھونپڑی میں بیٹھا اپنے تمام وعدوں کو یاد کر رہا تھا جو اس نے شہر کے بلبلوں کی طرح ثروت کے کانوں میں اس کے خون میں اتار دیئے تھے۔ جب دوبارہ موم بتی جلی تو اسے گپتا کی تیز تیر کی طرح چبھتی ہوئی آنکھوں ——— سے بڑا ڈر معلوم ہوا۔ یہ کامریڈ اس طرح کیوں گھور رہا ہے۔

"کامریڈ تم بہت گھبرا گئے ہو۔ روپوشی کا پہلا تجربہ ہے نا؟"

"ہاں!"

"ڈٹے رہو۔ سب خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی ہتھکڑی اور پھانسی کی بہت منزلیں آئیں گی۔ اس موڑ سے گزرنا مشکل ہے۔ لیکن گزر جاؤ گے تم۔ مجھے یقین ہے۔"

"آخر تم مجھے اتنی نصیحت کیوں کر رہے ہو؟"

"یونہی۔ اِس لئے کہ میں اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔"

وہ رات بھر نہیں سویا تھا۔ کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ ثروت کی آنکھیں اُسے پکارتی رہی تھیں۔ وہ اس کا گاؤں کا مکان جو اس کے سسر نے اپنے آقا کو زہر دے کر حاصل کیا تھا اور خود اس کی بیوی کو بیاہ لیا تھا۔ پھر بڑی خاصی زمینداری اس کی ہو گئی تھی۔ اس کے زمیندار سسر کے چہرے پر ہمیشہ محرم کی دسویں تاریخ لکھی رہتی تھی اور یہ کیلنڈر کبھی نہیں بدلتا تھا۔ وہ ثروت کو اپنی قہر بھری نظروں سے دیکھ رہا ہوگا۔ ثروت اس پر بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتی تھی اور وہ اس کٹیا میں بند تھا۔ اس کے پرانے مکان کی چھت پر ثروت بال کھولے کھڑی تھی۔ چاند بادلوں میں تیر رہا تھا اور اس کے پیٹ میں خون ایک زندگی کی گردش کھا رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور وہ اُسے پکار رہی تھی اور وہ اس اندھیری کٹیا میں بند تھا۔ جہاں موم بتی جلتی تھی اور بجھ جاتی تھی۔ جہاں گپتا اسے نصیحت کر رہا تھا اور اُس کی ہمت بڑھا رہا تھا۔ لیکن اُس کی ہمت تنکے کی طرح ثروت کے آنسوؤں میں بہتی چلی جا رہی تھی۔

شاہد صبح سویرے کٹیا سے غائب ہو گیا۔ گپتا گرفتار ہو گیا اور اُس کے گھر جاسوسوں کی آمد و رفت بے تکلف شروع ہو گئی۔ اس کا رشتہ اُس کے پیارے اصولوں سے 'قربانیوں سے' ساتھیوں سے کٹ گیا اور وہ زندگی سے بھاگ کر ثروت کی آغوش میں چھپ گیا۔

اس رات کو جب یار خاں کے پاس سے شراب پی کر آیا اور ثروت کے پاس سو گیا تو وہ دیر تک نیند سے محروم رہا۔ زندگی کے واقعات اُس کے سینے میں چبھتے رہے اور اُسے ایسا لگا کہ اس کے سینے سے ثروت نہیں لگی ہوئی تھی۔ بلکہ اس کی شکست کا کانٹا تھا جو اندر اور اندر چبھتا چلا جا رہا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ثروت بھی اس کی وحشت سے ڈر رہی تھی۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم ڈر رہی ہو۔ آج یار خاں نے مجھے گالی دی ہے۔ میں اُس کی کھال ادھیڑ دوں گا۔"

"تم سور ہو' تم نے بہت پی لی ہے۔"

"ہاں میں سور ہوں گا۔ تم بھی سور ہو۔ منی بھی سور ہے گی۔ ساری دنیا سور ہے گی۔ سالا یار خاں جاگتا رہے گا۔ اُس نے مجھے شراب دی ___ اُس نے مجھے گالی دی۔ اُس کی ایسی تیسی ___ تمہاری ایسی تیسی۔" تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح بکتا رہا اور پھر سو گیا۔

جب اس کی آنکھیں دوبارہ کھلیں تو وہ دور پیپل کی پھنگ پر میلی دھوپ اپنے اجلے پر سکھاتی ہوئی نظر آئی۔ اُس کے منہ میں ابھی تک جلے ہوئے پیاز اور سڑے ہوئے سر کے کا مزا باقی تھا۔ اس نے اپنا منہ بگاڑ کر ایک انگڑائی لی۔ کمرے کے باہر سے کسی کے بات کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ثروت کا قہقہہ آہستہ سے گونجا۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ سلاخوں سے گھری ہوئی چھت کی طرف دیکھا۔ چولھے سے ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا۔ کبھی آنچ لہرا کر نکلی تھی۔ دھوئیں کے لچھوں میں سونا سا گھلتا ہوا نظر آتا تھا۔

ثروت چولھے کے پاس سے اٹھی اور رات کا بھیگا ہوا شاہد کا پاجامہ نچوڑنے لگی۔ اس کی آستین اوپر چڑھی ہوئی تھی اور اس کی پتلی کلائی میں چوڑیاں چھنک رہی تھیں۔ چوڑیاں دھانی رنگ کی تھیں اور نئی ہونے کی وجہ سے چمک رہی تھیں۔ جب دوبارہ کسی کے بولنے کی آواز آئی تو شاہد باہر نکل آیا۔ یار خاں کا منشی اسٹول پر بیٹھا کش لگا رہا تھا۔

"کیوں شاہد صاحب کب تک کرائے کا انتظار کرائیں گے آپ؟"

"اب زیادہ انتظار نہیں کرنا ہو گا۔ اطمینان رکھیے۔"

"یار خاں نے آج صبح ہی صبح ٹوکا تو میں چلا آیا۔ مجھ سے آپ کی بیوی کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔"

"تکلیف وکلیف چھوڑیے۔ آج ہی تنخواہ ملے گی اور آج ہی آپ کا حساب صاف ہو جائے گا۔ کہہ دیجئے گا یار خاں سے ہاں ____

"اچھا تو یہ بات ہے۔ بڑے زور پر ہے مزاج۔ اچھا بھائی یہی سہی۔" جاتے جاتے منشی نے ایک خاص نظر سے اپنے کالروں کو اوپر کھینچتے ہوئے پاؤں پتلون کی کریز سیدھی کرتے ہوئے ثروت کی طرف دیکھا۔

جب منشی چلا گیا تو ثروت نے طیش میں آ کر کہا۔ "آپ کرائے کے پیسے بھی ادا نہیں کرتے اور اوپر سے رعب گانٹھتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ منی کو لے کر میں سڑک پر ماری ماری پھروں۔"

"کیا مطلب؟ ___ اچھا تو یہ بات ہے؟"

اب جو اس نے [illegible] تو گیا۔ وہ اپنی بیوی کا پٹی کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ رات اسے کچھ خبر ہی نہ تھی۔ وہ جلدی سے کمرے میں گیا اور سوٹ کیس [illegible] کرتے لگا اس کا پھٹا ہوا پاجامہ نکل آیا۔ ساتھ ہی اس کے ایک نیا دوپٹہ 'ایک خوبصورت سی

[illegible] ہر مہینہ گھر بھی [illegible] اس کے [illegible] سے باہر نکل [illegible] کو دیکھ [illegible] چھوٹے چھوٹے غریب [illegible] کے [illegible] مکان کو بھی کی [illegible] بیٹھے دھواں [illegible] رہے تھے اور اس کے [illegible] چولہے [illegible] اٹھے تھے۔

جب خاموشی سے اپنے کمرے سے نکلا۔ سر جھکائے ہوئے اس نے کھانا کھایا۔ جب جانے لگا تو ثروت نے کہا "آج آٹا اور چاول ختم ہے۔ تنخواہ کے روپے میں سے منی کا گرم کپڑا ضرور لیتے آیئے گا۔"

"کہاں سے آنا چاہئے گرم کپڑا؟"

"بازار سے اور کہاں سے؟"

"اور کرایہ کہاں سے دیا جائے گا؟"

"کرائے کا بعد میں دیکھا جائے گا۔ ہماری بچی سردی میں ——— خدا نہ کرے کچھ ہو گیا تو؟"

وہ جب اپنی سڑک کے موڑ پر پہنچا۔ تو اس کی ملاقات گپتا سے ہو گئی۔ وہ بہت دبلا اور کالا ہو گیا تھا' وہ اسی طرح مسکرا رہا تھا۔ وہ بیڑی پیئے جا رہا تھا۔

"کیوں شاہد صاحب اب تم کیسے ہو؟ تمہارے بارے میں میں نے بہت بُری بُری خبریں سنی ہیں۔"

شاہد کی آنکھیں جھکی جا رہی تھیں اور صرف کھسیانی سی ہنسی ہنسے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گپتا کسان سبھا کے دفتر میں چلا گیا جاتے ہوئے اس نے شاہد کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہتا گیا ——— "شاہد انسان کمزور ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم ہار گئے۔ میں جیل سے ہو آیا۔ زندہ ہوں۔ تم جیل سے باہر ہو ——— میں نہیں جانتا تم اپنے آپ کو زندہ محسوس کرتے ہو۔ کیا تمہارے مسئلے حل ہو گئے؟ تم خوش ہو؟ اچھے ہو؟"

شاہد ایک مجرم کی طرح سر جھکائے ہوئے آگے چلا گیا۔ اس دن بار بار اس کے ذہن میں گپتا کا کالا' طنز کرتا ہوا' بیڑی کا دھواں پھینکتا ہوا چہرہ اُبھر تا ڈوبتا رہا۔

شام کے وقت اسے تنخواہ ملی۔ اس کے ساتھ ہی اُسے سپر نٹنڈنٹ کا وارننگ لیٹر ملا۔ "ایک مہینہ اور موقع دیا جاتا ہے۔ اگر کام میں ترقی نہیں ہو سکتی تو تمہارا شمار ان لوگوں میں ہو گا جو چھانٹی کی فہرست میں ہیں۔"

ہوٹل کا مالک بھوت کی طرح آ موجود ہوا۔ اُس نے بہت جل دینا چاہا۔ لیکن وہ پیچھے لگا رہا۔ یہاں تک کہ وہ آخر پچھلے دروازے سے نکل بھاگا۔ دوڑ کر رکشے پر بیٹھا اور اسٹیشن کی راہ لی۔ گاڑی چلنے ہی والی تھی کہ ہوٹل کا مالک ڈبے میں داخل ہو گیا اور اسے کھینچ کر باہر نکال لایا۔

"شرافت سے روپے دے دو۔ چکمہ دیتے ہو۔ شریف بنتے ہو۔ آج میں چھٹی کا دودھ اُگلوا دوں گا۔"

اور جب شاہد نے اپنی جیب سے چالیس روپے نکال کر اُس کی ہتھیلی میں رکھے تو واقعی اُسے محسوس ہوا کہ اُس نے چھٹی کا دودھ اُگل دیا ہے اس کی آنکھوں میں تیزاب سا اُبھر گیا تھا۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے ڈبے میں واپس آیا۔ تماشائیوں کی آنکھیں اُسے ملامت کرتی ہوئی نظر آئیں۔ آنکھیں اُس کے چاروں طرف ناچ رہی تھیں۔ لیکن ایک آنکھ سے بھی ہمدردی کا نور نہیں چھن رہا تھا۔ انسان انسان کی ذلتوں' غلاظتوں اور پسپائیوں سے اپنے لئے کتنی تسکین پیدا کر لیتا ہے۔ وہ گھبرا کر ڈبے سے اُتر گیا۔ گاڑی چل دی۔ چھک چھک اور اُسے معلوم ہوا کہ اس کے ہاتھوں سے دس

دس کے نوٹ اُلٹے چلے جا رہے تھے۔ چمک چمک اور مسافر جو چلے گئے تھے۔ وہ بھی کینے تھے۔ شام ہو گئی تھی [illegible] اور ان کے سیاہ سوتے پھوٹ رہے تھے۔ جیسے رات کا میل اس کی آنکھوں میں جل رہا ہو۔ اس کی روح میں [illegible]

جب اندھیرا ہو گیا تو پھر گزشتہ شام کی طرح اسی بار میں گھس گیا ———— ڈی لائیز بار جس کے دروازے پر [illegible] جس کے لمبے سفید کوٹ میں پیتل کے بٹن چمک رہے تھے۔

اُس نے اپنی جیب سے روپے نکالے۔ ترسیٹھ روپے۔ اُس نے اردگرد نظریں نچائیں بار بھرا ہوا تھا [illegible] فضا صاف تھی۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور آسمان ننگا نظر آ رہا تھا۔ ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ کاریں گزر رہی تھیں اور دور امپیریل جمخانہ کی عالی شان عمارت کے پیچھے چاند سونے کی روٹی کی طرح تھر تھرا رہا تھا اور ایروڈروم سے فلیش لائٹ کی شعاعیں گند ھکی جھاڑو کی طرح آسمان کا منہ جھاڑنے کے لئے اُٹھتی تھیں۔ لپکتی تھیں اور ناچتی تھیں۔

"بیرا آج میں سب سے قیمتی شراب پیوں گا۔ اسکاچ ہے؟"

بیرے نے سر ہلاتے ہوئے اپنے دانت نکال دیئے۔

اس نے اسکاچ کو گلاس میں انڈیلا۔ چاروں طرف دیکھا۔ دل میں زور سے چیخا۔ "دیکھ یار خاں کے بچے، عیش کرنے والے کس طرح عیش کرتے ہیں۔" اور جب شراب کا سونا طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرنوں کی طرح اُس کے پیٹ میں اتر گیا تو اس نے بیرے کو قریب بلایا۔ "انڈے لاؤ۔ ہاف فرائیڈ ————"

جب بیرا انڈے لے کر آیا تو وہ اپنا گلاس خالی کر چکا تھا۔ اُس نے دل میں کہا۔ "اسکاچ شراب صبح کی طرح سبک، عورت کے سینے کی طرح گرم اور حسین ہوتی ہے۔"

"بھئی مجھے لوہے کا پرمٹ مل گیا ہے۔"

"تمہاری گپتا تو غضب کرتی ہے۔ ٹینس میں اُس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔"

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"یار میں ایک کا ہو کر نہیں رہ سکتا۔"

"ڈارلنگ کشمیر کب چلیں گے۔ دہلی سے ایر لفٹ اچھا رہے گا۔"

"دیکھو وہ لونڈیا کی کمر ہے یا بید مجنوں۔"

"تم گھانس کھا گئے ہو۔ ارے یہ تو مصنوعی کمر ہے۔ اصلی کمر تو وہ گھر چھوڑ آئی ہے۔"

"اور تم اپنی عقل نیلام گھر میں چھوڑ آئے ہو بیٹا۔"

"تو دیکھو سالا کیا پھٹے حال میں ہے۔ چہرے پر پھٹکار ہے مگر اسکاچ سپ کر رہا ہے۔ ہو گا یار کوئی پاکٹ مار۔"

وہاں جملوں کی آندھی میں تناور درخت کی طرح جھومتا رہا۔ گلاس پر گلاس خالی ہوتے رہے۔ "بیر ا یار خاں آئے تو اُسے دھکے دے کر نکال دو۔ اس سے کہو اس کا باپ آج اسکاچ پی رہا ہے۔ کل اُس نے مجھے گالی دی تھی۔ آج میں اُسے ٹھیک کروں گا۔"

وہ اٹھ کر [illegible] کھڑا ہو گیا۔ ڈر کر اور دوسرے لوگوں نے اپنے گلاسوں کو ہاتھ میں لے لیا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"ارے اس کو [illegible]۔"

"مجھے کوئی قتل نہیں سکتا۔ موت مجھے کوئی نالی ہوا سکتا ـــ [illegible]"

ایک لڑکی نے اپنے عاشق کے کان میں کہا ــــ "سنئے۔"

بیروں نے اُسے آ کر سمجھایا۔ لیکن وہ مگن تھا۔ اس کی بکواس جاری تھی۔ "میں یار خاں سے انتقام لوں گا۔ میں سپرنٹنڈنٹ کو زینوں پر سے دھکیل دوں گا۔ میں کرایہ نہیں دوں گا۔ میں ثروت کو ــــ میں مار دوں" اس کی زبان لڑکھڑا گئی اور منہ سے کف نکلنے لگا۔

بیروں نے اسے بار سے باہر کر دیا۔ اس کی جیب سے پیسے نکال کر اپنے بل کا حساب چکایا اور اُسے رکشے پر بٹھا کر چلا گیا۔ شاہد کی ہچکیاں جاری تھیں اور وہ بکے جا رہا تھا۔

"لے لو سب لے لو۔ میری ساری دولت لے لو۔ ہوٹل والے تی ایسی تیسی یار خاں کی ایسی تیسی۔ اس کے منشی کی ایسی تیسی ــــ"

جب وہ نشے کے عالم میں گرتا پڑتا کیچڑ میں لتھڑتا اپنی گلی کے موڑ پر پہنچا تو اس کی ٹکر ایک سائیکل سے ہو گئی اور وہ گر گیا۔ کسان سبھا کے آفس سے نکل کر گپتا نے اُسے اٹھایا ــــ

ــــ اس نے لیپ کی روشنی میں ایک آنکھ مشکل سے کھول کر گپتا کو دیکھا ــــ اس کے دماغ میں بم سے پھٹنے لگے اور اس سے اپنے آپ کو چھڑا کر وہ اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ "گپتا تم زندہ ہو۔ میں مر گیا ہوں۔ میں مر گیا ہوں۔ مجھے اب کوئی نہیں بچا سکتا ــــ"

وہ اندھیری گلی میں گرتا پڑتا لڑکھڑاتا ڈگمگاتا اپنے مکان سے قریب ہو رہا تھا۔ گپتا کا دبلا پتلا چہرہ اس کی آنکھوں میں انگارے کی طرح جل رہا تھا۔ "میں نے تمہیں جیل بھجوا دیا۔ میں نے اپنے ضمیر کو مار ڈالا۔ میں۔ میں۔"

"ارے شاہد میاں ــــ یہ کیا حال ہے۔ میں تو کرایہ لینے آیا تھا اور تمہارا منہ تو بھٹی کی طرح مہک رہا ہے ــــ جاؤ جاؤ ثروت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔" منشی جلدی جلدی ناک پر رومال ملتا ہوا یار خاں کے مکان کی طرف چلا گیا۔

وہ ہانپتا ہوا زینے پر چڑھا۔ اوپر کمرے کے دروازے پر کھڑا رہا۔ پھر اُس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ہوائی اڈے کی طرف فلیش لائٹ چمک رہی تھی۔ ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ چاند سونے کی روٹی معلوم ہو تا تھا۔

ثروت لیمپ کی دھیمی روشنی میں آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ لیمپ کی ٹوٹی ہوئی چمنی سے دھوئیں کا ایک تار اوپر اٹھ رہا تھا۔ کروسن تیل کی بو کمرے میں بسی ہوئی تھی۔

"کتنا بھیانک کمرہ ہے یہ" شاہد زور سے گرجا۔ کونے کے پاس تھرتھراتے ہوئے جالے والی دیوار سے چمگادڑ زور سے ٹکرایا۔ شاہد نے زور سے ہاتھ بڑھایا۔ لحاف کھینچ لیا۔ منی صرف بنیان پہنے سوئی تھی۔ ثروت صرف پھٹی کوٹ پہنے پڑی ہوئی تھی۔ اس نے پھر بھی اپنی آنکھیں کھولیں۔ شاہد کو اس کے گھلتے ہوئے جسم پر بہت رحم آیا۔ اُس کا جسم کبھی کتنا تندرست تھا۔ اس کے ہونٹ کیسے صحت مند تھے۔ سنگترے کی قاش کی طرح اور آج ــــ اس کے لئے اس نے کیا نہیں کیا تھا۔ اُسے اچانک یار خاں یاد آیا۔ منشی اور پھر گپتا کا مسکراتا ہوا چہرہ رحم اور طنز سے بھرا ہوا۔

"ثروت ــــ" وہ اتنے زور سے چیخا کہ کمرہ گونج اٹھا۔

ثروت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "آج پھر شراب پی لی ہے کیا؟"

"ہاں پی ہے۔ اپنی پی ہے۔ تمہارے باپ کی نہیں پی ہے۔" ثروت سہم گئی۔ "ڈرو نہیں میں آج بے حد خوش ہوں۔ آج پہلی بار میں تمہیں سچ بتاؤں گا۔ دیکھو میں تمہیں ہیرے نہیں دے سکتا۔ میں تمہیں سلکن سوٹ نہیں دے سکتا ــــ!!! میں تو تمہیں اس

ماہ کی تنخواہ بھی نہیں دے سکتا۔" ہچکی لیتے ہوئے اس نے چند آنے پیسے اس کی گود میں پھینک دیئے۔

"آپ نے کیا کیا؟ اب ہمارا کیا ہو گا؟"

"روؤ نہیں۔ میں وحشی نہیں ہوں۔ میں تمہاری گردن نہیں دباؤں گا۔ اسی گردن کے لئے ـــــ" اس نے اپنی انگلی سے اس کی گردن کو چھوا اور یک خباثت سے بھری ہوئی ہنسی ہنسا۔

"خدا کے لئے۔" ثروت گڑگڑائی۔

"خدا تمہارا دیکھو اس بڑے مکان میں رہتا ہے۔ ہے نا؟ وہ اس وقت کسی رنڈی کے ساتھ سویا ہوا ہو گا۔ ہے نا؟"

اُسے زور سے ہچکی آئی اور ایک زبردست ابکائی کے ساتھ اس نے سب کچھ ثروت کی گود میں اگلنا شروع کر دیا۔ ثروت بُت بنی بیٹھی رہی۔ اس کا تو جیسے دم ہی نکل گیا تھا۔

"تم سمجھتی ہو میں نشے میں ہوں۔ بالکل نہیں۔" وہ چارپائی پر پڑی ہوئی منی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں اب کچھ نہیں کہوں گا۔ اب میں شراب پیئوں گا۔ تم اپنے راستے پر چلتی رہو۔ منشی سالا کبھی کرایہ نہیں مانگے گا ـــــ"

"کیا مطلب؟"

"مطلب ـــــ تم پرسوں صبح کے شو میں ریشمی سوٹ پہن کر گئی تھیں یا نہیں۔ وہاں سے تم دریا کی سیر کو گئی تھیں ـــــ غلط؟ ڈرو نہیں۔ ـــــ میں تم سے سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں ـــــ"

وہ چپ ہو گیا اور جھومتا رہا۔ "گپتا نے ٹھیک کہا تھا۔ چٹان جب ایک بار پہاڑ کی چوٹی سے پھسلتی ہے تو کوئی نہیں جانتا ـــــ" ثروت اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگ نکلے گی۔ شاہد نے سوٹ کیس سے ریشمی شلوار اور جمپر نکال کر زمین پر پھینک دیا اور دوپٹہ اوڑھ کر ناچنے لگا۔ ناچتے ناچتے رکا۔ ثروت کو اپنے سینے سے چمٹا لیا ـــــ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے ـــــ

"ثروت، میری جان ـــــ چٹان کو لڑھکنے دو۔ مجھے سمجھوتہ پسند ہے ـــــ"

اتنا کہہ کر وہ آندھی میں اُکھڑے ہوئے درخت کی طرح چارپائی پر گر پڑا۔ منی جاگ پڑی اور زور زور سے رونے لگی۔

---

(۱۰)

مضامین

داستان سے افسانے تک

سید وقار عظیم

کہانی سے انسان کی دلچسپی اور اس مشغلہ سے اس کا لگاؤ' اس کی اجتماعی زندگی کی ایسی حقیقت ہے جسے تاریخ کی سنجیدگی اور اس کے فکر کی منطق نے بھی پورے وثوق کے ساتھ تسلیم کیا ہے۔ انسان اپنی حیاتِ اجتماعی کے بالکل ابتدائی دور میں فطرت کی جن قوتوں سے نبرد آزما اور برسرِ پیکار تھا۔ اس پیکار اور کشمکش میں اسے سختی کی جن منزلوں سے گزر کر فتح و ظفر کا روئے تاباں دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی تھی اس کی روداد میں اس کے لئے قندِ مکرر کی چاشنی تھی۔ کام و دہن کو اسی چاشنی سے آشنا کرنے کی خواہش نے اسے آپ بیتی دہرانے کا عادی بنایا۔ یہی کہانی کہنے یا داستان سرائی کا آغاز ہے۔ تھکے ہارے انسان کو اپنے سارے دن کی تھکن دور کرنے کے لئے فطرتاً کسی ایسے مشغلے کی جستجو ہوتی تھی جو اس کے فطری احساسِ برتری کو بھی تسکین دے سکے اور اس پر عارضی طور پر ایسی خود فراموشی بھی طاری کر سکے کہ اس ماحول میں حقائق کی سختیاں اور تلخیاں اسے نہ ستائیں۔ انسانی زندگی میں یہی رومان کی لذتوں کی ابتدا ہے۔ اپنی ان کشمکشوں کو دہرانے اور رومان کی لذتوں میں گم ہونے کے علاوہ اس مشغلہ میں ایک اور بڑی بات یہ تھی کہ یہ ساری کہانیاں ایک دوسرے کو سمجھنے اور اس طرح ایک دوسرے سے قریب آنے کا بھی وسیلہ تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کی وہ زندگی جس کا پس منظر کوہ و بیاباں کی سنگینیاں اور پہنائیاں ہیں' اس کی داستان سرائیوں سے گونج رہی ہے ____ اس کی ساری رنگینیاں اور اس کا سارا رومان انہی کہانیوں اور داستانوں کی بدولت ہے۔

انسان نے کوہ و بیاباں سے نکل کر' اور سنگِ خارا کی سختیوں سے اپنا رشتہ توڑ کر' لہلہاتی کھیتیوں سے اپنا ناطہ جوڑا اور اس ناطے کے ساتھ اس کے جسم کو راحت و آسائش میں زیادہ لطف محسوس ہونے لگا تو اس کی کہانیوں کا انداز ذرا بدلا لیکن اس بدلے ہوئے انداز میں بھی کہانی کے وہ بنیادی محرکات قائم رہے جو اس کی حیاتِ اجتماعی کے ابتدائی دور کی خصوصیت تھے ____ وہ اب بھی کہانیوں میں اپنے کارناموں کی روداد سُن کر خوش ہوتا تھا' اب بھی کہانیاں اس کے جذبہ برتری کی تسکین کا باعث تھیں اور اب بھی کہانیوں میں اسے حقیقت سے الگ ہٹ کر رومان' تصوّر اور تخیل کی ایک ایسی دنیا نظر آتی تھی جس میں اسے حقیقت کی آزمائشوں سے مکمل نجات حاصل ہو جاتی تھی۔ انسانی زندگی کی مدنیت کی پیچیدگیوں اور تہذیب کی شائستگیوں نے بھی کہانی کی کشش میں کوئی کمی نہیں ہونے دی۔ یہاں تک کہ جب اس نے تجربات' مشاہدات اور محسوسات کو ضبطِ تحریر میں لانا شروع کیا تو کہانی کے ساتھ یہی ابتدائی تصوّرات وابستہ رکھے ____ کہانی دلچسپی کا ایک مشغلہ ہے' کہانی انسان کے ان کارناموں کی روداد ہے جس میں اس نے اپنے ماحول کی کسی متصادم قوت کے مقابل آکر اس پر فتح حاصل کی ہے' کہانی انسان کے احساسِ برتری کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ کہانی حقائق کی دنیا سے دور' تخیل' تصور اور

رومان کے ایک جہانِ حیرت کی تصویر ہے ـــــ کہانی کا یہی تصور ہماری داستانوں کا بنیادی تصور ہے۔

ہماری داستانوں کی تاریخ انیسویں صدی کے نصف آخر میں شروع ہوتی ہے[1]۔ جن تصانیف کو ہم باقاعدہ داستان کہہ سکتے ہیں ان میں سب سے پہلی تحسین کی نوطرزِ مرصع[2] ہے۔ اس کے چند ہی سال بعد فورٹ ولیم کالج کا دور شروع ہو جاتا ہے اور دریں کی نوطرزِ مرصع یا باغ و بہار (تالیف ۱۸۰۱ء) اور انشا کی "رانی کیتکی کی کہانی" (تصنیف ۱۸۰۳ء) کو چھوڑ کر بیسویں صدی میں جتنی داستانیں لکھی گئیں وہ سب کی سب فورٹ ولیم کے منصوبے کے ماتحت لکھی گئیں۔ اس دور کی داستانوں میں باغ و بہار (میر امن) حیدر بخش حیدری کی آرائشِ محفل اور طوطا کہانی، خلیل علی خاں اشک کی داستانِ امیر حمزہ، بہادر علی حسینی کی نثرِ بے نظیر، مظہر علی ولا اور للو لال کی بیتال پچیسی، کاظم علی جوان اور للو لال کوی کی سنگھاسن بتیسی زیادہ معروف و مقبول ہیں اور ۱۸۰۱ء اور ۱۸۰۳ء کے درمیان لکھی گئیں۔ فورٹ ولیم کالج کے دور کے بعد انیسویں صدی کے آخر تک جو بے شمار داستانیں تصنیف ہوئیں ان میں محمد بخش مجور کی نورتن (۱۸۱۴ء) سرور کی فسانۂ عجائب، نیم چند کشمیری کی گلِ صنوبر (۱۸۳۷ء) الف لیلہ (۱۸۴۲، ۱۸۴۴) بوستانِ خیال[3]، طلسم ہوش ربا[4]، سخن دہلوی کی سروشِ سخن (۱۸۶۰ء) شیون کی طلسم حیرت (۱۸۷۲ء) اور الف لیلہ (مرزا حیرت اور رتن ناتھ سرشار) زیادہ مشہور ہوئیں۔ ان مشہور و معروف داستانوں کے علاوہ جن کا حجم کئی ہزار صفحے ہے، اسی دوران میں سینکڑوں داستانیں لکھی گئیں۔ ان میں سے بہت سی چھپی اور بہت سی اب بھی کتب خانوں میں غیر مطبوعہ کتب کے خزانوں میں شامل ہیں۔

ان سب داستانوں کے مطالعہ کے بعد پڑھنے والا (ایسا پڑھنے والا جو کتابوں کو طالب علم کی طرح پڑھتا ہے) بڑی آسانی سے کچھ ایسی باتیں تلاش کر لیتا ہے جن سے یہ سب تصانیف ایک خاص صنف کے دائرے میں آجاتی ہیں۔ ان سب داستانوں میں بوستانِ خیال اور داستانِ امیر حمزہ (اور طلسم ہوش ربا) جیسی ضخیم و جسیم اور لحیم شحیم داستانیں بھی شامل ہیں اور بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی، طوطا کہانی اور انشائے نورتن میں چھپی ہوئی ایک ایک دو دو صفحوں کی کہانیاں بھی، اور ان دونوں کے بیچ میں الف لیلہ کے نسبتاً بڑے اور رانی کیتکی کی کہانی جیسے متوسط قد و قامت کے قصے بھی۔ لیکن ضخامت اور حجم سے قطع نظر ان سب میں کچھ مشترک باتیں ایسی ہیں جو انہیں ترتیب، ساخت اور اس سے بھی بڑھ کر دلچسپی کے نقطۂ نظر سے ایک ہی زنجیر کی کڑیاں بناتی ہیں۔ ایک خاص قسم کا قاری، ان کی تفصیلات کے فرق کے باوجود ان سب میں ایک ہی قسم کی دلچسپی محسوس کرتا ہے۔ ایک ہی طرح کا تاثر قبول کرتا ہے اور ایک ہی قسم کے ردِ عمل سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ سب داستانیں پڑھنے والوں کے لئے ایسی تفریح، دلچسپی اور ذہنی انبساط کا سرمایہ مہیا کرتی ہیں جس میں منطق اور استدلال کی کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ ان سب داستانوں اور کہانیوں کا مقصد بنیادی طور پر صرف یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کی دلچسپی کا ذریعہ بن سکیں۔ اس دلچسپی کے حصول کے لئے لکھنے والوں نے عموماً ایک ہی سے نسخے استعمال کئے ہیں۔

ان چھوٹی بڑی سب داستانوں میں دلچسپی پیدا کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ قصہ کو جہاں تک ممکن ہو طول دیا جائے تاکہ پڑھنے والا زیادہ سے زیادہ عرصہ تک حقیقت کی دنیا کو بھول کر رومان اور تخیل کی دنیا کی سیر کر سکے۔ کہانی کو طویل بنانے کے لئے ہمارے داستان

۱۔ میں نے وجہی کی سب رس کو جو بعض نقادوں کے نزدیک اردو کی پہلی داستان ہے اس خیال سے اپنے بیان کا جزو نہیں بنایا کہ وہاں مصنف کا مقصود کہانی سنانا نہیں۔

۲۔ نوطرزِ مرصع کا سنہ تصنیف (یا تالیف) ۱۸۷۵ء اور ۱۸۸۱ء کے درمیان ہے۔

۳، ۴۔ ان دو کتابوں کے ساتھ میں نے مصنفوں کے نام اور کتابوں کے سنہ تصنیف اس لئے نہیں لکھے کہ ان کتابوں کے حصے مختلف مصنفوں نے مختلف سنوں میں دلی اور لکھنؤ میں تالیف کئے۔

نویسوں نے عموماً یہ انداز اختیار کیا ہے کہ وہ اصل قصہ کے ساتھ ضمنی قصے بڑھا کر پڑھنے والے کی توجہ اور انہماک کے لئے گنجائش نکالتے رہتے ہیں۔ باغ و بہار جیسی متوازن اور فسانہ عجائب جیسی ادبی داستان میں بھی یہ خصوصیت موجود ہے اور سنگھاسن بتیسی بیتال پچیسی اور طوطا کہانی جیسی کہانی نما داستانوں میں بھی ایک کہانی سے دوسری کہانی پیدا ہوتی ہے۔ آرائش محفل، بوستان خیال اور طلسم ہوش ربا اور داستان امیر حمزہ کی تو یہ یوں بھی امتیازی خصوصیت ہے۔ اردو کی سب داستانوں میں رانی کیتکی کی کہانی اور انشائے نادر تین صرف دو مستثنیات ہیں۔ اصل کہانی میں ضمنی کہانیوں کا اضافہ کر کے انہیں طول دینے کی کوشش میں کہانی کی وحدت اس کے تناسب و توازن اور مجموعی تاثر میں جو کمی آتی ہے (اور جسے اب کہانی کے فن کا ایک ناگزیر عنصر سمجھا جاتا ہے) اس کا احساس ہمارے داستان گویوں کو بالکل نہیں تھا۔ کہانی کی ابتدا کے بعد اس منزل کا آنا' جب مسئلہ ایک واضح شکل اختیار کرتا ہے اور کہانی ایک خاص راستہ پر چل کر ارتقا کے مختلف مرحلے طے کر کے نقطہ عروج اور خاتمہ تک پہنچتی ہے' داستان کے فن کی روایت میں شامل نہیں تھا (کہانی میں اٹھان بھی کوئی چیز ہے' اس کا تصور سید انشا نے رانی کیتکی میں البتہ پیش کیا ہے[1]) کہانی میں جس چیز کو Suspense کہتے ہیں اور جو کہانی کی دلچسپی کا لازمی عنصر ہے داستانوں میں ہے ضرور' لیکن عموماً اس پر ایک طرح کا تصنع غالب ہے۔ اسی مصنوعی تصنع کی وجہ سے داستان پڑھنے والے کو پوری طرح اپنی گرفت میں لینے سے قاصر رہتی ہے ——— لیکن داستان گو کے پاس داستان میں دلچسپی پیدا کرنے اور قاری کو اپنا ہم نوا بنانے کے لئے اور بہت سے وسیلے ہیں۔

ان بہت سے وسیلوں میں ایک وسیلہ یہ ہے کہ وہ حقیقت کی دنیا سے الگ' پڑھنے والے کے لئے رومان کا ایک جہان دلکش آباد کرتا ہے۔ اس دنیا میں ان لوگوں کی کثرت و فراوانی ہے جنہیں خدا نے تاج داری و جہاں بانی کا شرف بخشا ہے۔ بادشاہ' وزیر' امیر' تاجر سے اس دنیا کی رونق اور آبادی ہے۔ بادشاہوں' وزیروں' امیروں اور تاجروں کی اس دنیا کی رونق' اس کے شان و شکوہ' اس کی شان جلال و جمال میں ہی قاری کے لئے وہ کشش ہے جس سے وہ اپنی سیدھی سادی حقیقت کی دنیا میں محروم رہتا ہے۔ اس رنگین' حسین و جمیل اور پر شکوہ دنیا کی تشکیل و تعمیر داستان گو کے فن کی روایت کا حصہ ہے اور اپنی روایت کی اس دلکشی سے وہ قاری کے دل کو موہتا ہے۔

بادشاہوں' وزیروں' امیروں کی اس دنیا پر پریوں کا سایہ بھی ہے۔ پریاں' جن' دیو' ساحر اور نجومی رومان کی اس عجیب و غریب دنیا کے باسیوں کے مسرت و غم میں ان کے شریک ہیں اور اس لئے پڑھنے والے کو اس دنیا میں ایسی ایسی باتیں نظر آتی ہیں جو عقل و فہم کی رسائی سے باہر ہیں۔ ان غیر معمولی اور مافوق الفطرت باتوں کو عقل کسی صورت میں بھی قبول نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ انسانی تجربہ اور مشاہدہ کے لئے یہ سب کچھ انوکھا اور نرالا ہے۔ لیکن داستان گو کا دائرہ عمل دنیائے حقائق کے بجائے عالم سحر اور جہان نظر کے بجائے عالم تخیل و تصور ہے اس لئے داستان کا قاری اسی دنیا کی سیر سے مطمئن و مسرور ہوتا ہے اور یوں داستان گو کے اس فنی منصب کی تکمیل ہو جاتی ہے کہ وہ قاری کے لئے سرور و انبساط کا سرمایہ مہیا کرے۔

تخیل و تصور کی اس دنیا کے باشندے یوں دیکھنے میں ہماری دنیا کے انسانوں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں لیکن اپنے غیر معمولی عمل اور قوتوں کی بنا پر ان کی سیرت اور شخصیت مثالی بن جاتی ہے ——— جو نیک ہے وہ نیکیوں کی ان سب خصوصیات کا حامل ہے جو انسان کے تصور میں آسکتی ہیں' جو بد ہے وہ بدی کا ایسا مجسمہ ہے کہ شیطان بھی اس سے پناہ مانگتا ہے۔ نیکی اور بدی کی قوتوں کے حامل اور علم بردار ان مثالی کرداروں کی شناسائی پڑھنے والوں کو اس لئے مطمئن کرتی ہے کہ یہاں انہیں وہ اہم اقدار برسر عمل دکھائی دیتی ہیں جن کا حقیقت کی دنیا میں وہ صرف تصور کر سکتے ہیں۔ وہ بدی جو اسے زندگی میں ہمیشہ سختیوں اور آزمائشوں میں مبتلا رکھتی ہے' یہاں نیکی سے متصادم ہوتی ہے تو ہمیشہ شکست کھاتی ہے اور یہی چیز اس کی خوشی کا سرچشمہ ہے۔ داستان گو نے اپنی داستانوں کے ذریعہ انسان کو یہی خوشی دی ہے اس لئے عقل و منطق سے عاری ہونے پر بھی وہ اس کی دلچسپی کا وسیلہ ہے۔

1۔ انشا نے اسے ابھار کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ تمہید کے بعد رانی کیتکی کی کہانی میں یہ عنوان ہے "کہانی کا ابھار اور بول چال کی دولہن کا سنگار"

داستانوں نے انسان کے لئے عملی زندگی کا ایک ایسا نمونہ مرتب کیا ہے جس میں عقل و عشرت کی فراوانی ہے' جرات' ہمت' شجاعت اور مردانگی کے بدلے ابدی سکون و راحت کا انعام ہے' مہر و فا' محبت اور وفاداری کے بدلے جاہ و ثروت ہے۔ عارضی سختی کوشی کے بدلے دائمی راحت ہے۔ یہ دنیا مشاہدہ اور فکر نے نہیں تصور و تخیل نے آباد کی ہے اور اس کی تزئین میں ادبیت و شعریت نے اپنی پوری قوتیں صرف کی ہیں اس لئے ہر طرف حسن و جمال کے جلوے ہیں اور یہی بات قاری کے لئے کشش کی ہے۔

ہماری داستانوں نے کہانی میں دلچسپی و دل فریبی کی' تخیل و تصور کی' کشمکش اور جد و جہد کی اور پھر شادمانی و مسرت کی' سکون اور راحت کی' باطل پر حق کی فتح کی' انسان اور فطرت کے تصادم اور ہم آہنگی کی' مادہ' روح اور سحر و افسوں کی نیرنگی عمل کی فضا بنائی اور اس طرح ایک ایسی دنیا بسائی جو کبھی کبھی حقیقت کی دنیا سے بھی زیادہ سچی اور قابلِ یقین نظر آتی ہے۔ جو کچھ فطری نہیں وہ یہاں فطری اور جو ناقابلِ یقین ہے وہ یقینی اور قابلِ قبول بن جاتا ہے۔ یہاں فن کی ساری روایت دل کے تقاضوں پر قائم ہے کہ اسی تقاضے کی منطق وہ واحد منطق ہے جس میں مخاطب کی دلچسپی اور اس کی خوشنودی کا مقام سب سے پہلا بھی ہے اور سب سے اونچا بھی۔

ابھی اردو میں داستان گوئی کا عہدِ شباب ختم نہیں ہوا[1] تھا کہ کہانی کی ایک نئی صنف نے جنم لیا اور اس طرح کہانی کی روایت نے ایک دوسری طرف رُخ موڑا۔ نذیر احمد کے ناولوں نے کہانی کو تخیل اور تصور کی دنیا بسانے کے بجائے حقیقت کی دنیا میں قدم رکھنا سکھایا۔ کہانی کو محض دلچسپی اور تفریح کی چیز سمجھنے کے بجائے اسے معاشرتی زندگی کے مقاصد کا حامل اور علم بردار بنانے کی تعلیم دی۔ رومانیت کو کہانی کے لئے جنسِ غریب قرار دے کر حقیقت کو اس کی بنیاد بنایا۔ خیر اور حق کے عالمگیر تصورات کے ساتھ ساتھ ایک مخصوص معاشرے کے مسائل کو کہانی کے رگ و پے میں جذب و سرایت کیا اور بیان میں شعریت' ادبیت اور رنگینی کو مقصود بالذات سمجھ لینے کے بجائے اسے زندگی کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا اور تکلف و تصنع کی جگہ سادگی کو (ایسی سادگی کو جس پر تصنع کا سایہ نہ پڑا ہو) حسنِ بیان کا زیور جانا اور سادگی بیان کی معنوی وسعتیں اور اس کے امکانات واضح کئے' پھر بھی داستان کی قائم کی ہوئی اس روایت کو اپنا رہنما بنایا کہ کہانی کے کردار حقیقی سے زیادہ مثالی ہوں اور ان سے ایسے غیر معمولی افعال و اعمال وجود میں آئیں کہ دنیا محوِ حیرت رہ جائے۔ وہ نیکی کے جس راستے پر گامزن ہوں وہی راستہ زندگی کا سب سے پسندیدہ راستہ معلوم ہو اور اس راستے پر چلنے والے کو بہر صورت کامیاب و کامران دکھایا جائے اس لئے کہ ناظر کی خوشنودی اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے۔ نیکی کے ساتھ داستان گویوں کو جو جذباتی اور مبالغہ کی حد تک غیر منطقی لگاؤ ہوتا تھا اسے نذیر احمد نے بھی اسی طرح قائم رکھا اور اس کی خاطر فن کی ہر نزاکت و لطافت کی قربانی دی۔ ابتدائی دور کے ناول نگاروں میں شرر اور سرشار نے بھی داستان کی روایت کے ساتھ کسی نہ کسی طرح اپنا رشتہ قائم رکھا۔ سرشار کی مخصوص حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ فسانہ آزاد میں واقعہ نگاری کی رنگینی' طرزِ بیان کی صنعت گری اور کرداروں کے عمل میں حد درجہ کی سنجیدگی کے ساتھ' مبالغہ اور مضحکہ کا امتزاج اور قدم قدم پر معمولی سے فعل کو مہم کا رنگ دینے کا رجحان داستان کی روایت کے باقیات الصالحات ہیں۔ اسی طرح شرر کے ناولوں میں (خصوصاً تاریخی ناولوں میں) بہادری اور جاں بازی کے مبالغہ آمیز کارناموں کی کثرت' ہیرو کی تاریخی شخصیت کی صداقت میں تخیل کی رنگ آمیزی' مناظر فطرت کے بیان میں واقعہ نگاری کے بجائے شاعرانہ تصور آفرینی کا غلبہ اور منطق کے احساس کو بھلا کر کہانی کو طرب انگیز انجام دینے کی کوشش اور ان سب باتوں میں فن کے مطالبات کی پیروی کے بجائے قاری کی خوشنودی مزاج کی تسکین کا خیال داستان کی روایت کے عناصر ہیں۔ ناول اپنے ابتدائی دور

---

1 اردو کا پہلا ناول مراۃ العروس ۱۸۶۹ء میں تصنیف ہوا اور ذیل کی داستانیں اس سنہ کے بعد تصنیف' تالیف و ترجمہ ہوئیں
داستان امیر حمزہ ــــ سید محمد عبداللہ بلگرامی (۱۸۷۱ء) طلسم حیرت ــــ جعفر علی شیون (۱۸۷۲ء) بوستان خیال ــــ محمد عسکری و آغا محمد (۱۸۸۲ء تا [illegible]) داستان امیر حمزہ ــــ تصدق حسین جاہ، احمد حسین قمر (۱۸۸۳ء تا ۱۹۰۱ء) ہزار داستان ــــ حامد علی خان (۱۸۸۹ء)
شبستان حیرت ــــ [illegible] (۱۸۹۲ء) الف لیلہ ــــ رتن ناتھ سرشار (۱۹۰۱ء)

میں یایوں کہنا چاہیئے کہ نذیر احمد شرر اور سرشار کے ہاتھوں حقیقت کی زندگی کا مصور، ترجمان، مفسر، نقاد اور خدمت گزار بن کر بھی اپنے آپ کو تخیل، تصور اور شعریت کی ان قدروں سے جدا نہیں کر سکا جن کی مدد سے داستان نے ایک جہان نو بسانے کی روش کو اپنا شیوہ بنایا تھا۔ نذیر احمد، شرر اور سرشار نے داستان کی روایت کو عزیز رکھتے ہوئے بھی کہانی کو حقیقت نگاری اور احترامِ فن کا جو انداز سکھایا تھا اسے ان کے بعد آنے والوں نے تکمیل کی راہ دکھائی۔ ہماری ناول نگاری کا دوسرا دور تکمیل راہ کی مختلف منزلوں کی نشان دہی کرتا ہے۔

اس دور کے لکھنے والوں میں سجاد حسین کے علاوہ مرزا رسوا اور مرزا محمد سعید کے ناول بعض حیثیتوں سے کہانی کے فن کے ارتقا میں ایسے مدارج طے کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جن کے طے کئے بغیر فن کے نصب العین تک رسائی ناممکن ہے۔

سجاد حسین نے لکھنوی معاشرے کو اپنے ناولوں کا پس منظر بنا کر مرقع کشی اور اصلاحِ معاشرت کے جو مطالبات پورے کرنے کی کوشش کی ہے اس میں ان کے سامنے ہمیشہ یہ بات بھی رہی ہے کہ قاری اصلاحی مقصد میں ان کا ہم نوا ہونے کے ساتھ ساتھ کہانی میں دلچسپی بھی محسوس کرے کہانی میں دلچسپی کے عناصر کا وجود کہانی کی روایت کے تسلسل کا مظہر ہے اور روایت کے اس پہلو کو ہمارے کہانی کہنے والوں نے (جن میں ناول نگار اور افسانہ نگار بھی شامل ہیں) اکثر یاد رکھا ہے۔ یہاں تک کہ مرزا رسوا اور مرزا محمد سعید بھی' جو فلسفیانہ فکر' منطقی ترتیب اور نفسیاتی تجزیہ کو ناول کے ضروری اجزا جانتے ہیں، اس حقیقت کو فراموش نہیں کرتے کہ فلسفہ 'منطق اور نفسیات میں جب تک ایسے عناصر شامل نہ کئے جائیں کہ وہ قاری کے لئے قابلِ قبول بن سکیں' کہانی میں ان کی کوئی جگہ نہیں۔ اس طرح کہانی نے جو سفر داستان کی رنگین' رومانی اور تخیلی سرزمینوں میں شروع کیا تھا اور پھر نذیر احمد کی رہنمائی میں محض تخیل و تصور کو چھوڑ کر حقیقت کی سادہ دنیا میں قدم رکھا تھا۔ رسوا اور مرزا محمد سعید کی رہبری نے اسے نفسیات کی پر پیچ وادیوں سے آشنا کیا۔

نذیر احمد نے کہانی کو محض نشاطِ خاطر کا ایک ذریعہ سمجھنے کے بجائے اس سے معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کا اہم کام لیا۔ شرر نے اصلاح کے اس مقصد و منصب کو اور زیادہ واضح شکل دے کر اسے وسیع تر قومی مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ سرشار نے بھی' گو ایک معنوی انداز میں سہی' زمانہ کی روش سے متاثر ہو کر اپنے ناولوں میں تزئینِ اخلاق کی طرف اشارے کئے۔ رسوا اور مرزا محمد سعید کے ناولوں (امراؤ جان ادا اور خوابِ ہستی) میں مقصدیت کی بنیادیں اور زیادہ مضبوط اور اس کی جڑیں اور زیادہ گہری ہوئیں۔ نذیر احمد کے یہاں زندگی کے پس منظر کے باوجود مصنف کی اصلاح کا جذبہ اور مقصدیت قاری کی خوشنودی کے احساس پر غالب ہے۔ شرر کے یہاں کم تر اور سرشار کے یہاں نسبتاً زیادہ قاری کو اپنے آپ سے قریب لانے کا احساس نمایاں ہے۔ لیکن اس احساس کو شرر اور سرشار دونوں نے جو عملی شکل دی ہے اس میں ہر جگہ تصنع نمایاں ہے۔ کہیں شاعرانہ منظر نگاری کی شکل میں' کہیں سستے اور جذباتی رومان کے پیرایہ میں' کہیں جوشیلے اور ولولہ انگیز واقعات کے ذکر میں اور کہیں کہانی کے ایسے انجام میں جو کہانی کے اٹھان' ارتقا اور نقطہ عروج کے ساتھ منطقی مطابقت نہیں رکھتا بلکہ قاری کے تصورات کی ہم نوائی کو اپنا مقصد جانتا ہے۔ مرزا محمد سعید اور مرزا رسوا کے ناولوں میں قاری کی خوشنودی کے یہ مصنوعی اور جذباتی وسیلے اعتدال و توازن کا قرب حاصل کرتے ہیں اور لکھنے والے فکر' تخیل اور مقصدیت میں مناسب امتزاج پیدا کر کے فن کی اس روش کا آغاز کرتے ہیں جو واضح طور پر ناول کے فن کی روش ہے۔ کہانی کے مختلف اصناف ہیں' اس رشتہ کی بنا پر کہ انسان کی یہ فطرت اس کی محرک ہے کہ وہ انسانی زندگی کے متعلق زیادہ سے زیادہ جانے اور اس کے احساسِ برتری کو زیادہ سے زیادہ تسکین کا سامان میسر آئے۔ ایک خاص طرح کا ربط اور تسلسل ہے اور اس لئے داستان اور ناول کی بنیادوں میں یہ مشترک محرکات پھلتے اور ترچتے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان مشترک عناصر کے علاوہ جنہیں فنی تسلسل کا لازمی اور منطقی تقاضا کہنا چاہیئے' ناول نے ایک

[illegible] ادب کی طرح قائم کیا اور اس کے باوجود کہ [illegible] کے پردے میں [illegible] داستان اور ناول کے درمیانی رشتے کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ناول کا ایک [illegible] اس فن کی ابتدا [illegible] سے ہوئی۔ [illegible] اور سرشار نے اس فن میں [illegible] کا اضافہ کیا لیکن داستان اور ناول کو ایک دوسرے سے پوری طرح علیحدہ کر سکے۔ یہ صورت سب سے پہلے [illegible] اور خواب ہستی میں پیدا ہوئی۔ اس کے بعد تقلید کا ایک ایسا دور آیا جس میں محمد علی طبیب اور راشد الخیری نے نئی [illegible] کی ترتیب کی اور پھر ناول کا فن ایک ایسی منزل پر پہنچا جسے پریم چند کی منزل کہنا چاہئے۔

پریم چند کی ناول نگاری کئی حیثیتوں سے اردو میں ناول نگاری کے فن کی تکمیل کی منزل ہے۔ پریم چند کے معاشرتی اور سیاسی زندگی کے گہرے مشاہدے، اس مشاہدے کے ساتھ فرد اور جماعت کی زندگی کے اہم مسائل کے مطالعے، اس مشاہدے اور مطالعے کے بعد فکر، تخیل اور جذبات کی صحیح آمیزش اور پھر ان سب چیزوں کو فن کے سانچے میں ڈھالنے کے واضح احساس اور احساس کو پوری ذمہ داری کے ساتھ عملی شکل دینے کی کوشش نے پریم چند کے ناولوں کو اردو ناول نگاری میں فن کا معیار بنایا ہے۔ پریم چند کے ناولوں کا قائم کیا ہوا معیار واقعہ نگاری کی تفصیلات و جزئیات، کردار نگاری کی جذباتی و نفسیاتی بنیاد اور فن کی ترتیب و توازن کی کسوٹی بھی ہے اور ایک سوچنے اور محسوس کرنے والے انسان کے تجربات و محسوسات کی ایسی تصویر بھی جس میں زندگی کی صداقتوں اور فن کی نزاکتوں کا یکساں احترام کیا گیا ہے۔ پریم چند کی ناول نگاری کا ابتدائی دور تو یقیناً ایک شدید قسم کی جذباتی اصلاح پسندی کا دور ہے لیکن اس کے آخری ایام [illegible] زندگی اور فن کے امتزاج کا بے حد دلکش نمونہ ہیں۔ اس نمونے کو کہیں کہیں مغرب کے بلند ترین معیاروں کا ہمسر تسلیم کرنے میں ضرور تامل ہوتا ہے لیکن اس میں یقیناً کوئی شبہ نہیں کہ اردو میں ناول نگاری کے فن کی معراج وہی ہے جہاں پریم چند نے اسے پہنچایا تھا۔ گئودان اور میدانِ عمل، پریم چند کے ایسے ناول ہیں جن میں کہانی کی روایت کے بہترین عناصر مجتمع ہیں۔ ہماری داستان نے کہانی کو حسنِ تہذیب کا نقش، رنگینیِ رومان و تخیل کا مرقع اور جذباتی اور ذہنی تسکین و لطف اندوزی کا وسیلہ بنا کر کہانی کے فن میں ایک مخصوص صنف کا اضافہ کیا، اسے ہمارے ناول نے پوری طرح اپنے اندر سمو کر کہانی کو ایک صنف دی جس میں بھرپور زندگی بھی ہے اور بھرپور فن بھی، ایک کا پھیلاؤ، دوسرے کی گہرائی، ایک کی پیچیدگیاں، دوسرے کی نزاکتیں، ایک کا حُسن و جمال اور دوسرے کی اثر انگیزی۔

لیکن جس طرح زندگی ایک جگہ نہیں ٹھہرتی فن بھی اس کی بے چینی اور بے قراری کا ساتھ دیتا رہتا ہے۔ زندگی آگے بڑھتی ہے، فن بھی آگے بڑھتا ہے، اس لئے کہ زندگی فن سے اسی بات کی طالب اور متقاضی ہے اور فن زندگی کی اس طلب اور تقاضے کا ساتھ نہ دے سکے تو زندہ نہیں رہ سکتا۔

زمانے نے ادیب اور فن کار سے کہانی کی ایک ایسی صنف کا تقاضا کیا تھا جو رومان کی رنگینیوں کے بجائے زندگی کی سادہ و پر پیچ حقیقتوں کی حامل ہو ___ ایک ایسی صنف جس میں فن کار کے تخیل اور تصور کی جدت پسندی نہیں بلکہ تفکر کی گہرائی شامل ہو، جس میں انسان زندگی کی تلخیوں سے گھبرا کر ایک اَن دیکھی دنیا کی سیر کرنے کی جگہ اس کی کشمکش سے دوچار اور نبرد آزما ہو، جہاں اسے زندگی سے فرار کی نہیں اس سے اُلجھنے اور اس کی اُلجھنوں کو سلجھانے کی تعلیم ملے ___ جہاں فن کار محض مصوّر نہیں، مبصر، اور نقاد اور معلّم کے فرائض اور منصب پورے کرنے کی خدمت انجام دے، جہاں جذبات اور احساسات پر فن کی منطق حاوی اور غالب نظر آئے۔ زمانے کی اسی طلب اور تقاضے نے ناول کی تخلیق کی اور آہستہ آہستہ اس نے داستان کی جگہ لے لی۔

ناول شروع ہوا تو اس نے ارتقا کے مختلف مدارج و مرحلے طے کئے لیکن زمانہ بدلا تو اس کے تغیر پسند مزاج نے ایک دوسری طرح

کی کہانی کا مطالبہ کیا ایسی کہانی جو زندگی کی ساری وسعتوں پر حاوی اور اس کی گہرائیوں کی ترجمان ہوتے ہوئے بھی ایک ایسے فریم کی علم بردار ہو جہاں ایجاز و اختصار کی حکمرانی ہو۔ جاگیردارانہ نظام اور عشرت پسند تہذیب کے تقاضوں نے داستان جیسی صنف کی تخلیق کی تھی۔ حقائق کے تلخ احساس اور زندگی کے مسائل کو کہانی کے ذریعہ حل کرنے کی خواہش نے ناول کو جنم دیا۔ لیکن وقت میں پہلا سا پھیلاؤ باقی نہیں رہا اور انسان کو اپنے تفریحی مشاغل میں کتر بیونت اور کانٹ چھانٹ کرنی پڑی تو اس کا وہ مزاج جسے کہانی سننے کا چسکا ازل سے ہے افسانہ کی ایک ایسی صنف کا طلبگار ہوا جو زندگی اور فن کو اس طرح سموئے کہ انسان کو اس سے ذہنی سرور و مسرت کا سرمایہ بھی ہاتھ لگے' زندگی کے مسائل کو حل کرے اور اپنے ماحول کو حسین تر بنانے کی آرزو بھی پوری ہو اور اس کے باوجود اتنی مختصر ہو کہ وقت پر اس کی گرفت مضبوط رہے' وہ اپنے بے شمار مشاغل میں سے بھی کہانی پڑھنے کا وقت نکال سکے' زمانے کے یہ سب تقاضے اور انسان کی یہ سب ضرورتیں مختصر افسانہ کی تخلیق کی بنیاد بنیں۔

اردو میں جس طرح ناول کی ابتدا ہو جانے کے بعد بھی داستان پوری آب و تاب کے ساتھ زندہ رہی۔ اسی طرح ناول کے عین فنی عروج کے زمانہ میں مختصر افسانہ پیدا ہوا اور پروان چڑھنا شروع ہوا۔ افسانہ کی پیدائش کے دن وہ ہیں جب ہمارا ناول آہستہ آہستہ فلسفہ' منطق اور نفسیات کی دنیا میں قدم رکھ رہا تھا۔ امراء جان ادا اور خواب ہستی کی تخلیق کا دور افسانہ کی پیدائش کا زمانہ ہے ——— پھر ایک بات اور بھی ہے کہ ناول کہانی کی ایک منفرد اور ممتاز صنف ہونے کے باوجود مدتوں اپنے آپ کو داستان کے سحر وافسوں سے آزاد نہ کر سکا اور ہمارے ابتدائی ناول نگاروں میں سے ہر ایک کے یہاں داستان کے رنگ کی جھلکیاں اور اس کے نور کی کرنیں برابر اپنا جلوہ دکھاتی رہیں۔ یہی صورت مختصر افسانہ کے ساتھ پیش آئی۔ ہمارے مختصر افسانہ کے ابتدائی دور میں واضح طور پر داستان کی دل کش روایت کا عکس جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

اردو کے سب سے پہلے افسانہ نگار پریم چند کے مختصر افسانوں کے کئی ابتدائی مجموعے 'سوز وطن' پریم پچیسی اور پریم بتیسی اور ان میں بھی نمایاں طور پر سوز وطن' ان کے ہم عصروں میں سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں میں خارستان و گلستان' سلطان حیدر جوش کے اکثر اصلاحی افسانے اور نیاز فتح پوری کے افسانوں کا مجموعہ نگارستان اور اس میں بھی بالخصوص کیوپڈ اور سائکی اور الحمرا کا گلاب وغیرہ اس رنگین روایت کی نشانیاں اور یادگاریں ہیں۔

سوز وطن کے افسانوں میں "دنیا کا سب سے انمول رتن" اور "شیخ مخمور" کی فضا اور ماحول سر تا سر رومانی ہے' اس رنگین اور رومان انگیز فضا میں کرداروں کا مزاج' ان کا جذباتی انداز فکر و نظر' گفتگو کا شاعرانہ اور پر تصنع اسلوب' افسانے کے انجام میں حق کی اقدار کی فتح' یہ سب داستانی رنگ کی باقیات ہیں اسی طرح پریم پچیسی اور پریم بتیسی کی کہانیوں میں تاریخ و روایت کا افسانوی اسلوب' کرداروں کی دلیرانہ اور حق پرستانہ سیرت' ان کے افعال و کردار پر غیر فطری جوش کا غلبہ' حق کی حمایت میں عمل کے جذباتی اور بعض صورتوں میں غیر منطقی حدود ——— یہ سب کچھ بھی افسانہ نے داستان کی روایت سے حاصل کیا اور اسے برقرار رکھا ہے۔ یلدرم کے افسانوں میں افسانوی فن کے مزاج اور اس کی فطرت کے احترام اور انہیں فکر و عمل کے منطقی حدود میں رکھنے کی عام روش کے ساتھ ساتھ مناظر فطرت کی رنگینیوں اور بہار آفرینیوں کو جذبہ محبت اور رومان کا پس منظر بنانے اور انسانی جذبات اور حسن فطرت میں باہمی ربط و ہم آہنگی پیدا کرنے کا رجحان داستانی فن کی روایات سے لگاؤ کا نتیجہ ہے۔ نیاز فتح پوری کے افسانوں میں موضوع سے لے کر اس کی ہیجان انگیز و نشاط آفریں ترتیب و تشکیل اور کرداروں کے پر جوش و رومانی عمل اور رد عمل تک ساری چیزیں داستانوں کے تخیلی اور نشاط

[illegible] ہیں۔ ان افسانوں کے واقعات [illegible] کی ایک [illegible] کے [illegible]
ترتیب کے [illegible] حسن بیان کا غلبہ بھی داستان [illegible] کی [illegible] ہے [illegible] سلطان حیدر جوش کے [illegible]
[illegible] افسانوں میں ایک خاص وضع اور انداز کے سوچنے والوں [illegible] اخلاق کی [illegible] اقدار کو پسندیدہ [illegible] والوں کو [illegible]
[illegible] کرنے کی کوشش بھی داستان کی اس روایت کا عکس ہے جس میں [illegible] کو [illegible] کی سب سے اہم قدر سمجھا جاتا ہے۔

ہمارے ابتدائی دور کے ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں مختلف حیثیتوں سے داستان کی قائم کی ہوئی فنی روایت کا گہرا عکس ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ سب تخلیقات کہانی کی ایک نئی صنف کے نقش اول بھی ہیں ـــــ ایسا نقش جس سے زمانہ کے تقاضوں کی تکمیل بھی ہوتی ہے اور افسانوی فن کی روایت میں ایک نئے اسلوب کا اضافہ بھی ہوتا ہے۔ افسانہ نگاروں نے کہانی سنانے اور قاری اور سامع کی دلچسپی کا سامان مہیا کرنے کی قدیم روش پر قائم رہ کر بھی کہانی کو فن کی حیثیت سے بعض نئی چیزیں دیں۔ داستان اور ناول میں اب تک تخیل اور تصور کی پیدا کی ہوئی عالم رومان کی پہنائیاں اور مشاہدے اور تجربہ کی دی ہوئی دنیائے حقیقت کی پیچیدگیاں اور گہرائیاں کہانی کا پس منظر بنتی تھیں اور اس پس منظر میں واقعات، کردار، زندگی کے مسائل کی کثرت و فراوانی اور فطرت اور اس کے حسن کی رنگینی اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ و وابستہ ہوتی تھی کہ پڑھنے اور سننے والے کے لئے (داستان کی روایت میں پڑھنے اور سننے کی جگہ ایک سی ہے) ایک چیز کو دوسری سے الگ کرنا ناممکن تھا۔ افسانہ کہانی میں پہلی مرتبہ وحدت کی اہمیت کا مظہر بنا۔ کسی ایک واقعے، ایک جذبے، ایک احساس، ایک تاثر، ایک اصلاحی مقصد، ایک رومانی کیفیت کو اس طرح کہانی میں بیان کرنا کہ وہ دوسری چیزوں سے الگ اور نمایاں ہو کر پڑھنے والے کے جذبات و احساسات پر اثر انداز ہو۔ افسانہ کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے اسے داستان اور ناول سے الگ کیا ہے۔ مختصر افسانہ میں اختصار اور ایجاز کی دوسری امتیازی خصوصیت نے اس کے فن میں سادگی، حسن ترتیب و توازن کی ضرورت پیدا کی اور یہ سب چیزیں ہمیں پریم چند، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کے ان افسانوں کے ذریعہ ملیں جنہوں نے داستان کی روایت کو بھی زندہ رکھا اور کہانی کی ایک نئی صنف کی بنیاد بھی ڈالی۔

پریم چند، سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کی رکھی ہوئی بنیاد پر اگلے ۲۰، ۲۵ برسوں میں علی عباس حسینی، مجنوں گورکھپوری، اعظم کریوی، ل۔ احمد اکبر آبادی، حامد اللہ افسر، محشر عابدی، مسعود علی ذوقی، طالب بانعتی، کوثر چاندپوری اور فضل حق قریشی نے افسانوی فن کی ایک ایسی عمارت کی تعمیر کی، جس میں زندگی کی حقیقتیں اور فن رعنائیاں دست بدست ایک دوسرے کو سہارا دیتی دکھائی دیتی ہیں۔ ہمارے ابتدائی افسانہ نگاروں نے افسانہ کو حقیقت و شعریت، صداقت و تخیل اور زندگی و فن کے امتزاج کا جو نقش اول بنایا تھا۔ اسے ان افسانہ نگاروں نے زیادہ ابھارا، چمکایا اور رنگین بنایا۔ ان سب نے تخیل کے بجائے مشاہدہ کو اور شعریت کی جگہ غور و فکر کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ لیکن ان میں سے اکثر نے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال لینے کو کافی جانا ہے۔ بحر حیات میں کود کر اس کے تلاطم کا مقابلہ کرنے کی عادت ان میں ابھی پیدا نہیں ہوئی زندگی کے ایوان میں داخل ہو کر اس کے رازہائے درون سے واقف ہونے کی خواہش اور طلب انہیں بے چین اور بے قرار نہیں کرتی اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان افسانہ نگاروں کی کہانیوں میں زندگی کا رنگ نسبتاً زیادہ شوخ ہونے پر بھی اتنا چوکھا نہیں کہ دیکھنے والے کی نظر کو مسحور کر سکے۔ ان میں فن کی ترتیب پہلے کے مقابلہ میں زیادہ متوازن ہونے کے باوجود اب بھی اتنی منطقی نہیں کہ کہانی کا انجام اس کے گزرے ہوئے اجزاء کا منطقی، لازمی اور ناگزیر نتیجہ معلوم ہو۔ اخلاقی اور اصلاحی نقطہ نظر اور قاری کے نقطہ نظر سے دل خوش کن انجام اب بھی عموماً ان کا فنی سطح نظر ا[illegible]

نصب العین ہے ___ اب بھی اتفاقات کو، ایسے اتفاقات کو جو پیچیدہ سے پیچیدہ صورت حال کو مصنف (اور اس طرح قاری) کی پسند کے سانچے میں ڈھال سکیں ان افسانوں کے فن میں خاصا دخل ہے۔ اب بھی جذباتیت اور مثالیت فن کے توازن و اعتدال کے راستہ میں حائل ہیں۔

۱۹۲۹ء اور ۱۹۳۰ء کے بعد سے البتہ افسانوں میں زندگی کے نقش نسبتاً زیادہ گہرے ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس زمانہ کے شدید معاشی اور سیاسی ہیجان و اضطراب نے ہر حساس انسان کے دل میں انسان اور انسانیت کی خدمت کا جو جذبہ پیدا کیا تھا اسے ہمارے افسانہ نگاروں نے اپنا فنی منصب سمجھنے کی طرف پہلی مرتبہ قدم بڑھایا۔ پریم چند نے اس معاملہ میں اپنے ہم عصروں کی رہنمائی کی اور زندگی کے گھمسان میں کود کر ایک سپاہی کی طرح ان قوتوں کو مٹانے کا تہیہ کیا جن کے ہاتھوں انسانیت دردمیں مبتلا تھی۔ یہ خدمت فن کار اس وقت تک انجام نہیں دے سکتا جب تک زندگی اور اس کے مسائل پر اس کی گرفت پوری طرح مضبوط نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۳۵ء تک ہمیں افسانہ نگاری ایک ایسے دور سے گزرتی دکھائی دیتی ہے جس میں افسانہ نگاروں نے زندگی کے صرف ان پہلوؤں کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے جن پر وہ پوری طرح حاوی ہیں افسانہ نگاروں نے زندگی کو گہری نظر سے دیکھنے اور اس کے بھیدوں سے پوری طرح واقف ہونے کو اپنے فنی نصب العین کی پہلی منزل بنایا ہے۔ پریم چند کے علاوہ علی عباس حسینی' اعظم کریوی' مجنوں گورکھپوری' سدرشن' ل۔ احمد اکبر آبادی' راشد الخیری' عظیم بیگ چغتائی ___ سب کے افسانے صرف اس ماحول کے مصوّر ہیں جس پر ان کی نظر گہری ہے' اور صرف اس مقصد کے ترجمان جس سے انہیں پورا جذباتی لگاؤ ہے زندگی سے اس قرب کے ساتھ فن کا احساس بھی ان سب افسانہ نگاروں کے یہاں اب تیز تر ہے۔

اسی فنی احساس کی ایک دوسری نمایاں صورت یہ ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں نے دوسری زبانوں کے افسانے اردو میں منتقل کر کے اردو افسانہ کو فن کی ان نزاکتوں اور لطافتوں سے روشناس کرایا جن تک ہنوز اس کی رسائی نہیں ہوئی تھی۔ ایسے ترجمہ کرنے والوں میں محمد مجیب' خواجہ منظور' منصور احمد اور جلیل قدوائی کے نام اہم ہیں۔ ان ترجمہ کرنے والوں کے ساتھ لکھنے والوں کا ایک گروہ بھی نظر کے سامنے آتا ہے جس نے مغربی شاہکاروں سے متاثر ہو کر ایسے طبع زاد افسانے لکھے جو زندگی اور فن کے امتزاج کے موثر اور دلکش نمونے ہیں ___ حیات اللہ انصاری' اختر انصاری' سجاد ظہیر' اختر حسین رائے پوری' احمد علی اور فیاض محمود اس گروہ کے ایسے نمائندے ہیں جنہیں مختصر افسانے کے فن کی تاریخ میں اس لئے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا کہ ان کی تخلیقات نے افسانے کو مغرب کے بلند ترین معیاروں سے قریب لانے کی مہم کو آسان بنایا۔

مختصر افسانے کی تاریخ میں ۱۹۳۵ء کا سال ایک اہم سنگِ میل ہے۔ اوّل تو اس لئے کہ اس سال تک مختصر افسانے نے فنی ارتقا کی جتنی منزلیں طے کیں ان کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ افسانہ جس کا آغاز اردو میں ایک ایسی صنف کی طرح ہوا جس پر فن اور اسلوبؔ کے اعتبار سے داستان کا خاصا گہرا اثر تھا سادگی اور رنگینی کی اس فضا سے نکل کر ایسی ایسی راہوں سے گزرا جن پر اسے زندگی کے قرب اور فن کے احساس نے برابر نئی چیزوں سے آشنا کیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء تک پہنچتے پہنچتے اس نے فن کے بے شمار مراحل طے کر کے ایسی صورت اختیار کی جس میں تکمیل فن کے سُراغ موجود ہیں۔ پھر یہ کہ اس منزل پر پہنچ کر ہمارے بعض افسانہ نگاروں نے ایسے افسانے لکھے جو ایک طرف تو اس لئے اہم ہیں کہ ان میں مشرقی زندگی کی روایتوں اور فن کی نزاکتوں کی بڑی لطیف آمیزش ہے اور دوسرے اس لئے کہ مغرب کا جو فن آہستہ آہستہ ہمارے مختصر افسانے کے اسلوب کو متاثر کرتا اور اسے تکمیل کی راہیں دکھاتا رہا تھا وہ

ان افسانوں کے ذریعہ ایک باغیانہ انداز میں اردو افسانے کی روایت میں داخل ہوا۔ پہلی قسم کے افسانوں کی سب سے نمایاں مثال پریم چند کا افسانہ "کفن" ہے اور دوسری طرح کے افسانوں کا نمونہ افسانوں کا وہ بدنام مجموعہ جو "انگارے" کے نام سے چھپا۔ کفن زندگی کے گہرے اور ہمدردانہ مشاہدے اور مطالعے، تخیل اور فکر کی متوازن آمیزش اور فن کے تقاضات احساس کے ربط و آہنگ کا مثالی نمونہ ہے اور انگارے کے افسانے اس ذہنی اور باغیانہ روش کے علم بردار جس کے بغیر فن میں نئی راہوں کا کھلنا بند ہو جاتا ہے اور اس لئے فن کے لئے ہر ترقی کے مدارج مسدود و ممنوع ٹھہرتے ہیں۔ 'کفن' اور 'انگارے' کے بعد اور اسی کے ساتھ وجود میں آنے والی ترقی پسندی کی تحریک نے مختصر افسانے کو بڑی تیزی سے ایسا بننے میں مدد دی کہ اگلے دس برسوں کے اندر اس کی بعض تخلیقات دنیا کی بہترین افسانوی تخلیقات کی ہمسری کے قابل ہو گئیں۔

۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۷ء تک ہمارے مختصر افسانوں کی زندگی کے شباب اور اس کے فنی عروج کا بہترین زمانہ ہے۔ افسانہ کے اس عروج و شباب کے آغاز تک داستان اپنی زندگی پوری کر چکی تھی اور میر باقر علی داستان گو کی وفات نے اس بزم کی آخری شمع کو گل کر دیا تھا۔ ناول نے البتہ اس کی ترقی کے ساتھ ساتھ ارتقا کے بہت سے مراحل طے کئے اور پریم چند کی وفات کے وقت تک (انہی کے ہاتھوں) ناول اس بام عروج تک پہنچ چکا تھا جس سے اونچا پریم چند کے پیشرو اسے نہیں لے جا سکے اور اس طرح گویا ۱۹۳۶ء تک فن کی حیثیت سے داستان کا وجود باقی نہیں رہا اور ناول کو جو کچھ بننا تھا وہ بن چکا اور اس طرح اب افسانوی ادب کی صرف ایک صنف (یعنی مختصر افسانہ) پر یہ ذمہ داری آپڑی کہ وہ زندگی کی خدمت گزاری اور فن کی ناز برداری کے دوہرے منصب کو پورا کرے اور اس میں شبہ نہیں کہ ۱۹۳۶ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک ہمارے مختصر افسانے نے یہ دونوں منصب اس طرح پورے کئے کہ زندگی اور فن دونوں کے لئے باعث ناز و افتخار ہیں۔

اس دور کے افسانہ نگاروں میں علی عباس حسینی، کرشن چندر، اپندر ناتھ اشک، سہیل عظیم آبادی، اختر اورینوی، اختر انصاری ——— حیات اللہ انصاری، منٹو، حجاب، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور ان کے ذرا بعد غلام عباس، دیوندر ستیارتھی، احمد ندیم قاسمی، حسن عسکری، بلونت سنگھ، ممتاز مفتی، ابراہیم جلیس، ممتاز شیریں، ہاجرہ مستور، شفیق الرحمٰن، قرۃ العین حیدر، خدیجہ مستور اور تسنیم سلیم چھتاری اس دور کے وہ افسانہ نگار ہیں جنہوں نے پڑھنے والوں کے ایک وسیع حلقے میں مقبولیت بھی حاصل کی اور اپنے اپنے مخصوص انداز میں افسانے کے فن کو کوئی نہ کوئی نئی چیز بھی دی۔ اس دور کی افسانہ نگاری میں مجموعی حیثیت سے تین خصوصیتیں نمایاں ہیں۔ پہلی خصوصیت تو یہ ہے کہ ان میں سے ہر افسانہ نگار نے اس چیز کے شدید احساس کے ساتھ کہ افسانہ اور زندگی کی حقیقتوں میں بڑا گہرا اور ناگزیر ربط ہے اپنے افسانوں کے لئے زندگی کے اس مخصوص پہلو کا انتخاب کیا ہے جس کی جزئیات کا علم اسے سب سے زیادہ ہے۔ اسی لئے علی عباس حسینی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، احمد ندیم قاسمی اور دیوندر ستیارتھی کے افسانے دیہاتی زندگی کے افسانے ہونے کے باوجود ہندوستان کے مختلف حصوں میں پھیلے ہوئے الگ الگ دیہاتوں کے مصور اور ترجمان ہیں۔ اشک، بیدی، حیات اللہ انصاری، اختر انصاری، غلام عباس، عصمت، تسنیم سلیم، ہاجرہ، خدیجہ، قراۃ العین حیدر، حسن عسکری وغیرہ شہری زندگی کے افسانہ نگار ہوتے ہوئے بھی زندگی کے ایسے پہلوؤں کو اپنا موضوع بناتے ہیں جو ان کے مشاہدہ سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ کرشن چندر نے بہت کچھ لکھا ہے پھر بھی کشمیر کے متعلق سب سے زیادہ لکھا ہے۔ منٹو کی نظر سینکڑوں چیزوں پر ہے پھر بھی بمبئی ان کا سب سے عزیز موضوع ہے۔ ان چند مثالوں سے یہ اندازہ لگانا آسان ہے کہ مشاہدہ اور مطالعہ میں زندگی کے کسی خاص پہلو کی تخصیص کو اس

دور کے افسانہ نگاروں نے اپنی خصوصیت بنایا ہے۔

اس دور کے افسانوں کی دوسری امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ لکھنے والوں کے مزاج اور شخصیت کا بہت گہرا پرتو ان کے افسانوں میں نظر آتا ہے۔ ان افسانہ نگاروں نے جس موضوع پر بھی افسانہ لکھا ہے اس پر اپنے انداز فکر، اپنے طرز تخیل اور اپنے جذبات و احساس کی بڑی گہری مہر ثبت کی ہے اور اس ماحول کی تخصیص کے ساتھ ساتھ مصنفوں کی انفرادی شخصیتوں کی گوناگونی نے اس دور کے افسانے کو ہزار رنگ دے دیے ہیں۔

اور پھر تیسری بات یہ کہ اس دور کے افسانہ نگار اسلوب اور فن میں نئے تجربے کرنے سے نہیں گھبراتے۔ ان میں دوسروں کی اچھی چیزوں کو اپنا لینے کا حوصلہ بھی ہے اور نئے اسلوب تلاش کرنے اور انہیں بے جھجک سامنے لانے کی جرات بھی، اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ماحول کے صدگونہ تنوع اور شخصیتوں اور مزاجوں کے رنگارنگ فرق نے ہمارے افسانے کو جو نئے سے نئے انداز دیے تھے ان میں نئے تجربوں کی شوخی اور جرات نے اور چار چاند لگائے اور اس طرح اس نئے دور کا افسانہ موضوع کے تنوع کے اعتبار سے، اسلوب کے نئے پن کے لحاظ سے اور فکر، تخیل اور احساس کی گوناگونی کے نقطہ نظر سے پچھلے دور کے افسانوں سے بہت مختلف نظر آتا ہے۔ اس میں جدت اور روایت کا بڑا شیریں اور لطیف امتزاج ہے اس میں ایک خاص عہد کی سیاسی زندگی اور اس سیاسی زندگی کے پیدا کئے ہوئے معاشی اور معاشرتی نتائج کی بڑی واضح اور مکمل تصویریں ہیں اور خارجی حقائق کی تصویروں کے ساتھ ساتھ انسان کے جذبات، احساسات، افکار اور نفسیاتی رد عمل کا بڑا صحیح عکس بھی۔ اجتماعی زندگی کے مسائل فرد کے ذہن اور اعصاب پر کس طرح اثر انداز ہوتے ہیں اور اس کا مطالعہ اس دور کے افسانہ نگاروں نے بڑی باریک بینی سے کیا ہے اور اپنے اپنے دائرہ عمل میں فرد کے فکری اور جذباتی رد عمل کی جو صورتیں دیکھی ہیں انہیں ملے جلے علمی اور فنی انداز میں اپنے افسانہ میں جگہ دی ہے اور مشاہدہ کی اس وسعت اور دقت نظر نے اسے جو نئے نئے موضوع دیے ان کے اظہار کے لئے اس نے فن کے نئے نئے تجربے کرنے کی طرف قدم بڑھایا اور اس طرح اس دور کے افسانوں میں زندگی کی پوری گہما گہمی اور فن کے نئے سے نئے اور اسالیب نے ایک دوسرے کو آگے بڑھانے میں مدد دی ہے۔ فن زندگی کا خدمت گزار اور معاون ہے اور اس کے بدلے میں زندگی فن کو نئی راہیں سمجھاتی اور اس خدمت گزاری کا حق ادا کرتی ہے۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی زندگی میں ایک زبردست سیاسی اور معاشرتی انقلاب رونما ہوا۔ اس انقلاب کے ظاہر ہونے سے پہلے ہمارا افسانہ فن کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں زندگی کے حقائق، فن کار کی شخصیت اور فن کا حسن ایک دوسرے میں جذب اور مدغم ہو جاتے ہیں۔

تقسیم ملک کے بعد خاصے عرصے تک معاشرتی اور اخلاقی زندگی پر انتشار اور اضطراب کی کیفیت طاری رہی۔ انسان ایک ناقابل بیان بحران میں مبتلا رہا اور اس کے جذبات، احساسات اور افکار اعتدال و توازن کی اقدار سے عاری و بیگانہ ہو گئے اور اس طرح فن کار کے لئے متوازن فنی تخلیق کی راہیں مسدود ہو گئیں۔ ان حالات میں اکثر افسانہ نگاروں نے کچھ نہیں لکھا اور پھر جب آہستہ آہستہ انہوں نے لکھنا شروع کیا تو ان کے افسانوں کا موضوع یہ زبردست انقلاب اور اس انقلاب کے سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی شاخسانے تھے۔ ان موضوعات پر قلم اٹھاتے وقت اکثر لکھنے والے اپنے آپ کو جذباتی ہیجان سے محفوظ نہیں رکھ سکے اور جنہوں نے اپنے جذبات و اعصاب پر قابو پا کر کوئی متوازن افسانہ لکھا اس میں واقعات کی عکاسی اور اصلاح پسندی کا رجحان اس درجہ غالب ہے کہ فنی اقدار کو پوری

طرح ابھرنے کا موقع بہت ہی کم ملا ہے۔

تقسیم سے پہلے جن افسانہ نگاروں نے اس فن میں رہنمائی کا شرف حاصل کیا تھا یا جنہوں نے زندگی اور فن پر پوری گرفت حاصل کر کے اپنے لئے کوئی امتیازی جگہ بنائی تھی انہوں نے بھی تقسیم کے بعد کے زمانہ میں جو کچھ لکھا اس میں فن کا شعلہ کچھ بجھا بجھا سا دکھائی دیتا ہے ——— کم از کم علی عباس حسینی، مجنوں گورکھ پوری، حجاب امتیاز علی، اپندر ناتھ اشک، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی اور حیات اللہ انصاری کا یہی حال ہے۔ یہ بات البتہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے اسلوب خاص کی جھلکیاں ان کے افسانوں میں کہیں کہیں ضرور نظر آ جاتی ہیں۔ کرشن چندر اور منٹو نے تقسیم کے بعد بھی حسب معمول کثرت سے لکھا اور میر کی طرح کبھی بہت اچھا اور کبھی بہت برا لکھنے کی روش قائم رکھی۔ فن کو ان دونوں فن کاروں کے ہاتھوں انحطاط اور زوال سے زیادہ آشنا ہوا ——— ترقی کا روئے زیبا اسے کم دیکھنا نصیب ہوا۔ لیکن اس دور کے جن افسانوں کو "حسن و زیبائی" کی سند ملی ہے ان میں موضوع، شخصیت اور فن کا رچاؤ موجود ہے۔ یہ رچاؤ، ٹھہراؤ اور استقلال احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ اور غلام عباس کے اکثر افسانوں میں نمایاں ہے اور ہاجرہ مسرور، خواجہ احمد عباس، خدیجہ مستور، قرۃ العین حیدر، ممتاز مفتی، مہندر ناتھ، دیوندر ستیارتھی، تسنیم سلیم، قدرت اللہ شہاب اور شفیق الرحمٰن کی جستہ جستہ کہانیوں میں۔ ایک چیز البتہ ان سب لکھنے والوں کے یہاں صاف نظر آتی ہے اور وہ یہ کہ ان میں سے ہر ایک کا وہ اسلوب فن جس کی تخلیق میں ان کے مخصوص ماحول، ان کے منفرد انداز فکر، تخیل، ان کے جذباتی میلان اور شخصیت کے مختلف اجزاء نے پورا حصہ لیا تھا اب بھی قائم ہے اور اس اسلوب کی بدولت ہر ایک کا افسانہ دوسرے سے الگ ایک ایسے رنگ کا حامل نظر آتا ہے جس میں ایک مخصوص دلکشی اور تاثیر ہے۔

ان افسانہ نگاروں کی ان اکا دکا فنی تخلیقات کے علاوہ جن میں فن کا رچاؤ موجود ہے یا ان دو چار افسانہ نگاروں کے علاوہ جن کا ابھی ذکر آیا (ندیم، غلام عباس، بلونت سنگھ اور کبھی کبھی منٹو اور کرشن چندر) اس دور کے پورے فن پر انحطاط کی اقدار کا سایہ ہے۔ فن کار جیسے یا تو تھک گیا ہے یا سیاسی اور اقتصادی حالات کے بوجھ نے اس کی ساری تخلیقی قوتیں سلب کر لی ہیں یا ماحول میں اسے ایسے محرکات میسر نہیں ہیں جن میں ادب اور فن پوری آزادی سے پروان چڑھتے ہیں۔

یہ حال تو پرانے لکھنے والوں کا ہے ——— لیکن ان پرانے لکھنے والوں کے علاوہ تقسیم کے بعد بعض نئے لکھنے والے افسانوی ادب اور فن کے ایوان میں داخل ہوئے اور پڑھنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ——— ان نئے آنے والوں میں انتظار حسین، اے حمید، دیوندر اسر، انور، ضمیر الدین، انور عظیم، خلیل احمد، ابن الحسن اور اشفاق احمد کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان نئے لکھنے والوں میں سے ہر ایک نے موضوع کے انتخاب اور اسے پیش کرنے کے فنی اسلوب میں اپنے ذہنی و جذباتی رجحانات کو دخل دیا ہے اور اس لئے ہر ایک کے افسانے ماحول کے بعض مشترک تاثرات و رجحانات کے حامل ہونے کے باوجود اس کے مخصوص فکری، تخیلی اور جذباتی میلانات کا عکس ہیں۔

ان نئے افسانہ نگاروں نے عموماً اپنے مشاہدہ کے لئے ایک خاص میدان منتخب کر کے اسے اپنی کہانی کا پس منظر بنایا ہے، اس مخصوص اور محدود ماحول سے الگ ان سب نے عموماً بین الاقوامی سیاست اور معیشت کے بدلتے ہوئے حالات پر بھی نظر رکھی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ انھیں ماحول اور فرد کے رشتے کا پوری شدت سے احساس ہے اور اس لئے ان سب نئے لکھنے والوں کی کہانیاں ایک مخصوص اور محدود ماحول کی کہانیاں ہوتے ہوئے بھی بین الاقوامی زندگی کے رجحانات کا عکس اور فرد کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیتوں کی آئینہ دار ہیں۔

موضوع کے ان مشترک پہلوؤں سے قطع نظر انداز و بیان میں بھی ان سب لکھنے والوں نے تفصیل و تشریح کے بجائے ایجاز، اختصار اور اشاریت وایمائیت کو اپنے مقصد کے لئے زیادہ پسندیدہ جانا ہے۔ ان لکھنے والوں نے ادبیت و شعریت، ابہام و رمزیت اور تشبیہات کی جدتوں کو اظہار کا موثر وسیلہ سمجھ کر اپنے اسالیب میں انہیں پوری آزادی سے جگہ دی ہے ——— اور پھر ان وسائل سے کام لے کر افسانوں میں صرف اس موضوع کو جگہ دی ہے جو ان کی پسند ہے اور مزاج سے مطابقت رکھتا ہے ——— مثلاً خلیل احمد کے افسانے انسان کی اس ذہنی کیفیت کی مصوری کرتے ہیں جو زندگی اور ماحول سے بیزاری کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے ——— ابن الحسن کی کہانیاں عموماً ایسے کرداروں کی کہانیاں ہیں جنہیں ماحول کا رنگ اتنا پختہ کرتا ہے کہ کوئی طوفان، کوئی انقلاب اسے ہلکا اور پھیکا نہیں کر سکتا ——— ضمیر الدین نے اپنی کہانیوں کے ذریعہ انسان کے ظاہری عمل اور باطنی کیفیت کے ربط و تعلق کی وضاحت کی ہے ——— انور عظیم کے افسانے بھی ذرا تیکھے انداز میں کرداروں کے ماحول اور مزاج کے اسی رشتہ کی تصویریں کھینچتے ہیں ——— شوکت صدیقی کے افسانوں میں ایسے کردار چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جنہیں ماحول کی ستم ظریفیوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے ماضی کی یادوں میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ دیوندر اسرّ نے تصوّر و تخیل کی دنیا میں پناہ لینے کے بجائے آزادی کے نغمے گانے اور حقیقت کی ایک ایسی دنیا آباد کرنے کو اپنا مطمح نظر بنایا ہے جس میں زندگی دکھوں سے آزاد ہو سکے ——— اے حمید کے افسانوں کا پسندیدہ موضوع زندگی کی تلخیوں کے ساتھ ساتھ حسین مناظرِ فطرت ہیں ——— انتظار حسین کی کہانیاں ایک مخصوص معاشرے اور اس معاشرے کے کرداروں کی کہانیاں اور اشفاق احمد کی کہانیاں کسی مخصوص ماحول کی پابندی کے بغیر اسی سچی محبت کی کہانیاں ہیں جس کا نور ہر دل میں موجود ہے۔

موضوع کی ندرت کی یہ راہیں افسانہ نگاروں کو ان کے مخصوص مزاج اور ذاتی پسند و ناپسندیدگی نے دکھائی ہیں اور ان راہوں پر چل کر ان نئے لکھنے والوں نے کبھی کبھی ایسی کہانیاں لکھی ہیں کہ وہ فنی انحطاط کے اس دور میں بھی ہمیں مایوسی کے احساس سے بچاتی ہیں لیکن یہ احساس اب بھی ہر ایک کے دل میں کھٹک پیدا کرتا ہے کہ یہ کارنامے اس سطح تک کبھی نہیں پہنچتے جس تک وہ اپنے دورِ عروج (یعنی کرشن چندر، بیدی، عصمت، منٹو وغیرہ کا عہد) میں پہنچتے تھے۔ لیکن اس کھٹک اور خلش کے ساتھ ایک بات تسکین کی بھی ہے اور وہ یہ کہ ان نئے لکھنے والوں میں سے اکثر میں صلاحیتیں موجود ہیں جن سے فن کو عظمت ملتی ہے ——— شرط صرف یہی ہے کہ فن کار فکر، تخیل اور احساس کی گہرائیوں میں جذب ہو کر اپنے کام کو پورے خلوص، پوری دیانت داری اور پوری مشقت سے انجام دینے کے عادی بنیں کہ افسانہ نگاری کی جوئے شیر بھی کوہ کنی کے بغیر ممکن نہیں۔

مختصر افسانے کا فن

ڈاکٹر عبادت بریلوی

مختصر افسانہ وہ افسانہ ہی نہیں ہوتا جو صرف مختصر ہو ___ وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے ___ اختصار اس کی بنیادی خصوصیت ضرور ہے لیکن اس اختصار کے ساتھ ساتھ جب تک اس میں دوسری خصوصیات موجود نہ ہوں اُس کو مختصر افسانہ نہیں کہا جا سکتا ___ مختصر افسانہ تو ایک فن ہے جس کے اپنے جمالیاتی اصول اور فنی مقتضیات ہیں ___ افسانہ جب تک ان اصول اور مقتضیات کو پورا نہیں کرتا' اس وقت تک اس کو مختصر افسانے سے تعبیر کرنا مشکل ہے۔ ایسے افسانے جن میں محض اختصار ہوتا ہے اور جو ان جمالیاتی اصول اور فنی مقتضیات سے کوئی سروکار نہیں رکھتے وہ تو ابتدائے آفرینش سے لے کر اس وقت تک تاریخ کے مختلف ادوار میں برابر تخلیق کئے جاتے رہے ہیں ۔ لیکن ان جمالیاتی اور فنی مقتضیات نے مختصر افسانے کو جو مخصوص شکل دی ہے وہ دورِ جدید کی پیداوار ہے ___ ویسے کہیں کہیں ان اصول اور مقتضیات کی جھلک ان افسانوں میں بھی جگہ جگہ نظر آجاتی ہے جن میں محض اختصار ہے اور جو ہر ملک اور ہر قوم کی زندگی میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ___ مختلف ملکوں کے علم الاصنام اور دیومالا میں ان کہانیوں کا پتہ چلتا ہے۔ بائبل اور دوسری مذہبی کتابوں میں ایسی بے شمار کہانیاں موجود ہیں ___ ان کہانیوں اور داستانوں کو مختصر افسانہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان میں کہیں کہیں مختصر افسانے کی سی بات پیدا ضرور ہو جاتی ہے اس لئے مختصر افسانے کی روایت یوں زندگی اور ادب میں بہت پرانی ہے لیکن اس نے ایک مستقل فن کی صورت موجودہ دور ہی میں اختیار کی ہے اور اس کی بنیاد جدید دور کے جمالیاتی تقاضوں پر استوار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر وہ افسانہ جو صرف مختصر ہو مختصر افسانہ نہیں ہے بلکہ مختصر افسانہ وہ صنف ادب ہے جس کے فن کی اپنی ایک دنیا ہے' اور اس دنیا کے اپنے اصول ہیں' اپنی قدریں ہیں' اپنے معیار ہیں' اپنے قواعد و ضوابط ہیں ___ مختصر افسانہ انہی اصولوں' قدروں اور معیاروں سے پہچانا جاتا ہے۔ وہ انہی سے عبارت ہے۔

یہ اصول' قدریں اور معیار کیا ہیں؟ ان کا وجود کب ہوا؟ کیسے ہوا؟ کیوں ہوا؟ کون سے حالات تھے جن میں ان کی تخلیق ہوئی؟ اور وہ کون لوگ تھے جنھوں نے ان کو برتا' پروان چڑھایا اور اس طرح ان کو فروغ دینے کا باعث بنے؟ ___ یہ سوالات مختصر افسانے کے فن کو سمجھنے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں ___ اور ان سوالات کو حل کرنے ہی میں مختصر افسانے کے فن کو سمجھنے کا راز مضمر ہے۔

مختصر افسانے کا فن انیسویں صدی کے دورِ آخر کی پیداوار ہے۔ اس سے قبل یہ فن کسی مستقل صورت میں نظر نہیں آتا۔ ویسے اس سے قبل بھی افسانے لکھے ضرور جاتے تھے۔ ان افسانوں میں اختصار بھی ہوتا تھا لیکن اس اختصار کے باوجود وہ داستانوں اور ناول سے زیادہ قریب تھے ان میں ایک پھیلاؤ ہوتا تھا' ایک وسعت ہوتی تھی۔ پلاٹ کی پیچیدگی اور کرداروں کی رنگارنگی کے سہارے وہ آگے بڑھتے تھے۔ اسی لئے مجموعی طور پر ان کا میدان (کینوس) بھی وسیع ہوتا تھا۔ وحدت اور ہم آہنگی کی طرف ان میں بہت کم توجہ دی جاتی تھی ___ بیسویں صدی کے آغاز سے قبل ہر زبان میں ایسے افسانوں کی خاصی تعداد نظر آتی ہے۔ انگریزی میں ڈکنس نے ایسے بہت سے افسانے لکھے ہیں۔ فرانس میں بالزاک ایسے افسانے لکھنے میں پیش پیش رہا ہے۔ روس میں ٹالسٹائی کے یہاں اس قسم کے افسانے

موجود ہیں ـــــ اردو میں سرشار، شرر، نذیر احمد، راشد الخیری وغیرہ کے یہاں ایسے افسانوں کی فراوانی نظر آتی ہےـــــ غرض مختصر افسانے کی تخلیق سے قبل کوئی ملک بھی ایسے افسانوں سے خالی نہیں رہاـــــ لیکن یہ افسانے فنی اعتبار سے اپنے اندر کوئی انفرادی شان پیدا نہ کر سکے ـــــ، راسی لئے ان افسانوں کی کوئی فنی اور جمالیاتی اہمیت نہیں ہے۔ صرف کہانی کا نشیب و فراز انہیں دلچسپ بناتا ہے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان افسانوں میں دلچسپی کا محور ہیئت اور فن کے مقابلے میں موضوع اور مواد زیادہ ہوتا تھا اور اسی کے سہارے وہ زندہ رہتے تھے۔

انیسویں صدی کے آخر میں مختصر افسانے کے جس فن کا آغاز ہوا اس کو ان افسانوں سے کوئی تعلق نہیں۔ کیونکہ وہ تو ان افسانوں سے موضوع اور مواد، فن اور ہیئت دونوں اعتبار سے مختلف تھا۔ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انیسویں صدی کے آخر تک آتے آتے حالات بڑی حد تک بدل چکے تھے۔ زندگی ایک نئے موڑ پر آگئی تھی اور اس کے نتیجے میں معاملات و مسائل میں تغیر ہوا تھا۔ افراد کے مذاق میں تبدیلی ہوئی تھی۔ ان کے فنی شعور نے نیا رخ اختیار کر لیا تھا اس لئے ان کے جمالیاتی تقاضے بھی کچھ اور تھےـــــ مختصر افسانے کو اسی بدلتے ہوئے فنی شعور اور جمالیاتی تقاضوں نے پیدا کیاـــــ ایک عام خیال یہ ہے کہ انیسویں صدی کے آخر میں صنعتی انقلاب کے زیر اثر انسانی زندگی کو جس صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا اس نے مختصر افسانے کی تخلیق کی۔ اس خیال کو بنیاد بنا کر بعضوں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ انیسویں صدی تک آتے آتے چونکہ انسان بہت مصروف ہو چکا تھا۔ اس کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ بڑی تخلیقات سے دلچسپی لے سکے۔ اس لئے اس نے ناول کی جگہ مختصر افسانے کو پیدا کیاـــــ اس خیال میں ایک حد تک تو صداقت ضرور ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس میں بڑی ہی سطحیت کا احساس ہوتا ہےـــــ یہ بات تو صحیح ہے اور اس میں ذرا بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ انیسویں صدی کے آخر تک آتے آتے انسان صنعتی انقلاب کے باعث خاصا مصروف ہو گیا تھا، اس کے پاس فرصت کے لمحات بہت کم رہ گئے تھے اس لئے وہ اپنی جمالیاتی تسکین کی خاطر ادب اور فن کی ایسی اصناف کو تخلیق کرنا چاہتا تھا جن سے دلچسپی لینے میں زیادہ وقت صرف نہ ہو۔ اسی صورتِ حال نے مختصر افسانے کی بنیاد رکھی۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ صحیح یہ بات ہے کہ صنعتی انقلاب نے جو حالات پیدا کئے تھے۔ انہوں نے انسانی مزاج کو تبدیل کیا تھا۔ ان کے مذاق میں ایک بدلی ہوئی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ ہر چیز کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے لگے تھے۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہیں اپنی جمالیاتی تسکین کے لئے نئے اصناف کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ انہوں نے ادب کے ہر شعبے میں نئے اصناف کی تخلیق کا سلسلہ شروع کیا۔ شاعری میں ہیئت اور اسالیب کے نئے تجربے کئے۔ ناول کو نئے سانچوں میں ڈھالاـــــ مختصر افسانہ بھی بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر نئے تجربات کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس مختصر افسانے نے ایک نئی صنف ادب کی حیثیت سے موجودہ دور میں ان گنت افراد کی جمالیاتی تسکین کا سامان فراہم کیا ہے اور موجودہ دور میں اس کی مقبولیت کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔ لیکن اس کی بنیاد تمام تر مختصر افسانے کے اختصار ہی پر نہیں ہےـــــ اگر ایسا ہوتا تو مختصر افسانے کے ساتھ ساتھ ناول کے فن کا ارتقائی تسلسل جاری نہ رہتا اور مختصر افسانے کے فن میں طویل مختصر افسانے کے نت نئے تجربے نہ ہوتے۔ ناول کا فن مختصر افسانے کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا رہا ہے لیکن نئے جمالیاتی احساس نے اس میں نئے تجربے کئے ہیں اور اس طرح اس کی ہیئت بھی بدلی ہے۔ بہت سے نئے ناول نگاروں کے یہاں اس صورتِ حال کا احساس ہوتا ہےـــــ اور ناول کے ان تجربات میں بڑی حد تک ان ایمائی، اشاراتی اور کنایاتی پہلوؤں کو دخل ہے جو موجودہ دور کے تمام اصناف ادب میں نمایاں نظر آتے ہیں اور اس کا احساس نہ صرف ان ناولوں میں ہوتا ہے جن کو نئے تجربات نے مختصر کر دیا ہے بلکہ طویل ناولوں میں بھی یہ خصوصیت نمایاں نظر آتی ہےـــــ وہ ناول جو اختصار کے ساتھ لکھے گئے ہیں ان میں ورجینیا وولف کے بعض ناول خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر (The light House) اور The Waves مختصر ناولوں کے ان تجربات کے بہت اچھے نمونے ہیں۔ ان میں

اشاراتی اور کنایاتی انداز کے ساتھ ساتھ ایک خوابی کیفیت کا احساس ہوتا ہے جس نے انہیں شاعری اور نظم سے زیادہ قریب کر دیا ہے ——— اور طویل ناولوں میں جیمس جوائس کا ناول یولائی سیز (Ulysses) اس کی بہت اچھی مثال ہے ——— ہر چند کہ اس ناول میں تفصیل اور جزئیات کا بیان ہے لیکن اس تفصیل اور جزئیات میں بھی مجموعی طور پر جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کا اشاراتی اور کنایاتی پہلو ہے ——— بلکہ جیمس جوائس کے فن کا کمال ہی یہ ہے کہ اس نے ان دونوں کا ایک سنگم بنایا ہے ——— اور ورجینیا وولف اور جیمس جوائس ہی پر منحصر نہیں جدید دور کے ہر اچھے ناول نگار کے یہاں اس قسم کے تجربات نظر آتے ہیں ——— اور اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ نئے دور کا انسان بڑی حد تک بدلا ہے ——— بدلتے ہوئے حالات نے اس کے مزاج اور اس کے جمالیاتی احساس میں بڑی تبدیلیاں کی ہیں اور ناول میں ہیئت کے یہ تجربے جن میں اشاراتی اور کنایاتی انداز کو بنیادی حیثیت حاصل ہے' در حقیقت اسی بدلتے ہوئے جمالیاتی احساس کا نتیجہ ہیں ——— صنعتی انقلاب کے بعد جو حالات پیدا ہوئے ہیں انہوں نے زندگی کو زیادہ پیچیدہ بنادیا ہے اور زندگی کی اس پیچیدگی سے افراد کچھ مانوس سے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اس کے ساتھ کچھ مطابقت سی پیدا کرلی ہے۔ چنانچہ سیدھی سادی باتوں میں انہیں لطف نہیں آتا ——— سامنے کی باتوں سے ان کی تسکین نہیں ہوتی۔ ان کا ذہن تو زندگی کی تہوں کو کھولنا چاہتا ہے۔ اس لئے وہ زندگی کے ساتھ ساتھ فن میں بھی تہوں کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس کے بغیر ان کی جمالیاتی تسکین کا سامان فراہم نہیں ہوتا ——— جدید دور کے پیچیدہ ماحول نے افراد کے ذہنوں کو تیز کیا ہے' ان کے احساس میں شدت پیدا کی ہے اور ان کے تخیل کو بلند پرواز بنایا ہے ——— یہ سب باتیں اس کا تقاضا کرتی ہیں کہ موجودہ دور کے افراد فن میں اشاراتی اور کنایاتی انداز سے دلچسپی لیں کیونکہ اس طرح اشاروں اور کنایوں کی تہوں کو کھولنے کا موقع ملتا ہے اور وہ اس طرح اپنی جمالیاتی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں ——— ان کے نزدیک اسی اشاراتی اور کنایاتی انداز سے فن میں حُسن کی قدر پیدا ہوتی ہے ——— مختصر افسانہ موجودہ دور کی اسی بدلتی ہوئی صورتِ حال کی پیداوار ہے۔ اس کے پیچھے اس نئے جمالیاتی احساس کے تقاضے ہیں جو اس بدلتی ہوئی صورتِ حال کے زیرِ اثر ایک نیا روپ اختیار کر رہا تھا اور جس نے ادب اور فن کی اقدار میں بعض اہم تبدیلیاں رونما کر دی تھیں۔ مختصر افسانے کا فن ان تبدیلیوں کی پوری طرح نمائندگی کرتا ہے۔

ناول اور مختصر افسانہ یوں بظاہر دیکھنے میں ایک دوسرے سے بہت قریب معلوم ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصنافِ ادب کی حیثیت سے ان کا ایک دوسرے سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ ناول بہر حال ناول ہے اور مختصر افسانہ بہر حال مختصر افسانہ ہے۔ موجودہ دور میں مختصر افسانے کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس نے ناول کی جگہ لے لی ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ مختصر افسانہ ناول کی کوئی ارتقائی صورت ہے۔ ناول اور افسانہ چونکہ دو مختلف اصناف ہیں اس لئے ان میں کسی آویزش کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ جدید دور میں افسانے کے ساتھ ناول کے فن میں بھی ایک ارتقائی کیفیت نظر آتی ہے ——— مختلف زبانوں میں بہت اچھے افسانوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے ناول بھی لکھے گئے ہیں اور اپنی اپنی جگہ ان دونوں کو مقبولیت حاصل ہوئی ہے ——— وجہ اس کی یہ ہے کہ ناول اور مختصر افسانہ دونوں کے میدان مختلف ہیں۔ ناول زندگی کی وسعت اور اس کے پھیلاؤ کی عکاسی کرتا ہے اور مختصر افسانے کے پیشِ نظر زندگی کے ایسے پہلو ہوتے ہیں جن کا وسعت اور پھیلاؤ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مختصر افسانہ تو زندگی کی کسی وقتی اور لمحاتی کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس لئے اس میں کسی قسم کی وسعت اور کسی طرح کے پھیلاؤ کی ترجمانی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ناول میں انسان کی زندگی کے سارے نشیب و فراز کی تصویریں ہوتی ہیں۔ بچپن سے لے کر مرتے دم تک افراد کو جو واقعات پیش آتے ہیں' جن معاملات و مسائل سے دوچار ہونا پڑتا ہے وہ سب ناول کے فن کا موضوع بنتے ہیں۔ اسی لئے ناول میں تفصیل و جزئیات ہوتی ہے۔ بر خلاف اس کے مختصر افسانہ زندگی کے کسی ایک پہلو کو پیش کرتا ہے' کسی ایک فرد پر

بیتا ہوا کوئی ایک واقعہ' اس کی کوئی ایک مخصوص وقتی کیفیت 'کوئی ایک ذہنی اُلجھن افسانے کا موضوع بن سکتی ہے ___ ظاہر ہے کسی وقتی کیفیت کو پیش کرتے ہوئے تفصیل و جزئیات سے کام نہیں لیا جاسکتا۔ اسی لئے مختصر افسانے میں اختصار اور اجمال ہوتا ہے ___ لیکن مختصر افسانے کا فن کار اس اجمال و اختصار میں بھی معنویت کی دنیائیں سمو دیتا ہے ___ کچھ نہ کہہ کر بھی بہت کچھ کہنا اس کے فن کی بنیادی خصوصیت ہے ___ لیکن افسانہ نگار کے اس اظہار میں انتشار نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے اس اظہار کے لئے ایک محور ضروری ہے۔ یہ محور خیال کی وحدت کے سہارے پیدا ہوتا ہے اور اس خیال کی وحدت سے تاثر کی وحدت پیدا ہوتی ہے ___ اس وحدتِ خیال اور وحدتِ تاثر کے بغیر مختصر افسانے کو فنی طور پر مختصر افسانہ نہیں کہہ سکتے۔

ویسے ناول کی طرح مختصر افسانے میں بھی ان عناصر کا ہونا ضروری ہے جن کے بغیر اس کو افسانے کے تحت شمار نہیں کیا جاسکتا ___ اس کے لئے بھی پلاٹ ضروری ہے' کردار یا کردار کا کوئی پہلو ضروری ہے' کوئی نقطہ نظر یا نظریہ حیات ضروری ہے' ایک مخصوص اسلوب اور اندازِ بیان ضروری ہے ___ ان کے بغیر نہ تو اس میں وہ ایمائی اور اشاراتی انداز پیدا ہو سکتا ہے' نہ وحدتِ خیال اور وحدتِ تاثر' ___ کیونکہ ان سب پہلوؤں کو برتنے ہی کی صورت میں یہ خصوصیات پیدا ہو سکتی ہیں ___ ان کی بنیاد تو وہی افسانے کے بنیادی عناصر ہیں جن سے اس کی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔

مختصر افسانے میں آج کل جو نئے تجربات ہوئے ہیں انہوں نے اس کو بہت سی پابندیوں سے آزاد کر دیا ہے ___ چنانچہ بعض ایسے افسانے بھی موجودہ دور میں لکھے گئے ہیں جن میں پلاٹ نہیں ہے حالانکہ پلاٹ افسانے میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے ___ پلاٹ کہانی کی ترتیب کا نام ہے اور اس ترتیب کے بغیر افسانے میں افسانویت نہیں رہتی ___ اس لئے مختصر افسانے میں پلاٹ کا وجود لازمی ہے۔ کیونکہ مختصر افسانہ سب سے پہلے افسانہ ہوتا ہے ___ اور افسانہ ہونے کے لئے اس میں کسی نہ کسی حد تک کہانی کے عنصر کا ہونا ضروری ہے ___ اس عنصر کی اہمیت کا احساس ہی پلاٹ کا وجود بخشتا ہے اور اس پلاٹ کو مختصر افسانے میں بڑی اہمیت حاصل ہے ___ ناول میں بھی پلاٹ کی وہ اہمیت نہیں جو مختصر افسانے میں ہے۔ ناول میں تو کردار بڑا کام کرتے ہیں لیکن مختصر افسانے میں کرداروں کی ارتقائی کیفیت کی تفصیل نہیں ہوتی ___ اس لئے ظاہر ہے اس میں پلاٹ کسی نہ کسی صورت میں ضرور ہونا چاہئے ___ ناول میں تو اس پلاٹ کا کینوس بہت وسیع ہوتا ہے اور کرداروں کے فطری ارتقا کے ساتھ اس کی ارتقائی رفتار ہم آہنگ ہوتی ہے ___ لیکن مختصر افسانے میں ایسا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں کرداروں کی ارتقائی کیفیت پیش نہیں کی جاتی ___ اس لئے کہانی اور پلاٹ سے اس کے ہم آہنگ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ___ برخلاف اس کے مختصر افسانے میں ہوتا یہ ہے کہ بعض اوقات کوئی ایک معمولی سا واقعہ ہی پلاٹ کی صورت اختیار کر لیتا ہے ___ اس واقعے میں چونکہ بظاہر کوئی پیچیدگی نہیں ہوتی اس لئے اس کے بیان میں کسی پیچیدہ اور پر پیچ انداز کو دخل نہیں ہوتا ___ اس واقعے کے بیان میں ناول کی سی تفصیل ممکن نہیں کیونکہ یہ واقعہ بذاتِ خود زندگی کے کسی ایک لمحے سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس واقعے سے مختصر افسانے میں پلاٹ کی جو ترتیب عمل آتی ہے اس میں سادگی کا احساس ہوتا ہے ___ لیکن اس سادگی میں پرکاری کا رنگ وہ رمزیت اور ایمائیت بھرتی ہے جس کو مختصر افسانے کا فن کار کسی حال میں بھی اپنے آپ سے جدا نہیں کرتا ___ اس سے پلاٹ میں دلچسپی برقرار رہتی ہے۔ پلاٹ کو پیش کرنے کا یہ رمزیاتی اور ایمائی انداز مختصر افسانے کو سپاٹ ہونے سے بچا لیتا ہے۔ کیونکہ پڑھنے والے کے فکری تقاضے اس سے پورے ہوتے ہیں ___ ایک ایک فقرے اور ایک ایک لفظ سے اس کی تخیل کو تحریک ہوتی ہے اور وہ خود اس میں اس تفصیل کو تلاش کر لیتا ہے جو ان الفاظ اور فقروں کے پردوں میں چھپی ہوتی ہے ___ اس مختصر اور سادہ پلاٹ کی بنیاد حقیقت اور صداقت پر استوار ہونا یقینی ہے کیونکہ وہ واقعہ ذہن پر کسی گہرے اثر کے نتیجے میں مختصر افسانے کے فن کار کو متوجہ کرتا ہے اور پھر چونکہ اس کے حدود وسیع نہیں ہوتے اس لئے اس میں غیر فطری باتوں کے راہ پانے کا امکان ذرا کم ہی ہوتا ہے

___ پلاٹ کے محدود ہونے کے باعث اس کے تقلیب و ترتیب پر فن کار کی توجہ زیادہ مرتکز ہوتی ہے ___ اس لئے وہ اس کی اہمیت کو ذہن میں کبھی محو کرنے کے خیال کو پس پشت نہیں ڈالتا ___ یہی اس کا تخلیقی عمل ہے جو مختصر افسانے کے پلاٹ کو ان خصوصیات سے مالامال کرتا ہے جو ان کے لئے کیا ناول اور کیا مختصر افسانہ ہر جگہ ضروری ہوتی ہیں ___ پلاٹ میں وحدت اور تسلسل ایک بنیادی چیز ہے۔ مختصر افسانے کے پلاٹ میں یہ وحدت اور تسلسل کی خصوصیت کچھ اور بھی نمایاں ہوتی ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ موضوع اور مواد محدود ہوتا ہے اور دوسرے ایک بات یہ بھی ہے کہ سادگی اور اختصار اس کو پیش کرنے کی بنیاد ہوتا ہے ___ ان حالات میں وحدت اور تسلسل کا باقی رکھنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔ اسی لئے مختصر افسانے کے پلاٹ کی تشکیل میں فن کار سے اس کے تقاضے زیادہ ہوتے ہیں ___ بظاہر مختصر افسانے کے پلاٹ میں اس Suspense کی گنجائش نسبتاً ہوتی ہے جو ناول کے پلاٹ میں واقعات یا کرداروں کے حرکات و سکنات سے پیدا ہوتا ہے۔ مختصر افسانے کے پلاٹ میں نہ تو واقعات زیادہ ہوتے ہیں اور نہ کرداروں کے حرکات و سکنات ہی کا ایسا کچھ زیادہ چکر چلتا ہے۔ ناول کے برخلاف مختصر افسانے کے سارے پلاٹ ہی میں ایک Suspense کی کیفیت ہوتی ہے ___ وہ Suspense سے شروع ہو کر Suspense ہی پر ختم ہوتا ہے ___ اور یہ مختصر افسانے کے پلاٹ کی نمایاں ترین خصوصیات ہے۔

اس پلاٹ میں کردار نمایاں نہیں ہوتے۔ زیادہ سے زیادہ کردار کا کوئی پہلو نمایاں ہوتا ہے ___ کسی کردار کی کوئی حرکت نمایاں ہوتی ہے ___ اسی لئے مختصر افسانے کے فن میں کردار نگاری کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے ___ بات یہ ہے کہ مختصر افسانے میں کردار تو محض چند لمحوں کے لئے منظر عام پر آتے ہیں۔ اس لئے ان کی صرف ایک جھلک دکھائی دیتی ہے ___ لیکن اس جھلک سے بھی ان کو پہچانا جاسکتا ہے ___ ان کے بارے میں ایک رائے قائم کی جاسکتی ہے۔ یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کردار میں کونسی خصوصیات ہیں ___ لیکن ظاہر ہے اس کی ساری تفصیل مختصر افسانے میں نہیں سماسکتی۔ اسی لئے مختصر افسانے میں کردار تو ملتے ہیں۔ ان کے کرداروں کی بنیادی خصوصیات کی وضاحت بھی ہوتی ہے لیکن ان کی ترجمانی میں بھی پلاٹ کی طرح تفصیل اور جزئیات کو دخل نہیں ہوتا ___ یہاں بھی کردار کی طرف کچھ اشارے ہوتے ہیں ___ ان اشاروں ہی کے سہارے کردار کی تصویر سامنے آتی ہے ___ یہاں تک کہ بعض ان افسانوں میں بھی جن کا موضوع ہی کوئی ایک مخصوص کردار یا اس کردار کی کوئی مخصوص ذہنی کیفیت ہوتی ہے، یہی اشاراتی کیفیت نمایاں نظر آتی ہے ___ یہی وجہ ہے کہ مختصر افسانے میں کردار نگاری کا انداز ناول سے بالکل مختلف ہے ___ ناول میں اشاراتی انداز کے بجائے توضیحی انداز ہوتا ہے جس سے کردار کی بہت واضح اور نمایاں تصویر اُبھرتی ہے ___ مختصر افسانے میں ایسا نہیں ہوتا ___ وہاں تصویر ابھرتی نہیں ___ وہ سامنے آنے کے باوجود نظروں سے اوجھل رہتی ہے ___ ویسے جہاں بھی مختصر افسانے میں کرداروں کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جاتی ہے وہاں کچھ ڈرامائی سا انداز ضرور پیدا ہو جاتا ہے اور کردار کی بنیادی خصوصیت کی طرف توجہ کو مرکوز کرنے کے لئے اس ڈرامائی انداز کا پیدا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ اس سے تخیل کو تحریک ہو اور اس طرح کردار کی وہ خصوصیات جو نظر سے اوجھل ہیں، سامنے آسکیں ___ بہرحال مختصر افسانے میں کردار نگاری مقصد نہیں 'ذریعہ' ہے ___ مختصر افسانے کا فن کار اپنے بنیادی خیال کی وضاحت کے لئے ان کو ذریعہ بناتا ہے ___ یہ حرکت افسانے کا بنیادی موضوع بھی ہو سکتی ہے لیکن اس کا مقصد کردار نگاری نہیں ہوتا۔ اسی لئے مختصر افسانوں میں ایسی کردار نگاری نظر نہیں آتی جس کی بنیاد تفصیل اور جزئیات ہو ___ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ کردار کے افسانے لکھے ہی نہیں گئے ہیں ___ ایسا نہیں ہے ___ ہرچند مختصر افسانے میں ناول کی طرح کردار نگاری کوئی بنیادی حیثیت نہیں رکھتی ہو لیکن ایسے افسانے موجودہ دور میں ضرور لکھے گئے ہیں جن کی بنیاد بعض کرداروں کے مطالعے پر قائم ہے۔ محمد حسن عسکری کا افسانہ 'چائے کی پیالی' منٹو کا 'موذیل' اور ممتاز مفتی کے بیشتر افسانے اس قسم کے افسانوں کے بہت اچھے نمونے

ہیں ـــــ یہ افسانے اور ایسے ہی بہت سے دوسرے افسانے کرداروں کے نفسیاتی مطالعے پر مبنی ضرور ہیں ـــ لیکن ان میں بھی کرداروں کی زندگی کی ساری تفصیل نہیں ہوتی۔ صرف زندگی کے کسی ایک پہلو کا بیان ہوتا ہے جس سے ان پر روشنی پڑتی ہے ـــ ان کی زندگی کے کچھ معاملات ان کے کردار کی بنیادی خصوصیات کو واضح کرتے ہیں ـــ افسانے کا فن کار ان کو پیش کرتے ہوئے اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتا ـــ ان کرداروں کی زندگی کا جو پہلو پیش کیا جاتا ہے وہ خود انہیں بے نقاب کر دیتا ہے ـــ جس بات کی طرف اشارے کئے جاتے ہیں وہ انہیں سامنے لا کر کھڑا کر دیتی ہے ـــ اس لئے مختصر افسانے میں کردار نگاری کا بھی ایک مخصوص انداز ہے جس میں تمثیلی انداز اور اشاراتی زاویہ نظر بنیادی حیثیت رکھتا ہے ـــ موجودہ دور کے بڑھتے ہوئے نفسیاتی شعور نے اس انداز کو مختصر افسانے کے فن میں کچھ اور بھی ابھارا ہے ـــ اور آج جو مختصر افسانے کے فن میں کرداروں کی تصویر کشی نیا سے نیا انداز اختیار کر رہی ہے وہ اسی کا بنیادی نتیجہ ہے۔

پلاٹ اور کردار مختصر افسانے میں اپنی اپنی جگہ تو ایک حیثیت رکھتے ہیں لیکن ویسے ان دونوں کی کوئی بڑی فنی اہمیت نہیں ہے ـــ ان کی بنیاد کسی نہ کسی مرکزی خیال پر استوار ہوتی ہے ـــ یہ کسی نہ کسی بنیادی نقطہ نظر کے گرد گھومتے ہیں ـــ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ مختصر افسانے کے فن کار کا نقطہ نظر ہی پلاٹ اور کردار کی عمارتوں کو کھڑا کرتا ہے ـــ اسی لئے مختصر افسانے کے فن میں نقطہ نظر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہ نقطہ نظر ہی درحقیقت افسانے کا موضوع ہوتا ہے ـــ پلاٹ اور کردار وغیرہ کی حیثیت تو اس میں ضمنی ہوتی ہے ـــ زندگی میں اَن گنت واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں لیکن افسانے کا فن کار ان میں سے ہر ایک کو اپنے فن کا موضوع نہیں بناتا۔ وہ تو اسی واقعے کو اپنا موضوع بناتا ہے جس کو اس کے بنیادی نقطہ نظر کے ساتھ مطابقت ہوتی ہے' جو اس کے نظریہ حیات کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے ـــ اس کا سبب یہ ہے کہ پلاٹ اور کرداروں میں بذات خود اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ـــ کیونکہ اس کا فن اس بات کی اجازت نہیں دیتا ـــ اس کا فن تو اپنے محدود ہونے کے پیش نظر اس سے صرف اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ زندگی کے کسی اہم پہلو کی طرف متوجہ ہو اور اہم پہلو اس کے نزدیک اپنے بنیادی خیال' نقطہ نظر اور نظریہ حیات سے زیادہ کوئی اور چیز نہیں ہو سکتی ـــ اس لئے مختصر افسانے کو اسی نقطے سے اپنے فن کا ارتقائی سفر شروع کرنا پڑتا ہے اور یہی اس کے سفر کی آخری منزل بھی ہوتی ہے ـــ ناول کے فن کار کی طرح مختصر افسانے کے فن کار کو یہ موقع نہیں ملتا کہ وہ کرداروں کے ذریعے یا کہانی کے نشیب و فراز کے توسط سے اپنے مقصد کی وضاحت کرے کیونکہ اس محدود میدان میں اس کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ اپنے نقطہ نظر کی طرف سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا اور یہی سبب ہے کہ اس کے ہر فقرے اور ہر لفظ میں ایسی تہیں ہوتی ہیں جن میں سے اس کا نقطہ نظر اپنے آپ کو رونما کرتا رہتا ہے ـــ ناول میں نقطہ نظر کی وضاحت مختلف طریقوں سے ہو جاتی ہے ـــ کہیں کردار اس کو واضح کر دیتے ہیں کہیں خود ناول کا فنکار اس پر اظہار خیال کرنے لگتا ہے، مختصر افسانے کا فن اس کو سہار نہیں سکتا۔ مختصر افسانے میں اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس میں نقطہ نظر پر بحث نہیں ہو سکتی ـــ اس پر وعظ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے اس پہلو کی طرف جگہ جگہ اشارے ہوتے ہیں ـــ اور ان اشاروں کا سلسلہ شروع سے آخر تک جاری رہتا ہے ـــ مختصر افسانہ اسی لئے تو کچھ نہ کہنے کے باوجود بہت کچھ کہتا ہے اور اس سے دلچسپی لینے والے کچھ نہ سمجھنے کے باوجود بہت کچھ سمجھتے ہیں۔

مختصر افسانے میں بظاہر تو فضا اور ماحول کا بیان بہت ہی کم ہونا چاہئے۔ کیونکہ اس میں بیانیہ انداز اختیار کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ لیکن چونکہ جس بنیادی نقطہ نظر کو سامنے رکھ کر اس کی تخلیق کی جاتی ہے وہ کوئی نہ کوئی پس منظر ضرور رکھتا ہے۔ اس کی کوئی نہ کوئی بنیاد ضرور ہوتی ہے ـــ اور انہی کے سہارے اس میں فضا اور ماحول کے نقوش اُبھرتے ہیں ـــ اس فضا اور ماحول سے حد درجہ موانست پیدا کرنا اور پڑھنے والے کے لئے ان کو قابل قبول بنانا فن کار کا ایک بہت ہی اہم کام ہے ـــ مختصر افسانے کے فن نے اس کام کو

[illegible] ممکن ہے کہ ناول کے مقابلے میں اس کا میدان محدود ہے اس لئے فضا اور ماحول کی ترجمانی میں ناول کی سی بات افسانے میں [illegible] ویسے مختصر افسانے کا فن کار اپنے مخصوص انداز سے فضا اور ماحول کا احساس ضرور دلاتا ہے اس کی طرف متوجہ ضرور کرتا ہے۔ یہاں بھی چونکہ اس کے پاس تفصیل اور جزئیات کی گنجائش نہیں ہوتی اس لئے وہ صرف اشاروں کے ذریعے فضا اور ماحول کی تصویر کشی کرتا ہے لیکن یہ تصویر کشی بڑی ہی موثر ہوتی ہے ـــــ کیونکہ پڑھنے والے کا ذہن اور شعور برابر اس سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ لیکن مختصر افسانے میں اس فضا اور ماحول کی ترجمانی بذاتِ خود اہمیت نہیں رکھتی ـــــ کیونکہ وہ تو فن کار کے بنیادی نقطۂ نظر کو اُبھارتی ہے۔ اس کے نقوش کو نمایاں کرتی ہے۔ اس لئے خود اس کا کوئی مقصد نہیں ہوتا ـــــ چنانچہ مختصر افسانوں میں جہاں جہاں فضا اور ماحول کی ترجمانی ملتی ہے وہاں فن کار بعض بنیادی خیالات کو اشاروں میں واضح کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے ـــــ لیکن یہ فضا اور ماحول ناول کی طرح مختصر افسانے کا بنیادی جزو نہیں ہوتے ـــــ یہ بھی کرداروں کی طرح ایک ذریعہ ہیں ـــــ ویسے موجودہ دور میں ایسے مختصر افسانے لکھے ضرور گئے ہیں جن میں ماحول کی ترجمانی اور فضائی عکاسی نمایاں نظر آتی ہے ـــــ لیکن ان میں بھی فن کار کے پیش نظر کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے ـــــ یعنی کسی بنیادی خیال کی ترجمانی ضرور ہوتی ہے ـــــ بہرحال مختصر افسانے میں فضا اور ماحول کی ترجمانی سے احساس اور تاثر میں اضافہ ہوتا ہے ـــــ اور اس طرح پلاٹ، کردار اور نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ یہ ترجمانی بھی مختصر افسانے کے فن کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔

پلاٹ، کردار، نقطۂ نظر، فضا اور ماحول، ان تمام عناصر کی اہمیت مختصر افسانے کے فن میں مسلّم ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ اس میں سارا تکمیل اسلوب، انداز بیان اور طرزِ ادا کا ہوتا ہے ـــــ یوں تو ہر صنفِ ادب میں اسلوب، انداز بیان اور طرزِ ادا کو نمایاں جگہ حاصل ہے لیکن مختصر افسانے کے فن میں اس پہلو کو کچھ زیادہ ہی اہمیت حاصل ہے ـــــ بات یہ ہے کہ مختصر افسانے کا میدان بہت محدود ہوتا ہے اس لئے اس سے عہدہ برآ ہونے کی خاطر فن کار کو ایک ایسا انداز بیان اختیار کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے جو اس اختصار سے مطابقت رکھتا ہو لیکن جس سے اظہار و ابلاغ میں کسی قسم کی اُلجھن پیدا نہ ہو۔ گویا مختصر افسانے کا فن کار ایک ایسے اسلوب کی تشکیل کرتا ہے جس میں محدود ہونے کے باوجود ایک وسعت ہو ـــ اسی لئے مختصر افسانے میں شاعری کی طرح الفاظ کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے ـــ ایک ایک لفظ اور اس کے استعمال سے مختصر افسانے کا فن کار بڑے بڑے کام لیتا ہے ـــ بعض اوقات یہ دیکھا گیا ہے کہ صرف ایک ہی لفظ پر سارے افسانے کی بنیاد ہوتی ہے۔ اگر اسی ایک لفظ کو ہٹا لیا جائے تو افسانے کا وجود ہی قائم نہیں رہتا ـــ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ الفاظ افسانے میں اپنا اصل مفہوم بدل دیتے ہیں اور فن کار کا سحر کار قلم اس میں نئی معنویت پیدا کر دیتا ہے ـــ یہی حال جملوں کی ساخت اور فقروں کی دروبست کا ہوتا ہے ـــــ اس کی مختلف صورتیں مختصر افسانے میں نظر آتی ہیں ـــ فن کار ان سب سے اپنے مقصد کے پیش نظر کام لینے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی لئے زبان و بیان پر پوری قدرت مختصر افسانے کے فن کار کے لئے از بس ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو ساری تکنیک اس سے متاثر ہوتی ہے ـــ لیکن مختصر افسانے میں زبان و بیان کی اس قدرت کا مطلب محض انشا پردازی کا خیال نہیں ہوتا کیونکہ مختصر افسانے کے فن میں انشا پردازی کی گنجائش نسبتاً کم ہوتی ہے۔ وہاں تو ہر لفظ خیال سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر فقرے کو موضوع کے ساتھ مناسبت ہوتی ہے۔ ہر جملہ مواد کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے ـــــ اسی لئے تو مختصر افسانے میں ایک لفظ بھی بیکار استعمال نہیں ہوتا ـــــ صرف انشا پردازی کے خیال سے اگر کوئی فن کار ایک لفظ بھی زیادہ استعمال کرے تو وہ افسانے میں بُری طرح کھٹکتا ہے ـــــ چنانچہ مختصر افسانے میں شاعری کی طرح الفاظ اپنی بہترین ترتیب کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں ـــ ان الفاظ میں تہیں ہوتی ہیں ـــ یہ پہلودار ہوتے ہیں ـــ ان میں جب تک ہیرے کی سی تراشی ہوئی کیفیت نہ ہو، یہ خاطر خواہ اثر نہیں کرتے۔ یہی سبب ہے کہ مختصر افسانہ نگار کو ایسا کرنے میں بڑی ہی چابکدستی سے کام لینا پڑتا ہے ـــــ لیکن اس میں کسی کاوش کو دخل نہیں

ہوتا___ اس کی یہ کوشش شعوری نہیں ہوتی___ موضوع کی مناسبت سے اس کا فن کارانہ شعور اس صورت [illegible] ہے___ موضوع اور مواد کی بنیادی خصوصیات مختصر افسانے میں اسلوب اور انداز بیان کو پیدا کرتی ہیں___ [illegible] ہر فن کار کے یہاں ایک مخصوص سانچے میں ڈھلا ہوا نظر آتا ہے۔

ان تمام عناصر کی بنیادی خصوصیات جب یکجا ہوتی ہیں تب مختصر افسانے کے فن کی تشکیل ہوتی ہے۔ اور وہ ایک مخصوص ہیئت اختیار کرتا ہے۔ اس ہیئت میں بنیاد تو وہی اختصار ہے جو مختصر افسانے کے ساتھ مخصوص ہے اور جس کی وجہ سے پلاٹ، کردار اور اسلوب سب کے سب اس میں ایک نیا روپ اختیار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں___ یہ نیا روپ اس فن میں ایک انفرادیت کو پیدا کرتا ہے___ اس انفرادیت کے سہارے وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہوتا ہے اور اسے کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی___ بقول لیوکس "مختصر افسانے کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے اور اس کے لئے یہ ضروری بھی ہے کہ وہ اپنی ایک دنیا پیدا کرے"___ چنانچہ وہ اپنی دنیا پیدا کرتا ہے اور بذاتِ خود ایک دنیا بن جاتا ہے۔

مختصر افسانے کی اس دنیا میں جو چیز سب سے زیادہ اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ اس کے تاثر کی وحدت ہے۔ اس کی ہیئت چونکہ فروعی یا ضمنی باتوں کے اظہار کی اجازت نہیں دیتی اس لئے صرف مرکزی خیال کو پیش نظر رکھنا اور مختلف زاویوں سے اس پر روشنی ڈالنا اس کے پیش نظر ہوتا ہے اور یہ مرکزی خیال بھی پیچیدہ نہیں ہوتا۔ اس میں بھی وسعت اور ہمہ گیری نہیں ہوتی اس لئے مختصر افسانہ اس محدود دائرے سے باہر نہیں نکلتا۔ فن کار اسی بنیادی خیال پر اپنی توجہ مرکوز رکھتا ہے___ چونکہ خیال ایک سے زیادہ نہیں ہوتا اس لئے اس میں بذاتِ خود بھی ایک وحدت ہوتی ہے اور جب فن کار اس کو ایک وحدت سمجھ کر اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو خود اس کے اظہار میں بھی ایک وحدت کی خصوصیت نمایاں ہونے لگتی ہے___ بلکہ شعوری طور پر وہ اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے کہ یہ وحدت پڑھنے والے پر خاطر خواہ اثر کرے۔ چنانچہ تاثر کی یہ وحدت مختصر افسانے کا بڑا اہم جزو بن جاتی ہے___ مختصر افسانے کے تمام نقاد اس خیال پر متفق ہیں کہ اس میں شروع سے آخر تک تاثر کی یہ وحدت کارفرما ہونی چاہئے___ اڈگر ایلن پو جو مختصر افسانے کا نقاد بھی تھا اور جس نے خود بھی مختصر افسانے میں تجربے کئے ہیں۔ اس نے تو اس حد تک کہہ دیا ہے کہ مختصر افسانے میں سب سے زیادہ جس چیز کو اہمیت حاصل ہے وہ تاثر کی وحدت ہے___ اور اس کا یہ خیال ایسا کچھ غلط نہیں ہے___ کیونکہ تاثر کی اس وحدت کے بغیر اس کا مقصد پورا نہیں ہوتا___ اس کے بغیر اس کی ہیئت خاطر خواہ اثر نہیں کرتی۔ چنانچہ اگر یہ خصوصیت مختصر افسانے کے فن میں نہ ہو تو وہ مختصر افسانے کے فنی حدود سے باہر نکل جاتا ہے___ اور جمالیاتی احساس کی تسکین کا باعث نہیں بنتا___ لیکن مختصر افسانہ چونکہ کسی ایک واحد مقصد کو سامنے رکھ کر تخلیق کیا جاتا ہے___ اس لئے اس مقصد کی وحدت اس میں تاثر کی وحدت کو خود بخود پیدا کر دیتی ہے___ یہی وجہ ہے کہ تاثر کی اس وحدت کا خیال شعوری نہیں ہوتا___ وہ موضوع اور صورت، مواد اور ہیئت کی ہم آہنگی کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔

تاثر کی اس وحدت کے ساتھ ساتھ مختصر افسانے کے فن میں اس کی رمزیت اور ایمائیت بھی کچھ کم اہم نہیں ہوتی۔ ابتدا سے لے کر آخر تک اس میں ایک ایمائی انداز کا ہونا ضروری ہے___ اس کا آغاز کسی ایسے واقعے سے ہوتا ہے جو حقیقت پر مبنی ہوتا ہے لیکن جس کو زندگی کے درمیان سے لے لیا جاتا ہے اور پھر اس پر جس طرح روشنی ڈالی جاتی ہے وہ شروع سے آخر تک اس کو پوری طرح واضح نہیں ہونے دیتا___ فن کار اس کو واضح کرنے کے لئے صرف اشاروں سے کام لیتا ہے___ اور خاتمے پر یہ پراسرار ایمائی کیفیت کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے اور پڑھنے والا سوچتا رہ جاتا ہے___ بے شمار پہلو غور کرنے کے لئے اس کے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے ہیں___ اگر افسانے میں یہ خصوصیت نہ ہو تو اس کو فنی اعتبار سے مختصر افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔ انگریزی کے مشہور افسانہ نگار اور ناول نگار اسٹیونسن نے [illegible] اپنے ایک خط میں واضح کیا ہے___ سر سڈنی کالون نے اس کے ایک افسانے پر یہ رائے ظاہر

[illegible] نہیں ہے اس لئے اس کو بدلنا [illegible]
[illegible] میرے لکھنے کا یہ انداز نہیں ہے [illegible]
سے بہت سے اثرات پیدا کرتا ہوں ___ اگر میں اپنے اس افسانے کے خاتمے کو تبدیل کر دوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ از سر نو اس کا آغاز کروں ___ افسانہ تو ایک مستقل وحدت ہوتا ہے ___ اس لئے مجھے تو اس کا خیال بھی نہیں ہو سکتا کہ میں اس کے اختتام میں کوئی تبدیلی کروں گا ___ کیونکہ میرے خیال میں تو افسانے کی ابتدا اور اس کے خاتمے میں وہی تعلق ہے جو گوشت اور ہڈی میں ہوتا ہے ___ اس لئے ان کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" ___ اس کے ساتھ ہی ساتھ اسی خط میں اس نے اس بات پر خاص طور پر زور دیا ہے کہ افسانے کو مجموعی طور پر بہت واضح نہیں ہونا چاہئے۔ اس میں تو ایک رمز و ایمائی کیفیت سب سے زیادہ ضروری ہے ___ اور یہ خیال صحیح ہے کیونکہ جب تک افسانے میں یہ ایمائی کیفیت نہ ہو وہ اپنی طرف متوجہ نہیں کرتا۔ اس ایمائی انداز سے ایک طرف تو دلچسپی برقرار رہتی ہے اور دوسرے افسانے کے معنوی پہلوؤں میں وسعت کا احساس بڑھتا ہے ___ لیکن اس رمز و ایمائیت میں جو پہلو سب سے زیادہ اہم ہے وہ جمالیاتی ہے ___ ہر فن میں کسی نہ کسی حد تک یہ ایمائی انداز احساس جمال کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے۔ مختصر افسانے کے فن میں بھی اس کا مقصد یہی ہے ___ اسی لئے تو مختصر افسانے کے فن میں اس کو اس درجہ اہمیت دی جاتی ہے۔ ایک مصنف نے تو اپنی کتاب میں مختصر افسانے کے اختصار کا سبب اسی ایمائی اور رمزیاتی کیفیت کو بتایا ہے ___ اس کے خیال میں وہ مختصر افسانہ جو واقعی فن کاری کا اعلیٰ نمونہ ہو، اس میں تو یہ خصوصیت اپنے شباب پر نظر آتی ہے ___ اس خصوصیت کو وہ Very curious hunting and suggestive quality سے تعبیر کرتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اس کا یہ خیال صداقت پر مبنی ہے۔

اس ایمائی کیفیت اور رمزیاتی انداز کا اثر مختصر افسانے میں یہ ہوتا ہے کہ اس میں شروع سے آخر تک ایک احساسِ تحیر کی لہر سی دوڑی ہوئی نظر آتی ہے ___ اور یہ احساسِ تحیر مختصر افسانے کے فن کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے پڑھنے والا اس کی طرف پوری طرح متوجہ رہتا ہے ___ اور ساتھ ہی افسانے میں اس کی دلچسپی قائم رہتی ہے ___ یہ احساسِ تحیر پڑھنے والے کے شعور میں تحریک پیدا کرتا ہے۔ اس کے تخیل کی رو اس سے تیز ہوتی ہے ___ اور وہ افسانے میں زیادہ دلچسپی لیتا اور اس سے زیادہ متاثر ہوتا ہے ___ اس طرح یہ احساسِ تحیر ان تقاضوں کو پورا کرتا ہے جو مختصر افسانے کے فن کار کو اپنے پڑھنے والوں سے ہوتے ہیں ___ یہی وجہ ہے کہ افسانے کے پہلے جملے سے یہ تحیر کا احساس پڑھنے والے پر چھانے لگتا ہے اور جیسے جیسے افسانے میں ارتقائی کیفیت پیدا ہوتی جاتی ہے یہ احساسِ تحیر تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے ___ اور اس کا منتہا افسانے کا اختتام ہوتا ہے ___ گویا افسانہ احساسِ تحیر سے شروع ہو کر احساسِ تحیر ہی پر ختم ہوتا ہے ___ اور آخر تک پہنچتے پہنچتے اس میں حد درجہ شدت پیدا ہو جاتی ہے ___ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مختصر افسانے کی تکنیک اس میں پیش کئے ہوئے کسی مسئلے کو حل نہیں ہونے دیتی اور ہر بات کو زیادہ سے زیادہ الجھا دیتی ہے۔ ایسا نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مختصر افسانہ تخیل پر پہرے نہیں بٹھاتا ___ جو مسائل اس کا موضوع ہوتے ہیں وہ پڑھنے والے کے ذہن میں حل ہوتے ہیں ___ اس کا تخیل انہیں حل کرتا ہے ___ ان کو حل کرنے ہی کے لئے تو اس میں احساسِ تحیر کی تکنیک استعمال کی جاتی ہے ___ ایک نقاد نے بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ مختصر افسانے کا فن کار اپنی طرف سے بہت کم دیتا ہے لیکن اپنے پڑھنے والوں سے بہت زیادہ کا تقاضا کرتا ہے۔

یہ عناصر جب تک موجود نہ ہوں مختصر افسانہ فن کے حدود میں داخل نہیں ہوتا ___ یہی عناصر تو اس فن کی بنیاد ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مختصر افسانے کا فن جامد اور غیر متحرک ہے اور اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی ___ بس ان عناصر کو یکجا کر دیئے

ہی سے اس کی فنی تشکیل عمل میں آجاتی ہے ___ یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ مختصر افسانے کے فن کی مختصر سی تاریخ بتاتی ہے کہ اس میں شروع ہی سے تغیرات کا ایک سلسلہ جاری رہا ہے اور اس نے وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر نئے نئے رنگ بدلے ہیں ___ وہ اس طرح کہ اس فن میں ہمیشہ سے رنگارنگ تجربات کا سلسلہ جاری رہا ہے ___ اپنی محدود دنیا میں رہ کر اس نے ان تجربات کو اپنے دامن میں جگہ دی ہے ___ لیکن ان تجربات نے اس کی بنیادی فنی خصوصیات پر پانی نہیں پھیرا ہے ___ ان کو ختم نہیں کیا بلکہ اس فن میں نئے نئے گل کھلائے ہیں اور اس کے نتیجے میں یہ فن ترقی کے نئے امکانات سے آشنا ہوا ہے۔ مختصر افسانہ جو اوّل اوّل صرف کسی واقعہ اور کسی خاص جذبے کا بیان ہوتا تھا، وہ وقت کے ساتھ ساتھ اس طرح بدلا کہ اس میں کردار کی طرف بھی توجہ کی جانے لگی۔ کسی حد تک تفصیل و جزئیات کو بھی دخل ہونے لگا ___ اور اس کے نتیجے میں مختصر افسانے نے کہیں کہیں طویل مختصر افسانے کی صورت بھی پیدا کرلی۔ کہیں کہیں وہ محض کرداروں کا ایک خاکہ بھی بن کر رہ گیا ___ کہیں کہیں واقعات کے فن کارانہ بیان نے اسے "رپورتاژ" بھی بنادیا ___ اور کہیں کہیں زندگی سے گہری دلچسپی اور اس کے اظہار نے اسے مضمون اور انشائیہ کی شکل بھی دے دی ___ غرض یہ کہ بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر اس نے بہت سی شکلیں بدلیں لیکن اس کے باوجود وہ مختصر افسانہ رہا۔ کیونکہ ان تجربات کے باوجود اس نے ان خصوصیات کو خیرباد نہیں کہا جو مختصر افسانے کے فن کا بنیادی حصہ ہوتی ہیں ___ اس میں وہ تمام عناصر ان حالات میں بھی برقرار رہے۔ جب وہ مختصر افسانے سے بڑھ کر "طویل مختصر افسانہ" ہوگیا تب بھی وحدتِ تاثر باقی رہی، رمزیاتی اور ایمائی انداز باقی رہا۔ جب اس نے خاکے کی صورت اختیار کرلی، تب بھی یہ عناصر اس کے دم کے ساتھ رہے اور جب وہ "رپورتاژ" ہو گیا، تب بھی ان عناصر کو اس نے نظرانداز نہیں کیا ___ اسی لئے اس میں فنی اعتبار سے کوئی ایسی انقلابی تبدیلی نہیں ہوئی جو اس فن کی صورت ہی کو بدل دیتی ___ تجربات کا سلسلہ جاری رہا لیکن اس کی فنی اقدار کو ان سے ٹھیس نہیں لگی ___ اور یہ فن ان تجربات کے باوجود ترقی کی راہوں پر گامزن رہا۔

مختصر افسانے کے فن کی بنیادی خصوصیات جو تجربات کے ہوتے ہوئے بھی اس کے دم کے ساتھ رہتی ہیں ان کو سمجھنے اور ان کی اہمیت کو محسوس کرنے کے لئے ایک مخصوص ذہنی تربیت کی ضرورت ہے اور یہ ذہنی تربیت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک نئے حالات سے مطابقت پیدا نہ کی جائے ___ نئے حالات سے مطابقت نئے جمالیاتی احساس کا شعور عام کرتی ہے ___ بدلتی ہوئی فنی قدروں کی پاسداری سکھاتی ہے اور مختصر افسانے کا فن ان سب کا تقاضا کرتا ہے ___ وہی لوگ اس سے دلچسپی لے سکتے ہیں جن کے پاس بدلتے ہوئے حالات کے زیر اثر بدلتے ہوئے مذاق کا شعور ہے ___ جو یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی آج حد درجہ پیچیدہ ہوگئی ہے اور اس کو برتنے اور بسر کرنے کے لئے بلند تخیل کی ضرورت ہے تاکہ اس کے نشیب و فراز کو صحیح طور پر سمجھا جاسکے ___ جن کے پاس اس حقیقت کا شعور ہے کہ موجودہ دور کے پیچیدہ ماحول میں بیانیہ انداز سے کہیں زیادہ اشاروں اور کنایوں کی ضرورت ہے ___ مختصر افسانے کا فن ایسے ہی افراد کا متقاضی ہے اور موجودہ دور چونکہ ایسے ہی افراد کا دور ہے اس لئے اس دور کو مختصر افسانے سے خاص مناسبت ہے ___ زندگی کا آج جو عام انداز ہے اس میں اس صورتِ حال کے بدلنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ___ یہی وجہ ہے کہ مختصر افسانے کے لئے ترقی کی بہت سی راہیں کھلی ہوئی نظر آتی ہیں ___ مختصر افسانے کے فن کو آج حساس ذہن اور تیز پڑھنے والے کی ضرورت ہے موجودہ زندگی میں اس کی فراوانی ہے ___ اور اسی لئے اس کا مستقبل روشن اور تابناک ہے۔

اس مستقبل کو روشن اور تابناک بنانے میں ان فن کاروں کا ہاتھ بھی کچھ کم نہیں ہے جنہوں نے مختصر افسانے کے اس فن کو پروان چڑھانے میں نمایاں حصہ لیا ہے اور جن کی تخلیقات نے افسانے کے ان فنی اصول اور مقتضیات کو برت کر اس میں دلچسپی لینے کی ایک فضا قائم کی ہے ___ ان فن کاروں میں گوگول، ایڈگرایلن پو، ملویل، برٹ ہارٹے، اوہنری، چیخوف، موپاساں، ٹالسٹائی، گورکی، کیتھرین

مانسفیلڈ وغیرہ نمایاں حیثیت رکھتے ہیں ___ روس میں گوگول [illegible] مختصر افسانے کے اس فن کا آغاز ہوتا ہے۔ گورکی نے یہ بات غلط نہیں کی ہے کہ ہم سب (یعنی مختصر افسانے کے [illegible]) اوورکوٹ سے پیدا ہوئے ہیں We all sprang from Gogol's over coat ___ گوگول نے افسانے کے فن کو آسمان سے اتارا اور اس کی بنیاد زمین پر رکھی ___ اسی لئے اس کے یہاں مختصر افسانے کے مخصوص انداز میں عمومی زندگی کی تصویریں ملتی ہیں ___ ایڈگر ایلن پو نے اس فن کو عوامی زندگی سے قریب تو نہیں کیا لیکن افسانے کے فن کو نوک پلک سے درست کرنے کی کوشش ضرور کی ___ اور اس میں شک نہیں کہ اس کی یہ کوشش مختصر افسانے کے فن کے لئے ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے ___ امریکہ میں اس کے بعد جو افسانے لکھے گئے ہیں ان سب پر اس کا اثر ہے ___ امریکی زندگی اس عرصے میں بدلی ہے اور اس میں تیزی پیدا ہوئی ہے ___ اس بدلتی ہوئی کیفیت نے وہاں ایڈگر ایلن پو کے بعد بہت سے افسانہ نگاروں کو پیدا کیا اور اس طرح فن کی روایت طویل' بریٹ ہارٹ اور او ہنری وغیرہ کے ہاتھوں میں نئی سے نئی شکلیں اختیار کر کے ترقی کی منزلیں طے کرتی رہی۔ پھر روس میں چیخوف نے اور فرانس میں موپاساں نے مختصر افسانے کی فنی روایت کو اپنی تخلیقی کاوشوں سے چار چاند لگا دئے ___ مختصر افسانے کے فن میں چیخوف اور موپاساں کے سے بلند مرتبہ فن کار ذرا مشکل ہی سے ملتے ہیں ___ چیخوف نے روسی عوام کی زندگی کو افسانے کا موضوع بنایا ہے اور ان کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی ایک ایسے انداز میں کی ہے جو بظاہر تو سیدھا سادہ ہے لیکن ذرا غور سے دیکھئے تو اس میں بہت سی تہیں نظر آتی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کہانیوں کے پیچھے چیخوف کی اپنی شخصیت زیادہ کام کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے ___ موپاساں کو اس کی فکر نہیں ہوتی ___ وہ تو جو کچھ دیکھتا ہے اس کو بیان کرتا ہے ___ اسے اس بات کی پروا نہیں ہوتی کہ اس کے کردار کیا کر رہے ہیں اور اس کے واقعات کا رُخ کس طرف ہے ___ وہ جس طرف بھی جانا چاہتے ہیں وہ انہیں جانے دیتا ہے ___ اس لئے انسانی نفسیات کے لئے اسرار و رموز اس کے افسانوں میں بغیر کسی کاوش کے کھلتے ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے ___ بہر حال چیخوف اور موپاساں نے ان پہلوؤں کو اس طرح افسانے میں سمویا ہے کہ اس سے فن کے لئے نئی راہیں نکلی ہیں ___ روس میں چیخوف کے بعد یہ فن ٹالسٹائی' تیرجنیف اور گورکی کے ہاتھوں میں پہنچتا ہے ___ اور فرانس میں موپاساں کے بعد فلابیر' ڈادے اور اناطول فرانس وغیرہ فن کی اس روایت کو آگے بڑھاتے ہیں ___ ان سب میں اکثر ناول نگار ہیں لیکن ان میں سے بیشتر نے فنی اعتبار سے مختصر افسانے میں بھی اضافہ کیا ہے ___ گورکی ان سب میں سب سے بڑا فن کار ہے ___ وہ انقلابی تھا اور اس کی زندگی کے انقلابی انداز نے اس کے فن میں بھی انقلابی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ گورکی کے مختصر افسانوں کا کمال یہ ہے کہ مجموعی طور پر تو وہ زندگی کے اہم پہلوؤں کو پیش کرتے ہی ہیں لیکن ویسے اس کے افسانوں کا ایک ایک لفظ منہ سے بولتا ہوا نظر آتا ہے ___ اس کے فقروں کی ایک ایک بندش کچھ کہتی ہوئی سنائی دیتی ہے ___ انگلستان میں مختصر افسانے کو ایسا کچھ زیادہ فروغ نصیب نہیں ہوا لیکن انگریزی زبان میں ایک افسانہ نگار ایسی ضرور پیدا ہوئی ہے جس کو چیخوف کا معنوی شاگرد کہا جا سکتا ہے ___ انگریزی افسانے میں نیوزی لینڈ کی کیتھرین مینسفیلڈ کی ویسے اپنی ایک انفرادی حیثیت ہے لیکن اس کا مزاج چیخوف کے فن سے مناسبت رکھتا ہے اس لئے اس کے یہاں چیخوف کے فن کے سے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں ___ غرض افسانے کے فن نے ان فن کاروں کے ہاتھوں ترقی کی ان گنت منزلیں طے کی ہیں اور ان کے بعد ایسے ہی بہت سے فن کاروں نے اس کو ترقی سے ہم کنار کرنے میں بڑا کام کیا ہے ___ ہر ملک کے ادب میں ایسے فن کاروں کے سلسلے ملتے ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک فن کار کا سلسلہ کسی نہ کسی طرح مختصر افسانے کے ان فن کاروں سے ضرور ملتا ہے جو صحیح معنوں میں اس فن کے معمار ہیں ___ مختصر افسانے کے فن کار' چاہے وہ کسی نظریے سے تعلق رکھتے ہوں' ان فن کاروں میں سے ہر ایک کو مختصر افسانے کے فن کا امام تسلیم کرتے ہیں ___ اس لئے افسانے کا ہر فن کار' خواہ وہ کسی ملک کا کیوں نہ ہو' ان سے اکتساب فیض کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہے ___ یہی وجہ ہے کہ ان کے فنون نے مختصر افسانے کے فن پر جو

اثرات چھوڑے ہیں ان میں ایک ہمہ گیری ہے۔ کوئی شعوری طور پر چاہے بھی تو ان اثرات سے دامن نہیں بچا سکتا ——

یہ دور مختصر افسانے کا دور ہے کیونکہ آج کل کی زندگی کے حالات اس فن سے مطابقت رکھتے ہیں —— بدلتے ہوئے ماحول کی رفتار اس فن سے پوری طرح ہم آہنگ ہے —— اس لئے مختصر افسانے کا فن' اور جن فن کاروں نے اس فن کو صحیح معنوں میں فن بنایا' نئی تہذیب میں اتنی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں کہ تہذیب' معاشرت' ادب اور فن' فلسفہ اور جمالیات سے دلچسپی رکھنے والا کسی حال میں بھی ان سے چشم پوشی نہیں کر سکتا —— کیونکہ مختصر افسانے کا فن بہرصورت ایک نئی تہذیب اور معاشرت کا نقیب' ادب اور فن کے نئے میلانات کا عکاس اور فلسفہ و جمالیات کی نئی قدروں کا ترجمان ہے —— اور اس فن کو اسی زاویے سے دیکھنے کی ضرورت ہے' ورنہ اس کے خط و خال کا صحیح اندازہ جوئے شیر لانے سے کم مشکل نہیں!

مغربی اَفسانہ کا اثر اُردو اَفسانہ پر

ممتاز شیریں

چیخوف اور موپاساں، ____ مغربی افسانہ کے ذکر کے ساتھ فوراً یہ دو بڑے نام ہمارے ذہن میں آتے ہیں۔ یہ دو نام جو آج بھی مختصر افسانہ کی تاریخ میں سب سے اہم مانے جاتے ہیں اور سچ پوچھئے تو صحیح معنوں میں جدید مختصر افسانہ کا آغاز چیخوف اور موپاساں ہی سے ہوتا ہے۔

کہا جاتا ہے ٹولسٹائے نے ایک مرتبہ چیخوف کو داد دیتے ہوئے کہا تھا:

"چیخوف روسی موپاساں ہے"

ٹولسٹائے نے تو یہ لقب ازراہ تحسین عطا کیا تھا۔ لیکن آج نصف صدی بعد، دونوں فن کاروں کو پہلو بہ پہلو رکھ کر ان کی ادبی حیثیت کو جانچا جائے، تو بہت ممکن ہے ہمیں یہ شبہ ہو کہ آیا چیخوف کے لئے روسی موپاساں کہلانا باعث تحسین ہے یا موپاساں کے لئے یہ زیادہ باعث فخر ہوگا کہ موپاساں کو فرانسیسی چیخوف کہا جائے۔

بہر حال وقت کے اعتبار سے موپاساں کو چیخوف پر تھوڑی سی اولیت حاصل ہے اور خود چیخوف کو موپاساں اور موپاساں کی حقیقت نگاری پسند تھی۔ اپنے ایک افسانے "A woman's kingdom" میں انہوں نے موپاساں کا ذکر یوں کیا ہے۔ اس افسانے کا ایک کردار ایک دوسری کردار اینا سے کہتا ہے:

"موپساں، عزیز من، موپساں کو پڑھو۔ اُس کے ایک ایک صفحے میں روئے زمین کی ساری دولت سے زیادہ تمول ہے۔ اس کی ہر سطر میں ایک نیا افق ہے.... نرم و نازک روحانی محسوسات کے ساتھ شدید طوفانی، سنسنی خیز جذبات، شیطانی شہوت...... نازک ریشوں کا جال......"

اور اینا اس لفاظی کی دھند کے پرے صرف ایک چیز دیکھ رہی تھی۔ "زندگی! زندگی، زندگی، زندگی موپساں کے ہاں زندگی ہے زندگی موپساں کے ہاتھوں ڈھل کر افسانے بن جاتی ہے[1]۔"

---

[1] Fagnet نے یہ بات موپساں کی اہمیت کو نظر انداز کرتے ہوئے کہی ہے اور ان معنوں میں کہ زندگی اور حقیقت کو جیسی کہ وہ نظر آتی ہے، بالکل اسی طرح پیش کر دینا سہل انگاری ہے اور موپساں کا اپنا کوئی فلسفہ، کوئی تصور حیات نہیں تھا، جو حقیقت میں اور معنی پیدا کر سکے۔ لیکن اسی بات کو ہم تعریفی معنوں میں بھی لے سکتے ہیں کہ زندگی موپساں کے ہاتھوں ڈھل کر افسانے بن جاتی تھی۔

"چیخوف زندگی سے بھی بڑھ کر ہے![1]"

موپساں براہ راست بات کہنے کا عادی ہے۔ صاف سیدھے تیز تند انداز میں 'موپساں نے یوں افسانے تخلیق کئے جیسے عیّاری سے زندگی کے ٹکڑے کاٹ لئے جائیں۔ چیخوف نے جیسے زندگی سے پرے ہٹ کر 'کہیں دُور سے 'ایک ترچھے زاویہ سے زندگی کو دیکھا۔ یونہی بظاہر بے خیالی میں 'غیر اہم 'سیدھے سادے واقعات سمیٹ لئے اور انہیں بغیر کسی شعوری قرینے اور ترتیب کے اپنے افسانوں میں پیش کر دیا لیکن ان افسانوں میں زندگی یوں سمٹ آئی 'جیسے ان میں زندگی کا عطر نچڑ گیا ہو۔

موپساں کے افسانوں میں تیز بھڑکیلے جذبے ہیں 'عمل ہے 'تیزی ہے۔ آگ ہے۔ چیخوف کے افسانے ایک مدھم نقرئی فضا میں ملفوف ہوتے ہیں۔ ان میں عمل کے ساتھ ساتھ کیفیات اور احساسات ہیں۔ نازک گہرا احساس اور سارے افسانے پر کہر ے کی طرح چھایا ہوا دھیما دھیما غم اور لطیف مایوسی۔

موپساں کے پاس "جسم" ہے۔ چیخوف کے پاس "رُوح"۔ یعنی موپاساں کے ہاں وہ فطری 'ہیجانی جذبات اور Passions ہیں جن کا تعلق جسم سے ہے اور چیخوف کے ہاں انسانی رُوح کی ٹیسیں۔

موپساں کے ہاں حقیقت سخت ٹھوس شکل میں ملتی ہے۔ چیخوف کے ہاں یہ ایک روشن 'سیال 'بہتی ہوئی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

موپساں نے گویا تیز گاڑھے رنگوں میں زندگی کی مصوری کی 'چیخوف کے رنگ 'ہلکے 'نرم اور لطیف ہوتے ہیں۔ Subtility چیخوف کے فن کا کمال ہے۔

چیخوف اور موپساں 'ایک رُوسی دوسرا فرانسیسی 'یہ دو بڑی قوتیں ہیں جو مغربی افسانے پر '(لہذا ہمارے افسانے پر بھی) اثر انداز ہوئیں۔ دونوں برابر کے قد کے تھے۔ اگر ایک طرف چیخوف کے اچھے افسانوں ———— The 'Ward No. 6 'Steppe 'The Party 'The Darling اور The School Mistress کو رکھا جائے اور دوسری طرف موپساں کے اچھے افسانوں مثلاً Donle De Saif' Mademoiselle Fifi' Maison Teller وغیرہ کو رکھا جائے تو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کس کا پلڑا بھاری ہے۔۔ دونوں افسانہ نویسی میں نئے اور نرالے طرز کے بانی اور موجد تھے۔ براعظم کے افسانوی ادب پر دونوں کا اثر برابر کا تھا مگر دونوں کا اثر اپنی نوعیت میں متوازی نہیں 'مختلف بلکہ بڑی حد تک متضاد تھا۔ کیونکہ دونوں صاحب طرز ادیب تھے اور مختلف طرز کے ادیب۔

چیخوف اور موپساں کا ہمارے افسانوی ادب پر بھی زبردست اثر پڑا ہے۔ افسانے کے یہ دونوں طرز 'جن کے یہ دو استاد ان فن موجد تھے' اور جنہیں انہوں نے تکمیل تک پہنچایا بھی تھا 'شروع ہی سے ہمارے افسانوی ادب میں رواج پائے' بلکہ ان دو مختلف طرز کے افسانوں کے سر فہرست نظر دوڑائیں تو ہم اپنے ادب میں بھی ایک موپساں اور ایک چیخوف کو ڈھونڈ ہی نکالیں گے۔

موپساں کو پہچاننے میں تو ہمیں چنداں دقت نہ ہو گی کیونکہ بھلا موپساں کے طرز کا افسانہ نگار ہمارے ہاں منٹو کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟

چیخوف کی البتہ جھلکیاں کئی ایک ادیبوں میں ملتی ہیں۔ مثلاً بیدی 'حیات اللہ انصاری 'محمد حسن عسکری 'غلام عباس۔ خصوصیت سے چیخوف کے افسانوں کی فضا، رنگ اور لہجہ (Tone) بیدی کے ہاں پائے جاتے ہیں۔

منٹو اور بیدی جو ہمارے دوصف اوّل کے افسانہ نگار ہیں 'ان دونوں کی تحریروں میں ہم وہ فرق واضح پائیں گے جو چیخوف اور موپساں کا فرق ہے۔ فن شخصیت کا اظہار ہے 'موپساں اور چیخوف (اسی طرح منٹو اور بیدی) انسان کی حیثیت سے ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے۔ چنانچہ فنکار چیخوف اور فن کار موپساں کا فرق اسی فرق کا پرتو ہے۔

۱۔ ولیم جرارڈی: "چیخوف"۔

منٹو اور بیدی کا فرق چیخوف اور موپساں کی طرح رویہ کا فرق ہے۔ منٹو کا رویہ اگر کلی نہیں تو (اپنے دوسرے دور کے افسانوں میں منٹو کا انسان کی انسانیت پر مکمل اعتماد تھا وہ کلی بالکل نہیں رہا) ایک حد تک سادی ضرور ہے۔ زندگی اور انسان کو اور انسان کے وحشیانہ ہیجانی جذبات عریاں کرنے میں اور اپنی تحریروں میں شوک (Shook) دھچکا پہنچانے میں منٹو کا رویہ موپساں کی طرح تقریباً سادی ہے۔ اس کے برخلاف بیدی کا نہایت ہی ہمدردانہ اور مشفقانہ جیسے چیخوف کا۔

گو چیخوف کی نظر میں بھی زندگی میں اتنی ہی قنوطیت ہے کہ کوئی ادب قنوطیت میں زندگی کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ چیخوف نے کہا تھا:

"No literature could out do real life in Cynicism"

لیکن چیخوف کی نظر ایک معالج کی نظر تھی۔ ایک معالج کے لئے دنیا میں کوئی چیز گندی نہیں۔ ایک ادیب کو چاہئے کہ اپنے داخلی ذاتی نقطہ نظر کو چھوڑ کر ایک معالج کی سی معروضیت برتے اور یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ کوڑے کے ڈھیر بھی لینڈ سکیپ میں اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں اور انسان کے بڑے وحشی ہیجانی جذبات بھی اتنے ہی فطری ہیں جتنے اچھے اور نیک جذبات۔"

موپساں کی نظر زندگی اور انسانی سیرت کو جانچنے میں بہت تیز تھی لیکن موپساں کی پیش کش میں خارجیت علیحدگی اور معروفیت ہے۔ ایک فن کار کی علیحدگی اور معروفیت چیخوف میں بھی تھی۔ وہ لکھتے ہوئے اپنے موضوع میں ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ اپنے کرداروں کے جذبات واحساسات اور کیفیات کو اپنے آپ پر اس طرح طاری کر سکتا تھا جیسے وہ خود اسی تجربہ سے گذر رہا ہو۔ انسان کی حیثیت سے وہ اپنے کرداروں میں مکمل مل جاتا تھا لیکن ایک فن کار کی حیثیت میں وہ علیحدگی برابر قائم رکھتا تھا جو ایک بڑے فن کار میں ہونی چاہئے۔ معالج کے رویہ میں ہمدردی کے ساتھ وہ سائینسی معروفیت بھی درکار ہے جو اسے مرض کا صحیح تجزیہ کرنے اور اس کے علاج کرنے میں مدد دیتی ہے۔ چیخوف کی سچی ہمدردی نے کبھی رقت اور جذبات کی شکل اختیار نہیں کی۔ ٹینسن اور موپاساں میں وہ دونوں باتیں ایک ساتھ موجود تھیں جو ای۔ ایم فارسٹر کی رائے میں ایک ادیب میں ایک ساتھ ہونی چاہئیں۔ یعنی (جذبہ) (Passion) اور علیحدگی او معروفیت (Detatchment)۔

زندگی کو دونوں نے سمجھا تھا۔ انسانی زیست اور انسانی سیرت کی پیچیدگی تنوع اور رنگا رنگی دونوں کے حیطہ نظر میں تھی۔

چیخوف نے زندگی کو بڑی آگاہی سے سمجھا۔ ان میں انسانوں کو سمجھنے کی بے پایاں صلاحیت تھی' انسانی مسرت کا عکس اتارنے کی قدرت اور ہمدردی اور رحم کا بے پناہ جذبہ۔

موپساں کو پڑھنے کے بعد بھی' مجموعی طور پر انسان کی یہ تصویر مرتب ہوتی ہے کہ انسان میں بدی ہے' بدصورتی ہے' غلاظت اور حیوانیت ہے' لیکن انسانیت پھر بھی خوبصورت ہے۔

منٹو کے ہاں بھی' خصوصیت سے منٹو کے دوسرے دور کے افسانوں میں' انسان کی یہی تصویر مرتب ہوتی ہے۔

منٹو کے موضوعات بھی موپساں کی طرح انسان کے وحشیانہ' ہیجانی جذبات سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنس' شہوانیت' ظلم' ایذا' قتل وخون' تیز ہیجانی جذبات' غیر معمولی واقعات اور غیر معمولی انوکھے کرداروں کے ساتھ منٹو نے چونکا دینے والے افسانے تخلیق کئے۔ بیدی کے ہاں تیز جذبات' غیر معمولی واقعات طوفانی حادثات شاذ ونادر ہی ملتے ہیں۔ روزمرہ کے معمولی سے معمولی واقعات' جذبات واحساسات اور سیدھی سادی حقیقت کو نرمی' لطافت اور پاکیزگی سے پیش کرنے کا ان میں چیخوف کا سا سلیقہ ہے اور ان افسانوں کو یہ سیدھی سادی حقیقت ہی لطیف اور دلکش بنا دیتی ہے۔

چنانچہ ان کے مشہور افسانے "گرم کوٹ" کو لیجئے۔ اس افسانہ کے متعلق یہ افواہ پھیلائی گئی کہ یہ گوگول کے اوور کوٹ کا چربہ ہے مجھے تو اس میں گوگول والی کوئی بات نہ نظر آئی البتہ نچلے متوسط طبقے کے ایک معمولی گھر اور اس کے افراد کی' ان کی چھوٹی چھوٹی خوشیو

محبتوں، دکھ درد اور مصیبتوں کی یہ سچی نرم لطیف ہمدردانہ پیش کش میں چیخوف کا رنگ چھایا نظر آتا ہے۔

یا پھر 'لاجونتی' میں عورت کی شبیہہ دیکھئے۔ اس افسانہ میں جو فسادات سے متعلق اپنے انداز کا یکتا افسانہ ہے 'عورت کی روح کے نازک تاروں کو کس طرح چھوا گیا ہے۔ لاجونتی کا شوہر ایک سیوک ہے اور اغوا شدہ عورتوں کو واپس لے آنے اور ان کے رشتہ داروں سے اچھا سلوک کروانے کی مہم اٹھا رکھی ہے۔ انسانی ہمدردی سے اس کا دل معمور ہے' وہ دل جو خود چوٹ کھایا ہوا ہے کیونکہ اس کی بیوی بھی اغوا کر لی گئی ہے۔ جب اسے واپس مل جاتی ہے وہ اس سے اتنا نرم سلوک کرتا ہے جیسے وہ کانچ کی بنی ہوئی ہو اور ٹوٹ نہ جائے جیسے وہ لاجونتی ہو۔ 'اس کے پیچھے ہی چوٹ کھائے ہوئے دل کو ٹھیس نہ پہنچے اور اس کی زخمی روح تڑپ نہ اٹھے۔ اس کے واپس ملنے کے بعد وہ اپنی بیوی کو دیوی پکارتا ہے اور دیوی ہی سمجھتا ہے اور لاجونتی چاہتی ہے وہ اسے دیوی نہ سمجھے 'ایک کمزور عورت سمجھے۔ اغوا کے دوران میں اس پر جو کچھ بیتی تھی اسے سننے سے یوں گریز کرے۔ اسے سن کر اس کے دل کا بوجھ ہلکا کرے اور اس کی زخمی روح پر مرہم رکھے۔

بیدی کے لاجونتی میں بھی وہی 'چیخوفی' کیفیت پائی جاتی ہے۔ چیخوف کا فن ایک طرح سے انسانی نفسیات کا فن ہے' لیکن نفسیاتی اُن معنوں میں 'نہیں' جن میں پروست کا فن نفسیاتی کہا جاتا ہے۔ بلکہ رُوح پر چھایا ہوا ہلکا سا غبار' درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں' وہ ناقابل عبور خلیج جو انسان انسان کے درمیان حائل ہے۔ ساتھ ساتھ رہتے ہوئے بھی وہ دُوری وہ بیگانگی' وہ ناقابل بیان تنہائی جو انسان اپنے وجود اپنی روح میں محسوس کرتا ہے۔

لاجونتی بھی یہی تنہائی اپنی روح میں محسوس کرتی ہے۔

بیدی کے ہاں عورت یا لاجونتی ہے یا گرم کوٹ' کی محبت کرنے والی بیوی شمی یا "گرہن" کی ستائی ہوئی ہندوستانی عورت ہولی۔

منٹو کے ہاں وہ سوگند تھی ہے' نیلم ہے 'کلونت کور ہے' موذیل ہے۔ اپنے تیز جذبات کے ساتھ جاندار پھڑکتی ہوئی' جس کے بیان میں وہی موپساں والی کیفیت پائی جاتی ہے کہ اس تحریر کا کاغذ تک' جس پر اس کا ذکر ہو' تازہ گرم گوشت کی طرح پھڑکنے لگتا ہے۔

"ہتک" کی سوگندھی میں منٹو نے بھی طوائف کے اندر چھپی ہوئی عورت کو پایا ہے اور اس کی روح کو چھوا ہے۔ لیکن سوگندھی بھی ایک فطری عورت ہے۔ تیز جذبات والی جو سیٹھ کی "اونہہ" کی توہین کا بدلہ مادھو کی توہین کر کے لیتی ہے۔ اپنے جذبات کا بخار اس پر نکالتی ہے اور آخر میں سارے مردوں سے نفرت کے اظہار کے طور پر اپنے خارش زدہ کتے کو پہلو میں لپٹائے سو جاتی ہے۔

منٹو کے ایک تازہ افسانے 'سڑک کے کنارے' میں البتہ عورت کی رُوح ہی رُوح ہے۔ ایک عورت اور ایک ماں کی زخمی تڑپتی ہوئی روح! لیکن منٹو نے اس افسانے میں بھی ایسا Situation پیدا کیا ہے کہ اس رُوح میں ایک طوفان ہے ایک ہلچل مچی ہوئی ہے۔ اس کے برخلاف لاجونتی کی رُوح میں ہلکی ہلکی ٹیسیں ہیں جنہیں وہ خاموشی سے چپ چاپ برداشت کر لیتی ہے۔

چیخوف کی ڈارلنگ بھی منٹو کے ہاں جانکی بن جاتی ہے۔

اور نچلے طبقے کا وہ سیدھا سادا کردار جو بیدی کے 'رحمٰن کے جوتے' میں ہے' منٹو کے ہاں نیا قانون کا اُستاد منگو بن جاتا ہے۔

موضوع اور بنیادی رویہ کے فرق کے علاوہ انداز پیش کش اور افسانے کی تکنیک میں بھی موپاساں اور چیخوف کے طرز الگ الگ ہیں۔

موپساں کے افسانے زندگی سے کاٹے ہوئے ایسے ٹکرے ہیں جو بذات خود مکمل ہیں' ان میں ایک پلاٹ ہوتا ہے' ایک آغاز ایک وسط' ایک منتہی' ایک ایسا منتہی جو افسانے کو واقعی اختتام تک پہنچائے یا ایک ایسا چونکا دینے والا موڑ جس سے ایک ضرب کے ساتھ داستان کے ٹوٹ جانے کا احساس ہو۔ موپساں کا افسانہ مناسب تراش خراش' تعمیر اور فنش کے ساتھ مکمل مختصر افسانہ ہے۔

چیخوف کی حقیقت نگاری' جیسا کہ ولیم جرارڈی نے لکھا ہے "گوگل' ترگنیف' دستاوسکی اور ٹولسٹائے کی حقیقت نگاری کی ارتقائی

صورت ہے۔ حقیقت نگاری دراصل زندگی کے خاص مناظر اور نمایاں خدوخال کو اخذ کرنے سے عبارت ہے ورنہ آرٹ کے ذہن کے باہر زندگی ایک بکھراؤ میں مستور رہے۔ مبہم، دھندلی، بغیر کسی شکل، بغیر کسی ہیئت کے، ایک بے پایاں وسعت۔ چیخوف کے افسانوں میں زندگی ایک خاص ہیئت کی قید و بند میں جکڑی نہیں جاتی۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ چیخوف کے افسانے تکنیک اور ہیئت سے بالکل بے نیاز ہوتے ہیں بلکہ یہ کہ ان میں ہیئت ہوتے ہوئے بھی محسوس نہیں کی جا سکتی۔

چیخوف کا فن اشارہ (Implication) کا فن ہے۔ چیخوف کے افسانوں کے اختتام کسی بات کو انجام تک نہیں پہنچاتے۔ افسانے کے آخر میں چیخوف جیسے کہتے کہتے رُک سا جاتا ہے اور ہمیں حیران چھوڑ کر ہم سے رخصت ہو جاتا ہے۔ بات ادھوری دیکھ کر پہلے تو ہم کچھ سمجھ نہیں پاتے لیکن پھر ہمیں کوئی اہم معنی خیز اشارہ، کوئی گہری حقیقت چھپی ہوئی مل جاتی ہے۔ جس سے افسانے کا انجام خود بخود ہمارے ذہن میں تشکیل پا جاتا ہے چیخوف کے افسانوں میں یہ ادھورے رہ جانے اور تکمیل نہ پانے کا احساس ہمیں ایک اور شدید احساس دلاتا ہے کہ یہ خارجی واقعات جو پیش آتے ہیں، دراصل بہت معمولی، غیر اہم اور چھوٹے چھوٹے ذریاتی ہیں اور اس حقیقت کا جسے زندگی کہتے ہیں، محض ایک چھوٹا سا جزو ہیں۔ کوئی چیز بذات خود مکمل نہیں۔

چیخوف کے افسانوں میں شعریت بلکہ تغزل کی سی کیفیت پائی جاتی ہے اور چیخوف کے افسانوں میں ترتیب اور تشکیل کا انداز موسیقی کا سا ہے۔

موپساں کا افسانہ ہمارے ادب میں اپنی مکمل ارتقائی صورت میں (اسی طرز کا افسانہ او ہنری جیسے افسانہ نگاروں کے ہاں اپنی خام، معمولی صورت میں ملتا ہے) منٹو کا افسانہ ہے۔ ہمارے ہاں منٹو کے سوا کسی اور ادیب نے موپساں کے طرز کو کامیابی سے نہیں اپنایا ہے۔

نہیں معلوم منٹو نے موپساں کے اثر کو شعوری طور پر قبول کیا ہے یا نہیں۔ منٹو کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ منٹو کو بذات خود موپساں یا کسی بھی مغربی ادیب کے اثر سے انکار تھا۔ یہ منٹو کی 'انا' تھی' (اور یہ انا اُس کو بھاتی بھی تھی) جو کسی کے اثر سے سراسر منکر تھی۔ ورنہ یہ قرین قیاس ہے کہ منٹو نے پہلے پہل رسالوں کے روسی اور فرانسیسی نمبر مرتب کرتے ہوئے مغربی افسانہ کے اثر کو قبول کیا ہو گا۔ چنانچہ منٹو کے ایک آدھ افسانے میں گورکی کا اثر بھی ملتا ہے۔ دیوندر ستیارتھی نے اپنے منٹو پر طنزیہ افسانے "نئے دیوتا" میں یہ ظاہر کیا ہے کہ منٹو پر سامرسٹ مام کا بہت زیادہ اثر تھا۔ بلکہ مام سے زبردست ادبی عقیدت تھی۔ ممکن ہے موپساں کا اثر بالواسطہ مام کے ذریعہ پڑا ہو کیونکہ سامرسٹ مام موپاساں کے عقیدت مندوں اور مقلدوں میں سے ہیں، بہر حال منٹو پر موپاساں کا اثر شعوری ہو یا غیر شعوری، براہ راست یا بالواسطہ منٹو موپاساں کے اس قدر قریب پہنچ گیا، جہاں تک سامرسٹ مام کی بھی رسائی نہ ہوئی۔

منٹو نے بھی موپساں کی طرح زندگی کا زہر اس طرح چکھا تھا کہ اس کی تلخی کام و دہن سے اُتر کر قلب و روح تک پہنچ گئی۔ لیکن پھر بھی منٹو نے موپساں کی طرح ہمیں یہ احساس دلایا کہ انسان میں بدی ہے، بدصورتی ہے، گندگی ہے، حیوانیت ہے، لیکن انسانیت پھر بھی خوبصورت ہے۔

منٹو کو پڑھتے ہوئے بھی ہمیں وہی احساس ہوتا ہے جیسے موپساں کے متعلق چیخوف کے ایک کردار کو ہوا تھا (جسے 'اینا' صرف ایک ہی چیز دیکھ رہی تھی)

زندگی، زندگی، زندگی، منٹو کے ہاں زندگی ہے!
زندگی منٹو کے ہاتھوں ڈھل کر افسانے بن جاتی
ہے!

چیخوف کا اثر بھی [illegible] نے شعوری طور پر قبول کیا ہے یا نہیں یہ اندازہ لگانا مشکل ہے۔ چیخوف کا اثر ہمارے مغربی

افسانہ پر اتنا زبردست تھا کہ James T. Farrel نے اپنے مضمون The League of frightened Philistines میں لکھا کہ چیخوف کی کہانیوں کا انگریزی میں ترجمہ مختصر افسانے کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور اگر کوئی ایک واحد زبردست اثر امریکہ، انگلستان اور سارے برِ اعظم کے افسانوی ادب پر پڑا ہے تو وہ چیخوف کا اثر ہے۔ ہمارے یہاں چیخوف کا اثر نمایاں اور واضح طور پر کسی ایک افسانہ نگار میں ظاہر نہیں ہوا (جیسا کہ موپاساں کا منٹو میں) لیکن یہ زیادہ وسیع اور گہرا ہے اور ایک Undercurrent کی طرح بہتا ہے۔

بیدی کے افسانوں کا رنگ اور لب و لہجہ چیخوف کا سا ہے۔ خواہ یہ اثر شعوری ہو یا غیر شعوری اور محمد حسن عسکری نے جو ہمارے ان معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں۔ جنھوں نے مغربی ادب کو پوری آگاہی سے سمجھا ہے' چیخوف کے شعوری اثر کا اعتراف کیا ہے۔

حسن عسکری اپنے مجموعے "جزیرے" کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

"ایک چیز کے حسن کو میں نے واقعی اپنی رُوح کی گہرائیوں میں محسوس کیا ہے اور اتنے شدید طور پر کہ اس احساس کی لرزش جب چاہوں اپنے اندر پا سکتا ہوں' اور وہ چیخوف کا افسانہ "اسکول مسٹرس" ہے۔ یہ خالص موسیقی ہے اور میں اس کوشش میں رہا ہوں کہ یہی نغمگی اپنے افسانوں میں پیدا کر سکوں۔ میرا افسانہ "حرامجادی" چیخوف کے اسی افسانہ سے متاثر ہے۔ اگر اس میں کچھ ہے تو اسے جمال ہم نشیں کا عکس ہی سمجھئے اور اسی طرح "چاء کی پیالی" کا خیال بھی مجھے چیخوف کے "اسٹیپ" سے پیدا ہوا تھا............ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حُسن معنوی ہو یا حُسن صوری سب رُوح کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔

یوں تو کرشن چندر کا "حسن و حیوان" بھی چیخوف کے The Steppe کی طرز پر لکھا گیا ہے کافی کامیاب کوشش ہے۔ اس زمانے میں جب کرشن چندر نے پہلے پہل لکھنا شروع کیا تھا اور جو ہمارے نئے ادب کا اور افسانہ کا ابتدائی زمانہ تھا' کرشن چندر نے مغربی افسانہ سے متاثر ہو کر کئی ایک نئے تجربے کئے۔ بلکہ ان کا ہر افسانہ ایک نیا تجربہ ہوتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس دَور میں کرشن چندر نے بعض بہت اچھے افسانے لکھے۔ چنانچہ "حسن و حیوان۔ "پورب دیس ہے دلی۔" "دو فرلانگ لمبی سڑک۔" "زندگی کے موڑ پر"۔ "گرجن کی ایک شام"۔ "ان داتا"۔ "بالکونی" اور سچ پوچھئے تو آج بھی کرشن چندر کے یہی بہترین افسانے ہیں۔

کرشن چندر کے پاس ذہانت تھی' کسی چیز کا فوری اثر قبول کر لینے والا مزاج' ایک زود نویس' تیز رفتار قلم' چلتی ہوئی رنگین زبان۔ جس سے انہیں اظہار میں کوئی مشکل نہ ہوتی تھی۔ لہٰذا وہ جس مغربی افسانے سے بھی متاثر ہوئے' اسی طرز کے افسانے کو فوراً اردو میں منتقل کیا۔ اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ کرشن چندر کے افسانے مغربی افسانوں کے چربے ہوتے تھے۔ بلکہ یہ کہ ان میں یہ صلاحیت تھی کہ مختلف طرز کے مغربی افسانوں سے بہ یک وقت اثر قبول کریں اور فوری طور پر انہیں اُردو میں تخلیق کریں اور یہی وجہ تھی کہ شروع شروع میں ہر افسانہ ایک نئے طرز کا لکھ کر انہوں نے فوراً پڑھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ لیکن کرشن چندر کا رویہ ان دونوں بھی جب انہوں نے اپنے آپ کو کسی مخصوص سیاسی آئیڈیالوجی سے وابستہ نہیں کر لیا تھا ہمیشہ ایک صحافی کا سا رہا ہے۔ وہ کسی چیز کا اثر فوری لیکن وقتی طور پر قبول کرتے ہیں۔ فوری اظہار بھی ان کے لئے آسان ہے۔ چنانچہ کرشن چندر سے یہ شاذ ہی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی چیز کی تخلیق کرتے ہوئے اس کرب سے گزرے ہوں گے' جسے Creative agony کہتے ہیں۔ یا انہوں نے جس "حسن" کی تخلیق کی ہے اسے رُوح کے سانچے میں ڈھالا ہے گو یہ حسیات (Senses) اور جذبات (Sentimints) کو ضرور متاثر کرتا ہے۔

کرشن چندر نے کسی ایک مغربی ادب یا کسی خاص تحریر کا اثر یوں قبول نہیں کیا کہ وہ ان کی رُوح کی گہرائیوں میں اتر گئی ہو۔ بلکہ انہوں نے وقتی طور پر مختلف طرز تحریر اور مختلف مغربی رجحانات سے دلچسپی لی۔ حتیٰ کہ کوئی نیا ٹکنیکی یا کسی اور طرح کا تجربہ کرنا ان کے لئے کھیل سا ہو گیا اور انہوں نے ایک سوریلسٹک تصویر (Surrealistic) بھی کھینچی' اور ایک افسانہ میں الفاظ بدل کر نئی زبان بنانے کا صوتی تجربہ بھی کیا۔ یہ ایسا کام ہے جس میں کوئی جیمس جوائس ہو گا جو ایرد کر (Earwicker) کے خواب میں آفاقی اور کائناتی اصولوں کی

... جوائس کی (Finnegans Wake) کے لئے ایک نئی زبان کی تخلیق کرسکے۔ لیکن کرشن چندر کی یہ کوشش تو اس کے ... تھی اور یہ اپنی جگہ کوئی معمولی کوشش ہی نہیں تھی۔ اسی طرح انہوں نے "..." میں ایک پراسرار رمزیت پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں کچھ توانائی گرانی پو کے پراسرار افسانوں Pit and the Pendulum کی سی ذہنی اذیت کی ... تھی اور کچھ کافکا کے انداز کو اپنانے کی کوشش۔

کافکا کی گہری رمزیت اور کافکا کا انداز اگر ہمارے ہاں کسی ادیب میں ہے تو وہ احمد علی میں ہے۔ ممکن ہے احمد علی کافکا سے شعوری طور پر متاثر ہوئے ہوں اور انکے ہاں کی مطابقت ادبی مزاج کی مطابقت کا نتیجہ ہو۔ چنانچہ ابھی ایک نئے فرانسیسی ادیب کی تخلیق Aminadab کی کافکا کی تخلیقات سے موازنہ کرتے ہوئے ژاں پال سارتر نے لکھا ہے کہ مصنف کو خود کافکا کے اثر سے انکار ہے۔ بلکہ اس کا یہ کہنا ہے کہ جن دنوں یہ تحریر ہوئی اس نے کافکا کو پڑھا تک نہیں تھا۔ تو پھر ژاں پال سارتر کی رائے میں یہ مطابقت اور بھی حیرت انگیز ہے۔[1]

کافکا کی جینئس کچھ ایسی غیر معمولی اور یکتا Unique تھی کہ وہ ایک Myth ہی بنا رہا۔ عام ادیبوں کی رسائی سے بہت دُور ایک پیہم کشش اور ترغیب_______ ژاں پال سارتر کے الفاظ میں_______

"He remained on the Horizon A perpetual temptation. Kafka could not be imitated."

لہٰذا کافکا کی فکر سے مناسبت اور کافکا کا سا رمزی طریقہ اظہار خواہ وہ شعوری ہو یا غیر شعوری' بہت بڑی بات ہے اور ایک مشابہ جینئس کا تقاضا کرتی ہے۔

ہمارے افسانہ نگاروں میں احمد علی کی جینئس غیر معمولی ہے اور وہ ہمارے وقیع ترین (Significant) افسانہ نگار ہیں گو وہ منٹو یا کرشن چندر کی طرح مقبول عام نہیں۔ منٹو کی تحریروں کی اپیل خاص و عام کے لئے یکساں تھی۔ لیکن احمد علی کی تحریریں' اپنی نوعیت میں Esoteric ہیں۔ جنہیں محدودے چند ادب کا صحیح ذوق رکھنے والے ہی Appreciate کرسکتے ہیں۔

احمد علی کی رمزی تحریروں کے علاوہ دوسری تحریریں بھی ایک خاص پایہ اور مقام رکھتی ہیں۔ (   ) چنانچہ "ہماری گلی" "مستو شموخاں" اور "مارچ کی ایک رات" وغیرہ۔ لیکن احمد علی کا مخصوص لب و لہجہ اور رنگ رمزی اور فلسفیانہ ہے۔ رمزیت[2] کو انہوں نے شروع ہی سے اپنایا تھا۔ نئے ادب کی سب سے پہلی کتاب "انگارے" میں بھی ان کے افسانے سرریلزم اور آزاد تلازمِ خیال کے مظہر تھے۔ "پریم کہانی" میں انہوں نے محبت کا فلسفہ پیش کیا۔ "قلعہ" میں سیاست کو بھی فلسفیانہ رنگ دیا۔ "گزرے دنوں کی یاد" میں انہیں وقت کی ... کی پُراسرار حیران کن آواز آئی۔ یہ افسانے سب کے سب بڑی شدت (Intensity) اور گہرائیوں کے حامل ہیں۔

احمد علی کی جن تحریروں میں خاص طور پر کافکا کی رمزیت اور طریقہ اظہار پایا جاتا ہے وہ "قید خانہ" "تیسرا کمرہ" اور "موت سے پہلے" ہیں جن میں کافکا کے افسانوں سے نہیں بلکہ "The Caske" اور "The Trial" سے مناسبت پائی جاتی ہے۔ جو فکشن میں رمزیت کے ... ہیں۔ اگرچہ امریکی ناول نگار ہرمن میلول ہیں (موبی ڈک) جن کے نزدیک ساری دنیا ہی ایک سمبل تھی۔ لیکن جدید رمزیت کا ... سرچشمہ کافکا ہی سے پھوٹتا ہے۔ کافکا میں ایک حقیقت نگار کے مشاہدہ کی گہرائی اور باریک بینی ہے اور ایک شاعر کی قوت تخیل ... ایک طرح کی الہامی بے خودی (Delirium) کی حد تک لے جاتا ہے جس میں تصورات ایسے ہوتے ہیں' جو ظاہری حقیقت ... ہوتے ہوئے بھی ان چیزوں کی اندرونی تہوں اور ان کی اصلی فطرت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان میں ہمیں سطحی نہیں بلکہ عمیق ... ہے۔

"... اسرار و رموز کی کرب ناک جستجو بن جاتا ہے' ایک وجودِ مطلق کی جستجو' خدا اور انسان

1- Jean Paul Sartre: Literrary and Philoaphical Essays.

2. Symbolism.

کے درمیان ایک کچھ رشتہ کی جستجو ایک صحیح طرزِ زندگی کی تلاش کے یہ تلاش کی راہیں جو بظاہر آسان ہوتے ہوئے بھی کچھ ایسی گزرتی ہیں کہ انسان جیسے بھول بھلیوں میں کھو کر رہ جاتا ہے۔

احمد علی کے "قید خانہ" میں ایک انسانی رُوح جکڑی ہوئی ہے۔ ایک قید کے اندر دوسری قید، دائرے تنگ ہوتے چلے جاتے ہیں، گھٹن بڑھتی جاتی ہے۔ حتی کہ انسان کا جسمانی وجود ہی ایک قید ہے۔ "قید خانہ" میں احساس مجسم بن گیا ہے۔ اس افسانہ کا کردار ایک احساس آدمی کا ذہن ہے۔ احساس کے زیر اثر نہ صرف ذہن سوچتا ہے اور آنکھ دیکھتی ہے بلکہ احساس جسم کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا ہے۔ ذہن جسم و رُوح سب اس کرب، گھٹن اور قید میں جکڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور "موت سے پہلے" ایک طرح کا بھیانک رمزیہ خواب (Symbolic Nightmare) ہے۔ اس میں "The Trial" کی کیفیت ہے۔

کافکا کا ایک "ماورائے ادراک حقیقت Transcendental Reality" پر ایمان تھا۔ یہ حقیقت جس کی جستجو میں انسانی ذہن و رُوح بھٹکتے ہیں، لیکن جو انسان کی رسائی سے بہت دُور ہے۔

اس حقیقت کی تلاش میں میلول نے بحر بیکراں کی وسعتوں میں سفر کیا اور عمیق، وسیع و عریض سمندر کو گنج معانی اور ان رازہائے سربستہ کا سمبل بنایا جن کی تلاش میں انسانی عقل بھٹکتی پھرتی ہے۔ موبی ڈک' کے کپتان اہب کو اس بحر بیکراں میں اتنی دُور جانے کی سوجھی جہاں کسی اور سیاح کی رسائی نہ ہو اور وہ ایک نا قابلِ شکست 'نا قابل فہم Unscrutibility ایک Opaque دبیز سفیدی (جس کی سفید وہیل مچھلی سمبل ہے) سے ٹکرا کر فنا ہو گیا۔ میل ول کی Prophecy میں ایک حقیقتِ مطلق کی جستجو اور زندگی کے معانی پانے کی کوشش انسان کی فنا تک لے جاتی ہے۔

اسی Fatality کا احساس کافکا کے ہاں بھی ہے۔

جہاں احمد علی کے ادبی مزاج نے کافکا کی گہری رمزیت میں یگانگت محسوس کی، وہاں عزیز احمد نے ایمل زولا کی نیچریت (Naturalism) اور غیر مشروط حقیقت نگاری میں کشش پائی۔ لیکن زولا کی یہ نیچریت اور "ریلزم" "Nana" میں کچھ اور ہے۔ "Earth" میں کچھ اور۔ جب زولا نے Nana کے لئے ایک ایسی موت تجویز کی جس سے اس کے شفاف، بے داغ حُسن پر اس کے گناہ کی گندگی اور باطن کی سڑاند اُبل پڑے تو زولا نے ایک سپیشلسٹ کے پاس سے چیچک کی کیس ہسٹری منگائی اور ایک ایسے کیس کا خصوصیت سے بغور مطالعہ کیا جس میں بدترین قسم کی چیچک سے موت واقع ہوئی تھی اور اس کیس کی ساری تفصیلات سے نانا کی موت کی تصویر کھینچی۔ ظاہر ہے کہ جب حقیقت نگاری اس حد تک Studied ہو تو اس میں فطرت کی وہ بے پناہ، غیر ارادی سی بے ساختگی پائی جا سکتی ہے؟ لیکن زولا کے Earth میں فطرت نگاری اس بلا کی ہے کہ اس میں زندگی دھڑکتی، زرخیز دھرتی Fecund Earth کی کوکھ سے پھوٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

عزیز احمد کا اپنا کہنا ہے کہ وہ آلڈس ہکسلی سے بھی متاثر ہیں۔

ہکسلی...... سائنسی علوم سے واقف، ذہین، سنجیدہ اور انٹلکچو ئل.... . ہکسلی کا رویہ ایک فن کار سے زیادہ ایک انٹلکچو ئل کا ہے۔ فکشن ان کے لئے بعض خاص Ideas اور اصولوں کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ ان کی تحریریں یا تو Allegories ہیں، جیسے "The brave new World"، "Ape and Essence" یا ان کے ناول "Novel of Ideas" کے تحت آتے ہیں اور ان کے کردار مختلف خیالات اور تصورات (Conceptions) کے مظہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کے "پوائنٹ کاؤنٹر پوائنٹ" میں مارک ریمپئن اور فلپ کوارلس خود مصنف کی شخصیت کے دو رُخ ہیں، جو مجسم کو دئے گئے ہیں۔ ان کی منقسم انا (Divided Ego) کے دو مظاہر ــــــــــ Alter-Ego، دو اصلی کرداروں میں اتنی تفاوت نہیں ہوتی، وہ

کردار ایک دوسرے سے اتنے آزاد نہیں ہوتے، اتنے مکمل طور پر ایک دوسرے کی ضد نہیں ہو سکتے۔ جیسے کہ فلپ کوارلس اور مارک ریمپئن ہیں۔ یہاں دو مختلف اور متضاد میلانات کو بڑھا چڑھا کر انہیں مجسم کر دیا گیا ہے۔ فلپ کوارلس کی عقلیت اور منطق حد سے تجاوز کر گئی ہے حتیٰ کہ اس کے فطری جذبات اور حسیں بھی عقل و دماغ کے تابع ہیں اس کے برخلاف ریمپئن آزاد فطری جبلتوں اور بے لگام جسمانی جذبات کا نمائندہ ہے۔

اپنے تازہ ترین ناول The genius and the godess میں ہکسلی نے اسی Split charactor alter egos کی تقسیم کو ایک اور ہی پس منظر میں پیش کیا ہے "Intellect" اور "Instinct" کی وہی تکرار اور تضاد ہے۔ لیکن یہاں "عقلیت" کا نمائندہ مرد ہے اور "جبلت" کی نمائندہ عورت۔ یعنی "پوائنٹ کاؤنٹر پوائنٹ" کی وہ محبت کی پیاسی ایلینا جو اپنے شوہر کی جذبات سے عاری نری عقلیت اور منطق سے تنگ آگئی تھی اب محض Sensulity کی نمائندہ ہے یا بنادی گئی ہے۔ یہاں جینکس ایک Physicist ہے اور "Godess" اس کی حسین بیوی جو اس کی جینکس کے لئے وجدان کی محرک ہے۔ یہ دونوں ایک نوجوان معصوم، آئیڈیلسٹک رومانی لڑکے کے زاویہ نظر سے دکھائے گئے ہیں جو مرد کو اپنی intellect کے ساتھ ایک جینکس اور ہیرو سمجھتا ہے اور عورت کو اپنے حسن کے ساتھ ایک دیوی، وہ Phsysicist کی "ہیرو ورشپ" کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس کی خوبصورت بیوی کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں کی ایک ساتھ پرستش کرتا ہے لیکن آخر میں اُسے دونوں سے ڈزالوژن ہوتا ہے کیونکہ یہ دونوں نامکمل تھے۔

آلڈس ہکسلی نے ان دو حدوں "Intellect" اور "Instinct" کو مجسم پیش کر کے گویا دونوں قسم کی افراط تفریط میں اعتدال اور توازن کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ عزیز احمد نے اسی طرح دو حدوں کے درمیان اعتدال اور توازن کی ضرورت کو "اور بستی نہیں یہ....." میں Alter-Egos اور Split charactor کے ذریعہ پیش کیا ہے اور ہکسلی کی طرز پر ایک تجربہ کیا ہے۔ چنانچہ اس افسانہ میں الف خاں اور بے خاں دو الگ الگ میلانات کے مجسم مظہر ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کی پوری ضد تو نہیں، لیکن ایک ہی کردار کے دو رُخ ضرور ہیں۔ ایک میں جبلت کی بے لگام تیزی اور افراط ہے، دوسرے میں اعتدال اور توازن، اکثر کوئی عملی قدم اٹھانے سے پہلے اور ذہنی اور قلبی کشمکش میں دو آوازیں حصہ لیتی ہیں۔ ب خاں، الف خاں کی دوسری آواز ہے۔ چنانچہ الف خاں گویا "جبلت ہے" (Instinct)، اور بے خاں ضمیر (Conscience)۔

ہکسلی کے ہاں تو خیر بڑے کھلے طریقے پر ایک کردار کو دو کرداروں میں بانٹا گیا ہے۔ ورنہ یوں دیکھا جائے تو واقعی بڑے ادب میں کئی ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں یہ فرق ایک زیریں حقیقت ہے اور ایک کردار دراصل ایک پیچیدہ مکمل اور بڑے کردار ہی کا ایک جزو ہوتا ہے۔ چنانچہ پرومیتھیوس اور ایپیمیتھیوس دراصل ایک ہی ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی بڑی شخصیت کے Introvert اور Extraver پہلو ہیں۔ (Jung) میفسٹوفلس دراصل فاوسٹ ہی کی شخصیت کا دوسرا یعنی "Evil" رُخ ہے جو اس پر حاوی ہو جاتا ہے اور یہ اوتھیلو کی شکی طبیعت ہی تو ہے جو Ego بن کر اُسے اکساتی ہے اور اس کی آتشِ رقابت کو بھڑکاتی ہے!

ہکسلی کے شعوری اثر کے تحت اس خاص تجربہ کے علاوہ عزیز احمد ہکسلی سے یوں بھی متاثر ہیں کہ ان کے ناول اور افسانوں کے Structure بھی "Ideas" کے گرد کھڑے کیے جاتے ہیں۔ جو کبھی کرداروں کی بحث کے ذریعہ پیش ہوتے ہیں یا کبھی کسی اور طریقہ پر۔

اوپر میں نے چند ایسے انفرادی اثرات کا جائزہ لیا ہے، جس میں بعض خاص خاص مغربی ادیبوں کا اثر ہمارے افسانہ نگاروں پر انفرادی طور پر ہوا ہے۔ لیکن ہمارے صفِ اول کے افسانہ نگاروں میں بعض ایسے ہیں، جن میں کسی خاص مغربی ادیب یا کسی خاص مغربی رجحان یا کسی خاص تحریر کا اثر واضح طور پر نمایاں نہیں ہے لیکن ان کے افسانے پڑھ کر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے مغربی ادب کو سمجھ کر پڑھا

ہے اور اسے غیر محسوس طور پر اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ چنانچہ غلام عباس کے افسانوں میں کسی کا واضح اثر نظر نہیں آتا لیکن ان کا ہر افسانہ پڑھتے ہوئے ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم کوئی بہت اچھا مغربی افسانہ پڑھ رہے ہیں۔ "آنندی" "حمام میں" "سمسایہ" "جواری" اور "سایہ" جیسے افسانے کسی بھی مغربی ملک کے افسانوی ادب کی بہترین کوششوں کے ساتھ شمار ہو سکتے ہیں۔

مغربی ادب کا اثر ہمارے افسانے پر دو طرح سے ہوا ہے۔ ایک تو انفرادی اثر یعنی بعض انفرادی مغربی ادیبوں کا اثر ہمارے خاص خاص لکھنے والوں پر، دوسرا مجموعی اثر یعنی مجموعی طور پر مغرب کے ادبی مزاج، مغرب میں نئے نئے رجحانات اور نئی نئی تحریکوں کا اثر۔

افسانہ مغرب میں بھی سب سے نئی اور کم عمر صنفِ ادب ہے۔ اردو افسانے کی عمر تو مشکل سے بیس پچیس برس کی ہو گی۔ ہمارے ہاں افسانہ کی پیدائش بھی اُس وقت ہوئی جب ہمارے ادیب مغربی ادب کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنے اور اس سے مستفیض ہونے لگے تھے اور یہ مغربی ادب کا مطالعہ، نیا شعور اور آگاہی سب سے زیادہ اسی صنف یعنی افسانہ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ کیونکہ مغربی ادب سے نئی نئی تحریکوں، رجحانوں، تکنیکوں اور نئے نئے طرز اپنانے کا شعور افسانے کے ساتھ ساتھ ہی پیدا ہوا اور ہمارے افسانے نے بھی مغربی افسانے کے دوش بدوش ہی ترقی کی منزلیں طے کیں۔

افسانے کے لیے ہمارے اپنے ادب میں کوئی روایات نہ تھے۔ افسانہ کا ازلی ماخذ روایتیں اور حکایتیں ہیں، جو سب سے پہلے عبرانی (Hebrew) عربی اور یونانی میں پائی جاتی ہیں۔ اسی طرح کی الف لیلوی حکایتیں ہمارے ہاں "قصہ چہار درویش" اور "حاتم طائی" کے سے حکایاتی (Episodic) اور Picareque قسم کی کتابوں میں نمودار ہوئیں۔ لیکن یہ الگ الگ مختصر کہانیوں کی بجائے سفر ناموں اور ناولوں کی صورت میں پیش ہوتی تھیں۔

افسانہ یوں تو پریم چند سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن پریم چند اور ان کے سکول کے افسانہ نگاروں مثلاً سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی وغیرہ کے ہاں ناول اور افسانہ کا فرق ابھی واضح نہیں ہوا تھا اور ان دو صنفوں کے درمیان حد فاصل قائم نہیں ہوئی تھی۔ فرق صرف طوالت کا تھا یعنی افسانہ ناول کے مقابلے میں مختصر کہانی ہوتا تھا۔ لیکن ایسی ہی بھرپور کہانی۔

پرانی صنف ناول اور نئی صنف افسانہ کا یہ درمیانہ وقفہ (Transitional Stage) دوسرے ملکوں کے ادب میں بھی پایا جاتا ہے۔ ان دنوں افسانے، مختصر افسانے (Short stories) نہیں کہانیاں (Tales) کہلائے جاتے تھے۔ چنانچہ امریکی ادب ہی کی مثال لیجئے۔ میلول نے اپنی کہانیوں کے مجموعے کو Piazza Tales کا نام دیا اور ہاتھوان کی کہانیاں "دہرائی گئی کہانیاں" "Twice told tales" کے نام سے مشہور ہوئیں۔

پریم چند کے آخری دور کے بعض افسانوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انہیں جدید مختصر افسانے کی تکنیک اور مواد سے پوری آگاہی تھی۔ چنانچہ ان کا مشہور افسانہ "کفن" جدید افسانے کے معیار پر پورا اترتا ہے یا شکوہ شکایت جو سارا ایک "مانولاگ" ہے۔

لیکن صحیح معنوں میں مختصر افسانے کا آغاز نئے ادب کی تحریک کے ساتھ ہی ہوا اور اسی تحریک کے ساتھ ایک خاص آرٹ فارم کی حیثیت سے مختصر افسانے نے عروج پایا۔ نئے ادب کی سب سے پہلی ضبط شدہ کتاب "انگارے" گویا روایت سے بغاوت تھی۔ رشید جہاں نے اس میں عورت کی آزادی اور عورت کے حقوق کی پاسبانی کا مسئلہ پیش کیا۔ احمد علی نے آزاد خیال کو سرریلزم کے ذریعہ پیش کیا۔ یعنی خیال [illegible] میں، جب کہ وہ کسی عقلی یا جمالیاتی یا اخلاقی پابندی یا رکاوٹ کے بغیر انسانی دماغ میں اپنا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ چنانچہ سرریلزم [illegible] تحریک سے جو مغرب میں ۱۹۱۹ء میں شروع ہوئی تھی، اردو افسانہ کے آغاز ہی میں احمد علی نے روشناس کرایا۔

اردو افسانے پر [illegible] مغربی تحریکیں اور ادبی رجحانات بہ یک وقت اثر انداز ہوئے، نئے ادب کی یعنی ۳۶۔۳۷ء کی تحریک میں "سوشل ریلزم" [illegible] سب سے نمایاں رجحان بن کر آئی۔ اس دور کی حقیقت نگاری میں معاشرتی مسائل کے علاوہ

سیاسی مسائل کو بھی نمایاں ردِ عمل تھا کیونکہ ہمارے ہاں کی ترقی پسند تحریک اسی کا حصہ تھی جو ایک آفاقی تحریک بن چکی تھی۔

سیاست اس دور میں زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ بن چکی تھی۔ یہ دو عظیم جنگوں کا درمیانی وقفہ تھا۔ ایک طرف فاشیت سر اٹھا رہی تھی دوسری طرف ادیبوں کے سامنے روس کا انقلاب اور نیا نظام تھا جس کے متعلق انہیں یہ الوژن تھا۔

Bliss was it in that dawn to be alive

And to be young was very heaven!

"Popular Front" بن چکا تھا۔ سپین کی خانہ جنگی میں ادیب بہ نفسِ نفیس حصہ لے کر جمہوریوں کا ساتھ دے رہے تھے۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ژید کے پایہ کے ادیب بھی سیاست کا ساتھ دینے پر تیار تھے!

ترقی پسند تحریک کے لئے وجدان کا سرچشمہ روس اور روسی ادب تھا۔ لیکن ہمارے ادیبوں نے عام طور پر ٹولسٹائے، ترگینیف، دستوئفسکی یا چیخوف کی بجائے گورکی اور گورکی کے بعد کے ادیبوں سے زیادہ اثر لیا۔ ان دونوں ہمارے افسانہ نگار خصوصیت سے ۳۵ء کے انگریزی ادیبوں کے نیو رائٹنگ والے، یعنی آڈن، سپنڈر، اشروڈ، جارج آرول، پر نجیٹ گروپ سے بھی متاثر تھے۔ ۳۵ء کے یہ ادیب جوئس، لارنس اور ورجینیا وولف کے ردِ عمل میں "خارجی" حقیقت نگاری کی تحریک لے کر آئے تھے۔ ہمارے ہاں نئے ادب کی حقیقت نگاری بھی ایک طرح سے نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم، مجنوں گورکھپوری وغیرہ کی رومان نگاری کا ردِ عمل تھی۔ نیاز فتحپوری گروپ کے رومانی رجحان کا اس وسیع تحریک سے کوئی خاص اور گہرا تعلق نہ تھا، جسے مغربی ادب میں Romanticism کہتے ہیں۔ چنانچہ انگریزی ادب میں انیسویں صدی کی رومانٹزم یا فرانسیسی ادب میں Chvalry کا رومان۔

نئے ادب ۳۶ء، ۳۷ء کی تحریک کے ساتھ ادب برائے زندگی اور "ادب اور انقلاب" کی آواز اٹھی۔ یہ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری جیسے فنکاروں کی بھی آواز تھی اور زندگی کو اپنی ساری حقیقتوں میں پیش کرنے کا رجحان اردو افسانہ پر اس طرح چھایا رہا کہ ہمارے بہت سے اچھے افسانہ نگاروں کو "Realists" کے اسی گروہ میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ منٹو، بیدی، حیات اللہ انصاری، رشید جہاں، عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، خواجہ احمد عباس، بلونت سنگھ، قدرت اللہ شہاب، انور، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور...... ابوالفضل صدیقی، شوکت صدیقی......... یوں یہ طویل فہرست کبھی ختم نہ ہو گی۔

اپنے دور کے سیاسی اور سماجی مسائل کے علاوہ، سماجی حقیقت نگاری کے جس خاص جزو پر ہمارے ادیبوں نے توجہ دی وہ جنسی حقیقت نگاری تھی۔ ہمارے بعض اچھے اچھے افسانہ نگار جنسی حقیقت نگاری (Sex Realism) سے اس طرح وابستہ ہو گئے کہ جنس کا موضوع ان کے لئے ایک Obsession سا بن گیا۔ چنانچہ منٹو، عصمت چغتائی، ممتاز مفتی، عزیز احمد وغیرہ۔

عزیز احمد کی رائے میں (ترقی پسند ادب) ہمارے جنس نگار ڈی ایچ لارنس سے متاثر ہوئے ہیں۔ بلکہ یہ کہ ان کی جنس نگاری ڈی۔ ایچ لارنس کو ہضم نہ کر کے ایک کھٹے ڈکار کی صورت میں نمودار ہوئی ہے۔ مجھے عزیز احمد کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ یہ نہیں کہ ہمارے ادیبوں نے ڈی۔ ایچ لارنس کو پڑھ کر ہضم نہیں کیا بلکہ ہمارے ادیبوں کا رویہ ڈی۔ ایچ لارنس سے قطعی مختلف تھا۔ ہمارے ادیبوں نے سماج کو یوں عریاں کرنا چاہا کہ ساری ڈھکی چھپی گندگی باہر آئے۔ ان کی تحریریں سماج کی اخلاقی قدروں اور پابندیوں اور ان سے پیدا سماج کی گری ہوئی جنسی حالت پر بھرپور طنز تھیں۔

ڈی۔ ایچ لارنس نے بھی سماج کی اخلاقی قدروں پر حملہ کیا تھا اور انہیں ان بے جا پابندیوں اور مصنوعی قدروں اور سماجی انسان کی ریاکاریوں سے جتنی بے پناہ نفرت تھی وہ ان کی گالزوردی پر تنقید سے ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن لارنس کا مقصد جنسی بے راہ روی اور گناہ کی زندگی پر تنقید [illegible] ایک صحت مند جنسی توازن کی تبلیغ۔ لارنس کی جنسی تحریروں میں جسمانی مظاہروں کے

ساتھ ساتھ 'لطیف سے لطیف' نازک سے نازک احس ہ عکاسی ہے اور "جنس" کی پیش کش میں 'جوانگی نظر میں زندگی کی قوت "ہے' لارنس جسمانی لذت کے ساتھ حسن 'مسرت' رو قوت اور امن کا احساس دلاتے ہیں۔ لارنس نے جنس کو ایک فلسفہ ہی نہیں بنا لیا تھا' بلکہ ایک مذہب کا درجہ دیدیا تھا۔ انہوں نے خود کو کا پیغامبر گردانا اور آخر میں اس کے' جیسا کہ مڈلٹن مرے نے اپنی کتاب Some of woman میں لکھا ہے۔

"اس کے صلیب زدہ شمار ہوئے۔"

فطری جبلت اور فطری زندگی کے Puritan prophet کی حیثیت سے شاید لارنس اور منٹو میں تھوڑی سی مناسبت ہوا پنے آخری ڈرامے "اس منجدھار میں" میں منٹو نے لارنس کی لیڈی چیٹرلیس لور والی تھیم کا استعمال کیا ہے۔ لیکن یہاں بھی منٹو کا ٹریٹمنٹ لارنس سے مختلف ہے۔

عزیز احمد کی جنس نگاری فرانسیسی جنس نگاروں سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ ممتاز مفتی نے مغرب کے جنسی ادب سے اثر نہیں لیا بلکہ وہ براہ راست جنسی نفسیات کی طرف رجوع ہوئے۔ فرائیڈ کی علم نفسیات میں جنسی تحویلیں' ہیولاک ایلس' کرافٹ ایبگ' سٹیکل وغیرہ نے جو مثالی واقعات (Case histories) دیئے ہیں۔ جنسی نفسیات کے ایسے ہی (Cases) سے ممتاز مفتی نے اپنے افسانوں کے لئے مواد حاصل کیا۔

اس طرح کا خالص نفسیاتی افسانہ ہمارے ادب میں ایک انفرادی رجحان تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ممتاز مفتی نے بعض کامیاب نفسیاتی افسانے لکھے اور تحت الشعور کی بہت سی ڈھکی چھپی' ان کہی حقیقتیں اُجاگر کیں۔ لیکن ان کے بعض افسانوں کی خصوصیت سے بعد کے افسانوں میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ افسانہ ایک نفسیاتی کیس کے گرد بنا گیا ہے۔ ان کے بہترین افسانے وہی ہیں جن میں نفسیات ایک زیریں حقیقت ہے اور جن میں ہلکے ہلکے نفسیاتی تجسس کے ساتھ ہماری معاشرتی زندگی کی نازک اور سچی تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ چنانچہ "آپا" "ماتھے کا تل"۔ "مورا"۔ "یہ دیوی"۔

یوں انسانی نفسیات کی پیش کش ہمارے کئی ایک افسانوں میں ہوئی ہے اور جنسی نفسیات کو منٹو اور عصمت چغتائی نے بھی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ چنانچہ منٹو کے افسانوں میں "دھواں" "بلاؤز" "ٹھنڈا گوشت" وغیرہ جنسی نفسیات کی کامیاب مثالیں ہیں اور عورت کے جنسی جذبہ' جنسی اٹھان اور ارتقا اور نفسیات کو تو عصمت چغتائی سے بہتر کوئی ترجمان شاذ ہی مل سکے۔ عصمت نے بے باکانہ جرات سے عورت کو پہلی دفعہ اصلی روپ میں پیش کیا تھا اور اس لئے عصمت کو ہمارے ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔

عصمت پر کسی مغربی ادیب کا اثر پڑا ہے یا نہیں' یہ اندازہ لگانا مشکل ہے۔ غالباً پطرس یا مجنوں گورکھپوری نے لکھا ہے کہ عصمت اپنے ڈراموں میں برنارڈ شا سے بہت متاثر ہیں اور اسی طرح کا Witty طنزیہ ڈائلاگ انہوں نے استعمال بھی کیا ہے۔ لیکن جہاں تک ان کے افسانوں کا تعلق ہے' (اور عصمت سب سے پہلے افسانہ نگار ہی ہیں) کسی خاص اثر کا ان میں اظہار نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ مغربی ادب میں جنسی حقیقت نگاری سے مجموعی طور متاثر ہوئی ہیں۔

آگے چل کر ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے بھی عصمت کی طرز اختیار کی اور گو ہاجرہ مسرور' خدیجہ مستور اور قرۃ العین حیدر کا ادبی پایہ عصمت چغتائی کے برابر نہیں ہے۔ لیکن ان دونوں بہنوں نے عصمت کی طرز کے افسانوں میں بہت سے اضافے کئے اور جنسی حقیقت نگاری سے ہٹ کر بھی انہوں نے اپنے موضوعات کو وسعت دی اور معاشرتی حقیقت نگاری کے اور پہلوؤں کی بھی اپنے افسانوں میں ترجمانی کی۔

جس طرح ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نے عصمت چغتائی کی طرز اختیار کی۔ قرۃ العین حیدر نے حجاب امتیاز علی سے مطابقت

خصوصیت کی ہے۔ پہلے پہل انہوں نے حجاب امتیاز علی کے رنگ میں افسانے لکھنے شروع کئے۔ حجاب امتیاز علی کے افسانے بڑی Gothic قسم کے پراسرار فضا پیدا کیا کرتے تھے اور نفسیاتی الجھنیں، یہ نفسیاتی Fantasy کا عنصر اب بھی قرۃ العین کی تحریروں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن بعد میں انہوں نے ورجینیا وولف کا انداز اختیار کر لیا ہے۔ (چونکہ یہ بات کہ قرۃ العین کا انداز ورجینیا وولف کا ہے سب سے پہلے میں نے ہی کہا تھا' میں یہاں واضح کردوں کہ یہاں قرۃ العین کا ورجینیا وولف یا ورجینیا وولف کی ادبی حیثیت سے تقابل مقصود نہیں اور نہ یہ مناسبت ان معنوں میں لی گئی ہے جیسے منٹو کے متعلق کہا جائے کہ منٹو موپاساں ہے یا احمد علی کے متعلق کہ ان کے ہاں کافکا کی سی گہری رمزیت پائی جاتی ہے۔ میرا مطلب صرف یہ ہے کہ قرۃ العین نے شعوری طور پر ورجینیا وولف کا اثر قبول کیا ہے)

ظاہری فارم کی حد تک قرۃ العین کی ورجینیا وولف سے مناسبت ہے "مافیہ" کی نہیں۔ ورجینیا وولف کے نزدیک زندگی کی قدریں کچھ اور ہیں اور ورجینیا وولف میں وہ "ادبی قابو" اور توازن بدرجہ اتم موجود ہے جو وقت اور جگہ اور ہیئت کی پابندیوں کو توڑنے کے بعد لازمی ہے۔ قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں یہ مکمل ادبی قابو اور توازن نہیں ہے۔

ای ایم فارسٹر نے کہا ہے کہ زندگی فکشن میں دو سطحوں میں پیش ہوتی ہے ایک Life in time دوسری Life in values جب وقت کے تسلسل کو توڑا جائے تو Values بڑے اور وزنی ہونے چاہئیں۔ جیمس جوائس نے جب وقت اور زمانے کی حدیں توڑدی تھیں تو کل علوم اور کائناتی اصول اپنی تخلیقات میں سمیٹ لئے تھے۔ قدیم کلاسیکی ادب اور قدیم تہذیبوں کی Mythology کو موجودہ زمانے میں ڈھالا تھا۔ پروست نے اپنے کھوئے ہوئے اور پھر پائے ہوئے وقت میں موجودہ زمانے کا شعور Modern Concsiousness سمیٹ لیا اور ورجینیا وولف نے وقت کے ایک ایک لمحے کو وقعت اور تکمیل بخشی۔

قرۃ العین کے ہاں زندگی کی بڑی حقیقتوں اور اقدار کا اور زمانے کا کوئی گہرا شعور نہیں ہے بلکہ ایک Adolescence کی سی رومانی آئیڈیلزم اور اس سے نتیجۃً الوژن اور رومانی شکست خوردگی۔ یہی وجہ ہے کہ قرۃ العین کی اگر کسی نے نقل کی تو وہ عموماً جذباتی قسم کی Adolescent لڑکیوں نے، جنھوں نے قرۃ العین کی طرزِ تحریر کی بعض خاص خوبیوں کو چھوڑ کر قرۃ العین کے افسانے کو اپنی بالکل Bare شکل میں اپنایا جس میں ایک ہی طرح کے رومانی ماحول میں ازلی رومانی تثلیث ہوتی ہے۔ (سوائے جیلانی بانو کے جو آجکل کی لکھنے والیوں میں ایک ہی ہیں جو ایک اچھی افسانہ نگار کی حیثیت سے اُبھری ہیں' اور جنھوں نے ایک افسانہ اس طرز میں اتنا ہی اچھا لکھا ہے جتنا کہ قرۃ العین کا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس افسانے میں بھی جیلانی بانو کا رویہ قرۃ العین کے برخلاف ترقی پسند ہے اور جیلانی بانو اپنی دوسری تحریروں میں ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور سے زیادہ قریب ہیں)۔

قرۃ العین کا طرز گو مغربی ادب سے مستعار تھا' لیکن اُردو کے لئے نیا تھا اور اس نئے انداز میں ایک شگفتگی اور جاذبیت تھی۔ لیکن اس انداز کے اُردو افسانہ میں ارتقا کے جو امکانات تھے انھیں یا تو بعض نئی لکھنے والیوں کی اس سستی تقلید نے ختم کر دیا۔ لیکن اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ قرۃ العین خود ایک سطح پر آکر رُک گئیں اور اپنے آپ کو دہرانے لگیں کہ ان کے بیشتر افسانے اور ناول بھی ایک دوسرے کے Rebash معلوم ہونے لگے۔ ایک ہی سی فضا' ایک ہی سا ماحول' ایک ہی سے کردار جو ایک ہی طرح کی باتیں کرتے اور ایک ہی انداز میں سوچتے بھی ہیں۔ ورجینیا وولف کے ہاں یہ ہمیشہ کی یکسانیت کا احساس نہیں ہے۔ وہ اپنے کرداروں کا فرق احساسات اور موڈس کے نازک فرق کے ذریعہ واضح کر دیتی ہیں۔ ورجینیا وولف کا اسلوب ایک ایسا شفاف اور ذی حس ادبی آلہ ہے جو حس کے ہلکے سے ہلکے ارتعاش کو پکڑ سکتا ہے۔ اسی طرح ان کی تخلیقات میں بھی تنوع ہے۔ چنانچہ ان کی دو بہترین اور نمائندہ تخلیقات کا واضح فرق دیکھئے "The Waves" " The light House" سے بالکل الگ چیز ہے۔

بہرحال اُردو افسانہ میں ایک نیا طرز لے آنا بجائے خود قابلِ قدر ہے اور قرۃ العین کے طرز کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ گو وہ

خود ایک محدود دائرے میں گہری رہ کر اس کی وسعت اور امکانات کا پورا فائدہ اُٹھا سکی ہیں اور کوئی بڑی تقسیم انھوں نے پیش نہیں کی ہے۔ انھوں نے دوسروں کے آگے ایک نئی راہ کھول دی ہے اور ممکن ہے کوئی زیادہ پڑھا لکھا ادیب جس نے بڑے ادب اور کلاسکس کو پوری آگاہی سے سمجھا ہو اور اپنے اندر جذب کئے ہوئے ہو جس کی Intellect زیادہ پختہ Mature اور گہری ہو اس طرز میں کوئی بڑی تخلیق پیش کر سکے۔

گو مغرب کے کئی ادبی رجحان اور تحریکیں ہمارے نئے ادب اور خصوصیت سے افسانے پر اثرانداز ہوئیں لیکن ہمارے ادب میں یہ مختلف رجحان الگ الگ مجموعی تحریکوں کے طور پر نہیں اُبھرے بلکہ ہمارے چند منفرد شعوری فنکاروں نے انھیں اپنانے کی کوشش کی۔ یا کم از کم ان رجحانوں کے زیر اثر چند تجربے کئے۔ یہ بات خصوصیت سے داخلی رجحانات کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ چنانچہ "رمزیت" Symbolism ہمارے ہاں کوئی مجموعی تحریک نہیں بنی اور اس کے واحد اور وقیع نمائندہ احمد علی ہی رہے۔ شعور کی رو Flow of conciousness عسکری ہی سے وابستہ ہو گئی اور "سرریلزم" میں احمد علی کی پہلی کوششوں کے بعد شاذ ہی کسی نے کوئی تجربہ کیا۔

"اظہاریت" Expressionism میں البتہ دو تین ادیبوں نے خاصے تجربے کئے۔ "ایکسپریشنزم" ____ اظہاریت یا باطن نگاری ایک قسم کی ذہنی کیفیات اور تصوّرات کا اظہار ہے۔ یہ جوائس یا پروسٹ کے شعوری تسلسل Stream of Consiousness سے مختلف چیز ہے۔ "اظہاریت" میں ذہن خاص قسم کے تصورات دیکھتا ہے جو دیکھنے والے کو دُنیا کے حقائق سے دُور لے جاتے ہیں۔ اس اسکول کا نظریہ یہ ہے کہ فن کار کو اپنے انفرادی محسوسات کا اظہار کسی ظاہری وسیلہ سے کرنا چاہئے۔ اطالوی مصنف لوئی جی پیراندیلو اس سکول کا سب سے بڑا نمائندہ ہے۔ اس سکول کے مقلد کہتے ہیں کہ کروچے کے اصول اور نظریئے ان کے آرٹ کی صحیح تشریح کرتے ہیں۔ لیکن کروچے نے "ایکسپریشنزم" کا لفظ الگ معنوں میں استعمال کیا ہے۔ کروچے کے لئے ایکسپریشن فن کار کے ذہن میں آمد ہے۔ آرٹسٹ کی نظر جب کسی چیز یا واقعہ کو دیکھتی ہے تو اس کا تاثر ذہن میں قائم ہو جاتا ہے۔ اس تاثر کو احساس، وجدان اور تخیل ذہن ہی میں ایک خوبصورت شکل دے دیتے ہیں اور یہی "اندرونی اظہار" ہے۔ لیکن خود فن کار تو اس خوبصورت ذہنی تخلیق کو جسمانی شکل دے کر دائمی بنانا چاہتا ہے۔

"ایکسپریشنزم" ایک غیر معمولی ذہنی کیفیت کی عکاسی ہے۔ جس میں ذہن ایسی عجیب تصویریں دیکھتا ہے جو حقیقت میں موجود نہ ہوں بلکہ اسے ایک خواب سحر Day-Dreaming میں نظر آتی ہوں۔ چنانچہ عزیز احمد کے "جھوٹا خواب" میں اظہاریت ہے، نفسیاتی تجزیہ میں خواب بڑی اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ خواب ایک خالص نفسی کیفیت ہے جس میں ہمارے تحت الشعور کو بیدار کر کے واقعات دکھائے جاتے ہیں، ایسے واقعات جو بیداری میں دکھائی نہیں دیتے۔ عزیز احمد کے 'جھوٹے خواب' کے علاوہ فسادات پر ان کے افسانے "کالی رات" میں شدید بیماری کی حالت میں ایک ہذیانی تصوریہ اور Halucination ہے جس کے ذریعہ انسان کی افتاد دکھائی گئی ہے۔ منٹو کے ایک قابل افسانے "فرشتہ" میں شدید بھوک، ذہنی پریشانیوں اور بیماریوں کے دوران میں، جب وہ موت سے قریب پہنچ جاتا ہے ایک بھیانک "ذہنی تصوریہ" ہے۔

حیات اللہ انصاری نے جنھوں نے "حقیقت نگاری" میں آخری کوشش کا سا شاہکار پیش کیا تھا، اپنی دو ایک تازہ تحریروں میں اظہاری اور رمزی طرز اختیار کیا ہے۔ چنانچہ "ماں بیٹا" اور "شکر گزار آنکھیں" میں۔ "ماں بیٹا" میں تو خارجی حقیقت نگاری کے ذریعہ ہی ایک رمزی Symbolic Significance پیدا کی گئی ہے۔ لیکن "شکر گزار آنکھیں" میں ایک شدید باطنی انفعالی کیفیت ہے جس میں ایک قاتل اس کی طرف [illegible] شکر گزار آنکھوں کو اپنے جسم اور گوشت پر کھاڑھتا رہتا ہے۔ یہ شکر گزار آنکھیں اس کے

[illegible] نہیں کراتے، لا محدود بناتی ہیں۔ اپنے پیچھے یہ تاثر چھوڑ کر وہ اپنے آپ پر کاری ضربیں لگا کر [illegible] [illegible] کی روح میں اسی طرح گڑ گئے ہیں جیسے "تا ئیورن" میں "سیلاب لیو" کے پادری کی روح میں اور ان زخموں سے [illegible] ایک سکون ملتا ہے۔

ہمارے یہاں انفعالیت کی سب سے کامیاب پیش کش جاوید اقبال کے تخلیقوں میں ہوئی ہے۔ خصوصیت سے "پیغمبر" میں معصوم گناہ اور گناہ کے امکان اور ترغیب کے باوجود انسان کی ازلی معصومیت اور ملائکانہ پاکیزگی کی بڑی مکمل اظہاری تصویر ہے۔

"خود وجودیت" Existentialists مابعد جنگ کی سب سے تہلکہ مچادینے والی تحریک ثابت ہوئی گو یہ فرانسیسی ادیبوں تک ہی محدود رہی۔ اس تحریک کا منبع بھی فلسفہ تھا۔ کیر کے گارد کے فلسفہ سے شروع ہو کر وہ ادب میں سارتر کے ذریعہ آئی لیکن سارتر کا خود بھی فلسفہ اور ادب دونوں سے تعلق تھا 'لہٰذا انھوں نے بڑی کامیابی سے اس فلسفہ کو ادب میں پیش کیا' خصوصیت سے اپنے ڈراموں میں۔ جہاں تک فکشن کا سوال ہے 'میرے خیال میں دوسرے Existentialism کامو Camus اور سیمون دبوار نے خود وجودیت کے فلسفہ کو کہیں زیادہ بہتر طریقہ پر اپنے ناولوں میں سمو دیا ہے۔

ہمارے ہاں ژاں پال سارتر اور ادب میں ان کے فلسفہ "خود وجودیت" پر تنقید میں تو خوب نظریاتی بحث چلی 'لیکن تخلیقی ادب پر اس تحریک کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا۔ انتظار حسین نے البتہ "چاند گہن" میں ایک ایسی انفعالی کیفیت کی عکاسی کی ہے جو سارتر کے Nausea سے بہت مشابہ ہے۔ La Nausea اب بھی سارتر کا بہترین ناول تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس انفعالی کیفیت سے نکل کر ایک "نیا وجود" کیسے اپنے آپ کو Assert کرتا ہے 'یہ اس ناول میں اتنا واضح نہیں ہے جتنا کہ سارتر کے ڈراموں میں 'مثلاً ان کے شاندار ڈرامے The Flies میں جس کی تھیم مشہور یونانی اور یسٹس والی تھیم ہے سارتر کا اور یسٹس Orestes ایک نرم طبیعت 'نازک 'اخلاقی پابندیوں کے ماحول میں پلا لڑکا ہے ' (یہ گویا اس کا Essence ہے) لیکن جب وہ ایک "عزم" کر لیتا ہے تو ایک دوسری ہی ہستی بن جاتا ہے اور صحیح معنوں میں اس کا وجود (Existence) اس وقت قائم ہوتا ہے اور یسٹس کا نیا وجود وہ ہے جسے دیکھ کر خود ذیوس Zeus پکار اٹھتا ہے۔

"ایک وقت کے پورا ہونے کے بعد ایک انسان آنے والا ہے 'ایک ایسا انسان جو میری (یعنی خدا کی) اُفتاد کا اعلان کرتا اور تم اور یسٹس 'ایسا معلوم ہوتا ہے 'تم وہ انسان ہو۔"

"چاند گرہن" کا مرکزی کردار La Nausea کے کردار کی طرح آخر تک بھی انفعالیت کے بوجھ تلے دبا رہتا ہے۔ اس کے سامنے ایسا کوئی واضح Choice نہیں ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو کچھ اور بنا سکے۔ ایک مثبت 'نیا وجود' بن جائے اور موجودہ دور کے انسان کے لئے جس کے سامنے ابہام 'شکوک وشبہات اور Uncertainities کے سوا کچھ نہیں 'کوئی واضح انتخاب شاید ممکن بھی نہیں۔

انتظار حسین کی "ین لکھی رزمیہ" بھی جو تقسیم کے بعد لکھی گئی 'ساری چیزوں میں ایک خاصی وقیع تخلیق کی حیثیت رکھتی ہے انسانی شخصیت کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش ہے۔ یہاں انتظار حسین آندرے ژید سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔

ہمارے ہاں ایک اور طرح کا افسانہ جو کسی تحریک یا رجحان کے تحت نہیں آتا لیکن جو افسانہ کی ترقی یافتہ اور بالکل نئی شکل ہے تینوں بعد کا (Three Dimensional) افسانہ ہے۔ اس طرز کے چند ہی افسانے لکھے گئے ہیں۔ چنانچہ "ان داتا" (کرشن چندر "مدن سینا اور صدیاں" [illegible] (عزیز احمد) "دیپک راگ" اور "میگھ ملہار" (ممتاز شیریں)۔ تینوں بعد کے معنی ہیں لمبائی 'چوڑائی

اور گہرائی۔ یعنی وہ بات جو بڑے سے بڑے کینوس پر تصویر میں بھی پیدا نہیں ہو سکتی ایک ایسی تراشیدہ شبیہ کے ذریعہ پیش کی گئی ہے جسے کئی زاویوں سے دیکھا جا سکے۔ چنانچہ کرشن چندر کے "ان داتا" میں ایک موضوع یعنی بنگال کے قحط پر مختلف زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک غیر ملکی سفیر کی اس المیہ سے بے اعتنائی طوفان سے دور ساحل پر کھڑے طبقوں کی جھوٹی ہمدردی اور آخر میں خود اس انسان کا المیہ جو اس طوفان سے گزر رہا ہے۔ سارے پہلوؤں کو مکمل طور پر Exhaustive بنانا تقریباً ناممکن ہے۔ کیونکہ ہر پہلو سے کوئی اور پہلو نکل آتا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات کہ ایک ہمہ گیر اور وسیع سے وسیع تر دائرے میں ایک مسئلہ کو گھیرا جا سکتا ہے۔ "دیپک راگ" میں جنس و محبت سے متعلق کئی مختلف رویے (Attitudes) ہیں جو متوازی بھی ہیں اور متضاد بھی اور یہ رویے اتنے ہی مختلف اور متنوع ہو سکتے ہیں جتنی کہ انسانی سیرت پیچیدہ ہے۔ "ان داتا" اور "دیپک راگ" میں زاویے مختلف ہیں لیکن زمانہ ایک ہے۔ "تمرزیں تاج" میں زمانے مختلف ہیں، جن میں ایرانی عورت کو مختلف شبیہوں میں پیش کیا گیا ہے، لیکن 'مکاں' ایک ہے۔

"مدن سینا اور صدیاں" اور "میگھ ملہار" میں زماں اور مکاں دونوں کی وسعتوں کو سمیٹنے کی کوشش ہے۔ قدیم سے قدیم زمانے سے لے کر موجودہ زمانے تک یعنی صدیوں کا فاصلہ اور دُنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں اور بڑی بڑی قدیم تہذیبوں اور مذہبوں کے مشترکہ اور متضاد عناصر کو یکجا کرنے کی سعی۔

عزیز احمد کے افسانے میں (مدن سینا اور صدیاں) جس کی مرکزی تھیم "عاشق، معشوق اور رقیب" کی تثلیث ہے اور وہی ازلی سوال "ان تینوں میں فیاض کون ہے؟" اس میں مختلف ملکوں کی پرانی مشہور داستانیں ہیں، ہندوستانی، یونانی، ایرانی، مدن سینا، شیریں فرہاد، ڈوری گن آرے لیس وغیرہ اور داستان گوئی کے ساتھ اس میں تاریخ اور تحقیق کا امتزاج ہے۔

"میگھ ملہار" کی، جس کی مرکزی تھیم موسیقی کا سحر اور فن کار کی حیات جاودانی ہے، بنیادی دُنیا کی قدیم تہذیبوں کی Mythology پر رکھی گئی ہے۔ ہندو دیومالا اور یونانی اساطیر جن میں کئی باتیں مشترک ہیں اور جہاں Mythology سے تھوڑا سا گریز کیا ہے، وہاں میں نے انجیلی، عیسائی رمزیت Christian Symbolism اور ہومر، ورجل، ملٹن کے ہلکے سے مجز دیئے ہیں، جن کی داستان سے مناسبت ہے اور آخر میں آرفیوس، یوریڈیس اور نارسائیس کی یونانی Myth ایک ایرانی رومان میں دہرائی گئی ہے جو اسی زمانے کا ہے، لیکن افسانے کے دوسرے قصوں سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے اسے بھی اسطوری Mythical ٹون دیا ہے۔

روایاتی تصور کے مطابق اسطوری حقیقت مادّی حقیقت سے کہیں گہری ہوتی ہے گویہ مبہم ہوتی ہے اور Myth میں ہمیشہ کوئی گہرے معانی پوشیدہ ہوتے ہیں اور بظاہر سادہ اور حسین Legends کسی آفاقی Universal حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ہمارے افسانے کی رینج ہر لحاظ سے وسیع ہے۔ تکنیک، رجحان، موضوع و مواد، ہر اعتبار سے ہمارا افسانہ متمول اور متنوع ہے۔ چنانچہ اگر معاشرتی حقیقت نگاری میں "آخری کوشش" (حیات اللہ انصاری) "کلیاں اور کانٹے" (اختر اورینوی) اور "زندگی کے موڑ پر" (کرشن چندر) کے سے شاہکار ہیں تو "رمزیت" میں "قید خانہ" (احمد علی) کا سا نہایت گہرا اور مکمل افسانہ۔ ایک طرف "بابو گوپی ناتھ" (منٹو) اور "حرامجادی" (عسکری) کے سے انفرادی افسانے ہیں تو دوسری طرف "آنندی" (غلام عباس) کا سا اجتماعی افسانہ ایک طرف بلونت سنگھ کے "ترنگ" کا سا ہلکا پھلکا نازک افسانہ ہے، جس میں محض رنگوں کے امتزاج اور تبدیلی کے ذریعہ مختلف چھوٹے چھوٹے تاثرات یکجا کئے گئے ہیں یا قدرت اللہ شہاب کا "تلاش" جس میں صرف ایک "موڈ" کی گرفت ہے، یہ نازک، مرصّع زیورات کے سے تراشے ہوئے افسانے تو دوسری طرف یہ تینوں بعد Three Dimensional کے افسانے "ان داتا" "مدن سینا اور صدیاں" "میگھ ملہار" جو ایک وسعت و گہرائی عظمت و شان اور ایک Colassus کا احساس دلاتے ہیں۔

[illegible] کون کہہ سکتا ہے کہ [illegible]
[illegible] کی ایک [illegible] کرتے ہیں [illegible] بھی ایک "جستجو" ہوتی ہے۔ ہر افسانہ کی اپنی ایک "فضا" ہوتی ہے۔ افسانے آسمان پر بکھرے ہوئے ستاروں کی طرح ہیں؟ [illegible] ذہن کو الگ الگ مرکوز کیا جائے تو ہمیں یہ احساس ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی ایک الگ دنیا ہے اور ہر ایک کی اپنی الگ روشنی۔ ان میں سے بعض ستاروں کی طرح ساکت و جامد ہوتے ہیں بعض سیاروں کی طرح اپنے اپنے دائروں میں گھومتے ہیں۔ بعض شہاب ثاقب کی طرح اچانک شعلہ زن ہوتے ہیں اور اپنے پیچھے روشنی کی ایک لکیر چھوڑ کر غائب ہو جاتے ہیں اور بعض دمدار سیاروں کی طرح ہیں جو اصل ستارے کی مرکزی روشنی کے علاوہ ایک اور کہانی اپنے جلو میں لئے ہوتے ہیں جو دمدار سیارے کی دم کی طرح بہت پیچھے تک اپنی روشنی چھوڑتی ہے۔

ہمارے افسانوں میں بھی یہی تنوع ہے۔ ہمارا افسانہ مغربی ادب سے ضرور متاثر ہوا ہے لیکن ہمارے افسانے نے نہ صرف مغربی افسانہ کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے بلکہ اپنی اُپج اور انفرادیت کا بھی مظہر ہے۔ یہ ہماری اپنی قومی زندگی کا نمائندہ ہے۔ اس میں ہمارے اپنے مسائل پیش ہوئے ہیں خواہ وہ معاشرتی ہوں یا معاشی یا جنسی یا سیاسی مسائل۔ اور آج ہمارا افسانہ اتنا ترقی یافتہ ہے کہ وہ مجموعی طور پر کسی بھی مغربی ملک کے افسانوی ادب کے مقابلے میں فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے۔

اُردو افسانے کا مستقبل

محمد حسن عسکری

ہمارے ادب پر جمود طاری ہے یا نہیں؟ ہمارے ادیبوں کی تخلیقات میں کمی واقع ہوئی ہے یا نہیں؟ پچھلے پانچ سال میں جو کچھ لکھا گیا ہے اسکی ادبی حیثیت کیا ہے' اس کا کتنا حصہ قابل قدر ہے؟ ان سوالوں کے مختلف جواب ہو سکتے ہیں۔ بعض لوگ ممکن ہے ضرورت سے زیادہ مایوس ہوں اور بعض ممکن ہے ابھی تک خوش فہمی میں مبتلا ہوں۔ بہر صورت ادبی قدر و قیمت کے سوا سے الگ ہٹ کر بھی پچھلے پانچ سال کے ادب پر غور کیا جا سکتا ہے اور اسکی بحث سے بعض ایسے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں جنکا تعلق صرف ادب ہی سے نہیں بلکہ پورے معاشرے کی حالت اور خصوصاً ملک کی ذہنی فضا سے بھی ہو گا۔ اس کے ساتھ موجودہ ادب کی نوعیت بھی کسی نہ کسی حد تک متعین ہو سکے گی۔ فی الحال میں اپنی بحث کو محض افسانوی ادب تک محدود رکھنا چاہتا ہوں' خصوصیت کیساتھ ان افسانوں تک جو پچھلے ڈھائی تین سال میں ہمارے سامنے آئے ہیں۔ یعنی مجھے دیکھنا یہ ہے کہ جب فسادات سے متعلق افسانوں کا زور کم ہو گیا تو پھر افسانہ نگاروں نے اپنا مواد زندگی کے کن حصوں سے حاصل کیا' اور اپنے موضوع کے بارے میں انکا رویہ کیا رہا۔ اس عرصے میں جتنے افسانے لکھے گئے ہیں' میں نے سب کے سب نہیں پڑھے' نہ مجھے اس وقت اس سارے افسانوی ادب کا جائزہ لینا ہے۔ جو رجحانات پچھلے پندرہ سال سے ہمارے ادب میں حاوی ہیں' وہ تو بہر حال اپنی جگہ ہیں ہی' مجھے تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ پچھلے تین سال میں کوئی نئے رجحانات نظر آئے ہیں یا نہیں۔ وہ رجحانات کس قسم کے ہیں اور اُن کا مجموعی سماجی حالات سے کیا تعلق ہے؟ یہاں بھی میں اپنی تفتیش کا دائرہ محدود رکھوں گا۔ نئے ادب کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ اس تحریک نے سیاست اور جنس کے بارے میں بہت صاف گوئی سے کام لیا۔ فی الحال میں یہ دیکھوں گا کہ آج کل کے افسانوں میں جنس کے بارے میں کیا نیا رویہ پیدا ہوا ہے اور ملک کی سیاسی حالت سے اس رویے کا کتنا تعلق ہے۔ یہ بات واضح کر دینا بہتر ہے کہ انفرادی حیثیت سے میں کسی افسانہ نگار پر بحث نہیں کر رہا ہوں اور نہ ان افسانوں کی ادبی حیثیت پر کوئی [illegible] دراصل اس وقت میرا موضوع بحث افسانوی ادب سے زیادہ ملک کی ذہنی فضا ہے۔ جو افسانوں میں جھلکتی ہے۔

[illegible] افسانوں کے جنسی رویے پر کچھ کہنے سے پہلے یہ سوچنا چاہئے کہ ادب میں جنسی موضوعات کو کس طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ کچھ دنوں [illegible] ایک اصطلاح چل نکلی ہے جو ظاہر میں تو بے ضرر سی ہے' لیکن اسکے مبہم استعمال سے ادبی بحثیں اور اُلجھ جاتی ہیں۔ لوگ کہتے [illegible] صحت مند ہونا چاہئے۔ دراصل یہ توصیفی فقرہ بالکل غیر ضروری ہے۔ اگر کوئی تحریر ادب کی حدود میں آتی ہے تو اپنے آپ [illegible] ہو گی۔ کیونکہ ادب کی تخلیق بذات خود جمالیاتی اور جذباتی توازن کی تلاش ہے۔ عام طور سے اس نظریہ کا مطلب [illegible] میں جنسی کجروی اور جنس کے تخریبی پہلوؤں کا ذکر نہیں ہونا چاہئے لیکن اگر اسکی

[illegible] کر دی جائیں تو دنیا کے ادب کا بہت بڑا حصہ قربان کرنا پڑے گا جو کچھ نکل بھاگے۔ راستہ نکل جائیگا۔ [illegible]
[illegible] کے بہت سے حصے خارج کرنے پڑیں گے۔ اس طرح ادب کے نقصان کا جو اندازہ ہو اگر اس کی [illegible] اس کی تلافی ہو تو [illegible]
[illegible] اجتماعی زندگی کی صحت کیلئے لازمی ہے کہ جنسی تخریبات جو دراصل [illegible] دبائے جانے پر پیدا ہوتے ہیں [illegible] آئیں [illegible] ادب اور فن میں
ان کا اظہار کر کے ان پر قابو پالیا جائے مثلاً یونگ کے خیال میں ہر قدیم انسان اپنے اندر ایک ایسا [illegible] لئے پھرتا ہے اور [illegible]
[illegible] ان سے بچنے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ تمیز میں یہ سارا قصہ دیکھ لیا جائے [illegible] یہ جنگ محض تماشا نہیں تھا بلکہ پوری
[illegible] ایک ذہنی علاج تھا۔ اگر جنس کے تخریبی پہلوؤں کو ادب سے بالکل خارج کر دیا جائے اور انہیں شعور میں آنے سے پہلے بالکل
دبا دیا جائے تو اس سے سماج کا ذہنی توازن متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لئے یہ کلیہ تو کسی طرح بھی مناسب نہیں ہو گا کہ ادب میں
صرف غیر صحت مندانہ افعال اور جذبات کا بیان ہو۔ جس طرح یہ ضروری ہے کہ جو غیر صحت مندانہ عناصر افراد میں اور سماج میں موجود
ہیں وہ ادب اور فن کے ذریعے شعور میں آجائیں اور یوں کسی حد تک ان کا ازالہ ہو جائے۔ اسی طرح یہ بھی لازمی ہے کہ متوازن اور
تندرست شخصیت کی جسمانی اور نفسیاتی ضرورتوں کو بھی اظہار کا موقع ملتا رہے۔ غیر صحت مندانہ عناصر کے ادب میں ظاہر ہو جانے کا
ایک فائدہ تو یہ ہے کہ ہمیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ سماج میں غیر شعوری طور پر کس قسم کے رجحان پرورش پا رہے ہیں مثلاً پچھلے سو سال کا
مغربی ادب اور آرٹ دیکھ کر دو بڑی جنگوں سے پہلے یہ پیشین گوئی کی جا سکتی تھی کہ یورپ میں کس قسم کے ہولناک واقعات رونما ہونے
والے ہیں۔ اسی طرح ہمارے برصغیر میں فسادات کے دوران میں جو کچھ ہوا اسکا پرتو پچھلے پندرہ برس کے ادب میں موجود ہے لیکن
اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری ادب اور آرٹ پر ہے۔ بعض لوگ چند سیاسی اور اجتماعی نظریات کے ماتحت اس
قسم کے نتیجے نکالتے ہیں مگر وہ یہ بات نظر انداز کر جاتے ہیں کہ فن تو بذات خود ایسے تخریبی رجحانات سے نبرد آزمائی کرنے کا ایک ذریعہ
ہے بلکہ زیادہ خطرے کی بات تو یہ ہے کہ ادب میں تخریبات کا ذکر آنے ہی نہ پائے اور ادب سہانے خوابوں اور نیک ارادوں کا مجموعہ
بن کر رہ جائے۔ اس کا مطلب تو یہ ہو گا کہ سماج کے لاشعور میں تخریبی رجحانات اندر ہی اندر پل رہے ہیں اور ایسی جڑ پکڑ گئے ہیں کہ
انہیں شعور میں لانا بھی مشکل ہے۔ لہذا تخریبات کے بیان سے گھبرانا اور اس پر پابندیاں عائد کرنا جسمانی اور ذہنی تندرستی کی ہرگز
دلیل نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر صحت مند اور پختہ شخصیت کی ضرورتیں ادب میں بالکل ظاہر ہی نہ ہوں
تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ سماجی شخصیت اندرونی ہم آہنگی اور توازن حاصل کرنے کے لئے پوری جدوجہد نہیں کر رہی۔ مختصر یہ کہ
ادب کو جنسی کج روی اور اس قبیل کے موضوعات اختیار کرنے سے ڈرنا نہیں چاہئے کیونکہ ادب انسانی وجود کی حقیقتوں سے پہلو بچائے
تو وہ ادب ہی کیا ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ متوازن اجتماعی زندگی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ادب صحت مندی کی تلاش سے خالی
نہ ہو۔

اس کے بعد یہ سوال آتا ہے کہ جنس کے معاملے میں صحت مند اور پختہ شخصیت کے مطالبات کیا ہوتے ہیں۔ جنس کی اعلیٰ ترین اقدار کیا ہیں اور ادب میں کہاں کہاں ملتی ہیں' یہ بحث تو فی الحال چھوڑیئے۔ جہاں تک عام انسانوں کا تعلق ہے۔ انکی صحیح جنسی تسکین کے لئے دو باتیں ضروری ہیں۔ ایک تو خالص جسمانی تسکین ہے جس میں انسان اور حیوان برابر کے شریک ہیں۔ اس جبلت کی شرکت کے بغیر محبت میں قوت اور گیرائی آ ہی نہیں سکتی۔ لیکن اس حیوانی خواہش کی تسکین انسان کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس میں ان لطیف جذبات کی آمیزش بھی ہونی چاہئے جو انسان نے اپنی انفرادی اور اجتماعی نشوونما کے دوران میں پیدا کئے ہیں۔ جبلی خواہش کی شدت اور انسانی جذبات کی نرمی [illegible] کے بغیر صحت مندانہ اور متوازن جنسی رویہ مکمل نہیں ہو تاہم اس رویے کو معیار سمجھ کر اردو کے افسانوی ادب کا جائزہ لیں گے۔

۱۹۳۶ء سے پہلے اُردو میں وہ صنف بہت مقبول تھی جسے رومانی افسانہ کہتے ہیں۔ ان افسانوں میں محبت کے جنسی اور جبلی پہلو کا اعتراف قطعاً نہیں ہوتا تھا۔ لیکن محبت کو روحانیت بنانے سے بھی گریز کیا جاتا تھا۔ اس دور میں محبت کے جذباتی عالم کا اظہار تھا یعنی اس دور کے ادیبوں کی ذہنیت پندرہ سولہ سال کے لڑکوں کی سی تھی۔ جب جنس مخالف کی طرف کشش تو ہونے لگتی ہے مگر اس کشش کی جنسی نوعیت کو تسلیم کرنے سے گھبراہٹ ہوتی ہے اس لئے آدمی اس جذباتی ہیجان کی اصلیت پر غور نہیں کرتا کیونکہ ڈر یہ ہوتا ہے کہ اگر ان جذبات کی جنسی آلودگی کو قبول کر لیا تو یہ جذبات قابل قبول نہیں رہیں گے۔ جو ادب کسی جذبے کی تہہ تک پہنچنے سے گھبرائے اس میں ہلکا پن اور سطحیت ہونی ہی چاہئے۔ ان رومانی افسانوں کے ساتھ ساتھ ٹیگوری نثر بھی خوب چلتی تھی۔ وہ بھی بلوغت کی زندگی کا ایک نمونہ ہے۔ اس عمر میں انسان جنسی خواہش محسوس بھی کرتا ہے اور اسے گندی چیز سمجھ کر اس سے بھاگتا بھی ہے۔ چنانچہ جنسی جذبہ بڑی آسانی سے معبودیت اور مذہبیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یونگ نے سچی مذہبیت کی تعریف یوں کی ہے کہ آدمی شعوری طور پر جانتا ہو کہ میں اپنی فطرت کے کن فاسد عناصر کو قابو میں رکھنے کے لئے مذہب کا اخلاقی نظام قبول کر رہا ہوں اور جھوٹی مذہبیت یہ ہے کہ آدمی ان فاسد عناصر کا اعتراف کئے بغیر کسی اخلاقی نظام میں پناہ لینا چاہے۔ یہ جھوٹی مذہبیت بلوغت کے زمانے میں ہر لڑکے اور لڑکی کو اپنی پناہ میں لینے کے لئے موجود رہتی ہے۔ وہی اس زمانے میں ہمارے ادیبوں نے اختیار کر رکھی تھی۔ پھر ایک تیسری چیز تھی۔ نیاز فتح پوری اور ان کے ساتھیوں کی جمال پرستی۔ اُن لوگوں کو دعویٰ تھا کہ ہم میں ذرا ریاکاری نہیں ہے۔ اپنی خواہش کا اظہار بے لاگ کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی مزعومہ لذت پرستی بس یہ تھی کہ عورتوں کے اعضا کا نام بار بار چٹخارے کے ساتھ لیتے تھے۔ یہ بھی بلوغت کے اس دور کی خصوصیت ہے جب جنسی حس تو بیدار ہو گئی ہو مگر عملاً اس کی تکمیل کی اہلیت نہ آئی ہو اور آدمی کی ساری جنسی لذت دوسروں کو یہ جتانے پر منحصر ہو کہ لو، خیر سے ہم بھی جوان ہوئے ... ... غرض اُردو ادب کے اس دور میں جنسیات کا ہر اظہار کھوکھلا اور بے تہ تھا۔ پھر اس قسم کے ادب کو ذرا وسیع پس منظر میں دیکھئے۔

۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۶ء تک مسلمانوں کی حالت بھی ایسی تھی جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ انہیں ملک کی سیاست میں اپنی کوئی جگہ نظر نہ آتی تھی۔ زندگی کی ذمہ داریوں اور فریضوں سے انہوں نے اپنے آپ کو الگ کر لیا تھا۔ اجتماعی حیثیت سے ان کے لئے کوئی کشمکش اور جدوجہد باقی نہ رہی تھی۔ ان کا ایمان یہ رہ گیا تھا کہ 'ہو رہے گا کچھ نہ کچھ' گھبرائیں کیا'.. ....انفرادی حیثیت سے ایک عام مسلمان کا مطمح نظر اتنا تھا کہ "کھا ڈبل روٹی' کلرکی کر' خوشی سے پھول جا۔" جو بچگانہ پن اس زمانے میں مسلمانوں کی سیاست میں تھا' وہی ادب میں بھی تھا..... پھر ایک قابل غور بات یہ ہے کہ افسانوں میں زن مریدوں کے کردار کتنے عام ہو گئے تھے۔ غرض مسلمانوں پر ایک عجیب بچکانیت اور مفعولیت طاری تھی۔ وہی رویہ جنس کے متعلق افسانوں میں بھی ملتا ہے۔

۱۹۳۶ء میں نئے ادب کی تحریک شروع ہوئی۔ جس کے ساتھ سیاست کے متعلق زیادہ دلیرانہ رویہ اور جنس کے بارے میں زیادہ حقیقت پرستانہ رویہ ابھرا...... لیکن ۱۹۳۶ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک افسانوں میں جنس کے متعلق جو انداز نظر ملتا ہے۔ اُسے بھی متذکرہ بالا معیار کے مطابق مکمل طور پر صحت مندانہ اور متوازن نہیں کہہ سکتے۔ ۱۹۳۶ء سے پہلے عشقیہ افسانوں میں محض جذباتی گداز اور نرمی ہی تھی' جسمانی پہلو کا اعتراف نہ تھا۔ اب وہ نرمی غائب ہو گئی' محض جسمانی بلکہ حیوانی پہلو پر زور دیا گیا' یہ رجحان اُس دور کی نمائندگی کرتا ہے جب لڑکا جنسی [illegible] کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس وقت جذبات کا سوز و گداز اُس کے لئے کوئی معنے نہیں رکھتا اور وہ ہر جنسی مظہر کو خالص جسمانی [illegible] دیکھتا ہے۔ اس عمر میں لڑکے کے لئے یہ انداز نظر انتہائی حقیقت پرستانہ ہوتا ہے 'اور وہ اس پر فخر بھی کرتا ہے پھر جنسی جذبات کو خالص [illegible] تک محدود کر دینے کے بعد لڑکے میں جنس اور جسم سے بیزاری پیدا ہو جاتی ہے اور گھن آنے لگتی ہے۔ چنانچہ اس دور کے [illegible] کی خصائص ملتے ہیں۔ لیکن یہ ذہنیت متوازن اور پختہ نہ سہی' مریضانہ ہرگز نہیں ہے۔ یہ جنسی

[illegible] تجربے کی ... اور روحانی تجسس کی بنیاد بن سکتی ہے [illegible] ادب نے کیے۔ کم از کم ذہنی [illegible] [illegible] [illegible] پیدا ہوا اضطراب سے ساٹھ ستر سال پہلے بعض حضرات نے ادیبوں کو بلوغت بالغی [illegible] [illegible] ضرورت ہے جس میں اسی بلوغت بالغی کے طفیل ادیبوں میں اتنی جان آگئی تھی کہ زندگی کے ہر پہلو سے دلچسپی لیں۔ غرض آنکھ [illegible] بلکہ ہر چیز کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کریں، سیاست میں دلیری اور جرات سے کام لیں، اپنے سیاسی مسائل کو [illegible] کے معاشی اور سیاسی پس منظر میں دیکھیں۔ اس بلوغت بالغی نے ہمارے ادیبوں کو دو چیزیں بالخصوص سکھائیں، حقیقت بینی اور صاف گوئی۔ یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے ان سے کام کتنا لیا۔ بہر حال یہ دو رجحانات ایسے تو پیدا ہوئے جن کے بغیر جاندار ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔ [illegible] اجتماعی زندگی میں بھی ایسی تحریکات پیدا ہوئیں جو ان رجحانات کو تقویت پہنچا رہی تھیں۔ مسلمانوں نے بھی مجہولیت چھوڑ کر ایک واضح رویہ اختیار کر لیا۔ یہ رویہ غلط ہو یا صحیح، بہر صورت مسلمانوں نے بعض حقیقتوں کو بالکل حتمی طور پر قبول کر لیا اور ان کے بارے میں پوری صاف گوئی سے کام لیا جو نئی قوت مسلمان قوم میں نظر آتی ہے وہی اس دور کے اردو ادب میں دکھائی دیتی ہے، مگر سیاسی اور ادبی تحریکیں دونوں کی دونوں نرمی سے خالی ہیں۔ اگر ادیب اپنے ادبی فرائض کے بارے میں واقعی سنجیدہ ہوتے تو یقیناً ممکن تھا کہ [illegible] شخصیت کے تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت ان میں آجاتی اور وہ جنس کے جسمانی پہلو اور انسانی محبت کے سوز و گداز کو سمو سکتے۔ لیکن بہت سے اسباب ایسے پیدا ہوئے جن کی وجہ سے ادیبوں کی صحیح نشو و نما نہ ہو سکی۔

بنگال کے قحط اور فسادات کے دوران میں ادیب حقیقت بینی چھوڑ کر نیک نیتی پر آرہے۔ اس نیک نیتی کے پیچھے کتنی اذیت پسندی چھپی ہوئی تھی اس کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ کیونکہ ادیب زندگی کی حقیقتوں سے کیا دو چار ہوں گے۔ اب تو وہ خود اپنی حقیقت سے آنکھیں چار کرتے گھبراتے ہیں۔ بہر صورت نیک نیتی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ حقائق کو تسلیم نہ کیا جائے۔ لیکن حقائق سے بچنے کے لئے بعض دفاعی انتظامات بھی کرنے پڑتے ہیں۔ ان کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا غرض حقیقت بینی کے بعد نیک نیتی آئی اور اس کے بعد خواب آلودگی۔ یہ ہے ۳۶ء سے لیکر اب تک ہمارے افسانوی ادب کی داستان۔

اگر ہمارا ادب صحیح معنوں میں ترقی کرتا تو جنس کے متعلق اتنی حقیقت بیانی کے بعد یہ ہونا چاہئے تھا کہ انسانی تہذیب میں جنسی [illegible] نے جو نشو و نما حاصل کی ہے، ادیب اُسے سمجھنے کی کوشش کرتے اور اپنے جنسی رویے میں قوت، توانائی، نرمی، ملائمت، نفاست، [illegible] کے عناصر لاتے۔ لیکن ہمارے افسانے نے ایک بالکل دوسرا رُخ اختیار کیا ہے۔ ۳۶ء سے ۵۰ء تک عام طور پر جو افسانے لکھے گئے [illegible] عشقیہ نہیں کہا جا سکتا گو ان میں جنسی معاملات کا ذکر نمایاں حیثیت رکھتا ہے لیکن اب پچھلے دو ڈھائی سال سے عشقیہ افسانے پھر [illegible] شروع ہو گئے ہیں۔ عشقیہ سے مراد وہی لڑکوں والا دھیما سا جذباتی ہیجان ہے جس میں اس ہیجان کی جنسی نوعیت کا اقرار کرنے سے [illegible] جاتا ہے۔ یعنی نئے ادب کی تحریک افسانے کو جہاں تک لے آئی وہاں سے آگے بڑھنے کے بجائے ہمارا افسانہ پھر پیچھے کی طرف [illegible] ہے۔ مگر ۳۶ء سے پہلے کی جذبات پرستی تو لڑکوں کی سی تھی، آج کل افسانے اس طرح کے لکھے جا رہے ہیں جیسے چودہ پندرہ سال کی لڑکیاں [illegible] میں خواب دیکھتی ہیں۔ ہمارے بیشتر افسانے نہ صرف معاشرے کی حقیقت سے دُور ہوتے جا رہے ہیں بلکہ جنسی حقائق سے بھی گریز کرتے ہیں جو افسانے ترقی پسندانہ تاثرات کے ماتحت لکھے جاتے ہیں ان کی ادبی حیثیت کچھ بھی سہی، اُن میں حقیقت کو کتنا ہی مسخ [illegible] کیا گیا ہو۔ بہر حال ان میں زندگی کے بعض پہلوؤں کو سمجھنے اور زندگی میں چند تبدیلیاں پیدا کرنے کی دعوت تو ہوتی ہے۔ [illegible] افسانے کم سے کم حقیقت سے ٹکر لینے کا دعویٰ تو کرتے ہیں مگر یہ نئی عشقیہ افسانہ نگاری سیاسی، سماجی، نفسیاتی، جنسی، ہر قسم کی [illegible] چھڑاتی ہے۔ اگر ترقی پسند افسانہ ادب نہیں ہے تو یہ افسانہ بھی ادب نہیں ہے۔ ترقی پسند افسانہ کم سے کم اس بات [illegible] اصلیت [illegible] نہیں کرتا۔ ان عشقیہ افسانوں میں، اور جنس کی گندگی سے گھبرا کر

ملک ہوتا ہے اور یہ عشق عجیب و غریب ناموں والے درختوں کے سائے میں یا امریکی گانوں کی تال پر پروان چڑھتا ہے۔ انجام عشق کی شکست اور آنسوؤں پر ہوتا ہے۔ یہ ذہنیت سو فیصدی اسکول کی لڑکیوں کی ہے لیکن اس سے یہ نہ سمجھئے کہ ہمارے ادب میں یا ہمارے مزاج میں نرمی اور نفاست بڑھتی جا رہی ہے۔ کوئی سماجی مظہر اپنی جگہ اکیلا نہیں ہوتا اس کا تعلق دوسرے مظاہر سے بھی ہوتا ہے اور انہی کے ساتھ مل کر اس میں پورے معنی پیدا ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو افسانوں میں یہ رونا دھونا اور سوز و گداز ہے۔ دوسری طرف جو فلمیں مقبول ہو رہی ہیں ان کی کیفیت ہی اور ہے۔ ایسی فلمیں لوگوں کو بہت پسند آتی ہیں جن میں ہیرو ہیروئن سے بد سلوکی کرے اور اُسے اپنا غلام بنا کر رکھے۔ بلکہ بعض فلموں کا اشتہار تو اس طرح دیا جاتا ہے کہ اس میں ہیرو ہیروئن کو پیٹتا ہے۔ ان فلموں اور متذکرہ بالا افسانوں سے اثر لینے والے تقریباً ایک ہی ہیں۔ ان دو چیزوں کو ساتھ ملا کر دیکھئے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمارے متوسط طبقے میں فاعلی اور مفعولی دونوں قسم کی ایذا پرستی بڑھ رہی ہے، لیکن وہ اس سے واقف نہیں ہونا چاہتا۔ یہ عشقیہ افسانے اس ایذا پرستی پر پردے کا کام دیتے ہیں۔ لیکن ایسے خطرناک رجحانات اندھیرے میں اور تیزی سے پلتے ہیں۔ اگر ہمارے ادب میں پہلے کی طرح حقیقت بینی اور صاف گوئی کا مادہ ہوتا تو کم سے کم ہمارا شعور ان رجحانات سے واقف تو ہو سکتا تھا اب یہ زہر اندر ہی اندر پک رہا ہے اور خدا جانے ہمارے معاشرے کے لئے اس سے کیا نتیجے نکلیں گے۔ اگر اور کچھ نہ ہوا تو بھی یہ کیا کم ہے کہ ایسے ادب کے زیر اثر آنے والا طبقہ صحیح قسم کی جنسی تسکین کا تصور اپنے ادب سے اخذ نہ کر سکے، اور یا تو لڑکپن کی جذبات پرستی میں پڑا رہے یا جنسی اذیت پسندی کی طرف مائل ہو جائے۔

ہمارے افسانے میں یہ ترقی معکوس کیوں ہو رہی ہے؟ ہماری شخصیت میں پختگی آنے کی بجائے لڑکپن کیوں آتا جا رہا ہے؟ اس کی نفسیاتی وجوہ تو بہت کچھ ہوں گی مگر ان کی تفتیش کی اہلیت مجھ میں نہیں۔ بہر صورت سماجی اسباب کا سمجھنا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ ہم نے ابھی آزادی حاصل کی ہے، بلکہ ایک نیا ملک اور نئی قوم بنائی ہے۔ ایسی صورت میں ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ ہماری ذہنی دلچسپیاں اور سنجیدہ تفکر کی عادت بڑھے، ہم اپنے معاشرے کو معاشی انصاف اور سماجی مساوات کی بنیادوں پر تشکیل دینے کی تجویزیں سوچیں لیکن ہوا یہ ہے کہ ہم نے آزاد ملک کے باشندوں کی ذمہ داریاں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ دوسری طرف حکومت کو یہ پسند نہیں کہ عام آدمی رموز مملکت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ملک کی سیاسی حالت کے متعلق رائے قائم کرتے ہی آدمی کمیونسٹ بن جاتا ہے آئینی طور پر ملک میں آزادی رائے ہو یا نہ ہو، مگر عملی اعتبار سے عموماً لوگ اس جمہوری حق کو استعمال کرتے ہوئے گھبرانے لگتے ہیں کیونکہ ہمارے یہاں حب الوطنی کی ایسی شدت ہے کہ غداری کی بو دُور سے آجاتی ہے۔ جب سماجی حقیقتوں کے سمجھنے سمجھانے میں ایسی دشواریاں ہوں تو ذہن جنسی تصورات میں پناہ لیتا ہے۔ لیکن یہاں بھی یہ حال ہے کہ ذرا کسی جنسی فعل کا ذکر کر دیجئے اور فحاشی کے جرم میں کھنچے کھنچے پھریئے۔ غرض نہ سیاست کے متعلق صاف گوئی سے کام لے سکتے ہیں نہ جنس کے متعلق۔ بالغ نظر کے انسانوں کی جتنی دلچسپیاں ہیں ان سب کو ڈر کے مارے ادب سے خارج کرنا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ادیب بے چارے سر سٹ کے اسکول کی لڑکیاں نہ بنتے چلے جائیں تو اور کیا ہو .... لیکن کیا بالغ انسان اطمینان کے ساتھ لڑکیاں بنے رہ سکتے ہیں؟ اگر وہ اس پر قانع نہیں رہ سکتے تو پھر اس کا انجام کیا ہو گا؟ یہ بسوزد پرم کا معاملہ ہے۔ بہر حال اگر اس میں نفسیاتی رجعت کا نتیجہ ناخوشگوار نہ نکلے تب بھی یہ سوچنے کی بات ہے کہ ایک نئے نئے آزاد اور جمہوری ملک کے تعلیم یافتہ طبقے کا اس طرح بچوں کی سطح پر اترنا ملک کے لئے اور اس کے مستقبل کے لئے کس حد تک فائدہ مند ہے؟ ایک ادبی بحث ہمیں اس جگہ لے آئی ہے۔ جہاں بات ادب سے بہت دُور نکل گئی ایک معمولی مضمون نگار اتنے بڑے سوال کا کیا جواب دے۔ یہ تو ان لوگوں کے سوچنے کی بات ہے جو ملک اور قوم کے مستقبل کے لئے خاکے تیار کرتے ہیں۔

(نقوش ۲۵، ۲۶)

اردو افسانے میں روایت اور تجربے

(سمپوزیم)

شرکاء:

سعادت حسن منٹو　احمد ندیم قاسمی　سید وقار عظیم　ڈاکٹر عبادت بریلوی
ہاجرہ مسرور　خدیجہ مستور　انتظار حسین　شوکت تھانوی　حمید اختر۔

یہ سمپوزیم اس سے پہلے بھی نقوش کے ایک افسانہ نمبر میں چھپ چکا ہے۔ اس نمبر میں اسے دوبارہ پیش کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ اس نمبر میں اس کی شمولیت بعض کوتاہیوں کے باوجود ناگزیر تھی۔

آخر میں تین چار افسانہ نگاروں پر قدرے تفصیلی تبصرہ ایزاد کر دیا گیا ہے۔

مدیر نقوش نے کہا ___ آج کی نشست کا مقصد یہ ہے کہ ہم "اردو افسانہ میں روایت اور تجربے" کے عنوان کے ماتحت گفتگو کریں۔"

احمد ندیم قاسمی۔ پہلے وہ صاحب بولیں جنہیں اس کا تجربہ ہو۔

سعادت حسن منٹو۔ پہلے یہ بتایئے کہ آپ کو افسانے سے بحث ہے یا افسانہ نگار سے، دوسری بات یہ کہ افسانے کی روایت کو تو بہت دور سے Trace کرنا پڑے گا۔

عبادت بریلوی۔ ہم ان افسانوں کی روایت سے بحث کریں گے جو اردو میں لکھے گئے۔

ندیم۔ منٹو صاحب کا یہ کہنا کہ ہر افسانہ نگار کی ایک روایت ہے، ٹھیک ہے لیکن یہی روایت آگے چل کر افسانے کی روایت بن جاتی ہے۔ موجودہ دور کے افسانوں سے پہلے جو اردو افسانے لکھے گئے ہیں ان کی ہیئت کے اعتبار سے جو صورت مرتب ہوتی ہے ہم اسی کو جیاد بنا کر بحث کریں گے۔ ذاتی اسٹائل کو بھی اسلوب اور روایت کہہ سکتے ہیں۔

وقار عظیم۔ بنیادی طور پر ہر صنفِ ادب کے کچھ فنی لوازم ہوتے ہیں۔ یہی لوازم اس صنف اور دوسری اصناف میں فرق و امتیاز پیدا کرتے ہیں۔ یہی صورت افسانے کی ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ جب ہمارے پہلے افسانہ نگار نے افسانہ لکھا تو کن چیزوں کو بنیاد بنایا اور پھر آگے چل کر نئے تجربوں سے کون کون سی چیزیں اس میں اضافے ہوئے؟

منٹو۔ لیکن پرانے زمانے میں جو لوگ افسانے لکھتے تھے کیا وہ ان روایات پر قائم رہتے تھے ___ میرے خیال میں تو ان کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنا مشکل ہے۔

وقار عظیم۔ ہر تجربہ آگے چل کر روایت کا جزو بن جاتا ہے اور جب وہ روایت بن جاتا ہے تو آگے آنے والے، وقت کے تقاضوں کی بنا پر، نئے تجربے کرتے ہیں اور ہوتے ہوتے یہ بھی روایت کا حصہ بن جاتے ہیں۔

ندیم۔ سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اردو افسانے کی ابتدا کہاں سے ہوئی، اور کیا اردو افسانے کی روایت اتنی وسیع ہے کہ ہم اس پر بحث کر سکیں۔ غالباً اردو افسانے کی ابتدا اسی صدی میں ہوئی ہے اور ہمارے ابتدائی افسانہ نگاروں میں سلطان حیدر جوش، پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری شامل ہیں۔ اور ہمیں ان کے ساتھ آج کے افسانہ نگاروں کا تعلق قائم کرنا ہے۔

وقار عظیم۔ اس طرح بات یہاں آکر ٹھہری کہ ہمارے ابتدائی افسانہ نگار سلطان حیدر جوش، سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری ہیں۔

منٹو۔ سجاد حیدر کو میں افسانہ نگار نہیں مانتا کیونکہ وہ سب ترجمے کرتے رہے ہیں۔

وقار عظیم۔ انہوں نے ترجمے ضرور کئے ہیں لیکن طبعزاد افسانے بھی لکھے ہیں۔

ندیم۔ تو سب سے پہلے ہمیں یہ متعین کر لینا چاہئے کہ اردو

افسانے کی روایت وہیں سے شروع ہوتی ہے یا اس سے بھی پہلے۔
منظور۔ افسانے کی روایت تو وہیں سے شروع ہوتی ہے جہاں سے قصے کہانیاں شروع ہوئیں۔
وقار عظیم۔ لیکن ہماری بحث کا تعلق اردو افسانے سے اور خاص کر مختصر افسانے سے ہے۔
منظور۔ پھر میں یہ جاننا چاہتا ہوں گا کہ افسانہ ہوتا کیا ہے؟
انتظار حسین۔ غالباً پریم چند سے افسانے کی باقاعدہ روایت قائم ہوتی ہے۔ اس لئے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ان کے زمانے میں افسانے کا کیا تصور تھا___ اور پھر اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ بعد کے لکھنے والوں نے اس سے کیا انحراف کیا۔
عبادت۔ یوں تو افسانہ ہر کہانی کو کہتے ہیں لیکن مختصر افسانے کے چند فنی لوازم ہوتے ہیں۔ مثلاً وحدت تاثر' رمزیت' ایمائیت اور مواد کی فنکارانہ ترتیب وغیرہ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ افسانے کی یہ روایت کب سے قائم ہوئی۔ پریم چند سے یا اس سے پہلے' میرا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ مختصر افسانہ خود یورپ میں بھی بہت بعد کی پیداوار ہے۔ انیسویں صدی عیسوی کے دور آخر سے قبل اس کا وجود باقاعدہ ایک صنف کی صورت میں نہیں ملتا۔ البتہ اس کی روایات دوسری اصناف ادب میں نظر آتی ہیں___ مثال کے طور پر انگریزی شاعری میں Balled کی جو صنف ہے' اس میں مختصر افسانے کا سا انداز مل جاتا ہے۔ اسی طرح اردو میں جو داستانیں لکھی گئی ہیں' ان میں بھی جگہ جگہ ایسے حصے ہیں جن میں مختصر افسانے کی روایات تلاش کی جا سکتی ہیں مثلاً سرشار کے فسانۂ آزاد میں اور میرامن کی باغ و بہار میں یہ چیز ضرور موجود تھی۔ بعد میں اس پر مغرب کا اثر ہوا جس کی وجہ سے مختصر افسانے نے تیزی سے ترقی کی اور موجودہ ہیئت تک پہنچ گیا۔ اس عرصے میں مختصر افسانہ بیسیوں تجربات کی منزلوں سے گزرتا گیا اور اس طرح اس میں روایات صورت پذیر ہوتی گئیں۔ آج یہی روایات اردو مختصر افسانے کا سرمایہ ہیں___ انہی کو سامنے رکھ کر ہم یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مختصر افسانہ کیا ہے اور اس کی بنیادیں کن اصولوں پر قائم ہیں؟
منظور۔ میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ مختصر افسانہ کے دوٹوک اصول کیا ہیں؟
وقار عظیم۔ ہمارے افسانے نے موجودہ ہیئت مغرب کے اثر کے تحت حاصل کی۔ لیکن اس میں ہماری قدیم کہانیوں اور داستانوں کی خصوصیات بھی شامل ہیں اور ان دونوں کے امتزاج سے ہمارا افسانہ بنا ہے۔ مغرب کا افسانہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ افسانہ میں ایک چیز کے متعلق کوئی کیفیت کی جائے اور اس کا ایسا تاثر ہو کہ اس میں انتشار نہ ہو۔ یہ چیز ہم نے مغرب سے لی ہے۔ ایک واحد تجربہ یا تاثر افسانہ کا اصل موضوع ہے۔
منظور۔ ایک تاثر کو خواہ وہ کسی کا ہو اپنے اوپر مسلط کر کے اسے اس انداز سے بیان کر دینا کہ وہ سننے والے پر بھی وہی اثر کرے' یہ افسانہ ہے۔
وقار عظیم۔ جی ہاں!___ جب افسانے کی ایک تعریف متعین ہو گئی تو اسے سامنے رکھ کر یہ دیکھنا ہے کہ ابتدائی افسانہ نگار کس حد تک اس بنیادی بات کو پورا کرتے ہیں اور کس حد تک داستانوں سے متاثر ہیں۔
عبادت۔ پریم چند کے یہاں افسانے کی جو روایت ملتی ہے' اس میں ابتدا داستانوں کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ پریم پچیسی' پریم بتیسی' اور پریم چالیسی کے بیشتر افسانے اسی انداز میں لکھے گئے ہیں اور مختصر افسانے کی تکنیک کے بنیادی اصولوں کا پوری طرح لحاظ نہ رکھنا انہی داستانوں کی تکنیک سے متاثر ہونے کا ثبوت ہے۔ ان کے بعد افسانوں میں یہ بات نہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ مختصر افسانے کی خصوصیات کو برتنے لگتے ہیں۔
وقار عظیم۔ لیکن پریم پچیسی اور پریم بتیسی کے افسانے پریم چند کے ابتدائی افسانے نہیں۔ حقیقت میں ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "سوز وطن" نہ صرف ان کی افسانہ نگاری کی بلکہ ہمارے افسانے کی بنیاد ہے۔ اس میں پانچ افسانے ہیں جو تمام کے تمام داستانوں کے رنگ میں گہری مقصدیت کے حامل ہیں۔ کرداروں کے ناموں تک میں یہی رنگ موجود ہے۔ ہیرو اور ہیروئن کا وہی تصور ہے جو داستانوں میں تھا۔ انداز بیان شروع سے آخر تک شاعرانہ ہے لیکن اس کے باوجود ان کے ہر افسانے میں ایک واحد مقصد ہے جسے بڑی کامیابی سے داستانی رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ پس منظر بالکل داستانوں کا ہے۔ افسانہ نگار کے پیش نظر ایک خاص مقصد ہے جسے وہ ناظر تک پہنچانا چاہتا ہے وہ بار بار اس کی تکرار کرتا ہے۔ کبھی یہ اعادہ برا معلوم ہوتا ہے اور کبھی اس میں لطف آجاتا ہے۔ لیکن افسانہ نگار کو اپنا مقصد اتنا عزیز ہے کہ وہ تکرار کے بوجھ کو محسوس بھی نہیں کرتا۔
عبادت۔ لیکن یہ بات تو یقینی ہے کہ پریم چند کی یہ مقصدیت جو "سوز وطن" کے افسانوں میں ملتی ہے وہ مغرب کے اثرات کا

تیجہ نہیں تھی اس میں ایک انفرادیت ہے۔ بہر حال ان افسانوں کی تکنیک پر ان داستانوں کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔

ندیم۔ میرے خیال میں اگر وہ افسانہ جو داستانوں سے الگ ہوا ہے تو اس میں افسانہ نگاروں کے دو گروہ تھے ___ ایک وہ جو یونانی اور ہندو اساطیر کو پیش کرتے تھے دوسرے وہ جو پریم چند کی طرح سوسائٹی کی بدحالی کی طرف اشارہ کرتے اور ان کے اصلاحی پہلو پیش کرتے تھے۔ ہمیں اس اصلاحی پہلو کو ہی پیش نظر رکھنا چاہئے کیونکہ یہ اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کا نتیجہ تھے۔

وقار عظیم۔ سلطان حیدر جوش اور پریم چند دونوں کا سیاسی ماحول ایک سا تھا۔ لیکن مسلمانوں پر سرسید کی تحریک کا ردعمل یہ تھا کہ وہ انگریزی تعلیم اور مغربی معاشرت سے متنفر نظر آتے تھے اور ہندوؤں کا زاویہ نظر خالص سیاسی تھا۔ مثلاً پریم چند کا پہلا افسانہ "دنیا کا سب سے انمول رتن" اسی سیاسی رجحان کا حامل ہے۔ اس افسانہ کی ابتدا، خاتمے اور اس کے دوسرے حصوں کا انداز بالکل داستانوں کا سا ہے یہی رنگ اس مجموعہ کے دوسرے افسانوں کا ہے ___ اس کے برعکس سلطان حیدر جوش کے افسانوں میں مسلمان تعلیم یافتہ لڑکیوں اور مغرب زدہ نوجوانوں کی معاشرتی اور اخلاقی زبوں حالی کا کوئی نہ کوئی پہلو پیش کیا گیا ہے۔ پریم چند اور سلطان حیدر جوش دونوں کے افسانے مقصدی ہیں لیکن دونوں میں یہی بنیادی فرق ہے۔

عبادت۔ اب ایک سوال یہ ہے کہ پریم چند نے جو روایت قائم کی اس میں انہوں نے مغرب سے اثر لیا ہے یا نہیں۔

وقار عظیم۔ پریم چند نے خود بھی لکھا ہے کہ ان کے ابتدائی افسانوں میں داستانوں کا رنگ ہے ___ وہ بچپن میں چھپ چھپ کر طلسم ہوشربا پڑھتے تھے۔ بڑے ہو کر ٹالسٹائی کا مطالعہ کیا اور اس کی سادگی اور سلاست کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ دوسروں نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے زیادہ تر قیاس آرائی پر مبنی ہے۔

عبادت۔ ان کے افسانوں کے مطالعہ سے بھی یہی بات ظاہر ہوتی ہے۔

منٹو۔ کیا طلسم ہوشربا میں مقصدیت اور افادیت نہیں تھی؟

وقار عظیم۔ ضرور [illegible]

منٹو۔ ایچ۔ جی۔ ویلز اور طلسم ہوشربا میں کیا فرق ہے؟

عبادت۔ یہ الگ سوال ہے۔

منٹو۔ ہم مقصدیت پر زور دیتے ہیں اور دوسری چیزوں کو بھول جاتے ہیں لیکن ایچ۔ جی۔ ویلز نے سائنس کی بڑی خدمت کی ہے۔ اس کا جھوٹ تخلیقی جھوٹ تھا اور افسانے سے جھوٹ نکالا نہیں جا سکتا۔

ندیم۔ ایچ۔ جی۔ ویلز اور طلسم ہوشربا میں Fantasy ایک قدر مشترک ہے صرف دور کا فرق ہے۔

وقار عظیم۔ یہ بحث ہے تو بڑی دلچسپ لیکن ہمارے دائرہ گفتگو سے باہر ہے۔ میں نے جو طلسم ہوشربا کا نام لیا وہ محض اس لئے لیا کہ پریم چند نے اس سے اثر قبول کیا۔

ندیم۔ اب ہمیں پریم چند کے "سوز وطن" سے افسانے 'کفن' تک یہ طے کرنا ہے کہ اس سے کیا اثرات مرتب ہوئے۔

وقار عظیم۔ پہلے مقصد اصلاحی تھا اب دیکھنا یہ ہے کہ اس سے انحراف کس نے کیا اور اس کے کیا اثرات ہوئے اور مقصدیت کے نقطہ نظر سے سجاد حیدر یلدرم، جوش اور پریم چند میں کچھ فرق ہے یا نہیں۔

ندیم۔ سجاد حیدر ان سے الگ ہیں۔

عبادت۔ خود پریم چند کے افسانوں میں یہ بات ہے کہ وہ خالص مقصدیت کے حامل نہیں بلکہ ان کے ہر دور کے افسانوں میں زندگی کو سمجھنے، اس کو برتنے اور اس کو بہتر بنانے کا خیال بھی ملتا ہے۔ خصوصاً ان کے بعد کے افسانوں میں یہ سماجی اور اصلاحی پہلو کچھ اور بھی نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

وقار عظیم۔ یہ چیز بعد کے افسانوں میں آتی ہے۔

عبادت۔ البتہ انسانی زندگی کے بنیادی تقاضوں کو سب سے پہلے سجاد حیدر یلدرم نے پیش کیا۔ مثلاً "خیالستان" کے بعض افسانوں میں ہمیں یہ بات ملتی ہے۔ خارا اور نسرین نوش کی کہانی اگرچہ ایک رومانی فضا رکھتی ہے لیکن اس کا موضوع انسانی زندگی کی ایک نفسیاتی حقیقت ہے ___ یعنی مرد اور عورت کا جذباتی اور جسمانی رشتہ!

وقار عظیم۔ سجاد حیدر پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ خیال عام کیا کہ اصلاحی مقصد افسانے کے فن کو مجروح کرتا ہے۔ آگے چل کر پریم چند نے بھی مقصدیت اور اصلاح کے ساتھ فن پر پوری توجہ دی۔

عبادت۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ سجاد حیدر یلدرم کے افسانے انقلاب سے قبل کے ترکی افسانے کے زیر اثر لکھے گئے ہیں۔ اس دور کے ترکی ادب اور خصوصاً افسانے پر جذباتیت اور رومانیت کا دور دورہ تھا۔ یہ رومانیت یلدرم کے یہاں بھی ملتی ہے۔ تقریباً ہر افسانے میں انہوں نے ایک رومانی فضا قائم کی ہے جو ان

کی تکنیک کا ایک بنیادی جزو بن گئی ہے ___ اس کو نکال دیجئے تو سجاد حیدر یلدرم کے یہاں کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔

وقار عظیم۔ کیا نیاز فتح پوری اور یلدرم کی رومانیت میں کوئی مماثلت ہے؟

ندیم۔ یلدرم نے افسانے کی ہیئت میں بڑی تبدیلی کی ہے اس وقت تک افسانے میں پلاٹ کا التزام تھا۔ لیکن انہوں نے کردار نگاری کی طرف لوگوں کا رجحان بڑھایا اور ایسے Sketches کھینچے جن میں صرف ایک کردار ہے۔

وقار عظیم۔ یہ صحیح ہے ___ موضوع کے اعتبار سے جو سب سے اہم چیز ہے وہ یہ کہ سلطان حیدر جوش اور پریم چند نے معاشرتی اور سیاسی پہلو لئے ہیں لیکن یلدرم نے ایسے موضوع اپنائے جو زندگی سے تعلق رکھتے تھے انہوں نے زیادہ تر عورت مرد کی محبت پر افسانے لکھے ہیں' اور اس طرح موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے نئے تجربے کئے۔

انتظار حسین۔ بہر حال ان میں ایک بات مشترک تھی کہ وہ زندگی کے تسلسل کے قائل تھے اور موجودہ مختصر افسانے کی ابتدا وہاں سے ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے تسلسل کی منکر ہے۔ اس میں ایک الگ حادثہ ہے جسے زندگی سے کوئی ربط نہیں۔

عبادت۔ سوال یہ ہے کہ یہ جو روایت یلدرم نے قائم کی ہے اس کے بعد نیاز فتح پوری اور ل احمد نے اس میں کوئی اضافہ کیا یا نہیں؟

وقار عظیم۔ نہیں ___ ان لوگوں نے اور مجنوں گورکھپوری نے افسانہ کسی مقصد کی خاطر نہیں بلکہ اسے کہانی سمجھ کر لکھا۔

ندیم۔ لیکن اس سے پہلے پریم چند کے آخری افسانے کامیاب تکنیک پر کیسے پہنچے میرے خیال میں انہوں نے مغربی افسانوں سے اثر قبول کیا۔

عبادت۔ پریم چند کی کہانی 'کفن' میں ان کے ابتدائی افسانوں کی تکنیک سے بڑا انحراف ہے اور اس میں مغربی افسانوں کی تکنیک کا اثر پایا جاتا ہے۔

وقار عظیم۔ لیکن افسانہ نگار کے مخصوص رجحانات کے ذہنی ارتقا کی ایک شکل ہے اس لئے ہمیں اس کے بعد افسانوں پر غور کرنا چاہئے۔

عبادت۔ "انگارے" ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی ہے اور اس میں شامل ہونے والے افسانہ نگاروں پر بھی پریم چند کا خاصا اثر معلوم ہوتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت تک خود پریم چند جہاں تک تکنیک کا تعلق ہے بڑی حد تک بدل چکے تھے۔

ندیم۔ اثر کیوں نہ ہو ___ اگر ہم اس سے انکار کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں روایت کے تسلسل سے انکار ہے۔

انتظار حسین۔ ہمیں یہ نہیں دیکھنا ہے کہ انہوں نے پریم چند سے کتنا اثر قبول کیا بلکہ یہ کہ اس سے انحراف کس طرح کیا۔

وقار عظیم۔ "انگارے" کے افسانوں میں ہندوستانی زندگی کی مسلمہ قدروں کو توڑنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ چیز پریم چند کے یہاں نہیں۔

عبادت۔ انگارے" کے افسانوں میں جو شدت ہے وہ انقلابی ہے لیکن اس میں کسی نہ کسی حد تک پریم چند کا اثر ضرور ہے۔ ویسے ایک بات یہ بھی ہے کہ "انگارے' کے افسانہ نگار نوجوان تھے۔ ان کے خون میں گرمی تھی۔ بغاوت ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس لئے انہوں نے فن میں ایک شدت کو پیدا کیا ___ لیکن ان کی اس انتہا پسندی نے فن کو ٹھیس پہنچائی۔

وقار عظیم۔ لیکن یہ ایک تجربہ تھا اور خود اس کے مصنف آگے چل کر بہت کچھ سنبھل گئے۔

ندیم۔ جی ہاں! بعض تو بالکل ہی بدل گئے۔

وقار عظیم۔ پھر بھی "انگارے" کے ان مصنفوں نے جہاں جہاں روایت سے شدت کے ساتھ انحراف کیا وہ آگے چل کر فن کے لئے مضر ثابت ہوئی۔

عبادت۔ لیکن یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ "انگارے" کے لکھنے والوں نے اردو کے افسانہ نگاروں کو بے جھجک نشتر زنی کا انداز سکھایا۔ اس کا یہ اثر ہوا کہ بعد کے افسانہ نگاروں نے اپنے فن میں شدت اور بے باکی پیدا کی۔ شاید ہی سوسائٹی کا کوئی ایسا پہلو ہو جس پر انہوں نے شدت اور بے باکی کے ساتھ قلم نہ اٹھایا ہو۔ مثال کے طور پر ہم اس سلسلے میں سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کو پیش کر سکتے ہیں۔

وقار عظیم۔ لیکن منٹو 'انگارے' کی شدت سے متاثر نہیں ہوئے۔

منٹو۔ میں نے 'انگارے' پڑھی بھی نہیں۔

انتظار حسین۔ 'انگارے' نے ایک غلط روایت کی طرح ڈالی۔ بعد میں آنے والوں نے یہ سمجھا کہ افسانہ میں سنسنی کی ضرورت ہے۔

عبادت۔ بات یہ ہے کہ وہ زمانہ سیاسی دہشت پسندی کا زمانہ تھا اور ان افسانوں میں جو شدت پیدا ہوئی اس میں ماحول کی اس

کیفیت بھی ملتی ہے۔ ویسے ہر تجربے میں شروع شروع شدت اور انتہا پسندی ہوتی ہے ___ بعد کے لکھنے والوں نے اس شدت اور انتہا پسندی میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کی۔

ندیم۔ میرے خیال میں انگارے کی سنسنی کی روایت غلط ہے۔ کیونکہ بعد میں لکھنے والوں نے اسے روایت کا جزو نہیں بنایا اور اس سے انکار کیا۔ ممکن ہے اکا دکا مثالیں مل جائیں لیکن بہ حیثیت مجموعی نہیں۔ عصمت، منٹو وغیرہ کسی نے بھی شعوری طور پر یہ کوشش نہیں کی۔

انتظار حسین۔ لیکن ہم افسانے میں آج بھی شدت Intensity ڈھونڈتے ہیں جو مختصر افسانے کی خوبی نہیں۔

منٹو۔ شدت کس چیز کی؟

وقار عظیم۔ شدت احساس کی۔

منٹو۔ یہ تو افسانے کی بنیادی چیز ہے۔

عبادت۔ غالباً انتظار صاحب کا مقصد یہ ہے کہ "انگارے" میں سماجی موضوعات پر جارحانہ انداز میں جو روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کو پیش کرتے ہوئے طنز اور نشتر زنی کا جو انداز اختیار کیا گیا ہے وہ کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے۔

وقار عظیم۔ جی ہاں ___ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ کن باتوں کا ذکر ضروری ہے اور کن کا نہیں ___ مثلاً جنس کے بارے میں خاصی بے اعتدالی کا ثبوت دیا گیا ہے۔

منٹو۔ جنس کے بارے میں تو اس سے پہلے بھی کافی کچھ لکھا جا چکا تھا مثلاً داستانوں میں۔

عبادت۔ لیکن داستانوں میں جن جنسی موضوعات کا تذکرہ ہے ان کی نوعیت مختلف ہے۔ یہاں تو وہ ایک طرح کی لذت پرستی اور تعیش پسندی کا نتیجہ ہیں۔ "انگارے" کے افسانوں میں یہ بات نہیں۔ ان میں جنسی موضوعات کا ذکر زیادہ ہے لیکن "انگارے" کے افسانوں کے موضوعات صرف اسی حد تک محدود نہیں رہے۔ ان میں سماجی زندگی کے بہت سے دوسرے پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ وہ کون سے افسانہ نگار ہیں جنہوں نے آگے چل کر تنوع کے اس رجحان کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

وقار عظیم۔ ایک طرف 'کفن' دوسری طرف "انگارے" ___ دونوں کو سامنے رکھ کر ہمیں آگے بڑھنا ہے ___ پریم چند نے ہمیں یہ بتایا کہ ہمیں زندگی کے متعلق کس طرح لکھنا چاہئے۔ ہیئت کے اعتبار سے اس مجموعہ نے ہمیں یہ سبق دیا کہ فرسودہ طریقوں کو چھوڑ کر نئی راہوں کو اپنانا چاہئے اور یہ کہ زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے موضوع پر بڑے سے بڑا افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح ہم ۳۵ - ۱۹۳۶ء تک پہنچ چکے ہیں۔ بعد میں یہی رجحان منٹو، کرشن چندر اور ندیم میں پیدا ہوا کہ وہ جس معاشرے میں رہتے ہیں بستے ہیں اسی کے متعلق لکھیں۔

ندیم۔ روایت کی بحث یہاں ختم تو نہیں ہو جاتی۔

وقار عظیم۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔

عبادت۔ نئے لکھنے والوں نے خاصے تجربے کئے ہیں ہیئت اور موضوع دونوں کے اعتبار سے، نئے لکھنے والوں نے اپنے ذہنوں میں کشادگی پیدا کی ہے اور زندگی کی کشمکش کو نئے زاویوں سے دیکھا ہے۔ فنی اعتبار سے بھی انہوں نے تکنیک کو نکھار دیا ہے اور یہ چیز پڑھنے والوں پر زیادہ اثر کرتی ہے۔ "انگارے" کا کینوس زیادہ وسیع نہیں اور اس میں ایک قسم کی جھنجھلاہٹ پائی جاتی ہے بعد میں آنے والوں نے "انگارے" کے افسانوں کے مقابلے میں اپنے ماحول کی زیادہ وسیع اور باشعور ترجمانی کی ہے۔ جذباتی رومانیت کی تحریک نے جو رجحان پیدا کیا تھا وہ اور زندگی کی باشعور ترجمانی کا رجحان دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ رومانیت کی اہمیت سے بھی ہم انکار نہیں کر سکتے۔ خصوصیت کے ساتھ جب یہ رومانیت ہمارے یہاں جذباتیت کی حدود سے باہر نکلتی ہے تب تو اس کی اہمیت کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ کرشن چندر اور احمد ندیم قاسمی کے ابتدائی افسانے رومانیت کے اس نئے رجحان کو پیش کرتے ہیں۔

ندیم۔ اردو افسانہ ۱۹۳۵ء تک جو تھا اس میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں ان میں دو لکھنے والے بہت نمایاں ہیں۔ عصمت اور منٹو۔

وقار عظیم۔ اس میں احمد علی، حیات اللہ انصاری، بیدی اور ندیم بھی شامل ہیں۔

ندیم۔ ان پر اگر ایک نظر ڈال لی جائے تو یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اس دور تک افسانہ کہاں پہنچ چکا ہے۔

عبادت۔ حیات اللہ انصاری اور احمد علی کے ہاں ایک خاص قسم کی واقعیت اور حقیقت نگاری Realism ہے۔

وقار عظیم۔ یہ رجحان تو ہر افسانہ نگار کے ہاں ہے کہ وہ زندگی کو ایک خاص قسم کی حقیقت پسندی کی نظر سے دیکھتا ہے ___ مثلاً کرشن چندر کے افسانے کشمیر اور بمبئی سے متعلق ہیں ___ منٹو بمبئی کے متعلق لکھتے ہیں ___ ندیم پنجاب کی

کاسی کرتے ہیں۔ بیدی کے افسانوں کے کردار لاہور میں سانس لیتے ہیں۔

انتظار حسین۔ اس طرح دو گروہ پیدا ہو جاتے ہیں کرشن 'ندیم' جن کا انداز تحریر شاعرانہ ہے۔ دوسرے احمد علی 'منٹو۔

ندیم۔ مجھے احمد علی اور منٹو میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔ مثلاً احمد علی کے "ہماری گلی" اور "قید خانہ" میں بڑی مجرد قسم کی انفرادیت ہے۔

وقار عظیم۔ لیکن ان سب نے ایک محدود دائرے میں رہ کر یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ بین الاقوامی حالات کا اثر ہمارے ماحول پر کیا ہے۔ خصوصاً منٹو اور کرشن نے ___ یہ بات پہلے نہیں تھی۔

عبادت۔ احمد علی اور حیات اللہ انصاری کی حقیقت نگاری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

وقار عظیم۔ وہ ایک خاص ماحول سے باہر نہیں نکلتے 'عصمت بھی ایک خاص ماحول کی عکاسی کرتی ہیں ___ وہ ماحول جس کی تفصیلات کا انہیں اچھی طرح علم ہے۔

عبادت۔ لیکن منٹو اور ندیم کے ابتدائی افسانوں میں بین الاقوامی حالات اور سیاسی شعور کا کوئی گہرا اثر نہیں ہے۔

وقار عظیم۔ یہ ممکن ہے۔ ندیم کے انداز بیان میں شعریت گھلی ملی ہے اور وہ دیہاتی فضا کو سیدھے سادے رنگ میں پیش کرتے ہیں لیکن جہاں وہ سپاہی کا ذکر کرتے ہیں وہاں اسیر جنگ کے اثرات ضرور واضح ہیں۔

ندیم۔ سوال یہ ہے کہ منٹو کے ابتدائی افسانوں میں بھی جو وسعت اور بین الاقوامیت کی فضا ہے اس کا وجود کیسے ہوا۔ ان کے فن کے ابتدائی زمانہ میں موضوع اور مواد کے اعتبار سے وسعت کیسے پیدا ہوئی؟

منٹو۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو افسانہ نگار سمجھا ہے 'میں نے بہت سے تجربے کئے ہیں جن میں سے کچھ میں تو ناکام رہا ہوں اور کچھ میں کامیاب ___

ندیم۔ میرے خیال میں اس کی کچھ مادی وجوہ بھی ہیں۔ مثلاً مطالعہ ___ مغربی افسانوں کے تراجم ___ وغیرہ۔

عبادت۔ / اصل بات تو یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کے متنوع پہلوؤں سے قریبی تعلق بھی رکھا ہے اور ان میں گھل مل کر انہیں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ یہی زندگی سے قربت ہے اور اس کی ترجمانی کا سبب بھی یہی ہو سکتا ہے۔

منٹو۔ لیکن میں زندگی کو جیسے دیکھتا ہوں اس کا ویسا اظہار نہیں کرتا بلکہ میں زندگی کو جیسے دیکھنا چاہتا ہوں اس کا اظہار کرتا ہوں ___ اور یہی آرٹسٹ کا نقطہ نظر ہونا چاہئے۔ میں نے اپنے افسانے "خوشیا" میں ایک بھڑوے کی کہانی لکھی ہے۔ اشک نے کہا بھڑوا ایسا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے جواب دیا کہ ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ لیکن یہ ضرور ممکن ہے کہ اسے پڑھنے کے بعد تم بھڑوے بن جاؤ ___ یا یہ بھی ممکن ہے کہ بھڑوا میں ہی ہوں ___

افسانہ نگار کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ ایک چیز لکھے اور وہی آپ کو زندگی میں بھی مل جائے ___ وہ ہر کمی کو Fill - up کرتا چلا جاتا ہے۔

وقار عظیم۔ اب تک ہم نے اپنے افسانہ کے ارتقا کی ان ابتدائی منازل کا جائزہ لیا ہے جن سے اردو افسانہ گزرا ہے اس وقت تک بعض رجحانات واضح طور پر نمایاں ہو چکے تھے مثلاً واقعیت کی طرف توجہ 'اور یہ چیز سب سے پہلے پریم چند نے شروع کی۔ پریم چند کے اثر سے لکھنے والوں نے اس اسلوب کو اپنایا ___ اس کی مثالیں ہمیں اعظم کریوی' علی عباس حسینی' اور پھر احمد ندیم قاسمی کے ابتدائی افسانوں میں نمایاں طور پر ملتی ہیں۔

اس کے علاوہ انہی میں کچھ لوگ ایسے ہوئے جنہوں نے دیہات کو چھوڑ کر شہروں کو اپنا موضوع بنایا۔ مثلاً حامد اللہ افسر اور راشد الخیری وغیرہ لیکن ان میں سب سے نمایاں نام عظیم بیگ چغتائی کا ہے۔ ان سب افسانہ نگاروں کے یہاں ہمیں زندگی سے گہرا رابطہ نظر آتا ہے۔

دوسرا گروہ سجاد حیدر یلدرم اور ان کے متبعین کا ہے' ان کے افسانے زندگی سے متعلق ضرور ہیں لیکن زیادہ تر رومانی کیفیات کے ترجمان ہیں ___ مثلاً حجاب امتیاز علی اور ل۔احمد اکبر آبادی۔ یہ زندگی اور رومان دونوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔

بعض لوگ ان دونوں گروہوں سے متاثر ہوئے۔ مثلاً سدرشن کے ہاں پریم چند اور یلدرم دونوں کا اثر ہے۔

تیسرا گروہ جو ان سے الگ ہے ترجمہ کرنے والوں کا ہے ان لوگوں نے رومانی رجحان کو دور کرنے کی کوشش کی یہ زندگی کو فن کے ساتھ لے چلنے کے قائل تھے۔ مثلاً خواجہ منظور (ان کا کوئی مجموعہ نہیں چھپا) اس اثر کے تحت بعض لوگوں نے موپاساں کے اور بعض نے چینی افسانوں کے ترجمے کئے ___ ان میں مولانا ظفر علی خاں، منٹو' حامد علی خاں' منصور احمد جیسے لوگ شامل ہیں۔

اس طرح یہ بات واضح ہوتی ہے کہ موجودہ روایت پر پریم چند کی روایت، یلدرم کی روایت اور ترجمے کرنے والوں کا انداز تحریر کی طرح پر اثر انداز ہوا۔

پریم چند اور یلدرم کے بعد والے دور میں اعظم کریوی اور علی عباس حسینی کے نام بہت نمایاں ہیں اس لئے ہمیں انہی سے بحث کا آغاز کرنا چاہئے۔

عبادت۔ علی عباس حسینی اور اعظم کریوی نے پریم چند کے انداز کو اپنایا ہے۔ لیکن حسینی کے افسانوں میں انسانی نفسیات کے نمونے بھی ملتے ہیں۔

وقار عظیم۔ پریم چند اور حسینی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پریم چند کا نقطہ نظر سیاسی تھا۔ حسینی کی راہ اس سے مختلف ہے۔

عبادت۔ اسی طرح اعظم کریوی کے ہاں زندگی کی ترجمانی میں نفسیات کی گہرائی شامل نہیں۔ ان کے پاس ایک سیدھا سادہ بیان ہے۔

حمید اختر۔ پریم چند کا انداز فکر ایک خاص قسم کا تھا۔ حسینی کے یہاں بعض اور چیزیں بھی ملتی ہیں مثلاً محبت کی Frustration اور ازدواجی زندگی کی ناکامی۔

عبادت۔ حسینی نے وقت کے بدلتے ہوئے رجحانات کا ساتھ دیا ہے۔ موجودہ دور میں بھی وہ افسانے لکھ رہے ہیں اور آج کے مسائل کو برتنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں خالص رومانی نقطہ نظر کے علاوہ واقعیت اور حقیقت نگاری کے رجحان نمایاں ہیں۔ ان کے افسانوں میں جو شدت ہے (گو یہ بعد میں پیدا ہوئی ہے) سیاسی نہیں لیکن اس میں سماجی درد اور کسک ضرور ہے۔

وقار عظیم۔ ایک چیز اور بھی ہے اور وہ یہ کہ پریم چند نے اپنے فن کے ہر دور میں راہ نما کی حیثیت قائم رکھی۔ علی عباس حسینی اپنا نہیں کر سکے۔ لیکن یہ بات بھی بڑی اہم ہے کہ وہ ہر صف کا ساتھ دیتے رہے۔

عبادت۔ ایک بات اور علی عباس حسینی کے ہاں یہ محسوس ہوتی ہے کہ ان کے پاس زندگی کے بارے میں کوئی بہت واضح اور قطعی نقطہ نظر نہیں ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ ایک طرح کے انسانیت پرست (Humanist) اور اصلاح پسند ہیں۔

وقار عظیم۔ اصل میں ان کی نظر ان مسائل پر ہے جو بالکل ان سے قریب ہیں۔ وہ یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ ان حالات کے پیچھے کیا حقائق کام کر رہے ہیں۔

عبادت۔ حسینی صاحب کو میں ذاتی طور پر بھی جانتا ہوں۔ وہ چونکہ سرکاری ملازم رہے ہیں اس لئے کوئی ایسی بات نہیں کہہ سکے جو قابل گرفت ہو۔ شاید اسی وجہ سے ان کے افسانوں میں وہ شدت نظر نہیں آتی اور وہ جارحانہ انداز نہیں ملتا جس کی تخلیق انقلابی شعور کے ہاتھوں ہوتی ہے۔

حمید اختر۔ حسینی اور پریم چند میں فنی اعتبار سے بھی بڑا فرق موجود ہے حسینی کے پاس قاری کو ساتھ Move کرنے کی اپیل نہیں ہے پریم چند کے ہاں یہ بات پائی جاتی ہے۔

عبادت۔ حسینی صاحب کے بعض افسانے ہیئت اور تکنیک کے اعتبار سے بڑے مکمل ہیں مثلاً "انسپکٹر کی عید" بڑا اثر انگیز افسانہ ہے اور اس طرح کے بہت سے افسانے انہوں نے لکھے ہیں۔

ندیم۔ یہی بات "میلہ گھومنی" میں ہے۔

وقار عظیم۔ ایک اور افسانہ "رفیق تنہائی" بھی مجھے پسند ہے۔ غالباً اردو میں جانوروں کے بارے میں بالکل نئی چیز ہے۔ میں بیان' ادبیت اور شعریت ہے۔ اس کے مقابلے میں پریم چند فن کے معاملہ میں شروع شروع میں بڑے لاپرواہ ہیں۔ پھر انہیں بیان پر بھی اتنی قدرت نہیں تھی۔ اس معاملے میں علی عباس ان سے بہت آگے ہیں۔

عبادت۔ حسینی صاحب کو ہیئت پر پوری قدرت ہے۔ وہ تکنیک اور دوسرے فنی لوازمات کو سمجھتے ہیں اور میرے خیال میں تو وہ ایک باشعور لکھنے والے ہیں۔ شاید اس کی وجہ ان کا گہرا مطالعہ ہے۔ اسی مطالعہ نے انہیں افسانے کا نقاد بھی بنا دیا ہے۔ مغربی افسانے کی روایات کو اسی وجہ سے وہ پوری طرح سمجھتے ہیں اس کا اثر ان کے افسانوں کی تکنیک میں بھی جھلکتا ہے۔

وقار عظیم۔ حسینی صاحب کو ہر پرانی چیز سے محبت ہے لو انہوں نے زندگی کے آداب اور آپس کے تعلقات کو افسانوں میں بڑی خوبی سے نبھایا ہے۔

عبادت۔ ایک اور بات یہ ہے کہ ساری تکنیک کو سمجھنے کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے وہ ہر ایک کی بات سنتے اور مانتے ہیں۔ تکنیک کے تنوع کا جو شعور ان کے ہاں ملتا ہے وہ اسی صورت حال کا نتیجہ ہے۔

وقار عظیم۔ اس وقت فن کا واضح شعور لکھنے والوں میں پیدا ہوا تھا اور اس وقت افراد کی طرف توجہ شروع ہو گئی تھی۔

عبادت۔ حسینی صاحب کے ساتھ ہی دوسرا نام اعظم کریوی کا آتا ہے۔ ہمیں ان کے فن کا بھی جائزہ لینا چاہئے۔

وقار عظیم۔ ان کے افسانوں میں رومانی کیفیت زیادہ غالب ہے۔ مثلاً وہ دیہات کے متعلق لکھتے ہیں تو انہیں زیادہ کشش اس چیز میں معلوم ہوتی ہے کہ ساون میں عورتیں کیا لباس پہنتی ہیں۔ کون سے گانے گاتی ہیں' وغیرہ۔

ندیم۔ انہوں نے تاریخی کہانیاں بھی لکھی ہیں۔

وقار عظیم۔ اس کی وجہ پریم چند کا اثر ہے۔

عبادت۔ اعظم کریوی کے ہاں فن کے ارتقاء کا پتہ نہیں چلتا۔ وہ زندگی کو جس طرح دیکھتے ہیں اسی طرح بیان کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک فطرت نگار Naturalist کہے جا سکتے ہیں۔

حمید اختر۔ زندگی کے بارے میں پریم چند کا جو نقطہ نظر ہے وہ حسینی کے پاس ہے نہ اعظم کریوی کے پاس۔ پریم چند تو اکثر اوقات انقلابی مصنفین کی طرح لکھتے ہیں۔

وقار عظیم۔ اور یہ چیز نئے لکھنے والوں کو روایت کی طرح ورثہ میں ملی ہے۔ پھر نئے لکھنے والوں کو مغربی ادب سے بڑا تعلق ہے۔ مثلاً احمد علی اور کرشن چندر کے افسانوں میں مشرقی روایت اور مغربی ادب دونوں کا نمایاں اثر نظر آتا ہے۔

عبادت۔ اس دور کے لکھنے والوں میں ہم نے ابھی تک عظیم بیگ چغتائی کا مرتبہ معین نہیں کیا۔ حالانکہ اردو افسانے کو جذباتی رومانیت سے نکالنے اور حقیقت و واقعیت سے ہم کنار کرنے میں وہ بہت نمایاں رہے ہیں۔

حمید اختر۔ چغتائی نے افسانوں میں سے رومانیت پسندی کو کم کیا ہے۔

وقار عظیم۔ ایک خاص بات جو طرز بیان سے متعلق ہے اور ہمارے ہاں ہمیشہ سے بڑی اہم روایت رہی ہے' یہ ہے کہ کہانی کو کہانی سمجھنا چاہئے اس روایت کو نئے دور میں عظیم بیگ نے زندہ کیا ہے۔

عبادت۔ مجموعی طور پر ان کے پاس مختصر افسانہ کے فنی لوازم پوری طرح نہیں ہیں۔ ان کے بیشتر افسانے بہت واضح ہیں۔ ان میں وحدت تاثر کا احساس بھی کم ہوتا ہے لیکن سماجی حالات کی ترجمانی میں انہوں نے اپنے طنزیہ انداز سے جو ایک جارحانہ انداز پیدا کیا ہے وہ بالکل نیا ہے اور اس نے اردو افسانے میں نئی راہیں کھولی ہیں۔

وقار عظیم۔ [illegible] ہم انہیں فن کار کی حیثیت سے بڑا افسانہ نگار نہیں سمجھتے لیکن عظیم بیگ کا یہ بڑا احسان ہے کہ انہوں نے لکھنے والوں کو محض اصلاح کے راستے سے ہٹا کر نئے طریقے سے سوچنے کا اسلوب دیا۔ بعد کے افسانہ نگاروں کے ہاں ظرافت اور طنز کا یہ جو عنصر ہے وہ چغتائی کے اثر کا نتیجہ ہے۔

عبادت۔ اس کا مطلب یہ نکلا کہ عظیم بیگ کے اثرات دانستہ یا نادانستہ طور پر ہمارے نئے لکھنے والوں پر نمایاں ہیں۔ عظیم بیگ کے بعد جو نئے افسانہ نگار آئے وہ سب کے سب کسی نہ کسی حد تک چغتائی کی فن کاری کے جارحانہ انداز سے متاثر نظر آتے ہیں۔

وقار عظیم۔ اب ہمیں بات کو آگے بڑھانا چاہئے۔

عبادت۔ جی ہاں' اب تو ہمیں منٹو' عصمت' بیدی' ملک' کرشن چندر' احمد علی اور حیات اللہ انصاری میں سے ہر ایک کی خصوصیات کے ساتھ یہ دیکھنا چاہئے کہ انہوں نے نئے تجربوں سے ہماری روایت میں کیا اضافے کئے۔ مثلاً سب سے پہلے منٹو کو لیجئے۔ ان کے یہاں موضوعات میں تنوع ہے لیکن اس کے باوجود وہ صرف دو تین موضوعات پر پوری طرح حاوی ہیں۔ دوسرے موضوعات میں وہ شدت نہیں۔

مثلاً طوائف کی زندگی کی انہوں نے ایسی جزئیات پیش کی ہیں جن سے گھن آتی ہے اور یہ ایک سماجی خدمت ہے لیکن بعض جگہ جنسی موضوعات پر لکھتے لکھتے وہ بھٹک گئے ہیں۔ مثلاً ٹھنڈا گوشت

وقار عظیم۔ یہ بعد کا ہے اس لئے ابھی اس کا ذکر بے محل ہے۔

ندیم۔ میرے خیال میں ان کی تخلیقات اتنی ہیں کہ انہیں بھی دو ادوار میں تقسیم کر لیا جائے تو بہتر ہے۔

حمید اختر۔ اختر حسین رائے پوری کس دور میں آتے ہیں؟

وقار عظیم۔ وہ عبوری دور سے تعلق رکھتے ہیں۔

عبادت۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا کوئی بڑا مرتبہ نہیں۔ ان کے بیشتر افسانے یا تو ترجمے ہیں یا مغربی افسانوں سے ماخوذ ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے افسانوں میں ایک رومانی سی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اس سے قبل بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ انہوں نے اس میں کوئی جدت نہیں کی۔

ہاجرہ مسرور۔ میرزا ادیب کس دور میں رکھے جائیں گے؟

وقار عظیم۔ ان کا انداز یلدرم اور حجاب امتیاز علی کا ہے۔ ان میں ایسی رومانیت ہے جو کھوکھلی ہے بلکہ اس رومانیت کو بھی آگے لے

بیشتر افسانے چھپ گئے ہیں۔

ہاجرہ مسرور۔ کرشن چندر کے کون سے افسانے ہیں جن میں ارتقا ملتا ہے؟

عبادت۔ ابھی ہم ان کا ذکر نہیں کر رہے ہیں۔

انتظار حسین۔ میرے خیال میں منٹو صاحب اور قاسمی صاحب کے تقسیم کے بعد کے افسانوں پر ہمیں الگ بحث کرنی ہو گی۔

ندیم۔ انتظار صاحب کی بات ٹھیک ہے۔ تقسیم کے بعد لکھنے والوں میں بعض بڑی نمایاں تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس لئے پہلے یہ متعین کر لینا چاہئے کہ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۵ء تک افسانے میں کیا تجربے ہوئے اور اس وقت روایت نے کیا شکل اختیار کی تھی۔

عبادت۔ ۱۹۴۷ء کے بعد جو کچھ ہوا اس کا جائزہ بعد میں لیں گے۔ اس وقت تو صرف یہ دیکھنا چاہئے کہ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۵ء کے درمیان اردو افسانہ کن منزلوں سے گزرا اور اس میں کون کون سے تجربے ہوئے؟ (ہاجرہ مسرور سے مخاطب ہو کر) آپ کی منٹو کے بارے میں کیا رائے ہے؟

ہاجرہ مسرور۔ آپ حضرات فرمائیں۔ مجھے تو ان کے بارے میں سوچتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔

وقار عظیم۔ مجھے منٹو کی تکنیک میں جو چیز شروع سے کھٹکتی ہے وہ یہ کہ وہ ہمارے سیاسی اور سماجی عقائد اور ہماری اخلاقی قدروں کے خلاف ایسی بات کہنا چاہتے ہیں جو پڑھنے والے کو Shock دے۔ وہ نئی بات کے بجائے غیر متوقع بات کہتے ہیں اور چونکہ آدمی ذہین ہیں اس لئے وہ بات پیدا بھی کر لیتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ بات اتنی غیر متوقع ہوتی ہے کہ پڑھنے والے کا ذہن اس سے بغاوت کرتا ہے۔

انتظار حسین۔ ان کی تخلیق کا تصور یہ ہے کہ جو چیز ہے اسے کہا جائے کہ نہیں ہے ___ یہ رویہ تخلیق کے لئے بہت مہلک ہے چیزوں سے انکار کرنے سے بات نہیں بنتی۔

ندیم۔ وہ Fantasy اور جھوٹ دونوں کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔

حمید اختر۔ یہاں تک کہ اب ان کا مقصد صرف چڑھانا رہ گیا ہے شروع کے افسانوں میں یہ بات نہیں ہے۔ پہلے انہوں نے بڑے پیارے سے رومانی افسانے بھی لکھے ہیں۔ یہ چیز انہوں نے آہستہ آہستہ Develop کی ہے۔

وقار عظیم۔ یہاں مجھے ایک لطیفہ یاد آیا ___ ایک دن منٹو اور اشک اپنے اپنے فن پر بحث کر رہے تھے۔ ایک صاحب ثالث نے اور انہوں نے بتایا کہ یوں تو دونوں میز پر رکھی ہوئی دیا سلائی کے متعلق لکھتے ہیں۔ لیکن اشک کی نظر دیا سلائی پر سیدھی جاتی ہے اور منٹو میز کے نیچے سے نظر گھما کر دیا سلائی کو دیکھتا اور اس پر لکھتا ہے۔ اصل میں منٹو پڑھنے والے کو حیرت زدہ کرنا چاہتا ہے۔

حمید اختر۔ یہ بات کبھی بہت بڑی ہو جاتی ہے اور کبھی کچھ نہیں رہتی۔

عبادت۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ منٹو کے ہاں زندگی کی کشمکش کا کوئی صحیح اور واضح شعور نہیں۔

ندیم۔ میرے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ شدید قسم کے انفرادیت پسند ہیں اور ایسے شخص میں حسد، ضد اور جھنجلاہٹ ہوتی ہے۔ انہوں نے ہمیشہ ضد میں لکھا ہے اور مقدمے چلائے جانے کی وجہ سے لکھا ہے اور کہتے ہیں کہ تم اگر "کالی شلوار" سے چڑتے ہو تو میں تمہیں "دھواں" لکھ کر پریشان کروں گا۔

وقار عظیم۔ انہوں نے یہ محسوس نہیں کیا کہ زندگی طرح طرح کی الجھنوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ انہیں گرد و پیش کی زندگی کا صحیح احساس نہیں ہے۔ وہ فرد سے آگے بڑھ کر سوچنا نہیں چاہتے۔

عبادت۔ ان کے افسانوں میں دو چیزیں خاص طور سے نمایاں ہیں۔ ایک تو افراد کی مصوری دوسرے سماج کے بعض خاص پہلوؤں کا ذکر۔ لیکن ایسے نقطہ نظر سے جس کے اندر زندگی کا کوئی طبقاتی اور تجزیاتی شعور نہیں ہے۔ اسی وجہ سے ان کے افسانوں میں ایک ایسی حقیقت نگاری ملتی ہے جس میں فوٹوگرافی نظر آتی ہے مصوری نہیں۔

وقار عظیم۔ یہ رجحان اس دور میں عام ہے کہ کردار کی ذہنی کیفیت اور جزئیات کے ذریعے فضا پیدا کی جائے مثلاً اشک خاصی تفصیل سے لکھتے ہیں اور افسانے کو خوبی کے ساتھ ختم کر دیتے ہیں۔ منٹو ماحول سے پوری طرح واقف ہیں اور ان جزئیات سے وہ خاص چیزیں نکال لیتے ہیں جو قاری کو متاثر کرتی ہیں۔

ہاجرہ مسرور۔ آخر وہ قاری کو تاثر کیا دیتے ہیں؟

عبادت۔ انسانی زندگی کی بدحالی اور سماجی مذمومات کا تاثر۔ ان کے افسانوں میں بڑا گہرا اثر ہوتا ہے ___ مثلاً طوائف کی زندگی کا دوسرا رُخ ___ اس سے قبل تو طوائف کو صرف تعیش کے زاویے سے دیکھا جاتا تھا۔ منٹو اس کے انسانی پہلو کو پیش کرتے ہیں اور اس سے پڑھنے والے کو نفرت نہیں پیدا ہوتی۔ بلکہ ہمدردی کا جذبہ جاگتا ہے اور یہ صورت حال اسے ایک غلط سماجی نظام کی پیداوار

نظر آتی ہے۔

وقار عظیم۔ یہ سارے دور کی کیفیت ہے۔ اس میں دو طبقے ہیں Exploiter اور Exploited طوائف اول اول ایک مظلوم کی حیثیت سے پیش کی گئی ہے۔

حمید اختر۔ آپ د ۔ سال کا عرصہ ملا رہے ہیں۔ ان کے ابتدائی افسانوں کے پڑھنے سے جو ہمدردی کا اظہار ہوتا ہے۔ Convincing ہے لیکن آخری کہانیوں میں صد وغیرہ کی وجہ سے گھن پیدا ہوتی ہے۔

عبادت۔ گھن پیدا کرنا مقصد برآری ہے۔ یہاں منٹو مقصدی ہو جاتا ہے۔ یہ اس کا بڑا Contribution ہے۔ اگر اس سماجی شعور کے ساتھ طبقاتی احساس بھی پیدا ہو جاتا تو وہ اس دور کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہوتا۔ لیکن وہ ان مسائل کا کوئی حل نہیں پیش کر سکا۔ وہ اس کا شعور بھی پوری طرح نہیں رکھتا یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں ان مسائل پر جھلاہٹ تو ہے لیکن سائنٹیفک زاویہ نظر نہیں ہے۔

حمید اختر۔ منٹو گندگی کو اُچھالتے ہیں لیکن اس کا کوئی مداوا نہیں پیش کرتے۔

وقار عظیم۔ ان کا تعلق موضوع کے ساتھ جذباتی نہیں ذہنی ہے۔

شوکت تھانوی۔ کیا ان کے افسانوں کو پڑھ کر یہ تاثر نہیں ہوتا کہ ایک سرجن نے آپریشن کر کے چھوڑ دیا ہے۔ مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ نگار بیدرد ہو گیا ہے۔

عبادت۔ یہ تو ان کی بڑائی ہے اس طرح وہ پڑھنے والے کو اپنی طرف زیادہ متوجہ کرتے ہیں اور اس سے ان کا مقصد بھی پورا ہوتا ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ طوائف کے بارے میں تو ہوا لیکن "بو" اور اسی قبیل کے دوسرے افسانوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟

وقار عظیم۔ یہ ایک ذہنی تفتیش اور بے بسی کی نشانی ہے۔

ندیم۔ ان کی کہانی "پھاہا" کیا اس صف میں آتی ہے؟

انتظار حسین۔ "پھاہا" ان کا ابتدائی افسانہ ہے اور اس کے رجحان کی مذمت نہیں کی جا سکتی۔

عبادت۔ اس طرح اندازہ ہوتا ہے کہ منٹو کا فن دو رجحانات کا حامل ہے ایک ر[illegible] ہے جس میں سماجی مذموعات کا بیان ہے لیکن ذہنی تفتیش [illegible] دوسرا [illegible] جس کی نوعیت نفسیاتی ہے اور جس میں وہ جنسی [illegible] کرتے ہیں ___ دوسرے رجحان میں صحت مندانہ کیفیت نہیں ہے۔

وقار عظیم۔ یہ چیزیں شروع میں ہیں لیکن آگے چل کر ختم ہو جاتی ہیں۔

عبادت۔ منٹو صاحب "ٹھنڈا گوشت" تو [illegible] لکھتے تو یہ ان کی بڑائی ہوتی۔

ہاجرہ مسرور۔ یہ تو تقسیم کے بعد کا افسانہ ہے۔

وقار عظیم۔ ایک بات منٹو میں مستقل ہے۔ وہ یہ کہ انہوں نے افسانے کو پیش اس طرح کیا ہے کہ ہر جگہ فن کے لوازمات کا خیال رکھا ہے۔ تکنیک کی پابندی، افسانہ کے مختلف اجزاء کا ربط، اور مجموعی تاثر، ہر منزل پر اس کا احساس ان کے ہاں ملتا ہے فن کے لحاظ سے یہ بڑی کامیابی ہے۔

انتظار حسین۔ مختصر افسانے کی تکنیک پر منٹو پوری طرح حاوی ہیں لیکن ادب محض تکنیک بھی تو نہیں اس سے باہر نکل کر دیکھیں تو ان کے افسانوں کو اتنی وقعت نہیں رہتی۔

وقار عظیم۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اچھی فنی تخلیق کے لئے جس انہماک، کاوش اور جدوجہد کی ضرورت ہوتی ہے وہ منٹو کے پاس نہیں ہے۔

محمد طفیل۔ اب تو وہ کہتے ہیں کہ آپ ایک فقرہ لکھ دیجئے میں افسانہ آگے چلا کر مکمل کر دوں گا۔ اس طرح ایک افسانہ تو لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن فن کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔

عبادت۔ ہاں وہ ایسا کر سکتے ہیں۔ انہیں زندگی کا بڑا گہرا تجربہ ہے وہ خود کہتے ہیں کہ میری زندگی میں افسانے بکھرے پڑے ہیں۔ یہ خود اعتمادی زندگی کے وسیع تجربے ہی کا نتیجہ ہے۔

ندیم۔ اس دور کے افسانوں کے تین Contribution ہیں۔

۱۔ اچھوتے موضوعات کو فن کا موضوع بنانا۔

۲۔ افسانے کی تکنیک

۳۔ سلاست بیان

میں منٹو کے ساتھ بیدی کو بھی اس زمرے میں رکھتا ہوں۔

وقار عظیم۔ بیدی بعض حیثیتوں سے منٹو سے آگے ہے۔ بیدی فن کار کی حیثیت سے لغزش کرنا گناہ سمجھتا ہے۔

انتظار حسین۔ ایک اور فرق بھی ہے، منٹو نے روسی افسانوں سے زیادہ اثر نہیں لیا، امریکی افسانوں سے لیا ہے۔ مثلاً O Henry بیدی نے روسی افسانوں سے اثر لیا ہے۔ روسی افسانہ امریکی افسانے

[illegible] ہے اسی طرح بیدی کی ادبی وقعت [illegible]
[illegible]
[illegible] اس وقت زندگی کے حقائق کا سامنا بھی ہوا ہے [illegible] ایسا نہیں ہوتا۔ اگر وہ سماجی نظام کو سمجھتے اور اس کی [illegible] ہوتی تو شاید وہ ایسا کر سکتے۔

وقار عظیم۔ یہ تو وہی ضد والی بات ہے۔

[illegible]۔ لوگ بیدی کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں حالانکہ وہ بہت بڑے افسانہ نگار ہیں۔

وقار عظیم۔ نہیں صاحب یہ نہ کہئے کم از کم میں نے تو مختلف وقتوں میں جتنی ان کی تعریف کی ہے کسی مسلمان نے کسی سکھ کی کم ہی کی ہوگی۔

(قہقہہ)

عبادت۔ ایم اسلم کا بھی افسانہ میں کوئی مقام ہے یا نہیں۔

انتظار حسین۔ اس کا مطلب ہے کہ ہم آگے سے پیچھے کی طرف چلیں۔

وقار عظیم۔ اگر ایم اسلم کا ذکر کرنے لگیں تو بہت سے اور لوگوں کا ذکر کرنا ہوگا۔ ایم اسلم اصل میں بنیادی طور پر ناول نگار ہیں۔

محمد طفیل۔ لیکن انہوں نے تقسیم سے پہلے زیادہ تر افسانے لکھے ہیں۔ ناول بعد میں لکھے ہیں۔

شوکت تھانوی۔ صاحب میرے خیال میں تو پارٹیشن کی وجہ بھی ہے۔

(قہقہہ)

عبادت۔ ایم اسلم کے ساتھ یہ بات زیادتی ہے کہ ہم افسانوں میں ان کا ذکر نہیں کرتے۔ ہم ان کے رطب و یابس کو (جو میر کے کلام میں بھی ہے) نکال دیں تو ان کے پاس بھی ایسے افسانے ملیں گے جو تکنیک کے اعتبار سے اور فطرت نگاری کے اعتبار سے اچھے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ بسیار نویس اور زود نویس ہیں اور اسی نے انہیں نقصان پہنچایا ہے۔

انتظار حسین۔ لیکن روایت اور تجربے کی بحث میں ان کا ذکر غالباً بے محل ہے۔

ندیم۔ اگر اردو کی مختصر افسانہ نگاری کا جائزہ مدِ نظر ہوتا تو ایم اسلم کا نام ضرور ہوتا لیکن روایت اور تجربے کے سلسلہ میں ان کا ذکر برمحل نہیں۔

وقار عظیم۔ انہوں نے ایسے وقت کہ روایت بہت آگے بڑھ چکی ہے پرانی روایت کو برتا اس لئے آج کی گفتگو میں ان کا تذکرہ بے محل ہے۔

شوکت تھانوی۔ ان کی حیثیت اس گھڑی کی ہے جو پچھلی صدی میں بند ہو گئی۔

(قہقہہ)

محمد طفیل۔ عبادت صاحب اس بند گھڑی کو پھر چالو کرنے کی کوشش میں ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تحریری گناہ بخشوائے جا رہے ہیں۔

وقار عظیم۔ میرے خیال میں اب ہمیں بیدی کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔ مجھے خود بیدی اتنا پسند ہے کہ اگر میں اردو کے پانچ چھ افسانوں کا انتخاب کروں تو اس میں بیدی کا افسانہ ضرور آئے گا۔ ان کے پاس بڑی تعداد ایسے افسانوں کی ہے جنہیں عظیم کہا جا سکتا ہے۔

عبادت۔ وہ ہمارے اندر گھل مل کر ہماری جذباتی اور ذہنی الجھنوں کی اعلیٰ درجہ کی تصویریں پیش کرتا ہے۔ اس کے پاس انقلابی رجحان نہیں ہے۔ لیکن وہ ان چھوٹے چھوٹے موضوعات کو لیتا ہے جنہیں ہم نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس کے افسانوں میں Human Touch بھی بہت شدید ہے۔

وقار عظیم۔ اس کے یہاں فنی اعتبار سے بڑی بلندی ہے۔ منٹو تخیل اور فکر کو موضوع میں رچاتا نہیں، یہ چیز بیدی کے یہاں بدرجہ اتم ہے۔ وہ اس غور و فکر کے ساتھ دل نشین زاویے اور شکلیں پیش کرتا ہے کہ صرف بیان کی قدرت کے علاوہ اس کے پاس کوئی خامی نظر نہیں آتی۔

عبادت۔ اس کے پاس نکھرا ہوا انداز اور ترشا ہوا فن ہے۔ بیان پر قدرت نہ ہونے کے باوجود وہ اپنے موضوع میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موضوع کو مختصر افسانے کے سانچے میں ڈھالنا اس کے لئے مشکل نہیں ہوتا۔

خدیجہ مستور۔ بیدی کا فن یہ ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹا موضوع اس چابکدستی اور گہرائی سے پیش کرتا ہے کہ قاری چونک اٹھتا ہے۔

وقار عظیم۔ مجیب صاحب جو روسی ادب کے بہت اچھے طالب علم اور افسانہ نگار بھی ہیں، جب بیدی کے افسانوں کا مجموعہ "دانہ و دام" چھپا تو بغل میں دبائے پھرتے تھے اور کہتے تھے کہ میں نے آج تک اردو میں اتنا اچھا مجموعہ نہیں دیکھا۔ روسی افسانہ نگاروں کا جتنا گہرا اثر بیدی کے ہاں ہے اور کسی کے یہاں نہیں۔

انتظار حسین۔ اس کے لہجے کی آہنگی بہت متاثر کرتی ہے۔ منٹو کا افسانہ پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نقارہ بج رہا ہے۔ بیدی کے افسانے میں عام اپیل کم ہے اور منجھے ہوئے ادبی ذوق کی ضرورت زیادہ ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ یہ عجیب بات ہے کہ بیدی سے زیادہ مقبولیت کرشن چندر نے حاصل کی۔

خدیجہ مستور۔ یوں تو ایم اسلم کرشن چندر سے زیادہ مقبول ہے۔

انتظار حسین۔ کرشن چندر اور منٹو کا انداز ایک سا ہے وہ عام قاری کو زیادہ متاثر کر سکتے ہیں۔

عبادت۔ بیدی کے مقابلے میں کرشن چندر کی مقبولیت کا سبب اور بھی ہے۔ اگرچہ بیدی کا انداز اور لہجہ کی آہنگی صحیح ہے لیکن گہرے سماجی روابط کا شعور بیدی کو کم ہے۔ ان کے ہاں زندگی کی عکاسی ضرور ہے لیکن زندگی کی تنقید کم۔ کرشن چندر کے یہاں باوجود رومانیت کے یہ شعور زیادہ ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ سوال یہ ہے کہ کیا مختصر افسانہ زندگی پر تنقید ہے؟

حمید اختر۔ ایک چیز اور بھی ہے کہ کرشن چندر اور منٹو نے بیدی سے بہت زیادہ لکھا ہے۔

عبادت۔ یہ تو ایم اسلم کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے۔

انتظار حسین۔ "یہ سماجی روابط کے شعور" کا فقرہ ذرا گمراہ کن ہے۔ بیدی کے پاس سماجی روابط کا تانا بانا زیادہ مضبوط ہے۔

حمید اختر۔ کرشن چندر واضح بات کرتا ہے جس سے تھوڑا پڑھے ہوئے بھی متاثر ہو جاتے ہیں اس طرح اس کے قارئین کا حلقہ بڑھ جاتا ہے اعلیٰ ادبی ذوق والے کم ہیں جو بیدی سے متاثر ہو سکیں۔

عبادت۔ بیدی کے ہاں انداز بیان میں الجھن ہے اور ان کے افسانوں میں زیادہ حرکت نہیں ہے بلکہ ایک ست روی ہے۔ یہ حرکت کرشن چندر کے یہاں بہت زیادہ ہے اس لئے اس کے افسانوں کا اثر بیدی کے مقابلے میں گہرا ہوتا ہے۔

انتظار حسین۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی — او ہنری بڑا سادہ [illegible] ہے چیخوف نہیں ہے۔ لیکن چیخوف زیادہ بڑا فن کار ہے۔

عبادت۔ [illegible] اور روانی تاثر کو گہرا کرتی ہے۔ بیدی کے افسانوں کی مقبولیت میں [illegible] اور روانی کی یہ کمی حائل نظر آتی ہے۔

وقار عظیم۔ اس کے [illegible] بیان کی قدرت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔

انتظار حسین۔ کرشن چندر کے ہاں صحافتی انداز پیدا ہو گیا ہے اس لئے وہ قاری [illegible] کر دلچسپی لے لیتا ہے۔

عبادت۔ یہ بات [illegible] کرشن چندر کے پاس بڑا خوب صورت انداز بیان ہے۔ اس انداز سے [illegible] اور کرشن چندر کے علاوہ اردو کے باقی تمام افسانہ نگاروں سے آگے [illegible] صحافت کو بھی ادب بنا دینے کا جادو ہے۔

وقار عظیم۔ بیدی کے موضوع اتنے [illegible] کرشن چندر کے ہیں۔ لیکن جتنا کچھ انہوں نے لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس مشاہدہ کی گہرائی ضرور ہے۔ کرشن چندر کی مقبولیت میں ان کے طرز بیان اور طرز بیان کی شاعری کو بڑا دخل ہے۔ اس سے قطع نظر بیدی بڑا افسانہ نگار ہے۔

عبادت۔ میرا مطلب ہے کہ بیدی محدود ہو کر سوچتے ہیں ان کے یہاں احساس کی شدت ہوتی ہے لیکن گہرائی نہیں ہوتی۔ وہ جن مسائل کے بارے میں لکھتے ہیں ان کے افسانوں میں ان کا کوئی حل نہیں ملتا۔

وقار عظیم۔ کرشن چندر باتیں زیادہ کہتے ہیں۔ پھیل کر کہتے ہیں۔ گہرائی تو بیدی کے پاس ہے البتہ وسعت نہیں۔ انہوں نے اپنے گرد و پیش کی زندگی کو دیکھا ہے اور اسی کو اتنا کافی سمجھا ہے کہ وہ اور چیزوں کے محتاج نہیں۔ کرشن چندر جس چیز کو سماجی شعور کہتے ہیں وہ کہیں کہیں پروپیگنڈا بن گئی ہے۔

انتظار حسین۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ایک خاص تحریک کی طرف سے اپنے اوپر ایک فرض عائد کر لیا ہے۔

ندیم۔ یوں تو ہر افسانہ نگار نے اپنے اوپر کچھ نہ کچھ فرائض عائد کر لئے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ آواز اس کے دل کی آواز ہے یا خارجی تحریک کا اثر۔

عبادت۔ کرشن چندر کا خلوص اس سے ظاہر ہے کہ وہ رومانی ہے اگر پراپیگنڈسٹ ہوتا تو ایسا نہ ہوتا۔

انتظار حسین۔ یہ بحث ختم کیسے ہوگی؟

شوکت تھانوی۔ مزید بحث سے پہلے مجھے اجازت دیجئے۔

عبادت۔ کچھ اشک کے بارے میں۔

وقار عظیم۔ وہ پریم چند کے مقلد ہیں۔ تفصیلات اور جزئیات میں زیادہ جاتے ہیں۔

خدیجہ مستور۔ ان کے افسانوں میں بڑی ناپختگی ہے۔

وقار عظیم۔ انہیں یہ اندازہ نہیں کہ تفصیلات میں سے کون سی چیزیں منتخب کر کے کام میں لانی چاہئیں۔ One Act Plays وہ اچھے لکھتے ہیں۔

محمد طفیل۔ ایسا لگتا ہے کہ اردو کا کوئی بڑے سے بڑا افسانہ نگار بھی ہوتے کے قابل کھڑا ہوتے ہوئے گھبرائے گا۔

عبادت۔ اس دور کے لکھنے والوں میں تیسرا نام عصمت چغتائی کا ہے ان کے افسانوں میں دو رجحان ملتے ہیں۔ ایک تو جنسی زندگی کے ایسے پہلو جن کی کوئی سماجی اہمیت نہیں مثلاً نوجوان لڑکیوں کے ایسے مسائل جو ذہنی الجھنوں کے پیدا کردہ ہیں اور جن کو پیش کرتے ہوئے کہیں کہیں خالص رومانی اور جذباتی سی فضا بھی پیدا کرتی ہیں۔ دوسرے وہ افسانے جن میں انہوں نے متوسط طبقے کی نوجوان لڑکیوں کے جنسی اور جذباتی مسائل کو موضوع بنانے کی کوشش کی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں رجحانات نے اردو افسانے میں کیا اضافے کئے ہیں۔

وقار عظیم۔ عصمت کا فن اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ صرف ایک عورت ہی اسے پیش کر سکتی ہے۔ عصمت کا بڑا اضافہ یہ ہے کہ انہوں نے ہمیں بتایا کہ عورت کے بھی اپنے مسائل ہیں۔ دوسری بڑی بات سماجی شعور ہے۔ انہوں نے یو۔پی کے متوسط طبقے کے خاندانوں کی زندگی کو قریب سے دیکھا ہے اور اس میں جو پیچیدگی اور گھٹن ہے اسے بڑے لطیف اور نشتر زنی کے انداز میں پیش کیا ہے۔

عبادت۔ لیکن انہوں نے بعض ایسی کہانیاں بھی لکھی ہیں جن میں ایک مستی قسم کی رومانیت پیدا ہو گئی ہے۔

وقار عظیم۔ اس کی وجہ کچھ یہ بھی ہے کہ ان کے مزاج میں تمسخر کا رنگ ہے۔

عبادت۔ اس میں ان کا اپنا جذبہ اور خواہش بھی شریک دکھائی دیتی ہے اور یہ اس معاشرہ کا تمسخر معلوم ہوتا ہے جس نے انہیں گھٹن اور مجبوری میں رکھا۔ لیکن ان باتوں کو موضوع بنانے میں کیا ان پر رشید جہاں کے افسانوں کا اثر نہیں ہے؟

وقار عظیم۔ رشید جہاں اور عصمت میں بڑا فرق یہ ہے کہ رشید جہاں نے ماحول کی عکاسی زیادہ نہیں کی۔

انتظار حسین۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ افسانہ نگار خواتین کا گروپ ممتاز شیریں کو چھوڑ کر یو۔پی میں پیدا ہوا اور یہ بغاوت یو۔پی میں ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ انہیں اپنے معاشرتی ماحول کا پورا احساس ہے۔ ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور اور قرۃ العین اسی کڑی میں آتی ہیں۔

عبادت۔ قرۃ العین حیدر کا مزاج ان سب سے الگ ہے ان کا نام ان کے ساتھ نہ لیجئے۔

انتظار حسین۔ ہاں ان کی کچھ دوسری شکل ہے۔

محمد طفیل۔ بھئی تم کس پھیر میں پڑ گئے یہاں بات شگوفوں کی نہیں افسانوی تخلیقات کی ہو رہی ہے۔

(قہقہہ)

عبادت۔ عصمت چغتائی نے مختصر افسانے کی تکنیک کو اچھی طرح سمجھا اور اسے توازن اور ہم آہنگی سے پیش کیا۔ اس سلسلے میں ان کا اندازِ بیان خاصے کی چیز ہے۔ انہیں زبان پر بڑی قدرت ہے۔ بے ساختگی اور روانی نے ان کی تکنیک پر بڑا اچھا اثر ڈالا ہے۔ وہ تصویریں جو انہوں نے پیش کی ہیں بڑی واضح ہیں۔ ان میں معنویت اور مقصدیت بھی ہے اور وہ بڑی دل آویز اور دل نشین بھی ہیں۔

وقار عظیم۔ ایک اور بات یہ کہ وہ بڑی بے جھجک ہیں۔ انہیں کسی کے عتابِ تعزیر کا خوف نہیں۔

عبادت۔ لیکن ان کی یہ شدت، تیزی، جارحانہ کیفیت اور بیباکی کہیں کہیں حد سے گزر جاتی ہے اور متوازن قسم کے انسان پر اچھا اثر نہیں کرتی۔

وقار عظیم۔ یہ تو عمر کا تقاضا بھی ہوتا ہے۔ سنجیدگی کی کمی توازن کی کمی کا سبب بن جاتی ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ عبادت صاحب نے جو حد سے گزرنے کی بات کی ہے تو میں پوچھنا چاہتی ہوں کہ وہ حدود کیا ہیں؟

وقار عظیم۔ حدود تو کوئی نہیں لیکن لکھنے والے کے پاس ایک مقصد ہوتا ہے۔ اب اگر وہ بیان میں اتنی شدت پیدا کر دے کہ ہمدردی کے بجائے جھنجھلاہٹ پیدا کرنے لگے تو ٹھیک نہیں۔

انتظار حسین۔ غالباً عبادت صاحب کے ذہن میں یو۔پی کا قاری ہے۔

ندیم۔ میرے خیال میں عبادت صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ہر گھرانے اور ملک میں چند سماجی قدریں ہوتی ہیں جن کا توڑنا گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

ہاجرہ مسرور۔ میں نے یہ بات اس لئے کی کہ ہم نے پہلے منٹو پر بحث کی تھی۔ ان کا انداز کہیں زیادہ خطرناک اور پھسلواں ہے۔

عبادت۔ منٹو کا انداز مختلف ہے۔ سماجی مذمومات کے بیان میں ان کی اپنی ذہنی کیفیت شامل نہیں لیکن عصمت کے ہاں ان کی اپنی کیفیت شامل ہو جاتی ہے۔ عصمت کے فن کا مجموعی تصور ہمارے

سامنے ہے اس میں اگرچہ زندگی کی بڑی اچھی عکاسی ہے لیکن کہیں کہیں ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ راستہ سے ہٹ کر ایک والہانہ جوش اور جذبے میں انہوں نے جگہ جگہ ایسی باتیں بھی کہہ دی ہیں جس سے فن کے کارگہ شیشہ گری کو ٹھیس لگتی ہے۔ شاید اس کی وجہ ان کی نوجوانی اور نوجوانی کی ذہنی جذباتی کیفیات ہیں جن کو ایک مخصوص ماحول نے دبا کر ابھرنے کے لئے مجبور کر دیا ہے۔

انتظار حسین۔ یہ بات تو کرشن چندر اور اس دور کے دوسرے لکھنے والوں پر بھی عائد ہو سکتی ہے۔

وقار عظیم۔ بچہ فطری طور پر شرارت پسند ہوتا ہے' آپ اسے روکتے ہیں تو وہ اور راستے ڈھونڈھ لیتا ہے۔ چیخنے سے منع کئے جانے پر وہ دیواریں سیاہ کرنے لگتا ہے۔

عبادت۔ عصمت باشعور انقلابی نہیں ہیں۔ ان کے یہاں ایک باغی کی جھنجھلاہٹ ہے۔ یہ خصوصیت ان کے ہر افسانے میں جھلکتی ہے۔

وقار عظیم۔ بہر حال آپ انہیں روکتے ہیں تو چٹکیاں لینے لگتی ہیں۔

ندیم۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اردو افسانہ کی جوش ملیح آبادی ہیں۔

(قہقہہ)

ہاجرہ مسرور۔ عصمت چغتائی نے جن مسائل پر لکھا ہے ان کے لئے یہ انداز لازمی ہے' مثلاً انہوں نے مردوں کے رانیں کھجانے کا ذکر کیا ہے۔ اب اس کے لئے وہ اور کیا لکھ سکتی ہیں اور یہ بات تہذیب کے دائرے میں کس طرح لائی جا سکتی ہے۔

عبادت۔ اسے جانے دیجئے اور ان کی فقرہ بازی اور چھینٹے اچھالنے کو پیش نظر رکھئے۔

وقار عظیم۔ ان کی فقرہ بازی میں بڑی تلخی محسوس ہوتی ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ اس سلسلے میں "لحاف" کا ذکر ضرور ہونا چاہئے۔ عصمت نے اس میں بنیادی غلطی یہ کی ہے کہ اسے بچے کی زبان سے پیش کیا ہے اسی لئے وہ گھناؤنا سا ہو گیا ہے۔ انداز بیان غلط تھا لیکن موضوع ضروری تھا۔

عبادت۔ اس کا مجموعی تاثر فن کار کی اپنی دلچسپی اس معاملے میں ضرور ظاہر کرتا ہے اور یہ اس افسانے کی سب سے بڑی خامی ہے اور اس کا بنیادی مقصد اس طرح فوت ہو جاتا ہے۔

انتظار حسین۔ میرے خیال میں تو عصمت نے صحیح انداز اختیار کیا۔ [illegible] Narrator [illegible] بات زیادہ گھناؤنی ہوتی۔ یہ Indirect ہے۔ بچے کے بہانے سے [illegible] گئی اور اس میں عریانی نہیں برتی۔

عبادت۔ عریانی بالکل نہ سہی لیکن مجموعی تاثر [illegible] کیفیت کا اظہار نہیں ہو سکا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ [illegible] اس میں خود لذت محسوس کرنے لگتا ہے اور یہ خصوصیت اس افسانے کو خاصا خطرناک بنا دیتی ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ اس میں لذت نہیں محسوس ہوتی۔

ندیم۔ قاری لذت محسوس کرتا ہے۔ اگر وہ بچے کے بجائے بالغ Narrator کے ذریعے پیش کرتیں تو افسانہ کامیاب ہوتا۔

خدیجہ مستور۔ اور جس عورت کے ساتھ یہ واقعات ہو رہے ہیں اس سے ہمیں ہمدردی نہیں ہوتی' افسانے میں گڑبڑ یہ ہے۔ یقین نہیں آتا کہ "چوتھی کا جوڑا" کا افسانہ نگار ایسا افسانہ بھی لکھ سکتا ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ میں نے تو موضوع سے بحث کی تھی۔

عبادت۔ اس افسانے کے موضوع کی اہمیت سے تو کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ خرابی ہماری معاشرت میں موجود ہے کاش عصمت اس اہم موضوع کو اس طرح پیش کرتیں کہ اس کا اثر اس سے نفرت کی صورت میں نمایاں ہوتا لیکن اس افسانے نے تو اس موضوع سے دلچسپی لینے کی ترغیب دی ہے۔ عصمت کا وار اس طرح خالی جاتا ہے۔ وہ خود اس کا شکار ہو جاتی ہیں۔

انتظار حسین۔ احمد ندیم قاسمی کے ذریعے اردو افسانے میں ایک نئی چیز آئی اب تک یو۔پی کے علاقے کی ترجمانی ہوتی تھی لیکن اردو دان حلقہ پنجاب کے کرداروں سے واقف نہیں تھا۔ اب یہ بات اور ہے کہ ندیم صاحب نے اسے Deal کیسے کیا۔ ان میں خامی یہ ہے کہ وہ پنجاب کی فضا پر شاعری کا پردہ ڈال لیتے ہیں۔ وہ حقائق کو رنگین عینک سے دیکھتے ہیں۔

عبادت۔ جس چیز کو انتظار صاحب خامی کہتے ہیں میں اسے ان کے فن کا ضروری جزو سمجھتا ہوں۔ یو۔پی اور پنجاب کی فضا میں بڑا فرق ہے۔ پنجاب کے دیہات کی فضا رومانی ہے۔ یہاں کے پہاڑوں میں رومان ہے۔ دریاؤں میں رومان ہے' کھیتوں میں رومان ہے۔ غرض یہ کہ ساری فضا میں رومانی کیفیت چھائی ہوئی ہے۔ ندیم صاحب جب اس فضا کو پیش کرتے ہیں تو رومان کا رنگین پردہ از خود ان کے فن پر پڑ جاتا ہے۔ یہ شعوری نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اکھڑی اکھڑی سی نہیں معلوم ہوتی۔ اس رومانی فضا میں تو وہ پنجاب کی روح کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔ اس لئے ان کی یہ رومانیت فن کو حقیقت سے قریب کرتی ہے۔

انتظار حسین۔ لیکن خود ندیم صاحب کے بعض افسانے ایسے ہیں [illegible] نہیں ہے۔ بلونت سنگھ کے افسانے بھی ایسے ہیں اور اس پردہ کے بغیر ہم چیزوں کو زیادہ قریب سے دیکھ سکتے ہیں۔

عبادت۔ ابتدائی دور میں ان کے افسانوں کی [illegible] ہے جن کا نقطہ نظر تمام تر رومانی ہے۔ شاید ان کی نوجوانی نے اس خصوصیت کو پیدا کیا ہے۔ بعد میں حقیقت نگاری کی طرف ان کا رجحان بڑھنے لگا ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ ابتدائی دور سے آپ کی کیا مراد ہے۔ ان کے مجموعے "بگولے" کے افسانے "خربوزے" میں تو کوئی رومان نہیں۔

محمد طفیل۔ یہ افسانہ "بگولے" میں نہیں "آنچل" میں ہے۔

عبادت۔ ان کا پہلا مجموعہ "چوپال" ہے۔ اس کے بیشتر افسانوں میں رومانی فضا ہے۔

وقار عظیم۔ یہ دور ہی حقیقت نگاری اور رومانی ادوار کے بین بین ہے اس وقت یہ دونوں چیزیں ہماری روایت کا جزو بن چکی ہیں۔ بعد میں ندیم صاحب کے افسانوں میں واقعیت رومان پر غالب آگئی ہے۔ ایک خاص حد تک اس فضا کا ذکر کرتے ہیں اس کے بعد نہیں۔

عبادت۔ ان کے شعور میں ارتقائی کیفیت ہے اب ان کے پاس حقیقت نگاری Realism کا بڑا رچا ہوا انداز ملتا ہے، جس کو ان کے بڑھتے ہوئے سماجی شعور نے پیدا کیا ہے۔

وقار عظیم۔ لیکن اس سماجی نوعیت کے باوجود اس رومانی فضا کو نظرانداز نہیں کرتے۔

عبادت۔ آج سے سات آٹھ سال پہلے وہ یہ فضا قائم کرتے تو ان کے یہ افسانے اجڑے اجڑے سے نظر آتے۔ اس فضا نے ان کے فن میں بڑی جان پیدا کی ہے۔ اس فضا نے ان کے افسانوں کو واقعیت سے قریب کیا ہے۔

انتظار حسین۔ لیکن احمد علی نے اسی زمانے میں اور قسم کے رنگ میں افسانے لکھے ہیں۔

محمد طفیل۔ کیا ہم اسے خرابی کے بجائے ایک اسلوب کا درجہ نہیں دے سکتے؟

ندیم۔ اس سلسلے میں میں انتظار صاحب اور وقار صاحب سے متفق ہوں۔ ابتدا میں رومانیت اتنی شدت اختیار کر گئی کہ واقعیت دب گئی ہے۔

وقار عظیم۔ اس میں [illegible] ضرور آتا ہے لیکن مجموعی تاثر دب گیا [illegible]

لیکن فن سے شاید نہیں ___ ندیم صاحب اس دور کے واحد افسانہ نگار ہیں جنہوں نے فن اور زندگی کو ساتھ ساتھ چلایا ہے۔

عبادت۔ ان کے ہاں بڑا توازن اور مسلسل ارتقائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ کہیں پیچھے نہیں ہیں۔ انہوں نے زندگی اور فن کے امتزاج کی ایک صحت مند روایت قائم کی ہے۔

ندیم۔ اردو افسانے کی ساری روایت مجھ پر بیت چکی ہے۔ میں نے ابتدا داستانوں سے کی تھی۔ فنی حیثیت متعین کرنا آپ لوگوں کا کام ہے۔

انتظار حسین۔ قاسمی صاحب کے فسادات کے بارے میں افسانوں میں خامی یہ ہے کہ وہ بڑے جذباتی ہو گئے ہیں۔

وقار عظیم۔ یہ بات تو فسادات کے بارے میں جتنے لوگوں نے لکھا ہے سب میں موجود ہے۔ وقت گزرنے پر ہی اس میں اعتدال پیدا ہو سکا۔ یہ خرابی کرشن چندر، بیدی، عصمت اور حیات اللہ انصاری میں بھی ہے۔

عبادت۔ ندیم صاحب نے تفصیل اور جزئیات کو مختصر افسانے میں بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ اس سے ایک فضا بھی پیدا ہوئی ہے۔ ایک ماحول بھی وجود میں آیا ہے۔ ندیم صاحب اسی فضا اور ماحول کے افسانہ نگار ہیں۔

وقار عظیم۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ افسانہ نگار کو قدرت ہے کہ وہ دس جملوں کی بات کو ایک جملے میں ادا کر سکتا ہے۔

محمد طفیل۔ اور یہ کہ ایک جملے کی بات کو دس جملوں میں بھی ادا کر سکتا ہے۔

وقار عظیم۔ خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور دونوں کے ابتدائی دور میں عصمت چغتائی کا اثر ضرور ہے شعوری یا غیر شعوری طور پر۔ یہ شاید احساس کمتری کا نتیجہ ہو لیکن عصمت کا ماحول ان سے مختلف ہے۔

عصمت کا ماحول علی گڑھ کے آس پاس ہے اور ان کے پاس لکھنو کا ماحول ہے۔ عصمت میں جو انتقام کا جذبہ ہے وہ ان کے یہاں نہیں ہے۔

عبادت۔ ابتدائی دور کے افسانوں میں ان کے یہاں ایک طرح کا احساس شکست بھی ہے اور اس میں عصمت والی بلندی نہیں ہے۔

وقار عظیم۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ عصمت نے اپنے آپ کو گھریلو شکنجوں سے نکال لیا تھا اور یہ ایسا نہیں کر سکی تھیں۔

ہاجرہ مسرور۔ میرے خیال میں اگر ہم دونوں بہنوں پر صرف اس

نہ ایک ساتھ بات کی جاتی ہے کہ ہم سمجھیں ہیں تو بڑی زیادتی ہے۔

یم۔ ان دونوں کے فن میں بھی بڑا فرق ہے' خدیجہ کے سانوں میں آہستہ روی اور سہج سہج قدم رکھنے کا انداز ہے' ہاجرہ کے افسانوں میں عصمت کی تیزی اور شوخی بھی ہے۔

قار عظیم۔ یہ تو مزاجوں کا فرق ہے۔

نظار حسین۔ خدیجہ کے یہاں مرثیہ کی فضا ہے لیکن ہاجرہ کے ہاں طنز ہے۔

بادت۔ ان دونوں کو زبان پر بڑی قدرت ہے۔ ان کے بیان کی روانی اور طرز ادا کی بے باکی نے ان کے افسانوں میں زندگی پیدا کی ہے۔

قار عظیم۔ قرۃ العین میں اور ان میں یہ فرق ہے کہ اس نے سوری میں زبان سیکھی ہے اور انہوں نے لکھنو میں۔

نظار حسین۔ قرۃ العین کے پاس امام باڑے کی زبان نہیں بلکہ نئے لکھنو اور وہ بھی کافی ہاؤس کی زبان ہے۔

بادت۔ لیکن اب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہاجرہ اور خدیجہ کے پاس موضوعات ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے انداز میں بھی اب وہ شگفتگی نہیں رہی۔

ریم۔ میرے خیال میں موجودہ دور میں ان کا فن زیادہ وسیع اور بلند ہو گیا ہے۔

بادت۔ میں بالکل ابتدائی دور سے مقابلہ نہیں کر رہا ہوں بلکہ کچھ عرصہ پہلے کی بات کر رہا ہوں۔

قار عظیم۔ بیان وغیرہ کی حد تک تو آپ کی بات ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن زندگی کی باشعور ترجمانی تو اب ہی ہے۔ ایک کمی ضرور ہے کہ پہلے بیان کا انداز بے ساختہ تھا۔ اب اسے بنانے سنوارنے کی کوشش میں روانی میں کمی آگئی ہے اور تھوڑا سا تصنع پیدا ہو گیا ہے۔

عبادت۔ میرے خیال میں اب ان کے یہاں لکھنے کی Urge اس شدت کے ساتھ نہیں ہے۔ زندگی کا شعور ضرور ہے لیکن جب Urge ہی نہیں ہو گی تو شعور تخلیق میں کس طرح معاونت کر سکے گا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے موضوعات ختم ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

انتظار حسین۔ ہر دور میں ایک مزاج ہوتا ہے' پہلے وہ Inner urge کے تحت لکھتی تھیں اب ایک خاص تحریک کے ماتحت لکھتی ہیں تو وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی۔

ندیم۔ ہاجرہ مسرور کے دو افسانے "صدمہ" اور "بھالو" تازہ ترین اور بڑے کامیاب افسانے ہیں۔

عبادت۔ انتظار حسین صاحب نے یہ بات ایک تعصب کے تحت کی ہے۔ کسی تحریک کے ماتحت ہو کر لکھنا تو بڑی اچھی بات ہے بشرطیکہ اس تحریک کا ذہن و شعور پر خاطر خواہ اثر ہو۔

ندیم۔ خدیجہ مستور کا افسانہ "سیتوں لے چلے بابلا" مختصر اور بڑے Dispassionate انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ان دونوں کی تخلیق کی رفتار میں کمی آئی اور شاید اسی کے باعث خامیاں پیدا ہو گئیں۔

عبادت۔ میرا خیال یہ ہے کہ زندگی میں اگر فن کار کو سکون مل جائے تو تخلیقی صلاحیتیں سونے لگتی ہیں ——— ہاجرہ اور خدیجہ آج اسی سکون سے دوچار ہیں۔ ان کے موضوعات ختم ہو گئے ہیں اسی لئے ان کے افسانوں میں جان نظر نہیں آتی۔ اب ان کے فن کو زندہ کرنے کی ایک ہی صورت ہے۔ وہ یہ کہ وہ چوں کے بارے میں لکھیں۔ کیونکہ آج وہ زندگی کی انہی منزلوں سے دوچار ہیں۔

ہاجرہ مسرور۔ صاحب بڑی مشکل یہ ہے کہ آپ لوگ ہماری گھریلو زندگی دیکھ لیتے ہیں اور پھر نسخہ تجویز کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔

وقار عظیم۔ اس سے پہلے جو نام ہم نے لئے ہیں ان میں دیوندر ستیارتھی اور خواجہ احمد عباس کے نام رہ گئے ہیں۔ ہمیں ایک نظر ان پر بھی ڈال لینی چاہئے۔ دیوندر ستیارتھی میں ایک بات ہے جو کسی افسانہ نگار میں نہیں۔ دوسرے افسانہ نگار فضا سے متاثر ہیں یا انہوں نے پریم چند کی پیروی کی ہے لیکن ستیارتھی نے لوک گیتوں کے سلسلے میں سارے ہندوستان کا دورہ کیا اور ان گیتوں کے تانے بانے سے کہانیاں تیار کی ہیں اس طرح ان کی کہانیوں میں بڑی رنگارنگی ملتی ہے۔ انہوں نے اس رنگینی کو بڑے تنوع کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا موضوع افسانے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ البتہ انہوں نے فنی لوازمات کا زیادہ خیال نہیں رکھا ہے۔

عبادت۔ "لال دھرتی" افسانہ انہوں نے کافی چابکدستی سے لکھا ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ میرے خیال میں تو اس میں بڑا تصنع ہے انہوں نے خواہ مخواہ لال رنگ سے لڑکی کی بلوغت کو تعبیر کیا ہے۔ یہ چیز غیر قدرتی سی لگتی ہے۔ فنی حیثیت سے یہ کامیاب افسانہ نہیں ہے۔

وقار عظیم۔ جی ہاں فنی نقطہ نظر سے ان کا انداز عموماً بڑا لاابالی ہوتا ہے۔

عبادت۔ وہ جس پس منظر کے متعلق لکھ رہے ہیں شاید اسے ہم یہاں بیٹھ کر اچھی طرح محسوس نہیں کر سکتے لیکن انہوں نے جس ماحول کے بارے میں لکھا ہے اس پس منظر میں وہ خاصا موثر نظر آتا ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ لیکن وہ اسے کسی اور انداز سے بیان کر سکتے تھے۔ انہوں نے ایک جگہ لڑکی کے گھونگھروؤں پر گھوم جانے کا ذکر کیا ہے۔ یہ بات بڑی مصنوعی ہے۔

عبادت۔ یہ اصل میں اس بات کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ماحول سے یہ ماحول قدرے مختلف ہے۔

انتظار حسین۔ لیکن ہم ایسے افسانے بھی تو پڑھتے ہیں جن کا ماحول ہم نے نہیں دیکھا لیکن افسانہ نگار ہمیں پوری طرح Convince ضرور کرتا ہے۔ مثلاً ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے میکسیکو کے بارے میں افسانے۔

عبادت۔ مجھے اس سے اختلاف نہیں لیکن یہاں بات فن کی نہیں رہ جاتی یہ تو ماحول کی عکاسی کی بات ہے۔ ستیارتھی اس عکاسی میں کامیاب ہیں۔

وقار عظیم۔ لکھنے والے کا کمال یہی ہے کہ وہ ایسی فضا پیدا کرے کہ پڑھنے والا اجنبیت محسوس نہ کرے اگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تو یہ اس کی کمزوری ہے۔ ہاں یہ ستیارتھی کی خصوصیت ہے کہ انہوں نے مختلف دیہات کی فضا کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانے میں رنگوں کی بڑی اہمیت ہے۔ جہاں کہیں انہوں نے بسنت میں یو۔ پی کے دیہات کا ذکر کیا ہے تو زردی کا ذکر بڑے فن کارانہ انداز میں پیش کیا ہے اور رنگ ہی سے پس منظر بنایا ہے۔ ان کے نزدیک انداز بیان اور سوچنے پر ٹیگور کا گہرا اثر ہے اور وہ اپنے کرداروں سے بڑی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ ان میں ہر ایک کو اپنانے کی خواہش بدرجہ اتم ہے۔

خواجہ احمد عباس کے افسانوں میں مجھے بڑا تصنع محسوس ہوتا ہے۔ دوسرے افسانہ نگاروں کے ہاں انداز بدلتا رہتا ہے مثلاً کرشن چندر پہلے رومانی تھے پھر بدل گئے۔ لیکن احمد عباس کا زندگی کے متعلق ایک خاص قسم کا نقطہ نظر ہے جو سیاسی ہے۔ وہ ایک خاص قسم کی قومیت کے حامی ہیں اور اس طرح وہ جو فضا بناتے ہیں اس میں تصنع کا احساس ہوتا۔

ہاجرہ مسرور۔ قومی احساس بری بات نہیں، ہاں اسے پیش کرنے میں خامی رہ سکتی ہے۔

وقار عظیم۔ فن کا اصل مقصد یہ نہیں کہ آپ اس کے محاسن سے لطف اندوز ہوں۔ فن کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارا احساس دوسرے کا احساس بن جائے۔ اگر یہ تصنع معلوم ہونے لگے تو مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

عبادت۔ خواجہ احمد عباس اپنے افسانوں میں زیادہ حقیقت نگار ہو جاتے ہیں اور اسی وجہ سے ہم شاید اسے محسوس کرتے ہیں کہ وہ کافی بیباک ہیں۔ انہوں نے افسانے کے بنیادی اصولوں کا کم خیال رکھا ہے ___ شاید اس لئے بھی کہ وہ صحافی ہیں اور ان کی تحریروں پر صحافت کا خاصا اثر ہے۔ اسے ہم تصنع نہیں کہہ سکتے۔ صاف گوئی کہہ سکتے ہیں بیباکی کہہ سکتے ہیں سیدھا سادا انداز کہہ سکتے ہیں۔

وقار عظیم۔ ہم کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے ایک منطق قائم کرتے ہیں جب تک یہ بات نہ ہو ہماری بات سے کوئی متاثر نہ ہوگا۔ افسانے کی منطق اس سے کچھ مختلف ہے جو چیز زندگی میں حقیقت ہے وہ افسانے میں تصنع بن جاتی ہے۔ افسانوی حقیقت کے لئے ہمیں بڑے جوڑ توڑ کرنے پڑتے ہیں۔ احمد عباس اس میں پورے نہیں اترتے شاید اس لئے کہ صحافی ہیں۔

محمد طفیل۔ ان کا صحافی ہونا کوئی عیب نہیں ہونا چاہئے۔ بعض افسانہ نگار صحافی نہیں ہیں۔ لیکن ان کی تحریروں میں صحافتی رنگ جھلکتا ہے ___ اس سلسلے میں کسی حد تک کرشن چندر کا نا جا سکتا ہے۔

ہاجرہ مسرور۔ مجھے ان کا ایک افسانہ یاد آتا ہے۔ ایک آدمی یادداشت کھو چکا ہے اور ریل میں سفر کر رہا ہے۔ ہندو اس سے پوچھتے ہیں کہ وہ کون ہے۔ مسلمان بھی یہی پوچھتے ہیں ___ یہ مصنوعی لگتا ہے کیونکہ اس زمانے میں تو لوگوں نے قومیت اور مذہب معلوم کرنے کے بڑے بڑے انوکھے ڈھنگ ایجاد کر رکھے تھے۔

وقار عظیم۔ اصل میں اس وقت یہ رجحان تھا کہ فسادات کے بارے میں جو لکھا جائے اس میں ہندو اور مسلمان دونوں کے ساتھ پورا انصاف کیا جائے۔ کرشن چندر نے بھی ایسا کیا ہے لیکن ان کے بیان کا لوچ اس پر پردہ ڈال دیتا ہے۔

محمد طفیل۔ میرے خیال میں اس موقع پر اختر اور بیدی کا بھی ذکر ہونا چاہئے۔

عبادت۔ ان کے ساتھ اختر انصاری کا بھی۔

وقار عظیم۔ ان کا ذکر شروع میں ہونا چاہئے تھا۔ یہ دونوں اف

نگار مظلوموں کی حمایت کرتے ہیں۔ اختر اور ینوی کے ہاں کسانوں اور شہروں کے متعلق افسانے ہیں۔ یہ افسانے انہوں نے ایسے دور میں لکھے ہیں جب لوگ فیشن کے طور پر ان کا ذکر کرتے تھے۔ ان کے پاس صحیح ہمدردی اور محبت ہے۔

عبادت۔ اختر انصاری کے افسانوں کو بڑے غور سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ ان کے افسانے اردو میں نفسیاتی تجزیے کی بنیاد رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں ایک فضا کا قیام اور ایک سماں بندی ملتی ہے ان کے پاس عوام سے ہمدردی کا عنصر تو نہیں ہے البتہ متوسط طبقہ کی ذہنی الجھنوں کا خاص طور پر ذکر ہے۔ اس سے جو نتائج نکل سکتے ہیں اس کو انہوں نے بڑی مہارت سے لکھا ہے۔

وقار عظیم۔ اختر انصاری نے ایسی کہانیاں لکھی ہیں جن میں افراد کی ذہنی کیفیتوں کی عکاسی ہے (مثلاً ان کے مجموعہ نازو' میں) انہوں نے اس بات پر زور دیا ہے کہ حالات سے ان پر کیا اثر پڑتا ہے اور اس کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔ یہ بات اس دور کے لکھنے والوں میں نہیں تھی۔

عبادت۔ ان کے کردار پریشان' سراسیمہ اور کٹھ پتلیوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں کے ہاتھوں وہ ایک فضا قائم کرتے ہیں۔ لیکن یہ فضا پڑھنے والے پر کس انداز میں اثر انداز ہوتی ہے۔ کاش انہیں اس کا بھی اندازہ ہوتا۔ ان کی قائم کی ہوئی فضا بیمار اور تھکی ہوئی سی نظر آتی ہے اور اس بات کا احساس وہ اتنی شدت سے دلاتے ہیں کہ پڑھنے والا اس میں پھنس جاتا ہے۔

وقار عظیم۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سے انہوں نے زندگی کی گہماگہمی میں قدم رکھا ہے Frustrated رہے ہیں۔ چونکہ ان کی اپنی زندگی میں مایوسی ہے اس لئے وہی مایوسی ان کے کرداروں پر حاوی ہے۔ وہ کسی مصیبت سے نکلنے کی کوشش نہیں کرتے ہاں اس طرح کی زندگی میں انسان کو جن کیفیتوں سے سابقہ پڑتا ہے ان کی عکاسی بڑی صفائی سے کرتے ہیں۔

ندیم۔ اردو افسانے کی تکنیک میں اختر انصاری کی Contribution اتنی ہے کہ ان کا نثر لکھنے کا انداز بڑا خوبصورت' سلیس اور سادہ ہے منٹو کے مقابلے میں ان کا انداز بیان بڑا دلکش ہے۔ ان کے چند افسانے (مجموعہ نازو) خاصے مشہور اور کامیاب ہیں۔ لیکن ان کا کوئی اسلوب Develop نہیں ہو سکا اور مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ صرف متوسط طبقے کے نوجوان کی زندگی ہی پیش نہیں کرتے' بلکہ ایسے موضوعات پر لکھتے ہیں جن کے بارے میں انہیں علم نہیں ہوتا۔ ایسا کرشن چندر نے بھی کیا ہے۔

عبادت۔ جس ترقی پسندی کی طرف انہوں نے پلٹا کھایا ہے وہ اصل میں ان کا مزاج نہیں ہے۔

وقار عظیم۔ یہ عہد کا دور ہے ترقی پسندی کا Craze اس کی وجہ ہے۔

عبادت۔ ان کے افسانہ "دریا کی سیر" میں کئی کردار ہیں۔ اس میں انہوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے اور یہ ان کا مخصوص انداز ہے۔

وقار عظیم۔ یہ وہ زمانہ ہے جب پریم چند کا اثر بہت گہرا ہے حتیٰ کہ حسینی بھی اس سے متاثر ہیں۔ اس زمانے میں اختر انصاری نے انفرادیت پسندی کا ثبوت دیا اور اپنا رنگ الگ رکھا۔

عبادت۔ ہر چند کہ ان کا نقطہ نظر صحت مندانہ نہیں ہے لیکن انہوں نے ایک نئے انداز کی بنیاد ضرور رکھی ہے۔ اختر اور ینوی نے زندگی اور معاشی کشمکش پر بڑے عمدہ افسانے لکھے ہیں مثلاً "کلیاں اور کانٹے"۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ وہ نتیجہ کوئی نہیں نکال پاتے' اس معاملہ میں اگر اسی دور کے دوسرے افسانہ نگاروں کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ بہت آگے بڑھ گئے ہیں لیکن اختر اورینوی جس فلسفہ حیات کے قائل ہیں وہ انہیں آگے بڑھنے کی اجازت ہی نہیں دیتا۔ ان پر بلا مقصد مذہب کا اثر ہے۔

ندیم۔ اختر اور ینوی کے افسانوں میں حقیقت پسندی اور تصنع کا بڑا عجیب امتزاج ہے۔

عبادت۔ جب تک انسان کے پاس زندگی کی کشمکش کا صحیح شعور نہ ہو وہ اسی طرح بھٹکتا ہے۔ اختر اورینوی اس سے محروم نہیں۔ اگر طبقاتی آویزش کا شعور ان کے پاس ہوتا تو ان کے فن میں یہ خامی نہ باقی رہتی۔

وقار عظیم۔ لیکن اس کے باوجود طویل مختصر افسانے کی روایت کو آگے بڑھانے میں اختر اور ینوی کا بڑا حصہ ہے۔

عبادت۔ اب ہم اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں یہ پتہ لگانے کی ضرورت ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے کون کون سے نئے تجربے کئے اور کون کون سی نئی روایات قائم کیں۔

نئے افسانہ نگار پریم چند سے کچھ آگے بڑھتے ہیں۔ ان کی حقیقت نگاری انقلابی رجحان کی طرف بڑھ رہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کا شعور بھی بڑھا ہے۔ اس میں ترقی پسند تحریک کا اثر بھی شامل ہے۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے

حقیقت نگاری اور واقعیت کے اس رجحان کے ساتھ ساتھ اپنے افسانوں میں حقیقت و رومان کا ایک سنگم بنانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس کی بہترین مثال کرشن چندر کا فن ہے۔ کرشن چندر نے اپنے تقریباً تمام افسانوں میں حقیقت و رومان کا یہ سنگم بنایا ہے اور اس طرح اس نے جنت اور جہنم کو یکجا کر دیا ہے۔ اس اعتبار سے وہ منفرد ہے۔

ندیم۔ پریم چند کے زمانے میں افسانہ زیادہ تر عکس حیات تک محدود رہا ہے لیکن اب عکاسی میں تنقید حیات بھی شامل ہو جاتی ہے۔ محبت کے بارے میں بھی جو کہانیاں لکھی گئی ہیں ان میں بھی سماجی عوامل کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔

عبادت۔ پریم چند کے یہاں محبت کا جو تصور ہے وہ خدمت کا تصور ہے۔ یلدرم اور نیاز اس محبت کو حسن و ناز کا مجسمہ بنا کر پیش کرتے ہیں لیکن موجودہ دور میں محبت کی نفسیاتی نوعیت کو پیش کرنے کا رجحان عام ہے۔ اس سماجی کشمکش میں محبت کا کیا رخ ہو سکتا ہے ان چیزوں کے متعلق بھی افسانے لکھے گئے ہیں اس طرح گویا محبت کو وسیع مفہوم میں پیش کیا گیا ہے جو پہلے محبت جذباتی یا اصلاحی تھی اب اس کا ایک پس منظر ہے جو اس کا محرک بنتا ہے۔

وقار عظیم۔ یہ بات صرف محبت کے لئے مخصوص نہیں۔ حقیقت میں اب عام انداز بیان جذباتی نہیں رہا اور افسانہ نگار کسی مسئلے کو زندگی سے الگ کر کے نہیں دیکھتا۔

ندیم۔ محبت ہمارے شعری اور افسانوی ادب کا بہت بڑا موضوع رہا ہے' اس لئے اس میں تبدیلی بھی واضح ہے۔ تیسری چیز جو اردو افسانوں میں موجود ہے بین الاقوامیت ہے۔

وقار عظیم۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس دور میں ہمارے افسانہ نگاروں کی نظر ساری دنیا کے ادب پر ہے۔

عبادت۔ بین الاقوامیت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں زندگی کے متعلق ایک خاص نقطہ نظر ہے جس کو ایک سائنٹیفک تجربے کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تجزیہ ہمیں بین الاقوامیت کی طرف لے جاتا ہے۔ اس نقطہ نظر کے قیام سے ایک خاص بات یہ پیدا ہو گئی ہے کہ اب ہم چیزوں کو تاریخی شعور کے تحت دیکھتے ہیں۔ یہ شعور جذباتی نہیں۔ اس میں زندگی سے دلچسپی اور اس کا گہرا احساس ہے۔ اس سے پہلے انسانیت پرستی یا انسان دوستی (Humanism) کے جو تصورات تھے اس میں چیزوں کو ایک محدود دائرے میں رہ کر دیکھا اور سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب ایک عالمگیر انسانی برادری کا خیال پیدا ہوا ہے اور میں تو یہ کہوں گا کہ ہمارے افسانے میں یہ کرشن چندر کا پیدا کردہ ہے۔ اس معاملے میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔

ندیم۔ بین الاقوامیت اور آفاقیت دو الگ الگ چیزیں ہیں انہیں ملانا نہیں چاہئے۔

عبادت۔ بین الاقوامیت کی بنیاد آفاقیت پر ہے۔

وقار عظیم۔ سوچنے کا یہ انداز اس وجہ سے ہے کہ ہم چھوٹے چھوٹے مسائل کا تجزیہ کر کے ان کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں اور جب ان چھوٹے چھوٹے مسائل کا تجزیہ کیا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کے پیچھے بین الاقوامی مسائل ہیں۔

عبادت۔ چھوٹے چھوٹے مسائل کے بارے میں بھی جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں بھی آج کے افسانہ نگاروں کا تصور بدل گیا ہے۔ بیدی کے ہاں اس کی عمدہ مثالیں ملتی ہیں۔ زندگی سے گہری دلچسپی اور اس دلچسپی کا احساس پہلے اتنا شدید نہیں تھا۔ پہلے ان مسائل کو پیش کرتے ہوئے ماحول سے جھنجھلاہٹ اور بیزاری پیدا ہو جاتی تھی۔ اب اس میں اس زندگی کی دلکشی کا خیال شامل ہو گیا ہے۔

وقار عظیم۔ یہ چیز ایک خاص شکل میں پریم چند کے ہاں بھی موجود تھی۔

ندیم۔ اس زمانے میں مثالی تھی اب Realistic ہے۔

عبادت۔ زیر بحث دور کے لکھنے والوں کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ ان لوگوں نے تکنیک اور فن کے اعتبار سے بھی اضافے کئے ہیں اور افسانے کی روایت کو بعض نئے پہلوؤں سے آشنا کیا ہے۔ انہوں نے اظہار و بیان' سماں بندی' کردار نگاری اور نفسیاتی تجزیے کے نئے میدان تلاش کئے ہیں۔ اس لحاظ سے میں کرشن چندر کو بہت بڑا اصناع سمجھتا ہوں۔ انہوں نے شعوری طور پر اردو مختصر افسانے کی تکنیک کو فن کی نئی راہوں سے آشنا کیا ہے۔ مثلاً "ان داتا" کو لے لیجئے۔ اس میں فن کا انداز ہی بدلا ہوا نظر آتا ہے اور اس سے پہلے ہم افسانے میں اس طرح کی ہیئت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

وقار عظیم۔ لیکن کرشن چندر کے ہاں ایسے نمونے بھی ہیں' جنہیں دیکھ کر یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ افسانے کو پیچھے لے گئے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر اس کی ناکامیاں کم ہیں اور نیا لکھنے والا ان سے بچ سکتا ہے۔

عبادت۔ ہر تجربہ اپنے اندر شدت اور کسی حد تک انتہا پسندی

ور دیکھتا ہے' یہ منزلیں فن کے لئے بڑی کٹھن ہوتی ہیں۔ اس لئے خامیاں اور فروگزاشتیں اس دور کے فن کاروں میں بھی موجود ہیں ___ کرشن چندر اور بیدی تک ان سے اپنا دامن نہیں بچا سکے ہیں۔

ایک اور بات۔ اس زمانے میں طویل مختصر افسانے کی تکنیک تجربہ بھی کیا جاتا ہے۔ ندیم۔ کرشن اور اختر انصاری نے اس کی بنیاد ڈالی ہے۔ پھر دوسرے لوگ بھی میدان میں آئے جنہوں نے سے آگے بڑھایا۔

ندیم۔ اس بحث کو سمیٹنے سے پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ کوئی بات رہ تو نہیں گئی۔

وقار عظیم۔ ناول کی طرح کینوس کی وسعت اور وہ بھی اس طرح کہ بوجھ نہ بن جائے اس دور کے افسانوں کی خصوصیت ہے۔ یہ لوگ تفصیلات کو زیادہ بہتر طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ کردار کا تصور گہرا کرتے ہیں۔ ان کے افسانہ میں کینوس کے پھیلاؤ کے باوجود وحدتِ تاثر قائم رہتی ہے۔ حیات اللہ انصاری کا افسانہ "آخری کوشش" اس دور میں اس کی نمایاں مثال ہے۔ اس کے پیچھے ایک وسیع دنیا ہے۔ اس کی ساری ہنگامہ آرائیاں ہیں جو پڑھنے والے پر خود فراموشی کی کیفیت طاری کر دیتی ہیں۔

ندیم۔ ان لکھنے والوں کا ایک Contribution یہ بھی ہے کہ انہوں نے Fantasy کے انداز کو نکھارا ہے مثلاً غلام عباس کا افسانہ "آنندی۔"

انتظار حسین۔ یہ بعد کی بات ہے ابھی ہم وہاں تک نہیں پہنچے۔

عبادت۔ میں سمجھتا ہوں کہ داستانوں کا اثر بتدریج کم ہوتا گیا۔

وقار عظیم۔ حقیقت نگاری کے رجحان کے پھیلنے کے بعد کمی لازمی تھی اب شاعرانہ ماحول اور فضا سے مدد ضرور لی جاتی ہے لیکن محض تخیل اور تصور ہی پر افسانہ کی بنیاد نہیں رکھی جاتی۔

انتظار حسین۔ عبادت صاحب نے داستانوں کے اثر کے متعلق جو کچھ کہا اس سے مجھے اختلاف ہے۔ داستانوں میں صرف Fantasy ہی نہیں بلکہ جہاں کہیں ان میں حقیقت پسندی کا اظہار ہوا ہے وہ آج کل کے افسانوں سے بہت قریب ہے "قصہ چہار درویش" میں جہاں کھانے' لباس اور دوسری چیزوں کی تفصیل ہے وہ بالکل آج کے افسانوں کی ہے۔

عبادت۔ اس سے مجھے اتفاق ہے' لیکن رومانی فضا جو داستانوں نے دی ہے اس کو ان لوگوں نے اس انداز میں پیش نہیں کیا بلکہ ان کا انداز اس کی نفی کرتا ہے ___ پریم چند کے ہاں جو بات ہے وہ آج کے افسانوں میں نہیں ملتی۔ اب افسانہ نگار رومانی فضا بھی قائم کرتے ہیں تو اس میں نری جذباتیت نہیں ہوتی ہے۔

وقار عظیم۔ یہ رنگ تو خود پریم چند کے آخری افسانوں میں بھی نہیں ملتا۔ لیکن داستانوں کے اثر سے انکار ممکن نہیں۔ یہ اصل میں مشرقی مزاج کی ایک کیفیت ہے۔

عبادت۔ غالباً کرشن چندر پر مغربی رومانیت کا اثر زیادہ ہے۔

وقار عظیم۔ اگر غور کیجئے تو یہ انداز داستانوں میں مغرب کے رنگ سے بھی زیادہ ہے۔

عبادت۔ لیکن داستانوں میں جو رومانیت ہے اس میں تصنع کی فضا قائم رہتی ہے لیکن نئے افسانہ نگاروں کے رومانی انداز میں بڑی زندگی کا احساس ہوتا ہے اسی لئے اس میں زیادہ جان ہے۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اب تک جو روایات قائم ہوئی ہیں ان کی روشنی میں نئے لکھنے والوں نے کیا کیا تجربے کئے۔

حسن عسکری' بلونت سنگھ' ممتاز مفتی' قرۃ العین حیدر اور ممتاز شیریں وغیرہ اس دور میں آتے ہیں۔

حسن عسکری نے اردو افسانے کو بعض نئی چیزیں اس اعتبار سے دی ہیں کہ انہوں نے نفسیاتی تجزیے کے رجحان پر اچھا تجربہ بھی کیا ہے مثلاً "کالج سے گھر تک" وغیرہ وغیرہ۔ نفسیاتی تجزیے کے رجحان کو ان کا افسانہ "چائے کی پیالی" بڑی خوبی سے پیش کرتا ہے۔

وقار عظیم۔ اس طرح کا سب سے پہلا افسانہ "دو فرلانگ لمبی سڑک" کرشن چندر نے لکھا ہے۔

عبادت۔ یہ تو ماخوذ ہے جس کا حوالہ نہیں دیا گیا اور اس طرح انہوں نے ادبی دیانت داری کا خیال پوری طرح نہیں رکھا۔

وقار عظیم۔ یہ صحیح ہے کہ افسانہ نگار نے اعتراف نہ کر کے ایک اخلاقی غلطی کی ہے لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ اس نے اردو میں لکھا ہے اس سے افسانہ کی روایت میں ایک اضافہ ضرور ہوا۔

انتظار حسین۔ اس نقطہ نظر سے یہ اعتراض تو بیدی پر بھی کیا جا سکتا ہے ان کا افسانہ "گرم کوٹ" غیر زبان سے لیا گیا ہے۔

عبادت۔ حوالہ دئے بغیر ایسا کرنا ایک معیوب بات ہے۔

وقار عظیم۔ میں اخلاقی پہلو سے آپ سے بھی زیادہ اس کی مذمت کرتا ہوں لیکن اس سے انکار کرنا ممکن نہیں کہ اس ترجمہ سے ہماری افسانوی روایت میں ایک مفید اضافہ ہوا ہے۔

عبادت۔ عسکری کے افسانے [illegible] سے کچھ [illegible] میں ایک ان میں شعور کی رو بھی ملتی ہے۔ یہاں وہ اپنی ذات کی ذات میں [illegible] کی کوشش نہیں کرتے۔ دوسری چیز ان کے افسانوں میں یہ ہے کہ وہ مسائل پیدا کرتے ہیں اور اس سلسلے میں نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں۔ "چائے کی پیالی" ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ یہ رجحان ان کے یہاں دو راستوں سے آیا ہے۔ جوائس اور پروست کا ان پر اثر ہے۔ انہوں نے ان دونوں کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے اثرات کو سمونے کی کوشش کی ہے۔

تیسری چیز عسکری کے یہاں وہ ہے جو "پھسلن" میں ہے۔ یہ عصمت کے "لحاف" کی ایک دوسری شکل ہے، اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ افسانہ خواہ مخواہ لکھا گیا ہے۔

وقار عظیم۔ تجربے کے سلسلے میں جو چیز عسکری کی خصوصیت ہے اس کا اندازہ ان کے مجموعے "جزیرے" کے عنوان سے ہوتا ہے۔ اس میں ایک الگ دنیا آباد کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ ہر شخص اپنی ذات کو فکر کا محور و مرکز سمجھتا ہے۔ یہ رجحان اس روش کا ترجمان ہے کہ جب افسانہ نگار کو اجتماعی زندگی میں موضوع نہیں ملتے تو وہ فرد کو افسانہ کا موضوع بناتا ہے اور اس کی ذہنی کیفیت کی مصوری کرتا ہے۔ اس رجحان کی بدولت "شعور کی رو" کی تکنیک ہمارے افسانہ میں داخل ہوئی۔

ندیم۔ جب "چائے کی پیالی" اور "حرام جادی" چھپے تو بعض حلقوں کی طرف سے یہ کہا گیا تھا کہ یہ مغربی افسانوں سے ماخوذ ہیں۔

انتظار حسین۔ یہ بات تو عسکری صاحب نے "جزیرے" کے دیباچہ میں لکھی ہے کہ انہوں نے کون کون سا افسانہ کس کس افسانہ سے متاثر ہو کر لکھا ہے۔

عبادت۔ اس کے باوجود عسکری کے فن میں بڑی انفرادیت ہے۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ دس بارہ افسانے لکھے ہیں لیکن اپنا مقام پیدا کر لیا ہے۔ ان کی بڑائی تو اس میں ہے کہ انہوں نے مغربی اثرات کے باوجود اپنے فن میں ایک اپج پیدا کی ہے۔ ان کے ہر افسانے میں ایک انوکھا پن نظر آتا ہے۔

وقار عظیم۔ حسن عسکری نے جس خاص ماحول کو اپنے افسانوں کا پس منظر بنایا ہے وہ بھی ان کے لئے مخصوص ہے۔

عبادت۔ اور وہ اس تمام زندگی میں گھلے ملے معلوم ہوتے ہیں۔ اس زندگی کا کتنا گہرا احساس ان کے فن میں نظر آتا ہے۔

انتظار حسین۔ وہ بلند شہر کے علاقے کی زندگی کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔

وقار عظیم۔ فن کے نقطہ نظر سے یہ بات بڑی اہم ہے کہ افسانہ نگار جس ماحول سے پوری طرح واقف ہو اسی کی عکاسی کرے۔

انتظار حسین۔ حقیقت میں حسن عسکری اور اس طرح کے دوسرے لوگ افسانہ نگار نہیں تھے۔ مختصر افسانے کی مکمل تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی ایسا واقعہ یا تاثر لیا جائے جو فرد کی زندگی پر پوری طرح سے اثر انداز نہ ہو۔ لیکن حسن عسکری کے افسانوں میں مسلسل واقعات ملتے ہیں جو Determing Factor ہوتے ہیں۔ ان کا انداز طویل مختصر افسانوں کا سا ہے۔

عبادت۔ عسکری صاحب نے طویل مختصر افسانے لکھنے کا بہت بڑا تجربہ کیا ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ انہوں نے مختصر افسانے نہیں لکھے' ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے بعض بڑے اچھے مختصر افسانے بھی لکھے ہیں۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ ان کے جوہر طویل مختصر افسانے ہی میں کھلتے ہیں۔ شاید یہ مواد اور ہیئت کی ہم آہنگی کے شعور کا نتیجہ ہے۔

انتظار حسین۔ میرا کہنا یہ ہے کہ مختصر افسانے کی تکنیک اس کی متحمل نہیں ہو سکتی کہ آپ تفصیل تلاش کریں۔

عبادت۔ آپ "چائے کی پیالی" کو لے لیجئے۔ اس میں وہ تمام واقعات کو بڑی خوبی سے یکجا کرتے ہیں۔ اس میں ایک شخص کی ذہنی کیفیت کی ساری تفصیل موجود ہے لیکن مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اس افسانے میں ایک مکمل وحدت نظر آتی ہے اور یہ مختصر افسانے کی تکنیک ہے۔

انتظار حسین۔ مختصر افسانے کے تصور میں صرف وحدت شامل نہیں' ان کے افسانوں میں بہت سے واقعات کو ملا کر ایک شکل مرتب ہوتی ہے جو فرد کی شکل کو بدل دیتی ہے۔

وقار عظیم۔ مختصر افسانہ کی جو تعریف آپ نے کی وہ بہت محدود ہے۔ افسانہ کے فن میں جو بے شمار نئے تجربے ہوئے ہیں انہوں نے افسانہ کی ہیئت ہی بدل دی ہے اور اب جس چیز میں آپ کو اجنبیت محسوس ہوتی ہے وہ حقیقت میں فن کی روایت بن چکی ہے افسانہ کے نئے فن میں بڑی تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ ہمارا مرکزی تصور اب واقعات کے بجائے کرداروں کی طرف منتقل ہو گیا ہے۔

عبادت۔ ساری دنیا میں مختصر افسانہ میں تجربے کا تسلسل نظر آتا ہے تکنیک کا جتنا تنوع اس صنف ادب میں ملتا ہے شاید ہی کسی اور صنف میں ملے۔ اردو میں عسکری نے اس تسلسل کو باقی رکھا ہے اور

[illegible] وجہ سے ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ ایک امتیازی حیثیت [illegible] کرتے ہیں۔
[illegible] ہیں۔ انہوں نے ہمارے مختصر افسانے کی تکنیک میں بڑی دلچسپی پیدا کی ہے۔ البتہ ایک بات ہے وہ یہ کہ عسکری صاحب ان سیاسی تجربوں کے ساتھ سماجی شعور کا اظہار بھی کرتے تو افسانہ نگاری حیثیت سے ان کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا اس کمی نے ان کے ہاں ایک گھٹن سی پیدا کر دی ہے۔

وقار عظیم۔ لیکن جس چیز کو ہمارا جی چاہتا ہے اس کا مطالبہ ہر افسانہ نگار سے کرنا زیادتی ہے۔

عبادت۔ لیکن صرف زندگی کی عکاسی ہی میں تو عظمت نہیں ہے۔ عظمت تو زندگی کے مسائل کی گہرائی تک پہنچنے میں ہے۔ ہم اجتماعی یا انفرادی طور پر اس کا تقاضا نہیں کرتے۔ خود زندگی اس کی متقاضی ہے۔

وقار عظیم۔ مگر جب کوئی فن کار صرف عکاسی کو اپنا مطمح نظر جانتا ہے تو آپ اس کا مسلک کیسے بدل سکتے ہیں ___ لیکن اس کمی کے باوجود عسکری نے فن کی حیثیت سے افسانہ کو آگے بڑھانے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

ندیم۔ عسکری صاحب کے افسانے ایک فرد کے تاثرات کی عکاسی کرتے ہیں لیکن انہوں نے ایک فرد کے اتنے بہت سے تاثرات یکجا کر دیئے ہیں کہ مختصر افسانہ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

عبادت۔ مجھے اس سے اختلاف ہے' میرا خیال تو یہ ہے کہ جزئیات سے اثر زیادہ گہرا ہوتا ہے اور بات زیادہ دلکشی سے ذہن نشین ہوتی ہے۔ عسکری صاحب نے یہی تکنیک استعمال کی ہے اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب ہیں۔

وقار عظیم۔ ایک بات البتہ ہے کہ اس طرح کہانی پن باقی نہیں رہتا۔

عبادت۔ ان کا نقطہ نظر صرف فضا کو پیش کرنا ہے۔ مختصر افسانے کی تکنیک میں جو لچک ہے وہ اس کی اجازت دیتی ہے۔

وقار عظیم۔ یہ صحیح ہے لیکن اس کے باوجود فن کے ارتقاء کا جب ذکر آئے گا تو عسکری کا نام نمایاں طور پر لیا جائے گا۔

عبادت۔ عسکری صاحب کا نقطہ نظر انفرادی ہے۔ ممتاز مفتی کا نقطہ نظر بھی انفرادی ہے لیکن وہ لاشعور اور تحلیل نفسی کی گہرائیوں میں چلے جاتے ہیں۔ "آپا" اور "بوڑھا" ان کے بڑے اچھے افسانے ہیں جو [illegible] کی تکنیک کو بڑی اچھی طرح سے پیش کرتے ہیں لیکن [illegible] طرح وہ بھی ایک بیمار سی فضا

وقار عظیم۔ انہوں نے جنس کو [illegible] نقطہ نظر سے پیش کیا ہے۔

عبادت۔ مجھے اس میں شبہ ہے۔ ان کے سارے کردار بیمار معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سب لاشعور کی بھول بھلیوں میں کھوئے ہوئے ہیں اور خارجی اثرات کا احساس نہیں رکھتے۔ سماجی محرکات کا ان کے یہاں کوئی شعور نہیں اس لئے جو شخص ان کے قریب رہتا ہے وہ بھی بیمار ہو جاتا ہے۔ لاشعور کی دنیا میں رہنے والا انسان آخر کب تک ذہنی اور جذباتی طور پر صحت مند رہ سکتا ہے۔

ندیم۔ لیکن یہ ان کا اپنا زاویہ نظر ہو سکتا ہے۔ وہ خارجی حقیقت کے تو قائل ہی نہیں۔

عبادت۔ لیکن افسانے کے جائزے میں ہم اس کے اثرات کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مفتی نے اپنے آپ کو بہت محدود کر رکھا ہے۔ ان کے افسانوں میں بڑی گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ وہ قاری کو ایک ایسی جگہ پھنسا دیتے ہیں جہاں دنیا کی ہمہ گیری اور دل کشی کے تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں اور اعصاب مفلوج معلوم ہوتے ہیں۔

ندیم۔ اس نقطہ نظر میں بے بسی تو قدرتی ہے۔ وہ خارجی حسن کا احساس نہیں رکھتے اور میرے خیال میں وہ محض اس لئے اپنے لاشعور کی عکاسی کرتے ہیں کہ خود خارجی دنیا میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اور اب تو انکے افسانوں میں تکرار یا گھٹن کا احساس بھی ہونے لگا ہے۔

عبادت۔ وہ فرائڈ کو اپنا امام مانتے ہیں اسی لئے ان کے افسانوں میں یکسانیت اور گھٹن پیدا ہو گئی ہے ___ فرائڈ کے سہارے انسان آخر کب تک چل سکتا ہے؟

ندیم۔ لاشعور کی تمام گہرائیوں اور بھول بھلیوں کا جائزہ لیتے ہوئے فن کار کو زبان پر پورا عبور ہونا چاہئے۔ یہ قدرت مفتی میں نہیں ہے۔

عبادت۔ فرائڈ کے لکچر پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا ادبی مطالعہ بہت وسیع ہے لیکن ممتاز مفتی کے ہاں یہ بات بھی نہیں۔ انہوں نے فرائڈ کو ضرور پڑھا ہے لیکن اس کے بعد اس سلسلے میں جو کام ہوا ہے اسے نہیں دیکھا ___ شاید اسی وجہ سے وہ ان موضوعات پر بھی مفصل نہیں لکھ سکتے۔

ندیم۔ اب تو وہ خارجی حقیقتوں کے بھی سرے سے قائل نہیں۔

عبادت۔ ان کے علاوہ اس دور کے دو اور افسانہ نگار اہم ہیں۔ بلونت سنگھ اور غلام عباس۔

بلونت سنگھ نے ہمیں بہت سی نئی چیزیں دی ہیں۔ بظاہر وہ دیہاتی زندگی کے ترجمان ہیں لیکن وہ اس ترجمانی سے آگے بڑھ کر دیہاتی زندگی میں جو حُسن اور توانائی ہے اس کو بھی محسوس کرتے ہیں۔ مولانا صلاح الدین نے انہیں "پنجاب نگار" کہا ہے میں انہیں "حیات نگار" کہتا ہوں۔ وہ پنجاب پر اس لئے نہیں لکھتے کہ پنجابی ہیں بلکہ اس لئے کہ انہیں پنجاب میں زندگی نظر آتی ہے۔ اس زندگی میں جو حُسن اور توانائی ہے اس نے بلونت سنگھ کو متاثر کیا ہے وہ اس زندگی میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انہیں اس زندگی سے ایک والہانہ دلچسپی ہے ___ جو افسانے انہوں نے فسادات پر لکھے ہیں ان میں بھی اسی زندگی کا احساس ہے۔ مثلاً "کالے کوس" میں یہ بات نظر آتی ہے کہ یہ ایک بڑی معرکۃ الآرا کہانی ہے۔ تقسیم پر بڑی ہیجان انگیز چیزیں لکھی گئی ہیں بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں کہ ہیجان انگیز چیزیں ہی لکھی گئی ہیں۔ بلونت سنگھ نے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ تقسیم کے وقت لوگ کس طرح محسوس کر رہے تھے۔ کس طرح زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہجرت کے بارے میں ان کا کیا خیال تھا۔

"کالے کوس" میں ایک ماں اور اُس کا بیٹا مشرقی پنجاب سے ہجرت کی غرض سے پاکستان کی طرف چل دیتے ہیں اور چلتے چلتے جب منزل پر پہنچتے ہیں تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ کیا ہم پہنچ گئے۔ یہاں بھی زندگی ویسی ہے جیسی کہ وہاں تھی۔ وہی سبزہ ہے وہی کھیت ہیں، ہر چیز ویسی ہی ہے ___ اس سے پتہ چلتا ہے کہ بلونت سنگھ ہر موضوع پر لکھتے ہوئے انسانی زندگی کی دلکشی اور دلآویزی کو اپنے پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ وہ اسی کے افسانہ نگار ہیں۔

انتظار حسین۔ ان کے وہ افسانے جو پنجاب کے فسادات کے بارے میں لکھے گئے ہیں مختصر افسانے کی حدود سے باہر نکل جاتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں ایک ایسا رچاؤ ہے جو یکسانی کی حد تک پہنچ جاتا ہے، یہ تکنیک ناول کی ہے۔

عبادت۔ جس چیز کی طرف انتظار صاحب نے اشارہ کیا ہے وہ بلونت سنگھ کی خامی نہیں ہے بلکہ یہ تو ان کی خوبی ہے۔ ان کے ایسے افسانے بھی اختصار سے مربوط ہیں ___ ان میں وحدت ہے، تسلسل ہے ___ اور یہ وحدت اور تسلسل درحقیقت زندگی کے شدید احساس کا نتیجہ ہے۔ ناول کی تکنیک اس میں نہیں ہے ___ ان افسانوں میں تفصیل ضرور ہے لیکن اس کے باوجود وہ Compact ہیں اور یہی ان کی خوبی ہے۔

وقار عظیم۔ یہ بات ہر اس افسانہ نگار میں ہوتی ہے جو زندگی کو جامد نہیں سمجھتا اور اس کے تسلسل کا قائل ہوتا ہے۔

انتظار حسین۔ ایسے لوگوں کے افسانے ناول اور طویل مختصر افسانے کے تحت آتے ہیں۔ یہ ان کی کاہلی ہے کہ مختصر افسانے لکھتے ہیں۔

ندیم۔ میرے خیال میں یہ بحث تکنیک کی ہے۔

عبادت۔ مختصر افسانے کی تکنیک کو اتنا محدود نہیں کیا جا سکتا کہ جس افسانے میں تفصیل ہو اس کو افسانہ ہی نہ کہا جائے۔ یہ تفصیل اور پھیلاؤ اگر وحدت کے روپ میں سامنے آئے تو اس کو مختصر افسانہ کیوں نہ کہا جائے ___ پھر افسانے کی تکنیک اس وقت تجربے کے دور سے گزر رہی ہے۔ طویل مختصر افسانہ، مختصر افسانے کی تکنیک میں ایک اہم تجربہ ہے۔ بلونت سنگھ نے بھی ایسا ہی ایک تجربہ کیا ہے۔

وقار عظیم۔ اس دور میں سوائے منٹو کے تمام اچھے لکھنے والوں کے یہاں افسانے کا آخری حصہ فکر کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس سے قبل یہ عیب ہو سکتا تھا۔ لیکن اب یہ عیب نہیں رہا۔

انتظار حسین۔ بلونت سنگھ اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ انہوں نے پنجاب کی زندگی میں سکھوں کے طبقے کی ترجمانی کی، ندیم صاحب نے پنجاب کے دیہات کی ترجمانی کی تھی لیکن سکھوں کو پیشِ نظر نہیں رکھا تھا۔

عبادت۔ بلونت سنگھ ہی کی طرح اس دور میں ایک اور چابکدست فنکار غلام عباس نظر آتے ہیں۔ غلام عباس بڑے ہوشیار افسانہ نگار ہیں وہ افسانہ نگاری کے فن اور اس کی تکنیک کا بڑا گہرا شعور رکھتے ہیں ___ فن کی لطافتوں اور نزاکتوں کا احساس ایک لمحے کو بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ ان کے موضوعات مختلف ہیں لیکن ان موضوعات میں جو چیز سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ موضوع کی تہہ تک پہنچتے ہیں اس کی تمام باریکیاں تلاش کرتے ہیں اور ان تمام پہلوؤں پر ان کی نظر بڑی گہری پڑتی ہے ___ انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی جس لطیف انداز میں انہوں نے کی ہے، اردو افسانے میں اس کی صرف چند مثالیں مل سکتی ہیں ___ البتہ وہ ان تمام باتوں کی تفصیل اور وضاحت سے بیان نہیں کرتے۔ ان کے انداز میں رمزیت ہے ___ اور یہ رمزیت ان کے افسانوں میں بڑی گہرائی اور گیرائی پیدا کر دیتی ہے ___ مختصر افسانے کی یہی خصوصیت

ہے۔ غلام عباس نے تو فن میں اس کو بڑی خوبی سے برتا ہے۔
وقار عظیم۔ غلام عباس نے فن سے بڑی وفاداری برتی ہے۔ ان کے فن میں مستعدی نظر آتی ہے۔ اکثر افسانہ نگار سہل انگاری دکھاتے ہیں اور یہ بات افسانہ نگاری کے فن کو بڑا نقصان پہنچاتی ہے غلام عباس سہل انگار نہیں ہیں۔ وہ دس سطروں کے افسانوں میں چاول کی سی جگر کاوی کرتے ہیں۔ ایک ایک لفظ پر غور کرنا' چاول پر چاول اٹھانا اور سوچنا فن کے لوازم ہیں اور یہ لوازم غلام عباس کے پاس موجود ہیں۔

انتظار حسین۔ راجندر سنگھ بیدی نے افسانے کو جہاں چھوڑا تھا___ غلام عباس افسانے کو اس سے آگے لے گئے ہیں___ ان کا اسٹائل بڑا منجھا ہوا ہے۔ لفظوں کی دروبست اور فقروں کی چستی جو مختصر افسانے کے لئے ضروری ہے وہ غلام عباس کے پاس موجود ہے۔ وہ افسانے کا Tempo متوازن رکھتے ہیں۔ نقارہ نہیں بجاتے۔

عبادت۔ ان کے فن کی یہ آہستہ روی اور متوازن کیفیت در حقیقت ان کی شخصیت کا پرتو ہے۔ وہ بڑے دھیمے آدمی ہیں۔ ان کی شخصیت میں بڑا توازن ہے اور یہی چیز ان کے فن پر اثر انداز ہوتی ہے۔

ندیم۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ خاصے معمر ہیں اور انہوں نے بہت بعد میں افسانے لکھنے شروع کئے ہیں۔

وقار عظیم۔ شروع میں انہوں نے بچوں کے لئے بھی کہانیاں لکھی ہیں جن کے لئے بڑی احتیاط اور سنبھلی ہوئی کیفیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس چیز نے بھی ان کے فن کو متاثر کیا ہے۔

محمد طفیل۔ یہاں قرۃ العین اور شفیق الرحمٰن کا ذکر ہونا چاہئے۔

عبادت۔ شفیق الرحمٰن اور قرۃ العین حیدر نے اونچے طبقے کی زندگی کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ شفیق الرحمٰن کے یہاں کوئی سنجیدہ فضا نہیں ہے۔ وہ زندگی کے ہلکے پھلکے پہلوؤں کو دیکھتے ہیں۔ ان کا فن ایک خوش وقتی کے احساس کی پیداوار ہے۔ زندگی ان کے نزدیک ایک سنہرا خواب ہے۔ جس میں قہقہے ہیں' شوخیاں ہیں' اٹھکیلیاں ہیں' چہلیں ہیں___ ظاہر ہے زندگی کے ان پہلوؤں میں گہرائی اور گیرائی نہیں ہے۔ لیکن یہ زندگی کے کچھ پہلو ہیں ضرور۔ یہی وجہ ہے کہ شفیق الرحمٰن کو لوگ دل خوش کرنے کے لئے پڑھتے ہیں___ ان کا تاثر گہرا نہیں ہوتا___ لیکن قرۃ العین اس زندگی کو نسبتاً زیادہ قریب سے دیکھتی ہیں___ ان کے یہاں زندگی صرف ایک سنہرا خواب ہی نہیں ہے___ وہ مسرتوں کے ساتھ اپنے طبقے کی تلخیوں کو بھی شدت کے ساتھ محسوس کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں تشکیک کے ساتھ آنسو بھی ملتے ہیں۔ منوری اور تمثیل کی فضاؤں میں زندگی کی تلخیاں محسوس ہوتی ہیں اور وہ سب کی بڑی فنکارانہ تصویر پیش کرتی ہیں۔ اس اعتبار سے وہ شفیق الرحمٰن کے مقابلے میں ایک بڑی فنکار ہیں۔

انتظار حسین۔ شفیق الرحمٰن گز نہیں دیتے گز کی سی بات کر دیتے ہیں___ قرۃ العین تھوڑا سا گز بھی دے دیتی ہیں۔

وقار عظیم۔ دونوں نے زندگی کے ایک ہی طبقے کی عکاسی کی ہے لیکن شفیق الرحمٰن کے مقابلے میں قرۃ العین کے یہاں اس طبقے کی زندگی کا شعور زیادہ ہے۔

عبادت۔ قرۃ العین کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ اونچے طبقے کی ساری تفصیل پیش کرتی ہیں اور اگرچہ ان کی قائم کی ہوئی فضا تمام تر رومانی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود یہ افسانے ہمیں متاثر کرتے ہیں۔ رومانی فضا میں اس زندگی کا کھوکھلا پن کچھ زیادہ ہی واضح ہوتا ہے___ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں آپس میں ایک ہم آہنگی رکھتے ہیں۔

وقار عظیم۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ اس طبقے کی زندگی کے گھناؤنے پن پر پردہ نہیں ڈالتیں' بلکہ اس کو اجاگر کرتی ہیں۔

ندیم۔ انہوں نے زندگی کی خوبیاں اور خامیاں بغیر کسی تعصب کے پیش کر دی ہیں۔ البتہ ان کے پاس سماجی رشتوں کا شعور نہیں ہے لیکن جہاں ان کے افسانوں میں دوسرے طبقوں کا ذکر آیا ہے وہاں ان کے ساتھ ایک ہمدردی کا احساس ضرور ہوتا ہے۔

عبادت۔ قرۃ العین کے فن میں سب سے زیادہ جو چیز اپنی طرف متوجہ کرتی ہے وہ ان کا تخیل ہے___ وہ اس تخیل کے سہارے بہت اونچا اڑتی ہیں___ یہ پرواز تمام رومانی ہوتی ہے۔ ان کے اونچا اڑنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ لیکن اس اڑان میں کبھی کبھی ایسی منزلیں بھی آتی ہیں جہاں ان کے ساتھ اڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ان کا پڑھنے والا ایک لمحے میں زمین پر آ جاتا ہے___ اسی جگہ جہاں سے اس نے اڑنا شروع کیا تھا۔

وقار عظیم۔ جس طرح عصمت نے بعض افسانہ نگار خواتین کو متاثر کیا ہے اسی طرح قرۃ العین، حجاب امتیاز علی سے ایک حد تک متاثر ہوئی ہیں___ البتہ حجاب کی طرح ان کے یہاں زندگی سے بے تعلقی باقی نہیں رہتی۔

عبادت۔ لیکن اس کے باوجود ان کی رومانی پرواز انہیں زندگی سے

..کسی حد تک وہ ضرور لے جاتی ہے۔ بعض اوقات تو ان کی یہ رومانی پرواز اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ ہم ان کا ساتھ نہیں دے سکتے اور ہمیں مبہم معلوم ہونے لگتی ہیں۔ یہ ابہام ان کی تکنیک میں بہت واضح ہے۔ درحقیقت اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تخیل کو پوری طرح اپنے قابو میں رکھنے پر قادر نہیں ہیں۔ تخیل کی یہ گرفت جس جگہ بھی ان کے یہاں ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ ان کا فن ایسی ان جان گھاٹیوں میں بہہ نکلتا ہے جہاں ہم اجنبی ہو جاتے ہیں۔

وقار عظیم۔ ان کی فطرت میں مشرقیت اور مغربیت کا اتنا میل ہے کہ ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے والدین سے مشرقی روایت کا احترام اور مغربیت کا اثر بھی لیا اور یہ تصادم ان کی تحریر میں بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔ وہ کبھی اُردو میں سوچتی ہیں اور کبھی انگریزی میں اور اس طرح ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔

ندیم۔ قرۃ العین نے منظر نگاری کے سلسلے میں کرشن چندر کی طرح بڑے گہرے مشاہدے کا ثبوت دیا ہے۔

عبادت۔ قرۃ العین کے یہاں مناظر کا بڑا شدید احساس ہے اس کا بیان وہ دل نشیں انداز میں کرتی ہیں لیکن کرشن چندر کا احساس ان سے کہیں زیادہ شدید اور اس کا مشاہدہ کہیں زیادہ تیز ہے اس کا انداز بھی پختہ ہے۔ اس لئے وہ بڑا فن کار ہے۔

انتظار حسین۔ بہر حال قرۃ العین نے اُردو افسانے میں کچھ نہ کچھ اضافے ضرور کیے ہیں۔

عبادت۔ ایک اور بات جو اس دور کے لکھنے والوں میں نئی ہے وہ یہ کہ اس زمانے میں گھریلو ماحول کی عکاسی کا شعور بھی خصوصاً بعض خواتین افسانہ نگاروں میں پیدا ہوا ہے۔ گھریلو ماحول میں جو دلکشی ہوتی ہے اس کو ہماری افسانہ نگار خواتین نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اس زمانے میں ممتاز شیریں نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اس سے قبل افسانہ نگار خواتین کے موضوعات ایک Frustration سے تعلق رکھتے تھے یہ افسانہ نگار خواتین نارمل نہیں تھیں۔ انہیں گھریلو ماحول کی دلکشی نصیب ہی نہیں ہوئی تھی۔ پھر وہ اس کو موضوع کس طرح بناتیں۔ ان کا موضوع تو چند ناآسودہ خواہشات کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ممتاز شیریں نے ان کے برخلاف گھریلو ماحول کی ترجمانی بڑی کامیابی سے کی۔ ان کے مجموعے "اپنی نگریا" میں اس موضوع پر اچھے افسانے ملتے ہیں۔

وقار عظیم۔ ممتاز شیریں نے جنوبی ہند کی زبانوں کے افسانوں سے اثر قبول کیا ہے۔ ان زبانوں کے افسانوں میں فن اور زندگی کا جو امتزاج ہے اس سے بعض اچھی باتیں لی ہیں۔ انہوں نے ان زبانوں سے بعض افسانوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔

عبادت۔ ممتاز شیریں کے افسانوں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ان کے پاس مختصر افسانے کی تکنیک کا بڑا گہرا شعور ہے افسانے میں تکنیک کا جو تنوع ہے اس کو انہوں نے بڑی خوبی سے برتا ہے لیکن تنوع کا یہ شعور ان کے یہاں تکنیک کے ایک Synthesis کی صورت میں نمایاں ہے۔ ان کی شخصیت میں یہ شعور رچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

انتظار حسین۔ خواتین افسانہ نگاروں نے جو روایت قائم کی تھی' اس کو کسی حد تک ممتاز شیریں نے اپنایا ہے اور کسی حد تک توڑا ہے۔

عبادت۔ میرے خیال میں ممتاز شیریں نے ہماری دوسری خواتین افسانہ نگاروں کے مقابلے میں زندگی کے صحت مندانہ پہلوؤں کی ترجمانی کی۔ دوسری افسانہ نگار خواتین نے ان صحت مندانہ پہلوؤں کو نظر انداز کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان پہلوؤں سے انہیں تعلق ہی نہیں تھا۔ وہ تو ایک گھٹن کی پیداوار تھیں۔ ممتاز شیریں کے حالات مختلف تھے اس لئے وہ اس ڈگر پر نہ چل سکیں جو ان سے قبل کی افسانہ نگار خواتین نے بنائی تھی۔ بہر حال ممتاز شیریں کے ہاں دوسری خواتین افسانہ نگاروں سے ایک انحراف ملتا ہے۔

انتظار حسین۔ اس میں صحت مند اور غیر صحت مند ہونے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ عصمت وغیرہ زندگی کو ایک اور زاویے سے دیکھتی ہیں اور ممتاز شیریں کا زاویہ نظر مختلف ہے۔

عبادت۔ درحقیقت بات یہ ہے کہ عصمت کے ابتدائی دور کے افسانوں میں وہ آسودگی کا احساس نہیں جو ممتاز شیریں کے یہاں ملتا ہے۔ عصمت وغیرہ کے یہاں ایک تشنج کی سی کیفیت نظر آتی ہے۔ میں ان کے فن کی حقیقت وواقعیت سے انکار نہیں کرتا۔ نہ ان کے فن کو کم مرتبہ سمجھتا ہوں۔ البتہ یہ بات کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں ایک نارمل کیفیت کم ہے۔

انتظار حسین۔ تعجب ہے عبادت صاحب کو یہ احساس کیسے ہوا؟ ہاجرہ اور خدیجہ کے افسانوں میں بھی تو زندگی ہنستی کھیلتی نظر آتی ہے۔ ہاجرہ' خدیجہ اور عصمت نے ہندوستان کی عورتوں کی اکثریت کی ترجمانی کی ہے اور شیریں نے آسودہ طبقے کی۔

عبادت۔ یہ شاید صحیح نہیں، ممتاز شیریں نے ایک خاصے بڑے طبقے کی نمائندگی کی ہے۔ پھر انہوں نے متوسط طبقے کی گھریلو زندگی پیش کی ہے جس کو خواتین افسانہ نگار نے اس سے قبل اہمیت نہیں دی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری خواتین افسانہ نگار کو اس سے قبل گھریلو زندگی کا صحیح احساس ہی نہیں تھا۔ ممتاز شیریں نے اس کی ابتدا کی۔

وقار عظیم۔ اصل میں دونوں کے ماحول کا فرق ہے۔ ہاجرہ اور عصمت وغیرہ نے یو۔ پی کی مسلمان عورت کو دیکھا ہے جہاں تعلیم کا چرچا بھی ہوا ہے اور وہاں ماحول سے بغاوت زیادہ نمایاں ہے۔ شیریں کے افسانوں کی عورت ان منزلوں سے گزر چکی ہے۔ اس نے اپنے ماحول سے پوری طرح مطابقت پیدا کر لی ہے۔ اس نے آزاد ہو کر بھی گھر کو جنت سمجھنا سیکھا ہے۔

عبادت۔ آزاد ہونے کے باوجود گھریلو زندگی کا احساس تو بڑا مستحسن ہے اس میں ایک صحت مندانہ کیفیت ہے۔ ہماری افسانہ نگار خواتین نے اس کو اہمیت نہیں دی۔

وقار عظیم۔ یقیناً ـــ حقیقت نگاری دونوں طرح کی لکھنے والیوں کے یہاں ہے۔ عصمت، شیریں کے ماحول میں ہوتیں تو غالباً اس سے زیادہ اچھے افسانے لکھتیں اور شیریں لکھنو میں ہوتیں تو شاید اس سے کہیں تلخ لکھتیں۔

انتظار حسین۔ غالباً اب تقسیم کی لائن آگئی ہے۔

عبادت۔ تقسیم کے بعد افسانے میں ایک طرح کا انحطاط پیدا ہوتا ہے میرا خیال ہے کہ اس وقت تک لکھنے والوں میں سے بیشتر اپنا کام کر چکے تھے، تقسیم کے بعد ان کے موضوعات ختم ہو گئے ـــ بات یہ ہے کہ جن راہوں پر یہ چل رہے تھے وہ سب تاریکی میں گم ہو گئیں۔ انہوں نے جو کچھ چاہا تھا وہ نہ ہو سکا۔ جس چیز کی تمنا تھی وہ نہ ملی۔ اس لئے ایک احساسِ شکست Frustration عام ہوا۔ ان پر ایک مایوسی طاری ہو گئی۔ مایوسی کبھی کبھی انتہا پسند بھی بنا دیتی ہے۔ مثال کے طور پر کرشن چندر جو بہت بڑا فن کار ہے اسے تقسیم نے بڑا نقصان پہنچایا۔ اسے اپنے مقام کا احساس تک نہیں رہا۔ مثلاً اس نے اپنے اوپر مقصدیت اور افادیت کو اتنا طاری کر لیا ہے اور ایک تحریک کے ساتھ ایسی جذباتی وابستگی کا اظہار کیا ہے کہ کہیں کہیں اس کا فن لڑکھڑا جاتا ہے۔

ندیم۔ یہ کیفیت تو تقسیم کے بعد دونوں قسم کے افسانہ نگاروں کے ہاں موجود ہے۔ ترقی پسند اور غیر ترقی پسند۔ ترقی پسند اگر زوال پر آتے ہیں تو داخلیت پسند بھی اچھا ادب نہیں پیش کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ترقی پسند کچھ اور توقعات رکھتے تھے لیکن Frustration ہونے کی وجہ سے وہ فن کو سنبھال نہ سکے۔ دوسرے افسانہ نگاروں نے ان حالات سے فرار کا اثر لیا اور موجودہ حالات کا ذکر نہ کرنے میں ہی بڑائی سمجھنے لگے۔ اکثر اوقات انہوں نے انسانیت کا مذاق اڑایا۔ اس طرح دونوں افراط و تفریط کا شکار ہوئے۔

انتظار حسین۔ یہ گروہ ایک خاص سیاسی ماحول میں پیدا ہوا تھا۔ جب تقسیم ہوتی ہے تو ایک بریک سا آجاتا ہے، نیا دور آتا ہے تو وہ یہ نہیں سمجھ پاتے کہ اب کیا ہو اور چیزوں کو کس انداز سے لکھا جائے؟

عبادت۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں نے جو نقطہ نظر قائم کیا تھا بڑا باشعور تھا۔ وہ انگریز کے خلاف صرف جذباتی رد عمل نہیں تھا بلکہ اس میں طبقاتی آویزش اور سماجی شعور کا صحیح احساس بھی تھا اور یہ شعور تقسیم کے بعد بھی قائم رہا ہے۔ انگریز چلا گیا تو ہمارے افسانہ نگاروں نے سمجھا کہ ہمارا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا ہے۔ یہ احساس زیادہ بڑھا، یہاں تک کہ لوگ اسے پیش کرنے میں انتہا پسند ہو گئے اور اس طرح فن کا خون ہوا۔

ندیم۔ ڈاکٹر تاثیر نے بھی یہی بات کہی تھی جو انتظار صاحب نے ابھی بیان کی ہے کہ ترقی پسند تحریک کا ایک خاص نقطہ نظر تھا جو تقسیم کے ساتھ ختم ہو گیا۔ یہ تحریک British Imperialism کی تمازت کے خلاف ایک چھاتے کی حیثیت رکھتی تھی۔ انگریز چلا گیا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی، میں نے انہیں بتایا کہ یہ تحریک بہتر زندگی کی قائل تھی اس لئے نقطہ نظر اب بھی اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ توقعات کے مطابق نتیجہ نہیں نکلا اور لیڈروں نے اسے جس طریقے سے نظر انداز کیا ہے اس سے لکھنے والے کچھ مبہوت ہو گئے ہیں۔

انتظار حسین۔ تقسیم کا اثر ہمارے ذہنوں پر بہت گہرا پڑا ہے، سماجی فضا اور سیاسی ماحول یکلخت بدل گیا۔ انگریزوں کا اثر ضرور رہا لیکن انگریز حاکم سامنے سے ہٹ گئے۔ ادھر ہمیں یہ احساس دلایا گیا کہ اب قومی حکومت ہے۔ اس طرح ہم اپنے طریقِ کار متعین نہیں کر پائے پہلے ہندو، سکھ اور مسلمان اکٹھے تھے۔ سماجی تانابانا تھا، استحکام تھا زندگی میں تسلسل تھا۔ اب یہ لوگ ہٹ گئے اور ایک طرح کا Social Disintegration کا دور آگیا اور ان نئے

حالات میں لکھنے والوں کو بڑی دقت پیش آتی ہے۔

عبادت۔ یہ بات بڑے پتے کی ہے۔ طبقاتی کشمکش میں کوئی فرق نہیں پڑا لیکن سماجی انتشار کا اثر ذہنوں پر بہت گہرا ہے اس نے ہماری جو روایت تھی اور جس کا ہم نے تجزیہ کیا ہے اس پر اس ردو بدل کا اثر یقیناً ضرور ہوا ہے۔ بعض افسانہ نگاروں کا ماحول یکسر بدل گیا۔ ان کے لئے یہ دشواری پیدا ہو گئی ہے کہ برسوں سے وہ جس ماحول کا گہرا اثر رکھتے تھے اب اس کے متعلق وہ صرف تصور سے کام لیتے ہیں' اس طرح بہت سوں نے تو لکھنا ہی چھوڑ دیا۔ مثلاً حسن عسکری۔ انہوں نے پاکستان آنے کے بعد یہ کہا کہ اب میں آخر کس چیز کے بارے میں لکھوں۔ میرا مانوس ماحول جس سے میں جذباتی ربط رکھتا تھا اب پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں نے لکھنا ترک کر دیا ہے۔

وقار عظیم۔ تخصیص خاص طرح کے سوچنے والے کی نہیں ہے۔

انتظار حسین۔ خاص ماحول میں پرورش پانے والے کی ضرور ہے۔ آپ تصور کیجئے دلی کے کوچہ چیلان میں ایک لڑکی رسم ورواج کی کتنی پابند ہوتی تھی' لیکن وہ کراچی پہنچنے کے بعد ضابطہ اخلاق اور روایات کو توڑ دیتی ہے تو احمد علی' جو اسے کوچہ چیلان میں جانتے تھے' اب اس کے متعلق کیا لکھیں' کیسے لکھیں۔

عبادت۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ جو اتنی بڑی ردوبدل ہوئی ہے اس کے متعلق ہمارے افسانہ نگاروں نے کیوں کم سوچا ہے۔ اس پر تو بڑی Epic لکھی جا سکتی ہے۔ یہ ہماری تاریخ کا کتنا بڑا سانحہ ہے۔

ندیم۔ اس کی وجہ وہی ہے جو انتظار صاحب نے بتائی کہ وہاں کے لکھنے والے نئے حالات سے ناواقف ہیں اور یہاں کے رہنے والوں سے اجنبی ہیں۔

عبادت۔ تو ہمارے لکھنے والے Values کو متعین کیوں نہیں کرتے شاید یہ وجہ ہے کہ یہ ایک بحرانی دور ہے اور ابھی اتنا ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوا کہ اس پر سوچا جا سکے۔ سوائے انتظار حسین کے کسی نوجوان افسانہ نگار نے اس موضوع پر توجہ نہیں کی' حالانکہ یہ تمام کیفیات اکثر پر بیت چکی ہیں۔

انتظار حسین۔ پہلے یہ متعین کر لیجئے کہ اس کے متعلق کون لکھے۔

وقار عظیم۔ ہمیں تو اس وقت ان نئے حالات میں افسانہ نگاری شروع کرنے والوں کا جائزہ لینا ہے اور دیکھنا ہے کہ اس کی ادبی قدرو قیمت کیا ہے۔

عبادت۔ پرانے لکھنے والوں میں بھی بعض ایسے ہیں جنہوں نے اس دور میں بہت اچھے افسانے لکھے ہیں مثلاً ندیم اور ان میں بڑا صحت مندانہ زاویہ نظر ہے۔ لیکن اب چونکہ Concentration نہیں اس لئے اچھی تخلیقات نہیں ہو سکیں' اس سے ہم جمود کا اندازہ نہیں لگا سکتے' ہاں یہ دیکھنا ہے کہ تقسیم کے بعد جو افسانہ نگار پیدا ہوئے ہیں انہوں نے کونسے نئے تجربے کئے ہیں جن سے افسانے کی روایت آگے بڑھی ہے۔

اس نقطہ نظر سے انتظار حسین کے افسانوں کو میں خاص اہمیت دیتا ہوں انہوں نے زندگی کی متزلزل اقدار اور تقسیم کے اثرات کا بیان بڑی خوبی سے کیا ہے۔ اس میں ایک انسانی نقطہ نظر ملتا ہے انہوں نے زندگی کے منتشر پہلوؤں کو بڑی اچھی طرح پیش کیا ہے۔

محمد طفیل۔ ان کے افسانوں کی یکسانیت عیب بن گئی ہے۔

عبادت۔ اس یکسانیت کو میں ان کی خوبی سمجھتا ہوں' ان پر روسی حقیقت پسندی کا بڑا گہرا اثر ہے۔ خصوصاً "ٹالسٹائی اور "ترجنیف" کا۔ یہ یکسانیت اصل میں تکنیک کا دھیما پن ہے۔ یہ زندگی کو ایک خاص طرح سے محسوس کرنے کا انداز ہے۔

ندیم۔ میرے خیال میں انہوں نے موضوع کی تخصیص کر لی ہے جو ہر بڑے افسانہ نگار کو کر لینی چاہئے۔ انہوں نے جس خاص ماحول اور خاص طبقے کو دیکھا ہے اسی کی عکاسی کی ہے۔

عبادت۔ طبقے کی وضاحت کیجئے۔

ندیم۔ نچلا درمیانی طبقہ' چھوٹے دکاندار' ملازمت پیشہ لوگ وغیرہ۔ ان کے ہاں ایک عجیب وغریب چیز یہ ہے کہ سماجی شعور تو ہے لیکن یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس کے بھرپور اظہار سے کترا کر نکلنا چاہتے ہیں۔

عبادت۔ طبقے کے بارے میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے صرف معمولی دکانداروں کی نہیں بلکہ یو۔پی کے خاص اضلاع کے متوسط طبقے کی ترجمانی کی ہے یعنی بلند شہر کے آس پاس کا علاقہ' انتظار کے ہاں درحقیقت دو قسم کے ماحول ہیں' ایک تو وہ جو وہاں موجود تھا۔ دوسرا اس تبدیلی کے بعد جسے وہ سوچ سکتے ہیں۔ رہا سماجی شعور تو وہ اس کے قائل نہیں۔ ان کا تعلق درحقیقت اسی سکول سے ہے جس کے تحت ہم نے بیدی اور غلام عباس کو رکھا

ہے۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ انہوں نے اپنے موضوع کی تخصیص کرلی ہے ان کے پاس ماحول کے المیے کا اظہار زیادہ ہے اور ان مسائل پر ان سے اچھے افسانے کسی نے نہیں لکھے۔

ندیم۔ ان کا نام ہادی اور غلام عباس کے ساتھ لینا زیادتی ہے لیکن ایک یہ چیز انتظار کے بارے میں اور ہے اور وہ یہ کہ یہ چیخوف کی طرح جزئیات کو پیش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں لیکن تکنیکی طور پر ان کے افسانوں میں یہ محسوس ہوتا ہے کہ پلاٹ کو بالکل ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔

وقار عظیم۔ اس حد تک اس دور کے کسی افسانہ نگار نے اس اصول کی پابندی نہیں کی۔ رہی موضوع کی تخصیص جس سے تکرار کا احساس ہوتا ہے تو اس کا احساس انہیں خود ہوا ہے۔ اب وہ اپنے مانوس کردار کو نئے ماحول میں چھوڑ دیتے ہیں اور اس بدلے ہوئے ماحول میں اس کے احساس کی شدت کو بیان کرتے ہیں۔ اس طرح اب تکرار کا احساس کم ہو گیا ہے۔ یہ چیز آگے بڑھی تو ان کے افسانوں میں یقیناً وسعت پیدا ہو گی۔ اس طرح یہ ایک نئی راہ ہے جو انہوں نے نئے لکھنے والوں کو سجھائی ہے۔

عبادت۔ اس نے ان کی تکنیک اور انداز بیان میں شدت پیدا کی ہے یا اسے شدت کہنے کے بجائے صحیح طور پر خلوص کے ساتھ پیش کرنا کہا جا سکتا ہے مثلاً "سانجھ بھئی چوندیس" میں ایک شخص پاکستان سے ہندوستان واپس جاتا ہے تو ریل میں جمنا کے پل پر سے گزرتے ہوئے جب وہ ہندوؤں کو پیسے پھینکتے نہیں دیکھتا تو خود بے اختیار ہو کر پیسے پھینکنے لگتا ہے۔ یہ اور اس طرح کے چھوٹے چھوٹے واقعات کے جذباتی بیان سے ان کے افسانوں میں بڑا گہرا اور مستقل تاثر پیدا ہوتا ہے۔

ندیم۔ فسادات کے بعد جو افسانے لکھے گئے ہیں ان میں سے اکثر ناکام ہیں۔ موجودہ تبدیلیوں کے بارے میں سب سے پہلے انتظار حسین نے لکھا ہے اور ان کے افسانے کافی اچھے ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ پلاٹ اور کردار کی روایتی ہم آہنگی سے انہوں نے بڑا انحراف کیا ہے۔

عبادت۔ انہیں معاشرت کی اہمیت کا احساس زیادہ ہے اور یہ چیز قدرتی پر اسی طرح زیادہ واضح کی جا سکتی ہے۔ اگر کردار کے مدوجزر حرکات و سکنات سے واضح کیے جا سکیں تو یہ کامیابی کی دلیل ہے۔

وقار عظیم۔ اس پورے ماحول میں صرف طبقے کی عکاسی نہیں بلکہ متوسط طبقے کی بھی ہے۔ ان چیزوں سے انتظار کو بڑا گہرا ہے۔ لیکن اس میں جب کوئی خامی نظر آتی ہے تو وہ اتنی تلخی اس کا ذکر کرتے ہیں کہ ماحول سے الگ معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ کہیں کہیں تو ایک بڑے Cynic کا سا انداز ہو جاتا ہے۔ نشتر کی کیفیت معلوم نہیں کس وجہ سے ہے۔

ندیم۔ انتظار حسین نئے لکھنے والوں میں نمایاں ترین ہیں۔

عبادت۔ ان کی تمام چیزوں میں وہی کیفیت ہے جو بلونت سنگھ کے یہاں ہے، وہی حیات نگاری ہے، ان کو پڑھنے کے بعد ا زمانے کی زندگی کا بڑا شدید احساس ہوتا ہے۔ اس معاشرت ساتھ ان کا انداز بیان پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ محاوروں اور کا استعمال کرداروں کی ذہنی سطح کے مطابق ہونا بڑی خوبی ہے۔ کے یہاں محاورہ ڈپٹی نذیر احمد کی طرح ٹھونسا ہوا نہیں ہے۔ خیال کی روانی کے ساتھ آتا ہے۔ ماحول کی وضاحت میں بھی ا سے مدد ملتی ہے۔ لیکن انہیں یہ بھی محسوس کرنا چاہئے کہ 'زندگی کو باقی رکھنے کے لئے جس سے انہیں اتنی دلچسپی ہے' کون سی راہ اختیار کرنی چاہئے۔ انہیں لہجے کے دھیمے پن میں ذرا شدت پیدا کرنی چاہئے۔

وقار عظیم۔ میں اس سے متفق نہیں۔ اس میں مزاج کو د ہے اور اگر اس سلسلے میں کوئی شعوری کوشش کی گئی تو تصنع پید جائے گا۔

محمد طفیل۔ اگر یہ بقدر ضرورت پلاٹ پر بھی توجہ دینے لگیں ان کے افسانے زیادہ جاندار ہو جائیں گے۔ پھر ان کے افسا میں محاوروں کی جو بھرمار ہوتی ہے۔ وہ بُری طرح کھلتی ہے۔

وقار عظیم۔ ان کے افسانوں میں جو محاورے آتے ہیں ضرورت کے تحت آتے ہیں۔ چنانچہ ان کے حال کے افسانوں محاورے نہیں ہیں۔

محمد طفیل۔ اگر ان کے حال کے افسانوں میں محاورے نہیں تو ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہاں انہوں نے ضرورت نہیں بلکہ یہ کہ ان کے ہاں محاوروں کا اسٹاک ختم ہو گیا ہے۔

عبادت۔ اب نئے لکھنے والوں میں اشفاق احمد رہ جاتے ہیں بہت ذہین افسانہ نگار ہیں اور اسی سکول کے نمائندہ ہیں جس بلونت سنگھ اور انتظار حسین متعلق ہیں۔

وقار عظیم۔ مجھے بہت اختلاف ہے۔ بلونت سنگھ اور انتظار حسین نے اپنے لئے علاقے کی تخصیص کر لی ہے لیکن اشفاق احمد نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے کئی افسانے بچوں سے متعلق ہیں جن میں انہوں نے ان کے نرم و نازک احساسات کی بڑی فن کارانہ ترجمانی کی ہے۔ بعض افسانوں میں وہ رومان پیش کرتے ہیں۔ ان کی یہ نمایاں خوبی ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو کو بڑی شگفتگی سے پیش کرتے ہیں۔

بچوں کے لئے ان کے دل میں بڑی محبت ہے، وہ انہیں انسانیت کے مستقبل کی امانت سمجھتے ہیں۔ ان کا احترام کرتے ہیں اور یہ پوری انسانیت کی خدمت ہے۔ ہمارے اور کسی افسانہ نگار کے یہاں یہ بات نہیں۔

عبادت۔ اشفاق کے تمام افسانوں کا ایک فنی معیار ہوتا ہے، وہ باشعور افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے پاکستان کی ثقافتی تبدیلی بھی کہانی لکھی ہے۔

وقار عظیم۔ ان کی نظر ایک جگہ ٹھہری ہوئی نہیں ہے لیکن جہاں ٹھہرتی ہے وہاں تمام جزئیات کا جائزہ لیتی ہے۔ انہوں نے پرانے ادب اور شعر کو بڑے حسن سے اپنے افسانوں میں رچایا ہے۔ غالب، حافظ اور میر درد ان سب کا کلام ان کے سامنے ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ باقی طرز بیان میں بھی اس کی مطابقت کا خیال رکھنا پڑتا ہے جس سے ان کے افسانوں میں بڑی ہمواری اور روانی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ مخلص فن کار ہیں اور ماحول کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔

انتظار حسین۔ پنجاب کے افسانہ نگار نادانستہ طور پر پنجابی الفاظ لاتے ہیں لیکن اشفاق احمد اس امر کی شعوری کوشش اور اہتمام کرتے ہیں۔ اس سے تاثر کہیں بڑھ جاتا ہے۔

عبادت۔ اس سے انتظار حسین، بلونت سنگھ اور اشفاق سب کام لیتے ہیں۔

وقار عظیم۔ ایک فرق البتہ ہے۔ انتظار حسین کو اس خاص طرح کے انداز سے فطری لگاؤ ہے۔ اشفاق اور بلونت سنگھ کے یہاں ہر جگہ اس کا انداز شعوری ہے۔ اس سے بعض اوقات خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن اشفاق احمد کی اس شعوری کوشش میں ہر جگہ یہ احساس موجود ہے کہ بیان کو فنی تخلیقات کے حسن و تاثیر میں بڑا دخل ہے اور اس لئے وہ ہمیشہ اس کے بنانے سنوارنے پر پوری توجہ صرف کرتے ہیں۔

محمد طفیل۔ انہوں نے پنجاب کی دیہاتی زندگی کے بارے میں بھی کئی کامیاب افسانے لکھے ہیں۔

وقار عظیم۔ وہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو ایک خاص قسم کے افسانے لکھنے کے لئے نہیں چنا۔

عبادت۔ نئے لکھنے والوں میں اے حمید کا نام بھی رہ گیا۔

وقار عظیم۔ نام تو کئی اور ہیں، مثلاً دیویندر اسر کا ذکر ضرور ہونا چاہئے کیونکہ ہماری موجودہ زندگی میں جو انتشار پیدا ہوا ہے اس کا ذکر تو افسانہ نگاروں نے کیا ہے لیکن اس کی ذمہ داری کس پر ہے، اس کے اظہار میں عموماً جھجک محسوس کی ہے۔ اسر نے عام انداز کے خلاف اس معاملہ میں پوری جرات کے ساتھ اس کی ذمہ داری ارباب سیاست پر رکھی ہے۔

عبادت۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ زندگی کے متعلق ایک واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔

وقار عظیم۔ ایک وجہ یہ ہے اور دوسری یہ کہ جس ماحول میں اسر رہتے ہیں وہاں اظہار پر اتنی پابندیاں نہیں ہیں۔ ہمارے لکھنے والوں کو غالباً یہ اندیشہ بھی ہے کہ پڑھنے والے اتنے جذباتی ہیں کہ وہ لکھنے والے کے نقطۂ نظر کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے ___ جی ہاں! میں دیویندر اسر کا ذکر کر رہا تھا اور بتانا مقصود تھا کہ نئے لکھنے والوں میں صرف دو ہی نام نہیں بلکہ کئی نام توجہ کے مستحق ہیں۔ لیکن ابھی ان کے کارناموں پر انفرادی حیثیت سے گفتگو شاید قبل از وقت ہے اس لئے بہتر ہے کہ ہم ان لکھنے والوں کی ایسی خصوصیات کا ذکر کر لیں جو سب میں مشترک ہیں۔ اس سلسلہ میں بعض چیزیں نمایاں ہیں مثلاً ایک عام رجحان یہ ملتا ہے کہ کسی افسانہ نگار نے اپنے آپ کو فسادات کے موضوع سے ملوث کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی وجہ غالباً ان لکھنے والوں کے نزدیک یہ تھی کہ اگر اپنے لئے جگہ پیدا کرنی ہے تو نئے موضوع تلاش کرنے چاہئیں۔ پھر یہ کہ یہ سب نئے لکھنے والے فن کی روایات کی پابندیوں کو بے حد ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس انتشار کے دور میں بھی روایت کو ٹھیس نہیں پہنچی اور نہ وہ پیچھے کی طرف گئی۔ موجودہ حالات میں یہ بھی فن کی بڑی خدمت تھی۔ دوسری چیز جو ان سب افسانہ نگاروں میں مشترک ہے، وہ زندگی کا احساس ہے۔ ہر ایک نے اپنے آپ کو کسی نہ کسی خاص زندگی سے وابستہ کیا ہے اور اسی کو موضوع بنایا ہے مثلاً شوکت صدیقی کے وہ افسانے

زیادہ کامیاب ہیں جن میں انہوں نے لکھنو کے نوابوں اور بیگموں وغیرہ کی زندگی کی مصوری کی ہے ___ نئے لکھنے والوں میں صرف انہی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور اسے ایک نئے رنگ سے پیش کیا ہے۔ ان کے اس طرح کے افسانوں میں زندگی کے مسائل کا احساس نچلے طبقے کے لوگوں کو بھی ہے اور نوابوں اور بیگموں کو بھی۔

ندیم۔ شوکت صدیقی بالکل نئے لکھنے والے نہیں ہیں۔ وہ کافی عرصے سے لکھ رہے ہیں۔ شروع میں معمولی درجے کے افسانے لکھے ہیں لیکن اس دور میں اچھے افسانے بھی لکھے ہیں۔

عبادت۔ نئے افسانہ نگاروں نے جو روایت قائم رکھی ہے اس میں ان افسانہ نگاروں کی کوششوں کے علاوہ اس روایت کی عظمت کو بھی بڑا دخل ہے' ہمارے افسانے نے بڑی عظیم روایت قائم کی ہے' اسے برقرار رکھنا ان لوگوں کے لئے ضروری تھا۔ نئے لکھنے والوں میں کوئی بھی ایسے Calibre کا نہیں ہے جیسے ان کے پیش رو تھے۔ ان کی سطح اپنے پیش روؤں سے بہت نیچی ہے۔ ان کے احساس میں بھی وہ شدت نہیں جو پہلے افسانہ نگاروں میں تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے زندگی کو نسبتاً کم دیکھا ہے۔ ان کے احساس میں شدت بھی نہیں ہے' شعور میں بیداری بھی نہیں' یہی وجہ ہے کہ ان کے فن میں وہ عظمت نہیں ہے جو ان کے پیشروؤں کے فن میں نمایاں نظر آتی ہے۔

وقار عظیم۔ ابھی یہ افسانہ نگار اپنی تخلیقی زندگی کی اس منزل تک نہیں پہنچے کہ ہم انکے کارناموں پر کوئی قطعی حکم لگا سکیں لیکن ان کی تحریروں میں اس عظیم روایت کی موجودگی اور اس کی پابندی کا احترام ایسی چیزیں ہیں جنہیں مستقبل کے لئے نیک فال کہا جا سکتا ہے۔

عبادت۔ ان سب کے یہاں اس رجحان کا احساس بھی ہوتا ہے کہ ان میں سے بیشتر رومانیت بلکہ کہیں کہیں سستی جذباتیت کی طرف مائل ہیں۔

وقار عظیم۔ یہ صحیح ہے لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ ابھی ہمارے پورے ماحول میں وہ ہمواری پیدا نہیں ہوئی کہ کسی چھوٹے سے واقعے کو موضوع بنا کر اس پر کچھ لکھا جا سکے' اور اسلئے یہ لکھنے والے رومانیت کے سہارے [illegible]

عبادت۔ ان میں سے بیشتر کے [illegible] ایک فراری کیفیت ہے زندگی کا کوئی [illegible] ان کے یہاں نہیں ہے اور [illegible] جب تک کوئی واضح [illegible] کو محرول سے [illegible] نگاروں میں سے بیشتر کے [illegible] مثال ہے۔

وقار عظیم۔ اس فرار کی ایک شکل [illegible] نمایاں ہے اور وہ اس طرح کہ ان کے [illegible] ہیں جن میں قہوہ خانوں کا ماحول ہے' یہ زندگی کی تلخیوں سے آنکھ چراتے ہیں۔ ان میں اس کا مقابلہ کرنے کی جرأت اور اس لئے سختیوں سے بھاگ کر ایسی جگہ جانا چاہتے ہیں جہاں چھپ کر تلخیوں کا مذاق اڑا سکیں۔

عبادت۔ اے حمید ایسے افسانہ نگار ہیں جن کے یہاں یہ ر[ویہ] ملتا ہے۔ ان کے افسانوں کی جذباتی اور رومانی فضا اس کو ظاہر [کرتی] ہے۔ انہیں زندگی کی تلخیوں کا احساس ضرور ہے لیکن وہ ان [تلخیوں] کو برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ اگر یہ سکت ان [میں] ہوتی تو ان کے فن میں بڑی توانائی پیدا ہو سکتی تھی۔

وقار عظیم۔ ایک وجہ اور بھی ہے کہ ان لوگوں نے (اشفاق اور [...] کو الگ کر کے) جہاں زندگی کا مشاہدہ نہیں کیا دوسری طرف اور فلسفہ کا بھی مطالعہ نہیں کیا کہ خیال میں وسعت پیدا ہوتی۔

عبادت۔ لیکن اے حمید کے ہاں ایک چیز ہے یعنی زندگی [کے] مظاہر سے دلچسپی ___ ہر چند کہ اس دلچسپی میں بچپن کی سادگی [اور] معصومیت کو دخل ہے لیکن یہی ان کے فن کی جان ہے ___ ان [کے] ہاں زندگی سے دلچسپی کا رجحان ضرور ملتا ہے جس کا اظہار موسموں' پہاڑوں اور دریاؤں کے بیان میں کرتے ہیں۔

نئی پود کے افسانہ نگاروں میں اے حمید کا فن اس اعتبا[ر سے] منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

ندیم۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ وہ اس میں توازن قائم نہیں ر[کھ سکے۔ ب]جائے اس کے کہ وہ حقیقت پسندی کی راہ پر چلتے انہو[ں نے] رومانیت کا سہارا لیا۔

انتظار حسین۔ اصل میں ان کے ہاں [C]ommon Man [کا] زاویہ نظر ملتا ہے۔ مصنف عام آدمی سے الگ نہیں دکھائی د[یتا۔] ہر چیز کو رومان کی عینک سے ضرور دیکھتے ہیں۔ لیکن ان کی رو[مانیت] میں جو سادگی اور معصومیت ہے وہ اپنے اندر بلا کی دلکشی رکھتی [ہے۔]

محمد طفیل۔ آپ حضرات مذاکرہ ختم کر چکے لیکن میری رائے ہے کہ اگر ہم تین چار افسانہ نگاروں کا ذکر اور کر لیتے [...]

منٹو، بیدی، مرزا ادیب، چودھری محمد علی ردولوی، قدرت اللہ شہاب، شمیم، نسیم اور ابوالفضل صدیقی سے ہے۔

عبادت۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ ہم نے اپنی گفتگو میں سب شمار نام لئے ہیں لیکن یہ نام محض اس لئے نہیں لئے گئے کہ ہم انفرادی طور پر ان کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کرنا چاہتے تھے۔ اصل مقصود یہ تھا کہ ہم ناموں کے ساتھ ساتھ یہ دیکھتے چلیں کہ ان کے انفرادی فن نے ہمارے افسانہ کی روایت کو آگے بڑھانے میں کیا حصہ لیا ہے۔

وقار عظیم۔ عبادت صاحب کا خیال بالکل صحیح ہے لیکن طفیل صاحب کا مقصد بھی غالباً یہی ہے کہ ان افسانہ نگاروں نے بھی ہمارے افسانہ کی روایت کو کوئی نہ کوئی چیز دی ہے اس لئے روایت اور جدت کے تسلسل کے تذکرہ میں ان کا ذکر آنا ضروری ہے۔

محمد طفیل۔ جی ہاں! میرا یہی خیال ہے۔

وقار عظیم۔ تو پھر آیئے ان افسانہ نگاروں کے فن کے ان پہلوؤں پر گفتگو کر لیں جن کی بدولت ہماری افسانوی روایت کسی نہ کسی جدت سے آشنا ہوئی ہے۔ سب سے پہلے چودھری صاحب کے افسانوں کو لیجئے۔

عبادت۔ چودھری صاحب خاصے پرانے افسانہ نگار ہیں اور بڑی مدت سے خاموشی کے ساتھ لکھ رہے ہیں اور اس خاموشی کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جو خدمت ہمارے افسانے کی انہوں نے کی اس کی داد بعد میں آنے والوں کو ملی۔

وقار عظیم۔ آپ کا اشارہ شاید ان خاص طرح کے افسانوں کی طرف ہے جن میں چودھری صاحب نے جنسی مسائل کو بڑے لطیف اور نازک فنی انداز میں پیش کیا ہے۔

عبادت۔ جی ہاں! بالکل انہی افسانوں کی طرف۔ جنسی مسائل کو افسانہ کا موضوع بنانے کی جو روش متوسط دور کے لکھنے والوں میں نظر آتی ہے اور جس کی مختلف صورتیں ہمیں منٹو، عصمت اور ممتاز مفتی کے افسانوں میں نظر آتی ہیں اس کی ایک نکھری ہوئی شکل چودھری محمد علی کے افسانوں میں ہے۔

وقار عظیم۔ [illegible] ذکر کرتے وقت ندیم صاحب نے فرمایا تھی کی [illegible] ہے۔

ندیم۔ مجھے یاد [illegible]

وقار عظیم۔ آپ [illegible] جنسی مسائل اور خاص کر ان مسائل کے نفسیاتی پہلو کی عکاسی کرنے کے لئے بیان پر جس قدرت کی ضرورت ہے وہ مفتی کو میسر نہیں۔ چودھری محمد علی کا امتیاز، بیان کی یہی قدرت ہے۔

ندیم۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک خاص طرح کے ماحول اور اس کے کرداروں سے پوری طرح واقفیت اور بے تکلفی۔

وقار عظیم۔ چودھری صاحب کے بعض افسانے پڑھ کر تو مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ موضوع سے پوری واقفیت اور بیان پر پوری قدرت ہو تو سیدھی سادی کہانی میں بھی ایک طلسم کا سا انداز پیدا ہو جاتا ہے۔

انتظار حسین۔ یوں اس طرح کے طلسم تو قدرت اللہ شہاب نے بھی باندھے ہیں۔

وقار عظیم۔ آپ کی اجازت سے میں آپ کے بیان میں تھوڑی سی ترمیم کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ قدرت اللہ شہاب نے طلسم باندھنے کی کوشش تو ضرور کی ہے لیکن طلسم باندھنے میں انہیں کامیابی ذرا کم ہی ہوئی ہے۔

انتظار حسین۔ مجھے اس معاملہ میں آپ سے اتفاق نہیں "یاخدا" ایک مکمل طلسم ہے۔

وقار عظیم۔ "یاخدا" کی حد تک تو سب آپ سے متفق ہوں گے لیکن یہاں ذکر مختصر افسانوں کا ہے اور شہاب کے مختصر افسانوں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ جب جنسی پہلو کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو ایک پست قسم کی لذتیت ان کے پورے افسانے پر چھا جاتی ہے۔

محمد طفیل۔ لیکن انہوں نے سارے افسانے جنسی پہلوؤں ہی پر تو نہیں لکھے۔ پھر ان کے ہاں اظہار کی جرات بھی ہے۔ جرات کے بجائے شدید جرات کا لفظ مناسب ہے۔ بعض اوقات تو حیرانی ہوتی ہے کہ ایک گزیٹڈ آفیسر اس طرح بھی ہو سکتا ہے۔

وقار عظیم۔ جی ہاں! یہ صحیح ہے۔ شہاب کے موضوع متنوع ہیں اور ان متنوع موضوعات میں نفسِ مضمون اور طرز بیان کے اعتبار سے دو چیزیں مشترک ہیں۔ نفسِ مضمون کے اعتبار سے تو یہ کہ وہ ہماری معاشرتی زندگی کے کسی ایسے پہلو کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں (اور اس میں ان کے جنسی افسانے بھی شامل ہیں) جس میں بھرپور طنز اور بیدردانہ تنقید کی گنجائش ہو اور اظہار کے نقطہ نظر سے یہ کہ اس بات کو وہ پوری دلیری سے بیان کرتے ہیں۔

یہاں تک کہ اس میں پستی یا سوقیت کے پیدا ہو جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔

عبادت۔ اور اس طرح وہ توازن ختم ہو جاتا ہے جسے ہم فن اور تاثیر سے تعبیر کرتے ہیں۔

وقار عظیم۔ اس کے باوجود ہمارے افسانہ میں جرأت اظہار کی روایت بہت عام نہیں ہے اور عصمت، منٹو اور ہاجرہ مسرور کے علاوہ بہت کم کہیں دکھائی دیتی ہے اسے شہاب نے ایک نئی شکل دے کر اس روایت کو وسعت دی ہے اور یہ ان کی خدمت ہے۔

محمد طفیل۔ تسنیم صاحبہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟

وقار عظیم۔ یہ بات پہلے ندیم صاحب بتائیں گے۔

ندیم۔ صاحب! میں تسنیم کو کئی حیثیتوں سے مکمل افسانہ نگار سمجھتا ہوں ___ پہلی تو یہ کہ وہ موضوع کے انتخاب کے لئے اِدھر اُدھر کبھی نہیں بھٹکی۔ اب آس پاس کی زندگی میں اس نے ایسے بے شمار موضوع تلاش کر لئے ہیں جن میں اچھا افسانہ بننے کی صلاحیت ہے۔ دوسری خاص بات یہ ہے کہ تسنیم کا کوئی افسانہ پڑھ کر پڑھنے والا اپنے ذہن پر کسی طرح کا بوجھ نہیں محسوس کرتا۔ ہلکی پھلکی، سیدھی سادی شگفتہ فضا ہے اور اسے ہلکے پھلکے، سیدھے سادے شگفتہ انداز میں پیش کر دیا گیا ہے ___ نہ کہیں افسانہ کی رفتار میں بوجھل پن ہے، نہ اس کے طرزِ بیان میں۔

عبادت۔ لیکن اس کی وجہ آخر کیا ہے ؟

وقار عظیم۔ صاحب! مجھے تو ان ساری باتوں کی ایک ہی وجہ معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ ہماری دوسری افسانہ نگار خواتین کی طرح تسنیم کسی طرح کے Complex میں مبتلا نہیں ہیں۔ عصمت، ہاجرہ، خدیجہ، قرۃ العین حیدر سب کے ذہن بظاہر کسی نہ کسی نفسیاتی اُلجھن میں پھنسے ہوئے ہیں اور ان اُلجھنوں سے ان کے فن میں جا بجا صاف گرہیں پڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ تسنیم کا ذہن ان اُلجھنوں سے خالی ہے اور اس لئے اس کا فن ہموار اور مصفا ہے۔ [illegible] کے ہاں زندگی کے مسائل آتے ضرور ہیں لیکن وہ [illegible] میں بیڑیاں ڈال کر نہیں بیٹھ رہتے اور اس طرح [illegible] سے فن کا ایک بڑا اچھا سبق یہ ملتا ہے کہ افسانہ نگار [illegible] خلوص اور سادگی سے لکھتا ہے تو اس میں تاثیر ضرور ہوتی [illegible]

ندیم۔ تسنیم [illegible] سے جو [illegible] ہے اس نے بھی افسانوں میں بے تکلف روانی کی یہ فضا پیدا کی ہے۔

محمد طفیل۔ ان کے ہاں اتنا خلوص ہے جو کسی افسانہ نگار میں نہیں ہے وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہیں قاری پر اثر انداز ہو جاتا ہے۔

وقار عظیم۔ ہاں صاحب یہ تو حقیقت میں ہماری افسانہ نگاری کا ایک اہم رجحان بن گیا ہے کہ ہمارے اکثر افسانہ نگار اپنے ماحول اور اپنے کرداروں کے متعلق لکھتے ہیں جن سے وہ اچھی طرح مانوس ہیں۔

محمد طفیل۔ اور اس لحاظ سے مجھے ابوالفضل صدیقی میں جو بات نظر آتی ہے کسی اور میں نہیں دکھائی دیتی۔ جس خاص طرح کے ماحول کی عکاسی اس نے اپنے افسانوں میں کی ہے کسی اور افسانہ نگار نے نہیں کی۔ اس کی زبان اور بیان بھی اپنا ہے۔ اسے اس ماحول کی جزئیات کا اتنا علم ہے اور وہ اس علم کو اس نئے انداز میں اس بے تکلفی اور خوبصورتی سے بیان کرتا ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹے موضوع پر خاصا طویل افسانہ لکھ سکتا ہے۔

عبادت۔ اور اس طرح پڑھنے والوں کو بور بھی کر سکتا ہے۔

وقار عظیم۔ طوالت اور بوریت میں ایک قریبی تعلق ہے اور اس لئے اگر ابوالفضل صدیقی کسی طرح اپنے آپ کو اختصار اور اعتدال کی طرف مائل کر سکیں تو ان کی وہ خوبیاں جن کا طفیل صاحب نے ذکر کیا، انہیں بڑا کامیاب افسانہ نگار بنا دیں۔

محمد طفیل۔ ہم نے بزعم خود تمام افسانہ نگاروں کا ذکر کر لیا، پھر بھی کئی ایک افسانہ نگار چھوٹے جا رہے ہیں۔ ان میں سے کم از کم انور اور جلیس کا ذکر یہاں ضرور ہونا چاہئے۔

عبادت۔ ابراہیم جلیس کے بارے میں گفتگو ہو چکی ہے۔ انہوں نے افسانے میں کوئی خاص تجربہ نہیں کیا۔ کم و بیش انہی موضوعات پر انہوں نے افسانے لکھے ہیں جن پر اس دور کے بیشتر افسانہ نگار لکھتے رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے متوسط طبقے کے افراد کی زندگی، ان کی معاشی اُلجھنیں، ان کی اقتصادی پریشانیاں ___ جلیس نے زندگی کو قریب سے دیکھا ہے۔ طبقاتی سماج پر جو کچھ گزرتی ہے اس کا وہ گہرا شعور رکھتے ہیں ___ اسی کیفیت کے مختلف پہلوؤں کو انہوں نے اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ جلیس کی تکنیک میں ویسے کوئی ایسی بات نہیں جس کو اہم تجربہ کہا جا سکے لیکن انہیں واقعات کو کہانی کا روپ دینے کا گر آتا ہے اور وہ اس کو خوبی کے ساتھ برتتے ہیں ___ البتہ خاکے کی طرف انہوں نے خاص طور پر توجہ کی ہے اور اس میں شک نہیں کہ بعض بہت اچھے خاکے انہوں

[illegible]: انہیں زندگی کا شدید احساس ہے اور اس شدید احساس کا ہی نتیجہ ہے کہ انہوں نے بعض اچھے افسانے لکھے ہیں۔

محمد کامل: ان پر کرشن چندر کا اثر معلوم ہوتا ہے۔

[illegible]: شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ کرشن چندر جو کچھ اپنے افسانوں میں پیش کرتے ہیں اور جس طرح پیش کرتے ہیں اس میں ہمارے نوجوانوں کی ذہنی اور جذباتی کیفیات کی ترجمانی ہوتی ہے اس لئے ان کے فن کا رنگ نوجوان افسانہ نگاروں پر بہت جلد چڑھ جاتا ہے۔ بعض کرشن چندر کے انداز میں سوچتے ہیں اور اس لئے اسی طرح اس کو پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ندیم: ان کے انداز بیان میں خاصی روانی پائی جاتی ہے اور اس خصوصیت نے ان کے افسانوں میں دلآویزی پیدا کی ہے۔

وقار عظیم: ہم نے "روایت اور تجربے" کے موضوع پر خاصی طویل گفتگو کی اور اس طویل گفتگو میں ایک خاص نقطہ نظر سے اپنے مختصر افسانہ کی تقریباً پچاس برس کی تاریخ کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ اس جائزہ کے سلسلے میں اُردو کے بے شمار افسانہ نگاروں کی فنی تخلیقات اور ان کی اہم خصوصیات کا تذکرہ آیا۔ بعض لکھنے والوں کا تذکرہ بار بار کیا گیا اور خاصی تفصیل سے کیا گیا بعض کا ذکر محض سرسری انداز سے ہوا۔ بعض لکھنے والے شاید ایسے بھی ہوں جن کا ذکر بالکل نہیں آیا۔ لیکن چونکہ فرداً فرداً سب افسانہ نگاروں کے فنی مرتبہ اور حیثیت کا تعین اس گفتگو کا مقصد نہیں تھا اس لئے کسی نام کا سونا یا نہ ہونا اس کے بڑے یا چھوٹے ہونے کی دلیل ہرگز نہیں۔ گفتگو کا مقصد تو صرف یہ دیکھنا تھا کہ جب ہمارا افسانہ شروع ہوا تو اس کی اساس کون کون سی ایسی چیزیں تھیں جنہیں ہم اس کی روایت کہہ سکیں۔ اس اساس میں وقت کے ساتھ ساتھ کیا اضافے ہوئے اور کس طرح افسانہ کی روایت ایک سیدھی سادی روایت سے بڑھ کر اس بلند مقام تک پہنچی جہاں ہم اسے آج دیکھ رہے ہیں (یا اب سے چند برس پہلے دیکھ چکے ہیں)۔

افسانوی روایت کے ارتقا کی اس تاریخ میں بعض ناموں کی اہمیت یقیناً دوسروں سے زیادہ ہے ____ کچھ کی اس لئے کہ انہوں نے افسانہ کو اس کی اساسی حیثیت بخشی، کچھ کی اس لئے کہ انہوں نے اس اساس پر بلند تعمیریں کیں اور کچھ کی اس لئے کہ انہوں نے کبھی کبھی ایسے مشکل حالات میں جب بڑی سے بڑی اور پختہ سے پختہ روایت کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں اس عمارت کو گرنے سے مسمار ہونے سے بچایا ہے۔ مثلاً ان ناموں میں سب سے اہم نام پریم چند کا ہے ____ ایسا کئی وجوہ سے ہے۔ ایک تو اس لئے کہ پریم چند ہمارے افسانے کی روایت کے بانی ہیں، دوسرے اس لئے کہ اپنی افسانہ نگاری کے تیس برس کی عمر میں انہوں نے اس روایت میں طرح طرح کی جدتوں اور تجربوں سے بے شمار اضافے کئے۔ افسانہ اپنی زندگی کے ابتدائی تیس برسوں میں روایت اور تجربہ کی جن جن منزلوں سے گزرا ہے وہ ساری کی ساری منزلیں ہمیں پریم چند کے افسانوں میں نظر آتی ہیں اور اس طرح "دنیا کا سب سے انمول رتن" سے "کفن" تک افسانہ کی روایت [illegible] ارتقا اور عروج کی ساری داستان درج ہے۔ روایت نے ابتدا سے عروج تک پہنچتے پہنچتے جو راہیں طے کی ہیں ان سب راہوں میں [illegible] حیثیت محض رہرو کی نہیں رہنما کی ہے اور یہ چیز ان کی اہمیت کا تیسرا نمایاں پہلو ہے۔

پریم چند کا افسانہ روایت اور تجربہ کی جن مختلف منزلوں سے گزرا ہے انہیں چھ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس کی ابتدا تو وہ ہے [illegible] "سوز وطن" کے افسانوں میں ہمیں گہری مقصدیت، شدید قسم کی جذباتیت اور فضا اور طرز بیان پر داستانوں کی شعریت، رنگینی [illegible] چھائی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ "پریم پچیسی" اور "پریم بتیسی" کے تاریخی، نیم تاریخی اور روایتی افسانوں میں [illegible] جذباتیت تو موجود ہے لیکن داستانوں کا فوق الفطرت بہت کم ہو گیا ہے۔ ذرا اور آگے چل کر تاریخ کی جائے زندگی افسانوں [illegible]۔ مقصدیت میں پھیلاؤ پیدا ہو گیا ہے اور اس نے معاشرتی اور اخلاقی اصلاح پسندی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ بیان میں [illegible] اب بالکل نہیں رہے لیکن شعریت اور خطابت اب بھی ہے۔ اس سے اگلے دور میں ماحول اور مسائل کی تخصیص پیدا ہو گئی [illegible] میں اب بھی دھیما پن ہے۔ پانچویں دور میں ماحول کی تخصیص کے ساتھ نقطہ نظر میں وسعت

ہوئی ہے۔ اب نظر سماجی اور اخلاقی مسائل سے ہٹ کر سیاست پر بھی جاتی ہے اور باتوں کو دیکھے انداز میں کہنے کی طرف بھی توجہ ہے۔ آخری دور وہ ہے کہ افسانہ نگار واقعہ سے زیادہ اشخاص کو اپنے افسانہ کا موضوع بناتا ہے اُن کے خارجی ماحول سے زیادہ اس کی داخلی کیفیتوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس نے اس دور میں حقیقت اور فن کا مکمل امتزاج بھی کیا ہے اور اپنے فن کو اپنی شخصیت کا مکمل مظہر بھی بنایا ہے۔ پریم چند کی افسانہ نگاری کے یہ مختلف دور حقیقت میں اُردو افسانہ کی روایت کے ارتقا کی مختلف منزلیں ہیں۔ ان مختلف منزلوں میں پریم چند نے ایک تنہا مسافر کی طرح کبھی سفر نہیں کیا۔ ہر دور میں ان کے ساتھ ایسے لکھنے والوں کا ایک کارواں رہا ہے جس کے ہر فرد نے ان کی بنائی ہوئی روایتوں کو اختیار کر کے ان کی پیروی کی ہے۔ پہلے اور دوسرے دور میں سدرشن ان کے ساتھ ہیں۔ تیسرے دور میں علی عباس حسینی اور اعظم کریوی ہیں چوتھے اور پانچویں دور میں بے شمار لکھنے والے ان کے رنگ میں ڈوبے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ حامد اللہ افسر، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، اختر انصاری ان میں سے چند ہیں۔

پریم چند نے افسانہ کے بالکل ابتدائی دور میں اسے مقصدیت اور داستانی رنگ کی روایت دی۔ تقریباً اسی زمانہ میں سلطان حیدر جوش نے ایک خاص ماحول کی زندگی کے پس منظر میں اصلاحی مقصد سے افسانے لکھے اور اس طرح داستانی رنگ سے بچ کر حقیقت نگاری اور مقصد نگاری کے امتزاج کی روایت شروع کی۔ تقریباً اسی زمانہ میں سجاد حیدر یلدرم نے افسانہ کو رومانیت کی روایت سے آشنا کیا اور اس طرح احساس کی حیثیت سے روایت کے تین پہلو افسانہ کا جزو خاص بنے ____ مقصدیت اور داستانی رنگ، مقصدیت اور حقیقت نگاری، رومانیت اور فنی لطافت کا احساس آنے والے ہر دور میں افسانہ کی روایت انہیں تین راستوں پر چل کر موجودہ دور تک پہنچی ہے۔ حقیقت نگاری کی روایت کو پریم چند کے علاوہ حسینی، حامد اللہ افسر، عظیم بیگ چغتائی، منٹو، بیدی، حیات اللہ انصاری، احمد علی، اختر انصاری، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، عصمت چغتائی، بلونت سنگھ، غلام عباس، ہاجرہ مسرور اور انتظار حسین نے زندہ رکھا، ترقی کی نئی راہیں دکھائیں اور فن کی بلندیوں تک پہنچایا۔ رومانیت کی روایت سجاد حیدر یلدرم کے علاوہ نیاز فتح پوری، ل احمد اکبر آبادی، مجنوں گورکھ پوری، حجاب امتیاز علی کے ہاتھوں پلی، بڑھی اور پروان چڑھی۔ سدرشن، اعظم کریوی، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی اور قرۃ العین حیدر نے حقیقت اور رومانیت کے امتزاج سے اس روایت کو چار چاند لگائے۔

فن کے جس رجحان کا احساس سجاد حیدر یلدرم کے ترجموں نے پیدا کیا تھا اسے خواجہ منظور، بشیر الدین، منصور احمد، جلیل قدوائی [illegible] کے افسانوں کے ترجموں اور محمد مجیب کے روسی انداز کے افسانوں نے جلا دی ____ یہاں تک کہ ۳۵ء، ۳۶ء تک ہمارے [illegible] حقیقت، رومانیت اور فنی احساس نے ایک عظیم المرتبہ روایت کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔ پریم چند کے فن، ترقی پسندی کی [illegible] اور "انگارے" کے باغیانہ انداز نے تجربوں کی بے شمار راہیں کھول دیں اور تقسیم سے بہت پہلے علی عباس حسینی، کرشن چندر، [illegible] انصاری، عصمت، اختر انصاری، احمد علی اور اختر اورینوی نے اور اس کے ذرا بعد حسن عسکری، بلونت سنگھ، غلام عباس، [illegible] شکیلہ، دیویندر ستیارتھی، ہاجرہ مسرور اور قدرت اللہ شہاب نے جو کچھ لکھا اس سے حقیقت نگاری میں نئے نئے باب [illegible] کے بجائے کسی خاص ماحول کی تخصیص، ایک محدود ماحول کی زندگی میں بین الاقوامی حالات کا عکس، زندگی کے پہلے [illegible] انسانیت کا تصور، واقعات کے بجائے کرداروں پر اہمیت، زندگی کے خارجی مظاہر کے ساتھ ساتھ انسان کی [illegible] جذبات کے علاوہ اس کی لاشعوری کیفیتوں کا تجزیہ، ذہنی گتھیاں اور تحلیل نفسی، زندگی سے متعلق کسی مخصوص زاویہ [illegible] کے مسائل کا اجتماعی شعور ____ یہ سب کچھ حقیقت نگاری کے زمرہ میں شامل ہو گیا اور یہ ساری چیزیں مختلف [illegible] افسانہ میں اس طرح گھل مل گئیں کہ نہ اس میں موضوعات کی کمی رہی اور نہ اس کی

تلازم کے ساتھ حقیقت میں شیر و شکر ہو گئی اور اس نے فرد کی بیزاری کا لباس پہن کر فن کو نئی سے نئی شکلیں دیں۔ اظہار و بیان میں بھی نت نئے تجربے ہوئے کچھ روسی حقیقت نگاروں کے اثر کچھ فرانسیسی رومانیت کے اثر کے ماتحت اور کچھ فرانس اور انگلستان کے لکھنے والوں کے نئے تکنیکی فن کی بدولت یہاں تک کہ تقسیم تک ہمارے افسانہ میں وہ سب کچھ آگیا جو مغرب میں افسانہ کی روایت کا بہترین عنصر سمجھا جاتا ہے۔ لکھنے والوں نے اسے کبھی جوں کا توں اختیار کر کے اور کبھی مشرقی مزاج کے رنگ میں سمو کر اپنے افسانہ کی روایت کو مالا مال کیا اور تقسیم کے بعد لکھنے والوں نے ایک ایسے دور میں جب ہر چیز انتشار کی سخت زد میں تھی اس عظیم روایت کو اپنا کر اسے زندہ و برقرار رکھا۔ وہ اب تک بظاہر اس میں کوئی اضافہ تو نہ کر سکے لیکن جس دشوار دور میں انہوں نے اس کی حفاظت کی ہے وہ اس لئے بہت اہم اور غنیمت ہے کہ اس طرح روایت کا تسلسل درہم برہم نہیں ہوا۔ ایک سیدھی سادی روایت کو بے شمار فنکاروں نے 'نئے نئے تجربوں سے ان کی ذہنی کاوشوں نے 'ان کے خون جگر نے جو عظیم الشان شکل دی تھی' وہ بجھنے نہیں پائی۔ حالات سازگار ہوں گے تو یقین ہے کہ اس کے بننے سنورنے کی صورت بھی پیدا ہو گی ـــــــ اور نئے تجربے ہماری عظیم روایت کو عظیم تر بنائیں گے۔

تصریحات

نامور افسانہ نگاروں اور نقادوں کے درمیان "اردو افسانے میں روایت اور تجربے" کے بارے میں جو یہ گفتگو ہوئی اس کے متعلق مجھے بجز اس کے کچھ نہیں کہنا ہے کہ یہ گفتگو بڑی کارآمد اور افسانوی ادب کے مخلصانہ مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ لیکن رواروی کی گفتگو میں جن چند افسانہ نگاروں کا ذکر ایک آدھ ہی فقرے میں ہوا ہے میں چاہتا ہوں ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ عرض کر دوں۔ مقصود فیصلوں کو جھٹلانا نہیں ہے' اپنی رائے کا اظہار کرنا ہے۔

میں نے اس سمپوزیم کی پہلی اشاعت پر بھی عرض کیا تھا کہ "اس بحث میں جن دوستوں کی ضرورت سے زیادہ تعریف ہو گئی ہے یا جن کی تعریف ضرور تاً بھی نہیں ہوئی ان سے مجھے بحث میں حصہ لینے والے احباب کے خلوص نیت کی خاطر معذرت کرنا ہے۔"

ان تمام باتوں کے باوجود میں چاہتا ہوں کہ زیادہ نہیں تو کم از کم اختر حسین رائے پوری' میرزا ادیب' اوپندر ناتھ اشک اور شفیق الرحمن کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کر دوں۔

ہر دور میں (مسئلہ خواہ کسی صنف ادب کا ہو) دو ایک ہی بڑے لکھنے والے ہوتے ہیں۔ لیکن ہر دور میں ایسے لکھنے والے بھی ہوئے ہیں جن کے دم قدم سے ادب میں بہار رہی۔ مندرجہ بالا افسانہ نگاروں کا میرے نزدیک یہی درجہ ہے۔

اس ساری بحث میں اختر حسین رائے پوری کا ذکر صرف اسی ایک فقرے میں آیا ہے کہ "افسانہ نگار کی حیثیت سے ان کا کوئی بڑا مرتبہ نہیں' ان کے بیشتر افسانے یا تو ترجمہ ہیں یا مغربی افسانوں سے ماخوذ۔"

انہوں نے جس دور میں افسانے لکھے' اس دور کی تمام افسانوی تخلیقات پر رومان ہی رومان چھایا ہوا تھا۔ وہ اس سے الگ ہو کر سوچ ہی نہیں سکتے تھے اور یہ بھی کہ اس وقت مغربی افسانوں کا ایک ایسا طلسم بندھا ہوا تھا' جس نے ہمارے پورے افسانوی ادب کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ساتھ ہی سجاد حیدر یلدرم اور نیاز فتح پوری کا نوجوان افسانہ نگاروں پر بڑا اثر تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے (بعد میں سہی) کئی ایک حقائق کو ترقی پسندانہ انداز میں پیش کیا اور اپنی سابقہ روش کو جس میں محض رومان ہی رومان رہا تھا' ترک کر دیا اور کئی ایک ترقی پسند افسانہ نگار ان سے متاثر بھی ہوئے۔

ٹھیک ہے [illegible] کی چیزیں کم لکھیں۔ اگر ان کا قلم رواں رہتا اور وہ ایک سرکاری منصب پر فائز نہ ہوتے تو ہمیں امید تھی کہ ایک [illegible] کو بہ حد متاثر کرتے رہتے۔ بہر حال ان کا جتنا بھی افسانوی سرمایہ موجود ہے وہ قطعی طور پر نظر انداز کر دینے کے قابل [illegible] روایت سے اپنا ناطہ جوڑ کر کچھ نہ کچھ تجربے بھی کئے ہیں جو میرے نزدیک قابل احترام ہیں۔

آگے چل کر [illegible] ادبی زندگی کو ایک ہی فقرے میں نپٹا گیا ہے۔ وہ یوں کہ "ان کا انداز یلدرم اور حجاب امتیاز علی کا [illegible] اس رومانیت کو آگے لے جانے کی بجائے پیچھے لے گئے ہیں۔"

ے۔ جیسے جیسے ان کا شعور پختہ ہوتا گیا۔ ان کے ہاں رومانیت کا عنصر رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ اگر کم نہ بھی ہوتی تو کیا رومان نگار ہونا عیب کی بات ہے؟ اگر ایسا ہے تو ہمارا کلاسیکل لٹریچر سارے کا سارا انہیں لوگوں کا ہے جن کو رومانی کہا جاتا ہے۔ دیکھنا تو یہ چاہیے تھا کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں کوئی نئی بات کی ہے یا نہیں۔ اگر ہم ان کی صرف ابتدائی چیزوں کو بھی نظر رکھیں تو ان کا ایک منفرد رنگ تھا جس کے یہ واحد مالک تھے اور موجودہ دور کے افسانوں میں بھی وہ تمام چیزیں مل جاتی ہیں جن کی ہم ایک اچھے افسانہ نگار سے توقع کر سکتے ہیں۔ اب میرزا ادیب کے افسانوں میں زندگی کے عام مسائل کا فنکارانہ تجزیہ ملتا ہے۔ معاشرت کی اچھائیوں اور برائیوں پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کے افسانے اب ایک تماشائی کی روداد نہیں ہیں بلکہ ان میں ایک سچے افسانہ نگار کا کھرا پن، خلوص اور ایک اچھے فن کار کی چابکدستی موجود ہے۔

میرزا ادیب بیک وقت افسانہ نگار بھی ہیں اور ڈرامہ نگار بھی۔ جہاں تک میرا خیال ہے وہ خود کو ڈرامہ نویس کی حیثیت سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

اوپندر ناتھ اشک کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ "وہ ڈرامے اچھے لکھتے ہیں اور افسانے میں اس چیز کا اندازہ نہیں کر سکتے کہ تفصیلات میں سے کون کون سی چیزیں منتخب کر کے کام میں لانی چاہئیں۔"

اشک صاحب عموماً اوریجنیلٹی (Originality) میں مارے جاتے ہیں۔ ان کے تمام افسانے اور ان کے افسانوں کے تمام کردار اس بات کے شاہد ہیں کہ ان کا افسانہ بڑا افسانہ بنے یا نہ بنے مگر اس میں کہیں بھی غیر فطری اور خواہ مخواہ کی سنسنی پیدا کرنے والی بات راہ نہیں پاتی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں منٹو کے افسانوں پر یہ اعتراض ہے کہ وہ افسانہ نگار کی حیثیت سے بعض غیر ضروری باتوں کو لا کر خواہ مخواہ عبرت ناک قسم کا تاثر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم افسانے کے فن اور اس کی نازک سی جزئیات کا پورا پورا احترام کریں تو اشک کے افسانے خواہ وہ بڑے افسانے نہ ہوں) ایک بڑے فنکار کی تخلیقات کے طور پر پیش کئے جا سکتے ہیں۔ یہ اشک کی بدقسمتی ہے یا خوش قسمتی کہ ان کے فن پر بھی ڈرامہ کچھ اس طرح چھا کر رہ گیا ہے کہ اُردو افسانے کے ضمن میں ان سے پورا پورا انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ پھر یہ بات بھی بہت کم ہی سمجھ میں آتی ہے کہ جو ڈرامہ لکھتے وقت ڈرامے کی ذرا ذرا سی جزئیات کو پیشِ نظر رکھتا ہو اور اس کی کوئی بھی چول ڈھیلی نہ ہونے دیتا ہو۔ وہ افسانے میں غیر ضروری باتیں لکھ دے۔ میرے خیال میں تو وہ تمام ضروری ہی باتیں لکھتے ہیں اور غیر ضروری باتیں لکھتے ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان کی کہانی افسانہ نہیں بنتی۔ پھر بھی چھ سات بڑے افسانہ نگاروں کو چھوڑ کر ان کی افسانوی تخلیقات بلا تامل پیش کیا جا سکتا ہے۔

فنکار کی حیثیت سے شفیق الرحمٰن اور قرۃ العین حیدر کی راہیں بالکل الگ الگ ہیں۔ ان دونوں کے فن کا مقابلہ کرنا یا ان کے بارے میں ایک ہی انداز میں سوچنا مناسب نہیں ہے۔ اگر ان دونوں نے اونچے طبقے کی زندگی کو پیش کیا ہے تو کیا ان تمام افسانہ نگاروں کے فن کے بارے میں ایک ساتھ سوچنا ہو گا جنہوں نے نچلے طبقے سے متعلق افسانے لکھے ہیں۔ اگر یوں سوچنا صحیح نہیں ہے تو شفیق الرحمٰن کے فن کا تجزیہ کرتے ہوئے کچھ مختلف انداز میں سوچنا ہو گا۔

شفیق الرحمٰن نے دو طرح کی چیزیں لکھی ہیں۔ ایک تو خالصتاً رومانی افسانے' دوسرے ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین' اور یہ ان دونوں قسم کی تحریروں میں بڑے کامیاب ہیں۔ جن میں ان کا اپنا ایک اسٹائل ہے۔ یہ اسٹائل اپنے اندر کشش اور ستھرا پن رکھتا ہے۔ نہ ان کے رومانی افسانے محض ذہنی عیش کے آئینہ دار ہیں اور نہ ان کی مزاحیہ تحریریں محض تفریح ہی تفریح ہیں بلکہ ان میں پورے رکھ رکھاؤ کے ساتھ حسن ہے، شائستگی ہے، ادب ہے اور اپنا ایک قطعی منفرد رنگ۔

اب یہ سوال کہ ان کا ادب کس درجے کا ہے' تو یہ بات سوچنے والی ضرور ہے مگر کوئی فیصلہ روا روی میں نہیں ہونا چاہئے۔ اگر کوئی رومانی افسانوں میں ایک منفرد اسٹائل اور شگفتہ نگاری کی بنیاد میں شفیق الرحمٰن کی تحریروں پر غور کرے گا تو انہیں ایک بڑا فرق ماننا پڑے گا۔

میں نے ان چند سطروں میں بات کو طول پکڑنے کی اجازت نہیں دی۔ نہ ہی مثالوں سے بھاری بھر کم بنانے پر راضی ہوا۔ یہ تو صرف اس حقیقت کا انکشاف ہے کہ میں آپ سے اتنا عرض کر سکوں کہ ان حضرات نے بھی افسانوی ادب میں' اپنے اپنے رنگ میں کچھ

ادارہ نقوش نے جدید تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نقوش کے درج ذیل پرچوں کو C.D. پر منتقل کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ درج ذیل پرچے C.D. پر محدود تعداد میں جلد دستیاب ہوں گے۔

قرآن نمبر اوّل، دوم، سوم، چہارم

قرآن نمبر (انگلش ترجمہ) اوّل، دوم

رسولؐ نمبر (مکمّل)

افسانہ نمبر ۔ شخصیات نمبر ۔ لاہور نمبر

غزل نمبر ۔ گولڈن جوبلی نمبر

○